DUE DATE

Cl. No. Acc. No. __________

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.





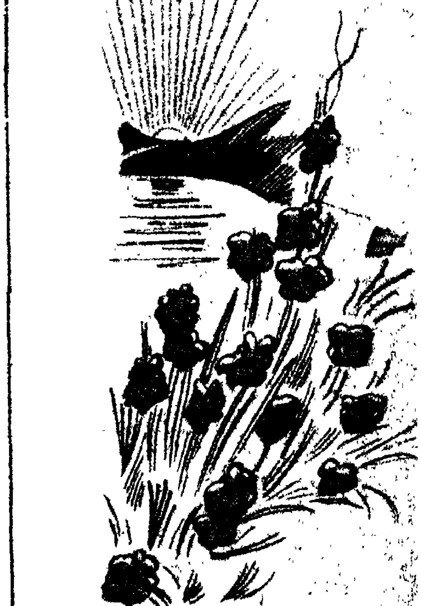
جسے مری نگاہ نے دیکھا نہ یہ کبھی،

فوٹو : ایس۔ پی اروڑہ۔ جے پور

ایڈیٹر ۔ خوشتر گرامی

فروری ۱۹۹۵ء

جلد ۔ ۲۹
نمبر ۔ ۲



قیمت فی پرچہ
۵ روپے
پتہ

[illegible]

مستقل خریداروں کی خدمت میں سالنامہ مفت بھیجا جا رہا ہے۔ اسے مفت حاصل کرنے کے لئے آپ آج ہی سالانہ قیمت آٹھ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج کر ... وی پی بھیجنے کی اجازت دے کر خریدار بن جائیں تاکہ سالنامہ ... کے لئے آپ کو ...

سالانہ قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں آپ کو ۹۰ پیسے کا فائدہ ہوگا۔ آٹھ روپے کی قلیل رقم میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ ڈیڑھ روپیہ قیمت کے خاص نمبر دیئے جاتے ہیں۔

[illegible]

(سالانہ خریدار بننے کا طریقہ) "بیسویں صدی" کے پاکستانی خریداروں کے لئے سالانہ قیمت بھیجنے کا آسان طریقہ ... منی آرڈر سے جناب ... نیو ٹاؤن کراچی کو بھیج دیں۔ کوپن پر سالانہ قیمت رسالہ بیسویں صدی ... کی رسید جو پوسٹ آفس سے ملتی ہے ہمیں بھیج دیجئے۔ رسید ملتے ہی "بیسویں صدی" آپ کے نام فوراً جاری ہو جائے گا اور سال بھر تک ماہ بماہ خدمت ہوتا رہے گا۔ ... دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی مقامی بینک کو یہ درخواست دیں کہ وہ "بیسویں صدی" دہلی کے خریدار بننا چاہتے ہیں اس لئے "بیسویں صدی" کی سالانہ قیمت ... کا ڈرافٹ دیا جائے۔ اس درخواست پر آپ کو ڈرافٹ مل جائے گا جسے آپ بذریعہ رجسٹری "بیسویں صدی" دہلی کے نام بھیج دیں۔ ... سال آپ کے نام جاری کر دیا جائے گا۔

سالانہ قیمت بذریعہ پوسٹل آرڈر ہرگز نہ بھیجیں۔ پوسٹل آرڈر راستے میں ضبط کر لئے جاتے ہیں۔

منیجر رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

تیرونشتر

خوشتر گرامی

تیغ کی بلندیوں سے ——— جہاں میرے محبوب رسول نے [illegible] حفاظت کرنے والے
جان نثار سورماؤں کی خدمت میں خلوص و محبت سے عقیدت کے پھول پیش کرتے ——— خوشتر گرامی

"[illegible]": ایک خبر ——— [illegible]

"[illegible] کے نعرے": ایک عنوان ——— [illegible] کے نعرے

"پاکستان پارلیمنٹ کا اجلاس شروع": ایک خبر ——— یہ ختم ہوا تو پارلیمنٹ کا اجلاس شروع ہوگا۔

"فیملی پلاننگ کو کامیاب بنانے کے لئے بھارت سرکار کا اقدام": ایک عنوان ——— ذہن کنٹرول آسان بنانے کے لئے [illegible] شامل کیا جائے۔

"چین میں [illegible] مشکل ہے": ایک خبر ——— بالکل صحیح۔ [illegible] ہے۔

"پنجاب کے لڑکوں پر تین کروڑ کے نئے ٹیکس ٹھونسے جائیں گے": ایک عنوان ——— تاکہ [illegible] کے خسارے کو پورا کیا جا سکے۔

"چین میں خوفناک پولیس راج۔ کوئی منہ نہیں کھول سکتا": ایک خبر ——— [illegible] سانپ، بچھو اور دیگر کھانے پینے کی چیزیں بھی رہتی ہوں گی۔

"سائنس جادوگری سے بچائی جانی چاہئے": شری چاگلہ کا اظہار خیال ——— لیکن ایٹم بم پھر بھی چلایا جا سکے گا۔

"ہندوستان نے چین کے ایک انچ علاقے پر بھی قبضہ نہیں کیا": ایک عنوان ——— بلکہ چین کو اپنے ہزاروں مربع میل علاقے پر قبضہ کرنے دیا۔

"فرعون کو فاقہ کشی کا سامنا۔ روٹی کی بجائے شکرقندی": ایک عنوان ——— ناشکر گزار بندہ! خدا کا شکر ادا کرو۔ شکرقندی مل رہی ہے۔ اس کے چھلکے نہیں۔

"گورکا کنٹرول اپنے مقصد میں ناکام رہا": ایک عنوان ——— نہ صرف گورکا کنٹرول [illegible] اور انہیں [illegible] تنگ آ کر [illegible] ہونا پڑا۔

"اناج کا بھاؤ نہ چڑھنے دو" — سکھاڑیا کی اپیل ——— اناج غائب ہو جائے گا تو کوئی نہیں پوچھے گا۔

"ہندوستان آزاد نہیں": راجہ جی کا تازہ ارشاد ——— اس امر کا ثبوت یہ ہے کہ [illegible] آزاد ہیں۔

"چنڈی گڑھ میں پارٹی منسٹروں کی کانفرنس" ——— جس میں پنجاب کے بیکار وزیروں کے مسئلے پر غور کیا گیا۔

"[illegible] گئے": ایک عنوان ——— [illegible]

"ذاکروں کے متعلق کانفرنس۔ شاستری جی بھی شریک ہوں گے": ایک خبر ——— تاکہ حکومت کے [illegible] سکیں۔

124068
5793

مستقل خریداروں کی خدمت میں سالنامہ مفت بھیجا جا رہا ہے۔ اسے مفت حاصل کرنے کے لئے آپ آج ہی سالانہ قیمت مبلغ آٹھ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج کر یا وی۔پی بھیجنے کی اجازت دے کر خریدار بن جائیں تاکہ سالنامہ کے لئے آپ کو جُدا قیمت نہ دینی پڑے سالانہ قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں آپ کو ۶۰ پیسے کا فائدہ ہوگا۔ آٹھ روپے کی قلیل رقم میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ ڈیڑھ ڈیڑھ روپیہ قیمت کے دو خاص نمبر بھی دیئے جاتے ہیں۔

(سالانہ خریدار بننے کا طریقہ) "بیسویں صدی" کے پاکستانی خریداروں کے لئے سالانہ قیمت بھیجنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ منی آرڈر سے جناب زاہد میاں۔ نیو ٹاؤن کراچی کو بھیج دیں۔ کوپن پر سالانہ قیمت رسالہ بیسویں صدی دہلی کے الفاظ ضرور لکھیں اور منی آرڈر کی رسید جو پوسٹ آفس سے ملتی ہے ہمیں بھیج دیجئے۔ رسید ملتے ہی "بیسویں صدی" آپ کے نام فوراً جاری ہو جائے گا اور سال بھر تک حاضر خدمت ہوتا رہے گا ———— خریدار بننے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی مقامی بنک کو یہ درخواست دیں کہ وہ "بیسویں صدی" دہلی کے خریدار بننا چاہتے ہیں اس لئے "بیسویں صدی" کی سالانہ قیمت مبلغ آٹھ روپے کے عوض ایک بینک ڈرافٹ دیا جائے۔ اس درخواست پر آپ کو ڈرافٹ مل جائے گا جسے آپ بذریعہ رجسٹری "بیسویں صدی" دہلی کے نام بھیج دیں۔ رجسٹری لفافہ ملتے ہی رسالہ آپ کے نام جاری کر دیا جائے گا۔ سالانہ قیمت بذریعہ پوسٹل آرڈر ہرگز نہ بھیجیں۔ پوسٹل آرڈر راستے میں ضبط کر لئے جاتے ہیں۔

منیجر رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر۶

تیرونشتر

خوشتر گرامی

زندگی لطیفہ ہے — جہاں [illegible] میری قومی درپردہ کی حفاظت کے لئے

[illegible] کی خدمت میں خلوص [illegible] سے عقیدت کے پھول پیش کئے — خوشتر گرامی

"چین نے دلائی لامہ کا پتہ کاٹ دیا" ایک خبر — یہ کونسا درخت ہے جس کا پتا ہے۔

"چینی پارلیمنٹ کا اجلاس شروع" ایک خبر — یہ ختم ہوا تو گو پارلیمنٹ کا اجلاس شروع ہوگا۔

"چین میں سادگی کی مشکل ہے" ایک خبر — بالکل جھوٹ۔ یہاں ڈبل روٹی ملتی ہے۔

"چین میں خوفناک پولیس راج۔ کوئی منہ نہیں کھول سکتا" ایک خبر — چوہے۔ سانپ۔ بچھو اور دیگر کھانے پینے کی چیزیں بھی رہتی ہوں گی۔

"ہندوستان نے چین کے ایک انچ علاقے پر بھی قبضہ نہیں کیا" ایک عنوان — بلکہ چین کو اپنے ہزاروں میل علاقے پر قبضہ کرنے دیا۔

"گولڈ کنٹرول اپنے مقصد میں ناکام رہا" ایک عنوان — نہ صرف گولڈ کنٹرول بلکہ گولڈ کنٹرولر مرارجی ڈیسائی بھی اور اُنھیں تو وزارت تک سے ہاتھ دھونا پڑا۔

"ہندوستان آزاد نہیں" راجہ جی کا تازہ ارشاد — اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ راجہ جی جو چاہیں کہنے میں آزاد ہیں۔

"بعض وزیر کروڑپتی بن گئے" ایک عنوان — [illegible] ہنوز اُنھیں ارب پتی ہونا چاہیئے تھا۔

"کانگریس سوشلزم کے نعرے" ایک عنوان — ہائے آہا! ہائے چینی کے نعرے۔

"فیملی پلاننگ کو کامیاب بنانے کے لئے بھارت سرکار کا قدم" ایک عنوان — دلہن کنٹرول آرڈر جاری کرنے کے لئے مرارجی ڈیسائی کو کابینہ میں شامل کیا جائے۔

"پنجاب کے لوگوں پر تین کروڑ کے نئے ٹیکس ٹھونسے جائیں گے" ایک عنوان — تاکہ کیروں راج کے خساروں کو پورا کیا جا سکے۔

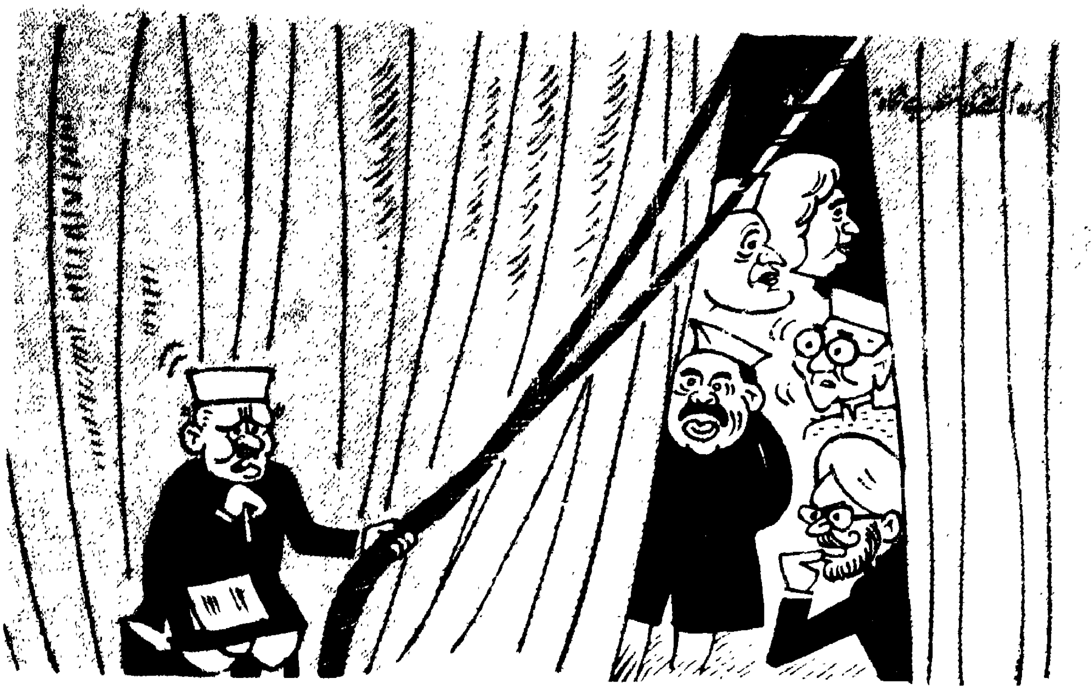
"سائنس پرائمری سے پڑھائی جانی چاہیئے" شری چھاگلہ کا اظہارِ خیال — لیکن ایٹم بم پھر بھی نہ بنایا جائے گا۔

"غریبوں کو فاقہ کشی کا سامنا۔ روٹی کی بجائے شکر قندی" ایک عنوان — ناشکر گزار بندو! خدا کا شکر ادا کرو۔ شکر قندی مل رہی ہے۔ اُس کے چھلکے نہیں۔

"اناج کا بھاؤ نہ چڑھنے دو"۔ سکھاڑیا کی اپیل — اناج غائب بیشک کرو کوئی نہیں پوچھے گا۔

"چنڈی گڑھ میں ہاؤسنگ منسٹروں کی کانفرنس" — جس میں پنجاب کے بے گھر وزیروں کے مسئلے پر غور کیا گیا۔

"ڈاکوؤں کے متعلق کانفرنس۔ شاستری جی بھی شریک ہوں گے" ایک خبر۔ — تاکہ حکومت کے نام پر ڈاکے ڈلوانے والے کانگریسیوں کی کارکردگی کا اندازہ لگا سکیں۔



مرکزی وزارت میں تبدیلیوں کی افواہیں۔

"رشوت لینے والا چپراسی گرفتار"۔ ـــــ نہ ہوا وزیر۔ بڑی سے بڑی بدعنوانی کے باوجود بندنا تا چھوٹا۔

"دانوں کو بھی آگ لگ گئی"۔ ایک عنوان ـــــــ کیا کاغذی تھیں؟

"سوتا کنٹرول آرڈر واپس نہیں لیا جائے گا"۔ ایک خبر ـــــــ بلکہ ویسا ہی ایک، بھوک کنٹرول آرڈر جاری کیا جائے گا۔

"بوڑھے اور معذور لوگوں کی مالی امداد کے لئے اسکیم شروع ہونے والی ہے" ایک خبر ـــــ راجہ جی۔ ماسٹر تارا سنگھ۔ سنت فتح سنگھ اور پنڈت سندرلال شرما وغیرہ مستحق لوگوں کا خیال رکھا جائے۔

"پنجاب سرکار منافع خوری اور بلیک مارکٹ کبھی برداشت نہیں کرے گی" سردار دربارہ سنگھ کا اعلان ـــــــ اس نے سردار کیروں کے انجام سے سبق سیکھا ہے۔

"آزاد بھارت میں بھی لوگوں کی حالت خراب"۔ ایک عنوان ـــــــ اسی لئے تو راجہ جی کہتے ہیں کہ بھارت ابھی تک آزاد نہیں ہوا۔

"ایک سال میں طلبا کی ۲۶۱ ہڑتالیں" ـــــــ اب ۲۹۵ میں سے جو دن بچے وہ مختلف چھٹیوں میں گزر گئے۔

"قومی اتحاد"۔ ایک عنوان ـــــــ جو ان دنوں بلیک کرنے والوں، منافع خوروں اور ذخیرہ اندوزوں کے درمیان بہت زور سے قائم ہے۔

"پاکستان کے بنیادی کیریکٹر کو سمجھو"۔ ایک عنوان ـــــــ جسے صدر ایوب نے سمجھا اور گندے سیاستدانوں سے نجات دلائی۔

"کیروں راج راون راج تھا" شری ہ ۔ ۔ ۔ کا بیان ـــــــ جسے ختم کرنے کے لئے بھگوان نے رام کشن کو مقرر کیا۔

"مفت ہاتھ پہ سونا بھی محال" ۔ایک عنوان —— چاندی تو آسان ہے۔

"وزیروں کے بیٹوں کو کاروباری فرموں میں ملازمت کی ممانعت کی جائے" —— یہ علاج نہیں ہے بلکہ ایسے وزیر بنائے جائیں جن کے لاد ہی نہ ہو۔

"اجارہ داروں کے ساتھ وزیروں کے تعلقات کرپشن کا کاسنا ہے" ۔ایک اخباری عنوان —— واہ صاحب! آپ اُن کی پرائیویٹ زندگی میں بھی مداخلت کرتے ہیں۔

"یونانی دواؤں میں بڑے پیمانے پر ملاوٹ" ڈاکٹر ... کا بیان —— یہ شاید انگلستان میں بھی یونانی ہی ہوتے ہوں گے جنہیں دواؤں کی بجائے صرف پانی کا استعمال کر لیا جاتا ہے۔

"لوگوں کی حالت بہتر نہ ہوئی تو انقلاب رونما ہوگا" ۔اشتراکی کا بیان —— ہمارا ارادہ ہے اسی لیے حالت کو بہتر بنانے کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔

"ریڈ بنک میں ..." ۔ایک خبر —— پنڈت شری رام شرما کو کیا سمجھئے۔

"ڈاکٹر عشق کا مریض" ۔ایک خبر —— ... اپنے آپ کو ... کرنا چاہتا ہوگا۔

"راجہ جی فیملی پلاننگ کے خلاف" ۔ایک عنوان —— اس لئے کہ راجہ جی جانتے ہیں اس ملک میں وزارتوں، سفارتوں، ... کی کوئی کمی نہیں۔

"آٹے کے ڈپوؤں پر آٹا نہیں" ۔ایک خبر —— شکر ادا کیجئے کہ ڈپو تو موجود ہیں۔



آپ کی قسمت ہے۔ سرکار کا کوئی قصور نہیں۔

"مانع حمل سستی دوائیاں تیار کرنے کے لئے پبلک سیکٹر میں فیکٹری" ایک خبر
—— قوم کو مانع حمل دواؤں کی نہیں مانع اشتہا اشیاء کی ضرورت ہے حضور۔

"یو۔پی سرکار گنڈوں کی نقل و حرکت پر پابندیاں لگانے لگی" ایک خبر —— پابندی کی کیا ضرورت ہے۔ ٹانگیں توڑ دیجئے۔ پاؤں کاٹ دیجئے۔ نہ پاؤں ہوں گے نہ گنڈہ نقل و حرکت کر سکے گا۔

"دلی کا نیا ڈھانچہ کیسا ہو؟" ایک عنوان —— ایسا جس میں ہر کانگرسی بلا کسی روک ٹوک وزیر بن سکے۔

"بینڈ پمپوں کا پانی مت پیو" کارپوریشن کی جنتا سے اپیل —— اس لئے کہ کارپوریشن گندہ پانی پلا کر یرقان اور ملیریا کے جراثیم تقسیم کرنا چاہتی ہے۔

"پاکستان کے سابق وزراء اسمگلر تھے" صدر ایوب کا انکشاف —— اور وہی لوگ اب پھر چور دروازوں سے آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

"لمبے بال رکھنے کی ممانعت" جاپان کے ایک اسکول میں فساد —— ہندستانی لڑکیوں نے اسی لئے پہلے ہی بال کٹوانے شروع کر دیئے ہیں۔

"چاول حاصل کرنے کا کام تسلی بخش" ایک عنوان —— مگر چاول کھانے کا کام بے اطمینانی کا موجب۔

"بناسپتی پر کنٹرول نہیں ہوگا" ایک خبر —— اس لئے کہ ایسا کرنے سے منافع خوروں کو نقصان پہنچے گا۔

"گوڑگاؤں کے پرچون فروشوں کا حلف" ایک خبر —— زیادہ سے زیادہ ملاوٹ کر کے قلت اجناس کو دور کیا جائے گا۔

"پاکستان میں جمہوریت کی شمع نہیں بجھے گی" پاکستانی اخبارات —— بشرطیکہ سابق سیاستدانوں کی چالیں کامیاب نہ ہوں۔



بیسویں صدی دہلی

"پنجاب کے دانی افسر" ایک عنوان ـــــ دانی لیڈروں کے ساتھ چلتے کئے جائیں۔

"پچھڑا معیار بلند کریں" ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا مشورہ ـــــ مگر کیسے کریں۔ اب تو قطب مینار کی ایک منزل سے اوپر چڑھنے ہی نہیں دیا جاتا۔

"ہنک گودام تعمیر کے مسئلہ خوراک کے حل میں مدد دیں" پنجاب کے وزیر مالیات کا بیان ـــــ تاکہ اگر خوراک نہ ملے تو گوداموں کی دیواریں چاٹ کر گزارہ کیا جا سکے۔

"کوئلے کی برآمد پر پابندیاں ختم" ایک افواہ ـــــ اب لوگ دل کھول کر کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے کر سکتے ہیں۔

"پراپرٹی ٹیکس و ہاؤس ٹیکس ملا دئے جائیں" ایک عنوان ـــــ تاکہ ٹیکس چوروں کو دو دو ٹیکس چوری کرنے کی زحمت نہ ہو اور ایک ہی ٹیکس چوری کرنا پڑے۔

"چوڑیوں کی صنعت میں کرائسس" ایک عنوان ـــــ شاید چوڑی کنٹرول آرڈر جاری ہوا ہے کوئی۔

"عاشق کے ساتھ جانے کے لئے باپ کی مرمت" ایک خبر ـــــ مجنوں نے خبر پڑھی تو کہا کاش میری لیلا ایسی ہوتی۔

"پہرچون فروشوں کو سرکاری ایجنٹوں کے طور پر کام کرنا ہوگا" کرشنم اچاری ـــــ اور وہ وزارتیں۔ سفارتیں براہ راست تقسیم کیا کریں گے۔

"راجدھانی کے دھماکوں کی گونج" ایک عنوان ـــــ لوک سبھا میں سنی گئی اور ممبروں نے اظہار تشویش کیا۔

راجہ مہدی علیخاں لکھتے ہیں۔ "بمبئی میں کوئلہ غائب" ـــــ دلی میں تو میاں اکثر پانی تک غائب ہو جاتا ہے۔

"ہوشربا گرانی" ـــــ طلسم ہوشربا کا تازہ ترین ایڈیشن۔

"زیادہ شراب صحت کے لئے تباہ کن۔ شراب کی بوتل پر لکھنے کی ہدایت" ـــــ مگر یہ ہدایت لکھنے کے لئے ہے پڑھنے کے لئے نہیں۔ پڑھ لی جائے تو عمل کرنے کے لئے نہیں۔



"پاکستان کے صدارتی انتخاب کے بارے میں دونوں اُمیدواروں کے ہمنواؤں نے جیوتشیوں سے مشورے لئے" ـــــ جیوتشیوں کے وارے نیارے

شعبہ سیاسیات، گورنمنٹ ڈگری کالج، دتیا (مدھیہ پردیش)

۲۳ اکتوبر ۱۹۹۳ء   برادر محترم! تسلیمات

انجمن ترقی اردو کانفرنس جے پور میں شرکت سے واپس ہوا ہی تھا کہ آپکا [illegible] ہو گیا۔ بستر پر دراز ہوں ورنہ اب تک تو کبھی کا وہاں پہنچ گیا ہوتا ——— ان دنوں دوستوں سے دور ہوں کیونکہ ۱۴ اکتوبر سے تمام اسٹاف کالج بند ہوتے ہی تین ہفتہ کی تعطیلات میں دتیا چھوڑ چکے ہیں۔ ایسے عالم میں وہ قصے ذہن میں اُبھر رہے ہیں جنھیں میں نے بہت پہلے اندور کی حسین فضاؤں میں مکمل لیا تھا ——— تصویریں پر خطوط کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

آپ کا ——— ظفر احمد نظامی

شام کی [illegible] فضاؤں میں کمپنی باغ کے خوبصورت پھول خوشبو بکھیر رہے تھے۔ ہوا کے جھونکے [illegible] درخت [illegible] تھے۔ [illegible] ان کو مسرور کر رہا تھا۔ آسودگی چہروں سے نمایاں تھی۔ خوبصورت جوڑے ہاتھ میں ہاتھ دیئے [illegible] میں مصروف دنیا سے بے خبر، خود سے بے نیاز، محبت کی ابتدائی منزلوں کی طرف گامزن تھے۔ وہ بھی شہر کی پریشان کن اور منافقانہ مصروف زندگی سے بھاگ کر ان مناظر میں پناہ لینے آپہنچا تھا اور اسوقت اپنی ایک ادھوری نظم کی تکمیل میں مصروف تھا جو اس نئے شہر سے متاثر ہو کر لکھی جا رہی تھی۔ اس نے شفق کی سرخی پر نظر دوڑاتے ہوئے چند مصرعے موزوں کئے اور پھر لکھنے میں محو ہو گیا۔ خیالات اس کے دل و دماغ سے اُبلنے لگے اور وہ انہیں نظم کی گرفت میں لانے لگا۔ تخیلات کی رنگینیاں اور تصورات کی رعنائیاں الفاظ میں ڈھلنے لگیں اور الفاظ اشعار کی نغمگی کا روپ اختیار کرنے لگے۔ باغ کی حسین فضاؤں میں اس کے جذبات اُمنڈ رہے تھے۔ محویت بڑھتی جا رہی تھی۔ دفعتاً اس کی نظر اٹھی۔ اس نے دیکھا کہ سامنے کی بنچ پر بیٹھی ایک خوبصورت لڑکی اُس پر نگاہیں جمائے ہوئے ہے۔ اس کی نگاہوں میں ایک مضطرب تجسس پنہاں تھا جو اُس کے ذوقِ تجسس کی غمازی کر رہا تھا۔ وہ یقیناً کسی کالج سے تعلق رکھتی تھی۔ ایسی معصوم اور رومانی فضاؤں میں تنہائی شعری ذوق کی توہین ہے۔ اس نے سوچا۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ وہ پھر تخلیق میں ڈوب گیا اور گنگنانے لگا۔ اس طرح مصرعے بہت جلد موزوں ہو جاتے ہیں۔ ترنم اور موسیقی اشعار کا بہترین سانچہ ہے۔ اسی عالم میں ایک نقرئی آواز اس کے کانوں میں گونج گئی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"

"ضرور ضرور!" اُس نے دیکھا، وہی خوبصورت لڑکی بنچ سے اُٹھ کر اُس کے پاس پہنچ چکی تھی۔

"میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟"

"ممکن ہے! دُنیا بہت چھوٹی تو نہیں!!"

"لیکن کہاں دیکھا ہے؟ یہی سوچ رہی ہوں!"

"یاد کیجئے"

"آپ شاعر ہیں؟"

"جی ہاں کچھ کہہ تو لیتا ہوں"

"تو پھر کسی مشاعرے ہی میں دیکھا ہوگا"

"ممکن ہے"

"میں آپ کے کلام سے شاید آپ کو یاد رکھ سکی ہوں۔ آپ کا تخلص؟"

"مجھے راہی کہتے ہیں"

"ہاں ہاں! اسی نام سے میں نے آپ کو پہچانا۔ بمبئی میں شاید پہلی بار آئے ہیں آپ؟"

"جی ہاں! ایک فلم کے گیت لکھنے کو کنٹریکٹ ملنے کی اُمید ہے۔"

"خدا آپ کو کامیاب کرے۔"

"شکریہ! اگر آپ نے تو اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں؟"

"جی، مجھے ممتاز کہتے ہیں۔"

"بہت خوب، واقعی آپ ممتاز ہیں ۔ ۔ ۔ مشغلہ؟"

"ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔"

"بہت خوب! غالباً ادب سے بھی دلچسپی ہے؟"

"جنون کی حد تک۔ کوئی نظم کہہ رہے تھے شاید آپ؟"

"جی ہاں، اس ماحول سے متاثر ہو کر کچھ کہنے لگا تھا۔"

"میں خواہ مخواہ مخل ہوئی۔"

"نہیں، یہ بات نہیں۔"

"تو سنائیے اپنی نظم۔"

"ابھی نقطۂ عروج تک نہیں پہنچی ۔ ۔ ۔ اور آپ جانتی ہیں کہ نظم کلائمکس کی منزل تک پہنچ کر ہی اپنا تاثر مکمل کرتی ہے۔"

"پھر اسے مکمل کر لیجئے۔"

"دیکھئے کوشش کرتا ہوں۔"

ممتاز رسالے کے صفحات میں گم سی ہو گئی۔ اور راہی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ بڑی عجیب بات تھی۔ اس نے اپنی شاعری پر فخر محسوس کیا۔ وہ اپنی شاعری کے باعث مقبول تھا۔ وہ ایک ممتاز شاعر تھا۔ بمبئی آتے ہی اس سے ایک پروڈیوسر نے گیت لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ اگرچہ وہ ایسی پابندیوں کو فن کے لئے مضر سمجھتا تھا لیکن حالات سے مجبور تھا۔ بمبئی جیسے شہر میں جہاں اجنبیت ہی اجنبیت تھی۔ اُسے ممتاز ایک بڑا سہارا معلوم ہوئی۔ اُس نے لوگوں سے سنا تھا کہ بمبئی میں قریبی دوست بھی دوست نہیں رہتا۔ وہاں تجارت ہے، کاروبار ہے۔ ہر شخص پیسے کمانے کی دُھن میں رہتا ہے۔ دوستی وہاں صرف الفاظ کا کھیل ہے۔ وہاں کی زندگی بالکل مشین بن گئی ہے۔ وہاں کوئی کسی کو سہارا نہیں دیتا۔ اور اگر کوئی سہارا دیدے تو اُسے فرشتہ سمجھنا چاہئے۔ اور ممتاز کی حیثیت بھی کچھ اسی قسم کی تھی۔ اُس نے جلدی جلدی شعر کہنے شروع کر دئے اور نظم اپنی منزل کی جانب بڑھتی گئی۔ ممتاز کی نظریں بے چینی سے صفحات پر دوڑ رہی تھیں۔ اُس کی زلفوں سے خوشبوئیں بکھر رہی تھیں۔ خوبصورت ساڑی میں اس کا جسم اجنتا کے کسی حسین مجسمے کی طرح اپنے نقش نمایاں کر رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور آنکھوں میں متانت کا انداز تھا۔ کبھی کبھی پڑھتے ہوئے وہ مسکرا اُٹھتی۔ اُس کی مسکراہٹ حسین اور دلکش تھی۔ رسالہ بند کرتے ہوئے وہ بولی۔

"معاف کیجئے، مجھے دیر ہو گئی افسانہ ختم کرنے میں۔"

"ہو گئی مکمل؟"

"جی ہاں"

"عنوان کیا ہے؟"

"شام ۔ ۔ ۔ عروس البلاد۔"

"بہت خوب! چلئے پہلے پارک کے ریسٹوران میں چائے پئیں۔ وہیں نظم سنوں گی آپ سے۔"

"چلئے"

اور وہ دونوں ریسٹوران میں آ گئے ۔ بیٹھتے ہوئے ریسٹوران میں داخل ہوتے ہوئے ممتاز نے زمانے کی بہت سی چیزوں کا ذکر کیا۔ راہی نے سوچا کتنی مہذب ہے۔ زمانہ ادب کی صحیح قدر دان! لوگ اسے مفت میں بمبئی کو بدنام کرتے ہیں۔ یہ تو شعر و ادب کا مرکز ہے۔ کتنے خوش اخلاق ہیں یہاں کے لوگ۔ اور شعر و ادب کا کتنا پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں۔ میز پر کھانے کی بہت سی چیزیں چن دی گئیں۔

ممتاز نے نظم سنانے کی فرمائش کی۔ چائے کے دوران میں اُس نے نظم شروع کی۔ جو واقعی بہت اچھی تھی۔ ممتاز نے اُسے بہت پسند کیا۔ وہ بہت متاثر ہوئی۔ اُس نے ایک کاغذ نکالا اور اُس پر کچھ لکھنے لگی۔ غالباً نظم ہی لکھ رہی تھی۔

قریب ہی لڑکیوں کا ایک جھرمٹ نظر پڑا۔ سرخ سرخ ہنسی ۔ ۔ ۔ زرد زرد نیلے پیلے آنچل فضاؤں میں سرسرا گئے۔ اب وہ ماحول کو رنگینی بخش رہی تھیں۔ ممتاز نے اُدھر دیکھا تو اُس کی کسی سہیلی نے آواز دی۔

"ارے ممتاز تم؟"

"او تم یہاں کیسے؟"

اُس نے راہی سے کہا: "میں آپ کو اپنی ایک عزیز ترین سہیلی سے متعارف کراتی ہوں۔ اس کو ادب سے عشق ہے۔"

راہی کے چہرے پر مسرت کی سُرخی دوڑ گئی۔ ممتاز اپنی سہیلی کو بلانے کی غرض سے اُٹھی اور سہیلیوں کے جھرمٹ میں گم ہو گئی۔

راہی نے اس دوران میں نظم پر نظر ثانی کرنے کا ارادہ کیا تو یاد آیا کہ اُس کا پارکر پین تو ممتاز کے پاس ہے۔ وہ پرچہ وہیں رہ گیا تھا جس میں اُس نے راہی کی نظم کے چند اشعار لکھے تھے۔ راہی نے وہ کاغذ اٹھا لیا۔ اُس پر اشعار نہیں یہ عبارت لکھی تھی

"خدا کا شکر ہے کہ میرا اضطراب دُور ہوا۔ میں نے اب تک شام کی چائے نہیں پی تھی۔ یہ بمبئی ہے۔ آپ کی سادہ لوحی پر رحم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یادگار کے طور پر صرف آپ کا قلم لے جا رہی ہوں۔ شکریہ۔"

راہی کا سر چکرانے لگا۔ دُور سے قہقہوں کی آوازیں آتی محسوس ہو رہی تھیں اور سامنے بیرا ادب سے بل لئے کھڑا تھا۔

قہقہے

پروفیسر ظفر احمد نظامی ایم اے

شعبۂ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، [illegible] (مدھیہ پردیش)

[illegible] اکتوبر [illegible]ء

برادرِ محترم [illegible]

انجمن ترقی اردو کانفرنس [illegible] میں شرکت سے واپس ہوا [illegible] آپ کے [illegible] پہنچ گیا ہوتا ——— اِن دِنوں دوستوں سے دور ہوں کیونکہ [illegible] اکتوبر سے [illegible] میں [illegible] ایسے ہی عالم میں یہ "قہقہے" ذہن میں اُبھرے [illegible] ——— تصویر [illegible] خطوط کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

ظفر احمد نظامی

شام کی سُرمئی فضاؤں میں ملانہ وپارک کے خوبصورت پھُول خوشبوئیں بکھیر رہے تھے۔ ہوا کے ہلکے ہوئے جھونکے اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ یہ حسین ماحول دل کو مسرور بخش رہا تھا۔ آسودگی چہروں سے نمایاں تھی۔ خوبصورت جوڑے ہاتھ میں ہاتھ دیئے چہل قدمی میں مصروف دُنیا سے بے خبر، خود سے بے نیاز محبت کی انجانی منزلوں کی طرف گامزن تھے۔ وہ بھی شہر کی پریشان کُن اور انتہائی مصروف زندگی سے بھاگ کر ان مناظر میں پناہ لینے آپہنچا تھا اور اسوقت اپنی ایک ادھوری نظم کی تکمیل میں مصروف تھا جو اِن نئے شہر سے متاثر ہو کر کہی جا رہی تھی۔ اُس نے شفق کی سُرخی پر نظر دوڑاتے ہوئے چند مصرعے موزوں کئے اور پھر لکھنے میں محو ہو گیا۔ خیالات اُس کے دل و دماغ سے اُبلنے لگے اور وہ انھیں قلم کی گرفت میں لانے لگا۔ تخیلات کی رنگینیاں اور تصورات کی رعنائیاں الفاظ میں ڈھلنے لگیں اور الفاظ اشعار کی نغمگی کا رُوپ اختیار کرنے لگے۔ باغ کی حسین فضاؤں میں اُس کے جذبات اُمنڈ رہے تھے، محویت بڑھتی جا رہی تھی۔ دفعتاً اُس کی نظر اُٹھی۔ اس نے دیکھا کہ سامنے کی بینچ پر بیٹھی ایک خوبصورت لڑکی اُس پر نگاہیں جمائے ہوئے ہے۔ اُس کی نگاہوں میں ایک مضطرب تجسس پنہاں تھا جو اُس کے ذوقِ تجسس کی غمازی کر رہا تھا۔ وہ یقیناً کسی کالج سے تعلق رکھتی تھی۔ ایسی معصوم اور رومانی فضاؤں میں تنہائی شعری ذوق کی توہین ہے۔ اُس نے سوچا۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ وہ پھر تخلیق میں ڈُوب گیا اور گنگنانے لگا۔ اِس طرح مصرعے بہت جلد موزوں ہو جاتے ہیں۔ ترنم اور موسیقی اشعار کا بہترین سانچہ ہے۔ اِسی عالم میں ایک نقرئی آواز اُس کے کانوں میں گونج گئی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"

"ضرور ضرور!" اُس نے دیکھا، وہی خوبصورت لڑکی بینچ سے اُٹھ کر اُس کے پاس پہنچ چکی تھی۔

"میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟"

"ممکن ہے! دُنیا بہت چھوٹی تو نہیں!!"

"لیکن کہاں دیکھا ہے؟ یہی سوچ رہی ہوں!"

"یاد کیجئے۔"

"آپ شاعر ہیں؟"

"جی ہاں کچھ کہہ تو لیتا ہوں۔"

"تو پھر کسی مشاعرے ہی میں دیکھا ہوگا۔"

"ممکن ہے۔"

"میں آپ کے کلام سے شاید آپ کو یاد رکھ سکی ہوں۔ آپ کا تخلص؟"

"مجھے راہی کہتے ہیں۔"

"ہاں ہاں! اِسی نام سے میں نے آپ کو پہچانا۔ بمبئی میں شاید پہلی بار آئے ہیں آپ؟"

"جی ہاں! ایک فلم کے گیت لکھنے کا کنٹریکٹ ملنے کی اُمید ہے۔"

"خدا آپ کو کامیاب کرے۔"

"شکریہ! مگر آپ نے تو اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں؟"

"جی! مجھے ممتاز کہتے ہیں۔"

"بہت خوب، واقعی آپ ممتاز ہیں ..... مشغلہ؟"

"ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔"

"بہت خوب! غالباً ادب سے بھی دلچسپی ہے؟"

"جنون کی حد تک۔ کوئی نظم کہہ رہے تھے شاید آپ؟"

"جی ہاں، اس ماحول سے متاثر ہو کر کچھ کہنے لگا تھا۔"

"میں خواہ مخواہ مخل ہوئی۔"

"نہیں، یہ بات نہیں۔"

"تو سنائیے اپنی نظم۔"

"ابھی نقطۂ عروج تک نہیں پہنچی ..... اور آپ جانتی ہیں کہ نظم کا تسلسل کی منزل تک پہنچ کر ہی اپنا تاثر مکمل کرتی ہے۔"

"..... پھر اسے مکمل کر لیجئے۔"

"دیکھئے کوشش کرتا ہوں۔"

ممتاز رسالے کے صفحات میں گم سی ہو گئی۔ اور راہی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں۔ بڑی عجیب بات تھی۔ اس نے اپنی شاعری پر فخر محسوس کیا۔ وہ اپنی شاعری کے باعث مقبول تھا۔ وہ ایک ممتاز شاعر تھا۔ بمبئی آتے ہی اس سے ایک پروڈیوسر نے گیت لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ گو وہ ایسی پابندیوں کو فن کے لئے مُضر سمجھتا تھا لیکن حالات سے مجبور تھا۔ بمبئی جیسے شہر میں یہاں اجنبیت ہی اجنبیت تھی، اُسے ممتاز ایک بڑا سہارا معلوم ہوئی۔ اُس نے لوگوں سے سنا تھا بمبئی میں قریبی دوست بھی دوست نہیں رہتا۔ وہاں تجارت ہے، کاروبار ہے۔ ہر شخص پیسے کمانے کی دُھن میں رہتا ہے۔ دوستی وہاں صرف الفاظ کا کھیل ہے۔ وہاں کی زندگی بالکل مشین کی سی ہے۔ وہاں کوئی کسی کو سہارا نہیں دیتا۔ اور اگر کوئی سہارا دیدے تو اُسے فرشتہ سمجھنا چاہئے۔ اور ممتاز کی حیثیت بھی کچھ ایسی قسم کی تھی۔ اُس نے جلدی جلدی شعر کہنے شروع کر دیئے اور نظم اپنی منزل کی جانب بڑھتی گئی۔ ممتاز کی نظریں بے چینی سے صفحات پر دوڑ رہی تھیں۔ اُس کی زلفوں سے خوشبوئیں بکھر رہی تھیں۔ خوبصورت ساڑی میں اس کا جسم اجنتا کے کسی حسین مجسمے کی طرح اپنے نقش نمایاں کر رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور آنکھوں میں متانت کا سمندر تھا۔ کبھی کبھی پڑھتے ہوئے وہ مسکرا اُٹھتی۔ اُس کی مسکراہٹ حسین اور دل کش تھی۔ رسالہ بند کرتے ہوئے وہ بولی۔

"معاف کیجئے، مجھے دیر ہو گئی افسانہ ختم کرنے میں۔"

"ہو گئی مکمل؟"

"جی ہاں۔"

"عنوان کیا ہے؟"

"عنوان ..... عروسِ البلاد۔"

"بہت خوب! چلیے پہلے پارک کے کینٹین میں چائے پی لیں۔ وہیں نظم سنوں گی آپ سے۔"

"چلیے۔"

اور وہ دونوں سڑک پار کر کے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کینٹین میں داخل ہوئے۔ ممتاز نے کھانے کی بہت سی چیزوں کا آرڈر دے دیا۔ راہی نے سوچا کتنی مہذب ہے ممتاز۔ ادب کی صحیح قدر دان! لوگوں نے مفت بمبئی کو بدنام کر رکھا ہے۔ یہ تو شعر و ادب کا مرکز ہے۔ کتنے خوش اخلاق ہیں یہاں کے لوگ۔ اور شعر و ادب کا کتنا پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں۔ میز پر کھانے کی بہت سی چیزیں چُن دی گئیں۔ ممتاز نے نظم سنانے کی فرمائش کی۔ چائے کے دوران میں اُس نے نظم شروع کی۔ جو واقعی بہت اچھی تھی۔ ممتاز نے اُسے بہت پسند کیا۔ وہ بہت متاثر ہوئی۔ اُس نے ایک کاغذ نکالا اور اُس پر کچھ لکھنے لگی۔ غالباً نظم ہی لکھ رہی تھی۔

قریب ہی لڑکیوں کا ایک جھرمٹ نظر پڑا۔ سبز، سُرخ، مُنہ پی ..... اور نہ جانے کتنے رنگین آنچل فضاؤں میں سرسرا گئے۔ اب وہ ماحول کو رنگینی بخش کر بٹ سے جا رہی تھیں۔ ممتاز نے اُدھر دیکھا تو اُس کی کسی سہیلی نے آواز دی۔

"ارے ممتاز تم؟"

"اور تم یہاں کیسے؟"

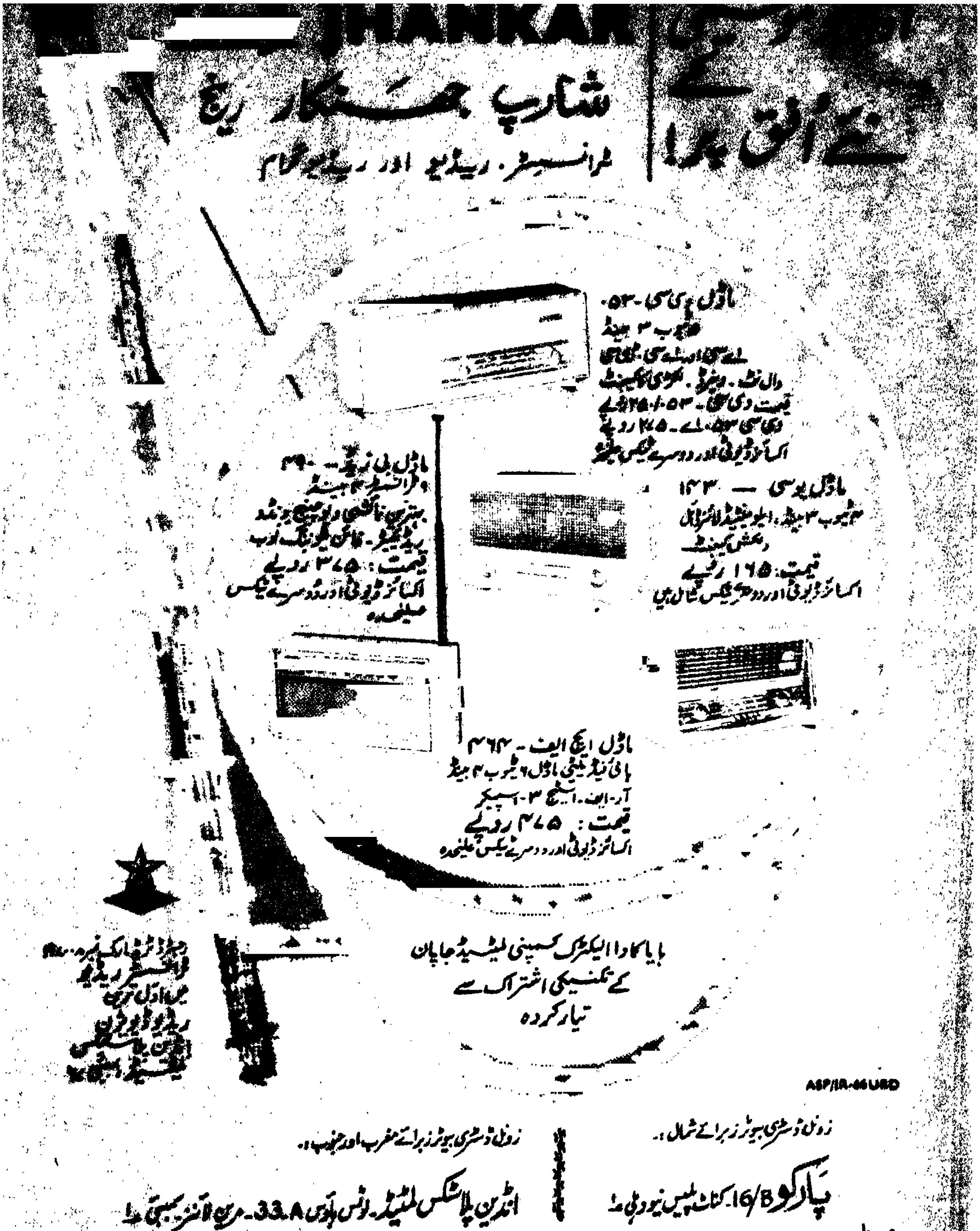
اُس نے راہی سے کہا "میں آپ کو اپنی ایک عزیز ترین سہیلی سے متعارف کراتی ہوں۔ اس کو ادب سے عشق ہے۔"

راہی کے چہرے پر مسرت کی سُرخی دوڑ گئی۔ ممتاز اپنی سہیلی کو بُلانے کی غرض سے اُٹھی اور سہیلیوں کے جھرمٹ میں گم ہو گئی۔

راہی نے اس دوران میں نظم پر نظرِ ثانی کرنے کا ارادہ کیا تو یاد آیا کہ اُس کا پارکر پین تو ممتاز کے پاس ہے۔ وہ پرچہ وہیں رہ گیا تھا جس میں اُس نے راہی کی نظم کے چند اشعار لکھے تھے۔ راہی نے وہ کاغذ اُٹھا لیا۔ اُس پر اشعار نہیں یہ عبارت لکھی تھی

"خدا کا شکر ہے کہ میرا اضطراب دُور ہوا۔ میں نے صبح سے اب تک شام کی چائے نہیں پی تھی۔ یہ بمبئی ہے۔ آپ کی سادہ لوحی پر رحم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یادگار کے طور پر صرف آپ کا قلم لئے جا رہی ہوں۔ شکریہ!"

راہی کا سر چکرانے لگا۔ دُور سے قہقہوں کی آوازیں آتی محسوس ہو رہی تھیں اور سامنے بیرا ادب سے بل لئے کھڑا تھا۔


JHANKAR
شارپ جھنکار رینج
ٹرانسسٹر، ریڈیو اور ریڈیو گرام
ماڈل پی سی-۵۳
قیمت
اکسائز ڈیوٹی اور دوسرے ٹیکس علیحدہ
ماڈل پی سی — ۱۴۳
قیمت: ۱۶۵ روپے
قیمت: ۳۷۵ روپے
ماڈل ایچ ایف - ۴۶۴
قیمت: ۴۷۵ روپے
اکسائز ڈیوٹی اور دوسرے ٹیکس علیحدہ
ہایاکاوا الیکٹرک کمپنی لمیٹیڈ جاپان
کے تکنیکی اشتراک سے
تیار کردہ
ASP/IR-66 URD
زونل ڈسٹری بیوٹرز برائے شمال:
پارکو 16/B۔ کناٹ پلیس نیو دہلی ۱
زونل ڈسٹری بیوٹرز برائے مغرب اور جنوب:
انڈین پلاسٹکس لمیٹیڈ۔ 33.A۔ مرین لائنز، بمبئی ۱

DR. W. H. A. SHADANI,
M.A., Ph.D. (London)
Professor & Head of the Department

پیارے خورشید! ابھی ابھی تمہارا خط ملا۔ پڑھ کر میں سوچتا ہی رہ گیا کہ یہ تم نے کیا لکھا ہے
کہ ملال نامہ سر پر آگیا۔ اس سلسلے میں آپ کو تکلیف دینا چاہتا ہوں ...... اور ویسے بھی تو آپ کے مجھ پر اتنے احسان ہیں کہ زندگی میں
بھول نہیں سکتا۔ بہت خوش ہوں کہ اگر ابھی کوئی بات یاد آتی ہے [illegible] احسان سے تعبیر کر سکوں۔ تمہارا احسان البتہ مجھ پر ہے۔ ایسا
احسان جو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ چالیس برس پہلے کا زمانہ یاد کرو۔ [illegible] تم [illegible] کی کوٹھی میں ایک ہی
کمرے میں رہتے تھے۔ جب میں یکایک بیمار ہو گیا تھا اور بیماری نے طول کھینچا تھا۔ اس وقت تم نے جس طرح میری [illegible] تیمارداری کی تھی
اس کا نقش آج تک دل سے محو نہیں ہوا نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ تم کمرے میں جھاڑو دیتے تھے۔ نل سے پانی بھر بھر کر لاتے تھے۔ میرا بستر صاف
کر کے بچھاتے تھے۔ سہارا دے کر بٹھاتے تھے۔ [illegible] ہاتھ منہ دھلاتے تھے۔ دوا وغیرہ پلاتے تھے۔ میرے لیے پرہیزی کھانا تیار کرتے تھے۔
میرا حقیقی چھوٹا بھائی بھی ہوتا تو اتنی دل سوزی سے میری خدمت نہ کر سکتا۔ اب بتاؤ احسان کس نے کیا؟ میں نے یا تم نے؟ اور ہاں خورشید!
جب بھی تمہارا خط آتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گیا ہوا زمانہ لوٹ آیا ہے۔ دل پر گزرے ہوئے ہی لمحے ہیں جو خوش گوار یادوں کے
پھول بن کھلتے ہیں۔ میری تصویر [illegible] ہو گا اور لوگ تمہاری خوش ذوقی کے متعلق شبہ کرنے لگیں گے۔ بہت بہت پیار،

تمہارا عندلیب شادانی

غزل

پروفیسر ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم اے پی ایچ ڈی

وہ الم کشوں کا ملنا، وہ نشاطِ غم کے سائے + کبھی مہ پرہ تبسم، کبھی اشک مسکرائے
جو ہزار نامرادی، بسے عمر بھر سراپا + اُسے بے وفا کہوں اب یہ جگر کہاں سے آئے
یہ افق سے چاند ابھرا، کہ شفق کا نور پھیلا + کہ تری ضیائے رخ سے در و بام جگمگائے
ہے ازل سے یوں تو جاری شب و روز کا تسلسل + ترے ساتھ دن جو گزرے کبھی لوٹ کر نہ آئے
لبِ ناز کا تبسم، لبِ ناز کی ہے غیرت + مجھے کیوں یقین آئے، اگر آنکھ مسکرائے
تری آرزو کے قرباں! یونہی زندگی گنوائی + اس امید میں کہ شاید، کوئی انقلاب آئے
ترا سوزِ والہانہ، مری شمعِ زندگانی + کہیں نامرادیوں میں یہ چراغ بجھ نہ جائے
یہ بہار کیا کرے گی، مرے درد کا مداوا + نہ وہ بجلیاں نظر کی، نہ وہ گیسوؤں کے سائے
کوئی جرم ہے محبت کہ چھپا چھپا کے رکھئے + کہیں کوئی آنہ جائے کہیں کوئی پا نہ جائے
مرے بادہ نوش سے اُٹھی جو شمیم مشک و عنبر + کئی دوست جھوم اُٹھے کئی دوست مسکرائے

شعیب ردولوی ایم اے

لائبریرین سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، رڑکی (یوپی)

۲۷ نومبر ۱۹۶۴ء   پیارے بھائی اخلاص و محبت

میری تخلیقات پر ایسے حوصلہ افزا خطوط ملے جن کا تقاضہ ہے کہ میں اپنی ادبی کاوشیں جاری رکھوں۔ قارئین کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس بار آپ کے حضور میں "پُروا" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ اسے بھی میں نے دیگر کہانیوں کی طرح پورے اعتماد سے لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے آپ یہ جدت طرازی پسند کریں گے۔ مجھے کمل کا پیغام دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانا ہے۔ اسی لئے بیسویں صدی کا سہارا لے رہا ہوں۔ میں اُن تمام حضرات کا ممنون ہوں جنھوں نے مجھے اپنی گرانقدر رائے سے نوازا ہے۔ اِس کہانی پر بھی قارئین کی رائے کا انتظار کروں گا....

نیازمند ـــــــ شعیب ردولوی

میرے جسم سے لاوا پھوٹ نکلا۔ کمل کی اس حرکت نے مجھے نفرت اور غصہ کی دہکتی ہوئی بھٹی میں جھونک دیا۔ میرے تصور پر ایسی بجلی گری کہ نازک احساسات اور مہکتے ہوئے خواب جھلس کر رہ گئے۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اتنا گر سکتا ہے۔ اُس کے کردار کا دوسرا رُخ اتنا گھناونا اور قابلِ نفرت بھی ہو سکتا ہے، یہ میرے گمان میں بھی نہ تھا

اگر کوئی اور مجھ سے یہ بات بتاتا تو شاید میں یقین بھی نہ کرتی لیکن میں اپنی آنکھوں کو کیسے جھٹلا سکتی ہوں۔ حقیقت سے انحراف سب سے بڑی نادانی ہے۔ میں خون کے تلخ گھونٹ پی کر رہ گئی۔ آخر مجھ میں کیا کمی ہے کہ وہ کسی اور کو چاہنے لگے ہیں۔ اُس کی تصویر کے سامنے جھکتے ہیں۔ اُسے آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ اگر انھیں ایسا ہی کرنا تھا تو مجھ سے شادی ہی کیوں کی۔ میں نے التجا نہیں کی تھی۔ ہاتھ پیر نہیں جوڑے تھے

یہ دن ہی مجھ سے کہہ رہے تھے ... نمرتا! جب میں پہلی بار تم سے ملا۔ مجھے تمھاری ان خوبصورت چھلکتی ہوئی آنکھوں میں بے پناہ کشش محسوس ہوئی۔ میں نے دیکھا تمھاری آنکھوں میں سنہرے خوابوں کے بسیرے ہیں۔ میرے دل میں اسی وقت یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں ان سنہرے خوابوں کا شہزادہ بن سکتا۔ ایسی بھی کیا جلدی؟ میرے دل نے سرگوشی کی اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ لہرا گئی۔

شادی سے پہلے ہی اُس نے مجھے اپنے ماضی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا ـــ بچپن ہی میں والدین کا سایہ اُٹھ جانے کی وجہ سے میں بے سہارا ہو گیا تھا۔" کمل کہہ رہا تھا "اس کم عمری میں کیا کرتا، اپنے رشتہ داروں کے ہاں پڑا رہا لیکن وہ سب جلد ہی بیزار ہو گئے کیونکہ میرے والد نے مرتے وقت کوئی جائیداد نہیں چھوڑی تھی۔ میں ایک غریب باپ کا مفلس بیٹا تھا۔ مجھے اپنے رشتہ داروں کے ہاں اسی لئے زیادہ دن تک پناہ نہ مل سکی۔ وہ سب مجھ پر طنز کرنے اور طعنہ دینے کے لئے میرے عزیز تھے۔ مجھے پیٹ بھرنے کے لئے سخت محنت کرنی پڑتی۔ دن سڑکوں پر سامان ڈھوتے گزرتا اور رات دوکانوں کے پٹروں پر۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن قسمت نے آنکھیں پھیر لیں۔ ایک دن مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑا اور میں یہاں بمبئی بھاگ آیا۔" وہ مسکرانے لگا۔ "تیسرے دن مجھے سیٹھ پنالال جیولرز کی دوکان پر ملازمت مل گئی۔ جب مجھے اپنی زندگی کا مقصد معلوم ہوا تو میں نے ایمانداری اور محنت کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ اور پھر تین سال بعد پنالال آرٹ گیلری دوکان کا اسسٹنٹ منیجر بن گیا۔ میں سیٹھ جی کا دست راست اور خصوصی مشیر کار تھا۔ اگلے سال سیٹھ جی کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ پوری فرم میرے پاس آگئی کیونکہ میری طرح سیٹھ جی کا بھی دنیا میں کوئی نہ تھا۔ قسمت کی دیوی مجھ پر اتنی مہربان ہوئی کہ وہ کمل جو پانچ سال پہلے پیوند لگی خاکی نیکر اور بوسیدہ بش شرٹ پہنے بمبئی آیا تھا، آج کوٹھیوں اور کاروں کا مالک ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے لہجہ میں زمانہ بھر کی تلخیاں سمٹ آئی تھیں۔

... "نمرتا! میں بہت دکھی رہ چکا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میری زندگی کے تپتے ہوئے ریگ زاروں میں بس پیار کی کمی ہے۔ اگر تم مل گئیں تو میری زندگی سنور جائے گی۔ ان ریگ زاروں میں محبت کے سوتے پھوٹ پڑیں گے اور میری زندگی پھر سے ہری بھری ہو جائے گی۔ کلیاں چٹکیں گی، پھول مہکیں گے، سارا ماحول خوشگوار ہو جائے گا۔" کہتا ہوا ...

[illegible]

اگر میری محبت تمہاری زندگی میں رنگینی لا سکتی ہے تو میں تمہارے جیون کو اس پیار کے [illegible] آخری قطرہ بھی [illegible] میری آواز لرز گئی۔

"نمرتا ——— !" وہ مجھ سے بچوں کی طرح لپٹ گیا۔

شہنائی کے سریلے راگ، ہم دونوں کو ایک اٹوٹ بندھن میں باندھ گئے۔

کمل نے شادی کی رات ہی مجھے بتا دیا تھا کہ وہ پوجا پاٹ کا بہت قائل ہے۔ اسی لئے وہ صبح ٹھیک چار بجے اٹھ جاتا ہے۔ اس کے اس معمول میں کبھی فرق نہ آیا۔ مجھے اس میں دیوتاؤں کا سا روپ نظر آتا۔

لیکن اس کا یہ نقلی خول یکایک موم کی طرح پگھل گیا۔ برابر کے کمرہ میں کسی چیز کے گرنے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کمل پوجا کرنے جا رہا ہے۔ میں ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ سب سے پہلے کمل نے بھگوان کی مورتی کے قریب خوشبو سلگائی۔ اس کے بعد بہت دیر تک آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑے، خاموش کھڑا رہا۔ وہاں سے آکر رامائن کا پاٹھ کیا۔ رامائن پڑھنے کے بعد اس نے قریب ہی رکھے ہوئے سیف میں سے ایک خوبصورت فریم نکالا اور اس کی محبت سے بھرپور نگاہیں بہت دیر تک اس پر جمی رہیں۔

مجھ میں اس سے آگے دیکھنے کی طاقت نہ رہی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میرے چاروں طرف کا ماحول اتنی تیزی سے گردش کرنے لگا کہ مجھے کچھ سجھائی نہ دیا۔ دل میں آیا کہ اس کے ہاتھوں سے تصویر چھین لوں، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کمل کے منہ پر دے ماروں ——— کتنی بھاری بھول ہوئی اسے پہچاننے میں۔ زندگی کی سب سے بڑی غلطی!

میں غم اور نفرت سے کانپ رہی تھی۔ میرا مستقبل میرے سامنے تھا آنسوؤں سے لبریز اور خون سے لت پت۔ کتنا بہروپ ہوتا ہے ایک انسان میں۔ میں یہ سوچ کر رو پڑی میرے ہی سامنے کسی اور سے پیار کیا جاتا، دوسرے سے دل بہلایا جاتا ——— یہ ناممکن ہے۔ میں نے کمل کو کتنی شدت سے چاہا ہے! جب میں نے اس کے سوا کسی دوسرے کے متعلق سوچنا بھی گناہ سمجھا تو پھر یہ کیسے برداشت ہو سکتا ہے کہ وہ کسی دوسری لڑکی سے پیار کرے۔ یہ میری محبت کے منہ پر طمانچہ ہے۔ میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ میں پاگل ہو جاؤں گی۔

یہ تصویر سندھیا کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ وہ اس دن کمل کی تعریف کرتے ہوئے کہہ رہی تھی ——— تمہارے پتی کی آواز میں سنگیت کی چاشنی ہے، قہقہوں میں جھنکار کی سی مدھر دھن ہے، اس کی آنکھوں میں اگر کبھی جھانکو گی تو سورگ نظر آئے گا۔ کتنی خوش قسمت ہو تم نمرتا! میرے گال پر چٹکی لے کر وہ بھاگ گئی۔

کمل کے خیالات بھی سندھیا کے متعلق کچھ اسی قسم کے تھے میں کتنی ناسمجھ تھی معمولی سی بات کو بھی نہ سمجھ سکی۔ لیکن اب مجھ کو فیصلہ کرنا ہوگا۔ اُسے اپنے لئے ایک راستہ چن لینا ہوگا۔ میں اگر اب بھی خاموش رہی تو یونہی سلگتی ہوئی زندگی ساری عمر خون تھوکتی رہے گی۔ آج انہیں فیصلہ کرنا ہی ہوگا!

"خوابوں کی دنیا سے باہر آ جاؤ نمرتا!" کمل ٹہل کر واپس آ گیا تھا۔

"میں اب تک واقعی خوابوں کی دنیا میں تھی لیکن اب دھوکا نہیں کھا سکتی۔"

"دھوکا ——— ؟ کیسا دھوکا؟"

وہ ٹھٹک رہا تھا۔

"چھپانے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں آپ کو دیوتا سمجھتی تھی لیکن آج آپ کے اصلی روپ کو دیکھ کر کانپ گئی۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں کہہ رہی ہوں جب آپ کو پیار کسی اور لڑکی سے کرنا تھا تو مجھ سے شادی ہی کیوں کی۔ میرے جسم سے کھیلنے کے لئے؟ اپنی تشنگی بجھانے کے لئے؟ آپ نے اتنا بڑا پاپ کیا ہے کہ بھگوان بھی معاف نہیں کر سکتا ———" میرا غصہ سوڈے کی بوتل کی طرح ابل پڑا۔

"کون سی لڑکی؟"

اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"سندھیا ——— جس کی تصویر آپ نے خوبصورت فریم میں سجا رکھی ہے، جو ہمیشہ سیف میں بند رہتی ہے اور جس کی کنجی صرف آپ کے پاس رہتی ہے اور . . ."

"نمرتا ——— !!!؟"

وہ چیخ پڑا۔ آنکھوں میں انگارے دہک اٹھے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کمرہ تک کھینچتا ہوا لے گیا۔ فریم کو سیف سے نکالا ——— اور ایک جھٹکے سے میرے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ مجھے چکر آ گیا۔ زمین و آسمان تیزی سے گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے دیکھا اس فریم میں اس کی پیوند لگی خاکی نیکر اور پھٹی ہوئی بش شرٹ ہے جو کمل بمبئی پہن کر آیا تھا۔

"انسان کو اپنے بیتے دن ضرور یاد رکھنے چاہئیں نمرتا! تاکہ وہ بہک نہ سکے۔"

کمل پورے اطمینان سے بولا۔

میں اس کے پیروں میں گر گئی!!

چند یادیں

سرگودھا (پاکستان)

۱۸ نومبر ۱۹۹۴ء

پیارے بھائی جان! اسلام محبت

"بیسویں صدی" باصرہ نواز ہوا۔ مجھ سے انٹرویو لیتے وقت یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ "بیسویں صدی" کے لئے ہے۔ دسمبر کے شمارے میں اپنا انٹرویو پڑھ کر حیرت ہوئی۔ یہ سب آپ کی الطاف نوازیاں ہیں ——— ورنہ من آنم کہ من دانم۔ کل رات ماہنامہ "تخلیق" میں راجہ مہدی علی خاں کی نظم "ذکر ایک ملاقات کا" پڑھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ وہی مہدی ہے" جو بیسویں صدی کے دفتر میں بیٹھ کر عمدہ سے عمدہ رومانی نظم کہنے پر قادر تھا۔ وہ آپ کا محبوب مہدی علی خاں جو رشتہ ادب حضرت مولانا ظفر علی خاں، مولانا حامد علی خاں مدیر ہمایوں اور پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی ہمشیرہ اور صاحب طرز شاعرہ حجاب صاحبہ کا فرزند ارجمند ہے۔ آج اپنی پرانی پسندیدہ روش سے ہٹ کر عجیب و غریب شاعری کر رہا ہے اور یہ شاید اس کی طبیعت کے تشبیہ اور ذہنی پختگی کا نتیجہ ہے کہ وہ قہقہوں میں بیٹھ کر معاشرہ پر طنز کے بھرپور وار کر رہا ہے۔ آہ! اسی مہدی سے میری کتنی دلنواز یادیں وابستہ ہیں۔ اختر شیرانی مرحوم ادب میں ہیجانات کے ایک یادو بیچ اِس پر چھاپا مارا کرتے تھے اور کسی روزنامہ کے دفتر یا گھر میں اسے پالینے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ مہدی علی کا خوبصورت چہرہ اور ہلکی ہلکی جیب ہمیشہ خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کرتی تھی اور ہم اکثر اسے دفتر سے بھگا لاتے تھے۔ ایک شام شاید مہدی چھٹی پر تھا کہ مجھے اپنے مختصر سے کمرے میں مل گیا۔ (یہ کمرہ ہم آوارگان ازلی کی پناہ گاہ تھی) ہم نے اپنے دورہ کا پروگرام مرتب کیا اور چل کھڑے ہوئے۔ گھومتے پھرتے رات کے بارہ بجے کے قریب ایسی گلیوں میں پہنچ گئے، جن میں دن سوتے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں۔ ہمیں انھیں گلیوں میں ایک تیسرا ساتھی مل گیا راوی کے کنارے جانے کا پروگرام بنایا گیا۔ اور ہم تینوں تانگے پر سوار راوی کنارے جا پہنچے، رات گئے تک خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ اور پھر ریت سے لپٹ کر سو گئے۔ جب سورج کی کرنوں نے ہمارے چٹکیاں لینا شروع کیں تو آنکھیں کھلیں کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارا تیسرا ساتھی اور تانگہ غائب ہے اب ہمارا لٹا ہوا کارواں سڑک پر خراماں خراماں گھروں کی سمت رواں ہے۔ آہ وہ مہدی جب بھی یاد آتا ہے۔ اُسے آنکھیں بند کر کے تصور کی گود میں کھینچ لیتا ہوں۔ اور جی بھر چومتا ہوں۔ صرف ایک مہدی ہی نہیں اور کئی محبوب شخصیتیں دیوار کے اُس پار گم ہو گئیں۔ اب اُن کی میٹھی یادیں ہی میرے لئے سرمایۂ حیات ہیں۔ وہ ساحر لدھیانوی جو کسی باغ کی دیوار پر بیٹھ کر لڑکیوں کے من گھڑت قصے سنایا کرتا تھا اور جسے دیسی شراب پینے سے غش ہو جاتی تھی اور جو جب کبھی شورش کاشمیری سے جھگڑتا تھا تو اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ میں ابھی الطاف مشہدی کو خط لکھتا ہوں اور وہ آہیر (ایک فلمی پرچے کا ایڈیٹر اور گرانڈیل کاشمیری نوجوان) کو خط لکھے گا اور طاہر شورش کاشمیری کی پٹائی کرے گا۔ پھر میرا جان سے پیارا بھائی خوشتر گرامی یعنی آپ۔ جو یار لوگوں میں مشکل کشا کے نام سے مشہور تھے۔ لاہور میں ہم رندانِ بلانوش کے دو ہی تو مشکل کشا تھے۔ خوشتر گرامی اور حکیم تیر ذاسلی۔ جگن ناتھ آزاد جسے پہلے ہم مشہور شاعر پنڈت تلوک چند محروم کا نورِ نظر سمجھ کر پیار کیا کرتے تھے۔ مگر تقسیم کے بعد تو وہ چھپا رستم نکلا۔ تخت سنگھ جو اچھا شاعر ہونے کے باوجود ہمیشہ "بھر" کو "فر" پڑھتا تھا۔ پنڈت ہری چند اختر جنہیں مرحوم لکھتے وقت کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جنہوں نے ڈھاکہ میں ایک مشاعرہ کے موقعہ پر جگن ناتھ آزاد اور مجھ سے مل کر متکبر شعرا کو پنجابی زبان میں بڑی معیاری گالیاں دی تھیں اور ساغر نظامی جو ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں جوش ملیح آبادی کے ساتھ لاہور تشریف لائے تھے دونوں منٹگمری ہوٹل کے ایک کمرہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، کہ راقم الحروف بھی نازل ہو گیا۔ کمرے میں دو ہی پلنگ تھے۔ ایک پر شاعر انقلاب اور دوسرے پر ہم دونوں شاعرانِ شباب سوئے۔ صبح آنکھ کھلی تو میرے نتھنوں میں ساغر کی عنبر و معطر نزاکت تہہ نشیں ہو چکی تھی اور کتنے ہی دوست مجھے بلکتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔ اور اب شاید وہ کبھی نہ مل سکیں ... ایک غیر مطبوعہ غزل ارسال خدمت ہے۔

آپ کا دیوانہ بھائی ——— الطاف

غزل

الطاف مشہدی

غم کی حسین رات میں جینے بھی دیجئے
تھوڑا سا وقت ہے. مجھے پینے بھی دیجئے

مدہوش انکھڑیوں کو ملے آنسوؤں کا حسن
نیلے سمندروں کو سفینے بھی دیجئے

آوارگی پہ ساعتیں ہیں کس لئے محیط؟
کچھ ایسے برق پاش جھینے بھی دیجئے

ساغر میں صرف "آتشِ انگور" ہی نہ ہو
پینے کو عطر بیز پسینے بھی دیجئے

ہر مقبرے میں دفن ہے تاریخِ بے بسی
گنبد کے ساتھ ہم کو دفینے بھی دیجئے

ماحول کی جبیں پہ لکھا ہے یہ حرفِ زر
کتنا لذیذ خون ہے، پینے بھی دیجئے

الطاف دل پہ غم کی عنایت اگر ہوئی
آنکھوں کو موتیوں کے خزینے بھی دیجئے



محبوبُ مشغلے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
ناموں کے انتخاب نے رُسوا کیا ہے

________________ ________________ راجہ مہدی علی خاں

۱۳۹۔پالی روڈ، باندرہ۔بمبئی ۵۰
۱۵ دسمبر ۶۳ء

دی گریٹ مغل ایسٹ انڈیا بھائی مولانا خوشتر گرامی! آمرغ و بریانی علیکم

(میں نے "دی گریٹ مغل" آپ کو اس لئے لکھا ہے کہ مغلیہ کھانے کھا کھا کر اب آپ خود بھی ایک باوقار مغل بن گئے ہیں۔ ٹوپی بھی ایسی پہنتے ہیں جو کابل میں پہنی جاتی ہے) آپ نے "بیسویں صدی" کا سالنامہ۔ تو بڑے زور کا نکالا ہے۔ آپکی پرکتیں کوئی نئی نہیں ہیں۔ لیکن آپ نے سالنامے میں میرے خلاف ایک مفصل نوٹ لکھ کر میری بڑی بے عزتی کی ہے ؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

آپ نے مجھے "نواب بے ملک" "فلمی پریوں کے جھرمٹ میں رہنے والا نواب" اور نہ جانے کیا کیا لکھ کر ناظرین "بیسویں صدی" کی نظروں میں میری وقعت گرادی ہے۔ ایک دُنیا جانتی ہے کہ میں اب بھی اپنی ریاست کا مالک ہوں۔ انڈین گورنمنٹ نے تمام ریاستوں کے معاملات میں دخل دیا لیکن میری ریاست کے معقولات میں دخل دینے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میرا فلم انڈسٹری سے بھی تعلق ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی فلم نہیں دیکھی۔ مذہبی کتابیں چھاپتا ہوں اور حلال کی روزی کماتا ہوں۔ چونکہ آپ بھی پبلشر ہیں۔ آپ مجھ سے تاجرانہ رقابت کا ثبوت مہیا کر رہے ہیں۔ خوشتر صاحب! فقیر کو نہ چھیڑئیے جو نہ کسی کے بھلے میں ہے نہ بُرے میں۔ آپ نے میرے کیرکٹر کو اتنا رُسوا کر دیا ہے کہ شریف اور پردہ دار خواتین میرا نام سُنتے ہی اپنے گھروں میں ہائے رام! یا ہائے اللہ کہہ کر منہ کو آنچلوں میں چھپا لیتی ہیں۔ بہت سی خواتین نے مجھ سے خط و کتابت بند کر دی ہے ——— میں آپ کو مخاطب کرکے "بیسویں صدی" میں بہت سے خط لکھ چکا ہوں۔ اُنہی خطوں کو پڑھ کر خوش ذوق ادبی حلقوں نے مجھے نثر لکھنے پر مجبور کیا۔ کتنے شاعروں اور ادیبوں کے خط آئے؟ کچھ کہنا چھوٹی بات ہوگی۔ کبھی کبھی بہت سے ایسے دوستوں کے بھی خط آئے جو مجھے ڈانٹتے ہیں کہ "آپ حضرت مولانا خوشتر صاحب سے گستاخیاں کیوں کرتے ہیں؟" ——— ان بھلے مانسوں کو کیا معلوم کہ ان گستاخیوں میں عظیم محبت اور لافانی خلوص کے کتنے سمندر موجزن ہیں۔ بعض فقیر ہم سے کچھ لے کر دعا تو دے جاتے ہیں لیکن اُن کی دعاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن کبھی کوئی جلالی فقیر یا مجذوب ایک پتھر اُٹھا کر ملاقاتی کے سر پر دے مارتا ہے۔ اُس ایک پتھر کی چوٹ سے ملاقاتی کی مُراد پوری ہو جاتی ہے۔ میں پتھر مارنے والا مجذوب ہوں اور یہ لوگ دعائیں دینے والے ——— خوشتر صاحب! میری ہاتھاپائی میں جو مزہ ہے، جو لطف ہے وہ دوسروں کے سہرہ ہائے عقیدت میں یا دوسروں کے بوسوں میں نہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کوئی باذوق آدمی میرے اِن مخلصانہ خطوط کا غلط مطلب نہ لیتا ہوگا۔ آدمی ساری دُنیا کو تو خوش نہیں کر سکتا۔

[illegible] کسی ادبی مذاق [illegible]
[illegible] ہیں۔ خدا کی قسم سیکڑوں درخواستیں میرے نام آئیں کہ آپ کے [illegible]
[illegible] نے پھونک پھونک کر میرا ناطقہ بند کر دیا —— مضمون کی دوسری قسط [illegible]

مخلص —— راجہ مہدی علی خاں

وزیر آغا ایڈیٹر "ادبی دنیا" (لاہور)

صبح منہ اندھیرے اٹھنا۔ اشنان کرنا۔ تلک لگانا۔ مندر جانا۔ بھجن میں غلطی سے [illegible] قوالی ملا دینا۔ واپس آ کر گائے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنا۔ گائے کو سونگھنا۔ جنیو پہن کر بھوجن کرنا۔ بھوجن کرنے کے بعد گائے کی دُم سے منہ پونچھنا۔ اِس کے بعد گھر پر آئے مسلمان دوستوں سے "نمستے نمستے" کہہ کر ملاقات کرنا۔ مشہور کتاب How to keep quiet and Influence people کا خاموشی سے گھنٹوں مطالعہ کرنا۔ بیگم سے بار بار تاکید کرنا کہ اگر میں کبھی بولوں تو ٹوک دینا۔ کیونکہ ؎

خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

دن بھر ایلورا کے غاروں کی تصویریں دیکھنا۔ سرگودھا میں ایسے ہی غار تعمیر کرانے کی سکیمیں بنانا۔ معماروں کی کمیٹی میں بار بار اپنا نام بھی پیش کر دینا۔

ادب کے وسیع و عریض جنگل میں جدید شاعری کے پیچھے تنقید کے شکاری کُتّے "ہُش ہُش" کر کے دوڑانا۔ بے ہوش اور زخمی جدید شاعری کو بستر پر لٹا کر اپنے لطف و کرم کے دامن کی ہوائیں دینا اور کہنا "اُٹھ ری اُٹھ"۔

؎ بجھائی ہے ترے دامن سے شمعِ زندگی اپنی

جنگل کے بوڑھے درختوں سے گلے ملنا۔ پیڑوں پر اونگھتے ہوئے اُلوؤں سے تبادلۂ خیالات کرنا۔ اُنھیں "برادرم" کہنا۔ شور مچاتی ہوئی کوئلوں کو "کالی رنڈیاں" کہنا کہ عشق کی آگ دل ہی میں دبا کر کیوں راکھ نہیں ہو جاتیں۔ شور مچاتی ہیں چھنالیں۔

ادب کو پیشہ بنانے کی بجائے بھیس بدل بدل کر بار بار پشاور جانا۔ وہاں جا کر ہینگ خرید لانا اور یہاں آ کر نوکروں سے کہنا "جاؤ تم بازار میں بیچ آؤ۔ مجھے شرم آتی ہے"۔

کبھی کبھی لنڈی کوتل جا کر چاقو چھریاں قینچیاں تیز کرنا۔ لگے ہاتھوں بردہ فروشی بھی کر لینا۔ بندوقیں بنا کر بیچنا۔ بہت سا پیسہ کما کر گھر لانا۔ خوش ہونا اور کہنا "کسی ولی اللہ نے اتنی دولت دی ہے"۔ —— عید کے دن نوکروں کو چھٹی دے کر خود آٹا گوندھنا۔ مسالہ پیسنا۔ برتن مانجھنا۔ رونا اور رو رو کر کہنا ؎

خودی کو کر ذلیل اتنا کہ ہر اک کام سے پہلے
کہے نوکر سے خود مالک بتا تیری رضا کیا ہے

ایم اسلم (لاہور)

ایک سو ایک کلرک ملازم رکھ کر اپنی لاکھوں کتابوں کی فہرست تیار کرانا۔ [illegible] اندازہ لگوانا کہ ان کتابوں کی کتابت پر کتنے ہزار ٹن روشنائی خرچ ہوئی۔ [illegible] یورپ سے کتنے جہاز کاغذوں کے [illegible] اور ڈوبتے رہے۔ یہ کتابیں چھاپ چھاپ کر ملک میں کتنے پریس بند ہو گئے۔ کتنے پبلشروں کا دیوالہ نکل گیا۔

میاں اسلم یا محمد اسلم کی بجائے اپنے آپ کو ایم اسلم لکھنا۔ شلوار پر کوٹ اور ٹائی پہن کر انگریزی تہذیب سے متاثر نوجوانوں کو گالیاں دینا۔ اُن کے اخلاق کا ماتم کرنا۔ اُن کی مغرب زدگی پر رونا۔ کتاب "گناہ کی راتیں" کے لاکھوں ایڈیشن چھپ جانے کے بعد ملک میں جا بجا ڈھنڈورا پٹوانا کہ بھائیو! میں نے یہ کتاب لکھ دی ہے مگر ؎

من نہ کردم شما حذر بکنید

بھائیو بہنو بچو نوجوانو!
اِس کتاب کے پڑھنے سے بیٹوں کا بُرا ہوگا۔

اکثر یہ رباعی گنگنانا ؎

اِک رند یہ کہہ رہا تھا ہنگامِ سحر
واعظ بھی رہا ہے میکدے میں شب بھر
سُن کر یہ بیاں کہا کسی نے ہنس کر
واعظ جو کہے وہ کر جو کرتا ہے نہ کر

امتیاز علی عرشی (رامپور)

عرشی ہو کر فرشی سلام کرنا۔ بُرے بھلے میں کوئی امتیاز نہ کرنا۔

غالب نے اپنا جو کلام پھاڑ کر اپنے پچھواڑے پھینک دیا تھا ہر روز اُس کے جا بجا بکھرے ہوئے پُرزے اکٹھا کرنا۔ بڑی مشکل سے اُن چیتھڑوں کو آپس میں جوڑ کر غالب کا کلام بغور پڑھنا۔ اُسے شائع کر کے مرزا غالب کو تباہ کرنے کی پوری پوری کوشش کرنا۔ ذوق کی دعائیں لینا۔ دیوان غالب کو "کلیات میر" بنانے کی کوشش کرنا۔

دوستوں کے خطوط پھاڑ پھاڑ کر پھینک دینا۔ غالب کے نام [illegible]

بیسویں صدی، دہلی

پھر [illegible] کسی کے پیچھے کھڑا ہو کر [illegible] غالب کے [illegible] جواب

[illegible] غالب کے اشعار [illegible] سنتا۔ [illegible] کہتا [illegible] صاحب [illegible] غالب کا

[illegible] کا [illegible] یہ شعر پڑھتا ؎

گر دیکھتے [illegible] غالب پرتی ایک دن

پہلے [illegible] کر کے گزرتی ایک دن

علم کی دنیا میں میری شاعری [illegible] رہی

[illegible] گزرتی ایک دن

نیاز فتح پوری (کراچی)

کافر اور نیازی ہونا۔ اشرف نیاز حاصل کرنا۔ مذہب کے خلاف جہاد کر کے مولویوں کی بددعائیں لینا۔ گالیاں کھا کے بھی بدمزہ نہ ہونا۔ مولویوں سے کہنا ؎

اب تو آرام سے گزرتی ہے

عاقبت کی خبر خدا جانے

ساری عمر سورج کی طرف توپیں داغتے ہوئے گزار دینا۔

"خاص نمبر" نکالنا۔ جیسے "استفادیات نمبر" "اخلاقیات نمبر" "نباتات نمبر" "حیوانات نمبر" "خرافات نمبر" "نیازات نمبر" "واہیات نمبر" وغیرہ۔

جوش ملیح آبادی صاحب اور چند دوسرے منکروں کے ہاتھ میں ایک ایک دوربین تھما کر اور ایک دوربین اپنی آنکھوں پر لگا کر صحراؤں میں نکل جانا۔ پورب کی طرف۔ پچھم کی طرف۔ اُتر کی طرف۔ دکھن کی طرف۔ آسمان کی طرف۔ زمین کی طرف دیکھنا۔ کنوؤں میں جھانکنا۔ غاروں میں جھانکنا۔ پھر "دوربین بردار" دوستوں کے ساتھ مل کر یہ شعر گانا ؎

وہ اگر ہوتا تو دے جاتا دکھائی بارہا

دوربینوں سے خدا کو عمر بھر ڈھونڈا کئے

احمد ندیم قاسمی (لاہور)

ہر روز پچیس ہزار سینیں بنا کر سونا۔ خطوں میں ہر شخص کو لفظ "برادرم" سے مخاطب کرنا۔ "پچاؤں" کو بھی "برادرم" کہہ کر بلانا۔ دعا مانگتے وقت غلطی سے اللہ میاں کو بھی "برادرم" کہہ جانا۔ بعد میں معافی مانگنا۔ توبہ کرنا۔ جمعہ کے دن دیہاتی افسانے۔ ہفتے کے دن شہری افسانے۔ اتوار کو نظمیں۔ پیر کو غزلیں۔ منگل کو قطعے اور رباعیات لکھنا۔ بدھ کے دن "فنون" کو تول تول کر ایڈٹ کرنا۔ ادب کی خدمت میں اپنا دیوالہ نکال لینا۔ جمعرات کو مسجد میں جا کر اذان دینا۔ مُلّا کو "برادرم" کہہ کر اس کے حصے کا کھانا کھا کر واپس آجانا باقی چھ دن بھوکا رہنا۔

دنیا کے میدان میں شرافت کے اصولوں کو قواعد کرانا۔ "اٹینشن" کہنے پر قواعد کرنے

والے "سپاہیوں" کا اور بھی زیادہ ڈھیلا ہو کر کھڑا ہو جانا۔

"فنون" کو اونٹوں پر لدوا کر پوسٹ کرنے کے لئے شہر کے بیس ڈاکخانوں میں بھیجنا۔

تبدیلی آب و ہوا کے لئے جیل چلے جانا۔ رہا ہونے کے بعد کہنا "اے خدا تو مجھے رہا کر کے اس سے بڑی جیل میں کیوں بھیجتا ہے؟" پھر ایک داروغۂ جیل کے گلے میں بانہیں ڈال کر رو رو کر یہ شعر پڑھنا ؎

چھٹ کر قید سے دل بھر کر آزاد بہت رویا

لذت کو اسیری کی کر یاد بہت رویا

داروغۂ جیل کا رو کر جواب دینا ؎

زہر لگتی ہے اگر آب و ہوائے زندگی

شاعرِ شیریں صفت زنداں میں واپس لوٹ آ

مولانا صلاح الدین مرحوم[1] (لاہور)

اُردو بولنا۔ اُردو لکھنا۔ اُردو لکھوانا۔ اُردو کھانا۔ اُردو پینا۔ اُردو سونگھنا۔ اُردو بچھانا۔ اُردو اوڑھنا۔ اُردو کے خواب دیکھنا۔ ڈر کر چونک چونک جانا۔ ہندوستان میں اُردو کے تحفظ کے لئے دعائیں کرنا اور کرانا۔

مہمانوں کو اُردو روزمرہ کے روغنی نان اُردو محاورات کے کبابوں اور اُردو چٹنی کے ساتھ کھلانا۔ اُردو کی باریک شال اوڑھ کر سردی میں باہر چلے جانا۔ جوانک جانے سے "اُردو بخار" میں مبتلا ہو جانا۔ صبح دوپہر شام اور رات کو "اُردو کا جوشاندہ پینا" پر اولاسے اُردو کھلانا۔ جدید نظمیں سونگھ سونگھ کر پھینک دینا یا بھیجنے والوں کو بیرنگ لفافوں میں واپس بھیج دینا۔ وزیر آغا صاحب کو صلواتیں سنانا کہ "تم ایسی نظمیں کیوں" ادبی دنیا میں زبردستی چھپواتے ہو؟"

حسینۂ اُردو کے گلے میں بانہیں ڈال کر مندرجہ ذیل اشعار گنگنانا ؎

مجھے دیوانہ شاید کر دیا ہے عشقِ اُردو نے

کبھی اُردو میں ہنستا ہوں کبھی اُردو میں روتا ہوں

اے ادیبانِ جہاں! اگر میں عالم رہا سے!

چمن میں ہر طرف اُردو ہی اُردو میں اُگا دوں گا

---

[1] یہ مضمون مولانا صلاح الدین مرحوم کی زندگی میں لکھا گیا تھا اُن کی طرف سے مجھے داد بھی ملی تھی۔ (ادور مدیرِ "بیسویں صدی" محترم راحہ صاحب کی خدمت میں یہ قبل پیش کرتا ہے)

[illegible]
[illegible]

[illegible] کو
ہم نہ دینے دیں گے اُردو میں اذاں

شملہ، انگلش، یہ پاکستان ہے!
کیمبرج کے رنگ دیکھو اُردو میں جھنگ!

فرشتے بولیں گر عربی نہ روکو
سُنو عربی جواب اُردو میں ٹھوکو

مخدوم محی الدین (حیدرآباد)

مشاعروں میں آزاد نظم کو ترنم کی سزائیں دینا۔ برسرِ عام شاعروں کی "غلطیاں" پکڑ کر پبلک پر رعب جمانا۔ صدر بننا۔ کم سے کم شعر کہہ کر زیادہ سے زیادہ مشہور ہونے کی کوشش کرنا۔

بریانی اور شیرمال کھا کھا کر بھوک ہڑتالیں کرانا۔ اپنے متعلق لطیفے مشہور کروانا۔ قوم کی غریبی کے غم میں اعلیٰ درجے کی شراب پینا اور یہ شعر گنگنانا ؎

جام اُٹھاتا ہوں طلوعِ رُخِ مہتاب کے ساتھ
قوم کے غم میں پیا کرتا ہوں احباب کے ساتھ

سید احتشام حسین (لکھنؤ)

بڑے تزک و احتشام سے سخت اور بنجر زمینوں میں تنقید کا ہل جوتنا۔ بیج بکھیرنا۔ نہ اُگنے پر رونا۔ محلے کے سیدوں سے جھگڑنا کہ یہ سب تمہاری بددعاؤں کا نتیجہ ہے۔

اپنا مقالہ پورا کرنے کے بعد تمام خوبصورت فقرے کاٹ دینا۔ ادب کی ہر صنف کے کپڑے اُتار کر اُسے اپنے سامنے ننگا کھڑا کر لینا۔ اُسے پہلے بُری نظروں سے دیکھنا۔ بعد میں تھپڑ مار مار کر اُس پر تنقید کرنا۔ باورچی سے کہنا میں بولتا جاتا ہوں تو لکھتا جا۔

ادب کے بازار میں قصائی کہلانا۔ اپنے فاؤنٹین پین کو چھرا اور روشنائی کو خون کہنا۔

اپنے مضامین کو کمیونزم کا عطر لگانا اور ہوائی جہاز سے عوام پر برسا برسا کر اُن کا بیڑہ غرق کرنے کی کوشش کرنا۔

تنقیدی جلال میں آکر غالبؔ کو مغلوب۔ ذوقؔ کو بدذوق۔ انیسؔ کو غریب۔ میرؔ کو فقیر۔ جوشؔ ملیح آبادی کو خرگوش ملیح آبادی۔ مجازؔ لکھنوی کو پیاز لکھنوی۔ فراقؔ گورکھپوری کو مراق

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

راجہ مہدی علی خاں (بمبئی)

پان کھانا۔ دانت خراب کرنا۔ اپنی عاقبت خراب کرنا۔ دوست بنانا۔ [illegible] ہو جانا۔ اُن کی غیبت کرنا۔ اپنی نصف سے زیادہ کمائی جوتشیوں کے گھر پہنچانا۔ باقی نصف جھوٹے فقیروں اور شرابیوں میں تقسیم کر دینا۔ خود قرض پہ گزارا کرنا۔

اسّی اسّی سال کے بڈھوں کو بیٹا، پچاس پچاس سال کی عورتوں کو بیٹی بنانا۔

اپنی دعائیں قبول کرانے کے لئے اللہ میاں سے جھگڑنا۔ اُن سے روٹھ جانا۔ اُن سے بات چیت بند کر دینا۔ اللہ میاں کو خودکشی کرنے کی دھمکیاں دینا۔ زہر کی بجائے مٹھائی کھانا۔ بطور احتجاج صبح کی نماز دس بجے ایک ٹانگ پہ کھڑے ہو کر پڑھنا۔

چوروں اور ڈاکوؤں کو ولی اللہ سمجھ کر گھر لے آنا۔ گھر والوں کی جلی کٹی سُن کر پھر بھی باز نہ آنا۔

روتے ہوؤں کو اپنی مزاحیہ نظمیں سُنا سُنا کر اور زیادہ رُلانا۔ خوشامد [illegible] سُن سُن کر خوش ہونا، منت سے خوشامد کرانا، پیسے دے دے کر خوشامد کرانا، خوشامد کر کر کے خوشامد کرانا۔

بیگم پر ظلم کرنا، بیگم کے ظلم برداشت کرنا، محبت مُفت تقسیم کرنا، بعد میں رونا کہ میرے پاس کم رہ گئی ہے۔

طاہرہ سلطانہ مخفی سے نظمیں لکھوا کر اپنے نام سے شائع کرانا، مخفی کے خلاف مکارانہ پروپیگنڈہ کرنا، اُن کی بددعائیں لینا۔

بیک وقت ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک، یونانی اور ویدک دوائیں [illegible] ڈاکٹروں کی بجائے موچیوں سے اپنا علاج کرانا۔

گرجنا، برسنا، چنگھاڑنا، ستم ڈھانا، رُلانا، بعد میں معافیاں مانگنا، پچھتانا، قدموں پر سر رکھنا، قدموں پر سر رکھ کر چپکے سے سُوئی چبھو دینا، پبلک کو لمبے لمبے خط لکھ کر بور کرنا، بس حسرتؔ مہدی علی کو یاد کرنا، یہ مصرعے پڑھ کر سو جانا ؎

سرہانے مہدی کے آہستہ بولو
ابھی ٹک لڑتے لڑتے سو گیا ہے
وگرنہ اُٹھ کے پھر لڑنے لگے گا

خوشتر گرامی ایڈیٹر بیسویں صدی

[illegible] سے شکایت کرنا۔ اگر [illegible] ہوگا۔

[illegible] کرنا اور پھر سکون سے [illegible] سُنانا اور کہنا جب تک اُردو خوبصورت رہے گی اُردو سے محبت نہ کرے گی میں مجھے نہیں چاہوں گا۔

رات مجھ عشق اُردو میں مُبتلا ہونے کے بعد نصف شب کو "اردو کی مسہری" پر خواب [illegible] کر لیٹ جانا۔ "بیسویں صدی" کی فائلوں کو تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لینا اور [illegible] کی خوبصورت شال اوڑھ کر سو جانا۔ نیند میں ہندی کے خلاف زور زور سے خراٹے لینا [illegible]۔ اُردو کے سایے میں خوبصورت خواب دیکھنا۔ سوتے میں مُسکرانا۔

دولت کو ترقی کرتے دیکھ کر وزن بڑھانا۔ قوم کے بعض افراد کو غلط کام کرتے دیکھ کر ڈائیٹنگ کر کے وزن گھٹانا۔ قوم کی حالت ٹھیک کرنے کے لئے حکام کے دروازے کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر توڑ ڈالنا۔ حکام کی شاندار دعوتیں، صلواتیں سُنا سُنا کر کھانا۔ حکام دوستوں کا خوشتر صاحب سے ازراہِ مذاق کہنا ؎

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
غم تو خوشتر کو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ

ہر دوسرے تیسرے دن ڈائیٹنگ کر کے دُبلا ہونے کی ناکام کوششیں کرنا۔ کھانا کھانے سے پہلے مُسلمان باورچی سے پوچھ لینا کہ "ذبح کرنے سے پہلے مُرغ کو اذان دلوائی تھی یا نہیں" (مطلب یہ کہ مُرغ نے خدا کو یاد کر لیا تھا یا نہیں) "بے اذان" مُرغ کھانے سے صاف انکار کر دینا۔ پلیٹیں توڑ ڈالنا۔ "بااذان" مُرغ کو اذان دے کر کھا جانا۔

اپنے موٹے دوستوں کو ڈائیٹنگ کرنے پر مجبور کرنا۔ موٹا ہونے کے نقصانات بتانا۔ موٹے دوستوں کو محبت بھری گالیاں دے دے کر کہنا "میرے موٹے بے شرم دوستو! میرے مختصر دُبلاپے کو دیکھ کر عبرت حاصل کرو (وزن خوشتر صاحب دس من بیس سیر پندرہ چھٹانک) سادہ اور زود ہضم غذا وہ بھی بہت تھوڑی سی کھا کر زندہ ہوں۔"

غذاؤں کی تفصیل پوچھنے پر کہنا "صبح اُٹھ کر دو سیر دہی شہد ملا کر کھاتا ہوں سیر پاؤ بھر مکھن اور پندرہ توسٹ ایک بھینس کے دودھ کے ساتھ زہر مار کرتا ہوں۔ سوا کپ چائے پیتا ہوں۔ ایک سیر حلوا سوہن مل گیا تو کھا لیا ورنہ آہ بھر کر خدا کا شکر ادا کر لیتا ہوں۔

دوپہر کے کھانے میں ایک مُرغ مسلّم اذان والا کھاتا ہوں۔ تین پلیٹ بریانی، سولہ شیریں بھنی ہوئی، پانچ تیتروں کا قورمہ، بیس پراٹھے کھا لیتا ہوں۔ آدھا سیر گاجر کا حلوہ مل گیا تو خیر ورنہ ربڑی کے دو چار پیالے کھا کر اُردو کی خدمت میں مصروف ہو جاتا ہوں۔

رات کو کچھ نہیں کھاتا پچاس شامی کباب، ایک ران بکرے کی، آٹھ بکریوں کا دودھ، دس سیر بتاشوں کا کر سو جاتا ہوں۔ رات کو زود ہضم اور کم غذا کھانی چاہیے۔

موٹے اور دُبلے دوستوں کو مُٹاپے اور دُبلاپے کے نقصانات بتانے کے بعد اُن کی شاندار دعوتیں کر کے اُن کا وزن بڑھانا۔ اُنھیں مرغن غذائیں کھلا کھلا کر خوش ہونا اور کہنا "آج کھا لو پھر کبھی نہ کھانا"۔

خوشحالوں، شاعروں کی تعریف کرنا۔ مولی کی تاثیر بتانا۔ گاجریں کھانے کا مشورہ دینا۔ صحت کے مضامین لکھ لکھ کر قوم کو صحت مند بنانے کی ناکام کوشش کرنا۔

دوستوں اور دشمنوں کی مالی امداد کرنا۔ دوستوں کی کمزوریوں کو معاف کر دینا۔ مگر اُن کے کمزور مضامین شائع کرنے سے صاف انکار کر دینا۔ اُنھیں گالیاں دینا۔ دوسروں سے کہنا "میں تمہارا سخت دشمن ہوں" اور وقت آنے پر اُن کے لئے جان تک دینے سے دریغ نہ کرنا۔ احسان قبول نہ کرنا لیکن احسان کر کے خوش ہونا۔ مکر و فریب اور زمانہ سازی سے اس طرح دُور رہنا جیسے شیر سے خرگوش۔ فرشتوں کی سی معصوم سیرت رکھتے ہوئے اپنے آپ کو بہت جہاندیدہ اور خرانٹ سمجھنا۔ بڑی آسانی سے دھوکے میں آ جانا۔

مذہبی معاملات میں مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کی پیروی کرنا۔ مذہبی اعتقادات معلوم کرنے پر آہ بھر کر کہنا ؎

ہندی[1] تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور جگن ناتھ[2] سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

---

[1] راجہ مہدی علی خاں۔ [2] جگن ناتھ آزاد

مشہور ناول اور کتابیں

حسن کی قیمت	انتصار حسین	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
رومانِ بہار	اشفاق حسین	دو روپے
اللہ کے نام پر	انتصار حسین	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
جلوۂ ایثار	پریم چند	چار روپے
آہٹ	ستیہ پال آنند	چار روپے
نیا جو بک گئی	شوکت ہاشمی	دو روپے ۵۰ پیسے
وعدہ	مہندر ناتھ	چار روپے ۷۵ ,,
ہزار راتیں	ش مظفر پوری	چار روپے ۵۰ ,,
شمیم	فیاض علی	سات روپے ۵۰ ,,
تکے پارے	سنی حسن نقوی ایم اے	دو روپے ۵۰ ,,
چشمہ	اے آر خاتون	دس روپے ۷۵ ,,

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی کتابیں

مضامین الہلال	ابوالکلام آزاد	تین روپے ۷۵ پیسے
تحریکِ آزادی	,,	تین روپے ۵۰ ,,
ہماری آزادی	ابوالکلام آزاد	پندرہ روپے
غبارِ خاطر	,,	چھ روپے
دعوتِ حق	,,	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
عیدین	,,	ایک روپیہ ۵۰ ,,
اِسلام اور آزادی	,,	ایک روپیہ ۵۰ ,,
ذکرِ آزاد	,,	سات روپے
انسانیت موت کے دروازہ پر	,,	تین روپے ۵۰ پیسے
نقشِ آزاد	,,	چھ روپے
قولِ فیصل	,,	دو روپے ۵۰ پیسے
ملفوظاتِ آزاد	,,	دو روپے ۵۰ ,,
صدائے رفعت	,,	دو روپے ۲۵ ,,
فلسفہ	,,	دو روپے ۲۵ ,,
تبرکاتِ آزاد	,,	چھ روپے
مضامین البلاغ	,,	تین روپے ۷۵ پیسے

کشیدہ کاری
کی مشہور کتابیں

بیسویں صدی کی کشیدہ کاری	کرشنا کماری ایم اے	چار روپے
زینت کشیدہ کاری	زینت کوثر	[illegible]
رشیدہ کی کشیدہ کاری	رشیدہ خاتون	تین روپے ۵۰
شمع کشیدہ کاری	زینت کوثر	چار روپے ۵۰ ,,
حسین کشیدہ کاری	زینب انور	دو روپے ۵۰ ,,
دلہن کشیدہ کاری	,,	دو روپے ۵۰ ,,
قدسیہ کشیدہ کاری	قدسیہ انور	ایک روپیہ
شبنم کشیدہ کاری	,,	ایک روپیہ
درزی ماسٹر جدید ایڈیشن		چار روپے
تکیہ کے اشعار	[illegible]	[illegible]
کامیاب درزی خانہ	زینب انور	[illegible]
رضیہ کی مشرقی کشیدہ کاری		[illegible]

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر

غزل

سُونی راہوں میں جلنے والے ہیں
ہم ترے شہر کے اُجالے ہیں

ہم نے مطلب مہ و ستارہ کے
آپ کی زُلف سے نکالے ہیں

اصل موضوع کیا حسیں ہوگا
دیر و کعبہ تو دو حوالے ہیں

دُودھ کی نہر جو نکال سکیں
کوہکن تو نہیں گوالے ہیں

شیخ اِن کے قریب مت آنا
یہ کتابیں نہیں پیالے ہیں

کاش اِک روز جھوٹ ہی کہہ دے
میری آنکھیں ترے حوالے ہیں

حادثوں سے شراب کی ہے کشید
پتھروں سے صنم نکالے ہیں

آج ہم نے تجھے چراغوں میں
پیس کر آفتاب ڈالے ہیں

تف ہے تاریخ پر عدم جس نے
صرف شاہوں کے نام اُچھالے ہیں

سید عبدالحمید عدم

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

[illegible]	خوش باش ایم اے	دو روپے
[illegible]یرے	اختر عادل روپ	[illegible]
[illegible] اور سوال	م م راجندر ایم اے	[illegible]
[illegible]یسہ بنانے	عادل رشید	تین روپے
[illegible]یری راتیں	ریوتی سرن شرما	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
[illegible]	رام سرن شرما	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
[illegible] صاحب	شوکت تھانوی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
[illegible]	”	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
[illegible]	”	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
[illegible] غیرت	مضطر ہاشمی	چار روپے ۲۵ ”
[illegible]دن پتے	کرشن چندر ایم اے	پانچ روپے ۹۵ ”
[illegible] لڑکی	رازداں ایم اے	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
[illegible]	فیاض علی	آٹھ روپے ۵۰ ”
برہمن	کرشن گوپال عابد	چار روپے ۵۰ ”
ستم	”	چار روپے ۷۵ ”
گھائل	”	تین روپے ۹۵ ”
ظالم	سعید امرت	دو روپے ۵۰ ”
جانے والے	اختر عادل روپ	تین روپے ۵۰ ”
جاتی ہوئی بہار	جوش محمود آبادی	چار روپے
چوٹ	دت بھارتی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
گناہ	”	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
حال دل	بیگم تنویر ولایت حسین	تین روپے ۵۰ ”
خاتون	انتصار حسین	تین روپے
حاجی مراد	قیسی رامپوری	چار روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
نجم ابرو (نظم)	عبدالحمید عدم	دو روپے ۵۰ نئے پیسے

[illegible] پھول	عادل رشید	تین روپے ۹۵ ”
دو سال پہلے دو سال بعد	زبیدہ خاتون	چھ روپے
فریب مسلسل	شفیق بانو	دو روپے
[illegible]	ذکی انور	چھ روپے
[illegible]	قیسی رامپوری	چار روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	تین روپے
کانٹے	رضیہ سجاد ظہیر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	تین روپے ۵۰ ”
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	چار روپے ۵۰ ”
ننگی جوانی	سعید امرت	دو روپے
رہ گذر	انیس مرزا	چار روپے ۵۰ نئے پیسے
خوفناک محبت	عبدالحلیم شرر	تین روپے
شاہدہ	انتصار حسین	تین روپے
کرنیں	شفیق الرحمٰن	تین روپے
ناظمہ کی آپ بیتی	ایم اسلم	تین روپے
ایک دل ہزار غم	عزیز بدایونی	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
زردینہ	رئیس احمد جعفری	چھ روپے ۵۰ نئے پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع	پانچ روپے
دروانہ	نادرہ خاتون	پانچ روپے
چندر کلا	جمنا داس اختر	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
جلن	”	دو روپے ۵۰ ”
رادھا الزبتھ	”	دو روپے ۵۰ ”
پاپی	”	چار روپے
سوناگاچھی	”	چار روپے ۵۰ ”
طوفانوں کی کہانی	”	چار روپے ۵۰ ”
جوار بھاٹا	”	چار روپے ۵۰ ”

قیامت	[illegible]	[illegible]
سازش	”	[illegible] ۵۰ ”
کانٹوں کی سیج	رشید اختر ندوی	پانچ روپے
گھرانہ	قیسی رامپوری	چار روپے [illegible]
ناگ دیوتا	محمود جالندھری	دو روپے ۵۰ ”
خون کے چھینٹے	”	دو روپے ۵۰ ”
خوابگاہ میں	”	تین روپے ۵۰ ”
فراق	رنگین بھارتی	تین روپے ۵۰ ”
پیاسا	”	تین روپے ۵۰ ”
پراسرار قاصد	”	دو روپے
پراسرار قاتلہ	”	دو روپے
پیاس	کے۔ ایل [illegible]	تین روپے ۵۰ ”
محبت روتی ہے	غلام عباس	دو روپے
مالوا	میکسم گورکی ترجمہ: نریش کمار شاد	ایک روپیہ [illegible] نئے پیسے
کھیت میں لہو	تاجور سامری	ایک روپیہ ۷۵ ”
جی ہاں بیچتے ہیں	شوکت تھانوی	تین روپے ۲۵ ”
پردے کے پیچھے	منٹو	دو روپے ۵۰ ”
ملکہ صحرا	اوم پرکاش نامی	دو روپے ۵۰ ”
خاموش نغمہ	”	چار روپے
آتش گل (مجموعہ کلام)	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
باقیات اقبال ”	ڈاکٹر اقبال	تین روپے
تلخیاں (کلاں) ”	ساحر	چھ روپے
تلخیاں (خورد) ”	ساحر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
پرچھائیاں ”	ساحر	ایک روپیہ ۷۵ نئے پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	(مولانا آزاد)	تین روپے ۵۰ ”
زہریلا حسن	اشفاق احمد	دو روپے

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

خوشبو گلاب کی

ظفر اُدگانوی، ایم اے

نظیمن، رمنہ روڈ، پٹنہ ۱۲

۲۶ راگست ۹۴ء گرامی قدر! خلوص و عقیدت

... "خوشبو گلاب کی" ایک خوبصورت عنوان کی خوبصورت کہانی ہے۔ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ میرا ذاتی نظریہ ہے۔ نظریہ کی تفصیل میں کہانی کا یہ جملہ غور طلب ہے اور داد طلب بھی کہ "محبت یادوں کے دریچے کا ایک ایسا گلاب ہے جس کی خوشبو سے آنے والی نسل کے ذہن بھی معطر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے"۔ آخری خواہش کی بے پناہ مقبولیت کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے افسانہ نمبر میں شامل کر کے ایک اچھا مقام دیا۔ پھر بیوی سندری کے تقریباً ان تین درجن قارئین کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے خط لکھ کر میری حوصلہ افزائی کی۔ میں نے سب کو شکریہ کا خط لکھا ہے پھر بھی اگر کسی قاری کو میرا جواب نہ ملا ہو تو ان سطروں کے ذریعہ وہ میرا شکریہ قبول کر لیں...

خلوص کار ــــــ ظفر اُدگانوی

میں نے تم سے ایک بار فیصلہ کن لہجے میں کہا تھا۔

"قیصی! میں تمھیں بھول جاؤں گا۔"

تو تم نے جواب دیا تھا۔

"میں دیکھوں گی آپ مجھے کس طرح بھولتے ہیں۔"

جبکہ میں نے تمھاری تصویر تک بھی لوٹا دی تھی اور میں تمہارے گھر سے بھاگ کھڑا ہوا تھا اگر میرے کانوں نے تمہارا آخری جملہ سن لیا ہوتا تو میں اپنے ارادے میں کب کا کامیاب ہو چکا ہوتا کیونکہ تم نے خودکشی کر لی ہوتی اور اس طرح تم سے پیچھا چھوٹ گیا ہوتا لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کہ تم نے مجھے چیلنج کیا تھا اور مجھے اسے قبول کرنا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ مر کر تم سے نجات پا لینا بہت آسان بات ہے۔ لیکن میں زندہ رہ کر بھی تمھیں بھول سکتا ہوں۔ جو میرے تمہارے ملنے میں عتاب و رنجش میرے ارادے میں تھی۔ اور اسی وقت میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی تھی کہ وہ مولسری، اس کی ڈالیاں اور گھنی شاخیں آج بھی گواہ ہیں کہ میں نے تمھیں کبھی نہ بھولنے کی قسم کھائی تھی۔ میں نے تمھاری ان زلفوں کی بھی قسم کھائی تھی جن کی گھنی چھاؤں میں کوئی تھکا ہارا راہی اگر رک کر ذرا دم لے لے تو اس کے لئے منزل پہ پہنچنا کتنا آسان ہو جائے۔ میں نے تمھاری ان نیم باز آنکھوں کی بھی قسم کھائی تھی جن میں مجھے جھیلوں اور وادیوں کی گہرائی کا عکس نظر آیا تھا۔ میں نے تمہارے ایک ایک عضو اور ایک ایک روپ کی تقدیس کی قسم کھا کر کہا تھا کہ میں تمھیں کبھی نہ بھولوں گا۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ــــــ پھر میں نے تمھیں زندگی کی کٹھن راہ کے لئے ہم سفر بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تمھیں میرے گھر والوں نے بھی بہو بنانے پر رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ اتنی آسانی کے ساتھ نہیں ہوا تھا جتنی آسانی کے ساتھ تم نے اور میں نے مل کر یہ بات سوچ لی تھی۔ میں انجینئر تھا۔ میرے ڈیڈی شہر کے ایک بڑے تاجر تھے اور تم ایک کلرک کی لڑکی۔ کلرک، جس کی زندگی آفس کے فائلوں میں بند رہتی ہے۔ جس کی تنخواہ کے پیسوں میں سڑے ہوئے ضمیر کی بو آتی ہے۔ جس کے دماغ میں صرف مکھیوں کی بھنبھناہٹ گونجتی رہتی ہے۔ یہ تھے میرے ڈیڈی کے خیالات۔ ایسے میں تمھیں اپنا لینا کتنا کٹھن کام تھا۔ لیکن میں تو شروع ہی سے بہت ضدی واقع ہوا ہوں۔ میں نے کھلے لفظوں میں ڈیڈی سے کہہ دیا تھا۔

"ڈیڈی! میں قیصی سے شادی کروں گا۔ یہ میرا پہلا اور آخری فیصلہ ہے اگر اس کے لئے مجھے زہر کا پیالہ بھی پینا پڑا تو خوشی سے گوارا کر لوں گا۔"

ڈیڈی پر جیسے اچانک فالج آ گرا ہو۔ وہ میرا منہ تکتے رہ گئے تھے۔ ان کا بلڈ پریشر کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ پھر بھی میں نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا بلکہ اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کے چند قطرے لئے ہوئے اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ میں مانتا ہوں کہ مجھے ڈیڈی کو یہ سب کہہ کر تکلیف نہ دینی چاہئے تھی۔ لیکن انسان کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ اپنے فیصلے کو

[illegible] بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑتی ہے۔ میں نے
[illegible] تمہارے لئے دنیا کی سب سے بڑی قربانی دینی چاہی تھی۔ لیکن کیا
[illegible] کی خوشی سے محروم ہو گیا۔ ڈیڈی اور ممی دونوں ہی نے اپنے اکلوتے بیٹے کی
خوشی کے لئے روایات کو سینت چڑھانا قبول کر لیا تھا۔ تمہارے ڈیڈی کا مسئلہ کوئی مسئلہ
نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ جب میری ممی کار پر رشتے کے لئے تمہارے یہاں پہنچی ہوں گی تو تمہارے
ڈیڈی نے یقیناً یہی سمجھا ہوگا کہ انہیں اس رشتے کے ذریعے جیسے کونین کی سب سے بڑی
دولت مل گئی ہو۔ بات اسی وقت پکی ہو گئی تھی۔ تاریخ بھی طے کر لی گئی اور اسی کے
ساتھ ممی شادی کے اخراجات کے لئے تمہارے ڈیڈی کو پانچ ہزار روپے دینے کا وعدہ
بھی کر آئی تھیں۔

وہ دن صرف ہم دونوں کا تھا۔ ہم اس دن کتنے خوش تھے۔ قاضی گھاٹ کے
اس بوڑھے مولسری کے درخت کو بھی ہم نے اپنی خوشیوں میں شریک کر لیا تھا۔ اس کے
تنے پر چڑھ کے ہم دونوں نے بچپن کو بلایا تھا۔ لیکن گزرا ہوا وقت بھی کبھی لوٹا ہے۔ یہ سوچ کر
ہم مستقبل کی طرف لپکے تھے اور تمناؤں کی تابناک شعاعوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے رہے
تھے۔ یہاں تک کہ وقت کی سانسیں رک گئی تھیں، لمحوں کا توازن بگڑتے بگڑتے رہ گیا تھا۔ پھر
تم نے پہلو بدلا تھا اور گرتے گرتے بچ گئی تھیں لیکن تمہارا پرس تو گرنے سے نہیں بچ سکا
تھا۔ میں نیچے اترا تھا اور پرس لے کر پھر اسی تنے پر تمہارے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن
اس سے پہلے لاشعوری طور پر میں نے یکایک تمہارا پرس کھول لیا تھا۔ اس کی ہر ایک چیز پر
میں نے سرسری نگاہ ڈالی تھی۔ میری نظر میں تمہارے پرس کی کوئی چیز قابلِ توجہ نہیں تھی۔
لیکن پرس بند کرتے کرتے بھی میری نگاہوں نے وہ چیز دیکھ ہی لی جو ایک حقیقت تھی اور
جس سے انکار ممکن نہ تھا۔ وہ تھا ایک خط! تم میری انگلیوں میں وہ خط دیکھ کر گھبرا گئی
تھیں۔ میں نے خط پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ تم نے آج تک مجھے بے وقوف بنائے رکھا ہے۔
تمہیں نجانے کب سے میرے بجائے [illegible] سے دلچسپی رہی ہے۔ میں نے اس خط میں انہیں جذبات کی
تصویر دیکھی تھی جو میں تمہارے لئے یہ سمجھ کر بناتا رہا تھا کہ یہ صرف میرا ہی حق ہے۔ اس میں دوسرا
کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ میں نے مشکوک ہونے سے پہلے تم سے اتنا پوچھ لینا ضروری سمجھا تھا
کہ یہ ناصر کون ہے۔ تم نے کہا تھا۔

"پھول پر اگر صرف ایک ہی بھونرے کو حق دے دیا جائے تو دوسرے بھونرے پھول
پر تو گزر نہیں کر سکتے۔"

میں نے اپنے غصے پر مسکراہٹ کا دبیز پردہ ڈال دیا تھا۔

"چمن میں صرف ایک ہی پھول تو نہیں ہے سینکڑوں پھول ہیں۔ اور بھونرے
دوسرے پھولوں کو اپنا سکتے ہیں۔"

تم نے پرس میرے ہاتھ سے اچک لیا تھا۔

[illegible]

میں جاننا چاہتا [illegible] سوال ہی پیدا نہیں ہوتا [illegible]
یہی بڑائی ہے پھول کی [illegible] حق ادا کر رہا ہو۔"

جبھی میں نے غصے ہی غصے میں وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جو مجھے کہنا چاہئے تھا۔ پھر
وہاں سے میں سیدھا گھر چلا آیا تھا۔ میں نے تمہارے سبھی خطوط اور تصویریں [illegible] اور
تمہیں واپس کرنے تمہارے یہاں آ گیا تھا۔ تمہارے چہرے پر اس وقت دکھوں کی پرچھائیاں
ہونی چاہئے تھیں اور آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب ہونا چاہئے تھا۔ لیکن تمہارے چہرے
سے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے تمہاری زندگی کا یہ بہت ہی غیر اہم واقعہ ہو۔ جیسے
تمہیں اس بات کی خوشی ہو کہ تمہارے راستے سے ایک بہت بڑا کانٹا دور ہو گیا۔ میں تمہاری
تصویریں تمہارے چہرے پر پھینک کر صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

"میں نے وقت پر تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیا۔ اور شکر ہے کہ بھٹکنے سے
پہلے ہی صحیح راستے پر آ گیا۔"

تم خاموش رہنے والی کب تھیں۔

"بالکل نہیں، آپ اب راستے سے بھٹک رہے ہیں۔ پہلے منزل سے آپ بہت
قریب تھے، اب بہت دور ہو گئے ہیں۔"

میں تقریباً چیخ اٹھا تھا۔

"قیصی! اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا تو یہ تمہارا
وہم ہے۔"

تم نے بہت ہی متانت سے یہ بات کہی تھی۔

"میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ آپ مجھے بھول نہ سکیں گے۔"

میرے لہجے کی تلخی بہت حد تک نمایاں ہو چکی تھی۔

"میں تمہیں بھول جاؤں گا اور بھول کر دکھا دوں گا۔"

تم نے ترکش کا آخری تیر بھی نکال دیا تھا۔

"میں بھی دیکھوں گی ...... تجربہ کر لیجئے گا۔"

ایسے میں تمہارا گلا گھونٹ دینا میرے لئے بہت آسان تھا۔ لیکن میں ایسا نہیں
کر سکا۔ صرف پیر پٹختے ہوئے گھر واپس آ گیا تھا۔ ممی نے مجھے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا تو
پکار لیا۔ نہ جانے انہوں نے مجھے کیوں پکارا تھا اور نہ معلوم وہ مجھ سے کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔
جب میں ان کے سامنے آیا تھا تو انہوں نے میرا چہرہ دیکھا۔ اس وقت غصے کی شدت سے
میرا چہرہ تمتما رہا تھا۔ پہلے تو انہوں نے مجھے غور سے دیکھا، پھر مجھ سے پوچھنے لگیں۔

"کیا تم کہیں سے لڑ کر آئے ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں ممی! تمہارا بیٹا اتنا گرا ہوا نہیں [illegible]

ممی کا شک پھر بھی دُور نہ ہوا۔

"تمہیں ـــــ تم کیا چاہتے ہو؟"

پھر میں نے اُن سے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ میں نے صاف طور پر یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میں [illegible] سے شادی نہیں کروں گا۔ اب تم جہاں چاہو میں وہیں شادی کر لوں گا۔ ممی خوشی سے پاگل ہو کر ڈیڈی کو خبر دینے چلی گئی تھیں اور میں اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظر کتابوں کی ریک ـــــ پر پڑی تھی۔ اور اُس نے مجھے یاد دلایا تھا کہ کتابیں تو تم ہی نے ایک بار قرینے سے رکھی تھیں۔ اِس سے پہلے کہ تمہارا حُسنِ ترتیب مجھے متاثر کرتا میں نے کتابوں کی ریک ہی اُلٹ دی تھی۔ ساری کتابیں بکھر گئی تھیں۔ ایسا کرتے ہوئے کیا بتاؤں مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میں نے تمہارے گال پر ایک بھرپور طمانچہ لگایا ہو۔ اِس خوشی کے احساس کے ساتھ جب میں بستر پر لیٹنے لگا تو میں نے محسوس کیا تھا کہ کمرے میں گلاب کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ میں نے کھڑکی بند کر دی تھی تاکہ لان میں کھلے ہوئے گلاب کی خوشبو سے تمہاری یاد کی خوشبو کا کوئی تصور نہ اُبھرے لیکن اُس کے بعد ہی سینٹ کی خوشبو سے میرا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ میرے کپڑوں میں وہی سینٹ بسا ہوا تھا جو آج تم نے لگایا تھا۔ میں نے دوسرے ہی لمحے کپڑے اُتار کر پھینک دئے تھے۔ مجھے ایسا کرنے میں بھی ایک مسرت ہوئی تھی۔ پھر میں نے جب یہ دیکھا تھا کہ تم کرسی پر بیٹھی ہوئی مسکرا رہی ہو تو میں نے غصے میں ایک ٹھوکر ماری تھی اور کرسی اُلٹ دی تھی جس میں کمرے سے باہر آ گیا تھا اور اُسی وقت میں نے اپنے لئے دوسرا کمرہ منتخب کر لیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہاں کچھ سکون ملا تھا۔ نیند آ گئی تھی۔ لیکن پھر کچھ ہی دیر کے بعد کیا بتاؤں کہ تم نے مجھے کیوں کر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ میں اُٹھ بیٹھا تھا اور رات بھر نہیں سو سکا تھا۔ تمہاری وہ باتیں، جن میں کبھی میں نے خلوص کی گرمی پائی تھی۔ وہ آنکھیں ـــــ وہ گیسو ـــــ وہ ہونٹ۔ وہ سبھی کچھ رات کی تاریکی اور تنہائی میں مجھ سے اتنے قریب تھے، جتنے جاگتے میں ہو سکتے تھے۔ پھر اُسی تاریکی میں وہ لمحہ بھی آیا تھا جس میں تم نے مجھے زہر دیا تھا اور میں نے زہر کا جام پی کر بھی زندہ رہنے کی تمنا کی تھی۔ صرف اِس لئے کہ تمھیں بھول سکوں گا۔ اور جب میں اِس نتیجے پر پہنچنے ہی والا تھا کہ تمھیں کسی قیمت پر نہیں بھولا جا سکتا، تو ڈیڈی نے کاروبار کے سلسلے میں مجھے دوسرے ہی دن بنارس بھیج دیا تھا۔ کام دو دن کا تھا لیکن میں نے وہاں آٹھ دن صرف یہ سوچ کر گزار لئے کہ یہاں کی مصروفیتیں مجھے تمہارے تصور سے دُور رکھنے کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔ اِس میں مجھے ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن میری چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں [illegible] مجھے واپس آنا پڑا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ میری شادی کی تیاری شروع ہو چکی ہے۔ ممی نے [illegible] رشتے کی بات طے [illegible] تمھیں بھول جانے میں بہت آسانی ہوگی۔ غرض کہ احباب آ گئے۔ گھر میں چہل پہل شروع ہو گئی۔ پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جسے زندگی کا سب سے عظیم اور مقدس لمحہ کہا جاتا ہے۔ یہ لمحہ وہ تھا جب میں نے اپنی نئی نویلی دُلہن روشنی کا گھونگھٹ اُٹھا کر اُس کے چاند سے مُکھڑے کو دیکھا تھا۔ [illegible] اُس نے اپنے چہرے کو کچھ اور نیچا کر لیا تھا۔ اُس کی نگاہیں کچھ اور بھی جھک گئی تھیں لیکن ایسے میں تمہاری وہ ادائیں میرے ذہن سے دُور نہیں ہو سکی تھیں جن پر کبھی میں جان چھڑکتا تھا۔ اُس وقت بھی مجھے احساس ہوا تھا کہ میرے سامنے روشنی نہیں ہے تم ہو۔ اور پھر میری نظروں کے سامنے سے دو سال پہلے کا وہ منظر گزر گیا جب میں نے تمھیں پہلی بار پکڑ کر گدگدا دیا تھا اور تم نے شرم سے اپنی نظریں نیچی کر لی تھیں ـــــ پھر میں نے تمھیں ذہن سے اِس بُری طرح جھٹک دیا تھا کہ تمہاری یادوں کا ہفتوں گزر نہیں ہو سکا تھا۔

روشنی میں وہ سب کچھ تو تھا ہی جو ایک بیوی میں ہونا چاہئے۔ کچھ بیش اُس کے اندر وہ باتیں بھی تھیں جو تم میں تھیں۔ اِس کے علاوہ تم سے زیادہ اُس نے مجھے خلوص دیا۔ اُس نے تم سے زیادہ مجھے ذہنی اذیتوں سے بچایا۔ وہ اُس وقت تک کھانا نہیں کھاتی تھی جب تک میں نہ کھاؤں۔ اگر میں دوستوں کے ساتھ سکنڈ شو دیکھنے چلا گیا تو جب تک واپس نہ آ جاؤں وہ میرے انتظار میں جاگتی رہتی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو مجھے اِس بات پر یقین ہونے لگتا ہے کہ تم مجھے زندگی میں اِتنا آرام، اِتنا سکون کس طرح دے سکتی تھیں۔ تم میرے بغیر کھانا کھا لیا کرتیں۔ تمھیں اِس سے کیا غرض ہوتی کہ میں بھوکا رہوں یا مر جاؤں۔ لیکن بار بار تم میرے ذہن میں اِس طرح آ رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حالانکہ میں تمھیں بھول چکا تھا یا بھول جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر میں نے کشمکش کے انہی لمحوں میں یہ بھی سوچا تھا کہ روشنی کے ہوتے ہوئے مجھے کسی دوسرے کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اب تو وہ ایک بچے کی ماں بھی بن چکی ہے۔ اب میری ذمہ داریاں بھی بڑھ رہی ہیں۔ ذمہ داریوں کے ہجوم میں انسان کو یادوں کے ویرانے میں جانے کی فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ مجھے اُس وقت بھی یادوں کے ویرانے میں کوئی لاشعوری طاقت لے جاتی رہی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ وہاں پہنچ کر میں تمہاری یادوں کے اجزا سمیٹنے لگ جاتا تھا۔ اگرچہ میں نے رانی روڈ سے گزرنا چھوڑ دیا تھا صرف اِس لئے کہ تمہارے چھوٹے بھائی پر میری نظر نہ پڑے۔ جب بھی میں اُدھر سے گزرا تھا میں نے منّی کو تمہارے دروازے پر کھڑا پایا تھا۔ میں نے اسکوٹر روک کر اُس سے تمہاری خیریت کبھی نہیں پوچھی تھی۔ لیکن اُسے دیکھ کر تمہاری تصویر میرے سامنے آ گئی تھی۔ اِسی لئے میں نے وہ راستہ چھوڑ دیا تھا اور دوسری سڑک سے آنا جانا میرا معمول ہو گیا تھا۔ اُسی سڑک پر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اُس معاملے پر کسی بڑی سے بڑی قربانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے [illegible] سے دنیا کی سب سے بڑی قربانی دینی چاہی تھی۔ لیکن کیا [illegible] کر میں اُس سے بھی محروم ہو گیا۔ ڈیڈی اور ممی دونوں ہی نے اپنے اکلوتے بیٹے کی [illegible] کے لئے روایت کو بھینٹ چڑھانا قبول کر لیا تھا۔ تمہارے ڈیڈی کا مسئلہ تو کوئی مسئلہ [illegible] کہ جب میری ممی کا رشتے کے لئے تمہارے یہاں پہنچی ہوں گی تو تمہارے [illegible] بھی سمجھا ہوگا کہ انھیں اس رشتے کے ذریعہ جیسے کونین کی سب سے بڑی [illegible] اُسی وقت طے ہو گئی تھی۔ تاریخ بھی طے کر لی گئی اور اُس کے [illegible] شادی کے اخراجات کے لئے تمہارے ڈیڈی کو پانچ ہزار روپے دینے کا وعدہ [illegible]۔

وہ دن صرف ہم دونوں کا تھا۔ ہم اُس دن کتنے خوش تھے۔ قاضی گھاٹ کے اِن بوڑھے مولسری کے درخت کو بھی ہم نے اپنی خوشیوں میں شریک کر لیا تھا۔ اِس کے تنے پر چڑھ کے ہم دونوں نے بچپن کو بلایا تھا۔ لیکن گزرا ہوا وقت بھی کبھی لوٹا ہے۔ یہ سوچ کر ہم مستقبل کی طرف لپکے تھے اور تمناؤں کی تابناک شعاعوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ وقت کی سانسیں رُک گئی تھیں۔ لمحوں کا توازن بگڑتے بگڑتے رہ گیا تھا۔ پھر تم نے پہلو بدلا تھا اور گرتے گرتے بچ گئی تھیں۔ لیکن تمہارا پرس نو گرنے سے نہیں بچ سکا تھا۔ میں نیچے اُترا تھا اور پرس نے کر پھر اِس تنے پر تمہارے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن اِس سے پہلے لاشعوری طور پر میں نے یکایک تمہارا پرس کھول لیا تھا۔ اُس کی ہر ایک چیز پر میں نے سرسری نگاہ ڈالی تھی۔ میری نظر میں تمہارے پرس کی کوئی چیز قابلِ توجہ نہیں تھی لیکن پرس بند کرتے کرتے بھی میری نگاہوں نے وہ چیز دیکھ ہی لی جو ایک حقیقت تھی اور جس سے انکار ممکن نہ تھا۔ وہ تھا ایک خط! تمہاری انگلیوں میں وہ خط دیکھ کر گھبرا گئی تھیں۔ میں نے خط پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ تم نے آج تک مجھے بے وقوف بنائے رکھا ہے۔ تمھیں تو بے نہیں میرے پیسوں سے دلچسپی رہی ہے۔ تم نے اُس خط میں انھیں جذبات کی تصویر دکھی تھی جو میں تمہارے لئے یہ سمجھ کر بناتا رہا تھا کہ یہ صرف میرا ہی حق ہے۔ اِس میں دوسرا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ میں نے مشکوک ہونے سے پہلے تم سے اِتنا پوچھ لینا ضروری سمجھا تھا کہ یہ ناصر کون ہے۔ تم نے کہا تھا۔

"پھول پر اگر صرف ایک ہی بھونرے کو حق دے دیا جائے تو دوسرے بھونرے پتوں پر تو گزر نہیں کر سکتے۔"

میں نے اپنے غصّے پر مسکراہٹ کا دبیز پردہ ڈال دیا تھا۔

"چمن میں صرف ایک ہی پھول تو نہیں ہے، سینکڑوں پھول ہیں۔ اور بھونرے دوسرے پھولوں کو اپنا سکتے ہیں۔"

تم نے پرس میرے ہاتھ سے اُچک لیا تھا۔

"یہاں اپنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے [illegible] سی بُرائی ہے پھول کو پھول سمجھ کر تعریف کرنے کا حق تو سب کو رہنا چاہیے۔"

جبھی میں نے غصّے میں تمھیں وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جو مجھے کہنا چاہیے تھا۔ پھر وہاں سے میں سیدھا گھر پہنچا تھا۔ میں نے تمہارے بھی خطوط اور تصویریں جو تمھیں اور تحفیں واپس کرنے تمہارے یہاں آگیا تھا۔ تمہارے چہرے پر اُس وقت غموں کی پرچھائیاں ہونی چاہئے تھیں اور آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب ہونا چاہئے تھا۔ لیکن تمہارے چہرے سے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے تمہاری زندگی کا یہ بہت ہی غیر اہم واقعہ ہو۔ جیسے تمھیں اِس بات کی خوشی ہو کہ تمہارے راستے سے ایک بہت بڑا کانٹا دُور ہو گیا۔ میں تمہاری تصویریں تمہارے چہرے پر پھینک کر صرف اِتنا ہی کہہ سکا تھا۔

"میں نے وقت پر تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھ لیا۔ اور شکر ہے کہ بھٹکنے سے پہلے ہی صحیح راستے پر آگیا۔"

تم خاموش رہنے والی کب تھیں۔

"بالکل نہیں، آپ اب راستے سے بھٹک رہے ہیں۔ پہلے منزل سے آپ بہت قریب تھے، اب بہت دُور ہو گئے ہیں۔"

میں تقریباً چیخ اُٹھا تھا۔

"قیصی! اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا تو یہ تمہارا وہم ہے۔"

تم نے بہت ہی متانت سے یہ بات کہی تھی۔

"میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ آپ مجھے بھول نہ سکیں گے۔"

میرے لہجے کی تلخی بہت حد تک نمایاں ہو چکی تھی۔

"میں تمھیں بھول جاؤں گا اور بھول کر دکھا دوں گا۔"

تم نے ترکش کا آخری تیر بھی نکال دیا تھا۔

"میں بھی دیکھوں گی ...... تجربہ کر لیجئے گا۔"

ایسے میں تمہارا گلا گھونٹ دینا میرے لئے بہت آسان تھا۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکا۔ صرف پیر پٹختے ہوئے گھر واپس آگیا تھا۔ ممی نے مجھے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا تو پکار لیا۔ نہ جانے اُنھوں نے مجھے کیوں پکارا تھا اور نہ معلوم وہ مجھ سے کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ جب میں اُن کے سامنے آیا تھا تو اُنھوں نے میرا چہرہ دیکھا۔ اُس وقت غصّے کی سُرخی سے میرا چہرہ تمتما رہا تھا۔ پہلے تو اُنھوں نے مجھے غور سے دیکھا، پھر مجھ سے پوچھ بیٹھیں۔

"کیا تم کہیں سے لڑ کر آ رہے ہو؟"

میں نے اُن سے چھپا چھڑا لینا چاہا۔

"نہیں ممی! تمہارا بیٹا اِتنا گرا ہوا نہیں ہے کہ دوسروں سے لڑتا پھرے۔"

ممّی کا شک پھر بھی دُور نہ ہوا۔
نہیں ـــــــ تم کچھ چھپا رہے ہو۔

پھر میں نے اُن سے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ میں نے صاف طور پر یہ بھی کہہ دیا تھا کہ روشنی کے علاوہ میں کسی سے شادی نہیں کروں گا۔ اب تم جہاں چاہو گی میں وہیں شادی کر لوں گا۔ ممّی خوشی سے پاگل ہو کر ڈیڈی کو خبر دینے چلی گئی تھیں اور میں اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظر کتابوں کی ریک پر پڑی تھی۔ اور اُسی لمحے مجھے یاد آیا تھا کہ یہ کتابیں تو تم پہلے ایک بار قرینے سے رکھ گئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ تمہارا سلیقہ ترتیب مجھے متاثر کرتا میں نے کتابوں کی ریک ہی اُلٹ دی تھی۔ ساری کتابیں بکھر گئی تھیں۔ ایسا کرتے ہوئے کیا بتاؤں مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میں نے تمہارے گال پر ایک بھرپور طمانچہ لگایا ہو۔ اِس خوشی کے احساس کے ساتھ جب میں بستر پر بیٹھنے لگا تو میں نے محسوس کیا تھا کہ کمرے میں گلاب کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ میں نے کھڑکی بند کر دی تھی تاکہ لان میں کھلے ہوئے گلاب کی خوشبو سے تمہاری یاد کی خوشبو کا کوئی تصوّر نہ اُبھرے۔ لیکن اُس کے بعد تو سینٹ کی خوشبو سے میرا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ میرے کپڑوں میں وہی سینٹ بسا ہوا تھا جو آج تم نے لگایا تھا۔ میں نے دوسرے ہی لمحے کپڑے اُتار کر پھینک دیئے تھے۔ مجھے ایسا کرنے میں بھی ایک مسرّت ہوئی تھی۔ پھر میں نے جب یہ دیکھا تھا کہ تم کرسی پر بیٹھی ہوئی مُسکرا رہی ہو تو میں نے غصّے میں ایک ٹھوکر ماری تھی اور کُرسی اُلٹ دی تھی۔ جبھی میں کمرے سے باہر آگیا تھا اور اُسی وقت میں نے اپنے لئے دوسرا کمرہ منتخب کر لیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہاں کچھ سکون ملا تھا۔ نیند آگئی تھی۔ لیکن پھر کچھ ہی دیر کے بعد کیا بتاؤں کہ تم نے مجھے کیوں کر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ میں اُٹھ بیٹھا تھا اور رات بھر نہیں سو سکا تھا۔ تمہاری وہ باتیں، جن میں کبھی میں نے خلوص کی گرمی پائی تھی۔ وہ آنکھیں ـــــــ وہ گیسو ـــــــ وہ ہونٹ۔ وہ سبھی کچھ رات کی تاریکی اور تنہائی میں مجھ سے اتنے قریب تھے، جتنے جاگتے میں ہو سکتے تھے۔ پھر اُسی تاریکی میں وہ لمحہ بھی آیا تھا جس میں تم نے مجھے زہر دیا تھا اور میں نے زہر کا جام پی کر بھی زندہ رہنے کی تمنّا کی تھی۔ صرف اِس لئے کہ تمھیں بھُول سکوں گا۔ اور جب میں اِس نتیجے پر پہنچنے ہی والا تھا کہ تمھیں کسی قیمت پر نہیں بھُولا جا سکتا، تو ڈیڈی نے کاروبار کے سلسلے میں مجھے دوسرے ہی دن بنارس بھیج دیا تھا۔ کام دو دن کا تھا لیکن میں نے وہاں آٹھ دن صرف یہ سوچ کر ضائع کئے کہ یہاں کی مصروفیتیں مجھے تمہارے تصوّر سے دُور رکھنے کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔ اِس میں مجھے ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن میری چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں اِس لئے مجھے واپس آجانا پڑا تھا۔

گھر پہنچتے ہی میں نے دیکھا کہ میری شادی کی تیاری شروع ہو چکی ہے۔ ممّی نے بتایا کہ ایک بہت بڑے گھرانے کی پڑھی لکھی اور خوبصورت لڑکی سے رشتے کی بات طے ہو گئی ہے۔ مجھے خوشی صرف اِس بات کی تھی کہ چلو اِس شادی کے بعد تمھیں بھُول جانے میں بہت آسانی ہو گی۔ خیر جی کر احباب آگئے۔ گھر میں چہل پہل شروع ہو گئی۔ پھر وہ لمحہ آگیا جسے زندگی کا سب سے عظیم اور مقدّس لمحہ کہا جاتا ہے۔ یہ لمحہ وہ تھا جب میں نے اپنی نئی نویلی دلہن روشنی کا گھونگھٹ اُٹھا کر اُس کے چاند سے مکھڑے کو دیکھا تھا۔ کیسا لگی تھی۔ اُس نے اپنے چہرے کو کچھ اور نیچا کر لیا تھا۔ اُس کی نگاہیں کچھ اور بھی جھک گئی تھیں بالکل ویسے ہی، تمہاری وہ ادائیں میرے ذہن سے دُور نہیں ہو سکی تھیں جن پر کبھی میں جان چھڑکتا تھا۔ اُس وقت بھی مجھے احساس ہوا تھا کہ میرے سامنے روشنی نہیں ہے تم ہو۔ اور جبھی میری نظروں کے سامنے سے دو سال پہلے کا وہ منظر گزر گیا جب میں نے تمھیں پہلی بار پکڑ کر گدگدایا تھا اور تم نے شرم سے اپنی نظریں نیچی کر لی تھیں ـــــــ پھر میں نے تمھیں ذہن سے اِس بُری طرح جھٹک دیا تھا کہ تمہاری یادوں کا ہفتوں گزر نہیں ہو سکا تھا۔

روشنی میں وہ سب کچھ تو تھا ہی جو ایک بیوی میں ہونا چاہئے۔ کم و بیش اُس کے اندر وہ باتیں بھی تھیں جو تم میں تھیں۔ اِس کے علاوہ تم سے زیادہ اُس نے مجھے خلوص دیا۔ اُس نے تم سے زیادہ مجھے ذہنی اذیتوں سے بچایا۔ وہ اُس وقت تک کھانا نہیں کھاتی تھی جب تک میں نہ کھاؤں۔ اگر میں دوستوں کے ساتھ سکنڈ شو دیکھنے چلا گیا تو جب تک واپس نہ آجاؤں وہ میرے انتظار میں جاگتی رہتی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو مجھے اِس بات پر یقین ہونے لگتا ہے کہ تم مجھے زندگی میں اِتنا آرام، اِتنا سکون کس طرح دے سکتی تھیں۔ تم میرے بغیر کھانا کھا لیا کرتیں۔ تمھیں اِس سے کیا غرض ہوتی کہ میں بھوکا رہوں یا مر جاؤں۔ لیکن بار بار تم میرے ذہن میں اِس طرح آرہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حالانکہ میں تمھیں بھُول چکا تھا یا بھُول جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر میں نے کشمکش کے انہی لمحوں میں یہ بھی سوچا تھا کہ روشنی کے ہوتے ہوئے مجھے کسی دوسرے کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اب تو وہ ایک بچے کی ماں بھی بن چکی ہے۔ اب میری ذمہ داریاں بھی بڑھ رہی ہیں۔ ذمہ داریوں کے ہجوم میں انسان کو یادوں کے ویرانے میں جانے کی فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ مجھے اُس وقت بھی یادوں کے ویرانے میں کوئی لاشعوری طاقت لے جاتی رہی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ وہاں پہنچ کر میں تمہاری یادوں کے اجزاء سمیٹنے لگ جاتا تھا۔ اگرچہ میں نے رانی روڈ سے گزرنا چھوڑ دیا تھا صرف اِس لئے کہ تمہارے چھوٹے بھائی پر میری نظر نہ پڑے۔ جب بھی میں اُدھر سے گزرا تھا میں نے صوفی کو تمہارے دروازے پر کھڑا پایا تھا۔ میں نے اسکوٹر روک کر اُس سے تمہاری خیریت کبھی نہیں پُوچھی تھی لیکن اُسے دیکھ کر تمہاری تصویر میرے سامنے آگئی تھی۔ اِسی لئے میں نے وہ راستہ چھوڑ دیا تھا اور دُوسری سڑک سے آنا جانا میرا معمول ہو گیا تھا۔ اُسی سڑک پر پٹنہ مارکیٹ بھی ہے۔ سائٹ سے واپسی پر بچی کے لئے مارکیٹ سے ٹافیاں اور سبزی باغ سے روشنی کے لئے پھل ضرور خرید لیتا تھا۔

میں اُس دن سُوٹ کا کپڑا خریدنے پٹنہ مارکیٹ گیا ہوا تھا۔ میں نے تجھی سے وعدہ

...جاسے پہنانا چاہتا ہے تو اُس میں کبھی بڑی سے بڑی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ میں نے تمھیں حاصل کرنے کے لئے دین و دُنیا کی سب سے بڑی قربانی دینی چاہی تھی۔ لیکن کیا وجہ کہ میں اُس سے کیوں محروم ہو گیا۔ ڈیڈی اور ممی دونوں ہی نے اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی کے لئے روایت کو بھینٹ چڑھانا قبول کر لیا تھا۔ تمھارے ڈیڈی کا مسئلہ تو کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ اس لئے کہ جب میری ممی [illegible] رشتے کے لئے تمھارے یہاں پہنچی ہوں گی تو تمھارے ڈیڈی نے یقیناً یہی سمجھا ہوگا کہ انھیں اس رشتے کے ذریعہ جیسے کونین کی سب سے بڑی دولت ملنے والی ہو۔ بات اُسی وقت پکی ہو گئی تھی۔ تاریخ بھی طے کر لی گئی اور اُس کے ساتھ ممی شادی کے اخراجات کے لئے تمھارے ڈیڈی کو پانچ ہزار روپے دینے کا وعدہ بھی کر آئی تھیں۔

وہ دن صرف ہم دونوں کا تھا۔ ہم اُس دن کتنے خوش تھے۔ قاضی گھاٹ کے اس بوڑھے مولسری کے درخت کو بھی ہم نے اپنی خوشیوں میں شریک کر لیا تھا۔ اس کے تنے پر چڑھ کے ہم دونوں نے بچپن کو بلایا تھا۔ لیکن گزرا ہوا وقت بھی کبھی لوٹا ہے۔ یہ سوچ کر ہم مستقبل کی طرف لپکے تھے اور تمناؤں کی تابناک شعاعوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے رہے تھے یہاں تک کہ وقت کی [illegible]، لمحوں کا توازن بگڑتے بگڑتے رہ گیا تھا۔ پھر تم نے پہلو بدلا تھا اور گرتے گرتے بچ گئی تھیں لیکن تمھارا پرس نو گرنے سے نہیں بچ سکا تھا۔ [illegible] نیچے اُترا تو [illegible] تمھارے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے لاشعوری طور پر میں نے [illegible] تمھارا پرس کھول لیا تھا۔ اُس کی ہر ایک چیز پر [illegible] نگاہ ڈالی تھی۔ میری نظر میں تمھارے پرس کی کوئی چیز قابلِ توجہ نہیں تھی لیکن پرس بند کرتے کرتے بھی میری نگاہوں نے وہ چیز دیکھ ہی لی جو ایک حقیقت تھی اور [illegible] تھا۔ وہ تھا ایک خط [illegible] وہ خط دیکھ کر [illegible] محسوس ہوا کہ [illegible] مجھے بے وقوف بنا رکھا ہے۔ [illegible] میرے پھولوں سے دلچسپی رہی ہے۔ تم نے اُس خط میں انھیں جذبات کی تصویر دکھائی تھی جو [illegible] تمھارے لئے [illegible] رہا تھا کہ یہ صرف میرا ہی حق ہے۔ اس میں دوسرا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ میں نے [illegible] ہونے سے پہلے تم سے اتنا پوچھ لینا ضروری سمجھا تھا کہ [illegible] تم نے کہا تھا۔

"پھول پر اگر صرف ایک ہی بھونرے کو حق دے دیا جائے تو دوسرے بھونرے تو پر تو گزر نہیں کر سکتے۔"

میں نے اپنے غصے پر مسکراہٹ کا دبیز پردہ ڈال دیا تھا

"چمن میں صرف ایک ہی پھول تو نہیں ہے، سینکڑوں پھول ہیں۔ اور بھونرے دوسرے پھولوں کو اپنا سکتے ہیں۔"

تم نے پرس میرے ہاتھ سے اُچک لیا تھا۔

"یہاں اپنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھول کو صرف پھول سمجھنے میں کون سی بُرائی ہے۔ پھول کو پھول سمجھ کر تعریف کرنے کا حق تو سب کو برابر ہے۔"

جبھی میں نے غصے میں تمھیں وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جو مجھے کہنا چاہئے تھا۔ پھر وہاں سے میں سیدھا گھر پہنچا تھا۔ میں نے تمھارے سبھی خطوط اور تصویریں سمیٹی تھیں اور تمھیں واپس کرنے تمھارے یہاں آگیا تھا۔ تمھارے چہرے پر اُس وقت غموں کی پرچھائیاں ہونی چاہئے تھیں اور آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب ہونا چاہئے تھا۔ لیکن تمھارے چہرے سے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے تمھاری زندگی کا یہ بہت ہی غیر اہم واقعہ ہو جیسے تمھیں اس بات کی خوشی ہو کہ تمھارے راستے سے ایک بہت بڑا کانٹا دور ہو گیا۔ میں تمھاری تصویریں تمھارے چہرے پر پھینک کر صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

"میں نے وقت پر تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھ لیا اور شکریہ کہ بھٹکنے سے پہلے ہی صحیح راستے پر آگیا۔"

تم خاموش رہنے والی کب تھیں۔

"بالکل نہیں، آپ اب راستے سے بھٹک رہے ہیں۔ پہلے منزل سے آپ بہت قریب تھے، اب بہت دور ہو گئے ہیں۔"

میں تقریباً چیخ اُٹھا تھا۔

"قیصی! اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمھارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا تو یہ تمھارا وہم ہے۔"

تم نے بہت ہی متانت سے یہ بات کہی تھی۔

"میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ آپ مجھے بھول سکیں گے۔"

میرے لہجے کی تلخی بہت حد تک نمایاں ہو چکی تھی۔

"میں تمھیں بھول جاؤں گا اور بھول کر دکھا دوں گا"

تم نے ترکش کا آخری تیر بھی نکال دیا تھا۔

"میں بھی دیکھوں گی ... تجربہ کر لیجئے گا۔"

ایسے میں تمھارا گلا گھونٹ دینا میرے لئے بہت آسان تھا۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکا۔ بس پیچ و تاب کھاتے ہوئے گھر واپس آگیا تھا۔ ممی نے مجھے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا تو پکار لیا۔ نہ جانے انھوں نے مجھے کیوں پکارا تھا اور نہ معلوم وہ مجھ سے کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ جب میں اُن کے سامنے آیا تھا تو انھوں نے میرا چہرہ دیکھا۔ اُس وقت غصے کی سُرخی سے میرا چہرہ تمتما رہا تھا۔ پہلے تو انھوں نے مجھے غور سے دیکھا، پھر مجھ سے پوچھ بیٹھیں۔

"کیا تم کہیں سے لڑ کر آرہے ہو؟"

میں نے اُن سے پیچھا چھڑانا چاہا۔

"نہیں ممی! تمھارا بیٹا اتنا گرا ہوا نہیں ہے کہ دوسروں سے لڑتا پھرے۔"

ممی کا شک پھر بھی دُور نہ ہوا۔

"نہیں ــــ تم کچھ چھپا رہے ہو۔"

پھر میں نے اُن سے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ میں نے صاف طور پر یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اب میں کسی سے شادی نہیں کروں گا۔ اب تم جہاں چاہو گی میں وہیں شادی کر لوں گا۔ ممی خوشی سے پاگل ہو کر ڈیڈی کو خبر دینے چلی گئی تھیں اور میں اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظر کتابوں کی ریک ــــ پر پڑی تھی۔ اور اُسی لمحے مجھے یاد آیا تھا کہ یہ کتابیں تو تم ہی نے ایک بار قرینے سے رکھی تھیں۔ اس سے پہلے کہ تمہارا حُسنِ ترتیب مجھے متاثر کرتا میں نے کتابوں کی ریک ہی اُلٹ دی تھی۔ ساری کتابیں بکھر گئی تھیں۔ ایسا کرتے ہوئے کیا بتاؤں مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میں نے تمہارے گال پر ایک بھرپور طمانچہ لگایا ہو۔ اس خوشی کے احساس کے ساتھ جب میں بستر پر بیٹھنے لگا تو میں نے محسوس کیا تھا کہ کمرے میں گلاب کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ میں نے کھڑکی بند کر دی تھی تاکہ لان میں کھلے ہوئے گلاب کی خوشبو سے تمہاری یاد کی خوشبو کا کوئی تصور نہ اُبھرے۔ لیکن اُس کے بعد ہی سینٹ کی خوشبو سے میرا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ میرے کپڑوں میں وہی سینٹ بسا ہوا تھا جو آج تم نے لگایا تھا۔ میں نے دوسرے ہی لمحے کپڑے اُتار کر پھینک دئے تھے۔ مجھے ایسا کرنے میں بھی ایک مسرت ہوئی تھی۔ پھر میں نے جب یہ دیکھا تھا کہ تم کرسی پر بیٹھی ہوئی مُسکرا رہی ہو تو میں نے غُصّے میں ایک ٹھوکر ماری تھی اور کُرسی اُلٹ دی تھی جبھی میں کمرے سے باہر آ گیا تھا اور اُسی وقت میں نے اپنے لئے دوسرا کمرہ منتخب کر لیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہاں کچھ سکون ملا تھا۔ نیند آ گئی تھی لیکن پھر کچھ ہی دیر کے بعد کیا بتاؤں کہ تم نے مجھے کیوں کر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ میں اُٹھ بیٹھا تھا اور رات بھر نہیں سو سکا تھا۔ تمہاری وہ باتیں، جن میں کبھی میں نے خلوص کی گرمی پائی تھی۔ وہ آنکھیں ــــ وہ گیسو ــــ ــــ وہ ہونٹ۔ وہ سبھی کچھ رات کی تاریکی اور تنہائی میں مجھ سے اتنے قریب تھے، جتنے جاگتے میں ہو سکتے تھے۔ پھر اُسی تاریکی میں وہ لمحہ بھی آیا تھا جس میں تم نے مجھے زہر دیا تھا اور میں نے زہر کا جام پی کر بھی زندہ رہنے کی تمنا کی تھی۔ صرف اس لئے کہ تمہیں بھول سکوں گا۔ اور جب میں اِس نتیجے پر پہنچنے ہی والا تھا، کہ تمہیں کسی قیمت پر نہیں بھولا جا سکتا۔ تو ڈیڈی نے کاروبار کے سلسلے میں مجھے دوسرے ہی دن بنارس بھیج دیا تھا۔ کام دو دن کا تھا لیکن میں نے وہاں آٹھ دن صرف یہ سوچ کر ضائع کئے کہ یہاں کی مصروفیتیں مجھے تمہارے تصور سے دُور رکھنے کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔ اِس میں مجھے ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن میری چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں اِس لئے مجھے واپس آ جانا پڑا تھا۔

گھر پہنچتے ہی میں نے دیکھا کہ میری شادی کی تیاری شروع ہو چکی ہے۔ ممی نے بتایا کہ ایک بہت بڑے گھرانے کی پڑھی لکھی اور خوبصورت لڑکی سے رشتے کی بات طے ہو گئی ہے۔ مجھے خوشی صرف اِس بات کی تھی کہ چلو اِس شادی کے بعد تمہیں بھول جانے میں بہت آسانی ہوگی۔ خیر چُن کر احباب آ گئے۔ گھر میں چہل پہل شروع ہو گئی۔ پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جسے زندگی کا سب سے عظیم اور مُقدّس لمحہ کہا جاتا ہے۔ یہ لمحہ وہ تھا جب میں نے اپنی نئی نویلی دُلہن روشی کا گھونگھٹ اُٹھا کر اُس کے چاند سے مُکھڑے کو دیکھا تھا۔ وہ کسمسائی تھی۔ اُس نے اپنے چہرے کو کچھ اور نیچا کر لیا تھا۔ اُس کی نگاہیں کچھ اور بھی مخمور ہو گئی تھیں لیکن ایسے میں تمہاری وہ ادائیں میرے ذہن سے دُور نہیں ہو سکی تھیں جن پر کبھی میں جان چھڑکتا تھا۔ اُس وقت بھی مجھے احساس ہوا تھا کہ میرے سامنے روشی نہیں ہے تم ہو۔ اور تبھی میری نظروں کے سامنے سے دو سال پہلے کا وہ منظر گزر گیا جب میں نے تمہیں پہلی بار پکڑ کر گُدگُدا لیا تھا اور تم نے شرم سے اپنی نظریں نیچی کر لی تھیں ــــ پھر میں نے تمہیں ذہن سے اِس بُری طرح جھٹکا دیا تھا کہ تمہاری یاد کا مفتوں گزر نہیں ہو سکا تھا۔

روشی میں وہ سب کچھ تو تھا ہی جو ایک بیوی میں ہونا چاہئے۔ کم و بیش اُس کے اندر وہ باتیں بھی تھیں جو تم میں تھیں۔ اِس کے علاوہ تم سے زیادہ اُس نے مجھے خلوص دیا۔ اُس نے تم سے زیادہ مجھے ذہنی اذیتوں سے بچایا۔ وہ اُس وقت تک کھانا نہیں کھاتی تھی جب تک میں نہ کھا لُوں۔ اگر میں دوستوں کے ساتھ سکنڈ شو دیکھنے چلا گیا تو جب تک واپس نہ آ جاؤں وہ میرے انتظار میں جاگتی رہتی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو مجھے اِس بات پر یقین ہونے لگتا ہے کہ تم مجھے زندگی میں اِتنا آرام، اِتنا سکون کس طرح دے سکتی تھیں۔ تم میرے بغیر کھانا کھا لیا کرتی تھیں۔ اِس سے کیا غرض ہوتی کہ میں بھوکا رہوں یا مر جاؤں۔ لیکن بار بار تم میرے ذہن میں اِس طرح آ رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حالانکہ میں تمہیں بھول چکا تھا یا بھول جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر میں نے کشمکش کے انہی لمحوں میں یہ بھی سوچا تھا کہ روشی کے ہوتے ہوئے مجھے کسی دوسرے کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اب تو وہ ایک بچّے کی ماں بھی بن چکی ہے۔ اب میری ذمہ داریاں بھی بڑھ رہی ہیں۔ ذمہ داریوں کے ہجوم میں انسان کو یادوں کے ویرانے میں جانے کی فُرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ مجھے اُس وقت بھی یادوں کے ویرانے میں کوئی لاشعوری طاقت لے جاتی رہی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ وہاں پہنچ کر میں تمہاری یادوں کے اجزا سمیٹنے لگ جاتا تھا۔ اگرچہ میں نے رانی روڈ سے گزرنا چھوڑ دیا تھا صرف اس لئے کہ تمہارے چھوٹے مکان پر میری نظر نہ پڑے۔ جب بھی میں اُدھر سے گزرا تھا میں نے صوفی کو تمہارے دروازے پر کھڑا پایا تھا۔ میں نے اسکوٹر روک کر اُس سے تمہاری خیریت کبھی نہیں پُوچھی تھی۔ لیکن اُسے دیکھ کر تمہاری تصویر میرے سامنے آ گئی تھی۔ اِسی لئے میں نے وہ راستہ چھوڑ دیا تھا اور دُوسری سڑک سے آنا جانا میرا معمول ہو گیا تھا۔ اُسی سڑک پر پٹنہ مارکیٹ بھی ہے۔ سائٹ سے واپسی پر ممی کے لئے مارکیٹ سے ٹافیاں اور سبزی باغ سے روشی کے لئے پھل ضرور خرید لیتا تھا۔

میں اُس دن سُوٹ کا کپڑا خریدنے پٹنہ مارکیٹ گیا ہوا تھا۔ میں نے مُجی سے وعدہ

کرلیا تھا کہ ڈاکٹری کے امتحان میں جب وہ فرسٹ پوزیشن حاصل کرے گا تو میں انعام میں اُسے ایک قیمتی سوٹ دوں گا۔ اسی لئے میں کئی ضروری کام چھوڑ کر یہاں آگیا تھا تاکہ نجمی کے لوٹنے سے پہلے ہی میں اُس سے یہ کہہ دوں کہ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ لیکن مجھے کپڑا پسند نہیں آرہا تھا۔ اُس کے لئے مجھے کئی دوکانوں کا چکر لگانا پڑا۔ آخر جب ایک دوکان میں میں نے کپڑا پسند کر لینے پر خود کو مائل پایا تو ٹھیک اُسی وقت دوکان میں لڑکیوں کی ایک جماعت داخل ہوئی۔ دوکاندار مجھے چھوڑ کر اُن کی طرف متوجہ ہوگیا۔ مجھے یہ بات بہت ناگوار گزری لیکن کیا کرتا وہیں کرسی پر بیٹھ گیا تاکہ لڑکیوں کے جانے کے بعد اطمینان سے کپڑا خرید سکوں۔ میرا ذہن اُس وقت بالکل خالی تھا۔ سوچنے کو بھی کچھ باقی نہیں رہا تھا سوائے اس کے کہ میں لڑکیوں کی باتیں سُنتا۔ وہ مجھ سے زیادہ دُور نہیں تھیں۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہی تھیں اُس کا اکثر و بیشتر حصّہ میرے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ اُن کے لباس اور گفتگو سے سب سے پہلے میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ میڈیکل کالج کی طالبات ہیں۔ پھر وہ بار بار نجمی کا نام لینے لگیں تو میرے تجسّس کی رگ پھڑکی اور میں غور سے اُن کی باتیں سُننے لگا۔ وہ زنانہ کپڑے دیکھ رہی تھیں اور کچھ اِس طرح کی باتیں کر رہی تھیں۔

"نجمی نے تو کمال کر دیا بھئی اُس نے جس بلا کا ذہن پایا ہے وہ کم ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے" بیچ میں سے کوئی بولی تھی۔

"لیکن رعنا سے پوچھو تو وہ کہے گی کہ نجمی نے جس بلا کا حُسن پایا ہے وہ کسی کے حصّے میں نہیں آیا" دوسرے کنارے سے آواز آئی تھی۔

جبھی میں نے مُڑ کر دیکھا تھا۔ ایک لڑکی جس کا چہرہ شرم و حیا سے گلابی ہوگیا تھا اپنی جھینپ مٹانے کے لئے بولی تھی۔

"میں کیوں کہنے لگی ـــــ وہ تو سعدیہ اور تبسم کہا کرتی ہیں ...."

اِس سے پہلے کہ میں اُن لڑکیوں کی پُوری گفتگو سُنتا، سُوٹ کا کپڑا خریدے بغیر گھر آگیا تھا۔ میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے نجمی کو اُس کے کمرے سے بُلایا اور پُوچھا یہ رعنا کون ہے؟ اُس نے بتایا کہ وہ اُس کی کلاس فیلو ہے۔ اُس نے ڈاکٹری کے امتحان میں سکنڈ پوزیشن حاصل کی ہے۔ اور یہ کہ رانی روڈ والے ناصر صاحب کی بڑی لڑکی ہے۔

میں اِس سے زیادہ نجمی سے کچھ اور نہیں پُوچھ سکا۔ میں نے اپنی کار نکالی اور ناصر صاحب کے یہاں چلا آیا۔ وہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ ایک بچّی کے ہاتھ بھجوا دیا۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہی بچّی آئی اور مجھے اندر آنے کے لئے کہہ گئی۔ گھر کے اندر سائبان میں تم بچّوں کو کپڑے بدلوا رہی تھیں۔ رعنا بھی مارکیٹ سے واپس آچکی تھی۔ میں کھڑا ہوا منتظر تھا کہ تم سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہو گی تو میں بیٹھوں گا اور تم سے خود ہی گفتگو کا آغاز کروں گا۔ لیکن تم نے تو مجھے دیکھے بغیر میرا کبھی کا کہا ہوا یہ جملہ دہرا دیا۔

"میں تمہیں بھول جاؤں گا"

اِس جملے سے مجھ پر ایک ناقابلِ بیان کیفیت طاری ہوگئی۔ [illegible] پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ پھر بھی میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور [illegible] بات کہی۔

"مسز ناصر! محبت یادوں کے ویرانے کا ایک ایسا گلاب ہے جس کی خوشبو سے آنے والی نسل کے ذہن بھی مُعطّر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے"

اور اُسی دن میں نے نجمی کے لئے مسز ناصر سے رعنا کو مانگ لیا تھا تاکہ گلاب کی خوشبو رہتی دُنیا تک باقی رہے!!

بسریٰ صدی دہلی

غزل

مظہر امام، ایم اے

جسم و جاں کے کانچ سے نازک رشتے ٹوٹ ہی جاتے ہیں
دل کے پھپھولے وقت آنے پر اک دن پھوٹ ہی جاتے ہیں

میری رقابت ہی میں آخر، تم آئے تو منزل تک
راہِ وفا میں ورنہ اکثر ساتھی چھوٹ ہی جاتے ہیں

دِل کو پتھر کر لینے کا، ہم نے کچھ فن سیکھا ہے
ایک ذرا سی ٹھیس پہ ورنہ شیشے ٹوٹ ہی جاتے ہیں

طوفانوں میں کود پڑیں ہم کشتی کا غم کرنا کیا
ساحل سے ٹکرا کے سفینے یوں بھی ٹوٹ ہی جاتے ہیں

چاہو تو ہشیار رہو، ہشیاری سے کیا ہوتا ہے
لوٹنے والے دل کے نگر کو اک دن لوٹ ہی جاتے ہیں

یادوں کے پھول

سلیم حیدر

منجور، ڈاکخانہ ٹکی، ضلع گیا (بہار)

۱۱ نومبر ۱۹۶۴ء   محترم خوشتر گرامی! عقیدت و خلوص

"یادوں کے پھول" چھوٹا سا افسانہ ہے۔ معلوم نہیں "بیسویں صدی" کی بلندی کو چھو سکا ہے یا نہیں۔ بہرحال پڑھئے، پرکھئے اور پسند آئے تو شائع کیجئے۔ آپ کی گرانقدر رائے اور بلند ذوق قارئین کے ناقدانہ مشورے میرے لئے مشعل راہ ہوں گے ..

مخلص ——— سلیم حیدر

رادھا کے پوتے کی نئی نویلی بیوی پر اُس کی ہم عمر نند نے کٹورا بھر گھلا ہوا رنگ چھپاک سے ڈال دیا۔ دُلہن کا چہرہ بیر بہوٹی کی طرح سُرخ ہو گیا۔ بسنتی کپڑے کہیں کہیں سے نارنجی ہو گئے۔ اُس نے شوخ و شریر نند کو دوڑ کر لپٹا لیا۔ اُس کے کپڑوں پر بھی رنگ کے دھبے لگ گئے دونوں جوانیاں ہنس پڑیں۔

"بول! ان ہونٹوں کو لال رنگ سے رنگ دوں؟" رادھا کے کانوں میں کوئی گنگنا اُٹھا اور اُس کے خیالوں میں ماضی کی یادیں مہکنے لگیں۔

چیت کی نشیلی ہوا میں رنگ برنگے پھولوں کی مدہوش کن خوشبو رچی ہوئی تھی۔ رادھا کے انگ انگ میں جوانی مچلنے لگی۔ فرطِ جذبات سے اُس کی غلافی آنکھیں بند ہو گئیں یاقوتی ہونٹ پھڑکنے لگے۔ گیت کے مدھر بول فضا میں تھرکنے لگے۔

سہاگن بھگوا پیا سنگ کھیلوں

چیتا کھیلوں بل جوری

اے لالہ، چیتا کھیلوں بل جوری!

مخمور آنکھیں کھلیں، دنکر کو سامنے پایا اور شرما گئیں۔ رادھا وہاں سے ہنستی لچکتی بھاگ آئی پہروں اُس کا دل دھڑکتا رہا۔ ذہن میں گیت کے بول مسلسل گونجتے رہے۔

اے لالہ، چیتا کھیلوں بل جوری!

اے لالہ، چیتا کھیلوں بل جوری!

اتنی ہمت، اتنا حوصلہ اُس میں کہاں تھا کہ والدین کی مخالفت اور سماج سے بغاوت کرتی۔ بس بلکتی رہی، تڑپتی رہی۔ دل کے آبلے پھوٹ پھوٹ کر آنکھوں سے بہتے رہے۔ اور کسی نے اُس کی کنواری مانگ میں پھولوں کی جگہ انگارے بھر دیئے۔ اور وہ روتی سسکتی اُس کے ساتھ چلی آئی۔ دنکر کو دیکھ بھی تو نہ سکی۔

رادھا نے جھریوں میں چھپے آنسوؤں کو ہتھیلی سے پونچھ دیا۔ سسکتی ہوئی کئی آنسوؤں سے ٹکرائی اور جوانی کی یادوں پر جمی ہوئی برف بوند بوند پگھلنے لگی۔

زمین نے چاندنی کی نقرئی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ مقدس گنگا کا شفاف پانی تیز تیز قدم اُٹھاتا چل رہا تھا۔ سرد پانی میں نہاتا ہوا چاند کانپ رہا تھا۔ رادھا ٹھٹھرتی کانپتی گنگا کی گود سے نکلی۔ بھیگی ساڑی گرمی پانے کے لئے اُس کے گرم و گداز جسم سے چمٹی جا رہی تھی۔ رادھا نے دھانی ساڑی باندھی، مانگ سلگائی، خوشبو جلائی، پوجا کی اور لجاتی جھجکتی دیوتا کے درشن کو چلی۔ دیوتا مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ رادھا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھوٹ پڑی۔ اُس نے جھٹ ہونٹ سکوڑ لئے۔ چہرہ پر سنجیدگی کا خول چڑھا لیا اور دیوتا سے پوچھا۔

"دیو! تم نے اشنان نہیں کیا؟"

"میں کیوں اشنان کروں؟"

"پھر یہاں کیوں آئے ہو؟"

ڈنکر نے اُس کی کومل کلائی پکڑ کر اُسے اپنے سامنے بٹھلاتے ہوئے کہا: "صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ نہاتے ہوئے جوان چاند کا حسین جسم کیسا لگتا ہے؟"

رادھا شرما گئی۔

"ارے! تو کیوں شرماتی ہے؟ پگلی، میں تو چاند کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ جب وہ بارہ گھونگھٹ پہن کر، چار چاند لگا کر اور سولہ سنگار کر کے سرِ شام نکلا تو سورج دیوتا بے قرار ہو گیا ـــــ اور اُسے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ دُنیا جل کر سیاہ ہو گئی۔ تارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ اور جب وہ سورج کی آغوش سے نکلا تب کتنا سرور تھا۔ اور اب نہانے کے بعد، دیکھو کیسا نکھر آیا ہے!"

رادھا نے ایک نظر آسمان میں چمکتے ہوئے چاند کو دیکھا۔ پھر اُس کی نگاہیں ڈنکر پر جم گئیں۔

وہ ڈنکر کو دیکھتی رہی۔ جیسے سورج مکھی کا پھول سورج کو تک رہا ہو!

چاند چلتا رہا۔ رات رینگتی رہی۔ رادھا ڈنکر کو دیکھتی رہی!

"چاند وے جا۔ کہیں تجھے بھی گہن نہ لگ جائے!"

رادھا کے منہ سے دبی گھٹی تمنا آہ بن کر نکل گئی۔ اُس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ دور سمندر کے ساتھ سمت جل رہا تھا۔ لپٹیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ لپٹوں کے آر پار آکاش میں پونم کا چاند کانپ رہا تھا۔

پرانی یادوں پر جمے ہوئے خس و خاشاک جل کر راکھ ہو گئے!

دھرتی تپ رہی تھی۔ ہوا آگ برسا رہی تھی۔ ڈنکر زمین سے اُٹھتی ہوئی لپٹوں کے پار سے لپکتا آیا اور دوڑ کر گھر میں داخل ہو گیا۔ رادھا کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کٹورا بھر پانی پی کر اُس نے کُرتہ اُتار دیا۔ ننگی چھاتی پسینے کے قطروں سے بھر گئی۔ چوڑی چکلی چھاتی دیکھ کر رادھا کو نشہ سا ہو گیا۔ ایسا نشہ جس سے بچپن ناآشنا ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں جس کی دھندلی سی یاد باقی رہ جاتی ہے۔ ایسا نشہ جو صرف جوانی ہی میں چڑھتا ہے! رادھا نے عجیب عجیب باتیں اُس وقت سوچی تھیں۔ لیکن تمام سوچی ہوئی باتیں، تمام آرزوئیں گھُٹ کر رہ گئیں۔ اور جب پہلی بار سسرال سے میکے گئی تو میکہ ویران ہو چکا تھا۔ خیال و خواب کی دُنیا جس سے آباد تھی، وہ نہیں تھا۔ دل و دماغ کو اپنی یاد کا درد دے کر کہیں چلا گیا تھا اور رادھا اس درد کو پچاس برس سے اپنے کلیجے سے لگائے بیٹھی تھی۔ جانے ڈنکر کے دل میں کوئی درد تھا یا نہیں!

۲

ہوا کے دوش پر سوار ہو کر دور سے آتے ہوئے جوانی کے میٹھے بول ڈنکر کے بوڑھے کانوں میں رس گھول رہے تھے۔

گوریو، کہاں کہاں گودے بی گودنا؟

گوریو کہا؟

للہوا گودے ہو، بہیا گودے ہو...!

ڈنکر کے ذہن میں پرانی یادیں پھر اُجاگر ہو گئیں۔

وہ مٹی کی دیوار میں لگے ہوئے آئینے کے ٹکڑے میں اپنے جوان چہرے کو دیکھ رہا تھا اور بال سنوار رہا تھا اور رہوے ہوے گا رہا تھا۔

گوریو، کہاں کہاں گودے بی گودنا؟

گوریو کہا؟

ٹھُپی گودے ہو، گھٹنا گودے ہو اور گودے ہو ـــ ٹھو خنج ٹھو!

پیچھے سے آکر رادھا نے پیچھے سے چٹکی بھر سُرخ رنگ اُس کے منہ میں بھر دیا۔

وہ بھاگتی ہوئی شریر رادھا پر جھپٹا اور اُس کے گداز اور صندلی بانہوں کو اپنی مضبوط مٹھیوں میں جکڑ لیا۔

"بول؟" وہ رادھا کی شوخ اور چنچل آنکھوں میں دیکھتا رہا ـــــ دیکھتا رہا۔ جیسے سارا قصور انہی کا ہو!

"بول، ان ہونٹوں کو لال رنگ سے رنگ دوں؟"

رادھا نے ڈنکر کے رنگ سے بھرے ہونٹوں کو دیکھا اور شرما گئی۔

ڈنکر کے ہاتھ کا دباؤ اُس کے شانے پر بڑھ گیا۔

"جانے اب رادھا کیسی دکھائی دیتی ہوگی!" بوڑھے منہ سے دھیمی آواز نکلی۔

اُس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اِدھر اُدھر کوئی نہ تھا۔ سرمئی آسمان پر پورا چاند کھلا ہوا تھا۔ جیسے گہری جھیل کی سطح پر کنول کا ہنستا ہوا پھول! جیسے رادھا کی سیاہ آنکھ میں چمکتا ہوا تارا!

ڈنکر کو کارتک کے ایک پورنماشی کی یاد آ گئی!

آسمان سے اُترے ہوئے شبنم کے بے شمار قطرے دھرتی پر پھیلے ہوئے تھے۔ شیتل چاند گہن سے نکل کر پوتر گنگا کے نرمل جل میں اشنان کر رہا تھا۔

رادھا اشنان کر کے نکلی۔ دودھیا چاندنی میں اُس کا بھیگا ہوا بدن کسی حسین جل پری سے زیادہ حسین لگ رہا تھا۔

پھر دیوداری کے دھوئیں میں لپٹی رادھا آئی اور رات کی رانی کی پھوار بکھری

شاخ کی طرح اُس پر جھک گئی، اور پوچھا۔

"دیوتا! تم نے اشنان نہیں کیا؟"

"میں کیوں اشنان کروں؟"

"پھر یہاں کیوں آئے ہو؟"

ڈنکر نے وحشی نکھری رادھا کو اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے کہا "صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ نہاتے ہوئے جوان چاند کا حسین جسم کیسا لگتا ہے!"

رادھا کی بڑی بڑی آنکھیں پلکوں کی چلمن میں چھپ گئیں۔ جیسے کسی حسینہ نے شرما کر چھتر گرالی ہو۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جیسے اوس سے نہائی ہوئی سرخ گلاب کی کوئی کلی چٹکی ہو!

"بابا، نہاؤ گے نہیں؟ گہن چھوٹ گیا ہے۔"

"آں؟ ہوں۔"

ڈنکر اٹھا۔ دھیرے دھیرے باؤلی کی اور چلا۔

"اب تو رادھا بوڑھی ہو گئی ہوگی۔ کمر جھک گئی ہوگی۔ چہرہ ان گنت جھرّیوں سے بھر گیا ہوگا۔ بال بگلا گئے ہوں گے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا باؤلی پر پہنچا۔

مست چاند پانی کی سطح پر جھوم رہا تھا۔ شوخ ہوا جھک جھک کر اُس کا منہ چوم رہی تھی۔

ڈنکر باؤلی میں اترا۔ پانی میں بڑی بڑی لہریں اٹھیں جن کے پیچھے چاند چھپنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ نہا کر نکلا تو لطیف ہوا کے نرم جھونکے اُس کے بدن کو گدگدا گئے۔

پھوارے لدی ہوا کے شوخ جھونکے ڈنکر کو گدگدا رہے تھے۔ بارش کی بوندیں زمین پر گر کر نقطوں میں سمٹ رہی تھیں۔ اور درختوں پر جلترنگ سا بج رہا تھا۔ سارا باغ خاکستری ملگجے اُجالے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس رومانی ماحول میں رادھا کی یاد اُس کے دل میں چٹکی لے رہی تھی کہ گھونگھٹ اوڑھے رادھا آگئی۔ ڈنکر کا رواں رواں ناچ اٹھا۔ انگ انگ ہنس پڑا۔ رادھا مسکراتی ہوئی برگد کے تنے سے لگ کر اُس کے بازو میں کھڑی ہو گئی۔

"کیسا چہرہ تھا۔ بھرا بھرا، نرم نرم، سرخ سرخ جیسے پکا ہوا سندریا آم!" ڈنکر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اب تو اُس پر جھرّیاں پڑ گئی ہوں گی۔"

اُس کے دماغ میں سن رسیدہ عورتوں کی صورتیں گھومنے لگیں۔

دُبلی پتلی مریل سی، خمیدہ کمر، پوپلا منہ، آگے کو نکلی ہوئی ٹھوڑی، پچکے گال اور جھرّیوں کا جال! موٹی تھل تھل، پھولتی سانسیں، عینک کے موٹے موٹے شیشوں سے جھانکتی ہوئی پیلی پیلی آنکھیں، سفید بال!

خزاں زدہ چہرے اور جاتی زندگیاں گڈمڈ ہو کر معدوم ہو گئیں۔ پھر ایک شبیہ اُبھرنے لگی۔ مبہم سے واضح ہوئی پھر صاف اور روشن ہو گئی۔

ڈنکر چند لمحوں تک اُسے دیکھتا رہا۔ پھر عجیب لہجے میں اُس نے کہنا شروع کیا۔

"اچھا ہی ہوا جو تو مجھے نہ ملی اور میں تجھ سے دُور چلا آیا۔ میرے خیالوں میں، میرے تصور میں تو سدا جوان رہے گی!"

ستاروں کے بیچ سال کا آخری چاند ہنس رہا تھا!!

غزل

حقی حزیں ایم۔ اے

ہے جو وابستہ ہر اک فتنۂ دوراں ہم سے
کتنی برہم ہے تری زلفِ پریشاں ہم سے

ہو سکی کچھ بھی نہ پھر قدرِ دلِ جاں ہم سے
جانے کیا کہہ گئی اک جنبشِ مژگاں ہم سے

ہم ہیں اب اور ہے اک سلسلۂ راہِ دراز
مژدہ اے شوق کہ منزل ہے گریزاں ہم سے

اس قدر فاصلۂ دیر و حرم کیا کہئے
دور اتنا تو نہیں تھا درِ جاناں ہم سے

ہاں ہوا تھا کبھی آغازِ فریبِ رنگیں!
ہاں کبھی تم نے کیا تھا کوئی پیماں ہم سے

کس کو معلوم کہاں اپنا ٹھکانا ہوگا
کہیں چھوٹا جو ترا گوشۂ داماں ہم سے

یا کہیں گرمیٔ محفل نہیں پائی جاتی
یا تری بزم تھی اک بزمِ چراغاں ہم سے

نہ بظاہر کوئی شعلہ، نہ تپش ہے نہ دھواں
تم نے دیکھے ہیں کہیں سوختہ ساماں ہم سے

کس قدر ہے غمِ بیگانگیٔ عشق حزیں
چھن گئی جب سے متاعِ غمِ پنہاں ہم سے

میسور پریس دہلی

فرار

انوار احمد زئی ایم اے، ایل ایل بی

مسلم ہائی اسکول، حیدرآباد (مغربی پاکستان)

۴ ستمبر ۱۹۶۳ء

محترمی و معظمی آداب

ایک تازہ ترین تخلیق "فرار" لے کر "بیسویں صدی" کی بزم میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اگر کہانی "بیسویں صدی" کے معیار کے مطابق ہو تو کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ممنون ——— "بیسویں صدی" میں اس کی اشاعت میرے لئے باعثِ صد عزّت و افتخار ہوگی۔ پاکستان میں اس جریدہ کی سی مقبولیت شاید ہی کسی دوسرے اردو رسالہ کو حاصل ہو۔ میں کہانی میں صنفِ نازک کے احساسات کو اُجاگر کرنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں، اس کا اندازہ تو آپ کی دوربین نگاہیں ہی کر سکیں گی۔۔۔

نیازمند ——— انوار احمد زئی

"ٹرن۔ ٹرن ——— ٹرن۔ ٹرن!"

"ہلو!"

"ٹو۔ ون۔ تھری۔ ایٹ؟"

"جی ہاں!"

"کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"آپ کو کس کی تلاش ہے؟"

"جی ——— میں ڈاکٹر کنول کو چاہتی ہوں"

"اچھا نہیں کرتیں"

"جی ———!؟"

"جی!"

"میں پوچھتی ہوں آپ کون ہیں؟"

"اور اگر میں بھی یہی پوچھوں تو؟"

"میں سمجھ گئی آپ ڈاکٹر ہیں"

"سمجھی تو آپ بالکل ٹھیک ہیں لیکن میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ کون ہیں؟"

"کنول ——— میں نشاط بول رہی ہوں"

"نشاط؟"

"ہاں نشاط ——— آپ کی نشو!"

"نشاط۔ نشو! ——— بھئی معاف کرنا محترمہ! میں سمجھا نہیں"

"تو کیا آپ ڈاکٹر کنول نہیں؟"

"سو فیصدی ڈاکٹر کنول ہوں!"

"تو آپ نشاط کو نہیں جانتے؟"

"مگر اتہ پتہ تو دیجئے"

"آپ کی سابق اسٹوڈنٹ!"

"اوہ اچھا! ایک سال پرانی بات ہے"

"کیسی باتیں کر رہے ہو ڈاکٹر۔ پڑھائی کو ایک سال ہوا لیکن ملاقات کو۔۔۔"

"ہاں شاید چند ماہ ہوتے"

"چند ماہ! ——— بھئی ابھی پچیس دن پہلے تو میں کراچی جانے سے پہلے تم سے ملی ہوں"

"ہاں تو آپ کراچی کس لئے گئی تھیں؟"

"پہلے تو یہ بتائیے کہ آج یہ آپ کی چیخ کیوں لگا رکھی ہے؟ ——— اگر میں آواز نہ پہچان لیتی تو سمجھتی کہ تم کنول نہیں ہو"

"اور اب کیا رائے قائم کی جناب نے؟"

"یہی کہ آپ کا [illegible] شاید ان پچپن دنوں میں"

"اور کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

"ہاں بہت کچھ"

"تو جلدی کرو۔ میرے پاس وقت کم ہے"

"پھر وہی بات۔ تمہیں ہو کیا گیا ہے آخر؟"

"تم کو گرانی کی شکایت ہے"

"خیر میں رات واپس آئی ہوں۔ اور عجیب عالم میں۔ اب میں تم سے مل بھی نہیں سکتی"

"تو کوئی حرج نہیں"

"حرج نہیں!؟ ——— معلوم ہوتا ہے تم خود مجھ سے ملنا نہیں چاہتے"

- اپنے کو مظلوم کی بددعا سے بچاؤ۔ اس لئے کہ وہ خدا سے صرف اپنا حق مانگتا ہے۔ اور خدا حق دار کو اپنا حق مانگنے سے نہیں روکتا (یعنی اُسے اُس کا حق ضرور دیتا ہے) (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- وہ شخص کامل مومن نہیں ہو سکتا جو خود تو سیر ہو کر کھائے لیکن اُس کا ہمسایہ بھوکا رہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- کم کھانا صحت ہے، کم بولنا حکمت اور کم سونا عبادت میں داخل ہے۔ (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ)
- خاموشی عالم کا زیور ہے اور جاہل کی جہالت کا پردہ! (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

"سمجھدار ہو"

"بکواس مت کرو!"

"بند کر دوں فون؟"

"کنول! مجھے ممی نے واپس بلایا ہے۔ وہ اب ہوسٹل میں نہیں رہنے دینا چاہتیں اور ——— اور پتہ نہیں کیا چاہتی ہیں"

"پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"تم سے ایک بار ملاقات!"

"اور وہ ناممکن ہے"

"یعنی؟"

"یعنی ناممکن!"

"کنول! تم جیسے سوجھ بوجھ کے آدمی کے یہ الفاظ!"

"جی نہیں ——— چلے ہوئے دماغ کے آدمی کے"

"سنو کنول۔ میری شادی ۱۹ دسمبر کو ہو رہی ہے"

"تو کیا تہنیت کارڈ نہیں چھپے"

"جی نہیں۔ اب تو اخبار میں موت کی خبر چھپے گی"

"کسی اخباری نمائندہ سے مل لو تو فوٹو بھی آ سکتا ہے"

"......"

"اچھا سلام علیکم"

"سنئے!"

"سنائیے؟"

"تو آپ میری بات نہیں سنیں گے؟"

"تو کیا اب تک تان سین سے راگ سن رہا تھا"

"توبہ"

"توبہ ——— توبہ!"

"کنول! میں سچ کہتی ہوں۔ مر جاؤں گی ——— مر جاؤں گی!"

"رانگ نمبر پلیز۔ ان در رگارڈز!"

"آخر چاہتے کیا ہو تم؟"

"دی سیم کوسچن فرام دس سائڈ!"

"تو تم مجھ سے ملنا نہیں چاہتے"

"یہی سمجھ لو"

"آخر کیوں؟"

"کچھ موڈ نہیں"

"تو کیا تمہارے تمام وعدے ....؟"

"جی جھوٹے تھے"

"مجھے یقین نہیں"

"اب بھی؟"

"ہاں"

"تو پھر؟"

"تو پھر تم نے مجھ سے یہ آنکھ مچولی کیوں کھیلی تھی۔ سچ مرد کی ذات دھوکے اور فریب کا دوسرا نام ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ جیسا سوجھ بوجھ کا پڑھا لکھا آدمی۔ ملک کا لائق پروفیسر اور ماہر تعلیم ایک معصوم لڑکی سے اتنا بھونڈا مذاق بھی کر سکتا ہے! ——— [illegible]

بیسویں صدی دہلی

ـــ دوالیوں کے ڈیڑھ سال بعد ان کے اثرات اتنے گہرے ہو جائیں گے۔"

"واقعی بہت ہے۔"

"کنول؟"

"فرمایئے۔"

"خدا کے لئے ....."

"معاف فرمایئے۔"

"کنول ـــ دیکھو میں اس سے زیادہ ضبط نہ کر سکوں گی۔"

"تو؟"

"تو کیا تم نے واقعی تمام تعلقات ختم کرنے کے تمام یادیں بھلا دیں؟ وہ حسین راتیں فراموش کر دیں ـــ اُف ـــ کنول! تم نے کتنا بڑا فریب دیا ہے۔ تم تو کہتے تھے ـــ تم اندھیری راتوں میں حسین چاندنی کا پیغام ہو۔ تمہارے حُسن سے چاندنی کچھ اور نکھر آتی ہے تمہاری مانگ کو دیکھ کر کہکشاں شرماتی ہے۔ تمہاری گھنیری پلکوں کی جھالر میں زندگی کے رموز پنہاں ہیں تمہارے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ زندگی کا سنہرا باب ہے۔ تمہارا اندازِ تکلم سہانی صبح کا پیغام اور تمہاری آواز ابرِ باراں کی آمد کا پتہ دیتی ہے ـــ تم نے میری تعریف میں کیا کچھ نہ کہا تھا۔ تم نے مجھے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ اور اُس تصور کے حسین سائے مجھ پر اس حد تک چھا گئے کہ میں اپنے آپ کو آکاش کی دیوی سمجھنے لگی اور اپنی زندگی تم سے منسوب کر بیٹھی۔ میں یہ محسوس کرنے لگی کہ جیسے میں ایک آسمانی حور ہوں اور تم ایک فرشتہ ـــ لیکن ـــ لیکن مجھے تم نہ جانے کیوں اتنے اچھے لگتے ہو۔ ورنہ میں یہ کہے بغیر نہ رہتی کہ تم فریبی ہو ـــ فریبی!"

"ماشاءاللہ ـــ بہت اچھا افسانہ ہے۔"

"بس مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا۔"

"شکر ہے ـــ تو سلام علیک۔"

"لیکن سنو ـــ کیا میں پوچھ سکتی ہوں۔ تمہاری اس اچانک تبدیلی کی وجہ؟"

"لیکن آپ تو کچھ اور کہنا نہیں چاہتی تھیں؟"

"مجبور ہوں۔"

"اور کیا چاہتی ہو! ـــ پہلے وہ بتا دو۔"

"میں تم سے ایک ملاقات چاہتی ہوں۔"

"وہ تو کر رہی ہو۔"

"نہیں پھر ملنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"کچھ کہنا ہے۔"

"اور کیا باقی رہ گیا ہے ـــ چلو وہ بھی کہہ ڈالو۔"

"تو کنول ـــ میری شادی ہو رہی ہے۔"

"کس سے؟"

"میں ایک لمحے!"

"اچھا!؟ ـــ لو بدلی؟"

"اُف کنول! ابھی حد ہو گئی ـــ ایک ہیں ڈاکٹر شکیل احمد ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی۔"

"اچھا۔ تو ہم پر رعب! ہماری تعلیم تمہیں معلوم نہیں؟"

"اوہو! کیوں نہیں معلوم۔ تم بھی پی ایچ۔ ڈی ہو۔ لیکن تم اگر کچھ بھی نہ ہوتے تو بھی اُس سے عظیم تھے۔ تم بہت عظیم ہو کنول۔ تمہاری عظمت میرے دل پر نقش ہے تم ....."

- کسی کے لئے دل میں نفرت بھرے رکھنے کی بہ نسبت اُسے فوراً ظاہر کر دینا اچھا ہے۔ جیسے پل بھر میں جل جانا دیر تک سلگتے رہنے سے بہتر ہے۔ (وید ویاس)
- اگر کوئی کمزور شخص تمہاری بے عزتی کرے تو اُسے بخش دو۔ کیونکہ معاف کرنا ہی بہادروں کا کام ہے۔ (گرو گوبند سنگھ)
- آدمیت جسم کی ساخت کا نام نہیں مزاج کی خوبیوں کا نام ہے۔ (سوامی سار شبدانند جی)
- بدی کے موقعے دن میں سو بار ملتے ہیں۔ لیکن نیکی کرنے کا موقع سال میں صرف ایک بار آتا ہے۔ (والٹیئر)

"جی ہاں ـــ خود فریبی کے انداز ہیں۔"

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو تم؟"

"اچھا تو وہ کیا کرتے ہیں؟"

"سُنا ہے کراچی یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر ہیں۔"

"پروفیسر ہیں ـــ تب تو بوڑھے ہوں گے۔"

"یہ مجھے نہیں معلوم لیکن تم بوڑھے ہو کیا؟ تم بھی تو پروفیسر ہو۔"

"اس کا مطلب ہے تم نے اُنہیں دیکھا بھی نہیں؟"

"اور میں دیکھنا چاہتی بھی نہیں۔"

"ہاں تو خیر ـــ کب کر رہی ہو شادی۔ اُنہیں کو؟"

"تو تم چاہتے ہو میری شادی ہو جائے اُس سے؟"

"میں تو سمجھتا ہوں اچھا ہی ہے۔ اس میں بُرائی کیا ہے؟"
"تو تمہارے نزدیک بھلا ہی ہے! اسی لئے تو تمہیں اپنا کہا تھا" ــــــ "سنو کنول میں فرار چاہتی ہوں۔ زندگی سے فرار!"

"حقیقت میں؟"

"ہاں واقعی! میں ایسی زندگی سے موت بہتر سمجھتی ہوں۔ یقیناً فرار، ہمیشہ کے لئے فرار ــــــ"

"اچھا تو سنو! ــــــ انہیں کو ساتھ فرار حاصل کریں گے اور سر براتیوں کے بھاگیں گے!! محترمہ! میرا پورا نام ایس اے کنول ہے یعنی ڈاکٹر شکیل احمد ــــــ تمہارے کراچی جانے کے دوسرے ہی دن مجھے کراچی بُلا لیا گیا تھا، نفسیات کے پروفیسر کی حیثیت سے۔ جہاں سے میں نے اپنے گھر والوں کو تمہارے والدین کے پاس بھیجا اور تمہیں مانگ لیا۔ سمجھیں؟"

"......"

"سُنو!"

"جی!"

"تو فرار چاہتی ہیں آپ؟"

"ہم نہیں بولتے!"

غزل

محسن زیدی ایم۔ اے

ہجر کو زیست کا عنوان نہ کر دینا تھا
دل کو خوں گشتۂ ارماں نہ کر دینا تھا

شکوۂ جور بجا تھا مگر اے جرأتِ شوق!
حسنِ تمکیں کو پشیمان نہ کر دینا تھا

یاد تو کیا کوئی مبہم سا تصور بھی نہیں
دل کو اِس طرح تو ویران نہ کر دینا تھا

چند لمحوں کے تبسم کے لئے فصلِ بہار
چاک غنچوں کا گریبان نہ کر دینا تھا

دلِ دیوانہ مچل اُٹھا تو شکوہ کیوں ہے
اپنی زلفوں کو پریشان نہ کر دینا تھا

میری راتوں کو جو سنسان ہی کرنا تھا تجھے
میرے خوابوں کو تو ویران نہ کر دینا تھا

غزل

شباب الملت ایم اے

موجوں کی بات ہے نہ کناروں کا ذکر ہے
اِک ناخدا کے جھوٹے سہاروں کا ذکر ہے

جلتے ہوئے چمن کے نظاروں کا ذکر ہے
اہلِ چمن یہ کیسی بہاروں کا ذکر ہے

گلشن یہ جل نہ جائے کہیں گھر کی آگ سے
پھولوں کی انجمن میں شراروں کا ذکر ہے

سب کی نظر بچا کے پلاتے ہو تم جنھیں
اُن خوش نصیب بادہ گساروں کا ذکر ہے

ساحل نصیب اِس کو جگر تھام کر سُنیں
طوفانِ حادثات کے ماروں کا ذکر ہے

ترتیبِ داستانِ محبت پہ غور کر
پھولوں کے ساتھ ساتھ شراروں کا ذکر ہے

پشیمان

پروفیسر انور سیوانی ایم اے

شیخ محلہ نئی گلی سیوان ضلع سارن (بہار)

۲۲ اگست ۱۹۶۴ء   محترمی خوشتر صاحب! تسلیمات

"بیسویں صدی" کے اگست کے شمارہ میں خال رُخ کی اشاعت کے لئے شکریہ ـــــ افسانے کی پسندیدگی کے سلسلے میں جو خطوط آئے اُن میں غیر ممالک سے آنے والے خطوط بھی شامل ہیں۔ اس سے "بیسویں صدی" کی ہمہ گیر مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے ـــــ اِس سلسلے میں ایک ایسا خط بھی آیا ہے جس میں افسانے کے شدید جذباتی رجحان پر اعتراض کیا گیا ہے یہ کہا گیا ہے کہ اِس صنعتی دَور میں اِس طرح کے رُومانی اور جذباتی افسانوں کی ضرورت نہیں ـــــ یہ بحث طلب موضوع ہے رُومان اور حقیقت کے فرق کو بتانے کا یہ موقع نہیں ـــــ حقیقت خود ہی ایک معاملہ میں ڈالنے والا پیچیدہ تصور ہے ـــــ حسین تصورات اور سپنوں کی بھی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنے لئے حقیقت کی تلاش کرتا ہے اور اپنے تجربات کی روشنی میں اُسے پیش کرتا ہے ـــــ بہرحال یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ "بیسویں صدی" کا مطالعہ کرنے والے حضرات اِس میں شائع ہونے والی تخلیقات کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے تاثرات سے فن کاروں کو آگاہ کر دیتے ہیں۔۔۔ اس بار میں اپنی یہ نئی تخلیق "پشیمان" بھیج رہا ہوں۔ خطوط پر مشتمل اِس افسانے کے مقام اور کرداروں کے نام قطعی فرضی ہیں ـــــ ہاں یہ حقیقت ہے کہ اِن کا حقیقی وجود ہمارے سماج میں ہر جگہ موجود ہے۔ اپنے اِس افسانہ سے متعلق میں آپکی اور "بیسویں صدی" کے قارئین کرام کی رائے جاننے کا متمنی ہوں ۔۔۔

خلوص کیش ـــــ انور

جاوید منزل عظیم آباد

۱۴ فروری ۱۹۵۴ء   پیارے مقبول!

آج سلمان سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک تمہارے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ اُسی سلسلے میں سلمان نے تمہارے رومانوں کا ذکر بھی چھیڑ دیا۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی، تم تو شروع ہی سے رُومانی مزاج کے واقع ہوئے ہو۔ تمہاری اُفتادِ طبع کی یہ کیفیت حلقۂ احباب میں کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ میں تو خیر تمہارا جگری دوست ہوں اور یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم دل کے ویسے نہیں ہو جیسا یار لوگوں نے تمہارے بارے میں مشہور کر رکھا ہے۔ کیوں نہ ہو ہم کافی عرصہ تک ایک ساتھ رہے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں چار سال تک ہوسٹل کے ایک ہی کمرے میں رہے اور اُس کے بعد جب کچھ دنوں تک سہسرام میں ہم دونوں کی ملازمت رہی تو ایک ہی مکان میں رہنا سہنا، اُٹھنا بیٹھنا رہا۔ کم و بیش سال بھر کا عرصہ ہوا ہوگا جب میں بہتر جگہ ملنے کی وجہ سے یہاں چلا آیا۔ لیکن فاصلے کی اِس دُوری کے باوجود ہم دونوں کے دل تو قریب ہی رہے۔ خطوط کے رابطے نے فاصلے کی اِس دُوری کو بہت حد تک کم کر دیا ہے۔ جب تمہارا خط آتا ہے، میں سمجھتا ہوں تم آگئے! تمہارے خط شب و روز کے حالات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ آخر تمہاری کون سی بات ہے جو مجھے معلوم نہیں ـــــ لیکن سلمان نے مجھے ایک خبر پہنچائی ہے جس سے میرے اعتماد کو دھکا سا لگا ہے لیکن سچ پوچھو تو مجھے اُس پر یقین نہیں آتا۔ میں سمجھتا ہوں، دوسرے دوستوں کی طرح سلمان بھی تمہاری اُفتادِ طبع سے واقف نہیں۔ یاروں نے تمہارے رُومانوں کے بارے میں کیسے کیسے افسانے اُڑائے سلمیٰ، ریحانہ، روبی، غزالہ اور نہ جانے تمہارے رُومان لڑانے کی کیسی کیسی داستانیں گھڑی گئیں! کیسے کیسے قصے تراشے گئے! تم پر تہمت لگائی گئی لیکن تم تھے کہ ہر بات کو ہنسی میں اُڑا دیتے۔ میں جو تمہاری اُفتادِ طبع سے واقف تھا، اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سارے رُومانی افسانے بے بُنیاد تھے۔ تم یار باش آدمی ہو،



قابلِ مطالعہ معیاری کتب

سیرت خاتم الانبیاء	مولانا محمد شفیع صاحب	ایک روپیہ پچیس پیسے
سوشلزم	پرنسپل چیپلاس	ایک روپیہ پچاس پیسے
وہ ایک لمحہ جاوداں	کشور زیدی	دو روپے
اردو	جگن ناتھ آزاد	پچاس پیسے
تعلیم دینے کا فن	ڈاکٹر منوہر سہائے انور	تین روپیہ پچاس پیسے
ذوق جنوں	آل احمد سرور	تین روپے پچاس پیسے
رشید کی کشیدہ کاری		تین روپے پچاس پیسے
شبنم کشیدہ کاری		ایک روپیہ
شمع کشیدہ کاری		چار روپے پچاس پیسے
قدسیہ کشیدہ کاری		ایک روپیہ
دلہن کشیدہ کاری		دو روپیہ پچاس پیسے
بیگم کشیدہ کاری		ایک روپیہ پچاس پیسے
گلشن کشیدہ کاری	زینب انور	دو روپیہ

سموم و صبا	جوش ملیح آبادی	آٹھ روپے
شکوہ جواب شکوہ	ڈاکٹر اقبال	پچیس پیسے
بال جبریل	"	تین روپے پچاس پیسے
ابھی نندن گرنتھ	جوش ملسیانی	دس روپے
نقش فریادی	فیض	دو روپے پچیس پیسے
آہنگ حجاز	عرش ملسیانی	ایک روپیہ
ہفت رنگ	عرش ملسیانی	تین روپے
قول و قرار	عبدالحمید عدم	دو روپیہ پچاس پیسے
رنگ و آہنگ	"	ایک روپیہ
آہنگ	مجاز	تین روپے
شکنتلا	ساغر نظامی	بارہ روپے
گلستان ہزار رنگ	سید بہار الدین	دس روپے
سنگم	نریش کمار شاد	تین روپے

سرقہ و توارد	نریش کمار شاد	دو روپے پچیس پیسے
پھوار	"	دو روپے پچاس پیسے
دستک	"	دو روپے پچیس پیسے
ڈارلنگ	"	دو روپے پچاس پیسے
آتش گل	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
صنم و حرم	شکیل بدایونی	ایک روپیہ
رعنائیاں	"	تین روپے پچاس پیسے
گفتنی	مخمور سعیدی	[illegible] روپے
گل رعنا	برج لال رعنا جگی	تین روپے پچاس پیسے
دل ناداں	کرشن موہن ایم اے	چھ روپے
شبنم شبنم	"	پانچ روپے
تماشائی	"	ایک روپیہ
گرد راہ	ضیا فتح آبادی ایم اے	تین روپے پچاس پیسے
سازو نغمہ	بسمل کپور تھلوی	تین روپے
آہنگ حیات	پروفیسر نثار الرحمٰن خاں نقشا	ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی

ساتھ ہی شعر پرستی بھی تمہاری خصلتوں میں شامل ہے۔ مہ وشوں اور سوسائٹی گرلز کے ساتھ تفریحات میں حصہ لینے کے شوقین ہو لیکن مُنی کی محفلوں کے ان سارے ہنگاموں میں تمہاری حیثیت محض ایک تماشائی کی ہوتی ہے۔ تفریح طبع کے طور پر تم اُن محفلوں میں جاتے ضرور ہو لیکن تم دل کے بُرے نہیں ہو۔ تمہارا کردار میری نگاہوں میں آئینے کی طرح جھلکتا ہے۔

ہاں تو میں سلمان کی بات کر رہا تھا، اُس نے مجھے بتایا کہ آج کل تم کسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو ــــ یقین مانو مجھے تو اس بات پر ذرہ برابر بھی اعتبار نہیں آتا۔ سلمان نے قسمیں کھا کھا کر واقعات بیان کئے لیکن میں نے اُس کی باتوں کو دوسرے دوستوں کی باتوں کی طرح افواہ سے زیادہ اہمیت نہ دی ــــــــ بھلا یہ بھی یقین کرنے کی بات ہے؟

کیا میں تمہیں جانتا نہیں؟ جب سے شہناز تمہاری منگیتر بنی ہے، تم نے مجھے بتایا کہ تم نے دوشیزاؤں کے تفریحی پہلو سے بھی اپنے آپ کو بچا کے رکھا ہے۔

ہاں لکھنا کب تمہارے سہرے کے پھول کھلیں گے، ہم ابھی سے سہرے کے اشعار موزوں کرنے کی فکر میں لگ گئے ہیں!

تمہارا ــــــــ انیس

جاوید منزل عظیم آباد

۲ مارچ ۱۹۵۴ء پیارے مقبول ــــ!

یہ تم نے کیا لکھا؟ سلمان کی پہنچائی ہوئی خبر سچّی ہے! تم نے یہ کیا غضب کیا؟ کیا واقعی میں تمہارے بارے میں غلطی پر تھا، مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا۔ تم نے اپنے اِس خط میں کیا لکھا ہے۔ تم اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو۔ پھر شہناز کا کیا ہوگا؟ تمہارے اور شہناز کے والدین کیا محسوس کریں گے؟ شہناز سے تمہاری نسبت کے لئے تم پر تو کسی طرح کا دباؤ نہیں ڈالا گیا تھا، یہ نسبت تمہاری مرضی سے طے پائی تھی ــــ تم نے بتایا تھا کہ شہناز بھی تم سے محبت کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں، تم غلط قدم اُٹھا رہے ہو، ٹھنڈے دل سے سوچو اور وقتی جذبات کے تحت بہک نہ جاؤ۔ یہ بُرا ہوگا، بہت بُرا ہوگا آخر تم شہناز کو کیوں ٹھکرا رہے ہو؟ ــــ شہناز جیسی خوبیوں کی لڑکی ہزاروں میں بھی شاید مشکل سے نکلے۔ وہ امیر باپ کی بیٹی نہیں، لیکن اِس سے شہناز کی خوبیوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ میں تو کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میں تم پر اپنا حق سمجھتا ہوں اور اُسی حق کے ماتحت میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟

تمہارا ــــــــ انیس

جاوید منزل عظیم آباد

۱۹ مارچ ۱۹۵۴ء مقبول ــــ!

تمہارے خط سے تمہارے دلِ مضطرب کی بے کلی کا اندازہ ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ تمہارے کردار کے اُس رخ سے واقفیت ہوئی جس سے میں ابھی تک ناواقف تھا۔ تم مجھ سے ہمدردی کے طلبگار ہو، سُن لو مجھے تم جیسے غلط روش اختیار کرنے والے ساتھیوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں، دوستی کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی اپنا رفیق صحیح یا غلط جس راستے پر جا رہا ہو، ہر حال میں اُس کا ساتھ دیا جائے۔ تم نے غلط راستا اختیار کیا ہے۔ میں تمہیں اپنے طور پر اُس راستہ پر چلنے سے منع کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور جب تم خود غرضانہ طور پر مجھ سے معاونت کے طلبگار ہو تو میں صاف صاف بتائے دیتا ہوں کہ میں اس سلسلے میں ہرگز تم سے موافقت نہیں کر سکتا۔ تمہارے اور شہناز کے والدین کو سمجھانے یا تمہاری نئی محبوبہ کے سرپرستوں کو ہموار کرنے کی میں ہرگز ہرگز کوشش نہ کروں گا۔

ہاں یہ جان کر تمہارے کردار کا مکروہ رُخ میرے سامنے آ گیا کہ تمہاری "محبت" کے محور کا رُخ پھیرنے والی دوشیزہ شہناز سے زیادہ دولت مند والدین کی بیٹی ہے۔ گویا تمہاری محبت زر و سیم کی ترازو پر تُلنے والی چیز بن گئی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے تمہارا خط پڑھ کر کتنا صدمہ ہوا۔ تمہاری محبت کا یہ پہلو اور بھی مضحکہ خیز ہے کہ تمہارا یہ رُومان ابھی یکطرفہ چل رہا ہے یقیناً میں تمہیں عقلمند نہیں سمجھتا، یہ جان کر کہ اپنی اِس محبت کی کامیابی کا یقین کئے بغیر تم نے شہناز جیسی لڑکی سے اپنی نسبت پر اپنے اور شہناز کے والدین پر ناراضامندی ظاہر کر دی ہے ــــ خدا تمہیں عقل دے، اگر اس رومان کو ناکامی کا مُنھ دیکھنا پڑا تو تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟ ان باتوں کی تلخی سے تم یقیناً چراغ پا ہو گے، لیکن میرے دل کی پوچھو تو اُس سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا تمہاری محبت کو ناکام کرے۔

تمہارا بہی خواہ ــــ انیس

جاوید منزل عظیم آباد

۱۵ اپریل ۱۹۵۴ء مقبول!

تمہارا عتاب نامہ ملا۔ مجھے تم سے اُمید بھی یہی تھی۔ تم جذبات کی رو میں بہک کر بہت زیادہ خود غرض بن گئے ہو۔ تم نے لکھا ہے میں نے تمہارے زخم پر مرہم رکھنے کے بجائے نمک چھڑکا ہے۔ تم سا پاگل اور سمجھ ہی کیا سکتا ہے! میں نے جو کچھ تمہیں لکھا ہے اُس پر مجھے ذرا بھی تاسف نہیں، آخر ایسا کیوں ہو؟ سچی بات تلخ ہوتی ہے۔ لیکن ایک حق گو اُس کا اظہار کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔

تم ایک امیر گھرانے کا داماد بننے اور بھاری بھرکم جہیز کے خواب دیکھتے رہے ہو، اور اپنی فطرت کی خباثت کو چھپانے کے لئے محبت کا ڈھونگ رچا رہے ہو۔ جبکہ تمہارا ہر ملاقاتی جانتا ہے کہ یہ تمہاری پہلی محبت نہیں۔

تین دن ہوئے شہناز کے والد سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کسی کام سے یہاں آئے

ہوئے تھے۔اُف ماں کی معصوم صورت اثر جاتا ہے یہ غم —— غالباً تم نے انسانیت کو اُنہی بلندی کے ڈھیلوں سے تولا ہے، تم کیا سمجھ سکتے ہو ایک غریب لیکن غیرت مند باپ کے جذبات کو۔ کاش تمہارے پہلو میں دل ہوتا اور اُس بیچارے کے غم کو سمجھ سکتے جو تمہارے شہناز سے نسبت توڑنے سے اُس غریب کے دل کو پہنچا ہے۔

لیکن تم تو سلطانہ کے لیے سر سے جا رہے ہو۔

مقبول! یہ کوئی تمہارا قصور نہیں، ہمارے اُس ماحول کا قصور ہے جس میں متوسط طبقے کے نوجوان پرورش پا رہے ہیں۔ آج درمیانہ طبقہ کے ہر اُس نوجوان کی جو تعلیم یافتہ ہے یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی اونچے گھرانے میں اُس کی شادی ہو تاکہ اونچے محلوں، کاروں، ٹیلیویژن اور قیمتی سوٹوں کے خواب جو وہ دیکھتا آ رہا ہے، اور جسے اُس کے والدین کی مالی حالت یا اُس کی اپنی کمائی پورا ہونے کی اجازت نہیں دیتی، اُن خوابوں کی تعبیر پا سکے۔ کیوں، میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟

میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ شہناز کو نہ ٹھکراؤ —— اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ مقبول لوٹ جاؤ، لوٹ جاؤ، تم نے جو راستہ اختیار کیا ہے، صحیح نہیں ہے۔

تمہارا بہی خواہ —— انیس

جاوید منزل، عظیم آباد

۱۷ جولائی ۱۹۵۴ء مقبول!

تمہارے چھ سات خطوط فائل میں پڑے ہیں۔ میں تمہیں کیا جواب دیتا۔ تم کسی کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اپنی غرض کے پیچھے ایسے پاگل ہو رہے ہو کہ اپنی بکواس کے سامنے کسی کی سُننا نہیں چاہتے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم آخر مجھے کیوں لکھتے ہو جب کہ جانتے ہو کہ اس سلسلے میں میرا خیال کیا ہے؟ —— میں تمہاری دوستی کا لحاظ کر کے ہر بات میں تمہاری ہمنوائی کروں یا اصولی طور پر جس بات کو اچھا سمجھتا ہوں وہ بات کہوں ——؟

تم نے اپنی نئی ہونے والی بیوی کے والد سے راہ و رسم بڑھالی ہے اور انھیں متاثر کر کے خود کو اُن کا داماد بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم نے اپنی راہ خود نکالی ہے۔ اُس کے نشیب و فراز کو جانتے ہو پھر مجھ سے کیوں صلاح لیتے ہو۔ یہ بھی خوب رہی، تم چاہتے ہو کہ میں اس سلسلے میں تمہارے لئے کوشش کروں۔ اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی تم مجھ سے ایسی اُمید رکھتے ہو، اب مجھے تمہاری دماغی صحت پر شک ہونے لگا ہے۔

فقط —— انیس

جاوید منزل، عظیم آباد

۵ اگست ۱۹۵۴ء مقبول!

اب تم گالیوں پر اُتر آئے —— اگر میں تمہارے خط کا جواب دینا ضروری دیکھ کر خاموش رہ جاتا ہوں تو تم اتنے بوکھلا کیوں جاتے ہو۔ میں نے تمہیں پہلے ہی لکھ دیا ہے کہ میں اِس سلسلے میں کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں —— یہ مانا کہ خدا کی مہربانی سے آج میں ایک معزز عہدے پر فائز ہوں اور یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتا کہ میری ترقی میں میرے دوستوں اور بہی خواہوں (تم بھی ان میں سے ایک ہو) کی نیک خواہشیں شامل ہیں۔ تم نے مجھ پر جو احسانات کئے ہیں ان سے کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ سب کچھ تسلیم کرتے ہوئے بھی صرف اِس لئے کہ اپنے عہدہ اور رسوخ سے متاثر کر کے اُن صاحب کو جنہیں تم اپنا خسر بنانا چاہتے ہو، رشتہ کے لئے راضی کرنے کی کوشش کروں، میں ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ تم خود اپنی شخصیت سے اُنھیں متاثر کرو۔ تم اُن کی ثروت سے متاثر ہو کر اُن کا داماد بننا چاہتے ہو۔ اُن کا بھی تمہاری صلاحیت اور حیثیت سے متاثر ہونا ضروری ہے۔

تم نے لکھا ہے اگر میں نے اِس سلسلے میں تمہاری معاونت نہ کی تو تم ہمیشہ کے لئے مجھ سے تعلقات منقطع کر لو گے، یہ میری بدنصیبی ہے، میں اور کیا کہوں۔

فقط —— انیس

جاوید منزل، عظیم آباد

۲ نومبر ۱۹۵۴ء پیارے مقبول!

میں نے سمجھا تھا، تم اب مجھے کبھی خط نہ لکھو گے لیکن تمہارے خطوط کی آمد کی رفتار میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ بچپن کی دوستی کا یہ کرشمہ ہے پیارے! وقتی طور پر تم مجھ سے خفا ہو گئے ہو، مجھے ناصح ہونے کا طعنہ دیتے ہو لیکن یقین رکھو جب تمہاری آنکھوں کے سامنے سے غبار کا پردہ ہٹ جائے گا، تم مجھے پہلے ہی جیسا مخلص پاؤ گے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو —— تم نے لکھا ہے کہ تم اپنے والد صاحب کو رشتے کی بات کرنے کے لئے راضی کر رہے ہو، یہ بھی کر دیکھو۔

ویسے تمہاری واقفیت کے لئے کہہ رہا ہوں کہ دو مہینے پہلے اشفاق صاحب (جن کا تم داماد بننے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو) اپنی اکلوتی بیٹی سلطانہ کی نسبت کے سلسلے میں مجھ سے باتیں کرنے آئے تھے۔ اشفاق صاحب بڑے آدمی ہیں پھر بھی مجھ سے اپنی لڑکی کی نسبت کرنے کے بہت خواہش مند ہیں۔ میں نے اُن سے کہہ دیا کہ میری نسبت طے ہو چکی ہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میرے ہونے والے خسر ایک معمولی آدمی ہیں تو کئی طرح کے سبز باغ دکھا کر مجھے اپنانا چاہا لیکن میں نے صاف صاف انکار کر دیا۔

ہاں یاد آیا، برسبیل تذکرہ میں نے تمہارا نام لیا اور ایک طرح سے سمجھو کہ تمہارے لئے کوشش بھی کی۔ اُن کی باتوں سے ایسا معلوم ہوا کہ انہوں نے زیادہ توجہ نہ دی بہرحال کوشش کئے جاؤ۔

یہ خبر تم نے ٹھیک ہی سُنی ہے کہ ایک مہینے کا عرصہ ہوا میں نے شادی کر لی ہے۔

فقط —— انیس

جاوید منزل، عظیم آباد

۲۵ فروری ۱۹۵۵ء　　　پیارے مقبول!

تمہارے کئی خط آئے ہوئے تھے۔ میں دو مہینے کی غیر موجودگی کے بعد کل شام یہاں آیا ہوں۔ میں اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ سیر و تفریح کی غرض سے شملہ گیا ہوا تھا۔ بات یہ ہوئی کہ میری شادی کچھ عجیب حالات میں ہوئی۔ میرے خسر تشویشناک طور پر علیل تھے ان کے بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ اور اُن کی خواہش تھی کہ اُن کی زندگی ہی میں لڑکی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائے۔ بڑی عجلت میں میرا عقد ہوا۔ اُس وقت رخصتی ممکن نہ تھی اللہ کے فضل و کرم سے خسر صاحب صحت یاب ہو گئے ہیں۔ دو مہینے پہلے رخصتی کے بعد میں اپنی رفیقۂ حیات کو سیر و تفریح کے لئے شملہ لے گیا تھا۔

شادی کی مبارکباد کا شکریہ! —— تمہاری شکایت بجا کہ میں نے تمہیں اپنی شادی کی خبر نہ کی۔ لیکن کبھی کبھی انسان حالات سے مجبور ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کچھ مجبوری تھی ورنہ شادی جیسے خوشی کے موقع پر تم جیسے عزیز دوست کو کون بھول سکتا ہے۔

تم میری رفیقۂ حیات کے بارے میں تفصیل سے جاننے کے متمنی ہو، انشاء اللہ کبھی موقع آیا تو بتا دوں گا۔　　　تمہارا —— انیس

جاوید منزل، عظیم آباد

۲ اپریل ۱۹۵۵ء　　　مقبول پیارے!

تمہارا خط ملا۔ افسوس ہوا۔ خوب! وہ لڑکی بھی فلرٹ نکلی اور اُس کے باپ نے بھی تمہیں قابلِ اعتنا نہ سمجھا —— عبرتناک، عبرتناک! بہر حال کیا کر سکتے ہو صبر کرو۔

تمہارا —— انیس

جاوید منزل، عظیم آباد

۱۸ مئی ۱۹۵۵ء　　　پیارے مقبول —!

تمہارے غم و اندوہ کا کچھ اندازہ ہوا لیکن اب اِس سے حاصل ہی کیا؟ محبت کی ناکامی نے تمہیں شکستہ خاطر کر دیا ہے۔ لیکن ایسا بھی کیا، دنیا ابھی خالی نہیں ہوئی، لڑکیوں کی کیا کمی ہے، اگر شادی کرنا چاہو گے تو کہیں نہ کہیں رشتہ مل ہی جائے گا۔ چھوڑو اب محبت کے ان مایوس کن خیالوں کو —— تم جیسا آدمی ایک جگہ مات کھا کر شکست خوردہ ذہنیت کا اظہار کرے، تعجب کی بات ہے۔ ارے دوست، تمہارا تو یہ اصول رہا ہے۔

تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

پھر ملکِ خدا تو تنگ نہیں ——

بالآخر میرا مشورہ ہے تمہیں ضرور دوں گا کہ اب رومانوں کے چکر میں پڑنا چھوڑو اور کسی شریف گھرانے کی لڑکی سے شادی کر لو۔ تمہارے دل کا کھویا ہوا سکون لوٹ آئے گا۔

تمہارا —— انیس

جاوید منزل، عظیم آباد

۱۵ جولائی ۱۹۵۵ء　　　مقبول پیارے!

تمہاری داستانِ غم پڑھ کر تأسف ہوا۔ اب کیا شہناز کو لئے پھر رہے ہو۔ تم نے تو اُسے ٹھکرا ہی دیا۔ اب ایسا بھی کیا کہ وہ تمہارا سٹور روم میں پڑی رہتی! کیا وہ اِس قابل بھی نہ رہ گئی تھی کہ کوئی شریف نوجوان اُسے اپنی رفیقۂ حیات بنا لیتا۔ چھوڑو اِس خام خیالی کو اور کوئی دوسرا گھر آباد کرو۔　　　تمہارا —— انیس

جاوید منزل، عظیم آباد

۵ نومبر ۱۹۵۵ء　　　پیارے مقبول!

تمہارے کئی خط ملے ——

بھئی، تم بھی عجیب آدمی ہو —— اب شہناز، شہناز کی کیا رٹ لگا رکھی ہے! خواہ مخواہ اُس سے اپنی محبت جتانے کی کوشش کرتے ہو۔ وہ بیچاری قدامت پسند گھرانے کی لڑکی، کیا جانتی ہو گی ماڈرن نوجوانوں کی محبت کی گھاتوں کو —— اپنے والدین کی مرضی سے تمہاری منگیتر بنی تھی، والدین کی پسند اُس کی پسند تھی۔ وہ بیچاری کیا جانے محبت کسے کہتے ہیں۔ اُس کے والدین نے اُسے جس کی رفیقۂ حیات بنا دیا وہی اُس کا محبوب ہے۔

شہناز اب تمہاری پہنچ سے باہر ہے اور جہاں کہیں بھی ہے، خوش ہے۔

تمہارا —— انیس

جاوید منزل، عظیم آباد

۸ مئی ۱۹۵۶ء　　　مقبول پیارے!

تمہارے درجنوں خط آ چکے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر تمہیں صورتِ حال سے مطلع نہ کرو تو تمہارے خطوط کو سنبھالنے کے لئے ایک الگ فائل رکھنی پڑے گی۔

آخر تم شہناز کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو اب وہ تمہاری پہنچ سے باہر ہے۔ جب کبھی تمہارا خط آتا ہے شہناز اُسے پڑھ کر مسکرا دیتی ہے۔ اُس کے چہرے پر ایک پُراسرار مسکراہٹ رقص کرنے لگتی ہے، ایک عجیب سی مسکراہٹ جس سے نہ خوشی کا اظہار ہوتا ہے اور نہ غم کا —— کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ اپنی جس بھابی کے لئے تم اپنے ہر خط میں تسلیم و نیاز کے گلدستے بھیجتے ہو وہ شہناز کے سوا کوئی دوسری ہستی نہیں!

میں نہیں کہہ سکتا تمہارے اس رومان کا یہ انجام تمہارے لئے مسرت انگیز ہو گا یا حسرت خیز!

خلوص کیش —— انیس

غزلیں

تمنا یوسفی

دِل اب مرے پہلو میں دھڑکتا نہیں شاید
اِس شہر میں مجھ سا کوئی تنہا نہیں شاید

ہر تارِ نفس سے مرا فریاد ہی فریاد
اِس ساز کی تقدیر میں نغما نہیں شاید

تپتی ہوئی آنکھیں ہیں تو جھلسا ہوا چہرہ
اَب سر پہ تری زُلف کا سایا نہیں شاید

کیُوں میرے تبسم کو سمجھتے ہیں تبسّم؟
احباب مرے غم سے شناسا نہیں شاید

جو آپ نے سمجھا ہے وہ مطلب نہیں میرا
جو میں نے کہا آپ نے سمجھا نہیں شاید

کچھ جذب ہی کم ہے تری جھنکار میں ساقی!
سونا تری پازیب کا سچّا نہیں شاید

دیکھے تو ہیں کچھ خواب مسرت کے تمنّاؔ
بے دِل کو یہ دھڑکا کوئی سچّا نہیں شاید

اختر مشتاق رحیم آبادی

کسی محفل میں جب لب تک لبِ پیمانہ آتا ہے
نظر میں حسنِ محرابِ لبِ جانانہ آتا ہے

اگر چاہیں تو اے طعنہ زن تم کو بھی تڑپا دیں
ہم اہلِ درد کو ایسا بھی اِک افسانہ آتا ہے

بچھا جاتا ہے کیوں ہر گام پر پیراہنِ صحرا
یقیناً قیس سے چھٹ کر کوئی دیوانہ آتا ہے

کراماتِ فقیرانِ درِ میخانہ ہے واعظ!
حرم سے جو بھی ابر اُٹھے سوئے میخانہ آتا ہے

ہم اُن کو نامہ ہائے شوق کیوں کر مختصر لکھیں
کہ دو سطروں میں کب حالِ دلِ دیوانہ آتا ہے

رہِ وحشت میں اِک ایسی بھی منزل ہے جہاں اخترؔ
قدمبوسی کو دیوانوں کی خود ویرانہ آتا ہے

چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری

حوصلے دِل میں اگر ہوں کام کے
رُخ بدل دیں گردشِ ایام کے

معجزے دیکھے تمہارے نام کے
پھر گئے دِن ہی دلِ ناکام کے

جن سے آتا ہو وفا پر اتہام
ایسے نالے عشق میں کس کام کے

بخش دے دِل کو جو اِک کیفِ دوام
منتظر ہیں ہم تو اُس پیغام کے

آشیاں پر برق نے سجدے کئے
چار تنکے نکلے کتنے کام کے

جُرأتِ پرواز ہونی چاہیے
آپ کھل جائیں گے حلقے دام کے

لذّتِ راہِ طلب جوہرؔ نہ پوچھ
ہیں مزے آغاز میں انجام کے

شانِ نزول

نریش کمار شاد

۱۵۔ایف، موتی باغ ۲۔ نئی دہلی

۱۷؍دسمبر ۱۹۶۴ء　　　　　　محبی خوشتر صاحب! آداب

سالنامہ منظرِ نواز ہوا۔ حسبِ توقع بلکہ توقع سے بھی بڑھ کر بلند پایہ، دیدہ زیب اور دل فریب ہے۔ یوں تو بہت سے مضامین نظم و نثر قابلِ ستائش ہیں لیکن راجہ مہدی علی خاں کا نیا ادبی مشغلہ حاصلِ سالنامہ ہے۔ آپ کے جان دار نوٹ نے اِس جان فزا مضمون کو "دو آتشہ" بنا دیا ہے ـــــــ آئندہ شمارے کے لئے "شانِ نزول" پیش کر رہا ہوں بکلف برطرف گر قبول اُفتد زہے عز و شرف والی بات نہیں ہے۔ اِسے اِس اعتماد کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ آپ کا جدّت پسند ذہن اِسے پسند کرے گا۔

آپ کا اپنا ـــــــ نریش کمار شاد

۱۱۹۰ھ میں جب میر تقی میر پہلی بار دِلّی کو چھوڑ کر لکھنؤ پہنچے تو معلوم ہوا وہاں ایک مشاعرہ ہے۔ اُسی وقت طرحی غزل کہی اور بزمِ مشاعرہ میں پہنچ گئے۔ وہاں اُن کی درویشانہ وضع قطع دیکھ کر لوگ ہنسنے لگے۔ میر غریب الوطنی کے احساس سے پہلے ہی افسردہ دل تھے۔ لوگوں کی ہنسی نے اِس افسردگی کو اور بھی گہرا کر دیا۔ جب شمع اُن کے سامنے لائی گئی تو کچھ اصحاب نے طنزاً دریافت کیا کہ جناب کا وطن کہاں ہے۔ میر نے اِس کے جواب میں یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل میں پڑھ دیا ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لُوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

❖

شیخ امام بخش ناسخ کسی سوداگر کی کوٹھی میں گئے تو وہاں سوداگر کا خوب رُو لڑکا لیٹا ہوا تھا جو کچھ سوتا اور کچھ جاگتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر بے اختیار ناسخ نے یہ مصرعہ کہہ دیا ؏

ہے چشمِ نیم باز عجب خوابِ ناز ہے

لیکن دوسرا مصرعہ جیسا وہ چاہتے تھے کوشش کے باوجود نہیں ہو رہا تھا۔ اِسی فکر میں تھے کہ خواجہ وزیر بھی وہاں آ گئے۔ جب اُنھیں شیخ صاحب کے سکوت کی وجہ معلوم ہوئی تو اُسی وقت بلا تامّل شعر مکمل کر دیا ؎

ہے چشمِ نیم باز عجب خوابِ ناز ہے
فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

❖

میرزا یوسف علی خاں، غالب کے بھائی تھے اور غالب کو اُن سے بڑی محبت تھی۔ وہ مسلسل تیس برس تک مخبوط الحواس رہنے کے بعد جب صحت یاب ہوئے تو غالب نے دِلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ شعر کہا ؎

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالب یوسفِ ثانی مجھے

❖

بہادر شاہ ظفر کے صاحبزادے مرزا فخرو جو خود بھی شعر کہتے تھے ایک دن غالب کے

کنارے چاندنی رات میں چاندنی کی بہار دیکھ رہے تھے۔ ذوقؔ دہلوی بھی اُن کے پاس کھڑے تھے۔ مرزا فخرو کی زبان سے یہ مصرعہ نکلا ؎

چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر

انھوں نے اس پر دوسرا مصرعہ لگانے کی ذوقؔ صاحب سے فرمائش کی۔ ذوقؔ نے فوراً کہہ دیا ؎

تاب عکسِ رُخ سے پانی پھیر دے مہتاب پر

❖

داغؔ دہلوی نے ایک دن اپنی محبوب طوائف کو بلا بھیجا۔ اُس نے بڑی تمکنت سے پیامبر سے کہا کہ داغؔ صاحب سے کہہ دیجئے اُن تک میری بلا بھی آنے کی نہیں۔ جب یہ پیغام داغؔ کو سنایا گیا تو چند لمحوں تک کچھ سوچنے کے بعد انھوں نے اپنا یہ مشہور مطلع موزوں کر دیا ؎

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی
کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

❖

اکبرؔ الٰہ آبادی کو جب یہ معلوم ہوا کہ حکومتِ حجاز نے ایک برطانوی کمپنی کو حجاز لائن تعمیر کرنے کا ٹھیکہ دے دیا ہے تاکہ جدہ سے مکہ معظمہ تک ریل نکال کر حاجیوں کی سفری مشکلات دور کی جائیں تو اُن کی شوخ و شریر تخلیقی رگ پھڑک اٹھی اور انھوں نے فرمایا ؎

مکے تک ریل کا ساماں ہوا جاتا ہے
اب تو انجن بھی مسلماں ہوا جاتا ہے

❖

مولانا وحید الدین سلیمؔ پانی پتی کے پاس شہر کے چند سرکردہ اصحاب پہنچے اور اُن کی خدمت میں استدعا کی کہ ترکِ موالات کی تحریک کے سلسلے میں کچھ رہنمایانِ قوم یہاں آئے ہیں۔ اُن کے خیر مقدم کے لئے آپ چند اشعار کہہ دیجئے۔ مولانا نے جواب دیا کہ میں قصیدہ خوانی کے لئے تو پیدا نہیں ہوا۔ پھر بھی آپ لوگوں کے ارشاد کی تعمیل کے طور پر ایک شعر عرض کئے دیتا ہوں۔ اور فی البدیہہ یہ شعر کہہ دیا ؎

بن کے اب ترکِ موالات کے حامی آئے
کرکے برباد حرم کو یہ حرامی آئے

❖

شاہد احمد دہلوی ایڈیٹر "ساقی" ایک رات جوشؔ ملیح آبادی سے ملنے اُن کے یہاں پہنچے تو جوشؔ صاحب اپنے معمول کے مطابق چراغِ بادہ روشن کئے بیٹھے تھے۔ جوشؔ صاحب نے ایک پیگ تیار کرکے جب شاہد صاحب کو پیش کیا تو انھوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"حضرت! میں یہ شغل نہیں کرتا۔" جوشؔ صاحب نے حیران ہوکر شاہد صاحب کی طرف دیکھا اور اسی وقت یہ شعر موزوں کر دیا ؎

ساقی کے مدیر اور نہیں ہیں مخمور
برعکس نہند نامِ زنگی کافور

❖

جب اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ہند سرکار ہندوستانی ریاستوں کے پنشن کو ختم کر دے گی تو تلوک چند محرومؔ فکر مند ہو گئے اور انھوں نے اپنا اندیشہ نگارشات سے اس قطعے کی صورت میں ظاہر کیا ؎

سب پنشنوں کو ختم کر دے گی
کہہ رہی ہے یہ ہند کی سرکار
شاعرو! اپنے یہ دُعا مانگو
اُن میں شامل نہ ہو پنشن نگار

❖

Swin Burne نے کہیں لکھا ہے کہ

And blossom by blossom the spring arrives

فراقؔ گورکھپوری نے جب اسے پڑھا تو بے اختیار یہ مصرعہ کہہ دیا ؎

بہار غنچہ بہ غنچہ چمن میں آتی ہے

اور بعد میں اسے اس طرح پورے شعر کا روپ دے دیا ؎

بہار غنچہ بہ غنچہ چمن میں آتی ہے
قدم قدم پہ چھلکتا ہے رنگِ فتنہ گری

❖

مفتی مولوی محمد حنیف سید نکودری نہایت پرہیزگار بزرگ شاعر تھے اور جوشؔ ملسیانی صاحب کو یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوتا تھا کہ مفتی صاحب بھی اُن کی طرح حقے کے بہت مشتاق ہیں۔ چنانچہ اسی اطمینان نے جوشؔ صاحب سے یہ شعر کہلوایا ؎

ہائے مولوی صاحب بھی دَم بھرتے ہیں حقے کا
دھوئیں کے ساتھ اب اڑ جائے گی تکفیر حقے کی

❖

نظمؔ لکھنوی سے کسی صاحب نے فرمائش کی کہ اس مصرعے پر پیش مصرعہ لگا دیجئے ؎

مجھ کو قبلے سے گھنگھور گھٹا آتی ہے

نظمؔ صاحب نے کچھ تأمل کے بعد دو مختلف مصرعے اس صورت میں کہہ دئے ؎

لطف جب ہے کہ بہنے لگے میخانے پر
مجھ پہ قبلہ سے گھنگھور گھٹا آتی ہے

اور ؎

کیا عجب ہے کہ صراحی بھی کرے سجدۂ شکر
مجھ پہ قبلہ سے گھنگھور گھٹا آتی ہے

جوش ملیح آبادی نے ایک بار دہلی کے جشنِ جمہوریت کے سالانہ مشاعرے میں جس کے سامعین میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی موجود تھے شراب بندی کے خلاف ایسی کئی رباعیاں سُنائیں ؎

آتے نہیں جن کو اور دھندے ساقی
جو دام سے بُنتے ہیں وہ پھندے ساقی
جس مے کو چھڑا سکا نہ اللہ اب تک
اُس مے کو چھڑاتے ہیں بندے ساقی

اور ؎

آنا تو صراحیاں اُڑا کر آنا
انگور کی بیل تک جلا کر آنا
مجرم کے مُنہ پر تھوک دینا جس وقت
انسان سے مے کشی چھڑا کر آنا

اور ؎

یہ حکم نہ بن جائیں فسانے تو سہی
انسانوں سے اُبھریں نہ ترانے تو سہی
مے خانے کو اے جیل بنانے والے!
جیلیں نہ بنیں شراب خانے تو سہی

جن میں علی الاعلان حکومت کی ترکِ شراب کی پالیسی کا تمسخر اڑایا گیا تھا۔ سُننے والوں میں بعض نے تو جرأتِ رندانہ کی داد دی لیکن کچھ لوگوں نے جوش صاحب کی اس زباں درازی کو انتہائی معیوب و مذموم بھی خیال کیا۔ جن میں جوش صاحب کے پُرانے دوست منور لکھنوی بھی شامل تھے جو جوش صاحب کی ان رباعیوں کو سُن کر خود یہ رباعی کہنے پر مجبور ہو گئے ؎

کیا خاک وہ رند شغلِ مے کرتا ہے
کیا جادۂ مستی کو وہ طے کرتا ہے
جشنِ جمہوریت میں پاگل ہو کر
نہرو کے جو مُنہ پہ قے کرتا ہے

آزادی سے پہلے ہندو اور مسلمان چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں لڑتے اور اتحاد کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی لیکن دونوں کے رہنما انگریزی حکومت پہ الزام دھرتے۔ عرش ملسیانی نے اس صورتِ حال کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ؎

کچھ شیخ و برہمن مجرم ہیں اک جام سے دونوں پی نہ سکے
ساقی کی بُخل پسندی پر ساقی کا شکوہ کیا معنی

شاد عارفی جب پانچویں جماعت کے طالب علم تھے تو اُن کے ایک دوست نے بتایا کہ میں ایک مشاعرے کے لئے غزل کہہ رہا ہوں جس کا مصرعِ طرح ہے ؎

تیری وحشی کی گرم آہوں نے دیکھے بن کے بن کالے

"بن" قافیہ اور "کالے" ردیف۔

شاد نے ذرا تامل کے بعد بے تکلفی سے کہا، ایک مصرعہ یہ بھی رکھ لو ؎

ترے آنچل کے سائے میں پریشاں ہیں ہرن کالے

"اس میں کالے ہرن سے کیا مُراد ہے؟" اُس دوست نے پوچھا۔

"گیسوئے شب رنگ" شاد نے جواب دیا۔

"تو پھر اِس پر پہلا مصرعہ کس طرح چسپاں ہو گا جبکہ تشبیہ بھی فضول سی ہے"

شاد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "فضول تو ہر دور کی ہر تشبیہ ہوتی ہے مثلاً رخسارِ محبوب کو گلاب اور جام و مینا کو سورج سے تعبیر کرنا کس صداقت پر مبنی ہے۔ اب رہا مصرعہ چسپاں کرنے کا سوال تو اُس کی صورت یوں ہو سکتی ہے ؎

مرے حالات سے دلچسپیاں تیری نہیں چھپتیں
ترے آنچل کے سائے میں پریشاں ہیں ہرن کالے

دہلی میں "یوم برق" کے سالانہ مشاعرے کے لئے ایک سال یہ مصرعِ طرح تجویز ہوا ؎

چراغ جلتے ہیں اور روشنی نہیں ہوتی

اتفاق سے اُنہی دنوں الیکشن کا دَور دورہ تھا۔ جن سنگھ کا انتخابی نشان چراغ (دیپک) تھا اور اُسے اس الیکشن میں خاصی ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ اِس صورتِ حال نے مشہور اخباری شاعر خان غازی کابلی کو مشاعرے کے مصرعِ طرح پر اِس طرح گرہ لگانے پر اُکسایا ؎

عجیب حال ہے جن سنگھ کا الیکشن میں
چراغ جلتے ہیں اور روشنی نہیں ہوتی

مدیر بیسویں صدی کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی فوراً تعمیل ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے ——— منیجر

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

شکست کے بعد	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
طوفان کی کلیاں	″	چار روپے
گرہن کی واپسی	″	تین روپے
الٹا درخت	″	دو روپے پچھتر پیسے
دو روتہ	″	دو روپے پچیس پیسے
سسرال	شوکت تھانوی	دو روپے
مسترہ ۵	″	تین روپے پچاس پیسے
بقراط	″	دو روپے پچاس پیسے
جی ہاں بچے ہیں	″	تین روپے پچیس پیسے
جوڑ توڑ	″	پانچ روپے
داماد	″	دو روپیہ پچیس پیسے
گوشۂ عافیت	پریم چند	پانچ روپے
چوگان ہستی مکمل	″	گیارہ روپے
دودھ کی قیمت	″	تین روپے
خاک پروانہ	″	تین روپے
صبح زندگی	راشد الخیری	دو روپے
شب زندگی	″	ایک روپیہ پچیس پیسے
شام زندگی	″	ایک روپیہ پچاس پیسے
سیدہ کی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
سمن پوش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
اقبال	″	چار روپے
گرد کارواں	کنھیا لال کپور	تین روپے
سنگ و خشت	″	دو روپیہ پچاس پیسے
سونا گاچھی	جگناداس اختر	چار روپے پچاس پیسے
شعلۂ سنگ	کوثر چاندپوری	تین روپے پچاس پیسے
شمع	اے آر خاتون	پانچ روپے
چشمہ	″	دس روپے پچھتر پیسے
شکیلہ	مسعود ہمایوں	چار روپے پچیس پیسے

شکست قلت	محمود جالندھری	ایک روپیہ پچھتر پیسے
آرزو کی کلیاں	″	ایک روپیہ پچھتر پیسے
پہلی محبت	″	ایک روپیہ پچیس پیسے
خواب گاہ میں	″	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسداں	″	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظلم	سید امت	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	″	تین روپے
اکبری دروازہ	″	چار روپے
دوشیزۂ روم	″	تین روپے
دیوانہ	″	تین روپے
دو دیوانے	″	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	″	تین روپے
گناہ	دت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	″	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	″	تین روپے پچانوے پیسے
مفرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
قیامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
مازش	″	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	″	چار روپے پچیس پیسے
ممتاز	ایم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات	″	پانچ روپے
ریحانہ	″	سات روپے

دورہ	مہندر ناتھ	چار روپے پچھتر پیسے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
فردوس گوش	حضرت جوش ملسیانی	چھ روپے
کفر و ایمان	ہری چند اختر	چار روپے
وسکی کی بوتل	موہن یاور	دو روپے
لکھنؤ سے کابل	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر میکینک گائڈ	شیو ناتھ تسکین	چار روپے
موٹر ڈرائیونگ	کرشنا نند شولا	چار روپے پچاس پیسے
کیا خوب آدمی تھا		ایک روپیہ پچیس پیسے
عجیب لڑکی	اوم پرکاش ناہی	تین روپے
ہمارا اپیل (بچوں کیلئے)	خورشید گرامی	پچاس پیسے
ہمارا سبھاش	″ ہندی	پچاس پیسے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہر اثر	دو روپے
آندھی میں چراغ	غلام الثقلین	سات روپے پچاس پیسے
اقوال زریں	مصطفیٰ احسن زیدی	پچاس پیسے
انارکلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آشا دیپ بجھ نا	ست پرکاش سنگر	دو روپیہ
ابراہیم لنکن	چندر موہن لانبہ	ایک روپیہ پچھتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابو الکلام آزاد	تین روپیہ پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	بے سی داس سابد	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
چھبیس سال بعد	اختر پر تیم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کا شاہی دستر خوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے اجالے	اکبر علی آبادی	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۲۳۴۴، دہلی

بیسویں صدی دہلی

افسانہ

منزل بہ منزل

اختر عابد نوگانوی

گھیرمنات۔ امروہہ

۲۱ جولائی ۱۹۶۴ء

محترم! تسلیم

لیجئے پھر خطوط پر مشتمل افسانہ "منزل بہ منزل" ارسالِ خدمت ہے۔ میں نے اس کا عنوان "منزل بہ منزل" رکھا ہے۔ اب جو آپ کو پسند آئے ——— چند خطوط مجھے ایسے اربابِ ذوق کے بھی موصول ہوئے ہیں جنھوں نے محترمہ زکی انور صاحب کے برابر مجھے جگہ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ اُن کا حُسنِ نظر ہے ——— اُمید ہے دوسرے افسانوں کی طرح یہ افسانہ بھی آپ کو اور سب کو پسند آئے گا۔۔۔

خلوص کار ——— اختر عابد نوگانوی

مولوی گنج، لکھنؤ

۱۰ فروری ۱۹۶۴ء

میرے حبیب!

گدگداتی ہوئی آرزوؤں اور مچلتی ہوئی خوشیوں کے ساتھ تمھارے ایک خط کے جواب میں یہ دوسرا خط لکھ رہی ہوں۔ تین ماہ پہلے تمھارا ایک خط بمبئی سے بخیر و عافیت پہنچ جانے کا ملا تھا۔ اُن چند سطروں نے تمھاری نئی منزل کا پتہ تو مجھے بتا دیا۔ لیکن اُس منزل پر تمھاری آرزوؤں کے اُجالے بھی تمھارے قریب ہیں یا۔۔۔ اُن کا عکس میں بھی دیکھنا چاہتی تھی۔ کیونکہ تمھارے عزم کے بارے میں جتنا میں نے سوچا ہے اُس میں بلندیاں ہی نظر آتی ہیں۔ لیکن تین ماہ سے تم اِس طرح خاموش ہو جیسے صُبح سے اُجالا روٹھ گیا ہو۔ نہ جانے مجھے کیوں ایک ہلکا سا گمان ہوتا ہے کہ اجنبی شہر کی رونقوں اور رعنائیوں کے دلفریب ہنگاموں میں اتنے کھو گئے ہو کہ ان لمحات کو میسر نہ آسکے جو اُس راہ کی جانب بھی نگاہیں اُٹھا کر دیکھو جہاں آج بھی کوئی تمھارا منتظر ہے۔ اور شب و روز مستقبل کے لئے دعا گو ہے کہ خدا وہ دن جلد آجائے جو حسین خواب بن کر آنکھوں میں بسا ہے۔ اور تم ایک عظیم فنکار بن جاؤ تاکہ اپنا وطن تم پر ناز کرے، میں ناز کروں، ساری دُنیا ناز کرے۔

لیکن خدا کے لئے اُن لمحات کو نہ بھلا دینا جنھوں نے مجھے تمھاری قُربت کا پیار دیا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تمھارے نام کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ آنکھوں میں تمھارے تصوّر کی روشنی ہے۔ احساس میں تمھارا پیار رچا ہوا ہے۔ سانسوں میں تمھاری خوشبو ہے۔ تم دور ضرور ہو لیکن تصوّر سے قریب ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اِس قُربت میں کوئی فاصلہ حائل ہو جائے اور دل جیسا نازک شیشہ ٹوٹ جائے۔

کل میری سالگرہ تھی۔ کتنی رونقیں سمٹ آئی تھیں میرے دل کے آنگن میں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ دنیا صرف جنّت ہے۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لیکن جب تمھارا خیال آیا تو ایک فاصلہ سامنے آ گیا۔ تب احساس ہوا کہ دُنیا جنّت ہی نہیں کچھ اور بھی ہے۔ یہاں غم بھی ہے، درد بھی، فاصلے بھی ہیں، جُدائی بھی ہے۔ اور اسی دُنیا سے نبھانے کے لئے اپنا گھر چھوڑنا پڑتا ہے، اپنوں سے دامن بچانا پڑتا ہے۔ پھر کہیں یہ دُنیا اپنے دامن میں پناہ دینے کا راز بتاتی ہے۔ اِس احساس کے بعد قلب و جگر پر کیا گزری، قابلِ تحریر نہیں۔ لیکن وہ خوشیوں کے گھرے جو محبت کو تحفے میں ملے تھے خود بخود بکھر گئے۔ دل نے تمھیں پکارا۔ تم نہ آئے۔ آنکھوں نے تمھیں تلاش کیا۔ تم بہت دُور تھے۔

اور اُسی رات ———

ابّا جان امّی جان سے کہہ رہے تھے: "بیگم ہماری بیٹی نکہت کی یہ اٹھارھویں سالگرہ ختم ہو چکی ہے۔ اب ہمیں اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہی پڑے گا۔"

"سوچئے۔ میں تو کئی برس سے دن رات دعائیں مانگ رہی ہوں۔"

ابّا جان پھر کہنے لگے: "لیکن بیگم میں اِس بات کا قائل نہیں ہوں کہ صرف اپنی ہی پسند سے کسی کو چُن کر ہاتھ میں ہاتھ دے دیا جائے۔ لڑکی کو بھی حق دینا چاہئے تاکہ اُس کی زندگی کسی اندھیرے کی نذر ہو کر نہ رہ جائے۔"

"تو میں کب چاہتی ہوں کہ آپ کسی ایرے غیرے کے ہاتھوں میں میری لاڈلی کا ہاتھ تھما دیں۔ میری بیٹی اَن پڑھ تو ہے نہیں ماشاء اللہ بی۔ اے پاس ہے"

"یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔ اُس کی رائے جاننے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرنا ہے"

میں ابھی اپنے دل کی دھڑکنوں اور سانسوں پر قابو بھی نہ پا سکی تھی کہ ابّا جان امّی کے ساتھ میرے ہی کمرے میں آ گئے۔ اُنھوں نے مجھ سے کئی سوال کئے۔ ایسے سوال جن کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پھر بھی وہ مُصر رہے تو میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے وہی عام سی بات کہہ دی بھلا میں اس بارے میں اپنی کیا رائے دے سکتی ہوں۔ اِس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔

"ہمیں اپنی بیٹی سے یہی اُمید تھی"

ابّا جان خوش ہو گئے۔ میں نے دیکھا اُن کی آنکھوں میں ممتا کے ستارے چمکنے لگے۔ پھر وہ ستارے ٹوٹ کر میرے دامن میں آ گرے۔ میں نے محسوس کیا یہی میری اندھیری رات کا نُور ہیں یہی میری مستقبل کی راہوں میں اُجالا دکھائیں گے۔ یہ سوچ کر میں بے اختیار امّی کے سینے سے چمٹ کر سسکنے لگی۔

اور وہ رات گزر گئی۔

میں سو کر بھی نہ اُٹھی تھی کہ تمھاری چہیتی یعنی شمیمہ کی بچی آ گئی۔ اور آتے ہی تمھارا ذکر چھیڑ دیا۔ نہ جانے اُسے کیا پڑی رہتی ہے کہ جب بھی آتی ہے تمھارے ہی تذکروں سے دل بہلانے کی کوشش کرتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمھارے تصوّر کا دامن تھام کر خیالات کے ریشمی جال بُننے لگی ہو اور اُنھیں میں اُلجھ کر رہ جانا چاہتی ہو۔ مجھے اُس کے ماضی پر رحم آتا ہے۔ وہ تو سب تمھیں معلوم ہی ہے۔ اُسی سے متاثر ہو کر تم نے اپنے خلوص اور ہمدردی سے اُسے نوازا تھا لیکن کہیں اُس نے اِس ہمدردی کا غلط مطلب تو نہیں سمجھ لیا ہے۔ ہو سکتا ہے تم نے اُس سے کوئی وعدہ کیا ہو اور یوں اُس کے دل پر تمھاری یادوں کے نقش گہرے ہو گئے ہوں۔ اب میں اُس کے دل کے راز کو کیسے سمجھوں۔ لیکن ہاں، جب وہ تمھارے بارے میں کچھ معلوم کرتی ہے تو ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ وہ کہیں دُور بھٹک جاتی ہے اور چہرے پر شفق کی پرچھائیاں سی رنگ بدلنے لگتی ہیں۔ آنکھوں میں ایک روشنی سمٹ آتی ہے ——— بے وقوف ہیں کی ——— کچھ جلن سی محسوس کرنے لگی ہوں۔ یقین ہے ان تین مہینوں میں بھولی ہوئی یادوں کو دل سے لگا کر پیار کر لو گے۔

خدا کرے حسین ہنگاموں سے تمھیں اِتنی فرصت مل جائے کہ خط کا جواب دے سکو۔ کوئی میرے کمرے کی جانب چلا آ رہا ہے۔ شاید امّی جان ہیں۔ وہ کمرے میں آتے ہی سب سے پہلا سوال یہی کریں گی کہ میں اِتنی رات تک کیوں جاگ رہی ہوں۔ تو بتاؤ میں کیا جواب دوں گی۔ اس لئے اجازت دو۔

جواب کی شدت سے مُنتظر ———

نکہت!

موڈرن آرٹ کالج، مُوری۔ این روڈ، بمبئی ۱

یکم اپریل ۶۲ء

میری ہمدم!

تمھاری شکایت سر آنکھوں پر۔ ٹھیک ہے کہ میں نے ایک خط کے بعد ابھی تک تمھیں دوسرا خط نہیں لکھا۔ کچھ مجبوریاں تھیں۔ اجنبی شہر تھا، نیا ماحول تھا، نئے انسان تھے۔ انھیں پرکھنا، اُن سے ربط پیدا کرنا۔ دوسرے نئی آب و ہوا کی وجہ سے کچھ طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ تمھیں لکھ کر پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب ٹھیک ہوں۔ یہاں کے کالج میں آرٹ پر ریسرچ کر رہا ہوں۔ میرے بنائے ہوئے پورٹریٹ یہاں بہت پسند کئے گئے ہیں۔

آج فرصت تھی تمھیں خط لکھنے بیٹھا تھا۔ پوسٹ مین نے تمھارا خط لا کر دیا۔ فوراً کھولا، پڑھا۔ کاش تم اِتنا لکھتیں کہ میں آج سارا دن تمھارا خط ہی پڑھتا رہتا اور کم از کم ایک دن کے لئے تو میں یہ بھول جاتا کہ میں تم سے دُور چلا آیا ہوں اور جہاں بیٹھ کر تمھارا خط پڑھ رہا ہوں یہ وہی کمرہ ہے جسے کبھی تم نے اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔ میری بے سرو سامانی کا مجھے احساس دلا کر میرے لئے سازگار بنا دیا تھا۔ تو کیا تمھارا وہ خلوص بُھلا دینے کے قابل ہے۔ میری تنہائیوں میں کچھ یادیں ہی ہیں جو میرا ساتھ دیتی ہیں، دل بہلاتی ہیں اور فاصلے کے احساس کو قدرے بُھلا دیتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ایک منزل تک پہنچنے سے پہلے کئی منزلوں کو پیچھے چھوڑنا پڑتا ہے۔ اِس دنیا میں رہنے کے لئے پہلے خود بھی ایک دُنیا کی تخلیق کرنی پڑتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ شہر رنگینیوں اور رعنائیوں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن یہ سب اُس دریا کی موجوں کی طرح ہیں جو ہوا کے ایک جھونکے سے پیدا ہوتی ہیں لیکن پھر دم توڑ دیتی ہیں۔ یہاں وہ محبت کہاں جو تمھارے قریب رہ کر نصیب ہوئی تھی۔

خدا کے لئے یقین کر لو نکہت کہ یہاں مجھے کسی وجود نے متاثر نہیں کیا۔ میں فن کی تکمیل کے لئے یہاں آیا ہوں، یہی میری جستجو ہے اسی سے میری آرزوئیں وابستہ ہیں اور اسی پر میری زندگی کا انحصار ہے۔

خدا کرے تمھیں یقین آ گیا ہو۔

کاش میں بھی تمھاری سالگرہ میں شریک ہو سکتا اور کوئی تحفہ تمھیں پیش کر سکتا جو زندگی کے ہر دور میں تمھاری سالگرہ کی یاد دلاتا رہتا۔ لیکن تمھاری جو خواہش میں لکھنؤ میں رہ کر پوری نہ کر سکا تھا وہ یہاں پوری کر رہا ہوں۔

میں نے دو تصویریں بنائی ہیں جو یقیناً شاہکار ہوں گی۔ اور یہی وہ تصویریں ہیں جن کے دلوں میں یادوں کا سرمایہ ہے۔ جانتی ہو وہ تصویریں کس کس کی ہیں۔

یقیناً شک میں مُبتلا ہو گئی ہو۔

لیکن یہ تو تمھاری عادت ہے۔

اور یہ اپنی فطرت ہے۔

خوب جلو۔ دوپٹے انگلیوں میں لپیٹ لپیٹ کر پھاڑو۔ دانت کٹکٹاؤ۔ سینڈل کی ایڑیاں بجاؤ۔

لو پھاڑ کر پھینک دو۔

تم نے بھی تو لکھا ہے کہ میرا کیا اعتبار۔ تو میں اپنا راز تم پر کیوں ظاہر کردوں۔ اگر تم نے کوئی تہمت لگا دی تو؟

لیکن مایوس نہ ہو۔ مجھے تم پر اعتبار ہے۔

اچھا تو سنبھل کر بیٹھ جاؤ۔ بقول تمہارے، دل شیشے کی طرح نازک ہوتا ہے۔ وہ تمہارا دل ہو، تمہاری سہیلی شمیمہ کا دل ہو یا دنیا کی کسی بھی لڑکی کا ہو۔ میں نے تمہاری اس بات کی تصدیق کردی ہے۔ اب مسکرا دو۔

ایسے نہیں!

اُسی دن کی طرح جب تم جھنڈے والا پارک کی ایگزیبیشن میں پہلی بار مجھے اپنی سہیلی شمیمہ اور اپنے بھائی جان کے ساتھ ملی تھیں اور تمہارے بھائی جان نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ ہیں میرے ایک آرٹسٹ دوست مسٹر ضیاء الاسلام"

"تو کل انسان بھی ہوں گے!" تم نے برجستہ کہا تھا۔

میں خاموش تھا کیونکہ تمہاری مسکراہٹوں میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ میں کافر سہی لیکن تمہاری مسکراہٹوں نے مجھے عابد بنا دیا تھا۔ پھر کچھ تمہاری میری راہیں اس طرح ملیں کہ ہم دونوں ایک ہی منزل کے راہی معلوم ہونے لگے۔ تمھیں میری تندرستی، میری کوتاہیوں اور مجبوریوں کا خیال بھی رہنے لگا۔ یہاں تک کہ تم نے مجھے مجبور کردیا کہ میں اپنے کالج کے ہوسٹل میں نہ رہوں کیونکہ ہوسٹل کے کمرے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ اُن میں دم گھٹتا ہے۔ اور نہ کھانا ہی اچھا ملتا ہے جو صحت ٹھیک رکھ سکے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ میں دال کھاتے کھاتے اُکتا گیا تھا۔ تمہارے بھائی جان اُسی کالج کے اسٹوڈنٹ تھے اس لئے اُنھیں ان باتوں کا پہلے ہی احساس تھا اور انھیں نے تمھیں بھی یہ احساس دلا دیا تھا۔ پھر تم نے مجھے اپنے پرانے گھر کا وہ کمرہ دے دیا تھا جو ہوسٹل سے کم از کم چوتھائی تو تھا ہی۔ تم ہی نے میرے کھانے کا انتظام بھی کرا دیا تھا۔ اور پھر میں تمہاری مسکراہٹوں کا شیدائی ہو گیا تھا۔

اب بھی اُسی طرح مسکراؤ۔ میں تمھیں یہ راز بتا دوں گا۔ ایک بار نہیں — بار بار۔ ہزار بار!!

جب تک میری آنکھیں نم نہ ہو جائیں۔ مجھے کوئی یاد نہ آجائے۔

تم مسکراتی رہو اُس وقت تک کہ میں تمہارے لبوں پر ہاتھ نہ رکھ دوں۔

ہاں تو سنو نکہت! میں نے یہ تصویریں کتنی راتیں جاگ کر بنائی ہیں کسی کو اعتبار نہ آئے، مجھے غم نہیں۔ تصویریں خود کہیں گی۔ میں نے آج پہلی بار اپنے منہ سے اپنی تعریف کی ہے۔ لیکن جو آواز دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے اس لئے مجھے اعتماد ہے۔

نکہت یقیناً تم چونک جاؤ گی کہ یہ تصویریں....

ان میں ایک تصویر تمہاری ہے۔ اور ایک شمیمہ کی — یہ کیا راز ہے جسے میں نے تصویروں میں سمو دیا ہے اسے میں راز ہی رکھنا چاہتا ہوں اُس وقت تک کہ میں اپنے مقصد تک نہ پہنچ جاؤں۔ ایک دن یہ تصویریں اس راز کو خود ہی تم سے کہہ دیں گی۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ تم غلط فہمی کا شکار ہو کر رہ جاؤ اس لئے ایک اشارہ بھی کر رہا ہوں کہ انھیں تصویروں میں ایک تصویر اُسی کی بھی ہے جسے میرا اُس وقت تک انتظار کرنا ہے جب تک میری جستجو ختم نہ ہو جائے۔

شمیمہ کو تم نے میری چہیتی سمجھا ہے۔ میرے فن نے مجھے سب سے پیار کرنا سکھایا ہے۔ اُس کی پُردرد کہانی تو سب کو متاثر کر سکتی ہے بشرطیکہ دل حساس ہو۔ جب سے میں نے اُس کی کہانی سُنی ہے میرے احساسات اور جذبات میں ایک انقلاب سا آگیا ہے۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے درد کی حد کو چھو لیا ہے۔ خدا کرے تمہارا خلوص، تمہاری بے لوث محبت ہمیشہ مجھ سے وابستہ رہے۔ شمیمہ کو پیار کرنا۔ اُسی طرح جب ایک بار تم نے گدگداتے ہوئے دونوں ہتھیلیاں اُس کے رخساروں پر جما دی تھیں۔ اور پیشانی کو چوم لیا تھا۔

یقین ہے یہ خط اب تک کی ساری کمی پوری کرے گا۔

تمہارا حبیب — اسلام

امین آباد لکھنؤ

۱۵ مارچ ۶۴ء

میرے غمگسار!

سوچتی ہوں کہ آپ کو کیا لکھوں پھر بھی خوشی کے نہ مٹنے والے احساس کے ساتھ کوشش کر رہی ہوں۔ ایک جھجک سی بھی ہے۔ ایک شرم بھی ہے جسے شدت سے محسوس کر رہی ہوں۔ وہ الفاظ میرے پاس کہاں ہیں جو آپ کی عظمت کی ترجمانی کر سکیں۔ تصویر ملی۔ خدا آپ کے ہاتھوں کو نظر بد سے بچائے۔ ناچیز کے پاس دعاؤں کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔ کتنی آنکھوں نے اس تصویر کو پوجنے کی حد تک دیکھا ہے۔ یہ حقیقت اگر آپ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو یقین آجاتا۔ نہ جانے کیوں آپ نے ایک مُردہ جسم میں روح ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ میری ہی تصویر مجھے بھیجنے کے بجائے اگر آپ نے اپنی تصویر بھیجی ہوتی تو میری اُداس آنکھوں میں آپ کے خلوص کی روشنی گہری ہو جاتی اور میری زندگی کے کئی سال بڑھ جاتے۔ خدا کے لئے برا نہ مان جایئے گا۔ میں آپ کے فن کی پجارن ہوں۔ یہ تصویر دیکھ کر ہی میرا دل چاہا تھا کہ آپ کے ہاتھوں کو چوم لوں۔ اور یقین جانئے کہ میں نے اپنی ہی تصویر کو بار بار چوما ہے اس لئے کہ آپ کے ہاتھوں نے اسے بنایا ہے۔

ابا جان کا پاؤں اب ٹھیک ہے۔ بیساکھی کے سہارے چلنے لگے ہیں۔ آپ کو دعائیں

سے یاد کرتے ہیں کیونکہ آپ ہی اُن کے لئے وہ انسان تھے جو ایک دن فرشتۂ رحمت ثابت ہوا تھا۔
اب اسکول کا وقت ہوگیا ہے۔ آپ کو خوشی ہوگی کہ اب مجھے اپنے اسکول کی ہیڈ مسٹریس بنا دیا گیا ہے۔
آپ کا کردار میرے لئے وہ انقلاب ہے جس نے میری زندگی کے رُخ کو پلٹ دیا ہے۔ میں نے موت کے تصور کو بھی ذہن سے جھٹک دیا ہے۔ اور اگر سوچتی ہوں تو اب موت بھی مجھے پیاری معلوم ہوتی ہے۔ خدا کرے آپ اپنی جستجو میں ہمیشہ کامیاب رہیں۔ اجازت دیجئے۔

آپ کی ہمیشہ مرہونِ منت ـــــــ

شمیم

بمبئی

۱۵ اپریل ۶۲ء

اچھی شمیم!

خط کا جواب تاخیر سے دے رہا ہوں۔ مجبوریوں کی تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تمھیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

لیکن شمیم! تمھیں بہت سی شکایتیں کرنی چاہئیں۔ نکہت کی طرح تمھیں بھی شکایتوں کا دفتر اُلٹ دینا چاہئے۔ لیکن میں جانتا ہوں تم ایسا نہ کرو گی۔ میرے لئے اس سے بڑی عظمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ تم مجھے اپنا غمگسار سمجھتی ہو اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں تمہارے کسی کام آسکا۔
لیکن شمیم تم نے اس بات کو دُہرایا ہی کیوں کہ میں نے تم پر کوئی احسان کیا ہے۔ کیا احسان کیا ہے میں نے تم پر؟ صرف اتنا ہی کہ تمھارے زخمی باپ کو سڑک سے اُٹھا کر ہوسپٹل تک لے گیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو یہ دُنیا خالی تو نہ تھی انسانوں سے۔ فرض کی اگر کوئی قیمت ہو سکتی ہے تو وہ خلوص ہے۔ یہ بات کسی زردار کو زیب دے سکتی ہے کہ فرض کا معیار قائم کر کے اُس کی قیمت چکانے کی کوشش کرے۔ مگر فرض ٹھکرا دیتا ہے۔ وہ ذلیل ہوتے ہیں جو فرض کی کوئی قیمت چاہتے ہیں۔ خلوص کا معاوضہ مانگتے ہیں۔ پھر میرا احسان تم پر کیا رہ گیا۔ لیکن میں تمھیں ایک حق دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تم مجھے جس طرح چاہو یاد کر سکتی ہو میں ہمیشہ تمھارے پاکیزہ جذبات کی قدر کروں گا۔ میں نے آج تک اپنی تصویر نہیں بنائی تھی لیکن جلد تمھیں میری تصویر بھی مل جائے گی۔

ابا جان سے آداب کہنا۔

تمھارا ـــــــ اسلام

مولوی گنج۔ لکھنؤ

۷ اکتوبر ۶۲ء

میرے رازدار!

تم کتنے سنگ دل ہوتے جا رہے ہو۔ آخر کیوں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھیں فاصلوں سے اس قدر پیار کیوں ہے اور کیوں میرے خیالوں سے دُور رہنا چاہتے ہو۔ یہ راتیں اور اس رات کی تنہائیاں گواہ ہیں کہ میرے آنسو لاکھ کوشش کے باوجود نہ رُک سکے۔ اَن گنت خطوط تمھیں بھیجے لیکن تم نے جواب نہیں دیا۔ آخر اس ظلم کی وجہ میں بھی تو جانوں۔ وہ کون سا جُرم ہے جس کی تم مجھے سزا دینا چاہتے ہو۔ یقیناً اجنبی شہر کی دلفریبیوں نے تمھیں بہکا دیا ہے اور کسی نئی تصویر میں رنگ بھرنے کی کوشش کرنے لگے ہو۔ کاغذ کے پھولوں کو کوئی لاکھ عطر میں بسائے لیکن خوشبو اُن کی فطرت نہیں بن سکتی۔ پھر کاغذ کے پھولوں کی حقیقت ہی کیا ہوتی ہے۔ جس شیشے میں میں نے تمھاری تصویر اُتاری ہے کہیں ایسا نہ ہو وہ ٹوٹ جائے، اور جو اُمیدیں تم سے وابستہ کی ہیں وہ دَم توڑ دیں۔

لیکن نہیں!

مجھے یقین نہیں آتا کہ تم مجھ سے دامن چھڑانا چاہتے ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ غمِ روزگار نے تمھارے پیروں میں تلخ حالات کی زنجیریں پہنا دی ہوں۔ اگر ایسا بھی نہیں ہے تو پھر کیوں ایک ایسا راز بنے ہوئے ہو جس کا سمجھنا دشوار ہو گیا ہے ـــــــ یقیناً تم اُس اجنبی شہر میں نامساعد حالات سے ٹکرانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس کے علاوہ دوسری وجہ میرے ذہن میں جگہ نہیں پا سکی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنے فیصلے پر کامل یقین ہو گیا ہے۔ آخر تمھیں کس بات کی کمی ہے۔ میں جو تمھارے ساتھ ہوں، میری محبت جو تمھارے ساتھ ہے۔ ابا کا التفات جو تمھیں میسر ہے۔

جانتے ہو جس دن تمھاری بنائی ہوئی تصویر مجھے ملی تھی، کیا قیامت آئی۔ بس کچھ نہ پوچھو ندیم! دل تھا کہ دھڑکے جا رہا تھا اور میں تھی کہ خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اُسی دن ابا جان نے کُھلے لفظوں میں امی جان سے کہہ دیا تھا۔

"بیگم! ہماری پسند اور نکہت کی پسند میں ایک لفظ کا اختلاف نہیں ہے۔" ساتھ ہی یہ غضب بھی ہوا کہ خط انور کے ہاتھ نہ جانے کیسے لگ گیا۔ وہ خود تو پڑھنا جانتی نہیں۔ جب ابا جان نے پڑھا تو تمھارا خط میری خاموشی کا جواب بن گیا۔ یہ سب کچھ تو ہو گیا لیکن جو مجھ پر بیتی ـــــــ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ تمھیں بُرا بھلا کہتی ـــــــ لیکن تم آ کیوں نہیں جاتے۔ آ جاؤ ندیم! ـــــــ اب چھوڑ دو اس جستجو کا دامن۔ تمہارے فن میں کس بات کی کمی ہے۔ اپنی منزل کو تو تم نے پا ہی لیا ہے۔ اب میری منزل کا پتہ بھی بتا دو۔ میں بے حد تھک چکی ہوں۔

اور ہاں اگر تم چلے آؤ گے تو ابا جان نے وعدہ کیا ہے کہ وہ تمھارے ذوق کے لئے ایک شاندار اسٹوڈیو بنوا دیں گے اور رہائش کے لئے ایک اچھا گھر ہوگا۔ تفریح کے لئے ایک کار ہوگی۔ پھر تمھیں کس بات کی کمی رہ جائے گی۔ ابا جان بھی تمھیں خط لکھیں گے۔ یہ انتظار کا طویل عرصہ میں نے کیسے گزارا ہے، میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرے رازدار! میں اپنی زندگی کے تمام راز تمھارے دل کے نہاں خانوں میں چھپا دینا چاہتی ہوں تاکہ کوئی دوسرا کبھی نہ سمجھ سکے۔

تمھاری منتظر ـــــــ نکہت

بمبئی

۲۸ اکتوبر ۶۳ء

میری محسن!

خلوصِ بیکراں کے ساتھ تمہاری بے پناہ محبت ملی۔ ان گنت خط ملے۔ اور دو دن پہلے تمہارے ابا جان کا خط بھی ملا۔ ان تمام باتوں کے لئے بار بار ممنون ہوں جیسا کہ تمہیں پہلے سے یقین ہے کہ میں نے عزم کا دامن تھام کر طوفانوں کو پیچھے چھوڑ دینے کی کوشش کی ہے اور کبھی مڑ کر نہیں دیکھا ہے۔ میں نے اسی دُھن کی خاطر زندگی کے دس سال اپنے شہر امروہہ میں گزارے، اس کے بعد پانچ سال لکھنؤ میں بتائے۔ یہ تمہیں کیسے بتاؤں کہ اسی کے لئے میں نے کتنی قربانیاں دی ہیں، کتنی محبتوں سے دامن چھڑایا ہے، کتنی بانہیں میرے لئے پھیل کر سمٹ گئی ہیں، کتنے دل دھڑک کر خاموش ہو گئے ہیں، لیکن تم جیسی جذباتی لڑکی کو زندگی کا صحیح احساس نہیں ہو سکتا۔ تم صرف شکایتیں کر سکتی ہو، آنسو بہا سکتی ہو، راہیں مسدود کر سکتی ہو، عشق و محبت کی زنجیریں پہنا کر قید کر سکتی ہو۔ اپنی اداؤں سے، اپنے جلوؤں سے دل بہلا سکتی ہو لیکن میری جستجو میں میرا ساتھ نہیں دے سکتیں کیونکہ تم ایسے باپ کی بیٹی ہو جو تمہارے لئے سب کچھ خرید سکتا ہے۔ لیکن میں بکنا نہیں چاہتا۔ تم نے مجھے محبت دی میں نے اُس کا جواب محبت سے دیا۔ تم نے اپنی شوخ مسکراہٹیں مجھے بخشیں میں نے انھیں دل میں جذب کر لیا۔ تم نے مجھ سے شکایتیں کیں۔ میں نے انھیں سراہا۔ لیکن اب تم میری راہ میں دیوار بن کر حائل ہونا چاہتی ہو۔ اور میری منزل آگئی ہے۔ نکہت! اگر مجھے صرف دولت کی تمنا ہوتی تو محل تعمیر کرا سکتا تھا۔ مجھے سب سے پہلے فن کی تلاش ہے۔ یہی میری زندگی کا پہلا مقصد ہے۔ اس کے بغیر میری زندگی میں نہ کوئی خوشبو ہے اور نہ اُجالا ہے۔ میں تین ماہ بعد امریکہ چلا جاؤں گا۔ نہ جانے وہاں کتنے سال اور لگیں۔ تم اتنا انتظار نہیں کر سکتیں۔ ڈرتا ہوں کہیں دل کے شیشہ کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ ٹوٹنے کا سوال اسلئے پیدا نہیں ہوتا کہ میں پہلے ہی اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ میں نے تمہیں دھوکا دینے کی کبھی کوشش نہیں کی ـــ اسی طرح نہ جانے کتنی کہانیاں میرے ماضی سے وابستہ ہیں۔ میرا آخری فیصلہ اٹل ہے کہ ان ذہنی تصویروں میں سے ایک تصویر ایسی ہے جو میری زندگی کا دوسرا مقصد ہے۔ اور جسے میرا اُس وقت تک انتظار کرنا ہے جب تک پہلے مقصد کو نہ چھو لوں۔ وہی ایک تصویر میری ہم سفر، ہم راز، ہم خیال اور ساتھی ہوگی۔ یقین ہے اب تم کبھی غلط فہمی میں مُبتلا نہ رہو گی۔ اور نہ کوئی شکایت تمہارے لبوں تک آئے گی۔ میں آج بھی تمہارا حبیب ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ اب یہ تمہارے جذبات اور احساسات پر منحصر ہے کہ وہ جو بھی رُخ اختیار کریں ـــ!!

تمہارا ہم راز

ـــــ۔ اسلام

غزل

سعادت نظیر ایم۔ اے

جو کشتۂ غم جہاں آگیا
وہاں رنگ پر گلستاں آگیا

شبِ غم اِک آہٹ سی آئی مجھے
میں سمجھا کہ آرامِ جاں آگیا

بہت دور پہنچا ہے دامانِ شوق
اُڑا کر کوئی دھجیاں آگیا

یہ ہے دل کی بے چینیوں کا اثر
سکوں آفریں ناگہاں آگیا

محبت میں شاید ہوئی کچھ کمی
کہ اب ہو کے وہ مہرباں آگیا

مرے سامنے جب وہ آئے نظیر
حجابِ نظر درمیاں آگیا

غزل

مہدی پرتاب گڑھی

اِلزام جب بھی اپنی وفاؤں پہ آئے ہیں
بیچارگیٔ زیست پہ ہم مسکرائے ہیں

مِل جائے حُسنِ خواب بھی دِل و جاں کروں نثار
وہ جس نے میرے واسطے کانٹے بچھائے ہیں

اُس بے وفا کی یاد کا عالم نہ پُوچھئے
پلکوں پہ ہم نے کتنے ستارے سجائے ہیں

کس سے کریں جراحتِ قلبِ نظر کی بات
دنیا نے سُن کے طنز کے نشتر لگائے ہیں

تیرے کرم نے بڑھ کے سہارا دیا مجھے
راہِ وفا میں جب بھی قدم ڈگمگائے ہیں

مہدی عجیب چیز ہیں دِل کے معاملات
کھلتے رہے ہیں زخم مگر مُسکرائے ہیں

قابلِ مطالعہ مُنتخب شعری مجموعے

کتاب	شاعر	قیمت
آتش گل	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
کلیاتِ اقبال	ڈاکٹر اقبال	چھ روپے
جنون و ہوش	جوش ملسیانی	چار روپے
ہفت رنگ	عرش ملسیانی	تین روپے
آہنگِ حجاز	〃	ایک روپیہ
سحرِ غزل	ساحر ہوشیارپوری	تین روپے
دستک	نریش کمار شاد	دو روپے ۱۵ پیسے
پیمانہ	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
للکار	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
قاشیں	〃	تین روپے
آیاتِ جنوں	〃	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
سنگم	〃	تین روپے
رباعیاتِ محروم	تلوک چند محروم	تین روپے ۷۵ پیسے
گنجِ معانی		سات روپے ۵۰ پیسے
رُوپ	فراق گورکھپوری	تین روپے ۵۰ پیسے
رمز و کنایات		تین روپے ۵۰ پیسے
مشعل		دو روپے ۷۵ پیسے
بیکراں	جگن ناتھ آزاد	چار روپے ۵۰ پیسے
ستاروں سے ذروں تک	〃	دو روپے ۷۵ پیسے
کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی (اول)	اکبر الٰہ آبادی	پانچ روپے
〃	حصہ دوم	چھ روپے
کلیاتِ اختر شیرانی	اختر شیرانی	آٹھ روپے
رعنائیاں	شکیل بدایونی	تین روپے
صنم و حرم	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
گلِ رعنا	جگی رعنا	تین روپے ۵۰ پیسے
شبنم شبنم	کرشن موہن	پانچ روپے
دلِ ناداں	〃	چھ روپے
خرابات	عبدالحمید عدم	چار روپے
رمِ آہو	〃	چار روپے
گلنار	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
قول و قرار	〃	تین روپے ۵۰ پیسے
گردشِ جام	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
بطِ مے	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
گجر	قتیل شفائی	تین روپے
جھومر	〃	تین روپے
روزن	〃	تین روپے
جلترنگ	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
گفتنی	مخمور سعیدی	دو روپے
نئی صبح	ضیا فتح آبادی	ایک روپیہ
طلوع	〃	۷۵ نئے پیسے
نورِ مشرق	〃	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
آہنگِ غزل	پورن سنگھ ہنر	دو روپے ۵۰ پیسے
شہرِ دل	محسن زیدی	دو روپے
سفینہ و ساحل	عزیز وارثی	چار روپے

آئینۂ اصلاح ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر مع توجیہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

جوش ملسیانی کے مکمل حالات زندگی، انتخاب کلام شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویروں کے ۴۰ صفحے ضخامت ۵ سو صفحات۔ موجودہ دور کی بے مثل کتاب۔ قیمت دس روپے۔

مضراب شباب للت کے ایک ایک شعر میں اُس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور اِن دھڑکنوں میں اُس نے سارے جہان کے دکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت تین روپے۔

گلستانِ ہزار رنگ جس میں تقریباً چار ہزار شعراء کے اشعار عنوان وار ترتیب دیے گئے ہیں۔ اِس یادگار کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور ہندی کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام نامی ہی اِس بات کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز فتحپوری نے اِس کتاب کو اِس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ اُردو ایڈیشن دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۷۵ پیسے۔

شاہنامۂ اسلام جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام۔ چار حصوں میں جن میں تیرہ سو سال اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے۔ ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے۔ تازہ ایڈیشن اصلاح کے بعد چھپا ہے۔ قیمتی سولہ روپے اب صرف نو روپے میں پیش کیا جارہا ہے۔ محصولڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

تلامذۂ غالب غالبیات کے مشہور ماہر مالک رام صاحب کی گرانقدر تصنیف۔ اِس کتاب میں غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کی مکمل سوانح حیات اور کلام درج ہیں۔ پورے صفحہ کی تقریباً تیس تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔ ہندوستان بھر کے ادیبوں کا فیصلہ ہے کہ یہ کتاب بہترین ادبی تحفہ ہے۔ قیمت فی جلد سات روپے ۵۰ پیسے۔

کفر و ایمان پنڈت ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام حضرت اختر کا نام نامی ہی اِس کتاب کی اہمیت و افادیت کا ضامن ہے، کلام میں طنز کے نشتروں کے ساتھ درد مند دل کی گرمی بھی ہے قیمت چار روپے۔

کلامِ بے لگام ابن صفی ناشاد دہلوی کا نادر مجموعۂ کلام جس کے ہر شعر میں اکبر الٰہ آبادی کا رنگ جھلکتا ہے طنز و مزاح کا رنگین گلدستہ، ۲۵۲ صفحات پر مشتمل دوسرا ایڈیشن شائع ہوگیا قیمت مجلد چھ روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

افسانہ

یہ ماضی، یہ گھاؤ

پروفیسر وقار بن الٰہی، ایم اے

۴۰۳۔ چھونی، روڈ کیمبل پور (پاکستان)

۲ نومبر ۶۴ء

خوشتر جی! آداب

... جلد بتا دیں گے تو آپ کا ممنون ہوں گا۔ اُمید ہے افسانہ آپ کو پسند آئے گا۔ سالنامہ کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ اِس لئے کہ "بیسویں صدی" اور پھر خوشتر گرامی ——— بس اِتنا ہی کافی ہے ...

آپ کا اپنا ——— وقار بن الٰہی

میدانوں میں اُن دنوں بہت سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ باہر نکلتے تو معلوم ہوتا کسی نے پٹرول ٹینک کو آگ لگا کر اُس کے پیچھے بہت سے فین رکھ دیے ہیں جو اتنی گرم ہوا پھینک رہے ہیں کہ جسم جھلسا جا رہا ہے۔ اِس کے سوا اور کوئی چارہ دکھائی نہ دیا کہ بھاگوں اور سیدھا پہاڑ پر جا کر دم لوں ——— جس ہوٹل میں میں ٹھہرا تھا اُس کے چاروں طرف حسین مناظر تھے۔ دُور دُور تک چیڑ کے بلند و بالا درختوں میں گھرے ہوئے سیب اور ناشپاتی کے درخت عجیب بہار دیتے تھے۔ میں آج بھی سوچتا ہوں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ دراصل ہم گرمی کے ہاتھوں کبھی پریشان ہو کر نہیں بھاگتے۔ یہ تو وہ شہر کی زندگی ہے جس میں مکر و فریب، ریاکاری اور مکاری کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور جس میں سانس لیتے لیتے اور جن سے کھیل کھیل کے لاشعوری طور پر جب ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے تو پھر ہم بھاگ نکلتے ہیں۔ قدرت نے ہر جگہ اور ہر قدم پر ہمیں ایک نرم اور پُر آسائش گود مہیا کر رکھی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم نے اپنی نااہلی اور خود غرضی کے ہاتھوں ہر گود کا سکون چھین لیا ہے۔

کمرے کے جب میں نہانے گیا اور شاور کھولا تو ساتھ ہی میرے مُنہ سے 'اُوئی!' کی آواز نکل گئی۔ گرم پانی کی بجائے برفیلی دھاریں میرے جسم پر تیر کی طرح اُترنے لگیں۔ غصّے میں جلدی جلدی میں نے جسم صاف کیا، باہر نکلا اور کال بیل پر اُنگلی رکھ دی۔ بیرا آیا تو میری آواز میں غیر معمولی رعب تھا: "جاؤ، منیجر کو بُلا لاؤ ———" تھوڑی دیر بعد منیجر آیا تو میں غصّے ہی میں تھا۔

"یہ ہوٹل ہے آپ کا جس کی اِتنی تعریفیں کی جاتی ہیں۔ وہ سرد پانی ہے کہ خدا کی پناہ۔ حد ہو گئی ———!" منیجر نے سر جھکایا۔ بڑی مسکین صورت سے معافی مانگی اور منیجروں کی طرح ہتھیلیاں مسل کے کھی کھی کر کے بولا۔

"معاف کیجئے، آپ ابھی ابھی تشریف لائے ہیں اور کمرہ دو دن سے بند تھا۔ گرم پانی کس طرح سپلائی کرتے۔ آپ آدھ گھنٹہ ٹھہر جائیے۔ اُس کے بعد آپ کی ضرورت کی ہر چیز آپ کو مہیا کر دی جائے گی ———" لیکن میں نے نہیں سُنا، اُس نے کیا کہا ہے۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ اُس کے تاثرات اور الفاظ کیا تھے۔ میں تو اُس کے چہرے میں گم ہو کے رہ گیا تھا۔ سر کے بیشتر بال غائب تھے۔ کہیں کہیں ایک دو دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بھی اِس طرح جیسے چاندی کے تار ہوتے ہیں۔ رنگ کبھی سانولا تھا لیکن اِس علاقے کی ہوا نے اُسے گندمی بنا دیا تھا۔ چہرے پر جھرّیوں کا ایک معمولی سا سلسلہ تھا اور آنکھوں میں چمک اب بھی تھی۔ عمر اُس کی یہی کوئی پچپن ساٹھ کے لگ بھگ ہو گی۔ جسم تھوڑا سا خمیدہ تھا۔ وقت اور زمانے کا بوجھ اُسے خم نہ دیتا تو کیا دیتا ——— اور ——— اور ——— اُس کی ٹھوڑی اور ماتھے پر زخم کے لمبے نشان تھے۔ جن کی حالت بتا رہی تھی کہ بہت پُرانے ہیں۔ بس یہی وہ زخم تھے جنھوں نے مجھے گم کر دیا تھا۔ میں نے سوچا یہ تو اسد ہے۔ اُس کے بھی تو ایسے ہی زخم تھے۔ لیکن ——— اُسے گم ہوئے یا مرے تو ایک مدّت ہو چکی ہے۔ اسد تو نہیں ہو سکتا یہ ——— وہ اسد نہ سہی لیکن میرا ذہن بھٹک چکا تھا جس نے مجھے شدید طور پر بیزار کر دیا تھا۔ کافی آئی تو اُس کے دو چار تلخ گھونٹ لے کے میں نے پائپ میں تمباکو بھرا۔ تمباکو انگوٹھے سے خوب دبا کے سُلگایا اور پھر بہت بے چینی سے کش لگائے۔ کافی کے دو پیالے ختم کر ڈالے لیکن ——— جو چین چھن چکا تھا۔ وہ اب کہاں آتا۔ میں نے برتن ہٹا کے ٹانگیں میز پر رکھیں اور آنکھیں بند کر لیں اور اُن یادوں میں اُلجھ گیا جن میں اسد میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

کس بلا کا جوان تھا وہ بھی ـــــ ہزاروں دیکھے لیکن اُس جیسا پھر نہیں دیکھا۔
یا پھر یوں ہو سکتا ہو کہ دو برس اُس کے ساتھ گزارے ہیں اور ذہن میں اُس کی یادیں ہی یادیں بکھری پڑی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے اسد کے سوا اور کوئی کیا جوان ہوگا۔ مجھے یاد ہے، بی۔ اے کر کے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو پہلے ہی دن ایک نوجوان کو دفتر کے کاؤنٹر پر جھگڑتے دیکھا۔ وہ بھی گرم گرم آواز میں ـــــ میں نے رک کر نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا ـــــ کیا بات ہے؟ ـــــ وہ ایک دم پلٹا اور یوں بولا جیسے مجھے برسوں سے جانتا ہو اور مدت سے ہماری دوستی ہو ـــــ بس یہ کیا مجہول کلرک ہے۔ میں کہتا ہوں مجھے بارہ نمبر ملے دو اور یہ دس ہی دینے پر تُلا ہوا ہے۔ سمجھ کیا رہا ہو کہ نہیں لینا ـــــ داخلے کے اعتبار سے دس ہی نمبر اُس کے حصے میں آتا تھا لیکن وہ کسی صورت بھی لینے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے کاؤنٹر پر سرکے کیا۔ اسد کے بھرے بھرے بازو ٹٹولے اور بابو کو دیکھ کے کہا۔

- اگر تمھیں اپنی زندگی عزیز ہے تو وقت ضائع نہ کرو کیونکہ تمھاری زندگی وقت ہی کے بہت سے لمحوں سے مل کر بنی ہے۔ (ایک مشرقی دانشور)
- زندگی کا اصل مقصد خدائی حکومت کا قیام ہے، اور یہ جبھی ممکن ہے کہ ہم میں سے ہر شخص سچائی اور دیانت اختیار کرے۔ (ٹالسٹائی)
- سب سے بڑا بزدل وہ ہے جو موت سے ڈرتا ہے۔ (ارسطو)
- قوت اور ذوق و شوق رکھنے والا شخص تمام مشکلات پر حاوی ہو سکتا ہے۔ (برٹرنڈ رسل)
- میں اپنے دوستوں میں حسن تلاش کرتا ہوں، واقف کاروں میں کیریکٹر اور دشمنوں میں دماغ۔ (آسکر وائلڈ)

"او بھیا! کیوں شامت آئی ہے تیری۔ دیتا ہے کہ دو یا نہیں ـــــ" کلرک چپ ہی تھا اور نمبر لکھ بھی۔ کہنے لگا۔
"ڈراتے کیوں ہو جی۔ میں تو پہلے ہی ڈرا ہوا ہوں۔ لیجیے بارہ نمبر ہی لیجیے ــ"
جلب سے کے چلے تو پہلی بار ہم دونوں کو خیال آیا کہ معانقہ کرنا چاہیے۔ پھر کالج کے کاریڈور سے اترے تو اسد بولا۔
"تم اُس کا مطلب سمجھے؟ ـــــ پہلے ہی ڈرا ہوا ہوں۔ کیوں کہا اُس نے ـــــ ارے میاں! اُس کی بیوی وزن میں یقیناً اُس سے زیادہ ہوگی ـــــ" ہم دونوں کھلکھلا کے ہنسے اور پھر ہاسٹل کی طرف نکل گئے۔
آہستہ آہستہ اسد کے جوہر نکھرنے لگے۔ وہ صاف ستھرے اور اُجلے کپڑے پہننے کا عادی تھا۔ یہ تو خیر کوئی خاص بات نہیں، جہاں بھی مخلوط تعلیم ہو وہاں لوگ سب سے پہلے بننا سنورنا ہی سیکھیں گے۔ شاید اس لیے کہ عورت کی موجودگی کا احساس مردوں کو کب سے کیا بنا رہا ہے۔ لیکن وہ کپڑے بہت معمولی پہنتا تھا۔ شوخی شرارت کچھ اُس کا حصہ تھا یہاں تک کہ اُستاد سوال پوچھتے وقت جھجک جاتے تھے کہ جانے یہ ظالم کیا جواب دے بیٹھے۔ لیکن وہ تو گفتگو پہ مختار تھا۔ موقع ہو یا نہ ہو کچھ یوں بولتا تھا جیسے دنیا بھر میں صرف اُسی کو زبان عطا کی گئی ہے۔ میں نے اِس طرف اشارہ کیا تو بولا۔
"بات یہ نہیں کہ میں بہت باتونی ہوں۔ دراصل مجھے یہ زندگی کا گورکھ دھندا بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ میں کل تک زندہ رہوں گا! ـــــ جب زندگی ہی کا بھروسہ نہیں تو پھر منہ لپیٹ کر رہنے سے فائدہ ـــــ!" میں نے بات کاٹ دی ـــــ "لیکن مجھے یقین ہے کہ تم کل کیا، پرسوں بھی زندہ رہو گے ـــــ" اِس پر وہ زور سے ہنسا۔
"کیوں نہیں ـــــ تمھارا تو خاندان ہی جیوتشیوں کا تھا ـــــ!"
ریڈنگ روم میں اخبار سجا دینا یا کامن روم میں سے پنگ پانگ کا بیٹ چُرا لیتا یا ہاتھ میں سے لونے اُٹھا لینا اُس کے محبوب مشغلے تھے۔ ایک دن دیکھا کہ اُس کی چارپائی کے نیچے لونے ہی لونے بکھرے پڑے ہیں۔ دوسرے دن وہ بڑی فراخدلی سے خیرات کر رہا تھا۔ پھر وہ کھلاڑی اِس غضب کا تھا کہ اچھے سے اچھا باؤلر بھی اُس کے آگے پانی بھرتا تھا۔ میں نے اُس کے جتنے بھی میچ دیکھے، رکھ کے سہی جاتا تھا، ابھی پانچ سات بنا کے لوٹتا ہوں لیکن کیا مجال جو پچاس سے کم کبھی اُس کا سکور رہا ہو۔ لیکن بڑی بات یہ ہے کہ پڑھنے کے معاملے میں بھی وہ چھپا تھا۔ جب پڑھنے کا موڈ ہوتا تو نوکر سے کہہ کے کمرے کے باہر قفل ڈلوا لیتا اور سات سات دن غائب رہتا۔ ایک بار پوچھا ـــــ "کہاں رہے اتنے دن ـــــ" تو ہنس کے کہنے لگا ـــــ "ذرا ابا جان کی شادی میں گیا تھا ـــــ" پریلیمز میں اُس نے بڑے بڑے کتابی پہلوانوں کو وہ شکست دی کہ یاد ہی کرتے ہوں گے۔ اور پھر فائنل میں تو اُس کا مقابلہ ہی نہ تھا۔
یہ فائنل ایر کے آخری دن تھے اور اُس سیزن کا آخری میچ کہ اسد کی ٹیم بُری طرح پٹ رہی تھی۔ میچ جیتنے کے لیے دو سو رنز کی ضرورت تھی جبکہ کھلاڑی صرف تین رہ گئے تھے۔ اسد جان بوجھ کے اپنا نمبر لیٹ کر رہا تھا۔ میں نے اس سے التجا بھی کی۔
"دیکھو کیوں ذلیل کرواتا ہے۔ جا دفع بھی ہو۔ بعد میں تو تیرا ساتھ دینے والا کوئی نہ ہوگا"
تو اُس نے اَن سُنی کر کے کہا۔
"تماشائیوں کی چوتھی صف میں ایک مینا ہے۔ میری جان اُس کے قبضے میں ہے۔ اُس کا حکم ہے کہ میچ ہارنا ہے۔ کیونکہ مخالف ٹیم میں اُس کا بھائی کھیل رہا ہے۔ نہیں تو وہ مجھے دوسرے میدان میں ایسی شکست دے گی کہ ـــــ" اتنے دیر میں ایک کھلاڑی آؤٹ ہو گیا۔ اسد اُٹھا بلا گھمایا اور میدان میں اُتر گیا۔ میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھا۔ دیکھوں تو سہی کہ یہ مینا کون ہے اور ـــــ اچھا تو اسد میاں نے بھی ٹانکا لگا ہی لیا۔ ہولے، تو یہ حال ہیں ـــــ طرح طرح کی باتیں سوچتا ہوا میں پاس پہنچا تو اپنے انگلش ڈیپارٹمنٹ کی مس ... نکلیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا یا انگریزی پڑھنا

والے انگریز کھلاڑی بن جاتے ہیں۔ اُن کے سے انداز، چال ڈھال، بات چیت، لباس پوشاک۔ ہر شے سے لاپرواہی کی بو آرہی تھی۔ لیکن لڑکی تھی بڑی ٹاپ کی۔ اور یوں بھی کسی کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ میں دیکھنے میں گم تھا کہ شور ہوا۔ میدان کی جانب دیکھا تو ہماری ٹیم کے سنچری بیٹ میاں اسد سات ہی دوڑیں بناکر واپس آرہے تھے۔

کالج، چشمے کا بہتا پانی اور بیڑے کا سفر سبھی ایک جیسے ہیں۔ کالج سے لوگ نکل جائیں تو کہاں ملتے ہیں۔ پانی بہہ جائے تو کہاں پلٹ کے آتا ہے اور بیڑہ دوسرے کنارے پہنچ کے مسافروں کو اُگل دے تو پھر وہ مسافر کہاں اکٹھے ہوتے ہیں۔ ہم لوگ بھی تعلیم پوری کرکے نکلے تو ایسے بکھرے کہ کوئی کہیں جالگا اور کوئی کہیں۔ میں اور اسد ہر روز کھانا ساتھ کھاتے تھے اور اب ملے تھے تو پورے تین ماہ بعد ——— جب نتیجہ آیا ——— پتہ نہیں کیسے ہم دونوں ایک ساتھ ہی کالج کے گیٹ پر اُترے اور پھر جو ہم نے بغل گیر ہوکر چیخیں ماریں اور دفتر کے سامنے کلرک بھاگ کے باہر نکل آئے کہ دیکھیں تو سہی، ہو کیا گیا ہے۔ وہاں سے فارغ ہوکر ہم چائے پینے آئے تو میرے پوچھنے پر اسد نے ایش ٹرے گھماتے ہوئے، میز کی سطح دیکھتے ہوئے ہوئے، دھیمے دھیمے لہجے میں کہا۔

"سارے پروگرام چوپٹ ہوگئے یار۔ ساری کرکٹ نکل گئی۔ وہ ایسا ظالم جھٹکا لگا ہے کہ ——— پہلے امتحان کا خیال تھا لیکن اب ایک فرم پانچ چھ سو کی نوکری دے رہی ہے اور میں دو ایک دن میں جارہا ہوں اور ——— بس دوسرے ہی مہینے شادی ———" میں نے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور ایک آنکھ دبا کے اُس سے کہا۔

"پیارے! ہو جاتا نا یہاں بھی ایک چوکا یا چھکا ———" اسد ہنسا ضرور لیکن یہ بہت اُداس ہنسی تھی۔

"نہیں میاں۔ میں تو صرف حکیم ہوگیا ہوں اِس میدان میں ———" ہم دونوں زور سے ہنسے۔ حکیم ہمارا کھلاڑی تھا جو ہر بال پہ بُری طرح پِٹتا تھا لیکن پھر بھی ضد کرتا تھا کہ اُس جیسا اچھا باؤلر ساری ٹیم میں نہیں۔ میرا جی چاہتا تھا اسد سے کہوں۔ دیکھو بھئی! تو اُس لڑکی کے پلے کا نہیں۔ وہ بڑی مغرور ہے۔ پھر آزاد بھی۔ نائٹ کلبوں میں جاتی ہے، اکثر ہوٹلوں میں گھومتی ہے، دوستوں سے ملنا اُس کے لئے معمولی بات ہے۔ ٹھیک ہے، آدمی کا اپنا من میلا نہ ہو تو کوئی بات نہیں۔ لیکن پھر بھی دیکھ لو ——— ایک بار پھر سوچ لو لیکن بعض اوقات چُپ بھی تو رہنا پڑتا ہے۔ دوست کی خاطر دوستی بھی قربان کرنی پڑتی ہے۔ لیکن جتنی دیر وہاں بیٹھا رہا، یہ خیالات میرے ذہن میں گونجتے رہے۔ پھر میں نے شادی میں شرکت کا وعدہ کیا اور اُٹھ آیا۔

لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ فوراً ہی مجھے نوکری مل گئی اور جس دن برات جانے والی تھی میں کینیڈا میں ایک لیبارٹری میں کام کر رہا تھا۔ میں نے اُسے مبارکباد کے تار بھیجے، کئی تحائف اور کئی راز اور گُر بھی پوسٹ کئے اور خود کام چھوڑ کے تھوڑی دیر سوچتا رہا کہ اسد کتنا خوش قسمت ہے جو اُسے فرزانہ جیسی لڑکی مل رہی ہے جو کبھی یونیورسٹی ناک رہی ہے ——— اور پھر چُپ چاپ کام میں لگ گیا۔

واپس آکر میں نے سب سے پہلا کام جو کیا، وہ اسد سے ملاقات تھی۔ اُف! کس خوشی کے ساتھ میں ملا ہوں اُس سے۔ میں نے سوچا، ہوسکتا ہے وہ باپ بن گیا ہو لیکن والا ہو۔ پوچھا، تو وہ ٹال گیا۔ اب وہ بات ٹالنا اور چھپانا سیکھ گیا تھا۔ ہم نے ایک بار پھر یونیورسٹی کے دنوں کو تازہ کیا اور پھر اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کرکے بچھڑ گئے۔

دو ماہ بعد پھر اُس سے ملا تو میں نے اُس میں نمایاں تبدیلی دیکھی۔ وہ کچھ چُپ چُپ سا تھا اور اُس کی شوخی اور شرارت ختم ہوچکی تھی۔ چہرے پر مُردنی سی چھاری تھی جسے وہ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ایک بار کسی بات پر ہنسا تو میں نے اُس سے کہہ دیا: "اسد۔ تمہاری ہنسی کتنی کھوکھلی ہے ———" وہ یکدم چونک اُٹھا اور بہت غور سے میری طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہوں میں خوف تھا۔ جیسے یہ کہہ کے میں نے اُسے ننگا کردیا ہو۔ ہم رات

- اگر تم چاہو تو اپنے خیالات بدل کر اپنی زندگی بہتر بنا سکتے ہو۔
(آسکر وائلڈ)
- نیکی کرنا میری عبادت ہے اور خدا کے سامنے جُھک جانا میرا مذہب! (والٹیر)
- کسی طرح سہی انتہائی مصیبت کا دن بھی کٹ ہی جاتا ہے۔ (شیکسپیئر)
- آدمی کا بہترین معلم تجربہ ہے اور زندگی کی ٹھوکریں اعلیٰ ذریعہ تعلیم! (ہربرٹ اسپنسر)
- بد سرشتوں کے ساتھ حُسنِ سلوک ایسا ہے جیسے نیکوں کے ساتھ بدی کرنا۔ (شیخ سعدیؒ)

گئے تک اپنے پسندیدہ ریستوراں میں بیٹھے رہے۔ چُپ بھی رہے اور بہت سی باتیں بھی کیں لیکن میں ہاتھ دھو کے اسد کے پیچھے پڑگیا تھا کہ اُسے اپنے دل سے پردہ اُٹھانا ہوگا۔ اُٹھنے لگے تو اُس نے مجھے صرف اِتنا بتایا کہ ——— "یہ شادی کرکے میں خوش نہیں ہوں ———"

ہوسکتا ہے، اُس نے اپنی دانست میں یہ معمولی بات کہی ہو لیکن میرے لئے تو یہ طوفان سے کسی طرح کم نہ تھی۔ آخر وہ کچھ ہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وہ جاچکا تھا۔ میں نے اُسے روکا بھی نہیں کہ وہ کچھ پریشان بھی ہو رہا تھا۔ لیکن اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ یہ میری اور اُس کی آخری ملاقات ہے تو میں اُسے کبھی نہ جانے دیتا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ لے آتا۔ سچے دوست تو انمول موتی ہیں۔ کون انھیں کھو سکتا ہے۔ وہ تو دل کی گہرائیوں میں چھپا کے رکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

کوئی دو مہینے بعد مجھے زکریا کا خط ملا کہ اسد ایک ماہ سے غائب ہے۔ سنا یہی ہے کہ

وہ گھر چھوڑ کے کہیں چلا گیا ہے لیکن اُس کے والدین نے چپہ چپہ چھان مارا ہے اور اب سب کا یقین ہے کہ اُس نے خودکشی کر لی ہے۔ میں نے اس خط کو پڑھا۔ جی چاہا اُسی لمحے پہنچوں لیکن پھر سوچ کے چُپ ہو گیا کہ اب وہاں جا کے کیا کروں گا جس کے لئے جانا تھا، جب وہی نہیں ہے تو پہنچ جانے سے فائدہ؟ لیکن کتنے ہی دن بات بات پر آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے اور دل چاہتا ہو جاتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بھاگ جاؤں۔ دو لمحوں کی خوشی کے لئے ہی تو انسان اپنے آپ کو ان بکھیڑوں کے جہنم میں ڈالتا ہے۔ یہ لمحے، یہ خوشی ہی نہ مل سکے تو ____ میں نے سوچا اُس نے واقعی خودکشی کر لی ہوگی اور فرزانہ نے اس ڈر سے کہ کہیں الزام اُس پر نہ آئے اصل بات کو چھپا دیا ہوگا۔ جی چاہا کبھی فرزانہ سے ملوں لیکن کافی دنوں کے بعد زکریا کے ایک خط سے پتہ چلا کہ اُس نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اُس بات کو تین برس گزر گئے ہیں لیکن اسد مجھے ہمیشہ یاد آتا ہے۔ کون سی جگہ اور کون سا لمحہ ہے، جب وہ میرے ذہن میں نہیں رہا اور جب میں کسی کے چہرے پر زخم دیکھتا ہوں تو پاگل ہوا اٹھتا ہوں۔ جی چاہتا ہے آگے بڑھ کے زخموں پر انگلی رکھ دوں اور پوچھوں۔

"یہ زخم کرکٹ کی گیند کے تو نہیں ہیں؟"

❖

بہت دیر تک میں آنکھیں بند کر کے کرسی ہی پر لیٹا رہا۔ جانے یہ اسد کی یادوں میں کیا ہے کہ ہمیشہ ذہن کو ایک آگ سی لگی رہتی ہے۔ بہت دیر بعد طبیعت بحال ہوئی تو میں پھر باتھ میں گیا۔ اب گرم پانی آ گیا تھا۔ نہا کے کپڑے پہنے اور باہر نکلا تو شام ہو چکی تھی۔ ہوٹل سے اُتر کے دریا کے کنارے ہو لیا اور چُپ چاپ دور تک پتھروں کے ساتھ سر ٹکراتی لہروں کو دیکھتا چلا گیا۔ اندھیرا گہرا تو چاند نکل آیا۔ واپسی پر چاند بالکل سامنے تھا اور دریا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چاندی بہہ رہی ہو۔ لیکن اسد کے خیال نے کچھ ایسا بے چین کر دیا تھا کہ مجھے اُس منظر اور اُس سیر میں خاک لطف نہ آیا اور میں جلدی جلدی ہوٹل واپس آ گیا۔

ڈائننگ ہال میں ایک دو بیرے ہی تھے۔ ایک سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ منیجر صاحب بیمار ہیں اور اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں۔ میں صرف پانی کے گھونٹ حلق سے اُتارنے لگا۔ کھانا کھایا نہیں صرف چکھا اور پھر جیسے کسی نے میرے دل سے نکل کر زور سے کہا: "اسد یہی ہے۔ اسد یہی ہے!!" میں اٹھا تو بیرے نے کرسی کھینچ لی اور میں نے پوچھ لیا: "کمرہ کس طرف ہے؟"

دروازے پر بے ربط سی دستک دی تو کسی نے تھکے تھکے قدموں سے چل کے دروازہ کھولا اور جونہی منیجر کی صورت میرے سامنے آئی، میں نے فوراً انگلی اُس کی پیشانی کی طرف بڑھا دی۔

"میں اگر بھولتا نہیں تو یہ زخم اُسی گیند کا ہے جس کا تم کہہ کے گئے تھے کہ چکا لو گے۔"

میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ بے اختیار آگے بڑھ کے مجھ سے لپٹ گیا۔ اُس کا گلا رُندھ رہا تھا لیکن اُس کی آواز خاصی اونچی تھی۔

"ظالم! میں نے تو تمہیں پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا اور تم نے اتنی دیر لگا دی؟"

ہم دونوں اندر جا بیٹھے۔ اچانک یوں مل جانے پر دونوں ہی گنگ تھے۔ دونوں کے ذہن جیسے شل ہو چکے تھے۔ میں چارپائی کی پائنتی پر بیٹھا تھا کہ بہت دیر بعد اسد چونکا ____ "کہاں بیٹھے ہو یار! اس طرف کرسی پر بیٹھو نا ____" رُندھے جذبات اُس کے گندمی چہرے پر ابھی تک پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن میری تو جیسے کسی نے زبان کاٹ لی تھی۔ بہت دیر تک ہم اسی طرح چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر اسد اٹھا، کوٹ پہنا، باہر گیا۔ تھوڑی دیر میں آیا تو کافی سے بھرا تھرماس اُس کے ہاتھ میں تھا۔

"چلو، نیچے چل کے پُل پر بیٹھیں۔ اس علاقے میں یہ دو ہی دن کام کے ہوتے ہیں۔ پورن ماشی کے دن ____" مجھ سے پھر بھی بات نہ کی گئی۔ اُس کے ساتھ باہر نکلا، نیچے اُترا اور پھر پُل کے پاس گھاس پر بیٹھ گیا۔ دریا کا شور جیسے میرے حواس مجھے لوٹانے لگا تھا۔ اور پھر تیز اور تلخ کافی۔ بہت دیر بعد میں اُبھرا ____ "یہ تم کہاں اسد ____؟" اُس نے ایک سستا سا سگریٹ سلگایا۔

"چھوڑ اس بات کو۔ تو سُنا آج کل کیا کرتا ہے۔ کہاں ہے، کتنے بچے ہیں اور ____ اور کچھ بتا ____!"

"بس میں ٹھیک ٹھاک ہوں اسد۔ زندگی کی گاڑی دھکیل رہا ہوں لیکن تم بتاؤ، سب کچھ بتاؤ۔ یہ اتنے برس تم کہاں رہے اور آج تک لوگ کیوں سمجھتے رہے کہ تم نے خودکشی کر لی ہے؟" اُس نے سرد آہ بھری اور پھر بہت مجروح آواز میں بولا۔

"لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں دوست! کہ میں نے خودکشی کر لی۔ صرف چلتے پھرنے کا نام ہی تو زندگی نہیں ہے نا۔ یہ برس بس گزر ہی گئے ہیں۔ یوں سمجھو، دھکے کھا کے یا گن گنا کے بس گزر ہی گئے!"

اُس کے ان جملوں سے مجھے حیرت نہیں ہوئی البتہ صدمہ ضرور ہوا۔ کیا یہ وہی اسد ہے جس کے خیال میں زندگی شوخ و شنگ تیز طرار حسینہ تھی۔ اب بھاگا ہے تو ایسا کہ ____ میں نے دیکھا، چاندنی میں اُس کے سفید بال عجیب معلوم ہو رہے تھے۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا جسے دریا کا شور بھی نہیں توڑ پایا تھا۔ ہر شے چاندنی میں سو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس کائنات میں صرف ہم دو متنفس زندہ رہ گئے ہیں۔ میں نے پہلی بار اُس کا شانہ پکڑا: "تم لاکھ دامن بچاؤ اسد! میں تم سے سب کچھ پوچھ کے چھوڑوں گا۔ مجھے سب کچھ بتاؤ، سب کچھ!"

"میری کہانی تو بہت مختصر ہے! میں نے ایک چیز حاصل کرنا چاہی، جو مجھے نہیں ملی۔ بزدل تھا، بھاگ آیا اور اب چُپ چاپ جیے جا رہا ہوں کہ اپنے آپ مرنے کی جرأت و ہمت نہیں ہے۔" میں نے محسوس کیا، وہ پیچھا چھڑانا چاہتا ہے لیکن میں کب چھوڑنے والا تھا۔ بڑی مشکل سے اُسے اپنی طرف لے آیا۔

"سُن دوست! اس قصے کو بیتے آج تیس برس گزر گئے ہیں لیکن یہ قصہ میرے ذہن میں آج بھی یوں تازہ ہے کہ کیا کہوں۔ شاید اس لئے کہ میں ہر رات ایک کونے میں چھپ کے

روشنی کرتا ہوں اور پھر کتاب کھول کر بیٹھ جاتا ہوں۔ یہاں تک کہ میری آنکھوں سے خون ٹپکنے لگ جاتا ہے اور ـــــــ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ایسی زندگی کے خواب دیکھے جس میں ہنسی اور خوشی کے سوا تیسری کوئی بھی شے نہ تھی۔ تم جانتے ہو میں کتنا شریر تھا۔ اگر مجھے مستقبل کا ڈر نہ ہوتا تو میں نے جو وقت پڑھنے میں ضائع کیا ہے کبھی نہ کرتا۔ پھر مجھے اُس راستے میں فرزانہ ملی۔ میں نے دیوانوں کی طرح اُس لڑکی کو چاہا اور ایک دن سوچا یہ مجھے مل جائے تو میری زندگی مسرتوں کا گہوارہ بن جائے گی۔

تم نہیں جانتے میں نے تم سے چھپایا ہے کہ فرزانہ کو میں کس شدت سے چاہتا تھا، یوں سمجھو میں نے راتوں کی نیند اپنے اوپر حرام کر لی۔ تم تو کینیڈا میں بیٹھے تھے نا لیکن میں جانتا ہوں کہ جس دن میں اُسے لے کے آیا ہوں مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے سارا آکاش ستاروں سمیت میری گود میں سمٹ آیا ہے اور میں ہر وقت یہی کہتا تھا: اسد! تیرے جیسا قسمت کا دھنی کوئی نہیں۔ لیکن دوست! پہلے ہی دس دنوں میں مجھے محسوس ہو گیا کہ فرزانہ مجھ سے تھوڑی سی مختلف ضرور ہے ـــــــ یہ اتنی بڑی بات کہہ کے وہ رُک گیا۔ پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، پیالے میں کافی انڈیلی اور دو تین گھونٹ جلدی جلدی بھر کے بولا۔

"اُس لڑکی میں بَلا کا غرور اور ضد تھی۔ میں اِس بات کو جانتا تھا لیکن میرا خیال تھا، بیوی بن جانے کے بعد اُس میں نرمی آ جائے گی لیکن بات اور بھی بگڑ گئی۔ یوں کہ جب میں نے اُس سے دیوانہ وار پیار کیا تو ـــــــ عورت تھی نا ـــــــ نہیں سمجھ سکی اور غلط راستے پر چل نکلی۔ اُس کے غرور اور اُس کی ضد میں اور اضافہ ہو گیا۔ بات بات پر وہ وقت بے وقت آنسو بہاتی اور بعض اوقات یوں بولتی جیسے میں اُس کا خاوند نہیں، چپراسی ہوں اور وہ میری بیوی نہیں، باس ہے۔ لیکن میں اُن سب باتوں کو پیتا گیا کہ زندگی کو ـــــــ کچھ لیتے وقت بہت کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔ فرزانہ میں چاہت اور پیار بھی تھا لیکن اُس کے تلخ جملوں نے اُس کے پیار کو ہمیشہ داغدار کیا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے، وہ من مانی کی طرف مائل ہوتی گئی۔ جہاں اُس کا جی چاہتا چلی جاتی۔ جو اُس کے جی میں آتا، کر گزرتی۔ مجھے صرف بتا دیتا اُس نے ذہن سمجھ لیا تھا اور بس ـــــــ تم جانتے ہو نا، میں کتنا حساس ہوں۔ لاکھ کوشش کی کہ اُس کی اس بے پروائی کو ذہن سے نکال دوں لیکن وہ ایک ایک کر کے جمع ہوتی رہی گئیں۔ یہاں تک کہ میرا ذہن پھٹنے لگا۔ پھر عجیب بات یہ تھی کہ میں کوئی بات کروں تو وہ سارا گھر سر پر اُٹھا لیتی تھی اور وہ اگر بڑی سے بڑی بات بھی کر لے اور میں احتجاج کروں تو اپنی غلطی کبھی نہیں مانتی تھی لیکن میں یہ بھی برداشت کر گیا۔

آخری دنوں میں، مجھے یاد ہے، وہ بات بات پر کہتی تھی، تم تو بڑے جاہل ہو، تمھیں تو سلیقے اور ایٹی کیٹ کا علم ہی نہیں۔ تو یہ کس جاہل خاندان سے واسطہ پڑا ہے! تو میں کہ رہ جاتا۔ شعلے میرے ذہن سے اُٹھتے اور میں سڑکوں پر آوارہ گردی کر کے انھیں سرد کرتا۔ لیکن دوست! تم ہی کہو، کوئی کب تک برداشت کر سکتا ہے۔ مجھ سے چپراسی بن کے نہیں رہا گیا۔ ایک دن اُٹھا اور چُپ چاپ نکل آیا۔ اُس دن سے آج تک دُور دراز کے علاقوں میں بھٹک رہا ہوں۔ مجھے کچھ علم نہیں، میرے بعد کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں نا کہ اپنے آپ مرنے کی ہمت نہیں، بس جیتے جا رہا ہوں۔ آج یہاں ہوں، تو کل وہاں۔ تین برس گزر گئے ہیں، باقی گزرنے مشکل نہیں۔"

اسد نے کوئی نئی بات نہیں بتائی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، میرا ذہن ساتھ ساتھ اُس کی تائید کرتا جا رہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ عورت کا ب، ہونٹوں اور زلفوں کی شکل دیکھ لے تو پھر شدت سے پیار ہی کیوں نہ کرے، شوہر کی کم ہی ہوا کرتی ہے۔ اِس لیے کہ اس صورت میں گھر میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ اور یہ وہ نہیں کر سکتی۔

"لیکن اسد! تمھارے کوئی بچہ نہیں ہوا۔ شاید اُسی سے حالات سُدھر جاتے؟"

"نہیں دوست! یہ اچھا ہی ہوا۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ اِس طرح ایک تو اُس بچے کی زندگی خراب ہو جاتی، دوسرے فرزانہ کا مستقبل تاریک ہو جاتا۔ اب اُس نے آسانی سے دوسری شادی کر لی ہو گی اور ـــــــ اور میرا جی چاہا کہ اُسے بتا دوں لیکن پھر سوچا، اُس کے دل پر ایک اور گھونسہ لگے گا۔

"لیکن دیکھو نا۔ اگر حالات بگڑ گئے تھے تو اُس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ تم یوں بھاگ آتے۔ آخر اس کے اور بھی حل تھے ـــــــ" اسد تھوڑا سا مُسکرایا۔ چاندنی میں اُس کی مسکراہٹ مجھے صاف دکھائی دی۔

"اُس کا ایک حل تو یہ تھا کہ میں فرزانہ کو چھوڑ دیتا اور دوسری شادی کر لیتا۔ لیکن دوست! انسان ہوں، کُتا تو نہیں ہوں کہ ایک گھر سے ٹکڑا نہیں ملا تو دوسرا گھر سہی۔ دوسرے میں تمھیں کیا بتاؤں کہ میں نے کتنے حسین خواب دیکھے تھے۔ میں نے کیا کیا چاہا تھا اور میں نے کیا کیا سوچا تھا۔ دوست! جب انسان کے سارے خواب بکھر جاتے ہیں، اُس کی ساری سوچیں سیاہی میں ڈوب جاتی ہیں اور اُس کی چاہت یوں بکھر جاتی ہے تو پھر اُسے کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔ بس وہ وہی کچھ کر گزرتا ہے، جو اُس کے جی میں آتا ہے۔"

وہ کتنا دُکھی تھا! مجھے علم تھا کہ وہ دُکھوں سے بھاگ کے جگہ جگہ بھٹک رہا ہے لیکن دُکھ یہاں بھی اُس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ دُکھ کبھی ساتھ نہیں چھوڑتے۔ اُس کے لیے اِس سے بڑھ کے اور کون سا دُکھ ہو سکتا ہے کہ آج اِس عمر میں بھی اُس کا کوئی گھر نہیں۔ اور کوئی ایسا وجود نہیں جو اُس کے بعد اُس کے نام کو زندہ رکھ سکے۔ وہ لاکھ انکار کرے لیکن اُس کے چہرے کا ایک ایک نقش اِس حقیقت کا آئینہ ہے۔ میں نے بہت دیر بعد اُس سے پوچھا۔

"لیکن اتنی مُدت میں کیا تمھیں ایک بھی ایسا دوست نہ ملا جو تمھیں پہچان سکتا؟"

"بہت سے ملے لیکن اِس سے پہلے کہ وہ مجھے پہچان لیں، میں غائب ہو چکا ہوتا تھا۔"

میں سوچ رہا تھا کہ اُس کا دل ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا ہے ــــــ پھر کہنی کے بل گھاس پر لیٹ کے اور ماتھے کے گُش لیتے ہوئے میں نے سوچا، اندر کر اس خاموشی کی اذیت ناک زندگی سے نکالنا چاہیئے۔ یہ لاکھ انکار کرے، میں اِسے باندھ کے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں اِسے ساتھ لے جاؤں گا! ماضی کو اپنے سامنے دیکھ کے وہ خود ہی بدل جائے گا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ دو بج چکے تھے اور سہ پہر ہوا بھی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ نم آلود کہرے پہاڑ کے پہاڑ اُٹھے اور چُپ چاپ چڑھائی چڑھنے لگے۔ انسان اپنے آپ کو کتنا بڑا پاتا ہے لیکن حالات اُسے بعض اوقات ایسی جگہ بھی لا کھڑا کرتے ہیں، جب اُس کا ذہن جواب دے کر گُم صُم ہو جاتا ہے۔ ہوٹل میں آ کے اندر اپنے کمرے میں چلا گیا اور میں لیٹ کے دیر تک یہی سوچتا رہا کہ ــــــ اِسے ضرور لے کے جاؤں گا!

مجھے یاد ہے، کوئی ساڑھے تین بجے میں سویا تھا۔ جاگا تو دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ پوچھا تو بیرا تھا جو بتانے آیا تھا کہ گیارہ بج رہے ہیں اور ناشتہ ختم ہو رہا ہے۔ ہڑبڑا کے اُٹھا، جلدی جلدی کپڑے بدلے اور ڈائننگ روم پہنچ گیا۔ اس قدر عجلت میں بھی یہ فیصلہ ہو گیا۔ پورج کھاتے ہوئے بیرے سے کہا۔

"جاؤ منیجر صاحب کو بُلا لاؤ۔ اور دیکھو، میرے کمرے میں جاکر سامان سمیٹو۔ ہم ابھی جائیں گے۔" بیرے نے میری طرف دیکھ کے تھوڑا سا جھجک کر کہا: "منیجر صاحب تو نہیں ہیں۔ میں ہی بل بنائے دیتا ہوں اور سامان بھی باندھے دیتا ہوں۔"

"لیکن منیجر صاحب کہاں ہیں؟"

"جی صاحب! وہ صبح ہی صبح بس سے کہیں چلے گئے ہیں۔ انھوں نے اِس ہوٹل کی نوکری چھوڑ دی ہے۔"

کھمن اور سلائس چھوٹ کے نیپکن پر آ گرے۔ اور میں پھر گُنگ رہ گیا!!

غزل

نصیر پرواز ایم۔ اے

زندگانی سے گزر جانا پڑا　　آپ کی محفل سے جب آنا پڑا
لمحہ لمحہ زندگی کٹتی رہی　　رفتہ رفتہ غم کو اپنانا پڑا
جب چلی بے مقصدِ ہستی کی بات　　آپ ہی کا نام دُہرانا پڑا
اِس قدر معصوم تھی اُن کی نظر　　خود زباں پر مُدعا لانا پڑا
اپنی ہی تر دامنی پر ہنس دئے　　راہ میں جب کوئی میخانا پڑا
آرزوئیں بن گئیں جب سدِ راہ　　آدمی کو بھی ٹھہر جانا پڑا
دیکھ کر ماحول کا گہرا سکوت　　بارہا خاموش ہو جانا پڑا

زُلف کا سایہ ملا پرواز جب
چند لمحوں کو ٹھہر جانا پڑا

غزل

ساجد رضوی

اُن کا جلوہ دیکھ کر بھی میں نے دیکھا کچھ نہ تھا!　　کیں بے احساس کا سب عذر نہ پردا کچھ نہ تھا
آپ نے سوچا بھی ہے کچھ آپ سے ہٹ کر کبھی　　درد دل درد محبت کا تقاضا کچھ نہ تھا
تم نے خود رُسوا کیا اپنی زباں سے عشق کو　　اِک ذرا سی بات تھی جھگڑا بکھیڑا کچھ نہ تھا
آج کچھ کر لو غمِ عہدِ گزشتہ چھوڑ کر　　حال ہے جو کچھ بھی ہے ہنگامہ کچھ نہ تھا
یہ ترے غم کی کرشمہ سازیوں کا فیض ہے　　غم سے دل کی لاج رکھ لی ورنہ کیا تھا کچھ نہ تھا
خود محبت جان دینے کا ارادہ بن گئی　　آپ کے سر کی قسم میرا ارادہ کچھ نہ تھا
ہم ہی وہ اِک گھونٹ پی کر ہو گئے بے ہوش و حواس　　اِس میں چشمِ مست ساقی کا اشارا کچھ نہ تھا

اس حقیقت سے ہیں ساجد اہلِ دل واقف تمام
میرے سر رکھنے سے پہلے آستانا کچھ نہ تھا

طنزیہ

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد جاروں کھونٹ گھومتا ہے۔ افواہیں جمع کرتا ہے۔ اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ یہ جنون اس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے پوشش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں۔

گھوڑے اور مشین کی جنگ

معلوم ہوا ہے کہ پچھلے دنوں راجستھان کے ایک جنگل میں ہندوستان بھر کے گھوڑوں اور گھوڑیوں کی ایک لیڈرز کانفرنس ہوئی۔ اِس گھوڑا کانفرنس کا بُنیادی مقصد یہ تھا کہ گھوڑوں اور انسانوں کے تعلقات پر نئے سرے سے غور کیا جائے۔ مقررین گھوڑوں اور گھوڑیوں نے اپنی تقریروں میں انسانوں کے موجودہ رویّہ پر انتہائی تاسف کا اظہار کیا اور کہا کہ گھوڑوں اور گھوڑیوں نے صدیوں انسانوں کے ساتھ وفاداری نبھائی ہے۔ لیکن انسان نے اب ان کے ساتھ بے وفائی شروع کر دی ہے۔ کیونکہ جب سے مشین ایجاد ہوئی ہے انسان نے گھوڑوں کا کام مشین سے لینا شروع کر دیا ہے اور گھوڑوں اور گھوڑیوں کو اِس طرح نظر انداز کر دیا ہے، جیسے کبھی اِن سے رسم و راہ ہی نہ تھی۔

انسانوں کی بے وفائیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھنؤ کے ایک چرب زبان گھوڑے نے کہا: "بہنو اور بھائیو! میں پوچھتا ہوں، ہم صدیوں تک بُدھو کیوں بنے رہے۔ ہم انسان کی فطرت کو کیوں نہ سمجھ سکے کہ وہ اپنا مطلب نکالتے ہی مُنہ موڑ لیتا ہے۔ اور ذرا اپنی موجودہ حالت پر نظر ڈالئے کہ ہمارا اب کیا مصرف رہ گیا ہے۔ ہم نوجی نسل کے لوگ تھے۔ لیکن اب ہمیں فوج میں بھرتی کرنا بیکار سمجھا جاتا ہے کیونکہ اب میدان جنگ میں ہماری بجائے موٹریں جیپیں، ٹرک اور بسیں دندناتی پھرتی ہیں۔ اب دُشوار گذار پہاڑی راستوں پر بار برداری کا کام ہوائی جہازوں سے لیا جاتا ہے۔ ہم کبھی تانگوں، بگھیوں اور ٹم ٹموں میں جُت کر سرا اُبھارے چلا کرتے تھے۔ لیکن اب انسان ہماری بجائے کاروں، موٹر سائیکلوں، سکوٹروں اور بائیسکلوں پر سفر کرتا ہے ہم شادی بیاہ کے موقعوں پر بڑی سج دھج کے ساتھ ہر دولھا کو سوار کر کے چلا کرتے تھے۔ لیکن حضرات گذشتہ ہفتے لکھنؤ میں میری آنکھوں نے یہ دردناک منظر دیکھا کہ ایک برات میں گھوڑے کی بجائے سکوٹر کو سجا سنوار کر اُس میں دُولھا کے سہرا باندھ کر بٹھا دیا گیا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اب انسانوں کے ساتھ ہمارا کیا رشتہ باقی رہ گیا ہے۔ ہم انسان کے ساتھ بے غیرتوں کی طرح کیوں چمٹے ہوئے ہیں۔ کیا ہم انسان کو اُس وقت تک نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک وہ ہمیں رُسوا کر کے، ٹھوکریں مار کر، دھکّے دے دے کر باہر نہیں نکال دیگا"

لکھنوی گھوڑے کی اِس پوٹیکل تقریر نے کانفرنس کو بے حد گرما دیا اور اُس کے بعد یکے بعد دیگرے ہر سٹیٹ کے گھوڑوں اور گھوڑیوں نے دو لتیاں جھاڑیں اور تقریریں بھی جھاڑیں اور بالآخر متفقہ رائے سے ایک ریزولیوشن پاس کیا کہ ہندوستان بھر کے تمام گھوڑوں اور گھوڑیوں کو انسانی آبادیوں سے نکل کر فوراً جنگل میں لوٹ جانا چاہیئے۔

جہاں گرد نے نرم اور کمزور طبیعت کے کئی گھوڑوں اور گھوڑیوں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ گھوڑا کانفرنس نے "ترک وطن" کے لئے کونسی تاریخ مقرر کی ہے۔ لیکن ہر ایک نے تاریخ بتانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ کانفرنس میں تاریخ پوشیدہ رکھنے کا حلف لے چکے ہیں بہرکیف اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ تمام گھوڑے اور گھوڑیاں مقررہ رات کو آبادیوں سے بھاگ جائیں گے اور صبح جب انسان سو کر اُٹھے گا تو اپنے صدیوں کے پُرانے اور وفادار ساتھیوں سے محروم ہو چکا ہوگا۔

محکمہ انکم ٹیکس ختم

دہلی کے غیر سرکاری حلقوں میں یہ سرکاری افواہ بڑے زور شور سے گشت کر رہی ہے کہ ہند سرکار نے محکمہ انکم ٹیکس ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیونکہ بیوپاری طبقہ میں انکم ٹیکس کی چوری کرنے کا فن تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ انکم ٹیکس کا ایک پیسہ بھی وصول نہ ہوگا۔ اور عملہ کے اخراجات کا بوجھ سرکار کے کندھوں پر آپڑے گا۔ اِس لئے انکم ٹیکس وصُول کرنے کا رواج ہی ختم کر دیا جائے۔

کہا جا رہا ہے کہ بیوپاریوں سے پیسے وصُول کرنے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا

جائے گا۔ چنانچہ ایک تجویز کے مطابق بھارت سادھو سماج کی خدمات حاصل کی جائیں گی یعنی سادھو لوگ ہر روز کشکول لے کر بیوپاریوں کے دروازے پر صدا لگائیں گے۔ اور جو کچھ ملے گا، اُسے سرکاری خزانہ میں جمع کرا دیں گے۔ انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کے موجودہ سٹاف کو سادھو بنا کر بھارت سیوک سماج میں شامل کر دیا جائے گا۔

اس لئے آئندہ جب آپ کے گھر یا دکان پر کوئی سادھو کشکول لے کر دان مانگنے آئے تو آپ کو یہ شک کرنے کا حق ہو گا کہ یہ پھٹے پُرانے کپڑوں میں سادھو نہیں ہے بلکہ کوئی انکم ٹیکس افسر ہے۔

دن رات کے سو گھنٹے

اپریل ۱۹۶۵ء سے ہندوستان میں دن اور رات کا وقفہ چوبیس گھنٹوں کی بجائے ایک سو گھنٹوں کا شمار کیا جائے گا۔

ایک افواہ کے مطابق اِس تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ سرکار وقت کے سلسلہ میں بھی اعشاریہ سسٹم اپنانے والی ہے۔ کیونکہ ناپ تول اور سکے کے معاملہ میں اعشاریہ سسٹم پہلے ہی اپنایا جا چکا ہے۔ اس لئے وقت بیچارہ اِس سسٹم سے محروم کیوں رہے۔

اِس تبدیلی کے بعد دن اور رات کے سو گھنٹے ہوں گے۔ ہر گھنٹے کے سو منٹ اور ہر منٹ کے سو سیکنڈ ہوں گے۔ اِس حساب سے اگر سورج آج کل آٹھ بجے نکلتا ہے۔ تو اب نئے حساب سے چونتیس بجے نکلا کریگا۔ آج کل جب ہم کہتے ہیں کہ دن کے بارہ بج گئے ہیں۔ تو پھر کہیں گے، پچاس بج گئے ہیں۔ گھڑیوں کے ڈائل بدل دئے جائیں گے۔ یعنی ڈائل پر بارہ کی بجائے سو تک ہندسے درج ہوں گے۔ پُرانی گھڑیوں کو نئی گھڑیوں میں بدلنے کے لئے مفت سرکاری سروس مہیا کی جائیگی۔

اگرچہ اِس نئے تجربہ سے وقت کے موجودہ بین الاقوامی سسٹم میں بہت گڑبڑ ہو جائیگی۔ لیکن ہند سرکار اس گڑبڑ کو برداشت کرنے پر آمادہ ہے۔ اور کوشش کر رہی ہے کہ یونائیٹڈ نیشنز میں وقت کے اعشاری سسٹم کو قبول کرنے کا ریزولیوشن پاس کرایا جائے۔ اگر ریزولیوشن کو ویٹو کر دیا گیا۔ تو بھی ہندوستان میں یہ تجربہ ضرور کیا جائے گا۔ اور پہلی اپریل ۱۹۶۵ء سے اس پر عمل شروع کر دیا جائیگا۔

چھوٹے قد کی بڑائی

ہندوستان میں جلد ہی ایک عجیب و غریب عوامی تحریک شروع ہونے والی ہے اور یہ تحریک چھوٹے قد کے عوام کی طرف سے شروع ہو رہی ہے۔

افواہ ہے کہ اِس تحریک کو پارلیمنٹ کے تین سو ممبروں کی حمایت حاصل ہے۔ تحریک کی غرض و غایت یہ ہے کہ چھوٹے قد کے آدمیوں کو ایک "پرویلج کلاس" قرار دیا جائے۔ اور انہیں قانونی طور پر مخصوص رعایتیں دی جائیں۔ کیونکہ چھوٹے قد کی وجہ سے سماج میں اُنہیں ترقی کرنے کے مساوی مواقع نہیں ملتے اور اُن پر ایک مستقل احساس کمتری سوار رہتا ہے۔ شادی کرنے میں، محبت کرنے میں، مُلازمت حاصل کرنے میں، تجارت میں، سیاست میں، ادب میں غرض سماج کے ہر شعبہ میں اُنہیں بڑے اور درمیانہ قد کے لوگوں کے سامنے شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ چاہے ذہنی طور پر وہ کتنے ہی عظیم کیوں نہ ہوں۔ قد کی کمی کے باعث شکست کھا جاتے ہیں۔

چنانچہ اِس "چھوٹا قد اندولن" میں ہندوستان بھر کے چھوٹے قد کے مرد اور عورت شریک ہوں گے۔ اور اُنہیں قوی اُمید ہے کہ وہ پرویلج حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے ایک قانون پاس کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کیونکہ تین سو ممبر پارلیمنٹ ان کے ساتھ ہیں۔

اگر یہ قانون پاس ہو گیا تو اس کی رُو سے ہر نوکری میں چھوٹے قد والوں کو ترجیح دی جائیگی۔ اُنہیں تنخواہوں میں ایک سپیشل چھوٹا قد الاؤنس بھی دیا جائیگا۔ جو تنخواہ کا پچیس فی صدی ہوگا۔ سرکار چھوٹے قد کے بیوپاریوں کو سب سے پہلے پرمٹ، لائسنس اور ٹھیکے دیا کرے گی۔ پرائیویٹ فرموں اور دفتروں کو آرڈر دیا جائیگا کہ وہ چھوٹے قد کے امیدواروں کو ملازمت دینے میں فوقیت دیں۔ شکایت ملنے پر سرکار اُن فرموں کے خلاف سخت ایکشن لے گی۔ اُس لڑکی یا لڑکے کو سرکار کی طرف سے سپیشل وظیفہ دیا جائیگا جو چھوٹے قد کی لڑکی یا لڑکے سے شادی کریگی یا کریگا۔

اِس تحریک کے سلسلہ میں صرف ایک خدشہ کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ ان سپیشل رعایتوں سے انسان کی فطرت پر بڑا اثر پڑے گا اور ہر آدمی کے دل میں چھوٹے قد کے بچے پیدا کرنے کی خواہش پیدا ہو جائے گی۔ اور پھر ایک ایسا دن بھی آئے گا، جب سارے ہندوستان میں صرف چھوٹے قد کے انسان ہی نظر آئیں گے۔

تمام وزیر گرفتار

ہندوستانی سرکار کی کابینہ نے اتفاق رائے سے فیصلہ کیا ہے کہ کابینہ کے تمام وزیر ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیں۔ ابھی تک یہ بات صیغہ راز میں رکھی جا رہی ہے کہ کابینہ کے وزیروں نے یہ انقلابی فیصلہ کس بنا پر کیا ہے۔ لیکن افواہوں میں یقین رکھنے والے حلقوں کا خیال ہے کہ چونکہ مرکزی وزراء ملک کو قریب قریب قحط کی حالت تک لے آئے ہیں۔ اور مہنگائی کے بھیانک دیو کو کچلنے میں ناکام ہوئے ہیں۔ اِس لئے وہ چاہتے ہیں کہ اپنے اِس جرم کی سزا خود ہی تجویز کریں اور خود ہی گرفتار ہو جائیں۔ تاکہ عوام اور کچھ نہیں تو کم سے کم ان کی قربانی کی سپرٹ ہی کے مداح ہو جائیں۔

معلوم ہوا ہے کہ کابینہ کی جس میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا اُس میں وزیر اعظم شری شاستری موجود نہیں تھے لندن گئے ہوئے تھے اُنہیں واپسی پر جب علم ہوا تو انہوں نے

وزیراعظم کی اس سپرٹ کی بےحد تعریف کی. لیکن اس کے ساتھ ہی وزراء کو مشورہ دیا کہ جب تک آپ کی جگہ پر وزراء کی نئی ٹیم تلاش نہ کر لی جائے اُس وقت تک آپ گرفتار نہ ہوں۔

چنانچہ اب صرف یہی اڑچن رہ گئی ہے کہ وزراء کی نئی ٹیم نہیں مل رہی۔ کیونکہ یہ ایک کو یہ خطرہ ہے کہ چند ماہ بعد کہیں انہیں بھی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش نہ کرنا پڑے۔ خاص طور پر وزیر خوراک، وزیر خزانہ اور وزیر تجارت بننے کیلئے تو کوئی بھی آمادہ نظر نہیں آتا ——— بہرکیف جونہی ٹیم مل گئی، موجودہ تمام وزراء ایک وقت ایک ساتھ پھولوں کے ہار پہن کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیں گے۔ اور اگر بدقسمتی سے نئی ٹیم نہ ملی تو مجبوراً موجودہ ٹیم ہی کو برداشت کرنا پڑیگا اور مہنگائی کو بھی۔

بھگوان کرشن کا جنم ——— •

متھرا کے اندر گرد و نواح میں زبردست افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ بھگوان کرشن ایک بار پھر بھارت کی دھرتی پر اوتار لے چکے ہیں۔ اور انہوں نے دودھ کی قلت، ملاوٹ اور مہنگائی کے مسئلہ کا خاتمہ کرنے کے لئے ہی جنم لیا ہے۔

اس افواہ سے ہندوستان بھر کے تمام گوالوں، ڈیری کے مالکوں، حلوائیوں اور ملک سپلائی سکیموں کے افسروں میں خوف و ہراس کی ایک لہر دوڑ گئی ہے اور سنسنی پھیل گیا ہے

وہ جلد ہی ایک آل انڈیا کنونشن بلا رہے ہیں۔ جس میں وہ کچھ ایسے کرشن بھگتوں کو خاص طور پر مدعو کر رہے ہیں جو جنم اشٹمی کے چھپنے ہضم کر جاتے ہیں۔ اور بھگوان کرشن کے نام پر نوٹ چلانے میں ایکسپرٹ ہیں ——— اس کنونشن میں وہ متفقہ طور پر بھگوان کرشن سے اپیل کریں گے کہ وہ مہابھارت کی تاریخ کو ایک بار پھر دُہرانے سے احتراز کریں۔ کیونکہ کوروؤں کی اولاد کو شکست دینا اب اتنا آسان نہیں رہا۔ جتنا مہابھارت کے زمانہ میں تھا۔ اب ہم جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح ہو چکے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اگر بھگوان کرشن پر اس اپیل کا کوئی اثر نہ ہوا تو ہندوستان کی دھرتی پر ایک بار پھر مہابھارت کا یدھ ہوگا۔ عام طور پر خطرہ یہی ہے کہ بھگوان کرشن اپنے جنم کے مقصد کی تکمیل کر کے ہی رہیں گے۔

موڈرن گرل

حبیب عالم

۶۰ سوناپور۔ مدنی روڈ۔ ماہم، بمبئی ۱۶
۲۵ اگست ۶۴ء

مکرمی خوشتر صاحب آداب

اپنی ایک تخلیق "موڈرن گرل" لے کر بیسویں صدی کی عظیم محفل میں شریک ہونے کی جرأت کر رہا ہوں بمبئی میں ایسی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ اگر آپ کی بیسویں صدی کے بلند معیار کو چھو لے اور شرف قبولیت پا جائے تو زہے قسمت!....

نیاز مند ——— حبیب عالم

تیکھے نقوش والی وہ خوبصورت لڑکی بس میں سوار ہوئی تو پوری بس رومانی سینٹ کی لپٹوں سے مہک اٹھی۔ دل پھینک نوجوان جو اپنی سیٹوں پر اکیلے تھے، اس لڑکی کو اپنے لئے جگہ ڈھونڈتے دیکھ کر ذرا سمٹ سمٹ کر بیٹھنے لگے۔ ان کے چہروں کی چمکتی آنکھیں ان کی دلی کیفیت کی غماز تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ وہ لڑکی ان کے پہلو میں بیٹھے ——— میں نے ان دل پھینک نوجوانوں کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دیتے ہوئے اپنی نظریں اس کتاب پر گاڑ دیں جو میں پڑھ رہا تھا۔ ابھی بمشکل چند ہی سطریں پڑھ پایا تھا کہ میں نے بس میں پھیلی ہوئی بھینی بھینی خوشبو اپنے قریب محسوس کی۔ قریب! —— اور قریب!! ——— پھر خوشبو کا ایک تیز جھونکا آیا اور وہ لڑکی میرے قریب خالی جگہ پر بیٹھ گئی۔

میں نے کتاب سے نظریں ہٹا کر بس کے مسافروں کا سرسری جائزہ لیا۔ لوگوں کے چہروں کا وہ سکون، جو اس لڑکی کے سوار ہونے سے پہلے تھا، اب یکسر غائب ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ اسے للچائی ہوئی نظروں سے بالکل اسی طرح تاک رہے تھے جس طرح ہم لوگ بچپن میں ڈپٹی صاحب کی کوٹھی کے باغ میں لگے ہوئے اس امرود کو تکا کرتے تھے جس کے کمزور اور پتلے سے تنے میں ایک ہی پرانا زنگ آلود چھوٹا سا بورڈ لٹکا رہتا تھا اور جس پر لکھا ہوتا تھا "پھل توڑنا منع ہے" لیکن ہم نے اس بورڈ کی کبھی پرواہ نہیں کی تھی۔

ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا پارسی بابا [illegible] موٹی سی ناک [illegible] ہاتھ رکھ کر [illegible] موٹے شیشوں والی عینک کے اوپر سے اس لڑکی کو بہت اشتیاق سے گھور رہا تھا۔ سامنے [illegible] بیٹھی تھی جس کا بچہ اس کے کندھے سے لگا ہوا تھا ہاتھ پھیلا کر اس لڑکی کی گود میں رکھا ہوا خوبصورت منی بیگ اٹھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

میں نے کنکھیوں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی اتنی حسین اور جاذب نظر تھی کہ دیکھنے والوں کی نظریں اس کے بے داغ حسن کو دیکھتی رہ جائیں۔ ہلکے پیازی رنگ کی ہینڈلوم ساڑی اور سفید بلاؤز میں وہ بہت ہی پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ ریشم جیسے چمکدار سنہرے بال جو جدید فیشن کے مطابق بہت خوبصورتی سے تراشے گئے تھے، اس کے کندھوں پر جھول رہے تھے۔ پتلے پتلے خوبصورت ہونٹوں پر ساڑی سے میچ کرتی ہوئی لپ اسٹک اور اسی رنگ کا نیل پالش ناخنوں کو رنگنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ سفید بلاؤز، جس کی آستین آجکل کے فیشن کی نذر ہو چکی تھیں، بس کے مسلسل جھٹکوں سے اس کا برہنہ بازو میری کہنی سے چھو رہا تھا، اور میں اس کے جسم کی گرمی اپنے اندر تحلیل ہوتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ ہر چند کہ میں نے اپنی توجہ کتاب میں کھونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ جذبات کا ایک طوفان سا تھا جو امڈا چلا آ رہا تھا۔ اس کے دلنواز حسن نے میرے دل کے خاموش تاروں کو جھنجھنا کر رکھ دیا تھا۔ پل بھر کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری جنم جنم سے بھٹکنے والی آرزوؤں کو منزل مل گئی ہو ——— کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ ہمیشہ کیلئے میری ہو جائے ———؟

میرے ذہن میں سوال ابھرا۔

اس سے گفتگو کرنے کی شدید خواہش میرے دل پر [illegible] لینے لگی۔

میں اپنے گرد و پیش [illegible] میں بکھر گیا۔

"کہاں تک جائیں گی [illegible] صاحب" [illegible] آواز سے میرے خیالات [illegible]

آنکھیں

صرف اک بار ہوئیں وجہِ گرفتاریٔ دل
التفات آپکی آنکھوں نے دوبارہ نہ کیا ——— حسرت موہانی

آواز دو کہ صبحِ قیامت طلوع ہو
کس شوخ کی نگاہ کا اب انتظار ہے ——— عبدالحمید عدم

یقیں آئے کو تو آجائے ترے عہد و پیاں کا
تری آنکھ اے بُتِ وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے ——— محمد علی جوہر

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے ——— غالب

گئے ہوش تیرے زاہد جو وہ چشمِ مست دیکھی
مجھے کیا اُلٹ نہ دیتی جو نہ بادہ خوار ہوتا ——— داغ دہلوی

مرسلہ: حافظ۔ گلاسگو (لندن)

کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ اُس کے قریب کھڑا ٹکٹوں کا بنڈل کھول رہا تھا۔

"مرین لائنز" لڑکی نے دس روپے کا نوٹ کنڈکٹر کی طرف بڑھایا۔

"چھٹا نہیں ہے بیگم صاحب!" کنڈکٹر کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ کیونکہ عام طور پر صبح کے وقت اُن کے پاس ریزگاری کی کمی رہتی ہے۔

میں نے دیکھا اُس کے خوبصورت ہاتھ پرس میں جلدی جلدی ریزگاری تلاش کر رہے تھے ———

پھر اُس کے چہرے پر مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔

شاید اُس کے پاس ریزگاری نہیں تھی۔

"کیا میں آپکی کچھ مدد کر سکتا ہوں ———؟" میں نے موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دس نئے پیسے کنڈکٹر کی طرف بڑھا دیئے۔

"اوہ! ——— تھینک یو ——— اس کی ضرورت نہیں" لڑکی نے کہا۔

"ہاں اگر آپ کے پاس دس روپے کا چینج ہو تو دیدیں"۔ اُس نے ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے درخواست کی۔

اب یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ اُس وقت میرے پاس ٹھیک دس ہی روپے کے چھوٹے نوٹ اور ریزگاری نکلی، جو میں نے اُس کی طرف بڑھا دی۔

"شکریہ!" وہ دس روپے کا نوٹ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے مسکرائی۔ میں نے اُس کے پتلے پتلے خوبصورت ہونٹوں پر پھیلنے والی حسین مسکراہٹ اپنے دل کی گہرائیوں میں اُترتی محسوس کی۔ اور جب نوٹ لیتے وقت اُس کی نرم و نازک اُنگلیاں میرے ہاتھ سے ٹکرائیں تو اُس کے صبیح رخساروں پر حیا کی سُرخی دوڑ گئی۔

اُس کی پلکیں جُھک گئیں اور اُس کی جُھکی ہوئی حسین پلکوں میں میں نے اپنی آشنہ آرزوؤں کی ہلکی ہلکی جھلک دیکھی۔

میں نے ایک سرد آہ کھینچی اور بس کے باہر حدِ نظر تک پھیلے ہوئے بحرِ عرب کی مچلتی ہوئی لہروں میں کھو گیا۔

بس تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر بنے ہوئے اسٹاپوں پر رُکتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہی۔ اور میرا ذہن اُس سے دوستی پیدا کرنے کی غرض سے مزید گفتگو کرنے کے لئے کسی مناسب موضوع کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔

اچانک بس ایک جھٹکے کے ساتھ رُکی۔

میرے خیالات کسی ریت کے تودے کی طرح بکھر گئے۔

وہ جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔

مرین لائینز کا اسٹاپ آگیا تھا۔

اُس وقت بس کی تیز رفتاری پر مجھے بے حد غصہ آیا۔ کاش فاؤنٹین اور مرین لائنز کے درمیان کا یہ مختصر سا فاصلہ ہزاروں میل لمبا ہو جاتا ——— میری حسرتیں چیخ اُٹھیں ———

ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر ——— !

لیکن وہ چلی گئی ———

میں بے بسی سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اُس دن کالج میں ذرا بھی جی نہ لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عزیز شے کھو گئی ہو۔ خیالات کی رو بار بار اُس کی طرف چلی جاتی۔ وہ میرے تصوّرات پر اِس طرح چھا گئی تھی کہ میں نے اپنے تصوّر کی وسعتوں میں جدھر بھی نگاہ دوڑائی اُسی کو کھڑی پایا۔

شام کے بڑھتے ہوئے دُھندلکوں میں کالج کا خوبصورت لان ایک عجیب سی رومان انگیز فضا میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہواؤں میں خوشگوار خُنکی چھائی ہوئی تھی میں اور وہ لڑکی ماحول سے بے پرواہ نرم نرم گھاس پر ٹہل رہے تھے سامنے ہی جوہی کی باڑھ تھی، جہاں ہری ہری گھاس پر بیشمار سفید سفید پھول آسمان پر تاروں کی طرح چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے ہم جوہی کی باڑھ کے سائے میں بیٹھ گئے۔ ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں نہ جانے کیا دیکھ رہے تھے۔ اُسی وقت میں نے اپنے گرد پھیلے ہوئے دُھندلکوں میں کچھ سائے حرکت کرتے دیکھے۔ یہ سائے ہماری طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔

پھر یہ سائے چلتے چلتے اچانک رُک گئے۔ جیسے زمین نے اُن کے پاؤں جکڑ لئے ہوں۔ اور وہ چل نہ سکتے ہوں۔ وہ ہماری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِس طرح دیکھ رہے تھے

جیسے انہیں اپنی بصارت پر شک ہو۔ میں نے اُن سایوں کو پہچان لیا۔ یہ میرے کلاس فیلو رفعت، کشور اور عارف تھے۔

عارف ——— جو اکثر کالج کے لڑکوں میں میرا مذاق اُڑانے کے لئے کہا کرتا تھا۔ "اسے یہ کیا بنائے گا گرل فرینڈ! کسی لڑکی سے بات کرنے کی ہمت تو ہے نہیں اس میں اور شکل تو دیکھو جیسے اندھا بھینسا! ——— اِس وقت میرے ساتھ اُس حسین لڑکی کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

رفعت کا دودھ جیسا سفید دوپٹہ ہوا میں لہرا رہا تھا جسے وہ بار بار سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اِس وقت اس کا رنگ اُڑا اُڑا سا تھا۔ اُس نے کئی بار مجھ سے لئے ہوئے نوٹس واپس کرتے وقت اُس میں میرے نام خطوط رکھے تھے۔ لیکن میرے جواب نہ دینے پر میرے سامنے سے بھی دُور رہنے لگی تھی ——— اِس وقت اُن سب کی شکست کے احساس سے میرا سر فخر سے تن گیا۔

"واہ بھئی واہ! ——— پیریڈ کب کا ختم ہو چکا اور تم یہاں تنہا بیٹھے بلیک بورڈ کو گھور رہے ہو؟" مہندر نے میری کمر پر زور کی دھول جمائی۔ میرے خیالات کا حسین طلسم مکڑی کے جالے کی طرح ٹوٹ گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کلاس روم میں قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"اُٹھو یار!" مہندر مجھے گھسیٹتے ہوئے بولا۔ اور میں دل ہی دل میں اُسے کوستا ہوا اُس کے ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر ہم لوگ کالج کے گیٹ پر کھڑے باتیں کرتے رہے پھر مہندر اپنے دوسرے دوستوں سے گپیں لڑانے لگا اور میں اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا گھر جانے کے لئے بس میں سوار ہو گیا۔

"نوٹ جعلی ہے صاحب!" بس کنڈکٹر کے الفاظ ہتھوڑے کی طرح میرے ذہن پر پڑے جو ٹکٹ لینے کی غرض سے دیئے ہوئے دس روپے کے اُس نوٹ کو جو مجھے اُس لڑکی سے ملا تھا اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے پیروں تلے زمین کھسکتی محسوس کی کیونکہ اُس دس روپے کے نوٹ کے سوا میرے پاس ایک نیا پیسہ بھی نہ تھا۔

میں نے خفت مٹانے کے لئے اپنی جیبیں ٹٹولیں لیکن لاحاصل!

"پیسے نہیں ہیں تو اُتر جائیے!" کنڈکٹر کے لہجے میں بے پناہ طنز تھا۔

اُس نے نوٹ مجھے واپس کرتے ہوئے، بس روکنے کے لئے گھنٹی بجائی اور میں اُس چور کی طرح جسے عین چوری کرتے وقت دیکھ لیا گیا ہو بس کے مسافروں سے نظریں چُراتا ہوا جلدی سے بس سے اُتر گیا۔

مسافروں کے طنزیہ قہقہے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اُتر رہے تھے ———

اور جب میں چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ولسن کالج سے کولابہ تک پیدل چل کر

اِنتظار

کوئی آیا نہ آئے گا لیکن
کیا کریں گر نہ انتظار کریں ——— فراق گورکھپوری

تمام عمر ترا انتظار کریں گے
مگر یہ رنج رہے گا کہ زندگی کم ہے ——— شاہد صدیقی

ناگاہ صبحِ حشر نمودار ہو گئی
بیٹھا ہوا تھا میں تو ترے انتظار میں ——— عبدالحمید عدم

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا ——— داغ دہلوی

نگاہِ شوق سرِ رہگزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے ——— نامعلوم

مُرسلہ: حافظ گلا سگو (لندن)

پسینے میں شرابور گھر پہنچا، تو عشق کے وہ سارے کیڑے جو دماغ میں پیدا ہوئے تھے کھوپڑی پہ پڑنے والی دھوپ سے دم توڑ چکے تھے۔

اور وہ نوٹ ———؟

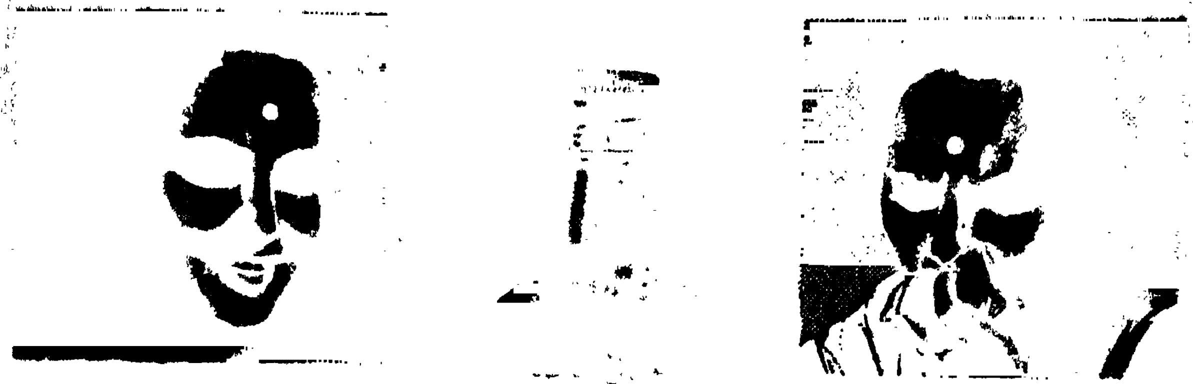
وہ نوٹ آج بھی میرے پاس موجود ہے!

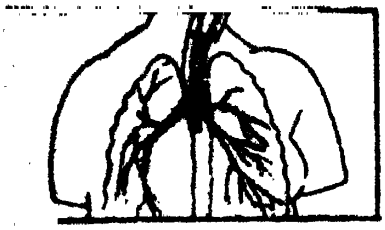
ایک اجنبی محبوبہ کی نشانی!!

کھانسی سے نجات پانے کے لئے

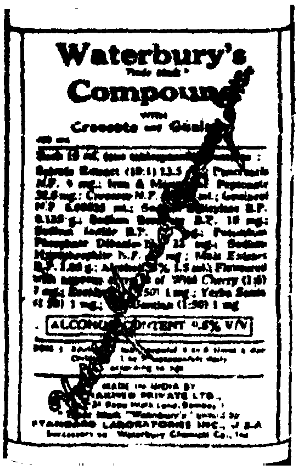
واٹربریز کمپاؤنڈ لیجیے

لال لیبل





واٹربریز کمپاؤنڈ میں موجود کریوسوٹ اور گائیکول سانس کے نظام کو جراثیم سے پاک رکھتے ہیں اور بلغم خارج کرتے ہیں، پھیپھڑے صاف رکھتے ہیں، کھانسی، زکام، سانس کی تکلیف اور دمہ جیسی کیفیت کا مقابلہ کرنے میں مدد کرتے ہیں اور جراثیم کو دوبارہ پھیلنے سے روکتے ہیں۔



کھانسی مستقل رہنے سے کمزوری آجاتی ہے اور بیماری کا مقابلہ کرنے والی توانائی کم ہوجاتی ہے۔ واٹربریز کمپاؤنڈ بیک وقت تین طرح سے اثر کرتا ہے: آرام پہنچاتا ہے، طاقت بحال کرتا ہے، اور بیماریوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے موثر اجزاء کریوسوٹ اور گائیکول کھانسی میں آرام پہنچاتے ہیں۔ لوہا اور مقوی اجزاء نیز جو اور طحال کے ست بھوک بڑھاتے ہیں، طاقت بحال کرتے ہیں اور جراثیم کا مقابلہ کرنے والی توانائی پیدا کرتے ہیں جس سے مرض کے پلٹنے کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔

بارہ مہینے بیماریوں کا مقابلہ کرنے والی توانائی برقرار رکھنے کے لئے لال لیبل والا واٹربریز کمپاؤنڈ پیجیئے۔

واٹربریز کمپاؤنڈ

کھانسی، زکام، سانس کی تکلیف اور دمہ جیسی کیفیت کا مقابلہ کرنے کی توانائی پیدا کرتا ہے

وارنر - ہندوستان لیمیٹڈ، بمبئی

JWT-WL-2394

بیسویں صدی دہلی

پنکھڑیاں

ڈاکٹر بشیر قریشی

رہس کراس ہسپتال۔ لندن

۲۲ ستمبر ۶۴ء

دوستِ گرامی قدر! تسلیم

بعض اوقات بہت سی مختصر باتوں سے ہوتا ہے۔ برطانیہ کا تعلق جمہوریت سے ہے تو پاکستان کا تعلق بنیادی جمہوریت سے اور ہندوستان کا سرکاری جمہوریت سے ہے۔ مثلاً آج لندن ٹائمز میں جب یہ خبر پڑھی کہ محترمہ فاطمہ جناح صدارتی انتخاب لڑ رہی ہیں تو مساوات کا خیال آیا۔ ایک مصرع یاد آیا ؂ تماشا ہے، تہِ آتش دُھواں ہے! ——— آج ہی شام ٹیلی ویژن پر کشمیر کے ساتھ پاکستان اور ہندوستان کا نقشہ دیکھا تو ان دونوں نوجوان ملکوں کا تعلق اور قطع تعلق واضح ہوگیا ساتھ ہی بخشی غلام محمد کی تصویر یہ کہہ ساتھ خبر سنی کہ وہ نظر بند ہوگئے تو شیخ عبداللہ کا خیال آیا کہ وہ باہر ہیں۔ لوا بھی یہ بخشی صاحب کی گرفتاری پر احتجاج بھی کر رہے ہیں ؂ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے! ——— پیارے وطن کا خیال آتے ہی کرسیوں کا خیال آتا ہے۔ اُن کے تبادلے پر دھیان جاتا ہے۔ کسی بوڑھے انگریز سے جنگ عظیم کے قصے سُنئے تو بوڑھے عرب کی الف لیلیٰ یاد آئے گی۔ کسی نوجوان گورے سے بیٹل (BEATLES) کی موسیقی کے متعلق سن کر نوجوان شاعر کا خیال آتا یقینی بات ہے جو بھارت اور پاکستان کے اعصاب پر بُری طرح سوار ہے۔ مغرب کے خلائی سیارے اور مشرق کے خیالی گھوڑے ایک فاصلہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک تعلق بھی رکھتے ہیں۔ "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ" مغرب کی مشرق سے خوب چلتی ہے۔ علامہ اقبال کو دیارِ دوستہ الکبریٰ میں دلی یاد آئی تھی۔ مجھے ان سب خیالات کے ساتھ لندن میں بڑی سادگی سے وہ شاعر دوست اور اُنکی رنگین محفلیں یاد آتی ہیں، حسن کی زبوں حالی بقول حالیؔ سراپا قیاس بن گئی ہے اور حسن کا ذکر قوالی میں ڈھل گیا ہے ؎

باہنر بن کر رہو تو قوم کی گالی سنو	بے ہنر بن کر جیو تو طعنۂ جہالی سنو
ہمکو تو پیرِ طریقت نے دیا ہے یہ سبق	شیخ جی بن کر رہو اور ٹرٹ کے قوالی سنو

بھولی بسری یادوں کے چند ٹکڑے چُنے ہیں۔ وہ ادیب دوست جنکی صحبت کے لمحے جاودانی ہوگئے ہیں، اُن کے چند برجستہ شعر اور جملے یاد آگئے ہیں۔ ذرا طنز کی چاشنی کے ساتھ نذرِ قارئین کرتا ہوں۔ آپکی پسند اور قارئین کی رائے کے ساتھ "بیسویں صدی" کے اُس شمارے کا بھی بے تابی سے انتظار رہے گا جس میں یہ شائع ہوں۔ لندن اور دلی کے فاصلے کا تعلق آپکے اور میرے دل کے اُس احساس سے ہے جو انسانیت، دوستی اور دُکھی انسان کی خدمت پر ہم آہنگ ہے۔ جہاں خیالِ حسن، حسنِ خیال بن جاتا ہے ....

خلوص کار ——— بشیر قریشی

روغن

سلطان گردہ مرکز کے مشاعرے سے واپسی پر گلڈ ہوٹل ملتان میں شعرائے کرام جمع تھے۔ ایڈیٹرز گلڈ کی طرف سے سرکاری شاعروں کے لئے لنچ کا اہتمام تھا۔ مشاعرے کے بعد انتظامیہ یعنی پر تنقید شعرا کا بنیادی حق ہے۔ مبالغہ لازم ہے۔ اسی لئے ایک شاعر نے شاعروں ہی کے بارے میں کہا ہے ؎

کاتبِ تقدیر نے تو ایک لکھ کر بس کیا
یار لوگوں نے وہاں بندی لگا کر دس کیا

پروفیسر عاصی کرنالی بولے "کل ایک دھینہ مشاعرہ ملتان میں ہونا چاہیئے تھا۔ صرف شاعر باہر سے آتے۔ وہاں تو سامعین بھی باہر سے منگوانے پڑتے۔"

شمیم شمسی صاحب تلملا سے گئے کہ یہ کیا تماشا ہے۔ دراصل جاکر بھی ملتان کے شاعر مقامی شعرا کہلاتے۔ مقامی شاعر سے سوتیلی ماں کا سا سلوک ہوتا ہے۔ پوری نشست بیٹھے بھی رہیں۔ نہ پڑھ سکیں نہ سُن سکیں۔

ارشد ملتانی نے شاعر صحافی جناب ساغر صدیقی کو صلاح دی کہ وہ اپنے طنزیہ کالم "ہاں مری چشمِ گنہگار نے یہ بھی دیکھا" میں اس بات کا ذکر کریں۔

قتیل شفائی سے رہا نہ گیا۔ فرمانے لگے، جن چارپائیوں پر مہمان شعرا کو سُلانے کا اہتمام کیا گیا اُن پر گرد، روغن، پنج، ٹی...

ساغر صدیقی اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں بولے۔

چہار چیز است تحفۂ ملتان۔ گرد، گرما، گدا و گورستان!

شکر کیجیے مہمان شعرا کو پہلا تحفہ دیا گیا۔ مقامی شعرا کو تو آخری تحفہ۔ مقابل بھی نہ سمجھا گیا۔ بات چل نکلی۔ دُور دُور نکل گئی۔ سب شاعر بحث کرنے لگے

پروفیسر شمس صدیقی نے احمد ندیم قاسمی سے چٹکی لی جو ایک طرف بیٹھے زیرِ لب بہت سنجیدگی سے مسکرا رہے تھے اور کہا کہ آپ بھی کچھ کہیے۔

احمد ندیم قاسمی بولے "مجھے اختلاف ہے کہ روغن آدھ انچ موٹی تہہ کر دی تھی۔ میرا خیال ہے یہ اُن چارپائیوں کا "روغن" تھا"

گالیاں

بہت دنوں کی بات ہے لیکن ابھی تک یاد ہے۔ نشتر ہسپتال کے ٹی بی وارڈ کا قصہ ہے۔ میں دن بھر تھکا دینے والی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر شام کے کھانے پر اپنے کوارٹر میں آیا۔ میرے بہت ہی پیارے شاعر دوست جناب صادق قمر کھانے کے وقت خاص طور سے تشریف لایا کرتے تھے۔ اچھے شاعر ہیں، اچھا کہتے ہیں۔ بس ایک مصیبت یہ ہے کہ وہ میرے بے تکلف دوست ہیں۔ بعض سرکاری ڈاکٹروں کی جب ڈیوٹی آن ہوتی ہے تو اُن کا موڈ "آف" ہو جاتا ہے اور جب ڈیوٹی کے اوقات ختم ہو جاتے ہیں تو اُن کا موڈ "آن" ہو جاتا ہے۔

میرا موڈ تو شاید "آن" کے نمبر پر آن کر خراب ہو گیا تھا کہ سدا "آن" ہی رہتا ہے۔ لیکن اُس شام نجانے کیوں ڈیوٹی آف ہونے کے ساتھ ساتھ موڈ بھی آف ہو گیا۔ میں ذرا گہری سوچ میں تھا۔ سوچ رہا تھا کہ ٹی بی کے اس مریض کو اتنی مہنگی دوائیں تجویز کر دی ہیں۔ اچھی خوراک۔ تبدیلیٔ آب و ہوا کے ساتھ مکمل آرام کرنے کی ہدایت بھی کی ہے۔

.....اگر اُسے یہ سب کچھ میسر ہوتا تو کیا اُسے ٹی بی ہوتی....؟ وہ ستم ظریف مجسم سوال بن گیا تھا۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ حکومت اپنا خاصا بجٹ ٹی بی کنٹرول پر خرچ کرتی ہے لیکن مریض ہی اتنے زیادہ ہیں کہ وہ کافی نہیں ہوتیں اور اب تو کونسل یہ کہتی ہے کہ حکومت سارا بجٹ بھی خرچ کرے تو بھی ٹی بی کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ قصور نہ میرا تھا نہ حکومت کا اور نہ بیچارے مریض ہی کا۔

قصور کس کا تھا.... میں یہی سوچ رہا تھا کہ صادق قمر صاحب آ گئے۔ مجھے اُن کے آنے سے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔ اُس شام بھی ہوئی۔ کھانا میز پر چنا جا چکا تھا۔ وہ اپنے پُرمزاح لہجے میں بولے "ڈاکٹر صاحب! ایک شعر ہوا ہے۔"

"اس شعر کو ابھی ہونا تھا۔ اچھا ہونے دو۔ جب ہو رہے تو مجھے بتا دینا۔ شاعر کا شعر نہ ہوا کسی زچہ کا بچہ ہو گیا۔ جب جی چاہا ہو گیا۔" میں جھنجلا گیا اور اُٹھ کر ہاتھ دھونے چلا گیا میں سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

اتنا کہنا کسی شاعر کے لئے کافی تھا اور پھر ایک ایسے شاعر کیلئے جس کا شعر ابھی ہوا ہو پھر مجھے خیال آیا کہ وہ میرا مہمان ہے۔ کھانے پر بیٹھا ہے۔ یہ اچھا نہیں۔ میں واپس آیا اور اُن سے التجا کی کہ "بھئی شعر نہ سناؤ گالیاں دے لو۔"

شاعر جتنا حساس ہوتا ہے اُتنا ہی ڈھیٹ بھی ہوتا ہے۔

اور ہاں شاعر کبھی کھانے کی میز سے اُٹھ کر نہیں جاتا۔ وہ ڈٹے رہے اور کہنے لگے۔ "یار! عجیب آدمی ہو۔ تمہارا موڈ نہ ہوا عرب کی سیاست ہو گئی۔ ہمیشہ قیامت بھلا یہ بھی کوئی شرافت ہے ؎

گالیاں شوق سے سُنتے ہیں مگر
شعر کہہ دیں تو بدک جاتے ہیں!

اُن کے اس برجستہ شعر پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ موڈ... خوشی کے سانچے میں ڈھل گیا۔

شاعروں کی ایک عادت ہے کہ وہ اپنی تعریف ضرور کرتے ہیں... ایسا ہی اُنہوں نے بھی کیا لیکن اپنے دام میں آپ آ گئے۔ کہنے لگے "...

کوئی دوست بزم میں سر نہیں اُٹھا سکتا ؎

بیسویں صدی دہلی

اپنی ہر بات ہے پتھر کی لکیر ہم جو کہتے ہیں اٹل کہتے ہیں

ہمیشہ ہماری بات مجلس میں مقبول ہوتی ہے۔ اس پر ایک شعر ہوا ہے ؎

سرِ دوستاں کے بارِ ندامت سے جھک گئے
جب بھی چھڑی ہے بزم میں صادق فقر کی بات

"بے شک آپکی ہر بات ایسی ہوتی ہے کہ دوستوں کے سر ندامت سے جھک جاتے ہیں" میں نے بات سے بات نکالی۔ وہ ہمیشہ مجھے اِس شعر کے معنی سمجھاتے رہے اور میں ہمیشہ اِس کا دوسرا مطلب لیتا رہا۔ جتنا انہوں نے اِس شعر کو بھول جانے کے لئے کہا اتنا ہی یہ یاد رہا۔

دیو اور پری

ریلوے عوانسٹی ٹیوٹ میں محفلِ مشاعرہ تھی۔ شاعرات کلام پڑھ چکیں تو کوئی نہ چلے اٹھ کر چلے۔ چھوٹے شاعر پہلے پڑھ چکے تو بڑے شاعر پنڈال میں آئے۔ چند خواتین خوش ذوق اوّل نشست میں بیٹھی کلام سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ ہر شاعر ان کے اِس رنگین گوشے کو شعر سنا رہا۔

ظریف نسمی ایک بھاری بھر کم شاعر تھے۔ کلام سے زیادہ اُن کا جسم بھاری تھا۔ اُن میں دونوں خوبیاں تھیں۔ بہت موٹے تھے اور بہت کالے بھی۔ دوست انہیں پکا مسلمان کہتے تھے۔ یعنی جیسے باہر سے ویسے ہی اندر سے۔ ظاہر و باطن ایک سا تھا۔ باہر سے بھی کالے اور اندر سے بھی! ایک دوست کا خیال تھا اُن کا دل کالے غلاف میں سفید موتی جیسے دانتوں کی طرح شفاف ہو سکتا ہے۔ تو دوسرے کو اعتراض تھا کہ پھر کاٹنے میں دانتوں کی طرح تیز بھی ہو گا!

وہ کچھ بھی تھے ایک میڈیکل کالج کے ایڈمنسٹریٹر تھے۔ اِسلئے مشاعرے کے سرکاری صدر انہیں ہمیشہ آخر میں پڑھواتے تھے۔ حفظ مراتب کے خیال سے دوسرے شاعر خفا ہوں تو ہوا کرے۔ نام کے پروفیسر تھے لیکن کام کے وقت بھی شاعری کرتے تھے۔ مائیک پر تشریف لائے اور مطلع عرض کیا ؎

بزم سے جانِ دلبری بھاگی
دیو کو دیکھ کر پری بھاگی

انہوں نے جونہی یہ شعر کہا۔ چست لباس خواتین کا پورا گروپ اٹھ کر چل دیا۔ ایسے موقع پر یہ شعر ایسا چست ہوا کہ سامعین نے "مکرر مکرر!" کا شور بلند کیا۔ شور میں غزل بھی ختم ہو گئی اور مشاعرہ بھی۔ لوگ ہر شاعر کا کلام بھول گئے لیکن یہ شعر نہ بھولے۔

عدم اور حفیظ

جشن ہند و پاک "مشاعرہ تھا۔ یوم پاکستان کے عظیم جشن پر۔ صوبائی اسمبلی کے اُس وقت کے اسپیکر جناب معین الحق صدیقی صدارت کر رہے تھے۔ بھارت سے جگن ناتھ آزاد بھی آئے تھے۔ پاکستان کے نامور شعرا موجود تھے۔ ہزاروں سامعین گوش بر آواز تھے۔ عدم شراب پی کر شراب ہی پر شعر کہتے ہیں۔ انہوں نے پڑھنا شروع کیا ؎

عشق کچھ فرضِ منصبی تو نہیں
آپ معشوق ہیں نبی تو نہیں!

ایک مولوی صاحب جو القلانی تخلص کرتے تھے۔ برسرِ مجلس معترض ہو گئے کہ شراب کی حالت میں نبی کا نام لینا ناجائز ہے۔ اس لئے عدم کو کلام پڑھنے سے روکا جائے۔ عدم کو ضد تھی کہ یہی غزل ہو گی۔ رند و واعظ کی سرا لگتی ہے۔ مذہبی دلیل جذبات انگیز ہوتی ہے۔ بات بڑھنے لگی۔ عدم کو کلام پڑھنے سے روک دیا گیا۔ مائیک اُن کے سامنے سے ہٹا لیا گیا۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری تشریف لائے۔ اُن پر مشاعرہ ختم ہوتا تھا۔ انہوں نے بے تکلف اپنی مشہور نظم "رقاصہ" سنائی۔ جانے انہیں کیا خیال آیا کہ انہوں نے عدم کو متوجہ کر کے چوٹ کی۔

"عدم! لوگ انسانوں کو سنتے ہیں۔"

عدم نشے میں تھا۔ نشے میں آدمی ہر بات پی جاتا ہے۔ پی گیا۔

جب مشاعرہ ختم ہونے لگا تو خواتین کے گوشے سے "عدم! عدم!!" کی آوازیں آئیں۔ انہیں شراب کے موضوع پر عدم کا کلام پسند تھا۔

صدر مشاعرہ نے عدم کو پھر پڑھنے کے لئے کہا۔ مولانا القلانی کو رام کر لیا گیا تھا۔ انہیں سمجھایا گیا کہ جب رند آپ کی مجلس میں نہیں جاتے تو آپ اُن کی محفل میں کیوں آئے۔

موقع اچھا تھا۔ عدم نے حفیظ کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم سے میری ایک بات مختلف ہے۔"

"وہ کیا؟" حفیظ نے پوچھا۔

"میرا کلام اور میری سوانح حیات دونوں کا عنوان شراب ہے۔ یہ نہیں کہ کلام کچھ اور سوانح حیات کچھ اور!"

یہ کہہ کر عدم پھر بہہ گئے۔ نہ کہنے والا کلام بھی کہہ سنایا۔ دو شعر جانِ غزل تھے ؎

شیخ جی آپ بھی پیا کیجے
خلد والے تمام پیتے ہیں
نیتوں میں خلل نہیں اپنی
چیز بے شک حرام پیتے ہیں

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر یہ ضرور تحریر فرمایئے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ "رسالہ بیسویں صدی دہلی ۲" لکھنا کافی ہے۔

شاہکار ناول جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہے ہیں

ڈاکٹر یونس چھولی کے لکھے ہوئے ناول

رات کے گھونگھٹ جس میں نئی تہذیب کے اُن فرشتوں کی کہانی ہے جنہیں نئے نظام کی تاریک راتوں نے جنم دیا۔ مصنف نے آج کے سماج کے حسین چہروں سے بیباکی کے رنگین گھونگھٹ اُلٹ دیئے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے۔

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے اُن مردوں کی کہانی جو عورت کو ایسے عُریاں انداز میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جس پر سے نظریں پھسل پھسل جائیں۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

زلف کے سر ہونے تک عشق و محبت اور حسن و شباب کی رعنائیوں اور زندگی کی مسرتوں اور حسرتوں کا سنگم۔ تین معصوم بھولی بھالی لڑکیوں اور تین بے سہارا لڑکوں کی حسین ترین کہانی۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

چاندنی کے سائے جس میں شبنم کی ٹھنڈک بھی ہے اور شعلے کی حرارت بھی۔ کتاب کو ایک بار شروع کر کے ختم کئے بغیر آپ کو چین نہ آسکے گا۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

پیاسے بادل ایک پہاڑی دوشیزہ کے پیار کی کہانی۔ دلآویز رومان کی ایک درد انگیز داستان۔ قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

یادوں کے کھنڈر حیات کے نشیب و فراز کا آئینہ دار ناول جس میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان مچل رہا ہے۔ قابل مصنف نے دل کی دھڑکنوں کو ایسے رنگ و انداز سے اُجھارا ہے کہ قلبی رفاقت اور خلوص پرور محبت کی تصویر نگاہوں کے سامنے جھلکنے لگتی ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

وادیاں اور ویرانے سوکھے سڑے میدانوں اور سرسبز و شاداب پہاڑوں کی حسین و جمیل کہانی۔ قیمت فی جلد چار روپے۔

زنجیر ایک گراہستگار لڑکی کی حسین و جمیل داستان۔ عشق و محبت کی ایک ایسی تیز رومان پرور داستان جسے پڑھ کر آپ جوش عش کر اٹھیں گے۔ جسے زکی انور نے لکھا اور ادارہ بیسویں صدی نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

پگھلتے خواب اُردو ادب کے جواں سال ادیب پروفیسر [illegible] کا ایک دلچسپ رومانی ناول جس میں آپ کو کشمیر جنت نظیر کے حسین و دلفریب مناظر اور ان مناظر تلے بھکتی سسکتی کہانیوں کے خد و خال صاف دکھائی دیں گے۔ قیمت صرف دو روپے۔

نئے فرہاد پروفیسر شکیل الرحمٰن کا اچھوتا شاہکار ناول۔ ایک حسین و کمسن دوشیزہ کی المناک داستان۔ محنت و زر کی کشاکش کے اسٹیج پر لکھی ہوئی ایک انتہائی دلچسپ کہانی۔ قیمت صرف دو روپے۔

راہیں شباب کی فرانس کے عظیم ترین ناول نگار آلیمپ ویس کا غیر فانی شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، جسے عشق و محبت کی بے نظیر داستان تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ناول کی ہیروئن قلو پطرہ اور ہیلن سے بھی زیادہ حسین اور عظیم ہے۔ مترجمہ جناب مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

طوفانِ بہار روس کے عدیم المثال ناول نگار تورگنیف کا رومانی شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی بیالیس زبانوں میں ہو چکا ہے۔ جسے دُنیا کے مشہور نقادوں نے لازوال رومان قرار دیا ہے اور جسے اُردو میں پہلی مرتبہ ادارہ بیسویں صدی دہلی نے شائع کیا ہے۔ مترجمہ مخمور جالندھری۔ قیمت تین روپے۔

بھیگی راتیں فرانس کے عدیم المثال ناول نگار [illegible] کا مقبول ترین ناول۔ انسان میں چھپے ہوئے حیوان کا افسانہ۔ اپنے محبوب کیلئے محبوبہ کی ناقابلِ فراموش قربانیوں کی کہانی۔ مترجمہ مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد تین روپے

فرید موہنی حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اُس دیش کی کہانی جہاں مرد کا تصور بھی ایک جرم تھا۔ صدیوں بعد کی فضاؤں میں لکھی ہوئی ایک عجیب و غریب داستان جو اوّل سے آخر تک دلچسپیوں اور حیرت آفرینیوں سے لبریز ہے۔ جناب کوثر چاندپوری کا لکھا ہوا بے حد شوخ و دلچسپ ناول جو قاری کو کئی صدی آگے کی فضاؤں میں پرواز کراتا ہے۔ قیمت فی جلد محض تین روپے۔

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی۔ دہلی نمبر ۶

خواب بکھر گئے!

اے، مجید

دکن مُسلم ہاسٹل نمبر ۲۱۵، بی، رفتار بیگ اسٹریٹ، پہاڑ

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۴ء

مکرمی، تسلیم

"بیسویں صدی" کے لئے ایک افسانہ "خواب بکھر گئے" ارسالِ خدمت ہے۔ افسانہ کیا ہے! یہ آپ کی بلند نگاہ ہی دیکھ سکتی ہے اور بلند ذوق قارئین ہی پرکھ سکتے ہیں۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ میں نے اس افسانہ کے لئے جس لڑکی کو ہیروئن چُنا ہے وہ عام افسانوی لڑکیوں سے مختلف نہ ہوتے ہوئے بھی بے حد مختلف ہے۔ اُمید ہے آپ پسند کریں گے ...

نیاز مند ——— اے مجید

پہلے دن جب وہ کالج آئی تو کلاس کے تقریباً سبھی طلباء نے اُس کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ کسی نے اُسے ڈارلنگ کہا، کسی نے چھپکلی کے القاب سے نوازا اور کسی نے ذرا فراخدلی سے کام لے کر بھوتوں کی ملکہ کہہ کر خطاب کیا۔ دراصل اُس کی شخصیت تھی بھی عجیب۔ اگر کوئی مصوّر اُس کی تصویر اُتارنا چاہے تو ہزار سر مارے پھر بھی تصویر مکمل نہ ہوگی۔

رنگ یہاں تک صد تک کالا تھا جیسے کالا کوا یا کالی بھینس! ناک کا تو پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ چہرے پر ہے بھی یا نہیں! اور قد و قامت ایسی کہ کسی نے چھپکلی کی تشبیہ صحیح دی تھی۔

اُس کے آتے ہی کالج میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہنسی مذاق کا ایک طوفان تھا کہ تھمتا ہی نہ تھا۔ اگر پروفیسر لیکچر دے رہا ہے اور لیکچر کے دوران میں کوئی اُس کی طرف دیکھ لیتا تو "کھی" کہہ کر ہنس پڑتا اور چاروں طرف سے "کھی کھی" کی آواز آنے لگتی۔ پروفیسر بیچارے تنگ آجاتے، کلاس چھوڑ کر باہر چلے جاتے، جُرمانے کرتے، پرنسپل سے کہہ کر نام خارج کرانے کی دھمکی دیتے لیکن کسی پر اِن باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ جہاں موقع ملتا کوئی من چلا اُٹھ کر بلیک بورڈ پر اُس کی تصویر بنا دیتا اور نیچے بڑے حرفوں میں "چھپکلی" لکھ دیتا۔

معلوم نہیں ماں باپ نے اُس کا نام جمیلہ کیوں رکھا تھا، یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہ آئی کہ ماں باپ بچوں کے ایسے نام کیوں رکھتے ہیں جیسے بچے نہیں ہوتے ——— بچہ کالا حبشی ہوگا لیکن اُس کا نام رکھتے ہیں خورشید یا مہتاب!

ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے، ہر باپ یہی چاہتا ہے کہ اُس کا بچہ چاند کا ٹکڑا ہو لیکن جب قدرت اُن کی خواہش کے ساتھ مذاق کرتی ہے تو ماں باپ بھی اپنے بچے کا نام خورشید یا مہتاب رکھ کر قدرت سے مذاق کرتے ہیں۔

آہستہ آہستہ جمیلہ سارے کالج میں مشہور ہو گئی ——— جو اُس کی طرف ایک بار دیکھ لیتا ضرور ہنس دیتا۔ شاید بدصورت عورت دنیا کا سب سے بڑا عذاب ہے۔

جمیلہ ایک آئی، سی، ایس کی لڑکی تھی۔ وہ اِن باتوں سے بے نیاز ٹھیک وقت پر کالج آتی۔ سیدھی لیکچر ہال میں داخل ہوتی اور سب سے الگ تھلگ ایک ڈیسک پر بیٹھ جاتی۔

اُس کے والد کا حال ہی میں یہاں تبادلہ ہوا تھا اس لئے وہ یہاں کے لئے اور کالج کے ماحول کے لئے بالکل اجنبی تھی۔ اُس کی کسی سے جان پہچان بھی نہ تھی اور نہ اُس کی کوئی سہیلی ہی تھی۔ یہاں آتے ہی اُس پر جو نوازشیں لڑکوں کی طرف سے ہوئیں اُن کی وجہ سے وہ بہت رنجیدہ خاطر رہتی۔ کبھی کبھی بے زار ہو کر کلاس چھوڑ کر گھر چلی جاتی۔ لیکن دوسرے دن پھر کالج میں دکھائی دیتی۔

پڑھنے لکھنے میں بھی وہ بے حد کمزور تھی۔ شکسپیر کے ہجے تک نہ کر سکتی تھی۔ اور انگریزی کے دو جملے بھی صحیح طور پر نہ بول سکتی تھی۔ جب پروفیسر اُس سے سوالات کرتے تو بہت بھونڈے جوابات دیتی جس سے سارا ہال ہنسی سے گونج اُٹھتا اور وہ بے چاری شرمندہ ہو کر بیٹھ جاتی۔

آخر پروفیسروں نے اُس سے سوالات پوچھنے چھوڑ دیئے۔ شاید اُس کے باپ نے انھیں سمجھا دیا تھا کہ اُس کی لڑکی سے کوئی سوال نہ پوچھا جائے۔ وہ ایک آئی، سی، ایس کی اکلوتی

لڑکی جو ایک بڑے باپ کی بڑی جائیداد کی مالک! ایسے کتنے ہی پروفیسروں کو خرید سکتی ہے ایک پروفیسر صاحب تو کلاس میں اُس کی طرف اِس طرح دیکھتے تھے جیسے التجا کر رہے ہوں ——— مجھے خرید لو میں بہت غریب ہوں، میری بیوی بہت جھگڑالو ہے۔ میری ساری تنخواہ ماں کے دوسرے کے جھگڑوں میں چلی جاتی ہے۔ ٹیوشن کر کے بیوی کی فرمائشیں مشکل سے پوری کرتا ہوں پھر بھی بیوی سے کہ ہمیشہ جھگڑتی ہی رہتی ہے۔ کوئی کہاں تک صبر کرے! اِس لئے آئے آئی، سی، ایس کی لڑکی ....

یہ پروفیسر صاحب اُس کی طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے۔ موقع بے موقع اُس سے بات کرنے کی کوشش کرتے اور اُس پر اپنی ہمدردی اور قابلیت کا سکہ بٹھانا چاہتے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ پڑھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ کتابوں سے، کالج سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ محض اپنے باپ کے دباؤ سے کالج آیا کرتی اور ہمیشہ منہ میں چاکلیٹ ٹھونسے رہتی۔

❖

ایک دن شام ہو چکی تھی آسمان پہ بھورے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا بہت خوش گوار تھی۔ میں ایک باغ میں بیٹھا شیلی کو پڑھ رہا تھا۔ میری یہ عادت ہے کہ جہاں کہیں جاتا ہوں اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی کتاب ضرور رکھتا ہوں۔ میرے ساتھی میری اِس عادت سے جھنجلا جاتے اور کہتے اگر تمھیں کتاب ہی پڑھنی تھی تو گارڈن میں کیوں جھک مارنے آئے ہو ـــ میں مُسکرا کر چُپ ہو جاتا اور اُن کی باتوں میں شامل ہونے کی کوشش کرتا۔ عموماً اُن کی باتوں کا موضوع وہی چھپکلی جمیلہ ہوتی۔

آج اُس نے بہت بھدا میک اپ کیا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر سُرخی اِس طرح دکھائی دیتی تھی جیسے کوّے کے منہ میں گوشت کے ٹکڑے! بے چاری کو میک اپ بھی اچھی طرح سے کرنا نہ آیا۔ میں اگر جمیلہ کی طرفداری کرتا یا اُس سے ہمدردی جتاتا تو سارا کلاس مجھ پر برس پڑتا اور کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے! کا نعرہ لگتا۔ کوئی کہتا ـــ "میاں تمھیں بھی چھپکلی پسند آگئی!؟" کوئی کہتا ـــ "چھپکلی تو خیر کیا پسند آتی، یہ تو اُس کے باپ کی جائیداد پر دانت لگائے بیٹھے ہیں!" تیسرا کہتا ـــ "منہ دھو رکھو۔ کہاں ایک آئی سی، ایس اور کہاں تم سپکڑ وظیفہ خوار! جسے ڈھنگ کے کپڑے بھی نصیب نہیں" ـــ اِس میں شک نہیں کہ کالج سے مجھے وظیفہ ملتا تھا اور میں سارے کلاس میں ایک ذہین لڑکا مانا جاتا تھا۔ امتحان کے دنوں میں سارے لڑکے مجھے گھیرے رہتے اور مجھے اپنا لیڈر بنا لیتے۔ کوئی کہتا ـــ "بھیا! یہ ورڈز ورتھ کیا کہتا ہے، سمجھا دو۔" اور کوئی اکنامکس کی گتھیاں سُلجھانے کے لئے میری خوشامد کرتا۔ لیکن میں نے جمیلہ کو ایک لڑکی سے زیادہ وقعت نہیں دی اور نہ کبھی اُس کی طرف دیکھ کر ہنسا اور نہ اُس سے کبھی کوئی مذاق کیا۔ میں تھا بھی بہت شرمیلا کسی لڑکی سے بات بھی نہ کر سکتا۔

کالج کا کوئی لڑکا مجھے چھیڑنے کی ہمت نہ کرتا اِس لئے کہ میں ایک ایسا شخص تھا جو سب کے آڑے وقتوں میں کام آتا تھا لیکن میں جمیلہ کے بارے میں جہاں ہمدردی ظاہر کرتا سب لڑکے میرے پیچھے پڑ جاتے اور دال میں کالا! کہہ کر چھیڑتے۔

ایک دن میں گارڈن میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ پیچھے سے وہ آئی اور بڑی بے تکلفی سے میری طرف مُسکرا کر متوجہ ہوئی۔ میں گھبرا گیا اور آگے پیچھے مُڑ کر دیکھا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ وہ کہنے لگی: "میں پچھلے دو ہفتے سے کالج سے غیر حاضر تھی اِس لئے تقریباً سبھی مضامین کے نوٹس ادھورے رہ گئے ہیں۔ اگر آپ مجھے اپنے نوٹس عنایت کر دیں تو نوازش ہوگی۔ میں کاپی کر کے لوٹا دوں گی۔"

میں نے اُسے اپنا پتہ بتا دیا اور کہا کہ وہ اپنے چپراسی کو کل شام میرے گھر بھیج کر منگوا لے۔ لیکن اُس نے کہا: "میں کل اِسی وقت اِسی گارڈن میں ملوں گی آپ یہیں لیتے آئیے گا، عنایت ہوگی۔" تھوڑی دیر موسم پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا اور پھر وہ چلی گئی۔ میں اُس سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ وہ پچھلے دو ہفتے سے کالج سے کیوں غیر حاضر رہی۔ دراصل میں نے کہا نا کہ لڑکیوں کے معاملے میں میں ذرا....

صاحب یہ لڑکیاں بھی بہت خود غرض ہوتی ہیں۔ جہاں کام ہوگا مسکراتی ہوئی آئیں گی اور کام ختم ہوتے ہی ایسی بے اعتنائی برتیں گی جیسے وہ جانتی ہی نہیں۔ سلمیٰ، رشیدا اور شمع۔ میں اِن سب لڑکیوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ جب کوئی کتاب یا کسی کاپی کی ضرورت پڑے گی مُسکراتی ہوئی چلی آئیں گی اور لڑکے بے وقوف بن جائیں گے۔ وہ جو چیز بھی چاہیں گی، پیش کر دیں گے۔ لیکن میں کسی لڑکی کو اپنی کوئی چیز نہ دیتا۔ صاف انکار کر دیتا کہ میرے پاس ہے ہی نہیں یا بہانہ کر دیتا کہ ایک دوست لے گیا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں جمیلہ کے بارے میں میرا رویہ بدل گیا۔ نہ اُس سے انکار کر سکا اور نہ کوئی بہانہ کر سکا۔ دوسرے دن اُس کی مطلوبہ کاپیاں لئے بہت بے چینی سے گارڈن میں اُس کا انتظار کرنے لگا۔ بہت دیر کے بعد وہ آئی۔ آج اُس نے غضب کا فیشن کیا تھا۔ بھینی بھینی خوشبو میں جیسے بھیگی ہوئی تھی۔ سارا ماحول مہکنے لگا۔ لوگ مُڑ مُڑ کر کبھی اُس کی طرف اور کبھی میری طرف دیکھتے۔ میں گھبرا گیا کہ اگر کسی نے بات کرتے دیکھ لیا تو نام اُچھال دے گا اور چھپکلی کے ساتھ مجھے بھی نہ جانے کیا بنا دے گا۔ میرے اِس احساس اور انداز کو وہ بھانپ گئی اور کہنے لگی: "چلئے کیفے میں چائے پی لیں۔" میں نہیں چاہتا تھا کہ اُس پر بار ہوں۔ اور میری جیب میں صرف گیارہ نئے پیسے تھے اِسی بڑی کش مکش میں پڑ گیا کہ جاؤں یا نہ جاؤں؟ کیونکہ گیارہ نئے پیسے میں کہاں ایک آئی، سی، ایس کی لڑکی کو چائے پلائی جا سکتی ہے۔ میں نے بات بنائی۔ کہا ـــ "شکریہ! ابھی تھوڑی دیر ہوئی میں نے کافی پی لی ہے" لیکن وہ کب ماننے والی تھی۔ اُس کا اصرار بڑھتا گیا۔ آخر مجبور ہو کر اُس کے ساتھ کیفے جاتے ہی بنی۔

کیفے پہنچ کر اُس نے بیرے سے صرف چائے ہی نہیں کیک اور پیسٹری لانے کو کہا۔ میں خاموش بیٹھا دل ہی دل میں اپنی غریبی کو کوستا رہا کہ تف ہے مجھ پر ایک لڑکی کو چائے نہیں پلا سکتا! اُس نے نہایت خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے ہر ...

منہ پیش پڑھا دی۔ میں اُس کے سامنے ایک نا خواندہ بچے کی طرح بیٹھا اُس کے چہرے کو تکتا رہا۔ میری نظروں کی گرمی سے وہ شرما گئی اور مجھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھائے رکھا۔

جب بیرا آیا تو میں نے یوں ہی کہہ دیا کہ آپ زحمت نہ کیجئے بل میں ادا کر دوں گا۔

لیکن اُس نے آگے بڑھ کر بل ادا کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آج بلا ٹل گئی۔ اگر وہ میری بات مان جاتی، مجھے بل ادا کرنے دیتی تو؟ اِس خیال ہی سے مجھے پسینہ آنے لگا اور کئی پرچے تو میں نے اِسی خوف سے ایک اور پیشتر ہی ڈرتے ڈرتے کھائی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک جیبی لیسے کے پیچھے جا رہا ہوں! لیکن بھلا ہو جمیلہ کا، اُس کا رویہ بڑا ہی خوشگوار رہا۔

راستے بھر مجھے عجیب عجیب خیالات ستاتے رہے۔ کبھی سوچتا جمیلہ کا اتنا التفات مجھ پر کیوں ہے؟ کیا وہ مجھ سے ..... نا ممکن ..... ہو سکتا ہے، اپنا کام نکال لینے کی غرض سے مجھ پر اتنی مہربان ہو۔ اور یہ پُرتکلف چائے بھی خالی از علت نہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے دل میں اُس کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کر دوں لیکن رہ رہ کر دل میں اُس کی نوازشات کا کانٹا کھٹکتا رہا اور اُس کی محبت بھری نظریں میرے دل میں چٹکیاں لینے لگیں۔ اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ مجھے اپنی محبت کے دام میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں۔ کیا ہوا اگر وہ بدصورت ہے۔ اُس کا باپ تو آئی سی ایس ہے اور وہ اپنے باپ کی اکلوتی لڑکی ہے!

میں انہیں خیالات میں بہا چلا جا رہا تھا کہ میرے دائیں طرف سے ایک موٹر قریب قریب مجھ سے لگ کر سن سے گزر گئی اور میں بُری طرح چونک کر اپنی برابر جاتی ہوئی ایک جوان سندھی لڑکی سے ٹکرا گیا۔ وہ بہت خفا ہوئی: "اندھے ہو دیکھ کر نہیں چلتے! لڑکیوں پر گرتے ہو بدمعاش کہیں کے! ابھی پولیس کے حوالے کر دوں گی!" میں نے خوف سے کانپتے ہوئے معافی مانگی ـــــ "بہن جی معاف کرنا غلطی ہو گئی۔"

اِس حادثے نے گھر پہنچنے تک جمیلہ کا خیال بھلا دیا۔ لیکن گھر پہنچنے پر پھر وہی خیالات پریشان کرنے لگے۔ اور میں رات کو دیر تک سو نہ سکا۔

صبح جب کالج پہنچا تو اپنے کو چور اور مجرم سا محسوس کرنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ سارے لڑکوں کی نظریں مجھ پر لگی ہوئی ہیں اور وہ کہہ رہے ہیں ـــــ "ہم سب جانتے ہیں! کل تم نے جمیلہ کے ساتھ کیفے میں چائے پی ہے! اور اُس کے ساتھ بہت دیر تک راز کی باتیں کی ہیں۔" ہر لڑکا جب بات کرنے کے لئے منہ کھولتا تو مجھے یہی محسوس ہوتا کہ وہ جمیلہ اور میرے متعلق ہی کچھ کہے گا۔ آخر اختر نے پوچھ ہی لیا ـــــ "کیوں میاں! آج اُداس اور حواس باختہ کیوں ہو، کیا کہیں ....؟" اِس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میں بہانہ کر گیا کہ ہاں!

رات بہت دیر تک پیٹ میں درد رہا اِس لئے سو نہ سکا۔ اُسی وقت پرویز کہیں سے آ نکلا اور بولا: "پیٹ میں درد تھا یا دل میں؟"

میں سمجھ گیا کہ اِس کم بخت نے ہمیں دیکھ لیا ہے! اب میں نے بھی ذرا دل کو مضبوط بنا لیا۔ کوئی دیکھے میری بلا سے! میری نیت تو بالکل صاف ہے۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ کبھی کبھی میری اور جمیلہ کی نگاہیں ٹکرا جاتیں۔ کبھی وہ مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر میرے پاس سے گزر جاتی اور کبھی جب اچانک سامنا ہو جاتا تو ایک دلنواز مسکراہٹ سے میرا خیر مقدم کرتی۔ اُس سے میری ہمدردی بڑھتی گئی۔ سارے کلاس میں جو اُسے پریشان نہ کرتا تو وہ میں تھا۔ اور شاید اُس ہمدردی کا نتیجہ تھا کہ وہ میری طرف مائل ہونے لگی۔ اُس کی نظریں جب میری طرف اُٹھتیں تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کہہ رہی ہوں۔ تم ہی میرے سچے ہمدرد ہو۔ تم ہی پورے کلاس میں ایک انسان ہو!

ایک دن میں لائبریری میں بیٹھا اکنامکس پر نوٹس تیار کر رہا تھا۔ کالج کے تقریباً سبھی لڑکے جا چکے تھے۔ چند لڑکے گراؤنڈ میں فٹ بال کھیل رہے تھے۔ لائبریری بند ہونے کا وقت قریب تھا۔ اِتنے میں جمیلہ مسکراتے ہوئے آئی اور کہنے لگی: "میں کیفے میں آپ کا انتظار کروں گی۔ کام ختم کر کے آ جایئے گا۔" میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ جھپاک سے چلی گئی۔ اپنا کام ختم کر کے میں کیفے پہنچا اور ایک کرسی کھینچ کر اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اُس کی نگاہوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں بہت سے گلے شکوے ہیں کہ میں اِتنے دنوں تک اُس سے نہیں ملا۔ اُس نے بیرے کو چائے لانے کے لئے کہا اور میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی ـــــ "کل میری سالگرہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کل شام میری سالگرہ پارٹی میں ضرور شرکت کریں۔"

میں نے کہا: "اِس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ اگر کوئی کام نہ نکل آیا تو ضرور حاضر ہوں گا۔"

"نہیں! آپ کو ضرور آنا ہوگا! میں انتظار کروں گی!" جمیلہ نے جواب دیا۔

میں انکار نہ کر سکا۔ اُس کی باتوں میں عجیب سی مٹھاس تھی۔ عجیب سی اپنائیت تھی۔

جب میں اگلے دن اس کے گھر پہنچا تو سچ مچ وہ میری منتظر تھی۔ مہمانوں سے میرا تعارف کرایا گیا۔ اُس دن میں نے بھی اپنے ایک دوست کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اُس کا بنگلہ بہت شاندار تھا۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی بجلی کی روشنی سے سارا ماحول بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ زرق برق لباس پہنے مہمانوں کے ہجوم میں میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔ لیکن جمیلہ ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہی اور مجھے اکیلا پن محسوس نہ ہونے دیا۔ آج اُس نے لباس بھی بہت قیمتی زیب تن کیا تھا۔ کانوں میں دمکتے ہوئے آویزے تھے۔ اور گلے میں طلائی ہار جگمگا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جمیلہ کی ساری بدصورتی لباس اور زیور نے چھپا دی ہے۔

کوئی بھی کنورٹیبل ہول لائف بیمہ پالیسی لے سکتا ہے!

مجھ جیسے پیسے۔ میں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ اپنی تھوڑی سی تنخواہ میں زندگی بیمہ سے سکون ملے گا۔ میں جو کچھ کماتا تھا وہ میری بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کے لئے ہی کافی تھا۔

ایک دن ایک بیمہ ایجنٹ نے مجھے کنورٹیبل ہول لائف بیمہ پالیسی کے بارے میں بتلایا۔ کیا شاندار پالیسی ہے یہ! ابتدا ہی سے اس میں آپ کے بیمہ کا جوکھم لیا جاتا ہے اور پانچ سالوں کے بعد جبکہ آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا اس وقت آپ اس کو میعادی بیمہ پالیسی میں تبدیل کر سکتے ہیں اور اپنی زندگی ہی میں روپیہ لے سکتے ہیں۔

مجھے کہنے دیجئے کہ کس طرح اس پالیسی نے میری مدد کی۔ تین سال

پہلے ... ۲ سال کا تھا میں نے ۱۰۰۰۰ روپیوں کے لئے کنورٹیبل ہول ... بیمہ پالیسی نکالی اور اس کے لئے ہر ماہ ۲۰ روپے ... میں خاندان والوں سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جاتا تو یہ ... کو منافع کے ساتھ مل جاتی۔

... دو سال بعد میں اس پالیسی کو میعادی بیمہ پالیسی میں ... سکتا ہوں۔ اور زندگی ہی میں رقم حاصل کر سکتا ہوں۔ اگر میں ... سے پہلے مر جاؤں تو یقیناً یہ رقم میرے خاندان والوں کو مل ... گی۔ بے شک پالیسی کو بدلنے کے بعد سے پریمیم کی رقم میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن میں وقت میں اس اضافے کو برداشت کرونگا۔

زندگی بیمہ ... کے لئے بے مثال ہے



پارٹی ختم ہونے کے بعد بہت دیر تک وہ مجھے ریکارڈ سنواتی رہی۔ جھوم جھوم کر بہت سے بہترین ریکارڈ بجواتے اور جب میں چلنے لگا تو مجھے آتے رہنے کا وعدہ لیا۔

آج کی رات بہت خوشگوار رات تھی۔ ایسی رات میری زندگی میں کبھی نہیں آئی۔ میں بہت خوش تھا کہ میں جمیلہ جیسی دولت مند لڑکی کو پسند آگیا ہوں۔

آج تک اُس کی مسکراہٹ ایسی ہوتی تھی جیسے مُردہ ہنس رہا ہو۔ لیکن آج اُس کی مسکراہٹ سے پھول کھل اٹھے ہیں۔ کون کہتا ہے وہ بدصورت ہے! میری نظروں سے کوئی اُسے دیکھے۔ اُس کی باتوں میں اب ایک میٹھے جھرنے کا ترنم تھا۔ اُس کی نظروں میں پیار کی نرم اور ٹھنڈی چاندنی تھی۔ اب وہ ہنستی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے آسمان پر دھنک کے رنگ بکھر گئے ہیں۔ اب اُس کی چال میں سرشاری اور آنکھوں میں شراب کی سی کیفیت جھلکتی تھی۔

آج ساری رات جاگتے ہی گزر گئی۔ صرف جمیلہ کے متعلق سوچتا رہا اور اپنی قسمت کو سراہتا رہا۔

اب میرے پنشن یافتہ باپ کو کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب میری بوڑھی ماں کو کپڑے سی سی کر آنکھیں پھوڑنے کی ضرورت نہیں۔ اب میں خود بھی ایم اے کر لوں گا اور آئی، سی، ایس کروں گا۔ لوگ مجھے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اُس بنئے کے بچے کو مزہ چکھاؤں گا جس نے ایک مہینہ میں بل دیر سے دینے پر میرے باپ کو گالی دی تھی۔ اور وہ مالک مکان جس نے چودہ روپے کے لئے میرے باپ سے جھگڑا کیا تھا اُسے بھی دیکھ لوں گا۔ اب تو خود میرا اپنا بنگلہ ہوگا، موٹر ہوگی اور ایسے ایسے کئی مکان ہوں گے۔ اپنی بہن کی شادی بڑی دھوم دھام سے کروں گا اور چھوٹے بھائی کو اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا۔ میرا باپ بنگلہ میں بیٹھا بیٹھا حقہ گڑگڑایا کرے گا اور میری ماں مجھے دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرے گی اور میرے بچوں کو کھلایا کرے گی۔

میں ساری رات انہی خیالات میں ڈوبا رہا اور صبح جب آنکھ لگی تو وہی آئی، سی، ایس بن جانے کے خواب دیکھا کیا۔

رفتہ رفتہ ہم قریب سے قریب تر ہوتے گئے ——— اب مجھ میں وہ پہلا سا ڈر اور جھجک نہ رہی۔ کالج میں لڑکوں میں سرگوشیاں ہوتی رہیں لیکن ہم نے کوئی پروا نہ کی۔ ہم بے تکلف ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ لیکن نہ میں کبھی دل کی بات زبان پر لایا اور نہ جمیلہ ہی نے پہل کی۔

میں چاہتا تھا کہ پہل جمیلہ ہی کی طرف سے ہو۔ گو میرے سینے میں محبت کی دھیمی دھیمی آنچ سلگتی رہی۔ میری راتوں کی نیند اُڑ گئی اور دن کا چین کھو گیا۔ میں ہر روز چاہتا کہ آج جمیلہ سے دل کی بات کہوں گا۔ اُس سے اظہارِ محبت کروں گا لیکن نہ جانے کیوں میری زبان رُک جاتی۔

ہوتے ہوتے امتحان کا زمانہ قریب آگیا۔ امتحان کی تیاری میں میں برابر جمیلہ کی مدد کرتا رہا۔ اس بہانے اُس سے قریب رہنے کی آرزو پوری ہوتی۔ جی چاہتا میں ہر وقت اُس کے سامنے بیٹھا رہوں اور وہ کچھ نہ کچھ مجھ سے پوچھتی رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی پڑھائی کی طرف سے میری توجہ ہٹتی گئی اور جوں جوں امتحان قریب آنے لگا، مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے میرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ جو کچھ پڑھتا بھول جاتا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ میں امتحان میں فیل ہو گیا۔ اور جمیلہ پاس ہو گئی۔ مجھے اپنے فیل ہونے کا اتنا غم نہیں تھا جتنا جمیلہ سے چھوٹ جانے کا۔

فیل ہونے کے بعد ہر وقت میں اپنے آپ کو کوستا رہا کہ کیوں نہ اپنے دل کی بات جمیلہ سے کہہ سکا۔ لیکن نہ جانے پھر کیوں مجھے یقین ہونے لگتا کہ جمیلہ ایک نہ ایک دن میرے پاس ضرور آئے گی اور اپنی بانہیں میری گردن میں ڈال دے گی۔ یا نہیں تو خط ہی کے ذریعہ مجھے پیغامِ محبت بھیجے گی اور میں ہر وقت اُس کے خط کا انتظار کرنے لگا۔ آخر ایک دن اُس کا خط بھی آ ہی گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا خود جمیلہ آ گئی۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے خط کھولا لیکن اُسے پڑھتے ہی میری آنکھوں میں زمین اور آسمان گھوم گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے ساتویں آسمان سے زمین پر پھینک دیا ہے! اور میں گہری کھائی میں گرتا جا رہا ہوں!!

جمیلہ نے لکھا تھا ———

ذیر احسن بھائی!

میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں کہ میں آپ کی محنتوں اور کوششوں سے امتحان میں کامیاب ہو گئی۔ کل شام میری امتحان میں کامیابی کی خوشی میں ایک پارٹی کا انتظام کیا گیا ہے امید ہے آپ ضرور تشریف لائیں گے۔ یہ بات بھائی سے کہنے کی نہیں، لیکن قلم کی نوک تک آ ہی گئی ——— یہ پارٹی میری منگنی کی تقریب بھی ہے ——— یہ بتا کر میں شرم سے عرق عرق ہوئی جا رہی ہوں!

آپ کی بہن ——— جمیلہ

اور جمیلہ کا خط پڑھ کر میرے سنہرے خواب بکھر گئے!!

41,35,000 [illegible] روپے 15,000

50,000

[illegible] — ایک روپیہ فی حل | حل ارسال کرنے کی آخری تاریخ [illegible]

ایک غلطی پر 8,000 روپے — دو غلطیوں پر 5,000 روپے — تین غلطیوں پر 2000 روپے

سُرس سبودھ پہیلی (معمّہ) کے تمام اشارے ہندی کی شائع شدہ کتابوں سے لئے گئے ہیں۔ اشارہ کے دو الفاظ اشارہ کے سامنے دیئے گئے ہیں جن میں سے ایک صحیح لفظ ہے۔ حل کا داخلہ ایک روپیہ فی حل ہے۔ فیس داخلہ بذریعہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا سُرس کیش وڈچر بھیجا جاسکتا ہے۔ منی آرڈر کی رسید، پوسٹل آرڈر یا سُرس وڈچر حل کے ساتھ بھیجیں۔ براہ مہربانی پوسٹل آرڈر کراس نہ کریں۔ ۱۸ اشاروں کے ۱۸ جوابی الفاظ لکھنے پر ایک حل بنتا ہے۔ آپ جتنے چاہیں حل بھیج سکتے ہیں۔ صحیح حل و انعام پانے والوں کے نام جاننے کیلئے اپنے ایڈریس لکھا ہوا پیپر کا لفافہ ضرور بھیجیں۔ حل بھیجنے کی آخری تاریخ [illegible] (وقت ۶ بجے شام) ہے۔ صحیح حل کا اعلان ایک گھنٹہ بعد کیا جائیگا۔ اردو خواندہ حضرات کے اصرار پر سُرس سبودھ پہیلی کا اردو ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

سُرس سبودھ پہیلی (رجسٹرڈ) نمبر ۸

حل سادہ کاغذ پر بھی بھیج سکتے ہیں!

نمبر شمار	اشارے	دو لفظ جن میں سے ایک صحیح جواب ہے	
۱	...... لوگ یورپینوں سے او شیہ (ضرور ہی) نفرت کرتے ہیں۔	چینی	زردی
۲	کل ہمیں مرنا ہے، اور مرتے تک ہمیں ...... ہے۔	لڑنا	جینا
۳	تمہاری نیت صاف ہے تو تمہیں کسی طرح کا ...... نہیں۔	فکر	دکھ
۴	...... کا برتن راکھ سے اور تانبا کھٹائی سے شُدھ ہوتا ہے۔	پیتل	کانسے
۵	آج کل کی ...... نے نوجوانوں کو چور اور ڈاکو بنا دیا ہے۔	بے کاری	مہنگائی
۶	...... کو ہردیہ (دل) کی چاہ (خواہش) رہتی ہے، روپوں کی نہیں۔	غریبوں	پریمی
۷	ہمارے دیش (ملک) میں ...... سے ہی سب سے ادھک (زیادہ) مٹھائیاں تیار کی جاتی ہیں۔	کھوئے	دلیسی آئیل
۸	...... ہونے پر تو سنسان کھنچا چلا آتا ہے۔	دھن	سادھن
۹	چاروں طرف روشنی ہوتے ہوئے بھی ...... دیا (چراغ) تلے اندھیرا ہوتا ہے۔	کبھی کبھی	ہمیشہ
۱۰	...... سے ادھک (زیادہ) پوتر (پاک) ہوا اور کہیں کی نہیں ہے۔	کاشی	الہ آباد
۱۱	...... کی بھوک بھی مٹانی ہی ہوتی ہے۔	پیٹ	شریر
۱۲	پہنا ...... کے پرجا (رعایا) ودروہی (باغی) نہیں ہو سکتی۔	انیائے	اتیاچار
۱۳	...... ہونے پر وہ جلدی جلدی پھسلنے لگتے ہیں۔	اکیلے	چکنے
۱۴	کمہار ...... کے بنا گھڑا نہیں بنا سکتا۔	مٹی	چاک
۱۵	رنگین ٹائلیں بنانا اصل میں ...... کی دستکاری تھی۔	یونان	ایران
۱۶	...... انسان کو سدا (ہمیشہ) دقتوں (مشکلوں) میں ڈالتی ہے۔	اگیانتا	غفلت
۱۷	ہمارے شریر (جسم) کا پانی کا انش (حصہ) سدا (ہمیشہ) ...... دوارہ (ذریعے) نکلتا رہتا ہے۔	شواس	پسینے
۱۸	کیا ہندو دھرم اتیاچاری (ظالم) کو ...... کی انومتی (صلاح) دیتا ہے۔	مارنے	جتانے

[illegible]

میں نے سُرس سبودھ پہیلی (رجسٹرڈ) کے قواعد اور ضوابط پڑھ لئے ہیں اور مجھے منظور ہیں۔

نام اور پورا پتہ ....

اپنے حل اور فیس داخلہ اس پتہ پر بھیجیں:۔ سُرس سبودھ پہیلی رجسٹرڈ نمبر ۸

سُرس سبودھ پہیلی رجسٹرڈ نمبر ۸ پلاٹ نمبر 36 ساؤتھ 5628 بستی ہرپھول سنگھ دہلی ۶

فہرست الفاظ گائڈ کیلئے ماہنامہ جمشید کا نیا شمارہ اور مدلل بحث کیلئے ماہنامہ نتیجہ خورجہ کا مطالعہ کیجئے!

(اشتہار)

سالنامہ دیکھا

اہلِ قلم حضرات کی رائیں

... "بیسویں صدی" ابھی ایک تہائی کے قریب گزری تھی کہ خوشتر گرامی نے "بیسویں صدی" جاری کیا۔ اب تقریباً ایک تہائی صدی باقی ہے۔ گویا تیس سے زیادہ سالنامے شائع کر چکے۔ لیکن اس سال کا سالنامہ چیزے دیگر است۔ منظومات، افسانے، مضامین سب دلچسپ اور معیاری ہیں۔ بہت سے اچھے اور معتبر لکھنے والوں نے اس میں حصہ لیا ہے۔ مصنفین کی تصاویر اور پھر اُن کے گھر بار کی تصویریں۔ یہیں خوشتر کیا ہیں۔ لکھانے والے گھر کے بھیدی ہیں۔ میں ان کا بہت پرانا نیاز مند ہوں اس لئے میری بات کو سند نہ مانئے کہ ان کے لہجے کی کرختگی ان کی صاف دلی پر ضرب نہیں لگاتی اور یہی بات "بیسویں صدی" کے باب میں کہی جا سکتی ہے کہ خوشتر گرامی کی تاجرانہ روش "بیسویں صدی" کے ادبی معیار کو کم نہیں کر سکتی ...

عرش ملسیانی (دہلی)

... یہ آپ ہی کی ہمت ہے کہ اس دورِ گرانی میں بھی اتنی پابندی سے اتنے معیاری خاص نمبر منظرِ عام پر پیش کرتے ہیں۔ سالنامہ معیاری تخلیقات کا حامل ہے اور بہترین ادب کا نمائندہ۔ مجھے یقین ہے کہ دو ماہ بعد ہی آپ پھر افسانہ نمبر کا اعلان کر دیں گے۔ قابلِ تحسین ہے آپ کا جذبۂ صحافت!! زندہ باد خوشتر گرامی اور پائندہ باد "بیسویں صدی"!!!

ظفر احمد نظامی (دنیا)

... خدا جھوٹ نہ بلوائے تو یہ سچ ہے کہ "بیسویں صدی" کے سالنامہ کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ کچھ افسانے تو ایسے بھی پائے جو ۱۹۶۵ء کے بہترین افسانے کہلائیں گے۔ اور کچھ شعری تخلیقات ایسی بھی ہیں جن کا اُردو شاعری میں جواب نہیں ...

موہن یاور (جموں)

... دلکش سرورق۔ دلفریب تصاویر سے آراستہ اور نہایت بلند پایہ مضامین نظم و نثر سے مرتب ... صحت مند ادب کا علمبردار سالنامہ نظر نواز ہوا۔ ترتیب میں وہی سلیقہ اور وہی فنکارانہ انداز کارفرما ہے جو سالہا سال سے اس بے مثال جریدہ کا طرۂ امتیاز چلا آ رہا ہے۔ تیر و نشتر کی حلاوت کا مزہ چکھنے کے بعد آپ کے مضامین اشتیاق سے پڑھے جاتے ہیں۔ میری رائے میں "اشرویو" اور "افواہیں" ابتدائی کاپیوں میں جگہ پائیں تو بہتر ہو۔ "تیر و نشتر" "سمعہ کارٹون" اور "افواہیں" کے مستقل فیچروں کی طرح "اشرویو" کا سلسلہ بھی لوگوں نے کافی پسند کیا ہے ...

رشی پٹیالوی (چنڈی گڑھ)

... سالنامہ ہے یا کیف و سرور ۔۔۔ رنگ و نور کا کارواں! ہر صفحہ جنت نما۔ سرورق فردوسِ نظر ہے! فنکاروں کی گھریلو زندگی کی جھلکیاں خوب ہیں اور راجہ مہدی علی خاں کا طنز بھی خوب تر ہے! ۔۔۔ ان ہوشربا حالات میں ایسا سالنامہ پیش کرنا آپ کے بلند عزائم کا عظیم کارنامہ ہے ...

آتما رام نگری (مغل سرائے)

... آپ نے اس قدر حسین سالنامہ نکال ڈالا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح مبارکباد پیش کروں کہ میرے جذبات و خیالات کی ترجمانی ہو سکے۔ میرے خیال میں اگر جنت طرازی اور فسوں کاری سیکھنا ہو تو آپ سے سیکھے۔ "بیسویں صدی" اس بات کا آئینہ دار ہے۔ خدا کرے آپ ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہیں اور اسی طرح اردو ادب کی خدمت کرتے رہیں۔ ہمارا ادب آپ پر ہمیشہ نازاں رہے گا ...

شعیب ردولوی (رڑکی)

... آپ کے حسنِ ترتیب کی تعریف کرنا "بیسویں صدی" کے ہزاروں مداحوں کے تعریفی کلمات کو دہرانا ہوگا ۔۔۔ حصۂ نثر و نظم دونوں معیاری ہیں۔ افسانوں میں واجدہ تبسم کا "نسو کا بوجھ" م۔ک۔ مہتاب کا "مغرل" نور شاہ کا "آشیاں" اور بشریٰ رشید کا "اپنے دکھ کسے دوں" بہت پسند آئے۔ غزلوں میں فراق، جوش ملسیانی اور آثر لکھنوی کی غزلیں پسند آئیں۔ غلام احمد فرقت کاکوروی کا "آدم خانہ خراب" اور راجہ مہدی علی خاں کا "اہلِ قلم کے محبوب مشغلے" بہت پسند آئے۔ راجہ صاحب نے اس لکھنے سے اُردو طنز و مزاح نگاری کو ایک نئی راہ دکھائی ہے ...

انور سیوانی (سیوان۔ بہار)

... مجھے زندگی میں صرف دو ہی چیزوں کا شدید انتظار رہتا ہے۔ ایک تو اپنی چنی کا، جو سکول سے وقت بے وقت لوٹتی ہے۔ دوسرے "بیسویں صدی" کا۔ جس سے میں

اعلیٰ مقام پر سمجھتا ہوں۔ اگر چہ میں ہر سال کئی کئی دن سے پہنچنے پر تڑپ اٹھتا ہوں کیونکہ مجھے ان دنوں سے دیوانگی کی حد تک محبت ہے۔ سالنامہ دیر سے پہنچا بے حد پریشان تھا۔ مگر یہ پریشانی اس وقت مسکراہٹوں میں بدل گئی جب حیات پرور افسانوں اور زندگی بخش نظموں اور غزلوں کا گلدستہ ملا۔ آپ قابلِ صد مبارکباد ہیں۔ جو اتنا حسین اور پیارا گلدستہ ہر چند ماہ بعد تیار کر لیتے ہیں۔ پھر تصویروں کا اہتمام تو حیرت انگیز طور پر نرالا ہے۔ اس قدر حسین وزیروں اور گورنروں کی تصویریں تو ہر ایک چھاپتا ہے۔ مگر زندگی اور جذبات کے ترجمانوں کو کون پوچھتا ہے۔ ان لوگوں کے فوٹو چھاپنے کا سہرا آپ کے سر ہے...

حنیف چودھری (ملتان پاکستان)

...سالنامہ آپ کی مثالی محنت و کاوش کا آئینہ دار ہے۔ مضامین نظم و نثر معیاری اور دلکش ہیں۔ حضرات فراق گورکھپوری، ساحر ہوشیارپوری، عرش ملسیانی، الطاف مشہدی، منظور احمد منظور اور محمود سعیدی کی غزلیں حضرت نظم کی جان ہیں۔ یہ افسانے خاص طور پر پسند آئے۔ مثلاً "آشیانہ" (نور شاہ) "پاگل خانہ" (کوثر چاندپوری) "اپنے اپنے دکھ کے رشتے" (بشریٰ رشید) اور "سفید بال" (ماسٹر کرتانی)۔ راجہ مہدی علی خان کی تخلیق "میرا قلم کے محبوب مشغلے" ایک چیز ہے...

پرکاش ناتھ پرویز (چنڈی گڑھ)

...بیسویں صدی کا سالنامہ وہ گلِ صد رنگ ہے جس کی بہار خزاں نا آشنا ہے۔

امرجیت قیس جالندھری

...تعریف کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں بجز کہ ایک مصرعہ درج کرتا ہوں کہ

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

میں یہ بات بلا جھجک لکھ رہا ہوں کہ نظریاتی اختلاف کے باوجود بھی مجھے بیسویں صدی کے وجود و عروج پر مسرت حاصل ہوتی ہے۔ خدا آپ کا دم سلامت رکھے ورنہ ہندوستان نے اردو زبان کے احسانات کو تو فراموش کر ہی دیا ہے ـــــ راجہ مہدی علی خان تک مبارکباد پہنچا دیجئے۔ فکر تونسوی سے میری ذہنی وابستگی ہے...

پریم کمار نظر (ہوشیارپور)

...بیسویں صدی کا عظیم اور بے حد خوبصورت سالنامہ ملا۔ دیکھ کر خیال و فکر کی نئی شمعیں فروزاں ہو گئیں۔ میں اس دلکش، پرکیف اور رنگین و دل آویز نمبر کی اشاعت پر پُرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں...

حفیظ مالیگانوی (مالیگاؤں)

...آپ نے اتنا خوبصورت سالنامہ نکالا کہ اس کا جواب نہیں ہے۔ میں تو صرف آپ کے حضور مبارکباد پیش کرنے حاضر ہوا تھا ـــــ اتنے خوبصورت اور شاندار نمبر کے لئے ایک بار پھر بے شمار مبارکباد اور تحسین قبول فرمائیں...

مظفر [illegible]

...سالنامہ ملا۔ دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ سوچا تھا اس بار [illegible] آپ اپنی روایات پر کیسے قائم ہیں۔ آپ آج کل جیسے بندوں کے چھکے چھڑاتے نظر آ رہے ہیں ـــــ بیسویں صدی کی منفرد کوشش سے وہ سبق لیں جو بزعمِ خود ہندوستان میں اردو ادب کے سب سے بڑے خادم ہیں...

ایم شفیع [illegible]

...یوں تو بیسویں صدی کا ہر شمارہ ایک خاص نمبر کی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن آپ کو خاص نمبر نکالنے میں واقعی کمالِ لازوال حاصل ہے۔ آپ کی ان خداداد صلاحیتوں سے کوئی اُردو داں منحرف نہیں ہو سکتا۔ جو آپ اپنی جدت طرازی اور ندرت کے کمال سے بیسویں صدی کے خاص نمبروں میں سمو دیتے ہیں ـــــ ان کی تعریف آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے...

شکیل انجم [illegible] (امروہہ)

...سالنامے کی جملہ خوبیاں اپنی مشہور و ممتاز روایات کے مطابق ہوتے ہوئے سالنامہ کو ہر اعتبار کامیاب بنانے میں اپنا جواب آپ ہیں۔ جس کے لئے آپ اور آپ کے معاونین کی ساعیٔ جمیلہ یقیناً لائقِ تحسین و مستحقِ مبارکباد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ہمت شکن دور میں بھی ایسے گرانقدر نمبر پیش کرنا واقعی آپ ہی کا کام ہے...

[illegible] (... آباد)

...یہ آپ ہی کے جہدِ مسلسل کا نتیجہ ہے کہ اس بحرانی دور میں آپ نے ادب کی وہ دستاویز پیش کی ہے کہ پڑھنے والے بھی خوش ہو گئے ـــــ کس کس کی تخلیقات کی تعریف کروں۔ بلاشبہ آپ انفرادیت اور جدت کے شیدائی ہیں...

اختر عابد نوگانوی (امروہہ)

...بیسویں صدی کا سالنامہ اپنی سابقہ روایات کے ساتھ آسمانِ ادب پر ایک درخشاں ستارہ بن کر نمودار ہوا۔ بلاشبہ میدانِ ادب میں اس کا ثانی نہیں ہے۔ راجہ مہدی علی خان کا مزاحیہ فیچر "میرا قلم کے محبوب مشغلے" اس نمبر کا شاہکار فیچر ہے۔ آج تک کسی بھی ادب میں طنز و مزاح پر اس دلچسپ انداز سے کوئی تحریر میری نظروں سے نہیں گزری۔ یہ حقیقت ہے کہ راجہ کا اندازِ نگارش سب سے جداگانہ ہے...

کیول دھیر (پھگواڑہ)



صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید طبی اشارات

ا ـــــ کیلے ـــــ مکمل غذائیت کا خزانہ

کیلا کثیر الاستعمال، ارزاں اور عام دستیاب ہونے والا پھل ہے جسے امیر غریب بچے بوڑھے سبھی خوشی خوشی کھاتے ہیں۔ کچا کیلا سبزی کے طور پر اور پختہ کیلا پھل کے طور پر کھایا جاتا ہے۔ کیلے کی ترکاری بہت ثقیل اور دیر ہضم ہوتی ہے۔ اسے کمزور معدے بآسانی ہضم نہیں کرسکتے۔

عام طور پر لوگ کیلے کو صرف ایک خوش ذائقہ پھل سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غذائی اعتبار سے بھی کیلا خاصی اہمیت اور افادیت کا حامل ہے۔

مغرب کے ایک مستند ماہر نے پھلوں کے متعلق اپنی رائے دیتے ہوئے کہا ـــــ "کیلا چاہے خام شکل میں استعمال کیا جائے یا کسی اور شکل میں اپنی غذائی خوبیوں کی وجہ سے گرم خطوں میں اس کی وہی حیثیت ہے جو معتدل آب و ہوا کے ممالک میں گیہوں اور آلو کی ہے۔"

دودھ کے ساتھ کیلا کھانے سے جسمِ انسانی کو اپنی نشوونما اور قوت کے لئے تقریباً تمام چیزیں مل جاتی ہیں۔ اسے متوازن غذا کہا جاسکتا ہے۔

کیلے میں وافر مقدار میں وٹامنز ہوتے ہیں۔ ایک درمیانی سائز (وزن ۵½ اونس) کے کیلے میں پانی ۳٫۷ اونس، معدنی نمک ۰٫۵ ، پروٹین ۰٫۶ اونس، چکنائی ۰٫۵ اونس، نشاستہ ۱٫۳۷ اونس ہوتے ہیں۔ جبکہ ایک بالغ شخص کو روزانہ ۴ اونس پروٹین، ۳ اونس چکنائی اور ۱۶ اونس نشاستہ (اسٹارچ) کی ضرورت ہوتی ہے۔

کیلے کے پروٹین اور اسٹارچ چاول اور گندم میں ملنے والی ان چیزوں سے بہتر ہوتے ہیں۔

انسانی جسم کو جس قدر غذائیت اور آیوڈین کی ضرورت ہوتی ہے وہ کیلے سے مکمل حاصل ہو جاتی ہے سوائے اس میں پروٹین اور چربی کم ہے۔ نشاستہ اور شکر بہت زیادہ ہے اس لئے خون پیدا کرکے طاقت بخشتا ہے۔ طاقت اور وزن بڑھانے کے لئے کیلے کا استعمال بہت مفید ہے۔ کمزور بچوں کو کیلا ضرور دینا چاہیے۔

کیلے میں بہت زیادہ ٹھوس غذائیت ہے۔ اس میں وٹامن اے، بی اور سی بکثرت ہیں۔ وٹامنز کے اعتبار سے کیلا مفید ترین پھلوں میں ہے۔ اسے غریبوں کا حلوہ کہہ سکتے ہیں جس میں مکمل غذائیت موجود ہے اور جسم کو نشوونما دینے والے صحت بخش اجزا اس میں بکثرت ہیں۔ خون کی کمی میں کیلے بہت مفید ہیں۔ اس میں فولاد کی مقدار اتنی زیادہ ہے جس سے خون کی کمی کی بیماری دُور ہو جاتی ہے۔ اس میں معدنی اجزاء کی بھی کمی نہیں۔ اس میں کیلشیم اور پوٹاشیم کی جو غیر معمولی مقدار ہے وہ دانتوں، ہڈیوں، پٹھوں اور اعضائے رئیسہ کے لئے بہت مفید ہے۔

کیلے میں غذائی اجزاء دوسرے پھلوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں اور یہ ایک ٹھوس پھل ہے۔ اسے اعتدال سے زیادہ نہیں کھانا چاہئے۔ کمزور معدے ہضم نہیں کرسکتے۔ کیلے کو خوب چبا کر، پانی سا بنا کر حلق سے نیچے اُتارنا چاہئے۔

کیلا آنتوں کے جراثیم کو ہلاک کرتا ہے۔ اس سے آنتوں کی سوزش بھی دُور ہوتی ہے۔ خون میں جب زہریلے اجزاء شامل ہوں اور گردے انھیں چھانٹ کر خون سے الگ نہ کرسکے ہوں تو اس حالت میں کیلے بطور غذا بہت مفید ہیں۔ کیلوں سے گردوں پر بوجھ نہیں پڑتا۔ گردے کی تکلیف میں نرم کیلے بطور غذا مفید ہیں اور انہیں کھانا کھانے کے بعد کھانا چاہئے۔ یہ خیال غلط ہے کہ کیلے سے معدے پر بوجھ پڑتا ہے بلکہ کیلا ملین اور نرم غذا ہے۔ نہار منہ کیلا ہرگز نہیں کھانا چاہئے۔ اس سے نظامِ ہضم میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور نہ ہی شام کے وقت کیلوں کا استعمال موزوں ہے۔

بہت سے امراض میں کیلا بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ خصوصاً دستوں اور پیچش میں اس کا استعمال بہت زود اثر اور نافع ہے۔ سنگرہنی اور جریان و احتلام میں بھی بہت مفید ہے

[illegible]

بعض ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ اگر کیلے کے ساتھ تھوڑا سا نمک اور الائچی کا مرکب شامل کر لیا جائے تو پیچش کے لئے یہ حیرت انگیز علاج ہو جاتا ہے۔

اکثر معدہ کی خرابیوں میں اس کا مناسب استعمال بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کیلے کو خشک کر کے آٹے کی شکل میں تبدیل کر لیتے ہیں اور یہ آٹا اُن بچوں کو استعمال کرایا جاتا ہے جن کا ہاضمہ کمزور ہو گیا ہو یا معدہ کی خرابیوں میں مبتلا ہوں۔ ایسا سفوف اگر دودھ میں ملا کر استعمال کیا جائے تو معدہ اور آنتوں کی اکثر خرابیوں میں بے حد مفید ہوتا ہے۔

کیلے کا استعمال بچوں کیلئے خصوصاً بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اگر اس کا سفوف بچوں کو دودھ کے ساتھ دیا جائے تو قوتِ ہاضمہ بہت بڑھ جاتی ہے یہ جسم کو فربہ اور بارونق بناتا ہے۔ قد کو غیر معمولی طور پر بڑھاتا ہے۔ دانتوں کو سفید چمکدار اور مضبوط کرتا ہے۔ جو بچے بھی طالب علمی کا زمانہ پورا کر رہے ہوں انہیں اگر دو کیلے اور ڈیڑھ پاؤ دودھ روزانہ صبح کو ناشتہ کے طور پر دیا جائے تو اُن کی نشوونما میں بے حد مفید و معاون ہوتا ہے۔ دماغ کی صلاحیتوں کو برقرار رکھتا ہے تھکاوٹ نہیں محسوس ہونے دیتا۔ جسم میں چستی پیدا کرتا ہے۔ ذہن تیز بناتا ہے اور قوتِ حافظہ پر بھی اچھا اثر ڈالتا ہے۔

کیلے میں معدنیات کے اجزاء بھی بکثرت ہوتے ہیں۔ چونا، فاسفورس، سلفر، لوہا، نمک۔ لوہے کی مقدار تقریباً سارے پھلوں سے زیادہ اسی میں پائی جاتی ہے۔ البتہ اس میں چربی کے اجزاء بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اسے دودھ کے ساتھ استعمال کیا جائے تو بہترین غذا بن جاتی ہے۔

۳ ـــــ سفید چاول ـــــ ایک گھٹیا غذا

ہندوستان اور پاکستان کے طول و عرض میں چاول کھانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لوگ چاول بہت رغبت سے کھاتے ہیں۔ اور اُس سے بہت سے اقسام کے کھانے تیار کرتے ہیں۔ چاول بطور غذا مسلسل کھانا مفید نہیں۔ یہ دوسرے اناجوں سے کم طاقت بخش ہے۔ اس میں کیلشیم بھی نہ ہونے کے برابر ہے اور جسم کو نشوونما دینے والے اجزاء بھی بہت کم ہیں۔

سفید مصفا شکر کو ماہرین غذا زہر قرار دیتے ہیں، اسی طرح میدے یا سفید آٹے کی ڈبل روٹی کو غذائیت سے خالی غذا سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح پالش کیا ہوا سفید چاول بھی غذائیت کے اعتبار سے بہت گھٹیا چیز ہے۔ لیکن نئی تہذیب کے پرستار لوگ اسی کو پسند کرتے ہیں جو چاول پالش کیا ہوا نہ ہو اُسے کھانا مہذب لوگوں کی طبع نازک پر بار اور ذائقہ پر گراں گزرتا ہے۔

اناجوں، دالوں اور پھلوں کے باریک چھلکے جو ان پر خوب اچھی طرح چسپاں ہوتے ہیں، صرف حفاظت اور خوبصورتی کا کام انجام نہیں دیتے۔ جسم کے لئے نہایت قیمتی اجزاء کے حامل ہوتے ہیں۔ وٹامنز اور معدنی اجزاء جو ہماری جسمانی صحت کا مدار ہے، اُن میں بڑی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ چاول کی بیرونی رنگین تہہ جسے الگ کر دیا جاتا ہے اُس میں چاول کا دس فی صد پروٹین ہوتا ہے ۸۵ فی صد چکنا مادہ اور ستر فی صد معدنی اجزاء۔ اُس میں سفید چاول سے چار سو فی صد زیادہ تھیامین تین سو فی صد زیادہ ریبوفلیوین اور تین سو فی صد زیادہ نیاسین ہوتی ہے۔

یہ سب وٹامن بی کی اہم ترین اقسام ہیں۔ چاول کی اس رنگین تہہ میں دوسرے وٹامنز بھی ہوتے ہیں، جنہیں الگ کر دیا جاتا ہے۔ وٹامن بی کمپلیکس میں ایک جز کولین کا بھی ہوتا ہے، جو چاول کے رنگین چھلکے میں اچھی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ کولین جگر میں چربی کی پیدائش کو روکتا اور جگر کی چربی کو گھلاتا ہے۔ جگر میں چربی کا بڑھ جانا ایک خطرناک مرض ہے۔ چاول جو ہم کھاتے ہیں اُس سے اگر کولین دُور نہ کی جائے تو صرف اسی مقدار میں کولین کا جسم کے اندر پہنچنا انسان کو جگر کی اس خرابی سے محفوظ رکھتا ہے۔

کولین کے علاوہ رنگین تہہ والے چاول میں اور بھی مفید اجزاء پائے جاتے ہیں۔ وٹامن بی کمپلیکس کی اُن اقسام کے علاوہ جن کا ذکر کیا جا چکا ہے، اُس میں بائیوٹین بھی ہوتی ہے اور پی اے بی اے اور پائری ڈاکسین بھی۔ اس میں جسم کے لئے صحت بخش اجزاء فاسفورس، پروٹین اور روغن بھی پایا جاتا ہے۔

مشین سے صاف کئے ہوئے چاولوں کی اوپر کی تہہ اُتر جانے کے باعث چاول کے سب مقوی اجزاء زائل ہو جاتے ہیں اور اُس کی غذائیت برائے نام رہ جاتی ہے اور وٹامن بی صفائی کے دوران میں ضائع ہونے سے ان چاولوں کے کھانے سے مرض بیری بیری ہو جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مشین سے صاف کئے ہوئے چاولوں کے بجائے اوکھلی میں ہاتھ سے کوٹ کر صاف کئے ہوئے چاول مقابلتاً زیادہ مفید ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں آج ہی تہیہ کر لیجئے کہ پالش کئے ہوئے سفید چاول کے بجائے آپ ہمیشہ رنگین تہہ والے چاول استعمال کریں گے۔

۴ ـــــ صحت کی خرابی کا خوف

ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ یوں تو ہر خوف تکلیف دہ اور تباہ کن ہوتا ہے لیکن صحت کی خرابی کا خوف ہر خوف سے زیادہ تکلیف دہ اور تباہ کن ہے۔ یہ خوف موت کے خوف سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ انسان درحقیقت اُتنا بیمار نہیں ہوتا جتنا بیماری کے خوف سے بیمار ہوتا ہے۔ ذہن جہاں انسان کی زندگی بنا سکتا ہے بگاڑ بھی سکتا ہے اگر آپ کے ذہن میں یہ خیال آ گیا کہ آپ کی صحت اچھی نہیں ہے تو یقین ہے کہ آپ [illegible] انسان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر آج دوائیں بنانے کے سینکڑوں [illegible] دولت کما رہے ہیں۔ ڈاکٹر مریض کو تبدیلیٔ آب و ہوا کی اس لئے رائے دیتے ہیں کہ وہ [illegible]

سے مریض کو ہٹانا چاہتے ہیں جہاں رہ کر وہ اس مرض میں مبتلا ہوا۔ تاکہ مریض کا ذہن دوسری طرف مشغول ہو۔ دُنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی ناکامی کو چھپانے کے لئے بیماری کا بہانہ تلاش کر لیتے ہیں۔ ہزاروں ایسے مریض ہیں جو صرف مرض کے خوف سے مرے جاتے ہیں۔ اگر آپ اُن کی کسی بیماری کا علاج کریں تو وہ خود بخود ایک دوسرا مرض اپنے اندر پیدا کر لیں گے۔

۴ ـــــــ کامیابی بکتی ہے!

مشہور مفکر ڈاکٹر ہارڈن نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے ـــــ کیا تم کامیابی کی آرزو رکھتے ہو؟ کیا تمھیں کامیابی کی خواہش ہے؟ تو بتاؤ تم اُس کی قیمت ادا کر سکتے ہو؟ تم کس قدر تکلیفیں برداشت کر سکتے ہو؟

مشکلات کے مقابلہ میں تم کتنا عرصہ استقلال سے ٹھہر سکتے ہو۔ کیا تم میں اتنی ہمت ہے کہ جو کام دوسرے لوگ نہیں کر سکتے تم انھیں انجام تک پہنچا سکو۔ کیا تم اتنے عالی حوصلہ ہو کہ جو باتیں دوسروں کے خواب و خیال میں بھی نہ گزریں تم انھیں کرنے کی کوشش کرو۔

کیا تم میں اتنا استقلال ہے کہ ناکامی پر ناکامی ہونے کے باوجود تم اپنی جدوجہد جاری رکھ سکو؟

کیا تم اپنے دل و دماغ کو اپنے مقصد عالی پر مرکوز کر سکتے ہو اور اگر لالچ اور فریب تمھاری توجہ کو ہٹانے کے لئے عمل میں لائے جائیں تو ان کی مردانہ وار مخالفت کر سکتے ہو۔

کیا تمھیں کام کرتے ہوئے انجام کا بھی ایسا ہی خیال رہتا ہے، جیسا آغاز کا؟ اگر ایسا ہے تو کامیابی تمھاری ہے! کیونکہ تم اُس کی قیمت ادا کرنے کے قابل ہو۔ کامیابی بھی زندگی کے بازار میں فروخت ہوتی ہے۔ تم بھی اُسے خرید سکتے ہو۔ اسے ہر آدمی خرید سکتا ہے، لیکن وہی جو اُس کی قیمت ادا کر سکتا ہے!

۵ ـــــــ خود اعتمادی

اِس موضوع پر اِس سے پہلے بھی آپ نے بہت سے مقالات پڑھے ہوں گے، لیکن یہ ایک ایسا اہم سبق ہے جسے بار بار دُہرانا، بار بار پڑھنا چاہئے۔

زندگی ایک مہم، ایک معرکہ، ایک مقابلہ ہے اس میں وہی لوگ کامیاب و کامران ہوتے ہیں، وہی فتح و ظفر کے پرچم لہراتے ہیں جو اپنے اوپر بھروسہ رکھتے ہیں۔ جنھیں اپنے اوپر اعتماد ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نپولین ہل نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے ـــــ زندگی کی جدوجہد میں کوئی چیز آپ کے اطمینان کا باعث نہیں بن سکتی جب تک کہ آپ خود اعتمادی کی عادت نہ ڈالیں۔ آپ کو یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ آپ کے سوا کوئی دوسرا آپ کے لئے کامیابی نہیں لا سکتا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اگر آپ کا نصب العین بلند ہے تو اس میں آپ کو دوسرے لوگوں کے اشتراک کی ضرورت پیش آئے گی۔ لیکن آپ اُس وقت تک یہ اشتراک حاصل نہیں کر سکتے جب تک آپ میں خود اعتمادی نہ ہو۔

شاید آپ کو اِس بات پر حیرت ہو کہ دُنیا میں کچھ لوگ انتہائی بلند درجے پر پہنچ جاتے ہیں، لیکن اُن کے بہت سے ساتھی جو علم اور تجربے میں کم نہیں ہوتے، عمر بھر اُس درجے کو حاصل نہیں کر پاتے۔ آپ کسی دو آدمیوں کو لے لیجئے اور اُن کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیجئے۔ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ ایک کے آگے بڑھنے اور دوسرے کے پیچھے رہ جانے کا کیا سبب ہے۔ آپ یہ سُن کر حیران رہ جائیں گے کہ وہ شخص جو آگے بڑھتا ہے وہ اپنے آپ پر پورا بھروسہ رکھتا ہے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ اپنے اُس اعتماد اور یقین کا اظہار اپنے عمل کی شدت سے کرتا ہے۔

۶ ـــــــ دُنیا کی ایک بہت بڑی حقیقت

ایک مشہور مغربی مفکر نے لکھا ہے ـــــ یہ دُنیا کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ لوگوں کے کام اُن کے خیال کے مطابق عمل کے سانچے میں ڈھلتے ہیں ـــــ عمل کے سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔

کامیاب انسان اِس لئے کامیاب ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے دل و دماغ میں کامیابی کی شمع روشن رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ کامیابی کے متعلق سوچتا ہے اور مایوس ہونا جانتا ہی نہیں۔

اگر آپ زندگی کا دامن کامیابی و کامرانی کے پھولوں سے بھرنا چاہتے ہیں تو اپنے مقصدِ حیات کو اپنے ذہن پر اِس طرح مسلط رکھئے کہ وہ کامیابی کے علاوہ اپنے مقصدِ حیات کے علاوہ کوئی بات سوچ نہ سکے۔ خصوصاً ناکامی، پستی و نامرادی کا کوئی جذبہ یا خیال اُس کے ذہن میں پیدا نہ ہو سکے۔

جواب طلب اُمور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ پاکستانی ٹکٹ ہندوستان میں کار آمد نہیں ہیں اِسلئے پاکستانی بھائی اور بہنیں اِس شرط سے مستثنیٰ ہیں۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

سوال و جواب

سرگوشیاں

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی اور ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔

(ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

مس نیلوفر امین۔ کلکتہ

س۔ شادی کے لئے لڑکے کے ماحول کو دیکھنا ضروری ہے یا نہیں جبکہ لڑکا نیک ہو۔

ج۔ لڑکا نیک ہو جب بھی ماحول دیکھنا، ہر طرح اطمینان کر لینا ضروری ہے۔ اس لئے کہ شادی ساری زندگی کا سودا ہے۔

س۔ غلط فہمی!

ج۔ کبھی کبھی بہت خطرناک اور افسوسناک ثابت ہوتی ہے۔

س۔ محبت؟

ج۔ ایک کھیل! جس کا آغاز حسین اور انجام حسرت ناک ہوتا ہے۔

محمد عتیق صدیقی۔ دہلی

س۔ بھیا! میں اکثر و بیشتر سوال بھیجتا ہوں، لیکن وہ شریک اشاعت نہیں ہوتے۔ کیا وجہ ہے؟

ج۔ آپ کے سوال لاجواب ہوتے ہوں گے۔ اپنا جواب آپ ہوتے ہوں گے۔

س۔ آپ کو فلموں سے کیوں نفرت ہے۔ پہلے تو آپ اپنے رسالے میں فلموں کا ایڈورٹائزمنٹ کیا کرتے تھے۔

ج۔ اچھی فلمیں ہوں، اخلاق کو تباہ کرنے والی نہ ہوں تو ہمیں اُن سے ہرگز نفرت نہ ہوگی۔

س۔ غالب کا کوئی شعر سنایئے۔

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

صداقت قریشی۔ کانپور

س۔ ظفر پیامی ہندو ہیں یا مسلمان؟ میرے ایک دوست کہتے ہیں، ہندو ہیں۔

ج۔ ظفر پیامی ہندو ہیں نہ مسلمان ـــــ انسان ہیں۔

بشیر احمد۔ بورگم پہاڑ

س۔ کیا سیاست بھی ایک پیشہ ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ اور بے حد نفع بخش!

س۔ انسان کی آخری منزل؟

ج۔ ستاروں سے بھی آگے! ـــــ کوئی منزل ہو، ہمت چاہئے سرہو ہی جاتی ہے۔

س۔ آپ کا پسندیدہ شغل کون سا ہے؟

ج۔ زبان و ادب کی خدمت۔

اے۔ قدوس اشک۔ رشڑا۔ ہگلی

س۔ ہر عمل کا ردعمل کیوں ہوتا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ ہر عمل کا ردعمل ہونا چاہئے۔

س۔ جگر مرادآبادی کا یہ شعر مکمل کیجئے ؎

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونی منظر سے

ج۔ وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونی منظر سے
اُس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

نور الاسلام سودائی۔ کلکتہ

س۔ ہنسی کی سب سے بڑی خوبی؟

ج۔ ہنسی صحت کے لئے سب سے بہتر ٹانک ہے۔

س۔ علامہ اقبال کی وفات کس تاریخ کو ہوئی؟

ج۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو۔

حبیب حسین۔ حیدر آباد

س۔ شادی ہونے کے بعد انسان پر خوش رہنے کی بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو ایک اور زندگی کو ملول و محزون بناتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اپنے ساتھ ایک اور زندگی پر موت کا سایہ ڈالتا ہے۔

س۔ چواین لائی کا دورۂ سہ ممالک سے کیا مقصد ہے؟

ج۔ اپنے فریب کے منصوبوں کو اور وسیع بنانے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

عبید صفی۔ بنگلور

س۔ افسانہ نگاروں کے پتے تو آپ دیتے ہیں لیکن شاعروں کے پتے کیوں نہیں دیتے؟

ج۔ افسانوں کے ساتھ افسانہ پر روشنی ڈالنے کے لئے افسانہ نگاروں کے خط ہوتے ہیں خطوط کے ساتھ اُن کے پتے بھی ہوتے ہیں ——— منظومات کے ساتھ شاعروں کے خط ہوتے ہیں نہ اُن کے پتے۔

س۔ کیا خوش مزاجی وقار کو دھکا پہنچاتی ہے؟

ج۔ نہیں۔ ہاں موقع بے موقع، ہر وقت کی خوش مزاجی وقار کو دھکا پہنچاتی ہے۔

س۔ سچ بتائیے کیا ہندوستان آزاد ہو گیا؟

ج۔ کیا آپ کو شک ہے؟ کیا آپ راعی سے رعیت تک سب کو، قانون اور اخلاق کی ساری پابندیاں توڑ کر کھل کھیلتے نہیں دیکھتے؟

ساجد آرزو۔ کلکتہ

س۔ تاج محل پر کون سا خیال بہتر ہے

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

اِک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل
ساری دُنیا کو محبت کی نشانی دی ہے

ج۔ دوسرے شعر میں جو خیال ظاہر کیا گیا ہے بہتر ہے۔

س۔ خوشتر بھیا! اقبال کا کوئی اچھا سا شعر سنائیں۔

باغبان چارہ فرمائے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک

ڈاکٹر زین العابدین۔ جاجا

س۔ اِس مفہوم کا کوئی دوسرا شعر سنائیے ؎

طولِ شبِ فراق سے گھبرا نہ اے جگر
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہ ہو

ج۔
اِک نئی صبح کا فروغِ جمال
رات کے آنسوؤں میں رقصاں ہے

س۔ کیسے لوگ کامیابی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں؟

ج۔ جو احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جو خود شناسی و خود اعتمادی کی دولت سے محروم ہوتے ہیں۔

س۔ غمِ زندگی؟

ج۔
غمِ زندگی پہ اب تک بہت اشک بہہ چکے ہیں
اِس غم پہ مسکراؤ کہ بہار آ رہی ہے

آفتاب احمد نجمی۔ گورکھپور

س۔ آنسوؤں کی قیمت؟

ج۔ جیسی آنکھیں، جیسے آنسو ہوں ——— مگرمچھ کے آنسوؤں کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ قوم کے غم میں گرنے والے اُن آنسوؤں کی کیا قیمت ہو سکتی ہے جو ایسی آنکھوں سے گریں جن میں قوم کے چندے سے حاصل عیش و عشرت کا خمار چھایا ہو۔

س۔ ایسے انسان کو کیا کرنا چاہئے جو ہر طرف سے مصیبتوں اور تکلیفوں میں گھرا ہوا ہو۔

ج۔ اس یقین کے ساتھ مصیبتوں کا مقابلہ کرنا چاہئے،

حوصلہ کا دامن [illegible]
صبح ہونے کو ہے شام کی [illegible]

س۔ غالب کا کوئی ایسا شعر سنائیے جس میں [illegible] کا پیغام ہو۔

ج۔
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

احمد شریف۔ منگلور

س۔ بھیا! میں ایک لڑکی سے پیار کرتا ہوں۔ لیکن کچھ دن ہوئے اُس کی شادی ہو گئی۔ آئیں اب میں کیا کروں؟

ج۔ خدا کا شکر ادا کیجئے ——— حالات نے آپ کی شرافت کی لاج رکھ لی!

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت!

ماسٹر اعجاز چک۔ منگلور

س۔ اگر کسی کو اپنی زندگی سے نفرت ہو جائے تو؟

ج۔ دل کی آنکھوں سے زندگی کا حسن دیکھیے، اُسے زندگی سے پیار ہو جائے گا۔

س۔ آج کل لوگ انسانیت سے دور کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ انسان انسان نہ رہا۔

سراج الدین ایم ابراہیم۔ بھیونڈی

س۔ جلالۃ العظم غلام محی الدین خضر کے سہرے کا تمغہ!

ج۔ اپنی مثال آپ ہیں!!

س۔ خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کا کوئی رنگین شعر سنائیے۔

ج۔
ہستیِ نا آشنائی وحشت [illegible]
یاری آنکھوں میں [illegible]

زبیر خاں بجبری، ہزاری باغ

س۔ امیر شخص ہیں یا غریب؟

ج۔ غریب! امیر بیچاروں کے دکھوں کا شمار نہیں ننانوے کے پھیر کا غم انھیں دن رات کھائے جاتا ہے۔

س۔ شعلہ و شبنم میں کیا فرق ہے؟

ج۔ شعلہ دیدہ کے گرد ماند دیدہ! آپ نے بارہا دیکھا ہوگا۔

س۔ انسان اپنی زندگی میں کن باتوں کی احتیاط رکھے؟

ج۔ ہر بُری بات، ہر بُری راہ سے بچے۔

فطرت قاسمی، بنگلور

س۔ میں تنہائی پسند ہوں لیکن، حالات ہنگامہ آرائیوں سے ایک لمحہ بھی دور رہنے کی فرصت نہیں دیتے۔ بتائیے میں کیا کروں؟

ج۔ اپنی پسند بدلنے کی کوشش کیجئے۔

س۔ کیا واقعی سوزش میں لذت ہوتی ہے؟

ج۔ یہ سوزش پر موقوف ہے۔ جیسی سوزش ہو، جہاں سوزش ہو۔

س۔ بھیا! ایک درد انگیز شعر سنائیے۔

ج۔ سُنیے ؎

مری حیات ہے محروم مدعائے حیات
وہ رہگذر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا

سید عابد حسین، مرشد آباد

س۔ بھائی صاحب! میرا ایک دوست کہتا ہے، سوالوں کے جواب آپ خود نہیں دیتے، کوئی اور دیتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟

ج۔ جی ہاں، یہ سو فیصدی سچ ہے۔ سوالوں کا جواب ہم نہیں دیتے، ہمارا قلم دیتا ہے۔

س۔ میں افسانے لکھ تو لیتا ہوں لیکن جب اپنے ماسٹر صاحب کو دکھاتا ہوں تو وہ کہتے ہیں ..... ٹھیک نہیں ہوا۔ بتائیے میں کیا کروں؟

ج۔ کسی اچھے افسانہ نگار سے افسانے لکھنا سیکھئے۔

س۔ میں ایک لڑکی سے بہن جیسی محبت کرتا ہوں لیکن وہ کچھ اور ہی سمجھتی ہے۔ آپ بتائیں میں کیسے اُسے سمجھاؤں کہ میں تم سے بہن جیسا پیار کرتا ہوں۔

ج۔ اگر آپ کو واقعی اس لڑکی سے بہن جیسی محبت ہے آپ اُسے بہن سمجھتے ہیں تو اُس کے حال پر رحم فرمائیے۔ اُس سے پیار نہ کیجئے۔ ورنہ آپ کی محبت اُس کے لئے مصیبت بن جائے گی۔

مس اظہر علی، امراوتی

س۔ اگر دنیا سے لفظ "بے روزگاری" مٹ جاتا تو؟

ج۔ کتنے رشوت خور اربابِ حکومت "بے روزگار" ہو جاتے!

س۔ سوسائٹی اور سماج کی نظروں میں سب سے بڑا جرم؟

ج۔ سوسائٹی اور سماج کی برائیوں کو بُرا کہنا!

س۔ لطف مرنے میں ہے زیادہ، یا مزہ جینے میں؟

ج۔ آج کل جینا مشکل ہے، مرنا آسان ہے۔ زندہ رہنے کے لئے سامانِ زندگی ملنا مشکل ہو گیا ہے لیکن کفن کسی طرح مل ہی جاتا ہے۔

ابراہیم انصاری، جبل پور

س۔ کیا قتیل شفائی پاکستان میں رہتے ہیں؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ آپ ہمیشہ محبت کو بُرا کہتے ہیں کیا آپ کے ساتھ بھی کسی نے بے وفائی کی ہے؟

ج۔ ہم محبت کو اس لئے اچھا نہیں سمجھتے کہ کسی سمجھدار نے کہا ہے ..... کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا! ویسے ہمیں نفرت سے بھی نفرت نہیں ہے۔

سید ارشد یوسف، آرہ

س۔ کیا عورت محبت کی بھوکی ہوتی ہے؟

ج۔ جی ہاں

س۔ "بیسویں صدی" میں افسانہ شائع کرانے کی کیا شرائط ہیں؟

ج۔ صرف ایک شرط ہے۔ افسانہ "بیسویں صدی" کے معیار کا ہو۔

س۔ خودکشی بُزدلی ہے یا بہادری؟

ج۔ بُزدلی!

محمد اسلام الحق۔ چکر دھر پور

س۔ بقول ... غالب شراب پیا کرتے تھے۔ کیا ڈاکٹر اقبال کو بھی شراب نوشی سے ذوق تھا؟

ج۔ جی ہاں۔ غالب نے کہا ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

س۔ زندگی پھول بھی ہے پتھر بھی۔ تو حُسن و شباب کیا ہے؟

ج۔ شراب بھی۔ سراب بھی!

قدسیہ جمیل۔ لاہور

س۔ بھائی جان! کوئی نعت کا شعر سُنائیے۔

ج۔ سُنیے ؎

نہ قدسیوں کے لئے ہے نہ انس و جاں کیلئے
سپاس و مدح ہے سردارِ دو جہاں کیلئے

س۔ بھائی جان! نعت کا کوئی ایسا شعر سُنا سکتے ہیں جو کسی ہندو شاعر کا ہو۔

ج۔ سرکشن پرشاد شادؔ کا ایک شعر سُنئے ؎

بلوائیں مجھے شادؔ جو سُلطانِ مدینہ
جاتے ہی میں ہو جاؤں گا قُربانِ مدینہ

ریاض احمد۔ چمپارن

س۔ انسان کا سب سے بڑا دشمن؟

ج۔ انسان!

س۔ اگر انسان کو محنت کرنے کے باوجود ناکامی ہو تو؟

ج۔ جب بھی بددل نہ ہونا چاہیئے۔ محنت کبھی رائیگاں نہیں ہوتی۔

س۔ زندگی اور زندہ دلی کا سب سے بڑا قاتل؟

ج۔ آزردگی و افسردگی!

عبدالمجید خان۔ برہان پور

س۔ خورشید بھیا! آج کل فرقہ پرستی کا زور کیوں ہے؟

ج۔ اس لئے کہ فرقہ پرستی کی آگ کو ہوا دینے والے یہ بھول گئے ہیں کہ فرقہ پرستی کی آگ مُلک کے خرمن کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔ فرقہ پرستی کا طوفان مُلک کے سفینے کو ڈبو دے گا۔

س۔ خورشید بھیا! روحانی خوشی کب ملتی ہے؟

ج۔ دوسروں کو خوشی دے کر۔ دوسروں کو خوش کر کے۔

اے۔ سردار۔ بنگلور

س۔ انسان اپنی دُنیا کا آپ خالق ہوتا ہے یا مالک؟

ج۔ انسان اپنی دُنیا کا آپ خالق ہوتا ہے لیکن اکثر حالات اُس کی دُنیا کا مالک کسی اور کو بنا دیتے ہیں۔

س۔ عورت کے مساوی حقوق سے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ عورت کو مردوں کے برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ عورت کو کمتر سمجھنا مردوں کی تنگ دلی ہے اور بے انصافی بھی!

س۔ "زن بے وفا است" اِس مقولہ میں کہاں تک صداقت ہے؟

ج۔ ایک فیصد بھی نہیں! یہ کسی تنگ دل، کم نظر کا قول ہوگا۔ عورت کو بے وفا کہنا حقیقت کو جُھٹلانا ہے۔

خورشید شیدائی۔ کلکتہ

س۔ دنیا گول ہے، اس کا کیا ثبوت ہے؟

ج۔ بندہ نواز! شنیدہ کے بود مانند دیدہ؟ دُنیا آپ سے دور ہے۔ آپ ... پھر کر دیکھ لیجئے۔ آپ جہاں سے چلے تھے پھر وہاں آجائیں گے۔

س۔ حُسن کیا ہے؟

ج۔ ایک پُر نور دلکش ... سے ... کے ... خود حُسن حقیقت نہیں دھوکا ہے نظر کا

س۔ وہ کون سا تھیلا ہے جسے بھرتے جایئے اور خالی ہوتا جائے گا۔

ج۔ غریب کا پیٹ۔ حریص امیر کا دل!

امام الحق صدیقی۔ نبڈیل۔ کلکتہ

س۔ ترقی کا راز؟

ج۔ انتھک جدوجہد!

س۔ کوئی مزاحیہ شعر سُنا کر ہنسنے پر مجبور کیجئے۔

ج۔ ہنسنے پر مجبور ہوا تو آپ کے ذوق کی بات ہے شعر سُنئے

مہنگائی میں کیوں پھاڑتے دامان و گریباں
عاشق تھے، مگر قیس کے انکل تو نہیں تھے

مظفر بیدری

س۔ شادی سے پہلے کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے

ج۔ شادی کی ذمہ داریاں اُٹھانے کا حوصلہ پیدا کیجئے

س۔ بھائی جان! اگر محبت کی شادی کامیاب ہو گی

ج۔ محبت کی شادیاں بہت کم کامیاب ہوتی ہیں۔ شادی کے بعد جو محبت ہوتی ہے وہ مستحکم ہوتی ہے۔

صالحہ زیدی۔ لاہور

س۔ بھائی جان! یہ شعر کس کا ہے ؎

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دُنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

ج۔ مجازؔ کا۔

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر خوشتر گرامی ——— مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائٹل ہاشت پریس ... بازار دہلی ——— دفتر رسالہ بیسویں صدی ...



ڈ حُسن کی تمکنت حجاب سے ہے

فوٹو:۔ ٹی۔ نریندر پال سنگھ۔ دہلی

Telephones: Office 271637 Residence: 619927




iswin Sadi
ELHI
29(3)

appeared in year
sensibly, clearly,
how to recognize
to grow out of th
and understand in
help them to adju



فرشتہ ہو تو بہک جائے آدمی کیا ہے

فوٹو۔ محفوظ شاہد۔ لاہور

mean concretely in e
New Y

Dr. Overstreet's bo
clarity, wholeness o
someness of intent.
less than the good

کلا
این ایڈ
نمبر ۸ کوا



دھوپ چھاؤں

فوٹو۔ محفوظ شاہ۔ لاہور



حسنِ سوگوار

فوٹو: محمد شاہد ۔ لاہور

ایڈیٹر خوشتر گرامی

جلد ـــــ ۲۹
نمبر ـــــ ۳



قیمت فی پرچہ
۷۵ پیسے
پتہ

تیرونشتر

"دلی کو یو۔پی سے مزید دودھ ملے گا" ایک خبر ——— دلی کو دودھ دینے کے لئے شریمتی سچیتا کرپلانی کا شکریہ۔

"خوراک اور بیکاری کے مسئلوں کو حل کرنا ضروری ہے" شری کامراج ——— اس لئے کہ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خالی بیٹھا آدمی زیادہ کھاتا ہے۔

"اڑیسہ کے بعض لیڈر وزارتوں کو موروثی جائیداد سمجھتے ہیں" ایک عنوان ——— جو انھیں جیل جانے کے سلسلہ میں ملی ہے۔

"ہندوستانی صنعتوں کی نمائش" ایک خبر ——— ان میں رشوت خوری۔ گراں فروشی۔ اقربا پروری۔ خویش نوازی اور ملاوٹ کی ترقی یافتہ صنعتیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

"وید اور حکیم اپنے اپنے نام رجسٹر کرائیں" ایک خبر ——— تاکہ پتہ چل سکے کہ قبرستان کی آبادی اور شمشان بھومی میں راکھ کے ڈھیر کون بڑھا رہا ہے۔

"عوام کو روٹی کپڑا اور مکان مہیا کرو۔ کانگرس کے کھلے اجلاس میں مطالبہ" ایک خبر ——— کیا کانگریسوں کو عہدوں کی الاٹمنٹ سے بھی پہلے۔

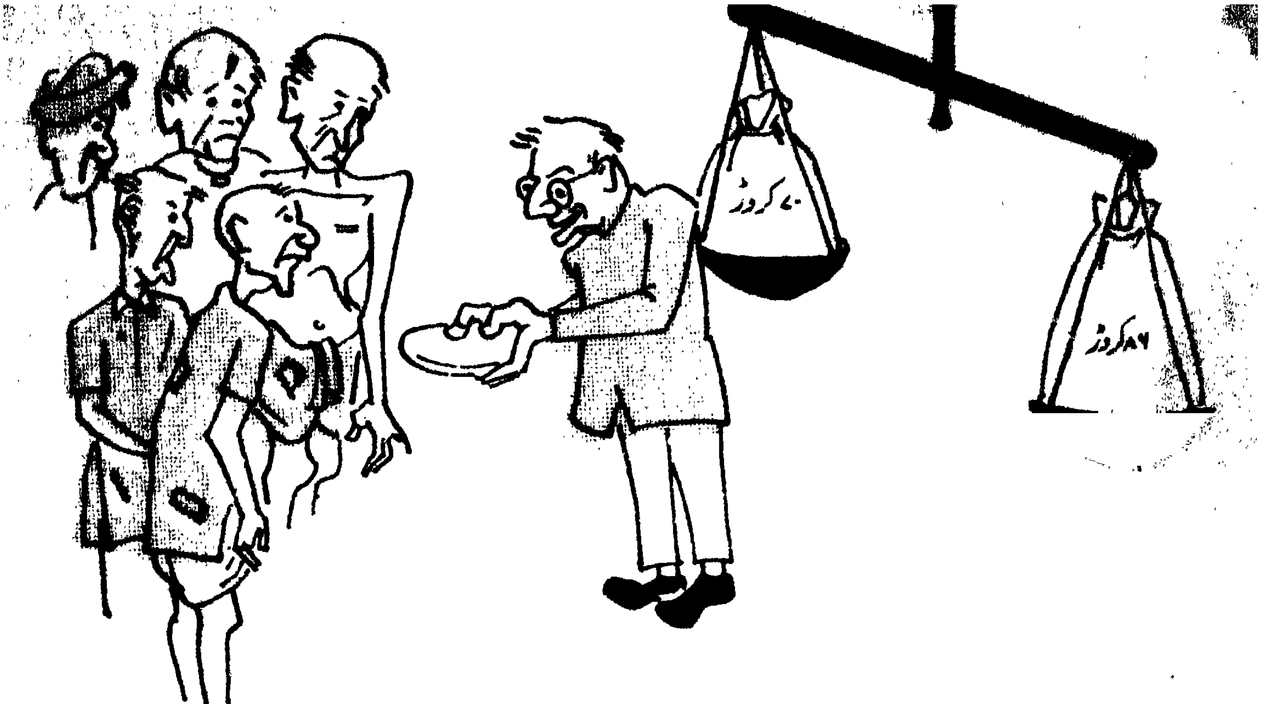
"سوشلزم کا مقصد عوام کا معیار بلند کرنا ہے" ایک مقالہ ——— بس اتنی بات ہے تو وہ انھیں قطب مینار پر چڑھا کر بھی بلند ہو سکتا ہے۔

"چاول اور دالوں کا ملنا بہت دشوار ہو گیا" ایک خبر ——— کوئی حرج نہیں کیک۔ پیسٹری۔ انڈا۔ مچھلی۔ کباب اب بھی بہ آسانی مل جاتے ہیں۔

"ہمارے سرکاری کارخانے" ایک عنوان ——— کرپشن کی پیداوار بڑھا رہے ہیں۔



"ہند سرکار ہنگامی پلان پر غور کر رہی ہے" ایک خبر ——— جسے منافع خور ہنگامی طور پر تار پیدا کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔



"مرکزی اخراجات میں ستر کروڑ کی کمی کے باوجود ۸۶ کروڑ کا گھاٹا": ایک خبر —— نئے ٹیکس لگانے کے لئے معقول جواز۔

"سیکولر ملک ہیں!": ایک عنوان —— ہندو مہاسبھا۔ جن سنگھ۔ اکالی۔ مسلم لیگ سبھی کچھ ہے ہمارے۔

"بھوک ہڑتال": ایک عنوان —— ہڑتال عام ہو جائے تو وزیر خوراک اُس کی ہر طرح سے ہمت افزائی فرمائیں گے۔

"طلباء ہڑتال کے جذبے کو خیرباد کہہ دیں": ایک عنوان —— مگر ایک شرط ہے کہ انھیں پھر پڑھنا نہ پڑے بلکہ بغیر پڑھے سند مل جائے۔

"حالات کتنے ہی خراب ہوں مایوس نہ ہونا چاہیئے": ایک عنوان —— کبھی نہ کبھی آپ کے حصے میں بھی وزارت۔ سفارت۔ کوٹا یا پرمٹ آہی جائے گا۔

"جنتا کالونی میں فساد": ایک خبر —— جنتا راج کے نظارے۔

"گورے گاؤں میں پولیس": ایک خبر —— اور کالے گاؤں میں ڈاکو۔

"دیش میں چھپا ہوا دھن": ایک عنوان —— پتہ لگانا ہے تو کھدر مارکاؤں کے یہاں تلاش کیجئے۔

"کامراج سے کوئی اختلاف نہیں": شری شاستری کا اعلان —— بلکہ اُن کا تو میں ہمیشہ شکر گذار رہوں گا۔

"عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ کم کیا جائیگا": ایک خبر —— مگر نئے ٹیکس لگاکر۔

"یہ گھڑی ہمارے لئے امتحان کی گھڑی ہے": صدر کانگرس —— اسمیں وقت کا پتہ نہیں چلتا۔

"مریخ پر زندگی موجود ہے": ایک خبر —— اسی لئے تو دنیا پر مُردنی چھا رہی ہے۔

"ہندوستان کی سب سے مقبول صنعت": ایک عنوان —— کرپشن جو پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر دونوں میں چل رہی ہے۔

"طلبہ صرف ہندی میں حقیقی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں" دہلی کے ایک کالج میں مرارجی ڈیسائی کا اعلان ——— اور وہ بھی صرف گولڈ کنٹرول اور عوام لازمی بچت اسکیم کی۔

"ہندوستان میں کشتی لڑنے کا معیار بلند کرنے کی کوشش" ایک عنوان ——— اس کی کیا ضرورت ہے یہ تو سیاسی لیڈروں کی دن رات کی کشتیوں سے بڑی تیزی سے نہ صرف بلند ہو رہا ہے بلکہ فروغ بھی پا رہا ہے۔

"چینیوں کا سفید جھوٹ: ہند کا ماننے سے انکار" ایک عنوان ——— سفید نہیں، زرد چینیوں کا پیلا جھوٹ۔

"فیملی پلاننگ دو پہیوں والی گاڑی" ڈاکٹر سوشیلا نایر کا نظریہ ——— جس میں سوار ہو کر میاں بیوی اولاد سے محروم ہو سکتے ہیں۔

"ملک کے اندر غذائی بحران نہیں بلکہ قیمتوں کا بحران ہے" مسٹر کرشنا مینن کا بیان ——— ٹھیک اسی طرح جیسے آپ کے دورِ وزارت میں چینی حملہ کبھی نہیں ہوا بلکہ سرحدی خلاف ورزی ہوئی تھی۔

"سینما کا شوقین سردی کا شکار" ایک خبر ——— شہیدِ ناز ہو گیا۔ سردی تو ہر سال آتی ہے۔ فلم پھر ملتی نہ ملتی۔

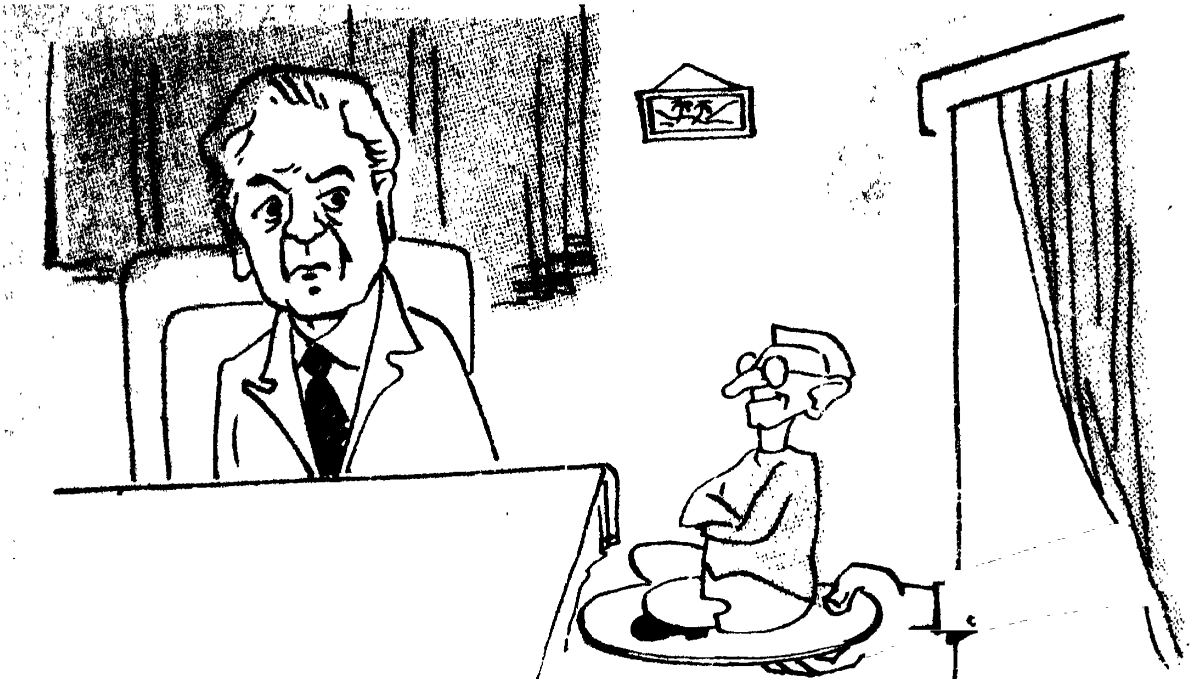
"کانگرس اجلاس میں حکومت کی غذائی پالیسی پر نکتہ چینی" ایک عنوان ——— اجلاس میں کھانے کا انتظام اچھا نہ ہونے کا نتیجہ۔

"گراں فروشوں کے ساتھ سختی سے نپٹا جائے گا" حکومت کا اعلان ——— مگر گرانی اس سے پہلے عوام سے نپٹ چکے گی۔

"دلی میں گیہوں کے بھاؤ گر گئے" ایک خبر ——— گیہوں کا دانہ ایک نہ گرا کہ کسی بیچارے غریب کا بھلا ہو جاتا۔



"تبت کے لئے پنچن لامہ کی جگہ خالی" ایک عنوان ——— کامریڈ گوپالن درخواست ڈال دیں۔



"لندن میں سونے کی قیمت میں اضافہ" ایک خبر ——— برطانوی حکومت شری مرارجی ڈیسائی کو وزارت میں شامل کرے۔ وہ گولڈ کنٹرول نافذ کر کے سب ٹھیک کر دیں گے۔

"طلبا کو انتظامی صلاحیت کی تعلیم دی جائیگی" شری چیاگلا کی تقریر ——— اس سے پیشتر آج کل اُن کے ہنگاموں، ہڑتالوں اور استادوں کے ساتھ گستاخیوں میں بڑی بد انتظامی ہوتی ہے۔

"پولیس نظم و نسق کو بہتر بنانے کے اقدامات" ایک عنوان ——— چوروں کو پولیس کی تربیت کے لئے انسٹرکٹر مقرر کیا جائیگا۔

"نئے ٹیکسوں کی گنجائش کہاں ہے" کامراج ——— پرانے ہی ٹیکسوں نے کچومر نکال دیا ہے۔

"مہاراشٹر کے متعدد وزرا اناج کی خریداری کے لئے روانہ" ایک خبر ——— خدا کرے چار چار گھنٹے لائن میں کھڑے ہوں۔ دھکا پیل کا ذائقہ چکھیں۔ پولیس [illegible] ڈنڈے کھائیں اور پھر خالی ہاتھ واپس آئیں۔

"[illegible] داری کس پر ہے؟" ایک سوال ——— بیچارے عوام پر۔

... جو چیزیں خریدتے ہیں اور گرانی کا دکھ سہتے ہیں۔

"قومی تعمیر کے مقصد کے لئے عوام سے رابطہ ضروری" ایک عنوان ... اور اس رابطے کے لئے وزارت ارشاد ضروری تاکہ لوگ [illegible] ری سیپشن کا انتظام کریں جس میں اُن سے رابطہ قائم ہو۔

"خوراک کے جرائم کی روک تھام پر غور" ایک عنوان ——— [illegible] ضرورت خوراک کے استعمال کی روک تھام کی تھی۔

"مال روڈ لاہور کا نام بدلنے کی تجویز" ایک خبر ——— [illegible] اب مسافر روڈ رکھا جائے۔

"لاہور میں ۲۴ گھنٹے کے دوران چوری [illegible]" خبر ——— پورا ریکارڈ، ہماری [illegible]

بیسویں صدی دہلی

"جیل کی مشقت سے تنگ آکر کمیونسٹ روحانیت پسند ہوگیا": ایک خبر
——— یعنی شاعر ——— جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

"صحت یابی کے بعد آپ کے بھائی راجہ مہدی علی خاں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ منگل کے دن چاول نہیں کھایا کریں گے": محترمہ اہرہ کا خط خوشتر گرامی کے نام ——— تاکہ وہ منگل ستارے کے اثرات سے محفوظ رہیں۔

"ڈیفنس کالونی میں کار کی چوری": ایک خبر ——— وہاں ڈیفنس کا یہ عالم ہے تو باقی کیا ہوگا۔

"ہندوستان ایٹم بم کی دوڑ میں شامل نہ ہوگا" شری لال بہادر شاستری کا اعلان ——— اس لئے کہ اسے ابھی تک کوئی اچھا دوڑنے والا گھوڑا نہیں ملا۔

"پچھے ہوئے اناج پر قبضہ": ایک خبر ——— غیر مطبوعہ اناج آزاد ہے۔

"سارا گاؤں لوٹ لیا گیا": ایک خبر ——— رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتے ہیں رہزن کو۔

"تیس آدمی کھانا کھانے کے بعد دم توڑ گئے": ایک خبر ——— یعنی اپنا غذائی مسئلہ حل کر گئے۔

"مرنے کے بعد کیا ہوگا": ایک اشتہار ——— پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا۔

"چین کانگریس سے مطالبہ": ایک عنوان ——— مرنے کے بعد خود شیخ کی قبر بھی استالن کی طرح سے اکھڑوائی جائے۔

"پولیس کے لئے خطرہ کون ہے": ایک سوال ——— ہم آپ سب جو بلیک، منافع خوری، رشوت خوری، رشوت ستانی وغیرہ قسم کے جرائم کرتے ہیں۔



"کانگریس ملک کی سب سے مضبوط جماعت ہے": ایک عنوان ——— اور کانگریس میں ہی ملک کی سب جماعتوں سے زیادہ گڑبڑ، رسہ کشی، اور دھڑے بندی ہے۔

افسانہ

خوشبو سی اُڑی

[illegible]

اے بی [illegible] جالندھر

[illegible] مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

سالنامہ ملا اور بے اختیار مُنہ سے نکل گیا ——

مستیم شوم ششدرم

شاید کسی عالمی ادبی کارنامے کی پرکھ کے لئے یہ الفاظ آپ کے سالنامے ہی کے لئے ہیں۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمایئے —— ایک افسانہ "خوشبو سی اُڑی" ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید ہے قارئین [illegible] کی خاطر قارئین کچھ باتوں کے لئے مجھے معاف کریں گی —— غزل کے بارے میں ایک [illegible] نظر آتا ہے لیکن [illegible] سے پرنٹر [illegible] دور تو ہوگا نا۔ آپ خود ہی سوچئے کہ بعض نام [illegible] کی خاطر آپ بعض [illegible] نہیں چاہتے! —— خدا کرے نیا سال آپ کے لئے صحت اور شادمانی کے پیام لے کر آئے!...

خیر اندیش —— [illegible]

ایک خوشبو سی اُڑی اور بات سارے کالج میں پھیل گئی۔

"شکنتلا کے خشک بالوں کے بڑے سے جوڑے میں دو سبز پتیوں کے درمیان موتیے کا تازہ پھول!"

اور اُس روز کالج کی شاید ہی کوئی ایسی نگاہ ہو جس نے کسی نہ کسی بہانے ریت کے اِس لق و دق صحرا میں اِس پھول کو کھِلتے نہ دیکھا ہو۔

لنچ کے وقفے میں تو سارے پروفیسروں اور لڑکیوں کے پاس صرف ایک ہی موضوع تھا کہ شکنتلا کے گیسوؤں میں اِن دو پتیوں اور سفید پھول کی کیا سگنیفیکنس ہے۔ کون ہے جس نے اُس کی بے آب و گیاہ زندگی کے آنگن میں قدم رکھا ہے۔ کون سے مبارک ہاتھ ہیں جو یہاں تک پہنچ پائے ہیں۔ یا کون ہے وہ خوش نصیب جسے رجھانے کے لئے پرنسپل شکنتلا نے صحرا کی دہلیز پر پھول رکھا ہے۔

جب سے شکنتلا پرنسپل ہو کر کالج میں آئی تھی کسی نے اُسے پلین ریشمی یا سُوتی ساڑی، بغیر ایڑی کے چپل اور کس کر باندھے ہوئے خشک بالوں کے جُوڑے کے سوا کسی اور لباس میں نہیں دیکھا تھا۔ بغیر آرائش کے خالی دیوار کا سا چہرہ جس پر دو ڈری ڈری سی سہمی آنکھیں ہمیشہ جھانکتی رہتیں۔ جن سے آنکھ ملانے کا حوصلہ کبھی کسی لیکچرر یا طالب کو نہ ہوتا تھا۔

جب سے وہ کالج میں آئی تھی کالج کی رنگین زندگی پر اوس پڑ گئی تھی جب تراش خراش کی دلدادہ سٹاف ممبروں کا رنگ و روغن اُس کے سامنے بیٹھے پسینے کی دھاروں میں بہہ جاتا تھا اور کلاسوں میں چہکتی کلیوں کے قہقہے کشا لبوں ہی میں دبک کر رہ گئے تھے۔

جب اِس خزاں دیدہ فضا میں ایک شبنم موتیے کی دو پتیاں اور ایک تازہ پھول نظر آیا تو نظروں ہی نظروں میں کئی سوال ایک سے دوسرے ذہن میں منتقل ہو گئے۔

کیا شکنتلا کی سگائی ہو گئی ہے؟

کیا شکنتلا نے کہیں دل لگا لیا ہے؟

کیا شکنتلا کو کوئی دشینت مل گیا ہے؟

کیا شگفتہ اس خشک زندگی سے اُکتا گئی ہے؟

دوسرے دن جب شگفتہ کالج آئی تو اُس نے دھوپ چھاؤں سفید کی نہایت عمدہ جارجٹ کی ساڑی پہن رکھی تھی اور موتیے کا ایک سفید پھول اپنی جگہ پر اسی طرح مسکرا رہا تھا۔

"رضیہ! تم بے شک نفسیات کی پروفیسر ہو اور میں حساب کی لیکچرر، لیکن میں شرط سے کہہ سکتی ہوں کہ پرنسپل شگفتہ کی کہیں انگیجمنٹ ہو گئی ہے۔" شائستہ نے کالج کے اندر دل میں کھڑی پروفیسر رضیہ پراچہ سے بات شروع کی۔

"تمھیں دوسروں کی سگائی بیاہ کی خبریں لانے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ شاید تم چھ برس سے یہاں بورڈ پر چاک اور انگلیاں گھس گھس کر مر رہی ہو۔ تمھارے اپنے ذہن میں اس کے سوا کوئی اور انگیجمنٹ نہیں ہوتی۔" مس پراچہ نے شائستہ کو چڑانے کی کوشش کی۔ شائستہ کا چہرہ ایکدم اُتر گیا اور وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"رضیہ! مجھے کسی سے شوق نہیں۔ میرا تو معاملہ ہی الگ ہے۔ جو مجھے پسند ہے، میرے والدین کو پسند نہیں اور جو انھیں پسند ہے وہ مجھے ناپسند۔ پھر یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے۔ جب کوئی اس کشتی میں سوار ہوتا ہے تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔"

"لیکن میں کہتی ہوں، اگر شگفتہ کی کہیں سگائی ہو گئی ہوتی تو وہ اس کا ذکر اپنی جیسی کلاس فیلو مس پریم چندھا سے ضرور کرتی۔ وہ تو پرنسپل کا کھایا پیا تک جانتی ہے۔"

"تو آؤ مس چندھا سے پوچھ ہی لیں۔ وہ مجھ سے تو کچھ چھپانے کی نہیں۔" اور شائستہ رضیہ کو لے کر مس چندھا کے کمرے کی طرف چل دی۔

مس چندھا اپنے کمرے میں بیٹھی پرچے دیکھ رہی تھی۔ دونوں کو آتے دیکھ کر بولی۔

"آج خیر تو ہے بہت مسکراتی چلی آتی ہو؟"

"ایک اُلجھن میں گرفتار ہیں۔ سوچا چلو تم سے مدد لیں۔" شائستہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"کچھ کہو بھی تو؟" مس چندھا نے کچھ پریشان ہو کر پوچھا۔

"پوچھنا یہ تھا کہ پرنسپل کی انگیجمنٹ کہاں ہوئی ہے؟" شائستہ نے بات آخری کڑی سے شروع کی۔

مس چندھا کھلکھلا کر ہنسی۔ "کمال کی چیز ہو شائستہ تم بھی! ساتویں آسمان کی خبر رکھتی ہو۔ میں کہتی ہوں تمھارے اس ہندوستان میں لڑکیوں کی انگیجمنٹ یا میرج ہی ہوتی ہے یا کچھ اور بھی ہوتا ہے۔ اس نیوکلیر ایج میں کسی سپوتنک کی بات کرو۔ عالمی کشیدگی اور تخفیف اسلحہ کی بات کرو۔ ملک میں غذائی بحران کی فکر کرو۔ لیکن تم پڑھ لکھ کر بھی مڈل ایج کی شادی بیاہ کی دلچسپیوں سے باہر نہیں آ سکیں۔ آخر کیا رکھا ہے اس مجلسی رسم میں کہ پرنسپل جیسی دانشمند لڑکی کسی کے ہاتھ میں غلام ہو جائے۔ آخر تم نے کس شیخ چلی سے یہ بے پر کی سُن لی۔ ہمیں تو اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔"

"مس چندھا! تم کون سے احمقوں کے بہشت میں رہتی ہو۔ تم اگر آنکھیں موند لو تو کیا دنیا میں کچھ ہوگا نہیں۔ اور نہ اگر کانوں میں انگلیاں دے لو تو تم سمجھتی ہو کوئی کچھ کہے گا نہیں۔ اس بات کا علم تو کالج کی ایک ایک لیکچرر اور ایک ایک سٹوڈنٹ کو ہے۔"

"لیکن اس کا ثبوت کیا ہے مس شائستہ لال بجھکڑ؟"

"ثبوت تو وہ تبدیلیاں ہیں جو تین دن سے مس شگفتہ میں دکھائی دے رہی ہیں۔ یہ موتیے کے پھول، یہ نئی ساڑیاں، یہ اونچی ایڑی کے سینڈل۔ تاڑنے والے تو قیامت کی نظر رکھتے ہیں میری سیدی!" رضیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کہتی ہوں کہ تم لڑکیاں سماج سے فریب کرتی ہو۔ تم بے شک شادی کے نام سے بدکتی ہو۔ آزاد فضاؤں میں اُڑانیں بھرنے کے سپنے دیکھتی ہو۔ کوئی سگائی رشتے کا نام لے تو ناک بھوں سکیڑنے لگتی ہو لیکن بنیادی طور پر ابھی تم ایک ورڈ ہو۔ شادی کا خیال ہمیشہ تمھارے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ میرے خیال میں شائستہ! کسی کی بارات کے باجے کی آواز سن کر ہی تمھارے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہوں گی۔ اور اب کوئی اور موضوع سخن نہیں تو درویش صفت شگفتہ ہی سہی۔ جاؤ کچھ قوم کی اس امانت کی فکر کرو جو ان کے والدین نے تمھیں سونپ رکھی ہے۔"

"ہم تم سے لیکچر سننے نہیں آئیں۔ ایک خبر کی تصدیق کرنے آئی ہیں۔ اگر تمھیں علم نہیں تو جا کر اپنی سہیلی سے پوچھ لو۔ اگر میرا قیاس غلط ہو تو میں سائیکالوجی پڑھانا چھوڑ دوں گی۔" رضیہ نے شرط کے طور پر ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے بھی شگفتہ کے جوڑے میں پھول ضرور دیکھا ہے لیکن اس کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکی۔ اچھا میں آج بات کروں گی اور کل تمھیں بتاؤں گی۔"

رضیہ اور شائستہ کے جانے کے بعد پریم پرچے دیکھتے دیکھتے سوچنے لگی۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ شگفتہ نے یہ راز اُسے بتانا ٹھیک نہ سمجھا ہو۔ اور کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ شگفتہ نے اس خشک زندگی سے اُکتا کر زندگی کو ایک نئی ڈگر پر لانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ لیکن ایسا سوچتے سوچتے اُسے وہ دیوار منہدم ہوتی دکھائی دینے لگی جس کے سہارے وہ کھڑی تھی۔ شگفتہ ہی تو اس کے جذبات کا سہارا تھی جسے دیکھ کر وہ اپنے آپ کو ڈھارس دے لیا کرتی تھی کہ اگر اُس نے شادی نہیں کی تو کیا ہوا۔ پرنسپل تو عمر میں اُس سے دو برس بڑی ہی ہوگی وہ بھی تو کنواری ہی ہے۔

•

وہ جلدی سے اُٹھ کر الماری کے سامنے لگا آئینہ دیکھنے لگی۔ اپنے دائیں رخسار کے نچلے حصے پر ہونٹ کے خمیدہ گوشے کے قریب پڑی ایک بڑی سی جھری کو انگلی سے مسلتے ہوئے وہ سوچنے لگی۔ کیا یہ جھری غائب نہیں ہو سکتی؟ کیا گزرتا ہوا وقت لوٹ نہیں سکتا؟ اس کے چہرے پر جھریاں ڈالتا جائے گا۔ اُس نے کیوں نہ پہلے ہی کوئی سہارا ڈھونڈ لیا۔ ہائے وہ کیا خوبصورت

...تھا ہی۔ تردید کی۔ لیکن براہمن اور کھتری کی بحث میں اُلجھ کر اُس نے وہ شکایت ٹھکرا دینے کی بے وقوفی کی۔

...اور شانتا کے جانے کے بعد وہ دھیان سے پرچے نہ دیکھ سکی۔ بار بار نمبر غلط ہو گیا۔ اُس نے پرچے اُٹھا کر الماری میں پھینک دیئے اور خود پرنسپل کے کمرے میں چلی گئی۔

شکنتلا کسی وزیٹر سے بات کر رہی تھی۔ پریم کرسی پر بیٹھی شکنتلا کے چہرے کا بغور جائزہ لیتی رہی۔ اُسے محسوس ہوا کہ واقعی شکنتلا کے چہرے پر نیا نکھار نئی تازگی ہے۔ اُسے شکنتلا کے ہونٹ بھی رنگین ہوتے دکھائی دینے لگے اور وہ ملاقاتی کے جاتے ہی بول اُٹھی۔

"تم کون سی لپ سٹک استعمال کرتی ہو۔ بہت نیچرل کلر ہے اس کا۔ بہت پھب رہی ہے تمہارے چہرے پر!

"کیا کہہ رہی ہو پریم۔ کہیں سے بھنگ پی کر تو نہیں آ گئیں۔ یا یونہی بہک گئی ہو؟"
شکنتلا نے بڑے تعجب سے لیکن قدرے درشت لہجے میں کہا۔

"تمہارا کچھ قصور نہیں ہے ریدی! دریا میں ایک دن تو طغیانی آتی ہی ہے اور جب طغیانی آئے تو اُس کا کناروں سے چھلک جانا ہی اچھا ہے ورنہ طغیانی کو طغیانی تو کیا کوئی اہر تک نہ کہے گا۔"

"دیکھ، یہ کیا پہیلی ہے پریم! جلدی سے کہو اگر کوئی ایسی باتیں سن لے تو؟"

"سنتا ہے تو سن لے۔ جو آج نہ سنے گا اُسے کل معلوم ہو جائے گا۔"

"کچھ منہ سے پھوٹو نے کی بھی اِکا لو نہ تجھے یہار رہے؟" شکنتلا نے بناوٹی غصے میں کہا۔

"بات یہ ہے میری پرنسپل صاحبہ! کہ کالج میں بچے بچے کی زبان پر یہ افواہ ہے کہ کسی دشمنت نے آکر شکنتلا کو تیرِ نظر سے بیندھ ڈالا ہے۔"

"کیا بکتی ہو؟"

"بکتی یہ ہوں کہ میری ریدی کی کشتی کو کنارا مل گیا ہے۔"

"کیوں جھوٹ کہتی ہو؟"

"جھوٹ یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں شکنتلا کی سگائی ہو گئی ہے۔"

"مگر تمہیں کیسے معلوم ہے؟" شکنتلا تھکاوٹ سی محسوس کرتے ہوئے واپس کرسی پر بیٹھ گئی۔

"چاند نکلے گا تو کس سے چھپا رہے گا۔ مشک ہو گا تو خوشبو کہاں دبی رہے گی۔"

"تم ماڈرن خیالات کی مالک ہو کر یہ کیا جھوٹ کہہ رہی ہو۔ سو فیصدی جھوٹ!"

"میں نہیں کہہ رہی ہوں سارا کالج کہہ رہا ہے۔ تین دن سے یہی افواہیں کالج کے ہر کمرے میں چکر لگا رہی ہیں اور تم ہو کہ دعوے تو دوستی کا کرتی ہو اور دایہ سے پیٹ چھپایا جا رہا ہے۔"

"لیکن اِس بات کا کوئی ثبوت؟" شکنتلا نے جھنجھلا کر میز کو ٹھوکیں سے ٹھیک تھامتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ سب غلط ہے تو تمہارے ہونٹوں پر یہ لپ سٹک کیسی ہے؟"

"یہ تمہاری نظر کا دھوکا ہے!"

"اگر یہ نظر کا دھوکا ہے تو تمہارے بالوں میں یہ سبز پتیاں اور موتیے کا پھول کون لگا دیتا ہے؟"

شکنتلا جواب دینے کی بجائے کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اُس کا چہرہ حیا کی سُرخی سے گلابی ہو گیا اور وہ کہنے لگی۔ "سنو میری لاڈو! وہ تمہاری نظر کا دھوکا تھا تو یہ تمہاری عقل کا دھوکا ہے۔ ایک دن میں کنگھی کر رہی تھی کہ کوٹھی کی ملازمہ باغیچے سے آئی۔ اُس کے ہاتھ میں موتیے کی دو پتیاں اور ایک پھول تھا۔ میں نے جوڑا باندھا تو اُس نے یہ پھول اُس میں اڑس دیا۔ میں اُس کی اس گستاخی پر تڑپ اُٹھی۔ میں چاہتی تھی کہ اُس کے منہ پر طمانچہ دے ماروں لیکن وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ "مالکن! آپ کے یہ بہت اچھا لگتا ہے۔ میرے لئے اسے آج کے دن لگائے رکھئے۔" اُس کی آنکھوں میں ایک اَن مٹ پیاس ایک انجانی سی تمنا دیکھ کر میں نے اُسے کچھ نہیں کہا۔ اور دن بھر پھول لگائے رکھا۔ پھول کی بھینی بھینی خوشبو کا ایک احساس سارا دن مجھ پر چھایا رہا اور دوسرے دن جب وہ پھول لائی تو میں نے اُسے لگانے سے انکار نہیں کیا۔ بس اتنی سی بات تھی جسے تم نے دشمنت کا تیر اور نہ جانے کیا کچھ بنا ڈالا۔"

"اچھا جی! تو لگے ہاتھوں اس نفیس جارجٹ کی ساڑی کی بھی وضاحت ہو جائے۔ یہ کون سا پرندہ کس سٹور سے اُٹھا کر لایا تھا؟"

"کتنی عجیب لوگ ہو تم بھی ایک ایک چیز پر نگاہ رکھتی ہو۔ بات پھر اُسی ملازمہ کی ہے۔ میں نے اُس سے ساڑی مانگی وہ یہ نکال لائی۔ کہنے لگی سفید اور سبز شیڈ کی یہ ساڑی سفید پھولوں اور سبز پتیوں کے ساتھ خوب جچے گی۔ میں نے کہا مجھے کالج جانا ہے، تو وہ بڑے التجا بھرے لہجے میں بولی۔ "وہیں تو اس کا رنگ نکھرے گا۔" اُس کے چہرے پر اُس کی داخلی خواہشات کی جھلک تھی اور میں نے محض اُس کی تسکین کے لئے یہ ساڑی پہن لی۔"

"اور پلین چپل کی جگہ یہ اونچی ایڑی کے جوتے کس کی پسند ہیں؟"
شکنتلا کچھ جواب دینے کی بجائے ہنسنے لگی۔

"کہاں تک لے کے جاؤ گی میری شکست اب دو جواب ... میرا فرض بنتا ہے۔"

"او جو۔ میں کہتی ہوں اگر عقل کم ہو تو کسی سے اُدھار لے لینی چاہئے۔ لیکن لباس کے بارے میں ایک اتھارٹی ہو۔ اتنا نہیں سمجھ سکتیں کہ جب ساڑی ... ویسٹ لائن کو بھدے پن سے بچانے کے لئے اونچی ایڑی کا ...

کوئی شک باقی ہے؟ میرے خیال میں آپ لوگوں کے پیریڈ بڑھا دینے چاہئیں۔ بے کار دماغ افواہیں ہی پھیلاتا رہے گا۔

واپس آکر پریم نے رضیہ اور شانتا کو آڑے ہاتھوں لیا۔ لیکن افواہ تو دھوئیں کا جن ہے جو ایک بار بوتل سے نکل گیا تو واپس بوتل میں نہیں جا سکتا۔ وہ برابر اس ٹوہ میں لگی رہیں۔ کالج کے برآمدوں میں، سٹاف روم میں متواتر موتیے کا پھول اپنی خوشبو پھیلاتا رہا۔

شکنتلا نے کئی بار سوچا وہ پھول لگانا بند کر دے لیکن اسے اب اس سے کچھ ذہنی رغبت سی ہو گئی تھی اور پھر اس نے پھول اتارنے میں اپنی شکست اور افواہ بازوں کے سامنے اپنی سبکی بھی سمجھی۔

اور چند ہی دن بعد آن کی آن میں ایک اور افواہ سٹاف روم کے آتش دان میں چٹخ کر پھیل گئی۔ شکنتلا اور کانتی ورما!

شکنتلا اور کانتی ورما ایک لاجواب جوڑا ہے۔ کا اب تک کسی کو دھیان بھی نہیں گزرا تھا۔

منجیت والیہ بھاگی بھاگی رضیہ کے پاس آئی اور بولی۔

"تم خاک ماہر نفسیات ہو جو آج تک موتیے کے پھول کا راز معلوم نہ کر سکیں۔ سنو! یہ سب کرامات کیمسٹری کے پروفیسر کانتی ورما کی ہے۔ وہی کانتی ورما جو اس اندر سبھا کا شہزادہ گلفام ہے۔ وہی جس کے متعلق تم نے کہا تھا۔ ہائے ری ظالم کی انگلیاں کتنی خوبصورت ہیں! اور جسے دیکھتے ہی شانتا جل بھن جاتی ہے کہ لڑکیوں کے اس کالج میں اس موٹے لنڈورے کو حکومت نے کیوں لگا رکھا ہے۔ کیا کیمسٹری کے لئے کوئی خاتون پروفیسر نہیں مل سکتی۔ میں بتاؤں شانتا کو جلن کس بات کی ہے۔ ایک دن مجھ سے کہتی تھی۔ یہ کانتی بالوں میں کون سا پرم لگاتا ہے۔ دن بھر بالوں کا خم نہیں ٹوٹتا۔"

"میں سب سمجھتی ہوں منجیت۔ تم خود ہی اس پر فریفتہ ہو رہی ہو۔ بات بھی تو کرو، اس کی خوبصورتی ہی کا قصیدہ پڑھے جا رہی ہو۔" رضیہ نے منجیت کی طرف اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کیا تم نے پرسوں شام کانتی کو دیکھا تھا؟ میں کہتی ہوں شانتا اگر اسے دیکھ لیتی تو بے ہوش ہو جاتی۔ اس نے ڈارک براؤن ٹریلین کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر سے پاؤں تک نفاست میں نہایا ہوا۔ بارش کے بعد پیپل کی کونپلوں کی طرح خوبصورت! میں تو اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

سائنس کی لڑکیوں کا ایک گروپ فوٹو تھا۔ پرنسپل اور کانتی درمیان میں کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ ہائے رام کیا خوبصورت جوڑا تھا جسے کالج کی نوخیز کلیوں نے گھیر رکھا تھا۔"

"لیکن اس میں شک کی کیا بات ہے۔ ایسی تصویریں تو کالج میں روز ہی اترتی ہیں۔" رضیہ نے پوچھا۔

"تم ایم اے کرنے کے بعد بھی بچی ہی ہو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کانتی کے کالر کے فلاور ہول میں بھی موتیے کی ایک سبز پتی آویزاں تھی۔ تم تو سائیکالوجسٹ ہو۔ ذرا اندازہ لگاؤ نا؟"

موتیے کی ایک پتی ...... یعنی تجویز

موتیے کی دو پتیاں ...... یعنی منظور

"او گڈ گاڈ۔ یو منجیت۔ تم تو تجریدی آرٹ کی دقیق ترین تشریح سے بھی آگے نکل گئیں۔" رضیہ نے منجیت سے زور سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں نئی افواہ کو جھنڈے کر شانتا کے پاس پہنچیں۔ شانتا تو جیسے اس صدمے سے سکتے میں آ گئی لیکن سنبھلتے ہوئے بولی۔ "آؤ پریم کے پاس چلیں۔ بڑی آئی تھی ہمیں جہاز چلانے۔ البتہ داد دینی پڑے گی شکنتلا کے چوائس کی کیا چیز پر ہاتھ رکھا ہے۔ خدا کی قسم اب اسے ملازمت چھوڑ کر پھر اپنا برش اور رنگ سنبھال لینے چاہئیں اور زندگی کی ساری خوبصورتی کینوس پر اتار لینی چاہئے۔ کسی نے آج تک سوچا بھی نہ تھا کہ ریشوں کی بند کھڑکیوں کے اندر چھپا ہوا یہ شگوفہ جو دن بھر مائیکروسکوپ پر ہی جھکا رہتا ہے محبت کرنے والا دل بھی رکھتا ہوگا۔"

پریم نے سنا تو وہ حیران رہ گئی۔ کالج میں سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ اگر یہ افواہ درست تھی تو شکنتلا کا انتخاب لاجواب تھا۔ وہ اسے مبارکباد دینا چاہتی تھی لیکن اگر یہ افواہ بھی غلط ہوتی تو اسے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ شاید انضباطی کارروائی ہی ہو اور اگر شکنتلا نے اسے جھڑک کر کمرے سے باہر نکال دیا تو سارے کالج میں بڑی بدنامی ہوگی۔

سائنس گروپ کی تصویریں کر آگئی تھی۔ شکنتلا تصویر سامنے رکھے مسکرا رہی تھی۔ اس کی ملازمہ لاجو ٹھیک ہی کہتی تھی۔

"بی بی جی! آپ کے بالوں میں یہ پھول اور پتیاں بہت خوبصورت لگتی ہیں۔"

واقعی وہ تصویر میں پہلے سے کتنی بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اور پھر وہ پریم کی باتیں یاد کر کے ہنسنے لگی۔ یہ عورتیں بھی کیا خوب چیز ہیں اتنی سی بات کا افسانہ بنا دیتی ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان میں سے بہت سی ابھی میری طرح کنواری ہیں۔ اور عورت جب تک کنواری رہے، شادی کا خیال لاکھ دور بھگانے پر بھی اس کے ذہن پر چھایا رہتا ہے۔ خیر اس سے باتیں کرنے میں خوب مزہ رہا۔ مجھے وضاحت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اس رومانس کو چلتے رہنے دینا چاہئے تھا۔ اور سننا چاہئے تھا کہ اور کیا کیا شگوفے پھوٹتے ہیں۔ میرا خیال ہے ان افواہوں کے پیدا کرنے والوں کے ذہن کا تجزیہ کیا جائے تو حیرت انگیز انکشافات ہوں۔ لیکن یہ افواہیں بھی تو ان کے اندازِ فکر کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ شکنتلا کو کسی دہشت نے آگھیرا ہے۔ یہ ساڑی،

یہ اونچی ایڑی کے جوتے کس کی پسند ہیں؟ اور یہ پھول یہ پتیاں!

شگفتلا کا جی چاہا، وہ زور سے قہقہہ لگائے لیکن دل میں ایک گدگدی سی ہو کر رہ گئی۔ جیسے اُسے کوئی چھیڑ رہا ہو۔ اُس کا جی چاہا وہ پریم کو بُلا کر پوچھے۔ اب اُس کے بارے میں کیا باتیں ہوتی ہیں۔ اب کون سی افواہ اُڑتی ہے۔ اور اُس نے غیر ارادی طور پر گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

"مِس پریم چندرما کو بُلا دو۔" چپراسی سر جھکائے باہر چلا گیا۔

پریم چندرما کے داخل ہوتے ہی شگفتلا بول اُٹھی۔ "دیکھو پریم! تم میری محبت اور دوستی کا ناجائز فائدہ اُٹھا رہی ہو۔ سیکنڈ کوارٹر کے امتحان میں تمھاری کلاس کی چھتیس میں سے تیئیس لڑکیاں فیل ہیں۔"

پریم شگفتلا کے چہرے پر تیوریاں دیکھ کر گھبرا گئی لیکن کچھ سنبھل کر بولی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کل تو آپ کہہ رہی تھیں پرچے آپ نے ابھی نہیں دیکھے۔ رات کی رات میں سب لڑکیاں کیسے فیل ہو گئیں؟"

"اچھا چھوڑو، لڑکیوں کی اس نالائقی کو۔ بتاؤ کیا پیو گی۔ ایک ایک کپ چائے ہو جائے۔"

دونوں خاموشی سے چسکیاں لیتی رہیں۔ پھر شگفتلا مسکراتے ہوئے بولی۔

"اتنے دنوں میں کوئی اور افواہ نہیں پھیلی کیا؟"

"پھیلی تو بہت کچھ ہے۔ لیکن آپ پروں پر پانی کہاں پڑنے دیتی ہیں۔ اُلٹا مجھے ناراض کریں گی۔"

"کہو بھی تو" شگفتلا نے پیار سے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن پہلے مٹھائی منگواؤ۔"

"کس بات کے لئے؟"

"افواہ سننے کے لئے۔"

"خوب بہت خوب! بڑی ڈھیٹ ہو گئی ہو۔ جیسی افواہ ویسی مٹھائی۔ پہلے افواہ سناؤ۔ اب سہیلیوں نے کون سے آسمان کی خبر دی ہے؟"

"شگفتلا جی! آپ مجھے بنا رہی ہیں۔ ورنہ میں سب سمجھتی ہوں۔ یہ چہرے پر آج مسکراہٹیں بے سبب نہیں۔"

"مطلب؟" شگفتلا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ آپ کسی کی ہو گئی ہیں۔ تازہ افواہ یہ ہے۔"

"کس کی؟" حیرانی سے شگفتلا کی آنکھیں کھل گئیں۔ بھویں تن گئیں۔

"پروفیسر کانتی ورما کی!"

"کیا کہہ رہی ہو پریم!" شگفتلا مٹھیاں بھینچتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ چائے کا پیالہ فرش پر گر گیا۔ اور وہ غصے میں چیخی۔ "جھوٹی، مکار کہیں کی! میری دوستی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر تمھارا حوصلہ اتنا بڑھ گیا ہے۔ خبردار جو ایک لفظ بھی مُنہ سے نکالا! تم لوگوں کی اتنی جرأت۔ بے کار بیٹھے کیچڑ اُچھالنے کے سوا کوئی کام نہیں۔ شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے؟ تم میری دوست نہ ہوتیں تو ابھی دھکے مار کر باہر نکلوا دیتی۔ خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے اسی وقت چلی جاؤ۔ اور پتہ لگا کر دو کہ اس افواہ کا منبع کیا ہے۔ میں ایسی سازش میں شریک تمام ٹیچرز سے جواب طلب کروں گی۔ خبردار جو آئندہ مجھ سے ضرورت سے زیادہ بات کرنے کی کوشش کی! غضب خدا کا جس سے ذرا اچھا سلوک کرو وہی نگل جانے کی کوشش کرتا ہے۔"

پریم خاموشی سے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ فضا ایک دم بوجھل ہو گئی۔ شگفتلا نے اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ پھر زخمی شیرنی کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اُس کا اُبلتا ہوا ذہن ان لڑکیوں سے بدلہ لینے کی سوچتا رہا۔ پھر وہ کرسی پر آ کر بیٹھ گئی اور سامنے رکھی ہوئی تصویر کو لفافے میں بند کر کے سوچنے لگی۔

شگفتلا اور کانتی ورما!

اس سے بڑھ کر تہمت اور کون سی ہو سکتی ہے۔ شرم نہیں آتی ان لوگوں کو۔ لیکن اس افواہ کا ماخذ کیا ہو سکتا ہے؟

وہ پھر تصویر سامنے رکھ کر بیٹھ گئی ...... سوچنے لگی۔

یہ معصوم لڑکیاں۔ نہیں نہیں وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتیں۔

پھر کانتی ورما۔ نہیں نہیں اُسے یہ گمان نہیں ہو سکتا۔ وہ شخص ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔

"سوچ کیوں نہیں سکتا؟" وہ اپنے آپ سے سوال کرنے لگی۔ "ہو سکتا ہے وہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا ہو۔ اگر میں نے اُسے کبھی اس نگاہ سے نہیں دیکھا تو اُس کی سوچوں پر تو پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ وہ جوان ہے خوبصورت ہے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ شاید مجھ سے بھی بہت سی لڑکیاں اُسے پانے کی کوشش کرتی ہوں۔ تو وہ مجھے حاصل کرنے کی کیوں نہیں سوچ سکتا۔ اور بہت ممکن ہے وہی اس افواہ کا منبع ہو۔"

لیکن یہ مجسمۂ شرافت جس نے آج تک کبھی کسی سے ناشائستہ بات نہیں کی ایسی بات کر نہیں سکتا۔ اُس کی تو نگاہ بھی میرے روبرو نہیں اُٹھتی۔ دیکھو کیا بُت سا بنا بیٹھا ہے۔

لیکن اس خاموشی میں قیامت بھی تو پوشیدہ ہو سکتی ہے؟

یہ لباس اُسے کیا پھب رہا ہے۔ ہاں وہ مسکرا بھی رہا ہے۔

اور کالر میں موتیے کی پتی لگی ہے! اور وہ مسکراتے ہوئے سوچنے لگی۔ شاید میرے جوڑے کے پھول کی مہک اُس تک پہنچ گئی ہو۔

شگفتلا ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر مسکرانے لگی۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر موتیے کا پھول تصویر پر رکھ دیا!!

مدیر "بیسویں صدی" کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے ——

غزل

طفیل ہوشیارپوری

عشق میں دل پہ جو حالات گراں گزرے ہیں
وہ سرِ طور، سرِ دار کہاں گزرے ہیں

مشعلِ راہ بنی آپ ہی منزل آکر
جب نظر تیرے قدموں کے نشاں گزرے ہیں

کتنے اشکوں کو ملی آہ کے شعلوں سے جلا
کتنے مہتاب سرِ کاہکشاں گزرے ہیں

ضبطِ غم نے جنہیں تخلیق کیا ہے اے دوست
وہ فسانے تری نظروں پہ کہاں گزرے ہیں

دیکھنا تھا ترا دزدیدہ نگاہی سے مجھے
بزم کی بزم کو کیا کیا نہ گماں گزرے ہیں

بیخودی کونسی منزل پہ مجھے لے آئی
دونوں عالم مری جانب نگراں گزرے ہیں

یہ بھی محسوس ہوا ہے شبِ تنہائی میں
جیسے وہ ہو کے قریبِ رگِ جاں گزرے ہیں

بات کہدے کوئی میہ ساقیٔ دریا دل سے
تیرے میخانے سے ہم تشنہ دہاں گزرے ہیں

شوقِ دیدار لئے دل میں ترے دیوانے
رسن و دار سے بھی رقص کناں گزرے ہیں

لالہ و گل میں بھی تسکین کا پہلو نہ ملا!
دن بہاروں کے بہ اندازِ خزاں گزرے ہیں

(ناتمام)

غزل

کمال ہاشمی

دُنیا کے اسرار و رموز کی ایک سے ایک گرہ کھولوں
بیٹھ کے دل کے آنگن میں جب تنہائی سے بات کروں

جی اُداس ہے، رات سمے ہی کیوں نہ کوئی تدبیر کروں
خود کو اپنی کتھا سناؤں اور یونہی پہروں رو دوں

یہ جنگل، یہ کالے پربت گیان اُجالا کیا دیں گے
کیوں نہ دل کی بات مان لوں، کیوں نہ گھر کو لوٹ چلوں

تیرے دل کا درد تو کیا ہے، اپنا دُکھ محسوس نہ ہو
کیا ہی خوب رہے جو اک دن اپنے آپ کو بھول چلوں

کیا کیا باتیں، کیا کیا یادیں، کیا کیا عالم ہے مجھ میں
جانے کون گھڑی کی گھٹنا، کون صدی کا قصہ ہوں

کیا بتلاؤں، یہی سمجھ لو، بڑا عجیب سا لگتا ہے
کبھی جو تنہائی میں بیٹھ کے آپ اپنے پر غور کروں

کبھی کبھی تو یوں بھی ہوا ہے، کوئی سنے تو حیراں ہو
رہ رہ کر خود اپنے ہی دل کو تڑپاؤں اور لذت لوں

میں بھی باتیں سب بسرا دوں، تم بھی ہو کر مگن سنو
لاکھوں صدیاں بیت چکی ہوں میں جو کہانی ختم کروں

میرے ظرف نے پیار میں مجھ کو چپ رہنا سکھلایا ہے
لاکھ کہو تم، لاکھ کریدو، پھر بھی اُس کا نام نہ لوں

شبِ فراق کو جوں توں کر کے کاٹ دیا تو یہ جانا
جیون کی دکھ بھری کتھا کو بے ترتیب ہی رہنے دوں

جس کو پانے کی آشا میں تن نے سو سو روپ بھرے
کیا ہی خوب رہے جو ہاشمی آج اُسی کے ہاتھ بکوں

نچی ایڑی کے جوتے کس کی پسند ہیں؟ اور یہ پھول پر پتیاں!

شکنتلا کا جی چاہا، وہ زور سے قہقہہ لگائے لیکن دل میں ایک گدگدی سی ہو کر رہ گئی۔

ملے کوئی چھیڑ رہا ہو۔ اُس کا جی چاہا وہ پریم کو بلا کر پوچھے۔ اب اُس کے بارے میں کیا باتیں ہوتی

ہیں۔ اب کون سی افواہ اُڑتی ہے۔ اور اُس نے نادانستہ طور پر گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

"مس پریم چڈھا کو بلاؤ۔" چپراسی سر جھکائے باہر چلا گیا۔

پریم چڈھا کے داخل ہوتے ہی شکنتلا بول اُٹھی۔ "دیکھو پریم! تم میری محبت اور

نرمی کا ناجائز فائدہ اُٹھا رہی ہو۔ سیکنڈ ٹرم کے امتحان میں تمھاری کلاس کی چھتیس میں

سے تیئیس لڑکیاں فیل ہیں۔"

پریم شکنتلا کے چہرے پر تیوریاں دیکھ کر گھبرا گئی لیکن کچھ سنبھل کر بولی۔ "یہ کیسے ہو سکتا

ہے۔ کل تو آپ کہہ رہی تھیں، پرچے آپ نے ابھی نہیں دیکھے۔ رات کی رات میں سب لڑکیاں کیسے فیل ہو گئیں؟"

"اچھا چھوڑو ان لڑکیوں کی بے اعتنائی کو۔ بتاؤ کیا پیو گی۔ ایک ایک کپ چائے

ہو جائے۔"

دونوں خاموش بیٹھی چسکیاں لیتی رہیں۔ پھر شکنتلا مسکراتے ہوئے بولی۔

"ان دنوں کوئی اور افواہ نہیں پھیلی کیا؟"

"پھیلی تو ہے کچھ۔ لیکن آپ پردوں پر پانی کہاں پڑنے دیتی ہیں۔ اُلٹا مجھے

ہی ناراض کریں گی۔"

"کہو بھی تو۔" شکنتلا نے پیالے سے لب الگ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن پہلے مٹھائی منگواؤ۔"

"کس بات کے لئے؟"

"افواہ سننے کے لئے۔"

"خوب بہت خوب! بڑی دُتی ہو گئی ہو۔ جیسی افواہ ویسی مٹھائی۔ پہلے افواہ سناؤ۔

اب سہیلیوں نے کون سے آسمان کی خبر دی ہے؟"

"شکنتلا جی! آپ مجھے بنا رہی ہیں ورنہ میں سب سمجھتی ہوں۔ یہ چہرے پر آج

مسکراہٹیں بے سبب نہیں۔"

"مطلب؟" شکنتلا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ آپ کسی کی ہو گئی ہیں۔ تازہ افواہ یہ ہے۔"

"کس کی؟" حیرانی سے شکنتلا کی آنکھیں کھل گئیں۔ بھویں تن گئیں۔

"پروفیسر کانتی ورما کی!"

"کیا کہہ رہی ہو پریم!" شکنتلا مٹھیاں بھینچتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ چائے کا پیالہ فرش پر

گر گیا۔ اور وہ غصّے میں چیخی۔ "جھوٹی۔ مکّار کہیں کی! میری درستی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر تمھارا حوصلہ

اتنا بڑھ گیا ہے۔ خبردار جو ایک لفظ بھی منہ سے نکالا! تم لوگوں کی اتنی جرأت۔ بے کار بیٹھے کیچڑ اُچھالنے

کے سوا کوئی کام نہیں۔ شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے! تم میرے کالج سے [illegible]

دھکّے مار کر باہر نکلوا دیتی۔ خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے ابھی وقت چلی جاؤ۔ [illegible] کر دو کہ

اس افواہ کا منبع کیا ہے۔ میں ایسی سازش میں شریک تمام ٹیچرز سے جواب طلب کروں گی۔ خبردار جو

آئندہ مجھ سے ضرورت سے زیادہ بات کرنے کی کوشش کی! غضب خدا کا جس سے نرم سلوک

کرو وہی نگل جانے کی کوشش کرتا ہے۔"

پریم خاموشی سے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ فضا ایکدم بوجھل ہو گئی۔ شکنتلا نے اُٹھ کر

دروازہ بند کر دیا۔ پھر زخمی شیرنی کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اُس کا اُبلتا ہوا ذہن ان افواہوں

سے بدلہ لینے کی سوچ رہا۔ پھر وہ کرسی پر آ کر بیٹھ گئی اور سامنے رکھی ہوئی تصویر کو لفافے میں

بند کر کے سوچنے لگی۔

شکنتلا اور کانتی ورما!

اس سے بڑھ کر تہمت اور کون سی ہو سکتی ہے۔ شرم نہیں آتی ان لوگوں کو۔ لیکن

اس افواہ کا ماخذ کیا ہو سکتا ہے؟

وہ پھر تصویر سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ ...... سوچنے لگی۔

یہ معصوم لڑکیاں نہیں نہیں وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتیں۔

پھر کانتی ورما؟ نہیں نہیں۔ یہ مجال نہیں ہو سکتی۔ وہ شخص ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔

"سوچ کیوں نہیں سکتا؟" وہ اپنے آپ سے سوال کرنے لگی۔ "ہو سکتا ہے وہ اپنے آپ کو

اس قابل سمجھتا ہو۔ اگر میں نے کبھی اس نگاہ سے نہیں دیکھا تو اس کی سوچوں پر تو پابندی

نہیں لگائی جا سکتی۔ وہ جوان ہے خوبصورت ہے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ شاید مجھ سے بھی بہت سی

لڑکیاں اُسے پانے کی کوشش کرتی ہوں۔ تو وہ مجھے حاصل کرنے کی کیوں نہیں سوچ سکتا۔ اور

بہت ممکن ہے وہی اس افواہ کا منبع ہو۔"

لیکن یہ مجسّمہ شرافت جس نے آج تک کبھی کسی سے ناشائستہ بات

نہیں کی ایسی بات کر نہیں سکتا۔ اُس کی تو نگاہ بھی میرے روبرو نہیں اُٹھتی۔ دیکھو کیا بُت سا

بنا بیٹھا ہے۔

لیکن اس خاموشی میں قیامت بھی تو پوشیدہ ہو سکتی ہے؟

یہ لباس اُسے کیا سج رہا ہے۔ ہاں وہ مسکرا بھی رہا ہے۔

اور کالر میں موتیے کی پتّی لگی ہے! اور وہ مسکراتے ہوئے سوچنے لگی۔ شاید

میرے جوڑے کے پھول کی مہک اُس تک پہنچ گئی ہو۔

شکنتلا ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر مسکرانے لگی۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر موتیے کا پھول

تصویر پر رکھ دیا!!

مدیر بیسویں صدی کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے مراسلے کی فوراً

تعمیل ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے ——— مدیر

غزل

طفیل ہوشیار پوری

عشق میں دل پہ جو حالات گراں گزرے ہیں
وہ سر طور، سرِ دار کہاں گزرے ہیں

مشعلِ راہ بنی آپ ہی منزل آکر
جب نظر سے ترے قدموں کے نشاں گزرے ہیں

کتنے اشکوں کو ہی آہ کے شعلوں سے جلا
کتنے مہتاب سرِ کہکشاں گزرے ہیں

ضبطِ غم نے جنھیں تخلیق کیا ہے اے دوست
وہ فسانے تری نظروں کہاں گزرے ہیں

دیکھنا تھا ترا دزدیدہ نگاہی سے مجھے
بزم کی بزم کو کیا کیا نہ گماں گزرے ہیں

بیخودی کونسی منزل پہ مجھے لے آئی
دونوں عالم مری جانب نگراں گزرے ہیں

یہ بھی محسوس ہوا ہے شبِ تنہائی میں
جیسے وہ ہو کے قریبِ رگِ جاں گزرے ہیں

ت کہدے کوئی میساقیِ دریا دل سے
تیرے میخانے سے ہم تشنہ دہاں گزرے ہیں

شوقِ دیدار لئے دل میں ترے دیوانے
رسن و دار سے بھی رقص کناں گزرے ہیں

لالہ و گل میں بھی تسکین کا پہلو نہ ملا!
دن بہاروں کے بہ اندازِ خزاں گزرے ہیں

(نا تمام)

غزل

کمار پاشی

دنیا کے اسرار و رموز کی ایک سے ایک گرہ کھولوں
بیٹھ کے دل کے آنگن میں جب تنہائی سے بات کروں

جی اداس ہے، رات ہے لمبی، کیوں نہ کوئی تدبیر کروں
خود کو اپنی کتھا سناؤں اور یونہی پہروں رو دوں

یہ جنگل، یہ کالے پربت گیان اُجالا کیا دیں گے
کیوں نہ دل کی بات مان لوں، کیوں نہ گھر کو لوٹ چلوں

تیرے دل کا درد تو کیا ہے، اپنا دکھ محسوس نہ ہو
کیا ہی خوب ہے جو اک دن اپنے آپ کو بھول چلوں

کیا کیا باتیں، کیا کیا یادیں، کیا کیا عالم ہے مجھ میں
جانے کون گھڑی کی گھٹنا، کون صدی کا قصہ ہوں

کیا بتاؤں، یہی سمجھ لو، بڑا عجیب سا لگتا ہے
کبھی جو تنہائی میں بیٹھ کے آپ اپنے پر غور کروں

کبھی کبھی تو یوں بھی ہوا ہے، کوئی سنے تو حیراں ہو
رہ رہ کر خود اپنے ہی دل کو تڑپاؤں اور لذت لوں

میں بھی باتیں سب بسرا دوں، تم بھی ہو کر گمن سنو
لاکھوں صدیاں بیت چکی ہوں میں جو کہانی ختم کروں

میرے ظرف نے پیار میں مجھ کو چپ رہنا سکھلایا ہے
لاکھ کہو تم، لاکھ کریدو، پھر بھی اُس کا نام نہ لوں

شبِ فراق کو جوں توں کر کے کاٹ دیا تو یہ جانا
جیون کی دکھ بھری کتھا کو بے ترتیب ہی رہنے دوں

جس کو پانے کی آشا میں تن نے سو سو روپ بھرے
کیا ہی خوب رہے جو پاشی آج اُسی کے ہاتھ بکوں

افسانہ

نئی منزل نئی راہیں

عفت موہانی۔ ایم اے

۱۱۳۴-۴-۳۱، غیرتِ خاں لین۔ حیدرآباد دکن

۲۳ دسمبر ۱۹۶۴ء

محترمی خوشتر گرامی صاحب اسلام و رحمت

... اپنی ایک کہانی "نئی منزل نئی راہیں" بصد فخر و مسرت "بیسویں صدی" کی نذر کر رہی ہوں۔ اُمید ہے پسند آئے گی۔ اپنی گرانقدر رائے سے نواز کر ممنون فرمائیں۔ آپ کے خط کا انتظار رہے گا...

آپ کی بہن ——— عفت موہانی

وہ پورے دس سال بعد امریکہ سے لوٹ رہا تھا۔

امّی اور آپا نے اُس کے استقبال کی نہایت شاندار تیاریاں کی تھیں۔ رُوبینہ بھی منتظر تھی۔ کون جانے وہ اُس کے تصوّرات کا پیکرِ جمیل نکلے! انتظار میں سر کھپانا بے سُود سمجھ کر وہ باہر برآمدے کی طرف نکل گئی۔ دھوپ سنہری ہو چلی تھی۔ سائے طویل تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ پورچ میں بیلیں جھوم رہی تھیں۔

اُس نے اطمینان سے بھرپور لمبی سانس لی۔ اُسی وقت کوئی سامنے سے لپکتا ہوا چلا آرہا تھا

"معاف فرمائیے گا۔ کیا مسٹر احسان کی کوٹھی یہی ہے؟" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"کیا آپ نے گیٹ پر لگی ہوئی نیم پلیٹ نہیں ملاحظہ فرمائی؟"

"کون سے گیٹ پر؟"

"بدھو نمبر ایک!" وہ اُسے نظر انداز کرکے گنگنانے لگی۔

"اُن کی صاحبزادی ———" جانے وہ کیا کہنے والا تھا۔ رُوبینہ جھلّا گئی۔

"چلتے پھرتے نظر آئیے۔"

"بہت اچھا!" وہ تیر کی طرح ڈرائنگ روم میں گھس گیا۔

"انجم؟"

"آنٹی!"

اندر سے مِلی جُلی خوشیوں بھری آوازیں سُن کر وہ اُدھر لپکی۔

اُس کی امّی اُسے گلے لگائے ہوئے تھیں۔

"اُف! یہ انجم ہے!" رُوبینہ متحیّر رہ گئی۔

"یہ آپ کی نئی ماما بڑی بدتمیز ہے۔" انجم نے رُوبی کو گھور کر دیکھا۔

اُس کی امّی بے ساختہ ہنس پڑیں۔ "ارے۔ تم اسے پہچان نہ سکے۔ یہ رُوبی ہے۔"

"کون رُوبی؟"

"رُوبینہ احسان!" رُوبی نے خود اپنا تعارف کرایا۔

"معاف کیجئے۔ میں کسی کا احسان نہیں مانتا۔" اُس نے منہ بنا کر کہا۔

یہ ولایت سے پلٹے ہیں یا پاگل خانے سے؟ انتظار کی ساری اُمنگ ختم ہو رہی تھی۔ بھلا اِس گنوار بے ادب کے ساتھ رہ کر وہ کیا سمارٹ معلوم ہو گی۔

اپنے احساس کی تلخی کم کرنے کے لئے وہ خود کو پروفیسر شاہد کے تصوّر سے بہلانے لگی۔ اللہ۔ اُن کی کمپنی... پہلی بار اُنھوں نے رُوبینہ کو اپنی کار میں گھر تک کیلئے لفٹ دی تھی۔ وہ رُوبینہ کے لئے یادگار دن تھا۔ اُس کے دل میں پروفیسر کے لئے بہت گہرے جذبات تھے۔ احترام اور محبت سے لبریز!

کہاں یہ جنگلی اور کہاں وہ ہینڈسم پروفیسر!

چائے کی میز پر امّی اُسے آوازیں دے رہی تھیں۔ وہ خاموش رہی۔ لیکن آبا کی گرجدار آواز پر اُسے اُٹھنا پڑا۔

اُسے دیکھتے ہی انجم نے سروقد ہو کر اُسے سلام کیا۔

جواب میں اُسے بھی مُکتی اُڑانی پڑی۔

امّی ابّا کے چہرے پھول کی طرح کِھلے ہوتے تھے۔ جس ننھے منّے پودے کو انھوں نے محنت سے دن رات سینچا تھا۔ اب وہی پودا تناور درخت بن کر اُن کے بڑھاپے پہ فگن تھا جس کی گھنی ٹھنڈی چھاؤں کے خیال ہی سے اُن کی روحیں مطمئن و مسرور تھیں۔

"ہماری رُوبی اِس سال بی۔ اے میں فرسٹ آئی ہے" امّی نے کہا۔

"لاحول ولاقوۃ!" انجم نے بڑی قوّت سے کہا۔

"کیوں؟" رُوبینہ نے ابرو سکیڑ لئے۔

"ایسے لڑکیوں کو صرف خانہ داری اور بچے پالنا سیکھنا چاہئے جس کے گُر جاننے کی سے لٹریچر تھوڑی سُننا پڑے گا"

"آپ کو کسی نے لڑکیوں سے گفتگو کرنے کے آداب نہیں سکھائے" رُوبینہ برہم ہو گئی۔

"آداب؟" وہ معصوم بن کر بولا "اچھا! یاد تو تھا آپ کو جھک کر"

اور پھر رات کو رُوبی امّی سے شکایتیں کرنے لگی۔

"یہ کب تک یہاں رہیں گے؟"

"وہ اب ہمیشہ یہیں رہے گا" امّی بے حد خوش تھیں۔

"نہ تو بات کرنے کی تمیز ہے۔ نہ کھانے پینے کی۔ آخر اُنھوں نے مجھے ماما کیوں سنا دیا؟"

امّی پھر ہنس دیں "برسوں بعد تمھیں دیکھا تھا۔ پہچان نہ سکا۔ اور وہ تو ہے ہی شریر!"

"آپ لوگ اُن سے بہت محبت کرنے لگے ہیں؟"

"کیوں نہ کریں۔ کیا نکال دیں گھر سے باہر۔ اُس کے ماں باپ ہوتے تو وہ کیوں ہمارے آتا" امّی نے ہلکا سا جواب دیا اور اُٹھ کر کسی کام سے چل دیں۔

باہر کسی کے قدموں کی گمبھیر دھمک سُنائی دی۔ دوسرے لمحے انجم رُوبی کے میں تھا۔

"پوچھ کے آیا کیجئے" وہ پھر چڑ گئی۔

"میرا کمرہ کون سا ہے؟ یہیں رہنے لگوں تو کیا حرج ہے؟"

"خدا کی پناہ۔ آپ مجھے دیوانہ بنا دیں گے"

"سچ مچ!!" وہ چہکا۔

رُوبی خاموشی سے "ٹیڑھی لکیر" اُلٹنے لگی۔

"وہی محبت کا فرسودہ افسانہ!" وہ بولا "ہوتا ہی کیا ہے اِن داستانوں میں۔ سی کی اچھی شکل نظر آئی بس چار دن ہاتھ پاؤں سے مرنے لگے۔ ارے بھئی! دو آنکھوں اک اور منہ میں حُسن کہاں ہوتا ہے۔ ہم نے تو کہیں آنکھوں کے تیر، زلفوں کی چھاؤں اور ہونٹوں کا یاقوتی پن نہیں دیکھا۔ جیسے دیکھا سب تمھاری شکل کے کالے کلوٹے یا مریل ٹائپ کے۔ خدا غارت کرے!"

"اور کچھ؟" وہ بڑی متانت اور استقلال سے اُس کا لیکچر ہضم کر گئی۔

"اور یہ کہ یہ گھناؤنا لباس اُتار کر خوبصورت لباس پہنو۔ غضب خدا کا! آستین غائب۔ بلاؤز میں تمھیں سردی نہیں لگتی۔ میری تو روح پر بھی کپکپی طاری ہو گئی ہے"

"بکواس بند کیجئے۔ میں ایسی خرافات نہیں سُن سکتی"

"بہت بہتر ———" وہ احتراماً جُھکا اور پردہ ہٹا کر باہر نکل گیا۔

اور پھر رُو[illegible] ہی سے بیزار رہنے لگی۔ جیسے درجنوں انجم گھر کے کونے کونے سے پھوٹ نکلے ہوں! اُس [illegible] اللہ اُسے بے حد سراہتیں۔ دن دن بھر پڑا انھیں امریکہ کی کہانیاں سُنایا کرتا۔ ایسے ایسے [illegible] کہ وہ ہنسی ضبط نہ کر سکتیں

شام کو وہ [illegible] باہر نکلی۔

"کہاں؟" [illegible] نے استفہامیہ نظروں سے رُوبی کو دیکھا۔

"زینت [illegible] ہے۔ پکچر کے لئے"

"پکچر!؟" وہ بول پڑا "شام کو اکیلی لڑکی کا باہر جانا اچھا نہیں"

"منع کرو تو سُنتی کہاں ہے" امّی شکایت کرنے لگیں "یہ سہیلیاں اچھی بھلی لڑکیوں کو ورغلاتی ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں جانے کی!"

رُوبی پاؤں پٹکتی دندناتی اپنے کمرے میں آئی۔ پرس کہیں اُچھالا، چپلیں کہیں پھینکیں اور تکیے پر اوندھی گر کر رونے لگی۔

آخر یہ شیطان اُس پر کیوں مسلط ہو گیا ہے۔

کتنے پروگرام اُس نے اپ سیٹ کر دئے تھے۔ ہر موقع پر روڑے اٹکاتے تھے۔ ہزار بار لاکھ بار ڈانٹنے پر بھی وہ باز نہ آیا۔ رُوبینہ کو اُس سے نفرت تھی۔ گہری نفرت! جس نے امّی ابّا کی ساری توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ وہ خود کو اپنے ہی گھر میں پرائی محسوس کرنے لگی۔

اُسے انتظار تھا کب پروفیسر شاہد آ کے کہیں اور کب وہ ہمیشہ کے لئے اِس گھر سے چلی جائے۔ پروفیسر نے تو اکثر اُس کی محبت کے گیت گائے تھے لیکن وہ اُن گیتوں کو سہاگ کی شہنائی کا رُوپ دینا چاہتی تھی۔ جانے کب گونجے۔

اکثر اُس نے انجم کو ڈانٹ دیا تھا۔ اب وہ بھی اُس سے کترانے لگا تھا۔ اپنے دوسرے پروگرام بنا لئے تھے۔ کھانے کی میز پر بھی نہ آتا۔ اُس نے یوں اُسے جھڑک کر اچھا کیا تھا یا بُرا کیا تھا؟ وہ تجزیہ نہ کر سکی... اُس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا۔ سکون ہی تو چاہتی تھی اب سکون تھا۔ جہاں چاہے جائے، جدھر چاہے گھومے پھرے۔ کوئی انجم راستہ نہ کاٹتا! لیکن دل میں یہ کھٹک کیسی تھی؟ وہ سمجھ نہ سکی... جس چیز کو دل چاہے اور وہ مل جائے پھر یہ

لس اور اٹھ [illegible]

دل [illegible] کی ذرا ذرا سی حرکت پر اُس نے سیکڑوں کپے دے لیے۔ انجم نے خوب [illegible] امی نے سُنا تو وہ بھی اُسے ڈانٹنے بیٹھ گئیں "بھلا یا کہے گا؟ پڑھ لکھ کر کیسی [illegible] چھوڑ رہے ہے"۔

اچانک صبح کو وہ ناشتہ پر آیا۔ خوب مسکرا رہا تھا۔

"آؤ بیٹے!" ابّا نے ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ بات چیت کے دوران میں دعائیں دیتے جا رہے تھے

"یہ دعائیں نہ لگیں گی انکل!" انجم بسور کر بولا۔

"ضرور لگیں گی بیٹے۔ جب تم نے میرا دل خوش کیا تو..."

"پڑوسن کی ماما مجھے بڑے بُرے کوسنے دے رہی تھی [illegible] بولا۔

"اُس کی یہ مجال؟" رُوبی کے ابّا نے غصّے سے ہاتھ [illegible] لیا۔

"کہتی تھی کہ تمہاری صورت میرے شوہر سے ملتی جلتی [illegible] ہے؟"

سب ہنس پڑے۔ رُوبی جل گئی۔ خواہ مخواہ بالواسطہ [illegible] سے کیوں چھیڑتا ہے!

[illegible] کے بعد وہ شکار کی تیاریوں میں لگ گیا۔

رُوبی کالج جا رہی تھی۔ ساڑی کی کلفدار لہروں کو ہوائی چپل سے پھٹکارتی وہ زینہ [illegible] لگی۔ کمپاؤنڈ میں وہ ملا

"شکار پر چلو رُوبی!" بہت پُرخلوص لہجے میں اُس نے دعوت دی۔

"شکریہ!" رُوبی کی نخوت برقرار رہی۔

"شکریہ کاہے کا؟" وہ سنجیدہ ہوگیا۔ "میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اگر شکاری ماہر [illegible] شکار خود بخود پھنس جاتا ہے۔"

"ہُنہہ!" وہ پھنکارتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

کالج سے واپس آکر وہ شاہد کے ساتھ چل دی۔ پارک کے سُنسان گوشے میں دونوں آئندہ زندگی کے خوشنما پلان بناتے رہے۔ دونوں نے نئی کوٹھی کے بے شمار [illegible] چے۔ اس کے بعد کوٹھی کے سرسبز لان پر کھیلنے والے بچّوں کے بارے میں سوچتے ہوئے یکلخت شرما گئی۔

شام کی تاریکیاں اُمڈ آئی تھیں۔ بسیرا لینے والی چڑیوں نے درختوں میں شور [illegible] اُٹھا۔ فضا بوجھل ہونے لگی تھی۔

رُوبینہ سے اپنی باتوں کا جواب مانگنے کے بعد شاہد نے اُس کا ہاتھ

"تم اِس قدر ڈرتی کیوں ہو؟ جب ہمارے دل راضی ہیں تو پھر یہ جھجک کیسی؟ [illegible] شادی کر لیں گے۔"

"بعد میں؟" رُوبینہ کا دل دھڑک اُٹھا۔ نظریں چار کرنے کی ہمّت [illegible] دھندلی روشنیوں کا عکس تھا یا اُس کے اندر کوئی انار چھوٹ رہا تھا۔ آنکھیں [illegible] چمک سے روشن ہونے لگی تھیں۔

اور پھر یہ انتہائی مغرب پسند لڑکی دفعتاً مشرقی بُزدل لڑکی بن گئی۔

وہ جیسے ہی اُس کی طرف جُھکا۔ رُوبینہ ہاتھ چھڑا کر تیزی سے بھاگ گئی۔

"سُنو تو۔ رُوبینہ۔ پُوری بات تو سُنو" جانے کون سا کانٹا اُن کے پاؤں میں اُلجھ گیا کہ وہ بھاگ ہی نہ سکے۔

کمپاؤنڈ میں ڈاکٹر غزنوی کی کار دیکھ کر اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ ابّا کہیں پھر تو نہیں آ پڑے۔ وہ تیزی سے اوپر گئی۔

"کہاں تھیں اب تک؟" راہداری میں امّی کھڑی شعلہ بار نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ "شریف لڑکیوں کے یہ لچھن نہیں ہوتے۔"

اُس کا دل دُکھا ہوا تھا۔ امّی کی بات گھونسہ بن کر لگی۔ دل دھڑک اُٹھا۔

"انجم اندر زخمی پڑا ہے۔ لیکن تم تو اُسے کوستی تھیں۔ اچھا ہی ہوا۔ تم اُس کی کون ہو؟" امّی کہتی رہیں۔ وہ اندھیرے میں چُپ چاپ کھمبے سے لگی کھڑی رہی۔

امّی اور ابّا ساری رات بیمار کے کمرے میں رہے۔ درد اور تکلیف کی شدّت سے انجم سر تکیے پر رگڑتا رہا۔ رُوبینہ کی ہمّت نہ پڑی کہ وہ اندر جا سکتی!

اُس کے ابّا اور امّی بہت پریشان تھے۔

"کیا سوچتا ہوگا دل میں" امّی کہتی تھیں۔ "گھر آئے مہمان کے لئے ہر دم کوسنا کاٹنا!"

"نہیں نہیں" رُوبی سجدے میں گر گئی "اے خدا! میری ساری بد دعائیں واپس لوٹا دے" وہ روتی رہی۔ امّی اور ابّا آخر شب تھک ہار کر سو گئے۔

وہ دبے پاؤں اندر مُڑ گئی۔

"پانی۔ پانی!" انجم کراہ رہا تھا۔

"لیجئے پانی پی لیجئے!" اُس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"رُوبی۔ تم؟" انجم نے سُرخ سُرخ آنکھیں کھولیں۔

صُبح کے ہلکے نور میں وہ کوئی اور ہی وجود معلوم ہو رہی تھی۔ دوپٹے سے سر ڈھانکے، کلائیوں تک آستینیں بند، جُھکی جُھکی پلکیں بارِ حیا سے لرز رہی تھیں۔

"پانی پی لیجئے" وہ رُکتی رُکتی بولی۔

"میری پیاس بُجھ گئی" انجم مُسکرایا "مگر یہ تم۔ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟"

"آپ کو وہ سب کچھ ناپسند تھا نا؟"

"اور اُلو بناؤ گی؟"

[illegible] آپ [illegible] اب کہاں ہیں

[illegible]

"اور تم نے [illegible] میں کس سے فریاد کروں گا:"

"مجھو کہ خدا کے لئے [illegible] میں نے آپ کے ساتھ بہت

زیادتیاں کی ہیں، کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے؟"

"کر دوں گا، مگر ایک شرط پر!"

تاہم خطوط نہیں ملتے:

"کیوں؟"

"کیا؟"

"کیسے کہہ دو؟"

"مجھ کو... آ رہی ہو گی۔"

اس نے سرگوشیوں میں کہا اور [illegible]!!

غزل

بیتاب پیلی بھیتی، ایم کام

غنچی شبنمی فضا ہو تم
یا برستی ہوئی گھٹا ہو تم

ناز ہو، غمزہ ہو، ادا ہو تم
اس سے بھی اور کچھ سوا ہو تم

میری آنکھوں سے تم اگر دیکھو
تم کو معلوم ہو کہ کیا ہو تم

عارضِ گل ہو، رنگِ گلشن ہو
ایک پیکر شباب کا ہو تم

دل سے پوچھو تو دل یہ کہتا ہے
دل نشیں اور دلربا ہو تم

میرے بکھرے ہوئے فسانوں کا
ایک رنگین سلسلہ ہو تم

میری غزلوں کی، میرے نغموں کی
جان ہو، روح ہو، صدا ہو تم

نشہ ہو، روپ ہو، جوانی ہو
کیا بتاؤں کہ اور کیا ہو تم

زندگی بھر کی آرزوؤں کا
ماحصل اور مدعا ہو تم

غزل

ذوقی رامپوری

بہار کا ہے تجھے انتظار، دیوانے
بہار پر تجھے کیا اختیار، دیوانے

جہاں کو رازِ جنوں کی خبر نہ ہو جائے
کسی کا نام نہ لے بار بار، دیوانے

خزاں میں تھا کیے آرائشِ چمن کا خیال
بہار میں نکل آئے ہزار دیوانے

یہ ہوش بھی نہ رہا جستجو میں پھولوں کی
اُلجھ گئے ترے دامن میں خار، دیوانے

خرد پہ ناز تھا جن کو وہ سوچتے ہی رہے
پڑا جو وقت چلے سوئے دار دیوانے

جنابِ شیخ کی ایسے میں کون سنتا ہے
گھٹا اُٹھی تو ہوئے بادہ خوار دیوانے

بس اِک خفیف تبسم بس اِک لطیف نگاہ
کہ ہو نہ جائیں کہیں ہوشیار دیوانے

ہے اُن کی خاص نوازش مجھی پہ ورنہ وہ
جدھر نگاہ اُٹھائیں ہزار دیوانے

سکوں تلاش نہ کر زندگی میں اے ذوقی
کسے ملا ہے جہاں میں قرار، دیوانے

افسانہ

رنگ اور روشنی

پروفیسر حامدی کاشمیری ایم اے

بھوری کدل۔ سری نگر ۲

۲۶ ر دسمبر ۶۴ء

پیارے بھائی! آداب

شدید برفباری کی وجہ سے ہفتوں سے بجلی آف ہے۔ شمع کی مدھم سی، کانپتی ہوئی لو میں یہ افسانہ مکمل کیا ہے۔ اُمید ہے آپ کو اور قارئین کو پسند آئے گا ——— میرے خطوط آپ کو مل گئے ہوں گے۔ آپ نے اس سلسلے میں مزید کچھ تحریر نہیں کیا۔ میں آپ کے خط کا انتظار کر رہا ہوں۔ کیا وہ بات کسی حد تک آگے بڑھ گئی ہے ——— برف نے راستے مسدود کر دئے تھے، اس لئے سالنامہ دیر سے ملا۔ کتنا خوبصورت نمبر نکالا ہے آپ نے۔ سالنامہ کے ورق اُلٹتا جا رہا ہوں، جیسے رنگ و نور کی دُنیا میں گم ہو رہا ہوں۔ آپ کی کاوش کی داد نہیں دی جا سکتی! اس بار بھی آپ کی جدت پسندی، آپ کی رعنائی طبع اور ذوقِ جمال ہر صفحہ پر جلوہ گر ہے!...

آپ کا ——— حامدی کاشمیری

آتش دان کی دہکتی لہراتی ہوئی آگ میں خطوط جل رہے تھے۔ تہہ کئے ہوئے رنگین اور معطر اوراق آگ کا لمس پاتے ہی لال، پیلے اور نیلے رنگ کے نرم شعلوں میں ڈھل رہے تھے۔ شعلے لپک رہے تھے اور لفظوں کے اندر جاگتے ہوئے، سرسراتے ہوئے احساس کی نازک تھرتھراہٹوں کو چاٹ رہے تھے۔ دل کی دھڑکنیں بھسم ہو رہی تھیں، خواب جل رہے تھے، دھواں اُٹھ رہا تھا۔

اُس کی اُنگلیاں سردی سے سُن ہو کر رہ گئی تھیں۔ کمرے میں، اَمل ہو کر اُس نے جلدی سے اسٹیتھسکوپ ٹیبل پر گرا دیا جیسے اُس کے ہاتھ برف سے شل ہو گئے ہوں۔ کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں لیکن پردے ابھی تک گرائے نہیں گئے تھے۔ سرد ہوا کے جھونکے کمرے میں آرام کے ساتھ آ رہے تھے۔ باہر تانبے کے ورق جیسی سڑکوں اور رنگین کوٹھیوں میں برفانی ہوا چاروں طرف پھیلی جا رہی تھی۔ درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے آ گیا تھا۔ اس موسم میں کسی پیشنٹ کو گھر جا کر دیکھنا مصیبت ہے۔ وہ اُنگلیوں کی درد کرتی ہوئی پوروں کو سانس کی گرمی پہنچانے لگا۔ آتش دان دن سے غائب تھا۔ باہر زمستان کی شام کے ویران، گرد آلود اور زنگ بستہ سائے آ رہے تھے۔ وہ ویران برف آلود تنہائی میں سرد اور بے جان آتش دان کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُسے نوکر پر سخت غصہ آیا کہ وہ جو کے سر کے سینگوں کی طرح غائب ہے، کم بخت! ابھی ہوتی بیماری اُس کی جان کو رو رہی ہے لیکن وہ خاموش رہا۔ اُس نے نوکر کو آواز نہیں دی۔ اُس کی نگاہوں میں تھوڑی دیر پہلے مسز مہتا کی موت کا نقشہ گھوم گیا۔ کاش وہ اُسے بچا سکتا! مشکل سے پچیس برس کی عمر تھی اُس کی۔ اُس کا خوبصورت جسم برف کی چادر کی طرح پھیلا ہوا تھا، اور اُس کا چیختا ہوا نوزائیدہ بچہ ماں کی لاش سے الگ ٹھٹھر رہا تھا۔ وہ کانپ اُٹھا یہ نظارہ دیکھ کر۔ اُس کا دل کمزور ہو چکا تھا۔ اگر وہ مسٹر مہتا کی بین کرتی ہوئی بہن کی توجہ اُس ننھی سی جان کی طرف نہ پھیرتا، تو وہ بھی برف ہو جاتا بیچارہ!

رنگین شعلوں کے آنچ دیتے ہوئے سنہرے سائے اُس کے گمبھیر چہرے پر کانپ رہے تھے۔ وہ پلک جھپکائے بغیر شعلوں کے سرسراتے اور پھڑپھڑاتے ہوئے سونے کے اوراق کو گھور رہا تھا۔ شعلوں کا انعکاس، باریک نوکوں کی صورت میں اُس کی آنکھوں کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر کر تھرتھرا رہا تھا۔

جب وہ مسٹر مہتا کے گھر سے نکلا تو مایوسی کی برف کا پہاڑ اُس کے سینے پر جم چکا تھا۔ شانتا بھی شادی کے ڈیڑھ برس بعد اسی طرح زندگی اور موت کی کشمکش میں پڑ گئی تھی، اور اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود وہ اُسے موت کے ظالم ہاتھوں سے واپس نہ لا سکا تھا۔ اُس کا تپتا ہوا جسم برف ہو گیا، اُس کی رنگین آنکھوں کا چاند بجھ چکا تھا۔ اور اُس کی دُنیا تاریک ہو گئی تھی۔ اتنے برس بعد بھی ...

بس کی بات نہ تھی، اُس کے ہوش و حواس پر بجلی گر پڑی تھی۔

اُس نے کرسی پر اپنے اکڑے ہوئے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اُس کے ہاتھ مونگیا رنگ کے جسٹر میں بند تھے، اور اُس نے لمبے لمبے نوکیلے کالروں سے ڈھکی ہوئی گردن کو کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ اُس کے شکن آلود ماتھے پر پسینہ تھا، مائل خیالات اور ذہن تک جھک آئی تھی، وہ آتش دان کے سرد راکھ کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر تشنج کی سی کیفیت تھی، جیسے چہرے پر پڑی ہوئی سلوٹیں جم گئی ہوں، مایوسی کی ایسی ہی ذہنی کیفیت انسان کو کہیں کا نہیں رکھتی، انسان پاگل ہو جاتا ہے، وہ اپنے منصب سے گر جاتا ہے، اور ـــــــ اور وہ دھرتی کے سینے پر ایک بوجھ بن کر رہ جاتا ہے۔

لیکن وہ اس دھرتی پر بوجھ بن کر زندہ رہنے کے لئے تیار نہیں جس سے اُسے یقین ہو جائے گا کہ وہ ایک بے کار بوجھ بن کر رہ گیا ہے۔ وہ ـــــــ وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے وجود کو ختم کر دے گا! یہ اُس کا آج کا فیصلہ نہیں ہے، برسوں پہلے کا فیصلہ ہے۔ یہ فیصلہ اُس نے شانتا کی موت کے بعد کیا تھا۔ نوکرنے آتش دان میں آگ جلائی تھی، آگ کے شعلوں کو زبان مل گئی۔ زبان ہنے لگی ـــــــ تمہارے فیصلے ہم دیکھ چکے ہیں نیند آور گولیاں ان فیصلوں کو موت کی نیند سلاتی ہیں!

شانتا کی موت نے اُس کی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو مفلوج کر دیا تھا!

وہ شام ایسی ہی تاریک اور ویران تھی کہ اچانک ایک الہامی کیفیت اُس کے دل میں جاگ اُٹھی تھی۔ روشنی کی ایک کرن دل کی تاریکی میں تھرتھرائی تھی اور پھر اُس کی نگاہوں میں شاداب روشنی کے بہت سے دریچے کھل گئے تھے۔ وہ روشنی کے سمندر میں نہا گیا تھا ـــــــ یہ شانتا کے خطوط تھے جنہیں وہ بھول چکا تھا اور جو اچانک آج شانتا کے سوٹ کیس میں اس کے ہاتھ لگ گئے تھے جیسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ شانتا کے محبت نامے، نسوانی تحریر کے آڑے ترچھے خطوط، ہر لفظ خلوص اور محبت کی ایک دنیا، ایک البیلی دنیا، پیار کے نازک جذبات کے مختلف رنگ، لو پھٹتے وقت رنگوں کی پھوار، کاغذ کے ان رنگین اوراق میں ایک معصوم دل کی دھڑکنوں کا ارتعاش زندہ تھا۔ کون کہتا ہے شانتا اُس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ چکی ہے؟ شانتا کی چھلکتی ہوئی آنکھوں کے خواب، اُس کے شبنمی ہونٹوں کے سلگتے ہوئے افسانے، اُس کی دھڑکنوں کا سنگیت، اُس کے خون کی حرارت، اُس کی رُوح کی تپش اُس کے خطوط میں محفوظ ہے۔

اُس کا جسم آگ کی تپش محسوس کرنے لگا۔ لکڑیاں تڑخ تڑخ کر جل رہی تھیں۔ آگ کے سرخ شعلے نرم نیلی دھاریوں کے ساتھ پھیل رہے تھے، جھول رہے تھے، اینٹھ رہے تھے اور سوکھی لکڑی کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔

اُس کے چہرے کا تناؤ ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا!

اُس کا چہرہ تانبے کی طرح دمک رہا تھا!

اُس کے ہونٹ مُسکرا رہے تھے!

یہ خطوط اب اُسے آنکھوں کی روشنی سے زیادہ عزیز تھے۔ شانتا کی حنائی انگلیوں کی خوشبو میں بسے ہوئے یہ خطوط اُس کی کُل کائنات تھے۔ اُس نے ان خطوط کو ایک مقدس امانت کی طرح اپنے کیسے میں ٹیبل کے ڈرائیر میں بہت احتیاط اور حفاظت کے ساتھ رکھا تھا۔ اور آج سولہ برسوں سے اِس یادگار کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ ہسپتال سے لوٹ کر وہ اپنی شامیں شانتا کی میٹھی میٹھی، خواب آور اور پیار بھری باتوں سے آباد کر لیتا۔ اُس کے لہجے کی کھنکتی ہوئی گنگناہٹ اُس کے کانوں میں رس گھولتی۔ اُس کی پلکیں بوجھل ہونے لگتیں۔

نوکرنے کھڑکیوں کے پردے گرا دئے تھے اور شام کے جمتے ہوئے سائے کمرے کی دیواروں، ٹیبل، دواؤں سے بھری الماری اور ہینگر میں بے ڈھنگے طور پر آویزاں گرد آلود سوٹوں سے چمٹے ہوئے تھے۔

کچھ سوچ کر اُس نے آگ پر ایک لکڑی ڈالی۔ سوچ کے تاریک حلقے اُس کے دل و دماغ کو بتدریج اپنی گرفت میں لے رہے تھے۔ وہ بے بس ہوا جا رہا تھا۔ اُسے شدت سے محسوس ہوا کہ اُس کا سارا جسم زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ ان زنجیروں کو جھٹک دینا چاہتا ہے، وہ آزاد ہونا چاہتا ہے اور یہ خط ـــــــ یہ زنجیریں؟

اُس نے ریشم کے کیڑے کی طرح خود ہی اپنے گرد ایک سخت جال بن رکھا ہے!

یہ خطوط محض ایک فریب ہیں، جلا دو!

شانتا مر چکی ہے ـــــــ شعلے زور زور سے چیخ رہے تھے۔

یہ نئی سوچ اُس کے دل و دماغ پر بُری طرح مسلط ہو رہی تھی!

اُس کے سینے پر جمے ہوئے پہاڑ کے نیچے ایک تیز کھولتا ہوا لاوا حرکت میں آگیا!

خطوط سائے ہیں سایوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ سولہ سترہ برسوں سے اِن سایوں کی پوجا کرتا رہا ہے۔ یہ سائے اُس کے دل اور دماغ کو زنگ لگا چکے ہیں۔ اُس کی رُوح کی ویرانی بڑھتی گئی۔ ہر نیا لمحہ سینے کے بوجھ کو بڑھاتا رہا، اُس کی سانسیں بوجھل ہوتی گئیں۔ وہ مستقل طور پر اعصاب کی کمزوری کا شکار ہوتا گیا۔ وہ دلی سکون کے لئے ترستا رہا۔ بے خوابی کے جھلستے ہوئے انگاروں کو خواب آور گولیوں سے ٹھنڈا کرتا رہا۔ اُس کی ذہنی صلاحیتیں ماند پڑ گئیں، یادداشت کمزور ہو گئی۔ اُس کی شہرت روز بروز گھٹتی جا رہی تھی۔

اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لے لیا۔

آگ کے شعلے گنگنا رہے تھے!

اچانک وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے ادھ جلی سگریٹ آگ میں پھینک دی۔ وہ ٹیبل کی طرف آیا۔ ڈرائیر کھینچ کر کھول کر اُس نے تہہ در تہہ خطوط کی ڈھیری کو اپنے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لی۔ اور ڈرائیر کو کھلا چھوڑ کر وہ پھر کرسی پر آبیٹھا اور آن واحد میں خطوط کی اِس

[illegible] جلتی ہوئی آگ میں [illegible]

آگ چٹخنے [illegible] شعلے [illegible] لینے لگے اور بل کھاتے

[illegible] شعلوں کے [illegible]

وہ [illegible] سال کے بعد جب شہر کے لئے اُس کا تبادلہ ہوا

[illegible] وہ سامان [illegible] رہا تھا تو شانتا نے جھکی ہوئی آنکھوں پر گھنی پلکوں

[illegible] تھماتے [illegible] کے ساتھ ایک لفافہ اُس کی طرف بڑھایا۔

"ارے [illegible] کیا؟ تمہارے کام کا بل تو مجھے چکانا ہے؟" وہ مذاق کے موڈ

[illegible] تھا۔

شانتا نے صرف اتنا کہا اور آنچل سنبھالتی ہوئی سیڑھی سے غائب ہو گئی۔

"جہاں ہونٹ گونگے ہوتے ہیں، وہاں خطوط کہہ جاتے ہیں۔"

اور جب اُس نے بس میں، دوسرے مسافروں کو اونگھتے ہوئے پاکر وہ خط ایک [illegible]سے پڑھا تو اُسے محسوس ہوا بے شک اِس خط نے شانتا کی بے زبانی کو زبان دے دی ہے۔

پیار کے ازلی حروف سے لکھا ہوا وہ خط اُس نے گھر پہنچ کر بار بار پڑھا۔ اور [ب]ار بار ایک انجانی لطافت اُس کی رگ و پے میں تحلیل ہو گئی۔ یہ خط نسوانی حسن، احساس اور [پاک]یزگی کا ایک جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ زندگی کا یہ حسین اور لطیف پہلو آج تک نہ جانے کیوں [اُ]س کی نظروں سے اوجھل رہا۔ میڈیکل ٹریننگ کے دوران کئی شوخ و شنگ لڑکیوں نے [اُ]س سے محبت کی پینگیں بڑھائیں لیکن وہ اُسے ٹالتا رہا اور جب اُسے گھر سے پچاس میل دور [ا]س علاقے میں تعینات کیا گیا، تو شانتا اُسے بہت قریب لی۔ وہ ڈیرے والے کی اکلوتی [لڑ]کی تھی اور مقامی اسکول میں کام کرتی تھی۔ خاموش سی، اداس لڑکی، اُس کے [چ]ہرے پر چیچک کے چند مٹے مٹے سے داغ بھلے لگتے تھے۔ اُس کا صحت مند جسم ایک موزوں [س]انچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ فرصت میں، گھر کے کام کاج سے فراغت پاکر وہ، اُس کے پتا جی [او]ر میں تینوں مختلف مسائل پر گفتگو کرتے۔ شانتا کی فطری ذہانت اُس کی کم گوئی چھپا [نہ س]کی۔ اُس کی دلآویز خوبصورتی سے وہ دل ہی دل میں متاثر تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ شانتا [ک]ے پاؤں میں زنجیر پڑ چکی ہے۔ اپنے ہی علاقے کے ایک دکاندار سے اُس کی منگنی ہو چکی تھی۔

شانتا کے خطوط آتے رہے ——!

خطوط جل رہے تھے!

جلتی ہوئی لکڑی کے شفاف شعلے کی روشنی میں اب یہ موٹا خط جل رہا ہے۔ اُس [ک]ے ایک کونے کو آگ چوم رہی ہے اور خط کی اوپری سطح جھلک رہی ہے۔

'میں پاؤں کی اِس زنجیر کو توڑ پھینکنا چاہتی ہوں۔'

اُس کے حوصلے جوان تھے۔ اُسے ایک اَن پڑھ، موٹی توند والا دکاندار ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ کاغذ کے اوراق پر اُس نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔

خط کی لپٹی ہوئی جھوٹی پر [illegible] سوار [illegible]

ہر پیا خط شانتا کی شخصیت کی ایک نئی [illegible] کھول دیتا۔ [illegible] کی ایک [illegible] کے دل کو چھو لیتی۔

اُس کی زندگی کے راستے دُور دُور تک روشن ہو جاتے۔

اور پھر تین سال کی جدوجہد کے بعد وہ کامیاب ہو گئے [illegible] آنکھوں نے خطوط کے سہارے گزار دی تھیں۔ اُن کی گھریلو زندگی کا آغاز ہو چکا تھا [illegible] نمونہ تھا۔ ہر لمحہ حسن، رنگ اور خوشبو میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ زندگی کی راحتوں کا لطف لے رہے تھے۔

سرد ہوا کے جھونکوں سے شعلے تیز ہو رہے تھے۔

بہت سے خطوط سُلگتی ہوئی راکھ میں بدل چکے تھے۔ راکھ کے ڈھیر میں رہ رہ کر کوئی چنگاری بھڑک اُٹھتی اور معدوم ہو جاتی۔ اب ایک خط باقی رہ گیا تھا۔

'یہ خط آپ کے پاس ...' آگ کی زہریلی زبان نے بقیہ جملے کو ڈس لیا۔ فوراً خط کا کاغذی پیرہن جلنے لگا۔ شعلہ یک بارگی بلند ہوا اور جلد ہی نیچے آ رہا اور آہستہ آہستہ مدھم پڑ گیا۔

ایک لمحہ گزرا۔

شعلے خاموش ہو چکے تھے، لکڑیاں جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔ دو ادھ جلی لکڑیاں سُلگ رہی تھیں۔ آتشدان کے بیچ میں جلے ہوئے خطوط کے سیاہ ورق ہوا کی ہلکی جنبش سے راکھ ہو رہے تھے۔

اُس کے چہرے پر شام کی سیاہی گھل گئی تھی۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے کندھے جھٹک دیئے۔ اُس کا جسم قدرے ہلکا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ماضی کے اوراق پریشاں کو آگ لگا چکا تھا۔ یادیں راکھ بن چکی تھیں۔ وہ ٹیبل کی سمت آیا اور ٹیبل لیمپ روشن کیا۔

"چائے لاؤں جناب؟" دروازے پر نوکر سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

"لے آؤ" اُس نے ٹیبل پر بے ترتیبی سے رکھی ہوئی کتابوں کو قرینے سے رکھا اور تازہ آئے ہوئے لٹریچر کو دیکھنے لگا۔

چند لمحے گزرے۔

غیر شعوری طور پر اُس نے دیکھا کہ ٹیبل کا ڈرائیر کھلا پڑا ہے —— خالی اور ویران!

گزشتہ پندرہ بیس برسوں سے ڈرائیر کی آغوش خوشبو میں بسے ہوئے جن انفاس سے آباد تھی، وہ آج لُٹ چکے تھے۔ روز ٹیبل پر بیٹھ کر وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ڈرائیر کو کھول دیتا اور محبت کے دفتر کھل جاتے۔ اُس کے ویران لمحوں میں پھول ہی پھول کھل اُٹھتے!

کیسی کہانی ——!

ایک سلگتا ہوا درد کی لہر اُس کے دل کو چیرتی ہوئی اُٹھی۔ وہ تلملا اُٹھا اور اضطراب میں ادھر اُدھر ٹہلا پھر آتشدان کی طرف گیا ایک پاگل کی طرح!
آتشدان کی آگ بجھ چکی تھی!

کمرہ تاریک تھا، تم روشن تھا، دیواریں سائے گیر تھیں، فرش ویران تھا اور باہر کے الاؤ بھرے سے ٹھٹھری ہوئی تاریکی میں پاگل ہو چکے تھے۔

اُس کی زندگی کا آخری سہارا چھن چکا تھا۔ اُس کی جان سے بھی پیاری متاع لٹ چکی تھی!

اُس نے اپنے ہاتھوں زندگی کی بنیادوں کو ڈھا دیا تھا۔ وہ قاتل ہے قاتل! اُس کی روح کی شادابی کی آخری رمق بھی جل گئی تھی۔ اب وہاں سلگتے ہوئے ویرانے تھے اور بس!

چہرے کے بگڑتے ہوئے خدوخال سے اُس نے بائیں ہاتھ سے پسینہ پونچھا اور واپس مڑا۔

"جناب چائے!"

"واپس لے جاؤ۔ میں پینا نہیں چاہتا ——" اُس کی اپنی آواز اُسے اجنبی معلوم ہوئی۔ نوکر چپکے سے باہر نکلا۔

وہ چند لمحوں تک خطوں کی سیاہ راکھ کو خالی خالی بے معنی نظروں سے گھورتا رہا۔

کچھ سوچ کر وہ پلٹا، وہ کہاں جاتے؟ لمحوں کے پہاڑ جم چکے تھے۔ زمستاں کی یخ بستہ اور طویل رات پھیلی ہوئی تھی اور کسی تارے کی چنگاری بھی نہ سلگتی تھی۔

وہ آگے بڑھا۔ اُس نے الماری کھول دی۔ باہر سیڑھی پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سے وہ چونک اٹھا لیکن دروازے کو بند دیکھ کر وہ مطمئن ہوا۔ اُس نے خواب آور گولیوں کی ایک نئی شیشی نکالی۔ سرد ہاتھ سے الماری بند کی۔

ارے ——؟ الماری کے نیچے فرش پر ٹیبل لیمپ کی دھیمی سی سبز روشنی میں ایک خط اُبھری ہوئی تہوں کے ساتھ پڑا تھا۔ یہ خط اُس کے ہاتھوں سے گر گیا ہے۔ سارے کے سارے خطوط جل کر خاکستر ہوتے لیکن یہ کم بخت ——؟ وہ اسے بھی جلا کر راکھ کر دے گا جو کہانی ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہے، اُس کا کوئی حصہ، کوئی تار بھی باقی نہیں بچنا چاہئے۔ یہ کہانی ختم ہونے کے لئے ہی شروع ہوئی تھی۔ وہ ٹیبل کی طرف آیا۔ اُس نے شیشی ٹیبل پر رکھ دی۔ اور خط کو دونوں ہاتھوں سے دو ٹکڑے کرنے کی نیت سے پکڑا ہی تھا کہ چرمراتے ہوئے خط کی تہوں سے تازہ خوشبو کی ایک شاداب لہر اُس کے نتھنوں کو چیر گئی۔

وہ حیران رہ گیا۔

وہ خط کو آنکھوں کے قریب لا کر حروف پڑھنے لگا۔ وہ اچھی طرح سے پڑھ نہ سکا۔

دل کی رانی!

تم نے میرے جیون کے ہر پل کو رنگ اور روشنی سے بھر دیا ہے۔ کل میری تمہاری ان بن ملاقات ہوگی۔ تمہارے خط کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ یہی خط میری زندگی کا سہارا ہیں۔ ماتا جی کا حال لکھو۔ ڈیڈی کی الماری سے ان کے لئے کیوڑا عطر کی نئی شیشی بھجوا رہا ہوں ...

ارے یہ خط؟ کہاں سے آگیا؟ یہ حروف! یہ شانتا کا خط تو نہیں ہے اور نہ اس کی تحریر ہی ہے، پھر یہ خط ——؟ یہ ماجرا کیا ہے؟

اس کی حیرت زدہ آنکھیں خط کے اوراق سے پھسل پھسل کر خاتمے کو ڈھونڈنے لگیں۔ دوسرے لمحے جب اس نے خط کے خاتمے کو دیکھا تو خط اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چھوٹ کر ٹیبل پر اوندھے منہ آن گرا —— اس کا سارا بدن پسینہ پسینہ ہو چکا تھا۔ وہ ٹیبل پر کہنیاں ٹکائے اپنے ہاتھوں سے چہرے کو تھامے ہوئے تھا۔ ایک لمبی سانس لے کر اس نے اپنے ہاتھ آنکھوں سے ذرا ہٹائے اور کنپٹیوں کے نیچے رکھ دیئے۔

معاً اسے محسوس ہوا کہ نیچے ٹیبل پر محبت کے خطوں کے انبار لگ گئے ہیں۔ رنگین اور معطر خط اس نے سر اوپر اٹھایا۔ اسے دکھائی دیا جیسے سارا کمرہ خطوں سے اَٹ گیا اور ساری کائنات پر محبت نامے بکھرے ہوئے ازلی اور ابدی رشتوں کے اسرار کے دفتر کھولے ہوئے ہیں۔ کہانی ختم نہیں ہوئی۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے۔ جہاں یہ بظاہر ڈوبتی ہے، وہیں اس کا طلوع بھی ہوتا ہے۔ وہ اٹھا۔ اس نے شیشی واپس الماری میں رکھ دی کچھ سوچ کر خط بھی الماری کے اندر رکھ دیا۔

وہ دروازے کی طرف آیا اور سوئچ آن کیا۔ کمرہ روشنی سے بھر گیا۔

"راگھو!"

"جناب!"

"دیکھ کیا رہے ہو، فوراً آگ جلاؤ!"

آتشدان کی آگ پھر روشن ہو گئی۔

"راگھو!"

"جی!"

"چائے لے آؤ —— اور ہاں، بھوشن آجائے تو کہہ دو کہ ڈیڈی بلاتے ہیں!"


عید مبارک
عید کے موقع پر خوب
دیکھ بھال کر اپنے لیئے
جوتوں کا انتخاب کیجیے
اور یہ آپ کے لیئے بہتر
ہوگا کہ آپ اپنی نزدیک
ترین باٹا کی دوکان میں
تشریف لائیے۔
Bata
فینسی ۹۵ر۵
سٹیلا ۹۵ر۱۰
من موہن ۹۵ر۱۱

غزل

رفعت سلطان بی۔ اے

گیسوؤں کی ہوا نہیں ملتی
زندگی کی فضا نہیں ملتی

منزلِ عشق میں خبر اپنی
صورتِ نقشِ پا نہیں ملتی

حسرتِ دید کے کرم سے مجھے
فرصتِ التجا نہیں ملتی

موت جب تک نہ عشق میں آئے
زندگی کو بقا نہیں ملتی

چھو کے اُن گیسوؤں کو آئی ہے
اب کسی سے صبا نہیں ملتی

عشق اگر ہو نہ قدرداں رفعت
حسن کو بھی ادا نہیں ملتی

غزل

ضامن ناگپوری

مقدر ہے حریفِ جلوۂ جانانہ برسوں سے
اسیرِ شامِ ہجراں ہے دلِ دیوانہ برسوں سے

ہزاروں انقلاب آئے ذرا جنبش نہ لی اُس نے
خدا معلوم کس عالم میں ہے دیوانہ برسوں سے

خدارا اب تو دل آزاریوں سے باز آجاؤ
چھلکنے کیلئے بیتاب ہے پیمانہ برسوں سے

جو اپنے چاکِ دامن کو رفو تک کر نہیں سکتے
وہ دیوانے سمجھتے ہیں مجھے دیوانہ برسوں سے

نہ قاصد ہی کوئی آیا نہ کچھ اُن کی خبر آئی
خدا جانے بھٹکتا ہے کہاں پروانہ برسوں سے

پرستش آج بھی کرتا ہوں میں ضامن کسی بت کی
ہے میرے کعبۂ دل میں نہاں بتخانہ برسوں سے

غزل

جبرئیل صدیقی ایم۔ اے

نظر سے کام غمِ عشق میں زباں کے لئے
کہ لفظ غیر ضروری ہیں داستاں کے لئے

یہ زندگی ہے کہاں زندگی تمہارے بغیر
کہ اتحاد ضروری ہے جسم و جاں کے لئے

تری نظر جو نہیں ہے تو کیا ہے قصۂ غم
کہاں سے لاؤں میں عنوان داستاں کے لئے

چمن میں آتشِ گل سے بھی آگ لگتی ہے
بہار و برق برابر ہیں آشیاں کے لئے

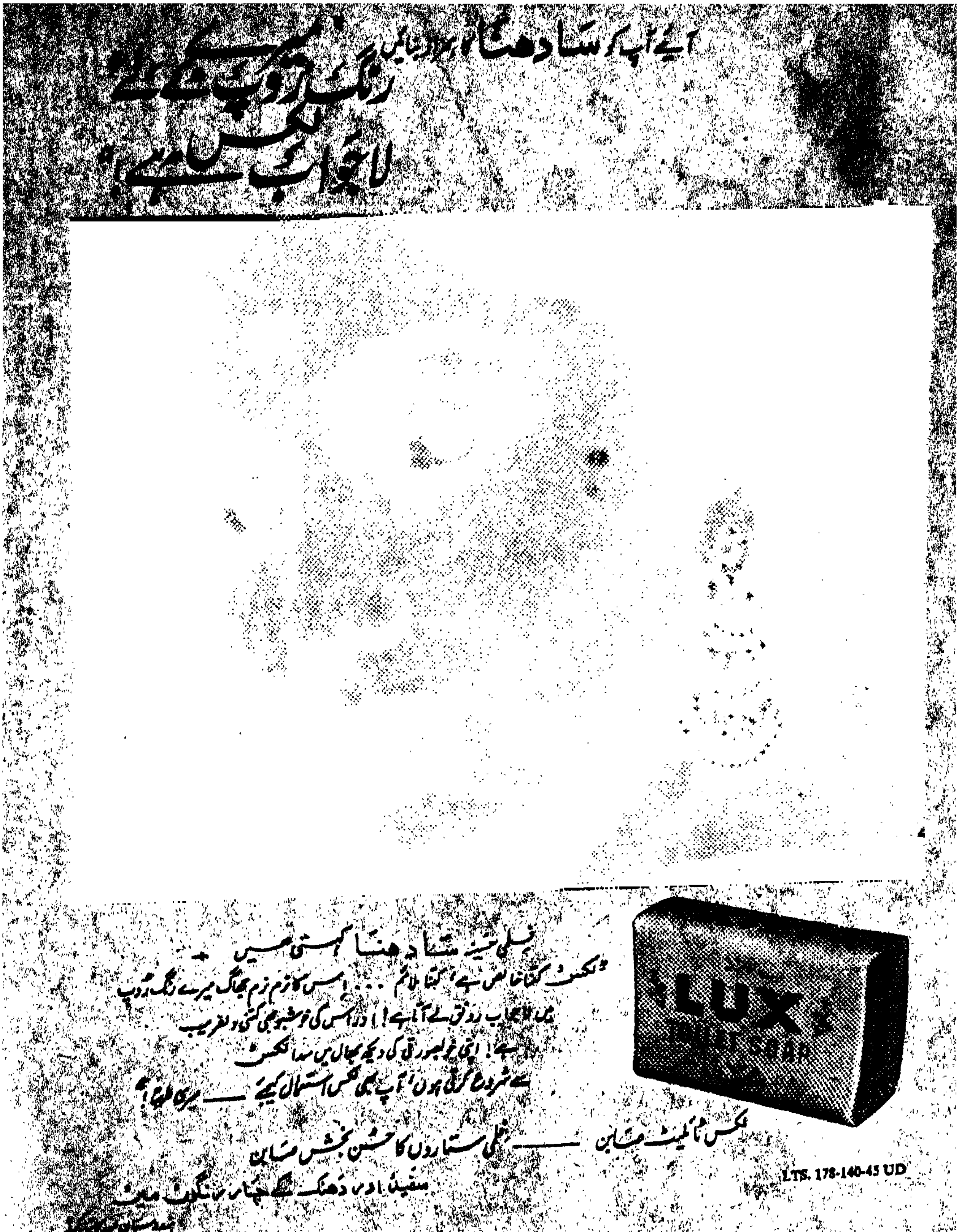
دلِ خراب کو خود نذرِ حسن کرتا ہوں
زمیں ابھار رہا ہوں میں آسماں کے لئے

گلوں کا رنگ بہت تیز ہو گیا جبرئیل
چمن میں آگ لگی میرے آشیاں کے لئے

غزل

ثمر انصاری نکاروی

بادہ و ساغر و سبو ہے تو کیا   سامنے کوئی ماہرو بھی تو ہو
ڈھونڈنے سے خدا بھی ملتا ہے   جذبۂ شوقِ جستجو بھی تو ہو
اُن کا ملنا تو کوئی بات نہیں   اُن سے ملنے کی آرزو بھی تو ہو


آئیے آپ کو سادھنا سے ملوائیں
جس کے رنگ روپ کے لئے
لکس
لاجواب ہے!
فلمی حسینہ سادھنا کہتی ہیں
"لکس کتنا خالص ہے، کتنا ملائم . . . اس کا نرم نرم جھاگ میرے رنگ روپ
میں لاجواب رونق لے آتا ہے! اور اس کی خوشبو بھی کتنی دلفریب
ہے! اپنی خوبصورتی کی دیکھ بھال میں سدا لکس
سے شروع کرتی ہوں، آپ بھی لکس استعمال کیجئے — میری طرح!"
LUX
TOILET SOAP
لکس ٹائلیٹ صابن — فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن
سفید اور دھنک کے چار رنگوں میں
LTS. 178-140-43 UD

مشہور اہلِ قلم کے

محبوب مشغلے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
ناموں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

راجہ مہدی علی خاں

۱۳۹۔ پالی روڈ، باندرہ۔ بمبئی ۵۰

۱۵ر جنوری ۶۵ء

برادرم مولانا "بیسویں صدی"! زندہ باد

جب سے آپ آوارہ گردی کے "دورے" پہ گئے ہیں، آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ اُمید ہے آپ اب تک بخیریت واپس آگئے ہوں گے ـــــ فروری کا "بیسویں صدی" اب تک نہیں ملا۔ شاید چند روز تک مل جائے۔ میں نے "مشاغل" کی دوسری قسط جو روانہ کی تھی وہ سب کی سب چھپ گئی یا کچھ حصّہ بچا ہے؟ ـــــ میں پچھلے دنوں بہت بیمار رہا۔ گردے خراب ہو جانے کی وجہ سے منہ، آنکھیں، ہاتھ، پاؤں، پیٹ سب متورم ہو گئے تھے۔ علاج جاری ہے۔ ہفتوں مرغ و ماہی سے محروم رہا ـــــ دو تین دن تک "مشغلوں" کی آئندہ قسط گھسیٹ ڈالوں گا۔ اطلاع دیجئے کہ زیادہ سے زیادہ کس تاریخ تک آپ کو یہ قسط مل جانی چاہیئے ـــــ برادرم مولانا بیسویں صدی! اگر آپ نے پھر کبھی مجھے کچھ بھیجا تو دِلّی آکر آپ کی ٹانگیں توڑ دوں گا ـــــ اب معلوم ہوا کہ مجھے جو مرچیں، مربّے، شامی کباب، اچار وغیرہ بھیجے گئے تھے وہ کسی مضمون کے معاوضے کے سلسلے میں تھے۔ میں سمجھا تھا کہ بھائی نے بھائی کو تحفہ بھیجا ہے۔ اب اِس قسم کی کوئی چیز بھیجی تو بذریعہ ہوائی جہاز سب چیزیں خوشتر گرامی کے پیٹ پر دے ماروں گا ـــــ وزیر آغا صاحب کو "بیسویں صدی" کا جنوری نمبر جس میں میرا مضمون درج ہے، نہیں ملا۔ از راہِ کرم فوراً انھیں جنوری اور فروری کے پرچے بذریعہ رجسٹری بھجوائیے۔ ہندوستان میں جس طرح آپ میرے تنہا دوست ہیں، پاکستان میں وزیر آغا صاحب ہیں ـــــ اگر آپ کو راجہ "تیر دلشتر علی خاں" کہلا کہلا کر خوش ہونے، قوم کو گاجروں کے فوائد اور مرچوں کے نقصانات بتانے سے فرصت مل جائے تو اِس خط کا جواب دیجئے۔ ورنہ نہیں۔

مخلص ـــــ راجہ مہدی علی خاں

جناب منیجر صاحب "بیسویں صدی"! اسلام مسنون

(آپ جانتے ہیں حضرت خوشتر گرامی میرے انتہائی عزیز دوست ہیں۔ خدانخواستہ کبھی اُن پر کوئی وقت پڑ جائے تو میں اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔ اُن کا ایک خط میرے نام آیا ہے جسے پڑھنے کے بعد میں بہ آسانی اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ میں اُن سے دُور ہوں۔ ایسے میں میری تمام اُمیدیں آپ ہی سے وابستہ ہیں۔ براہِ کرم جلد از جلد دُنیا کے مشہور ڈاکٹروں کو بذریعہ طیارہ دِلّی بُلوائیے اور اُن کا علاج ہندوستانی اور یوروپین ڈاکٹروں کے بورڈ کے ذریعہ کروائیے۔ فیس اور دیگر اخراجات کی بالکل فکر نہ کیجئے۔ "بیسویں صدی" کے اکاؤنٹ میں میرے ہزاروں روپے جمع ہیں اور

مزید رقم میں ٹیلیفون کے ذریعے بھیج دوں گا ان سے تمام بل ادا کر دیجئے (شکریہ!)
خاک پائے خوشتر گرامی ——— راجہ مہدی علی خان

سید سجاد ظہیر (دہلی)

سیاہ قلم سے سُرخ تحریریں لکھنا اور لکھوانا۔ ترقی کو پسند کرنا ——— ترقی پسندوں کو پسند کرنا اور ترقیاں دلوانا۔ کیمونزم ... "ترقی ازم" دونوں "ازموں" کو ملا کر ایک تیسری "اِزم" "موقع اِزم" ایجاد کرنا۔

ترقی پسندوں کو سُرخ گلاب سُنگھا سُنگھا کر ہوش میں لانا اور کہنا۔

"دیوانو! بکارِ خویش ہمیشہ ہشیار رہو"

اپنی کوٹھی کے باغ میں ٹماٹر، چقندر، آلوچے، آلو بخارے اور سُرخ مرچوں کی کاشت کرنا۔ علی سردار جعفری کو اپنے گھر کی چھت پر کھڑے دیکھ کر یہ مصرع پڑھنا ؏

سُرخ پوشے بہ لبِ بام نظر می آید

علی سردار جعفری کا جواب دینا ؏

نہ بزور و نہ بہ زاری نہ بہ زر می آید

آلِ احمد سرور (علی گڑھ)

آلِ احمد کی زبوں حالی دیکھ کر سرور حاصل کرنا۔ "انجمن ترقی اُردو" کے مقابلے میں "انجمن تنزلِ اُردو" کی حوصلہ افزائی کرنا۔ ادب کے ہسپتال میں مریضوں کے دلوں کا پہلے خوردبین سے پھر دوربین سے معائنہ کرنا۔ آخر میں "سیر بین" لکھنا۔

مریضوں کا پوسٹ مارٹم کر کے پہلے اُنھیں سڑک پر پھینک دینا۔ بعد میں اُنھیں اُٹھا کر گھر لے آنا۔ اُنھیں دیکھ دیکھ کر کبھی ہنسنا کبھی رونا۔ کفن اُتار کر اُنھیں دریا میں پھینک دینا اور کہنا ؎

ہوئے مر کے تم جو رُسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

خلیل الرحمٰن اعظمی (علی گڑھ)

خلیل کے ساتھ لفظ "خاں" لگا کر شاعری کے چمن زاروں میں خوبصورت فاختائیں اُڑانا۔ جنگل میں مُصلّٰی بچھا کر "یا خلیلُ" "یا رحمٰنُ" "یا اعظمُ" کا وِرد کرنا۔ مجھے علالت کی حالت میں سامنے سے گزرتے دیکھ کر وظیفے کے الفاظ یوں بدل لینا۔

"یا علیلُ" "یا ذلیلُ" "یا رذیلُ" "یا کمینُ"

کالج میں پروفیسروں کی حاضری لگانا۔ اپنے آپ کو بھول کر خلیل الرحمٰن اعظمی کو "غیر حاضر" لکھ دینا۔

راقم الحروف کو ہر روز دو ایک دماغوں اور دس ہزار بد دماغوں کے ساتھ یاد کر کے اپنی عاقبت خراب کرنا۔

اشعار گُنگُنانے سے صاف انکار کر دینا اور کہنا کہ اشعار غنڈے گُنگُناتے ہیں۔ پھر یکایک کسی غنڈے کے مندرجہ ذیل اشعار گُنگُنانے لگنا ؎

کیوں بے تیلی اُونگھ رہا ہے؟
جب "وہ" آئے
کر کے ہائے
آنکھ تو اُس کو مار
تاش کے پتّے پھینکو یارو
تاش کے پتّے پھینکو یار

عبادت بریلوی (کراچی)

بندوں کے خدا کی خود عبادت کرنا اور خدا کے بندوں سے اپنی عبادت کرانا۔ تنقیدی مضامین پر تنقیدی مضامین لکھنا۔

ہر روز بریلی کے پاگل خانے کی سیر کرنا۔ پاگلوں سے تبادلۂ خیالات کرنا۔ اُنھیں اپنے تنقیدی مضامین سُنا سُنا کر خوش ہونا۔ اُن کی رائے لینا۔ اُن کی رائے سے لفظ بہ لفظ اتفاق کرنا۔ ہوشمندوں کی ایک نہ سُننا۔

پاگلوں کو اپنا رباعیاتِ عمر خیام کا ترجمہ سُنانا۔ اُن کی رائے پوچھنا۔ کچھ پاگلوں کا چلّا چلّا کر کہنا: "بھاگ جاؤ غلط ترجمہ ہے" کچھ پاگلوں کا کہنا: "اماں جانے دو ؏

دیوانہ ہے دیوانہ، دیوانے کو کیا کہئے"

کچھ پاگلوں کا عبادت صاحب کے ہاتھ میں چاقو دے کر کہنا ؎

مِٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

عاشق بٹالوی (لندن)

لندن میں رہ کر لاہور سے محبت کرنا۔ یورپین لائبریریوں سے مشاہیر کی ڈائریاں

کھود کھود کر نکالنا اور انھیں واپس کرنے کے لئے "اولڈ وُنیا" کے دفتر بھیجنا۔

شیکسپیئر کے مزار پر اگر بتیاں سُلگانا۔ فاتحہ پڑھنا۔ انگریزی میں قوالیاں لکھ کر ہندوستانی دُھنوں میں گوانا۔ حال میں آنا۔ نیازیں دلوانا۔ منتیں ماننا۔ انگریز دوستوں سے زبردستی تسبیح پر آیت کریمہ پڑھوا کر شیکسپیئر کی رُوح کو ثواب پہنچانا۔ شیکسپیئر کو "مولانا" کہنا۔

انگلینڈ کی لائبریریوں میں (unpaying Guest) کی حیثیت سے رہنا۔ وہاں کی دیمک زدہ قلمی کتابوں کی جھاڑ پونچھ کا کام مُفت کرنا۔

ٹاور آف لندن پر چڑھ کر انگریزی میں اذان دینا۔ نیچے کھڑی ہوئی پبلک کو مخاطب کر کے کہنا۔

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تم فقط انگریز ہو، انگریز ہو، انگریز ہو

شاہد احمد دہلوی (کراچی)

دُشمنوں کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہنا "میاں جانے دو، پہلوان افقیر کر تنگ نہ کرو۔ غصہ تھوک دو"۔۔۔۔۔ سمجھانے بجھانے پر بھی جب دُشمن باز نہ آئے تو نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کہہ کر دُشمن پر پل پڑنا۔ پہلے اُس کا گریبان پھاڑنا۔ پھر گھونسوں سے اُس کے دانت توڑنا۔ پھر لاتیں مار مار کر اُس کی ہڈی پسلی ایک کر دینا اور کہنا ع

"ہاتھ لا اُستاد کیوں کیسی رہی؟"

حسینۂ اُردو کو لچکے دار خوبصورت غرارہ پہنا کر دہلوی محاوروں کے زیوروں سے آراستہ کرنا۔ افشاں لگا کر عطرِ حنا کی خوشبو میں مہکا کر، اُسے حُسن کی بلندیوں پر بٹھا دینا اور پھر کہنا: "شعر عرض کرتا ہوں۔۔۔"

سارنگی کے کان مروڑنا۔ طبلے کے پیٹ پر گھونسے لگانا۔ ستار کی زلفوں کو مضراب سے چھیڑ چھیڑ کر تانیں لگانا اور...

مجھ خوست نا مید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

لڑنے والے مرغوں میں صلح کرانا۔ نہ لڑنے والے مرغوں کو لڑنا سکھانا۔

مصنفوں کو اُن کی کتابوں کے حقوق مُفت واپس کر کے اپنا دیوالہ نکالنا۔

گھاٹے کے بیوپار کرنا۔ خوش ہونا۔

دلّی کی طرف مُنہ کر کے دلّی کو یاد کرنا۔ دلّی والوں کو یاد کرنا۔ قطب مینار کی بلندی کو دعائیں دینا۔ جامع مسجد دہلی کی یاد میں نہاری کھانا۔ بے حد مرچوں والی نہاری کھلا کر اپنے پنجابی دوستوں یا دُشمنوں کی آنکھوں سے آنسو نکلوانا۔ خوش ہونا اور کہنا ؎

آپ کے مُنہ میں نہاری رکھ دی و اِک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

مرزا ادیب (لاہور)

غبی لڑکوں کو شاگرد بنانا۔ اُن کی خاطر بیگم سے ڈانٹیں کھانا۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑانا۔ بدحواس رہنا۔

"صحرا نورد کے خطوط" پوسٹ کرنے کے لئے صحراؤں میں لیٹر بکس تلاش کرنا۔ ریگستان کے اونٹوں کو دوست بنانا۔ اونٹوں کی سواری کرنا۔ اونٹنیوں کا دودھ تھنوں میں مُنہ لگا لگا کر پینا۔ اونٹوں کو "بھائی جان" کہنا۔ اونٹوں سے پوچھنا "اونٹ رے اونٹ۔۔۔۔! تمھاری کون سی کل سیدھی؟" (اونٹوں کا جواب دینا "میرا رے میرزا! تیری کون سی کل سیدھی؟") اونٹوں سے رُوٹھ جانا۔

پالش کر کر کے ڈرامے لکھنا۔ آغا حشر کاشمیری کے مزار پر فاتحہ دلوانا۔ مزار میں آغا صاحب کو مخاطب کر کے ناقدریٔ عالم کی شکایت کرنا۔ پہلے تو فرطِ احترام سے آغا صاحب کے مزار پر گھٹنے ٹیک دینا پھر مُرغا بن جانا۔ دو گھنٹے تک مُرغا بنے رہنا۔ کچھ یاد آتے ہی یکایک کان چھوڑ کر کھڑے ہو جانا۔ پھر اپنے اونٹ پر سوار ہو کر سرپٹ ... کی طرف بھاگ جانا۔ آخر ایک گندی جگہ آ کر رُک جانا اور یہ شعر پڑھنا ؎

کس نے پھینکا یہاں کوڑا کرکٹ
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

شاد امرتسری (لاہور)

لاہور اور پشاور ریڈیو سے اپنے کلام کی بجائے دوسرے شعراء کا کلام براڈ کاسٹ کرنا۔ کسرِ نفسی کرنا۔ اپنا کلام نہ سُنا کر سُننے والوں کی دعائیں لینا۔

شاد عظیم آبادی۔ شاد عارفی۔ نرلیش کمار شاد۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد اور شاد امرتسری کے نام لے لے کر دوسرے شاعروں کو تلقین کرنا کہ وہ بھی اپنا تخلص شاد رکھ کر قوم کے دل شاد کریں۔

"شاد" کے آگے "ی" بڑھا کر مُلک کی آبادی میں اضافہ کرنے کی کوشش کرنا۔

اپنی کامیابی کے لئے نیازیں دلوانا۔ نیاز دینے سے پہلے کہنا "نیاز دیتا ہوں میں واسطے نیاز فتح پوری کے۔ مُنہ میرا فتح پور بدمعاش کی طرف"۔

میری نظموں کی تعریفیں کرنا۔ میری طرف سے بھیجے ہوئے شکریے کے تاروں کو پھاڑ پھاڑ کر پھینکنا اور کہنا ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہُنرش نہفتہ باشد

حکیم یوسف حسن مرحوم (لاہور)

اپنا خون محمل [illegible] کی نسوں میں داخل کرنا۔ اب کی خدمت میں اپنا [illegible] کے [illegible]۔

[illegible] واپس بلانا۔

[illegible] میں مصالحت کرانا۔ طرح طرح کے گٹھے تیار کرنا۔

اپنی سونے کی انگوٹھی آگ میں پھینکنے کے بعد گھبرا کر اُسے چمٹے سے جلدی سے باہر نکالنا اور یہ مصرعہ پڑھنا ؎

تو آزُردہ شدی آہ چرا کردم من

عارف عبدالمتین (لاہور)

معرفت کی باتیں کرنا۔ عشقِ حقیقی کی تعلیم دے کر دُنیا والوں کو دُنیا سے بیزار کرنا۔ بعد میں انھیں عشقِ حقیقی کے خلاف لیکچر دے کر عشقِ مجازی کی طرف گھسیٹ لانا۔ قہقہے لگانا۔

بچّوں کو پڑھانا۔ پڑھاتے پڑھاتے آرٹ کی دُنیا میں چلے جانا۔ واپس آنے پر کلاس روم کو خالی پانا۔ چپراسی سے پوچھنا "بچے کہاں گئے؟" چپراسی کا کہنا "وہ تو جوان ہو گئے۔ اُن کی شادیاں بھی ہو گئیں۔ اب وہ خود پروفیسر ہو گئے ہیں۔" حیران ہو کر چپراسیوں کو پڑھانے کی کوشش کرنا۔ چپراسیوں کا چیخیں مار کر بھاگ جانا۔

آرٹ کی دُنیا میں واپس چلے جانا۔ دس برس کے بعد واپس آکر پوچھنا "میں کہاں ہوں؟" لڑکوں کا اطلاع دینا کہ "یہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا دفتر ہے۔" یہ سُنتے ہی "انا الحق" کا نعرہ لگا کر سڑک پر واپس بھاگ آنا۔

چڑیا گھروں کو پاگل خانے اور پاگل خانوں کو چڑیا گھر کہنا۔ آسمان کو رباعیات سُنانا۔ کُتّوں سے مختلف مصرعوں پر گرہیں لگوانا۔

ایک سانس میں ہزاروں باتیں کہہ جانے کے بعد ایک سال کے لئے بالکل خاموش ہو جانا۔ کسی اونچے درخت کی ٹہنی پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ جانا اور کہنا ؎

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بُلبل ہے کوئی اُداس بیٹھا
آنکھوں سے ٹپک رہے ہیں آنسو
اور کہتا ہے "ہائے میں کروں کیا"

مختار صدیقی (لاہور)

سارنگی بجانا۔ تان پورے بیچنا۔ مور پنکھیوں کی مرمّت کرنا۔ پائلیں پہن کر سارے

شہر میں گھومنا ناچنا اور ساتھ ساتھ یہ مصرع [illegible]

پگ [illegible] باندھ [illegible]

ساتھ سُر کہانا۔ پیا ستم گر [illegible] ناچنا اور [illegible]

ثنائیہ سے ترنم ہاتھ والے [illegible] کا ورد کرنا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

۱۔ پنگھٹ پہ گُریا چھوڑ گیو شام

۲۔ پائلیں بجتی ہیں گھونگھرو کی صدا آتی ہے

۳۔ تانا نا۔ ری دی ری دی ری

یوسف ظفر (لاہور)

قد چھوٹا کرنے کی دوائیں کھانا۔ چاکلیٹ کھانا۔ جیبوں میں کھلونے رکھ کر باہر پھرنا۔ فیڈر خریدنا اور چوسنا۔ ننھی ننھی نظمیں لکھنا۔ گلیور ز ٹیلز پڑھنا۔

حسن میں اپنا مقابلہ حضرت یوسف سے اور بُزدلی میں اپنا موازنہ بہادر شاہ ظفر سے کرنا۔ حسینوں کا ذکر کرتے ہوئے دوستوں سے کہنا ؎

میں کسی کی آنکھ کا نور ہوں، میں کسی کے دل کا قرار ہوں
نہ چل کے مجھ سے کہا کرو کہ میں ایک مُشتِ غبار ہوں

لارنس گارڈن (لاہور) میں دراز قد حسینوں کو مخاطب کر کے کہنا ؎

قد سرو کے جاؤ گی کہاں تم؟
تمہیں سیڑھی لگا کر ہم چُھو لیں گا

ثناء اللہ ایڈیٹر نیا دور (کراچی)

ہر ماہ اپنا نام بدل ڈالنا (آجکل ان کا اسم گرامی ممتاز احمد ہے) "نیا دور" نکالنے کے بعد چھ ماہ کے لئے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لینا۔ اُٹھتے ہی جلدی سے نیا دور کا آئندہ شمارہ مرتّب کرنا۔ اُسے پوسٹ کر کے پھر چھ ماہ کے لئے سو جانا۔ فرنگی دوستوں اور مضمون نگاروں سے بحث کرنا۔ شہابؔ، نصیر، دہیجا۔ مندرجہ ذیل مصرعے گنگنانا ؎

قوم کے غم میں نیند اڑائی ہے
چھ مہینے کی نیند سوتا ہوں
قوم کے غم میں اُٹھ کے روتا ہوں

فارغ بخاری

وجہ تسمیہ — بچپن میں نام ذوالفقار خاں تھا۔ بچہ ہر وقت بخار میں مبتلا رہتا تھا۔ ایک دن کسی فقیر نے اُن کے در پر دستک دی۔ فقیر کو بہلانے اور بخار سے [illegible] کی کوشش کیا گیا

[illegible] ہو؟

گھر والوں نے [illegible] ڈاکٹر کو بلایا [illegible] بس وہ [illegible] ہے۔

[illegible] تب [illegible] سب ٹھیک [illegible] جسم [illegible] بخار [illegible] تھا۔

[illegible] ہو گیا [illegible] بس [illegible] کا نام ناسخ بخاری [illegible] جب کبھی اسے بخار آئے گا، تیسرے دن [illegible] اتر جائے گا۔ چنانچہ بچے کا نام ناسخ بخاری رکھ دیا گیا۔

پھر کیے مشغلے —

[illegible] تیسرے دن فارغ ہو جانا۔ وزیر آغا صاحب سے [illegible] پیسہ خرید کر [illegible] بیچا۔ پشاور کے قابل اعتراض بازاروں میں تہبند باندھ کر اور کانوں میں عطر کی پھریری رکھ کر وزیر آغا صاحب کے ساتھ گھومنا اور [illegible] کے ساتھ [illegible] گرم [illegible] اور بستر پر تپ تپ کر پہلو بدل بدل کر [illegible] یہ شعر پڑھنا ہے

گئے دو کوئی بند آکر بخاری
بخار عاشق صبا آتی نہیں ہے

مضمون نگار حضرات

سے درخواست ہے کہ مضمون بھیجتے وقت [illegible] مضامین لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں کیونکہ برائے اشاعت موصول ہونے والے مضامین میں سے مختصر افسانوں کو طویل افسانوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور طویل افسانے مضمون نگاروں کو واپس کر دیئے جاتے ہیں۔ غیر مطبوعہ مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ بھیجیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے [illegible] غیر مطبوعہ [illegible]

مشہور افسانہ نگار

حضرت آسی رام نگری مناسب اجرت پر اصلاح کا کام بھی کرتے ہیں۔ ضرورت مند اصحاب شعر و شاعری لکھنے والے اپنے مضامین، افسانوں اور کتابوں پر اصلاح لے کر ایک مستند اور بہتر خدمات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ پتہ: معرفت آسی رام نگری مظفر [illegible] دہلی


SUNLIGHT
SOAP
نئے فارمولے والے
سنلائٹ
سے آپکے کپڑے چمک اُٹھتے ہیں!
نئے فارمولے والے سنلائٹ کی شان دیکھئے ... نیا خوشنما سرورق، نئی خوبصورت ٹکیہ اور زیادہ اُجلی دُھلائی کی قوت! اِس قوت کی بدولت آپکے کپڑے ہر بار زیادہ چمکدار دُھلتے ہیں ...
جی ہاں! زیادہ سفید، زیادہ چمکدار!
ہندوستان لیور کا تیار کردہ
S. 56-140-45 UD

تحفہ

واسو دیو۔ ایم اے

۳۶۔ برانڈول روڈ، ویسٹ ڈریٹن۔ میڈل سیکس (انگلینڈ)

۱۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء　　　　محترمی خوشتر صاحب آداب

ایک مدت کے بعد اپنے وطن سے پانچ ہزار میل کی دوری سے "بیسویں صدی" کے لئے ایک افسانہ "تحفہ" ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ کو اور قارئین "بیسویں صدی" کو پسند آئے گا ——— "بیسویں صدی" آپ کی عنایت سے باقاعدگی سے ہر ماہ مل رہا ہے اور اسے پاکر ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے ہر ماہ اپنے وطنِ عزیز پہنچ جاتا ہوں ——— "تحفہ" کے بارے میں آپ کی اور قارئین "بیسویں صدی" کی رائے کا منتظر ہوں۔۔۔

نیازمند ——— واسو دیو

سُدھا نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ وہ بہت آرام سے بے فکری کی نیند سو رہا تھا۔

لیکن جب سے سُدھا نے سیڑھیوں میں وہ منظر دیکھا تھا، اُس کی آنکھوں کی نیند غائب ہو گئی تھی۔ اُسے اپنی دُنیا میں اندھیرا بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا، اپنی جیون نیا بھنور میں گھِرتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ سب سوچ سوچ کر اُس کا دماغ بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ عورت کی دُنیا اُس کا شوہر ہی تو ہوتا ہے۔ وہ اُسی کے سہارے ہنستی، ناچتی، گاتی، اُچھلتی اور کودتی پھرتی ہے۔ جب وہی اُسے دغا دے جائے تو پھر عورت کا جینا کیسا؟ شوہر اگر ہنس کر بات کرلے تو عورت کے لئے دُنیا روشن ورنہ ایک بھیانک کالی رات!

کچھ دیر پہلے سُدھا نے دیکھا تھا یہی اندھیرا اُس کے سُکھ سنسار کو نگل رہا تھا۔

وہ بازار گئی تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے اُسے بہت دیر ہو گئی۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ اِس لئے وہ تیز تیز قدم بڑھاتی چل رہی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ اُس کا شوہر جے دفتر سے لوٹ آیا ہوگا اور اُسے گھر نہ پاکر پریشان ہوگا۔ ویسے وہ مسز سریواستوا سے کہہ تو آئی تھی۔ تالے کی ایک کُنجی جے کے پاس بھی تھی اِس لئے گھر کا دروازہ کھولنے میں جے کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ پھر بھی وہ اُسے نہ پاکر پریشان تو ہوگا ہی۔ کتنا پیار کرتا ہے وہ اُسے۔ اُسے نہ پاکر وہ پریشان ہو جاتا ہے۔

اِس طرح ایک دن جب وہ شاپنگ سے گھر دیر میں پہنچی تھی تو جے کو پریشان اور اُداس دیکھ کر اُس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"جے تم میرے ذرا سے لیٹ آنے پر اتنے بے چین کیوں ہو جاتے ہو؟"

"بازاروں میں سڑکوں پر لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اور موٹر گاڑیوں کا تانتا سا لگا رہتا ہے۔ اُس افراتفری میں میری بُلبل کہیں کھو گئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ یہ سوچ کر میں اُداس ہو جاتا ہوں۔"

"ہماری شادی کو چار ہی سال تو ہوئے ہیں۔ اِس سے پہلے بھی میں اِسی شہر میں رہتی آئی ہوں۔"

"اُس وقت تم بہت محفوظ تھیں۔"

"وہ کیسے؟"

"اُس وقت تم میرے سپنوں میں جو قید تھیں۔"

جے کی یہ بات سُن کر سُدھا کا رُواں رُواں کھِل اُٹھا تھا۔ یہ سوچتی ہوئی وہ جلدی جلدی قدم بڑھا رہی تھی۔ اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ کسی کو باتیں کرتے ہوئے سُن کر ٹھٹک گئی۔ اُسے سُنائی دیا۔

"پکڑ لیا نا! بتاؤ اب کیسے بھاگو گی؟ نہ جانے کب سے مجھے دُور دُور سے ترسا رہی ہو۔ بڑی ظالم ہو!"

یہ آواز سُن کر سُدھا کانپ گئی۔ یہ تو جے ہے!! وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ اندھیرے میں اُسے جے کی پرچھائیں سی دکھائی دی۔ وہ کسی کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

[illegible]

اُس آواز کو سُن کر سُدھا چونک اُٹھی۔ یہ تو مسز سریواستو کی نوجوان لڑکی ریتا ہے!

"کوئی نہیں آئے گا۔ ریتا، تمہاری ممی تو پہلی منزل کھانا بنا رہی ہیں۔"

"اور سُدھا؟" ریتا جے کے نزدیک ہوتے ہوئے بولی۔

"بازار شاپنگ کے لئے گئی ہے۔ آج تو ان پنکھڑیوں کو چھو لینے دو۔" جے کی آواز سُدھا کو سُنائی دی۔

اِس سے پہلے کہ وہ اور قریب آتے ریتا ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی اور جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ یہ دیکھ کر سُدھا بھی ایک کونے میں دُبک گئی۔

جے نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بھاگتی ہوئی ریتا سے ہنس کر کہنے لگا۔

"کوئی نہیں تھا۔ وہ تو بلی تھی۔ بس بلی سے ڈر گئی!"

لیکن ریتا نے مڑ کر نہ دیکھا اور بھاگ کر اپنے گھر میں گھس گئی۔ دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز سُدھا کو بھی سُنائی دی۔ کچھ دیر تک جے وہیں کھڑا رہا اور جب سیٹی بجاتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اُترا تو سُدھا کونے سے نکلی۔

"کون؟ سُدھا؟" جے نے پوچھا۔

"ہاں!" سُدھا نے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے بہت جلد آنے کی کوشش کی لیکن دیر ہو ہی گئی۔" سُدھا نے جے کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔

جے نے اندھیرے ہی میں سُدھا کے ہاتھوں کے بنڈل کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ اتنی دیر تمہیں کیوں ہو گئی۔"

"مجھے ڈھونڈنے چلے تھے شاید!"

"ہاں۔ اندھیرا چھا رہا تھا نا!"

وہ اِس طرح باتیں کرتے ہوئے اوپر آ گئے۔ سُدھا ہی نے دروازہ کھولا۔ بجلی روشن کرتے ہوئے بولی۔

"پھر تو میں وقت ہی پر آ گئی ہوں نا۔ زیادہ اندھیرا تو نہیں ہوا؟"

سُدھا کے طنز کو جے نہ سمجھ سکا۔

اپنے کسی بھی انداز سے سُدھا نے جے پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اُس نے ریتا اور اُس کی رومان بھری باتیں سُن لی ہیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ حسبِ معمول اپنا کام کرتی رہی۔ لیکن اُس کا دل رو رہا تھا۔ اُس کے دل سے ہُوک اُٹھتی تھی لیکن وہ اُسے دبا دیتی۔

سُدھا اب اپنے پلنگ پر پڑی تھی۔ نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ اُسے اپنے چاروں طرف بھیانک اندھیرے کے سوا کچھ نہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کیا کرے؟ اُس نے اپنے دل سے پوچھا۔ اگر وہ مسز سریواستو سے کہا تو وہ کبھی یہ ماننے کے لئے تیار نہ ہوں گی

کہ اُن کی بھولی بھالی اور شرم و حیا کی پُتلی لڑکی ریتا [illegible] اور پاکیزگی کے لئے وہ بڑی سے بڑی قسم کھانے کے لئے تیار ہو جائیں گی۔

اگر جے سے کچھ بات کرتی ہے تو گھر میں [illegible] کب کہتا ہے کہ اُس نے چوری کی ہے۔ چاہے وہ رنگے ہاتھوں [illegible] جیسے اپنا قصور مان لے گا۔ اِس سے فائدہ کے بجائے [illegible] بگڑے گا۔ جے کچھ پروا نہ کرے گا۔ بس اُس کی اپنی ہی زندگی زہر بن جائے گی۔

ایسے ہی خیالات میں ساری رات گزر گئی۔

صبح اُٹھ کر بھی سُدھا اپنے دل کی بات زبان پر نہ لائی۔ دفتر جاتے ہوئے جے نے سُدھا سے کہا۔ "سُدھا آج میں تم میں ایک بہت بڑی تبدیلی دیکھ رہا ہوں۔"

جے کی بات سُن کر سُدھا کانپ گئی۔ وہ سوچنے لگی کیا اُس کے مَن کا چور جے نے پکڑ لیا ہے؟

"جانتی ہو آج میرا جنم دن تھا۔ شادی کے بعد تم میرے ہر جنم دن پر صبح اُٹھ کر سب سے پہلے ہیپی برتھ ڈے کہا کرتی تھیں۔ آج یہ بات تم بھول گئی ہو۔ کہیں شام کا پروگرام نہ بھول جانا۔ شام کی دعوت بہت مزیدار ہو۔"

جے نے اُس کے ریشمیں بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

سُدھا نے جے کی بات سُن کر اطمینان کی سانس لی۔

"اوہ! یہ تو واقعی بہت بڑی بھول ہوئی۔ اِس کی تو مجھے بہت بڑی سزا ملنی چاہئے۔ بطور جُرمانہ آج شام کو دعوت کے ساتھ ساتھ میں آپ کو ایک شاندار تحفہ بھی دوں گی۔" سُدھا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"سچ! کاش شام ابھی آ جائے!" جے نے سُدھا کے گالوں پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"انتظار کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ انتظار کیجئے شام کا۔"

سُدھا کی بات سُن کر جے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

شام کو جے گھر لوٹا تو اُس نے دیکھا ریتا بھی سُدھا کے ساتھ کام میں مشغول ہے۔ وہ اُسے دیکھ کر حیران ہوا۔ شوہر کی حیرانگی کو بھانپ کر سُدھا نے کہا۔

"آج آپ کا برتھ ڈے ہے نا! اِس لئے بہت سے پکوان بنائے ہیں۔ مدد کے لئے ریتا کو بُلا لیا تھا۔"

"کیا سارے شہر کو دعوت پر بُلا رہی ہو؟" گھر کی سجاوٹ کو دیکھ کر جے بولا۔

"خیال تو یہی تھا۔ مسٹر اور مسز کپور کا آج سنیما دیکھنے کا پروگرام تھا۔ چڈھا صاحب اور اُن کی دھرم پتنی ایک رشتے دار کی شادی میں گئے ہوئے ہیں۔ مسز سریواستو کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ اِس لئے ہماری خوشی میں صرف بے چاری ریتا ہی شریک ہو رہی ہے۔"

سدھا نے جے کو بتایا۔

رات کو ریتا، سدھا اور جے تینوں نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد تینوں تاش کھیلنے لگے۔ تاش کھیلتے کھیلتے جے کو یاد آیا۔

"ارے ہاں سدھا! وہ آج تم مجھے میری سالگرہ پر کوئی تحفہ دینا چاہتی تھیں؟"

"میں تو بھول ہی گئی تھی۔ نہ جانے کیا بات ہے آج میں ہر چیز بھولتی جا رہی ہوں؟"

"پھر لاؤ وہ تحفہ؟"

"دوسرے کمرے میں ہے ابھی لاتی ہوں۔" تاش کے پتّوں کو پھینک کر سدھا اُٹھی اور کمرے سے باہر آ گئی۔ کمرے میں ریتا اور جے ہی رہ گئے تھے۔ سدھا نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا وہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"اس طرح چوری چھپے دیکھنے سے کچھ نہیں بنتا ہے اور نہ اندھیرے میں سپنے میں کھڑے ہو کر دل کی پیاس بجھتی ہے۔ میں نے دروازہ بند کر دیا ہے۔ جب خوب دل کی بھڑاس نکل جائے تو مجھے آواز دے لینا۔"

اور سدھا نے باہر سے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔

"جے جیسے برتھ ڈے بوائے! جنم دن پر اپنی دھرم پتنی کی طرف سے اس حقیر تحفے کو قبول کرو۔" سدھا نے باہر ہی سے کہا۔

جے اور ریتا بُت بنے سدھا کی باتیں سُنتے رہے۔ شرم و حیا سے وہ زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ ندامت سے جے کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ ریتا نے شرم سے اپنا منہ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کچھ دیر تک کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔ صرف ریتا کی سسکیوں کی آواز اُس خاموشی کو توڑتی رہی۔

آخر جے نے اُس خاموشی کو توڑا۔ دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے بولا۔

"سدھا دروازہ کھولو۔ ہم دونوں اپنی اس غلطی پر شرمسار ہیں۔"

جے کی آواز سُن کر سدھا نے دروازہ کھولا تو ریتا دوڑ کر سدھا کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"دیدی! میں تمہاری مجرم ہوں جو سزا دو گی مجھے منظور ہے۔"

پیروں پڑی ہوئی ریتا کو اُٹھاتے ہوئے سدھا نے بہت مشکل سے اپنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روکتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔

"کسی کی خوشیوں کا محل گرا کر اُس پر اپنی خوشی کا محل نہیں بنایا کرتے پگلی! شرم اور ندامت کے آنسو تمہاری آنکھوں میں ہیں بس یہی سزا کافی ہے۔ جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا۔"

سدھا کی آواز سُن کر ریتا وہاں سے بھاگ گئی۔

"کیوں کیسا رہا یہ تحفہ؟" جے کی طرف مسکراتے ہوئے سدھا نے کہا۔

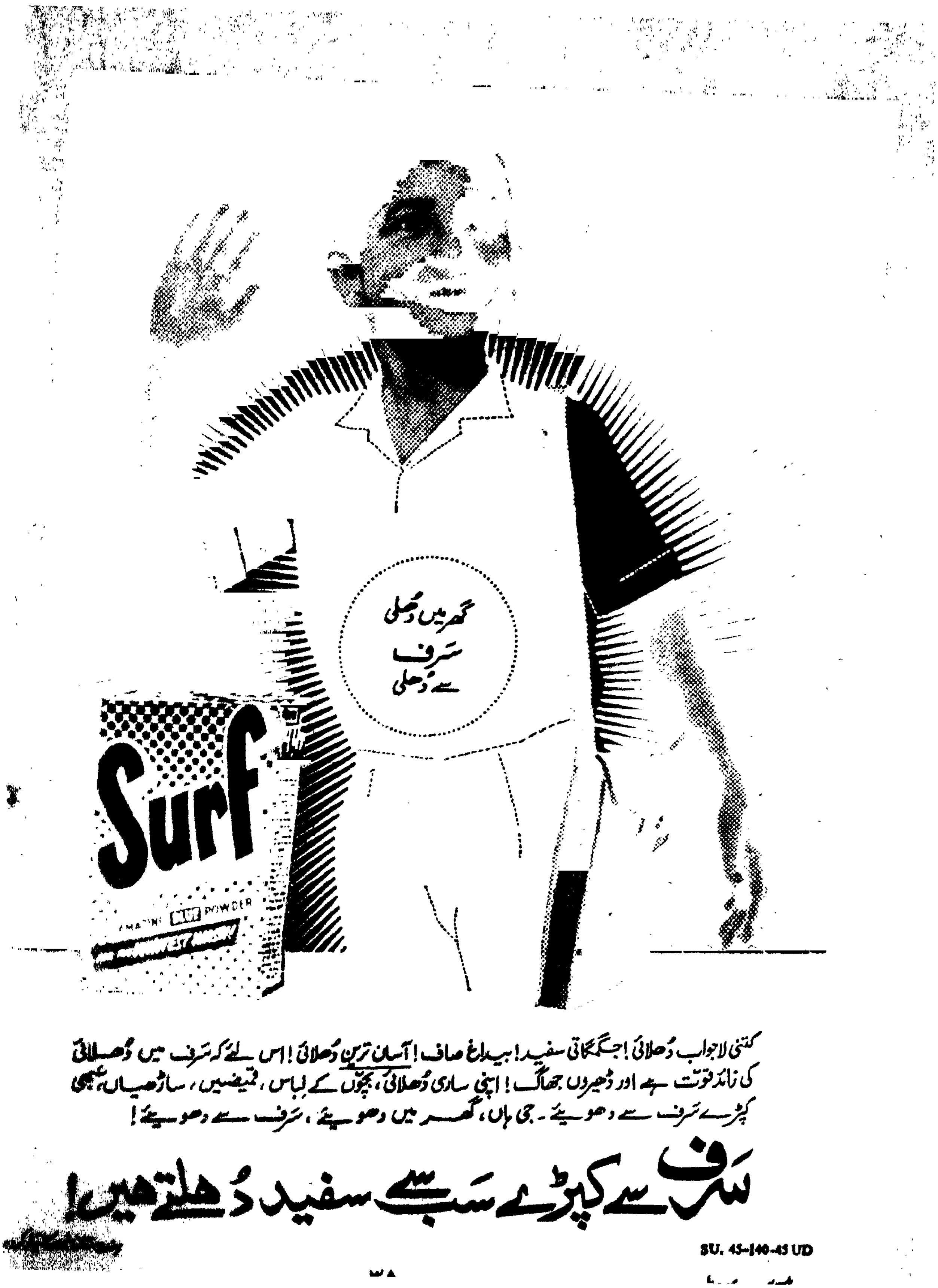
جے اُسی طرح سر جھکائے کھڑا رہا۔ سدھا بہت دیر تک جے کو نہ دیکھ سکی۔ آخر کو رونے پر مجبور ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر گالوں پر لڑھکنے لگے اور آگے بڑھ کر سدھا نے جے کو گلے سے لگا لیا۔

غزل

اختر واصفی

تم نے جو درد دیا ہے یارو — یہ تو ہر دُکھ کی دوا ہے یارو
راہزن راہ نُما ہے یارو — یہ تماشا تو نیا ہے یارو
تم سے جو پیار کیا ہے یارو — یہ ہماری ہی خطا ہے یارو
اتنے چُپ چاپ سے کیوں بیٹھے ہو؟ — آج کیا تم کو ہوا ہے یارو؟
کیوں نظر آتی ہے سُونی سُونی؟ — کون محفل سے گیا ہے یارو؟
کون یہ فتنہ خرام آیا ہے؟ — ہر طرف حشر بپا ہے یارو
ذرّہ ذرّہ ہے جو روشن اِس کا — کون اِس رہ سے گیا ہے یارو؟
چھوڑ کر راہ میں تم بھاگے ہو — کیا یہی شرطِ وفا ہے یارو
اپنے گلشن میں بہار آئی ہے — تم نے کچھ آج سُنا ہے یارو
کیوں جبیں خود ہی جھکی جاتی ہے — کس کا نقشِ کفِ پا ہے یارو
رُوٹھتے ہیں کہ مناتے کوئی — یہ حسینوں کی ادا ہے یارو

تم ہی ناراض نہیں اختر سے
اک زمانہ ہی خفا ہے یارو


گھر میں دُھلی
سَرف سے دُھلی
Surf
POWDER
کتنی لاجواب دُھلائی ! جگمگاتی سفید ! بیداغ صاف ! آسان ترین دُھلائی ! اس لئے کہ سَرف میں دُھلائی
کی زائد قوت ہے اور ڈھیروں جھاگ ! اپنی ساری دُھلائی ، بچّوں کے لباس ، قمیضیں ، ساڑھیاں ، سبھی
کپڑے سَرف سے دھوئیے ۔ جی ہاں ، گھر میں دھوئیے ، سَرف سے دھوئیے !
سَرف سے کپڑے سب سے سفید دُھلتے ہیں !
SU. 45-140-45 UD

افسانہ

تنہا تنہا

ایم کوٹھیاوی راہی

قاضی پور خورد۔ گورکھپور (یوپی)

۲۶ راکتوبر ۶۳ء برادر محترم خوشتر صاحب! آداب

... پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ آپ کی خاموشی بھی کتنی پیاری ہے۔ زیادہ سے زیادہ مشق اور محنت کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ دیکھئے یہ کہانی لایا ہوں "تنہا تنہا" ـــــــ یہ ایک جائیہ کہانی ہے جس میں متوسط طبقے کے ایک فرد کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں بے ساختہ ہنسی آتی ہے اور کہیں آنسو ـــــــ اس میں جذبات کا دھیما پن ہے۔ کسک ہے۔ دبی دبی چنگاریاں ہیں ... آپ کا بھائی ـــــــ ایم کوٹھیاوی راہی

"ایک خوبصورت، خوب سیرت اور پڑھی لکھی لڑکی کے لئے رشتہ درکار ہے جس کی عمر اٹھارہ بیس سال کے لگ بھگ ہے۔ لڑکا خوبصورت، خوب سیرت اور پڑھا لکھا ہو۔ عمر پچیس چھبیس سال سے زیادہ نہ ہو۔ کام کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ شادی کے بعد مستقل طور پر لڑکی والوں ہی کے گھر رہنا ہوگا۔ لڑکی والے متموّل ہیں۔ سیّد ہیں۔ لڑکے کا بھی سیّد ہونا ضروری ہے۔"

میں یہ اشتہار کیل میں شیروانی ٹانگتے اور اتارتے وقت روز ہی دیکھتا۔ میرے کمرے کی دیوار پرانی تھی جس کا پلستر جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ جب سے میں نے یہ کمرہ کرائے پر لیا تھا یہ ردی اخبار اور لوہے کی ایک کالی سی کیل دیوار پر لگی تھی تاکہ شکستہ پلستر میں سے جھانکتی اینٹیں صاف ستھرے کپڑوں کا ستیاناس نہ کریں۔ شاید میری طرح پہلا کرایہ دار بھی نفاست پسند تھا۔ جب مجھے تنہائی حد سے زیادہ پریشان کرتی تو میں اپنے دل کو اسی اشتہار میں گم کر دیتا مسکراتا، ٹھنڈی آہیں بھرتا اور پھر جب یہ حسین طلسم ٹوٹتا تو میں خود کو صلواتیں سنانے لگتا۔

میں اس دن شام کا دھندلکا گہرا ہوتے ہی کمرے میں چلا آیا اور شیروانی ٹانگ کر جونہی بستر پہ دراز ہوا "وہ" اچانک اشتہار سے باہر نکل آئی اور زیرِ لب مسکرانے لگی۔ میں نے کہا "جاؤ چائے لاؤ۔" وہ اٹھی اور ایک کپ گرم گرم چائے بنا لائی۔ چسکی لیتے ہوئے تم نے پوچھا۔ "کہو میری جان! دن کیسا گزرا؟"

وہ بولی۔

"آپ کی یاد میں!"

اور پھر اس نے شوخی سے پوچھا۔

"کیا آپ دفتر جانا بند نہیں کر سکتے؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

وہ مسکرانے لگی اور بولی۔

"میرے گھر کوئی کام دھام نہیں ہے۔ ملازمت کو لات ماریئے اور چلئے ..."

میں ملازمت کو لات مار کر تیار ہو گیا اور یہ چھوٹا سا بوسیدہ کمرہ چھوڑ کر ایک شاندار حویلی میں آ گیا جہاں بہت سے نوکر چاکر تھے۔ ہر طرح کا عیش و آرام تھا۔ نہ کوئی کام نہ کاج۔ بس بیٹھے رہو۔ جی چاہے تو بندوق اٹھاؤ اور شکار کھیلنے چل دو۔

ایک دن شیر کے شکار کی سوجھی۔ میں نے بندوق اٹھائی اور دو نوکر ساتھ لے کر جنگل کی راہ لی۔ چلتے چلتے شام ہو گئی لیکن شیر کیا کہیں گیدڑ تک نظر نہ آیا۔ ایک مچان بھی بنوایا گیا تھا بیچ جنگل میں۔ رات کو مچان پر بیٹھا نیچے بندھے بھینسے کو دیکھتا رہا وہ کرنا رہ جلاتا تو وہ جگالی کرتا نظر آتا۔ برسات کی رات تھی جھینگروں اور مینڈکوں کی بے ہنگم آوازوں کے ساتھ کبھی کبھی کسی خوفناک درندے کی گرج بھی سنائی دے جاتی۔ سنتے سنتے جمائی آنے لگتی۔ دونوں نوکر مچان ہی پر میرے ساتھ بیٹھے تھے اور بیڑی پی رہے تھے۔ یکایک میں نے دیکھا تاریکی میں دو سرخ سی بتیاں چمک رہی ہیں۔

دونوں لوگ بول اُٹھے۔

"حضور! شیر آ رہا ہے۔"

میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ بندوق چھاتی سے لگا کر نشانہ درست کرنے لگا۔ وہ دو نیم سُرخ بتیاں شیر کی آنکھیں تھیں۔ آنکھوں کے درمیان اندھیرا تھا۔ میں اُسی اندھیرے پر نشانہ لگائے ہوئے تھا۔ اور جب شیر گرجتا ہوا بیٹھے پر جھپٹا تو میں نے دھائیں سے فائر کر دیا۔ اور پھر ایک فائر اور! دوسرا فائر ایسا تھا کہ میں دھڑام سے چارپائی کے نیچے آ گیا منہ کے بل! رات ابھی باقی تھی اور خواب ٹوٹ چکا ——— میں لیمپ بجھانا بھول گیا تھا۔ اُس کی زرد روشنی میں مجھے وہ اشتہار نظر آیا۔ شیروانی کے دامن کے پاس یہ عبارت صاف چمک رہی تھی: "ایک خوبصورت، خوب سیرت اور پڑھی لکھی لڑکی کے لئے رشتہ درکار ہے ...!"

مجھے ایسے خواب عموماً مہینے کی بیس سے اکتیس تک برابر دکھائی دیتے۔ خوبصورت خواب! جن کی تعبیر نہایت گھناؤنی اور مزاج کو تلخ بنا دینے والی ہوتی، چارپائی کبھی مچان بن جاتی، کبھی پیڑ، کبھی کوئی اونچی عمارت جس پر سے میں آنکھ بند کئے تماشہ کرتا۔

ایک دن سرِ شام ہی گھر چلا آیا تھا۔ تنخواہ مل گئی تھی۔ جیب کی بیوگی دور ہو چکی تھی۔ جس دن ایسا ہوتا میں زیادہ تر آدھی رات کے بعد ہی گھر میں قدم رکھتا۔ لیکن اُس دن اِس لئے خلافِ معمول سرِ شام ہی آنا پڑا کہ وہ میکے جانے والی تھی اور پہنچانا مجھی کو تھا۔

"تمہارے ابّا کو اپنی دولت پر بڑا ناز تھا۔ اب ذرا پوچھو اُن سے کیا حال ہے؟"

"دیکھئے جناب! اب بار بار میرے ابّا کو نہ کوسا کیجئے؟"

"کوسوں گا اور ضرور کوسوں گا۔"

"دیکھئے اچھا نہ ہوگا!"

"کیا کر لو گی؟"

"زہر کھا لوں گی!"

"اللہ کرے کھا لو ...!"

"ہائے اللہ! میری قسمت پھوٹ گئی۔ کس سے پالا پڑا۔ میں کیا کروں؟"

"روؤ، اِتنا روؤ، اِتنا روؤ کہ گاڑی کا وقت نکل جائے۔"

"وہ تو میں جانتی ہی تھی کہ یہ رنگ بدل بدل کر باتیں کیوں ہو رہی ہیں۔ دیکھئے جناب! ایمان سے کہتی ہوں۔ رو بیٹے گا ہاتھ پر ہاتھ دھر کے۔ نہیں ملے گی کوئی دوسری مجھ جیسی!"

"خدا کرے اب ملے کوئی تم جیسی!"

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"یہی کہ ——— بند کرو یہ بکواس ——— ترک کرو خیال میکے جانے کا۔

پہلے میں تمہارے بزرگوار سے ڈرتا تھا۔ لیکن جب سے اُن کی زمینداری اللہ کو پیاری ہوئی ہے سارا ڈر دل سے نکل چکا ہے۔ اب میں آزاد ہوں۔"

"شادی کیوں کی، جب میں بُری تھی؟"

"کس نے کی تھی شادی تم سے ——— محترمہ! صاف صاف سُن لو، تم سے نہیں کی تھی شادی میں نے۔ اُف! یہ فریب ——— اِشتہار میں تو لکھا گیا تھا لڑکے کو مُستقل طور پر لڑکی ہی والوں کے گھر رہنا ہوگا۔ بے کار ہو چاہے باکار ——— اِس لئے شادی کی تھی تم سے کہ مجھے عمر بھر بیکار رہ کر کسی دقیانوسی شاعر پر ریسرچ کرنی تھی۔ سُنو! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں تم سے کہ میں نے شادی کی تھی تمہارے ابّا کی حویلی میں ٹھاٹ باٹ سے رہنے سہنے کے لئے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں گے۔ اپنی حویلی کو نیلام کر کے تمہارے ابّا جنّت میں محل تعمیر کرانے کی تیاریاں شروع کر دیں گے۔ مجھے اور تمہیں دُنیا بھر کی مصیبتوں میں گرفتار کر کے خود حج کرنے چلے جائیں گے اور پھر واپس آ کر ایک کچے اور بوسیدہ مکان میں رہنے لگیں گے۔ اور ..."

"بس بس ... کیا تم نہیں جانتے ہر کمالے را زوال ...؟"

"رہنے دو یہ نصیحت۔ میں کچھ نہیں سُنوں گا۔ آج تنخواہ کے جو مبلغ ایک سو تائیس ملے ہیں اُن کے خرچ کا حساب سُنو۔"

لیکن اُس نے کچھ نہیں سُنا۔ رونے لگی۔ مجھے مجبوراً خاموش ہو جانا پڑا اور اُسے منانے میں لگ جانا پڑا۔ اور جب وہ مَن گئی تو لے کر اسٹیشن جانا پڑا۔ اور ٹکٹ کٹا کے تیسرے درجے کے ایک ڈبے میں سوار ہو جانا پڑا۔

ٹرین جب فرّاٹے بھرنے لگی تو میرے دل نے دعا مانگی۔ اللہ کرے کوئی حادثہ ہو جائے۔ یہ ٹرین کسی پہاڑ سے ٹکرا جائے ... میں عاجز آ چکا تھا اُس زندگی سے۔ اُس نام کی ہری بھری زندگی سے۔ دعا قبول ہو گئی۔ اور گاڑی لڑ گئی اور لڑتے ہی میں دھم سے نیچے آ گرا۔ مُنہ کے بل زمین پر ——— کمرے میں اُسی طرح سنّاٹا تھا۔ رات ابھی باقی تھی۔ میں لیمپ بجھانا بھول گیا تھا۔ بجھانے سے پہلے نظر اُٹھ گئی۔ دیوار پر ضرورتِ رشتہ کا اشتہار مُنہ چڑاتا نظر آیا۔ تنخواہ کے سارے روپے تکیے کے نیچے سو رہے تھے۔

اور ایک دن اِس سلسلہ میں ایک عجیب سا خواب دیکھا جو بیان نہیں کر سکتا۔ آنکھ کھلتے ہی جی میں آئی کہ اِس کم بخت اشتہار کو پھاڑ دوں۔ پھاڑنے کے لئے لپکا بھی۔ لیکن جیسے مجھے کسی نے روک دیا ہو۔ نہ پھاڑ سکا۔ اتوار کا دن تھا۔ اکیس تاریخ تھی۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ جیب خالی تھی۔ گھر سے چھوٹے بھائی انیس اور حمیدہ آپا کے کئی خط آ چکے تھے کہ جلد آؤ۔ امّاں بُلاتی ہیں۔ ایک بہت ضروری کام ہے۔ میں خوب سمجھتا تھا۔ مجھے پھنسانے کی تیاریاں ہوں گی۔ پہلے بھی اِس قسم کی تیاریاں ہوتی تھیں کئی سال سے

نکل گیا تھا۔ لیکن اب سب مل کر مجبور کر رہے تھے۔ پہلے تو میں اپنی ضد پر اڑا رہا کہ اُس وقت تک شادی نہ کروں گا جب تک حالات سازگار نہ ہو جائیں گے۔ ماہانہ آمدنی کم سے کم تین سو تک نہ ہو جائے گی۔ لیکن ضرورتِ رشتہ کے اُس اشتہار نے جو میری تنہائی کا رفیق تھا، ایک ایسا خواب دکھا دیا تھا کہ اب شادی کرنے کو خود میرا جی چاہنے لگا تھا۔ میں نے حمیدہ آپا کو لکھ دیا۔ پہلی کے بعد آؤں گا۔ ابھی جیب خالی ہے۔

رات آنکھ موندتے ہی "وہ" پھر نمودار ہو گئی۔

اس سے پہلے وہ کچھ عجیب ڈھنگ سے ملی تھی۔ کچھ عجیب گھناؤنے اور بیہودہ ڈھنگ سے۔ دیکھتے ہی دل میں نفرت بھر گئی۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ اُس نے لپک کر گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"یہ کیا؟"

"وہی جو تم چاہتے ہو۔"

"میں کچھ نہیں چاہتا تم سے۔ چلی جاؤ میرے کمرے سے۔"

"تیور بدل کر بات نہ کرو صاحب!"

"بہت بدتمیز ہو تم!"

"اس میں کیا شک ہے۔ تم ہی نے تو سکھائے ہیں یہ چلن۔"

"میں؟ ——— میں کیا سکھا سکتا ہوں۔ مجھے کمینہ سمجھتی ہو؟"

"توبہ کرو توبہ۔ اپنے کو اس طرح بُرا نہیں کہتے۔"

"چھوڑو مجھے۔ کتنی بے حیا ہوتی جا رہی ہو تم۔"

"حیا کسے کہتے ہیں؟"

"وہی جو تمھیں آتی نہیں ہے۔ ایک مشرقی خاتون ہو تم؟"

"اور تم۔ تم بھی تو ایک مشرقی مرد ہو۔ مشرقی تہذیب کے پروردہ لوگ ہمیشہ ملتے آئے ہیں۔ سناٹوں میں۔ اندھیروں میں ...۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں تم ایک رئیس آدمی کی بیٹی ہو۔ ایک ایسے آدمی کی بیٹی جس کی حویلی میں گناہ پلتے آئے ہیں صدیوں سے ...۔"

"ڈائیلاگ نہ بولو صاحب! وقت ضائع ہو گا خواہ مخواہ۔ میں نہیں جاؤں گی اِس کمرے سے۔ تم میرے ہونے والے سرتاج ہو!"

"میں اپنے لئے ایسی کسی لڑکی کو پسند نہیں کر سکتا جس کے جذبات اتنے شوخ، اتنے بے باک، اتنے عُریاں ہوں۔"

"ایسا ہی کرنا تھا تو مجھے بُلایا کیوں تھا؟"

"کب بُلایا تھا میں نے تمھیں؟"

"یہ اپنے دل سے پوچھو۔ اپنے خیال سے پوچھو۔"

"صاف صاف کہو۔ یہ کیا معمہ ہے؟"

"یہ اِس اشتہار سے پوچھو جو تمھاری ویران تنہائی کا واحد رفیق ہے ...۔"

"میں .... میں اِس ناپاک اشتہار کو پھاڑ دوں گا۔"

"زندہ نہ رہ سکو گے اِس کے بغیر کیونکہ اِس میں تمھاری زندگی ہے۔ تمھاری حسرت، تمھاری آس ہے، تمھاری ...۔"

اور پھر اُس نے گرفت سخت کر دی۔ میں تلملا گیا۔ پھر وہی کچھ ہو گیا جو ہو چکا تھا۔ پھر مجھے اپنے آپ سے شرمندہ ہونا پڑا۔ پشیمان ہونا پڑا۔

دوسرے دن میں نے دفتر سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے لی۔ اور ایک شخص سے سو پچاس روپے قرض لے کر گاؤں روانہ ہو گیا۔ راستے بھر مجھے وہ خواب یاد آتے رہے۔ یاد آ کے شرمندہ کرتے رہے۔ رہ رہ کر یہی سوچتا رہا کہ روانگی سے پہلے میں نے اُس اشتہار کو پھاڑ کیوں نہ دیا۔ ضرورتِ رشتہ کے اُس معمولی اشتہار نے مجھے ایک نفسیاتی مرض میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں جلد سے جلد گاؤں پہنچ کر شادی کے لئے "ہاں" کر دینا چاہتا تھا۔ جلد سے جلد کسی خوب صورت، خوب سیرت اور پڑھی لکھی ہونہار لڑکی سے شادی کر لینا چاہتا تھا۔ اور مجھے سولہ آنے یقین تھا کہ اسی لئے بلایا گیا ہوں ....

لیکن اماں نے کہا۔

"تُو تو جب بُڈھا ہو جائے گا تب ہی شادی کرے گا۔ مجھے فکر ہے انیس کی۔"

"انیس کی؟"

"ہاں۔ بات پکی کر دی ہے۔ بڑے اچھے گھر کی لڑکی ہے۔ لڑکی کا باپ انیس کو پڑھائے گا بھی۔"

"اچھا!"

"ہاں۔ اُن لوگوں نے اپنی لڑکی کے لئے اخبار میں اشتہار بھی چھپوایا تھا۔ مگر کوئی خاندانی لڑکا نہیں ملا .... قصبے کے اسکول کا سرپرست ہے لڑکی کا باپ۔ انیس سے وہیں ملاقات ہو گئی۔ خود ایک دن آیا تھا یہاں موٹر میں بٹھا کر انیس کو۔ میں نے بات پکی کر دی، اِسی چاند کی اٹھائیس کو ...۔"

"مگر اماں۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" میں نے اپنی خشک زبان کو تالو سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ذرا میں بھی تو دیکھوں وہ اخبار جس میں ...؟"

"معلوم نہیں کہاں رکھ دیا حمیدہ نے۔"

اور حمیدہ آپا اخبار ڈھونڈ لائیں۔

میں نے دیکھا۔ اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور کانپتا رہ گیا۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکل سکا۔ وہی اخبار، وہی اشتہار، وہی لڑکی۔ بدتمیز .... بے حیا .... بے وفا... لیکن .... لیکن .... میں یہ کیسے کہہ سکتا تھا۔ باتیں بھی خواب کی۔ ملاقاتیں بھی خواب کی!

"تو ٹھیک ہے اماں۔ میں ایک مہینے کی چھٹی کے لئے درخواست بھیج دیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے سر جھکا لیا۔ نہ جانے کس خوشی میں آنسو نکل آئے!!

ہمارے ماہر دستکار



ہزارہا برسوں سے
نسل بعد نسل،
ہمارے دستکار حیاتِ عزیز کو
اپنے فن کے لئے وقف کرتے آئے ہیں۔
اسی کے صدقے انہوں نے اپنے روایتی ہنر میں
بے مثال مہارت پائی ہے۔ اُن کی ہر تخلیق
حسین، جمیل، جاں نواز ہوتی ہے
دُنیا میں اُن کی مثال کم کم ملتی ہے
اُن کی صناع اُنگلیوں سے تخلیق کی وہ غیر مرئی شعاعیں
پھوٹتی ہیں کہ ہر شے کو شاہکار بنا دیتی ہیں
دستکاری کے قدیم فن کو مزید سنوارنے،
اشیاء کی افادیت بڑھانے اور اُن کی
خوبصورتی میں چار چاند لگانے کے لئے
ہر روز ایک نیا ڈیزائن
ہر روز ایک نئی تکنیک۔

ہمارے جمالیاتی ذوق کو جلا دینے اور ثقافتی ورثے کو بھرپور بنانے کے
سلسلے میں انجام دی گئی خدمات کے پیشِ نظر ملک میں پہلی بار ممتاز
دستکاروں کو قومی انعام دیئے جا رہے ہیں۔

آل انڈیا ہینڈی کرافٹس بورڈ

DA 64/560

غزلیں

ڈاکٹر امرت لعل عشرت ایم۔ اے ڈی لٹ

(نذرِ میرؔ)

جب کبھی دل پر مرے چھا جائے ہے گردِ ملال
اِس گھڑی چاندنی برسائے ہے تیرا خیال

اہلِ عالم کی نظر سے اِس طرح بھاگوں ہوں میں
شہر کی وحشت سرائے جس طرح بھاگے غزال

ہر نفس سینے میں اِک تلوار سے چل جائے ہے
اب تو فُرقت میں ہوا ہے سانس بھی لینا محال

پاؤں پڑ پڑ کر، گریاں مائلِ فریاد ہے
آج اُس بُت پر بھی کُھل جائے گا دیوانے کا حال

آج طبع حاضر ہے کچھ، عشرتؔ تفنن کے لئے
میر کے انداز میں دو چار مصرے ۲۔بکال)

امرچند قیسؔ جالندھری

ہر نظر میں اگر عیاں بھی نہیں
لاکھ پردوں میں وہ نہاں بھی نہیں

مے کدے میں بھی جا کے دیکھ لیا
چارۂ رنج و غم وہاں بھی نہیں

جلوۂ حسن، گو نہیں ارزاں
جان کے مول کچھ گراں بھی نہیں

لامکاں میں بھی ڈھونڈ آئے ہم
کیا خبر تھی کہ تو وہاں بھی نہیں

مہرباں تو نہ تھا وہ پہلے بھی!
اب وہ اے قیسؔ! بدگماں بھی نہیں

اُفق سبزواری

کل سرِ بزم کہا شمع نے پروانے سے
زیست ملتی ہے تپِ عشق میں جل جانے سے

کُھل نہ جائے کہیں پیچ و خمِ گیسو کا بھرم
آپ اُلجھے ہی نہیں ہیں کسی دیوانے سے

تھی کبھی گرمیِ ہنگامۂ محفل ہم سے
آج محفل میں ہمیں لگتے ہیں بیگانے سے

جب کسی دل کی طرف آتی ہیں کافر نظریں
حدیں مل جاتی ہیں کعبہ کی صنم خانے سے

اے اُفقؔ ناصحِ مشفق کو کوئی سمجھا دے
چھیڑ ہر وقت کی اچھی نہیں دیوانے سے

رشید جعفری

اُن کو غمخوار ہم نہ کر پائے
یعنی اظہارِ غم نہ کر پائے

زندگی کی مصیبتوں سے گریز
زندگی کی قسم نہ کر پائے

بھیک اُن سے ستم کی مانگیں گے
وہ اگر کچھ کرم نہ کر پائے

گو اُنھوں نے کمی ستم میں نہ کی
ہم ہی قدرِ ستم نہ کر پائے

عشق میں ہم نے جان تک دیدی
آپ آنکھیں بھی نم نہ کر پائے

سردار جعفری سے اِنٹرویو

زرش کمار شاد

۱۵. ایف. موتی باغ ۲. نئی دہلی

۳۰ دسمبر ۱۹۶۳ء

محبی خوشتر صاحب!

... سردار جعفری کا نام اُردو کے جدید ادب میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اِس حقیقت سے وہ لوگ بھی انکار نہیں کر سکتے جو جعفری کے نظریات اور اُن کی شاعری کی مقصدیت سے اتفاق نہیں کرتے۔ ساتھ ہی کے بعض مضامین سے اب تک لطف اندوز ہو رہا ہوں...

آپ کا ——— نرش کمار شاد

شاد۔ کیوں حضرت! یہ سردار جعفری آپ کا نام ہے یا تخلص؟

جعفری۔ علی سردار میرا نام ہے۔ جعفری سیدوں کی ذات ہے یعنی میرے خاندانی نام کا حصہ ہے۔ تخلص کوئی نہیں ہے۔

شاد۔ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

جعفری۔ ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء کو بلرام پور میں۔

شاد۔ تعلیم کہاں کہاں سے اور کہاں تک حاصل کی؟

جعفری۔ بلرام پور۔ علی گڑھ۔ دہلی اور لکھنؤ سے۔ ڈگری اگرچہ بی۔ اے کی ہے لیکن پڑھا ایم۔ اے تک ہوں۔ انگریزی لٹریچر میں ایم۔ اے فائنل کا امتحان نہیں دے سکا۔

شاد۔ شاعری کا آغاز کب ہوا۔

جعفری۔ بچپن ہی میں ہو گیا تھا کیونکہ انیس کی وجہ سے گھر میں شاعری کا ماحول تھا۔

شاد۔ کیا میں آپ کا سب سے پہلا شعر سن سکتا ہوں؟

جعفری۔ اب یاد نہیں۔ البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ میری شاعری کا آغاز مرثیوں سے ہوا تھا۔ جن کی زبان تشبیہہ۔ استعارے اور ترتیب ہر چیز انیس کی ہوتی تھی میرا اپنا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

شاد۔ کسی ابتدائی مرثیے کے کچھ شعر یاد ہوں تو فرمائیے۔

جعفری۔ پہلا مرثیہ جو کہا تھا وہ کچھ اس طرح شروع ہوتا تھا ؎

آتا ہے کون شمعِ امامت لئے ہوئے
اپنی جلو میں فوجِ صداقت لئے ہوئے

اللہ رے حُسن فاطمہ کے ماہتاب کا
ذروں میں چھپتا پھرتا ہے نُور آفتاب کا

اور آخری دو مصرعے تھے ؎

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سُلاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

شاد۔ آپ نے ابتدائی شاعری پر اصلاح کس سے لی؟

جعفری۔ کسی سے بھی نہیں۔

شاد۔ شروع میں کس کس اُردو شاعر سے آپ خاص طور پر متاثر ہوئے؟

جعفری۔ انیس۔ غالب۔ اقبال اور جوش سے۔

شاد۔ آپ کے نزدیک اِس صدی کا بہترین اُردو شاعر کون ہے؟

جعفری۔ اقبال۔

شاد۔ آپ کے نزدیک بہترین شعر کی تعریف کیا ہے؟

جعفری۔ طالب علمانہ باتیں کہی جا سکتی ہیں کہ جس میں جذبے کی شدت ہو۔ بندش کی چُستی ہو۔ تشبیہہ اور استعارے کا حُسن ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حُسن کی طرح شعر کی بھی تعریف نہیں ہو سکتی۔

شاد۔ آپ کس طرح شعر کہتے ہیں؟

جعفری۔ یہ بتانا ممکن نہیں ہے۔

شاد۔ اپنے ہم عصر شاعروں میں کون کون سے شاعر آپ کو خاص طور پر پسند ہیں؟

جعفری۔ فیض۔ جذبی۔ مخدوم اور ن م۔ راشد۔ لیکن "ماورا" کے بعد کا راشد پسند نہیں ہے مگر جو شاعری کی نظم "ایران میں اجنبی" کے بارے میں پطرس کا کہنا یہ ہے کہ وہ ایشیا کے سب سے بڑے شاعر ہیں لیکن یہ اُن کی ذاتی رائے ہے جس سے میں اتفاق نہیں کرتا۔

شاد۔ غیر ملکی شاعروں میں آپ کس کس سے متاثر ہوئے؟

جعفری۔ بہت طویل فہرست ہے۔ بہتوں نے متاثر کیا۔ انتخاب بہت مشکل ہے۔

شاد۔ آپ کی زندگی کا کوئی ایسا اہم واقعہ جس نے آپ کی شاعری پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو؟

جعفری۔ ایک آدھ نہیں۔ ایسے کئی واقعات ہوں گے۔ لیکن اِس وقت کوئی یاد نہیں آرہا۔

شاد۔ کیا نئی نسل کے اُردو شاعروں میں کوئی قابلِ ذکر شاعر بھی ہے؟

جعفری۔ یہ نئی اور پُرانی نسل کا سوال ہی غلط ہے۔ فراقؔ حالانکہ جوشؔ کی نسل سے ہیں لیکن نمائندگی ہماری نسل کی کرتے ہیں۔ اختر الایمان بہت دیر سے شعر کہہ رہے ہیں لیکن انھیں بالکل نئی نسل کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔

شاد۔ شاعری کے علاوہ ادب کی دوسری کن کن اصناف سے آپ کو دلچسپی ہے؟

جعفری۔ لکھنے یا پڑھنے کی حد تک۔

شاد۔ دونوں کی حد تک۔

جعفری۔ پڑھنے کی حد تک تو ہر صنفِ ادب سے دلچسپی ہے اور لکھنے کی حد تک شاعری کے علاوہ تنقید اور کہانیاں بھی میں نے لکھی ہیں۔

شاد۔ سیاست سے آپ کب اور کس طرح وابستہ ہوئے؟

جعفری۔ طالب علمی کے زمانہ میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی اُس تحریک میں شامل ہوگیا۔ خاص طور پر متاثر کرنے والا جواہر لال نہرو تھے۔

شاد۔ سیاست سے گہری وابستگی نے آپ کے ادب پر کیا اثر ڈالا؟

جعفری۔ کسی حد تک اچھا اثر ڈالا اور کسی حد تک بُرا بھی۔

شاد۔ کس طرح؟

جعفری۔ اچھا اِس طرح کہ میں باشعور ادب پیش کرسکا اور بُرا اِس طرح کہ اُس میں سیاست کا رنگ ضرورت سے زیادہ گہرا ہوگیا۔

شاد۔ رنگ گہرا ہونے سے آپ کی مُراد غالباً خطابت کی فراوانی سے ہے۔

جعفری۔ نہیں۔ خطابت کو میں بُری چیز نہیں سمجھتا۔ آخر قرآن اور انجیل میں بھی تو خطابت ہے۔

شاد۔ تو پھر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

جعفری۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے آپ کو محدود کر لیا۔ اچھی شاعری کو زندگی کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں پر حاوی ہونا چاہیئے۔ اِس ضمن میں اب میں احتیاط کر رہا ہوں۔

شاد۔ آپ کے خیال میں کیا ہر ادیب کو آپ ہی کی طرح کسی سیاسی پارٹی سے مستقیماً وابستہ ہو جانا چاہیئے۔

جعفری۔ ضروری نہیں۔

شاد۔ ادب اور سیاست کے علاوہ آپ کے کیا مشاغل ہیں؟

جعفری۔ فلموں میں کبھی جھک مارتا ہوں لیکن سیاست میرا مشغلہ تو نہیں ہے۔ میں سیاست سے واقف ضرور ہوں اور اس سے دلچسپی بھی رکھتا ہوں لیکن یہ میرا مشغلہ نہیں ہے

شاد۔ حُبّ الوطنی اور بین الاقوامی اخوت میں آپ کسے ترجیح دیتے ہیں؟

جعفری۔ کسی ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حُبّ الوطنی فاشزم بھی بن سکتی ہے۔ اور بین الاقوامی اخوت حُبّ الوطنی سے فرار کا باعث بھی ہوسکتی ہے۔ حُبّ الوطنی تو انسانی خون میں ہوتی ہے۔ اُسے کوئی نہیں چھین سکتا۔ یہاں تک کہ وطن کا غدار بھی اُس سے پورے طور پر دامن نہیں چھڑا سکتا اور بین الاقوامی اخوت تربیت یافتہ ذہن کی چیز ہے۔ میرے خیال میں اِن دونوں میں توازن ہونا چاہیئے۔

شاد۔ کیا شعر و شراب لازم و ملزوم ہیں؟

جعفری۔ نہیں بھائی شعر تو پوری زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

شاد۔ تو آپ شراب کیوں پیتے ہیں؟

جعفری۔ اچھی لگتی ہے اِس لئے۔ اُس کا مزہ اچھا لگتا ہے۔ اُس سے لطف حاصل ہوتا ہے صحیح حدود کے اندر پی جائے تو صحت کے لئے بھی مفید ثابت ہوتی ہے۔

شاد۔ آپ کے خیال میں کیا اچھا شاعر اچھا انسان بھی ہوتا ہے؟

جعفری۔ ضروری نہیں۔

شاد۔ کیا ادب ادیب کی شخصیت کا غماز ہوتا ہے؟

جعفری۔ بالکل ہوتا ہے۔

شاد۔ کیا آپ عروض سے واقف ہیں؟

جعفری۔ واقف ضرور ہوں لیکن اتنا نہیں جتنا اساتذہ۔

شاد۔ معاف کیجئے یہ بہت مبہم جواب ہے۔

جعفری۔ سچی بات یہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں جب میں اُردو کا طالب علم تھا تو مولانا احسن مارہروی میرے اُستاد تھے جنھوں نے باقاعدگی سے مجھے عروض پڑھایا ہے۔

میں بحروں سے واقف ہوں۔ تقطیع کر سکتا ہوں۔ زحافات کو جانتا ہوں لیکن اس کے باوجود میرے کلام میں ایسی بہت سی چیزیں ہوں گی جو عروض کے اعتبار سے غلط ہوں گی۔

شاد۔ کیا عروض کا جاننا شاعر کے لئے لازمی ہے؟

جعفری۔ اچھے شاعر عروض سے ضرور واقف ہوتے ہیں۔

شاد۔ ہمارے بہت سے اچھے شاعر عروض سے ناواقف ہیں۔

جعفری۔ مثلاً؟

شاد۔ مثلاً اختر شیرانی۔

جعفری۔ اختر شیرانی ان بڑے شاعروں کی صف میں نہیں ہیں جن میں میر، غالب، اقبال اور جوش ہیں۔

شاد۔ لیکن جوش صاحب نے بھی مجھے خود بتایا ہے کہ وہ عروض نہیں جانتے۔

جعفری۔ جانتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ انھوں نے جھوٹ بولا ہے کہ نہیں جانتے۔ جب روسی حکومت یہ کہتی ہے کہ ہمارا پلان فیل ہو گیا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ سوویت یونین میں قحط پڑ گیا ہے۔ جوش صاحب جب یہ کہیں کہ میں عروض سے واقف نہیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ عروض سے ناواقف ہیں۔

شاد۔ بہت خوب! جواب نہیں جعفری صاحب آپ کا بھی! مدعی سست گواہ چست۔ شاید اسی موقع کے لئے بولتے ہیں۔ خیر! اب یہ بتائیے کہ کیا ہمارا موجودہ ادب واقعی جمود کا شکار ہے؟

جعفری۔ نہیں جمود کا شکار تو نہیں البتہ حالات کا اثر ضرور پڑ رہا ہے۔ وہ اثر یہ ہے کہ علمی سرمایہ کم ہو رہا ہے۔

شاد۔ اردو غزل کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جعفری۔ غزل بطور صنفِ سخن کے باقی رہے گی لیکن رشید احمد صدیقی، فراق اور سرور کی اس بات کو مبالغے پر محمول کرتا ہوں کہ غزل نظم پر حاوی ہے۔ میرے خیال میں اردو شاعری کی عظمت اور اس کا مستقبل نظم سے وابستہ ہے۔

شاد۔ غزل کے مستقبل کی بات چھوڑئے۔ یہ فرمائیے کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟

جعفری۔ اگر یہی صورت حال رہی تو اچھا نہیں۔ اور اگر اس میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا ہو گئی تو پچھلے پندرہ سال میں اردو نے جو کھویا ہے وہ حاصل ہو جائے گا۔ حالات بظاہر اچھے نظر نہیں آتے۔ قطعی جواب دینا بہت مشکل ہے۔

شاد۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں کہ ہندوستان میں اردو کی بقا کی صرف یہی صورت ہے کہ دیوناگری رسم الخط کو اپنا لیا جائے؟

جعفری۔ پہلے اس سے متفق تھا لیکن اب نہیں ہوں۔

شاد۔ وہ کیوں؟

جعفری۔ رسم الخط سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اردو زبان کو تعلیم اور ایڈمنسٹریشن سے بے تعلق کیا جا رہا ہے۔ ایسا ہونے سے رسم الخط کی تبدیلی کے باوجود اردو زبان کو نقصان پہنچے گا۔ اردو زبان خواہ کسی بھی رسم الخط میں ہو اسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہے جب نظم و نسق اور تعلیم میں بھی اس کا استعمال ہو۔ ویسے اردو والوں کو دونوں رسم الخطوں سے واقف ہونا چاہئے اور اگر اردو ادیب ہندی سے اچھی طرح واقف ہو جائیں تو اور بھی اچھا ہے۔ اس سے اردو بہتر ہو سکے گی۔

شاد۔ اچھا جناب اب ذرا ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق کچھ فرمائیے۔ یہ تو آپ مانتے ہیں نا کہ ترقی پسند ادب کی تحریک اب ختم ہو چکی ہے۔

جعفری۔ جی ہاں۔ اب پھل آ گیا ہے۔ حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ ترقی پسند ادب کی تحریک اپنا رول ادا کر کے چلی گئی۔ قیامت تک تو کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

شاد۔ یہ بھی بتانے کی زحمت فرمائیے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک نے کیا رول ادا کیا ہے؟

جعفری۔ ادب کو نیا خیال اور نیا مواد بخشا ہے۔ آج اردو ادب میں جو بڑے نام نظر آتے ہیں وہ اسی تحریک کی دین ہیں۔ فیض، مخدوم اور فراق نے اپنی آواز اسی تحریک کے زیر اثر پہچانی ہے۔ فراق کی غزلوں میں جو عظمت آئی ہے وہ اسی تحریک کا نتیجہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج وہ اس کا اعتراف شاید اتنا کھل کر نہ کریں۔

شاد۔ کیا اس تحریک کی موجودہ حالت میں ضرورت نہیں ہے؟

جعفری۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اب حالات بدل چکے ہیں۔ نئے شعور کی آج بھی ضرورت ہے لیکن تحریک کی شکل میں نہیں۔

شاد۔ اس موضوع کو بھی چھوڑئے۔ یہ بتائیے کہ آپ کے اب تک کے کہے ہوئے کلام میں آپ کو اپنی کون کون سی نظمیں خاص طور پر پسند ہیں۔

جعفری۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ ویسے مجھے اپنی نظمیں "میرا سفر"، "پتھر کی دیوار" اور "نیند" بہت پسند ہیں۔ ادھر جو نئی نظمیں کہی ہیں ان میں "پیغمبر مسیحا دست" اور "قتلِ آفتاب" مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔

شاد۔ کیا موجودہ مشاعرے آپ کے خیال میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے سود مند ہیں؟

جعفری۔ مشاعروں کی اس اہمیت سے ... کہ لوگوں تک کچھ چیزیں پہنچتی ہیں۔
... اس لئے مشاعروں
...

شاعر۔ آپ جس مشاعرہ میں شرکت کرنے کے لئے دلی تشریف لائے ہیں اُس کا وقت
ہو چکا ہے اس لئے اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا اور آپ مشاعرے کے
علمی اور ادبی معیار کو سنبھالا دیجئے۔ اچھا آداب عرض!!

اُردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ

نغمۂ سرمد شہید سرمدؔ کی فارسی رباعیوں کا ترجمہ اُردو رباعیوں میں۔ از عرش ملسیانی۔ سرمد کے سوانح بھی کتاب میں درج ہیں۔ پہلے اصل رباعی ہے اس کے نیچے اُردو ترجمہ۔ اُردو اور فارسی ادب اور تصوف کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نادر تحفہ۔ قیمت پانچ روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دلی نمبر ۶

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر یہ ضرور تحریر فرمائیے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ "رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶" لکھنا کافی ہے۔

بیسویں صدی دہلی

افسانہ

سکوتِ پردۂ ساز

——— سعید احمد صدیقی

میمن منزل، بدر باغ۔ علی گڑھ

۱۱ر دسمبر ۱۹۶۴ء   محترمی و مکرمی خوشتر صاحب! تسلیم

آپ کی خدمت میں ایک اچھوتا اور نیا تجربہ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ میرا مضمون نفسیات ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میری یہ پیشکش ادب کی دنیا میں قبول کی جائے گی۔ اِس افسانے کا تعلق کچھ ایسے مشاہدات سے ہے جن سے اکثر عوام اور شاید خواص بھی آشنا نہیں ہیں۔ جہاں پر یہ کہانی ختم ہوتی ہے عموماً وہاں سے لوگ افسانہ شروع کرتے ہیں ——— صرف خیالات (Reflections) پر بہت سی کہانیاں لکھی گئی ہیں لیکن عام طور پر یہ کہانیاں فلیش بیک تکنیک یا کچھ خارجی اتفاقات اور واقعات کے سہارے آگے بڑھتی ہیں یا منزل تک پہنچتی ہیں۔

زیرِ نظر افسانے میں خیالات اپنی خالص شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ خارجی واقعات اور یادوں سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو کچھ ہے وہ فوری تاثر سے متعلق ہے۔ ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اِس افسانے میں بیک وقت تین کرداروں کے خیالات پیش کئے گئے ہیں اور ہر کردار کے ساتھ پُورا انصاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے ——— یہ تینوں کردار ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ صرف ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک ہمسفر رہنے کے بعد مختلف منزلوں کی سمت چل دیتے ہیں۔ دَورانِ سفر میں بھی آن میں کوئی گفتگو نہیں ہوتی۔ نہ ایثار، قربانی اور بہادری کے اظہار کے لئے کوئی "حادثہ" پیش آتا ہے۔ لیکن پھر بھی اُن کے ذہن کے پردوں پر جو خیالات اُبھرتے ہیں وہ ایک ایسی کہانی کی تشکیل کرتے ہیں جو ہر لحاظ سے مکمل ہے۔

مخلص ——— سعید احمد صدیقی

وہ ڈبے میں داخل ہونے سے پہلے - اتنا ——— فرسٹ کلاس میں بھی غیر مہذب اور گندے انسانوں سے چھٹکارا نہیں ملتا، جنہیں یہ بھی تمیز نہیں کہ فوم کشنڈ سیٹس پر کیسے بیٹھنا چاہیئے اور سامان کس جگہ رکھنا چاہیئے۔ سامان؟ رَبش!! جنک! ایسے کسی ملک میں [illegible] اتنا گھٹیا سامان خریدنا پسند نہیں کرتا۔ اُس نے اپنا قیمتی [illegible] اوپر کی برتھ پر رکھتے ہوئے سوچا۔

گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ وہ بے خیالی میں چوڑیوں کو کلائی سے اوپر نیچے کھسکانے لگی۔ یہ کتنا لمبا سفر ہے۔ روز ریل میں بیٹھ کر کالج اور کالج سے گھر۔ نہ [illegible] سب پڑھائی لکھائی ختم [illegible]

ڈیڈی بیچارے اسی فکر میں گھلے جاتے ہیں کہ کوئی "معقول" لڑکا ——— ہونہہ! اُس نے شانے جھٹکتے ہوئے سوچا۔ ڈیڈی ایک دن مذاق میں کہہ بھی تو رہے تھے کہ "ممی! جب آجکل تو لڑکیاں خود ہی بر ڈھونڈ لاتی ہیں ———" لیکن اس مذاق میں کچھ حقیقت بھی تھی۔ شاید دبی ہوئی خواہش! کسی دن میرے خوابوں کا شہزادہ حقیقت کی دنیا میں نظر آگیا تو پکڑ کر اُسے ڈیڈی کے پاس لے جاؤں گی۔ یہ سوچ کر ہی اُس کے چہرے پر ہلکی سی سُرخی پھیل گئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر مُڑ کر دیکھا کوئی اس کے خیالات بھانپ تو نہیں گیا۔ لیکن مجھے تو خود بھی نہیں معلوم کہ میری پسند کیا ہے۔ کالج کی لڑکیاں کیا بڑھ چڑھ کر اپنی محبت کے قصے سناتی ہیں اور ہر روز بدلتے ہوئے فیشن کی طرح نیا محبوب ڈھونڈ لیتی ہیں۔ یہ بھی کوئی محبت ہوئی! اُس کی نظر خوبصورت نوجوان کے سگریٹ کیس پر سے

آنکھیں

مستی و ناآشنائی، وحشت و بیگانگی
یا تری آنکھوں میں دیکھی یا ترے دیوانے میں ——— ذوق دہلوی

اُف، وہ نیند کے ستائے، نیم باز آنکھوں پر
سو رہا ہو جیسے کوئی آبگینوں میں ——— قتیل شفائی

بہت لطیف اشارے تھے چشم ساقی کے
نہ میں ہوا کبھی بے خود، نہ ہوشیار ہوا ——— اصغر گونڈوی

شرح دوری ترے آنکھوں سے الٰہی توبہ
چاہئے تھا انھیں بیوست رگ جاں ہونا ——— نظیر لکھنوی

چشم ساقی کر تھی کبھی مخمور
خود ہی آخر ستم زدہ ہو کے رہی ——— فانی بدایونی

(وصلہ ... ... ایم اے کلکتہ)

ہوتی ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے نیم دیہاتی نوجوان کی پتلون پر لگے ہوئے پیوند پر ٹھہر گئی۔

لڑکی نے سامنے والی سیٹ پر رکھا ہوا اپنا بایاں پیر سمیٹ لیا۔ ایک بے تعلق سی نظر نئے آنے والے پر ڈالی جو اپنا سامان سلیقے سے رکھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ اپنی کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھ کر بیزاری سے گاڑی کے حرکت میں آنے کا انتظار کرنے لگی۔ کالج تو بس اب شروع ہونے ہی والا ہوگا۔ مسز شکلا کا پیریڈ تو اب ملنے سے رہا۔

اُس نے سب خالی سیٹوں کو نظر انداز کر کے عین لڑکی کے سامنے والی سیٹ کو رومال سے صاف کر کے بیٹھنے کے قابل بنایا۔ جیب میں سے سنہرا سگریٹ کیس نکال کر میوزیکل لائٹر سے سگریٹ جلا کر ہلکے زرد شعلے کی لو میں سے لڑکی کے سراپا کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اِسپلینڈڈ اِنڈیڈ !! ——— اگر یہ ہندوستان نہ ہوتا اور یہ لڑکی پیرس کے کسی ریستوراں میں بیٹھی ہوتی تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اُسے ہم رقص بننے کی دعوت دیتا۔ ریل کا ختم نہ ہونے والا مسلسل نغمہ ——— جیسے جاز کی طویل دُھن۔ اجنبی شہر میں میز پر تنہا بیٹھے ہوئے اسکاچ کے جام پر جام خالی ہوتے جاتے ہیں اور پھر کوئی نیم عریاں اطالوی یا فرانسیسی حسینہ مُسکراتی بل کھاتی "ایکسکیوز می، مے آئی سِٹ ہیئر" کہہ کر تنہائی کے جادو کو توڑ کر کسی دوسرے طلسم میں لے جاتی ہے جہاں جسم خوشبو بن کر ہواؤں میں اُڑنے لگتا ہے اور رات فاکس ٹراٹ، والٹز یا ٹوئسٹ کے بہکے ہوئے قدموں میں جاگ کر سو جاتی ہے اور صبح کو کچھ یاد نہیں آتا کون ہم رقص تھا کس نے لائٹ آف کی موسیقی کب تھم گئی۔ ایک گمنام خلش، ایک بے نام تھکن!

اُس نے سوچا ٹکٹ خریدنے سے کچھ پیسے بچ جاتے تو آج شہر سے لوٹتے وقت چھوٹی بہن کے لئے چوڑیاں، نقلی موتی کے بُندے اور بالوں کی پنیں لے لیتا۔ تھرڈ کلاس کے کسی ڈبے میں صرف ٹکٹ ہی کی جگہ مل گئی ہوتی تو فضول پیسے پھنکنے سے بچ جاتے۔ اور اگر دفتر پہنچنے میں بھی دیر ہو گئی تو ؟ اُس نے گھبرا کر سر کھڑکی سے باہر نکال کر پلیٹ فارم پر لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھنے کی کوشش کی لیکن فاصلے کی وجہ سے نہ دیکھ سکا۔

اُس نے کھڑکی کی سمت سے ایک لمحے کے لئے پلٹ کر دیکھا اور پھر اُسی طرح باہر دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ہرے بھرے دُور تک پھیلے ہوئے کھیت، نیم دائرے کی شکل میں سجے ہوئے پیڑ، کھیتوں کی مُنڈیریں جو دُور سے نقطے کے متوازی معلوم ہوتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ اپنا زاویہ بدلتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ریل کے قریب آتے پر یکلخت پیچھے کی جانب بھاگتے ہوئے پتھروں، جھاڑیوں اور ٹیلیفون کے کھمبوں کے ساتھ ساتھ ختم نہ ہونے والی دوڑ میں شریک ہو جاتی ہیں۔ بے خیالی میں اُس کا ہاتھ اپنے پتلون کے پیوند کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں ——— یہ ٹیلیفون کے کھمبے بھی عجیب ہیں !! اِن کے درمیان تنے ہوئے تار خود بخود کبھی نیچے کی طرف جھکتے چلے جاتے ہیں اور پھر ایک مقررہ وقفے کے بعد اوپر اُٹھنے لگتے ہیں۔ اوپر... نیچے .... اوپر.... نیچے وہ کسی بچّے کی طرح انہماک سے دل ہی دل میں تاروں کو اپنے حکم پر چلتے دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ پھر خود ہی اُسے اپنی احمقانہ "دلچسپی" کا احساس ہوا اور اُس نے کھڑکی کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

لڑکی کے ہاتھ سے چوڑی اُتر کر نیچے گر پڑی اور سائیکل کے پہیے کی طرح بل کھاتی ہوئی اُس کے پیروں کے قریب آخری بار تیزی سے گھوم کر فرش سے جا لگی۔ چوڑی اُٹھانے کے لئے لڑکی نے اُٹھنا چاہا لیکن ——— ٹائٹ اسکرٹ میں جھک کر کوئی چیز اُٹھانا مشکل بھی ہے اور بے تکا بھی.... اور ایک ذرا سی چوڑی کے لئے اسکرٹ کو شلوار کے گھیرے سے اوپر تک اُٹھا کر جھکنا اور اتنے مردوں کے سامنے ؟ اِس خیال ہی سے اُس کے چہرے پر ایک جھینپی ہوئی سی مُسکراہٹ پھیل گئی۔ اُٹھنے کی کوشش کرنے کے بجائے اُس نے اسکرٹ میں پڑی ہوئی خیالی شکنوں کو دونوں ہاتھ کو لھوں

کے پیچھے گھٹنوں تک لے جاکر ٹھیک کر کے واپس بیٹھ جانا ہی بہتر سمجھا۔

ریل سے نظر آنے والے دُور تک پھیلے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھ کر وہ سوچنے لگا ایک دن جب بنئے کا قرض ادا ہو جائے گا تو وہ اپنے گروی رکھے ہوئے کھیت چھڑا کر پھر سے کاشت شروع کرے گا اور پھر جب کھیتیاں لہلہانے لگیں گی اور اُس کی بہن کی شادی ہو جائے گی تو ایک دن وہ بھی کسی خوبصورت اور محنتی لڑکی سے شادی کرے گا۔ جو کھیتی باڑی میں اُس کا ہاتھ بٹا سکے۔ اُس کے لئے کھیت پر کھانا پکا کر لائے۔ اور جب تک وہ کھانا کھائے سامنے بیٹھی مُسکراتی رہے ——— اُس نے مُڑ کر دیکھا لڑکی اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرا رہی تھی ——— تصور نے تھوڑی دیر کے لئے ہم سفر لڑکی کو گاؤں کی گوری کے رُوپ میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اور وہ سوچنے لگا بھلا پڑھی لکھی اور امیر لڑکی اُس کے ساتھ کیا خوش رہ سکے گی۔ اور پھر اُسے نہ جانے کیوں اپنے گاؤں کے زمیندار کا مقولہ یاد آگیا جو وہ وقت بے وقت اپنے کاشتکاروں اور مزدوروں سے نہایت تیکھے اور طنز بھرے لہجے میں کہا کرتا تھا" رہیں جھونپڑوں میں اور خواب دیکھیں محلوں کے"۔

اُس نے مُڑ کر نیچے گری ہوئی چوڑی کو دیکھا۔ لیکن پھر اپنے بڑھے ہوئے شیو اور شکستہ حال کپڑوں کے نمایاں ہونے کے خیال سے، اُس نے پہلو بدل کر چوڑی اُٹھانے کا خیال ترک کر دیا۔ اور یُوں بھی بلاوجہ اپنی ہنسی اُڑوانے سے کیا فائدہ؟ اتنے لوگوں میں میں ہی چوڑی اُٹھانے کے لئے اُٹھوں گا تو لوگ سوچیں گے میں لڑکی کی توجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اب پہلی بار اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی واقعی بہت خوبصورت ہے.... لیکن میرے اور اِس کے ماحول میں بہت فرق ہے اور اِس فرق کے ہوتے ہوئے اِس لڑکی کے متعلق سوچنا....

لڑکی نے اُس کے بڑھے ہوئے شیو کو دیکھا۔ کتنے گھنے بال ہیں!! ٹھوڑی سے گردن تک، اور گردن سے سینے تک موٹے سیاہ بالوں کا سلسلہ سا چلا گیا ہے۔ کتنا مینلی (Manly) معلوم ہوتا ہے۔ جیسے بغیر تراشا ہوا ہیرا!! پھٹی ہوئی قمیص سے نظر آتی ہوئی بازو کی مچھلیاں۔ چوڑے شانے اور کشادہ سینہ۔ جیسے کسی عظیم مصوّر نے مردانہ وجاہت کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہو۔ غریب ہے تو کیا ہوا۔ کتنا سیدھا اور شریف ہے۔ کاش یہ مجھ سے بات کرے.... وقت ہی پُوچھ لے۔ اور پھر میں اِس سے پوچھوں گی آپ کیا کرتے ہیں؟ کیا نام ہے؟ اور.... اور.... آپ کی شادی ہو گئی ہے کیا؟ اور پھر جب جان پہچان ہو جائے گی اور یہ بھی اگلے اسٹیشن پر اُترا تو میں اِس سے کہوں گی وہ بھی میرے ساتھ اسکوٹر میں بیٹھ جائے اور پھر کسی ہوٹل میں چائے پئیں گے.... دوستی بڑھ جائے گی.... اور شاید.... اور وہ خوابوں اور خیالوں کی بستی میں سُنہرے محل تعمیر کرنے لگی۔

اُس نے چوڑی اُٹھا کر لڑکی کو دیتے ہوئے نہایت قاتل مُسکراہٹ سے دیکھا۔ مُسکراہٹ جو اُس نے برسوں کے تجربے اور محنت کے نتیجے میں اپنی مرضی کے طابع کی تھی۔ لیکن لڑکی نے شُکریہ بھی تو نہیں کہا۔ خیر اب جلد ہی گفتگو کا کوئی موقع نکل آئے گا۔ لیکن خود سے کوئی گفتگو شروع کرنے تو انڈین لڑکیاں اُسے چیپ سمجھنے لگتی ہیں۔ اور کون جانے خود بھی اِسی وجہ سے پہل نہیں کرتیں۔ زمانہ بدل گیا لیکن ہمارے مُلک کی لڑکیاں نہ بدلیں۔ خیر کچھ بھی ہو شی اِز لائے ڈِش.... کیوپڈ اگر مہرباں ہو گیا تو سفر ختم ہونے سے پہلے ہی....

وہ اپنی پتلون کی نہ مٹنے والی کریز پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچ رہا تھا لڑکی اِس کی شخصیت سے کافی مرعوب ہو چکی ہے۔ بس دولت کا تھوڑا سا رعب اور پڑ گیا تو کامیابی یقینی ہے۔ اُس نے جیب سے پرس نکال کر کسی فرضی ضرورت کے خیال سے ٹکٹ نکالا اور اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا اور قصداً پرس اِس طرح گرا دیا کہ وہ لڑکی کے

حدیثِ دل

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں ——— فیض احمد فیض

تم نے تو حکمِ ترکِ تمنا سُنا دیا
کس دل سے آہ ترکِ تمنا کرے کوئی ——— مجاز لکھنوی

عجب حال اپنا ہوتا، جو وصالِ یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی، کبھی دل نثار ہوتا ——— داغ دہلوی

تم زمانے کی راہ سے آئے
ورنہ سیدھا تھا راستہ دل کا ——— باقی صدیقی

پھر دل طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے ——— غالب

(مُرسلہ: کے کے سود۔ ایم، اے۔ دہلی)

اس حال کو [illegible] بہت سے ٹوٹ اور گٹھلیاں ہو گئے۔ اُس
دیہاتی نے [illegible] اخلاق بڑا انگا کر اسے دیتے کا
حال کہے۔ لیکن اس سے پہلے [illegible] دیہاتی نوجوان نے بڑا اُس کے ہاتھ میں
تھما دیا۔ کتنا اُن گھڑ اور وحشی ہے! اس نے کس سے کہا تھا آپ تکلیف فرمائیے!!
کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے فکر مت کیجیے ہیں سے کچھ رنگین امریکی رسالے نکال کر
بچے پر ڈال دیے۔ ہو سکتا ہے [illegible] سے کسی رسالے کی قیمت جاگ اُٹھے!

وہ خیالات کے دھارے میں بہتی ہوئی بہت دُور آ گئی تھی۔ جان پہچان سے
دوستی اور دوستی سے محبت کی سرحد کے قریب!

"آپ کیا کرتے ہیں؟"

"کھیتی..... اور آپ؟"

"جی۔ میں کالج میں پڑھتی ہوں۔"

"آپ روز شاہدرہ سے غازی آباد کالج میں پڑھنے جاتی ہیں؟"

"جی ہاں۔ اور آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں کھیتوں کے لئے بیج خریدنے منڈی جا رہا ہوں۔"

"سنئے آپ کے گھر میں کون کون ہے۔ میرا مطلب....."

"سب ہیں.... ماں ہیں۔ پتا ہیں۔ بہن ہے۔ بس ایک کمی ہے...."

"اور اگر وہ کمی میں پوری کر دوں تو؟"

"نہیں تم وہ کمی نہیں پوری کر سکتیں۔ تم کالج میں پڑھنے والی نرم اور نازک لڑکی ہو۔ تم کھیت پر میرا ہاتھ نہ بٹا سکو گی۔ میں تمھیں وہ دولت اور آرام نہ دے سکوں گا جس کی تم عادی ہو۔"

"مجھے دولت اور سکھ نہیں چاہیے۔ میں کھیت پر تمھارے ساتھ محنت کروں گی تمھیں آرام دوں گی اور اسی میں خوش رہوں گی۔"

"کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

گاڑی کی رفتار مدھم ہو رہی تھی شاید اسٹیشن قریب آ گیا تھا۔

گاڑی دھیرے دھیرے رک رہی تھی۔ تھینک گاڈ! اس ریچھ سے تو پیچھا چھوٹا۔ اب ماحول زیادہ سازگار ہو جائے گا۔ جب یہ دیہاتی اپنا ٹاٹ کا تھیلا اٹھا کر یہاں سے روانہ ہو جائے گا تب شاید یہ لڑکی اتنا حجاب نہ محسوس کرے۔ گاڑی بھی رک گئی ہے۔ ڈائننگ کار کا کوئی بیرا آ جائے تو ——— لیکن یہ کیا؟ لڑکی بھی اسی اسٹیشن پر اتر رہی ہے۔ کمبخت نے آخری وقت میں رسپونس دی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایکسپریس تو وہ شروع ہی سے

پہنچی تھی۔ [illegible] اندازے کی [illegible]
ہم سفر [illegible] بہت کچھ ہو سکتا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا یہ کتنی احمقانہ بات ہے کہ یہ اس لڑکی کے [illegible] پیوند لگے ہوئے [illegible] ہوئی قمیص، جوتوں کی [illegible] جنھیں [illegible] کوشش کے بعد بھی نہیں سمجھا سکتا۔ ایسے مفلس اور وحشی آدمی سے کون لڑکی محبت کرے گی۔ محبت تو خیر دُور کی بات ہے۔ بات کرنے میں بھی شاید [illegible] محسوس کرے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ لڑکی وہی ہے جس کی مجھے ضرورت ہے۔ خوبصورت اور جسم بھی کسی گاؤں کی لڑکی سے کم نہیں۔ بس یہی چاہتا ہے اس سے کہہ دوں میرے ساتھ گاؤں چل۔ میں تجھے سونا چاندی اور نئے فیشن کے کپڑے تو نہ دے سکوں گا لیکن تجھے رکھوں گا بڑے آرام سے اور [illegible]۔ لیکن یہ لڑکی کیوں عیش و عشرت کو چھوڑ کر ایک قلاش کا ہاتھ پکڑے گی۔ ڈر ہے کہ [illegible] ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتی رہے گی اگر کہیں اس نے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا: [illegible] ———
اُس نے اپنی خیالی حماقت پر لعنت بھیجی۔

اُس نے اپنا تھیلا اُٹھایا اور ٹٹول کر اُس کے اندر کی چیزوں کی سلامتی اور موجودگی کا یقین کرنے کے بعد گاڑی رُکنے سے پہلے ہی دروازے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اُس نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھنے کی ضرورت بھی نہ سمجھی جو اُس سے کچھ کہنا چاہتی تھی لڑکی کے ہلتے اور کانپتے ہوئے ہونٹوں اور سوالیہ آنکھوں کو وہ نہ دیکھ سکا۔ اپنے خیالات کی بلند پروازی سے گھبرا کر اور اُن سے جلد سے جلد چھٹکارا پانے کے لئے وہ گاڑی اچھی طرح رُکنے سے پہلے ہی پلیٹ فارم پر پھیلی ہوئی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

اُس نے سوچا گاڑی رُکنے پر وہ اُسے چائے پینے کی دعوت دے گا۔ پہلے وہ ہندوستانی لڑکیوں کے عام رواج کے مطابق تکلف کرے گی۔ لیکن جب یہ قریب بیٹھے ہوئے سب لوگوں کے لئے چائے کا آرڈر دوں گا تو پھر اُسے زیادہ انکار کی گنجائش نہ رہے گی۔ اِس لڑکی کی وجہ سے اِس بندر کو بھی چائے پیش کرنی پڑے گی اُس نے حقارت سے نیم دیہاتی نوجوان کی طرف دیکھا اور پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا شاید اب محبت کا اثر اُدھر بھی رنگ لانے لگا ہے۔ کس ادا سے نظریں بچا گئی اور اس طرح دوسری طرف دیکھنے لگی جیسے اُس جنگلی کو دیکھ رہی ہو۔ اور وہ سرخی جو ایک لمحے کے لئے اُس کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ مشرقی لڑکیاں اپنے جذبات کو چھپا سکتی ہیں ریفلکسز (Reflexes) پر کنٹرول نہیں کر سکتیں۔ یہ سرخی صرف اُس وقت [illegible]

ہوسکتی ہے جب کسی مرد کے خیال سے لڑکی کے جذبات میں ارتعاش پیدا ہو۔ اور اس ضمنے میں میرا حریف اور کون ہوسکتا ہے۔ کیا وہ ریچھ!! ادھر بیٹھے ہوئے بڈھے ؟ "تمھاری چیز گر پڑی تو؟" اور وہ سگریٹ جلانے لگا۔

وہ سوچ رہی تھی شاید اب وہ مُڑکر دیکھے گا۔ ایک بار... ایک لمحے کے لئے تو میں اُس سے کہوں گی: "میں بھی اِسی اسٹیشن پر اُتر رہی ہوں"؛ لیکن نہ اُس نے مُڑکر دیکھا اور نہ وہ کچھ کہہ سکی۔ کاش اُس نوجوان کو معلوم ہو جاتا کہ میرے دل میں اُس کے لئے ——— پھر یک بیک اُس نے کتابیں سمیٹیں اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ ترک رہی تھی۔ دُور بھیڑ میں وہ وحشی سا انسان جا رہا تھا جس کے لئے لڑکی کے دل میں ایک بے قرار دھڑکن پیدا ہوئی تھی۔ گاڑی رُک چکی تھی لیکن وہ ترک کر جاتے ہوئے نوجوان کو بھیڑ میں گم ہوتے دیکھتی رہی۔ تم دیکھتے تو میں تمھارے ساتھ کھیتوں میں محنت بھی کر سکتی تھی۔ تمھارے لئے میں سب کچھ کر سکتی تھی۔ بھیڑ میں اب اُس نوجوان کی شکل پہچاننا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ لڑکی کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر ریل کے پائیدان میں جذب ہو گیا جو شاید کسی نے نہیں دیکھا۔

غزل

حفیظ مالیگانوی

محبت باعثِ آزار کیوں ہے
زمانہ برسرِ پیکار کیوں ہے
کسی کو کیا خبر ہم جانتے ہیں
عنایت آپ کی سرکار کیوں ہے
کیا تھا میں نے اظہارِ تمنا
تمہارے ہاتھ میں تلوار کیوں ہے
چُبھی جاتی ہے دل میں خار بنکر
نظر آسا دۂ آزار کیوں ہے
حفیظؔ اِس بات پر برہم ہے دنیا
مرا دل مرکزِ انوار کیوں ہے

غزل

خلش وردی

جواں عزمِ سفر ہونے لگا ہے
جنُوں پھر راہبر ہونے لگا ہے
کسی کی یاد دل میں بس رہی ہے
خزف ریزہ گہر ہونے لگا ہے
شبِ ظلمت بھیانک تھی کب اِتنی
کہیں ذکرِ سحر ہونے لگا ہے
ترے جلوؤں کی رنگینی میں شامل!
مرا حُسنِ نظر ہونے لگا ہے
کوئی آتا نہیں راہِ وفا میں
یہ رستہ پُرخطر ہونے لگا ہے

غزل

خورشید افسر بسوانی

دل اگر اُن کے لب و عارض کا افسانہ کہے
وہ بھی دیوانہ کہیں، دنیا بھی دیوانہ کہے
خود مری بیتابیاں سب کچھ بتا دیں گی اُنھیں
کون اپنے منھ سے اپنے دل کا افسانہ کہے
ذرّے ذرّے سے نُمایاں ہیں جنوں سامانیاں
جب یہ عالم ہو تو کس کو کون دیوانہ کہے
اب تو سنا ملے ہے زنداں سے فصیلِ دار تک
ایسی دنیا کو زمانہ کیوں نہ ویرانہ کہے

افسانہ

نائٹ وزٹ

اختر ملیح آبادی۔ بی اے، بی ٹی

۲۷، چھتواپور روڈ۔ لکھنؤ

۳۰ ردسمبر ۶۴ء

میرے خوشتر بھائی! تسلیم

. . . صحت کے بعد نئی توانائی ہی محسوس نہیں کرتا بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے جیسے دماغ روشن اور بینائی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ مایوسی اور قنوطیت دُور ہو چکی ہے۔ حالانکہ مسائل اُسی طرح اُلجھے ہوئے ہیں لیکن اُمید کی روشنی اُبھر آئی ہے۔ آپ نے مجھے یاد کیا اور سالنامہ کا حسین تحفہ بھی دیا۔ ظاہر ہے کہ غسلِ صحت کا اس سے بہتر اور خوبصورت تحفہ میرے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا . . . ——— ابھی سالنامہ کا زیرِ مطالعہ جاری ہے لیکن پہلی نظر میں جو کچھ دیکھا اور جتنا متأثر ہوا اُس کا حال چھپانا مجھ جیسے صاف گو کے لئے ممکن نہیں ——— میں بیسویں صدی کے پُرانے ساتھیوں اور قدر دانوں میں سے ہوں۔ میں نے "بیسویں صدی" کو پروان چڑھتے دیکھا ہے۔ وہ زمانہ بھی یاد ہے جب "بیسویں صدی" طوفان میں پھنس گیا تھا اور اُس کا دوبارہ دہلی سے طلوع بھی یاد ہے ——— اور پھر جس تیزی سے خزاں زدہ بیل میں پھول کھلنے شروع ہوئے، وہ دور بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آج "بیسویں صدی" ہند و پاکستان کے اُن معدودے چند رسائل میں چوٹی کا مقام رکھتا ہے جو "فیملی جرنل" شمار ہوتے ہیں اور جنھیں ہر گھر میں "اپنا" سمجھا جاتا ہے۔ اُن کی اسی طرح عزت و توقیر ہوتی ہے جیسی اپنے عزیزوں، دوستوں اور ہمدردوں کی۔ اور میری رائے میں ایک ادبی معیاری جریدے کی معراج یہی ہے ——— میں تو یہ کہوں گا کہ "بیسویں صدی" ایک معیاری ادبی جریدہ ہی نہیں خود اُردو ادب کے لئے ایک معیار ہے۔ ایک شاہراہ ہے! ——— سالنامہ جہاں ظاہری حُسن و خوبصورتی سے مزیّن ہے اور ذوقِ جمال کے تقاضوں کو نہ صرف پورا کرتا ہے بلکہ مکمل طور پر مطمئن بھی کرتا ہے، وہاں معنوی لحاظ سے گرانقدر ہے اور اس قابل ہے کہ اسے محفوظ رکھا جائے ——— آپ کی جدت طرازی کا ثبوت یہ ہے کہ ادیبوں کی گھریلو تصاویر، حالات کے علاوہ دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر، اُن کی ادبی کاوشوں کو نکھار رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے سالنامہ کا حُسن اور بڑھا دیا ہے۔ ادبی حلقے اس جدت کو سراہیں گے۔ ساتھ ہی اتنے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کا سالنامہ میں موجود ہونا اس بات کی علامت ہے کہ سالنامہ یقیناً ہر حلقہ میں سراہا جائے گا ——— یہ کامیابی آپ کی ذاتِ خاص سے متعلق ہے۔ اگر خوشتر گرامی میں ادب، حُسن و زندگی کا توازن اور اُس کی فطرت میں رچاؤ نہ ہوتا تو حُسن و جمال کے یہ تیکھے انداز دیکھنے میں نہ آتے ——— کچھ ہو، آپ کی تعریف نہ کرنا ادبی ناانصافی ہوگی ——— جانتا ہوں کچھ لوگ اس حقیقت پر آگ بگولہ بھی ہوں گے جیسا کہ ہوتے رہے ہیں۔ طعنے بھی دیں گے جس طرح کہ دیتے رہے ہیں لیکن میں وہ سب کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتا جو کہنا چاہتا ہوں ——— سالنامہ انتہائی کامیاب ہے اور میں سمجھتا ہوں ہند و پاکستان ہی سے نہیں بلکہ بیرونی دُنیا سے بھی اس "حسین تحفے" پر آپ کو مبارکباد ملنی شروع ہو گئی ہوگی . . .

ناچیز ——— اختر ملیح آبادی

اپنے جسم میں کسی کی آواز سن کر میرا ردِعمل اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ کوئی مریض ہے۔ اس لئے کہ میں ابھی ابھی مطب کو بالکل خالی چھوڑ کر آیا تھا۔ اور اس خیال نے بغیر دیکھے مریض کی شدت کا احساس دلا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میری انگلیاں جسم کے لگاتے لگاتے خود بخود رک گئیں۔ اچانک چھپر کا دروازہ زور سے کھلا اور کمپاؤنڈر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے پوچھا۔

"کوئی مریض ہے؟"

"ایک عورت ہے!"

کمپاؤنڈر نے شاید میرا سوال سنا نہیں تھا یا وہ سردی میں بری طرح ٹھٹھر چکا تھا اور اس وقت اچانک مریض کے آجانے سے اس کا ذہن منتشر ہو گیا تھا ۔۔۔ اس بے جواب نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس وقت رات کے دس بجے جبکہ نہ صرف

- اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا شریف وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ (قرآن کریم)
- ایک ساعت انصاف (برسہا برس کی) عبادت سے بہتر ہے۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- بوڑھے کا مشورہ جوان کی قوت بازو سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- سردار بننا چاہتے ہو تو حرکت و عمل، جدوجہد کو اپنا معمول بناؤ۔
(حضرت حسین علیہ السلام)
- تقدیر پر یقین رکھو اور تدبیر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ (آئینہ سرور)

سردی غضب کی ہے بلکہ بارش کے ساتھ ساتھ برفانی ہوا بھی چل رہی ہے۔ مریض کا آنا اور وہ بھی عورت کا۔ یقیناً کوئی سنگین کیس ہو سکتا ہے۔

"عورت!" کمپاؤنڈر نے کانوں کے گرد مفلر کستے ہوئے اور دانت کٹکٹاتے ہوئے کہا: "وزٹ چاہتی ہے ۔۔۔۔!"

"وزٹ؟" میں نے گھبرا کر اور یہ سوچتے ہوئے کہ کار بنے گئی ہے، پوچھا۔ "اس وقت؟"

"جی ہاں!" کمپاؤنڈر نے بڑی مایوسی سے کہا۔ "بہت ٹالا لیکن وہ ٹلی نہیں۔"

ایک لمحہ میں دروازے کو گھورتا رہا۔ پھر میں نے فیصلہ کن انداز سے کمپاؤنڈر کو دیکھا اور کہا۔

"کہہ دو اس وقت وزٹ ممکن نہیں۔"

کمپاؤنڈر سردی سے کانپتا ہوا چلا گیا۔ میں نے جلدی سے بٹن لگائے، ٹوپی پہنی اور دستانے پہنتا ہوا باہر کی طرف ہو لیا۔ اس خیال سے کہ کمپاؤنڈر کی مدد کروں تاکہ اسے نائٹ وزٹ سے جان بچ جائے ۔۔۔۔۔ لیکن مجھے دیکھتے ہی عورت میری طرف بڑھی اور بہت عاجزانہ انداز سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! میری بہن بہت بیمار ہے ۔۔۔ اسے دیکھ لیجئے ۔۔۔ بھگوان کے لئے ڈاکٹر صاحب!"

میں نے ہنستے ہوئے جلدی سے کہا "بھگوان ہی کی مرضی نہیں۔ بارش ہوا اور ٹھنڈک دیکھ رہی ہیں آپ؟"

یہ کہتے کہتے میں نے اس جوان عورت کی طرف دیکھا جو صرف جوان ہی نہیں بلکہ "چارمنگ" نظر آ رہی تھی۔ پوشاک سے بھی اپنے کلچر کو واضح کر رہی تھی۔ میرے جواب نے شاید اسے قطعی ناامید کر دیا تھا۔ جب ہی وہ ابھی تک مجھے گھور رہی تھی۔ آخر میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"سویرے وزٹ کر لوں گا۔ اپنا ایڈریس چھوڑ جایئے ۔۔۔"

"میری بہن کے پیٹ میں بہت درد ہے۔ صبح کا انتظار وہ نہیں کر سکتی ڈاکٹر صاحب"

جس عجلت سے میں نے سوال کیا تھا اتنی ہی عجلت سے میں نے دیکھا کہ اس کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ اس نے قدرے شرماتے ہوئے اور ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

"میری بہن ان میریڈ ہے ڈاکٹر صاحب!"

"میرے پاس کار بھی نہیں۔ کارخانے گئی ہے ۔۔۔!"

"ڈاکٹر صاحب! کنوینس میرے پاس ہے!"

بادل زور سے گرجا۔ بجلی چمک گئی۔ ہوا کا زوردار جھونکا آیا۔ لیکن یہ سب باتیں بیکار ثابت ہوئیں اس لئے کہ میں باہر کھڑے ہوئے تانگے پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ عورت آگے میرا بیگ تھامے بیٹھی تھی۔ تانگہ بھیگی سڑکوں سے گزر رہا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر انسان کا خادم ہوتا ہے اس کی زندگی انسانیت کے لئے وقف ہوتی ہے۔

"آپ کی بہن کو تکلیف کیا ہے؟"

"پیٹ میں بہت سخت درد ہے ڈاکٹر صاحب!"

"اس سے پہلے بھی یہ شکایت ہوئی؟"

"جی نہیں۔"

"وزن تو نہیں اٹھایا؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحب!"

"پھر کیا بات ہے؟"

"آپ چل کر خود دیکھ لیجئے گا!" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ نے بڑا احسان کیا

ڈاکٹر صاحب!"

میں نے سنجیدہ ہو کر جیسٹر کی جیبوں سے ہاتھ پیوست کر لئے۔ تانگہ برابر چل رہا تھا۔ بارش تھم چکی تھی لیکن ہوا میں کچھ تیزی آ گئی تھی۔ مطلع صاف ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ کیونکہ بادل پھٹ رہے تھے۔

"بس روک لو ــــــ یہیں!"

اچانک اُس جوان عورت نے تانگے والے سے کہا اور بیگ سے کرایہ دینے کے لئے تیار ہو گئی ــــــ تھوڑی دیر بعد میں اُس کی بہن کے کمرہ میں تھا۔ اُس نے مجھے بڑی عجیب نگاہوں سے دیکھا اور پھر کراہنے لگی۔

میں نے اُس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ دل کی حرکت کافی تیز تھی۔ میں مریضہ کی خوبصورت لیکن دُکھی آنکھیں دیکھ رہا تھا ــــ اُس وقت میرے ذہن میں یہ خیال تیزی سے گونج رہا تھا کہ حُسن آشنائے درد تھا ــــــ نبض کے بعد میں نے مریضہ کے پیٹ پر ہاتھ رکھا تو وہ بڑے درد کے ساتھ بولی۔

"یہاں ــــــ ڈاکٹر صاحب یہاں!"

"آپ تو درد پیٹ میں بتا رہی ہیں؟"

میں نے قدرے گھبرا کر مریضہ سے پوچھا تو وہ عجیب [illegible] نظروں سے دیکھنے لگی۔

"درد یہاں بھی ہے۔۔۔"

میں نے گھبرا کر دل کے نیچے کے لئے تیار نہیں دیر جب گیا مجھے شک ہوا کہ درد کہیں دل میں تو نہیں۔ اس لئے دل پر آلہ رکھ کر دیکھا۔ لیکن میری سمجھ میں نہ آیا کہ تکلیف کیا ہے اور کیا ہو سکتی ہے؟

اچانک مریضہ کی بڑی بہن چائے کی کشتی لئے آئی اور مُسکرا کر بولی "چائے لیجئے ڈاکٹر صاحب!"

مجھے ششدر دیکھ کر اُس نے جلدی سے کہا "اتنی سردی میں آپ نے میری بہن پر احسان کیا ہے۔"

چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے میں نے نہایت صفائی سے کہا "مجھے افسوس ہے کہ شاید مرض نہیں پہچان سکا۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ مُسکرا کر اپنی بہن کو دیکھتے ہوئے بولی "آپ کے آنے ہی سے میری بہن سنبھل گئی ــــ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ مسیحا نہیں؟"

چائے کا آخری گھونٹ لے کر اور سگریٹ کیس نکالتے ہوئے میں نے مُسکراتے ہوئے کہا "یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ آپ نے مجھے مسیحا کا لقب دے دیا۔"

"جھوٹ نہیں ڈاکٹر صاحب!" اُس نے بہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور ہنستے ہوئے کہا "ثبوت موجود ہے۔ آپ کے آنے سے پہلے میری بہن کا بُرا حال تھا لیکن اب دیکھئے وہ ہنس رہی ہے۔۔۔!"

میں مُڑا ــــــ دو درد آنکھیں مُسکرانے لگیں۔

لیکن میرا دماغ چکرا رہا تھا ــــــ درد سے وہ تڑپ رہی تھی۔ اُس کی آواز میں نے زینے پر سُنی تھی، لیکن اب درد ختم ہو گیا تھا۔ جبکہ دوا ایک مریضہ کے حلق میں نہیں گئی تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے مُسلسل تین سگریٹ پی گیا۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب!"

مریضہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اپنی انگلیوں سے بستر کا دامن پکڑے وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور مُسکرا رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف مخاطب پا کر وہ نیم دراز ہو کر اپنی چوٹی سے کھیلتی ہوئی بولی۔

"ایسا درد کبھی کبھی اُٹھتا ہے۔۔۔!"

- خدا کا تصور ہماری زندگی میں ہر طرح کی فلاح و بہبود، نیک چلنی، عالی ہمتی، استقلال اور ذہنی و قلبی سہارے کا موجب ہے۔ (پروفیسر جیمز)
- ہر مقصد میں خدائے تعالیٰ کی بڑائی۔ مُلک کی بھلائی اور حق کی تلاش مدِ نظر رکھو۔ (شیکسپیئر)
- آدمی کسی کے ساتھ نیکی نہ کر سکے تو کم سے کم اتنا تو کرے کہ اُسے اُس کی بُرائیوں سے آگاہ کرتا رہے۔ (حکیم بقراط)
- عظمت صرف ایک فیصد ودیعت کی جاتی ہے اور ۹۹ فیصد محنت و ریاضت سے ملتی ہے۔ (عربی ادب)
- حوادثِ روزگار کا مقابلہ پہاڑ کی طرح جم کر کرو۔ (ابن یمین)

اچانک میں نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا "بے درد کا درد کیوں؟"

وہ چونک پڑی۔ ہنسی روکتے ہوئے جلدی سے اُس نے کہا "درد بہت دیر رکا تھا۔"

"میں ڈاکٹر ہوں!"

"جی؟"

اُس نے چونکتے ہوئے مجھے گھورا اور میں نے کہا "خیر آپ کو بغیر دوا کے آرام ہو گیا اور میرا کام ختم ہو گیا۔"

"کیا معلوم پھر ہونے لگے؟"

"اب نہیں ہوگا۔"

دوسرے لمحے جب بڑی بہن آئی تو میں نے مریضہ کی کیفیت بتاتے ہوئے کہا "اب



دیگر کسی قوم کی طرح اہلِ ہند کا بھی یہ خصوصی حق ہے کہ وہ آزاد ہوں۔ اپنی محنت کے ثمر اور زندگی کی آسائشوں سے لطف اندوز ہوں تاکہ انھیں نشو و نما کے مکمل مواقع میسّر آسکیں۔

جواہر لال نہرو

حلف آزادی
۲۶ر جنوری سنہ ۱۹۳۰ء



ہمارا راستہ صاف اور سیدھا ہے یعنی ہم داخلی طور پر آزادی و خوشحالی پر مبنی سوشلسٹ جمہوریت کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور خارجی طور پر امنِ عالم کی برقراری اور سبھی اقوام سے دوستانہ تعلقات رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اس سیدھے راستے پر گامزن ہونے اور ان درخشاں آدرشوں کے حصول کے لئے ہم آج خود کو ازسرِ نو وقف کرتے ہیں۔

لال بہادر شاستری
وزیراعظم ہند

جملہ پنجابی آج

آزادی کو مستحکم بنانے کے لئے اپنے عزم کی ازسرِ نو توثیق کرتے ہیں۔

جاری کردہ:۔ محکمہ تعلقات عامہ پنجاب

NO. PRO/612

"مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ درد ٹھیک ہے۔"

"لیکن تانگے والا تو ہے نہیں۔"

"اُسے جانے کیوں دیا؟"

"وہ چائے پینے گیا تھا۔" اُس نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔ "چائے پی کر آنے کو کہہ گیا تھا۔ لیکن ابھی تک نہیں آیا۔ آئے گا ضرور اس لئے کہ ابھی میں نے کرایہ نہیں دیا ہے۔"

"لیکن گیارہ بج رہے ہیں۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے میں نوکر کو بھیجتی ہوں۔"

"ذرا جلدی کیجئے!"

جب بڑی بہن چلی گئی تو چھوٹی بہن نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! اتنی جلدی کیا ہے؟"

اُس وقت اچانک مجھے خیال آیا کہ شاید یہ سب ڈراما تھا۔ لیکن کوشش کے باوجود ذہن ڈرامے کا پس منظر معلوم نہ کر سکا۔

"چائے اور پیجئے ڈاکٹر صاحب!"

مصنوعی مریضہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بس اب ضرورت نہیں۔"

"ٹھنڈ بہت ہے!"

"میں رات بھر چائے پینے کے لئے تیار نہیں۔"

"لیکن تانگہ تو ابھی آیا نہیں ہے۔"

"نہ آئے!"

"تو کیا آپ؟" اُس نے سوالیہ نشان بنتے ہوئے کہا۔ "بغیر تانگے کے چلے جائیں گے؟"

"ہم لوگ ہر مرض کا علاج جانتے ہیں۔"

"ڈاکٹر جو ہیں۔"

اُس نے ہنستے ہوئے کہا اور تکیے کے نیچے سے آئینہ نکال کر بال درست کرنے لگی پھر لپ اسٹک نکالی اور میں اچانک کرسی سے اُٹھ کر کھڑکی کی طرف کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ تانگہ آیا یا نہیں۔ ساتھ ہی مجھے خطرہ کا پہلی بار احساس ہوا اور اُس کے ساتھ ہی غصہ آیا۔ میں نے پلٹ کر بناوٹی مریضہ کی طرف دیکھا تو وہ کہنی تکیے پر ٹیکے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے مسکرا رہی تھی اور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے پلٹتے دیکھا تو وہ ہنسنے لگی اور بولی۔

"تشریف رکھئے ڈاکٹر صاحب!"

"یہ حرکت اچھی نہیں.....!"

"کون سی؟"

"اس طرح وزٹ کرانا غلط ہے!"

"واقعی درد نے مجھے تڑپا رکھا تھا ڈاکٹر صاحب!"

"اور میرے آتے ہی درد رفو چکر ہو گیا۔ اُسی کے ساتھ تانگے والا بھی؟"

"ہو سکتا ہے دیدی نے تانگہ واپس کر دیا ہو۔"

"کیوں؟"

"یہ سوچ کر کہ شاید علاج میں دیر لگے ——— اور آپ کے متعلق کون نہیں جانتا کہ آپ روپے سے زیادہ مریض کا خیال کرتے ہیں۔"

"میں اپنا اصول بدل دوں گا۔"

"ایسا غضب نہ کیجئے گا ڈاکٹر صاحب!"

یہ کہتے کہتے وہ ہنس دی۔ بڑی بہن نے آکر بتایا کہ تانگہ والا جا چکا ہے۔

"کوئی بات نہیں!" میں نے آگے بڑھ کر بیگ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں سواری ڈھونڈ لوں گا۔"

"ایسی سردی میں جائیے گا؟"

"ہاں!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اسی سردی میں آیا بھی تھا۔"

"لیکن!" بڑی بہن نے جلدی سے کہا۔ "سُنئے ———!"

"کافی وقت ہو چکا ہے!"

یہ کہہ کر میں نے بیگ اُٹھا لیا اور دوسرے کمرے کی طرف ہو لیا۔ بڑی بہن نے تعاقب کیا اور کہا۔

"فیس ڈاکٹر صاحب؟"

میں نے ٹالتے ہوئے اور خود کو خطرے سے نکالنے کا جتن کرتے ہوئے کہا۔ "فیس کس بات کی؟ نہ دوا دی میں نے نہ انجکشن دیا۔"

"لیکن آپ کی وزٹ تو ہو گئی۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔"

یہ کہہ کر میں زینے پر چڑھ گیا اور باہر گلی میں پہنچتے ہی تیزی سے بڑی سڑک کی طرف بڑھ گیا ——— لیکن اس بڑھتے ہوئے احساس کے ساتھ کہ اب کوئی آیا اور اب کوئی آیا ——— مجھے حملہ کا پورا پورا یقین تھا کیونکہ وزٹ کا مقصد اب مجھ پر واضح ہو گیا تھا۔ بغیر مرض کے ڈاکٹر کی طلبی کے دوسرے معنی ہو بھی کیا سکتے تھے؟ مجھے لانے کا مقصد ہی کچھ اور تھا جبکہ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ وہ مقصد ہنوز تشنہ تھا ——— آخر ہا پڑا اس لئے تو نہیں بیلے گئے تھے کہ مجھے بغیر نقصان پہنچائے جانے دیا جائے!

بڑی سڑک تک پہنچتے پہنچتے بلا کی ٹھنڈ کے باوجود میں پسینے میں ڈوب چکا تھا۔

اتفاق سے ایک تانگہ مجھے جاتے ہی مل گیا۔ میں نے اُس سے چلنے کو کہا تو تانگہ والے نے کہا۔

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

افسانہ لکھ رہی ہوں	خورشید ہاشمی ایم اے	دو روپے
اندھیرے	اختر عادل روپ	دو روپے
آگ اور دھواں	م م راجندر ایم اے	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
ایک پیار ایک دھوکا	رام سرن شرما	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
بیگم صاحبہ	شوکت تھانوی	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
داماد	"	دو روپے ۲۵ نئے پیسے
پگلی	"	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
بے غیرت	مظہر ہاشمی	چار روپے ۷۵ "
باون پتے	کرشن چندر ایم اے	پانچ روپے ۹۵ "
پہلی لڑکی	رازداں ایم اے	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
انور	فیاض علی	آٹھ روپے ۵۰ "
برہمن	کرشن گوپال عابد	چار روپے ۵۰ "
ستم	"	چار روپے ۷۵ "
گھائل	"	تین روپے ۹۵ "
ظالم	سعید امرت	دو روپے ۵۰ "
جانے والے	اختر عادل روپ	تین روپے ۵۰ "
جاتی ہوئی بہار	وحشی محمود آبادی	چار روپے
چوٹ	دت بھارتی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
گناہ	"	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
حال دل	بیگم توقیر ولایت حسین	تین روپے ۵۰ "
خاتون	انتصار حسین	تین روپے
حاجی مراد	قیسی رامپوری	چار روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
زخم آبرو (نظم)	عبدالحمید عدم	دو روپے ۵۰ نئے پیسے

دو پھول	عادل رشید	تین روپے ۹۵ "
دو سال پہلے دو سال بعد	زبیدہ خاتون	چھ روپے
زر بامسلسل	شفیق بانو	دو روپے
زہر	ذکی انور	چھ روپے
رجنیس	قیسی رامپوری	چار روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	تین روپے
سانچے	رضیہ سجاد ظہیر	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	تین روپے ۵۰ "
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	چار روپے ۵۰ "
ننگی جوانی	سعید امرت	دو روپے
رہ گذر	انیس مرزا	چار روپے ۵، نئے پیسے
خوفناک محبت	عبدالحلیم شرر	تین روپے
شاہدہ	انتصار حسین	تین روپے
گرہن	شفیق الرحمٰن	تین روپے
ناظر کی آپ بیتی	ایم اسلم	تین روپے
ایک دل ہزار غم	عزیز بدایونی	دو روپے ۵ نئے پیسے
زرینہ	رئیس احمد جعفری	چھ روپے ۵۰ نئے پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع	پانچ روپے
دروازہ	نادرہ خاتون	پانچ روپے
چندر کلا	جمنا داس اختر	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
جلن	"	دو روپے ۵۰ "
رادھا الزبتھ	"	دو روپے ۵۰ "
پاپی	"	چار روپے
سوناگاچھی	"	چار روپے ۵۰ "
طوفانوں کی کہانی	"	چار روپے ۵۰ "
جوار بھاٹا	"	چار روپے ۵۰ "

قیامت	ذکی انور	دو روپے [illegible]
سازش	"	دو روپے ۵۰ "
کانٹوں کی سیج	رشید اختر ندوی	پانچ روپے
گھرانہ	قیسی رامپوری	چار روپے [illegible]
ناگ دیوتا	محمود جالندھری	دو روپے ۵۰ "
خون کے چھینٹے	"	دو روپے ۵۰ "
خوابگاہ میں	"	تین روپے ۵۰ "
فراق	رنگین بھارتی	تین روپے ۵۰ "
پیاسا	"	تین روپے ۵۰ "
پراسرار رقاصہ	"	دو روپے
پراسرار قاتل	"	دو روپے
پیاس	کے ایل ترانہ بی اے	تین روپے ۵۰ "
محبت روتی ہے	غلام عباس	دو روپے
مانوا	میکسم گورکی ترجمہ: نریش کمار شاد	ایک روپیہ ۵ نئے پیسے
کھیت میں لہو	تاجور سامری	ایک روپیہ ۵، "
جی ہاں پٹے ہیں	شوکت تھانوی	تین روپے ۲۵ "
پردے کے پیچھے	منٹو	دو روپے ۵۰ "
ملکہ صحرا	اوم پرکاش نامی	دو روپے ۵۰ "
خاموش نغمہ	"	چار روپے
آتش گل (مجموعہ کلام)	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
باقیات اقبال "	ڈاکٹر اقبال	تین روپے
تلخیاں (کلاں) "	ساحر	چھ روپے
تلخیاں (خورد) "	ساحر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
پرچھائیاں "	ساحر	ایک روپیہ ۷۵ نئے پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر (مولانا آزاد)		تین روپے ۵۰ "
زہرہ کا حسن	اشفاق احمد	دو روپے

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

"دس روپے ہوں گے صاحب!"

"چلو؟"

یہ کہتے ہوئے میں تانگے پر بیٹھ گیا اور جلدی سے کہا ۔ تیز چلو!"

تانگے والے نے دس پانچ چابکیں گھوڑے کے رسید کیں اور وہ سردی بھول کر

دوڑنے لگا ۔۔۔ میں رومال سے پسینہ پونچھنے لگا!

گھر پہنچ کر میں نے ساری جیبیں جلدی جلدی اور گھبرا کر ڈھونڈ لیں لیکن میرا

پرس غائب تھا ۔۔۔!!

جس میں سات سو روپے نکل چکے تھے ۔۔۔!!

دوسرے دن میں نے آدمی بھیجا تو مکان بند ملا ۔۔۔!!

یہ نائٹ وزٹ مجھے بہت مہنگی پڑی تھی ۔۔۔ یہ واقعہ میری پریکٹس کے آغاز کا

ہے۔ جو مجھے اب تک یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گا ۔۔۔!!!

غزل

کیف احمد صدیقی

حسن کے دل میں راہ پیدا کر
کوئی شکل نباہ پیدا کر

جلوۂ حسن دیکھنے والے
پہلے ذوقِ نگاہ پیدا کر

حرم و دیر ہو کہ میخانہ
ہر جگہ رسم و راہ پیدا کر

جس پہ جلوے ہوں خود بہ خود قرباں
کوئی ایسی نگاہ پیدا کر

کیف اب اپنی چشمِ گریاں سے
کچھ نئے مہر و ماہ پیدا کر

غزل

چندر پرکاش جوہر بجنوری

دے کر مجالِ دید مذاقِ نظر کو میں
جلووں کو دیکھتا ہوں کبھی جلوہ گر کو میں

پا جاؤں تابِ دید اگر لمحہ بھر کو میں
آئینۂ جمال بنا لوں نظر کو میں

پھر ہے جبینِ شوق کو سجدے کی آرزو
پھر ڈھونڈنے چلا ہوں ترے سنگِ در کو میں

اللہ رے احترامِ حریمِ جمالِ دوست
یہ تاب ہی نہیں کہ اٹھاؤں نظر کو میں

منزل مجھے ملے نہ ملے کچھ گلہ نہیں
جوہر نہ ساتھ لونگا مگر راہبر کو میں

غزل

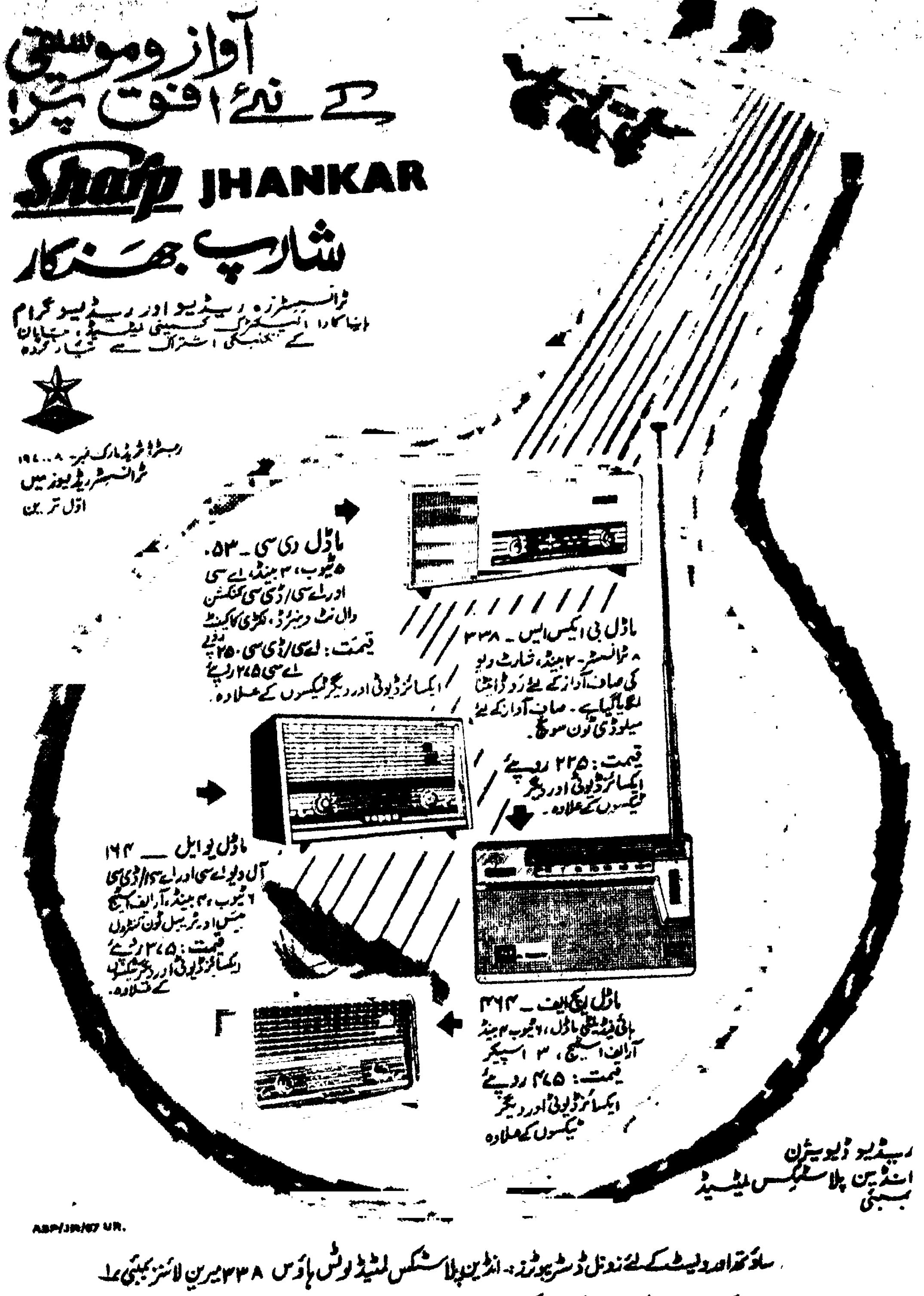
سروج کنجاہی

اِک قافلہ خیال کا آیا گزر گیا
ہر چند ہم نے روکنا چاہا گزر گیا

برسوں کے بعد بھی وہ ملے ہیں تو اس طرح
سایہ سا میرے پاس سے گویا گزر گیا

آنکھوں کی پیاس بھی نہ بجھی تھی کہ دوستو
چہرہ دکھا کے ابر کا ٹکڑا گزر گیا

تُو پوچھ نہ ہم سے کیا ہے غمِ زندگی کی دھوپ
سر سے ہمارے آگ کا دریا گزر گیا


آواز و موسیقی
کے نئے افق پر!
Sharp JHANKAR
شارپ جھنکار
ٹرانسسٹرز، ریڈیو اور ریڈیو گرام
اپنا کاروا الیکٹرک کمپنی لمیٹیڈ، جاپان
کے تکنیکی اشتراک سے تیار کردہ
رجسٹرڈ ٹریڈ مارک نمبر ۱۹۰۰۰۸
ٹرانسسٹر ریڈیوز میں
اوّل ترین
ماڈل ڈی سی ـ ۵۳۰
۵ ٹیوب، ۳ بینڈ، اے سی
اور اے سی/ڈی سی کنکشن
وال نٹ وینیرڈ، لکڑی کا کیبنٹ
قیمت: اے سی/ڈی سی ۲۵۰ روپیے
اے سی ۲۷۵ روپے
ایکسائز ڈیوٹی اور دیگر ٹیکسوں کے علاوہ۔
ماڈل بی ایکس ایس ـ ۳۳۸
۸ ٹرانسسٹر، ۲ بینڈ، شارٹ ویو
کی صاف آواز کے لیے زور دار ٹرانسسٹر
لگایا گیا ہے۔ صاف آواز کے لیے
میلوڈی ٹون سوئچ۔
قیمت: ۲۲۵ روپیے
ایکسائز ڈیوٹی اور دیگر
ٹیکسوں کے علاوہ۔
ماڈل یو ایل ـ ۱۶۴
آل ویو اے سی اور اے سی/ڈی سی
۶ ٹیوب، ۴ بینڈ، آر ایف اسٹیج
بیس اور ٹریبل ٹون کنٹرول
قیمت: ۳۷۵ روپے
ایکسائز ڈیوٹی اور دیگر ٹیکسوں
کے علاوہ۔
ماڈل ایچ ایف ـ ۳۶۴
ہائی فیڈیلٹی ماڈل، ۶ ٹیوب ۴ بینڈ
آر ایف اسٹیج، ۳ اسپیکر
قیمت: ۴۷۵ روپیے
ایکسائز ڈیوٹی اور دیگر
ٹیکسوں کے علاوہ
ریڈیو ڈیویژن
انڈین پلاسٹکس لمیٹیڈ
بمبئی
ASP/JR/67 UR.

افسانہ

ادھوری کہانی

پروفیسر ظفر احمد نظامی ایم اے

شعبہ سیاسیات، گورنمنٹ ڈگری کالج۔ دتیا (مدھیہ پردیش)

۲۲ دسمبر ۶۴ء   برادر محترم! تسلیمات

۲ نومبر کو میرٹھ سے دلی پہنچا اور پھر اُسی شام وہاں سے دتیا کے لئے چل پڑا کیونکہ ۳ سے کالج کھل رہا تھا۔ اسی لئے دوبارہ حاضری سے قاصر رہا۔ ویسے میرٹھ روانگی سے پیشتر میں نے ٹیلیفون پر دیوالی اور سالِ نو کی مبارکباد پیش کرنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن آپکی عدم موجودگی کے باعث ناکامی ہوئی ——— دلی کے مختصر سے دورانِ قیام میں آپ سے وہ لمحاتی ملاقات ذہن پر جاوداں اثر مرتسم کر گئی ہے جب آپ انتہائی مصروفیات کے باوجود مجھ سے اپنی شفقت اور محبت کا اظہار فرما رہے تھے۔ کوکا کولا کی بوتل جتنی سیاہ و سرد تھی میرا دل اُتنی ہی شدت سے آپ کے اُجلے اور گہرے خلوص کی گرمی کو محسوس کر رہا تھا۔ راجہ مہدی علی خاں کا خط پڑھ کر آپ کا دل بھر آیا تھا اور آپ جذبات کی رَو میں بہہ نکلے تھے جسے میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ ملک ضرور تقسیم ہو گیا لیکن خلوص ایسی شے نہیں جو منقسم ہو جائے۔ آپ کے بلند خیالات قومی یک جہتی اور ہندو مسلم اتحاد کی کڑیوں کا سنگم ہیں ——— بہر حال اس دلی میں میری مصروفیتیں بہت کارآمد ثابت ہوئیں اور آپ کو مسرت ہوگی کہ اپنی علالت کے باوجود اتنے کم وقت میں بھی میں نے اپنے لکچرس کے لئے کافی مواد فراہم کر لیا۔ یہاں پہنچ کر سے پھر اپنی مصروفیات میں گم ہو جانا پڑا۔ اگرچہ دلی کی گہما گہمی کے بعد فطرت کے وسیع دامن میں پھر خاموش اور پُر سکون زندگی مل گئی لیکن دریا گنج کی مصروف ترین شاہراہ کا وہ حصّہ اب بھی ذہن و دل میں محفوظ ہے جس میں آپ کی نشست اور "بیسویں صدی" کا دفتر ہے ...

آپ کا بھائی ——— ظفر احمد نظامی

اختر ڈاک کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کا معمول تھا صبح اخبار پڑھتا اور پھر ناشتے کے بعد ڈاکیہ کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ ایک ہفتہ وار اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ وقت گزاری کے لئے وہ اپنے ہی اخبار کے تازہ شمارے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ تجارتی امور کے سلسلے میں باہر رہنے کے باعث وہ اِس شمارے کے میٹر کو نہیں پڑھ سکا تھا۔ اِس کی مکمل ترتیب اُس کے اسسٹنٹ کی مرہونِ منت تھی۔ اُس نے پرچے کا ٹائیٹل دیکھا، صفحات اُلٹے، اداریہ پڑھا۔ نظموں کے ابتدائی بند اور غزلوں پر اُچٹتی نظریں ڈالتا ہوا وہ افسانوی حصّہ کی جانب متوجہ ہوا۔ سبھی جانے پہچانے ادیب تھے۔ اکثر اُس کے دوست تھے اور بیشتر اُسی کے بنائے ہوئے جنھیں خود اُسی نے لفٹ دے کر ادبی دنیا میں مشہور کیا تھا۔ اسی سرسری جائزے کے دوران میں ایک افسانے پر اُس کی نگاہیں جم گئیں جو "ڈائری کے اوراق" پر مشتمل تھا اور اُسی کے ایک عزیز دوست کی جنبشِ قلم کا نتیجہ تھا۔

اُس کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ یہ ایک لڑکی کی ڈائری تھی۔ وہ ایک اوسط درجے کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ابتدائی تعلیم مدرسوں میں حاصل کرنے کے بعد وہ کالج کی رومانی فضاؤں میں گم ہو کر رہ گئی۔ آزادانہ ماحول اُسے راس آگیا۔ اُس کے خیالات کی رَو نئی تہذیب کی راہوں کی جانب بہنے لگی۔ زندگی کے رُخ سے پہلی بار پردہ اُٹھا تو دُنیا رنگین نظر آئی۔ سینے میں مچلتے ہوئے دل کی دھڑکنوں نے رومانی اشعار کی صحیح ترجمانی کی۔ مخلوط تعلیم نے اُس کے دل کی دُنیا کو اُمنگوں اور آرزوؤں سے بھر دیا تھا۔ لڑکے اُسے دیکھ کر فقرے کستے تو وہ لطف اندوز ہوتی، وہ اُن سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتی۔ پڑھنے سے زیادہ وقت بناؤ سنگار میں گزارنے لگی۔ وہ کالج کے الیکشن اور سوشل ہنگاموں کی روحِ رواں بن گئی۔ کوئی

[illegible] اُس کی فطرت کے برعکس [illegible] اُس کے لیے رنگین ہوئی تھی۔ ہر محفل میں اُس کی موجودگی ضروری قرار دے دی گئی تھی۔ اُس نے بھی وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے [illegible] کے وارثوں کی حوصلہ افزائی کی اور جوانی کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے اُن کی خوبصورت تکمیل کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔

احسن کو الجھن سی ہونے لگی۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے پھر ڈائری پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔

۷ر دسمبر ——————

زندگی کی ویران وادیوں میں بہار آ گئی۔ اُس سے ایک پکنک میں ملاقات ہوئی۔ اُس نے مجھے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا اور میرے دل میں چبھتا چلا گیا۔ وہ بہت دولت مند ہے۔ میں پہلی ہی ملاقات میں اُسے بہت قریب محسوس کرتی ہوں۔ نظروں سے کیا ہوا آغاز ہونٹوں کے تبسم پر اختتام پذیر ہوا۔

۹ر دسمبر ——————

اُس سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، گفتگو جاری رہی۔ اُس نے پہلی بار مجھے عمر خیام کی رباعیات کا قیمتی مجموعہ تحفہ پیش کیا۔

۱۲ر دسمبر ——————

تحفے آتے رہے اور ہم ملتے رہے۔ باغوں میں، سینماؤں میں، کلبوں میں، ہوٹلوں اور ناچ گھروں میں۔ زندگی شاید انہیں دلچسپیوں کا دوسرا نام ہے۔ شاید ہی کوئی لمحہ افسردگی کی نذر ہوا ہو۔

۱۹ر دسمبر ——————

وہ بہت اُداس آیا۔ نظریں نیچی کئے۔ اُس کے والدین اُس کی شادی کہیں طے کر چکے تھے لیکن ایک امیر باپ کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی وہ میری محبت میں گم ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ میں نے پہلی بار اُسے اُداس دیکھا، خود بھی افسردہ ہو گئی۔

۲۱ر دسمبر ——————

میں نے اُس سے کہا، ہم جیون ساتھی بن جائیں۔ وہ بے حد خوش ہوا لیکن اُس کے والدین نے صاف انکار کر دیا۔

۲۲ر دسمبر ——————

میں اُسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اپنی محبت کے واسطے دیے اور سول میرج کا مشورہ دیا جسے وہ ٹھکرا نہ سکا۔

۲۶ر دسمبر ——————

شادی بہت سادہ طریقہ سے ہوئی۔ مجھے اُس سادگی سے کہیں زیادہ اُس کے [illegible] وحشت کی زندگی پسند تھی لیکن وقت کا تقاضا [illegible] کے رسم و رواج سے بے نیاز اور سماج کی بے بنیاد کھوکھلی پابندیوں سے ہٹ کر ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن گئے۔

۳۰ر دسمبر ——————

میں اُس سے علیحدگی چاہتی ہوں۔ ساری رات مجھے بیدار رہنا پڑا۔ اکلوتی اولاد ہونے کے باوجود اُس کے والدین نے اِس شادی کی وجہ سے اُسے جائیداد سے محروم کر دیا۔ میں پریشان ہو چکی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ جلد ہی چھٹکارا پا لوں۔ اب اُس کے ساتھ رہنے سے کچھ حاصل نہیں۔ میں نے اُسی کے ایک وکیل دوست سے رابطہ لیا ہے جو جلد ہی مجھے آزاد کرا دے گا۔

یہاں تک پڑھنے کے بعد احسن نے دیکھا جگہ کی کمی کے باعث آخر میں "باقی آئندہ" لکھ دیا گیا ہے۔

کہانی کی یہ پہلی قسط تھی۔ مطلب یہ تھا کہ قارئین بے چینی سے اگلی اشاعت کا انتظار کریں۔ اُس نے سوچا حقیقت سے دور ہے یہ کہانی۔ کہیں ایسا بھی ہوا ہے۔ دفعتہً اُس کی نظریں قریب ہی رکھی ہوئی میز کی جانب اٹھ گئیں جس پر کچھ خطوط رکھے ہوئے تھے۔ وہ پڑھنے میں اتنا منہمک تھا کہ اُسے خبر بھی نہ ہوئی کہ ملازم کب ڈاک رکھ گیا۔ ڈاک میں اخبارات اور رسائل کے علاوہ چند خطوط بھی تھے۔ اُس نے جلدی جلدی سارے خط پڑھ ڈالے۔ اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے ملک کے مختلف حصوں سے ایڈیٹر کے نام موصول ہونے والے اِن خطوط کے مضمون کی یکسانیت پر غور کیا۔ سب کا خلاصہ یہ تھا۔

”براہِ کرم افسانے کی دوسری قسط شائع نہ کر کے احسان فرمائیے۔ حیرت ہے کہ میرے دل کا راز افسانہ نگار پر کیوں کر ظاہر ہو گیا۔ یقین کیجئے اب میں اپنی قسمت پر اعتماد رکھ کر وہی کروں گی جو میرا فرض ہے۔“

دِلّی جو ایک شہر ہے

فکر تونسوی

آہ مرحوم جہاں گرد ———— •

" افواہیں " سُنانے والا جہاں گرد (جسے کچھ لوگ غلط فہمی سے فکر تونسوی بھی کہتے تھے) انتقال کر گیا ہے اور جاتے جاتے فکر تونسوی کو وصیت کر گیا ہے کہ میرے بعد میرے خیالات کی شمع جلائے رکھنا۔ لوگ مرتے ہیں تو اپنے پیچھے کوئی جائداد چھوڑ جاتے ہیں لیکن جہاں گرد مرحوم صرف ایک شمع چھوڑ گیا ہے اور فکر تونسوی کی بدنصیبی یہ ہے کہ اُسے اپنا وارث "دستگیر" کر گیا ہے اب بچارا وارث اپنی شرافتِ نفس کے ہاتھوں مجبور ہے کہ شمع جلائے رکھنے کی اِس "وراثتی مصیبت" کو اپنے سر لے اور "افواہیں" کو " دہلی جو ایک شہر ہے " کے سائن بورڈ میں بدل کر مرحوم سے بدلہ لیتا رہے۔

دہلی کا آواگون ———— •

کہتے ہیں، دہلی کئی بار اجڑی اور کئی بار آباد ہوئی۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ دہلی کو اجڑنے اور آباد ہونے کا پرانا چسکا ہے۔ وہ اُجڑنے کے لئے آباد ہوتی ہے اور آباد ہونے کے لئے اُجڑتی ہے۔ یعنی وہ آواگون کی تھیوری میں یقین رکھتی ہے۔ بار بار جنم لیتی ہے، بار بار مرتی ہے۔ لیکن اِس فرق کے ساتھ کہ بار بار اُسی گھر میں جنم لیتی ہے جہاں سے اُس کی ارتھی نکلی تھی وہی روح' وہی نام' وہی مقام ———— صرف چولا بدل لیتی ہے۔ بلکہ کئی بار تو چولا بھی وہی ہوتا ہے۔ صرف اُسے "ڈرائی کلیننگ" کرا لیتی ہے، اُس کا رنگ بدل دیتی ہے، اُس پر نئے پھول اور نئے بیل بوٹے کاڑھ لیتی ہے۔ شاید اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے یا نئے نادر شاہ کو ترغیب دینے کے لئے کہ دیکھو میں کتنی پُر کشش ہوں آؤ اور میرے حسن کو لوٹ لو۔ میری مانگ اُجاڑ دو کیونکہ میں اُجڑنے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہوں۔ میری بہار میری خزاں ہی کا عکس ہے۔ مجھے اُجاڑ دو، لوٹ لو، مار دو، کیونکہ میری موت ہی سے زندگی کا پھول کھلتا ہے۔

دہلی ———— ایک بیوہ ———— •

آج کی دہلی ایک خوشنما پھول بن کر کھلی ہوئی ہے۔ آج سے اٹھارہ سال پہلے اُس کی سانس اکھڑ گئی تھی۔ جب چند سیاستداں قسم کے غاصبوں نے تقسیم ہند کے نام پر اُس کی مانگ اُجاڑ دی تھی۔ اُس کے پھول مسل ڈالے گئے، اُس کی بہار لوٹ لی گئی۔ اور پھر جب اُس کا حسن نیست و نابود کر دیا گیا تو دہلی کی روح اِس بربادی اور ویرانی پر جھپٹ اُٹھی کیونکہ تخریب ہی اُس کی روح کی غذا تھی۔ موت ہی اُس کی طمانیت تھی۔ مسمار ہونا ہی اُس کا مزاج تھا ———— اور پھر چند برس ہی میں دنیا نے دیکھا کہ دہلی کے ویرانے میں ایک پھول کھل اُٹھا۔ اُس پھول میں ایک نئی کشش تھی، نئی خوشبو اور نیا رنگ تھا۔ اٹھارہ برس پہلے کا کوئی "جلا وطن" آج دہلی میں آئے تو دیکھ کر حیران رہ جائیگا کہ یہ وہ خاتون تو نہیں ہے جو بیوہ ہو گئی تھی۔

لیکن دہلی، جمنا میا کی قسم کھا کر کہے گی "میں وہی خاتون ہوں۔ صرف رنگ رُوپ ذرا نکھر آیا ہے۔ کیونکہ وٹامن سی کا استعمال ذرا زیادہ کرنے لگی ہوں":

"مگر اے رُوپ متی ڈرتا ہوں، کہیں تجھے پھر نظر نہ لگ جائے"

"چشمِ ما روشن دِل ماشاد"

دہلی ———— ایک اٹھارہ سالہ دوشیزہ ———— •

آج کی دہلی ایک ایسی اٹھارہ سالہ دوشیزہ کی طرح ہے جس پر جوانی ٹوٹ ٹوٹ کر آئی ہے اِس سے آنکھ ملانے کے لئے سورج دیوتا کی سی آنکھ چاہئے اور مہرشی وشوامتر کا سا تقدس ورنہ ایمان بھرشٹ ہونے میں ایک سیکنڈ نہیں لگتا۔ ایک بار جو دہلی آ گیا وہ اِس کی زُلف کے جال سے نکل نہ سکا اور جو ابھی تک دہلی نہیں آیا وہ دُور بیٹھا اُس کے فراق میں آہیں بھر رہا ہے اور کون جانتا ہے کہ وہ ایک آہ ایسی لمبی بھرے کہ خود بخود کھنچ کر دہلی تک آ جائے اور دہلی ریلوے اسٹیشن پہ پہنچ کر یہ پوچھے "کیوں صاحب! کیا دہلی یہی ہے؟"

اور اُسے جواب ملے "معاف کیجئے، مجھے فرصت نہیں، کسی اور سے پوچھ لیجئے۔"

کسان سے سمگلر تک ———— •

اگر آپ ابھی تک دہلی نہیں آئے ہیں تو کسی نہ کسی بہانے جلد ہی آ جائیں گے۔ کیونکہ دہلی آنے کے کئی بہانے ہیں۔ آپ کسی کسان ڈیلی گیشن میں شامل ہو کر آ جائیں گے تاکہ پارلیمنٹ کے سامنے

اگر خدا ہو کریں۔ جس کے مدد گر دعا اور پر دفعہ ۱۴۴ لگی رہتی ہے۔ منڈی پرائلنس کی کوٹھی کے باہر بھوک ہڑتال کرنے کے لئے آجائیں گے، گاؤں میں بھوکوں مر کر دہلی میں نوکری کرنے کے لئے آجائیں گے یا بھیک مانگنے کے لئے آجائیں گے۔ کیونکہ یہاں کے گداگر بھکاریوں کے کشکول میں پانچ دس پیسے کے سکے ڈال کر احساس گناہ کم کرنے کے بہت شوقین ہیں اور اگر آپ کے پاس دولت زیادہ ہے تو آپ دہلی کے اشوکا ہوٹل میں چاسنے پینے کے لئے آجائیں گے۔ جہاں پانچ روپے فی کپ چائے ملتی ہے اور جہاں کے بیرے مغل شہزادے معلوم ہوتے ہیں — اور اگر کوئی بہانہ نہ ملیگا تو آپ کوئی نہ کوئی چیز سمگل کر کے دہلی لے آئیں گے۔ گھڑیاں، سونا، اناج، کپڑے، لڑکیاں، عورتیں، کیونکہ دہلی سمگلروں کی بہت چھپتی منڈی ہے۔ جہاں گھڑی سے لے کر لڑکی تک ہر چیز بغیر سیلز ٹیکس کے منہ مانگے داموں بک جاتی ہے۔

غرض آپ کسی بھی بہانے سے آئیں گے، جلد یا بدیر دہلی ضرور آئیں گے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ جائیں گے۔ شادی کریں گے، بچے پیدا کریں گے اور پھر لکھ پتی ہو جائیں گے یا ککھ پتی۔ دونوں حالتوں میں دہلی آپ کو برداشت کرے گی۔

اجنبی باشندوں کی بستی

دہلی میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں اور ہر راستے سے ہر روز ہزاروں لوگ دہلی پر حملہ کرنے کے لئے داخل ہوتے ہیں اور پھر دہلی کے کوچہ و بازار میں یوں پھیل جاتے ہیں کہ وہ بھی دہلی ہی کے باشندے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ایک اجنبی حملہ آور اور دہلی کے مستقل باشندے میں تمیز کرنا انتہائی مشکل ہے۔ آپ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ایک پہاڑی چھوکرا جو دہلی کے ایک ہوٹل میں برتن مانجھ رہا ہے آٹھ سال سے دہلی میں مقیم ہے یا آج صبح ہی لاریوں کے اڈے پر اترا ہے۔ یا کافی ہاؤس میں جو سیاہ رنگ کا مدراسی جنٹلمین سیاہ رنگ کا سوٹ پہنے سیاہ رنگ کی کافی پی رہا ہے — سنٹرل سیکرٹریٹ میں گذشتہ دس سال سے کلرکی کر رہا ہے یا آج ہی مدراس میل پر سوار ہو کر دہلی میں کلرکی کرنے آیا ہے — اور یا اجمیری گیٹ سے جس تانگہ بان کے تانگے پر آپ سوار ہوتے ہیں وہ ۱۹۴۷ء ہی میں یہاں تانگہ بانی کرنے آ گیا تھا یا سہارن پور میں اس کا چینی کا ڈپو تھا جو کسی وجہ سے چل نہ سکا اور یہ دہلی میں تانگہ چلانے کے لئے ایک ہی ہفتہ پہلے آیا ہے۔

دہلی کے باشندوں اور باہر سے آنے والوں میں امتیاز کرنا کیوں مشکل ہے؟ اس لئے کہ موجودہ دہلی کا نہ کوئی اپنا کلچر ہے نہ لباس ہے نہ زبان جس سے یہ پتہ چل سکے کہ یہ دہلی والا ہے اور یہ کلکتے والا اور یہ لکھنؤ والا۔ دہلی کی کسی سڑک پر اگر دو آدمی چل رہے ہوں تو آپ یہ جان کر حیران ہو جائیں گے، کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے۔ ایک نے کوٹ پتلون پہن رکھا ہے تو دوسرا دھوتی کرتے میں ملبوس ہے۔ ایک نے کوٹ پتلون کے اوپر گاندھی ٹوپی پہنی ہوئی ہے تو دوسرے نے کھدر کی اچکن اور پاجامے کے اوپر ہیٹ لگا رکھی ہے۔ ایک ابھی ابھی ہوٹل سے مچھلی چاول کھا کر نکلا ہے تو دوسرے نے اشنان کر کے پوری ترکاری کھائی ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ دونوں ہی اپنے آپ کو دہلی کے باشندے کہتے ہیں۔

غرض دہلی میں ہر شخص دہلی کا باشندہ ہے اور ہر شخص اجنبی ہے۔ یہ باشندہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں لیکن ہر اجنبی اپنے آپ کو دہلی کا باشندہ کہتا ہے کیونکہ دہلی کا کلچر اجنبی ہے، لباس اور زبان اجنبی ہے۔ دہلی کے کیپیٹل کے گھیرے میں یہی اجنبیت پھیلی ہوئی ہے۔ اجنبیت ہی دہلی کا کلچر ہے، لباس اور زبان ہے۔ اور یہ کلچر، لباس اور زبان دہلی میں آنے والے ہر راستے سے ہر روز داخل ہوتی رہتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد دہلی نے اپنا کلچر کھو دیا ہے اور اجنبیت پائی ہے۔

حدود اربعہ کہاں گیا؟

دہلی کا حدود اربعہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ ریاضی اور جغرافیہ کا کوئی فارمولا دہلی پر لاگو نہیں ہوتا۔ دہلی ریاضی اور جغرافیہ کو پس پشت ڈال کر آگے نکل گئی ہے۔ کہتے ہیں کچھ قدرتی حدود ہوتی ہیں، جیسے دریا، پہاڑ، نہر جن سے کسی مقام کا حدود اربعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ گو دہلی میں دریا بھی ہے، پہاڑ بھی اور نہر بھی۔ لیکن دہلی نے قدرت کی لگائی ہوئی ان حدبندیوں کی پرواہ نہیں کی اور تیز رفتار سیلاب کی طرح اُن کے اوپر سے دندناتی ہوئی گذر گئی۔ آج کل یہ دریا، پہاڑ اور نہریں دہلی شہر کے اندر آ گئی ہیں۔ یہ دہلی کو قید نہیں کر سکیں بلکہ دہلی نے انہیں قید کر لیا ہے۔ مثلاً بیچاری جمنا دہلی شہر کے اندر یوں بہہ رہی ہے جیسے پولیس کے گھیرے میں کوئی سہما ہوا مجرم۔ دہلی کے کئی پہاڑ جو کبھی اپنے سر اٹھائے کھڑے رہتے تھے، اب دہلی کے باشندے اُن پر سے موٹریں، لاریاں اور سائیکلیں گذار کر یوں نے جاتے ہیں جیسے یہ پہاڑ نہ ہوں بلکہ اُن کے زر خرید غلام ہوں۔ سارے پہاڑ دہلی کے چھوٹے چھوٹے محلے بن گئے ہیں اور دہلی والوں نے ان کا نام پہاڑ گنج، پہاڑی دھیرج، بھوجلہ پہاڑی، آنند پربت رکھ چھوڑا ہے اور یہ پہاڑ قدرتی پہاڑوں کی بجائے پہاڑی چھوکرے معلوم ہوتے ہیں جو برتن مانجھنے کے لئے دہلی میں آ گئے ہیں۔

دراصل جب سے دہلی آزاد ہندوستان کا دارالخلافہ بنی ہے۔ آزاد اور بے باک ہو گئی ہے اور کسی الھڑ دوشیزہ کی طرح چاروں کھونٹ اٹھکھیلیاں کرتی پھر رہی ہے۔ اس لئے اس کی حدود متعین کرنا قریب قریب ناممکن ہے ہر سال نہیں بلکہ ہر ہفتے اس کی حدود بدل جاتی ہیں۔ اگر ایک ہفتہ پہلے اس کی مغربی حد پٹیل نگر نامی کالونی میں تھی۔ تو ہفتہ کے ختم ہونے سے ایک گھنٹے پہلے پتہ چلتا ہے کہ اب پٹیل نگر سے آگے ایک اور کالونی نمودار ہو گئی ہے۔ جو اب دہلی کی مغربی حد کہلاتی ہے۔ مشرقی حد میں پہلے جمنا ندی تھی۔ اس کے بعد شاہدرہ بن گئی۔ اور اب شاہدرہ والے سرد آہ بھر کر کہتے ہیں کہ اب ہم مشرقی حد نہیں رہے کیونکہ ستاروں سے آگے ایک اور کالونی کا جہاں بس گیا ہے۔

خوشنما دہلی کی صدیوں پرانی تہذیب اور فنی لوثتی رہتی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دہلی میں شیطان گھسا ہے جو اپنی ناخنوں کو چاروں طرف پھیلاتا چلا جا رہا ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ ایک دن ہم یہ خبر سنیں کہ دہلی کی ایک سڑک ہے اور دوسری سڑک۔ ممکن ہے یہ نقشے سے ہندوستان کا نام ایک غائب ہو جائے اور دہلی نام کا ملک نمودار ہو جائے کیونکہ ہندوستان سمٹ رہا ہے اور دہلی بڑھ رہی ہے۔ دہلی ایک جسم ہے، جس میں ہندوستان کی رُوح داخل ہوتی جا رہی ہے۔ جسم اور روح کا یہ وصال ٹریجڈی ہے یا کامیڈی۔ اس کا فیصلہ ہم آنے والے مؤرخ پر چھوڑتے ہیں۔

ایک نہیں پانچ دہلیاں ———— •

بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ دہلی صرف ایک ہے۔ انہیں یہ غلط فہمی دور کر لینی چاہئے کیونکہ دہلیاں تو پانچ ہیں۔ پرانی دہلی، نئی دہلی، شرنارتھی دہلی، چھاؤنی دہلی، دیہاتی دہلی اور ان میں سے ہر دہلی دوسری دہلی سے الگ مزاج رکھتی ہے۔ ہر دہلی دوسری دہلی کی سوتن معلوم ہوتی ہے۔ پرانی دہلی اپنے آپ کو خاندان کی اُس بڑی بی کی طرح سمجھتی ہے جس کی کمر میں چابیوں کا گچھا لٹکتا رہتا ہے اور جو اپنے سامنے خاندان کے سارے افراد کو ہیچ سمجھتی ہے اور منہ میں پان کی گلوری دبائے "پدرم سلطان بود" کے نعرے لگاتی رہتی ہے ———— اور نئی دہلی خاندان کی وہ ماڈرن لڑکی ہے جو چابیوں کے گچھے کی بجائے کلائی میں پرس جھلاتی ہوئی اپنے آپ کو "یوروپ ریٹرن" کہتی ہے منہ میں "چیونگ گم" دبائے اپنے آپ کو انڈیا کی "ہر ہائنس" سمجھتی ہے اور پرانی دہلی سے اُڑ کر آئی ہوئی کسی مکھی کو ناک پر نہیں بیٹھنے دیتی ———— اور "شرنارتھی دہلی" اپنے آپ کو وہ طرار حسینہ سمجھتی ہے جو اپنی عشوہ طرازیوں کے ساتھ یہاں آئی اور دلِ عشاق پر حملہ کر کے فاتح بن گئی کبھی منہ میں پان دبا لیتی ہے، کبھی چیونگ گم اور کبھی گنڈیریاں۔ اپنے آپ کو دہلی کی ناک سمجھتی ہے۔ مگر سرکار اُس پر ہمیشہ کھسیاں بٹھاتی رہتی ہے۔ چھاؤنی دہلی کی پوزیشن اُس جلاوطن ملکہ کی سی ہے جو اب بھی اپنے آپ کو تخت و تاج کا وارث سمجھتی ہے۔ اور اپنی رعایا سے دور ہی رہنے میں اپنی بڑائی سمجھتی ہے اور دیہاتی دہلی اُس ... ... ہے جس کا بیاہ زبردستی ایک ایسے شخص سے کر دیا گیا ہو جس کے نام کا وہ صحیح تلفظ بھی نہیں جانتی۔ لیکن کمر نہٹ کے "پتی ورتا دھرم" نبھائے جا رہی ہو۔

ان پانچوں دہلیوں میں صرف ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہم حاکم ہیں۔ ہمارے ہی احکام کے سامنے سارا ہندوستان سر جھکاتا ہے۔ ہم اُس دِلّی کے مالک ہیں جو ہمالیہ سے راس کماری تک راج کرتی ہے۔ دہلی کا ہر باشندہ اپنے آپ کو راجکمار محسوس کرتا ہے۔ اپنی رگوں میں شاہی خون دوڑتا ہوا محسوس کرتا ہے چاہے اُسے آسٹریلیا کا گندم ہی کھانے کو ملے۔ ان پانچوں دہلیوں کے اندر کیا کچھ ہوتا رہتا ہے یہ آئندہ صفحے بتاؤں گا۔ اہلِ دہلی کے ایسے ایسے راز فاش کروں گا جو خود اہلِ دہلی بھی نہیں جانتے۔

محترم لئیق اخترؔ فیض آبادی کے اس خط کو جس کے ایک ایک لفظ میں محبت اور خلوص کے دریا موجزن ہیں، مدیر "بیسویں صدی" نے نمناک آنکھوں سے پڑھا اور بے ساختہ زبان سے نکلا ؎

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

دل کے پرانے زخم تازہ ہو گئے۔ اُن تمام دوستوں، عزیزوں اور محسنوں کے چہرے آنکھوں میں گھوم گئے، جن کی یادیں اب زندگی کا سرمایہ ہے۔ ———— خوشتر گرامی

ادب پرور اور ادیب نواز!

یعنی

حضرت خوشتر گرامی!

"بیسویں صدی" زندہ باد ———— سالنامہ دیکھا۔ فن کی تعریف کروں کہ فنکار کی؟ "بیسویں صدی" کی مدح کروں کہ خوشتر گرامی کی؟ ———— دونوں لازم و ملزوم ہیں ———— بزبانِ فارسی تعریف کچھ یُوں ہوگی ———— کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست ———— لیکن میری پیاری زبان اس سالنامہ کی مدح یُوں کرتی ہے ؎

زِ فرق تا قدم تمام جسم جسم نازنیں
لطیف جگمگاہٹوں کے کارواں لئے ہوئے (فراقؔ)

نہ میں شاعر ہوں، نہ صورت گر ہوں اور نہ افسانہ نویس۔ اِس لئے کوئی شے میرے اعصاب پر سوار نہیں ہے۔ حق یہ ہے کہ سب ہی افسانے لاجواب اور بے نظیر ہیں۔ لیکن "منہ کا بوجھ"؟ الامان و الحفیظ ———— یہ حیدرآبادی خاتون قاری کے ذہن کی انگلی پکڑ کر کتنی سُبک خرامی کے ساتھ اپنے افسانے کے گلشن کی سیر کراتی ہے ———— اہلِ قلم کے محبوب مشغلے کی ایک یادگار چیز ہے ———— تقسیمِ ہند کے بعد جب اُردو کی کشتی منجدھار میں گھِر چکی تھی۔ ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں ایک سے ایک اُردو دشمن پڑا ہوا تھا اُسی دارالسلطنت کے دریاگنج میں ایک دریادل شخص ———— الطاف شہدی کا بھائی، عندلیب شادانی کا محسن، کرشن چندر کا رفیق، سلام مچھلی شہری کا یار، راجہ مہدی علی خاں کا مسلمان دوست، ادیبوں کا مربی جو نام سے ہندو ہے نہ مسلمان، سکھ ہے نہ عیسائی، یہودی ہے نہ پارسی ———— آدمیت جس کا دین اور انسانیت جس کا مذہب ———— اُٹھا۔ اور اُردو کی اِس ڈوبتی کشتی کو بچا لایا ———— "بیسویں صدی" ———— اور ———— اُردو ———— یہ دونوں خوشتر گرامی کا وطن ہیں ———— کلمہ ہیں ——— زندگی ہیں ———— مذہب ہیں ———— خدا آپ کو زندہ رکھے!

لئیق اختر ———— بہرائچ

خاوند بیوی کا رہنما

پریم شاستر — کام شاستر — گربھ شاستر

اِن کتابوں میں ایسے ایسے راز اور نکتے بیان کئے گئے ہیں جن کا جاننا نوجوان جوڑوں کے لئے بہت ضروری ہے۔ ایسے ایسے کار آمد نکتے ہیں جو اکثر تجربہ کار سے تجربہ کار خاوندوں کو بھی معلوم نہیں اور جنہیں جاننے کے بعد آپ کو شادی کی اصلی مسرتیں حاصل ہوں گی۔ گھر کو بہشت بنانے کی تدابیر تفصیل سے لکھدی گئی ہیں۔ خاوند اور بیوی کے لئے اِن کتب کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنی ایک انسان کے لئے ہوا اور غذا ضروری ہے۔

اِن کتب کی خوبیوں کا اندازہ آپ اِس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان جیسے غریب ملک میں اِن کتب کی چھ لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز کسی خاص خوبی کے بغیر اتنی بھاری تعداد میں فروخت نہیں ہو سکتی

پریم شاستر باتصویر ——— قیمت اُردو تین روپے ہندی تین روپے
کام شاستر باتصویر ——— قیمت اُردو تین روپے ہندی تین روپے
گربھ شاستر باتصویر ——— قیمت اُردو تین روپے ہندی تین روپے

صحت و زندگی

اِس مفید کتاب کا مطالعہ آپ کے لئے اِتنا مفید ثابت ہوگا کہ آپ اِسے خود پڑھنے کے بعد اپنے اُن دوستوں اور عزیزوں کو پڑھنے کی ہدایت کریں گے جن کی صحت آپ کو عزیز ہے۔ انسانی جسم کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور پوشیدہ سے پوشیدہ امراض کو بلا دوا دُور کرنے کے ایسے آسان طریقے، تدابیر اور علاج درج کئے گئے ہیں جن پر عمل کرنے سے آپ بہت سی بیماریوں سے عمر بھر کے لئے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ غذا، صحت و شباب اور تندرستی کے متعلق تمام باتیں تفصیل سے لکھی گئی ہیں۔ جن کا جاننا ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ قیمت صرف تین روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

ہر ایک کو چاہیئے

جی ہاں ڈاکٹر ہو یا مسافر شکاری ہو یا گھر والی ہر ایک کو جیپ فلیش لائٹ کی ضرورت پڑتی ہے

GEEP









جیپ فلیش لائٹ آپ کو تیز روشنی دیتی ہے۔ اعلیٰ قسم کے پیتل اور چمکدار کرومیم سے بنائی گئی یہ فلیش لائٹ چھ مختلف سائزوں میں ملتی ہے۔

اپنا جیپ آج ہی خرید لیجئے

جیپ فلیش لائٹ انڈسٹریز لمیٹڈ
۲۸ ۔ ساؤتھ روڈ ۔ الہ آباد ۔ ۱

SHERWANI ENTERPRISE

STERLING-GF-138A

ادبی لطائف

شکر پارے

شمیم حنفی۔ ایم اے

معرفت مکتبہ شاہکار ۵/۱۴۳ اسپول لائنز سلطان پور (یو۔ پی)

۲۱ر دسمبر ۱۹۶۳ء

برادرم! تسلیم

... لیجئے! "شکر پاروں" کا ایک خوان حاضرِ خدمت ہے۔ پچھلی قسطوں کی پسندیدگی کے سلسلے میں خطوط کا تانتا تو نہیں بندھا البتہ مختلف خواتین و حضرات کے تقریباً دو درجن خطوط ملے ہیں جن میں یہ اصرار کیا گیا ہے کہ میں اس سلسلے کو برابر جاری رکھوں۔ لیکن آپ خود سوچیے! میری اپنی ادبی و غیر ادبی معروفیتوں سے قطع نظر آج کل بازارِ جیات میں تبسم کے شکر پاروں کی کتنی قلت ہے۔ مختلف مسائل اور قلاقچیں مار مار کر بھاگتی ہوئی قیمتوں نے کسے اتنی مہلت دے رکھی ہے کہ شکر پاروں کے لئے شکر ڈھونڈتا پھرے۔ ایک صاحب جو ذرا ترقی پسند واقع ہوئی ہیں لکھتی ہیں کہ "اب آپ نمک پارے بنانا شروع کیجئے۔ شکر پر کنٹرول ہو چکا ہے۔" میں بھی ان کے مشورے پر سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں آپ بھی فرمائیے آپ کی کیا رائے ہے؟ ـــــ "سالنامہ" دیکھنے سے پہلے سوچا تھا کہ اس کی تعریف میں آپ سے یہ کہوں گا، وہ کہوں گا۔ لیکن اس پر نظر پڑنے کے بعد یہ عالم ہے کہ ـــــ "دل کی دھڑکن کا برا ہو مجھے کہنے نہ دیا"ـــــ اس کی تعریف ہر حلقے میں ہو رہی ہے اس لئے میں اگر خاموش ہی رہوں تو بہتر ہے...

آپ کا ـــــ شمیم حنفی

بیادِ مجاز

الحفیظ والاماں

کسی مشاعرے میں حضرت ابو الاثر حفیظ جالندھری اپنا کلام سنا رہے تھے۔

ان کے قریب ہی ڈائس پر حضرت گوپی ناتھ امن لکھنوی بھی تشریف فرما تھے۔

مجاز مرحوم نے دفعتاً ان دونوں حضرات پر ایک نظر ڈالی اور بڑے رازدارانہ انداز میں مضطر لکھنوی سے بولے ـــــ "وہ پاکستان کے 'الحفیظ' ہیں اور یہ ہندوستان کے 'الاماں'!"

قلعی گر

اُن زمانے میں مجاز بے روزگار تھے۔

اُن کے کسی دوست نے ایرانی سفارت خانے میں کسی جگہ کے لئے مجاز کے سلسلے میں ایرانی سفیر سے باتیں کیں اور مجاز کو تاکید کی کہ وہ فلاں وقت خود بھی ایرانی سفیر کی رہائش گاہ پر جا کر اُن سے مل لیں۔

وقتِ مقررہ پر مجاز وہاں پہنچے۔ اتفاق سے اُنھیں دنوں ایرانی سفیر کو کسی ماہرِ فن باورچی کی بھی ضرورت تھی اور سفیرِ محترم کے کسی ہندوستانی دوست نے ایک نئے باورچی کو ٹھیک اُسی وقت اُن کی رہائش گاہ پر بھیجنے کی اطلاع دی تھی۔

سفیر کے سکریٹری کے علم میں یہ دونوں اطلاعات تھیں کہ فلاں وقت کوئی مجاز صاحب اور ایک باورچی آنے والا ہے چنانچہ جیسے ہی اُن کی نظر مجاز پر پڑی اُنھوں نے مجاز کے کھدر کے لباس کا متکبرانہ انداز میں جائزہ لیا اور تعارف سے پہلے ہی پوچھ بیٹھے۔

"آپ ہر قسم کا کھانا پکا سکتے ہیں؟"

ایک لمحے کے لئے مجاز کی پیشانی پر کچھ سلوٹیں اُبھریں پھر اُنھوں نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔

"میں صرف اوسط قلعی کر سکتا ہوں؟"

مقابلے کا شاعر

[illegible] ایک مرتبہ [illegible] آپس میں [illegible]

[illegible] ہندوستان کے شاعروں [illegible]

تو مجاز، جوش صاحب اور فراق صاحب کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے [illegible]

[illegible] حضرت

[illegible] تعلق

[illegible] کیا جاتا ہے۔

دفعتاً اُن کے ذہن میں ایک سوال اُبھرا اور اُنہوں نے دونوں حضرات کی طرف رُخ کر کے

سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"کیوں جی! ہندوستان میں آج کل جوش صاحب کے مقابلے کا کون کون شاعر ہے؟"

جوش صاحب اور فراق کچھ سوچنے لگے اور مجاز نے فوراً جواب دیا۔

"[illegible]!"

ترجمہ

دورانِ گفتگو [illegible]

ایک بار مجاز مرحوم نے نہایت سنجیدگی سے [illegible] کو مخاطب کر کے کہا۔

"میں سوچتا ہوں تمہاری شاعری کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کر ڈالوں۔"

مگر [illegible] نے [illegible] سے سوال کیا۔

"تو کیا [illegible]" مجاز نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "پھر انہیں اردو میں منتقل

کر دو گے؟"

نئی نظم

کافی عرصے کے بعد جب [illegible] ملاقات ہونے پر اُن کے ایک بے تکلف دوست

نے دریافت کیا۔

"مجاز! ادھر تم نے کوئی نئی نظم نہیں کہی؟"

اور مجاز نے سر جھکا کر بہت دھیرے سے جواب دیا۔

"نئی نظم کیا کہوں، جو پرانی ہیں وہی لوگوں کو یاد نہیں!"

شکریہ

مجاز مرحوم اور جذبی صاحب ایک ساتھ کسی دوست کے ہاں پہنچے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] لے۔

"مجاز صاحب! آپ کس [illegible] ہیں؟"

([illegible] عرض کر دوں [illegible])

[illegible] جگر صاحب [illegible]

اس حرکت کا سوال سنتے ہی مجاز نے [illegible] جواب دیا

"یہ وہ شکر ہے جو آپ کے ہاں [illegible]؟"

([illegible] ایک [illegible] صاحب [illegible]

شاعر [illegible]

[illegible])

نقشِ فریادی

کسی مشاعرے میں مجاز مرحوم اپنا کلام سنا رہے تھے۔

دفعتاً بجلی چلی گئی [illegible]

[illegible]۔

مجاز نے [illegible] غالب کا یہ مصرعہ پڑھا:

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

صاحبو! [illegible]

کیا ہے جنہوں نے [illegible]

دوسروں [illegible]

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے

سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

کیا [illegible] (Tagore) کے ان الفاظ کی [illegible]؟

The moon has all her light in the sky; her dark spots to herself!

(چاند کی ساری روشنی آسمان کی [illegible]

صرف اُس کا [illegible])

اس سوال کا جواب [illegible]؟

چراغِ آرزو

نعیم کوثر آکولوی

بازار پیٹھ، آکولہ، ضلع آکولہ (مہاراشٹر)

محترم مدیر صاحب! تسلیمات

ایک کہانی "چراغِ آرزو" بھیج رہا ہوں۔ آپ کی بزم میں شریک ہو رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ میری اِس کوشش کو سراہیں گے۔ افسانہ کیسا ہے، اس کا فیصلہ تو آپ ہی کریں گے۔ اس لئے کہ آپ نقاد ہیں...

نیازمند ـــــ نعیم کوثر

کھڑکیوں پر شبنم پڑنے لگی ہوتی تھی۔ شکیل نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو ایک نظر باہر کا منظر دیکھا۔ وہ حسین و دلکش ماحول ــــــ قدرت کا حسن بکھرا ہوا تھا۔ چاندنی کا مدھم سا سماں تھا۔ فضا خوشبودار پھولوں سے بھری کیاریاں۔ پھولوں سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے ہوا کے نرم و نازک جھونکے۔ کلیاں کھلنے کے لیے بے چین۔ شبنم کے قطرے پھولوں پر جیسے گلاب پاشی کر رہی تھی۔ اچانک شکیل کی نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی نگاہیں اُن شفاف بادلوں کے ٹکڑوں میں کچھ تلاش کر رہی ہوں۔ آنکھوں میں وہ ستارہ کہ جس کا نام جیسے نسرین نہ جانے کتنی بار کہہ چکی تھی ایک دم ٹوٹ گیا۔ رات اپنی پہلی منزل سے گزر کر دوسری منزل میں داخل ہو چکی تھی۔ نسرین نے ایک بار پھر کمرے میں جھانک کر دیکھا اور شکیل کو اسی طرح کھویا ہوا پاکر کمرے میں داخل ہوئی۔ قریب آکر کچھ کہنا چاہا لیکن کچھ رک گئی۔ اُس کا ہاتھ اُٹھا اور دھیرے سے شکیل کے کاندھے پر رک گیا۔ ہوا کا ایک جھونکا کھڑکی سے اندر آیا اور میز پر رکھے ہوئے کاغذات اپنے ساتھ اڑاتا چلا گیا۔ شکیل چونک اٹھا۔ اُس کی نگاہیں نسرین کے معصوم چہرے پر جم گئیں۔ نسرین نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا "یہ کیا آپ پھر اسی طرح گم سم کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ اپنی صحت کا خیال کیجیے ورنہ ... جب دیکھو کسی گہری سوچ میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔" شکیل مسکرا دیا۔ اُس کی نگاہوں میں بے پناہ محبت تھی۔ وہ عجیب نظروں سے نسرین کو دیکھ رہا تھا۔ نسرین نے شرما کر سر جھکا لیا۔ شکیل پھر جہاں تھا وہیں آگیا۔ اُس کی نظریں اسی طرح جم گئیں جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ نسرین نے بکھرے ہوئے کاغذات میز پر رکھ دیئے اور شکیل کی طرف مسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور سیاہ پلکوں پر موتی جھلملانے لگے۔ شکیل نے چونک کر دیکھا نسرین جاچکی تھی۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اور پھر شکیل کا قلم کاغذ پر تھرکنے لگا۔ شاید کوئی افسانہ قلمبند کرنا چاہتا ہو۔ وہ دیر تک لکھتا رہا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ شکیل نے انگڑائی لی اور وہیں میز پر سر رکھ کے آنکھیں بند کرلیں۔ نیند نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

شکیل اور نسرین دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے بے حد محبت تھی۔ کالج کے زمانے سے وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے۔ شکیل نسرین کے حسن کا دلدادہ تھا اور نسرین شکیل کے افسانوں کی۔ نسرین کو شکیل کے افسانے بے حد پسند تھے۔ وہ اُس کے افسانوں میں کھو سی جاتی۔ جب کبھی شکیل کا کوئی افسانہ کہیں چھپ کر شائع ہوتا، نسرین اُسے نہ جانے کتنی بار پڑھتی۔ اُسے شکیل کے افسانوں میں عجیب لطف محسوس ہوتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ خود کو اپنے آپ کو شکیل کے افسانوں کا ایک اہم کردار تصور کرنے لگی تھی۔ شکیل اُس کے سپنوں کا راجہ تھا۔ اُس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں شکیل ہی شکیل بسا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اُسی کے تصور میں کھوئی رہتی۔ شکیل یہ ساری باتیں جانتا تھا۔

ایک دن شکیل اپنے کالج کے احاطے میں ایک درخت سے ٹیک لگائے کچھ پڑھ رہا تھا کہ نسرین اپنی سہیلی مدرا کے ساتھ وہاں سے گزری۔ شکیل پر

تھرتھرانے لگے۔ اس کے قدم رک گئے۔ عذرا نے اس کی طرف دیکھا اور پھر شکیل کی طرف۔ وہ مسکرانے لگی۔ شکیل اسی طرح اپنی کتاب میں گم بیٹھا تھا۔ عذرا نے شوخی سے مسکراتے ہوئے شکیل کی طرف دیکھا اور کہہ اٹھی: "اُف! اتنی محویت! خدا کی پناہ!" نسرین نے گھبرا کر عذرا کی طرف دیکھا۔ عذرا مسکرا رہی تھی۔ شکیل نے کتاب بند کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ نسرین پر جیسے کپکپی طاری ہو گئی۔ شکیل قریب آیا تو اس کے ہاتھ سے کتابیں چھوٹ گئیں۔ شکیل نے انھیں احتیاط سے اٹھا کر نسرین کے ہاتھوں میں دے دیں اور مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ عذرا نے نسرین کی طرف دیکھا اور کہا: "اری پگلی! یہ تجھے کیا ہو گیا۔ اتنا اچھا موقع ہاتھ سے جانے دیا۔" نسرین کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی۔

اور اس کے بعد وہ رفتہ رفتہ ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے گئے۔ نسرین کی دلی آرزو پوری ہو گئی۔ شکیل نے چپکے سے اس کی زندگی میں قدم رکھا اور آگے

♦ ━━━━━ ♦ ━━━━━ ♦ ━━━━━ ♦ ━━━━━ ♦ ━━━━━ ♦

- گناہ کا آغاز کڑی کے تار کی مانند نازک ہوتا ہے، لیکن انجام جہاز کے رستے کی مانند مضبوط اور ناقابلِ شکست ہوتا ہے۔ (عقبہ بن یوسف)
- انسانوں سے محبت کرنا ہی دراصل خدا سے محبت کرنا ہے اور انسانوں کی خدمت ہی دراصل خدا کی خدمت ہے۔ (حضرت ابوذر غفاریؓ)
- قناعت ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- دوسروں کے مال کا لالچ نہ کرنا بھی داخلِ سخاوت ہے۔ (حضرت امام جعفر صادقؒ)
- عقل جس جگہ کامل ہو گی، حرص وہاں ناقص ہو گا۔ (افلاطون)
- جو آدمی جتنا زیادہ بولتا ہے اتنا ہی کم عقل ہوتا ہے۔ (خلیل جبران)
- دانا وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ سنے۔ (اقلیدس)

♦ ━━━━━ ♦ ━━━━━ ♦ ━━━━━ ♦ ━━━━━ ♦ ━━━━━ ♦

بڑھتا گیا۔ نسرین جھوم اٹھی۔ دل میں مسرت کے نغمے پھوٹنے لگے۔ دل کی بند کلیاں کھل گئیں اور نسرین ایک نئی لے، نئی ترنگ لئے ایک انوکھا نغمہ بن گئی۔ وہ اپنے دل میں عجیب سی گدگدی محسوس کرتی۔ ایک عجیب سا درد، ایک عجیب سی ٹیس اس کے سینے میں ہر وقت رقصاں رہتی۔ اس کے گلابی رخساروں پر ہر وقت مسکراہٹ رقص کرتی۔ شکیل نے ساز کو چھیڑ دیا۔ نغمے خود بخود بکھرنے لگے۔ نسرین راتوں کو عجیب عجیب سپنے دیکھنے لگی۔ اس کے سپنوں کا راجہ شکیل مسکراتا آتا ــــ نسرین اس کی باہنوں میں جھول جاتی اور کہتی: "شکیل! اگر تم میری زندگی میں نہ آئے ہوتے تو میں ان حسین نظاروں سے محروم رہ جاتی۔" اور شکیل کہتا: "نسرین! ابھی یہ نظارے بے کیف ہیں، بے جان ہیں۔ ان میں تو اسی وقت جان آئے گی جب تم میری بن جاؤ گی۔ اس وقت یہ کلیاں اپنا گھونگھٹ الٹ دیں گی، یہ پھول مسکرانے لگیں گے۔" اور پھر سپنے بکھر جاتے۔

نسرین سوچنے لگتی، کیسے کے سے سپنے ہوتے ہیں۔ کیا یہ سپنے کبھی سچ بھی ہو سکیں گے یا نہیں۔ اور اگر کبھی شکیل نے دغا کیا تو؟ لیکن دل فوراً جواب دیتا: "شکیل تمہارا ہے! تمہاری محبت میں پاکیزگی ہے۔ سچی لگن ہے۔ پھر تم سے شکیل کو کون چھین سکتا ہے۔" اور نسرین کو ایک اطمینان سا ہو جاتا۔

ـــــــــــــــــ ✿ ـــــــــــــــــ

دن اسی طرح گزرتے گئے اور ... اور ایک دن نسرین کا برسوں کا سپنا پورا ہو گیا۔ شکیل نے نسرین سے شادی کر لی۔ نسرین نے شکیل کی شریکِ حیات بن کر اس کی زندگی میں قدم رکھا۔ شکیل کے افسانوں نے ایک نیا موڑ اختیار کیا۔ اب اس کے افسانوں میں مسکراہٹیں ہوتیں، قہقہے ہوتے۔ ہر افسانے کا ایک نیا انداز ہوتا ــــ دونوں کی زندگی ایک مسکراہٹ بن گئی ــــ ہنستے ہنستے دن گزرتے گئے۔

اور پھر اچانک حالات نے رُخ بدلا۔ نسرین کی مسکراہٹیں نہ جانے کہاں کھو گئیں۔ اک ذرا سی بات افسانہ بن گئی ــــ ایک روز شکیل کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میز پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ اسی وقت نسرین کمرے میں داخل ہوئی۔ شکیل کو اس حالت میں پا کر حیران رہ گئی۔ وہ شکیل کے قریب آئی اور اسے جھنجھوڑ کر کہنے لگی: "آخر آپ کو ہوا کیا ہے۔ میں کچھ دنوں سے دیکھ رہی ہوں آپ مجھ سے کچھ کھنچے کھنچے سے رہنے لگے ہیں اور اپنی طرف سے بھی بے پروا نظر آتے ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو ..." کہتے کہتے نسرین خاموش ہو گئی۔ شکیل نے اس کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور وہ سہم سی گئی۔ شکیل نے اس کی طرف اسی طرح دیکھتے ہوئے کہا: "تمھیں ایسی باتیں کرنے کو ہمیشہ ایسا ہی وقت ملتا ہے جب میں کوئی کہانی یا افسانہ لکھتا ہوں یا کوئی نیا پلاٹ میرے ذہن میں ابھرتا ہے۔" شکیل نے ڈانٹ پلائی۔ "تم مجھے دوش دے رہی ہو؟ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اب تم خود بدل گئی ہو۔ کبھی تم میرے افسانوں اور کہانیوں کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیا کرتی تھیں اور اب تمھیں یہ گراں گزرتا ہے کہ میں گھنٹوں بیٹھ کر کوئی کہانی یا افسانہ لکھتا ہوں۔ کیوں میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟ تم تو یہ چاہتی ہو کہ میں ہر وقت تمھیں دیکھتا رہوں۔ تمھاری تعریف کرتا رہوں۔ تمھاری ان خوبصورت آنکھوں کی، ان سیاہ ریشمیں بالوں اور ان کے پیچ و خم کی تعریف کرتا رہوں۔ یہی سب تمھیں پسند ہے۔ اور میں یہ سب کر نہیں سکتا۔ ہاں تمھاری اس آرزو کو اپنے افسانوں میں ضرور پوری کر سکتا ہوں لیکن شاید وہ سب کچھ تمھیں پسند نہیں۔ اس لئے کہ تمھیں ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔" شکیل نے بیزاری سے کہا اور کمرے سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس نے نسرین کی طرف دیکھا تک نہیں۔ بس اتنی سی بات سے دونوں کے دلوں میں تلخی پیدا ہو گئی۔ شکیل کو کیا معلوم کہ اس کی اتنی سی بات کا اس کے نازک دل پر کیا اثر ہوا۔ ان چند لفظوں نے نسرین کے دل سے

گئی شگفتہ۔ اُس کی آنکھوں سے ایک سیلاب اُمڈ پڑا جسے وہ کسی طرح نہ روک سکی نسرین کی اس چھوٹی سی بات سے شکیل کے دل میں بدگمانی پیدا ہوگئی اور نسرین کا گھر اُس خزاں دیدہ چمن کی طرح نظر آنے لگا جس سے بہاریں روٹھ گئی ہوں۔ اُس کے ہونٹوں پر قوس کی مسکراہٹیں بے جان ہو کر رہ گئیں۔ اُسے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی ایک ذرا سی بات کہہ کر اُس نے کیوں شکیل کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔ وہ سب اُس نے شکیل سے کیوں کہا کاش اُس وقت اُس کی زبان اُس کا ساتھ نہ دیتی لیکن اُسے کیا معلوم کہ یہ سب کیوں اور کس لئے ہوا اُس نے چاہا کہ شکیل کو منالے۔ اُس سے معافی مانگے۔ اس کے لئے اُس نے بہت کوشش کی لیکن بے سود شکیل نے اِس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ نسرین دل ہی دل میں گھٹ گھٹ کر رہ جاتی اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

ایک دن رات کے بارہ بجے تھے شکیل بے خبر سو رہا تھا نسرین اُس کے پاس آئی۔ مسہری کے قریب کھڑی شکیل کے مسکراتے چہرے کو دیکھنے لگی۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اُس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات اُٹھ رہے تھے۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے شکیل کے پیروں کو چھوا اور بے اختیار اُس کی پیشانی چوم لی۔ حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کا دل بھر آیا۔ بھیگی پلکوں سے موتی گرنے لگے۔ گلابی رخساروں پر آنسو ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے گلاب پر شبنم کے قطرے ہوں۔

نسرین آنسوؤں سے مُنہ دھوتی رہی۔ دن گزرتے گئے لیکن شکیل کے رویئے میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ نسرین اِس غم میں گھلتی رہی لیکن ایک ادیب، ایک فنکار اُس کے جذبات و احساسات کو نہ سمجھ سکا۔ نسرین کا شاداب و شگفتہ چہرہ مُرجھا گیا۔ نسرین جو ایک مشرقی لڑکی تھی، اپنی زبان نہ کھولتی۔ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتی رہی۔ ایک شمع کی طرح جو رات کی تاریکی دُور کرنے کے لئے خاموش جلتی رہتی ہے اور اُسے سحر کا انتظار ہوتا ہے، نسرین کو بھی شاید اُسی کی طرح کسی صبح کا انتظار تھا۔

ایک دن نسرین سر جھکائے کسی کام میں مشغول تھی شکیل کمرے میں داخل ہوا۔ آج وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ نسرین نے سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور ششدر رہ گئی۔ آج اُس کے لئے یہ پہلا اتفاق تھا جو شکیل کو اپنے سامنے ... دیکھ رہی تھی۔ اِس سے پہلے کہ شکیل کچھ کہتا دروازہ کھلا اور نسرین کی سہیلی عذرا کمرے میں داخل ہوئی لیکن جیسے ہی اُس کی نظر نسرین پر پڑی وہ حیران رہ گئی۔ نسرین اُسے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی اور آگے بڑھ کر عذرا سے لپٹ گئی۔ عذرا نے نسرین کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور حیرت سے اُس کی طرف دیکھ کر کہنے لگی "کیا بات ہے نسرین تمھاری یہ حالت۔ کیا تم ... کیا تم بیمار تھیں؟"

"نہیں تو۔ میں بھلا بیمار کیوں ہونے لگی" نسرین نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا "لیکن یہ آج اچانک مجھ غریب کی یاد کیسے آگئی؟"

عذرا بولی "ارے ہاں نسرین! یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔ میں اصل میں اپنے دولھا بھائی کو مبارکباد دینے آئی تھی"

"تم ... مجھے ..." کہ کر شکیل ہکلا کر رہ گیا۔

عذرا نے اپنے بیگ سے ایک کتاب نکال کر نسرین کی طرف بڑھائی۔ نسرین حیرت سے کبھی عذرا اور کبھی کتاب کی طرف دیکھتی۔ عذرا نے آگے بڑھ کر کتاب کا سرورق اُلٹ دیا۔ سامنے شکیل کی تصویر تھی۔ عذرا تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی "چراغِ آرزو۔ جناب کی پہلی تخلیق! یہ خوبصورت ناول!!"

نسرین کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملانے لگے۔ اُس نے شکیل کی طرف دیکھا شکیل نے سر جھکا لیا۔ عذرا کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہنے لگی "کیا بات ہے بھائی جان! آپ اور باجی اِس طرح خاموش کیوں ہیں؟" شکیل نے سر اُٹھا کر عذرا کی طرف دیکھا۔ شکیل کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر رہے تھے۔ پھر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا "کچھ نہیں عذرا! میں نے اپنے ناول کے لئے نسرین کے ساتھ ایک خطرناک کھیل کھیلا" اتنا کہہ کر شکیل آگے بڑھا اور پیار سے نسرین کے شانے پر ہاتھ

♦ ──── ♦ ──── ♦ ──── ♦ ──── ♦ ──── ♦

- خاموشی سے یہی کیا کم فائدہ ہے کہ بحث مباحثے سے نجات ملتی ہے۔ خاموش رہو یا ایسی بات کرو جو خاموشی کا نعم البدل ہو۔ (ایک مشرقی دانشور)
- خوش خلقی حصولِ مقصد میں کامیاب کرتی ہے اور خوش کلامی منزلِ مقصود سے قریب تر۔ (عربی ادب)
- میری فضیلت کا راز یہ ہے کہ میں نے اپنے جہل کو سمجھ لیا ہے۔ (حکیم بقراط)
- میں اچھے کردار کے دوست اور بہترین دماغ کے دشمن منتخب کرتا ہوں۔ (آسکر وائلڈ)
- اگر مجھ سے خدا کا تصور چھین لیا جائے تو میں پاگل ہو جاؤں۔ (ولسن)
- آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ مذہب و اخلاق کی پابندی نہ کی جائے۔ (پوپ آگسٹائن)
- آرزو نصف زندگی ہے اور بے حسی نصف موت۔ (خلیل جبران)

♦ ──── ♦ ──── ♦ ──── ♦ ──── ♦ ──── ♦

رکھ کر کہنے لگا "نسرین! میں بھی کتنا سنگدل انسان ہوں تمھیں کتنا پریشان کیا۔ کتنا دکھ پہنچایا۔ صرف اپنے ناول "چراغِ آرزو" میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے ______ لیکن میں بہت خوش ہوں مجھے ناز ہے تم پر کہ تم اِس امتحان میں کامیاب رہیں۔ میری اتنی بے پروائی اور بے توجہی پر بھی تم نے اپنی زبان نہ کھولی۔ سچ ہے عورت زبان رکھتے ہوئے بھی اُف نہیں کرتی۔ ہر ظلم سہہ سکتی ہے لیکن کچھ کہہ نہیں سکتی کسی نے سچ کہا ہے ؎

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

میرا یہ ناول اِس حقیقت کا ثبوت ہے" ______ نسرین کے ہاتھ میں ناول تھا اور نظریں اُس کے نام پر۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ناول میں جذب ہوگئے۔ اُس نے ناول کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ شکیل نے جذباتی لہجے میں کہا "یہ تو میری ایک ادنیٰ تخلیق ہے نسرین! ورنہ در حقیقت میری آرزوؤں کا چراغ تم ہو!!"

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

[illegible]	کرشن چندر	[illegible]
[illegible]	〃	پانچ روپے
[illegible]	〃	تین روپے
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
سسرال	شوکت تھانوی	دو روپے
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	〃	پانچ روپے
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	پریم چند	پانچ روپے
[illegible]	〃	گیارہ روپے
[illegible]	〃	تین روپے
[illegible]	〃	تین روپے
[illegible]	راشد الخیری	دو روپے
شب زندگی	〃	[illegible]
شام زندگی	〃	[illegible]
[illegible]	رازق الخیری	تین روپے
[illegible]	[illegible]	[illegible]
اقبال	〃	پانچ روپے
[illegible]	کنہیا لال کپور	تین روپے
سنگ و خشت	〃	[illegible]
[illegible]	[illegible] اختر	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	پانچ روپے
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]	قرۃ العین حیدر	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
فتح خیبر	[illegible]	پانچ روپے
مقابلہ	[illegible]	تین روپے
نیلوفر	〃	تین روپے
اکبری [illegible]	〃	پانچ روپے
[illegible]	〃	تین روپے
[illegible]	〃	تین روپے
[illegible]	〃	[illegible]
سیلاب	〃	تین روپے
گناہ	[illegible]	[illegible]
اندھیرے اجالے	[illegible]	تین روپے
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
مفرور	[illegible]	[illegible]
قیامت	[illegible]	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
گورا	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]		[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
خون	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
زمین کے [illegible]	[illegible]	[illegible]

نمک دان

اقبال سلیم

[illegible] منڈیا (میسور اسٹیٹ)

۲۲ اکتوبر ۱۹۹۳ء

مکرم و محترم جناب نوشتر صاحب، تسلیم

ادبی لطافت سے کچھ اپنی دلچسپی کچھ قارئین بیسویں صدی کے نوازشی خطوط سے متاثر ہو کر ایک بار پھر "نمک دان" لے کر حاضر ہوا ہوں ——— ادبی لطائف بظاہر تفریحِ طبع کا سامان نظر آتے ہیں لیکن کسی شاعر یا ادیب کی شخصیت و کردار کا مطالعہ کرنے میں بڑی حد تک چاشنی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت کا اب ادبی حلقوں میں اعتراف کیا جانے لگا ہے۔

آپ کا ——— اقبال سلیم

شیطان کی آنت

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھنؤ میڈیکل کالج میں زیرِ علاج تھے۔ اصغر گونڈوی مرحوم اُن دنوں الٰہ آباد میں تھے۔ اُن کا معمول تھا کہ الٰہ آباد سے ہر اتوار کو رشید صاحب سے ملنے ہسپتال آیا کرتے۔ انہی دنوں رشید صاحب کا مضمون "شیطان کی آنت" شائع ہوا تھا۔ ایک دن اُن سے نہ رہا گیا، پوچھنے لگے: "اصغر صاحب! آپ ہر ہفتے اتنی دُور سے یہاں آنے کی کیوں زحمت فرماتے ہیں؟"

"شیطان کی آنت کھینچ لاتی ہے۔" اصغر صاحب نے جواب دیا۔

حاصلِ مشاعرہ غزل

علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں جگر مرادآبادی شراب کے نشے میں دھت صدرِ مشاعرہ کی حیثیت سے موجود تھے۔ جب کوئی اچھا شعر سنتے تو داد دیتے ورنہ بے تکلف "لاحول" پڑھتے لیکن آواز اتنی مدھم اور نشے میں ڈوبی ہوئی تھی کہ دُور بیٹھے ہوئے سامعین یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ جگر صاحب داد دے رہے ہیں یا لاحول پڑھ رہے ہیں۔ ایک شریر طالب علم نے بات نوٹ کر لی۔ وہ جب اپنی غزل سنانے لگا تو اُس کی غزل کے ہر شعر پر جگر صاحب حسبِ عادت لاحول پڑھنے لگے اور وہ شریر طالب علم اُن کی ہر لاحول پر جھک کر آداب کرتا۔ سامعین اس غلط فہمی میں کہ جگر صاحب داد دے رہے ہیں خود بھی داد و واہ سبحان اللہ کا شور بلند کرنے لگتے۔ جب وہ طالب علم پڑھ چکا تو مسکرا کر جگر صاحب سے کہنے لگا۔

"بس جناب! آپ کی لاحول دھری کی دھری رہ گئی اور میری غزل حاصلِ مشاعرہ ہو گئی۔"

حُسنِ طلب

علی گڑھ کالج کے ایک طالب علم جو خیر سے کالج میں کافی مشہور تھے، مولانا سلیمان اشرف کی کلاس سے متواتر غیر حاضر رہنے لگے۔ مولانا نے اُن کے متعلق دوسرے طلباء سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ حضرت آج کل بہت مصروف ہیں اور اپنے کمرے سے بہت کم نکلتے ہیں۔ ایک دوسرے طالب علم نے اکھڑ کر کہا: "فلاں فلاں کلاس میں تو دیکھے گئے تھے۔"

مولانا نے فرمایا: "آپ اُن سے کہہ دیجئے گا کہ آجایا کریں ؎

میرے غم خانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی"

فی البدیہہ

مولانا ابوالکلام آزاد بارہ تیرہ برس کی عمر کے تھے کہ کلکتہ کے مشاعروں میں اکثر اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخی رامپوری کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ مولانا جو غزلیں مشاعروں میں سناتے ہیں وہ اُنہی کی ہوتی ہیں۔ ایک دن مولانا مسجد سے نماز پڑھ کر نکلے ہی تھے کہ شوخی صاحب نے روک لیا اور کہا۔

"میاں! ایک شاگرد نے غزل کہنے کے لئے ایک مصرع دیا ہے رکھا ہے جلدی میں بیٹھا ہوں

قابلِ مطالعہ مُنتخب شعری مجموعے

آتش گل	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
کلیات اقبال	ڈاکٹر اقبال	چھ روپے
جنون و ہوش	جوش ملسیانی	چار روپے
ہفت رنگ	عرش ملسیانی	تین روپے
آہنگ حجاز	〃	ایک روپیہ
سحر غزل	ساحر ہوشیارپوری	تین روپے
دستک	نریش کمار شاد	دو روپے ۲۵ پیسے
پھوار	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
فکار	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
قاشیں	〃	تین روپے
آیات جنوں	〃	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
سنگم	〃	تین روپے
رباعیات محروم	تلوک چند محروم	تین روپے ۷۵ پیسے
گنج معانی	〃	سات روپے ۵۰ پیسے
روپ	فراق گورکھپوری	تین روپے ۵ پیسے
رمز و کنایات	〃	تین روپے ۵۰ پیسے
مشعل	〃	دو روپے ۷۵ پیسے
بیکراں	جگن ناتھ آزاد	چار روپے ۵۰ پیسے
ستاروں سے ذروں تک	〃	دو روپے ۷۵ پیسے
کلیات اکبر الہ آبادی (اول)	اکبر الہ آبادی	پانچ روپے
〃 حصہ دوم	〃	چھ روپے
کلیات اختر شیرانی	اختر شیرانی	آٹھ روپے
رعنائیاں	شکیل بدایونی	تین روپے
صنم و حرم	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
گل رعنا	جگی رعنا	تین روپے ۵ پیسے
شبنم شبنم	کرشن موہن	پانچ روپے
دل نادان	〃	چھ روپے

خرابات	عبدالحمید عدم	چار روپے
رم آہو	〃	چار روپے
گلنار	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
قول و قرار	〃	تین روپے ۵۰ پیسے
گردش جام	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
بط مے	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
گجر	قتیل شفائی	تین روپے
جھومر	〃	تین روپے
روزن	〃	تین روپے
جلترنگ	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
گفتنی	محمود سعیدی	دو روپے
نئی صبح	ضیا فتح آبادی	ایک روپیہ
طلوع	〃	۷۵ نئے پیسے
نور مشرق	〃	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
آہنگِ غزل	پورن سنگھ ہنر	دو روپے ۵۰ پیسے
شہرِ دل	محسن زیدی	دو روپے
سفینہ و ساحل	فرزند وارثی	چار روپے

آئینۂ اصلاح ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر مع توجیہہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

جوش ملسیانی کے مکمل حالات زندگی، انتخاب کلام شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویروں کے ۸۴ صفحے ضخامت، ۵۰۰ صفحات۔ موجودہ دور کی بے مثل کتاب۔ قیمت دس روپے۔

مضراب شباب ملت کے ایک ایک شعر میں اس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور ان دھڑکنوں میں اس نے سارے جہاں کے دکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت تین روپے۔

گلستانِ ہزار رنگ جس میں تقریباً چار ہزار شعراء کے اشعار عنوان وار ترتیب دئے گئے ہیں۔ اس یادگار کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور ہندی کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام نامی ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز فتحپوری نے اس کتاب کو اس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ اُردو ایڈیشن دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۷۵ پیسے۔

شاہنامۂ اسلام جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام چار حصوں میں ہے جس میں تیرہ سو سال اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے۔ ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے۔ تازہ ایڈیشن اصلاح کے بعد چھپا ہے۔ قیمتی سولہ روپے اب صرف نو روپے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

تلامذۂ غالب غالبیات کے مشہور ماہر مالک رام صاحب کی گرانقدر تصنیف۔ اس کتاب میں غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کی مکمل سوانح حیات اور کلام درج ہیں۔ پورے صفحہ کی تقریباً تیس تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔ ہندوستان بھر کے ادیبوں کا فیصلہ ہے کہ یہ کتاب بہترین ادبی تحفہ ہے۔ قیمت فی جلد سات روپے ۵۰ پیسے۔

کفر و ایمان پنڈت ہری چند اختر کا مجموعہ کلام حضرت اختر کا نام نامی ہی اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا ضامن ہے کلام میں طنز کے نشتروں کے ساتھ درد مند دل کی گرمی بھی ہے۔ قیمت چار روپے۔

کلامِ بے لگام این بی تنا دہلوی کا نادر مجموعہ کلام جس کے ہر شعر میں اکبر الہ آبادی کا رنگ جھلکتا ہے۔ طنز و مزاح کا رنگین گلدستہ ۱۹۲ صفحات پر مشتمل دوسرا ایڈیشن شائع ہوگیا۔ قیمت مجلد چھ روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

چند شعر اُسی وقت کہہ دو۔۔۔ انھوں نے زمین بتائی "یاد نہ ہو۔۔۔ شمار نہ ہو"
مولانا نے ایک کُتب فروش کی دوکان پر بیٹھے بیٹھے چند شعر اُسی وقت کہہ دئے۔ لیکن انھوں نے مزید اطمینان کے لئے کہا: اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہئے۔" مولانا نے ایک لمحہ توقف کے بعد برجستہ یہ مقطع پڑھا:

وعدۂ وصل بھی اک طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو جھوٹوں نہ کہوں، اُن کو کبھی یاد نہ ہو

پھبتی

خدائے سخن غالبؔ کی طرح حضرت شغلؔ اکبر آبادی بھی بلا کے ظریف اور بذلہ سنج شاعر تھے۔ مہاراجہ بلوان سنگھ کے یہاں مشاعرہ تھا۔ مہاراجہ نے مسانَد کے لئے تُحفے بھوا رکھے تھے اور خود بیٹھے سنک پی رہے تھے۔ خوب موٹے تازے، گوری چٹی رنگت، گول چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی اور مُنہ میں حقّے کی سنک۔ شغلؔ نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا ؎

دُور سے تو بھے بلو نظر آتا ہے

مہاراجہ نے سُنا اور مُنہ سے سنک نکالی ہی تھی کہ شغلؔ نے دوسرا مصرعہ بھی کھینچ مارا ؎

دُم چباتا ہوا لنگور نظر آتا ہے

ڈر

بابائے طنز اکبرؔ مرحوم سے صہبا نام کے ایک درویش صفت مگر باذاق شاعر اکثر ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک دن اکبرؔ نے فرمایا: "بھائی صاحب! آپ نمازِ عشا یہیں محلّہ کی مسجد میں پڑھ لیا کیجئے۔ میں بھی آجایا کروں گا۔ اس کے بعد دونوں گھر چلے جائیں گے ذرا لطفِ صحبت رہے گا۔"۔۔۔ انھوں نے منظور کر لیا۔ لیکن اگلی صبح آتے ہی کہنے لگے۔
"معاف کیجئے گا اِشب کو حاضر نہ ہو سکا۔ بات یہ تھی کہ مسجد میں داخل ہوا تو لق و دق عمارت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ وہ وحشت، وہ سنّاٹا، وہ ویرانی۔ توبہ توبہ!"
اکبرؔ کی رگِ طنز پھڑکی مُسکرا کر فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

شیخ جی رات کو مسجد میں نہیں جاتے ہیں
یعنی ڈرتے ہیں کہ بیٹھا کہیں اللہ نہ ہو

چوٹ

مولانا گرامیؔ اور حضرت داغؔ کے درمیان جو نظامِ دکن کے اُستاد بھی تھے، معاصرانہ چشمک تھی۔ ایک دن داغؔ نے نظام کی خدمت میں برسبیل غیبت کہا: "حضور! یہ شخص شعر کیا خاک کہے گا۔ شاید کہیں سے قلمی دواوین ہاتھ آگئے ہیں اور اب اپنے نام سے پڑھتا پھرتا ہے۔"
مولانا عبدالحلیم شررؔ کے ذریعہ یہ بات مولانا گرامیؔ تک پہنچی۔ بس پھر کیا تھا۔ گرامیؔ نے نہ صرف داغؔ کی ہجو کہی بلکہ دوسرے دن سرِ دربار پڑھ بھی دی۔ داغؔ جل بھُن کر خاک ہوگئے۔ نوبت درشت کلمات تک پہنچی۔ گرامیؔ نے موقع پاکر کہا: "میں بھلا شعر کہنا کیا جانوں۔ یہ بھی کسی اُستاد کا غیر مطبوعہ کلام ہوگا۔"

شعر اور شیر

شاہد احمد دہلوی کے والدِ محترم مولانا بشیرالدین احمد کسی کام کے سلسلے میں حیدر آباد میں مقیم تھے۔ اُنھوں نے ایک ٹوپچی کو چند سادے دستر خوان دیئے کہ ان پر شعر چھاپ لاؤ۔ کچھ دن بعد وہ ٹوپچی دستر خوان لے کر حاضر ہوا تو دیکھنے والوں نے حیرت سے دیکھا کہ دستر خوان کے حاشیوں پر نیلے اور لال شیر چھپے ہوئے تھے۔ مُنہ پھٹا ہوا، دُم اکڑی ہوئی جیسے ابھی حملہ کردیں گے۔ مولوی صاحب نے حیران و پریشان ہوکر پوچھا: "اے کمبخت! یہ تُو نے کیا کیا؟"
وہ معصومیت سے بولا: "سرکار ہی تو بولے تھے کہ اِس پر شیراں چھاپ لاؤ۔"

مضمون نگار حضرات سے

درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کردیئے جاتے ہیں۔ مضمون کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نو آموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں انھیں واپس کردیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (ایڈیٹر)


دلکش نفیس
ایمبرائیڈری
ہر مجلس میں نمایاں ! ہر نظر میں بس جانے والی !
ھاکوبا ایمبرائیڈرڈ کپڑے کی
بنائی ہوئی چولی آپ کی ہر ساڑی کے ساتھ
موزوں اور دیدہ زیب ہوتی ہے کیونکہ ...
ھاکوبا
ہر لباس میں دلکشی اور جان پیدا کر دیتا ہے
فینسی کارپوریشن لمیٹیڈ
۱۶۔ اپالو اسٹریٹ ، بمبئی ۱
RB/FC/U/76

سالنامہ دیکھا

اہلِ قلم حضرات کی رائیں

...جس طرح خوشترگرامی اور بیسویں صدی لازم و ملزوم ہو چکے ہیں اسی طرح بیسویں صدی کے سالنامہ اور عظمت میں بھی چولی دامن کا ساتھ پیدا ہو چکا ہے۔ اس لئے جب بیسویں صدی کا تازہ سالنامہ ہمارے پاس برائے تبصرہ موصول ہوا تو ہمیں اس سالنامہ کی عظمت چکا چوند، وقار اور اعلیٰ ادبی معیار پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ یہ سالنامہ نہیں بلکہ موجودہ اُردو ادب کے ارتقاء کی ایک سالہ خوبصورت تاریخ ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپ کے ذوقِ ادب کی ہی تسکین نہیں ہوتی بلکہ مُستقبل کے اُردو ادب کی واضح جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے مسلّمہ اور نامور افسانہ نگاروں، ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ نئے اُبھرتے ہوئے فنکار بھی اپنی اچھوتی تخلیقات کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اور ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ یہ عظیم مرقع بیسویں صدی کے زندہ جاوید ایڈیٹر خوشتر گرامی کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے...

روزنامہ "ملاپ" (دہلی)

...یہ سالنامہ بھی سابقہ سالناموں کی طرح بہت شاندار اور قابلِ مطالعہ ہے۔ غزلوں اور افسانوں کا معیار بہت پاکیزہ، سبق آموز اور فکر انگیز ہے۔ لکھنے والوں میں ہندوستان کے وہ مشاہیر ہیں جن کے قلم پر ادب اور زبان فخر کرتی ہے۔ اس سالنامہ میں ۱۸ افسانے شریکِ اشاعت ہیں مگر ان میں کوئی افسانہ اخلاق سوز، سوقیانہ اور مبتذل نہیں۔ انھیں گھر کی لڑکیاں اور بڑی بوڑھیاں کسی تردد کے بغیر پڑھ سکتی ہیں۔ افسانوں کا کمال ہی یہ ہے کہ ہر شریف نظر اسے دلچسپی سے پڑھ سکے۔ شاعروں میں ممتاز شعراء اور افسانہ نگاروں میں مشاہیر اہلِ قلم شامل ہیں۔ مجموعی حیثیت سے بیسویں صدی کو اس صدی کا افسانوی شاہکار سمجھنا چاہئے...

روزنامہ "الجمعیۃ" (دہلی)

...سالنامہ اس قدر حسین و جمیل ہے اور ایسے بیش قیمت اور کیف پرور مضامین نظم و نثر سے مالامال کہ ماہِ مبارک میں جبکہ میرا زیادہ تر فرصت کا وقت تلاوت کلامِ پاک میں گزرتا ہے بیسویں صدی کے اس دلکش سالنامے کی نذر کرنا پڑا۔ یہ کوئی رسمی تعریف اور خوشامد نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت ہے کہ آپ کا ہر خاص نمبر اپنے گذشتہ نمبر سے بہتر ہوتا ہے...

پروفیسر حفیظ بنارسی (آرہ)

...سالنامہ کیا ہے ایک ایسا تعویذِ ادب ہے جو افسانہ و شعر کے متوالوں کے لئے حرزِ جاں کی حیثیت رکھتا ہے۔ لباسِ حریر میں لپٹی ہوئی اس عروس جمیل کا حسن دامنِ دل کو اپنی جانب کھینچنے میں بے حد کامیاب ہے۔ ہر تخلیق اپنی اپنی جگہ ایک نگینہ کی طرح جڑی ہوئی ہے...

مذہر حسین رضوی (امروہہ)

...محترم خوشتر گرامی کے ہاتھوں مرتب کیا ہوا یہ پاکیزہ سالنامہ پڑھ کر جو مسرت حاصل ہوئی کہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ اپنے وطن عزیز سے بہت دُور لندن میں بیٹھ کر سالنامہ کے مطالعہ سے یہ محسوس کر رہا ہوں، جیسے میں آپ ہی کے پاس بیٹھا ہوں۔ غریب الوطنی کا احساس زائل ہو گیا ہے۔ وطن کا اس سے بڑھ کر تحفہ میرے لئے اور کیا ہو سکتا تھا ـــــ تمام مضامینِ نظم و نثر اعلیٰ اور معیاری ہیں...

حافظ گلاسگو (لندن)

...یہ خوبصورت شمارہ خصوصی قصیدہ خوانی سے بالاتر ہے۔ آپ کی محنتوں اور کاوشوں کی تعریف کیسے کروں۔ حسبِ معمول یہ شمارہ بھی بہت خوب ہے ـــــ بہت دِنوں کے بعد محترمہ واجدہ تبسم کے ساتھ آپ کی تصویر دیکھی۔ وہی آب و تاب اور وقار ہے چہرے پر۔ آپ سے میری ملاقات کو بارہ سال گزر گئے اِس عرصے میں جہاں حیرت انگیز تبدیلیاں نمودار ہوئیں وہاں زمانے کے سرد و گرم نے آپ پر ذرا بھی اثر نہ کیا۔ زندہ باد خوشتر گرامی...

یونس احمد (کراچی)

...چلتے پھرتے افسانوں کی حسین دُنیا کے خوبصورت شہر لندن میں بیسویں صدی کا سالنامہ پڑھا۔ فن پارے بہت پسند آئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر افسانہ دوسرے سے بڑھ کر ہے۔ سالنامہ کے ذریعہ جب اپنے محبوب دوست پروفیسر ہاشمی کرنالی اور سہابی طاہرہ شباب سے ملاقات ہوئی تو خوشی کی انتہا نہ رہی...

ڈاکٹر بشیر قریشی (ڈسپ کراس ہسپتال لندن)

...سب روایات یہ نمبر بھی شاہکار مضامین نظم و نثر کا حسین گلدستہ ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین پر آپ کو جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے...

روشن نگینوی (پشاور)

... ایسا خوبصورت سالنامہ اُردو ادب میں ایک سنگِ میل ہے۔ بے حد پسند آیا۔ یہاں اہلِ ذوق نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لندن میں اس کی مقبولیت دیکھ کر بے پایاں مسرّت حاصل ہوئی ...

واسو دیو (انگلینڈ)

... رنگ و نور کا پیکر، حُسن و جمال کا مخزن، زبان و ادب کا نقرئی مینار سالنامہ "بیسویں صدی" اپنے حسین دامن میں تمام تر رعنائیوں اور رنگینیوں کے ساتھ ضیا بار و نظر نواز ہوا۔ میں نے افسانوی ادب کی اس تاریخی دستاویز کو محفوظ کر لیا ہے ...

اکرم فاروقی (امروہہ)

... "خاص نمبر" اور "سالنامے" نکالنا آپ کو آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کے سلیقہ، حُسنِ ترتیب اور نگاہِ فن شناس کی داد بھی بقدرِ معیار نہیں پیش کر سکتا۔ دراصل آپ کا کام داد سے بالاتر ہے ...

عنوان چشتی (جامعہ ملیہ دہلی)

... "بیسویں صدی" ہماری تہذیب کا علمبردار ہے اور اُردو ادب کا گہوارہ۔ ۱۹۶۵ء کا سالنامہ ایک تاریخِ ادب ہے۔ اتنا حسین و جمیل اور باتصویر سالنامہ نکالنے پر میری مبارکباد قبول فرمائیے ...

رشید جعفری (آنولہ)

... اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا نام اُردو ادب کے محسنوں میں لکھا جا چکا ہے۔ ایسے نازک وقت میں اور ناموافق حالات میں اُردو کی اتنی خدمت کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ اور وہ بھی ہندوستان کے دل میں بیٹھ کر ...

پروفیسر مقبول احمد خاں (قصور)

... سالنامہ کی جس قدر تعریف کروں کم ہے۔ اس نمبر نے نہ صرف "بیسویں صدی" کی شاندار روایات کو زندہ اور برقرار رکھا ہے بلکہ ان روایات کے سفر میں سنگِ میل کا کام کیا ہے ...

دھرم پال جرنلسٹ (دہلی)

... سالنامہ پا کر مجھے یہ محسوس ہوا جیسے کسی "عروسِ بلاد" کے عطر بیز تنفّس سے میرا ذہن و دماغ معطّر ہو رہا ہے۔ اس ادبی شہ پارے کی ایک ایک سطر بانو "جانفزا" کی طرح لطیف جذبات و احساسات میں اُتار لی ...

ظہیر گیلانی امروہوی (امروہہ)

اعلان

گلستانِ ہزار رنگ (مجموعۂ اشعار بقید عنوان مقدمہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد) کی دوسری اشاعت کی تیاری کی جا رہی ہے۔ طبع اوّل کی ساری جلدیں ختم ہو گئیں۔ شعرائے کرام سے التماس ہے کہ اپنے کلام کا انتخاب مع مختصر سوانح مؤلف کے پاس مندرجہ ذیل پتہ پر جلد روانہ فرمائیں۔

سید بہاء الدین احمد۔ ڈسٹرکٹ ڈسپنسری مظفر پور، بہار

قابلِ مطالعہ معیاری کتب

سیرت خاتم الانبیاء	مولانا محمد شفیع صاحب	ایک روپیہ پچیس پیسے
سوشلزم	پرنسپل چھبیلداس	ایک روپیہ پچاس پیسے
دھنیکا لو جاودان	کشور زیدی	دو روپے
اردو	جگن ناتھ آزاد	پچاس پیسے
تعلیم دینے کا فن	ڈاکٹر منوہر سہائے انور	تین روپیہ پچاس پیسے
ذوقِ جنوں	آل احمد سرور	تین روپے پچاس پیسے
رشیدہ کی کشیدہ کاری		تین روپے پچاس پیسے
شبنم کشیدہ کاری		ایک روپیہ
شمع کشیدہ کاری		چار روپے پچاس پیسے
قدسیہ کشیدہ کاری		ایک روپیہ
دلہن کشیدہ کاری		دو روپیہ پچاس پیسے
بیگم کشیدہ کاری		ایک روپیہ پچاس پیسے
گلشن کشیدہ کاری	زینب انور	دو روپیہ

سموم و صبا	جوش ملیح آبادی	آٹھ روپے
شکوہ جوابِ شکوہ	ڈاکٹر اقبال	پچیس پیسے
بالِ جبریل	"	تین روپے پچاس پیسے
انجمن در گرہ	جوش ملسیانی	دس روپے
نقشِ فریادی	فیض	دو روپے پچیس پیسے
آہنگِ حجاز	عرش ملسیانی	ایک روپیہ
ہفت رنگ	عرش ملسیانی	تین روپے
قول و قرار	عبدالحمید عدم	دو روپیہ پچاس پیسے
رنگ و آہنگ	"	ایک روپیہ
آہنگ	مجاز	تین روپے
شکستِ	ساغر نظامی	بارہ روپے
گلستانِ ہزار رنگ	سید بہاء الدین	دس روپے
سنگم	نریش کمار شاد	تین روپے

سرِ تا سر ولمد	نریش کمار شاد	دو روپے پچاس پیسے
پھوار	"	دو روپے پچاس پیسے
دستک	"	دو روپے پچیس پیسے
ڈارلنگ	"	دو روپے پچاس پیسے
آتشِ گل	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
صنم و حرم	شکیل بدایونی	ایک روپیہ
رعنائیاں	"	تین روپے پچاس پیسے
گفتنی	محمود سعیدی	دو روپے
گلِ رعنا	مہتہ لال رعنا جگی	تین روپے پچاس پیسے
دلِ ناداں	کرشن موہن ایم۔اے	چار روپے
شبنم شبنم	"	پانچ روپے
تماشائی	"	ایک روپیہ
گردِ راہ	ضیا فتح آبادی ایم۔اے	تین روپے پچاس پیسے
ساز و نغز	بسمل کپور تھلوی	تین روپے
آہنگِ حیات	پروفیسر مشاق الرحمٰن خلش نشا	ایک روپیہ پچاس پیسے

ملنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی



زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱ — صحت کے لئے سبزیاں کیوں ضروری ہیں؟

دُنیا کے بڑے بڑے محققوں اور سائنس دانوں نے جدید ترین تحقیقات سے یہ ثابت کیا ہے کہ صحت کو برقرار رکھنے کے لئے سبزیوں کا استعمال بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر ایڈورڈ سمتھ ایم۔ بی۔ ایف۔ آر۔ ایس کہتے ہیں کہ "جسم کی صحت، توانائی اور طاقت کے لئے جو معدنی اشیاء درکار ہیں وہ سب سبزیوں میں پائی جاتی ہیں۔ جسم کی طاقت قائم رکھنے کے لئے سبزیاں ضروری اور مفید ہیں۔"

ڈاکٹر سر ہنری ٹامسن کی رائے ہے کہ "انسانی جسم کی تمام طبعی ضروریات سبز ترکاریوں سے پوری ہو سکتی ہیں۔ حرارت، طاقت اور جسمانی نشو و نما کے لئے جتنی چیزیں درکار ہیں وہ سب سبز ترکاریوں سے مل سکتی ہیں۔"

سبز ترکاریوں میں وٹامنز کی مقدار دوسری غذاؤں سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وٹامنز کی موجودگی نہ صرف جسمانی نشو و نما اور صحت کے لئے لازمی ہے بلکہ بہت سی بیماریوں کو روکنے میں مدد و معاون ہوتی ہے۔ سبزیوں کے بغیر ہماری خوراک مکمل نہیں ہو سکتی۔ سبز ترکاریاں تو طاقت بخش اجزاء کی ایک کان ہے۔ جس میں وٹامنز، فولاد، تانبا، چونا اور فاسفورس ہوتے ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں ہمارے جسم کی نشو و نما اور پرورش کے لئے ضروری ہیں یہ چیزیں جسم کی قوت بڑھانے، اسے مضبوط بنانے، قوت ہاضمہ کو تیز کرنے اور جسم کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے دیگر اجزاء سے کہیں زیادہ مفید ہیں۔

ساری غذاؤں کے ہضم میں تیزابی مادہ پیدا ہوتا ہے جو کئی طرح کی تکالیف پیدا کرتا ہے لیکن سبزیوں میں تیزابی مادے کو زائل کرنے کی قوت ہوتی ہے۔ اس لئے سبزیاں کافی مقدار میں کھانی چاہئیں۔

چونکہ سبزیوں میں نمکیات، معدنیات اور وٹامنز زیادہ مقدار میں ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا استعمال جگر، گردے، مثانہ کی پتھری اور پرانے قبض کی شکایت میں بہت مفید ہے۔ سبزیاں زود ہضم اور قبض کشا ہوتی ہیں۔ انتڑیوں کو صاف کر کے انہیں طاقت بخشتی ہیں اس لئے سبزیوں کا استعمال صحت اور زندگی کے لئے بہت ضروری اور بہت مفید ہے۔ سبزیوں میں شامل نمکیات سے خون معتدل اور صاف رہتا ہے۔ انسان خون اور جلد کے امراض سے بچا رہتا ہے اور قبض کی شکایت بھی نہیں ہوتی۔

ہماری غذا میں لوہا، چونا، فاسفورس، آیوڈین اور سلفر وغیرہ قدرتی کھار (نمکیات) ہونے چاہئیں۔ ورنہ ہمارا جسم مختلف امراض کا شکار ہو جاتا ہے یہ تمام نمکیات جو انسانی صحت کے لئے ضروری ہیں سبز پتے والی ترکاریوں میں بکثرت موجود ہوتے ہیں۔ خصوصاً پالک، کاہو، قلفہ، بتھوا، پت گوبھی، سرسوں کا ساگ اور شلغم کے پتوں میں اتنی زیادہ مقدار میں ہوتے ہیں کہ سیب اور سنگترہ بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بالعلاوہ دیگر پتوں میں جوہر حیات بھرا رہتا ہے۔

دودھ جسے ہم ایک اعلیٰ غذا کہتے ہیں انہیں ساگوں اور سبزیوں کا دوسرا روپ ہے۔ ساگ اور دودھ ایک دوسرے کا بدل ہیں۔ جہاں دودھ نہ ملے وہاں سبزیاں بکثرت کھانے سے اس کی تلافی ہو سکتی ہے۔ گائے، بھینس، بیل، بکری وغیرہ جانوروں کو ہری گھاس اور سبز پتے نہ ملیں تو ان کی نشو و نما ہی رک جائے۔ دودھ میں تمام اناجوں کی بہ نسبت کیلسیم (چونا) کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اور یہ جانوروں کے دودھ میں سبز چارہ ہی کی بدولت ہے۔ دودھ ہماری صحت اور زندگی کے لئے بہت ضروری ہے اور دودھ کو یہ وصف سبز چارے ہی سے حاصل ہوا ہے۔ گرانی کے موجودہ دور میں جبکہ خالص دودھ ایک روپیہ سیر بھی بمشکل دستیاب ہوتا ہے، ماہرین کی رائے ہے کہ جو لوگ دودھ حاصل نہیں کر سکتے وہ سبز پتے دار ساگ اور سبزیاں استعمال کر کے دودھ کے فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ سبز پتے دار ساگ دودھ کی کمی کو یقیناً پورا کرتے ہیں۔ دراصل یہ ہرے پتوں کا رس ہی ہے

جسے کھا کر گائے بھینس دودھ میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

بچوں کی نشو و نما اور پرورش کے لئے ساگ اور سبز ترکاریاں بہت ضروری ہیں اور اگر ان میں بچپن ہی سے ساگ اور سبزیوں کی رغبت پیدا کی جائے تو یہ عادت زندگی بھر ان کی صحت کی حفاظت کرتی ہے۔ بچے جب دودھ سے ٹھوس غذا کی طرف آنے لگیں تو انھیں پالک وغیرہ نرم ساگ اور سبزیاں خوب اچھی طرح پکا کر دی جائیں۔

مدیر بیسویں صدی تک کے تجربات کے مطابق سبزیوں میں جو ہرا رنگ ہے وہ کھانے کے بعد جسم کے اندر خون میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سبز پتوں والے ساگ نمک اور معدنیات کی کان ہیں۔ خون میں تیزابی مادہ بڑھ جانے سے انسان مختلف امراض میں گرفتار ہو جاتا ہے اور خون میں نمکیات کی مقدار بڑھنے سے امراض سے نجات مل جاتی ہے اس لئے ساگ سبزیاں کھانے سے انسان امراض سے بچا رہتا ہے۔ ان میں خون کی صفائی کرنے والے اجزاء بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس لئے خون کی خرابی سے پیدا شدہ امراض سبزیوں کے استعمال سے دور ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہرے پتے والے ساگ کھانے سے کوڑھ کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ سبزیاں امراض جلد خارش، پھوڑے پھنسی کے لئے بھی مفید ہیں۔

ساگ اور سبز ترکاریوں میں ریشے زیادہ ہوتے ہیں۔ آنتوں میں ریشے پہنچنے سے آنتوں کی صفائی ہو جاتی ہے اور قبض سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ قبض کے باعث آنتوں میں فضلہ کی سڑاند پیدا ہونے سے اکثر بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور سبز ترکاریاں کھانے سے انسان متعدد امراض سے محفوظ رہتا ہے۔

حاملہ عورتوں اور دودھ پلانے والی ماؤں کے لئے سبز ترکاریاں اور ساگ اکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔ اس سے زچہ اور بچہ دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ماں کا دودھ بڑھتا ہے اور بچے کو صحت مند دودھ حاصل ہوتا ہے۔

کچی سبزیاں کھانا زیادہ سود مند ہے۔ پکانے سے وٹامنز ضائع ہو جاتے ہیں۔ انھیں پانی کے بغیر یا نرم آنچ پر تھوڑے سے پانی میں پکانا چاہئے جو پکتے پکتے انھیں میں جذب ہو جائے۔ کچی سبزی کھانا بہت مفید ہے۔ گاجر، مولی، ٹماٹر، شلغم، کھیرا، پیاز اور سلاد وغیرہ کچے کھائے جا سکتے ہیں۔

سبزیاں وزن میں ہلکی اور حجم میں زیادہ ہوتی ہیں۔ اس لئے ہاضمہ میں مدد دیتی ہیں۔ اور قبض نہیں ہونے دیتیں۔

اروی، آلو، چقندر، شکر قندی اور کئی سبزیوں میں نشاستہ کی مقدار گندم اور چاول کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔

مٹر، فراش بین، باکلا، سیم وغیرہ میں پروٹین کافی ہوتی ہے۔ اس لئے انھیں غذا میں کافی استعمال کرنا چاہئے۔

سبزیاں صحت کا گرانمایہ مطلب ہیں۔ ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہئے۔

۲ ــــــ سگریٹ نوشی کی تباہ کاریاں

سگریٹ نوشی کے مہلک اثرات کے متعلق آپ بہت کچھ جانتے ہوں گے، بہت کچھ پڑھ چکے ہوں گے۔ لیکن اس بارے میں بہت کچھ جانتے ہوئے بھی لوگ اس مہلک عادت کو ترک نہیں کرتے یا اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ اس لئے بار بار خطرے کا الارم بجاتے رہنا ضروری ہے

ڈاکٹر کلارنس لیپ نے لکھا ہے ــــ "صحت مند اور تندرست لوگوں کے لئے سگریٹ نوشی حد درجہ مضر ہے ہی، لیکن جن کی صحت اچھی نہ ہو، اُن کے لئے میری رائے ہے وہ فوراً سگریٹ پینا چھوڑ دیں۔ صرف چار ہفتوں کے لئے۔ اور چار ہفتے کی بعد کی صحت کا پچھلی صحت سے مقابلہ کر کے دیکھیں کہ اُس میں کتنی تبدیلی ہوئی ہے۔ طبیعت میں نئی جولانی پیدا ہوئی ہے، بھوک بڑھی ہے۔ اپنے تندرست ہونے کا احساس پیدا ہوا ہے؟ اگر آپ کو اپنے میں یہ تبدیلیاں محسوس ہوں تو سمجھ لیجئے کہ سگریٹ چھوڑنے سے پہلے آپ کی زندگی زہر آلود ہو گئی تھی۔"

ڈاکٹر اسٹیورٹ آر۔ رابرٹس نے لکھا ہے ــــ "سگریٹ پینے والے کا دل کمزور ہو جاتا ہے ــــ اور جب دل ڈوبا تو سب کچھ ڈوب گیا۔"

ڈاکٹر ہارڈے، ڈبلیو۔ ویلی نے ایک موقع پر کہا تھا ــــ "تمباکو موت کا ایک قریبی رشتہ دار ہے۔ اس کا خاص زہریلا جزو نکوٹین ہوتا ہے، جو سگریٹ پینے والے کی ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے۔"

گذشتہ دنوں وزیر صحت نے لوک سبھا میں انکشاف کیا کہ امریکن ڈاکٹروں نے سگریٹ پینے کے نقصانات کے متعلق جو رپورٹ مرتب کی ہے حکومت اُس پر غور کر رہی ہے۔ حکومت سگریٹ کی تباہ کاریوں اور ایسے مہلک نتائج سے آگاہ ہے۔ جوں جوں سگریٹ پینے کی بدعت بڑھ رہی ہے لوگ پھیپھڑوں کے کینسر (سرطان) میں گرفتار ہو رہے ہیں۔ وزارت صحت نے عوام کو سگریٹ پینے کے نقصانات سمجھانے کے متعلق کئی طرح کے اقدامات کئے ہیں۔ سنیما گھروں، ریل کے ڈبوں اور بسوں میں سگریٹ نوشی کی ممانعت ہے۔

عوام سگریٹ نوشی کے مہلک نقصانات سے آگاہ ہونے کے باوجود اس مہلک عادت سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ سگریٹ کی نسبت حقہ اور پائپ کم نقصان دہ ہے۔ امریکن ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق ایک سگریٹ پینے سے انسان کی عمر چودہ منٹ کم ہو جاتی ہے۔

۳ ــــــ طویل عمر کا راز

اگر آپ صحت اور زندگی کے اصولوں پر نظر رکھیں اور اُن پر کاربند رہیں تو یقیناً

اپنی عمر میں دس سال کی مدت کا اضافہ کرسکتے ہیں۔

ڈاکٹر ہنڈرسن اور دوسرے ڈاکٹروں نے مشورہ دیا ہے کہ اگر آپ زیادہ عرصے تک جینا چاہتے ہیں تو پریشان ہونا چھوڑ دیجئے۔ ذہنی انتشار اور پریشانیاں صحت کے لئے اتنی ہی نقصان دہ ہیں جتنے خوفناک جراثیم!

ادھیڑ عمر کے لوگوں کو دن کا کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر کچھ آرام کرنا چاہئے۔ اس عمل سے غذا ہضم کرنے میں معدہ کو مدد ملتی ہے۔

بحث و مباحثہ اور لوگوں سے تلخ و ترش باتیں کرنے سے بچئے۔ لوگوں کو سمجھنے اور خود کو سمجھانے کی کوشش کیجئے۔ اس طرح آپ بہت سی ناخوشگواریوں اور پریشانیوں سے بچ سکتے ہیں۔

مشہور ماہر حیات ڈاکٹر فریڈرک نے ایک موقع پر کہا تھا ــــــ اگر ہم صحیح طریقے سے زندگی گزاریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہر آدمی اپنی عمر میں دس سال کا اضافہ نہ کرسکے۔

کئی بیماریاں صرف ذہنی اضمحلال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ افسردگی، پریشانی، بےچینی، بےکیفی، بےاطمینانی، نفرت ایسی بیماریاں ہیں جو زندگی کی توانائی اور اس کی قوتوں کا شیرازہ بکھیر دیتی ہیں۔ نیز موت اور تباہی کو دعوت دیتی ہیں۔

۴ ــــــ دروازہ بند کردو!

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن کے حکیمانہ مشوروں نے کتنی زندگیوں کو سنوار دیا ہے اور زندگی سے مایوس بےشمار لوگوں کو نئی زندگی بخش دی۔

ڈاکٹر موصوف نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے ــــــ جو باتیں تمہاری طبیعت کو برگشتہ کردیتی ہیں، تمہارے دماغ کے توازن کو قائم نہیں رہنے دیتیں، انھیں بھول جاؤ ــــــ تم اگر مایوس رہتے ہو تو مایوسی کو چھوڑ دو۔ رنج اور فکر کو دل سے اس طرح نکال دو جس طرح چور کو باہر دھکیل دیا جاتا ہے۔ اپنی ساری کمزوریوں کے لئے دروازہ بند کردو اور اسے بند ہی رکھو۔ خوش دلی اور خوش باشی کے انتظار میں نہ رہو کہ وہ خودبخود آئے گی۔ اس کے پیچھے جاؤ، اس کا تعاقب کرو۔ اسے دعوت دو اور اپنے پاس سے جانے ہی نہ دو۔

تکلیف دہ باتوں کے گزر جانے پر انھیں پھر یاد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم انھیں یاد رکھوگے، بار بار دہراؤگے تو نقصان ہی نقصان ہوگا۔ سکون اور اطمینان کی کئی گھڑیاں کھو بیٹھوگے۔ اس لئے تکلیف دہ یادوں، تکلیف دہ باتوں کو بھول کر پھر نئے سرے سے کام شروع کردو۔ نئے عزم کے ساتھ زندگی کے میدان میں کامیابی و کامرانی کی منزل کی طرف قدم بڑھاؤ ــــــ ایسا کروگے تو تم یہ دیکھ کر حیران رہ جاؤگے کہ تمہاری زندگی میں جیسے ایک انقلاب آگیا ہے اور تمہارے گرد و پیش کے لوگ بھی تمہیں ایک نیا انسان، ایک بدلا ہوا انسان سمجھنے لگے ہیں۔

اس لئے آج ہی مایوسی کو چھوڑ دو۔ رنج اور فکر کو دل سے اس طرح نکال دو جس طرح چور کو باہر دھکیل دیا جاتا ہے۔ اپنی ساری کمزوریوں کے لئے دروازہ بند کردو!

۵ ــــــ صرف ہوائی قلعے نہ بنائیے

دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو کچھ کرتے نہیں، صرف دن رات سوچتے رہتے ہیں۔ بڑی بڑی اسکیمیں بناتے ہیں، ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہیں، سہانے خواب دیکھتے ہیں لیکن ان کے خواب کبھی تعبیر آشنا نہیں ہوتے۔ ان کے خواب کبھی حقیقت نہیں بنتے۔

ایسے لوگوں کے لئے ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ــــــ بہت سے انسان ایسے بھی ہیں جو دن رات ہوائی قلعے بناتے رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کبھی نہ کبھی سب کے دن پھرتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے بُرے وقت کے گزرنے اور اچھا وقت آنے کا انتظار کرتے ہیں لیکن اچھا وقت ایسے لوگوں کی زندگی میں کبھی نہیں آتا۔ دولت کسی کے آنگن میں نہیں برستی۔ وہ ہمیشہ دولت کی آرزو میں جیتے ہیں۔ وہ یہ کبھی نہیں سوچتے کہ دولت صرف ہوائی قلعے بنانے سے نہیں آسکتی۔ ان کا یہ مقصد بغیر جد و جہد کے پورا نہیں ہوسکتا۔ ایسے لوگ ہمیشہ ناکامی اور نامرادی کی زندگی بسر کرتے رہتے ہیں۔

۶ ــــــ ایک بڑا خزانہ، جس کے آپ مالک ہیں

ہر انسان کے پاس ایک بڑا خزانہ ہے جس کا وہ مالک ہے لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھیں اس کا علم ہے یا جو اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ڈاکٹر نپولین ہل نے ایک جگہ لکھا ہے ــــــ دولت حاصل کرنے کی خواہش ایک عالمگیر خواہش ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اپنی زندگی میں یہ خواہش پوری کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس راز سے واقف نہیں کہ وہ ذخیرہ، وہ خزانہ ان کے ذہن کی گہرائی میں دفن ہے۔ انھیں اس بات کا علم نہیں کہ ان کی دولت کا سرچشمہ خود ان کا دماغ ہے۔

لوگ زندگی بھر دولت اور شہرت حاصل کرنے کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی تگ و دو، اپنی کوشش میں ناکام رہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اس راز سے واقف نہیں کہ وہ دولت ان کے ذہن کی گہرائیوں میں دفن ہے۔

وہ ذہن جو بیدار ہو۔ وہ دماغ جو منظم اور کسی مقصد کے حصول میں لگا ہو وہ ایسی زبردست طاقت بن جاتا ہے جس کے سامنے شکست کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ شکست کو لے کر اسے ایسا منظم کرتا ہے کہ وہ فتح میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اور بڑی سے بڑی رکاوٹوں کو مٹا دیتی ہے اور انسان کے ہر خواب کو حقیقت بنا دیتی ہے۔



سوال و جواب

سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔

(ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

محمد نسیم اختر۔ کلکتہ

س۔ عورت کیا ہے؟

ج۔ شعلہ و شبنم کا حسین امتزاج!

س۔ بہت کوشش کرنے کے باوجود بھی اگر کامیابی حاصل نہ ہو سکے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ کوشش جاری رکھنی چاہئے۔ مایوس نہ ہونا چاہئے۔

محمد انعام الحق۔ چکر دھر پور

س۔ زندگی خواب ہے یا شراب۔ حباب ہے یا حجاب؟

ج۔ زندگی شراب ہے نہ حجاب، نہ حباب ہے نہ خواب۔ زندگی ایک درخشندہ و تابندہ حقیقت ہے!

س۔ لوگ کہتے ہیں علامہ اقبال شراب پیا کرتے تھے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے

س۔ زندگی پر کوئی پسندیدہ شعر سنایئے۔

ج۔ سنئے ؎

زندگی بزمِ طرب بھی رسن و دار بھی ہے
زندگی پھول سے نازک بھی ہے تلوار بھی ہے

عبدالعزیز جنجوعہ۔ شیخوپورہ (پاکستان)

س۔ ایک ادیب کی زندگی کا نصب العین؟

ج۔ خدمتِ ادب، خدمتِ خلق!

س۔ عورت کا انتقام؟

ج۔ عورت جتنی نرم و نازک ہے، اُس کا انتقام اُتنا ہی شدید ہوتا ہے۔

س۔ کسی قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے تو کب نازل ہوتا ہے؟

ج۔ کوئی قوم جب زیادہ بُرائیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اُس پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ اقوامِ عالم کی تاریخ اِس حقیقت کی شاہد ہے۔

ایم۔ زین الحق۔ ڈلٹن گڑھ

س۔ زندگی ایک موڑ ہے۔ شادی ایک زنجیر ہے تو حُسن....؟

ج۔ حُسن اس موڑ کو اور حسین بنا دیتا ہے۔

س۔ اگر ارمان بھرے دل میں آگ لگ جائے تو؟

ج۔ سمجھداری سے آگ بُجھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

قیصر رعنا۔ ہزاری باغ

س۔ انسان کس وقت خودکشی پر آمادہ ہوتا ہے؟

ج۔ جب عزم و حوصلہ کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔

س۔ آج کل انسان انسان سے دوستی نہیں کرتا دولت سے دوستی کرتا ہے۔ ایسا کیوں؟

ج۔ اِس لئے کہ آج کل دولت ہی سب کچھ ہے۔

سید وصی حیدر۔ گیا

س۔ ادیب عموماً غریب دیکھے جاتے ہیں۔ ایسا کیوں؟

ج۔ ادیب اپنا دماغ، اپنا وقت، اپنا سب کچھ ادب پر قربان کر دیتے ہیں، پھر غریب نہ ہوں گے تو کیا امیر ہوں گے۔

س۔ پھول کو چھوڑ کر عورت کو کس چیز سے تشبیہ دیں گے؟

ج۔ چاندنی سے، کرن سے، کلی سے، خوشبو سے۔

س۔ اگر پھول نہ ہوتا تو ہار کس چیز کا بنتا؟

ج۔ آنسوؤں کے تاروں کا!

زینب [illegible] ناگپور

س۔ آسمان پر چمکتے ہوئے تارے کس کے منتظر رہتے ہیں؟

ج۔ جو تاروں کی [illegible] بیدار رہتے ہیں۔ جو تاروں کی طرح اپنی منزل کی طرف گرمِ سفر رہتے ہیں۔

س۔ پھول اور چاندنی؟

ج۔ کرنیں اور کلیاں! یہ دونوں کسی افسانے کا حسین عنوان ہو سکتے ہیں۔

س۔ منزل سے بھٹکے ہوئے راہی کا انجام؟

ج۔ حسرت ناک ہوتا ہے۔

ایم۔ کمال احمد جھاجھا

س۔ عورت مرد کی نظر سے کب گر جاتی ہے؟

ج۔ جب مرد کی نظر بصارت سے محروم ہو جاتی ہے!

س۔ شراب اور شباب دونوں میں کس کا نشہ بُرا اور نقصان دہ ہوتا ہے؟

ج۔ دونوں کا نشہ بُرا ہوتا ہے۔ ہر نشہ بُرا ہوتا ہے۔ تباہ کن ہوتا ہے۔

....

س۔ زندگی کیا ہے؟

ج۔ ع زندگی ہے غم و مسرت کا
مختصر اور طویل افسانہ

س۔ انسان کو اپنی زندگی میں کیا کرنا چاہیے؟

ج۔ ایسے کام جن سے زندگی قابلِ رشک بن جائے۔

س۔ تاریک دل میں جب نہ ہو اُمید کی کرن؟

ج۔ اُمید کی شمع پھر فروزاں کر لینی چاہیے۔

داؤد خاں۔ جن پٹن (بنگلور)

س۔ آج کل لڑکیاں، لڑکیوں کے کالج ہوتے ہوئے بھی لڑکوں کے کالج میں کیوں پڑھتی ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ اُن کے مغرب زدہ والدین یہی پسند کرتے ہیں۔

س۔ عورتوں کی سینما بینی سے پردہ دار عورتوں اور بے پردہ عورتوں پر کیا اثر ہوگا؟

ج۔ بہت بُرا۔ بے حد تباہ کُن!

س۔ اگر بیسویں صدی لڑکیاں پڑھیں تو بیسویں صدی کا مطالعہ اُن پر کیا اثر چھوڑے گا؟

ج۔ اگر کبار مردوں کی طرح لڑکیاں بھی بیسویں صدی پڑھتی ہیں اور اِس سے زندگی کے ہر موڑ سے گزرنے کے لئے روشنی پاتی ہیں۔

نذر النبی بوگرا۔ مشرقی پاکستان

س۔ غریب ہر وقت اپنی قسمت کو کیوں کوستا رہتا ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ وہ کم نظر یہ سمجھتا ہے کہ اُس کی غربت کا باعث اُس کی حوصلہ کی پستی نہیں، اُس کی قسمت ہے۔

س۔ ایک غریب کی آرزوئیں تڑپ کر کیوں رہ جاتی ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ وہ امیروں سے اپنا حق لینے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔

س۔ ایک غریب محنت کرنے کے بعد بھی روٹی سے محتاج رہ جائے تو؟

ج۔ ہم اُس سے کہیں گے ــــ

اے شکوہ سنجِ شوخیٔ تقدیر دیکھنا
ذوقِ عمل ہی تیرا کہیں خام تو نہیں

بجن پیا۔ ساپھرلا

س۔ اگر پھولوں کے بدلے کانٹوں سے پیار کریں تو؟

ج۔ بجن بھیا! یہ تو اور بڑی بات ہوگی۔ پھولوں سے تو سبھی پیار کرتے ہیں۔

س۔ کہتے ہیں وقت پر گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔ اگر گدھا باپ بننے سے انکار کرے تو؟

ج۔ یہ [illegible] جس نے گدھے کو سر گرفتہ کر دیا ہے۔

سید محمد علی کاظمی۔ شیش محل بہانسہ

س۔ بیسویں صدی کے عاشق کی معراج؟

ج۔ محبوبہ کے سینڈلوں سے مزاج پرسی!

س۔ جوش کے اِس شعر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

اوروں کو جو روزی سے لگانے پہ مُصر ہے
چُپ کرنے کی خاطر اُسے روزی سے لگا دو

ج۔ اِس شعر میں حقیقت کی نہایت کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔

باشو حنفی۔ کانپور

س۔ خوش تر بھائی! آپ کی ہر دلعزیزی کا راز؟

ج۔ حق گوئی، حق پسندی، خلوص و خدمت!

س۔ عورت کی سو فیصدی بُرائیوں میں ۹۹ فیصدی مردوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ آپ کی رائے؟

ج۔ آپ کا خیال سو فیصدی درست ہے۔

زکریا ناز۔ کلکتہ

س۔ زندگی خدا کی بخشی ہوئی ایک نعمت ہے تو موت کیا ہے؟

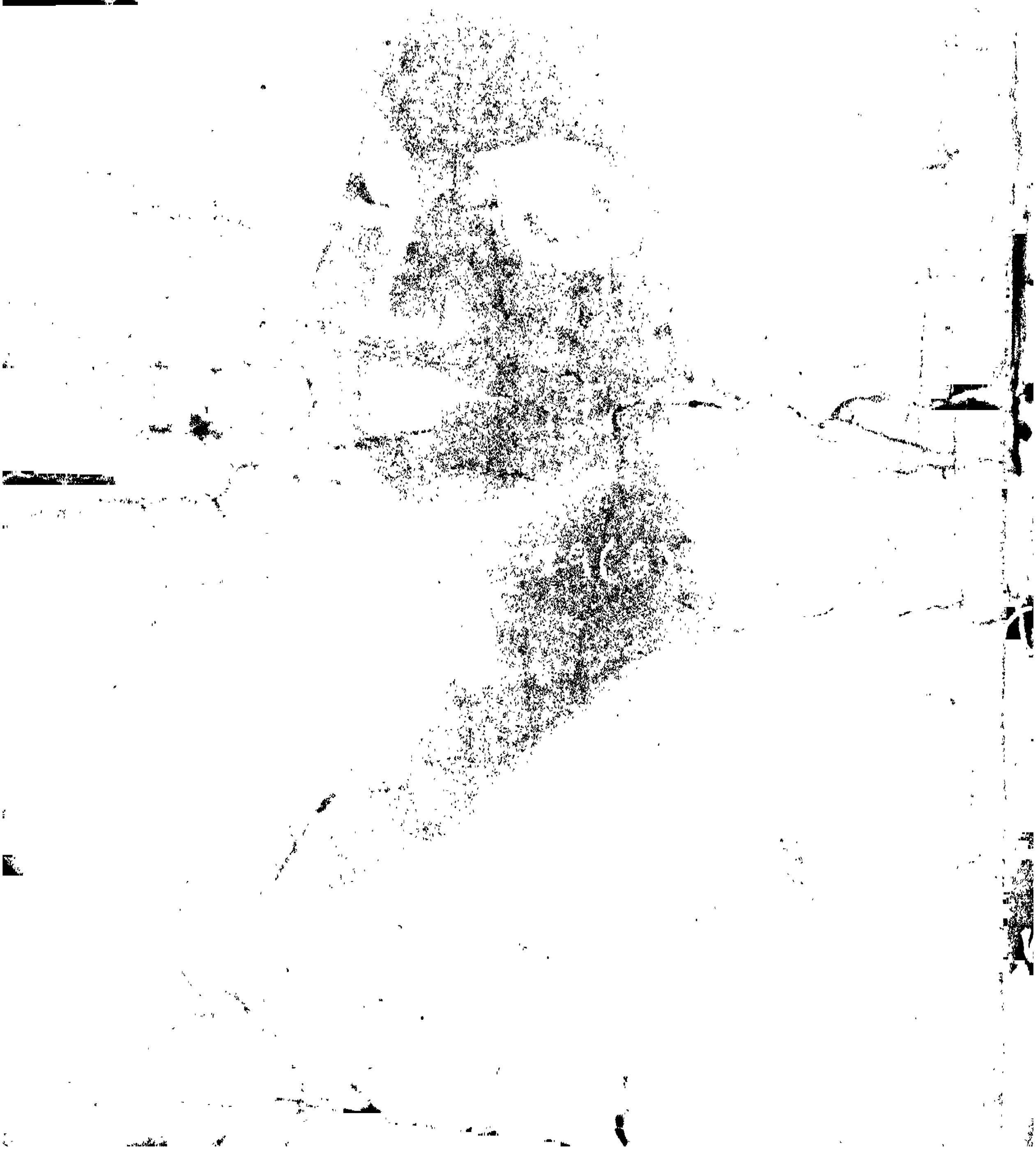
ج۔ ایک اٹل حقیقت!

س۔ جو اپنے علم اور عقل پر غرور کرتا ہو اُسے کیا کہنا چاہیے؟

ج۔ علم و عقل سے محروم و بے بہرہ!

س۔ زندگی کی راہیں اِتنی خطرناک اور پُر درد کیوں ہوتی ہیں؟

ج۔ یہ تو اپنے اپنے عزم و عمل پر موقوف ہے۔ انسان زندگی کی راہوں کو خطرناک بنالے یا خوشگوار و خوش منظر، پُر درد بنالے یا پُر مسرت۔



دِلّی کی ایک سُہانی شام



پچھلے دنوں جب اُردو کے نامور شاعر حضرت شکیلؔ بدایونی جشنِ شکیل کے سلسلہ میں دہلی تشریف لائے تو اُن کے اعزاز میں «بیسویں صدی» کی طرف سے عصرانہ دیا گیا۔ یہ اُسی عصرانے کا ایک منظر ہے جسے کیمرے کی آنکھ نے محفوظ کر لیا۔ دائیں طرف آسمانِ ادب کے «شکیل و جمیل» اور درخشاں و تابناک ستارے پہلو بہ پہلو موجود ہیں یعنی ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اور جناب شکیل بدایونی۔ ان کی مشہور ... اور جن کی تصنیف (شکیل بدایونی کی رومانی شاعری) اُردو کے اِس نامور شاعر کی خدمت میں پیش کی گئی۔ جو آج بھی ... شیرینی کی اُن روایتوں کو گلے سے لگائے ہوئے ہے جو جگر مرحوم کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور اُن کے ساتھ ہیں آپ ... جنھیں آپ اُن کے تیروں اور نشتروں کی وجہ سے جانتے ہیں۔ اور اِن کے بعد ہے دلّی کی باغ و بہار شخصیت ... بندۂ خلوص جناب ضیاءؔ فتح آبادی جو اپنی سنجیدہ شخصیت کی طرح شعر بھی سنجیدہ ہی کہتے ہیں اور اُستادوں سے داد پاتے ہیں۔ اِن کے ... جناب بہار برنی جو شاعر بھی ہیں اور مقرر بھی، صحافی بھی ہیں اور مقالہ نگار بھی۔ اور آخر میں جو صاحب نظر آ رہے ہیں ... شہزادۂ گلفام جناب ساحرؔ ہوشیارپوری جن کے اشعار لوگ اُنھیں کے سامنے چوری کر کے مشاعروں میں سُناتے ہیں اور داد پاتے ...

ج۔ بیماروں کا
کی طرح ایک
س۔ پھول اور م
ج۔ کرنیں یا ور کا
عنوان ہوتا
س۔ منزل سے پہنچ
ج۔ حسرت ناک

ایم۔
س۔ عورت مرد کی نظر ...
ج۔ جب مرد کی ...
س۔ شراب اور ...
اور نقصان
ج۔ دونوں کا ...
تباہ کُن ہوتا

س۔ زندگی کیلئے
ج۔ ...
س۔ انسان کو ...
ج۔ ایسے کام ...
س۔ تاریک دل
ج۔ اُمید کی شمع

داؤد خار
س۔ آج کل لڑکو
لڑکوں کے



جنّت بکف

فوٹو: محفوظات ۔ لاہور



ط لب پہ ہنسی جو آئی حیا اور بڑھ گئی



یہ جسمِ جواں جیسے طلسمات کا عالم

فوٹو محمود شاہد۔ لاہور



کیا اسی مجموعۂ گُل کا گلستاں نام ہے؟

فوٹو: محمد احمد علی، علی گڑھ

بیسویں صدی

جون ۱۹۶۵ء

جلد —— ۲۹

نمبر —— ۶



سالانہ قیمت خاص نمبر سمیت ہندوستانی و پاکستانی
سکۂ رائج —— بارہ روپے
ممالک غیر —— ۲۰ شلنگ

قیمت فی پرچہ

پتہ
رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

علم و ادب کی دنیا میں زبردست [illegible]

اور شان و شوکت کے ساتھ [illegible]

افسانہ نمبر گوناگوں جدتوں اور ندرتوں کا حامل ہوگا۔ مضمون نگار حضرات جلد اپنی تخلیقات روانہ فرمائیں طویل افسانوں پر [illegible]

سالانہ خریدار بننے کا طریقہ "بیسویں صدی" کے پاکستانی [illegible]

منی آرڈر سے "جناب زاہد میاں [illegible]

کے الفاظ ضرور لکھیئے منی آرڈر کی رسید جو پوسٹ آفس سے ملتی ہے ہمیں بھیجدیجئے۔ رسید ملتے ہی [illegible]

خدمت ہوتا رہے گا ——— خریدار بننے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی مقامی بنک کو یہ درخواست دیں [illegible]

سالانہ قیمت مبلغ [illegible] روپے کے عوض [illegible] ڈرافٹ دیا جائے۔ اس درخواست پر آپ کو ڈرافٹ [illegible]

لفافہ ملتے ہی رسالہ آپ کے نام جاری ہو جائے گا۔ سالانہ قیمت بذریعہ پوسٹل آرڈر ہرگز نہ بھیجیں [illegible]

بیسویں صدی کے لئے اعلیٰ پایہ کی حسین اور [illegible]

بیسویں صدی دہلی

کانگریس کا عیب نہیں ہو سکتی" وزیر ریلوے شری
ہو کر ہو تو دنیا کا کوئی ملک ہی مل گیا ہے؟ جو تنظیم کی جانچ

[illegible] کی ترقی کا تعین" ایک خبر ــــ شری مرارجی ڈیسائی ـ

کے لئے وزیروں کو بلایا گیا لیکن کوئی نہیں آیا" ایک خبر
یا اہم کاموں میں مصروف ہوں گے۔ شلاً ــــ
ہوگا۔
ہوگا۔
ہوگی یا چائے پارٹی ہو رہی ہوگی۔
سپاسنامہ پیش کر رہا ہوگا۔
اور رشتہ داروں کو پرمٹ اور کوٹے تقسیم کئے جا رہے ہوں گے۔

کے موجودہ وزراء ملک کو تباہ کر دیں گے" ایک عنوان ــــ
[illegible] ہیں وہ اقتدار کے نشے میں مست ہیں۔ وہ بھی بقید

"ایک عنوان" [illegible]

[illegible] ایک بیان ــــ بالکل غلط
[illegible] سے بچنا مشکل ہے۔

[illegible] لاکھ روپیہ کا نقصان" ایک خبر
[illegible] کے منافع بخش طریقے کے باوجود۔

"متوسط طبقہ" ایک عنوان ــــ جس کے لئے سفید کپڑے پہننا مشکل ہو گیا ہے۔

"دنیا کا سب سے بڑا المیہ" ایک عنوان ــــ ظاہر ہے سب سے بڑے جانور ہاتھی کا ہوگا۔



"حکومت پر کانگریسیوں کی نکتہ چینی سے شاستری جی کو دکھ ہوا۔"

علم و ادب کی دنیا میں زبردست تاریخی حیثیت لئے ہمیشہ کی طرح اِس بار بھی نہایت آب و تاب اور شان و شوکت کے ساتھ آئندہ ماہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ لحاظ سے افسانہ نمبر گوناگوں جدتوں اور ندرتوں کا حامل ہوگا۔ مضمون نگار حضرات جلد اپنی تخلیقات روانہ فرمائیں طویل افسانوں پر مختصر افسانوں کو ترجیح دی جائے گی۔

(سالانہ خریدار بننے کا طریقہ) "بیسویں صدی" کے پاکستانی خریداروں کے لئے سالانہ قیمت بھیجنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ "منی آرڈر سے" جناب زاہد میاں نیو ٹاؤن، کراچی" کو بھیجدیں۔ کوپن پر "سالانہ قیمت رسالہ بیسویں صدی دہلی" کے الفاظ ضرور لکھیئے۔ منی آرڈر کی رسید جو پوسٹ آفس سے ملتی ہے ہمیں بھیجدیجئے۔ رسید ملتے ہی "بیسویں صدی" آپ کے نام فوراً جاری ہو جائے گا۔ اور سال بھر تک حاضر خدمت ہوتا رہے گا ——— خریدار بننے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی مقامی بنک کو یہ درخواست دیں کہ وہ "بیسویں صدی" دہلی کے سالانہ خریدار بننا چاہتے ہیں۔ اِسلئے "بیسویں صدی" کی سالانہ قیمت مبلغ بارہ روپے کے عوض ایکسچینج ڈرافٹ دیا جائے۔ اِس درخواست پر آپ کو ڈرافٹ مِل جائے گا۔ جسے آپ بذریعہ رجسٹری "بیسویں صدی" دہلی کے نام بھیجدیں۔ رجسٹری لفافہ ملتے ہی رسالہ آپ کے نام جاری ہو جائے گا۔ سالانہ قیمت بذریعہ پوسٹل آرڈر ہرگز نہ بھیجیں۔ پوسٹل آرڈر راستے میں ضبط کر لیے جاتے ہیں۔

تیر و نشتر

"ہم ضمنی الیکشنوں میں کانگریس کامیاب نہیں ہو سکتی" وزیر ریلویز شری ... کا بیان ——— کیا اب آپ کو جیوتش ودیا کا ملکہ بھی مل گیا ہے؟ جیوتشی جی مہاراج ... کی قدر نہ کیجئے۔ اپنی بتائیے۔

"دلّی میں شراب کی نئی دوکانیں" ایک خبر ——— شری مرار جی ڈیسائی ان کے ... تعزیر کریں۔

"کابینہ میٹنگ کے لئے وزیروں کو بلایا گیا۔ لیکن کوئی نہیں آیا" ایک خبر ——— وہ اس سے زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہوں گے۔ مثلاً ———

کوئی ایٹ ہوم ہوگا۔
ڈنر چل رہا ہوگا۔
چائے نوشی ہو رہی ہوگی یا چائے پارٹی ہو رہی ہوگی۔
کہیں کوئی سپاسنامہ پیش کر رہا ہوگا۔
دوستوں اور رشتہ داروں کو پرمٹ اور کوٹے تقسیم کئے جا رہے ہوں گے۔

"شراب کے عادی وزرا ملک کو تباہ کر دیں گے" ایک عنوان ——— جو شراب کے عادی نہیں ہیں وہ اقتدار کے نشے میں بدمست ہیں۔ وہ بھی بقید ... حواس نہیں ہیں۔

"امداد باہمی کی تحریک کو کامیاب بنائیے" ایک عنوان ——— اور قرضے لے کر مزے اڑائیے۔

"یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ حکومت سو رہی ہے" ایک بیان ——— بالکل غلط ... سوتے کو تو جگایا جا سکتا ہے اور وہ چونکہ جاگ رہی ہے، اُسے جگانا مشکل ہے۔

"دلّی میں دودھ کی سرکاری سپلائی۔ ۲۲ لاکھ روپے کا نقصان" ایک خبر ——— اس ملاوٹ کے منافع بخش طریقے کے باوجود۔

"متوسط طبقہ" ایک عنوان ——— جس کے لئے سفید کپڑے پہننا مشکل ہو گیا ہے۔

"دنیا کا سب سے بڑا انڈا" ایک عنوان ——— ظاہر ہے سب سے بڑے جانور ہاتھی کا ہوگا۔



"حکومت پر کانگریسیوں کی نکتہ چینی سے شاستری جی کو دُکھ ہوا۔"



"پنجاب میں مقراشناس کونونشن" ایک خبر ——— شریمان ماسٹر تارا سنگھ، سوامی رامیشورانند اور مولوی عبدالغنی کا خیال رکھا جائے۔

"نیز چینی لیڈروں کی دعوت کا انتظار کر رہا ہے" ایک خبر ——— سانپ، بچھو، چوہے اور مینڈک کھانے کے لئے بے چین ہے۔

"عوام کو شراب نوشی کے نقصانات سے واقف کرایا جائے" ایک عنوان ——— اور اُن وزراء کی خبر نہ لی جائے جن پر مرارجی ڈیسائی نے بر سرِ عام شراب نوشی کا الزام لگایا ہے۔

"دہلی ملک اسکیم میں بھی بد انتظامی" ایک عنوان ——— آپ کو یہ غلط فہمی کیوں ہوئی کہ وہ بیچ میں دور ہو گئی تھی۔

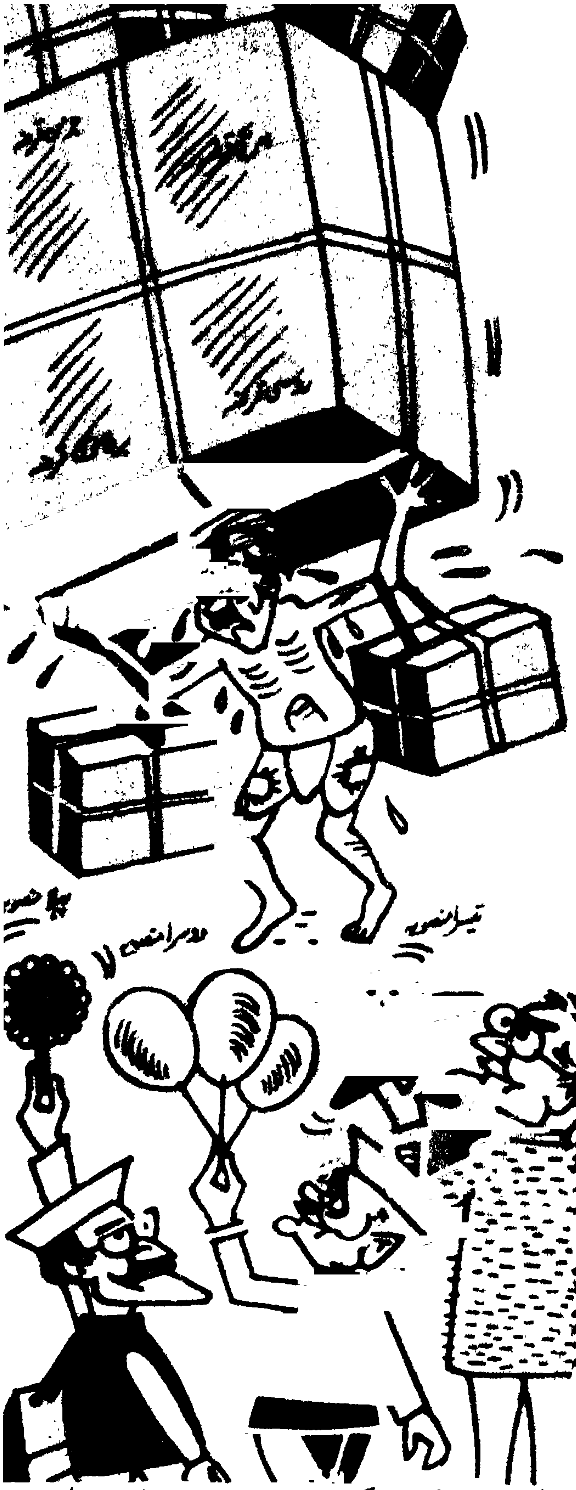
"گنے کی قیمت میں اضافہ نہیں ہوگا" وزیرِ خزانہ ——— بلکہ چینی کی قیمت بڑھائی جائے گی۔

"ہمالیہ کو سر کرنے والی بھارتی مہم" ایک عنوان ——— بھارت سرکار کی ہمالیائی غلطیوں کا ازالہ کریگی۔

"یو۔پی میں تین لاکھ بیکار" ایک خبر ——— سب کو کانگرس میں بھرتی کردہ کام میں لگ جائیں گے۔ عہدوں کے لئے جدوجہد اور باہمی رسہ کشی میں مصروف ہو جائیں گے۔

"سیمنٹ پر کنٹرول جاری رہے گا" لوک سبھا میں اعلان ———
تاکہ بلیک کرنے والے مزے اڑائیں۔
تاکہ مالک مکان مرمت نہ کرانے کا عذر پیش کر سکیں۔
تاکہ کرایہ داران مرمت کے عذر سے کرایہ روک سکیں۔
تاکہ محکمہ سول سپلائز والوں کے وارے نیارے رہیں۔

"ٹھروں کی حالت بہتر بنانے کی کوشش" ایک عنوان ——— کیا اس مقصد کیلئے امریکہ یا روس سے کوئی مشینری منگائی جا رہی ہے۔



"ہندوستان قرضوں کے بوجھ سے دبا جا رہا ہے": پارلیمنٹ میں تقریر۔

"اور اب راجستھان کے چیف منسٹر..." ایک عنوان ——— کی باری آئی ہے
اب جگر تھام کے بیٹھو۔

"آگرہ دیا جائے گا لکھنؤ میں پکار" ——— یوں چلانے سے کیا ہوتا ہے۔
——— سیدھا انسپکٹر کو تار دیجئے۔

"لاکھوں طلبہ کے پاس کتابیں نہیں": ایک خبر ——— صرف گیس پیپر لیں،
کام چل جائے گا۔

"پنجاب کے سرکاری ملازموں کو رعایت": ایک خبر ——— وہ کانگریس کے
ممبران کر دھڑے بندی میں حصہ لے سکتے ہیں۔

"بھارت ایک غیر ایشیائی دلش ہے": سوکارنو ——— کولمبس کی دریافت
سے زیادہ قابل قدر دریافت۔

"یو۔پی میں اناج کی بلیک زوروں پر": ایک خبر ——— اس لئے کہ سرکاری
پارٹی آپس کی رسہ کشی میں مصروف ہے۔

"وزیروں اور ممبروں کا ضابطۂ اخلاق": ایک عنوان ——— قطعاً غیر ضروری
ہے۔ ضابطے اور قاعدے جنتا کے لئے ہوتے ہیں۔

"ہندوستان کا سپوت": ایک عنوان ——— جو خویش پروری اور اقربا
نوازی کرے۔

"ہسپتالوں کو وسعت دینے کے لئے ڈھائی لاکھ صرف کئے جائیں گے": ایک
عنوان ——— اس لئے مریض جلدی جلدی لائن میں لگ جائیں۔

"ٹریکٹر سے آگ لگ گئی": ایک خبر ——— یعنی اب ماچس کی جگہ بھی ٹریکٹر ہی
استعمال ہوں گے۔

[illegible] کے [illegible] دھوکے اور فریب سے [illegible] کر چکا ہے۔



"آزادی کو خطرہ پیدا ہوگیا ہے" شری گلزاری لال نندہ —— اور وزیر صرف تقریریں کر رہے ہیں

"ہر بچے کو مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے" راجہ مہدی علی خاں ——
بشرطیکہ وہ اُردو نہ ہو۔

"ہند و پاکستان میں گفت و شنید کا امکان تاریک ہوگیا" ایک عنوان ——
ڈالر کے چراغ روشن کیجیے تو ہر چیز کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔

"روس میں صدر ایوب کا ٹھنڈا استقبال" ایک عنوان —— ٹھنڈا تک ہو جانا۔

"سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اُردو کو اُس کا اصلی مقام نہیں ملتا" شری جمنا داس اختر
مدیر سویرا —— اِس پردے کی کیا ضرورت ہے۔ صاف کہیے ووٹ کی طلب
اُردو کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ الیکشن میں جن سنگھ کے پالا مارنے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔

"عوام صدر ایوب کے دور میں خوشحال اور مطمئن ہیں" ایک مقالہ —— لیکن
بیچارے سیاستدان بدحال اور غیر مطمئن ہیں۔

"دلی میں مسلم دور میں بھی کھلم کھلا شراب نہیں پی جاتی تھی" مرارجی ڈیسائی کی تقریر ——
گویا مورخِ اعظم صاحب کے خیال میں وہ شراب و کباب کا زمانہ تھا۔

"اپنے دل کا خیال کیجیے" ایک عنوان —— کبھی بھی یہ راگ الاپتا ہے
ع اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

"کاش مجھے جیل بھیج دیا جائے" شری لال بہادر شاستری کی خواہش ——
شری گلزاری لال نندا توجہ فرمائیں۔

"دنیا کی سب سے زیادہ چائے پینے والی قوم" ایک عنوان —— دلی کے علاقہ جامع مسجد
میں آباد ہے جہاں ہر پانچ قدم پر ایک چائے خانہ ہے اور جہاں عموماً ہر چائے خانے کی شان
رونق بڑھانے کے لیے آراستہ پیراستہ ہجڑے بیٹھے نظر آتے ہیں۔

"قوم کا سچا خادم" ایک عنوان —— آج کل یہ ہے نایاب شاید۔

... اس لئے کہ غیر ملکی بیتا ہے اور جب دستی پتنگ اڑائی جاتی ہے۔

"مرغی خانہ جل گیا" ایک خبر ـــــ مرغیاں اور انڈے ایک ساتھ فرار ہو گئے۔

"حکومت نے اُردو کے جائز حقوق تسلیم کرنے سے انکار نہیں کیا" ایک عنوان ـــــ انکار نہیں کیا مگر اقرار بھی نہیں کیا۔

"دس برس سے عشق کی سزا ایک ماہ قید" ایک خبر ـــــ اگر ہسپتال میں گزارنے کا حکم ملے تو مجرم جان و مال کو دعا دیگا۔

"اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" ایک عنوان ـــــ یہ وطیرہ ہے فرقہ پرستوں کا۔

"پندرہ برس میں پیداوار دوگنی کرنے کے اقدامات" ایک عنوان ـــــ

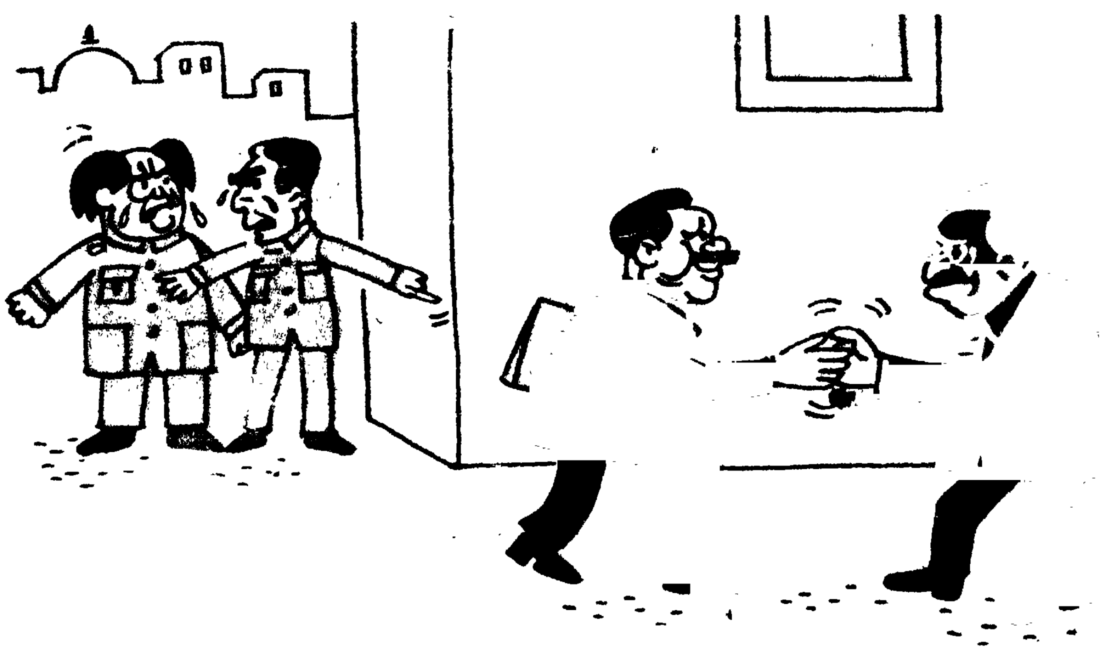
سب سے پہلے فیملی پلاننگ کا محکمہ توڑا جائے گا۔

"باوا آدم کے زمانے کے اسکول" ایک عنوان ـــــ اور ان میں حوا کے زمانے کے طالب علم۔

"کمیونٹی ڈویلپمنٹ منسٹری کی افادیت" ایک عنوان ـــــ ایک وزیر، ایک نائب وزیر، پرسنل سیکرٹری، جائنٹ سیکرٹریز، ہیڈ کلرک اور چپراسی برسر روزگار رہیں۔ اسٹیشنری کی بھی معقول کھپت ہو جاتی ہے۔

"تمام وزیروں کو ایک ہی زبان استعمال کرنی چاہیے" ایک عنوان ـــــ اور بہترین عام فہم زبان اُردو ہے۔

"قانون کا احترام قائم کرنے کے لئے وکلاء متحد ہو جائیں" پشاور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا بیان ـــــ جسے کرپٹ سیاستدانوں نے زبردست دھکا لگایا ہے۔



"صدر ایوب کا دورۂ روس" ایک عنوان ـــــ چاؤ ماؤ پر کیا گزری۔

حبیبہ

گوبندلاس ... روڈ، کھار، بمبئی ۵۲

... ۱۹۵۵ء

بلدرم خوشتر گرامی! تسلیم و نیاز

آپ نے میری طویل خاموشی کا مطلب غلط لیا۔ اتنے عرصے میں نے ... کہ ...

... میں شرکت نہ کرنے کا مجھے خود بڑا افسوس ہے ـــــــ خاموشی اس لئے بھی تھی کہ ...

... خط لکھنے سے اس خاموشی کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ جب کچھ ... تیار ہوا تو ... کی طرف سے بھیجے

دو افسانے حاضر ہیں۔ ایک "حبیبہ" میری لندن کی یادوں کی ایک تصویر۔ دوسرا افسانہ ...

افسانے پڑھ کر اپنی پسند، رائے اور رسید سے مطلع فرمائیے۔ خدا کرے آپ خوش و خرم ہوں۔

آپ کا ـــــــ کرشن چندر

خوبصورت عورت کا بڑھاپا بجھے ہوئے آتش فشاں پہاڑ کی طرح ہوتا ہے۔ اب لاوا برس چکا۔ آب و آتش کا طوفان گزر چکا۔ اب کریٹر کی تہہ میں کچھ گرم راکھ باقی ہے۔ جس میں کبھی کبھی چند شرارے چمکتے ہیں ـــــــ دِلّی میں میں نے حبیبہ کی نوجوانی کا سراپا دیکھا تھا اور اب لندن میں اُس کا بڑھاپا دیکھ رہا تھا ـــــــ بیچ میں تیس سال تھے!

"دِلّی کی وہ شام مجھے اکثر یاد آتی ہے۔" میں نے حبیبہ سے کہا۔ "جب میں نے تمھیں پہلی اور آخری بار انصاری کے گھر دیکھا تھا۔ تم نے جوتے اُتار دیے تھے اور قالیچے پر ٹہل رہی تھیں۔ یا یوں کہوں کہ ٹہل ٹہل کے مٹک رہی تھیں؟"

"اب کچھ بھی کہو۔" حبیبہ ایک اُداس تبسم سے بولی۔

"مجھے اجازت دو کہ میں تمھارا سراپا بیان کر سکوں۔ ذہنی سراپا۔ کیونکہ خوبصورت عورت محض جسم ہی تو نہیں ہوتی۔ وہ ایک تاثر ہوتی ہے۔ بار بار مجھے تمھارے جسم کا رنگ یاد آتا ہے۔ تمھارے انگ انگ سے نور یوں چھلک رہا تھا جیسے کانچ کی صراحی سے شراب کا رنگ جھلکتا ہے۔ وہ نور کس چیز کا تھا؟"

"اس تصور کا کہ میں خوبصورت ہوں!" حبیبہ ہنس کر بولی۔

"تمھاری وہ پُرکشش ہنسی اب تک باقی ہے! ـــــــ جانے کس طرح تم نے اِسے محفوظ رکھا ہے۔ میرے لئے یہ ایک معمّہ ہے۔ بہرحال تمھاری ہنسی آج بھی ... کے اِس موسم میں اٹلی کے آسمان کی یاد دلاتی ہے!"

"شکریہ!" حبیبہ میرا ہاتھ ذرا سا دبا کر بولی۔ "...اِس عمر کو پہنچ کر خوبصورت عورت ایک بھکارن بن جاتی ہے۔ تعریف کے ایک ایک ٹکڑے کو ترستی ہے!"

"مجھے یاد کر لینے دو وہ جسم!" میں نے کہا: "فالسئی غرارے کے ... میں جھمجھماتا ہوا۔ ریشمی جالی کے دھوئیں میں آگ کی طرح سُلگتا ہوا ـــــــ ... بانہوں میں تھرکتا ہوا۔ منہ زور اور رپٹ پڑنے کے لئے تیار... تمھارا حُسن خطرناک تھا۔ آج بھی یاد کرتا ہوں تو لگتا ہے کسی آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پہ کھڑا ہوا ... مگر جسم سے زیادہ تمھاری باتیں یاد ہیں۔ حسین عورت کی حماقت کی باتیں بھی الہامی درجہ رکھتی ہیں۔ مگر جب واقعی ایک خوبصورت عورت ذہانت کی باتیں بھی کرنے ... تو قیامت ہو جاتی ہے!"

"مزے کی بات یہ ہے کہ تم مجھے بالکل یاد نہیں ہو۔" حبیبہ بولی۔

"اُس وقت میں یاد رکھنے کے لائق نہ تھا۔" میں نے بتایا: "خوبصورت ...

زوال [illegible] ہے حقیقت ہوتی ہے۔ عورت کی زوال کمتر ہوتی ہے۔ مرد کی ادھوری اور [illegible] گی کا عالم بہت دیر میں آتا ہے۔"

[illegible] دیر سوچتی رہی۔ پھر مسکرائی۔ پھر ذرا رُک کر اکبارگی ہنس پڑی، جیسے صاف [illegible] اور چمکتے پانی کا فوارہ فضا میں بلند ہو گیا ہو۔ پھر یکایک ایسے چُپ ہو گئی [illegible] نے فوارے پر پاؤں رکھ دیا ہو۔ میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی [illegible] رہی تھی!

"میرا حُسن میرے لئے ہمیشہ ایک پرابلم رہا" وہ سوچ سوچ کر بولی "اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھے اپنے حُسن سے نفرت رہی ہے۔ یُوں تو ہوا ہی نہیں۔ کوئی مرد کسی عورت کی خوبصورتی سے اتنا پیار نہیں کرتا جتنا وہ خود کرتی ہے۔ مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی جیسا کہ تم کہتے ہو خوبصورتی کا ایک تاثر بھی ہوتا ہے۔ تو مرد ایسا کیوں کرتے ہیں؟ وہ اس تاثر کو خریدنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟ اگر تمہارے اندر کوئی خوبصورتی نہیں ہے تو تم باہر کی خوبصورتی خرید کر بھی کیا کرو گے۔ خوبصورتی کو بار بار ہاتھ لگانے سے کیا وہ خوبصورتی تمہاری ہو جائے گی؟ میں پُوچھتی ہوں گلاب کے پھول کا مالک آج تک کون ہوا ہے؟

میں یہ نہیں کہتی، شادی کرنا بُرا ہے۔ لیکن ملکیت کا یہ احساس یقیناً بُرا ہے۔ اور پھر مردوں کا یہ دوغلا پن! شادی سے پہلے میری جان! میری ڈارلنگ! کہتے کہتے مُنہ سوکھنے لگتا ہے، ہاتھ جوڑتے ہیں، ایک نگاہ کے لئے ترستے ہیں، گڑگڑاتے ہیں، پاؤں پڑتے ہیں۔ اور پھر شادی کرتے ہی گھر کے آنگن میں لے جا کر تھان پر باندھ دیتے ہیں۔ ایک گائے یا بھینس کی طرح جس کا دودھ دُوہا جائے گا اور جس سے بچھڑا پیدا کیا جائے گا۔۔۔" حبیبہ بولتے بولتے چُپ ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں دُھواں دُھواں ہو گئیں!

حبیبہ کی تلخی اُس کی زندگی سے متعلق تھی۔ حبیبہ کا پہلا شوہر سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ اُس نے حبیبہ کو گھر میں حوالات کی طرح بند رکھنا چاہا۔ حبیبہ اُس کی خوبصورتی اور وجاہت پر ریجھ گئی تھی۔ مگر یہ وجاہت محض اُوپری تھی۔ حبیبہ کا پہلا شوہر ایک بیل کی طرح وجیہہ تھا اور ایک سانڈ کی طرح مضبوط۔ لیکن اُس میں وہ نازکیٔ احساس نہ تھی جس کے بغیر حبیبہ زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ اِس لئے وہ اپنے پہلے شوہر سے رسیاں تڑا کر بھاگی!

دوسری بار اُس نے ایک آئی سی ایس سے شادی کی۔ شادی سے پہلے کورٹ شپ کے زمانے میں مرد ایک دوسرا ہی آدمی ہوتا ہے ـــــــ انصاری کو معلوم ہو چکا تھا کہ حبیبہ حسین ہونے کے علاوہ ذہین بھی ہے۔ خوش ذوق اور حساس بھی ہے۔ لہٰذا اُس نے اپنی کورٹ شپ شیکسپیئر سے شروع کی۔ بیچ میں غالب آئے، براؤننگ آئے۔ ماتیس کی مصوری آئی۔ پھر شادی ہو گئی۔ حبیبہ بہت خوش تھی۔ ذہنگ کا شوہر ملا ـــــــ!

لیکن انصاری شادی کے بعد پھر آئی سی ایس بن گیا۔ حبیبہ سے ایسا سلوک کرنے لگا جیسے وہ اُس کی بیوی نہیں انڈر سکریٹری ہو ـــــــ اُس کی باتوں کی حلاوت بھی جاتی رہی۔ ایسا چوبی لہجہ ہو گیا جیسے وہ اپنی بیوی سے بات نہ کر رہا ہو کسی فائل پر دستخط کر رہا ہو۔ حبیبہ کو بہت مایوسی ہوئی۔ اُس نے انصاری سے بھی طلاق لے لی۔ اس عرصہ میں اُس کا ایک بچہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سے اور دو بچے آئی سی ایس سے ہو گئے تھے!

حبیبہ اب بھی بہت خوبصورت تھی۔ لوگ کہتے ہیں وہ اپنے وقت میں شمالی ہند کی سب سے حسین عورت تھی۔ لوگ کہتے ہیں ایسا حُسن تو آج تک دیکھا ہی نہیں گیا۔ اِس لئے حبیبہ کو تیسرا شوہر ڈھونڈنے میں زیادہ دِقّت نہیں ہوئی۔ اب کے اُس نے ایک ادیب کو شوہر چُنا۔ حسّاس طبیعت، شاعر مزاج۔ بات بات پر عورتوں کی طرح جھینپ جانے والا!

حبیبہ کو یہ شوہر شروع شروع میں بہت پسند آیا۔ لیکن جلدی ہی رنگ اُترنے لگا۔ اِس خوش ذوقی کی جلد کتنی باریک تھی۔ اُس کے اندر کتنی تجارت تھی۔ شہرت کی کتنی ہوس تھی۔ دوسرے ادیبوں کے لئے کتنی جلن تھی۔ پیسے کو گالیاں دینے کے باوجود ہر وقت پیسہ ہتھیا لینے کے لئے کتنی تگ و دو تھی۔ ہر وقت سرمایہ داروں کو گالیاں دینے کے باوجود اُنہی کی جوتیاں چاٹنے کی کیسی خفیہ خواہش تھی۔ فراخدلی، انسانیت، خدمت اور نیک دلی کا لبادہ اوڑھے ہوئے یہ ادیب اندر سے کتنا تنگ نظر اور خود غرض تھا۔ جب اِس کا اندازہ حبیبہ کو ہولے ہولے ہونے لگا تو اُس کی طبیعت بُجھتی گئی ـــــــ بُجھتی گئی۔ اور جب ایک دن دھیرے سے اُس کے شوہر نے حبیبہ کو مشورہ دیا کہ وہ فلم ایکٹریس بن جائے تو حبیبہ کو ایک دھکا سا لگا۔ اُسے محسوس ہوا۔ اگر وہ اِس ادیب سے شادی کرنے کی بجائے جوہری بازار کے کسی جوہری سے شادی کر لیتی تو وہ اِس ہیرے کی پرکھ زیادہ بہتر طریقے سے کرتا۔

حبیبہ اُس ادیب سے بھی الگ ہو گئی۔ دھیرے دھیرے اب وہ اِس نتیجے پر پہنچنے لگی کہ اُس کے لئے شادی کرنا ہی غلط ہوگا۔ مگر اُس کا حُسن شعلہ ساماں اور آتش فشاں تھا۔ اُسے دیکھتے ہی ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے انگارے کو چھو لیا ہو۔ یا گرم گرم لاوے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ حبیبہ واقعی اب عشق اور حُسن، شاعری اور شادی سے اُکتا چکی تھی۔ لیکن عاشق تھے کہ بولائے پھرتے تھے۔ جدھر جاتی پرمی شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگتے۔ حبیبہ کو اِن کے عشق سے متلی ہونے لگی۔ اُن کی باتیں سُن سُن کر دل

[illegible] ہوگا!

جتنا اُس کا [illegible] ہوتا گیا ... کا اصرار بڑھتا گیا۔ لیکن دو عاشقوں
میر تھا لیکن ... میں سے دو موجود بے حد قابلِ توجہ تھے۔ ایک تو انتہائی
ن ... سا مگر بے حد امیر تھا۔ اُس کے سامنے جو پچھلے بچوں کے سے
ے دیکھ کر حبیبہ کے دل میں یہ خیال آنے لگا، کیوں نہ اب کے ایک ایسے
شادی کی جائے جس پر بیوی کے بجائے اس کا ساتھ جتایا جا سکے — دوسرا
ت کا ٹھیکیدار تھا۔ اَن پڑھ ——— اور اپنے اَن پڑھ ہونے پر مغرور کیونکہ
ہونے کے باوجود وہ اپنی محنت سے لکھ پتی بن گیا تھا۔ اُسے کتابوں سے
ی۔ کلچر اور شیکسپیئر، تھیٹر اور فن، مصوری اور شاعری۔ وہ اِن سب سے نہ صرف
ہ تھا بلکہ نابلد رہنا بھی چاہتا تھا۔ اُس کی صحت بہت اچھی تھی اور اُسے
بہت شوق تھا۔ اُسے دیکھ کر حبیبہ کو خیال آیا کہ اتنی حساس ذہنی اور تمدنی
بسر کرنے کے بجائے کسی ایسے شوہر کے ساتھ جنگلوں میں زندگی بسر کرنا کتنا
ہوگا۔ کبھی وہ بے وقوف امیر کی طرف جھکتی، کبھی اُس کا دل ٹھیکیدار کی طرف
رجاتا۔ کبھی وہ دونوں سے دُور رہنا چاہتی۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔
کو چاہنے کا کوئی سوال نہ پیدا ہوتا تھا۔ صرف وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اِن دونوں
کس کے ساتھ زندگی گزاری جائے ....!

جس بات کا فیصلہ حبیبہ نہ کر سکی اُس کا فیصلہ اِن دونوں عاشقوں نے
۔ اِن کا قصہ بہت مشہور ہے۔ کس طرح لکھنؤ کے ایک باغ میں اِن دونوں عاشقوں
بیبہ کی خاطر ڈوئیل لڑا؟ ڈوئیل کی رسم ہمارے ہاں کی رسم نہیں ہے۔ ہم عشق میں یا تو
ہر کھا لیتے ہیں یا لڑکی کو زبردستی بھگا لے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ڈوئیل نہیں ہوتا۔
حبیبہ کے لئے اپنے ہاں کی مقدس روایت بھی توڑ ڈالی گئی اور اِن دونوں عاشقوں
ھنؤ کے ایک باغ میں پستول لے کر ڈوئیل لڑا اور نتیجے میں دونوں ہلاک ہو گئے۔
وں کے پہلے صفحے پر جلی حروف میں اِس ڈوئیل کی خبر اور حبیبہ کی تصویر شائع ہوئی
نا ہنگامہ ہوا کہ بے چاری حبیبہ کو اپنا وطن چھوڑ کر لندن چلے جانا پڑا۔ اُس کے
باپ بہت امیر تھے اِس لئے اُسے لندن میں روپے پیسے کی کبھی دِقت نہ ہوئی۔ پھر
نے اپنے بچے بھی لندن بلا لئے اور اُس کے تینوں سابق شوہر اپنے بچوں کے لئے
ل وظیفہ بھیجنے لگے۔ اِس لئے حبیبہ کو بھی کسی طرح کی تکلیف نہ ہوئی...!

"بچے کہاں ہیں؟"

"دو تو پاکستان چلے گئے۔ دو ہندوستان میں ہیں۔ میں یہاں ہوں
تنہا....!"

اُس کے بعد ایک ... [illegible]
خاموشی سے گر رہی تھی۔ اندر آتش دان میں آگ جل رہی تھی ... [illegible]
اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کے ... میں ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا پھنسا کر ... آتش دان
کی آگ پر گرم کرتی، پھر دوسرا ٹکڑا۔ اِس طرح ہم دونوں باری باری اُس آتش دان سے
ٹوسٹ بناتے رہے اور پھر گرم کر کے کھاتے رہے۔ ایرانی قالین پر ...
شہرے جام ہم دونوں آتش دان کے سامنے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے اور دیواروں پر حبیبہ کی
تصویریں انگلستان کے شاہی خاندان کے ساتھ.... [illegible] کے ساتھ
وہ لوگ اپنے رتبے کے اعتبار سے عظیم تھے، اپنے فن میں عظیم تھے، تو حبیبہ اپنے حُسن
میں عظیم تھی ———!

"انگریز قوم کی وضعداری آج بھی باقی ہے!" حبیبہ میری نگاہیں شاہی خاندان کی ایک تصویر پر مرکوز دیکھ کر بولی "شاہی خاندان والے خاص خاص موقعوں پر آج بھی حبیبہ کو بلاتے ہیں اور اُس کا شمار لندن کی حسین و جمیل عورتوں میں کرتے ہیں!"

"اِس میں کیا شک ہے" میں نے ذرا مبالغہ سے کام لیتے ہوئے کہا "میں نے پچپن برس کی ایسی خوبصورت عورت آج تک نہیں دیکھی ....!"

"پچپن برس کی!" حبیبہ نے کسی قدر اُداسی اور تلخی سے کہا۔

میں چُپ ہو گیا۔

وہ بولی "ایک عرصے تک میں اپنی عمر کے خلاف لڑتی رہی۔ شامپو اور ہیئر آئل، کریم اور روژ، بجلی، پانی، بھاپ اور مالش۔ وہ سب کچھ جو اِس لڑائی میں ضروری ہے میں نے کیا۔ اور میں کیوں نہ کرتی۔ جو شے جس کے پاس ہوتی ہے وہ اُسے سنبھال کر رکھنا چاہتا ہے۔ میرے پاس میرا حُسن تھا تو پھر میں اُسے سنبھال کر رکھنے کی کوشش کیوں نہ کرتی۔ مگر یہ وقت کی چھلنی کیسی ظالم ہے۔ بوند بوند کر کے حُسن بہہ جاتا ہے۔ آخر میں صرف چھلنی کے سوراخ رہ جاتے ہیں!"

"کیا تمہیں اپنے بچوں سے محبت نہیں ہوتی؟"

"ہوتی تو۔ بہت پیارے بچے تھے جب تک میرے پاس رہے۔ اب بھی اُن کے خط آتے ہیں۔ اب اِس عمر میں تجزیہ کرتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اپنے حُسن کے سوا کسی سے محبت نہیں رہی۔ کسی شوہر سے نہیں، کسی دوست سے نہیں، کسی بچے سے نہیں.... کسی سے بھی اِتنی محبت نہیں رہی جتنی مجھے اپنے حُسن سے رہی۔ میں کبھی ماں نہ بن سکی۔ حبیبہ ہی رہی!"

"شاید یہ اُسی طرح کی محبت ہے جیسے کسی فنکار کو اپنے فن سے

ہوئے اس سے کہا۔

"ہاں، مگر فرق ہے،" حبیبہ بولی۔ "فنکار کا فن اس کی زندگی کے ساتھ چلتا ہے، حسن ڈھلتے ہی ساتھ چھوڑ جاتا ہے ..... یہ اب معلوم ہوا!"

"اگر حسن سے تمہاری مراد جلد کی تازگی سے ہے، اگر حسن سے تمہاری مراد صرف آنکھوں کی چمک سے ہے، روح کی تازگی اور دل کی چمک سے نہیں ہے تو تم سچ کہتی ہو لیکن ایک حسن اندر کا بھی تو ہوتا ہے۔ اگر آدمی ——— عورت یا مرد ——— حسن اور توازن اپنے اندر پیدا کر لے تو کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ میں نے بالشائے تھیٹر میں پچاس برس سے زیادہ عمر کی بوڑھی اولانووا کو سولہ برس کی جولیٹ کے کردار میں تتلی کی طرح ناچتے دیکھا ہے۔ فنی توازن نے وقت اور حسن دونوں کو منجمد کر دیا تھا ...!"

"میں اولانووا نہیں ہوں،" حبیبہ خفا ہو کر بولی۔ "میں حبیبہ ہوں، میں اس قدر چاہی گئی ہوں کہ کبھی اپنے ظاہری حسن کو نہیں بھول سکتی۔ سمجھنے کی کوشش بھی کی تو کسی نے بھلانے نہیں دیا ...!"

"سنو حبیبہ!" میں نے اس کی تلخی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "جس دن میں نے تمہیں پہلے پہل دیکھا تھا اسی دن تم سے عشق کرنے کا خیال آیا تھا۔ لیکن اس وقت میں بہت کم عمر تھا۔ اور اب ...!"

"ہاں، اور اب؟" اس نے تیکھی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اب کیا ہے؟"

"اب بہت دیر ہو چکی ہے!"

حبیبہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنا جام اٹھا کر اتنے زور سے آتشدان میں پھینکا کہ میں اس کے چھناکے سے چونک پڑا۔

"کسی انگریز نے مجھ سے آج تک ایسی بیہودگی سے بات نہیں کی،" وہ غصے سے بولی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے!

"میں انگریز نہیں ہوں،" میں نے اس کے لئے دوسرا جام بناتے ہوئے کہا۔ "تم نے انگلستان میں رہ کر کسی انگریز سے شادی کیوں نہیں کی؟"

"کی تھی،" وہ اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔ "وہ ایک انگریز سائنسداں تھا اور بہت شریف، معصوم اور بے ضرر آدمی تھا۔ مگر اس میں ایک ہی برائی تھی۔ وہ میرے تلوے چاٹتا تھا!"

"تلوے .....؟"

"ہاں واقعی! دن میں دو ایک بار ضرور وہ میرے ننگے تلوؤں کو اپنی زبان سے چاٹتا تھا۔ اس میں اسے لطف آتا تھا لیکن مجھے بہت گھن آتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بھینس میرے قریب بیٹھی جگالی کر رہی ہو!"

وہ کہہ کر مسکرائی، مسکرا کر زور سے ہنسی۔ اس کی ہنسی کا فوارہ کرسٹل فانوس کی طرح روشن ہو اٹھا!

"تین مہینے کے بعد میں نے اس سے طلاق لے لی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر چند پھلکی ماشوق!"

"اور اب؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اور اب!" اس نے مجھ سے کہا۔ "چلو دوسرے کمرے میں!"

جب ہم دوسرے کمرے میں پہنچے تو وہ کمرہ فرش سے چھت تک تصویروں سے پٹا پڑا تھا۔ ایزل پر ایک ادھوری تصویر تھی۔ رنگ اور برش بے ترتیبی کی حالت میں پڑے تھے اور دیواروں پر چھوٹے بڑے کینوس ٹنگے تھے!

بڑی بھیانک تصویریں تھیں۔ اور سب میں ایک ہی چہرہ تھا اور ایک ہی جسم تھا۔ حبیبہ کا اپنا۔ کبھی وہ چیچک زدہ، کبھی زخم خوردہ، کبھی خون اور پیپ میں لتھڑا ہوا۔ ایک آنکھ باہر نکل کر لٹکی ہوئی۔ کبھی ناک طوطے کی طرح مڑی ہوئی، کبھی چینیوں کی طرح پچکی ہوئی، کبھی ہونٹ پھٹے ہوئے، کبھی دانت غائب، کبھی ہڈیوں کا پنجر، کبھی سوکھی کھال میں ایک ایک پسلی نمایاں ——— مگر ان سب تصویروں میں حبیبہ کے سوا کوئی نہ تھا ———!

"مجھے قادریار نے بتایا تھا،" میں نے حبیبہ سے کہا۔ "کہ تم تصویریں بناتی ہو، مگر کسی کو دکھاتی نہیں ہو!"

"میں تمہیں یہاں تصویریں دکھانے کے لئے نہیں لائی تھی۔ اپنے شوہر سے ملانے کے لئے لائی تھی۔"

"تمہارا شوہر ....؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں،" وہ بولی۔ "آؤ تمہیں ملا دوں اپنے نئے شوہر سے!"

اتنا کہہ کر وہ مجھے تصویروں سے بھرے ہوئے ایک کونے میں لے گئی۔ یکایک میں ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گیا ....!

میرے سامنے ایک بہت بڑا پائی تھان پڑا تھا۔ بہت موٹا اور کئی فٹ لمبا اجگر کنڈلی مارے ایک کونے میں نیم مدہوش پڑا تھا ———!

اس رات ہمیں حبیبہ نے سوہو کے ایک نائٹ کلب میں سپر پہ مدعو کیا تھا۔ مجھے اور میرے دوستوں کو۔ میں نے قادریار، من موہن اور اس کی بدصورت یونانی لڑکی کو مدعو کر لیا تھا۔ قادریار اور من موہن یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ حبیبہ

جس عورت سے میری شناسائی ہے۔ جو ایک امیر کبیر عورت ہے۔ جس کا شمار دس پندرہ برس تک لندن کی حسین ترین عورتوں میں ہوتا رہا ہے۔ جو کبھی بادشاہی خاندان کی جان رہ چکی ہے۔ اُس حبیبہ نے آج ہمیں سپر پر بلایا ہے۔"

"جی ہاں!" میں نے ایسی سادگی سے کہا جس پر فخر کا شک بھی ہو سکتا تھا!

ہم لوگ وقت پر پہنچ گئے تھے۔ مگر حبیبہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ہمارا ٹیبل ایک خوبصورت گوشے میں سجا ہوا تھا۔ جہاں ویٹر نے ہمیں لے جا کر بٹھا دیا تھا۔ میں نے پائی تھان والا قصہ اپنے یاروں کو سنایا۔ قادر یار تو گہری سوچ میں پڑ گیا۔ مگر من موہن کو ذرا حیرت نہ ہوئی۔

"اِس میں تعجب کی بات کیا ہے؟" من موہن اپنی بدصورت محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ "ہر انسان کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے جب وہ ایک پائی تھان پال لیتا ہے یا کوئی بدصورت لڑکی یا کوئی بدصورت جذبہ پال لیتا ہے۔ اپنے ماحول سے بیزاری کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آدمی جس کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو جائے اُس کا منہ چڑاتا ہے۔ جیسے میں اِس لڑکی کا منہ چڑاتا ہوں۔ بیزاری اور نفرت بھی ایک طرح کا پائی تھان ہے یعنی ہر نفرت کی دُم لمبی ہوتی ہے اور اِس میں زہر بھی ہوتا ہے!"

قادر یار بولا "اب میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ فزکس کا قانون، کہ ہر عمل کا ردِعمل بھی ہوتا ہے اور بڑی شدت سے ہوتا ہے۔ صرف فزکس کی دُنیا پر ہی نہیں نفسیات کی دُنیا پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ جب انسان اپنے ماحول، اپنی زندگی اور اُس کی ترتیب سے مایوس ہو جائے تو باطنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ پھر اُس توازن کو سنبھالنے کے لئے، اُس ذہنی گھٹن کو راستہ دینے کے لئے انسان کیا کیا جتن کرتا ہے۔ وہ ایک پائی تھان پال لیتا ہے۔ کوکین کھاتا ہے۔ بھیانک مصوری کرتا ہے۔ چرس کا دم لگاتا ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھتا ہے۔ پلیٹ فارم پر چڑھتا ہے اور دس ہزار آدمیوں کے سامنے دو گھنٹے بکواس کرتا ہے یا بور بھرپور افسانے لکھے چلا جاتا ہے یا ہر روز کسی نئی لڑکی سے عشق کرتا ہے اور اگر یہ سب کچھ اُسے نصیب نہیں ہوتا تو گھر آکر اپنی بیوی کو گالی دیتا ہے اور اپنے بچوں کو پیٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے!"

"تم نے جتنی باتیں کہیں" میں نے قادر یار سے کہا "اُس میں سے صرف ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے والی بات مجھے پسند آئی۔ یعنی گھٹن کے اظہار کے بھی کئی طریقے ہیں۔ اپنے ماحول سے بیزاری کا اظہار کسی کو گالی دینے میں کیوں ہو۔ ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے کی کاوش میں کیوں نہ ظاہر ہو؟"

"تم تو ہر بات میں مقصدیت گھسیٹ لاتے ہو" من موہن خفا ہو کر بولا۔ پھر رُخ بدل کر اپنی محبوبہ سے پوچھنے لگا "پائی تھان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کھا جائے گا!" یونانی لڑکی بولی۔

ہم سب ہنسنے لگے۔ وہ بھی ہنسی۔ اُف! کتنی بھیانک ہنسی تھی۔ کیسے میلے اور پیلے پیلے دانت تھے۔ پھر بولی۔

"لیکن یہ ایک طرح سے اچھا ہے۔ دوسرے لوگ تو کئی کئی برسوں اور سالوں میں اپنی بیوی کو کھاتے ہیں۔ یہ پائی تھان ایک ہی جھٹکے میں حبیبہ کو نگل جائے گا۔ ایک بار مرنا اچھا ہے ہزار بار مرنے سے.....!"

کیسی خوفناک شدت تھی اِس لڑکی کی باتوں میں۔ اُس کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ اب وہ کچھ کچھ خوبصورت معلوم ہونے لگی۔ کیونکہ ذہانت بھی چہرے کو بدل دیتی ہے۔ پھر بدصورتی نکل جاتی ہے، جھریاں اور شکنیں غائب ہو جاتی ہیں۔ عمر کم ہو جاتی ہے۔ صرف ایک روشن خیال کا روشن تاثر چہرے پر دمکتا رہ جاتا ہے۔ حبیبہ نے یہی غلطی کی۔ اُس نے اپنے حسن کا اہتمام کیا۔ زندگی بھر اپنے گالوں کے گلاب کھلاتی رہی۔ اور بھول گئی اُن گلابوں کو جو دل کی ٹہنی پر اُگتے ہیں۔ جو ایک معمولی نارمل عورت کی آرزو ہیں۔ ممتا، رفاقت، سپردگی، ایثار۔ کسی میں خود کو کھو دینے کی تمنا۔ کسی کو اپنا سب کچھ دے دینے کی آرزو..... حبیبہ بھول گئی کہ عارض کے گلاب مرجاتے ہیں۔ لیکن آرزو کے گلاب سدا زندہ رہتے ہیں!

یکایک نائٹ کلب کا دروازہ کھلا اور ہم سب اُدھر دیکھنے لگے۔

حبیبہ نائٹ کلب کے دروازے پر کھڑی تھی۔ آنکھیں گہرے کاجل سے سنوری ہوئی۔ چہرہ گہرے میک اپ سے درخشاں، گلے میں ہیرے کا گلوبند جگمگاتا ہوا۔ اُس نے اپنا ہاتھ ایک ایسے انگریز کے ہاتھ میں دے رکھا تھا جس کی عمر مشکل سے بائیس برس کی ہوگی.....!!

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دئے جاتے ہیں۔ مضامین کے خاتمہ پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نو آموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں انھیں واپس کر دئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (ایڈیٹر)

گلبانگ

پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انور، ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل، پی ایچ۔ ڈی

تقرّبِ مانعِ المناب شرحِ غم نہیں ہوتا
گلِ رعنا کے آگے شورِ بلبل کم نہیں ہوتا

مقام و وقت کے احساس پر موقوف ہے عالم
جہاں وہ "جگمگاتے" ہیں وہاں عالم نہیں ہوتا

سُنائے جا رہا ہوں ایک ہی آہنگ میں سب کچھ
صدائے خامشی میں فرقِ زیر و بم نہیں ہوتا

فراقِ گاہ گاہی کا نتیجہ غم سہی، لیکن
وہ غم جس کو خوشی معدوم کر دے غم نہیں ہوتا

ہمیں روتی رہی ہے زندگی غم پر نہ مرنے تک
کسی انسان کا یوں "پیشگی" ماتم نہیں ہوتا

کہاں تک داد دوں تم کو تمہارے اس "سلیقے" کی
کہ آنسو پونچھتے ہو اور دامن نم نہیں ہوتا

ستم ہے کام لے کر پھینک دینا ساغرِ گل کو
جو اک ظرفِ دو نیمہ مثلِ جامِ جم نہیں ہوتا

محبت پہلے میں نے کی کہ تم نے کیوں لڑیں اس پر
یہ وہ جھگڑا ہے جس کا "فیصلہ باہم" نہیں ہوتا

سرِ منزل پہنچنا میری قسمت میں نہیں شاید
قدم اس راہ پر اُٹھتے ہیں جس میں خم نہیں ہوتا

دو عالم کیا، دو عالم آفریں خود ڈوب جاتا ہے
اک آنسو میں جو بیش از قطرۂ شبنم نہیں ہوتا

بھگتا ہے سزا ہر عاصیِ معصوم کیوں یارب؟
اگر عصیاں خلافِ فطرتِ آدم نہیں ہوتا

ہمارا آپ کا دل ایک ہے، لیکن بصد کاوش
ہمارے بیش تر اسرار کا محرم نہیں ہوتا

خدا کے فضل سے ہوں صاحبِ ہوش و خرد انور
مجھے خود پر گمانِ شاعرِ اعظم نہیں ہوتا

۵/۱، ایسٹ پٹیل نگر، نیو دلی ۱۲

افسانہ

آنکھیں

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن۔ ایم اے۔ ڈی لٹ

۱۵۔ جواہر نگر۔ گورنمنٹ کوارٹرز۔ سری نگر

۱۷۔ مارچ ۶۵ء

خوشتر بھائی!

کچھ نئی پرانی آنکھوں کی باتیں ہیں۔ ایک ہی گھر میں تین نسلیں رہتی ہیں۔ دادا، باپ اور بیٹی۔ ان تینوں کی آنکھوں میں مختلف صدیوں کی آنکھیں ہیں۔ نئی صدی میں تو ہر لمحہ ایک صدی ہے ــــــ اُمید ہے کہانی پسند آئے گی...

مخلص ــــــ شکیل الرحمٰن

بات گہری اور پُراسرار تھی۔ کالونی میں ہر طرف خاموشی تھی۔ دن بھر کے تھکے ماندے لوگ آنکھوں میں ہزاروں خواب لئے اپنے اپنے بستروں میں دبک چکے تھے۔ پوری کالونی جن پُراسرار لمحوں سے گزر رہی تھی اس کی خبر کسی کو نہ تھی۔

ایسے میں صرف جانکی داداجاگ رہے تھے۔ دو بج چکے تھے لیکن جانکی دادا کی آنکھوں میں نیند کی کوئی رمق نہ آئی تھی۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ اپنے بستر پہ بیٹھے ہوئے اُن کی آنکھیں کبھی کبھی سامنے کی بالکونی پر جاتی تھیں، جہاں کچھ دیر پہلے دو سائے تھے۔ اب اندھیرا تھا۔ سائے گم ہو گئے تھے۔ دریچے بھی بند تھے۔

جانکی دادا کی عمر ستر سال کی ہوگی۔ پہلے بزنس کرتے تھے۔ اب اپنے اکلوتے بیٹے ونود کے ساتھ تھے، جو کسی دفتر میں ملازم تھا۔ ونود اپنے پتا کی ہر ممکن خدمت کرتا۔ بال بچے والا آدمی تھا۔ ایک نوجوان بیٹی تھی۔ پربھا۔ اور تین چھوٹے بچے تھے۔ بیوی اکثر بیمار رہتی تھی اور اُس کی آمدنی کا نصف حصہ ڈاکٹر لے جاتے تھے۔ وہ کوشش کرتا تھا کہ گھر کے ہر فرد کو خوش رکھ سکے۔ بوڑھے باپ کو بھی اور بیمار بیوی کو بھی۔ پربھا کو بھی۔ جو چند برسوں میں دوسرا گھر بسانے چلی جائے گی۔ اور اپنے ننھے معصوم بچوں کو بھی۔ جو بات بات پر مچل جاتے تھے۔ ونود جانکی دادا کی ہر ممکن خدمت کرتا۔ اُن کی تلخ باتوں کو نظر انداز کر دیتا اور یہ سوچتا کہ وہ بہت پرانے آدمی ہیں۔ پرانے لوگوں کے خیالات بھی پرانے ہوتے ہیں۔ اور جانکی دادا یہ سوچتے کہ یہ زندگی بے کار ہے، جہاں اُن کی کسی بات کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ وہ دُنیا کس کام کی ہے۔ آدمی جتنی جلد مر جائے اچھا ہے۔

اِس گھر میں یوں تو بہت سی آنکھیں تھیں۔ بوڑھی، جوان اور معصوم آنکھیں۔ قدیم، موڈرن اور بالکل نئی آنکھیں۔ بیدار، مضمحل اور بے گناہ آنکھیں۔ صدیوں کے سفر کے بعد تھکی ہوئی آنکھیں۔ نئے سفر کی راہوں کو ڈھونڈنے والی آنکھیں لیکن صرف چھ آنکھیں اہم تھیں۔ دو آنکھیں جانکی دادا کی، دو آنکھیں ونود کی اور دو آنکھیں پربھا کی۔ جانکی دادا کی آنکھیں بوڑھی، پرانی اور تجربہ کار تھیں۔ اِن آنکھوں نے معلوم نہیں کتنی چیزوں کو ٹوٹتے، مٹتے، بنتے اور سنورتے دیکھا تھا۔ یہ آنکھیں تنقید کرتی تھیں، نکتہ چینی کرتی تھیں، ناراض ہوتی تھیں، خفگی کا اظہار کرتی تھیں۔ جانکی دادا کی یہ عادت واقعی اچھی نہ تھی۔ وہ ہر بات پر ٹوکتے تھے، جھنجھلاتے تھے، بات بات پہ خفا ہو جاتے تھے۔ گھنٹوں تنہا بیٹھے بولتے رہتے جیسے اس کمرے میں اور بھی لوگ ہوں جنہیں وہ اپنے دل کی بات سُنانا چاہتے ہوں۔ سب یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ بڑھاپے کی وجہ سے ہے۔ اب وہ اور کتنے دن زندہ رہیں گے۔ کبھی اُن کی آنکھیں خاموش ہو جاتیں اور غور کرنے لگتیں۔ پھر وہ بہت دیر خاموش رہتے، سوچتے رہتے۔

ونود کی آنکھیں قدیم اور جدید کی ہم آہنگی چاہتی تھیں۔ ڈبل روٹی اور مکھن، پیتل کے بڑے برتن میں کھاتے ہوئے اسے بہت خوشی ہوتی تھی۔ اُسے سوٹ پر گاندھی ٹوپی پسند تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا گھر بالکل موڈرن نہ بنے۔ پربھا کے لباس پر ہمیشہ اُس کی نظر رہتی۔ وہ جانتا تھا کہ پربھا جوانی کی منزلوں میں قدم رکھ چکی ہے۔ اُسے ایک اچھے ساتھی کی ضرورت ہے۔ لیکن جب تک وہ اچھے کپڑے نہ پہنے گی، اچھی طرح نہ رہے گی، اُس کی طرف کوئی توجہ نہ دے گا۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ پربھا بالکل موڈرن بن جائے۔ ٹائٹ سلیوز بلاؤز پہنے، اونچی ایڑی کا سینڈل پہن کر

[illegible]

چاہتی تھیں۔ قدیم اور جدید کے امتزاج کی قائل تھیں۔ اُس نے پربھا کو پڑھایا لیکن نئی روشنی کے قریب اُس حد تک جانے دیا جس حد تک وہ چاہتا تھا۔ پربھا نے ئی پرورش پائی تھی۔ دل روایت پسند نہیں تھا جدت پسند تھا۔ وہ اپنے دماغ ول کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتی تھی۔ دل پر تو اُس کا کبھی اختیار نہ تھا۔

پربھا کی آنکھیں ہر نئی چیز کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ چھپکے چھپکے ایسے رسالے بھی پڑھتی جنھیں وہ گھر میں کسی اور کو دکھانا پسند نہ کرتی تھی۔ بات یہ تھی کہ اُس کے فلیٹ سامنے رمبا رہتی تھی۔ پرکاش چندر کی لڑکی رمبا۔ اَپ ٹو ڈیٹ لڑکی تھی۔ پرکاش چندر اور ونود دونوں ایک ہی دفتر میں ملازم تھے، اِس لئے دونوں میں گھر کے سے تعلقات تھے۔ رمبا پربھا کو عجیب و غریب کہانیاں سناتی اور پربھا سوچتی کہ اِس دُنیا میں کیسی دُنیائیں آباد ہیں۔ ونود رمبا کو اچھی طرح جانتا تھا لیکن پربھا سے ملنے جلنے پر اُسے اعتراض نہ تھا۔ ہاں! وہ پربھا پر نظر ضرور رکھتا تھا۔ رمبا کا فلیٹ بالکل سامنے تھا۔ رزی نغمے سنتی اور ڈانس کرتی تھی۔

پربھا ایک سانولی لیکن خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کی آنکھیں گہری اور روشن تھیں۔ اُس کی زُلفوں میں گھٹا کی شام جذب تھی۔ ایک دن رمبا نے اُسے بتایا کہ وہ ایک پڑوسی مسٹر گپتا سے محبت کرتی ہے۔ ہر شام دونوں بالکنی پر ملتے ہیں۔ بالکنی کی دوری اُن کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں دونوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سمندر کی بے پناہ گہرائیوں میں ہاتھ تھامے ہوئے ہیں۔

پربھا پہلے تو چونکی پھر لذّت لینے لگی۔ جب بھی رمبا سے ملاقات ہوتی وہ چاہتی کہ اُسے اپنی محبت کے بارے میں کچھ اور بتائے۔ جب رمبا اُس سے کچھ کہتی تو اُس کی آنکھیں بوجھل ہو جاتیں۔ اُس کے رخسار تمتما جاتے اور ایک عجیب کیفیت اُس پر طاری ہو جاتی۔ وہ محسوس کرتی جیسے کوئی اُس کے قریب بیٹھا ہے۔ اُس سے کچھ پوچھ رہا ہے: "بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟" "تمہیں کون سا پھول پسند ہے؟" "یہ تمہاری آنکھیں اتنی گہری اور ن کیوں ہیں؟ —— اور معلوم نہیں کیا کچھ۔ کوئی اجنبی قریب بیٹھا محسوس ہوتا۔

جس دن رمبا اُس سے یہ کہہ گئی کہ رات کے گیارہ بجے کے بعد وہ اپنی کھڑکی سے انھیں دیکھ سکتی ہے، اُس رات سے اب تک پربھا اپنی کھڑکی سے انھیں دیکھ رہی تھی۔ دریچے کے سامنے رمبا اور مسٹر گپتا کی بالکنی تھی جہاں دونوں ہر رات ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے نظر آتے۔ پربھا تک کوئی آواز نہ آتی لیکن اُس کی عجیب حالت ہو جاتی۔ اکثر اُسے محسوس ہوتا تھا کہ وہاں رمبا نہیں وہ خود کھڑی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں کسی کا ہاتھ ہے۔

جب بالکنی سے سائے ہٹ جاتے اور اندر دریچوں کی روشنیاں گل ہو جاتیں

[illegible]

سپنے دیکھتی۔

پربھا کی آنکھیں گھر کے ماحول کو دیکھی تھیں۔ پربھا جانتی تھی کہ وہ رمبا نہیں بن سکتی لیکن اُسے یہ بھی محسوس ہوتا کہ وہ محبت تو کر سکتی ہے۔ اگر محبت نہیں کر سکتی تو بالکونی پر نظر جاتے ہی اُس کے دل کی ایسی حالت کیوں ہو جاتی ہے؟

شروع شروع میں تو کچھ راتیں جاگتے کٹ گئیں۔ دریچے کی کہانی ہی اُس کے لئے سب کچھ بن گئی تھی۔ وہ صبح سے زیادہ رات کا انتظار کرنے لگی جب بھی آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو معلوم نہیں جذبات اُسے کہاں سے کہاں لے جاتے۔ وہ اپنی صورت دیکھتی رہتی۔ آنکھوں میں بہت سی تصویروں کے خاکے بناتے۔ وہ کسی خاکے کو پہچان نہ پاتی۔ ہر خاکہ ایک اجنبی خاکہ تھا لیکن ہر تصویر اُس سے کچھ کہہ جاتی اور وہ انجانی سی کسمساہٹ محسوس کرتی۔

جانکی دادا ونود کے اِس رویّے کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لڑکی لڑکی کی طرح رہے۔ اُسی طرح جس طرح جانکی داد کے زمانے میں لڑکیاں رہتی تھیں۔ ونود سوچتا تھا کہ لڑکی جب تک پڑھی لکھی نہ ہو، اچھے لباس میں نہ رہے۔ اُس میں کچھ ہنر اور سلیقہ نہ ہو، کسی کو پسند نہیں آسکتی۔ اِس عہد کا سب سے بڑا مسئلہ لڑکے کی تلاش ہے۔

جانکی دادا شروع سے پربھا کی تعلیم کے خلاف تھے لیکن ونود نے کسی نہ کسی طرح پربھا کو ہائی اسکول تک پڑھایا۔ جانکی دادا چاہتے تھے کہ پربھا دن رات گھر کے کام میں لگی رہے، باہر نہ نکلے۔ ونود چاہتا تھا اُس کی بیٹی صبح شام ٹہلنے بھی جائے۔ اپنی سہیلیوں سے بھی ملے۔ اُس کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ وہ کچھ کھیلے بھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر اُسے رمبا کے یہاں بھیج دیتا جہاں ہر شام بیڈمنٹن اور دوسرے کھیلوں سے کالونی کی لڑکیاں دل بہلاتی تھیں۔ ونود پربھا کے لئے نئے سٹائل کے کپڑے سلواتا لیکن اُسی متوازن نقطۂ نظر سے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر جب اُسے اطمینان ہو جاتا کہ اِس لباس میں قدیم اور جدید کا امتزاج ہے تو پربھا کو پہننے کی اجازت دیتا۔

پربھا جانکی دادا اور اپنے ڈیڈی کے دھاروں سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ کوشش کرتی تھی کہ کسی صورت دونوں کو خوش رکھے۔ بیمار ماں کی تیمارداری کرتی۔ اپنے چھوٹے بھائیوں کی دیکھ بھال کرتی، گھر کا سارا کام کاج کرتی۔ پھر قدیم اور جدید قدروں کے توازن کا خیال رکھتے ہوئے بیڈمنٹن کھیلتی، صاف ستھرے کپڑے پہنتی۔ جب اُسے معلوم ہو جاتا کہ جانکی دادا اور ڈیڈی سو چکے ہیں تو اپنی دونوں آنکھیں کھول دیتی۔ رمبا کے دئے ہوئے رسالے پڑھتی۔ رمبا کے چھیڑے ہوئے موضوعات پر غور کرتی اور اُن سے انجانی لذت محسوس کرتی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں

دوستانہ [illegible] جاتی اور پھر رات کے گیارہ بجے آہستہ سے اپنا دریچہ کھول کر سامنے بالکونی پر نظر ڈالتی اور دونوں کو سامنے دیکھ کر کسی نور کی دنیا میں گم ہو جاتی۔ معلوم نہیں کیسی خوشبو تھی جو دریچہ کھلتے ہی اُس کے کمرے میں آجاتی، ہر طرف پھیل جاتی، پُورے کمرے کو معطر کر جاتی، بالوں میں اُلجھ جاتی، آنکھوں میں اُتر جاتی، ہونٹوں کو بے چین کر دیتی اور پھر رُوح میں سما جاتی جہاں ہر طرف روشنی تھی۔ معصوم، خاموش اور پُراسرار روشنی۔ روشنی اور خوشبو کے اِسی ملاپ سے تو آدمی کی تخلیق ہوتی ہے۔ آدمی کی رُوح بنی ہے۔

جانکی دادا نے بالکونی پر دو سائے دیکھ لئے تھے۔ بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ انھوں نے بالکنی کے سامنے پربھا کا نصف کھُلا ہوا دریچہ بھی دیکھا تھا۔ دریچے پر چڑیوں کی آواز بھی سُنی تھی اور پھر اندر آکر پربھا کو بھی دیکھا تھا جو بالکل بے خبر باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُسے خبر نہ تھی کہ اُس کے پیچھے کتنی صدیوں کا اخلاق اُسے گھُور رہا ہے۔ جانکی دادا کچھ کہے بغیر باہر آگئے تھے۔ اب اُنھیں نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔

ہر طرف اندھیرا تھا، خاموشی تھی۔ بالکونی کے سائے جا چکے تھے۔ پربھا کا دریچہ بھی بند ہو گیا تھا۔ پُوری کالونی خوابوں کی گود میں تھی لیکن جانکی دادا کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ وہ سوچ رہے تھے۔ معلوم نہیں کیا کچھ۔

صبح ہوئی تو جانکی دادا خاموشی سے رمبا کے فلیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے رمبا کے فلیٹ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ کچھ سوچا اور کال بیل پر اپنی کمزور اُنگلی رکھ دی۔ اندر گھنٹی کی آواز سُنائی دی۔ دروازہ کھُل گیا۔ سامنے رمبا کھڑی تھی۔

"کون؟ جانکی دادا؟ آپ؟" رمبا چونک گئی۔

"ہاں بیٹا! میں ہوں۔ تمھارے ڈیڈی ہیں؟" جانکی دادا نے پُوچھا۔

"جی ہاں۔ تشریف لائیے۔" رمبا جانکی دادا کو اندر لے گئی اور ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر اپنے ڈیڈی کے پاس اُچھلتی کودتی چلی گئی۔

تھوڑی دیر میں پرکاش چندر ڈرائنگ روم میں تھے۔

"آپ؟ کیوں تکلیف فرمائی۔ مجھے بُلا لیا ہوتا۔" پرکاش چندر نے جانکی دادا سے کہا۔

"کوئی بات نہیں پرکاش بابو۔ میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔" جانکی دادا کے لہجے میں غضب کا اعتماد تھا۔

"فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" پرکاش چندر نے انکساری کو کھاتے ہوئے کہا۔

"پرکاش بابو،" جانکی دادا نے کہنا شروع کیا۔ "رمبا کی شادی جلد [illegible] کر دیں۔ دونوں کے لئے اچھا ہوگا۔"

"لیکن کیوں؟" پرکاش چندر نے حیرت کا اظہار کیا۔ پھر [illegible] انداز میں کہا۔ "آپ کو کیا تشویش ہے؟ وہ دونوں دوست ہیں۔ ابھی رمبا کی عمر ہی کیا ہے؟"

"دونوں دوست ہیں!۔۔۔۔۔ رمبا شادی کے لائق نہیں ہے۔۔۔۔۔؟"

جانکی دادا سوچ رہے تھے۔

"کیا دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی؟" جانکی دادا نے پُوچھا۔

"کوئی ضروری نہیں۔" پرکاش چندر نے جواب دیا۔

"تو پھر کیا ہوگا؟" جانکی دادا کی آواز میں عجیب کیفیت تھی۔ جیسے معلوم نہیں کتنی حسرتوں کا خون ہو گیا ہو۔

"ہوگا کیا؟" پرکاش چندر نے اپنی بے توجہی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"پرکاش بابو! اِس گھر کی آگ اُس گھر میں پہنچ رہی ہے۔ رمبا کے ساتھ پربھا بھی برباد ہو جائے گی۔" جانکی دادا کھڑے ہو گئے۔ پرکاش چندر بھی اُٹھ گئے۔

"بھگوان کے لئے سوچئے پرکاش بابو۔ کیا میں پربھا کے دریچے کو پتھر سے بند کرا دوں۔ میری یہ بُوڑھی آنکھیں زیادہ کچھ دیکھنا نہیں چاہتیں ۔۔۔۔۔ زیادہ کچھ دیکھنا نہیں چاہتیں۔"

پھر ہر طرف خاموشی تھی۔

چند لمحوں کے بعد جانکی دادا آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اُتر رہے تھے ۔۔۔۔۔ پرکاش چندر بالکنی پر کھڑے پربھا کے دریچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کھڑکی بند تھی۔ دُور سے آواز آرہی تھی۔ "کیا اِس دریچے کو پتھر سے بند کرا دوں؟ کیا اِس ۔۔۔۔۔!"

غزل

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم۔ اے

عجب زندگی اہلِ دنیا کو دی ہے
کہ جو موت ہی ہے نہ جو زندگی ہے

جُدا ہے ہر اِک شے کی شکل و شباہت
ہر اِک شے مگر تیری تصویر بھی ہے

خوشی زندگی میں ہے نایاب یوں تو
ترے غم کی بھی ایک حدتک خوشی ہے

اُن آنکھوں میں جیسے ہو کوئی کہانی
لبِ ناز پر جیسے اِک بات سی ہے

تری زُلفِ پُرپیچ و خم میں پیاپے
کوئی رات انگڑائیاں لے رہی ہے

وہی دورِ افلاک ہے اب بھی لیکن
نہ وہ صبح ہی ہے نہ وہ شام ہی ہے

کسی شوخ کافر سے ہمراز میری
بڑی دوستی ہے، بڑی دشمنی ہے

یہ ہستی کسی روز مٹ کر رہے گی
اگر عشق کا آزمانا یہی ہے

تجھے مہرباں پا کے آنکھیں بھر آئیں
ارے یہ رلا دینے والی خوشی ہے

سمٹ کر گلستاں کی صبحِ بہاراں
لبِ ناز کی پنکھڑی ہو گئی ہے

مئے عشق کی میں صفت کیا بتاؤں
کہ وہ آبِ حیواں بھی ہے، زہر بھی ہے

کبھی شام سے صبح تک تھی تری یاد
کبھی صبح سے شام بھی ہو گئی ہے

نہ پایا نہ پایا۔ تجھے میں نے پیارے
تری یاد میں زندگی کٹ گئی ہے

اِسی سے رموزِ دو عالم کھلیں گے
مرے جام سے میں جو کچھ بچ رہی ہے

فراق اِس غزل تک رسائی ہے کس کی
کہ یہ عالمِ رنگ و بو باطنی ہے



آپ کے گھر میں
اوشا پنکھے اپنی اعلیٰ کارکردگی اور سٹینڈرڈ کے لئے دُنیا کے ۴۰ ممالک میں لاکھوں افراد کی واحد پسند ہیں۔
دُنیا کے سب سے بڑے واحد یونٹ پنکھا کارخانہ میں ماہر فن کی جد وجہد کا نتیجہ اوشا پنکھا ہندوستان میں سب سے زیادہ فروخت ہوتا ہے۔
جب بھی آپ پنکھا خریدیں تو اعتماد کے ساتھ اوشا ہی خریدیں۔ یہ آج کے بننے والے پنکھوں میں سب سے زیادہ دل پسند ہیں۔
بہترین پنکھے کی ضرورت
تمام سیلنگ پنکھوں میں ڈبل بال بیرنگ لگا ہوتا ہے تاکہ بغیر خرابی کے آپ کی خدمت کر سکے۔
اوشا پنکھے
تیار کردہ JAY
دی جے انجنیرنگ ورکس لمیٹڈ کلکتہ ۳۱

افسانہ

ساون آیا...

واجدہ تبسم۔ ایم، اے

رلو سے بلاک ۱۳۱۔ فلیٹ ۱۰۔ شانتا کروز (ویسٹ) بمبئی ۵۴

۱۸ مارچ ۶۵ء

عزیز بھیاّ!

... میری صحت آجکل اچھی نہیں۔ یہ کہانی بڑی مشکل سے پُوری کرپائی ہوں۔ آپ کو یہ داستانِ غم "ساون آیا..." ضرور متاثر کرے گی، اور یہ جان کر آپ کا دل ضرور دُکھے گا کہ اِس کہانی کے بدنصیب کردار حقیقی ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں رومانٹک کہانیاں ایک سرے سے لکھتی ہی نہیں۔ بس جتنی کچھ بھی لکھی ہیں صرف آپ کے کہنے پر "بیسویں صدی" کے لئے۔ اِس لئے کہ آپ نے زندگی میں اِس درجہ خلوص دیا ہے کہ آپ کی کوئی بات ٹالی نہیں جاتی۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ اگر لکھنے بیٹھوں تو ایسی ایسی کئی کہانیوں کے ڈھیر یادوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ آپ کے حکم کے مطابق یہ کہانی عام شمارے کے لئے ہے۔ خاص نمبر کے لئے اور کہانی بھیجوں گی ——— آپ نے عید پر جو حسین ساڑی میرے لئے بھیجی تھی وہ سبھی نے بے حد پسند کی اور ہر ایک نے آپ کے خلوص کو اتنا سراہا کہ آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ میری تو بس یہی دعا ہے کہ خدا آپ سی مخلص ہستی کو ہم سب کے لئے لازوال کر دے ——— اشفاق خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔ آپ کو بہت سی محبتیں بھیج رہے ہیں۔ بچوں کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ خاص طور سے وقار کی۔ اور اِسی وجہ سے میرا دل آجکل دنیا سے اچٹ سا گیا ہے۔ دعا کیجئے کہ خدا سدا میری مانگ بھری اور گود ہری رکھے ——— میرے چاہنے والوں کو میرا سلام ——— اچھا اب چلوں ———؟ بہت سی محبتوں کے ساتھ۔

آپ کی بہن ——— واجدہ تبسم

تم نے کبھی میری آنکھیں غور سے دیکھی ہیں؟

اِن آنکھوں میں تمھیں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی ———؟ کیا تم نے یہ محسوس نہیں کیا کہ یہ آنکھیں نہیں، ساون کے گھنگھور گھنگھور بادل ہیں ——— اُمڈتی گھمڈتی بدلیاں ہیں جو اب برسیں کہ تب برسیں ——— ! کیا کبھی تمھارا جی نہیں چاہا کہ اِن آنکھوں کو ہنسنا سِکھا دو ———؟؟ میں تم سے پُوچھ رہی ہوں شہاب۔ ہاں تم سے۔ تم جو میری تاریک زندگی کے آسمان پر ایک روشن چاند کی طرح جگمگاتے۔ جس کے وجود سے میری زندگی قوسِ قزح کی طرح رنگین ہو گئی ——— لیکن اِس حقیقت کو کیسے بھُولوں کہ روشن چاند بھی کبھی نہ کبھی اپنی جگمگاہٹ کھو کر تاریکیوں میں روپوش ہو جاتا ہے ——— بہاروں سے بھری قوسِ قزح بھی تو اپنی چھب دکھا کر آسمان کی وسعتوں میں گُم ہو جاتی ہے ——— پھر میری آس کتنی فضول تھی۔ اور میں خود کتنی بے بس اور نادان تھی جو روشنیوں کو اپنا مقدر سمجھ بیٹھی ——— میں اپنی حقیقت بھُول گئی تھی۔ یہ بھُول گئی تھی کہ میری آنکھیں ساون کا ایک رُوپ ہیں اور جو آنکھیں رونے کے لئے بنی ہیں وہ بھلا ہنسنا کیا جانیں ——— یہ نین تو وہ نین ہیں شہاب کہ برسنے پر آئیں تو سُوکھے جنگل کو ہرا کر دیں۔ لیکن کیسی بے بسی ہے کہ میں اپنی زندگی کے سُوکھے باغ کو اِس پانی سے نہیں سینچ سکتی ——— کہیں کھارے پانی سے بھی باغ سینچے گئے ہیں؟؟ یہ نمک تو ہری بھری ڈالیوں تک کو جھُلسا دیتا ہے۔ پھر میں کن بہاروں کی بات کرتی ہوں ———؟؟

آج یہ کیسی دل کو کاٹ دینے والی ہوائیں چل رہی ہیں۔ آسمان اُودی نیلی

[illegible] ہوگی ہے

[illegible] ساون کی بدلیاں گھری تھیں

[illegible] اس بات پر رونے کو تیار ہو جاتا تھا۔

[illegible] اور چھیڑ چھیڑ میں سہیلیاں میری

آنکھوں کی طرف اشارہ کرنے لگتیں۔

"ساون آیا رم جھم رم جھم ——"

کسے معلوم تھا سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ ایک دن حقیقت کا روپ دھار لے گی اور میری آنکھیں سدا کے لئے ساون بھادوں بن کر رہ جائیں گی ——!

لیکن تم چاہتے تو کیا ان آنکھوں کو ہنسنا نہیں سکھا سکتے تھے ——؟؟ شاید میرے یہ سارے گلے بیکار ہی ہیں۔ قسمت کے آگے ہم کتنے بے بس ہیں —— کس درجہ مجبور ——!

شہاب ——!

بادلوں کا رنگ گہرا قرمزی ہو گیا ہے۔ کوئی دم میں بوندا باندی شروع ہو جائے گی —— جانے آج کتنا جل تھل ہونے والا ہے —— لیکن ذرا میرے دل میں جھانک کر دیکھو تحسین کیا معلوم آج کس قیامت کی رم جھم مچی ہے —— آج میرے دل کی دُکھن کا وہ عالم ہے کہ یہ آنکھیں ساون تو کیا سمندر کی طرح بہیں تو بھی دل چین نہ پا سکے گا۔

میری داستانِ غم اُس دن سے شروع ہوتی ہے، جس دن تم نے میری طرف پیار سے بھری ایک نگاہ ڈالی تھی۔ پیار تو وہ انمول بیج ہوتا ہے جو مٹی کے صحرا تک میں گلزار کھلا دیتا ہے۔ لیکن تمہاری نگاہ وہ نگاہ تھی جو ہری بھری کھیتی کو پالا مار گئی —— شاید مجھ ہی میں اس نگاہ کو سہہ جانے کی تاب نہ تھی یا پھر کون جانے کہ نصیب نے ہر ظلم میرے ہی ساتھ روا رکھا تھا۔

تمہیں یاد ہوگا، ہمارا خاندان مشترکہ فیملی سسٹم کے تحت ایک ہی بڑی سی کوٹھی میں رہا کرتا تھا —— اِتنے سارے لوگ —— اِتنے سارے جانے پہچانے چہرے۔ لیکن پتہ نہیں میری دُکھوں کی ماری روح ایسے ہرے بھرے اور دل پرچا لینے والے ماحول میں بھی خود کو کیوں تنہا تنہا سی محسوس کرتی تھی۔ شاید اِس کی وجہ یہ تھی کہ میں بچپن ہی سے اپنے ابو کی بے پناہ شفقت سے محروم ہو چکی تھی اور اِس پر ستم یہ کہ خرابیٔ صحت کی وجہ سے میری تعلیم بھی ادھوری رہ گئی تھی۔ جس کا میرے دل پر بہت گہرا داغ تھا —— صبح ہی صبح جب کوٹھی کی ساری لڑکیاں نیلی نیلی یونیفارم پہنے بسوں اور کاروں میں کانونٹ اور کالجوں کو جاتیں تو میرا دل کٹ کٹ جاتا —— میں نے

[illegible]

کر بیٹھ [illegible] چند [illegible]

گتا۔ نیچے دیکھتے دیکھتے سر چکرانے لگتا اور سر میں درد ہونے لگتا —— تنگ آ کر میں نے اپنی توجہ خانہ داری کی طرف پھیر لی —— جاڑے آتے تو میں گھر بھر کے بچوں کے لئے سوئٹر، موزے، ٹوپیاں بنتی۔ برسات سے پہلے [illegible] آتا کپڑے خریدے جاتے اور میں سبھوں کے لئے گرم کپڑے تیار کرتی —— گرمیوں کے دنوں میں میں موتیا کے پودوں کی سینچائی کرتی —— ساری کوٹھی میں گھوم گھوم کر ہر ایک کے کمرے کی خبر لیتی کہ خس کی ٹٹیاں لگی ہیں یا نہیں۔ کوری صراحیاں اور ٹھلیاں، موتیا کے گجروں سے سنواری گئی ہیں یا نہیں ——؟ یہ کام بظاہر چھوٹے چھوٹے تھے لیکن میرا دل بہلا رہتا —— گرمیاں شروع ہوتیں تو سب لڑکے علی گڑھ سے چھٹیاں گزارنے گھر آ جاتے اور کوٹھی میں ایک ہلچل سی مچ جاتی۔ ہماری مشترکہ فیملی کے سرپرست خالو ابا تھے، جنہیں تعلیم کی خاطر لڑکوں کو علی گڑھ اور لکھنؤ بھجوانے کا خبط تھا۔ لڑکوں کے آتے ہی میری مصروفیت کا دور شروع ہو جاتا۔ کوئی ہوسٹل کے کھانوں سے اُکتا چکا ہوتا تو نت نئے پکوانوں کی فرمائش ہونے لگتی —— کسی کی قمیصوں کے ٹوٹے ہوئے بٹن ٹانکنے پڑتے —— پھر گرمیاں ختم ہونے کی تیاری مجھے ابھی سے کرنی پڑتی کہ برسات کے لئے کون کون سے گرم کپڑے ساتھ جائیں گے۔ کس کے ساتھ کون سا ناشتہ پیک کرے گا —— پھر اِن مرحلوں سے گزر کر جو پڑھائی سے اُکتائے ہوئے دل ہوتے تو نت نئی تفریحوں میں لگ جاتے —— تاریخی مقامات کی سیر، پکنک۔ وہ دھوم دھام ہوتی کہ توبہ —— ایسے موقعوں پر جو کھانے ساتھ لے جائے جاتے وہ میرے ہی [illegible] ہوتے۔ ویسے بھی مشترکہ زندگی کی مصروفیات اور کام کچھ کم ہوتے ہیں ——!؟ جب سب لوگ کوٹھی سُونی کر کے اپنے کام پر چلے جاتے تو میں کالجوں سے آتے ہوئے علی گڑھ اور لکھنؤ والوں کی کتابیں ٹٹولنے لگتی —— میری خوشیوں کے وہ لمحات کتنے عظیم ہوتے۔ لیٹے لیٹے میں کتنا سارا فکشن پڑھ ڈالتی —— مطالعہ کتنا پیارا شغل ہے۔ جیسے نئی جنت کے دروازے ایک ایک کر کے مجھ پر کھلتے جاتے۔ اور تعلیم نہ ہونے کا وہ غم جو میری روح کا ساتھی بن چکا تھا دھیرے دھیرے جیسے مٹتا جاتا۔

ایسے ہی دنوں میں سے ایک چمکیلے دن کی بات ہے۔ تم سب صبح سے کاروں میں بھر کر باہر گئے ہوئے تھے۔ میں صبح سے اپنے کمرے میں لیٹی لیٹی ہارڈی کا ایک غم انگیز ناول پڑھنے میں لگی ہوئی تھی۔ دل پر غم کی ایک تہہ سی جمی تھی کہ ایسے میں ماحول بھی پُرملال ہو گیا —— کبھی کبھی گرمیوں میں بھی بارش کے امکان پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور احساس لے چمکیلا اور نیلا آسمان کس طرح مٹیالی بدلیوں سے ڈھک جاتا ہے —— اور

[illegible]

سہاروں آنکھیں [illegible] ___ اُس وقت سب کچھ [illegible] ایک افسانوی ماحول میں ڈوبا ہوا

اور اچانک ہی میری طرف [illegible] ہوگئی۔ [illegible] ایک ایک کر کے تینوں کمرے میں

کوٹھی میں داخل ہوگئیں۔ پورا ہجوم سیدھا میرے کمرے میں گھس آیا اور سعیدہ باجی نے

میرے ہاتھ سے کتاب چھینتے ہوئے کہا۔

"ہوں ___ تم بھی بڑی اَن رومانٹک لڑکی ہو۔ ایسے موسم میں بھلا پڑھنے کی کوئی تُک ہے۔ ایسا موسم تو گرم گرم کافی اور چائے کے ساتھ تفریح کا مطالبہ کرتا ہے!"

میں ایک دکھی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ___ "اصل میں ناول اِتنا دلچسپ تھا، میں یوں کھو گئی کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ ویسے بھی شام کی چائے کا وقت تو آہی گیا ہے۔ بس ایک صفحہ رہ گیا ہے اسے پڑھ ڈالوں ___"

شمیم نے ایک تیر چلایا جو سنسناتا ہوا آیا اور سیدھا میرے دل میں ترازو ہوگیا۔

"ہاں! اب ایک صفحہ پڑھ لوگی تو جیسے گریجویٹ ہی تو ہو جاؤ گی ___"

میں نے تڑپ کر شمیم کی طرف دیکھا۔ لیکن ایسے موقعے پر زبان کب ساتھ دیتی ہے ___؟ آنسو بھی تو اپنی ایک زبان رکھتے ہیں ___ ایسی زندگی کا وہی ایک لمحہ ایسا تھا جس نے مجھے زمین کی پستیوں سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر بٹھا دیا۔ تم نے شمیم کو بُری طرح گھورا ___ اور اُنہی نگاہوں سے، جن میں شمیم کے لئے زہر بھرا تھا، میری طرف دیکھا جو لمرت اور محبت کے شہد سے لبریز تھیں!

سعیدہ باجی نے ہنس کر ماحول کی کثافت کو دھونا چاہا اور بولیں: "شہاب! تم نے کبھی گرمیوں میں ساون کے بادل جھومتے دیکھے ہیں ___؟"

شہاب! اُس وقت تم نے [illegible] میری داستانِ حیات کا سب سے سُنہرا باب ہے ___ جی چاہا اُسی ایک لمحے میں مر جاؤں کہ ممکن ہے اِس کے بعد اتنی بھرپور خوشی جیون میں کبھی نہ ملے ___ لیکن میں مر نہ سکی اِس لئے کہ مجھے تو تمہارے دامن میں بھرے ہوئے خوشیوں کے اور بھی پھول سمیٹنے تھے ___ اور غم یہ ہے کہ اُس واردات کے بعد میں جی بھی نہ سکی ___ یوں بظاہر جینے کو جیتی رہی اور دیکھنے والوں نے تو یہی دیکھا کہ زندہ ہوں۔ لیکن محبت میں سب کچھ ہار دینے کے بعد زندگی کوئی زندگی رہ جاتی ہے ___؟؟

اُس رات جب سب سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے، تم بے دھڑک میرے کمرے میں چلے آئے ___ "شہاب! ___ تم ___؟" میں سہم کر بولی ___ "اِتنی رات گئے؟"

تم نے بے حد بے باکی سے کہا ___ "کیوں کیا میں کسی سے ڈرتا ہوں ___؟ اور کیا میں کسی بُری نیت سے آیا ہوں جو ڈرتا پھروں ___" ___ پھر تم نے بڑی نہایت سے میرا ہاتھ تھام کر کہا تھا ___ "مسز شہلا! میں تمہاری یہ عادت مجھے پسند نہیں۔"

"کون سی ___؟" میں نے سر اُٹھا کر بہت حیرت سے تمہیں دیکھا۔

"یہ تم بار بار روتی کیوں ہو ___؟ کیا اِس لئے کہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہو؟ کیا اِس لئے کہ تمہارے ابّو نہیں ہیں ___؟ لیکن اِن سب باتوں کے نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے شلّو! ___ میں جو ہوں تمہارے لئے ___؟" یہ کیسی بہار چھا گئی ___؟ یہ بادل رِم جھم کہاں سے برسنے لگے ___؟ یہ جہنم میرے لئے جنّت کیسے بن گیا ___؟ یہ الفاظ کیسے ہیں؟

میں جو ہوں تمہارے لئے ___

میں جو ہوں تمہارے لئے ___

میں جو ہوں ___

شہاب کہہ رہا تھا ___ "شہلا! تم وہ سچا ہیرا ہو جسے کوئی ماہر جوہری ہی پرکھ سکتا تھا اور یقین کرو شہلا تمہیں مجھ سے زیادہ، مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں پرکھ سکتا۔ میں جانتا ہوں تم میٹرک بھی پاس نہیں ہو۔ لیکن تمہارے مینرز، تمہارا سلیقہ، تمہارا رکھ رکھاؤ اِتنا اونچا ہے کہ ایم۔ اے پاس لڑکیاں بھی تمہارے سامنے ہیچ ہیں ___ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سب سے کم دولت تمہاری امّی کے پاس ہے۔ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ تم سی لڑکی کی ماں ہو کر وہ کوٹھی کی سب سے دولت مند خاتون ہیں۔ مجھے پتہ ہے کوٹھی میں حسین لڑکیوں کی کمی نہیں۔ لیکن تمہارا یہ ملاحت بھرا چہرہ، یہ سانولے رخسار، یہ ریشمیں گھٹاؤں ایسے لانبے لانبے بال، اور تمہاری یہ ہر دم جھکی جھکی رہنے والی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں یقیناً ایسی ہیں کہ تمہیں سب سے نمایاں کر سکیں۔" وہ ذرا رُکا اور جھجک کر بولا ___ "مجھے یقین ہے تمہیں پانے والا شخص دُنیا کا سب سے خوش نصیب شخص ہوگا ___"

میں نے گھبرا کر آنکھیں اُٹھائیں ___ وہ بڑی بے نیازی سے کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ ایکدم وہ پلٹا اور بولا ___ "پلیز ___ یوں رویا نہ کرو شلّو ___ میرا دل ٹوٹنے لگتا ہے۔"

کہیں سے بکھری بکھری ہنسی میرے ہونٹوں پر آکر سمٹ گئی ___ "شہاب! تم سمجھتے ہو آنسو بھی کسی کو بھلے لگتے ہیں؟"

"لیکن ہر درد کا مداوا بھی تو ہے۔"

"ہر درد کا مداوا ___؟ اب تک تو یہی ہوا ہے شہاب کہ پھولوں کی لگن میں جب بھی میں نے ہاتھ بڑھایا ہے سدا کانٹے ہی ہاتھ آئے ہیں۔"

"اب سے یوں کرنا کہ کانٹے سدا میرے دامن میں ڈال دیا کرنا اور پھولوں سے اپنا آنچل بھر لیا کرنا ___"

میں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ شہاب کے ہونٹوں پر رکھ دیا ——
"خدا نہ کرے شہاب —— خدا نہ کرے —— ایسی بدفال منہ سے
نکالو —— میں تو یہ دعا کروں گی کہ تمہارے پیروں میں چبھنے والا ہر کانٹا میرے دل
میں چبھ جائے اور تمہاری راہیں سدا پھولوں سے ڈھکی رہیں ——
"نہیں میری جان —— میں قیامِ ازل سے سارے اندھیرے اپنے
لئے مانگ لوں گا اور تمہارے لئے صرف روشنیاں ہوں گی۔ بھرپور اجالے۔"

میری جان ——

میری جان ——

میری جان ——

میں کٹی ہوئی ڈالی کی طرح کانپ کر بستر پر گر پڑی —— میں یہ خوشی
سنبھال پاؤں گی —— میں —— میں۔ —— ؟ مر تو نہیں جاؤں گی —— میں نے
کانپ کر سوچا —— جانے شہاب کب میرے کمرے سے نکل کر جا چکا تھا اور اس کے
ساتھ ساتھ میری نیند بھی —— اس رات میں نے خوشیوں میں ڈوب کر رت جگا منایا۔
میں مرنا نہیں چاہتی۔ میں آنے والی خوشیوں کے لئے جینا چاہتی ہوں۔ میں شہاب
کے لئے جینا چاہتی ہوں —— میں —— میں ——!
آنسوؤں سے میرا تکیہ بھیگ گیا۔ سنہرے رنگوں سے کڑھے ہوئے پھول نئی
روپ اٹھے —— میری زندگی صبح کے اُجالوں سے جگمگا اٹھی۔

اتنی بے پایاں خوشی کیسے سنبھالوں —— ؟ جی چاہتا تھا چیخ چیخ کر ایک
ایک کو سناؤں —— چاند کے کان میں سرگوشی کروں۔ تاروں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ دوں۔
بہاروں کو، پھولوں کو، پتوں کو۔ ساری دنیا کو رازدار کرلوں کہ دیکھو —— مجھے کیسی
مار ڈالنے والی خوشی مل گئی ہے —— جی چاہتا تھا ایک جشنِ بہار مناؤں۔ مگر
مگر —— میں نے رک رک کر، سہم سہم کر سوچا —— "اگر میری خوشیوں کو نظر
لگ گئی تو —— ؟؟"
یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ اس حسین واردات کے دو دن بعد میری
سالگرہ تھی —— ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا —— مجھے سالگرہ منانی
ہی چاہئے۔ ورنہ یہ خوشی اگر دل ہی دل میں رہ گئی تو میں شاید سہہ نہ سکوں گی۔ مر
ہی جاؤں گی —— ہماری کوٹھی کے آس پاس اور بھی کئی بنگلے تھے۔ جہاں میری
کتنی ہی بچپن کی پیاری پیاری سہیلیاں بھی تھیں —— پھر گھر کے اتنے سارے
لوگ —— ہاں یہ موقع اچھا ہے۔ لیکن آج تک تو میں نے آپ اپنی سالگرہ کبھی
نہیں منائی۔ اب یہ کتنی شرم کی بات ہوگی کہ میں اپنے آپ اعلان کرتی پھروں کہ میں
اپنی سالگرہ منا رہی ہوں —— ؟!
اس مشکل کو شہاب نے حل کر دیا —— جانے اسے کیسے پتہ چل گیا ہوگا میری
سالگرہ کی تاریخ چار مئی پڑتی ہے۔ اس دن کھانے کی میز پر رات کے وقت اس نے
سب کے سامنے اعلان کر دیا۔
"ہم سبھی پرسوں شہلا کی سالگرہ منائیں گے۔"
شمیم نے حیرت سے پوچھا "لیکن کس خوشی میں ؟"
"کس خوشی میں —— ؟" شہاب حیرت سے نوالا ہاتھ میں تھامے تھامے
بولا —— "کیا یہ خوشی کی بات نہیں کہ پرسوں شہلا کی زندگی کے گلستان میں اٹھارواں
پھول کھلے گا —— ؟"
ذاکر بھائی بولے —— "اور یوں بھی ہم پردیسیوں کی زندگی میں ایسے
ہی بہانوں سے تو ذرا چہل پہل ہو جاتی ہے ورنہ ہم ہیں اور ہوسٹل کی بے کیف زندگی ؟"
—— شمیم زچ ہو کر بولی —— "تو میں کب منع کرتی ہوں —— شوق
سے منائیے ——"
اور وہ دن، میری زندگی کا یادگار دن تھا۔ جب میری آنکھوں نے،
جو اب تک صرف ساون کے بادلوں کی طرح برستی تھیں، جی کھول کر ہنسنا سیکھا
میرے لئے —— یہ سب کچھ اتنا نیا نیا اور عجیب عجیب سا تھا —— لیکن میں
خوش تھی۔ بے انتہا خوش! —— احساسِ کمتری اور غم کا وہ ناگ جو رہ رہ کر آج
تک میرے انگ انگ کو ڈستا آیا تھا، اپنا پھن جھکا کر کہیں روپوش ہو گیا تھا ——
تحفوں سے میرے سامنے والی میز بھر گئی۔ سبھی نے کچھ نہ کچھ دیا۔ لیکن شہاب یونہی
خالی ہاتھ بیٹھا رہا۔ کسی نے ٹوکا بھی تو وہ ٹال گیا۔ لیکن مجھے قطعاً غم نہ تھا —— جو اپنا
دل ہی دے دے، اس سے اور کون سے تحفے کی آس کی جا سکتی ہے —— جو
جو زندگی اور زندگی کی ہر خوشی سے عبارت ہوتا ہے۔ وہ تو میرا تھا نا ؟
رات گئے ایک مانوس خوشبو میرے کمرے میں بھٹکی اور میرا انگ انگ مہک
کہہ اٹھا، یہ تم ہو —— یہ تم ہو شہاب —— میری زندگی کی سب سے زیادہ عزیز
ہستی۔ وہ نام جسے سن کر دل عقیدت سے بھر جاتا ہے۔ وہ مہک جسے سونگھ کر
زندگی بہاروں کا روپ بن جاتی ہے —— میں کیسے اس آہٹ، اس مہک
اس خوشبو کو نہ پہچانوں گی —— ؟؟
کمرے کا دروازہ کھلا اور شہاب اندر داخل ہوا جیسے عبادت خانہ
میں دیوتا کی موجودگی سے دل ایک انجانے خوف اور عقیدت سے دھڑک اٹھتا
ایسے ہی میرا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھنا چاہا لیکن اتنی قوت کہاں
تھی ! —— رات کی خاموشی میں دو سانسیں تھیں جو ایک ہی تال اور ایک ہی

جل رہی تھیں۔

میں جو بھی ہوں تمہارے لئے ——

میں جو بھی ہوں تمہارے لئے ——

بڑی دیر بعد شہاب نے دھیرے سے پکارا —— "شفو!"

میں نے ساری دنیا کا بوجھ لئے بڑی مشکل سے پیچھے گھوم کر دیکھا اور دوڑ کر شہاب کے قدموں میں گر گئی۔

"ارے ارے شفو —— یہ کیا کرتی ہو ——؟" اُس نے ایک ہاتھ سے سنبھال کر مجھے اٹھایا، دوسرے ہاتھ میں ایک خوبصورت سی ٹوکری تھی جسے وہ میرے سامنے کر کے بولا: "یہ تمہاری سالگرہ پر ایک حقیر تحفہ۔"

میں نے سنبھل سنبھل کر ٹوکری کھولی —— تازہ تازہ خوش رنگ گلاب ——

کمرہ خوشبوؤں سے بھر گیا۔ میں نے سر اٹھا کر شہاب کو دیکھا اور رُکتے رُکتے بولی

"یہ پھول ——!"

شہاب نے بات کاٹ دی —— "مُرجھا جائیں گے لیکن تمہاری محبت کا سدا بہار پھول میرے دل میں سدا تر و تازہ رہے گا۔"

میں نے پھولوں کو دھیرے سے اُٹھایا —— ایک دو کی بجائے پورے اٹھارہ بڑے بڑے شگفتہ گلاب —— میں نے انہیں اُٹھا کر اپنے دل سے لگا لیا ——

"یہ تمہاری امانت محبت کے امین ہیں شہاب —— میں زندگی بھر ان پھولوں کی حفاظت کروں گی —— یہ تمہاری ہی نہیں میری بھی وفا کے امین ہیں —— "ٹپ سے دو آنسو میری پلکوں سے ٹپکے اور گلاب کی سبیج پتیوں پر سچے موتیوں کی طرح جگمگانے لگے —— شہاب دھیرے سے آگے بڑھا۔ اُس نے میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر تھام لیا —— جانے کتنے لمحے یونہی گزر گئے۔ کون جانے وہ صدیاں تھیں —— مجھ میں یہ تاب کہاں تھی کہ شہاب کو اتنے قریب دیکھ سکتی۔ بس اُس کے سانسوں کی تپش تھی جو میرے چہرے پر صبح کے سورج کے نرم نرم اُجالے کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بھاری مگر سنبھلی ہوئی آواز میں بولا۔

"آج تم مجھ سے اتنی قریب ہو کہ کوئی فاصلہ حائل نہیں۔ کوئی رکاوٹ، کوئی چٹان ہمارے درمیان نہیں۔ میں چاہوں تو تمہاری ان خوابناک آنکھوں کو چوم لوں۔ لیکن تم جانتی ہو شہلا، محبت میں پاکیزگی میرے لئے سب سے پہلی شرط ہے۔ جب میں جانتا ہوں کہ تم میری ہو اور میں تمہارا —— تو پھر ایسی امانت محبت کے لئے میں کسی جھوٹی مہر کا سہارا کیوں لوں ——؟؟"

اُس نے ہاتھوں کے پیالے کو دھیرے دھیرے میرے چہرے سے الگ کیا اور اُلٹے قدموں چلا، یوں کہ جیسے میں کوئی دیوی تھی اور مجھ سے پیٹھ کرنا گناہ۔ دھیرے دھیرے کمرے سے باہر ہو گیا۔

اب کی بار شہاب لکھنؤ گیا تو میں اِس طرح ٹوٹ کر روئی جیسے سب کچھ آنسوؤں میں بہہ کر رہ جائے گا —— سب کے سامنے رونا بھی تو نا ممکن تھا۔ بس میں تھی اور میرا تکیہ —— ممی کو میری صحت کی فکر کھانے لگی کیونکہ کچھ ہی دنوں میں میرا وزن اِتنا کم ہو گیا کہ چلتے چلتے کئی بار مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ہوا کے دوش پر اڑنے لگوں گی۔ ممی مجھے طاقت بخش غذائیں اور ٹانک لینے کو کہتیں۔ اور میں دل ہی دل میں ہنس کر سوچتی —— "ممی آپ نے کسی بیمارِ محبت کو دواؤں سے صحت یاب ہوتے دیکھا ہے ——؟"

ایک طرف تو مجھے شہاب کی جُدائی کا غم مارے ڈالتا تھا دوسری طرف ایک اور ہی فکر میرا خون پی رہی تھی۔ کیونکہ اپنی اپنی جگہ سبھی جانتے تھے کہ شہاب کی منگنی شمیم سے ہونے والی ہے۔ دیکھا جائے تو بڑا مناسب جوڑ تھا۔ شمیم بہت خوبصورت تھی۔ بی اے میں پڑھ رہی تھی۔ اور سونے پر سہاگہ ماموں جان کی بے اندازہ دولت کی تنہا مالک۔ اُس کا تو ہر غرور جائز اور ہر جذبہ بجا تھا —— لیکن میں اِس دل کا کیا کرتی جو برسوں سے چپکے چپکے شہاب کو چاہے جا رہا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ کبھو شہاب کی طرف سے پیش قدمی نہ ہونے پر میرے دل کا راز مجھ ہی تک رہا۔ لیکن اب جبکہ وہ اور میں دونوں ہی جانتے تھے کہ ہم صرف ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں، یہ بیل کیونکر منڈھے چڑھ سکتی تھی ——؟ پھر بڑی بات یہ کہ شہاب خالو ابا کا بیٹا تھا جن کے حکم سے کوٹھی کا ہر کام چلتا تھا —— شہاب کی محبت کی خوشی کا بوجھ، وہ مستقبل کی فکر و دل کا کرب ——! میں چکی کے دو پاٹوں کے بیچ بُری طرح پس رہی تھی۔ انسان جب ہی ہار بیٹھتا ہے تو سب کچھ خدا پر چھوڑ دیتا ہے۔ میں نے بھی یہ سوچ کر کہ خدا میری بہتری ہی کا سامان کرے گا، سب کچھ اپنے مالک پر چھوڑ دیا۔ دن تو خیر جیسے تیسے گزر ہی جاتا، رات اپنے دامن میں ہزار وسوسے لے کر آتی۔ ان دنوں میری آنکھیں کتنی بے خواب رہتیں —— میں نے کتنے چاندوں کی بیتیں دیکھائیں، میری آنکھوں نے کتنے ستاروں کے جنازے اٹھاتے ——؟ ایک ایسے ہی رُلا دینے والے دن میں نے بے بسی سے شہاب کو مخاطب کر ہی لیا —— "میرے شہاب! —— تم مجھ سے اتنے دور ہو کہ کبھی کبھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ اس جنم میں تعبیر پا بھی نہ سکوں گی —— پھر ایک موہوم سی آس مجھے جینے پر آمادہ کر دیتی ہے کہ تمہارے وعدے اتنے بھرپور تھے کہ مجھے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا کرے تم جلد لوٹو تاکہ میں پھر کبھی تم سے جُدا ہونے کی بات سوچ بھی نہ سکوں —— یہ خط لکھتے ہوئے میں کتنی ڈر رہی ہوں —— کہیں بات پھوٹ گئی تو؟ —— لیکن شہاب مجھ سے اب کچھ بھی برداشت نہیں ہو سکتا۔ کئی بار تو خودکشی کر لینے کو جی چاہتا ہے

[illegible]

سب کا صلہ ہے جیت کر تم [illegible] کو جانتے ہیں ــــــ خواب

[illegible]

میں بدلتا دیکھنے کی اُمید ہی میں جی رہی ہوں۔

خدا کرے میں تمہاری یادوں میں ہمیشہ محفوظ رہوں ــــــ زندگی میں اس سے بڑی کوئی خوشی نہیں کہ تم مجھے یاد رکھو ــــــ پیار کے ساتھ۔ تمہاری صرف تمہاری۔"

مجھے پتہ نہیں اِس خط کے الفاظ نے شہاب پر کیا اثر کیا ــــــ لیکن اِس کے جواب میں شہاب نے جو خط مجھے لکھا تھا اُس کا محض ایک جملہ ہی میری زندگی بھر کی خوشیوں کا سامان بن گیا۔

"میری جان! ــــــ اگر مجھے گناہ کا احساس نہ ہوتا تو یقین کرو میں حیدرآباد کے اُن در و دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے میں اپنی عاقبت بخیر سمجھتا جن میں تم رہتی بستی ہو ــــــ!!"

مجھے زندگی میں اور کیا چاہئے تھا؟ میں کتنی خوش نصیب تھی اِس کا اندازہ تو کچھ شہاب کا خط پڑھنے پر ہوا۔

اور وہ دن ــــــ جب شہاب نے پورے میڈیکل کالج میں ٹاپ کیا۔ سب کتنے خوش تھے۔ اور میں؟ ــــــ میں تو گویا آسمان کی سب سے بلند نشست پر جا بیٹھی تھی۔ جب لکھنؤ سے تار آیا ہے کہ "اب میں ڈاکٹر بن چکا ہوں" ــــــ وہ دن میری خوشیوں کی معراج تھا ــــــ سوچتے سوچتے میں پاگل سی ہو گئی ــــــ اب شہاب کے اور میرے ایک ہو جانے میں کون کسر باقی تھی ــــــ؟؟ شہاب لکھنؤ سے ڈاکٹر بن کر لوٹا تو مجھے یاد ہے، کامیابی اور نئی زندگی کی مسرّتوں سے اُس کا چہرہ آبدار موتی کی طرح جِھل مِل کر رہا تھا ــــــ ظاہر ہے اُن کے آتے ہی شادی کی بات چھڑی۔ لیکن مجھ سے نہیں۔ شمیم سے ــــــ شہاب نے بڑی خوبصورتی سے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ جو تین لڑکے اعلیٰ نمبر لے کر کامیاب ہوتے ہیں اُن میں سرِفہرست شہاب کا نام ہے اور حکومت اُن لڑکوں کو فارن بھیج رہی ہے اِس لئے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ــــــ ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میری خوشیوں کے چمن میں ہر سُو آگ ہی آگ پھیل گئی ہے اور ہر پھول پتہ اس آگ میں جھلسا جا رہا ہے ــــــ لیکن بہتے آنسوؤں کو قرار بس یہ سوچ کر آیا کہ اگر وہ میرا نہیں ہو سکتا تو کسی اور کا بھی تو نہیں ہو رہا ہے ــــــ میں کیسے اُسے کسی کا ہوتے دیکھ سکتی تھی ــــــ؟ مجھے تو اُس دھوپ

[illegible]

دو غم مجھ پر ایک ساتھ ٹوٹے ــــــ جس سال شہاب لندن گیا اُسی سال ممی بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں ــــــ شہاب سے ملنے کی، اُس کی واپسی کی تو ایک آس تھی۔ ممی وہاں گئیں جہاں سے آج تک کوئی لوٹ کر نہیں آیا ہے ــــــ اِس غم نے مجھے زندگی سے بیزار کر دیا۔ اب اِس بھری پری دنیا میں میں تنہا ہوں ــــــ ایک شہاب ہے جس کی آس پر زندگی کٹ رہی تھی۔ لیکن اب تو وہ بھی اِتنی دُور تھا جہاں پہنچنے کے لئے سوچوں کے پر بھی جل جل جائیں ــــــ شہاب نے جاتے وقت جو الفاظ کہے تھے وہی میری زندگی کا سرمایہ تھے ــــــ "شِلّو، میری گڑیا۔ میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہوں لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ زندگی میں تم سے جب کبھی ملوں گا، اکیلا ہی ملوں گا۔ ہم مل کر ہی ایک ہوں گے ــــــ ہم نے زندگی بھر کے لئے یہ عہد کیا ــــــ تاکہ ہم کبھی ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں گے!"

میں نے اپنی کانپتی انگلیاں اُس کے ہونٹوں پر رکھ دی تھیں اور لرزتی بولی تھیں ــــــ "بس شہاب بس! میں صرف اِسی ایک وعدے پر ہزار زندگیاں انتظار میں گزار سکتی ہوں" ــــــ اور اچانک ساون کے گہرے گہرے بھرپور بادل میری آنکھوں میں جھمک آئے اور میں شہاب کی قسموں کا خیال کئے بنا ہچکیاں لے لے کر رو پڑی ــــــ!

"شِلّو! یاد ہے تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ساون سے کوئی واسطہ نہ رکھو گی ــــــ"

اور میں سسکیوں کے درمیان بولی تھی ــــــ "کیا تم اِس بات پر خوش نہیں ہو شہاب! کہ یہ موتی میں تمہارے پیار ہی میں رول رہی ہوں؟"

شاید شہاب کی آنکھوں میں، میری آنکھوں میں جھانکنے کی سکت تھی ــــــ اُس نے مُنہ پھیر لیا تھا ــــــ لیکن میں دیکھ چکی تھی کہ ساون کے ہلکے ہلکے بادل وہاں بھی جھوم رہے تھے ــــــ!!

زندگی کتنی تیز رفتاری سے گزرتی ہے ــــــ؟! ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ آنے والا کل ہمارے لئے آنسوؤں کی سوغات لانے والا ہے یا خوشیوں سے بھرے تحفے؟ ــــــ اُنہی دنوں ملک تقسیم ہوا ــــــ مُدّتوں روح اور جسم کی طرح

ساتھ بہنے والے رشتے ناطے ختم ہوگئے ——— ایک دَور بیت گیا ——— ایک دَور شروع ہوا ——— ہماری کوٹھی بھی محفوظ نہ رہی۔ کتنے ہی لوگ پاکستان چلے گئے اور جنھیں اپنی مٹی سے پیار تھا وہ اسی سرزمین کو اپنی زندگی کی متاعِ بے بہا سمجھ کر بیٹھے رہے۔ ہمارے خاندان میں بھی کتنے انقلاب آئے ——— حمیدہ باجی۔ رقیہ آپا، ذکی، نوری، سیدہ ابھی سبھی کی شادیاں ہوگئیں ——— بہت سالوں کے انتظار کے بعد شمیم کو بھی بیاہ دیا گیا۔ لیکن میں نے زندگی میں شہاب سے جو وعدہ کیا تھا، اُس کے لئے بیٹھی رہی۔ شہاب نے چند سال پہلے خالو ابا کو ایک خط میں صاف صاف لکھ دیا تھا: "میں شادی کروں گا تو صرف شہلا سے، ورنہ میرے لئے اکیلے رہ کر زندگی گزار دینا کوئی مشکل بات نہیں ———" خاندانی روایتوں اور جاگیردارانہ دبدبے سے مجبور خالو ابا نے صاف صاف لکھ دیا ——— "ہمیں تمہاری آخری بات زیادہ پسند ہے شوق سے اکیلے رہو لیکن ہم ایک بار جبان زبان دے چکے، اُس سے ٹل نہیں سکتے۔" شہاب نے بددل ہوکر ہندوستان واپس آنے کی بات سوچنا ہی چھوڑ دی "میں وہاں آکر کیا کروں گا سوائے اس کے کہ ہر لمحہ اپنے دل کو دکھی محسوس کرتا رہوں!"

یہ کیسا غم ہے؟ ——— کیسی کسک ؟ ——— یادوں سے بوجھل یہ دل پھٹ کیوں نہیں جاتا ——— آج رہ رہ کر دل کی دھڑکن بڑھ کیوں رہی ہے؟ اتنے سال بیتنے پر آج پتہ چلا کہ زندگی نے، خاندان کے جھوٹے وقار کو نباہنے والے خالو ابا نے، بزرگوں نے میرے ساتھ کیسا سنگین مذاق کیا تھا ——— آج دوپہر کی بات ہے میں تنہا، اُداس اور ویران کوٹھی کے اُجڑے باغ میں سیڑھیوں پر بیٹھی تھی کہ ایک دُبلا پتلا بُوڑھا شخص جس کے چہرے پر وقت نے جھرّیوں کی شکل میں اپنے نشان چھوڑ دیے تھے، میرے سامنے آکر کھڑا ہوا ——— اُس نے غور سے میرے برف کی طرح سفید بالوں اور اُداس بے نور آنکھوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا میں بیگم شہلا سے مل سکتا ہوں ؟"

میں کمزوری کے باوجود تڑپ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیگم شہلا ——— کیسی بیگم شہلا ——— !؟ یہاں کوئی بیگم شہلا نہیں رہتی ——— !"

"تو کیا شہلا نے شادی نہیں کی تھی ———؟" بُوڑھا حیرت سے اپنی کمزور آواز میں پُوچھ رہا تھا۔

اب کے میں نے غور سے دیکھا ——— ارے شہاب !؟"

میں لڑکھڑا کر اُٹھی اور نووارد کے قدموں میں ڈھیر ہوگئی ——— "شہاب تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہو تو اکیلے ہی ملو گے ——— بھلا پھر میں کیسے اِس وعدے سے پھرتی ——— دیکھو شہاب میں آج بھی اکیلی ہوں "

ایکدم میری نظر اپنے ہی ہاتھوں پر پڑی ——— جُھرّیوں سے بھرے ہاتھ میری نگاہوں کی زد میں تھے۔ ——— میرا دل دُکھ سے بھر آیا ——— آہ کس قدر طویل انتظار ——— اب تو اِن ہاتھوں پر مہندی بھی نہیں رچ سکتی۔ یہ ہاتھ اب ننھا سا پنگوڑا بھی نہیں ہلا سکتے ——— ولولوں اور اُمنگوں کی عمر تو بیت گئی۔ اب مجھ میں کیا دھرا ہے ——— ؟

شہاب کے ہاتھوں میں سہما پڑا وہ خط تھا جس میں خالو ابا نے انھیں اطلاع دی تھی کہ "تم اپنی ضد کر سکتے ہو تو ہم بھی کم نہیں ——— ہم نے ایک ایک کر کے شہلا سمیت کوٹھی کی ساری لڑکیوں کو بیاہ دیا ہے ——— اب تم شوق سے عمر بھر تنہا رہو ———"

قدرت کا یہ کتنا سنگین مذاق تھا ——— کیسی دلخراش حقیقت۔ شہاب اُدھر یہ سمجھ رہا تھا کہ میں کسی دوسرے کی ہوگئی ہوں اور یہاں مجھ سے یہ بتایا گیا کہ شہاب نے لندن میں کسی انگریز لڑکی سے شادی کر لی ——— اُف! یہ دُوریاں، یہ فاصلے ——— !

دل میں رہ رہ کے یہ کیسی دھڑکن ہو رہی ہے خدایا جیسے اِس سانس کے بعد دوسری سانس نہ آئے گی ——— یہ کیسی کلیجے کو کاٹ دینے والی ہوائیں چل رہی ہیں۔ شاید ساون کی آمد آمد ہے ——— اِن ساون آگیا ہے۔ مگر میری زندگی میں نہیں ——— میری آنکھوں میں۔ اور اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ رِم جِھم رِم جِھم یونہی ہوتی رہے گی۔ اور میں دُکھے دل کو تھامے، ایک پیاسی رُوح کو لئے کراہتی رہوں گی۔

میں تنہا ہوں ——— !

میں تنہا ہوں ——— !!


دنیا بھر میں
پسندیدہ
اورینٹ
اورینٹ جنرل انڈسٹریز لمیٹڈ
کلکتہ ۱۱
ASP/OGI—5 64

مشہور اہلِ قلم کے ــــــــــــــ

محبوب مشغلہ

ــــــــــــــ راجہ مہدی علی خاں

۱۴۹۔ پالی روڈ۔ باندرہ بمبئی ۵۰

۲۷ مارچ ۶۵ء   مخدوم والا جناب بیسویں صدی صاحب اطنز و مزاح علیکم

ابھی ابھی آپ کو ایک ایکسپریس ڈلیوری لیٹر پوسٹ کیا ہے۔ خط پوسٹ کرنے کے بعد آپ کا گرامی نامہ ملا جس میں آپ نے دہلی میں نمک کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اتنا مہنگا نمک کھانے سے تو مرجانا بہتر ہے۔ اس سے تو اچھا یہی ہے کہ بمبئی میں نظر آنے والے نمکین چہروں سے نمک کھرچ لوں ــــــ میں خود ایک آدھ ماہ تک پاکستان جانے والا ہوں۔ سیر بھر کے قریب شاید لانے کی اجازت ہے ــــــ یہ معلوم کر کے بے حد افسوس ہوا کہ میرے ضروری خطوط بھی دفتر والے آپ کو اتنی دیر سے دیتے ہیں لیکن غالباً یہ دفتر والوں کا قصور نہیں۔ آپ نے ہدایت کر رکھی ہوگی کہ راجہ مہدی علی خاں کے خط ایک ہفتہ تک دراز میں رکھنے کے بعد آپ کے حوالے کئے جائیں ــــــ سرکار اگر میں آپ کو تار دوں کہ فلاں تاریخ کو میرا انتقال ہو رہا ہے۔ آپ فلاں تاریخ کو بمبئی آکر نمازِ جنازہ میں شامل ہو جائیے۔ اور دفتر والوں نے یہ خبر ایک ماہ کے بعد آپ کو پہنچائی تو اس عرصے میں کتے بلیاں قبر میں گھس کر میری لاش کھا چکی ہوں گی ــــــ خدا کرے میرا وہ خط جو میں نے آپ کو ابھی بھیجا ہے، آپ پڑھ لیں ــــــ پیارے بھتیجے کرشن کمار کے یہاں چوری کا جو افسوسناک واقعہ پیش آیا اس کی تفصیل معلوم کر کے بے حد صدمہ اور دکھ ہوا۔ ہمارا ملک تیزی سے اخلاقی ترقی کر رہا ہے۔ جب قوم کے لیڈر چور ڈاکو بن گئے ہیں تو عوام ان کے نقشِ قدم پر کیوں نہ چلیں گے۔ بمبئی میں بھی آئے دن اسی طرح کے بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ خدا ہم سب کو بچائے ــــــ ایک ضروری بات یاد آئی۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو اور کاپیاں پریس نہ گئی ہوں تو آنند نرائن مُلّا کے مشغلوں میں مندرجہ ذیل اضافہ کر لیجئے۔

"نقلی داڑھی لگا کر مسجدوں میں اذان دینا۔"

یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ آل انڈیا ایڈیٹرز کانفرنس کی انتظامیہ کمیٹی کے اجلاس کے بعد گوا سے بمبئی تشریف لائے ہیں۔ آپ نے میرے ہاں قیام نہ کیا تو یاد رکھئے آپ کی خیر نہ ہوگی۔ میں نے بمبئی کے ٹھیکیداروں سے منوں کے حساب سے مرغ و ماہی کے ٹینڈر طلب کر لئے ہیں۔ آتے وقت اگر ممکن ہو تو مندرجہ ذیل چیزیں لے آئیے۔ ۱۔ مرچوں کے اچار کے دو ڈبے، ۲۔ شہد بشرطیکہ خالص ہو، ۳۔ حبشی حلوہ، ۴۔ بغیر نمک والی مٹھیاں، ۵۔ اچار شلغم، ۶۔ خورشتر گرامی ڈھائی من ــــــ اور ہاں آپ کی بہن طاہرہ آپ کو اور بھابھی صاحبہ کو سلام لکھوا رہی ہے اور "فقیر خانہ" پر آپ کو آنے کی دعوت دے رہی ہے۔   مخلص ــــــ راجہ مہدی علی خاں

سلیمان اریب (حیدرآباد)

بار بار کسی ضروری کام سے بمبئی آنا۔ بمبئی آکر بھول جانا کہ کس کام سے آیا تھا۔ گھر آ انصاری صاحب کے گھر جا اُترنا۔ ظ انصاری صاحب کے گھر کو راجہ مہدی علی خاں کا گھر سمجھ لینا۔ انصاری صاحب کو بار بار "راجہ صاحب" کہہ کر پکارنا اور کہنا کہ راجہ صاحب آپ کافی دُبلے ہو گئے ہیں۔ صبح اُٹھ کر عزیز قیسی صاحب کے گھر چلے جانا اور عزیز قیسی صاحب کو ظ انصاری سمجھ لینا۔ ساری رات شغلِ مے جاری رکھنے کے بعد ظ انصاری صاحب کے یہاں واپس آجانا۔ اسی طرح ظ انصاری صاحب کے گھر سے عزیز قیسی کے گھر تک اور عزیز قیسی کے گھر سے ظ انصاری کے گھر تک مسلسل پندرہ روز تک آتے جاتے رہنا اور بھول جانا کہ میں کہاں ہوں اور کیوں آیا تھا۔

سڑک پر سے گزرتی ہوئی ایک بارات کو دیکھ کر اور بینڈ باجوں کی آواز سُن کر عالمِ مستی میں دوست احباب سے پوچھنا "دوستو! کیا کبھی میری بھی شادی ہوئی تھی؟ اگر ہوئی تھی تو میری دُلہن کہاں ہے؟ بچے کہاں ہیں؟ اُن کے نام کیا کیا ہیں؟ کتنے بڑے ہو گئے ہیں؟ اسکول میں پڑھتے ہیں یا نہیں؟ شراب تو نہیں پیتے؟"

دوستوں کا ہاتھ پکڑ کر اُنھیں حیدرآباد کی ٹرین میں زبردستی سوار کر دینا۔ گھر پہنچ کر اپنی بیگم صفیہ سلیمان اریب کو بھول جانا۔ اُنھیں سردار کنور مہندر سنگھ بیدی سمجھ لینا اور کہنا "سردار جی آپ کب تشریف لائے؟" بیگم کا اُنھیں حیرت سے تکنا۔ سلیمان صاحب کا پندرہ دن تک بے ہوش پڑے رہنا۔

اُن کا سب سے اہم مشغلہ ہے ماہنامہ "صبا" کو بڑی باقاعدگی سے بے قاعدہ نکالنا۔ ادب کے کاروبار میں خسارے اُٹھانا اور "اُف" نہ کرنا (فرصت نہ ہونے کی وجہ سے)

منشیات سے پرہیز نہ کرنے پر اپنی بیگم سے ڈانٹیں کھانا۔ تنگ آکر یا نو پر یہ نغمے فضاؤں میں اُڑانا۔

ملتی ہے خوئے صفیہ سے نارالتہاب میں
مُسلم ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کھاتا ہوں کتنی ڈانٹیں میں بیگم سے کیا کہوں
کمزور ہوں بہت ہی میں علم حساب میں
پیرِ مغاں کو لکھا ہے تھوڑی سی بھیج اُدھار
میں جانتا ہوں کیا وہ لکھے گا جواب میں
مجھ تک کب اُس کی بزم سے آتا تھا کوئی جام
ابّو نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

قتیل شفائی (لاہور)

کبھی قتل ہو جانا۔ کبھی قتل کر دینا۔ کبھی خود بیمار ہونا۔ کبھی دوسروں کو بیمار کر دینا۔ کبھی شفا بن جانا۔ کبھی شفا کی بھیک مانگنا۔

غیر ملکوں میں جا کر بڑے خلوص، بڑی محبت سے نئے نئے دوست بنانا۔ لاہور واپس آکر ایک آدھ مہینہ اُن سے بڑی مخلصانہ خط و کتابت جاری رکھنا۔ اُن پہ ظاہر کرنا جیسے وہ اُن کے بغیر ایک منٹ بھی زندہ نہ رہ سکیں گے۔ کچھ عرصے کے بعد بے وجہ اُن سے اُکتا جانا اور اُنھیں لکھ دینا "اُلّو کے پٹھو اب بند کرو خط و کتابت۔ میں تم لوگوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ تم تو پیچھے ہی پڑ گئے۔"

صبح اُٹھ کر پلنگ ہی پہ ایک سگریٹ سلگا لینا۔ پھر ایک جماہی لے کر "پاشا" [1] کو نسوار کے پلنگ پر سے آواز دینا۔ نوکر کو بلا کر جسم پر سرسوں کی مالش کرانا۔ نہانے یا غسل کرنے کے بعد تسمین کے دو دو قطرے کانوں اور ناک کے نتھنوں میں ٹپکوانا۔ نئے کپڑے پہن کر ناشتے میں چھ بوتلیں بیئر کی پی کر اور دو کباب کھا کر دفتر جانے کے لئے تیار ہو جانا۔ جانے سے پہلے نوکر سے کہنا "سینٹ کی بجائے تھوڑا مٹی کا تیل کپڑوں میں سپرے لگا دو۔"

شام کو دفتر سے گھر آنا۔ شراب کو زیادہ نشہ آور بنانے کے لئے اس میں افیم اور دھتورا ملا کر مولویوں کے سامنے بیٹھ کر پینا اور کہنا "یہ شراب نہیں "شراب دھتورا" ہے جو جائز ہے۔

پھر عالمِ مستی میں شاعری کے دریا بہا دینا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

قتیلؔ گر نہ پیتا تو مے خانے کہاں جاتے
صراحی کس کے منہ لگتی یہ پیمانے کہاں جاتے
بہت سے ساقیوں کو گر نہ میں پنشن دیا کرتا
تو یہ معصوم اپنا ہاتھ پھیلانے کہاں جاتے
ہزاروں ہی حسینوں کی کفالت روز کی میں نے
نہ میں ہوتا تو بیچارے یہ بک جانے کہاں جاتے
کروڑوں مہ وشوں کے سر پہ سہرے میں نے دیکھے ہیں
نہ میں ہوتا تو یہ ناک اپنی کٹوانے کہاں جاتے
بہت سے گیت کاروں نے مرے نغمے چرائے ہیں
نہ میں ہوتا تو پھر یہ گیت لکھوانے کہاں جاتے

---

[1] حضرت قتیلؔ شفائی کا پیار کا نام۔

کر تونسوی (دہلی)

ترنسہ شریف جاکر اپنے بدمعاش دوستوں کی اصلاح کے لئے دعائیں کرنا۔ کی عاقبت کی فکر کرنا۔ فکر کے ساتھ ساتھ "ذکر" کرنا۔

بات بات پر کہنا کہ "میں تو ایک بہت ہی معمولی آدمی ہوں" دل میں کہنا "میرے دنیا میں سب کمینے اور رذیل ہیں"۔

ڈیلی "ملاپ" کے چھپے ہوئے فارموں پر دوستوں کو خط لکھ لکھ کر خیانتِ مجرمانہ مرتکب ہونا۔ پکڑا نہ جانا (اس مضمون کی اشاعت کے بعد بھی بچ جانا)

بدخطی میں نوبل پرائز حاصل کرنے کی کوششیں کرنا۔ اپنی تحریریں عدالت کے مرسوں کو پیسے دے دے کر پڑھوانا۔

رات کے ایک بجے ناقدریٔ عالم پر رونا۔ رات کے دو بجے غصے میں آکر سڑکوں ننگا پھرنا۔ رات کے تین بجے اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہوکر چلّانا "اے حکومتِ ہندوستان ں ادیب اور شاعر بھوکے مرتے ہیں"۔

دنیا کے جنگل میں بسنے والے اُلوؤں سے ملاقات کرنا۔ اُن کی "آرتیاں" اُتارنا اور بنا "دوستو! آپ بہت عقل مند ہیں"۔ گدھوں کو سامنے بٹھا کر اپنے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین سنانا۔ اُن کی ڈھینچوں ڈھینچوں سننا۔ آہیں بھرنا۔

جنگل میں آنکھیں بند کرکے مزاح کے جھنڈے گاڑنا تاکہ خود فکر تونسوی کو پنے فن کی بلندی نظر نہ آسکے۔ لوگوں کو قسمیں دے دے کر یقین دلانا کہ فکر تونسوی جاہل ہے۔

ہندوستان، پاکستان، ایران، افغانستان، ترکستان، آسٹریلیا، افریقہ، امریکہ، انگلینڈ وغیرہ کے پرچوں میں مضامین لکھنا۔ ایڈیٹروں کو تاکیدی خط لکھنا کہ "اگر مجھے میرے مضامین کا معاوضہ دیا تو اچھا نہ ہوگا"۔

اداس رہنا، غریب رہنے کی کوشش میں مصروف رہنا۔ دھوپ میں بیٹھ کر نسو بہانا اور کہنا ؎

ایک رومال تلک گھر میں نہ پایا میں نے
دھوپ میں بیٹھ کے اشکوں کو سکھایا میں نے

جگدیش بمل (حیدرآباد)

افسانے پڑھنا، افسانے لکھنا۔ افسانے کھانا۔ افسانے پینا۔ افسانے سنانا۔ افسانوں کے خواب دیکھنا۔ مجسّم افسانہ بن جانے کی کوششیں کرنا۔ دوستوں سے ناراض ہو جانا کہ مجھے میرے افسانوں کی تعریف کیوں نہیں کرتے۔ جانی دشمنوں کے منہ سے اپنے افسانوں کی تعریف سن کر اُن کا جاں نثار دوست بن جانا۔

پیشے کے اعتبار سے برتن خریدنا۔ برتن بیچنا۔ برتن توڑنا۔ برتن چرانا۔ برتن قلعی کرنا۔ سٹین لیس سٹیل کی پتیلیاں سر پر مار مار کر خودکشی کی کوشش کرنا۔

نوٹ گننا۔ مسلمان دوستوں کی صحبت کی وجہ سے حساب میں کمزور ہو جانا۔ نوٹ گنتے گنتے گنتی بھول جانا۔ غصے میں آکر نوٹوں کی گڈیاں اٹھا اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دینا۔ کھڑکی سے نیچے جھانکنا کہ کون اٹھا رہا ہے۔ اٹھانے والے سے کہنا "بھائی ہاتھ روک کر خرچ کرنا۔ میری خون پسینے کی کمائی ہے"۔

دوستوں اور دشمنوں کو پکڑ پکڑ کر جوتشیوں کے پاس لے جانا۔ جوتشیوں سے کمیشن کھانا۔ اپنا اگلا جنم خراب کرنا۔

جوتشیوں سے مہورت نکلوا کر باتھ روم میں جانا۔ جوتشیوں سے پوچھ کر سفر کرنا۔ جوتشیوں سے پوچھ کر محبت کرنا۔ جوتشیوں سے پوچھ کر عداوت کرنا۔

کئی سال ہوئے بڑے شوق سے کہیں سے دردِ دل خرید کر لائے تھے۔ اب تک اس درد کو پال رہے ہیں۔ دل کا دورہ پڑتا ہے تو کسی ڈاکٹر کو نہیں بلاتے ہر شام اپنے گھر کی چھت پر سگریٹ سلگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور دل پر ہاتھ رکھ کر دردبھری دُھن میں گاتے ہیں ؎

یاالٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل
اور بڑھتا جائے یہ دردِ دل
میں کئی سالوں سے ہوں پژمردہ حال
اپنے پہلو میں چھپائے دردِ دل
اُس معالج کو دعائیں دوں گا میں
فیس لے کر جو بڑھائے دردِ دل

امتیاز علی تاج (لاہور)

زندۂ جاوید کتاب "انارکلی" لکھنے کے بعد لکھنے سے توبہ کر لینا۔ توبہ کے بعد ہاتھ میں تسبیح لے کر مصلّے پر بیٹھ کر توبہ و استغفار پڑھتے رہنا اور پرانے زمانے کی روپہلی یادوں کو وقتاً فوقتاً دریائے راوی میں پھینکواتے رہنا۔

اپنے پیارے پرچوں "پھول" اور "تہذیبِ نسواں" کو سالہا سال تک ایڈٹ کرنے اور کرانے کے بعد انھیں قبروں میں زندہ دفن کر دینا۔ اُن کی قبروں پر فاتحہ پڑھنا۔

بچوں اور عورتوں کے پرچوں کے ایڈیٹروں اور مالکوں سے آہ بھر کر کہتے رہنا ؎

من مذکرم شمار حذر کنید

ادب کا دامن چھوڑ کر ریڈیو اور فلم کا دامن تھام لینا۔ اکثر یہ شعر وردِ زبان رکھنا ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں ادب کی وہ میرا آشیانہ

سید عبد الحمید عدم (لاہور)

خوبصورت غزلیں اور بدصورت نظمیں لکھنا۔ مردم شماری کے زمانے میں اِس محکمے کے سٹاف کو تنگ کر اس سے اپنی "نظم شماری"، "غزل شماری" اور "دیوان شماری" کا کام لینا۔

اپنے محلے کو عدم آباد کہنا۔ اُوپر کی دُنیا کو مُلکِ عدم کہنا۔ کسی دوست کے مرنے کی خبر سُن کر کہنا بے چارہ میرے مُلک میں چلا گیا۔

یہ شعر وردِ زبان رکھنا ؎

میں اِس لئے پیتا ہوں مے خانۂ دُنیا میں
جی لگتا نہیں میرا ویرانۂ دُنیا میں
آنکھوں میں لئے ارماں نظروں میں لئے سجدے
پھرتا ہوں میں آوارہ، بُتخانۂ دُنیا میں

پروفیسر علم الدّین سالک (لاہور)

تاریخِ اسلام پڑھانا۔ مُسلمان بادشاہوں کا شجرۂ نسب یاد کرنا۔ اِن کی خوبیاں شمار کرنا۔ کچھ خوبیوں کا اپنی طرف سے اضافہ کر لینا۔ ثابت کرنا وہ فرشتے تھے۔ ولی اللہ تھے۔ دن رات اللہ اللہ کرتے رہتے تھے۔

ثابت کرنا کہ علاؤ الدین خلجی اور پدمنی کا واقعہ غلط ہے۔ کیونکہ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ علاؤ الدین خلجی نابینا تھے۔ جب اُنھیں نظر ہی نہیں آتا تھا تو وہ کیسے مطالبہ کر سکتے تھے کہ اچھا! پدمنی جی نہیں تو آئینہ میں پدمنی جی کا عکس ہی دکھا دیجئے۔

ثابت کرنا کہ انارکلی کے دیوار میں زندہ چُنے جانے کا واقعہ غلط ہے۔ کیونکہ معتبر تاریخیں بتاتی ہیں کہ اُس زمانے میں شہنشاہ اکبر نے کالے پانی میں ایک عالیشان محل تعمیر کرنے کے لئے مُلک کے تمام معماروں کو ہندوستان سے باہر بھیج دیا تھا۔ جب مُلک میں معمار ہی نہیں تھے تو انارکلی کو دیوار میں زندہ کس نے چُنا؟ جبکہ بیربل، مُلّا دو پیازہ، تان سین، فیضی وغیرہ معماری نہیں جانتے تھے۔ ثابت کرنا کہ نور جہاں بُرقع پہنتی تھی۔ شہزادہ جہانگیر ایک بُرقع پوش عورت کو کیسے کبوتر پیش کر سکتا ہے۔ پھر سلیم اُسے دیکھے بغیر کیسے اُس پر عاشق ہو گیا۔

ثابت کرنا کہ جہانگیر شراب نہیں کوکا کولا پیا کرتا تھا۔

ثابت کرنا محمد غوری نے کبھی ہندوستان پر حملہ کر کے لُوٹ مار نہیں کی تھی صرف غور کرنے آئے تھے۔

ثابت کرنا کہ محمود غزنوی نے کبھی سومنات کے مندر پر حملہ نہیں کیا اور نہ ہی لُوٹ مار کی۔ معتبر تاریخیں بتاتی ہیں کہ ہندوستان میں سومنات کا کوئی مندر تھا ہی نہیں بعض تاریخیں بتاتی ہیں سُلطان محمود نامی کوئی بادشاہ ہوا ہی نہیں۔ عزیز و محمود اپنے شاگردوں کو اِس قسم کے اشعار گنگنانے سے روکنا ؎

اچھے وہی ہیں مومن، مے خانے میں جو آکر
پیتے ہیں شراب اوّل کھاتے ہیں کباب آخر
پھر عالمِ مستی میں یہ رِند، یہ دیوانے
چیتے ہیں کباب اوّل کھاتے ہیں شراب آخر

سلمان الارشد فاروقی (کراچی)

قِسم قِسم کی بیماریوں کو پکڑ پکڑ کے گھر لانا۔ بیماریوں کی مالائیں پرو پرو کر کچھ اپنے گلے میں، کچھ اپنی بیوی کے گلے میں ڈال دینا۔ بچوں سے کہنا ہم بیمار ہوتے ہیں تم ہماری تیمارداری کرو۔

یاس انگیز خط لکھنا۔ بے حد دُبلا ہونے کے باوجود ہر وقت اپنے آپ کو اور اپنی بیگم کو دُبلا ہونے کی دوائیں کِھلاتے رہنا۔ بیماری میں بھی الشجاع کی ادارت کے فرائض انجام دینے سے باز نہ آنا۔

دوستوں سے محبت کرنا۔ دُشمنوں سے محبت کرنا۔ سب کی ناز برداری کرنا۔ سب کی خاطر مدارات کرنا۔ یہ شعر وردِ زبان رکھنا ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ پتے چیک کرنے کے بعد "بیسویں صدی" ہر ماہ باقاعدگی سے سپردِ ڈاک کیا جاتا ہے۔ اِس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک سے بھی کیجئے۔

(منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۲)

غزل

اختر واصفی

تھی اُن کی ہر اک بات عیاں اور نہاں اور
غیر اور ہی کچھ سمجھے ہوا مجھ کو گماں اور

اک میں ہوں نہیں ظاہر و باطن میں کوئی فرق
اک تم ہو کہ رکھتے ہو جو دل اور زباں اور

یہ ابر، یہ سبزہ، یہ لبِ جُو، یہ مے و جام
ایسے میں تم آجاؤ تو ہو جائے سماں اور

ہم رندِ بلانوش ہیں، دو چار سے کیا کام
لا جام پہ جام اور ابھی پیرِ مغاں اور

یہ طالبِ دنیا ہے، تو وہ طالبِ عقبیٰ
کافر کا جہاں اور ہے مومن کا جہاں اور

ٹھکرا کے جب آئے ہیں یہاں دونوں جہاں کو
اب اُٹھ کے تری بزم سے ہم جائیں کہاں اور

یہ دیر و حرم ہی نہیں عشاق کی منزل
سجدوں کے بہت اِن سے بھی آگے ہیں نشاں اور

مر جانا تو کچھ بات نہیں عشق میں ہمدم
اس راہ میں آتے ہیں بہت سنگِ گراں اور

وہ وقت گیا جبکہ تمہیں تم تھے مری جاں
ہیں تم سے سوا اب تو حسیں اور جواں اور

حاصل نہ ہُوا ہم کو تو عرفانِ زمیں بھی
غیروں نے پرے چرخ سے ڈھونڈے ہیں جہاں اور

اس دل کی لگی کا تو یہ درماں نہیں ناصح
میں ضبط جو کرتا ہوں تو اُٹھتا ہے دھواں اور

ناکردہ گناہوں کی نہ حسرت رہے دل میں
دم بھر کی تو مہلت دے جہانِ گذراں اور

اختر یہ غزل گرچہ ہے غالب کی زمیں میں
لیکن ہے اِک انداز یہاں اور وہاں اور

غزل

رشی پٹیالوی

زندگی سی چیز پا کر اس نے کچھ پایا نہیں
جس کے دامن میں تری اُلفت کا سرمایا نہیں

بیتر سے کھو جانے کی اُس کو فکر دامن گیر ہے
جس نے پانے کی طرح تجھ کو ابھی پایا نہیں

ایک عالم کے خیال و خواب پر چھایا ہُوا
ہائے وہ جلوہ جو اَب تک سامنے آیا نہیں

اُس کو موت آنے سے پہلے زندگی کھا جائے گی!
عشق میں ہنس ہنس کے جس نے زہرِ غم کھایا نہیں

وہ جمالِ دل نشیں ہے کس قدر سحر آفریں
دیکھ کر خود اپنی نظروں پر یقین آیا نہیں

کون سی شب ہم نہ تیری یاد میں ڈوبے رہے
ہم نے کس دن تیرے غم سے دل کو بہلایا نہیں

تھی عجب غارت گرِ ہوش اُن کی محفل میں فضا
خیر گزری پیش کوئی حادثہ آیا نہیں

اُن کو دیکھا یا نہیں دل سے نظر کا ہے سوال
پوچھتا ہے دل نظر سے اُن کو دیکھا یا نہیں

اُن کی شانِ رُونمائی کا سلیقہ دیکھئے
جلوہ آرائی بھی ہے پردا بھی سرکایا نہیں

کیوں ابھی سے غنچۂ اُمید کا رونا رشی
کھل کے مُرجھانے کا موسم تو ابھی آیا نہیں

افسانہ

آگ اور دُھواں

پروفیسر حامدی کاشمیری۔ ایم اے

بہوری کدل۔ سری نگر

۳۰ مارچ ۶۵ء

برادرِ عزیز! آداب

۲۲ مارچ کو میں جموں روانہ ہو رہا ہوں۔ وہاں سے لکھنؤ جانے کا ارادہ ہے، جہاں کچھ دن قیام رہے گا۔ ریسرچ کے سلسلے میں "مخزن" اور "دلگداز" کی پرانی فائلوں کا مطالعہ کرنا ہے۔ لکھنؤ سے واپسی پر دلّی آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا ــــــ ایک مدّت کے بعد آپ سے مُلاقات ہو رہی ہے، جس سے مجھے دلی مسرّت حاصِل ہوگی۔۔

آپ کا بھائی ــــــ حامدی کاشمیری

میں لرز اُٹھا!

اچانک اُس کی شفاف دودھیا پیشانی پر کئی شکنیں اُبھر آئیں۔ اُس کے شاداب چہرے پر بیزاری سی پھیل گئی۔ جیسے سیب کے سفید شگوفوں پر گھٹاؤں نے سایہ ڈال دیا ہو۔ وہ بے چینی سی محسوس کرنے لگی اور اپنے نچلے گلابی ہونٹ کو سفید سفید دانتوں سے چبانے لگی۔ کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اُس نے اپنے ڈیڈی کی طرف اُکتائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور اپنے اُلجھے اُلجھے بالوں پر ریشمی دوپٹہ ٹھیک کیا۔ اور مجھے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے، کمرے کے ماحول سے بالکل بے نیاز ہو کر بے چینی اور مایوسی میں انگلیاں چٹخانے لگی۔ اُس کے ڈیڈی بلند آہنگ لہجے میں اپنی چھوٹی سی خوبصورت چھڑی کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے اُن دنوں کے ایک واقعے کا ذکر کر رہے تھے، جب وہ ایس۔ پی کے عہدے پر فائز تھے۔

میں بظاہر اُس کے ڈیڈی عنایت اللہ کی باتیں توجہ اور دلچسپی سے سُن رہا تھا۔ لیکن اُس کے چہرے پر اچانک بیزاری، بے دلی اور بے چینی کے آثار دیکھ کر اندر ہی اندر سراسیمہ ہو رہا تھا۔ ابھی چند منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ وہ میرے ہاں آگئے تھے۔ عنایت اللہ اور رشیدہ میں ابھی ابھی آفس سے لوٹ کر چائے پی چکا تھا کہ سلام نے اطلاع دی کہ عنایت اللہ آئے ہیں۔ اُن کی لڑکی بھی آئی ہے۔ اور جب عنایت اللہ چھڑی گھماتے ہوئے اندر آئے تو اُنھوں نے بتایا کہ ہم بس سٹینڈ سے آ رہے ہیں۔ رشیدہ بیٹی اور میں ــــــ میں نے سوچا آپ سے مِل کر جانا چاہئے، کئی دِن سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔

آؤ بیٹا رشی، بیٹھو۔ یہ اپنا ہی گھر ہے۔ یہ ہیں میرے عزیز سرور صاحب۔ ایجوکیشن آفیسر۔ یہ ایجوکیشن ماشاء اللہ اچھا خاصا معزز پیشہ ہے۔ آدمی بکما ضرور بن جاتا ہے لیکن کرپٹ نہیں ہوتا ــــــ ویسے انسان کا ضمیر بیدار ہو تو وہ کسی حال میں بھی کرپٹ نہ ہوگا۔ مجھے یاد ہے جب میں ڈی۔ ایس۔ پی کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔

عنایت اللہ کرپشن کی بُرائیوں پر لیکچر جھاڑنے کے بعد حسب عادت رشی کے ذکر سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ اور میں حواس باختہ کبھی رشیدہ کو اور کبھی اپنے کمرے کو دیکھ رہا تھا۔ عنایت اللہ نے جب میرا تعارف کرایا تو رشیدہ کی گھنی پلکیں تھرتھرائیں گھنی اور نوکیلی پلکیں! اور اُس کی سیاہ [redacted] آنکھیں اُٹھیں اور ایک شرمیلی نظر، سورج کی شوخ کرن کی طرح میرے وجود کی گہرائیوں میں اُترتی چلی گئی۔ اُف! اِن آنکھوں میں کتنی کشش تھی۔ ایک مقناطیسی کشش! جس نے اُن واحد میں میری روح کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

وہ دونوں بیٹھ چکے تھے اور میں اپنے منتشر حواس سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمرے کی چیزوں کی بے ترتیبی اور ایک طرف چند میلے کپڑوں کی موجودگی کا احساس مجھے اندر ہی اندر شرمندہ کر رہا تھا۔ کاش سلام نے معمول کے مطابق آج بھی صفائی کی ہوتی۔ کاش عنایت اللہ اچانک نازل نہ ہوتے ہوتے۔ اُن کی تو خیر دوسری بات تھی۔ لیکن یہ حسین لڑکی، یہ بجلی غیر متوقع طور پر میرے دل و دماغ پر گِری تھی۔

جب میں قدرے اپنے حواس پر قابو پا چکا تو عنایت اللہ کے سلسلۂ کلام کو

آنکھیں

...نکھوں پر ہزاروں میکدے صدقے
وہ کافر بے پیئے ہی رات دن مخمور رہتا ہے ——— ریاض خیرآبادی

یہ بھی تو اب محبت نے گوارا نہ کیا
اُن کی تصویر کبھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی ——— حسرت موہانی

اشک اور اُن حسین آنکھوں میں
توبہ توبہ کسے گوارا ہے ——— حافظ لدھیانوی

اُمید نہیں اُن سے ملاقات کی ہر چند
آنکھوں سے مگر شوقِ تماشا نہیں جاتا ——— حسرت موہانی

یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے، کہتے ہیں جسے حُسن
جب دیکھیئے اِک نیند سی آنکھوں میں بھری ہے ——— جگر مرادآبادی

مرسلہ:۔ ایس۔ ایس ہنکاری ایم۔ اے۔ کلکتہ

توکر آفس سے آج دیر سے آنے کا ذکر کرنے لگا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میری حسین مہمان میری طرف ذرا بھی متوجہ یا ملتفت نہیں۔ اُس نے ایک دو بار اُچٹتی سی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ میں نے عنایت اللہ کی باتیں سُنتے ہوئے ایک آدھ بار چوری چھپے اُسے دیکھا۔ وہ بڑے بڑے پھولوں والی واش اینڈ ویر کی چُست قمیص اور شلوار میں ملبوس تھی۔ اُس نے ایک بڑی سی سوئٹر پہن رکھی تھی۔ سوئٹر کے بڑے بڑے بٹن شیشے کی مانند چمک رہے تھے۔ اُن کی چمک رہ رہ کر اُس کے رخساروں کو چھو جاتی۔ وہ اکہرے بدن کی ایک نازک سی لڑکی تھی۔ سیب کے باغات کی کھُلی اور معطر فضاؤں میں پلنے والی۔ اُس لڑکی کی صحت قابلِ رشک تھی۔ اُس کے سینے کی مُدوّر گولائیاں اُس کے جسم کی صحت مندی اور دلکشی کی نشانی تھیں!

وہ کسمسائی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

عنایت اللہ چونک پڑے۔

میری حالت غیر ہوگئی۔

• اچھا بھئی اب چلتے ہیں۔ رشیدہ تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ چلو رشی چلتے ہیں۔

سرور صاحب کبھی آیئے نا ہمارے غریب خانے پر۔ کل آجایئے۔ اتوار ہے۔ چائے ہمارے ساتھ پی لیجئے۔ دیکھئے ضرور آیئے گا

[illegible]

[illegible]

کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ چلے گئے تو رشیدہ نے میری طرف اُچٹتی سی نظر بھی نہ ڈالی۔ [illegible] سے اُٹھتے ہی وہ کمرے سے باہر نکل چکی تھی اور میں محسوس کر رہا تھا جیسے میری دنیا تاریک ہوگئی ہو۔

رشیدہ نے میرا دل توڑ دیا تھا۔ میری انفرادیت زخمی ہوگئی تھی۔ [illegible] ہے وہ اُجنن کے نشے میں چُور اکتنی آسانی سے اُس نے میرے وجود کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ چند منٹ بھی میرے کمرے میں ٹھہر نہ سکی۔ شاید اِس کمرے میں اُس کی سانس گھٹ گئی تھی یا شاید میری صورت ہی ایسی ہے کہ اُس کا جی چند ہی لمحوں میں اُچاٹ ہوگیا۔

وہ جا چکے تھے۔ شام کے سائے باہر سیب کے پھیلے ہوئے باغات میں پھیل رہے تھے اور میں بے بسی کے عالم میں دانتوں سے ناخن کترتے ہوئے اُداس سایوں میں گم ہوا جا رہا تھا۔

آج تک کسی لڑکی کے ایسے سنگدلانہ برتاؤ سے مجھے واسطہ نہ پڑا تھا جب تک میں کالج میں رہا۔ ڈبیٹنگ کلب کا سکریٹری رہا۔ اور کئی شوخ و شنگ لڑکیاں مجھ سے ملنے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔ میری شکل بھی بُری نہ تھی۔ اب ایجوکیشن میں رہ کر بھی میرا واسطہ بہت سی زہرہ جبینوں سے رہا۔ کچھ حسین عورتیں مجھ پر مائل بہ کرم تھیں۔ لیکن رشیدہ ——— رشیدہ کے شفاف دودھیا ہاتھ کی شکنیں تیز سوئیاں بن کر میرے جگر کو چھید رہی تھیں۔

میں اُس رات معمول کے مطابق سو نہ سکا۔ کئی بار آنکھ کھُلی اور آنگ کے بستر پہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ شکست کا احساس میری روح کو مجروح کر رہا تھا۔ میں نے آخر میں فیصلہ کیا کہ میں اس کے بارے میں ہرگز نہیں سوچوں گا۔ رشیدہ خوبصورت ہے تو ہوا کرے، اُس کا باپ صاحب جائیداد ہے تو کیا ہوا۔ رشیدہ میری کیا لگتی ہے؟ میرا اُس کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ میں نے طے کر لیا کہ صبح کو اُن کے ہاں نہیں جاؤں گا۔ اُن سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لوں گا۔

دھوپ کی تمازت کچھ کم ہو چلی تھی۔ سامنے کالی بسنتہ سڑک چمک رہی تھی اور دائیں بائیں دُور تک پھیلے ہوئے باغات میں سیب کے درخت قطار اندر قطار دھوپ سینک رہے تھے۔ درختوں کی شاخوں پر ہلکی سی، مبہم سی سبزی نمودار ہو چکی تھی۔ ہوا میں دھرتی کی سوندھی سوندھی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ یہ سارے باغات عنایت اللہ کے ہیں۔ جو انھیں اپنی مرحوم بیوی کے ورثہ میں ملے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں یہ عنایت اللہ کی اپنی جائیداد ہے جو انھوں نے پولیس میں نوکری کے دوران میں ناجائز طریقوں سے حاصل کی ہے۔ ... جو ... کار ... والا ... کہتا ہے کہ جائیداد عنایت اللہ نے ... [illegible] ... کی تاب نہ لاکر اُن کی بیوی گئی سلام ...

یہ بات اپنے باپ سے سُنی تھی جو کسی زمانے میں عنایت اللہ کے ہاتھوں بُری طرح پٹ چکا تھا ـ جتنے مُنہ اُتنی باتیں ــــــ مجھے ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ میں نے آج تک ان باتوں پر کبھی نہیں سوچا ـ مجھے یہاں ٹرانسفر ہوتے تین مہینے گزر چکے ہیں لیکن آج مجھے عنایت اللہ کے بارے میں مختلف خیالات پریشان کر رہے ہیں۔

میں نے ایک لمبی سانس لی!

یہ سوچیں مجھے کیوں پریشان کرتی ہیں؟ میں تو رشیدہ کے بارے میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا ــــــ لیکن وہ لڑکی اپنی تُند خُوئی اور بیگانہ وشی کے باوجود میرے دل و دماغ پر بُری طرح چھا گئی تھی۔ اُس کی تیز چمکتی ہوئی نظریں میرے دل میں پیوست ہو چکی تھیں۔ اُس کے جسم کا رنگ، جاذبیت، صفائی اور تمکنت میرے حواس میں انتشار پیدا کر رہی تھی۔ میں صرف اُس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ صرف ایک جھلک۔ تاکہ میری جلتی ہوئی آنکھوں کو شبنم کی طراوت ملے اور میں رات کو چین کی نیند سو سکوں۔ اگر وہ مجھے نظر نہ آئی تو آج کی رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ جائے گی، اور زندگی کی اتنی ساری پہاڑ سی راتیں ــــــ

میرے قدم ایک نامعلوم جذبے کی کشش کے تحت اُٹھ رہے تھے۔

رات کا فیصلہ رات کا افسانہ بن چکا تھا!

عنایت اللہ کے بنگلے کا سڑک پر کھلنے والا گیٹ آ گیا تھا! میں رُک گیا۔ کچی اینٹوں کی بنی ہوئی دیواروں کو سبز بیلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ دل کی دھڑکنوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے گیٹ کی زنجیر کانپتے ہاتھوں ہلائی۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ میں نے پھر زنجیر ہلائی۔ اندر کُتے کے بھونکنے کی آواز گونج اُٹھی۔ میں خوفزدہ ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی ایک باریک کھنکتی ہوئی نسوانی آواز نے کُتے کو ڈانٹا۔ کُتا خاموش ہو گیا اور دوسرے لمحے اندر سے دروازہ کھولا گیا۔ رشیدہ بدن کو جُھکائے ہوئے میرے سامنے تھی۔ وہ مجھے بھرپور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نگاہوں سے صبح کی روشنی پھوٹ رہی تھی اور میرا سارا وجود نرم، شفاف اور خُنک روشنی میں سر سے پاؤں تک نہا گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے دلفریب کونوں میں ایک دلآویز تبسم کی نازک کرنیں جنم لے رہی تھیں۔

اُس کی شفاف دُودھیا پیشانی آئینے کی طرح صاف تھی۔

اُس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ کھلے تھے۔ نم آلودہ برگ گلاب کی طرح شگفتہ، مہکے ہوئے!

یہ لمحہ کتنا خوبصورت تھا، کتنا سحر انگیز۔ مجھے محسوس ہوا یہ لمحہ خوشبو کی طرح پھیل گیا ہے اور پھیلتا چلا گیا ہے۔ اور میں بھی خوشبو کی اُمڈتی ہوئی لہروں میں تحلیل ہو کر زمان و مکان کی وُسعتوں میں پھیل رہا ہوں ــــــ!

[illegible]

یاد

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی
سُناتا جا رہا ہے، جس کو جتنا یاد ہوتا ہے ــــــ جگر مرادآبادی

یہ نکہتوں کی نرم روی، یہ ہوا، یہ رات
یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات ــــــ فراق گورکھپوری

زندگی نام ہے جدائی کا
آپ آئے تو مجھکو یاد آیا ــــــ زلین کلدشاد

جہاں بھولی ہوئی یاد آ کے دامن تھام لے دل کا
وہاں سے اجنبی بن کر گزر جانا ہی اچھا ہے ــــــ رشی پٹیالوی

کرتا ہوں ترے ملنے کی دن رات دعائیں
وابستہ تری یاد سے ہے یادِ خدا بھی ــــــ ساحر سیالکوٹی

مرسلہ:۔ کے کے سود۔ ایم۔ اے۔ دہلی

اُس کے ہونٹ مسکرائے۔ اِس مسکراہٹ میں کتنی اپنایت تھی، کتنا خلوص تھا، کتنا پیار تھا۔

میں نے بہت مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ رشیدہ مجھ پر اتنی مہربان ہو گی۔

عورت کتنے رُوپ بدلتی ہے۔

گیٹ کے اندر داخل ہو کر گلابوں کی تازہ خوشبو سے میرا دماغ معطر ہو گیا۔ دائیں بائیں لکڑی کے چھوٹے سے جنگلے کے ساتھ گلاب کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں چھوٹے چھوٹے سُرخ گلابوں سے خاردار جھاڑیاں ڈھک گئی تھیں اور ہوا میں تازہ خوشبو پھیل رہی تھی۔ ہوا کے معطر جھونکے سے رشیدہ کے ریشمی آنچل میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ اُس کی زلفوں کے ایک گُچھے کو ہوا چُوم رہی تھی۔ وہ آگے آگے تول تول کر قدم اُٹھا رہی تھی۔ میری نظریں پھر ایک بار اُٹھیں اور اُس کے سیاہ گھنے بالوں کے لہراتے ہوئے آبشار سے پھسلتی ہوئی اُس کے گداز شانوں سے ہو کر اُس کی پتلی کمر پر چپکی ہوئی باریک پھولوں والی قمیص پر رُک گئیں۔ اُس کے جسم کی متوازن ساخت، اُس کے سڈول بازو، نازک کمر، اُبھرے ہوئے کُولھے ــــــ وہ کیا ایک جیتا جاگتا مجسمہ!

میری نگاہیں اُس کے قدموں میں بچھ رہی تھیں!!

[illegible]

آنکھیں

خمار آلود آنکھوں پر ہزاروں میکدے صدقے
وہ کافر ہے پئے بھی رات دن مخمور رہتا ہے ——— ریاض خیرآبادی

یہ کن آنکھوں نے محبت نے گوارا نہ کیا
اُن کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی ——— حسرت موہانی

اشک اور اُن حسین آنکھوں میں
توبہ توبہ کسے گوارا ہے ——— حفیظ الرحمٰن

اُمید نہیں اُن سے ملاقات کی ہر چند
آنکھوں سے مگر شوقِ تماشا نہیں جاتا ——— حسرت موہانی

یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے، کہتے ہیں جسے حُسن
جب دیکھئے اِک نیند سی آنکھوں میں بھری ہے ——— جگر مرادآبادی

مرسلہ۔ ایس۔ ایس جھنکاری ایم۔ اے۔ کلکتہ

تو ذکر آفس سے آج دیر سے آنے کا ذکر کرنے لگا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میری حسین مہمان میری طرف ذرا بھی متوجہ یا ملتفت نہیں۔ اُس نے ایک دو بار اُچٹتی سی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہم نے عنایت اللہ کی باتیں سنتے ہوئے ایک آدھ بار چوری چھپے اُسے دیکھا۔ وہ بڑے بڑے پھولوں والی واش اینڈ ویئر کی چست قمیص اور شلوار میں ملبوس تھی۔ اُس نے ایک بڑی سی سوئٹر پہن رکھی تھی۔ سوئٹر کے بڑے بڑے بٹن شیشے کی مانند چمک رہے تھے۔ اُن کی چمک رہ رہ کر اُس کے رخساروں کو چھو جاتی۔ وہ اکہرے بدن کی ایک نازک سی لڑکی تھی سیب کے باغات کی کھلی اور معطر فضاؤں میں پلنے والی۔ اُس لڑکی کی صحت قابلِ رشک تھی۔ اُس کے سینے کی مُدوّر گولائیاں اُس کے جسم کی صحت مندی اور دلکشی کی نشانی تھیں!

وہ کسمسائی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

عنایت اللہ چونک پڑے۔

میری حالت غیر ہوگئی۔

"اچھا بھئی اب چلتے ہیں۔ رشیدہ تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ چلو رشی چلتے ہیں۔ سرور صاحب کبھی آئیے نا ہمارے غریب خانے پر۔ کل آجائیے۔ اتوار ہے۔ جاتے جاتے ساتھ پی لیجئے دیکھئے ضرور آئیے گا"

[illegible]

کرنا چاہتا ہوں"

وہ چلے گئے تو رشیدہ نے میری طرف اُچٹتی سی نظر بھی نہ ڈالی۔ میری سگرٹ سے اُٹھتے ہی وہ کمرے سے باہر نکل چکی تھی اور میں محسوس کر رہا تھا جیسے میری دنیا تاریک ہوگئی ہو۔

رشیدہ نے میرا دل توڑ دیا تھا۔ میری انفرادیت زخمی ہوگئی تھی۔ کتنی مغرور ہے وہ۔ حُسن کے نشے میں چور۔ کتنی آسانی سے اُس نے میرے وجود کو نظرانداز کر دیا تھا۔ وہ چند منٹ بھی میرے کمرے میں ٹھہر نہ سکی۔ شاید اِس کمرے میں اُس کی سانس گھٹ گئی تھی یا شاید میری صورت ہی ایسی ہے کہ اُس کا جی چند ہی لمحوں میں اُچاٹ ہوگیا۔

وہ جا چکے تھے۔ شام کے سائے باہر سیب کے پھیلے ہوئے باغات میں پھیل رہے تھے اور میں بے بسی کے عالم میں دانتوں سے ناخن کترتے ہوئے اداس سایوں میں گم ہوا جا رہا تھا۔

آج تک کسی لڑکی کے ایسے سنگدلانہ برتاؤ سے مجھے واسطہ نہ پڑا تھا۔ جب تک میں کالج میں رہا، ڈبیٹنگ کلب کا سکریٹری رہا۔ اور کئی شوخ و شنگ لڑکیاں مجھ سے ملنے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔ میری شکل بھی بُری نہ تھی۔ اب ایجوکیشن میں رہ کر بھی میرا واسطہ بہت سی زہرہ جبینوں سے رہا۔ کچھ حسین عورتیں مجھ پر مائل بہ کرم تھیں۔ لیکن رشیدہ ——— رشیدہ کے شفاف دودھیا ماتھے کی شکنیں تیز سوئیاں بن کر میرے جگر کو چھید رہی تھیں۔

میں اُس رات معمول کے مطابق سو نہ سکا۔ کئی بار آنکھ کھلی اور آگ کے بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ شکست کا احساس میری روح کو مجروح کر رہا تھا۔ میں نے آخر میں فیصلہ کیا کہ میں اس کے بارے میں ہرگز نہیں سوچوں گا۔ رشیدہ خوبصورت ہے تو ہوا کرے، اُس کا باپ صاحب جائیداد ہے تو کیا ہوا۔ رشیدہ میری کیا لگتی ہے؟ میرا اُس کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ میں نے طے کر لیا کہ صبح کو اُن کے ہاں نہیں جاؤں گا۔ اُن سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لوں گا۔

دھوپ کی تمازت کچھ کم ہو چلی تھی۔ سامنے کالی پختہ سڑک چمک رہی تھی اور دائیں بائیں دُور تک پھیلے ہوئے باغات میں سیب کے درخت قطار اندر قطار دھوپ سینک رہے تھے۔ درختوں کی شاخوں پر ہلکی سی، مبہم سی سبزی نمودار ہو چکی تھی۔ ہوا میں دھرتی کی سوندھی سوندھی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ یہ سارے باغات عنایت اللہ کے ہیں۔ جو انھیں اپنی مرحوم بیوی کے ورثہ میں ملے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں یہ عنایت اللہ کی اپنی جائیداد ہے جو انھوں نے پولیس میں نوکری کے دوران میں ناجائز طریقوں سے حاصل کی ہے۔ [illegible] جائیداد عنایت اللہ [illegible]

[illegible]

یہ بات اپنے باپ سے سنی تھی جو کسی زمانے میں عنایت اللہ کے ہاتھوں بُری طرح پٹ چکا تھا۔ عجیب منہ زبانی باتیں ———— مجھے ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ میں نے آج تک ان باتوں پر کبھی نہیں سوچا۔ مجھے یہاں ٹرانسفر ہوتے تین مہینے گزر چکے ہیں لیکن آج مجھے عنایت اللہ کے بارے میں مختلف خیالات پریشان کر رہے ہیں۔

میں نے ایک لمبی سانس لی!

یہ سوچیں مجھے کیوں پریشان کرتی ہیں؟ میں تو رشیدہ کے بارے میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا ———— لیکن وہ لڑکی اپنی تند خوئی اور بیگانہ وشی کے باوجود میرے دل و دماغ پر بُری طرح چھا گئی تھی۔ اُس کی تیز چمکتی ہوئی نظریں میرے دل میں پیوست ہو چکی تھیں۔ اُس کے جسم کا رنگ، جاذبیت، صفائی اور تمکنت میرے حواس میں انتشار پیدا کر رہی تھی۔ میں صرف اُس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ صرف ایک جھلک۔ تاکہ میری جلتی ہوئی آنکھوں کو شبنم کی طراوٹ ملے اور میں رات کو چین کی نیند سو سکوں۔ اگر وہ مجھے نظر نہ آئی تو آج کی رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ جائے گی، اور زندگی کی اتنی ساری پہاڑ سی راتیں ————

میرے قدم ایک نامعلوم جذبے کی کشش کے تحت اُٹھ رہے تھے۔

رات کا فیصلہ رات کا افسانہ بن چکا تھا!

عنایت اللہ کے بنگلے کا سڑک پر کھلنے والا گیٹ آگیا تھا۔ میں رُک گیا۔ کچی اینٹوں کی بنی ہوئی دیواروں کو سبز بیلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ دل کی دھڑکنوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے گیٹ کی زنجیر کانپتے ہاتھوں ہلائی۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ میں نے پھر زنجیر ہلائی۔ اندر کُتّے کے بھونکنے کی آواز گونج اُٹھی۔ میں خوفزدہ ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی ایک باریک کھنکتی ہوئی نسوانی آواز نے کُتّے کو ڈانٹا۔ کُتّا خاموش ہو گیا اور دوسرے لمحے اندر سے دروازہ کھولا گیا۔ رشیدہ بدن کو جُھکاتے ہوئے میرے سامنے تھی۔ وہ مجھے بھرپور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نگاہوں سے صبح کی روشنی پھوٹ رہی تھی اور میرا سارا وجود نرم، شفاف اور خنک روشنی میں سر سے پاؤں تک نہا گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے دلفریب کونوں میں ایک دلآویز تبسم کی نازک کرنیں جنم لے رہی تھیں۔

اُس کی شفاف دودھیا پیشانی آئینے کی طرح صاف تھی۔

اُس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ کھلے تھے۔ نم آلود، برگِ گلاب کی طرح شگفتہ، مہکے ہوئے!

یہ لمحہ کتنا خوبصورت تھا، کتنا سحر انگیز۔ مجھے محسوس ہوا یہ لمحہ خوشبو کی طرح پھیل گیا ہے اور پھیلتا چلا گیا ہے۔ اور میں بھی خوشبو کی اُمڈتی ہوئی لہروں میں تحلیل ہو کر زمان و مکان کی وسعتوں میں پھیل رہا ہوں ——!

[illegible]

یاد

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی
سُناتا جا رہا ہے، جس کو جتنا یاد ہوتا ہے ———— جگر مرادآبادی

یہ نکہتوں کی نرم روی، یہ ہوا، یہ رات
یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات ———— فراق گورکھپوری

زندگی نام ہے جُدائی کا
آپ آئے تو مجھ کو یاد آیا ———— نریش کمار شاد

جہاں بھولی ہوئی یاد آ کے دامن تھام لے دل کا
وہاں سے اجنبی بن کر گزر جانا ہی اچھا ہے ———— رشی پٹیالوی

کرتا ہوں ترے ملنے کی دن رات دعائیں
وابستہ تری یاد سے ہے یادِ خدا بھی ———— ساغر سیالکوٹی

مرسلہ:۔ کے۔ کے سود۔ ایم۔ اے۔ دہلی

اُس کے ہونٹ مسکرائے۔ اِس مسکراہٹ میں کتنی اپنایت تھی، کتنا خلوص تھا کتنا پیار تھا۔

میں نے بہت مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

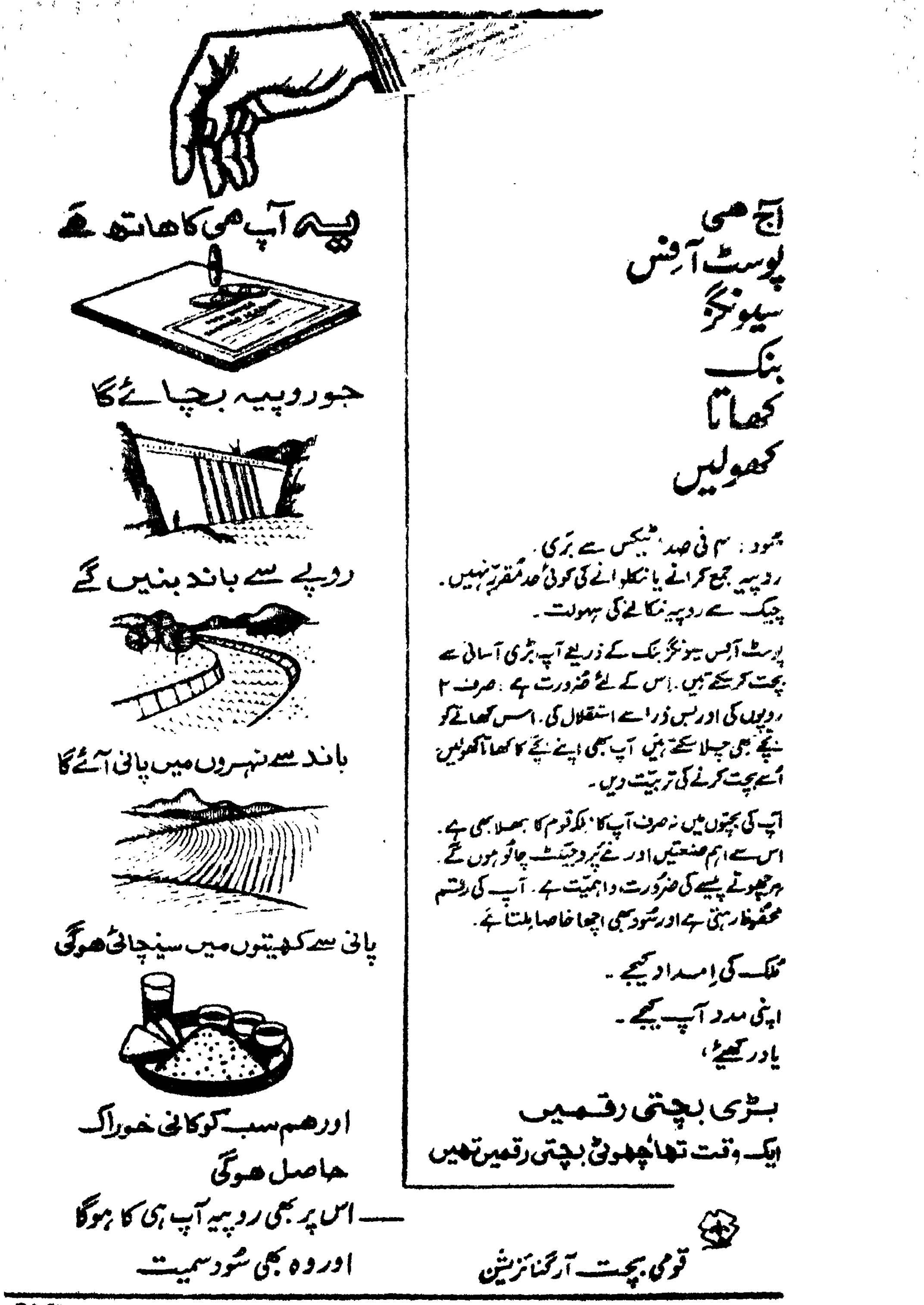
میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ رشیدہ مجھ پر اتنی مہربان ہو گی۔

عورت کتنے رُوپ بدلتی ہے۔

گیٹ کے اندر داخل ہو کر گلابوں کی تازہ خوشبو سے میرا دماغ معطر ہو گیا۔ دائیں بائیں لکڑی کے چھوٹے سے بنگلے کے ساتھ گلاب کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں چھوٹے چھوٹے سُرخ گلابوں سے خاردار جھاڑیاں ڈھک گئی تھیں اور ہوا میں تازہ خوشبو پھیل رہی تھی۔ ہوا کے معطر جھونکے سے رشیدہ کے ریشمی آنچل میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ اُس کی زلفوں کے ایک گچھے کو ہوا چوم رہی تھی۔ وہ آگے آگے تول تول کر قدم اُٹھا رہی تھی۔ میری نظریں پھر ایک بار اُٹھیں اور اُس کے سیاہ گھنے بالوں کے لہراتے ہوئے آبشار سے پھسلتی ہوئی اُس کے گداز شانوں سے ہو کر اس کی پتلی کمر پر چپکی ہوئی باریک پھولوں والی قمیص پر رُک گئیں۔ اُس کے جسم کی متوازن ساخت، اُس کے سڈول بازو، نازک کمر، اُبھرے ہوئے کولہے ———— مرمر کا ایک جیتا جاگتا مجسمہ!

میری نگاہیں اُس کے قدموں میں بچھ رہی تھیں!!

[illegible] پہلے کا ایک واقعہ



یہ آپ ہی کا ہاتھ ہے
جو روپیہ بچائے گا
روپے سے باند بنیں گے
باند سے نہروں میں پانی آئے گا
پانی سے کھیتوں میں سینچائی ہوگی
اور ہم سب کو کافی خوراک حاصل ہوگی
— اس پر بھی روپیہ آپ ہی کا ہوگا
اور وہ بھی سود سمیت
آج ہی پوسٹ آفس سیونگز بنک کھاتا کھولیں
سود : ۴ فی صد ٹیکس سے بری۔
روپیہ جمع کرانے یا نکلوانے کی کوئی حد مقرر نہیں۔
چیک سے روپیہ نکالنے کی سہولت۔
پوسٹ آفس سیونگز بنک کے ذریعے آپ بڑی آسانی سے بچت کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے : صرف ۲ روپوں کی اور بس ذرا سے استقلال کی۔ اس کھاتے کو بچے بھی چلا سکتے ہیں آپ بھی اپنے بچے کا کھاتا کھولیں اُسے بچت کرنے کی تربیت دیں۔
آپ کی بچتوں میں نہ صرف آپ کا بلکہ قوم کا بھلا بھی ہے۔ اس سے اہم صنعتیں اور نئے پروجیکٹ چالو ہوں گے۔ ہر چھوٹے پیسے کی ضرورت و اہمیت ہے۔ آپ کی رقم محفوظ رہتی ہے اور سود بھی اچھا خاصا ملتا ہے۔
ملک کی امداد کیجے۔
اپنی مدد آپ کیجے۔
یاد رکھیے،
بڑی بچتی رقمیں
ایک وقت تھا چھوٹی بچتی رقمیں تھیں
قومی بچت آرگنائزیشن
DA 65/10

سُنا رہے تھے۔ یہ ایک قتل کا کیس تھا جس میں اصلی مجرم مفرور ہو چکا تھا اور ایک بے گناہ کو پھانسی پر لٹکایا جا رہا تھا۔ عنایت اللہ نے دس دن کے اندر اندر مقدمے کا رخ موڑ دیا اور اصل قاتل کو کیفر کردار تک پہنچایا! عنایت اللہ اس واقعے کی جملہ تفصیلات سُنا رہے تھے۔ اور اُن کا اندازِ بیان ایسا زوردار اور جوشیلا تھا جیسے وہ تیس سال پہلے کا نہیں، کل کا واقعہ ہو۔ جہاں جہاں اُن کے لہجے میں جوش کی انتہا ہوتی، وہاں وہ تیزی سے اپنی چھڑی گھمانے لگتے۔ میں اُن کی قوتِ یادداشت پر متعجب ہو رہا تھا۔ اس عمر میں بھی اُن کا حافظہ بلا کا ہے۔ تیس چالیس سال پہلے کے واقعات یوں بیان کرتے ہیں جیسے کتاب کے اوراق اُلٹ رہے ہوں۔ ایک ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے تمام تفصیلات جن میں دن، تاریخ، وقت، موسم کا ذکر بھی شامل ہے، بیان کرتے ہیں۔ عنایت اللہ دراصل ماضی میں زندہ ہیں اور ماضی اُن کے لئے زندہ ہے، نہیں تو اُن کی عمر کچھ برس سے کم کیا ہوگی؟ اُن کے زرد سے چہرے پر گہری لکیروں کا جال بُنا ہوا تھا۔ اُن کا حلقوم نیچے اُتر آیا تھا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں صرف اُس وقت چمک پیدا ہوتی تھی، جب وہ کسی جوشیلے واقعہ کا ذکر کر رہے ہوں۔

رشیدہ اُن کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ اُن کی بڑی لڑکی شہر میں بیاہی گئی تھی۔ یہی دو لڑکیاں اُن کی کُل کائنات تھیں۔

چائے رشیدہ نے بنائی تھی اور وہی ٹیبل پر سرو کر رہی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے رہ رہ کر وہ میری طرف بھرپور نظروں سے دیکھتی اور مجھے محسوس ہوتا جیسے میں اُس کی نگاہوں کی گہرائیوں میں گُم ہو رہا ہوں ——— !میں نے اِتنی جادو بھری آنکھیں کہیں نہ دیکھی تھیں۔ نگاہوں کے ہر نئے تصادم سے مجھے محسوس ہوتا جیسے اجنبیت اور دُوری کے پردے پگھلتے جا رہے ہیں اور ہم ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ بہت قریب۔ ہماری روحیں ایک ہو رہی ہیں اور ہمارے جسم ایک دوسرے میں پیوست ہو رہے ہیں ——— !

میرا دل بے چینی سے دھڑک رہا تھا اور میرے خون میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔

دھوپ ڈھل رہی تھی!

گلاب کی جھاڑیوں کے سائے مہک رہے تھے!

اور جب رشیدہ شاخِ گُل کی طرح چلتی ہوئی، کُتے کو ڈانٹ کر مجھے گیٹ پر چھوڑنے آئی تو مجھے محسوس ہوا جیسے یہ کبھی نہ ختم ہونے والی سڑک ہے۔ اِس سڑک پر حدِ نظر تک گلاب کھِلے ہوئے ہیں اور ہوا خوشبو سے مہک رہی ہے، اور رشیدہ میری ہم سفر ہے! سیب کے باغات سے دُور، سُرمئی پہاڑوں کے اُس پار ہمارے خوابوں کی بستی ہے۔ جہاں محبت ہے، خوشبوئیں ہیں، حُسن ہے۔ اور رشیدہ میری جلتی ہوئی بانہوں میں ———

"پھر کب آیئے گا؟"

گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے رشیدہ بولی۔ اُف! میرے اللہ!! اُس کی آواز میں کتنی اپنایت تھی، کتنی نرمی، کتنی مٹھاس۔ مجھے محسوس ہوا جیسے اس آواز میں اُس کی روح کا ارتعاش ہے۔

"جب آپ بلائیں" میں نے جذبات کے طوفان کو سینے میں روکنے کی کوشش کی اور میرے ہونٹوں پر ایک بے معنی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا، میرے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میں اُس سے کہنا چاہتا تھا تم کتنی پیاری ہو، تم نے مجھے مالا مال کر دیا ہے رشیدہ۔ تم نے میری رگ رگ میں امرت گھول دیا ہے۔ تم کتنی فیاض ہو، کتنی عظیم، کتنی پیاری ——— !

میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ شاید میری بہکی ہوئی نگاہوں سے وہ میرے جذبات کے تلاطم کا اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اسی لئے وہ اِن نگاہوں کی تاب نہ لا سکی۔ اُس کی گھنی پلکیں تھرائیں۔ اُس کے رخساروں کو گلابی آگ مس کرتی ہوئی گزر گئی۔ نگاہیں نیچی کئے وہ اپنی لانبی لانبی مرمریں انگلیوں سے گیٹ کی زنجیر بجاتے ہوئے بولی۔

"کل آجایئے نا ———"

"کل؟"

"نہیں نہیں کل نہیں ——— کل ہم شہر جا رہے ہیں۔ پرسوں آجایئے۔ میں ڈیڈی سے کہہ دوں گی۔ شاید وہ اُس دن گاؤں جائیں گے ——— میں بات کر لوں گی۔ پرسوں آجایئے"

"اچھا ——— حاضر ہو جاؤں گا"

جب میں واپس گھر آیا تو میرے سینے میں ایک عجیب سا درد چٹکیاں لے رہا تھا۔ میری روح میں سلگتی ہوئی آگ کی تپش تھی اور مجھے لمحہ بھر کے لئے بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔

میری زندگی کا سکون لُٹ چکا تھا!

ہم ایک گھنٹے سے ساتھ بیٹھے تھے اور باتوں میں مشغول تھے۔ عنایت اللہ شام کو لوٹ رہے تھے۔ بنگلے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گیٹ کے قریب بوڑھا مالی کام میں مصروف تھا۔ کچن میں باورچی کھانا پکانے میں لگا ہوا تھا۔ لمبے لمبے کانوں والا کُتا کچھ دیر ہمارے گرد چکر کاٹتا رہا اور اب وہ ٹانگیں پسارے سبزے پر دھوپ سینک رہا تھا۔ رشیدہ باتیں کرتی رہی۔ بے تکلفی اور روانی کے ساتھ۔ باتیں کرتے کرتے وہ کھو جاتی۔ اُس نے کہا وہ شہر میں دو روز سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتی۔ وہ وہاں کی ہنگامہ پرور زندگی سے گھبراتی ہے اور ڈیڈی کے پاس اِس علاقے میں چلی آتی ہے۔ یہاں کا سکون اور خاموشی اُسے پسند ہے۔ لیکن یہاں بھی کبھی کبھی وہ تنہائی سے اِس قدر اکتا جاتی ہے کہ پھر شہر بھاگ جاتی ہے۔ عجیب چکر ہے۔ یہ کہتے کہتے اُس کا لہجہ اداس ہو گیا۔ سامنے

ملال پیدا کر جاتی ہے۔ وہ بڑے سیدھے سادے مزاج کی لڑکی ہے۔ پشپ چشم کی سی معصومیت ہے۔ رشید کی کمی بھی بھنساری تھی ـــــــ کبھی کبھی وہ کتابوں میں گم ہو جانا چاہتی ہے۔ اگلے سال وہ بی۔ اے۔ فائنل کے امتحان میں شریک ہو رہی ہے۔ لیکن اُس کا جی مطالعے میں نہیں لگتا۔ وہ مختلف موضوعات پر بے تکان باتیں کرتی رہی اور میں اُس کے کٹورا سے جسم کی لطافتوں میں گم ہوتا رہا۔

سیب کے درختوں کی شاخوں پر نئی کونپلیں پھوٹ نکلی تھیں اور کہیں کہیں سفید اور گلابی شگوفے کھل اُٹھے تھے۔ کھڑکی سے دُور نظر دوڑاتے ہوئے، بیچ بیچ میں کھلے ہوئے شگوفے ایسے دکھائی دے رہے تھے، جیسے خوابوں کی وادی میں تفریق و تسخر ایک جگہ جمع ہو گئی ہے۔

میری بے تاب نگاہیں رشیدہ کے راستے پر بچھی ہوئی تھیں اور جب وہ آئی تو میں دفورِ مسرت سے دیوانہ ہو گیا۔ مجھے اپنے حواس پر قابو نہ رہا۔ وہ کمرے کے اندر آئی اور میں نے بڑھ کر اُس کے گرم گرم ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُس کی مرمریں گردن پر پھیلے ہوئے گھنے بالوں کی خوشبو میرے نتھنوں سے میری روح میں اُتر گئی۔ وہ اِسی عالم میں چپ چاپ میرے قریب کھڑی رہی۔

کیف و سرور میں ڈوبا ہوا ایک حسین لمحہ بیت گیا!

اور اچانک نہ جانے کیا خیال آیا کہ اُس نے میرے ہاتھوں سے اپنے نرم نرم ہاتھ چھڑا لیے اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ میں یہ دیکھ کر ٹھٹکا کہ رشیدہ کے چہرے پر ایک نامعلوم سی اُداسی کا ہلکا سا سایہ ہے۔

میرے جذبات کو ایک دھچکا لگا۔

"رشیدہ!"

"جی!"

"تم بُرا تو نہیں مان گئیں؟"

"نہیں تو ـــــــ لیکن ـــــــ لیکن ایسا تو نہیں ہونا چاہئے تھا!" اُس کی آواز بُجھی ہوئی تھی۔ اُس کی نگاہیں جُھکی جُھکی سی تھیں۔

"گویا تمھیں میری محبت پر شک ہے؟" میں ہکلا سا رہا تھا۔

"نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ـــــــ ہمیں ـــــــ ہمیں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ لیکن مجھے محسوس ہوا جیسے اُسے اپنی بات پر اعتماد نہیں ہے۔

اُس دن بھی ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ لیکن رشیدہ صرف ہوں ہاں کرتی رہی۔ میں تنہا بولتا رہا۔ رشیدہ کی اِس وقت کی اُداسی ایک حساس لڑکی کا فطری ردِعمل ہے۔ میں نے سوچا اُس کا مرمریں ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھا۔ اور جب میں نے اُسے بٹھایا کر

میں اُس کے بدن کا تصور بھی نہیں کر سکتا اُس کے چہرے پر ایک ہلکی سی اُداسی ہو گئیں۔ اُس کی پلکیں بھیگ گئیں اور میں اُس کی لانبی لانبی مرمریں اُنگلیوں کی نازک پوروں کو چومتا رہا ـــــــ!

ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے درختوں پر سیب کے شگوفوں کی نرم و نازک سپید پتیاں بکھر رہی تھیں اور نیچے سبزے پر سپید پتیوں کی تہیں چڑھ رہی تھیں۔ جیسے سفید نرم ململ کا فرش بچھ رہا ہو۔ شگوفے بکھر رہے تھے اور لطیف ہوا کا لہراتا ہوا آنچل خوشبو پھیلا رہا تھا۔ دھوپ تیزی سے چمک رہی تھی اور شگوفوں کے روپہلے زیور اس سے آراستہ و پیراستہ درخت نئی نویلی دلہنوں کی طرح بدن کو چُرائے ہوئے ایستادہ تھے۔

ہم شگوفوں سے جھکے ہوئے ایک درخت کی روپہلی چھاؤں میں بیٹھے تھے۔ عنایت اللہ میوے کے گرتے ہوئے بھاؤ کی شکایت کر رہے تھے۔ لیکن میں کچھ بھی نہیں سُن رہا تھا۔ میری حالت عجیب تھی۔ رشیدہ چند منٹ ہمارے پاس خاموش اور کھوئی کھوئی سی بیٹھی رہی اور اچانک اپنی لانبی لانبی اُنگلیاں چٹخاتی ہوئی اُٹھی اور اندر مکان میں چلی گئی۔ اور اب ایک گھنٹہ گزر چکا تھا لیکن وہ واپس نہ آئی تھی۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔ میری بے چین نظریں رہ رہ کر دروازے کی طرف اُٹھتیں اور مایوس ہو کر عنایت اللہ کے چہرے کے دلدل میں پھنس جاتیں۔

کیا رشیدہ اندر جا کر مجھے بھول بیٹھی؟ کیا اُسے میرے دل کی بے قراری اور درد کا احساس نہیں؟ کیا وہ اِتنی سنگدل ہے؟ وہ جانتی ہے کہ میں ہر سانس میں صرف اُس کا نام لیتا ہوں۔ کاش یہاں عنایت اللہ نہ ہوتے۔ میں دوڑ کر اندر کمرے میں گھس جاتا اور رشیدہ کو اپنی باہوں میں چھپا کر اُس کی خفگی کا سبب پوچھتا۔ میرے آنسوؤں کی دھار اُس کے پاؤں دھو لیتی ـــــــ مجھے اِس وقت بھی محسوس ہو رہا ہے کہ میں رو رہا ہوں۔ آنسوؤں کا ایک سیلاب میری پلکوں کی اوٹ میں بے قرار ہے۔ کاش عنایت اللہ یہاں نہ ہوتے ـــــــ! کاش رشیدہ مجھے تنہائی میں ملتی ـــــــ تنہائی کے رازدار لمحو! تم کو کہاں ڈھونڈوں؟ وقت کے دہکتے ہوئے ریگستان میں تم شبنمی جھونکوں کی طرح میرے جلتے ہوئے سینے کو مس کر کے گزر جاتے ہو۔ کاش اِس وقت ـــــــ!

اور جب میں بالکل مایوس ہو کر عنایت اللہ سے رخصت ہونے کے لئے کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا رشیدہ بنگلے کی دوسری منزل کی کھڑکی میں تھی۔ میں نے بے بس نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے کھڑکی کی اوٹ میں چھپ گئی۔ کھڑکی کا نیلا پردہ ہوا کے جھونکے سے پھڑپھڑا رہا تھا۔

میں اتوار کو وہاں گیا۔ عنایت اللہ سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے ماضی کے کئی اوراق اُلٹے اور جوش میں آکر چھڑی گھماتے رہے۔ لیکن میری متلاشی نگاہیں رشیدہ کے لئے بے قرار تھیں۔ رشیدہ تم کہاں ہو۔ میری روح چیخ رہی تھی۔ رشیدہ کی ایک جھلک بھی میں نے نہیں دیکھی۔ شاید وہ اس گھر پر نہیں۔ شاید وہ شہر گئی ہے۔ لیکن عنایت اللہ نے کہا رشی اندر لیٹی ہوئی ہے۔ عجیب لڑکی ہے۔ کبھی کبھی بہروپ بیٹھی رہتی ہے۔

اور میں کلیجے پر بھاری پتھر رکھ کر وہاں سے چلا گیا۔

میں دوسرے دن وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ عنایت اللہ شہر گئے ہوئے ہیں اور رشیدہ کسی سہیلی کے ہاں گئی ہے۔ لیکن نوکر کی ہکلاہٹ اُس کے بیان کی صداقت کو مشتبہ بنا رہی تھی۔

میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ لیکن میں نے صبر سے کام لیا۔

میں تیسری بار بھی وہاں گیا۔ لیکن رشیدہ نہ ملی۔

میں چوتھی بار بھی گیا۔

پانچویں بار بھی

بار بار گیا ــــــــ

لیکن رشیدہ جیسے پر لگا کر کہیں اُڑ گئی تھی اور میں پاگل کی طرح شیو بڑھائے، آنکھوں میں بے خوابی کی جلن لئے، زرد چہرے اور جھکے ہوئے بوجھل جسم کے ساتھ بے مقصد گھومتا رہا۔ میں اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ترس رہا تھا!

لیکن ــــــــ

کوئی پندرہ دن کے بعد وہ مجھے چوک میں اپنے نوکر کے ساتھ آتی ہوئی دکھائی دی۔ میری آنکھیں چمک اُٹھیں۔ میں نے جذبات کے ہیجان میں آگے بڑھنا چاہا لیکن میں نے دیکھا وہ مُڑ کر نوکر سے کچھ کہہ کر بالکل بیگانگی اور لاتعلقی سے آگے بس سٹینڈ کی طرف جانے لگی ہے۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ نوکر نے میرے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک دو بار میری طرف عجیب انداز میں کنکھیوں سے دیکھا لیکن وہ مجھے سلام بھی نہ کر سکا۔ اُسے اپنی مالکن کی ہدایت کی خلاف ورزی کرنے کی کیسے جرأت ہوتی؟

وہ آگے چل دئے اور بس سٹینڈ پر میری طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو گئے۔ میرا جسم پسینہ پسینہ ہو چکا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے خون کی گردش رُک گئی ہے اور میں بے معنی نگاہوں سے اُن دونوں کو بس میں سوار ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

بس [illegible] رشیدہ سے [illegible] رختوں میں چھپ گئی تھی۔

میری پلکوں پر کئی آنسو تھرتھرا رہے تھے۔ میں بوجھل قدموں سے [illegible] کی طرف جانے لگا۔ میرا ذہن ماؤف تھا، بالکل ویران ۔ ۔ ۔ !

[illegible]

اور میری سانس گھٹ رہی تھی!

ــــــــ ⁘ ــــــــ

تین سال گزر گئے!

ایک دن وہ مجھے شہر کے بس سٹینڈ پر نظر آئی۔ میری نظر لڑکھڑائی۔ میرے قدم ڈگمگائے۔ میں عجیب کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ اتنے میں وہ بولی۔

"آپ مجھے پہچانتے نہیں شاید" وہ اُسی نرمی اور ملائمت سے بولی۔

"آپ کو ــــ میں آپ کو پہچان چکا ہوں۔ بہت پہلے، برسوں پہلے ــــ"

میرے لہجے کے طنز سے وہ ذرا بھی متاثر نہ ہوئی۔ لیکن میں اپنے جذبات کی زہرناکی پر کیسے قابو پا سکتا تھا۔

"انسان کو پہچاننا آسان نہیں ہوتا۔ انسان کے چہرے پر کتنے پردے پڑے ہوتے ہیں" وہ میرے نزدیک آگئی تھی اور میں بے بسی کے عالم میں کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔ واقعی میں اُسے ابھی تک پہچان نہ سکا تھا۔ میرے ذہن میں کسی نے سرگوشی کی۔

"میں بدقسمت ضرور ہوں۔ لیکن میرے دل میں کسی قسم کا کھوٹ نہیں۔ میرا دل آئینے کی طرح صاف ہے ــــ سرور صاحب! میں عجیب عورت ہوں۔ میں آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہتی تھی۔ میں نے آج تک کسی کو دھوکا نہیں دیا ہے ــــ میں ــــ میں آپ کے قابل نہیں تھی"

میں اُسے حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر اعتماد تھا۔ لیکن اُس کے لہجے کی کھنک دھیمی پڑ رہی تھی۔

"آپ کو معلوم نہیں سرور صاحب! میں ایک بچی کی ماں ہوں۔ میری بچی شاہینہ کانونٹ میں پڑھتی ہے"

"آ ــــ پ کی ــــ؟"

"جی ہاں میری لڑکی" اُس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری: "میں بُجھی ہوئی آگ ہوں۔ میری روح میں دھواں ہی دھواں بھرا ہوا ہے۔ مجھ میں کیا رکھا ہے بھلا؟ جوں توں کر کے بیوگی کے تاریک دن پورے کر رہی ہوں"

یہ کہہ کر وہ چل دی اور بس میں سوار ہو گئی۔

بس روانہ ہو چکی تھی اور میں ششدر کھڑا تھا!

میں رشیدہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ یہ بھی نہیں کہ تین سال پہلے جو آگ وہ میرے دل میں روشن کر چکی ہے، اُس آگ میں میری روح اور میرا جسم اب بھی جل رہا ہے۔ اور ــــ اور [illegible]

[illegible]



صافی
سے خون بھی صاف
اور جلد بھی صاف

غزل

سید حباب ترمذی

...ہوں لیکن مجھے تسکین نہیں ہے
شاید کہ محبت کا یہ آئین نہیں ہے

...سے سرِ مے خانہ تہی جام کھڑا ہوں
کیا اس میں ترے ظرف کی توہین نہیں ہے؟

...غ میں لایا ہے مجھے شوقِ نظارہ
جس باغ کا اک پھول بھی رنگین نہیں ہے

...و جو کہتا ہے بُرا مجھ کو زمانہ
یہ بات کوئی باعثِ توہین نہیں ہے

...ں میں اے عشوہ گر دے سیکڑوں غم اور
دل اتنا غمِ عشق کا شوقین نہیں ہے

...ن سے غمِ ہجر کا شکوہ نہ کروں گا
اربابِ محبت کا یہ آئین نہیں ہے

...ن کی تسلی سے تشفی نہیں ہوتی!
اب اُن کی توجہ سے بھی تسکین نہیں ہے

...ہے کچھ اور ابھی خونِ تمنا
تصویرِ محبت ابھی رنگین نہیں ہے

...م نے تغافل میں کمی تو نہیں کر دی
کیا بات ہے کیوں دل مرا غمگین نہیں ہے

...رمانہ انھیں بے دین نہ سمجھے!
کیا اہلِ محبت کا کوئی دین نہیں ہے

آئیں گے حباب اور بھی سنگین کئی موڑ
حالات کا یہ موڑ ابھی سنگین نہیں ہے

غزل

بیتاب پیلی بھیتی۔ ایم۔ کام

شہرِ اُلفت کی ہر رہگذر یاد ہے
تو کبھی تھا مرا ہمسفر یاد ہے

میرے شانے پہ تھا ترا سر یاد ہے
اب بھی وہ لمحۂ مختصر یاد ہے

دل میں اُتری تھی بن کر جو نشتر کبھی
آج تک وہ ادا، وہ نظر یاد ہے

ایک اک گام پر تم مرے ساتھ تھے
کتنا رنگین تھا وہ سفر یاد ہے

چاندنی رات کے نرم سائے میں تم
ملنے آئے تھے پچھلے پہر یاد ہے

میری آغوش میں مُسکراتے ہوئے
کیسے آئے تھے تم جھوم کر یاد ہے

جس نگاہِ کرم نے کیا تھا ستم
اُس نگاہِ کرم کا اثر یاد ہے

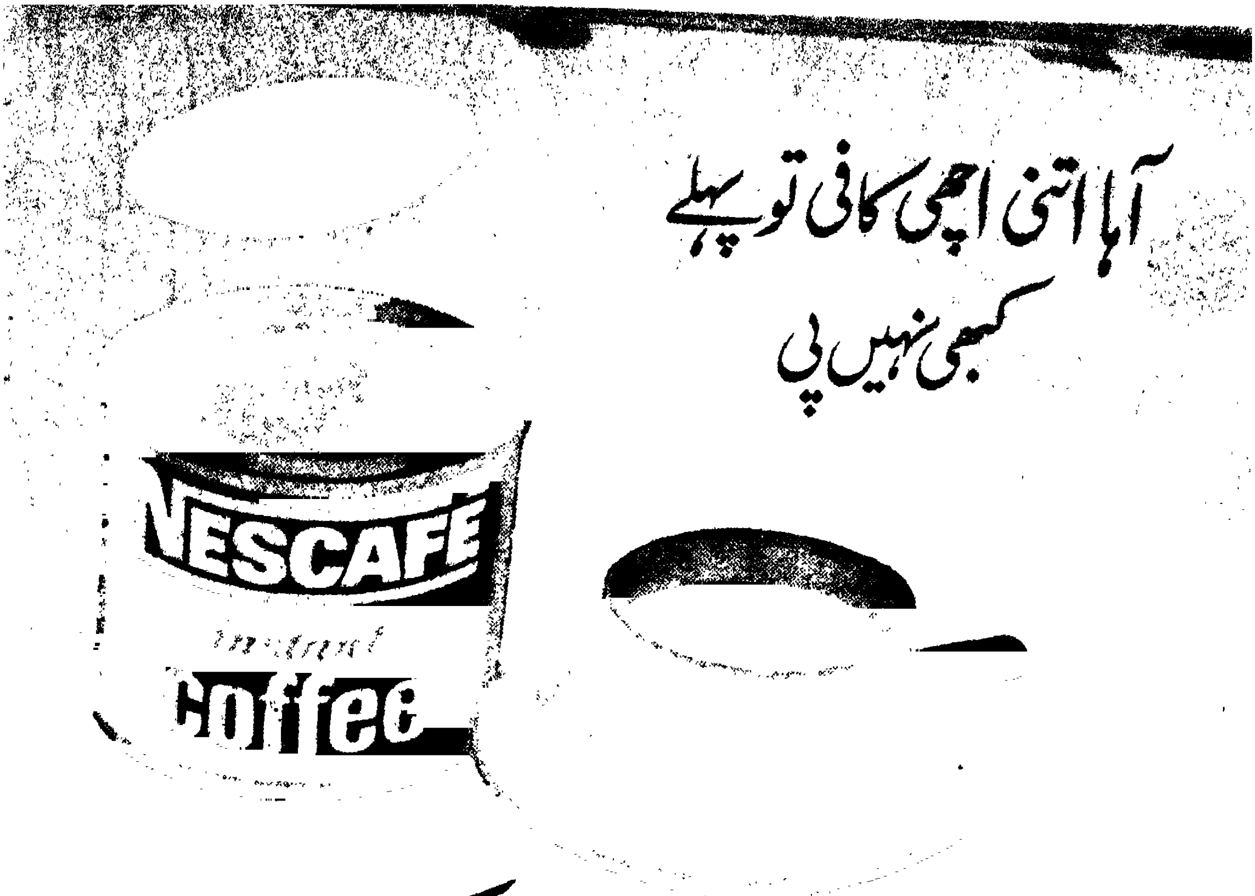
خونِ دل سے نہ کیوں تر ہو دامن مرا
وقتِ رخصت تری چشمِ تر یاد ہے

زندگی کے سفر میں حسیں موڑ پر
تم گئے تھے مجھے چھوڑ کر یاد ہے

کچھ بھی بھولا نہیں ہے ابھی تک مجھے
نقشِ پا اور ترا سنگِ در یاد ہے

آہ بیتاب نے تم سے ہو کر جُدا
زندگی کس طرح کی بسر یاد ہے

آہا اتنی اچھی کافی تو پہلے کبھی نہیں پی



صرف نیسکیفے

ہی آپ کو بڑھیا کافی کا پورا مزہ دیتی ہے

صرف 5 سیکنڈ میں تیار!

نیسکیفے منتخب شدہ کافی کے بیجوں سے بنائی جاتی ہے۔ جو کہ نہایت ہنرمندی کے ساتھ ملا کر بھونے جاتے ہیں۔۔۔۔
یہ خاص طور پر آپ کے واسطے ہے۔۔۔۔ ڈبے کا ڈھکنا کھولئے اور تازہ بھنے ہوئے کافی کے بیجوں کی [illegible]
مہک سے لطف اٹھائیے۔۔۔۔ یہ فوراً بننے والی کافی ہے۔
نیسکیفے میں استعمال کئے گئے کافی کے بیج اسے انتہائی بھرپور اور مرغوب بناتے ہیں۔ آج ہی خریدیں!

ہندوستان کی نفیس ترین کافی۔ ۱۰۰ فیصدی خالص

نیسکیفے ایک رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہے۔ جو نیسلے کی [illegible]

نیسلے پراڈکٹ

JWT-NCE 3321 (U)

روح کا کفن

رئیس نجمی امروہوی

"آشیانہ" سرائے کہنہ۔ امروہہ

۲۶ فروری ۱۹۶۵ء

گرامی قدر حضرت خوشتر صاحب۔ آداب و نیاز

.. میری خاموشی کو طویل عرصہ گزر گیا اور اس کا مجھے شدید احساس ہے۔ پچھلے دنوں کچھ بے معنی الجھنوں میں ایسا گھرا کہ کوششوں کے باوجود ادبی دنیا سے بالکل الگ ہو کر رہ گیا۔ اس درمیان ایک دو کہانیاں لکھیں بھی تو وہ "بیسویں صدی" کے انداز سے ذرا ہٹ کر تھیں۔ یہ کہانی میں نے لاہور جا کر لکھی ہے اور اب آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ اکی بار وہاں جا کر مجھے کئی نئے تجربات ملے ہیں۔ انھیں تجربات میں سے ایک تجربہ میں نے اس کہانی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کہانی میرے دل سے اس کہانی کار کے گرد گھومتی ہے جو مجھ سے کہیں زیادہ آپ کے قریب ہے اور جسے آپ پیار سے "شہزادہ" اور میں "جوگی جے پال" کہا کرتا ہوں۔ کہانی پڑھئے اور اپنی قیمتی رائے سے نوازئیے ——

واپسی میں آپ سے ضرور ملاقات کروں گا۔ امید ہے صدیقی صاحب کے کہنے کے مطابق آپ نے امروہہ کا کوئی نہ کوئی پروگرام مرتب کر لیا ہوگا —— اور میرے آنے تک وہ پروگرام تکمیل کی حدود کو چھونے لگا —— مجھے کل کراچی جانا ہے وہاں کم از کم دس پندرہ دن ضرور لگ جائیں گے۔ چلتے وقت آپ کو مطلع کر دوں گا ...

خلوص کار —— رئیس نجمی امروہوی

جب سے میرے نوکر نے یہ کاغذات اس مکان کی صفائی کرنے کے بعد مجھے لا کر دیئے ہیں نہ جانے کیوں مجھے اس سامنے والے مکان کے بالائی کمرے کو دیکھ کر بہت وحشت ہو رہی ہے۔ اور اچانک مجھے وہ لڑکا بھی شدت سے یاد آنے لگا ہے جو چند دن پہلے تک اس میں رہا کرتا تھا —— دبلے پتلے جسم اور لمبے قد کا وہ نوجوان۔ میں نے کبھی اس کی آواز نہیں سنی۔ جب تک وہ اس کمرے میں رہتا کمرے پر ایک گہرا سکوت طاری رہتا۔ دوسرے نوجوانوں کے کمروں کی طرح اس کمرے میں نہ کبھی کوئی گیت گونجا اور نہ کوئی قہقہہ ابھرا۔ اس کھڑکی سے سگریٹ کے دھوئیں کے سوا میں نے اور کچھ نکلتے نہیں دیکھا۔ نہ اُٹھتے گل، نہ نالۂ دل۔ ہاں کبھی کبھی وہ اس کمرے کی کھڑکی کی دہلیز پر ہاتھ رکھے ہوسٹل کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ خاموش اور ساکت سا اور کبھی جو میں نظر بھر کر اس کی طرف دیکھتی تو وہ اس طرح ہٹ جایا کرتا تھا جیسے وہ کوئی جرم کرتے ہوئے دیکھ لیا گیا ہو۔ میری ایک سہیلی نے بتایا تھا کہ وہ آرٹسٹ ہے۔ بس اس سے زیادہ اس کے بارے میں کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔ وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔ البتہ اکثر میں نے نوٹ کیا کہ یہ کھڑکی صبح دس بجے کے قریب کچھ دیر کھل کر بند ہو جاتی تھی اور پھر شام کو پانچ بجے کے قریب کھلا کرتی تھی۔ شاید وہ کسی دفتر میں ملازم ہوگا۔ یہ سب کچھ مجھے بھی اس لئے معلوم ہو گیا کہ کبھی میرے کمرے کی کھڑکی بھی بالکل اس کے سامنے تھی۔

شاید سال پورا ہو گیا۔ شاید نومبر کی بات ہے۔ ان دنوں شہناز میرے پاس ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ کھڑکی تمام دن کھلی رہی۔ رات کو بھی بند نہ ہوئی۔ اور پھر مدتوں بند نہ ہو سکی۔ اسے بند کرنے والا نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کھڑکی آج تک بند نہ ہو سکی ہے۔ جیسے وہ سامنے کی اس ویران میز پر بیٹھا ہوا ہے اور کوئی تصویر بنا رہا ہے۔ ابھی میرے قدموں کی آہٹ پا کر میری طرف دیکھے گا اور اچانک قہقہہ لگانے لگے گا —— پھر یہ کھڑکی خود بخود بند ہو جائے گی اور کمرے کا ذرہ ذرہ قہقہہ لگانے لگے گا اور یہ قہقہے کبھی ختم نہ ہوں گے اور ... پھر میری کمزور سماعت ان قہقہوں

کے بھنور میں پھنس کر ابدی نیند سو جاتے گی۔ گھبرا کر میں کھڑکی پر آگئی ہوں۔ سامنے کالج کے ہوسٹل کے کمروں کی قطار ہے اور وہاں چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں مجھے یوں نظر آرہی ہیں جیسے شیلف میں ترتیب سے ایک ہی سائز کی کتابیں چُنی ہوئی ہوں۔ ابھی سال بھر پہلے کی بات ہے میں بھی طالبہ کی حیثیت سے اِس ہوسٹل میں رہتی تھی اور آج وقت کے مختصر سے سفر کے بعد میری دُنیا کتنی بدل گئی۔ آج میں اِس کالج کی طالبہ نہیں پروفیسر ہوں ——— آج میں مس شوبی نہیں مسز شہابی ہوں۔

میں نے شہابی سے کہا تھا یہ مکان نہ لو۔ میں کسی کھُلی ہوئی جگہ پر چھوٹا سا بنگلہ لینا چاہتی تھی۔ جس میں ایک لان ہو ایک باغیچہ ہو جس میں شام کو کرسی ڈال کر بیٹھوں اور شہابی کے ساتھ چائے کے ہلکے گھونٹ لیتے ہوئے اُس رومان پرور اور کیف آگیں جذبے کو تر و تازہ رکھوں جس کے تحت میں اور شہابی جنم جنم کے ساتھی بنے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں شادی کے بعد محبت کا خون ہو جاتا ہے۔ اور میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ میں شہابی کو سدا ویسا ہی محسوس کروں۔ ہمیشہ اُس کے بارے میں اُسی انداز سے سوچوں جیسا شادی سے پہلے سوچتی تھی، محسوس کرتی تھی ——— اُف! محبت کا یہ جذبہ بھی کتنا خوبصورت ہوتا ہے! اِس احساس میں کتنی لطافت کتنی وسعت ہے کہ کوئی ہمیں چاہتا ہے۔

کھڑکی سے ہٹ کر میں میز پر آگئی ہوں۔ جہاں کاغذات کا ایک بنڈل رکھا ہے جو بیرے نوکر نے مجھے لاکر دیا ہے۔ وہ سامنے والا کمرہ شہابی نے اپنے ایک دوست سہیل کو کرایہ پر دلایا ہے وہ کل ہی لکھنؤ سے تبدیل ہو کر یہاں آیا ہے۔ اُسے مکان کی ضرورت تھی۔ شہابی نے سامنے والے مکان کے مالک سے وہ کمرہ سہیل کے لئے کرایہ پر لے لیا۔ شہابی صبح ہی ملازم سے یہ کہہ گئے تھے کہ وہ آج اِس کی صفائی کر دے۔ ملازم نے جیسے ہی ایک الماری کھولی اُسے وہاں سے یہ کاغذات ملے۔ وہ مجھے دکھانے کے لئے انھیں لے آیا ہے۔ وہ اب کمرہ صاف کرنے واپس چلا گیا ہے۔ میں یہ کاغذات دیکھ کر لرز گئی ہوں۔ حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئی ہیں۔ اِتنی طویل مدت تک کسی خالی کمرے کی الماری میں کوئی فائل یوں ہی پڑی رہ سکتی ہے؟ میں اتفاق اور حادثہ پر یقین رکھتی ہوں۔ میں نے اِسی لئے فائل کی ورق گردانی شروع کر دی ہے۔ اِس میں کچھ خطوط ہیں معلوم نہیں کس کے نام ....

میری ....

نہ جانے کیوں میں تمھیں آواز دینا چاہتا ہوں۔ تمھیں خط لکھنا چاہتا ہوں۔ شاید تمھیں خط لکھنا میرے لئے ضروری ہو گیا ہے۔ لیکن میں تمھیں کیا لکھوں؟ سُنو، دیکھو، نہیں، کچھ نہیں، میں تمھیں کچھ نہیں لکھ سکتا ....

تمھارا اجنبی ....

میری ....

میرا خط پاکر تم حیران ہوگی۔ ہو سکتا ہے تمھیں میری یہ حرکت پسند نہ آئے اور تم اِسے پڑھنے سے پہلے پھاڑ دو۔ اور اگر تم نے پڑھ بھی لیا تو بھی کیا اُمید کہ تم میری اِس اُلجھی ہوئی تحریر میں کسی روح کو دیکھ سکوگی۔ جو انسان اپنے احساس کی گھُٹی ہوئی مہک کا ہو اُس کی تحریر میں تمھیں زندگی کی مہک بھی کس طرح مل سکتی ہے۔ بھلا تم کیسے سمجھ سکتی ہو کہ میرے ایک ایک لفظ کے پیچھے کون سا جذبہ کتنا شدید ہے اور میرے لئے کتنا جاں بخش اور سکون آفریں ہے۔ کس قدر تلخ اور اذیت ناک ہے۔ نہ جانے میں کیا کیا سوچتا ہوں کیوں میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ تم سے میری دیرینہ شناسائی ہے اور ہم دونوں بہت قریب ہیں۔ اور ساتھ ہی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہم بالکل اجنبی ہیں۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا ہے۔ ہمارے درمیان ایک پتلی سی سڑک ہی نہیں ایک لامحدود ایک بے اندازہ طویل فاصلہ ہے۔ تم کس قدر دُور ہو کہ میں تمھیں صرف ایک نشان کی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ بات کچھ درد اور احساس کی ہے۔ ذرا سوچو تو یہ کیسا درد، کیسا احساس ہے ———؟ کبھی تم اِتنے قریب کہ میں تمھارے دل کی دھڑکنیں سُن رہا ہوں۔ اور کبھی اِتنی دور کہ آواز دوں تو تم سُن بھی نہ سکو۔

مجھے معلوم نہیں تم کون ہو۔ کون سی جماعت میں پڑھتی ہو۔ تمھارا نام کیا ہے؟ لیکن پھر بھی میں جیسے تمھیں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اِس کھڑکی پر کھڑے ہو کر تمھارا انتظار کروں۔ یہاں چوروں کی طرح خود کو تادیر چھُپاتے رہوں۔ تمھارے لئے کچھ بھی نہ سوچوں لیکن مجھے خود پر کچھ اختیار نہیں رہا ہے۔ میں ایک ایسا راہی بن گیا ہوں جو جانتا ہے کہ اِس راہ کی منزل کوئی نہیں پھر بھی چل رہا ہے۔ اور ——— او میں چل رہا ہوں برسوں سے تنہا سا، ہراساں تھکا ہوا سا، میرا نہ کوئی ہم سفر تھا اور نہ ہوگا۔ مگر نہیں ایک ہم سفر تھا مگر میں یہ سب کچھ کیا لکھ رہا ہوں؟ ——— کیوں لکھ رہا ہوں؟ ——— جانے تم اِسے پڑھوگی بھی یا نہیں ——— سُنو، ہو سکے تو اِسے لینا۔ سمجھنے کی کوشش کرنا۔

تمھارا اجنبی ..

یہ کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے جس پر لکھا ہے ———

"آسمان اونچا ہے اور سمندر دُور ——— اور دل ہے کہ ستاروں ما... موتی چاہے۔ پھر بھی زندہ ہوں۔ جیسے بچے نئے کھلونے مانگ مانگ کر سو ہی جاتے ہیں کیا کسی تصور سے تم بھی اپنے دل کو بہلا لیتی ہو؟"

اور یہ پھر ایک خط ہے ———

میری ....

رات تم خواب میں ملیں تو محسوس ہوا تمھارے پاس میرے اپنے ہی انداز... نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا ہے تم میرے بارے میں جاننا چاہتی ہو۔ ہو سکتا ہے...

دھوکا ہو۔ بہرکیف مجھے یقین سا ہو رہا کہ تم بھی مجھے ویسا ہی محسوس کرتی ہو میرے لئے ویسا ہی سوچتی ہو جیسا کہ میں تمھارے لئے ——— میں تو ایک تنہا مسافر ہوں۔ میرا زندگی کی راہ میں سب کچھ لُٹ چکا ہے۔ اب میرے پاس نہ ماں کی ممتا ہے نہ باپ کی شفقت ہے، نہ بہن کا پیار ہے اور نہ بھائی کا خلوص ہے۔ نہ بیوی کی چاہت نہ بچّوں کی معصوم محبت ——— کچھ نہیں ——— میرا کوئی نہیں ———

پھر میں کیا ہوں ——— ؟ میں بتاتا ہوں ——— میں ایک بچہ ہوں۔ ایک نوجوان ہوں ایک بوڑھا ہوں ——— مجھے میرے گھر کے کسی فرد نے بتایا تھا کہ جب میں چھ ماہ کا تھا تو میری ماں مرگئی تھی اور میں نے دیّا کے پانی پر پرورش پائی تھی۔ میں جہاں پیدا ہوا وہ گئے وقتوں کے لوگ تھے۔ میرا گھر، میرا آنگن، جہاں نہ کوئی احساس تھا نہ نفی درد اور نہ مردم شناسی۔ میں بچہ تھا بیمار تھا۔ ماں نے ساتھ چھوڑ دیا تو چچی کی سُونی گود نے اپنا لیا۔ لیکن چچی، چچی ہی تھیں، ماں تو نہیں تھیں۔ وہ میری معصوم فطرت کے اُس خلاء کو کیونکر پُر کرسکتی تھیں جو میری ماں کی بے وقت موت نے پیدا کیا تھا وہ خلاء تو رہ گیا اور آج تک ہے۔ میرا بچپن اُسی خلاء میں بھٹکتا رہا۔ میری جوانی بھی اُسی خلاء میں بھٹک رہی ہے۔ چچی کی گود میں دیکھ کر میرا باپ مجھ سے بے نیاز ہوگیا۔ پھر وقت کی ہر ضرورت اور خوشی مجھ سے بے نیاز ہوگئی۔ گھر کے دوسرے بچوں کے مقابلہ میں میرے پاس کپڑے کم تھے۔ میری غذا معمولی تھی۔ میری حیثیت غیر اہم تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ میں خود کو کمتر محسوس کرتا رہا۔

ابھی میں تیرہ چودہ سال کا تھا کہ میری شادی ہوگئی یا یُوں سمجھو کہ ایک بچے کو ایک لڑکی کا ذمّہ دار بنا دیا گیا۔ وہ لڑکی جو میری عمر سے بڑی تھی۔ جو جاہل تھی۔ گاؤں کی ایک بدمزاج لڑکی کا ہاتھ ایک بھٹکے ہوئے لڑکے کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا۔ میں کچھ نہ سمجھتا تھا کہ اُسے کیا دُوں اور کیا لُوں۔ لیکن زندگی تو بہت کچھ چاہتی ہے۔ یُوں بھی ہماری چاہ کم اور ہماری عمر زیادہ نکلتی ہے۔ اور عمر نکل گئی ——— میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سا خوف وہ کون سا جذبہ تھا جس کے تحت ہر وقت میں اپنے گھر سے دُور دُور اسکول کے ہنگاموں میں گھومتا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کیوں باغوں پارکوں سینما ہالوں اور کھلی ہوئی سڑکوں پر آوارہ پھرا۔ لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ میں خالی خالی ہوں۔ ایک بے نام سی تھکن، ایک عجیب سی یاسیت مجھے محسوس ہوتی تھی۔ اور یہ یاسیت ہر اُس گھڑی میرے لئے بوجھ بن گئی جب میں نے تخلیوں کی جانب بھاگنا چاہا ——— گھر والے مجھ سے ناراض تھے کہ میں ایک شوہر کی طرح ذمّہ دار اور سنجیدہ کیوں نہیں۔ میں لڑکوں کی طرح لاابالی اور بے پروا کیوں ہوں ——— ؟ گاؤں کی اُس لڑکی کو شکوہ تھا کہ میں اُس کی بجائے ناولوں کہانیوں اور تصویروں میں دلچسپی لیتا ہوں۔ کبھی کبھی وہ شکوہ کرتے کرتے لڑ پڑتی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میرا گھر ایک زنداں ہے اور ہر فرد زنجیر کا ایک حلقہ ہے۔ اور جب بھی میں گھر میں داخل ہوتا زنداں کی یہ دیواریں مجھ پر تنگ ہونے لگتیں۔ زنجیریں میری طرف بڑھنے لگتیں اور میں بھاگ نکلتا۔ میں تنہائیوں کے کنج میں نکل جاتا۔ میرے جسم کے اندر چُھپکے چُھپکے اِک آگ سی جل رہی تھی۔ میں نجانے کیوں اسکول کی کاپیوں پر پنسل سے لکیریں بناتا۔ نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا، میری وہ کون سی محرومی تھی جس کے تحت مجھے خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں بنانے کا شوق ہوا۔ چاروں طرف آگ ہی آگ تھی۔ گمنام بھوک ہی بھوک تھی تشنگی ہی تشنگی تھی۔ میرے دوست بچھڑ گئے، میرا سکون چھن گیا۔ میرے گھر والوں نے جب مجھے ایک بیوی کا شوہر بننے پر مجبور کیا تو میرا اسکول چھوٹ گیا۔ میں نے کتنی ہی بار کورس کی کتابوں میں خود کو گم کرنا چاہا لیکن نہ کرسکا۔ کہ میں گھٹ رہا تھا۔ زنداں کی دیواریں میری سانسیں روک رہی تھیں۔ حلقے پیروں میں زخم بن رہے تھے زندگی جھومنا چاہتی تھی۔ پارکوں میں میدانوں میں ہم عمر لڑکوں کے غول میں۔ اور قید کی گئی تھی گھر کی دیواروں میں۔ ایک گاؤں کی بدمزاج اور غیر جذباتی لڑکی کی خلوت گاہ میں ——— آخر کب تک یُوں قید رہتا۔ میں بھاگ نکلا ——— لیکن مجھو کیا تھیں میرے حالات میں کوئی دلچسپی محسوس ہو رہی ہے۔ ایک شعر سُنو ؎

بگڑ گئے جو نہ بن سکے وہ بات بن کے رہ گئی
مری ہر ایک خوشی غمِ حیات بن کے رہ گئی

تمھارا اجنبی . . . .

میری آنکھوں کے سامنے آج اُس نوجوان کی زندگی کا خاکہ دھیرے دھیرے اُبھر رہا ہے۔ اب میں ایک اور خط اُٹھاتی ہوں۔

میری . . . .

تم ناراض ہو۔ تم آج کیوں نظر نہ آئیں۔ کیوں ——— ؟ بخش دو مجھے۔ اگر انجانے میں مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ آج تم کیوں نظر نہ آئیں جبکہ میں چاہتا تھا کہ آج دیر تک تمھیں دیکھوں۔ تم اپنے کمرے کی کھڑکی سے لگی بیٹھی رہو اور میں چور نگاہوں سے تمھیں دیکھتا رہوں۔ یہاں تک کہ تمھارے جسم کا ایک ایک خم میری نگاہوں میں جذب ہو جائے اور پھر جب میں تمھاری تصویر بنانے بیٹھوں تو برش کی ایک ایک جنبش پہ مجھے محسوس ہو تمھاری تصویر نہیں بن رہی بلکہ تم پر سے آہستہ آہستہ پردہ ہٹا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تمھاری تصویر میرا شاہکار ہو۔ میں تمھاری آنکھوں میں اپنے لئے بے پناہ پیار پیدا کروں گا۔ تمھارے ہونٹوں کو قوتِ گویائی دوں گا کہ ہر دیکھنے والے کو تمھارے ہونٹوں پر میرا نام سُنائی دے گا ——— وہ پیار جو میری روح کا تقاضہ ہے، جو میرے وجود کی ضرورت ہے۔ جس کے لئے میں ترس گیا ہوں، میں تمھاری تصویر میں پیدا کروں گا ——— ذرا سوچو تو میرے احساسات کس قدر نازک ہوں گے۔ میری روح کی یہ تشنگی، یہ تقاضہ، میرے وجود کی یہ ضرورت کتنی شدید ہوگی کہ میں صرف ایک تصویر ہی سے خود کو بہلانا چاہتا ہوں۔ پیاسے کو اگر صرف شبنم ہی کی خواہش

رہ جاتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اُس کی پیاس کم ہو گئی ——— یہ تو مایوسی کی آخری حد ہوتی ——— خدا سوچو زندگی کے علاوہ کہ تمھاری ضرورت ہے۔ اور میں اُسے تمھاری تصویریں پیش کرنا چاہتا ہوں کہ میری روح کا یہ تقاضہ، میرے وجود کی یہ ضرورت کس مقام پر ہوگی!

ہاں تو کل میں تمھیں بتا رہا تھا کہ میں گھر سے بھاگ گیا تھا لیکن جب باہر آیا تو میں نے محسوس کیا میرے ذہن پر حالات کے نقش اتنے گہرے ہو گئے ہیں کہ اب میں کچھ نہیں سکتا۔ چاروں طرف دوسرے ساتھی چاندنی راتوں کو تقدیر میں سو کر اُجالوں کی طرف نکل گئے تھے۔ چند کے گھر بس گئے تھے۔ اور چند گھر اور بیوی کے خوبصورت تصورات میں بسر کر رہے تھے ——— پیسہ پاس نہ تھا اور راستہ کی ضرورت تھی۔ اور راستے مسدود تھے اور گھر میں زنجیریں تھیں۔

وہ نوجوان جسے کالج کا طالب علم یا کسی دفتر کا بابو ہونا چاہتے تھا جس کے اندر ایک فنکار کی روح فن پاروں میں ڈھلنے کے لئے بے چین تھی۔ جو پھولوں کی بات سُنتا تھا اور جھرنے کے شور میں پنہاں سکوت محسوس کرتا تھا۔ وہ تحصیل کے برآمدے میں پھٹی ہوئی نیلی دری پر چار آنے کے عوض عرضیاں لکھنے لگا!

دوستوں میں گیا۔ وہ مجھ سے دُور ہٹ گئے۔ کہیں میں بچ گیا کہ اُن کے درمیان احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ اب ایک ہی راہ تھی۔ میں نے وہ راہ اپنائی جہاں میں خود کو برتر سمجھتا تھا۔ میں کم تر درجہ کے لوگوں میں بیٹھنے لگا۔ سستے ہوٹلوں کے لوگوں کے درمیان بیٹھا اور وہاں میں نے سکون محسوس کیا۔ وہاں کوئی دوہری شخصیت کا مالک نہ تھا۔ وہاں کوئی خلاف نہ تھا۔ وہاں کوئی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ تھا ——— یقین کرنا وہاں مجھے روحانی سکون ملا۔ کیونکہ میری روح ایک فنکار کی روح تھی۔ فنکار جو حقیقت پسند ہوتا ہے۔ جو خوبصورت شیڈ سے ڈھکے ہوئے روشن بلب کے مقابلے میں چاند سے پیار کرتا ہے جو اُس سے بہت دُور ہوتا ہے۔ وہ خوبصورت فلیٹ اور ڈرائنگ روم کی بجائے میونسپلٹی کے پارک میں سکون پاتا ہے جو اُس کا نہیں ہوتا جو ریڈیو کے نغموں کے مقابلے میں اُن پرندوں کے نغمے پسند کرتا ہے جو اُس کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ اور اگر تم میرے اختیار میں ہوتیں تب ———؟

میں نے ڈرائنگ روم سے منہ پھیر لیا جہاں خوبصورت شیڈ سے ڈھکا ہوا منقش بلب تھا۔ جہاں گیتوں کا ترنم ابھرتا تھا۔ جہاں ہر ایک شے پر ایک خول چڑھا ہوا تھا۔ میں "آزاد پارک" میں آ گیا۔ جہاں نیم تاریک رات تھی۔ سیاہ رات تھی یا چاند کی کیف آگیں صاف روشنی تھی۔ بے نقاب پھول تھے اور پرندوں کے نغمے تھے۔ برسوں میں اسی پارک میں بیٹھا رہا اور غریب بے کس لوگوں کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بیٹھا تصویریں بناتا رہا۔ یا پھر کورس کی کتابیں پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ چند امتحان گاہوں سے گزر کر ایک دفتر میں پہنچ گیا۔ مجھے سکون ملا لیکن وہ آگ اب اندر کی تیز ہو گئی [illegible] جس کے [illegible] خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں بنانے پر مجبور تھا۔ میری روح [illegible] اور میں ایسا محسوس کرتا جیسے بہت تھک گیا ہوں۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد [illegible] میں نے چاہا میں ایک نوجوان کی طرح قہقہہ لگاؤں تو مجھے یاد آیا کہ میں ایک دفتر کا ذمہ دار کارکن ہوں۔ میں نے چاہا کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دوں اور ریشمیں بالوں کی لٹ کو اپنی انگلیوں میں لپیٹ کر کسی کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹوں کا سایہ کر دوں اور کہوں میں تم سے محبت کرتا ہوں ——— تو مجھے اپنی بیوی یاد آ گئی۔ گاؤں کی ایک بد مزاج لڑکی جس کے سر میں سرسوں کے تیل کی کڑواہٹ تھی اور جس کی آنکھوں میں اُس کی جہالت کی جھنجھلاہٹ تھی۔ ہاں میں نے چاہا کسی کے نرم مکھن سے ملائم ہاتھوں کو اپنی ہتھیلیوں میں دبا کر اپنے ہونٹ اُن پر رکھ دوں تاکہ موت سے قدم ملا کر چلنے والی آگ ختم ہو جائے۔ لیکن مجھے اپنی بیوی کے ہاتھ یاد آ گئے۔ خیام کی رباعیات کے باتصویر مجموعے سے کیٹس اور غالب کی کتابوں سے، ٹیگور کی گیتانجلی کے اوراق سے چرانا چاہنے والے ہاتھ! ——— میں پھر تشنہ رہا ——— ہاں میں نے چاہا کہ کسی کو خط لکھوں۔ پیار میں ڈوبا ہوا خط! جس کے ہر لفظ میں دل کی دھڑکن ہو ——— نرم نرم مہک سا خط۔ جس میں پھولوں کی خوشبو، چاند کی خنکی اور سورج کی پہلی کرن کی چمک ہو، جس میں قوس قزح کے رنگ ہوں اور شفق کی ضیاء ہو ——— لیکن پھر مجھے اپنی بیوی یاد آ گئی۔ اُف یہ یاد ——— یہ کربناک خیال ——— اُف میرا فطری تقاضوں سے فرار ———

میری محبوب! تم گود پھیلا دو۔ مجھے گلے سے لگا لو کہ یہ آگ مجھے جینے نہ دے گی!

سوچو تو اب جبکہ میں زندگی کے اس مقام پر تھا جہاں ہر نوجوان لڑکا اپنی دلہن کا انتظار کرتا ہے۔ تصور کرتا ہے اور سہاگ رات سے لے کر بچے کو دودھ پلانے کے گیت اور خوبصورت خاکوں کی خیالی تصویریں اُس کی آنکھوں میں سمائی رہتی ہیں تو یہ حقیقت میرے سامنے آئی تھی کہ میری شادی کو دس بارہ سال ہو چکے۔ میں کسی محبوب نہیں بلکہ ایک ایسی لڑکی کا شوہر تھا جو جوان آئی تھی اور جس کی عمر کا سورج اب غروب ہوتا جا رہا تھا اور ——— اُف میں کہاں آ گیا ——— لیکن یہ سب کچھ میں تم سے کیوں کہہ رہا ہوں؟ ایک اجنبی کی روح میں بھلا تم کیوں جھانکنے لگیں ——— تمھارا کیا ساتھ، کیا رشتہ؟ تم تو بجلی کی ایک لپک ہو اور میں آخر شب دریا کا سکوت۔ تم دھڑکن کی کیف آگیں گونج اور بادِ صبا ہو۔ تم تو ایک قہقہہ ہو اور میں زندگی کے ہونٹوں پر سسکتی ہوئی ایک چیخ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بھلا تم کیوں میری سننے لگیں میرا کوئی بھی نہیں۔

• کھٹ کھٹ ...؟

میں چونک اٹھی ہوں۔ شاید زینہ پر کوئی آ رہا ہو۔ شاید شہابی آ رہا ہے۔ اُف! میں تو بھول ہی گئی تھی کہ شہابی نے ہی جلدی ہی لوٹنے کا وعدہ کیا تھا۔ میرا انہماک ٹوٹ گیا ہے۔ میں محسوس کر رہی ہوں ایک عجیب سی تھکن میرے وجود پر غالب ہے۔ نجانے کیوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں ایک طویل سفر سے واپس آئی ہوں۔ نہیں ابھی ٹھہری نہیں ہوں، ابھی مجھے بہت چلنا ہے۔ منزل دور ہے . . . . میں مسکرانا چاہتی ہوں۔ ایک انگڑائی لینا چاہتی ہوں لیکن میں ساکت ہوں۔ میں ایک قدم چل کر کھڑکی تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اور سامنے ابھی بہت سے خطوط ہیں۔ میرے اندر کوئی شے گھٹ رہی ہے۔ شہابی ابھی تک نہیں آیا۔ پھر یہ زینہ پر کس کے قدموں کی چاپ تھی۔ شاید میرا وہم تھا۔ کاش وہ آجاتا۔ شہابی اگر آجاتے تو میرے وجود کی گھٹن ختم ہو جاتے۔ میں اسے اُس لڑکے کے بارے میں بہت کچھ بتاؤں۔ میں اس سے کہوں کہ دیکھو شہابی! زندگی اور بندھنوں کا کتنا قریبی رشتہ ہے۔ اور بعض وقت اتفاق ہمیں کتنی تنگ و تاریک وسعتیں بخش دیتا ہے۔ یاسیت کس طرح روح کے حسن کو کھا جاتی ہے اور کس طرح اس جذبہ کو ختم کر دیتی ہے جو ہمیں خوشیاں اپنانے کی تحریک بخشتا ہے۔ لیکن شہابی ابھی تک نہیں آیا ہے اور میز پر پھیلے ہوئے یہ خطوط اپنے اندر کتنا بڑا خلا کس قدر کرب انگیز زندگی کے سفر کی کہانی چھپائے ہوئے ہیں۔ نجانے کیوں میں سوچنے لگی ہوں کاش! یہ خطوط مجھے لکھے گئے ہوتے۔ کاش اجنبی نے میری تصویر بنائی ہوتی! یا دیر کھڑکی سے چھپ کر مجھے دیکھا ہوتا! کاش! شہابی میری زندگی کی ویرانیوں میں داخل نہ ہوتا اور میں خود آہستہ قدم چل کر اِس پیاسے اور یاسیت کے مارے انسان کی ادھوری زندگی کی تکمیل کا پیغام بن جاتی۔ اُف! نجانے وہ کہاں چلا گیا؟ اب وہ کہاں ہوگا؟ میں محسوس کر رہی ہوں کہ میں اُلجھتی جا رہی ہوں۔ میرے اندر کوئی بے نام سا جذبہ پیدا ہو رہا ہے جس کے تحت میں اپنے ہونٹ ان خطوط پر رکھنا چاہتی ہوں۔ نجانے کیوں مجھے اپنی اُس سہیلی پر غصہ آ رہا ہے جس نے اُس یاس کے شکار انسان کی زندگی میں ایک آگ اور لگا دی۔ اُف ——— بیچارہ ——— اُف! کس محبت، کس خلوص سے اُس نے یہ شعر لکھا ہوگا۔ میری نظریں میز پر پڑے ایک سفید کاغذ پر جم گئی ہیں ؎

"کوئی محفل ہو کہ مقتل ہو کہ میخانہ ہو
دل وہ آوارہ کہ ہر دم تیری صورت مانگے"

آگے اُس نے اُس کاغذ پر یہ کیا لکھا ہے ———

"میں اپنی روح یہاں چھوڑے جا رہا ہوں ———"

اور مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے کاغذ پر کسی آنکھ کی تصویر ہے جو مجھے گھور رہی ہے۔ اور میں چاہتی ہوں یہ آنکھ بند ہو جائے اور میں اجنبی! کہہ کر اتنے زور سے چیخوں کہ ——— ! میرے مالک شہابی ابھی تک کیوں نہیں آیا ——— ؟ میز پر بے شمار خطوط بکھرے ہوئے ہیں۔ اور میں اب اور خطوط کھولنا نہیں چاہتی ——— کیونکہ اب میں اتنا درد برداشت نہ کر سکوں گی۔ میرا جسم ہلکے ہلکے کانپ رہا ہے۔

میں کوئی آخری خط پڑھنے کے لئے تمام خطوط دیکھ رہی ہوں۔ لیکن یہ کیسا خط ہے؟ جو لفافہ میں بند ہے ——— میں پڑھتی ہوں۔

میری . . . .

ذرا سوچو تو میں نے کس محبت اور اعتماد سے تمہیں اپنی کہانی سُنائی اور تمہاری آنکھ سے آنسو نہ نکلا! تم پر میرا بہت حق ہے۔ لیکن نہیں شاید تم پر میرا کوئی حق نہیں ——— میرے یہ خطوط کس قدر زباں بندی کے حامل ہیں۔ کیا کبھی تم اندازہ لگاؤ گی؟ دیکھو ہم یاس کے مارے لوگوں کا صرف خواب سہارا ہوتے ہیں۔ اُن کی موت ہماری موت ہوتی ہے ——— یہ آج کل تمہارے کمرے میں کون ٹھہرا ہوا ہے؟ شاید ——— نہیں ———!! میں تمہاری تصویر نہیں بنا سکتا۔ بن ہی نہیں سکتی ——— میرے لئے یہاں رہنا ممکن نہیں ———!!

نجانے کیوں میرا تمام جسم کانپ اُٹھا ہے؟ شاید اُس نے اُس دن اپنے خوابوں کی خوفناک موت خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوگی۔ کتنی اذیت ناک ہوگی۔ ایک عجیب سی تلخی مجھے محسوس ہو رہی ہے اور اُس تلخی سے فرار پانے کے لئے میں اُن کاغذوں کے ڈھیر کی تلاشی لے رہی ہوں۔ اُف میرے خدا ——— یہ بھونچال کیسا ہے؟ یہ زلزلہ کیسا ہے؟ یہ دیواریں کیوں ہل رہی ہیں؟ یہ تصویر میرے ہاتھ کیوں لگ گئی؟ یہ ادھوری تصویر مجھے کیوں مل گئی؟ نجانے کیوں ایک عجیب سا ارتعاش میرے جسم میں پھیل گیا ہے۔ میرے وجود کی گھٹن ختم ہو گئی ہے۔ اور اب یہاں ایک اشتعال کی لہر دوڑ گئی ہے ——— یہ تصویر میری ہے ——— یہ خطوط مجھے لکھے گئے ہیں ——— شاید کمرے میں ٹھہرنے والا شہابی ہی ہوگا۔ شہابی کے باعث اُس کے خوابوں کی موت ہوئی ——— اور نہ ——— خواب! بزدل! میں بڑبڑاتی ہوں ——— نجانے کیوں میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں ایک گندی گالی اُسے دوں۔ اُف! اُسے میری تصویر بنانے کی ہمت کیسے ہوئی ——— ؟ کیا حق تھا ——— ؟ میرے خدا یہ زینہ میں کس کے قدموں کی آہٹ ہے؟ یہ کون آ رہا ہے؟ میرے خدا! آنے والے کو روک، ورنہ میں بے ہوش ہو جاؤں گی ——— یہ خطوط یہ تصویر میں کہاں چھپاؤں ——— ؟ میں کیا کروں؟ قدموں کی آہٹ ختم ہو گئی ہے۔ یہ پھر میرا وہم تھا ——— آنے والا کوئی نہ تھا ——— ابھی کچھ دیر گزرے گی۔ میں یہ تصویر اور اِس کے سارے خطوط جلا دوں گی اور پھر؟ لیکن نہیں، ایسا ممکن نہیں۔ یہ خط میں نہیں جلا سکتی ——— میں شہابی سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتی ——— میں کچھ طے نہیں کر پا رہی گرچہ مجھے اس اجنبی سے عجیب سی نفرت ہو رہی ہے۔ پھر یہ کون سا جذبہ ہے کہ میں اُس کے خط جلا نہیں سکتی ——— اگر کبھی فضاؤں میں پھیلی خاموشی نے شہابی سے کچھ کہہ دیا تو ——— ؟ میرے ہاتھ کے دباؤ سے میری کئی چوڑیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ میرا ہاتھ زخمی ہو گیا ہے اور میں سوچ رہی ہوں شہابی ابھی نہ آئے ———!!

...زل

پروفیسر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ ایم اے

...ساز دل کے تاروں کو
کیوں ستاتے ہو غم کے ماروں کو

...یں اپنے مست رہنے دو
ہم محبت کے سوگواروں کو

...ی درد و کرب کی دولت
دل دُعا دے رہا ہے یاروں کو

...م کو ہے جان و دل سے عزیز
کیسے سمجھائیں غمگساروں کو

جب ہو نگے آپکے جلوے
کون پوچھیگا چاند تاروں کو

...کے جانفزا تبسم نے
زندگی بخشدی بہاروں کو

...سے دیوانے ہی سمجھتے ہیں
حسن کے دلربا اشاروں کو

موجِ رقصاں کو دیکھ کر منشاؔ
ہم نے ٹھکرا دیا کناروں کو

غزل

کمار پاشی

محفل میں کسی کی ہم نے اُنہیں اِک بار نظر دیکھا ہی تو ہے
یُوں نام پیاں کے دھڑکے ہے دل گویا اُن سے رشتا ہی تو ہے

یادوں کے سُہانے موسم میں اُس گرم بدن کی آنچ لئے
چل نکلے ہیں ہم یُوں خوش خوش سے، گویا وعدہ ہو تنہا ہی تو ہے

ہم کچھ بھی کہیں لیکن اُن سے جو ایک تعلق تھا، نہ رہا
رِشتے کی حقیقت کیا معنی، بس ٹوٹ گیا دھاگا ہی تو ہے

کیا کیا نہ عجب لمحے گذرے تنہائی شب میں اِس دل پہ
خوش فہمی، کہ سب کہہ ڈالوں گا جیسے وُہ مری سُنتا ہی تو ہے

آپ اپنے سے باہر آکر بھی سب دیکھ لیا، سب جان لیا
عالم ہے یہ سارا بھید بھرا، پردے سے پرے پردا ہی تو ہے

زندہ ہیں مگر ہم جانتے ہیں، اِس درد کا درماں کوئی نہیں
مانا کہ یہ ہستی زہر ہے اِک، یہ زہر مگر پینا ہی تو ہے

تنہائی میں شامِ فرقت کی یہ سوچ کے خوش ہے جی اپنا
آئے گا منانے گھر اُس کو جیسے وُہ اِدھر آتا ہی تو ہے

ہر صنفِ سُخن کو پاشیؔ بھی اِک طرز نئی دی ہے ہم نے
ہر اِک سے الگ ہر اِک سے جُدا ہر شعر میں عکس اپنا ہی تو ہے

غزل

حشمت آرا حجاب

دردِ دل سے کبھی جُدا نہ ہوا
اِک یہی دوست بیوفا نہ ہوا

زندگی کٹ گئی عبادت میں
ایک سجدہ بھی کام کا نہ ہوا

دل تو کیا ہم نے جان بھی دے دی
کونسا آپکا کہا نہ ہوا

آدمی سوزِ عاشقی کے بغیر
خاک ہو کر بھی کیمیا نہ ہوا

زندگی ننگِ زندگی ہوتی
شکر ہے آدمی خُدا نہ ہوا

میں سمجھتی ہوں دل وہ دل ہی نہیں
جو ترے غم سے آشنا نہ ہوا

تیری تائید ہو گئی شامل
جب مرا کوئی آسرا نہ ہوا

وہ پسِ پردہ لے حجابؔ رہے
خیر گذری کہ سامنا نہ ہوا

افسانہ

نگاہِ آئینہ ساز میں

شمع زیدی

۳/اے نور الامراء، حیدرآباد ۳۳ (آندھرا)

۴ مارچ ۱۹۹۵ء

مکرمی! آداب و نیاز

ایک عرصے کے بعد "نگاہِ آئینہ ساز میں" لے کر آئی ہوں۔ آپ بھی ناراض ہوں گے اور پڑھنے والے بہن بھائی بھی۔ اس کے سوا کیا کہوں کہ ؎

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

اس تاخیر کے لئے "بیسویں صدی" اور اس کے قارئین سے شرمندہ ہوں۔ "عذرِ گناہ" کی میں قائل نہیں۔ اس لئے آئندہ کے لئے وعدہ کرتی ہوں کہ جلد حاضر ہوا کروں گی ——— سالنامہ کے بارے میں جو بھی خط نظر سے گزرتے ہیں مجھے اپنی ہی آواز معلوم ہوتے ہیں۔ شاد صاحب کے انٹرویو تو "خاصہ کی چیز" ہوتے ہیں۔ خاص طور سے ساحر لدھیانوی سے انٹرویو بہت پسند آیا۔ شاد صاحب کو میری مبارکباد دیجئے ——— زیرِ نظر کہانی قارئین کی پسند کو مدِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے اس لئے توقع ہے پسند کی جائے گی۔ تاہم پھر بھی ہمیشہ کی طرح اپنے قاری بہن بھائیوں کی رائے کا انتظار کروں گی۔ میرے پڑھنے والوں کو مجھ سے دو شکایتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں برابر کیوں نہیں لکھتی دوسرے میں سب کو جواب نہیں دے پاتی۔ حالانکہ میں سارے جوابی خطوط کے جواب دیتی ہوں، جنھیں نہیں دے پاتی انھیں مجھ سے شکایت اس لئے بھی نہ ہونی چاہئے کہ میں اُن کے لئے "بیسویں صدی" کے صفحات پر لکھتی ہوں اور وہ مجھے خط لکھتے ہیں، اس طرح حساب برابر ہو جاتا ہے۔ آپ سے امید کرتی ہوں کہ آپ اس کہانی کو جلد ہی جگہ دے کر مجھے مزید شرمندہ ہونے سے بچالیں گے۔

آپ کی گرانقدر رائے کی منتظر ——— شمع زیدی

"محبت ایک ایسا نغمہ ہے جو احساس کے بربط پر گایا جاتا ہے۔" جنسِ لطیف کے ترجمان نے کہا۔

"محبت ایک ایسی حماقت ہے جو دماغ کا خلل کہی جا سکتی ہے۔" شہریار نے جواب دیا۔

"اور اگر کسی سے یہ حماقت سرزد ہو جائے تب؟"

"اس کا علاج ایک حسین ساز ور دار تھپڑ!"

"شاید تم نہیں جانتے ایک بزرگ کا کہنا ہے۔ کوئی ایک تھپڑ مارے تو دوسرا گال پیش کر دو۔"

"میرا تھپڑ اتنا ارزاں نہیں کہ تمھیں مانگے سے مل جائے۔"

"کیا سب کچھ بغیر مانگے پا سکنے کو دے چکے ہو؟"

"دوسرا تھپڑ کھانے کا ارادہ ہو تو چپکے سے بتا دو۔ کسی سے کہوں گا نہیں۔ ویسے تم اقبال کو کچھ نہیں، میرا وقت برباد کرنے آئی ہو۔" شہریار نے کتاب روبینہ کی طرف پھینکی جو میز سے پھسلتی ہوئی اس کی گود میں جا گری۔

"ضروری نہیں کہ تم لوگوں کے خوبصورت سروں کے اندر عقل و شعور بھی ہو۔

ہی لئے چپ چاپ کھسک کر یہاں سے۔ وہ بڑبڑا رہی تھی ـــــ لیکن یہ تو روبی تھی یہاں سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی۔ پھر بیٹھ گئی۔

"روبی!"

"ہوں"

"تمہیں دنیا میں کوئی کام نہیں رہ گیا۔ خواہ مخواہ اپنا اور میرا وقت برباد کرتی ہو۔ رومانی ناول پڑھ پڑھ کر تم نے اپنا دماغ خراب کر لیا ہے۔ تم جذباتی ہی نہیں نادان بھی ہو۔"

"یہ ایک نیا انکشاف ہے میرے لئے۔ نہ میں جذباتی ہوں نہ نادان۔"

"تم جو بھی ہو مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں۔"

"شکریہ!"

- میں اُس شخص کے متعلق بتا دوں جس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ وہ وہ شخص ہے جو نرم مزاج نرم خُو ہو۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- مومن اپنی خوش خلقی کے ذریعہ رات کو عبادت کرنے والے اور دن کو روزہ رکھنے والے شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- فیاض خدا کا دوست ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- آزادی کی حفاظت نہ کرنے والا غلامی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- جو کام حکمت سے خالی ہے وہ آفت ہے، جو خاموشی حکمت سے خالی ہے وہ غفلت ہے، جو نظر حکمت سے خالی ہے وہ ذلت ہے۔ (حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ)

"اچھا تو اب تشریف لے جایئے۔"

"میں تم سے ایک مشورہ لینے آئی تھی۔"

"تو پھر بک چلو جلدی سے!"

"یوں نہیں اطمینان سے سنو۔"

"سُن رہا ہوں۔"

"کل سے رانی سخت علیل ہے۔ اُسے اسپتال لے جانا اچھا ہوگا یا گھر پر علاج کراؤں؟"

"واہ! کیا انداز ہے! جیسے کوئی فکر مند والدہ محترمہ فرما رہی ہوں!" جل کر شہریار نے روبی کو چڑایا۔ "ویسے میں اُسے ٹھیک کر دوں گا حوض میں دو چار غوطے دے کر۔ تیر بہدف علاج ہے۔"

میں اُسی وقت رانی صاحبہ اپنی مالک کی تلاش میں آ نکلیں اور تسلی کرتی اطمینان سے اُن کی گود میں براجمان ہو گئیں۔

"روبی! میں کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ یہ منحوس بلی میرے کمرے میں نہ آیا کرے۔ ایک دن شیرو کے حوالے کر دوں گا!"

"میں شیرو کو گولی مار دوں گی۔"

"پہلے نشانہ لگانا سیکھو۔ بلکہ بہتر ہے خانساماں کا ہاتھ بٹاؤ کچن میں جاکر ورنہ پرائے گھر جاؤ گی تو سر پہ ہاتھ رکھ کر رونا پڑے گا۔"

"واہ۔ کیا انداز ہے!" روبی نے شہریار کے لہجہ کی نقل کرتے ہوئے کہا "جیسے آپ میں قبلہ دادا میاں کی روح حلول کر گئی ہو۔"

"تم جاؤ گی یا مجھے دردِ سر کی کوئی دوا منگانی پڑے گی؟ ہاں تمہارے خیال میں سیریڈون اچھی رہے گی یا اناسین؟ ا سپرو تو سنا ہے تقویتِ قلب کے لئے بھی مفید ہے۔"

روبی پیر پٹکتی چلی گئی۔ شہریار کا قہقہہ دور تک اُس کے قدموں کا ساتھ دیتا رہا۔

روبی اور شہریار بچپن سے ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے تھے۔ ویسے روبی کے ساتھ اُس کا چچا زاد بھائی ساجد بھی بچپن سے رہتا تھا جو شاید والدین کے نہ ہونے سے شروع ہی سے بہت کم گو اور خاموش طبع تھا۔ روبی کو زیادہ لاڈ پیار نے خود سر اور ضدی بنا دیا تھا۔ وہ شہریار کے سوا کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔ اور شہریار خود شرارتیں کرتا اور روبی کے سر منڈھ دیتا۔ وہ رُوٹھتی تو منانے کی بھی زحمت نہ کرتا۔ ہمیشہ ہی ساجد اُس کی خوشامد کرتا اور پھر دونوں میں صلح ہو جاتی۔ ایک بار شہریار نے اپنی کوٹھی کے سامنے ایک خانصاحب کے باغ سے کیریاں توڑنے کا پروگرام بنایا۔ جب بہت سی کیریاں روبی کے فراک کے دامن میں اکٹھا ہو گئیں تو وہ اور کیریاں توڑنے کو غلیل لانے کا بہانہ کرکے باغ کے رکھوالے کو بُلا لایا۔ روبی نے اپنے سامنے مالی کو کھڑے دیکھا تو کیریاں گرا کر بے تحاشا رونے لگی۔ شہریار اُسے روتے چھوڑ بھاگ گیا۔ کئی دن اُس نے شہریار سے بات نہ کی۔ اور نہ ساجد سے۔ وہ غریب اُسے منانے پیچھے پیچھے پھرا کیا اور اپنے حصے کے چاکلیٹ دے کر منایا۔ یہ مثلث اسی طرح عمروں کے فاصلے طے کرتی رہی۔ شہریار اب بھی اُسے ستا کر خوش ہوتا اور منانا پڑتا ساجد کو۔ ساجد شہریار کا عزیز ترین دوست تھا بقول شہریار معصوم اور بے زبان دوست!

"کل میرا جنم دن ہے۔"

"اِس اطلاع کے پیچھے ضرور تحفے والی علّت ہوگی۔ کیا لوگی کل؟"

"تحفہ تو تم مجھے کچھ دن ہوئے دے چکے ہو۔ ایک تھپڑ! کہو تو دوسرا گال

بھی پیش کر دوں!"

"میں تم سے نہ معافی چاہوں گا نہ بھول جانے کو کہوں گا۔"

"تم نے یاسمین کے لئے بھی تھپڑ مارا تھا۔"

"نہیں صرف اس لئے کہ جب تم زندگی میں کسی جذباتی لے پر پہنچو تو تمھیں میرا تھپڑ یاد آجائے۔"

"میری زندگی میں کبھی کوئی ایسا لمحہ نہ آئے گا۔"

"شاباش! ہر لڑکی کو یہی سوچنا چاہئے۔"

"بے حس!"

"شکریہ!"

"مغرور!"

"ایک بار اور شکریہ! کئی لڑکیاں مجھے ایسے ناموں سے یاد کرتی ہیں۔"

"خود کو پتہ نہیں کیا سمجھتے ہو؟"

"ایک معمولی سا حقیقت پسند انسان۔ جو کسی لڑکی کو جذبات میں بہتے نہیں دیکھ سکتا!"

"تم لڑکیوں کے خدائی فوجدار ہو کیا؟"

"نہ سہی لیکن تمھاری طرح پاگل ہوں نہ احمق۔"

"یاسمین کے بارے میں کیا خیال ہے حضور کا؟"

"کوئی خاص خیال نہیں۔ میرے جملہ حقوق میری ان دیکھی بیوی کے نام محفوظ ہیں۔"

جھلا کر روبی چل دی۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر لوٹی اور شہریار کے سامنے سے ڈکشنری اٹھا کر چلی گئی۔ وہ سوچتا ہی رہ گیا۔ جلد ہی وجہ سامنے آگئی۔ ہاتھ میں ڈکشنری لئے اس کی ماں اندر آئی۔

"کیوں رے۔ تو تو کہتا ہے، امتحان کی پڑھائی کر رہا ہے۔ یہ انگریزی کے الٹے سیدھے ناول پڑھتا رہتا ہے؟ ہوا ویسے ہی میری جان کو آتے ہیں کہ لاڈ پیار میں بیٹے کو بگاڑ دیا ہے...."

وہ اماں بی کا لکچر سنتا رہا۔ اماں بی کے آگے وہ اب بھی ریسرچ اسکالر نہیں۔ دوسری تیسری جماعت کا کور مغز لڑکا تھا۔ یہ سوچ کر اسے ہنسی آتی۔ پھر جب انھوں نے بات ختم کی۔ اس نے بڑی سعادت مندی سے انھیں یقین دلایا کہ آئندہ وہ انگریزی کی الٹی سیدھی کتابیں نہ پڑھا کرے گا۔ ان کے جاتے ہی وہ کمرے سے نکلا۔ دیوار سے لگی روبی واپس جا رہی تھی۔ پکڑنے دوڑا تو اس کے ہاتھ روبی کی ناگن سی لہراتی بل کھاتی چوٹی لگی۔ ایک جھٹکے سے وہ لہراتی ناگن بھی ہاتھ سے پھسل گئی۔ ناچار اسے صبر کرنا پڑا۔

وہ معصوم سا بے حد سادہ لوح انسان اس کے سامنے اس طرح پریشان بیٹھا تھا کہ چہرے پر بلا مبالغہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ شیو بڑھا ہوا۔ آنکھوں میں کئی راتوں کی شب بیداری کا خمار۔ آخر شہریار کو اس فکر مندی کی وجہ پوچھنی پڑی۔ معلوم ہوا ساری زندگی کا مسئلہ سامنے ہے۔ چچا نے اسے بلا کر کہا تھا کہ وہ خود ہی روبی سے اس کی رائے پوچھ لے۔ وہ جلد سے جلد دونوں کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔ پوچھنے والی بات پر اسے روبی کے والد کی ترقی پسندی پر ہنسی آگئی۔

"تو پھر پوچھ لو۔" اس نے بہت خلوص سے مشورہ دیا۔ "ڈرنے کی اس میں بات ہی کیا ہے۔ لڑکی بھی کوئی ڈرنے کی چیز ہوتی ہے۔"

"اگر اس نے انکار کر دیا تب ــــــ؟"

"تب کیا۔ کوئی دوسرا گھر دیکھ لینا۔ سر سلامت تو سہرے ہزار۔"

- حسنِ سیرت برائیوں سے پرہیز کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ ذہن میں برائی کے ارتکاب کی خواہش پیدا نہ ہونے کا نام ہے۔ (برنارڈ شا)
- غلاموں کے ملک میں غلام ہی حکومت کرتے ہیں۔ اور ان کی منڈیوں میں تاجروں کا راج ہوتا ہے۔ (برنارڈ شا)
- ظالم سے بغاوت کرنا خدا کی اطاعت کے برابر ہے۔ (جیفرسن)
- جو شخص علم رکھتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا، وہ اس بیمار کی مانند ہے جس کے پاس دوا ہے اور وہ اسے استعمال نہیں کرتا۔ (حکیم اقلیدس)
- جھوٹ بولنے سے آدمی کی سچ بات کا بھی اعتبار جاتا رہتا ہے اور سچ بولنے سے آدمی جھوٹ کے شر سے محفوظ رہتا ہے۔ (حکیم بطلیموس)

"یار مذاق نہ کرو۔"

"پھر کیا ماتم کروں آپ کی حالتِ زار پر۔ ذرا سی ہمت کرو۔ خدا تمھاری مدد کرے گا۔ تم نے سنا نہیں ہمتِ مرداں مددِ خدا!"

"خدا کے لئے سنجیدہ بنو۔" ساجد نے تقریباً روتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بھئی کیوں پریشان کرتے ہو۔ یہاں جینا دوبھر ہو رہا ہے اور تم سنجیدہ اور رنجیدہ کے قافیے ملا رہے ہو۔"

ساجد جیسے رونے ہی والا تھا۔ تب شہریار واقعی سنجیدہ ہو گیا۔

"کیا مدد کروں تمھاری؟"

"تم جا کر روبی سے پوچھ لو۔ وہ تم سے بے تکلف ہے۔"

"یعنی یہ کہ وہ تمھیں امیدواری سے سرفرازی میں قبول کر سکتی ہے یا نہیں۔

ت ——؟ ابھی پوچھنا ہوں جاکر!" وہ روبی کے کمرے پر پہنچا تو وہ اس طرح رو رہے بیزار نظر آئی کہ مجبوراً شہریار نے ایک مصرعہ کھینچ مارا۔

"نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی"

اس کے بعد آگے گنگنا پایا ——"تم جانتی ہو مجھے ایک مصرعہ یاد رہتا ہے آگے لو ادھر یہ بتاؤ کہ بات کیا ہے؟ اتنا خوشگوار موسم اور تم کمرہ میں بند۔ آنٹی کہہ رہی تھیں ——کچھ کھایا بھی نہیں کئی دن سے بھوک ہڑتال کر رہی ہو۔ مزاج کیسے ہیں؟"

"آپ سے مطلب؟"

"مطلب کیسے نہیں —— تم نے سب کو پریشان کر رکھا ہے۔"

"تب تو تمھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ پاپا نے ساجد سے کیا کہا ہے؟"

"جانتا ہوں۔ پھر تمھاری کیا رائے ہے اُس نیک خیال کے بارے میں؟"

"ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور!"

"تمھارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"یہی کہ میں بیسویں صدی کے اِس رومانی دَور میں حادثاً ہی وجود میں آگیا۔"

"احمق ہو!"

"وہ تو ہوں ہی۔" بہت سکون سے شہریار نے جواب دیا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

"سمجھ میں نہ آنے والی تو کوئی بات نہیں۔ ساجد جیسا بے زبان سعادتمند انسان چراغ لے کر ڈھونڈو گی تو نہیں ملے گا۔"

"تم کون ہوتے ہو وکالت کرنے والے؟"

"میں شہریار۔ تمھارے بچپن کا مخلص ساتھی!"

"تم درمیان میں کیوں آتے ہو۔ میں خود جواب دے لوں گی۔"

"اگر تمھارا جواب اثبات میں ہے تو مجھے درمیان سے ہٹنے میں کوئی عذر نہیں۔"

"تب جاؤ جوجی میں آئے کہہ دو۔"

"شکریہ مادام۔" شہریار نے جھک کر تعظیم دی۔ "اس خوشی میں چلو ہم تینوں کہیں لنچ لیں گے!"

جواب میں روبی نے قریب کا ایک قیمتی واز شہریار پر کھینچ مارا جو دروازہ سے ٹکرا کر ہزاروں کرچوں میں بکھر گیا۔

"کوئی بات نہیں روبی۔ اِس سے بھی قیمتی واز تمھیں تحفتاً دے دوں گا۔ میرے معصوم دوست کا دل ٹکڑے ہونے سے بچ گیا۔" شہریار نے دل میں کہا۔

شادی کے ہنگامے شروع ہونے سے ایک دن پہلے وہ آئی اور میز سے ویڈنگ کارڈ اُٹھا کر چل دی۔ شہریار مسکرا کر رہ گیا۔ اُسے اس وقت اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ تو خود اپنے ہاتھوں سے شادی کے سارے انتظامات میں مشغول تھا۔ صبح بارات آنے والی تھی اُس نے دعوت کے لئے رات بھر انتظامات دیکھے۔ عروسی کے بھاری بھاری شرشے بھی اُس کی پسند سے خریدے گئے تھے۔ یہاں تک کہ دعوت نامہ کا مضمون بھی اُسی کا تھا۔ رات کو اُسے اطلاع ملی دولھن کے کمرے میں تمبل فین کی جالی پنکھوں سے تکرار رہی ہے۔ اِس لئے اُسے دولھن اور اُس کی سہیلیوں کے مجمع میں جانا پڑا۔ اِدھر شادی کے انتظام میں وہ کئی روز سے روبی کو دیکھ بھی نہ سکا تھا۔ شہریار نے دیکھا اُسے "جلوہ" کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ وہ شریر اور بات بات پر پریشان کرنے والی روبی آج ایک معصوم سی ہندوستانی دولھن تھی جو نہ جانے کن کن بوجھوں تلے کسی بار آور شاخ کی طرح جھکی جا رہی تھی۔ پھولوں کے ڈھیر میں چھپی گہنوں اور رعودسی لباس کے بوجھ میں جھکی جھکی ہندوستانی دولھن کیسی پیاری چیز بن جاتی ہے۔ شہریار نے سوچا اپنا تحفہ وہ ابھی دے دے۔ بعد میں اُسے فرصت ملے نہ ملے۔ وہ قریب آیا۔ روبی نے گھٹنے پر رکھے چہرے کو ذرا سا اوپر اُٹھایا۔ آنکھوں سے شرارت کی جگہ ہزاروں شکوے آنسوؤں کی شکل میں افشاں سے چمکتے گالوں پر لڑھکنے لگے۔ پہلی بار شہریار گھبرا سا گیا۔ اِن آنسوؤں میں اُسے سالی کو دیکھ کر روتی روبی نظر آنے لگی۔ ننھی مُنی معصوم سی گڑیا۔

"ارے —— یہ آنسو —— روتی کیوں ہو —— سارا کاجل بہہ جائے گا۔" اُسے کوئی بات نہ سوجھی۔

"ہاں تم ہی سمجھاؤ انھیں۔ کتنے دن سے روتے چلی جا رہی ہیں۔" چپکے سے جانے کب ساجد کمرے میں آگیا تھا اور ساجد کو دیکھ کر بچپن کا شہریار لوٹ آیا۔

"ہاں بھئی ٹھیک ہی تو ہے —— تم لڑکیاں اِتنے سارے گہنے اور اِتنا سارا جہیز لے کر بھی روتی ہوئی جاتی ہو۔ رونا بھی ایک رسم کی ادائیگی ہے تم لوگوں میں۔" اور جب وہ اپنا تحفہ جڑاؤ ہار کا مخملیں ڈبہ اُس کے ہاتھ میں دینے لگا تو ساجد بضد ہو گیا کہ خود ہی پہنا دو —— زرتار دوپٹہ اُٹھا —— افشاں چُنی ہوئی مانگ شہریار کے آگے جھکی۔ پھر کسی ہاتھ نے اُس کی موٹی سی چمکتی چوٹی اُٹھائی —— آہ یہ ناگن بھی ساکت تھی نہ لہرا رہی تھی، نہ بَل کھا رہی تھی۔ پھر بھی وہ ڈر رہا تھا کہیں ہاتھ چھو گیا تو ڈس نہ لے۔ اُسی وقت آنٹی کمرے میں داخل ہوئیں اور نوشہ میاں کو بے وقت کمرہ میں آجانے پر نکالنے لگیں تو شہریار بھی کھسک گیا۔

دوسری صبح وہ شہر سے باہر جانے کا ارادہ کرکے اُٹھا۔ اٹیچی اُٹھائی۔ دو چار جوڑے ابھی وہ رکھ ہی رہا تھا کہ دروازے میں ساجد نظر آیا۔ اُس کے پیچھے روبی۔

"صبح بخیر! تم دونوں اِتنے سویرے کیسے نازل ہو گئے؟ گھر میں سب کیا کہیں گے؟"

"پچھلے دروازہ سے آئے ہیں۔ یہ روبی رات بھر تمھاری شکایتیں کرتی رہی۔۔
میں نے کہا چلو میرے دوست سے معافی مانگو۔"

"اِس سادگی پہ کون نہ مرجائے لے خدا ؟" شہریار نے دل میں عادتاً ایک مصرعہ
دُہرایا۔

"لیکن یہ صبح صبح تم کہاں جا رہے ہو ـــــ ؟ آج کے ڈنر کا انتظام تمھارے
ہی ذمّہ ہے۔"

"وہ تم کرلوگے ـــــ اب تو گھر داماد ہوگئے۔ مجھے جانا پڑے گا۔ بہت
ضروری کام ہے۔"

"لیکن آج کا ڈنر تمھارے بغیر کیسے مکمل ہوگا؟" پھر ساجد روبی سے بولا "تم میرے
دوست سے پہلے تو معافی مانگو پھر اسے رُک جانے کو کہو۔"

"چشم بددُور۔ ایک ہی دن میں تمھیں شوہرانہ رعب جمانا آگیا۔ روبی معافی
کس بات کی چاہے۔ اِس نے کیا ہی کیا ہے؟"

"ساری رات تمھاری بُرائیاں کرتی رہی ـــــ چلو روبی معافی مانگو۔"
لیکن وہ مُنہ پُھلائے کھڑی رہی۔ اُسے اِس طرح کھڑے دیکھ کر شہریار کے ذہن میں پہلی
بار ایک پُورا شعر کہیں سے آگیا ؂

کانٹوں میں کبھی نیند آجاتی ہے غم میں کبھی بسر ہوجاتی ہے
مایوس نہ ہولے ہمتِ دل ہر شب کی سحر ہوجاتی ہے

لیکن اُس نے اِس شعر کے بجائے روبی کے محبوب شاعر اقبال کا ایک شعر نذر کیا
"روبینہ اپنی زندگی کی اِس نئی صبح پر ایک شعر سنو گی۔"

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

پھر شہریار نے شام تک لَوٹ آنے کو کہہ کر دونوں کو رخصت کر دیا
خود ایک عجیب سی خلش لئے ایک عجیب سفر پر روانہ ہوگیا۔ جیپ گرد اُڑاتی جب
اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے بچپن کا معصوم ساتھی اُس کا بہترین دوست ہمیشہ کے لئے اُ
بھی گرد راہ میں گم ہو رہا ہے۔ دُور کہیں سے آواز آئی۔

"پتھر!"

"اور تم بیکار ہی اِس پتھر سے سر ٹکرا رہی ہو۔"

"تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں۔"

اور زندگی کے اس موڑ پر جب اُس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا تو ٹکرانے کو سنگ
کی تلاش بھی لاحاصل تھی!!

غزل

سلام سندیلوی۔ ایم۔ اے، پی، ایچ۔ ڈی

وہ سمجھے تھے بہت آسان ہے زُلفوں کا سلجھانا
مگر ہنگامِ آرائش ہزاروں خم نکل آئے

تری رفتار کے فتنے، کبھی پہلے جو دیکھے تھے
غزالوں میں وہی اندازِ رقص و رم نکل آئے

اسیرِ زلف ہوکر جانے کتنے رنج و غم سہتے
بہت اچھا ہوا، پیچیدگی سے ہم نکل آئے

چھُپانا چاہتا تھا باغباں حالِ چمن لیکن
گُلِ تر خود ہی لیکر دیدۂ پُرنم نکل آئے

ذرا دیکھو تو کتنی دلنشیں ہے شامِ ہجراں بھی
اُفق سے کیا اُنہیں کے گیسوئے برہم نکل آئے

سلام آخر کہاں تک زیست قید و بند میں کٹتی
بہت اچھا کیا جو خلد سے آدم نکل آئے

غزل

ایاز جھانسوی

رہِ وفا میں کھڑے ہیں یہ سوچ کر تنہا
جو ہم نہ ہوں گے تو ہوگی یہ رہگذر تنہا

مری نظر سے کسی کی نظر نہیں ملتی
بھٹک رہی ہے ازل سے مری نظر تنہا

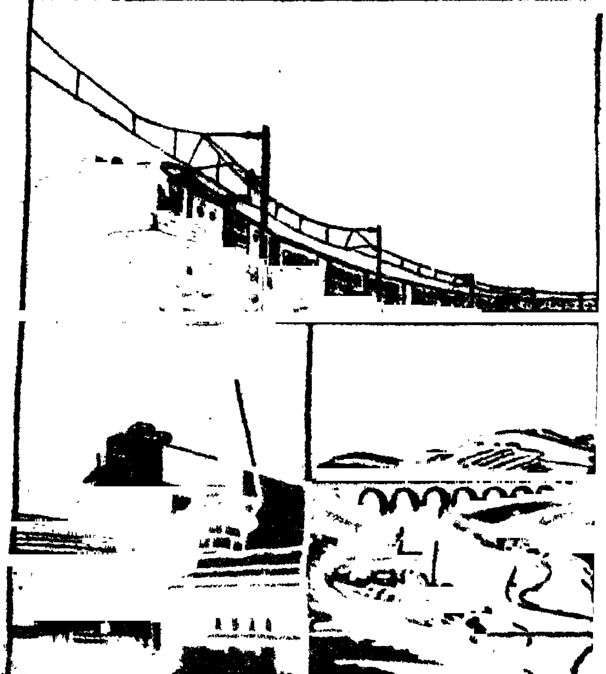
نہ تو رہا، نہ ترا غم رہا، نہ تیری یاد
میں رہ گیا ہوں زمانے میں کسقدر تنہا

وہ شوخ آنکھیں بھی رہتی ہیں ڈبڈبائی ہوئی
ہمارے غم کا ہمیں پر نہیں اثر تنہا

بجز تمہارے مجھے کچھ نظر نہیں آتا
نہ جاؤ تم مجھے ایسے میں چھوڑ کر تنہا

ایاز قافلے والوں کا اب خدا حافظ
نہ راہزن ہے اکیلا نہ راہبر تنہا





دلّی جو ایک شہر ہے

فکر تونسوی

دہلی کے مکان

دہلی میں صرف دو قسم کے انسان رہتے ہیں۔ مالک مکان اور کرایہ دار۔ ایک تیسری قسم بھی ہے جو "لامکان" کہلاتی ہے اور خدا کی طرح ہر جگہ موجود ہے۔ فٹ پاتھو پر، تھڑوں پہ، پارکوں میں، پلوں کے نیچے، پلوں کے اوپر، برآمدوں میں کھنڈروں میں۔ مگر یہ ضمنی قسم ہے۔ خدا کی طرح مکان سے بے نیاز ہے۔ حقیقی قسمیں دو ہی ہیں۔ مالک مکان اور کرایہ دار۔

مالک مکان ـــــ مکان بناتے ہیں۔ اپنے لئے نہیں بلکہ کرایہ داروں کے لئے دہلی میں جو مکان بنتا ہے اُس میں کرایہ داروں کے مزاج اور تمناؤں کو اینٹوں کی طرح چُن دیا جاتا ہے۔ جن مکانوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اُن کے متعلق مالک مکان سمجھتا ہے کہ بیکار پیسہ ڈبویا۔ مکان کے نقشے ہی میں کرایہ داروں کے چہرے اور جیب نقش کردی جاتی ہے۔ بلکہ اکثر اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ مکان کے لئے ابھی سیمنٹ کی منظوری بھی نہیں آئی کہ اُس پر کرایہ داروں کا بورڈ لگ جاتا ہے۔

دہلی میں ایسے مالک مکان بالکل گدھے سمجھے جاتے ہیں جو کرایہ دار نہیں رکھتے۔ اور شکر ہے کہ دہلی میں گدھوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مجھے ایک ایسے ہی گدھے رئیس کے بارے میں معلوم ہے۔ کہ اپنی کوٹھی میں کرایہ دار رکھنے کا سخت مخالف ہے۔ لیکن اُس نے ایک کمرہ اپنی بیوی کو کرایہ پہ دے رکھا ہے، جہاں وہ اپنا پالتو کتا رکھتی ہے اور ایک سو روپیہ ماہانہ کرایہ دیتی ہے۔ ایک چپڑاسی مالک مکان نے اپنا آدھا مکان اپنے بیٹے اور بہو کو کرایہ پر دے رکھا ہے۔

چاٹ والے سے ممبرانِ پارلیمنٹ تک

دہلی کے مکان، انسانوں کے لئے نہیں، کرایہ کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک صاحب اپنے مکان کے سامنے تھڑا بنا رہے تھے، میں نے عرض کیا، یہ تھڑا کس لئے ہے؟ فرمانے لگے "ایک چاٹ والے کو کرایہ پر دینا ہے"۔ ـــــ دہلی میں سیڑھیاں تک کرایہ پر چڑھنے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ دراصل دہلی کے ہر باشندے کی رُوح کرائے کی رُوح ہے۔ رُوح کو بھی سیڑھی اور تھڑا سمجھ کر کرایہ پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کئی ممبران پارلیمنٹ بھی ایسے ہیں جو اپنی ضمیر اور مکان دونوں کو کرایہ پر دے دیتے ہیں۔ (حالانکہ یہ ممبر خود بھی کرایہ دار ہوتے ہیں) اور پھر خود ہی پارلیمنٹ میں کرائے کی رُوحوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور اس طرح اپنے گناہ کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔

اِس اعتبار سے دہلی میں کوئی مالک مکان، خالص مالک مکان نہیں ہے کیونکہ اگر وہ کرایہ دار نہیں رکھتا تو اپنے آپ سے ہی اپنے مکان کا کرایہ وصول کر لیتا ہے۔

مکانوں کا شہر

دہلی صرف مکانوں کا شہر ہے۔ آزادی کے بعد یہاں صرف مکان بنے ہیں، ان کے سوا ہر چیز بگڑ گئی ہے۔ مکان خوبصورت ہو رہے ہیں، انسان بھدے ہو رہے ہیں۔ خدا نے انسان کو جتنا حُسن عطا کیا تھا وہ سب مکانوں پر لگا دیا گیا ہے۔ اس لئے انسان کے پاس کچھ باقی نہ رہا۔ صرف کرائے کے پیسے رہ گئے۔ یہاں تک کہ خُدا کے مکانوں میں بھی کرایہ دار رکھ لئے گئے ہیں جو پیٹ کی خاطر خدا کو کرایہ پر چڑھاتے ہیں اور خدا سے داد پاتے ہیں۔

دہلی کے مکانوں کی طرز تعمیر میں "کرایہ آرٹ" مد نظر رکھا جاتا ہے۔ کہنے کو دہلی کے سبھی آرکیٹیکٹ یہی کہتے ہیں کہ فلاں مکان میں مُغل آرٹ ہے، فلاں میں یورپین آرٹ اور فلاں میں چینی آرٹ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مکانوں کے سبھی سٹائل، "کرایہ آرٹ" کے گرد کولہو کے بیل کی طرح گھومتے ہیں۔ کرایہ داروں کی جتنی اقسام ہیں اتنی ہی اقسام کے تعمیری آرٹ ہیں۔ آرٹ ضمنی چیز ہے، کرایہ دار بنیادی چیز ہے۔

یہاں کے مکان چار قسم کے ہیں۔

(۱) قدیم مکان (۲) نئے بنگلے اور کوٹھیاں (۳) عوامی مکان (۴) سلم ایریا کی جھونپڑیاں۔

دہلی کے قدیم مکان

مکانوں کی یہ قسم پُرانی دہلی میں پائی جاتی ہے۔ انہی مکانوں کی گلیوں کے بارے میں

نے کہا تھا ؎

کون جائے ذوقؔ اب دلّی کی گلیاں چھوڑکر

یہ گلیاں اتنی تنگ و تاریک اور بھول بھلیاں قسم کی ہیں کہ اِن سے باہر نکلنے کا راستہ ہی نہیں۔ اِس لئے انہیں چھوڑکر جانا آسان نہیں۔ ذوقؔ نے ٹھیک کہا کہ اِن سے باہر نکلنے کا واقعی کوئی راستہ نہیں۔

قدیم طرز کے یہ مکان اُس زمانے کے انسانوں کی گہری اور قریبی محبت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں، اتنے جڑے ہوتے ہیں کہ ایک مکان کا باشندہ اپنی چھت پر کھڑا ہوکر دوسرے مکان کی چھت پر کھڑے ہوئے باشندے سے باتیں کرسکتا ہے، اُس کو ڈانٹ لگا سکتا ہے۔ ایک دوسرے کا سگریٹ سلگا سکتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو ہاتھ بڑھاکر تھپّڑ مار سکتا ہے۔ اِن مکانوں کی عورتیں اپنے گھروں سے نکلے بغیر ایک دوسری کو گالیاں اور کوسنے دے سکتی ہیں۔ دال سبزی ایکسچینج کرسکتی ہیں۔ اپنی اپنی جگہ کھڑے کھڑے تعزیت تک کرلیتی ہیں ــــــ غرض یہ قدیم طرز کے مکان دو انسانوں کے وصال اور قربت کا سمبل ہیں اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں۔ اے دنیا بھر کے لوگو! قریب آجاؤ۔ کیونکہ قربت ہی تمہارے دُکھوں کا علاج ہے نہ صرف علاج ہے بلکہ خود بھی دُکھ ہے اِس لئے دُکھی ہونا چاہتے ہو تو ایک دوسرے کے مکانوں کو اتنا قریب بناؤ کہ مردوں کو مورچے بنانے میں اور عورتوں کو سایہ کرنے میں سہولت ہو جائے۔

یہی جذبہ وصال و قربت ہے کہ اگر اِن میں سے ایک مکان بھی گرے تو وہ سیدھا دوسرے مکان پر گرتا ہے اور دوسرا مکان تیسرے پر ــــ اور اس طرح ایک مکان کے گرنے سے ایک ساتھ تین چار مکان گر جاتے ہیں۔ جیسے بچھڑے ہوئے اہلِ محبت ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر محبت ثبت کر رہے ہوں۔

اور چونکہ یہ قدیم مکان ہیں۔ اِس لئے عام طور پر گرتے رہتے ہیں۔ اگرچہ ان کا گرنا بدشگونی سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ دہلی کے قدیم کلچر کی یادگار ہیں۔ انہیں محفوظ رکھنے کے لئے ان پر بیساکھیاں اور پلستر لگائے جاتے ہیں۔ اس کلچر کو محفوظ کرنے کے سلسلے میں قربانیاں بھی دی جاتی ہیں اور ہر سال مکان گرنے سے بہت سے لوگ ملبے کے نیچے آکر شہید ہو جاتے ہیں۔ جب یہ قدیم مکان ملبے بن جائیں گے۔ دہلی کا قدیم کلچر بھی ملبہ بن جائے گا اور انشاءاللہ وہ دن بہت جلد آ رہا ہے۔

کوٹھیاں اور بنگلے

مکانوں کی دُوسری قسم کوٹھیاں اور بنگلے ہیں۔ اِن کی طرزِ تعمیر میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ان میں مصری، ایرانی، امریکی، فرانسیسی، رُوسی، جاپانی، افریقی رُوح نظر آئے۔ مگر ہندوستانی رُوح ہرگز نظر نہ آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی رُوح مفلس ہے اور یہ کوٹھیاں اور بنگلے امیر لوگ بنواتے ہیں۔ اور وہ نہیں چاہتے کہ ان پر مفلس ہندوستان کا سایہ پڑے۔ اس لئے وہ اپنی کوٹھیاں مفلس عوام کی چشم بد سے دور شہر کے باہر بنواتے ہیں۔ اگر اُن کا بس چلے تو وہ اپنی کوٹھیاں شہر کے باہر ہی نہیں، ہندوستان سے بھی باہر تعمیر کریں۔

عوام سے دُور شہر سے باہر کوٹھیاں بنوانے کا رجحان آہستہ آہستہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ شہر کے باہر کوٹھیوں اور بنگلوں کا ایک اور شہر بن گیا ہے اور یہ بڑے لوگ بہت پریشان ہیں کہ اب کیا کریں۔ وُہ اِس دوسرے شہر سے بھی باہر جنگلوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ تاکہ عوام سے دُور اور فطرت کے نزدیک جا بسیں۔ لیکن وہ جوں جوں جنگلوں کی طرف بڑھ رہے ہیں شہر ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ چنانچہ اب دہلی کے ارد گرد جنگل اور پہاڑ نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ جنگل اور پہاڑوں میں کوٹھیاں اور بنگلے نمودار ہو گئے ہیں۔ فطرت غائب ہو گئی ہے۔ افلاس اور سرمایہ کی ریس نے فطرت کو روند ڈالا ہے، مار ڈالا ہے، فنا کر دیا ہے۔

اِن کوٹھیوں میں وہی لوگ رہتے ہیں جو دہلی (بلکہ ہندوستان) پر راج کرتے ہیں۔ کار، بُل ڈاگ، ہرے ہرے لان، برقی قمقمے، مصوّروں کے تخلیقی شاہکار، ریشم و کمخواب، دودھ اور چاندنی میں دُھلی ہوئی عورتیں، ڈرائنگ روم، سلیپنگ روم، ریڈنگ روم، ڈریسنگ روم، ڈائننگ روم، پنگ پانگ رُوم، چلڈرن روم، ڈانس رُوم، انگریزی میں ہنسنا، رونا، لڑنا، عشق کرنا ــــــ غرض راج کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ وُہ سب اِن کوٹھیوں میں جمع کر لی جاتی ہیں۔ اِن سب نعمتوں کے لئے روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ یہ رائل فیملی کے شہزادے ہی جانیں۔ کیونکہ یہ ان کا "ٹریڈ سیکرٹ" (TRADE SECRET) ہے۔

ہاں! دہلی میں ایک افواہ ضرور پھیلی ہوئی ہے کہ یہ سب نعمتیں وہی لوگ مہیا کرتے ہیں جن سے یہ شہزادے بھاگ بھاگ کر جنگلوں کی طرف بڑھتے اور کوٹھیاں بناتے جا رہے ہیں۔

یہ کوٹھیاں اور بنگلے کرایہ پر مل جاتے ہیں۔ لیکن ان میں صرف وہی کرایہ دار رہتے ہیں جو خود بھی رائل فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ اِن کا کرایہ بھی شاہی ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ایک بار ایک سرکاری افسر نے جس کی تنخواہ ایک ہزار روپے ماہانہ تھی، ایک کوٹھی ایک ہزار روپیہ ماہانہ کرایہ پہ لے لی وہ اپنی تنخواہ کرایہ میں دے کر کوٹھی کے باہر بیٹھ گیا۔ اور ہر آنے جانے والے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا "بابا! خدا کے نام پر ایک پیسہ دے دو۔ بھوکا ہوں" لیکن شام تک اُسے بھیک میں ایک پیسہ تک نہ ملا۔ کیونکہ ہر راہ چلتے نے یہی سمجھا۔ ایسا سوٹڈ بوٹڈ آدمی بھکاری نہیں ہو سکتا۔ مذاق کر رہا ہے۔

عوام کے مکان

دہلی عوام کا شہر ہے۔ اِس لئے اُن کے مکان بھی زیادہ ہیں۔ اُن کے مکانوں کی

وہی سادگی ہے جو عوام کی اپنی ساخت ہے۔ عوام بھوک کے مارے ہیں۔ اس لئے اُن کے مکان بھی ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے صدیوں سے بھوک ہڑتال پر ہیں۔

عوام کے مکان عوام کے کلچر کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے اُن کی تعمیر کے وقت بھی عوام کے کلچر کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے۔ ایک کمرہ، ایک رسوئی۔ ایک باتھ . . . . (مگر نہیں، باتھ روم کا کام رسوئی سے بھی لیا جا سکتا ہے) اور بس ——— اس سے زیادہ کی عوام کا کلچر اجازت نہیں دیتا۔ اگر کسی عام آدمی کے پاس ایک کی بجائے دو کمرے ہوں تو اُس کی بیوی یہ کہہ کر اُس کی نیند حرام کر دیتی ہے کہ یہ دوسرا کمرہ کرائے پر اُٹھا دو۔ ہماری ضرورت سے زیادہ ہے۔ اور کچھ نہیں تو اِس کرایہ سے بچوں کی نیکریں اور قمیص ہی بن جائیں گی۔

عوام شاستروں کی انویائی ہیں۔ اس لئے اُن کے مکان بھی شاستروں کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ اُن مکانوں سے صبر و قناعت ٹپکتی ہے۔ حرص و ہوا کا اُدھر کبھی گزر نہیں ہوتا۔ اکڑ فوں اور جھوٹا غرور اُنہیں چھو تک نہیں گیا۔ ایک پاخانہ پندرہ عوامی کنبوں کے لئے کافی ہے۔ ایک غسل خانہ میں دس دس گھرانے اشنان کر لیتے ہیں۔ ایک ہی کمرے میں چار پائیاں، کرسیاں، الماری، ٹرنک، ریڈیو سیٹ، انگیٹھی، جوتے، کتابیں، برتن ——— ہر چیز سما جاتی ہے۔ کیونکہ عوام کی تھیوری یہ ہے کہ دل بڑا ہونا چاہیئے۔ مکان نہیں۔ دل بڑا ہے تو اُس میں کرسیاں بھی رکھی جا سکتی ہیں اور پانی کی بالٹیاں بھی ——— کئی لوگوں نے تو اپنے دل میں بچوں کیلئے پلے گراؤنڈ تک بنا رکھے ہیں۔ جسے دیکھ کر وہ خدا کا شکر بجا لاتے ہیں۔ جس نے اُنہیں صوفہ سیٹ عطا نہیں کیا۔ ورنہ وہ اُسے کہاں رکھتے۔

عوام کے اِن مکانوں کی ایک اور کلچرل خصوصیت ہے وہ یہ کہ اِن مکانوں کے ناموں میں تکلف اور جھوٹ روا نہیں رکھا گیا۔ یعنی عوام نے اپنے مکانوں کے "شیش محل" "پریم بھون" "قصرِ احمر"، "آرام منزل" "عشرت کدہ" جیسے شاندار نام نہیں رکھے۔ بلکہ اُن کے مکانوں کے نام ہندسوں پر رکھے گئے ہیں۔ بلاک نمبر آٹھ کوارٹر نمبر پندرہ ——— چوبیس نمبر، اٹھائیس نمبر، پچاس نمبر ——— ان سیدھے سادے، غیر پیچیدہ ناموں سے عوام کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ عوام کو اب اپنے نام رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ یعنی اگر کسی کا نام گھنشیام لال ہے تو اُسے گھنشیام لال کے نام سے نہیں پکارا جاتا۔ بلکہ یہ کہا جاتا ہے "اٹھارہ نمبر والا آیا تھا کہتا تھا، بائیس نمبر والے کی بیوی اُس کے تکیے کا غلاف چرا کر لے گئی ہے۔ ہم نے چھبیس نمبر والے سے اُس کی شکایت کی تو آٹھ نمبر والا باہر نکل آیا اور اُس کی بے جا حمایت کرنے لگا۔

یعنی عوام کا کوئی نام نہیں رہا۔ مکانوں کا نام ہی باقی رہ گیا ہے۔ عوام اب اپنے مکان کے نام ہی سے پہچانے اور پکارے جاتے ہیں۔ عوام اب انسان نہیں رہے، مکان ہو گئے ہیں۔ عوام اور مکان میں بھید بھاؤ مٹ گیا ہے۔ اور "تو من شدی، من تو شدم" کے مصداق ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے آتما، پرماتما میں مل جاتی ہے اور یہ عوام کے کلچر کی وہ بلند ترین منزل ہے۔ جہاں سے خدا مرد ایک آدھ ہاتھ آگے رہتا ہے۔

سلم ایریا کی جھونپڑیاں ——— •

دہلی میں سلم ایریا کی جھونپڑیاں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ اِن کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ یہ خودرو پودوں کی طرح اُگتی ہیں اور خود بخود مُرجھا جاتی ہیں۔ یہ عام طور پر گندے نالوں، نشیبی علاقوں اور جھاڑ جھنکاڑ کے آس پاس بنائی جاتی ہیں۔ بظاہر یہ دہلی کے بدنما داغ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اِس داغ کے بغیر دہلی کا ماتھا مکمل نہیں ہوتا۔ اس لئے دہلی کے ماتھے کو صاف کرنے کے لئے ایک جھونپڑی گرائی جاتی ہے تو دو نئی جھونپڑیاں جنم لے لیتی ہیں۔ دہلی کے مہذب حکام کا خیال ہے کہ جب تک اِن جھونپڑیوں میں رہنے والوں کو ختم نہیں کیا جائیگا، یہ جھونپڑیاں ختم نہیں ہو سکتیں۔ لیکن جھونپڑیوں والے چونکہ سماج کی تہذیب کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اِس لئے وہ ختم نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ تہذیب کی کوکھ کو بانجھ کرنا کسی کے بس کا نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ تہذیب کے نمائندے اِن جھونپڑیوں کو ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں۔ انہیں پانی، بجلی اور نالیاں مہیا کرتے ہیں۔ انہیں ووٹروں کی فہرست میں شامل کر لیتے ہیں۔ ان کے ہاں سکول تک کھول دیتے ہیں۔ کبھی ان کے حق میں اور کبھی ان کے خلاف آواز اُٹھاتے رہتے ہیں تاکہ یہ خلفشار قائم رہے، زندہ رہے۔ کیونکہ جمہوریت کو زندہ رکھنے کا یہی تقاضا ہے کہ کوٹھیاں اور جھونپڑیاں دونوں ساتھ ساتھ جیتی رہیں۔ اپنا اپنا اسٹیٹس قائم رکھیں۔ ایک دوسرے کی طرف نگاہ بد سے نہ دیکھیں۔

دہلی کے ایک بہت بڑے نیتا نے ایک بار اِنہی جھونپڑیوں کو دیکھ کر کہا تھا "میں جب اِن جھونپڑیوں کی طرف دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں" چنانچہ اُنہیں ایک رومال پیش کر دیا گیا۔ جس سے اُنھوں نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔

قابلِ مطالعہ معیاری کتب

سیرت خاتم الانبیاء	مولانا محمد شفیع صاحب	ایک روپیہ پچیس پیسے
سوشلزم	پرنسپل حبیب داس	ایک روپیہ پچاس پیسے
وعلیکم جاودان	کشور زیدی	دو روپے
اردو	جگن ناتھ آزاد	پچاس پیسے
تعلیم دینے کا فن	ڈاکٹر منوہر سہائے انور	تین روپیہ پچاس پیسے
ذوق جنوں	آل احمد سرور	تین روپے پچاس پیسے
رشیدہ کی کشیدہ کاری		تین روپے پچاس پیسے
شبنم کشیدہ کاری		ایک روپیہ
شمع کشیدہ کاری		چار روپے پچاس پیسے
قدسیہ کشیدہ کاری		ایک روپیہ
دلہن کشیدہ کاری		دو روپیہ پچاس پیسے
بیگم کشیدہ کاری		ایک روپیہ پچاس پیسے
گلشن کشیدہ کاری	زینب انور	دو روپیہ

سموم و صبا	جوش ملیح آبادی	آٹھ روپے
شکوہ جواب شکوہ	ڈاکٹر اقبال	پچیس پیسے
بال جبریل	"	تین روپے پچاس پیسے
ابھینندن گرنتھ	جوش ملسیانی	دس روپے
نقش فریادی	فیض	دو روپے پچیس پیسے
آہنگ حجاز	عرش ملسیانی	ایک روپیہ
ہفت رنگ	عرش ملسیانی	تین روپے
قول و قرار	عبد الحمید عدم	دو روپیہ پچاس پیسے
رنگ و آہنگ	"	ایک روپیہ
آہنگ	مجاز	تین روپے
شکنتلا	ساغر نظامی	بارہ روپے
گلستان ہزار رنگ	سید بہاء الدین	دس روپے
سنگم	زلیش کمار شاد	تین روپے

سرفروش اور لوازم	نریش کمار شاد	دو روپے پچاس پیسے
پھوار	"	دو روپے پچاس پیسے
دستک	"	دو روپے پچیس پیسے
ڈارلنگ	"	دو روپے پچاس پیسے
آتش گل	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
صنم و حرم	شکیل بدایونی	ایک روپیہ
رعنائیاں	"	تین روپے پچاس پیسے
گفتنی	مخمور سعیدی	دو روپے
گل رعنا	برج لال رعنا بجگی	تین روپے پچاس پیسے
دل نادان	کرشن موہن ایم اے	چھ روپے
شبنم شبنم	"	پانچ روپے
تماشائی	"	ایک روپیہ
گرد راہ	ضیا فتح آبادی ایم اے	تین روپے پچاس پیسے
ساز و نغمہ	بسمل کپور تھلوی	تین روپے
آہنگ حیات	پروفیسر عشرت الرحمان خان عشرت	ایک روپیہ ... پیسے

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی

افسانہ

آبرو

ش مظفرپوری

باتھا اصلی۔ براستہ رائے پور۔ مظفرپور (بہار)

یکم مارچ ۱۹۶۵ء

محترم خوشتر بھائی! سلام رحمت

میں نے دہلی سے رخصت ہوتے ہوتے وعدہ کیا تھا کہ گاؤں سے ایک کہانی ارسالِ خدمت کروں گا۔ لیجئے میری ایک نمائندہ کہانی "آبرو" حاضر ہے۔ اِس کہانی کے متعلق مجھے بڑی خوش فہمی ہے۔ اِس کا چونکا دینے والا کلائمکس بے حد خیال انگیز اور غیر معمولی ہے۔ ایسے کلائمکس پر کہانی لکھنے کا یہ میرا تیسرا تجربہ ہے۔ اپنی رائے سے نوازیں تو حقیقت معلوم ہو ——— کہانی اگر پسند آجائے تو اسے بھی آئندہ شمارے میں شریک کر لیجئے۔ فکریہ۔ میں رو بصحت ہوں۔ اللہ کا فضل اور آپ کی دعائیں ہیں لیکن شاید اواخر اپریل تک علاج جاری رہے گا۔ اُس کے بعد دہلی کا قصد کروں گا...

آپ کا ——— ش مظفرپوری

پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو کے بعد میں گھر جانے کے لئے سامان باندھ رہا تھا۔ ہوٹل کے ایک بیرے نے مجھے خبر دی کہ میرے نام کا فون ہے۔ مجھے کچھ حیرت سی ہوئی۔ کیونکہ شہر میں میری جان پہچان کا کوئی نہ تھا۔ یوں بھی میں پہلی بار اُس شہر میں گیا تھا اِس لئے اجنبی ہی تھا۔ ایک منٹ میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر گیا۔ لیکن کوئی بات ذہن میں جمی نہیں۔ ایک شک یہ گزرا کہ شاید میرے کسی ہم نام نے ہوٹل میں قیام کر رکھا ہو۔

میں نے بیرے سے پوچھا "ٹھیک ٹھیک پوچھ لیا ہے؟ میرا ہی فون ہے نا؟ میرا تو یہاں کوئی جاننے والا نہیں"۔

"منیجر صاحب نے آپ ہی کا نام اور کمرہ بتایا ہے۔ کمرہ نمبر گیارہ عظمت حسین۔ یہی ہے نا آپ کا نام؟"

"نام تو یہی ہے۔ کہیں میرے نام کا کوئی اور آدمی تو یہاں ٹھہرا ہوا نہیں ہے؟"

"مجھے کیا معلوم ہے صاب۔ منیجر نے آپ کو بلانے کو کہا ہے"۔

"اچھا چلتا ہوں" کہہ کر میں بیرے کے ساتھ چل پڑا۔

فون واقعی میرے ہی نام تھا۔

اِنٹرویو بورڈ کے ایک سینئر رکن مُراد علی خاں نے مجھے یاد کیا تھا۔ مراد علی خاں بہت وجیہہ اور متاثر کرنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ انٹرویو کے دوران میں وہ مجھے سر سے پاؤں تک بہت غور سے دیکھتے رہے۔ میں محسوس کرتا رہا کہ اِنھیں مجھ سے کچھ غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ سوالات اُنھوں نے مجھ سے ایسے بھی کئے جن کا انٹرویو سے کوئی خاص تعلق نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اُن باتوں سے میرے اقتصادی اور خاندانی پس منظر پر روشنی پڑتی تھی۔ لیکن یہ سوالات اُنھوں نے کچھ ایسی ہوشیاری سے کئے تھے کہ بظاہر بے جوڑ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اُنھیں سوالات میں گنجائش پیدا کر کے اُنھوں نے اِس ہوٹل کا نام بھی پوچھ لیا تھا۔

فون پر اُنھوں نے بہت مختصر گفتگو کی۔ صرف یہ بتایا کہ وہ مجھ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتے تھے۔ اور اُس کے لئے اُنھوں نے مجھے شام کی چائے اور رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ یہ غیر متوقع التفات مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا لیکن ذرا سی ہچکچاہٹ کے ساتھ میں نے دعوت منظور کر لی۔ کچھ یہ بات بھی ذہن کے کسی گوشے میں تھی کہ پبلک سروس کمیشن میں ان کی شخصیت خاص اہمیت رکھتی تھی۔ معلوم نہیں میری کون سی ادا اُنھیں پسند آگئی تھی۔ ویسے میں اپنی ذہانت، صورت اور قد و قامت کے اعتبار سے اپنے اندر پہلی نظر والی اپیل رکھتا تھا۔ کالج سے لے کر یونیورسٹی تک میں نے کتنی ہی

ہت کو متاثر کیا تھا۔ اپنی خدا داد دلکشی کی وجہ سے دوستوں اور شناساؤں میں بھی
لوپ تھا۔ میرے ان اوصاف پر جس خوبی نے چار چاند لگا رکھے تھے وہ میری پارسائی
وہ میری پارسائی کا سب سے مشہور ثبوت یہ تھا کہ ایک غیر معمولی لڑکی نے مجھ سے
س ہو کر خودکشی کر لی تھی۔ بات خودستائی کی ہے لیکن حقیقت ہے۔ کوئی مانے
مانے۔

لیکن مراد علی خاں صاحب کو میری ذاتی خوبیوں یا خرابیوں سے کیا دلچسپی
تھی؟ سارا دن اسی ادھیڑبن میں شام کا انتظار کرتا رہا۔ رہ رہ کے گھڑی پر
جاتی تھی۔

شام ہوئی اور میں مراد علی خاں صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ خاں صاحب
رہائش میں کم و فر تو بہت تھا لیکن اُن کا بنگلہ اتنا پُرسکون تھا کہ سُونا سُونا معلوم
تا تھا۔ دو تین شائستہ نوکر تھے۔ اُن کی ادھیڑ لیکن خوبصورت اور تندرست بیگم
میں اور وہ خود تھے۔ معلوم ہوا کہ لاولد تھے۔ اُس وقت میرے دل کے ایک دُور
از گوشے میں ایک شک اُبھرا کہ کہیں وہ مجھے بیٹا نہ بنانا چاہتے ہوں۔ اُنھوں نے
یا کہ ایک لڑکی کو اُنھوں نے متبنیٰ کیا بھی تو وہ اپنی ماں کے پاس واپس چلی گئی۔
ن کا ساتھ اُسے راس نہیں آیا۔ اِس بات پر میرا شک اور بھی بڑھ گیا۔

لیکن خاں صاحب یا اُن کی بیگم نے اشارتاً بھی ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں
، بلکہ وہ میرے گھر، خاندان، مشاغل وغیرہ کے بارے میں بہت تفصیل سے باتیں کرتے
ہے۔ میں نے بیچ بیچ میں کئی بار جاننا چاہا کہ وہ ضروری بات کیا تھی جس کے لئے اُنھوں نے
مجھے بلایا تھا لیکن وہ ہر بار ٹال گئے۔ رات کا کھانا دسترخوان پر آتے آتے اُن میاں بیوی
نے مجھ سے اتنا بے تکلف کر لیا تھا کہ باتوں باتوں میں اُس لڑکی کا بھی ذکر آگیا جس نے میرے
ہم میں خودکشی کر لی تھی۔

بیگم صاحبہ کا جی جیسے دھک سے رہ گیا اور وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔
اِس پر تمھیں فخر نہیں کرنا چاہئے۔ میرا دل کہتا ہے کبھی نہ کبھی وقت تم سے ضرور انتقام لے گا۔
خودکشی نہیں تھی، قتل تھا۔ خدا نہ کرے کسی پہ کچھ ایسی بن آئے کہ اُسے خودکشی کرنی پڑے۔"

میں بیگم صاحبہ کی اِس وارننگ پر سہم گیا اور اپنی صفائی پیش کی: "آپ غلط
سمجھیں۔ وہ محبت یک طرفہ تھی۔ لڑکی تو اچھی تھی ہی۔ ہو سکتا تھا کہ میں بھی اُسے شادی
کے لئے پسند کر لیتا۔ لیکن اُس لڑکی کے والدین نے پیغام بھیجنا اپنی عزت اور شان کے
خلاف سمجھا کیونکہ یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ وہ لڑکی مجھ پر فریفتہ تھی اور میں اُس سے دامن
بچاتا تھا۔ اگر مجھے ذرا بھی سُن گُن ملتی کہ وہ خودکشی ہی کرے گی تو میں اُسے بچانے کی کوشش
ضرور کرتا۔ مجھے بہت دُکھ ہوا لیکن میں بے قصور ہوں۔"

بیگم صاحبہ نے بحث کرنی چاہی تو خاں صاحب نے بات کاٹ کر کہا: "چھوڑو

اِس بیکار بحث کو۔ اُس لڑکی کے ساتھ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔" بیگم صاحبہ کی طرف دیکھ
لے رہی ہیں۔ میں بھی مانتا ہوں کہ اُس نوجوان کو اپنے کئے کا احساس تو ہونا ہی چاہئے کہ جس
نے اتنی ذہین اور حسین لڑکی نے خودکشی کر لی۔ مگر اتفاق سے عظمت میاں ہی اُس لڑکی کی
خودکشی کا سبب ضرور ہیں مگر ذمہ دار نہیں۔"

مجھے اب یہ ماحول بہت پُراسرار محسوس ہونے لگا۔ میرا دھیان کھانے کی طرف
نہیں بلکہ خاں صاحب اور بیگم صاحبہ کے چہرے کی کیفیات کی طرف تھا۔ دونوں میاں بیوی
ایک دوسرے کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا دیتے تھے۔ میں بہت اُلجھن محسوس کرنے لگا
اور چاہتا تھا کہ کسی طرح کھانا ختم کر کے بھاگ نکلوں۔

کھانے کے بعد دیر تک مجھے خاموش دیکھ کر خاں صاحب نے بات چھیڑی:
"عظمت میاں! دراصل بات وات کچھ بھی نہیں۔ میں نے تمھیں یوں ہی بلایا تھا۔ کل
انٹرویو لیتے وقت میں نے تمھاری طرف ایک کشش محسوس کی۔ تمھاری صورت، تمھاری صحت،
تمھاری ذہانت اور تمھارا اندازِ گفتگو، اُن سب نے مجھے بہت متاثر کیا۔ تم سے کیا چھپاؤں۔
میرے دل میں ہمیشہ تمھارے ہی جیسے بیٹے کی آرزو پلتی رہی۔ لیکن قسمت کو کوئی کیا کہے۔
میں اپنی اُس خواہش کو دبا نہ سکا کہ کچھ دیر تمھارے ساتھ گھُل مل کر یہ حسرت پوری کرلوں۔"

میں تو خیر بہت نرم دل ہوں۔ کوئی سنگ دل بھی ہوتا تو خاں صاحب کی اِس
بات پر آبدیدہ ہو جاتا۔ ہم تینوں کئی منٹ تک خاموش بیٹھے باری باری ایک دوسرے کو
دیکھتے رہے۔ اُس وقت مجھے کیا بولنا چاہئے تھا، یہ میری سمجھ میں نہ آسکا اور نہ اُن سے
اجازت لینے کی ہمّت پڑی۔

پھر خاں صاحب ہی نے بات شروع کی: "ایک ہفتے کے بعد ہم ڈیڑھ ماہ کی
چھٹّی پر جا رہے ہیں۔ شام گڑھ تو تم جانتے ہی ہوگے۔ تمھارے راج نگر سے اسّی نوّے میل
ہوگا۔ وہاں بیگم صاحبہ کا میکہ ہے۔ شریف اور سنجیدہ آدمیوں کے لئے چھٹّیاں گزارنے
کی اچھی جگہ ہے۔"

اب میں خاں صاحب کی باتیں دلچسپی اور ہمدردی کے ساتھ سُن رہا تھا۔
بجھے ہوئے سگار کو پھر سلگا کر وہ کہنے لگے: "شام گڑھ کوئی شہر یا صحت گاہ نہیں ہے۔
ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کے اِرد گرد میلوں میں چھوٹے چھوٹے جنگل اور چھوٹی چھوٹی
پہاڑیاں ہیں۔ علاقہ غیر آباد نہیں ہے۔ دو دو تین تین میل پر چھوٹی بڑی انسانی بستیاں
بھی ہیں۔ جہاں تہاں جھیل اور جھرنے بھی ہیں۔ شام گڑھ کے قریب سے ایک گہری
ندی بھی گزرتی ہے جس میں مچھلی کا شکار بھی کیا جا سکتا ہے۔ پرندے اور شکار کے
چھوٹے موٹے جنگلی جانور بھی جہاں تہاں پائے جاتے ہیں۔ کھیتیاں بھی ہیں۔ بیگم صاحبہ کے
میکہ کی حویلی کے اِرد گرد دُور دُور تک باغات بھی ہیں۔ مجھے تو وہاں بہت سکون ملتا ہے۔
زندگی کا سارا غُبار دھُل جاتا ہے۔ شام گڑھ ایک چھوٹی سی جاگیر تھی۔ جاگیر تو ختم ہو گئی۔ باقی رہی

پھر بھی اللہ کی مہربانی سے کچھ کمی نہیں ہے۔ خاندان سمٹ سمٹا کر مختصر ہو گیا ہے۔ ایک بھتیجا سرفراز خاں، ایک بھتیجی ملو بیگم اور بیوہ بھابی۔ دو چار نوکر چاکر۔ سرفراز خاں دل کا بادشاہ ہے۔ مست اور موجی۔ رائفل کا یار ہے۔ ملو بیگم علی گڑھ میں پڑھتی تھی۔ لیکن باؤلے بھائی نے پڑھنا چھڑوا کر گھر بٹھا دیا ہے۔ بیوہ فریدہ خانم ہیں تو وہ رات دن اپنا رحل مصلّٰی سنبھالے رہتی ہیں۔"

خان صاحب کی اس غیر ضروری تفصیل میں مجھے بے لطفی نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ میں شام گڑھ کی فضا اور حویلی کے تصور میں کھو سا گیا۔ خان صاحب نے پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی تھی لیکن کیوں؟ —— یہ انھوں نے بعد میں ظاہر کیا۔

"…. اگر وہاں کے ماحول میں چند دنوں کے لئے تم آسکو تو وہ تمھاری زندگی کے یادگار لمحے ہوں گے۔ ہماری دلچسپیاں بھی بڑھ جائیں گی۔"

خان صاحب کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اور کچھ اپنے اشتیاق کی وجہ سے بھی میں نے نیم رضامندی کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے مجھے شام گڑھ پہنچنے کا راستہ بھی سمجھا دیا اور تاکید سے کہا کہ اگر میں شام گڑھ کا قصد کروں تو انھیں خط ضرور لکھ دوں۔

اس کے بعد خان صاحب سے اجازت لے کر میں چلا آیا۔ سارے راستے ہی نہیں، ساری رات طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔ میں نے کتنے ہی مفروضات دل میں قائم کئے۔ یہ نہیں تو وہ۔ وہ نہیں تو یہ۔ لیکن کوئی بات قطعی نہیں معلوم ہوئی۔ میں صرف اس نتیجے پر پہنچ سکا کہ ان ساری باتوں کے پس منظر میں کوئی خاص بات ضرور ہے۔

خان صاحب کی باتوں اور یادوں نے گھر تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ لیکن میں نے اس سرگزشت کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ اس طرح پھر اُس لڑکی کا ذکر چھڑ جاتا جس کی خودکشی کا الزام مجھ پر عائد ہو چکا تھا اور دوست احباب مجھ پر سیکڑوں لعنتیں بھیج چکے تھے۔ وہ لڑکی ہی کچھ ایسی تھی۔ لیکن میں بقول احباب ایسا بدنصیب نکلا کہ اُس کے خون کا دھبہ دامن پر لگا بیٹھا۔ ناکردہ گناہ ہونے کے باوجود!

میری طبیعت بچپن ہی سے کچھ مہم پسند واقع ہوئی تھی۔ میں نے شام گڑھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن نہ جانے کیا سوچ کر میں نے خان صاحب کو اطلاعی خط نہیں لکھا۔ شاید میرے دل میں یہ آیا تھا کہ اچانک شام گڑھ پہنچ جانے سے ہو سکتا ہے کسی ایسی بات کا سراغ لگ سکے جو خان صاحب مجھ سے چھپانا چاہتے ہوں۔ کیونکہ دل میں ایک بے چین کر دینے والی کرید موجود تھی۔

صبح کی ٹرین سے چلا تو سہ پہر میں حضرت پور کے اسٹیشن پر پہنچا۔ وہاں سے پندرہ میل تک بس کا سفر تھا۔ پھر اس کے بعد تین میل تک پیدل چلنا۔ یا اگر پہلے سے انتظام کر رکھا ہو تو کسی سواری سے۔ لیکن میں بغیر اطلاع پہنچا تھا اس لئے پیدل ہی چلنا پڑا۔

سوٹ کیس اور بستر لے جانے کے لئے بمشکل ایک آدمی ملا۔

خان صاحب نے شام گڑھ اور اس کے گرد و نواح کی جو تصویر کھینچی تھی وہ غلط نہیں تھی۔ بلکہ اصلیت کچھ سوا تھی۔ میں بہت دلچسپی سے ایک سیاح کی طرح سب کچھ دیکھتا گیا۔ منزل جوں جوں قریب آتی گئی دل کی دھڑکن تیز ہوتی گئی۔

جس وقت گھنے باغوں کے درمیان سے حویلی کی جھلک ملی، ڈوبتے ہوئے آفتاب کا شعلہ بجھ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی تاریکی اور لطیف خنکی کا احساس ہونے لگا تھا اور جب میں بلند و بالا اور پرشکوہ حویلی کے صدر دروازے پر پہنچا تو ہر طرف سناٹا تھا۔ ذرا دیر کو میں ٹھٹکا تو فصیل کے بیرونی نکڑ سے ایک خوبصورت لمبا تڑنگا جوان کاندھے سے رائفل لٹکائے میری طرف لپکا اور قریب آتے ہوئے بولا "آپ کون ہیں؟"

اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دوں وہ خود ہی کہنے لگا "آپ عظمت حسین معلوم ہوتے ہیں۔ خوش آمدید، خوش آمدید! آپ کا تو یہاں کب سے انتظار ہو رہا تھا۔ لیکن میرے یار، اچانک ہی ٹپک پڑے! اچھے چلے۔ اندر تشریف لے چلئے۔"

اس طرح مست اور متوالے سرفراز خاں نے میرا استقبال کیا۔ مُراد علی خاں بھی بہت گرمجوشی سے ملے۔ اُن کی بیگم اور سرفراز کی والدہ فریدہ خانم نے تو جیسے میرے لئے آنکھیں بچھا دیں۔ جیسے میں اُن سب کا کوئی قریبی عزیز تھا جو کسی دور دراز مقام پر بھولے بھٹکے اُن کے درمیان پہنچ گیا ہو۔ میں اپنی اجنبیت کے احساس کو زیادہ دیر تک باقی نہ رکھ سکا۔

کچھ دیر گزرنے کے بعد جب نوکر نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی تو سرفراز خاں نے اُسے ڈانٹ دیا "سر شام ہی کھا کے پڑ جائیں" پھر کمال بے تکلفی سے مجھ سے پوچھا۔ "شراب پیو گے؟"

پہلی ملاقات، سب کی موجودگی اور فریدہ خانم کی تسبیح و مصلّٰی والی بات کا خیال۔ مجھے سرفراز خاں کی یہ بے تکلفی کچھ بھائی نہیں۔ البتہ یہ اندازہ ضرور ہوا کہ اُس کے لئے چائے اور شراب ایک جیسی چیزیں تھیں۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔

"ابھی تک تو اللہ نے بچائے رکھا ہے" میں نے عذر پیش کیا۔

میری اس بات پر وہ ذرا تیکھا ہو کر کہنے لگا "پھر کب پیو گے۔ بڑھاپے میں؟ اللہ میاں کو بیچ میں کیوں لے آئے! —— یہ شراب کا ذکر تھا، نماز کا نہیں۔" پھر رُک کر بولا "سمجھ گیا تم صرف امّی جان سے ملنے آئے ہو۔ مجھ سے نہیں۔"

مراد علی خاں صاحب کو بولنا پڑا "بُرا ماننے کی بات نہیں بیٹا! اپنا اپنا خیال اور اپنی اپنی طبیعت ہے۔ چلو، میں تمھارے ساتھ پیتا ہوں۔"

"ہاں چلئے" یہ کہہ کر سرفراز خاں اُٹھ کھڑا ہوا۔

[illegible] ڈرتی تھا وہ۔ شاید خانم نے مہمانوں [illegible]
کے طور پر کہا: "پیارا نانا بیٹا! ذرا باز آؤ ہو اور جب سے ایک واقعہ اس کے ساتھ پیش آیا ہے
سے کچھ چڑچڑا بھی ہوگیا ہے۔ ویسے بڑا دلیر اور بہادر ہے۔"

میرے ہونٹوں پر صلح صفائی والی مسکراہٹ آتے ہی مطلع صاف ہوگیا۔ پھر ادھر ادھر کی گپ شپ چل پڑی۔ حویلی کے کسی الگ تھلگ گوشے میں سرفراز خاں اور مراد خاں شغل کرنے چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ مراد خاں کو شراب کا شوق نہیں تھا لیکن کبھی اندھیرے اُجالے موقع پاکر چکھ لیا کرتے تھے اور سرفراز خاں کے ساتھ تو آج پہلی بار محض اس کا دل رکھنے کے لئے بیٹھ گئے تھے۔

سفر کی تھکان کی وجہ سے مجھے فوراً نیند آجانی چاہئے تھی لیکن میں آدھی رات تک کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک سوال تو انٹرویو والی رات سے میرے ذہن کو پریشان کر رہا تھا لیکن آج دو سوال اور بھی ذہن میں کلبلانے لگے۔ سرفراز خاں نے ساتھ کون سا [illegible] کیا تھا؟ اور وہ ماہ پیکر کہاں تھی؟ اس کی جھلک تو الگ رہی اس کا ذکر تک نہیں آیا۔

صبح کو کافی دیر سے میری آنکھ کھلی۔ مجھے جو کمرہ دیا گیا تھا اس میں آسائش و آرام کا ہر سامان موجود تھا۔ کچھ آثار ایسے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجھ سے پہلے [illegible]!... معاً مجھے ماہ پیکر کا خیال آیا۔ ہاں، یقیناً وہی... میرا ذہن ابھی پوری بات [illegible] بھی نہیں پایا تھا کہ باہر چوکھٹ اور پردے کے درمیانی خلا سے دو پاؤں نظر آئے۔ [illegible] کام اور سیاہ مخمل کے سلیم شاہی جوتوں میں دو گورے گورے پاؤں اور گلابی [illegible] دار پاجامے میں کسی ہوئی گداز پنڈلیاں۔ میں نے دل کی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کی۔ یقیناً کوئی جوان عورت پردے کے پاس اندر کا رُخ کئے کھڑی تھی۔ ایک [illegible] کھانسی سے میں نے اپنے بیدار ہونے کا اظہار کیا۔

دوسرے ہی لمحہ ——— ہاتھوں میں چائے کی چھوٹی ٹرے سنبھالے، سبز ریشمی قمیص پر پیازی دوپٹہ ڈالے ——— ایک دہکتی ہوئی سرخ سرخ سی پٹھان لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی۔ بھیگے بھیگے کھلے ہوئے بال۔ شفاف کشادہ آنکھیں۔ صبح [illegible] نکھارا ہوا بے داغ حُسن۔ تازہ اور شاداب۔ خون چھلکاتے بند ہونٹوں میں [illegible] کی مانند مچلتی کرتی مسکراہٹ۔ جیسے میرے سامنے عورت کے روپ میں تراشا ہوا ہیرا۔ اُسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ واقعی خدا کتنا بڑا مصور اور کتنا بڑا بت تراش ہے!

مُردے کو زندہ کرنے والے اس جادو کو دیکھ کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک [illegible] دل میں پیدا ہوا ——— انتقام! ——— مراد خاں اور اُن کی بیگم کا انتقام۔ [illegible] کرنے والی لڑکی کے خون کا بدلہ! ——— پوری سازش میری سمجھ میں آگئی۔ لیکن [illegible] وہ ایک ہی قاتل لمحہ فیصلہ کن تھا اور میری حالت اُس بے بس مسافر جیسی تھی جس

[illegible] سامنے آگیا [illegible] اس کا راستہ بند [illegible]

اُس مجسم قیامت نے چائے کی ٹرے میرے سامنے رکھتے ہوئے میری طرف [illegible] دل لبھانے والے لہجے میں کہا: "میرا نام ماہ پیکر ہے۔ آپ نے سنا ہوگا۔ کیا فضول سا نام ہے مگر میں اس سے بھی زیادہ فضول ہوں۔" اور ایک نظر مجھ پر ڈال کر بولی "آداب [illegible]" اور پھر چائے انڈیلتے ہوئے اپنے آپ کہتی رہی: "کل میں بیمار تھی۔ کمرے سے [illegible] آج اس کی تلافی کرنے آئی ہوں۔ کب سے آپ کے آنے کا شوق رہا تھا۔ [illegible] پھوپھا صاحب نے تو تعریفوں کے پل باندھ رکھے تھے۔" چائے میں [illegible] ڈالتے ہوئے اس کا ہاتھ رُکا اور بہت معنی خیز لہجے میں بولی: "خدا جانے سچ کہ غلط!"

میں نے چائے کے لئے ہاتھ بڑھا کر کہا: "اگر آپ نے صحیح مانا تو یہ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہوگی!"

اُس نے مسکرا کر اپنی جھینپ کو چھپانے کی کوشش کی۔

میں چپ چاپ چائے پینے لگا۔ چائے کے فلیور اور ماہ پیکر کے بھیگے بالوں کی ملی جلی بھینی بھینی خوشبو سے کمرہ مہک اٹھا تھا۔ پھر وہ کچھ کہے بغیر تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں چائے پیتا رہا اور بیگم مراد خاں کے الفاظ میری یادداشت میں گونجتے رہے۔ "کبھی نہ کبھی وقت ضرور انتقام لے گا۔"

اُس کے بعد بھی ماہ پیکر سے ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن تنہا نہیں۔ سب کے سامنے۔ اور اس کے بغیر مجھے اپنی زندگی کا تصور ایسا ہونے لگا تھا جیسے مصور نے تصویر کا محض خاکہ کھینچ کر چھوڑ دیا ہو۔ لیکن میں اپنے اندر اتنی اخلاقی جرأت نہیں پاتا تھا کہ مراد خاں اور اُن کی بیگم کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کرسکوں۔ اعتراف کا فائدہ بھی کیا تھا۔ وہ دونوں تو ماہ پیکر کے ذریعہ شاید انتقام لینے کا پلان بناتے ہوتے تھے۔

دس بارہ دن اُن لوگوں کی دلچسپ صحبتوں میں گزر گئے۔ میں جیسے اُس خاندان کا رکن بن گیا تھا۔ سرفراز خاں تو مجھ سے کھنچا کھنچا رہتا تھا کیونکہ میں اُس کا ہم ذوق نہیں تھا۔ لیکن مراد خاں صاحب کے ساتھ دُور دُور تک سیر سپاٹے کو نکل جایا کرتا۔ کبھی مچھلی کا شکار کرتے اور کبھی چڑیوں کا۔ میں نے تو زندگی میں بندوق کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ مراد خاں ہی چھوٹے موٹے جانوروں پر ہاتھ صاف کیا کرتے۔

ایک دن میری طبیعت مراد خاں سے بور ہوگئی۔ میری اور اُن کی عمر میں جو فرق تھا وہ رنگ لایا۔ طبیعت کچھ سرفراز کی طرف رجوع ہوئی۔ آخر تو وہ ماہ پیکر کا بھائی تھا اور میرا ہم عمر بھی۔ پڑھا لکھا تو مجھ سے بہت کم تھا لیکن اس کے اندر زندگی اور جوانی تھی۔ بس ایک عیب یہ تھا کہ شراب بہت پیتا تھا اور کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ کبھی کبھی دن کو بھی پی لیتا تھا۔

میرے دل میں سرفراز کو دوست بنانے کی خواہش پیدا ہوگئی اور ایک دن

دوپہر کو جب وہ نشہ میں سُرخ انگارا بنا ہاتھ میں رائفل لئے حویلی سے نکلا تو میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ جب اُسے حویلی سے کچھ زیادہ دُور جانا ہوتا تو بھری ہوئی رائفل لے کر نکلا کرتا۔ کافی دُور تک میں اُس کے پیچھے چلتا رہا۔ لیکن وہ بے خبر تھا۔ آخر جب وہ ایک ٹیلے کے پاس رُکا تو مجھے دیکھ کر حیرت سے چونک پڑا۔

"تم میرے پیچھے پیچھے کیسے آ گئے ؟"

"یُوں ہی۔ تمھاری کشش کھینچ لائی۔ تم تو پہلی ہی ملاقات سے کچھ ناراض ناراض سے نظر آتے ہو۔ حالانکہ میں اِتنا بُرا آدمی نہیں ہوں۔ ایک شراب ہی تو نہیں پیتا ہوں۔ بس یہی نا ؟"

وہ ایک چٹان پر بیٹھ کر میرا مُنہ دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا "کئی سال سے تنہا شراب پیتے پیتے تھک گیا ہوں۔ تمھیں دیکھ کر سوچا تھا کہ چلو چند دنوں کے لئے ایک ساتھی ملا۔ لیکن تم تو صُوفی نکلے۔"

میں نے اُس کا دل رکھنے کے لئے کہا: "اگر میرے شراب پینے میں تمھاری خوشی ہے تو میں پی لوں گا۔ لیکن تم میرے دوست تو بن جاؤ۔"

"بن جاؤ کیا، میں تو تمھارا دوست ہوں ہی۔"

یہ کہہ کر اُس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ پھر دل کھول کر باتیں ہونے لگیں۔ تب اُس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ سُنایا کہ کس طرح اِس علاقے کا ڈاکو سکندر ایک غریب کسان لڑکی کو اغوا کرکے لے جا رہا تھا۔

اور کس طرح اِس نے لڑکی کو بچایا۔ پھر وہ لڑکی اِس پر مرنے لگی اور وہ خود بھی اُس کیچڑ میں کھلے ہوئے کنول میں دلچسپی محسوس کرنے لگا۔ مگر ان دونوں کے درمیان بہت سی باتیں مانع تھیں۔ سکندر کی نظرِ بد سے بچانے کے لئے سرفراز نے اِس لڑکی کی شادی ایک جگہ طے کر دی۔ مگر ٹھیک شادی کی رات ۔ ۔ ۔ ۔ جب وہ دلہن بن کر رخصت ہو رہی تھی، سکندر نے اُسے پھر اغوا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن سکندر نے بھاگتے ہوئے انتقاماً اُس لڑکی کو گولی مار دی۔ سرفراز نے پہلی بار اُسی غم میں شراب پی تھی جسے چار سال گزر چکے تھے۔ لیکن سکندر اُسی وقت سے اُس کا دشمن بنا پھرتا تھا۔ ماہ پیکر علی گڑھ میں پڑھ رہی تھی۔ تو طرح طرح کا وسوسہ سرفراز کے دل میں گھر کئے رہتا اور وہ تھوڑے ہی تھوڑے دنوں پر اُسے دیکھنے جایا کرتا۔ اور ایک بار وہ بہن کو ساتھ ہی واپس لے آیا۔ لیکن کچھ دنوں سے یہاں بھی ایک خطرے کی آہٹ محسوس ہونے لگی تھی اِس لئے ماہ پیکر کی شادی جلد از جلد کر دینے کے لئے پریشان تھا۔ جس کے لئے اِس چھوٹے سے خاندان کو ایک شایانِ شان لڑکے کی فوری تلاش تھی۔ یہ کام سرفراز کے بس کا تو تھا نہیں اِس لئے مراد علی خاں اور اُن کی بیگم پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی۔

یہاں تک بتا کر وہ کچھ دیر کے لئے چُپ ہو گیا۔ پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مُسکرایا اور بولا: "شاید اب تمھاری سمجھ میں یہ بھی آ گیا ہو گا کہ تمھیں پُراسرار طور پر یہاں کیوں بُلایا ہے ؟"

ایک پل میں سارے پردے اُٹھ گئے اور میرے ذہن پر شکوک کی جو دھندلاہٹ تھی وہ ختم ہو گئی۔ میرے اندر ایک ایسا ہیجان پیدا ہوا کہ میں سرفراز کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بولا: "ہم سب تمھیں پسند کر چکے ہیں۔ ماہ پیکر بھی۔"

میرے تو دل کے کنول کِھل گئے اور آنکھوں میں ہزاروں بہاریں ناچ اُٹھیں۔ جی چاہا سرفراز خاں کا مُنہ چُوم لوں۔ قسمت نے دُنیا ہی میں مجھ پر بہشت کا دروازہ کھول دیا تھا۔ سرفراز خاں نے پھر بہت فکرمند لہجے میں کہا: "مجھے ایک ایسے خطرے کی آہٹ سی ہے کہ کل کی ہوتی بات کو چاہتا ہوں کہ آج ہو جائے۔ اگر تم ۔ ۔ ۔"

ابھی بات ادھوری ہی تھی کہ گولی کی آواز۔ سرفراز چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی بوکھلا گیا۔ آواز حویلی کی طرف سے آئی تھی۔ سرفراز کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "ارے ! یہ فائرنگ کی آواز کیسی ہے ؟" ——— ابھی اُس نے ذہن پر زور دیا ہی تھا کہ پھر دوسری آواز آئی اور ہم دونوں گرتے پڑتے حویلی کی طرف دوڑ پڑے۔

حویلی کا ایک نوکر ہماری طرف بھاگتا نظر آیا تو ہم نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ رائفل کے بوجھ سے سرفراز کو دوڑنے میں کافی دقّت محسوس ہو رہی تھی۔ جب ہم نوکر کے قریب پہنچ گئے تو وہ ہانپتے ہوئے جلدی جلدی کہنے لگا: "سرکار غضب ہو گیا! سکندر اپنے چند آدمیوں کے ساتھ چھوٹی بی بی کو باغ میں سے اُٹھا لے بھاگا ہے۔ چھوٹی بی بی کی چیخ سُن کر ہم سب دوڑ پڑے۔ بڑے صاحب اپنی رائفل کے ساتھ اُس کے تعاقب میں نکل پڑے ہیں۔ سکندر نے باغ کے رکھوالے کو گولی مار دی ہے۔"

ہم نوکر کی بتائی ہوئی سمت میں دوڑ پڑے۔ تھوڑی ہی دُور جانے پر پھر فائرنگ کی دو تین آوازیں آئیں۔ اور ہم آواز کی نشان دہی کی سمت میں بھاگے۔ ہم اِتنے قریب پہنچ چکے تھے کہ ایک بلند نسوانی چیخ سُنائی پڑی۔ یہ چیخ یقیناً ماہ پیکر کی تھی۔ اُس چیخ کی طرف ہم بے تحاشہ لپکے۔ جھاڑیوں، چٹانوں اور نشیب و فراز کو خاطر میں لائے بغیر۔

——— اور ہم نے سکندر کو جا لیا۔ ڈھائی تین سو گز کے فاصلے پر پہاڑی کی اوٹ سے پانچ چھ مسلح آدمی ماہ پیکر کو بے رحمی سے ہاتھوں سے گھسیٹ کر لئے جا رہے تھے۔ ماہ پیکر کا پیرہن تار تار تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے سخت مزاحمت کی ہو گی جبھی اُن بدمعاشوں نے اُس کے ہاتھ باندھ دئے تھے۔ سرفراز نے پُوری طاقت سے للکارتے ہوئے پوزیشن لی اور فائرنگ شروع کر دی۔ اُس کی پہلی ہی گولی سے ایک آدمی ڈھیر ہو گیا۔ سکندر کے اشارے پر دوسرا آدمی ماہ پیکر کو گھسیٹتا ہوا

فائر ہونے لگا تو سرفراز نے اُسے بھی داغ دیا۔ اُدھر پکے نے بھاگنے کی کوشش کی تو میرے کورین نے اُسے بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا اور اُسی کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔ اور اس کے بعد ہی جوابی فائرنگ ہونے لگی۔ سرفراز خاں تنہا تھا۔ اُس کے ساتھ کارتوس کی پیٹی بھی نہیں تھی۔ بس رائفل میں جو گولیاں تھیں انھیں پر دارو مدار تھا۔ لیکن بدمعاشوں کی طرف سے دو آدمی ایک ساتھ فائرنگ کر رہے تھے۔

میں دہشت زدہ ہو کر ایک چٹان کی اوٹ میں دبکا ہوا سارا ماجرا بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ مراد خاں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ زخمی ہو کر راستے ہی میں کہیں گر گئے تھے لیکن اس وقت تو مجھے یہ خیال بھی گزرا تھا کہ کہیں مارے ہی نہ جا چکے ہوں۔

کارتوس کی کمی کی وجہ سے سرفراز سنبھل سنبھل کے اور نشانہ جما کر فائرنگ کر رہا تھا۔ لیکن دوسری طرف سے تڑاتڑ گولیاں آ رہی تھیں۔ آخر ایک گولی سرفراز کے کاندھے کے نیچے ہنسلی کی ہڈی میں آ کر لگی اور وہ تڑپ کر نڈھال ہو گیا۔ گولی بھرپور اور گہری لگی تھی۔ میں کچھ نہ کر سکا۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ سرفراز کے رائفل کی گولیاں بھی شاید ختم ہو چکی تھیں۔ اُس کا ایک ہاتھ بے دم ہو چکا تھا۔ پھر بھی رائفل پر سے اُس کی گرفت چھوٹی نہیں تھی۔ ہاں ڈھیلی ہو گئی تھی۔ زخم سے خون بُری طرح اُبلنے لگا تھا درد لو

اذیت کی شدت سے اُس کے چہرے پر کھنچاؤ کی کیفیت طاری تھی۔ زندگی اور موت کی اس کشمکش میں بھی وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر ایک سکتہ طاری ہو گیا جس کے بعد سکندر نے سمجھا کہ مطلع صاف ہو چکا ہے۔

سکندر نشانہ باندھے کچھ دیر اور انتظار کرتا رہا پھر شاید اُسے یقین ہو گیا کہ دشمن ہلاک یا زخمی ہو چکا ہے۔ اس سکوت پر ماہ پیکر نے سمجھا کہ سرفراز مارا گیا۔ اور وہ سہارے کی تلاش میں بھاگی۔ کی دلدوز چیخیں سُنائی دینے لگیں۔ سکندر نے جب اپنا سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا تو وہ ایک کی طرف بڑھا۔ جس کی آڑ لے کر اُس کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔

سرفراز کراہتی ہوئی آواز میں بولا: "عظمت میاں! ابھی دشمن ہوش میں ہے گولی باقی ہے جو جرخان بختیار کے گھرانے کی آبرو بچا سکتی ہے تم ذرا میرے زخمی کاندھے کو سہارا دو۔"

میں نے جیسے تیسے اُسے سہارا دیا۔ نہ جانے کون سی طاقت سرفراز کا ساتھ دے رہی تھی۔ اُس نے اپنی ڈھیلی ہوتی ہوئی توانائی کو مجتمع کر کے نشانہ باندھا اور تھرتھراتے ہاتھوں سے گولی چلا دی۔۔۔۔ ایک جگر خراش چیخ کے ساتھ ماہ پیکر زمین پر تڑپنے لگی۔ سرفراز کا سر بے جان ہو کر ڈھلک گیا۔۔۔۔ برسوں کی بات ہے مگر میں آج بھی خود کو یقین دلانے کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ سرفراز نے نشانہ ماہ پیکر پر نہیں بلکہ سکندر پر کیا تھا!!

غزل

عرش صہبائی

جب شگفتہ تھی طبیعت، غم بھی تھے راحت فزا
دل ہے افسردہ تو اب نغمے بھی بارِ گوش ہیں

کیا کریں احبابِ خوش اطوار پر اب تبصرہ
کچھ شکستہ دل ہیں ہم کچھ فطرتاً خاموش ہیں

مسکرا کر ڈال دو تم اک نگاہِ پُر اثر
ہم بھی دیکھیں انجمن میں کتنے اہلِ ہوش ہیں

اس طرح لپٹے ہیں وہ جلوے نگاہِ شوق سے
جس طرح شام و سحر آپس میں ہم آغوش ہیں

کہہ رہے ہیں یورشِ آفات کو خوش آمدید
آج راہِ زندگی میں ہم کفن بردوش ہیں

حسرت و حیرت ہے جن کی بزم میں ہوں تشنہ کام
عرش جن کا فرق آ گئیں میکدہ بردوش ہیں

غزل

نسیم شاہجہان پوری

شہر شہر کے تجلّی دکھائی جاتی ہے
نگاہِ شوق کی ہمّت بڑھائی جاتی ہے

ستم کی مشق، کبھی امتحانِ دار و رسن
طرح طرح سے وفا آزمائی جاتی ہے

تمہاری یاد کو دل سے بھلا تو دوں لیکن!
کہیں یہ شمع جلا کر بجھائی جاتی ہے

کوئی ہزار نوازے مگر وہ بات کہاں
جو بات اُن کی توجہ میں پائی جاتی ہے

میں اُن کو دیکھ رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
کہ دل کی پیاس نظر سے بجھائی جاتی ہے

مجالِ دید، شعورِ ادب، حجابِ جمال
نظر کو پھر بھی تجلّی دکھائی جاتی ہے

افسانہ

خوشیوں کی بھیک

م۔ صبوحی

۸۵/۱۲/۲ نورتنگ۔ دروازہ۔ راجپور (میسور)

۲ فروری ۶۵ء — مدیر محترم! القدس و تکریم

... اپنی ایک کہانی "خوشیوں کی بھیک" بھیج رہی ہوں۔ پسند آجائے تو شریک اشاعت کر لیجئے۔ ممنون ہوں گی ...

م۔ صبوحی

ایک دن تم نے مجھ سے کہا تھا ـــــــ

"ہمیشہ مسکراتی آنکھیں جب رو پڑتی ہیں تو پھر رونے کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا۔ تب خوشیوں کی بھیک بہت مہنگی پڑتی ہے آذر!"

میں نے دھیرے سے مسکرا کر کہا تھا ـــــ "آذر خوشیوں کا شہنشاہ ہے، سائل نہیں۔ تم فکر نہ کرو۔"

وقت گزر گیا۔ بات ختم ہو گئی۔ سب کچھ اپنی اپنی جگہ تھم کر ٹھہر بن گیا۔ میں آہستہ سے آگے نکل گیا، بہت آگے، بے حد آگے! جو کچھ اپنے پاس تھا چھوڑ گیا۔ کوئی چیز اگر زادِ راہ بنی تو وہ میری چیخ ہے۔ میری ہی چیخ ہے افروز! ایک چیخ جو میری زندگی کے اس گنبد میں گونج رہی ہے۔ تم آئی تھیں۔ آکر لوٹ گئیں۔ کون جانے تمھیں کس چیز کی تلاش ہے۔ میرے پاس کیا کھو گیا ہے تمہارا؟ ـــــ میں نے تو سب کچھ لوٹا دیا تھا تمھیں۔ اپنی مسکراہٹیں، اپنی خوشیاں، اپنے قہقہے، اپنا سکون سب کچھ تو تمہارے حوالے کر دیا تھا پھر جانے کیا دیکھنا چاہتی تھیں تم مجھ میں! ـــــ کچھ بھی ہو میں آج اتنا ہی تم سے پوچھوں گا کہ ماضی کی بنجر زمین میں دبے پڑے لمحات کو نمی بخش کر تمھیں کیا ملا؟ ـــــ آج جب میں دفتر سے واپس آیا، میرے ساتھ گھریلو کام کرنے والے ایک چھوٹے سے لڑکے نے بتایا کہ نیلے رنگ کی بنارسی ساڑی میں لپٹی ہوئی کوئی عورت جس کے کھلے بالوں میں جوہی کی کلیاں چٹک رہی تھیں، مجھے پوچھتی رہی۔ تم نے اپنا نام بھی بتا دیا تھا۔ اگر نہ بھی بتاتیں تو میں جان جاتا کہ نیلگوں لہروں میں کھلا ہوا کنول تمہارے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ تم چلی گئیں۔ یہ جانے بغیر چلی گئیں کہ میری زندگی ایک ایسا کنارہ بن گئی ہے جس سے ہر خوشی کی موج ٹکراتی اور سر پٹکتی چلی جاتی، ہر مسرت لپکتی اور لوٹ جاتی۔

جانے مجھے کیا ہو گیا ہے!! ـــــ وہ قہقہے اب نہیں اُمنڈتے جو میری رگ رگ میں سرایت کر گئے تھے۔ وہ جھنکاریں نہیں چھلکتیں جن سے میری زندگی کا ہر لمحہ مہکا ہوا تھا۔ سچ ہے فوزی! تم نے سچ کہا تھا کہ خوشیوں کی بھیک بہت مہنگی پڑتی ہے۔

تم آج بھی ویسی ہی ہو جو آج سے چار برس پہلے تھیں تمہارے شفاف احساسات پر میں زمانے کی گرد کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم تو چاند کی کرن، شبنم کا آنسو، پھولوں کا تبسم، جوہی کی کلی ہو۔ اور میں ـــــ میں تم سے بہت دور جیسے دربلند حسرتوں کا مزار، کسی پہاڑی پر پھیلا ہوا ویران راستہ ہوں۔ آج جب کبھی میں اپنے اور تمہارے اس تصادم کو یاد کرتا ہوں تو ہنسی سی آجاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم تم بچے ہیں اور جانے ہاتھوں سے زندگی کی کوئی قیمتی شے گر کر ٹوٹ گئی ہو۔

مجھے یاد ہے تم نے اپنے قرب کی آگ سے مجھے نہیں جلایا تھا، میں نے ہی آگے بڑھ کر اپنی تمام تر گرمی تمھیں بخش دی تھی۔ تمہاری خمور آنکھوں میں اپنے خواب سجاتے تھے۔ اُن آنکھوں کے لرزتے آبگینوں میں اپنی پرچھائیاں پائی تھیں۔ تمہارے کپکپاتے لبوں سے پیار اور محبت کا رس پیا تھا۔ اُس دن جب پہلی بار میں تمہارے گھر پہنچا ـــــ تم آملیں۔

"دیکھئے نوید بھائی باہر گئے ہیں بہتر ہے آپ ..."

"لیکن آپ؟؟" میں نے بڑی جرأت سے تمہاری بات کاٹ دی اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی ا ـــــ جی میں ... میں افروز ہوں ... دیکھئے ... وہ ... وہ بات دراصل یہ ہے کہ چند ہی لمحے انتظار کے بعد ... بھائی آجائیں گے آپ

تک جلتے اور ... "

تم نے رُکتے جھجکتے ہوئے یہ کہا اور میں ڈرائنگ روم میں رکھے ہوئے ایک اسٹیچو کی مانند جم سا گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے تم مسکرا رہی تھیں۔ میرے ذہن کے ہر دریچے سے تم جھانک رہی تھیں۔ میرے دل و دماغ میں ایک عجیب سا شور تم نے برپا کر دیا تھا۔ شاید یہی وہ لمحہ تھا جب میں بچہ بن گیا تھا اور میری زندگی کی سب سے قیمتی شے میرے ہاتھوں سے گِر کر ٹوٹ گئی تھی۔ کہتے ہیں دولت مند ہاتھ ہر ٹوٹی ہوئی چیز کو جوڑ سکتے ہیں۔ دولت کی پالشں ہر داغ اور دھبّے کو دُور کر سکتی ہے لیکن، نہ جانے میں کیسا دولت مند تھا کہ آخر تک اُس ٹوٹی ہوئی چیز کو جوڑ نہ سکا۔

مجھے کس چیز کی کمی تھی افروز! ایک سیشن جج کا بیٹا، لکچرر کا بھائی۔ اور خود میں ڈاکٹری کا آخری سال جوائین کر رہا تھا۔ کتنی تلخ ہے یہ حقیقت کہ جب سے میں نے اِس دُنیا میں آنکھ کھولی، دولت کی جھنکار میرے لئے لوریاں بن گئی۔ ہر عیش و آرام میرے لئے مہیا تھا اور میں مسکراتی زندگی کی اُس سکون پرور نیند میں ڈوبا رہا۔ میں نے کبھی کسی سے کوئی شکست نہ کھائی تھی۔ دُکھ، رنج، غم، آنسو میں نے محسوس ہی نہیں کئے تھے۔ میری کوئی چاہ، کوئی تمنّا ایسی نہ تھی جس نے تکمیل کا رُوپ نہ دیکھا ہو۔ اگر اُن دنوں کوئی تشنگی تھی، کوئی کمی تھی تو صرف یہ کہ تم مجھ سے دُور تھیں اور میں تمھیں ہر لمحہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔

دن، ماہ و سال بیتے چلے گئے۔ مجھے یاد ہے وہ خوشیوں کا دن تھا، مسرتوں کے غنچے مہکنے کے لمحات تھے۔ ایسا ہی خوشگوار دن تھا، جسے لوگ عید کہتے ہیں۔ اُس روز تم نے مجھے بلایا تھا۔ میں چلا آیا۔ میں نے دیکھا تم ہمیشہ کی طرح نیلے لباس میں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ تمھاری طرف بڑھا دئے۔ تم نے اُن ہاتھوں کو تھام لیا تھا افروز! تم نے اُس مقدس وقت کو، اُس پاکیزہ لمحے کو گواہ بنایا تھا کہ زندگی کی منزل میں تم میری ہم سفر ہو۔

میں تمھیں پاکر شاداں و فرحاں رہا۔ تم میرے لئے ایسی تھیں جیسے پکاسو کے رنگ ٹیگور کا دل اور جگر کا ترنّم ہو ــــــ اُس دن میں بہت دیر تک کیرم کھیلتا رہا۔ ہر بار میری جیت ہوتی رہی۔ میرے قہقہے فضاؤں کو سرشار کرتے رہے۔ میں نے دیکھا تم فلسفیوں کی طرح خاموش تھیں۔ مجھے احساس تھا کہ تم میں سمندر کی گہرائی، پہاڑوں کا سکوت سمایا ہوا ہے۔ پھر بھی میں چاہتا تھا کہ تم ہنستی رہو۔ کھِلکھِلا کر ہنستی رہو۔ مجھے ہنسی سے پیار جو تھا! میں تمھارے قریب پہنچا۔ تم گھبرائی گھبرائی سی کہنے لگیں۔

"ہر لمحہ پھوٹتے نغمے اچھے نہیں لگتے آذر! کبھی کبھی انھیں خاموشی کی آغوش میں سُلا دیا کرو۔ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ... "

"ہُش ... آپ پگلی ہیں محترمہ! خموشی، سکوت، یہ سب کیا ہے۔ مجھے پسند نہیں۔ میں نے کبھی ٹوٹے ہوئے بربط، ڈھلتے ہوئے آنسو، ڈوبتا سورج، بجھتی ہوئی شمع نہیں دیکھی۔ میرے خیال میں اِنکا کوئی وجود ہی نہیں ہے افروز! میں نے جیسے تمھیں پا لیا۔ جس کی آرزو کی وہ میری سانسوں میں بس گیا۔ کون ہے کیا ہے جس کی میں تمنّا کروں اور مجھے نہ مل سکے۔ تم وہی ہو دوست ــــــ یہ دیکھو نا۔ تمھیں پا لینے کے بعد شعلہ کہاں رہنا!" میں نے تمھارے گال تھپتھپا دئے۔ تم کچھ کہنے لگیں۔

"دل میں درد، سر میں سودا نہ سلگتے۔ اور اگر تم نے دُنیا بھی حاصل کر لی تو کیا؟ رشک تو اُن انسانوں پر آتا ہے آذر! جن کی رگ رگ میں ایک ازلی و ابدی تشنگی، تلاش سُلگتی رہتی ہے۔ جس کی آگ میں جل جل کر وہ کندن بنتے ہیں ــــــ رہی میری بات ــــــ میں جانتی ہوں کہ اُس چیز کی انسان کے پاس کوئی قیمت نہیں ہوتی جو من و سلویٰ بن کر اُترے ــــــ"

"اوہ! میری فلسفی دوست! میرے لئے تو ہر چیز من و سلویٰ بن کر اُترتی ہے۔ بہتر ہے تم اِن باتوں پر اپنا سر نہ کھپاؤ۔ اتنا یقین رکھنا کہ چھ ماہ کے بعد جب تمھارا آذر اپنی ٹریننگ ختم کر کے ڈاکٹر بن جائے گا۔ اُس کا اپنا ایک بنگلہ ہوگا۔ ایک کار ہوگی اور جب وہ اپنی کار میں بیٹھ کر تمھارے گھر آئے گا تو بھلا کیا وہ تمھیں پا نہ سکے گا؟ تمھارے غریب ماں باپ بے حد خوش ہوں گے افروز! کہ تم خوش نصیب ہو۔ اور چُپ چاپ تمھیں میرے حوالے کر دیں گے۔ ہے نا! میں ناز کروں گا کہ میں مجنوں بنا نہ فرہاد! اور مجھے میری لیلیٰ مل گئی!" میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ تم خاموش سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ میں نے اپنی ہتھیلیوں میں تمھارے چہرے کو لے کر تمھیں جھنجھوڑ ڈالا۔ "افروز!" تمھارے بال ماتھے پر بکھر گئے۔ پلکوں سے کتنے آنسو ٹوٹ کر رخساروں پر بہہ نکلے۔ "افروز! یہ کیا!" پہلی بار مجھے ایک گہرے غم کا احساس ہوا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے تم یکسر بجھ کر رہ گئی ہو۔ بجھی ہوئی شمع!

"کچھ نہیں آذر! سوچ رہی تھی تم ... "

"یہی نا کہ چھ ماہ مجھ سے دُور کیسے رہ سکو گی! چلو چھوڑو یہ غم۔ دیکھتے دیکھتے یہ دن گزر جائیں گے۔ چلو کہیں گھوم آئیں" ــــــ دوسرے لمحے ہم پُر رونق بازاروں سے گزر رہے تھے۔

میں جلد ہی چلا گیا۔ چھ ماہ کے اُس طویل عرصہ میں میں نے تمھیں کتنے خطوط لکھے لیکن جواب نہ ملا۔ جانے کیوں تم چُپ رہیں۔

چھ ماہ بعد میں لوٹ آیا۔ دوسرے دن تمھارے گھر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ سب سے نفیس سوٹ زیب تن کیا۔ ہر طرح اپنے آپ کو جانچا، پرکھا، ٹائی کی گرہ درست کی۔ آئینہ پر ایک آخری نگاہ پھینکتے ہوئے پلٹا ہی تھا کہ اُچھل پڑا۔ تم سامنے کھڑی تھیں۔ نہیں، نہیں میں نے غلط کہا۔ تم نہیں، وہی بجھی ہوئی شمع میرے سامنے تھی! جو چپ چاپ تھی۔ میرا جی چاہا دوڑ کر تم سے لپٹ جاؤں تمھیں اپنی بانہوں میں جکڑ لوں اور کہہ دوں۔

"آذر! ایک شہنشاہ ہے میری ملکہ! اُس کی سلطنت میں صرف مسکراہٹوں کا راج ہے۔ یہ اُداسی کیسی ہے؟" ——— لیکن دوسرے ہی لمحہ ایک زہریلا نشتر تم نے میرے سینے میں اُتار دیا۔

"مسٹر آذر! یہ شادی کا دعوت نامہ ہے۔"

"افروز!" میں بے اختیار چیخ اُٹھا۔

"اوہ! ایک قہقہہ تو لگاؤ دوست! شادی کی خبر ہے۔ مبارک باد بھی نہ دوگے!"

"یہ سب تم کیا کہہ رہی ہو افروز! میں تو اب تمہارے۔۔۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے تم اب میرے گھر آنے والے تھے۔ اپنی خوبصورت کار میں بیٹھ کر تاکہ میرے غریب ماں باپ مجھے چپ چاپ تمہارے حوالے کر دیں۔ ہے نا! ——— تم بہت دیر تک منتظر رہے اور پھر کہنے لگے ——— "بیسٹ پاگل ہو گئی ہو۔ تمہارے بنگلے، تمہاری کار کو چھوڑ کر اپنی ہی حیثیت کے ایک انسان کو میں نے ڈھونڈ لیا۔ جو تمہاری طرح اُن کی غربت کا مذاق نہ اُڑائے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ غربت کا مذاق۔ اُڑائے۔ مذاق نہ اُڑائے۔ مذاق نہ اُڑائے ——— میں زیرِ لب اِن الفاظ کو دہراتا رہا۔

"اچھا میں جا رہی ہوں ——— بائی بائی!"

"افروز!" میں تڑپ کر چیخ پڑا۔ میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ میری سمجھ میں سب کچھ آگیا تھا۔ میں چاہتا تھا افروز لوٹ آئے میں اُسے سمجھا دوں۔ اُس سے ہاتھ جوڑ کر کہہ دوں ——— "میرے اِس گناہ کی اتنی سخت، اِتنی بڑی سزا نہ دو۔ تم لوٹ آؤ۔ لوٹ آؤ افروز! تمہارے بغیر میں کچھ بھی نہیں! ——— افروز! ——— افروز!" میں سسکتا رہا، چیختا رہا۔ میری چیخ دُور دُور تک جا کر لوٹ آئی لیکن تم لوٹ نہ سکیں۔ مجھے معاف نہ کر سکیں۔

وہ چیخ آج تک میری زندگی میں گونج رہی ہے افروز! میری رگ رگ میں سما گئی ہے۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ سچ کہا تھا تم نے۔ خوشیوں کی بھیک بہت مہنگی پڑتی ہے!!

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
[illegible]	خوش باش ایم اے	دو روپے
اندھیرے	اختر عادل روپ	دو روپے
آگ اور دھواں	م م راجندر ایم اے	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
ایک پیالہ ایک دھوکا	رام سرن شرما	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
بیگم صاحبہ	شوکت تھانوی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
[illegible]	″	دو روپے ۲۵ نئے پیسے
پگل	″	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
بے غیرت	مضطر ہاشمی	چار روپے ۲۵ ″
بادل پتہ	کرشن چندر ایم اے	پانچ روپے ۹۵ ″
پہلی لڑکی	راندل ایم اے	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
انور	فیاض علی	آٹھ روپے ۵۰ ″
برہن	کرشن گوپال عابد	چار روپے ۵۰ ″
ستم	″	چار روپے ۷۵ ″
گھائل	″	تین روپے ۹۵ ″
ظالم	سعید نصرت	دو روپے ۵۰ ″
جانے والے	اختر عادل روپ	تین روپے ۵۰ ″
جاتی ہوئی بہار	وحشی محمود آبادی	چار روپے
چوٹ	دت بھارتی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
گناہ	″	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
حالِ دل	بیگم توقیر ولایت حسین	تین روپے ۵۰ ″
خاتون	انتصار حسین	تین روپے
حاجی مراد	قیسی رامپوری	چار روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
جمِ ابرو (نظم)	عبدالحمید عدم	دو روپے ۵۰ نئے پیسے

کتاب	مصنف	قیمت
دو پھول	عادل رشید	تین روپے ۹۵ ″
دو سال پہلے دو سال بعد	زبیدہ خاتون	چھ روپے
فریبِ مسلسل	شفیق باقر	تین روپے
زہر	نقی انور	چھ روپے
برجیس	قیسی رامپوری	چار روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	تین روپے
سائے	رضیہ سجاد ظہیر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی انور	تین روپے ۵۰ ″
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	چار روپے ۵۰ ″
ننگی جوانی	سعید نصرت	دو روپے
رہگذر	انیس مرزا	چار روپے ۲۵ نئے پیسے
خوفناک محبت	عبدالحلیم شرر	تین روپے
شاہدہ	انتصار حسین	تین روپے
کرنیں	شفیق الرحمن	تین روپے
ناظمہ کی آپ بیتی	ایم اسلم	تین روپے
ایک دل ہزار غم	عزیز بٹالوی	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
تدبیر	رئیس احمد جعفری	چھ روپے ۵۰ نئے پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع	پانچ روپے
دردانہ	نادرہ خاتون	پانچ روپے
چندر کلا	جمنا داس اختر	دو روپے ۲۵ نئے پیسے
جلن	″	دو روپے ۵۰ ″
[illegible]	″	دو روپے ۵۰ ″
پاپی	″	چار روپے
سوناگاچھی	″	چار روپے ۵۰ ″
طوفانوں کی کہانی	″	چار روپے ۵۰ ″
جوار بھاٹا	″	چار روپے ۵۰ ″

کتاب	مصنف	قیمت
قیامت	نکہت	[illegible]
سازش	″	[illegible] ۵۰ ″
کھنڈروں کی سیج	[illegible]	پانچ روپے
گھرانہ	قیسی رامپوری	چار روپے ۵۰ نئے پیسے
ناگ دیوتا	[illegible]	دو روپے ۵۰ ″
خون کے چھینٹے	″	دو روپے ۵۰ ″
خوابگاہ میں	″	تین روپے ۵۰ ″
فراق	رنجن بھارتی	تین روپے ۵۰ ″
پیاسا	″	تین روپے ۵۰ ″
پراسرار قاصد	″	دو روپے
پراسرار قاتل	″	دو روپے
پیاس	کے ایل [illegible] بی اے	تین روپے ۵۰ ″
محبت روتی ہے	غلام عباس	دو روپے
مالوا	میکسم گورکی ترجمہ: نرش کمار شاد	ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
کھیت میں لہو	تاجور سامری	ایک روپیہ ۵۰ ″
جی ہاں چھپے ہیں	شوکت تھانوی	تین روپے ۲۵ ″
پردے کے پیچھے	منٹو	دو روپے ۵۰ ″
مکر صحرا	اوم پرکاش شاہی	دو روپے ۵۰ ″
خاموش نغمہ	″	چار روپے
آتش گل (مجموعہ کلام)	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
باقیات اقبال ″	ڈاکٹر اقبال	تین روپے
تلخیاں (کلاں) ″	ساحر	چھ روپے
تلخیاں (خورد) ″	ساحر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
پرچھائیاں ″	ساحر	ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر (مولانا آزاد)		تین روپے ۵۰ ″
زہرِ عشق	اشفاق احمد	دو روپے

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

غزلیں

پرکاش ناتھ پرویز ایم۔ اے

صنم کدے میں ہے پنہاں نہ خانقاہ میں ہے
تمہارا حسن فقط دل کی بارگاہ میں ہے

اگر جہاں میں نہ ہم ہوں تو پھر نہ ہو یہ کبھی
ہمارے دم سے حرارت رگِ گناہ میں ہے

دلِ تباہ کا عالم نہ پوچھ آپ ہم سے
دلِ تباہ کا عالم تری نگاہ میں ہے

یہ کس کے جسم کی خوشبو ہے لالہ و گل میں؟
یہ کون عکس فگن روئے مہر و ماہ میں ہے

دیارِ عشق سے فکرِ فرار کیا معنی
نجات دل کی کہاں ترکِ رسم و راہ میں ہے

یہ واقعہ ہے کہ وہ گردش جہاں میں نہیں
نہاں جو حشر تری گردشِ نگاہ میں ہے

خدا کرے وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو
مزہ جو میرے لئے دردِ بے پناہ میں ہے

مختار انصاری ایم۔ اے

برگشتہ ملے ہیں کہ گراں بار ملے ہیں
یہ بات ہی کیا کم ہے کہ سرکار ملے ہیں

ملنے کو بہت یوں تو ہوس کار ملے ہیں
کم ہیں جو محبت کے سزاوار ملے ہیں

وہ ذہن جو اس دور میں بیدار ملے ہیں
انصاف کی نظروں میں گنہگار ملے ہیں

جو دعوئ پندارِ خرد لے کے چلے تھے
وہ بھی تری زلفوں کے گرفتار ملے ہیں

اک ہم کہ محبت کی نگاہوں کو بھی ترسے
اک تم کہ تمہیں ہم سے پرستار ملے ہیں

کیا کیا نگہ و دل کے لئے سوچ رہے تھے
کیا کیا نگہ و دل کے خریدار ملے ہیں

پھر شام ہوئی پھر کسی یاد نے ابھر آئیں
پھر دل میں وہی درد کے آثار ملے ہیں

اختر مشتاق رحیم آبادی

اس کا گلہ نہیں کہ کم و بیشتر لئے
ہاں تم نے انتقام مگر سوچ کر لئے

اپنا فسانہ چھیڑ کر اپنے ہی حال سے
کچھ حال ہم نے ان کے بھی معلوم کر لئے

کیا کہئے پھر رہے ہیں زمانے میں کب سے ہم
اک داستانِ محفلِ دیوانہ گر لئے

کیوں کر پہونچتے منزلِ مقصود پر وہ لوگ
بیٹھے رہے جو دل ہی میں ذوقِ سفر لئے

دیوانگانِ عشق کی آوارگی نہ پوچھ
پھرتے ہیں دشت دشت غمِ معتبر لئے

اے چاند آج سوچ سمجھ کر طلوع ہو
نکلا ہے بزم سے کوئی داغِ جگر لئے

اب امتحانِ رحمتِ باری کا وقت ہے
اختر چلا ہے حشر کو دامانِ تر لئے

سعادت نظیر ایم۔ اے

زحمتِ وعدہ سے دل شاد نہیں کر سکتے
آپ کیا اتنا بھی ارشاد نہیں کر سکتے

جو سمجھتے ہیں، محبت کے تقاضے کیا ہیں؟
ضبط کر سکتے ہیں، فریاد نہیں کر سکتے

ہم سا مجبور بھی دنیا میں نہ ہوگا کوئی
اپنی ہستی کو بھی برباد نہیں کر سکتے

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

...ت کے بعد	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
...ن کی کلیاں	״	چار روپے
...کی والیں	״	تین روپے
...رغت	״	دو روپے پچھتر پیسے
...ائزہ	״	دو روپے پچیس پیسے
...سرال	شوکت تھانوی	دو روپے
...۵۰	״	تین روپے پچاس پیسے
...ل	״	دو روپے پچاس پیسے
...ال پڑے ہیں	״	تین روپے پچیس پیسے
...وڈ	״	پانچ روپے
...و	״	دو روپیہ پچیس پیسے
...عافیت	پریم چند	پانچ روپے
...ن ہستی مکمل	״	گیارہ روپے
...کی قیمت	״	تین روپے
...چھر دانہ	״	تین روپے
...زندگی	راشد الخیری	دو روپے
...ے زندگی	״	ایک روپیہ پچیس پیسے
...زندگی	״	ایک روپیہ پچاس پیسے
...ہ کی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
...پوش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
...ل	״	چار روپے
...ہاروں	کنھیا لال کپور	تین روپے
...ب وحشت	״	دو روپیہ پچاس پیسے
...ا کا چھو	جمنا داس اختر	چار روپے پچاس پیسے
...ہ جگ	کوثر چاند پوری	تین روپے پچاس پیسے
...ع	اے آر خاتون	پانچ روپے
...شہ		دس روپے پچھتر پیسے
...لید	مسعود ہمایوں	چار روپے پچیس پیسے

شکست لذت	محمود جالندھری	ایک روپیہ پچھتر پیسے
آرزو کی کلیاں	״	ایک روپیہ پچھتر پیسے
پہلی محبت	״	ایک روپیہ پچیس پیسے
خواب گاہیں	״	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسداں	״	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	سعید لبرت	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	״	تین روپے
اکبری دروازہ	״	چار روپے
دوشیزۂ روم	״	تین روپے
دیوانہ	״	تین روپے
دو دیوانے	״	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	״	تین روپے
گناہ	دت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	״	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	״	تین روپے پچھتر پیسے
مغرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
ندامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	״	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	״	چار روپے پچیس پیسے
ممتاز	ایم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات	״	پانچ روپے
ریحانہ	״	سات روپے

وعدہ	مہندر ناتھ	چار روپے پچھتر پیسے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
فردوس گوش	حضرت جوش ملیح آبادی	چھ روپے
کفر و ایمان	ہری چند اختر	چار روپے
وسکی کی بوتل	موہن یاور	دو روپے
لکن سے کیک	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر میکینک گائڈ	شیو ناتھ تسکین	چار روپے
موٹر ڈرائیونگ	کرشنا نند شرما	چار روپے پچاس پیسے
کیا خوب آدمی تھا		ایک روپیہ پچیس پیسے
عجیب لڑکی	اوم پرکاش نامی	تین روپے
ہمارا اپیل (بچوں کیلئے)	خورشید گرامی	پچاس پیسے
ہمارا سماج	״ ہندی ״	پچاس پیسے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہار اثر	دو روپے
آندھی میں چراغ	غلام الثقلین	سات روپے پچاس پیسے
اقوال زریں	مصطفیٰ احسن زیدی	پچاس پیسے
انار کلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آبشار سیکھنا	ستیہ پرکاش سنگر	دس روپیہ
ابراہیم لنکن	چندر موہن لانبہ	ایک روپیہ پچھتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابوالکلام آزاد	تین روپے پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	چندی داس ساجد	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
پچیس سال بعد	مرزا پرتیم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ ساجدہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے جیالے	آزاد ملیح آبادی	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی ، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲ ، دہلی

افسانہ

نیا رُوپ

———— رضاء الجبار، ایم کام (عثمانیہ)

۹۴۸۔ کاچی گوڑہ۔ اعظم جاہی روڈ حیدرآباد دکن (آندھرا پردیش)

مورخہ ۴ مارچ ۱۹۶۵ء   ڈیر خوشتر بھائی! تسلیمات

.... خطوط پر مشتمل ایک مختصر افسانہ بھیج رہا ہوں۔ توقع ہے کہ اس کی تکنیک اور موضوع آپ پسند فرمائیں گے۔ اِس موضوع پر بہت ہی کم افسانے لکھے گئے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ زیادہ لکھنے کی اِس موضوع میں گنجائش بھی نہیں۔ سالنامہ میں آنے والے میرے افسانے کے بارے میں اب تک خطوط مل رہے ہیں ....

آپ کا مخلص ———— رضا الجبار

بال۔ ۲ جنوری ۱۹۶۱ء

مائی ڈیر شاکر!

تسلیمات۔ خط مختصر لکھ رہا ہوں، شہرت پانے کی تیر بہدف ترکیبیں درج کر رہا
ں۔ آزمودہ نسخے ہیں، بے حد مجرب ہیں۔ جم کے استعمال کرنا، استعمال کرنے کے بعد
ے لکھنا۔ اِس ترکیب کا اعجاز دیکھنا۔ وہ سارے ایڈیٹر جو آج تمہاری نظمیں کو شکریہ
ے ساتھ واپس کر رہے ہیں، ان ترکیبوں کے استعمال کے بعد تمہارے گُن گائیں گے۔
ہاری شان میں خود قصیدے لکھیں گے۔ تمہیں خوب اُچھالیں گے۔ ہر روز کی ڈاک
ں ایڈیٹروں کے نئے نئے تقاضے تمہارے ہاں آئیں گے۔ خاص نمبروں کی تیاری میں
ہیں سب سے پہلے یاد کیا جائے گا۔ اچھا تو اب فی الحال دو ترکیبیں سُن لو۔ نمبر ایک یہ ہے
م کسی بہت بڑے اور مستند زندہ شاعر کے خلاف کچھ سنسنی خیز انکشاف اپنی کسی نظم
ے ذریعہ کر دو۔ کہہ دو کہ وہ انتہائی واہیات قسم کا آدمی ہے، اُس نے ساری چیزیں
ی چھپے رستم سے نقل ماری ہیں، اُس کی نجی زندگی گندگی سے بھری ہے۔ وغیرہ وغیرہ
یکھ لینا بیٹھے بٹھائے ایک ہنگامہ، ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔ لوگ خوب جوش
ر طیش میں آکر ایڈیٹر کو مراسلے لکھیں گے۔ بار بار تمہارا نام لیں گے، کچھ تعجب نہیں تمہارے
اف کوئی مقدمہ بھی دائر ہو جائے تم چُپ چاپ تماشہ دیکھتے رہنا۔ اچھی طرح روشناس
و جاؤ تو پھر ایک تردیدی بیان چھپوا دینا کہہ دینا کہ بعض وجوہ کی بنا پر تم غلط فہمی میں
تلا تھے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ تم اپنا نام بدل دو۔ میرا اپنا خیال ہے کہ شہرت کے
ستاروں کا تعلق نام سے بھی ہوتا ہے۔ آجکل نسوانی ناموں کو بڑی شہرت مل رہی ہے۔ کیوں نہ تم بھی کوئی نسوانی نام رکھ لو۔ شاکر کی بجائے شاکرہ بن جاؤ۔ پھر کسی دُور دراز کے شاعر و ادیب کے ساتھ کچھ اِس طرح رُومان لڑاؤ اور اُس رومان کی رنگین روداد اور اپنا اضطراب نظموں کے ذریعہ کچھ اِس طرح ظاہر کرو کہ تمہارے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ جب ہر طرف تمہارے رومان کا ذکر ہونے لگے تو ایک دن اپنے رُخ سے نقاب اُلٹ دو۔ ظاہر کر دو کہ تم عورت نہیں مرد ہو!! کہو قائل ہو گئے نا؟ کیسی نادر ترکیبیں ہیں؟ کیسے تیر بہدف نسخے ہیں؟ ایسے نسخے کبھی بے اثر ہو ہی نہیں سکتے۔

میں اِن دنوں اچھا ہوں۔ پچھلے دنوں کشمیر کے دورے پر گیا تھا۔ امّی جان مجھے شادی کے بندھن میں جکڑنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہ زنجیر میرے پاؤں میں نہ پڑے۔ اپنے محلّے میں وہ ایک شاہانہ تھی نا بھئی؟ سُنا ہے وہ کسی جاتی میاں سے بیاہی جانے والی ہے۔ اگلے ہفتے تم آنے والے ہو نا؟ تفصیلی ملاقات ہو گی۔ یقین مانو تمہیں شہرت کی بلندیوں پر دیکھنے کا میں بہت خواہشمند ہوں کیونکہ مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے۔ سچ کہتا ہوں شاکر! اگر تم لڑکی ہوتے تو کبھی کا تمہیں شادی کا پیام دے چکا ہوتا۔ باقی بوقتِ ملاقات۔

فقط۔ تمہارا مخلص

قمر الدین بڑی چاوڑی والا

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

...کے بعد	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
...کلیاں	"	چار روپے
...	"	تین روپے
...فت	"	دو روپے پچھتر پیسے
...ٹہ	"	دو روپے پچیس پیسے
...سرال	شوکت تھانوی	دو روپے
...	"	تین روپے پچاس پیسے
...	"	دو روپے پچاس پیسے
...ل پڑھتے ہیں	"	تین روپے پچیس پیسے
...	"	پانچ روپے
...	"	دو روپیہ پچیس پیسے
...عافیت	پریم چند	پانچ روپے
...ہستی مکمل	"	گیارہ روپے
...کی قیمت	"	تین روپے
...پروانہ	"	تین روپے
...زندگی	راشد الخیری	دو روپے
...زندگی	"	ایک روپیہ پچیس پیسے
...زندگی	"	ایک روپیہ پچاس پیسے
...کی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
...پوش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
...	"	چار روپے
...کارواں	کنھیا لال کپور	تین روپے
...وحشت	"	دو روپیہ پچاس پیسے
...ہا بھی	جانثار اختر	چار روپے پچاس پیسے
...رنگ	کوثر چاندپوری	تین روپے پچاس پیسے
...	[illegible]	پانچ روپے
...		دس روپے پچھتر پیسے
...ید	[illegible]	چار روپے پچیس پیسے

شکست ظلمت	قمر جالندھری	ایک روپیہ پچھتر پیسے
آرزو کی کلیاں	"	ایک روپیہ پچھتر پیسے
پہلی محبت	"	ایک روپیہ پچیس پیسے
خواب گاہ تک	"	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسداں	"	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	[illegible]	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	"	تین روپے
اکبری دروازہ	"	چار روپے
دوشیزۂ روم	"	تین روپے
دیوانہ	"	تین روپے
دو دیوانے	"	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	"	تین روپے
گناہ	دت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	"	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	"	تین روپے پچھتر پیسے
مغرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
قیامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	"	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	"	چار روپے پچیس پیسے
ستارہ	ایم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات	"	پانچ روپے
ریحانہ	"	سات روپے

وعدہ	مہندر ناتھ	چار روپے پچھتر پیسے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
فردوسِ گوش	حضرت جوش ملسیانی	چھ روپے
کفر و ایمان	ہری چند اختر	چار روپے
وسکی کی بوتل	موہن یاور	دو روپے
لنکن نے کہا	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر میکینک گائڈ	شیو ناتھ تسکین	چار روپے
موٹر ڈرائیونگ	کرشنا نند شرما	چار روپے پچاس پیسے
کیا خوب آدمی تھا		ایک روپیہ پچیس پیسے
عجیب لڑکی	اوم پرکاش نامی	تین روپے
ہمارا اپیل (بچوں کیلئے)	نوشتر گرامی	پچاس پیسے
ہمارا سبھاش	" ہندی "	پچاس پیسے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہار اثر	دو روپے
آندھی میں چراغ	غلام الثقلین	سات روپے پچاس پیسے
اقوالِ زریں	مصطفیٰ حسن زیدی	پچاس پیسے
انارکلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آشا دیپ بجھے نا	ست پرکاش سنگر	ایک روپیہ
ابراہیم لنکن	چندر موہن لامبہ	ایک روپیہ پچھتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابو الکلام آزاد	تین روپیہ پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	بنسی داس ساحر	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
پچیس سال بعد	مرزا پریم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے چھالے	آزاد ملیح آبادی	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی

نیا روپ

رضاء الجبار ایم کام (عثمانیہ)

۴۲۰۔ کاچی گوڑہ۔ اعظم جاہی روڈ حیدرآباد دکن (آندھرا پردیش)

مورخہ ۴ مارچ ۱۹۶۵ء ڈیئر خوشتر بھائی! تسلیمات

.... خطوط پر مشتمل ایک مختصر افسانہ بھیج رہا ہوں۔ توقع ہے کہ اس کی تکنیک اور موضوع آپ پسند فرمائیں گے۔ اس موضوع پر بہت ہی کم افسانے لکھے گئے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ زیادہ لکھنے کی اس موضوع میں گنجائش بھی نہیں۔ سالنامہ میں آنے والے میرے افسانے کے بارے میں اب تک خطوط مل رہے ہیں ....

آپ کا مخلص —— رضاء الجبار

بھوپال۔ ۳ جنوری ۱۹۶۱ء

مائی ڈیئر شاکر!

تسلیمات۔ خط مختصر لکھ رہا ہوں، شہرت پانے کی تیر بہدف ترکیبیں درج کر رہا ہوں۔ آزمودہ نسخے ہیں، بے حد مجرب ہیں۔ جم کے استعمال کرنا، استعمال کرنے کے بعد مجھے لکھنا۔ اس ترکیب کا اعجاز دیکھنا۔ وہ سارے ایڈیٹر جو آج تمہاری نظمیں کو شکریہ کے ساتھ واپس کر رہے ہیں، ان ترکیبوں کے استعمال کے بعد تمہارے گُن گائیں گے۔ تمہاری شان میں خود قصیدے لکھیں گے۔ تمہیں خوب اُچھالیں گے۔ ہر روز کی ڈاک میں ایڈیٹروں کے نئے نئے تقاضے تمہارے ہاں آئیں گے۔ خاص نمبروں کی تیاری میں تمہیں سب سے پہلے یاد کیا جائے گا۔ اچھا تو اب فی الحال دو ترکیبیں سُن لو۔ نمبر ایک یہ ہے کہ تم کسی بہت بڑے اور مستند زندہ شاعر کے خلاف کچھ سنسنی خیز انکشاف اپنی کسی نظم کے ذریعہ کر دو۔ کہہ دو کہ وہ انتہائی واہیات قسم کا آدمی ہے، اُس نے ساری چیزیں کسی چھچھورے تم سے نقل ملی ہیں، اُس کی نجی زندگی گندگی سے بھری ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ دیکھ لینا بیٹھے بٹھائے ایک ہنگامہ، ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔ لوگ خوب جوش و خروش میں آکر ایڈیٹر کو مراسلے لکھیں گے، بار بار تمہارا نام لیں گے، کچھ تعجب نہیں تمہارے اوپر کوئی مقدمہ بھی دائر ہو جائے تم چُپ چاپ تماشہ دیکھتے رہنا۔ اچھی طرح روشناس ہو جاؤ تو پھر ایک تردیدی بیان چھپوا دینا کہہ دینا کہ بعض وجوہ کی بنا پر تم غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ تم اپنا نام بدل دو۔ میرا اپنا خیال ہے کہ شہرت کے ستاروں کا تعلق نام سے بھی ہوتا ہے۔ آج کل نسوانی ناموں کو بڑی شہرت مل رہی ہے کیوں نہ تم بھی کوئی نسوانی نام رکھ لو۔ شاکر کی بجائے شاکرہ بن جاؤ۔ پھر کسی قدر دورانیہ کے شاعر ادیب کے ساتھ کچھ اس طرح رُومان لڑا دو اور اُس رومان کی رنگین روداد اور اپنا اضطراب نظموں کے ذریعہ کچھ اس طرح ظاہر کرو کہ تمہارے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ جب ہر طرف تمہارے رومان کا ذکر ہونے لگے تو ایک دن اپنے رُخ سے نقاب اُلٹ دو۔ ظاہر کر دو کہ تم عورت نہیں مرد ہو!! کہو قائل ہو گئے نا؟ کیسی نادر ترکیبیں ہیں! کیسے تیر بہدف نسخے ہیں! ایسے نسخے کبھی بے اثر ہو ہی نہیں سکتے۔

میں ان دنوں اچھا ہوں۔ پچھلے دنوں کشمیر کے دورے پر گیا تھا۔ امی جان مجھے شادی کے بندھن میں جکڑنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہ زنجیر میرے پاؤں میں نہ پڑے۔ اپنے محلے میں وہ ایک شاہانہ تھی نا بھئی؟ سنا ہے وہ کسی جانی میاں سے بیاہی جانے والی ہے۔ اگلے مہینے تم آنے والے ہو نا؟ تفصیلی ملاقات ہو گی۔ یقین مانو تمہیں شہرت کی بلندیوں پر دیکھنے کا میں بہت خواہشمند ہوں کیونکہ مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے۔ سچ کہتا ہوں شاکر! اگر تم لڑکی ہوتے تو کبھی کا تمہیں شادی کا پیام دے چکا ہوتا۔ باقی بوقتِ ملاقات۔

فقط۔ تمہارا مخلص

قمر الدین بڑی چاوڑی والا

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

[illegible]	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
[illegible]	〃	چار روپے
[illegible]	〃	تین روپے
[illegible]	〃	دو روپے پچہتر پیسے
دروازہ	〃	دو روپے پچیس پیسے
سسرال	شوکت تھانوی	دو روپے
سترہ ۵	〃	تین روپے پچاس پیسے
بقراط	〃	دو روپے پچاس پیسے
جی ہاں پٹے ہیں	〃	تین روپے پچیس پیسے
جوڑ توڑ	〃	پانچ روپے
داماد	〃	دو روپیہ پچیس پیسے
گوشۂ عافیت	پریم چند	پانچ روپے
چوگان ہستی مکمل	〃	گیارہ روپے
دو دن کی قیمت	〃	تین روپے
خاک پروانہ	〃	تین روپے
صبح زندگی	راشد الخیری	دو روپے
شب زندگی	〃	ایک روپیہ پچیس پیسے
شام زندگی	〃	ایک روپیہ پچاس پیسے
سیدہ کی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
سمن پوش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
اقبال	〃	چار روپے
گرد کارواں	کنہیا لال کپور	تین روپے
سنگ و خشت	〃	دو روپیہ پچاس پیسے
[illegible]	[illegible]	چار روپے پچاس پیسے
[illegible]	کوثر چاندپوری	تین روپے پچاس پیسے
شمع	اے آر خاتون	پانچ روپے
جستہ		دس روپے پچہتر پیسے
[illegible]	مسعود [illegible]	چار روپے پچیس پیسے

شکست ظلمت	محمود جالندھری	ایک روپیہ پچہتر پیسے
آدم کی کلیاں	〃	ایک روپیہ پچہتر پیسے
پہلی محبت	〃	ایک روپیہ [illegible] پیسے
خواب گاہ میں	〃	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسداں	〃	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	سید امرت	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	〃	تین روپے
اکبری دروازہ	〃	چار روپے
دوشیزۂ روم	〃	تین روپے
دیوانہ	〃	تین روپے
دو دیوانے	〃	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	〃	تین روپے
گناہ	دت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	〃	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	〃	تین روپے پچانوے پیسے
مفرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
قیامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	〃	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	〃	چار روپے پچیس پیسے
ستارہ	ایم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات		پانچ روپے
ریحانہ		سات روپے

وعدہ	مہندر ناتھ	چار روپے پچہتر پیسے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
فردوس گوش	حضرت جوش ملسیانی	چار روپے
کفر و ایمان	ہری چند اختر	چار روپے
وسکی کی بوتل	موہن یاور	دو روپے
لنکن نے کہا	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر مکینک گائڈ	شیو نانند کمکین	چار روپے
موٹر ڈرائیونگ	گرشنانند شرما	چار روپے پچاس پیسے
کیا خوب آدمی تھا		ایک روپیہ پچیس پیسے
عجیب لڑکی	اوم پرکاش ساحر	تین روپے
ہمارا اپیل (بچوں کیلئے)	نوشتر گرامی	پچاس پیسے
ہمارا سماش	〃 ہندی 〃	پچاس پیسے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہر اثر	دو روپے
آدمی یہ چہرے	غلام السبطین	سات روپے پچاس پیسے
اقوال زریں	مصطفےٰ احسن رضوی	پچاس پیسے
انار کلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آشا دیپ بجھ نہ	ست پرکاش سنگر	دو روپے
ابراہیم لنکن	پنڈت موہن لال زتشی	ایک روپیہ پچہتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابو الکلام آزاد	تین روپے پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	بی بی داس صاحب	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
پچیس سال بعد	مرزا یہ تیم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کاشانی ہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے چھالے	آزاد ملیح آبادی	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۲۳۴۲ ، دہلی

نیا رُوپ

رضاء الجبار ایم کام (عثمانیہ)

۹۳۸۔ کاچی گوڑہ۔ اعظم جاہی روڈ حیدرآباد دکن (آندھرا پردیش)

مورخہ ۴ مارچ ۱۹۶۵ء   ڈیر خورشید بھائی! تسلیمات

.... خطوط پر مشتمل ایک مختصر افسانہ بھیج رہا ہوں۔ توقع ہے کہ اس کی تکنیک اور موضوع آپ پسند فرمائیں گے۔ اِس موضوع پر بہت ہی کم افسانے لکھے گئے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ زیادہ لکھنے کی اس موضوع میں گنجائش بھی نہیں۔ سالنامہ میں آنے والے میرے افسانے کے بارے میں اب تک خطوط مل رہے ہیں ....

آپ کا مخلص ——— رضاء الجبار

بھوپال۔ ۳؍ جنوری ۱۹۶۱ء

مائی ڈیر شاکر!

تسلیمات۔ خط مختصر لکھ رہا ہوں، شہرت پانے کی تیر بہدف ترکیبیں درج کر رہا ہوں۔ آزمودہ نسخے ہیں، بے حد مجرب ہیں۔ جم کے استعمال کرنا، استعمال کرنے کے بعد مجھے لکھنا۔ اِس ترکیب کا اعجاز دیکھنا۔ وہ سارے ایڈیٹر جو آج تمہاری نظموں کو شکریہ کے ساتھ واپس کر رہے ہیں، ان ترکیبوں کے استعمال کے بعد تمہارے گُن گائیں گے۔ تمہاری شان میں خود قصیدے لکھیں گے۔ تمہیں خوب اُچھالیں گے۔ ہر روز کی ڈاک میں ایڈیٹروں کے نئے نئے تقاضے تمہارے ہاں آئیں گے۔ خاص نمبروں کی تیاری میں تمہیں سب سے پہلے یاد کیا جائے گا۔ اچھا تو اب فی الحال دو ترکیبیں سُن لو۔ نمبر ایک یہ ہے کہ تم کسی بہت بڑے اور مستند زندہ شاعر کے خلاف کچھ سنسنی خیز انکشاف اپنی کسی نظم کے ذریعہ کر دو۔ کہہ دو کہ وہ انتہائی واہیات قسم کا آدمی ہے، اُس نے ساری چیزیں کسی چھپے رستم سے نقل مار لی ہیں، اُس کی نجی زندگی گندگی سے بھری ہے۔ وغیرہ وغیرہ دیکھ لینا بیٹھے بٹھائے ایک ہنگامہ، ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔ لوگ خوب جوش اور طیش میں آکر ایڈیٹر کو مراسلے لکھیں گے، بار بار تمہارا نام لیں گے، کچھ تعجب نہیں تمہارے خلاف کوئی مقدمہ بھی دائر ہو جائے تم چُپ چاپ تماشہ دیکھتے رہنا۔ اچھی طرح روشناس ہو جاؤ تو پھر ایک تردیدی بیان چھپوا دینا کہہ دینا کہ بعض وجوہ کی بنا پر تم غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ تم اپنا نام بدل دو۔ میرا اپنا خیال ہے کہ شہرت کے ستاروں کا تعلق نام سے بھی ہوتا ہے۔ آجکل نسوانی ناموں کو بڑی شہرت مل رہی ہے کیوں نہ تم بھی کوئی نسوانی نام رکھ لو۔ شاکر کی بجائے شاکرہ بن جاؤ۔ پھر کسی مقدر ساز کے شاعر ادیب کے ساتھ کچھ اس طرح رُومان لڑاؤ اور اُس رومان کی رنگین روداد اور اپنا اضطراب نظموں کے ذریعہ کچھ اِس طرح ظاہر کرو کہ تمہارے بارے میں طرح طرح کی باتیں بننے لگیں۔ جب ہر طرف تمہارے رومان کا ذکر ہونے لگے تو ایک دن اپنے رُخ سے نقاب اُلٹ دو۔ ظاہر کر دو کہ تم عورت نہیں مرد ہو!! کہو قائل ہو گئے نا؟ کیسی نادر ترکیبیں ہیں کیسے تیر بہدف نسخے ہیں! یہ نسخے کبھی بے اثر ہو ہی نہیں سکتے۔

میں اِن دنوں اچھا ہوں۔ پچھلے دنوں کشمیر کے دورے پر گیا تھا۔ امی جان مجھے شادی کے بندھن میں جکڑنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہ زنجیر میرے پاؤں میں نہ پڑے۔ اپنے محلے میں وہ ایک شاہانہ تھی نا بھئی؟ سنا ہے وہ کسی جاپانی میاں سے بیاہی جانے والی ہے۔ اگلے ہفتے تم آنے والے ہو نا؟ تفصیلی ملاقات ہوگی۔ یقین مانو تمہیں شہرت کی بلندیوں پر دیکھنے کا میں بہت خواہشمند ہوں کیونکہ مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے۔ سچ کہتا ہوں شاکر اگر تم لڑکی ہوتے تو کبھی کا تمہیں شادی کا پیام دے چکا ہوتا۔ باقی بوقت ملاقات۔

فقط۔ تمہارا مخلص

قمر الدین بٹ، چاندنی محلہ

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

[illegible]	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
...کلیاں	"	چار روپے
[illegible]	"	تین روپے
...ت	"	دو روپے پچھتر پیسے
[illegible]	"	دو روپے پچیس پیسے
...ل	شوکت تھانوی	دو روپے
[illegible]	"	تین روپے پچاس پیسے
	"	دو روپے پچاس پیسے
...ں بچے ہیں	"	تین روپے پچیس پیسے
...ر	"	پانچ روپے
	"	دو روپیہ پچیس پیسے
...عافیت	پریم چند	پانچ روپے
...ہستی مکمل	"	گیارہ روپے
...کی قیمت	"	تین روپے
...دانہ	"	تین روپے
...ندگی	راشد الخیری	دو روپے
...زندگی	"	ایک روپیہ پچیس پیسے
...ندگی	"	ایک روپیہ پچاس پیسے
...ی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
...رش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
	"	چار روپے
...روش	کنھیا لال کپور	تین روپے
...وحشت	"	دو روپیہ پچاس پیسے
...اچھی	جمنا داس اختر	چار روپے پچاس پیسے
...نگ	کوثر چاندپوری	تین روپے پچاس پیسے
	اے آر خاتون	پانچ روپے
		دس روپے پچھتر پیسے
	مسعود ہمایوں	چار روپیہ پچیس پیسے

شکست الملت	مخمور جالندھری	ایک روپیہ پچھتر پیسے
آرزو کی کلیاں	"	ایک روپیہ پچھتر پیسے
پہلی محبت	"	ایک روپیہ پچیس پیسے
خواب گاہ میں	"	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسداں	"	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	سید مرت	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	رزاق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	"	تین روپے
اکبری دروازہ	"	چار روپے
دوشیزۂ روم	"	تین روپے
دیوانہ	"	تین روپے
دو دیوانے	"	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	"	تین روپے
گناہ	دت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	"	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	"	تین روپے پچھتر پیسے
مغرور	رئیس احمد جعفری	پانچ روپے پچاس پیسے
قیامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	"	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	"	چار روپے پچیس پیسے
ستارہ	نسیم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات		پانچ روپے
ریحانہ		سات روپے

وعدہ	مہندر ناتھ	چار روپے پچھتر پیسے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
فردوس گوش	حضرت جوش ملسیانی	پانچ روپے
کفر و ایمان	ہری چند اختر	چار روپے
وسکی کی بوتل	موہن یادو	دو روپے
انکھیوں نے کہا	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر میکینک گائڈ	شیو ناتھ تمکین	چار روپے
موٹر ڈرائیونگ	کرشنا نند شرما	چار روپے پچاس پیسے
کیا خوب آدمی تھا		ایک روپیہ پچیس پیسے
عجیب لڑکی	اوم پرکاش نامی	تین روپے
چار اپیل (بچوں کیلئے)	خورشید گرامی	پچاس پیسے
پہلا سبھاش	" ہندی "	پچاس پیسے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہار اثر	دو روپے
آندھی میں چراغ	علامہ السیماب	سات روپے پچاس پیسے
اقوال زریں	مصطفیٰ احسن زیدی	پچاس پیسے
انارکلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آشا دیپ بجھے نا	ست پرکاش سنگر	دو روپے
ابراہیم لنکن	چندر بھن	ایک روپیہ پچھتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابوالکلام آزاد	تین روپیہ پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	[illegible]	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
چھبیس سال بعد	مرزا پریم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	[illegible]
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
[illegible]	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے چہلے	آزاد ملیح آبادی	تین روپے پچاس پیسے

...کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی ، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲ ، دہلی

...یجنسی دہلی

نیا رُوپ

———— رضا الجبار ایم کام (عثمانیہ)

۹۲۸۔ کاچی گوڑہ۔ اعظم جاہی روڈ حیدرآباد دکن (آندھرا پردیش)

مورخہ ۴ مارچ ۱۹۶۵ء ڈیر خوشتر بھائی: تسلیمات

.... خطوط پر مشتمل ایک مختصر افسانہ بھیج رہا ہوں۔ توقع ہے کہ اس کی تکنیک اور موضوع آپ پسند فرمائیں گے۔ اِس موضوع پر بہت ہی کم افسانے لکھے گئے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ زیادہ لکھنے کی اس موضوع میں گنجائش بھی نہیں۔ سالنامہ میں آنے والے میرے افسانے کے بارے میں اب تک خطوط مل رہے ہیں ....

آپ کا مخلص ———— رضا الجبار

بھوپال۔ ۳ جنوری ۱۹۶۱ء

مائی ڈیر شاکر!

تسلیمات۔ خط مختصر لکھ رہا ہوں، شہرت پانے کی تیر بہدف ترکیبیں درج کر رہا ہوں۔ آزمودہ نسخے ہیں، بے حد مجرب ہیں۔ جم کے استعمال کرنا، استعمال کرنے کے بعد مجھے لکھنا۔ اِس ترکیب کا اعجاز دیکھنا۔ وہ سارے ایڈیٹر جو آج تمہاری نظموں کو شکریہ کے ساتھ واپس کر رہے ہیں، ان ترکیبوں کے استعمال کے بعد تمہارے گُن گائیں گے۔ تمہاری شان میں خود قصیدے لکھیں گے۔ تمہیں خوب اُچھالیں گے۔ ہر روز کی ڈاک میں ایڈیٹروں کے نئے نئے تقاضے تمہارے ہاں آئیں گے۔ خاص نمبروں کی تیاری میں تمہیں سب سے پہلے یاد کیا جائے گا۔ اچھا تو اب فی الحال دو ترکیبیں سُن لو۔ نمبر ایک یہ ہے کہ تم کسی بہت بڑے اور مستند زندہ شاعر کے خلاف کچھ سنسنی خیز انکشاف اپنی کسی نظم کے ذریعہ کر دو۔ کہہ دو کہ وہ انتہائی واہیات قسم کا آدمی ہے، اُس نے ساری چیزیں کسی چھپے رستم سے نقل ماری ہیں، اُس کی نجی زندگی گندگی سے بھری ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ دیکھ لینا بیٹھے بٹھائے ایک ہنگامہ، ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔ لوگ خوب جوش اور طیش میں آ کر ایڈیٹر کو مراسلے لکھیں گے۔ بار بار تمہارا نام لیں گے، کچھ تعجب نہیں تمہارے خلاف کوئی مقدمہ بھی دائر ہو جائے تم چُپ چاپ تماشہ دیکھتے رہنا۔ اچھی طرح روشناس ہو جاؤ تو پھر ایک تردیدی بیان چھپوا دینا کہہ دینا کہ بعض وجوہ کی بنا پر تم غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ تم اپنا نام بدل دو۔ میرا اپنا خیال ہے کہ شہرت کے ستاروں کا تعلق نام سے بھی ہوتا ہے۔ آجکل نسوانی ناموں کو بڑی شہرت مل رہی۔ تم بھی کوئی نسوانی نام رکھ لو۔ شاکر کی بجائے شاکرہ بن جاؤ۔ پھر کسی مشہور ادیب کے ساتھ کچھ اس طرح رُومان لڑاؤ اور اُس رومان کی رنگین روداد اپنی نظموں کے ذریعہ کچھ اس طرح ظاہر کرو کہ تمہارے بارے میں طرح طرح کی لگیں۔ جب ہر طرف تمہارے رومان کا ذکر ہونے لگے تو ایک دن اپنے اُلٹ دو۔ ظاہر کر دو کہ تم عورت نہیں مرد ہو۔ لو قائل ہو گئے نا؟ کیسی نادر کیسے تیر بہدف نسخے ہیں! یہ نسخے کبھی بے اثر ہو ہی نہیں سکتے۔

میں اِن دنوں اچھا ہوں۔ پچھلے دنوں کشمیر کے دورے پر گیا تھا۔ امی مجھے شادی کے بندھن میں جکڑنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں یہ زنجیر میرے پاؤں میں نہ پڑے۔ اپنے محلے میں وہ ایک شاہانہ تھی نا؟ کسی جاگیردار سے بیاہی جانے والی ہے۔ اگلے ہفتے تم آنے والے ہو نا؟ ملاقات ہو گی۔ یقین مانو تمہیں شہرت کی بلندیوں پر دیکھنے کا میں بہت خواہشمند ہوں کیونکہ مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے۔ سچ کہتا ہوں شاکر! اگر تم لڑکی ہوتے تمہیں شادی کا پیام دے چکا ہوتا۔ باقی بوقت ملاقات۔

فقط۔ تمہارا مخلص

قمر الدین بھوپالی

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

شکست کے بعد	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
[illegible]	"	چار روپے
[illegible]	"	تین روپے
[illegible]	"	دو روپے پچھتر پیسے
دروازہ	"	دو روپے پچیس پیسے
سسرال	شوکت تھانوی	دو روپے
سنہ ۵۰	"	تین روپے پچاس پیسے
بقراط	"	دو روپیہ پچاس پیسے
[illegible]	"	تین روپے پچیس پیسے
جوڑ توڑ	"	پانچ روپے
داماد	"	دو روپیہ پچیس پیسے
گوشۂ عافیت	پریم چند	پانچ روپے
چوگان ہستی مکمل	"	گیارہ روپے
دودھ کی قیمت	"	تین روپے
خاک پروانہ	"	تین روپے
صبح زندگی	راشد الخیری	دو روپے
شب زندگی	"	ایک روپیہ پچیس پیسے
شام زندگی	"	ایک روپیہ پچاس پیسے
سیدہ کی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
حسن پوش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
اقبال	"	چار روپے
گرد کارواں	کنھیا لال کپور	تین روپے
سنگ و خشت	"	دو روپیہ پچاس پیسے
سوناگاچھی	جمنا داس اختر	چار روپیہ پچاس پیسے
شعلۂ سنگ	کوثر چاندپوری	تین روپے پچاس پیسے
شمع	اے آر خاتون	پانچ روپے
چشمہ		دس روپے پچھتر پیسے
شکیلہ	مسعود ہمایوں	چار روپے پچیس پیسے

شکست ظلمت	محمود جالندھری	ایک روپیہ پچھتر پیسے
آرزو کی کلیاں	"	ایک روپیہ پچھتر پیسے
پہلی محبت	"	ایک روپیہ پچیس پیسے
خوابگاہ میں	"	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسداں	"	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	سعید امرت	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	"	تین روپے
اکبری دروازہ	"	چار روپے
دوشیزۂ روم	"	تین روپے
دیوانہ	"	تین روپے
دو دیوانے	"	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	"	تین روپے
گناہ	ونت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	"	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	"	تین روپے پچاس پیسے
مغرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
قیامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	"	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	"	چار روپے پچیس پیسے
ستارہ	نسیم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات	"	پانچ روپے
ریحانہ		سات روپے

وعدہ	مہندر ناتھ	چار روپیہ پچھتر پیسے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
فردوس گوش	حضرت جوش ملسیانی	پانچ روپے
کفر و ایمان	ہری چند اختر	چار روپے
وسکی کی بوتل	موہن یاور	دو روپے
لنکن نے کہا	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر میکینک گائڈ	شیو ناتھ تسکین	چار روپے
موٹر ڈرائیونگ	کرشنا نند شرما	چار روپے پچاس پیسے
کیا خوب آدمی تھا		ایک روپیہ پچیس پیسے
عجیب لڑکی	اوم پرکاش نامی	تین روپے
ہمارا ٹیپل (بچوں کیلئے)	خوشتر گرامی	پچاس پیسے
ہمارا سبھاش " ہندی "		پچاس پیسے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہار اثر	دو روپے
آندھی میں چراغ	غلام السبطین	سات روپے پچاس پیسے
اقوال زریں	مصطفیٰ حسن زیدی	پچاس پیسے
انارکلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آشا دیپ بجھنا	ستیہ پرکاش سنگر	دو روپے
ابراہیم لنکن	چندر موہن لال	ایک روپیہ پچھتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابوالکلام آزاد	تین روپیہ پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	[illegible] داس ساجد	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
چھبیس سال بعد	ظہیر تیم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے چاند	آزاد بانو بیگم	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی

نیا رُوپ

رضاء الجبار۔ ایم کام (عثمانیہ)

۹۲۰۔ کاچی گوڑہ۔ اعظم جاہی روڈ حیدر آباد دکن (آندھرا پردیش)

مورخہ ۴ مارچ ۱۹۶۵ء ڈیئر خوشتر بھائی! تسلیمات

.... خطوط پر مشتمل ایک مختصر افسانہ بھیج رہا ہوں۔ توقع ہے کہ اس کی تکنیک اور موضوع آپ پسند فرمائیں گے۔ اِس موضوع پر بہت ہی کم افسانے لکھے گئے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ زیادہ لکھنے کی اِس موضوع میں گنجائش بھی نہیں۔ سالنامہ میں آنے والے میرے افسانے کے بارے میں اب تک خطوط مل رہے ہیں ....

آپ کا مخلص ——— رضاء الجبار

بھوپال۔ ۲ جنوری ۱۹۶۶ء

مائی ڈیئر شاکر!

تسلیمات۔ خط مختصر لکھ رہا ہوں، شہرت پانے کی تیر بہدف ترکیبیں درج کر رہا ہوں۔ آزمودہ نسخے ہیں، بے حد مجرب ہیں۔ تم کے استعمال کرنا، استعمال کرنے کے بعد مجھے لکھنا۔ اِس ترکیب کا اعجاز دیکھنا۔ وہ سارے ایڈیٹر جو آج تمہاری نظموں کو شکریہ کے ساتھ واپس کر رہے ہیں، ان ترکیبوں کے استعمال کے بعد تمہارے گُن گائیں گے۔ تمہاری شان میں خود قصیدے لکھیں گے۔ تمہیں خوب اُچھالیں گے۔ ہر روز کی ڈاک میں ایڈیٹروں کے نئے نئے تقاضے تمہارے ہاں آئیں گے۔ خاص نمبروں کی تیاری میں تمہیں سب سے پہلے یاد کیا جائے گا۔ اچھا تو اب فی الحال دو ترکیبیں سُن لو۔ نمبر ایک یہ ہے کہ تم کسی بہت بڑے اور مُستند زندہ شاعر کے خلاف کچھ سنسنی خیز انکشاف اپنی کسی نظم کے ذریعہ کر دو۔ کہہ دو کہ وہ انتہائی واہیات قسم کا آدمی ہے، اُس نے ساری چیزیں کسی چھچھے رستم سے نقل ماری ہیں، اُس کی نجی زندگی گندگی سے بھری ہے۔ وغیرہ وغیرہ دیکھ لینا بیٹھے بٹھائے ایک ہنگامہ، ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔ لوگ خوب جوش اور طیش میں آکر ایڈیٹر کو مراسلے لکھیں گے، بار بار تمہارا نام لیں گے، کچھ تعجب نہیں تمہارے خلاف کوئی مقدمہ بھی دائر ہو جائے تم چُپ چاپ تماشہ دیکھتے رہنا۔ اچھی طرح روشناس ہو جاؤ تو پھر ایک تردیدی بیان چھپوا دینا کہہ دینا کہ بعض وجوہ کی بنا پر تم غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ تم اپنا نام بدل دو۔ میرا اپنا خیال ہے کہ شہرت کے ستاروں کا تعلق نام سے بھی ہوتا ہے۔ آجکل نسوانی ناموں کو بڑی شہرت مل رہی ہے کیوں نہ تم بھی کوئی نسوانی نام رکھ لو۔ شاکر کی بجائے شاکرہ بن جاؤ۔ پھر کسی دُور دراز کے شاعر و ادیب کے ساتھ کچھ اِس طرح رُومان لڑاؤ اور اُس رومان کی رنگین روداد اور اپنا اضطراب نظموں کے ذریعہ کچھ اِس طرح ظاہر کرو کہ تمہارے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ جب ہر طرف تمہارے رومان کا ذکر ہونے لگے تو ایک دن اپنے رُخ سے نقاب اُلٹ دو۔ ظاہر کر دو کہ تم عورت نہیں مرد ہو۔ لو کہو قائل ہو گئے نا؟ کیسی نادر ترکیبیں ہیں! کیسے تیر بہدف نسخے ہیں! یہ نسخے کبھی بے اثر ہو ہی نہیں سکتے۔

میں اِن دنوں اچھا ہوں۔ پچھلے دنوں کشمیر کے دورے پر گیا تھا۔ اتی جان مجھے شادی کے بندھن میں جکڑنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہ زنجیر میرے پاؤں میں نہ پڑے۔ اپنے محلے میں وہ ایک شاہانہ تھی نا بھئی؟ سنا ہے وہ کسی جاتی میاں سے بیاہی جانے والی ہے۔ اگلے مہینے تم آنے والے ہو نا؟ تفصیلی ملاقات ہو گی۔ یقین مانو تمہیں شہرت کی بلندیوں پر دیکھنے کا میں بہت خواہشمند ہوں کیونکہ مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے۔ سچ کہتا ہوں شاکر! اگر تم لڑکی ہوتے تو کبھی کا تمہیں شادی کا پیام دے چکا ہوتا۔ باقی بوقتِ ملاقات۔

فقط۔ تمہارا مخلص

قمر الدین بڑی چاوڑی والا

[illegible]

[illegible] نظر آنے والی ستارہ!

میرے خوابوں کی تعبیر —— شاکرہ!!

آداب! [illegible] خوابوں کی تیرگی کے لئے تم سے نور کی بھیک مانگنے کے لئے میں نے [illegible] لیا۔ میں سمجھ گیا کہ میری روح جس تشنگی سے تڑپتی ہے، جس کے لئے بیقرار رہتی [illegible] ہو۔ شاکرہ! محبت ایک لطیف جذبہ ہے جس سے دو چار ہونے والا ایک [illegible] رہتا ہے۔ یہ آگ مجھے بھی جلا رہی ہے۔ میں جل رہا ہوں شاکرہ! [illegible] "[illegible] جلوہ" میں تمہاری نظم کے ان تمام مخفی اشاروں کو میں سمجھ گیا۔ اپنے [illegible] آنکھوں کے سہارے ہی میں سمجھ گیا کہ تم نے پہلی بار مجھے بی ایل کالج میں دیکھا اور اُن ہی دنوں سے تم خاموش ہی خاموش مجھ سے محبت کرنے لگیں لیکن شاکرہ! میں یہ پڑھ کر تمہارا ماتم سا کرتا چلا۔ مجھے اس کی خبر ہی نہیں تھی کہ تم شدید جذباتی طور پر مجھ سے وابستہ ہو چکی ہو۔ ہائے وقت کا موڑ کبھی کبھی کیسے حالات پیدا کر دیتا ہے۔ اب میں سمجھ رہا ہوں کہ کیوں میرا دل اُداس رہا کرتا تھا۔ اب میں قائل ہو گیا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے لیکن مدت گزر گئی تو کیا ہوا اب بھی ہم ایک دوسرے کے ہو سکتے ہیں۔ میں ضرور تمہیں بتاؤں گا۔

خط کا جواب دینا۔ دوسری بار لکھوں گا تو بہت تفصیل سے لکھوں گا۔ اس بار اتنا ہی کافی ہے۔ رات بہت ہو گئی اور ایک ناول کا باب مجھے مکمل کرنا ہے۔ ذرا خیال رکھنا کہ تمہارے خط کا بہت بے چینی سے انتظار کروں گا۔

تمہارے حسن کا پجاری —— مشاغل آفاقی

حیدرآباد - ۱۱ر جولائی ۱۹۶۱ء

مائی ڈیر غافل،

خوش رہو میرے یار خوش رہو۔ یہ خط تمہیں انتہائی عجلت میں لکھ رہا ہوں۔

پیارے! مجھے حسب ذیل امور میں تمہاری فوری مدد چاہئیے۔ اچھے دوست ہونے کے ناطے مجھے نا اُمید نہ کرنا۔ تم جانتے ہو کہ ہمارے محلے میں ایک افسانہ نگار مشاغل آفاقی صاحب رہتے ہیں۔ یہ خط اُسی خرانٹ کے بارے میں ہے۔ کل میں اُن کے گھر اُن کے چھوٹے بچوں کو پڑھانے گیا تو ایک عجیب سے اتفاق کے باعث میری نظر آفاقی صاحب کی ڈائری میں چھپے ہوئے ایک خط پر پڑی جو اُنھوں نے تمہارے شہر کی مشہور شاعرہ شاکرہ کے نام لکھا ہے کہہ نہیں سکتا اُسے پڑھا تو میرا خون کس قدر کھولنے لگا۔ یہ حضرت تین شادیاں کرنے کے بعد اور دو بچوں کے باپ ہونے کے باوجود اُس بے چاری معصوم شاعرہ سے رومان لڑا رہے ہیں۔ میں [illegible] حضرت کے بارے میں یہاں جو باتیں سچ سچ لکھ رہا ہوں تم سارے کا سارا حال اُس پہ [illegible]

یہ حضرت ایسے نہیں ہیں جیسا اپنی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ افسانہ نگاری کرنے سے پہلے یہ حضرت عامل تھے۔ لوگوں سے پیسے کر جادو ٹونے کیا کرتے تھے۔ لوگوں کو دھوکے دیا کرتے تھے۔ اِن کی پہلی بیوی بے چاری اِسی غم میں گھُل گھُل کر مری۔ دوسری بیوی ہوشیار تھی۔ گھر آتے ہی ایک ہفتے کے اندر ہی اندر اُس نے اِن کی کایا پلٹ دی۔ داڑھی منڈوادی اور اپنے میکے والوں کی کوششوں سے ایک دفتر میں کلرک رکھوا دیا۔ لیکن خود ایک آفیسر کے ساتھ بھاگ گئی۔ اب یہ تیسری بیوی ہے جس کا اچھا ادبی ذوق ہے، افسانے لکھا کرتی ہے۔ تو یہ حضرت اُسے اپنے نام سے چھپوا لیتے ہیں حالانکہ خود اُن کی حالت یہ ہے کہ سیدھا خط بھی نہیں لکھ سکتے تم ضرور بے چاری شاعرہ کو یہ باتیں بتا دینا۔ ہاں لگے ہاتھوں میرے بارے میں بھی ذکر کر دینا مجھے بھی ادبی ذوق ہے۔ لکھتا نہیں ہوں تو کیا ہوا بہت شوق سے پڑھتا ہوں اور [illegible] ادبی اداروں کو چندہ دیتا ہوں۔ شاکرہ کی شاعری کا دلدادہ ہوں۔

اچھا میرے دوست! مجھے اُمید ہے کہ تم مجھ پر یہ احسان ضرور کرو گے بھابی جان کو سلام۔

تمہارا اپنا —— ارشاد خان

نوٹ : باتیں ذرا دانشمندی سے کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بات بننے کی بجائے بگڑ جائے۔

الٰہ آباد ۲۲ر جولائی ۱۹۶۱ء

محترمہ شاکرہ اکبری، آداب

آپ کے نام لکھا ہوا مشاغل آفاقی کا خط اور آپ کی تازہ نظم ملی۔ آپ اطمینان رکھئے اس خط میں دیئے ہوئے حالات کو ہم بہت مخفی طریقے سے ظاہر کریں گے۔ مشاغل صاحب کو کوئی علم نہ ہوگا کہ یہ خط ہمارے ہاں آ چکا ہے۔

آپ نے لکھا تھا کہ اپنے فن پر آپ ایک مضمون ایشور سنگھ کے نام سے روانہ کریں گی۔ وہ ہمیں ابھی تک نہیں ملا۔

"فرمان" کے خاص نمبر کے لئے کوئی چست سی نظم بھیجئے۔ ہم آپ کی تخلیق اس میں ضرور دینا چاہتے ہیں۔

پچاس روپیوں کا چیک بطور حقیر نذرانہ روانہ کیا جا رہا ہے۔ اِسے معاوضہ نہ سمجھئے گا۔ کارلائقہ سے یاد کریں۔

خیراندیش —— [illegible]

ڈیر مسز ہمدانی گڈ مارننگ ٹو یو

کیسی ہو مسز ہمدانی؟ تمہاری شادی جب سے ہوئی ہے، تم نے تو ہاسپٹل [illegible] سے ہی ہاسپٹل کو یوں بھلا دیا۔ ڈیوٹی سے فارغ ہوکر جب بھی اپنے کوارٹر میں آرام کرنے بیٹھتی ہوں، تمہیں بہت یاد کرتی ہوں۔ خصوصاً مسز ڈی میلو اور مسز [illegible] دونوں وارڈ نمبر ۸ میں نائٹ ڈیوٹی کر رہی ہیں۔ وارڈ کی بات [illegible] ایک انتہائی دلچسپ بات تمہیں بتاؤں؟ تقریباً دو ہفتے پہلے کی بات ہے۔ ایک شام ایک آدمی کو لایا گیا تھا جو بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ غیر بے ہوشی کی حالت میں بہت سے کیس یہاں آتے ہیں بات کوئی غیر معمولی نہیں تھی کہ چرچا ہو۔ ڈاکٹر چاولہ کے ہاتھ میں وہ کیس آیا۔ ہم نے اُسے آکسیجن پر رکھا تھا۔ اُسے ہوش میں لانے کی بڑی کوشش کی گئی اور بہت تفتیش کی گئی کہ اس کی طبیعت کی خرابی کا باعث معلوم کیا جائے۔ پانچ دن تک کوئی پتہ نہ چلا۔ چھٹے دن اُسے یونہی آپریشن تھیٹر میں لے گئے تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر چاولہ باہر آئے اور حیرت انگیز انکشاف انہوں نے کیا کہ وہ مریض اپنی جنس تبدیل کر رہا ہے مرد سے عورت بن رہا ہے۔ ایسا انکشاف اتنا حیرت انگیز تھا کہ چند ہی منٹوں میں ہسپتال کا سارا عملہ اُسے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑا۔ بات ہسپتال سے باہر گئی تو ایک زبردست مجمع ہو گیا۔ شام کو چار سے چھ بجے تک جو ملاقاتیوں کے آنے کا وقت ہے، اُس وقت لوگوں کا اتنا ہجوم ہو جاتا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ سنا ہے یہ شخص اُردو کا ایک مشہور شاعر ہے جو شہرت کی غرض سے عورت کے نام سے اپنی نظمیں اور غزلیں پرچوں میں دیا کرتا تھا۔ جب ہم نے پہلی بار اُس کی بیوی کو یہ بات بتائی کہ اُس کا شوہر عورت بن رہا ہے تو بے چاری کی حالت بہت عجیب ہو گئی تھی۔ ایک سکتے کا عالم تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوش ہو رہی ہے یا اُسے افسوس ہے۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا سکتہ ٹوٹا تو وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی "ہائے! اب میں اپنے بچوں سے جاکر کیا کہوں؟ کہہ دوں کہ اُن کا باپ مرگیا ہے یا باپ بھی ماں بن گیا ہے؟"

تمہیں یاد ہوگا، جب بھی میں نے مرد کی بے وفائی اور بے اعتباری کی بات کی تھی تو تم نے میرا مذاق اُڑا لیا تھا۔ یہ بھی مرد کی بے وفائی اور بے اعتباری کا ایک معمولی سا ثبوت ہے۔ میں اب بھی کہتی ہوں کہ مجھے مردوں سے بڑی نفرت ہے اور اُس موئے ڈاکٹر راجندر سے بھی۔ پتہ نہیں وہ ہسپتال کو فیشن پریڈ کا اڈا کیوں سمجھتا ہے۔ ہر روز بن سنور کر خوشبو کی لپٹیں اُڑاتا، سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بناتا اب بھی وہ میرے بہت قریب سے ہوکر اس طرح گزرتا ہے جیسے وہ لاشعوری طور پر ایسا کر رہا ہو۔ لیکن میں سب جانتی ہوں۔ ایک دن تو اُسے ایسا طمانچہ جڑ دوں گی مسٹر کہ میری یہ نوکری بھی چلی جائے تو کوئی پروا نہیں۔

کبھی فرصت ہوگی تو پھر لکھوں گی۔ فوراً کچن کی طرف جانا ہے۔ ورنہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر آیائیں مریضوں کے حصے کا دودھ پی جائیں گی اور میٹرن کے ڈر سے پھر اُس میں پانی ملاکر مقدار پوری کرتی ہوں گی۔ وہ تو تم جانتی ہی ہو۔ اچھا باقی باقی! ——— ہمدرد

مسز بیگ

بنگلور ۱۰ر جنوری ۱۹۶۵ء

مائی ڈیر صفیہ آداب

بیگم خورشید حسین کی زبانی تمہیں جو اطلاع ملی وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ کیا کروں بہن میری زندگی اجیرن ہو گئی۔ ہائے قدرت نے میرے ساتھ کتنا بھیانک مذاق کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے حالات پہ چیخ چیخ کر روؤں یا حالات کے اس مذاق پر کھل کھلا کر ہنس دوں۔ تمہارے ماضی کے بھائی صاحب اور حال کی بہن صاحبہ کو گزشتہ ہفتہ مردانہ وارڈ سے زنانہ وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ شاید وہ تین ہفتوں میں اب ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ اُن کے سارے جسم میں بتدریج تبدیلیاں ہوتی جا رہی ہیں۔ آواز بدل گئی۔ جسم کی ساخت بدل گئی داڑھی مونچھ غائب ہو گئیں۔ بس وہ میری ساڑی پہنے ہسپتال کے برآمدے میں کچھ دیر کے لئے آئیں تو لوگ پلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ جنہوں نے پہلی بار انہیں دیکھا ہے وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ یہ جیسے پہلے ایک مرد تھیں۔ آواز اور جسم کی ساخت کے ساتھ ساتھ اُن کی عادتیں بھی بدل گئی ہیں۔ بات بات پر شرماتی ہیں۔ [illegible] ہیں پرسوں میں ہسپتال سے گھر لوٹ رہی تھی تو مجھے یاد دلایا کہ دوسرے دن آتے وقت میں پاؤڈر کا ڈبہ اور اسنو ضرور لاؤں۔ آج اپنے ایک پرانے دوست قمرالدین بڑی چاندی والا کے ساتھ بہت شرما شرما کر کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ میں گئی تو خاموش ہو گئیں۔ ہاں جب میں واپس ہو رہی تھی تو اتنا کہا کہ کل میں گھر سے آتے وقت وہ کالے کا نکلس بھی لیتی آؤں وہ پہن کر دیکھنا چاہتی ہیں کہ وہ کیسی لگتی ہیں۔ قمرالدین بڑی چاندی والا کے ساتھ شاکرہ کی اتنی بڑھی ہوئی دوستی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ پتہ نہیں اتنی دیر تک وہ آخر کیا باتیں کرتے ہیں۔ دو دن ہوئے ایک نرس کی زبانی معلوم ہوا کہ قمرالدین بڑے ڈاکٹر کی اجازت لے کر صبح کے اوقات میں بھی ایک دو گھنٹے کے لئے ملنے آیا کرتا ہے۔ گویا کچھ باتیں ضرور ہیں جو یہ میری غیر موجودگی میں کرتے ہیں۔ نہیں نہیں، بہن! مجھے تو اس عورت کے تیور اچھے نہیں لگتے۔ بار بار خیال آتا ہے، اگر میرے زیور، پیسے اور جہیز میں آئی ہوئی ساڑیاں اور چھوٹا موٹا سامان سمیٹ کر یہ عورت کہیں بڑی چاندی والا کے ساتھ بھاگ جائے تو میں ہاتھ ملتی ہوئی رہ جاؤں گی۔ سوچو آخر میں اپنے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر کہاں جاؤں گی۔ ماضی جو کچھ بھی تھا اچھا تھا۔ حال کے یوں ایکا ایک بدل جانے سے اب مستقبل خوف کے بادلوں میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ میرا کیا ہوگا؟ میرا کیا ہوگا؟ میں بے حد پریشان ہوں۔ جو کچھ سوچ رہی تھی بے تکلفی کے ساتھ سپردِ قلم کر دیا کیونکہ اب میری غمخوار تم ہی ہو۔ آگے اور لکھا نہیں جاتا۔ مجھے جلد جواب دو۔

تمہاری دُور افتادہ اور مصیبت زدہ سہیلی ——— عذرا

غزلیں

عابد مناوری

کیا کہیں اُن سے ماجرا دل کا
ہے عجب ہی معاملا دل کا

اُس گُلِ تر نے کیا نظر پھیری
گلستاں ہی اُجڑ گیا دل کا

کیوں مداوائے درد کرتے ہو؟
درد ہی تو ہے آسرا دل کا

تم بھی کہنے کو صاحبِ دل ہو
پھر نہ سمجھو گے مدعا دل کا

آج پچھتا رہے ہیں ہم ناصح!
ہم نے مانا تھا کیوں کہا دل کا

جب وہ سُن کر بھی کچھ نہیں سنتے
ہم کہیں اُن سے حال کیا دل کا

آپ دیکھیں تو مل کے عابد سے
آدمی وہ نہیں بُرا دل کا

صفیر احمد صوفی

ڈھلی چاندنی، وہ درختوں کے سائے
بھلانے کے باوصف وہ یاد آئے

بہ اُمیدِ مبہم کہ شائد وہ آئے
میں بیٹھا ہوں پلکوں پہ شمعیں جلائے

ابھی میں نے رودادِ غم بھی نہ چھیڑی
وہ بیٹھے ہیں کیوں اپنی نظریں جھکائے

سرِ میکدہ کیوں دُھواں اُٹھ رہا ہے
کوئی رند آیا ہے دامن جلائے

بظاہر رہا بے نیازِ تمنا
بھرا عشق کی آگ دل میں چھپائے

رہِ آرزو میں، ہر اک سانحے سے
گذرتا گیا جوت من کی جگائے

بہت دن رہے اُن کی خلوت میں صوفی
کوئی کیسے اب لکھنؤ سے نہ جائے

عارف احمد

اللہ اللہ اُن کا غم
بھول گئے ہم اپنا غم

دل کا غم، دنیا کا غم
تھا کتنا ہمارا غم

خوب ہمیں تڑپایا ہے
کتنا شوخ ہے تیرا غم

عشق کا سودا کیا کیجیے
دل دینا اور پانا غم

ہنستے ہنستے بجھ گیا دل
عین خوشی میں دیکھا غم

آنسو خود تھے بہتی آگ
اِن سے بھلا کیا بجھتا غم

اُس کی عطا تھی اے عارف
کرلیا ہم نے گوارا غم

محمود واجد

تمہارا یہ کرم بھی کم نہیں ہے — نوازش ہے مگر پیہم نہیں ہے
مرا دل بے نیازِ غم نہیں ہے — مگر پہلا سا وہ عالم نہیں ہے
جنابِ شیخ کی محفل نہیں یہ — یہاں تخصیصِ بیش و کم نہیں ہے

سرخ حاشیہ

نریش کمار شاد

15۔ الف۔ موتی باغ ۲۔ نئی دہلی

۳۰ مارچ ۱۹۶۵ء

محبی و محترمی، خوشتر صاحب (بقول پرنسپل کنھیالال کپور تجے بیسویں صدی)

آپ کی طرح "بیسویں صدی" کے قارئین بھی تنوع پسند ہیں اس لئے اُن کے ذہنوں کا ذائقہ بدلنے کے لئے اِس بار انٹرویو کی بجائے سرخ حاشئے کی ایک تازہ قسط پیش کر رہا ہوں ... اُمید ہے آپ بخیریت سے ہوں گے لیکن آپ کی اُمید کے مطابق میں خیریت سے نہیں ہوں شاد

میں پھر بھی ہنس رہا ہوں، یہ میرا کمال ہے

آپ کا اپنا ——— نریش کمار شاد

بے بسی ———●

حیدرآباد دکن کی عدالت عالیہ کے مفتی مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم نے اپنے یہاں ایک مختصر سی بزم مشاعرہ کا انعقاد کیا۔ مدعو شعراء میں حضرت جوش ملیح آبادی بھی شامل تھے۔ مشاعرے کے اختتام پر مولانا نے تمام شاعروں کو چائے کی دعوت دی اور جب یہ چائے جوش صاحب کے سامنے لائی گئی تو وہ مولانا کی عظمت سے مرعوب ہونے کے باوجود تری لہجہ سے کہنے لگے۔

"معاف کیجئے، مولانا یہ تو شیر کو گھاس کی دعوت ہے۔"

موازنہ ———●

اختر شیرانی نشے میں دُھت تھے کہ اُن کے کسی دوست نے پوچھا "اختر صاحب——جوش ملیح آبادی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" "آڑھتی ہے صرف آڑھتی——الفاظ کی آڑھت کرتا ہے ——" اختر صاحب نے رُک رُک کر کہا۔

"جوش الفاظ کا آڑھتی ہے تو جناب آپ کیا ہیں؟" اِس دوست نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

"الفاظ کا جوہری——" اختر صاحب لڑکھڑاتے ہوئے بولے۔

سعادت مند ———●

اُردو کے مشہور مزاح نگار احمد شاہ بخاری پطرس نے جو اُن دنوں دہلی میں ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر جنرل تھے ایک بار نہایت سرپرستانہ انداز میں سعادت حسن منٹو کو کوئی مشورہ دیتے ہوئے ابھی اتنا ہی کہا تھا۔

"دیکھو منٹو! میں تمہیں اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں ——" کہ منٹو نے جھلا کر اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"—— لیکن میں آپ کو اپنے باپ کے برابر نہیں سمجھتا۔"

جواز ———●

اسرارالحق مجاز سے ایک بار ازراہِ مذاق رضیہ سجاد ظہیر نے پوچھا "مجاز صاحب! نام تو ہے آپ کا اسرارالحق اور تخلص آپ نے رکھا ہے مجاز؟"

"اِس لئے کہ حق کے تمام اسرار مجاز ہی کے ذریعے واضح ہو سکتے ہیں؟" مجاز نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

تفاوت ———●

جن دنوں حفیظ جالندھری اور اسرارالحق مجاز کے درمیان معاصرانہ چشمک زوروں

...[illegible] والوں کے خلاف ایک نظم کے جواب میں مجازؔ نے صرف یہ شعر کہنے
...کیا۔

وہاں کا حُسن تو سب کچھ ہے مانا
مگر خود عشق تو جالندھری ہے۔

...قات ●

راولپنڈی کے ایک مُشاعرے میں مجازؔ اور عدمؔ دونوں مدعو تھے۔ اتفاق
...دونوں بلانوش بغیر پئے مُشاعرے میں شامل ہوئے۔ مشاعرے کے دوسرے دن
...نے سرِ شام ہی اپنی قیام گاہ پہ چراغِ بادہ روشن کر لیا۔ جب عدمؔ اُن سے
...ات کے لئے وہاں پہنچے تو مجازؔ نے عدمؔ کو دیکھتے ہی نہایت گرمجوشی سے اُن کا خیر مقدم
الفاظ میں کیا۔

"آؤ بھائی! اب تک تو اسرارالحق اور عبدالحمید ہی ملتے رہے ہیں۔ اب مجازؔ اور
...م کی ملاقات بھی ہو جائے۔"

ردِ عمل ●

ایک محترمہ جو خدا کے فضل سے متعدد بچوں کی ماں تھیں ایک بار اُنہیں اپنے
...ہر کے ساتھ دیکھ کر ضمیرؔ جعفری نے اپنا ذہنی ردِ عمل اُسی وقت ایک شعر میں موزوں
...یا ؎

بہ فیضِ کثرتِ اولاد وہ نوبت بھی آ پہنچی
جہاں بچوں کی ماں شوہر کی ماں معلوم ہوتی ہے

...ئینہ ●

بھٹنڈہ کے ایک مُشاعرے میں جب مشیرؔ جھنجھانوی نے یہ شعر پڑھا ؎
دیوانے کے ہمراہ بھی رہنا ہے قیامت
دیوانے کو تنہا بھی تو چھوڑا نہیں جاتا

تو سامعین میں سے کسی خوش مذاق نے کہا۔
"سبحان اللہ! کیا ہمہ گیر شعر فرمایا ہے۔ شعر کیا ہے ہر شاعر کی بیوی کے
دلی جذبات کا آئینہ ہے۔"

حاصلِ کلام ●

دلّی کلاتھ مل کے مُشاعرے میں ایازؔ جھانسوی نے اپنی ایک غزل شروع کی۔

...رم کی لاج سوالوں کی آبرو رکھ لی
جو تم نے میرے خیالوں کی آبرو رکھ لی
اور جب وہ یہ شعر پڑھنے لگے۔
مرے کلام سے بہتر ہے میری خاموشی
نہ جانے کتنے سوالوں کی آبرو رکھ لی
تو پہلا مصرع سنتے ہی سامعین میں سے کوئی بولا۔
"بلاشبہ صاحب بلاشبہ۔ کیا حاصلِ کلام مصرع فرمایا ہے۔"

ذی استعداد ●

اکبرؔ الٰہ آبادی کاتبوں کی غلط کاریوں سے بہت عاجز تھے۔ ایک بار مولانا
ظفر الملک علوی ایڈیٹر ماہنامہ الناظر کو اُنہوں نے ایک خط میں لکھا۔
"میں اپنے مسودات کو خود نہیں پڑھ سکتا۔ کاتب صاحب ایسے ذی استعداد
ہیں کہ کونسلوں میں سیٹ کو "گھونسلوں میں بیٹ" لکھ دیتے ہیں۔"

مشورہ ●

اکبرؔ الٰہ آبادی کے ایک نہایت بے تکلف دوست نے جب اُنہیں ایک
ایسی ٹوپی دکھائی جس پر "قُل ھو اللہ" کڑھا ہوا تھا تو اکبرؔ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بہتر تو یہ
ہے۔ اگر کسی دعوت میں کھانا آنے میں دیر ہو جائے تو فوراً یہ ٹوپی پیٹ پر رکھ لیجئے۔
سب سمجھ جائیں گے آپ کی انتڑیاں "قل ھو اللہ" پڑھ رہی ہیں۔"

استدلال ●

مولانا محمد علی سیتا پور کی ایک دعوت میں مہاتما گاندھی کے ساتھ شریفے
کھانے لگے تو مہاتما جی نے اُنہیں ٹوکتے ہوئے کہا۔
"آپ کو ذیابیطس ہے شریفے آپ کو تکلیف دیں گے۔"
مولانا نے برجستہ جواب دیا۔ "سسرال کا مال بھی کبھی تکلیف دیتا ہے
گاندھی جی!"
"سسرال کا مال ــــــــ؟" گاندھی جی متعجب ہو کر بولے۔
"جی ہاں ــــــــ!" مولانا نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے
کہا "یہ شریفے تو سیتا پور کے ہیں نا اور میں رام پور کا رہنے والا ہوں۔"

کلمۂ خیر ●

مولانا محمد علی شریفوں کے اتنے رسیا تھے کہ ڈاکٹروں کی مخالفت کے باوجود

انھیں کھانے سے باز نہیں آسکتے تھے۔

ایک بار علی گڑھ میں شریفے کھا رہے تھے۔ شریفوں کے بیج ادھر اُدھر پھینکنے لگے تو کسی نے ایسا کرنے کی وجہ دریافت کی۔ کہنے لگے۔

"علی گڑھ میں شریفوں کی کمی ہے اس لئے بیج بو رہا ہوں۔"

استفسار ———•

جوش ملیح آبادی ایک بار ڈاکٹر اقبال سے ملنے گئے۔ علامہ اپنے آگے قرآن کھولے زار زار رو رہے تھے۔

جوش صاحب نے انتہائی معصومیت سے سوال کیا "کیوں علامہ کوئی وکیل قانون کی کتاب پڑھتے ہوئے بھی روتا ہے؟"

خاوند بیوی کا رہنما

پریم شاستر ‖ کام شاستر ‖ گرہستھ شاستر

اِن کتابوں میں ایسے ایسے راز اور نکتے بیان کئے گئے ہیں جن کا جاننا نوجوان جوڑوں کے لئے بہت ضروری ہے۔ ایسے ایسے کارآمد نکتے جو اکثر تجربہ کار سے تجربہ کار خاوندوں کو بھی معلوم نہیں اور جنھیں جاننے کے بعد آپ کو شادی کی اصلی مسرتیں حاصل ہوں گی۔ گھر کو بہشت بنانے کی تدابیر تفصیل سے لکھی گئی ہیں۔ خاوند اور بیوی کے لئے اِن کتب کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنی ایک انسان کے لئے ہوا اور غذا ضروری ہے۔

اِن کتب کی خوبیوں کا اندازہ آپ اِس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان جیسے غریب ملک میں اِن کتب کی چھ لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز کسی خاص خوبی کے بغیر اتنی بھاری تعداد میں فروخت نہیں ہو سکتی

پریم شاستر باتصویر ——— قیمت اُردو تین روپے ہندی تین روپے

کام شاستر باتصویر ——— قیمت اُردو تین روپے ہندی تین روپے

گرہستھ شاستر باتصویر ——— قیمت اُردو تین روپے ہندی تین روپے

ملنے کا پتہ: رسالہ بیسویں صدی دہلی

دلچسپ نئی کتابیں

سنگ و خشت اُردو ادب میں طنز نگاری کے میر کارواں پروفیسر کنھیا لال کپور کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت صرف دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

چنگ و رباب پروفیسر کنھیا لال کپور کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ قیمت صرف دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

ابراہیم لنکن امریکہ کے محبوب ترین صدر کی سوانح عمری جس نے غلامی کا قلع قمع کیا اور مساوات اور آزادی کو انسان کا پیدائشی حق قرار دیا قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

روح و جسمانی معذوریوں پر قوت عمل کی فتحیابی کی کہانی۔ ایک نابینا بچے کی قابل ستائش کوششوں کا مرقع۔ قیمت تین روپے ۲۵ نئے پیسے۔

نور ایک قاصد کو اپنے اندر جاذبیت اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے کیا کیا امتحان قربانیاں دینی پڑیں۔ قیمت صرف دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

آرزو کی کلیاں امریکہ کے شہرۂ آفاق ناول نگار جان سٹین بیک کے دو مختصر ناولوں کا حسین ترجمہ۔ قیمت ایک روپیہ پچھتر نئے پیسے۔

دنیا کے مشہور سائنس داں یہ کتاب آپ کو ان سائنس دانوں کی زندگیوں سے روشناس کرائے گی جنھوں نے نسلِ آدم کو ترقی کے موجودہ زینے پر پہنچایا قیمت صرف دو روپے پچیس نئے پیسے۔

اپنی منزل اپنی راہیں ہولیم سرویان کا بے نظیر ناول جس کی فلم بنی تو ساری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ انسان کے دکھ سکھ کی کہانی۔ قیمت صرف دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

شکست ظلمت یہ ایک اندھی عورت ہیلن کیلر کا افسانۂ زندگی ہے جس نے اپنی انگلیوں سے آنکھوں کا کام لیا اور دنیا سے اپنی ذہانت کا لوہا منوایا۔ قیمت ایک روپیہ ۷۵ نئے پیسے۔

مابی ڈک ہرمن میلول کا مایۂ ناز شاہکار۔ آسمانِ ادب کا جگمگاتا تارا قیمت چار روپے

سائنس کی دنیا یہ کتاب آپ کو سائنس کی ہر پیچیدگی کو سمجھنے میں مدد دے گی۔ آج دنیا میں کوئی بھی انسان سائنس سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا مصنف ولیم اینج کروزر مترجم ایم ایم بیگ۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

ملنے کا پتہ: رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶

قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

[illegible]	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
...ت اقبال	ڈاکٹر اقبال	چھ روپے
...ات و ہوش	جوش ملسیانی	چار روپے
...ت رنگ	عرش ملسیانی	تین روپے
...نغمۂ حجاز	"	ایک روپیہ
...ر غزل	ساحر ہوشیارپوری	تین روپے
...ستک	نریش کمار شاد	دو روپے ۲۵ پیسے
...پتوار	"	دو روپے ۵۰ پیسے
...لکار	"	دو روپے ۲۵ پیسے
...اسمیں	"	تین روپے
...ایات جنوں	"	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
...سنگم	"	تین روپے
رباعیات محروم	تلوک چند محروم	تین روپے ۵۰ پیسے
گنجِ معانی	"	سات روپے ۵۰ پیسے
روپ	فراق گورکھپوری	تین روپے ۵۰ پیسے
رمز و کنایات	"	تین روپے ۵۰ پیسے
مشعل	"	دو روپے ۵۰ پیسے
بیکراں	جگن ناتھ آزاد	چار روپے ۵۰ پیسے
ستاروں سے ذروں تک	"	دو روپے ۵۰ پیسے
کلیاتِ اکبر الہ آبادی (اول)	اکبر الہ آبادی	پانچ روپے
" حصہ دوم	"	چھ روپے
کلیاتِ اختر شیرانی	اختر شیرانی	آٹھ روپے
رعنائیاں	شکیل بدایونی	تین روپے
صنم و حرم	"	دو روپے ۲۵ پیسے
گلِ رعنا	جگی رعنا	تین روپے ۵۰ پیسے
شبنم شبنم	کرشن موہن	پانچ روپے
دلِ ناداں	"	چھ روپے

غزلیات	عبدالحمید عدم	چار روپے
رمِ آہو	"	چار روپے
گلنار	"	دو روپے ۲۵ پیسے
قول و قرار	"	تین روپے ۵۰ پیسے
گردشِ جام	"	دو روپے ۲۵ پیسے
بطِ مے	"	دو روپے ۲۵ پیسے
گجر	قتیل شفائی	تین روپے
جھومر	"	تین روپے
روزن	"	تین روپے
جلترنگ	"	دو روپے ۲۵ پیسے
گفتنی	مخمور سعیدی	دو روپے
نئی صبح	ضیا فتح آبادی	ایک روپیہ
طلوع	"	۷۵ نئے پیسے
نورِ مشرق	"	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
آہنگِ غزل	پورن سنگھ ہنر	دو روپے ۵۰ پیسے
شہرِ دل	محسن زیدی	دو روپے
سفینہ و ساحل	عزیز وارثی	چار روپے

آئینۂ اصلاح ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر معہ توجیہہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

جوش ملسیانی کے مکمل حالاتِ زندگی، انتخابِ کلام شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویروں کے ۳۸۰ صفحے، ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ موجودہ دور کی بے مثل کتاب۔ قیمت دس روپے۔

مضراب شباب للت کے ایک ایک شعر میں اس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور ان دھڑکنوں میں اس نے سارے

جہان کے دکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ۔

گلستانِ ہزار رنگ جس میں تقریباً چار ہزار شعراء کے اشعار عنوان وار ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اس یادگار کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور ہندی کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نامِ نامی ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز فتحپوری نے اس کتاب کو اس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ اردو ایڈیشن دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۷۵ پیسے۔

شاہنامۂ اسلام جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام۔ چار حصوں میں ہے جن میں تیرہ سو سال اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے۔ ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے۔ کئی ایڈیشن ختم ہونے کے بعد چھپا ہے۔ قیمت سولہ روپے اب صرف نو روپے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

تلامذۂ غالب غالبیات کے مشہور ماہر مالک رام صاحب کی گرانقدر تصنیف۔ اس کتاب میں غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کی مکمل سوانح حیات اور کلام درج ہیں۔ پورے صفحہ کی تقریباً تیس تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں۔ ہندوستان بھر کے ادیبوں کا فیصلہ ہے کہ یہ کتاب بہترین ادبی تحفہ ہے۔ قیمت فی جلد سات روپے ۵۰ پیسے۔

کفر و ایمان پنڈت ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام حضرت اختر کا نام ہی اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا ضامن ہے۔ کلام میں طنز کے نشتروں کے ساتھ درد مند دل کی گرمی بھی ہے۔ قیمت چار روپے۔

کلامِ بے لگام ابنِ ناشاد دہلوی کا نادر مجموعۂ کلام جس کے ہر شعر میں اکبر الہ آبادی کا رنگ جھلکتا ہے۔ طنز و مزاح کا رنگین گلدستہ ۲۲۴ صفحات پر مشتمل دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا۔ قیمت مجلد چھ روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

[redacted]

جلتی، پگھلتی شمع

علیم حیدر

منجور، ڈاکخانہ نیلی بگیا، بہار

۸ مارچ ۹۵ء   محترم خورشید صاحب! آداب

.....دیکھئے کتنی دور سے ایک اجنبی آیا ہے۔ آپ بیٹھنے کے لئے منہیں کہیں گے .... ؟ آپ تو بہت اچھے ہیں سبھی کو جگہ دیتے ہیں۔ جان پہچان نہیں دیکھتے۔ اجنبی بھی آپ کے اپنے ہیں....

مخلص ——— علیم حیدر

بہت تیز بارش ہو رہی ہے۔ آسمان بھیانک کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے بہت سے لوگ سامنے برآمدے میں چھپے کھڑے ہیں۔ سمٹے ہوئے۔ سراپا انتظار کبھی کبھی بجلی چمک اٹھتی ہے۔ اور کچھ نگاہیں میری کوٹھی سے ٹکراتی ہوئی آسمان کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ جیسے کچھ اندازہ لگانا چاہتی ہوں۔ کتنی مایوسی ہوتی ہے ان لوٹتی ہوئی نگاہوں میں بارش تیز اور طوفانی ہوتی جا رہی ہے۔ میں خوش ہوں۔ میں چاہتی ہوں، تنی بارش ہو، اتنا بڑا طوفان آئے کہ ساری دنیا بہہ جائے۔ سب کچھ تباہ ہو جائے۔ ایک ایک نشان مٹ جائے۔ لیکن یہ سب کچھ نہ ہوگا۔ تم لوگوں کی آنکھوں کی اداسی ختم ہو جائیگی۔ جھونپڑیاں چھوٹ جائیں گی۔ کچھ لوگوں کو اپنی طاقت کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن میں جانتی ہوں تم کبھی نہیں ہارتے۔ مرد کبھی نہیں ہارتے۔ وہ جو چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے۔ ہار تو عورت کے لئے بنی ہے۔

تم نہیں مانتے ؟

آؤ میں تمہیں یقین دلاؤں۔

کل کی بات ہے ———

رات کے دو بجے ہونگے۔ حسبِ معمول قدم اِدھر اُدھر پڑ رہے تھے۔ میں انہیں سہارا دے کر خوابگاہ میں لے آئی۔ روز کی طرح۔ آج شاید انہوں نے کچھ زیادہ پی لی تھی میں اُن کا سر اپنی گود میں رکھ کر دبانے لگی ہوں۔ کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ جیسے ساری کائنات کی خوشیاں مل رہی ہوں۔ لیکن یہ سلسلہ ابھی ٹوٹ جائیگا۔ انہیں آج بھی پیاس لگے گی۔ اور پانی لے کر لوٹوں گی تو وہ گہری نیند میں ہوں گے۔ بالکل بے خبر۔ اور میں ؟ انہیں تکتے تکتے مجھے بھی نیند آ جائے گی میٹھی۔ گہری نیند۔ اُن کی یہ بے نیازی، یہ نفرت میری محبت اور بے لوث خدمت کے آگے کب تک قائم رہ سکے گی ؟ میں یونہی نہیں جلتی رہوں گی۔ ندی سدا ایک رُخ تو نہیں بہتی۔ لیکن آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں پانی لے کر آئی تو وہ ایک خوبصورت پینٹنگ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ قدموں کی آہٹ پر چونکے۔ میں نے دھیرے سے گلاس اُن کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ پانی پی کر بولے۔

"کتنا ٹھنڈا ہے !"

"ٹھنڈا! کیا آپ کو تپش کا ذرا بھی احساس نہ ہوا ؟ اسے میری جلتی انگلیوں نے چھوا تھا"

"جی!" میں نے دھیرے سے کہا۔

"مجھے ذرا پانچ بجے جگا دینا" وہ گلاس واپس کرتے ہوئے بولے۔

"تمہاری نیند اچھی ہے۔ روز دو بجے تم جاگ جاتی ہو" میں اُن کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ انہیں اس کا احساس تو ہوا کہ میں اُن کے لئے روز دو بجے جاگ جاتی ہوں۔ مجھے رات بھر جاگنے کا صلہ مل گیا۔

"جگا رہا جانا ہے" وہ لیٹ گئے "ساڑھے پانچ بجے جہاز ہے"

"کب تک وہاں رہیں گے ؟"

"جب تک کام ختم نہ ہو"

"پھر بھی"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ دو مہینے بھی لگ سکتے ہیں"

ہوتے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر اتنے دن یہاں کیسے رہے گی؟"

ایک کی درد بھری آواز!

"جی!" زبان سے بلکی سی کراہ نکلی۔

وہ ہنس رہے تھے۔ پھر بھی آج میں بے حد خوش تھی۔ اُن کا اس طرح باتیں کرنا۔ شاید زندگی پہلی ہی ہے۔ لیکن یہ خیال کہ وہ تم سا بہت چھا۔

صبح نہیں چھوڑنے گیٹ تک گئی۔ دل پر بوجھ بڑھ رہا تھا۔ کار کا دروازہ بند کرتے کرتے میں نے دھیرے سے کہا۔

"جتنی جلد ممکن ہو آنے کی کوشش کیجئے گا۔ ہوٹل کی زندگی۔ کوئی دیکھنے والا بھی نہیں اور پھر میں یہاں اِتنے دنوں اکیلی کیسے رہوں گی؟"

"میں نہیں سمجھا!" پیر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُنہوں نے کہا۔ میں کانپ گئی۔ "یہی ہوٹل

- اپنی صحت و تندرستی کے لئے شام کو فٹ بال، ٹینس اور پولو کھیلنے والو! تم دیہاتوں میں جا کر اُن غریب کسانوں کا ہاتھ کیوں نہیں بٹاتے۔ جن کے جسم ضعف کی زیادتی سے چور چور ہو رہے ہیں۔ (برنارڈ شا)
- انسان کے لئے اتنی عقل کافی ہے کہ وہ سعادت و شقاوت، ہدایت و ضلالت، راہ صواب و نا صواب میں امتیاز کر سکے۔ (حکیم جالینوس)
- میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ سب سے مہلک بیماری، خدا کی نافرمانی ہے (حکیم بوذر جمہر)
- عقل کی حد ہو سکتی ہے لیکن بے عقلی کی کوئی حد نہیں۔ (ایمرسن)
- گلیوں میں پھرنے والے آوارہ مزاج اور لچر قسم کے لوگ سنجیدہ مفکروں کے لئے سبق آموز شخصیتیں ہوتی ہیں۔ (اردن ایڈمن)
- خوبصورت عورت کو دیکھنے سے آنکھ اور نیک دل عورت کو دیکھنے سے دل خوش ہوتا ہے۔ (سیموئل)

ایک جیسے نہیں ہوتے اور پھر میری سکریٹری ریٹا دیکھ بھال کے لئے ساتھ جا رہی ہے"

زمین تیزی سے گھومنے لگی "یا اللہ! یہ میں کیا سُن رہی ہوں" میں جہاں سے چلی تھی وہیں آ گئی۔ وہ کہہ رہے تھے "تم نے تو کالج میں تعلیم پائی ہے۔ ایک آدھ رومانس تو ہوا ہی ہوگا۔ حافظہ بھی اچھا ہے" بہت معنی خیز انداز میں اُنہوں نے مجھے دیکھا۔ اور کار ایک دھچکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ مجھے کچھ سُجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں کیسے اندر آئی ہوش نہیں۔ کاش کبھی ہوش نہ آتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھے سب باتیں یاد ہیں تاکہ تڑپتی رہوں۔

"میرے ساتھ دیکھ بھال کے لئے ریٹا جا رہی ہے"

"ایک آدھ رومانس تو ہوا ہی ہوگا"

"حافظہ بھی اچھا ہے"

——— حافظہ بھی اچھا ہے۔

ہم لوگ نا سمجھ تھے۔

تمہارا ذکر چل رہا تھا۔ امی کی خواہش تھی تم ہمارے یہاں آ جاؤ۔ ممانی زبان سے تمہاری تعریفیں کرتی جا رہی تھیں۔ تمہاری ذہانت کی خوبصورتی کی۔ ڈیڈی کچھ سوچ رہے تھے۔ لوہا گرم تھا۔ اماں نے تجویز پیش کی۔ اُنہوں نے یہ بات مجھ پر ٹال دی۔ ورنہ ڈیڈی ایک ایک بات ——— ایک ایک بال کی کھال کھینچتے۔ جج ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کنسنٹ دینے میں کیوں دیر کرتی۔ تم جو آئے۔

بے حد خوشگوار دن تھا۔ میں سرسبز و شاداب لان میں کرسی پر بیٹھی ایک کتاب دیکھ رہی تھی۔ معاً تمہارے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اور تم میرے پاس آ گئے۔ بالکل نزدیک۔ میں تمہاری آنکھوں کے سحر میں کھو گئی۔ بے خود ہو گئی۔ کتنے معصوم معلوم ہو رہے تھے تم۔ تمہاری آواز کتنی دلکش تھی!

"میم صاحب!" تم نے میرے پینٹ کئے ہونٹ اور خوبصورت ناک کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "میری خالہ کہاں رہتی ہیں؟"

"اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!"

"جی!" میں نے مُسکرا کر تمہیں ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ اور رنگ و نور کیف و سُرور کی جنت میں کھو گئی!

تم میرے گھر میں رہنے لگے۔ میرے خوابوں میں بسنے لگے۔ لیکن اُس حسین و خوش آئند خواب کو ٹوٹنا تھا۔

ایک دن امی نے دھیرے سے مجھ سے پوچھا تمہیں معراج پسند ہے؟

کتنی بے خبر ہیں وہ؟ کیا میری ایک ایک ادا لوگوں سے میرے دل کی بات نہیں کہتی؟ میں امی کے سینے سے لگ گئی۔ اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ بہت محبت سے میری پیشانی کو چوما۔ اور فیصلے کے لئے جج صاحب کی طرف چلیں۔ میں کیسے بیٹھی رہتی۔ دل میں اُمنگوں اور آرزوؤں کی ایک دنیا لئے میں بھی امی کے ساتھ چلی۔

امی اتنی خوش تھیں کہ منہ سے بے ربط باتیں نکل رہی تھیں۔ ڈیڈی کے پیر چھوتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ "معراج میری مرحومہ بہن کا اکلوتا لڑکا ہے جیسے تمہارے بارے میں ڈیڈی کو کچھ نہ معلوم ہو۔" کتنی محنت سے اُس نے اس کی پرورش کی ہوگی۔ کتنا ذہین ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے ہم خیال بھی ہیں۔" وہ پھولی نہیں سما رہی تھیں۔ بہت دنوں کے بعد اُن کے چہرہ پر ایسی خوشی تھی۔ معلوم ہوتا تھا

[redacted]

آج امی کو کوئی فکر نہیں۔ وہ بہو کی جاری تھیں۔ تم دیکھتا۔ بچوں کی باتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ سمل نصیبن تھوڑی سی مہدی لے آئی تھی۔ پسی ہوئی۔ میں نے شمع سے کہا، رہنے دے۔ اسے سہیلیوں کا ڈر تھا کہیں بر باد نہ ہو جائے۔ معراج سے کہا۔ کہنے لگا "مہدی بھی کوئی ہاتھ میں لگانے کی چیز ہے۔ دیکھ کر ابکائی آتی ہے۔ مجھے تو نفرت ہے اس سے۔" حالانکہ وہ بچپن سے مہدی کا عاشق تھا۔ امی سانس لینے کے لئے رُکیں "مجھے تو بے حد پسند ہے۔ مانا کہ وہ غریب ہے۔ لیکن ذہین کیا ہے۔ کچھ ہی دنوں میں اچھا ڈاکٹر ہو جائے گا۔ ایک گھر میں دو ڈاکٹر اور رہیں گی بھی کس چیز کی ہے قطرہ قطرہ کا حساب ہو گیا تھا۔

"ہونہہ!" ڈیڈی نے ایک طویل سانس لی۔ میں سہم گئی۔ "بیگم!" اپنے پیر امی کی گود سے کھینچتے ہوئے انہوں نے دھیرے سے کہا۔

"پیسے اور وقت کو کبھی زیادہ نہ سمجھنا چاہئے۔" پھر رُک کر بولے۔

"میری زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم شمع کو جھونپڑی میں لے جا کر بٹھا دو۔" ڈیڈی کی آواز اونچی ہو گئی۔ "دو چار سال انتظار کرو پھر راستے صاف ہیں۔ دل کے مریض سے اور کیا اُمید رکھتی ہو۔" میں اس سے آگے کچھ نہ سن سکی۔ گرتی پڑتی آکر بستر پہ گر گئی۔ میں خوب رونا چاہتی تھی۔

دریا نہیں بھٹکا گیا تھا۔

اور پھر تم زندگی سے بیزار ہو گئے۔ تمہاری صحت گرنے لگی۔ امّاں ان باتوں کے لئے مجھے ذمہ دار قرار دے رہی تھیں۔ لیکن خدا گواہ ہے۔ میں نے تم سے کچھ نہیں کہا تھا۔ دل پر پتھر رکھ لئے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ غم کا کوئی ہلکا سا سایہ بھی تم پہ نہ پڑے۔ میں تم سے کھنچی کھنچی رہنے لگی۔ شاید میری بے رُخی تمہیں میری طرف سے برگشتہ کر دے۔ تم اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ۔ لیکن تم مجھے بے وفا سمجھنے لگے۔ تمہاری حالت نہیں بدلی۔ تم اِسٹڈی سے دُور ہوتے گئے۔ شاید تم نے ڈیڈی کی باتیں سُن لی تھیں تم نے پیریڈ بھی چھوڑنا شروع کر دیئے تھے۔ یہ سب مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا۔

ایک دن ——

تم زینہ اُتر رہے تھے۔ میں راستے میں آ گئی۔

"چلو معراج! وارڈ تک۔ ہارٹ آپریشن ہے۔ تمہارے پسندیدہ سرجن ڈاکٹر فریدی ہیں۔" میں ایک سانس میں سب کہہ گئی۔

"دل کا۔" تم نے سرگوشی کی۔ پھر میری آنکھوں میں اُترتے ہوئے دھیرے دھیرے سے بولے۔ "میں نے دیکھا ہے خون ہرتے ہوئے۔ تمہارے لئے نئی چیز ہے۔ جاؤ دیکھ لو، مریض پر کیا بیتتی ہے۔" میں کٹ کر رہ گئی۔ کاش! تم میری مجبوری سمجھتے۔ ایک لڑکی کتنی کمزور ہوتی ہے یہ سمجھ سکتے۔ کاش تمہیں ڈیڈی کی ضد کا پتہ ہوتا۔

اور ایک دن تمہاری یہ وحشت اتنی بڑھی کہ ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلے گئے تھے کہ آنسو بھی تمہیں نہ روک سکے۔ میں تڑپتی رہ گئی۔ تم نے کبھی ایک خط بھی نہ لکھا۔ میری حالت بدتر ہوتی گئی۔ میں تمہیں دیکھ کر جی لیتی تھی۔ وہ سہارا بھی نہ رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں۔ ڈیڈی کے خیال میں میرا ایک ہی علاج تھا کہ میری شادی کر دی جائے۔ ایک جگہ انہوں نے ہاں بھی کر دی۔ بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔ جلد ہی آنے والا تھا۔ کیا سمجھدار تھا بیچارا۔ پڑھا لکھا۔ اپنے والدین کے لئے کسی طرح کی پریشانی کیسے لاتا۔ اس نے مجھے ایک راہ بتا دی تھی۔

دوسرے دن میں تمہارے چھوٹے سے شہر کی طرف چل پڑی۔ میں تمہیں کیسے ہار جاتی۔ ڈیڈی کو دوسرا لڑکا بھی مل سکتا تھا۔ تمہارا گھر میرا دیکھا ہوا نہیں تھا۔ لیکن ایسے پہنچ گئی جیسے ہزاروں بار آ چکی ہوں۔

- مرد عموماً بُزدل عورتوں کو پسند کرتے ہیں، تاکہ اُن کی حفاظت کر کے اُن کے آقا بن سکیں۔ (برٹرنڈ رسل)
- شادی کا مطلب ایک دوسرے کے جسم پہ حکومت کرنا نہیں، اِس کا مطلب یہ ہے کہ ایک کی کمی دوسرے سے پُوری ہو۔ (سیموئل)
- سوچنا نہایت مشکل کام ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت کم لوگ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ (ہنری فورڈ)
- امیروں کا یہ خیال کہ غریب خوش اور بے غم ہوتے ہیں، اتنا ہی احمقانہ ہے، جتنا غریبوں کا یہ خیال کہ امیر خوش و خرّم ہوتے ہیں۔ (واشنگٹن پوسٹ)
- کچھ نہ کچھ عیب سب میں ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ عقلمند اپنے عیب خود محسوس کر لیتا ہے، دنیا نہیں محسوس کرتی۔ بے وقوف اپنے عیب خود نہیں محسوس کرتا، دنیا محسوس کرتی ہے (ڈاکٹر جانسن)

تم سوئے ہوئے تھے۔ وہ منظر نہیں بھولتا۔ جیسے کوئی کہانی کا روٹھا ہوا شہزادہ غم کی چادر اوڑھے سو رہا ہو۔ تمہاری حالت کیسی ہو گئی تھی۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ لیکن تمہارے ہاتھ مہدی سے سُرخ تھے۔ تمہیں دیکھ کر میری حالت عجب ہو گئی۔ آنسوؤں پہ قابو نہ رہا۔ میں سر جھکائے رو رہی تھی۔ میری سسکیوں کی آواز سے تمہاری نیند ٹوٹ گئی۔ تمہاری حالت عجیب تھی۔ مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بچہ نہ سمجھ میں آنے والا تماشہ دیکھ رہا ہو۔ کوئی احساس کوئی تاثر نہیں۔ لیکن میرے آنسو تم سے زیادہ دیر تک نہ دیکھے جا سکے۔ مجھے بڑھ کر بازوؤں میں لے لیا۔ میں تمہارے سینے سے لگی ہچکیوں کے درمیان بول رہی تھی۔

ے نہیں تو مہری سے نفرت تھی۔ کیسے رسیت بدل لی۔ کتنی جلدی ہار گئے ہم!
شمع! مجھے معاف کر دو۔" تم نے میرے آنسو اپنی سُرخ سُرخ، خوبصورت
میں جذب کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔" اماں کا کوئی ٹھیک
تو میں کبھی اُن کی کوئی خدمت کرنے کے قابل نہ ہوا۔ اُن کی خواہش کیسے
دیتا۔ اور پھر جو راستے تم نے اپنائے ہیں مجھے پسند نہیں۔ میں کبھی تمہارا ساتھ
سکتا۔ اتنا ہم لوگ کیسے گر سکتے تھے؟" میں تمہیں تکنے لگی۔

"خدا کے لئے اس طرح نہ دیکھو شمع! میں بہک نہ جاؤں۔" تم نے میری
میں دیدیں۔" ہماری چاہت پاک ہے۔ بدنام نہ ہو جائے۔ آؤ ہم دونوں
لیں کہ ایک دوسرے کو بھول جائیں گے۔ جیسے ہم کبھی ملے تھے۔ یہی ہماری
ہے۔" تمہاری آنکھیں بھیگ گئیں۔ کتنے عظیم تھے تم!

میں بھی بہک جاتی، اگر میرا مذہب اجازت دیتا۔ میں اُسی دن گھر لوٹ آئی۔
کچھ پتہ تھا۔ میں تمہیں بھول گئی۔ کتنی کھٹور ہو گئی تھی۔ لیکن راہی دو ہوں تو منزل
نی سے مل جاتی ہے۔ تم بھی تو اسی راہ سے گذر رہے ہو گے ـــــ ایک وقت
میں تمہیں بالکل بھول گئی۔ وہی شمع بن گئی جیسی تمہیں دیکھنے سے پہلے تھی۔ جیسے
میری زندگی میں کبھی کوئی نہ آیا ہو۔ کوئی ناکامی نہیں۔ کوئی حسرت نہیں، کوئی تڑپ نہیں۔
کے سارے لوگ خوش تھے۔ اور گھر کے لوگ زیادہ خوش ہوتے ہیں تو شادی
دیتے ہیں۔ میرے یہاں بھی تیاریاں ہونے لگیں۔ لڑکا ڈیڈی کے معیار پر کھرا
دولت والا۔ بالکل آزاد خیال۔ ایک دن پتہ چلا اُن کے چال چلن کچھ زیادہ اچھے نہیں
یڈی کے آگے کسی کی کیا چلتی۔ اُن کے خیال میں یہ لغزشیں جوانی کے ساتھ چلی جاتی ہیں۔

امّی نے کہا تھا "بیٹی! عورت، محبت سے سب کچھ جیت سکتی ہے" لیکن ڈیڈی
لت کے آگے امّی کی کیا بساط!

آج وہ ہار گئی ہیں۔

میں اُنہیں محبت سے نہ جیت سکی۔

تم نے کہا تھا ہم ایک دوسرے کو بھول جائیں۔ جیسے کبھی نہ ملے تھے یہی ہماری
نیت ہے۔

میں تمہیں بھلا نہ سکی۔

آج میں بھی ہار گئی ہوں۔

تمہیں میری یاد کبھی نہ آتی ہو گی۔

تم نہیں ہار سکتے۔

جوانی کے ساتھ اُن کی لغزشیں ضرور چلی جائیں گی۔

ڈیڈی بھی نہیں ہار سکتے۔

مو کبھی نہیں ہارتا۔ ہار تو عورت کے لئے بنی ہے۔
پانی ختم ہو گیا ہے۔ نہ اتنی بارش ہو سکی، نہ اتنا ... آ سکا ... بہا
بہہ جاتی، تباہ ہو جاتی۔ ایک ایک نشان مٹ جاتا۔ تم لوگوں نے جو ہاری ہے
اب تمہیں یقین آ گیا ہے۔ تمہاری آنکھوں میں جیت کی چمک ہے۔ تم لوگ اپنے
اپنے گھروں کی طرف جا رہے ہو۔ جہاں سکون ہے۔ جہاں ... کی ٹھنڈک ہے ...
میں کہاں جاؤں۔ ہر طرف اندھیرا ہے۔ میرا تو یہی مقدر ہے ـــــ جلتی رہے ... گی

نوائے دل — از پروفیسر محمد منظور الرحمٰن خاں منتشر ایم۔ اے
(مجموعۂ غزل) قیمت فی جلد ـــــ ایک روپیہ پچاس پیسے

سمندر پیاسا ہے — جناب غلام رسول مشتوش کا ایک نہایت ہی دلچسپ
اور بلند پایہ ناول جس میں آپ کو اپنے دل کی
دھڑکنیں اور ماضی کے ناسور پوشیدہ ملیں گے۔ قیمت سات روپے۔

پیاسے بادل — ایک پہاڑی دوشیزہ کے پیار کی کہانی۔ ولولہ انگیز رومان کی ایک دلآویز
داستان۔ مصنف شاکر پونچھی۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

شکر پارے

علی عباس عابدی اُمید۔ ایم۔ اے (علیگ)

ایم۔ اے۔ ایک۔ ہائر سکنڈری اسکول، عالم چند۔ یو۔ پی

۲۷ اگست ۶۴ء

محترمی خوشترصاحب۔ تسلیمات

. . . یوں تو آج کل اردو کے بہت سے ادبی و نیم ادبی پرچے نکل رہے ہیں لیکن دو چار کے سوا کسی کا معیار بلند نظر نہیں آتا۔ اور اُن دو چار میں "بیسویں صدی" کا نام سرفہرست ہے۔ زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کی نمائندگی نے اس کی افادیت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ہر پرچہ ہمارے ذہن پر گہرے نقش چھوڑتا ہے۔ آپ لائق صد تحسین ہیں جو مدتوں سے اردو ادب کو حُسن، معنویت، شگفتگی اور جاودانی بخش رہے ہیں . . .

نیاز آگیں ——— علی عباس عابدی امید

اصلی رنگ

ایک مشاعرے میں علی سردار جعفری نے اپنا کلام سُنانے سے پہلے کہا "حضرات! میں عاشقانہ رنگ میں کچھ اشعار عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ یہ میرا اصلی رنگ نہیں ہے"

جگن ناتھ آزاد نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا "تو کیا آپ کا اصلی رنگ معشوقانہ ہے؟"

آرائشِ خمِ کاکل

دہلی کے انڈو پاک مُشاعرے میں ملک زادہ منظور احمد نے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو مائک پر آنے کی زحمت دیتے ہوئے کہا "ان کے کلام کی خصوصیت آرائشِ خمِ کاکل ہے"

کنور صاحب نے مجمع کو مخاطب کر کے جواب دیا "حضرات! میری شاعری میں آرائشِ خمِ کاکل ہو کہ نہ ہو (اپنی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) آرائشِ خمِ ریش ضرور ہے!"

اِس پر ملک زادہ صاحب نے فرمایا "مردوں کی ریش بھی کاکل ہوتی ہے"

کنور صاحب بھلا کب چوکنے والے تھے۔ برجستہ بول اُٹھے "لیکن بفضلِ خدا ہم وہ لوگ ہیں جن کی کاکل بھی ہوتی ہے اور ریش بھی!"

عبرت

ایک بار گورکھپور میں مسعود اختر جمال اور مجاز کچھ دوستوں کے ساتھ اُردو بازار سے گزر رہے تھے۔ ایک دوکان پر شوکیس میں بہت ہی بھیانک سائز کا جوتا رکھا ہوا دیکھ کر مسعود اختر جمال نے مجاز سے پوچھا "مجاز! بتا سکتے ہو اس جوتے کا جوڑا کہاں ہے؟"

مجاز نے مخمور نگاہوں سے جوتے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم؟ اللہ میاں نے دُنیا والوں کی عبرت کے لئے ایک جوتا یہاں بھیج دیا ہے۔ دوسرا عاقبت میں بھیگ رہا ہے۔ قیامت کے دن تمہیں نظر آئے گا"

غیر مُلکی

نوح ناروی مرحوم غزل پڑھ کر جب کسی مشاعرے میں خوب داد حاصل کر چکے تو ایک حاکم جو صدرِ مشاعرہ تھے بولے "نوح صاحب! آپ غیر مُلکی ہو کر بھی اُردو زبان میں ایسے اچھے اچھے شعر کہہ لیتے ہیں۔ حیرت ہے"

"غیر مُلکی؟" نوح صاحب تعجب اور حیرت سے اُن کا مُنہ دیکھنے لگے۔

"جی ہاں۔ ناروے کے رہنے والے ہیں نا آپ؟" صدرِ مشاعرہ نے فرمایا۔

مرغِ بسمل

مولانا بسمل شاہجہاں پوری نے اپنے ایک دوست سے کہا "صاحب میں اپنا دیوان شائع کرانا چاہتا ہوں لیکن پریشانی یہ ہے کہ کوئی نام سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ اپنے تخلص کی رعایت سے مجموعے کا نام رکھنا چاہتا ہوں۔ جیسے فانی بدایونی کے مجموعۂ کلام کا نام باقیاتِ فانی۔ مخمور دہلوی کے مجموعۂ کلام کا نام بادۂ مخمور۔ جوش ملسیانی کا بادۂ سرجوش ہے"

ان کے دوست نے فوراً جواب دیا "اس لحاظ سے تو آپ کے مجموعے کا نام مرغِ بسمل بہت اچھا نام ہوگا۔ کیوں کیا خیال ہے؟"

تمسخر

کراچی میں انڈو پاک مشاعرہ تھا۔ مولانا ماہر القادری نے باہر سے آتے ہوئے شعراء کی دعوت کی۔ شوکت تھانوی کو اس دعوت کا علم ہوا تو انھوں نے ماہر صاحب سے اپنے مدعو نہ ہونے کی شکایت کی۔

مولانا نے کہا "بھائی میرے فلیٹ کا جو مردانہ کمرہ ہے اُس میں چودہ آدمیوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے آپ اور بعض دوسرے احباب کو بھی تکلیف نہ دے سکا۔"

اس کے بعد اکثر شوکت صاحب ان سے کہا کرتے تھے "میرا شمار اُن چودہ آدمیوں میں ہوگا یا پندرھواں سولھواں نمبر ہے۔"

دوستوں کی محفل سے

اختر بستوی۔ بی اے

روشن محل۔ گاندھی نگر۔ بستی (یوپی)

۱۰ ستمبر ۱۹۶۴ء　　　گرامی قدر! اسلام مسنون

ادبی لطائف کی ایک اور قسط حاضرِ خدمت ہے۔ قبول فرمائیے ــــــ آج کل میں دیکھ رہا ہوں کہ لوگ اخباروں اور رسالوں میں ایسے لطیفے پیش کرتے ہیں، جو چھپی ہوئی کتابوں یا پرانے رسائل سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ میری رائے میں یہ محض تضیعِ اوقات ہے۔ میں نے آپ کو اب تک جو لطائف بھیجے ہیں اُن کے بارے میں پورے وثوق و اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ سب کے سب غیر مطبوعہ ہیں ــــــ اِس قسط کا پہلا لطیفہ آنجہانی ڈاکٹر ہادی حسن نے علی گڑھ میڈیکل کالج کی افتتاحی تقریر میں بیان کیا تھا جسے اُس وقت سینکڑوں لوگوں نے سُنا تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ لطیفہ بھی اب تک کہیں شائع نہیں ہوا ہے ــــــ افسانہ نمبر میں راجہ مہدی علی خاں کا مضمون پڑھ کر بہت دیر تک ہنستا رہا۔ میں بھی اُن کی طرف سے سفارش کرتا ہوں کہ اب آپ اپنے دل سے میل نکال دیجئے اور اُن سے صلح کر لیجئے . . .

احقر ــــــ اختر بستوی

خاموشی کا سبب ــــــ ●

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جس زمانے میں علی گڑھ میں تھے، یہ اُس وقت کی بات ہے۔ ایک بار عید کے مہینے میں وہ اور ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم علیگڑھ میڈیکل کالج کے چندے کے لئے ایک رئیس کے پاس تشریف لے گئے۔ اتفاق سے وہ صاحب اِن دونوں جلیل القدر ہستیوں سے ناواقف تھے۔ ہادی صاحب نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا: "مجھے ہادی حسن کہتے ہیں۔ میں مُسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں"

ذاکر صاحب نے فرمایا: "میرا نام ذاکر حسین ہے میں وہاں کا وائس چانسلر ہوں"

وہ صاحب اِن دونوں حضرات کے نام سُن کر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ ذاکر صاحب نے پوچھا: "کیوں حضرت! آپ چُپ کیوں ہو گئے؟"

انھوں نے مسکرا کر جواب دیا: "بات یہ ہے کہ میں عید کے مہینے میں "حسن" اور "حسین" دونوں کو اپنے گھر پر دیکھ کر روزہ ہو گیا ہوں"

البتہ ــــــ ●

قاضی محمد عدیل عباسی کے مکان پر حیات اللہ انصاری کے اعزاز میں شہر کے معززین اور شعرائے کرام کی ایک مخصوص نشست تھی جس میں علمی و ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیال بھی ہو رہا تھا اور شعر و شاعری کا دور بھی چل رہا تھا۔ بات چیت کے دوران میں نہ جانے کیسے "تکیہ کلام" کے متعلق گفتگو چل نکلی۔ حیات اللہ صاحب نے فرمایا: "اکثر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ لوگوں کی زبان پر کچھ غلط الفاظ چڑھ جاتے ہیں جنھیں وہ اپنا تکیہ کلام بنا لیتے ہیں۔ مثلاً میرے ایک دوست "البتہ" کو ہمیشہ "البت" بولا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے انھیں ٹوکا تو وہ جھلا کر بولے: آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ مجھ پر بلا وجہ تہمت لگاتے ہیں کہ میں البتہ کو البت بولتا ہوں۔ میرے تمام دوست اِس بات کے گواہ ہیں کہ میں "البت" کبھی نہیں بولتا۔ ہاں جب ضرورت پڑتی ہے تو "البتہ" البت بولتا ہوں"

جمال و جلال

ایک بار دوستوں کی محفل میں ایک صاحب نے احمد جمال پاشا کے پیٹھ پیچھے ان کی بُرائی کر دی۔ دوسرے دن انھیں معلوم ہوا کہ کسی نے وہ بات پاشا صاحب تک پہنچا دی ہے اور وہ اُن سے سخت ناراض ہیں۔ اِس لئے وہ فوراً ہی پاشا صاحب کے گھر تشریف لے گئے اور نہایت ہی لجاجت اور انکساری کے ساتھ بولے: "مجھے انتہائی ندامت ہے کہ کل میں نے بے خیالی میں آپ کے متعلق ایک ایسی بات کہہ دی جس سے آپ کو تکلیف پہنچی۔ میں معافی کا خواستگار ہوں کیونکہ واقعی مجھ سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔ آپ جتنا بھی غصہ کریں بجا ہے۔"

احمد جمال پاشا نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ جواب دیا: "حضرت میں غصہ نہیں کیا کرتا کیونکہ میرا نام 'جمال' ہے 'جلال' نہیں۔"

ذی عقل جانور

صوبائی اُردو کانفرنس کے سلسلے میں ہندوستان کے بہت سے شعراء اور ادیب بستی میں جمع تھے۔ اُن میں سے ایک صاحب اپنے دیرینہ دوست تارا شنکر ناشاد کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کانفرنس کے صبح کے اجلاس کے بعد انھوں نے ناشاد صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ میں ذرا آپ کے شہر کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ ناشاد صاحب انھیں ایک رکشے پہ لے کر بستی کی سڑکوں پر گھومنے نکلے۔ وہ لوگ ابھی چند ہی قدم گئے ہوں گے کہ ایک موڑ پر ایک گدھا نظر آیا جسے دیکھ کر وہ مُسکرا دیئے۔ اتفاق سے کچھ دُور چلنے کے بعد پھر ایک گدھا دکھائی دیا۔ اِس بار اُن کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور انھوں نے فرمایا:

"ناشاد صاحب آپ کے شہر میں ذی عقل جانور کافی نظر آتے ہیں۔"

ناشاد صاحب نے فوراً ہی جواب دیا: "جی ہاں آج کافی تعداد میں باہر سے آ گئے ہیں۔"

آنند بھون

دوستوں کی محفل میں یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا کہ پنڈت نہرو کی الٰہ آباد کی رہائش گاہ "آنند بھون" کا مستقبل کیا ہوگا۔ اِس سلسلے میں لوگوں نے مختلف رائیں ظاہر کیں۔ ایک صاحب نے کہا: "اب وہ کانگریس پارٹی کے کاموں کے لئے وقف ہو جائے گا۔"

دوسرے صاحب بولے: "ہو سکتا ہے اُن کی صاحبزادی مسز اندرا گاندھی کسی وقت اُس میں سکونت اختیار کریں۔"

تیسرے صاحب نے اظہارِ خیال فرمایا: "ممکن ہے نہرو جی کے نواسوں میں سے کوئی وہاں قیام کرے۔"

جب سب لوگ اپنی اپنی رائے دے چکے تو ڈاکٹر اشتیاق حسین رضوی صاحب نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ کہا: "آنند بھون کے ایک حصے پر تو میرا کبھی قبضہ ہوگا۔"

میں نے پوچھا: "وہ کیسے؟"

انھوں نے جواب دیا: "بھون (محل) پر چاہے جس کا قبضہ ہو لیکن آنند (خوشی) پر تو میں بھی اپنا حق جتا سکتا ہوں۔"

طول و عرض

گذشتہ سال ایک آغا صاحب کچھ دنوں کے لئے کابل سے بغرضِ تجارت تشریف لائے اور میرے محلے میں ایک مکان کرایے پر لے کر سکونت پذیر ہوئے۔ ان کا نام عبد الصمد خاں تھا۔ انھیں شعر و شاعری سے مطلق لگاؤ نہ تھا پھر بھی نہ جانے کیوں اکثر شام کو جب وہ اپنے کاموں سے فارغ ہوتے تھے تو میرے کمرے میں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ حالانکہ اِس کمرے میں زیادہ تر ادبی موضوعات پر ہی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ عبد الصمد خاں صاحب کی تندرستی ماشاء اللہ بہت اچھی تھی اور لمبائی چوڑائی دونوں لحاظ سے وہ پُورے دیو معلوم ہوتے تھے۔ ایک دن دوستوں کو نہ جانے کیا سوجھی کہ شعر و سخن کے تذکرے چھوڑ کر صمد خاں کے طول و عرض پر رائے زنی شروع کر دی۔

کسی نے کہا: "خاں صاحب عوج بن عنق کے رشتہ دار معلوم ہوتے ہیں۔"

کسی نے فرمایا: "نہیں ان کا سلسلۂ نسب ابو الہول سے ملتا ہے۔"

کوئی بولا: "آپ لوگ مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ خدا نے ہرکولس کے جسم میں نئی روح ڈال کر اُس کا نام عبد الصمد خاں رکھ دیا ہے۔"

جب سب لوگ اپنا اپنا ترکش خالی کر چکے تو میں نے افتخار عزیز خاں ساحر سے کہا:

"کیوں جناب آپ نے اِس 'چاند ماری' میں کیوں نہیں حصہ لیا؟"

انھوں نے فرمایا: "اب تک لوگ نثر میں صمد خاں کی مدح سرائی کر رہے تھے۔ میں نے سوچا نظم میں ان کی تعریف کرنی چاہئے۔ چنانچہ ایک شعر موزوں ہو گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

مالک نے طول و عرض کو سارے جہان کے
جب مختصر کیا تو صمد خاں بنا دیا"

آم پسندی

دہلی کے آزاد ہند ہوٹل میں بہت سے بے تکلف شعراء اکٹھا تھے اور غالب کی فنکارانہ عظمت پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے فرمایا: "آج کل حدت پسندی کے بہت چرچے ہیں لیکن مجھے غالب جیسا جدت پسند ایک بھی نظر نہیں آتا۔ [illegible] جو کبھی فرسودہ خیال کو اپنے کلام میں جگہ نہیں دی۔ آپ اُن کی شاعری میں [illegible] نکال سکتے ہیں لیکن اُنھیں عام پسند نہیں کہہ سکتے ..."

غلام محی الدین شہری نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "غالب عام پسند [illegible]"



صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

آپ کی صحت اور خربوزہ!

خربوزہ، جاڑے والے دیس میں گرمی کے موسم کا بہت لذیذ اور کثرت سے استعمال کیا جانے والا پھل ہے۔ یہ کم و بیش ملک کے ہر حصہ میں پیدا ہوتا ہے۔ آم کی طرح اس کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ لکھنؤ اور ٹونک (راجستھان) کا پکا ہوا خربوزہ بہت میٹھا اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ خربوزہ جسم کو پرورش کرنے والا، خوش ذائقہ اور فرحت بخش پھل ہے۔

طبی اعتبار سے اس کا مزاج گرم و تر ہے۔ یہ قبض کو دور کرتا ہے اور دل و دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ عمدہ قسم کے پکے ہوئے خربوزے کو کھانا کھانے کے بعد یا سہ پہر کے وقت کھانا چاہئے۔ خالی معدے میں اس کا کھانا مضر ہے۔ درد اور سوء ہضم جیسی شکایتیں پیدا کر دیتا ہے۔ خربوزہ کھانے سے پہلے یہ احتیاط رکھنی چاہئے کہ وہ اچھی طرح سے پکا ہوا ہو۔ کچا یا ادھ پکا خربوزہ نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔ اس سے معدے میں فتور اور بدہضمی کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔

خربوزے میں ایسے کیمیاوی اجزاء اور ترکیبات موجود ہیں، جن سے گردے، مثانے اور آنتوں کے فاسد مادے پیشاب اور پاخانے کے ذریعہ خارج ہو جاتے ہیں۔ اگر گرمی کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے پیشاب سرخ اور جلن کے ساتھ آرہا ہو تو ایسی حالت میں خربوزے کا استعمال حیرت انگیز طور پر فائدہ پہنچاتا ہے۔ اس سے پیشاب بآسانی اور کھل کر ہوتا ہے۔ خربوزہ رکے ہوئے پیشاب کو کھولتا ہے اور پسینہ لاتا ہے، اور پیشاب کے راستے گردہ و مثانہ کی گرمی اور زہریلے مادے خارج ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ خربوزہ پتھری کی بیماری کا بھی موثر علاج ہے۔ اس کے متواتر استعمال سے گردے یا مثانہ میں پڑی ہوئی پتھری، ٹوٹ ٹوٹ کر پیشاب کے راستے خارج ہو جاتی ہے۔ قبض کے عادی لوگوں کے لئے تو خربوزہ ایک نعمت بے بہا ہے اور بہت سی دواؤں کے مقابلہ میں زیادہ پُراثر اور مفید ہے۔ یہ آنتوں کی حرکت دودیہ کو تیز کرتا ہے اور ان کے گرد لپٹے ہوئے غلیظ اور فاسد مادّوں کو کھینچ کر باہر نکال دیتا ہے۔ اس کے استعمال سے پاخانہ کھل کر آتا ہے اور طبیعت بشاش رہتی ہے۔ خربوزہ دل و دماغ کو قوت بخشتا ہے۔ یہ بہت زود ہضم اور مفرح پھل ہے۔

خربوزے کا گودا ہی نہیں اس کا چھلکا اور بیج بھی کارآمد ہیں۔ یہ دوا کے طور پر کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ قلت البول کی بیماری میں اس کے بیج اور چھلکا اس مرض کی اکثر دواؤں کا لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔ ایسے وید اور یونانی طریقہ علاج میں مختلف طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔

خربوزے کا چھلکا ایک عام گھریلو ضرورت کی چیز بھی ہے۔ اگر گوشت یا کسی ایسی سبزی میں جس کا گلنا دشوار ہو، خربوزے کی قاشوں کے دو تین چھلکے ڈال دیے جائیں، تو گوشت یا سبزی بہت جلد اور آسانی سے گل جاتی ہے۔ اس ضرورت کے لئے خربوزے کے چھلکے دھوپ میں سکھا کر خشک کر لئے جاتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر کام میں لائے جاتے ہیں۔

خربوزے کے بیج بھی مختلف طریقوں سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ مفرح قلب اور مقوی دماغ ہیں، قبض کشا اور پیشاب آور ہیں۔

دل و دماغ کی کمزوری، معدہ و جگر کی حدت اور پیشاب کی سوزش میں انھیں منقّیٰ، مغز تخم خیارین، مغز تخم کدو مساوی الوزن کے ساتھ پیس چھان کر اور ہلکی سی شکر ملا کر علی الصبح پینا اکثر صورتوں میں انتہائی مفید ثابت ہوتا ہے۔ یہ مرکب نہ صرف دل و دماغ ہی کو فرحت و قوت بخشتا ہے بلکہ معدہ و جگر کی گرمی، قلت البول اور قبض کو بھی دور کر دیتا ہے۔ اس کا استعمال ہفتہ دس دن تک لگاتار کرتے رہنا چاہئے۔

چاولوں شوربوں کے ساتھ خربوزے کے بیجوں کا حریرہ بناکر اور آدھ دیسی گھی ... عام جسمانی کمزوری اور ضعف باہ کے لئے مفید ہے۔

خربوزہ یرقان، جلندھر اور قبض کی شکایتوں میں خاص طور پر مفید ہے۔

... والی ماؤں کو اس کا استعمال باقاعدگی سے کرنا چاہئے۔ اِس سے دودھ ... اُس میں شامل مضر اثرات دُور ہو جاتے ہیں۔

خربوزے کے بیجوں کا تیل بھی نکالا جاتا ہے، جسے دودھ میں ملاکر پینے سے ... بول (پیشاب کا رُک جانا) کی شکایت جاتی رہتی ہے۔

خربوزے کا زیادہ استعمال مضر ہے۔ اِس سے بدن کی حرارت معمول سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ہمیشہ اعتدال کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے۔ اِس کا زیادہ استعمال گرمی کرتا ہے۔

۴ ـــــ دوا کی بجائے غذا کی طرف دھیان دیجئے

چلتے پھرتے، کام کرتے لوگوں کو یہ کہنا مبالغہ معلوم ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب لوگ نہیں تو ہر تیسرا آدمی ضرور مریض ہوگا۔ کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہوگا، چاہے وہ مرض چھوٹا ہو یا بڑا۔ ایسا کیوں ہے، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اِس طرف بہت کم لوگ دھیان دیتے ہیں۔ اگر اِس طرف توجہ کی جائے تو بہت کم لوگوں کو ڈاکٹروں کے پاس جانا پڑے۔

ازالۂ مرض و اعادۂ صحت میں غذا کو بہت بڑا دخل ہے ـــــ کیا کھانا چاہئے؟ کس چیز سے پرہیز کرنا چاہئے؟ صحت کی حالت میں اگر انسان اِس نکتے کو سمجھ لے اور اِس پر عمل کرے تو اکثر امراض کا وجود ناپید ہو جائے۔ حکیم بقراط نے لکھا ہے ـــــ "لوگوں نے تندرستی کی حالت میں درندوں کی طرح کھا کر اپنے آپ کو بیمار ڈال لیا اور جب ہم نے اُن کا علاج کیا تو انھیں چڑیوں کی غذا دی اور تندرست بنا دیا۔"

حکیم ابوالحسن قرانی نے لکھا ہے ـــــ "بوڑھے آدمی کے لئے سب سے زیادہ نقصان دہ بات یہ ہے کہ اُس کے پاس اعلیٰ درجہ کا باورچی ہو۔ کیونکہ عمدہ غذا پائے گا تو زیادہ کھا کر بیمار پڑ جائے گا۔"

ڈاکٹر سرولیم کوپر نے کہا ہے ـــــ "جو لوگ عوام کو یقین دلا دیں کہ وہ غذا کے انتخاب میں جہالت سے کام لیتے ہیں، وہ بنی نوع انسان پر بھاپ اور بجلی کے موجدوں سے زیادہ برکات نازل کریں گے۔"

ڈاکٹر سر ہیٹر کھاس نے دقیق تحقیقات کے بعد یہ فیصلہ دیا ـــــ "کم سے کم آدھے امراض کہنہ جو ادھیڑ عمر اور بڑھاپے میں انسان کو لاحق ہوتے ہیں، ایسی غذائی غلطیوں سے پیدا ہوتے ہیں جن سے بچا جا سکتا ہے۔"

ایک مصری ڈاکٹر نے لکھا ہے ـــــ "مستقبل قریب میں ڈاکٹر کے لئے جو چیز ہم مریضوں کو بتائیں گے وہ دوا نہیں، غذا ہوگی۔ علاج کا تعلق دوا سے نہیں غذا سے ہوگا۔"

صدر شعبۂ طب ٹاڈیا کا مشورہ ہے ـــــ "صرف دق ہی نہیں بلکہ ہر طرح کے متعدی امراض کا مقابلہ نہایت کامیابی کے ساتھ صرف غذا کے توازن سے کیا جا سکتا ہے۔"

۳ ـــــ گرمی کا موسم اور لوکاٹ!

آج کل لوکاٹ کا موسم ہے۔ یہ گرمی کے موسم کا ایک سستا اور سہل الحصول پھل ہے۔ حجم میں قلمی بیروں کے برابر، رنگ میں پیلا اور گچھوں کی شکل میں ملتا ہے۔ اِس کا ذائقہ قدرے ترش یا کھٹا میٹھا ہوتا ہے۔ لوکاٹ خوش ذائقہ پھل ہے اور موسمِ گرما میں تسکینِ قلب کے لئے بہت مفید ہے۔ پیاس کو کم کرتا ہے اور دل کو فرحت بخشتا ہے۔

طبّی اعتبار سے اِس کا مزاج سرد تر ہے۔ گرم مزاج والوں کے لئے یہ خصوصیت کے ساتھ مفید ہے۔ گرمی کے موسم میں جب تیز لُوئیں چلتی ہیں اور جسم کی حدّت بڑھ جاتی ہے، لوکاٹ کا استعمال مختلف طریقوں سے سود مند ہوتا ہے۔ اِسے سہ پہر کو پھل کے طور پر بھی کھایا جاتا ہے اور شربت بناکر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جو بازار میں شربتِ لوکاٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اور دیسی دوافروش گرمی کے موسم میں اِسے عام طور پر فروخت کرتے ہیں۔ لوکاٹ کا شربت گھر پر بھی تیار کیا جا سکتا ہے۔ اِسے بنانے کا طریقہ بہت آسان ہے۔

تقریباً ایک کلو کی مقدار میں لوکاٹ کا رس حاصل کیجئے اور اِس میں دو سو گرام عرقِ گلاب، دو سو گرام عرق بیدمُشک اور تھوڑا سا لیموں کا رس ملاکر ایک صاف قلعی دار برتن میں بھر کر آگ پر چڑھا دیجئے اور ہلکی آنچ پر پکنے دیجئے۔ جب گرم ہو جائے تو اُس میں حسبِ مقدار شکر یا چینی ملا دیجئے۔ دو تار کی چاشنی تیار ہو جائے تو آگ سے اُتار لیجئے۔ ٹھنڈا ہونے پر صاف کپڑے میں چھانئے اور بوتلوں میں بھر کر رکھ لیجئے۔ شربتِ لوکاٹ تیار ہے۔

یہ شربت پیاس کو رفع کرتا ہے اور دل و دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ ضعفِ ہضم اور حدّتِ جگر کے لئے بہت مفید ہے۔

لوکاٹ خون کی اکثر بیماریوں میں نافع ہے، خونی بواسیر، خون کی بڑھی ہوئی گرمی، پیاس، پتّی اُچھلنا، قے، خونی قے، معدے کی بڑھی ہوئی گرمی کی وجہ

سے بھوک کا کم ہوجانا، اِن سب شکایتوں میں نوکاٹ کا استعمال بے حد مفید ہے۔

بلغمی مزاج والوں کو اِس کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہئے۔ کھانسی، نزلہ اور زکام میں بھی اِس کا استعمال مضر ہے۔ کیونکہ یہ بلغم بڑھاتا ہے اور سینے اور گلے میں خراش پیدا کرتا ہے۔

نوکاٹ کھاکر پانی ہرگز نہ پینا چاہئے۔ نہایت ضرر رساں ہے۔ گلے میں خراش اور کھانسی کی شکایت فوراً ہوتی ہے۔

گرمی اور بادی سے پیدا ہونے والی بیماریوں میں نوکاٹ کا استعمال خاص طور پر مفید ہے۔ یہ جسم کی حرارت کو اعتدال میں رکھتا ہے۔ ہاضم ہے اور معدے کی ترش رطوبات کے مناسب مقدار میں پیدا ہونے میں مدد دیتا ہے۔

۴ ــــــ غصہ کا روشن پہلو

عام طور پر غصہ اور اشتعال، کو صحت کے لئے مضر سمجھا جاتا ہے اور سمجھدار لوگ غصہ اور اشتعال سے بچنے کی تلقین و ہدایت کرتے ہیں۔ لیکن آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ غصہ مفید بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے ماہرینِ نفسیات نے غصہ پر تحقیقات کی اور اِس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد اِس نتیجہ پر پہنچے کہ غصہ بعض اوقات بے ضرر ہی نہیں مفید بھی ہو سکتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو ایسے کتنے مریض ملیں گے جو معدے کی مزمن شکایات میں اِس لئے مبتلا ہیں کہ انھوں نے اپنی فوری برہمی یا طیش کو مسلسل روکنے یا دبانے کی کوشش کی تھی۔

عام طور پر لوگ غصہ کو اعصابی خرابی کی علامت خیال کرتے ہیں یا غیر متوازن شخصیت کا نشان سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت اِس کے خلاف ہے طبِ عقلی (سائیکیاٹری) کے ایک مشہور ادارے میں چار سو آدمیوں کی جانچ کی گئی۔ اُن میں سے دو سو افراد نارمل حالت پر پائے گئے اور باقی کی دماغی کیفیت غیر متوازن دیکھی گئی۔ اُن میں سے تقریباً ہر نارمل قسم کے زیرِ تجربہ شخص پر غصہ کے اثرات اشتعال دلانے کے بعد زیادہ پائے گئے۔ جن لوگوں کی دماغی حالت غیر متوازن تھی، اُن پر غصہ کا اثر کم دیکھا گیا۔ وجہ ظاہر ہے۔ جس شخص کی دماغی حالت ٹھیک ہوتی ہے اُسے اگر کسی بات میں کوئی ناگوار پہلو نظر آتا ہے تو وہ ایسے شخص کے مقابلہ میں زیادہ غضب ناک ہوتا ہے، جس کا ذہن پورے طور پر صحت مند نہ ہو۔ کیونکہ وہ ناگواری محسوس نہیں کرتا۔

۵ ــــــ نمک بطور دوا

پسا ہوا نمک شہد میں گوندھ کر، کپڑے میں لپیٹ کر اوپر مٹی لگا کر آگ پر رکھیں۔ مٹی سرخ ہو جائے تو نمک کو اندر سے نکال کر پیس کر رکھ لیں۔ ایک ماشہ صبح یا کھانا کھانے کے بعد پانی سے کھانا زکام، نزلہ، ریاح اور جوڑوں کے درد کے لئے مفید ہے۔

نمک کو اجوائن کے ساتھ ملا کر کھانے سے بھوک خوب لگتی ہے۔ ریاح خارج ہو جاتی ہیں۔ گٹھیا اور نقرس کو مفید ہے۔

نمک ملے ہوئے پانی سے غسل کرنا صحت کے لئے بے حد مفید ہے۔ اگر نمک حل کئے ہوئے پانی سے چہرہ دھویا جائے تو چہرے کی رنگت نکھر جاتی ہے۔ دانتوں کی ٹیس کی تکلیف میں دانتوں پر نمک ملتے ہی تکلیف دُور ہو جاتی ہے۔

پھوڑوں پر نمک اور پیاز پیس کر باندھنے سے آرام ہو جاتا ہے۔ حلق کی تکلیف دُور کرنے کے لئے نمک ایک حصہ، شہد دو حصّے اور سرکہ تین حصّے ملا کر اِس مرکب سے غرارہ کیا جائے تو حلق کی تکلیف رفع ہو جائے گی۔

باریک پسا ہوا نمک سرسوں کے تیل میں ملا کر دانتوں پر ملنے سے دانت موتی کی طرح چمک دار اور سفید ہو جاتے ہیں۔ کیڑے نہیں لگتے۔ یہ مسوڑھوں سے پیپ اور خون بہنے کو روکتا ہے۔ منہ کی بدبو زائل کرتا ہے۔

ایک گلاس پانی میں دو ماشہ نمک ڈال کر تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک ایک گھونٹ پینے سے بدہضمی، شکم کی گرانی دُور ہوتی ہے۔ دردِ سر کی تکلیف کم ہو جاتی ہے۔

۶ ــــــ کیا آپ کا ذہن بیمار ہے؟

بہت سے ڈاکٹروں اور ماہرینِ نفسیات کا یہ تجربہ ہے کہ بیمار آدمیوں میں پچھتر فی صد ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذہنی کیفیت اور فکر و تردد کی وجہ سے بیمار بن جاتے ہیں۔ واضح الفاظ میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اِس طرح کے مریض ذہنی مریض ہوتے ہیں۔ اُن کا ذہن بیمار ہوتا ہے۔ اُن میں سے بعض بدنصیب اپنے آپ کو ہر اُس مرض کا شکار سمجھتے ہیں جس کا نام بدنصیبی سے انھوں نے کسی سے سُن لیا ہو۔ یہی ذہنی کیفیت انسان کو پاگل بنا دیتی ہے۔

اِس لئے ہر شخص کو چاہئے کہ وہ دماغ اور اُس کی بے اندازہ صلاحیتوں کے مطابق ایسا لٹریچر پڑھے جس میں بتایا گیا ہو کہ انسان اپنے دماغ کی تربیت سے کس طرح تندرست رہ سکتا ہے۔ جب انسان کی فکر بھٹک جاتی ہے تو اس کی عجیب حالت ہو جاتی ہے۔ وہ عجیب عجیب حماقتیں کرتا ہے اور بعض وقت یہی اندازِ فکر اُسے دیوانگی کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔ آپ کو یہ سُن کر غالباً حیرت ہوگی کہ رشک، حسد، کینہ، بغض، خود غرضی، یہ ساری بیماریاں ہمارے ذہن کی بے راہ روی کا نتیجہ ہیں۔

[illegible] پانا چاہتے ہیں تو اپنے ذہن کی تربیت کی طرف توجہ کیجئے۔

آپ کے پریشان خیالات آپ کی ذہنی بیماریوں کا سبب بن جاتے ہیں اور آپ کو بستر پر لیٹنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اگر آپ اپنے خیالات کو بدل دیں تو یہ خیالات اتنی ہی آسانی سے آپ کی بیماریوں کو ختم بھی کر سکتے ہیں جتنی تیزی سے یہ بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔

۷ ـــــ منزل کا تعیّن ضروری ہے

نامور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ منزل کا تعیّن کئے بغیر زندگی کا سفر طے کرنا، بغیر تعیّنِ مقصد کے زندگی گزارنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے انسان بغیر پہیوں کی گاڑی پر سفر کرے ـــــ ہم زندگی سے کیا چاہتے ہیں، ہم زندگی میں کیا بننا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ہمارے سامنے کیا لائحہ عمل ہیں۔ یہی وہ اندازِ فکر ہے جو انسان کو ترقی کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر آپ کا کوئی راستہ نہیں کوئی منزل نہیں تو آپ اپنا سفر کہاں سے شروع کریں گے اور اس کا اختتام کہاں پر ہوگا؟

جو لوگ منزل کا تعیّن نہیں کرتے وہ ہمیشہ بے مقصد بھٹکتے رہتے ہیں۔ جو لوگ ساحل کے متلاشی نہیں ہوتے، ان کا سفینہ ہمیشہ موجوں کی زد میں رہتا ہے اور بالآخر سمندر کی ظالم لہریں انھیں اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ جو لوگ بلا تعیّنِ مقصد زندگی گزارتے ہیں، زندگی قدم قدم پر ان کا منہ چڑاتی ہے اور وہ اسی طرح مارے مارے پھرتے ہوئے موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

۸ ـــــ آپ کا ماحول!

آپ کی زندگی کو کامیاب یا ناکام بنانے میں ماحول کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ آپ کا ذہن صرف وہی غذا حاصل کرتا ہے جو آپ اسے پہنچاتے ہیں یا جو زبردستی ماحول کے ذریعہ اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس لئے آپ کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ اپنے ماحول کو بہتر سے بہتر بنائیں تاکہ آپ اپنے ذہن کے لئے بہتر سے بہتر غذا مہیا کرنے کے قابل ہو جائیں۔

اگر آپ کا ماحول آپ کی پسند کے مطابق نہیں تو اُسے بدل ڈالئے۔

ماحول بدلنے کے لئے آپ کو پہلے یہ قدم اٹھانا پڑے گا کہ آپ ایک ایسے ماحول کا تصور کریں جہاں آپ اپنے مقصدِ حیات کو پورا کر سکتے ہیں۔ پھر آپ اس پر پوری توجہ دیں اور اسے حقیقت میں منتقل کر دیں۔

ہمیشہ یہ بات یاد رکھئے کہ جو لفظ آپ کے کانوں سے ٹکراتا ہے یا جس چیز کو آپ دیکھتے ہیں یا جن چیزوں کو آپ محسوس کرتے ہیں یا حواسِ خمسہ جن چیزوں سے متاثر ہوتے ہیں وہ آپ کے خیالات کو یقینی طور پر اسی طرح متاثر کرتی ہیں جیسے سورج مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔

جب آپ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے تو آپ اپنے غلط اور غیر مفید ماحول کو بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ آپ کا صرف انھیں لوگوں سے ملنا مفید ہے جو آپ کے مقصدِ حیات سے قریب ہیں!

۹ ـــــ بھول جاؤ!

جن لوگوں کی زندگی پر رنج و اندوہ، فکر و تشویش، ناکامیوں اور نا امیدی کا گہرا اندھیرا چھایا ہوا ہے، وہ ڈاکٹر مارڈن کے اس زرّیں مشورہ سے اُس اندھیرے کو دُور کر سکتے ہیں اور اپنی زندگی میں اُجالا پھیلا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر مارڈن نے اپنی کتاب زندگی اور عمل میں لکھا ہے ـــــ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو تکلیف دہ اور تباہ کن خیالات کو چھوڑ دینا جانتے ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر وقت ان کے اعصاب تنے رہتے ہیں۔ ان کی رگیں اسقدر کھنچی رہتی ہیں کہ ان کے لئے دنیا میں سب سے بڑا، سب سے مشکل کام یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی غلطی کو حافظے سے مٹا دیں ـــــ تم آج ہی عہد کر لو کہ کبھی بھی تم گذری ہوئی باتوں، مُردہ ڈھانچوں کے خواب نہیں دیکھا کرو گے، تم گزشتہ غلطیوں، گزشتہ باتوں کے سائے کو حافظے کے لوح سے مٹا دو، مصمّم ارادہ کر لو کہ اپنے دل اور دماغ سے ایسے سارے خیالات کو نکال دو گے، چاہے وہ کیسے ہی وحشت ناک ہوں۔ کتنے ہی بار تمھارے دل میں آئیں۔ انھیں مٹا دو، بالکل بھول جاؤ۔ رنج و غم، فکر و تشویش کو دُور کر دو۔ ایسا نہ ہو وہ تمھاری طاقت اور قوت کو زائل کر دیں ـــــ تمھاری طاقت ہی تمھارے آئندہ کارناموں کا سرمایہ ہے۔

سوال و جواب

سرگوشیاں

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو، یا وہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔
(ایڈیٹر بیسویں صدی نئی دہلی)

سیدہ سراج الدین۔ بھیونڈی

س۔ بھائی جان! حالات سلجھنے کی بجائے اُلجھتے ہی چلے جائیں تو کیا کیا جائے؟

ج۔ حالات سے سمجھوتہ کرلینا چاہئے۔

س۔ کیا "تیرو نشتر" لکھتے وقت آپ کو ذرا بھی خوف نہیں معلوم ہوتا؟

ج۔ جو خدا سے ڈرتا ہے وہ انسان سے نہیں ڈرتا۔ حق و صداقت کے پرستار حق بات کہتے ہوئے دار و رسن سے بھی نہیں ڈرتے۔

س۔ مصورِ غم فانی بدایونی کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ سنئے ؎

پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا
جب ذکرِ بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی

الف کمال کاکوی۔ گیا

س۔ بھائی جان! یہ تو بتایئے پہلے زمانہ میں وزیروں کے بادشاہ ہوتے تھے لیکن آج کے وزیروں کے کون بادشاہ ہیں؟

ج۔ پہلے زمانہ میں وزیروں کے بادشاہ ہوتے تھے آج کے بے تدبیر وزیر خود بادشاہ بنے بیٹھے ہیں۔

س۔ جواہر لال نہرو کے بعد جناب لال بہادر شاستری وزیرِ اعظم ہوئے ہیں۔ ان کے بعد کیا میں بن سکتا ہوں؟ جبکہ نہ عمر کی قید ہے اور نہ تعلیم کی۔

ج۔ وزیرِ اعظم بننے کے لئے تو عمر اور تعلیم کی قید و شرط ہے۔ ہاں! آپ وزیر اور منسٹر بن سکتے ہیں۔ جن کا صرف بالغ ہونا اور ہندی میں دستخط کرلینا کافی ہے۔

محمد صلاح الدین۔ گیا کالج

س۔ آج کل زندگی کو لوگ موت کہتے ہیں تو موت کیا ہے؟

ج۔ جو اتنی بھیانک، اتنی کربناک نہ ہوگی۔

س۔ خوشتر بھیا! ہمارے وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو نے کہا تھا ــــ ایمانداری ہی سب سے بڑی سیاست ہے۔ کیا آج کل لوگ ایمانداری کو سیاست سمجھتے ہیں؟

ج۔ کاش! ایسا ہوتا۔ پنڈت نہرو کے غم میں ٹھنڈی آہیں بھرنے والے، گرم آنسو پینے والے کاش ایسا کرتے۔ آج کے اربابِ سیاست اگر ایمانداری کو سب سے بڑی سیاست سمجھتے تو آج ملک کی یہ حالت نہ ہوتی۔

ایم۔ کے محمود الدین۔ حیدر آباد

س۔ غمِ جاناں اور غمِ دنیا میں کون سا غم زیادہ اور پُر اثر ہوتا ہے؟

ج۔ کبھی غمِ جاناں، غمِ دوراں سے زیادہ تھا۔ لیکن آج کے جان لیوا غذائی بحران نے غمِ دوراں کو غمِ جاناں سے بھی جان گداز و جاں گسل بنا دیا ہے۔

س۔ شاعر اور ادیب کی مرنے کے بعد کیوں قدر ہوتی ہے؟

ج۔ یہ دنیا ہمیشہ سے مُردہ پرست ہے۔ قدرِ مردم بعد مردن!

س۔ سلام پر کوئی اچھا شعر سنایئے؟

ج۔ مومن کا ایک شعر سنئے ؎

لکھو سلام غیر کے خط میں غلام کو
بندے کا بس سلام ہے ایسے سلام کو

[illegible] سنگھ جگادھری۔ انبالہ

س۔ غریب کی زندگی جیسا ایک ہے جو قدرت سے
تقدیر سے ٹوٹ سکتا ہے ایسا کیوں؟

ج۔ غریب ہو یا امیر سب کی زندگی اس اعتبار سے
ایک ہی جیسی ہے ہاں اگر انسان کے اختیار
کی بات ہوتی تو دنیا کا امیر غریب کا فرق وہ
امتیاز خود رکھتا۔

س۔ زندگی جو ہر حال میں گزرتی ہے اس کے آگے
انسان بے حد مجبور ہوتے چلے جاتے ہیں اور پھر
ایک دن ایسا آتا ہے جب وہ لوٹ نہیں سکتا ہے
جیسے محکوم بیت ہی لیکن کوئی بھی نہیں۔ ایسا
کیوں ہوتا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ انسان رنج کا خوگر ہو جاتا ہے
رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج

محمد تقی بیتئر خورجہ۔ بلند شہر

س۔ کیا محبت کرنا ضروری ہے؟

ج۔ جی ہاں! ملک سے، قوم سے۔ نیک مقاصد، نیک
کاموں سے۔ بھائیوں اور بہنوں سے۔ ہر اچھے
انسان سے لیکن رسمی محبت نہیں۔ سچی محبت!

س۔ آج کے دوستوں میں دوستی نہیں۔ ایسا کیوں؟

ج۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھئے۔ آپ کو اس
سوال کا جواب مل جائے گا۔

عبدالقادر۔ کمرہٹی

س۔ کیا عورت بذات خود ایک افسانہ ہے جبکہ
اس کی ذات پر افسانے لکھے جاتے ہیں؟

ج۔ عورت ـــــ سمجھو تو حقیقت ہے دیکھو تو
فسانہ ہے۔

س۔ میں بہن شمع زیدی کا پتہ طلب کر سکتا ہوں؟

ج۔ بہن شمع زیدی پسند فرمائیں تو اپنا پتہ
دے سکتی ہیں۔

س۔ شوہر تعلیم یافتہ ہو اور بیوی ان پڑھ تو دونوں
کی زندگیاں خوش رہیں گی یا نہیں؟

ج۔ شوہر سمجھدار اور طبیعت کا ہو تو زندگی کی گاڑی
کو کیسے شاں بنائے گا۔

زیڈ پرویز شکر گری۔ پنڈری دیدیا

س۔ خوش قسمتی کیا بات ہے کہ پاس ہوتے ہوئے
پیدا کچھ بھی نہیں؟

ج۔ کیونکہ تمہیں روشنی و تاریکی میں جو فرق ہے کے
عقل سے تو محسوس ہے۔

س۔ بد قسمتی سے اپنی کچھ کچھ تو خوشی ملی آتی ہے
جب قصور پر ترقی کرتی ہوں کچھ نہ کچھ پیدا ہو جاتی ہے
پھر آپ ہی بتائیے کیا کروں؟

ج۔ حوصلہ سنبھالئے۔ پھر تیز ہوائیں ہار جائیں گی۔
بلند عزم ہواؤں کے رُخ بدلتے ہیں۔

سید خورشید علی۔ امراؤتی کیمپ

س۔ کیا ماضی کی روشنی مستقبل کو آراستہ کر سکتی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ اگر انسان ہوش مند ہو۔

س۔ آج اور کل....؟

ج۔ کل کی امید پر آج کو کھو دینا دانشمندی و
ہوشمندی نہیں۔

عزیز عمر عزیز فاروقی۔ علیگڑھ

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ عورت مرد کا نصف ایمان ہے؟

ج۔ ایک مفکر مولوی نے یہی کہا ہے۔ عورت کو مرد کا
نصف بہتر تو آپ بھی مانتے ہوں گے۔

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ عورت تقدیس و تعظیم کے لئے
پیدا کی گئی ہے؟

ج۔ جی ہاں، عورت تقدیس و احترام کی سزاوار ہے۔
شوہر دانشور ہے جو ایک شوہر ہو [illegible]
تقدیس و تعظیم کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

س۔ مرد اپنا سکون قلب کیسے حاصل کر سکتا ہے؟

ایسے بہت سے حالات ایسے بہت سے اسباب
ایسے بہت سے مواقع ہو سکتے ہیں۔

ایس۔ اے۔ زلفی۔ کراچی

س۔ عورت اخلاص کی بجائے دولت سے کیوں
پیار کرتی ہے؟

ج۔ دولت سے کئی پیار کرتے ہیں۔ عورت ہو یا
مرد۔ کیا آپ نے ایسا کوئی مرد دیکھا ہے جو دولت
سے نفرت کرتا ہو؟

س۔ جس انسان کے چاروں طرف مایوسیاں اور
ناکامیاں ہوں اُسے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ امید کے چراغ روشن رکھنا چاہئیں ورنہ مایوسیوں
کا اندھیرا اور گہرا ہو جائے گا۔

س۔ عورت قرآن جیسی مقدس کتاب کی قسم کھا کر
بھی بے وفائی سے نہیں چوکتی۔ ایسا کیوں؟

ج۔ عورت کے بارے میں ایسا کہنے والا ــــ عورت
کی بے وفائی کا گلہ کرنے والا مرد عورت سے
دو چار قدم نہیں، میلوں آگے ہے۔

رونق افروز برقی۔ شکار پور (پاکستان)

س۔ انسان اتنا خود غرض کیوں ہو گیا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ انسان انسان نہ رہا

خدا تو ملتا ہے انسان ہی نہیں ملتا
یہ چیز وہ ہے جو دیکھی کہیں کہیں میں نے

س۔ روح کو راحت کب ملتی ہے؟

ج۔ نیک کام کرنے سے۔ دوسروں کو راحت پہنچانے سے۔

س۔ انسانیت کیا ہے؟

ج۔ غم کے ماروں کی غم خواری!

[illegible]

س۔ عورت اور عورت زاد میں کیا فرق ہے؟

ج۔ کسی عورت زاد (مرد) اور کسی عورت کو دیکھیے آپ کو فرق معلوم ہو جائے گا۔

س۔ ہم تو سنتے آئے تھے عورت کا دوسرا نام مستورات ہے جس کے معنی ہیں چھپی ہوئی (یا چھپایا ہوا) اور جس کا مفہوم ہے پردہ دار عورت۔ یہ لفظ سب مسلمان عورتوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا تھا۔ لیکن آج کل کی مسلمان عورتوں میں یہ عریانی کیوں؟

ج۔ آپ کے اس سوال کا جواب حضرت اکبر الٰہ آبادی آج سے بہت پہلے دے گئے ہیں۔ آپ بھی سنئے ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا؟
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا!

سیفی غازی۔ بمبئی

س۔ قوم پستی کی طرف کیوں جاتی ہے؟

ج۔ جب پستی بلندی کا احساس مٹ جاتا ہے، قوم پستی کی طرف جانے لگتی ہے۔

س۔ عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس بات میں کہاں تک حقیقت ہے؟

ج۔ عورت مرد کی سب سے بڑی طاقت ہے، یہ زیادہ حقیقت ہے۔

س۔ آج کل کی لڑکیوں کا رجحان عریانیت کی طرف کیوں ہو رہا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ ان کے گھر کے مرد عریانیت کو پسند کرتے ہیں۔

ابوبکر۔ بمبئی

س۔ آپ "بیسویں صدی" میں ہمیشہ عورتوں کی تعریف کرتے ہیں لیکن مجھے ان سے نفرت ہے۔ اس نفرت کو محبت میں بدلنے کی کوئی ترکیب بتائیے۔

ج۔ تنگ دلی و تنگ نظری چھوڑ دیجئے۔ نفرت محبت میں بدل جائے گی۔

س۔ شیخ عبداللہ کس قوم کی بھلائی چاہتے ہیں؟

ج۔ یہ وہی بتا سکتے ہیں۔

نکہت آرا۔ سلچر

س۔ بھائی جان! آج کل کا ہر انسان اپنا سکون کیوں کھو بیٹھا ہے؟

ج۔ آج کا انسان شکم اور سکون کی تلاش میں غلط راہ پر جا پڑا ہے۔ اس لئے اپنا رہا سہا سکون بھی کھو بیٹھا ہے۔

س۔ جب کوئی دشمنی کے بعد پھر دوستی کا ہاتھ بڑھائے تو اس کا استقبال کیا جائے؟

ج۔ اگر وہ "چاقو" ہو تو ہرگز نہیں! کوئی اور ہو تو تجربہ کرنا چاہیے۔

س۔ حیاتِ قیدِ ہستی سے چھٹے جب ملکِ عدم میں پہنچے ۔۔۔ اور اس کے بعد ۔۔۔ صورتِ حال بدلتی رہی زندانوں کی ۔۔۔؟

ج۔ عقل دوڑتی بہت ہے تو گماں تک پہنچے
کہ حقیقت بھی ہے انساں کی کہاں تک پہنچے

ابراہیم انصاری۔ جبل پور

س۔ جو مضامین "صحت و زندگی" کے عنوان سے ہر ماہ "بیسویں صدی" میں آتے ہیں کیا یہی مضامین آپ کی کتاب "صحت و زندگی" میں بھی ہیں؟

ج۔ جی نہیں۔ اس کتاب سے ان مضامین کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ ایک مستقل تصنیف ہے۔

س۔ کیا واقعی تصویریں بنانا گناہ ہے؟

ج۔ مختلف دین کے نزدیک گناہ ہے مختلف مذاہب کے نظریے ہیں

شگفتہ ناز۔ مونگیر

س۔ "گلستانِ ہزار رنگ" کے مصنف کون ہیں؟ کیا یہ کتاب آپ کے یہاں مل سکتی ہے؟

ج۔ "گلستانِ ہزار رنگ" کے مرتب کا نام ہے سید بہاء الدین احمد۔ یہ کتاب "بیسویں صدی" سے مل سکتی ہے۔

س۔ آپ کے یہاں سے الگ اردو سے اتنی ہی دلچسپی رکھتی ہیں جتنی آپ کو ہے؟

ج۔ جی ہاں ایسی چیز کے ابھی نہیں معلوم ہوتی۔

ممتاز احمد راہی۔ [illegible]

س۔ انسان قابلِ تحسین ہے یا قابلِ محبت؟

ج۔ انسان کا کردار اچھا ہو تو قابلِ تحسین ہے اور قابلِ محبت بھی ورنہ قابلِ نفرت ہے۔

س۔ گناہ؟

ج۔ عذرِ گناہ بدتر از گناہ!

ذاکر بادشاہ۔ پنجار واڑی۔ کرنول

س۔ ہندوستان میں بڑھتی ہوئی گرانی کو کیوں کر روکا جا سکتا ہے؟

ج۔ ذخیرہ اندوزوں کی بیش از بیش حوصلہ افزائی کر کے!

س۔ فانی کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ ؎ ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

تصحیح

"بیسویں صدی" کی ۱۹۷۵ء کی [illegible] کے شمارے میں التوسے انٹرویو میں صفحہ ۳۵ کے پہلے کالم کی ساتویں سطر میں "موجودہ صدی میں جن شاعروں کا انتقال ہو چکا ہے" کی بجائے "موجودہ شاعروں میں جن شاعروں کا انتقال ہو چکا ہے" طبع ہو گیا ہے۔ ناظرین تصحیح کر لیں۔

شاہکار ناول جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہے ہیں

ٹھاکر پونچھوی کے لکھے ہوئے ناول

رات کے گھونگھٹ جس میں نئی تہذیب کے اُن فرشتوں کی کہانی ہے جنہیں معاشرے کی تاریک راتوں نے جنم دیا۔ مصنف نے آج کے سماج کے حسین چہروں سے پارسائی کے رنگین گھونگھٹ اُلٹ دیئے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے۔

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے اُن مردوں کی کہانی جو عورت کو ایسے عریاں انداز میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جس پر نظریں پھسل پھسل جائیں۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

زلف کے سر ہونے تک عشق و محبت اور حسن و شباب کی رعنائیوں اور زندگی کی مسرتوں اور حسرتوں کا سنگم۔ تین معصوم بھولی بھالی لڑکیوں اور تین بے سہارا لڑکوں کی حسین ترین کہانی۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

چاندنی کے سائے اس میں شبنم کی ٹھنڈک بھی ہے اور شعلے کی حرارت بھی۔ کتاب کو ایک بار شروع کر کے ختم کئے بغیر آپ کو چین نہ آئے گا۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

پیاسے بادل ایک پہاڑی دوشیزہ کے پیار کی کہانی۔ دلآویز رومان کی ایک درد انگیز داستان۔ قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

یادوں کے کھنڈر حیات کے نشیب و فراز کا آئینہ دار ناول جس میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان مچل رہا ہے۔ قابل مصنف نے دل کی دھڑکنوں کو ایسے رنگ و انداز سے اُبھارا ہے کہ فنی نزاکت اور خلوص پرور محبت کی تصویر نگاہوں کے سامنے جھلک آتی ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

وادیاں اور ویرانے سوکھے سڑے میدانوں اور سرسبز و شاداب پہاڑوں کی حسین و جمیل کہانی۔ قیمت فی جلد چار روپے۔

زنجیر ایک گنہگار لڑکی کی حسین و جمیل داستان۔ عشق و محبت کی ایک ایسی پُرپیچ رومان پرور داستان جسے پڑھ کر آپ عش عش کر اُٹھیں گے جسے رکی انور نے لکھا اور ادارہ بیسویں صدی نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد صرف ۔۔۔ روپے

پگھلتے خواب اردو ادب کے جواں سال ادیب پروفیسر ۔۔۔ کا ایک دلچسپ رومانی ناول جس میں آپ کو کشمیر جنت نظیر کے حسین و دلفریب مناظر اور اُن مناظر تلے پنپتی سسکتی کہانی ۔۔۔ صاف دکھائی دیں گے۔ قیمت صرف دو روپے۔

نئے فرہاد پروفیسر شکیل الرحمٰن کا اچھوتا شاہکار ناول۔ ایک حسین ۔۔۔ دوشیزہ کی المناک داستان۔ محنت ۔۔۔ کشاکش کے ۔۔۔ پر لکھی ہوئی ایک انتہائی دلچسپ کہانی۔ قیمت صرف دو روپے۔

راہیں شباب کی فرانس کے عظیم ترین ناول نگار آلیے پریوس کا ۔۔۔ شاہکار جس کا ترجمہ دنیا کی تمام زبانوں میں ہو ۔۔۔ جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، جسے عشق و محبت کی سب ۔۔۔ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اِس ناول کی ہیروئن قلوپطرہ اور ہیلن سے بھی زیادہ ۔۔۔ عظیم ہے۔ مترجمہ جناب محمود جالندھری۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

طوفانِ بہار روس کے عدیم المثال ناول نگار ترگنیف کا ۔۔۔ جس کا ترجمہ دنیا کی بیالیس زبانوں میں ہو چکا ہے ۔۔۔ کے مشہور نقادوں نے لافانی رومان قرار دیا ہے اور جسے اردو میں ادارہ "بیسویں صدی" دہلی نے شائع کیا ہے۔ مترجم محمود جالندھری۔ قیمت تین ۔۔۔

بھیگی راتیں فرانس کے عدیم المثال ناول نگار ۔۔۔ کا مقبول ۔۔۔ انسان میں چھپے ہوئے حیوان کا افسانہ۔ اپنے محبوب ۔۔۔ کی ناقابلِ فراموش قربانیوں کی کہانی۔ مترجم محمود جالندھری۔ قیمت فی جلد ۔۔۔

فریڈ موسی حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اُس ۔۔۔ مردکا ۔۔۔ ایک جرم تھا۔ سدیوں بعد کی ۔۔۔ ہوئی ایک عجیب و غریب داستان جو اول سے آخر تک ۔۔۔ سے لبریز ہے۔ جناب کوثر چاندپوری کا الگ ہوا بے حد خوبصورت دلچسپ ناول ۔۔۔ صدی آگے کی فضا میں پرواز کرتا ہے۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی - دہلی نمبر ۶

غلام حامد خاں۔ نگینہ

س۔ انسان؟

ج۔ تقاضائے فطرتِ انسان نہ پوچھو
فرشتہ بھی ہے یہ شیطان بھی ہے

س۔ دُنیا کسی کی نظر میں بُری، کسی کی نظر میں اچھی کیوں ہے؟

ج۔ دُنیا کو اپنے لئے جو جیسی بنالے ویسی بن جاتی ہے۔

س۔ کسی زندہ شاعر کا کوئی زندہ شعر سنائیے؟

ج۔ سُنئے ؎

موت کی راہ ہے انساں کی تمنائے حیات
دل دھڑکتا ہے اسی نام سے طوفانوں کا

آسیہ صلاح الدین ۔۔۔ ؟

س۔ بھیا! بتایئے آپ ایسے مرد کو کیا کہیں گے جو ایک لڑکی کو تو کسی کام کی ہمت دلاتا ہے لیکن اسی کام میں خود پیش قدمی کرنے کی اُس میں ہمت نہ ہو۔

ج۔ پست ہمت۔ بے عمل!

س۔ بھیا! زندگی سے پیار کرنے والے ایک شوہر کے دل کی کیفیت اُس وقت کیا ہوگی جب یکایک اُسے یہ معلوم ہو کہ اُس کی بیوی بہری ہے۔

ج۔ شوہر اچھا انسان ہوگا، سمجھ دار انسان ہوگا تو اپنی زندگی کو تلخ نہ بننے دے گا۔ خدا کا شکر ادا کرے گا کہ اُس کی بیوی بہری ہی ہے۔ گونگی نہیں ہے۔

س۔ اُس تاریکی کو کیسے مٹائیں جو محض میری وجہ سے کسی کے روشن مستقبل پر چھائی چلی جا رہی ہے۔

ج۔ اپنے سائے کو اُس کے "حال" سے دُور رکھئے۔

افضل یونس۔ حیدرآباد دکن

س۔ آج کل ازدواجی تعلقات دیرپا نہیں ہوتے بہت جلد میاں بیوی میں طلاق کی نوبت آجاتی ہے۔ کیا یہ کوئی وبا ہے یا مشرق مغرب کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔

ج۔ یہ وبا ہوا آندھی۔ آئی ہے مغرب ہی کی سمت سے۔

سی۔ رحمت النساء بیگم۔ آمبور

س۔ آجکل لڑکیوں میں فیشن پرستی کیوں زیادہ ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ مرد فیشن کے پرستار بن گئے ہیں۔

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ عورت کا غصّہ بہت خطرناک ہے؟

ج۔ آپ عورت ہیں۔ یہ آپ ہم سے زیادہ جانتی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے ہمارے اِس جواب پر آپ کو غصّہ آجائے۔

سید محمد عمر سانحہ۔ مونگیر

س۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے؟

ج۔ جو ہر ہندوستانی کی ہے۔

...کار ناول جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہے ہیں

ٹھاکر پونچھی کے لکھے ہوئے ناول

رات کے گھونگھٹ جس میں نئی تہذیب کے اُن فرشتوں کی کہانی ہے جنہیں ظلم کی تاریک راتوں نے جنم دیا۔ مصنف نے آج کے سماج کے حسین چہروں سے پاسانی کے رنگین گھونگھٹ اُلٹ دیئے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے۔

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے اُن مردوں کی کہانی جو عورت کو ایسے عریاں انداز میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جس پر سے نظریں پھسل پھسل جائیں۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

زلف کے سر ہونے تک عشق و محبت اور حُسن و شباب کی رعنائیوں اور زندگی کی مسرتوں اور حسرتوں کا سنگم۔ تین معصوم بھولی بھالی لڑکیوں اور تین بے سہارا لڑکوں کی حسین ترین کہانی۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

چاندنی کے سائے اس میں شبنم کی ٹھنڈک بھی ہے اور شعلے کی حرارت بھی۔ کتاب کو ایک بار شروع کر کے ختم کئے بغیر آپ کو چین نہ آئے گا۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

پیاسے بادل ایک پہاڑی دوشیزہ کے پیار کی کہانی۔ دلآویز رومان کی ایک درد انگیز داستان۔ قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

یادوں کے کھنڈر حیات کے نشیب و فراز کا آئینہ دار ناول جس میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان چل رہا ہے۔ فاضل مصنف نے دل کی دھڑکنوں کو ایسے رنگ دلنواز سے اُبھارا ہے کہ قلبی رفاقت اور خلوص پر مبنی محبت کی تصویر نگاہوں کے سامنے جھکنے لگتی ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

وادیاں اور ویرانے سوکھے سڑے میدانوں اور سرسبز و شاداب پہاڑوں کی حسین و جمیل کہانی۔ قیمت فی جلد چار روپے۔

زنجیر ایک گناہگار لڑکی کی حسین و جمیل داستان۔ عشق و محبت کی ایک ایسی پُر پیچ رُومان پرور داستان جسے پڑھ کر آپ عش عش کر اُٹھیں گے جسے زکی انور نے لکھا اور ادارہ بیسویں صدی نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد صرف [illegible] روپے

پگھلتے خواب اردو ادب کے جواں سال ادیب پروفیسر ... کا ایک دلچسپ رومانی ناول جس میں آپ کو کشمیر کے حسین و دلفریب مناظر اور اُن مناظر سے جھلکتی سسکتی کہانیاں صاف دکھائی دیں گے۔ قیمت صرف ... روپے۔

نئے فرہاد پروفیسر شکیل الرحمٰن کا اچھوتا شاہکار ناول۔ ایک دوشیزہ کی المناک داستان۔ جنت ہند کی کشاکش پر لکھی ہوئی ایک انتہائی دلچسپ کہانی۔ قیمت صرف دو روپے۔

راہیں شباب کی فرانس کے عظیم ترین ناول نگار ایمیل زولا کا شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی تمام زبانوں میں جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ جسے عشق و محبت کی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اِس ناول کی ہیروئن قلوپطرہ اور ہیلن سے بھی عظیم ہے۔ مترجم جناب مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد صرف دو

طوفانِ بہار روس کے عدیم المثال ناول نگار تورگنیف کا ترجمہ دُنیا کی بیالیس زبانوں میں ہو چکا ہے جسے مشہور نقادوں نے لافانی رُومان قرار دیا ہے اور جسے اُردو ادارہ بیسویں صدی دہلی نے شائع کیا ہے۔ مترجم مخمور جالندھری۔ قیمت

بھیگی راتیں فرانس کے عدیم المثال ناول نگار ایمیل زولا کا شاہکار، افسانہ میں چھپے ہوئے حیوان کا افسانہ، اپنے کی ناقابلِ فراموش قربانیوں کی کہانی۔ مترجم مخمور جالندھری۔ قیمت

فرید موسیٰ حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اُس دَور کا تصور بھی ایک جرم تھا۔ صدیوں بعد ہوئی ایک عجیب و غریب داستان جو اوّل سے آخر تک دلچسپیوں سے لبریز ہے۔ جناب کوثر چاندپوری کا لکھا ہوا بے حد شوخ و دلچسپ ناول ... آنگن کی فضاؤں میں پرواز کرتا ہے۔ قیمت فی جلد محض تین

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی۔ دہلی نمبر ۶

غلام حامد خاں۔ نلگنڈہ

س۔ انسان؟

ج۔ تضادِ فطرتِ انساں نہ پوچھ
فرشتہ بھی ہے شیطان بھی ہے

س۔ دنیا کسی کی نظر میں بری، کسی کی نظر میں اچھی کیوں ہے؟

ج۔ دنیا کو اپنے لئے جو جیسی بنالے ویسی بن جاتی ہے۔

س۔ کسی زندہ شاعر کا کوئی زندہ شعر سنائیے؟

ج۔ سنئے ۔

موت کی بار ہے انساں کی تمنائے حیات
دل دھڑکتا ہے اسی نام سے طوفانوں کا

آسیہ صلاح الدین ____؟

س۔ بھیا! بتائیے، آپ ایسے مرد کو کیا کہیں گے جو ایک لڑکی کو تو کسی کام کی ہمت دلائے لیکن اسی کام میں خود پیش قدمی کرنے کی اس میں ہمت نہ ہو۔

ج۔ پست ہمت۔ بے عمل!

س۔ بھیا! زندگی سے پیار کرنے والے ایک شوہر کے دل کی کیفیت اس وقت کیا ہوگی جب کہ ایک اُسے معلوم ہو کہ اس کی بیوی بہری ہے۔

ج۔ شوہر اچھا انسان ہوگا، سمجھ دار انسان ہوگا تو اپنی زندگی کو تلخ نہ بننے دے گا۔ خدا کا شکر ادا کرے گا کہ اس کی بیوی بہری ہی ہے۔ گونگی نہیں ہے۔

س۔ اس تاریکی کو کیسے مٹائیں جو محض میری وجہ سے کسی کے روشن مستقبل پر چھائی چلی جا رہی ہے۔

ج۔ اپنے سائے کو اُس کے حال سے دور رکھئے۔

افضل یونس۔ حیدرآباد دکن

س۔ آج کل ازدواجی تعلقات دیرپا نہیں ہوتے بہت جلد میاں بیوی میں طلاق کی نوبت آجاتی ہے۔ کیا یہ کوئی وبا ہے یا مشرق مغرب کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔

ج۔ یہ دنیا ہو یا آدمی۔ آگئی ہے مغرب ہی کی سمت سے۔

سی۔ رحمت النساء بیگم۔ آمبور

س۔ آجکل لڑکیوں میں فیشن پرستی کیوں زیادہ ہے؟

ج۔ اس لئے کہ مرد فیشن کے پرستار بن گئے ہیں۔

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ عورت کا غصہ بہت خطرناک ہے؟

ج۔ آپ عورت ہیں۔ یہ آپ ہم سے زیادہ جانتی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے ہمارے اس جواب پر آپ کو غصہ آجائے۔

سید محمد عمر ساغر۔ مونگیر

س۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے

ج۔ جو ہر ہندوستانی کی ہے۔

بیرونی صدری دہلی

غلام حامد خاں نگلینہ

س۔ انسان؟

ج۔ تضادِ فطرتِ انساں نہ پوچھو
فرشتہ بھی ہے شیطاں بھی ہے

س۔ دنیا کسی کی نظر میں بُری، کسی کی نظر میں اچھی کیوں ہے؟

ج۔ دنیا کو اپنے لئے جو جیسی بنا لے ویسی بن جاتی ہے۔

س۔ کسی زندہ شاعر کا کوئی زندہ شعر سنایئے؟

ج۔ سُنئے ۔

موت کی مار سے انساں کی تمنائے حیات
دل دھڑکتا ہے اسی نام سے طوفانوں کا

آسیہ صلاح الدین ۔۔۔۔؟

س۔ بھیا! بتایئے آپ ایسے مرد کو کیا کہیں گے جو ایک لڑکی کو تو کسی کام کی ہمت دلائے لیکن اسی کام میں خود پیش قدمی کرنے کی اس میں ہمت نہ ہو۔

ج۔ پست ہمت۔ بے عمل!

س۔ بھیا! زندگی سے پیار کرنے والے ایک شوہر کے دل کی کیفیت اُس وقت کیا ہوگی جب یکایک اُسے معلوم ہو کہ اُس کی بیوی بہری ہے۔

ج۔ شوہر اچھا انسان ہوگا، سمجھ دار انسان ہوگا تو اپنی زندگی کو تلخ نہ بننے دے گا۔ خدا کا شکر ادا کرے گا کہ اُس کی بیوی بہری ہی ہے، گونگی نہیں ہے۔

س۔ اُس تاریکی کو کیسے مٹائیں جو محض میری وجہ سے کسی کے روشن مستقبل پر چھائی چلی جا رہی ہے۔

ج۔ اپنے سائے کو اُس کے "حال" سے دُور رکھیے۔

افضل یونس حیدرآباد دکن

س۔ آج کل ازدواجی تعلقات دیرپا نہیں ہوتے بہت جلد میاں بیوی میں طلاق کی نوبت آجاتی ہے۔ کیا یہ کوئی وبا ہے یا مشرق مغرب کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔

ج۔ یہ وبا ہو یا آندھی، آئی ہے مغرب ہی کی سمت سے۔

سی۔ رحمت النساء بیگم۔ آمبور

س۔ آجکل لڑکیوں میں فیشن پرستی کیوں زیادہ ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ مرد فیشن کے پرستار بن گئے ہیں۔

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ عورت کا غصہ بہت خطرناک ہے؟

ج۔ آپ عورت ہیں۔ یہ آپ ہم سے زیادہ جانتی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے ہمارے اِس جواب پر آپ کو غصہ آجائے۔

سید محمد عمر سانحہ۔ مونگیر

س۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے؟

ج۔ جو ہر ہندوستانی کی ہے۔

یہ مہدی دہلی

انور حسین منظور ہتر مل۔ عادل آباد

س۔ سوہن لال ساحر اور ساحر لدھیانوی ایک ہی شاعر ہیں یا الگ الگ۔ ساحر لدھیانوی کا پورا نام کیا ہے؟

ج۔ یہ دونوں دو شاعر ہیں۔ ساحر لدھیانوی کا پورا نام عبدالحیٔ ہے۔

س۔ واجدہ تبسم صاحبہ کو وطنی نسبت سے امراوتوی کہیں یا حیدرآبادی، یا ناگپوری کہیں جبکہ انھوں نے پہلی کہانی آٹھ سال کی عمر میں امراوتی میں لکھی اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ اور پھر حیدرآباد میں بی۔ اے کیا اور ناگپور میں ایم۔ اے۔

ج۔ اس اعتبار سے انھیں امراوتوی، حیدرآبادی، ناگپوری سبھی کچھ کہا جا سکتا ہے۔

س۔ حیدرآباد (دکن) اور لکھنؤ میں کس سرزمین نے زیادہ شاعروں اور ادیبوں کو جنم دیا؟ ادبی اور تہذیبی حیثیت سے آپ کس شہر کو پسند کریں گے؟

ج۔ حیدرآباد کی خاک نے بڑے بڑے ادباء و شعراء کو جنم دیا ہے۔ لیکن لکھنؤ کو حیدرآباد پر فوقیت حاصل ہے، اور لکھنؤ پر دلی کو۔

نصیر احمد۔ من مدہ (نلگنڈہ)

س۔ کسی اچھے رسالے کا نام بتایئے جو آپ کی نظر میں اچھا اور بلند معیار کا ہو۔

ج۔ خودستائی ہمارا شیوہ نہیں۔ لیکن اظہارِ حقیقت کو خودستائی نہ سمجھیں تو کیا "بیسویں صدی" اچھا پرچہ نہیں ہے۔ اس کا معیار بلند نہیں ہے؟

س۔ کہتے ہیں زندگی میں غم ہی غم نہیں ہوتا، خوشیاں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن میں اب تک خوشیوں سے محروم ہوں۔ بتایئے، کیا یہ کہنے والے سچ کہتے ہیں؟

ج۔ جی ہاں، یہ کہنے والے سچ کہتے ہیں۔ آپ خوشیوں سے محروم ہیں، پھر بھی کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ اپنے آنسو گن سکتے ہیں، قہقہے نہیں گن سکتے۔ خوشی سے محروم زندگی میں بھی جتنی بار روئے ہوں گے، اس سے کہیں زیادہ بار ہنسے ہوں گے۔

س۔ تخیل جتنی بلندی تک جاتا ہے حقیقت وہاں تک کیوں نہیں پہنچ سکتی؟

ج۔ تخیل بھی حقیقت ہی کا ایک روپ ہے۔

نصرت شمع۔ ایوت محل

س۔ بھائی جان! جب شمع جلتی ہے تو اس کے چاروں طرف روشنی بکھر جاتی ہے لیکن خود اس کے نیچے اندھیرا رہتا ہے۔ آخر کیوں؟

ج۔ تاکہ چراغ تلے اندھیرا کا محاورہ غلط نہ ہو جائے۔

س۔ خدا نے انسان کے دل میں امید کا دیا روشن کر کے اسے اتنا بڑا دھوکا کیوں دیا ہے؟

ج۔ انسان کے دل میں امید کا دیا روشن کر کے خدا نے انسان کو دھوکا نہیں دیا ہے۔ انسان اپنے حوصلہ کی پستی سے اسے خود بجھا دے یا اس کی روشنی سے فائدہ نہ اٹھائے تو یہ اس کا قصور ہے۔

س۔ جو رہے ہیں گردشِ وقت کے کوئی اور ہوں گے، وہ ہم نہیں
جو ہجومِ غم ہے بہت تو ہو طلبِ حیات تو کم نہیں
یہ شعر کس کا ہے اور اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ یہ شعر ادیب سہانپوری کا ہے۔ بہت اچھا شعر ہے۔

خورشید شیدائی۔ کلکتہ

س۔ انسان کے لئے خدا کی سب سے بڑی نعمت کیا ہے؟

ج۔ زندگی!

س۔ انسان کو ناکامی کی کس منزل پر آ کر نا امید ہو جانا چاہئے؟

ج۔ کسی منزل پر نہیں۔ امید کا دامن کبھی نہ چھوڑنا چاہئے۔ امید کی شمع کبھی نہ بجھنے دینا چاہئے۔

عبدالمجید خاں۔ برہانپور

س۔ محترم گرامی صاحب! بڑھتی ہوئی گرانی کی وجہ؟

ج۔ حکومت کی کمزور پالیسی! جس پر وہ طرح طرح کے بہانوں سے پردہ ڈال رہی ہے۔

س۔ عمل پر کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

سراج الدین ایم ابراہیم بھیونڈی

س۔ سچائی کی راہ پر چلنے والا انسان اکثر پریشان حال دیکھا جاتا ہے۔ ایسا کیوں؟

ج۔ اس لئے کہ آج کی دنیا میں سچائی کے قدردان بہت کم ہیں۔

س۔ بھیا! دوست دشمن بن جائے تو؟

ج۔ اس کا نام کچھ بھی ہو، آپ چاہے جو بھی کہیں گے!

س۔ کوئی حیات افروز شعر سنایئے۔

ج۔ ؎ حادثات ایک طرف موت بھی شرما جائے
زندگی اپنی حقیقت سے خبردار تو ہو

مختار احمد نسیم۔ کلکتہ

س۔ کیا حیات ایک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے؟

ج۔ یہ تو صاحبِ حیات پر موقوف ہے۔ اپنی حیات کو جیسی بنا لے۔ زندگی سنگِ گراں بھی ہے، گلِ تر بھی!

س۔ خوبصورت عورت آنکھوں کی مسرت ہوتی ہے، اور خوب سیرت عورت؟

ج۔ خوب سیرت عورت روح کی مسرت ہوتی ہے، دل کی مسرت ہوتی ہے۔

نبی بخش بہادر۔ جون ہبلی۔ دھارواڑ

س۔ علم بغیر عمل اور عمل بغیر علم؟

ج۔ اچھا نہیں۔

[illegible] شوال۔ بنارس

س۔ [illegible] بھائی! [illegible] کو کس طرح کی تسلیم [illegible]؟

ج۔ جو [illegible] عقل نہیں، چراغ خانہ بنائے۔

س۔ قاضی محمد سلیم بنارسی کے یہ شعر مجھے بہت پسند ہیں۔ آپ کی رائے میں یہ شعر کیسے ہیں؟

برق گر جائے گی شاخ جل جائے گی
آشیانے کا نقشہ بدل جائے گا
رُخ سے پردہ ہٹاؤ نہ تم اے صنم
ورنہ مہتاب کا حسن ڈھل جائے گا

ج۔ معاف فرمائیے گا یہ عامیانہ اشعار ہیں۔

محمد سلیم انصاری۔ بریو بزاری باغ

س۔ بچپن کی دوستی بڑھاپے تک کیوں قائم نہیں رہتی؟

ج۔ اس لئے کہ بچپن گزر جانے کے بعد خلوص کے دامن پر خود غرضی کا سایہ پڑ جاتا ہے۔

س۔ انسان اپنی عادت سے کب مجبور ہو جاتا ہے؟

ج۔ جب دماغ پر دل کو ترجیح دینے لگتا ہے۔

س۔ اگر میں آپ کو غزل اور افسانہ بھیجوں تو "بیسویں صدی" میں جگہ دیں گے؟

ج۔ آپ کی تخلیقات "بیسویں صدی" کے معیار کی ہوں گی تو یقیناً جگہ پائیں گی۔ ہم فن کو پہلے فنکار کو بعد میں دیکھتے ہیں۔

مسلم آزاد۔ رمضان پور

س۔ کیا فرقہ پرستی پچھڑے ہوئے ملکوں کی نشانی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ کیا امیر کی صحبت کالی رات کی سیاہی ہے؟

ج۔ امیر کی صحبت کالی رات کی سیاہی [illegible] دل کو مردہ کر دیتی ہے۔ یہ حضرت [illegible] کا ارشاد ہے۔

س۔ خورشید بھیا! کیا آج کل سب سے بڑا شریف وہ ہے جس کے پیٹ میں روٹی، بدن پر کپڑا ہے اور جیب میں پیسے ہیں؟

ج۔ نام نہاد شریفوں نے شرافت کا یہی معیار بنا رکھا ہے۔

محی الدین شریف۔ کوپل

س۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے لٹریچر سے علماء کا ایک طبقہ متنفر ہے۔ دوسری طرف چوٹی کے علماء و مفکرین انھیں بہت بڑا عالم و فاضل اور بہت بڑا مفکر سمجھتے ہیں۔ آپ کی رائے کا خواہاں ہوں۔

ج۔ مولانائے موصوف بے شک بہت بڑے عالم، بہت بڑے مفکر ہیں۔ اختلاف رائے سے کون بچا ہے۔ کچھ لوگ پیغمبروں کے بھی منکر تھے۔

حسن جمال۔ گورکھ پور

س۔ خورشید بھائی! اگر کوئی بہت ہی عزیز دوست روٹھ جائے اور بظاہر خفگی کی کوئی وجہ بھی نہ معلوم ہو تو بتائیے اسے کس طرح مناؤں کہ وہ پہلے ہی جیسا ہمراز اور مخلص دوست بن جائے۔

ج۔ روٹھنے کی کوئی وجہ ہو گی یا غلط فہمی ہو گی۔ اسے دور کر کے اپنے خلوص کا یقین دلانا چاہئے۔ بگڑی بات بنانے کی یہی راہیں ہیں۔

ممتاز ناظم۔ [illegible]

س۔ بھائی جان! آپ کی [illegible] بہت [illegible] کیا [illegible] ہم خیال ہو سکتے ہیں؟

ج۔ دوسروں کے [illegible] ہم [illegible] کہہ سکتے ہیں۔ [illegible]!!

س۔ ایک حسین شعر سنائیے؟

ج۔ سنئے۔

تاریکیٔ حیات میں بھر کر سحر کا رنگ
ظلمت کدوں سے نور [illegible]

فیروزہ خاتون۔ گیا

س۔ کیا حسن کی پرستش سے خدا ملتا ہے؟

ج۔ خدا کی پرستش سے خدا ملتا ہے۔

س۔ ماں کی ممتا کو کس چیز سے تشبیہ دی جا سکتی ہے؟

ج۔ ماں کی ممتا اپنی مثال آپ ہے۔

س۔ میں دہلی آنے والی ہوں۔ آپ مجھے اپنی [illegible] محترمہ سے ملنے کی اجازت دیں گے؟

ج۔ آپ بصد شوق مل سکتی ہیں۔

محمد اسحاق جونپوری۔ ہزاری باغ

س۔ اگر زندگی کی ضروریات ناجائز راستہ [illegible] کرنے پر مجبور کریں تو؟

ج۔ جب بھی [illegible] راستے پر [illegible] جانا چاہئے۔

[illegible] پرنٹر پبلشر۔ خوشتر گرامی [illegible] مطبوعہ۔ [illegible] [illegible] آصف علی روڈ۔ نئی دہلی [illegible]


بیسویں صدی
اگست
29(8)
BISW



رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں

اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے ——— آتش



اللہ اللہ حسن کی تابانیاں
آنکھ بھر کر دیکھنا ممکن نہیں

فوٹو: آر۔ ایس۔ پروانہ، بمبئی

پچھلے دنوں آل انڈیا ایڈیٹرز کانفرنس گوا میں
شرکت کے بعد خوشتر گرامی اور جناب جمنا داس
اختر کنوینر آل پارٹیز اردو تالوق زبان کمیشن
دہلی، روزنامہ انقلاب بمبئی کی [illegible]
خوشتر گرامی ان کے دفتر گئے [illegible]
پر ایڈیٹر [illegible] احمد صاحب انصاری
[illegible] ادارہ انقلاب کے [illegible]
[illegible]
[illegible] ان [illegible] تصویر میں بیٹھے
ہوئے صاحب ہیں جناب [illegible]
خوشتر گرامی اور جناب [illegible]
[illegible]



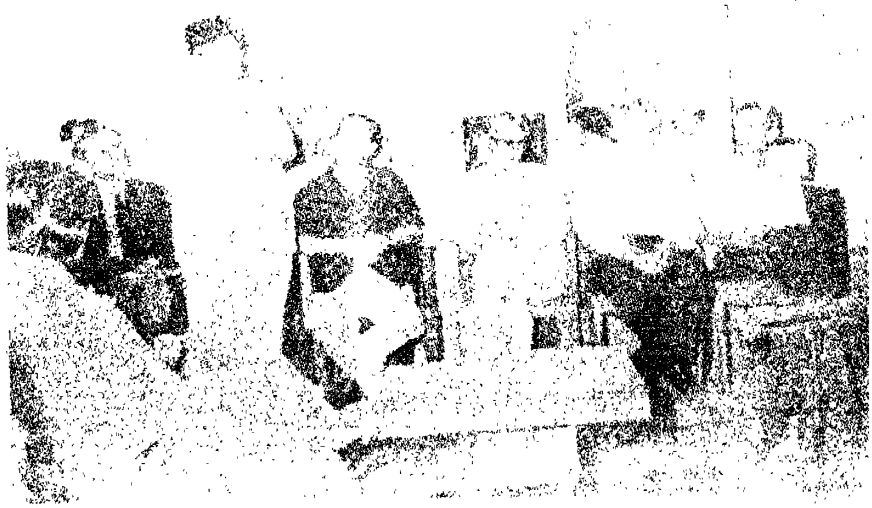


[illegible]
[illegible] اپنے [illegible] کی
[illegible] کرتے ہوئے حاضرین کی طرف
[illegible] میں اظہار خیال
[illegible] تصویر میں انصاری صاحب مہمانوں
[illegible] کرا رہے ہیں [illegible] جناب
[illegible]



سب سے پہلے اردو کے مشہور صحافی اور روزنامہ
سویرا کے ایڈیٹر جناب [illegible] نے
اپنے مخصوص سلجھے ہوئے منطقی انداز میں کہا
کیا اردو کا مسئلہ لسانی [illegible] ہے
اور [illegible]

[illegible]



[illegible]

[illegible] ہندوستان [illegible] اردو کو ان کی مادری
زبان سے محروم کر دیا گیا ہے اور یہ ایک ناقابل
برداشت ظلم ہے۔ ہندوستان کے کروڑوں
باشندے اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے
بے چین ہیں اور اگر [illegible] اردو کے پرستار [illegible]
[illegible] حاصل کر سکتے [illegible]

مشہور ترقی پسند شاعر جناب سردار جعفری نے کہا کہ اُردو کے ساتھ زیادتی اُن علاقوں میں ہو رہی ہے، جہاں اُردو مادری زبان ہے۔ کچھ سال پہلے بیس لاکھ اُردو دانوں کے دستخطوں کے ساتھ اُردو کے تحفظ کے لئے ایک اپیل صدرِ جمہوریہ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی لیکن اُس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا——— "انڈین ایکسپریس"، "ہندوستان ٹائمز" اور "اسٹیٹس مین" کے اداریے اِس بات کا ثبوت ہیں کہ اُردو کا کیس بہت مضبوط ہے۔ ہم اپنے عمل اور جدوجہد سے اُردو کا حق منوا کر رہیں گے....



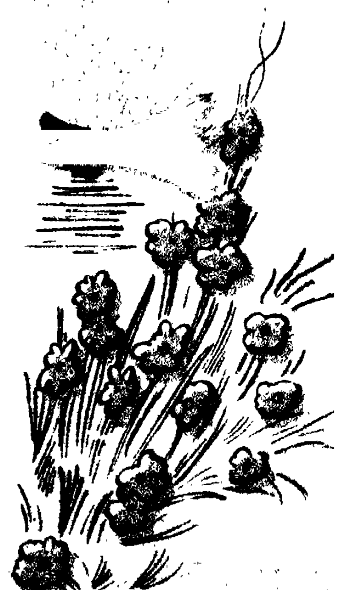


راشٹر کے وزیر برائے شہری ترقیات
ب ڈاکٹر رفیق زکریا نے مہمانوں کے خیالات اور
کی کوششوں کو سراہتے ہوئے فرمایا۔
بڑا افسوسناک ہے کہ سیاسی مصلحتوں کی بنا
اردو کو فرقہ وارانہ رنگ دیا جا رہا ہے۔ اردو
بھاشا اور سنسکرت کے امتزاج سے
ہے۔ اگر اس میں عربی اور فارسی کے
الفاظ ہیں تو کیا قباحت ہے۔ آج جو مرہٹی
ہے، اُس میں تیس فیصدی الفاظ فارسی
ہیں اور شیواجی کے خطوط میں تو ستر فیصدی
الفاظ فارسی کے ہیں۔ مہاراشٹر کی حکومت
اُردو کے ساتھ ہے۔"

بیسویں صدی دہلی

اگست ۱۹۶۵ء

ایڈیٹر:- خوشتر گرامی



تیر و نشتر

"ہندوستان میں اب بھی کروڑوں لوگ بھوکے سوتے ہیں" ایک مقالہ
——— اُنھیں یقیناً کم از کم نیند آتی ہوگی۔

"ملک کی سلامتی خطرے میں ہے" لال بہادر شاستری ———
مگر آل انڈیا ریڈیو گانے سُنا سُنا کر قوم کو ملکی سلامتی کے لئے تیار کر رہا ہے۔

"بیرونی حملے کی صورت میں جن سنگھ سرکار کو پورا پورا تعاون دے گا" ایک بیان
——— ورنہ سرکار کی جڑیں کاٹنے کے لئے پوری پوری کوشش کریگا۔

"اناج کی کھپت میں کمی کرنے کی کوشش جاری رکھنے کے لئے شری لال بہادر شاستری کا مشورہ" ——— اور کنکروں پتھروں سے پیٹ بھرنے کی تجویز۔

"دلّی میں چاول کی بلیک" ایک خبر ——— یعنی اب چاول سفید نہیں، بلیک (سیاہ) ملتے ہیں۔

"راجستھان میں اناج کے اسٹاک کی حد مقرر کر دی گئی" ایک خبر ———
اس سے آسان کام لوگوں کی خوراک مقرر کرنا تھا۔

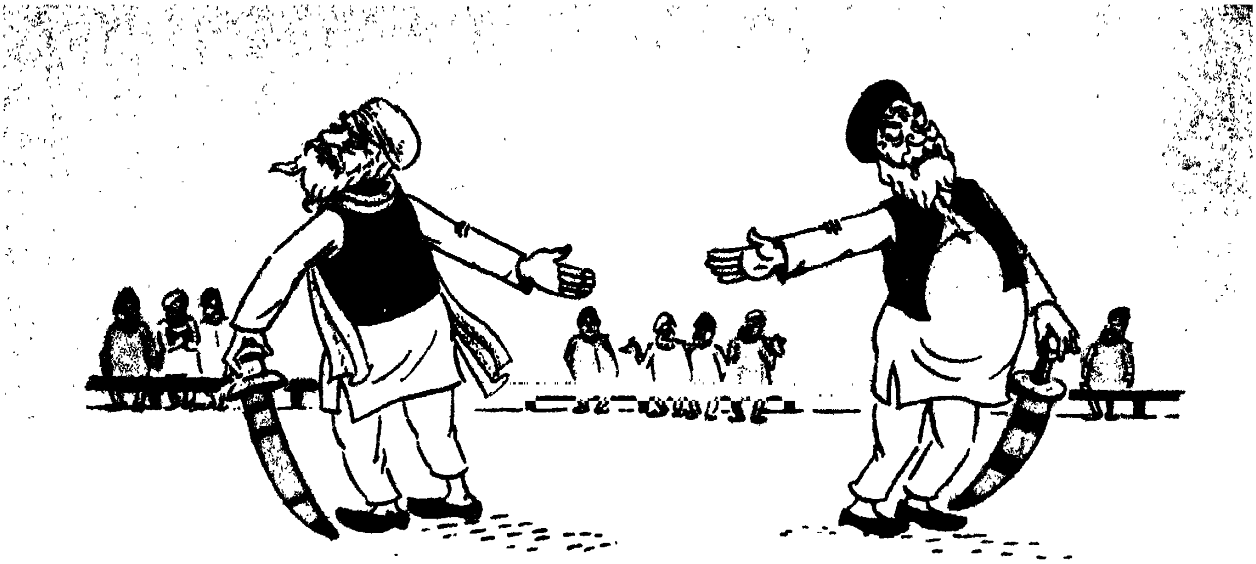
"سیلون میں بھارتیوں پر روزگار کے دروازے بند" ایک خبر ———
بھارت میں تو پہلے ہی تھے۔

"اقتصادی تعمیر کے کام میں بے صبری دکھاؤ" گلزاری لال نندہ ———
مگر جنتا لیڈر نہیں۔

"مُردے کے نام سمن۔ دلّی کی عدالت کا کمال" ایک خبر ———
وہ حاضر نہ ہوا تو پھر وارنٹ جاری کیا جائے گا۔



"جن سنگھ مرکز میں قومی سرکار بنانے کے خلاف" ایک عنوان ——— انگور کھٹے ہیں۔



"ماسٹر گروپ اور سنت گروپ میں سمجھوتہ کی کوشش": ایک خبر ——— بڑا مزہ اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔

" جاگتے رہو": ایک عنوان ——— نہیں تو کوئی کانگرسی چکمہ دے جائیگا۔

"دلّی کارپوریشن سے لوگ دُکھی ہیں۔ اِسے توڑ دیا جائے": ایک مقالہ ——— اور فوراً اسمبلی قائم کی جائے جس کے نہ ہونے سے لیڈر دُکھی ہیں۔

"کامریڈ وزارت کیرول کے نقشِ قدم پر۔ سوامی رامیشورانند کا سرٹیفکٹ": ایک عنوان ——— ہمیں سوامی جی سے ہمدردی ہے کہ اُن کے نقشِ قدم پر نہ چل سکی۔

"روہتک میں صفائی کی حالت ناگفتہ بہ": ایک خبر ——— بلکہ ناقابلِ صفائی۔

"دربارہ سنگھ کی نیند حرام ہوگئی": ایک خبر ——— ہر محبِ وطن اور کام کرنیوالا آرام حرام سمجھتا ہے۔

"لاہور میں بجلی بند رہے گی": ایک خبر ——— دلّی کی وبا لاہور تک پہنچ گئی۔

"کیرول نیشنل فرنٹ قائم ہوگا": ایک خبر ——— تاکہ سردار کیرول کی آتما بھی شانتی سے نہ رہ سکے۔

"ہم کیا جواب دیں": ایک جن سنگھی اخبار ——— اور یہ بھی کہ کس منہ سے جواب دیں۔

"رام کرشنا پورم دلّی میں پانی کی ایک بالٹی ایک روپیہ میں ملتی ہے": ایک خبر ——— فوراً خرید لو۔ بہت سستی ہے۔ لوہے کی ایک بالٹی تو چار روپے سے کم میں نہیں مل سکتی۔

"بھارت سخت رویہ قائم رکھے گا": ایک عنوان ——— اور سختی کے لئے بھلائی کے کارخانے کا فولاد استعمال کیا جائے گا۔

"دلّی کارپوریشن کا دیوالہ": ایک عنوان ——— دیوالی سے پہلے۔

"امریکی جوڑا احکام کسٹم کے حوالے" ایک خبر —— کپڑوں کا جوڑا ہے۔
یوں کا جوڑا ہے یا جوتی کا جوڑا ہے۔

"داس کمیشن کی رپورٹ" ایک عنوان —— سرد کیروں کی طرح
ی کردی گئی۔

"کانگرس ہائی کمان کا لسانی فارمولا انتشار لائیگا" راجہ جی کا بیان ——
راجہ جی کی لسانی سرگرمیاں دلوں کو جوڑنے والی ہیں۔

"ٹیچروں کی ٹریننگ کا طریقہ تبدیل کیا جائے" ایک عنوان ——
ایسا طریقہ رائج کیا جائے جس میں بغیر کسی ٹریننگ کے سرٹیفکٹ مل جایا کرے۔

"فرانس کا پہلا مصنوعی ستارہ خلا میں" ایک خبر —— فرانس بھی شامل ہوگیا
یوں سواروں میں۔

"جمنا نگر میں شراب کی بھٹی" ایک خبر —— اماں نہیں جمنا کا پانی ہوگا۔

"علاقائی زبانوں کی ترقی کے لئے مرکزی بورڈ" ایک عنوان ——
مرکزی زبان ہندی میں کام کرے گا۔

"بڑے بڑے مگرمچھوں کے خلاف مقدمات واپس لینے کا فیصلہ"
ب خبر —— اس لئے کہ مقدموں کے لئے چھوٹی چھوٹی مچھلیاں جو ہیں۔

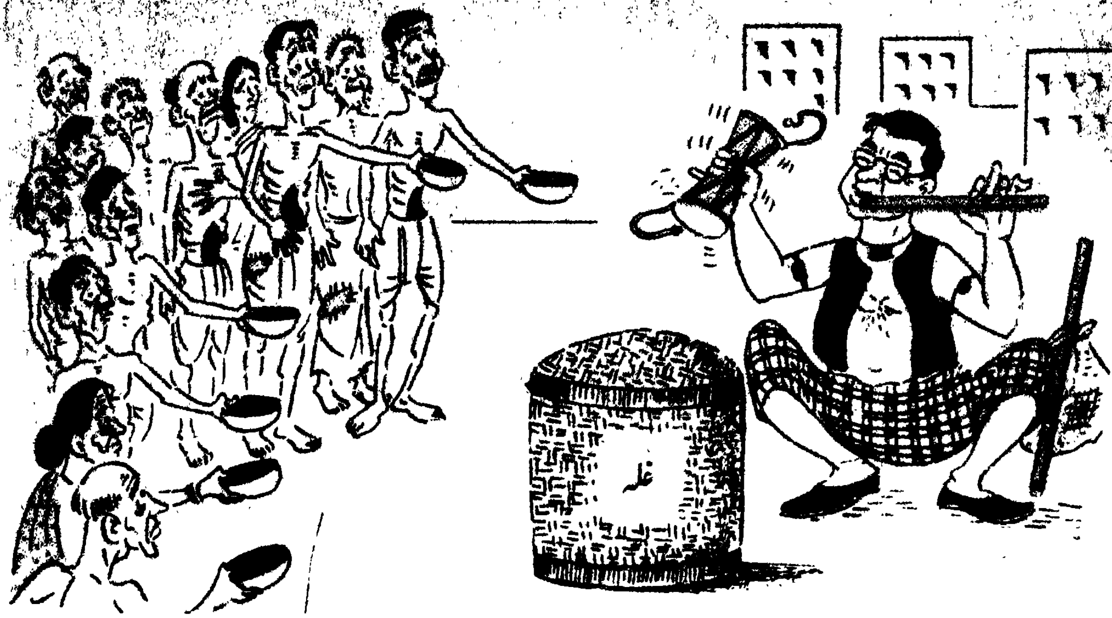
"بونس کی ادائیگی لازم" ایک عنوان —— مالکوں کے لئے دیوالہ
ی لازم اور مزدوروں کے لئے کام نہ کرنا ملزوم۔

"ہم دیش کی رکھشا کے لئے جانیں قربان کردیں گے" ایک عنوان ——
ی نہیں۔ آل انڈیا ریڈیو رکھشا گیت گائیں گے اور بس۔

"عاشق کا منہ کالا" ایک خبر —— کہ محبت میں یوں بھی ہوتا ہے۔



"گندم کے بھاؤ چڑھنے سے غریب پریشان" ایک عنوان —— امیروں
کے مزے ہوگئے۔ اُنہوں نے کیک پیسٹری۔ انڈا مچھلی کھانی شروع کردی۔



"میرے بیان پر آپ بھروسہ کریں۔" بھر امینم ـــــــ اور جو لوگ قحط کی بات کرتے ہیں وہ ناقابلِ اعتبار ہیں۔

"پنجابی جوانوں کے کارنامے قابلِ فخر ہیں۔" سکا. ریڈ رام کشن ـــــ کہ وہ لیڈروں کی
سیاسی دھڑے بندیوں میں حصہ نہیں لیتے۔

"کھوتے پر پابندی نہیں لگے گی۔" ایک خبر ـــــ اس لئے کہ جو کھو گیا اُس پر
مدی مناسب نہیں۔

"ملک کی تمام اسٹیٹوں میں زبانوں کی انسٹی ٹیوٹ قائم کی جائیں گی۔" ایک خبر ـــــ
اُردو زبان کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

"سردار دربارہ سنگھ کو وزارت سے معطل کر کے تحقیقات کرانے کا مطالبہ۔"
عنوان ـــــ تاکہ اُن باتوں پر پردہ پڑا رہے جنہیں دربارہ سنگھ بے نقاب کرنے پر
ے ہیں۔

"انسان یا شیطان۔" ایک عنوان ـــــــ خوب پہچانا۔

"کولڈ اسٹوریج سے لاش برآمد ہوئی۔" ایک خبر ـــــ تاکہ ٹھنڈے ٹھنڈے
ملکِ عدم کا سفر طے ہو سکے۔

"بیوی کے پاسپورٹ پر سفر" ایک خبر ـــــ اُن کا گھریلو معاملہ ہے۔
آپ کون؟

"مدھیہ پردیش میں ریوالور بنانے والا بہت بڑا کارخانہ پکڑا گیا۔" ایک خبر ـــــ
قومی دفاع کے لئے ساز و سامان کی تیاری کی پرائیویٹ کوشش۔

"پاکستان کے سابق مرکزی وزیرِ تعلیم نے دوبارہ وکالت شروع کر دی۔" ـــــ
اسی لئے مجید لاہوری مرحوم نے وزارت کو کچی نوکری کہا تھا۔

"مسافر عورت کو نشہ پلا کر لوٹ لیا۔" ایک خبر ـــــ مزہ تو جب ہے کہ
لٹتوں کو تھام لے ساقی۔

"بریلی میں زمین پر فساد" - ایک خبر ——— تعجب! حیرت!! ورنہ اب تک تو آسمان پر فساد ہوتے تھے۔

"لوگوں کو تعلیم اور سماجی بہبود کے میدان میں حکومت سے زیادہ سے زیادہ تعاون کرنا چاہیئے" پاکستان کے مرکزی وزیرِ تعلیم کی تلقین ——— نہ کہ وزارتوں، سفارتوں اور عہدوں کے لئے دوڑ دھوپ کرنی چاہئے۔

"کان کے دھماکے میں تخریب کاری" ایک عنوان ——— کان کا پردہ پھٹ گیا ہوگا۔

"قتل کے ملزم نے خودکشی کر لی" ایک خبر ——— جج کا کام آسان کر دیا۔

"پاکستان کی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں ووٹوں کی گنتی کے خلاف اپیلیں" ایک خبر ——— اپنے حامی حمایتیوں کی تسلی کے لئے ہارے ہوئے اُمیدواروں کا مشغلہ۔

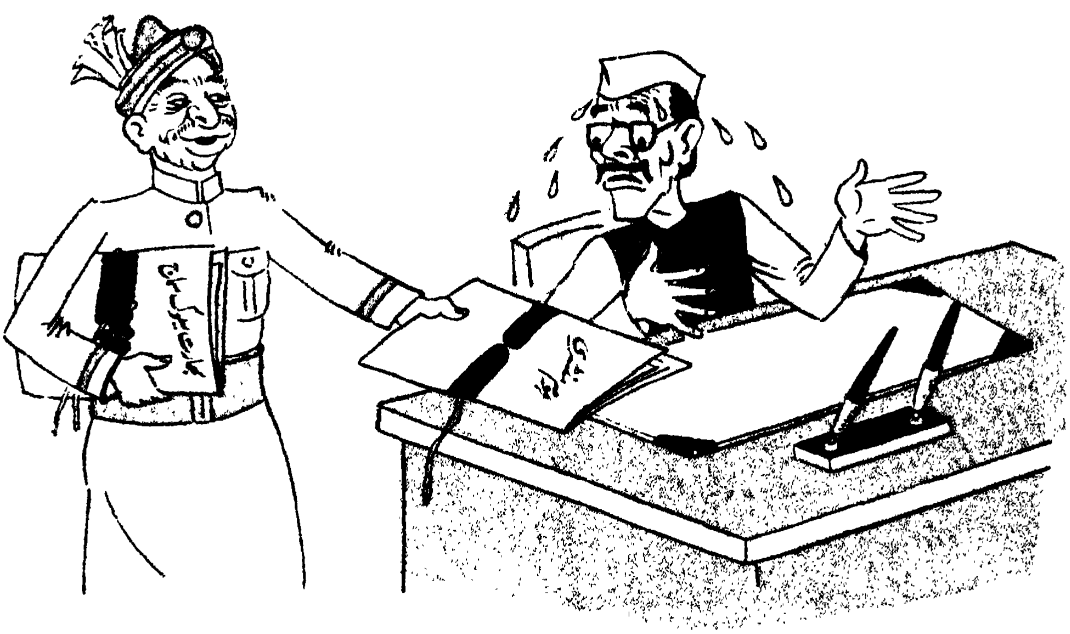
"دیش کی اُلجھنیں اور اُن کا حل" - ایک مقالہ ——— کانگرس نے پیدا کی ہیں۔ جنتا آئندہ الیکشن میں حل کرے۔

"نیشنل کانفرنس مر چلی ہے" پھاگلہ ——— حق مغفرت کرے۔

"گرم جنگ سے گھبرانا انتہا درجہ کی بزدلی ہے" جن سنگھ کے پردھان کا اعلان ——— اور گرم جنگ کے متعلق باتیں کرنا انتہا درجہ کی بہادری ہے جو آپ کے حصے میں آئی ہے۔

"کانگرسی دھڑوں میں ٹکر" ایک عنوان ——— اور جنتا بیچاری کا نقصان۔

"جو بات اندھوں کو بھی نظر آ رہی تھی وہ ہمارے حکمرانوں کو نظر نہ آئی" ایک تبصرہ ——— اسی لئے تو کسی نے کہا ہے، اندھے کو اندھیرے میں بہت دُور کی سوجھی۔



"بھارت سیوک سماج سے شری گلزاری لال نندہ کا استعفےٰ منظور" ——— اور ہوم منسٹری سے کب تک دیں گے؟

[illegible]

[illegible]

ماہم چرچ کے باہر فٹ پاتھ پر ہم پانچوں سداشیو سنتری کے ساتھ ٹھرا پی رہے تھے۔ میں اور باسکو جو چور تھا۔ تانتیا جو گرہ کٹ تھا اور ابھی جیل سے چھوٹا تھا۔ جتنا جو طوائف تھی۔ عبدل جو سامنے کے ایرانی ریستوران میں دن کو بیراگیری کرتا تھا اور رات کو ٹھرے کی بوتلیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا تھا۔ رات نشے کی طرح گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اور ایک آتشیں گھونٹ کی طرح جیسے ہمارے گلے سے اتر رہی تھی۔

دو بجے کے قریب سداشیو مستی کے عالم میں بولا " اور منگاؤ !"

تانتیا کی جیب میں صرف بارہ روپے آٹھ آنے باقی رہ گئے تھے۔ وہ بولا " اور کدھر سے منگاؤں۔ اب صرف کھولی کا بھاڑا باقی ہے۔ وہ میں دینے کا نہیں !"

" جیل جانا مانگتا ہے ؟" سداشیو سنتری نے اُسے دھمکی دی۔

تانتیا نے غرور سے کہا " جب کھرا دھندا کروں گا تو جیل کیوں جاؤں گا ؟"

سداشیو کو اب چڑھ گئی تھی۔ اُس نے کنکھیوں سے باسکو کی طرف دیکھا اور بولا۔ " تو کیا کہتا ہے باسکو ؟ چھگن کی دوکان کی چوری کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔ سوچتا ہوں سراغ لگا ہی لوں !"

باسکو ایک منٹ تک سداشیو کو گھورتا رہا۔ پھر کچھ کہے سُنے بغیر گھوم گیا اور عبدل کو اشارہ کر کے بولا " میرے ساتھ آؤ !"

سداشیو زور سے ہنسا اور باسکو اور عبدل کو اُس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ دونوں چرچ کے پیچھے کی گلی میں غائب نہ ہو گئے۔

وہ گلی دن کو سوتی ہے۔ رات کو جاگتی ہے اور اپنا تنگ و تاریک دہانہ کھولے کیچڑ میں لت پت کسی مگرمچھ کی طرح منہ کھولے ہوئے نظر آتی ہے۔ تاریکی اور مٹیالی روشنی کی ملی جلی دھند میں لپٹی ہوئی کہر آلود صورتیں دروازوں کے اندر جاتی اور باہر نکلتی دکھائی دیتی ہیں۔ بچے بوتلیں کھنکھناتے ہوئے اِدھر سے اُدھر جاتے ہیں۔ عورتیں بیسن کی پکوڑیاں یا مچھلی کے ٹکڑے یا بھینس کے کباب تلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لکڑی کے نیم تراشیدہ بینچوں پر گاہک ٹھرا پیتے نظر آتے ہیں۔ اِس گلی کے باہر گھر میں ایک چھوٹی سی بھٹی ہے۔ جب ایک گھر کا ٹھرا ختم ہو جاتا ہے تو دوسرے گھر سے اُدھار لے لیا جاتا ہے۔ یہ گلی ہر مہینے پانچ سو روپیہ بھتہ دیتی ہے۔ ورنہ دھندا ایک دن نہ چلے۔ پھر بھی پولس مہینے میں دو بار چھاپے مارتی ہے اور مال برآمد کرتی ہے۔ اور دو ایک دوکانداروں کو گرفتار کر کے لے جاتی ہے اور یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی تجویز کے زیرِ تحت ہوتا ہے ! ٹھرا بیچنے والے گرفتار بھی ہوتے ہیں، سزا بھی پاتے ہیں، جیل بھی جاتے ہیں لیکن ٹھرے کا دھندا چلتا رہتا ہے اور گرفتار ہونے والوں کے گھروں اور اُن کے بال بچوں کی پوری کفالت گلی کرتی ہے۔

اِس لئے کہ ٹھرے میں بہت نفع ہے۔ دارو کا پرمٹ بیس روپے میں ملتا ہے۔ دس روپے ڈاکٹر ایک سرٹیفکٹ کے لیتا ہے۔ تیس روپے ہوئے۔ پھر گھٹیا سے گھٹیا شراب کے دام جو لائسنس یافتہ دوکان پر فروخت ہوتی ہے، بہت زیادہ ہیں۔ ستائیس روپے سے کم میں کوئی بوتل نہیں آتی اور ٹھرے کی بوتل صرف چار روپے میں بکتی ہے۔

[illegible] سکے ہیں کہ ایک
[illegible]
[illegible] کپڑوں کو اور رستی
[illegible] کہ اس پر جے
[illegible] سکے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔
[illegible] کی ساری گلیاں اور محبوبہ یادیں چھوڑنا چاہتا
[illegible] جاتے ہیں ... نکل آتے ہیں۔
[illegible] کی طرح اس کی آنکھیں
[illegible] اس کا چہرہ یاد آتا ہے۔ بیری
کے [illegible] سب کے لئے جینا ہوگا اور
زندگی کے [illegible] اور [illegible] کر اپنا نام کر دو کہ اس کی خوشی ہی زندگی
[illegible] ہیں.....!

بڑھو مستری پارسی باوا کی بستی اس گلی میں سب سے بڑی تھی۔ اس کا مکان بھی سب سے بڑا تھا۔ اس کی بکری کی بھی سب سے زیادہ تھی۔ اس کے پاس ایک موٹر بھی تھی۔

باسکو عبدل کو لے کر مستری باوا کے ہاں پہنچا۔

"صاحب جی!" باسکو نے پارسی باوا کو پکارا۔

"صاحب جی!" کہہ کر پارسی باوا نے جواب دیا۔

"چار بوتلیں ٹھرے کی دو!" باسکو بولا۔

"سولہ روپے نکالو!" مستری نے کہا۔

"پیسے تو نہیں ہیں" باسکو نے بتایا۔

"تو جاؤ" مستری باوا بولا اور گھر کا دروازہ بند کرنے لگا۔

باسکو نے جلدی سے اپنا مضبوط پیر دروازے کے اندر رکھ دیا اور بولا۔

"سیٹھ! تمہاری گاڑی کا ایک ٹائر پچکا ہے"

"ہاں پھٹ گیا ہے!"

"نیا لاؤ گے؟"

"کتنے میں؟" پارسی باوا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

"ستر روپے میں!"

"ستر روپے تو بہت ہیں۔ میں تم کو چار بوتل دے دوں گا!"

"سیٹھ! نیا ٹائر سو روپے میں آتا ہے۔ دو بات کا ٹائر ستر میں دوں گا۔ بولو [illegible] ہوگا آدھے پیسے والا؟"

"چل، آٹھ بوتل ٹھرا اور دس روپے ساتھ میں!"

"سولہ روپے کا مال بتیس روپے میں؟" باسکو نے چڑ کر پوچھا [illegible] منافع کیسے ہوگا؟"

"اچھا! سولہ روپے ادھر دوں گا۔ مگر مال ذرا اچھا چاہئے!"

"پچیس پچیس روپے کا [illegible] چار باٹلی ابھی ادھار دے دو [illegible] گھنٹے میں مال آتا ہے!"

اچھی بات ہے۔ چار باٹلی لے کر باسکو عبدل کے ساتھ روانہ ہوا۔ آگے سے نکل کر اس نے عبدل کے ہاتھ میں چار باٹلیں دیں اور بولا "ادھر جا کر گلاب موٹر گیراج کے پیچھے آجاؤ!"

جب عبدل بوتلیں پہنچا کر گلاب موٹر گیراج کے پیچھے پہنچا تو باسکو پیچھے کے روشندان میں ایک رستی لٹکا چکا تھا۔ وہ عبدل سے بولا "گیراج کا لاک بہت مضبوط ہے کھلتا نہیں ہے۔ سب کھڑکیاں بھی اندر سے بند ہیں۔ تم روشندان کے ذریعے گیراج کے اندر گھس کر ایرانی ہوٹل والے کی گاڑی کا ٹائر نکالنا ہوگا!"

عبدل نے انکار میں سر ہلایا "ہم پانی کا دھندا کرتا ہے مگر چوری نہیں کرتا ہے!"

باسکو نے غصے میں آگ بگولا ہو کر گھورا تو عبدل سولہ سال کا لڑکا تھا سہم گیا۔ دھیرے سے بولا۔ "انکار! ہم ایرانی کے ہاں نوکر ہیں۔ اس کو پتہ چل گیا تو نوکری بھی ہاتھ سے جائے گی!"

باسکو بولا "اگر میں گیراج کے اندر جا سکتا تو تم کو نہیں بولتا۔ پر اس ناتے چوری کی بات ہے۔ تم کو روشندان سے اندر جانا ہوگا۔ تم کو گلاب موٹر گیراج کے اندر کا سب حال معلوم ہے۔ تین مہینے تم قاسم بھائی مکینک کے انڈر میں کام کر چکے ہو۔ ایرانی کی گاڑی تم پہچانتے ہو۔ تم کو معلوم ہے قاسم بھائی ڈھیل پانا اور جیک کدھر رکھتا ہے۔ جیک چڑھا کر ڈھیل پانے سے ایک ٹائر نکال کے لے آؤ۔ اندر کی کھڑکی کھول کے ٹائر باہر پھینک دو اور چھلانگ لگا کر باہر آجاؤ تو سب کام پندرہ منٹ میں ہوگا۔ جاستی بات مت کر!"

"نہیں۔ ہم چوری نہیں کرے گا!" عبدل نے بہت زور سے سر ہلایا۔

باسکو نے اسے گردن سے پکڑ لیا اور چاقو نکال کر اس کا پھل اس کی گردن کی جلد پر رکھ کر تیز لہجے میں بولا "اندر جائے گا کہ نہیں؟"

عبدل نے چاقو کی تیز دھار کو اپنے گلے پر محسوس کیا۔ باسکو کے مضبوط ہاتھ کے دباؤ سے عبدل کی آنکھیں باہر نکلنے لگیں۔ گلا رکتا ہوا معلوم ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ باسکو نے چاقو ہٹا لیا۔ عبدل کو چھوڑ دیا۔ رستی اس کے ہاتھ میں دے دی۔

دھیرے دھیرے عبدل رستی پر چڑھنے لگا۔

روشندان کے اندر گھس کر اس نے باہر کی رستی اندر کھینچ لی اور دھیرے دھیرے گیراج کے گھپ اندھیرے میں یوں اترنے لگا جیسے کسی کنویں کے اندر اتر رہا ہو۔ سانس روک کر دھیرے دھیرے وہ نیچے اترتا رہا۔ چند لمحوں تک رستی کے آخری سرے کو پکڑ کر نیچے لٹکا رہا اور دونوں پاؤں کو نیچے جھکا کر فرش کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب اس کے پاؤں فرش پر نہ پہنچے تو رستی چھوڑ کر نیچے پھلانگ گیا۔

فرش پر گرتے گرتے اس کا پاؤں پٹرول کے ایک خالی ٹین سے ٹکرایا۔ [illegible] اس کے دماغ

[illegible]

[illegible]

[illegible] گاڑی کے مالک کون ہیں، وہ سب جانتا تھا لیکن [illegible]
پہچان نہ سکتا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی اور جب آنکھیں اندھیرے
سے مانوس ہو گئیں تو اُسے آس پاس کی نشانیاں مدھم سی دکھائی دینے لگیں، تاریک خطوط نظر آنے لگے، گاڑیاں،
[illegible] اوزار کی الماری اور ایک کونے میں ایک لمبی پتلی مستطیل نما الماری۔ بچتا بچاتا وہ
ڈرتا ہوا فرش پر گھسٹتا ہوا گاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ باسکو کی دی ہوئی جیبی ٹارچ اُسے یاد آئی۔
[illegible] احتیاط سے اُس نے کسی گاڑی کے مڈگارڈ کی اوٹ میں سے جا کر جیبی ٹارچ کو کچھ جگہ
روشن کیا۔ اور جب اُسے اُسی ایرانی کی گاڑی مل گئی تو وہ چند لمحوں تک اُس کے قریب کھڑا اُس پر
ہاتھ پھیرتا رہا۔ ایرانی ہوٹل والے کی گاڑی اُسے بہت پسند تھی۔ اُس کا شربتی رنگ، اُس کے چکنے خطوط،
اُس کا میٹھا سُریلا ہارن۔ جب چلتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تیر کمان سے نکلا جا رہا ہے۔ اُس نے
اس گاڑی کی طرف ہمیشہ ایسے دیکھا تھا جیسے کوئی بھکاری کسی شہزادی کو دُور سے دیکھتا ہے۔ وہ
چند لمحوں تک اُس گاڑی کے قریب کھڑا اُس کے خنک چکنے جسم پر ہاتھ پھیرتا رہا اور ایک عجیب
لذت سے آشنا ہوتا رہا۔ پھر اُسے باسکو یاد آیا جو چاقو لئے گیراج کے باہر کھڑا تھا اور وہ گاڑی سے
الگ ہو کر اوزاروں کی الماری کے آدھ کھلے پٹ کی طرف گیا اور وہیل پانا اور جیک نکال کر دبے
پاؤں سر جھکائے ہوئے ایرانی ہوٹل والے مالک کی شربتی رنگ کی مرسیڈیز کے پاس اُس کا ٹائر نکالنے
کے لئے پہنچا۔

اُس نے جیک اور وہیل پانا گاڑی کے مڈگارڈ کے نیچے رکھ دیا اور جیبی ٹارچ نکال کے
روشنی کی۔ روشنی کی چند کرنیں مڈگارڈ کے تاریک گڑھے سے چھلک کر اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔
مرسیڈیز کا شربتی رنگ اُس کی آنکھوں میں چھلکا اور اندر کی آرام دہ سبز رنگ کی سیٹیں ایک
لمحے کے لئے روشن ہو گئیں۔ بے اختیار عبدل کا ہاتھ کروم کے ہینڈل پر گیا، ہینڈل گھمانے
سے گھوم گیا اور دروازے کا پٹ کھل گیا۔ عبدل کو بے حد حیرت ہوئی۔ شاید میکینک غلطی سے
اسے بند کرنا بھول گیا تھا۔ اب کُھلی کار کسی خوبصورت شہزادی کی آغوش کی طرح اُس کے سامنے
تھی۔ اُس نے ٹارچ کی روشنی کار کے اندر ڈالی اور ایک لمحے کے لئے نٹ پانا چھوڑنے والے
ہاتھوں میں کار کی آرام دہ سیٹوں کی گداز خوبصورتی گھوم گئی۔ فرش کے چھوٹے چھوٹے ایرانی
قالین، سبز رنگ کی آرام دہ بستر نما سیٹ اور ریشمی کشن جو کناروں پر رکھے ہوئے اور سیٹوں
کے پیچھے کارنس پر رنگ برنگ گلاب کے پھولوں والے ریشمی گدے رکھے ہوئے۔ عبدل ایک لمحے کے لئے
[illegible] اپنے آپ کو روک نہ سکا اور گاڑی کے اندر گھس گیا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اندر

[illegible]

کے خالی پیٹ پر، چوکیداری کے کام سے [illegible]
پر سکون اور گہرا دراز ہو گیا۔

آہ یہ کتنا نرم، ملائم، چکنا اور گداز گدّا بستر تھا! [illegible]
[illegible] کے گدوں کے نیچے ہوں۔ ایک بار اُس نے ہوٹل کے کچن میں کام کرتے ہوئے
دھوتے سب کی نظر بچا کر قریب کی میز پر رکھے ہوئے [illegible] کریم [illegible]
کا ایک چمچ بھر کر اپنے منہ میں ڈال لیا تھا۔ وہ مزہ اور یہ مزہ بالکل ایک سا تھا۔ اُسے ایسا
محسوس ہوا جیسے اُس کا سارا جسم زبان بن گیا ہے اور بالائی کھا رہا ہے۔ اُس نے
بازو بڑھا کر اوپر کے کشن اپنے سر کے نیچے رکھ لئے اور چند لمحوں کے لئے اپنی آنکھیں
بند کر لیں۔

کورٹ میں قاسم بھائی نے بیان کیا: "صبح جب میں نے گیراج کا دروازہ کھولا
تو ملزم کُھلی مرسیڈیز کی پچھلی سیٹ پر بہت آرام سے لیٹا ہوا سو رہا تھا اور وہیل پانا اور
جیک مڈگارڈ کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ملزم ٹائروں کی چوری
کرنے کی نیت سے گیراج میں داخل ہوا تھا۔"

جرح کے دوران میں جب ملزم نے اپنی چوری کے ارادے کا اقبال کر لیا تو
عدالت نے اُس سے پوچھا۔

"پھر تم نے چوری کیوں نہیں کی؟"

"مجھے نیند آگئی سرکار!" عبدل نے جھجکتے جھجکتے اقبال کیا: "مجھے ایسا محسوس ہوا
جیسے میں بہشت کے کسی باغ میں ہوں اور جنت کے مزے لے رہا ہوں۔"

"تین ماہ قید با مشقت!" عدالت نے مسکرا کر کہا۔

میں فٹ پاتھ کے پتھر پر لیٹا تھا۔ جنتا میرے سرہانے بیٹھی پوچھ رہی تھی۔ ایک
کھلکھلی ہنسی ہنس کر بولی: "اب جنت کے مزے آپ کہاں لیں گے، عبدل کو جیل میں!"

"بچہ ہے۔ ابھی اسے معلوم نہیں ہے کہ اس دنیا کی جنت ہم غریبوں کے لئے
نہیں ہے۔ یہاں تو ہم بس جنت کے چند لمحے چُرا لیتے ہیں۔ باقی ساری زندگی دوزخ میں
گزرتی ہے۔"

"اور اگر اس دنیا میں بھی جنت مل جائے؟" جنتا نے [illegible] پوچھا۔

"بکو مت۔ چوٹیں گنو!"

غزل

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم اے

اب تو ہم ہیں اور اک خوابِ پریشانِ چمن
ہو گئی بوئے پریدہ وہ گلوں کی انجمن

پاس ہی پہلو میں چھپی ہے ابھی کوئی کمان
چھپ کے گزرا ہے ادھر ہی سے کوئی ناوک فگن

زینتِ پہلو ہے جب وہ کس لیے گھٹتا ہے دم
دشت اندر دشت ہے جو دل چمن اندر چمن

عشقِ آوارہ سے کہہ کوئی ٹھکانا تو ملے
بس قرار آجائے دم بھر کوئی گلشن ہو کہ بن

حیدرآباد آہ یہ اک جنتِ قلب و نگاہ
ہائے یہ اندازِ دلکش یہ ادا ہائے دکن

میری بیتابیٔ فرقت، سر بسر رشکِ سکوں
تیری یادوں نے سکھایا مجھکو گھبرانے کا فن

مدتیں گزریں جنونِ عشق کو چھوڑے ہوئے
روئے رنگیں کا گلستاں زلفِ مشکیں کا ختن

چلتے پھرتے شہرِ عالم کے یہ مرثیے ہائے ہائے
سرے پاتک سب کفن اندر کفن اندر کفن

کون ہے پرسانِ حال اپنا یہاں جز آپ کے
اے غمِ عالیجناب اے قبلۂ حاجاتِ من

عشق کو لازم ہے لے کچھ روز ابھی درسِ نشاط
سنتے ہیں شہرِ نگاراں میں نہیں غم کا چلن

بھول بیٹھا ہوں ہر اک راز و نیازِ حسن و عشق
پھر کبھی یاد آتا ہے رہ رہ کے کوئی عہدِ کہن

یاد ہے تیری اداسی یاد ہے تیری ہنسی
میں نے سیکھا تجھ سے اے مرتی تشالدِ غم کا فن

ملک کے سینے میں رکھا وقت نے ایمانِ عشق
اور فتویٰ کفر کا لے بیٹھے شیخ و برہمن ۱

ہر غزل میں گزری صدیاں لیتی ہیں انگڑائیاں
فکرِ تازہ میں جھلک جاتے ہیں آثارِ کہن

وحدت و کثرت اسی کے جلوے ہیں آنکھیں تو کھول
زندگی خلوت کی خلوت انجمن کی انجمن

تیری رنگینیٔ قامت کا مری غزلوں میں عکس
موج زن باتوں میں میری تیری خوشبوئے دہن

اے فراق آئی کہے یہ راگنی یہ موہنی
کچھ دنوں سے عام ہے یوں تو مرا طرزِ سخن

۱؎ حال میں میں حیدرآباد دکن گیا تھا۔ یہ غزل وہیں کہی۔ یہ شعر اہلِ حیدرآباد کے پُرخلوص تپاک اور حلاوت و نرمیٔ مزاج سے متاثر ہو کر میں نے کہا ——— فراق

[illegible] بیگ کی
[illegible] کی گردن
[illegible] آنکھیں [illegible] جب گاڑی ختم ہوئی تو چھوڑنے
[illegible] آنکھیں [illegible] کی آرائش کی
[illegible] چیز کیا ہے۔ روشنی کا سچ
[illegible] گاڑیاں [illegible] باقی رہیں وہ سب جانتا تھا لیکن سوچ کے
[illegible] نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے [illegible] میں دیکھنے کی کوشش کی اور جب آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں تو اُسے آس پاس کی فضا کی تاریکی میں زیادہ گہرے تاریک خطوط نظر آنے لگے گاڑیوں کی [illegible] اوزار کی الماری اور ایک کونے میں ایک لمبی بڑی مستطیل نما تاریکی۔ پہلے پہلے وہ ٹٹولتا ہوا فرش پر گھسٹتا ہوا گاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ باسکو کی دی ہوئی جیبی ٹارچ اُسے یاد آئی۔ بڑی احتیاط سے اس نے کسی گاڑیوں کے مڈگارڈ کی اوٹ میں سے جا کر جیبی ٹارچ کر کی جگہ روشن کیا۔ اور جب اُسے اُس ایرانی کی گاڑی مل گئی تو وہ چند لمحوں تک اُس کے قریب کھڑا اُس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ ایرانی ہوٹل والے کی گاڑی اُسے بہت پسند تھی۔ اُس کا شربتی رنگ، اُس کے تیکھے خطوط، اُس کا [illegible] جب چلتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تیر کمان سے نکلا جا رہا ہے۔ اُس نے اُس گاڑی کی طرف ہمیشہ ایسے دیکھا تھا جیسے کوئی بھکاری کسی شہزادی کو دُور سے دیکھتا ہے۔ وہ کتنی لمحوں تک اُس گاڑی کے قریب کھڑا اُس کے خنک چکنے جسم پر ہاتھ پھیرتا رہا اور ایک عجیب لذت سے آشنا ہوتا رہا۔ پھر اُسے باسکو یاد آیا جو چاقو لئے گیراج کے باہر کھڑا تھا اور وہ گاڑی سے الگ ہو کر اوزاروں کی الماری کے آدھ کھلے پٹ کی طرف گیا اور وھیل پانا اور جیک نکال کر دبے دبے سر جھکائے ہوئے ایرانی ہوٹل والے مالک کی شربتی رنگ کی مرسیڈیز کے پاس اُس کا ٹائر نکالنے کے لئے پہنچا!

اُس نے جیک اور وھیل پانا گاڑی کے مڈگارڈ کے نیچے رکھ دیا اور جیبی ٹارچ نکال کے روشنی کی۔ روشنی کی چند کرنیں مڈگارڈ کے تاریک گوشے سے چھلک کر اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ مرسیڈیز کا شربتی رنگ اُس کی آنکھوں میں چھلکا اور اندر کی آرام دہ سبز رنگ کی سیٹیں ایک لمحے کے لئے روشن ہو گئیں۔ بے اختیار مبارک کا ہاتھ کروم کے ہینڈل پر گیا ہینڈل گھمانے سے گھوم گیا اور دروازے کا پٹ کھل گیا۔ مبارک کو بے حد حیرت ہوئی۔ شاید مکینک غلطی سے کار کو بند کرنا بھول گیا تھا۔ اب کھلی کار کسی خوبصورت شہزادی کی آغوش کی طرح اُس کے سامنے وا تھی۔ اُس نے ٹارچ روشن کر کے اندر روشنی ڈالی اور ایک لمحے کے لئے فٹ پاتھ پر سونے والے کی آنکھوں میں کار کی آرام دہ سیٹوں کی گداز خوبصورتی گھوم گئی۔ فرش کے چھوٹے چھوٹے گدے ایرانی قالیچے، سبز رنگ کی آرام دہ بستر نما سیٹ اور ریشمی گدیاں کناروں پر رکھے ہوئے اور سیٹوں سے اوپر پیچھے کی [illegible] گلاب کے پھولوں والے گلدستے [illegible] مبارک ایک لمحے کے لئے تکتا رہا پھر اپنے آپ کو روک نہ سکا اور گاڑی کے اندر گھس گیا اور سیٹ پر بیٹھ گیا بیٹھتے ہی اندر

[illegible]
[illegible] پڑی رہ گئی۔ [illegible] کے [illegible] پہاڑیں [illegible] پر سکھیں اور اپنا دراز ہو گیا۔

آہستہ آہستہ کتنا نرم ملائم، چکنا، گدیلا، گرم گرم [illegible] تھا۔ ایسے [illegible] تھیں اُن گدوں کے پیچھے ہوں۔ ایک بار اُس نے ہوٹل کے کچن میں [illegible] دھوتے سب کی نظر بچا کر قریب کی میز پر رکھے ہوئے آئس کریم کے [illegible] کا ایک چمچ بھر کر اپنے منہ میں ڈال لیا تھا۔ وہ مزہ اور یہ مزہ بالکل ایک سا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا سارا جسم زبان بن گیا ہے اور بالائی کھا رہا ہے۔ اُس نے باند بڑھا کر [illegible] کے کشن اپنے سر کے نیچے رکھ لئے اور چند لمحوں کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کورٹ میں قاسم بھائی نے بیان کیا: "صبح جب میں نے گیراج کا دروازہ کھولا تو ملزم کھلی مرسیڈیز کی پچھلی سیٹ پر بہت آرام سے لیٹا ہوا سو رہا تھا اور وھیل پانا اور جیک مڈگارڈ کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ملزم ٹائروں کو چوری کرنے کی نیت سے گیراج میں داخل ہوا تھا۔"

جرح کے دوران میں جب ملزم نے اپنی چوری کے ارادے کا اقبال کر لیا تو عدالت نے اُس سے پوچھا۔

"پھر تم نے چوری کیوں نہیں کی؟"

"مجھے نیند آ گئی سرکار!" مبارک نے جھجکتے جھجکتے اقبال کیا: "مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں بہشت کے کسی باغ میں ہوں اور جنت کے مزے لے رہا ہوں۔"

"تین ماہ قید با مشقت!" عدالت نے مسکرا کر کہا۔

میں فٹ پاتھ کے پتھر پر لیٹا تھا۔ جنت میرے سر سے جوتی چھڑا رہی تھی۔ ایک کھوکھلی ہنسی ہنس کر بولی: "اب جنت کے مزے آپ ہی لوٹیں گے مبارک جیل میں!"

"بچہ ہے۔ ابھی اسے معلوم نہیں ہے کہ اِس دُنیا کی جنت ہم غریبوں کے لئے نہیں ہے۔ یہاں تو ہم بس جنت کے چند لمحے چرا لیتے ہیں۔ باقی ساری عمر [illegible] کٹتی ہے!"

"اور اگر اس دُنیا میں بھی جنت مل جائے؟" جنت نے مجھ سے پوچھا۔

"گو مت۔ جوتی چھوڑ!"

غزل

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم اے

اب تو ہم ہیں اور اک خواب پریشاں چمن
ہوگئی بوئے پریدہ وہ گلوں کی انجمن

پاس ہی پہلو میں تجھی ہے ابھی کوئی کمان
چھپ کے گزرا ہے اِدھر ہی سے کوئی ناوک فگن

زینتِ پہلو ہے جب وہ کس لئے گھٹتا ہے دم
دشت اندر دشت ہے جو دل چمن اندر چمن

عشقِ آوارہ تجھے کوئی ٹھکانا تو ملے
بس قرار آجائے دم بھر کوئی گلشن ہو کہ بن

حیدرآباد آہ یہ اک جنتِ قلب و نگاہ
ہائے یہ اندازِ دلکش ہیلو ہائے دکن[1]

میری بیتابیٔ فرقت، سر بسر رشکِ سکوں
تیری یادوں نے سکھایا مجھکو گھبرانے کا فن

مدتیں گزریں جنونِ عشق کو چھوڑے ہوئے
روئے رنگیں کا گلستاں زلفِ مشکیں کا ختن

چلتے پھرتے شہرِ عالم کے یہ مُردے ہائے ہائے
سر سے پاتک سب کفن اندر کفن اندر کفن

کون ہے پُرسانِ حال اپنا یہاں جز آپ کے
اے غمِ عالیجناب اے قبلۂ حاجاتِ من

عشق کو لازم ہے لے کچھ روز ابھی درسِ نشاط
سنتے ہیں شہرِ نگاراں میں نہیں غم کا چلن

بھول بیٹھا ہوں ہر اِک رازو نیازِ حسن و عشق
پھر بھی یاد آتا ہے رہ رہ کے کوئی عہدِ کہن

یاد ہے تیری اُداسی یاد ہے تیری ہنسی
میں نے سیکھا تجھ سے اے دوست غم کا فن

راز کے سینے میں رکھا وقت نے ایمانِ عشق
اور فتویٰ کفر کا دیے بیٹھے شیخ و برہمن

ہر غزل میں گزری صدیاں لیتی ہیں انگڑائیاں
فکرِ تازہ میں جھلک جاتے ہیں آثارِ کہن

وحدت و کثرت اسی کے جلوے ہیں آنکھیں تو کھول
زندگی خلوت کی خلوت انجمن کی انجمن

تیری رنگینیٔ قامت کا مری غزلوں میں عکس
موج زن باتوں میں میری تیری خوشبوئے دہن

اے فراقؔ آئی کہے یہ راگنی یہ موہنی
کچھ دنوں سے عام ہے یوں تو مرا طرزِ سخن

[1] حال ہی میں حیدرآباد دکن گیا تھا یہ غزل وہیں کہی یہ شعر اہلِ حیدرآباد کے پُرخلوص تپاک اور حلاوت و نرمیٔ مزاج سے متاثر ہو کر میں نے کہا ـــــ فراقؔ

دائرے

م۔ک۔ مہتاب، ایم اے

[illegible] جالندھر

[illegible]   محترمہ مدیرہ صاحبہ السلام

. . . ایک افسانہ نگار کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کی تحریر میں حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشارہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ میں یہ افسانہ اس قول پر کہاں تک پورا اترتا ہے یہ تو بیسویں صدی کے بلند ذوق قارئین ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ وہ قارئین جن کے لئے بیسویں صدی گنجینۂ ادب ہے اور جن کا کہنا ہے کہ بیسویں صدی کی قیمت اگر دوگنی کر دی جاتی تو بھی کم تھی ــــــ میں پچھلے دنوں کچھ مصروفیت اور کچھ علالت کی وجہ سے بہت سے کرم فرماؤں کے خوشبودار خطوط کا جواب نہیں دے سکا جنہوں نے خوشبوئی [illegible] کے بعد مجھے اپنے خطوط سے نوازا ہے۔ میں ان سب کا ممنون ہوں۔ . .

خیر اندیش ــــــ م۔ک۔ مہتاب

اس عالم میں وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اندو کی باتوں میں وہ مٹھاس ہے لہجے میں وہ لوچ، انداز گفتگو میں وہ رس اور شخصیت میں وہ دلکشی تھی کہ ایک بار ملنے کے بعد اس سے بار بار ملنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ خود بھی اس کی رس بھری کومل آواز کا اسیر ہو گیا تھا جیسے تر و تازہ گلاب کی پتیوں سے شبنم کے قطرے ٹپک رہے ہوں۔ اس نے خود ہی رشتے کے لئے تجویز بھجوائی تھی۔ لیکن اس نے تو یہ سوچا تھا کہ اس شہد کی ساری مٹھاس اس پھول کی ساری مہک صرف اس کے لئے ہوگی۔ لیکن اس کے تصورات کو کتنی ٹھیس پہنچی جب شادی کے بعد بھی اندو کی فطرت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

چنانچہ ایک دن اس نے جھنجلا کر کہہ ہی دیا۔

"اندو! میں سنتوش، پریتم اور سدرشن کا یوں بے کھٹکے گھر میں چلا آنا پسند نہیں کرتا۔"

اندو نے اس کی بات کا برا نہیں مانا اپنے فطری دھیمے پن سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو پرشن! لیکن ان کے آنے میں حرج بھی کیا ہے۔ سنتوش اور پریتم میرے کلاس فیلو ہیں۔ میرے ساتھ ڈراموں، مباحثوں اور موسیقی کی محفلوں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ ہماری بہت سی یادیں مشترک ہیں۔ آتے ہیں تو ماضی کے کچھ حسین لمحے لے آتے ہیں۔ سدرشن کا پرائیویٹ [illegible] جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ وہاں جس شفقت کے ساتھ وہ ہم سے پیش آتا ہے اس سے ہی پرائیویٹ [illegible] ہم لوگ سب سے اچھا رشتہ ہے۔ زندگی کے مسائل کو جیسے کہ اس نے حل کیا کبھی سے شادی کی تھی ۔۔۔ [illegible] میں ہے۔ کتنا حلیم اور منکسر مزاج شخص ہے۔ اچھے کر کی بات کرتا ہے تو آنسو بہہ نکلتے ہیں۔"

"لیکن ــــــ"

"آپ جانتے ہیں پانی کے اثرات کی بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تو انسانی اخلاق کا تقاضا ہے۔ آپ کے ملنے والوں سے میں بھی تو کنی کترا کے نہیں کرتی۔ پھر یہ تو اس بات کو خود ہی محسوس کرتے ہیں۔ پچھلے مہینے پریتم کتنا کچھ لے آیا تھا۔ کالی رکشن، جیم، دودھ کے ڈبے۔ کوئی کسی کا کوئی لیتا ہے۔ بیماری کے دن آپ خود ہی سدرشن سے کہہ رہے تھے کہ وہ پیچ کے لئے جوتے کھلونے وغیرہ کیوں لایا۔ اگر کوئی شخص آپ کے خلوص سے متاثر ہو کر آتے ہیں کچھ لاتے تو اسے دھتکارا بھی تو نہیں جا سکتا۔"

وہ کہنا چاہتا تھا کہ رشتے کا کچھ ہوتا ہے [illegible] کیا ان کے جواب میں وہ کسی دل فریب تکرار سے [illegible] گلاب کی پتیاں

[illegible]

"ہرلیش جی! آپ [illegible] سمجھ رہے ہیں۔ دنیا کی زبان تو آپ کو [illegible] ہو جاتا تو اُن کے [illegible] پتا بھی ہو گیا ہے"

[illegible] ہو رہے تھے وہاں میٹھی باتوں سے گزر گئے۔

پٹیالے سے چنڈی گڑھ پہنچ کر انھوں نے پہلا صدمہ یہ ہوا کہ اسٹیشن پر دو نوجوان مہندر سنگھ اور جگ موہن اُن کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ انھوں نے ہرلیش کو [illegible] پہچان کر خیر مقدم کیا اور اندو کی اپنی انداز والی مسکراہٹوں سے خوش آمدید کہا۔ "شرما جی! آپ نے کیوں تکلیف کی۔ آپ کو یہاں سے فون کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کس نے بتایا؟"

"اچھا! آپ چھپانا چاہتے تھے۔ پتہ نہیں چلتا کیا؟ پٹیالے سے ستیش نے لکھا تھا کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہو۔ اچھے گئے کہ مجھ سے دیکھئے اور آپ اپنا سامان نکلوائیے" شرما جی نے جھک کر بیگ کو اُٹھا لیا۔

"ہرلیش جی! ان سے ملئے" اندو تعارف کراتے ہوئے بولی "یہ ہیں مسٹر [illegible] فرینڈ مسٹر رمیش شرما۔ اُن کے بہت اچھے کھلاڑی ہیں۔ یہاں یونیورسٹی کے بارے میں نمبر ہیں۔ اور یہ ہیں مسٹر مہندر نارنگ۔ میری سہیلی رجنیت کے شوہر۔ [illegible] پٹیالہ بھی آتے تھے آپ سے مل نہیں سکے۔"

اور ہرلیش اُن دونوں کے گرم جوش مصافحہ کے جواب میں ایک مری سا پسینے سے تر ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دیتا ہوا سوچنے لگا کہ اُس نے پٹیالے سے جو مقصد حاصل کرنا چاہا تھا وہ حاصل نہیں ہو سکا اور گویا ایک گڑھے میں سے نکلنے کے بعد دوسرے گڑھے میں جا گرا ہے۔

لیکن اُسے مہندر اور شرما جی کے رویہ میں کوئی بات قابل اعتراض معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ اُن لوگوں نے بہت محنت اور پیار سے اُن کے مکان کی آرائش میں مدد دی۔ فرض تو یہ تھا کہ وہ بھی پیار اور خلوص کا جواب اُسی خلوص سے دیتا لیکن لاشعوری طور پر ایک جذبہ حسد و رقابت کا اُس کی راہ میں تھا۔ اسی لئے اُسے اندو کے رو برو خفیف بھی ہونا پڑا۔ ایک دن صبح کی چائے پر اندو کہنے لگی۔

"ہرلیش جی! آپ کی باتیں کبھی کبھی میری سمجھ سے بالاتر ہو جاتی ہیں۔ بھلا یہ مہندر اور شرما جی جانے کیا ہو سکتے ہیں۔ تھوڑی جان پہچان ہی ہے تا ہم اُن کا خلوص دیکھا آپ نے۔ وہ لوگ خادموں کی طرح کام کرتے رہے لیکن آپ نے انھیں چلتے وقت کے لئے نہیں کہا۔"

"میں نے سوچا تم جو کہہ دو گی۔" اُس کی بات قلبی شفقت کی آئینہ دار تھی لیکن اندو نزاکت سے بولی۔

"آپ بھی بڑے بھولے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ میرے لئے نہیں آپ کی عزت افزائی کے لئے کر رہے تھے۔ ہم تو ایک دوسرے سے تھوڑے ہی ہیں۔ یہاں تو آپ کا گھر تھا اور آپ کی گرم جوشی سے آپ کا امیج اُن کی نگاہوں میں کتنا بلند ہو جاتا۔"

ہرلیش وہ عمر رفتہ کی فائلوں پر ترشے لگا تھا اور اپنی امیج کی بات سوچا۔ دفتر کے گلاس پیپر پر چہروں کے کنارے پڑھاؤ کے بے ہنگم خطوط میں اُلجھا ہوا سوچا کہ کیا سلسلہ ہے۔ مہندر کی بیوی اُس سے کچھ کھل مل کر باتیں کرنے لگی ہے۔ گویا دوستی ہو۔ مہندر اور شرما جی اُن کے مکان کی تزئین کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ جیسے یہ گھر اُن کا نہیں انھیں کا ہو۔ اندو اُن کی نہیں اُن کی بیوی ہو۔ یہ کیسا ماحول ہے اور کیا وہ یہاں بھی غیر ہے نہیں؟ اُس نے فائل پر ایک بڑا سوالیہ نشان بنا دیا۔

شام کو وہ جب گھر لوٹا تو انھیں خیالات میں اُلجھا ہوا تھا۔ مکان کے برآمدے میں بید کی سفید کرسیوں پر اندو اور سُدرشن جی بیٹھے بڑے رازدارانہ لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ درمیان میں ایک گلدستہ رکھا تھا۔ اندو نے اُسے آتے دیکھ کر رومال سے آنسو خشک کر لئے لیکن جب سُدرشن نے اُس سے ہاتھ ملایا تو آنسو اب بھی اُس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔ اُسے یہ منظر دیکھ کر سخت دھکا لگا۔ وہ اپنے دلی جذبات کو ایکدم اُگل دینا چاہتا تھا لیکن زبان نہیں کھل رہی تھی۔ اندو چائے لے آئی۔ ہرلیش بُجھا بُجھا سا بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے سوچتا رہا کہ کیا یہ لوگ وہ مشفقت کی بُرائی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کے آنسوؤں کی زبان کیا کہتی ہے۔ اگر آنسو دل کے ترجمان ہیں تو یہ لوگ چہروں سے فریب اور بناوٹ کی کینچلیاں اُتار کیوں نہیں پھینکتے۔ سُدرشن کہہ رہا تھا کہ پٹیالے میں اُن کی کمی بہت محسوس کی جا رہی ہے۔ اندو کے والدین اداس ہیں۔ کلاکیندر میں اندو کی سہیلیاں چاہتی ہیں کہ وہ واپس پٹیالہ آ جائیں۔ اور ہرلیش گم سُم بیٹھا سُن رہا تھا۔

سُدرشن کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو شاید رات بھر اُس کے من میں آگ لگائے رکھتے۔ اگر رات اندو خود ہی نہ کہہ دیتی "جب کوئی آ جائے تو آپ کھنچے کھنچے سے کیوں ہو جاتے ہیں؟"

"نہیں تو؟"

"دیکھئے نا۔ دوسرا کیا تاثر لے کر لوٹتا ہوگا کہ کیا اِن کے پاس ہمدردی کے دو بول بھی نہیں۔ دیکھا نہیں آپ نے سُدرشن کتنا پریشان تھا؟"

"دنیا میں کون پریشان نہیں ہے اندو!" ہرلیش نے لمبی آہ بھر کر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ اندو اس سرد آہ کا مطلب نہیں سمجھ سکی لیکن اپنے نرم دھیمے لہجے میں بولی۔

"اُن لفظوں کے [illegible] ...
والوں کے لیے [illegible] کوئی اُمید نہیں۔ اور اُن کے بچوں کی زندگی کی [illegible]۔ لیکن اپنا سارا آنند اِس اُمید پر صرف کر دیا شاید اُس کی زندگی لوٹ آئے گی۔ لیکن دو ظالم نصیب کہہ رہا تھا کہ موہن تاتا کا اُمید ہو گئی ہے۔ اور آتے وقت اُنھوں نے اُن کے ہاتھ چوم کر کہا: شاید یہ آخری ملاقات ہو۔ مرنے والا تو بچے گا نہیں۔ جینے والا تو زندہ ہے۔ چاہئے کوئی اور کنارہ تلاش کر لیجئے۔ کتنا حقیقت پسندانہ نظریہ تھا اُن کا۔ لیکن سُدرشن جی کو کون سمجھاتے۔ میں نے بہت کہا۔ اُن کا من بھرا ہوا تھا۔ میں بھی چاہتی تھی کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو لیں لیکن میری تو اپنی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ کتنا کم عمر ہے اور مصائب کا کتنا بڑا پہاڑ اکیلا اُٹھائے پھر رہا ہے۔"

"ہاں اندو! کاش کوئی کسی کا دکھ بانٹ سکتا۔" ہریش کی ذہنی گھٹن کچھ کم ہوئی۔

"کسی کا غم سن لینے سے بھی تو کچھ راحت ہوتی ہے۔ کہتے تھے اندو تمھاری باتوں میں مرہم کا اثر ہے۔ زخم بھرتے سے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ بہت سیدھے ہیں سُدرشن جی۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ہمدردی کے ہر بول میں شفا ہوتی ہے خواہ وہ آپ کہیں یا میں ——"

"لیکن سُدرشن جی دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ شاید اُن کا تنہائی کا احساس ختم ہو۔"

"چاہتی تو میں بھی یہی ہوں اور میں نے ایک لڑکی تجویز بھی کی تھی۔ لیکن جب اُن کی شانتا سینی ٹوریم میں بسترِ مرگ پر ہو وہ کس دل سے شادی کریں۔ پھر کسی دن انھیں کھوں گی۔ شاید مان جائیں۔"

اور ہریش جب سویا تو گراف پیپر پر گھومتے ہوئے سب چہرے اپنی اپنی لائنوں پر اٹکے تھے۔

سُدرشن کے بعد پریتم اور پریتم کے بعد ستیش۔ گھر پر ایک چھوٹے سے کلب کا گمان ہوتا تھا۔ اور اندو کی سب مہربانیاں، قہقہے اور مسکراہٹیں انہی لوگوں میں تقسیم ہو کر رہ جاتی تھیں۔ اُس کا ذہن ہمیشہ دوسروں کے مسائل میں اُلجھا رہتا۔ اُسے اپنی نسبت دوسروں کا زیادہ پاس تھا اور وہ بھی تو اُس پر زیادہ مہربان تھے۔ یہی بات ہریش کے ذہن میں نت نئے شکوک کو جنم دیتی۔ جن کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ کئی بار جنون کی حدود کو چھو لیتا۔

ستائیس دسمبر کو پپّو کا دوسرا جنم دن تھا۔ چندی گڑھ آ کر وہ پہلی بار اپنے کچھ ملنے والوں کو گھر پر مدعو کر رہے تھے۔ ہریش کے دفتر کے کچھ لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ آئے [illegible] اور سُدرشن جی اور [illegible] ملاقات [illegible] سب وہاں تھے۔ [illegible] ہریش کے بچے کا انھیں خود [illegible] ہریش [illegible] پریتم کا تعارف کراتے ہوئے کہا: "یہ مسٹر پریتم ہیں۔ آپ کی [illegible] ڈرامہ نگار ہیں۔"

اشونی نے پریتم کو سر سے پاؤں تک بڑی پُرتحسین نظروں سے [illegible] کرتے ہوئے ایسی کروہ ہنسی ہنسا کہ ہریش کو گھبراہٹ سے پسینہ آ گیا اور اُسے کسی اور شخص کا تعارف کرانے کی ہمت نہ ہوئی۔

لیکن جہاں اُس کے دفتر کے ساتھی پپّو کے لئے زیادہ سے زیادہ ایک آدھ کھلونا یا ٹافیوں کا ڈبہ لے آئے تھے، وہاں پریتم سفید لومڑی کی کھال کا کوٹ لایا تھا۔ رنجیت اور مہندر بچّہ گاڑی لائے تھے۔ ستیش جرمن کا بڑا سا ایک بنا لایا تھا۔ شرما جی بجلی کے کھلونے لائے تھے اور سُدرشن جی نے تو حد ہی کر دی تھی۔ پپّو کے لئے اطلس کا خوشنما سوٹ اور اندو کے لئے آسمانی رنگ کی اورنگ آبادی ساڑی۔ تحائف کو دیکھتے ہوئے ہریش احساسِ ندامت سے گڑا جا رہا تھا۔ مادی لحاظ سے بھی اندو کے دوستوں کا خلوص اُس کے دوستوں سے کتنا بڑھ چڑھ کر تھا۔ اندو اِس پارٹی میں جہاں اپنی شیریں گفتار کا رس بکھیرتی رہی ہریش ندامت کے احساس میں گھرا ہوا بیٹھا رہا۔

دو دن بعد جب وہ دفتر گیا تو بھی وہ اسی احساس سے مغلوب تھا۔ لنچ کے وقفے میں وہ اشونی کے کمرے میں گیا لیکن دروازے ہی پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ اندر تین چار لوگ اور موجود تھے جو بلند آواز قہقہے لگا رہے تھے۔ موضوعِ سخن ہریش ہی تھا۔ پارٹی کی باتیں ہو رہی تھیں۔

"سو بھئی سالگرہ کی پارٹی۔ آہاہا۔ تمھارے بچے کی تو کیا تمھاری بھی کبھی نہ ہوئی ہوگی۔" اشونی نے قہقہہ لگایا۔

"بھئی! ہماری بیوی کے اتنے دوست ہوتے تو اِس سے بھی اچھی پارٹی ہوتی۔" ست نام سنگھ کی بات پر پھر قہقہہ پڑا۔

"بھئی شادی تو ہم بھی کسی ایسی ہی لڑکی سے کریں گے۔ کپڑے لتے کا خرچ تو نہ ہو۔" سکسینہ کی بات پر غل مچ گیا۔

"یہ سب آزادی کے کرشمے ہیں صاحب۔ ہم جیسوں [illegible]۔ پھر بیوی کے دوست ہی نہیں بہت سے شوہر بھی ہوا کریں گے۔" [illegible] کی بات [illegible] سب [illegible]

"بھئی! آپ نے جنم دن پر بچے کے لئے تحائف تو دیکھے ہیں، اُن کے لئے نہیں۔" سکسینہ پھر بولے۔

[illegible] شاید پہنچنے سے خود [illegible] کہ وہ [illegible] ابھری۔

"فوٹو شاپ کرنا آسان نہیں ہے [illegible] مال۔ اب تم اسے تو ذرا [illegible] افسر جانگڑ کی بات پر [illegible] کچھ کروں میں [illegible] جا رہا۔"

"آپ نے [illegible] کی شخصیت دیکھی اور اُن کا انہماک بھی۔ دیکھا وہ ستی کی حد درکہاں تک پہنچتی ہیں۔" سکینہ نے ایک نئی تان چھیڑی۔

"مجھے تو سارے ہی کچھ گڑ بڑ نظر آتا ہے۔" سنتام سنگھ نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"پرکاش بابو میں تو بہت گہری نظر سے دیکھتا رہا ہوں۔ مجھے تو ہرپش کے چہرے کی شکل ہی سُدرشن سے ملتی جلتی نظر آتی تھی۔ ہا ہا ہا۔" کرنیل سنگھ کی بات پر وہ قہقہہ پڑا کہ ہرپش کو سیکرٹریٹ کی عظیم عمارت ڈولتی نظر آنے لگی۔ جیسے نچلی منزلوں میں زلزلہ آگیا ہو۔

ہرپش وہاں زیادہ دیر ٹھہر نہ سکا۔ اُس کا جی چاہا کہ اندر جا کر کرنیل سنگھ کی گردن دبا دے۔ گھونسے مار مار کر سکینہ کے دانت توڑ دے۔ غصے سے اُس کی کنپٹیاں پھٹنے لگیں۔ وہ مٹھیاں بھینچتا رہا اور برافروختہ ہو کر فرش پر ایڑیاں رگڑتا رہا لیکن یہ سوچ کر کہ بات اُس کی سطح کے افسروں سے نکل کر اعلیٰ افسروں اور کلرکوں تک پہنچ جائے گی، وہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

فائلوں پر اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ گراف پیپر پر ابھرے ہوئے چہرے بری طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ جیسے کئی پتنگوں کا ایک ساتھ پیچ پڑ گیا ہو۔ اور کسی کو کچھ پتہ نہ ہو کہ کس کی پتنگ کٹ جائے گی اور کس کے ہاتھ میں دھاگے کی بے جان رسی رہ جائے گی۔

ہرپش اُٹھ کر گھر چلا آیا۔ جہاں شگفتہ گلاب کی سی اندو اُس کے خیر مقدم کے لئے موجود تھی۔ اُس کے لبوں کی شگفتگی، چہرے کا نکھار اور مسکراہٹوں کا جادو پریشان سے پریشان شخص کے لئے راحت کا پیام تھا لیکن ہرپش کو اس میں آج کوئی دلکشی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ آتے ہی صوفے پر دراز ہو گیا۔

"آج جلدی لوٹ آئے آپ؟" اندو نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

"طبیعت بہت خراب تھی۔"

"کیوں کیا ہوا؟" اندو یکدم پریشان ہو گئی۔ [illegible] پھینکتے ہوئے اُس کے پاس آ گئی۔ اپنا مرمر کے چاندی کا سا ملائم ہاتھ ہرپش کی پیشانی پر پھیرا نبض دیکھی اور [illegible] آپ سے کہا ہے تاکہ شام کو دفتر میں [illegible] منگوا لیا کیجئے۔ آخر اپنا کام [illegible] بھی تو ضروری ہے۔ لیکن آپ میری بات مانیں تب نا؟ آپ کو پرسوں کی [illegible] ہو رہی ہے [illegible] ہیں

سر پر تھوڑا سا تیل ڈال دوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سر پر سے ذرا اوپر رکھ لیجئے اور اندو اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے ہرپش کے سر کو سہلاتے ہوئے میٹھی میٹھی باتوں سے اُس کا دل بہلانے کی کوشش کرنے لگی۔ ویسے تو آپ کے دفتر کے لوگ تو خوش تھے نا پارٹی میں۔ مجھے تو اُن سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اگر چائے کا پانی کم گرم ہو تو اُن کا ٹمپریچر چھ ماہ چڑھ جاتا ہے۔ اسی لئے میں نے رنجیت سے کہہ دیا تھا کہ ہم میں سے کسی کو کچھ ملے یا نہ ملے آپ کے دوستوں کو شکایت کا موقع نہ ہو۔"

"اندو! وہ ساڑی کتنے کی ہوگی؟" ہرپش نے آنکھیں کھول کر اندو کی طرف پُر معنی نظروں سے دیکھا۔ اندو کے ہاتھ ایکدم رُک گئے۔ اُس نے ہرپش کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی اور بولی "کیوں؟ میں مطلب نہیں سمجھی۔ ہوگی کوئی دو سو کی۔ میں نے سُدرشن جی کو منع بھی کیا تھا لیکن انہیں کون روکے۔ جب اُن کے ہاں کوئی موقع ہوگا تو ہم اس سے زیادہ قیمت کی کوئی چیز دے دیں گے۔"

"میرے خیال میں تمہیں وہ نہیں لینی چاہئے تھی۔"

"میں کب چاہتی تھی لیکن کسی کی پیار بھری بھینٹ کا یوں اپمان بھی تو نہیں کیا جاتا ——— میں نے آپ سے کئی بار کہا ہے نا کہ آپ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں نہ سوچا کیجئے۔ آپ بے کار اپنی طبیعت خراب کر لیتے ہیں۔ اچھا ذرا سر ہٹائیے میں تیل گرم کر لاؤں۔" اور وہ اُٹھ کر چل دی۔

"کہیں یہ ساڑی اُن کی بیوی شانتا کی تو نہیں ہے۔" ہرپش نے صوفے پر لیٹے ہوئے کہا۔

"چٹاخ" یہ تیل کی شیشی اندو کے ہاتھ سے فرش پر جا گری۔ وہ سکتے کی حالت میں وہیں بھونچکی کھڑی رہ گئی۔ جیسے جسم پتھر آگیا ہو۔ وہ بیٹھ کر فرش سے تیل سمیٹنے لگی۔ اُس کا گلا رُندھ گیا۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ لیکن اُس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بات کا رُخ پلٹنے کی کوشش کی۔

"آئیے تھوڑا جھیل کی طرف گھوم آئیں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ رنجیت کو مٹھائی بھی دے آئیں گے۔"

"نہیں میں نہیں جا سکوں گا۔ تم ہی کل آئی تھیں وہ میری تو جیسے کوفت رہی ہے۔ ہاں وہ فوٹوگرافر پارٹی کی تصویریں دے گیا ہے۔ انہیں میرے سرہانے رکھ دو۔ تم پنکو کو پلام میں لے جاؤ۔ رنجیت کو مٹھائی دینی آج خراب ہو رہی ہے۔"

"یہ آپ بار بار پرسوں کی پارٹی ہی کی کیا سوچ رہے ہیں؟ تصویریں آگئی تھیں۔ آپ کے تکیے کے نیچے ہی رکھی ہیں۔" اندو بادل نخواستہ بچے کو لے کر رنجیت کے ہاں چلی گئی۔ پریشان سی گھبرائی ہوئی سی۔ جیسے اُس کے دل کی پُر سکون سطح میں کسی شیطان کی چھیڑ یکوں نے طوفان کھڑا کر دیا ہو۔

[illegible]

[illegible] تصویریں [illegible] اور

[illegible] ایک تصویر میں سندرشن نے [illegible] اٹھا رکھا تھا

[illegible] تھی۔

"[illegible] ۔ [illegible] پرتیش [illegible]

[illegible] شاید کرنل سنگھ ٹھیک ہی کہتا تھا ان دونوں کی آنکھوں میں کتنی مشابہت ہے۔" پھر پرتیش دیوار سے سندرشن، اس کی بیوی اور بیٹی کی تصویریں اتار لایا۔ سندرشن کی تصویر کاٹ کر بیٹی کی تصویر سے ملانے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں [illegible] ذہن مفلوج تھا۔ وہ اٹھ کر [illegible] سندرشن [illegible] سب کے [illegible] اٹھا لایا۔ انھیں الٹ پلٹ کر دیکھا شاید کہیں پیار بھرا کوئی پیغام رکھا ہو۔ ساڑی کے سب کپڑے دیکھے شاید کوئی چٹ ہو۔ دفتر کے دوستوں کے قہقہے دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہے تھے۔ جسم چور تھا لیکن دماغ میں الاؤ بھڑک رہے تھے۔ تھک کر اس نے نیند آور گولیاں پانی سے نگل لیں اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔

اندو لوٹی تو اسے دھچکا سا لگا۔ کہیں چوری تو نہیں ہو گئی!! سوٹ کیس کے ڈھکنے کھلے تھے۔ ہرتیش سو رہا تھا۔ پلنگ کے قریب بیچ کے کپڑے بکھرے تھے۔ ساڑی اور [illegible] حالت میں [illegible] میں واپس ٹھونس دی گئی تھی۔ بیچ پر سندرشن اور اس کی تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ ان پر پنسل کے نشانات تھے جیسے ہرتیش بیچ اور سندرشن کی تصویروں کا موازنہ کرتا رہا ہو۔ ایک خوف اس کے ذہن میں گھر کرتا چلا گیا۔ ایک کہانی کی کڑیاں آپ ہی آپ جڑتی چلی گئیں۔

ہرتیش جب سو کر اٹھا تو بتی ابھی جل رہی تھی۔ کلاک پونے چار بجا رہا تھا۔ اس کا سر درد کچھ کم تھا لیکن دماغ اب بھی کرنل سنگھ کی آواز سن رہا تھا۔ اندو اپنے پلنگ پر بیچ کے اوپر جھکی ہوئی سو رہی تھی جیسے اسے سلاتے سلاتے خود بھی سو گئی ہو۔ ہرتیش سندرشن کی تصویر اٹھا کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اندو کے گلابی چہرے پر کچھ زردی سی نظر آ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی رائٹنگ پیڈ تھا۔ پیڈ کے نیلگوں کاغذوں پر ایک خط لکھا رکھا تھا۔ قلم کھلا ہی رہ گیا تھا۔

ہرتیش نے پیڈ اٹھا لیا۔ لیکن یہ تو دوسرا ورق تھا۔ پہلا ورق اڑ کر بیچ کے نیچے آ گیا تھا۔ ہرتیش نے بیچ کے جاگ اٹھنے کے ڈر سے پہلا ورق نہیں اٹھایا۔ دوسرا ہی پڑھنے لگا۔ لکھا تھا ——

"..... مجھے شادی سے کیا انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ سوچ لیں کہ آپ نبھا [illegible]

[illegible] ——

آپ کے [illegible]

[illegible] نہیں چاہتی [illegible] دولت، آزادی اور سلطنت کے [illegible] تعلیم یافتہ ہو گر اس سے [illegible] چاہتے ہیں کہ کسی ایسی سرکس میں [illegible] کی [illegible] کہ اس کا [illegible] کی دوست ہو [illegible] اقتصادی مشین کا ایک اہم پرزہ قرار دے کے اور [illegible] تو پھر اپنے پاؤں ہی میں رہنے دیجئے، [illegible] اٹھاتے ہیں۔ وہ آپ کی [illegible] بن کر شک و شبہات کی آگ میں جلنے کی بجائے شاید چین [illegible] سے زندگی بسر کرسکے۔ مرد اسے کبھی اپنے برابر آزادی نہیں دے سکا تو پھر ان آزاد خیالی کے ڈھونگ سے کیا فائدہ؟

اس لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ [illegible] جو ایک آزاد خیال لڑکی ہو، کانٹوں کی سیج پر نہ گھسیٹئے۔ کسی گم سم سی گھریلو لڑکی سے بات طے کر لیجئے جس کی سلطنت میں صرف آپ کی حکمرانی ہو۔ جس کی مسکراہٹوں کا کوئی اور شریک نہ ہو۔ جو آپ کے پاؤں دبایا کرے اور اگر آپ ناراض ہوں تو اس کے آنسو چولہے کی آگ میں ٹپ ٹپ بھسم ہوتے رہیں۔

ہاں۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں —— اگر آپ اجازت دیں تو وہ اورنگ آبادی ساڑی آپ کو لوٹا دوں۔ شاید اس طرح ایک مرد کی کھوئی ہوئی دنیا اسے واپس مل جائے۔

—— اندو

اور ہرتیش کے ہاتھ سے سندرشن کی تصویریں گر گئیں جیسے کسی کی پتنگ کٹ گئی ہو!!

[illegible]

[illegible] بیسویں صدی دہلی نمبر [illegible] (مدیر)

زل

طفیل ہوشیارپوری

یم کی آگ میں اپنے جل
تے بدلی پڑے نہ بل

دُکھ اور سکھ کی بات نہ چھیڑ
دُکھ سُکھ ہے کرموں کا پھل

سپنا آخر سپنا ہے
اِکٹیا، کیا شیش محل

پریم کی اگنی میں اِک دن
آنسو بھی جاتے ہیں جل

دھا میں بن جاتا ہے
ال سال کا اِک اِک پل

ہونی ہو کر رہتی ہے
سوچ نہ اِس کا کوئی حل

یم کی راہ میں کانٹے ہیں
پھولوں سے بھی کومل

میں بن باسی دکھیارا
رُک جا، میرے ساتھ نہ چل

روپ رنگ پر ناز نہ کر
جائیگا یہ سورج ڈھل

ہونا ہے گر تجھے امر
پی لے پریم کا گنگا جل

غزل

اختر واصفی

نظر کا فرق تھا کتنا؛ جسے ہم تیرگی سمجھے
اُسی کو سب کے سب اہلِ زمانہ روشنی سمجھے

ہماری ہر وفا تم کو ریاکاری نظر آئی
تمہاری ہر جفا کو ہم ادائے دلبری سمجھے

نظر آتا ہے آئینے میں اپنا عکس ہی سب کو
تمہیں میں آشنا سمجھا، مجھے تم اجنبی سمجھے

جہاں نے چرخِ کجرفتار کو اِس کا سبب جانا
مگر ہم اپنی محرومی کو اپنی کجروی سمجھے

ابھی نام ونشانِ دشمنی مٹ جائے دُنیا سے
اگر دُنیا کا ہر انساں رسومِ دوستی سمجھے

رموزِ آدمیت منکشف ہو جائیں سب اُس پر
اگر ہر آدمی ہر آدمی کو آدمی سمجھے

وہی بھلا سبب اے وائے اِسکی بیقراری کا
غلط فہمی سے ہم جس کو قرارِ زندگی سمجھے

خدا کو مائلِ لطف و کرم کرنا نہیں مشکل
مگر یہ شرط ہے بندہ مقامِ بندگی سمجھے

ہمیں تو اپنی پُرکاری سے لوٹا عمر بھر تم نے
ہم اپنی سادگی سے رہزنی کو رہبری سمجھے

عجب کج فہم لوگوں سے مجھے پالا پڑا اخترؔ
میں اُن سے دوستی کرتا رہا وہ دشمنی سمجھے


BUOY
for health
ہے جہاں
تندرستی ہے وہاں
اب ایک نئی شان کیساتھ
لائف بوائے سے نہایئے... چستی، تندرستی اور تازگی کا لطف اُٹھایئے! لائف بوائے میل میں چھپے جراثیم کو دھو ڈالتا ہے۔
آپ کی طبیعت میں تندرستی اور تازگی کی اُمنگ لے آتا ہے۔
اور ہاں، لائف بوائے کا نیا سرورق کتنا خوشنما ہے، پکڑنے میں کتنی آسان، جیسے خاص آپ کے لئے
بنائی گئی ہو! آج ہی لائف بوائے صابن خریدیئے۔
L. 47-140 45 UD

میرا آنگن

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن۔ ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ

۱۵۔ جواہر نگر، سری نگر، کشمیر

خورشید بھائی!

ایک نئی کہانی حاضر ہے۔ ایک لڑکی کی اُلجھن ہے جو یقیناً "بیسویں صدی" کے پڑھنے والوں کو متاثر کرے گی۔ کہانی موضوع کے اعتبار سے بالکل نئی ہے۔ حقیقت پسندی بھی ہے اور رومانیت بھی۔ مجھے یہ کہانی بہت پسند ہے اس لئے میری خواہش ہے کہ یہ "بیسویں صدی" میں شائع ہو...

مخلص ـــــــ شکیل الرحمٰن

کچھ دنوں سے میں نیند میں چلنے لگی ہوں، نیند میں بستر سے اُٹھ جاتی ہوں اور کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہوں۔ کوئی نہ کوئی ٹکر ہوتی ہے اور نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ کبھی کرسی سے ٹکرا جاتی ہوں، کبھی دیوار سے اور کبھی دروازے سے۔ آپ میری نفسیاتی اُلجھن کا تجزیہ نہ کیجئے۔ آیئے بتا دوں۔ دراصل مجھے اپنے آنگن کی تلاش ہے!

میرے ذہن میں یہی بات ہے۔ میں بچپن سے اُس آنگن کی تلاش میں ہوں، لیکن آنگن نہیں ملتا۔ میرے لاشعور میں اُس آنگن کا ایک خاکہ، ایک تصویر ہے۔ لیکن کیسی ہے میں نہیں بتا سکتی۔ اس لئے کہ میں جانتی نہیں۔ صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرے لاشعور میں ایک آنگن ہے جہاں میری امی کے بنائے ہوئے خوبصورت گھروندے ہیں، میرے ابو کے لائے ہوئے کھلونے ہیں، پیاری پیاری گڑیاں اور خوبصورت گڈے ہیں۔ کوئی پیڑ بھی ہے اس آنگن میں۔ ہو سکتا ہے امرود یا شریفہ کا پیڑ ہو ــــــ یا مہندی کی ڈالیاں ہوں۔ میں بھلا کس طرح اس درخت کو پہچان سکتی ہوں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ امی کے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروندے کیسے ہیں، اُن میں کتنے کمرے ہیں، کتنی دیواریں ہیں، اوپر جانے کے لئے کتنے زینے ہیں، پیاری گڑیوں کے کپڑے کس رنگ کے ہیں، گڈے کی مونچھیں ہیں یا نہیں ــــــ میں صاف طور پر کچھ دیکھ نہیں سکتی۔ لیکن اتنا جانتی ہوں کہ میرے ذہن کے کسی حصے میں وہ آنگن موجود ہے جس کی مجھے تلاش ہے!

میں بچپن سے اُسے ڈھونڈ رہی ہوں۔ اُس آنگن کو ابو کے گھر میں ڈھونڈا، نہیں ملا۔ چچی جان کے گھر میں دیکھا، اُن کے گھر کا آنگن بھی انجانا اور اجنبی تھا۔ چچی جان کے میکے بھی گئی، وہاں بھی آنگن وہ نہ تھا جو میرے ذہن میں ہے۔ میں تلاش کرتے کرتے تھک گئی، میں نے صبر کر لیا کہیں وہ آنگن ہو تو ملے۔ وقت کے ساتھ میری عمر بھی بڑھتی رہی۔ میں جوان ہو گئی۔

ہر لمحے کے ساتھ ایک تجربہ حاصل ہوا۔ یہ لمحے بہت ظالم ہیں، یہی تو مجھے کھینچ کر اِس حد تک لائے ہیں۔ اب میں اُس آنگن کے بارے میں زیادہ نہیں سوچتی۔ بھلا کیوں سوچوں؟ بچپن کی بات بہت دُور رہ گئی ہے۔ میں اکثر ذہن سے اُس آنگن کے خاکے کو جھٹک دیتی ہوں۔ لیکن کبھی کبھی پھر اِس کے بارے میں بہت کچھ سوچنے لگتی ہوں۔ جانے کیا کیا ــــــ اتنا ضرور ہے کہ میرے ذہن کا وہ حصہ جو تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہے، جہاں کچھ نظر نہیں آتا۔ جسے لاشعور کہتے ہیں ــــــ وہ میرے آنگن کے خاکے کو لئے اب تک اُسے ڈھونڈ رہا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو بھلا میں نیند میں کیوں چلتی۔ اُس وقت تو میں سوئی رہتی ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں گہری نیند میں اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ پھر کھڑی ہو جاتی ہوں اور اس کے بعد چلنے لگتی ہوں۔ اب کیا شک ہے کہ میں نیند میں اُسی آنگن کو تلاش کرتی ہوں ــــــ اپنے آنگن کو!

جب میں پیدا ہوئی تو میری چچی نے گود لے لیا۔ میری امی کی صحت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لئے میری پرورش چچی جان کے گھر میں ہونے لگی۔ میرے چچا جان [illegible] شہر

میں رہتے تھے۔ جب چچی جان وہاں گئیں تو مجھے بھی ساتھ لے گئیں۔ بچپن میں ماں باپ سے علیحدہ ہو گئی۔ چچا جان کی شفقت اور چچی جان کی محبت ہی میرے لئے سب کچھ تھی۔ جب ہوش سنبھالا تو اسی گھر کو اپنا گھر سمجھا جہاں میری پرورش ہوئی تھی۔ پہلے تو مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ میرے ابّو کہاں ہیں اور میری امّی کہاں ہیں۔ اس کا احساس سب سے پہلے اس وقت ہوا جب مجھ سے کہا گیا کہ میں اپنے پرورش کرنے والوں کو ابّو اور امّی نہ کہوں، بلکہ چچا جان اور چچی جان کہوں۔ اسی وقت سے اس گھر کو [illegible] مجھے اجنبی سا معلوم ہونے لگا۔ مجھے معلوم ہوا کہ دوسرے شہر میں میرے والدین رہتے ہیں۔ اُن کے گھر میں اور بھی بچے تھے۔ چچا جان کے بڑے لڑکے کا نام فیروز تھا اور اُن کی دو بچیوں کے نام تھے رخسانہ اور قیصر۔ وہ سب چچا جان کو ابّو اور چچی جان کو امّی کہتے تھے۔ میں بھی انہیں یہی کہنا چاہتی تھی لیکن مجبور تھی۔ مجھے منع کر دیا گیا تھا۔

اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں اس گھر کی لڑکی نہیں ہوں۔ فیروز، رخسانہ اور قیصر سب مجھ سے چھوٹے تھے۔ گھر میں سب مجھ سے محبت کرتے تھے لیکن ایک انجانی سی کسک تھی جو دل کو بے چین کر دیتی تھی۔ چچی جان اپنے بچوں کے لئے جو کچھ کرتیں میرے لئے نہ کرتیں۔ لیکن اُن کی شفقت مجھ پر ہمیشہ رہی۔ میرا احساس ذہن کو کوئی نہ کوئی کمی ضرور محسوس کرتا۔ میں سوچتی کہ چچی جان نے میرے لئے جو گھروندا بنایا ہے وہ اتنا خوبصورت کیوں نہیں ہے جتنے خوبصورت گھروندے رخسانہ اور قیصر کے ہیں۔ میرے کپڑے اتنے خوبصورت کیوں نہیں ہیں جتنے اس گھر کے دوسرے بچوں کے ہیں۔ چچی جان جس طرح مجھے کبھی کبھی جھڑک دیتی ہیں وہ دوسرے بچوں کو کیوں نہیں جھڑکتیں۔ مجھ میں کمی کیا ہے؟ میں تو دوسرے بچوں سے زیادہ کام کرتی ہوں، زیادہ خدمت کرتی ہوں۔ ساری شفقتوں کے باوجود ایسی کمی کیوں ہے؟ میری پرورش تو اسی گھر میں ہوئی ہے۔ اسی طرح جس طرح فیروز کی پرورش ہوئی ہے، رخسانہ اور قیصر کی پرورش ہوئی ہے۔ چچا جان جب دفتر سے آتے تو اپنے بچوں کو پیار کرتے۔ میں دور کھڑی دیکھتی۔ پھر انہیں کچھ خیال آتا اور مجھے اپنے قریب بلاتے اور پیار کرتے۔ لیکن اس پیار میں مجھے کچھ کمی محسوس ہوتی۔ بتا نہیں سکتی، کیسی کمی تھی وہ!

وقت گزرتا گیا۔ اب میں بڑی ہو رہی تھی۔ پہلے تو گھر پر ماسٹر جی پڑھانے آتے۔ ہم سب بھائی بہن پڑھتے اور خوب پڑھتے۔ ماسٹر جی کا برتاؤ بھی گھر والوں کی طرح تھا۔ مجھے چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر کڑی سزا دیتے۔ فیروز، رخسانہ اور قیصر کو ہر بات پیار سے سمجھاتے۔ خیر میں تو ایسی باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔ میں سمجھ چکی تھی کہ مجھے اپنے حق کے مطابق سب کچھ مل رہا ہے۔ کھانا، کپڑا ــــ محبت اور شفقت!

میں اپنے ابّو اور امّی کا تصور کرتی تو تڑپ جاتی۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے یہاں آ گئی تھی۔ ابّو اور امّی کے [illegible] تھیں۔ کچھ ذہن میں جو تصویریں ابھرتیں وہ بھی [illegible] کیسی صورت ہے۔ میں سوچتی اور تڑپتی۔ خیال آتا [illegible] ہر چھوٹی عمر کے ساتھ یہ غم بھی بڑھتا گیا۔ اب میں دوسری کلاس [illegible] کر چکی تھی۔ میں نے دبی زبان سے جب کبھی ذکر کیا [illegible] چچی جان ناراض ہو گئیں۔ کافی دیر تک باتیں سناتی رہیں۔ [illegible] اور چچا جان کے تعلقات کچھ اچھے نہ تھے۔ کچھ زمین جائداد کا جھگڑا [illegible] بھی بند تھی۔ میں سوچتی تھی آخر ابّو مجھے اپنے پاس بلا کیوں نہیں لیتے۔ کیا ابّو اور امّی نے مجھے دل سے نکال دیا ہے؟ ــــ طرح طرح کے خیالات میرے ذہن میں آتے تھے۔ پھر سوچتی یہ بھی ہو سکتا ہے میں تو اُن سے بچپن ہی میں جدا ہو گئی تھی۔ شاید انہیں میری صورت بھی یاد نہ ہو گی۔ انہوں نے مجھے چچی کے حوالے کر کے [illegible] کیا یہی ماننا ہے؟ اُن کا دل بدل جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میرے بعد انہیں خدا نے دو اولادیں اور دیں۔ ایک بھائی اور ایک بہن۔ اُن لوگوں نے مجھے بھول کر انہیں کو سب کچھ سمجھ لیا۔ میرے بھائی کا نام ظفر اور بہن کا نام عشرت تھا۔ اُن دونوں کے بارے میں بھی میں اکثر سوچتی تھی۔ کتنے بڑے ہوں گے کیسی صورتیں ہوں گی کیسی شرارتیں کرتے ہوں گے۔ فیروز، رخسانہ اور قیصر میری اس سوچ کو ختم کر دیتے تھے۔ وہ مجھے کبھی تنہا چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ کھینچ کر لے جاتے اور میں اُن کی دوستی میں سب کچھ بھول جاتی تھی۔

اکثر راتوں کو نیند ٹوٹ جاتی اور میں فیروز کے چہرے پر نظر جاتے اپنے بھائی ظفر کا تصور کرتی، رخسانہ اور قیصر کو تکتے ہوئے اپنی چھوٹی بہن عشرت کو یاد کرتی۔ میں نے انہیں دیکھا نہیں تھا لیکن ایک انجانی سی کسک تھی جو اُن کے مختلف پیکروں کو ذہن میں ابھارتی رہتی تھی اور میں ہر پیکر کو دیکھ کر مضطرب ہو جاتی تھی۔

اسکول میں میرا نتیجہ ہمیشہ اچھا نکلا۔ ایک طرف گھر کا کام کرتی۔ دوسری طرف فیروز، رخسانہ اور قیصر کی دیکھ بھال کرتی اور تیسری طرف اسکول کی پڑھائی لکھائی کی طرف توجہ دیتی۔ اس طرح دن بھر تھک جاتی۔ اپنے گھر کے بارے میں سوچنے کا بہت کم موقع ملتا۔ جس روز چچی جان کسی بات پر جھڑک دیتیں تو میں بے اختیار اپنے اَن دیکھے گھر کے بارے میں سوچنے لگتی ــــ وہ اَن دیکھا گھر شاید کبھی میرے ذہن میں نہ ابھرتا اگر چچی جان اُس دن کسی بات پر یہ نہ کہتیں ــــ "آخر تم دوسرے گھر کی لڑکی ہو نا!"

جب پہلی بار یہ سنا تو کانپ گئی۔ کیا بتاؤں اندرونی طور پر کیا اضطراب تھا مجھے چچی جان کی باتوں پر غصہ نہیں آیا۔ میں تو صرف یہ سوچنے لگی کہ جس گھر میں سانس

سے لگی ہوں، جس گھر کے آنگن میں کھیل کر بڑی ہوئی، جس گھر کو میں نے اپنا گھر سمجھا، وہ گھر وہ آنگن میرا نہیں ہے۔ میرا گھر، میرا آنگن کہیں اور ہے ــــــ میں دوسرے گھر کی لڑکی ہوں! معلوم نہیں کتنے سوالات ان سامنے آجاتے۔ جب رات گہری ہو جاتی تو اس آنگن کے ننھے پودے مجھ سے کہتے ــــــ تم دوسرے آنگن کی لڑکی ہو، یہ آنگن تو فیروز، ریحانہ اور قیصر کا ہے۔ تم سے ہمارا کیا واسطہ؟ دیواریں سرگوشیاں کرتیں ــــــ یہاں سے چلی جاؤ، یہ تیرا گھر نہیں ہے ــــــ میں وہیں پر بیٹھ جاتی اور رو دھو کر جانے کہاں کھو جاتی۔ اداسی بہت ستاتی۔ تیرا گھر، تیرا آنگن ہے۔ ہوائیں آکر میرے بالوں کو چھیڑ جاتیں اور آہستہ سے کہتیں: "چل تجھے تیرا آنگن دکھائیں ہم وہیں سے تو آرہی ہیں!"

میرا اپنا گھر، میرا اپنا آنگن، کسی بوستان کے تصور سے کم نہ تھا۔ جہاں ننھی ننھی چھوٹی چھوٹی خوبصورت پروں والی ہر رنگ کی پریاں ہوتی ہیں۔ میں بے قرار ہو گئی۔

چچی جان نے پھر اکثر کہا اور بات بات پر کہا: "کیا شان و ٹھاٹ ہو۔ یہ تمہارا گھر ہے؟ آخر تم اس گھر کی لڑکی جو نہ ہوتیں۔ تم دوسرے گھر کی لڑکی ہو نا؟" ــــ اب تو چچی سے ملنے کے لئے آنے والی پڑوسنیں بھی زخم پر نمک چھڑکنے لگیں۔ فیروز، ریحانہ اور قیصر بھی یہ باتیں سن کر مجھ سے اُلٹی سیدھی باتیں کر جاتے اور میں بڑی شدت سے اُن لمحوں کا انتظار کرتی جب مجھے اپنے گھر اور اپنے آنگن کی مٹی کی خوشبو ملے گی اور میں آنکھیں بند کر کے دیوانی سی، پورے آنگن میں دوڑتی پھروں گی۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ اِتنی عمر ہو گئی تو کیا؟ اپنے آنگن میں کبھی کھیلی بھی تو نہیں۔ جب ابّو اور امّی سو جائیں گے اور میں ظفر اور حشمت کو پیار کر کے خوابوں کی خوبصورت اور دلفریب دُنیا میں پہنچا دوں گی تو رات گئے آہستہ آہستہ آنگن میں اُتر کر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاؤں گی۔ اپنے آنگن کی مٹی کی خوشبو سے میرا وجود معطر ہو جائے گا۔ یہ تصور ہی مجھے تڑپا دینے اور جھوم جھوم جانے کے لئے کافی تھا!

میں ہائی اسکول پاس کر کے کالج میں آ گئی۔ اُس وقت ابّو اور چچا جان کے تعلقات کچھ اچھے ہونے لگے تھے۔ جائداد کا جھگڑا ختم ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی ابّو کا خط آجاتا اور چچا جان جواب دے دیتے۔ لیکن یہ سب کاروباری باتیں تھیں۔ تعلق اِس منزل پر نہیں تھا کہ کوئی میرے بارے میں سوچے۔ لیکن میں مایوس نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن ابّو مجھے ضرور بلائیں گے۔ چچا جان اور چچی جان نے مجھے بیٹی بنایا تھا اِس لئے بھیجے جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ اِس بارے میں بھول کر بھی سوچنا نہ چاہتے تھے اور غالباً ابّو کو بھی اطمینان تھا بیٹی دے کر۔ بچپن میں مجھے الگ کر کے وہ مجھے کیوں بھول گئے، میری سمجھ میں کچھ نہ آتا۔

ایک دن میں کالج سے واپس آئی تو فیروز نے بتایا کہ میری امّی کا انتقال ہو گیا۔ کئی دن ہو گئے۔ میں غم میں ڈوب گئی۔ امّی کو دیکھا نہیں تھا، اُن کی محبت مجھے نہیں ملی تھی لیکن اُس غم کی عجیب کیفیت تھی۔ میں نڈھال ہو گئی۔ کئی دن تک بس زندہ سانس لیتی رہی۔ کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ بار بار ابّو کے بارے میں اور اپنے بھائی بہنوں کے بارے میں سوچتی تھی۔ اُن پر کیا گزری ہو گی۔ اِس وقت بڑی بہن گھر میں ہوتی تو انھیں کتنا بڑا سہارا ملتا۔ میں نے دبی زبان سے چچی سے ذکر کیا تو وہ سخت ناراض ہوئیں۔ انھوں نے کہا: "وہاں جا کر کیا کرو گی؟ اب کیا ہے وہاں؟ تمہارا گھر تو یہی ہے؟" پھر بات سے بات بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ ہر وقت اُس گھر کا بھوت سر پر کیوں سوار رہتا ہے؟ اُس گھر سے تمہارا واسطہ کیا ہے؟ ہم نے پالا، پرورش کی، دیکھ بھال کی، دُکھ درد میں کام آئے، بڑا کیا، تعلیم دلائی اور ہم ہی غیر ہو گئے ــــــ سچ ہے غیر کے بچے کو اپنوں کی طرح پرورش کریں تو بھی کیا وہ اپنے ہوتے ہیں؟"

اُس دن میں روتی رہی۔ آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے۔ سسک سسک کر اور بلک بلک کر روتی۔ عجیب کشمکش تھی، عجیب عالم تھا۔ میرے ذہن میں کچھ اُلجھنیں تھیں۔ میں چاہتی تھی کوئی ہمدرد ملے اور میں اُس سے اپنی اُلجھنوں کے بارے میں کہہ سکوں۔ شاید کچھ سکون ملے لیکن کوئی نہ ملا۔

کالج کی زندگی میں مجھے نیر ملے۔ نیر رفتہ رفتہ میرے لئے کیا بن گئے، کس طرح بتاؤں۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی کے تپتے ریگستان میں مجھے بادل کا ایک ٹکڑا مل گیا ہے اور میں اُس کی ٹھنڈی چھاؤں میں منزل کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ جیسے مجھے میرا پیار مل گیا ہے۔ میرا آنگن، جس کے خواب میں برسوں سے دیکھ رہی ہوں۔ جیسے مجھے ایک ہمدرد دوست مل گیا ہے۔ ایک آئینہ! میں نے اُس آئینے سے محبت کی، اُسے چاہا اور اُس آئینے میں جذب ہو گئی۔ نیر مجھے بہت پسند کرتے۔ مجھ سے دو سال سینئر تھے۔ جب وہ ایم اے میں تھے تو میں بی اے میں تھی۔ نیر چاہتے تھے کہ میں اُن کی شریکِ زندگی بن جاؤں۔ کالج کے سالانہ جلسے میں اُن سے پہلی بار ملی۔ اور اُنھوں نے پھر مجھے اپنی نگاہوں سے دُور نہیں کیا۔ میں بھی انھیں دیکھ کر جانے کیا کیا سوچنے لگتی تھی۔ آپ ہی آپ مسکرا دیتی۔ آنکھیں بند کر لیتی، کہیں ڈوب جاتی، کھو جاتی۔ وہ بہت اچھے مصور تھے۔ اُن کی تصویروں کی نمائش ہوتی تو میں ضرور جاتی، مبارکباد دیتی۔ اُن کی تصویروں کی تعریف کرتی۔ وہ میری تعریف سے بہت خوش ہوتے تھے۔ واقعی مجھے اُن کی تصویریں بہت پسند تھیں۔ انھوں نے میری بھی کئی تصویریں بنائی تھیں۔ اب آپ سے کیا چھپانا۔ اپنی کشمکش اور ذہنی انتشار سے چھٹکارا پانے کے لئے مجھے ایک سہارا مل گیا تھا۔ اُن کی خوبصورت آنکھیں، اُن کا مسکراتا ہوا چہرہ، اُن کی وہ اُنگلیاں جو خوبصورت اور

کہ گھر میں ہی تھی جو میرے لئے بہت کچھ تھیں۔ میں ان ہی سہیلیوں کے سامنے کھل کر ہنستی بولتی تھی۔ مجھے کسی قسم کی کمی نہ لگی تھی۔

ہو سکتا ہے آپ میرا افسانہ پڑھ کر یہ سوچیں کہ میں ایک عجیب لڑکی ہوں گی، ایک گھر اور ایک آنگن کا خواب دیکھ رہی تھی جب میں تیزی سے ابھرتی کوٹھیوں کے کمروں کا فرنیچر دیواروں پر، ہر دریچہ پر دو سلائیڈ، ہر آرائش ___ اور آنگن کی مٹی اور اس مٹی کی خوشبو، آنگن کے پھول اور ان پھولوں کا رنگ ___ سب مجھے خوش کن اُمید کہتی ہے۔ مجھے اپنا گھر مل جائے گا ___ آپ یقیناً غلط نہیں سوچ رہے ہیں!

اب میں خارجی لمحوں سے زیادہ داخلی لمحوں میں سانس لے رہی تھی۔ میں نے ایک دنیا بسائی تھی۔ جہاں میرے ذہن نے ایک گھر بسایا تھا۔ میں کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ اپنے آپ میں گم ہو گئی۔ انہی زمانے میں مجھے معلوم ہوا کہ ابو نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اس بات کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شعوری طور پر ان باتوں سے میری دلچسپی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن دل کے چور کو سمجھاتی تھی۔ اب بھی یہ خواہش ہوتی تھی کہ میں ابو کے یہاں جاؤں۔ کم سے کم ایک بار انھیں دیکھ لوں۔ ایک بار تو بھائی بہن کو پیار کروں، اپنی نئی امی سے لپٹ جاؤں۔ اسی درمیان ایسا ہوا کہ چچی جان اپنے میکے گئیں۔ اپنے بچوں کو چچا جان کے پاس چھوڑ کر، صرف مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔ میں جانا نہیں چاہتی تھی کہ تیرے دُور ہو جائیں گے۔ اور میں یہ دُوری ایک پل کے لئے بھی برداشت نہ کر سکتی تھی، لیکن مجبور تھی۔ گرمی کی چھٹیاں تھیں اور کوئی بہانہ نہ تھا۔ وہاں بھی ایک بڑا گھر تھا۔ چچی جان کے رشتہ دار تھے۔ وہاں بھی گھر میں بہت سے بچے تھے۔ میری عمر کی لڑکیاں تھیں۔ بہت سے کمرے تھے اور ایک بڑا آنگن تھا۔ میں اپنی ہم عمر لڑکیوں سے بہت جلد گھل مل گئی اور آنگن میں رات گئے تک بیٹھی انھیں طرح طرح کی کہانیاں سناتی رہی۔ جانے کیوں آنگن کا تصور میرے ذہن سے چپٹ گیا تھا۔ کوئی آنگن دیکھا اور متوالی ہو گئی۔ میں اُن لڑکیوں کو مزے دار کہانیاں سناتی تھی اور یہ کوشش کرتی تھی کہ کہانیاں جلد ختم نہ ہوں۔ دیر تک سناتی رہوں اور مجھے دیر تک اس آنگن میں بیٹھنے کا موقع ملے۔ گرمی کے دن تھے۔ میرا بستر بھی دوسری لڑکیوں کے ساتھ اُسی آنگن میں تھا۔ میں رات کو دیر تک جاگتی رہتی اور اس آنگن کی مٹی کی خوشبو کے بارے میں سوچتی لیکن آپ سے سچ کہتی ہوں۔ وہ خوشبو بھی اجنبی تھی۔ مجھے کوئی کشش محسوس نہ ہوتی۔ چچی جان کی بڑی بہن بھی اپنے بچوں کے ساتھ وہاں تھیں۔ پھر یا تھا، میری شادی کی باتیں ہونے لگیں۔

میں گھبرا گئی۔ سوچنے لگی جس طرح مجبور ہو کر میں چچی جان کے گھر میں پرورش پا رہی ہوں اور جس طرح مجبور ہو کر یہاں آئی ہوں، اسی طرح مجبور ہو کر کسی لڑکے

سے شادی کر لی تھی اور وہ ... مجھے ... تھی۔ چچی جان کو ... اپنی بیٹی ... اور میں ایک دوسری کا مجموعی شکار ہو گئی تھی۔ میں نے اُن کو دیکھا تھا۔ تیری طرح نہیں تھا اور وہ تیری طرح ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ قانون پڑھ لیا تھا اور ضرورت سے زیادہ قانون داں تھا۔ اپنی گفتگو میں ہر وقت قانون کی باتیں کرتا۔ مجھے وہ بالکل پسند تھا۔ لیکن میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کس طرح کروں، یہ بہت مشکل مسئلہ تھا۔ چچی جان بھی واقف تھیں۔ اب کیا تھا۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ! دیکھتے کیا ہو۔ چچا جان کا کار کا ایک دو منٹ تماشہ ہی، اور چچی جان سب کچھ بھول کر مجھے لے کر واپس آ گئیں۔ چچا جان بہت بیمار تھے۔ علاج ہو رہا تھا۔ چچی جان اپنے شوہر کی تیمارداری میں سب کچھ بھول گئیں۔ میرے ذہن میں وہ آنگن جب کبھی ابھرتا ہے کانپ جاتی ہوں۔ اُس آنگن کے ساتھ قانون کی کتنی دفعات ابھرتی ہیں۔ بہت سے ضابطے اور اصول ابھرتے ہیں۔ زندگی کا ایک میکانکی تصور ابھرتا ہے۔ تیرے ساتھ میرا رشتہ میکانکی نہ تھا۔ یہاں کوئی قانون نہیں تھا۔ ضابطوں کی بات نہیں تھی۔ گلے اور اصول نہیں تھے۔ محبت کو بھلا ان باتوں سے کیا واسطہ؟ تیرے لئے اور میں سب کچھ بھول گئی۔ یہ رومانی زندگی کتنی دلفریب اور خوبصورت تھی، میں بتا نہیں سکتی۔

چچا جان بستر پر تھے۔ ایک دن میں انھیں دوا دینے گئی تو انھوں نے بڑی شفقت سے کہا: "بیٹی! ایک بات مانو گی؟" میں چونک گئی۔ میرے ذہن میں قانون کے الفاظ کیڑوں کی طرح کلبلانے لگے۔ میری خاموشی دیکھ کر مسکرائے۔ انھوں نے کہا "تم کچھ دنوں کے لئے اپنے گھر چلی جاؤ۔ تمہارے ابو کا خط آیا ہے۔ ان کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

میں نے سمجھا خواب دیکھ رہی ہوں۔ لیکن یہ حقیقت تھی۔ میں خوشی کے مارے دوہری ہو گئی اور چچا جان کا ایک ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر میں بے اختیار رونے لگی۔ چچا جان کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ انھوں نے مجھے پیار سے سمجھایا اور میں بہت مشکل سے اپنے کمرے میں آئی، اور دیر تک اپنے بستر پر پڑی سوچتی رہی۔ شاید میں خوشی سے دیوانی ہو گئی تھی۔ آنسوؤں کا ہر قطرہ خوشی اور مسرت کا قطرہ تھا۔ میں اپنے گھر کے بارے میں سوچنے لگی۔ ابو کے بارے میں، بھائی بہن کے بارے میں، نئی امی کے بارے میں، اپنی امی کی تصویر کے بارے میں۔ میں نے سوچا اپنی امی کی تصویر لے کر آؤں گی۔ اپنے گھر کا ایک خاکہ ذہن میں ابھرا۔ میں نے اسے توڑ دیا۔ دوسرا خاکہ ابھرا، اسے بھی توڑ دیا۔ اس طرح کئی خاکے ابھرے۔ میں سوچنے لگی ___ میرے گھر کا خاکہ سب سے اچھا اور خوبصورت ہوگا۔ وہاں ایک بڑا آنگن بھی ہوگا۔ اس آنگن میں خوبصورت پودے بھی ہوں گے۔ شریفے یا امرود کا کوئی پیڑ بھی ہوگا۔ عشرت اور ظفر

کے گھروندے بھی ہوں گے۔ میری امّی کے بنائے ہوئے گھروندے۔ انھوں نے شاید ایک تیسرا گھروندا بھی بنایا ہوگا۔ میرے لئے۔ جو میرا انتظار کرتی رہی اور میں بدنصیب ــــــــــ

دوسرے دن میں اپنے گھر میں آگئی تھی۔ یہ گھر میرے ذہن کے کتنی خاکوں سے بل کر بنا تھا۔ میں نے اندر جاتے ہی سب سے پہلا آنگن دیکھنا چاہا۔ وہ آنگن جہاں میں کبھی نہیں کھیلی، وہ آنگن جو اب تک میرے انتظار میں تھا، وہ آنگن جو بچپن سے جوانی تک میرے ذہن میں رہا ہے۔ جس نے دور سے مجھے چاند کی طرح بلایا ہے۔ جس آنگن میں پریاں اترتی ہیں اور جس کی مٹی میں ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت بھری دعائیں ہیں۔

میں نے آنگن میں اتر کر ہر طرف دیکھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہاں تین چھوٹے چھوٹے گھروندے بنے ہوئے ہیں۔ اگرچہ تینوں ٹوٹ گئے ہیں۔ میری بہن نے بتایا امی جان نے یہ تیسرا گھروندا میرے لئے بنایا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے عشرت کو کھینچ لیا اور اُسے پیار کرنے لگی۔ ظفر نے بھی مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ وہ بھی چند لمحوں میں مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ مجھے ایک دنیا مل گئی تھی، ایک کائنات مل گئی تھی۔ وہ دنیا جسے کھو چکی تھی، وہ کائنات جسے زمانہ نے بھول جانے کو کہا تھا۔ میرے آنے کے بعد گھر میں خوب چہل پہل ہوگئی۔ میری نئی امّی بہت اچھی تھیں۔ بات بات کا خیال رکھنے لگیں۔ ابو نے بھی پیار بھری نگاہوں سے دیکھا اور کچھ سوچنے لگے۔ میں اس گھر میں آکر سب کچھ بھول گئی۔ اگر کوئی ذہن میں تھا تو وہ نیّر تھے۔ ابو نے امی کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا "یہ ہیں تمھاری امّی! ہو بہو تمھاری تصویر! غور سے دیکھو" اور میں اس آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر حیران تھی۔ مسرت اور غم کے ملے جلے جذبوں کے ساتھ میں نے اپنی امّی کو بے اختیار چوم لیا۔ صدیوں کی پیاسی روح کو سکون نہ ملا۔ میں نے ابو سے وہ تصویر مانگ لی۔ صبح سے شام تک میں عشرت اور ظفر کے ساتھ رہتی۔ گرمی کی چھٹیاں تھیں اس لئے ان دونوں کے اسکول بھی بند تھے۔ میں انھیں کہانیاں سناتی، اُن کے لئے نئے نئے ڈیزائن کے کپڑے بناتی۔ رات کو جب ابو اور نئی امّی سو جاتے تو ہم تینوں آنگن میں خوب کھیلتے۔ میں بھی اُن کے ساتھ بچی بن جاتی۔ میں محسوس کرتی میری عمر یک بیک کم ہوگئی ہے۔ میں عشرت کی ہم عمر ہوں۔

اب گرمی کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور ابو بھی اچھے ہو رہے تھے۔ میرا کالج کھلنے والا تھا۔ چچی جان نے خط لکھوایا تھا کہ ابو مجھے جلد بھیج دیں۔ میں بھی اس آنگن میں کھیلنا اور رہنا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ اب کبھی نہ جاؤں۔ نیّر بھی مجھے یہاں آکر ملیں، ابو سے مل کر فیصلہ کریں۔ ابھی میرے جانے میں کچھ دن اور تھے کہ نئی امّی نے کسی بات پر مجھ سے کہا: "آخر تم کسی دوسرے گھر کی لڑکی ہو نا تم سے آدمی کیا کہے؟" ــــــ میں چکرا گئی۔ واقعی میں اس گھر کی بھی لڑکی نہ تھی۔ میری پرورش اس گھر میں نہیں ہوئی تھی۔ پھر میں اس گھر کی لڑکی کس طرح ہوگئی؟ ــــ کیا یہ آنگن بھی میرا نہیں ہے؟

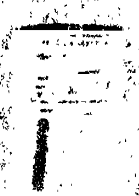
اِس خیال سے ذہن میں عجیب کشمکش شروع ہوگئی۔ میرا آنگن کہاں ہے؟ میرا گھر کہاں ہے؟ نئی امّی پر پہلے مجھے غصّہ آیا تھا۔ سوچا تھا پلٹ کر جواب دے دوں۔ لیکن پھر سوچا وہ غلط نہیں کہہ رہی ہیں۔ یہ گھر میرا نہیں ہے، میں اس گھر کی لڑکی نہیں ہوں۔ میری پرورش دوسرے گھر میں ہوئی ہے لیکن وہ گھر ــــــ وہ گھر بھی میرا نہیں ــــــ پھر میرا گھر کہاں ہے۔ میرا آنگن کہاں ہے؟ کوئی بتاؤ میرا آنگن کہاں ہے ــــــ؟ یہ میری روح کی چیخ تھی جو کائنات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی جانے کہاں گم ہوگئی۔

میں چچا جان کے گھر واپس آگئی ہوں۔ بھائی بہن کی یاد لے کر اور اپنی امّی کی تصویر لے کر۔ اس گھر میں بھی اجنبی ہوں۔ جب سے آئی ہوں جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہوں۔ جب نیند آجاتی ہے تو نیند میں چلنے لگتی ہوں۔ جب کسی دیوار سے یا دروازے سے ٹکرا جاتی ہوں تو نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ سوچتی ہوں کیا اب میں لاشعوری طور پر اپنے آنگن کو ڈھونڈ رہی ہوں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا!

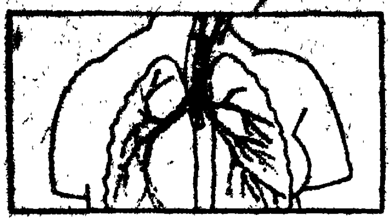
نیّر نے ایم۔ اے کر لیا ہے۔ میں بھی بی۔ اے پاس کر چکی ہوں۔ باہر نیّر کے والد نیّر کے ساتھ چچا جان کے پاس آئے ہیں۔ رشتے کی بات لے کر، مجھے مانگنے۔ وہ مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں۔ شاید وہ آنگن میرا آنگن ہو!!

کھانسی سے نجات پانے کے لیے
واٹربریز کمپاؤنڈ لیجیے
لال لیبل

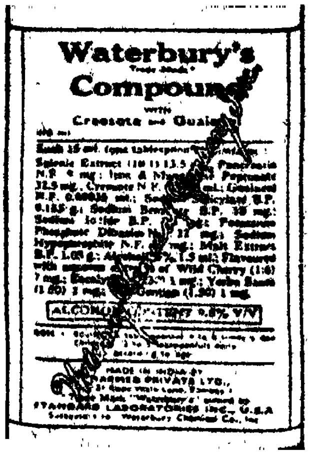








واٹربریز کمپاؤنڈ میں موجود کریوسوٹ اور گائیکول سانس کے نظام کو جراثیم سے پاک رکھتے ہیں اور بلغم خارج کرتے ہیں، پھیپھڑے صاف رکھتے ہیں، کھانسی، زکام، سانس کی تکلیف اور دمہ جیسی کیفیت کا مقابلہ کرنے میں مدد کرتے ہیں اور جراثیم کو دوبارہ پھیلنے سے روکتے ہیں۔



کھانسی مستقل رہنے سے کمزوری آجاتی ہے اور بیماری کا مقابلہ کرنے والی توانائی کم ہو جاتی ہے۔ واٹربریز کمپاؤنڈ بیک وقت تین طرح سے اثر کرتا ہے: آرام پہنچاتا ہے، طاقت بحال کرتا ہے، اور بیماریوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے موثر اجزاء کریوسوٹ اور گائیکول کھانسی میں آرام پہنچاتے ہیں، لوہا اور مقوی اجزاء نیز حیاتین اور طحال کے ست بھوک بڑھاتے ہیں، طاقت بحال کرتے ہیں اور جراثیم کا مقابلہ کرنے والی توانائی پیدا کرتے ہیں جس سے مرض کے پلٹنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔

بارہ مہینے بیماریوں کا مقابلہ کرنے والی توانائی برقرار رکھنے کے لئے لال لیبل والا واٹربریز کمپاؤنڈ پیجئے۔

واٹربریز
کمپاؤنڈ

کھانسی، زکام، سانس کی تکلیف
اور دمہ جیسی کیفیت کا مقابلہ کرنے کی توانائی پیدا کرتا ہے

وارنر ۔ ہندوستان لمیٹڈ، بمبئی

JWT-WL-2236

یاد

شعلہ علیم آبادی

کیا یاد کریں یاد جو رہی، اللہ تھی یاد
تمثالِ لبِ جُو، چمن گل بدنی، یاد
وہ صبح زرافشاں میں، نہ پرچھرِ وفا سب
وہ سیلِ شبِ ماہ میں رواں سیم تنی یاد
وہ بام پہ اُڑتے ہوئے آنچل کے کچھ کے
آنکھوں میں وہ چھپتی ہوئی کلی پیرہنی، یاد
وہ غمزۂ ناز، جو سنبھلے نہ سنبھالے
آواز کی وہ دھار، خموشی کی ادا یاد
پھر تلخیٔ گفتار کا وہ موج میں آنا
وہ تلخیٔ گفتار میں شیریں دہنی یاد
دِل اُن سے، تو پیمانہ مرے ہاتھ سے اُٹھا
پیماں وہ مجھے یاد ہے، پیماں شکنی یاد
وہ دَور بھی آیا کہ ہوئے دید سے محروم
غم خوار سے احباب کی وہ خندہ زنی یاد
اب نامہ و پیغام کہاں، جی کا زیاں ہے
وہ تنگیٔ دِل یاد ہے، وہ کم سخنی یاد
اللہ ری برگشتگیٔ خاطرِ محبوب
ہے کلمۂ یزداں، بہ لبِ اہرمنی یاد
گردش وہ شباب اب بھی شرربار ہے دل میں
ہے گردشِ ساغر ہے، وہ اعصار شکنی یاد

غزل

اخگر مشتاق رحیم آبادی

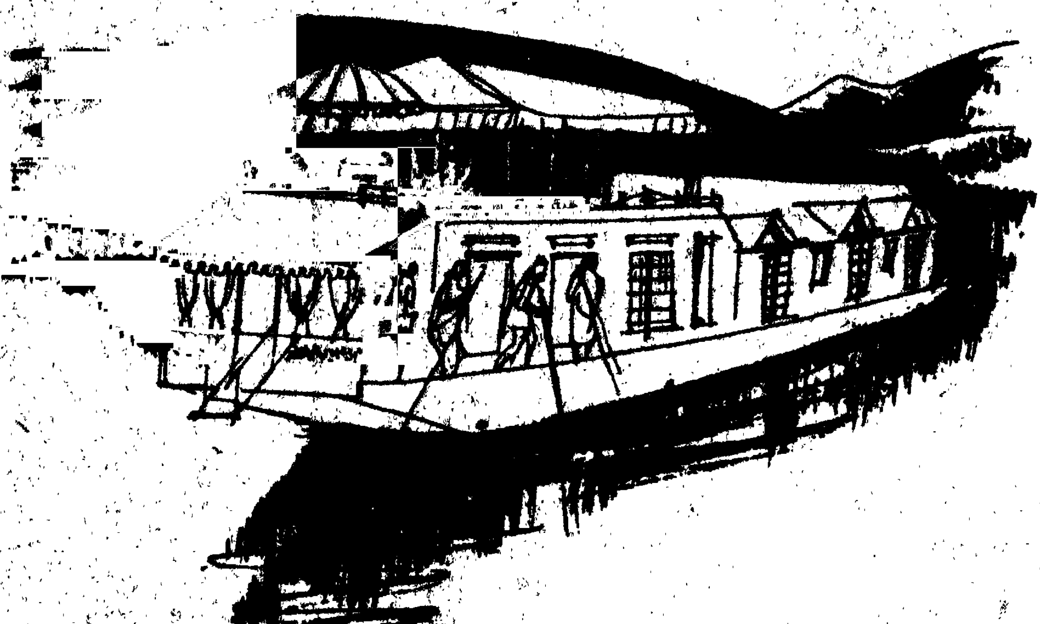
تمناؤں کا اک شہرِ فروزاں دیکھ آئے ہیں
وہ دنیا بھی، جہاں مرنا ہے آساں دیکھ آئے ہیں
دمِ رخصت نزاعِ کفر و ایماں دیکھ آئے ہیں
بڑا سخت امتحانِ عہد و پیماں دیکھ آئے ہیں
متاعِ جان و ایماں کی حقیقت پوچھنے والو!
وہاں سب کچھ نثارِ روئے جاناں دیکھ آئے ہیں
جمالِ ماہِ نو بھی اپنی نظروں میں نہیں جچتا
کسی کا جب سے ہم چاکِ گریباں دیکھ آئے ہیں
ہمیں بہکا نہیں سکتی ہے اب نیرنگیٔ عالم
کہ ہم خود التفاتِ چشمِ جاناں دیکھ آئے ہیں
عجب رنگینیاں ہیں عالمِ خواب و تصور میں
تجھے جس دن سے اے جانِ بہاراں دیکھ آئے ہیں
تو ہی تنہا نہیں اے دل گرفتارِ غمِ دوری
وہاں بھی دل میں داغِ رنجِ ہجراں دیکھ آئے ہیں
خدا جانے مآلِ وحشتِ فکر و نظر کیا ہو
کہ دل پر سایۂ زلفِ پریشاں دیکھ آئے ہیں
عجب کیا ہے جو ازِ سے نکل آیا ہو قدرت سے
حرم والوں کے گھر پینے کا ساماں دیکھ آئے ہیں
بس اب رہنے بھی دے اخگر ہمیں معلوم ہے سب کچھ
ہم اُنکی بزم میں تجھ کو غزلخواں دیکھ آئے ہیں

کشمیر

آپ کو خوش آمدید کہتا ہے....

اپنی چھٹیاں کو یادگار بنائیں — ہاؤس بوٹوں یا شکارا میں جھیل ڈل کی سیر کا لطف لیں۔ پاس ہی نگین جھیل میں غسل اور آبی کھیلوں کا لطف اٹھائیے یا جائیے شالیمار و نشاط باغات کے حسین سبزہ زاروں پر۔ گلمرگ میں چاندی کی طرح چمکتے چشموں کے پہاڑوں اور پہلگام کی وادیوں کے درمیان قیام فرمائیے۔ نظر نواز نظاروں اور روح افزا آب و ہوا کے لئے سیر و تفریح کے لئے پہلگام بے مثال ہے۔ دریا جہلم میں بہترین ٹراؤٹ مچھلی کا شکار کھیلیں۔

اب اکتوبر تک بانہال ٹنل و سڑک راستہ سے سفر کیجئے — دہلی اور سری نگر کے درمیان روزانہ دو وقتی ہوائی خدمات ہیں — ایک ہوائی جہاز کا سیل بمبئی سے دہلی تک آنے والے کیراویل ہوائی جہاز سے ملتا ہے۔ ہاؤس بوٹوں میں قیام اتنا مہنگا نہیں پڑتا جتنا کہ آپ کا خیال ہے۔ محکمہ سیاحت، جموں و کشمیر (سری نگر) کا ڈائرکٹر آپ کو چھٹیوں کا منصوبہ بنانے میں بخوشی تعاون دے گا۔



ڈیپارٹمنٹ آف ٹورازم، بھارت سرکار

محبوب مشغلے

راجہ مہدی علی خاں

۱۳۹۔ پالی روڈ باندرہ بمبئی ۵۰

۱۸ مئی ۱۹۶۴ء

محترم جناب ایڈیٹر صاحب آیر وشیر علیکم

ایک عدد شریف، معصوم، شکیل لڑکا جو میرا بھانجا بھی ہے اور بھتیجا بھی، وصول پایا۔ رسید لکھ دی ہے تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے ——— میرا بھانجا یا بھتیجا خدا کا شکر ہے، آپ کی طرح لفنگا لچا اور بدمعاش نہیں معلوم ہوتا۔ بہت ہی بھولا ہے، فرشتہ ہے۔ خدا کا شکر ہے وہ اپنی والدہ محترمہ پر گیا ہے۔ فکر نہ کیجئے آپ کے حکم کے مطابق ہم آپ کو کوئی سیوا نہیں کر رہے۔ نہ مہمان نوازی کر رہے ہیں۔ وہ خود ہوٹل میں لے جا کر اپنے پیسوں سے ہمیں ناشتہ کراتا ہے۔ دوپہر کو خود ہوٹل سے کھانا منگوا کر کھاتا ہے، طاہرہ کو بھی کھلاتا ہے۔ مجھے بھی، کاشی ناتھ کو بھی، دوسرے نوکروں کو بھی اور پانچ بلیوں کے لئے صبح شام دس دس سیر بالائی بھی کہیں سے لے آتا ہے۔ رات کو وہ ہمیں تاج محل ہوٹل میں کھانا کھلاتا ہے۔ ہم نے بے حد اصرار کیا تھا کہ گھر کی دال روٹی کھا لیا کرو مگر وہ کہتا ہے، "میرے ڈیڈی کی ہدایت ہے کہ راجہ مہدی علی خاں کے گھر کی کوئی چیز نہ کھانا اس لئے مجبوری ہے ——— " آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہم کر سکتے ہیں نہ عزیزی مجیب سلمہٗ۔ اس لئے ہم مجبوراً اُس کے اشارہ علیہ پر چل رہے ہیں۔ اور آپ کو لاکھ لاکھ دعائیں دے رہے ہیں۔ آپ کی بھیجی ہوئی کروڑوں قسم کی مٹھائیاں موصول ہوئیں۔ بہت بہت شکریہ۔ میرے گھر کے سامنے چند دکانیں خالی تھیں۔ یہ سب مٹھائی اُن دکانوں میں بھروا دی گئی ہے تمام باندرہ آج کل اپنی دکانوں کی مٹھائی کھا رہا ہے۔ ڈر ہے کہ اب میں "راجہ مہدی علی خاں حلوائی" نہ مشہور ہو جاؤں۔ اگر ایسا ہوا تو یہی سمجھوں گا کہ خوشتر صاحب نے میری عزت افزائی کی ہے ——— محترمہ بہن صاحبہ کی خدمت میں میری اور طاہرہ کی طرف سے آداب۔ بچوں کو دعا۔

آپ کا ——— راجہ مہدی علی خاں مٹھائی بازار والا

ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم۔ اے (ڈھاکہ)

رام پور میں بچپن گذارنا اور اپنے حالاتِ زندگی میں کبھی اس کا حوالہ نہ دینا۔ کسی واقف کے پوچھنے پر جھینپ کر صرف یہ کہہ دینا ؎

"اجی وہ دن کھیل کود کے تھے تمیز کیا تھی بُرے بھلے کی"

ایک دن تنگ آ کر رام پور سے بھاگ نکلنا۔ شہروں شہروں گھومنا۔ پھر ڈھاکے جا پہنچنا۔ اور پھر رو رو کے ڈھاکہ نہ چھوڑنے کی قسم کھانا۔ لوگوں سے کہنا کہ "پہلے ڈھاکہ ململ کی وجہ سے مشہور تھا۔ اب عندلیب شادانی کی وجہ سے مشہور ہے۔"

کالج کے لڑکوں کو پڑھانا تنقیدی مضامین لکھنا۔ اچھے شعر کہنا۔ اچھے شعروں کی داد دینا۔ گلستان، ادب میں چہکنا، دوستوں کے کہنے پر کہ "گلستانِ ادب میں عندلیب چہک رہا ہے" برہم ہو جانا اور کہنا "حضور عندلیب چہک نہیں رہا عندلیب چہک رہی ہے۔ میری خاطر محاورے کی ٹانگ کیوں توڑتے ہیں آپ؟"

نمونۂ کلام ؎
چہک رہی ہے کہیں عندلیبِ شادانی
جنوں طراز ہے ظالم کی زمزمہ خوانی

کوثر چاندپوری (بھوپال)

چاند کے سائے میں بیٹھ کر پوریاں کھانا۔ آپ کوثر پینا اور افسانے لکھنا۔

…خوب کلفٹ کے قبرستان سرگرداں پھر نکل جانا کہ شاید مرے ہوئے شاعروں کو
…کا بچا کر اپنے افسانوں کے کرداروں میں زبردستی شامل کر لینا
…مطلب کی لائبریری میں معطون کی بجائے افسانوں کی کتابیں، ڈکشنریاں،
…مطب کرنا۔ مایوس علاج مریضوں کو اپنے افسانے اور دوسروں
…افسانوں کو شائع کرنے کی کوشش کرنا تاکہ مریضوں سے کہنا "تمہارا کوئی علاج
…آپ کو تو ابھی پوری چادر پر نظر۔ بال تک آ گئیں گے" مریضوں کی جیبوں کی طرف
…جی بھر کر دیکھنا اور کہنا۔ "کاش یہ جیب کترا ہوتا"

قیام دہلی کے دوران میں خوشتر گرامی صاحب کے دسترخوان پر بیٹھ کر دعوت
…کے اُبلے ہوئے شلغم کو مرغ مسلّم کہہ کہہ کر کھانا اور خوشتر کی بیگم کو بشیر کہہ کر
…لینا۔ اُن کی میز پر رکھے ہوئے اُبلے ہوئے آلو کھا کھا کر کہنا "واہ خوشتر صاحب آپ کے
…ہوئے مسلّم شتر مرغ بہت مزیدار ہیں" اپنے مریضوں سے چلا چلا کر کہنا۔

نگاہوں سے کہہ دیکھیں، بستی میں کہاں چھپا ہیں
مسیح الملک ہوں، خورشید بن کر چھپا ہوا ہوں
کرو مت دل کو تم مایوس، بیماری کے صدموں سے
اُٹھا لو آ کے "معجونِ شفا" بندے کے قدموں سے!

…ت اللہ شہاب (کراچی)

عہدوں کی چارپائی پر دنیائے ادب کا چودھری بن کر طرّہ دار پگڑی اور ریشمی تہمد
…باندھ کر بیٹھ جانا۔ سرکاری حقّے میں افسانوں سے کشید کیا ہوا پانی بھروانا۔ اِس حقّے کی چلم میں
…اور افسانوں کا خمیرہ تمباکو ڈال کر کش پر کش لگانا۔ دھواں ادیبوں کے چہروں پر
…رعب ڈالنا۔ زبردستی دخل در معقولات کرنا۔

مشاعروں میں مندرجہ ذیل اشعار سے اپنا تعارف کرانا۔

…ے بچے جوان سب مجھ کو	قدرت اللہ شباب کہتے ہیں
…رے سب سفید ریش مجھے	قدرت اللہ خضاب کہتے ہیں
…ن ایسے بھی ہیں جو بندے کو	قدرت اللہ عذاب کہتے ہیں
…ں کو مجھ سے غرض ہے وہ مجھ کو	قدرت اللہ ثواب کہتے ہیں
…ر گداگر مجھے خوشامد سے	قدرت اللہ نواب کہتے ہیں
…ر جو اچھے ہیں لوگ وہ مجھ کو	قدرت اللہ خراب کہتے ہیں

حاضرینِ مشاعرہ مجھ کو
شاعری کی کتاب کہتے ہیں

بسمل سعیدی (دہلی)

شعر کہنا۔ عشق کرنا، شک کرنا۔ دن بھر [illegible]
پھر جا بیٹھنا مشاعرے کے قریب جا کر بیٹھی پھر لاجواب [illegible]
کہنا "آج کل میری طبیعت بڑی عشقی ہو گئی ہے"
صدموں سے مایوس ہونے کے بعد خلاؤں میں تکتے رہنا [illegible]
کیا خوب کہے گئے ہیں۔

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میر کا شعر غلط دہرا کر کہنا میر صاحب نے بھی کیا خوب کہا ہے

کیا ستم ہے اسی بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطّار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

سیر کرنے کے لئے کسی طرف شہر سے بہت دور نکل جانا۔ تھک جانے کے بعد ستانے کے لئے کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ جانا۔ کسی گدھے کو دور سے آتا دیکھ کر چلانا "آ جا آ جا میرے پیارے دوست! میرے ہم سفر میرے شریکِ حیات۔ دوڑ کر میرے قریب آ کر مجھ سے ہم آغوش ہو جا۔"

گدھے کا جواب دینا۔

آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے
دل کی اے دھڑکن ٹھہر جا مل گئی منزل مجھے

ایک شاعرہ پر عاشق ہو کر روز اُس کے گھر جانا۔ شاعرہ کا تنگ آ کر ہر مرتبہ پوچھنا۔ آپ یہاں سے کب جائیں گے؟

بسمل صاحب کا جواب دینا۔

شوخ ادا حور کو غلمان بنا لوں تو چلوں
ٹھیر جا تجھ کو میں اِک بات سنا لوں تو چلوں

شاعرہ کا باورچی خانے جانے کے لئے اٹھنا۔ اُٹھ کر ایک لمحے کے لئے پھر بیٹھ جانا اور کہنا۔

ٹھیریئے آپ کو اک بات سنا لوں تو چلوں
آپ کے عشق کی میں پیاس بجھا لوں تو چلوں

مجروح سلطانپوری (بمبئی)

اپنا تمام کام یہ کہہ کر بسمل شاہجہانپوری کو بھیج دینا، میں تو صرف مجروح سا ہوں

[illegible] اس لئے وہ زیادہ مستحق ہیں۔

ہر سال اپنی کار کی لمبائی میں اضافہ کر دینا۔ اپنی آمد سے دس گنا زیادہ کرائے کے مکان تلاش کرتے رہنا۔ بور کرنے والے ملاقاتیوں کو یہ کہہ کر گھر سے بھگاتے رہنا کہ "میں بہرہ ہو گیا ہوں، کچھ سنائی نہیں دیتا۔ گلا خراب ہے اس لئے بول بھی نہیں سکتا۔"

شکیل بدایونی صاحب سے ہر وقت ساحر لدھیانوی صاحب کی تعریفیں کرتے رہنا اور جواب میں شکیل صاحب کے تعریفی کلمات سن کر مسکرانا۔ سال میں صرف ایک ادبی غزل لکھنا۔ اُسے مسلسل دس سال تک مختلف پرچوں میں شائع کراتے رہنا نمونۂ کلام یہ ہے

تمہارے پیچھے صنم ساری ساری رات چلے
نہ تم کو لات لگائی۔ نہ تم پہ ہاتھ چلے
بُرا تھا حال مگر پھر بھی ساتھ ساتھ چلے

رشی پٹیالوی (چنڈی گڑھ)

رشی کہلانا اور رشیوں والی کوئی حرکت نہ کرنا۔ سوٹ پہن کر ٹائی لگا کر، نو بیند چڑھا کر ڈانس کے لئے بال روم چلے جانا اور جاتے جاتے مسکرا کر گھر والوں سے یہ جانا کہ رشی پٹیالوی "رمبا" "سمبا" اور "ٹوئیسٹ" ناچنے جا رہا ہے۔ بھگوان نے رشیوں کے لئے "ٹوئیسٹ" بھی کیا اچھی چیز بنائی ہے

ملتا ہوں روز اِک نئے محبوب سے گلے
دن رات ہیں یہی میرے محبوب مشغلے

ادب کے ہرے بھرے جنگل میں خوش ذوقی کی بندوق میں پختگی کے کارتوس بھر کر شکار کھیلنا۔ شام تک غزلوں کی بہت سی مرغابیاں، قطعوں کے ہرن اور نظموں کی بطخیں مار مار کر گھر لانا۔ پھر ان پر ٹکٹ لگا کر رسائل کے مدیروں کو بھیج دینا۔

دلی جا جا کر خوشتر گرامی صاحب کا مہمان بننا۔ میز پر بیٹھ کر بڑی بے دلی سے کھانا، سلاد ٹماٹر، گاجر مولی سے شروع کرنا، آخر صبر و قرار کا دامن چھوڑ کر اور "یا علی" کا نعرہ لگا کر میز پر رکھے ہوئے مرغ مسلم، مچھلی، بریانی، کوفتوں، شامی کبابوں اور روغنی نانوں پر ٹوٹ پڑنا آدھے گھنٹے کے بعد تمام میدان صاف کر دینا الحمد للہ کہہ کر اٹھ بیٹھنا۔

جب بھی دلی آنا خوشتر صاحب کے لئے سوتی ازار بندے کر آنا اور انہیں قسمیں دے دے کر یقین دلانا کہ یہ ریشمی ہیں۔ آپ کی نظر کمزور ہو گئی ہے۔

جب بھی دلی آنا خوشتر صاحب کے لئے خوبصورت جوتے لے کر آنا اور انہیں پلیٹ میں رکھ کر بڑے احترام سے خوشتر صاحب کی خدمت میں پیش کرنا۔

جب بھی دلی آنا جیب میں بہت سی ٹافیاں اور چاکلیٹ خوشتر صاحب کے لئے بھر لانا۔ ایک ایک کر کے خوشتر صاحب کو کھلانا کہ "بچے کھائے۔ یہ دنیا چار دن کی ہے۔"

خوشتر صاحب کو اپنی کسی بات کا یقین دلانے کے لئے گاجر و مولیوں اور سلاد کے پتوں کی قسمیں کھانا۔

اکثر شام کو جامع مسجد دہلی کے سامنے سیخ کبابوں کی کسی دکان کے سامنے خوشتر صاحب کی کار رکوا کر کہنا، دیکھئے خوشتر صاحب

کبابِ سیخ ہیں یہ کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں!
جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

ساحر کپور تھلوی

پان کھا کھا کر شراب پینا۔ نان کھا کھا کر شراب پینا۔ ران کھا کھا کر شراب پینا جان کھا کھا کر شراب پینا۔ تانگے والوں سے اپنے آپ کو "دیوان صاحب" کہلا کر خوش ہونا چندوں کی فہرستیں تیار کرنے کے لئے عقل مندوں سے ملاقاتیں کرنا اور انہیں اس فہرست میں شامل کر کے واپس آ جانا۔

اپنے ڈرائنگ روم میں جا بجا الّوؤں کی تصویریں لگانا۔ صبح اٹھ کر ان تصویروں کے سامنے اگربتیاں سلگانا۔ انہیں ہاتھ جوڑ کر "نمستے" کہنے کے بعد کام پر جانا۔ انہیں پیارے بھائی جان کہنا۔

منتظمین مشاعرہ کو رشوت دے کر ان سے مشاعرے میں شامل ہونے کی دعوتیں لینا۔ اپنی ناکامی پر خوش ہونا، ناکامی پر آنسو بہانا۔ نشے میں مائیک کی طرف پیٹھ کر کے حاضرینِ مشاعرہ کی بجائے دیواروں کو اپنا کلام سنانا۔ کھڑے کھڑے جھک جانا۔ جھکنے کے بعد بیٹھ جانا۔ بیٹھ جانے کے بعد لیٹ جانا۔ لیٹ جانے کے بعد سونا۔ لوگوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر یا اپنے آپ کو کسی گھوڑے پر رسوں سے بندھوا کر عالمِ بیہوشی میں گھر آنا۔

نام سوہن لال ساحر کپور تھلوی ہونے کی وجہ سے شراب کے ساتھ ہمیشہ سوہن حلوہ کھانا۔ نشے میں یہ شعر گنگنانا

بڑھاپے میں صہبا[1] سے کرتا ہوں عشق
ابھی ہوں میں دلی، ابھی ہوں دمشق

[1] "صہبا" سے مراد حضرت صہبا لکھنوی مدیر "افکار" کراچی۔

جاں نثار اختر (بمبئی)

فلمی گیت لکھ لکھ کر رونا۔ تنگ آ کر پہ ڈڈیو سرین جانا۔ اور لوگوں سے کہنا

[illegible] درخواست لیں ... [illegible] جاؤں گا۔ اگر
[illegible] کے سودے میں نقصان ہوا تو پھر کسی جنگل میں آباد ہو کر لوٹ مچانے کا کاروبار
شروع کردوں گا۔

صبح اُٹھ کر سات عدد بیویوں کی تصویر کو سجدہ کرنا۔ (اسے ؟) ہر ایک تصویر کے اِرد گرد سات چکر کاٹنا اس کے بعد اپنی مرحوم بیگم کی تصویر کے سامنے کھڑا ہو کر سلام کرنا۔ آنکھوں سے سات سو چھیاسی آنسو بہا کر کسی سیال چیز کا گلاس بغیر سوڈا ڈالے غٹاغٹ پی جانا۔ پھر مرحومہ کی تصویر سے ہاتھ جوڑ کر کہنا ۔۔

غم غلط کرنے کو پیتا ہوں وگرنہ سوچیے
زہر میں ڈوبی ہوئی تلوار ہے تیرے بغیر

اپنی پہلی بیگم کی یاد میں اپنے نورِ نظر اور مرحومہ کے لختِ جگر کو گھر سے نکال دینا تاکہ مرحومہ کی روح خوش ہو اور آسمان سے ان پر دعاؤں کی بارش کرے۔ باہر کام پر چلنے سے پہلے اپنی مرحوم بیوی کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر شعر پڑھنا ۔۔

گرچہ میں جاں نثار اختر ہوں — تم پہ میں جاں نثار کر نہ سکا
تم پہ مرتا رہا سدا لیکن — لیٹ کر میں زمیں پہ مر نہ سکا

ابراہیم جلیس (کراچی)

ہر روز درودِ ابراہیمی پڑھنا۔ جلسوں میں شامل ہونا۔ طنز و مزاح کے چھاتے تان کر اُن کے سائے میں بھنگ پی کر سو جانا۔ اخبار "جنگ" کے مزاحیہ کالم لکھنا۔ اپنے وطن حیدرآباد دکن کے بنیوں سے خط و کتابت کرنا۔ خطوں میں انہیں جھوٹی تسلیاں دینا کہ میں تمہارا سب قرضہ بیباق کر دوں گا۔

ہندوستان آکر دوستوں سے بہت سے جھوٹے وعدے کر جانا۔ ایک بھی وعدہ پورا نہ کرنا۔ اور اپنی عاقبت خراب کرنا۔ درپردہ اس قسم کے شعر کہنا ۔۔

وہ آئے اور دال پکا کے چلے گئے — کچھ روٹیاں رکھیں تھیں وہ کھا کر چلے گئے
اللہ کی "خصمت" ہے کہ چاخو کے ساتھ ساتھ — "خیچی بھی طاخ" سے وہ چرا کر چلے گئے

محمود ایاز (کراچی)

ہر روز سوچنا کہ میرا نام محمود ایاز کیوں ہے۔ بحث کرنا کہ یہ نام غلط ہے یا صحیح؟ اپنی قیمتی عمر کا نصف حصہ اپنے نام پر غور کرنے میں گذار دینا۔ کبھی کبھی سوچنا کہ میں اپنا نام محمودؔ و ایازؔ کیوں نہ رکھ لوں۔

شعر کہنا۔ صرف شاعروں سے ملنا۔ پرچے نکالنا۔ پرچے کے مقبول ہونے کے بعد اسے [illegible]
میں انجمن ترقی [illegible]
ہیں اب وہ بھی [illegible]
ہیں۔ دستر خوان پر [illegible]
کر تم ہندوستانیوں کو سوٹ سینا نہیں آتا۔ ہر [illegible]
بمبئی آکر اختر الایمان صاحب سے گلے ملنا۔ اُن کے سر پر [illegible]
چلے جانا۔ خواب میں تلوار سے اپنے دو ٹکڑے کر کے کہنا ۔۔

ایک ہی وار میں دو ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

دَور آفریدی (بمبئی)

موٹا چشمہ لگانا۔ چشموں سے عشق کرنا۔ چشموں سے بہت سا قرضہ لینے کے باوجود انہیں تنگ نظری سے دیکھنا۔ ختم چشموں سے بار بار ابھر کر ابوالہول ہونا [illegible] بازار کے چوراہوں پر کھڑے ہو کر چلتی پھرتی بھنڈیوں توریوں کو آنکھیں پھر پھر کے دیکھنا۔ ایک حسینہ سے درپردہ عشق کرنا۔ راقم الحروف کو بار بار خط لکھ کر درخواست کرنا کہ [illegible] خلاف وہ کوئی ایسی بات نہ لکھیں کہ "لڑکی" (ان کی محبوبہ) بدک جائے۔ اپنی محبوبہ کی سہیلیوں پر بھی بے ہودہ نظر رکھنا۔ پوچھنے پر کہ میاں ایسا کیوں کرتے ہو؟ جواب دینا کہ بے وقوفی اور حرامزدگی میں ریکارڈ توڑنا چاہتا ہوں۔ اپنی محبوباؤں سے [illegible] کہ میں چپلانگ میں شادی شدہ ہوں اور رام پور میں میرے سات بچے میری جان کو رو رہے ہیں۔
(خواتین و بزرگ حضرات نوٹ فرمالیں کہ دَور آفریدی صاحب کے جملہ حقوق بنام محترمہ نوری بی انصاری محفوظ ہیں)

اپنی محبوباؤں کو اپنی نثر کو نظم کہہ کر سنانا۔ ان کو مخاطب کر کے کہنا کہ آج آپ کے بارے میں عرض کیا ہے۔

دندانِ تو جملہ در دہان اند
چشمانِ تو زیرِ ابروان اند

رئیس نجمی امروہوی (امروہہ)

صرف خوش شکل خواتین کو شاگرد بنانا۔ انھیں زبردستی افسانے لکھنے بتانا اور کہنا کہ اچھی کہانی میں دو ماشہ محبت، چار ماشہ آنسو، دو رتی غم، ایک رتی آہ [illegible] ہیں۔ ریہرسل کرتے کرتے بے ہوش ہو جانا۔ نماز پڑھنا۔ نماز محبت ادا کرنا۔ روزہ رکھنا۔ خدا کی محبت میں سجدہ گزار رہنا [illegible] کی محبت میں مجبور کار رہنا [illegible]

کرانا۔ بچا۔ علموں کرواؤں سے پٹنا۔ سر کی ہڈیاں بچا کر ہاتھ کے ہڈی توڑنا۔ بیوی کے گھونسے کھانا۔ دلوں پر آرے چلانا۔ دکانوں پر آرے چلانا۔ دوستوں کے پوچھنے پر کہ آپ نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا کہنا کہ ؎

اگر دکان کے مشینوں کے درمیان گذرے
تو کہئے آپ ہی یہ زندگی کہاں گذرے

اپنے جوہر فروشی کے کارناموں سے اُٹھ کر اپنی پردہ نشین خواتین شاگردوں کے پاس جانا۔ خواتین کا ہنس کر پوچھنا کہ آپ ہمارے پاس روز کیوں آتے ہیں؟ —
مجی صاحب کا جواب دینا ؎

اگر نہ پردہ نشینوں کے درمیان گذرے
تو کہئے آپ ہی یہ زندگی کہاں گذرے

چھپال امروہوی (امروہہ)

خواتین کے فرضی ناموں سے افسانے لکھنا۔ نسوانی نام رکھ کر ادیبوں سے خط و کتابت کرنا۔ خطوں میں اظہارِ محبت کرنا۔ معاملہ حد سے زیادہ بڑھ جانے پر نروس ہو جانا۔ نروس ہو کر خودکشی کی خاطر ہڑتی لینا۔ مرنے سے پہلے وصیت کر جانا کہ میری جائداد بیچ کر رقم "بیسویں صدی" کے اکاؤنٹ میں جمع کر دی جائے۔ اس رقم سے حسینوں کی راہوں میں پھول بچھوا دیئے جائیں۔

اپنے افسانے حفظ کر لینا۔ کسی حافظ کی طرح اُنہیں خوش الحانی سے سنانا۔ اپنی عمر کا زیادہ حصہ اُن ادیبوں کے ایڈریس حاصل کرنے میں گذار دینا جو خواتین کے فرضی ناموں سے لکھتے ہیں۔ کچہری جانا۔ کچہری سے واپس آنا۔ روتے روتے جانا روتے روتے واپس آنا۔ کسی محبوبہ کے شکایت کرنے پر کہ آپ ملتے ہی نہیں، کہاں رہتے ہیں؟ کہنا ؎

قانونِ عدالت میں پھنس کر قانونِ محبت بھول گئے
مائی لارڈ کی صورت یاد رہی ہم آپ کی صورت بھول گئے

محبوبہ کا جواب دینا ؎

جو سمجھتے ہیں تمہیں نیڑھا تو خوش فہم ٹھیک کہتے ہیں
کہا کرتے ہیں جو کچھ وہ سراسر ٹھیک کہتے ہیں

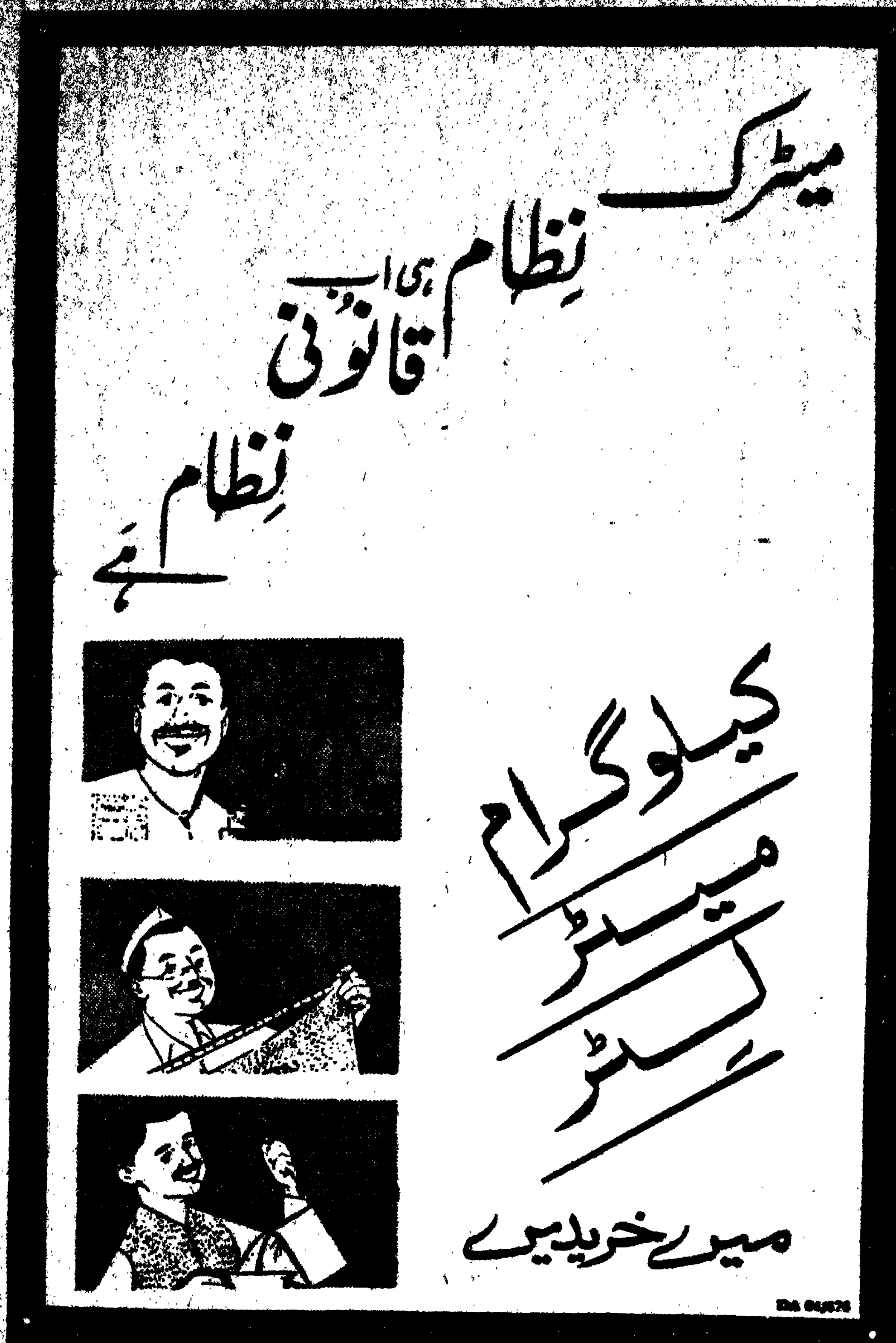
حمید الماس (گلبرگہ)

کلرک رہ کر افسروں کی طرح رہنا۔ افسروں کی طرح رہ کر بادشاہوں کے سے انداز اختیار کرنا۔ بادشاہوں کے انداز اختیار کر کے شہنشاہوں کی طرح زود رنجیوں کے ثبوت دیتے رہنا۔ غصہ کم کرنے کی دوائیں استعمال کرنے کی بجائے غلطی سے غصہ بڑھانے کی دوائیں کھا جانا۔

اپنی نظموں کی داد لینا۔ داد حاصل کرنے کے لئے کبھی کبھی بیداد پر اُتر آنا۔ گھونسے مار مار کر لاٹھیاں مار مار کر زبردستی داد لینا۔

رات کو تارے گننا۔ دن میں اپنی نظموں کی تعداد گننا کہ اب تک کتنی لکھی ہیں۔ اپنے مداحوں کو اُن رسائل کے نام صفحہ نمبر کے ساتھ بتانا جن میں ان کی نظمیں شائع ہوئی ہوں۔ کبھی کبھی اپنی نظم والا پرچہ خریدنے کے لئے اپنے مداحوں کو رسالے کی قیمت بھی دے دینا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

کچھ سال پہلے یارو سمجھو کہ میں تھا ہیرا
چوروں کے ڈر سے اب میں الماس بن گیا ہوں


میٹرک
نظام ہی اب
قانونی
نظام
ہے
کیلوگرام
میٹر
لٹر
میں خریدیے

بہاریں پھر بھی آئیں گی

جی ہے"

تمھاری آنکھیں بھیگ گئیں اور تم نے جھجکتے ہوئے میری طرف دیکھا ——
سے نکلنے میں مسکرا دیا، کیا تم رو رہی ہو۔

"لیکن —— لیکن میں نے تو ہمیشہ تمھیں مسکراتے ہی دیکھا ہے۔"

"تم سچ کہتی ہو ریتو۔ میں مسکراتا اس لیے ہوں کہ غمگین رہنے کے لئے
میرے پاس دُکھ نہیں اور نہ میری مسکراہٹ اُن خوشیوں سے ہی نہیں اُبھرتی جو کسی کو
اپنا آپ سونپ دینے کے بعد ملتی ہیں۔"

تم نے اُس دن پہلی بار مجھے اِس طرح کی باتیں کرتے ہوئے سُنا تھا ورنہ
میں مسکراہٹوں اور خاموشیوں ہی کو تم نے میرا سب کچھ سمجھ رکھا تھا۔ تم کچھ میرے
لئے اپنا وہ غم بھی بھول گئیں جو ہر وقت تمھاری اُداس آنکھوں اور چہرے کی
زردی میں گھُلا ملا رہتا تھا۔

"حیرت ہے تم —— تم اِتنا جانتے ہو پھر بھی ابھی تک اپنا آپ کسی کو
نہیں سونپ سکے۔"

میں کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

"میں پتھر کی مورتیوں میں نہیں رہتا ریتو! جیتے جاگتے انسانوں کے درمیان
رہتا ہوں۔ وہ دل بھی تو ملے جس کی جھولی میں میں اپنا آپ ڈال سکوں۔"

تمھارے منہ سے نکل گیا —— "ایسا کون ہوگا جو تمھارا حسین دل
قبول نہ کرے گا۔"

مجھ سے رہا نہ گیا۔ "کیا تم اِس دل کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو؟"

تمھارا سارا جسم سوکھے پتے کی طرح کانپ گیا۔

"نہیں نہیں۔ تم ایسا نہیں کہہ سکتے —— تم —— تم یہ کیا
کہہ رہے ہو؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا تم بے ہوشی میں بڑبڑا رہی تھیں۔

میں کرسی سے اُٹھ کر بالکل تمھارے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"دیکھا! میں نے تم سے کہا تھا نا، میرے نصیب میں وہ دل نہیں جس کی
جھولی میں میں اپنا آپ ڈال سکوں۔"

پھر میں تمھارے پاس سے چلا آیا۔

دوسرے دن صبح میں گھبرا کر باہر بالکونی میں آکر بیٹھ گیا۔ آفتاب
مشرق سے اُبھر آیا تھا۔ سرد سرد ہوائیں چل رہی تھیں ...
آج کتنی ... مشرق ... راتوں کے بعد سُنہرے آفتاب کا روشن چہرہ کتنا

سا معلوم ہوتا ہے۔ بالکونی کی ریلنگ پر جھک کر میں ... آفتاب کی طرف
دیکھ رہا تھا جس میں اِتنے پیارے اور اُجلے دن کا آغاز ہے۔

تم اُسی وقت وہاں آکر میرے قریب کھڑی ہو گئیں۔

"سورج سے آنکھ ملاؤ گے تو نظر کی روشنی چلی جائے گی۔"

میں نے تمھاری طرف دیکھا۔ تمھاری آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ ایسا
محسوس ہوتا تھا جیسے تم رات بھر سو نہیں سکیں۔ پھر بھی تمھارے چہرے پر ایک عجیب
نرمی اور تازگی تھی۔ تھکن کا کوئی نشان نہ تھا۔

میرے اندر جیسے کوئی کلی کھِل کر پھول بن گئی۔

تم نے پھر کہا۔ "صبح صبح آفتاب کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

مجھے پتہ بھی نہ چلا کب احساس ذہن تک پہنچا کب ذہن نے قوتِ گویائی
زبان کو بخش دی اور کب اور کیسے یہ الفاظ میں نے ادا کر دیئے۔

"اگر یہ آفتاب نہ ہوتا تو کسی بھی انسان کو نظر کی روشنی نہ ملتی۔ نظر کی وہ
روشنی جس سے اِنسان اپنے محبوب کو دیکھ سکتا ہے۔ جیسے اِس وقت میں تمھیں
دیکھ رہا ہوں۔"

تمھارے ہونٹ لرزنے لگے اور نظروں میں ہلکی ہلکی سی خوشی کی روشنی
جگمگانے لگی۔ پھر تم نے اپنا سر جھکا لیا۔

"تم جانتے ہو نا میری زندگی میں کتنی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے!"

"ہاں میں جانتا ہوں ریتو! اور اِس حقیقت کو بھی جانتا ہوں کہ ہم دونوں
زندہ ہیں اور آج ایک دوسرے کے سامنے کھڑے لمحوں کی دھڑکنوں سے بہتی ہوئی
روشن خوشی کو محسوس کر رہے ہیں۔"

تمھاری آنکھوں کا درد پگھل گیا —— میں نے جب تمھاری
آنکھوں کی طرف اپنی اُنگلیاں بڑھائیں تو تمھیں کچھ سُوجھ نہ سکا۔ میرے سینے پر اپنا سر
رکھ کر تم سِسکنے لگیں۔

تم نے میری محبت کو قبول کر لیا تھا۔ اِس سے بڑھ کر میرے لئے خوشی
کی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ تمھاری بہتی ہوئی آنکھیں میرے سینے سے کیا لگیں میرے
اندر اُمیدوں اور خوشیوں کا چراغاں ہو گیا۔ اُمید کی ساری کلیاں کھِل کر پھول
بن گئیں۔

... سرد ہوائیں اپنے دامن میں خزاں کی تبدیلی
... اس کے پتوں پر بہار نے پیار ... کا
رنگ ... محبت کی آگ سے دل کے بجھے ہوئے چراغ روشن ہو گئے۔ بہار نے

تھے۔ اُنھوں پیشانی کی سُرخی دو گئی تھی۔ تمہارا چہرہ پونم کے چاند
سا چمک رہا تھا۔ تمہاری آنکھوں میں ستاروں کی افشاں چمک اُٹھی۔ ستاروں کی یہ
چمک مجھ کو نذر ہو گئی اور نور کا یہ اُجالا دل کے جھروکوں سے سمٹ کر دماغ کی اُن
وادیوں میں جا پہنچا جہاں روشنی کی ایک کرن سے ہزاروں آفتاب جنم لیتے ہیں۔
تم نے اُنھیں دنوں مجھ سے پوچھا تھا: "انسان کو جب محبت کی دولت مل جاتی ہے تو وہ پاگل کیوں ہو جاتا ہے؟"

میں جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اِس لئے کہ میں یہ جان نہ سکا تھا یہ بات تم نے اپنے لئے کہی تھی یا میرے لئے۔ میرا اُن دنوں کچھ ایسا ہی حال تھا۔ جیسے کوئی پاگلوں کی طرح تمہاری محبت سے مخمور آنکھوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ تمہارے چہرے پر، تمہارے رخساروں اور تمہارے ہونٹوں پر میں جھکتا تو میری نظر اور میرے دل میں جنگ ہونے لگتی۔ آنکھیں چاہتی تھیں کہ تمہیں دیکھتے رہنے کی خواہش میں پتھرا جانا چاہتی تھیں اور دل چاہتا تھا کہ تمہارے وجود کو اپنے وجود میں سمیٹنے کے لئے اپنی دھڑکنوں کو بھول جاتا تھا۔

میں آج سوچتا ہوں ریتو! اگر تم واقعی مجھ سے زیادہ مجھ سے محبت کرتی تھیں، اِسی لئے تو محبت کی اِن خوشیوں نے تمہارے دل سے دھڑکنیں چھین لیں۔ انسان کس طرح ڈھیروں پیار برداشت کر سکتا ہے؟

مجھے یاد ہے وہ چاندنی رات جب ہم ڈل کے اندر شکارے میں پاس پاس بیٹھے تھے۔ شکارا آہستہ آہستہ پانی کی سطح پر بہتا چلا جا رہا تھا۔ تم نے مجھ سے پوچھا۔

"تم جانتے ہو، اندھیرے کے قید خانوں سے نکل کر یہ ستارے کس منزل کو ڈھونڈ رہے ہیں؟"

میں نے تمہاری طرف دیکھا۔

تم نے پھر کہا: "جب کوئی انسان پیار کرتا ہے تو اُس کے دیکھنے کا انداز بدل جاتا ہے، اُس کی نگاہ بدل جاتی ہے —— آج مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ ستارے کسی کی تقدیر کو روشن کرنے کے لئے نور کی شمعیں لئے اندھیرے کے قید خانے سے نکل آئے ہیں —— اور یہ چاند —— دیکھو کس طرح اِس رات میں اس نے چاندنی کا سحر سمو دیا ہے۔"

تم خاموش ہو گئیں اور میں چپ چاپ تمہاری سیاہ اور گھنی زلفوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اپنا سر تکیے سے اُٹھا کر تم نے میرے سینے پر رکھ دیا۔ پھر بولیں۔

"میں سوچتی ہوں انسان کے سینے میں محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میں کتنی غمگین اور اُداس رہتی تھی لیکن اب تو خوشیوں کو پرکھنے کے لئے مجھے اپنا دل چھوٹا محسوس ہو رہا ہے۔

پیوست کر دئے۔

تم بولتی رہیں: "تم نے مجھے ڈھیروں پیار دیا ہے لیکن میں یہ پیار کہاں رکھوں؟ تم نہیں جانتے میں اس پیار کو برداشت نہیں کر پاؤں گی۔"

اِن دنوں تم نے کیا کہا تھا —— آج میں سوچتا ہوں، محبت دنیا کا سب سے بڑا علم ہے۔ جب اُس کا نور جان کے اندر سمٹتا ہے تو وقت کے کارواں کی ہر چاپ، تقدیر کے ستاروں کی ہر منزل اور زندگی کی بہتی ہوئی ندی کی ہر گزرگاہ کا ہمیں خود بخود علم ہو جاتا ہے۔ میں اُن دنوں تمہاری باتوں کا مطلب نہ سمجھ سکا تھا لیکن آج تمہاری ہر بات کی گونج میرے ذہن میں تمہاری آواز کے دیئے جلا جاتی ہے۔

تم ڈھیروں پیار برداشت نہ کر سکیں اور یہاں سہاروں کے سبھی چراغ گل ہو گئے۔ اُمنگ کے سارے پھول مرجھا گئے۔ آج بھی چاندنی راتیں آتی ہیں لیکن جب دل کا چاند اتنا اُداس، اتنا مدھم ہو تو انسان کی نگاہ بھی یاس کی شبنم میں بھیگ جاتی ہے۔ اُس کے دیکھنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ جن آنکھوں میں تمہاری یاد کے آنسو ہوں، وہ آنکھیں راتوں میں چاندنی کا کھلا ہوا جادو کیسے دیکھ سکتی ہیں۔ ستارے کسی کی تقدیر کو روشن کرنے کے لئے کہاں جائیں گے جب خود صدیوں سے یہ اپنی منزل کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

تم ہی بتاؤ اِس گھپ اندھیرے میں، ارمانوں کی اِس تاریک قتل گاہ میں میں کتنی دیر جی سکوں گا۔

مجھے تمہارے آخری الفاظ یاد آ جاتے ہیں جب خون کی قے کر کے تم اسپتال کے بیڈ پر پڑی تھیں۔ میں تمہارے قریب پلنگ پر بیٹھا تھا۔ تم نے کہا تھا ——

"دیکھو، باہر کتنی اچھی دھوپ چمک رہی ہے۔"

میری آنکھ سے آنسو ڈھلک کر تمہاری پیشانی پر گر گیا۔

"نہیں۔ تم رونا نہیں۔" تم نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "میں اِس دنیا سے بہت خوش جا رہی ہوں۔ تم نے تو مجھے ڈھیروں پیار دیا ہے۔ یہ میرا دل ہی تھا جو برداشت نہ کر سکا۔"

"لیکن ریتو! تم —— تم مجھے تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔" آنسوؤں کے طوفان نے میری آواز کے بادبانوں میں سوراخ کر دئے۔

موت کے سامنے بھی تم مسکرا دیں۔

"اب تم تنہا نہیں ہو سکتے —— میری یاد ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی۔"

[illegible] ہے

[illegible] ہے

[illegible]

[illegible] ہے

[illegible]

[illegible] ہے

[illegible]

[illegible] ہے

[illegible]

[illegible] ہے

[illegible] ہے

[illegible] ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہے

[illegible]

[illegible] ہے

[illegible]

[illegible] ہے

[illegible]

[illegible] ہے

[illegible]

[illegible] ہے

[illegible]

[illegible] ہے

[illegible]

[illegible] ہے

[illegible]

پاپا بھی تمہارا فیصلہ منظور ہے؟

ریحہ کی زبان سے یہ جملہ سن کر دادو کا دل چاہا وہ بڑھ کر ریحہ کو اپنے سینے سے لگا لیں لیکن جب ریحہ کی سسکیاں اس کے کانوں سے ٹکرائیں تو اس کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے اور چہرے پر مسرت کی ابھرتی ہوئی [illegible] پڑ گئی۔

[illegible]

[illegible]

یہ کیا کہہ رہے ہو [illegible]

بھروسہ تو بہت ہے [illegible] لیکن [illegible]

[illegible]

ہم کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ دادو [illegible] خاموش [illegible] آیا اور ریحہ کا ذہن [illegible] کی طرف متوجہ ہو گیا۔

[illegible] آج تو تم بہت ہی خاموش دکھائی [illegible]

پھول اور کانٹے

پھولوں کو ناز حسن اگر ہے ہوا کرے
کانٹے بھی ہیں عروج گلستاں لئے ہوئے ——— [illegible]

پھولوں کی آرزو میں بڑے زخم کھائے ہیں
لیکن چمن کے خار ابھی تک پرائے ہیں ——— ناسلوم

کانٹوں سے ہم نے پیار کیا ہے کبھی کبھی
پھولوں کو شرمسار کیا ہے کبھی کبھی ——— زینت کوثر

وہی محرم نظر راز گلستاں کھول سکتی ہے
جو گل کو خار کے کانٹے میں رکھ کر تول سکتی ہے ——— کمال سنگھ بیدر

میرا حسن نظر معاذ اللہ
خار کو پھول کر دیا میں نے ——— ناسلوم

کیا ہے؟" جوالا نے چائے کا گھونٹ زمین پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔ بس یونہی سوچ رہا تھا۔"

"وہی تو پوچھ رہا ہوں کیا سوچ رہے تھے؟"

"میرے لئے ایک ہی تو سوچ باقی رہ گئی ہے۔ اور وہ ہے ریتو۔ اس چھوٹے سے آنگن میں کتنے لاڈ پیار سے پل کر یہ بڑی ہوئی ہے۔ بچپن میں یہ بہت شریر تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر اُلجھ جاتی تھی تو گھر بھر کو ہلا کر رکھ دیتی تھی۔ پر آج تک میرا ہاتھ اس پر نہ اُٹھ سکا۔ اگر کبھی اسے ڈانٹ بھی دیتا تھا تو گھنٹوں سینے سے لگا کر اس سے معافی مانگتا تھا۔ گاؤں کی گلیوں میں گھروندے بنا بنا کر اس کا بچپن بیتا تو اس کی ماں چل بسی اور گھر کی ساری ذمہ داری اس پر آپڑی۔ جب میری آنکھوں کی جوت چلی گئی تو میرے لئے صرف ایک ہی جوت باقی رہ گئی جس کے سہارے میں آج تک جی رہا ہوں ——— اس کی ماں کہا کرتی تھی کہ وہ ریتو کی شادی اتنی دھوم دھام سے کرے گی کہ گاؤں میں اس کا جواب نہ ہوگا۔ اتنا جہیز دے گی کہ گاؤں کی اور کوئی لڑکی اپنی سسرال میں اب تک اتنا نہ لے گئی ہو۔ اور نہ جانے کیا کیا کہا کرتی تھی۔ لیکن وہ تو یہ حسرت لئے ہوئے چتا پر جل کر راکھ ہو گئی۔ اور یہ بوجھ مجھ جیسے مجبور انسان پر ڈال گئی۔ کون جانے میں اس کی یہ حسرت پوری بھی کر سکوں گا یا نہیں ——— اور سب سے بڑا سوال تو یہ ہے کہ میں کس دل سے اسے اپنے سے جدا کر دوں گا۔"

[illegible] کی آرزو میں [illegible] گئے۔ [illegible] ان کی [illegible] کے پھول [illegible] کے [illegible] ———

[illegible] کا [illegible] کے رشتے [illegible] آنچل [illegible] کی [illegible] سے پلکیں جھک گئیں۔ نرم رخساروں پر حیا کی سرخی ابھر آئی اور آنکھوں کے [illegible] گلابی ہو گئے۔

زندگی میں پہلی بار آج اُسے اپنے جسم سے ایک عجیب سی خوشبو آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُسے اپنے انگ انگ میں ایک انجانی گدگدی کا احساس ہوا جیسے کسی پھول کی رگوں میں رنگینی کی دھوپ رچتا ابھر آئی ہو۔ وہ مست ہو گئی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کا دم ہونٹوں پر آگیا اور سنولائی ہوئی شام کے آنچل تلے جب آرزوؤں خوابوں کے گھونگھٹ اُٹھائے تو اُس کے ذہن کی سطح پر تمنّاؤں کی شاداب کلیاں کھل اُٹھیں۔ جذبات کے لرزتے سینے پر تصوّرات کے سفینے چلنے لگے۔ پت جھڑ کے آنگن میں سوئی ہوئی بہاروں نے انگڑائیاں لیں۔ زندگی کے بند دریچوں سے گیت بہتے آبشاروں کی ڈھلانوں میں ترانے بہنے لگے تو تبسّم کی ایک ہلکی سی لکیر اُس کے ہونٹوں پر ابھر آئی اور اُسے احساس ہوا جیسے کسی نے اُس کی نگاہوں میں روشنی کر دی ہوں۔ جب شہنائیوں کی مدھر تانیں اُس کے آنچل میں بل کھانے لگیں، ڈھولکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور بابل کی دلسوز آوازیں اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں تو اُسے تصوّرات کے جھونکوں کی چلتی کرنوں پر اپنا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہوا جیسے وہ کنول پر مست ہوا شبنم کا ایک قطرہ ہو جسے سورج کی نرم کرنوں نے گدگدا کر منتشر کر دیا ہو۔ اور پھر وہ جذبات کے اُس سنگم پر پہنچ گئی جہاں ملن کی مدھم آنچ تھی۔ آشاؤں کے جھلملاتے دیپ تھے۔ اُس کا دل چاہا وہ اِن چراغوں کو اپنے آنچل میں چھپا لے لیکن اُس کا تو آنچل چھوٹا تھا اور تمنّائیں بہت تھیں۔ پھر اُس نے سوچا اُس کی زندگی اِسی مرکز پر ختم ہو جاتی۔ اِسی طرح وہ سپنوں کے آنگن میں گھونگھٹ ڈالے اپنے آنچل کے تاروں میں تصوّرات کے بیل بوٹے سجاتی رہے لیکن جب اُس کی نظر اپنے باپو کے چہرے پر پڑی جہاں فکر اور حالات نے اَن مٹ نقوش تجربوں کے روپ میں چھوڑے تھے تو اُس نے اپنا گھونگھٹ سمیٹ لیا۔ اُس کی آشاؤں کے دیپ ایک ایک کر کے بجھ گئے اور وہ اُن سے اُبھرتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ آکاش سے دھرتی پر آگئی۔ جہاں صرف بھوک تھی، تنگدستی تھی۔ لاغر بھوک کے سسکتے ہوئے شعلے تھے جو دھرتی کو یاس و حسرت سے دیکھ رہے تھے اور دھرتی کے ہونٹ خشک تھے۔

جوالا ریتو کو اپنی منزل سمجھ کر اپنا ہر غم بھول گیا۔ چند دنوں کی کسک اس نے
[illegible] دل میں دفن کر دی۔ وقت کے ساتھ ساتھ دونوں کے بیچ کے فاصلے سمٹنے
[illegible] قربتیں بڑھتی گئیں۔

ایک نکھری سہانی رات میں جوالا نے ریتو سے ریتو کو مانگا۔ زندگی بھر ساتھ
چلنے کا وعدہ چاہا ــــــ جواب میں ریتو نے آسمان پر تیرتے ہوئے چاند کی طرف
اشارہ کیا۔ جس کے سامنے سے سفید بادلوں کے ذرا ذرا سے ٹکڑے گزر رہے تھے لیکن
چاند کسی کے سامنے نہیں ٹھہرتا تھا۔

وہ ریتو کی ایک ادا سمجھ کر خاموش ہو گیا پھر کچھ دنوں بعد ــــــ
جنگل کی پگڈنڈیوں نے ریتو اور جوالا کے ملن کے شباب کو پہچانا۔
کھیتوں کی اونچی منڈیروں نے چناروں کے سائے تلے دو دلوں کو پیار
[illegible] شعلوں پر چلتے دیکھا۔
سبز وادیوں نے سرمئی شاموں کے ریشمی اندھیروں میں دو بدن سلگتے
ہوئے دیکھے۔
سنہری راتوں میں چاند کی تھکی ہوئی کرنوں نے دو دلوں کی سرگوشیاں
سنیں۔
کہکشاں نے رات کی نگاہوں میں کھلتے ہوئے دو کنول دیکھے۔
اور اسی طرح کئی مہینے بیت گئے۔

ہر سال کی طرح اس سال بھی بیساکھی کے میلے کی دھوم تھی۔ پوری بستی میلے
کی طرف اُمنڈ رہی تھی۔ جوالا آج پہلی بار میلے جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ریتو بھی اس
کے ساتھ چلے۔ اور اسی خیال سے وہ ریتو کے پاس گیا۔ جو اس وقت چارہ کاٹنے میں
مصروف ہوئی تھی۔

"ریتو! کیا تو میلے نہیں جائے گی؟" جوالا نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔
"دیکھ رہا ہے۔ میں کیا کر رہی ہوں۔"
"ہاں ہاں۔ وہ تو دیکھ رہا ہوں ــــــ لا مجھے دے دے میں منٹوں میں
کاٹ دوں گا اور تو ہو جا تیار!"
"لیکن پھر بھی میں نہ جا سکوں گی۔"
"کیوں؟"
"بابو کاکا کے ساتھ میلے گئے ہیں۔ وہ دیر سے آئیں گے۔ گر دونوں
[illegible] میں بھی چلی جاؤں گی تو جانوروں کو کون دیکھے گا۔ وہ کھل کر کہاں نکل جائیں گے؟"
"اچھا جیسی تیری مرضی۔ لیکن ہاں یہ تو بتا میں تیرے لئے کیا لاؤں؟"

بہار اور خزاں

یہ دل کی تازگی ہے وہ دل کی فسردگی
اس گلشنِ جہاں کی خزاں کیا بہار کیا ــــــ نکہت

اب کیا کریں جو دل نہ لگائیں خزاں سے ہم
رنگینیاں بہار کی لائیں کہاں سے ہم ــــــ نامعلوم

خزاں کے ساتھ بہت دور مجھ کو جانا ہے
نہ انتظار کرے محفلِ بہار مرا ــــــ روشن صدیقی

ایسے خزاں نصیب کا کیا ہو سکے علاج
دل جس کا بیٹھ جائے نویدِ بہار سے ــــــ بشیر احمد

ہر خزاں کے غبار میں ہم نے
کاروانِ بہار دیکھا ہے ــــــ افسر میرٹھی

"میں کیا بتاؤں۔ جو تیرے من میں آئے۔"
"دیکھ ریتو! تجھے میری قسم ہے تو اپنی پسند مجھے بتا دے۔"
"اچھا تو یہ بات ہے ــــــ میرے لئے ایک اوڑھنی اور ڈھیر ساری
لال چوڑیاں لیتے آنا۔"
"اچھا۔ اب میں تیاری کرتا ہوں ــــــ دیکھ آج میں کیا کیا
لاتا ہوں!"
جوالا جب اپنے کمرے میں جانے لگا تو ریتو کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ جوالا
کے قدم پھر لوٹ آئے۔
"کیا کچھ اور رہ گیا ہے؟"
"نہیں ــــــ آج میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"
"ایک نہیں۔ دو۔ لیکن جلدی!"
"تو آج بہت خوش ہے نا؟"
"ہاں ہاں۔ بول تو!"
"تو مجھے بہت چاہتا ہے نا؟"
"ریتو! چاہنے کی بات چھوڑ۔ میں تجھے گزشتہ کی طرح پوتر مان کر تیری
آتما کی پوجا کرتا ہوں۔ بس تو اتنا سمجھ لے کہ اگر تو نے میری جان بھی مانگی تو بھی افسوس

بیچ گا کر تُو نے ماگی بھی تو کیا چیز مانگی ؟"

"بابو مجھ سے کئی بار پُوچھ چکے ہیں لیکن میں آج تک کسی کو کوئی جواب نہ دے سکی۔ تُو ہر بار ٹال جاتا ہے لیکن آج میں تجھے اپنے سر کی قسم دلاتی ہوں۔"

"اچھا یہ بتا کہ میں کیا ہوں، کہاں سے آیا ہوں اور کیوں ؟"

"ریتو ابھی جا تو نہیں چاہتا کہ میں تجھے یہ سب کچھ بتاؤں۔ لیکن آج تیری قسم نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ لیکن ایک وعدہ کر کہ تُو کسی کو بتائے گی نہیں۔"

"اپنا قسم کھا کر کہتی ہوں میں کسی سے نہ کہوں گی۔"

"سو میری جرنی آنکھیں تجھے کس طرح سب کچھ بتاؤں۔ ایک لمبی کہانی چند لفظوں میں سُناتا ہوں۔ تمہیں اِتنا جان لے کہ میں حالات کا ستایا ہوا ایک انسان ہوں۔ میرا گاؤں یہاں سے سیکڑوں میل دُور ہے۔ وہاں میرے ماں باپ، بھائی بہن رہتے ہیں، کھیتی ہے۔ ایک خوبصورت سا مکان ہے۔ اُسی گاؤں میں مجھے تاراں نام کی ایک لڑکی سے پیار ہو گیا۔ تاراں بھی مجھے بہت چاہتی تھی لیکن ایک شمشان جیسی رات میں میں نے ایک خون کر دیا۔"

"تُو نے [illegible] کیا ؟" ریتو نے خوف و ہراس کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

"ہاں ریتو، لیکن تاراں کا نہیں۔ اُس کا جس سے تاراں نے کہا تھا کہ وہ زندگی میں نہیں موت میں بھی اُس کا ساتھ دے گی۔"

"اور پھر تاراں کا کیا ہوا ؟"

"یہی تو افسوس ہے کہ وہ اُس رات بچ گئی ——— پھر کئی دنوں تک میں گاؤں کے آس پاس چھپا رہا کہ تاراں کو بھی اُس کے پاس پہنچا دوں لیکن جب پولیس مجھے تلاش کرنے لگی تو مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ پھر مہینوں ویران جنگلوں کی خاک چھاننے کے بعد ایک رات تیرے گاؤں کی روشنی دیکھی اور پھر تیرے یہاں پناہ لی ——— ابھی پھر ایک بار مجھے اپنے گاؤں واپس جانا ہے تاراں کی موت بن کر تاکہ اُس کا قول پُورا ہو سکے۔"

"تو کیا تُو چاہتا تھا کہ تاراں پر اور کسی کا ادھیکار ہی نہ رہے تیرے دیس کی ریت ہی نرالی ہے۔"

"میرے پیار پر کسی کا ادھیکار نہیں ہو سکتا !"

"کچھ بھی ہو۔ اب میں تجھے اُس گاؤں میں واپس نہ جانے دوں گی۔ تجھے میں دوسرا خون نہ کرنے دوں گی۔"

"میرے قول سے تیرا پیار بھی ٹکر نہیں لے سکتا۔ ہمارے گاؤں میں بیر بولنا ہے اور ہم لوگ اُس پر اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔ اور پھر میں اُس تاراں کو زندہ چھوڑوں گا، جس نے میرے ماں باپ، بھائی بہن سب مجھ سے جدا کروا دیے ؟ جس دھرتی پر پل کر جوان ہوا اُسے دیکھنے کو ترس گیا۔ ریتو ! میں کیا بتاؤں پیا گاؤں کتنا سُندر ہے۔ اُس کی ایک ایک گلی میں میری بچپن کی یادیں دفن ہیں۔ کیا دن تھے جب کھیتوں کی منڈیروں پر کھڑی فصلوں کے بیچ چھپا رہا کرتا تھا تو ایک نشہ سا چھا جاتا تھا۔ جب کھیتوں کی بالیاں پک جاتی تھیں تو میرا دل رقص کرنے لگتا تھا۔ جوانی کے نشے میں چور ہو کر گوریاں آنچل لہراتی ہوئی گاتی تھیں تو دھڑکتے ہوئے دِل دُور دُور تک کھل جاتے تھے۔ گھونگٹ میں اُن کی بالیاں آنکھیں بچھی رہتی تھیں کبھی کبھی مجھے اُن کا دیکھنا بہت بھلا لگتا تھا۔ اور جب میں اُن کے قریب سے اٹھلاتا ہوا نکل جاتا تو وہ اپنے ہونٹ چبا کر رہ جاتی تھیں۔ گھاٹ سے آتی ہوئی بہوئیں مجھے گھونگھٹ کی اوٹ سے دیکھتیں۔ اور جب میں اُن کے سامنے سے ہوا کے جھونکے کی طرح گزر جاتا تو وہ اپنا گھونگھٹ سنبھالتی ہی رہ جاتیں ——— اور آج میں اُن سب سے دُور دربدر کی خاک چھانتا پھرتا ہوں۔ پیٹ بھرنے کے لئے بھیک مانگتا ہوں۔ مزدوری کرتا ہوں۔ ریتو ! تُو میرے دل سے پُوچھ جس وقت مجھے اپنا گھر یاد آتا ہے، میری کیا حالت ہوتی ہے۔ میری ماں آج بھی گھر کے دروازے کھولے ہوئے بیٹھی ہوگی اور ہر آہٹ پر چونک جاتی ہوگی کہ شاید میں آ گیا ہوں ! میرے باپ کی بوڑھی آنکھیں میرے انتظار میں جاگ جاگ کے تھک گئی ہوں گی۔" یہ کہتے کہتے جوالا کی پلکیں بھیگ گئیں اور ریتو کے گالوں پر بھی دو موتی جھلملانے لگے۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ ماحول پر سکوت چھا گیا۔ چند لمحوں بعد جوالا کو خیال آیا کہ وہ تنہا جیسے جا رہا ہے۔ جنگل راستہ ہے۔ کرپان لے لے ہتھیار پاس رہتا ہے تو دل کو بھی ڈھارس رہتی ہے۔ اور اسی خیال سے وہ اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

چاند نکل آیا تھا۔ چاندنی کے جھونکوں پر بکھری اُداسی تھی۔

دُور سے گاؤں کی روشنیاں چاند کی روشنی میں کبھی کبھی معلوم ہو رہی تھیں۔ مسکی سے بوجھل نغمانے جوالا کے ذہن میں تصورات کے رنگین دُھندلکے اُبھار گئے۔ اُس نے زرد چاندنی میں کانچ کی لال چوڑیوں کو دیکھا۔ اُس کے دل میں خیال آیا کہ کانچ کی یہ چوڑیاں ریتو کی نرم گوری کلائیوں میں کتنی بھلی معلوم ہوں گی جب یک ساتھ یہ ٹکرائیں گی تو سنگیت کا ایک آبشار اُس کی کلائیوں سے اُبھرے گا اور ریتو ایک گیت بن جائے گی۔ پھر پورے ہونے پر سنگیت ختم ہو جائے گا تو یہ لال اوڑھنی ریتو اپنے سر پر ڈالے گی اور جب وہ بن کھلے شرمائے گی تو ایسا معلوم ہوگا جیسے چاند اُفق سے پھسل کر چنار کے پتوں پر اٹک گیا ہو۔ اور پھر جب وہ آہستہ سے ریتو کو چھیڑے گا تو وہ گھونگھٹ میں اپنا مکھڑا چھپا لے گی۔ جب یہ لال اُس کے گلابی گالوں پر اُبھرے گی

تب وہ دیئے کی لَو جھٹکے سے مدھم کردے گی۔ ریتو گھبرا کر اپنا گھونگھٹ اُلٹ دے گی۔ اُس وقت اُس کے چہرے کا کچھ اور ہی رنگ ہوگا۔ وہ وہاں سے بھاگ جائے گی لیکن چوڑیوں کا سنگیت اُس کے قدموں کا پتہ دے گا۔

وہ یہیں تک سوچ پایا تھا کہ یکایک بستی کے کتّوں کی بے ہنگم آوازوں نے اُس کے تصوّرات کے ریشمی تانے بانے توڑ دئے۔ اُس کے قدم تیز ہوگئے

گاؤں کی گلیوں میں خاموشی تھی۔ کوئی شور نہ تھا، کوئی ہنگامہ نہ تھا۔ اکثر سویرا دن نکلتے ہی یہ ویران راہیں آباد ہوجاتی ہیں اور سورج ڈوبنے تک یہ جیتی رہتی ہیں۔ دن بھر اِن گلیوں میں بچپن دُھول پھانکتا ہے۔ بڑھاپا رینگتا ہے۔ یہاں گاؤں کے چھوکرے ہر روز مٹّی کے گھروندے بناتے ہیں۔ جانوروں کی بولیاں بولتے ہیں لیکن رات ہوتے ہی یہ سب مرجاتے ہیں۔ صرف کُتّوں کی آوازیں ہی زندہ رہتی ہیں۔

سامنے گھر کا دروازہ تھا۔

سانسوں کا شور مدھم ہوا تو اُس نے آہستہ سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔

دروازے میں کوئی جنبش نہ ہوئی تو اُس نے ریتو کو آواز دینے کا ارادہ کیا۔

لیکن جب اُسے اندر سے سرگوشیوں کی آہٹ ملی، اُس کی آواز ہی حلق سے نہ نکل سکی۔

اُسے اپنے دل کی دھڑکنیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئیں، لیکن پھر بھی کانوں پر یقین نہ آیا۔

وہ دروازے سے لگ گیا۔

"تو جوالا سے زیادہ سُندر تو نہیں لیکن نہ جانے کیوں تُو مجھے اچھا لگتا ہے"

ایک جانی پہچانی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ریتو۔۔۔!!" وہ پوری طاقت سے چیخا۔ اُسے اپنا خون کھولتا ہوا محسوس ہوا اور سارے جسم پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُبھر آئیں۔

دروازہ کھلتے ہی ایک جھٹکے کے ساتھ وہ اندر داخل ہوا۔ باہر سے کسی کے کودنے کی آواز آئی۔

اُس کا پاگل پن اور بڑھ گیا۔

وہ ریتو کو گھسیٹتا ہوا کوٹھری میں لایا۔ وہ ایک گٹھری کی طرح گھسٹتی چلی آئی۔

جیسے ریتو میں جان ہی نہ ہو۔

دیئے کی لَو اونچی کرکے اُس نے دیکھا۔

ریتو کی کلائیوں میں لال چوڑیاں چمک رہی تھیں اور سر پر لال اوڑھنی!

وہ ایک دلہن کی طرح سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔

اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ کانچ کی چوڑیاں اُس کے ہاتھوں سے چھٹ کر فرش پر گر پڑیں اور چکنا چور ہوگئیں۔

"بول ریتو۔ وہ کون تھا؟" اُس کے حلق میں کانٹے سے چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔

ریتو نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنا سر نیچا کرلیا۔

"یہ سمجھ لے ریتو! میں اُسے اِس دھرتی پر زندہ نہیں چھوڑوں گا! اِس بستی کو جلاکر راکھ کردوں گا۔"

ریتو نے اپنا سر اونچا کیا۔ یاس و حسرت کی ایک نظر جوالا کے تمتمائے ہوئے چہرے پر ڈالی۔ اور پھر اپنا سر نیچا کرتے ہوئے کہا۔

"جوالا! سارا قصور میرا ہے۔"

اور پھر کرپان فضا میں لہرائی۔

ریتو کا جسم تھوڑی دیر کے لئے تڑپا۔

اور پھر آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہوگیا۔

ریتو سوتے جاگتے جو سپنے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی کبھی نہ جاگنے کے لئے سوگئے!!


ہوادار چال سے چلیے
کھلے میدان کی آزادی کا مزہ لیجئے ۔ چلیے
چلتے پھرتے ۔ دھوپ آپ کی قدم بوسی کرتی
چلے گی خرید لیجئے باٹا کا ایک جوڑا سینڈل ۔ پہلی بار
آزماتے ہی آپ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا
آرام محسوس کرینگے ۔ انکے طرح طرح کے نمونوں سے آپ خوش
ہوجائینگے اور اپنے لیئے بالکل ٹھیک جوڑا چن سکینگے
Bata

اُردو کے بلند پایہ شاعر، افسانہ نگار اور ناقد

اختر انصاری سے انٹرویو

———— نریش کمار شاد

۱۵ الیف۔ موتی باغ ۲۔ نئی دہلی

یکم جون ۱۹۶۵ء

شاد نواز خورشتر صاحب! قبلہ

آئندہ شمارے کے لئے اُردو کے نہایت شُستہ خو اور شُستہ نظر ادیب حضرت اختر انصاری سے انٹرویو بھیج رہا ہوں۔ اختر صاحب جتنے بڑے اور سُلجھے ہوئے ادیب ہیں، اُن کی فطری متانت اور گوشہ گیری کی وجہ سے انھیں اُتنی شہرت نصیب نہ ہو سکی لیکن جن ادب دوست حضرات کی نظر سے اُن کی نگارشاتِ نظم و نثر گزر چکی ہیں وہ اُن کی غیر معمولی ادبی حیثیت سے انحراف نہیں کر سکتے ———— خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔ اپنی حالت کیا بتاؤں ؎

گزر رہا ہوں میں اُن آتشیں مراحل سے   جہاں حسین خیالوں کے پنکھ جلتے ہیں

آپ کا اپنا ———— نریش کمار شاد

شاد۔ اختر صاحب! انٹرویو کا آغاز نہایت رسمی سوال سے کرنا چاہوں گا کہ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ اور تعلیم کہاں کہاں سے اور کہاں تک حاصل کی؟

اختر۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء کو بدایوں میں پیدا ہوا۔ لیکن میری پیدائش سے پہلے ہی میرے والد دہلی میں بس چکے تھے۔ میری ساری تعلیم دہلی میں ہوئی۔ میں دہلوی زبان اور محاوروں کے نام لیواؤں میں ہوں اور دہلی ہی کو اپنا وطن سمجھتا ہوں۔ تعلیم کی تفصیلات کچھ اس طرح ہیں۔ ہائی اسکول ۱۹۲۴ء میں اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی سے، انٹرمیڈیٹ ۱۹۲۸ء میں ہندو کالج دہلی سے، بی۔ اے (آنرس) ۱۹۳۰ء میں سینٹ اسٹیفن کالج دہلی سے، بی۔ ٹی ۱۹۳۴ء میں مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اور ایم۔ اے ۱۹۴۷ء میں مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے۔

شاد۔ اور آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب اور کیوں کر ہوا؟

اختر۔ میں نے ۱۹۲۸ء کے لگ بھگ لکھنا شروع کیا۔ ابتدا اگرچہ چھوٹی شاعری سے ہوئی۔ کچھ دنوں تک جذباتی انداز کی نظمیں لکھنے کے بعد غزل گوئی کی جانب میلان پیدا ہوا اور غزل کے میدان میں ابھی ناپختگی کی حدود کو پار نہیں کیا تھا کہ قطعات نگاری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ۱۹۴۳ء کے لگ بھگ افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔

شاد۔ آپ کی ادبی زندگی میں آپ کی سب سے زیادہ رہنمائی کس نے کی؟

اختر۔ میں اپنی زندگی میں اپنے ذاتی ذوق، وجدان اور شوقِ طبیعت سے زیادہ کسی دوسرے کی رہنمائی کا رہینِ منت نہیں ہوا۔ کسی رہبرِ کامل کی توجہ میری قسمت میں نہیں تھی۔ میری زندگی میں جہاں اور بہت سی محرومیاں ہیں وہاں ایک محرومی یہ بھی ہے۔

شاد۔ آپ شعر اور افسانہ کیوں اور کیونکر لکھتے ہیں اور لکھنے کے لئے آپ کو کیسا ماحول چاہئے؟

اختر۔ ہر لکھنے والا کسی اندرونی تحریک یا کسی جذباتی دباؤ کے تحت لکھتا ہے اور اپنے تفکر و تصور میں دوسروں کو شریک کرنے کی خواہش کے زیرِ اثر اپنے جذباتی و خیالیاتی تجربات کو لفظی پیکروں میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ میں کیونکر لکھتا ہوں تو یہی کہوں گا کہ لکھنے کی طرح لکھتا ہوں۔ ماحول کے بارے میں یہ عرض کروں گا کہ مجھے لکھنے کے لئے کچھ خاص خارجی

ماحول کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف داخلی سطح پر سکون و طمانیت کی شرط لازمی ہے۔ یہ طمانیت اگر مسرت کی حد تک ہو تو کیا کہنا۔

شاد۔ آپ ادب میں مقصدیت اور افادیت کے کس حد تک قائل ہیں اور ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا یہ تحریک اب ختم ہو چکی ہے اور کیا اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی؟

اختر۔ میرے عقیدے میں مقصدیت اور افادیت کے بغیر ادب ایک جسم بے روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کے صالح تصورات پروان چڑھانے میں نہایت اہم خدمات انجام دیں۔ تنظیمی سطح پر ہو سکتا ہے یہ تحریک ختم ہو چکی ہو لیکن ادبی نظریات کی دنیا میں اس کے اثرات مصروفِ عمل ہیں اور رہیں گے۔ تنظیم اور تحریک کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ لیکن موجودہ نسل کی زندگی میں شاید ترقی پسند تحریک سابقہ زور و قوت کے ساتھ بروئے کار نہ آئے۔ ملکی یا عالمی حالات کے کسی بحرانی دور میں اس کے احیاء کی توقع کی جا سکتی ہے۔

شاد۔ آپ اس صدی کا سب سے بڑا اردو شاعر اور افسانہ نگار کسے اور کیوں سمجھتے ہیں؟

اختر۔ جوش ملیح آبادی اور کرشن چندر کو، عام اور مروجہ رایوں کی روشنی میں اس سوال کا جواب ہونا چاہیے تھا اقبال اور پریم چند۔ لیکن عام اور مروجہ رائیں بعض اوقات غلط بھی ہو سکتی ہیں اور ہوتی بھی ہیں۔ مثلاً وہ رائیں جو کسی اتفاق یا مصلحت کی بنا پر پیدا ہونے کے بعد عام لوگوں کی ذہنی کاہلی کے سہارے پروان چڑھتی ہیں اور مسلمات کا درجہ حاصل کرتی ہیں۔ میں ایسی رایوں اور فیصلوں کی پابندی ضروری نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں اس صدی کی حدود کے اندر جوش سے زیادہ شاعرانہ استعداد اور انسانیت کے عظیم مقاصد کے ساتھ ہم آہنگی کا ثبوت کسی دوسرے شاعر نے نہیں دیا اور افسانہ نگاری میں کرشن کے یہاں فن اور سماجی مقصدیت کا امتزاج جس اعلیٰ سطح اور وسیع پیمانے پر ملتا ہے کہیں اور نہیں ملتا۔ ان دونوں کا ادبی کام، ایک کی شاعری اور دوسرے کی افسانہ نگاری، کیفیت اور کمیت دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے بے مثل ہے۔

شاد۔ اپنے ہم عصر ادیبوں میں کون کون سے لوگ آپ کو پسند ہیں؟

اختر۔ اپنے ہم عصر لکھنے والوں میں بالعموم مجھے وہ لوگ پسند نہیں ہیں جن کے نام اور کام کے ڈھول دن رات پیٹے جاتے ہیں۔ میری نظر میں ان کی شہرت محض اتفاقی ہے اور ادبی گھپلے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جنہیں قسمت کی دولت [illegible] ہم [illegible] آتی ہے۔ یہ شہرت اپنے دن پورے کر کے ختم ہو جائے گی۔ شاعروں میں میرے پسندیدہ شاعر جوش، [illegible] ہیں۔ اختر شیرانی اور کسی قدر پرانے شاعروں میں [illegible] کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ بعد کے شاعروں میں مجاز اور ساحر لدھیانوی کے کلام کو عزیز رکھتا ہوں۔ افسانہ نگاروں میں ایک [illegible] ان لکھنے والوں کی ہے جنھوں نے میرے خیال میں بہت اچھا کام کیا ہے۔ کرشن چندر اور بیدی کا نام لینا تحصیلِ حاصل ہے۔ جدید تر افسانہ نگاروں میں [illegible] کا جواب نہیں۔ اسلوبِ نثر کے نقطۂ نظر سے قاضی عبدالغفار میرے خیال میں اس صدی کے بہترین لکھنے والے ہوتے ہیں۔ چلتی ہوئی نثر اور نیاز فتح پوری کے اسلوبِ تحریر کا بھی بہت قائل ہوں۔

شاد۔ جدید ترین ادیبوں میں بھی آپ کی نظر میں کوئی قابلِ ذکر ادیب ہے؟

اختر۔ جدید ترین ادیبوں میں جہاں تک شاعروں کا تعلق ہے ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کے کلام میں مجھے دور دور تک شاعری کے آثار نظر نہیں آتے۔ پھر بھی بعض شعراء کو قابلِ توصیف سمجھتا ہوں۔ اگر یہ سوال آپ کی بجائے کسی اور نے کیا ہوتا تو اس ضمن میں آپ کا نام ضرور لیتا۔ اس دور میں جتنے قطعات نگار شاعر ہیں، ان میں آپ کے سوا کسی دوسرے شاعر کے قطعات پڑھ کر مجھے رشک محسوس نہیں ہوا۔ آپ کے قطعات کو پڑھتے ہوئے بارہا یہ جذبہ دل میں پیدا ہوا کہ کاش یہ قطعے میں نے لکھے ہوتے۔

شاد۔ ذرہ نوازی کے لئے شکریہ! اچھا اب یہ فرمائیے کہ ہندوستان میں اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا آپ دیوناگری رسم الخط کو اپنا لینا اردو کی بقا کے لئے ضروری سمجھتے ہیں؟

اختر۔ اگر دنیائے لسانیات کی اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ زبان ایک بار وجود میں آنے کے بعد کبھی نہیں مرتی اور کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہتی ہے۔ تو اردو کے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اردو جیسی زندہ و توانا زبان ایک ایسا چراغ ہے جسے پھونکوں سے نہیں بجھایا جا سکتا۔ اس وقت یہ زبان سیاست کے نرغے میں پھنس کر بے انصافیوں کا شکار ہو رہی ہے لیکن موجودہ دور میں ہر قسم کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی بے انصافیوں کے خلاف جو عالمگیر جدوجہد عالمی سطح پر ہو رہی ہے اس کی شدت اور توانائی کو دیکھتے ہوئے یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ ہر طرح کے تعصب اور استبداد کی قوتوں کو پسپا ہونا پڑے گا اور یہ [illegible] ہو کر

اس طوفان میں لسانی تعصب خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے یہ جذباتی رویہ حد سے زیادہ رجائی معلوم ہو لیکن اسے کیا کیا جائے کہ ہونا یہی ہے اور اگر یہ نہیں ہوتا ہے تو پھر کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں یہ دنیا رہنے کے قابل نہ ہوگی اور ہو سکتا ہے انسان کو خلا سے کسی دوسرے کرہ کا رخ کرنا پڑے۔ دیوناگری رسم الخط ہرگز اُردو کے درد کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ زبان اور رسم الخط کا تعلق جسم و لباس کا نہیں جسم و روح کا تعلق ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی کا سوال اٹھانے والے کسی جنت الحمقاء میں بستے ہیں اور یقیناً زبان و لسانیات کے سلسلے میں کوئی درک نہیں رکھتے۔ اُردو کا رسم الخط اپنی بعض خامیوں کے باوجود بہت سی خوبیاں بھی اپنے اندر رکھتا ہے اور کئی اعتبار سے اسے دیوناگری رسم الخط پر تفوق حاصل ہے۔ اسے ترک کر دینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

شاد۔ موجودہ مشاعروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے کیا وہ اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے سود مند ہیں؟

اختر۔ مشاعرے میرے خیال میں اُردو کی ترقی کے لئے نہ تو مضر ہیں اور نہ کوئی خاص افادیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ جہاں اور بہت سے تہذیبی مشغلے ہیں وہاں مشاعرے کو بھی ایک مہذب ادبی مشغلے کی حیثیت سے جاری رہنا چاہئے۔ البتہ اس کے اصلاح طلب پہلوؤں پر خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

شاد۔ غیر ملکی ادیبوں میں کون کون سے ادیب آپ کو پسند ہیں؟

اختر۔ پسندیدہ غیر ملکی ادیبوں کے نام کہاں تک بتاؤں۔ کم و بیش پینتیس سال سے ادب کا مطالعہ میرا دن رات کا مشغلہ ہے۔ اُردو ادب میں تو کوئی قابلِ مطالعہ چیز ایسی نہیں ہے، جو میں نے نہ پڑھی ہو۔ انگریزی ادب اور انگریزی زبان کے توسط سے مغربی زبانوں کا ادب بھی کثرت کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس طویل المیعاد مشغلے کے دوران میں بے شمار غیر ملکی مصنفین سے متاثر و مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ان میں سے چند کا ذکر بھی طوالت سے خالی نہ ہوگا۔ مختصراً یہ کہوں گا کہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، مجھے مغربی شعراء سے زیادہ فارسی کے اساتذہ نے متاثر کیا۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ ایرانیوں سے بہتر شاعری دنیا میں کسی نے نہیں کی۔ خیام، حافظ، نظیری، عرفی، بیدل اور غالب کی شاعری کو میں فیضان کا سب سے بڑا سرچشمہ سمجھتا ہوں اور یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس سرچشمے سے پوری طرح فیضیاب ہونے کے لئے ایک پوری زندگی کیا کئی زندگیوں کی مدت بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ میں مروں گا تو مرتے وقت مجھے سب سے بڑا دکھ اس بات کا ہوگا کہ میں فارسی غزل کے خزانوں سے حسبِ دل خواہ اور حوصلے کے مطابق متمتع نہ ہو سکا۔ افسانہ اور ناول کے باب میں مغربی مصنفوں کو بدیہی فوقیت حاصل ہے۔ اس خصوص میں میرے پسندیدہ لکھنے والوں کی فہرست بے حد طویل ہے۔ لیکن وکٹر ہیوگو سے زیادہ مجھے کسی نے متاثر نہیں کیا۔ میں اسے دنیا کا سب سے بڑا ناول نگار سمجھتا ہوں اور واضح رہے کہ ٹالسٹائی کے تمام کارناموں سے گزرنے کے بعد یہ بات کہہ رہا ہوں۔ مختصر افسانے میں چیخوف کا جواب نہیں۔ دوسرے پسندیدہ غیر ملکی ادیبوں میں گوئٹے، چارلس ڈکنز، دانتے، گورکی، لوسون، خلیل جبران، موپساں اور چارلس لیمب کے نام لینا چاہوں گا۔

شاد۔ کیا آپ عروض سے واقف ہیں اور کیا عروض کا جاننا شاعر کے لئے ضروری سمجھتے ہیں؟

اختر۔ عروض سے واقفیت شعر کہنے کے لئے ضروری نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے ایک شخص ماہر و باکمال عروض داں ہوتے ہوئے بھی موزونیٔ طبع سے محروم ہو اور شعر کہنے کی صلاحیت بالکل نہ رکھتا ہو۔ ویسے عروض کے عملی اور اطلاقی پہلوؤں سے واقفیت شاعر کے لئے بہت مفید ہے اور بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس طرح وہ عروضی غلطیوں سے محفوظ رہتا ہے۔ عروضی غلطیاں اگر فاحش قسم کی ہوں تو کلام کا بہت بڑا سقم ہوتی ہیں اور شاعر کی کم سوادی پر دلالت کرتی ہیں۔ ان کی وجہ سے اچھے سے اچھے کلام کا لطف غارت ہو جاتا ہے۔ میں عروض صرف اس حد تک جانتا ہوں کہ نہ تو خود کسی عروضی غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہوں نہ کسی دوسرے کی عروضی غلطی کو میری نظر معاف کر سکتی ہے۔

شاد۔ بہترین شعر اور بہترین افسانے کی آپ کے نزدیک کیا خصوصیات ہیں؟

اختر۔ خصوصیات کا گنوانا تو طوالت سے خالی نہ ہوگا۔ ہاں اہم ترین خصوصیت بتانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ میرے خیال میں بہترین شعر اور بہترین افسانے کو مکمل فن کاری اور فن کارانہ صناعی کے ساتھ اُن جذباتی اور جمالیاتی تجربات کا اظہار کرنا چاہئے جو اپنے آخری تجزیے میں انسانی فلاح کے ضامن ہوں اور مداوائے دردِ انسانیت کی حیثیت رکھتے ہوں۔

شاد۔ کیا ہمارا موجودہ ادب جمود کا شکار ہے؟

اختر۔ ہمارا موجودہ ادب جمود کا شکار ہے بھی اور نہیں بھی۔ مطلب یہ کہ مقدار و کمیت کے لحاظ سے کوئی جمود نہیں ہے۔ موجودہ دور میں جس کثرت سے

تنقیدی و تخلیقی کام جو اب ہو رہا ہے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ پندرہ بیس سال پہلے تک اُردو کے اچھے اور معیاری رسالوں کی تعداد دس پندرہ سے زیادہ نہیں تھے۔ ہمایوں، ادبی دنیا، ادب لطیف، نگار، ساقی، جامعہ، ساقی، نیا ادب اور دو چار اور۔ ان میں بھی رسائل کی ضخامت بھی بہت محدود ہوتی تھی۔ شاید ہی کوئی رسالہ ہو جو ۱۰۰ صفحات سے تجاوز کرتا ہو۔ اب پانچ پانچ سو صفحات کے دس دس سہ ماہی رسائل شائع ہوتے ہیں اور ہر رسالے میں بیسیوں کی تعداد میں غزلیں اور نظمیں اور درجنوں افسانے اور مضامین ہوتے ہیں۔ کتابیں بھی پہلے سے زیادہ چھپ رہی ہیں اور پہلے سے زیادہ ضخیم ہوتی ہیں۔ غرضیکہ مقدار کا جہاں تک تعلق ہے، جمود نہیں ہے۔ البتہ ان معنوں میں جمود ضرور ہے کہ آج کی ادبی تخلیقات میں وہ گہرائی، وہ وزن اور وہ تاثر نہیں جو پچھلے ادبی ادوار کی خصوصیت تھی۔ نئے لکھنے والے اُن معیاروں کو چھونے سے قاصر رہتے ہیں، جن تک پرانے لکھنے والے پہنچ گئے اور پہنچ سکے اور خود پرانے لکھنے والے جن معیاروں کو چھو چکے وہ اُن کی پرواز کی آخری حد تھی۔ جمود کے مسئلے پر جو گرما گرم بحثیں پچھلے سالوں میں ہوتی رہیں، اُن میں اس فرق و امتیاز کو مدِنظر نہیں رکھا گیا جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا۔ اگر اس بات کو ملحوظ رکھا جاتا تو شاید یہ بحث اس قدر طول نہ پکڑتی۔ ذہنی اور کیفیاتی اعتبار سے جو جمود ہے اُس کے اسباب کا تعین البتہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔

شاد۔ کیا تقسیمِ وطن کے بعد سے اُردو افسانے کی تکنیک میں کوئی اہم تبدیلی پیدا ہوئی ہے؟

اختر۔ تقسیمِ ملک کے بعد اُردو افسانے کی تکنیک نہیں، اُس کا مزاج بدلا ہے۔ اُس میں سے عینیت بالکل خارج ہو چکی ہے۔ اُس کا دائرہ کار سمٹ کر گھر کی چہار دیواری میں مقید ہو گیا ہے۔

شاد۔ آپ ادب میں اشاریت اور ابہام کے کس حد تک قائل ہیں؟

اختر۔ میں ادب میں صرف اُس ابہام کا قائل ہوں جس کی حد میں اہمال اور مہملیت سے نہ ملتی ہوں اور صرف اُس اشاریت کی قدر کرتا ہوں جو بلاغت کے بطن سے پیدا ہوتی ہے اور معنویت کو جنم دیتی ہے۔

شاد۔ آپ کی زندگی کا کوئی ایسا اہم واقعہ جس نے آپ کے ادب پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو؟

اختر۔ میری زندگی کا کوئی ایسا خاص واقعہ نہیں ہے جس نے میرے ادبی کام کو خاص طور پر متاثر کیا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سچ ہے کہ میں معمولی سے معمولی واقعات اور شخصیتوں [illegible] انسان خاص اور غیر معمولی واقعات سے متاثر ہوتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ میری ادبی کارگزاری اُن سے متاثر ہوتی ہے۔ میں طبعاً بہت حساس ہوں اور اپنی شاد و روزانہ زندگی میں حقیقت سے متعلق واردات کا تماشہ دیکھتا ہوں۔ اتنا گہرا اور اتنا دیرپا اثر لیتا ہوں کہ بڑے بڑے حادثات کا میرے اوپر وہ اثر نہیں ہوتا جو اصولاً ہونا چاہیے اور یوں عام سی چھوٹی باتیں بھی بظاہر مجھے غیر متاثر چھوڑ جاتی ہیں کیونکہ جس نسبت سے میں معمولی واقعات سے متاثر ہوتا ہوں اگر اُسی نسبت سے غیر معمولی واقعات سے بھی متاثر ہونے لگوں تو ظاہر ہے کہ یہ تجربہ کا کلیجہ شق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زندگی بہر حال مجھے عزیز ہے۔ اگر اجازت ہو تو اس مقام پر اپنا ایک شعر پڑھوں۔

شاد۔ ضرور ضرور!

اختر۔ مر رہے پھر بھی زندگی کی ہوس
ہے نہایت ہی، پوچھئے کیا ہو

شاد۔ بہت خوب! اچھا جناب! اب یہ بتائیے کہ کیا اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے؟

اختر۔ اچھا ادیب یقیناً اچھا انسان بھی ہوگا۔ اِس بات کو اُلٹ کر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اچھا ادیب ہی اچھا انسان ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی معنی میں بُرا ہو تو وہ زیادہ دنوں تک اپنی بُرائی سے اپنے ادب کو محفوظ نہ رکھ سکے گا۔ آخر ایک بُرا انسان کب تک اچھائی کو اپنے ادب پر طاری کئے رہ سکتا ہے۔ اور کہاں تک مصنوعی انسانیت کا لبادہ اوڑھ کر اپنی بُرائی کو چھپائے رکھ سکتا ہے۔ اُس کا خبثِ باطن جلد یا بہ دیر کسی نہ کسی چور دروازے سے اُس کی تخلیقات میں داخل ہو جائے گا اور الفاظ و زبان کے جامے سے پھوٹ نکلے گا۔ اب اِس کلیے کو مخصوص افراد پر منطبق کرنے میں جو دشواری ہوتی ہے اُس کا سبب یہ ہے کہ نہ اچھے ادب کا کوئی معیار مقرر ہے نہ اچھے انسان کا۔ اِن دونوں چیزوں کو پرکھنے کے لئے ابھی تک کوئی ایسا معروضی پیمانہ وجود میں نہیں آیا جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو۔ اِس سارے معاملے میں لطف کا پہلو یہ ہے کہ اِس اصول کا اعلان کرنے والا ضروری نہیں کہ خود بھی ایک اچھا انسان ہو اور اِس لئے ایک اچھا ادیب ہو اور نتیجہ اِس کا یہ نکلتا ہے کہ اگر میں اِس نظریے کی حمایت کرتا ہوں تو اِس کے یہ معنی نہیں کہ میں اچھا انسان اور اچھا ادیب ہونے کا دعویٰ کر رہا ہوں۔

شاد۔ کیا شراب اور عورت ادیب کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں؟

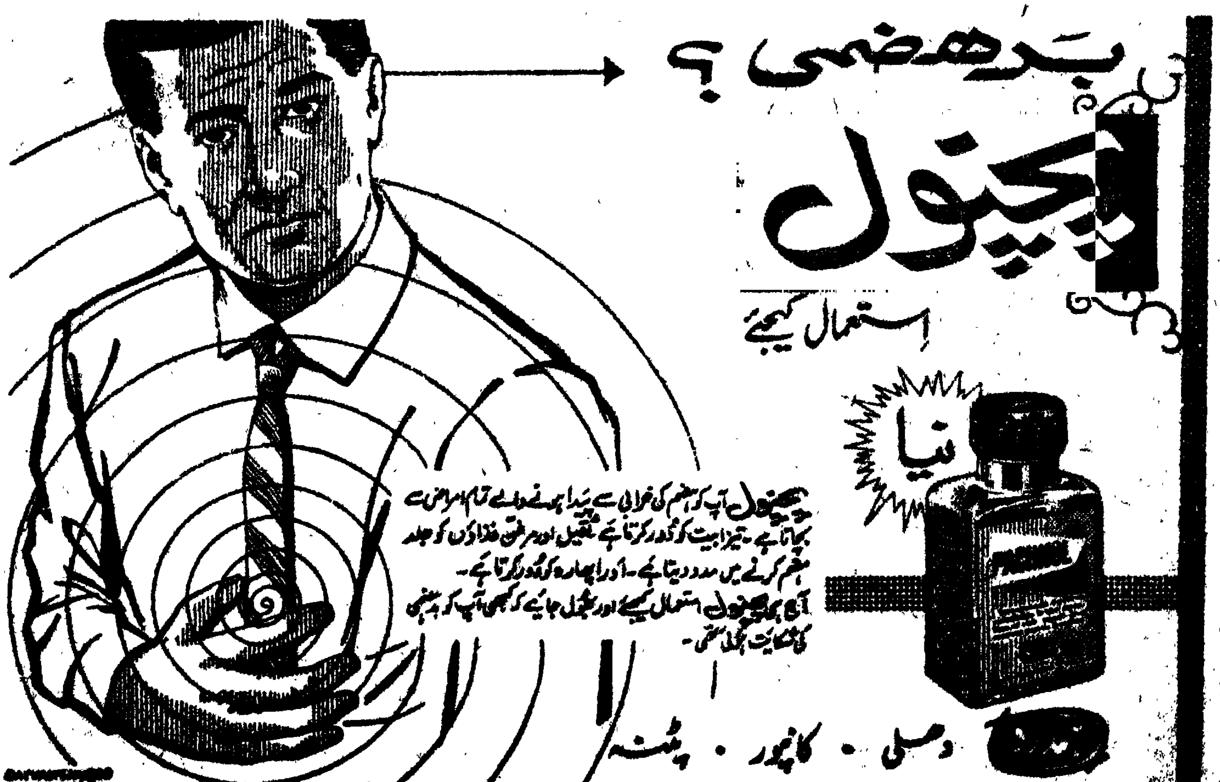
اختر۔ اس اعتبار سے کہ عام انسانوں کی بہ نسبت شاعر و ادیب کے احساسات میں زیادہ تیزی، شدت اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ یہ قطعی ممکن ہے کہ شراب اور عورت کے معاملے میں وہ بہت شدید، حساس اور سریع التاثر ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا مناسب نہ ہوگا کہ جس ادب میں شراب یا عورت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو یا جس ادب کا محور شراب اور عورت ہو وہ کوئی اعلیٰ درجے کا ادب ہوگا۔ میرے خیال میں حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یعنی شراب اور عورت کے گرد گھومنے والا ادب لازماً دوسرے درجے کا ادب ہوتا ہے۔

شاد۔ گویا آپ کے نقطۂ نظر کے مطابق خیام کی شاعری دوسرے درجے کی شاعری ہے؟

اختر۔ ہرگز نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ خیام کے یہاں بادہ و ساغر اور ساقی و محبوب محض علامتیں ہیں اور بیان و اظہار کے ذرائع۔ ورنہ حقیقت میں اُس کی شاعری شراب اور عورت سے متعلق نہیں بلکہ حیات و کائنات کے عظیم مسائل سے بحث کرتی ہے اور تفکر و تفلسف کی اعلیٰ ترین سطح پر واقع ہوئی ہے۔

شاد۔ معاف کیجئے اختر صاحب! آپ کا بہت وقت ضائع کیا لیکن آخر میں صرف ایک سوال اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ علی گڑھ کے ماحول نے آپ کی ادبی زندگی پر کیا اثر ڈالا؟

اختر۔ اپنی ادبی کارگزاریوں اور فنی کاوشوں کے ضمن میں ہدایت و فیضان کے جن سرچشموں سے میں نے فائدہ اٹھایا وہ علی گڑھ سے متعلق نہیں تھے۔ اس اعتبار سے علی گڑھ کے ماحول نے میری ادبی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ اور اگر ڈالا بھی تو منفی قسم کا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اپنی ادبی کاوش اور ادبی زندگی مجھے اتنی عزیز نہ ہوتی جتنی رہی ہے اور اس کی طرف میرا وہ رویہ نہ ہوتا جو اُس مخلص کا ہوتا ہے جو اپنی حقیر سی پونجی ہی کو اپنا قیمتی سرمایہ اور اپنی بے بہا دولت سمجھتا ہے تو علی گڑھ کا ماحول مجھے اور میری ادبی زندگی دونوں کو کبھی کا ختم کر چکا ہوتا۔




نئے بڑھیا سنلائٹ
سے ہر بار
آپ کے کپڑے
زیادہ چمکدار دُھلتے ہیں
SUNLIGHT
Soap
نیا بڑھیا سنلائٹ ایک بار آزما کر دیکھئے ... آپ کے کپڑے نہیں زیادہ چمکدار دُھلیں گے۔ بلکہ ہر دُھلائی کے بعد زیادہ، اور بھی زیادہ چمکدار نکلے آئیں گے۔ تھوڑا سا مَلئے
اور دیکھئے۔ جھاگ ہی جھاگ جس میں کپڑے زیادہ صاف دُھلتے ہیں ... زیادہ چمکدار! گھر بھر کی ساری دُھلائی نئے بڑھیا سنلائٹ سے کیجئے۔
اپنے روز پہننے کے کپڑے
نئے بڑھیا سنلائٹ سے دھوئیے
ہندوستان لیور کا تیار کردہ

محبوبہ سے

پروفیسر انور سیوانی۔ ایم، اے

شیخ محلہ، نئی گلی سیوان۔ ضلع سارن (بہار)

۵ مارچ ۱۹۵۸ء　　　محترمی خوشتر گرامی صاحب! نیاز و تسلیمات

فروری کے شمارے میں 'پشیمان' کی اشاعت کے لئے شکریہ! ـــــ میری اس تخلیق کی اشاعت پر بہت سے تعریفی خط آئے، اتنے خطوط کہ ابھی تک اُن میں سے نصف کے قریب خطوط کے جواب دینے باقی ہیں۔ نوجوان طبقہ نے اس افسانے کا خاص اثر لیا ہے ـــــ "بیسویں صدی" کے ایک مداح نے تو ایک افسانے کا پلاٹ بھیج کر افسانہ لکھنے کی فرمائش کی ہے ـــــ بیسویں صدی کے صفحات کے ذریعہ میں اپنے تمام کرمفرماؤں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں ـــــ میری نئی تخلیق 'محبوبہ سے' حاضر ہے۔ اُمید ہے پسند آئے گی۔۔۔

نیاز مند ـــــ انور سیوانی

رونی ڈیر!

تمہارے کئی محبت نامے نظر نواز ہوئے۔ تمہاری شکایت سر آنکھوں پر۔ مجھے اپنی فروگذاشت تسلیم ہے۔ میں نے تمہارے نازک دل کو دُکھ پہنچایا۔ تمہارے خطوط کے جواب نہ بھیجے۔ حالانکہ میرے دل کی کیفیت یہ ہے کہ جب تک تمہارا خط نہ آئے، اُسے چین نہیں ملتا۔ تم نے میرے لئے کتنی زحمت گوارا کی ہوگی، تمہارے دستِ نازک کو خطوط تحریر کرنے میں کتنی تکلیف اٹھانی پڑی ہوگی۔ اپنے معمول کے پروگراموں کو ملتوی کر کے خطوط لکھنے کے لئے وقت نکالنے میں تمہیں کتنی کوفت ہوتی ہوگی ـــــ اور پھر میرا جواب نہ پا کر تمہارے دل کو کتنا صدمہ پہنچا ہوگا، اس کا مجھے احساس ہے۔ کوئی ایسی مصروفیت بھی نہیں، ایسی مجبوری بھی نہیں جو تمہیں خط لکھنے میں مانع ہو پھر بھی میں تمہیں خط نہ لکھ سکا۔ بلکہ یوں سمجھو کہ نہ لکھا۔

رونی ڈیر! معاف کرنا، معذور سمجھ کر مجھے معاف کر دینا ـــــ انسان حالات کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آزاد پیدا ہوا ہے۔ آزادی اس کا پیدائشی حق ہے۔ اُسے سوچنے اور اپنی سمجھ کے مطابق کام کرنے کی آزادی ہے لیکن کیا یہ سچ ہے؟ کہا جاتا ہے سماج میں سوچنے اور اپنی سمجھ کے مطابق کام کرنے کی آزادی ہے جبکہ ہم لوگ بندشوں میں ہیں۔ سیکڑوں کڑیاں ہیں جو ہر قدم پر ہماری راہ روک کر کھڑی ہیں۔ یہاں تو حالات کی حکومت ہے۔ وہی ایک آدمی کو اپنے محلوں کی عشرت نصیب کراتے ہیں، وہی دوسرے آدمی کو در بدر کی خاک چھاننے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ زندگی کا ایک دور ہوتا ہے۔ جب ایک ناتجربہ کار نوجوان اپنے ماحول اور حالات سے بے نیاز ہو کر ہر کام کو اپنے لئے آسان سمجھنے لگتا ہے۔ زندگی اُس کے لئے ایک حسین تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔ سپنے اُس کی نظر میں حقیقت بن جاتے ہیں۔ اُمنگوں کے جھولے پر جھولتا ہوا وہ ناممکن کو بھی ممکن سمجھنے لگتا ہے۔ نادان انسان! جب اُسے زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اُسے پتہ چلتا ہے کہ جسے وہ حقیقت سمجھتا تھا وہ لمحاتی سراب سے زیادہ نہیں۔

رونی ڈیر! خفا نہ ہونا، میں کوئی پہیلی نہیں بجھا رہا ہوں۔ ناصحِ مشفق نہیں بن رہا ہوں۔ حقیقت کا انکشاف کر رہا ہوں۔ ایسی حقیقت کا جس کا زندگی کی تلخیوں سے مجھ پر انکشاف ہوا ہے۔

کیسا خوش قسمت میں اپنے کو سمجھتا رہا ہوں رونی ڈیر! ـــــ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تم جیسی حسین لڑکی کی نظرِ عنایت مجھ پر ہے۔ وہ دن میری زندگی کا یادگار دن تھا جب میں نے تمہیں پہلے پہل یونیورسٹی کے سیمینار میں دیکھا۔ تمہارے حسن اور دلربائی کا میرے دل پر ایسا نقش کھنچا کہ جب ہوسٹل واپس آ کر اپنے بستر پر لیٹا تو تمہارے حسین چہرے کی یاد کے سوا میرے ذہن میں کوئی دوسرا خیال نہ تھا۔ رات بھر

ہوگا اسے تصور میں کھو گیا ہو گا کہ زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ ہم دونوں
پیار ہوا اور سب حالات نے ہماری محبت کے تقاضے [illegible]
ملاقات بڑھتے گئے اور یہ احساس کی حاجت تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب
ہوگئے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ تم جیسی حسین لڑکی کی محبت حاصل کر سکا۔

روفی ڈیر! مجھے اپنے عہد و پیماں یاد ہیں، میں انھیں بھولا نہیں ہوں۔ ہم نے زندگی میں ایک دوسرے کا ہو جانے کے لئے جو عہد و پیماں کیا تھا، اُس کی یاد میرے دل میں اسی طرح تازہ ہے جیسے ہم نے ابھی ابھی عہد و پیماں کئے ہوں۔

کیا بھلائے جا سکتے ہیں وہ لمحے جو ہم نے دنیا کی نظروں سے چھپ کر ایک دوسرے سے ملنے کی آرزو میں اور ایک دوسرے کے ساتھ گزارے تھے۔ وہ آنسو، وہ آہیں، وہ عہد و پیماں، وہ خوش آئند سپنے، وہ آنے والے دنوں کی مسرت، وہ لمحے جنھوں نے ہمارے درمیان کی دوری کے احساس کو مٹانے میں ہماری مدد کی۔ کیا بھولنے کی چیزیں ہیں؟

روفی ڈیر! تم نے مجھے میرے وعدے یاد دلائے ہیں۔ میں انھیں بھولا ہی کب؟ میں کتنا خوش قسمت ہوتا اگر اُن وعدوں کو تکمیل تک پہنچانے کے قابل ہوتا۔ میں نے تم سے کہا تھا ہماری زندگیوں پر حالات کی حکومت ہے اور ان حالات کے ہاتھوں میں ایسا بےبس ہو گیا ہوں کہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی حاصل کرنے سے محروم ہو گیا ہوں۔ مجھے غلط نہ سمجھو روفی ڈیر! مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے لیکن جذبات پر تھوڑی دیر کے لئے قابو پا کر میری مجبوریاں بھی تو سمجھو۔

تمہارا یہ لکھنا کہ میری بے کاری کے دن ختم ہو گئے، درست ہے۔ اب میں برسرکار ہوں۔ جسم و جان کے رشتے کو قائم رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی حیلہ تو چاہئے ہی۔ اور بس سمجھو کہ میرا برسرکار ہونا اتنا ہی ہے کہ میں اپنی معمولی ضروریات کے لئے پیسوں کا محتاج نہ رہا ——— لیکن کیا یہی وہ زندگی ہے جس کے میں نے جوانی کی اُمنگوں میں خواب دیکھے تھے! اپنی ذہانت، شخصیت، عزم و حوصلے کے بل بوتے پر میں نے زندگی کے بارے میں کیا کیا نہ سوچا تھا۔ لیکن وہ اُمنگوں سے بھری زندگی کیا بن کر رہ گئی ہے!! میری تنخواہ کے یہ چند سکے جو آج کل کی ہوشربا گرانی میں میری ذاتی ضروریات بھی پوری کرنے کے لئے کافی نہیں، ماں باپ اور بھائی بہنوں کی بھی اُمیدوں کا سہارا بن گئے ہیں۔

ایسے حالات میں روفی ڈیر! میں اپنے عہد و پیماں یاد رکھتے ہوئے بھی اگر تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانے سے معذور رہوں تو کیا مجھے خطاوار سمجھو گی؟

اپنے اس بوسیدہ مکان میں جس کی مرمت اور چونا کاری بھی میرے لئے ایک بڑا مسئلہ، بڑا کام ہے، جس کے احاطے میں نہ کوئی سایہ دار باغ ہے اور نہ جس میں پرانی [illegible]
[illegible] کے کاموں میں لگے لوگوں کی [illegible]
زندگی کیا کرنا چاہے گی؟

روفی ڈیر! تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں عالیشان کوٹھی کی [illegible] میں تم نے ہمیشہ محلوں کے خواب دیکھے ہیں۔ تمہارا عیش و عشرت کے سامانوں سے آراستہ کمرہ، تمہارے دل میں زیادہ سے زیادہ عشرت کے سامان [illegible] تمہاری کوٹھی کی رونق بڑھانے کے لئے اتنی ساری خادمائیں اور نوکر [illegible] میں آئے دن اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ اچھے سے اچھے ماڈل کی کار میں سیر کرنے کے لئے جب تم نکلتی ہو گی تو تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہو گا کہ اس سے بہتر ماڈل کی کوئی اور کار ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا ——— اور میرے حالات ایسے ہیں کہ ہر روز پیدل چل کر دفتر جاتا ہوں اور پیدل ہی دفتر سے گھر واپس آتا ہوں۔

روفی ڈیر! کیا ظلم نہ ہو گا تمہارے اُن سپنوں پر جنھوں نے ہمیشہ عیش و عشرت کے تصور کے گہواروں میں پرورش پائی ہے! اُن گھنیری زلفوں کی کیا یہ توہین نہ ہو گی جن کے لئے تم نے آرائش کے نہ جانے کتنے سامان مہیا کر رکھے ہیں؟ کیا اذیت ناک نہ ہو گا اُن غلافی آنکھوں کے لئے جنھوں نے زندگی کا حُسن تو دیکھا ہے لیکن اس کی بدصورتی سے ہمیشہ شرماتی رہی ہیں ——— وہ پھول سا بدن جو ہمیشہ قیمتی لباسوں میں ملبوس رہنے کا عادی ہے کیا کم قیمت کھردرے کپڑے اسے راس آئیں گے؟ ایوڈی کلانگ، ایوننگ ان پیرس اور عطر مجموعہ جیسی خوشبوؤں میں بسی رہنے والی نازک طبیعت کیا بیزار نہ ہو جائے گی اس بوسیدہ مکان اور اس کے متعفن ماحول سے!

روفی ڈیر! مالی و معاشی بدحالی بدصورتی ہے، تعفن ہے۔ اور میں تو کہوں گا یہ زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے!

بھول جاؤ، روفی ڈیر! اُن بیتے لمحوں کو جن کے سائے میں ہم نے جیون ساتھی بننے کے خواب دیکھے تھے۔ زندگی کی حقیقتیں ایسی تلخ بن گئی ہیں کہ اگر تم بھول کر بھی میری دنیا میں آ جاؤ تو تمہیں معلوم ہو گا کہ یہ جہنم ہے!! اذیتوں سے بھری ہوئی جہنم!

روفی ڈیر! زندگی کے عیش و آرام، اُس کی خوشیاں اور رعنائیاں تمہارے لئے مقسوم ہیں۔ اپنی زندگی کو تلخ نہ بناؤ، اپنی حسین اور غم و الم سے بے نیاز دنیا کی مسرتوں سے ہمکنار ہو جاؤ!

معاف کرنا روفی ڈیر! اگر میرے قلم کی بے باکی سے بھی تمہارے نازک دل کو تکلیف پہنچی ہو ———

تمہارا
شاہد

غزل

سید یزدانی جالندھری

کیوں ہے گھٹی گھٹی سی فضا، سوچنا پڑا
کیا ہے خیالِ موجِ ہوا، سوچنا پڑا

ہم کر چکے تھے ترکِ تعلق کا فیصلہ
جب دل نے مشورہ نہ دیا، سوچنا پڑا

ہم خاک بھی ہوتے ہیں تو وہ مطمئن نہیں
کیا اور دیں ثبوتِ وفا، سوچنا پڑا

غنچے خموش، پھول پریشاں، چمن اداس
کیا کہہ گئی ہے موجِ صبا، سوچنا پڑا

کیا اتنے بدنصیب تھے زخمِ دل و جگر
کیوں تیر ہو گیا ہے خطا، سوچنا پڑا

شاید کہیں چراغِ وفا جگمگا اٹھا
کیوں چل رہی ہے تند ہوا، سوچنا پڑا

یہ رہگزار، رہگزرِ حشر تو نہیں
گم صم سے کیوں ہیں راہنما، سوچنا پڑا

اُس کی نظر میں ہم تھے یزدانیؔ حزیں؟
کس کس پہ مہرباں ہے خدا، سوچنا پڑا

غزل

ضیا فتح آبادی ایم اے

نالہ و فریاد سے ہوتا ہے کیا
عاشق کی آبرو کھوتا ہے کیا

نعش پر اُمید کی روتا ہے کیا
اس طرح کم بارِ غم ہوتا ہے کیا

سر پہ سورج آ گیا، او بے خبر
تان کر چادر ابھی سوتا ہے کیا

خون کا قطرہ بھی آنکھوں میں نہیں
دل میں تخمِ آرزو بوتا ہے کیا

کش مکش میں زندگی و موت کی
آدمی پاتا ہے کیا، کھوتا ہے کیا

حسرتوں کے داغ یوں مٹتے نہیں
آنسوؤں سے آستیں دھوتا ہے کیا

جب نہیں ہوتا ہے تو، دل میں مرے
میٹھا میٹھا درد سا ہوتا ہے کیا

بجلیاں جس پر بنا لیں آشیاں
وہ شجر بھی باثمر ہوتا ہے کیا

اے ضیاؔ میں ہوں مریضِ دردِ دل
وہ دوا ہو یا دعا، ہوتا ہے کیا

غزل

نسیم شاہجہانپوری

عیب سے خالی حُسن کی ذات — عشق پہ لاکھوں الزامات
دردِ تمنا، آہ و فغاں — جُرمِ محبت کی سوغات
ہر ٹھوکر معراجِ جنوں — ہر لغزش معراجِ حیات
اُن کی نظر کے اشارے پر
بنتے بگڑتے ہیں حالات



گھر بھر کی دُھلائی جگمگاتی سفید! بے داغ صاف! اسلئے کہ ڈھیروں جھاگ دینے والے سرف میں دُھلائی کی زائد قوت ہے! ساڑھیاں، شلواریں، قمیضیں، بچوں کے لباس... ہر کپڑا سفید ترین دُھلتا ہے اور صاف ترین! ساری دُھلائی گھر میں سرف سے کیجئے۔

سرف سے کپڑے سفید ترین دُھلتے ہیں

ہندوستان لیور کا تیار کردہ

SU. 38-140-45 UD

کاغذی پیرہن

سید شمیم اشرف

کشہری (بارہ بنکی)

۱۸ مارچ ۱۹۶۵ء

محترم خوشتر صاحب! آداب

"کاغذی پیرہن" بظاہر ایک تشنہ و نامکمل کہانی ہے۔ زندگی کی چند آڑی ترچھی لکیریں ہیں، چند پرچھائیاں ہیں، کچھ اشارے ہیں۔ اجنبی، شکستہ ——— اداس ——— اپنی رائے سے مطلع فرمایئے مجھے بہت مسرت ہوگی . . .

آپ کا اپنا ——— سید شمیم اشرف

اُس کے بالوں کی وضع برگیڈ بار دوت سے ملتی جلتی تھی اور اُس کے سڈول اعضا
ںد کو قدرت نے کوہساروں کی برفانی چوٹیوں پر بکھری ہوئی سنہری دھوپ کا
ن عطا کیا تھا۔ وہ علاقائی ٹورسٹ بیورو کی ایک وین میں شہر سے یہاں آئی تھی۔
ن کے ساتھ دو لڑکیاں اور تھیں جو خد و خال کے اعتبار سے اطالوی معلوم
تی تھیں۔ یہاں سے بیکراں رفعتوں کی آغوش میں سوئی ہوئی کنچن جنگا کی خاموش
بانی چوٹیوں کا نظارہ حُسن اور ایڈونچر کے شیدائیوں کے لئے ہمیشہ کشش کا
عث بنا رہا۔ اُس لڑکی کا نام مارتھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بانس کی تیلیوں کا ایک
شنما بیگ تھا جس پر برف سے ڈھکی ہوئی وادیوں کی ایک دلکش تصویر بنی ہوئی
ی۔ وہ اُس وقت بانس کی چٹائی پر اپنی ٹانگیں پھیلائے نہایت انہماک سے میری
یں سُن رہی تھی۔ اُس وقت جب میں نے رومانی کہانیاں لکھنا شروع کی ہیں اور
قدروں کے قول کے مطابق میں اپنی کہانیوں میں سیاہ دراز گیسوؤں کا عطر نچوڑتا
تھا اور لب لعلیں کے سربستہ چشموں کا جادو چھڑکتا تھا، مجھے شہر کے الٹرا ماڈرن
ت خانوں میں ایسا کوئی بُت نظر نہیں آیا تھا جس کا سُرخ و سپید جسم گنگ و جمن
ی لہروں میں مچلتی ہوئی قوسِ قزح کی مانند حسین ہو۔ میرے لاشعور کے اُفق پر بکھری
وئی گہری گہری خنک شاموں میں مارتھا کا حسین وجود انگڑائیاں لے رہا تھا۔

سبز آنکھوں میں شرابی لہروں کا رقص!

گلاب جیسے رخساروں پر کانپتے ہوئے سنہرے گیسوؤں کی عطر بیز نازک قوسیں!!

وہ اجنتا کی نقاشی پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ رہی تھی اور میں نے کوکاکولا کی ٹھنڈی ٹھنڈی چسکیاں لیتے وقت اُس سے کہا تھا کہ پتھر کی یہ حسین برہنہ تصویریں صدیوں سے پیاسی ہیں۔ ان کے جامد ہونٹوں کو نوشگفتہ کلیوں کی دلفریب مسکراہٹوں نے کبھی نہیں چھوا۔ ان کی پتھرائی ہوئی آنکھیں زندہ و متحرک حُسن کی انجانی سرحدیں دیکھنے سے مجبور ہیں۔

اور مارتھا . . . . سنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔

"جمہوریت کے متعلق آپ کا تصور فرضی اور جذباتی بنیادوں پر قائم ہے۔"

مارتھا نے اپنے سفری بیگ سے وسکی کی اسکاچ کا ایک گھونٹ پی کر کہا تھا۔

یکایک برفانی ہواؤں کے نرم رو جھونکے سرسراتے ہوئے نکل گئے۔

"میں اونچے طبقہ کی نیم وحشی اجتماعی طاقت کو جمہوریت نہیں کہہ سکتا۔"

میں مارتھا کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "جہاں چند مضبوط ہاتھ عوامی شعور کے اُبھرتے ہوئے سورج پر خاک پھینکتے ہوئے نظر آتے ہیں ——— آج جمہوریت دنیا کے جس خطہ میں اپنے تمام ساحرانہ حربوں کے ساتھ جلوہ فگن نظر آتی ہے، وہاں اکثریتی شعور کا مہلک زہر معاشرے کے پورے اعصاب کو مریض بنائے ہوئے ہے۔ ہم ایک ایسی اجنبی دُنیا میں سانس لے رہے ہیں جو نیم وحشی اخلاق پرستوں کی بنائی ہوئی ہے۔ ہم کو ہر چہرہ مصنوعی نظر آتا ہے۔ ہر شکل اجنبی دکھائی دیتی ہے۔ جہاں کاغذ کے رنگین مستطیل نما ٹکڑوں کے اُفق پر زندگی انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہے۔ ہماری غیر حقیقی زندگی روٹی کے تابناک چہرے کے دلفریب تصور میں اُونگھتے ہوئے سحر زدہ ویرانوں کی خاک پھانکتی ہے۔ اِس جمود کا خالق کون ہے؟

[illegible] ساحلی قصبات کے نیم عریاں [illegible] کو سجائے ہوئے ہیں جو [illegible] مغرب پرست ہیں جو تخیل اور نظریاتی پروازوں میں مستانہ آوارہ کی طرح بھٹک رہے ہیں۔ اخلاق نظریہ پرستوں کی میراث ایک جذباتی اور تہذیبی ورثہ ہے! [illegible] جام ہے جہاں سب کے سب عریاں نظر آتے ہیں۔

مارتھا مکمل شبیہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور لپ اسٹک زدہ [illegible] جھکا دیا۔ اب وہ سگریٹ کے دھوئیں کے ننھے ننھے دائرے بنا رہی تھی۔

ایک دو لمحہ سکوت رہا اور دھوئیں کی غبار آلود سطح پر رینگ رہا تھا۔ میں نے خاموشی سے سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کے حلقوں میں تیرتے ہوئے مارتھا کے حسن کے رنگین جزیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

میں جو برفانی طوفانوں کی چیخوں کی طرح جسم کی سرحدوں کو چھوتا ہوا اجنبی اور ناقابلِ تسخیر لامتناہی سپید فضاؤں میں گنگناتا رہا اور برسوں میرے شعور کی بالیدگی سے تشنگی کا بیکراں احساس جونک کی طرح چمٹا رہا۔ میری زندگی شراب کے ارغوانی شعلوں اور گلاب کے خوں چکاں رنگوں کی آرزو میں سلگتی رہی۔ کسی لیلیٰ نے میرا کاسۂ دریوزہ گری توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ کسی زلیخا کی مخروطی انگلیوں نے میرا دامن چاک نہیں کیا ——— !!

میں دنیا کے لئے اب تک اجنبی تھا۔

یہ دنیا!

جہاں زندگی گرم قہوے کی پیالیوں سے ناپی جاتی ہے۔

جہاں عورت شراب کی خالی بوتل کی طرح کھڑکی سے باہر پھینک دی جاتی ہے۔

اور ——— مارتھا؟

میرا ذہن اس کے حسین چہرے کی فردوس میں لڑکھڑا رہا تھا۔

وہ میری جانب دیکھ کر مسکرائی تھی اور مجھے پہلی بار اپنی روح کے کھنڈروں میں شوخ رنگوں والی نیم باز کلیوں کی مسکراہٹ محسوس ہوئی تھی۔

یکایک اس کے حسین چہرے پر اضطراب کی لہریں مچلنے لگیں۔ ویٹر جھنجھنی ہوئی اس طرف آ رہی تھی اور چند لمحوں بعد دو گلابی ہاتھ ویٹر کی کھڑکی سے اسے اشارہ کر رہے تھے۔

"ہوں ——— تم جا رہی ہو؟" میں بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

مارتھا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نشیلی آنکھوں میں غم کے سائے تیر رہے تھے۔ اس کے نازک کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کی بانسری میرے وجود میں جادو چھڑک رہی تھی۔ اور جب اس کی لرزتی ہوئی دودھیا بانہیں میری گردن سے جدا ہوئیں تو میرا ذہن محبت کی عالمگیر صفت کے تصور میں غرق تھا یہ صفت کتنی دلفریب

لذت طلبی ہے جو گوشت اور پوست کے جلتے ہوئے جہنم میں [illegible] خلوت کے تیرہ زاویوں میں گم ہو سکتی ہیں۔

میں فطرت کے رنگین زاویوں کو دیکھتا رہا۔

جہاں تک کہ وہ [illegible] کے بازاروں میں ایک سیال شعلہ بن کر بھڑک رہی تھی!!

غزل

سید حامد ترمذی

شکونِ قلب میسر نہیں، جہاں میں ہوں
فضائے روح کا منظر نہیں، جہاں میں ہوں

ہوائے زلفِ معنبر نہیں، جہاں میں ہوں
دماغِ عشق معطر نہیں، جہاں میں ہوں

شباب ہے مرے میکدے میں تشنہ لبی
کسی کے ہاتھ میں ساغر نہیں، جہاں میں ہوں

نظر نوازِ خوش قامتی نہیں سلمیٰ
بہارِ سرو و صنوبر نہیں، جہاں میں ہوں

ہر ایک خضر یہ ہوتا ہے راہزن کا گماں
حقیقتاً کوئی رہبر نہیں، جہاں میں ہوں

جواہرات سمجھتے ہیں سنگ ریزوں کو
نظر شناسِ گوہر نہیں، جہاں میں ہوں

مقدرات پہ قابو تو پا لیا لیکن
رسا کسی کا مقدر نہیں، جہاں میں ہوں

اسے نظر کی بصیرت کہو کہ محرومی
حسین ایک بھی منظر نہیں، جہاں میں ہوں

یہ قصرِ زر کی تجلی یہ قمقموں کی بہار
کوئی حیات کا مظہر نہیں، جہاں میں ہوں

جگا سکا نہ کوئی روحِ آدمیت کو
کسی میں آہ یہ جوہر نہیں، جہاں میں ہوں

یہ خرقہ پوش فریب لباس دیتے ہیں
کوئی بھی مردِ قلندر نہیں، جہاں میں ہوں

مری نوا میں ہے سرمستی صداقت فن
شکستِ شیشہ و ساغر نہیں، جہاں میں ہوں

حوادثات کے قلزم میں ڈوب کر دیکھا
حباب کوئی شناور نہیں، جہاں میں ہوں

افسانہ

خوشبو میں آگ

ظہیر کیفی امروہوی

محلہ کشکوئی۔ امروہہ۔ ضلع مرادآباد (یو۔پی)

۱۵ مارچ ۱۹۵۲ء بندہ نواز خوشتر گرامی صاحب! تسلیم

آپ نے میرا پچھلا افسانہ "بیسویں صدی" جیسے موقر جریدہ میں شریکِ اشاعت کیا اور اُن قارئین تک پہنچایا جو سات سمندروں کے "اس پار بھی" "بیسویں صدی" کی عظمت کے گن گاتے ہیں۔ جہاں وہ سب کچھ ہے، جو مجھ جیسے معمولی انسانوں کی نظر سے اوجھل ہے۔ میں اس قدر نوازی کے لئے ممنون ہوں ــــــ ایک اور افسانہ "خوشبو میں آگ" نذر کر رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ میرا یہ نذرانہ بھی "ادبی دُنیا" میں قبول کیا جائے گا۔ اِس افسانہ میں میں نے ایک عورت کے جذبات کی ترجمانی ہی نہیں کی ہے۔ کوشش کی ہے کہ رومان بھرے دل کسی الزکیلے انداز میں ایک دوسرے کو چاہیں۔ یہ میری ہی کہانی نہیں ہے ــــــ اُس کی بھی کہانی ہے، جو میرے خوابوں کی تنویر بنی میرے ذہن کے آنگن میں شب و روز جاگتی رہتی ہے . . .

نیازمند ــــــ ظہیر کیفی

پچیس دسمبر سن اُنیس سو باسٹھ عیسوی

اللہ بھی! مجھے یہ آج ڈائری لکھنے کی کیوں سوجھ گئی ہے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ میرے اِس اقدام کا انجام کیا ہوگا؟ جب کوئی نظر اِسے پرکھے گی، وہ میرے بارے میں کیا فیصلہ دے گی؟ وہ میں جانتی ہوں۔ پر میں اپنے دلی جذبات اگر اِس میں محفوظ نہ کروں تو پھر میرے دل میں جو طوفان اُمڈ رہا ہے، وہ کیسے تھمے گا؟ میرے اللہ! کوئی مجھے بتلائے کہ میں کیوں نہ اپنے زخموں کی مہکار اِن کاغذوں کے دل میں سموؤں۔ اِس لئے کہ آج کا دن میرے لئے یوں بھی اہم ہے کہ آج میں نے اُن زنجیروں کو توڑ دیا ہے جو میرے معاشرہ اور ماحول نے مجھے پہنا رکھی تھیں۔ ہاں! ــــــ آج میں آزاد ہوں۔ بالکل اُس پنچھی کی طرح جو آسمان کی وسعتوں میں اپنی سانسیں بکھیرتا ہے۔ آج مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے جیسے میں خزاؤں کو روند کر بہاروں کے قریب آگئی ہوں۔ کیونکہ آج ہی مجھے ایک ادھیڑ لیکن سرد جذبات کے شوہر کی غلامی سے آزادی ملی ہے۔ اِس آزادی کے لئے میں نے جب جب سوچا میرا دماغ تھک ہار کر بیٹھ گیا اور اپنی شکست کے بعد میں سوچتی تھی کہ میں زندگی بھر یونہی اپنے جذبات دباتے اپنے آپ کو مُردہ بنائے رہوں گی . . . !!

ہاں! ــــــ مجھے خوشی ہے کہ میں آج آزاد ہوں۔ یہ میں چلّا چلّا کر کہنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ کل ہی تو میں نے اپنا وہ مکان چھوڑا ہے، جو میرے نکاح کے بعد مجھے لکھا گیا تھا۔ وہ مکان مجھے ایک ایسا زندان نظر آتا تھا جس میں انسان نہیں مصلوب روحیں اپنا مسکن بنائے ہوئے تھیں۔ یہ کل ہی کی بات ہے۔ میں نے حسبِ شرع اپنے شوہر کی موت کا سوگ منانے کی آخری رسم ادا کی تھی۔ پچھلے پانچ سال میں نے کیسے گزارے ہیں۔ کتنی اذیت اور جذباتی اُلجھن میں گزارے ہیں، یہ ایک طویل کہانی بھی ہے اور میرے جذبات کی تشہیر بھی۔ لیکن میں آج اپنے دل کی ساری اُمنگوں، آرزوؤں اور چاہتوں کو بے نقاب کرنا چاہتی ہوں تاکہ میرے دل کا یہ بوجھ، یہ احساس ختم ہو کہ میں اب اُس ادھیڑ مرد کی بیوی نہیں ہوں جس نے میری ساری جوانی کو خزاؤں کے اندھیروں میں دھکیل دیا تھا۔ ہاں! ــــــ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ جسے میں من و عن کہہ دینا چاہتی ہوں۔ تاکہ میرے دل کا بوجھ کم ہو جائے اور میں سکون بھری سانسیں لے سکوں ــــــ ہاں نئی چاہتوں کے ساتھ۔ نئی اُمنگوں اور جذبوں کے ساتھ۔ مگر کس کے لئے . . . ؟

[illegible] اُس کے سے [illegible] ہے، جب میں نے اُسے دیکھا ہے

[illegible] ہے۔ وہ بدصورت بھی نہیں ہے۔ معمولی نقوش کا نوجوان ہے وہ۔

[illegible] وہ نوجوان کا [illegible] میرا پسندیدہ ہے۔ تھوڑا پڑھا لکھا بھی ہے ———

[illegible] میں سے کیوں [illegible] ہے۔ جذباتی ہوں اُف!... میرے اللہ!

اُس کی جذباتی کرتی... لیکن اُس کی خاموش چاہتیں میرے لئے ——— میرے خدا!

یہ کیسا المیہ کا آخری لمحہ ہے میرا اُس کے لئے کہ جب جب وہ پُرانی باتیں بھول کر

اُس کی سنجیدگی بھری جذباتیت کے لئے چلتا ہے، لرز کر رہ جاتی ہوں!!

ہاں ——— تو میں بات اپنے اُس پُرانے غم کی کہنا چاہتی ہوں جسے میں

نے ابھی الوداع کہا ہے۔ جس نے مجھے پامال کیا ہے۔ میری جوانی، میری دوشیزگی کی

بہاروں کو خزاؤں سے قریب کر دیا ہے۔ میں کیسے لکھوں؟ کہاں سے لکھوں کہ میرے

- یقیناً اللہ اترانے والے اور خودستائی کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔
(قرآن پاک)
- نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے سے تعاون کرو۔ گناہ اور نافرمانی میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دو۔ (قرآن پاک)
- جس نے خاموشی اختیار کی وہ سلامت رہا، جس نے سلامتی پائی اُس نے نجات پائی۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- زبان پر نگاہ رکھو۔ یہ ایسا ناوک ہے جس کا نشانہ اکثر غلط ہی ہوتا ہے۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- ذلیل اور پست فطرت لوگوں کی صحبت سے بچو۔ (حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ)

ذہن میں کتنے ہی ادھورے سوال آتے ہیں جن کا میرے پاس معقول جواب بھی ہے اور مکمل جواز بھی.... اُف میرے اللہ! کیا میں سب کچھ لکھ دوں؟ پہروں سوچتی ہوں لیکن نہیں لکھ پاتی۔ شاید کل لکھ سکوں گی۔ ہاں! کل میں سب کچھ لکھ دوں گی!!

اکیس جنوری سن اُنیس سو تریسٹھ عیسوی ———

کئی دن بیتے جبھی سے سوچ رہی ہوں۔ وہ سب کچھ لکھ دوں جو میرے دل نے نہ چاہتے ہوئے سہا ہے۔ جو مجھے برداشت سے باہر ہو کر بھی اپنانا پڑا ہے۔ کیسے لکھوں؟ کہ مجھے اس میں اپنی بدنامی، اپنی تشہیر کے لئے بھی بہت کچھ لکھنا ہے۔ کیا میرا ضمیر، میرا احساس مجھے اتنی ہمت اور حوصلہ بخشے گا۔ ہاں میں لکھوں گی ——— ہاں میں یہ بھی لکھوں گی کہ میری کہانی اُن سے بچپن کے اُن خوابوں سے شروع ہوتی ہے جب میں بارہ سال کی تھی۔ تب انجانے میں ہی ایک سہیر [illegible] بن گئی تھی وہ

[illegible] کیا تھا [illegible] ہے [illegible]

میں [illegible] خواب بیاہ [illegible] کے [illegible]

وہ [illegible] رات، نہیں، ہاں وہ میری سہاگ رات نہیں، میری زندگی کے [illegible]

کی وہ رات، جس پر ایک سرد واقعہ نے جنم لیا تھا۔ جس میں [illegible]

تھرتھراہٹ، نہ کپکپاہٹ، نہ جذبات، نہ گداز، نہ کوئی سوز تھا، نہ کوئی [illegible]

بس ایک اُبال کی طرح سرد اور گُھٹی گُھٹی تھی اور میں تھی یا وہ آغوش تھا جس میں [illegible]

کے فقدان کا احساس ہوا تھا۔ ہاں ——— وہ سرد آغوش، جس میں میرے [illegible]

پگھلا دیا تھا۔ منجمد ہو گیا تھا۔ میری پلکوں پر برسات کے اشک بہا کر تھرتھراہٹ کے [illegible]

احساس کی لہریں تو تھیں وہ میری سہاگ رات نے بخشی تھی۔ خوشیوں اور خوشبوؤں سے [illegible]

——— ایک سرد سی جذباتی کسمساہٹ تھی اور میں تھی، یاد رہ گیا تھا اور سانسیں،

جن کا جب جب خیال آتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں برف کی سِل بن رہی ہوں۔

نہیں۔ میں اُس احساس کو تباہ کر دوں گی اور اپنے احساس کے زخموں کو جو میری روح میں کھٹک رہے ہیں اور میرے وجود کو سلگا رہے ہیں اپنے دل سے کھرچ کر پھینک دوں گی۔ میں اُس احساس کو اپنے ذہن سے دور پھینکنا چاہتی تھی۔ پھینکنا چاہتی ہوں!!

لیکن میں ابھی اس احساس کو نہیں بھول پائی ہوں کہ اگر میں اُس مردِ سے بیاہی نہ گئی ہوتی، تب کیوں میرے جذباتی تقاضے تشنگیوں سے چھٹکارا پاتے اور سانسیں تیز کیوں بنتیں۔ بھلا کہیں بوڑھے بھی جوان ہوتے ہیں، کوئی مجھے اُس لمحہ بتا دیتا کہ جب میں نے نکاح کی رسم کے وقت اپنے شرمیلے لبوں سے "ہاں" کے لفظ کا غیر شعوری اقرار کیا تھا۔ اُس سرد لاش سے مجھے قریب کرنے میں میرا باپ بھی معاون تھا، میری ماں بھی اور میرا بھائی بھی شریک تھا۔ اور ہر وہ کردار، جو میری نوخیز رعنائی کے احساس کو برداشت نہ کر پاتا تھا!!

ہاں! تو بات گئے بیتے زمانے کی طرف جا رہی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اُس زمانے کی بے رحم کروٹ کو نیا رُخ دوں۔ میں تو وہی دُہرانا چاہتی ہوں، لکھنا چاہتی ہوں جس نے مجھے چوٹ کا احساس بخشا ہے اور جو مجھے یہ سمجھنے نہیں دیتا کہ میری "سہاگ رات" ایسی غیر جذباتی اور مکروہ کیوں تھی۔ جس میں نہ کوئی ہلچل تھی، نہ کسمساہٹ، نہ جذبات کی تیزی، نہ شدت۔ بس ایک رسمی سی کیفیت تھی۔ گہری خاموشی اور گہری [illegible] تنہائی تھی!!

سترہ فروری سن اُنیس سو تریسٹھ عیسوی ———

میں تو چاہتی ہوں کہ جلد سے جلد وہ سب کچھ لکھ کر [illegible] کی سانس لوں [illegible] میرے اوپر بیتی ہے۔ لیکن یہ میرے اختیار میں کہاں ہے۔ میں [illegible] کہیں [illegible] لکھ پائی [illegible] ہوں [illegible]

سوالا عورت ہو کہیں تو یہی کہ کم بخت یا تو اپنے طنز کرتی ہے کہ نا قابلِ برداشت ہو جاتے ہیں میرے لئے۔ پر کیا کروں؟ یہاں رہ کر سب سہنا ہی پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اور چند دن باقی ہیں زندگی میں بہار آنے کے۔ جب جب مجھے ہنستی ہوں وہ اعتراض کرتی ہے۔ غلط سلط افواہیں میرے متعلق گلی اور محلے کی عورتوں میں پھیلاتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کیوں لکھوں یہ سب کچھ اپنی رُسوائی و ذلت ہی کیا ہے اپنی رُسوائی کی باتیں لکھنے سے۔ پر دل نہیں مانتا۔ اپنی ذہنی اور جذباتی اُلجھنوں کی وجہ سے کتنی ہی وہ باتیں خواب و خیال ہو گئیں جو حقیقت تھیں۔ زہر بھری حقیقتیں! روح کو جُھلسا دینے والی!!

اکیس فروری سن اُنیس سو نواسی عیسوی ــــــــــــــــ

شادی کے بعد ایک سال تک میں بہار کا انتظار کرتی رہی!

دوسرے سال، کسی نئے پھول کی خوشبو بکھرنے کی منتظر رہی!!

تیسرے سال، اپنے جذبات کو سنبھالے ہوئے اپنے شوہر کی صحت یابی کی دعا کرتی رہی!!!

چوتھے سال، اپنے آپ کو ٹٹولتی رہی، اپنی خوبیوں اور کمزوریوں کو پرکھتی رہی اور سسکتی رہی!

پانچویں سال، بدنامی کے سنگریزے چُنتی رہی۔ اس لئے کہ میں کسی غنچہ، کسی کلی کے کھلانے کے قابل نہیں تھی!!

ہر روز اسی بدنامی کے ماحول میں سانس لیتی رہی اور جیتی رہی۔ لوگوں کی نت نئی طنز بھری باتیں اپنے احساس میں گھولتی رہی اور اپنی جوانی کے تقاضوں کو فنا کرتی رہی۔ لیکن کب تک میں اپنے آپ کو دھوکا دے سکتی تھی۔ پھر اسی سال میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔ لیکن یہ بھی میرے اختیار میں نہ تھا۔ کیوں کہ میرے شوہر نے ہر وقت میری نگرانی کرنی شروع کر دی تھی۔ اور پھر اسی شک میں اس ادھیڑ انسان نے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا اور میں تنہا ترستی سسکتی رہ گئی۔

اپنی ادھوری بہاروں کی چاہت بھری خوشیوں اور خوشبوؤں کے لئے!!

چودہ مارچ سن اُنیس سو نوے عیسوی ــــــــــــــــ

اِس لمحے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری سترہ سالہ بیتی زندگی میں کوئی ہلچل، کوئی اُمنگ نہیں اُبھری ہے۔ اور میری کہانی ــــــــ میرے زخمی جذبات کی داستان یہیں آکر ختم ہو گئی ہے۔ مگر نہیں ــــــــ یہ تو میرے ماضی کے کچھ ایسے روپ تھے، جن میں رہ کر میں اپنے آپ کو کھو چکی تھی۔ میری کہانی، میرے جذبات کی تشکیل تو اب ہونے والی ہے کہ میں اب بہاروں سے قریب آگئی ہوں۔ اسی لئے میرے جسم کے گوشوں سے خوشی سرشار ہونے لگی ہے۔ اسی لئے میں اب یہ سب کچھ لکھنا چاہتی ہوں،

اپنے ذہن سے یہ احساس مٹا دینا چاہتی ہوں کہ میں اپنی جوانی کے خوبصورت خوابوں بہت پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ دلولہ خیز چاہتیں کھو بیٹھی ہوں .... میں .... میں .... اس نوجوان کو کتنے ہی دنوں سے اپنی طرف متوجہ پا رہی ہوں، جو ہر روز مجھے اپنے سامنے سے گزرتے پا کر میری طرف ضرور دیکھ لیتا ہے۔ لیکن وہ بُزدل بھی تو ہے کم بخت کبھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں ایک شادی شدہ لڑکی ہوں اور میرے جذباتی تقاضے مجھے ایسا سوچنے پر جانے کیوں اُکساتے ہیں، اور میرے خوابیدہ احساسات ابھارتے ہیں اور میری یہ خواہش اتنی شدید ہوتی جاری ہے کہ وہ مجھ سے بات کرے، مجھے چھیڑے اور ستائے۔ اور جانے کیا کیا؟ جسے سوچ کر ہی میں شرما جاتی ہوں، لجا جاتی ہوں، کانپ سی جاتی ہوں۔ لیکن میں ایسی گری پڑی تو نہیں ہوں۔ اسے میں یہ کیسے بتاؤں، میں ایک عورت ہی نہیں بن گئی ہوں بلکہ مشرقی بیوی بھی رہ چکی ہوں۔

- اپنی روزی پر قانع رہ۔ حقیقی غنا قناعت ہی ہے۔ جو قناعت سے مغرور ہو جاتا ہے، خوشحالی اُس سے قریب ہو جاتی ہے۔ (عربی ادب)
- اگر تمہیں دنیا میں آرام سے رہنا ہے تو خاموش رہو۔ جو غنچہ کی طرح کھلا وہ برباد ہوا۔ (پنجابی ادب)
- پگڑی باندھنے والے سر تو ہزاروں ہیں، لیکن پگڑی کے قابل سر بہت کم ہیں۔ (پشتو ادب)
- اعتدال ہی کا راستہ درست اور مفید ہے۔ سچی چیز جہاں کہیں بھی ہو اُسے اپنا لو۔ اپنی فطرت کا جزو بنا لو۔ (برنارڈ شا)
- آدمی نہ کچھ اپنے ساتھ لایا ہے، نہ لے جائے گا۔ (چینی ادب)

میں اُس لمحہ تک اُس کے التفات اور جذباتی پہل کا انتظار کروں گی، جب تک میری سانسیں مجھے زندگی سے قریب کئے ہوئے ہیں! ــــــــ صاحب جہاں

عجیب عجیب سے جذبوں میں ڈوبا ڈائری میں لکھا ہوا ایک ایک لفظ پڑھ رہا تھا۔ آگے کچھ نہ لکھا تھا۔ سارے صفحات اُس کے تجسس کو بھڑکا رہے تھے۔ اُسے گمان بھی نہ تھا کہ وہ جس پھول کی تمنا کر رہا ہے، وہ اپنی خوشبو بکھیر چکا ہے۔ وہ کافی عرصے سے اس لڑکی کو اپنے قریب سے نت نئے برقعوں میں ملبوس گزرتے دیکھتا رہا تھا بے معنی، ناخوش چاہتوں اور خوابوں کے ساتھ۔ آج اگر یہ ڈائری اس کے ہاتھ سے گر جاتی اور اسے نہ ملتی، تب اسے کیسے پتہ چلتا کہ وہ اپنی خاموش محبت اور چاہت میں کامیاب ہوا ہے۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ جانے کیسے کیسے رنگین خواب اُس نے ساری رات سجائے اور اسی احساس کو لئے سو گیا۔

شاعروں ادیبوں سے

آپ نے بھی ... اپنے دوست یا دشمن شاعروں ادیبوں کے ... پڑھے ہوں گے ... کرم فرما سے میں ... بہت واقف تھا ... لیکن ... زمانے اب کے ہر گوشے میں میری رسائی ... اس لئے مجھے ... کے حالات یا ان کے مشغلوں سے میں ... نہیں ہوں ... پتے معلوم ہیں۔ آخر مجبوراً لکھنے کا ... بیدا ہو چاہتے ۔ اگر آپ (میں محترم خواتین سے بھی مخاطب ہوں جن کا ... خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا جائے گا) از راہ کرم مجھے اپنے محبوب مشغلے اپنے ... اپنے انداز تحریر میں بھیج سکیں تو بے حد ممنون ہوں گا۔ آپ کی ارسال ... "بنیادوں" پر میرے "معمار" "خوبصورت عمارتیں" بنانے کی کوشش ... گے ـــــ آپ اپنی بدحالیاں لکھ سکتے ہیں، بتا سکتے ہیں کہ دوستوں کا ... یا آپ کا دوستوں سے کیسا سلوک ہے۔ آپ اپنی بیوی اور بچوں سے ... سلوک کرتے ہیں؟ آپ کی بیگم اور آپ کے بچے آپ سے کتنے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ ... کا ذریعہ آمدنی کیا ہے؟ آپ متحمل مزاج آدمی ہیں یا آتش کے پرکالے؟ وغیرہ ... ـــــ آپ کا پتہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے میں ذاتی طور پر آپ کو خط ... سکا۔ اگر آپ میری عرض پر توجہ کر سکیں تو مجھ پر احسان ہوگا۔ سمجھ لیجئے یہ ... آپ ہی کے نام ہے۔

ایک بے درد، سنگدل، بے مہر، بے وفا پبلشر صاحب جنہیں کچی گاجریں ... مولیاں کھانے کا بہت شوق ہے، ان مشغلوں کو شاعروں ادیبوں کی تصویروں ... ساتھ کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ وقت بہت کم ہے اس لئے ... راہ کرم فوراً توجہ کیجئے۔ اگر ممکن ہو تو اپنی تصویر بھی یا تو فوراً یا بعد میں بھیج کر ... ممنون فرمایئے۔

مخلص ـــــ راجہ مہدی علی خان

۱۳۹۔ پالی روڈ۔ باندرہ بمبئی ۵۰

اگلی صبح وہ بہت سویرے بیدار ہو کر اپنے کمرے میں آبیٹھا۔ اس کا کمرہ ... کے ایک جانب تھا۔ وہ بڑی شدت سے اس انجانی لڑکی کے ادھر سے گزرنے کا منتظر تھا ... بے تابی، ذہنی اضطرابی کشمکش میں گھرا سوچ رہا تھا کہ وہ جب ... دیکھے گی تو وہ اسے ... اپنی غلطی ... کی معافی چاہے گا!!

لیکن وہ لڑکی ... لڑکی کے ساتھ

کے بچے ہی ... کی ... سے ... سے پہلے

اس نے ... بے ... اپنی ... کر چکا تھا ... اس کا ...

اس کے ... کے گرد گھوم جاتا ... لگے ... تک ... کو دیں ... اپنے

ہے ... ہو کر اس نے ایک بار پھر ... ہو دیکھا وہ لڑکی آ رہی تھی ... سے

اور اس چال سے ... اس کے ... کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ اس نے ... نظریں

اس کی جانب لگا رکھی تھیں۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ دیکھ رہا تھا ... تو ...

اس کا دل ... جذبے کے تحت لرزنے لگا لیکن وہ اپنی نگاہیں اس کی طرف

سے نہ ہٹا سکا۔ اس نے سوچا چند لمحے بعد وہ اس کے قریب آجائے گی اور وہ اس سے

پوچھے گا کیا تم واقعی میرے لئے ایسے خوبصورت اور پاکیزہ جذبات رکھتی ہو۔ اور

جب وہ شرماتے لجاتے انداز میں اقرار کرے گی تب وہ کہے گا میں تمہیں پا کر اپنے

آپ کو خوش نصیب سمجھوں گا۔ اس نے دیکھا وہ قریب آگئی ہے۔ وہ دانستہ اپنے

کمرے میں چلا آیا۔ اس کا اندازہ صحیح نکلا۔ وہ بڑی جرأت سے اس کے کمرے میں آگئی چند

لمحے تک وہ گہری گہری سانسیں لیتی رہی جو بے ترتیب اور تیز تھیں لیکن خوشبو انگیز

تھیں۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر نقاب تھی۔ اس کے کانوں کی سرخ لوؤں

پر نقرئی آویزے لرزاں نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنے دل میں ایک جذباتی لہر اٹھتی پا کر

سراپا توجہ بن گیا۔ اس نے سوچا اب اس کے لب کانپیں گے وہ اپنے جذبات کا اظہار

کرے گی اور وہ اس سے اپنی تنہا اور اداس زندگی میں چلے آنے کی درخواست کرے گا

وہ یقیناً اپنے جذبات چھپا نہ پائے گی۔ لجا کر شرما کر اقرار کرے گی، اور تب.... لیکن

اب اس کے لب واقعی ہلنے لگے تھے۔ اور پھر ایک نقرئی لہر فضا میں ابھرنے لگی تھی۔

"کیا آپ میری ڈائری مجھے واپس کر دیں گے؟" اس کے ہونٹوں سے بھری شیرینی کی

کیفیت پا کر اس نے سوچا۔ وہ جھوٹ کا سہارا لے، تا کہ وہ اپنے بارے میں اس کے

تأثرات پرکھ سکے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ کیونکہ اس کے جسم کا رُواں رُواں سچ بولنے کو

تیار تھا: "ہاں ـــــ ہاں ـــــ ہاں!!" لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے خاموش چہرے

کو دیکھتا رہا جو اب نقاب سے باہر تھا۔ صبیح، پرکشش اور خوبصورت نرخیز ... کے

کے ساتھ۔ وہ پھر بھی نہ بولا۔ مجبوراً وہ لڑکی خود ہی بولی: "دیکھئے ... نے

آپ کو ڈائری پڑھتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔" وہ لمحہ بھر ٹھہر کر اپنی سانسیں درست کرنے لگی۔

بہت ... لہجے میں وہ بولا: "کیا ہوا...؟"

... لہجے میں بولی: "آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔ ڈائری میری

نہیں ... کی ... ہے ... اس ...

... !!

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد جہاں جہاں گھومتا ہے افواہیں جمع کرتا ہے۔ اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ یہ جنون اس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے پوشش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں۔

اخبار بند ہوجائیں گے

دلی کے کچھ معتبر اور کچھ غیر معتبر حلقوں میں یہ افواہ بڑے زور شور سے گشت لگا رہی ہے کہ ہند سرکار ملک کے تمام اخباروں کی اشاعت ممنوع قرار دینے پر غور کر رہی ہے کیونکہ حکومت کا خیال ہے کہ سوسائٹی کے بہت سے دُکھوں، بے چینیوں اور مصیبتوں کی جڑ یہی اخبارات ہیں۔ اخبارات بے اطمینانی پیدا کرتے اور بڑھاتے ہیں اور سوسائٹی کی پُرامن زندگی میں طوفان پیدا کرتے رہتے ہیں۔

اگر اخبارات واقعی بند ہو گئے تو بڑی دلچسپ صورت حالات پیدا ہو جائے گی۔ سیاسی لیڈر تقریریں کرنا چھوڑ دیں گے یا کم کر دیں گے کیونکہ ننانوے فی صدی لیڈر صرف اس لئے تقریریں کرتے اور بیانات دیتے ہیں کہ وہ اخباروں میں شائع ہو سکیں۔ جیٹ فنڈ کمپنیاں اشتہار نہیں دے سکیں گی اور ممکن ہے اُن میں سے بیشتر کمپنیاں بند ہو جائیں۔ فلموں کے اشتہارات بھی بند ہو جائیں گے جس سے فلم بینی کا جنون بہت کم ہو جائے گا۔ جنگ، حادثے، قحط، قتل، اغوا، خودکشی وغیرہ کی خبریں لوگوں تک نہیں پہنچیں گی جن سے انسانی ذہنوں میں ہر روز ہلچل پیدا ہوتی رہتی ہے۔ جلسوں، میٹنگوں اور کانفرنسوں کی کارروائیاں شائع نہیں ہوا کریں گی۔ جو لوگوں پر متضاد اور زہریلا اثر ڈالتی رہتی ہیں۔ غرض عام آدمی کی زندگی میں ایک نئے قسم کا سکون اور اطمینان شامل ہو جائے گا جس سے وہ آج تک محروم رہے ہیں۔

سُنا گیا ہے کہ یہ افواہ سُن کر تمام پولیٹکل لیڈروں نے (جن میں کانگریسی بھی شامل ہیں) وزیر اعظم شری شاستری کو ایک مشترکہ چٹھی میں دھمکی دی ہے کہ اگر اخبارات بند کر دئے گئے تو ہم سب اپنی پولیٹکل پارٹیاں توڑ دیں گے۔ بلکہ ہندوستان ہی سے ہجرت کر جائیں گے۔

بڑے شہر چھوٹے ہوجائیں گے

آئندہ ہندوستان کے کسی بھی شہر کی آبادی پانچ لاکھ سے زیادہ نہ ہوگی۔۔۔

اسے صرف افواہ ہی مت سمجھئے بلکہ سچ ہی مان لیجئے کہ ہند سرکار ایک انقلابی سکیم تیار کر رہی ہے کہ بڑے بڑے شہروں پر آبادی کا بوجھ بڑھ رہا ہے۔ جو آگے چل کے شہر کا رُخ کرتا ہے جس سے انتظام کرنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ بجلی، پانی، صفائی، رہائش، نوکریوں، ٹریفک وغیرہ کے انتظام میں خطرناک کرائسیس آجاتے ہیں۔ شہروں میں شور و غل اتنا زیادہ بڑھ جاتا ہے جس سے نسیں تن جاتی ہیں، دل فیل ہونے کے واقعات بڑھ جاتے ہیں اور غور و فکر کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ اس سکیم کی رُو سے آئندہ ہندوستان کے کسی شہر کی آبادی پانچ لاکھ سے زیادہ نہیں بڑھنے دی جائے گی۔ موجودہ بڑے بڑے شہروں دلی، بمبئی، کلکتہ، مدراس وغیرہ کی زائد آبادی کو دوسرے چھوٹے چھوٹے شہروں میں منتقل کر دیا جائے گا۔ دیہات اور قصبوں میں شہری لوگ آباد کر دئے جائیں گے۔ اور اس طرح دیہات اور شہروں کا فرق بھی کم ہو جائے گا اور ایک قسم کی مساواتی فضا پیدا ہو جائے گی۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اس سکیم سے ہندوستان میں ایک نئی طرز کا صحت مندانہ اور خوشحال سماج جنم لے گا اور اس کا اثر مہنگائی پر سب سے زیادہ پڑے گا مثلاً دلی شہر میں ایک کمرہ جو آج کل ایک سو روپے کرایہ پر ملتا ہے، پانچ روپے ماہانہ پر ملا کرے گا۔

غریب نوازی کی سکیم

گزشتہ دنوں خبر آئی تھی کہ ہندوستان کے میڈیکل کالجوں میں داخلہ لینے کے لئے آٹھ آٹھ ہزار روپے فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ جس سے غریب طبقہ کے ذہین طالب علم

…ے محروم ہوتے ہیں اور بہت [illegible] … تک … ہے۔

چنانچہ افواہ ہے کہ آئندہ وہ دن گئے نہیں گئے جب دولت مندوں کے لڑکوں پر … پابندی لگائی جانے والی ہے کہ وہ ڈاکٹر بننے کے لئے میڈیکل کالجوں میں داخلہ نہیں … لے۔ صرف ڈاکٹر نہیں بن سکے بلکہ وکیل، انجینئر، مجسٹریٹ، بی اور آئی۔ اے۔ ایس … کے لئے بھی داخلہ کی درخواست نہیں دے سکتے۔ ان کی بجائے صرف ان غریب ماں باپ … بیٹے ہی ڈاکٹر، وکیل، انجینئر اور مجسٹریٹ اور افسر بن سکیں گے جن کی ماہانہ آمدنی پانچ سو روپے … سے کم ہو۔

سنا گیا ہے کہ امیر طبقہ اس افواہ سے بہت پریشان ہو گیا ہے اور اس طبقہ کے … بہت سے افراد یہ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح وہ اپنی آمدنی پانچ سو روپے ماہانہ سے کم … کر سکیں اور چور دروازے سے داخل ہو کر اس تجویز کو تارپیڈو کر دیں اور مفلس … وں کو ایک بار پھر الّو بنا سکیں۔

…الے وزیر بنیں گے

ایک گوالے نے دودھ کا کام چھوڑ کر سمگلنگ کا پیشہ اختیار کر لیا نتیجہ خاطر خواہ … لا۔ وہ آج لاکھوں کا مالک ہے۔ کاروں میں گھومتا ہے، بنگلہ میں رہتا ہے اور ایک … سین ایکٹرس سے شادی کرنے کے درپے ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس خبر سے کئی صوبائی اور مرکزی وزیروں کے منہ میں پانی بھر آیا ہے اور انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ گدّی وزارت پر لات مار دیں گے اور اُس … والے کی طرح سمگلنگ کا نوبل شغل اختیار کر لیں گے۔ کیونکہ اُن کا سماجی مرتبہ گوالوں … سے کئی درجے کم ہو گیا ہے۔

یہ بھی سنا جا رہا ہے کہ اگر وزراء نے وزارت کی کرسیاں خالی کر دیں تو صوبوں کے چیف منسٹروں کو اپنی کیبنٹ بنانے کے لئے بڑی مشکل پیش آئے گی۔ کیونکہ اگر تمام وزیر سمگلر بن گئے تو حکومت کا کام چلنا ناممکن ہو جائے گا۔ ایک اور ضمنی افواہ کے مطابق ایک چیف منسٹر نے تو مذکرہ بالا گوالے کو پیش کش کی ہے کہ اب چیف منسٹر کی کرسی آپ سنبھال لیں۔ کیونکہ آپ کا سماجی مرتبہ مجھ سے بلند ہو گیا ہے اور آپ چاہیں تو اپنی کیبنٹ کے لئے گوالوں میں سے وزیر منتخب کر سکتے ہیں۔

ابھی ابھی جب میں یہ افواہ تحریر کر رہا تھا، ایک کالج کا پروفیسر میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"گوالے کی خبر پڑھ کر میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ پروفیسری چھوڑ کر سمگلنگ کا پیشہ اختیار کر لوں گا۔"

کالے دھن کے مندر

جن مرکزی حضرات کے پاس کروڑوں روپے کا کالا دھن ہے ___ گزشتہ دنوں ایک بہت بڑے مندر میں ان کی ایک خفیہ میٹنگ ہوئی جس میں اس امر پر بڑی تشویش ظاہر کی گئی کہ ہم میں سے کئی کالے دھن والے وزیر خزانہ کی [illegible] کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئے ہیں اور انہوں نے اپنے کالے دھن کا ذرا سا کچھ حصہ جو گورنمنٹ کے سامنے ظاہر کر دیا ہے۔ اس سے کالا دھن [illegible] کے وقار کو ٹھیس پہنچی ہے اور [illegible] رسوا ہوئی ہے۔

میٹنگ میں کالے دھن کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک نئے زاویہ سے بھی غور کیا گیا اور طے کیا گیا کہ کالے دھن کو گورنمنٹ کے حوالے کرنے کی بجائے دان میں دے دیا جائے کیونکہ دان دئے دھن نہ گھٹے کہہ گئے بھگت کبیر ___ چنانچہ اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کالے دھن سے ہندوستان بھر میں بڑے بڑے قیمتی اور عالیشان مندر تعمیر کئے جائیں۔ کیونکہ مندروں کی تعمیر پر سرکار بھی کوئی اعتراض نہیں کر سکے گی اور اس سے ہندوستانی عوام میں دھارمک خیالات کی بھی اشاعت ہوگی۔ سماج میں جو اخلاقی گراوٹیں آ گئی ہیں وہ مندروں کی تعداد بڑھنے سے وہ گراوٹیں دُور ہو جائیں گی اور اخلاق بلند کرنے میں مدد ملے گی۔

میٹنگ میں ایک دو کالے دھن پتیوں کی طرف سے یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ وزیر خزانہ سے درخواست کی جائے کہ اگر وہ ہمارے سارے کالے دھن کو سفید ماننے پر تیار ہو جائیں تو ہم اپنا کالا دھن ظاہر کرنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن یہ تجویز مسترد کر دی گئی کہ اس سے گورنمنٹ کا وقار خطرہ میں پڑ جائے گا۔ اور اسے اپنے پہلے اعلان کو واپس لینا پڑے گا۔ لہٰذا گورنمنٹ کے وقار کو بچانے کی خاطر یہ تجویز رد کر دی گئی۔

اُمید کی جاتی ہے کہ آنے والے ایک دو برس میں ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں بڑے بڑے عالیشان مندر تعمیر ہونا شروع ہو جائیں گے اور کالے دھن کی برکت سے دھرم اور اخلاق کی اشاعت عام ہو جائے گی۔

بلبل نہیں گائیں گے

مشہور فلمی موسیقاروں لتا منگیشکر، محمد رفیع، مکیش اور طلعت محمود نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اب ہندوستان میں نہیں رہیں گے اور آنے والے پانچ سال یورپ میں سکون کی زندگی گزاریں گے ___ ایک افواہ یہ بھی ہے کہ وہ یورپ کی بجائے ہمالیہ پربت پر جا رہے ہیں۔ جہاں وہ رشی منیوں کی طرح رہیں گے۔

اس انوکھے فیصلہ کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ گزشتہ دنوں آل انڈیا ریڈیو کے ارباب اختیار نے ان موسیقاروں سے پُر زور درخواست کی تھی کہ چونکہ ریڈیو کا پچھتر فی صدی پروگرام آپ حضرات کے گانوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ریڈیو سننے والے صرف آپ کے گانے سننے کے لئے ہی ریڈیو سیٹ کھولتے ہیں۔ اور ہمارے دوسرے تعمیری پروگرام بالکل نہیں سنتے جس سے ریڈیو کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے کیونکہ ہم ریڈیو اسٹیشنوں سے جتنے بھی تعمیری پروگرام نشر کرتے ہیں وہ سنے ہی نہیں جاتے اور ریڈیو ڈیپارٹمنٹ کی ساری محنت، روپیہ اور دماغ بالکل ضائع ہو رہا ہے۔

چنانچہ افواہ ہے کہ ان چاروں موسیقاروں نے قوم اور ملک کی تعمیر کی خاطر اپنی قربانی دینا منظور کر لی ہے اور آئندہ پانچ برس تک وہ ایک بھی گانا نہیں بنائیں گے اور ملک سے عارضی ہجرت کر جائیں گے۔

فلمی موسیقاروں کے اس فیصلہ کی مخالفت فلم کمپنیوں اور ریکارڈنگ کمپنیوں کی طرف سے کی جا رہی ہے اور وہ اس فیصلہ کو بدلوانے کی خاطر شاید مرن برت بھی رکھیں لیکن موسیقار ابھی تک اپنے فیصلہ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ اور وہ کروڑوں کی قوم کے مقابلہ میں چند لوگوں کے مرن برت کی پروا نہیں کریں گے اور چلے جائیں گے۔

حسیناؤں کی یونین

دہلی میں یہ افواہ بڑی سنجیدگی سے گشت لگا رہی ہے کہ یہاں قابل شادی نوجوان لڑکیوں نے اپنی ایک یونین بنائی ہے اور اس کے ممبروں کی تعداد پچاس ہزار تک جا پہنچی ہے۔

اس یونین کا مقصد بے حد دلچسپ اور انوکھا بیان کیا جاتا ہے۔ سنا ہے کہ اس یونین کے ذریعے جہیز کی بدعت کا قلع قمع کیا جائے گا اور آئندہ دہلی میں جو بھی شادی ہوگی، یونین کی منظوری سے ہوگی۔ لڑکے والوں میں لڑکی والوں سے مال و دولت بٹورنے کا جو رجحان بڑھ رہا ہے اور جس سے ان گنت نوجوان لڑکیاں کنواری بیٹھنے پر مجبور ہو رہی ہیں۔ یونین ان کی شادیوں کا ذمہ لے گی اور اس وقت تک دہلی کے کسی نوجوان لڑکے کو دولہا بننا نصیب نہیں ہوگا جب تک اسے یونین کی منظوری نہیں مل جائے گی۔ یونین کی کوئی ممبر لڑکی اس وقت تک شادی نہیں کرے گی جب تک اسے یونین اجازت نہیں دے گی۔ ہر شادی یونین کی سرکردگی میں ہوگی۔ جو نہایت سادہ طریقے سے کی جائے گی۔ جہیز، دھوم دھڑکا، باجے گاجے، روشنیاں اور فضول اخراجات کی سختی سے چیکنگ کی جائے گی۔ اگر یونین کی کوئی ممبر لڑکی خلاف ورزی کرے گی تو اس کی شادی کے وقت پکٹنگ اور مظاہرے کئے جائیں گے۔ جو لڑکا اپنی امیری کی دھونس میں جہیز اور شاندار بارات کا مطالبہ کرے گا اسے عمر بھر کنوارا رہنا پڑے گا۔

کہا جاتا ہے کہ یونین کی پچاس ہزار ممبروں نے اپنی نازک انگلیوں کے خون سے حلف نامہ پر دستخط کر دئے ہیں اور دھڑا دھڑ نئی ممبروں کی بھرتی جاری ہے لیکن یہ بھرتی اس خفیہ طریقے سے ہو رہی ہے کہ یونین کی کئی ممبر اپنے ممبر ہونے کو تسلیم نہیں کر رہی ہیں۔

سنا ہے کہ اگر دہلی میں یہ تجربہ کامیاب رہا تو اس کے بعد ہندوستان بھر میں اس یونین کی شاخیں قائم کی جائیں گی۔ اور جو کام سرکار اور قانون سے نہ ہو سکا، اسے خود نوجوان لڑکیاں ہی پورا کر دکھائیں گی۔

چھوٹی موٹی افواہیں

- شراب بندی سکیم کی بُری طرح ناکامی پر شری مرار جی ڈیسائی کو دل کے دورے شروع ہو گئے — سنا ہے ڈاکٹروں نے انھیں مشورہ دیا ہے کہ دل کو نارمل حالت پر لانے کے لئے وہ دن میں ایک بار جامِ مے نوش فرمایا کریں۔
- شیخ عبداللہ نے ہند سرکار سے درخواست کی ہے کہ یا تو مجھے اوٹا کمنڈ سے کسی دوسرے شہر میں منتقل کر دیا جائے یا مرزا افضل بیگ کو اوٹا کمنڈ سے کہیں اور بھیج دیا جائے۔ کیونکہ یہ شخص میرے ذہنی سکون کو برباد کر رہا ہے۔
- ہندوستان کے گداگروں نے سرکار سے ایک وفد کے ذریعہ اپیل کی ہے کہ وہ گداگری کا پیشہ ترک کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ انھیں گداگری کی بجائے چوری کرنے کی قانونی اجازت دے دی جائے۔ سنا ہے ہند سرکار اس اپیل پر ہمدردانہ غور کر رہی ہے۔
- ہندوستانی وکلاء کی انجمن اس امر پر غور کر رہی ہے کہ آئندہ وہ جس مقدمہ میں ہار جائیں اپنے مؤکل کی فیس واپس کر دیں۔
- آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے کانگریس کا ممبر بنانے کے لئے امتحان کا سسٹم رائج کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو آدمی کانگریس کا ممبر بننا چاہے گا اسے پنڈت نہرو کی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" میں سے ایک ٹیسٹ پیپر دینا پڑے گا۔ یہ شرط موجودہ کانگریسی ممبروں پر بھی لاگو کی جائے گی۔
- فکر تونسوی نے آئندہ ہفتہ میں ایک بار سگریٹ برت رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ فکر تونسوی سے جب اس کے متعلق استفسار کیا گیا تو اس نے مسکرا کر کہا:
یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی

[...] محروم ہو رہے ہیں اور بہت حد تک [...] کے لئے بے حد دردناک [...] ہو رہا ہے۔

چنانچہ افواہ ہے کہ آئندہ دس برسوں کے لئے دولت مندوں کے لڑکوں پر [پا]بندی لگائی جانے والی ہے کہ وہ ڈاکٹر بننے کے لئے میڈیکل کالجوں میں داخلہ نہیں [لے سک]یں گے۔ صرف ڈاکٹر ہی نہیں بن سکیں گے بلکہ وکیل، انجینئر، مجسٹریٹ، جج اور آئی۔ اے۔ ایس [بننے] کے لئے بھی داخلہ کی درخواست نہیں دے سکیں گے۔ ان کی بجائے صرف انہی غریب ماں باپ [کے بچ]ے ہی ڈاکٹر، وکیل، انجینئر اور مجسٹریٹ اور افسر بن سکیں گے جن کی آمدنی پانچ سو روپے [ماہوار] سے کم ہو۔

سنا گیا ہے کہ امیر طبقہ اس افواہ سے بہت پریشان ہو گیا ہے اور اس طبقہ کے [ب]ہت سے افراد یہ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح اپنی آمدنی پانچ سو روپے ماہانہ سے کم [ظا]ہر کر سکیں اور چور دروازے سے داخل ہو کر اس تجویز کو تارپیڈو کر دیں اور مفلس [...]وں کو ایک بار پھر الّو بنا سکیں۔

[...]والے وزیر بنیں گے ●

ایک گوالے نے دودھ کا کام چھوڑ کر سمگلنگ کا پیشہ اختیار کر لیا۔ نتیجہ خاطر خواہ [ن]کلا۔ وہ آج لاکھوں کا مالک ہے۔ کاروں میں گھومتا ہے، بنگلہ میں رہتا ہے اور ایک [...]سین ایکٹرس سے شادی کرنے کے درپے ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس خبر سے کئی صوبائی اور مرکزی وزیروں کے منہ میں پانی بھر آیا ہے اور انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ کرسی وزارت پر لات مار دیں گے اور اس [گو]الے کی طرح سمگلنگ کا قومی شغل اختیار کر لیں گے۔ کیونکہ ان کا سماجی مرتبہ گوالوں سے کئی درجے کم ہو گیا ہے۔

یہ بھی سنا جا رہا ہے کہ اگر وزراء نے وزارت کی کرسیاں خالی کر دیں تو صوبوں کے چیف منسٹروں کو اپنی کیبنٹ بنانے کے لئے بڑی مشکل پیش آئے گی۔ کیونکہ اگر تمام وزیر سمگلر بن گئے تو حکومت کا کام چلنا ناممکن ہو جائے گا۔ ایک اور ضمنی افواہ کے مطابق ایک چیف منسٹر نے تو متذکرہ بالا گوالے کو پیش کش کی ہے کہ اب چیف منسٹر کی کرسی آپ سنبھال لیں۔ کیونکہ آپ کا سماجی مرتبہ مجھ سے بلند ہو گیا ہے اور آپ چاہیں تو اپنی کیبنٹ کے لئے گوالوں میں سے وزیر منتخب کر سکتے ہیں۔

ابھی ابھی جب میں یہ افواہ تحریر کر رہا تھا، ایک کالج کا پروفیسر میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"گوالے کی خبر پڑھ کر میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ پروفیسری چھوڑ کر سمگلنگ کا پیشہ اختیار کر لوں گا۔"

کالے دھن کے مندر ●

جن معزز حضرات کے پاس کروڑوں روپے کا کالا دھن ہے ـــــ گزشتہ دنوں ایک بہت بڑے مندر میں ان کی ایک خفیہ میٹنگ ہوئی جس میں پاس اور بڑی تشویش ظاہر کی گئی کہ ہم میں سے کئی کالے دھن والے وزیر خزانہ شری [...] کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئے ہیں اور انہوں نے اپنے کالے دھن کا، شاید [...] حصہ جو گورنمنٹ کے سامنے ظاہر کر دیا ہے۔ اس سے کالا دھن کمیونٹی کے وقار کو ٹھیس پہنچی ہے اور کمیونٹی رسوا ہوئی ہے۔

میٹنگ میں کالے دھن کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک نئے زاویے سے بھی غور کیا گیا اور طے کیا گیا کہ کالے دھن کو گورنمنٹ کے حوالے کرنے کی بجائے دان میں دے دیا جائے۔ کیونکہ "دان دے دھن نہ گھٹے" کہہ گئے بھگت کبیر ـــــ چنانچہ اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کالے دھن سے ہندوستان بھر میں بڑے بڑے قیمتی اور عالیشان مندر تعمیر کئے جائیں۔ کیونکہ مندروں کی تعمیر پر سرکار بھی کوئی اعتراض نہیں کر سکے گی اور اس سے ہندوستانی عوام میں دھارمک خیالات کی بھی اشاعت ہوگی۔ سماج میں جو اخلاقی گراوٹیں آگئی ہیں، یہ مندروں کی تعداد بڑھنے سے وہ گراوٹیں دور ہو جائیں گی اور اخلاق بلند کرنے میں مدد ملے گی۔

میٹنگ میں ایک دو کالے دھن پتیوں کی طرف سے یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ وزیر خزانہ سے درخواست کی جائے کہ اگر وہ ہمارے سارے کالے دھن کو "سفید" ماننے پر تیار ہو جائیں تو ہم اپنا کالا دھن ظاہر کرنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن یہ تجویز مسترد کر دی گئی کہ اس سے گورنمنٹ کا وقار خطرہ میں پڑ جائے گا۔ اور اسے اپنے پہلے اعلان کو واپس لینا پڑے گا۔ لہٰذا گورنمنٹ کے وقار کو بچانے کی خاطر یہ تجویز رد کر دی گئی۔

امید کی جاتی ہے کہ آنے والے ایک دو برس میں ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں بڑے بڑے عالیشان مندر تعمیر ہونا شروع ہو جائیں گے اور کالے دھن کی برکت سے دھرم اور اخلاق کی اشاعت عام ہو جائے گی۔

بلبل نہیں گائیں گے ●

مشہور فلمی موسیقاروں لتا منگیشکر، محمد رفیع، مکیش اور طلعت محمود نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اب ہندوستان میں نہیں رہیں گے اور آنے والے پانچ سال یورپ میں سکون کی زندگی گزاریں گے ـــــ ایک افواہ یہ بھی ہے کہ وہ یورپ کی بجائے ہمالیہ پربت پر جا رہے ہیں۔ جہاں وہ رشی منیوں کی طرح رہیں گے۔

اِس افسوسناک فیصلہ کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ گزشتہ دنوں آل انڈیا ریڈیو کے اہلکاروں نے اِن موسیقاروں سے پُرزور درخواست کی تھی کہ چونکہ ریڈیو کا بیشتر حصہ ہی پروگرام آپ حضرات کے گانوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ریڈیو سننے والے صرف آپ کے گانے سننے کے لئے ہی ریڈیو سیٹ کھولتے ہیں۔ اور ہمارے دوسرے تعمیری پروگرام بالکل نہیں سنتے جس سے ریڈیو کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہم ریڈیو اسٹیشنوں سے جتنے بھی تعمیری پروگرام نشر کرتے ہیں وہ سنے ہی نہیں جاتے اور ریڈیو ڈیپارٹمنٹ کی ساری محنت، روپیہ اور دماغ بالکل ضائع ہو رہا ہے۔

چنانچہ افواہ ہے کہ اِن چاروں موسیقاروں نے قومی اور مُلکی تعمیر کی خاطر اپنی قربانی دینا منظور کر لی ہے اور آئندہ پانچ برس تک وہ ایک بھی گانا نہیں گائیں گے اور مُلک سے عارضی ہجرت کر جائیں گے۔

فلمی موسیقاروں کے اِس فیصلہ کی مخالفت فلم کمپنیوں اور ریکارڈنگ کمپنیوں کی طرف سے کی جا رہی ہے اور وہ اِس فیصلہ کو بدلوانے کی خاطر شاید مَرن برت بھی رکھیں۔ لیکن موسیقار ابھی تک اپنے فیصلہ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ اور وہ کروڑوں کی قوم کے مقابلہ میں چند لوگوں کے مَرن برت کی پروا نہیں کریں گے اور چلے جائیں گے۔

حسیناؤں کی یونین

دہلی میں یہ افواہ بڑی سنجیدگی سے گشت لگا رہی ہے کہ یہاں قابلِ شادی نوجوان لڑکیوں نے اپنی ایک یونین بنالی ہے اور اِس کے ممبروں کی تعداد پچاس ہزار تک جا پہنچی ہے۔

اِس یونین کا مقصد بے حد دلچسپ اور انوکھا بیان کیا جاتا ہے۔ سُنا ہے کہ اِس یونین کے ذریعے جہیز کی بدعت کا قلع قمع کیا جائے گا اور آئندہ دہلی میں جو بھی شادی ہوگی، یونین کی منظوری سے ہوگی۔ لڑکے والوں میں لڑکی والوں سے مال و دولت بٹورنے کا جو رجحان بڑھ رہا ہے اور جس سے اَن گنت نوجوان لڑکیاں کنواری بیٹھنے پر مجبور ہو رہی ہیں۔ یونین اُن کی شادیوں کا ذمہ لے گی اور اُس وقت تک دہلی کے کسی نوجوان لڑکے کو دُولہا بننا نصیب نہیں ہوگا جب تک اُسے یونین کی منظوری نہیں مل جائے گی۔ یونین کی کوئی ممبر لڑکی اُس وقت تک شادی نہیں کرے گی جب تک اُسے یونین اجازت نہیں دے گی۔ ہر شادی یونین کی سرکردگی میں ہوگی۔ جو نہایت سادہ طریقہ سے کی جائے گی۔ جہیز، دھوم دھڑکا، باجے گاجے، روشنیاں اور فضول اخراجات کی سختی سے چیکنگ کی جائے گی۔ اگر یونین کی کوئی ممبر لڑکی خلاف ورزی کرے گی تو اُس کی شادی کے وقت پکٹنگ اور مظاہرے کئے جائیں گے۔ جو لڑکا اپنی امیری کی دھونس میں جہیز اور ٹھاٹھ باٹ کا مطالبہ کرے گا، اُسے عمر بھر کنوارا رہنا پڑے گا۔

کہا جاتا ہے کہ یونین کی پچاس ہزار ممبروں نے اپنی نازک اُنگلیوں کے خون سے حلف نامہ پر دستخط کر دئے ہیں اور دھڑا دھڑ نئی ممبروں کی بھرتی جاری ہے لیکن یہ بھرتی اِس خفیہ طریقہ سے ہو رہی ہے کہ یونین کی نئی ممبر اپنے ممبر ہونے کو تسلیم نہیں کر رہی ہیں۔

سُنا ہے کہ اگر دہلی میں یہ تجربہ کامیاب رہا تو اُس کے بعد ہندوستان بھر میں اِس یونین کی شاخیں قائم کی جائیں گی۔ اور جو کام سرکار اور قانون سے نہ ہو سکا، اُسے خود نوجوان لڑکیاں ہی پورا کر دکھائیں گی۔

چھوٹی موٹی افواہیں

- شراب بندی سکیم کی بُری طرح ناکامی پر شری مرارجی ڈیسائی کو دل کے دَورے شروع ہو گئے۔ سُنا ہے ڈاکٹروں نے انھیں مشورہ دیا ہے کہ دل کو نارمل حالت پر لانے کے لئے وہ دن میں ایک بار جامِ مے نوش فرمایا کریں۔
- شیخ عبداللہ نے ہند سرکار سے درخواست کی ہے کہ یا تو مجھے کوڈاکنال سے کسی دوسرے شہر میں منتقل کر دیا جائے یا مرزا افضل بیگ کو کوڈاکنال سے کہیں اور بھیج دیا جائے۔ کیونکہ یہ شخص میرے ذہنی سکون کو برباد کر رہا ہے۔
- ہندوستان کے گداگروں کی سنگھ نے ایک وفد کے ذریعہ اپیل کی ہے کہ وہ گداگری کا پیشہ ترک کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ اُنھیں گداگری کی بجائے چوری کرنے کی قانونی اجازت دے دی جائے۔ سُنا ہے ہند سرکار اِس اپیل پر ہمدردانہ غور کر رہی ہے۔
- ہندوستانی وکلاء کی انجمن [illegible] ہے کہ آئندہ وہ جس مقدمہ میں ہار جائیں اپنے موکل کی فیس واپس کر دیں۔
- آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے کانگریس کا ممبر بننے کے لئے امتحان کا سسٹم رائج کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو آدمی کانگریس کا ممبر بننا چاہے گا اُسے پنڈت نہرو کی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" میں سے ایک ٹیسٹ پیپر دینا پڑے گا۔ یہ شرط موجودہ کانگریس ممبروں پر بھی لاگو کی جائے گی۔
- گلزاری نندا نے ہر ہفتہ میں ایک بار مَرن برت رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ گلزاری نندا سے جب اِس کے متعلق استفسار کیا گیا تو اُس نے مسکرا کر کہا
یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی



DA 66/182

افسانہ

دیوار

افروز فاطمہ۔ بی، ایس سی

۳۶۔ نیو ٹیوٹون پٹ شریشہ خلاصی پالیم۔ بنگلور ۲

۵ مئی ۱۹۶۵ء محترم خورشید بھائی! تسلیم

. . . ایک نئی کہانی "دیوار" لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ کہانی کیسی ہے؟ یہ آپ اور قارئین بہتر جانتے ہیں

"شکست" پڑھنے کے بعد کتنی لوگوں نے لکھا تھا کہ میں نے انہی کی کہانی لکھ دی ہے ——

ہو سکتا ہے "دیوار" پر بھی کسی کو اپنی پرچھائیاں نظر آجائیں . . . آپ کی بہن —— افروز فاطمہ

سسکتے رہے ——

اُلجھتے رہے ——

اُلجھتے رہے ——

اور —— روشنی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"میرے خدا! —— یہ میری کہانی کس نے لکھ دی ہے؟"

روشنی کی زندگی کے بیس سال اسی طرح گزرے تھے جیسے ایک خوشحال گھرانے کی لڑکی کے گزرتے ہیں۔ آئینے کی طرح شفاف بچپن —— جس میں رنگین اور خوبصورت عکس ابھرتے تھے۔ بس دادی کی موت کی دھندلی دھندلی پرچھائیاں سی تھیں جو ہمیشہ ان عکسوں کے پیچھے غائب ہو جاتی تھیں۔

مسرتوں سے بھرپور لڑکپن۔ ماں باپ کی محبت۔ بہنوں بھائیوں کی چہلیں۔ دوستوں رشتہ داروں کے قہقہے۔ ہر طرف مسکراہٹیں، مسرتیں، خوشیاں!

اور —— اور بے حد خوش آئند مستقبل۔ جس کے خواب اس نے ان مسرتوں کے درمیان دیکھے تھے۔ بچپن کے رنگین عکس ان خوابوں کو اور بھی خوبصورت بناتے تھے۔

چچا اور ابّو کی محبت جس کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ اماں اور چچی کا خلوص لوگوں کی گفتگو کا موضوع تھا۔ اس کے بہن بھائی، چچازاد بہنیں، چچازاد بھائی ان میں شہاب بھی تھا جسے دادی نے روشنی سے منسوب کر دیا تھا۔

دادی کے مرنے کے بعد چچا چچی نے شہر میں سکونت اختیار کر لی۔ اور ابّو جگہ جگہ کا پانی پینے کے عادی ہو گئے۔ سرکاری ملازمت نے کسی جگہ دو سال سے زیادہ رہنے کا موقع نہ دیا۔

لیکن اس دوری نے محبت اور بڑھا دی۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ آگے بڑھتا رہا۔

بچپن کا زمانہ بیت گیا۔ بچے بڑھتے گئے۔ پودے تناور درخت بن گئے اور روشنی بھی بڑی ہو گئی۔

مدّت کے بعد شہاب کی بہن کی شادی میں سب یکجا ہوتے۔ ابّو اور چچا نے دادی کی آرزو پوری کرنی چاہی۔ چچی نے بڑے ہی ارمانوں سے شہاب کی منگنی کی تیاریاں شروع کیں۔

نئی روشنی میں پروان چڑھے شہاب نے روشنی کی بڑی بہن روبی کو رازدار بنایا اور روشنی کی مرضی معلوم کرنی چاہی۔

روبی نے روشنی سے جواب مانگا۔ اس کا جواب ہاں کے سوا ہو ہی کیا سکتا تھا۔

اور پھر چچی نے بڑے ہی چاؤ سے روشنی کو منگنی کی انگوٹھی پہنا دی۔

لیکن ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ یکایک ایک بھونچال سا آگیا۔

ابّو اور چچا کی دوستی کی انتہا نہ رہی۔ دو بھائیوں کے درمیان [illegible] دولت ایسی کسی کی نہ ہوئی۔ جو کسی کی نہیں ہوتی!

دونوں بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اُن کی محبت جس کی مثالیں دی جاتی تھیں، ایسے ختم ہو گئی جیسے کھلی شیشی سے سینٹ کی خوشبو!

بات اتنی کیسے بڑھی، آج تک روشنی کی سمجھ میں نہ آسکا۔ کس نے بڑھائی؟ اس کا فیصلہ بھی اُس کا دماغ نہ کر سکا۔ چاچا کو بچپن سے دیکھتی آئی تھی۔ خاموش، سنجیدہ، کم بات میں دخل نہ دینے والے۔ اُس کا دل انھیں قصور وار ٹھہرانے پر کبھی راضی نہ ہوتا۔ اور اس کے ابّا ــــ وہ کیسے انھیں قصور وار کہہ سکتی تھی؟

جائداد بٹ گئی، دولت تقسیم ہو گئی۔ کوٹھی کے دو حصے ہو گئے۔

اینٹوں اور چونے کی دیواروں نے کوٹھی ہی کو نہیں، خاندان کو بھی تقسیم کر دیا۔ دلوں کو الگ کر دیا۔ دولت نے محبت ختم کر دی۔ دلوں کا فاصلہ بڑھ گیا۔ بھائی ایک دوسرے کے لئے غیر ہو گئے۔ بہنیں اجنبی بن گئیں!

- وہ خدا سے بہت قریب ہے جو خوش خلق اور دوسروں کا بوجھ اٹھانے والا ہے۔ (حضرت بایزید بسطامیؒ)
- جب کام زیادہ ہوں تو سب سے پہلے اُس کام کو ہاتھ میں لو جو سب سے اہم ہو۔ (حضرت امام شافعیؒ)
- لوگ بیماری کے خوف سے غذا چھوڑ دیتے ہیں لیکن عذابِ الٰہی کے خوف سے گناہ نہیں چھوڑتے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- اُس کی ہمت پر قربان جو نیک کام اخلاص سے کرتا ہے۔ (حضرت شیخ سعدیؒ)
- افراط و تفریط سے الگ رہو۔ اعتدال کو اپنا شیوہ بناؤ۔ (ابن یمین)
- عقل سے بہتر ہمارا کوئی رفیق نہیں۔ (کے خسرو)

اور ــــ روشنی پر جیسے بم پھٹ پڑا۔

اُس کے خواب ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئے، بکھر گئے۔ اُن کی کرچیاں اُس کے دل میں چبھ گئیں۔ زخم بن گئے۔ رستے ہوئے زخم! جنھیں وہ کسی کو دکھا بھی نہ سکتی تھی۔ اُف بھی نہ کر سکتی تھی کسی کے سامنے۔

اور پھر ــــ اس کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ شادی ــــ جو شعیب سے نہیں ہو رہی تھی۔

دو مہینے رہ گئے تھے شادی میں۔

روشنی نے سر اٹھایا اور پڑھنے لگی۔

دو مہینے رہ گئے تھے سالکہ کی شادی کو۔

شادی جو آصف سے نہیں ہو رہی تھی۔

سالکہ اُس وقت سے اپنے آپ کو آصف کی دلہن سمجھتی تھی جب یہ بھی نہ جانتی تھی کہ شادی بیاہ کیا ہوتا ہے۔ دلہن کسے کہتے ہیں۔ اُس نے ابھی ہوش بھی نہ سنبھالا تھا کہ دادی کے الفاظ کان میں پڑے ــــ "یہ تو ہے آصف کی دلہن ہے۔"

پھر کئی بار چچی کو آصف کی دلہن کہتے سنا۔

ذرا بڑی ہوئی۔ دلہن کے معنی سمجھ میں آنے لگے۔ آصف کے بھیا بھی "بھیا کی دلہن" ــــ "ہماری بھابی" کہہ کر چھیڑنے لگے۔

اور پھر ایک دن چند مہمانوں کے سامنے امّاں کو بھی کہتے سنا: "یہ تو بچپن ہی سے آصف کے لئے مانگی جا چکی ہے۔"

آصف اُس کے ساتھ کوئی خصوصیت تو نہ برتتا تھا۔ لیکن سالکہ نے اُسے کئی بار کہتے سنا تھا: "اپنی تو ریڈی میڈ دلہن ہے سالکہ!"

اور ہاں ــــ امّاں اور چچی نے کئی بار آصف کے بچپن کا واقعہ ہنس ہنس کر سنایا تھا۔

سالکہ بالکل چھوٹی تھی اُس وقت۔ شاید سال بھر کی ہوگی۔ آصف ابا اُسے کسی دوست کی شادی میں لے گئے تھے۔ واپس آکر آصف امّی سے ضد کرنے لگا کہ "ہم بھی شادی کریں گے۔"

امّی نے ٹالنے کے لئے کہا ــــ "شادی تو کر دیں گے لیکن دلہن کہاں ہے؟"

"دلہن؟" آصف چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا ــــ "سالکہ جو ہے۔ اُسے دلہن بنا دیجئے۔"

امّی خوب ہنسی تھیں اُس وقت۔

ٹالتے ہوئے انھوں نے کہا: "اچھا۔ چچا کو آ جانے دو۔ اُن سے پوچھ کر شادی کریں گے۔"

آصف ضد کرنے لگا ــــ "نہیں امّی! دیر ہو جائے گی۔ ابھی کر دیجئے۔"

امّی نے سمجھایا ــــ "نہیں بیٹے! سالکہ اُن کی بیٹی ہے۔ بغیر اُن سے پوچھے کیسے شادی کر دیں۔ انھیں آ جانے دو۔"

آصف اپنی بسم اللہ پر بنی ہوئی کمخواب کی شیروانی پہنے ٹہلنے لگا چچا کے انتظار میں۔ اور آخر تھک کر سو گیا۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن امّاں نے کئی بار یہ واقعہ دہرایا تھا اور بات اس بات پر ختم کر دیا تھا کہ گھر میں اور ساری بچیاں تھیں۔ ساجدہ تھی ــ سالکہ کی بہن

لیکن آصف نے سالکہ کو کہاں دیکھا تھا؟

اور ـــــ پھر پچھلی بار جب سب لوگ عابدہ کی شادی میں شریک ہوئے تو آصف کی نظروں کی چوری چھپا نہ سالکہ کی نگاہوں میں دیکھ لیا۔

اور اُس ہنگامہ میں جانے کیسے آصف نے موقع نکال کر سالکہ کو تنہائی میں پکڑ لیا۔

"سالکہ! تم جانتی ہو۔ بچپن سے امی اور چچی جان کا کیا ارادہ ہے ہمارے بارے میں ـــــ اور اب امی تو بہت آگے کی سوچ رہی ہیں۔ میں ہرگز نہ ہونے دوں گا جب تک تم مجھ سے اپنی زبان سے کہہ نہ دو گی کہ تم خوش ہو اور اس میں تمہاری مرضی شامل ہے۔"

کسی کے آجانے کے ڈر سے اور شرم سے سالکہ دُہری ہوتی جا رہی تھی۔ آصف کا اصرار بڑھتا ہی گیا۔ پھر سالکہ کو ہاں کہنی ہی پڑی۔

اس کے بعد تو سالکہ کے خواب اور زیادہ روشن ہو گئے۔ اور بھی رنگین ہو گئے۔ جب بھی شادی کا ذکر ہوتا سالکہ کی آنکھوں میں دولہا بنا ہوا آصف گھومنے لگتا۔

اور اب سالکہ کی شادی ہو رہی تھی۔ لیکن دولہا آصف نہیں تھا۔

کوئی اور ـــــ اور ـــــ اس کا تصور ہی سالکہ کا خون خشک کئے دیتا تھا۔ جسے ہمیشہ اپنا سمجھا۔ جو ہمیشہ خیالوں میں بسا رہا۔ وہ اُس کا نہیں تھا۔ کوئی آصف کا نام لینا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔

اور سالکہ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ گیلی لکڑی کی طرح۔ دھوئیں میں اُس کا دم گھٹتا رہا۔ وہ خاموشی سے گھٹتی رہی۔

دن گزرتے رہے ـــــ

چند دن رہ گئے تھے شادی میں کہ سالکہ نے بہت ساری ٹیڑھی میڑھی راہوں میں ایک ایسا راستہ تلاش کر لیا جو اُسے آصف تک لے جاتا تھا۔

اُس نے فوراً اُس راہ پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں اپنے کئے ہوئے فیصلے پر! ـــــ وہ ناچ اُٹھی۔

"میرے خواب مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا! انہیں کوئی نہیں توڑ سکتا۔ میں اُن ہاتھوں ہی کو توڑ دوں گی جو اس ارادہ سے اُٹھیں گے۔ آصف کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا! میں اپنی زندگی اور مستقبل کسی پر قربان نہیں کروں گی۔ کاش ابا یہ سمجھیں نہیں؟"

اور وہ مطمئن ہو گئی۔

ـــــ

روشنی نے بہت ہی بے چینی سے صفحہ اُلٹا۔

صفحہ پر سرخ فیتہ رکھا ہوا تھا۔ روشنی چونک پڑی۔ لیکن سالکہ کا فیصلہ جاننے کے لئے آگے پڑھنے لگی۔

"چونڈہ ایکسپریس آصف اور سالکہ کو لئے آگرہ چلی جا رہی تھی۔ دونوں مطمئن تھے کہ اب انہیں کوئی نہیں جدا کر سکتا۔"

روشنی کے ہاتھ سے کتاب گر پڑی۔

"تو ـــــ تو ... یہ انہوں نے ... مجھے روشنی دکھائی ہو کر ... ایسا کیا جائے ـــــ"

اُس نے ٹک ٹک کر سوچا۔

رجنی کی شادی سے واپسی پر کافی دیر ہو گئی تھی۔ شاید گیارہ بج رہے تھے

- یہ ضروری نہیں کہ ہر آدمی دولت مند اور عالی رتبہ ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ عقلمند ہو۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ نیک چلن اور ایماندار ہو۔ (بیکن)
- دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ تفصیل پر اختصار کو ترجیح دی جائے۔ تفصیل اکثر صبر آزما ہوتی ہے۔ (شیکسپیر)
- بے شک دیر تک سوچو لیکن سوچنے کے بعد جو فیصلہ کرو وہ اٹل ہو۔ (فرینکلن)
- استدلال سے گفتگو کرنا فصاحت سے بہتر ہے۔ (بیکن)
- دل میں نو برائیاں صرف سستی سے پیدا ہوتی ہیں۔ (بیکن)
- جو والدین صبر نہیں سکھاتے وہ آسودگی کے تلخ تجربات سکھاتے ہیں۔ (ہربرٹ اسپنسر)

میز پر پارسل رکھا ہوا تھا۔ اُسے بے حد حیرت ہوئی تھی کہ اُس نے یہ کتاب تو نہیں منگائی تھی لیکن کتاب پڑھنے کے شوق میں سب بھول گئی تھی۔ اب ـــــ یہ سرخ فیتہ اور وہ بھی اِس صفحے پر دیکھ کر آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا۔ شک یقین میں بدل گیا۔

اور وہ اِس اقدام کے امکانات پر غور کرنے لگی۔

ـــــ

ٹوٹے ہوئے خواب آہستہ آہستہ جڑ گئے۔ رنگ اُبھر آئے۔ خوبصورتی پھر لوٹ آئی۔ سب کچھ کیا تھا۔ وہی مسرتیں، خوشیاں، سکون ہی سکون، محبت، پیار ـــــ!

وہ مسحور سی ہو گئی۔ کھو سی گئی۔

ـــــ

"زہرہ کی ماں شاہم نے۔"

"کیا بات ہے خالہ؟"

"وہی روشنی کے متعلق!"

"کیا ہوا روشنی کو؟ اُس کی تو شادی ہونے والی تھی۔ انھوں نے انکار تو نہیں کر دیا؟"

"وہ انکار کیوں کریں گے۔ جانتی ہو اُس کی منگنی اُس کے چچازاد بھائی کے ساتھ ہو گئی تھی۔"

"ہاں ——— مگر اب ہوا کیا خالہ؟"

"ہوا کیا۔ روشنی بھاگ گئی اپنے بچپن کے منگیتر کے ساتھ!"

"کیا کہا ——— بھاگ گئی؟ ——— نہیں خالہ! روشنی ایسی لڑکی تو نہیں تھی۔"

"روشنی ایسی لڑکی نہیں تھی۔ لیکن بی بی لڑکی کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے۔ اُس کے ابا کو سوچنا چاہیے تھا۔ بچپن سے روشنی اور شہاب کا نام لگا ہوا تھا۔ وہ شروع سے اُس سے منسوب تھی۔ اُس کا بھی تو دل ہے۔ اب یکایک منگنی توڑ دی گئی۔ میں تو کہوں اُس نے اچھا ہی کیا۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو خالہ! اچھا کیا ——— ؟ خاک اچھا کیا۔ خاندان کی عزت خاک میں ملا دی۔ ماں باپ کی ناک کٹوا دی۔ یہ اچھا کیا؟ ایسا بھی کیا دل، ایسے بھی کیا ارمان جو اچھا بُرا نہ دیکھیں۔ آگ میں جھونک دو ایسے دل کو اگر حد سے بڑھنا چاہے۔ ہندوستانی لڑکی اپنے ارمان، اپنی محبت دل میں دفن کرنا بھی جانتی ہے۔ سمجھیں ——— ؟"

"بیگم! میں نے بہت ہی عجیب خبر سُنی ہے آج۔ یقین ہی نہیں آتا۔ شریفوں کے خاندان میں بھی ایسا ہوتا ہے؟"

"روشنی کی بات کہہ رہے ہو نا؟ لڑکیوں کو پڑھانے کا نتیجہ دیکھ لیا؟ خدا کا شکر ہے میں نے زلیخا کا اسکول چھڑوا دیا۔ لڑکیاں ناک کٹاتی ہیں ماں باپ کی، پڑھ لکھ کر۔"

"کتنی بار کہا ہے رومی سے نہ ملا کر۔ سنتی ہی نہیں کمبخت۔ بڑی بہن گھر سے بھاگ گئی۔ یہ جانے کیا گل کھلائے۔ خبردار جو تو گئی رومی کے گھر!"

"یار ——— دیکھا انھیں ——— یہی ہیں جن کی لونڈیا چچازاد بھائی کے ساتھ فرار ہو گئی۔"

"افتخار! تمھاری بہن کہاں ہے؟"

"گھر میں ہے۔"

"رومی کو کہہ رہے ہو نا؟ میں روشنی کو پوچھ رہا ہوں۔"

"وہ ——— وہ . . ."

"بھاگ گئی ہے نا؟ کہتے کیوں نہیں یار کہ بہن بھاگ گئی؟"

"رومی تمھاری روشنی بجیا بھاگ گئی ہیں نا گھر چھوڑ کر؟"

"جانے کہاں چلی گئیں زہرہ! ——— میں جانتی ہی نہیں۔ نانی سے پوچھو تو مارتی ہیں کہ اُن کا نام نہ لو۔"

"اے بیوی ——— میں نے کہا ——— انور حسین کی بیوی بھی آئی ہیں نا شادی میں ——— ؟ وہی جن کی لڑکی چچازاد بھائی کے ساتھ بھاگ گئی!"

"ہاں آئی تو ہیں۔ وہ دیکھو اُدھر بیٹھی ہیں۔ اُس کونے میں۔ ارے وہی قرمزی ساڑی والی بی بی ——— مُنہ دِکھانے کے قابل نہ رکھا لڑکی نے انھیں؟"

"میرے بہت کہنے سُننے سے آئی ہیں۔ ورنہ آنا جانا ہی چھوڑ دیا ہے کہیں۔"

روشنی نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے۔

لیکن آوازیں برابر آتی رہیں۔

جانی پہچانی آوازیں، رشتہ داروں کی، محلّہ والوں کی، دوستوں کی آوازیں جو اُس نے ایسے بہت سے موقعوں پر سُنی تھیں۔

کسی کی موت پر، کسی کی شادی پر، کسی کے دیوالیہ ہونے پر، کسی کے گھر کرنے پر، کسی کے گھر جانے پر۔

ہمدردی کرتی ہوئی آوازیں، روتی ہوئی، ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی، طنز کرتی ہوئی۔

یہی آوازیں اِس پر بھی اُٹھیں گی۔ اِس کا نام لیا جائے گا۔ یہ ملامت کا نشانہ بنے گی۔ ہو سکتا ہے کوئی ہمدردی بھی کر لے۔

وہ زور زور سے سر جھٹکنے لگی۔

"نہیں نہیں۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ کبھی نہیں۔"

بے شک مجھے شہاب سے محبت ہے۔ بے شک وہ میرے خوابوں کا شہزادہ ہے۔

ہے میرے خوابوں کی دنیا آباد ہے۔ لیکن ـــــ لیکن ـــــ میں اُس کے لئے ایسا
سکوں گی۔

اپنے خواب، اپنی محبت ـــــ مجھے اپنے ماں باپ پر قربان کر دینا چاہئے۔
ے جو سی کتنی لڑکیاں ہیں جنھوں نے اپنا سب کچھ ماں باپ پر قربان کر دیا ہے ـــــ
ے کتنی ہیں جن کے درمیان دیواریں حائل ہیں۔ ہر طرح کی دیواریں! دولت کی،
ی کی، مرتبہ کی، نفرت کی۔ جنھیں وہ پھلانگ نہیں سکتیں، ڈھا نہیں سکتیں ـــــ وہ
ی تو اپنے ارمان دفن کر دیتی ہیں اپنے سینوں میں۔

میرا دل بھی مدفن بنے گا۔ میرے ٹوٹے ہوئے خوابوں کا ـــــ کوئی نہ جان
ے گا کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ اُف بھی نہ نکلے گی میری زباں سے۔ میں رووں گی
ں نہیں۔ اکیلے میں بھی نہیں۔

آنسو آنکھوں میں بھرے ہوتے تھے لیکن روشی نے انھیں نکلنے نہ دیا۔ گلے
ں آنسوؤں کا پھندا سا پڑ گیا۔ دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا ـــــ وہ آنگن
ں نکل آئی۔

رات اپنا سفر پورا کر رہی تھی۔ تاروں کے چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ اُن کی ہلکی
ں روشنی میں روشی کی نظر دیوار پر پڑی۔ اُس دیوار پر جس نے اُسے شہاب سے
ں کر دیا تھا۔

گھٹن بڑھے گی ـــــ

"اس دیوار کو ڈھانا بہت آسان ہے۔ میرا ایک قدم اس دیوار کو ڈھانے کے لئے کافی ہے۔ لیکن میں یہ نہ کر سکوں گی۔

شہاب مجھے معاف کرنا۔ میں اتنی بڑی قربانی نہ دے سکوں گی۔ اس دیوار میں دو بھائیوں کی محبت کا خون شامل ہے۔ اس کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے شہاب! بہت بڑھ گئی ہے۔ ہم اسے کسی بھی حالت میں نہیں توڑ سکتے!"

گھٹن اور بڑھ گئی۔

اس نے پلٹ کر گھڑے سے پانی پیا۔

اور ـــــ آہستہ آہستہ اندر چلی گئی۔

دیوار کی دوسری طرف شہاب نے پچیسواں سگریٹ سلگایا۔

"ہوڑہ ایکسپریس سالکہ اور آصف کو لئے آڑی چلی جا رہی تھی۔ دونوں مطمئن تھے کہ اب انھیں کوئی نہیں جدا کر سکتا۔"

روشی نے کتاب آہستہ سے میز پر رکھ دی۔

سگریٹ سے نکلتی ہوئی دھوئیں کی باریک سی لکیر پر نظریں جماتے ہوئے اس نے سوچا: "ایسا تو صرف ناولوں ہی میں ہوتا ہے۔"

غزل

رن سنگھ ہنر ـــــ

ں جہاں بھی مرے پاؤں ڈگمگاتے ہیں
وہیں وہیں وہ مری رہ بری کو آتے ہیں
ن میں مہر و وفا ہے نہ اِن میں صدق و صفا
یہ آدمی تو نہیں آدمی کے سائے ہیں
سر نوازیٔ حسنِ ازل تعالی اللہ!
مری نگاہ میں جلوے وہی سمائے ہیں
ثِ رحمتِ باری ہے ہم کو محشر میں
گناہگار کی صورت بنا کے آئے ہیں
سی خوشی ہی گزاری ہے زندگی ہم نے
مصیبتوں کو بھی دیکھا تو مسکرائے ہیں
ہنرؔ فریب نہیں یہ جہان کیا دیتا
یہاں تو سوچ سمجھ کر فریب کھائے ہیں

ساغر مہدی ـــــ

چاک ہر گل کی قبا ہے اِس بار
یہی جینے کی ادا ہے اِس بار
میرے سینے میں لہو ہو کہ نہ ہو
اُن کے ہاتھوں میں حنا ہے اِس بار
کوئی نغمہ ہے نہ کوئی آواز
یہ خموشی ہی صدا ہے اِس بار
تجھ سے مل کر بھی اُداسی ہے وہی
دل پہ اِک بار سا کیا ہے اِس بار
اب نہ چمکیں گے محبت کے چراغ
کس قدر تیز ہوا ہے اِس بار
تیری آنکھیں جو کہا کرتی ہیں
کچھ تو میں نے بھی سُنا ہے اِس بار

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

شکست کے بعد	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
طوفان کی کلیاں	"	چار روپے
گرجن کی ایک شام	"	تین روپے
الٹا درخت	"	دو روپے پچھتر پیسے
دروازہ	"	دو روپے پچیس پیسے
سسرال	شوکت تھانوی	دو روپے
[illegible]	"	تین روپے پچاس پیسے
بقراط	"	دو روپے پچاس پیسے
کیا بال بچے ہیں	"	تین روپے پچیس پیسے
جوڑ توڑ	"	پانچ روپے
داماد	"	دو روپیہ پچیس پیسے
گوشۂ عافیت	پریم چند	پانچ روپے
چوگان ہستی مکمل	"	گیارہ روپے
دودھ کی قیمت	"	تین روپے
خاک پروانہ	"	تین روپے
صبح زندگی	راشد الخیری	دو روپے
شب زندگی	"	ایک روپیہ پچیس پیسے
شام زندگی	"	ایک روپیہ پچاس پیسے
سیدہ کی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
سمن پوش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
اقبال	"	چار روپے
گرد کارواں	کنہیا لال کپور	تین روپے
سنگ و خشت	"	دو روپیہ پچاس پیسے
سوناگاچی	جاں نثار اختر	چار روپے پچاس پیسے
شعلۂ سنگ	کوثر چاندپوری	تین روپے پچاس پیسے
شمع	اے آر خاتون	پانچ روپے
چشمہ	"	دس روپے پچھتر پیسے
شکیلہ	مسعود جاوید	چار روپے پچیس پیسے

شکست ظلمت	قمر جالندھری	ایک روپیہ پچھتر پیسے
شفق کی کلیاں	"	ایک روپیہ پچھتر پیسے
پہلی محبت	"	ایک روپیہ پچیس پیسے
خواب گاہیں	"	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسدان	"	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نعمت حقانی	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	سیادت	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	"	تین روپے
اکبری دروازہ	"	چار روپے
دوشیزۂ روم	"	تین روپے
دیوانہ	"	تین روپے
دو دیوانے	"	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	"	تین روپے
گناہ	دت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	"	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	"	تین روپے پچھتر پیسے
مغرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
قیامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	"	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	پانچ روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
..دل ہی تو ہے	"	چار روپے پچیس پیسے
ممتاز	ایم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات	"	پانچ روپے
ریحانہ	"	سات روپے

وعدہ	مہندر ناتھ	چار روپیہ پچھتر پیسے
گلی گلی	ام سلمیٰ	چار روپے
فردوس برگشتہ	[illegible]	چار روپے
کنوارپن	[illegible]	چار روپے
[illegible]	[illegible]	دو روپے
[illegible]	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر میکینک گائڈ	قیوم احمد تسکین	چار روپے
موٹر ڈرائیونگ	کرشنا نند شوا	چار روپے پچاس پیسے
کیا خوب آدمی تھا		ایک روپیہ پچیس پیسے
عجیب لڑکی	اوم پرکاش ناہی	تین روپے
چار ناول (پہلا کلیہ)	[illegible]	پچاس پیسے
پہلا پیمانہ " ہندی	"	پچاس پیسے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہر افسر	دو روپے
آندھی میں چراغ	غلام الثقلین	سات روپے پچاس پیسے
اقوال زریں	مصطفیٰ احسن ندوی	پچاس پیسے
انارکلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
[illegible]	ستیہ پال شنکر	دو روپیہ
ابراہیم لنکن	چندر موہن لانبہ	ایک روپیہ پچھتر پیسے
افسانۂ حرمت کے مطالعہ سے	مولانا ابوالکلام آزاد	تین روپے پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	بے سی داس ساجد	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
چھبیس سال بعد	امرتا پریتم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے چھالے	آزاد گلاٹی	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی

افسانہ

یہ قربتیں یہ دوریاں

جی۔ آر۔ سنتوش

معرفت کمار گیلری، سُندر نگر مارکیٹ۔ نئی دہلی

۲۲ر فروری ۶۵ء محترمی خوشتر صاحب آداب

ایک طویل مدت کی خاموشی کے بعد پھر "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہونے کی جسارت کر رہا ہوں ____ "یہ قربتیں یہ دوریاں" اس ایک احساسِ لطیف کی کہانی ہے جو روح کی گہرائیوں میں پلتا ہے۔ اس احساسِ لطیف کو میں نے شعور کی سطح پر لاکر ایک ٹھوس حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، وہ آپ کی گہری نظر اور قارئین کی رائے ہی بتا سکتی ہے ____ میرا ناول "سمندر پیاسا ہے" چھپ کر آیا ہے۔ بہت جلد آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوں گا۔ ویسے میں آج کل آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں۔ ڈی ۲۔ نظام الدین ایسٹ۔ مجھے اس شبھ گھڑی کا انتظار ہے، جب دوریاں آپ کی قربت میں سمٹ کر مجھے پہنچنے کا موقع بخشیں گی . . .

آپ کا ____ سنتوش

میں کالج کے سٹوڈیو میں اکیلا بیٹھا ہوں۔ سامنے ایزل پر لگے ہوئے کورے کینوس پر میری نظریں جمی ہوئی ہیں۔ اچانک جانی پہچانی وہی دو آنکھیں کینوس میں سے جھانکتی ہوئی دکھائی دے گئی ہیں۔ جن کے بارے میں میں نے دوستوں کو اکثر یہ کہتے سنا یہ آنکھیں نہیں نیلگوں وسعتیں ہیں جن میں دیکھتے ہوئے انسان کھو جاتا ہے۔

آج بہت دنوں سے اس کینوس پر رنگ بکھیرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لکیروں کا تانا بانا بُننے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن ہر بار کینوس میں سے جھانکتی ہوئی آنکھیں میرے ہاتھوں کی وہ قوت چھین لیتی ہیں، جو شاہکاروں کو جنم دیتی آئی ہے۔ جب کبھی میں نے ان آنکھوں پر سیاہی تھوپنے کی کوشش کی، یہ مسکرا دیتی ہیں۔ برش میرے ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے۔ میں اپنے ہوش کھو بیٹھتا ہوں اور مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ماضی کی وہ پرچھائیاں جو ہر وقت میرے تعاقب میں رہتی ہیں۔ ایک سایہ بن کر مجھ پر مسلط ہو جاتی ہیں۔

شام ہو چلی ہے اور میں سٹوڈیو بند کرکے پورچ میں کھڑا ہوں۔ سامنے لان میں سیمنٹ کی بنی ہوئی مورتی، شام کی کملاتی ہوئی روشنی میں ایسی دکھائی دے رہی ہے جیسے کوئی کنواری لوگوں کی نظروں سے چھپ چھپا کر اپنے پیا سے ملنے جا رہی ہے۔ لان کے اُس طرف وہ سڑک ہے جو دن کی تیز دھوپ میں سنسان رہتی ہے اور شام ڈھلتے ہی اُس پر تنہائی اور خاموشی میں پلنے والے لمحے جوان ہو جاتے ہیں۔ اِس وقت بھی ہر وقفے کے بعد لڑکے لڑکیوں کے جوڑے ایک دوسرے کا سہارا لئے رینگتے ہوئے جا رہے ہیں۔ ہر قدم پر سرگوشیاں وعدوں میں بدل جاتی ہیں۔ مہکتی کنواری خوشبو سے فضا معطر ہو رہی ہے۔ جوان دل دھڑکتے بےخود ہو جاتے ہیں اور انکار اقرار میں بدل جاتے ہیں۔ مستقبل کی روشن اور تاریک دونوں صورتیں آنکھوں کے سامنے لہرانے لگتی ہیں۔

یہ پورچ تنہائی کا وہ گوشہ ہے جس نے کتنی ہی کہانیوں کو جنم دیا ہے۔ اِس پورچ کے ساتھ اُن آنکھوں کی بھی کہانی وابستہ ہے جو ہر سمت پھیلتی ہوئی نظروں کا جال بُنتی ہیں ____ یہیں بیٹھ کر میں اکثر اپنے ماضی کی بند کتاب کھول کر رکھ دیتا اور اُن نقوش کی تلاش میں کھو جاتا جو زمانے کے حوادث سے دھندلے پڑ گئے تھے۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا کہ میں حال کا باسی ہو کر بھی ماضی کا انسان ہوں۔

ایک ایسی ہی شام کو جب میں ماضی کی یادوں میں کھویا ہوا تھا، اپنے پیچھے کسی چبھتی ہوئی شے کے شدید احساس نے مجھے مُڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ وہی دو آنکھیں تھیں۔ جن کا تذکرہ میں نے یار دوستوں سے سُنا تھا۔ گھنی بوجھل پلکوں سے جھانکتی ہوئی

...بڑی کاجل بھری آنکھیں سمندر کی سی نیلاہٹ اور گہرائیاں لئے مجھ پر گڑی تھیں۔
...ن کے ماضی کے وہ دھندلاتے ہوئے نقوش جیسے روشن ہو کر پھر سیاہ
...ں میں ڈوب گئے۔ میرے سینے میں درد کا ایک طوفان جاگ پڑا تھا اور درد میں
...بی ایک چیخ رات کے سناٹوں میں گونج گئی تھی۔

...بنا وہ ان چھبتی ہوئی نظروں کو!

ایک دبی دبی سی ہنسی میں میری چیخ کی گونج دب کر رہ گئی تھی۔

خاموشیاں انسان کو پاگل بنا دیتی ہیں۔

میں خاموشیوں میں پلی ہوئی وہ آواز ہوں جو دھڑکن بن کر زندہ رہتی ہے۔

فوارے سے چھوٹتے ہوئے پانی کی طرح، کلپنا کی ہنسی نے مجھے بے چین کر دیا
...ر میرا دل رو اُٹھا تھا۔

'اور تنہائیاں خودکشی کا احساس اُبھارتی ہیں'

'خودکشی ایک فرار ہے، زندگی کی دشواریوں سے'

'تو فن کے پجاری کیوں بنے ہو؟'

میں ایک بار پھر اُس کی آنکھوں میں دیکھنے پر مجبور ہوا تھا۔

'اِس لئے کہ وہ بھی ایک فرار ہے۔ لیکن تم کیا چاہتی ہو؟'

کلپنا نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی۔

'فرار'

میں نے چیختے ہوئے پوچھا تھا۔

'کس چیز سے؟'

کلپنا کی سانسوں کا لمس میرے چہرے کو چھو رہا تھا۔

'تنہائی اور خاموشی سے'

اُس کے بعد ایک طویل قہقہہ پگھلتا ہوا سیسہ بن کر میرے ماضی کے رِستے
... ناسوروں میں بھر گیا تھا۔ میں درد کی شدت سے کراہ رہا تھا اور سانسوں کا
...زدیک سے نزدیک تر ہو رہا تھا۔

فضا خاموش ہے۔ کمپنی باغ کے وہ پھول جو دن کی روشنی میں آنکھوں کو
...ک بخشتے ہیں۔ رات کی سیاہی میں اپنے رنگ کھو چکے ہیں۔ بڑ کے درخت کسی
...کم کے انتظار میں گُم سُم کھڑے ہیں۔ یونانی حسینہ کا مجسمہ اپنا ایک ہاتھ چھاتی پر
...ے دُور خلاؤں میں دیکھتا ہوا اپنے آپ سے بے خبر ہے۔ جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا یہ
...تہ اپنے دونوں طرف ایسے گوشوں کو چھپائے ہوئے ہے جن کی تنہائیاں جوان دلوں کو
...نا سکھاتی ہیں۔ میرے قدموں کی چاپ سے مخالف سمت سے آتی ہوئی چاپ اچانک
...اتی ہے اور پھر تیز تیز قدم جھاڑیوں میں گُم ہو جاتے ہیں۔

یہ کمپنی باغ کا وہ تنگ گوشہ ہے۔ جہاں میں اکثر خلاؤں میں ٹکٹکی باندھے تاروں
کو دیکھتا رہا ہوں۔ چاند کے اُجلے چہرے سے داغ مٹانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ یہیں
تنہا خاموش گوشے میں ہی سرگوشیوں نے جنم لیا تھا۔ لیکن وہ سرگوشیاں مختلف تھیں۔
کچھ درد میں ڈوبی ہوئی۔ کچھ محبت کی ٹھنڈک سے بھرپور۔ شفاف چاندنی کی طرح اکثر
یہ سرگوشیاں سسکیوں میں ڈوب جاتیں اور ماضی کے سائے ہر طرف منڈلانے لگتے۔ ایسے
ہیبت ناک منظر سے گھبرا کر میں کلپنا کے آنسو پونچھ لیتا اور اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگتا۔

'کیسے ہیں وہ لوگ جو تمہاری آنکھوں کی اِن نیلگوں وسعتوں میں ڈوب جانے
کے لئے اپنی روشن راہوں کو تاریک بنا کر خوش ہوتے ہیں'

کلپنا کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھرتی، جسے میں اَن سُنی کر دیتا۔

'میں اِن آنکھوں کو صرف دیکھنے کا تمنائی ہوں۔ اِس لئے کہ اِن میں میرے
ماضی کی وہ نامکمل تصویر ہے جس کے رنگ زمانے کے مدّ و جزر نے دھو ڈالے ہیں۔ کون
جانے کہ یہ تصویر کبھی اپنے اصلی رنگوں کو پا سکے گی یا نہیں؟'

کلپنا میری باتوں کو بھول کر اپنی کہتی۔

'اور مجھے تم میں مستقبل کی وہ رنگین اور روشن تصویر دکھائی دے رہی ہے
جس میں ماضی اور حال دونوں اپنی ہیئت کھو دیتے ہیں'

کلپنا کے ملائم ہاتھ کا لمس میرے منتشر خیالات کو ایک نقطے میں سمیٹ کر جکڑ دیتا
اور مجھے محسوس ہوتا جیسے خلاء میں لٹکا ہوا سیّارہ اچانک دھرتی کی جانب کھنچتا چلا آ رہا
ہے اور میں آپ ہی آپ کلپنا کے سینے سے لگ کر انجانے خیالوں میں ڈوب جاتا۔ چند لمحوں
کے لئے میرے ماضی کا تصوّر آنکھوں سے دُور ہو جاتا۔ میں اُسے وقتی سکون سمجھ کر اپنے آپ کو
جھٹک دیتا۔

'دو مخالف سمتوں کو جانے والے رستے کبھی مل نہیں پائیں گے'

'راستے کبھی اچانک کسی موڑ پر ختم بھی ہوتے ہیں'

ماضی کے سائے پھر اچانک نمودار ہو جاتے۔

'وہ موت ہے۔ جس کی اُمید پر میں جی رہا ہوں'

کلپنا اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیتی۔ مجھے سینے سے لگا کر اپنی گھنیری زلفوں
میں یوں چھپا لیتی جیسے میں بلکتا ہوا وہ معصوم بچہ ہوں جو اپنوں سے بچھڑ گیا ہے۔

وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرتی۔

'جس انجام کو تم موت کہتے ہو۔ دراصل وہی آغاز ہے اُس زندگی کا جہاں
قُرب اور دُوری کا امتیاز مِٹ جاتا ہے'

مجھے محسوس ہوتا جیسے برفانی چوٹیوں سے گرتا ہوا پہاڑی نالہ شفاف چٹانوں
سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہا ہے۔ کلپنا کی بانہوں کا حلقہ سمٹ جاتا۔

'میں وہ مجبور دھرتی ہوں جو تمہارے قدموں کو چھو سکے تو پھول ہی پھول کھل اٹھیں گے'

میری نظریں ستاروں سے ہٹ کر کلپنا کی آنکھوں میں دیکھنے لگتیں جن میں پیار کا ساگر آنسو بن کر چھلکنے لگتا۔ نہ جانے کیوں میں بے چین سا ہو جاتا۔

کینوس میں سے جاگتی ہوئی وہ تکتی تکتی سی آنکھیں جیسے ہر طرف سے آکر مجھے اپنے حلقے میں جکڑ رہی ہیں اور مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ ایک ایسی کیفیت جس میں درد بھی ہے اور سکون بھی۔ جن کی چھبتی ہوئی نگاہوں میں پیار کا وہ لمس شامل ہے جو مجھے تھپکیاں دے کر میٹھی نیند کی آغوش میں سلا رہا ہے۔ ماضی کے سائے چاندنی میں تحلیل ہو کر اپنا وجود کھو رہے ہیں ——— ایک ساتھ کئی قدموں کی چاپ کھنکتی ہوئی چوڑیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر مختلف سمتوں کی طرف بھاگ کر گم ہو جاتی ہے۔

یہ وہی جھونپڑی ہے۔ جہاں ایسی ہی ایک رات کو میں نے پہلی بار کلپنا کے دل کی دھڑکنوں کا سنگیت سنا تھا۔ اس کنواری مہک سے آشنا ہوا تھا جو ایک تاج محل کو جنم دیتی ہے۔ حالانکہ میری ہمیشہ یہی کوشش رہتی کہ فاصلے وہاں تک کھینچ چلے جائیں جس کی کوئی حد نہ ہو۔ لیکن کلپنا کی موجودگی ان فاصلوں کو سمیٹ کر رکھ دیتی اور مجھے یہی محسوس ہوتا، میں وہیں کھڑا ہوں جہاں سے میں چلا تھا۔ تھکے ہارے مسافر کی طرح میرے قدم لڑکھڑا جاتے اور میں خود بخود کلپنا کی آغوش میں گر جاتا۔ چند لمحوں کے لئے اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتا۔ وہ چند لمحے مجھے سکون تو ضرور دیتے۔ لیکن ان تلخیوں کا اثر زائل نہ ہو پاتا زہر بن کر جو میرے تمام وجود میں سرایت کر چکا تھا۔ کلپنا چاہتی تھی کہ یہ لمحے ایک ایسی لمبی زندگی بن جائیں جہاں ماضی کا کوئی بھی سایہ نہ ہو۔ مستقبل کے تابناک نقوش لئے حال کی جیتی جاگتی تصویر ہو۔

سیلاب کے رکے ہوئے پانی میں ایک ہلچل سی پیدا ہو جاتی اور دور ساکن پانی کی جھیل کے اوپر طوفان اپنے پر تولتا ہوا منڈلانے لگتا۔

'پرانی تصویر پہ پھر نئی تصویر بنائی جا سکتی ہے!' دل کی گہرائیوں سے ایک آواز ابھرتی۔

لیکن اس احساس کو مٹایا نہیں جا سکتا جو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ اس تصویر کے نیچے ایک اور تصویر بنی ہوئی ہے۔ دماغ کے نہاں خانوں سے ایک سوچ سوال بن کر آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔

اور میں اپنے آپ کو اس دوراہے پر کھڑا پاتا جہاں ایک طرف اندھیرا ہوتا اور دوسری طرف اجالا۔

لیکن میں اس سنگم کی تلاش میں ہوں جہاں اجالے اور اندھیرے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں۔

احساسات اور جذبات کے اس نہ ختم ہونے والے دائرے میں میں ایک مدت تک گھومتا رہا۔ جتنا ہی اس دائرے سے نکلنے کی کوشش کرتا اتنا ہی اپنے آپ کو اس میں الجھا ہوا پاتا۔ میں کلپنا کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتا تو اپنا وجود کھو دیتا۔ میں دور بھاگنے کی کوشش کرتا تو اپنا دامن کہیں کسی چیز سے الجھا ہوا پاتا۔ اور میرا وجود ایک سوالیہ نشان کی طرح میری ہی آنکھوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور میں لاجواب سا ہو کر آنکھیں بند کر لیتا۔ کلپنا میرے دل کی دھڑکنوں کو چھو لیتی۔

'احساس وہی روپ اپنا لیتا ہے جو ہم اسے دیں۔ احساس ایک کورا کینوس ہے۔ جس پر من چاہی صورت بنائی جاتی ہے'

اس بار جھونپڑی کے پیچھے گاؤں سے گرباناچ کرتی ہوئی لڑکیوں کے گانے کے بول ابھر رہے ہیں۔ ایک پرانی لوک کہانی ہے جس میں ایک راجہ راہ چلتی گوالن سے مخاطب ہوتا ہے ——— 'گوالن! اپنی اس دودھ کی گگریا کی قیمت کیا لوگی؟' ——— 'راجہ کے اصطبل کے سارے گھوڑے!' گوالن جواب دیتی ہے ——— 'اپنی ان بانہوں کی چوڑیوں کی قیمت کیا لوگی؟' گوالن مسکرا دیتی ہے اور کہتی ہے ——— 'راجہ کا آدھا راج!' ——— راجہ پھر کہتا ہے۔ 'پاؤں میں پڑی ان پازیبوں کی قیمت کیا لوگی؟' ——— گوالن کی بھنویں تن جاتی ہیں۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں۔ 'راجہ کا سارا راج!' ——— راجہ گوالن کے قریب جا کر اس سے سرگوشی میں پوچھتا ہے 'اور اپنی اس من موہنی صورت کی قیمت کیا لوگی؟' ——— گوالن کڑکتی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔ 'راجہ کا تن سے جدا کیا ہوا سر!!'

اسی گیت کے بول اس رات کو بھی فضا میں تھرک رہے تھے۔ جب میں نے کلپنا کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس سے کہا تھا۔

'کلپنا! آؤ ہم بھی سودا کریں'

کلپنا نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔

'سودے سے مکر تو نہیں جاؤ گے؟'

'نہیں'

'قسم کھاؤ!'

'تمہاری ان آنکھوں کی سوگند . . . !؟'

نہ جانے کیسے یہ الفاظ میری زبان سے پھسل پڑے تھے اور مجھے اپنے ہی الفاظ پرائے محسوس ہوتے تھے۔ اپنی ہی آواز ناآشنا معلوم ہوتی تھی۔

'مجھ سے دور رہنے کی قیمت کیا لوگی؟'

میں نے منہ پھیر کر کہا تھا۔

کچھ کلیاں جیسے جھک کر رہ جاتی تھیں۔

سو تقدیروں کی قربت میں بھی صدیوں کا احساس ہو رہا ہو۔

مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے ہوا ٹھہر گئی ہو۔ جیسے درختوں کی ٹہنیاں یک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ وشوامتری ہاتھ ہلا کر جیسے کھو گئی اور میں کیتھی باغ میں کھو گیا، بت کی طرح بے حس سا کھڑا رہا تھا۔ [illegible] گیت کی آواز [illegible] میں ستاروں کی جھلک سی پھیل رہی تھی۔

شفق کی سمت سے چاند نکل آیا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے چاند میں سے کلپنا کی شکل آ گئی ہیں۔ یہ پرانی داستان سنا رہی ہیں جس کا میں عنوان ہوں ۔۔۔۔ یہ کہانی پھر سے شروع ہوئی کبھی نہ ختم ہو۔ ہوا سرگوشیوں میں وہ کہانی سنا رہی ہے۔ جب میں کلپنا کے ساتھ کتنے ہی برسوں سے گزر گیا تھا، میں خلاؤں میں دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ چنچل گھڑی آتی ہوئی آہٹ کی آواز ان لذت بخش لمحوں کی یاد تازہ کر رہی ہے جب ماضی کے سائے مجھ پر مسلط ہو گئے تھے۔ میں حال کا باسی ہوں اور میرا رخ مستقبل کی روشنیوں کی طرف ہے۔ یہ آہٹ کی آواز مجھے ماضی کے ان کھنڈرات کی یاد دلا رہی ہے جن پر میں نے حال کی تعمیر کی تھی جو ڈھہ چکی ہے۔ وہ دور کہیں تنہائی اور خاموشی سے گھبرایا ہوا اجالا الھڑ سے بجائے اکیلے پن کو ڈرا رہا ہے۔ کتنی معطر ہوا ہے۔ مست چاندنی کی طرح بے خود کرنے والی۔ یہ کون سا سنگیت ہے جس میں صدیوں کا احساس جذب کر ساکت دھڑکن سما رہی ہے۔

چاند آکاش کی بلندیوں میں آ گیا ہے اور مجھے پتا چل رہا ہے، ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ دور کہیں کسی حادثے کی کہانی سنا رہی ہیں۔ حادثے جو زندگی کی دشواریوں اور خوشیوں کے رشتے جلائے ہوئے ہیں۔ سامنے بجلی کا وہ کھمبا جیسے مجھ سے کہہ رہا ہے یہاں میرے نیچے مخالف سمتوں سے آنے والے سائے ایک ہوتے ہیں اور میرا سایہ میرا ساتھ چھوڑ کر مجھ سے آگے نکل جاتا ہے۔ کیوں نہ میں واپس بجلی کے کھمبے کے پاس جاؤں اور مخالف سمت سے ایک اور سایہ بڑھتا ہوا آئے اور میرے سائے میں مدغم ہو جائے۔

یہ جھونکا پچھلے لمحوں کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ کاش وہ لمحے لوٹ آئیں اور ایک لمبی زندگی بن جائیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وشوامتری اپنی نگر نگر کی کہانیوں کو آگ لگا دے۔ میری اس کہانی کو بھی جو اس نے اپنے اندر چھپائی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ پرانے کتبے ڈھ جائیں اور نئے کتبے تشکیل پائیں۔

کیتھی باغ کا جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا راستہ خاموش اور سنسان کیوں ہے؟ مجھے خوف سا محسوس ہو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کسی کے قدموں کی چاپ اس پر گونج رہی ہے اور وہ یونانی حسینہ کا مجسمہ ابھی خلاؤں میں گھور کیوں رہا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ باغ میں بے تحاشا دوڑنے لگے اور پھر تھک ہار کر کسی کی آغوش میں گر جائے!

[illegible]

پیاسے ہونٹوں پر کبھی یہ راستے [illegible] پکڑ کر لے جاتی ہیں [illegible] کبھی کبھار یہ رات بیت گئی [illegible] اور تنہائی پھر لوٹ کر آ جاتی ہے اور میں کا پیاسا انتظار کرتے رہ گیا [illegible] داستان کو اپنے دل میں ہمیشہ کے لئے دفن کر دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں [illegible] کتنے عام ہیں؟ کیونکہ ایسا پیار کرشن اور رادھا کا [illegible] اپنے پیار کی [illegible] ہے۔

میں سفیدے کے پیڑوں کے بیچ کھڑا ہوں۔ رات ڈھلی جا رہی ہے۔ تیرگی رات کی سیاہیوں کا سینہ چاک کر رہی ہو اور میں سرخ سا ابھرتا محسوس کر رہا ہوں۔ راہی کی طرح جو گھوم پھر کر پھر وہیں آن پہنچا جہاں سے اس کا سفر شروع ہوا تھا۔ یہ کون سا سنگم ہے جہاں راستے ملتے ہیں؟ یہ کون سا موڑ ہے جہاں راستہ ایک ختم ہوتا ہے۔ یہ وہی وقت ہے جب رات کی تاریکیوں کی کوکھ سے روشنی کی ایک کرن جنم لیتی ہے جو پھر جوان ہو کر ایک روشن دن کی شکل اختیار کرتی ہے۔

لان کی اس طرف کی سڑک سنسان اور خاموش ہے۔ لیکن یہ کیا؟ کوئی سایہ میری طرف بڑھ رہا ہے۔ نہیں یہ میری نظروں کا دھوکا ہے۔ لان میں کلپنا اس سمت کی مورتی میں جان پڑ گئی ہے اور رات ڈھلنے سے پہلے اپنے پیار سے ملنے آ رہی ہے۔ نہیں یہ مورتی نہیں۔ کوئی اور سایہ ہے جو میری طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ سایہ ایک حسینہ کی صورت میں ڈھل گیا۔ میں اسے اب پہچاننے لگا ہوں۔ یہ وہی جھیل سی آنکھیں ہیں۔

"کلپنا!"

"صبح ہونے سے پہلے جو جیسے روشنی پھیل رہی ہے۔"

"آؤ کلپنا آؤ اپنے گلے سے لگ جاؤ۔ ان تقدیروں کو قربت میں بہت جانے دو۔ جن میں میں آج تک بھٹک رہا ہوں۔ میں نے ماضی کے ان سایوں سے چھٹکارا پالیا ہے جو تمہیں مجھ سے چھین لیتے تھے۔ تم رک کیوں گئیں؟ کیا اب بھی میں تمہیں پیار کا نہ دیتا ہوں؟ دیکھو تو تاریک رات کی سیاہیاں دن کی روشنی میں دم توڑ رہی ہیں۔ ایک انگڑائی مسکراتی ہوئی صبح جنم لے رہی ہے۔"

"میرے لئے اب رات شروع ہو رہی ہے۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو کلپنا؟"

"میں کسی اور کی ہو چکی ہوں؟"

مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے واقعی رات شروع ہو رہی ہے جو قربتوں اور تقدیروں کا احساس ستاتی ہے!!

جواہر ریزے

اقبال سلیم

۱۵۸۱/۷ ڈی۔ کرشنا راجندرا اسٹریٹ۔ منڈیا (میسور اسٹیٹ)

۱۵ر جنوری ۶۵ء　　　　محترم خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

... پچھلے دنوں "بیسویں صدی" میں دو نئی چیزیں پڑھنے کو ملیں۔ راجہ مہدی علی خاں کے "محبوب مشغلے" اور شاد صاحب کی "شانِ نزول"۔ راجہ صاحب بجائے خود ایک جیتا جاگتا مزاح ہیں۔ یہ وہی راجہ صاحب ہیں جن سے متعلق منٹو مرحوم نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں ——— "راجہ کو ایک بار بھیک بھی مانگنی پڑی تھی۔ ایک بار وہ انارکلی میں بھیک مانگ رہا تھا۔ سامنے سے ایک گوجر سر پر دودھ کا ایک بہت بڑا ولٹوہا اٹھائے چلا آرہا تھا۔ راجہ نے اندازہ لگایا کہ اسامی مالدار ہے۔ اگر میں اس سے اپنی حالتِ زار بیان کروں گا تو اس کا دل ضرور پسیج جائے گا۔ اور اس سے کم از کم ایک روپیہ تو ضرور مل جائے گا۔ آگے بڑھ کر اس نے گوجر سے اپنا دکھڑا کہہ سنایا۔ اس نے راجہ سے کہا: "ذرا ہاتھ دینا میرے ولٹوہا کو" ——— راجہ نے کافی زور صرف کر کے اس کے سر کا بوجھ اتارنے میں مدد دی۔ جب ولٹوہا اتر گیا تو گوجر نے اپنے تہمد کا ڈب کھولا۔ اس میں کئی نوٹ اور کریانہ تھا۔ لیکن اس نے اس میں سے صرف ایک پیسہ نکالا اور راجہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور ستم بالائے ستم اس نے یہ کہا: "نوجوان! اب ولٹوہا رکھ دو میرے سر پر!"

——— یہ حقیقت ہو یا افسانہ۔ لیکن ہے راجہ صاحب سے متعلق۔ اس لئے جب وہ دوسروں کی باتیں لکھ سکتے ہیں تو کیوں نہ میں ان کی بات بھی لکھ دوں؟ شاد صاحب کی "شانِ نزول" کی ایک قسط "آج کل" کے کسی شمارے میں آچکی ہے۔ انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے "جواہر ریزے" کا عنوان دے کر چند واقعات میں بھی بھیج رہا ہوں۔ کسی قریب ترین اشاعت میں شریک کر لیں ...

آپ کا ——— ——— اقبال سلیم

استاد ذوق نواب الٰہی بخش خاں کے پاس بیٹھے ان کی غزل بنا رہے تھے جس کا ایک مصرع تھا۔

کون روتا ہے یہ لگ کر بلا کی دیوار سے

اتنے میں ایک سوداگر نواب کی خدمت میں پہنچایا گیا۔ انہوں نے اس کی لائی ہوئی چیزوں میں سے ایک اصفہانی تلوار پسند کی اور ذوق کی طرف مسکرا کر دیکھا اور فرمایا۔

اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

استاد ذوق نے ایک لمحہ تامل کیا پھر یہ مصرعہ لگا کر شعر موزوں کر دیا۔

سر لگا دیں ابروئے خم دار کی قیمت میں آج
اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

ایک دن دربار کے دوران میں ایک شہزادے بہادر شاہ ظفر کے پاس آئے اور سرگوشیوں میں کچھ کہہ کر لوٹ گئے۔ حکیم احسن اللہ خاں نے حیرت سے پوچھا۔

"حضور یہ آنا کیا تھا اور تشریف لے جانا کیا؟"

شعر و سخن کے دلدادہ بادشاہ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

پھر جیسے ہی اُنھوں نے اُستاد ذوقؔ کی طرف دیکھا اُنھوں نے اُسی وقت مصرع
شعر مکمل کر دیا جو آگے چل کر اُن کی ایک غزل کا مشہور مطلع بن گیا ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اُستاد مصحفیؔ کی طرح آتشؔ و ناسخؔ کی معاصرانہ چشمک بھی محتاجِ تعارف
ہیں۔ انشاؔ کی طرح ناسخؔ کو بھی اکثر و بیشتر بادشاہ کی پشت پناہی حاصل رہی۔ ایک دن
بادشاہ کی طرف سے ایک خاص مشاعرہ ترتیب دیا گیا۔ آتشؔ کو بھی دعوت دی گئی۔ لیکن
اُن کے شاگردوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا گیا جبکہ ناسخؔ معہ اپنے تمام شاگردوں
کے مدعو تھے۔ مشاعرے کی ایک خاص اور عجیب بات یہ تھی کہ جب کوئی شاعر اپنا کلام
پڑھ چکتا تو اُٹھ کر چلا جاتا تھا۔ جب آتشؔ کی باری آئی تو آثارِ سحر نمودار ہو رہے تھے۔
بزمِ مشاعرہ بالکل خالی تھی۔ جیسے ہی شمع اُن کے آگے آئی اُنھوں نے اُٹھتے اُٹھتے
فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

رات کو تھا آسماں پر ماہ و انجم کا ہجوم
صبح کو خورشید جب نکلا تو مطلع صاف تھا

خدا جانے شعر تھا یا طلسم! آناً فاناً بادشاہ کے علاوہ اور لوگ بھی آ موجود ہوئے
اور مشاعرے کا از سرِ نو آغاز ہو گیا۔

کہیں مشاعرہ تھا۔ ناسخؔ ایسے وقت پہنچے جب جلسہ تو ختم ہو چکا تھا لیکن
خواجہ آتشؔ اور چند شعراء ابھی موجود تھے۔ یہ بھی جا کر بیٹھے۔ علیک سلیک اور مزاج پُرسی
کے بعد پوچھا۔

"خواجہ صاحب! مشاعرہ ہو چکا؟"

خواجہ صاحب نے جواب دیا "جی ہاں! سب کو آپ کا اشتیاق رہا"
ناسخؔ نے بلا تامّل یہ شعر پڑھا ؎

جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہِ عام نہیں
شمارِ دانۂ تسبیح میں امام نہیں

ناسخؔ کا نام امام بخش تھا، اِس لئے اِس شعر سے سامعین بہت محظوظ ہوئے۔

اکبرؔ کے ایک دوست نے مُسکرا کر اُنھیں خوشخبری سُنائی کہ میرے ہاں ولادت
ہوئی ہے۔ یارانِ بزم نے سُنا تو ہنس ہنس کر مٹھائی طلب کرنے لگے۔ اِدھر اکبرؔ کو اُن کی حالت
پر ہنسی آ رہا تھا۔ کیونکہ اُن صاحب کے چار بچے پہلے ہی سے موجود تھے اور وہ تنگدستی

کے باعث اُن دِنوں پریشان رہتے تھے۔ اکبرؔ کی زبان سے بے ساختہ نکلا ؎

عاشقِ تیرہ شریعت میں جب آ جاتا ہے
حبلۂ کثرتِ اولاد پہ کیا حبلتی ہے

ایبٹ آباد کے ایک وکیل الف دین صاحب نے حقانیتِ اسلام پر ایک
کتاب لکھی اور اُس کی ایک جلد اکبرؔ کی خدمت میں تبصرے کے لئے بھیجی۔ اُنھوں نے
تبصرے کے ساتھ یہ شعر برجستہ لکھ کر وکیل صاحب کو بھیج دیا ؎

الف دین نے خوب لکھی کتاب
کہ بے دین نے پائی روحِ ثواب

مرزا خادم حسین رئیس اکبرآبادی نہایت وضع دار اور بڑی آن بان والے
بزرگ تھے۔ اکبرآباد کے رؤسا میں اُن کا شمار تھا۔ داغؔ، امیرؔ اور جلالؔ جیسے ناخدایانِ
سخن کے ہم پلّہ مانے جاتے تھے۔ اُن کے صاحبزادے محمد زکریا ملک کے ختنہ کی تقریب تھی۔
تمام معززینِ شہر جمع تھے۔ جیسے ہی حجام نے ختنہ کیا آپ نے برجستہ یہ شعر پڑھا ؎

حجام نے یہ کام کیا ہے نمود کا
گُل لے گیا تراش کے شمعِ وجود کا



روشنی کا مینار

فرید شہزاد

۱۷۔ بندی روڈ ایسٹ۔ ساکچی۔ جمشید پور

۸۔ فروری ۶۵ء مخدوم و مکرم! تسلیم

آپ کو میری کہانی "روشنی کا مینار" پسند آئے نہ آئے لیکن آپ میری اس جرأت کی داد تو دیں گے ہی کہ میں اردو کے ایک ایسے پرچے کو کہانی بھیج رہا ہوں، جس میں شائع ہو جانا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ "بیسویں صدی" کا اپنا ایک خاص مقام ہے۔ اس بلندی تک کوئی پرچہ پہنچ سکتا ہے نہ عام لکھنے والے وہاں تک پہنچ سکتے ہیں .... یہ بات دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے، جہاں "بیسویں صدی" کے دم سے ادب کا بھرم قائم ہے، وہاں "بیسویں صدی" نے قارئین کو بہت سے نئے نئے فنکاروں سے روشناس کرایا ہے اور سچ پوچھئے تو اسی بات نے مجھے اتنی بڑی بات کے لئے اُکسایا کہ میں "بیسویں صدی" کو اپنی تخلیق بھیجوں .... کہانی کیسی ہے؟ کیا ہے؟ اس سلسلے میں مجھے کچھ عرض نہیں کرنا ہے۔ اس کی کسوٹی آپ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، اگر میری کہانی میں کچھ بھی جان ہوگی تو آپ ضرور میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے.. آپ کا ——— فرید شہزاد

بارش زور شور سے ہو رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشے پر بارش کے قطرے موتیوں کی طرح گر رہے تھے۔ خوشگوار ہوا کے جھونکوں سے دروازے اور کھڑکیوں کے خوش رنگ ریشمی پردے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ایک بے حد حسین اور خوشگوار شام مون سون کی بارش میں بھیگ رہی تھی۔ دیپالی موسم کی رنگینی سے بے نیاز ہلکے میک اپ سے آراستہ ہو کر صوفے پر بیٹھی بے چینی سے بارش کے تھمنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کا حُسن کافی دلکش اور جوانی بے حد دلفریب تھی۔ ہلکے میک اپ سے اُس کا دلفریب حُسن اور نکھر گیا۔ سیفون کی شوخ ساڑی اور اُسی رنگ کا بلاؤز اُس کے حُسن کو اور بھی پُروقار اور جاذبِ نگاہ بنا رہا تھا۔ جیسے کسی کہنہ مشق سنگ تراش کا حسین شاہکار ہو۔ بار بار اُس کی نگاہیں کلائی کی گھڑی کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بارش اُسی طرح ہو رہی تھی اور ہلکی ہلکی دھندلاہٹ فضا پر چھا رہی تھی۔ گہری ہوتی ہوئی شام کے ساتھ ساتھ اُس کے کھلے شاداب چہرے پر اُداسی کی پرچھائیاں پھیلنے لگیں اور دل بجھنے لگا۔ اُسے شدت سے راج کی یاد آنے لگی۔ راج اُس کے خیالوں اور خوابوں میں بس چکا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس نے زندگی کے حسین لمحات گزارے تھے۔ وہ راج کو بھولنے کی کوشش کے باوجود بھول نہ سکی تھی۔ وہ جھنجلا کر اُٹھی اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگی۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے کے ساتھ بارش کی پھوار اس کے چہرے کو بھگو گئی۔ جھٹ کھڑکی کے پٹ بند ہو گئے اور وہ تھکی تھکی بجھی بجھی سی صوفے پر گر پڑی۔ پھر گہری نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ اُس کی بھٹکتی نگاہیں آتشدان پر جم کر رہ گئیں۔ آتشدان کے اوپر اُس کے شوہر ڈاکٹر انیل مکرجی کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے ڈاکٹر انیل مکرجی کی تصویر اپنی فتح پر ناز کر رہی ہے اور اُس کی شکست کا مذاق اُڑا رہی ہے۔ یکایک اُس کے دل میں ڈاکٹر انیل مکرجی کے خلاف نفرت کا جذبہ اُبھرا کیونکہ وہ ایک ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی اُس کے جذبات اور فطرت کو سمجھ نہ سکا، دل کی جلن کو محسوس نہ کر سکا۔ شادی سے پہلے اُس نے انیل سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے لیکن انیل نے ہنس کر ٹال دیا تھا۔ اور کہا تھا محبت اور شادی میں بڑا فرق ہے۔ وہ نفرت اور حقارت کے جذبے کے زیرِ اثر نظر پھیر کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ اُجلی صاف ستھری دیواروں پر جدید آرٹ کی دلکش تصویریں لگی تھیں۔ اُس نے سوچا یہ تصویریں راج کو کتنی پسند تھیں۔ اور اُس کی

قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

آتشِ گل	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
کلیاتِ اقبال	ڈاکٹر اقبال	چھ روپے
جنون و ہوش	جوش ملسیانی	چار روپے
جشنِ رنگ	عرش ملسیانی	تین روپے
آہنگِ حجاز	•	ایک روپیہ
سحرِ غزل	ناصر ہوشیارپوری	تین روپے
دستک	نریش کمار شاد	دو روپے ۲۵ پیسے
پھوار	•	دو روپے ۵۰ پیسے
فگار	•	دو روپے ۲۵ پیسے
قاشیں	•	تین روپے
آیاتِ جنوں	•	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
سنگم	•	تین روپے
رباعیاتِ محروم	تلوک چند محروم	تین روپے ۷۵ پیسے
گنجِ معانی	•	سات روپے ۵۰ پیسے
روپ	فراق گورکھپوری	تین روپے ۵۰ پیسے
رمز و کنایات	•	تین روپے ۵۰ پیسے
مشعل	•	دو روپے ۷۵ پیسے
بیکراں	جگن ناتھ آزاد	چار روپے ۵۰ پیسے
ستاروں سے ذروں تک	•	دو روپے ۷۵ پیسے
کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی (اول)	اکبر الٰہ آبادی	پانچ روپے
حصہ دوم	•	چھ روپے
کلیاتِ اختر شیرانی	اختر شیرانی	آٹھ روپے
رعنائیاں	شکیل بدایونی	تین روپے
صنم و حرم	•	دو روپے ۵۰ پیسے
گلِ رعنا	جگی رعنا	تین روپے ۵۰ پیسے
شبنم شبنم	کرشن موہن	پانچ روپے
دلِ ناداں	•	چھ روپے

خرابات	عبدالحمید عدم	چار روپے
رمِ آہو	•	چار روپے
گلنار	•	دو روپے ۲۵ پ
قول و قرار	•	تین روپے ۵۰ پیسے
گردشِ جام	•	دو روپے ۲۵ پیسے
بطِ مے	•	دو روپے ۲۵ پیسے
گجر	قتیل شفائی	تین روپے
جھومر	•	تین روپے
روزن	•	تین روپے
جلترنگ	•	دو روپے ۲۵ پیسے
گفتنی	محمود سعیدی	دو روپے
نئی صبح	ضیا فتح آبادی	ایک روپیہ
طلوع	•	۷۵ نئے پیسے
نورِ مشرق	•	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
آہنگِ غزل	پورن سنگھ ہنر	دو روپے ۵۰ پیسے
شہرِ دل	محسن زیدی	دو روپے
سفینہ و ساحل	عزیز وارثی	چار روپے

آئینۂ اصلاح ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر مع توجیہہ اِس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

جوش ملسیانی کے مکمل حالاتِ زندگی، انتخاب کلام شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویروں کے ۴۸ صفحے، ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ موجودہ دور کی بے مثل کتاب۔ قیمت دس روپے۔

مضراب شباب للت کے ایک ایک شعر میں اُس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور اِن دھڑکنوں میں اُس نے سارے

...جہاں کے نکتہ ور دیتے ہیں۔ قیمت مجلد چھ روپے۔

گلستانِ ہزار رنگ منتخب اشعار کا ہزار شعروں کا مجموعہ عنوان وار ترتیب دئے گئے ہیں۔ اس یادگار کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور ہندی کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام نامی ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز فتحپوری نے اس کتاب کو اِس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ اُردو ایڈیشن دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۵۰ پیسے۔

شاہنامۂ اسلام جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام چار حصوں میں جس میں تیرہ سو سالہ اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے۔ ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے۔ ستواں ایڈیشن اصلاح کے بعد چھپا ہے۔ قیمت سولہ روپے۔ اب صرف نو روپے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

تلامذۂ غالب غالبیات کے مشہور ماہر مالک رام صاحب کی گرانقدر تصنیف۔ اس کتاب میں غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کی مکمل سوانح حیات اور کلام درج ہیں۔ پورے صفحہ کی تقریباً تیس تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں۔ ہندوستان بھر کے ادیبوں کا فیصلہ ہے کہ یہ کتاب بہترین ادبی تحفہ ہے۔ قیمت فی جلد سات روپے ۵۰ پیسے۔

کفر و ایمان پنڈت ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام۔ حضرت اختر کا نام نامی ہی اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا ضامن ہے۔ کلام میں طنز کے نشتروں کے ساتھ دردمند دل کی گرمی بھی ہے۔ قیمت چار روپے۔

کلامِ بے لگام ایم بی تنقاد دہلوی کا نادر مجموعۂ کلام جس کے ہر شعر میں اکبر الٰہ آبادی کا رنگ جھلکتا ہے۔ طنز و مزاح کا رنگین گلدستہ ۱۴۲ صفحات پر مشتمل دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا۔ قیمت مجلد چھ روپے۔

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

پلکوں پر آنسو تھرتھرا اٹھے۔

برسات کے ایسے ہی دن تھے۔ رِم جھم رِم جھم بارش میں بھیگی شام تھی وہ کالج سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی تھی۔ بس اسٹاپ کالج کے قریب ہی تھا۔ لیکن بس اسٹاپ تک پہنچتے پہنچتے وہ کافی بھیگ چکی تھی۔ چکن کی سفید ساڑی اُس کے صحت مند جسم پر چپک گئی تھی اور کشادہ پیشانی پر زُلفوں کی جالی پھیل گئی تھی ـــــ وہ بس اسٹاپ پر شیڈ کے نیچے کھڑی بارہ ڈی کی بس کا انتظار کرنے لگی۔ شیڈ کے نیچے اور بھی لوگ تھے۔ اور اَن گنت نگاہیں اُس کے جوان جسم پر جمی ہوئی تھیں۔ چند قدم کے فاصلے پر راج بھی کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اور اُس کے چہرے کے دل کش زاویوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اُسے پلکوں کی اوٹ میں چھپا لینا چاہتا ہو۔ دیپالی بھی چور نگاہوں سے راج کا جائزہ لے رہی تھی۔ کبھی نگاہوں کا تصادم بھی ہو جاتا۔ راج دراز قد، وجیہہ و خوبصورت، صحت مند، پُر وقار شخصیت کا نوجوان تھا۔ ہونٹوں کی دل آویز مُسکراہٹ اُس کی ہر دلعزیزی کی مظہر تھی۔

اور اُس شام کے بعد ہر شام وہ راج کو بس اسٹاپ پر دیکھتی۔ راج اُسے دیکھتا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک کہانی کی تخلیق ہونے لگی۔ ایک گیت کا جنم ہونے لگا۔ وہ راج کی پُرکشش شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ صبح و شام کا سنگم ہوتا رہا۔ دن گزرتے رہے اور وہ حسین تصورات میں کھوتی گئی۔ لیکن ایک شام راج کو نہ دیکھ کر اُس کے حسین تصور کا شیرازہ بکھر گیا۔ وہ کھوئی کھوئی آنکھوں سے راج کو تلاش کرنے لگی۔ اُس کے اِرد گرد اَن گنت چہرے اَن گنت نگاہیں تھیں لیکن راج نہیں تھا۔ اُس پر اُداسی چھا گئی اور دل بجھنے لگا۔ ہر سمت اُداسی اور ویرانی نظر آنے لگی۔ جیسے کائنات کا حُسن کھو گیا۔ حالانکہ ہر سمت حُسن تھا، رعنائی تھی، مُسکراہٹیں تھیں اور شام بے حد حسین اور خوشگوار تھی۔ راج کا سراپا اُس کی آنکھوں میں بس چکا تھا۔ اِتنا لمبا راستہ کیسے طے ہوا، اُسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو اُس وقت چونکی جب بس ایک جھٹکے سے رکی اور لوگ اُترنے لگے۔

وہ رات دیپالی کی زندگی میں ایک عجیب رات تھی۔

لیکن صبح بہت سہانی، نکھری نکھری تھی۔ موسم بے حد رومانٹک ہو گیا تھا۔ دیپالی کی زُلفیں ہوا کے جھونکوں سے بکھر بکھر جاتی تھیں۔ چہرہ تازہ کھلے کنول کی طرح تھا۔ وہ موسم کی دلفریبی میں ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتی کتابیں لئے بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔

ایگریکو کے بس اسٹاپ پر راج کو اچانک اپنے قریب دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ اُس کے چہرے پر حیرت کے آثار پھیل گئے اور نگاہیں سوالیہ نشان بن گئیں۔ راج بس کے انتظار میں ایگریکو بس اسٹاپ پر کھڑا تھا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ بس آگئی۔ اور راج بھی اُس کے پیچھے پیچھے بس میں سوار ہو گیا۔ بس میں بہت بھیڑ تھی۔ لوگ کھڑے تھے۔ راج بھی اُس کے قریب کھڑا ہو گیا اور اُس کی زُلفوں کی سحر کن خوشبو سے بے خود سا ہوتا رہا۔ کاش بس اِسی طرح چلتی رہے! غالباً دونوں اس وقت یہی سوچ رہے تھے۔ راستہ کبھی ختم نہ ہو۔ فاصلے اور لمبے ہو جائیں۔ لیکن ایک جھٹکے سے اُن کے خیالات بکھر گئے۔ بس سابکی پہنچ چکی تھی۔ انھوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور وہ نیچے اُتر گئے۔

ایک شام سیاہ کالے بادل جھکے ہوئے تھے۔ برفانی ہوا شیشم کے درختوں میں چیخ رہی تھی۔ ساری فضا ہلکی ہلکی نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کالج سے نکل کر وہ سندھیا کے ساتھ نوٹ بک لینے اُس کے گھر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد سندھیا کے گھر سے چلنے کو نکلنے ہی والی تھی کہ ہوا کے تیز جھونکوں کے ساتھ بارش شروع ہو گئی اور لمحہ بہ لمحہ تیز ہونے لگی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد جب بارش تھمی تو وہ گھر جانے کے لئے نکل پڑی۔ رات کے ابتدائی لمحات خاموشی سے گزر رہے تھے۔ ہواؤں میں خنکی رچی ہوئی تھی۔ دُور دُور تک سڑک سُنسان تھی صرف کنارے کی سڑک کے دونوں جانب ایستادہ شیشم کے درختوں میں ہواؤں کا شور تھا۔ ایک انجانے خوف سے وہ کانپ گئی پھر تیز تیز قدم اُٹھاتی بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔ سیکنڈ بارہ ڈی کی آخری بس جا چکی تھی۔ بس اسٹاپ ویران تھا۔ وہ بجلی کے کھمبے کے نیچے فٹ پاتھ پر کھڑی کسی سواری کا انتظار کرنے لگی۔ شاید کوئی ٹیکسی یا رکشا مل جائے۔ سرد ہوا کے جھونکوں سے محفوظ رہنے کے لئے اُس نے جسم کو ساڑی میں اچھی طرح چھپا لیا تھا۔

"کیا بارہ ڈی کی آخری بس چلی گئی؟" ایک سوال اُس کے کانوں سے ٹکرایا۔ اُس نے آواز کی جانب پلٹ کر دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ راج کو اپنے قریب دیکھ کر بوکھلا گئی۔

"شاید چلی گئی!" اُس نے راج کی موجودگی کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے ویران سڑک پر حدِ نگاہ تک دیکھتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

لیکن ایک انجانے احساس سے اُس کا دل دھڑکنے لگا۔

"اِس وقت آپ یہاں؟" اُس نے راج سے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔ میں بھی اسٹوڈنٹ ہوں" راج نے جواب دیا۔ چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ نہ جانے کن خیالوں میں کھوئے کھڑے رہے۔ "آپ شاید ایگریکو میں رہتی ہیں؟" راج نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ سولہ نمبر کراس روڈ پر۔" اُس نے کہا۔

اب سوالات ختم ہو چکے تھے۔ دونوں اِس طرح کھڑے تھے جیسے کوئی مجرم اپنے جرم کا اقبال کر چکنے کے بعد فیصلہ سُننے کے لئے سر جھکائے کھڑا ہو۔

"میرا خیال ہے اب کسی سواری کا انتظار کرنا فضول ہے۔ مجھے بھی ایگریکو جانا ہے۔

[illegible] مل جاتے ہی راج نے تجویز پیش کی۔ [illegible] جب چاپ چل پڑی۔ دونوں کے درمیان اجنبیت کی [illegible] وہ چند لمحوں تک خیالوں میں کھوئے خاموش چلتے رہے [illegible] شروع ہو گیا۔ وہ ایک دوسرے کے بارے میں جاننے لگے۔ [illegible] اکیلا ہے بالکل اکیلا اور بے سہارا۔

[illegible] آنے میں کچھ بہت دن نہ لگے۔ جب وہ اکثر ہر شام کو ایک ساتھ [illegible] پارک اور سینما جاتے۔ کسی اچھے ریسٹورنٹ کے خوبصورت لان میں گھنٹوں بیٹھے [illegible] اور کچھ یہ باتیں کرتے ——— اور کچھ عجیب سیدھے سادے انداز میں ان کی ملاقات پیار میں تبدیل ہو گئی۔

ایک رات جب کائنات سو رہی تھی اور ہر سمت خاموشی تھی۔ آسمان کی نیلاہٹوں پر پونم کا چاند جاگ رہا تھا۔ دُور دُور تک اُجلی چاندنی بکھری ہوئی تھی اور فضائیں مہکی ہوئی تھیں۔ وہ جوبلی پارک کے ایک گوشے میں پتھر کے بینچ پر بیٹھے کسی فلمی کہانی پر باتیں کر رہے تھے کہ جانے کیوں اور کس جذبے کے تحت اُس دن راج نے دیپالی کی زلفوں کو چھو لیا۔ پھر اس نے کہا۔

"دیکھو دیپ! رات کتنی خوبصورت ہے! حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی چاندنی ستاروں کی کہکشاں، مہکی مہکی فضائیں، بہکی بہکی ہوائیں۔ سچ پوچھو تو کائنات کی ہر شے پر تمہاری خوبصورتی کا عکس ہے! دیپ! تم ایک پھول، ایک خوشبو، ایک گیت ہو! چاندنی رات کا گیت!!"

"بس بس کسی کی تعریف کرنا کوئی تم سے سیکھے!" دیپالی نے اُس کے ہاتھوں سے اپنی زلفوں کو چھڑاتے ہوئے مصنوعی خفگی سے کہا اور اُس کی بات ادھوری رہ گئی۔

"حقیقت کو حقیقت کی شکل میں پیش کرنا تعریف نہیں صداقت ہے۔" راج نے کہا۔ "کتنا عظیم ہے وہ فنکار جس نے تمہاری تخلیق کی!"

پورنماشی کا چاند شیشم کے درختوں میں چھپنے لگا اور وہ پارک سے اُٹھ گئے۔

*

ایک دن راج کے قدم انجانی منزل کی سمت اُٹھنے لگے۔ جانے پہچانے راستے تھے۔ جانے پہچانے نشیب و فراز تھے۔ جانی پہچانی گلیاں تھیں۔ دیپالی کے پتا راج سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اُس کی شخصیت سے متاثر ہوئے۔ پہلی ہی ملاقات میں اُس نے انھیں اپنا بنا لیا۔ وہ بہت دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھا اُن سے باتیں کرتا رہا۔ ادب کی باتیں، سیاست کی باتیں، اپنی نجی زندگی کی باتیں، اپنی آئندہ زندگی کی باتیں۔ اُسی وقت دیپالی کو پتہ چلا کہ وہ ٹریننگ کے سلسلے میں تین سال کے لئے امریکہ جانے والا ہے تو دیپالی کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ جیسے جسم کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہو۔ ایک سال کا عرصہ

تھے۔ یہ عرصہ معلوم ہونے لگا جیسے [illegible] رات گئے جب راج گھر جانے کو اُٹھا تو وہ باہر [illegible] آئی۔ رات کا پہلا پہر خاموشی سے گزر رہا تھا۔ شیشم کے درختوں کی اوٹ سے چاند اُبھر رہا تھا۔ نیم روشن نیم تاریک ماحول تھا۔ رات کے پُرسکون ماحول میں وہ [illegible] ملے اور جُدا ہو گئے۔ اُس نے راج کو مُسکراتے ہوئے رخصت کیا۔ پھر راج باقاعدگی سے گھر آنے لگا۔ اُس کی گفتگو کا انداز، رکھ رکھاؤ کا ڈھنگ، اُس کی پُروقار شخصیت سے سبھی متاثر تھے۔ رفتہ رفتہ وہ دیپالی کے گھر کا ایک فرد بن گیا جہاں اُسے [illegible] پُرخلوص محبت اور زندگی کی بہاریں مل گئیں۔

*

اور ایک دن جب ڈاکیے نے اُس کے ہاتھوں میں ایک رجسٹری لفافہ دیا تو راج کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی۔ لفافہ ایک نئی زندگی کا پیغام ——— اُس کی دیرینہ آرزوؤں کی تکمیل کا پروانہ تھا۔ امریکہ آنے کا اجازت نامہ تھا۔

راج کی نگاہوں میں نیو یارک کی پُرشکوہ فلک بوس عمارتیں پھیل گئیں۔ واشنگٹن کا وائٹ ہاؤس اور پیرس کا ایفل ٹاور اُجاگر ہو گیا اور بحر اوقیانوس کے ساحل پر ڈولتے ہوئے جہاز کی طرح اُس کا دل مچلنے لگا اور دماغ کی گہرائیوں میں ہالینڈ کے اُن خوبصورت دُور دُور تک پھیلے ہوئے باغوں میں کھلے رنگین پھولوں کی خوشبو بس گئی جن کا ذکر وہ کتابوں میں پڑھ چکا تھا، تصویروں میں دیکھ چکا تھا۔ وہ خوش تھا۔ بے حد خوش! لیکن دیپالی کی جُدائی کے تصور سے لرز کر رہ گیا۔ سارے خوبصورت خیال بکھر گئے اور ذہن ایک نقطے پر آکر ٹھہر گیا۔ دیپالی اُس کی تاریک زندگی میں روشنی کا مینار تھی۔ جس کی جوت سے وہ زندگی کے گوشے گوشے کو منور دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ جس کی ریشمیں زلفوں کی چھاؤں میں ہر غم سے بے نیاز، سکون اور راحت کا متلاشی تھا۔ اور جب اُس نے دیپالی کو اپنی روانگی کے بارے میں بتایا تو رات کی پُرسکون خاموشی میں سنگیت کے تار ٹوٹ کر بکھر گئے اور راگنی سسکنے لگی اور چاند کا حُسن کھو گیا۔ اُس نے بھیگی آنکھوں سے راج کو رخصت کیا اور راج دیپالی کو ایک خلش ایک سوز اور اضطراب دے کر اجنبی راستوں سے ایک اجنبی شہر کی طرف پرواز کر گیا۔ لیکن اُس کے الفاظ دیپالی کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے۔ راج نے بہت گمبھیر لہجے میں کہا تھا ———

"تم سے دُور ایک اجنبی شہر کو جا رہا ہوں۔ جہاں کوئی اپنا نہیں سب پرائے ہیں۔ لیکن تمہاری یاد میرے شبستانوں کو ہمیشہ روشن رکھے گی۔ میرا انتظار کرنا!"

*

لیکن وقت کی رفتار تو پتھروں میں بھی جان پیدا کر دیتی ہے اور بے جان

لات کا رب استقبال کرتے ہیں۔ انیل چھپکے چھپکے دیپالی کی محبت میں تڑپ رہا تھا،
ہ راستہ جو راج کرا اپنے درمیان ایک دیوار سمجھتا تھا، راج کی عدم موجودگی میں
یات دیکھ کر اپنا جال پھیلانے لگا۔ پڑوسی کے ناطے اکثر دیپالی کے گھر آ کر گھنٹوں
باتیں کرتا۔ نئی نئی چیزیں بطور تحفہ دیپالی کے لئے لاتا رہتا لیکن دیپالی
راستے سے بھی دُور بھاگتی رہی۔ اپنا دامن بچاتی رہی۔ اور دیپالی کی خوشی
والدین کی خوشی تھی۔

اور تب انیل نے ذات پات کی دیوار کھڑی کر دی ——— ایک برہمن
شادی ایک کائستھ لڑکے سے کیسے ہو سکتی تھی ——— صدیوں پرانے رسم و رواج
نگاتے رہنے والے ماں باپ کے سامنے دیپالی کی کچھ نہ چل سکی۔ اُس کی آواز بغاوت
پیدا نہ کر سکی۔ قدم کانپ گئے۔

اور وہ شکست خوردہ سی ہو کر ایک دن انیل کے قدموں میں گر پڑی۔
ہوتے بھی اُس کی شادی ڈاکٹر انیل مکرجی سے ہو گئی۔ اور وہ انیل کے بستر کی
بن کر رہ گئی۔

لیکن راج کو وہ بھول نہ سکی۔ اپنے راستوں سے اُس کے نقش پا کو مٹا نہ سکی۔

اور آج ——؟

اپنی زندگی کا طویل سفر طے کر کے دیپالی واپس آ گئی تھی۔
کھڑکی کھول کر اُس نے باہر دیکھا۔ بارش تھم چکی تھی لیکن اُس کی آنکھیں
برس رہی تھیں۔

آج راج امریکہ سے واپس آ چکا تھا۔ اُس کے اعزاز میں ٹاؤن ہال میں ایک
ہوا تھا۔ کہیں سے فون کر کے راج نے دیپالی کو شادی کی مبارکباد دی تھی لیکن
صبح ہی سے اس طرح خاموش تھی جیسے اُس کے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔
لیکن یکایک وہ چیخ اُٹھی۔
"نہیں ... نہیں ... نہیں ... میں یہ سب کچھ نہیں سہہ سکوں گی ....
سہہ سکوں گی!!" اور وہ کھڑکی کے پاس سے واپس آ کر اپنے پلنگ پر پڑ گئی۔
رات کے گیارہ بج گئے لیکن انیل ہسپتال سے واپس نہ آیا تو اُس نے شال
پر رکھی اور گھر سے نکل گئی۔

انیل کچھ عجیب سے بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا کہ ایک بج گیا۔
اُس نے پھر پولیس اسٹیشن فون کیا۔ لیکن اُس کی بیوی کے بارے میں کچھ
ل سکا۔

اور پھر بارش شروع ہو گئی۔
اور اب کے بارش کسی قدر تھمی تو انیل پھر فون کرنے والا ہی تھا کہ دروازے
پر دستک ہوئی۔

بجلی کی سی سرعت سے اس نے دروازہ کھول دیا۔
سر سے پاؤں تک برساتی اوڑھے ایک نوجوان کے ساتھ دیپالی کھڑی تھی۔
اُس نوجوان نے ڈاکٹر انیل کی طرف دیکھ کر کہا۔
"ڈاکٹر صاحب! مسز انیل اِس برستی، اندھیری رات میں راستہ بھول
گئی تھیں۔"

اور وہ انیل کے جواب یا شکریہ کا انتظار کئے بغیر واپس لوٹ گیا۔

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

[illegible]	عرش ہاشمی ایم اے	دو روپے
[illegible]	اختر جمال روپ	دو روپے
[illegible]	ام ۔ اے حمید ایم اے	[illegible] روپے ۵۰ نئے پیسے
[illegible]	عادل رشید	تین روپے
[illegible] راتیں	ریوتی سرن شرما	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
[illegible] دھوکا	رام سرن شرما	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
[illegible]	شوکت تھانوی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
[illegible]	〃	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
پگلی	〃	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
بے غیرت	مضطر ہاشمی	چار روپے ۵۰ 〃
بارہ بچے	کرشن چندر ایم اے	پانچ روپے ۹۵ 〃
پہلی لڑکی	رام لعل ایم اے	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
انور	فیاض علی	آٹھ روپے ۵۰ 〃
بے بسی	کرشن گوپال عابد	چار روپے ۵۰ 〃
ستم	〃	چار روپے ۵۰ 〃
گھائل	〃	تین روپے ۹۵ 〃
ظالم	سعید امرت	دو روپے ۵۰ 〃
جانے والے	اختر جمال روپ	تین روپے ۵۰ 〃
جلتی بجھتی بہار	وحشی محمود آبادی	چار روپے
چوٹ	دت بھارتی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
گناہ	〃	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
[illegible]	بیگم توقیر ولایت حسین	تین روپے ۵۰ 〃
خاتون	انتصار حسین	تین روپے
[illegible]	قیسی رامپوری	چار روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
[illegible] (نظم)	عبد الحمید عدم	دو روپے ۵۰ نئے پیسے

دو پھول	عادل رشید	تین روپے ۹۵ 〃
دو سال پہلے دو سال بعد	زاہدہ خاتون	چھ روپے
فریب مسلسل	شفیق بانو	دو روپے
زہر	زکی انور	آٹھ روپے
برہمن	قیسی رامپوری	چار روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	تین روپے
کانٹے	رضیہ سجاد ظہیر	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	تین روپے ۵۰ 〃
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	چار روپے ۵۰ 〃
ننگی جوانی	سعید امرت	دو روپے
رہ گذر	انیس مرزا	چار روپے ۵۰ نئے پیسے
خوفناک محبت	عبد الحلیم شرر	تین روپے
شعلہ	انتصار حسین	تین روپے
کرنیں	شفیق الرحمن	تین روپے
ٹاگور کی آپ بیتی	ایم اسلم	تین روپے
ایک دل ہزار غم	عزیز بدایونی	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
مدینہ	رئیس احمد جعفری	چھ روپے ۵۰ نئے پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع	پانچ روپے
دروازہ	نادرہ خاتون	پانچ روپے
چندر کلا	جمنا داس	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
جلن	〃	دو روپے ۵۰ 〃
رادھا الزبتھ	〃	دو روپے ۵۰ 〃
پاپی	〃	چار روپے
سونا گاچھی	〃	چار روپے ۵۰ 〃
طوفانوں کی کہانی	〃	چار روپے ۵۰ 〃
جوار بھاٹا	〃	چار روپے ۵۰ 〃

قیامت	زکی انور	[illegible]
سازش	〃	[illegible]
کھنڈروں کا سچ	رشید اختر ندوی	پانچ روپے
گمراہ	قیسی رامپوری	چار روپے [illegible]
ناگ دیوتا	مخمور جالندھری	دو روپے ۵۰ 〃
خون کے چھینٹے	〃	دو روپے ۵۰ 〃
خوابگاہ میں	〃	تین روپے ۵۰ 〃
فراق	رنگین بھارتی	تین روپے ۵۰ 〃
پیاسا	〃	تین روپے ۵۰ 〃
پراسرار رقاصہ	〃	دو روپے
پراسرار قاتل	〃	دو روپے
پیاس	کے۔ایل ترانہ ایم اے	تین روپے ۵۰ 〃
محبت روتی ہے	غلام عباس	دو روپے
مالوا	میکسم گورکی ترجمہ : نریش کمار شاد	ایک روپیہ ۵۰ 〃
کھیت میں لہو	تاجور سامری	ایک روپیہ ۵۰ 〃
جی ہاں بیٹے ہیں	شوکت تھانوی	تین روپے ۲۵ 〃
پردے کے پیچھے	منٹو	دو روپے ۵۰ 〃
ملکۂ صحرا	اوم پرکاش ناشی	دو روپے ۵۰ 〃
خاموش نغمہ	〃	چار روپے
آتش گل (مجموعہ کلام)	جگر مراد آبادی	پانچ روپے
باقیات اقبال 〃	ڈاکٹر اقبال	تین روپے
تلخیاں (کلاں) 〃	ساحر	چھ روپے
تلخیاں (خورد) 〃	ساحر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
پرچھائیاں 〃	ساحر	ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا آزاد	تین روپے ۵۰ 〃
زہرہ حسن	اشفاق احمد	دو روپے

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

غزلیں

خورشید افسر بسوانی

جانے ہم غم کے شعلوں کو ہوا دینے کے بعد
بے نیازی کی ادا اور آمرا دینے کے بعد

میری قربتیوں تو اُن کو بارِ خاطر تھی مگر
رو دیئے وہ مجھکو محفل سے اُٹھا دینے کے بعد

چاندنی راتوں میں اکثر جاگتا رہتا ہوں میں
لیکن اپنی آرزوؤں کو سلا دینے کے بعد

جانے کس جانب فضا کے ساتھ رخصت ہو گئی
فصلِ گل زنجیرِ میخانہ ہلا دینے کے بعد

افسرؔ اُس کی یاد کے لمحے بھی کتنے شوخ ہیں
سو گئے جانے کہاں مجھکو جگا دینے کے بعد

نازش پرتاب گڑھی

جن پر تری نگاہِ توجہ ٹھہر گئی
اُن آنسوؤں کو تاج محل لکھ رہا ہوں میں

دیکھ اے وفا، درد! تری آبرو نہ جائے
مُدت کے بعد آج غزل لکھ رہا ہوں میں

میری طرح کوئی نہ ہو دیوانۂ خلوص
زخموں کو دوستی کا بدل لکھ رہا ہوں میں

اے غیرتِ وفا! مری جرأت کی داد دے
اُلفت میں دشمنی کو اٹل لکھ رہا ہوں میں

نازشؔ ہے یہ بھی فکر نہ ظاہر ہو رازِ دل!
اور لطف یہ بھی ہے کہ غزل لکھ رہا ہوں میں

آزاد گورداس پوری بی اے

انھیں موتی بھی کہتے ہیں انھیں شبنم بھی کہتے ہیں
یہی آنسو کے قطرے داستانِ غم بھی کہتے ہیں!

نگاہِ ناز ہے یا اک جہانِ کیف و سرمستی
ہم اُن کی مد بھری آنکھوں کو جامِ جم بھی کہتے ہیں

جو کلیاں پھول بن جاتی ہیں وہ مرجھا بھی جاتی ہیں
ہنسی کی انتہا کو ابتدائے غم بھی کہتے ہیں

ربابِ زندگی کی لے بدل جاتی ہے دم بھر میں
جسے نغمہ سمجھتے ہو اُسے ماتم بھی کہتے ہیں

غمِ اُلفت تو اے آزادؔ کلفت بھی ہے راحت بھی
اسے نشتر بھی کہتے اسے مرہم بھی کہتے ہیں

شمیم ساحلی ناظم مظفر پوری

حساب مانگ نہ تو مجھ سے میرے سجدوں کا
کہ میرے سجدے ہیں تجھ کو خدا بنائے ہوئے

نہ جانے بخل پہ مائل ہے کیوں کرم تیرا
غریب کب سے ہیں دستِ دعا اُٹھائے ہوئے

ہوا ہے تیز بہت وقت کی مگر اے دوست
مرا جنوں ہے چراغِ وفا جلائے ہوئے

غرور توڑ دو اِس دور کے خداؤں کا
چلو دیارِ عمل میں قدم ملائے ہوئے

ادب کر اِس کو کہ ناظمؔ بھی اہلِ فن کی طرح
زمینِ شعر کو ہے آسماں بنائے ہوئے

...کے مایہ ناز ادیبوں کے لکھے ہوئے دلچسپ شاہکار

...مجموعہ افسانہ جناب جگدیش چندر کے دلچسپ بلند پایہ افسانوں
...ہیں ... اپنے قہقہے اور اپنے آنسو سمجھنے پر
...گے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

...ہے ناول نگار ... کی ... تلخ کہانیوں کا حسین
...فی جلد صرف دو روپے۔

...سپنے نامور افسانہ نگار خاتون پروفیسر کرشنا کماری ایم اے کے بہترین
...افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

...میں پروفیسر کرشنا کماری ایم اے کے بہترین دلچسپ رومانی افسانوں
...کے ہر صفحے پر جذبات کا ایک محشر انگڑائیاں لے رہا ہے۔ قیمت دو روپے

...لیں ہر افسانے میں جوانی کا اضطراب ہے، حسن کی بیکلی ہے عشق کی بیقراری
...جناب شمس مظفر پوری۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

...ام میں تین ننگے زندگی کی عریاں تصویریں۔ وقت کی دکھتی ہوئی رگ
...مرت کی فنکارانہ ضرب۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

...اتیں سعید امرت کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ۔ تشنہ جوانیوں کے
...جذبات کی ترجمان۔ بہکے ہوئے بڑھاپے کی ہوسناکیوں پر طنز ہیں اور کالی
...میں رینگنے والے گناہوں پر ضرب کاری ہیں۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

...یاں رنگ رنگ کی شوخ و شنگ لڑکیوں کے جذبات و احساسات
...یریں۔ اختر ملیح آبادی کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

...ایک پہیلی کیا عورت واقعی ایک پہیلی ہے؟ سمجھ میں نہ آنے والی
اس کا جواب آپ راج کنول کے سولہ دلکش رومانی افسانوں میں پائیں گے
...فی جلد صرف تین روپے۔

...ٹے مار کم عرش ملسیانی کے مزاحیہ افسانوں اور مضامین کا حسین و جمیل
...میں مسکراہٹوں اور قہقہوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ قیمت سوا دو روپے۔

...سیاہ تاج محل موہن یادور کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت تین روپے۔

فرشتے؟ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک قابل قدر اضافہ ...
اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور اب دوسرا ایڈیشن قارئین کے اصرار پر
نہایت آب و تاب سے شائع کیا گیا ہے۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

۱۸۵۷ء کی دلی جناب ہیشور دیال نے اس میں تاریخی حالات کے ساتھ ...
کو ایک پرکیف داستان کے روپ میں پیش کیا ہے۔ جس میں آپ حسن و شباب کی
رنگینیوں ہی سے نہیں جذبۂ حب الوطنی، ایثار، اخوت و محبت اور رواداری کے
چشموں سے بھی سیراب ہوں گے۔ دلی کی ٹکسالی زبان، قلعۂ معلیٰ کی دل میں حلاوت
لینے والی زبان کی حلاوت آپ کو جناب ہیشور دیال ہی کے زور قلم میں پائیں
گے۔ کیونکہ یہ ان کی اپنی مادری زبان ہے۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

ڈارلنگ جناب نریش کمار شاد کے منتخب طبع زاد افسانوں کا بے مثل اور حسین
و جمیل مجموعہ۔ قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

سرخ حاشیے اردو کے مشاہیر ادیبوں کے دلچسپ لطیفے۔ قیمت دو روپے
پچھتر نئے پیسے۔

راکھ تلے غیر ملکی افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانے ہندوستانی لباس میں۔ قیمت دو روپے۔

مالوا میکسم گورکی کے شہرۂ آفاق ناولٹ کا ترجمہ۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔

سیاہ پوش خاتون یہ ایک دلچسپ اور ولولہ انگیز ناول ہے جو بیک وقت رومانی
بھی ہے اور جاسوسی بھی۔ ایک پراسرار سیاہ پوش خاتون کی کہانی حصہ اول دو روپے، دوم چار روپے

شہر دل جناب محسن زیدی کی غزلوں کا حسین انتخاب۔ محسن زیدی نے شہر دل
کو آرزوؤں کی نوخیز کلیوں سے سجایا ہے۔ قیمت صرف دو روپے۔

سفینہ و ساحل جناب عزیز وارثی کا مجموعہ کلام۔ ان کی شاعری میں اتنی توانائی،
قوت اور دلآویزی ہے کہ نسلوں تک فراموش نہ کیا جا سکے گی۔ قیمت صرف چار روپے

گل رعنا جناب برج لال جگی رعنا کا تازہ مجموعۂ کلام جو موجودہ دور کی بہترین شعری
خوبیوں سے مزین ہے جس کے مطالعہ کے بعد آپ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے
کہ گل رعنا واقعی بہترین شعری مجموعہ ہے۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶

چار سو بیس

رام پال بی اے (آنرز)

۲۳-ایل ماڈل ٹاؤن۔ ہوشیارپور (پنجاب)

۲۲ مئی ۹۵ء محترم خوشتر صاحب، تسلیم

خطوط کی رفتار سے پتہ چلتا ہے کہ "سلاخوں کے پیچھے" مقبول ہوا ہے۔ خدا شاہد ہے آپ ادب میں نئے تجربوں کے قائل ہیں۔ اس بار "جرم و مجرم" پر ایک مضمون ارسال ہے۔ عنوان "چار سو بیس" میں نے جان بوجھ کے چنا ہے۔ کیونکہ عام ذہن کا فہم لڑتا جھگڑتا آدم ہے۔ لیکن "چار سو بیس" کا عام طور پر شکار ہوتا ہے اور معدودے چند حالات میں شکار کرتا ہے ـــــــ اور آپ خود بھی تو خدا آپ کو خوش رکھے، اس کا شکار ہو چکے ہیں جبھی آپنے "جعل سازِ اعظم" کی اصطلاح ایجاد کی۔ یہ مضمون اُسی سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ شاید یہ "چار سو بیس" آپ کو پسند آئے . . .

آپ کا ـــــــ رام پال

تعزیراتِ ہند کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے ہندوستانی زبان کو ایک ایسا لفظ عنایت کیا ہے، گویا کوزے میں دریا بند ہے اور جسے ٹکسالی زبان والے بھی استعمال کرتے ہیں۔ پرانے الفاظ جیسے عیار، مکار، دغا باز، چالاک، رنگے سیار، دھوکے باز، لفظ "چار سو بیس" کے سامنے ہیچ ہیں۔ یہ دراصل اِن سب کا مرکب ہے اور ان کی غمازی کرتا ہے۔ اور اسے آپ دوست دشمن، بڑے سے بڑے لیڈر، زاہد پارسا سے لے کر اپنی بیوی تک کے لئے بلا جھجک استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ ہلکی سی چبھن تو ضرور دیتا ہے لیکن اثر دیرپا نہیں۔ اور پچھلے چند برسوں میں تو مدیر "بیسویں صدی" نے اِس کے ساتھ ("چار سو بیس" کے دوسرے روپ "جعل ساز" کے ساتھ) لفظ "اعظم" لگا کر اس کی اہمیت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ یہ لفظ اب ہر دلعزیز الفاظ جیسے "تھینکس"، "سوری"، "موڈ" اور "بور" سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے دوست آپ کو وقت پر کافی ہاؤس میں نہ ملے تو "سالا چار سو بیس ہے"۔ اگر ماسٹر نے آپ کے نااہل بچے کو پاس نہیں کیا یا دوکاندار نے آپ کی کھوٹی اٹھنی واپس کر دی یا کسی سخن فہم نے آپ کے کسی شعر کو چوری کا یا بھرتی کا قرار دے دیا کسی ایڈیٹر نے آپ کی بکواس نہ چھاپی۔ پبلک سروس کمیشن نے آپ کو کسی نوکری کے لئے نہ چنا۔ آپ کی بیوی کی سہیلی کے خاوند نے ایک نئی ساڑی خرید دی یار لیفری نے آپ کی ٹیم کے لئے بے ایمانی نہ کی۔ آپ کے دفتر کا کلرک آپ کے افسر کی نظروں میں چڑھ گیا۔ غرضیکہ ہر شعبہ میں جہاں آپ کو جائز یا ناجائز طور پر زک پہنچی، آپ یہ لفظ استعمال کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔

ایک بات ضرور ہے۔ جس پر چار سو بیس کا اطلاق ہوگا، وہ شخص ذہنی طور پر عام آدمی سے نمایاں ہوگا۔ اخلاقی طور پر ایک رہزن، قاتل، ڈاکو اور چار سو بیس سبھی مجرم ہیں۔ فرق دونوں میں دل اور دماغ کا ہے۔ ایک من کے بس میں ہے۔ دوسرا عقل سے کام لیتا ہے۔ ایک ابرو، تیوری کے، بھنویں تان کے، لال پیلا ہو کے حملہ کرتا ہے۔ دوسرا ہنستا ہوا لفظوں کے ہیر پھیر سے لیس ہو کے مسکراتا ہوا دھاوا بولتا ہے۔ ایک میں جسم کی مچھلیاں پھڑکتی ہیں۔ دوسرے میں سوچ بچار کے تار ملتے ہیں۔ پہلے میں مار پیٹ کے بعد آدمی کو ناکارہ بنا دیا جاتا ہے۔ دوسرے میں مظلوم اپنی نااہلیت کے متعلق گوٹ پٹ جانے کے بعد سوچتا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری انسان خود آپ ہے۔ قاتل ہمیشہ مقتول کے انسان کو پچھاڑتا ہے۔ یہاں تک کہ مقتول کی روح اور جسم کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ اِس کے برعکس چار سو بیس اپنے مدِ مقابل کے انسان کو اُبھارتا ہے۔ یہاں تک کہ مظلوم خود اپنا شکار آپ ہو جاتا ہے۔

چار سو بیس کو قانونی شکل دئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اٹھارھویں صدی

چار سو بیس

رامپال بی اے (آنرز)

۲۳۔ ایل ماڈل ٹاؤن۔ ہوشیار پور (پنجاب)

۲۲ مئی ۶۵ء   محترم خوشتر صاحب تسلیم

خطوط کی رفتار سے پتہ چلتا ہے کہ "سلاخوں کے پیچھے" مقبول ہوا ہے۔ خدا شاہد ہے آپ ادب میں نئے تجربوں کے قائل ہیں۔ اس بار "جرم و مجرم" پر ایک مضمون ارسال ہے۔ عنوان "چار سو بیس" میں نے جان بوجھ کے چنا ہے۔ کیونکہ عام فہم زنا جگرتا تم ہے۔ لیکن "چار سو بیس" کا عام طور پر شکار ہوتا ہے اور صد وقت چند حالات میں شکار کرتا ہے ______ اور آپ خود بھی تو خدا آپ کو خوش رکھے، اس کا شکار ہو چکے ہیں جبھی آپ نے "جعل سازِ اعظم" کی اصطلاح ایجاد کی۔ یہ مضمون اسی سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ شاید یہ "چار سو بیس" آپ کو پسند آئے...

آپ کا ______ رامپال

تعزیراتِ ہند کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُس نے ہندوستانی زبان کو ایک ایسا لفظ عنایت کیا ہے، گویا کوزے میں دریا بند ہے اور جسے ٹکسالی زبان والے بھی استعمال کرتے ہیں۔ پرانے الفاظ جیسے عیّار، مکّار، دغاباز، چالاک، رنگے سیار، دھوکے باز، لفظ 'چار سو بیس' کے سامنے ہیچ ہیں۔ یہ دراصل اِن سب کا مرکب ہے اور ان کی غمازی کرتا ہے۔ اور اسے آپ دوست دشمن، بڑے سے بڑے لیڈر، زاہد، پارسا سے لے کر اپنی بیوی تک کے لئے بلا جھجک استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ ہلکی سی چبھن تو ضرور دیتا ہے لیکن اثر دیرپا نہیں۔ اور پچھلے چند برسوں میں تو مدیرِ بیسویں صدی نے اِس کے ساتھ ('چار سو بیس' کے دوسرے روپ 'جعل ساز' کے ساتھ) لفظ "اعظم" لگا کر اس کی ہیبت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ یہ لفظ اب ہر دلعزیز الفاظ جیسے "ٹیکنیکس"، "سوری"، "موڈ" اور "بور" سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے دوست آپ کو وقت پر کافی ہاؤس میں نہ ملے تو "سالا چار سو بیس ہے"۔ اگر ماسٹر نے آپ کے نااہل بچے کو پاس نہیں کیا یا دکاندار نے آپ کی کھوٹی اٹھنی واپس کر دی یا کسی سخن فہم نے آپ کے کسی شعر کو چوری کا یا سرقہ کا قرار دے دیا، کسی ایڈیٹر نے آپ کی بکواس نہ چھاپی، پبلک سروس کمیشن نے آپ کو کسی نوکری کے لئے نہ چنا، آپ کی بیوی کی سہیلی کے خاوند نے ایک نئی ساڑی خرید کر یا ریفری نے آپ کی ٹیم کے لئے بے ایمانی نہ کی۔ آپ کے دفتر کا کلرک آپ کے افسر کی نظروں میں چڑھ گیا۔ غرضیکہ ہر شعبہ میں جہاں آپ کو جائز یا ناجائز طور پر زک پہنچی، آپ یہ لفظ استعمال کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔

ایک بات ضرور ہے۔ جس پر چار سو بیس کا اطلاق ہوگا، وہ شخص ذہنی طور پر عام آدمی سے نمایاں ہوگا۔ اخلاقی طور پر ایک رہزن، قاتل، ڈاکو اور چار سو بیس سبھی مجرم ہیں۔ فرق دونوں میں دل اور دماغ کا ہے۔ ایک من کے بس میں ہے۔ دوسرا عقل سے کام لیتا ہے۔ ایک ابرو سکیڑ کے، بھنویں تان کے، لال پیلا ہو کے حملہ کرتا ہے۔ دوسرا ہنستا ہوا، لفظوں کے ہیر پھیر سے لیس ہو کے، مسکراتا ہوا دھاوا بولتا ہے۔ ایک میں جسم کی مچھلیاں پھڑکتی ہیں۔ دوسرے میں سوچ بچار کے تار ملتے ہیں۔ پہلے میں مار پیٹ کے بعد آدمی کو ناکارہ بنا دیا جاتا ہے۔ دوسرے میں مظلوم اپنی نااہلیت کے متعلق گوٹ پٹ جانے کے بعد سوچتا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری انسان خود آپ ہے۔ قاتل ہمیشہ مقتول کے انسان کو پچھاڑتا ہے۔ یہاں تک کہ مقتول کی روح اور جسم کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ اِس کے برعکس چار سو بیس اپنے مدِ مقابل کے انسان کو ابھارتا ہے۔ یہاں تک کہ مظلوم خود اپنا شکار آپ ہو جاتا ہے۔

چار سو بیس کو قانونی شکل دئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا اٹھارہویں صدی

[illegible] بنا لیا [illegible] دوسروں کے مسودات کا [illegible]
[illegible] پر پابندی لگا دی۔ اور اس کے بعد جوں جوں [illegible]
[illegible] انسانی [illegible] شعبے میں بھی ترقی کی۔ دھوکہ دہندوں کے
[illegible] ہوتے۔ اخبارات، رسالے، میگزین، ٹیلیفون، ٹیلیگراف، ریڈیو،
[illegible] خوبصورت عورتیں، چھپے ہوئے مردوں نے سفارش اور پیسے کا سہارا
[illegible] والے کھلے چھپے کھلے بازار میں کالا دھندا کرنے لگے۔

ہتھکنڈے چار سو بیس کے جاننے تو اتنے عام ہو چکے ہیں کہ آپ ان پر [illegible] ضرورت بھی نہیں سمجھتے۔ جیسے ایک آٹھویں جماعت کے طالب علم نے ایک [illegible] میں پڑھنے والے ہونہار طالب علم کو سینما کا لالچ دے کے اپنی جگہ امتحان میں بھیج دیا یا اپنی بدصورت لڑکی کی بجائے ہمسائے کی نک سک سے درست صاحبزادی کو شادی سے پہلے دکھا دیا۔ باسی گھی سے بھی بدترین گھی کو شدھ قرار دے دیا۔ دودھ بیچنے والی گائے کی بجائے بھینس بیچ ڈالی۔ ایک لڑکی کی شادی ہوئی اور کھانڈ کا پرمٹ دو کے لئے لے لیا۔ سمدھن کے آنے پر ہمسایوں سے ٹی سیٹ اور صوفہ مانگ لیا۔ چودہ کیرٹ کو اصلی سونا قرار دے دیا۔ مُردار کا گوشت بکرے کا بن گیا۔ سستا سن کا کپڑا شدہ سلک۔ نوٹ دُگنے کر دئے۔ لوہے کا سونا بن گیا۔ بانجھ کو بچہ۔ شرطیہ نرینہ اولاد۔ محبوب آپ کے قدموں میں۔ جو مانگو مل جائے گا۔ یہ سب روزمرہ کی باتیں ہیں۔

بڑے چار سو بیس تو ان چھوٹی موٹی شاطرانہ چالوں پر یقین نہیں رکھتے۔ وہ تو سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنانے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور وقت ملنے پر دنیا بھر کے رہبروں، سیاستدانوں اور لیڈروں کو بھی اپنے لفظوں سے جکڑ کے رکھ دیتے ہیں۔ ایک پڑوسی عدم تشدد پر کاربند ملک کی سرحدوں کا غلط نقشہ بناتا ہے اور دنیا کو یقین دلانے کے لئے لفظوں کی توپ داغ دیتا ہے اور تلوار کی نوک شہ رگ پر رکھ کے پوچھتا ہے۔

”کیا میں جھوٹ بولتا ہوں؟“

لیکن ایسے چار سو بیس کے ڈھول کا پول کھولنے کے لئے تو علیحدہ مضمون بلکہ کتاب درکار ہے۔ ذکر اُن اصحاب کا تھا جو چھوٹے پیمانے پر اس کا دھندا کرتے ہیں۔

میں ایک ایسے صاحب کو جانتا ہوں جو بہت پڑھے لکھے اور عالم فاضل تھے۔ شکل وصورت سے بھی معقول بلکہ معصوم نظر آتے تھے۔ اور اگر اپنی صلاحیتوں کا بجا استعمال کرتے تو ملک وقوم کے کام آسکتے تھے۔ لیکن انھیں فخر تھا تو اس بات کا کہ وہ ہر شخص کے دستخط اس صفائی سے کرتے ہیں کہ بڑے سے بڑا ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ بھی نہیں پہچان پاتا۔ اور اپنی اس برتری کو جتانے کے لئے انھوں نے جعلی چیک بھنوائے۔

لیکن ہر فرعون کے ساتھ ایک موسیٰ موجود ہے۔ آخر ایک دن دھر لئے گئے۔

ایک اور صاحب تھے [illegible]
افسر بنگلہ بن کر درخت نیلام کر چکے ہیں اور کہیں محکمہ کا [illegible] پکڑے گئے ہیں۔ ایک جگہ گاؤں میں مرغ بندی فرما چکے ہیں اور کہیں [illegible] بھیس بدلے ہوتے ہیں۔

اب چند واقعات سنئے۔ ان سے معلوم ہوگا کہ انسانی دماغ جسے اللہ میاں نے نیک وبد میں تمیز کرنے اور بنی نوع انسان کو نیک راستہ دکھلانے کے لئے عنایت فرمایا تھا پر شیطان کے چیلے کیسے استعمال کرتے ہیں۔ دروغ برگردنِ راوی!

ایک صاحبہ خوب بن سنور کر بہترین کار میں سوار ہو کر ایک جوہری کی دکان پہنچیں۔ اور پانچ دس ہزار کے زیورات خریدے اور نقد حساب ادا کر دیا۔ چند دنوں کے بعد پھر یہی کیا اور اپنا اعتبار جما لیا۔ اب ایک روز تشریف لائیں۔ کوئی ایک لاکھ روپے کے قریب کے زیورات پسند فرمائے۔ کوئی پچیس ہزار کے قریب نقد دئے اور بقایا کے لئے فرمایا کہ آپ اپنے منیجر کو میرے ساتھ کار میں بھیج دیجئے۔ ذرا اپنے شوہر کو زیورات پسند کرا لوں۔

راستے میں ایک جگہ کار روک کر کہنے لگیں میں ابھی آئی۔ میرے شوہر یہیں ہیں۔ اور چند ثانیہ بعد منیجر کو وہاں بلوایا۔ وہ جگہ پاگل خانہ تھی۔ جہاں کے مہتمم سے یہ محترمہ کہہ آئی تھیں کہ میرے شوہر دماغی امراض میں مبتلا ہیں اور عام طور پر میرے زیور میرے جواہرات کی گردان کرتے ہیں۔ جونہی منیجر صاحب اندر پہنچے محترمہ نے ہلکی سی مسکراہٹ مہتمم اور عملے پر پھینکی اور منیجر صاحب دھر لئے گئے۔ وہ زیورات! جواہرات!! چیخ رہے ہیں اور علاج کنندہ اُن کی بیماری کا علاج سوچ رہے ہیں۔ اور جب تک کہ یہ معاملہ صاف ہو، محترمہ نے نہ صرف زیورات صاف کر دئے بلکہ وہ علاقہ بھی اپنے وجود سے پاک کر دیا۔

اب یہ واقعہ کہاں تک سچ ہے۔ میں نہیں جانتا۔ لیکن دماغی اپج واقعی قابل داد ہے۔

ایک اور صاحب نے ایک نہایت قیمتی موتی خریدا۔ قیمت نقد ادا کر دی۔ کچھ عرصے کے بعد تشریف لائے اور کہنے لگے۔ اس کا جوڑا چاہئے۔ جوہری نے معذوری ظاہر کی۔ انھوں نے اصرار کیا اور اشتہارات نکلوانے کو کہا اور فرمایا جو خرچ آئے میرے ذمہ ہوگا۔ بلکہ اشتہار کا خرچ پیشگی دے دیا۔ چھ ماہ کے بعد اس کا جوڑا کہیں دور دراز سے چوگنی قیمت پر دستیاب ہوگیا۔ جسے جوہری نے خرید لیا۔ لیکن وہ صاحب نہ آئے کیونکہ انھوں نے تو خود اپنا موتی چوگنی قیمت پر بیچ دیا تھا۔

اب یہ کہانیاں اگر پرانی ہیں تو نئے نئے واقعات سے متاثر ہو کے اُن اصحاب نے نئی نئی تدبیریں استعمال کیں۔ جب سے اُوگھاٹن اور ریلیف فنڈ کے قصے شروع ہوئے

پہلے وقت بتانا شروع کر دیا۔ بڑے بڑے اشتہارات چھپے۔
ستانی اور غیر ملکی کلاکاروں کے حصہ لینے کی اطلاع دی گئی۔ ٹکٹ بک ہو گئے
موقت مقررہ پر خالی کرسیاں منہ تکتی رہ گئیں!

ایک صاحب نے فلم میں نوجوان طبقہ کو ستاروں کی جھلک دکھانے
لوگوں سے کافی روپیہ وصول کئے۔ دوسرے نے مختلف شہروں میں دفتر کھول کر
سے کاروں کو بھرتی کر کے ان سے سیکورٹی وصول کر لی۔ ایک نے صرف
روپے میں ہارمونیم تحفے! ایک سے دوسرا بڑھا اشتہار دے کر ایک ایک تاش ہر
آرڈر بھیجنے والے کو عنایت فرمائی۔ ایک بھائی نے گرمیوں میں کھیوں سے بچنے کا
صرف چار آنے کے ٹکٹ ارسال کرنے پر ہاتھ کا پنکھا استعمال کرنا بتایا۔ عورت پر
ارلانے والوں کو مہنگی قیمت پر صرف کھانا بنانے کی ترکیبوں کی ایک کتاب تھی!

جرم و تہذیب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب انسان غاروں میں رہتا
پھل پھول اور شکار سے گزارا کرتا۔ ستر پوشی بھی شاید شروع نہیں ہوئی تھی۔
ن زمانے میں انسان جرم سے ناآشنا تھا۔ طاقت کا استعمال شروع ہوئے سے
قبیلوں کا قیام ہوا اور قبیلوں کے لڑائی جھگڑے بڑھنے لگے کو جاگیردار وجود میں آئے
کی چپقلش نے راجوں کو جنم دیا اور راجوں کی حرص و ہوس نے ان میں سے
ایک کو بادشاہ چنا۔ جرم بھی ان اصلاحات کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور موجودہ زمانے میں جبکہ سائنسی دور اور دماغی قلابازیوں کا زمانہ ہے، انسان نے بربریت اور وحشی پن کا دامن پکڑے ہوئے اپنی صلاحیتوں کو غلط استعمال کرنا شروع کر دیا۔

اور فی زمانہ جبکہ آدمی کا منتہائے مقصود صرف پیسہ ہے اور دولت بٹورنے میں ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔ خواہ اس میں اُسے اپنا ضمیر، اپنا ایمان، یہاں تک کہ اپنا خدا بھی کیوں نہ بیچ دینا پڑے!!

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ اور سطروں کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابل اشاعت مضامین ضائع کر دئے جاتے ہیں۔ مضامین کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھا کریں۔ نو آموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی استاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابل اشاعت ہونے کی صورت میں انہیں واپس کر دئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (ایڈیٹر)

[illegible] ناول جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہے ہیں

[illegible] [illegible] کی کہانی ہے جس [illegible] کے حسین چہروں سے [illegible] قیمت [illegible] روپے۔

صبح ہر رنگ میں ملتی ہے [illegible] کی کہانی جو عورت کو ایسے عریاں انداز میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جس پہ سے [illegible] جائیں۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

زلف کے سر ہونے تک عشق و محبت اور حسن و شباب کی رعنائیوں اور زندگی کی مسرتوں اور حسرتوں کا سنگم۔ تین معصوم بھولی بھالی لڑکیوں اور تین بے سہارا لڑکوں کی حسین ترین کہانی۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

چاندنی کے سائے اس میں شبنم کی ٹھنڈک بھی ہے اور شعلے کی حرارت بھی۔ کتاب کو ایک بار شروع کر کے ختم کئے بغیر آپ کو چین نہ آئے گا۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

پیاسے بادل ایک پہاڑی دوشیزہ کے پیار کی کہانی۔ دلآویز رومان کی ایک درد انگیز داستان۔ قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

یادوں کے کھنڈر حیات کے نشیب و فراز کا آئینہ دار ناول جس میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان مچل رہا ہے۔ قابل مصنف نے دل کی دھڑکنوں کو ایسے رنگ و انداز سے ابھارا ہے کہ قلبی رفاقت اور خلوص و محبت کی تصویر نگاہوں کے سامنے تھرکنے لگتی ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

وادیاں اور ویرانے سوکھے سڑے میدانوں اور سرسبز و شاداب پہاڑوں کی حسین و جمیل کہانی۔ قیمت فی جلد چار روپے۔

زنجیر ایک گناہگار لڑکی کی حسین و جمیل داستان۔ عشق و محبت کی ایک ایسی پُر پیچ رومان پر درد داستان جسے پڑھ کر آپ عش عش کر اٹھیں گے جسے زکی انور نے لکھا اور ادارہ "بیسویں صدی" نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد صرف [illegible] روپے

پگھلتے خواب اردو ادب کے ہر دلعزیز ادیب پروفیسر [illegible] کا ایک دلچسپ رومانی ناول جس میں آپ کو [illegible] کے حسین و دلفریب مناظر اور ان مناظر میں بکھری ہوئی [illegible] صاف دکھائی دیں گے۔ قیمت صرف دو روپے۔

نئے فرہاد پروفیسر شکیل الرحمٰن کا اچھوتا شاہکار ناول۔ ایک حسین [illegible] دوشیزہ کی المناک داستان۔ محنت و زندگی کی کشاکش کے [illegible] پر لکھی ہوئی ایک انتہائی دلچسپ کہانی۔ قیمت صرف دو روپے۔

راہیں شباب کی فرانس کے عظیم ترین ناول نگار [illegible] کا غیر فانی شاہکار جس کا ترجمہ دنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، جسے عشق و محبت کی بے مثل داستان تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ناول کی ہیروئن قلوپطرہ اور ہیلن سے بھی زیادہ حسین [illegible] ہے۔ مترجمہ جناب مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

طوفانِ بہار روس کے عدیم المثال ناول نگار تورگنیف کا رومانی شاہکار جس کا ترجمہ دنیا کی بیالیس زبانوں میں ہو چکا ہے۔ جسے دنیا کے مشہور نقادوں نے لافانی رومان قرار دیا ہے اور جسے اردو میں پہلی مرتبہ ادارہ "بیسویں صدی" دہلی نے شائع کیا ہے۔ مترجمہ مخمور جالندھری۔ قیمت تین روپے۔

بھیگی راتیں فرانس کے عدیم المثال ناول نگار [illegible] کا مقبول ترین ناول۔ انسان میں چھپے ہوئے حیوان کا افسانہ، اپنے محبوب کیلئے محبوبہ کی ناقابلِ فراموش قربانیوں کی کہانی۔ مترجمہ مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

فرینڈ موہنی حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اُس دیش کی کہانی جہاں مرد کا تصور بھی ایک جرم تھا۔ صدیوں بعد کی فضاؤں میں لکھی ہوئی ایک عجیب و غریب داستان جو اوّل سے آخر تک دلچسپیوں اور حیرت آفرینیوں سے لبریز ہے۔ جناب کوثر چاندپوری کا لکھا ہوا بے حد شوخ و دلچسپ ناول جو قاری کو کئی صدی آگے کی فضا میں پرواز کراتا ہے۔ قیمت فی جلد محض تین روپے۔

پتہ: رسالہ بیسویں صدی۔ دہلی نمبر ۶

افسانہ نمبر دیکھا

اہلِ قلم حضرات کی رائیں

... ہر اعتبار سے لاجواب ہے۔ اس کے اوراق اُلٹتے چلے جائیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دیدہ و دل روشن ہو گئے ہیں۔ آپ بلاشبہ روشنیوں کے خالق ہیں۔ جتنی تخلیقات ہیں سب پڑھنے کی ہیں۔ سبھی معیاری، دلکش اور حسین ہیں۔ "تیر و نشتر" کا حصہ اس بار بھی دلچسپ ہے۔ ماہنامہ "شاعر" کے تازہ شمارے میں جناب اشرف قادری نے "تیر و نشتر" کے خالق خوشتر گرامی کے طنز و مزاح پر مقالہ لکھا ہے ——— آپ کی تصویر سرورق پر دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی...

پروفیسر حامدی کاشمیری (سری نگر)

... میں پوچھتا ہوں یہ کیا جادو ہے آپ کے پاس؟ میں تو ابھی اسے پڑھنے کا پروگرام ہی مرتب کر رہا ہوں۔ سوائے دو چار چیزوں کے زیادہ نہیں پڑھ سکا اور ادھر ایڈیٹر "تیرگام" نے لکھوانا یا پڑھ پڑھ کر خط لکھنے بھی شروع کر دیے۔ یہ جادو نہیں تو اور کیا ہے؟ میری طرف سے اتنے خوبصورت "افسانہ نمبر" کے لئے مبارک باد! اگلے الفاظ لکھ کر یوں نہیں! اور ادھر "شاعر" کے تازہ شمارہ کے سرورق پر حضرت یوں جلوہ نما ہیں کہ ہیں جواب نہیں۔ خدا نظرِ بد سے بچائے...

کشمیری لال ذاکر (ایم اے) روہتک

... بھارت میں اردو ادب کے عظیم محسنین میں حضرت خوشتر گرامی کا نام صفِ اول میں ہے۔ "بیسویں صدی" کے ذریعہ انھوں نے تقسیم کے بعد اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ یوں تو "بیسویں صدی" کا ہر پرچہ ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے مگر خاص نمبر نکالنے کا جو ڈھنگ خوشتر صاحب کو آتا ہے، اُس کا واقعی کوئی جواب نہیں۔ افسانہ نمبر خوشتر صاحب کی خوش ذوقی اور بلند نظری کا بین ثبوت ہے۔ انھوں نے اس ایک نمبر میں اردو کے کئی عظیم اور مشہور فنکاروں کو جمع کر لیا ہے...

ضیا فتح آبادی (ایم اے) نئی دہلی

... اس کی تصویر حیثیت اور زیب و زینت دیکھ کر اپنی اس محرومی کا احساس ہوا کہ اس کے لئے اپنی کہانی نہ بھیج سکا کیونکہ [illegible] لکھ رکھی تھی اور آپ کو اطلاعی خط بھی [illegible] پشیمانی کا شکار ہو گیا کہ کسی بات کی شرمندگی ———

افسانہ نمبر ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور قابلِ تعریف ہے۔ آپ نے جس خلوص اور حوصلے سے یہ شمارہ پیش کیا ہے وہ اس ہمت شکن دور میں آپ ہی کا حصہ ہے۔ اپنی الجھنوں کے باوجود نصف سے زائد پڑھ چکا ہوں۔ بعض چیزیں خصوصیت کے ساتھ پسند آئیں جو یقیناً خصوصیت کے ساتھ لکھی بھی گئی ہوں گی...

شمس مظفر پوری (مظفر پور)

— اس بار تو "بیسویں صدی" دلہن بن کر آئی ہے۔ ظاہری دیدہ زیبی اور باطنی حسن لاجواب ہے۔ مضامینِ نظم و نثر معیاری، خیال انگیز اور صحت مند ادب کے آئینہ دار ہیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ آپ کا یہ امتیازی شان کا جریدہ سو فیصدی گھریلو رسالہ ہے۔ اس کی انفرادیت گھر میں سب کو یکساں متاثر کرتی ہے۔ صحافت کے سلسلے میں آپ کی معاملہ فہمی اور ترتیب کے معاملے میں آپ کی نکتہ شناسی قابلِ داد ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیں ؎

جادو ہوا ہر آنکھ پہ ہر دل میں گھر ہوا
یہ معرکہ تو خوب سے بھی خوب تر ہوا

رشی پٹیالوی (چنڈی گڑھ)

... ظاہری اور باطنی جمال و جلال کو دیکھتے ہوئے مجھے تو یہ دلفریب نمبر ایک ایسی حسینہ نظر آ رہا ہے جس پر خدائے سخن میر تقی میر کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

جس جائے سراپا پہ نظر جاتی ہے اُس کے
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر

نریش کمار شاد (نئی دہلی)

... دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ مسرت سے زیادہ حیرت! ان حالات میں اتنا شاندار نمبر پیش کرنا آپ کے عزمِ جواں کا اعجاز ہے! ——— افسانہ نمبر فردوس بدوش ہے اور جس نظر بھی اس کا ہر صفحہ دیکھ کر بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست!

آسی رام نگری ([illegible])

... "بیسویں صدی" کا عام شمارہ باذوق قاری کے ہر قسم کے احساس کو چھوتا ہے۔ اس نمبر... بیچ کتابوں کو ہر دو طرف سے وقت نیت معرفت کردگار ــــــ یقیناً اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنی ہمت اور لگن دی ہے کہ آپ نفسی نفسی کے اس دور میں اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ صد آفریں ہے آپ کی ہمت پر...

مفتی مولانا (ایم اے) حیدرآباد دکن

... افسانہ نمبر ہر لحاظ سے بہت خوب اور بلند پایہ ہے...

ست پرکاش سنگھ (ایم اے) چنڈی گڑھ

... یوں تو اردو کے بہت سے رسائل نکلتے ہیں لیکن "بیسویں صدی" کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ اور کسی رسالہ کو نہیں۔ آپ اردو ادب کی جو بے لوث خدمت سرانجام دے رہے ہیں، یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ بلاشبہ "بیسویں صدی" نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کا ایک عظیم ادبی پرچہ ہے۔ اردو ادب کے تمام عظیم فنکاروں کا اسے پورا پورا تعاون حاصل ہے...

چندر پرکاش جوہر بجنوری (الہ آباد)

... افسانہ نمبر اتنا دلکش و حسین ہے کہ مجھے دکھ ہے کہ میں اس حسین محفل میں کیوں نہ شریک ہوئی۔ سب ہی نے خونِ جگر سے اس محفل میں چراغاں کیا ہے۔ لیکن اگر یہ کہوں کہ جگدیش بمل کا افسانہ جانِ محفل ہے تو جانبداری نہ ہوگی...

اعجاز نسرین (لال پور)

... کون کافر ہے جو آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا مداح نہ ہوگا۔ وہی دل کش سرورق۔ ویسی ہی دلفریب تصاویر اور بلند پایہ تخلیقات! ــــــ اس بحرانی دور میں جبکہ ہر شخص ایک ذہنی پریشانی میں مبتلا ہے، نہ جانے آپ کیسے اپنی روایات پر قائم ہیں اور آپ کا ہر قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ ایسے ادبی تحفے پر اردو کو بجا طور پر ناز کرنا چاہئے...

تبسم شفائی (اورنگ آباد)

... دلکش اور پرکشش افسانہ نمبر دیکھ کر طبیعت پھڑک اٹھی۔ مطالعے سے مسرت و شادمانی کے احساسات جاگ اٹھے۔ زندگی عزیز معلوم ہونے لگی۔ قلبِ افسردہ نے انگڑائی لی اور ایسا محسوس ہونے لگا۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

خیال مالیگانوی (مالیگاؤں ناسک)

... رنگا رنگ سرورقوں، جدتوں اور خوبیوں سے معمور افسانہ نمبر دیکھا، پڑھا اور جھوم جھوم اٹھا۔ آپ یقیناً بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ اردو زبان و ادب کی خدمت جس دیوجس جانفشانی سے آپ کر رہے ہیں اس کے لئے ہم شیدائیانِ اردو آپ کے دل سے شکر گزار ہیں۔ آپ کی جدوجہد بے غرض، آپ کی محنت و ریاضت داد و ستائش سے بے پرواہ ہے۔ ایک سچے مخلص اور ایماندار فنکار و صحافی کی یہی پہچان ہے۔ لہٰذا ایسے اتنے نفیس و معیاری افسانہ نمبر کی اشاعت پر میری طرف سے مبارکباد۔ ایم کوشیلیوی (آئیڈ گور کھپور)

... "بیسویں صدی" آسمانِ ادب کا درخشندہ ستارہ ہے۔ جس کی روشنی سے ادب کا جہاں روشن ہے۔ اردو کی خدمت میں "بیسویں صدی" نے جو کردار ادا کیا ہے اسے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے خوشتر گرامی کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے...

کریم رضا مونگیری (کلکتہ)

... ہر لحاظ سے قابلِ صد ستائش ہے اور آپ کے تمام سابق نمبروں سے ممتاز ہے۔ آپ نے بلاشبہ "بیسویں صدی" کو ایک نئے معیار اور ایک نئے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔

آزاد گوردواس پاسک (بی اے) جمشید پور

... افسانہ نمبر اہلِ ذوق کے لئے سالِ رواں کا حسین و جمیل تحفہ ہے...

رشید جعفری (آکولہ)

... یہ جو آپ ہر چھ ماہ بعد بہاروں کے تبسم اور کہکشاں کی تابناکیوں کو اپنی طلسماتی شخصیت کے زور سے یکجا کر دیتے ہیں، کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ آخر ہم دیوانوں پر ان سب کو یوں یکجا دیکھ کر کیا گزرتی ہوگی ــــــ افسانوی حصے میں جہاں ہر افسانہ خوب سے خوب تر ہے جناب کشمیری لال ذاکر، جگدیش بمل اور رام لعل نے اپنی بلندیوں کو بخوبی برقرار رکھا ہے۔ کرشن چندر تو اب اردو ادب کا وہ درخشندہ ستارہ بن گئے ہیں، جن کی رہنمائی اب صرف ادب ہی نہیں، بلکہ پوری زندگی چاہتی ہے... کلدیپ سنگھ (پٹیالہ)

غیر مطبوعہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے۔ بصورت دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے۔ ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

"بیسویں صدی" کے مستقل خریدار بن کر بارہ روپے سالانہ کی قلیل رقم میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ دو عظیم الشان بلند پایہ قیمتی خاص نمبر بھی دستیاب ہیں جن کی قیمت دو روپے فی پرچہ ہوتی ہے۔



زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱ــــــ ڈاکٹر کریلا

کریلا ہندوستان اور پاکستان کی مشہور (ارزاں) سبزی ہے جو کھانے میں بہت لذیذ اور مزیدار ہے اور پنجابیوں کی مرغوب غذا ہے۔ تاثیر کے لحاظ سے گرم خشک ہے۔ بھوک لگاتا ہے۔ بادی اور بلغم کو چھانٹتا ہے۔ ریاح اور بلغم کو تحلیل کرکے پیٹ کے کیڑوں کو ہلاک کرتا ہے۔ گٹھیا اور پتھری کو دور کرتا ہے۔ ذیابیطس میں اکسیر کا حکم رکھتا ہے اور جوڑوں کے درد میں نافع ہے۔ اعضائے رئیسہ کو قوت بخشتا ہے۔ اور قوتِ باہ میں اضافہ کرتا ہے۔

یونانی اطباء اِسے قابض اور آیورویدک والے اِسے ملین بتاتے ہیں۔ مدیر "بیسویں صدی" کے تجربہ میں کریلا اجابت بافراغت لاتا ہے اور پیشاب آور ہے۔ اِسے قابض ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ مصلح اِس کا گھی اور سرد چیزیں ہیں۔

کریلے کو سرکے میں پیس کر لیپ کرنے سے گلے کی سوجن جاتی رہتی ہے۔ عرق کریلے کو بار بار لیپ کرنے سے داد سے نجات مل جاتی ہے۔ کریلے کے رس میں شہد ملا کر پینے سے جلندھر کو آرام ملتا ہے۔ تلی کے لئے رس کریلے میں تھوڑی سی رائی اور نمک ملا کر پینا بہت مفید ہے۔ چمچہ بھر کریلے کے رس میں تھوڑی سی کھانڈ ملا کر پینے سے خونی بواسیر کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ ذیابیطس جیسے موذی مرض سے صبح خالی پیٹ کریلے کا پانی نچوڑ کر پینے سے نجات ملتی ہے۔

بہت سے لوگ اِسے پسند نہیں کرتے اور کم کھاتے ہیں مگر فوائد کے لحاظ سے یہ بہت مفید اور صحت بخش سبزی ہے۔ جو تنہا پکانے میں بھی بہت لذیذ اور مزیدار ہے اور گوشت میں بھی۔

۲ــــــ عمر رسیدہ لوگوں کے لئے

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ــــــ عمر رسیدہ لوگوں کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ اعصاب کو لچکدار اور نرم رکھیں تاکہ جسم کے رگ و ریشے قبل از وقت سخت اور کرخت نہ ہو جائیں۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ عرصے تک جوان اور زندہ دل رہیں۔ کام حد سے زیادہ کرنا بھی ایسا ہی بُرا ہے جیسے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنا۔

جسم کے انحطاط کی سب سے پہلی علامت یہ ہے کہ انسان کو کمزوری محسوس ہو۔ جسم میں زور رہے نہ بازو میں طاقت۔ انگلیوں کے اعصاب نرم اور کمزور پڑ جائیں۔

اعصابی رگ و ریشے میں عام انحطاط نمودار ہو جائے۔ ادھیڑ عمر میں پٹھوں کی بدنی کوٹھریاں بہت حساس نہیں رہتیں۔ وہ تھکی اور ماندی ہو جاتی ہیں۔ ہر عضو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیچے کی طرف جا رہا ہے۔ جسم کے سارے اعضاء اور معدے کی دیواروں کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ گرتی جاتی ہیں۔ جوڑ کے اعصاب پرانی کمانوں کی طرح خمیدہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

دماغی قوی میں بھی وہ تیزی اور چستی نہیں رہتی۔ عقل و فہم اور سوجھ بوجھ میں کمی ہو جاتی ہے۔ اِس سستی اور جمود کو دور رکھنے اور دماغی قوتوں کو چست و چاق رکھنے کے لئے صبح کی سیر اور سبز گھاس پر ننگے پاؤں چلنے سے بہتر کوئی موثر دوا نہیں ہے۔ بڑھاپے میں رگ و ریشے کی کوٹھریاں ایسی طاقتور نہیں ہوتیں۔ ان میں مقابلے کی طاقت کم ہو جاتی ہے اور انہیں اور خون کو ہر طرح کے زہروں سے جو جسم کے اندر کی آگ سے پیدا ہوتے رہتے ہیں، بچائے رکھنے اور تندرست و صحت مند رکھنے کے لئے ہلکی سی ورزش ضروری ہے۔

اگر آپ سکون چاہتے ہیں!

اگر آپ اطمینان و سکون سے زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ناساعد و ناخوشگوار حالات و زندگی سے سمجھوتہ کرنے سے گریز نہ کیجئے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ حالات ہمیشہ ہماری خواہش کے مطابق ہوں اور جب ایسا نہیں ہوتا تو ہم اُنھیں مشکلات کا نام دیتے ہیں۔ مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہو، اُن سے شکست تسلیم کر لینے سے ہمیں کبھی دلی اطمینان نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنی بے بسی کے ہمیشہ شاکی رہیں گے۔ دُنیا میں بیشتر ایسے لوگ ہیں جو اپنے کام یا مقام سے مطمئن نہیں۔ وہ نہ اپنے کام کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں نہ اپنی ذات کے ساتھ۔ دُنیا میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو ایک کام کرتے ہوئے اپنی عمر گزار دیتے ہیں لیکن ساری زندگی اُس کام سے نالاں بھی رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں وہ کسی اور کام کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

لیکن اِس طرح کی مشکلات کا رونا وہی لوگ روتے ہیں جن میں جراَت و ہمت نہیں ہوتی جو کسی طرح کے جوکھم میں نہیں پڑ سکتے۔ جنھیں اپنی صلاحیتوں پر اعتماد نہیں ہوتا، جنھیں کامیابی کی توقع نہیں ہوتی۔ اور جو لوگ ناساعد حالات سے شکست تسلیم نہیں کرتے، نئے حالات کا عزم و حوصلہ سے خیر مقدم کر سکتے ہیں اور نئے میدانوں میں جا کر قسمت آزمائی کرتے ہیں، وہ قسمت یا حالات کا گلہ نہیں کرتے۔ ایسے کتنے لوگ ہیں۔ آپ کے گرد و پیش بھی ایسے لوگ ہوں گے جنھوں نے ناساعد اور ناخوشگوار حالات سے نکل کر نئی راہ اختیار کی، نئی مہم شروع کی اور اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے۔

اگر ایسے ناخوشگوار اور ناپسندیدہ حالات کو ہم بدل نہیں سکتے تو اُن سے ہمیں سمجھوتہ کر لینا چاہئے۔ ورنہ ذہنی بے چینی اور کوفت باقی رہے گی۔ اگر ہم ضبط و تحمل سے کام لیں تو بہت سی ناخوشگوار اور ناپسندیدہ باتوں کو نظر انداز بھی کر سکتے ہیں۔ اُن میں کچھ ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کا براہِ راست ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور ہم خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔

زندگی میں چھوٹے چھوٹے بہت سے واقعات ہوتے ہیں جنھیں ہم نظر انداز کر سکتے ہیں لیکن ہم خواہ مخواہ اُن کا بوجھ اُٹھائے پھرتے ہیں۔

۴ — فالسہ — ایک مُفید پھل

سرد و تر پھل ہے۔ تپکی، پیاس اور گرمی کو دُور کرتا ہے۔ قوتِ ہاضمہ کو تیز کر کے نیا خون پیدا کرتا ہے۔ پیشاب کی جلن مٹاتا ہے۔ گرمی اور پیاس کی شدت میں بہت تسکین دیتا ہے۔ اِس کا شربت بخار میں ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ بلغم کو خارج کرتا ہے۔ دل، معدہ، جگر اور گُردوں کو قوت بخشتا ہے۔

فالسہ مستورات کے [illegible]
سرد مزاج کو مضر ہے۔

فالسہ کا شربت موسم گرما میں بے حد تسکین بخشتا ہے۔ اِس کے تیار کرنے کا طریقہ بھی بہت آسان ہے۔ پاؤ سیر پختہ فالسوں کو صاف ستھرے کپڑے میں ڈال کر نمک سے گھول کر نچوڑ لیں اور اِس میں تین پاؤ چینی ملا کر شربت کا قوام بنالیں اور حسبِ ضرورت پانی، برف اور عرقِ کیوڑہ یا عرقِ گلاب یا عرقِ گاؤزبان ملا کر پئیں۔

یہ شربت معدے کو بے حد تقویت بخشتا ہے۔ جگر کی گرمی کو دُور کر کے پیاس کو تسکین دیتا ہے۔

۵ — مایوسی

انسان کی زندگی میں اُمید اور مایوسی بہت اہم کام انجام دیتی ہے۔ اُمید پر دُنیا قائم ہے۔ اگر اُمید ختم ہو جائے یعنی ایک انسان اپنے اوپر مایوسی مسلط کر لے تو پھر زندگی کی دشوار گزار گھاٹیوں کو طے کرنا تو درکنار وہ اُن میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔ غور کیا جائے تو ہم میں سے ہر شخص اُمید اور آس پر زندگی کے دن گزار رہا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی طرف سے جتنا پُر اُمید ہے، اُتنی ہی اُس کی زندگی خوشگوار اور پُر سکون ہے اور جس قدر مایوسی کو دل میں جگہ دیتا ہے اُتنی ہی اُلجھنیں اور دُشواریاں بڑھتی ہیں۔

کبھی کبھی ہم میں سے اکثر کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جب ہمیں دُنیا تاریک نظر آنے لگتی ہے۔ زندگی بے لُطف محسوس ہوتی ہے اور ہم آئندہ کے لئے کچھ بھی نہیں سوچ پاتے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

یہی زندگی کا وہ مقام ہے جہاں اکثر اوقات بڑی مشکل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اگر ایک شخص خون کی کمی کا مریض ہو تو اُس کے لئے وٹامن پہنچانے والی غذائیں اور مقوّی دوائیں تجویز کی جا سکتی ہیں۔ زیادہ تشویشناک بیماری ہو تو اُس کا علاج کسی قابل ڈاکٹر کو سونپا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر انسان مایوسی کا شکار ہو تو اُس کا کوئی مادی علاج ممکن نہیں۔ بھلا کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اگر ایک شخص نے اپنی زندگی اپنے لئے وبالِ جان بنالی ہو۔ اور کس طرح ایسے آدمی کا علاج ہو سکتا ہے، جس نے طے کر لیا ہو کہ وہ زندگی میں شکست کھا گیا ہے۔

جو انسان زندگی کے اِس خطرناک دَور سے گزر رہا ہو وہ ہمیشہ اپنے گرد و پیش کے حالات، ماحول اور انسان کو قصور وار گردانے گا۔ لیکن دراصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ حالات کو بے قابو اور مایوس کُن پا کر اپنے حوصلہ اور سمجھ بوجھ کی قوت کو منتشر سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ حقیقت میں اُس کا یہ احساس اور مایوسی

ہو حالات کا نتیجہ نہیں ہوتی جو اس کے گرد و پیش ہیں، بلکہ ان خیالات کا نتیجہ ہوتی ہے جو اندرونی طور پر اسے گھیرے ہوتے ہیں۔

اب ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ زندگی میں مایوسی ختم کرنے کے لئے کیا کیا جائے؟ اس کے لئے تین تجویزیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ اپنے کو قابلِ رحم سمجھنا چھوڑ دیجئے۔
۲۔ دوسروں کے لئے کچھ کیجئے۔
۳۔ حالات بدلنے کے لئے کوئی مثبت اور عملی قدم اٹھائیے۔

۶ــــــ عادت

عادت ہی انسان کو بناتی اور عادت ہی بگاڑتی ہے۔ لیکن لوگ قسمت کو کوستے ہیں۔ کبھی فلک کج رفتار کی ستم ظریفی کا رونا روتے ہیں، کبھی احباب واقربا کی بے اعتنائی اور ستم شعاری کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان کی خواہشات کی تکمیل اور عدمِ تکمیل میں عادت کو بڑا دخل ہے۔ اس کے دو رُخ ہیں۔ ایک رُخ بھلائی ہے اور دوسرا بُرائی۔ اچھائی کی نشو و نما کے لئے صحتِ جسم، صحتِ دماغ اور صحتِ ماحول بے حد ضروری ہے۔ دوسری حالت میں یہ اچھائی بُرائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ صحت وہ نعمت ہے جس کے ذریعہ انسان کی تمام خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے اور اچھی عادت کی صحت مندی ہی کامیابی کے ساتھ اس عالمِ رنگ و بُو کے گوناگوں طلسمات، ایجادات، اختراعات اور انکشافات سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحت تمام سماجی، معاشی، ذہنی اور اخلاقی خوبیوں کی بُنیاد ہے۔ صحت ہی سے بقائے حیات ہے اور صحت بہت حد تک عادت کی مرہونِ منت ہے۔

۷ــــــ بے خوابی

اگر آپ کو بے خوابی کی شکایت ہے اور آپ گہری نیند سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو خواب آور گولیاں کھانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ ان کا استعمال اُلٹا نقصان دہ ہے۔ گہری اور پُرسکون نیند حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو جسمانی طور پر خوب تھکا دیجئے اور معمول سے زیادہ کام کیجئے اور اچھی طرح ورزش کیجئے۔ جب آپ سونے کے لئے بستر پر لیٹیں تو اپنے ذہن سے تمام تفکرات اور ناخوشگوار خیالات نکال دیجئے اور نہایت مسرت انگیز اور خوشگوار باتوں کے متعلق سوچئے۔ اس الم کدۂ حیات میں کسی کو فکر و تشویش اور رنج و آلام سے مفر نہیں۔ نیند کے یہ چند لمحات ہی ایسے ہیں جب آپ تمام افکار سے نجات پا کر کسی آزاد پنچھی کی طرح ایک اور ہی دنیا کی فضاؤں میں چلے جاتے ہیں۔ آپ اس دنیا کو حسین بہشت میں تبدیل کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ سونے سے پہلے دلکش خیالات کو اپنے دماغ میں جگہ دیں۔ اگر آپ کا دماغ سونے سے پہلے پراگندہ خیالات کی آماجگاہ بنا رہا تو آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ آپ نے ایک سنہرا موقع نہایت بیدردی سے کھو دیا۔ آپ کو صبح اُٹھ کر پھر دُنیا کی مصیبتوں کے لشکر کے سامنے صف آرا ہونا ہے۔ اگر آپ نے اس وقت گہری نیند سو کر اپنے آپ کو قوتِ آزادی اور سکون و تازگی سے مسلح نہ کر لیا تو آپ کو شکستِ فاش کھانی پڑے گی۔ اپنے جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیجئے۔ اس طرح کہ جسم کا کوئی حصہ بھی کھنچا ہوا نہ رہے یا تناؤ محسوس نہ کرے۔

اگر آپ کو کسی وقت نیند نہ آ رہی ہو تو اُٹھ کر کام کرنا شروع کر دیجئے یا پڑھنے لگئے۔ جلد ہی نیند دبے پاؤں آپ کے پاس آ جائے گی۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اندھیرے میں زیادہ گہری نیند آتی ہے اور تھکے ماندے اعصاب کو زیادہ سکون ملتا ہے۔

سونے سے پہلے گہری سانسیں لیجئے۔ یہ صرف ایک اچھی ورزش ہی نہیں بلکہ گہری نیند کے لئے بھی بے حد مفید ہے۔

۸ــــــ مسرت ہی مسرت، زندگی ہی زندگی!

دو ہزار سال پہلے کا انسان آج کسی متمدن خطۂ زمین کے کسی شہر میں آ کر انسان کی مادی ترقی کے کرشمے دیکھے تو حیرت و استعجاب سے اُس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ جائیں اور اُسے شاید یقین نہ آئے کہ وہ یہ سب کچھ عالمِ بیداری میں دیکھ رہا ہے۔ بے شک انسان نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اس نے قدرت کی مہیب طاقتوں کو اپنے زیرِ نگیں کر لیا ہے۔ اس نے لامحدود فضاؤں اور بے پایاں سمندروں کو اپنی جولانگاہ بنا لیا ہے ـــــ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں! کہتا ہوا انسان اب چاند تک پہنچ رہا ہے۔ لیکن یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھئے۔ تصویر کے دوسرے رُخ پر بھی ایک نظر ڈالئے۔

آپ کسی شہر کے چوراہے کے سامنے کھڑے ہو جائیے اور گزرتے ہوئے بچوں، جوانوں، بوڑھوں اور مردوں عورتوں کو ذرا غور سے دیکھتے جائیے۔ آپ کو مشکل سے پانچ فی صد ایسے لوگ نظر آئیں گے، جن کے چہروں پر صحت مندی و تندرستی کا خون جھلکتا ہوا دکھائی دے گا ورنہ زیادہ تر ایسے ہی لوگ نظر آئیں گے جن کے جسم کمزور، رنگ زرد، رخسار پچکے ہوئے اور چہرے مُرجھائے ہوئے ہوں گے۔ جن کی آنکھوں میں چمک ہوگی نہ چہرے پر دمک۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نحیف کندھوں پر زندگی کی ذمہ داریوں کا بارِ گراں اُٹھائے زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہیں۔ لیکن اس بوجھ کے نیچے دبے چلے جاتے ہیں۔ ان میں ہر طبقہ کے لوگ ہیں اور تقریباً سب ہی زندگی کی اُس نعمت سے محروم ہیں جسے صحت کہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ جاننے کے لئے آج سے چند ہزار برس تک انسان کی زندگی پر ایک نظر ڈالیں۔ اُس زمانے کے انسان کو زندہ رہنے کے لئے طاقتور، تندرست، بہادر اور دلیر بننا پڑتا تھا۔ کیونکہ اُسے جنگل کے خونخوار درندوں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ کبھی خوراک حاصل کرنے کے لئے

[illegible] تیز کر [illegible] ہوں ہوں انسان [illegible] گیا۔ حرکت اور دوڑ [illegible] بنا کر موجودہ دور کے [illegible] کی صورت میں ادا کرنی پڑی۔ آج [illegible] دیہاتوں میں رہتے ہیں اُن کی صحت [illegible] قابلِ رشک ہے۔

آپ بھی اگر تندرست و توانا رہنا چاہتے ہیں، زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو فطری زندگی اختیار کیجئے۔ قدرت کی آغوش میں چلے جائیے۔ جہاں [illegible] ہے زندگی ہی زندگی ہے !

۹ ـــــــ غصہ

ماہرین متفق ہیں کہ اگر آپ برابر اپنے غصہ کے جذبات کو دباتے رہتے ہیں اور اُسے نکلنے کا راستہ نہیں دیتے تو لازمی بات ہے کہ آپ کے جسمانی نظام پر اُس کا اثر مضر پڑے گا۔ یہ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ خاموش غصہ کا اثر صحت پر بہت مہلک اور خطرناک ہوتا ہے۔

امریکن سائیکاٹرک ایسوسی ایشن کو رپورٹ دیتے ہوئے ڈاکٹر اِرونگ ہیرلیس نے اِس بات پر زور دیا کہ جتنے بھی مریض ہوتے ہیں انہیں زیادہ تر کوئی خاص بیماری نہیں ہوتی۔ مستقل غصہ دبانے کی وجہ سے اُن کے لاشعوری ذہن میں تلخی، جھلاہٹ اور رنج کا زہر بھر جاتا ہے اور نتیجہ میں سخت اعصابی تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے پٹھوں کے عمل اور رگ و ریشے کے عمل میں کمزوری آجاتی ہے اور دل کے ساتھ ساتھ پورا نظام بگڑ جاتا ہے۔

یہی نہیں، مستقل غصہ دبانے سے کوئی بھی مہلک مرض پیدا ہو سکتا ہے ـــ ادارہ نفسیاتی تجزیہ شکاگو میں جو تجربات ہوتے ہیں اُن سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس عادت کی وجہ سے باریک نسوں پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے جس کی وجہ سے ہائی بلڈ پریشر کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ آدھے سر کے درد کی تکلیف دہ شکایت بھی اکثر اسی عادت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور بھی دوسرے تجربات سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ غصہ کو مستقل ضبط کرنے کی وجہ سے بے خوابی، اختلاج، دماغی کمزوری اور کینسر وغیرہ کے خطرات ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔

جب غصہ آنا فطرتِ انسانی کا تقاضہ ہے اور اُس کے نتائج خطرناک ہوتے ہیں۔ تو اُس سے بچنے کے لئے سب سے پہلے غصہ سے گریز کیجئے۔ جس بات پر یا جس جگہ غصہ آجانے کے امکانات نظر آئیں اُسے نظر انداز کر دیجئے اور وہاں سے ہٹ جائیے۔ لیکن جب آپ پر غصہ کا بھوت سوار ہی ہو جائے تو ماہرین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ زیادہ بہتر ہے کہ آپ کے غصہ کا اظہار کسی نہ کسی صورت میں ہو جانا چاہئے۔ کہ آخر وہ کہاں تک [illegible] چپکے ہیں۔ لیکن تمام غصوں کے اظہار کے لئے کوئی دوسرا راستہ نکالنا چاہئے۔ مثال کے طور پر کسی انسان پر غصہ آئے تو کسی اور چیز کو نشانہ بنا کر دل کی بھڑاس نکال لیجئے۔ اپنے دل و دماغ کو اپنے غصہ کا شکار بنانے کے بجائے عقلمندی یہ ہے کہ اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کوئی بے ضرر طریقہ بنا لیجئے۔

۱۰ ـــــــ مفید اور کارآمد تجربات

- ہلدی اور اجوائن کے ساتھ امرود کے پتے جوش دے کر اُس پانی سے کلی کرنا دانتوں کے درد اور مسوڑھوں کے ورم میں مفید ہے۔ امرود کی نئی پتیاں چبانے اور چوسنے سے زبان کے آبلے اور سرخ دانے بھی دور ہو جاتے ہیں۔ جامن کی نرم کونپلوں کے ساتھ امرود کی کونپلیں پیس کر پلانے سے چھوٹے بچوں کے دست بند ہو جاتے ہیں۔
- نیم کی نرم کونپلوں کا عرق نکال کر آنکھوں میں ڈالنا، آنکھوں کی خارش اور دوسرے عوارض کے لئے اکسیر ہے۔ آم کی نئی، نرم ارغوانی رنگ کی پتیوں کو پھٹکری بریاں کے ساتھ کچل کر چند قطرے اُس کا عرق آنکھوں میں ڈالنا آنکھوں کی سُرخی کو زائل کر دیتا ہے۔
- ناریل کے تیل میں اصلی سرسوں کا تیل مساوی مقدار میں لگانے سے سر کے بال لانبے، گھنے، سیاہ اور چمکدار ہو جاتے ہیں۔
- جامن کی نرم پتیاں پیس کر، اُن کا عرق پینا پیچش میں بے حد مفید ہے۔ املی کی پتیاں بھی پیس چھان کر پینا ایسے دستوں کے لئے مفید ہے جو پیچش کی وجہ سے آتے ہوں۔
- شہتوت کے پتوں کے جوشاندہ سے غرغرہ کرنا حلق کو صاف کر کے بیٹھی ہوئی آواز کو کھول دیتا ہے۔ حلق کے ورم، گرمی دانوں، آبلوں کو بھی بے حد مفید ہے۔ اگر دیسی چنبیلی کی پتیاں بھی ملالی جائیں تو اور بہتر ہے۔
- زیادہ پسینہ آنے والے یا درد کرنے والے پیروں کو میتھلیٹڈ سپرٹ یا نمک ڈالے ہوئے گرم پانی سے رگڑ کر دھونا چاہئے اور جوتوں کے اندر یا جرابوں پر بورک ایسڈ چھڑکنا چاہئے۔
- موسم گرما میں سونٹھ کا استعمال بند یا کم کر دینا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ بہت گرم غذا ہے۔ اس کے کھانے سے خون گرم ہو کر جلد پر دھبے پڑ جاتے ہیں۔

مدیر تسنیم صدیقی کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں۔ تاکہ آپ کا ارشاد کی فوراً تعمیل ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

سرگوشیاں

سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، سماجی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ علمی اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و بیہودہ سوالات شاملِ اشاعت نہیں کیے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھیے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

اے، ایس، راہی۔ کٹک

س۔ حقیقی مسرّت صحت سے حاصل ہوتی ہے یا عزّت اور اقتدار سے؟

ج۔ یہ تو اپنا اپنا ذوق، اپنے اپنے خیال کی بات ہے کسی کو دولت سے مسرّت حاصل ہوتی ہے، کسی کو عزّت سے کسی کو اقتدار سے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حقیقی مسرّت صحت سے حاصل ہوتی ہے۔ صحت نہ ہو تو دولت حقیقی مسرّت دے سکتی ہے نہ عزّت و اقتدار دے سکتی ہے!

ایم رحیر نیپالی لہریا سرائے۔ بہار

س۔ کیا آپ اقوامِ متحدہ اور دولتِ مشترکہ کے ممبر ممالک کی تعداد بتانے کی زحمت گوارا کریں گے؟

ج۔ اخباری اطلاعات کے مطابق اقوامِ متحدہ کے کے ممبر ممالک کی تعداد ایک سو ہے۔

س۔ غذائی بحران اور ہندوستان کا مستقبل؟

ج۔ غذائی بحران عوام اور عوامی اخبارات کا جھوٹا پروپیگنڈہ ہے۔ سرکاری غلّہ کی دوکانوں پر بھکاریوں کی طرح دھرنا دینے والے بھوکے نہیں، ذخیرہ اندوز ہیں ——— اور ہندوستان کا مستقبل؟ ہندوستان کا مستقبل روشن و تابناک ہے یقین نہ آئے تو حال دیکھیے!!

س۔ خوشتر بھیّا! میرے ایک دوست کا کہنا ہے، روس میں کیمونسٹ حکومت زار شاہی سے زیادہ ظالم ہے۔ کیا آپ اُن کے نظریہ سے متفق ہیں؟

ج۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہندوستان میں کچھ ناسمجھ لوگ کہتے ہیں کانگریس کی حکومت سے اچھی انگریز کی حکومت تھی۔

نصراللہ امتیاز بنگلوریٹ

س۔ انسان کھانے کے لئے جیتا ہے یا جینے کے لئے کھاتا ہے؟

ج۔ سمجھدار انسان جینے کے لئے کھاتا ہے بے وقوف کھانے کے لئے جیتا ہے!

س۔ خوشتر بھیّا! دُنیا میں انسان کا نام بڑا ہے یا کام بڑا ہے؟

ج۔ کبھی کام بڑا سمجھا جاتا تھا۔ آج نام بڑا ہے۔

س۔ بھیّا! بتایئے کہ آج کی دُنیا میں سچائی پر چلنے والے کو لوگ سچا نہیں سمجھتے۔ کیوں؟

ج۔ اِس لئے کہ جھوٹوں نے اپنے کرتوت سے دُنیا کو سچوں سے بھی بدگمان کر دیا ہے۔

محمد شوکت علی۔ کلکتہ

س۔ شادی کے بعد انسان کو کون سی مصیبتیں اُٹھانی پڑتی ہیں؟

ج۔ انسان بے راہ روی نہ اختیار کرے تو شادی سے اُس کی زندگی کا دامن خوشی کے پھولوں سے بھر جاتا ہے۔ اور اگر انسان بے راہ روی اختیار کرلے تو شادی سے پہلے بھی طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے۔

محمد عمر پہلوان۔ عادل آباد (آندھرا)

س۔ انسان موت سے کب ڈرتا ہے؟

ج۔ بزدل انسان ہر وقت موت سے ڈرتا ہے۔ بہادر انسان کبھی موت سے نہیں ڈرتا۔

س۔ انسان گناہ سے کب ڈرتا ہے؟

ج۔ جب اُس کا ضمیر بیدار ہوتا ہے جب اُس کا دل جاگتا ہے۔

ملک کے مایہ ناز ادیبوں کے لکھے ہوئے نئے شاہکار ناول

جنھیں ادارۂ بیسویں صدی نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے

- جب انسانی سماج چاند، مریخ اور دوسرے سیاروں تک پہنچا جڑ گکیں ہوجائے گا۔
- جب مرد نہ صرف عورت بلکہ ماں بنکر اولاد کی پرورش کریں گے۔
- جب پورا نظامِ زندگی حسن و شباب اور رنگینی و رعنائی کے زیرِ نگیں ہوجائے گا۔
- جب عورت، مرد کے پنجۂ اقتدار سے آزاد ہوکر معاشرے پر چھا جائے گی۔

اُردو ادب میں ایک انوکھا تجربہ۔ حیرت انگیز واقعات پر مشتمل ایک دل فریب ناول

فرید موہنی (ناول)

حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اس دیش کی کہانی جہاں مرد کا تصور بھی ایک جرم تھا۔

صدیوں بعد کی فضاؤں میں لکھی ہوئی عجیب و غریب داستان جو اوّل سے آخر تک دلچسپیوں اور حیرت آفرینیوں سے بھرپور ہے۔ جناب کوثر چاندپوری کا لکھا ہوا بیحد شوخ دلچسپ ناول جو قاری کو کئی صدی آگے کی فضاؤں میں پرواز کراتا ہے۔ اور نئی زندگی کا سنگِ بنیاد رکھتا ہے۔ انتہائی دلکش اور شگفتہ اندازِ نگارش۔ جاذبِ نظر کتابت و طباعت، بہترین کاغذ، دیدہ زیب سہ رنگا گرد پوش۔ قیمت فی جلد محض تین روپے۔

نئے فرہاد

جناب پروفیسر شکیل الرحمٰن ایم اے کا اچھوتا شاہکار ناول

ایک بڑی شوگر فیکٹری کے منیجر کی ہوسنالیوں اور حسن پرستیوں کی بھیانک تصویر۔ جس نے بہارِ حسن و شباب کو خوش آمدید کہتی ہوئی نازک اور معصوم کلیوں کو سنہری، روپہلی سکوں کی جھنکار کے بل پر رقص و نغمہ اور شراب و شعر کے طوفان میں غرق کرکے گناہ پر مجبور کردیا۔ ایک حسین و جمیل دوشیزہ کی المناک داستان۔ محنت و زر کی کشاکش کے اسٹیج پر لکھی ہوئی ایک انتہائی دلچسپ کہانی جو آپ کے دل و دماغ پر چھا جائے گی شکیل الرحمٰن کے اسٹائل میں ایک انفرادیت کی جاذبیت ہے حسن ہے، زور ہے، جوش اور شگفتگی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک تیز اور شفاف چشمہ بہہ رہا ہے اور اس کا بہاؤ ہمیں اپنے ساتھ بہالے جائے گا۔ بہترین کتابت و طباعت عمدہ کاغذ دیدہ زیب ڈسٹ کور۔ قیمت فی جلد صرف چھ روپے

فرانس کے عظیم ترین ناول نگار اسپے پرلیوی کا غیر فانی شاہکار

راہیں شباب کی

- جس کا ترجمہ دنیا کی تمام زبانوں میں ہوچکا ہے۔
- جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہوچکی ہیں۔
- جسے عشق و محبت کی بے نظیر داستان تسلیم کیا جاتا ہے۔
- جسے اُردو میں پہلی مرتبہ ادارۂ "بیسویں صدی" نے شائع کیا ہے۔
- جس کی اشاعت پر پیرس کے رنگین ماحول میں ایک زلزلہ آگیا۔
- جسے نوخیز لڑکیاں ہی نہیں بوڑھے بھی حاصل کرنے کیلئے دوڑ دھوپ کرتے

عشق و محبت کا جاوداں افسانہ جس کے سامنے وامق و عذرا، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کے قصے بھی ہیچ ہیں۔ اس ناول کی ہیروئن قلوپطرہ اور ہیلن سے بھی زیادہ حسین اور عظیم مترجمہ جناب مخمور جالندھری۔ نظر فریب کتابت و طباعت، بہت عمدہ کاغذ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

یادوں کے کھنڈر

جناب ٹھاکر پونچھی کا ایک بے حد دلچسپ نیا سماجی ناول

جس میں اُن معصوم محبتوں، ناکامیوں اور حسرتوں کی حسین داستانیں بیان کی گئی ہیں جنھوں نے اپنے کمسن خیالوں میں محبت کے حسین رنگیلے محل تعمیر کیے لیکن حقیقی زندگی میں صرف یادوں کے تاریک کھنڈر ہی نصیب ہوئے "یادوں کے کھنڈر" کے دردناک قہقہے، سسکتی ڈوبتی آہیں، خاموش پلکوں پہ منجمد آنسو آج کے معاشرے کے وہ گھناؤنے نقوش اُجاگر کرتے ہیں جو محبت کی موت ہیں۔ زندگی کے قاتل۔ ایک ایک سطر میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان مچل رہا ہے۔ مصنف نے دل کی دھڑکنوں کو ایسے رنگین انداز سے اُبھارا ہے کہ تعلیم، ثقافت اور خلوص و محبت کی تصویر نگاہوں کے سامنے جھلکنے لگتی ہے۔ قیمت فی جلد صرف چھ روپے

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی - دہلی

عبد مصطفی۔ بنگلور

س۔ کیا انسان حقیقت میں وحشی ہے؟

ج۔ وحشی نہیں ہے۔ وحشی بن جاتا ہے۔ وحشی بنتا جا رہا ہے۔

س۔ کیا شاعر، ادیب اور فنکار حُسن پرست ہوتے ہیں؟

ج۔ جی ہاں حُسن پرست بھی، حُسن کار بھی۔

س۔ تہذیب ایک اصول ہے یا جبر؟

ج۔ ایک اصول ــــ جو کبھی جبر بھی بن جاتا ہے۔

ایم کلیم۔ بمبئی

س۔ آپ کی نظر میں سب سے اچھا آدمی کون ہے؟

ج۔ جس کی گفتار ہی نہیں کردار بھی اچھا ہو۔ جو دوسروں کے دُکھ درد کو اپنا دُکھ درد سمجھتا ہو۔ جو دوسروں کو خوشی دے کر خوش ہوتا ہو۔

س۔ مایوسیوں سے کس طرح چھٹکارا ہو سکتا ہے؟

ج۔ اپنے دل میں اُمید کی شمع روشن کر کے۔

محمد علی پٹیل۔ ہمنابار

س۔ زندگی پانی کا بلبلہ ہے۔ اور موت؟

ج۔ حیات بیداریٔ مسلسل، ممات اِک خواب جو نہ ٹوٹے۔

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ کیا تاریخ کے صفحات اور کتنے ہی عینی مشاہدات اِس حقیقت کے شاہد نہیں ہیں؟

عبدالشکور نور۔ وجے واڑہ

س۔ دُنیا میں بہتر اور باعزت پیشہ کون سا ہے؟

ج۔ لیڈری۔ یقین نہ ہو تو لیڈری کرتے کرتے وزیر اور گورنر بن جانے والے ملوں سے کمیشن اور کارشنوں کو دیکھئے۔

س۔ دُنیا کی سب سے بڑی طاقت کیا ہے؟

ج۔ انسان کا ناقابلِ شکست عزم و حوصلہ!

س۔ کیا محبت کبھی ذلیل ہو سکتی ہے؟

ج۔ محبت ذلیل ہوتی ہے اور ذلیل کرتی بھی ہے۔ کیا آپ نے کسی لڑکی کے سینڈلوں سے کسی دل پھینک نوجوان کی سرِ راہ تواضع ہوتے نہیں دیکھی؟

طلعت زیدی۔ کراچی

س۔ اُردو زبان میں سب سے پہلے کس نے غزل کہی؟ کیا آپ اُس کا کوئی شعر سنا سکتے ہیں؟

ج۔ حضرت امیر خسرو نے اُردو میں سب سے پہلے غزل کہی۔ اُس کا مطلع یہ ہے ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل، دُورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں لیہو کاہے لگائے چھتیاں

س۔ یہ شعر کس کا ہے ؎

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

ج۔ شاد عظیم آبادی کا۔

س۔ کوئی حسین شعر سنائیے۔

ج۔ سُنئے ؎

تیرا ملنا، ترا نہیں ملنا
اور جنت ہے کیا جہنم کیا

مظہر الاسلام نظری۔ کلکتہ

س۔ کیا طلباء کو سیاست میں حصہ لینا چاہئے؟

ج۔ تعلیم کی تکمیل سے پہلے ساری توجہ تعلیم پر صرف کرنی چاہئے۔

س۔ خوشتر بھائی! گورنمنٹ رشوت خوروں کے خلاف ایکشن کیوں نہیں لیتی؟ کیا رفیع احمد قدوائی جیسے ایماندار اور عظیم رہنما پیدا ہو جائیں تو رشوت ستانی ختم ہو سکتی ہے؟

ج۔ یقیناً ختم ہو سکتی ہے لیکن کوئی رفیع احمد قدوائی پیدا بھی تو ہو ــــ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

جمیلہ پروین۔ اورنگ آباد

س۔ بھیا! آج کل منسٹر کیا چاہتے ہیں؟

ج۔ غریب بھوکے عوام اُن کی بلا سے ہڈیوں کا پنجر بن جائیں۔ وہ موٹے سے اور موٹے ہو جائیں۔

س۔ کیا جواہر لال نہرو کی پالیسی قائم رہ سکتی ہے؟

ج۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ آثار اچھے نظر نہیں آتے۔

ایم۔ ایوب قریشی۔ پسنڈرہ (میرٹھ)

س۔ کیا مایوس انسان کے لئے دُنیا میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں اُسے سکون مل سکے؟

ج۔ انسان اُمید کا دامن نہ چھوڑے تو اُسے ہر جگہ سکون مل سکتا ہے۔ ورنہ کہیں نہیں۔

س۔ غالب کا ایک درد بھرا شعر سنائیے۔

ج۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

چودھری محمد یٰسین۔ سہارنپور

س۔ زندگی کیا ہے؟

ج۔ اِن کالموں میں یہ بہت بار بتایا جا چکا ہے۔ آپ بھی سُن لیجئے۔

زندگی سنگِ گراں بھی ہے چمن زار بھی ہے
زندگی پھول سے نازک بھی ہے تلوار بھی ہے

س۔ راتوں میں نیند نہیں آتی۔ کیا کروں؟

ج۔ دن میں محنت کیجئے۔ رات میں نیند آئے گی اتنی نیند آئے گی کہ نیند بڑی ہو جائے گی۔ رات چھوٹی ہو جائے گی۔

محمد عبدالرحیم کریم گنج، آندھرا

س۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ مولانا قابلِ احترام دینی رہنما ہیں۔

س۔ کیا جماعتِ اسلامی کے دینی لٹریچر سے اُردو کی غیر معمولی خدمت نہیں ہو رہی ہے؟ اس لئے کہ کسی جماعت کا اتنا لٹریچر اُردو میں نہیں ہے۔

ج۔ جماعتِ اسلامی کے لٹریچر سے اُردو کی غیر معمولی خدمت نہیں ہو رہی ہے تو خاصی خدمت ضرور ہو رہی ہے۔

شاہ نواز۔ اگر جونا ساگر

س۔ بھائی جان! غالب بڑے شاعر تھے یا رابندر ناتھ ٹیگور؟

ج۔ دونوں بڑے شاعر تھے۔

س۔ کوئی اچھا سا شعر سنایئے جس سے کچھ نصیحت ہو۔

ج۔ محبت کی راہ ہے انساں کی تمنائے حیات
دل دھڑکنا عبارت نام ہے طوفانوں کا

س۔ عقل کا کہنا ماننا چاہئے یا دل کا؟

ج۔ عقل کا۔

کرم اللہ بہرانڈری۔ سالن

س۔ انسان کس طرح انسانیت کے درجۂ کمال تک پہنچ سکتا ہے؟

ج۔ غم کے ماروں کی غمخواری
انسانیت کی معراج!

س۔ اُردو کا مستقبل؟

ج۔ اُردو کے تنگ دل بدخواہوں کی سرگرمیوں کے باوجود اُردو کا مستقبل تاریک نہیں۔ اُردو کی خوبیاں اس کی بقا کی ضامن ہیں۔

س۔ صحیح تعلیم و تربیت اور پاکیزہ اخلاق کا معیار کیا ہے؟

ج۔ صحیح تعلیم و تربیت انسان کے اخلاق کا آئینہ ہے۔ اور پاکیزہ اخلاق کا معیار یہ ہے کہ انسان عملاً کسی غیر پاکیزہ عمل کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ ایسے خیالات بھی نہیں رکھتا۔

آمنہ شیخ۔ بمبئی

س۔ بھائی جان! میں بہت زیادہ باتونی نہیں ہوں اور نہ بہت زیادہ سنجیدہ ہی۔ جب بھی لوگ مجھے سنجیدہ کہتے ہیں۔ ایسا کیوں؟

ج۔ یہ تو آپ کو سنجیدہ کہنے والوں سے پوچھنا چاہئے۔ ویسے سنجیدہ ہونا کچھ بُرا نہیں۔

س۔ بھائی جان! ایک بہن کو کیا تحفہ پیش کیا جائے کہ وہ مجھے یاد رکھ سکے؟

ج۔ بے لوث خلوص!

عابد جمال نعیمی سکاکو (بہار)

س۔ بھائی جان! دہلی میں وہ کون سا گڑھ ہے، جو لئے سالے چھوٹے لاتیں گنتے رہتے ہیں؟

ج۔ اگر دیکھ جائیے بشنیدہ کے بود مانند دیدہ اب کبھی دلی دور تھی اب تو دلی دور نہیں۔

س۔ پنڈت نہرو کو بچے چاچا نہرو کہتے تھے۔ لیکن شاستری جی کو کیا کہیں گے۔ ماموں شاستری؟

ج۔ ماموں شاستری نہیں۔ للو بھیا! (شاستری جی کے وطن بنارس کے ایک اخبار نے لکھا ہے شاستری جی کا بچپن کا نام للو ہے)

نجمہ خاتون۔ اسلام نگر جھاجھا

س۔ حرص و ہوس ....؟

ج۔ نظیر اکبر آبادی نے کہا ہے ؎

ٹک حرص و ہوس کو چھوڑ میاں
کیوں دیس بدیس پھرے مارا

س۔ محبت کا جواب اگر نفرت سے ملے تو کیا کروں؟

ج۔ آپ نفرت کا جواب نفرت سے نہ دیجئے۔ نفرت محبت سے بدل جائے گی۔

محمد خلیل انور۔ دلو گیا

س۔ قلم تذکیر ہے یا تانیث؟ سید انشاء کی کتاب "طرزِ نگارش" میں تذکیر لکھا ہے۔

ج۔ قلم اردو میں تانیث مستعمل ہے۔

س۔ مرد کا سب سے عمدہ زیور کیا ہے؟

ج۔ زیور عورتیں پہنتی ہیں۔ مرد کا سب سے اچھا وصف پوچھئے ـــــــ مرد کا سب سے اچھا وصف حق و صداقت کی حمایت کے لئے سر فروشی و جانبازی ہے۔

شبیر حسین نوری۔ ابھین

س۔ کیا عورت کسی بے راہرو مرد کی اصلاح کر سکتی ہے؟

ج۔ جی ہاں!

س۔ عرب کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز کہاں ہے؟

ج۔ مصر میں۔ جامعہ ازہر

س۔ صحت کا گر ....؟

ج۔ صحت کو اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھنا۔ صحت کی طرف سے کبھی غفلت نہ برتنا۔

جمیل ملک۔ لاہور

س۔ بھائی جان! کوئی حسین شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

یوں مہکتا ہوا آیا ہے صبا کا جھونکا
تیری خوشبو تیرے دامن کی ہوا ہو جیسے

س۔ فراق گورکھپوری جگر کی طرح غزل کے شاعر ہیں یا ان کی شاعری کو حیات افروز شاعری بھی کہا جا سکتا ہے؟

ج۔ آپ غزل کے دامن کو اتنا محدود کیوں سمجھتے ہیں کیا جگر کی غزل کا یہ شعر حیات افروز نہیں ہے؟

طولِ غمِ حیات سے گھبرا نہ اے جگر!
ایسی بھی کوئی رات ہے جس کی سحر نہ ہو؟

اور فراق کا ایک شعر سنئے ؎

حیات بیداری مسلسل عمات اک خواب جو نزدگی ہے
نشاط کی غفلتوں سے بہتر وہ غم جو انسان کو جگا ئے

کوثر پروین۔ دانم باڑی

س۔ نومبر کا بیسویں صدی میرے سامنے ہے۔ خندۂ گل میں پرکاش ناتھ پرویز لکھتے ہیں کہ جوش ملیح آبادی ایک بار مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں ان سے ملنے گئے اور نام کی چٹ اندر بھجوا دی۔ پانچ سات منٹ انتظار کیا۔ انتظار کے لمحے طبیعت پر گراں گزرنے لگے تو حسب ذیل شعر مولانا کو بھجوا دیا ؎

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کبھی اور وقت، مولانا

یہ شعر دیکھتے ہی مولانا صاحب باہر تشریف لائے۔ لیکن جوش صاحب جا چکے تھے ـــ لیکن یہی واقعہ کراچی کے افکار جوش نمبر میں نریش کمار شاد نے اس طرح لکھا ہے۔ جب یہ شعر مولانا نے پڑھا تو زیر لب مسکرائے۔ اور فی الفور جوش صاحب کو اندر بلا لیا ـــ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ دونوں میں سے کس کے بیان کو سچ مانا جائے؟

ج۔ اس واقعہ کے راوی پرکاش ناتھ پرویز اور شاد صاحب ہی اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

رحیم ادیب ۔ ٹونک راجستھان

س۔ شعراء ادیبوں انشاء پردازوں، سخن وروں اور افسانہ نگاروں کو کیا کرنا چاہئے جن کی تخلیقات آپ کے کالموں کی زینت ہوں؟

ج۔ کسی منزل آشنا کا دامن پکڑ کر منزل کی طرف بڑھنا چاہئے۔

س۔ کرشن چندر، راجہ مہدی علی خاں، ڈاکٹر منوہر سہائے انور، کوثر چاند پوری، فراق گورکھپوری، ڈاکٹر عندلیب شادانی، پروفیسر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا "بیسویں صدی" سے تعلق؟

ج۔ جسم اور جان کا تعلق ہے!

س۔ کیا یہ سوال ہو سکتا ہے "اندھا بانٹے ریوڑی اور پھر اپنے ہی اپنے کو دے"

ج۔ یہ سوال ہو سکتا ہے لیکن خویش پرور ارباب حکومت سے جان کی امان مانگ کر!

غلام رسول ۔ کلکتہ

س۔ میں کہتا ہوں فلم دیکھنا کسی طرح مفید نہیں ہے لیکن میرے ایک دوست کہتے ہیں فلمیں دیکھنا مفید ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ان میں عریانیت قطعی نہ ہو۔ آپ ہی بتائیے کیا وہ صحیح کہتے ہیں؟

ج۔ آپ کے دوست سچ کہتے ہیں لیکن ان کی یہ بات ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے۔ شراب پینا برا نہیں، بشرطیکہ اس میں نشہ نہ ہو۔

اطہر سیونی ۔ ایم، پی

س۔ ماہ جون کے شمارے میں آپ نے مس نسرین ماہرو رانچی کے سوال کے جواب میں فرمایا ہے "اپنے گرد و پیش کی کامیاب و مسرور زندگیوں کو دیکھئے" تو آج میں آپ ہی سے بیسویں صدی کے دور میں پوچھتا ہوں کیا آپ کی اپنی زندگی اس ماحول میں کامیاب و مسرور گزر رہی ہے اگر آپ مسرور ہیں تو یہ آپ کے قلم سے نشتر کیسے؟

ج۔ آپ کا ارشاد بجا سہی لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج کی دنیا میں بھی سارے انسان غمگین و اندوہگیں نہیں ہیں، سارے انسان ناکام نہیں ہیں۔

س۔ آج کل کے کچھ افسانے نامکمل سے رہتے ہیں۔ مکمل نقشہ پیش کرنے میں فنکاروں کو کیا مشکل ہوتی ہے؟ آخر ایسا کیوں رہتا ہے؟ "بیسویں صدی" کے اکثر شماروں میں ایسا ہوا ہے۔

ج۔ افسانے نامکمل نہیں ہوتے۔ اب افسانہ کا انداز بدل گیا ہے اور بدلتا جا رہا ہے۔

س۔ "غریب کی ہر خوبی عیب، امیر کا ہر عیب خوبی ہوتی ہے" کیا اس کا آپ تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں گے؟

ج۔ یہ آج کی ایک روشن حقیقت ہے۔ آپ خود دیکھتے ہوں گے۔ یہ کوئی سوال تو نہیں جس کا ہم تسلی بخش جواب دیں۔

سید خورشید علی ۔ امرآوتی کیمپ

س۔ خوشتر بھیا! سالنامہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے لئے آپ کو مبارکباد پیش کروں تو اسے خوشامد تو نہ کہیں گے؟

ج۔ حقیقت کا اظہار و اعتراف خوشامد نہیں۔

س۔ افسانہ نویسی پر کسی اچھی سی کتاب کا نام اور اس کے دستیاب ہونے کا پتہ تحریر فرمائیں۔

ج۔ افسانہ نویسی پر کوئی اچھی کتاب نظر سے نہیں گزری۔ اس طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ سید وقار عظیم کی ایک کتاب ہے۔ غالباً اس کا نام ہے داستان سے افسانہ تک۔ یہ وہ اچھی کتاب ہے۔ لیکن مبتدیوں اور نئے لکھنے والوں کے لئے مفید نہیں ہے۔

س۔ مجھے افسانے لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ بتائیے کس کا دامن پکڑوں۔ کیا میں بھی افسانہ نگار بن سکتا ہوں؟

ج۔ سچی لگن ہو تو انسان سب کچھ بن سکتا ہے۔ آپ دیکھتے نہیں۔ انسان آج چاند تک پہنچ گیا۔ آپ کو افسانہ نگاری سیکھنے کا شوق ہے تو جناب آسی رام نگری مغل سرائے (بنارس) سے رجوع فرمائیے۔

مس صابرہ ۔ کانپور

س۔ بھیا! یہ شعر کس کا ہے

عابدہ جن کی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھیں
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھیں

ج۔ حضرت اکبر الہ آبادی کا۔

نجمہ نقوی ۔ مونگیر

س۔ ہندوستان میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں؟

ج۔ ۱۴۳۷ زبانیں۔

س۔ ساری دنیا میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں؟

ج۔ ۳۲ ہزار۔

رشیاں ناز ۔ رانچی

س۔ خوشتر بھائی! کیا زلیخا نام خاتون شائع گل (بیسویں صدی "ماہ جون") اور زلیخا خانم سکونتوی ایک ہی ہستی ہیں؟

ج۔ جی ہاں۔

ایس. صفی احمد. رشتہ گلی. بنگلہ

س۔ اگر بیوی ان پڑھ ہو تو...؟
ج۔ خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ آپ ان پڑھ بیوی پر اپنی بڑائی اور برتری کا سکہ بہت آسانی سے جما سکتے ہیں۔

س۔ میری بیوی بدصورت ہے۔ بتایئے کیا کروں؟
ج۔ خدا کا شکر ادا کیجئے۔ بدصورت بیوی آپ پر اپنے حسن کا رعب نہیں جما سکتی۔

س۔ روٹھی ہوئی بیوی کو کس طرح منایا جائے؟
ج۔ بدصورت اور بے سلیقہ ہو جب بھی اس کے حسن اور سلیقہ مندی کی تعریف کرکے۔

شکیل احمد نعمت پور۔ بردوان

س۔ قرآن کہتا ہے مقتول کے بدلے قاتل کی جان لی جائے۔ اور حکومت کیا کہتی ہے؟
ج۔ یہ نہ پوچھئے حکومت کیا کہتی ہے؟ یہ پوچھئے حکومت کیا کرتی ہے؟ حکام رشوت لے کر قاتل کے دامن پر دھبہ بھی نہیں لگنے دیتے۔

س۔ آپ میں اور راجہ مہدی علی خاں میں کیا رشتہ ہے؟
ج۔ راجہ مہدی علی سے عافیت کی امان دلوا دیجئے تو ہم ان سے اپنا رشتہ بتا دیں۔

س۔ ہندوستان اس طرح غربت و افلاس کے جال میں کیوں ڈوب رہا ہے؟
ج۔ یہ آپ سے کس نے کہا؟ ہندوستان کے موٹے موٹے وزیروں اور سرمایہ داروں کو آپ نہیں دیکھتے۔

مسعود جاوید۔ اورنگ آباد۔ گیا

س۔ آپ کے سامنے جدید افسانہ نگاری کا مستقبل کیا ہے؟
ج۔ روشن و تابناک ہے ہمارا

س۔ فیض کا کوئی حیات افروز
ج۔ روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

س۔ اردو کے افسانہ نگاروں میں نمبر وار
راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس
مہندر ناتھ، کوثر چاند پوری، اختر اورینوی
عظیم آبادی، شکیلہ اختر اور ذکی انور۔
ج۔ ہم آپ کے اس سوال کے جواب میں یہی کہیں
نمبر دے کر کیا پایئے گا ——— گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن!

نادر خان۔ امنگ آباد۔ چھاونی

س۔ کیا آج کے امیر کل کے فقیر تھے؟

ج۔ جی ہاں۔ آج کے امیروں میں بیشتر ایسے ہی ہیں۔ جو کل کچھ نہ تھے لیکن غریبوں کا خون چوس کر آج امیر بن گئے ہیں۔

س۔ انسان نیکی اور بدی میں فرق سمجھتے ہوئے بھی بدی کیوں کرتا ہے؟

ج۔ داستہ فریب کھاتا ہے۔ نیکی کا حُسن پنہاں ہوتا ہے، بدی کی کشش نمایاں ہوتی ہے۔

س۔ کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ آپ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں؟

ج۔ جی ہاں۔ کیوں نہیں؟

ہو وہ گبر یا مسلماں ہے نظر میں میری یکساں
مرے دل میں دردِ انساں مرا دین دردمندی

.....؟

س۔ جب زندگی کے دن یاس والم سے اس قدر بھر پور ہوں کہ کوئی منزل ہی نظر نہ آتی ہو تو انسان کیا کرے؟

ج۔ حوصلہ نہ ہارے۔ ورنہ منزل اور دُور ہو جائے گی۔

س۔ جب دُنیا مجبور کر کے اتھاہ تاریک گہرائیوں میں پھینک دے کہ جینا بھی بے مقصد ہو جائے تو...؟

ج۔ بن آپ اپنے سفینے کا ناخدا اے دوست!

بلند عزم ہواؤں کے رُخ بدلتے ہیں
زورِ طوفاں دیکھ کر موجوں سے جو کترا گیا
اُس زبوں ہمت کی قسمت میں کنارا ہی نہیں

سرور سلطانہ۔ بی، ایس، سی۔ بی، ایڈ۔ سکندر آباد

س۔ آج کل راست بازی و صداقت کہیں بھی نظر نہیں آتی کیوں؟

ج۔ اِس دور میں راست بازی و صداقت شعاری کی جگہ فریب کاری نے لے لی ہے۔

س۔ بچوں کو سعادت مندی و فرماں برداری کس طرح سکھائیں؟

ج۔ خود سعادت مند اور فرماں بردار بن کر۔

اک۔ رخ۔ حیدر آباد دکن

س۔ دُنیا کی سب سے پہلی زبان کون سی ہے جبکہ انسان کو عقلِ سلیم عطا ہوئی؟

ج۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے وہ پہلی زبان عربی ہے۔ کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے وہ پہلی زبان سنسکرت ہے۔ ہو سکتا ہے ہندی کے حامیوں کا دعویٰ ہو کہ وہ پہلی زبان ہندی ہے! لیکن وہ پہلی زبان اُردو یقیناً نہیں ہے۔ اُردو تو ہندوستان میں سولھویں یا سترھویں صدی عیسوی میں عالمِ وجود میں آئی۔

س۔ مستقبل کے رنگین خواب دیکھنے کے بعد بھی سکون نہیں۔ حالانکہ عمل جاری ہے۔

ج۔ صرف خواب دیکھنے سے سکون اور سُکھ نہیں حاصل ہوتا۔ عمل جاری رکھیے۔ یہاں تک کہ خواب حقیقت بن جائے۔ پھر یقیناً سکون حاصل ہوگا اور سُکھ بھی۔

س۔ عشق میں کامیابی کا نسخہ کیا ہے؟

ج۔ یہ کسی تباہ حال محبت کے مارے سے پوچھیے۔ خدا کا شکر ہے اِس پاگل پن میں اپنا کوئی تجربہ نہیں۔

نذر النبی ساتھی۔ بوگرا۔ مشرقی پاکستان

س۔ ہزار جدوجہد کے باوجود ایک ساتھی کی آرزو محرومِ تکمیل رہ جائے تو؟

ج۔ جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔ تکمیلِ آرزو کا ... ممکن رہتا ہے۔

س۔ سکون کی زندگی کب اور کس جگہ نصیب ہو سکتی ہے؟

ج۔ جو لوگ اضطراب کو سکون بنا لیتے ہیں، انھیں ہر جگہ سکون کی زندگی نصیب ہو سکتی ہے۔

س۔ زندگی کا ہر پل عذابِ جان بن جائے تو؟

ج۔ ایسی زندگی بھی موت سے اچھی ہوگی۔

زبیدہ پروین۔ پنڈی۔ دلیوریا

س۔ خوشتر بھیا! آپ ہی بتائیے۔ مغرب کی پیروی کرتے ہوئے ہم نے لڑکیوں کو تعلیم دلوائی۔ انھیں گھومنے پھرنے کی آزادی دی۔ انھیں دفتروں میں نوکری کرنے دی۔ تو پھر شوہر چننے کی آزادی انھیں کیوں نہ ہو؟

ج۔ شادی زندگی کا سب سے اہم موڑ سب سے اہم منزل ہے۔ اِس اہم مرحلہ پر لڑکیوں کو والدین یا اپنے سرپرستوں کے تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ناتجربہ کار و ناپختہ کار لڑکیاں شوہر کے انتخاب میں غلطی کر سکتی ہیں، جیون ساتھی چننے میں دھوکا کھا سکتی ہیں۔ یہ ایک غلطی کر کے اپنی زندگی تباہ و تلخ بنا سکتی ہیں۔

س۔ بھائی جان! کوئی اچھا سا شعر سنائیے۔

ج۔ سُنیے ؎

مزاجِ غم سے جنھیں آگہی نہیں ہوتی
خوشی کے وقت بھی ان کو خوشی نہیں ہوتی

شاہد یوسف ناشر۔ خوشتر گرامی ——— مطبوعہ۔ دلی پرنٹنگ ورکس۔ چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائٹل و تصاویر۔ بلاک پریس سبزی بازار دہلی ——— پتہ۔ دفتر بیسویں صدی کوچہ ... دہلی

ڈکشنریاں، صنعت و حرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

کشیدہ کاریاں و ڈکشنریاں

بیسویں صدی کی کشیدہ کاری — کرشنا کماری ایم اے — چار روپے
زینت کشیدہ کاری — زینت کوثر — پانچ روپے ۵۰ پیسے
[illegible] — " — چار روپے ۵۰ پیسے
[illegible] — رشیدہ خاتون — تین روپے ۵۰ پیسے
[illegible] — نسیم انور — دو روپے ۵۰ پیسے
[illegible] — " — دو روپے ۵۰ پیسے
[illegible] — قدسیہ انور — ایک روپیہ
[illegible] — " — ایک روپیہ
[illegible] باب درزی خانہ — زینب انور — دو روپے
[illegible] اشعار — مسز بانو غفران — دو روپے
بنت کی نیا ڈیزائن بک — زینت کوثر — پانچ روپے

انگریزی اردو میں اپنی قابلیت بڑھائیے

اردو و انگریزی کی کامیاب ترین ڈکشنریاں

پاکٹ ڈکشنری انگریزی سے اردو و ہندی — چار روپے
انگریزی اردو ڈکشنری (کلاں) رسالہ سائز قیمت مجلد دس روپے
اردو انگریزی ڈکشنری (کلاں) رسالہ سائز قیمت مجلد گیارہ روپے
سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری — عبدالحق — تیس روپے
سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری — " — بیس روپے
سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری — " — بارہ روپے
اردو انگریزی ڈکشنری — گیارہ روپے
انگریزی اردو ڈکشنری — دس روپے
آکسفورڈ ڈکشنری انگریزی سے اردو ہندی — تین روپے
[illegible] ادبی لغت — آٹھ روپے
[illegible] اللغات جدید کلاں — بارہ روپے
فرہنگ عامرہ — سات روپے ۵۰ پیسے
[illegible] اللغات عکسی خورد — چھ روپے ۵۰ پیسے

صنعت و حرفت

الیکٹریکل انجینیرنگ بک — رشید ناتھ — [illegible] روپے
الیکٹرک گائیڈ (نیا ایڈیشن) — " — آٹھ روپے
الیکٹرک وائرنگ — " — چار روپے ۵۰ پیسے
موٹر کار وائرنگ — " — چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک بیٹریز — تین روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک [illegible] — " — آٹھ روپے
الیکٹرک [illegible] / [illegible] — " — چھ روپے ۵۰ پیسے
آئل انجن گائیڈ — دس روپے
آئل انجن [illegible] — " — چھ روپے
کروڈ آئل انجن گائیڈ — " — چار روپے ۵۰ پیسے
وائرلیس ریڈیو گائیڈ — " — چھ روپے
ریڈیو سروسنگ (ریڈیو مکینک) — آٹھ روپے ۲۵ پیسے
[illegible] لگانے کا ہنر — " — دو روپے ۵۰ پیسے
چھوٹے ڈائنیمو و الیکٹرک موٹر بنانا — تین روپے ۵۰ پیسے
پریکٹیکل آرمیچر وائنڈنگ (اے سی ڈی سی) — " — سات روپے ۵۰ پیسے
ریفریجریٹر گائیڈ — نریندناتھ — آٹھ روپے ۲۵ پیسے
[illegible] ریڈیو گیان — " — پندرہ روپے
ٹرانسفارمر گائیڈ — " — چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک موٹرز — " — آٹھ روپے
خراد شکشا یعنی ٹرنر گائیڈ — " — [illegible] روپے
ورکشاپ گائیڈ (فٹر ٹریننگ) — " — تین روپے
خراد اور ورکشاپ گیان — " — چھ روپے
پریکٹیکل گھڑی سازی — رام اوتار ورما — چار روپے ۵۰ پیسے
سائیکل ریپیرنگ — " — دو روپے ۵۰ پیسے

خانہ داری

عصمتی دسترخوان — [illegible] — تین روپے
رضیہ کا دسترخوان — [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
رنگ سازی — [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
پلاسٹک گائیڈ — دو روپے ۵۰ پیسے
بیوٹی بوٹ پالش سازی — " — دو روپے ۵۰ پیسے
بیوٹی [illegible] / روشنائیاں بنانا — دو روپے ۵۰ پیسے
کنفیکشنری (انگریزی مٹھائیاں بنانا) — دو روپے ۵۰ پیسے
ہیر آئل (خوشبودار تیل) — " — دو روپے ۵۰ پیسے
بیکری بہار (بسکٹ ڈبل روٹی بنانا) — دو روپے ۵۰ پیسے
[illegible] کا کام — " — چار روپے ۵۰ پیسے
فن مصوری (پینٹر کاری) — چار روپے ۵۰ پیسے
پرنٹنگ [illegible] ماسٹر — " — دو روپے ۵۰ پیسے
وارنش ماسٹر (وارنش سازی) — دو روپے ۵۰ پیسے
آتش بازی کا کاروبار — دو روپے ۵۰ پیسے
اچار مربہ چٹنی — [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
حلوائی ماسٹر — [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
تمباکو کا کاروبار (تمباکو کی دوکان) — " — دو روپے ۵۰ پیسے
پان کی دوکان — دو روپے ۵۰ پیسے
چھپائی پارچہ جات کیلیکو پرنٹنگ — " — تین روپے ۵۰ پیسے
انڈو یوروپین ککری بک / دیسی انگریزی کھانے — کمال [illegible] — چار روپے
کاروبار بڑھانے کی ترکیبیں — " — دو روپے ۵۰ پیسے
موم بتی کا کاروبار — " — دو روپے ۵۰ پیسے
ڈیری فارمنگ — " — چار روپے

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 630/57

BISWIN SADI

29 TH YEARS OF PUBLICATION

Telephones: Office 271637 Residence 619927

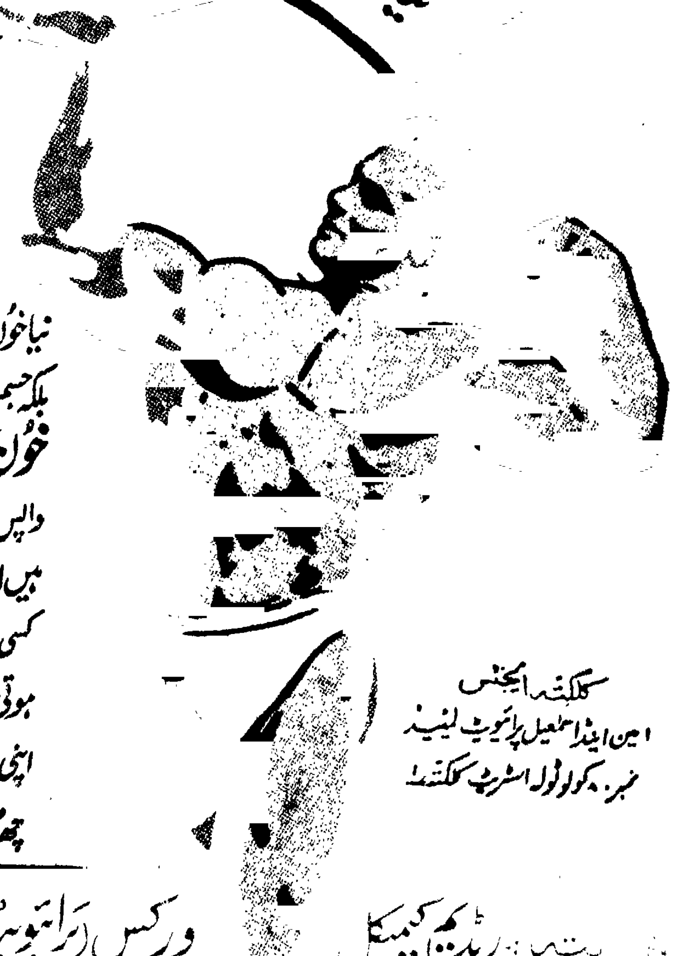
RADIUM TONIC PILLS

نئی طاقت

نیا خون

کمزوری کا زبردست علاج

ریڈیم ٹانک پلز



نیا خون بکثرت پیدا کر کے نہ صرف کمزوری دور کرتی ہیں بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں، وزن اور خون کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے کھوئی ہوئی طاقت اور صحت واپس لانے کیلئے ملک کے کونے کونے میں مشہور و مقبول ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ کمزوری خواہ کسی وجہ سے ہو کمزور سے کمزور انسان کو بھی نئی طاقت حاصل ہوتی ہے تندرست نوجوان ریڈیم ٹانک پلز کے علاج سے اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں۔ قیمت مکمل علاج صرف چھ روپے محصولڈاک علاوہ۔

کلکتہ ایجنٹس

امین اینڈ اسمٰعیل پرائیویٹ لمیٹڈ

نمبر ۸ کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ

پتہ: ریڈیم کیمیکل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵۱ دہلی


Sadi
DELHI



ہر نفس شعر، ہر نگاہ شراب
سر سے پا تک خمار کا عالم

فوٹو: محفوظ



تُو ہے سر بہ سر کوئی داستاں، ہے عجیب عالمِ انجمن
یہ نگاہِ ناز زباں زباں، یہ سکوتِ ناز سخن سخن

فوٹو: محفوظ شاہد۔ لاہور



کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں
پہلے تو بانکپن کی ادا سادگی میں تھی

فوٹو: محفوظ ساجد۔ لاہور

آسمانِ ادب کے دو شکیل ستارے



جناب ڈاکٹر شکیل الرحمان اور حضرت شکیل بدایونی ان کی تابانی اور چمک دمک سے دنیائے ادب منور ہے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمان ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ تنقید اور افسانہ نگاری کے میدان میں بہت بلند مقام حاصل کر چکے ہیں۔ حضرت شکیل بدایونی نے اردو غزل کی صنف میں اپنے کلاسیکی انداز و منفرد لہجے کی بنا پر لاکھوں دلوں کے محبوب ہیں۔

دفتر "بیسویں صدی" میں ایک یادگار شام



پچھلے دنوں اُردو غزل کے مستند و معروف شاعر حضرت شکیل بدایونی بمبئی سے اور اُردو کے نامور افسانہ نگار جناب ڈاکٹر شکیل الرحمان سری نگر سے دہلی تشریف لائے تو ادارہ "بیسویں صدی" نے اُن کے اعزاز میں عصرانہ دے کر ایک ایسی ادبی شام منائی جو دیر تک یادگار رہے گی۔ تصویر میں (دائیں سے بائیں) حضرت بیدار گلزار (دہلوی) جناب ڈاکٹر شکیل الرحمان —— اقلیم ادب کے رہنما جناب ساحر ہوشیارپوری اور محفل کی روحِ رواں حضرت شکیل بدایونی، پیکرِ خلوص حضرت ضیا فتح آبادی اور دلّی کی ہمہ جہت پہلو شخصیت جناب بہار برنی نظر آرہے ہیں

بیسویں صدی

ایڈیٹر:-

ٹیلیفون دفتر ------ ۲۷۱۹۳۷
ٹیلیفون رہائش ------ ۴۱۹۹۶۷



سالانہ قیمت عام نمبر بیست ہندوستانی و پاکستانی

قیمت فی پرچہ



"ماسٹر تارا سنگھ اور راجگوپال آچاریہ کی ملاقات" : ایک خبر ———
ع خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

"بھارت سرکار کی پالیسیاں بیہودہ ہیں" : جگجیون رام کی تقریر ——— اور اِس کا احساس آپ کو بھارت سرکار سے علیحدہ ہونے کے بعد ہوا ہے۔

"شاستری سرکار نے دیش کی نُتیا ڈبو دی" : پرکاش ویر شاستری ——— اور ویر جی کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔ چھلانگ لگا کر نُتیا کو بچا نہیں لیا۔

"اخباری بیانات دینے والوں کے خلاف کارروائی ہوگی" : گلزاری لال نندہ کا اعلان ——— آپ کا یہ بیان اخبار ہی میں چھپا ہے۔

"پاکستان سے معاہدہ دیش سے غداری ہے" : جن سنگھی لیڈروں کا اعلان ——— اور اُس سے جنگ ملک سے وفاداری۔

"پنجاب میں شہری جائدادوں کی حد مقرر ہوگی" : ایک عنوان ——— اِس لئے کانگرسی نیتا۔ وزیر اور اُن کے لگے بندھے اب دیہات میں جائدادیں بنائیں۔

"نقلی دل آئندہ پانچ سال میں تیار ہو جائیگا" : ایک خبر ——— ابھی تو نقلی کانگرسیوں کا دور دورہ ہے۔

"کانگرس میں بوگس ممبروں کی بھرتی کا کوئی فائدہ نہیں" : گلزاری لال نندہ ——— کیوں نہیں چونی فی ممبر جو ملتی ہے۔

"افریقہ میں ٹھیلہ چلانے والے کی سالانہ آمدنی تیس لاکھ پونڈ" : ایک خبر ——— کاش ہم سب ٹھیلے والے ہوتے۔

"نگیروں کے قتل کے پیچھے سیاسی مقصد نہیں" : ایک عنوان ——— بلکہ تفریح تھی۔



"عورتوں کے پیر بڑھ رہے ہیں" آگرہ کی ایک خبر۔۔۔ اِس لئے کہ اُنہوں نے یہ بات سمجھ لی ہے کہ پیر بڑا سردار کا۔

"دلی میں بھکاریوں کے خلاف مہم" ایک خبر ـــــــ آئندہ الیکشن کے لئے ٹکٹ مانگنے والے ہوشیار ہو جائیں۔

"کرپشن کے لئے لوگ خود ذمہ دار ہیں" نندہ جی کا فتویٰ ـــــــ اور وزیر غیر ذمہ دار ہیں۔

"اناج کو بچانے کے لئے ملک بھر میں مہم جاری کی جائیگی" ایک عنوان ـــــــ ہر کھانے والے کے منہ پر دفعہ ۱۴۴ لگائی جائے گی۔

"وزیروں کے بھیس میں نئے راجہ نواب دکھائی دینے لگے ہیں" ایک عنوان ـــــــ ان کو ختم کرنے کے لئے ضرورت ہے ایک سردار پٹیل کی۔

"امن نعروں سے حاصل نہیں ہوتا" ایک تبصرہ ـــــــ بلکہ کمیونسٹوں کی طرح خاموشی تمدن طریقے سے حاصل ہوتا ہے۔

"راجگوپال آچاریہ کو حکومت اپنا مشیر بنالے" ماسٹر تارا سنگھ کا مشورہ ـــــــ حکومت نے مشیر بنالیا تو پھر آپ اُن سے مشورہ کرنے نہ جائیں گے۔

"کچھ معاہدے سے بھارت کا وقار بڑھا ہے" شاستری جی کا اعلان ـــــــ مگر کچھ ہی بڑھا ہے ـــــــ ابھی اور ابھی اور ابھی اور۔

"کانگرس راج کو ختم کرنے کے لئے بہت بڑی تحریک کی ضرورت ہے" راجگوپال آچاریہ ـــــــ جی نہیں۔ بہت بڑی بلاٹ کی ضرورت ہے جس کے دولہا راجہ جی ہوں۔

"ملک کے لئے بہتر غذائی پالیسی کی ضرورت ہے" چیف منسٹر مغربی بنگال کا بیان ـــــــ اس کے لئے ماہر باورچیوں کی خدمات حاصل کی جائیں شری سمبرا منیم سے کام نہ چلے گا۔

"غازی آباد میں بدبودار آٹا" ایک خبر ـــــــ دلی میں تو کبھی کبھی ایسا بھی بیسٹ نہیں آتا۔

"دلّی میں جمنا کی تہہ کے نیچے سے پانی نکالا جائے گا" ایک خبر ——— کارپوریشن والے اوپر کا پانی تو پلا نہیں سکتے۔ نیچے کا ضرور نکالیں گے۔

"کانگریسیوں میں پیدا ہونے والے اختلافات فوراً دور کرائے جائیں" ایک عنوان ——— اگر ہندوستان میں کوئی نہ کرا سکے تو پھر وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ولسن سے کہا جائے۔

"سیلاب زدہ لوگوں کو ایسا چاول دیا جا رہا ہے جسے جانور بھی نہیں کھا سکتے" بہار کے کانگریسیوں کی شکایت ——— بڑے احسان فراموش ہیں آپ۔ کیا ایسا چاول دیا جاتا آپ کو جسے جانور بھی کھا سکتے۔

"چینیوں کے گاؤں میں مسلح لڑائی" ایک خبر ——— ایک گاؤں سے کیا ہوتا ہے۔ ہر شہر اور ہر گاؤں میں ہونی چاہیئے۔ تبھی تو ہم چین کے تماشے سے قابل ہو سکیں گے۔

"ہندی کو زیادہ سے زیادہ مقبول بناؤ" ——— جیتا کرپلانی ——— قانون، پولیس، لاٹھی اور گولی کے ذریعے۔

"بے میل شادی کا انجام۔ لڑکی والدین کے گھر بھیج دی گئی" ایک خبر ——— اس لئے آئندہ شادیاں میل ٹرین میں کی جائیں۔

بمبئی کی ایک خبر کی دو سرخیاں:۔

"ایک طرف بادل جم کر برستے رہے"

"دوسری طرف شہری نل کے پانی کو ترستے رہے"

——— خوب ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ شاعری دلّی ہی کے شہریوں تک ہے مگر معلوم ہوا بمبئی والے بھی اسی کشتی میں سوار ہیں جس میں ہم۔

"چوتھے منصوبے کے باوجود ملک کی بیروزگاری ختم نہیں ہو سکی" ایک عنوان ——— اسی لئے اب خاندانی منصوبہ بندی کو کامیاب بنانے کی کوشش ہو رہی ہے تاکہ بیروزگاری ختم نہ ہو سکے تو کم از کم روزگار مانگنے والے ہی نہ ہوں۔



"خاندانی منصوبے پر اس سال ایک کروڑ روپیہ خرچ ہوگا" ایک خبر ——— اور اسی مناسبت سے اس سال دس کروڑ بچے پیدا ہوں گے



"پنجاب سے سبق لو"۔ ایک اخباری عنوان ـــــ سیاسی دھڑے بندی اور رسّہ کشی کا۔

"بعض لوگ کانگرس میں صرف اس لئے شامل ہیں کہ وہ طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں"۔ بنگلور کے کانگرس سیشن میں ایک تقریر ـــــ کانگرس ہے کہ بھاکڑہ کا بجلی گھر۔

"ہندوستانی پھلوں کے بادشاہ کی یورپ میں مقبولیت"۔ ایک عنوان ـــــ وہاں کے لوگ جمہوریت سے تنگ معلوم ہوتے ہیں۔

"مشرقی پاکستان میں زبردست سیلاب"۔ ایک خبر ـــــ جو تمام سابق سیاستدانوں کو بہا لے گیا۔

"زمین تنگ ہوگئی ہے"۔ ایک عنوان ـــــ اسی لئے اب چاند تک پہنچنے کی کوششیں جاری ہیں۔

"سرکار کے امتحان کا وقت آگیا"۔ ایک عنوان ـــــ ابھی ڈیڑھ برس ہے الیکشن میں، سرکار اس قسم کے پروپیگنڈے سے نہ گھبرائے۔

"ہند اور پاکستان کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس"۔ ایک عنوان ـــــ کسی خارجی ملک میں ہوگی۔

"محکمہ آبپاشی کے افسر لعنت ہیں"۔ وزیر آبپاشی کا سرٹیفکیٹ ـــــ لیکن سب بارن گر کے ہوتے ہیں۔ آپ کو ایک محکمہ کا حال معلوم ہے ورنہ ہر محکمہ ایسا ہی ہے۔

"محبت کا مارا روس جائیگا"۔ ایک خبر ـــــ قیس بھی ترقی پسند ہوتا تو صحرا نوردی نہ کرتا، روس ہی جاتا۔

"اردو رسالے مشرق میں اطلاع ہے کہ جناب جسٹس اے اختر کو [illegible] پرائز [illegible] زبان کشمیری ـــــ اور ہندوستان جہاں اردو کے لئے آپ [illegible] کی توقع ہے۔

"سرکار فلم بندی کے لئے ایجنسی قائم کرے گی"۔ ایک خبر ـــــ شکل دوشیزہ لانے کا افسانہ۔

"ساٹھ فیصدی امریکی بہرے ہیں" ایک خبر ———— اس لئے کرٹن پر ہونٹوں کی باتوں کا اثر نہیں ہوتا۔

"اکالی اتحاد" ایک عنوان ——— بالکل کا فذی ثابت ہوا۔

"کانگریسیوں نے وعاخوں کو تالا لگالیا ہے" اندرا گاندھی کی تقریر ———— تاآئندہ الیکشن میں ان تالوں کو کھولنے کی تیاریاں کرے۔

"چڑیلنے سینما شو بند کرا دیا" ایک خبر ——— کیا وہ انسپکٹر پولیس لگی ہوئی ہے۔

"سوتنتر پارٹی کی طرف سے بے گھر لوگوں کی امداد کا پروگرام" ایک خبر ——— وہ لوگ آئندہ الیکشن میں سوتنتر پارٹی کی امداد کریں۔

"غذائی حالات بگڑنے کا شدید خطرہ" ایک عنوان ——— بلیک مارکیٹوں کیلئے نادر موقعہ

"پولیس کی کار سے بچہ ہلاک" ایک خبر ——— کار ڈرائیور کو کون پکڑے، کون مقدمہ چلائے۔ بچے نے دم توڑتے ہوئے کہا ؎

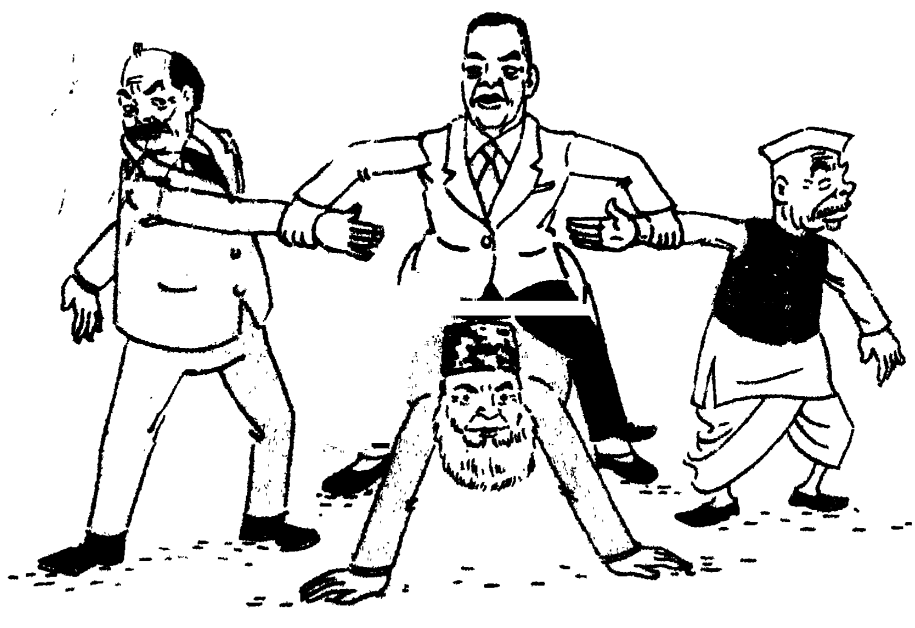
وہی قاتل وہی مخبر وہی منصف ٹھہرا!
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

"ریزرو بنک کے ملازموں کا مظاہرہ" ایک عنوان ——— آئندہ کے لئے ریزرو رکھ لیا گیا۔

"ملک کی آزادی کی حفاظت کے لئے ایٹم بم ہونا ضروری ہے" ایک مقالہ ——— اور کرشنا مینن جیسا ڈیفنس منسٹر ہونا بھی بہت ضروری ہے۔

"بمبئی کے نامراد عاشق نے دہلی میں اپنی محبوبہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا" ایک خبر ——— تاکہ اب عدالت اُسے محبوبہ کے پاس پہنچانے کا انتظام کرے۔

"یہ سوشلزم کے بوگس ٹھیکیدار" ایک عنوان ——— جو صرف تقریریں کرنا جانتے ہیں۔



"میں ماسکو میں روسی لیڈروں سے ہند پاکستان اختلافات ختم کرانے کے لئے کہوں گا" ——— مولانا بھاشانی کا بیان۔

گوردواس منشن روڈ، کمار جمبئی ۱۰

۲۲ جون ۱۹۹۶ء

برادرم! تسلیم

دلّی میں بیٹھ کر "لندن کی ایک شام" کا لطف لیجیے۔ آپ بھی اِس آئینے میں اُس آدمی کو پہچان سکیں گے جو اپنے ماحول کی غلاظتوں کا شکار ہو کر بھی زندہ ہے اور اِس بات کی علامت کہ انسانیت ابھی باقی ہے۔

آج کل تو دلّی میں آگ برس رہی ہوگی۔ آپ کیسے ہیں؟

آپ کا ــــ کرشن چندر

لندن کی آخری رات!

کل میں چلا جاؤں گا۔ صبح سویرے!

اِسی لئے ابھی سے سامان باندھ رہا تھا۔ کیونکہ آج رات کو ڈورتھی لٹیمور نے اپنے فلیٹ پر کھانے کے لئے مدعو کیا تھا۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے کم سے کم بیس نئے شاعروں سے ملائے گی۔ اِس لئے دعوت دیر تک چلے گی۔ ہو سکتا رات بھر چلے۔ صبح مجھے سامان باندھنے کا وقت نہ ملے گا۔ اِس لئے ابھی یہ کام کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

قادر یار اپنا میلا کچیلا، بیشمار سلوٹوں والا گون پہن کر میرے اِردگرد ٹہل رہا تھا۔ بار بار سگریٹ کی راکھ جھاڑتا جاتا تھا اور بیچ بیچ میں میری مدد بھی کرتا جاتا تھا۔ لیکن بہت بےچین معلوم ہوتا تھا۔

"کوئی بات تمہیں ستا رہی ہے؟" میں نے قادر یار سے کہا۔

"چند گھنٹے پہلے تم نے یورپ کی یہود دشمنی کی جو بات کہی تھی اور اُس سے جو نتائج اخذ کئے تھے، وہ مجھے صحیح نہیں معلوم ہوتے۔ یہ تو صحیح ہے کہ دوسری جنگِ عظیم میں ساٹھ لاکھ یہودی جان سے مار ڈالے گئے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ پورا یورپ اُن کے قتل کے حق میں تھا۔ شریف یورپ نے، شریف لوگوں نے، شریف دانشوروں نے، اِس قتل کے خلاف احتجاج بھی کیا!"

"مگر کتنا کم —!" میں نے کہا۔ "اور اِس لفظی احتجاج سے کیا ہوتا ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد بھی یہودیوں کا اخراج یورپ سے نہ رکا۔ اُنھیں یورپ میں پھر سے بسانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ اُن کے خاموش اخراج کے لئے ہر ممکن کوشش جاری رہی اور اُنھیں یورپ سے نکال کر ایک الگ خطۂ زمین دے دیا گیا اور وہ بھی عربوں سے چھین کر۔ دوسرے کی زمین کو چھین کر کسی تیسرے کو دیدینے میں کونسی فیاضی ہے؟ میں تو جب مانتا کہ یورپ کا ضمیر جاگا ہے، جب یہودیوں کو عربوں کے گھروں میں آباد کرنے کے بجائے اُنھیں اُن کے گھروں میں بسایا جاتا، جہاں سے وہ نکالے گئے تھے۔ جب مجھے کبھی یورپی پچھتاوے کا احساس ہوتا۔ اب تو نہیں ہے!"

"مجھے افسوس ہے، تم یہاں سے یورپ دشمن ہو کے جا رہے ہو۔" قادر یار بیزاری سے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ "یہ رجحان صحیح نہیں ہے!"

"میں یورپ کا دشمن نہیں ہوں۔ یورپ نے پچھلے چار سو سال میں دنیا کی تہذیب اور زندگی کو جو کچھ دیا ہے، وہ باقی دنیا کے سارے ملکوں نے مل کر بھی نہیں دیا۔ اِس سے بھی انکار ناممکن ہے کہ مختلف قومی نسلی اور جغرافیائی حدبندیوں کے باوجود دنیا کے ہر خطے کے لوگ ذہنی اعتبار سے یوروپین ہوتے جا رہے ہیں۔ جو عالمی تہذیب آج مر رہی ہے وہ یورپ کی دین تھی اور جو دوسری عالمی تہذیب اُس کے بطن سے نکل رہی ہے وہ بھی یورپ کی بیٹی ہے۔ اِس کا بھی میں فراخدلی سے اعتراف

"پھر تم یورپ کے کیا لگتے ہو؟"

"آج یورپ کے پاس کوئی خیال نہیں۔ کوئی چونکا دینے والا خیال۔ ایک بم گرا دینے والا ایٹم بم تو ہے لیکن دمک کر دینے والا کوئی ایسا خیال نہیں ہے جو اپنے اندر سے ساری دنیا کو روشن کر دے۔"

"اگر ایسا ہے تو تم یورپ و امریکہ کی دعوت میں کیوں جا رہے ہو؟"

"وہاں میں شاعروں سے ملوں گا۔ میں نئے مغربی یورپ کے ذہن کو سمجھنا چاہتا ہوں اور تم جانتے ہو، کسی بھی تہذیب کا بہترین نمائندہ اُس کا ادیب اور شاعر ہوتا ہے... خدا حافظ!"

نوروتی گھوش نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا۔

"آف کورس!" وہ مجھے دیکھ کر خوشی سے چلائی۔ "تم ہو؟ میرا قیافہ بالکل ٹھیک نکلا۔"

میں کچھ نہ کہہ سکا۔ بس حیرت سے اُسے تاکے جا رہا تھا۔

"اندر آجاؤ!" اُس نے اپنے بدن میں ایک جھرجھری محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اندر آجاؤ۔ ورنہ میں دروازے میں کھڑی کھڑی جم جاؤں گی۔"

میں دروازے کے اندر چلا گیا۔ اُس نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔

"بیٹھو!" اُس نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور جب میں صوفے میں دھنس گیا تو وہ مجھے سگریٹ پیش کرنے لگی۔

پھر وہ میرے پہلو سے اُٹھی اور دو قدم ہٹ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ پھر اپنی ایڑی پر گھوم گئی۔ بولی۔ "میرا رنگ کیسا ہے؟"

"دودھیا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے صندلی بدن بہت پسند ہیں یا ایسے بدن جن کی رنگت میں سانولا پن ہو!"

"جھوٹ بولتے ہو۔ سفید رنگ ہر ایک کو پسند ہے۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ انسانوں کے مختلف رنگ سب ایک سے اچھے ہوتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جتنے ایشیائی، افریقی اور زرد رنگت والے ہیں سب کے سب سفید رنگ کو دل ہی دل میں پسند کرتے ہیں۔ سفید رنگ سب سے برتر!"

"کیونکہ یہ زیادہ حسین ہے!"

"کیسے۔؟"

"کالی لڑکی کی تعریف آج تک کس ملک کی شاعری میں ہوئی ہے؟ مجھے ذرا بتاؤ۔ کالی اچھی لگتی ہو اور گوری چمڑی کو بُرا کہنے والے خود کیوں سفید رنگ کو اس قدر پسند کرتے ہیں۔ صاف اور کھلتے ہوئے رنگ پر سب کی جان جاتی ہے، چاہے وہ ہندوستانی ہوں یا افریقی حبشی یا زرد رنگ کے منگول۔ سبھی ہماری رنگت کے رسیا ہیں!"

"مجھے ایک ہندوستانی نے بتایا تھا کہ تمہارے ہاں اخباروں میں جتنے اشتہار شادی کے لئے چھپتے ہیں سب میں گوری یا صاف گندمی یا کھلتی ہوئی رنگت کی فرمائش ہوتی ہے۔ جنوبی ہند میں بھی جہاں تقریباً نوّے فیصدی لوگوں کا رنگ کالا ہے۔ وہاں بھی گوری لڑکی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں کیوں؟ اُدھر افریقہ میں دیکھو جو افریقی ذرا پڑھ لکھ جاتا ہے فوراً کسی سفید رنگت والی لڑکی سے شادی کرنے کی سوچتا ہے۔ آزاد افریقی ملکوں کے کتنے ہی وزیروں نے اپنے ملک کی حبشی لڑکیوں کو چھوڑ کر یورپین عورتوں سے شادی کی ہے۔ میں پوچھتی ہوں کیوں؟ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اگر کل کلاں کو ہمارے سائنسدان کوئی ایسی دوا یا انجکشن ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جائیں، جس سے کالے لوگوں کی رنگت سفید رنگت میں بہ آسانی تبدیل ہو سکے تو تم دیکھو گے کہ اس دنیا کے نوّے فیصدی لوگ تمہارے کالے لوگ سفید فام ہو جانے کے لئے بے قرار ہو جائیں گے۔ اس پر بھی جو حقیقت ہے اُسے تم لوگ چھپاتے ہو۔ دل ہی دل میں سفید رنگت کو پسند کرتے ہو اور ہمیں گالیاں دیتے ہو، اندر سے کُڑھتے ہو، جلتے ہو، اور جب بس نہیں چلتا تو گالیاں دیتے ہو۔ بالکل اُس بدصورت عورت کی طرح جو اپنے سامنے ایک حسین عورت کو دیکھ کر جلتی ہے اور اُس کے حسن سے منکر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تم بھی سفید رنگ کی برتری سے منکر ہو۔ کیوں؟ میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں؟"

"آف کورس۔!" میں نے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں نے کہا۔ "ایک روز میں نے پکاڈلی میں ایک حبشی کالی لڑکی دیکھی تھی۔ میں بتا نہیں سکتا وہ کتنی حسین تھی! مرد تو مرد، تمہاری کئی انگریز لڑکیاں اُسے دیکھنے کے لئے چلتے چلتے ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ حبشی مرد اپنی اُٹھی ہوئی گردن اور چوڑے سینے کے ساتھ کتنے وجیہہ معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کی لڑکیاں تم نے نہیں دیکھیں۔ کالی آنکھوں والی، سفید دانتوں والی، محراب دار بھنوؤں والی، سیاہ بال کر بنک بکھیرے ہوئے بنگالنیں اگر تم دیکھ لو تو احساسِ کمتری سے پانی پانی ہو جاؤ۔ فطرت نے ہر نسل کو اپنی طرح کی خوبصورتی عطا کی ہے۔ اپنی جگہ تمہارا بدن بھی خوبصورت ہے۔ تمہیں اور اپنے آپ کو اس طرح دیکھ کر مجھے اپنے ایک دوست اردو شاعر مخدوم کی ایک نظم یاد آتی ہے۔

دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے .... میکدے سے ذرا دور ......!

...کے چہرے کے بھلا تو نذر دو کی کہنے لگی۔
"... ادا کر بھوک کیا کر رہے ہیں۔ پیتے کیوں نہیں؟"
... ان ہیں شاعروں کا انتظار کر رہا تھا، جن سے ملانے کا
تم نے وعدہ کیا تھا۔"
"وہ آجائیں گے۔ پہلے شروع تو کریں۔" اتنا کہہ کر وہ اُٹھی اور دو جام بنا کر
لے آئی۔

میں نے شاعر سے پُوچھا "حبیبہ کہاں ہے؟ کئی دن سے اُسے نہیں دیکھا۔
دو تین بار میں نے فون بھی کیا لیکن کسی نے ٹیلی فون اُٹھایا تک نہیں۔"
"وہ آجکل سوگ میں ہے!"
"سوگ کیسا ---؟"
"شام کی بیوفائی کا!" (یہ ایک پبلشر تھا مس ہفورڈ کی طرف اشارہ تھا)
"وہ شرمیلا پبلشر؟" میں نے پُوچھا۔
"ہاں ---! اِس عمر میں بھلا حبیبہ کو اِس لونڈے سے عشق کرنے کی کیا سُوجھی۔
پھر تو یہی ہونا تھا ---!"
"مگر حبیبہ آج بھی غضب کی چارمنگ ہے۔"
"وہ تو ہے۔ مگر... مگر..." وُہ رُک گئی۔
"مگر کیا ---؟" میں نے پُوچھا۔
"تمہیں معلوم نہیں؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔ پھر خُود ہی کہنے لگی۔ "آف کورس!
تمہیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ شام ہوموHOMO ہے، وُہ عورتوں کو پسند نہیں
کرتا۔ اپنے سے بڑی عُمر کے مَردوں کو پسند کرتا ہے۔ اُسے اُس بوڑھے انگریز
ادیب سے عشق ہے جو اُس دن ہمیں اُو تھیلوز میں ملا تھا!"
"فرینک بیکن ---؟"
"ہاں ---" ڈورا نے آہستہ سے سر ہلایا اور غور سے جام کے سنہرے
رنگ کو دیکھنے لگی۔ پھر افسردگی سے سر ہلا کے بولی۔ "بیچاری حبیبہ!"
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وُہ بڑھتی ہُوئی افسردگی سے بولی۔
"ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو عورتوں کو پسند
نہیں کرتے۔ کہتے ہیں، عورت تو ایک عام تجربہ ہے، کوئی خاص انوکھی، الگ سی
بات ہونی چاہیئے۔ "They want something unusual"
"حالانکہ ہم جنسی بھی کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں، بہت پرانی بات ہے" میں نے
کہا۔ "لیکن ٹیڑھے سماج میں ہر چیز ٹیڑھی ہونے لگتی ہے۔ معاشرہ ٹیڑھا ہو تو خواہشیں
بھی ٹیڑھی ہونے لگتی ہیں اور اُن کے حصول کے ذرائع بھی۔ فطری حسن کی حِس تک

روپوش ہو جاتی ہے۔ لیکے بھی ہر مسئلے پر جب اپنے ... ہے ---
"...with a bang but with a whimper"
ڈورا بولی۔ "میں نے کئی بار حبیبہ کو سمجھایا ... کی عادت نے
وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتی --- ...You are ... اگر وہ ... ہے
تو اِس میں میرا کیا قصور ہے؟ اگر اُس کا بوائے فرینڈ ہوموسے تو میں کیا کروں؟" ڈورا
نے یہ کہتے ہوئے اپنے لب بہت پیارے انداز میں باہر کی طرف نکال دیئے۔
"بھول جاؤ اُسے۔" میں نے اُس سے کہا۔ "اور یہ دیکھو کہ دیوار پر تمہارا سایہ
کتنا حسین ہے، کتنا تیکھا اور نوکدار۔ جیسے کسی پنسل کی تیز نوک سے کسی مصوّر نے
تمہارا چارکول اسکیچ بنایا ہو۔ یہ Nude تو ماتیسں کے لیں کا بھی نہیں...؟"
وُہ دیوار پر اپنا سایہ دیکھنے لگی۔ سایہ اُسے دیکھنے لگا۔ میں اُن دونوں کو دیکھنے
لگا --- ایک کالی عورت، ایک سفید عورت۔ ان دونوں کو الگ کیسے کیا جائیگا؟
دونوں کا ساتھ ازل سے ہے!
یکایک وُہ پھر کھڑی ہو گئی --- "آؤ ناچیں!"
اُس نے جاز کا ایک ریکارڈ لگا دیا اور سرک کر میری باہوں میں آگئی اور ہم
دونوں چہرے سے چہرہ ملا کر ناچنے لگے۔
کرہ خُوب گرم تھا۔ دیواروں پر سائے ناچ رہے تھے۔ نیم تاریک ... نہ
میں دو بدن، موسیقی میں پگھلتے ہوئے، وقت کے چاک پر مٹی کے دو آبخورے
زندگی کی شراب سے چھلکتے ہوئے، آنکھیں بند کئے ہوئے ناچتے ہوئے۔ اِس
کمرے سے باہر کچھ نہیں ہے۔ اِس لمحے سے پہلے کچھ نہیں تھا۔ اِس لمحے کے بعد کچھ
نہیں ہے گا۔
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
بس ایک لمحے کی پینگ میں جھولتے ہوئے کسی ٹوٹتے ہوئے تارے کی طرح زندگی کی تاریک
رات کی بے معنویت کو منوّر کرتے ہوئے --- بس ایک پل کی چکا چوند روشنی پھر
اندھیرا... اندھیرا --- جس کے خوف سے اور بھی لپٹ جانے کو جی چاہتا ہے!
یکایک بند کھڑکیوں سے باہر زور کا ایک کوندا لپکا اور ایک ایسی گرج پیدا
ہوئی جیسے ایک ساتھ ایک لاکھ توپیں چل گئی ہوں۔ کھڑکیوں کے شیشے زور سے جھنجھنا
اُٹھے اور ڈورا ایک چیخ مار کر مجھ سے الگ ہو گئی اور بھاگتے ہوئے ایک بڑے صوفے
کے پیچھے جا چھپی۔
"ٹم... ٹم... ایٹم بم ---!؟"
میں نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "یہ ایٹمی بمباری نہیں ہے، باہر بادل
گرج رہا ہے۔ ذرا غور سے سنو ---!"

لیکن وہ صوفے کے پیچھے چھپی ہوئی اپنا سر جھکائے اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر چھپائے ہوئے سر ہلا ہلا کر میری بات ماننے سے انکار کر رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے گھسیٹ کر اُسے صوفے کے پیچھے سے نکالا۔

"ہم دونوں محفوظ ہیں، دیکھ لو!" میں نے اُس سے کہا۔ "اور سنو۔ تمہارا ریکارڈ ابھی تک چل رہا ہے۔ کوٹ پہن لو۔ تم سردی سے پاؤں تک کانپ رہی ہو!"

اُس نے کوٹ پہننے سے انکار کر دیا لیکن اُس نے بہت جلد اپنے خوفزدہ احساس پر قابو پا لیا۔ اپنے بال ٹھیک کئے۔ آئینہ دیکھ کر لپ اسٹک سے اپنے ہونٹ سنوارے اس دوران میں وہ بار بار اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتی تھی۔ جیسے میرا ہاتھ ہاتھ نہ ہو۔ زمین کا محور ہو، کمرے کا فرش ہو، زندگی کا ثبوت ہو۔ پھر اس نے گلاس اُٹھا کر بہت سی شراب اُس میں انڈیلی اور اُسے غٹاغٹ پی گئی۔ پی کر قریب کے دیوان پر دراز ہو گئی اور مجھ سے بولی۔

"وہ لوگ ہمیں بہت بدنام کرتے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے ہمارا ماضی ہم سے چھین لیا اور ہمارا مستقبل نوچ لیا اور ہمارے سر پہ ایٹم بم لا کے کھڑا کر دیا۔ کیونکہ ہمیں بدنام کرتے ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ جو بم ناگاساکی پر گرا تھا وہ صرف ناگاساکی پر گرا تھا وہ ہم پر بھی گرا تھا۔ — اور اُس نے ہمارے ذہن، تہذیب، کلچر، خواب، صورتیں خواہشیں، ہر شئے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ تم لوگوں نے اپنی زندگی ایک مضبوط زمین پر گزاری ہے۔ ہم لوگ بم کے فلیتے پر کھڑے ہیں۔ پھر کیوں نہ ہم اس لمحے کو آخری جانیں اور زندگی کے سارے خوبصورت رشتے بھول جائیں۔ ہمیں موت کے دہانے پر کھڑا کر کے ہمیں — پوچھتے ہو کہ ہمارے احساس اتنے عریاں کیوں ہیں—؟ روایت اور مستقبل دونوں کو چھین کر جاننا چاہتے ہو کہ ہم اتنے غیر ذمہ دار کیوں ہیں؟ کیا بھونڈا مذاق ہے اِس دُنیا کا.... آؤ مجھے اپنی بانہوں میں کس لو۔ اِس طرح پیار کرو کہ ہمارے وجود ایک ہو جائیں! وہ دانت پیس کر بولی۔ "لیکن تمہیں تو نشہ ہی نہیں ہو رہا ہے۔ کیا تم پانی پی رہے ہو۔؟"

اُس نے دیوان سے اُٹھ کر ایک بڑا جام زبردستی میرے منہ سے لگا دیا اور سارا مجھے پلا دیا۔ پھر وہ دیوان پر لیٹ گئی، بولی۔ "میری آنکھوں میں دیکھو!"

میں نے بات کا رُخ بدلنے کی غرض سے کہا۔ "وہ تمہارے بیس شاعر کہاں ہیں جن سے بلانے کا تم نے وعدہ کیا تھا!"

وہ ایک دم غصے سے اُٹھی اور دیوان کے قریب ایک بُک شیلف سے ایک کتاب کھینچ کر بولی۔ "یہ رہے تمہارے بیسیوں شاعر — بلوا اِن سے!"

کتاب کا نام تھا — "بیس نئے شاعر"!

"آؤ بلوالیں اِسے" وہ کتاب کے ورق اُلٹتے ہوئے بولی۔

یہ ڈبلیو۔ آر۔ راجرز ہے۔ سنو کیا کہتا ہے۔

"اُس ملک میں ساری زمین چپٹی ہے۔ بیکار اور وہاں کوئی گھر ہے نہ خیمہ
وہاں کوئی مقصد نہیں ہے اور کسی بات کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ کوئی منزل ہے نہ
کوئی رُجحان۔ نہ کوئی جادہ۔
ناک کی سیدھ۔ لے کر جہاں چاہو چلے جاؤ۔"

یہ رائے فُلر ہے۔ اِس کی بات سُنو۔

"شاید موسم بہار میں ہمارے سفیر لوٹیں گے۔ اُن کی آمد سے پہلے ہی شاید
ہمیں معلوم ہوگا کہ بم اور کتابیں، لوگ اور سیارے اور ہمارے دُکھ یہاں تک کہ
ہماری بیویاں، بھی ہمارے لئے اہم نہیں ہیں۔
یہ مضحکہ خیز بنسی کی ڈور جو ہماری بیزار زندگی ہے شاید کسی روحانی تجربے
یا کسی عظیم فلسفے کی مچھلی کو پکڑ لائے اور خدا آزاد ہو جائے۔
اخلاق کے لاشے سے یا نیلگوں، روشنیوں والے کمرے سے (آسمان)
یا اِس سے بھی بہتر شاید اِس سے پہلے کہ کوئی خاص بات ہو۔ ہم بہت
اطمینان سے مر جائیں—!"

یہ جان بیتھ اسٹیلس ہے۔

"یہ ملک بدصورت اور بدمعاش، نفرت زدہ، سورج کی طرح ڈھلتا
ہوا۔ وقت کی آخری حدوں کو جاتا ہوا — کھوکھلا، کان میں سکڑے ہوئے گنبدوں
کی طرح، ننگا، چٹانوں کی طرح۔ متعصب غم کی طرح۔ یہاں کی دلدلوں میں ماضی کے
استفادہ دوڑتے ہیں۔ کالے اور تاریک۔ چہروں والے کسان یاد کرتے ہیں اُنھیں جو
پتھروں پر جلائے گئے تھے....!"

ڈورا نے کتاب زور سے پھینک دی۔ کتاب اُڑ کر ریکارڈ پر جا گری۔ ریکارڈ اوندھا ہو گیا۔ میوزک بند ہو گیا۔ ڈورا نے اپنے بال جھٹلا کر غضبناک لہجے میں کہا۔ "جہنم میں جائے شاعری۔!"

"جہنم میں جائے شاعری!" میں نے بھی اُسی لہجے میں دُہرایا۔ میں اب اُسے خوش کرنے پر تُل گیا تھا۔

"جہنم میں جائیں ورڈزورتھ، براؤننگ"! وہ بولی۔

"شیلے، کیٹس، بائرن!" میں نے لقمہ دیا۔

اس عجیب اصطلاح "تعارف"!

"مگر میری شادی پر ضرور آنا" ... [illegible] ... کرنا چاہتی تھی

اور اسی لئے اُسے خوش کرنا چاہتا تھا کہ بے حد پیاری لگ رہی تھی!!

"ضرور میں جاؤں گا ... [illegible]"

"شکریہ ... [illegible]" میں نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

"ضرور ... [illegible]" اس نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کے بولی۔

"تم عجیب ہو شیکسپیئر!" میں اسے عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے ...

پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے دھکا دیا اور تڑپ کر کھڑی ہو گئی اور دیوان کے تکیے اُٹھا اُٹھا کر مجھے مارنے لگی اور جب تکیے ختم ہو گئے تو کتابیں شیلف سے نکال نکال کر انہیں اینٹوں کی طرح میری طرف پھینکنے لگی۔ وہ غصے میں بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اِدھر اُدھر ... رہی تھی ___

"How dare you insult Shakespeare?" ہمارے شیکسپیئر کی بے عزتی کرتے ہو۔ شیطان، بدمعاش، نکل جاؤ ___ میرے گھر سے!"

"سنو تو ___ ذرا میری تو سنو" میں مدافعت کرتے ہوئے اُس کے وار سے بچنے کے لئے پیچھے ہٹتا جا رہا تھا لیکن وہ آگے ہی بڑھتی آ رہی تھی۔ اُس نے مجھے دھکا دیکر اپنے فلیٹ سے باہر نکال دیا اور دروازہ بند کر دیا!

میں فلیٹ کے باہر سیڑھیوں پر اپنے سر کو تھامے ہوئے بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ غصے سے بھرا ہوا۔ چند لمحے لاوے کی طرح جلتا بھنتا بیٹھا رہا۔ جی چاہتا تھا مکے مار مار کر دروازہ توڑ ڈالوں۔ پھر جب صورت حال پر غور کیا تو یک لخت ہنسی چھوٹ گئی۔ میں کسی طرح اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ قہقہے مار کے ہنسنے لگا۔ میں نیچے سے اُٹھا اور ... کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹا کے بولا۔

"سنو ذرا ___ دروازہ مت کھولو۔ صرف میری بات سنو۔ سنو ذرا! میں نے تمہیں غلط سمجھا۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ تمہارے دل میں شیکسپیئر زندہ ہے اور جب تک شیکسپیئر زندہ ہے انسان کی اُمید زندہ ہے۔ میں جا رہا ہوں، میرا جہاز ... چار گھنٹے کے بعد ایئرپورٹ سے چلا جائے گا۔ خدا حافظ ڈیئر سویٹ ہارٹ!"

... میں زینے سے نیچے اُتر آیا۔ گھڑی دیکھی۔ چار بج رہے تھے۔ لندن سو رہا تھا ... کے ... سناٹے میں ٹھٹھرا ہوا سپیدۂ سحر کے پہلے تبسم کا انتظار کر رہا تھا ... کے فلیٹ میں ابھی تک روشنی تھی ___!

ایئرپورٹ پہ وہ مجھ سے ملنے کے لئے آئی۔ وہ ... رنگ کا کوٹ پہنے ہوئے

[illegible]

اُس نے ... [illegible]

"... [illegible] ... تھی؟"

"کوئی بات نہیں"

"بات کرتے ہوئے ... [illegible]"

میں نے جھک کر اُس کا ہاتھ چوما۔

"تم مجھے خط لکھو گے نا؟" وہ ... بولی۔

"نہیں" میں نے اُس سے کہا "ڈارلنگ ... [illegible] ... کسی انگریز ... [illegible] ... پہچان کیا کرتے ہیں ___ ... [illegible] ذرا ... وقت گزر جائے گا۔ تم مجھے بھول جاؤ گی۔ میں بھی تمہیں بھول جاؤں گا۔ پھر وقت کے کسی اجنبی موڑ پر کبھی ... کی وادی میں گھومتے گھومتے میں تمہارا چہرہ پہچان کر ٹھٹھک جاؤں گا اور اس طرح ... اچھے دوست اور ... اپنی اپنی زندگی کے راستوں پر چلتے ہوئے ... ایک دوسرے کو یاد کریں گے اور جن لمحوں میں ہم ایک دوسرے کو اس طرح یاد کریں گے وہی ہمارے ... ہوں گے"

پہلے تو وہ کچھ نہیں بولی۔ چند لمحے گہری گہری عجیب نگاہوں سے مجھے تکتی رہی۔ پھر ایکدم مسکرا کر کہنے لگی۔ "آف کورس!"

آف کورس کہہ کر وہ میرے کوٹ میں ایک پھول ٹانکنے لگی۔ میں اُس کی آنکھوں کے بنفشی پھول دیکھتا رہا۔

آواز آئی ___ "اٹینشن پلیز۔ فلائٹ نمبر ... کے مسافر۔ فلائٹ نمبر ... کے مسافر ... پر آ جائیں۔ ... کی لاسٹ کال ___!"

"وہی لاسٹ کال ... ___ خدا حافظ!"

غزل

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم اے

جو دل و جگر میں اُتر گئی وہ نگاہِ یار کہاں ہے اب | کوئی حد ہے زخمِ نہاں کی بھی کہ حیات وہم و گماں ہے اب

ملی عشق کو وہ حیات تو کہ عدم کا جس میں سکون ہے | یہ ہیں درد کی نئی منزلیں نہ خلش نہ سوزِ نہاں ہے اب

کبھی تھیں وہ اُٹھتی جوانیاں کہ غبارِ راہ نجوم تھے | نہ بلندیاں وہ نظر میں ہیں نہ وہ دل کی برقِ تپاں ہے اب

جنھیں زندگی کا مذاق تھا، وہی موت کو بھی سمجھ سکے | نہ اُمید و بیم کے مرحلے نہ خیالِ سود و زیاں ہے اب

نہ وہ حسن و عشق کی صحبتیں نہ وہ ماجرے نہ وہ سانحے | نہ وہ بے کسوں کا سکوتِ غم کسی کی تیغِ زباں ہے اب

یہ فراق ہے کہ وصال ہے کہ یہ محویت کا کمال ہے | وہ خیالِ یار کہاں ہے اب وہ جمالِ یار کہاں ہے اب

یہ فروغِ حسن و جمال کیا یہ فریبِ دید و وصال کیا | جو چمک رہا تھا ازل کا، وہی دردِ عمرِ جواں ہے اب

مجھے مٹ کے بھی تو سکوں نہیں کہ یہ حالتیں بھی بدل چلیں | جسے موت سمجھے تھے عشق میں، وہ مثالِ عمرِ رواں ہے اب

وہ مذاقِ شعر بدل گیا، جسے لکھنؤ میں فروغ تھا | جسے لوگ جانِ سخن کہیں نہ زباں نہ حسنِ بیاں ہے اب

وہ نگاہ اُٹھ کے پلٹ گئی، وہ شرارے اُڑ کے نہاں ہوئے
جسے دل سمجھے تھے آج تک وہ فراقؔ اٹھتا دھواں ہے اب

افسانہ

بہار آتے آتے

رشید انور

۹/۹۔ موتھرا روڈ، چھاؤنی اورنگ آباد۔ (مہاراشٹرا)

۳ / جون ۶۵ء

محترم بھائی! تسلیمات

پہلی بار "بیسویں صدی" کی بزم میں "بہار آتے آتے" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ شہر کے ایک سنسان سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر، کانپتی ہوئی آواز میں میرے سامنے جب وہ اُن دِنوں کی داستان دُہرا رہا تھا جو اُس کی ساری زندگی پر کسی گھناؤنے بادل کی طرح چھا گئے ہیں تو میں نے اُس کی ڈبڈبائی آنکھوں میں دیکھا ــــ مجھے محسوس ہوا اُس کی آنکھوں میں نہ جانے کتنے سوالیہ نشان ہیں جو آگ کی طرح میری طرف لپک سے رہے ہیں۔ آخر ایک انسان اپنا سب کچھ کھو کر بھی ایک آرزو ــــ صرف ایک تمنا کی تکمیل کیوں نہیں کر پاتا ــــ؟ کیا انسان کی قربانیوں، اُس کی سچائی اور خلوص کا بدلہ یہ دنیا کبھی نہ دے سکے گی؟ اپنے ہی لوگ جب زہر کا جام دیتے ہیں تو اُسے امرت کیوں کہتے ہیں؟ کیا دنیا میں آج کوئی ایسا نہیں ہے جسے اپنا کہا جا سکے ــــ؟ زندگی کے اِس تپتے ہوئے صحرا میں وہ کہاں جائے آخر ــــ؟ کہاں اپنے لئے سایہ تلاش کرے؟ اور زندگی بھر کا سفر طے کرنے اور اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد جب اُسے معلوم ہو کہ جس سائے کی تلاش میں وہ اپنے پاؤں لہولہان کرتا رہا ہے، اپنے دِل و جگر کو چھلنی کرتا رہا ہے، وہ محض ایک سراب تھا، تو وہ کہاں جائے ــــ کس کو ڈھونڈے؟ اپنی زندگی کی باقی گھڑیوں کے لئے وہ کیا کرے ــــ؟ کیا پھر کسی سراب کا پیچھا کرنا ہی اُس کا مقدر ہے ــــ؟ اُس کی اُداس آنکھوں کے کچھ سوال آپ تک پہنچا رہا ہوں....

آپ کا مخلص ــــ رشید انور

تاریک اور ویران سی رات میں قریب کے چرچ میں بجتی ہوئی گھنٹیوں کے ساتھ ایک سنّاٹے میں اُبھرتی ہوئی اِن اَن گنت آوازوں میں آنے والے سال اور آنے والے دِنوں کے لئے کتنی اُمیدیں اور کتنی آرزوئیں ہیں اور یہی مسلسل گونجتی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں اور انسانی آوازوں سے پھوٹتی ہوئی مسرتیں مجھے اِن سانس لیتے ہوئے لمحوں سے دُور گذرے ہوئے دِنوں کے ایک ایک راستے پر، تنہائی کے ایک ایک گوشے میں اور اُن تاریک کھنڈروں میں میرا دامن تھامے مجھے کھینچے کھینچے لئے پھر رہی ہیں جہاں تم نے میرے قدموں سے قدم ملائے تھے۔ جن گوشوں میں میں نے تمہاری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں ٹوٹتی ہوئی دیکھی تھیں اور جن کھنڈروں نے تمہاری جذبات سے کانپتی ہوئی آرزو کو اپنے بے جان سینوں میں ہمارے پیار کی امانت سمجھ کر محفوظ رکھا تھا ــــ یہ پچھلے ہی سال کی تو بات ہے۔ آج ہی کے دِن تم اِس درخت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ بجتی ہوئی گھنٹیوں کے ساز پر اِن گاتی ہوئی آوازوں نے ایسا ہی سماں باندھ رکھا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کچھ ہی دیر پہلے کی بات ہو۔ دھیرے دھیرے چلنے والی ہواؤں میں ابھی تک جیسے تمہارے جسم کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ غور سے دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے جیسے زمین پر کھنچی ہوئی وہ لکیریں بھی ابھی تک ویسی ہی ہیں جو تم نے بے خیالی میں کھینچی تھی اور اِس پیڑ کے سینے پر ہم دونوں کا نام پہلے ہی دِن کی طرح جگمگا رہا ہے۔ درخت کے اِس تنے پر ہم دونوں کے نام ایک نکیلے پتھر سے ایک ساتھ لکھتے ہوئے تمہارے ہاتھ کس طرح کانپ رہے تھے اور تمہارے چہرے سے خوشی کس طرح پھوٹی پڑ رہی تھی۔ یہ سب کچھ بس چند ہی لمحوں کی بات معلوم ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے تم میری

نظریں جھکا کر کوہ لر کے پیچھے چھپی ہوا اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں نظریں جمائے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ جب میں تھک جاؤں گا —— تمہارا انتظار نہ کر سکوں گا تو تم آہستہ سے آکر اپنے خوبصورت ہاتھوں سے میری آنکھیں بند کر لوگی اور ہم پھر زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے ہوئے سڑک کی راہ پر چل پڑیں گے۔ صرف ایک ہی سال کی تو بات ہے لیکن کتنا فرق ہے اُس دن اور آج کے دن میں۔ ان دونوں دنوں کے درمیان ہماری زندگی کے کتنے دنوں سے لبریز کتنے لمحے ہیں۔ کتنے تھکا دینے والے دن اور جان لیوا راتیں جب تمہیں پالینے کی آس اور اُمید نے مجھے ہر زخم کھا کر مسکرانا سکھایا تھا۔ ان دونوں دنوں کے درمیان کتنی جستجو اور ہنگامے ہیں اور وہ راہگذر کتنی پُرخار ہے جو ان دونوں دنوں کو ملاتی ہے —— چرچ میں بجتی ہوئی گھنٹیوں کا شور بڑھ رہا ہے وہ لوگ اپنے ہاتھوں کو سینوں پر باندھے آسمانی خلاؤں سے اپنی آنے والی زندگی کے لئے سکھ چین اور خوشیاں مانگ رہے ہوں گے۔ اپنی زندگی میں نئی بہاریں دیکھنے کی خاطر رہے ہوں گے اور میں یہاں بیٹھا دُور دُور تک پھیلے ہوئے اندھیرے میں نظریں جمائے سوچ رہا ہوں اُس باغباں کا کیا ہو جس کے چمن میں بہار آنے سے پہلے ہی خزاں نے اپنے قدم جما لئے اور میں تمہارے اُس خط کے متعلق سوچ رہا ہوں جو کہ روش بروش پیچ پیچ خراماں چلی آئی ہے۔ یہی خط کل تک کس طرح میرے لئے نئے جوش نئے ولولے اور میرے تھکے ہوئے دماغ کے لئے نئی سکت لاتا تھا۔ لیکن آج یہی خط مجھے احساس دلانے آیا ہے کہ اتنی بڑی دنیا میں اپنا کوئی نہیں ——

تم، جس کے لئے میں نے غیروں کے طعن اور اپنوں کی بے رُخی کے جان لیوا تجربے کھلا اپنے سینے پر جھیلتے ہوئے سہہ لئے —— تم، جس کے لئے میں گلی گلی کوچہ کوچہ رسوا ہوتا رہا —— تم بھی میری نہیں ہو۔ ہم دونوں کے درمیان بڑے فاصلے ہیں۔ اتنے فاصلے جنہیں میرا پیار اور میری چاہت بھی پُر نہیں کر سکتی —— ہم دونوں کی دنیا ہی الگ ہے اور ہمیں اب ایک دوسرے کے متعلق نہ سوچنا چاہیئے۔ ہمیں سوچ لینا چاہیئے کہ ہم دو ایسے اجنبی تھے جو زندگی کے چوراہے پر اپنی اپنی راہ کا تعین کرنے کے لئے چند لمحوں کے لئے رُکے تھے۔ ایک دوسرے کو اُچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اور پھر اپنی اپنی راہ پر چل پڑے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، جہاں میں رہتا تھا اُس محلے میں تمہیں آئے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ میں نے وہ باتیں بھی اُڑتی اُڑتی سُنی تھیں جو محلے کے آوارہ لوگ تمہارے متعلق قہوہ خانوں کے ہوٹلوں اور راستوں پر کھڑے ہو کر کیا کرتے تھے۔ میں نے تمہیں بارہا دیکھا تھا۔ تمہارے چھوٹے بہن بھائیوں کو کیچڑ میں لت پت محلے کے بچوں سے ہاتھا پائی کرتے ہوئے پایا تھا اور تمہارے اندھے پاپا کو تمہارے گھر کے چھوٹے سے چمن میں لکڑی کے سہارے اکثر ٹہلتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ تمہارے متعلق میں اُن دنوں صرف اتنا جان سکا تھا کہ تم شہر کی کسی فرم میں ملازم ہو۔ عمر کے اُس دَور میں جب لڑکیاں ماں باپ کی بڑی لاڈلی ہوتی ہیں۔ دُور بجتی ہوئی شہنائیوں کی آواز پر جب اُن کے کانوں کی لَوئیں سُرخ ہو جاتی ہیں اور دِل کی دھڑکنیں نہ جانے کیوں قابو سے نکل جاتی ہیں۔ ایسے ہی دَور میں تمہارے کمزور اور نازک کندھوں پر اپنے خاندان کا بوجھ آپڑا تھا۔ تم ہی تو تھیں جس کے سہارے تمہاری تین بہنوں اور دو بھائیوں کو پڑھایا جا رہا تھا اور تم ہی وہ واحد سہارا تھیں جو اپنے اندھے پاپا کی بے نور آنکھوں کی روشنی تھیں۔ یہ سب جان کر میں نے تمہارے لئے اپنے دِل میں ہلکا سا ہمدردی کا جذبہ محسوس کیا اور مجھے پہلی بار اُن لوگوں پر سخت غصّہ آیا جو تم پر نکتہ چینی کرتے تھے، جو تمہاری ملازمت کو، تمہارے رات گئے تک گھر لوٹنے کو اچھا نہ سمجھتے تھے اور جو تمہارے گھر آنے والے ہر فرد کو تم سے منسوب کرتے تھے۔ انہیں اِس بات کی جستجو تھی کہ ایک مفلوک الحال خاندان کی فرد ہوتے ہوئے بھی تم اپنے آپ کو ہمیشہ اتنا لئے دیئے کیوں رکھتی ہو۔

جس دن پہلی بار اچانک ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوئے، اُس دن سردی کچھ زیادہ تھی۔ میں لال بتی بس اسٹاپ سے جب بس چھوڑ کر چلا تو چاروں طرف دُھندلکا طاری ہو چکا تھا۔ اپنی رفتار تیز کرنے پر بھی چھاؤنی کے قریب پہنچتے پہنچتے کافی اندھیرا چھا گیا۔ دُور سے بستی کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ سنسان راستے پر چلتے ہوئے قدموں کی چاپ سے میں نے محسوس کیا جیسے میرے آگے بھی کوئی جا رہا ہے۔ میں نے سگریٹ سُلگا کر آگے کی طرف نظریں دوڑائیں تو دیکھا کہ تم تھیں اور شاید مجھے دیکھ کر تم میونسپلٹی کے لیمپ تلے رُک گئی تھیں۔ سفید ساڑی پر تم نے ہلکے آسمانی رنگ کا بہت خوبصورت کوٹ پہن رکھا تھا۔ لیمپ کی مدھم اور اُداس روشنی میں سڑک کے کنارے کھڑی تم مجھے بہت اچھی معلوم ہوئی تھیں۔ میں جب تمہارے قریب پہنچا تو تمہارا خوبصورت سلام تمہاری پیشانی کو جا لگا۔ اِس طرح اجنبیت کی دیوار ڈھا کر اُس بڑھتے ہوئے اندھیرے میں تمہارا اپنوں کی طرح میرے قریب آنا بہت عجیب تھا۔ ساری راہ تم بہت سنبھلے اور سہمے سہمے انداز میں مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔ تمہارے پڑوس کی کسی سہیلی نے تمہیں بتایا تھا کہ میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ٹیوشن بھی کرتا ہوں۔ اسی لئے تم مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔ تم نے مجھے بتایا کہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے تم ایک نائٹ کالج میں جاتی ہو اور اِس بار امتحان کی تیاری کے لئے تمہیں میری ضرورت ہے۔ تمہاری تعلیم پوری کرنے کی آرزو —— تمہارے خاندان پر گزرتے ہوئے کٹھن لمحے۔ اور تمہاری کانپتی ہوئی آواز!! میں انکار نہ کر سکا۔ تمہارے پاپا میرے بہت ممنون تھے کہ میں تم لوگوں کا اتنا ہمدرد ہوں۔ میں شام ڈھلے اپنی مصروفیت سے چھٹکارا پا کر تمہیں پڑھانے

تو تم مجھ سے بہت کم باتیں کرتی۔ جھجک اور حیا سے درمیان نگاہ کر پڑھتی رہتی تھیں
نہایت جھجکتے ہوئے تم کبھی کبھی کنکھیوں سے میری طرف دیکھ لیتیں۔
تمہاری اداس غمگین سی خاموش آنکھیں۔ اُن دنوں تنہائی میں کتنی دیر تک
اس خاموشی خاموش سی آنکھوں کے متعلق سوچتا رہتا۔ تمہارے چہرے پر چھپے
ہوئے درد و کرب کا بھید جاننا چاہتا۔ تمہاری آواز میں چھپے ہوئے سوز کا بھی تجزیہ
میں بہت سی چیزیں سامنے لگا کر دوسری طرف تمہاری بھولی بھالی باتیں
باتیں کرنے کا معصوم شرمیلا سا انداز۔ موم کی طرح نازک اور ہر ایک کے دکھ درد پر پسیج
اٹھنے والے تمہارے دل نے میری شخصیت سے ساری اجنبیت چھین لی۔ اپنائیت
کی ایک لکیر تھی جو تم نے میرے چاروں طرف کھینچ دی تھی۔ یہ لکیر آہستہ آہستہ چار دیواری
کی صورت اختیار کرتی گئی اور وقت گزرتا ہوا ہر لمحہ اس چار دیواری کو مضبوط کرتا گیا۔
تمہارے خیالوں اور تمہارے تصورات سے سجی ہوئی دنیا میں کتنی اچھی تھیں اور وہ دن
کتنے انمول تھے جو تمہارے ساتھ گزر رہے تھے۔ تم میرے قریب بیٹھی کورس کی کتابیں پڑھتی
رہتی اور میں آہستہ آہستہ تمہاری گزری ہوئی زندگی کی اُس کتاب پر نظریں دوڑاتا رہتا جسے
تم نے مجھے اپنا جان کر بھیگی آنکھوں سے میرے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا ——— جس کتاب
کا ایک ایک لفظ غم تھا، تڑپ رہا تھا۔ اُن دنوں واقعی میں نے کتنی شدت سے
سوچا تھا تمہارے متعلق اور تمہاری زندگی کے متعلق جو بہت ہی عجیب تھی۔ بچپن سے
جوانی تک کس طرح تم نے ایک ہمدم کا انتظار کیا تھا۔ جو تمہارا ہو، صرف تمہارا ———
تم جس کا خیال رکھ سکو۔ جس کے لئے تم تڑپ سکو۔ جسے پا کر تم دنیا کی ساری خوشیوں
اور نعمتوں کو ٹھکرا سکو ——— اور تم نے اس آرزو کی تکمیل کے لئے آس اور امید کے اُن دیئے
کی کتنی حفاظت کی تھی جو تمہارے سینے میں جل رہا تھا۔ لیکن یہ بھی قدرت کا کتنا بڑا ستم تھا
کہ تم پیار اور محبت کی ازلی پیاس لئے بھٹکتی رہیں۔ تم نے دل کا کاسہ لئے ہوئے در در
بھیک مانگی لیکن تمہیں سچا پیار اور چاہت کوئی نہ دے سکا۔ جب بھی تم نے اپنے
دل کی جھولی ٹٹولی تمہیں محبت کا ایک بھی مہکتا ہوا پھول نہ ملا۔ تم نے جتنی تگ و دو
کی تمہیں پھولوں کے بجائے کانٹے اور پیار کی سوغات کی بجائے دہکتے ہوئے انگارے ہی
ملے۔ نہ جانے کیوں بچپن ہی سے ناکامیوں اور مایوسیوں نے تمہاری زندگی کو اپنا مسکن
بنا لیا تھا۔ تم نے ابھی ہوش بھی نہ سنبھالا تھا۔ اپنے نرم روئی سے گالوں پر ماں کا لمس بھی
محسوس نہ کیا تھا کہ تمہیں غیروں کی گود میں ڈال کر تمہاری ماں کو منوں مٹی تلے دبا دیا گیا اور
یہیں سے قسمت نے تمہاری زندگی کی سرسبز زمین میں ناکامیاں ہی ناکامیاں بو دیں اور
تمہاری بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ ناکامیوں کی یہ فصل بھی بڑھتی چلی گئی۔ تمہاری دوسری
ماں کا بہیمانہ سلوک کی تیز دھوپ، پاپا کی بے رخی، سہیلیوں کے نفرت آمیز انداز ———
ایسے ہی نہ جانے کتنے دل شکن موڑ آئے۔ نہ جانے حالات کے کن کن نشیب و فراز سے تمہیں

گزرنا پڑا اور تمہاری زندگی [illegible]
ایک ایسا وقت بھی آیا جب تم [illegible]
پھر بھی تم نے اپنا سب کچھ [illegible]
اور تمہاری خوشیاں سب [illegible]
ہوگئیں۔ آہستہ آہستہ تم نے اپنی گزری ہوئی زندگی کے ایک ایک [illegible]
ڈالی۔ مجھے اپنا غمگسار جان کر سب ہی باتیں بتا دیں۔ تم نے یہاں تک کہ [illegible]
سب ہر اک لمحے مجھے دے دیا جیسے تم اب تک ہر ایک سے چھپاتی [illegible]
کتنا اطمینان ہوا اور جان لیا تھا [illegible]
تھیں۔ نہ جانے کیوں آہستہ آہستہ تمہاری رگوں میں سرایت کرتا رہا۔ تمہارے لبوں کے
ٹوٹتے ہوئے رہے پھر بھی تم اُس کے لئے مسکراتی رہیں کہ کوئی تمہارا دیدہ جان سکے

جی تمہارے کالج کا ساتھی تھا۔ تم بہت حسرت اور اُلجھن کے ساتھ اُس کا
تذکرہ کیا کرتی تھیں۔ جی سے پرستش کی حد تک تمہارا والہانہ پیار، اُن کے ساتھ گزارے
ہوئے وہ دن اور وہ لمحے اور ایک دوسرے کے لئے مر مٹنے کے وہ عہد و پیمان تم نے
کتنے بھولے اور معصوم انداز میں مجھے بتائے تھے۔ تم اُس دن پہلی بار گھر کی چار دیواری
اور کتابوں کی فضا سے نکل کر میرے ساتھ شہر کے ہنگاموں سے دور ایک ویران
اور خاموش سے علاقے میں چلی آئی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد اپنے بے وفا محبوب
جی کو یاد کر کے تم پھوٹ پھوٹ پڑیں تو تمہاری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ایک
ایک قطرے نے تمہاری لٹی ہوئی محبت کی داستان دہرا دی۔ کالج گیدرنگ کے
موقع پر وہ تمہارے بے حد قریب آ گیا۔ دونوں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ ایک
دوسرے کی طرف بڑھا دیئے، ہاتھوں نے ہاتھوں کو تھاما اور پھر دونوں نے ہمیشہ کے لئے
ایک دوسرے میں سما جانے کی قسمیں کھائیں۔ تم نے بڑی حسرت اور بھیگی ہوئی آنکھوں
سے قریب سے گزرتی شدید تیز تر شوخ ندی پر نظر ڈالی تھی۔ جی کے ساتھ تمہارا پیار
اور چاہت بھی اُن دنوں ندی کی اِن تند و تیز موجوں کی طرح آگے ہی بڑھتے
میں آنے والی ہر چیز کو روند کر آگے کی طرف بڑھتی رہتی تھی۔ تم نے اُن چرچوں کی پرواہ
نہ کی جو تمہارے اور جی کے متعلق کالج کے در و دیوار میں گونج رہے تھے
اُن سب ہنگاموں سے بے خبر تم جی کو اپنانے کے خواب دیکھتی رہیں ——— اور
پھر جی بھی تمہاری نامرادیوں اور ناکامیوں کے کتبے میں درج ہو کر شامل ہو گیا۔
اُس وقت جب تم جی کو چاہے جانے کے جنون میں تم نے اپنی زندگی کی سب سے
بڑی بازی بھی اُس کے قدموں میں ڈال دی تو تمہیں اچانک پتہ چلا کہ وہ کسی اور کا ہے
——— یہ جان کر کہ وہ اب تک تم سے محبت کا سوانگ کرتا رہا ہے تم نے

اُس کا دامن تھام لیا۔ اُسے اپنے پیار اور اپنی چاہت کا واسطہ دیا۔ اُسے وہ قسمیں اور عہد پیمان یاد دلائے جو کالج کے پشت والے سُرخ مینار کی نیم تاریک فضا میں اب تک بھٹک رہے تھے۔ لیکن تم نے ایک ہی جھٹکے میں اپنا دامن تمہارے ہاتھوں سے چھڑا لیا تم روتی سسکتی رہیں۔ اُس کی طرف دوڑتی رہیں۔ لیکن اُس کے گھر سے اُٹھتی ہوئی شہنائیوں کی آواز نے تمہارے سامنے ایک لکیر کھینچ دی جس کے آگے تم اب جا سکتی تھیں۔ پھر تم نے حالات کے سامنے سر جُھکا لیا۔ اپنی زندگی کے جس چمن میں تم نے آسودگی اور خوشیوں کے مہکتے ہوئے پھولوں کی تمنا کی تھی اُس میں خزاں نے اپنا بسیرا کر لیا۔ پھر تمہارے دل میں کوئی آرزو کوئی تمنا نہ رہی۔ تم نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ تم نے اُس گھر اُس محلے اور اُس شہر کو چھوڑنے کا تہیہ کر لیا جہاں تمہارا دل بار بار ٹوٹا تھا۔ جہاں زندگی تمہارے لئے دُکھوں کے ایک ایسے سمندر کی طرح تھی جس کا کوئی ساحل نہ تھا۔ اُنہی دنوں جب تمہارے اپنے غم تمہیں سنبھالے نہ سنبھلتے تھے تمہارے بابا سرحد کی جھڑپوں میں اپنی آنکھیں گنوا بیٹھے اور تم اپنے اِس چھوٹے سے خاندان کے ساتھ اِس شہر میں چلی آئیں جہاں میں پڑھتا تھا۔ مجھے اپنا جان کر جب تم مجھے اپنی گزری ہوئی زندگی کے خارزاروں میں لئے لئے پھرتی رہیں تو میں تمہاری زندگی کے اُن دنوں کا تصوّر کر کے کانپ گیا۔ تمہاری مسلسل ناکامیوں کا تصوّر کرتے میری آنکھیں بھیگ گئیں —— اور ایک دن میں نے چُپ چاپ فیصلہ کر لیا کہ تمہاری زندگی میں اب کی بار بہار ضرور آئے گی۔ یہ بہار تمہارے نئے پیار کے مہکتے ہوئے پھول لائے گی اور اِن پھولوں کو حاصل کرنے کے لئے اِس بار تمہیں اپنا دامن کانٹوں سے اُلجھانا نہ پڑے گا۔ پھر تمہارے نہ چاہتے ہوئے بھی میں تُمہارے نزدیک آتا گیا۔ تمہاری آنکھوں میں مسرّتوں کے نقوش ڈھونڈتا رہا اور تمہاری چنبیلی کی بیل کی طرح نرم و نازک باہوں کی گرفت میری گردن کے اطراف روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی۔ تم سے میری چاہت کے افسانے محلے سے نکل کر ہوا کے دوش بدوش چاروں طرف پھیلتے گئے۔ اُن دنوں میری جو حالت تھی، کیا تم اُس کا اندازہ کر سکتی ہو۔؟ سردیوں کی وہ تاریک راتیں جانتی ہیں کہ اُن کی گود میں میں نے وہ گھڑیاں کس طرح کروٹیں بدل بدل کر اور خیالوں کی تاریک پگڈنڈیوں پر ٹھوکریں کھا کھا کر گزاری ہیں۔ میرے دوست احباب، جاننے والے سبھی نے یہ کوشش کی کہ میں کسی طرح تمہارا خیال دل سے نکال دوں۔ تمہیں یکسر بھول جاؤں۔ کیونکہ تم آوارہ اور بدچلن ہو۔ تم کسی طرح میرے پیار کے قابل نہیں ہو۔ اور میں اُن سب کو کچھ بھی نہ سمجھا سکتا تھا۔ اُنہیں کیسے سمجھاتا کہ اِن گزرے ہوئے دنوں نے تمہیں میری زندگی میں اُتنی ہی اہمیت دے دی ہے جتنی میری سانسوں کو۔ میں اپنے آپ کو بھول سکتا تھا۔ یہ بھول سکتا تھا کہ سورج کب غروب ہوتا ہے اور چاند کی کرنیں کب ہمارے چہروں کو منوّر کرتی ہیں لیکن تمہیں ! —— تمہیں بھولنا میرے بس کی بات نہیں —— میرا دل کبھی کبھی چیخنے لگتا ایک ایک کا دامن تھام لوں۔ اُن سے کہوں تم بہت اچھی ہو تمہاری معصومیت اور بھولپن کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اُنہیں یہ بتاؤں کہ قسمت نے تم پر کتنے ستم توڑے ہیں اور قسمت نے تمہیں بائیس سال نامُرادیوں کی صلیب پر چڑھائے رکھا ہے۔ اُنہیں تمہاری زندگی کا ایک ایک واقعہ بتا کر اُن کے ہاتھ تھام لوں اور اُن سے کہوں کہ بدنامی کے یہ داغ وہ تمہارے دامن پر نہ لگائیں۔ وہ مجھ سے یہ کہیں کہ تم ہر اُس شخص کی بن سکتی ہو جس کے پاس دولت ہو اور زندگی جس کے لئے ایک حسین رقاصہ کی طرح ہو۔ میں یہ سب کچھ کیسے برداشت کر سکتا تھا اور جب میں یہ سب کچھ نہ برداشت کر سکا تو میں نے اُن سب سے مُنہ موڑ لیا۔ تمہاری خوشیوں سے زیادہ اُن دنوں میرے لئے کسی چیز کی اہمیت نہ تھی —— اور پھر میری آزمائش کے لمحات آن پہنچے۔ امّی اور ابّو نے مجھے اپنے پاس بُلا بھیجا۔ میں جب وہاں پہنچا تو ابّو نے مجھ سے کچھ بھی نہ کہا۔ چُپ چاپ وہ خط میرے ہاتھ میں دے دیا جس میں نہ جانے کس نے اُنہیں ہم دونوں کے متعلق لکھ بھیجا تھا اور ابّو کو اُن کے خاندانی وقار کا واسطہ دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو برباد ہونے سے بچا لیں۔ امّی روتی رہیں میری پیاری بہن عرشی اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑے حیرت سے مجھے دیکھتی رہی۔ ابّو غصّے سے آنگن میں ٹہلتے رہے اور میں اُس خط کو مٹھی میں بھینچے ہوئے تمہارے متعلق اور آنے والے کٹھن لمحوں کے متعلق سوچتا رہا۔ پھر ابّو نے آگ اُگلتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر جیسے اُس لمحے کا انتظار کیا جب میں اُٹھ کر اُن کے قدموں میں گر جاؤں گا۔ اُن کے رعب اور دبدبے سے نظریں اوپر نہ اُٹھا سکوں گا اور اپنی غلطیوں پر پشیمان ہو کر اُن سے معافی مانگنے لگوں گا۔ لیکن اُس لمحے وہ غصّہ بھول بیٹھے اور اُن پر سکتہ طاری ہو گیا جب میں نے تمہیں اپنانے کا فیصلہ سنا دیا۔ پھر وہ چُپ چاپ اپنے کمرے میں چلے گئے —— امّی کی سِسکیاں بڑھتی ہی گئیں اور عرشی ستون سے ٹیک لگائے کسی مجسمے کی طرح کھڑی رہی۔ واقعی ابّو اور امّی کے لئے کتنی عجیب بات تھی کہ اُن کا وہ بیٹا جس کی کل تک کوئی خواہش نہ تھی۔ جو اتنا بے بس تھا کہ اپنی تکلیف پر آواز سے چلا بھی نہ سکتا تھا۔ آج سرِ بازار خاندان کی نیک چلنی اور عزّت کو رُسوا کرنے کے درپے ہے۔ میں شام گئے جب اپنے دوستوں سے مل کر گھر لوٹا تو گھر کے در و دیوار تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ امّی دونوں ہاتھوں میں سر دیئے اُسی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں جہاں میں اُنہیں چھوڑ گیا تھا۔ عرشی چُپ چاپ میرے کمرے میں چلی آئی اور بہت سہمے سہمے انداز میں رونے لگی۔ کیونکہ ابّو نے میرے لئے فوراً گھر چھوڑنے کا حکم نامہ جاری کر دیا تھا۔ سسکتی ہوئی عرشی کے سر پر ہاتھ پھیر کر میں نے بہت اُداس انداز میں سوچا کہ کیا کوئی راستہ نہ تھا جس کے ذریعے ابّو اِس مرحلے کو طے کر جاتے —— ؟ کیا ابّو کو اِس بات کا کبھی احساس نہیں ہے کہ میں نے آج زندگی میں پہلی بار اُن سے کچھ مانگا تھا۔

کیا تم میری زندگی میں موجود اس کمی کو پورا کر سکتی تھیں کہ جو مجھے کسی اعلیٰ خاندان
سے نہیں ملنا تھا اور تم ان سب کے لئے ایک سائبان بھی اور اجنبی لڑکی تھیں۔ اور پھر
وہ لڑکی تو ایسا کہ کہاں بن سکتی تھی جس کا نام ملنے کے بعد ہر فرد کی زبان پہ تھا۔
میں کی زندگی بھی ایک حسن ایک پرایک کہانی بن کر شہر کے گلی کوچوں میں
سرگرداں تھا۔ میرے پاس ان سارے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا اس لئے میں چپ چاپ
اُس گھر سے نہ جانے کیوں ڈوبتے ہوئے گھر کو چھوڑ آیا۔ میرے پیچھے میری بہن عشی روتی
رہی اور دروازے سے سر ٹکراتی رہی، اور ساون بھادوں کی طرح برستی ہوئی آنکھوں سے
اُن راہوں کو تاکتی رہی جنہوں نے اُن سے اُن کی زندگی کا حاصل چھین لیا تھا۔ اُن بے وفا
اُن لوگوں کے متعلق کیا الزام تمہیں لگ سکتیں جب میں جیتے جی جہنم کی آگ میں جلتا رہا
لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ تمہیں سکھ اور خوشیوں کے اُجالے دینے کے لئے مجھ جیسے
جانا ہوگا ۔۔۔۔ میں اپنے دل کے رستے ہوئے زخموں کو تمہاری نظروں سے چھپائے مسکراتا
رہا کیونکہ منزلوں کے بن ہرے سہرے گنج میں تمہارے پاؤں تھکتے رہتے تھے۔ میں اپنی
پریشانیوں اور حوصلوں کو پست کر دینے والے حالات سے اُس کو دیکھنے میں بدلنے کا
تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

تم میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے ہنستی رہیں۔ وقت کے شریر اور خوبصورت
پرندے کو ہم نے لاکھ پکڑنا چاہا۔ لیکن وہ ہم سے بے خبر آگے کی طرف پھدکتا ہی رہا۔
پھر ہم دونوں اپنے یونیورسٹی امتحان سے بآسانی گزر گئے اور میں نے ایک چھوٹی سی
نوکری کر لی۔ تمہیں بھی سماجی مالی مشکلات کی کٹھن راہوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ
جو کچھ تم کما رہی تھیں وہ ناکافی تھا جس سے سکھ چین خریدا جا سکے، جس سے تمہارے
بھائی بہنوں کو اپنی غربت اور بے بسی کا احساس نہ ہو اور تمہارے زندگی سے بیزار
بابا کو جینے کی تمنا ہو۔ ان دنوں تم نے اُس شہر کو کتنا یاد کیا جو میرا شہر تھا۔ جس کے محلے میرے
اپنے تھے۔ جس کی گلی کوچوں سے میرا پرانا رشتہ تھا، جہاں میں پل کر بڑھا اور جوان ہوا تھا
تم نے اُن چھٹیوں میں میرے شہر چلنے کی کتنی خواہش ظاہر کی۔ تمہیں امی سے ملنے کی کتنی
تمنا تھی۔ جیسے تم اُن سے مل کر اپنی اُس ازلی پیاس کو بجھانا چاہتی تھیں جو تمہیں تمہاری
ماں نہ دے سکی تھی۔ تم جب عشی کو یاد کرتیں تو تمہاری خوبصورت آنکھوں میں [illegible]
سے چمک جاتے لیکن میں اپنی اُس وقت کی حالت تمہیں سمجھا نہ سکتا تھا۔ اس لئے
میں نے تمہیں بہت پیار سے سمجھایا کہ کچھ دن اور انتظار کر لو۔ میں کامیاب ہو جاؤں،
مجھے کوئی اچھی سی ملازمت مل جائے تو امی خود یہاں آ جائیں گی ۔۔۔۔ تمہیں اپنی ممتا
بھری آغوش میں سمیٹ لینے کی خاطر۔ مجھے یقین ہے امی کو تم جیسی بہو اور عشی کو اتنی
پیاری بھابی پا کر بہت خوشی ہوگی اور تم اپنی شادی کے تذکرے پر شرما کر اپنا چہرہ کتاب

کے پیچھے چھپا لیتیں [illegible]
[illegible] ہوا کرتا تھا۔ [illegible]
شرمیلا سا [illegible] سے [illegible] چھپانے کا [illegible] کے درمیان
اپنے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی رہتیں۔ امی سے ملنے کے ارمان لئے [illegible]
بھابی بھاگی بھاگی پھرتیں اور عشی کی خوشیوں [illegible] کی تلاش [illegible]
رس گھولتی رہتی ۔۔۔ لیکن میں نے اُن لمحوں میں سوچا [illegible] اصلی ہے
جتنی تمہارے چہرے پہ [illegible] کی آنکھیں پالینے کی خواہش ۔۔۔۔ انہی دنوں تمہاری
خالہ نے لکھا کہ وہاں دو تین فرمیں ایسی ہیں جہاں تمہیں معقول تنخواہ مل سکتی ہے۔ تم نے
مجھے اور اس شہر کو چھوڑنے میں جھجک سی محسوس کی جو تمہارے پیدا ہونے کا شہر تھا جہاں کے
ذرے ذرے سے تمہیں اب اپنائیت کا احساس ہو چکا تھا۔ لیکن تمہارے بابا نے بمبئی
جانے کا فیصلہ کر لیا اور ہم دونوں نے مل کر سوچا کہ تمہارے لئے بہتر ہی ہے کیونکہ
تمہیں اپنے خاندان کے لئے ہر حال میں آسودگی کی جستجو کرنی تھی۔ اور ایک دن تم اس
شہر کو چھوڑ گئیں۔ تمہارے پیچھے یہ شہر لٹا لٹا سا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اتنی ویرانی
اس شہر میں پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ تم سے جدا ہونے کے بعد یہ احساس
اور شدید ہو گیا کہ ہم دونوں کے لئے ایک دوسرے کا ساتھ بہت ضروری ہے
اور تمہیں اپنانے اور ان فاصلوں کو ختم کرنے کی تمنا کی وہ ننھی سی چنگاری جو مدتوں سے
میرے دل میں جل رہی تھی، ایک دم بھڑک کر شعلہ بن گئی اور میں نے آنے والے دنوں
کی طرف بہت پُر امید نظریں ڈالیں اور اپنے آپ کو حالات کے تھپیڑوں کے حوالے کر دیا۔

بمبئی کی جس فرم میں تم ملازمت کر رہی تھیں، وہاں تم بہت اچھی تنخواہ پا رہی
تھیں اور میں خوش تھا کہ تمہارے اچھے دن آ گئے ہیں اور ہمارے سکھ اور خوشیوں
کی منزل زندگی کے اگلے ہی موڑ پہ جیسے اپنے بازو پھیلائے ہماری منتظر ہے۔ پھر ہم دونوں
کامیاب ہو گئے۔ ہمارے مستقبل کی طرف جانے والی راہ پہ ایک اور ستارہ منور ہو گیا۔
تمہاری فرم کی احمد آباد برانچ میں تمہیں ترقی پر بھیج دیا گیا اور مجھے بھی ایک کالج میں لیکچرار
کی پوسٹ آفر کی گئی۔ پانی کے بلبلوں کی طرح ٹوٹتے ہوئے زندگی کے ایک ایک لمحے کو پکڑ
میں ایک مشین کی طرح کام کرنے لگا۔ خیالوں میں تمہارے پیار کی جوت جلا کر میں نے اپنا
سکھ اور چین سب کچھ بھلا دیا۔ اس مسلسل جدوجہد اور بے تکان محنت کے ثمر کا مجھے
انتظار تھا۔ میں اُس مسکراہٹ کا منتظر تھا جو ایک دن تمہارے چہرے پہ کھیلے گی
آسودگی کی اُن خوبصورت اور مہکتی ہوئی کلیوں پہ میری پُر امید نظریں تھیں جنہیں تمہارے
جوڑے میں لگ کر مہکنا تھا ۔۔۔۔ اور پھر ایک دن جیسے وہ لمحہ آن پہنچا۔ عشی کا خط
آیا تھا۔ میری لاڈلی بہن عشی کا۔ اور میرے لئے امی کی تڑپ اور بے قراری لایا تھا۔

انہیں تمہاری پیار بھری آغوش اور شفیق شکل ہمیشہ میرے لئے اب ایک خواب معلوم ہوتی تھی جیسے کہ خدا کا ایک لفظ جیسے امّی مجھے چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے پیٹ چلا چلا جانے کتنی بے قراری تھی اُن خطوں میں۔ اُس نے لکھا تھا کہ اُن کی محبت اور امتا کے سامنے انکو سر جھکانا پڑا۔ امّی اب بھی لکھا کرتی تھیں کہ تم سے میری شادی ابو کے خاندانی وقار کے لئے ایک ٹھیس ہوگی۔ اُن دو دلوں کی شکست ہو گئی جن پر آج تک ہمارے خاندان کے لوگ قدم سے قدم ملا کر چلتے آئے تھے۔ اور ابو جیسے سخت مزاج اور اپنے اصولوں پر ڈٹے رہنے والے انسان کو تیار کرنا کتنا مشکل تھا لیکن امّی کی ممتا ——

اُن کی یاد سے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُس دن میں اپنا کوئی کام نہ کر سکا۔ جگمگاتی اور جاگتی سڑکوں سے بے خبر سراسر اُن پھولوں اور موسیقی ریز قہقہوں سے پرے ویرانہ سی راہ جانب میرے قدم اُٹھتے رہے اور میری نگاہیں ڈھونڈتی اپنی بڑی سی حویلی کے کمروں میں امّی کو دیکھتی رہیں۔ زرق برق کپڑوں کے درمیان گھری امّی —— جھلکتے ہوئے زیورات کو سنبھالتی امّی اور اپنی آنے والی بہو کے متعلق سوچ سوچ کر مسکراتی امّی —— امّی کی کتنی بڑی خواہش تھی کہ وہ ایک اچھی سی بہو اپنے گھر لائیں۔ ایک ایسی بہو جو بالکل تمہاری طرح چلتی ہو۔ تمہاری طرح بولتی ہو —— جس کا انگ انگ تمہاری طرح ہو اور یہ بھی کیسا عجیب اتفاق تھا کہ امّی کے تصورات میں بسی ہوئی بہو سچ مچ تمہاری صورت میں اُس گھر میں آنے والی تھی۔ میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا میں اتنا خوش ہوں اتنا کہ اس کے آگے خوشیوں کی کوئی حد نہیں۔ لیکن خوشیوں کا یہ بلور کتنا نازک تھا جسے میں اُس دن لئے لئے پھرتا رہا تھا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ خوشیوں کا یہ بلور ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ میں یہ کیسے سوچ سکتا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے حالات میری زندگی سے خوشی اور مسرت کے یہ نقوش نوچ ڈالیں گے۔ اور میں زندگی کی اِس طویل راہگذر پر بغیر کسی آس اور اُمید کے چلتا ہی رہوں گا۔ لیکن اب کوئی مسکان میرے لئے نہ ہوگی۔ عشی اُسی طرح ڈھولک پر بیٹھی گیت گاتی رہیگی۔ امّی شادی کی تیاریوں میں سردیوں کی یہ طویل راتیں اپنی آنکھوں میں کاٹ دیں گی۔ لیکن اب کوئی بہو پھولوں اور خوشبوؤں میں بسی اُن کی حویلی میں داخل نہ ہوگی اور میں درخت کے اُس ٹوٹے ہوئے پتّے کی طرح ہو جاؤں گا جسے ہوا اپنے دوش پر نہ جانے کہاں کہاں لئے پھرتی ہے۔

اب میں جب اِس گوشے سے اُٹھ کر جاؤں گا تو تمہارے کریدے ہوئے جھروکوں کے وہ نام جو اِس درخت نے ہماری امانت کے طور پر سنبھالے تھے، پھر یہاں نظر نہ آئیں گے۔ پیار کی وہ شمع جو اِس بھولے بھالے پیڑ کے سینے میں جلی تھی۔ میں بجھا جاؤں گا —— کیونکہ آج تمہارا خط آیا ہے۔ خوشیوں اور کامرانیوں کے سندیسے لانے والا تمہارا خط ——! سب کچھ وہی ہے اُس میں، جو تم نے نہ جانے مجھے کتنی بار لکھا ہوگا —— وہی پیار بھری باتیں —— وہی ایک دوسرے کے لئے مر مٹنے کی قسمیں —— وہی عہد و پیمان —— اور تمہارے ہاتھوں کی وہ مانوس سی خوشبو جو میرے رگ و پے میں بس گئی ہے —— لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ اِس بار تم نے یہ خط اپنی بمبئی کی فرم کے منیجر بنرجی کو لکھا ہے —— اور جلدی میں اُسے میرا پتہ لکھے ہوئے لفافے میں ڈال گئی ہو ——!!

میری زندگی میں بہار آتے آتے لوٹ گئی ہے —— روٹھ گئی ہے!!

غزل

شکیل بدایونی بی۔ اے

جو نظر ہے مطمئن ہے، جو نفس ہے شادماں ہے
کہ بقیدِ جورِ پیہم کوئی مجھ پہ مہرباں ہے

مِری گفتگو نمایاں، ہے بغیرِ گفتگو بھی
میں سناؤں حالِ دل کیا، کہ نظر ہی خود زباں ہے

مرے تیرے سوزِ دل کا، نہیں بوالہوس تقابل
مِری آگ میں شرر ہے، تری آگ میں دھواں ہے

تری اِک نظر کا حاصل عدم و وجودِ جاں ہے
کہیں زندگی کا عالم، کہیں مرگِ ناگہاں ہے

جو ہو اذنِ اہلِ گلشن تو میں ہر کلی سے کہدوں
ترا مضمحل تبسم مرے ذوق پر گراں ہے

رہوں ترکِ معصیت پر میں شکیل، کیسے قائم
ابھی دل میں ولولے ہیں، ابھی آرزو جواں ہے

مارتھا

مسعود جامی بی۔ اے (آنرز)
ٹریژری آفس آف دی اکاؤنٹنٹ جنرل۔ بہار رانچی

۲۵ مئی ۱۹۶۵ء . خوشتر بھیا! ہدیۂ عقیدت

اس یقین کے ساتھ اپنی ایک تخلیق "مارتھا" آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ ضرور پسند آئے گی۔ یہاں کی ایک ادبی نشست میں یہ کافی پسند کی گئی۔ جناب زکی انور اور شمس اختر صاحب کے اصرار پر میں نے سوچا کہ اسے آپ کی نذر کروں ــــ آپ دردمند دل رکھتے ہیں۔ دردمندوں کے دل کی آپ پکار ہیں۔ ــ "مارتھا" کے غم کو بھی سمجھئے اور اسے "بیسویں صدی" کے پرستاروں کو بھی محسوس کرنے کا موقع دیجئے۔ شکر گزار ہوں گا ....

آپ کا ــ مسعود جامی

بیگم ارشاد میری باتیں سُن کر میری طرف غور سے دیکھنے لگی ہیں ــ اُن کی آنکھوں میں پیار ہے، ہمدردی ہے۔ لیکن۔ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے اُنکی آنکھوں میں میرے لئے نفرت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ مُسکرانے لگی ہیں اور مجھے اُن کی مُسکراہٹ بھی بے حد زہر آمیز محسوس ہو رہی ہے۔

"اسی لئے تم اتنے دنوں غائب رہیں؟" اُنہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

"شریر لڑکی تھا۔" وہ کہنے لگی ہیں۔ "نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تم ضرور آؤ گی، واپس آؤ گی۔ اور تم آگئیں لیکن.... لیکن ....." وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں اور یقیناً اس لئے نہیں کہہ رہی ہیں کہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ لیکن میرا دل تو ٹوٹ ہی چکا ہے اور آنکھیں پھر برس پڑی ہیں اور بیگم ارشاد میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی ہیں اور میں پھوٹ پڑی ہوں۔

"پاگل نہ بنو ــــ" بیگم ارشاد جذباتی انداز سے کہنے لگی ہیں۔ "جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ہے اب تم کلکتہ جاؤ اور اُسے لے آؤ۔"

"تو آپ نے مجھے معاف کر دیا؟" میں حیرت سے اُن کی طرف دیکھنے لگی ہوں اور مجھے بیگم ارشاد کے چہرے پر یسوع مسیح کا نور نظر آنے لگا ہے اور میں بے اختیار اُن کے سینے سے لگ گئی ہوں....

"تم نے مجھے پہچانا ڈاکٹر؟"

"نہیں"

"کہیں مجھے دیکھا ہے؟"

"نہیں، مجھے تو یاد نہیں۔"

"لیکن میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔ مجھے آج تک تمہارا وہ معصوم چہرہ یاد ہے، تمہاری وہ بھولی باتیں یاد ہیں ــــ جن میں عزم تھا، استقلال تھا، ہمت تھی، زمانے کی ناسازگاری کا شکوہ تھا۔

تم نے کہا تھا ــــ مجھ سے مریضوں کی پریشانی، تکلیف اور بیچارگی نہیں دیکھی جاتی نرس! میں ڈاکٹر بنوں گا ــــ اور پھر مجبوروں، بیکسوں اور ناداروں کی خدمت کروں گا۔ اُن کے دکھ درد بانٹوں گا ــ اُن کی خوشی میں ساتھ دوں گا، اُن کی بے بسی میں سہارا بنوں گا، اُن کے غم میں شریک ہوں گا۔ عزم و استقلال سے بھرپور ــــ جب یہ باتیں تم کہتے تو بہت جذباتی ہو جاتے، جوش و جذبہ تمہارے چہرے سے عیاں ہوتا ــ اور تمہارا چہرہ سُرخ ہو جاتا ــــ

"شاید تم مارتھا ہو.... ہو نا؟"

"ہاں"

"مگر تم یہاں کہاں؟"

"میرا جسم تندرست ہو گیا ہے۔ لیکن تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے ڈاکٹر؟"

"مجھے ابھی تک یاد ہے ــــــ تم کہاں رہتی ہو؟ ــــــ ممی سے ملیں تم؟"

"تمہاری ممی سے نہیں ملوں گی؟ انہوں نے تو مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اب بھی اکثر چھٹی والے دن ان سے ملنے آتی ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ چلو مجھے یہاں کوئی پتا تو ملا۔ اچھا ابھی تو میں ایک ضروری کال پر جا رہا ہوں۔ واپس آ کر اطمینان سے باتیں کروں گا۔"

ڈاکٹر طیب ارشاد گاڑی میں بیٹھ گیا ہے، گاڑی چل پڑی ہے گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ہے ــــــ لیکن میں اب تک جانے کیا کچھ دیکھ رہی ہوں۔ گم سم کھڑی ... دور افق کی طرف ..... شاید ماضی کی تصویر

آپریشن بہت سیریس تھا۔ اُسے بے ہوش کر کے آپریشن کیا گیا ہے۔ خطرناک آپریشن تھا ــــــ اور جب وہ اسٹریچر پر لٹا کر اپنے بیڈ پر لایا گیا ہے تو گھنٹوں بعد اُسے ہوش آیا ہے۔ وہ درد کی شدت سے کروٹیں بدلنے لگا ہے۔ لوٹنے لگا ہے۔ میں نے اُس کے سارے جسم پر اپنا وزن ڈال دیا ہے تاکہ وہ حرکت نہ کر سکے۔ لیکن وہ ٹھہرا ایک نوجوان مرد اور میں ایک کمزور عورت ــــــ میرے جسم کا بوجھ اُس پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکا ہے۔ آخر میں نے اُس سے التجا کی ہے کہ وہ چپ چاپ لیٹا رہے۔ اُس نے میرے چہرے کی طرف اور پھر میری آنکھوں میں غور سے دیکھا ہے۔ پاس ہی بیٹھی بیگم ارشاد اور اُن کی بچی جبیں اب تک رو رہی ہیں۔ لیکن اب وہ بے حس و حرکت سا ہو گیا ہے۔ کچھ ایسا بے حس و حرکت کہ میں گھبرانے سی لگی ہوں۔

رات کے تقریباً ساڑھے تین بجے اُس کی آنکھ کھل گئی ہے، اُس کے چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ہیں اور میں اُس کے قریب بیٹھی ہوں۔

"ممی کہاں ہیں؟" اُس نے کمزور آواز میں پوچھا ہے۔

"وہ سو گئی ہیں۔ ابھی ابھی۔ رات بھر بے چاری جاگتی رہی ہیں۔"

"اور جبیں؟"

"وہ بھی بے چاری، ننھی گڑیا رات بھر روتی رہی ہے۔"

"لیکن تم جاگ رہی ہو نرس؟ تم ایک پل کے لئے بھی سو نہ سکیں۔ تم کتنی اچھی ہو۔ کتنی اچھی!!" اور اُس نے فرطِ جذبات سے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔

شاید میں رو پڑی ہوں۔

"تم رو رہی ہو نرس ــــــ مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ نہ رو نرس، میں اچھا ہو جاؤں گا۔"

مجھ سے اُس کے پاس بیٹھنا برداشت نہیں ہو رہا ہے اور میں اُٹھ کر ایک طرف جا کے کھڑی ہوں۔ وہ جانتا ہے میں اب بھی رو رہی ہوں۔ شاید اُس کے دل میں ایک ٹیس اُٹھی ہے اور اُس نے مجھے بہت ہی رقت آمیز لہجے میں پکارا ہے۔ شاید میں اپنی ساری طاقت جمع کر کے کوشش کروں کہ میں اُس کے پاس نہ جاؤں مگر ایسا نہیں کر سکتی ــــــ اور میں اُس کے پاس پہنچ گئی ہوں۔

"تم روتی ہو میرے لئے ــــــ تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی ہے؟ میں تمہیں کبھی نہ بھول سکوں گا۔" وہ کہنے لگا ہے۔ "تم وعدہ کرو نرس۔ تم روتی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہو۔ مسکراؤ۔ ہنسو میرے لئے صرف ایک بار!! مجھے سکون ملے گا۔"

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی ہے اور وہ مجھے بہت ہی غور سے دیکھنے لگا ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں نرس۔"

"نرس نہیں مجھے کچھ اور کہو۔"

"کچھ اور کیا کہوں؟"

"میرا نام بھی ہے ..... میرا نام ملا ہے۔"

"اور میں طیب ہوں ..... طیب ارشاد۔"

اور پھر رفتہ رفتہ وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔

اور اکثر وہ مجھ سے کہتا ہے۔ "مجھ سے مریضوں کی یہ پریشانی، تکلیف اور بے چارگی نہیں دیکھی جاتی ــــــ میں ڈاکٹر بنوں گا اور مجبوروں، بیکسوں اور ناداروں کی خدمت کروں گا، اُن کے دُکھ درد بانٹوں گا اُن کی خوشی میں شریک ہوں گا۔ اُن کی بے بسی میں سہارا بنوں گا۔"

اُس نے مٹھیاں بھینچ لی ہیں، چہرہ سُرخ ہو گیا ہے، آنکھیں انگارے پھلنے لگی ہیں ــــــ اور وہ بہت دور خلا میں گھورنے لگا ہے۔

اور پھر وہ اپنے دوستوں سے کہنے لگا ہے۔ "تارتھا کی والہانہ محبت، خلوص و ایثار اور بے پناہ خدمت نے مجھے بہت جلد تندرست کر دیا ــــــ"

اور ایک دن میں اُسے اشکبار آنکھوں سے رخصت کر رہی ہوں۔ اُس کی آنکھیں چھلکتا ہوا ساغر بن گئی ہیں اور صہبائے غم جیسے چھل چھل کرتی ہوئی سُرخ رخساروں پر بہہ رہی ہے ــــــ جذبات کا ایک طوفان سا اُمڈ رہا ہے۔ میں نے طیب کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر فرطِ جذبات سے دبا لیا ہے، پھر اُس کا دامن تھام لیا ہے اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی ہوں۔

"مجھے بھول تو نہ جاؤ گے طیب؟ تم جا رہے ہو ..... بہت دور ــــــ پھر نہ جانے کب ملو گے؟ ..... میں چاہتی ہوں ..... میں چاہتی ہوں کہ ہمیشہ ....." اور پھر میں نے نچلے ہونٹ اس زور سے دانتوں میں دبا لئے کہ خون نکل آیا ہے۔ جیسے میں نے اپنی

[illegible]

"تم ڈاکٹر بنو گی نا؟"

"ہاں"

"ایشور سے تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے، لیکن مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

"کہو کیا بات ہے؟"

"مجھ سے وعدہ کرو کہ جب تم ڈاکٹر بن جاؤ گے تو تم مجھے اپنے ہی ساتھ رکھو گے۔"

"ایسا ہی سوچا ہے مدھا! میں وعدہ کرتا ہوں اور پھر زندگی کے کسی بھی لمحے تمہیں نہ بھول سکوں گا۔" اُس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کہا ہے۔

اور وہ اپنے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں مجھ سے کہہ رہا ہے —— "مجھے اب بھی اپنا وعدہ یاد ہے مدھا۔ لیکن سوچو تو اس اکیلے مکان میں میرے ساتھ تمہارا رہنا کہاں تک مناسب ہوگا۔ زمانے کی نگاہیں بدل جائیں گی، اُن کے دلوں میں ہماری وہ عزت، وہ وقار نہ رہے گا جو پہلے تھا —— کیا تم میں اتنی طاقت ہے کہ تم سماج کی گندی ذہنیتوں کی پہنچ سے دُور جا سکو، سماج کی تیز نگاہوں سے بچ سکو —— ہمیں اسی سماج میں رہنا ہے۔ سماج سے نفرت مول لے کر ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ ہماری کچھ عزت ہے، کچھ خاندانی وقار ہے۔ کیا تمہارے گھر کے لوگ اس بات کو پسند کریں گے؟"

"تم اپنی بات کرو۔ میرا اس دنیا میں اب ہے ہی کون۔" میں یاس انگیز نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتی ہوں اور ڈاکٹر جلدی سے کہتا ہے۔ "مجھ سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

اور ہم ساتھ رہنے لگے ہیں۔

لوگوں کے طعنے ملنے لگے ہیں۔

لوگوں کی انگلیاں اُٹھنے لگی ہیں۔

لیکن ہم ان تمام باتوں سے بے پرواہ ہیں بے نیاز ہیں۔

"اُف! آج کل تمہاری خوراک اتنی کم کیوں ہو گئی ہے؟ یہ پھل کھاؤ نا اور ہاں یہ مٹھائی، یہ میں نے تمہارے لئے خود ہی بنائی ہے اور یہ حلوہ، اِسے تو تم نے چکھا ہی نہیں۔" ناشتہ کی میز پر میں ڈاکٹر سے کہہ رہی ہوں۔

اور ایک رات جب ڈاکٹر کسی مریض کے یہاں جانے کے لئے کار نکال رہا ہے تو میں اُس پر برس پڑی ہوں۔ "اُف! ہر وقت کال، کال، یہ آخر کیا ہو گیا ہے تمہیں، کسی وقت سکون نہیں، کبھی آرام نہیں —— مریض، مریض، بس ہر وقت مریض ——! کھانا پینا، سونا جاگنا کچھ وقت پر نہیں۔"

"آخر تمہیں کیوں میرا اتنا خیال ہے مدھا، میں سمجھ نہیں سکتا۔" ڈاکٹر جرح کرتا ہے۔

میں اچانک خاموش ہو گئی ہوں اور میری آنکھیں چھلک پڑنے کو تیار ہیں۔

"ارے ارے —— پھر وہی آنسو؟ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم برا مان گئیں۔ میں نہیں جانتا تھا تمہارا دل اتنا نازک ہے —— اب کبھی میں تم سے ایسی باتیں نہ کروں گا۔ ہنس دو ایک بار میرے کہنے سے تاکہ میں سمجھ سکوں کہ تم خفا نہیں ہو گئیں ——"

مجھے ہنسی آ گئی ہے۔ آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر مُسکراہٹ۔

"تم کتنی اچھی ہو مدھا، کتنی معصوم —— اب میں تمہیں کبھی کچھ نہ کہوں گا!"

"تو اب تم رات کے دس بجے کے بعد مریض کے یہاں نہیں جاؤ گے؟"

"لیکن تم جانتی ہو مدھا، ہماری زندگیاں دوسروں کے لئے ہیں، ہمارا آرام دوسروں کی خوشیاں لوٹ لے گا —— خدا نے ہمیں دوسروں کی خدمت کے لئے بنایا ہے۔ خدمت ہمارا اوّلین فرض ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ ہم اپنے فرض سے منہ موڑ لیں۔ بولو جواب دو ——؟" اور میں اِن دلیلوں کے آگے لاجواب ہو گئی ہوں۔

اور جب وہ مریض کے یہاں سے کافی رات گئے لوٹا ہے تو اُس کا جسم درد سے چور چور ہو رہا ہے، جوڑ جوڑ میں اینٹھن ہے —— جب وہ بستر پر لیٹا ہے تو اُسے اپنی کچھ سُدھ بُدھ نہ رہی ہے۔

"کون؟ —— مدھا ——!"

"ہاں"

"لیکن یہ اتنی رات گئے تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"تم بہت تھک گئے تھے نا!"

"لیکن تم میری نوکرانی نہیں ہو —— اور پھر اس طرح تنہائی میں تمہارا میرے پاس آنا اچھا بھی نہیں ہے۔"

"آخر کیوں؟"

"کیوں کا جواب میں نہیں دے سکتا۔ جاؤ اپنے کمرے میں جاؤ۔"

اور میں خاموش بھاری بھاری قدم اُٹھائے جانے لگی ہوں۔

"اچھا سنو۔" ڈاکٹر نے نہایت دھیمی آواز میں کہا ہے۔

میں رک گئی ہوں۔

"میرے قریب آؤ" اور میں اُس کے قریب چلی آئی۔

ڈاکٹر نے میرا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے دبایا۔ "میں آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے تم نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ مگر تم نے میری خاطر اپنا آرام اور سکون سب تیاگ رکھا ہے —— جاؤ آرام کرو۔ تمہیں بھی اتنی رات تک نہیں جاگنا چاہیئے۔" اُس نے روہانسی

کھڑا ہو گیا اور میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔
آنسو بہہ نکلے۔

وہ پریشان سا کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس نے مارتھا پر بہت ظلم کیا ہے۔ اُسے اُس کے جذبات کی قدر کرنی چاہیئے۔ وہ آہستہ سے اُٹھا اور مارتھا کے کمرے کی طرف بڑھا ـــــ کمرہ بند تھا۔ اندر روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اُس نے شیشوں سے اندر جھانکا۔ مارتھا خاموش بیٹھی تھی، اُس کے بال اُلجھے ہوئے تھے اور چہرہ جذبات سے یکسر عاری تھا ـــــ! وہ کسی تصویر کو گھورے ہی جا رہی تھی ـــــ اور وہ تصویر ڈاکٹر ہی کی تھی، اچانک اُس نے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ لیا، ـــــ آنکھیں وحشت ناک ہو گئیں اور لب وا ہو گئے ـــــ "اے خداوند میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ کیوں مجھ پر اتنا ظلم کیا، یسوع مسیح تم میری مدد کرو ـــــ مجھے ضبط کی طاقت دو" وہ بلبلا اُٹھی۔ پھر اچانک مسکرائی، چہرے پر وہی حوروں کا تقدس لئے وہ تصویر کی طرف بڑھی اور اُس کے لبوں نے تصویر کو نم کر دیا۔

ڈاکٹر عجیب کشمکش میں تھا۔ وہ خاموش مبہوت سا لوٹ آیا۔

مارتھا کا خیال اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اُس نے مارتھا کے خیال کو دل و دماغ سے کھرچ کر نکال دینا چاہا لیکن وہ اور اُلجھتا چلا گیا ـــــ رات پھر وہ بہت دیر سے مریض کے یہاں سے لوٹا اور جب بستر پر گیا تو کروٹیں بدلتا رہا، اُسے کسی کا انتظار تھا ـــــ اور پھر اُس نے سوچا اب مارتھا نہ آئے گی، اُس نے مارتھا کا دل دُکھایا ہے ـــــ اُس کے دل میں انہونا سا خیال آیا، کاش مارتھا آجاتی، کاش مارتھا آجاتی...... اور کسی نے کواڑ نہایت آہستگی سے کھولا، اُس نے کنکھیوں سے دیکھا، یہ مارتھا ہی تھی ـــــ پھر اُس نے آنکھیں موند لیں اور ایسا ظاہر کیا جیسے وہ گہری نیند میں ہے ـــــ مارتھا اُس کے قریب آئی، اُس کے بستر کی سلوٹیں درست کیں۔

چادر جسم سے نیچے ڈھلک آئی تھی، اُس نے اچھی طرح جسم کو چادر سے ڈھک دیا۔ اُس کے سرہانے آئی۔ بالوں میں آہستہ آہستہ اُنگلیاں پھیرنے لگی۔ اِس طرح کہ نیند میں خلل نہ پڑے اور پھر ڈاکٹر کو اپنے چہرے کے بہت قریب کسی کی گرم گرم سانسوں کا احساس ہوا۔ پھر کسی نے جلتے ہوئے ہاتھ اُس کی پیشانی پر رکھ دیئے ـــــ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کی پیشانی پر دہکتے ہوئے انگارے رکھ دیئے ہوں۔ اور پھر اُس کے چہرے پر ٹپاٹپ کچھ آنسوؤں کے قطرے گرے ـــــ اور پھر کوئی دوڑتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر نے ایک لمبی سانس لی اور اُٹھ بیٹھا ـــــ کمرے میں اب کوئی نہ تھا۔ اُس کی بھی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، اُس نے بہت آہستہ سے پکارا ـــــ "مارتھا ـــــ! میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں مارتھا ـــــ میں تمہارا غم بھی جانتا ہوں، لیکن میں تم سے شادی کیسے کر سکتا ہوں، ہم نے کبھی سوچا میری تمہاری عمر میں کتنا فرق ہے۔ کیا تم نہیں معلوم ہوتی، تم کافی حسین بھی ہو، جوان بھی، لیکن میں کیا کروں۔ میں کیا کروں ـــــ اور پھر تمہارے ان نازک جذبات کا کیا ہوگا"

ساری رات ڈاکٹر بے چین سا تڑپتا رہا، سوچتا رہا، سوچتا رہا اور سوچتا رہا اور رات گذرتی رہی۔

اور آج رات پھر معمول کی طرح مارتھا آئی۔ اُس نے جیسے ڈاکٹر سو رہا ہے۔ اُس نے ڈاکٹر کی چادر درست کی، بالوں میں اُنگلیاں پھیریں، سر دبایا ـــــ اور پھر جب جانے لگی تو ڈاکٹر کو اپنی پیشانی پر ایسی نمی کا احساس ہوا جس میں جلن بھی تھی اور ٹھنڈک بھی، اُس نے بڑھ کر مارتھا کا ہاتھ پکڑ لیا ـــــ "مارتھا بیٹھو، آج مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں" مارتھا ایک مجرم کی طرح سہمی سہمی بیٹھ گئی، اُس کی سانس تیز چلنے لگی لیکن وہ خاموش تھی۔

"تم نے میری راتوں کی نیند اُڑا لی ہے ـــــ میرا سکون، میرا چین، میرا آرام سب تم نے چھین لیا ہے مارتھا! اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے میں صرف تمہارے ہی بارے میں سوچتا ہوں" ڈاکٹر جذبات میں بہہ سا رہا تھا، مارتھا خاموش تھی۔

"تم بولتیں کیوں نہیں، خاموش کیوں ہو گئیں؟" مارتھا کی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے ٹپکے، لیکن وہ خاموش ہی رہی۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے!" ڈاکٹر مسکرایا۔

"کیسا فیصلہ؟" آخر مارتھا نے خاموشی توڑی۔

"میں شادی کرنا چاہتا ہوں"

"کس سے؟" مارتھا نے حیرت سے پوچھا۔

"تم سے مارتھا ـــــ تم سے!! تم ہی میرا سکون ہو، تم ہی میری زندگی ہو"

ڈاکٹر جذباتی ہو گیا۔

"شادی؟ ـــــ مجھ سے ـــــ!!" مارتھا حیرت کا مجسمہ بن گئی۔

"ہاں تم سے ـــــ تم مجھ سے بڑی ہو تو کیا ہوا۔ میں نے تمہارے جسم سے نہیں روح سے محبت کی ہے"

"چٹاخ!؟" اور مارتھا نے ایک بھرپور چانٹا ڈاکٹر کے گال پر جڑ دیا۔ ڈاکٹر تلملا اُٹھا۔ وہ حیران سا پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا ـــــ لیکن مارتھا جا چکی تھی۔

ڈاکٹر کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا کچھ دیر عجیب کشمکش میں کھڑا رہا۔ پھر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مارتھا کے کمرے کی طرف بڑھا ـــــ کمرہ اندر سے بند تھا اُس

اندر جا چکا تھا۔ کمرے میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس مدھم روشنی میں مارتھا کا چہرہ بہت خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ آنکھیں وحشت زدہ سی ہو رہی تھیں —— "شادی —— اور تم سے؟؟" —— وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔ ڈاکٹر کی تصویر اُس کے ہاتھوں میں تھی پھر اُس نے ایک دوسری تصویر نکالی جو ڈاکٹر کی تصویر سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اُس نے پھر کہا: "میرے جون، میرے بیٹے۔ شادی! میں شادی کروں گی؟ تم سے —— ہاہاہا!!!" اور فلک شگاف قہقہہ کمرے میں گونج اٹھا۔

ڈاکٹر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ تصویر کو بہت حقارت سے دیکھ رہی ہو۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں! یسوع مسیح! تم میری مدد کرو۔ ہیلپ کرو گاڈ۔ میں بہت پریشان ہوں۔

"تم بھی پریشان!!" مارتھا نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا دئے۔

ڈاکٹر کو عجیب سا محسوس ہوا —— اور وہ خاموش اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

میں سوچتی ہوں ڈاکٹر طیب ارشاد سے سب کچھ کہہ دوں۔ اُسے سب کچھ بتا دوں۔ لیکن میں —— میں یہ نہیں کر سکتی۔ اُف! میں کتنی مجبور ہوں۔ میں کچھ بھی تو نہیں بتا سکتی —— میں کتنی مجبور ہوں!!

غزل

ماہر القادری

اب تبسم کا ہے یہ رنگ دھواں ہو جیسے
آج نغمہ کا یہ عالم ہے فغاں ہو جیسے

کچھ نہ کہنے پہ بھی سب کچھ ہے زمانہ پہ عیاں
خامشی حسن و محبت کی زباں ہو جیسے

قافلہ مہر و وفا کا یہ کہاں آ پہنچا
زندگی راہ میں خود سنگِ گراں ہو جیسے

آپ بیتی کو بھی اِس طرح بیاں کرتا ہوں
میرا افسانہ حدیثِ دگراں ہو جیسے

واعظ شہر کی باتوں پہ ہنسی آتی ہے
یہ بھی من جملۂ صاحب نظراں ہو جیسے

دردِ دل سخت ہے جانکاہ مگر کیا کیجے
زندگانی کی یہی روحِ رواں ہو جیسے

دل غمِ ہجر سے مانوس ہے اتنا ماہر
خواہشِ وصل محبت کا زیاں ہو جیسے

غزل

ابوالحفیظ بنارسی۔ ایم۔اے

ہر جام میں خونِ دلِ بسمل نظر آیا
میخانہ ہمیں کوچۂ قاتل نظر آیا

منزل پہ پہنچ کر بھی وہی ہے غمِ منزل
اِک دل بھی نہ آسودۂ منزل نظر آیا

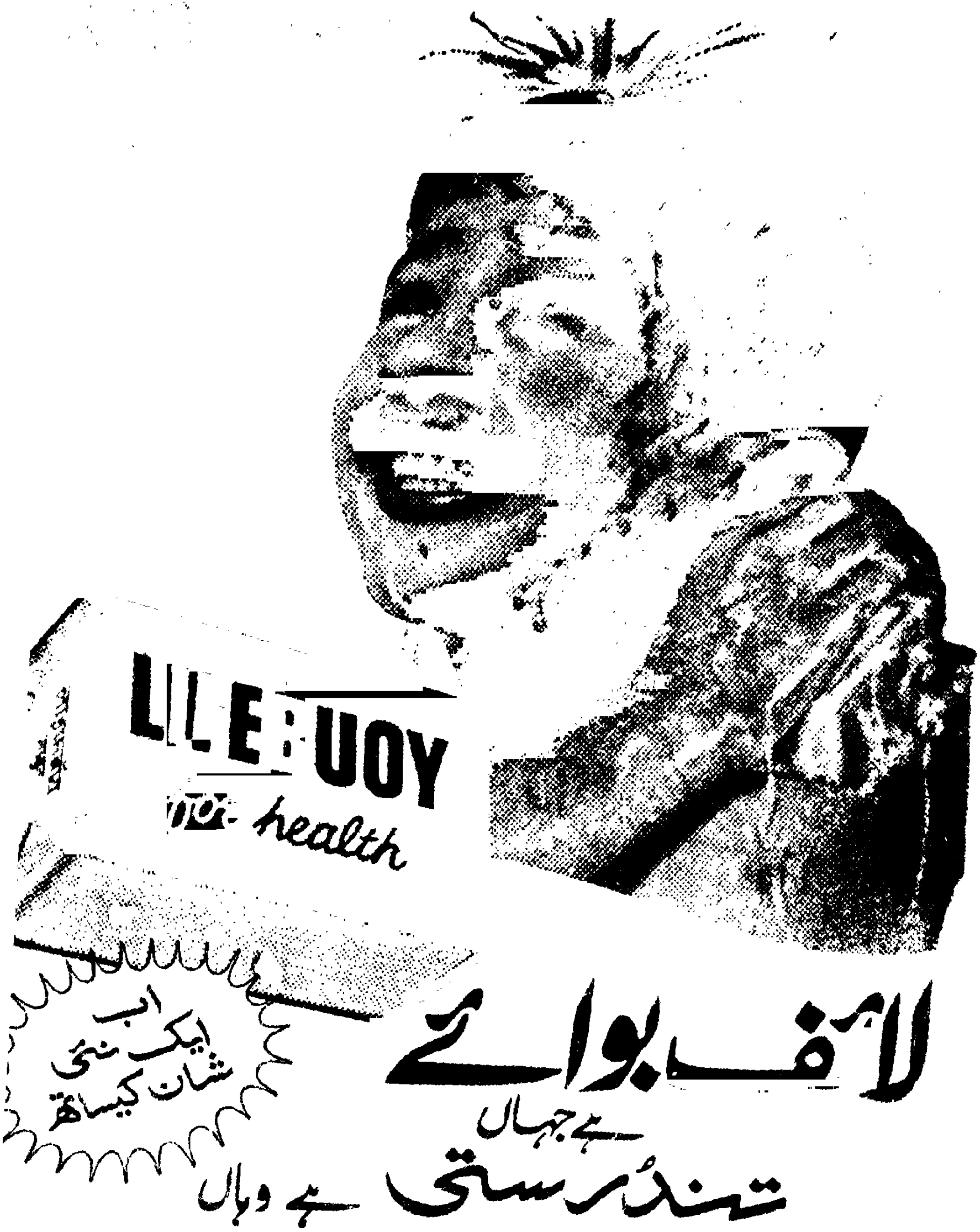
یہ بارِ امانت نہ اُٹھا اور کسی سے!
میں تھا جو ترے غم کے مقابل نظر آیا

اے عزمِ جواں تیری عنایت کے تصدق
ہر موج کی آغوش میں ساحل نظر آیا

پیشانیٔ پُر نور پہ کیوں اتنی شکن ہے
آئینہ میں یہ کون مقابل نظر آیا

دل کر بھی چکا صاحبِ محمل سے ملاقات
آنکھوں کو فقط پردۂ محمل نظر آیا

وہ حسنِ ستم پیشہ ہے مائل بہ عنایت
آج اپنی وفا کا مجھے حاصل نظر آیا



LIFEBUOY
for health
اب
ایک نئی
شان کیساتھ
لائف بوائے
ہے جہاں
تندرستی ہے وہاں

اپنی تصویر

اکرم فاروقی۔ بی اے۔ بی ٹی

۶۴۔ چلہ۔ امروہہ۔ یو۔ پی

۳؍ جون ۶۵ء   محترم خوشتر بھائی آداب

"ناپورنا" چندی گڑھ کی کہانی تھی۔ "اپنی تصویر" بمبئی کی داستان ہے اور یہ داستان "بیسویں صدی" کی دین ہے اس لئے "بیسویں صدی" کی نذر کر رہا ہوں ——— "بیسویں صدی" جہاں اردو دنیا بھر کی ندرتوں کا مخزن ہے وہاں یہ بھی ایک اہم خصوصیت ہے کہ آپ اِس میں کہانیاں ہی نہیں، کہانی کاروں کی تصویریں اور حالاتِ زندگی بھی شائع کرتے ہیں۔ اِن کی اشاعت سے کبھی کبھی کہانی کار عجیب سی کشمکش میں پڑ جاتا ہے۔ "اپنی تصویر" ایک ایسی ہی کشمکش کی کہانی ہے ——— اُمید ہے کہانی آپ کی بلند نگاہ اور قارئین کے پاکیزہ مذاق کے مطابق ہوگی۔

نیاز آگیں ——— اکرم فاروقی

اُس کے ہاتھ میں "بیسویں صدی" کا خوبصورت سالنامہ تھا۔ یکایک میرے قدم رُک گئے۔ وہ میری تصویر کو بغور دیکھ رہی تھی۔

میرے بھرے بھرے چہرے، ستواں ناک، چمکدار آنکھوں اور سبک ہونٹوں کی مبہم مسکراہٹ نے لڑکی کے چہرے پر اُن کومل جذبوں کو جگا دیا تھا جو کسی نوعمر لڑکی کے دل میں اُس کی پسندیدہ شخصیت کے تصوّر سے بیدار ہوتے ہیں۔

لڑکی نے سالنامہ کی قیمت ادا کی اور ورق گردانی کرتی ہوئی ماڈرن بک اسٹال سے باہر نکل آئی۔ لڑکی کے سلونے چہرے پر شادمانیوں کے گلابی سائے تھے۔ آنکھوں میں رومانی شاعر کے تخیل کی رنگینیاں تھیں۔ ہونٹوں پر بسنتِ ابرِ گلستاں کی سُرخی اور قدموں میں نسیمِ صبح کی خنک لہروں کا سکون تھا۔

مجھے یقین ہو گیا کہ لڑکی میری تصویر سے بے حد متاثر ہوئی ہے اور اُس کے چہرے کی بدلتی ہوئی شبنمی رنگت میری تصویر کے خوشگوار تاثر کا نتیجہ ہے۔

یہ میری زندگی کا پہلا اتفاق تھا کہ میں نے کسی لڑکی کے ہاتھوں میں وہ رسالہ دیکھا تھا جس میں میری تصویر شائع ہوئی تھی۔ حالانکہ ایسا تو کئی بار پہلے بھی ہوا ہے کہ میں نے لڑکیوں کے ہاتھوں میں اُن رسائل کو دیکھا ہے جس میں میری کہانیاں شائع ہوتی ہیں اور کتنی ہی لڑکیوں کو سفر میں اپنے رومانی ناولوں کو بہت شوق سے پڑھتے اور خریدتے ہوئے بھی دیکھا ہے لیکن ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کوئی لڑکی دیر تک میری تصویر دیکھتی رہی ہو اور اُس کے چہرے کی رنگت میں مشرقی حیا کی سُرخی گھل گئی ہو۔

میرا سینہ اپنی عظمت کے احساس سے پھول گیا۔ چال میں فنکارانہ تمکنت پیدا ہو گئی اور آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آ گئی۔ میں نے ٹائی کی گرہ درست کی اور سوٹ کی گرد کو رومال سے جھاڑا اور جوتوں کو زمین پر پٹخا تاکہ وہ بھی میرے مزاج کی طرح نفیس ہو جائیں۔

لڑکی آہستہ قدم چل رہی تھی اور میں غیر شعوری طور پر اُس کے قدموں کے نشانوں پر چل رہا تھا کہ بعض نشانوں میں بھی ایک لطیف سی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ میں نے سوچا اِس لڑکی نے نہ جانے میرے کتنے ناول اور کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ میرے لئے اِس کے دل میں کتنی قدر ہوگی، کتنی محبت اور نہ جانے کتنی عقیدت ہوگی کہ آج وہ اپنے محبوب فنکار کی تصویر دیکھ کر اتنی مسرور ہو گئی ہے۔ جیسے اُسے وہ زندگی مل گئی ہو، سارے جہان کی خوشیاں اِس کے دامن میں سمٹ آئی ہوں اور جیسے اُسے اپنے صدیوں کے خوابوں کی تعبیریں مل گئی ہوں۔

مجھے یہاں آئے ہوئے ابھی چند ہی دن گزرے تھے۔ اِن چند دنوں میں کئی ادبی جلسے میرے اعزاز میں منعقد ہو چکے تھے۔ بہت سے لوگوں نے میرے آٹوگراف لئے تھے۔ کتنوں سے نئی ملاقاتیں ہوئی تھیں یا کتنے ہی وہ لوگ میری قیام گاہ پر ملنے آئے تھے جو میری کہانیوں کے سلسلے میں داد و تحسین بھرے خطوط لکھتے تھے لیکن ابھی کچھ لوگوں سے ملاقات باقی تھی۔ میری ڈائری میں وہ پتے نوٹ تھے جنہیں میری آمد اور ملاقات کا انتظار تھا اور آنکھیں بچھائے میری راہ دیکھ رہے تھے میرے اعزاز میں ہونے والے ادبی اجتماعات کی اخباری رپورٹ سے میری آمد مشتہر ہو چکی تھی اس لئے میں نے فرداً فرداً سب کو اطلاع نہیں دی اور احباب ملنے آتے رہے لیکن میں نے سوچا یہ شاید کوئی ایسی لڑکی ہے جسے میرے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ اور بھی نہ جانے کتنوں کو علم نہ ہوا ہوگا۔ میں نے چاہا، اُس لڑکی سے کہہ دوں کہ میں ہی تمہارا محبوب فنکار بھی ہوں لیکن میری خودداری نے اجازت نہ دی کہ اُسے بتاؤں میں کون ہوں — اچھا تو یہی ہے کہ لڑکی مجھے خود دیکھے اور دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سمائے۔ چند لمحوں کے لئے مُسرّت سے اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جائیں۔ رُخساروں کے گُلاب کھِل اُٹھیں۔ ہونٹوں کے کنول کِھل جائیں اور فرطِ شوق سے وہ میرے ہاتھوں کو چُوم لے — کہ اِن ہاتھوں نے اُن فن پاروں کو لکھا ہے جو ہمیشہ زندہ و پائندہ رہیں گے! کچھ قدم چل کر لڑکی جنرل اسٹور میں داخل ہو گئی۔

میری نگاہیں اُس پہ مرکوز تھیں۔ اُس نے سیل مین سے کوئی بات کی اور پھر گفٹ کارنر میں چلی گئی۔ میں نے نہ جانے کس جذبہ کے تحت اسٹور میں قدم رکھا لیکن رُک گیا اور کچھ سوچ کر اُلٹے قدم لَوٹ آیا۔

بعض قارئین نے مجھے میری کہانی کی پسندیدگی پر خطوط ہی نہیں لکھے۔ بیش قیمت تحفے بھیج کر میری قدر افزائی بھی کی ہے۔ ہو سکتا ہے اِس لڑکی کو میری آمد کی اطلاع ہو گئی ہو اور مجھ سے ملنے کی غرض سے کوئی تحفہ خرید رہی ہو، اس لئے میں وہاں سے واپس آکر سامنے والے کیفے میں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد لڑکی باہر آئی۔ اُس کی باسکٹ میں بہت سی چیزیں تھیں۔ میں آہستہ آہستہ اُس کے پیچھے چلتا رہا کہ شاید وہ میری قیام گاہ کی طرف مُڑے لیکن وہ جے جے ہاسپٹل کے بس اسٹینڈ پر آکر کیو میں کھڑی ہو گئی۔

میں لڑکی کی نگاہوں سے بچ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور اُسے بغور دیکھنے لگا۔

لڑکی کے چہرے پر ملاحت تھی۔ مریم کی سی پاکیزگی تھی۔ اُس کے گلے میں سنہری رنگ کی صلیب پڑی تھی۔ نیم تراشیدہ بال تھے۔ وہ سادہ لیکن بیش قیمت ساڑی میں ملبوس تھی۔ اُس کے پیروں میں سیاہ چپل تھے۔ اُس کا جسم سادگی اور حُسن کا حسین سنگم تھا۔ میرے دل میں اُس لڑکی کے لئے کئی بے نام جذبوں نے سر اُبھارا۔ میں نے کئی زاویوں سے اُس کا جائزہ لیا۔ اُس کا ہر انداز دل آویز تھا۔

میرا ذہن ماضی کے جزیروں میں کھو گیا۔

یکایک میرے لاشعور کی خوابیدہ تہہ سے ڈینِس بیدار ہو کر تصورات کے آئینہ خانے میں جلوہ گر ہو گئی — ڈینِس بی۔ اے میں میری کلاس فیلو تھی۔ متانت سنجیدگی، اور کم گوئی کا ساتھیوں پہ ہی نہیں چند پروفیسروں کے دل پر بھی گہرا اثر تھا۔ اُس کی آواز میں بلا کی کشش تھی، سوز تھا۔ اُس کا ہر جملہ کانوں میں امرت گھول دیتا تھا اُس کی شخصیت میں رنگ تھا، رُوپ تھا، اور رس تھا!

اُردو میرا، اور اُس کا مشترکہ مضمون تھا اور اِس بہار آفریں مضمون ہی کے طفیل میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ میری زندگی کے اُفق پر رنگ و نور کی ایک البیلی لہر بن کر تیزی کے ساتھ چھا رہی ہے۔ دنوں کے کارواں وقت کے دوش پہ سوار ہو کر ماضی کی طرف بھاگتے رہے اور ہم ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد قربتیں فاصلوں میں بدل گئیں اُس کے والد کا تبادلہ کسی بڑے شہر میں ہو گیا اور وہ کالج چھوڑ کر چلی گئی۔ وقت نے زخموں کو مندمل کر دیا اور میں اُسے بھول گیا۔

ایک لمحہ کے لئے مسافروں میں جنبش ہوئی۔ بس آئی لیکن ٹھہری نہیں، چلی گئی۔

مسافروں کی جنبشیں رُک گئیں اور وہ لڑکی بھی اپنی جگہ سکون سے کھڑی رہی میں نے ایکبار پھر اُس میں ڈینِس کے نقوش تلاش کئے۔ مجھے کئی بار یقین سا ہوا کہ وہ ڈینِس ہی ہے۔ میں نے چاہا، اُس سے کوئی بات کروں، لیکن دل نے چاہت کے قدم روک لئے۔ ڈینِس کا رنگ گندمی تھا لیکن اس لڑکی کے چہرے پر سلونا پن ہے۔ اُس کے ماتھے پر تِل تھا لیکن اِس کی پیشانی پر کوئی نشان نہیں۔ یہ ڈینِس ہرگز نہیں ہو سکتی میرا ذہن ماضی سے لَوٹ آیا اور حال کی برنائیوں میں گم ہو گیا۔

پچھلے دنوں میری کسی کہانی کے سلسلے میں کلکتہ سے ایک کرسچن لڑکی کا خط آیا تھا، جس نے مجھے اپنا پسندیدہ فنکار لکھا تھا۔ لڑکی نے بہت دنوں تک خط و کتابت کی۔ ایک بار اُس نے مجھے تحریر کیا کہ وہ اٹلی جا رہی ہے، جہاں اُس کے والد کوئی بڑا بزنس کرتے ہیں اور وہ تھرڈ ایئر کی طالبہ ہے لیکن کچھ دنوں بعد مجھے اطلاع ملی کہ وہ اٹلی نہیں جا سکی ہے اور اب چند ماہ کے لئے اپنی ایک عزیزہ کے پاس بمبئی جا رہی ہے۔ مجھے یقین آگیا کہ یہ وہی لڑکی ہے میں نے اپنے حافظہ پہ زور ڈالا اور کئی ناموں کے سہارے اُس کا نام یاد کیا۔ میرا ذہن اُلجھ گیا۔ اُس کا نام منجن ہے۔ .... نہیں .... نہیں منجن تو دہلی میں رہتی ہے۔ شاید سالونیا ہے لیکن سالونیا تو دہرہ دون میں ٹیچر ہے۔ ٹھیک یاد آیا۔ اُس کا نام اینلیا ہے — میں نے مِس

ایلیا کے خطوط پڑھ کر اپنے ذہن میں جس نازک اندام لڑکی کے ہیولوں کو ترتیب دیا تھا وہ لڑکی اُس کے عین مطابق تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ایلیا ہے ۔۔۔ ایلیا۔ جو میری کہانیوں کی شیدائی ہے، میری دید کی متمنی ہے اور آج جب یہ مجھے یہاں خلافِ اُمید دیکھے گی تو حیرت اور خوشی میں ڈوب جائے گی۔

"ایلیا!" ۔۔۔ میں نے آہستہ سے پکارا۔

لیکن بس آ گئی اور اُس کے ہنگاموں میں میری آواز گم ہو گئی۔ اُس کے ساتھ ہی میں بھی بس میں سوار ہو گیا۔ میری سیٹ بس کی پشت کی داہنی جانب تیسرے مسافر کی اوٹ میں تھی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن میں اُس کا چہرہ بخوبی دیکھ رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ اُسے اپنی طرف متوجہ کر دوں لیکن بس کے ماحول نے اجازت نہ دی۔ حالانکہ بمبئی کے ترقی یافتہ ماحول میں ایسی کوئی پابندی نہیں لیکن میں نے اُسے اپنی اخلاقی روایات کے منافی سمجھا اور میں نے بے بسی کے ساتھ بس میں سگریٹ سلگا لیا۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے مسافر کو دھواں ناگوار ہوا۔ میں نے سگریٹ مسل دیا اور باہر کی جانب دیکھنے لگا۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ بمبئی شہروں کی دُلہن ہے، جس کی مانگ میں سدا سہاگ افشاں ہے۔ جس کی نازک کلائیوں میں کبھی نہ ٹوٹنے والی حسین چوڑیاں ہیں، جس کی پیشانی پر سنگ مرمر کا جھومر ہے، جس کے انگ انگ میں خمار ہے، نشہ ہے، جس کی زندگی کے کومل تاروں میں سحر آفریں نغمے ہیں۔ ساون کے گیتوں کی جھنکار ہے، رومانی مہک ہے۔ برقی گونج ہے۔ جس کا ہر لمحہ مصروفِ کار ہے جہاں صبح و شام کا کوئی جاں گُسل احساس نہیں ۔۔۔ کسی اسٹاپ پر بس رُکی اور میرے خیالات بکھر گئے۔

لڑکی نے اپنے کندنی جسم کو جنبش دی۔ میں سمجھا شاید اُترنا چاہتی ہے، لیکن وہ اُتری نہیں اُس نے اپنی باسکٹ سے "بیسویں صدی" کا سالنامہ نکالا۔ میری نگاہیں کچھ دیکھنے کیلئے بے چین ہو گئیں، میرا اشتیاق بڑھ گیا۔ میں نے سوچا شاید وہ پھر میری تصویر دیکھے گی ہو سکتا ہے میری کہانی پڑھے اور اس بار میں اس سے ضرور کہہ دوں گا کہ اب کاغذی تصویر نہ دیکھو مجھے دیکھو۔ میں زندہ تصویر حاضر ہوں!! ۔۔۔ لیکن یکبارگی میری اُمیدوں کے دیئے بجھ گئے۔ لڑکی نے دوسرے ہی لمحہ "بیسویں صدی" باسکٹ میں رکھ لیا اور اب اُس کے ہاتھوں میں انگریزی ماہنامہ "لنک" تھا۔ وہ بہت دیر تک ورق گردانی کرتی رہی اور کبھی کبھی کہیں کہیں سے کچھ پڑھتی بھی رہی۔ اُس کے چہرے پر بے چینی تھی، کرب تھا اور کوئی بے نام سی خلش تھی۔ میں اُس کی خلش کو سمجھ گیا۔ وہ بس کے ماحول میں میری تصویر دیکھ کر اپنے شوق، اپنی پسند، اور اپنے خوابوں کو رُسوا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اِس لئے کہ وہ میری تصویر دیکھ کر میری کہانی پڑھ کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے گی اُسے اپنے چہرے پر پھیل جانے والے تاثراتی دائروں میں دل کا چور پکڑے جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ میری تصویر کو تنہائی میں دیکھے گی، اپنے من مندر میں سجا کر پوجا کریگی وہ میری کہانی کو بھیگی ہوئی رات کے سناٹوں میں پڑھے گی، جہاں کوئی اُسے مشکوک نگاہوں سے نہ دیکھے گا، جہاں کوئی مشتبہ اُنگلی نہ اُٹھے گی ۔۔۔ مجھے ہر لمحہ اپنی عظمت، اپنی شہرت اور شخصیت کا احساس خوش فہمیوں کے جال میں اُلجھاتا رہا۔ کتنے ہی لوگ ملک کے گوشے گوشے میں میرے فن، میری شخصیت کے پجاری ہیں۔ میری ملاقات کے مشتاق ہیں۔ میرے فن کے شیدائی ہیں۔ مجھے اُن لوگوں کے خیالوں پر بہت دُکھ ہوا جو یہ کہتے ہیں کہ اُردو کا مستقبل تاریک ہے۔ سرکار اُردو کو زندہ رکھنا نہیں چاہتی، اُسے اسکول باہر کیا جا رہا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے، غلط ہے کہ اُردو کا مستقبل تاریک ہے۔ کسی زبان کا مستقبل سرکار کے نہیں عوام کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اردو عوام و خواص کی زبان ہے جو اِسے بولتے۔ لکھتے، پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔ تو پھر کس طرح اُردو مٹ سکتی ہے۔ ایلیا اِس کی ایک زندہ مثال ہے جس کے ہاتھوں میں اردو کا عظیم صحیفہ ہے۔

ایک جھٹکے کے ساتھ بس رُکی۔ میرے خیالات رُک گئے۔

وہ لڑکی اپنی جگہ سے اُٹھی ۔۔۔ میں بیٹھا رہا ۔۔۔ غیر ارادی طور پر اُس کی نگاہیں میری طرف اُٹھیں اور کچھ لمحوں کے لئے جم کے رہ گئیں۔ میں نے ایک طائرانہ نگاہ اُس پر ڈالی۔ وہ شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے بے نیازی سے اپنا رُخ پھیر لیا تاکہ اُس کا تجسّس بڑھ جائے اور وہ فرطِ شوق سے بے چین ہو کر مجھ سے کہے "کیا آپ نجمی ہیں ۔۔۔؟" اور میں ہوں کہہ کر مُنہ پھیر لوں۔ وہ پھر مجھ سے مخاطب ہو گی۔ التجا کرے گی۔ اپنا تعارف پیش کریگی۔ پھر مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دے گی اور میں ایک فنکارانہ تمکنت کے ساتھ اُس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ لیکن کئی لمحوں تک کوئی عمل نہ ہوا۔ کوئی التجائی جملہ میرے کانوں سے نہ ٹکرایا۔ میں نے گھبرا کر اُس طرف دیکھا۔ لڑکی جا چکی تھی۔ میرے خواب بکھر گئے۔ میں نے اپنی توہین محسوس کی اور تیزی کے ساتھ بس سے اُتر آیا۔ چاروں طرف اُس لڑکی کو دیکھا وہ چند قدم آگے بڑھ چکی تھی۔

"سُنئے!" میں نے آواز دی۔

"کیا آپ مجھے پہچانتی نہیں؟" میں لڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

"جی نہیں ۔۔۔ میں تو نہیں پہچانتی آپ کو" لڑکی نے روکھے پن سے کہا۔

"میں نجمی ہوں۔ کہانی کار ۔۔۔ یہ جو رسالہ آپ کی باسکٹ میں ہے، اِس میں میری کہانی اور تصویر ہے ۔۔۔ آپ نے دیکھی ہو گی" ۔۔۔ میں نے اپنی خودداریوں کو زخمی کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا" لڑکی مجھ سے مسکرائی۔
مجھے اُس کی مسکراہٹ سے بے حد مسرت ہوئی کہ وہ مجھے پہچان تو گئی۔
لیکن دوسرے ہی لمحہ میری اُمیدوں کا خون ہوگیا۔ "میں صرف آپ کی تصویر دیکھ سکتی ہوں کہانی نہیں پڑھ سکتی۔ یہ میری کم نصیبی ہے کہ میں اردو سے واقف نہیں۔ یہ اُمید میگزین میں نے اپنی سہیلی کو تحفہ میں دینے کے لئے خریدا ہے" لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔
میں نے چاہا کہ لڑکی سے اُس کی سہیلی ہی کا پتہ پوچھ لوں لیکن وہ اتنی تیزی سے آگے بڑھ گئی جیسے میں کہانی کار نہیں کوئی چور ہوں!!

غزلیں

رفعت سروش

نظر اُٹھاؤ بہاروں کی گفتگو چھیڑو
جنوں نواز ستاروں کی گفتگو چھیڑو
ابھی خروش سے طوفان آرزوؤں کا
ذرا مچل کے شراروں کی گفتگو چھیڑو
ابھی تو شوخیٔ طوفاں سے کھیلنا ہے مجھے
ابھی نہ مُردہ کناروں کی گفتگو چھیڑو
ہمیشہ ذکرِ خزاں ہے۔ ہمیشہ ماتمِ گُل
کبھی تو ہنس کے بہاروں کی گفتگو چھیڑو
ابھی تمہارا سراپا ہے اور میری نظر
ابھی نہ چاند ستاروں کی گفتگو چھیڑو
یہ رات اور یہ فضاؤں کی تیرہ سامانی
سحر کے شوخ نظاروں کی گفتگو چھیڑو
گُلوں کا ذکر بہت کر چکے ہیں اہلِ چمن
سروشؔ سینہ فگاروں کی گفتگو چھیڑو

نسیم شاہجہان پوری

لبِ خموش ہیں اظہارِ حال سے معذور
کہوں تو کیا کہوں حیران ہوں میں اُن کے حضور
دلوں کے ربطِ نہانی سے دونوں ہیں مجبور
نہ کچھ تمہاری خطا ہے، نہ کچھ ہمارا قصور
عجیب کشمکشِ مستقل کا عالم ہے
نہ عرضِ حال کی ہمت نہ ضبط کا مقدور
یہ کس مقام پر آئے ہیں تیرے دیوانے
چراغِ دیر، نہ شمعِ حرم، نہ جلوۂ طور
وفا سے ہم کو ہے مطلب ستم سے اُنکو غرض
ہم اپنے دل سے وہ اپنے مزاج سے مجبور
نہ جانے کتنے زمانے میں انقلاب آئے
مگر وہی ہے محبت کا آج بھی دستور
کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کارواں میں جنکو نسیمؔ
نہ رہروی کا سلیقہ، نہ رہبری کا شعور

پروفیسر عبدالرب عرفان ایم اے

خیالِ عیشِ دو عالم نہیں ہے
ترا غم ہے تو کوئی غم نہیں ہے
سکوں میں کب ہے لُطفِ بیقراری
جو کم ہے دردِ دل تو کم نہیں ہے
پریشانی بڑھی جاتی ہے دل کی!
مزاجِ یار تو برہم نہیں ہے
نیاز و ناز کے محرم سے پوچھو
جفا اُن کی وفا سے کم نہیں ہے
ترقی عالمِ ایجادِ نو کی!
سوائے پستیٔ آدم نہیں ہے
ڈرا مجھ کو نہ شیخ عاقبت بیں
تری باتوں میں کوئی دم نہیں ہے
کہاں عرفانؔ جینے کی ادائیں
کہاں وہ جو اسیرِ غم نہیں ہے

نئی تصویر

مختار الرحمٰن راہی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

ماسٹر منیر منزل۔ گلزار مسجد۔ گھاٹ گیٹ۔ جے پور (راجستھان)

۵ر جون ۶۵ء گرامی قدر حضرت خوشتر گرامی صاحب! آداب و نیاز

"بیسویں صدی" کی بزم سے ایک سال کی غیر حاضری کی وجہ بہت سے بھائیوں اور بہنوں نے دریافت کی ہے اور میں عذر لنگ بھی نہ تراش سکا۔ چند ماہ پہلے جب میں آپ سے دلّی میں ملا تھا تو آپ نے بھی "بیسویں صدی" میں عدم شرکت کی شکایت کی تھی۔ میں نے اپنی پریشانیوں اور ذہنی انتشار کی طرف اشارہ کیا تھا اور پھر آپ نے بھی اپنے دل و جگر کی خراشیں موثر الفاظ کے جامے میں اِس انداز سے بیان کیں کہ میرا دل بھر آیا۔ اُس وقت آپ کی آنکھوں میں پدری شفقت اور محبت کے آنسو لرزاں دیکھ کر میری آنکھیں بھی نمناک ہوگئیں۔ آپ کی آنکھوں میں تھمے تھمے آنسو جو حدیث دل کی شرح بیان کر رہے تھے، جو غم کے آئینہ دار تھے ۔۔۔ اُنہی آنسوؤں میں اُمید اور آس، عزم اور استقلال اور حوصلہ مندی کی آب و تاب جھلک رہی تھی اور میں نے حضرتِ خوشتر گرامی کی عظمت کا راز پا لیا تھا۔ غم و آلام کے ہجوم میں بھی خوش تر رہنے والا شخص جس ضبط و تحمل اور بلند عزائم کا حامل ہو سکتا ہے وہ خوشتر گرامی ہی کی ذات ہے اور یہی عظمت "بیسویں صدی" کے ہر صفحے سے نمایاں ہے۔ بوجھل سکوت اور غمناک ماحول سے فرار حاصل کرنے کے لئے آپ مجھے پُر رونق ریسٹوراں میں لے گئے تھے، یہاں زندگی کی بھرپور رنگینیوں اور آپ کی پُر تکلف دعوت نے اُس غم کے احساس کو قدرے زائل کر دیا تھا ۔۔۔ میں جبھی سے اُن آنسوؤں کی لڑی میں کوئی کہانی پرونے کی سعی کر رہا ہوں۔ ابھی کہانی مکمل بھی نہیں ہو پائی تھی کہ ۲ر مئی ۶۵ء کو آپ سے دلّی میں مہاراشٹر پیغامبرکی اشاعت کے سلسلہ میں ملاقات ہوئی اور آپ نے اپنا پیغام آفس کو فون پر ڈکٹیٹ کروانے کے بعد افسانہ بھیجنے پر بہت ہی تیکھے انداز میں اپنے تاثر کا اظہار کیا اور میں نے جلد کوئی افسانہ بھیجنے کا وعدہ کر لیا ۔۔۔ حسبِ حکم ایک تازہ ترین افسانہ "نئی تصویر" پیش کر رہا ہوں۔ اُمید ہے، آپ کی فن شناس نظریں اِس میں وہ سب کچھ تلاش کر لیں گی جو "بیسویں صدی" کے باذوق اور باشعور قارئین چاہتے ہیں ....

ہمیشہ کی طرح چشمِ التفات کا خواہاں، آپکا ۔ مختار الرحمٰن راہی

یکم مئی ۱۹۶۴ء

اب سے پانچ سال پہلے میں کالج کی ایک شوخ و شنگ، بیباک اور آزاد خیال لڑکی تھی۔ تین سال تک متواتر کامن روم کی صدر بھی رہی تھی۔ کالج کے اسٹیج پر کھیلے جانے والے ہر ڈرامے میں خصوصی رول بھی ادا کرتی تھی اور بزمِ نسواں کے زیرِ اہتمام منعقد کئے گئے ہر مشاعرہ کو موثر انداز میں کنڈکٹ کرنے کی وجہ سے مقبول تھی اور میری غزلیں اور نظمیں حاصلِ مشاعرہ قرار دی جاتی تھیں۔ کالج کے منچلے اور "دل پھینک" قسم کے لڑکے ڈراموں میں ادا کئے گئے میرے ہی مکالمے اور اشعار قصداً اُس وقت دُہراتے تھے جب میں لان یا گیلری سے گزرتی تھی۔

کوئی کہتا "میری خاموش سُلگتی ہوئی آنکھوں میں گرمئ اظہارِ خیال محسوس نہیں ہوتی تمہیں؟ کیا زباں ہی کے ذریعہ دل کی بات ادا کی جا سکتی ہے؟"

حدیثِ دل

کہنے میں دل کی کہانی کس قدر کھو گیا
ہیں نشانوں پہ فسانے میرے افسانے کے بعد ——— ریاض خیرآبادی

نظر میں ڈھل کے اُبھرتے ہیں دل کے افسانے
یہ اور بات ہے دنیا نظر نہ پہچانے ——— صوفی تبسم

رازِ دل کس سے کہوں حضرتِ ناصح، کہیے
جو مرے دوست ہیں کیا غیر کے احباب نہیں ——— داغ دہلوی

دل کی تربت پہ جل اُٹھے ہیں چراغ
کیا کہوں کس کی یاد آئی ہے ——— عبدالحمید عدم

مطمئن ہو دل تو ہیں صحرا کے سناٹے بھی گیت
دل اُجڑ جائے تو ہے شہروں میں تنہائی بہت ——— نامعلوم

کوئی گنگناتا ہے میرا تصور گویا معتبر ——— تیری صورت میرے مقابل۔

کوئی جذباتی لہجہ میں نسوانی آواز میں کہتا "آخر کب تک اِن تپتی ہوئی راہوں میں تنہا بھٹکتے پھروگے تم .... آؤ میں تمہیں اپنی زلفوں کے سایہ میں پناہ دوں.... سکون دوں۔" اور اُسی وقت کوئی برجستہ میرا ہی یہ شعر پڑھتا ہے

اب تو تپتے ہوئے صحرا میں بھٹکنا ہے ہمیں
سایۂ گل میں رہے تھے بہت آرام کے ساتھ

کالج کے وہ دن مجھے آج بھی یاد ہیں، جب میں نے خواب دیکھے تھے۔ حسین، دلکش، حیات افروز، سنہرے خواب! اپنے تصور کی آنکھ سے میں نے حسین تاج محل تراشا تھا۔ تاج! جو خلوص و مہر کی بے مثل یادگار ہے۔ اپنے مستقبل کو مہر و وفا کی کرنوں سے تابناک بنایا تھا۔ اور ——— اور ——— لیکن وہ سب جلوے پرائے نکلے۔ وہ سب خواب حقیقت نہ بن سکے اور محبت کا تاج میرے ہی اِس شعر کے مصداق ڈوب گیا۔

میری محبت جمنا جل میں
ڈوبا ڈوبا تاج محل ہے

اور میں صرف اسٹینوگرافر بن سکی۔ خیالات کی بلندی، تصورات کی وُسعت اور خوابوں کی بے پناہ رنگینیاں سب سمٹ کر شارٹ ہینڈ کی آڑی ترچھی لکیروں میں تبدیل ہو کر رہ گئیں۔

اور اب میں پانچ سال سے اِن لکیروں میں اپنی قسمت کی لکیر تلاش کر رہی ہوں۔ کبھی تو کوئی لکیر اُبھرے گی جو مجھے میرے خوابوں اور تصورات کی تراشی ہوئی اُس دنیا میں لے جائے گی جہاں مجھے اطمینان اور سکون کی سانس میسر ہوگی۔

مجھے اِن پانچ سالوں میں آٹھ باس کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل چکا ہے۔ وہ سب باس تاجرانہ ذہنیت کے ساتھ ساتھ تعیش پسندی کے شکار تھے۔ وہ ہر عورت کو دولت سے خرید کی جانے والی شے سمجھتے تھے اور جب اُنہوں نے مجھے بھی شوکیس میں سجی ہوئی "برائے فروخت" شے سمجھ کر خریدنا چاہا تو میں نے ہر بار ملازمت ترک کر دی۔ اور اِس طرح ابتک میں آٹھ باس تبدیل کر چکی ہوں۔ گزشتہ تین ماہ سے میں جس باس کی اسٹینو ہوں وہ بھی ایک بڑے تاجر ہیں لیکن ابھی تک میں نے ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی جو اُن کی ذہنیت میں تعیش پسندی، جذبات پرستی یا حُسن پرستی کے عناصر ظاہر کرتی۔ وہ نوجوان ہیں۔ خوبصورت ہیں۔ گفتگو کرتے وقت نرمی اور دل موہ لینے والا لوچ بھی ہے۔ لیکن کبھی کبھی میں نے اُنہیں جھلاہٹ اور غم و غصہ کے عالم میں دیکھا ہے۔ اُس وقت کوئی کام اُنہیں پسند نہیں آتا۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہیں اور کاغذات پھینک دیتے ہیں۔ میں اُس عالم میں اُن کے سامنے اُس وقت تک نہیں جاتی جبتک کہ طلب نہ کیا جائے۔

اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ غصہ کے عالم میں جب میں اُن کے کمرے میں گئی تو وہ سیٹ سے کھڑے ہو گئے۔ مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے باہر چلے گئے اور پھر کار میں بٹھا کر بنگلے پہنچ گئے۔ وہاں کچھ دیر تک میری طرف اِس طرح دیکھنے لگے جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں یا پھر میری آنکھوں کے آئینہ خانے میں اپنی تصویر مختلف پہلوؤں سے دیکھنے میں محو ہوں اور بس اُسی لمحہ اُن کا غصہ کافور ہو جاتا۔ اُس وقت میں نے اُن کے لبوں پر معصوم بچوں کا سا تبسم رقصاں دیکھا تھا۔

ہاں تو میں سوچ رہی ہوں کہ سعید صاحب جو آجکل میرے نئے اور نویں باس ہیں، اُن کے ساتھ میں نسبتاً زیادہ عرصے کام کر سکوں گی۔ بلکہ یہ میری خواہش بھی ہے کہ جبتک مجھے یہاں سے ہٹایا نہ گیا میں کام کرتی رہوں گی۔ شارٹ ہینڈ کی لکیروں میں اپنی قسمت کی لکیر تلاش کرتی رہوں گی۔ کیونکہ یہاں تنخواہ بھی معقول ہے اور عورت ایسی جنس نہیں سمجھی جاتی جو برائے فروخت ہو۔

---

۴ رمئی ۱۹۶۴ء

آج سعید صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا۔ جب اندر گئی تو ٹھٹک کر رُک گئی۔ ایک نوجوان اور تیکھے نقوش کی ٹیڈی گرل اُن کے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس کی چُست پوشاک سے اُس کے جسم کا ہر عضو، ہر خط نمایاں نظر آرہا تھا۔ میری نظریں اُس لڑکی کا جائزہ لیتی ہوئی سعید صاحب کے چہرے پر جم گئیں۔ اُس وقت میرے ذہن میں

سی شکوک سمجھ رہے تھے۔ میں نے سہمی ہوئی تشویشناک نظروں سے سعید صاحب کی طرف دیکھا۔ اُن کے خیالات چہرے کے تاثرات سے پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہاں گہرے سکوت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ہر طرح کے جذبات سے عاری نقوش سے اُن کے دل کی کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔

"بیٹھئے۔" خاموشی میں اُن کی آواز اِس طرح گونجی جیسے اچانک کسی نے ٹرانز سٹر سیٹ کا سوئچ آن کر دیا ہو۔

میں بیٹھ گئی۔ بے جان اور بے حس مجسمہ کی طرح! میں ذہنی اعتبار سے مفلوج ہو گئی تھی۔

"ڈکٹیشن پلیز!" وہ پھر بولے اور میں کانپتی ہوئی اُنگلیوں میں تھرتھراتی ہوئی پنسل سے نوٹ بک پر اُن کے الفاظ کو لکیروں میں منتقل کرتی رہی، جیسے روشنائی میں گری ہوئی مکھی جدوجہد کے بعد نکل کر فرش پر چلتی ہوئی اپنے پیچھے بے ربط لکیروں کا جال چھوڑتی جا رہی ہو۔ ڈکٹیشن جب مکمل ہو گیا تو وہ پھر بولے۔

"اسے ابھی ٹائپ کر کے لاؤ۔" اور میں ٹوٹے ہوئے دل اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اُس وقت میری نظروں میں تاریک مستقبل کے مہیب سائے ناچنے لگے۔ میں اُس ڈکٹیشن کی پوری عبارت کے ہر لفظ کے معنی سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھ سکی۔ صرف ایک جملہ ہی میرے دل اور دماغ پر متواتر ہتھوڑے برسا رہا تھا ——— "مس سیمیں جمال کا اسٹینوگرافر کی جگہ پر آج ہی سے تقرر کیا جاتا ہے۔"

میں سوچنے لگی ——— اگر میں بھی الٹرا ماڈرن گرل ہوتی یا اپنے باس کو اپنے اچھے کام کی بجائے اپنی دلفریب مسکراہٹوں اور گرمیٔ احساسات و جذبات سے خوش کر سکتی تو اِس طرح مجھے ہٹا کر کسی دوسری لڑکی کو رکھنے کی نوبت نہ آتی۔ لیکن سعید صاحب سے مجھے اِس ردِ عمل کی توقع ہرگز نہ تھی کیوں کہ میں نے اُن کی آنکھوں میں ابھی تک ایسی کوئی جھلک نہیں دیکھی تھی اور جب میں ٹائپ شدہ کاغذ لے کر اُن کے کمرے میں گئی تو اُنہوں نے اُس پر دستخط کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"مس شہناز! تم ابھی اپنا چارج مس سیمیں جمال کو دے دو۔ آج سے یہ تمہاری جگہ کام کریں گی۔ سب کام اِنہیں اچھی طرح سمجھا دینا ... اور ... تم ...."

"بہت بہتر!" میں نے بجھے بجھے دل سے کہا۔ "آئیے مس جمال صاحبہ!"

"اور تم شہناز ...." وہ پھر کہنے لگے "آج سے دفتر کی بجائے گھر پر پرائیویٹ سکریٹری کے فرائض انجام دو گی۔ تمہاری تنخواہ اب دو سو کی بجائے چار سو کر دی گئی ہے!"

"کیا؟" میرے حلق سے پُر مسرت اور تحیّر آمیز چیخ نکل گئی۔

"جاؤ اِنھیں اپنا چارج دے دو۔" اُنھوں نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ کہا۔ ایسا تبسم جو خلوص آگیں جذبات اور احساسات کا آئینہ دار تھا اور میں نے ابھی اِس پاکیزہ مسکراہٹ کو زندگی میں کسی کے لبوں پر نہیں دیکھا تھا۔ خود سعید صاحب کے لبوں پر بھی اِس سے پہلے نظر نہیں آیا تھا۔ سعید صاحب کے لئے میرے دل میں احترام اور بے پناہ عقیدت پیدا ہو گئی۔ آج سے میں اپنے باس کی پرائیویٹ سکریٹری ہوں۔ یا خدا کہیں میرا یہ خواب بھی تلخ حقیقت میں تبدیل نہ ہو جائے۔ میں اب کوئی خواب نہیں دیکھوں گی۔ میں اپنے مستقبل کا کوئی اور خاکہ نہیں تراشوں گی۔ میں اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن ہوں، خوش ہوں۔

داستان

نہیں کہتا تو اُن کی بدگمانی اور بڑھتی ہے
جو کہتا ہوں تو لطفِ داستاں باقی نہیں رہتا ——— مخمور دہلوی

داستانِ غم کہیں تو کیا کہیں
جانے میں کب سے کچھتائے ہم ——— ساحر ہوشیارپوری

بس اتنی سی تھی داستانِ حیات
ترے در پہ آئے صدا کر چلے ——— روشن صدیقی

مرتب کر رہا ہوں آنسوؤں کو اور آہوں کو
کہ میری زندگی کی داستاں تیار ہو جائے ——— بھگوان داس شعلہ

میں عشق ہوں مکمل، میں شوق ہوں مسلسل
گویا تمام عالم میری ہی داستاں ہے ——— جگر مرادآبادی

---

۸ مئی ۱۹۶۴ء

آج صبح جب میں باتھ روم سے نکل تو برابر والے کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی اچانک اِس طرح بجی جیسے کسی مے نوش کے ہاتھوں سے مدہوشی کے عالم میں شیشہ کا جام چھناکے کے ساتھ فرش پر گر کر پاش پاش ہو گیا ہو۔ سعید صاحب کسی ضروری کام سے باہر چلے گئے تھے۔ میں تولیہ سے بال خشک کرتی ہوئی ٹیلیفون والے کمرے میں گئی "پرائیویٹ سکریٹری اٹینڈنگ پلیز!" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"اوہ! مس شہناز! میں سیمیں جمال بول رہی ہوں۔"

"فرمائیے! سعید صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں پیغام اُن تک پہنچا دوں گی۔"

"میں اِس وقت تم ہی سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم کچھ دیر کے لئے دفتر

آ سکتی ہو؟"

"نو پلیز۔ میں باس کی اجازت کے بغیر یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی۔ وہ کسی بھی وقت مجھے رنگ کر سکتے ہیں۔"

"او! مس شہناز! بات یہ ہے کہ ... سعید صاحب کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" سیمیں جمال کی آواز رازدارانہ تھی۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "آخر تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"مائی ڈیئر! رائے کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا لیکن ہیں، مطلب یہی نکلے گا کہ سعید صاحب کیسے آدمی ہیں۔ تمہارے ساتھ اُن کا کیسا برتاؤ رہا ہے؟"

"میں اب بھی کچھ نہیں سمجھی ——— کیا تم مجھ پر شک کر رہی ہو؟" میرے لہجے میں تلخی اور سختی تھی۔

"جی ہاں۔ تم جیسی لڑکیوں نے ان زرداروں کی عادتیں بگاڑ دی ہیں اور اس کا خمیازہ شریف لڑکیوں کو اُٹھانا پڑتا ہے۔ تم جیسی لڑکیاں معاشرے، سماج اور اپنی جنس کے لئے بدنما داغ ہیں۔ ایسے ناسور ہیں جن سے پُرتعفن مواد خارج ہوتا رہتا ہے۔ جو..."

"مس جمال!" میں غصہ سے چیخ اُٹھی۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے!"

"جی ہاں میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں۔ دو واقعات میرے ساتھ ایسے ہو چکے ہیں جو تمہارے باس سعید کو وحشی اور درندہ صفت ثابت کرتے ہیں۔ میں اُن کی ملازم ہوں، داشتہ نہیں۔ کیا تمہارے ساتھ کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا؟"

"نہیں کبھی نہیں!" میں نے پُرسکون لہجہ میں جواب دیا۔ "وہ ایسے ہرگز نہیں ہو سکتے۔"

"یا تو تم خود اسی طرح کی ہو یا پھر سعید۔"

"مس جمال! پلیز ایسی باتیں فون پر نہ کیجئے۔ ہو سکتا ہے آفس میں کوئی سُن رہا ہو۔"

"مطمئن رہو۔ اِس وقت میں پبلک کال بوتھ سے بول رہی ہوں۔" سیمیں کی آواز میں مضحکہ خیز گونج تھی۔ وہ پھر بولی "اچھا میں پھر کسی وقت تمہارے سامنے ثبوت پیش کروں گی۔" اور سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

مس سیمیں جمال کی ٹیلیفون پر اِس گفتگو نے مجھے متفکر کر دیا ہے۔ سعید جنہیں میں مثالی کردار کا مالک سمجھتی تھی، وہ سیمیں جمال کی گفتگو کی روشنی میں عام زرداروں کی طرح اوباش ہے۔ میرے خدا یہ سب کچھ کیا ہے؟ اور اِس وقت میرے خیالات کے کینوس پر اُن آٹھوں وحشی، درندہ صفت اور خوش پوش لٹیروں کے چہرے اُبھر آئے ہیں جن پر گناہوں کی سیاہی لتھڑی ہوئی ہے ... کیا اُن آٹھ مکروہ چہروں میں سعید کے چہرے کا بھی اضافہ ہوگا؟ کیا اُن تصویروں میں نویں تصویر سعید کی بھی ہوگی؟ نہیں نہیں ——— سعید ایسے ہرگز نہیں ہو سکتے! میرا دل گواہی دے رہا ہے۔ میرے ساتھ تو اُن کا برتاؤ اب تک ایسا نہیں رہا ہے۔ میری نظر سے وہ نہیں گر سکتے، کچھ بھی ہو۔ میں آج بے حد پریشان ہوں کاش سیمیں نے مجھے فون نہ کیا ہوتا۔

---

۱۰ مئی ۱۹۶۴ء

۴ مئی سے میں سعید صاحب کے اصرار پر کرایہ کا فلیٹ چھوڑ کر اُن کے بنگلے کے ایک کمرے میں رہنے لگی ہوں۔ یہاں مجھے ہر طرح کا آرام ہے۔ چار ملازم ہیں اور ایک ملازمہ۔ اکثر سعید صاحب کی والدہ مجھ سے باتیں کرتی رہتی ہیں بالکل اس طرح جیسے میں ان کے خاندان ہی کی ایک فرد ہوں۔

گزشتہ رات میں اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ دفعتاً کمرے میں کسی کے دبے دبے قدموں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے کی تاریکی میں روشن دان سے آنیوالی چاند کی کرنوں کی مدھم روشنی میں سعید صاحب کو اپنی جانب آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے میں نے دیکھ لیا اور سیمیں جمال کی باتیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ میں خوف اور غصے سے کانپنے لگی۔ سعید صاحب کا سایہ لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہا تھا۔ میں آنکھیں بند کئے پیش آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگی۔ دفعتاً اُن کے قدموں کی چاپ میرے سرہانے آکر بند ہو گئی۔ کمرے کی خاموش فضا میں مجھے سعید صاحب کی پھولی ہوئی سانسوں کی دھمک صاف سُنائی دے رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک کھڑے رہے۔ شاید اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر وہ مجھ پر جھک گئے۔ اُن کی سانسیں بہت قریب سے سُنائی دے رہی تھیں پھر اُن کا ہاتھ ——— میرے سر اور تکیہ کو چھونے لگا ... تکیہ کو جنبش ہوئی اور میں چونک پڑی۔

"کون؟" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا اور بیڈ لیمپ روشن کر دیا۔

"اوہ! یہ میں ہوں شہناز!" وہ گھبرا گئے۔ اُن کی زبان لڑکھڑا گئی۔ لیمپ کی روشنی میں اُن کے چہرے پر سراسیمگی اور ندامت کے نقوش واضح نظر آ رہے تھے۔

"لیکن اِس وقت میرے کمرے میں ... آپ سُن لیجئے ... کیوں ...؟" میں نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ میری آواز خوف سے کانپی ہوئی تھی لیکن میں اپنے لہجہ میں کوشش کے باوجود تلخی اور غصہ پیدا نہیں کر سکی تھی۔

"مجھے غلط نہ سمجھو شہناز۔" اُن کی آواز میں التجا اور اپنی غلطی کا احساس تھا۔

"کچھ بھی ہو آپ نے اِس طرح میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔" میرے آنسو نکل آئے تھے اور آواز بھرا گئی تھی۔

"حقیقت وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو ... اگر ہو سکے تو اِس واقعہ کو بُھلا دینا۔ مجھے معاف کر دینا۔" اور وہ تیزی سے باہر چلے گئے۔

ایک بہت بڑی ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک جس سے دفتر کے سب ملازم، جن میں کئی لڑکیاں بھی ہیں، اُس کے سامنے جاتے ہی کانپنے لگتے ہیں، ابھی چند لمحے پہلے ایک لڑکی کے سامنے کانپ رہا تھا ... معافی مانگ رہا تھا۔ گناہ انسان کو بُزدل اور کم ہمت بنا دیتا ہے۔

"آج سعید کا کردار میری نظروں میں ایک سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ سیمیں جمال سحر بن کر میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح داخل ہو رہا ہے اور میں سوچ رہی ہوں جذبات کے کینوس پر اُبھری ہوئی اُس قابلِ نفرت تصویروں میں ایک اور تصویر کا اضافہ ہونے سے پہلے ہی مجھے یہاں سے دُور ہو جانا چاہیئے۔"

---

۱۱ مئی ۱۹۶۴ء

آج مجھے ایک گمنام خط ملا ہے جو انگریزی میں ٹائپ شدہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے ——— "آپ کو سعید جیسے سرمایہ دار شخص کا قرب مبارک ہو۔ ہو سکتا ہے آپ نے اُن کی ظاہری شخصیت سے متاثر ہو کر اپنے مستقبل کو زرّیں خیالات اور توقعات سے سجا لیا ہو۔ لیکن آپ اپنی حیات کا بیش قیمت سرمایہ لُٹا کر اپنی حقیقی دنیا میں واپس لَوٹیں اِس سے پہلے میں سعید کی زندگی اور کردار سے آپ کو واقف کرا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ سعید کی گرفت کی ڈور ذرا لمبی ہے اور وہ عورت کے گرد آہستہ آہستہ لپٹتا ہے جب وہ ڈور پورے طور پر حلقے ڈال لیتی ہے تب عورت کو احساس ہوتا ہے کہ وہ اب کس عالم میں ہے اور سعید اِس ڈور کو اُس وقت کھولتا ہے جب وہ عورت اُسی میں لپٹی رہنے میں اپنی عافیت سمجھتی ہے۔ لیکن اُس کی ڈور ہمیشہ ایک ہی عورت کے گرد نہیں لپٹی رہتی۔ سعید کی تعیش پسندی کی شکار بہت سی لڑکیاں میری نظر میں ہیں، جن کے لئے عرصۂ حیات تنگ ہو چکا ہے کیا آپ دیدہ و دانستہ اپنی بربادی اور تباہی کی راہ پر گامزن رہنے کا فیصلہ کر چکی ہیں؟"

یہ خط پڑھ کر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں آج ہی یہاں سے چلی جاؤں گی لیکن پھر یہ سوچ کر کہ سعید کل شام ہی دو دن کے لئے باہر گئے ہیں، اُن کی غیر موجودگی میں یہاں سے چلا جانا غیر دانشمندانہ اقدام ہوگا۔ اِس لئے میں اُن کے واپس آنے تک یہاں ہوں۔ انسان کے وجود پر کتنے گہرے غلاف چڑھے ہوتے ہیں جو اُس کی شخصیت کے گھناونے اور مکروہ رُوپ کو عام نظروں سے پوشیدہ رکھتے ہیں ——— اور سعید صاحب! اُن کا یہ رُوپ دیکھنے سے پہلے میں چلی جاؤں گی۔

---

۱۱ مئی ۱۹۶۴ء ۱۱ بجے رات

آج سہ پہر کو میں پریشان کُن خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں دماغ اور خیالات جاگ رہے تھے۔ سعید صاحب کے کردار کے تین ماہ کے مطالعہ نے میرے دل پر اچھے اور گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ میں اُن سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ میرے دل میں اُن کے لئے بہت بلند جگہ پیدا ہو گئی تھی۔ اُن کی خدمت میں معقول مشاہرہ ہی کے عوض نہیں، فطری جذبۂ خلوص اور ہمدردی کے تحت اور مقدس فرض سمجھ کر کرتی تھی۔ لیکن اُن کے کردار کی بلندی، اُن کا خلوص ایک رنگین فریب ثابت ہوا اور اب میں سوچ رہی ہوں۔ نجانے وہ کونسا جذبہ ہے جو مجھے سعید سے نفرت کرنے سے روک رہا ہے۔ نجانے کیوں میرے دل میں اُن کے لئے نفرت اور حقارت کے جذبات نہیں اُبھرتے۔ دل صرف یہ چاہتا ہے کہ خاموشی سے یہاں سے چلی جاؤں....اور بس.....

دفعتاً سیمیں جمال کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"مس شہناز! کیا میں آپ کے تصورات کی رنگین انجمن میں مخل ہو سکتی ہوں؟"

"اوہ! تشریف لائیے" میرے لبوں پر بے کیف مُسکراہٹ اُبھر کر ڈوب گئی۔

"باس کب تک لوٹیں گے؟" سیمیں نے پوچھا۔

"شاید کل آ جائیں" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"آج تم اُداس کیوں ہو؟ کیا میرا یہاں آنا ناگوار گذرا ہے؟" سیمیں کے لبوں پر معنی خیز تبسم تھا۔

"اوہ! نہیں تمہاری گفتگو نے مجھے فکر اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔"

"ارے تم میری باتوں سے پریشان ہو....بھلا اُس سے تمہارا کیا تعلق؟ ہو سکتا ہے صرف مجھی پر اُن کی چشمِ التفات ہوتی ہو۔ تمہارے ساتھ تو ابھی تک ایسا کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ پھر تم کیوں فکر مند ہو؟" سیمیں کے لہجہ میں طنز کی آمیزش تھی۔

"ہاں....لیکن....میرے ساتھ بھی———"

"اگر ایسا حادثہ ہو بھی گیا تو زندگی سنور جائے گی میری شنو!" سیمیں نے میری بات کاٹ کر نہایت ہی عامیانہ اور بے باکانہ لہجہ میں کہا اور میں اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ اور پھر کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔

اور میں رات کے اِس پُرہول سناٹے میں اپنی ڈائری کے صفحات سیاہ کر رہی ہوں۔ میری نظریں بار بار سامنے دیوار پر آویزاں سعید کی تصویر کی طرف اُٹھ رہی ہیں جن پر انسانیت شرافت۔ اور معصومیت کا دبیز غلاف بڑی نفاست، پُرکاری اور چابکدستی سے چڑھا ہوا ہے۔ کاش یہی اُن کا حقیقی رُوپ ہوتا....اور اگر یہ ظاہری رُوپ ایک غلاف ہے تو مجھے اُس کا احساس نہ دلایا گیا ہوتا۔ کاش....

---

۱۲ مئی ۱۹۶۴ء

ناشتہ سے فارغ ہو کر میں اپنے خیالات کی اذیت ناکی کے احساس کو مٹانے کے لئے "بیسویں صدی" کے تازہ شمارہ کی ورق گردانی کرنے لگی۔ ایک افسانے کی چند سطریں پڑھیں لیکن طبیعت گھبرا گئی۔ پھر "تیر و نشتر" کے ذریعہ اُس اذیت ناکی کا مداوا کرنے لگی۔ اچانک امّی جان (سعید صاحب کی والدہ) کمرے میں آ گئیں اور بازار تک چلنے کے لئے کہا۔ ایک گھنٹہ تک ہم کار میں گھومتے رہے۔ کچھ سامان خریدا اور جب واپس آئے تو ڈرائنگ روم میں سعید صاحب کو اُداس اور ملول بیٹھے ہوئے پایا۔

"کب آئے بیٹا؟" امّی نے اُن سے پوچھا۔

"ابھی آیا ہوں؟" اُنھوں نے مختصر سا جواب دیا۔ "بیٹھئے امّی جان .... اور تم بھی بیٹھو شہناز؟"

سعید کی آواز میں روکھاپن اور لہجہ میں تحکمانہ انداز تھا۔

امّی پہلے بیٹھ چکی تھیں۔ میں بھی بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے بیٹا تیرے چہرے پہ ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں۔ کمپنی میں نقصان ہوگیا ہے کیا؟"

"ہاں امّی بہت بڑا گھاٹا ہوا ہے۔" اُن کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"آخر کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"ابھی سب معلوم ہو جائے گا۔"

کچھ دیر بعد سیمیں جمال کمرے میں داخل ہوئی۔

"بیٹھ جاؤ سیمیں؟" سعید نے نرم لہجہ میں کہا۔

"شکریہ" وہ زیرِ لب تبسم کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"میں نے تمہیں اس لئے تکلیف دی ہے کہ اگر تمہارا تقرر پرائیویٹ سکریٹری کی جگہ کر دیا جائے تو تم انکار تو نہیں کرو گی؟"

سیمیں نے میری طرف دیکھا اور جھجکتے ہوئے بولی۔

"اور .... یہ؟"

"تمہیں اِن سے کوئی مطلب نہیں تم اپنا جواب دو۔"

"میں پوری کوشش کروں گی کہ اپنے فرائض بخوبی انجام دوں۔"

"گڈ .... مس شہناز! تم آج ہی سے خود کو ملازمت سے برطرف سمجھو .... لیکن سیمیں! تمہارا تقرر کرنے سے پہلے میں تم سے چند اہم سوالوں کے جوابات چاہوں گا۔"

"فرمایئے۔"

"تم نے ۹ مئی کی رات کے نو بجے آواز بدل کر مجھے فون پہ یہ کیوں کہا تھا کہ آپکا بھائی رات کے ۱۲ بجے شہناز سے ملنے جائے گا .... وہ دونوں روزانہ ملتے ہیں اور اگر آج وقت میں تبدیلی ہو گئی تو بھی مجھے شہناز کے تکیہ کے نیچے تمہارے بھائی کی تصویر ضرور ملے گی۔"

"میں نے آپ کو کوئی فون نہیں کیا۔" سیمیں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"تم جھوٹی ہو .... اور یہ خط بھی تم نے شہناز کو کسی گمنام اور فرضی شخص کی طرف سے نہیں لکھا؟ تم نے شاید یہ سمجھا کہ میں اپنے ٹائپ رائٹر کے حروف نہیں پہچان سکوں گا۔ اِس قسم کا ٹائپ رائٹر اِس شہر میں صرف ایک ہے اور وہ میرے پاس ہے جسے میں امریکہ سے لے کر آیا تھا۔ آج جب میں ٹور سے واپس آیا تو شہناز امّی کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھیں میں نے اِن کے تکیہ کو ہٹا کر دیکھا تو اِن کی ڈائری اور یہ خط مل گیا۔ جسے پڑھنے کے بعد تمہاری ساری چال سمجھ میں آ گئی۔ صرف پرائیویٹ سکریٹری کی جگہ حاصل کرنے کے لئے تم نے شہناز کے سامنے میرے کردار کو اِس طرح پیش کیا کہ انہیں مجھ سے نفرت ہو جائے اور یہ ملازمت چھوڑ کر چلی جائیں اور تم اِن کی جگہ لے لو .... کیا یہ غلط ہے؟"

"مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ میں نادم ہوں اور معافی کی خواستگار ہوں۔ میرے گھر میں بارہ افراد ہیں اور میں تنہا اُن کی کفیل ہوں .... روپے کی ضرورت نے مجھے اتنا گرا دیا تھا ورنہ میرا ضمیر ہمیشہ ملامت کرتا رہتا تھا۔ میں نادم ہوں باس! اور میں بہن شہناز سے بھی معافی چاہتی ہوں ...." سیمیں کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"جاؤ تمہاری تنخواہ چار سو روپے کر دی گئی ہے۔" سعید نے سنجیدگی سے کہا۔ "اور شہناز! تمہیں اجازت ہے کہ اپنے کینوس پر نئی تصویر میری بنالو .... اب مجھے کوئی ملال نہ ہوگا۔" اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپکنے لگے، جنہیں امّی نے اپنے پلّو سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"دُلہن! میری بیٹی اُٹھو۔ ہم سب کھانا کھالیں۔ پھر ہمیں بازار جا کر بہت سا سامان خریدنا ہے۔ میں نے سعید کی طرف معذرت طلب نظروں سے دیکھا۔ اُن کی آنکھوں کی پُرسکوت گہرائی اُن کے وسیع اور پاک دل کا پتہ دے رہی تھی۔ پھر وہ چلے گئے اور اب میرے تصورات کے کینوس پہ سب تصویریں مٹ کر صرف ایک ہی تصویر اُبھر آئی ہے .... میرے اپنے سعید کی تصویر! .... اِس کے نقوش اتنے گہرے اور ابدی ہیں کہ اب کوئی اور تصویر نہ اُبھر سکے گی!!

غزل

سید حباب ترمذی

نمودِ سوزِ پنہانی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے
سرشکِ غم کی طغیانی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

بہارِ تازہ آئی بھی تو کیا آئی گلشن میں
گلوں کی چاک دامانی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

بہت قانونِ تعزیرات کی تخلیق کی لیکن
جرائم کی فراوانی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

اگرچہ کر رہے ہیں اہلِ زر تعمیر کے دعوے
مگر تخریب سامانی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

خرد کی ماہ و انجم تک رسائی تو ہوئی لیکن
طلب کی تنگ دامانی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

ہزاروں انقلاب آئے ہزاروں محفلیں اجڑیں
مہ و انجم کی تابانی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

معاذ اللہ اس تہذیب کے آئینہ خانے میں
نگاہ و دل کی ویرانی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

غریبوں کے لہو سے قمقمے روشن ہیں محلوں کے
ہوس کی ظلم سامانی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

کہیں پر صوبہ سازی ہے کہیں فرقہ پرستی ہے
وہی تفریقِ انسانی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

وہی شاخِ نشیمن پر ہے یورش برق و باراں کی
چمن میں حشر سامانی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

سرشکِ غم کا ہے سیلاب ہر موجِ تبسم میں
دلوں کی مرثیہ خوانی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

بایں آسائش و راحت جہانِ مادیت میں
وہی تکلیفِ روحانی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

حبابِ خوشنوا یہ کیا بہ کوئی موضوع ہو پھر بھی
تری شانِ غزل خوانی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

دمِ آخر

راہی بلند شہری

بجھ گئی آگ، دھواں بھی نہیں باقی لیکن
آج بھی چند شرارے سے اڑا کرتے ہیں

آج بھی آپ کی یادوں کے بھٹکتے سائے
دلِ برباد کی وادی میں پھرا کرتے ہیں

دلِ برباد کبھی مجھکو یہ سمجھاتا ہے
جو بھی اب تجھ پہ گزرتی ہے گزر جانے دے

جب بہاریں ہی نہیں ہیں تو نشیمن کیسا
اب یہ تنکے جو بکھرتے ہیں بکھر جانے دے

قافلہ جا بھی چکا گرد بھی راہوں میں نہیں
جانے کیوں بانگِ سفر گونج رہی ہے اب بھی

اب نہ بربط ہے نہ جھنکار نہ نغمہ نہ صدا
ایک آواز مگر گونج رہی ہے اب بھی

محفلِ دل میں تمنا ہے نہ ارمان ہے بیتاب
بحرِ ہستی میں نہ ہلچل ہے نہ طوفاں کوئی

ایسے اجڑا ہے گلستانِ محبت جیسے
بن کے آئے گا نہ اب صبحِ بہاراں کوئی!

ایسے بدلے سحر و شام کہ جیسے مجھ پر
مہرباں ہوگی نہ اب گردشِ ایام کبھی

تھپکیاں دے کے اسے درد سلا دیتا ہے
جاگتی ہے جو کوئی حسرتِ ناکام کبھی

میری آواز سنی یا نہ سنی ہو لیکن!
آپ کو آخرِ دم بھی میں پکارا تو کیا

ڈوب جانے کا نہیں رنج یہی کیا کم ہے
آپ نے میری تباہی کا نظارا تو کیا





LUX
TOILET SOAP

افسانہ

پھٹی پُرانی نشانی

پروفیسر سلمہ صدیقی۔ ایم، اے

گوروِنواس، کھار، بمبئی ۵۲

۲۰ر جون ۶۵ء

محترم بھائی خوشتر صاحب! سلام احترام

اپنی ایک گھریلو کہانی کے ساتھ "بیسویں صدی" کی بزم میں پہلی بار شریک ہو رہی ہوں ——— اِس کہانی میں رومان اور رنگینی نہیں ہے۔ پھر بھی میں اپنی یہ کہانی اِس اعتماد کے ساتھ لے کر "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہو رہی ہوں کہ ——— "اِک عشق ہی علاجِ غمِ زندگی نہیں!" ——— "بیسویں صدی" زندگی کا نقیب و ترجمان ہے۔ اِس میں زندگی کے ہر رُخ کی تصویریں پیش کی جانی چاہئیں۔ میری یہ کہانی زندگی کے ایک قابلِ توجہ رُخ کی انتہائی تاثر انگیز تصویر ہے ——— اُمید ہے اِسے آپ اور "بیسویں صدی" کے پڑھنے والے پسند فرمائیں گے ...

آپ کی بہن ——— سلمہ صدیقی

یُوں تو وکیل صاحب کی بیوی یعنی بڑی بیگم چھ ماہ سے بیمار تھیں پھر بھی صبح ہی صبح جب اچانک اُن کے انتقال کی خبر محلّے میں پھیلی تو سب لوگ دھک سے رہ گئے!

میں نے جلدی جلدی گرم گرم چائے کے بڑے بڑے گھونٹ اُتارے۔ آئینے میں جھانکا۔ گہرے رنگ کی لپ اسٹک ہلکے رنگ کی قدرتی رنگ کی لپ اسٹک میں تبدیل کی اور جلدی جلدی رونے کی کوشش کرتے ہوئے بڑی بیگم کے گھر چل دی۔ سامنے کی کھڑکی کھُلی تھی۔ بڑی بیگم کا مُنہ سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ کافور اور اگربتی کی خوشبو فضا میں تیرتی ہوئی موت کی یاد دلا رہی تھی۔ سب بچّوں کو ٹرنک کال کے جا چکے تھے۔ سنگاپور میں رہنے والا بیٹا بار بار ٹرنک کال کرتا تھا کہ آخری رسُوم انجام دینے سے پہلے اُس کا انتظار کر لیا جائے۔ بڑی لڑکیاں اور بہوئیں رو رہی تھیں۔ وکیل صاحب سر جھکائے اِس طرح چُپ چاپ سہمے ہوئے بڑی بیگم کی مسہری کے سرہانے کھڑے تھے جیسے وہ اپنا کیس کورٹ میں ہار چکے ہوں اور ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کی بھی گنجائش نہ رہی ہو!

بڑی بیگم کی مسہری کے پاس ایک چھوٹی سی تپائی پر اُن کی لڑکی زرینہ بیٹھی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک کالے بلیک کے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ ٹیفیٹا کا سیاہ غرارہ، نائیلان جالی کا سیاہ کرتہ اور فرنچ شفان کا سیاہ باریک اور سرسراتا ہوا دوپٹہ۔ اُس کے زانو پر خوبصورت تاج کمپنی کا شائع کردہ قرآن شریف رکھا تھا اور وہ آہستہ آہستہ اینگلو انگریزی لہجے میں قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھی۔ میں نے جا کے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اُس نے آنکھیں بند کر کے ایک لمبی سانس لی اور آہستہ سے کہا۔

"Almighty ... what have you done?..."

سہ پہر تک غسل کی تیاری ہوتی رہی۔ غسل دینے والی عورتیں آ گئی تھیں۔ زرینہ ماں کے پاس ہی بیٹھی تھی اور اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوبصورت ڈائمنڈ کٹ سونے کی چوڑیاں اور ہیرے کی انگوٹھی کی دیکھ بھال کس طرح کرے جو ابھی تک اُس کی مرحومہ ماں کی کلائیوں اور انگلیوں میں چمک رہی تھیں۔ کسی عورت نے کہا "بیٹیوں کا دل کمزور ہوتا ہے انھیں یہاں سے ہٹا دو ... ہم غسل دے لیں گے ...!"

زرینہ نے جو کل سے چُپ چاپ تھی ایک سُریلی چیخ ماری اور پچھاڑ کھا کر بولی۔

"ہائے ممی ڈارلنگ ... کل صبح تک تم بالکل اچھی تھیں۔ کل میں دعوت میں جا رہی تھی تو تم کیسے پیار سے مجھے اپنی چوڑیاں اور انگوٹھی پہننے کو دے رہی تھیں۔ ہائے! مجھ بدقسمت کو کیا خبر تھی یہ تمھاری آخری Wish تھی ...!"

زرینہ کی اِس بات نے دوسری بڑی بہنوں کو اور بہوؤں کو بھی ہلا کے رکھ دیا۔ غسل دینے والی عورتیں ہکا بکا کھڑی تھیں اور ایک بیٹی چیخ کے کہہ رہی تھی ———

"ہائے امی جان! مجھے کیا معلوم تھا کہ دسمبر میں جو آپ سے ملاقات ہوئی تھی وہ

آخری ملاقات تھی۔ ہائے آپ نے کتنا کہا کہ دلہن بیوٹی مجھے بھی دے دو، میں پہنتا ہسکیں ہیں بدنصیب دلہانی۔ ہائے آپ کی روح کو کتنا صدمہ پہنچایا مجھ کمبخت نے۔۔۔!"

دوسری بیٹی دہاڑتی ہوئی بولی: "ہائے امی جان! جھمر او ٹیکہ اور جھومر آپ نے کیوں دے دیے تھیں۔۔۔ ہائے وہ آپ اپنی نشانی مجھے سونپ رہی تھیں۔۔۔!"

بڑی بہو نے کہا: "ہائے امی جان! خدا گواہ ہے آپ نے مجھے بیٹیوں سے زیادہ چاہا ہے۔ جب ہی تو پرانی حویلی تپّو کے نام، اپنے پیارے پوتے کے نام لکھے دے رہی تھیں!"

دوسری بہو نے کہا: "ہائے امی جان! پازیبیں مجھے کیوں سونپ گئیں۔۔۔ آپ چلی گئیں اور میں پازیب پہن کے بیٹھوں گی۔۔۔!"

تیسری بہو جو کھانے کی شوقین تھی، بولی: "ہائے ہائے امی جان! مجھے کیا پتہ تھا کہ گودام کی چابیاں آپ میرے حوالے کیوں کر گئی ہیں۔۔۔!"

◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆

- خبردار ہو جاؤ کہ دلوں کا چین اللہ کے ذکر میں ہے۔ (قرآن پاک)
- ایمان کے بعد افضل ترین نیکی اللہ کی مخلوق کو آرام پہنچانا ہے۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- دین نصیحت اور خیر خواہی کا نام ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- چار باتیں زوالِ حکومت کا باعث ہوتی ہیں۔ غیر ضروری کاموں سے دلچسپی، اصول اور قانون سے بے پروائی۔ اہلوں کی ناقدری، نا اہلوں کا اقتدار۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- سب سے بڑی خیانت قوم اور ملت کی خیانت ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- حلم اور بردباری انسان کی سیرت کو آراستہ کرتی ہے (حضرت امام حسینؓ)

◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆

اِسی دوران میں گھر کی پرانی ملازمہ نے روتے روتے آواز دی — "لے لو چھوٹی بیگم آگئیں —!"

سب کی نظریں آنے والے کی طرف اُٹھ گئیں۔ آنے والی ایک ادھیڑ عمر کی دُبلی پتلی، کمزور، بیمار، نحیف و ناتواں سی عورت تھی۔ اپنی ایک چھوٹی سی پوٹلی بغل میں دبائے، سیدھی آکے بڑی بیگم کے پاؤں پر گر پڑی۔

"ہائے آپا! مجھے کسی نے تمہاری بیماری کی بھی اطلاع نہ دی۔۔۔ اری آپا! امّی ابا کی آخری نشانی تم ہی تو تھیں۔۔۔ تم بھی چلی گئیں۔ اپنی چھوٹی بدنصیب چھٹو کو کس کے حوالے کر گئیں۔۔۔" یہ کہہ کہہ کے وہ عورت جسے چھوٹی بیگم کہا جا رہا تھا، پھپک پھپک کے رونے لگی۔ اِس عورت کے آجانے سے بڑی بیگم کی بہوؤں، بیٹیوں، بیٹوں اور خود وکیل صاحب کے چہرے فق ہو گئے تھے۔ اُس عورت نے ایک نظر سب کی طرف دیکھا۔ سہم کے گٹھی اور نوکروں کی کھولی کی طرف چلی دی۔

تیسرے دن بڑی بیگم کے تیجے کا فاتحہ تھا۔ بہت بڑا شامیانہ لگایا گیا تھا۔ بڑی مسجد کے سب سے بڑے مولوی کو فاتحہ پڑھنے کے لئے اور شہر کے سب سے بڑے باورچی کو پلاؤ پکانے کے لئے بلایا گیا تھا۔

گھر بھر میں سب نے صاف ستھرے قیمتی کالے اور سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ وکیل صاحب ہندوستانی فلموں کے محروم و مایوس ہیرو کی طرح در و دیوار پر نظریں گاڑے ہوئے تھے۔ بیٹیاں اور بہوئیں سفید چاندنی پر سفید نرم و گداز تکیوں سے پیٹھ لگائے پوڑی گلوں میں بسے ہوئے رومالوں سے کبھی کبھی آنکھیں ٹھنڈی کر لیتی تھیں۔ شہر کے سب سے بڑے بزنس مین کی بیوی تعزیت کو آگئی تھیں تو تھوڑی دیر کے لئے سب لوگ موت کے ماحول کو بھول کے اُن کا استقبال کرنے لگے تھے۔

بہت ہی قرینے سے ماتمی مجلس آراستہ تھی کہ اچانک پاس کے کمرے سے ایک عجیب سی گھُٹی گھُٹی سی کرب ناک سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ رونے والا انسان ہے یا کوئی زخمی جانور! گھر کے سب لوگ گھبرا گئے۔ ایک دوسرے کو جیسے شرمندہ ہو ہو کے دیکھنے لگے۔ گھر کی پرانی ملازمہ جلدی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں بھی ساتھ گئی۔ دیکھا، کہ وہی پرسوں والی ادھیڑ سی بیمار عورت اِس طرح پھوٹ پھوٹ کے رو رہی ہے جیسے آج کے بعد اُسے پھر کبھی رونا نہ تھا۔ ملازمہ نے جلدی سے ہاتھ پکڑ کے اُسے اٹھایا اور ڈریسنگ روم میں لے جاکے باہر سے دروازہ بھیڑ دیا۔ وہ عورت ڈریسنگ روم میں گندے کپڑوں کے ڈھیر کے پاس اِس طرح بیٹھ گئی جیسے اِس سے بہتر جگہ اُسے کبھی نہ ملی ہو!

پرانی ملازمہ جب دیگچی بھر پلاؤ اپنے نواسے کو اپنے گھر بھیجنے کے لئے ڈیوڑھی پر آئی تو مجھے بتایا کہ چھوٹی بیگم، بڑی بیگم کی چھوٹی سگی بہن ہیں۔ پورے میکے میں بس ایک یہی رہ گئی ہیں۔ بڑی بیگم اور چھوٹی بیگم لکھنؤ کے ایک بہت غریب گھرانے کی تھیں۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد باپ کے کسی رشتہ دار نے کام کاج کرنے کے لئے اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔ قسمت کی خوبی کہ بڑی بیگم وکیل صاحب سے بیاہ گئیں اور چھوٹی بیگم ایک تمباکو بیچنے والے دوکاندار کے دامن سے باندھ دی گئیں۔ بڑی بیگم بمبئی آگئیں۔ وکیل صاحب نے اپنے اور اُن کے ماضی پر تاریکی کے دبیز پردے ڈال دئے اور جس طرح وہ خود اپنی بہنوں اور عزیزوں کو گورکھپور میں چھوڑ کے بھول چکے تھے اِسی طرح بڑی بیگم کو بھی انھوں نے چھوٹی بیگم کو فراموش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چھوٹی بیگم اپنے شوہر کے مرنے کے بعد پڑوسیوں سے کرایہ لے کے ایک بار بڑی بیگم سے ملنے بمبئی آئی تھیں لیکن وکیل صاحب نے انھیں گھر کے باہر ہی سے واپس کر دیا تھا۔ پندرہ سال تک کسی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ چھوٹی بیگم کہاں گئیں۔ کبھی پتہ چلتا کہ وہ کسی کے گھر کھانا پکاتی ہیں۔ کبھی پتہ چلتا کسی کا بچہ کھلاتی ہیں۔ ایک بار کسی نے

کی چھوٹے سے نستعلیق صاحب کے تالے میں رکھی گئی تھیں۔ ایک بار بڑی بیگم کو بتا کر دہلی میں وہ ایک بار چند روز ٹھہری تو ایک دن اپنی کسی ملنے والے کے گھر گئیں۔ وہاں دیکھا چھوٹی بیگم باورچی خانے کے سامنے بیٹھی چھری کی پیل کوٹ رہی ہیں اور ان سے سبزی چھیلی جاتی ہیں۔ بڑی بیگم کی بیٹی کے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ اب چھوٹی بیگم چھوٹی خالہ ان کے اُس کے گلے سے لگ جائیں گی لیکن چھوٹی بیگم پاس آئیں ہی نہیں اور سر جھکائے بیل کوٹتی رہیں۔ ایک بار جب بمبئی میں اچھے نوکروں کی بہت قلت محسوس ہونے لگی تھی اور کام زیادہ ہونے کی وجہ سے کوئی خادمہ نہ ٹکتی تھی تو وکیل صاحب نے بڑی بیگم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی چھوٹی بہن کو یہاں بُلالیں۔ آخر باہر کے نوکروں کو بھی کپڑا لتہ دیتے ہیں۔ چھوٹی بیگم آجائیں گی تو اپنوں ہی کا کچھ بھلا ہو جائے گا۔ لیکن زرینہ نے اس تجویز کو غصے میں انگریزی بول بول کے رد کر دیا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ کبھی بے خیالی اور بے احتیاطی میں بہنوں کا خون جوش مار گیا اور رشتے کا راز افشا ہو گیا تو قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ وہ کیسے صوفیہ کالج کی سہیلیوں کو منہ دکھا سکے گی۔

سب لوگوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ بڑی بیگم کی علالت کی خبر چھوٹی بیگم کو نہ ہونے پائے۔ لیکن بڑی بیگم کے مرنے سے دو دن پہلے چھوٹی بیگم نے خواب دیکھا کہ وہ اور بڑی بیگم اسی طرح اپنے پُرانے ٹاٹ کے پردے والے لکھنؤ کے مکان میں نالی کے پاس بیٹھی بیٹھی زمین پر پڑی ہوئی جامنیں چُن چُن کے کھا رہی ہیں جیسے چالیس سال پہلے ہوائی ٹولے کے ایک چھوٹے سے گھر میں دونوں بہنیں کسی رشتہ دار کے بچے کھلاتی تھیں اور کبھی کبھی تھوڑی سی فرصت ملتی تھی تو دروازے کے باہر نالی کے پاس آ کے ٹھنڈی ہوا اور آزادی کے مزے لیتی تھیں۔

اچانک چھوٹی بیگم نے دیکھا، بڑی بیگم اُن کے پاس سے اُٹھ کے جامن کے پیڑ پر پہنچ گئی ہیں۔۔۔ اور پھر اُنھوں نے دیکھا، بڑی بیگم پیڑ پر سے اُڑ کے آسمان کی طرف جا رہی ہیں! بس چھوٹی بیگم نے اسی وقت اسٹیشن پہنچ کے جنتا کے بمبئی کا ٹکٹ کٹا لیا تھا!

بڑی بیگم کی فاتحہ خوانی بڑی شان و شوکت سے ہوئی۔ ایک خاص آدمی تعزیت کے تار اور خطوط کے جواب دینے کے لئے رکھا گیا۔ بستی بھر کے فقیروں کو بلاؤ زردہ کھلایا گیا۔ ٹھنڈا پانی پلایا گیا اور چار مولوی چالیس روز تک اُن کے مزار پر قرآن شریف پڑھنے کے لئے مقرر کئے گئے۔

سارے کاموں سے فارغ ہونے پر شام کو بڑے کمرے میں وکیل صاحب اپنے سب بیٹوں، بیٹیوں اور بہوؤں کے ساتھ بیٹھے اور بڑی بیگم کا سامان الماریوں اور صندوقوں سے نکال نکال کر سامنے قالین پر رکھتے گئے۔ زیور تو وکیل صاحب نے بہت انصاف سے سب میں تقسیم کر دیا۔ اب کپڑوں کی باری آئی۔ کمخواب کا جھلملاتا ہوا غرارہ کا مشت دیکھ کر بڑی بہو چیخ اُٹھی "یہ میں لوں گی!"

بنارسی زر دوزی ساڑی چھوٹی بہو نے اپنالی۔ کارچوبی شلوار قمیص کا سُوٹ دوسری بہو نے جھپٹ کے کلیجے سے لگا لیا۔ بیٹیاں اب تک چپ تھیں لیکن ماں کا سامان اس طرح لُٹتے دیکھ کے چپ نہ رہ سکیں اور جلدی جلدی زری کا دوشالہ، کامدانی کی ساڑیاں، پشت ماہی کے جال کی رضائی، اصلی کلابتو کا شلوکہ۔ سب کچھ پل بھر میں بٹ گیا۔ اب سامنے پڑی تھی ایک پُرانی ملی دلی سی ریشمی ململ کی اوڑھنی جو بیچ بیچ سے پھٹ گئی تھی اور جس کے کامدانی کے دانے دُھندلے پڑ گئے تھے۔ وکیل صاحب اُس اوڑھنی کو دیکھ کے دھک سے رہ گئے اور چھوٹی بیگم جو اب تک ایک کونے میں چپ چاپ پڑی تھیں، اُسے دیکھ کے اچانک پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں "یہی تو وہ اوڑھنی ہے جو بڑی بیگم نکاح کے بعد لوڑھ کے وکیل صاحب کے گھر لوٹ کر پہلی بار آئی تھیں!"

وہ برسات کی ایک بھیگی ہوئی اُداس رات تھی۔ وکیل صاحب کے گھر کی

- سوچ سمجھ کر بات کرو تاکہ معذرت کی ندامت سے بچو۔ (حضرت منصور عمار بصریؒ)
- جب تک کسی بات کو عقل کے ترازو میں تول نہ لو جواب ہرگز نہ دو۔
(حضرت شفیق بلخیؒ)
- حق شناس کتا ناسپاس آدمی سے بہتر ہے۔ (حضرت شیخ سعدیؒ)
- جو بات حکمت سے خالی ہے وہ آفت ہے، جو خاموشی حکمت سے خالی ہے وہ غفلت ہے، جو نظر حکمت سے خالی ہے وہ ذلت ہے۔
(حضرت حسن بصریؒ)
- مبارک ہیں وہ جن کی نظر انجام پر رہتی ہے۔ (ابن یمین خراسانی)
- شجر فراست کا میوہ نیکوکاری ہے۔ (کے خسرو)

کھپریل کی چھت ٹپک رہی تھی۔ نیچے یہی اوڑھنی اوڑھے ایک دُلہن بیٹھی تھی۔

اس کے آگے وکیل صاحب کچھ نہ سوچ سکے اور خاموشی سے اوڑھنی کو دیکھنے لگے۔ سنگاپور والی بڑی بہو جو اپنی فیاضی کا ثبوت دینا چاہتی تھیں، دوسری بہو سے بولیں: "لو دُلھن تم یہ اوڑھنی بھی لے لو۔ امّاں جان کی نشانی!"

چھوٹی بہو غصے سے جھنجھلا کے بولی "ہاں۔ ہاں سب لوگوں نے تو اچھا اچھا مال لے لیا۔ اب یہ میرے ہی لئے رہ گئی ہے نا ایسی پھٹی پُرانی نشانی!"

وکیل صاحب نے اوڑھنی اُٹھا کے پلنگ کے ایک کونے پر رکھ دی اور دھیرے دھیرے سب لوگ ڈرائنگ روم میں جمع ہونے لگے۔ صرف چھوٹی بیگم کی سسکیوں کی آواز دیر تک آتی رہی۔ اسی رات وکیل صاحب کی موجودگی میں زرینہ نے چھوٹی بیگم کا مسئلہ حل کرنا چاہا اور طے کیا کہ کل سے انھیں صاف ستھرے کپڑے پہننے پر مجبور کیا جائے گا اور

چھوٹی بیگم کی مسہری پر اُن سے بیٹھے گی، کہا جائے گا اور بڑی بیگم کی خادمائیں اُن کے ہاتھ پاؤں دبایا کریں گی اور اب وہ اپنی پرانی چٹائی پر نہیں بلکہ مخمل سے منڈھی ہوئی ایرانی جانماز پر نماز پڑھا کریں گی۔ اور کل سے وہ بڑی بیگم کی بہن کہلائیں گی جن کا سسرالی خاندان مغلیہ شاہ آگرہ سے ملتا ہے!

یہ سب باتیں چھوٹی بیگم نے سُنیں تو اور زور زور سے رونے لگیں اور گھبرا گھبرا کے دلی جانے کی اجازت مانگنے لگیں لیکن زرینہ بھلا ایسے زرّیں موقع کو کیسے ہاتھ سے جانے دیتی۔ دوسرے دن صبح چھوٹی بیگم کے نئے کپڑے تیار ہوئے۔ نیا سلیم شاہی جوتا آیا۔ انھیں ہدایت کی گئی کہ وہ ننگے پاؤں ہرگز نہ گھومیں اور عورتوں کے اُٹھنے کے بعد اُدھر نہ جائیں۔ چھوٹی بیگم کی مظلومیت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ وہ گھبرا گھبرا کے اپنی بہن کی اولاد کو ایسے دیکھتیں جیسے غریب بکری قصائی کو دیکھتی ہے۔ جب شام تک کسی طرح چھوٹی بیگم، بیگم شاہ آگرہ کے خاندان کی فرد کہلانے پر اور بڑی بیگم کی جانشین بننے پر رضامند نہ ہو سکیں تو وکیل صاحب اُن کی واپسی کا انتظام کرنے لگے۔ انھوں نے اپنے کلرک کو فون کیا کہ کل محترمہ بیگم صاحبہ ہمشیرہ صاحبہ دلی جانے کا ارادہ رکھتی ہیں اس لئے کسی بھی قیمت پر ایئر کنڈیشنڈ فرسٹ کلاس کی سیٹ اُن کے لئے ریزرو کرائی جائے۔ وہ کسی طرح کی تکلیف کی خوگر نہیں ہیں۔ اس لئے یہ انتظام ضروری ہے۔

یہ انتظام کر کے وکیل صاحب نے اطمینان کی سانس لی۔ زرینہ نے بڑی منت سماجت سے اپنی چھوٹی خالہ کو اس بات پر رضامند کیا کہ وہ کم سے کم کل یہاں سے اسٹیشن تک سلیقے سے جائیں یعنی پہلی بات تو یہ کہ صاف ستھرے کپڑے پہنیں۔ دوسری یہ کہ ننگے پاؤں نہ جائیں۔ تیسری یہ کہ اُنھیں جانے والوں کو اور نوکر چاکر کو خود سے جُھک کے سلام نہ کریں بلکہ صرف گردن کے ایک اشارے سے اُن کے سلام کا جواب دیں!

صبح چھ بجے جب وکیل صاحب نماز پڑھنے اُٹھے تو پتہ چلا کہ چھوٹی بیگم جو رات کو مسہری پر سُلائی گئی تھیں، غائب ہیں۔ جلدی جلدی سارے گھر میں، گودام میں، ڈریسنگ روم میں، کچن میں، نوکروں کی کھولی میں، ہر جگہ انھیں ڈھونڈا گیا لیکن وہ نہ ملیں۔ سامنے کے چوکیدار نے بتایا کہ "ہاں شاب بابو کا بلڈنگ سے ایک بائی نکلا تھا بہت سویرے کو اور اُدھر گیا تھا بس اسٹاپ پر!"

وکیل صاحب نے گھبرا کے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے ایئر کنڈیشنڈ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ نکل آیا لیکن چمڑے کا بٹوہ غائب تھا جس میں یہ ٹکٹ تھا۔ پانچ ہزار روپے کے نوٹ کل شام کو وکیل صاحب نے اس بٹوے میں رکھے تھے۔ ذرا سی دیر میں سارا گھر جمع ہو گیا۔ زرینہ نے فوراً ماہرِ فن جاسوس کی طرح اعلان کیا کہ ہو نہ ہو یہ ساری کارستانی اُسی بڑھیا کی ہے جو چھوٹی بیگم کہلاتی ہے!

وکیل صاحب اپنے دونوں بیٹوں اور زرینہ کے ساتھ بمبئی سنٹرل پہنچے۔ ٹرین چھوٹنے میں تھوڑی دیر تھی۔ جلدی جلدی گھبراتے ہوئے سب لوگ کمپارٹمنٹوں کا جائزہ لینے لگے۔ تھرڈ کلاس کے ایک بدبودار ڈبے میں گندگی اور بھیڑ میں دبکی ہوئی چھوٹی بیگم ایک مزدور عورت کے بچے کو سنبھالنے میں مصروف تھیں۔ زرینہ آگے آگے اور پیچھے اُس کے باپ بھائی چھوٹی بیگم کے سامنے پہنچ گئے۔ چھوٹی بیگم چوروں کی طرح گھبرا کے اور سہم کے انھیں دیکھنے لگیں۔ زرینہ نے کہا "لو اور لو دی۔ تم بڑی شریف بنتی ہو۔ چوری کی!! لاؤ ڈیڈی کا بٹوہ! ورنہ ابھی پولیس کو بلاتے ہیں۔" یہ کہہ کے زرینہ نے چھوٹی بیگم کی پوٹلی چھیننا چاہی۔ چھوٹی بیگم اپنی پوٹلی بچانے کی کوشش میں بلّی کی طرح غرّا غرّا کے لڑنے لگیں۔ اتنے میں وکیل صاحب کا ڈرائیور بھاگا بھاگا آیا "لیجئے صاحب یہ بٹوہ۔ اگلی سیٹ پہ پڑا تھا۔ رات آپ نے کار ڈرائیو کی تھی!"

ریل نے سیٹی دی۔ لیکن زرینہ چھوٹی بیگم کی پوٹلی کھولنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ سب لوگوں کے سامنے پوٹلی کی گٹھڑی پڑی تھی۔ اُس میں ایک پھٹی پرانی اوڑھنی تھی!!

پھٹی پرانی سی ایک نشانی!!

غزل

ضیا فتح آبادی ایم۔ اے

ابھی موج و ساحل کو کم جانتے ہیں
کہ ہم ناخدا کو خدا مانتے ہیں

یہ دُنیا بھی سپنا، یہ جنت بھی دھوکا
نہ وہ جانتے ہیں، نہ ہم جانتے ہیں

نہ منزل کی دوری کا دل میں غم ہم کو
ابھی خاک صحراؤں کی چھانتے ہیں

بھروسا نہیں ناخدا پر مگر ہم
وہ چوبِ خدا بھی کہاں مانتے ہیں

رُخِ مہر و مہ سے اُٹھاتے ہیں پردے
ابھی خود کو لیکن کہاں جانتے ہیں

زباں پر نہیں شکوۂ جور لیکن
جو دل پر گزرتی ہے پہچانتے ہیں

ضیا اور کیا ہوگی توہینِ انساں
مرے نام سے مجھ کو پہچانتے ہیں

شانِ نزول

نریش کمار شاد

۱۵ ایف، موتی باغ ۲، نئی دہلی

۲۵ جولائی ۶۵ء

میرے محترم!

گزشتہ کئی سالوں سے مجھے آپ سے جو خاص تعلقِ خاطر رہا ہے، اس سے میں نے یہی اندازہ کیا ہے کہ آپ بے حد جذباتی انسان ہیں۔ عجیب شاہانہ مزاج پایا ہے آپ نے۔ وہی گہے بسلامے رنجیدہ گہے بدشنامے خورسند والی کیفیت ہے اور ایسے انسان میری بہت بڑی کمزوری ہیں۔ اسی لئے آپ کے اصرار کے پیشِ نظر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اس بار انٹرویو کی بجائے "شانِ نزول" پیش کر رہا ہوں۔ کہئے اب تو خوش ہیں نا آپ؟ لیکن خوش کیا آپ تو پہلے ہی سے خوش تر ہیں۔

آپ کا اپنا ——— نریش کمار شاد

ایک دن خان آرزو نے میر تقی میر کی موجودگی میں سودا کے اس مطلع کی بہت تعریف کی ؎

چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا
صبا نے آب کا تیغِ رواں سے کام لیا

تو میر نے تلملا کر فی الفور یہ مطلع موزوں کر دیا ؎

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

◆

شیخ قائم علی الموی، میرزا سودا کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہونے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میرزا نے تخلص دریافت کیا۔ شیخ صاحب نے بتایا کہ امیدوار۔ میرزا یہ سن کر زیرِ لب مسکرائے اور اسی وقت یہ شعر کہہ دیا ؎

ہے فیض سے کسی کے شجر ان کا باردار
اس واسطے کیا ہے تخلص امیدوار

◆

مولانا آزردہ ایک روز غالب کے مکان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ جلدی میں تھے اس لئے انھوں نے غالب کے یہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور کہاروں سے جلدی چلنے کی تاکید کر دی۔ جب کہار کندھا بدلنے لگے تو آزردہ نے انھیں کندھا بھی نہ بدلنے دیا۔ غالب یہ سب دیکھ رہے تھے۔ فوراً یہ شعر موزوں کیا اور کاغذ پر لکھ کر کسی کے ہاتھ مولانا آزردہ کو بھجوایا ؎

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

شعر پڑھ کر معذرت کے لئے آزردہ خود غالب کے پاس پہنچے۔

◆

ذوق دہلوی جسمانی نقاہت کی وجہ سے روزہ نہیں رکھتے تھے لیکن اتنی احتیاط ضرور کرتے تھے کہ کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہیں تھے۔ ایک بار رمضان کا مہینہ تھا اور شدت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ ملازم نے کوٹھے پر کٹورے میں گھول کر نیلوفر کا شربت تیار کیا اور ذوق صاحب کو اوپر تشریف لے جانے کے لئے کہا۔ ذوق اس وقت کچھ لکھنے پڑھنے میں مصروف تھے اور مولانا محمد حسین آزاد ان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ ذوق ملازم سے کہنے لگے کہ یہیں لے آ۔ اور آزاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "یہ تو ہمارے یار ہیں۔ ان سے کیا پردہ!" اور جب ملازم نے کٹورا لا کر پیش کیا تو ذوق نے فی البدیہہ یہ مطلع کہہ دیا ؎

پلا مے آشکارا ہم کو کس سے ساقیا چوری
خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگردوں میں ایک نوجوان بچپن سے ان سے شعر کہا کرتا تھا۔ اتفاق سے شاگرد [illegible] بچپن ہی سے [illegible] آرزو صاحب کے پاس نہ آسکا۔ [illegible] آرزو صاحب کو [illegible] کلام کا مندر کرنے کے بعد فوراً رخصت طلب کی [illegible] کر آرزو صاحب نے اسی وقت یہ شعر موزوں کیا اور اسے سنا دیا ؎

یہ تازہ [illegible] میں تم نہ تھا
کیا تم جوان ہوکے بڑے مرد ہوگئے

داغ دہلوی کو ایک بار ایک ایسی تصویر دکھائی گئی جس میں ایک پیکر ناز و ادا جانے کا قصد کر رہی ہے اور عاشق ایک ہاتھ سے اس کا دامن پکڑے ہوئے ہے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے دل کو تھام رہا ہے۔ داغ سے اس تصویر کے بارے میں کوئی شعر کہنے کی فرمائش کی گئی۔ داغ نے کچھ تامل کے بعد یہ مطلع موزوں کر دیا ؎

ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے
دل کو تھاما اُن کا دامن تھام کے

اکبر الٰہ آبادی خواجہ حسن نظامی کے ہاں مہمان تھے کہ ایک دن دو طوائفیں خواجہ صاحب سے تعویذ لینے کے لئے آئیں۔ جب وہ چلی گئیں تو اکبر نے یہ شعر موزوں کر کے خواجہ صاحب کی نذر کر دیا ؎

فقیروں کے گھروں میں لُطف کی راتیں بھی آتی ہیں
زیارت کے لئے اکثر مستانیں بھی آتی ہیں

سونی پت ضلع رہتک میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا جس میں دوسرے شعراء کے ساتھ قبلۂ رنداں حضرتِ جوش ملیح آبادی بھی مدعو تھے۔ وہاں سرکاری طور پر شراب نوشی کی ممانعت ہے۔ تلوک چند محروم جب اسٹیج پر اپنا کلام سنانے کے لئے آئے تو جوش صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "جوش صاحب اگر اجازت ہو تو غزل عرض کرنے سے پہلے ایک رباعی آپ کے متعلق سناؤں۔"

"ہاں ہاں ضرور" جوش صاحب نے گوش بر آواز ہوتے ہوئے کہا اور محروم صاحب نے اسی وقت کہی ہوئی اپنی یہ رباعی سنا دی ؎

جب آئے جناب جوش سونی پت میں
برپا ہوا اِک خروش سونی پت میں
ہوش اُن کے اُڑ گئے کہا جب اُن سے میں نے
ممنوع ہے نا نوشش سونی پت میں

جوش صاحب نے [illegible] کا انتظام [illegible] کر [illegible]
تھا کہ انھوں نے فی البدیہہ شعر پڑھ دیا ؎

کیوں اُن کے اُڑ گئے ہوش سونی پت میں
جو کرتے ہیں نا نوشش سونی پت میں

فراق گورکھپوری کا ایک محبوب بہت تلخ مزاج تھا۔ کسی ہنسی کی رنجش کے بعد انقطاعِ تعلق ہو گیا اور فراق صاحب کے دل پر کچھ ایسی چوٹ لگی جسے وہ خود ہی جان سکتے ہیں۔ ایک رات انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہی محبوب اُن کے پاؤں چوم رہا ہے اور اپنے رویے کے لئے معذرت طلب کر رہا ہے۔ بیدار ہوتے ہی اس خواب سے متاثر ہو کر فراق نے یہ شعر کہا ؎

اِس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے
کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی

۱۹۴۷ء میں جب پنجاب دو نیم ہو گیا اور پانچوں دریاؤں میں انسانی خون بھی مل گیا تو اس صورتِ حال نے جوش ملسیانی سے یہ شعر کہلوایا ؎

سازِ آزادی نے چھیڑا تھا جو نغمہ بزم میں
ہر زباں پر نوحۂ پنجاب ہو کر رہ گیا!

عندلیب شادانی نے ایک بار اپنے چند باذوق احباب کی محفل میں کہا کہ ہماری شاعری میں پرانے استاد اتنا کچھ کہہ گئے ہیں کہ اب شعر کہنے کے لئے تھوڑی سی موزونیٔ طبع اور قدرتِ بیان کے سوا کسی تیسری چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ کسی بھی خیال کو تقریباً تین منٹ کی کاوش کے بعد ہر بحر اور ہر زمین کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ یقین نہ ہو تو آپ کسی شاعر کا شعر سنائیے۔ میں ذرا سے تغیر کے ساتھ جس بحر اور زمین میں آپ کہیں گے شعر کہہ کر دکھا دوں گا۔ ایک صاحب جو مرزا غالب کے بہت مداح تھے رشک کر کہنے لگے۔ اگر یہ بات ہے تو غالب کے اس شعر کو اسی وزن اور زمین میں کہہ کر دکھائیے ؎

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

عندلیب صاحب نے چند لمحوں تک فکر کرنے کے بعد کہا ——— بلکہ اسی قافیہ میں سنئے ؎

پرتوِ مہر سے ذرّے میں چمک آتی ہے
سامنے تم ہو تو پیارے مرا حال اچھا ہے

ایک صاحب نے کہا عندلیب صاحب آپ کے شعروں میں جدت ہی جدت ہے،
پہلے مصرعے کا سال خراب کر رہی ہے، ذرا مومن کے اس شعر کا حلیہ بدل کر دکھائیے ؎

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

عندلیب صاحب تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے ـــــ لیجیے جناب ؎

دل کے ہر قطرے میں آسودہ ہے اک مہرِ جہاں
مشرقی ہم نہ سہی اے مہِ کنعاں ہوں گے

اس کے بعد ایک اور صاحب نے کہا کہ اچھا غالب کے اس مطلع کی ہیئت بگاڑ کر دکھائیے ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

عندلیب صاحب نے کچھ تامل کے بعد کہا ؎

یہ کس خورشید کے پرتو سے ہر ذرہ چمک اٹھا
کہ میرے غم کدے میں آج عالم ہے چراغاں کا

بمبئی کے ایک جلسے میں ملک راج آنند نے بہت طویل تقریر شروع کر رکھی تھی۔ سامعین میں اسرار الحق مجاز بھی موجود تھے اور تقریر سنتے سنتے کافی بیزار ہو گئے تھے۔ آنند کی تقریر کے بعد مجروح سلطان پوری سے غزل سنانے کی فرمائش کی گئی اور مجروح نے اپنی رسیلی آواز میں اپنی وہ مشہور غزل سنائی جس کا مطلع ہے ؎

جو سمجھاتے بھی آکر واعظِ برہم تو کیا کرتے
ہم اِس دنیا کے آگے اُس جہاں کا غم تو کیا کرتے

لیکن مجروح کی خوش الحانی بھی مجاز کی ذہنی فضا کو پورے طور پر نہ بدل سکی اور غزل ختم ہونے کے بعد وہ تڑپ کر اُٹھے اور مائک کے سامنے آکر کہنے لگے ؎

یہاں تو ملک راج آنند ہی نے بور کر ڈالا
اگر ایسے میں ہوتے قائدِ اعظم تو کیا کرتے

سلام مچھلی شہری اردو بازار دہلی کے آزاد ہند ہوٹل میں تنِ تنہا بیٹھے چراغ بادہ روشن کیے ہوئے تھے کہ دفعتاً آسمان پر گھنگھور گھٹا چھا گئی۔ سلام صاحب نے یہ منظر دیکھا تو اپنا جام لہراتے ہوئے بے اختیار یہ مصرع موزوں کر دیا ؎

گھٹا اٹھی تو میں جام شراب لے کے اٹھا

چند لمحوں تک اس مصرع کو گنگنانے کے بعد انھوں نے پہلا مصرع بھی موزوں کر کے شعر مکمل کر دیا ؎

حسین فضا کا حسین تر جواب لے کے اٹھا
گھٹا اٹھی تو میں جام شراب لے کے اٹھا

جوش ملیح آبادی نے ملحد ہونے کے باوجود جب یہ شعر لکھا ؎

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

تو نصرت قریشی نے اِس شعر کے جواب میں کہا ؎

اگر سحر سے کسی کو ثبوتِ حق بھی ملے
سحر سحر ہے خدا کی قسم رسول نہیں

کسی مشاعرے میں مرحوم ادیب سہارن پوری لہک لہک کر اپنی غزل سنا رہے تھے ؎

باندھ کر عہدِ وفا جو گیا ہے کوئی
اے مری عمرِ رواں اور ذرا آہستہ

مشاعرے کا پنڈال واہ واہ کی صداؤں سے گونج رہا تھا۔ ادیب صاحب غزل پڑھ چکے تو ماہر القادری نے اسی وقت یہ شعر موزوں کر دیا ؎

سکھ بھی بیٹھے ہیں تری بزم میں او مستِ شباب
چھوڑ سگرٹ کا دھواں اور ذرا آہستہ

بسمل سعیدی ٹونکی سے پہلی بار میں نے کسی جدید ایرانی شاعر کا یہ شعر سنا تھا ؎

چگونہ مردمِ آگاہ شادماں باشند
کہ شادمانیٔ ہر کس بقدرِ غفلتِ اوست

اِس شعر نے بہت دنوں تک مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ آخر اسی تاثر نے مجھ سے یہ قطعہ کہلوا لیا ؎

جب یہ پوچھا گیا مسرت سے
تیرا مسکن کہاں ہے اے پیاری؟
ہنس کے بولی کہ اُن دماغوں میں
جو ہیں گہرے شعور سے عاری

مدیر بیسویں صدی کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی فوراً تعمیل ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔



اقتصادیات..... اور فیملی پلاننگ

ہاں! اقتصادیات کا ہماری زندگی میں بڑا دخل ہے۔ ہم میں سے بیشتر کی آمدنی محدود ہوتی ہے۔ اسی آمدنی سے گھر بھر کے سبھی لوگوں کے لئے ڈھنگ سے رہنے سہنے، کھانے پینے اور پہننے کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ تعلیم اور تفریح کے اخراجات بھی اسی آمدنی سے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ اور اگر ہو سکے تو تھوڑی بہت بچت بھی کرنا ہوتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے کنبے بڑے ہوتے ہیں، آمدنی زیادہ لوگوں میں بٹ جاتی ہے اور اس طرح ہر شخص کا حصہ نسبتاً گھٹ جاتا ہے۔

چنانچہ، سمجھدار ماں باپ ہمیشہ یہی چاہتے اور فیصلہ کرتے ہیں کہ ان کے اتنے ہی بچے ہوں جن کی پرورش وہ ٹھیک ڈھنگ سے کر سکتے ہیں۔ بچوں کو تعلیم دی جانی چاہیئے! انہیں خوراک اچھی اور مناسب مقدار میں ملنی چاہیئے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے رہن سہن کے حالات بہتر اور صحت مندانہ ہوں۔

کنبے کو محدود بنانے کے لئے آپ معلومات اور مشورہ مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ کسی قریبی فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹر میں تشریف لائیں۔

یاد رکھئے چھوٹا کنبہ — سکھی کنبہ ہوتا ہے

افسانہ

آنسو

محمد حبیب رضا، بی۔ اے
ڈیپارٹمنٹ آف اُردو، جموں و کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سری نگر ۳

۵ مئی ۱۹۶۵ء

قبلۂ محترم! عقیدت و احترام

پہلی بار "بیسویں صدی" کی بزم میں شامل ہونے کی جسارت کر رہا ہوں ـــــ آپ کی شخصیت اور "بیسویں صدی" سے میں کچھ اتنا مرعوب ہوں کہ کہانی کے متعلق کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں ہو رہی ہے ـــــ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے محترم و محبوب پروفیسر ڈاکٹر شکیل صاحب کے ساتھ ساتھ آپ کی سرپرستی بھی حاصل ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ سب کچھ حاصل ہو گیا ـــــ نہیں تو ... !؟ یہاں میری سوچ رُک جاتی ہے ...

نیاز مند ـــــ محمد حبیب رضا

ڈاکٹر زبیدہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی۔ کانپتی ہوئی انگلیوں سے پردہ ذرا سا کھسکایا، برفانی ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا، باہر رِم جھم بارش ہو رہی تھی، ہوا کے جھونکے نے اُس کے چہرے کی حدت کو بڑھا دیا اور وہ مضطرب نگاہوں سے دور ایک بجلی کے کھمبے کی طرف دیکھنے لگی، جس پر فکر اور سوچ کے لمحات میں، کھڑکی میں آتے ہی اُس کی نظریں اکثر مرکوز ہو جایا کرتی تھیں اور جو ہر بار اُسے پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ مستحکم اور باوقار نظر آیا کرتا تھا۔

"ہاں تو صاحب! سنایئے طبیعت کیسی ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب! بہت خراب ہے۔ کلاس میں بہت ہنسی آتی ہے۔"

پچاس سال کا بوڑھا عیسائی ڈاکٹر مسکرایا۔

"اور کلاس سے باہر؟"

"کوشش کے باوجود نہیں آتی!"

"ونڈرفُل! ـــــ ونڈرفُل!!"

"ونڈرفُل نہیں ڈاکٹر صاحب! ـــــ ٹیریبل (Terrible) کہئے، ٹیریبل!! ـــــ اور پھر ایک بیماری ہوتی تو کوئی بات بھی تھی۔ یہاں تو معاملہ چار پانچ کا ہے آج کل!!"

فرصت کے چند لمحات ملے تھے ڈاکٹر کو۔ اِسی لئے چہرے پر شگفتگی چھائی ہوئی تھی اور وہ فقیر کی باتوں سے دل بہلا رہا تھا۔

"کسی وقت مجھ پر ایسا جنون سوار ہو جاتا ہے کہ میں اپنے کمرے ہی میں ٹویسٹ ڈانس کرنے لگتا ہوں۔ کھانے کے وقت اتنی کھانسی آتی ہے کہ کھانے سے رہ جاتا ہوں۔"

وہ معصوم انداز میں انگلیوں کی پوروں پر اپنی نامعلوم بیماریوں کی فہرست گنانے لگا اور ڈاکٹر زور زور سے قہقہے لگانے لگا حالانکہ زبیدہ اُس کے ان سپاٹ قہقہوں پر بہت جھنجلائی۔

"سنجیدہ بن گیا تو پتھر کا بُت۔ ذرا سا موڈ بنا تو آٹھ نو سال کا بچہ! کوئی سوجھ بوجھ ہی نہیں۔ کہیں ایسے آدمیوں کو بھی اس طرح لفٹ دیتے ہیں کچھ نہیں، تو کم از کم اپنی یا دوسرے کی پوزیشن کا خیال تو رکھا جائے۔ پتہ نہیں اس میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ اس کی کسی بھی بات کا بُرا نہیں مانا جاتا اور ہر شرارت کو ہنسی میں ٹال دیا جاتا ہے۔"

زبیدہ نئی نئی آئی تھی اِس ہیلتھ سینٹر میں اور اِس تھوڑی ہی سی مدت میں اِس کے متعلق بہت سی افواہیں پھیل گئی تھیں۔

"بہت مغرور ہے، بہت تلخ مزاج ہے۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔ اپنی خوبصورتی پر حد سے زیادہ ناز ہے۔ ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتی۔ ڈاکٹری کے چار حرف پڑھ کر اپنے کو لقمان سمجھنے لگی ہے!"

شام کے سُرمئی دھندلکوں نے کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سردی

[illegible] گئی تھی۔

اس نے کمرے کے [illegible] کرسی پر بیٹھ کر [illegible] کافی بہت گرم تھی [illegible] وہ چاہے گھونٹ [illegible] کرسی کی پشت پر سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔

دستک [illegible] تیز ہو گئی۔

"ذرا دیکھو تو کون ہے؟"

دایہ نے دروازہ کھولا ——— اور آ کر اطلاع دی۔

"قیصر میاں ہیں!"

"جا کر کہہ دو کہ اجازت نہیں۔ دو بج چکے ہیں!"

دایہ واپس چلی گئی اور زبیدہ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ لئے۔

- اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہیں بھلائی سے یاد کریں تو دوسروں کو برا نہ کہو۔ اگر تم خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوش دیکھ کر حسد نہ کرو۔ (جگت کبیر)
- اچھی زندگی وہ ہے جو دوسروں کے کام آئے جب خدمت کی طاقت نہ رہے تو مر جانا اچھا ہے۔ (ہندی ادب)
- گھر میں سکھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ دکھ میں شاید حاصل ہو سکتا ہے یہی سوچ کر میں نے تاج و تخت اور عیش و آرام تیاگ کر گھر چھوڑا۔ (مہاتما بدھ)
- جب انسان خدا سے دور ہو جاتا ہے تو نہ اس کے دل کو سکون حاصل ہوتا ہے نہ راحت۔ (رابندر ناتھ ٹیگور)
- مالک گھر کا سب سے بڑا خادم ہوتا ہے۔ (بھرتری ہری)

ڈاکٹر جوزف سب لونٹ پہ چلے گئے تھے کیونکہ دو بجے کے بعد اُن کی ڈیوٹی وہیں لگ جاتی تھی۔

دستک بدستور جاری رہی بلکہ اب اور تیز ہو گئی۔

وہ دروازے پر جھپٹ گئی اور دروازہ کھولتے ہی گرجنے لگی۔

"آپ جانتے ہیں یہ ہسپتال ہے، کباڑ خانہ نہیں۔ کوئی اٹیکیٹ ہی نہیں آپ کو۔ دو بجے کے بعد اجازت نہیں دی جاتی، آپ تشریف لے جائیے۔"

جھکا ہوا سر اٹھ گیا معصوم سی نظریں زبیدہ کی نظروں سے ٹکرائیں۔

"اب اندر آ سکتا ہوں؟"

"جی!!؟" وہ بوکھلا گئی۔

وہ معصوم اور شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس نے نظریں اٹھا کر [illegible]

قیصر اس کے پیچھے چلا آیا [illegible] بیٹھ گئی۔

وہی شان اور وہی تمکنت!!

"کیا بیماری ہے آپ کو؟" اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"ٹی، بی!!"

"جی!!؟"

"ٹی، بی ہو گئی ہے مجھے!" اس کے لہجے میں درد تھا لیکن زبیدہ اس کے فاسفیٹ، صحت مند جسم، چوڑے چکلے سینے اور بھرے بھرے بازوؤں کو دیکھ رہی تھی۔

وہ حیران تھی!

وہ کھانسنے لگا تو وہ چونک پڑی۔

"کیسے معلوم ہوا آپ کو کہ ٹی بی ہے؟" وہ قدرے نرم پڑ گئی۔

"خون تھوکتا ہوں صبح صبح!!"

واقعی حیرت کی بات تھی۔ زبیدہ کیا ہسپتال کا سارا اسٹاف حیرت میں پڑ گیا۔ قیصر کو اب وہاں کون نہیں جانتا تھا۔ وہ روز نت نئی بیماریوں کی فہرست لے کر آ دھمکتا لیکن وہ ایسی بیماریاں ہوا کرتی تھیں جن پر خوف نہیں، خوشی ظاہر کی جاتی تھی۔ رویا نہیں ہنسا جاتا تھا۔

زبیدہ اسٹیتھسکوپ لے کر اٹھی اور اس نے قمیص کے بٹن کھول دیئے۔ چوڑی چکلی چھاتی ننگی ہو گئی اور سیاہ ملائم بال جیسے اس کا منہ چڑانے لگے۔ وہ گھبرا سی گئی اور اس کے شانوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

مضبوط اور توانا بھرے بھرے شانے تھے!!

اس نے اسٹیتھسکوپ چھوڑ دیا۔ کرسی پر بیٹھ گئی اور سفید شفاف رومال میں ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کے ننھے ننھے قطرے جذب کرتے ہوئے اس نے کمپاؤنڈر کو بلایا۔

کچھ دیر کے بعد اس کا ایکسرے لیا گیا۔

"یہ لیبارٹری کو بھیجنا پڑے گا۔ آپ کل آئیے۔" اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ آواز میں ذرا سی نرمی اور لرزش تھی۔

قیصر خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کمرے سے نکلا۔

دوسرے دن وہ نہیں آیا تیسرے دن بھی نہیں اور زبیدہ تیلاتی رہی کہ اس نے اس کے ساتھ مذاق کرنے کی جرأت کیسے کی ——— اسی بات پر ڈاکٹر جوزف سے بھی لڑائی ہوئی۔

چوتھے دن وہ آیا تو ڈاکٹر جوزف موجود تھے قیصر کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"تم نے کیوں تم نے انھیں پریشان کیوں کیا؟"
نوکر تھوڑی دیر چپ رہا اور اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگا۔
"ڈاکٹر صاحب یہ ۔۔۔۔۔۔ وہ ۔۔۔۔۔۔ بیگم صاحبہ بہت بدقسمت ہیں میں کہتا تھا کہ
ڈاکٹر صاحب کو بلا لوں۔ لیکن وہ کہتی تھیں نہیں۔ ڈاکٹر صاحب ابھی تو بہت گھبرا اٹھتے
اس نے آنکھیں بند کر کے زبیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
وہ جل بھن کر رہ گئی۔
"لیکن وہ اصل کی ہی نہیں ہونے دیتے۔ وہ انسوں سے خون آتا ہے۔"
زبیدہ نے خاموشی میں ہی رخ پھیر لیا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔
اندھیرا کب کا پھیل چکا تھا۔ تاریک کمرے میں لگا ہوا لیمپ روشن ہو گیا تھا۔
لیکن وہ ابھی تک آنکھیں بند کئے ہوئے کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی بھویں اور
پیشانی سکڑ گئے تھے غصہ اور حیرت اضطراب کی حد تک پہنچ چکا تھا۔
"کھانا بھجوا دوں بیگم جی؟" نوکر نے دروازے میں کھڑے ہو کر پوچھا۔
اس نے آنکھیں کھول دیں۔
"تم لوگ کھا لو۔ مجھے بھوک نہیں۔ میرے لئے صرف چائے کی ایک پیالی لے آؤ۔"
نوکر چلا گیا اور وہ سردی کے احساس سے آتش دان کے قریب کرسی ڈال کر
بیٹھ گئی۔
نوکر نے چائے کی ایک پیالی لا کر پاس ہی رکھ دی اور آتش دان میں لکڑیاں ڈال کر
پھونکنے لگا۔
شعلے بلند ہوئے اور لکڑیوں کو اپنی لپیٹ میں لینے لگے۔
اس نے شال اپنے ارد گرد لپیٹ لی اور چائے کی چسکیاں لینے لگی۔
وہ اسی کمرے میں بیٹھی تھی۔
دروازے سے لگی ہوئی کال بیل چیخ اٹھی اور نوکر نے آکر اطلاع دی کہ کوئی قیصر میاں
ہیں، سر میں تکلیف ہے اس لئے ملنا چاہتے ہیں۔
وہ جھنجلاتی، کھڑی ہوئی۔ اور کھڑکی کے شیشے میں سے جھانکا۔
وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے ہوئے باغیچے میں ایک درخت کے سہارے کھڑا تھا۔
آنکھیں بجھی بجھی سی اور چہرہ اترا اترا سا تھا۔ زبیدہ نے منہ پھیر لیا۔ اس کے چہرے پر غصے کی
ایک لہر سی دوڑ گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ جانے کس احساس سے عجیب سی نظروں سے وہ نوکر
کی طرف دیکھنے لگی اور پتہ نہیں نوکر کیا سمجھ کر واپس چلا گیا۔
وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔
دروازے کا پردہ ہلا اور قیصر آداب کہتے ہوئے داخل ہوا۔
اس کی طبیعت واقعی خراب تھی۔ وہ بول بھی نہ سکتا تھا۔ لہجے میں لکنت تھی۔ چہرہ
زرد تھا اور تکلیف کی شدت سے آنکھوں میں آنسوؤں کے چند قطرے جمع ہو گئے تھے۔
زبیدہ خاموشی سے اٹھی اور کمرے سے باہر آئی۔ نوکر کو کچھ ہدایت دے کر اس کے ہاتھ
میں تیل کی شیشی تھما دی اور پھر دوا کی دو ٹکیاں اور چائے کی ایک پیالی بھیج دی۔
اس نے دوا نگل لی لیکن چائے پینے سے انکار کر دیا۔
نوکر سر میں تیل ڈال کر مالش کرتا رہا۔
اس پر غنودگی چھانے لگی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ نیند کی دیوی اسے اپنی آغوش
میں لینے کی کوشش کر رہی تھی۔
وہ سو گیا!!
نوکر چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد جب زبیدہ کمرے میں آئی تو اسے اطمینان سے
سوتا دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

- اگر تم تیس برس میں طاقت ور اور چالیس برس میں عقلمند نہیں بنے تو اب کبھی طاقت ور اور عقلمند بننے کی امید نہ رکھو۔ (ڈاکٹر جانسن)
- نوکروں سے کہیں زیادہ پالتو جانوروں پر توجہ کی جاتی ہے حالانکہ نوکر ان جانوروں سے کہیں زیادہ سود مند ہوتے ہیں۔ (برنارڈ شا)
- ہم اُن لوگوں کو زیادہ چاہتے ہیں جن پر ہم نے احسان کیا ہے۔ بہ نسبت ان لوگوں کے جو ہم پر احسان کرتے ہیں۔ (الیگزاندر سی مٹکی)
- شادی کا مطلب ایک دوسرے کے جسم پر حکومت کرنا نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک کی کمی دوسرے سے پوری ہو۔ (سیموئیل)
- گناہوں کی تاریکیوں میں نیکی ضیاپاشی کرتی ہے۔ (شیکسپیئر)

"اونہہ ۔۔۔۔۔۔ بدتمیز ۔۔۔۔۔۔ جنگلی ۔۔۔۔۔۔ تھوڑی سی نرمی دکھائی تو بس چڑھ گیا سر!!"
وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور حقارت سے بھر پور ایک نظر اس پر ڈالی۔
وہ نیند ہی میں سردی کی وجہ سے اپنا جسم سمیٹ رہا تھا۔
زبیدہ کے چہرے پر نرمی سی آگئی۔ کرسی سے کھڑی ہو گئی اور دوسرے ہی لمحہ
اس کے جسم کو شال سے ڈھانپ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔
کچھ لمحے!
کچھ منٹ!! ۔۔۔۔۔۔ اور تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا۔
وہ کمرے میں آنے کے لئے ابھی دروازہ ہی پار کر رہی تھی کہ قیصر اپنی آنکھیں
ملنے لگا۔ پھر دو تین جمائیاں لیں اور زبیدہ کے کھنکھارنے پر چونک پڑا۔ ادھر دیکھا تو
ٹھٹک سا گیا۔

[illegible]

کیا شان سے اعلان ہو رہا تھا جیالا!!

قیصر نے اپنا بکس اٹھایا جو ابھی تک پڑا تھا، شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔

اور زبیدہ خاموش نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی۔

کافی کی پیالی ختم ہو چکی تھی۔ شال اُس کے سینے سے ڈھلک گئی تھی شانے تھم گئے تھے اور انگلیاں دیر تک ملتے تھے۔ اُس نے دائیں پیر سے لکڑیوں کے چند ایک ٹکڑے سمیٹنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔

رات سرک رہی تھی۔

نوکر چاکر ابھی اپنی کوٹھریوں میں جا کر سو گئے تھے۔ وہ اکیلی جاگ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔

"بس اُس دن کی ذرا سی نرمی نے اُس کی ہمت بڑھا دی اور وہ اُس کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگا۔ اب تقریباً روز ہی تو آتا ہے۔ کمبخت! ہر بار کوئی نہ کوئی شرارت کرتا ہے۔ لیکن اب ــــ ڈاکٹر برداشت کرے یا نہ کرے۔ لیکن میں ــــ بدتمیز ــــ کمینہ ــــ لفنگا!

اُس کی آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگی۔

"اب کی کوئی شرارت کی تو ایسی جوتیاں ماروں گی کہ عمر بھر یاد کرے گا۔"

اس فیصلے سے وہ مطمئن سی ہو گئی۔

اُسے جمائیاں آنے لگیں اور وہ پلنگ کی طرف بڑھ گئی۔

وقت کا پنچھی اُڑتا گیا۔

لیکن وہ نہ آیا۔ شاید امتحانات میں مصروف تھا۔

زبیدہ کی سختی میں نرمی آتی گئی۔ پرانے فیصلے میں پہلے ترمیم اور پھر تبدیلی آتی گئی۔

اور وہ کسی حد تک اُسے بھول گئی!!

وہ ہسپتال میں بیٹھی جھکی ہوئی تھی کہ باہر سے کراہنے کی دردبھری آوازیں آنے لگیں۔

وہ چونک سی پڑی۔ چہرے پر سختی آ گئی۔

"قیصر میاں کسی شدید بیماری سے تڑپ رہے ہیں!" دایہ نے سامنے آکر کہا۔

"شدید!" وہ سوچ میں ڈوب گئی پھر جھنجھلا کر بولی ــــ "تو تڑپنے دو۔ میں کیا کروں؟"

"جاؤ بولو کہ ڈاکٹر صاحب سب ایٹ پر چلے گئے ہیں۔"

"لیکن ــــ!"

"لیکن کیا؟" وہ کرسی سے کھڑی ہو کر گرج اٹھی اور دایہ کانپنے لگی۔

طبیعت سے کوئی سختی ہو گئی تھی۔ بے چین ہو کے جاتے ہوئے اس نے گھڑی کی طرف ایک نظر ڈالی۔ "جلدی۔ جلدی سے بلاؤ۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

دایہ دروازے کی طرف لپکی اور وہ آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اُف!" قیصر دونوں ہاتھوں سے دل کو تھامے کراہ رہا تھا۔

زبیدہ نے ایک اچٹتی سی نگاہ اُس پر ڈالی۔

وہ تکلیف کی شدت سے بے قرار اور بے چین ہوا جا رہا تھا۔ کراہوں میں کچھ عجیب درد پنہاں تھا۔

زبیدہ کو احساسِ فرض نے چونکا دیا۔

اُس نے اُٹھ کے سہارا لے کر اسٹیتھسکوپ سنبھالا۔

"دکھائیے تکلیف کس جگہ ہے؟" اُس نے نخوت سے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحبہ!" آواز گلوگیر اور نحیف سی تھی۔ "یہاں دل کی جگہ ــــ بہت تکلیف ہے ــــ جو ــــ جلن ہے، تڑپ ہے ــــ پتہ نہیں ــــ کیا ہونے والا ہے ــــ میں ــــ میں ــــ شاید مر جاؤں گا۔"

"آپ ہاتھ تو ہٹائیے۔" آواز میں ذرا نرمی تھی۔

"اُف! ــــ ہٹائے نہیں ــــ جاتے ــــ درد ہے ــــ شدید ــــ درد ہے!"

"لیکن ہاتھ ہٹائے بغیر کیسے معائنہ کیا جا سکے گا؟" اُس نے اُس کے دونوں ہاتھ ہٹا کر جو اپنا ہاتھ اُس کے دل پر رکھا تو قیصر نے کراہتے ہوئے ــــ مر گیا!! کہہ کر اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ کچھ اس مضبوطی سے کہ زبیدہ صرف کسمساتی رہی۔

"میرے خدا!" اب آواز بہت کمزور تھی ــــ "ڈاکٹر صاحبہ مجھے دل کی بیماری ہے۔" زبیدہ کے ہاتھ کو دباتے ہوئے قیصر نے کراہتے ہوئے کہا۔

زبیدہ کا چہرہ نسوانی شرم و حیا سے سُرخ ہو گیا تھا۔ اب رنگ پیلا ہونے لگا۔ جھکا ہوا سر اُٹھ گیا۔ سنجیدگی طاری ہو گئی۔

"میرا ہاتھ دبانے سے شاید آپ کے درد میں کچھ کمی ہو گئی ہو گی!" لہجہ طنز اور حقارت سے بھرپور تھا۔

قیصر سٹپٹایا۔ ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور زبیدہ ہاتھ چھڑا کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

دوسرے ہی لمحہ "چٹاخ" کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا۔

قیصر سر جھکائے گال سہلا رہا تھا اور زبیدہ کی آنکھوں میں شرارے ناچ رہے تھے۔

پھر سناٹا چھا گیا۔ گہرا سکوت ــــ اور چند لمحے گزر گئے۔

"میں نے غلطی کی۔ اس کے عوض سزا ملی۔ میں خوش ہوں۔" اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ "لیکن مجھے تم سے..." اُس کا گلا رُندھ گیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ڈھلک گئے اور وہ کچھ اور کہے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

[illegible] اس نے تیز کر بات [illegible]

وہ عجیب سی [illegible] کر بیٹھ گئی۔

[illegible]۔ دل کی بیماری [illegible] آرہی ہے؟"

میز پر رکھا ہوا پانی کا گلاس اُس نے غٹ غٹا کر پی لیا اور اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

لمحات سرکتے گئے اور دن گزرتے گئے۔

کل اُسے چھٹی پر جانا تھا اور وہ دایہ کو ہدایت دے رہی تھی۔

"میں نے کتابوں کے لئے لکھا تھا۔ وہ کل یا پرسوں پہنچ جائیں گی۔ کل میں یہاں نہیں ہوں گی۔ میں روپے رکھے دیتی ہوں۔ کل پہنچا تو تم پارسل چھڑا لینا اور ہاں کوئی خط وغیرہ ہو تو اپنے پاس سنبھال کر رکھ لینا۔"

"مس صاحب! — وہ — وہ — مجھے یاد نہیں رہا۔" وہ دروازے کی طرف گئی اور دوسرے ہی لمحے نیلے رنگ کا ایک لفافہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

"قیصر میاں پرسوں دے کر چلے گئے تھے۔"

قیصر کا نام سن کر ہی زبیدہ چونک پڑی اور پھر بپھری ہوئی ناگن کی طرح بل کھانے لگی۔

"چڑیل! — بے شرم!! — تمہیں شرم نہیں آتی!" اُس نے لفافے کے دو ٹکڑے کرکے پھینک دیے۔

دایہ تھر تھر کانپنے لگی۔

"مس صاحب! میں بے قصور ہوں۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے معاف کر دیجیے۔" اُس نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔

زبیدہ نے پاؤں چھڑا لیا اور تلملاتی ہوئی جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ دایہ سہمی ہوئی کانپتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

لمحے گزرتے گئے ——

ماتھے پر شکنیں ایک ایک کرکے غائب ہوتی گئیں اور نامعلوم جذبے ابھرنے لگے۔ آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔

اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے زبیدہ نے لفافے کے دونوں ٹکڑے پرس میں سمیٹ لئے اور کل کے لئے رخصت کی درخواست لکھ کر دفتر سے چلی گئی۔

راستہ بے قراری ہی میں طے کیا۔

عجیب سا تجسس اُس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچ گئی ——

بے چینی اور بے قراری انتہا پر پہنچ گئی تھی۔ خط کے نیلے سبز رنگ کے دونوں ٹکڑوں کو کرسی پر بیٹھ کر ملایا اور مضطرب نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"زبیدہ ڈیئر!

تمہاری قربت کے چند لمحات کی یادیں دل میں لئے اپنے وطن جا رہا ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ چاہ کے بدلے چاہ ملے۔ میں بھی چاہتا تھا لیکن دل کی وہ چاہ سسکتی ہوئی دم توڑ گئی۔ اب صرف تمہارے نام کے سہارے میرے دل کی دھڑکنیں زندہ رہیں گی۔

میں نے تمہیں چاہا تو تم نے ایک ایسا درد عطا کیا جو میری رگ رگ میں سما گیا۔ خدا کرے یہی درد ایک ناسور بن جائے اور زندگی بھر رِستا رہے اور میں اسی درد کے سہارے تصورات میں تمہاری یاد اور سانسوں میں تمہاری خوشبو لے کر جیتا رہوں، تڑپتا رہوں اور مرتا رہوں — —!!

بدنصیب —— قیصر

رات بہت گزر چکی تھی!

اور وہ جب سے اس کھڑکی میں کھڑی تھی۔ نظریں بجلی کے کھمبے اور اُس کے ساتھ لٹکے ہوئے لیمپ پر لگی ہوئی تھیں۔ ساری کائنات تاریکی میں چھپی ہوئی تھی، ایک خاموشی تھی، سناٹا تھا۔ پُراسرار سناٹا۔ درد سے بھرا سناٹا۔ بے قرار سا سناٹا۔ بے چین سا سناٹا۔ اور اسی سناٹے میں تار کا کھمبا اُسے اُداس سا، مایوس سا، تنہا اور اکیلا سا محسوس ہوا۔

اُس کے ہونٹ جذبات سے مغلوب ہو کر کانپنے لگے۔ شدت سے کانپنے لگے۔

اور ——!؟

اور ایک لرزتا ہوا آنسو اُس کی آنکھوں سے گر پڑا!!

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دئے جاتے ہیں۔ مضامین کے خاتمہ پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نوآموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں انہیں واپس کر دئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (ایڈیٹر)

روزے گلے پڑے

——— پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی۔ ایم، اے

[illegible] پہاڑی بھوجلہ۔ دہلی

۱۵ جون ۱۹۵۵ء　　　　خوشتر گرامی صاحب!

صاحب، ہندوستان سے چلا گیا مگر اس کے مصاحبین ابھی تک اُس کی زبان کھینچ رہے ہیں۔ ہندوستان میں اب اگر کوئی کام کی چیز رہ گئی ہے تو وہ صرف مرحوم کی زبان ہے لیکن کچھ لوگ اُس کی زبان کو بھی ہڑپ کرنے کی فکر میں لگے ہیں۔ آج کل تم زبان کی خدمت میں لگے ہوئے ہو اس لیے تمہیں لکھ رہا ہوں۔ خدا جانتا ہے لکھنؤ میں اس وقت وہ گرمی پڑ رہی ہے کہ یہاں کے کانگریسی اپنے اپنے اختلافات تک بھول گئے ہیں!

چناں قحط سالے شد اندر دمشق　　　کہ یاراں فراموش کردند عشق

یو۔پی کے کانگریسیوں میں جو کرسیوں اور عہدوں سے عشق چل رہا ہے، وہ دمشق کے رہنے والوں کے عشق سے کم نہیں! ———

ع　ہے وہی ذکر مگر دوسرے انداز میں ہے

وہاں اس نے محبت کی شکل اختیار کر کے جذبات پر ڈاکے ڈالنا شروع کر دیئے تھے، یہاں [illegible] نے عہدوں کی شکل اختیار کر لی ہے وہاں فاقوں نے عشاق کے ہوش گم کر دیئے تھے، یہاں گرمی نے سیاسی پہلوانوں کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے ——— تمہارا مضمون خود انسان بھی میری نظر سے نہیں گزرا۔ [illegible] کر تم نے اپنے مضمون مکمل کیا ہے ——— تمہارے [illegible] سو برس بعد اردو ادب میں شامل کیا جائے گا تو لوگ حیران ہو کر رہ جائیں گے کہ [illegible] پیدا ہو گیا۔ کس درجہ سب الگ مزاح [illegible] لکھتے ہیں۔ دورِ حاضر کے تمام مزاح نگاروں کی طرف سے [illegible] ——— افسانہ نمبر مل گیا۔ آپ کا فرمائشی خط بھی [illegible] اگر گردش [illegible] آمد و رفت بند ہو جائے کیسے کیسے [illegible] نکالتے ہو! اچھا ہوا کہ تم نے گھر میں بچہ کشی کا سلسلہ بند کر دیا ورنہ سال میں دو دو نمبر [illegible] کے پیدا کرنے سے محروم ہو جاتے۔ تمام مضامین سوائے اپنے مضمون کے مجھے بے حد پسند آئے ——— تم نے افسانہ نمبر میں ایک تصویر تو ایسی چھاپ دی ہے جسے دیکھ کر [illegible] دینے کو دل چاہتا ہے۔ تمہارے تیر و نشتر سے لے کر فکر تونسوی تک جتنے مضامین چلے گئے ہیں وہ سب ہی اچھے ہیں۔ [illegible] دیکھا کہ مجھے ان کے صاحبِ اولاد ہونے پر فخر ہو گیا ——— یہاں آم اس درجہ گراں ہے کہ اس کی گرانی دیکھ کر مرکزی اور صوبائی وزراء کی ارزانی اور زیادتی میں پناہ لینے کو دل چاہتا ہے۔ اس سے زیادہ میں تمہیں اور کیا بتا سکتا ہوں کہ خدا کرے آئندہ وزارت میں تمہیں کسی شعبہ کی وزارت مل جائے ——— [illegible] استعمال [illegible] تندرست ہوں کہ اگر کوئی وزیر مجھ کو دیکھ پاتے تو اپنے جسم پر چڑھی ہوئی [illegible] لگے!...

مخلص ——— فرقت کاکوروی

[illegible] تو روتے رہے [illegible] ہیں ہمارے ایک عزیز دوست کے

والد کا بھی انتقال ہو گیا اور ہمیں بحیثیت اپنے دوست کے اُن کی تعزیت ہی کو جانا تھا بلکہ ہمارے اخلاص اور اُن کے والد کی اُس رواداری کے اپنے دوست سے لپٹ کر دہاڑیں مار مار کر رونا بھی تھا تاکہ ہمارے دوست کو یقین ہو جائے کہ رونے والا صاحب حیثیت اُنہیں کے والد نہ تھے بلکہ تقریباً ہمارے دوست شریکِ والد [illegible] تھے۔

ہمارے رونے کو یا شاء اللہ [illegible] رو لیا ہے۔ ایک معمولی سے لے کر انتہائی الحروف تک میں اللہ تعالیٰ [illegible] رونے کی صلاحیتیں بخشی ہیں لیکن ہمارے رونے میں اگر کوئی خامی تھی تو وہ آنسو تھی۔ مقصد یہ کہ ہم آنسو بہانے پر بالکل قادر نہ تھے۔ دوسرے تحت اللفظ روتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ گئے بیاں تک کے ترنم سے رونے کو برداشت کرنے کو تیار تھے لیکن ہمارا آنسو آنسو رونا بھی کسی کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا چنانچہ والد محترم کی لاش پر ہم نے اپنے دوست کو دیکھتے ہی تنتے پھلا کر تحت اللفظ میں رونے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ہمارے دوست نے کچھ ایسی غیر آلود نگاہ سے ہم کو دیکھا جیسے وہ کہہ رہے ہیں کہ "ابے اب اچھے اُستاد رونے والوں کے مقابلہ میں کیا بدمذاقی کر رہا ہے" مگر اپنی اِس بدمذاقی کے احساس کے باوجود ہم کو بہرحال اپنے دوست کے والد کو تو رونا ہی تھا۔ اِس لئے اپنے رونے میں ایک کیف اور ایک آمد پیدا کرنے کی غرض سے ہم نے ایک ہفتہ پہلے ہی سے رونے کا ریہرسل شروع کر دیا اور ماشاء اللہ چند ہی روز کی مشق میں ہماری حالت یہ ہو گئی کہ ہم رقیب رُوسیاہ کی شادی سے لے کر معمولی گدھے کی حرکتِ قلب بند ہو جانے تک پر ہر طرح کا رونا رو سکتے تھے۔ آخر وہ دن آ گیا جس دن کے لئے ہم نے یہ پاپڑ بیلے تھے اِس لئے اپنے رونے کو فنی ٹِشنگ بخش دینے کی غرض سے رات کو بارہ بجے جب گھر بھر گھوڑے بیچ کر خراٹے لینے لگا تو ہم نے اپنے رونے کی سوئی گلے کے کھٹکے رکارڈ پر لگا کر ہزماسٹر وائس میں اپنے دوست کے والد کو رونا شروع کر دیا اور نقل کو اصل سے ملا دیا۔ لیکن یقین مانئے جب انسان پر خدا کا قہر نازل ہوتا ہے تو اُس کے لئے نئی نئی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی ہمارا رونا دراں دراں کی منزل سے دو ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ قریب ہی جو ہمارا آٹھ سالہ بچہ سو رہا تھا، اُس کی آنکھ کھل گئی اور اُس کے بعد پورے گھر میں ہمارے رونے کا ڈنکا بج گیا۔ تمام عزیز و اقارب اور گھر کی ماماتیں تک اپنی اپنی چارپائیاں چھوڑ کر ہمارے پلنگ کے گرد جمع ہو گئیں۔ ہماری مشق معیار سے تجاوز کر چکی تھی اِس لئے چھٹتے ہی ہم سو سوا سو میل فی گھنٹہ کی رُلائی کے حدود میں پہنچ گئے اور ہمارا دل یہ کہہ کر ہماری حوصلہ افزائی کرنے لگا ؎

ہوں وہ دریا جو سمندر سے ملا ہے فرقت
روکنے سے کہیں رُکتی ہے طبیعت میری

آنسو نہ تھے اِس رونے میں ہمارے لئے رونے کا کوئی معقول عذر سوچنا ممکن تھا۔

[illegible] ہو [illegible]
[illegible] ایک بار ہم سے [illegible] ہمارے سامنے پیش [illegible]
کی حالت کو دیکھا [illegible]

وہ میاں بیوی کسی [illegible] کی اِس منزل میں پہنچ گئے [illegible] ممکن تھا لیکن اِس کے باوجود جب بیل ہو گیا تو میاں نے ایک دوست سے [illegible] یہ معاملت کیسے ہوئی؟ اِس پر میاں کا لاکر اور عزیزوں پر ہنس کر لیتے ہیں "آخر [illegible] گھٹنوں کے بل آنا پڑا"۔ دوست نے پوچھا پھر کیا ہوا؟ بولے "اِس کے بعد بیوی نے کہا اب پلنگ کے نیچے سے نکل آؤ"۔

لیکن یہ لطیفہ بھی اشکوں کی روانی میں بہہ گیا۔ اِس کے بعد ہم نے ایک دوسرا لطیفہ یاد کیا جسے سُن کر کبھی ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے یعنی ایک عمر رسیدہ عورت بہت زیادہ میک اپ کرنے کے بعد اپنی سہیلی سے بولی "ملے بہن، ایک آدمی ہے جو مسلسل مجھے گھورے جا رہا ہے"۔ اِس پر سہیلی بولی "یہ پرانی چیزوں کا بیوپاری معلوم ہوتا ہے"۔

لیکن یہ لطیفہ بھی ہمارے اشکوں میں اِس طرح گھر سی مانتا نکل گیا کہ ہم حیران ہو کر رہ گئے۔ اِس کے بعد ہم نے چند مضحک اشعار کی تلاوت شروع کی اور اِس شعر کو یاد کیا ؎

جو ہیں ہیں تیرے سر میں آہو ہیں یا ختن میں
یا مُنے مُنے ہاتھی لیٹے ہیں گہری بن میں

اور جب اِس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ جو بڑا ہی مسبب الاسباب ہے اُس نے خود بخود ہمارے بچاؤ کی ایک صورت پیدا کر دی۔ اِسی دوران میں ہمارے تین سالہ بچے نے جو ہمارے رونے پر اُٹھ بیٹھا تھا، ہم کو روتے دیکھ کر تُتلا تُتلا کر کہنا شروع کیا "ابے۔ ابا! آپ تیوں لو لہے ہیں" یہ اُس کے "ابے" پر ہم کو ہنسی آ گئی اور ہمارے آنسو کچھ کچھ رُکنے لگے۔ لیکن اِسی دوران میں ہم نے دیکھا کہ ہماری محترمہ بوڑھی ماماؤں سے کھسر پھسر کچھ باتیں کرتی جاتی ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد قہر آلود نگاہوں سے ہمیں دیکھتی بھی جاتی ہیں۔

چنانچہ ہم اپنا رونا ختم کر کے ابھی ہچکیوں ہی کی منزل میں تھے کہ وہ جھٹکا مار کر ہمارے پاس آ کر غصے میں بولیں "جب آپ کو میری صورت سے نفرت تھی اور آپ کسی دوسری سے دل لگائے بیٹھے تھے تو آپ نے یہ چکّی پورتے پیدا کر کے میری جان کو جڑیا نوحین میں کیوں مبتلا کر دیا"۔ ہم نے آنکھ پھاڑ کر روتی آواز میں کہا "کیا کہا؟" بولیں "ابے کیا تجاہل عارفانہ برت رہے ہیں آپ۔ جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔ بس۔ اب میں بہت بے وقوف بن چکی۔ مجھے ایک روز اور بھی شبہ ہوا تھا کہ جیسے کوئی رو رہا ہے لیکن میں بھی کہتی ہوں گی مگر کیا خبر تھی کہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر آپ اپنی اگر چیتی کو یاد کرتے ہیں جو اب بھی دوسروں کا بنا بنایا گھر بگاڑنے کے لئے لمبے لمبے خطوط آپ کو لکھا کرتی ہے"۔ بیگم کے یہ الفاظ سُن کر ہماری کاپی بیچ گم ہو گئی اور ہم نے کہا کہ یہ ہو کیا؟ ہم رونے کے قول سے

پہنچ گئے کا خیر ہم نماز کے پڑھنے کی سعادت بیٹھے، مگر گناہ بخشنے لگے کہ آخر الیاس دوست کے انتقال اور کہاں ایک معروضہ مجرہ۔ جسے پڑھ کر ہمارے گلے زبردستی تھم چکے تیز ہو گئی ہم نے دماغ شگفتہ ہونے کی آوازیں کرتا ہے کیا خط ہے؟ بولیں یہ وہ خطوط ہیں جو آپ کو کئی ہیں دوسرے تیسرے دن بھیجے گئے۔ آپ پر تسکین پہنچتی رہتی ہے۔ یہ سمجھ کر ہم بڑی ایک طرح کی جھلاہٹ پیدا ہو گئی اور ہم سے کہا کہ وہ کون سے خطوط ہیں جو ہم کو تم دکھاؤ۔ وہ متعلق ہوئیں آستین سے لفافہ نکال کر ایک لفافہ ہمارے سامنے ڈال دیا۔ ہم نے اس لفافہ کو بغور پڑھا۔ الٹ پلٹ کر بہت دیکھا تو اس پر ہمارا ہی نام درج تھا اور پتہ لکھا تھا "میرے مشفق کاکوروی صاحب کو ملے" یہ خط ڈھاکہ کا تھا اور تقریباً تین چار ماہ پہلے کا آیا ہوا تھا۔ ہم نے جلدی سے خط نکال کر پڑھا تو اس کا مضمون یہ تھا۔ ——

بندہ نواز!

میں وہی ہوں اب بھی جو پہلے تھی مگر غریب نواز ہیں
یقین مانئے کہ میں ہندوستان سے ان حالات میں ڈھاکہ آئی کہ چلتے وقت
آپ کا دیدار بھی نہ میسر ہو سکا۔ یہاں آکر میں نے جو ماہنامہ نکالا ہے اس
کے دو پرچے آپ کو بھیج چکی ہوں مگر آپ نے اس کے لئے ایک حرف نہ لکھا۔ یہ
خط محض یاددہانی کے طور پر لکھ رہی ہوں مگر ؎

اک وہ کہ بے جانے نہ تھا چین ایک گھڑی یاں ہماری شکل سے بیزار تھے
اب سر اٹھا کے بھی وہ ہمیں دیکھتے نہیں اللہ اب ہم ایسے گنہگار ہو گئے

آپ کی کنیز ریحانہ

یہ خط پڑھ کر ہمارے ہوش اڑ گئے کیونکہ نہ اس سے پہلے ہم نے کبھی ان محترمہ کا نام سنا تھا اور نہ ان کا اس سے پہلے کوئی خط ہی آیا تھا۔ دماغ پر بہت زیادہ زور دینے کے بعد ہم اُن دوستوں کے بارے میں سوچنے لگے جو پاکستان اور بالخصوص مشرقی پاکستان کو پیارے ہو چکے تھے۔ سوچتے سوچتے ہمیں اپنے ایک یار غار اور کلاس فیلو کا خیال آیا اور وہ تھے ہمارے دوست رحمان جن کا ابھی چند روز پہلے خط آیا تھا جس میں صرف اتنا لکھا تھا کہ "آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے" اور بس۔ انھوں نے ہم سے ایک مضمون کی ایک سال پہلے فرمائش کی تھی اور آخر میں یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر مضمون نہ آیا تو گھر سے نکلوا دوں گا۔ بیگم بولیں "تو کیوں اب خوابوں میں کیوں آ گئے؟"

ہم نے سوچا اس رنگ کے عالم میں اگر کچھ بولے تو بے قصور مرتے جاؤ گے کیونکہ ایسے معاملات میں اگر کوئی شخص کچھ بولتا بھی ہے تو اس کے کئی رنگ خارج ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہم نے اپنے عافیت کا احساس کرتے ہوئے خط کو پھر الٹ پلٹ کر دیکھ رہی ہیں اپنی بہتری بھی۔ اس کے بعد ہم نے شکر اللہ ہی نے اُس خط کو جو ہمارے دوست کے یہاں سے آیا تھا نکال کر دیکھا تو معاملہ کی نزاکت سمجھ میں آگئی اور ہم نے سوچا کہ عورتیں بہت جلد مشتعل ہو جاتی ہیں اور کتنی جلد غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس بیگم بولیں کہ اگر عورت تخمیں مشتعل ہو گئی تو کے وقت میں نے سارا ہی حرکت کے زندگی کیوں

تباہ کن ہوتی۔ ہم نے اُس جھگڑے کا اندازہ کر کے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں خیال آیا کہ ہمارے دوست صاحب کی ایک لڑکی رومانہ تھی جسے ہماری بیگم نے گودوں کھلایا تھا اور جو ہمارے دوست کے پاکستان جانے سے پہلے دن دن بھر ہمارے ہی یہاں کھیلا کرتی تھی۔ ہم نے کہا کہ دیکھو بیگم یہ خط تم جانتی ہو کس کا ہے؟ یہ رحمان کی لڑکی کا خط ہے جو رحمان کے ساتھ دس سال پہلے پاکستان چلی گئی تھی اور اب وہاں سے اس نے عورتوں کا ایک میگزین نکالا ہے جس کے لئے رحمان نے ایک مضمون مانگا تھا اور مضمون نہ بھیجنے پر رحمان نے تمہیں بے وقوف بنانے کے لئے رومانہ کی طرف سے یہ خط لکھا ہے۔ ہم نے دونوں خطوں کو بیگم کے سامنے رکھ کر کہا کہ دیکھو یہ دونوں خطوط ایک ہی شخص کے لکھے ہوئے ہیں یا نہیں۔ ہو رحمان نے یہ خط محض تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لئے لکھا ہے۔ اسی لئے اس میں صرف یہ لکھا ہے کہ آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔ بیگم نے جب دونوں خط لے کر ان کی تحریر ملائی تو ان کا غصہ کسی قدر دھیما پڑا اور بہت مشکل سے ہماری جان بچی۔ لیکن اس کے بعد مصیبت یہ آئی کہ ہمارا ہفتہ دو ہفتہ کا راشن ختم ہی ایک ہاں کر رہ گیا۔ جب دوسرے روز ہم اپنے دوست کے یہاں تعزیت کو جانے لگے تو راستہ بھر کوشش کرتے رہے کہ ہم کن الفاظ میں دوست سے تعزیت کریں۔ دماغ پر انتہائی زور دینے کے باوجود نہ تو تعزیت کے الفاظ مل رہے تھے اور نہ رونا ہی آرہا تھا۔ یہ سوچ کر ہم نے اپنے اوپر یاس و غم کی کیفیت طاری کرنے کے لئے کچھ غمگین اشعار پڑھنا شروع کیا کہ شاید اس سے دل میں غم کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ ہم نے سوچا کہ اپنے دوست کو دیکھتے ہی پہلے یہ شعر پڑھیں گے ؎

گل ہوا عہد جوانی میں چراغ زندگی — ہائے کیسا نیند کا جھونکا سر شام آ گیا

لیکن پھر ہم نے سوچا کہ وہ تو اسی سال کی عمر میں مرے ہیں۔ یہ عہد جوانی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ہم نے اپنے والد صاحب کی موت اور اپنی یتیمی اور بے بسی پر غور کرنا شروع کیا لیکن پھر بھی دماغ میں غم کی فضا پیدا نہ ہو سکی۔ پھر پنڈت نہرو کے انتقال کا خیال اپنے دماغ میں لائے جن کے مرنے کی خبر سن کر ہم بے حد روئے تھے۔ مگر اس کے بعد ہی خیال آیا کہ اگر لال بہادر شاستری کو اس کی خبر ہو گئی کہ ہم پنڈت نہرو کو یاد کر کے ابھی تک روتے ہیں تو وہ اپنا دشمن سمجھ کر ہم کو ڈی۔ آئی۔ آر میں دھر دیں گے۔ اتنے میں ہمارے دوست کا گھر آ گیا۔ ہم نے اپنے چہرے پر شفقت دونوں یتیم خانوں کو سلام کرتے ہوئے رونی شکل بنانا چاہی لیکن گھبراہٹ میں ہماری آنکھ تک نہ بھیگی۔ ہم نے رومال جیب سے نکال کر اپنی دونوں آنکھوں کو رگڑتے ہوئے اور یہ سوچ کر کہ تعزیت یا تحریر جو بھی کچھ ہو شکل فنا کی تو ہمارے دوست نکل پڑے۔ ہم تعزیت کا ایک لفظ زبان پر لائے بغیر ان سے لپٹ گئے اور اس طرح زور زور سے سانس لینے لگے جیسے رو رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی رونا نہ آیا۔ آخر میں ہم نے دوست سے لپٹے لپٹے پھر غور کیا کہ کوئی ایسا واقعہ اچانک یاد آجائے جس پر ہم رو پڑیں۔ اتنے میں ہمیں بیک وقت کرپل سری ٹرپارٹ کا خیال آیا جن کا سوا سو روپیہ ادا نہ کرتے وقت ہمارے آنسو نکل آتے تھے۔ چنانچہ ہم اپنے دوست کو پوری قوت سے لپٹا کر ایسی آوازیں نکالنے لگے جیسے ہم رو رہے ہیں۔ ایک طرف ہمارے دوست کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں اور دوسری طرف جب ہم زور زور سے اپنے دوست کے والد کا نام لے کر رونی آواز نکالتے تھے تو ہمارے منہ سے کرپل سری ٹرپارٹ کرپل سری ٹرپارٹ کے علاوہ کوئی لفظ نہیں نکلتا تھا۔

غزلیں

سعادت نظیر بی اے

پہنچ گیا ہے یہاں تک معاملہ دل کا
بحرِ غم میں بڑھا اور حوصلہ دل کا
ہمیں گماں تو نہیں بعد ہٹانے کیا ہوگا
خرد کی راہبری میں ہے قافلہ دل کا
تسلیوں سے بھی اُن کی، سکوں نہیں ملتا
اُلجھ گیا ہے کچھ ایسا معاملہ دل کا
فضائے حسن میں اک انقلاب برپا ہو
زبانِ شوق پہ آئے جو فیصلہ دل کا
نہ مل سکیں، نہ الگ رہ سکیں قیامت ہے!
پڑا ہے کیسے سے، ہم دم، معاملہ دل کا
غیور اپنی طبیعت ہے منحرف ماحول
نکالے کیا کوئی ایسے میں حوصلہ دل کا

شباب للت ایم اے

تری بزم میں کامراں آگئے ہیں!
لٹا کر جو اپنا جہاں آگئے ہیں
غمِ دلبراں سے غمِ دو جہاں تک
کہاں سے چلے ہم کہاں آگئے ہیں
چلن دیکھ کر رہبرِ کارواں کا!
ہمیں چھوڑ کر کارواں آگئے ہیں
کسی کے شبستاں سے دار و رسن تک
ہم اے گردشِ آسماں آگئے ہیں
اُنہیں کیا ڈرائے گی، برقِ نشیمن
جو خود پھونک کر آشیاں آگئے ہیں
لگے رہنماؤں کے بھی ہوش اُڑنے
یہ کس موڑ پر کارواں آگئے ہیں

منظور عروجی

تُو نے گھبرا کے گلے ہم کو لگایا تھا کبھی
رنگ چہرے پہ مرا اضطراب لایا تھا کبھی
اب مجھے چھوڑ کے آوارہ خرامی کیسی
میں وہی ہوں، جسے محفل سے اٹھایا تھا کبھی
چاند گہنایا فلک پر تو مجھے یاد آیا
میں تری بزم میں کس شان سے آیا تھا کبھی
تو مرے دیدۂ نمناک سے دامن نہ بچا
میں نے سیلِ حوادث ترا سایا تھا کبھی
وقت نے روند دیا موجۂ خود سر کا غرور
تُو تو بھولے سے بھی ساحل پہ نہ آیا تھا کبھی
آج آمادۂ غارت گریِ دہر ہے کیوں؟
تُو نے اس دشت کو گلزار بنایا تھا کبھی

رُباعیات

کاوش بدری

ہم نرم ہتھیلی کو کنول کہتے ہیں   زُلفوں کو گھٹاؤں کا بدل کہتے ہیں
رُخسار پہ جب پرتوِ مژگاں پڑ جائے   اِس رنگ کو ہم رنگِ غزل کہتے ہیں

تکمیلِ محبت کے لئے جیتے ہیں   اک اُن کی عنایت کے لئے جیتے ہیں
خوگر ہیں قیامت کے ازل سے کاوش   اک اور قیامت کے لئے جیتے ہیں

انتظار

پروفیسر انور سیوانی ایم۔ اے

شیخ محلہ، نئی گلی سیوان، سارن (بہار)

۳۱ مارچ ۱۹۶۵ء — محترمی خوشتر صاحب! تسلیمات

.... تعجب ہے کہ آپ کو میرا افسانہ "انتظار" جسے میں نے گزشتہ نومبر کے پہلے ہفتے میں بھیجا تھا، نہ ملا ـــــ کہیں میرے افسانہ "خال رخ" (مطبوعہ اگست ۶۴ء) کی طرح یہ بھی ڈاک کے انبار میں کھو تو نہیں گیا؟ بہر حال، حسبِ ارشاد اسے پھر بھیج رہا ہوں۔ اُمید کہ رسید اور اپنی رائے سے مطلع کر کے ممنونِ کرم کریں گے ـــــ میرے افسانہ "پشیمان" (مطبوعہ فروری ۶۵ء) کے سلسلے میں ابھی تک خطوط آ رہے ہیں۔ حال ہی میں ایک صاحب نے لندن سے خط بھیج کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ اِس سے "بیسویں صدی" کی ہمہ گیر مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ "پشیمان" کے کردار مقبول کے بارے میں بیشتر قارئین کی رائے ایک جیسی ہے۔ ہاں ایک صاحب نے انیس کے شہناز کو شریکِ حیات بنانے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے ـــــ اُنھوں نے اِسے انیس کی خود غرضی پر محمول کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ انیس کو ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ مقبول کو شہناز کو اپنانے کا موقع ملنا چاہئے تھا! یہاں اِس کا موقع نہیں، انشاء اللہ آئندہ کچھ اور خطوط پیش کروں گا جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ انیس کا یہ اقدام مناسب تھا یا نہیں۔

نیاز مند ـــــ انور

قدِ آدم شیشے پر اُس کی نظر پڑی۔

چہرے سے پاؤڈر کی موٹی تہہ اُڑ گئی تھی۔

ہونٹوں کی سرخی مدھم ہو جانے سے اُن کا نیلا پن ظاہر ہونے لگا تھا۔

ربن کی گرہ ڈھیلی پڑ جانے سے بال بے ترتیبی سے اُس کے چہرے پر پھیل گئے تھے۔

"ارے توبہ، کیسا ہولناک چہرہ!"

اور اِس خیال کے آتے ہی اُس کے ہاتھ جھٹکے سے پیشانی کی طرف بڑھے۔

معاً اُس کی آنکھ کھل گئی ....

"سپنا!" اور یہ سوچ کر اُس نے آنکھ بند کر لی۔

لیکن نیند اب اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی ـــــ خواب میں اُس نے ہمایوں کو اپنے بغل میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن ہمایوں اب یہاں کہاں تھا! ـــــ وہ تو اُس سے جدا ہو کر بمبئی کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔ بیداری کا احساس کرتے ہی وہ خیال کی دنیا میں آ گئی، اُس کے دل پر پژمردگی چھا گئی۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اور سوئی ہوئی نگاہوں سے کمرے کی چھت کو گھورنے لگی۔

اُس کے بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ رات بھر ایک ہی کروٹ لیٹے رہنے سے اُس کے بائیں بازو میں ایسا درد ہو رہا تھا جیسے وہاں زور کی چوٹ لگی ہو۔ بہت مشکل سے وہ بستر سے اُٹھ سکی۔ اُس کا سر خالی خالی تھا اور اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے بدن سے سارا خون نکال لیا گیا ہو۔

رات کو وہ دیر تک جاگتی رہی ۔ ہمایوں کو رخصت ہوئے ابھی چوبیس

گئے ہی لگتے ہوں گے لیکن غزالہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُسے دیکھے مدت ہو گئی ہو۔ اُس پر رہ رہ کر اضطراب کی کیفیت طاری ہونے لگتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے اُس کی زندگی میں کوئی بڑی کمی آ گئی ہو۔ رہ رہ کر اُسے ہمایوں کی یاد آتی۔ اُس کی صورت اُس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی، کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہمایوں اُس کے پاس بیٹھا ہے، بے خیالی میں وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی اور جب اُسے اِس بات کا احساس ہوتا کہ ہمایوں تو اُس سے رخصت ہو کر چلا گیا ہے۔ ہمایوں کی جدائی کا تصور کرتے ہی اُس کا دل چور چور ہو جاتا۔ اُس کی معیت میں گذارے ہوئے دن یاد آتے تو اُس کی پُرکشش شخصیت، اُس کی دل کو موہ لینے والی باتیں، اُس کی ہنسانے والی باتیں کرنے کے انداز، اُس کی محبت برساتی نگاہیں ایک ایک کر کے ساری باتیں یاد آتیں تو اُس کے دل کا اضطراب بڑھ جاتا اور جب ذرا سکون ہوتا تو اُس کا دل اِس عجیب پژمردگی کے جذبات سے بھر جاتا۔ اُسے اپنا وجود معدوم ہوتا ہوا محسوس ہوتا ـــــ ہر طرح کے احساس سے بے نیاز ہو کر وہ ہمایوں کی شخصیت کے تصور میں کھو جاتی۔

سر کو جھٹک کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو ملا۔ دیر تک جاگتے رہنے سے پپوٹے سوج گئے تھے اور آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ گردن کو ہلکی جنبش دے کر اُس نے سامنے اسٹینڈ پر لگے قدِ آدم شیشے پر نگاہ ڈالی۔ اُلجھے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیر کر وہ انھیں درست کرنے ہی والی تھی کہ اُس کی نگاہ کے سامنے میز پر رکھی، فریم میں لگی، ہمایوں کی تصویر چمک اُٹھی۔ اُس کے اُٹھے ہوئے ہاتھ اُٹھے ہی رہ گئے اور وہ تصویر کی بے زبان کشش میں کھو کر رہ گئی۔ اُس پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ آنسو کے دو قطرے پھسل کر اُس کے رخساروں پر لکیریں بنا گئے۔ اُس کے دل میں میٹھا میٹھا درد اُٹھا اور وہ بے چین سی ہو گئی ـــــ وہ کھو گئی، کھو گئی، یادوں کی اتھاہ گہرائیوں میں اُس کے فکر و خیال گم ہوتے گئے اور اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہمایوں کے پاس پہنچ گئی ہو۔ وہ ہمایوں کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ہو اور ہمایوں اُسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھ رہا ہو۔

دستک کی آواز نے اُسے چونکا دیا، دوپٹے کا پلو اُس نے چہرے پر ملا اور آہستگی سے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

خادمہ نے اُسے خبر دی کہ ناشتہ میز پر لگ چکا ہے۔

"چلو آتی ہوں"، نحیف آواز میں وہ بس اتنا کہہ سکی، ایسی نحیف آواز میں جو خود اُس کے کانوں کو اجنبی سی معلوم ہوئی۔ دور سے آتی ہوئی اجنبی آواز جیسی۔

ڈائننگ ہال میں عجیب سی اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ ہمایوں کی غیر حاضری شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ اُس کی موجودگی میں ڈائننگ ہال کی رونق کچھ اور ہوتی۔ اُس کی پُرلطف باتیں کھانے کی لذت کو بڑھا دیتیں۔ اُس کی موجودگی میں ناشتے اور طعام کے اوقات تفریح کے لمحوں کی طرح دلچسپ بن جاتے۔ اُس کی غیر موجودگی نے ڈائننگ ہال کے ماحول پر بے کیفی طاری کر دی تھی۔ ممی نے اُس کی عدم موجودگی کو محسوس کیا۔ اُس کی بہن رخسانہ نے کہا "ہمایوں بھیا کے جانے سے ساری کی ساری رونق ختم ہو گئی ہے"۔ ہمایوں کا نام سنتے ہی غزالہ کے دل کا اضطراب بڑھ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے آتے آتے رہ گئے۔

ممی نے اداسی کے ماحول کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "نہ جانے ہمایوں اب کہاں تک پہنچا ہوگا۔ آج شام تک اُسے بمبئی پہنچ جانا چاہئے" اور پھر وہ ہمایوں کی خوبیاں بیان کرنے لگیں۔ کمرے کے اُداس ماحول میں خوشگوار تبدیلی آ گئی۔ ہر بات میں ہمایوں کا ذکر آ نکلتا۔ اُس کے باتیں کرنے کے دلکش انداز، اُس کی پُرکشش شخصیت، اُس کے کھانے کی پسندیدہ چیزیں اور پھر اُس کی ملنسار طبیعت، اِن سب کا بیان ہونے لگا۔ وہ اُداسی اور بے کیفی جو ہمایوں کے جانے کے بعد سے گھر کے ماحول پر چھائی ہوئی تھی اُس میں ڈائننگ ہال کی باتوں نے کسی حد تک کمی کرنے میں مدد کی۔ غزالہ خاموش بیٹھی ماں اور بہن کی باتیں سنتی رہی۔ ہمایوں کے کردار کی بڑائی کے بیان پر اُس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوتی۔ یاس اور پژمردگی کے احساسات جو کل سے اُس کے دل پر چھائے ہوئے تھے، اُنھیں ذرا سا سکون ہوا۔ اُس کا دل چاہتا تھا، اِسی طرح ہمایوں کی باتیں ہوتی رہیں، باتیں ہوتی رہیں اور وہ سنتی رہے۔

ممی اور رخسانہ کی باتوں نے اُس کے جذبات کو کچھ حد تک سہارا دیا۔ اِسی کے سہارے وہ ناشتے کی میز پر آخر وقت تک بیٹھی رہی ورنہ ناشتے کی میز پر بیٹھنا تو آج ایک طرح سے صرف روزانہ کے معمولات کی ادائیگی تھا۔ ہمایوں کی عدم موجودگی میں اُسے کچھ بھی اچھا نہیں معلوم ہو رہا تھا، کھانے کی میز پر لذیذ چیزیں رکھی ہوئی تھیں لیکن اُس کے ذائقہ کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا، اُسے کوئی چیز بھی نہ بھائی ـــــ اُس کا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ممی نے اُسے دبی زبان سے ٹوکا بھی لیکن غزالہ نے کچھ بھی نہ کھایا۔ اُس نے طبیعت کی گرانی کا عذر کر کے کھانے کی چیزوں سے ہاتھ اُٹھا لیا۔

دن ہفتے بن کر گزرتے گئے اور اب مہینہ ہونے کو آیا۔ ہر روز اور پھر ہر ہفتہ ہمایوں کے خط کا انتظار کیا جاتا۔ ڈاکیہ جب آتا، غزالہ بے صبری سے خطوں میں ہمایوں کا خط تلاش کرتی اور جب پہلی ڈاک سے کوئی خط نہ آتا تو دوسری ڈاک کا انتظار کرتی۔ غزالہ کے معمولات میں وہ لمحہ سب سے زیادہ اضطراب کا ہوتا جب ڈاکیہ کے آنے کا وقت ہوتا۔ ہر ڈاک کے آنے کا وقت اُس کے دل میں اُمید کی کرن چمکاتا اور جب آئے ہوئے خطوط پر وہ بھیجنے والوں کے نام پڑھ لیتی تو اُس کے دل پر مایوسی کی گرد بیٹھ جاتی۔ ہر ڈاک کا وقت اُس کے دل پر مایوسی کی گرد کی ایک نئی تہہ جما دیتا، دن پر دن یہ تہہ زیادہ سے زیادہ موٹی ہو رہی تھی۔ جب دن، ہفتوں سے گذر کر مہینے میں تبدیل ہو گئے تو یہ تہہ پھیل کر چادر سی بن گئی۔

کو جیسے اُس کے جذبات کے گرد پھیلتی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مایوسیوں نے اُس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔

غزالہ اُداس پژمردہ تنہائیوں میں وہ ہمایوں کے تصور میں کھو جاتی۔ ہمایوں کی محبت کی حقیقت میں اُسے اپنا وجود معدوم ہوتا ہوا محسوس ہوتا۔ جب وہ آپے میں آتی ——— اُس کے دل کا اضطراب بڑھ جاتا۔ گھنٹوں وہ ہمایوں کی تصویر کے سامنے کھڑی کھوئی کھوئی نظروں سے اُسے دیکھتی رہتی۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے ہمایوں کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجنے لگے ہوں۔ اور تب اُس کے ذہن کے تار جھنجھنا اٹھتے اُس کے پرجوش حقیقت کی اُس منزل پر پہنچ جاتے جس کی گذرگاہ پر جدائی نے سنگِ راہ بن کر اُس کے لئے مایوسیوں کی دیوار کھڑی کر دی تھی۔ اُداسی، مایوسی، اضطراب اور اُن کے سائے میں کھڑی سراپا انتظار ——— وہ خالی الذہن ہو کر کوچ پر پڑے ہوئے پلنگ پر لیٹی بے کیف اچاٹ کرنے والی لامحدود فضاؤں میں گھورنے لگتی۔ اپنی بے نور انتظار کے بوجھ سے سسکتی آنکھوں سے، جو شاید اس عالم یاس میں بھی اپنے سینوں میں اُمید کی رمق و دابستۂ دیدار کی آرزو لئے ہوئے تھیں ——— لیکن آہ!

شام کو وہ تنہا باغیچہ کی روشوں پر آہستہ آہستہ بے مقصد اپنے پاؤں کو حرکت دیتی۔ شام کی پُرکیف فضائیں اُس کے دل کے سکون کو اور بھی درہم برہم کر دیتیں۔ اِن روشوں، اِن فضاؤں میں ہمایوں کی یادیں گھُل مِل گئی تھیں۔ اِن یادوں کا عکس اُس کے دل کے آئینہ پر اُتر کر اُس پر مجنونانہ کیفیت طاری کر دیتا۔ وہ چلتے چلتے تھک جاتی سبزہ پر بیٹھ کر وہ اپنے مغموم چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیتی، اپنی آنکھوں کو بند کر لیتی، اُسے اِن فضاؤں پر نگاہ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی۔ شام کا دھندلکا چھانے لگتا۔ وہ پژمردہ دل کے ساتھ اُٹھ کر آہستگی سے اپنے کمرے کی طرف آتی اور پلنگ پر گر کر نہ جانے کب تک پڑی رہتی، اُداس پژمردہ، مایوس اور خالی الذہن!

سہیلیوں کا ساتھ اُسے نہ بھاتا۔ غزالہ مجلس پسند اور نت نئی تفریحوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والی لڑکی تھی لیکن اب وہ تنہائی پسند بنتی جا رہی تھی۔ تفریحی مجلسیں اُس کے دل کو مسرت نہ بخشتیں۔ اکثر وہ اُس کے لئے حزن و ملال کے باعث بن جاتیں۔ خوشی کے موقعوں پر اُسے ہمایوں کی اور زیادہ یاد آتی، وہ تفریحی تقریبات کے درمیان ہی میں یا اختتام سے پہلے ہی کوئی نہ کوئی عذر کر کے گھر چلی آتی۔ اُس کی سہیلیاں اُس کی اِس حرکت کو اُس کے غرور و نخوت پر محمول کرتیں لیکن اُن میں سے جو اُس کے دل کے درد کو جانتی تھیں اُن کے دلوں میں غزالہ کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے۔

جب کبھی وہ تنہائی میں بیٹھتی اُس کے ذہن میں طرح طرح کے شکوک سر اُٹھاتے۔ دن ہفتوں میں تبدیل ہو گئے اور ہفتے مہینوں میں، ہمایوں نے کوئی خبر نہ بھیجی۔ یہ ایسی بات تھی جس کی وہ اُمید نہ کرتی تھی۔ اُس کے دل کی اُداسی بڑھتی گئی، اُس کی محرومی اذیت ناک بنتی گئی۔ وہ اُن لمحات کو یاد کرتی جو ہمایوں کی محبت نے اُس کے دل میں پیدا کر دئے تھے اس وقت پژمردگی کے شکار ہو کر رہ گئے اور اب اُسے اِس بات پر تعجب ہونے لگا کہ ہمایوں جس نے اپنی محبت کے اتنے بلند بانگ دعوے کئے تھے، کیا اُس کے سارے عہد و پیماں صرف زبان کی سطح ہی پر اپنا وجود رکھتے تھے۔ کیا اُس کے دعوے کھوکھلے تھے کیا اُن دعووں کو اُس کے دل کی تائید حاصل نہ تھی ——— اِس طرح کے اذیت ناک خیالوں نے اُس کے دل و دماغ کو مفلوج کر دیا۔ شکوک اُس کے ذہن میں مختلف روپ بدل کر سر اُٹھاتے۔ کہیں ہمایوں کی محبت کا مرکز بدل تو نہیں گیا۔ لیکن پھر اُس کا غزالہ کے ساتھ گرمجوشی سے اظہارِ محبت اُس کے اِس خیال کے خلاف رائے دیتا۔ کہیں جا کر وہ اُسے بھول تو نہیں گیا! اور یہ خیال اُس کے قلب و جگر پر آرا بن کر چلتا۔ اپنے دل کی بیچارگی اور جذبات کی پامالی پر وہ حزن و ملال کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب جاتی "ایک خط ایک خط بھی نہ آیا!" اُس کا دل سسکیاں بھرتا پکارتا رہ جاتا۔ اُس کا ذہن کچھ سوچنے سے قاصر رہ جاتا۔ کھوئی کھوئی سی وہ خلاؤں میں دیکھتی رہ جاتی۔ کوئی خیال نہیں، خیالوں کی کوئی آواز نہیں ——— دل سے اگر کوئی آواز نکلتی تو وہ ہوتی ایک گہری آہ!

آج اُس نے صبح سویرے ہی بستر چھوڑ دیا۔ باغ کی روش پر جب اُس نے قدم رکھا اُسے فرحت محسوس ہوئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کا دل جھومتے ہوئے رقص کر رہا ہو۔ رات کے پچھلے پہر اُس نے ایک سہانا خواب دیکھا تھا۔ اُس نے دیکھا، ہمایوں اُس کے گلے میں باہیں ڈالے سبزہ پر بیٹھا ہے۔ وہ پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہا ہے وہ مدہوش اُسے دیکھے جا رہی ہے، دیکھے جا رہی ہے۔

جب وہ بیدار ہوئی اُس کا دل خواب کی کیفیات سے معمور تھا۔ ایک سرشاری کی کیفیت اُس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ بیدار ہونے پر بھی اُس نے آنکھیں بند رکھیں، وہ اُن کیفیات سے لطف اندوز ہو رہی تھی جو خواب نے اُس پر طاری کر دی تھیں اُس کا دل اِس خواہش سے لبریز تھا کہ وہ پھر وہی خواب دیکھے۔ اِس اُمید میں وہ آنکھیں بند کئے دیر تک پلنگ پر لیٹی رہی لیکن نیند اب اُس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ پھر بھی اُس کا دل مسرور تھا کہ اُس نے بہت دنوں کے بعد ایک سہانا سپنا دیکھا۔

اُس نے خواب کو نیک شگون تصور کیا، اُس کے دل نے کہا "ہمایوں تجھے بھولا نہیں، وہ کبھی نہ کبھی آئے گا ضرور، وہ تیرا ہے اور تیرا ہی رہے گا" ——— اُس کا دل مسرت سے ناچ اُٹھا۔ بے خود و مدہوش، وہ دیر تک اپنے خیالوں میں کھوئی رہی۔

صبح سویرے اُٹھ کر پانی کے چھینٹے ڈال کر اُس نے چہرے کو تولیے سے صاف کیا تو اُسے عجیب کیف کا احساس ہوا۔ بے اختیارانہ طور پر اُس کے پاؤں باغ کی روشوں کی طرف اُٹھتے گئے جن پر وہ ہمایوں کے ساتھ صبح و شام چہل قدمی کیا کرتی تھی۔ اُس نے نہ جانے کتنے چکر لگائے اور جب وہ تھکاوٹ محسوس کرنے لگی تو سبزہ پر بیٹھ گئی۔ وہ دیر تک

سوچتی رہی۔ رات کے خواب کی کیفیات میں کھوئی ہوئی، بے خود و سرشار سی۔

ڈاک سے آئے ہوئے خطوط میں سے ایک لفافہ کے بھیجنے والے کے نام پر جب اُس کی نظر پڑی تو اُس کا دل مسرت سے جھوم اُٹھا۔ ہاں یہ اُسی کا خط تھا۔ اُس نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ لفافہ کو چاک کرتے دھڑکتے دل کے ساتھ جب وہ خط پڑھنے لگی تو اُس کی سانس کی رفتار اتنی تیز ہو گئی کہ اُس کے لیے خط کی چند سطور پڑھنا بھی مشکل ہو گیا۔ بہت مشکل سے وہ دل پر قابو پا سکی اور جب خط کا مضمون پڑھ چکی تو اُس کا دل خوشی سے رقص کرنے لگا۔ اُس نے خط کو بار بار پڑھا اور ہر بار اُس کا دل خوشی کے احساس سے جھوم اُٹھا۔

جدائی کی آگ میں اُس کے جذبات راکھ بن گئے تھے۔ انتظار کی تپش نے اُس کی رگ رگ میں بے تابیوں کی بھٹی سُلگا دی تھی۔ خط نے ابرِ رحمت کا کام کیا۔ انتظار کی جس تپش سے اُس کا سارا وجود جل رہا تھا اُسے سکون نصیب ہوا۔ اُس کے انگ انگ میں مسرت کی لہریں موجزن ہو گئیں۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ خط پانے کی خوشی کی کیفیات میں کھوئی رہتی۔ ممی کے قہقہوں کی آواز نے اُس کی محویت توڑ دی۔ انھیں دیکھتے ہی مسرت سے سرشار اُن کے گلے لپٹ گئی۔

غزلیں

اسمٰعیل پرکار تناگیروی

کچھ عشقِ ستم اور پہ دعا لینے لگے ہاتھ
ہر وقت کہاں ملتے ہیں زنجیر بھرے ہاتھ

اللہ ری یہ آتشِ سوزِ غمِ فرقت
بہتے ہوئے اشکوں کو جو پونچھا تو جلے ہاتھ

کیا کہہ کے پکاروں اُسے اے گردشِ دوراں
خود اپنی تباہی پہ جو دن رات ملے ہاتھ

چاہت کا تقاضہ ہے کہ دونوں رہیں پابند
اے دوست محبت سے مِرے ہاتھ میں دے ہاتھ

دیکھے سے جنھیں مست ہوا ارمان بھرا دل
قسمت میں کہاں اپنی وہ پھولوں سے سجے ہاتھ

کیا پھر کوئی بیدار ہوا جذبۂ وحشت
کیوں آج گریباں کی طرف بڑھنے لگے ہاتھ

تُو پیکرِ نغمہ ہے تو میں مردِ مجاہد
محفل ہے ترے ساتھ تو میدان مرے ہاتھ

آفتاب شمسی

عشق کی فطرت کو چاہے سب حریفانہ کہیں
جی میں ہے اُن سے غمِ دل بے حجابانہ کہیں

چُپ ہوئے جاتے ہیں کیوں یہ رہبرِ دل کچھ تو دوست
کم سے کم اُن کے تبسم ہی کا افسانہ کہیں

ہم نے مانا جان ہی دینی ہے راہِ عشق میں
اور اگر اِس کو بھی وہ اِک کارِ طفلانہ کہیں

دیکھ لیں رندانِ مے کش گر وہ چشمِ نیم باز
بادہ کو بادہ، نہ میخانے کو میخانہ کہیں

کم سے کم اتنا اثر تو ہو بیانِ درد میں
میرے افسانے کو سب اپنا ہی افسانہ کہیں

جی میں آتا ہے کہ ہم بھی آج اُن سے رازِ دل
برسرِ محفل کہیں اور راز دارانہ کہیں

ایک دن تو اُن پہ ہو جائے غمِ دل آشکار
ایک دن تو وہ بھی کچھ بے اختیارانہ کہیں

پریم نارائن راز بی اے

عجب عالم دلِ بے تاب کا ہے!
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے

مِرے کانوں کو تنہائی میں اکثر
تری آواز کا دھوکا ہوا ہے

جہانِ زیست کا اک ایک منظر
مری بے چارگی پر رو رہا ہے

فراقِ دلرُبا میں شام ہی سے
چراغِ زیست بجھتا جا رہا ہے

ہوا دامن سے کس کو دے رہے ہو
شرارِ آرزو اب بجھ چکا ہے

ابھی کیوں بڑھ رہا ہے دستِ گلچیں
ابھی تو غنچۂ گُل ادھ کھلا ہے

کسی کے ہجر میں مر مر کے اے رازؔ
سلیقہ زندگی کا آ گیا ہے

مندہ روزگار!

ظفر واسطی

۲/۷/۸۳۵۔ بزاز محلہ صدر بازار۔ لاہور کینٹ

۸ مئی ۶۵ء

محترمی! تسلیم

ایک طنزیہ "مندہ روزگار" ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید ہے کہ اسے آپ کے موقر جریدے میں جگہ مل جائے گی۔ اس طرح کی اور چیزیں بھی لکھنے کا ارادہ ہے لیکن شرط آپ کی پسند کی ہے ــــــ اگر کوئی تعریف کا خط آئے تو میرے پاس بھجوا دیجئے اور اگر ہجو لکھی ہوئی آئے تو اُسے اپنے لئے سمجھئے کیونکہ اشاعت کی ذمہ داری آپ کی ہے . . .

مخلص ــــــ ظفر واسطی

گلزار زُلفی! یادش بخیر ــــــ شاعروں میں اُن کا دم غنیمت ہے۔ لیکن غنیمت لفظ درست نہیں۔ یہ تو غنیم کی مونث معلوم ہوتا ہے۔ پھر غنیم کے معنی دشمن کے ہیں اور گلزار خدا نہ کرے کسی کے دشمن ہوں۔ اُن کا نام ہی گلزار ہے۔ وہ دوستوں کے دوست ہیں اور دوست بھی وہ جس کے متعلق عرصہ ہوا غالب کہہ گیا ہے ؎

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو!

یہاں یہ عرض کر دینا بھی شاید بے محل نہ ہو کہ آج تک اِس مصرع کا مفہوم ہم غلط سمجھتے تھے۔ اِس کا صحیح مفہوم ہمیں گلزار صاحب نے بتایا۔ وہ کہتے ہیں جس کے تم دوست ہو گئے اُس کا آسمان دشمن کیوں ہو؟ مطلب یہ ہے کہ دشمنی کر کے آسمان اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کیونکہ اُسے تمھاری دوستی حاصل ہو گئی ہے اور جب آسمان کچھ نقصان ہی نہیں پہنچا سکتا تو بیکار دشمنی کرنے سے کیا فائدہ؟ اِس سے تو بہتر ہے کہ دشمنی ہی نہ کرے۔ اب ذرا اِس مصرع کو پھر پڑھئے ؎

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو!

تو ہم عرض کر رہے تھے کہ شاعروں میں گلزار کا دم ــ غنیمت ہی نہیں بہت بڑی نعمت ہے۔ صرف شاعروں ہی میں نہیں بلکہ مشاعروں میں بھی اُن کا دم بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر کچھ نالائق اور قدر ناشناس لوگ اُنھیں لعنت تصوّر کرتے ہیں تو آپ سمجھ لیجئے کہ یہ اُن کے ذہن کا قصور ہے۔

گلزار صاحب کام کچھ نہیں کرتے۔ اِس لئے ہر واقف اور ناواقف آدمی کے کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں اور اُن کے قلب کی صفائی کا یہ عالم ہے کہ ہاتھ بٹانے کے سلسلہ میں وہ اِس روایتی تکلّف کے بھی روادار نہیں ہوتے کہ کسی نے اُن سے مدد طلب کی ہے یا نہیں۔ مثلاً آپ نے اپنے بیٹے کی شادی کی۔ گلزار صاحب آپ کے واقف نہیں ہیں اس لئے آپ نے اُنھیں اِس تقریب میں نہیں بُلایا لیکن وہ نہایت بے تکلفی سے آپ کے یہاں جا پہنچیں گے۔ آپ کو اِس نیک فرض سے بخیر و خوبی عہدہ برآ ہونے پر مبارک باد دیں گے اور اُس کے بعد اپنے تھیلے سے نکال کر ایک تہنیت آپ کی خدمت میں پیش کریں گے بلکہ خود ہی پڑھ کر سُنائیں گے۔ پھر چند منٹ کے وقفہ کے بعد ارشاد ہوگا: "یہاں کے دکاندار تو لوٹتے ہیں۔ یہ کاغذ جس پر تہنیت لکھی ہے، شہر سے ایک روپے میں مل جاتا ہے لیکن یہاں سے ڈیڑھ روپے میں ملا۔ پھر کاتب لکھنے کے لئے آمادہ ہی نہ ہوتا تھا۔ ہزار نخروں کے بعد پانچ روپے پیشگی رکھوا لئے پھر لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا ہے ــــــ مجھے کل ہی شام معلوم ہوا تھا اور میں راتوں رات یہ نظم لکھ کر، بازار سے کاغذ خرید کر صبح ہی صبح کاتب کے پاس پہنچ گیا۔ پھر صبح سویرے کوئی اور سواری نہ ملی تو ٹیکسی لے کر گیا۔ چار روپے اُس کی نذر ہو گئے۔"

اب آپ ہزار شاعر نہ ہوں اور اُن کی تہنیت کو بالکل پسند نہ کرتے ہوں لیکن اِس بات کا آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ آپ کی تعریف میں خوشامد کا کوئی پہلو باقی نہیں چھوڑا گیا اور اپنے پاس سے آٹھ دس روپے بھی خرچ کر دئے۔ اِس لئے آپ بادلِ ناخواستہ تقریب کا کوئی اور خرچ کم کر کے پندرہ روپے اُنھیں دے دیتے ہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں۔

"میں نے روپے لینے کے لئے یہ تکلیف نہیں اُٹھائی۔ بس محبت اور خلوص کی

...بہت سکھلایا ہوں ... کے لئے میری محبت اور خلوص کی قیمت نہ لگائیے۔ اب کیا
عرض کروں۔ ابھی پچھلے ہفتے علوی صاحب کے یہاں ایسی ہی تہنیت لکھ کر لے گیا تھا۔
انھوں نے فوراً پچیس روپے نکال کر دے دئیے۔ دوسری بات تک نہیں کی۔"

لیکن آپ چونکہ بہن شرمندہ ہوتے رہتے ہیں اس لئے انھیں کچھ دے کر ہی رخصت فرمائیں گے۔

"میرے تو پیارے جو کسی نے خوشی سے دے دیا لے لیا۔ اپنی عادت تکرار کرنے کی نہیں ہے۔ اب آپ اپنے ہاتھوں ایک مشاعرہ بھی کروا ڈالئے۔ وہ شاعرات اور شاعر بلا کر لاؤں گا کہ مدتوں یاد رہیں گے۔"

آپ معذرت کے طور پر فرمائیے گا کہ آپ نے کسی یتیم خانہ میں صدقے کے سلسلے میں کچھ رقم بھیج دی ہے، اس لئے اب مزید خرچ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

وہ کہیں گے "شاعر بھی یتیم ہوتے ہیں اور سوسائٹی پر ان کا بھی حق ہوتا ہے۔ یہ لیجئے۔ میں یتیموں سے بھی بدتر ہوں۔ میں اپنی بیوی بچوں کو کہاں لے کر جاؤں۔ آپ لوگوں کی خدمت کرتا ہوں اور آپ ہی لوگوں سے روٹی کھاتا ہوں۔"

اور لطف کی بات یہ ہو کہ یہ ایک بہت بڑے کاریگر ہیں لیکن اس فن سے روزی کمانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اب تو وہ کاریگری اسی میں سمجھتے ہیں کہ شاعری کے ذریعہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرا جائے۔

آپ نے روزمرہ کی سپاٹ زندگی سے اکتا کر ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جونہی گلزار صاحب کو آپ کے اِس فیصلہ کا علم ہوگا، وہ آپ کے پاس پہنچ جائیں گے اور دعا سلام کے بعد کچھ اِس طرح کی گفتگو ہوگی۔

"مجھے گلزار کہتے ہیں۔ گلزار زلفی دہلوی!"

"یعنی آپ شاعر ہیں؟"

"جی ہاں! بس شاعر کیا ہوں، یونہی ادب اور اردو زبان کی خدمت کا جنون سا ہے۔"

"اچھا تو آپ مشاعرے کے سلسلہ میں آئے ہوں گے۔ دعوت نامے چھپ گئے ہیں۔ دو تین دن تک آجائیں گے تو آپ کو دعوت نامہ بھیج دیا جائے گا۔"

"کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کن کن شاعروں کو بلا رہے ہیں؟"

آپ شاعروں کی فہرست انھیں دے دیں گے، تو وہ نام پڑھتے جائیں گے اور ریمارکس پاس کرتے جائیں گے۔ "احسان صاحب ہرگز نہیں آئیں گے۔ صوفی صاحب بھی نہیں آئیں گے۔ عزیز وارثی بہت عدیم الفرصت ہیں۔"

آپ ہزار کہئے کہ ان حضرات نے آپ سے تشریف لانے کا وعدہ کر لیا ہے۔ لیکن وہ فرمائیں گے یہ ایسے ہی وعدے کر لیتے ہیں اور وقت پر ٹل جاتے ہیں۔ ہاں! انھیں روپے دے آیئے تو اپنے آپ چلے آئیں گے۔ جا کر لانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ میں نے پچاس مشاعرے کروا ڈالے ہیں۔ ان سب کو فرمائش پر بلوایا ہے ... اور تری آبائیں گے لیکن ان کے لئے بھی آپ کو ... ہوگا۔"

آپ سوچ میں پڑیں گے کہ یہ بتائے کس صورت میں ممکن ہے۔ مشاعرے کا اعلان کرنے اور صدر بنانے میں بھی شعور پڑتی ہے۔ پھر وہ آپ کے دل کی بات بھانپ کر آپ سے فرمائیں گے: "لیکن آپ فکر نہ کریں۔ یہ لوگ دیکھا آئیں پھر بھی آپ کا مشاعرہ کامیاب ہوگا۔ فلاں فلاں شاعر اور شاعرات میرے ذاتی دوست ہیں۔ میں انھیں اس مشاعرے میں لے آؤں گا۔ کھانے کا انتظام تو آپ کر ہی رہے ہیں۔ ان کے آنے جانے کے لئے صد کاروں کا بھی بندوبست کر دیجئے اور فلاں فلاں لوگوں کو بھی مدعو کر لیجئے۔ یہ شاعر تو نہیں ہیں لیکن محفل کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ ان سے محفل کی رونق میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔"

آپ کو خاموش دیکھ کر وہ پوچھیں گے۔

"اور کیا آپ نے پوسٹر بھی چھپوائے ہیں؟"

آپ کے انکار کرنے پر فرمائیں گے: "پوسٹر کے بغیر کیا خاک مشاعرہ ہوگا۔ اس سے بہتر ہے کہ مشاعرہ کرایا ہی نہ جائے اور بہت سے شاعر تو پوسٹر میں اپنا نام دیکھ کر بن بلائے ہی آجاتے ہیں۔ ہم خود ایسے بیسیوں مشاعرے پڑھ آتے ہیں اور جب آپ اتنا خرچ کر رہے ہیں تو پندرہ بیس روپے کے لئے کیوں تکرار کرتے ہیں۔"

آپ کہیں گے کہ پوسٹر چھپوانے کا آپ کے پاس وقت نہیں ہے۔

"یہی بات تو وہ آپ سے سننا چاہتے تھے۔ فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں گے اور اس کام کے لئے بیس پچیس روپے آپ سے وصول کر لیں گے۔ اگر آپ پندرہ روپے پیش کرتے ہیں تو وہ کہیں گے کہ چھپائی اور کاغذ کے لئے تو کافی ہیں، بس کتابت کے لئے دس روپے اور دے دیجئے۔ پھر وہ پوسٹر میں اپنی پسند کے شاعروں اور شاعرات کے نام نمایاں جگہ پر لکھوائیں گے۔ ان کے علاوہ اپنی طرف سے دس پندرہ خصوصی مہمانوں کے نام بھی لکھوا دیں گے جن سے حسبِ توفیق "حق الخدمت" وصول کر لیں گے۔ اگر آپ نے اس مشاعرے کے لئے پہلے سے کوئی صدر نہیں چنا تو وہ صدر انتخاب کرنے میں بھی اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید فرمائیں گے۔ قیمتی مشورے میں نے دیدہ و دانستہ کہا ہے کیونکہ مشورے دیتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ کس صدر سے اس "عزت افزائی" کی کتنی قیمت وصول ہو سکتی ہے۔

آپ انھیں اپنا ہمدرد سمجھ کر پوسٹر اور دعوت نامے چھپوانے کا کام ان کے سپرد کر دیں گے اور احتیاطاً فرمائیں گے کہ ذرا ہوشیاری سے کام لینا۔

ارشاد ہوگا "آپ اطمینان رکھئے۔ ہم نے کتنے ہی مشاعرے کرا ڈالے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ایسے خوبصورت دعوت نامے اور پوسٹر چھپوا کر لاتے ہیں کہ اس بستی میں کبھی نہ چھپے ہوں گے۔"

پھر وہ آپ کو شاعرات کے دولت کدوں پر لے جائیں گے۔ وہاں زور شور

سے آپ کی اور اُن صاحب کا ذکر کر کے آپ کا تعارف کرایا جائے گا اور آپ کی طرف سے
... کے جائیں گے۔

جب دس پندرہ روپے آپ کے ٹیکسیوں کے کرائے پر خرچ ہو چکیں گے تو وہ آپ سے کہیں گے اب آپ کو ایک تکلیف اُٹھانے پھر رہے گے۔ شاعر حضرات کو آپ خود دعوت نامے دینے اُن کے پاس ٹیکسی لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اِس کام کے لئے آپ انھیں دو چار روپے ضرور دیں گے۔ یہ روپے لے کر وہ کسی ایسے ریستوران میں چلے جائیں گے جہاں کوئی نہ کوئی انھیں جیسا شاعر وہاں پہلے بیٹھا ہوا کسی جاننے والے کی آمد کا انتظار کرتا رہتا ہے تاکہ اُسے ایک کپ چائے پلا جائے۔ یہ جا کر اُسے چائے پلائیں گے اور سب شاعروں کے دعوت نامے آپ سے لے آئیں گے کہ وہ اُن لوگوں کو پہنچا دے۔ یہ دعوت نامے تقسیم کرنے میں صرف ایک بات کا خیال رکھا جائے گا کہ کس کس شاعر نے کس کس مشاعرے میں گلزار صاحب کو بُلایا تھا۔ اگر کسی نے صرف بُلایا تھا اور کھانا نہیں کھلایا تھا تو اُس کے دعوت نامے سے مشاعرے کے متعلق سطر کاٹ دی جائے گی اور آپ کے دئے ہوئے روپوں میں سے ایک روپیہ بائیسکل کے کرائے وغیرہ کے لئے اُسے دے دیں گے۔

جوں جوں مشاعرے کا دن نزدیک آتا جائے گا یہ ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشاعرے کے انتظامات پر تبادلۂ خیالات کرتے رہیں گے۔ اگر مشاعرے کی صبح کو یا اُس سے پہلے آپ نے انھیں چالیس پچاس روپے اتنے دنوں کی دوڑ دھوپ کے صلہ میں دے دئے تو آپ کا مشاعرہ خاصہ کامیاب ہو جائے گا اور اگر آپ نے اُن کا حقِ خدمت ادا نہ کیا اور یہ سوچتے رہے کہ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد دیکھا جائے گا تو وہ اِس طرح کے خطرات مول نہیں لیتے۔ پھر بھی وہ اپنی ناراضگی کا اظہار نہ کریں گے۔ آپ کے ساتھ وہ شاعرات کو لینے ضرور جائیں گے لیکن موقع نکال کر منع کر دیں گے کہ مشاعرے میں نہ جائیں۔ بڑی بے عزتی ہوگی اور اگر آپ نے انھیں ایسی بات کہنے کا کوئی موقع نہ دیا تو وہ کسی آدمی کو بُلا کر کہہ دیں گے۔ اِس طرح وہ شاعرہ پر بھی احسان فرما دیں گے اور آپ کا کام بھی بگاڑ دیں گے اور آپ منہ لٹکائے ایک شاعرہ کے دولت خانہ سے دوسری کے عشرت کدہ تک جائیں گے اور بے نیل و مرام واپس آ جائیں گے اور یہ بڑے معصوم بنے آپ کے پہلو میں بیٹھے ان سب کو بُرا بھلا کہتے رہیں گے: "اِسی لئے میں مشاعرے کی جھنجھٹ میں نہیں پڑتا۔ اِن شاعرات اور شاعر حضرات کے نخرے کون دیکھے، ناز کون اُٹھائے۔"

اِن حالات میں ظاہر ہے کہ آپ کا مشاعرہ پھسپھسا سا ہو کر رہ جائے گا۔ اب یہ بڑے فخر سے مشاعرے کی ناکامی پر لوگوں سے کہتے پھریں گے: "بڑے آئے تھے مشاعرہ کرانے، میں نے دس دن اُن کے ساتھ برباد کئے۔ اِتنا نہ ہوا چالیس پچاس روپے دے دیتے۔ آخر میرا کیا کوئی روزگار لگ رہا ہے جس سے میں اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ ایسے ہی مشاعروں سے خدا خرچ پورا کرتا ہے۔"

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ تھکے ماندے کسی ریستوران میں چائے کا ایک کپ پینے داخل ہوتے ہیں اور کونے کی خالی میز پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ خاموشی سے اپنی میز سے اُٹھ کر آپ کی میز کے قریب اور اگر وہاں جگہ نہ ہوئی تو آپ ہی کی میز پر آ بیٹھیں گے۔ "آپ کچھ تھکے ہوئے سے نظر آ رہے ہیں۔ جب تک آپ کی چائے آتی ہے میں آپ کو اپنے اشعار سے تازہ دم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

اور واقعی جب تک آپ کی چائے آئے گی وہ آپ کو دو چار قطعے اور اتنی ہی رباعیاں سنا چکے ہوں گے۔

پھر وہ ایک اور وار کریں گے: "رات مشاعرے میں تو آپ ہوں گے ہی۔ دیکھا کتنا شاندار مشاعرہ تھا، اور کتنے بڑے بڑے شاعر آئے تھے!"

جس مشاعرے کا وہ ذکر کر رہے ہوں گے وہ کہیں نہ ہوا ہوگا لیکن آپ کے سامنے مشاعرے کی ایسی تصویر کھینچیں گے کہ آپ کو اُس میں شرکت نہ کرنے کا افسوس ہونے لگے گا۔ پھر وہ آپ کے اِس افسوس کو اپنا کلام سنا کر دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ اب لامحالہ آپ کو اُن کے لئے چائے منگانی پڑے گی اور وہ ریستوران کی کھڑکی سے باہر دور فضاؤں میں دیکھتے ہوئے کہیں گے: "اگر گنجائش ہو اور آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بند اور ایک مکھن کی ٹکیہ بھی منگا دیجئے۔ بات یہ ہے کہ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد میں سیدھا یہاں چلا آیا تھا۔ میرا معمول ہے کہ جب تک مشاعرے کی اُن سب زمینوں پر غزلیں نہ کہہ لوں، جن پر شاعروں نے غزلیں کہی تھیں، گھر نہیں جاتا۔"

اور وہ کچھ کاغذ اپنی جیب سے نکالتے ہیں اور آپ نصف چائے پیالی میں چھوڑ کر دروازے کی طرف بھاگ جاتے ہیں۔

کچھ کام اُنھوں نے رضاکارانہ طور پر اپنے ذمّے لے رکھے تھے اور بستی کے لوگوں کو بہت سی پریشانیوں سے نجات دے رکھی ہے۔ کسی کے ہاں رسم شادی ادا کی جا رہی ہو، یہ سہرا یا رخصتی لکھ کر پیش کریں گے۔ اگر لڑکا امیر ہے یا اُس کے باپ کا بستی کے رئیسوں میں شمار ہوتا ہے تو یہ نہ صرف خود سہرا لکھیں گے بلکہ اپنے دوست شاعروں سے لکھوائیں گے۔ پھر کوشش کریں گے کہ دُولہا یا اُس کا باپ سہروں کا مجموعہ چھپوا دے اور جن شاعروں نے محنت کی ہے اُنھیں مٹھائی کے لئے کچھ رقم دی جائے۔

اگر کوئی آدمی کسی خوشی کی تقریب میں کوئی جشن منانا چاہتا ہے تو یہ اُسے سمجھانے اور ترغیب دینے کی کوشش کریں گے کہ مشاعرہ کرانے سے بہتر جشن منانے کی صورت نہیں ہو سکتی۔ جشن کا جشن بھی ہو جائے گا اور اُردو زبان کی خدمت بھی ہو جائے گی۔ ایسی ایسی اُٹھتی ہوئی شاعرات کی تصاویر دکھاتے ہیں کہ آدمی مشاعرہ کرانے کے لئے ضرور آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کامیابی حاصل کرنے کے بعد اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ مشاعرے کا ٹھیکہ اُنھیں دے دیا جائے یعنی ایک مقررہ رقم اُن کی تحویل میں

غزل

[illegible] ـــــــــ

[illegible] بھی دستور غم ہے شاید

[illegible] کی سزا دیدۂ نم ہے شاید

ابھی دنیا نہیں آگاہ محبت اے دوست

ابھی احساس وفا دہر میں کم ہے شاید

گردِ ہی، تیری محبت بھی دی ہے، لیکن

میری تقدیر ہی وابستۂ غم ہے شاید

میکدے کے سبھی اسرار ہیں روشن اس پر

ساقیا! جام مرا ساغرِ جم ہے شاید

نہ تبسم ہی میسر ہے، نہ خوشیاں راہی

میرے حصے میں فقط دیدۂ نم ہے شاید

غزل

ـــــــــ اُو دے سنگھ مضطر ـــــــــ

دیری ہر بات سے، ہر التجا سے

نہیں معلوم کیوں ہیں وہ خفا سے

جفا کاری ہے وصفِ حسن پھر بھی

ذرا محتاط رہیئے اِس ادا سے

بڑی توہین ہے طوفاں سے ڈرنا

سفینہ غرق ہو جائے بلا سے

یہ لغزش ہائے پیہم اللہ اللہ

گزرنا ہے مجھے راہِ وفا سے

ملی ہے مجھ کو منزل اے مضطر

مری گم راہیوں کی انتہا سے

غزل

ـــــــــ مس غزالہ اشفاق شاہ جہانپوری

قیامت سی اُٹھی قیامت کے بعد

کھلے لب نہ حرفِ شکایت کے بعد

کھلا راز ہم پر یہ مدت کے بعد

وہ اقرار کرتے ہیں نفرت کے بعد

عجب زندگی تھی محبت سے پہلے

عجب زندگی ہے محبت کے بعد

بہت مختصر ہے بہت مختصر ہے

جو مل جائے راحت مصیبت کے بعد

[illegible]

ملیں اُن سے [illegible] کے بعد

دے دی جائے۔ باقی وہ جانیں اور اُن کا کام! جن جن شاعروں اور شاعرات کے [illegible] فیصلہ ہوگا وہ آکر مشاعرے میں اپنا کلام سنا جائیں گے۔

جن دنوں انھیں کسی مشاعرے کے انتظام کا ٹھیکہ مل جائے تو اُن کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ کرائے کی ٹیکسی پر شاعروں اور شاعرات کے مکانوں کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ کبھی پریس بھاگے جا رہے ہیں، کبھی مخیر حضرات کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کر رہے ہیں ــــ اس مشاعرے [illegible] اور [illegible] لانے کے لئے اپنی کار دے دیجئے بلکہ انھیں لانے لے جانے کا [illegible]

اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی افسوس اس بات کا ہے کہ [illegible] اُن کی قدر نہیں پہچانی اور مہینے کے زیادہ دن ایسے گزرتے ہیں جب کوئی مشاعرہ [illegible] اور اُن کا روزگار مندہ رہتا ہے!!

خوش فہمی

لالہ رُخ ایم اے

معرفت عنایت اللہ کھوسہ خیر پور (میرس) براستہ پیر گوٹھ، ڈاکخانہ احمد پور، مغربی پاکستان

۲۸ مئی ۱۹۶۵ء

مکرمی و محترمی بھائی جان! آداب و نیاز

میں ایم۔ اے (فلسفہ) کے امتحان میں پاس کرکے فخر کر رہی تھی لیکن "بیسویں صدی" میں میری تخلیق کو آخری پوزیشن بھی مل گئی تو یہ اُس سے کہیں بڑھ کر فخر کی بات ہوگی۔ تعلیمی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد مسلسل "بیسویں صدی" کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ اگر کہہ دوں کہ "بیسویں صدی" برصغیر ہند و پاک کا سب سے بلند معیار ادبی صحیفہ ہے تو بھی حق ادا نہ ہوگا ——— بہرحال موہوم سی اُمید پر اپنی حقیر تخلیق بھیج رہی ہوں۔ اِس نے "بیسویں صدی" میں جگہ پالی تو اِس تخلیق کے ساتھ خود کو بھی خوش قسمت سمجھوں گی!۔۔

آپ کی بہن ——— لالہ رُخ

"جوانی کے گرم لہو کے اضطراب کو محبت نہیں کہتے" وہ سنجیدہ تھا۔

"تو کیا بڑھاپے کے سرد خون کے جمود کو محبت کہتے ہیں؟" وہ طنزیہ اُتر آئی تھی۔

"... لیکن وہ لازوال ضرور ہوتی ہے"

"لازوال اور ابدی...؟" ایک قہقہہ!

"غیر فانی بھی!"

"ہونہہ... یہ الفاظ ایک ہی کیفیت کے تین مختلف اظہار ہیں"

"کون سی کیفیت؟"

"زندہ جاوید رہنے کی"

"یہ تو ڈکشنری بھی بتاتی ہے"

"اور میں بھی!"

"لیکن یہ تخلیقی صلاحیت نہیں۔ اور تم انسان کہلاتے ہو!" ایک طنز

"صفحۂ قرطاس پر ثبت ہو یا انسانی زبان سے عیاں ہو، حقیقت ہر جگہ بنیادی رُوپ کی مظہر ہوا کرتی ہے"

"تم اپنی اصلیت پر اُتر آئے ہو"

"وہ کیسے؟"

"تم بھی ایک حقیقت ہو اور اپنے بنیادی رُوپ کے مظہر ہو"

"تم ٹھیک کہتی ہو لیکن میری اصلیت کے کچھ رنگ بھی تھے۔ اب وہ مٹ چکے ہیں"

"میں کیسے مانوں جبکہ تم نے ابھی ابھی کہا تھا "وہ لازوال" ہوتی ہے"

"محبت یا حقیقت؟"

"دونوں"

"لیکن میں نے صرف محبت کو..."

"تم تاپختہ خیالات کے مالک معلوم ہوتے ہو"

"وہ کیسے؟"

"تم نے لازوال، ابدی اور غیر فانی کی رٹ لگا رکھی ہے لیکن یہ نہیں جانتے کہ ہر چیز لازوال بعد میں حقیقت پہلے ہوا کرتی ہے۔ میرا مقصد ہے صرف حقیقت ہی لازوال ہوا کرتی ہے۔ ایک فخریہ جھلک!"

"جی... جی... جی ہاں!"

"جھنجلانے کی کوئی بات نہیں۔ اب میرے سوال کا جواب دیجئے"

"لیکن میں نے محبت نہیں کی ہے"

"تمہاری اصلیت ——— تم نے محبت نہیں کی ہے ——— تمہارے کچھ رنگ ——— اُن کا مٹ چکنا ——— یہ سب فریب ہیں، دھوکے ہیں"

"تمہاری صبحِ درخشندہ کی اور اپنی تیرگیٔ شام کی قسم! میں تمہیں دھوکا نہیں

[illegible] تمہاری ذات کے ساتھ۔"
"اگر کبھی دھڑکنیں [illegible] سانسوں کی بے ترتیبی، تمہارے دل کی
[illegible] کیوں مرتب ہوتی ہے۔"
"یہ میرا آئیڈیل ہے۔"
"آئیڈیل کبھی [illegible] احساس کی تخلیق ہوا کرتا ہے۔"
"یہ محض تصوراتی احساس ہے جسے آج تک حقیقت کی کسی کرن نے تابناکی
نہیں بخشی۔"
"[illegible]... ہے جانے بھلا ایسے مصور سے کبھی ہمدردی نہیں ہو سکتی جو
[illegible] میں رنگ بھرنے کی صلاحیت نہ ہو۔"
"تم نے [illegible] کہا تھا کہ میں ناپختہ خیالات رکھتا ہوں۔"
"ناپختہ شعور بھی، ناپختہ عمر بھی اور ناپختہ..."
"شخصیت بھی...؟" اس نے ادھورا جملہ پورا کر دیا۔ ایک سوال بروح بے تھی۔
"یہ بھی غلط نہیں۔"
"تمہارے نظریے کو میں جھٹلا نہیں سکتا۔"
"سنو! تم اپنے آئیڈیل کی تشریح کر سکتے ہو؟"
"یہ تجاہلِ عارفانہ بہت خوبصورت ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"ناپختہ شخصیت مطلب نہیں سمجھا سکتی۔"
"میں سنجیدہ ہوں۔"
"چاند بھی سنجیدہ ہوا کرتا ہے۔"
"الجھنیں کبھی حل نہیں کہلاتیں۔"
"شاید!"
"پھر؟"
"صاف اور شفاف جھیل میں عکسِ رخ دیکھ کر چاند بھی چلو رہے پوچھتا ہے...،
تم اپنے آئیڈیل کی تشریح کر سکتے ہو؟"
"... یہ ایک لطیف مسکراہٹ!"
"اور چکور کے جواب نہ دے پانے پر چاند کے سیمیں ہونٹوں پر بھی ایسی ہی مسکراہٹ
نمودار ہو جاتی ہے اور ایک عالم روشن ہو اٹھتا ہے۔"
"اور میری مسکراہٹ سے کیا چیز روشن ہوتی؟"
"روشنی کا گزر صرف [illegible] وہ چاہے کائنات کی وسعت میں
[illegible] آنکھوں میں۔"

"پھول۔"
"...! خاموشی۔"
"... لیکن جس جھیل میں عرقِ انگور کے سینکڑوں قطرے [illegible] کے
مرابط دھندلا گئے ہوں کیا کبھی اس کے پانی میں عکس نمایاں ہونے کی توقع ہو سکتی ہے؟
جس میں ہزاروں کنکر پھینکے جا چکے ہوں کیا اس میں ٹھہراؤ بھی آ سکتا ہے؟ بلکہ [illegible]
پیدا کردہ اضطراب سے لہریں عکس کو لے کر بکھری ہوئی کناروں سے جا [illegible] عکس
کے ساتھ اُن لہروں کا وجود بھی فنا ہو جاتا ہے۔ یہ تسلسل قائم رہتا ہے۔ لہریں اٹھتی [illegible]
عکس پھیلتے پھیلتے فنا ہوتے ہیں۔ پھر میں تمہارے آئیڈیل کی تشریح کیسے کر سکتی ہوں۔"
"یہ آدمی کی سرشت میں ہے۔ لغزش، ازالہ اور تصحیح ——— اور میں ابھی
پہلی منزل سے گزر رہی ہوں۔"
"تم دوسری منزل میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی انا کو پہچاننے کی کوشش کرو۔ کہیں
ایسا نہ ہو تم راہ کی سختیوں سے یا احساسِ ندامت سے گھبرا کر بیچ ٹوٹ جاؤ اور اس طرح
غیرتِ انسانی پر ایک ضرب، ایک داغ ثبت ہو کر رہ جائے۔ اور ہاں! اگر تم کامیاب ہو تو
تیسری منزل میں مجھ سے مشورہ کر لینا۔ میں تمہاری رہبری کروں گی۔"
"اوہ! ذکی!!"
"یہ کیا خبط ہے۔ اتنی بے تکلفی؟"
"وفورِ جذبات سے بے قابو ہو رہی ہوں۔ تم نے میری رہبری کرنے کا وعدہ
جو کیا ہے۔"
"دیکھنا کہیں ولیم ہیزلٹ کے مقولے کا نشانہ نہ بن جانا۔"
"کیسے؟"
"ادھورا نام ایک بہت بھاری پتھر ہے جو صرف شیطان انسان کی طرف
پھینک سکتا ہے۔"
"اوہ! بہت بڑا طنز ہے!! شیطان سے بڑی نفرت کا اظہار کیا ہے
جناب نے!"
"یہ بھی اسی کے لائق شیطان!"
"کیوں؟"
"ہر باغی کی بھاری سزا اس سے نفرت کرنا ہی تو ہے۔"
"اگر خلوص اور عقیدت کا صلہ یہی ہے، اگر سینکڑوں برس کی عبادت کا
اجر یہی ہے اور اگر بے پناہ حقیقی اثر التسجد والی پیشانیوں کا پھل یہی ہے تو پھر بلوت
کیسے کہلائے گی۔"
"میرے لفظ واپس لے لو!"

"کیا سبھی ہو؟"

"چاند جس کی طرف شعلہ وقت بھڑکا دیا ہو کہ وہ کائنات کی جلوہ افروزیاں
... سے محجوب ہو جاتی ہیں۔ وہ تو صرف نور کی درخشندگی میں مستور ہونے کی
... کا سرچشمہ بن جاتا ہے اور اس طرح جزو اپنے کل میں سما جاتا ہے۔"

"میں؟"

"چھوڑو ان باتوں کو۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی نادر شب بیدار نہیں ہے۔
ہم دونوں کو روشنی کی تلاش ہے شاید۔"

"شاید۔"

"سنو! تم مضطرب نظر آتے ہو۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"تمہارے سینے کے نہاں خانوں میں کسی پرتو کا گمان ہوتا ہے۔"

"کیا تم یہ پورے وثوق سے کہتے ہو؟"

"میرے یقین میں شک کا امتزاج بھی ہے۔"

"اپنی ذات میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کرو۔"

"او گاڈ! میں بھی کتنا حساس ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

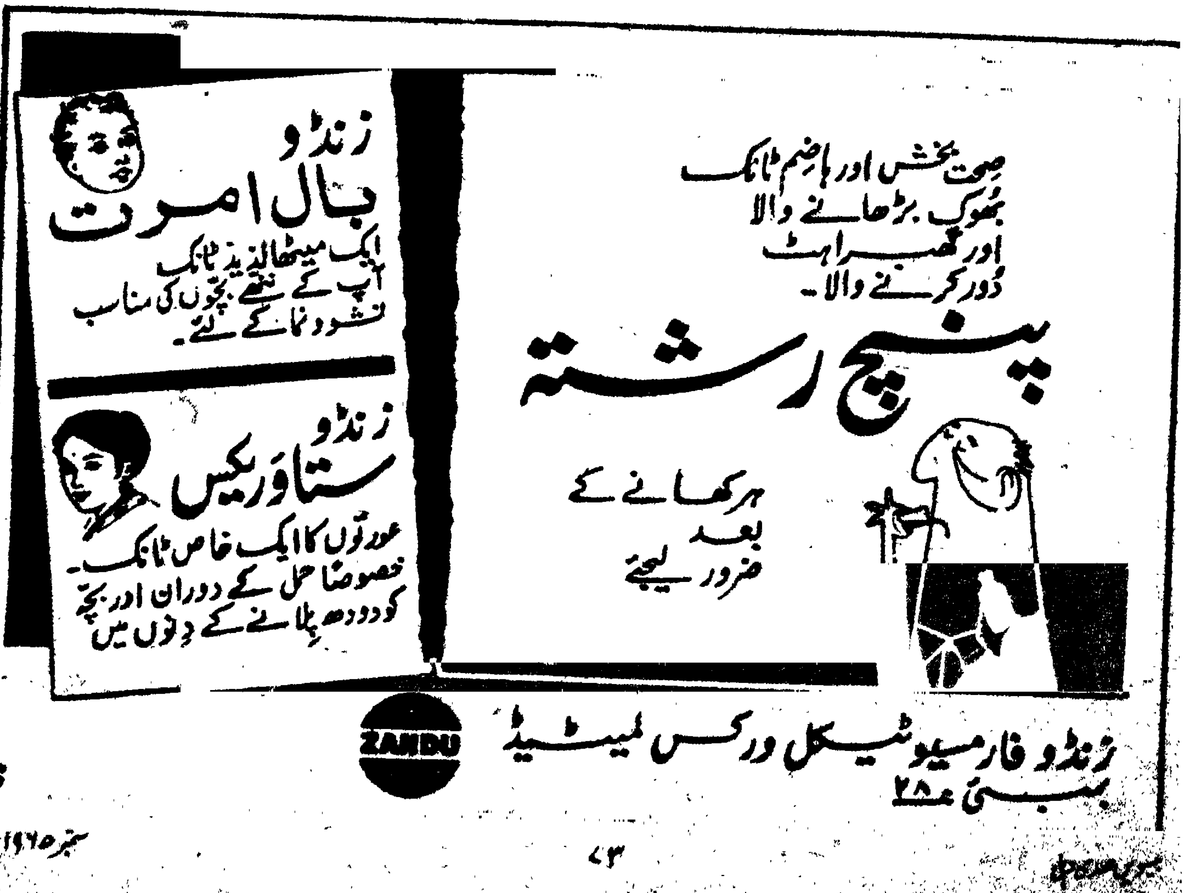
"یہی کہ تمہیں سمجھنے میں کتنا محتاط تھا میں۔"

"کیا سمجھے ہیں مجھے آپ؟"

"کہ تم نے بھی کسی منور عکس سے تابناکی حاصل کر لی ہے۔"

"لیکن جانتے ہو نہایت ہی تابناک کرن کے پرتو سے جگمگا سکتی ہوں صرف میں!"

شاہد جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے آنکھیں ملیں لیکن اُسے کچھ بھی نظر نہ آیا اور اس نے اِس حسین خواب کو بہرحال ایک عجیب سی خوش فہمی سے تعبیر کیا لیکن ——— لیکن اس نے دیکھا سامنے والے کمرے میں ابھی رات گئے روشنی جگمگا رہی تھی اور جاوید ذکیہ کی ٹھوڑی پکڑ کر اس سے کہہ رہا تھا۔ "پگلی کبھی خواب بھی سچ ہوا کرتے ہیں؟"




کیا نام میں رکھا ہے؟
بہت کچھ...... جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم جیپ فلیش لائٹ
انڈسٹریز لمیٹڈ الہ آباد میں عام خریدار کے لئے فلیش لائٹ
بنانے کی لگاتار کوشش کرتے رہے ہیں۔ ایک سمجھدار
خریدار جو معیار پر توجہ دیتا ہے...... جو قیمت کے بارے
میں غور کرتا ہے...... جو سچ مچ اپنی "خرید" کا انتخاب
کرتا ہے...... آپ کی طرح کوئی بھی!
جیپ اور جنتا فلیش لائٹس آپ ہی کے لئے
بنائی ہیں۔
عام خریدار اسے پسند کرتے ہیں کیوں کہ ان کی قیمت
بھی مناسب ہوتی ہے۔
GEEP
JANTA
SHERVANI
ENTERPRISE
جیپ
فلیش لائٹ
انڈسٹریز لمیٹڈ
۲۸ ساؤتھ روڈ الہ آباد نمبر ۱

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد جاروں کھونٹ گھومتا ہے افواہیں جمع کرتا ہے۔ اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ یہ جنون اس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے ہوش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں۔

روزگار مل جائے گا

چونکہ ہمارے بھارت دیش میں اعلیٰ تعلیم کے کالجوں کی بہت کمی ہے۔ چنانچہ ایک اطلاع ہے کہ اس سال قریباً لاکھوں طلباء کو کالجوں میں داخلہ نہیں مل سکا اور وہ بیکار پھرتے ہیں پھر خوار کوئی پوچھتا نہیں کے مصداق مارے مارے پھر رہے ہیں۔ وزارت تعلیم جو بڑے ذوق سے تعلیم کو عام کرنے کو فروغ دے چکی ہے، اِس دردناک صورت حالات سے نبٹنے کے لئے کچھ انوکھے طریقے سوچ رہی ہے تاکہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی نوجوان طلباء میں بغاوت بھی نہ پھیلے اور تعلیم بھی پھیلتی رہے۔ چنانچہ باخبر حلقوں میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ وزارتِ تعلیم مندرجہ ذیل طریقوں کا اعلان کرنے والی ہے :-

۱- جن والدین کی ماہانہ آمدنی پانچ سو روپے ماہوار تک ہے وہ اپنی اولاد کو گیارھویں جماعت سے زیادہ تعلیم نہ دلائیں۔

۲- یتیم لڑکوں کے لئے تعلیم بند۔ وہ صرف یتیم خانہ میں داخل ہو جائیں اور نئے آنے والے یتیموں کی سیوا کریں۔

۳- لڑکیاں صرف آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کریں۔ اُس کے بعد گھر گرہستی کا کام سنبھال لیں۔ اُن پر نوکریاں ممنوع قرار دے دی جائیں۔ صرف اُنہی لڑکیوں کو کالج میں داخلہ دیا جائے جن کے والدین کی ماہانہ آمدنی پانچ ہزار روپے ہو۔

۴- جو لڑکے گیارھویں جماعت پاس کر چکے ہیں یا تھرڈ ڈویژن میں گریجویٹ بن کر دھکے کھاتے پھرتے ہیں، اُنہیں افریقی ممالک میں بھیج دیا جائے۔ جہاں وہ افریقی عوام کو تعلیم دیں۔ (اِس سلسلہ میں افریقی حکومتوں سے معاہدہ کر لیا جائے کہ وہ ہماری فراخ دلانہ پیش کش قبول کرلیں)

۵- جو طلباء بچ جائیں یا افریقہ جانے سے گریز کریں، اُنہیں بھارت سیوک سماج میں بھرتی کر لیا جائے۔

سنا جاتا ہے کہ ان تجاویز کو پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس میں پیش کر کے قانونی شکل دے دی جائیگی۔ توقع ہے کہ سوائے عوامی ممبران پارلیمنٹ کے باقی سبھی ان تجاویز کی حمایت کریں گے۔ (اور خوش قسمتی سے عوامی ممبران پارلیمنٹ کی تعداد بے حد کم ہے اور اُنکی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز کے برابر ہے)

امریکہ بنام کمیونزم

ایک امریکی سینیٹر نے امریکی پارلیمنٹ کے اگلے سیشن کے لئے ایک ہنگامہ خیز ریزولیوشن بھیجا ہے۔ اِس ریزولیوشن کا لب لباب یہ ہے کہ :-

"امریکہ نے آج تک جتنے ممالک کو مالی اور فوجی امداد دی، وہ بالآخر یا تو کمیونسٹ ہو گئے یا کمیونسٹوں سے مل گئے یا کمیونسٹوں کے ہمدرد ہو گئے اور امریکی امداد کو رسوائی اور ذلت اُٹھانا پڑی۔"

ریزولیوشن میں کہا گیا ہے۔ "یہ پالیسی انتہائی غلط بلکہ کسی حد تک احمقانہ ہے۔ لہٰذا اِس پالیسی کو قطعی طور پر اُلٹ دیا جائے۔ یعنی آئندہ غیر کمیونسٹ ممالک کی بجائے کمیونسٹ ممالک کو مالی اور فوجی امداد دی جائے۔ تاکہ وہ اِس امریکی امداد سے تباہ و برباد ہو جائیں۔ کیونکہ امریکی امداد کا یہ خاصہ بن گیا ہے، کہ وہ جس ملک کو ملی، وُہ تباہ و برباد ہو گیا۔"

لہٰذا ریزولیوشن میں یہ مثبت تجویز پیش کی گئی کہ "اگر ہمارا مقصد کمیونسٹ ممالک کو تباہ کرنا ہے تو اُس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ صرف اُنہیں ہی مالی اور فوجی مدد دی جائے۔"

کہا جاتا ہے کہ صدر جانسن اِس تجویز پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے

[illegible] کے جائیں اور اس کے بعد [illegible] شمالی ویت نام پر کیا جائے اور جنوبی ویت نام کو [illegible] کے شمالی ویت نام کو منتقل کر دی جائے۔ یوں شمالی ویت نام تباہ و برباد ہو جائے گا۔

[illegible]گرسی شہزادوں کے لئے ———— •

گزشتہ دنوں ایک نہایت "لذیذ" خبر ملی کہ ہند سرکار کا ایک مرکزی وزیر [illegible] ایک شہر میں گیا تو وہاں رقص و سرور اور عیش و عشرت میں گم پایا گیا۔

افواہ ہے کہ یہ خبر جو بہت "لذیذ" بھی تھی اور "غلیظ" بھی ———— سن کر کانگرس صدر شری کامراج بہت تلملائے اور انہوں نے راتوں رات کانگرسی وزیروں کے لئے "ضابطۂ اخلاق" مرتب کیا جس کی چند دفعات یہ ہیں:۔

۱۔ کوئی وزیر صدر کانگرس کی منظوری کے بغیر غیر ممالک میں نہ بھیجا جائے۔

۲۔ ہر وزیر اپنا کھانا آپ پکائے جو انتہائی سادہ ہو (سادہ کھانے کی فہرست منسلک کی جا رہی ہے)

۳۔ وزراء جھونپڑیوں میں رہیں اور کوٹھیاں خالی کر دیں۔

۴۔ ہر وزیر مشین کا نہیں بلکہ چرخے کا بنا ہوا کھدر پہنے جو کافی موٹا اور کھاڑھا ہو (اپنے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھوئے۔

۵۔ پھول سونگھنا، عطر لگانا، فلمی گانے سننا، عورتوں کے ساتھ نوک جھونک، دعوتیں قبول کرنا، مہاراؤں کے کسی اُتسو کا اُدگھاٹن کرنا ہر وزیر پر ممنوع ہو (اُدگھاٹن صرف پلاؤ، بریانی پر جائز قرار دیا گیا)

۶۔ غیر ملکی سفارت خانوں کو ہدایت کر دی جائے کہ وہ دورے پر گئے ہوئے وزیر کی نقل و حرکت کی پوری رپورٹ وزیر اعظم کو ارسال کریں اور وزیر اعظم ان رپورٹوں کو آل انڈیا کانگرس کے کھلے سیشن میں پیش کریں۔

سنا گیا ہے کہ یہ ضابطۂ اخلاق جب وزیروں کے پاس بھیجا گیا تو بیشتر وزراء نے اپنے اپنے استعفے بھیج دیئے اور استعفے میں تحریر کیا کہ یا تو مسٹر کامراج کو کانگرس کی صدارت سے ہٹا دیا جائے یا ہمیں وزارت سے ہٹا دیا جائے۔ ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔

منگل سیارہ میں چینی ———— •

چینی کمیونسٹ لیڈروں نے ایک خفیہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ایک چینی ڈیلیگیشن منگل سیارے کی طرف بھیجیں گے۔

یہ خفیہ فیصلہ (جواب ظاہر ہو گیا ہے) کیوں کیا گیا؟ اس کا بھی ایک دلچسپ پس منظر ہے۔ بات یہ ہوئی کہ گزشتہ دنوں امریکہ نے اپنا ایک مصنوعی سیارہ "میرینر" منگل سیارے کے تعاقب میں بھیجا۔ جب "میرینر" منگل سیارے کے قریب سے [illegible] کوئی [illegible] چینی لیڈر کو اپنے پرانے کاغذات میں ایک نقشہ مل گیا۔ جس میں تحریر تھا کہ [illegible] میں منگل سیارہ چینی سلطنت کا حصہ تھا۔ جس پر اس زمانے کے کسی سامراجی [illegible] نے جارحانہ قبضہ کر لیا تھا۔ (غالباً وہ بھی امریکی سامراج تھا)

جس دن یہ نقشہ دستیاب ہوا، اسی شام کو ایک چینی سائنسدان نے اعلان کیا کہ منگل سیارے میں بھی کمیونسٹ پارٹی موجود ہے۔ کیونکہ اس نے دوربین سے [illegible] سیارے پر لال جھنڈا لہراتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن یہ کسی روس پرست کمیونسٹ پارٹی کا جھنڈا معلوم ہوتا ہے ———— چو، این، لائی نے دوربین سے دیکھ کر اندازہ لگایا)

اس نقشے اور لال جھنڈے کے انکشاف نے چینی لیڈروں میں بے چینی پیدا کر دی اور ہائی کمانڈ کی ایک ایمرجنسی میٹنگ بلائی گئی۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ فوراً ایک چینی ڈیلیگیشن منگل سیارے کی طرف بھیجا جائے جو وہاں مندرجہ ذیل انقلابی کام کرے۔

۱۔ منگل سیارے کی حکومت کو چیلنج دے کہ اگر امن اور پنچ شیل چاہتے ہو تو یہ سیارہ چینی سلطنت کے حوالے کر دو۔ ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

۲۔ منگل سیارے کی روس نواز کمیونسٹ پارٹی میں نظریاتی اختلاف اور پھوٹ پیدا کرے تاکہ وہاں بائیں اور دائیں بازو کی دو کمیونسٹ پارٹیاں وجود میں آ جائیں۔

اس سلسلہ میں ایک چینی ڈیلیگیشن جلد ہی منگل سیارے کی طرف کوچ کرنے والا ہے۔ صرف ایک اڑچن ہے، وہ یہ کہ ڈیلیگیشن کس چیز پر سوار ہو کر جائے؟ کیونکہ چین کے پاس کوئی خلائی جہاز موجود نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ چینی کامریڈوں نے امریکی سرکار سے درخواست کی ہے کہ وہ ڈیلیگیشن کے لئے ایک خلائی جہاز کرایہ پر مہیا کر دے۔

تنگیٔ داماں کی شکایت ———— •

گزشتہ دنوں ان خبروں سے نوجوان اور کافر ادا حسیناؤں میں بے حد تشویش پھیل گئی کہ کچھ سکولوں اور کالجوں میں چست لباس پہننے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ یہ خبریں ان کے آشیانۂ لباس پر گویا برق بن کر گریں، کہ ہم جو کبھی زلف و لب و رخسار سے شکار کیا کرتی تھیں اور اس کے بعد فنِ شکار کو زیادہ عوامی وسعت دینے کے لئے لباس کی تنگی اور چستی پر مائل ہو گئیں ———— ہمیں اب نام نہاد اخلاق کے نام پر اس نئی ایجادِ حسن سے بھی محروم کیا جا رہا ہے۔

افواہ ہے کہ گزشتہ ہفتہ دہلی کے ایک بہت بڑے فیشن ایبل ہوٹل میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے آئی ہوئی ان چاق و چوبند حسیناؤں کی ایک احتجاجی میٹنگ بلائی گئی اور اس میں سماج کے ٹھیکیداروں کے اس غیر حسین اور بھونڈے رویے پر گرما گرم بحث کی گئی۔ گرم دل کی چند حسیناؤں نے مطالبہ کیا کہ سکولوں اور کالجوں [illegible]

ایک سے زائد کتنے ہی شامل ہوتے کچھ بھی ... تعلق سے حسن کو ...
اگر بیٹھی ہے لباس وہ چھپ نہیں سکتا اور نہ یہ اخلاقی پابندیاں ہیں بلکہ حسن میں رکاوٹ
بنتی ہیں —— حسن ہر حالت میں حسین ہے۔ چاہے وہ کیسا بھی لباس
پہنے بلکہ کسی لباس کے نہ ہونے سے بھی اور زیادہ حسین اور مرغوب نظر آتی ہیں۔

چنانچہ حتمی طور پر فیصلہ کیا گیا کہ تنگ اور چست لباس قطعاً ترک کر دیا جائے
اور اس کی بجائے ہر جوگن کا سادہ ڈھیلا ڈھالا لباس زیب تن کیا کرے۔ گلے میں وہ بیں
یا چوغہ پہنا جائے گلے کی بجائے کنٹرول ہاتھ میں ... ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ اس ڈرامیٹک فیصلہ پر فوراً عمل شروع ہو جائیگا۔ صرف
ایک ہیجنے نے یہ خطرہ ظاہر کیا ہے کہ جوگن کے لباس میں تو ہم اور بھی قیامت ڈھانا شروع
کر دیں گی۔ اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ سماج اس لباس پر بھی پابندی لگانے کا مطالبہ کرنے
لگے —— مگر اس خطرہ کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا کہ اگر جوگن کے لباس پر بھی پابندی لگا دی
گئی تو ہم کوئی اور لباس اختیار کر لیں گی۔ حسن ہونا چاہئیے لباسوں کی کمی نہیں کیونکہ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

خودکشی کرنے والوں کو خوشخبری ——•

آپ یہ سنکر حیران بھی ہوں گے اور خوش بھی کہ آئندہ ہندوستان کی تمام ریل گاڑیاں ٹھیک
وقت پر چلا کریں گی اور کبھی لیٹ نہیں ہوں گی۔

یہ فیصلہ اس وجہ سے نہیں کیا گیا کہ ریل کے محکمہ میں ایک دم ایسی "شینی" آگئی ہے اور
نہ یہ فیصلہ عام مسافروں کی تکلیف دور کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ بلکہ اس مثبت فیصلہ کا پس منظر
ایک منفی واقعہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ گزشتہ دنوں ریل منسٹری کو سینکڑوں ایسے شکایتی خطوط موصول ہوئے
جو اُن مایوس اور نامراد لوگوں نے لکھے تھے، جو خودکشی کرنے کی نیت سے ریلوے لائنوں پر لیٹے
رہے۔ لیکن ہر بار ٹرین لیٹ ہو جاتی اور لیٹ ہو جانے کے باعث اُن کا خودکشی کا ارادہ بدل
جاتا۔

خودکشی کا ارادہ بدل جانے سے اُنہیں انتہائی ذہنی کوفت ہوئی اور اس کوفت کی ذمہ داری
اُنہوں نے ریل منسٹری پر ڈال دی کہ اُن کا محکمہ نااہل اور نکما ہے۔ چنانچہ وہ اُن مایوس اور نامراد لوگوں
کی جذبات انگیز تحریروں سے متاثر ہو گئے کوئی دوسری صورت نہ تھی۔ کہ ریل منسٹری نے اپنے محکمہ کے
تمام عملہ کو حکم دیا ہے کہ آئندہ گاڑیاں ٹھیک وقت پر چھوٹا کریں گی کہیں لیٹ نہ ہونے
دی جائے۔ ورنہ اُن کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔

چنانچہ ان ہدایات سے ریلوں کا ... عمل کیا گیا ہے ... عام مسافروں کا کہنا ہے کہ گاڑیاں ٹھیک
وقت پر چل جائیں گی، بلکہ خودکشی کرنے والے بھی آسانی سے اپنی منزل مقصود پر پہنچ جایا کریں گے

ننھی منی افواہیں ——•

۱- جن سنگھ نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ اس کا جو ممبر انگریزی لباس پہنکر اسٹیج پر آئیگا اُسے پارٹی سے خارج کر دیا جائیگا۔

۲- ماسٹر تارا سنگھ نے اعلان کیا ہے کہ اُن کے پاس ایک کروڑ سکھوں کے دستخطوں سے ایک اپیل پہنچ چکی ہے کہ وہ دوبارہ سیاست میں آجائیں۔ لہٰذا وہ ایک کروڑ دستخطوں کو مایوس نہیں کر سکتے۔

۳- شیخ عبداللہ نے جیل میں شاعری شروع کر دی ہے۔

۴- ہندی کے ایک متعصب حامی نے ایک ہندی ڈکشنری تیار کی ہے۔ جس میں اُردو کا ایک لفظ بھی شامل نہیں۔ یہ ڈکشنری سو صفحات پر مشتمل ہے۔

جواب طلب اُمور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ پاکستانی ٹکٹ ہندوستان میں کارآمد نہیں ہیں اس لئے پاکستانی بھائی اور بہنیں اس شرط سے مستثنےٰ ہیں۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

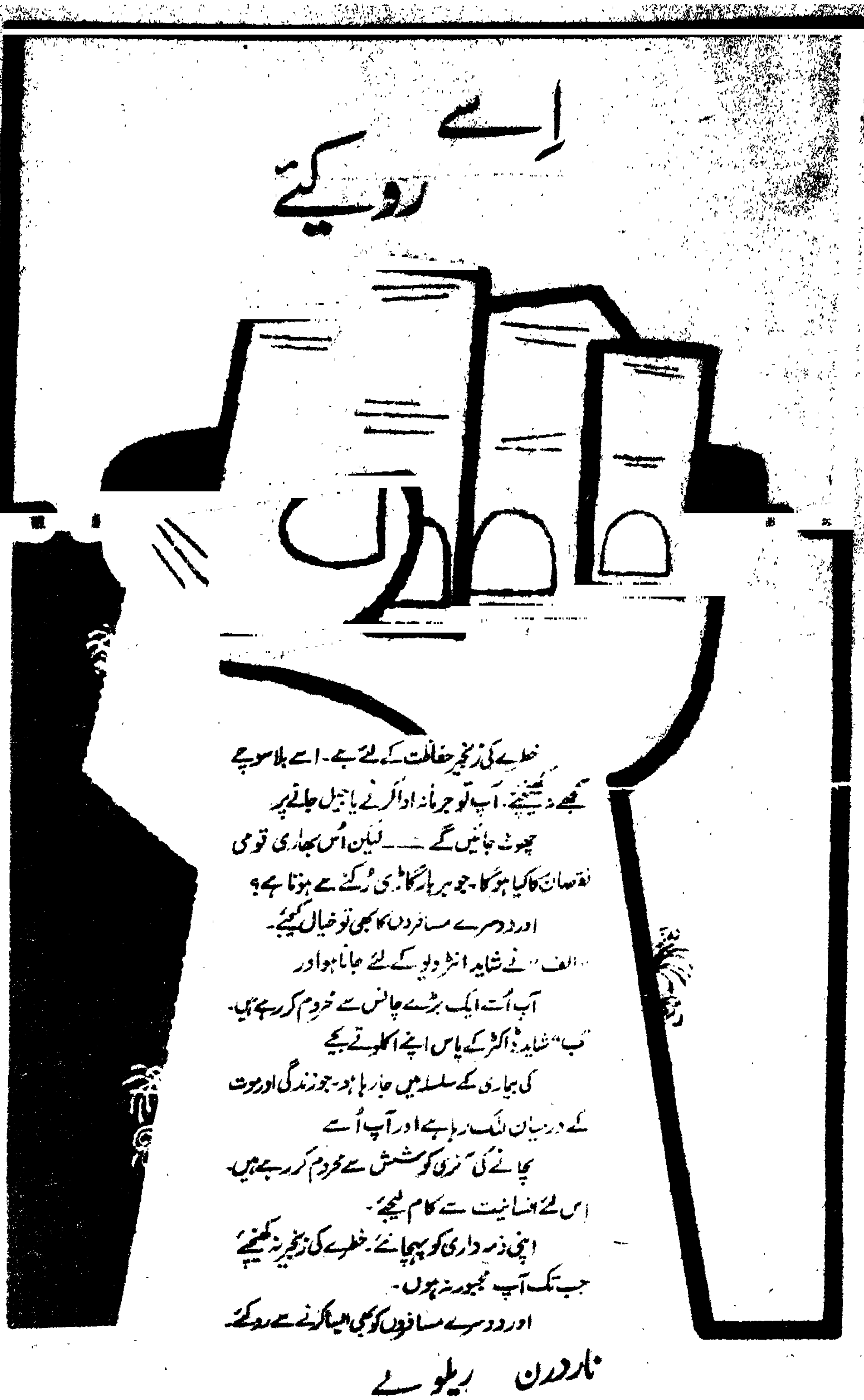
ہماری چند قابلِ قدر اور مشہور کتابیں

اُردو شاعری پر ایک نظر ترمیم شدہ تیسرا ایڈیشن از کلیم الدین احمد حصہ اوّل قیمت ۱۰/۵۰ روپیہ
حصہ دوم زیرِ طباعت

- صنفِ انشائیہ اور چند انشائیے از ڈاکٹر سید محمد حسنین —— قیمت ۴/- روپیہ
- عالمِ برزخ —— " —— از ڈاکٹر سید محمد حسنین —— " ۵/-
- سراج و منہاج —— از پروفیسر اختر اورینوی —— " ۴/- روپیہ
- مطالعہ نظیر —— از پروفیسر اختر اورینوی —— " ۲/- روپیہ
- مطالعہ اقبال —— از " " —— " ۲/- روپیہ
- علم العروض —— از سید محمد صدر الدین فضا —— " ۲/۵۰ "
- رستم و سہراب —— قیمت ۲/۲۵ روپیہ یاسین شاہم —— " ۲/۲۵ "
- انتخاب رسائل شبلی " ۲/۲۵ " —— حیرت زار —— " ۱/۷۵ "

اس کے علاوہ ہندی، انگریزی اور اُردو کی نصابی و معیاری کتابیں ہم سے طلب فرمائیں۔

پتہ: ۱- ایوانِ اُردو پٹنہ-۴ (بہار)
۲- ہندوستان اکیڈمی پٹنہ-۴ (بہار)
۳- موتی لال بنارسی داس پٹنہ-۴ (بہار)


اِسے روکیئے
خطرے کی زنجیر حفاظت کے لئے ہے۔ اسے بلا سوچے
سمجھے نہ کھینچئے۔ آپ تو جرمانہ ادا کرنے یا جیل جانے پر
چھوٹ جائیں گے ـــــ لیکن اُس بھاری قومی
نقصان کا کیا ہوگا۔ جو ہر بار گاڑی رُکنے سے ہوتا ہے؟
اور دوسرے مسافروں کا بھی تو خیال کیجئے۔
"الف" نے شاید انٹرویو کے لئے جانا ہو اور
آپ اُسے ایک بڑے چانس سے محروم کر رہے ہیں۔
"ب" شاید ڈاکٹر کے پاس اپنے اکلوتے بچے
کی بیماری کے سلسلے میں جا رہا ہو۔ جو زندگی اور موت
کے درمیان لٹک رہا ہے اور آپ اُسے
بچانے کی آخری کوشش سے محروم کر رہے ہیں۔
اس لئے انسانیت سے کام لیجئے۔
اپنی ذمہ داری کو پہچانئے۔ خطرے کی زنجیر نہ کھینچئے
جب تک آپ مجبور نہ ہوں۔
اور دوسرے مسافروں کو بھی ایسا کرنے سے روکئے۔
ناردرن ریلوے

شعلے ہی شعلے

نشتر خانقاہی

[illegible] دہلی

۲۳ مئی ۶۵ء

محترم [illegible] صاحب تسلیم

یہ کہانی جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں [illegible] ترجمہ [illegible] کا ایک انگریزی کہانی کا عکس ہے۔ میں نے اس کے تھیم کو بنیاد بنا کر اسے اپنے انداز میں تحریر کیا ہے [illegible] دراصل [illegible] احساس [illegible] روح [illegible] ہے ... آپکا ——— نشتر خانقاہی

اور آج پھر ———

جب ندا اپنے شوہر سے کہہ کر گھومنے کے لئے باہر جانے لگی تو [illegible] غصہ [illegible] استر سے ملنے جا رہی ہے [illegible] بیوی کا کسی دوسرے سے ملنا پسند نہیں تھا۔ اس نے [illegible] باہر جانے [illegible] تھا کہ ندا استر سے محبت کرتی ہے

"یہ نہیں ہو سکتا ——— کبھی نہیں ہو سکتا ——— میں یہ سب کیسے برداشت کر سکتا ہوں ——— [illegible] بڑبڑایا

[illegible] کوئی شخص [illegible] میری ازدواجی زندگی میں دخل اندازی کرے ——— [illegible] ضرور [illegible] گا ———"

[illegible] ندا [illegible] آنکھیں [illegible] حالت میں [illegible]

اور پھر [illegible] ہوٹل کی شاندار [illegible] گیا ہے اور [illegible] ہے

وہ دونوں ایک دوسرے کے [illegible] قریب [illegible] ایک دوسرے کے [illegible] محسوس کر رہا ہے [illegible] استر نے [illegible]

[illegible] ہے آسمان پر چمکتے ہوئے ننھے ننھے تاروں کی چھاؤں میں وہ دونوں [illegible] ساتھ [illegible] ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومنے کے لئے باہر نکل آئے تھے۔

[illegible] جیسے [illegible] جنت میں بیٹھے ہوں [illegible] آہستہ آہستہ ایک [illegible] نغمہ [illegible] ہے ——— [illegible] آسمان کے چمکتے ہوئے ستارے ہیں :

وہ [illegible] ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے [illegible] خاموشی کے عالم میں [illegible] ہیں۔

[illegible] بہت خوش [illegible] ہے

ندا [illegible] کی سی حالت میں [illegible] کہہ رہی ہے

"پیار کسے کہتے ہیں ——— ؟ [illegible] ایسے ہی [illegible] پیار کرتے [illegible] ——— ؟"

استر نے [illegible] ندا کو [illegible] قریب کھینچ لیا ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ——— [illegible]

۔۔۔ ہے ۔۔۔ چاہے وہ تم ہو یا تمہارا کوئی عاشق [illegible]

[illegible]

ٹھیک ہے ۔۔۔ لیکن تم یہ بھی تو سوچو کہ زندگی کتنی مشکل ہو جاتی ہے جیسے ہی میں نے تمہارے پاس آنے کے لئے تیاری شروع کی رکنے لگا

کہاں چلیں ۔۔۔ ؟

میں نے کہا ۔ جہنم میں ۔

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی ۔۔۔ جہاں بھی جاؤ گے جاؤں گی

میں تمہاری بیوی ہوں ۔۔۔ خادمہ نہیں ۔

ارتضیٰ ۔۔۔ غصے کے مارے اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں ۔ یک [illegible] چلانے والی نظروں سے مجھے گھور رہا ۔۔۔ اچھا تم ہی بتاؤ اس شلوار میں تمہیں کیسی لگتی ہوں ۔ تمہیں کس رنگ کا کپڑا اچھا لگتا ہے ۔ گلابی رنگ [illegible] ۔۔۔ کیوں استھر ؟

تم پر تو ڈارلنگ ہر رنگ جچتا ہے ۔ استھر پیار سے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہہ رہا ہے ۔۔۔ لیکن آج کی رات تو واقعی تم قیامت ڈھا رہی ہو ۔

ارتضیٰ کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی ہے ۔ وہ آہستہ آہستہ [illegible] ترچھی نگاہوں سے کھینچ لیا ہے ۔

لفظ [illegible] کی طرف آہستہ آہستہ سرک رہا ہے

"اور پھر میں جیسے ہی گھر سے نکلنے کو تیار ہوئی ۔۔۔ ارتضیٰ کے لہجے میں [illegible] کی آمیزش ہے ۔۔۔ آ جاتے ہو کیا ہوا [illegible] ہے ۔۔۔ تم سوچ نہیں سکتے [illegible]

استھر کے ہونٹ جذبات کی شدت سے کپکپانے لگے ہیں ۔

ارتضیٰ کہہ رہی ہے ۔۔۔ اور جب میں گھر سے باہر نکلنے لگی تو گویا کہ اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا ۔ اس کا چہرہ کتنا سخت اور [illegible] ہوگیا تھا اس وقت ، میں بتا نہیں سکتی ۔ استھر [illegible] کر سکوں گی ۔

اُف کیسی خوفناک ٹریجڈی ہے ۔ استھر کا لہجہ ہمدردی کے جذبات سے [illegible] کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کچھ دیر کے لئے بھی گھر سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتا ۔ وہ کتنا گھٹا ہوا اور سنگدل ہے ۔ تم تصور نہیں کر سکتے ۔ کسی بات پر سنجیدگی سے غور کرنا تو گویا اس نے سیکھا ہی نہیں ۔ لیکن اس کے سامنے [illegible] اسی بات پر زندگی اور

[illegible] ہو رہا ہے۔

"اُف! مارتھا تمہیں کتنی سخت تکلیف اُٹھانی پڑتی ہوگی؟" اسمتھ پیار سے اُس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہا ہے۔

"تم تو سوچ بھی نہیں سکتے، میں نے کتنی اذیتیں اُٹھائی ہیں، کتنی بھیانک تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ یہ دنیا میں شاید ہی کسی اور نے سہا ہو۔ محبت کیا ہوتی ہے، وہ اُس احساس کا پتہ ہی نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ تم سے ملنے سے پہلے میں بھی نہیں جانتی تھی کہ محبت کیا ہوتی ہے۔"

"ڈارلنگ، تم کتنی اچھی ہو!" اسمتھ نے باہوں میں بھر کر اُسے اپنے سر تک اونچا اٹھا لیا ہے۔

لفٹ کچھ اور نیچے سرک گئی ہے۔

"تم میرے سکھ کا اندازہ نہیں کر سکتے ــــ" اسمتھ کے سینے سے سر اُٹھا کر مارتھا کہہ رہی ہے۔ "تمہارے ساتھ کھلے آسمان میں جھلمل کرتے تاروں کو دیکھتے ہوئے سپنوں کی دنیا میں کھو جانا کتنا اچھا لگتا ہے۔ سچ! میں یہ لمحے کبھی نہیں بھولوں گی ــــ ارنلڈ جیسے شخص کے ساتھ تو ایک پل بھی رہنا مشکل ہے۔ کم بخت ایسا گمبھیر بنا رہتا ہے کہ بس! زندہ دلی تو جیسے اُسے چھو کر ہی نہیں گئی۔"

"اور ایسے شخص کو برداشت کئے جانا آسان نہیں ہے ڈارلنگ! بالکل نا ممکن ہے!"

"ہاں!" مارتھا دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی ہے۔ "لیکن ہم اُس آدمی کا تذکرہ کر کے اب ان خوشگوار لمحوں کو ضائع نہیں کریں گے۔ ہم حُسن اور پیار کی تلاش میں نکلے ہیں۔ بتاؤ، کیا اب بھی تم مجھ سے محبت کرتے ہو ــــ؟"

"بے شک! کیا تمہیں اس میں کچھ شک ہے ــــ" اسمتھ نے کمر سے پکڑ کر مارتھا کو پیچھے کی طرف جھکایا ہے کہ گردن نیچے لٹک جانے کی وجہ سے مارتھا کا منہ کھل گیا ہے۔

لفٹ اُسی رفتار سے نیچے اُتر رہی ہے۔

اسمتھ مارتھا کے اوپر جھک گیا ہے اور اُسے پیار سے گدگدا رہا ہے۔

"آئی! آج کی رات ہم دونوں اتنی شدت سے ایک دوسرے کو چاہیں ــــ اتنی شدت سے پیار کریں کہ آج تک کسی نے نہ کیا ہو۔" ارنلڈ کے منہ سے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز نکل رہی ہے۔

مارتھا نے اُس کی گردن میں اپنی باہوں کی گرفت اور زیادہ مضبوط کر لی ہے اور ایک انجانی سی کیفیت سے بے خود ہو کر اپنی آنکھیں موند لی ہیں۔

لفٹ بدستور نیچے کی طرف سرک رہی ہے۔

اسمتھ نے گھبرا کر مارتھا کو اپنے سے علیحدہ کر دیا ہے۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑنے لگی ہیں۔

"مارتھا! آج اِس لفٹ کو کیا ہو گیا؟ وہ رکتی کیوں نہیں ــــ؟ ہمیں چلے ہم کتنی دیر سے اس میں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں!"

"ہاں! اسمتھ ذرا میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی ہوں۔ ہمیں یہاں سے بہت دیر ہو گئی ہے۔ وقت بھی تو ہوا کی طرح اُڑتا ہے!"

"اُف خدا!"

دونوں سلاخوں سے باہر جھانکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بھیانک اندھیرے کے سوا کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی ــــ لفٹ ہے کہ اُسی رفتار سے نیچے اترتی جا رہی ہے۔

"خدا! رحم!! یہ کیا قیامت ہے؟ کیا ہم پاتال میں اُترتے جا رہے ہیں؟ زمین کے نیچے بہت نیچے تحت الثریٰ میں! اُف اب کیا ہوگا؟"

دونوں نیچے کی طرف جھانکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن وہاں بھی گھپ اندھیرے کے سوا کچھ نہیں۔

"معلوم ہوتا ہے یہ لفٹ تو اب سیدھی جہنم ہی میں پہنچا کر دم لے گی" اسمتھ خوف زدہ لہجے میں کہہ رہا ہے۔

"خدایا رحم کر!" مارتھا اسمتھ کی باہیں پکڑ کر خوف سے کانپنے لگی ہے۔ اُس کے ہاتھ پاؤں جواب دے گئے ہیں اور ہونٹ تیزی سے کانپ رہے ہیں۔

"ایمرجنسی بریک کھینچو، جلدی کرو اسمتھ!"

اسمتھ اپنی ساری طاقت لگا کر ایمرجنسی بریک کھینچ رہا ہے۔ لیکن یہ بھی بیکار ہے۔

لفٹ اُسی انداز سے نیچے اُتر رہی ہے۔

"اُف! اب کیا ہوگا؟" مارتھا خوف زدہ ہو کر رونے لگی ہے۔

"گھبراؤ مت ڈارلنگ!" اسمتھ تشویشناک لہجے میں کہہ رہا ہے۔ "ایسے میں ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ بس قسمت پر بھروسہ کرو اور اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دو۔"

دونوں مایوس ہو کر آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگے ہیں۔

"کون جانتا تھا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ہم تو سکھ کے کچھ پل گزارنے کے لئے نکلے تھے۔"

"لیکن کیسے خوفناک حالات کا شکار ہو گئے ہیں!" اسمتھ نے مارتھا کی بات پوری کرتے ہوئے کہا ہے اور دلاسا دینے کے لئے مارتھا کو اپنے سینے سے لگا لیا ہے۔

لفٹ چلتے چلتے ایک جگہ آکر رک گئی ہے۔

دونوں خوشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ چاروں طرف تیز روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ جیسے ہی وہ لفٹ سے باہر نکلے ہیں ایک بھیانک آواز اُن کے کانوں سے ٹکرائی ہے۔

"دوزخ ــــ!"

[illegible] گزر رہے ہیں —
[illegible] — ہم [illegible] گئے —
کمرہ نمبر [illegible] — دونوں [illegible] گئی ہے
[illegible] آرام [illegible] ہے — وہ گھور کر چاروں طرف
دیکھ رہی ہے لیکن [illegible] محسوس ہوتا ہے — [illegible] نہیں، جیسے [illegible]
آگئی ہو۔

بیٹھک [illegible] ہم [illegible] وہ کہہ رہا ہے۔
ڈرو نہیں — یقین رکھو تم یہاں بہت آرام سے رہو گے اور اپنی خواہش
کے مطابق یہاں [illegible] سکو گے۔

مسکرا — شکریہ [illegible] خوف [illegible] کے باوجود اُس کے سامنے
جھک گیا ہے — ہم صرف ایک رات کے مہمان ہیں۔ اس سے زیادہ [illegible]
کے لہجے میں نرمی اور نیازمندی ہے۔

خوف سے [illegible] کا ہاتھ تھام لیا ہے۔ جس [illegible]
[illegible] انہیں اپنے آس پاس
[illegible] دھیرے دھیرے

[illegible] دیکھ رہے ہیں [illegible]
[illegible] طرف [illegible]
[illegible]
[illegible] ہماری [illegible] پر [illegible] ہیں۔

وہ شخص کچھ دیر پہلے اُن کے سامنے آیا تھا، [illegible]
[illegible] ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتے ہو — ٹھیک ہے نا —؟

دونوں خاموش ہیں۔ اُن کے سر ندامت سے جھک گئے ہیں۔

مگر ٹھیک ہے — وہ شخص کہہ رہا ہے — تم آؤ اس طرف
آجاؤ، میرے پیچھے پیچھے۔

دونوں خاموشی سے اُس کے پیچھے پیچھے ایک گلی سے [illegible]
سے باہر نکل جاتی ہے۔ سامنے [illegible] کمرہ ہے۔ جس کے دروازے پر
ایک دھندلا سا لیمپ جل رہا ہے۔

صبح کی [illegible] تم یہاں رہ سکتے ہو [illegible] اجنبی شخص [illegible] واپس
جانے کے لیے [illegible] ہے۔

[illegible] ہے — لیکن یہ جگہ اتنی [illegible] نہیں [illegible]

[illegible]

[illegible] محسوس ہوتا ہے ... [illegible]

اس کمرے میں عجیب سی وحشت ہے اگرچہ ——— سب پہلے ہی سے [illegible] کیا
ہے۔ ہم خیال رکھتے ہیں یہاں آنے والوں کی زندگی بے مزہ نہ ہونے پائے۔

دونوں چپ چاپ کمرے میں داخل ہو گئے ہیں۔

کمرے میں ایک موٹی بھدی سی عورت اُن کا استقبال کرنے کے لئے موجود ہے۔
اُس کے دانت لمبے ہیں اور چہرہ بھیانک ہے۔ ہنستے ہنستے اُس کے منہ سے [illegible]
ٹپکتی ہے اور اُس کی بٹن جیسی آنکھوں سے عیاری کا جذبہ عیاں ہے۔

"آپ مسٹر استھر ہیں نا ——— اور یہ آپ کی [illegible] لڑکی کون ہے ——— [illegible]
پیاری ہی ہے۔"

"مگر میرا خیال ہے کہ آپ کمرہ نمبر ۲ میں چلے جائیں" اُس نے استھر کے ہاتھ میں
ایک لمبی سی چابی دیتے ہوئے کہا ہے۔

دونوں اُس کی ہدایت کے مطابق کمرہ نمبر ۲ میں چلے آئے ہیں۔ [illegible] پر ایک دھندلا سا
لیمپ جل رہا ہے۔ دیکھنے میں یہ کمرہ خاصا بڑا ہے۔ دیوار کے قریب ایک مسہری بچھی ہے۔

استھر سوچ رہا ہے یہ جگہ ویسی تو ہرگز نہیں جیسی بتائی جاتی تھی۔ کافی تہذیب یافتہ اور پُرسکون
ہے۔ مارتھا جاکٹ اتار کر کھونٹی میں ٹانگ رہی ہے۔

دونوں مسہری پر بیٹھ گئے ہیں۔ اور بانہوں میں بانہیں ڈال کر پیار کی باتوں میں
مصروف ہو گئے ہیں۔ کہ پچھلے دروازے سے ایک شخص داخل ہوا ہے۔ اُس نے ویٹروں کا سا
لباس پہن رکھا ہے۔ وہ چہرے سے بہت مہذب اور متقی معلوم ہوتا ہے اور اس طرح چلتا ہے
کہ اُس کے قدموں کی آہٹ تک محسوس نہیں ہوتی۔

وہ دونوں اُس کی آمد سے بے خبر ایک دوسرے کی بانہوں میں منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔
اُن میں سے کوئی بھی اُس کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ ویٹر اسی طرح چپ چاپ کھڑا ہے۔

"آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" ویٹر نے واپس جاتے ہوئے دھیرے سے پوچھا
ہے۔

"ہاں! ہمیں تھوڑی سی شراب کی ضرورت پڑے گی۔ آدھی بوتل شراب دے جاؤ"
استھر نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا ہے۔

ویٹر نے مودبانہ انداز میں اپنا سر جھکایا ہے اور بے آواز قدموں سے واپس چلا گیا ہے۔
استھر مارتھا کے چہرے کو اپنے چہرے سے لگائے دھیرے دھیرے اُس کے بالوں پر ہاتھ
پھیر رہا ہے۔ مارتھا [illegible] استھر ان سب باتوں سے
بے نیاز ہے۔

سوچ تو رہی ہے۔ مارتھا ہم آغوش [illegible] ہے ——— تم ہی تم اور صرف تم
[illegible] کرشمہ
[illegible] اچانک ہے نا ——— [illegible]
مارتھا [illegible] استھر پیار سے اُس کی پیٹھ سہلا رہا ہے۔ "تم کتنی اچھی ہو
کتنی پیاری ——— کیا تم یقین کر سکتی ہو ..."

اچانک ویٹر کمرے میں آ گیا ہے۔ [illegible] اور آواز کے بغیر آہستہ سے
میز پر گلاس رکھ کر اُن میں شراب انڈیلنے لگا ہے۔ لیمپ کی روشنی اس وقت ٹھیک اُس کے
چہرے پر پڑ رہی ہے۔

مارتھا سر اٹھا کر اُس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اُس کے چہرے پر موت کی سی
سفیدی چھائی ہوئی ہے۔ دائیں کنپٹی پر گولی لگنے کا نشان ہے جس سے خون بہہ بہہ کر
جم رہا ہے۔

مارتھا اچانک چیخ مار کر اچھل پڑی ہے۔

"ارنلڈ! یہ تم ہو ——— یہ تمہارا حلیہ؟ اے خدا! کیا ہوا؟"

ویٹر گہری نظروں سے مارتھا کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اُس کے چہرے پر زخم کی
تکلیف اور بے چینی کے تاثرات نہیں ہیں۔ وہ بالکل سنجیدہ اور پُرسکون ہے۔

"یہ تم نے کیا کیا ——— یہ تم نے کیا کیا ارنلڈ ———" مارتھا چیخ رہی ہے ———
"مجھے خدا کی قسم [illegible] تم اپنی جان پر کھیل جاؤ گے [illegible] تم نے
مجھ سے کچھ کہا بھی تو نہیں ——— اُف! میرے خدا یہ کیا ہو گیا؟"

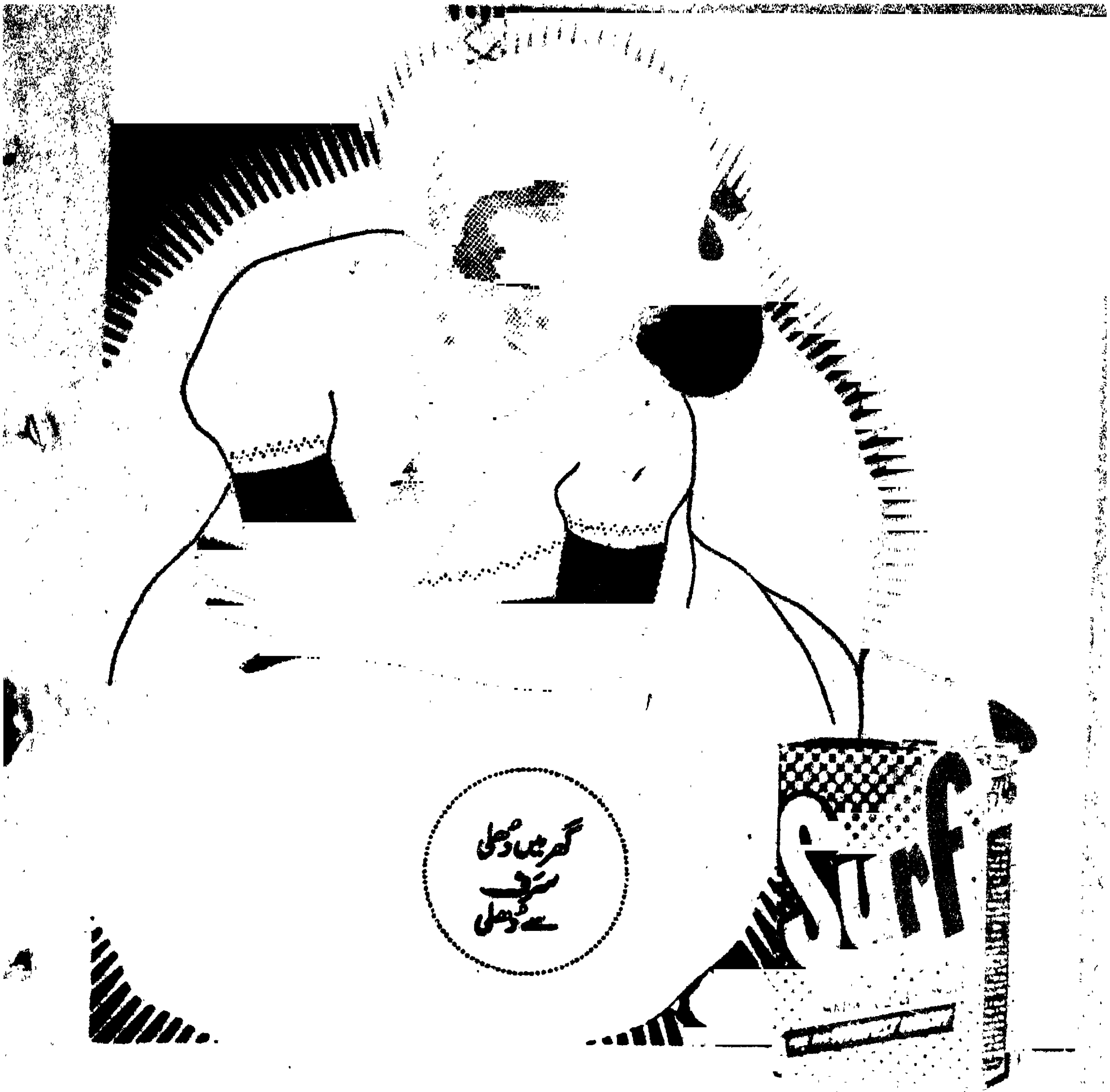
مارتھا کا سارا جسم تھر تھر کانپ رہا ہے۔ ارنلڈ خالی خالی نظروں سے مارتھا کی
طرف دیکھ رہا ہے جیسے وہ اُسے پہچانتا ہی نہ ہو۔ اُس کی آنکھیں بہت گہری اور اداس
ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہر چیز کے آر پار دیکھ سکنے کی طاقت رکھتی ہوں۔

اب اُس کے زخم سے خون نکلنا بند ہو گیا ہے۔ صرف ایک گہرا داغ باقی ہے ———
گہرا اور بھیانک ———!

"اُف! کیسی خوفناک ٹریجڈی ہے۔" مارتھا زور زور سے رونے لگی ہے۔

"میں یہاں نہیں رہوں گی۔ ارنلڈ مجھے لے چلو ——— مجھے [illegible]
کے لئے [illegible] میں کبھی یہاں نہیں آؤں گی۔ ارنلڈ ——— ارنلڈ ———"

مارتھا نے گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول لیں۔ سارا ماحول جوں کا توں ہے۔ صرف اُس کا
ضمیر ایک انجانی آگ میں سلگ رہا ہے ——— دھیرے دھیرے ———!


گھر میں دُھلی
سرف
سے دُھلی
Surf

افسانہ نمبر دیکھا

اہلِ قلم حضرات کی رائیں

...افسانہ نمبر ہر لحاظ سے کامیاب اور آپ کی روایات کے عین مطابق ہے۔ کہانیاں کافی اچھی اور بعض بہت اچھی۔ سُنا ہے کہ راجہ مہدی علی خاں کے نام حکومتِ دہلی نے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیا ہے۔ غالباً ادیبوں اور شاعروں نے اُن کے خلاف دعویٰ دائر کیا تھا کہ وہ اُن کے متعلق ہمیشہ سچی باتیں لکھتے ہیں اور جھوٹی باتیں بھی سچ کے انداز میں لکھ دیتے ہیں حالانکہ شاعر ہمیشہ جھوٹی باتوں سے خوش ہوتا آیا ہے۔ خدا کرے راجہ صاحب جلد جھوٹ بولنا شروع کر دیں — آپ نے یہ شاندار افسانہ نمبر نکال کر اُردو کے وقار میں اضافہ کیا ہے — اور اپنی عمر میں بھی!...

کوثر چاندپوری (دہلی)

...کتنی ہمت ہے آپ کی کہ ہر پانچ شماروں کے بعد دُنیائے ادب میں ادبی دستاویز پیش کر کے تہلکہ مچا دیتے ہیں — تاریخِ صحافت میں "بیسویں صدی" کا جو حصہ رہا ہے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ میں ہمیشہ اس کی کامرانی اور ترقی کی دعا کرتا ہوں...

(پروفیسر) ظفر احمد نظامی شیوپوری۔ مدھیہ پردیش

...افسانہ نمبر "بیسویں صدی" کی روایات اور آپ کی عظیم شخصیت کا پرتو ہے۔ صوری اور معنوی حیثیت سے یہ اُردو کے رسالوں کے خاص نمبروں میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ افسانہ نمبر کے سبھی افسانے پسند آئے۔ کرشن چندر ہمیشہ کی طرح یہاں بھی عظیم فنکار کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے ہیں۔ کوثر چاندپوری اور م۔ک۔ مہتاب کے افسانے بھی پسند آئے...

(پروفیسر) انور سیوانی۔ سیوان

...آج جبکہ بھارت کی اکثریت اُردو زبان سے چشم پوشی برت رہی ہے آپ اپنی مستحکم روایات کے مطابق خصوصی نمبر پیش کر رہے ہیں۔ یہ تاریخی دستاویزات جہاں ایک طرف آپ کی مستقل مزاجی کا ثبوت ہیں دوسری طرف اُردو کی بقا اور زندگی کا ثبوت بھی پیش کرتی ہیں۔ جو زبان اتنی صوری و معنوی خوبیوں سے مزین نمبر پیش کر سکتی ہے اُس کے مستقبل کی تابناکی کا کون منکر ہو سکتا ہے۔ کاش آپ کی لگن اور مستقل مزاجی کا کچھ حصہ بھی اُردو داں طبقہ کو مل جاتا تو آج اُردو اِس کس مپرسی کے عالم میں نہ ہوتی — مضامینِ نظم و نثر کا انتخاب "بیسویں صدی" کی انسان دوستی کی شائستگی کے ساتھ ہی اپنی جگہ داری و انفرادیت کے لئے دلیل ہے۔ آپ جس جیالداری کے ساتھ گلشنِ اُردو کی آبیاری کر رہے ہیں اس کی مثال ملنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے...

مہدی پرتاب گڑھی (پرتاب گڑھ)

...ویسے تو "بیسویں صدی" کا ہر شمارہ ایک دلنواز محبوبیت لئے ہوتا ہے لیکن افسانہ نمبر دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نئی نویلی حسین و جمیل دلہن مشرق کے تمام زیورات اور خوبصورت ملبوسات زیبِ تن کئے میری نظروں کے سامنے آ گئی ہو۔ ایسی حالت میں کون کافر ہو جو اسے پیار نہ کرے...

بشیر سعید (الٰہ آباد)

...اس وقت تک میں اسے اوّل تا آخر پڑھ چکا ہوں۔ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے شگفتگی اور رعنائی کا پیکر ہے اور اس کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے الفاظ کی تنگ دامانی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ "بیسویں صدی" میرے خیالات کا ترجمان ہے۔ افسانہ نمبر کی تخلیقات اُن کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ کشمیری لال ذاکر، م۔ک۔ مہتاب، حامدی کاشمیری، کوثر چاندپوری نیز کنھیا لال کپور کی تخلیقات مجھے خصوصی طور پر پسند آئیں...

مشتاق اعظمی (آسنسول)

...جدت اور ندرت پیدا کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ آپ ہر ماہ "بیسویں صدی" کو جس انداز سے مرتب اور جس حُسن سے مزین کرتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ زیرِ نظر افسانہ نمبر بھی آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا جیتا جاگتا شاہکار ہے۔ ویسے تو اس کے ہر افسانے کو نگاہ و دل سے لگانے کو جی چاہتا ہے لیکن خصوصی طور سے کوثر صاحب، راجہ مہدی علی خاں، رام لعل، وقار بن الٰہی، م۔ک۔ مہتاب، جگدیش بل اور کشمیری لال ذاکر کے افسانے بہت خوب ہیں۔ ساحر ہوشیارپوری، عندلیب شادانی، [illegible] مشہدی اور ضیاء فتح آبادی کی غزلیں بھی اس نمبر کی جان ہیں — اس اُردو کُش دور میں آپ اُردو کی جو خدمت کر رہے ہیں وہ یقیناً لائقِ تحسین اور قابلِ ستائش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس بدنصیب زبان کی تاریخ میں آپ کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا — [illegible]

[illegible] آپ کے [illegible] ہے لیکن آپ

[illegible] کہ لکھ کر اور [illegible] جاتیں۔ اس سلسلے میں [illegible]

[illegible] کا مشکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں

[illegible] سے بیاں کیا بلکہ جاری تو تھا ایک اہم کام کی طرف

[illegible] مستحق ہیں کہ آپ کے تیر و نشتر سے بچ کر شامل ہیں

[illegible] ... بیاض میں تپاسی (ایم۔ کام) فتح پور

. . . اب کے افسانہ نمبر خوب ہے۔ حصہ نثر میں جناب کشمیری لال ذاکر اور جناب [illegible] بہتر ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں اپنے فن کے عروج پر ہیں۔ کاش [illegible] بیسویں صدی کے آنے والے تمام شماروں کی زینت بنیں۔ پروفیسر فراق اور [illegible] کا کلام شامل کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسرت سے بہت سی [illegible] وابستہ ہیں۔ ان کے کلام سے میرا جذباتی رشتہ ہے ——— میری رائے میں بیسویں صدی کی قیمت میں اور افسانے کے ضخامت میں [illegible] کیا گیا افسانہ نمبر کی صورت میں۔ بیسویں صدی کے شیدائی اور اردو زبان و ادب کے فریفتہ اپنے محبوب رسالے کو کسی بھی قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہیں . . . پریم کمار نظر (کٹک)

. . . آپ نے نئے لکھنے والے ادیبوں کی عمدہ تخلیقات کو یکجا کر کے اپنی صحافتی صلاحیت اور خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے۔ میری جانب سے دلی مبارکباد اور ذرہ نوازی کی آپ سے بیکھے۔ بقول شاعر ؎

جنہیں حاصل ہوا ہے قرب تیرا

وہ ذرے ماہِ کامل بن گئے ہیں

محمد الاختر (بی۔ اے) کامٹی

. . . آپ نے بہت پیارا نمبر نکالا ہے۔ جسے رانچی سے چلتے وقت ایک دوست کے یہاں دیکھا تھا۔ مبارکباد کا ٹیلیگرام اسی وقت وہاں سے بھیج چکا ہوں۔ یقین ہے مل گیا ہوگا . . . ظفر احمد (دہلی)

. . . کچھ دن کے لئے باہر گیا ہوا تھا واپس دہلی آیا تو بیسویں صدی کے افسانہ نمبر نے خیر مقدم کیا۔ خیال تھا کہ دہلی میں موسم بدل گیا ہوگا لیکن یہاں جھلسا دینے والی گرمی ابھی تک کسر نکال رہی تھی لیکن افسانہ نمبر موجب تسکین ہوا اور طبیعت کے

دیکھ کر جو خوش حاصل ہوئی۔ بیسویں صدی [illegible]

[illegible] مزاج اور رومانیت اور [illegible] آپ کا طرز [illegible]

بیسویں صدی کے خد و خال آپ کے خد و خال بن گئے [illegible]

کی طرح آپ نے بیسویں صدی کو ایک ایسا [illegible] سے جناب

خوشتر کی خوبیاں، جدت طرازیاں اور گرافک [illegible]

نہیں ہے اور کہیں زیادہ قابل تعریف ہے . . . [illegible]

. . . ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ نے [illegible] مولیے ڈالا ہے۔ آپ لائق صد ستائش ہیں کہ اس [illegible] میں اردو کے گلستاں کو رنگا رنگ بنائے رکھنے کے لئے خون جگر صرف کر رہے ہیں۔ خدا کرے کہ آپ اسی لگن کے ساتھ اپنے مشن کو کامیاب بنائیں . . . حیدر [illegible]

. . . ہندوستان میں اردو ادب کے مشہور شیدائی جناب خوشتر گرامی نے حسبِ روایت اس سال بھی "بیسویں صدی" کا افسانہ نمبر نکالا ہے۔ گو حسبِ روایت افسانہ نمبر میں نظمیں اور غزلیں بھی شامل ہیں لیکن افسانوں کا حصہ پورے نمبر پر حاوی ہے۔ افسانے ہند و پاک کے اُن بلند پایہ فنکاروں کے قلم سے نکلے ہیں جن پر اردو ادب گزشتہ چوتھائی صدی سے فخر کر رہا ہے۔ اور ان میں اُن نئے اُبھرتے ہوئے افسانہ نگاروں کی تخلیقات بھی شامل ہیں جن کا فن آنے والی چوتھائی صدی تک اثر انداز ہو [illegible] افسانہ نگاروں کا یہ امتزاج ایک قسم کی ادبی تاریخ مرتب کرتا ہے۔ اور بیسویں صدی نے اپنے ہر دور میں اپنے نمبروں کے ذریعے ادبی تاریخ مرتب کرنے کا فریضہ ادا کیا ہے اور پوری ذمہ داری، خوبصورتی، نفاست اور عظمت کے ساتھ ——— یہ تمام افسانے اس قابل ہیں کہ ہند و پاک کا ہر شہری ان کا مطالعہ کرے اور اپنے ارد گرد کے سماج کے احساس و جذبہ کی زندگی کو اپنے دل و دماغ میں سموئے ——— اس خاص نمبر میں افسانوں کے علاوہ وہ خصوصیات بھی موجود ہیں جو بیسویں صدی کے لئے منفرد اور مخصوص ہیں۔ متعدد ادیبوں کی گھریلو زندگی کی تصویریں، طنز، سیاسی کارٹون، مستقل فیچر مثلاً تیر و نشتر، صحت و زندگی اور سرگوشیاں بھی اس نمبر کی زینت ہیں۔ ہم جناب خوشتر کو اس نمبر کی ترتیب کے لئے مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اُن کی درازیٔ عمر اور دولتِ اردو کی ترقی کی دعا کرتے ہیں . . . قطب [illegible] (دہلی)

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کے لئے پتہ لکھا ہوا لفافہ ضرور بھیجئے۔ بصورتِ دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

بیسویں صدی کے مستقل خریدار [illegible]



صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کار آمد اشارات

ڈاکٹر جامن

جامن اپنے اندر بہت سی خوبیاں رکھتی ہے۔ اس کا مزاج سرد خشک ہے۔ یہ مقوی معدہ ہے۔ جگر اور معدہ کی گرمی کو کم کرتی ہے اور قوت و تقویت بخشتی ہے۔ صفرا اور خون کے جوش کی تیزی کو کم کرتی ہے۔ اسے کھانے سے بھوک بڑھتی ہے۔ تلی اور پیشاب کے ساتھ شکر یعنی ذیابیطس جیسی مہلک بیماری کے لئے بہت مفید ہے۔ مثانہ کی کمزوری دور کر کے پیشاب کی زیادتی کو روکتی ہے۔ نیا خون پیدا کر کے جسم کو فربہ بناتی ہے۔ جامن آم کا مصلح ہے۔ آم کھا کر جامن کھانے سے وہ جلد ہضم ہو جاتے ہیں۔ اور پیٹ میں گرانی نہیں ہوتی۔

جامن کو خالی پیٹ کبھی نہ کھائیے۔ نہار منہ کھانے سے اکثر اوقات پیٹ میں سخت درد ہونے لگتا ہے۔ جامن کو نمک لگا کر کھانا چاہیے۔ اس طرح خوش مزہ ہونے کے علاوہ ان کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے۔ جامن ہمیشہ کم مقدار میں کھائیے۔ بے حد قابض ہوتی ہیں۔ قابض ہونے کے باعث دستوں اور پیچش میں بہت مفید ہیں۔

آم کی طرح جامن بھی مقوی باہ اور مقوی معدہ و جگر ہے۔ جامن کی گٹھلی کا سفوف بے حد مغلظ منی ہے۔ مثانہ کی کمزوری دور کر کے کثرتِ پیشاب کو روکتا ہے۔ تین ماشہ صبح اور تین ماشہ شام نیم گرم دودھ کے ساتھ کھائیں۔ ذیابیطس میں تخم جامن ایک ماشہ اور کشتہ فولاد ایک ماشہ صبح شام عرق سونف کے ساتھ استعمال کریں۔ بے حد مفید ہے۔ خونی دستوں میں جامن کو عرقِ گلاب میں بھگو کر اور رس نچوڑ کر ضرورت کے مطابق کھانڈ ملا کر دو دو تولے صبح و شام تھوڑے پانی ملا کر پئیں۔ جامن کا سرکہ تلی اور امراض جگر میں اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ معدہ کے لئے بے حد مفید ہے۔ غذا کو ہضم کرتا ہے اور خوب بھوک لگاتا ہے۔ سرکہ بنانے کے لئے جامن کو مسل کر ان کا رس نچوڑ کر چھان لیتے ہیں اور ایک گھڑے میں ڈال کر رکھ چھوڑتے ہیں۔ ترشی پیدا ہونے پر چھان کر بوتلوں میں محفوظ کر لیتے ہیں۔

جامن دانتوں کو مضبوط کرتی ہے۔ خون صاف کرتی ہے۔ بالوں کو گرنے سے روکتی ہے۔

مسوڑے پھولے اور کمزور ہوں۔ ان سے خون نکلتا ہو اور دانت ہلتے ہوں تو جامن کی چھال کے جوشاندہ سے کلیاں کرنے سے مسوڑھوں سے خون آنا بند ہو جاتا ہے۔ مسوڑے اور دانت مضبوط ہو جاتے ہیں۔

جامن کی لکڑی بھی بطور دوا کام آتی ہے۔ اس کی لکڑی کا کوئلہ باریک پیس کر اس میں سیاہ مرچ اور نمک ملا کر بطور منجن استعمال کرنے سے دانت صاف اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔

جامن کے پتے ایک تولہ پانی میں پیس چھان کر ایک تولہ مصری باریک ملا کر پینا خونی بواسیر کے لئے نافع ہے۔

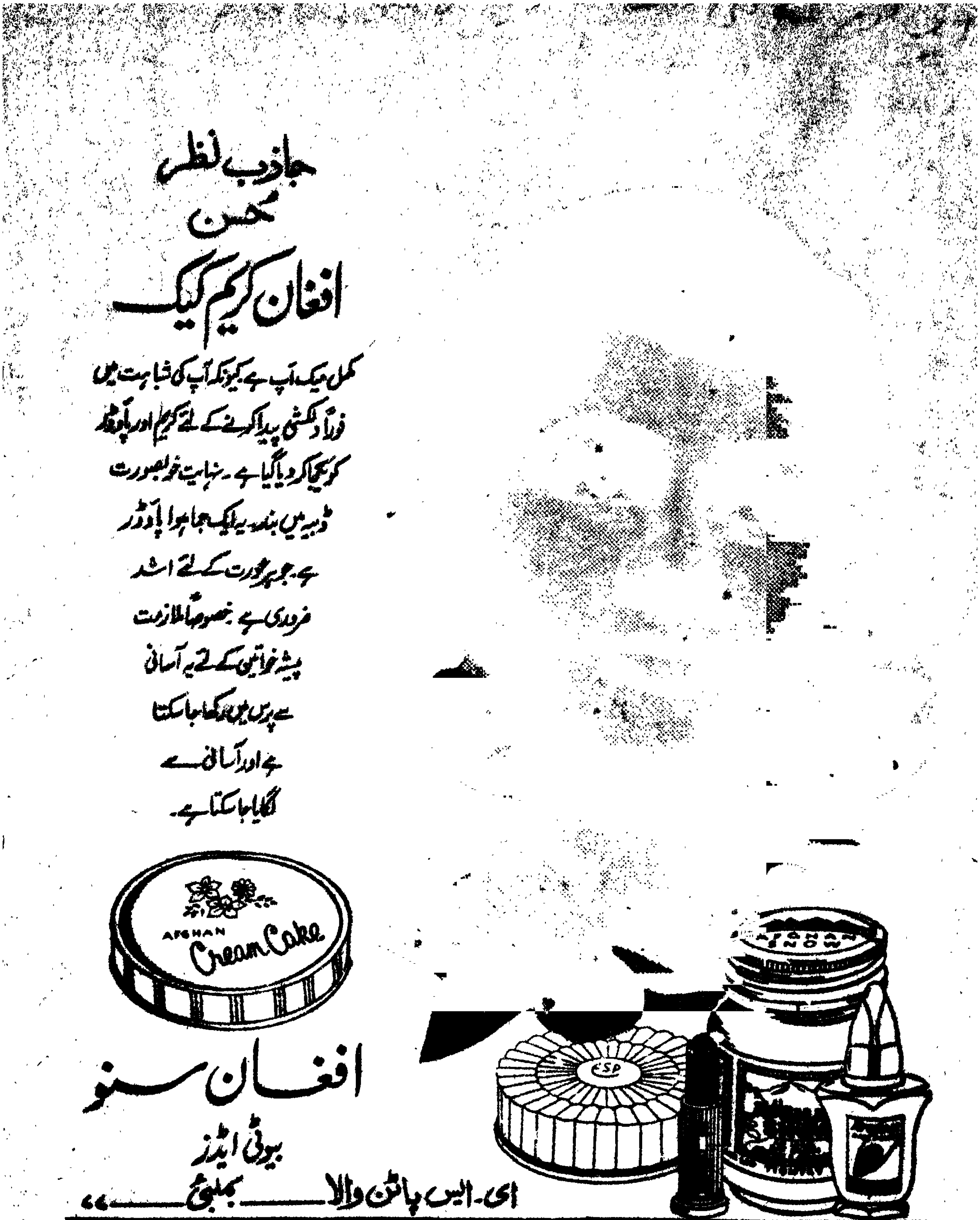
ایک تولہ جامن کے پتوں کو ایک پاؤ گائے کے دودھ میں پیس چھان کر روزانہ سات روز تک مسلسل پینا بواسیر کے لئے بہت مفید ہے۔ ترش اور بادی چیزوں سے پرہیز ضروری ہے۔

جامن کے تازہ پتوں کو پانی میں پیس کر مار گزیدہ کو پلانے سے سانپ کا زہر دور ہو جاتا ہے۔

گٹھلی اور پتوں کی طرح جامن کے پھول بھی دوا کے کام آتے ہیں۔ ایک تولہ جامن کے پھول کو عرق گاؤزبان میں پیس کر چھان لیں۔ دن میں تین بار پینا ذیابیطس کے مریض کے لئے مفید ہے۔

مغز جامن کو گنج کے مقام پر لیپ کرنے سے بال نکل آتے ہیں۔ چند ہی دنوں کے استعمال سے نمایاں فائدہ ہوتا ہے۔

جامن کے کچے پھل کو خشک کر کے باریک سفوف کر لیں۔ اس کے برابر باریک شدہ مصری ملائیں۔ چھ چھ ماشہ کی مقدار میں روزانہ صبح و شام کھانے سے عورتوں کے سیلان رحم


جاذب نظر
حسن
افغان کریم کیک
مکمل میک اپ ہے کیونکہ آپ کی شباہت میں
فوراً دلکشی پیدا کرنے کے لئے کریم اور پاؤڈر
کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ نہایت خوبصورت
ڈبیہ میں بند یہ ایک جما ہوا پاؤڈر
ہے۔ جو ہر عورت کے لئے اشد
ضروری ہے۔ خصوصاً ملازمت
پیشہ خواتین کے لئے یہ آسانی
سے پرس میں رکھا جاسکتا
ہے اور آسانی سے
لگایا جاسکتا ہے۔
AFGHAN
Cream Cake
افغان سنو
بیوٹی ایڈز
ای۔ ایس پاٹن والا ــــ بمبئی ۳

[illegible] کے ساتھ ان میں بہت سے عناصر پائے جاتے ہیں۔

جامن اور آم کی پتیاں آنکھوں کا منجن بنانے میں بہت مفید ہیں۔ جامن کے بیج پیس کر ملا لیں تو ذیابیطس کے مریضوں کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔

پیٹ کی تکلیف کے ساتھ جامن بہت ہی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اس لئے اعتدال کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے۔ جامن کا عرق معدے کی گرمی دور کرتا ہے۔ جامن زیادہ کھانے سے کھٹی ڈکار اور پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔ اس لئے کھانا کھانے کے بعد کھانا چاہئے اور وہ بھی چٹکی بھر نمک لگا کر۔ زیادہ عرصہ تک جامن کا استعمال نمک، ادرک اور مرچ کے ساتھ کرنا چاہئے۔

۲ ــــ اپنے گھر کو جنت بنائیے!

کون ہے جو اپنے گھر کو جنت نہیں بنانا چاہتا لیکن کتنے لوگ ہیں جو اپنے گھر کو جنت بنانے کی کوشش کرتے ہیں؟

اپنے گھر کو جنت بنانے کے لئے دولت اور خوشحالی سے زیادہ ضروری چیز ہے خوش اخلاقی، خوش کلامی، خندہ رُوئی و خندہ جبینی ــــ ایک مفکر نے کہا ہے ــــ "خوش اخلاقی اس روحانی صلاحیت کا نام ہے جو دوسروں کی شکستگی کو نظر انداز کر کے اس کی روح میں بکھرے ہوئے پھولوں کو دیکھ لیتی ہے"۔

ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ــــ "ازدواجی زندگی کے لئے اخلاق کی وہی حیثیت ہے جو موٹر کے لئے تیل کی ہوتی ہے لیکن آپ کیا کرتے ہیں؟ ــــ دفتر میں کام خراب ہو جائے، دکان پر کوئی گاہک ہاتھ سے نکل جائے، اپنے افسر سے جھڑکیاں سننی پڑیں یا سر میں درد ہونے لگے تو آپ کا پارہ فوراً چڑھ جاتا ہے۔ غصے میں بھرے ہوئے گھر آتے ہیں اور بے قصور گھر والوں سے اس کا بدلہ لیتے ہیں"۔

جاپان میں رواج ہے کہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے لوگ اپنے جوتے دروازے کے باہر رکھ دیتے ہیں۔ اگر ہم اس سے سبق سیکھنے کی کوشش کریں تو اپنے گھروں میں داخل ہونے سے پہلے اپنی پریشانیوں اور تلخیوں کو جوتوں کی طرح گھر کے باہر ہی چھوڑ آیا کریں۔

ہم میں سے اکثر لوگ اپنے گاہکوں سے تلخ کلامی نہیں کرتے، اپنے تجارت پیشہ ساتھیوں سے نرم کلامی کرتے ہوئے جھجکتے ہیں لیکن اپنی بیویوں پر غراتے وقت ذرا بھی نہیں سوچتے حالانکہ [illegible] خوشگوار بنانے کے لئے تجارت کے مقابلے میں ازدواجی اور گھریلو زندگی کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

اگر کوئی شادی شدہ آدمی گھر میں پُر سکون زندگی بسر کر رہا ہو تو وہ احساس [illegible] والوں سے کہیں بہتر ہے اور خوش نصیب ہے جو تنہا رہتا ہے۔

ایک مشہور مفکر [illegible] نے لکھا ہے ــــ "اگر آپ [illegible] سکون، دستیت سے محروم گھر کی قیمت ایک موٹر کے لئے ٹکڑوں رہنے کا نام گھر نہیں ہے لیکن ہر شخص ایک مرد بھی اپنی ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے سنجیدگی سے غور نہیں کرتا اور دل سے کوشش نہیں کرتا۔ وہ اپنی زندگی کی سب سے اہم بات کو اتفاق پر چھوڑ دیتا ہے"۔

اگر آپ ایسا کریں تو یقیناً اپنے گھر کو جنت بنا سکتے ہیں۔

۳ ــــ آپ ممتاز شخصیت کے مالک بننا چاہتے ہیں؟

مشہور مفکر ڈوگلس لبرٹن نے لکھا ہے ــــ "کسی بھی قوم میں ممتاز شخصیتیں وہی ہوتی ہیں جو سماج میں دوستانہ عمل کا ثبوت دیتی ہیں۔ ایسے لوگ صرف تنہا بیٹھ کر ہوائی قلعے نہیں تعمیر کرتے۔ وہ لوگوں سے روابط قائم کرتے ہیں، دوستوں کی دانت کاٹی روٹی کھاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے مفاد میں برابر شریک ہوتے ہیں۔ وہ محفلیں قائم کرتے ہیں۔ وہ اپنے حسن سلوک کے اظہار کے لئے مواقع پیدا کرتے ہیں۔ لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں سے مسکرا کر باتیں کرتے ہیں۔ خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ وہ دوسروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ لوگوں کی سالگرہ اور یوم پیدائش کو ازبر رکھتے ہیں اور ایسے موقع اور تقریبوں پر تحفے تحائف بھیجتے ہیں۔ وہ اس راز کو جانتے ہیں کہ کسی کو پسند کرنے ہی سے انسان پسند کیا جاتا ہے۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو انسان کو مقبول اور ممتاز شخصیت کا مالک بناتی ہیں۔ جن لوگوں میں یہ خوبیاں نہیں ہوتیں، وہ ساری زندگی قعرِ گمنامی میں رہتے ہیں۔

۴ ــــ آم ــــ ایک مفید دوا

۱۔ آم بہت سے دوائی اور غذائی خاصیتیں رکھتا ہے۔ اگر ہم اس کو استعمال کرنے کے طریقے معلوم ہوں تو ہم بہت سے امراض سے بغیر کسی دوا کے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر پرانے دستوں اور سنگرہنی میں آم کا چھلا اور میٹھا دہی ایک چھٹانک، دہی میٹھا ایک چھٹانک، اور ایک کا رس چائے کے دو چمچ بھر یا ہم اچھی طرح سے ملائیں۔ یہ ایک خوراک ہے۔ صبح شام اور دوپہر ایسی تین خوراکیں پینے سے پرانے دستوں اور سنگرہنی سے نجات مل جاتی ہے اور آنتوں کی کمزوری اور بواسیر میں بھی یہ بہت مفید ہے۔ کھانسی کو دور کرنے میں آم کا رس ایک چھٹانک، بادیک سونٹھ دو ماشہ صبح کے وقت پئیں۔

۲۔ تلی کے ورم میں ایک چھٹانک شیریں آموں کے رس میں ایک تولہ شہد ملا کر روزانہ صبح کے وقت پینا بہت مفید ہے۔

۳۔ پانی میں آم چور ملا کر کلیاں کرنے سے مسوڑھوں کے ورم سے نجات ملتی ہے۔

۴۔ [illegible] کا رس چلنے کے دوپہر
[illegible] بہت مفید ہے ان کے
[illegible] ہے۔ یہ جوانی لاتا ہے۔

۵۔ حقیقی [illegible] دودھ ایک پاؤ، اور ایک کا رس چلنے کے دو پہر [illegible] چینی حسب ذائقہ ملا کر پینے سے [illegible] پیدا ہوتی ہے [illegible] اور جسم کی کمزوری کا اس سے بہتر [illegible] نہیں ہے [illegible] استعمال کرنے سے قلت خون کی شکایت نہیں رہتی۔ جسم کی [illegible] اور چہرے کی [illegible] دور ہوتی ہے۔

۶۔ آم بے خوابی کی بیماری کا بہترین علاج ہے۔ رات کے وقت آم کھا کر اوپر سے نیم گرم دودھ پی لیں۔ گہری اور پُرسکون نیند آئے گی۔

۷۔ ضعف اعصاب یا نروس سسٹم کی خرابی سے جو بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں آم اُن کی بہترین دوا ہے۔ ضعف اعصاب کے مریض آم مسلسل استعمال کریں۔ اس سے اُن کا جسم مضبوط ہوگا اور بدن میں خون کی پیدائش بڑھ جائے گی۔ آم کے ساتھ دودھ کا استعمال قوت بخش اور مولد خون ہونے کے ساتھ ساتھ نروس سسٹم میں تحریک پیدا کرتا ہے۔ بدن کو فربہ کرتا ہے اور مقوی باہ بھی ہے۔

۸۔ مردانہ یا عام جسمانی کمزوری میں تازہ، میٹھے اور رسیلے آموں کا تین چار چھٹانک رس ایک صاف ستھرے چینی کے برتن میں جمع کریں اور اس میں ایک چھٹانک شہد خالص ملا کر گائے یا بکری کے دودھ کے ساتھ صبح و شام پی لیا کریں۔ تین چار ہفتوں کے مسلسل استعمال سے حیرت انگیز فائدہ محسوس ہوگا۔

۹۔ جن لوگوں کو عام طور پر قبض کی شکایت رہتی ہو وہ رات کو سونے سے پہلے آم کھا کر اوپر سے نیم گرم دودھ پی لیا کریں۔ صبح کھل کر اجابت ہوگی اور قبض کی شکایت جاتی رہے گی۔

۱۰۔ اگر آم کھا کر پیٹ میں گرانی محسوس ہو رہی ہو تو تین چار جامنیں کھا لینی چاہئیں۔ اگر جامن نہ ملے تو سونٹھ اور نمک چاٹ لیں۔ آم بہت جلد ہضم ہو جائیں گے۔

۱۱۔ دو تین کچے آم رات کے وقت بھوبل میں بھون لیں۔ جب وہ پلپلے ہو جائیں تو انھیں رات بھر کھلی ہوا میں رکھا رہنے دیں۔ علی الصبح نچوڑ کر اُن کا رس نکالیں اور اس رس میں تھوڑا سا بھنا ہوا زیرہ، تھوڑا سا نمک اور کالی مرچ ڈال کر پی لیں۔ یہ شربت لُو سے محفوظ رکھتا ہے۔ پیاس کو تسکین دیتا ہے اور اس سے تمام دن طبیعت تر و تازہ رہتی ہے۔

۵ —— کامیابی کا راز

آپ دُنیا کے کامیاب انسانوں کو دیکھ کر اُن پر رشک کرتے ہیں۔ اپنی ناکامیوں سے افسردہ و ملول ہوتے ہیں [illegible] کبھی یہ بھی سوچا کہ [illegible] کوشش کرتے [illegible] کامیابی کچھ خاص لوگوں کا حصہ نہیں ہے۔ کامیابی کسی کا خاص ورثہ نہیں [illegible] کامیابی حاصل کرنے کا تہیہ کر لیں۔ اپنے دل میں کامیابی کی سچی لگن پیدا کر لیں تو آپ [illegible] یقیناً کامیاب ہو سکتے ہیں۔

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے —— زندگی میں وہی لوگ ناکام ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی قوتوں کو نہیں پہچانا۔ جو اپنی کامیابی پر یقین نہیں رکھتے۔ کامیابی کے لئے جدوجہد نہیں کرتے۔

زندگی میں کامیابی انھیں لوگوں کو حاصل ہوتی جو عمل میں آنے سے پہلے ہی حاصل کر چکے تھے۔ جنھوں نے زندگی کے خوابوں کو حقیقت کا روپ دیا۔ وہ اُن کی تصویر پہلے اپنے دل میں پا چکے تھے۔ اُن کی کامیابی کا راز بھی اسی میں تھا۔ اگر ہم اپنے خوابوں کو حقیقت بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی یہی راہ اختیار کرنی ہوگی۔ کامیابی کا خواب ہی کامیابی کا دروازہ کھولتا ہے۔

آپ کے خواب اور آپ کی خواہشات آپ کو منزل کی طرف اُسی طرح کھینچ کر لے جائیں گے جیسے راستے میں لگے ہوئے سنگ میل راہی کو منزل کا پتہ دیتے ہیں۔ اگر آپ ہمیشہ ناکامی اور نااُمیدی کی باتیں سوچتے رہیں گے۔ اُمید اور کامیابی کے خیالات ذہن سے نکال پھینکیں گے تو زندگی میں آپ کو نااُمیدی اور ناکامی ہی ملے گی۔ آپ کی زندگی ناکامیوں کے بادل سے ڈھکی ہوئی ہے مستقل تاریک نظر آتی ہے تو ذرا بھی فکرمند نہ ہوں۔ اپنی خواہش پر جمے رہئے۔ اُس کی تکمیل کے لئے کوشش کرتے رہئے۔ یقیناً آپ اپنی کوشش میں کامیاب ہوں گے۔ ہمیشہ کامیابی کے خیال میں ڈوبے رہئے۔ ناکامی کا خیال بھی دل میں نہ آنے دیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہمیشہ کامیابی کی خواہش رکھتے ہوئے ایک دن آپ کامیابی حاصل کر لیں گے۔ کامیاب انسانوں کی زندگیاں اس حقیقت کی شاہد ہیں۔

۶ —— ہر لمحہ سُنہرا موقع ہے!

مشہور مفکر کے نولسن نے لکھا ہے —— لوگ کہتے ہیں خوش قسمتی ایک بار ضرور ہمارا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔ اگر ہم چوکنے ہوں تو فوراً دروازہ کھول کر اُسے خوش آمدید کہتے ہیں۔ اگر ہم سست یا سوتے پڑے ہوں تو وہ تھوڑی دیر انتظار کرتی ہے اور پھر چلی جاتی ہے۔ اس طرح ہم موقع ہاتھ سے کھو دیتے ہیں —— میرے خیال میں یہ حقیقت بڑی سادہ ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ انسان خوش قسمتی کے انتظار ہی میں رہے اور کچھ نہ کرے۔ یہ کیا حماقت ہے۔ خوش قسمتی ایک دائرے کی شکل میں گھومتی ہے۔ ہر لمحے اُس کے نتائج ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کیونکہ بعض اوقات اُس سے آپ زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہیں اور بعض اوقات کم۔ لیکن بیج کا بونا اتنی ہی خوش قسمتی ہے جتنی اُس کے پھل سے لطف اندوز ہونا۔ اگر دل

[illegible] اس کا تعلق آپ کے [illegible] زمانے سے ہے [illegible] وقت سے مخصوص وابستہ ہوتا ہے۔ خوش قسمتی بالکل اچانک طور پر [illegible] نہیں آتی۔ اس کا حالات سے ضرور تعلق ہوتا ہے۔ جب کسی کو کسی ممتاز منصب پر فائز کیا جاتا ہے تو اس خوش قسمتی سے ان طویل سالوں کا تعلق ضرور ہوتا ہے جو اس نے قابلیت و صلاحیت کا ثبوت دینے میں گزارے ہیں۔ جب وہ اس عہدے سے وابستہ ہوا تھا تو وہ بھی ایک خوش قسمتی تھی۔ یہ چھوٹی چھوٹی ندیاں ہی خوش قسمتی کے سمندر کو وسیع ہونے میں مدد دیتی ہیں۔

کیا آپ اس انتظار میں رہنا چاہتے ہیں کہ کب موقع ملے اور میں اپنی قابلیت و صلاحیت سے فائدہ اٹھاؤں؟ ایسا ہرگز نہ سوچئے، ایسا ہرگز نہ کیجئے! ہر لمحہ ہر لمحہ کو سنہرا سمجھئے۔ ہر دن، ہر لمحہ سنہرا موقع ہے!!

۷ — جھوٹی شان، جھوٹی زندگی!

ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے — انسانی تاریخ میں مصنوعی زندگی، تصنع اور دکھاوے کا جنون کبھی اتنا زیادہ نہیں تھا، جتنا آج کے زمانے میں ہم دیکھتے ہیں۔ آج ہر شخص کے ذہن پر یہ جنون سوار ہے کہ وہ اپنے لباس اور رہن سہن سے اپنے آپ کو اتنا دولت مند اتنا بڑا آدمی دکھائے، جتنا وہ درحقیقت نہیں ہے۔ صرف اسی لئے کہ لوگ اسے بڑا آدمی سمجھیں۔ اپنی حیثیت اور مقدرت سے زیادہ خرچ کرنا کسی طرح عقلمندی نہیں ہے۔

صرف اس لئے کسی چیز پر خرچ کرنا کہ دوسرے کرتے ہیں، سمجھداری نہیں ہے۔

بڑے شہروں میں ایسے بہت سے لوگ ملیں گے جو جسم کی آرائش کو ضروری غذا پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی آمدنی کا بہت سا حصہ دکھاوے پر صرف ہو جاتا ہے۔

دوسرے لوگوں کی آنکھوں کو خوش کرنے کے لئے ہم کتنی مشکلات برداشت کرتے ہیں! کتنی تکلیف اٹھاتے ہیں! ہم اپنے آپ کو فیشن کا کتنا غلام بنا لیتے ہیں! صرف اسی لئے کہ لوگ ہمیں دولت مند سمجھیں۔

دوسروں کو دکھانے کے لئے ہم پر کتنا زیادہ خرچ کا بوجھ پڑتا ہے۔ دوسروں کو دکھانے کے لئے ہم کتنی محنت، کتنی زحمت، کتنی جدوجہد کرتے ہیں۔ جھوٹے دکھاوے کے لئے کس طرح ہم اپنے آپ کو غلام بناتے ہیں۔

یہ جھوٹی زندگی ہے۔ دوسروں کو اپنے دکھاوے سے ہم فریب دینا چاہتے ہیں۔ لیکن سب سے پہلے ہم خود اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں۔ کیونکہ اس پر ہماری ہی کمائی خرچ ہوتی ہے۔ ہماری ہی محنت صرف ہوتی ہے۔

اس طرح کی جھوٹی زندگی سے ہماری طبیعت اور ہمارا کردار تباہ ہوتا ہے۔ اس سے ہم بناوٹی، غیر حقیقی اور جھوٹے ہو جاتے ہیں۔

بہت دنوں تک آپ لوگوں کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ آپ کچھ بھی بناوٹ ظاہر کیا کریں، یہ بات بہت دنوں تک نہیں چل سکتی۔ اس لئے کہ حقیقت ہمیشہ ظاہر ہونے کے لئے بیقرار رہتی ہے۔

۸ — حالات کا شکوہ نہ کیجئے!

کیا ہم اتفاقیہ زندگی بسر کر رہے ہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں اور ہماری زندگی کا کوئی مقصد ہے تو ہمیں چاہئے کہ ہم اس محدود زندگی میں اس مقصد کی تکمیل کے لئے جدوجہد کریں۔ دنیا میں بہت سے انسان بلا مقصد زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا کوئی مطمح نظر، ان کا کوئی نصب العین نہیں۔ ان کے سامنے زندگی کا کوئی نشانہ نہیں۔ وہ صبح اٹھتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، کام کرتے ہیں اور سو جاتے ہیں اور دوسرا دن بھی اسی طرح گزر جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی زندگی کا ہر دن گزرتا ہے۔ ایسے لوگ اپنی زندگی کا دامن کامیابی و کامرانی کے پھولوں سے نہیں بھر سکتے۔

جو انسان اپنی زندگی کا دامن کامیابی و کامرانی کے پھولوں سے بھرنا چاہتا ہے اسے نہ صرف زندگی بھر کے لئے بلکہ روزمرہ کے لئے اپنا نشانہ رکھنا چاہئے۔ گھر ہو یا دفتر یا کارخانہ۔ اگر ہم کچھ چاہتے ہیں تو اس کے لئے مناسب وقت مقرر کریں۔ اگر ہم دنیا میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں کل کے لئے آج ہی پروگرام بنانا چاہئے۔ پہلے سے پروگرام بنانے میں ناکامی کے باعث لاکھوں انسان مایوس ہو کر اپنی صحت سے محروم ہو چکے ہیں اور نتیجہ میں زندگی کی مسرتوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان کی زندگی زندگی نہیں ہے۔

ایسے لوگ اپنی اس حالت کے خود ذمہ دار ہیں۔ وہ حالات کا شکوہ کیوں کرتے ہیں؟

۹ — آپ کی صحت

صحت اور اس کا انحصار بہت حد تک آپ کی اپنی عادتوں اور طرز زندگی پر ہے۔ اگر آپ تندرست رہنا چاہتے ہیں تو صحت کے چند زریں اصول ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہنے چاہئیں۔

بہتر اور متوازن غذا استعمال کیجئے۔ مقدار میں اعتدال کو پیش نظر رکھئے۔ پانی خوب پیجئے۔ روزانہ کھلی فضا میں ورزش کیجئے۔

روزانہ رات کو سات گھنٹے سویئے۔ عصبی تناؤ، غم، غصہ اور تفکرات سے بچتے رہئے۔ طبیعت میں جوش و ہیجان پیدا کرنے والی تفریحات سے حتی الامکان اجتناب کیجئے اور تنہائی میں کچھ دیر یکسو ہو کر خدا کی عبادت کیجئے۔

یہ باتیں بظاہر بہت معمولی ہیں لیکن درحقیقت بہت اہم ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہو کر آپ صحت مند و شادماں رہ سکتے ہیں۔

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

[illegible]	[illegible] ایم اے	دو روپے
اندھیرے	اختر [illegible]	دو روپے
گرد اور دھواں	[illegible] ایم اے	ڈیڑھ روپے [illegible] نئے پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	تین روپے [illegible] نئے پیسے
ایک پیالہ ایک دوسرا	رام سرن شرما	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
بیگم صاحبہ	شوکت تھانوی	تین روپے [illegible] نئے پیسے
داماد	"	دو روپے ۲۵ نئے پیسے
پگلی	"	تین روپے [illegible] نئے پیسے
بے خبر	مسعود ہاشمی	چار روپے ۲۵ "
بادل بچے	کرشن چندر ایم اے	پانچ روپے ۷۵ "
بیمار لڑکی	[illegible] ایم اے	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
انور	فیاض علی	آٹھ روپے ۵۰ "
برہا	کرشن گوپال عابد	چار روپے ۵۰ "
ستم	"	چار روپے ۷۵ "
گونج	"	تین روپے ۷۵ "
ظالم	سعید [illegible]	دو روپے ۵۰ "
جانے والے	اختر [illegible]	تین روپے ۵۰ "
باقی رہی بہار	[illegible] محمود آبادی	چار روپے
چوٹ	دت بھارتی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
گناہ	"	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
حالِ دل	بیگم [illegible] حسین	تین روپے ۵۰ "
خاتون	انتصار حسین	تین روپے
حاجی [illegible]	قیسی رامپوری	چار روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
[illegible]	عبدالحلیم [illegible]	دو روپے [illegible] نئے پیسے

دو کہانیاں	عادل رشید	تین روپے ۷۵ "
دو سال پہلے دو سال بعد	زبیدہ خاتون	چھ روپے
زہرِ مسلسل	شفیق [illegible]	[illegible] روپے
زہر	[illegible]	چھ روپے
بہنیں	قیسی رامپوری	چار روپے
آنچل [illegible] نگاہ	ریاض ارشد	تین روپے
کانٹے	رضیہ سجاد ظہیر	تین روپے [illegible] نئے پیسے
مجھے تم سے محبت ہے	[illegible]	تین روپے ۵۰ "
نئے قدم	[illegible]	چار روپے ۵۰ "
ننگی جوانی	سعید [illegible]	دو روپے
رہ گزر	انیس مرزا	چار روپے ۵۰ نئے پیسے
خوفناک محبت	عبدالحلیم شرر	تین روپے
شعلہ	انتصار حسین	تین روپے
کرنیں	شفیق الرحمٰن	تین روپے
[illegible]	ایم اسلم	تین روپے
ایک دل ہزار غم	عزیز [illegible]	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
[illegible]	رئیس احمد جعفری	چھ روپے ۵۰ نئے پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع	پانچ روپے
دردانہ	[illegible] خاتون	پانچ روپے
چندر کلا	جمنا داس اختر	دو روپے [illegible] نئے پیسے
جلی	"	دو روپے ۵۰ "
رادھا اور [illegible]	"	دو روپے ۵۰ "
پاپی	"	چار روپے
سونا گاچھی	"	چار روپے ۵۰ "
[illegible] کی کہانی	"	چار روپے ۵۰ "
[illegible]	"	چار روپے ۵۰ "

کرامت	[illegible]	[illegible]
سازش	"	[illegible]
[illegible]	عطیہ [illegible]	[illegible]
گرداب	قیسی رامپوری	چار روپے
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر	دو روپے ۵۰ "
خون کے چھینٹے	"	دو روپے ۵۰ "
خوابگاہیں	"	تین روپے ۵۰ "
فراق	[illegible]	تین روپے ۵۰ "
پیاسا	"	تین روپے ۵۰ "
[illegible]	"	دو روپے
[illegible]	"	دو روپے
پیاس	[illegible] ایم اے	تین روپے ۵۰ "
محبت سچی ہے	غلام عباس	دو روپے
ماما	میکسم گورکی ترجمہ [illegible]	ایک روپیہ ۵۰ "
گیت [illegible]	تاجور سامری	ایک روپیہ ۷۵ "
[illegible]	شوکت تھانوی	تین روپے ۷۵ "
پردے کے پیچھے	منٹو	دو روپے ۵۰ "
[illegible] صحرا	اوم پرکاش [illegible]	دو روپے ۵۰ "
خاموش نظر	"	چار روپے
آتشِ گل (مجموعہ کلام)	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
باقیاتِ اقبال "	ڈاکٹر اقبال	تین روپے
تلخیاں (کلاں) "	ساحر	چھ روپے
تلخیاں (خورد) "	ساحر	تین روپے [illegible]
پرچھائیاں "	ساحر	ایک روپیہ [illegible]
انسانیت موت کے دروازے پر (ناول)		تین روپے ۵۰ "
[illegible] حسن	اشفاق احمد	[illegible]

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۷

سرگوشیاں

سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

ایم۔ الیاس الملبدی۔ یو ایم سی۔ الہ آباد

س۔ اچھی بیوی کی کیا تعریف ہے؟

ج۔ شوہر کی ہر ناروا، ہر ناسزا بات پر اُف بھی نہ کرے۔ شوہر کی تلخ باتوں کو قند و نبات سمجھے۔ شوہر کلب یا سینما کے سکنڈ شو سے رات کے ایک بجے گھر میں آئے تو اُس کا مُسکراتے ہوئے پرتپاک خیر مقدم کرے۔ شوہر کے لئے اُس کے دیدہ و دل فرشِ راہ رہیں۔

س۔ بیوی اور ماں کی محبت میں کیا فرق ہے؟

ج۔ ماں کی محبت بے مثال ہے!

س۔ لفظ سراب بضم السّین ہے یا بفتح السّین؟

ج۔ علامہ نشتر جالندھری نے اپنی کتاب ماڈرن اردو ڈکشنری میں سراب کو بفتح السّین لکھا ہے۔

محفوظ عالم۔ کلکتہ

س۔ دُنیا میں سب سے زیادہ عقل مند کون ہے؟

ج۔ بیوقوف اپنے آپ کو سب سے زیادہ عقل مند سمجھتا ہے۔

محمد اقبال میلو۔ قطب پور۔ ملتان

س۔ جب ہم آزاد ہو چکے ہیں تو پھر مغربی تہذیب کے غلام کیوں ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ ہم صدیوں انگریز کے غلام رہ چکے ہیں۔ انگریز یہاں سے چلے گئے لیکن اپنی تہذیب کا سایہ چھوڑ گئے ہیں۔

س۔ غریب کی خواہش حسرت و یاس کی کہانی ہو کر کیوں رہ جاتی ہے؟

ج۔ آپ بھی کس کی بات لے بیٹھے۔ غریب کی خواہش بھی کوئی خواہش ہوتی ہے۔ یہ تو امیروں کا پیدائشی حق ہے۔

عقیل احمد انصاری۔ کلٹی

س۔ بھیّا! خالق خوبصورت ہوتا ہے یا اُس کی تخلیق؟

ج۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر تخلیق اپنے خالق سے خوبصورت ہو یا ہر خالق اپنی تخلیق سے خوبصورت ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ خالقِ کائنات اپنی ہر تخلیق سے جمیل ہے۔

اعجاز احمد۔ دیول گھاٹ۔ بلڈانہ

س۔ اُمید اور خوف؟

ج۔ زندگی کو مسرّت بکنار بنانا چاہتے ہیں تو ہر حالت میں دل میں اُمید کی شمع روشن رکھئے۔ زندگی پر کبھی خوف کا سایہ نہ پڑنے دیجئے۔

س۔ آج کے انسان نے دُنیا کو مقصودِ زندگی کیوں بنا لیا ہے جبکہ انسان کو دُنیا میں ایک معین وقت تک رہنا ہے۔

ج۔ دُنیا کو مقصودِ زندگی بنانا بُرا نہیں ہے۔ عقبیٰ سے بے خبر بے پروا ہو جانا بُرا ہے۔

س۔ زندگی کیا ہے؟

ج۔ ؎ زندگی بزمِ طرب بھی ہے رسن و دار بھی ہے
زندگی پھول سے نازک بھی ہے تلوار بھی ہے

قیسی کبیر ہوروی۔ سیب پور

س۔ عورتوں کو گھروں کے اندر بند رکھنا کیسا ہے؟

ج۔ عورتوں کو گھروں میں بند رکھنا اُن پر ظلم ہے۔ لیکن عورتوں کو شمعِ محفل بنا دینا بھی اچھا نہیں۔

س۔ بدخواہوں کو اپنا بہی خواہ بنانے کے لئے کیا کیا جائے؟

ج۔ چین کی طرح ابھی کچھ جاندار ہے دینی چاہئے۔

تجمل جمال پوری

س۔ آپ میرے سوالوں کے جواب کیوں نہیں دیتے؟

ج۔ آپ کے سوال لاجواب ہوں گے۔ اپنا جواب آپ ہی ہوں گے۔

س۔ ایک غریب انسان کی زندگی کیسی ہوتی ہے...؟

ج۔ غریب آدمی کا دل غریب ہوتا ہے۔ آدمی کی زندگی بس شادی کے بعد پُرسکون ہوتی ہے۔

س۔ بھائی! کوئی اچھا سا شعر سُنائیے جو آپ کو بے حد پسند ہو۔

ج۔ ایک ہی کیا دو شعر سُنئے ۔

زندگی کی اُداس راہوں میں

اک نئے عزم کی ضرورت ہے

فکرِ احساس ہوں اگر بس میں

غم کا ہر پہلو خوبصورت ہے

عبید صدیقی گلشن۔ بنگلور

س۔ فیشن کی تیز رفتاری ہندوستانی لڑکیوں کو کہاں لے جائے گی؟

ج۔ مشرقی تہذیب سے دُور مغربی تہذیب کی فضاؤں میں، اور اس کے بعد تباہی کی گھاٹیوں میں۔

[illegible]

س۔ انسان کے دل میں انسانیت نہ ہو تو کیا ہوگا؟ نہ ہوں تو؟

ج۔ وہ انسان نہ ہوگا کچھ اور ہوگا ایسے ہی انسان کے لئے کسی نے کہا ہے ۔

آدمی آدمی کے پیکر میں

اور کچھ ہوگا آدمی نہ رہا

س۔ آپ حقیقت پسند ہیں تو!

ج۔ انسان کی سچائی کی انتہا نہ ہو!

س۔ زندگی کیا ہے؟

ج۔ بڑی از لفظِ شعر و معانی ہے زندگی!

مس بلقیس روحی۔ حیدرآباد

س۔ انتہائی جد و جہد کے بعد بھی ناکامیاں ہی میری قسمت میں لکھی ہیں۔ اب میں زندگی سے بیزار ہو گئی ہوں۔ آپ ہی مجھے راستہ بتائیں۔ روشنی دیں۔

ج۔ حالات سے سمجھوتہ ہی کرنا آپ کے درد کا درماں ہے۔

س۔ مجاز کا کوئی اچھا سا شعر سُنائیے۔

ج۔ ؎ کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے گردشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدہ گریاں بھول گئے

س۔ جب ہمت چھوٹ جائے تو انسان کو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ [illegible]

سنگی عباسی۔ [illegible]

س۔ تو محترم بھائی! ایک دولت مند کو اپنی دولت زیادہ عزیز ہوتی ہے یا اپنی جان؟

ج۔ امیر بخیل نہ ہوگا تو اپنی جان عزیز ہوگی بخیل ہوگا تو دولت!

س۔ کیا تحریر بھی انسانی جذبات کا آئینہ ہے؟

ج۔ صاحبِ تحریر باشعور ہو تو تحریر جذبات کا آئینہ ہوتی ہے۔

س۔ جو انسان ہر غم کو ہنس کر برداشت کر لے؟

ج۔ اُس کے لئے غم بھی خوشی بن جاتے ہیں۔

ایس۔ حسن نجمی۔ گیا

س۔ زندگی فانی ہے، پھر بھی لوگ اس سے محبت کیوں کرتے ہیں؟

ج۔ زندگی فانی ہے پھر بھی بہت پیاری ہے انسان چاہے تو اچھے کام کر کے اسے سدا دوامی بھی بنا سکتا ہے۔

س۔ اگر زندگی کو موت نہ ہو تو؟

ج۔ زندگی کی قدر و منزلت، زندگی کی اہمیت کم ہو جائے۔

س۔ سائنس کے عروج کا نتیجہ؟

ج۔ تعمیر و ترقی بھی۔ تباہی و بربادی بھی!

پرتاپ سنگھ۔ ڈالٹن گنج

س۔ دل سے بڑی دنیا کون سی ہے؟

ج۔ دماغ کی دُنیا۔

س۔ عورت کی سب سے بڑی دولت اُس کا پیار ہے یا اُس کی عزت؟

ج۔ عزت!



فرحت جہاں۔ جھمکر

س۔ کیا عورتیں مردوں سے زیادہ جذباتی ہوتی ہیں؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ اگر شوہر دوسری عورتوں سے بے جا راہ و رسم بڑھا لے اور یہ بات بیوی کے علم میں آجائے تو؟

ج۔ شوہر کو نرمی اور سنجیدگی سے سمجھانا چاہئے۔

س۔ عورت کو گھر کی چہار دیواری میں مقید رہنا چاہئے یا اُسے بھی کچھ آزادی کے حقوق حاصل ہیں؟

ج۔ بانو! عورت گھر کی چہار دیواری میں مقید نہیں رہتی۔ عورت گھر کی ملکہ ہوتی ہے۔ اپنی اِس مملکت میں اُسے سارے حقوق حاصل ہیں۔

اصغر علی۔ چک مگور

س۔ عورت کا دل؟

ج۔ نازک شیشہ!

س۔ اچھی زندگی کے لئے کیا چاہئے؟

ج۔ اچھی زندگی کے بہت سے لوازمات ہیں۔۔۔ کسی اچھی زندگی کو دیکھ لیں۔ یا اچھی زندگیوں سے سبق لیں۔

س۔ آج کا سماج؟

ج۔ ایک فرسودہ نظام ہے۔

اشک عظیم آبادی۔ رشٹرا۔ ہگلی

س۔ دوشیزگانِ مشرق پرستارِ مغرب کیوں بنتی جا رہی ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ فرزندانِ مشرق تہذیبِ مغرب کے پجاری بن گئے ہیں۔

س۔ نذیر بنارسی کا ایک شعر سُنایئے۔

ج۔ نذیر بنارسی کا کوئی شعر اِس وقت حافظہ میں نہیں۔ نظیر اکبرآبادی کا ایک شعر سُنئے ؎

باغ میں لگتا نہیں صحرا میں گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جاکے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

ادریس اختر۔ چک بھرلیو

س۔ یہ دُنیا کسی کے لئے پھولوں کی سیج ہے، کسی کے لئے کانٹوں کا بستر۔ ایسا کیوں ہے؟

ج۔ یہ اپنے اپنے حوصلہ کی بات ہے۔ کسی کے لئے دُنیا پھولوں کی سیج بن جاتی ہے، کسی کے لئے کانٹوں کا بستر!

س۔ وطن کے کانٹے سسرال کے پھولوں سے کہیں بہتر ہیں۔ کہئے آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ سسرال بھی عورت کا دوسرا گھر ہوتا ہے۔ بلکہ عورت کا حقیقی گھر سسرال ہی ہوتا ہے۔ اِس لئے سسرال کے کانٹے بھی عورت کے لئے پھول ہوتے ہیں۔

سیّد جاوید نور۔ کلکتہ

س۔ انسان کی ہر آرزو کیوں نہیں پوری ہوتی؟

ج۔ اِس لئے کہ انسان آرزو کا دامن دراز سے دراز تر کرتا جاتا ہے۔

س۔ آج کے ہندوستان میں لوگ اُردو زیادہ بولتے ہیں یا ہندی؟

ج۔ بولتے ہیں اُردو زیادہ۔ کہتے ہیں ہندی!

شاہ عالم۔ بہار شریف

س۔ اِس دُنیا میں عورت کو صرف عورت کیوں سمجھا جاتا ہے۔ ماں اور بہن کیوں نہیں سمجھا جاتا۔ ایک سچا رفیق اور ہمدرد کیوں نہیں سمجھا جاتا؟

ج۔ شریف اور سمجھدار سب کچھ سمجھتے ہیں۔ غیر شریف عورت کو صرف عورت سمجھتے ہیں۔

س۔ عورت کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو اپنی تعریف سُن کر نرم ہو جاتی ہے اور جب تعریف اِتنی خوبصورت ہو جائے جتنی وہ خود بھی نہیں تو پھر عورت موم کی طرح پگھلنے لگتی ہے۔

ج۔ عورت ہی پر کیا موقوف ہے۔ اپنی تعریف سُن کر مرد بھی پگھل جاتے ہیں۔

س۔ یہ دُنیا کسی بھی چیز کو بے داغ نہیں دیکھ سکتی۔

ج۔ دُنیا اپنے سوا ہر چیز میں داغ دیکھتی ہے۔ چاہے سفید ہو یا سیاہ!

صادق القادری۔ کلکتہ

س۔ عورت انگارہ ہے یا پھول؟

ج۔ عورت نہ انگارہ ہے نہ پھول! عورت عورت ہے!

س۔ انسان خواہشات کا غلام کیوں ہوتا ہے؟

ج۔ ہر آدمی خواہشات کا غلام نہیں ہوتا۔

س۔ تقدیر پر بھروسہ کرکے بیٹھا جا سکتا ہے؟

ج۔ جی نہیں۔ تدبیر کے نتیجے کا تقدیر نام ہے۔

حُسنہ لویب۔ مؤناتھ بھنجن

س۔ فلم کا ادب سے کیا تعلق ہے؟

ج۔ ہندوستانی فلموں کو ادب سے کیا تعلق!

س۔ عورت کا حقیقی وقار؟

ج۔ عصمت و عفت، حجاب اور حیا میں ہے۔

س۔ بیسویں صدی کے مدیرِ اعلیٰ کی سیر و سیاحت؟

ج۔ بیسویں صدی کے مدیرِ اعلیٰ کو اتنی فرصت کہاں۔

قیصر جہاں۔ کلکتہ

س۔ میری ایک سہیلی ہر وقت مجھ سے لڑتی رہتی ہے۔ بتایئے کیا کروں؟

ج۔ آپ اُس سے نہ لڑیں۔ وہ خود ہی تھک جائے گی۔

س۔ اگر امتحان میں کامیاب نہ ہوسکے تو؟

ج۔ بد دل نہ ہونا چاہئے۔ حوصلہ نہ ہارنا چاہئے۔ ناکامی کامیابی کا زینہ بنتی ہے۔

خورشید احمد وارثی سکھر (پاکستان)

س۔ سیاست کسے کہتے ہیں؟
ج۔ حسین فریب کو!

س۔ خوشتر بھیا! سیاسی لیڈر اور فقیر میں کیا فرق ہے؟ جبکہ دونوں کا کام بھیک مانگنا ہے۔
ج۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں صرف ایک فرق ہے۔ فقیر کی جھولی چھوٹی ہوتی ہے اور سیاسی لیڈر کی بہت بڑی! اور اُس کا پیٹ اُس کی جھولی سے بھی بڑا ہوتا ہے۔

مظفر علی۔ بھوپال

س۔ انسان کی زندگی میں دُکھ زیادہ ہیں یا خوشیاں؟
ج۔ خوشیاں۔ آپ اپنے آنسو گن سکتے ہیں قہقہے نہیں گن سکتے۔

س۔ اکبر الہ آبادی کا کوئی طنز سے بھرپور شعر سنائیے۔
ج۔ سُنیئے ؎

برق کے لیمپ سے آنکھوں کو بچائے اللہ
روشنی آتی ہے اور نُور چلا جاتا ہے

محمد صغیر۔ کراچی

س۔ بھائی جان! آج کل کی لڑکیاں فیشن میں آگے آگے نظر آتی ہیں اور مذہبی جلسے جلوس میں بھی اپنے جسموں کی نمائش کرتی ہیں۔
ج۔ لڑکیاں فیشن میں آگے آگے ہیں لیکن اُن کی قیادت تو مرد ہی فرما رہے ہیں۔ عورتوں کے اِس اقدام کا سہرا مردوں کے سر ہے۔ کبھی حضرتِ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا وہ پردہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

حضرتِ اکبر نے یہ بھی فرمایا تھا ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں

دیوان راجندر سنگھ کو چر ایم اے۔ جرنلسٹ۔ نئی دہلی

س۔ انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی کیا ہے؟
ج۔ انسانیت سے دُور ہو جانا۔ انسانیت سے محروم ہو جانا۔

س۔ زندگی اور موت؟
ج۔ یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

س۔ سچی خوشی کا راز؟
ج۔ دوسروں کو خوشی دینا۔

س۔ دونوں میں بڑا کون؟ خوشتر گرامی یا شیکسپیئر؟
ج۔ بندہ نواز! ہم نہ شیکسپیئر، نہ بڑے آپ!

رشید ملک۔ ایبٹ آباد (مغربی پاکستان)

س۔ کامیاب زندگی کا راز؟
ج۔ کامیاب زندگی گزارنے کی سچی لگن۔

س۔ کیا وجہ ہے کہ لو میرج عموماً کامیاب نہیں ہوتی؟
ج۔ اِس لئے کہ لو میرج کی بُنیاد کھوکھلی ہوتی ہے۔

س۔ اِن میں فرق بتائیے ـــــ پھُول، عورت، پتھر!
ج۔ آپ نے یہ تینوں چیزیں بہت بار دیکھی ہوں گی ـــــ ہو سکتا ہے روز دیکھتے ہوں۔ ہاں! ہمارا خیال جاننا چاہتے ہوں تو سُنئے ـــــ دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لئے عورت پھُول ہے۔ اندھوں کے لئے پتھر!

سیّد ریاض حسین بخاری۔ بڑودہ

س۔ محبت کی جاتی ہے یا ہو جاتی ہے؟
ج۔ یہ حماقت ہو بھی جاتی ہے۔ کی بھی جاتی ہے۔

س۔ محبت کا انجام؟
ج۔ کبھی سرد سرد آہیں، کبھی گرم گرم آنسو!

سید الرحمٰن صدیقی۔ علیگڑھ

س۔ عورتوں کا سب سے بہتر زیور؟
ج۔ شرم و حیا!

س۔ علم حاصل کرنے کا مقصد کیا ہے؟
ج۔ اچھا انسان بننا۔ اچھی زندگی گزارنے کا راز جاننا۔ روشنی حاصل کرنا۔

فضل مظفر پوری۔ ٹاٹا نگر

س۔ انسانیت کی موت کب ہوتی ہے؟
ج۔ جب انسان انسانیت سے دُور ہو جاتا ہے۔ جب انسان حیوان بن جاتا ہے۔

س۔ غریبی بھارت سے کبھی ختم ہوگی یا نہیں؟
ج۔ بھارت میں غریبی؟ کیا یہ بڑے بڑے ذخیرہ اندوز غریب ہیں؟ غیر ممالک کے بینکوں میں اپنے لاکھوں روپے رکھنے والے غریبوں کے خادم وزیر اور منسٹر کیا غریب ہیں؟

فرحت بیگم انجم۔ برہولیا۔ دربھنگہ

س۔ عورتیں اچھی سیرت کے بجائے اچھی صورت پر کیوں توجہ دیتی ہیں؟
ج۔ اِس لئے کہ مرد سیرت سے زیادہ صورت دیکھتے ہیں۔

س۔ کیا شادی زندگی کا ایک المیہ ہے؟
ج۔ ہرگز نہیں۔ جیون ساتھی اچھا ہو تو شادی سے زندگی حسین و خوشگوار بن جاتی ہے۔

س۔ اعجاز نسرین بہن کا افسانہ اب "بیسویں صدی" میں نظر نہیں آتا۔ ایسا کیوں؟
ج۔ کبھی کبھی انسان حالات سے مجبور ہو جاتا ہے۔ کاش حالات دل کا ساتھ دیں! اعجاز نسرین صاحبہ "بیسویں صدی" سے دُور نہیں ہیں۔

سید لیاقت علی۔ اورنگ آباد

س۔ خوش تر بھیا! علامہ اقبال کا کوئی مشہور شعر سنایئے۔

ج۔ ؎ چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

س۔ کامیابی کا راز؟

ج۔ عزم محکم جہد پیہم!

س۔ شاعری کا مقصد؟

ج۔ بیشتر شاعروں کے نزدیک بیداد نما داد حاصل کرنا۔

عبداللہ بھائی اطہر سیونی ایم۔پی

س۔ کیا شادی کرنا ضروری ہے؟

ج۔ جی ہاں! شادی بہت بڑی سماجی اور معاشرتی ضرورت ہے۔ اور ہم تو کہیں گے بہت بڑی انسانی ضرورت ہے۔

س۔ کون سی زندگی بہتر ہے، شادی کر لینے کی یا غیر شادی شدہ کی؟

ج۔ شادی کر لینے کی۔ آپ نے سنا ہوگا ہے گھر بن گھر بھوت کا ڈیرہ! زندگی کے طویل سفر کے لئے ایک ساتھی بے حد ضروری ہے۔ اور وہ ساتھی بیوی ہے۔

شفیق احمد مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

س۔ زندگی کے لئے بہترین تحفہ کیا ہے؟

ج۔ بلند کرداری و نیکوکاری!

پیاری سلطانہ۔ بھے واڑہ

س۔ بھائی جان! جب ایک عورت بہت زیادہ اُداس، غمگین اور بے بس ہو جائے تو؟

ج۔ کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی ہرگز نہ کرے۔ حالات سے سمجھوتہ کرے۔ زندگی جیسی بھی ہو بہت پیاری ہے۔

س۔ دل۔۔۔؟

ج۔ ؎ عاشقوں نے دل کا نام رکھ کر کلمہ
ہر جگہ اس لفظ کے معنی بدلتے جائیں گے

عبدالقدوس۔ رشتر اسنگی

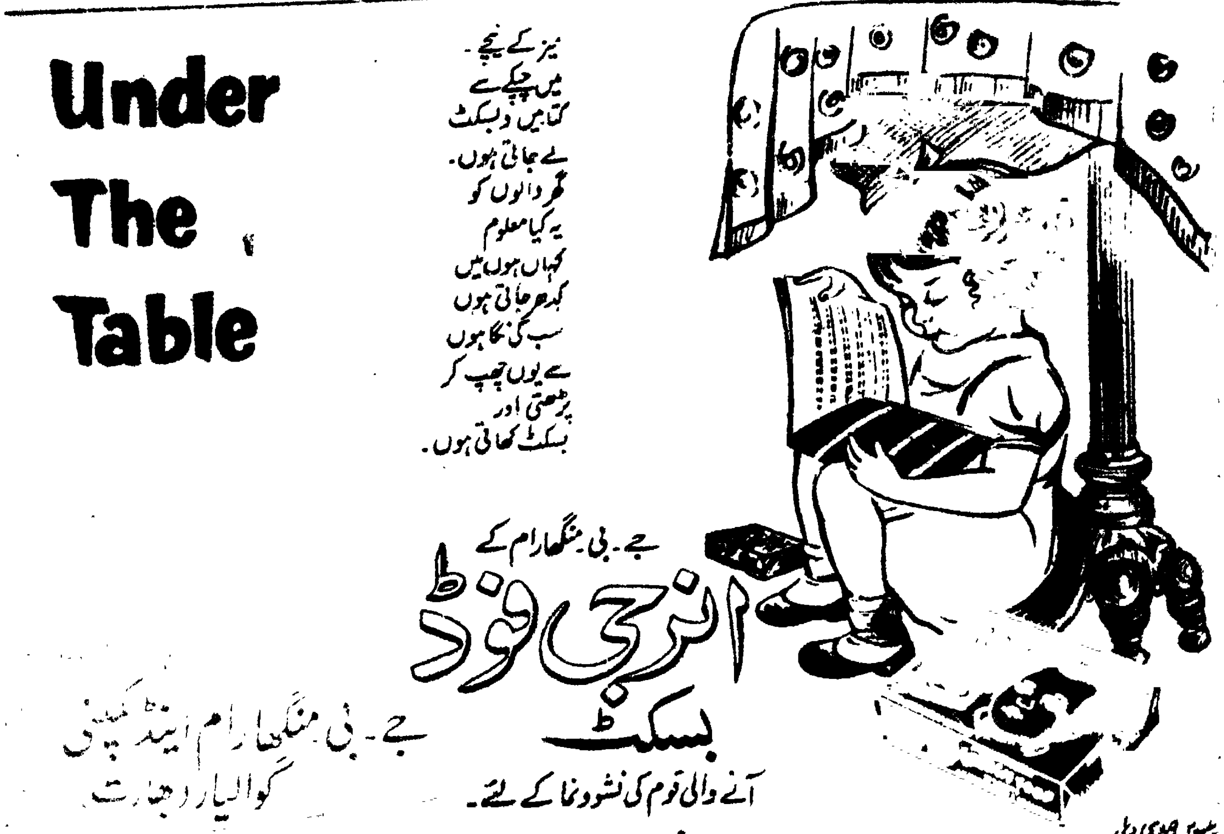
س۔ زندگی کو خوش حال بنانے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ زندگی کو خوش حال و خوشگوار بنانے کے لئے جان و دل سے جدوجہد کرنی چاہئے۔

سید یداللہ حسینی۔ گلبرگہ

س۔ کیا "بیسویں صدی" ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی پڑھا جاتا ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ غیر ممالک میں کافی تعداد میں جاتا ہے۔



اصغری۔ کلکتہ

س۔ انتقام لینے والا اپنے دشمن کی سطح پر رہتا ہے اور معاف کر دینے والا؟

ج۔ اس سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے معاف کر دینا سب سے بہتر و برتر انتقام ہے۔

س۔ کائنات کی مقدس ترین ہستی؟

ج۔ خالق کائنات کے نیک و مقرب بندے؟

یعقوب چودھری۔ شیفیلڈ۔ انگلینڈ

س۔ اگر زندگی زندہ دلی کا نام ہے تو موت کا کیا نام ہے؟

ج۔ میٹھی نیند۔ اگر زندگی صحیح طور سے گزاری جائے تو موت میٹھی نیند ہے۔

س۔ دکھ درد سے نجات موت دلاتی ہے یا زندگی؟

ج۔ ابھی زندگی! ذوق نے کہا ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

س۔ خوشگوار زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ کون سا ہے؟

ج۔ خوشگوار زندگی گزارنے والوں کے نقش قدم پر چلنا۔

محمد کرم اللہ۔ بھرانڈوی۔ سارن

س۔ اُردو کا مستقبل؟

ج۔ اُردو کے بدخواہ اُردو کا مستقبل تاریک بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن آفتاب پر کون خاک ڈال سکتا ہے؟

قمر الدین قمر۔ گھوری

س۔ خوشتر بھیا! کیا "بیسویں صدی" کو افسانہ بذریعہ رجسٹری بھیجنا ضروری ہے؟

ج۔ آپ عام ڈاک سے بھی بھیج سکتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں ان کا مل جانا ضروری نہیں ہے۔ گم بھی ہو سکتا ہے۔

س۔ خود ساختہ لیڈروں کا انجام؟

ج۔ نہایت عبرتناک ہوتا ہے۔ آپ نے بہت سے ایسے لیڈر دیکھے ہوں گے۔

س۔ سائنس نے ہمیں کیا کچھ دیا؟

ج۔ ایٹم بم۔ ہائیڈروجن بم!!

ایم ظہیر۔ سیتا مڑھی

س۔ جب اپنے پرائے ہو جاتے ہیں۔ جب زندگی کا آخری سہارا آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے اور ہر طرف نا اُمیدی ہی نا اُمیدی نظر آنے لگے تو انسان کو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ جب بھی اُمید کی شمع فروزاں رکھنی چاہئے۔ ورنہ اندھیرا اور گہرا ہو جائے گا۔ تاریکی اور بھیانک ہو جائے گی۔

رفیق احمد۔ کولار

س۔ ساحر لدھیانوی کا اصلی نام کیا ہے؟ اور کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں؟

ج۔ ساحر لدھیانوی کا نام عبدالحئی ہے۔ مذہب نام سے ظاہر ہے۔

شوکت خاں عشرت۔ تال ڈانگہ

س۔ کیا حقیقت سے آنکھیں ملائے بغیر زندگی نہیں کٹ سکتی؟

ج۔ جی نہیں۔ حقیقت سے آنکھیں چرانے والوں کو حقیقت اور آنکھیں دکھاتی ہے۔

بجن پیاسا۔ بھرپا۔ مونگیر

س۔ چین اور ہندوستان کا جھگڑا کب تک ہوتا رہے گا؟

ج۔ جب تک چین ایماندار نہ بن جائے گا جب تک چین انسان نہ بن جائے گا۔

س۔ اگر کسی مہینے آپ کو کوئی سوال موصول نہ ہو تو؟

ج۔ ہم خود سراپا سوال بن جائیں گے! اس لئے کہ ہر ماہ ہزاروں سوال موصول ہوتے ہیں۔

مسعود انصاری۔ نکتار ولی۔ دربھنگہ

س۔ مال داری کے لئے دولت زیادہ ضروری ہے یا تجربہ؟

ج۔ تجربہ!

س۔ آج کل کا زمانہ روز بروز پستی کی طرف کیوں جا رہا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ آج کل بلندی کا مطلب غلط سمجھا جاتا ہے۔

ایم۔ ایس۔ چکر دھرپوری

س۔ اُمید ایک ایسی کرن ہے جو ڈوبتے کو سہارا دیتی ہے لیکن اُمید ختم ہو جائے تو؟

ج۔ اپنے دل کے سہان خانے میں پھر اُمید کی شمع روشن کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ زندگی میں اُمید کی شمع بجھ جانے کے بعد پھر روشن ہوتی ہے۔

س۔ دنیا میں نیکی کرنا یا خدا کی عبادت کرنا دونوں کے پیچھے خود غرضی چھپی ہوتی ہے۔ اور وہ ہے آخرت میں راحت کی خواہش! یہ کہاں تک صحیح ہے؟

ج۔ ہر نیکی، ہر عبادت کرنے والے کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں آپ بھی خود غرضی سے بلند ہو کر نیکی کریں۔ عبادت کریں۔

قابلِ مطالعہ منتخب [illegible]ی مجموعے

آتشِ گل	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
کلیاتِ اقبال	ڈاکٹر اقبال	چھ روپے
جنون و ہوش	جوش ملسیانی	چار روپے
ہفت رنگ	عرش ملسیانی	تین روپے
آہنگِ حجاز	〃	ایک روپیہ
سحرِ غزل	ساحر ہوشیارپوری	تین روپے
دستک	رتن کمار شاد	دو روپے ۲۵ پیسے
پھوار	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
نکھار	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
قاشیں	〃	تین روپے
آیاتِ جنوں	〃	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
سنگم	〃	تین روپے
رباعیاتِ محروم	تلوک چند محروم	تین روپے ۷۵ پیسے
گنجِ معانی	〃	سات روپے ۵۰ پیسے
روپ	فراق گورکھپوری	تین روپے ۵۰ پیسے
رمز و کنایات	〃	تین روپے ۵۰ پیسے
مشعل	〃	دو روپے ۷۵ پیسے
بیکراں	جگن ناتھ آزاد	چار روپے ۵۰ پیسے
ستاروں سے ذروں تک	〃	دو روپے ۷۵ پیسے
کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی (اول)	اکبر الٰہ آبادی	پانچ روپے
〃 حصہ دوم	〃	چھ روپے
کلیاتِ اختر شیرانی	اختر شیرانی	آٹھ روپے
رعنائیاں	شکیل بدایونی	تین روپے
صنم و حرم	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
گلِ رعنا	جگی رعنا	تین روپے ۵۰ پیسے
شبنم شبنم	کرشن موہن	پانچ روپے
دلِ ناداں	〃	چھ روپے

خرابات	عبدالحمید عدم	چار روپے
رمِ آہو	〃	چار روپے
گفتار	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
قول و قرار	〃	تین روپے ۵۰ پیسے
گردشِ جام	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
بطِ مے	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
گجر	قتیل شفائی	تین روپے
جھومر	〃	تین روپے
روزن	〃	تین روپے
جلترنگ	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
گفتنی	مخمور سعیدی	دو روپے
نئی صبح	ضیا فتح آبادی	ایک روپیہ
طلوع	〃	۷۵ نئے پیسے
نورِ مشرق	〃	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
آہنگِ غزل	لچھمن سنگھ ہنر	دو روپے ۵۰ پیسے
شہرِ دل	محسن زیدی	دو روپے
سفینہ و ساحل	عزیز وارثی	چار روپے

آئینۂ اصلاح ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر معہ توجیہہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

جوش ملسیانی کے مکمل حالات زندگی، انتخاب کلام شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویروں کے ۸۴ صفحے۔ ضخامت ۵۰۰ سو صفحات۔ موجودہ دور کی بے مثل کتاب۔ قیمت دس روپے۔

مضراب شباب للت کے ایک ایک شعر میں اس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور ان دھڑکنوں میں اس نے سارے جہان کے دکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت تین روپے۔

گلستانِ ہزار رنگ جس میں تقریباً چار ہزار شعراء کے اشعار عنوان وار ترتیب دئے گئے ہیں۔ اس یادگار کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور ہندی کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام نامی ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز فتحپوری نے اس کتاب کو اس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ اردو ایڈیشن دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۵۰ پیسے۔

شاہنامۂ اسلام جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام۔ چار حصوں میں جن میں تیرہ سو سالہ اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے ہر حصہ تقریباً تین سو صفحات کا ہے تازہ ایڈیشن اصلاح کے بعد چھپا ہے قیمتی سولہ روپے اب صرف دس روپے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

تلامذۂ غالب غالبیات کے مشہور ماہر مالک رام صاحب کی گرانقدر تصنیف۔ اس کتاب میں غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کی مکمل سوانح حیات اور کلام درج ہیں۔ پورے صفحہ کی تقریباً تیس تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں۔ ہندوستان بھر کے ادیبوں کا فیصلہ ہے کہ یہ کتاب بہترین ادبی تحفہ ہے۔ قیمت فی جلد سات روپے ۵۰ پیسے۔

کفر و ایمان پنڈت ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام حضرت اختر کا نام نامی ہی اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا ضامن ہے کلام میں طنز کے نشتروں کے ساتھ دردمند دل کی گرمی بھی ہے قیمت چار روپے۔

کلامِ بے لگام ابن بی ناشاد دہلوی کا نادر مجموعۂ کلام جس کے ہر شعر میں اکبر الٰہ آبادی کا رنگ جھلکتا ہے طنز و مزاح کا رنگین گلدستہ ۲۵۲ صفحات پر مشتمل دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا قیمت مجلد چھ روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

ذکی انوار گوہر۔ پشاور

س۔ بھیّا یہ بات کہاں تک درست ہے کہ عورت جنّت کی حُور اور جہنّم کی بھتنی ہوتی ہے؟

ج۔ اپنی اپنی نظر اپنے اپنے خیال کی بات ہے۔ ہر عورت ہمیشہ جنّت کی حُور اور جہنّم کی بھتنی نہیں ہوتی۔ حالات اِس جنّت کی حُور کو جہنّم کی بھتنی بھی بنا دیتے ہیں۔

س۔ عورت کا زیور شرم و حیا ہے۔ پھر آج کل کی لڑکیاں؟

ج۔ لڑکیوں اور عورتوں کی اس آزادی کے لئے مردہی مبارک باد کے مستحق ہیں ؎

عابدہ چُپکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن، پہلے چراغِ خانہ تھی

ابراہیم محمد آگریا۔ کراچی

س۔ "بیسویں صدی" ہمارے گھر میں سب نے پسند کیا۔ آخر کیوں؟

ج۔ یہ تو اُنھیں سے پُوچھنا چاہئے۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں آپ کے گھر میں سب کا ادبی ذوق بلند ہے۔

س۔ وہ کون سی چیز ہے جو انسان کو چاہنے کے باوجود نہیں ملتی؟

ج۔ انسان کے دل میں پانے کے لئے سچی لگن ہو تو وہ سب کچھ پا سکتا ہے۔

مسعود دلکشا رودی۔ کشن گنج

س۔ خوشتر بھائی! میرے دوست شمیم ربانی صاحب کہتے ہیں۔ انسان کو ابھی تک جینے کا سلیقہ نہیں آیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ شمیم صاحب درست کہتے ہیں ؎

ارتقاء کی ہزار شمعیں جلیں
لیکن انسان بھٹک رہا ہے ابھی!

س۔ کیا اُردو نظم و نثر کو دُنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے؟

ج۔ یقیناً! اُردو میں ایسی تخلیقات ہیں جنھیں دُنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کے سامنے رکھا جا سکتا ہے۔

س۔ کیا آپ نے کبھی ہوائی قلعے بنائے ہیں؟

ج۔ یہ ہوائی کسی دُشمن نے اُڑائی ہوگی اویسے ہر انسان زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ہوائی قلعے بناتا ہے۔

ساگر ....

س۔ خوشتر بھائی! میں زندگی کی ایسی راہوں سے گزر رہا ہوں جن سے شاید ہی کوئی گزرا ہو۔ ایسی حالت میں میں کیا کروں؟

ج۔ حوصلہ کا دامن نہ چھوڑئے۔

حالات سے شکست ہے توہین زندگی!
موجوں سے اُلجھنے والے ہی رُخ پھیرتے ہیں طوفان کا

یوسف اعجاز حنفی۔ شاہجہانپور

س۔ خوشتر صاحب! اگر کوئی عزیز دوست یہ وعدہ کرے کہ اگر آپ جواب کے لئے لفافہ بھیجیں تو جواب دوں گا۔ پھر بھی وہ جواب نہ دے تو کیا کیا جائے؟

ج۔ انتظار کی لذّت سے لُطف اندوز ہوتے رہیں۔

س۔ محبت خوشی ہے یا غم؟

ج۔ آغاز خوشی۔ انجام غم۔

شاہدہ دلشاد۔ میسور

س۔ میری ایک سہیلی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتی ہیں۔ لیکن دوسرے دیکھ کر بہت حسد کرتے ہیں۔ کیا محبت بُری چیز ہے؟

ج۔ سہیلی سے سہیلی کا محبت کرنا بُرا نہیں، بہت اچھا ہے۔

س۔ اگر زندگی میں غم ہی غم ہو تو؟

ج۔ غم نہ کرنا چاہئے۔ غم کو خوشی بنا لینا چاہئے۔ پھر غم غم نہ رہے گا۔

س۔ اگر جدوجہد کے بعد بھی کامیابی نہ ہو تو؟

ج۔ جدوجہد جاری رکھنی چاہئے۔

میر کاظم علی۔ حیدرآباد دکن

س۔ لوگ اچھے دوست کو ڈھونڈتے ہیں لیکن خود ایک اچھا دوست بننے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟

ج۔ لوگ بُرا کرتے ہیں۔ آپ ہرگز ایسا نہ کریں۔

س۔ لوگ دانستہ گناہ کیوں کرتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ گناہ بظاہر حسین و پُرکشش ہوتا ہے۔

ایم۔ ریان نیّر۔ بہار شریف

س۔ انسان جھوٹ کس لئے بولتا ہے؟

ج۔ اس غلط فہمی میں کہ جھوٹ سچ سے اچھا ہے۔ لوگ اُس کے جھوٹ کو سچ سمجھیں گے۔

س۔ کوئی اچھا سا شعر سُنائیے۔

ج۔ سُنئے ؎

انساں نے مہر و ماہ کی راہیں تو دیکھ لیں
خود اُس کی انجمن میں چراغاں نہ ہو سکا

. . . . .

س۔ کوئی ایسا شعر سُنائیے جو دل میں حوصلہ پیدا کرے۔

ج۔ اُمید وقت کا سب سے بڑا سہارا ہے
جو حوصلہ ہو تو ہر موج میں کنارا ہے

س۔ صحیح معنوں میں طالب علم کی سب سے بڑی خواہش کیا ہونی چاہئے؟

ج۔ اپنی تعلیم کی تکمیل۔

اعجاز اے تسلیم۔ بہار شریف

س۔ جو راہ غریبی سے نکلی ہے، وہ کہاں پر رکتی ہے؟

ج۔ یہ تو راہی کے عزم و حوصلہ پر موقوف ہے۔ راہی کا حوصلہ پست ہو تو غریبی سے نکلی ہوئی راہ حسرت و حرماں پر رکتی ہے۔ راہی کا حوصلہ بلند ہو تو غریبی سے نکلی ہوئی راہ دولت و امارت کی دہلیز پر پہنچ جاتی ہے۔

س۔ کیا انسانیت کا خون انسان کرتے ہیں؟

ج۔ جی ہاں۔ انسان انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ بھائی بھائی کا خون کرنے سے دریغ نہیں کرتا، نہیں شرماتا۔ دور کیوں جایئے۔ چین ہی کو دیکھ لیجئے۔ کبھی ہندی چینی بھائی بھائی کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی تھی۔ اور آج چین ہندوستان کے خون کا پیاسا ہے۔

خسرو پرویز۔ کریم نگر

س۔ خوشتر بھیا! محبت زندگی برباد کرتی ہے یا دولت؟

ج۔ دولت زندگی برباد کرتی تو غربت سے لاکھوں زندگیاں موت سے بدتر کیوں ہوتیں۔

س۔ اکثر لوگ کہتے ہیں، قسمت میں جو ہوگا وہی ہوگا۔ زندگی کا خوش حال رکھنا قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے خیال میں حقیقت کیا ہے؟

ج۔ تدبیر کے نتیجے کا تقدیر نام ہے۔ قدرت نے انسان کو فہم و فراست بخش دی ہے۔ اُس سے کام لے کر زندگی کو خوش حال بنانا انسان کا کام ہے۔

طاہرہ نصرہ کردی۔ دربھنگہ

س۔ غریب عورت کو دولت مند شوہر کی آرزو ہوتی ہے۔ فیشن ایبل عورت آزادی پسند شوہر کی خواہشمند ہوتی ہے۔ شریف عورت کیسے شوہر پسند کرے گی؟

ج۔ شریف شوہر

س۔ شادی سے پہلے میں اپنے دیور سے خط و کتابت کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ شادی سے پہلے دیور سے خط و کتابت کرنا اچھا نہیں۔ دیور سے خط و کتابت تو شادی کے بعد بھی نہ کرنی چاہئے۔ اس طرح شوہر کے دل میں بدگمانی پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اور ایسی بدگمانی بھرے پرے گھر میں آگ لگا دیتی ہے۔ بھائی کو بھائی کا دشمن بنا دیتی ہے۔

راشد حسن صدیقی۔ سہارنپور

س۔ جب کسی کو ہر کسی سے نفرت ہی نفرت ملے اور وہ کمال فکر کے بعد بھی اپنے تئیں قصوروار نہ پاتا ہو تو کیا سمجھنا چاہئے؟

ج۔ یہی کہ اُس میں ضرور کوئی خامی، کوئی کمی ہے۔ ورنہ ہر کسی سے نفرت ہی کیوں ملتی ہے؟

س۔ کسی کو منحوس سمجھنا کیا ٹھیک ہے؟

ج۔ نہیں۔ کوئی منحوس نہیں ہوتا۔

عبدالحکیم کلیانوی۔ گلبرگہ

س۔ خوشتر بھیا! بتایئے دُنیا کا سب سے اچھا مذہب کون سا ہے؟

ج۔ سارے مذاہب اچھے ہیں۔ کوئی مذہب بُرا نہیں۔ مذہب کی تعلیم کو پسِ پُشت ڈال کر اُس کے پیرو بُرے بن جاتے ہیں۔

مغیض احمد ماصی۔ چھوٹی سریا گنج۔ مظفر پور

س۔ عورت کی بے وفائی کب سے شروع ہوئی؟

ج۔ عورت بے وفا نہیں۔

س۔ کیا محبت کرنا جرم ہے؟

ج۔ جرم ہی لگتا ہے [illegible]

س۔ اس پر [illegible] ہے

اُف ری حکومت ہائے [illegible]

ج۔ سُنئے ؎

سب کی زباں پر آج یہی ہے
اُف ری حکومت ہائے گرانی!!

عبدالقادر ابراہیم۔ کویت

س۔ تشنگی؟

ج۔ مبارک ہیں وہ لوگ جنہیں اپنی روح کی تشنگی کا احساس ہو۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنی تشنگی بجھانے کے لئے کوئی غلط راہ نہیں اختیار کرتے۔

س۔ مخدوم محی الدین کا ایک شعر سنایئے۔

ج۔ سُنئے ؎

چٹک رہی ہے کسی یاد کی کلی دل میں
نظر میں رقصِ بہاراں کی صبح و شام لئے

ایس مسعود ایوبی۔ مونگیر

س۔ اس دُنیا کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟

ج۔ پانے کے لئے جدوجہد کر کے۔

س۔ انسان کو جان سے زیادہ کوئی چیز عزیز ہے؟

ج۔ غیور کو عزت۔ بخیل کو دولت!

س۔ وہ کون سی سچائی ہے جو لوگوں کو ذلیل معلوم ہوتی ہے؟

ج۔ ذلیل لوگوں کو ہر سچائی ذلیل معلوم ہوتی ہے۔

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی —— مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس۔ چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائٹل و تصاویر: برائٹ پریس صبا بازار دہلی —— پتہ: دفتر بیسویں صدی دریا گنج دہلی

ڈکشنریاں صنعت وحرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

کشیدہ کاریاں و ڈکشنریاں

کشیدہ کاری	کشتاکماری ایم اے	چار روپے
... کاری	زینت کوثر	پانچ روپے ۵۰ پیسے
	”	چار روپے ۵۰ پیسے
	رشیدہ خاتون	تین روپے ۵۰ پیسے
”	زینب انور	دو روپے ۵۰ پیسے
”	”	دو روپے ۵۰ پیسے
	قدسیہ انور	ایک روپیہ
”	”	ایک روپیہ
... خانہ	زینب انور	دو روپے
	مشرف بانو غفران	دو روپے
... بک	زینت کوثر	پانچ روپے

... میں اپنی قابلیت بڑھایئے

انگریزی کی کامیاب ترین ڈکشنریاں

...ری۔ انگریزی سے اردو ہندی		چار روپے
...ہندو ڈکشنری (کلاں) رسالہ سائز قیمت مجلد		دس روپے
...ڈکشنری (کلاں) رسالہ سائز قیمت مجلد		گیارہ روپے
اردو ڈکشنری	عبدالحق	تیس روپے
...اردو ڈکشنری	”	بیس روپے
...اردو ڈکشنری	”	بارہ روپے
...ڈکشنری		گیارہ روپے
...اردو ڈکشنری		دس روپے
...ڈکشنری انگریزی سے اردو ہندی		تین روپے
		آٹھ روپے
		بارہ روپے
		سات روپے ۵۰ پیسے
		چھ روپے ۵۰ پیسے

صنعت و حرفت

الیکٹریکل انجینئرنگ بک	نرنیدر ناتھ	بارہ روپے
الیکٹرک گائڈ (نیا ایڈیشن)	”	آٹھ روپے
الیکٹرک وائرنگ	”	چار روپے ۵۰ پیسے
موٹر کار وائرنگ	”	چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک بیٹریز	”	تین روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک لائٹنگ	”	چھ روپے
الیکٹرک سپروائزر امتحان کے پیپرز (پنجاب)	”	چھ روپے ۵۰ پیسے
آئل و گیس انجن گائڈ	”	دس روپے
آئل انجن گائڈ	”	چھ روپے
کروڈ آئل انجن گائڈ	”	چار روپے ۵۰ پیسے
وائرلیس ریڈیو گائڈ	”	چھ روپے
ریڈیو سروسنگ (ریڈیو مکینک)	”	آٹھ روپے ۲۵ پیسے
ٹانکا لگانے کا ہنر	”	دو روپے ۵۰ پیسے
چھوٹے ڈائنمو و الیکٹرک موٹرز بنانا	”	تین روپے ۵۰ پیسے
پریکٹیکل آرمیچر وائنڈنگ (اے سی۔ ڈی سی)	”	ستارہ روپے ۵۰ پیسے
ریفریجریٹر گائڈ	نرنیدر ناتھ	آٹھ روپے ۷۵ پیسے
رہبر ریڈیو گیان	”	پندرہ روپے
ٹرانسفارمر گائڈ	”	چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک موٹرز	”	آٹھ روپے
خراد شکشا یعنی ٹرنر گائڈ	”	تین روپے
ورکشاپ گائڈ (فیٹر ٹریننگ)	”	تین روپے
خراد اور ورکشاپ گیان	”	چھ روپے
پریکٹیکل گھڑی سازی	رام اوتار ورما	چار روپے ۵۰ پیسے
سائیکل ریپئرنگ	”	دو روپے ۵۰ پیسے

خانہ داری

عصمتی دسترخوان	آمنہ نازلی	تین روپے
رضیہ کا دسترخوان	رضیہ سلطانہ تمکین	دو روپے ۵۰ پیسے
رنگ سازی	رفیق نرنیدر ناتھ	دو روپے ۵۰ پیسے
پلاسٹک گائڈ	”	دو روپے ۵۰ پیسے
اسٹوڈنٹ بوٹ پالش سازی	”	دو روپے ۵۰ پیسے
اسٹوڈنٹ ٹک ماسٹر (دستانے بنانا)		دو روپے ۵۰ پیسے
کنفیکشنری (انگریزی مٹھائیاں بنانا)	”	دو روپے ۵۰ پیسے
ہیئر آئل (خوشبودار تیل)	”	دو روپے ۵۰ پیسے
بیکری بہار (بسکٹ ڈبل روٹی کیک)	”	دو روپے ۵۰ پیسے
پینٹری کا کام	”	چار روپے ۵۰ پیسے
فن مصوری (مینا کاری)	”	چار روپے ۵۰ پیسے
پرفیومری ماسٹر		دو روپے ۵۰ پیسے
وارنش ماسٹر (وارنش سازی)	”	دو روپے ۵۰ پیسے
آتش بازی کا کاروبار		دو روپے ۵۰ پیسے
اچار، مربہ، چٹنی	جیبی رانی گپتا	دو روپے ۵۰ پیسے
حلوائی ماسٹر	جیندر کھان چکل	دو روپے ۵۰ پیسے
تمباکو کا کاروبار (تمباکو کی دوکان)	”	دو روپے ۵۰ پیسے
پان کی دوکان	”	دو روپے ۵۰ پیسے
چھپائی پارچہ جات کیلیکو پرنٹنگ	”	تین روپے ۵۰ پیسے
ہندو یورپین ککری بک (دیسی انگریزی کھانے)	کالی چرن	چار روپے
کاروبار بڑھانے کی ترکیبیں	”	دو روپے ۵۰ پیسے
موم بتی کا کاروبار	”	دو روپے ۵۰ پیسے
ڈیری فارمنگ	”	چار روپے

رسالہ بیسویں صدی دریا گنج، دھلی نمبر ۶

29 TH YEARS OF PUBLICATION
Telephones: Office 271637 Residence 619927



win Sadi

ELHI



ہونٹوں کی اوٹ میں وہ کرن سی دبی ہوئی

فوٹو



[illegible]ن کے پھول، تبسم کے پھول، پیار کے پھول

[illegible]میں یہ پھول تو سب [illegible] کا چلن نہ رہے

فوٹو: معصوم [illegible]



اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

مشہور مغنیہ اپشیا بس



دل بجھ گیا کہ بزمِ دو عالم ہی بجھ گئی
دنیا ترے بغیر نہ بہلا سکی مجھے

فوٹو: ایس۔ شاہ علی۔ حیدرآباد



…ں پھول والوں کی سیر کا میلہ مغلیہ دور کی
…ایسی تاریخی یادگار ہے جو ہر سال جوش و
…اور حسن و زیبائش سے منائی جاتی ہے
…یک جہتی اور میل جول کی زندہ
…ہے۔ اس موقع کی یہ حسین جھلکیاں
…رہی ہیں عالمِ تصور میں اُن آوازوں کو
…جو ایک پہ گونج رہی ہیں ——— -

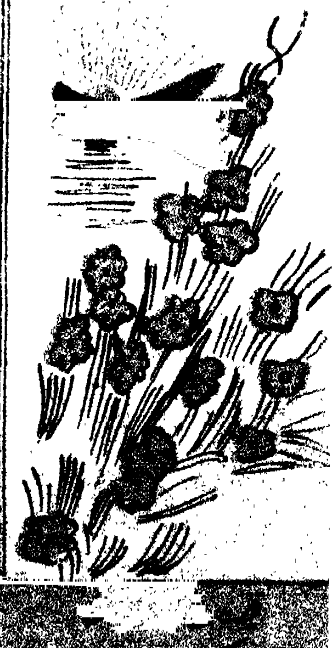
…تک جفا حسن والوں کی سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے
…وفا بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا دمدہ
گھڑی دو گھڑی تو کبھی شاد رہتے
…شیں نہ جلتا، نت نئی نو رہتی
ہمارا تھا کیا ٹھیک، رہتے نہ رہتے



بیسویں صدی دہلی

ایڈیٹر: خوشتر گرامی

ٹیلیفون دفتر —— [illegible]
ٹیلیفون مکان —— [illegible]



تیر و نشتر

"شاستری جی کے ہاتھ مضبوط کیجئے" ایک عنوان ــــ کیا شاستری جی کوبکسنگ چمپین شپ میں حصہ لینا ہے۔

"بناسپتی گھی مارکیٹ سے غائب" ایک خبر ــــ شرم سے منہ چھپا لیا بناسپتی لیڈر جو مارکیٹ میں بہت آگئے ہیں۔

"پنجاب سے دودھ دینے والے جانوروں کی برآمد بند کردی جائے" ایک خبر ــــ اس لئے کہ وہاں دودھ دینے والے سیاسی جنوں بہت ہیں۔

"نوجوان مجبور ہوکر میونسپلٹی کا بھنگی بن گیا" ایک خبر ــــ بڑا بیوقوف تھا۔ لیڈری کا راستہ اختیار کرتا تو وارے نیارے ہوجاتے۔

"شہری آزادیوں کا کل ہند کنونشن" ایک عنوان ــــ دنگا فساد قتل خون۔ چاقو چھری۔ لاٹھی گولی کے آزادانہ استعمال کی سفارش کرےگا۔

"ہندوستان و پاکستان سے برطانیہ کی اپیل" ایک عنوان ــــ آپ دونوں نا اہل ثابت ہوئے۔ ہمیں پھر آنے دیجئے۔

"بسوں کے کرایہ میں اضافہ" ایک خبر ــــ اس لئے اب اُن بیلوں کی جوڑیوں کو گاڑیوں میں جوتئے جنہیں ووٹ دیئے تھے۔

"ہندوستان میں روزگار کا معاملہ بہت ٹیڑھا ہے" ایک عنوان ــــ اس لئے لوگوں کو کانگرس کا ممبر بن کر روزی سے بے فکر ہوجانا چاہیئے۔

"ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے" ایک تبصرہ ــــ اسی لئے یہاں کی سیاسی پارٹیاں سب سے زیادہ اُچھل کود کرتی ہیں۔



کامراج صوبوں میں موجودہ قیادت کی تبدیلی کے خلاف ہیں۔



فاقہ مستوں پر حکومت کے نئے ٹیکس

"جن سنگھ اور فرقہ واریت" ایک عنوان ——— ایک ہی چیز کے دو نام۔

"ابھی جاگے نہیں" ایک عنوان ——— اس لئے کہ ابھی صبح نہیں ہوئی۔

"گاندھی جی کی تعلیمات پر لیکچر" ایک عنوان ——— سننے کے لئے، عمل کے لئے نہیں۔

"دلی تیز رفتاری کے ساتھ گندی بستیوں کا شہر بنتا جا رہا ہے" ایک مقالہ ——— اس کا سبب جگہ جگہ سیاسی لیڈروں کی پھیلائی ہوئی غلاظت ہے۔

"رہزنی میں ۲۰ سالہ حسینہ گرفتار" ایک خبر ——— جھلک دکھا دکھا کر لوٹتی تھی۔

"برطانوی سماج میں ابتری" ایک عنوان ——— ہندوستانی سماج کا سایہ۔

"مصنوعی قلت کا علاج راشننگ نہیں" ایک وفد کی چیف کمشنر دلی سے ملاقات ——— بلکہ یہ ہے کہ وزیر ذرا لائن میں کھڑے ہو کر خود راشن خریدیں۔

"تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہاں کا ہر بچہ ملک کی حفاظت کے لئے سر کٹا سکتا ہے" ایک تقریر ——— مگر یہ پرانی تاریخ ہے۔ حال کی تاریخ یہ ہے کہ ملک کا ہر بچہ ایک دوسرے کا سر پھوڑتا رہتا ہے۔

"سکھوں اور ہندوؤں کی بہبودی کے لئے متحدہ پنجاب ضروری" سردار دربارہ سنگھ ——— مگر لیڈروں کی لیڈری کے لئے نقصان دہ۔

"اچھا کھانا پینا معاشرت کی جان ہے" ایک عنوان ——— برخوردار آج کل تو بُرا کھانا پینا بھی ملنا محال ہے۔

"لڑکی کا دوپٹہ اڑا لے گئے" ایک خبر ——— شکر کرو کہ لڑکی چھوڑ گئے۔

"۔۔۔ در بیک گئے": ایک عنوان ——— جیسے چولی دامن۔

"یوپی اسمبلی سے متعدد کانگریسی ممبروں کا واک آرٹ"۔ ایک عنوان ———
۔۔کی جگہ اور سیٹ سے "واک اِن" کے لئے تیار ہیں۔

"آگرہ کی ایک سڑک کا نام": ایک عنوان ——— پاگل خانہ روڈ رکھا گیا۔

"ہندوستان میں سات سوشلسٹ گرفتار": ایک خبر ——— اب دیگ کو دیکھا
۔۔۔ اس میں کتنے سوشلسٹ ہیں۔

"بڑھتی ہوئی قیمتیں اور عوام کا فرض": ایک مقالہ ——— بھوکے ننگے رہ کر
۔۔ سرکار کو زیادہ سے زیادہ ٹیکس دیں اور چیزیں کم خریدیں۔

"روپے کی قیمت صرف ۱۲ پیسے": مسائی کا انکشاف ——— اور انسان کی
۔۔۔ پندرہ پیسے۔ روپیہ ہی سستا رہا۔

"۔۔ میں کپڑا ملوں نے کام بند کر دیا": ایک خبر ——— اس لئے ننگا رہنے کی
۔۔ منصوبہ بندی کیجئے۔

"غذائی مسئلہ": ایک عنوان ——— جو کئی وزیروں کے لئے وزارت لیوا
۔۔۔ ثابت ہوا ہے۔

"جیل میں بڑھتے ہوئے جرائم کی تحقیقات کا حکم": ایک عنوان ——— تاکہ
۔۔ مجرموں پر مقدمہ چلا کر اُنھیں رہائی کی سزا دی جاسکے۔

"ہندوستان میں ایمرجینسی مستقل خصوصیت بنتی جارہی ہے": این۔ سی۔
چیٹرجی ——— اور یہی دنیا کی دوسری جمہوریتوں کے مقابلے میں ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔

"مالی ذرائع کا تلاش کرنا سرکار کا کام ہے": ایک عنوان ——— اور اُن ذرائع کو
۔۔کام بنانے کا کام سرکاری افسران کا۔



حکومت ہند کی خان عبدالغفار خاں کو ہندوستان آنے کی دعوت



سکھوں کی لیڈر شپ کے لئے کشمکش کا نیا موڑ۔ ماسٹر جی اور سنت جی میں دوڑ شروع ہو گئی۔

"ماسٹر تارا سنگھ نے راجہ جی کا مشورہ نہیں مانا": ایک خبر ——— اِس لئے راجہ جی بھگوان سے کہہ رہے ہوں گے ؎

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

"افیون فیکٹری میں ہڑتال": ایک خبر ——— مزدوروں کو نشہ ہو گیا۔

"ملک کے اخبارات پر سرمایہ داروں کی اجارہ داری ہے" اندرا گاندھی ——— جیسے آل انڈیا ریڈیو پر سرکار کی اجارہ داری ہے۔

"سیدھی راہ یہ ہے": ایک عنوان ——— جو جنتر منتر روڈ کو جاتی ہے جہاں پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ٹکٹ بٹتے ہیں۔

"پانی پت میں خشک سالی ختم": ایک خبر ——— نام نے اپنا اثر دکھایا اور پانی ہی پانی ہو گیا۔

"ہٹلر اور مسولینی کے حشر سے سبق سیکھو": ایک عنوان ——— کیا اُنہوں نے سبق پڑھانے کے لئے کوئی اسکول کھول رکھا ہے۔

"تلواروں کی نوک پر کوئی بات نہیں ہو گی": ایک عنوان ——— اِس لئے کہ اُس پر بات چیت کے لئے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

"مردوں کو چھیڑنے والی لڑکیاں": ایک خبر ——— اُلٹی گنگا بہنے لگی۔

"ٹیکسوں کی پرانی بقایا کے سلسلہ میں سرکار کیا قدم اٹھا رہی ہے": ایک سوال ——— سرکار کا فیصلہ زیرِ غور ہے۔ مگر سرکاری افسران بالائی آمدنی بڑھا کر اُسے رائٹ آف کر رہے ہیں۔

"سردار دربارہ سنگھ کا قابلِ تعریف اقدام": ایک عنوان ——— کہ سنت سنگھ کی دھمکی کے مقابلہ کا اعلان کر دیا۔

بسمل سعیدی دہلی

"ہندو سکھوں میں پھوٹ ڈالنا دشمن سے غداری ہے" ایک مقالہ ——— ایسے لوگوں سے نپٹنے کو سردار دربارہ سنگھ بھی کمربستہ ہیں۔

"گیونسٹوں میں پھوٹ کے آثار" ایک عنوان ——— محکمہ آثارِ قدیمہ ان حفاظت کرے۔

"مرغ بانی کی تربیت" ایک عنوان ——— صرف مرغیوں کو دی جائیگی۔

"پاکستان اور روس میں تعلقات بہتر ہو رہے ہیں" ایک خبر ——— اور اس سے ہمیں گھبراہٹ پھیل رہی ہے۔

"دیہاتی باتیں" ایک عنوان ——— اور ایک شہری کے قلم سے۔

"دلّی میں مکان مالکوں کا کنونشن" ایک عنوان ——— پگڑی لینے کو جائز دینے کا مطالبہ کرے گا۔

"بلند مائی میں مردوں کو چھیڑنے والی طالبات" ایک خبر ——— کیا اُن کے باپ بھائی نہیں ہیں جو پرائے مردوں کو چھیڑتی پھرتی ہیں۔

"امریکہ نے پاکستان کو امدادی کلب کا اجلاس ملتوی کرا دیا" ایک خبر ——— شاید یہ سمجھ کہ گاڑی اُسی کے سہارے چل رہی ہے۔

"اخباروں کے لئے ضابطۂ عمل مرتب کیا جائیگا" اندرا گاندھی ——— جس کی رو سے وزیروں کا پروپیگنڈہ لازمی ہوگا۔

"چوتھے پلان تک ملک خوراک میں خود کفیل ہو جائے گا" وزیرِ خوراک کی یقین دہانی ——— کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔

دلّی کے چند سوال ——— دلّی میں غنڈہ گردی کیسے ختم ہو؟ دلّی میں گندی بستیاں کیسے ختم ہوں؟ دلّی میں پانی کی قلت کیسے ختم ہو؟ دلّی میں طبّی امداد کی دشواریاں کیسے ختم ہوں؟ تمام سوالوں کا جواب ایک ہے! ——— دلّی کو اسمبلی کا کھلونا تھما دیا جائے۔



ہندوستان کو امریکہ سے لاکھوں ٹن غلہ ملنے کا معاہدہ

شری لال بہادر شاستری

خوشتر گرامی

قد چھوٹا، دل بڑا اور دماغ نکتہ رس۔ ان تین چیزوں سے مل کر، کھدر کے دھوتی کرتے میں ملبوس جو مرکب بنا اُس کا نام رکھا گیا ——

لال بہادر شاستری ——

گول مُسکراتا چہرہ۔ بڑی بڑی گمبھیر آنکھیں۔ کشادہ پیشانی۔ بولنا کم، کرنا زیادہ۔ میٹھا بول اور اونچا بول خداداد عطیہ۔ ہر آفت کے لئے سینہ سپر، ہر مصیبت میں نر۔ دوستوں کا کرم فرما۔ مخالفوں سے نبرد آزما۔ بڑی سے بڑی مخالفت سے نہ گھبرائیں۔ یوں محکمے کے معمولی کارکن کی غلطی ہو تو خود مستعفی ہو جائیں۔ ہر ادا میں انفرادیت اور ہر عادت میں سادگی۔ گاندھی واد میں اتنے کٹر کہ پیدا بھی ہوئے تو گاندھی جی کے جنم دن پر ——

کھدر کا دھوتی کرتا لباس۔ بھولے بھٹکے لمبا کوٹ بھی زیب تن کر لیں۔ پہلے صرف چپل پہنتے تھے۔ اب بوٹ کی بھی عزت افزائی فرماتے ہیں۔ سبزی ترکاری خوراک۔ کہیں جائیں تو چوکا چولھا ساتھ لے جائیں اور اپنا رسوئی گھر سجائیں۔ ماسکو کی دعوتوں میں شراب پر لگا کر اٹھ جائیے۔ بیلگریڈ میں ٹیبل پر سبزیاں پائیں —— ڈسپلن میں سپاہی، لیڈر کے ہر حکم پر جھک جائیں۔ خود لیڈر ہوں تو درخت ثمر بار بن جائیں۔ مگر حق و انصاف کے حق میں، ظلم و جبر کے سامنے نہیں۔ لیڈروں کی خصلتوں سے یکسر خالی، لیڈر سپائی چانس میں اور وزارت عظمیٰ لاٹری میں ملی ہے۔ ورنہ سوراج پلان میں کام آ چکے تھے۔

وزارت عظمیٰ جب سے سنبھالی ہے رُخساروں پر سُرخی آ گئی ہے اور پھول کر کُپّا ہو گئے ہیں، گردن میں تناؤ پیدا ہو گیا ہے اور کسی ایسی چکّی کا آٹا استعمال کرنے لگے ہیں جس میں موٹاپے کے جراثیم معلوم ہوتے ہیں۔



نئی گھاس، پُرانی گھاس

کرشن چندر ایم، اے

گرودواس فلیٹ، تھر روڈ۔ کھار، بمبئی ۵۲

۲۸ جولائی ۱۹۶۵ء برادرم خوشتر گرامی صاحب! آداب

.... افسانہ بھیج رہا ہوں۔ اِس سے پہلے آپ کے خط کا جواب اس لئے نہیں لکھا کہ افسانہ نقل نویس سے واپس نہیں آیا تھا۔ کل سے پاؤں میں موچ کی تکلیف ہے۔ وقت خاصہ مِل گیا۔ اطمینان سے بیٹھ کے افسانہ پر نظرِ ثانی کی اور اب آپ کو بھیج رہا ہوں یہ افسانہ "نئی گھاس، پُرانی گھاس" ایک غریب لیکن جری عورت کی پرابلم سے متعلق ہے ـــــ "جنت کے مزے" کے سلسلہ میں اتنے خطوط آرہے ہیں کہ میں فٹ پاتھ کی زندگی کے متعلق افسانوں کا ایک سلسلہ لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں، بمبئی کا فٹ پاتھ بھی ایک مستقل انسٹی ٹیوشن، جس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے ....

آپ کا ـــــ کرشن چندر

جیل کی لان میں نئی گھاس لگائی جانے والی تھی۔ اِس لئے پُرانی گھاس کو کھود کے نکالا جارہا تھا۔ قیدیوں کی کئی ٹکڑیاں لان کے مختلف حصّوں میں کام کر رہی تھیں۔ موسم اچھا تھا۔ دھوپ چمکیلی تھی۔ پہرے دار مہربان تھے۔ آہستہ آہستہ کام ہو رہا تھا۔

"پھر ....؟" دولت نے کھُرپی سے گھاس کھودتے کھودتے لیسین سے پوچھا۔

لیسین بولا۔

"پھر میں سورت سے بمبئی آگیا۔ میں شمشاد کے لئے زیادہ کمانا چاہتا تھا، سوچا، بڑے شہر میں بڑا دھندا ملے گا۔ اِس لئے اِدھر آگیا اور کابلی لین کے بسم اللہ موٹر گراج میں میکینک ہوگیا۔ آٹھ رُوپے روز ملنے لگے۔ سورت میں ساڑھے تین چار ملتے تھے۔ گراج کا مالک رحیم بھائی میرا کام دیکھ کر مجھ پہ مہربان ہوگیا۔ اُسی نے مجھے گراج کے باجو میں تیلی واڑہ چال میں ایک کھولی لے کے دی۔ شمشاد اُس چھوٹی سی کھولی کو بھی شیشے کی طرح چمکا کے رکھتی تھی۔ میں بہت مزے میں تھا۔ بہت خوش تھا۔ خوشی کے لئے بہت کچھ نہیں چاہئے دولت بھائی! ـــــ ایک چھوٹی سی کھولی، دو ٹیم محبت کی روٹی اور پیار کرنے والی بیوی۔ بس اور کیا چاہیئے؟"

"پھر ....؟" دولت نے کھُرپی چھوڑ کر بائیں ہاتھ سے پسینہ پونچھا۔

"پھر میں ایک بار سورت گیا۔ ماں بہت بیمار تھی۔ کھط آیا تھا۔ میں ماں کو مہینے کے مہینے ساٹھ رُوپے بھیجتا تھا۔ کبھی ستر اَسی بھی بھیج دیتا تھا .... پھر اوور ٹیم کر کے کچھ جیادہ ہی کما لیتا تھا۔ رحیم بھائی کا گراج بہت اچھا چلتا تھا۔ وہ بہت مہربان تھا اپنے پر۔ کبھی کبھی کھولی پر بھی آجاتا ـــــ پوچھتا "کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟" ہیڈ میکینک رام رنگ بھی اچھا آدمی جان پڑتا تھا۔ کبھی میری کاٹ نہیں کی۔ جب ماں کا کھط آیا تو میں وہ کھط لے کر رحیم بھائی کے پاس پہنچا۔ اُس نے میرے کو اَسی روپے ایڈوانس دیئے۔ میں نے تیس رُوپے شمشاد کو دے اور باکی پچاس رُوپے جیب میں ڈالے۔ سورت کا ٹکٹ کٹایا اور ماں کو دیکھنے چلا گیا۔ سورت گیا، بول گیا سات دن کے بعد آؤں گا۔"

"پھر ....؟" دولت نے پوچھا۔

لیسین نے زور کی کھُرپی مار کر گھاس کا ایک بڑا سا گچھا جڑوں سمیت ہاتھ میں اُٹھا لیا اور اُس کی طرف بہت نفرت سے دیکھ کر اُسے پرے پھینک دیا۔

"پھر اُدھر مجھے سات دن کی جگہ بارہ دن لگ گئے۔ کیونکہ ماں بہت بیمار تھی۔ جب وہ اچھی ہوئی، تب میں سورت سے چلا۔ ٹکٹ کے پیسے اُدھار لے کے بمبئی آیا۔ کھولی پہ

...چا۔ نہایا دھویا۔ کپڑے بدلے۔ کھانا کھاکے کھاٹ پر لیٹا تو شمشاد میرے پاؤں دبانے ...گی۔ پاؤں دباتے دباتے رونے لگی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے شادی؟"

وہ سسک سسک کر بولی۔

"تمہارے پیچھے گراج کا سیٹھ اِدھر آیا تھا۔ کئی بار آیا تھا۔ بڑی بڑی باتیں بولتا تھا۔"

"کیا بولتا تھا؟" غصے سے مجھے بخار سا چڑھنے لگا۔

"بولتا تھا سو روپے دے گا!"

"پھر....؟"

"میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ چلا گیا۔ دوسرے دن پھر آیا۔ بولا۔ دو سو دے گا! میں نے پھر دروازہ بند کر لیا۔ دو دن کے بعد پھر آیا۔ بولا، نہیں مانے گی تو تجھ کو اٹھا کے لے جاؤں گا۔ مان جائے گی تو سونے کے کڑے بنا دوں گا۔"

"تیری بیوی اتنی خوبصورت ہے؟" دولت نے حیرت سے پوچھا۔

"ہے تو سہی۔" یٰسین نے اقرار کیا۔

"تو بڑی غلطی کی تو نے۔" دولت افسوس سے سر ہلا کے بولا۔

"غریب کو کبھی خوبصورت عورت سے شادی نہیں کرنی چاہئے۔"

"کیوں....؟"

"رہتی نہیں سب۔" دولت بولا۔ "خوبصورتی بھی تو ایک طرح کی دولت ہے۔ غریبی اور دولت کا کیا میل؟"

"تو تیرے ماں باپ نے تیرا نام دولت کیوں رکھا؟"

"غلطی کی.... نام بڑے درشن چھوٹے۔ اچھا تم اپنا قصہ سناؤ ــــ پھر....؟"

"پھر مجھے غصہ آگیا۔ میں نے تڑ سے شمشاد کے ایک چانٹا دیا اور بولا ــــ اور تو سالی مان گئی؟ سونے کے کڑوں کے لالچ میں عزت گنوا دی! حرامجادی!!"

وہ زور زور سے رونے لگی۔ بولی۔

"قسم لے لے۔ قسم قرآن پاک کی جو کسی نے تیرے پیچھے میرے بدن کو ہاتھ لگایا ہو۔"

پھر رک کر بولی۔ "اُس کی باتیں سن کر مجھے ایک دم اُبال آگیا۔ میں نے تیرے سیٹھ کو اتنی گالیاں سنائیں.... اتنی گالیاں سنائیں کہ سارا تیلی واڑہ اکٹھا کر لیا۔ پھر اُس دن سے تیرا سیٹھ اِدھر کبھی نہیں آیا۔"

وہ زور زور سے رونے لگی۔ پر میں نے اُسے دلاسا نہیں دیا۔ اُس کے سر پہ ہاتھ نہیں رکھا۔ اُسی ٹیم کھاٹ سے اُٹھا۔ کھولی سے باہر نکلا۔ سیدھا گراج میں پہنچا۔ معلوم ہوا، سیٹھ رحیم بھائی گراج میں نہیں ہے۔ پٹرول پمپ پر ہے۔ میں پٹرول پمپ پہ پہنچا۔ سیٹھ اندر کے کمرے میں حساب کر رہا تھا۔ میں سیدھا اندر چلا گیا۔

"اندر جاکے سیدھا اُس کو چکو مار دیا ـــ رحیم بھائی بہت تگڑا تھا۔ اُس نے مقابلہ تو کیا پر چکو میرے ہاتھ میں تھا۔ دو تین وار مارے پر شور سن کر پمپ پہ کام کرنے والے خلاصی اندر آ گئے اور مجھے پکڑ لیا ــــ جب سے ڈیڑھ سال کی سزا کاٹ رہا ہوں۔"

"اور شمشاد؟"

"اُس کا کچھ پتہ نہیں۔"

"کیا....؟" دولت کے منہ سے نکلا۔

یٰسین نے کھُرپی چھوڑ دی۔ پھر دیوار کی طرف پیٹھ کر کے اکڑوں بیٹھ گیا اور بیڑی سلگانے لگا۔ بیڑی سلگا کے بولا۔

"پہلے تو ملاقات کے ٹیم ٹھیک آتی تھی۔ دو سو روپے اُس نے بچا کے رکھے تھے۔ وہ دو مہینے میں کھرچ ہو گئے۔ پھر کڑکی شروع ہوئی۔ جو تھوڑا بہت چاندی کا جیور اُس کے پاس تھا، وہ بھی اُس نے بیچ دیا۔ پھر گھر کے برتن بیچے۔ کھاٹ بیچی۔ میرا بستر بیچا۔ اِس طرح کر کے اُس نے کسی طرح چار مہینے نکال دیے۔ پھر ایک مہینہ اُدھار سے چلا۔ پانچ مہینے کے بعد وہ جب ملاقات کے ٹیم آئی تو بہت دُبلی ہو گئی اور اُس کی غریب صورت دیکھ کر مجھے رونا آتا تھا۔ سوچتا تھا۔ چکو اِدھر اُدھر کیوں لگا؟ سیدھے رحیم بھائی کے دل میں کیوں نہیں لگا؟ وہیں کھلاص ہو جاتا۔ چاہے مجھے پھانسی ہو جاتی۔"

"پھر....؟"

"پھر ایک رات کو رام رنگ ہیڈ میکنک چوری سے تیس روپے شمشاد کے ہاتھ پہ دے کر چلا گیا۔ اُس سے کچھ روز چلے۔ ماں نے دو گھروں میں برتن جھاڑو کا کام سنبھال لیا۔ دونوں گھروں سے ملا کر گیارہ روپے آتے تھے۔ کبھی روکھی سوکھی، کبھی فاقہ.... پھر ایک رات کو رام رنگ آیا اور چوری سے بیس روپے دے گیا۔ بولتا تھا، اگر سیٹھ نے دیکھ لیا کہ میں یٰسین کی گھر والی کی مدد کرتا ہوں تو نکال دے گا۔ میری ماں نے ہاتھ پھیلا کر اُس کو دعائیں دیں۔"

"شمشاد اُس کو بھیا کہنے لگی۔ پھر ایک دن برسات میں جب میری گھر والی اور میری ماں دو روز کے فاقے سے تھے، رام رنگ پچاس روپے لے کر آیا۔ ماں نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ شمشاد نے اپنے بھیا کے لئے روٹی پکائی۔ اُسے کھلائی۔ برسات جور کی تھی، ماں بولی۔ ایسے میں تو کہاں جائے گا۔ یہیں پڑ رہ۔ رام رنگ مان گیا۔ وہیں سو گیا۔ پر رات کو اُس نے میری بیوی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شمشاد نے شور مچا دیا۔ مگر لوگوں کے اکٹھا ہونے سے

پلیٹ فارم تک پہنچا تک ملکر غائب ہو گیا۔

"رام اور رحیم دونوں غریب کی محبت کے دشمن نکلے!" دولت نے بڑی کڑوی داسی سے کہا۔

دونوں دیر تک چُپ رہے۔ گھاس کھودتے رہے۔

لیسین پھر کہنے لگا۔

"پھر بھی وہ آتی تھی۔ پر کبھی آتی تھی، کبھی نہیں آتی تھی۔ پہلا ب یہ جو عورت نی تھی، یہ میری شمشاد نہیں تھی بیٹو بہت دُبلی سوکھی ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کی حالت دیکھ کے مجھ کو بہت ترس آتا تھا۔ اب میں اُس سے یہ بھی نہیں پوچھتا تھا کہ تیرا حال کیا ہے؟ ماں کیسی ہے؟ کیسے تیرے دن رات گزرتے ہیں؟ تو کیوں دن پر دن گھلتی جاتی ہے؟ پوچھنے سے فائدہ کیا تھا؟"

"ٹھیک کہتے ہو" دولت نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔

جیسے اُسے بھی کچھ یاد آگیا ہو۔

"پھر ایک بار جب وہ آئی۔ آج سے چار مہینے پہلے کی بات ہے تو بولی — رحیم بھائی مجھ کو رکھنے کو بولتا ہے۔ بولتا ہے کیوں جوانی برباد کرتی ہے؟ کیوں بھولی مری جاتی ہے؟ میرے پاس آجا! تجھ کو سونے کے کپڑے دوں گا۔ بجلی کے پنکھے والا کمرہ دوں گا۔ ریشم کے کپڑے دوں گا۔ ریڈیو دوں گا۔ سب عیش کرا دوں گا۔ اتنا کہہ کر وہ میری طرف ایسی لٹی لٹی نگاہوں سے دیکھنے لگی جیسے کسی نے اُس کی گردن پر چھری رکھ دی ہو، اور وہ مجھ سے پوچھ رہی ہو: "بول اب کیا کروں!؟"

"اور میں کیا بولتا۔ سر جھکا کے چُپ ہو گیا۔ وہ بھی دیر تک سر جھکائے میرے سامنے کھڑی رہی اور ٹپ ٹپ آنسو اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے بہتے رہے۔ میں اُس کے سامنے تھا اور وہ میرے سامنے تھی۔ میں اُس کا گھر والا تھا اور وہ میری گھر والی تھی۔ پر ہم دونوں کے بیچ میں لوہے کی جالیاں تھیں۔ یہ جیل کی جالی تو میں مُکا مار کے توڑ سکتا ہوں۔ میرے ہاتھ بہت مضبوط ہیں۔ پر دولت بھائی میں وہ جالی کیسے توڑ دوں جو نظر نہیں آتی۔

بہت دیر تک جب میں کچھ نہ بولا تو وہ بھی کچھ بولے سُنے بغیر چلی گئی — اور پھر کبھی نہیں آئی۔"

"آج ایک سال ہو گیا ہے۔ اب تو میری سزا ہی چھ مہینے کی باکی رہ گئی ہے۔ پھر سوچتا ہوں اگر وہ مجھ سے جدا رحیم بھائی کے دل میں اُتر جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ میں باکی جندگی تو جیل میں کاٹ دیتا۔"

یٰسین کا گلا بھر آیا تھا۔ لیکن اُس نے اپنے غم کو ایک تلخ نوالے کی طرح اندر ہی اندر اُتار دیا اور اپنی ساری توجہ کھرپی سے گھاس کھودنے میں لگا دی۔

دیر تک یٰسین اور دولت گھاس کھودتے رہے۔ پھر جیلر صاحب دو تین قیدیوں، دو تین پہرے داروں کو لے کر لان میں آگئے اور سیدھے اُن دو قیدیوں کے سر کے اوپر آ کھڑے ہوئے۔ جیلر صاحب مُسکرا رہے تھے۔ یٰسین حیرت سے اُن کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

جیلر صاحب نے ذرا پیچھے ہٹ کے اور ایک قیدی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اِسے پہچانتے ہو؟"

یٰسین سیدھا کھڑا ہو گیا —— "شمشاد!" —— اُس کے منہ سے چیخ سی نکلی۔

شمشاد خوشی سے مُسکرا رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اُسے قیدی بننے کا ذرا بھی غم نہیں ہے۔

"تم یہاں کیسے؟" یٰسین نے پوچھا۔ اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

شمشاد بولی۔

"میں تم سے مل کر جو واپس گئی تو اُس کے دو ہی دن بعد مجھے قاسم بھائی کے یہاں آیا کا کام مل گیا۔ قاسم بھائی کا پٹرول پمپ چورنگی کے پاس ہے۔ بولتا تھا تجھ کو جانتا ہے۔ بہت بہت دلاسا دیا اُس نے مجھے۔ میرے ساتھ ماں کو بھی بُلا لیا۔ اپنے گھر بہت آرام سے رکھا۔ بڑا اچھا آدمی ہے۔ بیوی بچے والا ہے۔ میں بہت خوش تھی۔ دس دن آرام سے جو نکلے تو میری صورت ہی بدل گئی۔ سوچا اب دس دن بعد تم سے ملنے جاؤں گی تو خوش کھری ہوں گی۔ پھر جس دن ملاقات کو تم سے ملنے کے لئے مجھ کو آنا تھا، اُس سے دو دن پہلے گھر میں دو تین مہمان آ گئے۔ گھر میں کام بڑھ گیا۔ ایک رات میں بچوں کو سُلا کے خود سونے جا رہی تھی کہ قاسم بھائی بولے۔

"اُس کمرے میں مولوی صاحب آ کے ٹھہرے ہیں۔ اُن کے کمرے میں پھلوں کی یہ پلیٹ سجا کے رکھ دے!"

میں پھلوں کی پلیٹ اور چھری لے کے اُس کمرے میں گئی۔ مولوی صاحب پلنگ پر میری طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے اور کچھ پی رہے تھے۔ کھٹکا سُن کر جو مُڑے تو میری چیخ نکل گئی —— یہ رحیم بھائی تھے!

میں نے جلدی سے پلیٹ تپائی پر رکھی اور بھاگنے لگی کہ رحیم بھائی نے مجھے زور سے دھکا دے کر پلنگ پر گرا دیا اور خود اُٹھ کر دروازے کی کنڈی اندر سے بند کرنے کو چلا گیا۔ مجھے موقع مل گیا۔ جب وہ واپس مُڑا تو پھلوں کی چھری میرے ہاتھ میں تھی اور دل میں خدا کا نام تھا۔

وہ چپ ہو گئی۔

جیلر صاحب مُسکرا کر بولے۔

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے قاسم بھائی اندر سے رحیم بھائی سے مل گیا تھا۔ ہوسکتا ہے اُس کے ایما پر شمشاد کو اُس کے گھر میں نوکر رکھا گیا ہو۔ کیونکہ قاسم بھائی نے عدالت میں شمشاد کے خلاف بیان دیا۔ اِس پر الزام لگایا کہ یہ چوری کی نیت سے رحیم بھائی کے کمرے میں داخل ہوئی تھی اور نوکروں سے بیان دلایا کہ اِس سے پہلے بھی اِس کی دو ایک چوریاں پکڑی جا چکی تھیں۔ چھوٹی موٹی چوریاں جو اِس کے رونے دھونے پر قاسم بھائی نے معاف کر دی تھیں۔ اِس لئے شمشاد کے بیان کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ رحیم بھائی پھر بچ گیا۔ عدالت نے رحم کھا کر تمہاری بیوی کو صرف دس مہینے کی سزا دی ہے۔ چار مہینے سے یہ دوسری جیل میں تھی۔ آج ہی ٹرانسفر ہو کے آئی ہے۔ تم دونوں ایک ہی ساتھ ایک ہی دن جیل سے رہا ہو گے۔ خوش ہو جاؤ!"

"شنو! میری شنو!!" یٰسین کا چہرہ ایکدم روشن ہو اُٹھا۔ اُس نے بے قرار ہو کر سب کے سامنے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر دوسرے لمحے شرمندہ ہو کر چھوڑ دیا۔

جیلر صاحب ہنسنے لگے، پھر کمال مہربانی سے بولے۔

"جاؤ تم دونوں اُس جامن کے پیڑ کے پیچھے بیٹھ کر آدھ گھنٹے کے لئے بات کر لو۔"

وہ دونوں جامن کے اُس پیڑ کی طرف جانے لگے، جس کے پیچھے لکڑی کے ایک بنچ نے آڑ سی پیدا کر دی تھی۔ وہ دونوں اُس بنچ کی طرف بڑھتے گئے۔ باتیں کرتے کرتے یٰسین نے بہت سی گھاس کھود ڈالی تھی لیکن شمشاد کی نگاہوں میں ایک عجیب سی بے چینی تھی، آخر اُس نے پوچھ ہی لیا۔

"جیل سے چھوٹ کر ہم کہاں جائیں گے؟"

یٰسین نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "کہیں بھی جائیں گے۔ کوئی جگہ نہ ملی تو فٹ پاتھ پر بسیرا کریں گے۔ مگر اپنی محبت کبھی نہیں بیچیں گے۔"

شمشاد کچھ دیر تو چُپ رہی۔ پھر ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔ "جانے یہ دنیا کب بدلے گی؟"

"اری باؤلی!" یٰسین ہنس کر بولا۔ "دُنیا خود سے کبھی نہیں بدلتی۔ اِسکو بدلنا پڑتا ہے۔ نئی گھاس اُگانے کے لئے پُرانی گھاس کھود کر پھینک دینی پڑتی ہے!"

اتنا کہہ کر یٰسین نے کھُرپی زور سے زمین میں گاڑ دی اور پُرانی گھاس کا ایک گچھا اُٹھا کر بڑی نفرت سے اپنے پیچھے پھینک دیا۔

رسالہ نہ ملنے کی شکایت: دو مرتبہ پتے چیک کرنے کے بعد "بیسویں صدی" ہر ماہ باقاعدگی سے سپردِ ڈاک کیا جاتا ہے۔ اِس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک سے بھی کیجئے۔

(مینیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۲)

گزارش

طفیل ہوشیارپوری

میرے محبوب! وفا پر مری الزام نہ دے
زندگی دی ہے تو پھر موت کا پیغام نہ دے

زہر میں ڈوبے ہوئے خط مجھے تحریر نہ کر
بے وفا کہہ کے مرے عشق کی تحقیر نہ کر
میں نے دُنیا میں فقط تجھ سے محبت کی ہے
کعبۂ عشق میں دن رات عبادت کی ہے

میرے آغازِ محبت کو یہ انجام نہ دے
میرے محبوب! وفا پر مری الزام نہ دے

اُلجھے اُلجھے سے خیالات کا آئینہ ہے
تیرا ہر خط ترے جذبات کا آئینہ ہے
تیری تحریر میں دیکھی ترے ماتھے کی شکن
ایک اِک لفظ میں پائی ترے سینے کی جلن

اپنے ہاتھوں سے مجھے زہر بھرا جام نہ دے
میرے محبوب! وفا پر مری الزام نہ دے

جانِ من تجھکو تری صندلیں باہوں کی قسم
میکدہ ساز حسیں مست نگاہوں کی قسم
ایک اِک کر کے مرے ذہن میں محفوظ ہیں سب
تیری زلفیں، تری آنکھیں، ترے عارض، ترے لب

میری معصوم وفاؤں کو یہ انعام نہ دے
میرے محبوب! وفا پر مری الزام نہ دے

ایک دل پر جو کہیں گردِ ملال آتی ہے
دوسرے دل پہ قیامت سی گزر جاتی ہے
دھڑکنوں ہی سے ذرا اِسکی گواہی لے لے
پھر مجھے ترکِ محبت کی سزا بھی دے لے

بد دُعا تجھکو کہیں یہ دلِ ناکام نہ دے
میرے محبوب! وفا پر مری الزام نہ دے

کال گرل

کوثر چاندپوری

ہمدرد کلینک آصف علی روڈ، نئی دہلی

۲ راگست ۱۹۶۵ء

خوشتر صاحب!

ایک شعر سنئے تھکن دور ہو جائے گی۔

اے مہرِ تمنّا آ، جاگی ہوئی آنکھوں میں — سناٹا سا کھٹکتا ہے نجمِ سحری کب سے

اُس دن فون پر آپ کا لہجہ نہ پہچان سکا۔ آپ نے عسکری انداز میں بات کی تب سمجھا کہ آپ ہیں۔ تعمیلِ ارشاد کر رہا ہوں۔ نینی تال کے دورانِ قیام میں دو ہی کہانیاں لکھ سکا ہوں، اُن میں سے ایک یعنی دوسری آپ کی نذر ہے۔ پلاٹ نینی تال کی فردوسی فضاؤں کا عطیہ ہے جہاں آپ کا تصور بھی موجود تھا اور "بیسویں صدی" کا بھی۔ جی چاہتا ہے آپ کو جو لیہر ہوٹل لے چلوں۔ اب جہاں نہیں رہا، میزبان ہی سمجھئے! —— بتائیے کب؟

آپ کا بہت پرانا —— کوثر چاندپوری

بل کھاتی ہوئی سڑکوں اور اونچی سرسبز پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی رومانی شاعر کے دماغ میں شعر کا تصور بن کر گھوم رہا ہے۔ تیز رو آبشار بل کھاتے سانپوں کی مانند دوڑ رہے تھے، کہیں کہیں فضا میں روئی کے گالے سے اُڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر خلا سا بن گیا تھا اور نینی تال پہنچ کر اُس نے دیکھا، چاروں طرف پہاڑوں کی آغوش میں خوبصورت عمارتیں بنی ہوئی ہیں، جن کا سلسلہ چوٹیوں سے جھیل کے کناروں تک پھیلا ہوا ہے۔ پست و بلند عمارتیں کاغذ پر بنی ہوئی حسین اور نازک تصویروں کے مشابہ تھیں کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سے کبوتر آسمان سے زمین پر اُتر آئے ہیں اور قطار در قطار بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُس نے ہوٹل مانسرووَر کی پہلی بلڈنگ میں بیٹھ کر جھیل کا نظارہ کیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے پگھلی ہوئی چاندی پہاڑوں کے درمیان بھری ہوئی ہو۔ ہوٹل کی پہلی بلڈنگ اِس طرح مختلف عمارتوں کے درمیان کھڑی تھی جیسے بسنت رُت ایک جگہ سمٹ آئی ہو۔ جھیل میں ہلکی ہلکی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ اُن پر کشتیاں تیر رہی تھیں جن میں بہت سے مرد اور بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں بھی تھیں۔ اُن کی ساڑیوں کے رنگ دھنک کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ جھیل کا شفاف پانی ایک ایسے آنسو کی طرح دکھائی دے رہا تھا جو کسی عاشق کی آنکھ میں اُمڈ آیا ہو لیکن ابھی پیمانہ بھر یا چھلک کر محبوب کے دامن میں جذب نہ ہو سکا ہو۔ سڑک پر باہر سے آئے ہوئے لوگ رائڈنگ کے شوق میں مختلف قد و قامت کے گھوڑوں پر سوار اُچکتے چلے جا رہے تھے۔ اُس نے اپنا کمرہ بند کیا اور تالا ڈال کر بلندی سے اترتا نشیب میں جھیل کے کنارے آ گیا، جہاں بہت سی ڈانڈیاں برابر برابر رکھی تھیں۔ ایک طرف رکشے کھڑے تھے۔ جھیل کے قریب سیمنٹ کی دو بنچیں بنی ہوئی تھیں وہ بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ دو لڑکیاں دھیمی آواز میں باتیں کرتی ادھر آ گئیں۔ اُس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے اگلی بنچ کا راستہ چھوڑ دیا اور آہستہ سے بولا۔

"یہاں بیٹھئے وہاں سے کشتیاں صاف نظر نہ آئیں گی۔"

وہ دونوں بیٹھ گئیں اور وہ پچھلی بنچ کے سہارے کھڑا کشتیوں پر نگاہیں جمائے رہا۔ ایک دم احساس میں ایک بھینی سی مہک بھر گئی۔ اُس نے سوچا، یہ کسی قیمتی سینٹ کی خوشبو ہے جو یقیناً اِن لڑکیوں میں سے کسی نے لگایا ہوگا۔ اب وہ چونکا اور غور سے لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔ انداز سے ایک یہیں کی رہنے والی معلوم ہوتی تھی۔ وہ تپلی دُبلی اور ذرا لمبے قد کی تھی کپڑے معمولی تھے۔ رنگ گورا تھا لیکن کوئی خاص کشش نہ تھی۔ ناک نقشہ بھی کچھ بھونڈا سا تھا۔ دبی ہوئی ناک۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور خمیری آٹے کی طرح پھولا پھولا چہرہ۔

شرمائی سی شکل سے بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسری کا جسم تھوڑا گداز تھا۔ اُسے لمبی کہا جا سکتا تھا، شاید نہیں۔ اُس کے نقش و نگار میں عجیب سی معصومیت اور دلکشی تھی۔ آنکھوں میں جھیل کی سی گہرائی تھی۔ وہ شب بھی ایک مسکراہٹ معلوم ہو رہی تھیں۔ اُن میں ایک خاص تجسس تھا۔ نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ آنکھوں پر ہموار بھنویں اِس طرح کمان کی طرح کھینچی ہوئی تھیں جیسے جھیل کے گرد پہاڑیوں کی صفیں کھڑی تھیں۔ اُس نے جوڑے میں چند پھول لگا رکھے تھے اور آبی رنگ کی ساڑی باندھے ہوئے تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بادلوں کے نیچے شفق ابھی غروب نہ ہوا ہو اور اُس کی رنگین کرنیں بادلوں سے چھن کر اور زیادہ نکھرتی جا رہی ہوں۔

"آپ کھڑے کیوں ہیں، بیٹھ جائیے۔"

"بیٹھ کر اِن کشتیوں کو نہ دیکھ سکوں گا۔"

"اِسی بنچ پر بیٹھ جائیے۔" اُس نے اپنی سہیلی کی طرف سرکتے ہوئے کہا۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تھکن اُس کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ اُس کی نگاہیں کشتیوں پر جمی ہوئی تھیں جو بطخوں کی طرح جھیل میں تیر رہی تھیں لیکن ذہن و شعور میں وہی لڑکی تھرک رہی تھی جو اُس کے قریب بھی تھی اور اس سے بہت دور بھی! اِس قربت میں وہ دوری کتنی محسوس کر رہا تھا۔ اُسے آپ ہی آپ نیند سی آ رہی تھی شاید خوشبو میں کوئی ایسی دوا شامل تھی جو آدمی کو بیہوش کر کے سُلا دیتی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا، یہ لڑکی کتنی شریف اور مہذب ہے۔ وہ مجھے بیماری نہیں سمجھتی حالانکہ لڑکیوں کے نزدیک ہر نوجوان ایک متعدی بیماری سے کم نہیں ہوتا۔ شام ہو چکی تھی، پہاڑوں میں بادلوں کا دُھواں گھُٹا ہوا تھا اور مغرب میں شفق کے سُرخ رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ زمین پر بجلی کے ستارے جھلملا رہے تھے اور نینی تال روشنی کا شہر معلوم ہو رہا تھا۔ قمقموں میں یہ دلکشی اور رعنائی اِسے کہیں نظر نہ آئی تھی۔ روشنی کی لائنوں میں ایک انوکھی سی پستی اور بلندی تھی۔ زمین سے آسمان تک نور کی ایک چمکیلی دیوار کھڑی تھی سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑنے لگی تھی۔ لڑکیاں جانے کے ارادے سے کھڑی ہو گئیں۔ اُس نے گھوم کر دیکھا اُسی وقت ایک لڑکی نے پوچھ لیا۔

"کہاں سے آئے ہیں آپ؟"

"آگرہ سے ——— اور آپ؟"

"میں دہلی میں رہتی ہوں اور یہ میری سہیلی ہے مینا سہائے۔ یہیں کی رہنے والی ہے۔"

یہ کہتی ہوئی وہ متحرک شمع کی مانند سڑک کی سمت چلنے لگی۔ ذرا دیر بعد وہ بھی ہال سُرور میں آ گیا اور برآمدے میں بیٹھ کر جھیل کا نظارہ کرنے لگا۔ پانی پارے کی مانند لرز رہا تھا۔ اُس کے شعور میں اب تک وہی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ رات کافی سرد تھی۔ بارش کی بوندیں ٹین کی چھت پر ساز بجا رہی تھیں۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اُس کے سائے زمین پر اُتر آئے تھے۔ آٹھ بجتے ہی وہ کمرے میں چلا گیا اور دروازے بند کر لئے۔ خنک ہوائیں کھڑکیوں سے داخل ہوتی رہیں۔ وہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ خوشبو اُس کے دماغ کو معطر کرتی رہی۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا اور لڑکی کے جُملے کانوں میں گونجتے رہے۔

"اِسی بنچ پر بیٹھ جائیے۔"

"کہاں سے آئے ہیں آپ؟"

صبح سویرے ہی وہ چائے پینے کے ارادہ سے نکلا۔ مال سرور اور سڑک کے وسط میں چائے کا ایک معمولی سا ہوٹل نظر آیا۔ جہاں آہنی چمچوں میں بہت سے انڈے نیچے اوپر رکھے ہوئے تھے اور ایلومینیم کی کیتلی جو اوپر تک سیاہ ہو گئی تھی انگیٹھی پر دھری ہنستا رہی تھی۔ دو آدمی لکڑی کی تپائی پر بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ایک بیرا ہوٹل کے سامنے کانچ کے گلاس میں چائے لئے کھڑا تھا۔ چائے کا رنگ بہت گہرا تھا۔ اُس نے کبھی اِس طرح کے معمولی ہوٹلوں میں جانا پسند نہ کیا تھا۔ وہ اسے دیکھتا ہوا آگے بڑھ جانا چاہتا تھا کہ مینا سہائے ایک طرف بیٹھی نظر آ گئی۔ وہ جلدی سے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ مینا سہائے اُسے دیکھ کر دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے بہت بلند آواز میں بولی۔

"چائے پیو گے؟"

"ایک انڈا فرائی کرا دوں؟"

"مال سرور میں ٹھہرے ہو؟"

وہ چُپ رہا۔ مینا سہائے اتنے زور سے بول رہی تھی کہ نسوانی آواز کی مٹھاس نچڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

"منگاؤں ایک کپ چائے اور ایک ہاف بائل انڈا۔ یہاں کی سردی بہت بُری ہوتی ہے۔"

"انگیٹھی کے پاس آ جاؤ!"

"اے ا۔۔۔ ——— اُس نے ملازم کو مخاطب کیا۔" ایک نہیں دو انڈے بائل کرو۔"

ہاف بائل کھاؤ گے یا فل بائل۔ دو منٹ میں انڈا ہاف بائل ہوتا ہے اور چار منٹ میں فل بائل۔"

"مجھے چار منٹ والا دو۔"

"ایک دم ہندوستانی معلوم ہوتے ہو۔" ——— وہ بہت زور سے ہنسی اور قہقہے کی آواز دیہاتی جھنجھنے کی مانند دیر تک جھیل کی لہروں پر بہتی اور رقص کرتی رہی۔ اُس وقت اُسے معلوم ہوا کہ مینا سہائے میں ابھی شباب کی ایک ہلکی سی دلکشی موجود ہے اور اُس کے اوپر جمی ہوئی تہیں دھیرے دھیرے اُترتی جا رہی ہیں۔

مینا سہائے میلی ساڑی باندھے ہوئے تھی۔ اُس نے ملازم سے کہا۔

"انڈے بائل کرو، کیتلی کا گرم پانی پتیلی میں ڈالو اور اُسے انگیٹھی پر رکھ دو ——— آگرے ہی سے آتے ہو تم؟"

"ہاں آگرے ہی سے آیا ہوں۔"

"شاہجہاں بادشاہ نے کیا ممتاز محل کو ——— تاج محل دیکھا ہے؟"

"اندر سے نہیں باہر سے دیکھا ہے۔"

"اندر کیوں نہیں گئے؟"

"میں محبت کو مُردہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔"

مینا سہائے چونک گئی۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر اُس کی طرف دیکھنے لگی، سوچنے لگی، کتنی اچھی بات کہی ہے اِس نے۔

"میں اسکول میں پڑھتی ہوں۔ یہ ہوٹل میرے پتا جی نے کھولا ہے۔"

وہ اُسی طرح بلند آواز میں بول رہی تھی۔

"آہستہ بولنے کی عادت ڈالو مینا!"

"گاہک اونچی آواز نہیں سُنتے۔"

"میں گاہک نہیں ہوں۔"

"ہاں! تم گاہک نہیں ہو۔ میں تم سے چائے کے پیسے نہیں لوں گی۔"

اور واقعی مینا سہائے نے اُس کے اصرار کرنے پر بھی پیسے نہیں لئے۔

"کملا ترپاٹھی کہاں ہے؟"

"وہ اوپر ایک ہوٹل میں ٹھہری ہے۔ اپنے انکل کے ساتھ۔ ہوٹل بہت دُور ہے، یہاں سے میں کل دوپہر کو ڈانڈی میں بیٹھ کر گئی تھی اور اُسے ساتھ لے آئی تھی، اُس نے بھی دو انڈے کھا کر ایک پیالی چائے پی تھی۔"

"کیا نام ہے ہوٹل کا؟"

"نام پوچھ کر کیا کرو گے۔ جب تک وہاں پہونچو گے، وہ کار میں بیٹھ کر کاٹھ گودام کے لئے روانہ ہو چکی ہوگی، بہت پریشان ہے۔ انکل نے مقدمہ چلا دیا ہے اُس کی ماں پر۔ کملا اکیلی نہیں ہے۔ اُس کے تین بھائی بہن ہیں۔"

وہ چند روز اور نینی تال میں مقیم رہا۔ مینا سہائے سے روز ہی ملاقات ہوتی رہی اُس نے اپنے ذوق اور معیار کے مطابق اُسے تفریح بھی کرائی۔ چلتے وقت اُس نے مینا سے کملا ترپاٹھی کا پتہ پوچھ کر اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔ روانگی کے وقت مینا سہائے نے ایک عمدہ سا سویٹ اُس کی نذر کیا۔

آگرہ آنے کے بعد وہ بہت زیادہ مصروف ہو گیا اور تین مہینے تک دہلی جانے کا موقعہ نہ ملا۔ چوتھے مہینے وہ دہلی گیا اور کملا ترپاٹھی سے ملنے کی کوشش کی۔ غالباً پتہ پورا نہ تھا۔ وہ اُس کے گھر نہ پہونچ سکا۔ اُسے کملا سے نہ ملنے کا بہت افسوس تھا۔ وہ سوچ رہا تھا ایک بار اور نینی تال جائے اور مینا سہائے سے اُس کا پورا پتہ معلوم کرے، حالانکہ پتہ اب بھی ادھورا نہ تھا۔ ہو سکتا ہے کملا گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہو۔ ایک دن وہ اپنے ایک دوست سے ملنے شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں گیا۔ اُس کا دوست ۱۱۰ نمبر روم میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ لفٹ کے ذریعہ اوپر گیا۔

"ہیلو مسٹر اگروال!" ——— اُس کا دوست ڈاکٹر چوپڑہ اُسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور بہت تپاک سے ہاتھ ملایا۔ دونوں کالج میں ساتھ پڑھے تھے۔ دیر تک پرانی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر بعد چوپڑہ کو کسی نے فون پر بلایا اور وہ اُسے وہیں چھوڑ کر جلد آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اگروال نے میز پر پڑا ہوا اخبار اُٹھا لیا اور وقت کاٹنے کے لئے اُسے پڑھنے لگا۔ وہ ایک دلچسپ مقامی خبر پڑھ رہا تھا کہ اچانک دروازے کا پردہ اُٹھا اور ایک خوبصورت لڑکی نہایت قیمتی ساڑی پہنے اور میک اپ کئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اگروال سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ نینی تال والی خوشبو کمرے میں پھیلتی جا رہی تھی اور کملا ترپاٹھی اُس کے سامنے کھڑی تھی! وہ اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی! ذرا دیر بعد کملا مُسکرائی اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"میں نے پہلے بھی آپ کو دیکھا ہے لیکن کہاں یہ بالکل یاد نہیں آ رہا ہے۔"

"شاید نینی تال میں دیکھا ہو جھیل کے کنارے!"

"ہاں یاد آگیا ضرور وہیں دیکھا ہے۔ مینا سہائے بھی میرے ساتھ تھی وہ میرے ساتھ پڑھتی ہے اسکول میں، کب چھوڑا آپ نے نینی تال؟"

"کئی مہینے ہوئے، مینا سہائے بہت اچھی لڑکی ہے اُس نے آپ کا پتہ بھی لکھا دیا تھا۔"

"بے وقوف لڑکی! ——— خیر چھوڑو اُس کا ذکر میں پوچھتی ہوں میرا یہ پتہ کیسے معلوم کر لیا آپ نے؟"

"ابھی ایک آدمی میرے یہاں گیا اور اُس نے آپ کا روم نمبر لکھ کر کہا کہ میں جلد ہی یہاں پہونچ جاؤں" ——— "میں نے کسی کو آپ کے پاس نہیں بھیجا۔ مجھے آپ کا نیا پتہ ہی معلوم نہیں۔"

"پھر کس نے بھیجا؟" ——— "میرے دوست ڈاکٹر چوپڑہ یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں غالباً اُنہوں نے آپ کو بلایا ہوگا۔" اُسی وقت ڈاکٹر چوپڑہ آگیا اور کملا ترپاٹھی نے فوراً ہی اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ اُس کے سراپا کا جائزہ لینے لگا ——— اگروال نے وقت کی نزاکت اور اہمیت کا اندازہ لگاتے ہوئے اجازت طلب کی ——— "میں چلتا ہوں چوپڑے!"

چوپڑہ زینہ تک چھوڑنے آیا اور اُسے رخصت کرتے ہوئے بولا "میں جانے سے پہلے ایک خوبصورت سی کال گرل کا آرڈر دے چکا تھا۔" اگروال کچھ کہے بغیر زینہ اُترنے لگا۔ خوشبو اُس کے دماغ میں بھری ہوئی تھی اور مجھے ۱۱۰ میں شدید عفونت پھیلتی محسوس ہو رہی تھی۔

غزل

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری ایم اے

ارے خوابِ محبت کی بھی کیا تعبیر ہوتی ہے ۔ کھلیں آنکھیں تو دنیا درد کی تصویر ہوتی ہے

لہک پھولوں کی مرگِ عاشقِ دلگیر ہوتی ہے ۔ ہر اِک موجِ صبا اِک خوں بھری شمشیر ہوتی ہے

بوقتِ مے پرستی بزمِ مے دلگیر ہوتی ہے ۔ کہ موجِ بادہ، اُٹھتے درد کی تصویر ہوتی ہے

اُمیدیں ٹوٹ جائیں اور پھر جیتا رہے کوئی ۔ نہ پوچھ اے دوست! کیا پھوٹی ہوئی تقدیر ہوتی ہے

اُبھر آتی ہیں چوٹیں دل کی، زنداں یاد آتا ہے ۔ ہوائے فصلِ گُل ہلتی ہوئی زنجیر ہوتی ہے

نگاہِ سُرمگیں اُٹھی، صدائے الاماں اُٹھی ۔ بڑی قاتل، بڑی سفّاک یہ شمشیر ہوتی ہے

سراپا درد ہو کر جو رہا جیتا زمانے میں ۔ اُسی کی خاک یارو غیرتِ اکسیر ہوتی ہے

یہی دن تھے کہ جب صیاد نے پھونکا نشیمن کو ۔ بہار اپنے لئے اِک حسرتِ تعمیر ہوتی ہے

اِسی اِک لفظ کی، دل کہتے ہیں جس کو زمانے میں ۔ بہارِ گُل کی خونیں داستاں تفسیر ہوتی ہے

چلا جس وقت پروانہ، نگاہیں پھیر لیں مجھ سے ۔ بھری محفل میں دَر پردہ مری تعزیر ہوتی ہے

اجل آئی ہے، بدنامِ محبت ہو کے جاتا ہوں ۔ وفا سے ہاتھ اٹھاتا ہوں، بڑی تقصیر ہوتی ہے

بہار آئی کوئی دیکھے ترے دیوانے کے تیور ۔ نظر سمتِ چمن، وحشت گریباں گیر ہوتی ہے

کسی کی زندگی اے دوست جو دھوکوں میں گزری تھی ۔ اُسی کی جھلملاتی شمع اِک تصویر ہوتی ہے

فراقؔ اِک شمع سر دھنتی ہے پچھلی شب جو بالیں پر
مری جاتی ہوئی دنیا کی اِک تصویر ہوتی ہے

گہرے غم کا درد

ــــــ رئیس نجمی امروہوی

آشیانہ، سرائے کہنہ مقبرہ دہلی

۱۶ مئی ۱۹۹۵ء　　　　کرم گستر حضرتِ خوشتر، خلوصِ بیکراں، حیاتِ جاوداں

.... اس بار "افسانہ نمبر" میں شریک نہ ہونے کا مجھے بے حد دکھ ہے لیکن کیا کروں۔ بعض اوقات حالات کی دشواریاں اور کاروباری پریشانیاں کچھ اس طرح پیدا ہو جاتی ہیں کہ ان میں گھر کر اپنا بھی ہوش نہیں رہتا۔ پچھلے دنوں کارخانے سے مسلسل غیر حاضر رہنے والے عزیز بھائی کو پاکستان سے لانے اور وہاں اسے پہنچانے کی وجہ سے کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ میں پریشان رہا۔ آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا ورنہ بھائی جان ایک "افسانہ نمبر" ہی کیا "بیسویں صدی" کے لئے ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ اس کے ہر ماہ دو شمارے شائع ہوں اور ہر شمارے میں میری کہانی ہو۔ [illegible] میری تازہ ترین تخلیق "گہرے غم کا درد" آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں یہ میرا ایک مشاہدہ ہے۔ ایک مطالعہ ہے۔ اس نئے اس کہانی "ڈاکٹر" کا کردار آپ کی اور میرے پڑھنے والوں کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے ہیں ان کے لئے صرف اتنا ہی کہوں گا کہ ایک بار میرے اور آپ کے مخلص اور عزیز ترین بھائی .... نے میلوں دور گلاسگو میں بیٹھ کر مجھے چند باتیں بتائی تھیں۔ انھیں چند باتوں کے زیر اثر میں نے جو خاکہ ذہن میں ترتیب دیا وہ اس کہانی کے روپ میں ڈھل گیا اور اب آپ کے سامنے ہے ــــ ڈاکٹر کی شخصیت اور ان کے عظیم کردار کو جہاں تک اور جس حد تک میں سمجھ پایا ہوں وہ صرف ان کے آپ کے یا میرے لئے ہی نہیں پورے مشرق کے لئے ایک مثالی کردار ہے۔ کیونکہ ایسے کردار اس دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں اس لئے ان کی پرستش کرنے کو دل چاہتا ہے ــــ بالکل آخیر میں ایک بات کہنا چاہوں گا کہ جانے یا انجانے کوئی بات اگر میں ایسی لکھ گیا ہوں جو کہانی پڑھنے کے بعد ان کے دلِ نازک پر گراں گزرے تو اس کے لئے ڈاکٹر صاحب مجھے معاف کر دیں۔ کیونکہ کسی حقیقت کو کہانی کا روپ دینے کے لئے کہانی کار کو اپنی طرف سے بھی بہت کچھ کہنا پڑتا ہے ....

نیاز مند ــ ـــــ رئیس نجمی

کراچی پہنچنے کے دس دن بعد جب میں ڈاکٹر عطیا احسان کے بتائے ہوئے پتے پر ان کے بنگلے کی تلاش میں مارٹن روڈ پہنچا تو مجھے ان کا بنگلہ ڈھونڈنے میں زیادہ پریشانی نہ ہوئی کیونکہ سفر کے دوران میں ہونے والی پہلی ملاقات میں ڈاکٹر نے مارٹن روڈ کے موڑ پر جس راستے کا پتہ بتایا تھا۔ اس موڑ پر پہنچ کر جب میں نے دائیں طرف جانے والی ایک تنگ سی سڑک پر چند قدم طے کئے تو میں نے دیکھا میرے سامنے "گل نسرین" کی پُروقار عمارت تھی۔ "گل نسرین" کا خوبصورت نام جب میں نے پہلی بار ان کے منہ سے سنا تھا تو اسی لمحے میرے تصور میں "ہونواس" کی خوابی دنیا کا کوئی حسین خوبصورت سا گوشہ رقص کرنے لگا تھا اور اسے دیکھنے کی آرزو میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی لیکن اس وقت "گل نسرین" نام کی جس حسین ترین عمارت کے سامنے میں کھڑا تھا وہ میرے اس تصور سے کہیں زیادہ حسین اور رقبے کے اعتبار سے کہیں زیادہ وسیع تھی۔ اس کا طرزِ تعمیر اور ماحول کی خاموشی اس میں رہنے والوں کی شائستگی اور ان کے تخیل کی پُرکاری کا پتہ دے رہی تھی۔ اس وقت اس کا آہنی دروازہ بند تھا۔ چوکیدار موجود نہ تھا یا شاید کبھی رہتا نہ ہوگا کیونکہ ڈاکٹر نے اس کی ضرورت نہ سمجھی ہوگی۔ میں چند لمحوں تک ڈاکٹر کی شخصیت اور ان کے بنگلے کی نفاست کا موازنہ کرتا رہا۔ جب کئی لمحے یونہی اس سوچ میں کھڑے کھڑے گزر گئے تو میں نے گیٹ پر "کال بیل" کا سوئچ تلاش کیا اور آگے بڑھ کر اپنی انگلی کال بیل پر رکھ دی۔ کچھ

سے کسی کمرے میں گھنٹی کی آواز اُبھری اور ڈوب گئی۔ میں کسی کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت گیٹ کی جانب آ رہی ہے جو میرے اپنے خیال کے مطابق ڈاکٹر کی ملازمہ ہو سکتی تھی۔ جب وہ بالکل قریب آگئی تو اُس نے نہایت مودبانہ انداز سے مجھے سلام کیا اور پوچھنے لگی "آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"ڈاکٹر عطیہ احسان سے" کہتے ہوئے میں نے اپنا تعارفی کارڈ اُسے دیدیا۔

میرا کارڈ اندر پہنچانے کے بعد وہ جلد ہی واپس آگئی لیکن جواب میں کچھ نہ بولی بلکہ گیٹ کھول کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے ہرے بھرے جدید طرز کے پھولوں سے آراستہ لان سے گذر کر اُس کے ساتھ ساتھ ایک ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد اُس عورت نے جاتے جاتے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر صاحبہ ابھی کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہیں اور چند منٹ بعد مجھ سے ملنا پسند کریں گی، میری آمد سے اُنھیں مطلع کر دیا ہے۔ مجھے ڈاکٹر کی یہ بد اخلاقی کسی حد تک گراں گذری کیونکہ میں جہاں ٹھہرا ہوا تھا وہ جگہ ملٹن روڈ سے کئی میل دور تھی اور میں صرف اُن کی خواہش کی تکمیل کے لئے اُن سے اتنی دُور ملنے چلا آیا تھا لیکن وہ مجھ سے ملنے کے لئے اپنے کمرے سے اُٹھ کر ڈرائنگ روم تک نہیں آسکتی تھیں بہت دیر تک یہ احساس مجھے باغی بناتا رہا کہ مجھے اُن سے ملاقات کئے بغیر ہی واپس چلا جانا چاہیئے تاکہ اُنھیں اپنی اس بد اخلاقی کا احساس ہو جائے لیکن کافی سوچ وچار کے بعد آخر میں میں نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ بات اخلاقی قدروں کے منافی ہوگی اگر میں اُن سے ملاقات کئے بغیر اُن کے ڈرائنگ روم سے اُٹھ کر چلا گیا۔ پھر ایک گہری اور بے تکلف ملاقات کے بعد ڈاکٹر کی شخصیت بھی میرے لئے ایسی نہ رہ گئی تھی کہ اُن کے بارے میں کوئی بُری رائے قائم کی جا سکتی۔ میں نے اپنے ان خیالات کو ذہن سے نکال دیا اور ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگا۔

ڈاکٹر عطیہ احسان سے میری پہلی ملاقات جو میرے اور ان کے تعارف کا سبب بنی، بہت ڈرامائی انداز میں اُس وقت ہوئی تھی جب میں برسوں بعد اپنے وطن سے ملنے کراچی جا رہا تھا۔ وہ فروری کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ نہ جانے وہ کونسا اسٹیشن تھا، نہ جانے [illegible] ٹھہری تھی، مجھے کچھ یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ جب ایک بڑے جنکشن سے چلکر ٹرین چند لمحوں کے لئے کسی جگہ رُکی تھی تو وہیں سے وہ میرے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئی تھیں اور بغیر کسی تکلف کے میرے سامنے برتھ پر آ بیٹھ گئی تھیں۔ گاڑی چلنے کے بعد ہی وہ مجھے جانی پہچانی نظروں سے دیکھنے لگی تھیں۔ جسے میں نے اُسی لمحے نوٹ کر لیا تھا اور نہ جانے کیوں میں خود اپنے لئے ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ جب اسی کشمکش میں کافی دیر گزر گئی تھی تو اُنہوں نے ہی اپنی اُس بے چینی کی حد سے نکلکر خود اپنے کسی تعارف کے میرا تعارف چاہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنے گمان کی تائید بھی چاہی تھی۔ میں نے بتا دیا تھا کہ اُن کا شک صحیح ہے اور مجھے ہی شکیل آذر کہتے ہیں۔ جواب میں اُنھوں نے مجھے بتایا تھا کہ اُنہوں نے میری بہت سی کہانیاں پڑھی ہیں اور جرائد میں میری تصویریں بھی دیکھی ہیں۔ میری تحریریں میری تصویریں مجھے پہچاننے میں کام آئیں۔ اُنھوں نے پہلی ہی نظر میں مجھ پر شکیل آذر ہونے کا شک کر لیا تھا۔ اُن کے کہنے کے مطابق اُنھیں میری اس اچانک ملاقات سے بہت خوشی ہوئی تھی اور اس کا احساس مجھے اُن کے چہرے پر اُبھرنے والے بے پناہ خوشی کے تاثرات سے ہو رہا تھا۔

وہ ایک عام چہرے کی عام سی لڑکی تھیں۔ اُن کے چہرے پر سب سے نمایاں اُن کی آنکھیں تھیں یا اُن کے ہونٹوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی مسکراہٹ تھی۔ اُن کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں بلا کا درد اور بلا کا جادو تھا شاید ایسی ہی آنکھوں میں چھپکر کھو جانے کی تمنا کوئی کر رہی ہوگی کیونکہ عینک کے سفید شیشوں کے پیچھے اُن کی کھلی ہوئی آنکھیں مجھے دن کے وقت بھی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے سنگ مرمر کی کسی دیوار پر کسی نے دو چراغ روشن کر کے رکھ دیئے ہیں۔ اُن کی چند باتوں سے میں نے جلد ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اُنھیں مرد اور عورت کی فطرت کا موازنہ کر کے عورت کے کردار کو بلند ثابت کرنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ اُس وقت بھی اُنہوں نے اپنے اس شوق کو پُورا کرنے کے لئے میری چند کہانیوں کے کردار مجھے یاد دلائے تھے اور اُنھیں عورت مرد کے فطری جذبوں کے معیار پر تول تول کر قطعی غیر فطری قرار دے دیا تھا۔ مجھے اُن کی اس تنقید پر کوئی دُکھ نہیں ہوا تھا، اس لئے کہ ہر ایک کے سوچنے کا انداز الگ ہوتا ہے۔ بات کو پرکھنے کے راستے جُدا ہوتے ہیں ڈاکٹر کو بحث سے بہت دلچسپی تھی۔ اُنھوں نے مختلف موضوعات پر بہت طویل مباحثے کئے۔ کسی دلیل پر آکر وہ ہار گئیں۔ کسی جگہ پر میں اُن سے شکست کھا گیا اور اس ہار جیت کو ڈاکٹر نے اور میں نے بخوشی قبول کیا لیکن چند بار جب ایسا ہوا کہ میں اپنی کوئی دلیل کمزور پا کر کچھ سوچنے لگتا تو میرے اُس انداز پر ڈاکٹر ہنسنے لگتیں اور اُس وقت نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ مجھ پر نہیں دنیا کے سارے مردوں پر ہنس رہی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اُن کے اُن قہقہوں کے پیچھے مجھے وہ جذبہ قطعی محسوس نہ ہوا جو حقیقی خوشی کے پیچھے پنہاں ہوتا ہے۔ اور یہ بات ہر اُس لمحے میرے لئے سوالیہ نشان بن گئی جب میں نے ڈاکٹر کو گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ڈاکٹر کی زندگی بظاہر بہت خوش حال اور مطمئن نظر آ رہی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ شادی شدہ تھیں اور اپنی شادی کے بارے میں اُنھوں نے مختصر طور پر بہت مسکراتے مسکراتے انداز میں مجھے بہت کچھ بتایا بھی تھا اس لئے اُن کے دل میں کسی رومانی خلش کی تڑپ ہونا کوئی معنی نہ رکھتا تھا اور اس بارے میں میرا کوئی سوال اُن کی بے عزتی کے مترادف تھا۔ میں نے جان بوجھ کر انجان بن جانا ہی مناسب سمجھا۔

اُس دن وہ صرف حیدرآباد تک کے لئے میری ہمسفر تھیں۔ جس کا اُنھیں بیحد دُکھ تھا اور اس لئے اُنھوں نے بہت شدت سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں آٹھ دس دن بعد اُن سے کراچی میں اُن کے بنگلے پر آ کر ملوں کیونکہ تب تک وہ وہاں ضرور پہنچ جائیں گی۔ اُس سفر میں اُن کی اُس اچانک ملاقات سے مجھے بھی بے پایاں مسرت کا احساس

جواقعی اس لئے کہ وہ مادی دنیا میں رہنے بسنے والی ہوکر بھی ادب اور آرٹ کی بے حد دلدادہ تھیں۔ اپنی اس خوشی اور حیرت کا اظہار میں نے اُس وقت بھی کر دیا تھا۔ اُنھوں نے چند گھنٹوں کے سفر کے دوران میں میرے دل پر اپنے خلوص، اپنی شخصیت کے جو نقش چھوڑے انھیں میں کبھی نہ مٹا سکوں گا۔۔۔ ـــــ جب حیدرآباد کا اسٹیشن قریب آرہا تھا۔ وہ اپنا سامان درست کرنے لگی تھیں۔ اُن سے بچھڑنے کا وقت آگیا تھا۔۔۔ ـــــ پھر بھی مجھے خوشی تھی کہ میری اور اُن کی دوستی کا آغاز ہوگیا تھا۔

لیکن اُس وقت اُن کے ڈرائینگ روم میں کھو کر میرے ذہن میں آئے ہوئے کئی خواب، جاگ گئے تھے کئی خواب سو گئے تھے۔ کیونکہ میں نے اپنی مختصر سی زندگی میں اتنا خوبصورت ڈرائنگ روم اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی سادگی ہی میں اُس کی خوبصورتی پنہاں تھی۔ دو تین صوفہ سیٹ تھے چند نے مدنازک سی کرسیاں تھیں۔ میرے سامنے دیوار پر ڈاکٹر کی ایک نہایت جاذب نظر اور خوبصورت تصویر آویزاں تھی جو شاید ماضی قریب کا کسی رومانی آرٹسٹ کا شاہکار رہی ہوگی۔ میں کتنی ہی دیر تک اُس تصویر میں کھویا رہا اور بے شمار بے معنی باتیں سوچتا رہا۔ اُس کے علاوہ دیواروں پر بہت سی خوبصورت پینٹنگس تھیں جنھیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا یہ کوئی ڈرائینگ روم نہیں جدید آرٹ کی گیلری ہے۔ جتنی بھی تصویریں تھیں سب کا مرکزی خیال ایک سا ہی تھا، یا پھر مجھے ہی ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ یا شاید ڈاکٹر کی اپنی پسند ہوگی۔ اچانک میری نگاہ ایک تصویر پر ٹھہر گئی۔ اُس تصویر میں کھیگی رات کا منظر تھا جس میں چاند بہت نیلاں تھا۔ نیچے زمین تھی یا کائنات تھی۔ چاند کے بیچ میں چند سیاہ دھبے تھے پھر بھی پورے ماحول پہ چاندنی کی بارش تھی۔ اُس تصویر کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے ایک مشرقی مفکر کی وہ بات یاد آگئی کہ چاند کی روشنی دوسروں کے لئے ہے اور داغ اپنے لئے میرے خیال میں وہ آرٹسٹ اس تصویر کو بناتے وقت اپنی زندگی کے کسی ایسے دوراہے پر رُک گیا ہوگا جہاں اُس کی زندگی نے بے شمار ناکامیاں پائی ہوں گی اور اُس نے اُسی خیال کو سامنے رکھ کر اِس تصویر کو جنم دیا ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے میرا ذہن پھر ایک بار اُن کی تصویر میں اُلجھ گیا اور مجھے اُن کی کچھ باتیں یاد آنے لگیں۔ پھر اُن کی شخصیت بھی کچھ اِس تصویر کا عکس معلوم ہونے لگی۔ میرا وہ گمان جو ڈاکٹر سے پہلی ملاقات کے دوران ذہن میں اچانک اُبھرا تھا یقین کی حدود کو چھوتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ ڈاکٹر اور میری بحث کا موضوع اُس سفر میں اتفاق سے یہ بھی رہا تھا کہ مرد سے اُس کی بیوی زیادہ محبت کرتی ہے یا اُس کی محبوبہ؟ میں نے اِس مسئلہ کو اُن کے سامنے صاف طور پر واضح کر دیا تھا کہ کسی مرد کی بیوی ہی مرد سے زیادہ محبت کرتی ہے نہ کہ اُس کی محبوبہ! ظاہری طور پر محبت کرنیوالوں کو محبوبہ ہی کی محبت زیادہ معلوم ہوتی ہے جبکہ اُس کی وہ محبت صرف وقتی ہوتی ہے کیوں کہ اُس کے اُس ملن میں بچھڑنے کے بے پناہ امکانات ہوتے ہیں اِس لئے وہ ایک ہی بار میں اپنی تمام محبت اُس مرد پہ نچھاور کرنا چاہتی ہے جو اُس کا محبوب ہوتا ہے۔ بیوی کی محبت ابدی ہوتی ہے لیکن وہ اپنی محبت اور پیار کے اُس خزانے کو ایک دم ظاہر نہیں کرتی بلکہ اُسے اپنے شوہر پر آہستہ آہستہ نچھاور کرتی رہتی ہے کیونکہ اُسے زندگی بھر پیار دینا ہوتا ہے اور اُس پیار کو ہمیشہ ایک سا ہی چلنا ہوتا ہے۔ اُس دن وہ حیدرآباد اسٹیشن پر اتر گئی تھیں اور اِس بحث نے کوئی آخری شکل اختیار نہیں کی تھی۔ نہ تو وہ میری کسی بات پر مطمئن ہو سکی تھیں اور نہ اُنکی کسی دلیل سے میں ہی متفق ہو سکا تھا کیونکہ اُن کے اپنے نظریہ کے مطابق محبوبہ ہی مرد سے زیادہ پیار کرتی ہے۔ میں اُن کے اور اُن کے اِس نظریہ کے بارے میں شدت سے سوچنے لگا۔ میں نے سوچا اُن کا یہ نظریہ اُن کی زندگی کے کسی عظیم حادثے کی دین ہو سکتا ہے۔ جس کی ناکامی نے اُنھیں اِس قدر یاس پسند بنا دیا ہے کہ اُن کے ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی ساری تصویروں کا مقصد صرف ایک ہے اور وہ ہے "ناکامی"۔ میں نے سوچا ڈاکٹر سے آج اِس کی وضاحت کر لینی چاہیئے۔

میں ابھی ڈاکٹر کے بارے میں اور بھی بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا لیکن یکلخت میرے خیالات بکھر گئے۔ میں نے محسوس کیا میری دائیں طرف دروازے پر کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی میں چونک گیا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سرعت کے ساتھ وہ دھانی ساڑی میں ملبوس اندر داخل ہوئیں۔ اُن کے ہونٹوں پہ اب بھی وہی ملکوتی مسکراہٹ رقصاں تھی جو اُس پورے سفر میں اُن کے ہونٹوں کا ساتھ نہ چھوڑ سکی تھی۔ اُنہوں نے آتے ہی تاخیر کے لئے معذرت چاہی، رسمی سی مزاج پرسی کی، میرے سفر اور میری مصروفیات کے حالات معلوم کئے اور کراچی شہر کی پسندیدگی کے بارے میں پوچھا۔ میں نے ہر بات کا ڈاکٹر کو تسلی بخش جواب دیکر اُنھیں مطمئن کر دیا۔

اِن سب باتوں کے بعد اُنہوں نے مجھ سے پوچھا "آپ اِس وقت کیا پینا پسند کریں گے؟"

"میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے میں کوئی دوا پینے نہیں آیا۔ ویسے پینے کی چیزوں میں مجھے صرف سگریٹ پسند ہے اور وہ میرے پاس موجود ہے۔"

"اِس کے علاوہ اور بھی تو کچھ پیتے ہوں گے۔" اُنھوں نے میری باتوں پہ مسکراتے ہوئے میزبانی کے فرائض ادا کرنے چاہے۔

"اِس کے علاوہ صرف آنسو پیتا ہوں!" میں نے گفتگو کے آغاز ہی میں ڈاکٹر کو ایک نیا موضوع دیا۔

میں نے اپنا جملہ کہنے سے پہلے جو کچھ سوچا تھا وہی ہوا۔ آنسوؤں کی بات سُنکر وہ یکلخت اُداس ہوگئیں اُن کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بھی سمٹ گئی اور نہ جانے کیا سوچتے ہوئے کہنے لگیں۔ "کچھ لوگ آنسو جیسی قیمتی شے بہا بھی دیتے ہیں۔"

"کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے جو بیکراں غموں کے باوجود آنسوؤں کا ایک قطرہ تک نہیں بہنے دیتے۔" میں نے کہا۔

"لیکن کچھ لوگ ایسے بھی اِس دنیا میں ہوتے ہیں جنکے آنسو بھی نکلتے ہیں اور وہ مسکراتے بھی رہتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر گہرائی سے سوچا جائے تو آنسو ہی زندگی کا دوسرا نام ہے"
ڈاکٹر کے منہ سے پہلی بار ایسے یاس بھرے الفاظ سُن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے واقعی اُن کی ساری زندگی آنسوؤں سے عبارت ہو کر رہ گئی ہے۔ اِس لئے میں اپنے دل میں دبے ہوئے خدشات اور سوالوں کو مزید نہ چھپا سکا۔ میں نے اُن سے کہہ ہی دیا: "زندگی جس کے لئے آنسو بنی ہوگی اُس کے لئے بنی ہوگی لیکن خدا کے فضل سے آپ کے رہن سہن آپ کی صحت اور آپ کے ہونٹوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ سے تو مجھے ہرگز ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ کبھی کوئی دُکھ آپ کے قریب بھی آنے کی جسارت کرتا ہوگا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے آپ کی زندگی میں کسی کمی کا احساس ہوتا ہے۔"

"ایک طرح سے آپ نے میری زندگی اور میرے بارے میں بالکل ٹھیک ہی اندازہ کیا۔ ہو سکتا ہے میری زندگی میں کوئی غم نہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرا دل غموں کی آماجگاہ ہو لیکن انسان کو اِس دنیا میں کتنی ہی خوشیاں کتنا ہی سکون کیوں نہ میسر آ جائے پھر بھی نہ جانے کیوں موت کی حد ورتک وہ بہت سی کمیوں کا احساس لئے پھرتا ہے یہ انسان کی فطرت ہے اور یہ کسی طرح نہیں بدل سکتی۔" اُنھوں نے اپنی آنکھوں پر لگی عینک کو اُتار لیا اور ساڑی کے پلو سے اُس کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولیں: "آپ نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ بہت سے مشاہدے کئے ہیں اور بہت سے واقعات کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہوگا لیکن آپ کی اِس بارے میں کیا رائے ہے کہ محبت کا جذبہ مرد کے دل میں پہلے پیدا ہوتا ہے یا عورت کا دل اس لطیف جذبے سے پہلے متاثر ہوتا ہے؟" یہ کہکر اُنھوں نے اپنی زندگی کو میرے سامنے ایک معمہ سا بنا دیا اور میرے منہ سے اچانک نکلنے والی آنسوؤں کی بات پر ایک نئی بحث کا بیج ڈالدیا۔ وہ شاید کچھ ایسا ہی چاہتی تھیں۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور کہا: "جہاں تک محبت کے جذبے کے پیدا ہونے کا سوال ہے وہ عورت ہی کے دل میں پہلے پیدا ہوتا ہے اور مرد کے دل میں بعد میں۔ اگرچہ مرد اظہار پہلے کرتا ہے اور عورت ضبط کی بے پناہ طاقت رکھتی ہے اور محبت ہونے کے بعد بھی اُس کا اظہار اپنی زبان سے نہیں کر سکتی یا پھر یوں سمجھیے محبت ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہے اور مرد تشنہ لب صحرائی ہے۔ عورت جب کبھی اُس دریا کے قریب پہنچتی ہے تو کچھ دیر تک اُس کے بہاؤ کا اور اُس کے زور کا اندازہ کرتی ہے پھر اپنے پاؤں آہستہ دریا کے پانی میں ڈالکر ساحل پر کھیلتی رہتی ہے اور جب اُسے بخوبی اُس کے زور کا اُس کی گہرائی کا اندازہ ہو جاتا ہے تو اُس میں کود جاتی ہے لیکن مرد۔ ذرا شدت پسند ہوتا ہے اُسے خدا نے بہت ہمت دی ہے۔ بڑی قوت بخشی ہے۔ وہ اُس کی گہرائی دیکھے بغیر اُس کے زور کا اندازہ کئے بغیر اُس میں کود پڑتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر محبت کے افسانے کا انجام عورت سے کہیں زیادہ مرد کے لئے المناک بن جاتا ہے جبکہ مجنوں سے لیکر فرہاد تک اور شاہجہاں سے لیکر رانجھے تک محبت کے ہر باب میں مرد ہی قربانیوں کا بانی رہا ہے شاید میری بات آپ سمجھ گئی ہوں گی ــــــ!"

میرے خاموش ہوتے ہی [illegible] وہ [illegible] بولیں: "آپ نے اِن ناموں میں ایک لڑکی کا نام کیوں نہیں لیا ہے جو محبت کی پاداش میں دیوار میں چنوا دیا گیا تھا۔ آپ مرد ہیں اِس لئے مرد کے کردار کو اپنی کہانیوں میں بھی بہت بلند انداز سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور میں دیکھ رہی ہوں اِس وقت بھی آپ کی یہی کوشش جاری ہے۔"

"یہ بات نہیں ڈاکٹر! جہاں تک میری کہانیوں کی بات ہے وہ میرے اِرد گرد کے واقعات کا حقیقی تاثر ہوتی ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ آج کے دَور میں بھی عورت کی ذات بے وفائی کا ثبوت زیادہ دیتی ہے اور ویسا ہی میں اُنھیں کہانیوں میں پیش کر دیتا ہوں لیکن جہاں تک اِس وقت کی گفتگو کا تعلق ہے اِس کے متعلق میں اتنا آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے جب ہوش سنبھالا تھا تو اپنے آپ کو اپنی ماں کی شفیق آغوش میں پایا تھا اور جبھی سے میں عورت کو ایک قابلِ تعظیم اور قابلِ پرستش مخلوق ہی نہیں بلکہ فرشتوں جیسی ہستی سمجھتا ہوں۔" میں خاموش ہو گیا وہ پہلے ہی خاموش تھیں ــــــ اِس لئے لمحے بھی کچھ ساکت سے ہو گئے۔

مجھے دیر تک خاموش دیکھ کر جب وہ خوابوں کی دنیا سے لوٹیں تو کہنے لگیں: "جہاں تک آپ کے تجربات اور آپ کے مشاہدات کا تعلق ہے وہ کسی حد تک صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور میں اُنھیں غلط بھی ثابت نہیں کرنا چاہتی لیکن جہاں تک آپ کی سُنی ہوئی باتوں اور آپ کے مطالعہ کی بات کا تعلق ہے، اُس سے میں ہرگز متفق نہیں ہوں۔ مسٹر آزر! آپ نہیں جانتے کہ مرد کا میم مکاری سے لیا گیا ہے اِس لفظ کی "رے" ریاکاری کی طرف اشارہ کرتی ہے اور حرف "دال" اُسکی دغابازی کی نشاندہی کرتا ہے۔"

ڈاکٹر نے میرے سارے دلائل کو میرے سارے لیکچر کو بنیادی طور پر غلط ثابت کر دیا۔ بات مرد کی وفاداری کی تھی اور وہ اُسے عورت کی وفاداری پر ختم کرنا چاہتی تھیں لیکن میں اُن کے آخری جملے سے ایکدم سمجھ گیا کہ میں ایک طویل بحث کے بعد بھی اُنھیں مرد کی وفاداری پر مطمئن نہیں کر پایا ہوں۔ اُن کی ان باتوں کو سُنکر مجھے بالکل یقین ہو گیا کہ وہ اپنی شادی سے پہلے کسی رومان میں ناکام ہو چکی ہیں۔ اُس ناکامی کا زخم ابھی اُن کے دل میں گہرا ہے اور اُنھوں نے ابھی تک کسی مصلحت کی بنا پر مجھے بتلانا مناسب نہیں سمجھا ہے۔

لیکن مرد کے بارے میں اُن کے یہ تاثرات سُننے کے بعد میں اپنے اندر کے مرد کو نہ دبا سکا اور میں نے ڈاکٹر کو ہاتھوں ہاتھ لے لیا: "اگر آپ اِس طرح مرد کو انتہائی ذلیل ثابت کرنا چاہتی ہیں تو میرے پاس عورت کے لئے اِس سے بھی زیادہ عنوانات ہیں اور میں عورت کے احترام کے باوجود آپ سے کہیں زیادہ اِس لفظ پر بول سکتا ہوں لیکن ــــــ" میں ذرا کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا کیونکہ میں نے اِس بار اُن کے چند جملوں کی ادائیگی سے اُن کے اندر چھپے ہوئے کرب کو بھی طرح محسوس کر لیا تھا، اِس لئے میں نے بحث کو اختتام کی حدوں تک پہنچنے کے لئے ایک نئی اور الگ بات کہنی مناسب سمجھی۔ میں نے کہا: "سینے وفا نہ تو مرد ہوتا ہے اور نہ عورت۔ وہ ہے ...

ظاہر ہے حالات ہی عورت کو بلند و ظالم بنا دیتے ہیں اور ہر نئی منزل پر حالات ہی مرد کو بے وفا بنا دیتے ہیں۔ دراصل ہم سب ہی اپنے اپنے حالات کے اسیر ہیں اور اُن حالات کی اسیری جسے جو کچھ کہتی ہے وہی اُسے بار بار ظاہر بھی کرتا ہے اور میری رائے میں اِس مسئلہ کو اب یہیں پر ختم کر دیجئے کہ بحث نے اب طنز کی صورت اختیار کر لی ہے:

میری بات سُن کر اُنہوں نے اپنے ہونٹوں پر تبسّم کی ایک ہلکی سی لکیر ڈالی اور خاموشی کی چادر اوڑھ لی۔ ایک بار پھر سکوت بوجھل ہو گیا۔ وہ شاید پھر اپنی سوچوں کے گرداب میں اُلجھ گئیں۔ اس طرح کچھ لمحے گزر گئے ـــــ کچھ وقت اور آگے بڑھ گیا۔ کچھ لمحوں کے لئے ماحول پھر اُداس ہو گیا اور اُس بوجھل اُداسی کو شاید اُنہوں نے بھی جلد محسوس کر لیا۔

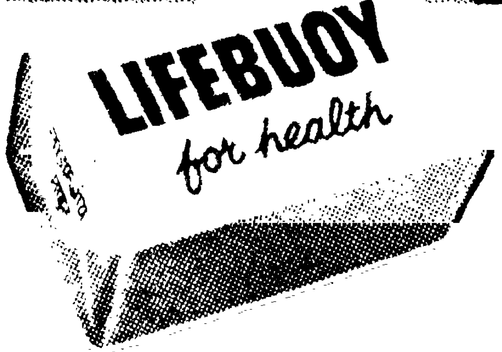
اُنہوں نے اُس بوجھل سکوت کی دیوار کو یوں توڑا۔

"مجھے یاد آیا" اتنا کہہ کر اُنہوں نے کھڑکی کے پار دُور خلاؤں میں دیکھا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "مسٹر آفتاب میں آپ کو ایک سچا واقعہ سُناتی ہوں۔ اِس واقعہ کو میں شروع میں سُنانا چاہتی تھی لیکن نہ سُنا سکی تھی۔ وقت کم تھا، منزل قریب تھی، واقعہ طویل تھا اور میں حد درجہ متاثر تھی۔ شاید اُسے سُن کر آپ کو اندازہ ہو جائے کہ مشرقی مرد کا کردار کتنا پست اور مشرقی عورت کا کردار کتنا بلند ہوتا ہے۔ اِس واقعہ میں آپ کو اپنی بہت سی باتوں کا جواب مل جائیگا اور آپ کی یہ حیرت بھی ختم ہو جائے گی کہ ہم سائنس کی دنیا میں رہنے والے لوگ جنہیں آپ مادّہ پرست سمجھتے ہیں کتنے جذباتی ہوتے ہیں اور اپنے وجود میں کتنا حسّاس دل رکھتے ہیں۔" یہ کہتے کہتے ڈاکٹر کی آواز یک بیک پھر بھرا گئی۔ شاید اُن کے دل کو پھر کسی دلخراش یاد نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا یا وہ پھر اپنی یادوں کی کرنوں کو ذہن کے دریچے میں ڈال کر واقعات کی روشنی مجتمع کرنے لگی تھیں۔

اُنہوں نے واقعہ کا پہلا ورق اِس طرح کھولا ـــــ "چند سال گزرے میں میڈیکل کالج میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی اور وہیں پر اتفاق سے میری ملاقات ایک لڑکی شاہینہ سے ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں کر نہ جانے کیسے وہ آپ ہی آپ اُس کی قربت نے مجھے اُس کا گہرا دوست بنا دیا۔ چند ہی دنوں میں ہم ایک دوسرے کے بے حد قریب آ گئے۔ یہ قربت کچھ اِس حد تک آگے بڑھی کہ ہم ایک ہی رنگ کے کپڑے پسند کرنے لگے۔ ایک ہی رنگ کے جوتے پہننے لگے۔ ایک ہی طرح کے کھانے پسند کرنے لگے اور یہاں تک کہ ایک ہی طرح کے موضوعات میں دلچسپی لینے لگے۔ ہمارا پانچ سال کا ساتھ رہا۔ وہ لڑکی عام لڑکیوں کی طرح جذباتی نہیں تھی جو کسی جذباتیت کا شکار ہو کر آج کی موڈرن لڑکیوں کی طرح کسی منچلے نوجوان کے خواب اپنے ذہن میں سجاتی۔ اُس کا گھرانہ متوسط گھرانہ تھا۔ اُس نے کسی جذبے کے تحت کبھی کوئی ایسا خواب نہیں دیکھا جو مذہب یا سماج کی حدود کو توڑ دیتا۔ یہ سب چیزیں اُن پانچ برسوں میں ہم دونوں میں مشترک سی رہیں اُس نے بھی تعلیم کے پُورے پانچ سال بعد اپنی منزلیں پا لیں۔ ہم دونوں امتحان پاس کر کے کچھ ماہ لاہور کے ریلوے کرزن ہاسپٹل میں ٹریننگ کرتے رہے۔ ٹریننگ کے بعد ہم دونوں نے ملازمت حاصل کی۔ اُس کا تقرّر مجھ سے میلوں دُور شیخوپورہ کے ایک اسپتال میں ہوا۔ سروس کا چارج لینے کے چند ہی ماہ بعد شاہینہ کے والدین نے اپنے ہی خاندان کے ایک معمولی پڑھے لکھے لڑکے رحمٰن خاور کے ساتھ اُس کی شادی کی بات پکّی کر دی۔ اُس نے یہ بات مجھے ایک خط میں لکھی۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ اُس نے مجھے ایک بار یہ بھی لکھا کہ اُس نے اپنے ماں باپ کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھا۔ آج عام لوگوں کا یہ خیال بن گیا ہے کہ آج کل کی لڑکیاں پڑھ لکھ کر کچھ سرکش سی ہو جاتی ہیں اور خاندان کی روایات کے خلاف بغاوت کا عَلم بلند کرنا اپنا فرض سمجھنے لگتی ہیں۔ لیکن میری شاہینہ اُس وقت اپنے پیروں پر کھڑی تھی اور ایک بھی ڈاکٹر تھی اپنے مقابلہ میں کم تر تعلیم یافتہ لڑکے کو اپنے سر کا تاج مان چکی تھی۔ میں نے اُس کے اِس فیصلے پر اور اِس سعادت مندی پر پُر مسرت مبارکباد کا پیغام بھیجا۔ اور پھر ایک دن اُس کی شادی ہو گئی اور میری شاہینہ، شاہینہ شمیم سے شاہینہ رحمٰن ہو گئی۔ میں بھی اُس کی خوشیوں میں برابر کی شریک ہوئی۔

اور جب اُس کی زندگی نئی منزلوں اور نئی راہوں پر گامزن ہوئی تو اُسے ہر روز نئی نئی خوشیوں کا احساس ہونے لگا۔ وہ اپنے شوہر رحمٰن خاور سے دل و جان سے پیار کرنے لگی۔ اُس کا کہنا یہ تھا کہ اگر تم کسی سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اُس کی کوئی خاص وجہ بیان نہ کرو صرف جذبۂ محبت کے لئے محبت کرو۔ یہ نہ کہو کہ مجھے اُس کی مسکراہٹ، اُس کی آنکھیں، اُس کے پاکیزہ انداز گفتگو کے باعث پیارے ہیں یا وہ شخصیت مجھے اِس لئے اچھی لگتی ہے کہ وہ میرے قریب ہے یا میرا اُس کا زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ اُس کے خیالات میرے نظریات سے ہم آہنگ ہیں یا وہ یہ بات مجھے زندگی کے اُداس لمحوں میں ایک خوشگوار کشش بہم پہنچاتی ہے کیونکہ یہ سب چیزیں بذات خود تغیر کا شکار ہو سکتی ہیں یا تمہاری نگاہ میں اُن کی نوعیت بدل سکتی ہے۔ یا پھر تمہارے راستے جُدا ہو سکتے ہیں۔ پھر یقیناً تمہاری محبت بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ اپنے جذبۂ ہمدردی کے تحت کسی کو پیار نہ کرو کیونکہ اگر تم کسی کے رخساروں سے اُس کے بہتے ہوئے آنسو اپنے دامن میں لے لو گے تو ہو سکتا ہے وہ شخص جس کے تم آنسو پونچھتے رہے ہو تمہارے حسن سلوک کے باعث رونا بند کر دے اور اُس کے غم باقی نہ رہیں اور وہ یوں تمہاری محبت تمہارے پیار سے بے نیاز ہو جائے۔ ہاں تم جس سے بھی محبت کرو جذبۂ خلوص کے تحت کرو تاکہ تم ہمیشہ ہمیشہ ایک ابدی جذبے کے جلو میں اُس سے ایک ابدی محبت قائم رکھ سکو۔ اِسی لئے اُس نے سیدھے سادے جذبے کے تحت اپنے شوہر کو پیار کیا اور ہمیشہ یہی سمجھا کہ یہ سماج ایک دائرہ ہے اور مشرقی عورت کا وجود اِس دائرے کے بیچ کا ایک نقطہ۔ عورت کو اِس سماج کی حدود کے اندر ہی رہنا چاہیئے۔ اُس نے اپنی زندگی کی ساری خوشیاں اپنے شوہر کے قدموں میں ڈال دیں۔ اپنے ہونٹوں کی ساری مسکراہٹیں اپنے شوہر کے ہونٹوں پر سجا دیں۔ اُس کا شوہر کسی پرائیویٹ فرم میں معمولی سی ملازمت کرتا تھا اور کبھی کبھی چھٹیاں گزارنے اُس کے پاس آتا رہتا تھا۔ شاہینہ کا تقرّر جس علاقے میں ہوا تھا وہاں کے




LIFEBUOY
for health

معلوم ہیں وہ چند ہی دنوں میں بے حد مقبول ہو گئی۔ شاید اِس مقبولیت کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہو گی کہ اُس کا قول تھا —— "ڈاکٹری میرا پیشہ نہیں شوق ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں ہر مرض پر بہت جلد فتح پا لیتی ہوں۔ مجھے اُس سے جب بھی ملنے کا موقع ملا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ہر مریض سے وہ اور ہر مریض اُس سے اپنے قریبی رشتہ داروں جیسا سلوک کرتا تھا۔ اپنے آس پاس کے ماحول سے وہ بے حد خوش تھی۔ اس طرح اُس کے دن خوشیوں کی آغوش میں بیت کر گاتے چہچہاتے رہے اور زندگی مسرتوں کے نغموں میں گھلتی رہی۔

لیکن ایک دن شاہینہ رحمٰن نے مجھے بتایا کہ پچھلے دنوں اُس کے ہاسپٹل میں بہت ہی عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ایسا واقعہ اُس کی معالجاتی زندگی میں اس سے پہلے کبھی رونما نہیں ہوا تھا اور نہ آئندہ ہی ایسے واقعہ کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ اتفاق سے اس ایک واقعہ نے اُس کی ہنستی گاتی زندگی کا نقشہ یکسر بدل دیا —— چند دنوں پہلے اُس کے ہاسپٹل میں ایک بہت خوبصورت پڑھی لکھی لڑکی کا ایک بے حد دردناک کیس آیا۔ جس نے اقدامِ خودکشی کے تحت زہر جیسی کوئی دوا کھالی تھی وہ انتہائی خطرے کی حالت میں اُس کے پاس لائی گئی تھی پھر بھی اُس نے بڑی جانفشانی اور جدوجہد کے بعد اُسے موت کے بھیانک جبڑوں سے بچا لیا لیکن حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ ہوش میں آنے کے بعد اس لڑکی نے میری سہیلی شاہینہ کے پاؤں پکڑ لئے اور گڑگڑا کر کہنے لگی "میں اس دنیا میں ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ رہنا نہیں چاہتی! مجھے زندگی نہیں ڈاکٹر موت کی بھیک دیدو!" یہ سُن کر شاہینہ نے اُسے بہت تسلی دی اور اپنی ہمدردی کا یقین دلایا۔ اُس نے لڑکی کو بتایا کہ دنیا میں ڈاکٹر کا کام بیمار زندگی کو سانس بخشنا ہوتا ہے اُس کے لئے موت کو آواز دینا نہیں!

جوانی کے جوان سال دنوں میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی کے مُنہ سے موت کی اتنی شدید چاہت اور گہری خواہش سُن کر شاہینہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔ آج تک اُسے کوئی مریض ایسا نہیں ملا جس نے اُس سے موت مانگی ہو۔ جتنے بھی مریض اُس کے پاس آئے وہ چاہے جس حالت میں ہوں اُس سے زندگی ہی مانگنے آئے تھے، اِس لئے شاہینہ کو اُس نادان لڑکی کی زندگی میں بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ اُس لڑکی کے بارے میں اپنی تنہائیوں میں شدت کے ساتھ سوچنے لگی۔ نہ جانے کیوں اُسے اُس کی زندگی میں کئی پُراسرار پہلو نظر آنے لگے۔ اُن پُراسرار پہلوؤں کی وجہ سے وہ بہت ہمدردی اور لگن سے اُس کا علاج کرنے لگی۔ اُسے ہر وقت اِس بات کی تشویش اور جستجو رہنے لگی کہ آخر کیوں اُس نے اپنی زندگی سے فرار پانے کی کوشش کی تھی آخر اُس کی زندگی کا وہ کونسا موڑ تھا جس پر پہنچ کر اُس نے زندگی سے موت کو بہتر جانا کیونکہ یہ دن تو ہر جوان لڑکی کے رنگین خوابوں میں کھو جانے کے ہوتے ہیں، اِن رنگین خوابوں کی تعبیریں تلاش کرنے کے ہوتے ہیں۔ آخر کار کتنی ہی بار ضد کرنے اور کتنی ہی بار پوچھنے کے بعد وہ مجبور ہو گئی۔ ایک دن فوزیہ نے اپنی زندگی سے فرار پانے کی پوری داستان شاہینہ کو سُنا دی —— اُسے ایک نوجوان نے دھوکہ دیا تھا۔ وہ بہاولپور کے کسی کالج کی طالبہ تھی اور کچھ دنوں پہلے وہ اپنے ملک سے مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وہاں گئی تھی۔ وہیں پر کالج فنکشن کے دوران میں اُس کی ملاقات ایک نوجوان سے ہو گئی اور اُس پہلی ملاقات نے آگے چل کر محبت کا رُوپ دھار لیا خیالات سے خیالات ملے۔ دل سے دل مل گیا اور اِس طرح تنہائی کا ہر احساس خود بخود مٹتا چلا گیا۔ قربتیں قریب آئیں احساس جاگا اور احساس کی نیند ٹوٹنے سے پہلے دونوں کے جذبات بھڑک اُٹھے اور پھر ایک رات ایک بھیانک طوفان آگیا جس کی زد سے نہ تو وہی بچ سکی اور نہ وہ نوجوان بچ سکا۔ چند دن گزرنے کے بعد اُس طوفان نے ایسے نقش اُبھارنے شروع کر دیئے جو سماج اور مذہب دونوں کی نظر میں ایک بڑے گناہ کا درجہ رکھتے تھے۔ اُس کا ذکر فوزیہ نے اُس نوجوان سے کیا۔ لیکن وہ نوجوان جس نے اُس سے بڑے بڑے وعدے کئے تھے بچی وفا کے عہد و پیمان باندھے تھے، کبھی جُدا نہ ہونے کی قسمیں کھائی تھیں، اُس ملاقات کے بعد پھر کبھی اُس سے نہ ملا۔ وہ پریشان ہو کر اُس کے دفتر پہنچی لیکن اُسے معلوم ہوا کہ وہ سروس چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ اِن حالات میں خود کو گھری دیکھ کر وہ ایک دم گھبرا گئی۔ اُسے سوچنے کی ساری قوتیں سلب ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں اور پھر ایک دن یہ بھی ہوا کہ وہ کالج چھوڑ کر گھر آگئی لیکن یہاں بھی اُس کا ضمیر اُسے جھنجوڑتا رہا۔ مستقبل کے بھیانک اندھیرے اُسے ڈراتے رہے۔ وہ تنہائیوں میں روتی رہی اور پھر ایک رات بہت زیادہ پریشان ہو کر اُس نے یہ قدم اٹھا لیا اور سوچ لیا کہ اُس کی موت اُس کے خاندان پر پڑنے والے بدنما داغ کے لئے ایک پردہ بن سکتی ہے —— یہاں تک سُنانے کے بعد ڈاکٹر عطیہ احسان ٹیبل پر رکھی ہوئی ایک کتاب کھول کر دیکھنے لگیں۔ میں سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ دھوئیں کے مرغولے فضا میں چھوڑتا رہا اور زیرِ لب مُسکراتا بھی رہا۔ یکایک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں سوچنے لگا ڈاکٹر نے اِس طرح مرد کی بے وفائی پر ایک اچھی لیکن عام سی کہانی سُنا کر اپنے فیصلے کی تصدیق چاہی ہے اور اِن میں کہانی کار بننے کی خاصی صلاحیت ہے۔ ابھی نہیں تو کچھ دنوں بعد وہ کہانیاں ضرور لکھنے لگیں گی۔

اُنھیں دیر تک خاموش دیکھ کر میں نے پوچھا۔ "جب وہ لڑکی فوزیہ بالکل اچھی ہو گئی تو پھر کیا ہوا؟"

میرے اِس جملے کو سُن کر وہ چونک سی گئیں جیسے کچی نیند سے بیدار ہوئی ہوں۔ کہنے لگیں —— "پھر کیا ہوا؟ میں یہ بھی ضرور بتاؤں گی ورنہ واقعہ ادھورا رہیگا! ہاں، تو پھر یہ ہوا کہ شاہینہ اپنی تمام تر توجہ کے ساتھ اُس واقعہ میں دلچسپی لیتی رہی تھی اور اُس کی غیر معمولی توجہ اور دلچسپی ہی کی بنا پر فوزیہ نے اُسے اپنی ہمراز بھی بنا لیا تھا۔ جب چند دنوں بعد وہ لڑکی اپنے گھر واپس جانے لگی تو شاہینہ نے چند دن کے لئے اپنے گھر اُسے مہمان رکھا اور اُس کی زندگی کے لئے کوئی نئی راہ سوچنے کے لئے اُس لڑکے کے بارے میں اُس نے مزید معلومات چاہنے کا اظہار کیا یہاں تک کہ فوزیہ سے اُس نوجوان کا نام بھی پوچھ لیا۔ اُس نوجوان کا نام فوزیہ نے بالکل وہی بتایا جو شاہینہ کے شوہر کا تھا اور جو اُس وقت بہاولپور میں ملازمت کر رہا تھا۔ نام سُننے کے بعد

شاہینہ نے شوہر کی شکست سے آگاہ تھی اُس نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ اُس کا شوہر کبھی ایسی گری ہوئی حرکت کر سکتا ہے کیونکہ اُسے احساس تھا کہ جتنی محبت وہ رحمان خاور سے کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ وہ اُس سے کرتا ہے۔ لیکن اپنا اپنا سا شک مٹانے اور اُس نوجوان کی شکل دیکھنے کی غرض سے جب شاہینہ نے اُس نوجوان کی تصویریں فوزیہ سے اُس کے گھر سے منگائیں تو ان تصویروں کو دیکھ کر اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اُس پر سکتہ سا طاری ہو گیا کیونکہ وہ ساری تصویریں اُس کے شوہر رحمن ہی کی تھیں جو فوزیہ کے ساتھ مختلف انداز میں کھنچی ہوئی تھیں۔ شاہینہ کے لئے وہ دن، وہ لمحے وہ ساعتیں کربناک بن گئیں۔ اُسے ہر سمت اندھیرے پھیلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اُس نے کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ رحمان جسے اُس نے دل کی گہرائیوں سے پیار کیا ہے کبھی اتنی بلندی سے اتنی پستی کی طرف بھی گر سکتا ہے۔ ان تصویروں کو دیکھتے دیکھتے اُس کے ذہن میں ایک آتش فشاں پھٹ گیا۔ یکلخت اُس کے تصور کے سامنے بہت سے راستے خود بخود آ گئے اور پھر ذہن کی وسعتوں میں کھو گئے۔ اُس نے چاہا کوئی راستہ اپنی زندگی کو پُر سکون بنانے کے لئے اپنا لے لیکن اُس وقت اُسے اپنے قدم خود بخود بہت تھکے ہوئے سے محسوس ہوئے لیکن اپنی گھبراہٹ چھپانے کیلئے بے چینی کا اظہار اُس نے فوزیہ پر نہ ہونے دیا اور نہ جانے کس جذبے کے تحت وہ اُسے یہی نہ بتا سکی کہ جس نوجوان نے اُس کی زندگی کو موت سے بدتر بنا دیا ہے، اُسی کا شوہر ہے۔ جب شاہینہ کے دو تین دن کافی کشمکش میں گذر گئے تو اُس نے اپنی اس زندگی کی ہولناک کہانی کے کاغذ کا انجام کرنا چاہا اور سوچا کہ قدرت سے وہ اس ہاسپٹل میں ہے اور دُور دُور تک اُس کی ذہانت، شرافت اور قابلیت کے چرچے ہیں کہ ہر مرض پر وہ فتح پاتی آئی ہے اور اب فوزیہ بھی اُس کے علاج سے بالکل اچھی ہو چکی ہے اگر اس وقت اس کا کوئی انتقامی جذبہ فوزیہ کو موت کے اندھیروں میں غرق کر دے گا تو ہو سکتا ہے وہ اُس کے دامن پر ایک بدنما داغ بنکر رہ جائے پھر فوزیہ تو بالکل بے قصور ہے، ہو سکتا ہے وہ یہاں سے جانے کے بعد پھر بھی قدم سنبھالے کہ اب اُس کی زندگی موت کا راستہ دیکھنے کے سوا کچھ اور دیکھنا نہیں چاہتی۔ اُسے اب دنیا کا کون مرد اس بدنامی کے بعد اپنا سکتا ہے؟ اتنا کچھ سوچنے کے بعد شاہینہ نے ایک راہ نکالی کیونکہ فوزیہ کے بچنے کی اس کے سوا کوئی اور راہ نہ تھی۔ اُس نے اُسی وقت اپنے شوہر کو ایک ٹیلیگرام اُس کے پتہ پر دیا کہ اُس کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے اور جب اگلے دن اُس کا شوہر شہزاد پور آ گیا تو اُس نے بغیر کچھ کہے سُنے فوزیہ کے ہاتھوں میں اُس کا ہاتھ دیدیا اور خود دونوں کے راستے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہٹ گئی" اتنا کہنے کے بعد ڈاکٹر علیا ساں چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئیں اور کچھ دیر بعد پھر بولیں ـــــ "اب آپ سمجھ لیجئے کہ میری شوہر پرست سہیلی کی ازدواجی زندگی کا یہ المیہ انتقام مرد کے کردار کو کس قدر واضح کرتا ہے اور ایک عورت سے آپ اس سے بڑی اور کیا قربانی چاہتے ہیں، بتائیے؟" ڈاکٹر کا آخری جملہ سُن کر میں نے ایک بھر پور قہقہہ لگایا اور کہا "بلاشبہ اچھے۔ واقعات بھی بہت اچھے ہیں آپ نے بیان کرتے وقت ترتیب کا کیا عمدہ خیال رکھا ہے کہ واقعات میں تو آپ کا جواب نہیں، ماحول کی عکاسی بھی آپ نے خوب کی۔ لیکن ڈاکٹر ان سب باتوں کے باوجود اس پوری کہانی میں چونکا دینے والے اختتام کی کمی ہے۔ پھر بھی ایک کامیاب کہانی بننے پر مبارکباد قبول فرمائیے!"

میری باتوں کو سن کر ڈاکٹر نے دور کھڑکی کے پار خلاؤں میں دیکھا اور دیر تک دیکھتی رہیں پھر آہستہ سے بولیں: "شاید میری باتوں پر آپ کو یقین نہیں آیا اور آپ نے اس المناک حقیقت کو صرف ایک کہانی سمجھ لیا"

"جی ہاں یہ واقعہ ایک فرضی کہانی سے زیادہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟ بھلا کوئی لڑکی جو ڈاکٹر ہو اپنے شوہر کا ہاتھ دوسری لڑکی کے ہاتھ میں اس طرح دے سکتی ہے؟ وہ تو ایسے حالات میں اپنے انتقامی جذبے کے تحت اُسے مار ڈالنے کی کوشش کریگی۔"

اس بار ڈاکٹر نے بہت دیر تک گہرائی سے نہ جانے کیا کیا سوچا اور کہا "شاید آپ اس طرح یقین کر سکیں" اتنا کہکر وہ کچھ دیر کے لئے چپ ہو گئیں اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولیں "میں کہنا تو نہ چاہتی تھی لیکن آپکو یقین دلانے کے لئے کہنا ہی پڑ گیا! وہ لڑکی شاہینہ رحمان میری سہیلی نہیں میں خود تھی! جس نے اب سے ایک سال پہلے اپنے شوہر کا ہاتھ فوزیہ کے ہاتھوں میں دیدیا تھا۔ میں نے اپنی آپ بیتی سُنانے کے لئے ایک فرضی نام شاہینہ رحمٰن کا لبادہ اوڑھ لیا تھا ـــــ!"

یہ سُن کر میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا ـــــ تو ـــــ تو ـــــ احسان آپ کے شوہر ـــــ !!!" میں اپنا جملہ پوری طرح ادا نہ کر سکا۔ میری آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

"جی!" اتنا کہتے ہی اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بے شمار قطرے بہہ کر رخساروں پر آ گئے اور اُس لمحے نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ڈاکٹر کی آنکھیں سنگ مرمر کی دیوار کے طاقوں پر جلتے ہوئے دو چراغ نہیں بلکہ کسی مرقد پر رکھے ہوئے وہ دو دیئے ہیں جو کسی وقت بھی ہوا کے تیز جھونکے سے بُجھ جائینگے جب میں حیرت کے ساگر سے باہر آیا تو میں نے اُن سے پوچھا ـــــ "لیکن اتنی بڑی قربانی کے بعد آپ نے کیا پایا؟"

"میں نے جو کچھ پایا وہ مجھے ملا نہیں اور جو کچھ ملا میں نے اُس کی کبھی توقع تک نہیں کی اور اب تو یہ کھونے پانے کی جستجو ہی ختم ہو چکی ہے"

"آپ کو اتنی جلدی حوصلہ کا دامن نہ چھوڑنا چاہیئے۔ کیا حرج ہے اگر آپ کوئی نئی راہ اپنا لیں" میں نے ڈاکٹر کو مخلصانہ مشورہ دیا۔

جواب میں ڈاکٹر گمبھیر آواز میں بولیں "میں مغربی تہذیب کی دلدادہ اور مغربی تعلیم کی پروردہ ضرور ہوں لیکن آذر صاحب! آپ یہ کیوں نہیں سمجھ سکے کہ میں ایک مشرقی لڑکی بھی ہوں جو ایک ہی مرد کے قدموں پر یا اُس کی یادوں پر اپنی زندگی جیسی عظیم قیمتی امانت ایک ہی بار نچھاور کر دیتی ہے !!"

غزل

آبرا حسنی گنوری

ثھا سیلِ فغاں دل سے بڑھا اشکِ رواں دل سے
دانہ قافلے دو دو ہوتے اِس ایک منزل سے

وہ کشتی ہوں کبھی دامن نہ چھوٹا جس کا مشکل سے
کبھی طوفان سے اُلجھی کبھی ٹکرائی ساحل سے

ب اِس کی ہی فضا میں کاٹ دونگا زندگی اپنی
ظر میں تیکے محفل، اُٹھ رہا ہوں تیری محفل سے

مری آنکھوں میں آنسو پاکر اتنا سوچکر ہنسنے
اگر دریا یہ باہر ہوگیا دامانِ ساحل سے

گلوں پہ اُوس پڑ جائے گی جب موسم نے رخ بدلا
نگاہیں داد دے بے وقت کے کہد عنادل سے

زمانہ کی نظر میں سپر کہاں عظمت محبت کی
محبت میں اگر ارماں نکل جایا کریں دل سے

رے رخ تک مری نظروں سے دوری گو نہیں کچھ بھی
گر یہ فاصلہ وہ ہے جو طے ہوتا ہے مشکل سے

گریباں چاک، نظریں آسماں پر، دل پراگندہ
اُٹھا ہوں جیسے میں، یوں بھی اٹھا ہے کوئی محفل سے؟

پھر اُس کو سہل ہو جاتی ہے ہر دشواریِ ہستی
بآسانی اُلجھنا جس کو آجاتا ہے مشکل سے

چمن کے پھول اب شعلے نہ بھڑکائیں تو اچھا ہو
چمن میں خود لگی ہے آگ فریادِ عنادل سے

سمجھ میں آبرؔ آتے ہی نہیں اِس ربط کے معنی
نظر پہ چوٹ پڑتی ہے نمایاں ہوتی ہے دل سے

غزل

شبلؔ اللت ایم اے

جب نظر اُن کی مہرباں نہ ہوئی
زیست رُسوا کہاں کہاں نہ ہوئی

آرزو کوئی کامراں نہ ہوئی
زندگی ہم پہ مہرباں نہ ہوئی

اُس بہارِ چمن کو کیا کہیئے
جس سے تہذیبِ گلستاں نہ ہوئی

تیرے غم کے سوا کوئی بھی شے
میرے دل کی مزاج داں نہ ہوئی

جلوۂ ذات پا سکی نہ حیات
موج یہ بحرِ بیکراں نہ ہوئی

دھیرے دھیرے چلا فسونِ نظر
دل کی تسخیر ناگہاں نہ ہوئی

عشق کی داستاں، خدا سمجھے
آج تک شرحِ داستاں نہ ہوئی

جانے کیوں آج بادہ خانے میں
طبع ناسازِ شادماں نہ ہوئی

جب سے وابستگی ہوئی تم سے
میری پرسش کہاں کہاں نہ ہوئی

میں ہوں وہ داستانِ شوقِ شبابؔ
لب پر آکر کبھی جو بیاں نہ ہوئی

وہ عورت

علی محسن نقوی

۱۴۔ الفردوس، فردوس کالونی۔ کراچی ۱۸
۱۸ر جون ۱۹۶۵ء
محترمی خوشتر صاحب! تسلیم

ایک افسانہ "وہ عورت" بھیج رہا ہوں "بیسویں صدی" کی عظیم، پاکیزہ اور زندگی سے بھرپور ادبی محفل میں شریک ہو رہا ہوں۔ یوں تو ابتک بہت سے افسانے لکھے، بہت سے شائع ہوئے لیکن مجھے "بیسویں صدی" کی انجمن میں شرفِ باریابی مل گیا تو یقیناً یہ میری ادبی زندگی کی ایک عظیم کامیابی ہوگی۔۔۔

نیازکیش ــــــ علی محسن نقوی

تہذیب کے دیئے کی روشنی گل ہوگئی۔ بیسویں صدی پہلی صدی کے گلے ملنے لگی۔

رقص شروع ہوگیا۔ آرکسٹرا سے اُبھرتی ہوئی مدھم مدھم سی دھن پر جسم لہرانے لگے۔ شاید "حباز" تھا یا "چاچا"، مجھے معلوم نہیں۔ میں رقص کا ماہر نہیں ہوں! مجھ میں انگریزی دھنوں کی وہ نرم نرم سی روانی اور کبھی شعلے جیسی لپک اور تندی، اُن کے پُراسرار پیچ و خم سمجھنے کی صلاحیت نہیں۔۔۔۔

میں نے آج تک کبھی رقص نہیں کیا۔

لیکن رقص۔۔۔ یہ سیمابی حرکت۔۔۔ آبشار جیسی روانی اور چاندنی جیسا نرم اور سحر طراز انداز ــــ میرے دل میں بھی رقص کی اچھوتی خواہش بیدار ہو رہی ہے۔ ایک تیز، شہوانی سرکش جذبہ سر اُبھار رہا ہے۔ میری آنکھوں میں روشنی ہے۔ بے حد تیز اور شفاف روشنی۔ حالانکہ ہال میں اندھیرا ہے۔ لیکن مجھے ہر چیز صاف دکھائی دے رہی ہے۔ جیسے گہری اندھیری رات میں روشن چمکتے ستارے اور اُن کی تابندہ مُسکراہٹ۔ میں اُن جسموں کو دیکھ رہا ہوں جو موسیقی کی لہروں پر متحرک رہے ہیں۔ اُن نگاہوں کو جو ایک دوسری میں جذب ہیں اور اُن میں مُسکراہٹ کے شوخ کنول تیر رہے ہیں۔ اُن ہونٹوں کو جو تشنہ ہیں اور اپنی پیاس بجھالینا چاہتے ہیں۔ بوتلیں فرش پر بکھری ہوئی ہیں۔ جام ٹوٹ گئے ہیں اور شراب بہہ گئی ہے۔

شراب رقص کا جذبہ بیدار کرتی ہے۔ رقص دو جسموں کے درمیان بُعد کی، فاصلے کی تمام حدود کو توڑ دیتا ہے۔ دو جسم ایک مرکز پر ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں اور جب یہ ساعت جاگتی ہے، یہ لمحہ بیدار ہوتا ہے تو تہذیب کے دیئے کی روشنی گل ہو جاتی ہے۔ بیسویں صدی اور پہلی صدی کی تخصیص ختم ہو جاتی ہے۔ صدیاں سمٹ کر لمحہ بن جاتی ہیں۔ لمحہ ایک نقطے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نقطہ نغمے میں اور نغمہ روح میں جذب ہو جاتا ہے۔ یہ کبھی نہیں مرتا۔ اس لئے کہ روح غیر فانی ہے۔ موت کی سیاہی اُس کی وسعتوں کو، اُس کی رفعتوں کو نہیں چھو سکتی!

میری پشت پر ایک نرم گورا گورا سا گداز ہاتھ، دھیمی دھیمی آنچ میں جلتا ہوا، چھوتے ہوئے لرزتا ہوا رینگ گیا۔ میں نے گھوم کر دیکھا جو میرے قریب کھڑی تھی۔

"تم رقص نہیں کر رہی ہو۔۔۔؟"

"اور تم بھی نہیں!" انگشتری میں جڑے ہوئے نگ کی طرح ایک گول، دائرہ نما چمکتی ہوئی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر اُبھر آئی۔

"ہاں۔۔۔ میں۔۔۔ وہ تمہیں ہی ڈھونڈھ رہا تھا!" اچانک میرے منہ سے نکلا۔ تب کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"اُونہہ!" اُس نے اپنی لمبی سُڈول گردن کو ایک ادا سے جھٹکا دیا اور سفید ساڑی میں لپٹا ہوا مرمریں بُت بہت نزاکت بڑی شائستگی سے کانپ گیا اور پھر جیسے یکدم اُسے کچھ یاد آگیا ہو۔ کوئی بے حد تلخ لمحہ! اُس نے ہونٹ سکوڑ لئے۔ نخوت سے کھنچے ہوئے دو سنہری قوسوں پر احساسِ خود پسندی و خود ستائی کا فسوں حد درجہ قاتل تھا!

"کیم کیوں نہیں پوچھ رہا تھا۔۔۔!" میں نے اُسے چھیڑا۔

اُس کے چہرے سے نخوت کی دھوپ غائب ہوگئی۔ سنہری قوسوں میں نزاکت اور نرمی سمٹ آئی اور اُس نے میری طرف دیکھ کر بہت وجد میں بے حد ترنم ریز انداز میں کہا۔

"دیکھو نہیں۔۔۔ آؤ باہر چلیں۔ میں بور ہو رہی ہوں۔ میں تھک گئی ہوں!"

"کیوں ....؟" میرے ہونٹ پھیل گئے۔

"لوگ کیوں تھکتے ہیں ....؟" وہ جھلاگئی۔

"تھکنا تو انسانی فطرت ہے۔" میری مسکراہٹ میں بیباکی جھلکنے لگی اور اُس کے چہرے پر جھلاہٹ اور اُلجھن کی دُھند اور کثیف ہوگئی۔ میں نے کہا۔

"کچھ لوگ محنت کرتے کرتے تھک جاتے ہیں، نڈھال ہو جاتے ہیں اور بھوکے رہتے ہیں۔ بعض دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتے سمیٹتے تھک جاتے ہیں اور اُن کی بھوک نہیں جاتی۔ لڑکیاں رقص کرتے کرتے تھک جاتی۔ لیکن تم ....؟" میں نے اُس کے چہرے پر نگاہیں جمادیں۔ اُس کے ہونٹوں سے ایک شوخ تبسّم پھوٹا، بے حد دلاویز اور دلکش، اور اُس کے پورے وجود پر پھیل گیا۔ جیسے چاند اچانک بادلوں کی اوٹ سے نکل آئے اور ساری کائنات، پوری فضا چاندنی میں نہا جائے۔ نور کے سیال میں ہر چیز کنول جیسی نزاکت اور دلکشی کے ساتھ تیرنے لگے۔ کلیوں کے دہن چٹک اُٹھیں، پھولوں کی پنکھڑیاں جھومنے لگیں۔ ہوا بیدار ہو جائے۔ اُس کے چہرے پر بھی یہی کیفیت تھی۔ یہی سحر آفریں، نغمہ ریز، تبسّم کناں وجد میں ڈوبی ہوئی کیفیت۔ اُس کے عارض، اُس کے ہونٹ، اُس کی آنکھیں چہرے کا ایک ایک نقش تبسّم کی چاندنی میں چمکنے لگا۔

"فلسفہ مت بگھارو۔ آؤ باہر چلیں!" اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "میں فلسفے میں ایم۔ اے ہوں۔ میرا مطالعہ بہت وسیع ہے!"

"یہی تو بات ہے!" میں نے جھوم کر کہا "تم فلسفے میں ایم۔ اے ہو۔ تمہارا مطالعہ بہت وسیع ہے اور تم بڑی بلڈنگ پر گفتگو کر سکتی ہو۔ میں نے فلسفہ نہیں پڑھا لیکن میں اُس کی ایک ایک چول ڈھیلی کر سکتا ہوں!"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ جیسے یکدم کوئی انگریزی دُھن بج اُٹھی ہو۔ اُس کے سفید موتیوں کی طرح چمکیلے دانت جھلک اُٹھے۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا اور اُس کی تُرشیدہ زلفوں کو چھیڑتا ہوا گزر گیا۔

"انڈیڈ یو آر ویری جولی!" اُس کا ہاتھ بہت نرمی، بہت نزاکت سے میرے شانے پر رینگ گیا۔ اُس کے منہ سے مدھم سی آواز نکلی "شہاب! آؤ باہر چلیں۔ مجھے رقص سے وحشت ہو رہی ہے۔ یہ چہرے بہت بھیانک معلوم ہو رہے ہیں ....!" جیسے وہ خواب کی گہرائی سے بولی ہو۔ نیند کی بیکراں وُسعتوں سے۔ بہت نرم تھمی ہوئی آواز۔

باہر کھُلے آسمان کے نیچے، نیلی سطح ستاروں سے جگمگا رہی تھی۔ جیسے کسی بہت بڑی چھت میں بے شمار رنگین قمقمے جڑ دیئے گئے ہوں۔ لان بہت وسیع تھا۔ اور گھاس بہت نرم اور ریشم کی طرح چکنی۔ فضا نکھری نکھری سی تھی۔ مہکی مہکی سی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لان میں استادہ تمام پودوں کی نرم لچکیلی شاخوں میں فانوس کی طرح فروزاں سُرخ سُرخ پھولوں کا عرق فضا میں نچوڑ دیا گیا ہو۔ کتنا صاف، کس قدر دُھلا ہوا ماحول تھا! ہال کی کثیف، گھٹی گھٹی سی، تھکی تھکی سی بوجھل فضا سے کتنا مختلف اور فسوں سے لبریز!

اُس کی چال میں شاعرانہ لچک اور نزاکت آگئی .... مگر اُس کے ریشمی قالین پر اُس کے قدم بہت آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ جیسے وہ فکر کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی ہو فلسفے کی گہرائی میں۔ اور پھر وہ چلتے چلتے رُک گئی۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں رات اُتر آئی تھی۔ رات جو ابھی تک صرف کائنات پر چھائی ہوئی تھی، اب اُس کے وجود میں، جسم کے ریشے ریشے میں رچ گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں دو ننھے ننھے بلب کی طرح جل رہی تھیں۔

"شہاب! میں تھک گئی ہوں .... بہت تھک گئی ہوں، میرے جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا ہے ....!" اُس کے ہونٹ جیسے پیاس کا شدید تاثر لئے ہوئے لرزنے اور یہ لرزش پھیل کر اُس کے پورے جسم پر پھیل گئی۔

"جلتے ہو کیوں ....؟" وہ میرے اور قریب سمٹ آئی۔ اُس کا جوان جسم کانپ گیا۔ اُس نے اپنی نگاہیں میرے چہرے پر جمادیں۔ ننھے ننھے جلتے ہوئے فانوس جن میں بہت نرم نرم سی روشنی تھی۔ ہلکی ہلکی سی۔ جیسی شب خوابی کے کمرے میں ہوتی ہے۔

میں خاموش رہا۔ میری طرف سے کوئی تحریک نہیں ہوئی۔ خاموشی، گہری خاموشی! بیکراں سکوت! میرے جذبات منجمد تھے۔ احساسات کی وسیع سطح پر حرارت کی ایک کرن بھی نہ تھی جانے کیوں ....! شاید اِس لئے کہ ابھی فاصلہ نقطے میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ بُعد کی دیواریں اُسی طرح کھڑی تھیں۔ ہم نے شراب نہیں پی تھی .... شراب جو بیداری سے دُور اور خواب سے قریب لاتی ہے۔ عقل سلیم کے سارے اجزا اُس میں حل ہو جاتے ہیں اور نگاہوں تلے ایک دُھند، ایک عجیب دُھند سی چھا جاتی ہے۔ اسے بے خودی کہہ لیجئے روحانی سکون یا خود فریبی۔ ایک شدید ناقابلِ تلافی دھوکہ! اور پھر ابھی ہم نے رقص بھی تو نہیں کیا تھا۔ مجھے تو رقص آتا ہی نہ تھا۔ کتنی شدید کمی تھی۔ کتنا بھیانک خلاء تھا میرے اندر!

اُس کے چہرے پر تلخی اور فسردگی سمٹ آئی۔ اُلجھن اور اُکتاہٹ کے ایک مضبوط جال نے اُس کے چہرے کے ایک ایک خط کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"تم بالکل اناڑی ہو۔ ایک معصوم بدھو! تم یہاں کیوں آگئے۔ اتنا خوبصورت جسم اور اتنا بے حس!" اُس کی آواز بہت بوجھل تھی اور چہرے پر پیاسی حسرتیں جیسے بیمار کی لرز رہی تھیں۔

چند لمحے بعد وہ پھر بولی "تم نہیں جانتے شہاب کہ عورت کیا ہوتی ہے۔ شراب کیا ہوتی ہے۔ کلب میں دلولے کب جاگتے ہیں۔ بھوک کب لگتی ہے۔ تو کب تھکتی ہے اور .... اور ....!" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔ اُس نے اپنے زخمی لبوں پر زبان پھیری جیسے پانی آخری دریغ حرارت پر پھینک گیا ہو۔ اُس کے اندر دُ

ت نہ ذہنی ہی تشنگی اور بے چینی تھی۔ اُس کی نگاہیں پھر میرے چہرے پر آ جمیں۔ جیسے روشنی کا طاقت ور ہالہ ہو جس نے مجھے اپنے خوبصورت دائرے میں لے لیا ہو۔

"تم پندرہ دن سے کلب آ رہے ہو اور ابھی تک بالکل اناڑی ہو.... تم رقص کا ب اسٹیپ بھی نہ سیکھ سکے۔ شراب کی ایک بوند نہیں چکھی.... اور تم نے کوشش بھی تو نہیں ... یہاں تو غبی سے غبی طالب علم ایک ہی رات میں، ایک ہی نشست میں پورا کورس، نصاب کی ایک ایک لائین حفظ کر دیتے ہیں۔"

اور پل بھر کے لئے مجھے واقعی گمان ہوا کہ میں ایک بے حد کند ذہن، حد درجہ غبی طالب علم ہوں۔ جو ہر چیز بہت دھیان، بہت انہماک سے دیکھ تو رہا ہے، لیکن سمجھ میں ایک لفظ نہیں آ رہا ہے۔

"آخر کیوں....؟"

"آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے....؟"

"میں اب تک دور کیوں ہوں.... آرزوؤں سے، رنگینیوں سے۔ ولولوں اور طوفانوں سے؟"

"جذبات سرد کیوں ہیں؟"

"ذہن پر برف کیوں جمی ہوئی ہے؟"

"احساسات یخ کیوں ہیں؟"

میں تو یہاں ہر شام آتا ہوں۔ شب کی زلفیں میرے شانوں پر بکھری ہیں۔ میرا مردانہ وقار مردانہ وجاہت.... کیا.... کیا....؟

اُس کی آواز پھر اُبھری۔ آواز نہیں ایک چیلنج تھا، جس نے مجھے للکارا تھا۔

"تم عورت کو نہیں سمجھ سکتے.... عورت ایک بہت اُلجھی ہوئی گتھی ہے۔ جس کا ایک سرا، ایک دھاگا بھی تمہارے ہاتھ نہیں آ سکتا۔" یہ کہتے ہوئے جیسے وہ ایک قدم اور آگے بڑھی۔ ایک حد درجہ مہلک اور خطرناک قدم.... نہیں نہیں! ایک ایسا قدم، جس میں پھولوں کا تعطر اور موجوں کی روانی تھی۔ اُس کا پلو ڈھلک کر زمین پر آ گیا اور کانچ کا سا نازک جسم بیدار ہوتے ہوئے چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں چمکنے لگا۔ مرمریں باہیں، حسین دہانہ اور اُس پہ دل آویز و درخشندہ مسکراہٹ، بریدہ گیسو، بے چین انداز.... تھکاوٹ، شدید ناقابل فہم تھکن!

میری نگاہ اُس پر جم گئی۔ میں نے اُس کی گہری نیلگوں آنکھوں میں جھانکا جو اس وقت ستارے کی طرح روشن تھیں۔ میں نے اُس مسکراہٹ کو پڑھا جو یاقوتی ہونٹوں پر فانوس کی نازک لو کی طرح مدھم مدھم سی حرارت لئے ہوئے کپکپا رہی تھی اور پھر جانے کس طرح میرے لب کانپ گئے۔ میں جو محو تھا۔ سویا ہوا تھا، بیدار ہو گیا۔

"ساحرہ تم غلط کہتی ہو.... عورت تو ایک کھلی ہوئی شفاف نیلی سطح ہے۔ جیسا آسمان ہوتا ہے۔ اُس کی ہیئت، اُس کا انداز بدلتا رہتا ہے۔ کبھی یہ ستاروں سے مزین ہو کر چاندنی کے سیل سے دُھل کر بے حد دیدہ زیب اور سحر انگیز ہو جاتا ہے۔ کبھی سورج کی تپتی ہوئی کرنیں اُسے اتنا گرم کر دیتی ہیں کہ اُس کی طرف نگاہ بھی نہیں اُٹھتی۔ اُس میں شفق بھی جلتی ہے اور بجلی بھی چمکتی ہے۔ بالکل یہی انداز یہی کیفیت عورت کی ہے۔ اُس کے بھی بہت سے رُوپ ہیں اور میں عورت کے ہر رُوپ، ہر زاویہ ہر موڑ —— بلندی، پستی، عمق اور اُس کی بیکراں وسعتوں سے واقف ہوں۔ مرد تو عورت کو اُسی دن پہچان لیتا ہے جب وہ پیدا ہوتا ہے۔ ماں کی آغوش، محبوبہ کی باہیں، دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ دونوں میں لذت ہے۔ بیکراں، لامحدود، اور غیر فانی۔ دونوں جگہ ابدی طمانیت اور خلوص ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ عورت بھی مرد کو ازل سے جانتی ہے، اُس سے پیار کرتی ہے اور....

اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

"فلسفی کہیں کے؟" اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ آؤ گلاب کے کنج کے قریب بیٹھیں۔ مجھے تمہاری معصومیت بہت پسند ہے۔"

"اور مجھے....!" میرا چہرہ اُس کے چہرے کے بہت قریب آ گیا۔ جسارت کا یہ انداز میرے لئے بہت انوکھا تھا۔ حد درجہ دلفریب اور لذت آمیز۔

"مجھے یہ گلاب پسند ہے....!" میں نے اُس کے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

"نانی....!" جیسے اُسے گدگدی کر دی گئی ہو۔ اُس کی ہنسی میں بے خودی اور بے خودی میں ایک معصوم شرارت جاگ اُٹھی۔ میرے ہاتھ پر اُس کی گرفت سخت ہو گئی۔

کلب میں میری دھوم مچ گئی۔ میری شخصیت نے شہرت اور وقار کا ایک انوکھا مقام پا لیا۔ جیسے روشنی کا مینار ہوتا ہے اور اُس سے ہر سمت شعاعیں بکھرتی ہیں۔ میری شخصیت بھی کچھ اسی طرح منور ہو گئی۔

مجھے مبارکباد بھی ملی کیوں کہ کلب کی حسین ترین لڑکی، ماڈرن تہذیب کا پیکر اور شباب کا نکھرا ہوا، مہکتا ہوا پھول میرے کوٹ کی زینت بن چکا تھا۔ نصیحت بھی کیونکہ اُسی کلب میں کتنے ایسے ممبر تھے —— جو میری طرح اِس منزل تک پہنچے تھے۔ اور پھر تتلی کی طرح پیچھے چھوڑ دئیے گئے تھے۔

"کلب کے ممبروں سے کھیلنا تو ساحرہ کی ہابی ہے۔ آج تم ہو، کل کوئی اور ہوگا۔ آج وہ تم پر جان چھڑک رہی ہے۔ کل تمہاری جگہ کوئی اور ہوگا۔ اور یہی گیت، یہی نغمہ اُس وقت بھی اُس کے ہونٹوں پر ہوگا۔

"تم سب احمق ہو.... دل جلے کہیں کے!" کبھی کبھی میرے ہونٹ شدتِ تنفر سے کانپ جاتے۔

"ڈارلنگ.... یہ احمق لوگ تمہارے متعلق بہت اُلٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں۔ بکنے دو اُنہیں.... مجھے تمہارا خوبصورت جسم بہت پسند ہے۔"

"کیوں ....؟" میرے ہونٹ پھیل گئے۔

"لوگ کیوں تھکتے ہیں ....؟" وہ جھلا گئی۔

"تھکنا تو انسانی فطرت ہے۔" میری مسکراہٹ میں بیباکی جھلکنے لگی اور اُس کے چہرے پر جھلاہٹ اور اُلجھن کی دُھند اور کثیف ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"کچھ لوگ محنت کرتے کرتے تھک جاتے ہیں، نڈھال ہو جاتے ہیں اور بھوکے مرتے ہیں۔ بعض دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتے سمیٹتے تھک جاتے ہیں اور اُن کی بھوک نہیں جاتی۔ لڑکیاں رقص کرتے کرتے تھک جاتی۔ لیکن تم ....؟" میں نے اُس کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔ اُس کے ہونٹوں سے ایک شوخ تبسم پھوٹا، بے حد رواں اور دلکش، اور اُس کے پورے وجود پر پھیل گیا۔ جیسے چاند اچانک بادلوں کی اوٹ سے نکل آئے اور ساری کائنات، پوری فضا چاندنی میں نہا جائے۔ نور کے سیال میں ہر چیز کنول جیسی نزاکت اور دلکشی کے ساتھ تیرنے لگے۔ کلیوں کے دہن چٹک اُٹھیں، پھولوں کی پنکھڑیاں جھومنے لگیں۔ ہوا بیدار ہو جائے۔ اُس کے چہرے پر بھی یہی کیفیت تھی۔ یہی سحر آفریں، نغمہ ریز، تبسم کناں وجد میں ڈوبی ہوئی کیفیت۔ اُس کے عارض، اُس کے ہونٹ، اُس کی آنکھیں، چہرے کا ایک ایک نقش تبسم کی چاندنی میں چمکنے لگا۔

"فلسفہ مت بگھارو۔ آؤ باہر چلیں!" اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "میں فلسفے میں ایم۔ اے ہوں۔ میرا مطالعہ بہت وسیع ہے!"

"یہی تو بات ہے!" میں نے جھوم کر کہا "تم فلسفے میں ایم۔ اے ہو۔ تمہارا مطالعہ بہت وسیع ہے اور تم باڈی بلڈنگ پر گفتگو کر سکتی ہو۔ میں نے فلسفہ نہیں پڑھا لیکن میں اُس کی ایک ایک چول ڈھیلی کر سکتا ہوں!"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ جیسے یکدم کوئی انگریزی دُھن بج اُٹھی ہو۔ اُس کے سفید موتیوں کی طرح چمکیلے دانت جھلک اُٹھے۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا اور اُس کی بُریدہ زلفوں کو چھیڑتا ہوا گزر گیا۔

"انڈیڈ یو آر ویری جولی!" اُس کا ہاتھ بہت نرمی، بہت نزاکت سے میرے شانے پر رینگ گیا۔ اُس کے مُنہ سے مدھم سی آواز نکلی۔ "شہاب! آؤ باہر چلیں۔ مجھے رقص سے وحشت ہو رہی ہے۔ یہ چہرے بہت بھیانک معلوم ہو رہے ہیں ....!" جیسے وہ خواب کی گہرائی سے بولی ہو۔ نیند کی بیکراں وُسعتوں سے۔ بہت نرم تھمی ہوئی آواز۔

باہر کھلے آسمان کے نیچے، نیلی سطح ستاروں سے جگمگا رہی تھی۔ جیسے کسی بہت بڑی چھت میں بے شمار رنگین قمقمے جڑ دیئے گئے ہوں۔ لان بہت وسیع تھا۔ اور گھاس بہت نرم اور ریشم کی طرح چکنی۔ فضا نکھری نکھری سی تھی۔ مہکی مہکی سی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لان میں استادہ تمام پودوں کی نرم لچکیلی شاخوں میں فانوس کی طرح فروزاں سُرخ سُرخ پھولوں کا عرق فضا میں نچوڑ دیا گیا ہو۔ کتنا صاف، کس قدر دُھلا ہوا ماحول تھا! ہال کی کثیف، گھٹی گھٹی سی، تھکی تھکی سی بوجھل فضا سے کتنا مختلف اور فسوں سے لبریز!

اُس کی چال میں شاعرانہ لچک اور نزاکت آ گئی .... گھاس کے ریشمی قالین پر اُس کے قدم بہت آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ جیسے وہ فکر کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی ہو فلسفے کی گہرائی میں۔ اور پھر وہ چلتے چلتے رُک گئی۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں رات اُتر آئی تھی۔ رات جو ابھی تک صرف کائنات پر چھائی ہوئی تھی، اب اُس کے وجود میں، جسم کے ریشے ریشے میں رچ گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں دو ننھے ننھے بلب کی طرح جل رہی تھیں۔

"شہاب! میں تھک گئی ہوں .... بہت تھک گئی ہوں، میرے جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا ہے ....!" اُس کے ہونٹ جیسے پیاس کا شدید تاثر لئے ہوئے لرزے اور یہ لرزش بھنور بن کر اُس کے پورے جسم پر پھیل گئی۔

"جانتے ہو کیوں ....؟" وہ میرے اور قریب سمٹ آئی۔ اُس کا جوان جسم کانپ گیا۔ اُس نے اپنی نگاہیں میرے چہرے پر جما دیں۔ دھیمے دھیمے جلتے ہوئے فانوس جن میں بہت نرم نرم سی روشنی تھی۔ ہلکی ہلکی سی۔ جیسی شب خوابی کے کمرے میں ہوتی ہے۔

میں خاموش رہا۔ میری طرف سے کوئی تحریک نہیں ہوئی۔ خاموشی، گہری خاموشی، بیکراں سکوت! میرے جذبات منجمد تھے۔ احساسات کی وسیع سطح پر حدت کی ایک کرن بھی نہ تھی جانے کیوں ....! شاید اِس لئے کہ ابھی فاصلہ نقطے میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ بُعد کی دیواریں اُسی طرح کھڑی تھیں۔ ہم نے شراب نہیں پی تھی .... شراب جو بیداری سے دُور اور خواب سے قریب لاتی ہے۔ عقلِ سلیم کے سارے اجزا اُس میں حل ہو جاتے ہیں اور نگاہوں تلے ایک دُھند، ایک عجیب دُھند سی چھا جاتی ہے۔ اسے بے خودی کہیئے روحانی سکون یا خود فریبی۔ ایک شدید ناقابلِ تلافی دھوکہ! اور پھر ابھی ہم نے رقص بھی تو نہیں کیا تھا۔ مجھے تو رقص آتا ہی نہ تھا۔ کتنی شدید کمی تھی۔ کتنا بھیانک خلا تھا میرے اندر!

اُس کے چہرے پر تلخی اور افسردگی سمٹ آئی۔ اُلجھن اور اُکتاہٹ کے ایک مضبوط جال نے اُس کے چہرے کے ایک ایک خط کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"تم بالکل اناڑی ہو۔ ایک معصوم بُدھو! تم یہاں کیوں آ گئے۔ اتنا خوبصورت جسم اور اتنا بے حس!" اُس کی آواز بہت بوجھل تھی اور چہرے پر پیاسی حسرتیں بہت بیچارگی سے لرز رہی تھیں۔

چند لمحے بعد وہ پھر بولی۔ "تم نہیں جانتے شہاب کہ عورت کیا ہوتی ہے۔ شراب کیا ہوتی ہے۔ کلب میں ولولے کب جاگتے ہیں۔ بھوک کب لگتی ہے۔ عورت کب تھکتی ہے اور .... اور ....." وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ اُس نے اپنے زخمی لبوں پر زبان پھیری جیسے پانی آخری درجۂ حرارت پر پہنچ گیا ہو۔ اُس کے اندر دلیسی ہی

شستہ ویسی ہی تندی اور بے چینی تھی۔ اُس کی نگاہیں پھر میرے چہرے پر آ جمیں۔ جیسے روشنی کا طاقت ور ہالہ ہو جس نے مجھے اپنے خوبصورت دائرے میں لے لیا ہو۔

"تم پندرہ دن سے کلب آ رہے ہو اور ابھی تک بالکل اناڑی ہو.... تم رقص کا ایک اسٹیپ بھی نہ سیکھ سکے۔ شراب کی ایک بوند نہیں چکھی .... اور تم نے کوشش بھی تو نہیں کی۔ میاں تو غبی سے غبی طالب علم ایک ہی رات میں، ایک ہی نشست میں پورا کورس، نصاب کی ایک ایک لائین حفظ کر لیتے ہیں۔"

اور پل بھر کے لئے مجھے واقعی گمان ہوا کہ میں ایک بے حد کند ذہن، حد درجہ غبی طالب علم ہوں۔ جو ہر چیز بہت دھیان، بہت انہماک سے دیکھ تو رہا ہے، لیکن سمجھ میں ایک لفظ نہیں آ رہا ہے۔

"آخر کیوں....؟"

"آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے....؟"

"میں اب تک دُور کیوں ہوں.... آرزوؤں سے، زندگی سے۔ ولولے اور طوفان ؟"

"جذبات سرد کیوں ہیں ؟"

"ذہن پہ برف کیوں جمی ہوئی ہے ؟"

"احساسات بیج کیوں ہیں ؟"

میں تو یہاں ہر شام آتا ہوں۔ شب کی زلفیں میرے شانوں پر بکھرتی ہیں میرا مردانہ وقار مردانہ وجاہت....کیا....کیا ....'

اُس کی آواز پھر اُبھری۔ آواز نہیں ایک چیلنج تھا جس نے مجھے للکارا تھا۔

"تم عورت کو نہیں سمجھ سکتے.... عورت ایک بہت اُلجھی ہوئی گتھی ہے۔ جس کا ایک سرا، ایک دھاگا بھی تمہارے ہاتھ نہیں آ سکتا" یہ کہتے ہوئے جیسے وہ ایک قدم اور آگے بڑھی۔ ایک حد درجہ مہلک اور خطرناک قدم .... نہیں نہیں! ایک ایسا قدم، جس میں پھولوں کا تعطر اور موجوں کی روانی تھی۔ اُس کا پلو ڈھلک کر فرش پر آ گیا اور کانچ کا سا نازک جسم بیدار ہوتے ہوئے چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں چمکنے لگا۔ مرمریں بانہیں، حسین دہانہ اور اُس پہ دل آویز درخشندہ مُسکراہٹ، بریدہ گیسو، بے چین انداز ... تھکاوٹ، شدید ناقابلِ فہم تھکن:

میری نگاہ اُس پر جم گئی۔ میں نے اُس کی گہری نیلگوں آنکھوں میں جھانکا جو اس وقت ستارے کی طرح روشن تھیں۔ میں نے اُس مُسکراہٹ کو پڑھا جو یاقوتی ہونٹوں پر فانوس کی نازک لَو کی طرح مدھم مدھم سی حرارت لئے ہوئے کپکپا رہی تھی اور پھر جانے کس طرح میرے لب کانپ گئے میں جو محو تھا۔ سویا ہوا تھا، بیدار ہو گیا۔

"ساحرہ تم غلط کہتی ہو.... عورت تو ایک کھلی ہوئی شفاف نیلی سطح ہے۔ جیسا آسمان ہوتا ہے اُس کی ہیئت، اُس کا انداز بدلتا رہتا ہے۔ کبھی یہ ستاروں سے مزین ہو کر چاندنی کے سیل سے دُھل کر بے حد دیدہ زیب اور سحر انگیز ہو جاتا ہے۔ کبھی سورج کی تپتی ہوئی کرنیں اُسے اتنا گرم کر دیتی ہیں کہ اُس کی طرف نگاہ بھی نہیں اُٹھتی۔ اُس میں شفق بھی کھلتی ہے اور بجلی بھی چمکتی ہے۔ بالکل یہی انداز یہی کیفیت عورت کی ہے۔ اُس کے بھی بہت سے رُوپ ہیں اور میں عورت کے ہر رُوپ، ہر زاویہ ہر موڑ ـــــ بلندی، پستی، عمق اور اُس کی بیکراں وسعتوں سے واقف ہوں۔ مرد تو عورت کو اُسی دن پہچان لیتا ہے جب وہ پیدا ہوتا ہے۔ ماں کی آغوش، محبوبہ کی بانہیں، دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ دونوں میں لذت ہے۔ بیکراں، لامحدود، اور غیر فانی۔ دونوں جگہ ابدی طمانیت اور خلوص ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ عورت بھی مرد کو ازل سے جانتی ہے، اُس سے پیار کرتی ہے اور ....

اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

"فلسفی کہیں کے" اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ آؤ گلاب کے کنج کے قریب بیٹھیں۔ مجھے تمہاری معصومیت بہت پسند ہے۔"

"اور مجھے ....!" میرا چہرہ اُس کے چہرے کے بہت قریب آ گیا۔ عبارت کا یہ انداز میرے لئے بہت انوکھا تھا۔ حد درجہ دلفریب اور لذت آمیز۔

"مجھے یہ گلاب پسند ہے ....!" میں نے اُس کے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

"نانی ....!" جیسے اُسے گدگدی کر دی گئی ہو۔ اُس کی ہنسی میں بے خودی اور بے خودی میں ایک معصوم شرارت جاگ اُٹھی۔ میرے ہاتھ پر اُس کی گرفت سخت ہو گئی۔

کلب میں میری دھوم مچ گئی۔ میری شخصیت نے شہرت اور وقار کا ایک انوکھا مقام پا لیا۔ جیسے روشنی کا مینار ہوتا ہے اور اُس سے ہر سمت شعاعیں بکھرتی ہیں۔ میری شخصیت بھی کچھ اسی طرح منور ہو گئی۔

مجھے مبارک باد بھی ملی۔ کیوں کہ کلب کی حسین ترین لڑکی، ماڈرن تہذیب کا پیکر اور شباب کا بھرپور دہکتا ہوا پھول میرے کوٹ کی زینت بن چکا تھا اور نصیحت بھی کیونکہ اُسی کلب میں کتنے ایسے ممبر تھے ـــ جو میری طرح اس منزل تک پہنچے تھے۔ اور پھر تیمچی کی طرح نیچے لڑھکا دئیے گئے تھے۔

کلب کے ممبروں سے کھیلنا تو ساحرہ کی ہابی ہے۔ آج تم ہو، کل کوئی اور ہوگا۔ آج تم پر جان چھڑک رہی ہے۔ کل تمہاری جگہ کوئی اور ہوگا۔ اور تب یہی گیت، یہی نغمہ اُس وقت بھی اُس کے ہونٹوں پر ہوگا۔

"تم سب احمق ہو .... دل جلے کہیں کے!" کبھی کبھی میرے ہونٹ شدتِ تنفر سے کانپ جاتے۔

"ڈارلنگ.... یہ احمق لوگ تمہارے متعلق بہت اُلٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں مرنے دو اُنہیں.... مجھے تمہارا خوبصورت جسم بہت پسند ہے!"

جھیل کی نیلی سطح پر جیسے دو رنگین کنول بہتے ہیں۔ وقت کے آبشار میں ہم اُسی طرح بہہ رہے۔ زندگی اُس صبح کی طرح معلوم ہونے لگی جو ابھی ابھی طلوع ہوئی ہو۔ شفق سہانی ہوئی۔ چٹکتے غنچے کی مہک سے تعفن کی ہر لہر بوجھل ہونے لگی۔ یہ دور زندگی کی یہ ساعت ایسی ہوتی ہے کہ انسان کو تمام باتیں خودبخود آنے لگتی ہیں اور جب ہی تو میں رقص جانتے ہوئے بھی ناچنے لگا۔ شراب میرے لئے ٹانک بن گئی ....اور ساحرہ ایک ایسی راحت۔ ایسا بھرپور، روحانی ابدی سکون کہ اگر وہ ایک پل کے لئے بھی چھن جائے تو موت آجاتی۔ اور شاید یہی کیفیت ساحرہ کی بھی تھی۔ جب ہی تو وہ صرف کلب ہی میں میری پارٹنر نہیں تھی۔ کلب کے باہر بھی ہم دونوں ملنے لگے۔ پکنک میں تفریح کے خاموش مقامات پر، سینما کے محدود باکس میں . . . اور اُن تمام موقعوں پر جہاں وہ بالکل ایک جیون ساتھی کے انداز میں میرے ساتھ ہوتی۔ اُس کی طرف سے کوئی قید و بند نہ تھی۔ اُس کی باتوں میں اُس کی مُسکراہٹ میں وہی چاشنی اور حلاوت ہوتی جو ایک بے لوث محبت کرنے والی اور خلوص کے بیکراں سمندر میں ڈوبی ہوئی بیوی کی مسکراہٹ میں ہوتی ہے۔

لیکن مجھے یہ انداز، خلوص کی یہ چاشنی پسند نہ آئی۔ وفا کی اِس ادا میں مجھے ہلکی سی اُلجھن محسوس ہوئی اور پھر یہ اُلجھن بڑھتی گئی۔ جیسے دریا کی سطح پر ننھا سا دائرہ پھیل کر وسیع ہو جاتا ہے۔ اُس میں بھنور اور طغیانی پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے اپنے اندر بھی خلش کی آنچ کو تیز ہوتے ہوئے محسوس کیا اور ایک دن جیسے شعلوں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔ میں تڑپ اُٹھا۔

"ساحرہ! ہم شادی کر لیں.... شادی کے بعد ہماری پوزیشن اور زیادہ پُر وقار ہو جائے گی۔ اور راحت کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہمارے لئے اور زیادہ وسیع اور گہرا ہو جائے گا ہم اور زیادہ آزادی سے اِس میں چھلانگیں لگا سکیں گے۔ تب ڈوبنے کا بھی خطرہ نہ ہوگا...." میرے لہجے میں عجیب سی روانی آگئی تھی اور میں گہری بے خودی کے عالم میں بول رہا تھا اور اپنے مُنہ سے نکلتے ہوئے ایک ایک لفظ میں مجھے بہت چاشنی محسوس ہو رہی تھی اور جبھی ساحرہ کے ہونٹ کانپے۔

"کیا بکتے ہو.... ہوش میں ہو....!" جیسے اُس کی پسندیدہ شراب کے بجائے کوئی اور سستی اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا گیا ہو۔ حد درجہ تلخ، انتہائی ناگوار۔

"کیوں....!" میں نے اُسے گہری نظر سے دیکھا ——— "اِس میں حرج کیا ہے .... یہ طویل ملاقاتیں .... یہ قربت، اور.... اور، یہ کلب والے تو ہمیں سچ مچ جیون ساتھی سمجھنے لگے ہیں" مجھ سے آگے بن نہ پڑا کہ میں اُن لمحات کی وضاحت کر سکوں جو صرف مقدس مخلص، اور پاکیزہ جوڑوں کی زندگی میں آتے ہیں ایک خاص معاہدے کے تحت اور پھر ساحرہ کی مجھ سے طویل یگانگت نے سب کو باور کرا دیا تھا کہ اب کی بار وہ سچ مچ چوٹ کھا چکی ہے .... دوسروں سے کھیلنے والی یہ خوبصورت اور مشاق کھلاڑی اِس بار خود کھلونا بن چکی ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ جبھی میں نے سادگی سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

قہقہے کی ایک حسین کھنک کے ساتھ اُس نے میرے شانے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"بیوقوف نہ بنو۔ آؤ مارٹنی کا ایک جام پئیں اور رقص کریں .... رقص خود ایک سمندر ہے۔ اِس کی لہریں ہمیں بہت دُور بہا لے جائیں گی ... ہم بہت گہرائی میں ڈوب جائیں گے!"

"لیکن میں ڈوبنا نہیں چاہتا.... تم بھی نہیں ڈوبو گی۔ ہمیں شادی کر لینی چاہیئے۔ اِس میں ہمارا فائدہ ہے۔"

"شادی .... شادی .... تم ایڈیٹ ہو!" وہ جھلاّ گئی اور اُس کے چہرے کے نقوش بہت سخت ہو گئے۔ اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

"لفٹ کا یہ مطلب نہیں کہ تم اتنا آگے بڑھ جاؤ.... تمہیں اپنی کیسٹ کا پتہ نہیں۔ تم ...."

"میرا باپ بھی تمہارے باپ کی طرح بزنس مین ہے۔!" میں نے اُس کی بات کاٹی۔

"ہوگا!" وہ غرائی۔ "شادی میرا پرائیویٹ معاملہ ہے ....اور میں نے اِس معاملے کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا ہے.... میں شادی نہیں کروں گی۔ شادی.... ہاہا .... ہاہا...." اُس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ اِس طرح کہ اُس کی بوٹی بوٹی پھڑک اُٹھی اُس کا آنچل ڈھلک کر فرش پر آگیا اور اُس پر وحشت سی طاری ہو گئی۔

"شادی.... ہاہا.... ہاہا...." اُس نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ "ڈارلنگ شادی تو وہ عورتیں کرتی ہیں جو اپنی راحتوں کا گلا گھونٹنا چاہتی ہیں.... اپنی آزادی کو سلب کرنا چاہتی ہیں۔ اپنے حُسن کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ میں ایسی حماقت نہیں کروں گی۔"

جیسے مجھے سانپ سونگھ گیا ہو اور میری قوتِ گویائی مفلوج ہو گئی ہو۔ میں چُپ چاپ بُت بنا کھڑا رہا۔ ساکت، بے حس۔

وہ پھر میرے قریب سرک آئی۔ ایک ہلکی سی مُسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر اُبھری۔

"شہاب! میں کب کی شادی کر چکی ہوتی.... اور تباہ ہو گئی ہوتی۔ میں آج یہاں نہ ہوتی .... نہ میرا یہ جسم ہوتا نہ یہ ہونٹ جسے سلیم گلاب کی پنکھڑی کہتا ہے۔ پھر میں تمہیں کیسے پاتی.... تمہارا یہ خوبصورت کسرتی جسم ....!" اُس کا ہاتھ پھر میرے شانے پر رینگ آیا۔ "جانتے ہو میری عمر کیا ہے ....؟"

میں کچھ نہ بولا۔ وہ خود بول پڑی۔ "تیس سال.... لیکن ایمان سے کہو .... کیا میں اتنی عمر کی معلوم ہوتی ہوں!" میرے ہونٹ اُسی طرح گنگ رہے۔

وہ دیر تک جانے کیا کیا بولتی رہی اور شادی نہ کرنے کی وضاحت کرتی رہی۔

اور بہو و ضاحت کے بعد میرے صحتمند جسم کی تعریف کرتی رہی ... اور جب رقص کا تیسرا راؤنڈ شروع ہوا تو میں پھر اُس کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ میرے اندر پہلے سے زیادہ والہانہ پن تھا اور میں نے روز سے زیادہ شراب پی لی تھی اور شراب کے نشے میں مدہوش مسلسل یہ سوچ رہا تھا کیا واقعی ساحرہ عورت ہے!

صرف نسوانی رُوپ دھار لینا ہی تو عورت ہونے کی دلیل نہیں ... ماں کی مامتا ماں بننے کی آرزو ... گرم گرم آبِ حیات سے تشنہ لبوں کی پیاس بجھانے کی تڑپ .. شوہر پرستی کا جذبہ کہاں گیا ... وہ سہاگ رات، جب کلب کی رنگینیاں اُس کے آگے ہیچ ہوتی ہیں ... کیا اُس کے دل میں اُس رات کو پانے کی تڑپ نہیں ہے ... پھر وہ کس طرح عورت ہے ... کیا عورت کی کوئی انوکھی قسم ہے ... ؟ بیسویں صدی کی نئی ایجاد ... ؟ اور میرے ہونٹ لرز اُٹھے ——

"ساحرہ! تم عورت ہو؟" رقص کا راؤنڈ بہت تیز ہو گیا تھا۔

"ہوں!" وہ ہوا کے جھونکے کی طرح گزرتی ہوئی بولی۔

"کس طرح ... کس زاویئے سے؟" میری آواز اونچی ہو گئی۔ اور رقص کا راؤنڈ مدھم پڑ گیا۔

"تمہیں زاویئے کا پتہ نہیں ... میرا دعویٰ ہے میں مکمل اور بھرپور عورت ہوں .. اور اُن سے زیادہ خوش قسمت ہوں جو شادی شدہ ہیں"

بجلی پھر گُل ہو گئی —— جوڑے پھر حرکت میں آ گئے۔ اور میری نگاہوں تلے عجیب تاریکی چھا گئی ——

میں سوچنے لگا —— یہ عجیب عورت ہے!!

غزل

سیّد حباب ترمذی

زُلف پریشاں، چہرہ فق ہے
شاید اُنھیں بھی میرا قلق ہے

اہلِ وفا کا صرف یہ حق ہے
لب پہ تبسم، سینہ شق ہے

مشکل ہے اب جاں بر ہونا
چارہ گروں کا چہرہ فق ہے

دستِ حنائی، پائے نگاریں
چھونے کو بیتاب شفق ہے

دستِ مبارک سے کچھ لکھ دیں
کب سے سادہ دل کا ورق ہے

حسن کا حال نہ جانے کیا ہو
عشق کا سینہ کب سے شق ہے

اس سے نازک دور نہ ہوگا
ناحق بھی اِس دور میں حق ہے

میری حباب اِک آہِ رسا سے
موجِ بلا کا سینہ شق ہے

غزل

عبدالقدوس ناطق

آدابِ جنوں اور ہیں اندازِ جفا اور
صحرا کا جہاں اور ہے گُلشن کی فضا اور

چلتی ہیں چمن میں جو طرب خیز ہوائیں
گُل آ کے کھلاتی ہے یہاں بادِ صبا اور

وعدوں سے فزوں ہونے لگی آتشِ اُلفت
وہ آگ بجھاتے ہیں کہ دیتے ہیں ہوا اور

دعوے ہیں خدائی کے تری شانِ خودی میں
اے واعظِ ناداں ہے خودی اور خدا اور

کیوں دل کے لگانے کو کہا پاؤں پھسلنا
ہے جذبۂ دل اور، تو ہے لغزشِ پا اور

مجنوں پہ نہیں ختم محبت کا فسانہ
کہتے ہیں کہ دنیا میں ہیں اربابِ وفا اور

اُٹھتی ہے گھٹا جھوم کے جب صحنِ چمن پر
ہوتا ہے محبت کا یہاں زخم ہرا اور

خاموش ہوئے ہیں دلِ عاشق پہ برس کر
تیور تو یہ کہتے ہیں کہ برسے گی گھٹا اور

ابھی تو آپ کے اخراجات کا
آغاز ہی ہوا ہے
کیا بچت شروع کر دینے کا یہی موزوں ترین
وقت نہیں ہے؟



یاد رکھیے۔ نیشنل اینڈ گرنڈلیز
پورے خاندان کا بینک ہے

آپ کے اخراجات بچے کے ساتھ ہی ساتھ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔
بچکانہ ہٹ اور شوق کی تسکین۔ اس کی خوراک۔ تعلیم۔ اس کا
لباس۔ اس کی حتا بیں۔
اور پھر یہ کہ آن ایک فٹ بال بھی۔
کیا آپ اس کا دل توڑ سکتے ہیں۔ ذرا سوچیے۔
نیشنل اینڈ گرنڈلیز میں تشریف لا یئے
اور سیونگز بینک اکاؤنٹ کھول دیجیے۔

یہ سلسلہ آپ محض ۵ روپیہ سے شروع کر سکتے ہیں۔
اس کیلئے ہر ماہ تھوڑی سی بچت کیجیے۔ اس طرح صرف آپ کی رقم
ہی محفوظ نہ رہے گی بلکہ اس پر ۳ فی صدی سالانہ سود بھی
ملے گا۔
اور آپ کی رقم ہمیشہ آپ کے لیے موجود رہے گی... جس وقت
بھی ضرورت ہو۔
یاد رکھیے۔ نیشنل اینڈ گرنڈلیز آپ ہی کا بینک ہے۔
کیونکہ ہم پورے خاندان کی خدمت کرتے ہیں۔

نیشنل اینڈ گرنڈلیز بینک لمیٹڈ

برطانیہ میں قائم شدہ • ممبروں کی ذمہ داری محدود ہے
ایسوسی ایٹڈ بینکس: لائیڈز بینک لمیٹڈ • نیشنل پراونشیل بینک لمیٹڈ

دہلی میں شاخیں۔ چاندنی چوک۔ چاندنی چوک (لائیڈز برانچ)۔ بیچاس بلڈنگ گرنڈ ٹرنک روڈ۔ دہلی کینٹ۔ ...
نئی دہلی۔ ... (لائیڈز برانچ)۔ ... کناٹ سرکس۔ ... بلاک کناٹ پلیس۔ ... آریہ سماج روڈ
قرول باغ۔ ... آصف علی روڈ۔ امرتسر۔ ... (لائیڈز برانچ)

مشہور اہلِ قلم کے ــــــــ

محبوب مشغلے

راجہ مہدی علی خاں ــــــــ

۱۴۹۔ پالی روڈ، باندرہ بمبئی ۵۰

۸ اگست ۱۹۶۵ء   محبوب من جوشتر گرامی! بہت بہت پیار

میں ابھی ابھی بستر مرگ پر لیٹا تھا۔ ابھی ابھی اٹھ کر کرسی مرگ پر آ بیٹھا ہوں اور آپ کی خدمت میں چند سطور تحریر کر رہا ہوں۔ آپ نے بمبئی آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن آپ نہیں آئے۔ میں محض آپ کو ایک نظر دیکھ لینے کی امید پر زندہ ہوں۔ ملک الموت کئی بار اپنا وزیٹنگ کارڈ بھیج چکا ہے۔ میں نے یہ کہلا بھیجا کہ "صاحب گھر پر نہیں ہیں"۔ مگر آج اس نے چھپ کر میرے چیخنے چنگھاڑنے کی آواز سن لی، نوکر کے ذریعے پیغام بھیجا "راجہ صاحب گھر پر نہیں تو یہ چیخ پکار کیسی؟" میں نے کہلوایا کہ راجہ صاحب کے گھر میں ان کا ہاتھی چنگھاڑ رہا ہے، وہ بولا جھوٹ ہے اور بلا اجازت میرے ڈرائنگ روم میں آ گھسا اور بولا "راجہ صاحب سیدھی طرح اپنی جان میرے حوالے کر دیجئے ورنہ اچھا نہ ہوگا"۔ میں نے پولیس کو ٹیلی فون کر کے ملک الموت کو مداخلتِ بیجا کے الزام میں اندر کرا دیا۔ لیکن جوشتر صاحب میری روح کانپ رہی ہے۔ اگر اللہ میاں نے اپنے فرشتے کو ضمانت پر رہا کرا لیا تو میرا کیا انجام ہوگا۔ آپ از راہِ کرم جلدی سے آ کر مجھ سے مل جائیے یا پھر اگر اللہ میاں سے آپ کے تعلقات خوشگوار ہیں تو نمبر ۸۶ پر ٹیلی فون کر کے میرا اور اللہ میاں کا سمجھوتا کرا دیجئے۔ اگر مجھے مزید دو سال کے لئے مہلت مل جائے تو میں آپ کے اور بہت سے کام کر جاؤں۔ میں غالباً اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں لاہور جا رہا ہوں۔ اگر "بیسویں صدی" کے پاس نے دفتر کے نام کوئی پیغام بھیجنا ہو تو مطلع فرمائیے۔ میں خود اُس عمارت کا دیدار کر دوں گا، جس میں کبھی میرا دوست شاہزادوں کی سی زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ مجھے افسوس ہے۔ میں گذشتہ ماہ مشغلوں کی فہرست روانہ نہ کر سکا۔

آپ کا ــــ راجہ مہدی علی خاں

ساغر نظامی (دہلی)

اب تک شعر کہنا اور کہے چلے جانا۔ منتظمین مشاعرہ سے اصرار کرنا کہ "اگر میری غزل سنی ہے تو سارنگی، ہارمونیم وغیرہ کا انتظام کر دو"۔ درخواست نامنظور ہونے پر سارنگی ہارمونیم اور ڈھولک کے بغیر اپنی غزلیں گانا۔ "ساز و سامان" کے بغیر اپنی غزلیں گاتے گاتے بے سُرا ہو جانا۔ غزل کے مصرع کو ٹھمری کی طرح بار بار دہرانا۔ پندرہ منٹ میں اپنی غزل کا صرف ایک مصرع سنا سکنا۔ اپنی سر بفلک تانوں کی وجہ سے چلا چلا کر مشاعرہ ہال کی چھت اڑا دینا۔ حاضرینِ مشاعرہ کو تسلی دینا۔ زخمی ہونے والوں کے بال بچوں کی بددعائیں لینا۔

دانت دبا دبا کر پان چبا چبا کر مٹھیاں بھینچ بھینچ کر اپنے شعروں کی تعریف کرنا۔

مجموعۂ کلام لوگوں کو منت سماجت کر کے فروخت کرنا۔

ریڈیو پر اپنا کلام اُگل اُگل کر اسٹوڈیو میں مائیکروفون اور دوسرا قیمتی سامان توڑ دینا۔

اس جرم پر بھاری بھاری جرمانے ادا کر کے نہانے والوں سے اپنا پیچھا چھڑانا۔

مشاعروں سے ہار کر واپس گھر آنا، گھر آ کر اپنی بیگم سے کہنا سہ

شکستِ وفتح نصیبوں سے ہے ولے ساغر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا!

ہونگ پر حاضرینِ مشاعرہ سے چلا چلا کر کہنا ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
ایسی بکواس کو ہم شعر کہا کرتے ہیں

ڈاکٹر امرت لعل عشرت (بنارس)

ہندی اور سنسکرت کی بجائے فارسی کھا کر، فارسی پی کر، فارسی پہن کر اپنی قوم سے غداری کرنا۔ فارسی گدھے پالنا۔ فارسی گدھوں کی سواری کرنا۔ اصفہان اور شیراز کی بلبلوں کو دیکھ کر ہندوستانی کوئلوں کی یادیں دل سے اُڑاتے رہنا۔ یونیورسٹی میں ایرانی خواتین سے جدید محاورات پر مباحثہ کرنا۔ ہار کر سمجھنا کہ میں جیت گیا ہوں۔ رات کو چوری چوری حضرت حافظ کے مزار پر پھولوں کا ہدیہ لیکر پہنچ جانا۔ شیرازی شراب کی بوتلیں مرحوم کی قبر پر انڈیل کر کہنا "حضور آپکی روح کو ثواب پہنچا رہا ہوں"۔

منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ایران چھوڑ کر ہندوستان آنا۔ ہندوستانی یونیورسٹی کے احاطوں میں "فارسی پڑھوالو، فارسی پڑھوالو" کی صدائیں لگانا۔ مایوس ہو کر لوٹ آنا، واپس آکر کبوتر بازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی، مرغ بازی کے شغل اختیار کرلینا۔

اِن مشغولیات سے تنگ آکر مشاعرے کروانے کا دھندا شروع کردینا اور اہلِ مشاعرہ کے جوتے چرا کر بازار میں بیچ آنا۔ اِس طرح بینک بیلنس ہزاروں تک لے جانا۔ کیس چل جانے پر مجسٹریٹ کا جوتا چرا کر بھاگ جانا۔

چوری سے توبہ کرکے بنارس ہندو یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہو جانا۔ خوشی میں آکر ناچنا اور گانا ؎

بنارس آگیا ہوں اور لنگڑے آم کھاتا ہوں
بتوں کو یاد کرکے ناچتا ہوں، غُل مچاتا ہوں

علامہ انور صابری (دہلی)

سگرٹ کے ہر کش کے ساتھ ڈھائی، پونے تین سو شعر اُگلنا۔ کباڑ خانوں سے خریدی ہوئی گھٹیا کتابوں کو عہدِ جہانگیری کے پُرانے قیمتی نسخے ظاہر کرکے اپنے معصوم شاگردوں پر رُعب جمانا۔ دروازہ پر آئے ہوئے کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دینا۔ کچھ نہ موجود ہونے کی صورت میں چند سوندھی سوندھی گالیاں پلیٹ میں رکھ کر پیش کردینا اور کہنا کہ "تناول فرمائیے"۔

آئے دن منتظمینِ مشاعرہ کے سر چڑھنا کہ مجھے کیوں نہیں بلایا۔ خوش شکل، خوش جمال، خوش ادا نوخیز لڑکوں کو دیکھ کر یہ شعر پڑھنا ؎

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

ہر روز پچیس شاگرد بنا کر سونا۔ پھر رو رو کر خدا سے مخاطب ہو کر کہنا ؎

تیری دنیا سے میں اِک روز چلا جاؤں گا
لاکھ دو لاکھ میں شاگرد بنا لوں تو چلوں

رفعت سلطان (راولپنڈی)

فارسی اور پنجابی کے مشہور صوفی شاعر حضرت سُلطان العارفین کا پوتا کہلا کر فخر سے سر اُونچا کرنا۔

خط و کتابت کے ذریعہ لوگوں کو یقین دلانا کہ رفعت سلطان عورت کا نام نہیں ہے۔ میں مرد ہوں، غلطی سے والدین نے کسی کے بھڑکانے پر میرا نام لڑکیوں کا سا رکھ دیا۔ کہتے ہیں، بچپن میں میں لڑکیوں کی طرح شریف اور شرمیلا تھا۔

طبلے، سارنگی، ہارمونیم، ڈھولک وغیرہ کو اپنا دوست کہنا۔ اِن "دوستوں" کے نغموں سے عشق کرنا۔ کسی بدصورت سے بدصورت مغنیہ کی انتہائی بھونڈی آواز سُن کر چلّا اُٹھنا ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو ——— (حرام زادی کی)

دوستوں سے صرف ہوٹلوں میں مِل کر خوش ہونا۔ (شاید مکان اچھا نہ ہوگا) اپنے گھر کے سامنے کسی دوست کو پہچاننے سے انکار کردینا اور کہنا کہ ہوٹل کریلین میں ملو تو پہچان سکتا ہوں۔

نسیان کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہر روز اپنی بیگم سے اپنا نام اور اپنے بچوں سے اُن کی امّی کا نام دریافت کرنا اور پڑوسیوں سے اُس کی تصدیق کرنا۔

راشننگ آفیسر ہونے کے ناتے لوگوں کو تلقین کرنا کہ "ہوا زیادہ کھاؤ راشن کم"۔

کسی کسی دن اپنے اوپر شاعری کا موڈ طاری کرکے لوگوں سے کہنا ؎

حضرتِ سلطان باہو کا میں پوتا ہوں حضور
دیکھ کر دنیا کی حالت خوب روتا ہوں حضور
رات کو میں جاگتا ہوں، دن میں اللہ کی قسم
بیٹھ کر پیپل کی اِک ٹہنی پہ سوتا ہوں حضور

بشیشر پردیپ (لکھنؤ)

افسانہ نگاری کرنا۔ اپنے افسانے اپنی بیوی کو سُنا کر مرش ہونا۔ گھر سے آلو خریدنے کے لئے نکلنا اور سڑی ہوئی مولیاں لے کر گھر آجانا۔ بیوی کی صلواتیں سُننا۔ ہاتھ جوڑ جوڑ کر بار بار بیوی کی منتیں کرنا کہ "ذرا آہستہ ڈانٹو پڑوسی سُن لیں گے"۔

ادب کی بجائے مٹی چونے سیمنٹ اور گارے کے بارے میں ریسرچ کرنا اور کہنا کہ "سائنس میرا ذریعہ معاش ہے۔ ادب میرا دل ودماغ روشن کرتا ہے"۔

علم نفسیات سے دلچسپی رکھنا۔ انسانوں کی بجائے کتّوں، بلیوں، مرغیوں اور الوؤں کا نفسیاتی تجزیہ کرنا۔

اپنی تصنیفات پر بار بار حکومت سے انعامی رقوم حاصل کرنے کے لئے جانا۔ پان بیڑی سگرٹ سے پرہیز کرنا۔ زبردستی کرنے پر رو رو کر پان بھی کھا لینا، سگرٹ بھی پی لینا۔

لپ سٹک اور پوڈر سے دشمنی کرنا۔ اپنی محبوبہ سے بار بار کہنا کہ "اگر مجھ سے محبت ہے تو لپ سٹک اور پوڈر گندی میں پھینک آؤ" ؎

حسن کو ضرورت کیا لپ سٹک کی، پوڈر کی
آپ کو ضرورت ہے سیدھے سادے شوہر کی

موہن یاور (جمّوں)

کباڑیوں کی دکان سے شراب کی خالی بوتلیں خرید لانا۔ اُن میں نل کا پانی بھر کر انہیں میز پر سجا دینا اور سادہ پانی کا ایک پیگ پی کر اپنے آپ پر جھوٹا نشہ طاری کر لینا۔ پھر ایک ایک پیگ یاروں کو پیش کرنا۔ اُن کے انکار کرنے پر بوتلیں ٹھاکر اُن کے سروں پر دے مارنا۔ اُنہیں زخمی کر کے پولیس اسٹیشن چلے جانا۔ رات وہیں گزارنا۔ سپاہیوں کے قدموں پر گر کر زار زار رونا اور یہ کہہ کر معافی مانگنا کہ "یارو مجھے معاف کر دیں نشے میں تھا"۔

صحافت کی کمائی دوستوں اور اُن کے خاندان والوں میں بانٹنا۔ بعد میں اُنہیں گالیاں دینا کہ "سب بدمعاش مجھے لوٹ لوٹ کر کھا رہے ہیں"۔ یہ کہہ کر عزیز دل اور دوستوں کو اس بات پر پکڑ پکڑ کر پیٹنے لگنا۔ لوگوں کے کہنے پر کہ پاگل خانے چلے جاؤ۔ اُن پر پتھر پھینکنا۔ "یا علی" کے نعرے لگانا۔

مجروح سلطانپوری صاحب کو ہر مہینے بڑے اصرار سے جموں آنے کی دعوت دینا، کہ "آؤ تمہیں ہریجنوں کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھلاؤں گا"۔ مجروح صاحب کا جواب لکھنا کہ "پہلے آپ بمبئی تشریف لائیے، میں آپ کو اپنے ہاتھ کا بُھنا ہوا کھلاؤں گا۔ میں فی الحال نہیں آتا"۔ اِس بات پر مجروح صاحب سے جھگڑا کر لینا کہ فلم والے سارے بدمعاش ہوتے ہیں۔

بیک وقت ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، مجروح سلطانپوری، راجندر کرشن اور جاں نثار اختر کو جموں آنے کی دعوت دینا۔ اُن کے وہاں پہنچنے سے پہلے گھر کے دروازے پر پانچ کتے باندھ کر بھاگ جانا۔

ویران سڑکوں پر گھوم گھوم کر مندرجہ ذیل شعر گنگنانا ؎

کل دھوپ میں چمکتا دیکھا رُوئے درخشاں
جب میں قریب آیا تھا ٹین کا وہ ڈبا

ابراھیم گنّوری (گنّور)

اپنے دس لاکھ شاگردوں کو فوج میں بھرتی کرا کے اُنہیں ملک سے باہر بھیج دینے کے منصوبے سوچتے رہنا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں بیک وقت ہر مشاعرے میں جنوں بھوتوں کی طرح نظر آنا۔ مشاعروں کو اس طرح لوٹنا جیسے کوئی نامی گرامی ڈاکو کسی گاؤں کو لوٹتا ہے۔ ہر مشاعرے میں اپنی دلچسپ باتوں سے میر مشاعرہ کی "چھٹی کرا دینا"۔ اپنے کلام کا مجموعہ خود شائع کر کے فروخت کرنا۔ پبلشروں کے بال بچوں کی بددعائیں لینا۔

انگریزی سے نابلد ہونے کی وجہ سے انگریزی ادب سے سخت نفرت کرنا۔ اپنے شاگردوں کو جو انگریزی کے پروفیسر ہیں، سمجھانا کہ انگریزی کی پروفیسری چھوڑ کر گلی گلی جوتوں پر پالش کا کام کرنا شروع کر دو۔ انگریزی میں بات مت کرو۔ انگریزی کتابیں مت پڑھو۔ آزاد نظموں کو گھیر گھار کر گھر لے آنا۔ کمرے میں بند کر کے اُنہیں اس طرح پیٹنا جیسے جاہل مرد اپنی بیویوں کو پیٹتے ہیں۔ آزاد نظم لکھنے والوں کو کافر اور جہنمی کہنا۔ کاشتکاری کرنا۔ گایوں بھینسوں اور بھیڑوں کو لیکچر دینا۔ اُن کے کلام کی اصلاح کرنا۔ "رہنمائے تعلیم" ایڈٹ کرنا۔ آزاد نظم کو کوستے ہوئے کہنا ؎

انگریز نے نظموں کو "آزاد" کیا آکر
جس چیز کو بھی چاہا برباد کیا آکر

حفیظ مالیگانوی (مالیگاؤں)

لالٹین ہاتھ میں لے کر زندگی کے اندھیروں میں دوستی کا نام ونشان تلاش کرنا۔ اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے لوگوں سے پوچھنا "اے لوگو! دوست کہاں ملیں گے؟" لوگوں کا ہنس کر خاموش ہو جانا۔

دوربین لگا کر چاروں طرف لکشمی جی کو تلاش کرنا۔ غصے میں آ کر دوربین پھینک دینا کہ "ناقص ہے کم بخت۔ لکشمی جی تک کا درشن نہیں کراتی"۔

مفلوک الحال لوگوں سے گلے مل مل کر زار زار رونا۔ نماز اپنی مرضی سے پڑھنا روزوں کے بارے میں کہنا "یہ تو قدرت ہر روز زبردستی خود رکھا لیتی ہے۔ ثواب ہم غریب روزے داروں کو نہیں بلکہ بھوکا مارنے والی قدرت کے حصے میں چلا جاتا ہے۔ رمضان کی کیا ضرورت ہے؟"

"یا حفیظ" کا ورد کر کے لوگوں سے کہنا "حفیظ صاحب خود اپنے آپ کو یاد کر رہے ہیں"۔

مجذوب ہوگئے ہیں۔ دوستوں کے بارے میں آہیں بھر بھر کہنا ہے

دوست ایسے بھی ہیں جو در پردہ
آستیں کے مکین ہوتے ہیں
سانپ کہنے کو وہ نہیں ہوتے
سانپ کے جانشین ہوتے ہیں

نزہت چاندپوری (بمبئی)

اپنے بڑے مکان کے بڑے کمرے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے شاعر اور ادیب روز جمع کر کے اُن پر لاٹھی چارج کرنا۔

شاعری کے ساتھ ساتھ بزازی کا دھندا کرنا۔ اپنی حسن پرستی کی وجہ سے ہر روز بیگم سے جو خود بھی شاعرہ ہیں پٹ جانا لیکن اپنی عادتوں سے باز نہ آنا۔ گھر میں جھاڑو دینے کے لئے اگر کوئی ہرجن خاتون آ جائے تو یا "ہرجن" کہکر اُس کے کالے کلوٹے قدموں پر جانا اور کہنا ہے آپ کے پاؤں کے اوپر میری نظر

اِک ذرا آپ کو زحمت ہو گی

ہر روز صبح اُٹھ کر اپنے بچوں کو گننا اور بیگم سے کہنا "ڈارلنگ یہ تو ابھی تک چھ ہی ہیں۔ اب تو اِن کو دس ہو جانا چاہئے تھا۔ آپ بڑی سست ہیں۔" اِس پر بیگم سے دو ہنٹر کھا کر بھاگ جانا۔

اپنی حسنِ خفیہ واردات کا جھوٹا پروپگنڈہ کرنا۔ اپنی بیگم پر ظاہر کرنا کہ ہزاروں عورتیں مجھ پر مرتی ہیں اور خود ہزاروں پر جان دینا۔ حسیناؤں کے جھرمٹ میں کھڑے ہو کر یہ کہہ کر اپنا دل نیلام کرنا ہے

اِک دل ہمارے پاس ہے نیلام کرے گا
پھر اپنے گھر میں بیٹھ کے آرام کرے گا

یکایک بیگم کا آ جانا اور حسینوں کو سینڈلیں مار مار کے بھگا دینا۔ ایک آدھ دو ہنٹر نزہت صاحب کی چاند پر رسید کرنا اور کہنا ہے

اِن سوکنوں کا کام ہم تمام کرے گا
ہم قتلِ خاص نہیں قتلِ عام کرے گا

گلزار دہلوی (دہلی)

"گلزارِ دہلی" میں بلبلوں کے ہوتے ہوئے "زاغ و زغن" کی طرح بولتے رہنا۔ دوست احباب کی تواضع کے بہانے پٹھانوں سے قرضہ لینا۔ قرضہ واپس نہ کرنا اور بعد میں ان سود خوار پٹھانوں سے اپنی "تواضع" کرا کے رونا۔

پچاس ہزار نخرے کر کے مشاعروں میں شرکت کرنا۔ مشاعروں کی جان نکالنا۔ مشاعروں میں جان ڈالنا۔ سوئے ہوئے سامعین کو جگانا۔ جاگتے ہوئے سامعین کو گہری نیند سلا دینا۔ مرے ہوئے شاعروں کے منہ میں آبحیات ٹپکانا۔

پارے کی طرح ہر وقت بے چین رہنا۔ اپنے خداداد حسن پر ناز کرنا۔ عورتوں کی طرح اپنی عمر کم بتانا۔ صبح اُٹھ کر بھگوان کی بجائے "فیشن ڈزو" اور "تاکسٹ ویوی" کی پوجا کرنا۔ ٹھیک بارہ بجے دفتر جانا۔ غروب آفتاب کے بعد دلی کے چنڈو خانوں میں شعر و شاعری کی شمعیں روشن کرنا۔ دوستوں کے منہ پر اُن کی تعریفوں کے پُل باندھنا اور پیٹھ پیچھے گالیاں دینا۔ رات کے دو بجے چنڈو خانے سے بھاگنا اور روتے ہوئے گھر واپس آ جانا۔ اگر گھر والوں سے کہنا ہے

چنڈو خانوں کے چراغوں کو بجھا آیا ہوں
لاکھوں پروانوں کو اندھا میں بنا آیا ہوں

میکش اکبرآبادی

دوستوں سے مل کر گلا پھاڑ قہقہے لگانا۔ گلا پھٹ جانے پر طبی امداد طلب کرنا۔ طبی مدد حاصل نہ ہونے پر کسی موچی کو بلا کر اپنا پھٹا ہوا گلا سلوانا۔ بچوں کے ساتھ مل کر کبڈی کھیلنا بوڑھوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنا۔ عورتوں کے ساتھ کشتی لڑنا۔ تنہائی میں ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر رونا۔ مشاعروں میں شامل ہونے کی دعائیں کرنا۔ منتیں ماننا۔ ہر روز سیر بھر بادام کھانے کے باوجود حافظے کی خرابی کی شکایت کرنا۔ لوگوں کو نہ پہچاننا اور کہنا "جناب میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔" اپنی ٹی بی زدہ محبوبہ سے ہنس ہنس کر کہنا ہے

نہ تجھ پر اُٹھے گا۔ نہ گھونسہ ہی اِن سے
یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں"

بشیر بدر (کھیری)

اُداسی سے خوفزدہ ہو کر ہر وقت اُداس رہنا۔ خود پڑھنا اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھانا۔ اپنے کتوں کو پڑھانا، اپنی بلی کو پڑھانا، اپنے گھر کے چوہوں کو پڑھانا۔ ساتھ ساتھ نوکری بھی کرنا۔ بیگم کی ڈانٹیں کھا کر زار زار رونا اور زیادہ اُداس ہو جانا، سر پیٹنا، ماتھا پھوڑنا۔ ہر اتوار کو خودکشی کرنے کے لئے گھر سے نکلنا، چلتے چلتے چلا چلا کر کہنا "میڈم غزل مجھے بچا لو میں مرنے چلا"۔

ہر ہفتہ سادھو بن جانے کا فیصلہ کرنا۔ گھر سے جنگل میں جا نکلنا۔ وہاں جا کر چلانا "اے کرکٹ کے فن مجھے بچا، نہیں تو میں سادھو بن جاؤں گا"۔ واپس آکر آنسو پونچھ کر کرکٹ کے کھیل میں مصروف ہو جانا۔

ہررو ز بیگم سے کہنا۔ "بیگم میں بہت اُداس ہوں۔ تیرِ نظر کھا کر مرنے کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ ہو سکے تو مجھے بچالو۔"

بیگم صاحبہ کا میاں صاحب کو ڈنڈے مار مار کر کمرے میں بند کر دینا۔ اِس طرح بدر صاحب کا نظریں کے تیروں کی زد سے بچ نکلنا۔

کبھی کبھی خود کو بچہ سمجھ کر جھولے میں آنکھیں بند کر کے لیٹ جانا۔ چوسنی چوسنا۔ جھنجھنا بجانا۔ چاکلیٹ کھانا اور اپنے آپ کو لوریاں دے دے کر سو جانا۔ لوری کا نمونہ ؎

آجا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا
"بشیر بدر" کی آنکھوں میں گھل مل جا

ہرشے پرکاش (جموں)

اپنے نام کے بارے میں ہمیشہ سوچتے رہنا کہ میرا نام کان کمار، ناک ناتھ، گرجے پرکاش کی بجائے ہرشے پرکاش کیوں ہے؟

لوگوں کو اپنے بے حد عقلمند ہونے کا یقین دلانا۔ دوستوں کے پوچھنے پر کہ عقل بڑی یا بھینس؟ جواب دینا کہ "مجھ سے کیا پوچھتے ہو کسی عقلمند سے پوچھو۔"

مکان بنوانا۔ پسند نہ آنے پر اُسے گرا دینا۔ مزدوروں کی بے عزتی کرنا کہ تمہارا بنایا ہوا مکان تاج محل کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔

افسانے لکھنا۔ اُنہیں چاک کر کے اُن کے پرزے ٹوسٹ کی بجائے چائے کی پیالی میں ڈبو ڈبو کر کھانا اور اپنے پاگل دوستوں کے منہ میں زبردستی ٹھونسنا۔ کبھی کبھی موڈ میں آکر ہوٹل کے بیرے کو حکم دینا کہ شراب چائے دانی میں لاؤ۔ لنگوٹیے دوستوں کو اِس چائے دانی کی "چائے" پلانا اِردگرد آ بیٹھنے والے مفت خوروں کو اصل چائے منگوا کر اُن کی تواضع کرنا۔ جیب سے اپنا ایک ایک افسانہ نکال کر اسے گولائی میں لپیٹ کر اُن کے ہاتھ میں دینا اور کہنا "کریم رول" ہے کھائیے۔

موٹی موٹی لڑکیوں سے عشق کر کے دُبلا ہونے کی بجائے اور زیادہ موٹا ہو جانا۔ خودکشی کے لئے اِن لڑکیوں کے سامنے دریا میں چھلانگ لگا دینا۔ ڈوبتے وقت شور مچا مچا کر لوگوں کو اکٹھا کر لینا کہ "مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ۔" آخر بچ جانا۔ موٹی لڑکیوں کا موٹے موٹے قہقہے لگانا۔ پی ڈبلیو ڈی کے دفتر میں اسسٹنٹ انجینئر کی کرسی پر بیٹھ کر اپنے کاروبار کے بارے میں سوچنا۔ دفتر سے بھاگ کر اپنی پرائیویٹ فرم کا حساب چیک کرنے کے لئے ہوا ہو جانا۔ واپس آنا۔ دفتر کی فائلوں میں ضروری کاغذات کی بجائے اپنے افسانے دیکھ کر حیران ہو جانا۔

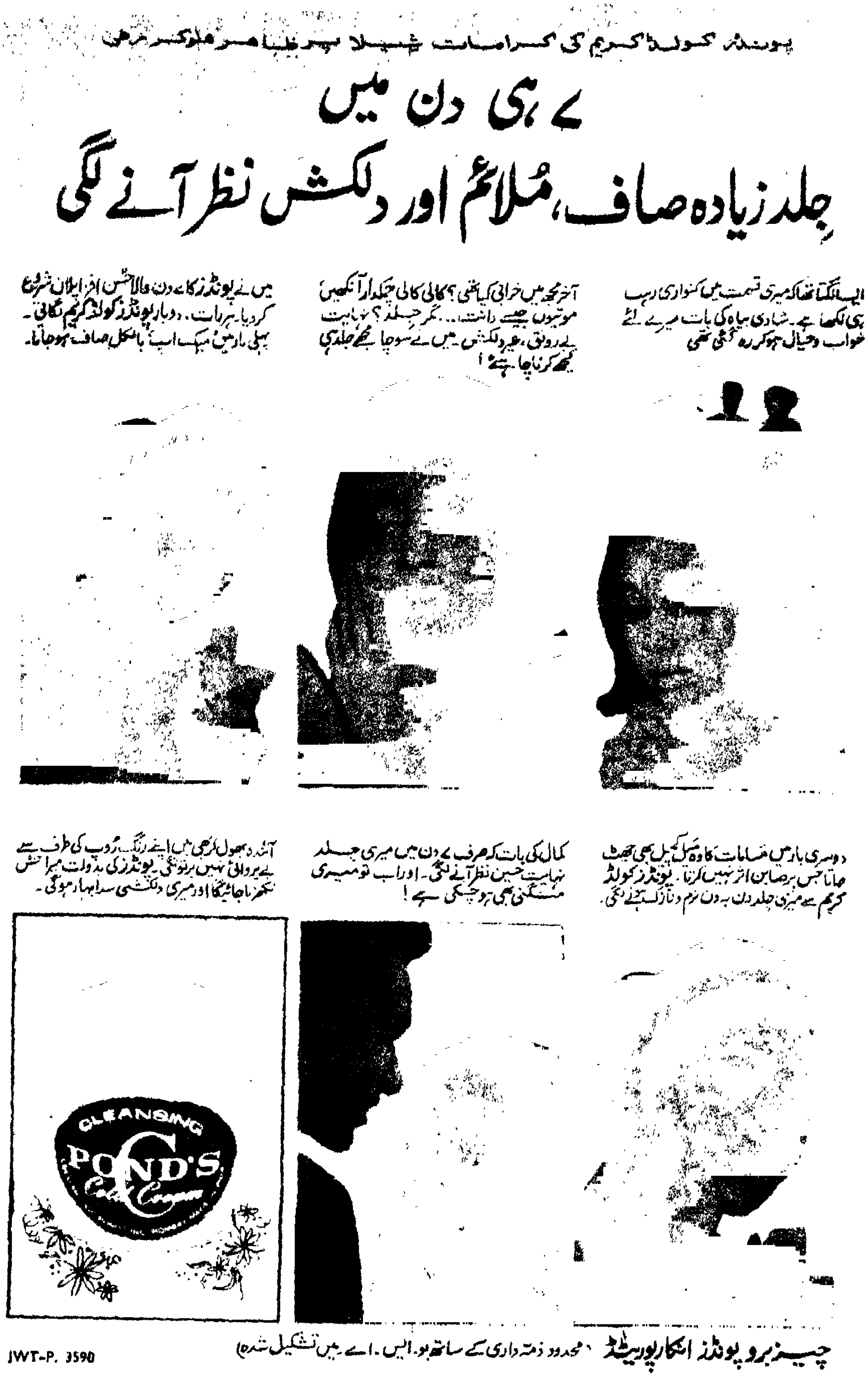
اپنے افسانے خوشتر گرامی صاحب کے نام خط لکھ کر ایک لفافے میں بند کرنا۔ لفافے پر بدحواسی میں "گورو گھنٹال" کے ایڈیٹر کا پتہ لکھ دینا۔ وہاں افسانہ شائع ہو جانے پر خوشتر صاحب کو غصہ میں آکر احتجاجی خطوط لکھنا کہ آپ کے دفتر میں چوریاں ہو رہی ہیں۔

اپنی فربہ اندام محبوبہ کے گلے میں باہیں ڈال کر زار زار رونا اور کہنا ؎

تنے پڑے ہیں سر پہ ڈنڈے تری گلی میں!
ارمان ہوگئے ہیں ٹھنڈے تری گلی میں

ہم جیت لیں گے اک دن یہ تیرے دل کی نگری
گاڑینگے دوستی کے جھنڈے تری گلی میں

از بے وفا، جو تجھ کو ہم پہ نہ رحم آیا!
ہم خودکشی کرینگے دن ڈے تری گلی میں



پونڈز کولڈ کریم کی کرامات شیلا …
۷ ہی دن میں
جلد زیادہ صاف، مُلائم اور دلکش نظر آنے لگی
ایسا لگتا تھا کہ میری قسمت میں کنواری رہنا ہی لکھا ہے۔ شادی بیاہ کی بات میرے لئے خواب و خیال ہو کر رہ گئی تھی
آخر مجھ میں خرابی کیا تھی؟ کالی کالی چمکدار آنکھیں موتیوں جیسے دانت... مگر جلد؟ نہایت بے رونق، غیر دلکش۔ میں نے سوچا مجھے جلدی کچھ کرنا چاہئے!
میں نے پونڈز کا ۷ دن والا حسن افزا پلان شروع کر دیا۔ ہر رات، دو بار پونڈز کولڈ کریم لگائی۔ پہلی بار میں میک اپ بالکل صاف ہو جاتا۔
دوسری بار میں مسامات کا وہ میل کچیل بھی چھٹ جاتا جس پر صابن اثر نہیں کرتا۔ پونڈز کولڈ کریم سے میری جلد دن بہ دن نرم و نازک ہونے لگی۔
کمال کی بات کہ صرف ۷ دن میں میری جلد نہایت حسین نظر آنے لگی۔ اور اب تو میری منگنی بھی ہو چکی ہے!
آئندہ … اپنے رنگ روپ کی طرف سے بے پروائی نہیں برتونگی۔ پونڈز کی بدولت میرا حسن نکھر جائیگا اور میری دلکشی سدا بہار ہوگی۔
CLEANSING
POND'S
Cold Cream
JWT-P. 3590
چیزبرو پونڈز انکارپوریٹڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو. ایس. اے. میں تشکیل شدہ)

پگلی

انوار احمد زئی

مسلم ہائی سکول لطیف آباد، حیدر آباد (پاکستان)

۱۱ جولائی ۶۵ء — بزرگوار محترم خوشتر گرامی صاحب!

ایک تازہ ترین تخلیق "پگلی" ارسال خدمت ہے۔ میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں؟ یہ آپ کی بلند نگاہیں دیکھ سکتی ہیں ——— "دیوالی نمبر" کے بارے میں کچھ لکھنے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں!...

خیر ——— انوار احمد زئی

سامنے کی کوٹھی سے آتی ہوئی شہنائیوں کی آواز تو آج مجھے مارے ڈالتی ہے ——— اُف!! اِس آواز میں کتنا درد، کتنا سوز ہے ——— بالکل میرے من کی طرح۔ میری سونی کوکھ کے دُکھ کی طرح ——— لیکن یہ کوٹھی کے مکین کیا جانیں، وہ تو اِسے عیش و طرب کا غماز جان رہے ہیں ——— اِس شہنائی کی دُھرتان اور ڈھولک کی گمبھیر تھاپ میں میرے دل کی دھڑکن کون سُنے ——— ؟ اِس دُلہن کی طرح سجی ہوئی کوٹھی سے کون ہے جو اِس بند کھولی میں مجھے دیکھنے آئے ——— اور آئے بھی کیسے میں تو پگلی ہوں ——— لوگ ڈرتے ہیں کہ کہیں میں اُنہیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤں، میں اُنہیں کاٹ نہ کھاؤں۔ کہیں میں اُن کے ابرق سے بے داغ کپڑوں کو داغدار نہ بنا دوں۔

آج چار سال کے بعد مجھے اپنی اِس رفیق کھولی سے پہلی بار وحشت ہو رہی ہے، اِس مقفل سلاخوں دار سیلی ہوئی کھولی سے۔ جو آج سے پہلے مجھے بے حد عزیز تھی۔ جو میرے دُکھ، درد کی واحد ساتھی ہے۔ جس میں میں نے اپنی جوانی کی چار بہاریں گزار دی ہیں، جس کی بوسیدہ بے قلعی دیواروں سے میں گھنٹوں سرگوشیاں کرتے کرتے سو گئی ہوں۔ جس کی آہنی سلاخیں میری ہمراز ہیں، میری سہیلیاں ہیں۔

آج تو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ دُلہن بنوں، سُرخ سے جوڑے میں شرما شرما جاؤں، جُھومر سجا کر جُھک جاؤں، ٹیکا لگا کر اِتراؤں ——— لیکن میرے تو جسم سے بُو آ رہی ہے، پسینہ کی بُو! اِس گُھٹے گُھٹے سے ماحول کی بُو! میرے جسم کے کپڑے بھی تو جگہ جگہ سے پھٹ گئے ہیں۔ پھٹ نہیں گئے، میں نے خود پھاڑ لئے ہیں۔ میں پچھلے چار سال سے خود اپنے سر میں مٹی ڈالتی رہی ہوں۔ وقت بے وقت ہنستی رہی ہوں کبھی خود اپنے پر کبھی زمانے کی بے حسی پر

اور اس طرح ایک دنیا مجھے پاگل سمجھتی رہی ہے۔ میں چاہتی جو یہی تھی کہ دنیا مجھے پاگل سمجھے، مجھے پگلی کہے ——— مگر!! کنول! تم بھی اپنی نشو کو پگلی سمجھ بیٹھے۔ تمہارے ہی کارن تو میں نے یہ سوانگ رچایا تھا۔

تمہیں یاد ہے کنول ؟ ۔ لیکن کہاں، تمہیں کہاں یاد ہوگا۔ تمہیں پچھلی باتوں کو یاد کرنے کی فرصت کہاں ——— ؟ کتنی جلدی بیت جاتے ہیں دن! وقت کے چکر کو کون روک سکا ہے ؟ ابھی کل ہی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ جب تم ولایت جا رہے تھے اور ہم سب، میرا مطلب ہے، میں، تمہاری خالہ زاد بہن عرشو، تمہاری امّی یعنی میری ممانی جان اور تمہارے دوست شکیل، سب لوگ تمہیں رخصت کرنے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں خود کو بہت سنبھالنے کی کوشش کے باوجود میری آنکھیں چھلکی پڑ رہی تھیں۔ اور میں سب سے اپنی اِس کیفیت کو چھپا رہی تھی کہ تمہاری نظر پڑ ہی گئی۔ تم کتنے رحمدل تھے اُس وقت، تم میری اِس حالت کو نہ دیکھ سکے اور چُپکے سے سب کی نگاہیں بچا کر اشارہ سے مجھے دوسرے کمرے میں چلنے کو کہا۔ میں تھکے تھکے قدموں سے جب ڈرائنگ روم میں پہنچی تو تم صوفہ پر بیٹھے سگریٹ پیتے کتنے بھلے معلوم ہو رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی تم نے کہا تھا۔

"کب سے انتظار کر رہا ہوں!"

"آپ کی اٹیچی درست کر رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"اتنی دیر تک ؟" تم جھٹ بولے تھے۔

"بس اتنی سی دیر میں گھبرا گئے ! ولایت میں تین سال کیسے گزریں گے ؟"

"وہ بھی گذر ہی جائیں گے۔ لیکن روتے سے یہ مدت کم نہیں ہو سکتی نشو! پھر

رونے سے فائدہ؟"

"سُنتے ہیں رونے سے جی کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے؟" میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔

"تو آؤ۔ جہاز جانے میں ابھی چار گھنٹے ہیں۔ ہم دونوں اس مدت میں "کورس" کے انداز میں رولیں۔ آخر تین سال کا کچھ بوجھ تو ہلکا ہوگا؟" تم نے شوخی سے کہا تھا۔

اور مجھے تمہاری اِس بات پر ہنسی آگئی تھی۔ جبھی تم نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا تھا مجھے یاد ہے اب تم بھی ضبط نہ کر سکے تھے اور تمہاری آنکھوں میں بھی شبنم کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ تمہیں یاد ہوگا اسی رقت کے عالم میں تم جلدی سے مجھے الگ کر کے باہر نکل گئے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ تم کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن خود تمہاری آنکھیں چھلک نہ کھائیں شاید اِس لئے تم مجھے تسلّی دیئے بغیر ہی چلے گئے تھے۔ ہاں! تم نے جاتے جاتے معمول کے مطابق میرے سر پہ ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا تھا "پگلی!"

اور پھر اُسی شام تمہیں تمہارا جہاز فضاؤں کو چیرتا، بلندیوں کو چھوتا مجھ سے دُور لے گیا۔ میں آسمان کی وسعتوں میں اپنی زندگی تلاش کرتی رہی اور میری زندگی دیکھتے ہی دیکھتے میری نظروں سے اوجھل ہوگئی ——— ایروڈرم کی ریلنگ پر کھڑے ہی کھڑے نہ جانے کہاں تک میں تمہارے ساتھ پرواز کرتی رہی کہ اچانک عرشو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "بھیّا ——— چڑیا پھُر!" میں نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور سب کے ساتھ گھر لوٹ آئی۔ یقین جانو کنول! آج وہی گھر جہاں دنیا بھر کا سکون و اطمینان ملتا تھا، ویرانے کی طرح اُجاڑ نظر آرہا تھا۔

دن بیتتے گئے، تمہارے خط آتے رہے اور مجھے عرشو سرسری طور پہ بتاتی رہی کہ تم خیریت سے ہو۔ کاش میں خود تمہاری تحریر پڑھ سکتی ——— تم نے کہا تھا، میں واپس آکر تمہیں خود پڑھاؤں گا۔ کاش تم مجھے پڑھا کر ہی جاتے۔ آج مجھے اپنے والدین کی قدامت پسندی پہ رونا آرہا تھا۔ کاش مجھے کچھ تو پڑھایا ہوتا۔ اُن کے نزدیک سینا، پرونا، کاڑھنا، بُننا اور خانہ داری کے امور ایک لڑکی کی سب سے بڑی خوبی تھے۔ وہ ابتدائی دینی تعلیم سے زیادہ لڑکیوں کو پڑھانا کفر سمجھتے تھے۔

اور کچھ دن کے بعد عرشو بھی چلی گئی، خالہ جان اُسے اپنے ساتھ لے گئیں تھیں۔ اور میں تمہاری خیریت سے بھی گئی۔ ممانی جان سے پوچھ نہیں سکتی تھی، نہ جانے کیوں۔ جب کبھی میں نے ایسا ارادہ کیا خود بخود زبان گنگ ہوگئی اور میں کچھ نہ کہہ سکی۔ لیکن مجھے اطمینان تھا اور اپنی دعاؤں پہ یقین کہ تم اچھے ہوگے اور دوسرے طلبا سے نمایاں بھی!

مجھے دِنوں کے گزرنے کا احساس ہی نہ تھا، تمہارے خیال سے فرصت ملتی تو احساس ہوتا ——— اچانک ایک دوپہر میری زندگی میں تلاطم بپا کرنے آگئی۔ پڑوس کی لڑکی نازی نے بتایا کہ دوسرے دن اُس کے بھائی کے ساتھ میری منگنی ہو رہی ہے ——— یقین جانو کنول! میں وحشیوں کی طرح اُسے دیکھتی رہ گئی مجھے کائنات کی ہر شے متزلزل نظر آئی، کمرہ اور اُس کی ہر چیز گھومتی دکھائی دی۔ لیکن میں نے بہت جلد اپنے پر قابو پالیا اور سنجیدگی سے اُس حادثہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ اب مجھے اپنے اس حد تک اطمینان پر بھی تعجب ہوا۔ اِس لئے کہ ممانی جان کو ہمارے بارے میں کیا علم تھا؟ اور پھر کسی بے کس کو سہارا دینے کا مطلب وہ تو نہیں ہوتا جو میں سمجھ بیٹھی تھی۔ مجھے اُس وقت اِس کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آتی تھی کہ تمہیں خط لکھوں اور اُن حالات سے آگاہ کروں ——— لیکن کاش میں ایسا کر سکتی۔ دوسری طرف میں ممانی جان کی بات کو بھی نہیں ٹال سکتی تھی اور اس طرح اُن کی مرضی سے انحراف کرنے کی جرأت مجھ میں نہ تھی۔ میں مسلسل غور کرتی رہی، نہ جانے میری بھوک پیاس کہاں غائب ہوگئی تھی۔ مجھے یاد ہے اُس رات میں ساری رات نہ سو سکی تھی اور اُنہی حالات پر غور کرتے صبح ہوگئی تھی ——— اُس روز کی صبح جس دن میری میت کی ابتدائی تیاریاں کی جانے والی تھیں۔ ابتک میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا کہ دفعتاً مجھے تمہارا جاتے جاتے کہا ہوا لفظ "پگلی" یاد آیا اور اُس کے ساتھ ہی جیسے مجھے سکون مل گیا ——— میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج سے میں پگلی ہی رہوں گی! آج سے میں پاگل کہلاؤں گی ——— تمہارے آنے تک! اِس لئے کہ اِس دنیا میں ایسا کون ہے جو ایک پگلی کو اپنی شریکِ حیات بنانے پہ تیار ہو جائے جو اپنی پُرسکون زندگی میں ایک پاگل سے شادی کر کے خود ہیجان پیدا کر لے اور جو جوانی کی اُمنگوں کو ایک زندہ درگور کے لئے ادھوری چھوڑنا گوارا کرے ——— اور میں نے اُسی لمحہ چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے جسم پر کے کپڑے تار تار کر ڈالے، میں اِردگرد کی چیزیں پھینکنے لگی۔ نہ جانے مجھ میں اتنی جرأت کہاں سے پیدا ہوگئی تھی، اور اُسی کے ساتھ ہی تمہاری شاندار خوبصورت کوٹھی میں جیسے بھونچال آگیا۔ سارے ملازمین، محلّہ والے اور ممانی جان میرے کمرے میں جمع ہو گئے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ بھلا کون یقین کر سکتا تھا کہ رات کو اچھی بھلی سونے والی لڑکی اچانک پاگل بھی ہو سکتی ہے! اور پھر میری تو آج منگنی ہونے والی تھی ——— مجھے مظلوم جان کر سب لوگوں کی رحم سے بھری نگاہیں مجھ پر مرکوز ضرور تھیں، لیکن یہ لوگ مجھ سے خائف بھی تھے۔ مجھ سے دُور کھڑے میرا تماشہ دیکھ رہے تھے، میرے پاس آنے کی جرأت کسی میں نہ تھی۔ ایسا نہ ہو میں کسی کو نقصان پہنچاؤں۔

میری اِس حالت کو دیکھ کر جتنے منہ اتنی باتیں شروع ہوگئیں، کسی نے کہا مجھ پہ اثر ہے۔ کسی نے رائے دی کہ مجھ پر کسی نے کچھ کرا دیا ہے۔ کسی کا خیال تھا کہ مجھے اچانک اپنے والدین کا صدمہ ہوا ہے۔ کوئی کہتا تھا، گرمی کا اثر ہے۔ بہرحال ایک بات پر سب متفق تھے کہ آج سے میں پاگل ہوگئی ہوں۔ میرا رشتہ ختم ہوگیا، میری شادی کے بارے میں سوچنا اور اُس کے چرچے جواب سے پہلے عام تھے یکسر ختم ہوگئے۔ مجھے پاگل خانہ دکھایا گیا لیکن بے سود ——— مجھے کئی عاملوں نے دیکھا، بین نتیجہ کچھ نہ رہا۔ اِس کا مجھے احساس تھا

[illegible] اور پھر [illegible]
[illegible] تھا فرق ہے کہ آج اس میں [illegible]
[illegible] محسوس ہوتا ہے [illegible] مجھے تسلی دینے کو
[illegible] ساتھی [illegible]۔ کبھی کبھی ماتی جان سرسری نگاہ ڈالنے آجاتی ہیں۔ میں ہر رات
[illegible]۔ جب [illegible] ہے تو اُسے کاشتی ہوں۔ فوراً کپڑے بدل لیتی
[illegible] ______ اس کمرے کے در و دیوار
[illegible] رات گئے اِن در و دیوار سے بات کرتی ہوں۔ تمہیں
[illegible] تمہاری باتوں کو دہراتی ہوں تو یہ دیواریں یہ سلاخیں مسکرا دیتی ہیں۔ پھر بھی ایک
[illegible] جب تم آ گئے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اور آخر [illegible] صدیوں بعد وہ وقت بھی آ ہی گیا جب [illegible] کوٹھی
[illegible] کیا [illegible] تمہارے استقبال کے لئے آ گئی تھی۔ اب تم ڈاکٹر ہو گئے تھے اور
یہ محسوس کر کے ہی میرا انگ انگ خوشی سے شادیانے بجا رہا تھا۔ کاش تم جان سکتے!!

لیکن ہاں تم جب میری کھڑکی کے پاس سے گزرے تھے تو ماتی جان اور شبنم نے بہت ذکر سے تمہیں بتایا تھا کہ "شاذ پاگل ہو گئی!" اور تم نے کہا تھا "اچھا! آپ لوگوں نے کہا تھا مجھے بہت ملال ہے۔" لیکن تمہیں معلوم تھا کہ تمہاری شاذ پگلی ہے۔ کاش تم ایک بار مجھ سے مل تو لیتے۔ لیکن کہاں تمہیں تو میں نے شبنم کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کئی بار کوٹھی سے نکلتے اور کار میں بیٹھتے دیکھا ہے۔ اور پھر آج ______ اُف!! یہ شہنائیوں کی آواز کتنی بلند ہو گئی ہے شاب! اور ایسی باجے کی آواز سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بارات جانے والی ہے۔ کاش میں تمہیں ایک نظر ہی دیکھ سکتی ______ ڈاکٹر کو دولہا بنے اور شبنم کو دلہن بنی دیکھنے کی تمنا تو شاید آج مجھے سچ مچ ہی پاگل کر دے گی۔

میرا جسم چٹک رہا ہے، میرے اعضا ٹوٹ رہے ہیں،
میرا ذہن ماؤف ہے۔
کہیں میں سچ مچ پگلی نہ ہو جاؤں!!

غزل

اخگر مستان رحیم آبادی

آ گئے آنکھوں میں آنسو میرے افسانے کے بعد
[illegible] سمجھانے کے بعد
زندگی [illegible] سامنے [illegible]
کون پھر کس سے وفا کرتا ہے مر جانے کے بعد
دل کی حقیقت اور کیا کیجے بیاں
اک یہی وہ گل ہے جو کھلتا ہے مرجھانے کے بعد
اعتبارِ وعدۂ فردا بھی کیوں کر آ سکے
مسکرا دیتے ہیں وہ اکثر قسم کھانے کے بعد
ہو چکی پھر تو سحر اُس بے بس و مجبور کی
شب کو یاد آئے جسے تم آنکھ کھل جانے کے بعد
جانے دیوانے نے کیا مجبوریِ دل پیش کی
سوچ میں خود پڑ گیا ناصح بھی سمجھانے کے بعد
خوب ہے اخگر نویدِ وعدۂ محشر، مگر
کیا کرو گے وعدۂ محشر بھی ٹل جانے کے بعد

غزل

صادق [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] وقت [illegible] ملے
[illegible]
[illegible] بیت الصنم سے ملے
نظریں [illegible]
جب جلوہ اور صاحبِ جلوہ بہم ملے
میں ہی اکیلا عشق میں حیراں نظر نہیں
وہ بھی بہ حالِ زار حزیں چشم نم ملے
دل بھی ہے باخبر تو نگاہیں بھی ہوشیار
صادق وہ خوب ہے جسے احساسِ غم ملے

رونے سے فائدہ؟"

"کہتے ہیں رونے سے جی کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔" میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔

"تو آؤ۔ جہاز جانے میں ابھی چار گھنٹے ہیں۔ ہم دونوں اس مدت میں "کورس" کے انداز میں رولیں۔ آخر تین سال کا بوجھ تو ہلکا ہوگا۔" تم نے شوخی سے کہا تھا۔

اور مجھے تمہاری اس بات پر ہنسی آگئی تھی۔ تبھی تم نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا تھا مجھے یاد ہے اب تم بھی ضبط نہ کر سکے تھے اور تمہاری آنکھوں میں بھی شبنم کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ تمہیں یاد ہوگا اسی رقت کے عالم میں تم جلدی سے مجھے الگ کر کے باہر نکل گئے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ تم کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن خود تمہاری آنکھیں چھلک گئی تھیں شاید اس لئے تم مجھے تسلی دیئے بغیر ہی چلے گئے تھے۔ ہاں! تم نے جاتے جاتے معمول کے مطابق میرے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا تھا "پگلی!"

اور پھر اُسی شام تمہیں تمہارا جہاز فضاؤں کو چیرتا، بلندیوں کو چھوتا مجھ سے دُور لے گیا۔ میں آسمان کی وسعتوں میں اپنی زندگی تلاش کرتی رہی اور میری زندگی دیکھتے ہی دیکھتے میری نظروں سے اوجھل ہوگئی ——— ایروڈروم کی ریلنگ پر کھڑے ہی کھڑے نہ جانے کہاں تک میں تمہارے ساتھ پرواز کرتی رہی کہ اچانک عرشو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی "بتو! ——— چڑیا پھر!" میں نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور سب کے ساتھ گھر لوٹ آئی۔ یقین جانو کنول! آج وہی گھر جہاں دنیا بھر کا سکون و اطمینان ملتا تھا، ویرانے کی طرح اُجاڑ نظر آ رہا تھا۔

دن بیتتے گئے، تمہارے خط آتے رہے اور مجھے عرشو سرسری طور پر بتاتی رہی کہ تم خیریت سے ہو۔ کاش میں خود تمہاری تحریر پڑھ سکتی ——— تم نے کہا تھا، میں واپس آکر تمہیں خود پڑھاؤں گا۔ کاش تم مجھے پڑھا کر ہی جاتے۔ آج مجھے اپنے والدین کی قدامت پسندی پر رونا آ رہا تھا۔ کاش مجھے کچھ تو پڑھایا ہوتا۔ اُن کے نزدیک سینا، پرونا، کاڑھنا، بُننا اور خانہ داری کے امور ایک لڑکی کی سب سے بڑی خوبی تھے۔ وہ ابتدائی دینی تعلیم سے زیادہ لڑکیوں کو پڑھانا کفر سمجھتے تھے۔

اور کچھ دن کے بعد عرشو بھی چلی گئی، خالہ جان اُسے اپنے ساتھ لے گئیں تھیں۔ اور میں تمہاری خیریت سے بھی گئی۔ ممانی جان سے پوچھ نہیں سکتی تھی، نہ جانے کیوں۔ جب بھی میں نے ایسا ارادہ کیا خود بخود زبان گنگ ہوگئی اور میں کچھ نہ کہہ سکی۔ لیکن مجھے اطمینان تھا اور اپنی دعاؤں پہ یقین کہ تم اچھے ہوگے اور دوسرے طلبا سے نمایاں بھی!

مجھے دنوں کے گزرنے کا احساس ہی نہ تھا، تمہارے خیال سے فرصت ملتی تو احساس ہوتا ——— اچانک ایک دوپہر میری زندگی میں تلاطم بپا کرنے آگئی۔ پڑوس کی لڑکی نازی نے بتایا کہ دوسرے دن اُس کے بھائی کے ساتھ میری منگنی ہو رہی ہے ——— یقین جانو کنول! میں وحشیوں کی طرح اُسے دیکھتی رہ گئی۔ مجھے کائنات کی ہر شے متزلزل نظر آئی، کمرہ اور اُس کی ہر چیز گھومتی دکھائی دی لیکن میں نے بہت جلد اپنے پر قابو پا لیا اور سنجیدگی سے اُس حادثہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ اب مجھے اپنے اس حد تک اطمینان پر بھی تعجب ہوا۔ اِس لئے کہ ممانی جان کو ہمارے بارے میں کیا علم تھا؟ اور پھر کسی بے کس کو سہارا دینے کا مطلب وہ تو نہیں ہوتا جو میں سمجھ بیٹھی تھی۔ مجھے اُس وقت اِس کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آتی تھی کہ تمہیں خط لکھوں اور اُن حالات سے آگاہ کروں ——— لیکن کاش میں ایسا کر سکتی۔ دوسری طرف میں ممانی جان کی بات کو بھی نہیں ٹال سکتی تھی اور اِس طرح اُن کی مرضی سے اختلاف کرنے کی جرأت مجھ میں نہ تھی۔ میں مسلسل غور کرتی رہی، نہ جانے میری بھوک پیاس کہاں غائب ہوگئی تھی۔ مجھے یاد ہے اُس رات میں ساری رات نہ سو سکی تھی اور اُنہی حالات پر غور کرتے صبح ہوگئی تھی ——— اُس روز کی صبح جس دن میری نسبت کی ابتدائی تیاریاں کی جانے والی تھیں۔ ابتک میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا کہ معاً مجھے تمہارا جاتے جاتے کہا ہوا لفظ "پگلی" یاد آیا اور اُس کے ساتھ ہی جیسے مجھے سکون مل گیا ——— میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج سے میں پگلی ہی رہوں گی! آج سے میں پاگل کہلاؤں گی ——— تمہارے آنے تک! اِس لئے کہ اِس دنیا میں ایسا کون ہے جو ایک پگلی کو اپنی شریکِ حیات بنانے پر تیار ہو جائے جو اپنی پُرسکون زندگی میں ایک پاگل سے شادی کر کے خود ہیجان پیدا کر لے اور جو جوانی کی اُمنگوں کو ایک زندہ درگور کے لئے ادھوری چھوڑنا گوارا کرے ——— اور میں نے اُسی لمحے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے جسم پر کے کپڑے تار تار کر ڈالے، میں ادھر اُدھر کی چیزیں پھینکنے لگی۔ نہ جانے مجھ میں اتنی جرأت کہاں سے پیدا ہوگئی تھی۔ اور اُسی کے ساتھ ہی تمہاری شاندار خوبصورت کوٹھی میں جیسے بھونچال آگیا۔ سارے ملازمین، محلّہ والے اور ممانی جان میرے کمرے میں جمع ہوگئے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ بھلا کون یقین کر سکتا تھا کہ رات کو اچھی بھلی سونے والی لڑکی اچانک پاگل بھی ہو سکتی ہے! اور پھر میری تو آج منگنی ہونے والی تھی ——— مجھے معلوم ہے کہ سب لوگوں کی رحم سے بھری نگاہیں مجھ پر مرکوز ضرور تھیں، لیکن یہ لوگ مجھ سے خائف بھی تھے۔ مجھ سے دُور کھڑے میرا تماشہ دیکھ رہے تھے، میرے پاس آنے کی جرأت کسی میں نہ تھی۔ ایسا نہ ہو میں کسی کو نقصان پہنچاؤں۔

میری اِس حالت کو دیکھ کر جتنے منہ اتنی باتیں شروع ہوگئیں، کسی نے کہا مجھ پر اثر ہے۔ کسی نے رائے دی کہ مجھ پر کسی نے کچھ کرا دیا ہے۔ کسی کا خیال تھا کہ مجھے اچانک اپنے والدین کا صدمہ ہوا ہے۔ کوئی کہتا تھا، گرمی کا اثر ہے۔ بہرحال ایک بات پر سب متفق تھے کہ آج سے میں پاگل ہوگئی ہوں۔ میرا رشتہ ختم ہوگیا، میری شادی کے بارے میں سوچنا اور اُس کے چرچے جو اب سے پہلے عام تھے یکسر ختم ہوگئے۔ مجھے پاگل خانہ دکھایا گیا لیکن بے سود ——— مجھے کئی عاملوں نے دیکھا، یہی نتیجہ کچھ نہ رہا۔ اِس کا مجھے احساس

[illegible] اور پھر کوئی [illegible]
[illegible] ہے کہ آج [illegible]
[illegible] ہوتا ہے جیسے [illegible]
[illegible] کبھی کبھی ماں جب میرے سر پر نگاہ ڈالنے آجاتی ہیں۔ [illegible] رات
[illegible] سب ٹھیک ہے تو اُسے کاٹتی ہوں۔ فوراً [illegible]
[illegible] اس کمرے کے در و دیوار
[illegible] گئے ان دیواروں سے لگ کر روتی ہوں۔ تمہیں
[illegible] ہوں کہ دیدیا ہے یہ سلائیں مسکرا رہی ہیں۔ [illegible]
[illegible] سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اور آخر [illegible] وہ دن بھی آ ہی گیا جب [illegible]
[illegible] تمہارے استقبال کے لئے آ گئی تھی۔ اب تم ڈاکٹر ہو گئے تھے اور
[illegible] میرا انگ انگ خوشی کے شادیانے بجا رہا تھا۔ کاش تم جان سکتے!!

لیکن جب میری کھڑکی کے پاس سے گزرے تو جانی جان اور [illegible]
بہت ڈر کر سے تمہیں بتایا تھا کہ [illegible] پاگل ہو گئی ہے؟ اور تم نے کہا تھا "ہاں! آپ لوگوں نے
کہا تھا مجھے بہت دکھ ہے۔" [illegible] معلوم تھا کہ تمہاری [illegible] ہے۔ کاش تم ایک بار
[illegible] لیکن کہاں تمہیں تو میں نے [illegible] ہاتھ ڈالے کئی بار کوٹھی سے
نکلے اور کار میں بیٹھے دیکھا ہے۔ اور پھر آج ——— اُف!! یہ شہنائیوں کی آواز کتنی
بلند ہو گئی ہے۔ [illegible] باجے کی آواز سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بارات جانے والی ہے۔
کاش میں تمہیں ایک نظر ہی دیکھ سکتی ——— ڈاکٹر کو دولہا بنے اور [illegible]
دیکھنے کی تمنا تو شاید آج مجھے سچ مچ ہی پاگل کر دے گی۔

میرا جسم پھنک رہا ہے، میرے اعضا ٹوٹ رہے ہیں،
میرا ذہن ماؤف ہے۔
کہیں میں سچ مچ پگلی نہ ہو جاؤں!!

غزل

اخگر مشتاق رحیم آبادی

آ گئے آنکھوں میں آنسو [illegible] افسانے کے بعد
[illegible] سمجھے تو سمجھانے کے بعد

زندگی ہی تک ہیں سارے عہد و پیمانِ وفا
کون پھر کس سے وفا کرتا ہے مر جانے کے بعد

[illegible] دل کی حقیقت اور کیا کیجے بیاں
اک یہی وہ گُل ہے جو کھلتا ہے مرجھانے کے بعد

اعتبارِ وعدۂ فردا بھی کیوں کر آ سکے
مسکرا دیتے ہیں وہ اکثر قسم کھانے کے بعد

ہو چکی پھر تو سحر اُس بے بس و مجبور کی
شب کو یاد آتے جسے تم آنکھ کھل جانے کے بعد

جانے دیوانے نے کیا مجبوریِ دل پیش کی
سوچ میں خود پڑ گیا ناصح بھی سمجھانے کے بعد

خوب ہے اخگر نویدِ وعدۂ محشر، مگر
کیا کرو گے وعدۂ محشر بھی ٹل جانے کے بعد

غزل

[illegible] صدیقی

[illegible] نگاہ [illegible] چشمِ نم سے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] وقت ہم ملے

[illegible]
[illegible] بیت الصنم سے ملے
نظریں [illegible] الوان [illegible]
جب جلوہ اور صاحبِ جلوہ بہم ملے

میں ہی اکیلا عشق میں حیراں نظر نہیں
وہ بھی بہ حالِ زار حزیں چشمِ نم ملے

دل بھی ہے باخبر تو نگاہیں بھی ہوشیار
صادق وہ خوب ہے جسے احساسِ غم ملے

افسانہ

لے نام بھی آہستہ

عفت موہانی۔ ایم۔ اے

۱۱۳۴-۴-۲۱ غیرت خاں لین۔ حیدرآباد دکن

۱۷ر جولائی ۶۵ء

محترمی بھائی صاحب! تسلیم

افسانہ نمبر نظر نواز ہوا۔ م۔ ک۔ مہتاب اور ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے افسانے بہت اچھے ہیں شباب ملیح آبادی اور سید یزدانی جالندھری کی غزلیں بے حد موثر اور پُر سوز ہیں۔ راجہ صاحب کے "محبوب مشغلے" نہ پوچھیے کیسے قہقہہ آفریں ہوتے ہیں۔ اس بار قدرت اللہ شہاب والے اشعار کا تو جواب نہیں ـــــــ اپنی ایک کہانی "لے نام بھی آہستہ" بھیج رہی ہوں۔ امید ہے پسند آئے گی۔ آپ کی رائے کی منتظر رہوں گی ـــــ پرسوں خالد صاحب کی کتابوں کے لئے آپ سے جو استدعا کی ہے، براہِ کرم اُس پر ضرور توجہ دیجئے گا ـــــ حسرت موہانی مرحوم کے غیر مطبوعہ مجموعۂ کلام اور ذاتی خطوط کی تلاش میں ہوں . . .

آپ کی بہن ـــــ عفت موہانی

درد میں ڈوبی ہوئی ایک آخری لے ـــــ اور پھر شہنائیوں کی جھنکار یوں
سُگی جیسے کوئی بیمار آخری بار کراہ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا ہو۔

ساز رُکتے ہی بے شمار آوازیں اُبھر آئیں۔

فرحانہ آج ہمیشہ کے لئے دوسروں کی ہو جائے گی! جج صاحب نے حسرت بھری اہ شامیانے پر ڈالی اور دل ہی دل میں رو پڑے۔ قناتیں گھری ہوئی تھیں۔ مہمان نچی آواز میں ہنس بول رہے تھے۔ بچوں نے لان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ مہمانوں کی کاریں ی تک آ رہی تھیں۔ جج صاحب سب سے معذرت کر کے اپنے کمرے میں آ بیٹھے تھے۔ اُن ہقہوں میں کہیں اُن کی رُوح چیخ رہی تھی۔

'یوں نہ ہنسو۔ یوں نہ چیخو۔ آج میری بچّی رخصت ہو رہی ہے۔ اُسے آنسوؤں ور آہوں کے نذرانے نہ دو۔ اُس کا دُکھ بٹاؤ۔ وہ یہ نہ کہے کہ بابل کے گھر سے وہ نسوؤں کا تحفہ لے چلی ہے۔ اُس کے ساتھ رونے والا اُس کے بوڑھے باپ کے سوا ور کوئی نہیں! کوئی نہیں!!'

جج صاحب کے دل کے اندر کوئی بلک بلک کر رونے لگا۔

'میری بچّی۔ آج آخری سہارا بھی چھوٹ گیا'

کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی اور انھوں نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے۔

لیکن اُن کی سُرخ آنکھوں نے اپنا راز عیاں کر دیا۔

"کیا آپ رو رہے تھے؟" پرنسپل صاحب نے اُن کے دونوں شانے تھام لئے۔

"خدا کے لئے یوں نہ روئیے۔ آپ کی بچّی کیا میری بچّی نہیں ہے؟"

جج صاحب سنبھل گئے "خدا کرے وہ اپنے باپ کو بھول جائے!"

رخصتی کے وقت پھر ایک ہنگامہ جاگ اُٹھا۔

"آج ایک رسم اور ادا ہو جائے" پرنسپل صاحب مسکرائے "اپنی بھابی سے مل لو۔ آج دونوں خاندان ایک ہو گئے ہیں۔ اب تو یہ پردہ مناسب نہیں معلوم ہوتا!"

پھر انھوں نے اقبال کو پکارا۔ زرنگار شیروانی میں ملبوس، گلے میں موٹی موٹی پھولوں کی بدھیاں ڈالے وہ اُٹھ کر پرنسپل صاحب کے پاس چلا آیا۔

"خیال رکھنا۔ آج سے تمھارے باپ یہ ہیں"

اقبال بہت ادب اور احترام سے جج صاحب کے قدموں پر جھک گیا۔

پھر جج صاحب نے ہزار انکار کیا لیکن کچھ تو پرنسپل صاحب کو دو خاندانوں کی یکجائی کا احساس تھا اور کچھ وہ چاہتے تھے کہ اُن کے دل پر سے غم کے سائے دُور ہو جائیں۔ کمال اپنی امّی کو لے آیا۔

"لو بھئی! آج نقاب کشائی کی رسم ادا ہو جائے" پرنسپل صاحب کے دل میں

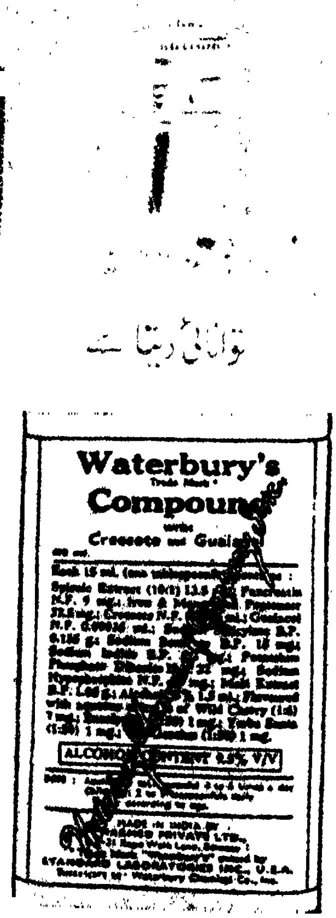
زکام کا مقابلہ کرنے کے لئے

واٹربریز کمپاؤنڈ

لال لیبل

لیجئے

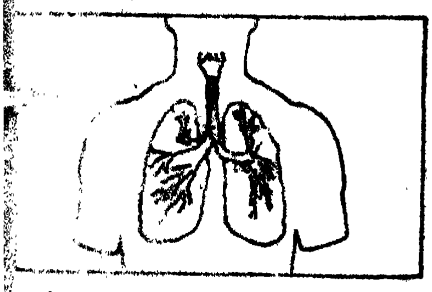






عام طور سے زکام کو معمولی بات سمجھا جاتا ہے لیکن اس سے دراصل کمزوری آجاتی ہے اور بیماری کا مقابلہ کرنے کی توانائی کم ہوجاتی ہے۔ واٹربریز کمپاؤنڈ بیک وقت تین طرح سے اثر کرتا ہے: آرام پہنچاتا ہے، طاقت بحال کرتا ہے اور بیماریوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے موثر اجزاء کریوسوٹ اور گائیکول زکام میں آرام پہنچاتے ہیں، لوہا اور مقوی اجزاء نیز جو اور شمال کے ست بھوک بڑھاتے ہیں، طاقت بحال کرتے ہیں اور جراثیم کا مقابلہ کرنے والی توانائی پیدا کرتے ہیں جس سے مرض کے پلٹنے کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔

بارہ مہینے بیماریوں کا مقابلہ کرنے والی توانائی برقرار رکھنے کے لئے لال لیبل والا واٹربریز کمپاؤنڈ پیجئے۔



واٹربریز کمپاؤنڈ میں موجود کریوسوٹ اور گائیکول سانس کے نظام کو جراثیم سے پاک رکھتے ہیں اور جراثیم [illegible] ہیں، پھیپھڑے صاف رکھتے ہیں، کھانسی [illegible] تکلیف اور دمہ جیسی کیفیت کا مقابلہ کرنے [illegible] جراثیم کو دوبارہ پھیلنے سے روک سکتے ہیں۔

واٹربریز کمپاؤنڈ

کھانسی، زکام، سانس کی تکلیف

اور دمہ جیسی کیفیت کا مقابلہ کرنے کی توانائی پیدا کرتا

وارنر۔ ہندوستان لمیٹڈ، بمبئی

لے نام بھی آہستہ

عفت موہانی۔ ایم۔ اے

۱۱۳۲-۴-۲۱ غیرت خان لین۔ حیدرآباد دکن

۱۷ر جولائی ۱۹۶۵ء   محترمی مجاز صاحب! تسلیم

افسانہ نمبر نظر نواز ہوا۔ مہتاب اور ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے افسانے بہت اچھے ہیں۔ شباب ملیح آبادی اور سید یزدانی جالندھری کی غزلیں بے حد پسند آئیں۔ راحم صاحب کے محبوب شعلے نہ جانے کیسے تہقہہ افروز ہوتے ہیں۔ اس بار قدرت اللہ شہاب والے اشعار کا تو جواب نہیں ——— اپنی ایک کہانی "لے نام بھی آہستہ" بھیج رہی ہوں۔ امید ہے پسند آئے گی۔ آپ کی رائے کی منتظر رہوں گی ——— پرسوں خالدہ صاحب کی کتابوں کے لئے آپ سے جو استدعا کی ہے، براہ کرم اس پر ضرور توجہ دیجئے گا ——— حسرت موہانی مرحوم کے غیر مطبوعہ مجموعۂ کلام اور ذاتی خطوط کی تلاش میں ہوں۔

آپ کی بہن ——— عفت موہانی

درد میں ڈوبی ہوئی ایک آخری لے ——— اور پھر شہنائیوں کی جھنکار یوں رک گئی جیسے کوئی بیمار آخری بار کراہ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا ہو۔

ساز رکتے ہی بے شمار آوازیں ابھر آئیں۔

فرحانہ آج ہمیشہ کے لئے دوسروں کی ہو جائے گی! جج صاحب نے حسرت بھری نگاہ شامیانے پر ڈالی اور دل ہی دل میں رو پڑے۔ قناتیں گھری ہوئی تھیں۔ مہمان اونچی آواز میں ہنس بول رہے تھے۔ بچوں نے لان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ مہمانوں کی کاریں ابھی تک آ رہی تھیں۔ جج صاحب سب سے معذرت کر کے اپنے کمرے میں آ بیٹھے تھے۔ ان قہقہوں میں کہیں ان کی روح چیخ رہی تھی۔

"یوں نہ ہنسو۔ یوں نہ چیخو۔ آج میری بچی رخصت ہو رہی ہے۔ اُسے آنسوؤں اور آہوں کے نذرانے نہ دو۔ اُس کا دکھ بٹاؤ۔ وہ یہ نہ کہے کہ بابل کے گھر سے وہ آنسوؤں کا تحفہ لے چلی ہے۔ اُس کے ساتھ رونے والا اُس کے بوڑھے باپ کے سوا [illegible] کوئی نہیں!!"

جج صاحب کے دل میں اندر کوئی بلک بلک کر رونے لگا۔

"بیٹی۔ آج [illegible] ساتھ بھی چھوٹ گیا۔"

[illegible] قدموں کی [illegible] انھوں نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے۔

لیکن اُن کی سرخ آنکھوں نے اپنا راز عیاں کر دیا۔

"کیا آپ رو رہے تھے؟" پرنسپل صاحب نے اُن کے دونوں شانے تھام لئے۔

"خدا کے لئے یوں نہ روئیے۔ آپ کی بچی کیا میری بچی نہیں ہے؟"

جج صاحب سنبھلتے گئے۔ "خدا کرے وہ اپنے باپ کو بھول جائے!"

رخصتی کے وقت پھر ایک ہنگامہ جاگ اٹھا۔

"آج ایک رسم اور ادا ہو جائے" پرنسپل صاحب مسکرائے۔ "اپنی بھابی سے مل لو۔ آج دونوں خاندان ایک ہو گئے ہیں۔ اب تو یہ پردہ مناسب نہیں معلوم ہوتا!"

پھر انھوں نے اقبال کو پکارا۔ زرنگار شیروانی میں ملبوس، گلے میں موتی پھولوں کی بدھیاں ڈالے وہ اٹھ کر پرنسپل صاحب کے پاس چلا آیا۔

"خیال رکھنا۔ آج سے تمہارے باپ یہ ہیں۔"

اقبال بہت ادب اور احترام سے جج صاحب کے قدموں پر جھک گیا۔

پھر جج صاحب نے ہزار انکار کیا لیکن کچھ تو پرنسپل صاحب کو دو خاندانوں کی یکجائی کا احساس تھا اور کچھ وہ چاہتے تھے کہ اُن کے دل پر سے غم کے سائے دور ہو جائیں۔ کمال اپنی امی کو لے آیا۔

"لو بھئی! [illegible] نقاب کشائی کی رسم ادا ہو [illegible]" پرنسپل صاحب کے دل میں

پیانو کی من موہنی دھن بند ہو گئی۔ کہ کھڑکی کے جھلملاتے پردے سرکا دیا۔

"تسلیم۔ خالد صاحب!" بیگم کی شائستہ سی آواز آئی۔

جج صاحب نے بمشکل نظریں اٹھائیں۔ دشت چمن سے گزرتی سیر ہوں بجلی آگری۔ پھر وہاں

امنگ کی عظیم الشان عمارتوں کے کھنڈر کے سوا کچھ بھی نہ بچا۔

"صالحہ؟!" حیرت اور حیرانی میں ڈوبی مدھم آواز ——— اور اُن کی نظریں

آہستہ آہستہ مجوب اور پشیمان صالحہ کے چہرے سے پھسلتی بہکتی بے بسی انداز میں فرش پر

گڑ گئیں۔

وہ اُلٹے قدموں چلتے تیس برس والی پچھلی دُنیا میں پہنچ گئے۔

خوابوں کی سرزمین ———

جہاں کا ذرّہ ذرّہ آفتاب تھا!

- کوئی خیر اُس عقل سے بہتر نہیں جسے علم نے سنوارا ہو اور اُس علم سے جسے علم نے آراستہ کیا ہو اور اُس علم سے جسے سچائی نے زینت بخشی ہو۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

- علم مال سے بہتر ہے۔ علم تمھاری حفاظت کرے گا اور مال کی حفاظت تمھیں کرنی ہوگی۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

- علم کی مثال دریا کی ہے۔ اُس میں سے کتنا ہی خرچ کرو کبھی گھٹتا نہیں۔
(حضرت سلمان فارسیؓ)

- علم اکتساب سے آتا ہے، عقل تجربہ سے آتی ہے۔
(حضرت ابو الدرداء انصاریؓ)

لا کالج کے قریب ہونے کی بنا پر وہ اپنے ایک دور کے عزیز کے ہاں دورانِ تعلیم تک رہنے کے لئے آگئے تھے۔ جس گھر میں وہ رہتے تھے، وہاں اُن کا ساتھی کوئی نہ تھا۔ صرف بیگم حفیظ تھیں اور اُن کی تین لڑکیاں۔ پھر اُسی ہفتہ اُنھیں لا کالج میں داخلہ مل گیا اور پھر وہ اپنے کورس کی موٹی موٹی کتابوں میں کھو گئے۔

جب وہ کالج سے واپس آتے اُنھیں اپنا کمرہ سجا ہوا ملتا۔ کپڑے ہینگرز پر ہوتے اور ریک کے پاس تھرماس میں گرم چائے۔ وہ بیگم حفیظ کے خلوص سے بے حد متاثر تھے لیکن لڑکیاں اُن کی بیگانگی سے سخت برہم تھیں۔ طرح طرح کی سازشیں ہوتیں لیکن صالحہ باجی سب پر پانی پھیر دیتیں۔

"آخر وہ ہیں کون ہیں؟"

"نہیں ابھی تو ہو جائیں گے" زہرہ بولتی۔

"تیرا کیا خیال ہے... [illegible]

یہ بھائی کسے چرچے نہیں ہیں؟ ہم تو اُنھیں ... [illegible]"

پھر دوسری شرارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

شام کو وہ واپس آئے۔ اپنا فائل میز پر رکھا اور ریک کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔

"کیا ہوا خالد بھائی؟" چھوٹی شاہینہ ہمیشہ سے بولنے میں تیز تھی۔

"شبی! میری کتابیں؟" اُنھوں نے مسکراہٹ چھپا کر کہا۔

"میں کیا جانوں بھائی جان! کوئی چرا لے گیا ہوگا کوئی" اُس کے انگ انگ سے مسکراہٹ چھلک رہی تھی۔

"تو پھر ہم تم مل کر چور کو ڈھونڈیں!"

"واہ بھائی جان! کیا وہ ہمارے انتظار میں بیٹھا ہوگا۔ جو کچھ لینا تھا لے کر چل دیا!"

پھر وہ اُنھیں لے کر چائے کے کمرے میں پہنچی۔

"خالد بھائی! یہاں تک آتے ہوئے آپ کے پیروں کی مہندی تو نہیں چھوٹ گئی" زہرہ چہکی۔

"اے اے۔ آپی سنبھل کر! خالد بھائی جج بن رہے ہیں۔ کہیں آپ کی قینچی کی طرح چلنے والی زبان کاٹ کر جیل میں نہ بند کر دیں!" شاہینہ بولی اور وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

"آج آپ کو سزا ملے گی!"

"کون سے قصور کی سزا؟" اُنھوں نے پوچھا۔

پھر زہرہ نے اتنے پروگرام بتائے کہ وہ بوکھلا گئے۔

"کبھی آپ نے آنکھ مچولی کھیلی ہے؟" شاہینہ نے کہا: "باجی کو بہت پسند ہے!"

"ہاں!" صالحہ نے کہا تھا: "جب پورے چاند کی چاندنی کھلی ہوتی ہے، ہوائیں دھیمے دھیمے چلتی ہیں۔ تب اندھیرے اُجالے میں آنکھ مچولی کتنی اچھی لگتی ہے۔ کبھی آپ چھپ جائیے ہم ڈھونڈیں۔ کبھی ہم چھپ جائیں اور آپ ڈھونڈتے!"

"اور اگر میں آپ کو نہ ڈھونڈ سکا؟"

"میں کبھی ایسی جگہ نہیں چھپتی!" اُس کا چہرہ گلگوں ہو گیا۔

وہ اُن کے مختصر کنبے کے ایک فرد بن گئے تھے۔ زہرہ، شاہینہ کے سب بھائی اور صالحہ کے کچھ اور ——— نہ اُنھوں نے محبت کے رواجی ٹکسالی بول بولے، نہ کبھی قرب و بعد کا رونا رویا، نہ آہیں بھریں۔ صرف آنکھوں کے خلوص نے سمجھا دیا: "تم ہمارے ہو، ہم تمھارے ہیں!"

چھلکنے لگیں اور تنگ کوچل زمین کی گرد سے چھپنے لگا اور ایک دن گھڑیاں وقت ہو جائے۔ پھر جب اُن کی خاموش محبت بڑھتی گئی۔ اُنہیں احساس تھا جو شعلہ اُن کے دل میں روشن تھا، اُس کی تپش عالیہ کے دل تک پہنچ گئی تھی۔

کتنے دن یونہی گزر گئے تھے۔ جن کے کسی لمحے کا کوئی حساب ہی نہ تھا۔

"آپ کے لئے یہ سویٹر بنا تھا!" عالیہ کہتی۔

"اچھا۔ عالیہ شکریہ! اُس دن آپ کے لئے یونہی ایک بروچ لے لیا تھا۔ اگر پسند آجائے تو آپ کی نذر ہے۔"

"بہت بہت شکریہ!"

اور پھر شکریے کی زبان بھی خلوص نے بند کر دی۔

جیسے ہی اُن کی تعلیم ختم ہوئی، وہ چاند جو عالیہ کے دل میں آنکھ مچولی کھیلنے کی اُمنگ جگاتا تھا، گھنی بدلیوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔

اُس شام جب وہ ہائی کورٹ سے واپس آئے تو گھر بھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

زہرہ اُن کے کمرے میں چائے لئے منتظر تھی۔

"آج کوئی نئی بات ہے زہرہ! تم بھی اُداس ہو؟"

"ہاں! خالد بھائی۔ . ." زہرہ کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ "کچھ ایسی ہی بات ہے!"

"کیا وہ بات مجھ سے راز رہے گی؟"

"جی نہیں" زہرہ کی آنکھیں بھیگ گئیں "لیکن آپ ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ امی یوں تو بڑی پُرمحبت اور رحمدل بنتی ہیں لیکن عالیہ باجی کی تقدیر پھوڑتے انہیں رتی برابر ترس نہیں آتا!"

اُن کے ہاتھ میں چائے کی پیالی لرز گئی: "عالیہ باجی کی تقدیر — انہیں کیا ہوا؟"

زہرہ نے سب کچھ کہہ دیا: "عالیہ باجی کے سلسلے میں امی نے پوری پوری قدامت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ کسی کی نہیں سنیں گی۔ اُن کی شادی وہ اپنی پسند سے کر رہی ہیں۔ اپنے بھانجے سے۔ جو پرنسپل ہے۔ دولت مند ہے!"

"عالیہ کی شادی؟" وہ آرزوئیں جو ابھی تک بن بیاہی دلہنیں تھیں، یکایک منہ چڑھا کر دور چلی گئیں۔

"ہاں! عالیہ باجی کی شادی!" زہرہ برتن سمیٹ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے معلوم ہے۔ آپ کی آرزو اور عالیہ باجی کی تمنا۔ لیکن امی کی پسند سب پر مقدم ہے۔"

تقدیر نے اتنا ہنسایا تو نہ تھا جس کی یہ سزا ملی تھی!

"مجھے بچا لیجئے۔ اگر آپ کے بس میں ہو —!" اُس رات عالیہ نے اپنا سارا فکر اُن کے سینے میں سمو دیا تھا۔ وہ برسوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھی۔ چہرہ زرد۔ بال پریشان۔ سرخ آنکھیں کہہ رہی تھیں وہ کئی راتوں سے مسلسل جاگ رہی ہیں — !! اتنی بے قرار اور مضطرب۔ جیسے وہ عالیہ نہ ہو۔ صرف اُس کا ہمیانک عکس ہو!

"کاش میں تمہیں بچا سکتا!" خالد نے نہایت کرب سے کہا۔ "کاش میں خود کو بچا سکتا!"

"یوں ہو جائے گا تو پھر میں کیسے زندہ رہوں گی! —" عالیہ رونے لگی تھی۔

"نہیں، عالیہ! خوش رہو اور خوش رکھنے کی کوشش کرو۔ نہ آہیں بھرو، نہ آنسو بہاؤ۔ تم نیک اور شریف لڑکی ہو۔ اور نیک اور شریف لڑکیاں دوسروں کی مرضی پر قربان ہو جاتی ہیں۔"

- جس شخص کو نرمی اور حلیمی دی گئی اُسے دنیا و آخرت کی بھلائی عطا کی گئی اور جس شخص کو نرمی سے محروم کیا گیا اُسے دنیا و آخرت کی بھلائی سے محروم کیا گیا۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- اعتدال کو اپنا شیوہ بناؤ۔ مال دار ہو کر آپے سے باہر اور غریب ہو کر شکستہ دل نہ ہو جاؤ۔ (حضرت حسان بن ثابتؓ)
- جو صحت و تندرستی کی حالت میں نیکی نہیں کرتا وہ جب کمزور ہو جاتا ہے تو سختی جھیلتا ہے۔ (حضرت شیخ سعدی)
- یہ تمہاری خوش بختی ہے کہ دشمن بھی تمہاری ایذا رسانی سے محفوظ رہیں۔ (سقراط)

عالیہ روتی رہی اور خالد بھی روتے رہے۔ وقت گزرتا گیا —

گھر بھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔

انہوں نے خاموشی سے عالیہ کی محبت کا زہر پی لیا۔ جس رات اُس کی شادی تھی اُسی دن انہوں نے ہمیشہ کے لئے وہ شہر چھوڑ دیا۔ پھر پتہ چلا عالیہ کی شادی ہو گئی۔ وہ اُس دن اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے۔ دن بھر پچھلی یادوں کے انبار کریدتے رہے! اچھی اور بُری ساری یادیں۔ عالیہ مانجھے بیٹھی ہو گی۔ پھر اُسے عروسی لباس پہنایا گیا ہو گا۔ اور پھر عالیہ نے اپنے ساتھی کے ساتھ پھولوں سے ڈھکی کار کے اندر قدم رکھے ہوں گے! کیا اُس وقت اُس نے خالد کو یاد کیا ہو گا؟

کون جانے۔ کون جانے —! وہ بچوں کی طرح روتے رہے تھے۔ یہاں کوئی اُن موتیوں کو دیکھنے والا بھی نہ تھا جو وہ عالیہ کی راہ میں بکھیر رہے تھے۔

اپنی ناکام محبت کو سینے سے لگائے، زخمی اور شکست خوردہ خالد نے اپنے وطن کو خیرباد کہہ دیا۔ دس سال انھوں نے ملکوں ملکوں کی سیر و سیاحت میں گزار دیئے۔ محبت جب ختم ہو جاتی ہے تو اُس لمحے کی طرف پلٹ جاتی ہے، جہاں سے اُس کا آغاز ہوا تھا۔ وہ جہاں جہاں گئے صالحہ کا نرم و نازک لطیف وجود اُن کے احساس کے ساتھ رہا تھا۔ شہر شہر قریہ قریہ۔ صالحہ ہمیشہ اُن کے ذہن سے وابستہ رہی۔

پھر وطن کی محبت نے دامن پکڑ کر واپس چلنے پر مجبور کیا۔ اب وہ ایک قابل اور معزز جج تھے۔ لیکن اکیلے اور اداس! خاندان کے بچے کھچے افراد میں صرف ایک بیوہ بہن تھی۔ انھوں نے بچھڑے ہوئے بھائی کو گلے لگا لیا۔ پھر انھوں نے خالد کی مرضی کے خلاف خاندان بھر کی لڑکیاں دیکھ ڈالیں اور ایک دن چپکے سے نکہت کی تصویر اُن کے سامنے رکھ دی۔

"میں شادی نہیں کروں گا باجی! اب میری عمر بھی اِس قابل نہیں رہی"۔

وہ تصویر سامنے سے ہٹاتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن باجی کے آگے انھیں ہار ماننی پڑی۔ پھر وہ زندگی سے تھک چلے تھے۔ جب باجی نے اُن کی مرضی پوچھی انھوں نے سارا معاملہ اُنہی پر چھوڑ دیا۔

لیکن وہ نکہت کو خاطر خواہ شکھ نہ پہنچا سکے۔ اُن کے بیگانوں جیسے سلوک اور غیریت کے برتاؤ نے اُسے مایوس کر دیا۔ وہ صرف اُن کی بیوی تھی اور بس... جس سے کوئی ذہنی اور قلبی لگاؤ نہ تھا! سال بھر کے اندر اندر نکہت اپنی مایوس محبت کی جیتی جاگتی نشانی فرحانہ کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے ویرانوں میں جا بسی!

یہ ایک دردناک عذاب تھا جو تنہا خالد نے بھگتا۔ اور پھر زندگی سمٹ کر اِس محدود دائرے میں آگئی، جہاں اُن کی بچی فرحانہ تھی۔ ایک دن کی بچّی سے لے کر بیس سال کی دوشیزہ کی دلجوئی کرتے ہوئے اُن کے ماہ و سال کیسے گزرے تھے۔ اگر کوئی اُن سے پوچھتا تو وہ شاید ایک لمحے کا حساب بھی نہ دے سکتے! وہ یادیں جو سرمایۂ حیات تھیں، کب کی فرحانہ کے قدموں تلے روند کر خاک ہو گئی تھیں۔

اور فرحانہ... اُن کی اکلوتی لڑکی... حیا پرور اور معصوم... آج وہ بھی سسرال جا رہی تھی!

'کیا قدرت کا یہ قانون اٹل ہے؟' انھوں نے سوچا۔

'ہاں! اٹل اور سخت!!' دل نے جواب دیا۔

'میں ہمیشہ تنہا رہوں گا۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں!'

ہولے ہولے دھیرے دھیرے پھولوں کی خوشبو قریب آتی گئی۔ اور قریب۔ اور قریب... اُن کی بچّی دلہن بنی... عروسی لباس میں ملبوس... گہنوں میں لدی پھندی، پھولوں سے ڈھکی چھپی اُن کے پاس لائی گئی۔

جج صاحب کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سہرا جو فرحانہ کے سر پر سجا ہوا ہے پھولوں کا نہیں، اُن کے آنسوؤں کا ہے۔ ہر پھول سسکیاں لے رہا تھا۔ خاموش خاموش فرحانہ بلک رہی تھی۔

"بابا! میں دوسرے گھر جا رہی ہوں۔ آج آخری بار میرے سر پر ہاتھ رکھ دیجئے۔ آخری بار مجھے پیار کر لیجئے۔ نہ جانے پھر میں کب آؤں... !"

"اب کچھ نہ سوچئے جج صاحب! ہنسی خوشی اِسے رخصت کیجئے!" پرنسپل صاحب کی آواز بہت دور سے آتی معلوم ہوتی۔ انھوں نے بہت مشکل سے نظریں اٹھائیں۔ اُن کی اور صالحہ کی نگاہیں ملیں۔ محجوب، سراسیمہ اور دیرینہ یادوں کے غبار سے لبریز نگاہیں۔ شاید وہ بھی وہی سب کچھ سوچ رہی تھی جو جج صاحب سوچ رہے تھے! نہ جانے اُن آنکھوں میں کیا تھا جس نے جج صاحب کے زخمی دل پر ٹھنڈا ٹھنڈا پھاہا رکھ دیا... !

اپنایت اور ہمہ گیر محبت کا ایک احساس تھا جو دلاسہ دے رہا تھا!

'فرحانہ ـــــ میری صالحہ کے گھر جا رہی ہے!'

پھر کچھ ہنستے ہوئے، کچھ روتے ہوئے انھوں نے جھک کر اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ سے پہلی بار اور آخری بار صالحہ کا ہاتھ تھام لیا اور فرحانہ کے سر پر رکھتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولے۔

"خوشی خوشی اپنے گھر سدھارو۔ میری بچّی! نہ روؤ۔ تم نہیں جانتیں یہ تمھاری ماں ہی ماں!!"

سیّد احتشام حسین سے انٹرویو

نریش کمار شاد

۱۵ الف۔ موتی باغ ۲۔ نئی دہلی

۲ راگست ۶۵ء

محبّی خوشتر صاحب!

"بیسویں صدی" کے آئندہ شمارے کے لئے احتشام صاحب سے انٹرویو بھیج رہا ہوں۔ احتشام صاحب کے شعور میں جو استواری اور پختگی ہے اُس کی بعض جھلکیاں اِس انٹرویو میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ احتشام صاحب کی زیادہ تر باتیں اتنی دل نشیں نہیں ہیں جتنی فکر انگیز ہیں۔ اسی وجہ سے یہ دل سے زیادہ دماغ کو متاثر کرتی ہیں اور میرے خیال میں یہی ان کی تنقیدی استعداد کا کمال ہے ——— "بیسویں صدی" میں چھپنے والے مضامین کے سلسلے میں مجھے بے شمار خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں، جن سے "بیسویں صدی" کی بے پناہ مقبولیت اور اس کے قارئین کے حلقے کی غیر معمولی وُسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر میں اِن سب خطوط کے جواب لکھنے لگوں تو یقین کیجئے لکھنے کا کوئی اور کام نہیں کر سکتا۔ بعض خطوط ضرور ایسے ہوتے ہیں جن کے جواب لکھنے پر طبیعت خود بخود مائل ہوتی ہے ——— ایسا ہی ایک خط پچھلے دنوں لائلپور (پاکستان) سے ایک صاحب افتخار حسین شیراز بخاری کی طرف سے موصول ہوا ہے جس میں اُنھوں نے "افسانہ نمبر" میں "منشی پریم چند سے انٹرویو" پڑھ کر مجھے اِس ادبی خدمت پر مبارکباد دینے کے بعد لکھا ہے کہ اُس انٹرویو میں مجھ سے بعض معاملات میں ذرا سی چُوک ہو گئی ہے۔ مثلاً اس سوال کے جواب میں کہ آپ کی سب سے پہلی تخلیق کیا تھی؟ پریم چند کی طرف سے اِس امر کی طرف بھی اشارہ ہونا چاہئے تھا کہ سب سے پہلے اُنھوں نے ایک ڈرامہ لکھا تھا، جس میں اُن کے ماموں کے کردار کا عکس تھا۔ یا اگر ناول ہی کی طرف اشارہ مقصود تھا تو اُن کے ناول "پرتاپ چندر" کا نام بھی لیا جا سکتا تھا اور اِس استفسار کے جواب میں کہ کن کن ادیبوں کے طرزِ نگارش سے متاثر ہو کر آپ نے لکھنا شروع کیا۔ پریم چند کی ذہن سے صرف دو ہندو ادیبوں کے اسلوبِ نگارش سے کچھ کچھ متاثر ہونے کا اقرار ہے حالانکہ "طلسم ہوشربا" کے اندازِ نگارش سے بھی شروع شروع میں پریم چند نے اثر لیا تھا۔ "سوزِ وطن" کا مجموعہ سراسر اُسی اثر کو لئے ہوئے ہے۔ اِس کے علاوہ پریم چند آخر تک اپنی کہانیوں میں کسی نہ کسی رنگ میں شرر، ڈپٹی نذیر احمد اور بعض مغربی اور مشرقی ادیبوں سے متاثر رہے اور اِس سوال کے جواب میں کہ مہاتما گاندھی کے عقائد سے تو آپ غیر معمولی طور پر متاثر ہیں لیکن کیا آپ نے اپنی عملی زندگی میں گاندھی جی کا مسلک اپنانے کی کوشش بھی کی ہے؟ پریم چند کی طرف سے اِس بات کو واضح کرنے کی ضرورت تھی کہ منشی جی گاندھی جی سے بعض نظریات میں اتفاق رکھتے تھے اور بعض نظریات میں اختلاف۔ اُنھوں نے کبھی ہر چیز کے ساتھ سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر ہمدردی نہیں جتائی بلکہ خالصتاً اُن کے مسائل کو انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے

پیش نظر صحیح کیا اور اُن کے حل کی صورتیں اپنی کہانیوں اور اپنے ناولوں میں پیش کرتے رہے۔ منشی جی نے گاندھی کی بہت سی باتوں کے بعض میدانِ عمل میں واضح لفظوں میں اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ اپ بہت سی کہانیوں میں وہ تشدد پسند بھی نظر آتے ہیں۔ پھر اس کے بعد اس بات سے کے جواب میں کہ کیا آپ کی مانند ان کی زندگی سے کوئی کہانی وابستہ نہیں؟ اپنے معلوماتِ فرحت کو بطورِ احسن پورا نہیں کیا گیا کیونکہ در اصل منشی جی کی پہلی بیوی کا انتقال ۱۹۰۴ء میں ہوا تھا اور دراصل اس کے بعد کا انتظار ہی کیا گیا بلکہ منشی جی کی سوتیلی ماں کے نارو اسلوک سے تنگ آ کر جب وہ بے چاری اپنے میکے چلی گئی تو پریم چند نے اپنی سوتیلی ماں کے اصرار پر دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں کے برتاؤ اور دباؤ کو تو شیورانی دیوی بھی برداشت نہ کر سکیں اور وہ بھی تقریباً آٹھ سال تک اپنے میکے ہی میں رہیں ۔۔۔۔۔ سب سے پہلے تو اس گراں قدر گرامی نامے کے لئے شیراز صاحب کا شکر گزار ہوں اور اس کے بعد میری گزارش یہ ہے کہ میں نے پریم چند کی زندگی اور اُن کے فن پر کوئی تنقیدی یا تحقیقی مقالہ قلم بند نہیں کیا۔ منشی جی کی کسی ذاتی کمزوری کو چھپانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جیسا کہ اس انٹرویو کے ساتھ آپ کے نام میرے خط سے ظاہر ہے اسے میں نے منشی جی کے مضامین اور خطوط کے بعض اقتباسات سے مرتب کیا ہے۔ پریم چند کے جوابات میں ایک لفظ کی ترمیم بھی میں نے اپنی طرف سے نہیں کی۔ خط بہت زیادہ طوالت اختیار کر جاتے گا ورنہ اُن تمام اقتباسات کے بارے میں بھی وضاحت سے لکھ دیتا کہ وہ منشی جی کے کس کس مضمون اور خط سے ماخوذ ہیں ۔۔۔۔۔ اس حقیقت کے باوجود شیراز صاحب کے خیالات لائقِ ستائش ہیں۔ اگرچہ اُن کی بعض باتوں سے مجھے اختلاف بھی ہے . . .

آپ کا اپنا ۔۔۔۔۔۔ زرش کمار شاد

شاد ۔ ڈاکٹر صاحب! پہلے تو یہ فرمائیے کہ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے اور آپ نے کہاں کہاں سے اور کہاں تک تعلیم حاصل کی؟

احتشام ۔ آپ نے مجھے ڈاکٹر کہا ہے۔ پہلے اس کی تصحیح کر دیجئے میرے پاس ڈاکٹری کی کوئی سند نہیں ہے۔ پیدا تو ہوا ہوں ۲۱ اپریل ۱۹۱۲ء کو لیکن عام طور سے ۱۱ جولائی ۱۹۱۲ء لکھتا رہا ہوں کیونکہ اسکول کے کاغذات میں یہی تاریخ لکھائی گئی تھی۔ ۲۱ اپریل کا یقین اس لئے ہے کہ یہ تاریخ گھر کے بعض قدیم کاغذات میں اور عزیزوں کے بعض خطوط میں مل گئی اور والدہ نے جو عربی مہینے کی تاریخ بتائی، وہ بھی اس سے مطابقت رکھتی ہے۔ بمقام پیدائش کی بھی صورت یہ ہے کہ میں ہر جگہ قصبہ ماہل ضلع اعظم گڑھ لکھتا رہا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری پیدائش ماہل سے پندرہ سولہ میل دور جون پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی۔ جہاں میرا خاندان پندرہ بیس دن کے لئے ماہل میں طاعون پھیل جانے کی وجہ سے منتقل ہو گیا تھا۔ لیکن مستقل وطن ہونے کے باعث میں اکثر و بیشتر ماہل ہی کو اپنا وطن قرار دیتا ہوں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر، پھر ماہل کے ایک اسکول میں ہوئی۔ ہائی اسکول اعظم گڑھ کے ویسلی ہائی اسکول سے پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد الٰہ آباد سے بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے۔ ایل۔ ایل۔ بی میں پڑھ رہا تھا کہ ۱۹۳۹ء میں ملازمت مل جانے کی وجہ سے تعلیم سے کنارہ کش ہو گیا۔

شاد ۔ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب اور کیونکر ہوا۔ سب سے پہلی تخلیق کب لکھی اور کہاں شائع ہوئی؟

احتشام ۔ یہ تو یاد نہیں کہ بالکل ابتدا میں کیا کیا لکھا لیکن یہ یاد ہے کہ ۱۹۲۷ء کے بعد سے افسانے لکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا تھا لیکن جہاں تک یادداشت کام کرتی ہے، سب سے پہلا مضمون جو شائع ہوا وہ مسٹر میکڈانلڈ وزیرِ اعظم برطانیہ کے کیوں نہ افراد پر تبصرہ تھا جو ناشی کے عنوان سے شائع ہوا۔ پھر جلد جلد چند مضامین اور افسانے "نگار" لکھنؤ، "سرپنچ" لکھنؤ، "حریم" لکھنؤ، "نظارہ" لکھنؤ، "نیرنگِ خیال" لاہور اور "جہانگیر" لاہور میں شائع ہوئے۔

شاد ۔ کن کن ملکی اور غیر ملکی ادیبوں سے متاثر ہو کر آپ نے لکھنا شروع کیا؟

احتشام ۔ ابتدا میں غیر ملکی ادب کا رجحان بالکل نہیں تھا ۔۔۔ [illegible] سب سے گہرا اثر تو [illegible]

نمایاں ہے۔ بعد میں اثرات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور سیکڑوں ملکی اور غیر ملکی ادیبوں سے خوشہ چینی کا موقع ملا لیکن یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ درحقیقت اثر کن کن ادیبوں کے پڑے۔

د۔ اقبال اور پریم چند کے بعد آپ اُردو کا سب سے بڑا شاعر اور افسانہ نگار کسے سمجھتے ہیں؟

ام۔ یہ کچھ طالب علمانہ سا سوال ہے۔ اس کا جواب قطعی شکل میں دینا تو ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ میری پسندیدگی یکسر غیر جذباتی ہے۔ اچھے نظم و نثر لکھنے والوں میں کبھی کسی کی تخلیق بہت اچھی معلوم ہوتی ہے کبھی کسی دوسرے کی۔ اس لئے ترجیحات معین اور اٹل نہیں ہیں۔ شاعروں اور نثر نگاروں میں چند نام لکھتا ہوں، جنھیں میں صفِ اوّل کے شاعروں اور افسانہ نگاروں میں شمار کرتا ہوں۔ مثلاً جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، فیض احمد فیضؔ، جمیلؔ مظہری اور افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی۔ اگر شاعروں اور افسانہ نگاروں کے علاوہ بھی نام لینا ضروری ہوں تو میں ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر عابد حسین، غلام السیدین، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی کے نام بھی شامل کر لوں گا۔ نئی نسل والوں کی بھی ایک اچھی خاصی فہرست میرے ذہن میں ہے، جن کا ذکر مختلف مضامین میں بار بار کرتا رہا ہوں لیکن آپ کا سوال اتنے طویل جواب کا مطالبہ نہیں کرتا۔

اد۔ بہترین شعر اور بہترین افسانے کی آپ کے نزدیک مختصر ترین تعریف کیا ہے؟

تشام۔ جو شعر یا افسانہ فن کی کچھ خصوصیات کے ساتھ میرے ذہن اور جذبے دونوں کو متاثر کرتا ہے، اُسی کو میں اچھا شعر اور اچھا افسانہ کہتا ہوں۔

اد۔ کیا ہمارا موجودہ ادب جمود کا شکار ہے؟ اگر ہے تو اس کی وجہ؟ اور اگر نہیں تو یہ مسئلہ پیدا ہی کیوں ہوا؟

تشام۔ مجھے اُردو ادب میں قطعاً جمود نہیں دکھائی دیتا۔ یہ سوال اُن نئے پرانے ناآسودہ ادیبوں نے پیدا کیا ہے، جنھیں بدقسمتی سے وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جسے وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ اور غالباً دوسرا سبب یہ ہے کہ آج ادبی اور فنی قدروں کے تعین میں بڑی افراتفری ہے اور بہت سے لوگ یہ سمجھنے سے معذور ہیں کہ ادب میں کیا ہوتا ہے اور کیا ہونا چاہئے۔

اد۔ آپ کے سیاسی نظریات کیا ہیں اور کیا ہر ادیب کے لئے کسی مخصوص سیاسی نظریے کا حامی ہونا ضروری ہے؟

احتشام۔ اگر سیاسی نظریے سے آپ کی مراد کسی سیاسی پارٹی کا نظریہ ہے تو میرا کوئی نظریہ نہیں لیکن ویسے میں اپنے طور پر اشتراکیت کے اکثر و بیشتر اصولوں کو پسند کرتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اُسی مفہوم میں ایک ادیب کا سیاسی نظریہ ہو سکتا ہے جسے ہم دوسرے لفظوں میں زندگی کا تصور کہہ سکتے ہیں اور جس کے بغیر اعلیٰ ادب کی تخلیق میرے خیال میں ناممکن ہے۔

شاد۔ آپ ادب میں افادیت اور مقصدیت کے کس حد تک قائل ہیں؟

احتشام۔ میرے خیال میں افادیت اور مقصدیت سے کوئی ادب خالی نہیں۔ صرف اس کی ضرورت ہے کہ ہمیں ادب اور فن کے سلسلے میں افادیت اور مقصدیت کے معنی معلوم ہوں۔

شاد۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا اب یہ تحریک ختم ہو گئی ہے اور کیا اب اس کی ضرورت نہیں رہی؟

احتشام۔ جو لوگ اسے سیاسی تحریک سمجھتے تھے اُن کے لئے یقیناً یہ تحریک ختم ہو گئی ہے لیکن ادب میں ترقی پسند تحریک نے جن قدروں کو بنیادی جگہ دی تھی اُن کا اب بھی ذکر آتا رہتا ہے اور اس وقت تک آتا رہے گا جب تک وہ جمہوری اور انسانیت نواز قدریں عام نہ ہو جائیں، جن کے لئے ہر مہذب انسان نہ صرف سوچتا رہتا ہے بلکہ اپنے دائرے میں کسی نہ کسی حیثیت سے اُن پر عمل بھی کرتا ہے۔ یہ عمل انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ مادی بھی ہے اور روحانی بھی۔ قومی بھی ہے اور بین الاقوامی بھی۔ عصری بھی ہے اور آفاقی بھی۔

شاد۔ اُردو کے بالکل نئے ادیبوں میں آپ کی نظر میں کون کون سے قابلِ ذکر ادیب ہیں؟

احتشام۔ شاد صاحب! بات یہ ہے کہ مجھے یہ سمجھنے میں ہمیشہ دشواری ہوتی کہ بالکل نئے ادیبوں کا سلسلہ کہاں سے شروع کیا جائے۔ اس لئے اس سوال کے جواب میں صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ ہر بار رسائل میں ایک دو ایسے نام نظر آجاتے ہیں جن کی (۱) سے پہلے کوئی چیز نہیں پڑھی ہوتی لیکن جو چیز نظر کے سامنے ہوتی ہے وہ بہت اچھی ہوتی ہے۔ مجھے خبر نہیں ہوتی کہ وہ اس کی پہلی تخلیق ہے یا بدقسمتی سے میں ہی اسے پہلی بار پڑھ رہا ہوں۔ اس لئے ناموں کی فہرست طویل ہی نہیں ہوتی جا رہی ہے بلکہ گھٹتی چلتی بھی رہتی ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ نئے ادیبوں کو جتنا پڑھ سکوں پڑھوں اور جب اُن کی بہت سی چیزیں دیکھ چکا ہوں کے سامنے آجائیں تو کوئی رائے قائم کروں۔ بعض نام گنانے میں خطرہ یہ ہے کہ شاید اس وقت سامنے نام

ذہنوں میں نہ ہوں اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ میں بعض لوگوں کو قابلِ ذکر ہی نہیں سمجھتا۔ اس دشواری کی وجہ سے بہت سے نام گنانا مناسب نہیں ہوگا۔ اگر ۱۹۴۷ء سے بھی شروع کروں تو فہرست خاصی طویل ہے۔

شاد۔ آپ کے خیال میں کسی ادیب اور شاعر کے شعور کی جستجو کس حیثیت سے کی جا سکتی ہے؟

احتشام۔ کسی ادیب اور شاعر کے شعور کی جستجو کئی حیثیتوں سے کی جا سکتی ہے کیونکہ شعور کی انفرادیت میں جماعتی ضرورتوں اور خواہشوں کے بہت سے پرتے گرتے اور بہت سے اٹھتے ہیں۔ ماحول کی مادی بنیادوں سے لے کر خوابوں کی رنگا رنگی تک نہ جانے کتنی منزلیں ہیں اور ہر منزل انسانی شعور پر اپنا عکس چھوڑتی ہے۔ گو اصل بنیاد معاشی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے معین ہوتی ہے لیکن دوسرے اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح فرد کا شعور مخصوص مادی حالات اور سماجی ماحول میں مسلسل عمل اور ردِ عمل سے تشکیل پاتا ہے۔ کسی کے پاس بنا بنایا شعور نہیں ہوتا بلکہ بنتا ہے اور حالات بدلیں تو بدل بھی جاتا ہے۔ انسان ماحول کو بدلتا ہے اور اس کے بدلنے میں خود بھی بدل جاتا ہے۔ اس طرح فرد کے شعور کے مطالعے میں، سماج کی بدلتی ہوئی مادی حالت کا مطالعہ ایک جزوِ لازم کی حیثیت سے شامل ہو جاتا ہے۔ عمل اور ردِ عمل کا یہی تسلسل ہے جس کے نظر انداز ہو جانے سے فرد کا شعور گرفت میں نہیں آتا۔

شاد۔ کیا آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شاعر اور فنکار کا طبقاتی رجحان اس کے فلسفۂ حیات کا پتہ دیتا ہے؟

احتشام۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر اور فنکار کا طبقاتی رجحان اس کے فلسفۂ حیات کا بہت کچھ پتہ دیتا ہے لیکن محض یہ دیکھنا کہ شاعر کس طبقہ میں پیدا ہوا یا سماج کے کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے کافی نہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے زندگی کی کشمکش کے سمجھنے میں اپنے ذہن اور شعور کی توسیع کس طرح کی اور عصری مسائل کے سمجھنے کے سلسلے میں اس کا کیا رویّہ رہا۔ محض کسی طبقے میں پیدا ہونا ایک شخص کو اس طبقے کا نہیں بناتا بلکہ اس طبقے کے مفاد کی ترجمانی کرتے رہنا، اس کی بقا کی جدوجہد میں حصّہ لیتے رہنا طبقاتی شعور کی سطح کو متعین کرتا ہے۔

شاد۔ آپ کے نزدیک نقاد کا منصب کیا ہے؟

احتشام۔ نقاد کا منصب یہ ہے کہ وہ ادیب کے محرکاتِ تخلیق کا پتہ لگائے۔ ان سرچشموں کا منبع تلاش کرے جہاں سے ادیب نے زندگی حاصل کی ہے۔ اس فلسفے کو ڈھونڈ نکالے جو ادیب کے خیالات کو ایک مربوط شکل میں پیش کرنے کا ذریعہ بنا۔ اس طرح یقیناً ایک منزل میں تو نقاد کو بھی ادیب کے ساتھ ہر وادی و کہسار میں چلنا پڑے گا اور ہر صحرا کی خاک چھاننی پڑے گی لیکن اس کا کام یہیں ختم نہ ہو جائے گا بلکہ آگے بڑھ کر وہ ادیب کے ذہنی سفر کا تجزیہ کر کے اس کے حقیقی خیالات اور معاشی تعلقات کا پتہ چلائے گا۔ ادیب کی جانب داری کا ذکر کرے گا اور ارتقائے تہذیب میں ادیب کے کارناموں کی جگہ متعین کرے گا۔

شاد۔ آپ خیال کو مقدم سمجھتے ہیں یا اسلوب کو؟

احتشام۔ اس پر بارہا بہت تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ مختصراً پھر عرض کرتا ہوں۔ اعلیٰ ادب کی تخلیق میں مجھے ان دونوں کا وجود لازمی نظر آتا ہے۔ رہی خیال کی اوّلیت، اس کا میں کسی حد تک اس لئے قائل ہوں کہ بغیر کسی جذبے، خیال، تجربے یا موضوع کے لکھنے کی تحریک نہیں ہو سکتی۔ صرف اسلوب کبھی اعلیٰ تخلیق کا محرک نہیں ہوا۔ اس معنی میں خیال کو اسلوب پر اوّلیت حاصل ہو سکتی ہے لیکن فنی تکمیل کی منزل پر پہنچ کر دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔

شاد۔ اپنے ہم عصر تنقید نگاروں میں کون کون سے تنقید نگار آپ کو پسند ہیں؟

احتشام۔ ہم عصر نقادوں میں آل احمد سرور، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، ممتاز حسین، فراق گورکھپوری، عبادت بریلوی، وقار عظیم، اختر اورینوی، سجاد ظہیر اور محمد حسن کی تنقیدیں تو اکثر و بیشتر پڑھتا رہتا ہوں لیکن کلیم الدین احمد، حسن عسکری، خورشید الاسلام، خلیل الرحمٰن اعظمی، ریاض احمد، جمیل جالبی اور بعض جدید تر نقادوں کی تحریریں بھی بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اور ان کے بعض مضامین پسند بھی کرتا ہوں۔

شاد۔ تنقید نگاری کے علاوہ خود لکھنے کی حد تک آپ کو ادب کی اور کس کس صنف سے دلچسپی ہے؟

احتشام۔ اب تو تنقید کے علاوہ بس کبھی کبھی ایک آدھ شعر کہہ لیتا ہوں اور دل ہی دل میں ناکردہ گناہوں کی حسرت پر پیچ و تاب کھاتا ہوں کیونکہ کبھی کبھی دل میں ناول، افسانہ اور ڈرامے کے علاوہ سماجی علوم پر کچھ لکھنے کی آگ بھی بھڑکتی ہے لیکن وقت کی تنگی، مشغولیت اور حالات کی سرگرانی اسے ٹھنڈا کر دیتی ہے۔

شاد۔ تخلیقِ ادب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے ادیب کو یک گونہ سکون حاصل

ہوتاہے۔ آپ اِس پہلو کو کس حد تک اہمیت دیتے ہیں؟

احتشام۔ بہت زیادہ اہمیت دیتا ہوں بشرطیکہ یہ ذہنی بیماری کی شکل میں نہ ہو۔

شاد۔ آپ کی ادبی زندگی میں آپ کی سب سے زیادہ رہنمائی کس نے کی؟

احتشام۔ میرے خیال میں میری سب سے زیادہ رہنمائی احتشام حسین ہی نے کی ہے۔ کیونکہ میں نے خود ہمیشہ اپنے خیالوں اور تحریروں کا سختی سے احتساب کیا ہے اور دوسروں کی کوئی بات اُس وقت تک قبول نہیں کی جب تک کہ میرے دل نے بھی اُسے قبول نہ کیا۔ ادب کے سلسلے میں یہ بات کسی قدر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ عملی زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں کمزوری برتتا ہوں۔

شاد۔ حب الوطنی اور بین الاقوامی اخوّت میں آپ کسے ترجیح دیتے ہیں؟

احتشام۔ مجھے تو دونوں میں کوئی تضاد یا اختلاف نظر نہیں آتا۔ مجھے حب الوطنی اور بین الاقوامی اخوّت دونوں عزیز ہیں۔ اِن میں ترجیح کا بھی کوئی سوال نہیں ہے۔ ہاں جارحانہ قوم پرستی اور عام انسان دوستی میں انتخاب کا سوال ہوتا تو دوسری بات تھی۔

شاد۔ آپ کی زندگی کا کوئی اہم واقعہ جس نے آپ کی ادبی زندگی پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو۔

احتشام۔ جہاں تک ادبی زندگی پر غیر معمولی اثر ڈالنے کا سوال ہے مجھے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے سوا اور کوئی دوسرا واقعہ یاد نہیں آرہا ہے۔ ویسے وہ محرکات جنھوں نے شعر کہلائے یا افسانے لکھنے پر مجبور کیا، اُن کا براہِ راست تعلق ادبی زندگی سے نہیں ہے۔

شاد۔ کیا ادیب کی زندگی میں شراب اور عورت کو خاص اہمیت حاصل ہے؟

احتشام۔ ہر ادیب کی زندگی میں تو نہیں ہے لیکن کچھ ادیبوں کی زندگی میں ہوسکتی ہے۔ میرے خیال میں شراب اور عورت ہی کیا انفرادی طور پر کوئی چیز، کوئی نقطۂ نظر، کوئی تصوّر ایسی ہی اہمیت اختیار کرسکتا ہے۔

شاد۔ اور کیا اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے؟

احتشام۔ یُوں بھی ہوتا ہے اور اِس کے برعکس بھی۔ ایک بات اور یاد رکھنے کی ہے کہ اچھائی ایک اضافی تصوّر ہے۔ اُسے کسی پر منطبق کرتے وقت بہت غور و فکر سے کام لینے کی ضرورت ہوگی۔ دونوں کا ربط معلوم کرنے کا کوئی معیّن پیمانہ نہیں ہے۔

شاد۔ کیا ادب ادیب کی شخصیّت کا ترجمان ہوتا ہے؟

احتشام۔ شخصیّت ادب میں بڑے پیچیدہ طریقوں سے نمایاں ہوتی ہے، اِس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ زندگی کے ظاہری نقوش اور ادب میں کوئی واضح ربط دکھائی دے لیکن کسی نہ کسی شکل میں ادیب کی شخصیت کا سب سے اچھا اظہار اُس کی تخلیق ہی میں ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ قاری کی گرفت میں آسکے یا نہ آسکے۔

شاد۔ تو کیا ایک قاتل یا ڈاکو کا تخلیق کیا ہوا ادب بھی ظاہری طور پر نہ سہی باطنی اعتبار سے اُس کی شخصیت کا ترجمان ہوگا؟

احتشام۔ قاتل اور ڈاکو ہر وقت قاتل اور ڈاکو نہیں ہوتا۔ اِس لئے اگر وہ کچھ لکھے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ اُس کی زندگی کے یہ پہلو بھی اُس کی تخلیق میں جگہ پائیں۔

شاد۔ لیکن کچھ اصحاب کے خیال میں ادب ادیب کی شخصیت کا نہیں بلکہ شخصیت سے اُس کے فرار کا عکس ہوتا ہے۔

احتشام۔ بیمار اور مُجرم ذہنوں کے لئے ہوسکتا ہے کہ وہ غیر شعوری یا شعوری طور پر اِس کی کوشش کریں۔

شاد۔ آخر میں صرف یہ اور فرما دیجئے کہ آپ کے خیال میں ہندوستان میں اُردو کا مُستقبل کیا ہے اور کیا آپ اِس خیال سے متفق ہیں کہ ہندوستان میں اُردو کی بقا کی صرف یہی صورت ہے کہ دیوناگری رسم الخط کو اپنا لیا جائے۔

احتشام۔ اُردو کے لئے دیوناگری رسم الخط اپنانا اُردو کی بقا کا کسی شکل میں ضامن نہیں ہوسکتا۔ یہ اُردو کی بقا کے بجائے اُس کی انفرادیت کو ختم کرنے کا ایک نعرہ ہے لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُردو کی اشاعت دیوناگری یا رومن رسم الخط میں نہ کی جائے۔ رہا ہندوستان میں اُردو کے مُستقبل کا سوال۔ اِس کا جواب تو وقت ہی دے سکے گا۔ اِس وقت حالات یقیناً اچھے نہیں ہیں۔

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑکر خوشخط لکھا کریں۔ اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کردئے جاتے ہیں۔ مضامین کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نوآموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مُرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں اُنھیں واپس کردئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پُورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (ایڈیٹر)

غزلیں

ڈاکٹر امرت لعل عشرت ایم اے۔ ڈی لٹ

جو اس کے سائے میں گزرے رہے شگفتہ حیات
تری جھکتی ہوئی زلف ہے بہار کی رات
پڑا ہے گردنِ مینا میں جب سے اپنا ہات
غمِ حیات کے ہاتھوں سے مل گئی ہے نجات
تو اپنے عرش پہ ہونے کا کچھ ثبوت تو دے
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں جانے کب سے حیات
دلوں کے پھول کھلائیں گے ہم کہ لائے ہیں!
نفس نفس میں نسیمِ سحر کی تاثیرات
ہماری طرح بیاباں میں ہو کے خاک بسر
یہ کس کو ڈھونڈتی پھرتی ہے پوسے چاندنی رات
نہ توڑی جام ہی چھلکا نہ آپ ہی آئے
لئے تو کیسے لئے ایسی خشک سی برسات

قمر اقبال

یہ تو سچ ہے کہ قفس میں بھی ستم ہی ہوں گے
ہاں مگر صحنِ گلستاں سے تو کم ہی ہوں گے
خیر مقدم کو بچھائے ہوئے پلکیں اپنی
ان کی راہوں میں ہر اک موڑ پہ ہم ہی ہوں گے
زخمِ نامعتبرِ نظر سادہ دل پہ ہیں ابھی
جانے والے یہ ترے نقشِ قدم ہی ہوں گے
کبھی سایہ، کبھی خوشبو، کبھی آنسو بن کر
تیرے دامن کو سنبھالے ہوئے ہم ہی ہوں گے
ہم اسیرانِ محبت جنھیں کہتے ہیں کرم
وہ بھی شاید ترے اندازِ ستم ہی ہوں گے
سوئے مقتل جو کفن باندھ کے نکلے ہیں قمر
سر کی کیا فکر کریں سر تو قلم ہی ہوں گے

عرش صہبائی

اک نہ اک یاد مرے دل سے لپٹ جاتی ہے
جب کبھی رات گئے نیند اُچٹ جاتی ہے
سیج پھولوں کی ضروری نہیں جینے کے لئے
جو سلیقہ ہو تو کانٹوں پہ بھی کٹ جاتی ہے
سوچتا ہوں کہ تری یاد کی آہٹ ہوگی
بارہا دل سے اک آواز پلٹ جاتی ہے
آپ ہلکے سے تبسم کا تکلف نہ کریں
زندگی غم کے سہارے بھی تو کٹ جاتی ہے
جب کبھی عمرِ گذشتہ پہ نظر کرتا ہوں
دامنِ دل سے تری یاد لپٹ جاتی ہے
عرش کیا کہیئے کسی کی وہ فسوں ساز نظر
دیکھتے دیکھتے کایا ہی پلٹ جاتی ہے

ناصر صدیقی

ہم سادگی سے وعدۂ فردا پہ ٹل گئے — اب سوچتے ہیں دل میں تمنا ہے اور بھی
اتنا ہی وہ بعید رہا ہے خیال سے — جتنا اُسے قریب سے دیکھا ہے اور بھی
یوں ہے اگر تو کیوں نہ ہوا اس سے کنارہ کش — واعظ یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا ہے اور بھی
کچھ اس طرح سے نقش ہوا ہے ترا خیال
جتنا بگاڑ دیں اُسے بنتا ہے اور بھی



دستکاریاں

ہمارا قابلِ فخر ورثہ

ہزار ہا برسوں سے نسل بعد نسل، ہمارے دستکاروں کو اپنے فن سے والہانہ لگاؤ رہا ہے، اِس لگن کی بدولت ہماری دستکاریوں کی انفرادیت ابھری، حُسن وافادیت کے حیرت انگیز نمونے تخلیق ہوئے اور بھارت کو ایک قابلِ فخر ورثہ ملا۔

فن، جس کی کوئی معراج نہیں، محض روائتی رہ کر، جمود پذیر ہو جاتا ہے، اُس میں زوال آجاتا ہے، اور ایک عرصہ تک ہوا بھی یہی، لیکن آزادی کے بعد آل انڈیا ہینڈی کرافٹس بورڈ کے قائم ہونے سے ہماری دستکاریوں نے کروٹ بدلی۔ دستکاروں کو نئی تحریک ملی، بورڈ نے دہلی، بنگلور، کلکتہ اور بمبئی میں چار علاقائی ڈیزائن سنٹر قائم کئے۔ اِن مرکزوں میں نئے نئے ڈیزائینوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ جن میں روائتی ڈیزائینوں کی خوبصورتی اور دلکشی ہے اور جو بدلتے ہوئے مزاج اور جمالیاتی شوق کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ نئی تکنیک، نئے خام مال کے استعمال اور نئے نئے طریقوں کو اپنانے سے ہماری دستکاری میں تازگی اور نئی آب و تاب آگئی ہے۔

دستکاری کے بے شمار شاہکار جو قیمتاً سستے ہیں، آپ کے کسی بھی کام آسکتے ہیں، آپ کے گرد و پیش حُسن اور آسودگی کے ضامن ثابت ہو سکتے ہیں۔

آل اِنڈیا ہینڈی کرافٹس بورڈ

افسانہ

کوڑاخانہ

وجاہت علی سندیلوی بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

نصرت منزل ۔ سندیلہ

۱۰ رجولائی ۱۹۶۵ء   معظمی ومکرمی ایڈیٹر صاحب! خلوص و نیاز

ایک افسانہ "کوڑاخانہ" ارسالِ خدمت ہے۔ آپ سے بہتر اس حقیقت کو اور کون سمجھ سکتا ہے کہ ہر انسان بنیادی طور پر شریف ہوتا ہے اور اکثر شرافت کے اصول جو بڑی اونچی حویلیوں سے زیادہ جھونپڑوں میں پائے جاتے ہیں ——

"بیسویں صدی" کا افسانہ نمبر ہر حیثیت سے ایک خصوصی نمبر ہے . . .

راقم ——— وجاہت علی سندیلوی

چُنّی کی کوٹھری کے چھپر کے نیچے شام ہی سے پھر کوئی جھگڑا ہو رہا تھا۔ اُس کے دو پرستار آپس میں تُو تُو مَیں مَیں کر رہے تھے اور محلے کے دس بارہ بے فکرے کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جب لڑائی کی آگ کچھ ٹھنڈی پڑنے لگتی تو بیچ میں بول کر اُسے پھر ہوا دینے کی کوشش کرتے اس شور غل میں کبھی کبھی چُنّی کی آواز بھی سُنائی دیتی۔ "جھگڑا بکھیڑا کرنا ہے تو کہیں اور جاکر کرو۔ اس کے لئے کیا میرا جہنم جلی ہی کا گھر رہ گیا ہے۔ میں کہتی ہوں ان بھانڈ پھرے مردُودوں کو ذرا بھی لاج نہیں آتی!" —— شاید وہ اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے محلے والوں کو سُنانا چاہتی تھی۔

قریب کے تماشائیوں سے تھوڑی دُور محلے کے مرد اور عورتیں اپنے اپنے دروازوں اور کھڑکیوں پر کھڑے اِس ہنگامے سے دلچسپی لے رہے تھے اور ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال بھی کرتے جاتے تھے

"پوری شیطان کی خالہ ہے یہ چنّی کی بچی!"

"اِس عمر میں بھی اس کا یہ حال ہے!" —

"ایسی عورت کو محلے والے نہیں معلوم کیسے برداشت کرتے ہیں؟"

"اب یہ گلی شریف بہو بیٹیوں کے رہنے کے قابل نہیں رہی"

"کتنی کوکھ جلی ہے اور ابھی تک چاہنے والے کٹے مرتے ہیں اس کل موہی پر!"

میرا مکان گلی کے دوسری طرف پانچ چھ مکان چھوڑ کر تھا۔ لیکن اپنے مکان کے برآمدے میں جہاں میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا، وہاں سے چُنّی کا چھپر دکھائی دیتا۔ کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوتیں اِس لئے سمجھ میں نہ آتا کہ جھگڑا کس بات پر ہے۔ میرے پڑوسی عبدالشکور خاں اپنے دروازے پر کھڑے بڑے انہماک سے سب کچھ دیکھ اور سُن رہے تھے اور جھگڑا کرنے والوں کی آوازوں پر کان لگائے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے مخاطب کرکے ہنستے ہوئے بتایا۔ "گردھاری کہتا ہے جب اُس نے منع کر دیا تھا تو آج پھر رحیم چُنّی کے یہاں کیوں آیا؟"

"اور رحیم کیا کہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں؟" خاں صاحب نے قہقہہ لگایا۔

اور پھر اس سارے ہنگامے کے درمیان کیلاناتھ شرما ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولس کی آواز گونجی "چلو بھاگو تم سب لوگ یہاں سے! حرامزادوں نے شریفوں کے محلے کو چکلا بنا دیا ہے! ابھی سالوں کی چمڑی اُدھیڑ کر نہ رکھ دوں تو میرا نام نہیں! بھاگو یہاں سے! اور اب تمہاری صورت دکھائی یہاں تو اتنے جوتے ماروں گا کہ صورت نہ پہچانی جائے گی!" ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے اپنی پولس کی ملازمت کی یادگار کچھ ایسی فحش اور مغلظات گالیاں سُنائیں کہ دم بھر میں بھیڑ چھٹ گئی۔ اُن کی چٹ پٹی گالیوں کو مرد تحسین سے اور عورتیں اشتیاق سے سنتیں۔ لیکن اُن کے تھانیداری غصے سے سارا محلہ ڈرتا اور اُس وقت اُنھیں واقعی غصہ آگیا تھا۔ دوسرے لوگوں سے چھپر خالی ہوگیا تو اُس کے قریب جاکر انھوں نے چُنّی کو ڈانٹا۔ لیکن اُس ڈانٹ میں کچھ تھوڑی سی مٹھاس بھی شامل تھی۔ "آخر تم اِن لفنگوں کو اپنے یہاں کیوں آنے دیتی ہو؟"

"میں کیا کروں داروگا جی! ہزار دفعہ منع کیا، مگر یہ حرامی کے پلّے خود ہی جمع ہو جاتے ہیں آوارہ کتّوں کی طرح!" چُنّی کے جواب میں کچھ ایسی گھلاوٹ اور بے تکلفی تھی کہ سمجھنے والے اُس سے بہت کچھ سمجھ سکتے تھے۔

"ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!" خاں صاحب نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا اور اپنے مکان کے کواڑ اندر سے بند کر لئے۔

حدیثِ دل

جھوٹ ہی سہی وعدہ، کیوں یقیں نہ کر لیتے
بات دلفریب اُن کی، دل اُمیدوار اپنا —— فراقؔ گورکھپوری

اُف یہ تنہائیٔ حیات کہ دل
تیری آواز کو ترستا ہے —— محمد علی تاجؔ

یہ وصال و ہجر کی بحث کیا، کہ عجیب چیز ہے عشق بھی
تجھے پا کے ہے وہی دردِ دل، وہی رنگ زخمِ جگر بھی ہے —— فراقؔ گورکھپوری

دل میں فانیؔ اِک نہ اِک ہنگامہ برپا ہی رہا
شوق تھا جب تک، کسی کے شوق کا ماتم نہ تھا —— فانیؔ بدایونی

دیکھ دل کی زمیں لرزتی ہے
یادِ جاناں! قدم سنبھال اپنا —— فانیؔ بدایونی

چُنّی کی عمر پینتیس سے پینتالیس کے درمیان کچھ بھی ہو سکتی تھی لیکن وہ ایسی عورت تھی جو کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ تیکھے ناک نقشے، ہلکے سانولے رنگ اور کوری کمان جیسی کاٹھی کے ساتھ وہ اب بھی جب اِٹھلا کر چلتی تو دیکھنے والوں کی نظریں اُس پر اُٹھتیں اور رُک جاتیں، اور پھر اس کی آواز میں، جو کسی نوخیز دوشیزہ کی سی تھی، ایسی کھنک تھی کہ سننے والوں کو خود بخود دورانِ خون تیز ہوتا محسوس ہونے لگتا۔ پُرانے ناز نخرے اُس میں اب بھی باقی تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ ہتھیار بڑی حد تک کُند ہو چلے تھے۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کے مسکراتے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت اور بے فکری اب بھی پھوٹ پھوٹ کر برستی۔

اپنی زندگی کے ساتھ اگر چُنّی نے انصاف نہیں کیا تو اس کی زندگی نے اُس کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کی تھی اور اُسے اپنی ہر مسکراہٹ آنسوؤں سے خریدنی پڑی تھی۔ زمانے کے پیروں تلے جی بھر کر روندی اور مَسلی جانے کے باوجود اگر اس کے خمیر میں کوئی تازگی اور شگفتگی باقی تھی تو غالباً اُس کی صرف یہی وجہ تھی کہ اُس نے زندگی کے تلخ و ترش پر شکوہ اور شکایت کرنا نہیں، اُنھیں بھگتنا اور برداشت کرنا سیکھا تھا۔

وہ ابھی پندرہ برس کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ گاؤں میں اپنے سوتیلے باپ کے گھر سے ایک پڑوسی نوجوان کے ساتھ شہر بھاگ آئی تھی اور پھر نہیں معلوم وہ کتنے مَردوں کی محبوبہ اور منظورِ نظر بنتی رہی تھی اور نہیں معلوم کتنے شہروں اور قصبوں میں بھٹکتی پھری تھی۔ اُس کی پوری تفصیلات اب شاید خود اُسے بھی یاد نہیں تھیں کیونکہ منظر بہت تیزی سے بدلتا چلا گیا تھا۔ چند سال ہوئے جب محلّے کا کلّو نائی جو ہسپتال میں ملازم تھا، اُسے اپنے گھر لے آیا تھا۔ ہسپتال میں وہ اکثر عارضی ملازمتیں کرنے آیا کرتی اور اُسی سلسلے میں وہ ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے تھے۔

کلّو کی دُلہن بن کر چُنّی نے محلّے میں قدم رکھا تو سارے محلّے میں رونق پھیل گئی۔ کلّو بھی بڑا بھلا چنگا انسان تھا۔ کچھ دنوں تک اُس نے چُنّی کو بہت کچھ باندھے بڑی پابندیوں میں رکھا لیکن جب چُنّی نے اپنے نئے ماحول میں مضبوطی سے قدم جما لئے اور اس کے ارد گرد اُس کے دو چار چاہنے والے پیدا ہو گئے تو رفتہ رفتہ وہ کلّو کے قابو سے نکل کر اپنی من مانی کرنے لگی۔ کلّو اُسے ٹوکتا تو وہ صاف صاف کہتی "تو مجھے روٹی بنانے اور خدمت کرنے کے لئے لایا تھا سو وہ میں کر ہی رہی ہوں۔ اب اور کیا چاہتا ہے؟ میں کسی سے دو گھڑی ہنس اور بول لوں یہ بھی منع؟ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب تک تیرے گھر میں ہوں اور تیری کمائی کھا رہی ہوں، تیری امانت میں کوئی خیانت نہیں ہونے دوں گی۔" اور پھر وہ کھلکھلا کر اس طرح ہنستی کہ بڑھاپے کے سپاٹ دنوں میں بھی کلّو کو جوانی کی حسین راتیں یاد آ جاتیں۔

ٹائیفائڈ کے تابڑ توڑ دو حملوں نے اور اُن کے بعد گٹھیا کی شکایت نے کلّو کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ اپنی حالت دیکھ کر وہ بھی سمجھتا کہ چڑھتے دریا کا پانی اُس کی کچی دیوار سے کب رُکنے والا ہے۔ اس لئے آخر میں اُس نے چُنّی کو اُسی کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ چُنّی کلّو کے ساتھ قریب بارہ برس رہی اور اس طویل عرصے میں چھوٹی موٹی ہنسی دل لگی اور محلّے والوں پر اپنے ناز نخروں کے تیر چلانے کے سوا وہ خلافِ توقع ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری چھ مہینے کلّو نے فالج کی بیماری میں چارپائی پر لیٹ کر کاٹے تھے۔ چُنّی نے اس زمانے میں اس کی بہت خدمت کی تھی۔ کلّو کی تیمارداری کرنے میں اس نے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا تھا۔ محلّے کے کچھ لوگ جو اُسے ایک آوارہ عورت سمجھتے تھے، وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ اُس نے اپنی پچھلی زندگی کا کفارہ ادا کر دیا۔

اور پھر جب کلّو مرا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی، خوب بین کئے اور اس کی دسویں تیرھویں اور برسی بڑی دھوم دھام سے منائی۔ کئی مہینوں تک وہ ایک نئی بیوہ کی طرح سوگوار رہی لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اُس کی فطری اُمنگ پھر اپنا رنگ جمانے لگی۔ وہ بناؤ سنگھار کر کے پھر اِدھر اُدھر اٹھلانے لگی۔ البتہ اپنی بیوگی کے احترام میں سر پر رنگین کے بجائے سفید دوپٹہ اور ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیوں کے بجائے چاندی کی پہننے لگی۔ رفتہ رفتہ اس کے چھپر کے نیچے "چاچا"، "موسی"، اور "بھوجی" کہنے والے شائقین پھر جمع ہونے لگے اور وہ خود بھی اِدھر اُدھر محلّے والوں کے گھروں میں خیریت پوچھنے جانے لگی۔ کمانے کی اُلجھنوں سے وہ آزاد تھی۔ کلّو نے گھر گرہستی کے علاوہ تین دُکانیں چھوڑی تھیں جن کا کرایہ اُس کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لئے بہت کافی تھا۔

کلّو جب تک زندہ تھا، چُنّی کی زندہ دلی اور بے راہ روی صرف اُس کے شوہر کا مسئلہ سمجھی جاتی، لیکن کلّو کی طویل بیماری اور پھر اس کی موت پر سوگواری کے بعد چُنّی نے جب پھر پر پُرزے نکالے اور وہ اپنی پُرانی روش زیادہ آزادی سے اختیار کرنے لگی تو سارا محلّہ اُس کے کردار کو اپنا ایک مشترکہ مسئلہ سمجھنے لگا۔ عورتیں تو اُس سے عام طور سے جلتیں اور نفرت کرتیں اور کبھی کبھی اس کی مثال سامنے رکھ کر یہ بھی

سوچتیں ——— کیا کسی عورت کی آنکھوں کا پانی ایسا بھی مر سکتا ہے؟ اور پھر اپنے اس خیال پر خود ہی شرما جاتیں۔ مردوں میں کچھ لوگ اس پردے ڈال چکے تھے یا ڈالنے کے تمنائی تھے۔ کچھ لوگ اسے صرف ایک تماشہ یا دلچسپی کا سامان سمجھتے اور زیادہ تر لوگ جنھیں اس سے قریب ہونے کا حوصلہ یا موقع نہ تھا اُسے علانیہ طور سے بُرا بھلا کہتے اور قربِ قیامت اور کلجگ کی نشانی بتا کر اپنی پرہیزگاری کا پرچار کرتے۔

جاڑوں کا موسم تھا، رات کے دس بج چکے ہوں گے، میں کھانا کھا کر ہاتھ دھونے جا رہا تھا کہ ایک دم سے گلی کی دوسری طرف سے آوازیں بلند ہوئیں: "چور! چور! لینا، پکڑنا! وہ بھاگا جا رہا ہے!!" ——— میں گھر سے باہر نکلا تو دیکھا خاں صاحب اپنے دروازے پر کھڑے محلے کے کچھ لوگوں سے، جو اُن کے دروازے کے سامنے جمع ہو گئے تھے، کہہ رہے تھے ——— "میں نو بجے کی گاڑی سے بریلی جا رہا تھا۔ اسٹیشن پہنچا تو گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ میں نے واپس آکر گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو مجھے چھت پر کوئی دوڑتا ہوا معلوم ہوا۔ میں لپک کر پچھلی طرف گیا تو کوئی پاخانے کا دروازہ کھول کر بھاگ رہا تھا۔ میں کچھ دور دوڑا لیکن اندھیرے میں کوئی کیا ہاتھ آتا!"

"گھر میں کسی کو خبر نہیں ہوئی؟" ماسٹر ہوری لال نے پوچھا۔

"بیوی اور شکورن بُوا، جن کو رات میں رتوندا آتا ہے، نیچے کمرے میں سو رہی تھیں، اُنھیں کچھ پتہ نہ چلا۔"

"کوئی چیز تو نہیں گئی؟" بنواری نے پوچھا۔

"کوئی تالا کُنڈی تو نہیں ٹوٹی۔ اب کوئی برتن وغیرہ اُٹھا لے گیا ہو تو دوسری بات ہے، دیکھئے اب جا کر دیکھتا ہوں۔" خاں صاحب نے جواب دیا۔

"اس گلی میں تو چور اُچکے ایسے گھستے چلے آتے ہیں جیسے مہمان ہوں۔ ابھی آٹھ روز ہوئے داروغا جی کے ہاں بروٹھے میں گھس کر کوئی کُنڈی کاٹ رہا تھا۔ وہ تو کہو پڑوس میں عیدا کی آنکھ کھل گئی۔ پرسوں کوئی مُوا حرامی میرے چھپر تلے ایک ست آوازا پٹاکا چھوڑ گیا۔ سوتے سے جاگ کر میں دہل گئی کہ کہیں چھپر نہ جل جائے لیکن ہیاؤ نہ پڑا جو دروازہ کھولتی اور آج کھان صاحب کے گھر میں دھاوا بول دیا۔" چُنی اِٹھلا کر بولی۔

"تم سلامت رہو تو ایسے پٹاخے روز چھوٹتے رہیں گے!" خاں صاحب نے قہقہہ لگایا اور اُن کے ساتھ دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔

چُنی شرماتے ہوئے بولی: "کھاں صاحب بڈھے ہو گئے لیکن اِن کی مجاکھ کرنے کی لت نہ چھوٹی۔"

خاں صاحب نے اپنا دروازہ بند کر لیا تو سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل پڑے۔

"خاں صاحب کی مذاق کرنے کی عادت چھوٹ جاتی تو بڑھاپے میں دوسری شادی ہی کیوں کرتے؟" کسی نے کہا اور دو تین آدمی معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگے۔

یاد

بارہا ایسا ہوا ہے، یاد تک دل میں نہ تھی
بارہا مستی میں لب پر اُن کا نام آ ہی گیا ——— مجازؔ لکھنوی

برسات کی اس رات میں اے دوست تری یاد
اِک تیز چھری ہے کہ اُترتی ہی چلی جائے ——— فراقؔ گورکھپوری

اے آرزو کے دُھندلے خرابو جواب دو
پھر کس کی یاد آئی تھی مجھ کو پُکارنے ——— ساحرؔ لدھیانوی

کہانی سُناتے ترے غم کی لیکن
نہ وہ بھولتی ہے نہ یاد آ رہی ہے ——— فراقؔ گورکھپوری

سب بھولنے کی کوششیں اک یاد بن گئیں
ترکِ تعلقات ہیں وجہِ تعلقات ——— بشیر بدرؔ

"نہ خان بیوی لاتے نہ روز گھر میں چور بھاندتے!" کسی نے ٹکڑا لگایا جس پر کئی قہقہے گونجے۔ کسی منچلے نے حلق پھاڑ کر "میں کیا کروں رام مجھے بڈھا مل گیا رے" الاپنا شروع کر دیا اور میں جلدی سے اپنے مکان میں گھس آیا۔

عبدالشکور خاں کا مکان میرے مکان کے سامنے تھا۔ بیچ میں بارہ پندرہ فٹ کی گلی تھی۔ اکثر جب گلی میں سناٹا ہوتا تو اڑوس پڑوس کے گھر کی باتیں، جب بولنے والوں کا لہجہ تیز ہو، کانوں میں پڑ ہی جایا کرتیں۔ کبھی کبھی جو باتیں میرے سُننے میں آئی تھیں، اُن سے میں یہ اندازہ لگانے پر مجبور ہو گیا تھا کہ خاں صاحب کے تعلقات اُن کی بیوی سے ناخوشگوار ہیں۔ خاں صاحب شکّی مزاج انسان تھے اور انھیں اپنے گھر میں بعض رشتے داروں کا اور خصوصیت سے اپنے خالہ زاد بھائی کا آنا جانا سخت ناپسند تھا۔ وہ اس سلسلے میں اکثر اپنی بیوی کو جھڑکتے اور تنبیہ کرتے رہتے۔ بیوی بھی دبنے والی نہیں تھی۔ وہ ترکی بہ ترکی جواب دیتی کہ وہ کسی کو بُلاتی تو ہے نہیں، اب کوئی خود آتا ہے تو وہ کیسے منع کر سکتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بند بند الفاظ میں کچھ ایسی چُٹکیاں بھی لیتی کہ خاں صاحب تلملا کر اول فول بکنے لگتے۔

چور کے بھاگ نکلنے کے بعد چند ہی دن گذرے تھے کہ ایک روز دوپہر میں دفعتاً خاں صاحب کے گھر سے عجیب غریب آوازیں آنے لگیں۔ پہلے کچھ دیر زبانی جھگڑا ہوتا رہا اور پھر خاں صاحب اپنی بیوی کو جوتی سے مارنے لگے۔ بیوی کی چیخوں کے ساتھ خاں صاحب کی بھی ہانپتی ہوئی آوازیں سُنائی

رہی تھیں: "بتا یہ تیرے کس یار کا خط ہے؟" ۔۔۔۔ "کس نے لکھا ہے تجھے کہ گیارہ بجے رات کو آؤں گا، دروازہ کھلا رکھنا!" ۔۔۔۔ "کہتی ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ خط یہاں آیا کیسے؟ فرشتے آکر ڈال گئے ہیں تیرے کمرے میں!" ۔۔۔۔ "ڈھول بجوا کر تیرے گھر میں اور سنگ دل تو ہے بیٹھنے پر آتا ۔۔۔۔" "بتا نہیں تو آج تیرے ہاتھ پیر توڑ کر تجھے طلاق دے دوں گا!"

میں نے دیکھا کہ ادھر اُدھر دروازوں اور کھڑکیوں پر بہت سے لوگ خاں صاحب کے گھر کی یہ مختصر فلمیں بڑے اشتیاق سے سُن رہے تھے اور دل ہی دل میں خوش تھے کہ آج ایک بڑے جھنڈے خاں کی شرافت کا جھنڈا سرنگوں ہو رہا ہے۔ میں خاں صاحب کے خیال سے مارے شرم کے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس وقت ایک پڑوسی اور دوست کے رشتے سے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ جی چاہتا کہ دروازے پر جاکر خاں صاحب کو مار پیٹ سے منع کروں۔ بھلا ایک عورت کا اس طرح پیٹا جانا کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے! لیکن ڈرتا کہ میری دخل اندازی کے کہیں خاں صاحب کوئی دوسرے معنی نہ نکالیں اور میری ہمدردی مظلوم بیوی کے حق میں اور بھی مضر ثابت نہ ہو۔ میں اسی اُدھیڑبُن میں تھا کہ سامنے سے بنی سجی چُنّی اِٹھلاتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے بُلایا تو وہ چاروں طرف دیکھ کر میری طرف اس طرح بڑھی کہ میں چند لمحوں کے لئے سہم کر رہ گیا۔ وہ قریب آئی تو میں نے رازدارانہ انداز میں کہا ۔۔۔۔ "خاں صاحب اپنی بیوی کو کس خط کے بارے میں مار رہے ہیں! بیچاری بلبلا رہی ہے!"

چُنّی نے اچھی طرح میری بات بھی نہیں سُنی اور جھپٹ کر خاں صاحب کا بند دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔

"کون ہے کم بخت!" خاں صاحب چیخے۔

"میں ہوں چُنّی!"

"کیوں آئی ہے ناشُدنی؟"

"ناک چھدی کوئی اور ہوگی خان صاحب! میں اپنا کھت لینے آئی ہوں!"

"تیرا خط یہاں کیسے آیا؟"

"میں لائی تھی بیگم ساب سے پڑھوانے!"

مار تو پہلے ہی بند ہو چکی تھی۔ اب خاں صاحب نے دروازہ کھول دیا اور بیوی سے مخاطب ہو کر بولے ۔۔۔۔ "تم نے پہلے کیوں نہ بتا دیا؟"

بیوی نے کیا جواب دیا وہ تو سنائی نہیں دیا، البتہ چُنّی نے بڑے جوش سے کہا "واہ پرایا راز آپ کو کیسے بتا دیتیں اور پھر بیگم ساب مجھے ملیں ہی کہاں؟ میں کھت چھوڑ کر چلی گئی تھی۔"

"بڑی آئی ہے رازوالی! قطامہ! لے اپنے یار کا خط اور چل دُور ہو! آج سے اگر تُو نے میرے گھر میں قدم رکھا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا!" خاں صاحب گرجے۔

"ہاں ہاں اب گھر میں کدم رکھنے والی کہاں رہی! میرے مُنہ میں بھی جبان ہے لیکن میں وہ کوٹھری کی سمت آپ سے باہر ہو رہی ہے کیوں پیچھے پڑ گئے!" چُنّی نے پکڑ کر دیکھتے ہوئے سمجھتے ہوئے کہہ دیا۔

پھٹے ہوئے خط کے پُرزے لے کر چُنّی بڑے تمکنت اندازانہ خاں صاحب کے گھر سے نکلی۔ میں اُسے دیکھ کر مسکرایا تو وہ بے اختیار کھلکھلا اُٹھی، لیکن اپنے مُنہ کو اپنے آنچل سے ڈھانک کر وہ اپنی کوٹھری کی طرف چلی گئی۔

اُسی دن شام کو مجھے رام دین پنساری کی دُکان کے قریب چُنّی ملی تو میں نے کہا۔

"واقعی آج تم نے تو کمال کر دیا!"

وہ بہت تیکھے انداز سے بولی۔ "کوڑا کھاتا پاس ہو تو پھر کسی گھر میں گندگی کیوں رہے؟ میں کوڑا کھاتا ہوں بابوجی! ہی! ہی! ہی!" اور وہ پان کی پیک تھوکتی ہنستی اور اِٹھلاتی بازار کی طرف چلی گئی۔

حسرت ہی سہی

ش. مظفر پوری

باتھ اصل (براہ رانپور) ضلع مظفر پور (بہار)

۴ جولائی ۱۹۶۵ء

برادر محترم! سلام و رحمت

چند روز پہلے ایک عریضہ ارسالِ خدمت کر چکا ہوں۔ آج ایک کہانی بھی حاضر ہے۔ اس کا عنوان میں نے "حسرت ہی سہی" رکھا ہے۔ اگر آپ کو پسند نہ آیا ہو تو دوسرا عنوان "حاصلِ مشاعرہ" بھی ہو سکتا ہے۔ اس کہانی میں کہانی کم اور کردار نگاری زیادہ ہے۔ اردو افسانہ کے موجودہ دور میں کردار نگاری اور تحلیلِ نفسی کا فقدان ہے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۶ء تک اردو افسانہ کا شاندار ارتقائی زمانہ رہا ہے اور یہی دور اردو افسانہ کا اصل سرمایہ ہے۔ اس دور میں کردار نگاری اور تحلیلِ نفسی کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے اور کسی اچھے افسانہ نگار کے لئے یہ دونوں صلاحیتیں طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن موجودہ دور میں یا تو ان دونوں باتوں کو اہمیت نہیں دی جا رہی ہے یا آج کا افسانہ نگار اس محنت اور مغز سوزی سے جی چراتا ہے۔ اس کی بنیادی کی حوصلہ افزائی خالص کاروباری بنیاد پر شائع ہونے والے کثیر الاشاعت جریدوں کے مدیرانِ گرامی بھی کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ان کی کاروباری مصلحتوں کا تقاضا ہے (جس کی تفصیل اس خط میں بے محل ہو گی)۔ آج کا اردو افسانہ عام طور پر چٹکلہ نما ہوتا ہے یا چند چٹکلہ نما باتوں کا مجموعہ۔ کچھ بے جوڑ چونکا دینے والے فقرے۔ نہ پلاٹ میں کوئی گہرائی ہوتی ہے، نہ کوئی غیر معمولی موضوع ہوتا ہے اور نہ تعمیم میں کوئی انوکھا پن ہوتا ہے۔ افسانہ میں فکر، پلاٹ اور بیان کے امتزاج کے ساتھ جو تسلسل اور ہمواری ہونی چاہیئے اس کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہے۔ افسانہ نگار پر، وقت کی تنگی پر، عوام کی پسند پر یا مدیرانِ جرائد پر ـــــ یا پھر پبلشر اور مصنف کے کاروباری سمجھوتے پر۔ کیونکہ آج کا مصنف اپنی چیزیں فروخت کرنے پر مجبور ہے چاہے وہ جس کے ہاتھ اور جس قیمت پر بھی فروخت ہوں اور جو چیز لازماً فروختنی ہو اس کا خریدار کے معیار اور اس کی پسند پر اُترنا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے، اگر مصنف اقتصادی بحران کا شکار نہ ہو اور ادبی تخلیقات کی خرید و فروخت روزمرہ ضروریات کی اشیاء کے ڈھنگ پر نہ ہو تو ادب کے معیار کی کایا پلٹ ہو سکتی ہے ـــــ میں نہیں جانتا اربابِ فکر میرے اس خیال سے کہاں تک متفق ہوں گے کہ ہندوستان میں اردو افسانہ کا موجودہ دور انحطاط کا دور ہے۔ کل کا فنِ افسانہ نویسی سنگ تراشی کی مثل تھا جبکہ آج کا فنِ افسانہ نویسی چوکھٹے میں تصویر فٹ کرنے کی مانند ہے۔ کل کا افسانہ "تخلیقات" کے زمرے میں آتا تھا جبکہ آج کا افسانہ "مصنوعات" کے ضمن میں آ سکتا ہے۔ آج کے دور میں افسانہ مالِ تجارت کی طرح "مینوفیکچر" کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں صرف ایک استثناء ہے ـــــ راجندر سنگھ بیدی! میں خود بھی ایک افسانہ نگار ہوں اس لئے مجھے اس طرح کی نزاعی یا بحث طلب باتوں سے دامن کش رہنا چاہیئے لیکن برسبیلِ تذکرہ دل کی بات زبان پر آگئی ہے۔ اور چونکہ "بیسویں صدی" اربابِ فکر و نظر کے حلقے میں بھی پہنچتا ہے اس لئے توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ چند سطور انہیں اس "انحطاط" کی طرف متوجہ کر سکیں گی ـــــ اور کیا عرض کروں۔ میرے حال احوال بدستور ہیں۔ ان دنوں زندگی کے بڑے بڑے صدمات جھیل رہا ہوں۔ چیچک کے مرض میں نواسہ کو دفنا چکا ہوں۔ تین افراد بمشکل جانبر ہوئے ہیں اور اب گھر کی ایک اور پیاری بچی اس موذی مرض کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے . . .

آپ کا ـــــ ش. مظفر پوری

حضرت فرہاد نے نسیم آباد کے آل انڈیا مشاعرہ کا دعوت نامہ بڑی تگ و دو کے بعد حاصل کیا۔ اس تگ و دو میں مقامی انجمن توصیفِ باہمی کے سکریٹری کی پُر تکلف دعوت بھی شامل تھی۔ مرغ ماہی والی اس ضیافت میں حضرت فرہاد کو پے در پے متعدد غزلیں مکمل کر سنانے کا موقع ملا۔ اور سامعین پر اُن کا راسہا جوہر بھی کھل گیا۔

اپنی فکرِ تازہ کی داد لینے کے لئے معمولی پیمانے کی دعوت تو حضرت فرہاد آئے دن کیا ہی کرتے تھے۔ لیکن ایسی دعوتوں میں داد دینے والوں کی گرمجوشی کچھ بجھی بجھی سی رہا کرتی۔ حضرت فرہاد کی

ایک ٹیکنک یہ بھی تھی کہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ کلام دسترخوان بچھنے سے پہلے سنا دینے کی کوشش کیا کرتے۔ لیکن جو سامعین اوّل طعام بعدہٗ کلام کے قائل تھے وہ اپنی سرد مہری سے اس ٹیکنک کا توڑ کر دیا کرتے۔

اِسی دعوت میں "انجمن توصیف باہمی" کے سکریٹری کو حضرت فرہاد کا چرمی ڈاکومینٹ کیس اتنا پسند آگیا کہ وہ قیمت پوچھ بیٹھا۔

فرہاد صاحب کے ایک مدّاح اور خیر اندیش نے فوراً سرگوشی کی "فرہاد صاحب، موقع غنیمت ہے سکریٹری صاحب کو خوش کر دیجئے۔"

فرہاد صاحب پس و پیش کرتے ہوئے بولے "مگر یہ تو میں نے آل انڈیا مشاعرے کے لئے خاص الخاص خریدا ہے۔ انھیں کیسے دیدوں؟"

مدّاح نے کہا "مگر مشاعرہ کے دعوت نامے سے اس کی قیمت زیادہ نہیں!"

آخر دل پر جبر کر کے حضرت فرہاد نے وہ پسندیدہ اور قیمتی ڈاکومینٹ کیس سکریٹری صاحب کو نذر کر ہی دیا۔ لیکن اس نذرانہ کے بعد حضرت فرہاد نے انتقاماً اتنی غزلیں سنائیں کہ وہ خود تو پسینہ پسینہ ہو ہی گئے سننے والوں کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا!

سکریٹری صاحب کی دعوت کے بعد ہی حضرت فرہاد کے نام آل انڈیا مشاعرے کا دعوت نامہ بذریعہ ڈاک آگیا۔ یہ دعوت نامہ مع لفافہ حضرت فرہاد کی جیب کی مستقل زینت بن گیا۔ دوستوں اور شناساؤں میں اس کی نمائش اور تشہیر کرنے لگے۔ اس دعوت نامے کی خوشی میں بھی یاروں نے انھیں چائے پانی سے نہیں بخشا۔ اس چائے پانی کے دوران ایک نے دل نے حضرت فرہاد کو مشورہ دیا۔

"اس عظیم الشّان مشاعرے کے لئے تو آپ کو دو غزلے کر جانا چاہیئے؟"

"یہ دو غزلہ کیا چیز ہوتی ہے!" ایک شخص نے استفسار کیا۔

"غزل اور اس کا ضمیمہ۔ یعنی غزل کا بچہ!"

حضرت فرہاد نے ازراہ انکسار کہا "بھئی طرح اتنی مشکل اور زمین اتنی تنگ ہے کہ ایک ہی غزل کے شعر نکالنے میں لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے۔"

ایک آل انڈیا غزل گو نے کہا "دو غزلہ تو کیا ہزار غزلہ کا بھی بندوبست ہو سکتا ہے! مگر کچھ معروف تو معلوم ہو!"

دو غزلہ کی تجویز پیش کرنے والے نے بتایا "بس حفظ ما تقدم کے لئے۔ ممکن ہے بائیں بازو والے سامعین کے شور و شر میں لوگ پہلی غزل کا لطف نہ اٹھا سکے تو دوسری جڑواں غزل سے تلافی کر دی جائے گی۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ پہلی غزل اتنی مقبول ہو کہ دوسری کی فرمائش ہو جائے۔"

مگر وہ غزلیں اپنے بس کی نہیں" حضرت فرہاد نے خود ستائی والی مسکان کے ساتھ مسند رسی کی۔ جیسے وہ ایسی ایسی ہزار غزلیں کہنے پر قدرت رکھتے ہوں۔

پھر دوسری ... میں نے ... ہے کہ شعرائے قدیم میں غزل ... ستعار ... کہا جاتا تھا شعرائے ... تو بعض استادوں

حسین صدیقی دہلی

کے ساتھ ایسا بھی ہوا کہ مشاعرے میں جاتا ہے مگر وقت کی تنگی ہے۔ غزل ... آخر کسی شاگرد کی غزل مشاعرے میں پڑھ دی۔ اگر داد بہت زیادہ ملی تو غزل اپنا لی ورنہ شاگرد کو بعض ہدایات کے ساتھ واپس کر دی۔"

دوسرے شخص نے اس ستم ظریفی کو دو آتشہ کرنے کے لئے کہا "بلکہ میں نے تو شعر البند میں یہاں تک پڑھا ہے کہ ایکبار مرزا غالب نے بھی استاد ذوق سے ایک غزل مستعار لی تھی جو غلطی سے بہادر شاہ ظفر کے دیوان میں شامل ہو گئی ہے۔"

"کون سی غزل؟" حضرت فرہاد نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی مشہور غزل —— نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں"

اس مستند جواز پر حضرت فرہاد کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی اور وہ ایک آل انڈیا غزل گو صاحب سے استفادہ کرنے پر نیم راضی ہو گئے۔

غرض آل انڈیا مشاعرے میں شرکت کا اعزاز ملنے کی خوشی میں یاروں نے حضرت فرہاد کو نت نئے طریقوں سے جی بھر کے لوٹا۔ اُن کے سال بھر کا اضافی بجٹ چند دنوں کے اندر ہی اس تقریب کی نذر ہو گیا! وہ تو خیر اُن کے دور اندیش والد مرحوم نے کچھ جائداد چھوڑی تھی جو انھیں تلاشی سے بچائے ہوئے تھی ورنہ اس طرح کے جھٹکوں کو برداشت کرنا ہما شما کے بس کی بات نہ تھی۔

نسیم آباد کے مشاعرے میں "جانے" کے لئے نہیں بلکہ "تشریف لے جانے" کے لئے حضرت فرہاد نے وہی اہتمام و التزام کیا جو انھوں نے کبھی نوشہ بننے کے لئے کیا ہو گا۔ ڈھیلے پاجامے پر اپنی مخصوص کالی شیروانی زیب تن کرنے کے بعد بیگم کے مجلا آئینے میں آرائش گیسو پر کچھ دیر محنت کی سیاہ مخملی رامپوری ٹوپی اوڑھی۔ سلیم شاہی جوتے پہنے۔ پھر نہایت فراخدلی سے خوشبو لگائی۔ بعض لوگ اتنی فراخدلی سے کفن پر بھی خوشبو نہیں لگاتے۔ جب لوک پلک سے درست ہو چکے تو داد طلب نظروں سے بیگم کو دیکھا۔ یوں تو سج دھج کی زیادتی نے حضرت فرہاد کو ایک مرقع کارٹون ہی بنا دیا تھا پھر بھی بیگم نے ان کا دل رکھنے کے لئے بہت ہی والہانہ لہجے میں "چشم بد دور!" کہہ ہی دیا۔

"نہیں جی، آپ مذاق کرتی ہیں" حضرت فرہاد کو یا تو اعتبار نہ آیا، یا انھوں نے مزید تصدیق چاہی۔

"واللہ! خوب سج رہے ہیں۔ نوشہ معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ کہتے ہیں مشاعروں میں بے حیا عورتیں بھی شریک ہوتی ہیں" بیگم کے ان الفاظ نے حضرت فرہاد کے جسم میں ایک تر از خون بڑھا دیا۔

بیگم کی مستقاد ستائش کی خوشی میں حضرت فرہاد عطر کی شیشی اٹھا کر دوبارہ شیروانی پر ملنے لگے۔ عورتوں کے ذکر پر آنکھوں میں حیا سی آگئی کہنے لگے "عورتیں تو کیا اگر حوریں بھی مشاعرے میں شریک ہوں تو آپ کا بندہ ہے ... سے ... نہیں ہو سکتا"

عطر گریبان کی طرح بہانے ... شیشی ... ساتھ ہی لیتے جائیں۔"

دوپہر اُٹھاتے اُن کی شیرخوار بچی بدتمیزی نے اُن کے پاجامے کی موری کو گیلا کر دیا۔ حضرت فرہاد کو غصہ تو بہت آیا لیکن بیگم کی نظر دیکھ کر دم سادھ گئے۔

بیگم نے کہا: "بچی چونچلے کر رہی ہے، ذرا گود میں اُٹھا لیجیے!"

مگر حضرت فرہاد نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ کیونکہ انھیں اپنی شیروانی کو مشاعرے تک بے شکن لے جانا تھا۔ نوکر کو سامان اُٹھانے کا اشارہ کر کے جھٹ باہر نکل گئے۔

تانگے پر سامان رکھا جا چکا، تب خیال آیا بٹوہ بھول گئے! بٹوہ منگوا کر جیب میں رکھا اور جب تانگہ چل پڑا تو رنگین ریشمی رومال نکال کر چہرے کو "پف" کیا۔ تانگہ کچھ آگے نکل گیا تو اچانک یاد آیا کہ وہ غزل مستعار تو طاق ہی میں رہ گئی! فوراً تانگہ پلٹا یا اور گھر کے دروازے پر رُک کر باہر ہی سے صدا لگائی کہ غزل طاق میں چھوٹ گئی ہے! اس طرح صدا لگانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اڑوس پڑوس والوں کو خبر ہو جائے کہ حضرت فرہاد آل انڈیا مشاعرے کی مہم پر روانہ ہو رہے ہیں اور لوگ یہ بھی جان جائیں کہ غزل گھر سے لے کر جا رہے ہیں، بازار سے نہیں خریدیں گے۔

بارے فرہاد صاحب اسٹیشن پہنچ کر سیکنڈ کلاس کی برتھ پر فروکش ہوئے۔ یہ راز تو صرف انجمن توصیفِ باہمی کے سکریٹری کو معلوم تھا کہ حضرت فرہاد نے ٹکٹ اپنے پاس سے خریدا تھا۔۔۔ حالانکہ سکریٹری نے کرایہ کی رقم وصول پانے کے دستخط فرہاد صاحب سے لے لیے تھے!

ٹرین صبا رفتاری سے نسیم آباد کی سمت بھاگی جا رہی تھی۔ مطلع ابر آلود ہونے سے خنکی بڑھ گئی تھی لیکن موسم سہانا تھا۔ اتنا سہانا کہ حضرت فرہاد کی غزل میں ایک پھڑکتے ہوئے شعر کا اضافہ ہو گیا۔ بزعمِ خود یہ شعر نہ صرف حاصلِ غزل تھا بلکہ حضرتِ فرہاد کو یہ گمان بھی لاحق ہو گیا کہ کہیں یہ حاصلِ مشاعرہ ہی نہ ثابت ہو۔ اب انھیں یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ اس شعر کو غزل میں کون سی پوزیشن دیں، مطلع کے بعد یا مقطع سے پہلے؟ آخر انھیں یہ سوجھی کہ غالب کے اس قول ــــ وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے ــــ پر عمل کرتے ہوئے اس شعر کو الگ سنبھال رکھیں تاکہ جب لوگ اُن کی غزل سے بے مزہ ہونے لگیں تو فوراً الٹرو پھینک ماریں اور آنِ واحد میں سماں بدل کر رکھ دیں۔

اِس خیال پر پہلی بار کے آل انڈیا مشاعرہ کی تلخ یادیں حضرت فرہاد کے ذہن میں تازہ ہونے لگیں۔ آہ، وہ بھی کیا جانکاہ سماں تھا ـــــــ جوں ہی حضرتِ فرہاد نے مطلع کیا: "مطلع عرض ہے" کہیں سے ایک چبھتی آواز آئی: "خدا کرے یہی آپ کا مقطع بھی ہو!"

ایک اور آواز آئی: "جب مطلع اتنا صاف ہے تو مقطع کا کیا عالم ہوگا!"

مگر حضرتِ فرہاد حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ہر شعر پر سخن فہموں نے واہ واہ کی اور سامعین کے گوشے سے "آہ! آہ!" کی صدا آئی۔ آخر تنگ آکر جب حضرتِ فرہاد نے واقعی کشت شارٹ کر کے کہا: "مقطع عرض ہے" تو فوراً آواز آئی: "یہ بھی کچھ کم ہوشربا نہ ہوگا!"

جوں ہی فرہاد صاحب نے مقطع کا پہلا مصرعہ پڑھا کسی حریف کے سکھائے پڑھائے آدمی نے بآوازِ بلند کہا: "مطلع ابر آلود تھا تو مقطع گرد آلود ہے!"

آخر دشمنوں نے حضرت فرہاد کو مقطع کا مصرعۂ ثانی پڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ پٹنہ تو انھوں نے دیا ہی تھا لیکن وہ قہقہوں کی نذر ہو کر رہ گیا تھا۔

اِس تلخ تجربے کے کئی سال بعد آج حضرت فرہاد دوسری بار آل انڈیا مشاعرے میں شرکت کرنے جا رہے تھے لیکن اس بار وہ اپنے خیال میں ہر طرح مسلح ہو کر جا رہے تھے۔ اب کے اتنی شاندار اور مرصع غزل لیے جا رہے تھے کہ بڑے بڑے حریفوں کو لوہا منوانے کا دم خم پیدا ہو گیا تھا۔ اس پر مستزاد وہ تازہ وارد الفاقیہ شعر تھا جس سے وہ موقع پر سکے لڈو کا کام لینے والے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس مرتبہ انھوں نے لکھنؤ دوروں کے ریاض کے بعد غزل کی ایک اچھی سی دُھن بھی نکال لی تھی۔ مشاعرے کے آل انڈیا ریڈیو سے ریلے ہونے کی بھی خبر تھی۔ گویا اس مشاعرے کے بعد حضرت فرہاد کے آگے بڑے بڑوں کا بھی چراغ جلنے والا نہیں تھا!۔

اپنی لاستناہی خوش خیالیوں میں اتراول کرنے کے لیے حضرت فرہاد ایک گھنٹہ میں چار پانچ بار باتھ روم کے آئینے میں نوک پلک درست کر آئے تھے اور اب پانوں کا ڈبہ کھولے زیرِ لب غزل گنگنا رہے تھے۔ اُن کے قریب بیٹھا ہوا ایک خوش پوش اور خوبرو جوان بہت دلچسپی سے اُن کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا اور زیرِ لب مسکرانے بھی لگتا تھا۔

پن بتی میں گلوریاں سجانے کے بعد حضرتِ فرہاد نے اپنی بیاض کا اس خشوع و خضوع کے ساتھ مطالعہ شروع کیا جیسے پنج سورہ وغیرہ تلاوت کر رہے ہوں اور جب وہ چھٹی یا ساتویں بار باتھ روم سے واپس آئے تو اُن کے ہم سفر جوان نے بغیر کسی تمہید کے اپنا تعارف کرایا: "خاکسار کا نام محمود ناصری ہے۔ لوہے کا بیوپاری ہوں۔ اور حضور؟"

فرہاد صاحب رشکِ حلمی ہو کر بولے: "کیا کیجیے گا جان کر۔ خاکسار تو ایک بے نام و نشان شاعر ہے جسے فرہاد بھارتی کہتے ہیں!"

"سبحان اللہ سبحان اللہ! کیا طنطنہ پر تخلص ہے! یہاں تو لوگ نیشنل انٹیگریشن کی باتیں کرتے ہیں لیکن حضور نے تو انٹرنیشنل انٹیگریشن کر دکھایا ہے۔ ایران اور انڈیا کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ شاعر کی آفاقیت دراصل نام ہی سے شروع ہوتی ہے!"

حضرتِ فرہاد کی باچھیں کھل گئیں۔ دل ہی دل میں سوچا، جب تخلص پر ان حضرت کی جان جاتی ہے تو کلام سُن کر نہ جانے کیا حال ہوگا۔ جھٹ پٹی اور بٹوہ بڑھاتے ہوئے کہا: "ذرہ نوازی ہے آپ کی، ورنہ میں کس قابل ہوں!"

محمود ناصری نے ایک گلوری قبول کرنے کے بعد روغنی کاغذ میں بند ایک سفید ٹیبلیٹ فرہاد صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ لیجیے، فوراً اثر کرے گی۔ احتیاطاً اس قسم کی دوائیں ساتھ لے لیا کرتا ہوں۔ سفر میں دست کا آنا بھی کیا غضب کی بات ہے!"

فرہاد صاحب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا: "مگر حضرت مجھے تو دست نہیں آرہے!"

"پھر تو حضور کو قبض کی شکایت معلوم ہوتی ہے۔ چلتے سفر کے لیے تو قبض کوئی بُری چیز نہیں۔ میرے پاس اس کی بھی گولی ہے۔ اگر اجازت ہو تو پیش کروں!"

فرہاد صاحب نے منہ کڑوا کر کے تنبیہاً کہا: "یہ کیا خرافات ہے۔ اپنا دواخانہ اپنے پاس

رکھئے۔ لاحول ولاقوۃ! یہ بھی کوئی تُک ہے!"

محمود ناصری نے معذرت کی "معاف کیجئے، بار بار ہاتھ روم کی طرف جاتے دیکھ کر میں سمجھا کہ حضور کو کچھ تکلیف ہے۔"

حضرت فرہاد پہلے تو کچھ جھینپے پھر کھی کھی کر کے ہنس پڑے۔

محمود ناصری نے حوصلہ پاکر مذاق کیا "شاید حضور کو کسی مصرعہ نے تنگ کر رکھا ہے۔"

فرہاد صاحب نے خفت کی ایک مسکراہٹ پر صلح کرلی اور اپنی بیاض اُلٹنے لگے۔ پھر محمود ناصری پر ایسی نظر ڈالی جیسے شکار کو بھانپ رہے ہوں۔ معلوم ہوا کہ محمود ناصری کی منزل بھی نسیم آباد تھی۔ شعر و شاعری سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن حضرت فرہاد نے تو بے سکے اس بیوپاری کو بھی نہیں بخشا اور بیاض کھول کر شروع ہو گئے۔

حضرت فرہاد کی غزل خوانی شروع ہوئے ڈیڑھ دو گھنٹے گذر چکے تھے۔ محمود ناصری جب اونگھنے لگتا تو اُسے جگا کر اپنے شعروں کی داد لیتے۔ اُس بے چارے نے آخر چھٹکارے کی ایک ترکیب نکالی۔ یکایک گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔ خاندانی حالات سے لے کر ازدواجی زندگی تک پر باتیں ہوئیں۔ گفتگو کا موضوع ختم ہوتے دیکھ کر حضرت فرہاد نے موقع کو غنیمت جان کر بیاض کے اوراق اُلٹے۔ محمود ناصری کانپ اٹھا اور ہڑبڑا کر ایک سوال کر دیا۔

"گستاخی نہ ہو تو ایک بات پوچھوں۔"

فرہاد صاحب نے کلام سنانے کے لئے جو موڈ تازہ کیا تھا اُس میں خلل پڑ گیا۔ اس لئے وہ ٹالنے والی بے دلی سے بولے "فرمایئے۔"

"سُنتے ہیں کہ شاعر اور افسانہ نگار کی زندگی میں کوئی نہ کوئی رُومان ضرور ہوتا ہے۔ حضور کی نگاہِ کرم بھی تو کہیں نہ کہیں ہوئی ہوگی۔"

حضرت فرہاد جیسے پھڑک اُٹھے۔ شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بیاض بند کرتے ہوئے بولے۔

"حُسن و عشق کی خانقاہ میں کون آیا کون گیا اس کا ریکارڈ کون رکھتا ہے۔ اپنا دامن تو بے داغ ہے۔"

محمود ناصری کی دو چار ترغیب آمیز باتوں کے بعد حضرت فرہاد کُھل گئے۔ بہت اصرار کے بعد بولے "آپ ہماری محفل سے باہر کے آدمی ہیں اس لئے نام بتائے دیتا ہوں۔ نام اتنا مشہور ہے کہ بدنامی کا ڈر ہے۔ بس بات اسی حد تک ہے کہ ہم دونوں ایک ہی حوض کے دو کناروں پر بیٹھ کر وضو کیا کرتے ہیں۔"

محمود ناصری نے بیقراری سے کہا "اب تو حضور کہہ گذریئے۔"

"اُن کا نامِ نامی شبنم شیریں ہے۔ مشہور شاعرہ ہیں۔"

محمود ناصری اس طرح چونک پڑا جیسے کسی نے اُسی کی محبوبہ کا نام لے لیا ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"یہ رُومان تو پُرانا ہو چکا ہوگا؟"

"رُومان وغیرہ بھی کیا۔ بس وہ کچھ مہرباں ہیں۔ اُن کی نوازشیں بے شمار ہیں۔ آپ ہی دیکھئے نا کہ میرے قیام و طعام کا انتظام بھی اُنھوں نے اپنے گھر کیا ہے۔"

محمود ناصری نے کُرید کُرید کر اُن کی باتیں بہت دلچسپی سے سُنیں۔ حضرت فرہاد کی داستانِ عشق ابھی ادھوری ہی تھی کہ نسیم آباد آگیا اور دونوں ہم سفر ٹرین سے اُتر کر بچھڑ گئے۔

دوسرے دن حضرت فرہاد بھارتی حاجی خیراتی کے مسافر خانہ سے قصد گویر کر کے مشاعرے کی طرف چلے۔ مشاعرے کے پنڈال کے صدر دروازے پر محمود ناصری بھی استقبال کرتا نظر آیا۔ حضرت فرہاد اُسے دیکھ کر کچھ جُز بُز ہوئے۔

ایک شناسا نے حضرت فرہاد کا تعارف کراتے ہوئے کہا "ان سے بھی ملیئے۔ محمود ناصری۔ مشہور شاعرہ شبنم شیریں کے شوہر!"

حضرت فرہاد کے حلق میں کوئی شے اٹک سی گئی اور وہ انتہائی عجلت کے ساتھ پلٹ کر چل پڑے۔ کسی نے پیچھے سے آواز دی "حضرت کہاں چلے؟"

"بیاض بھول آیا ہوں!" حضرت فرہاد نے پلٹ کر بوکھلاہٹ میں کہا ــــ اور حضرت فرہاد بھارتی حاجی خیراتی کے مسافر خانے سے مع اسباب مشاعرے کی بجائے اسٹیشن پہنچ گئے!

غزلیں

رشی پٹیالوی

ہر خوشی کو ہم ترے غم پر فدا کر جائیں گے
پی کے زہرابِ الم آرام سے مر جائیں گے

حق پرستی حسن ہے ناحق پرستی کفر ہے
بارگاہِ حسن میں ہم حسن بن کر جائیں گے

دور ہیں تو کیا ہوا یہ جلوے اُن کے جلوے ہیں
دل میں گھر کر جائیں گے دل پر اثر کر جائیں گے

وہ ہمیں ہیں ایک دن ڈھونڈے گی خود منزل جنہیں
ڈھونڈنے والے ترے در پر تو اکثر جائیں گے

مرنے والوں کے وفا پیماں ارادوں کی نہ پوچھ
مرنے والے تیرے ہر ارشاد پر مر جائیں گے

دل کی بات آئے زباں پر کچھ ضروری تو نہیں
حالِ دل ہم خامشی میں بھی بیاں کر جائیں گے

سرخرو ہوں گی بالآخر یہ پریشاں حالیاں
تجھ پہ مر کر زندگی کا حق ادا کر جائیں گے

مرہمِ تیرِ نظر تاثیر سے خالی نہیں
چارہ فرمائی سے دل کے زخم تک بھر جائیں گے

اے رشی ناکامیوں سے واسطہ ہوگا نہیں
لوگ جو عشق و وفا کی خامیوں پر جائیں گے

پروفیسر عبدالرب عرفان ایم اے

کون جیتا ہے زندگی کے لئے
مر رہا ہوں تری خوشی کے لئے

یہ فضا، یہ چمن، یہ سبزہ زار ہے
آؤ مل بیٹھیں دو گھڑی کے لئے

دونوں عالم سے دشمنی کر لی
میں نے اک تیری دوستی کے لئے

تیرا ارمان اے محبتِ یار
مانگ لائے ہیں زندگی کے لئے

موت کی لذتیں وہ کیا جانے
مر رہا ہو جو زندگی کے لئے

خلد کیا چیز ہے، جہنم کیا
بے نیازِ غم و خوشی کے لئے

مے نہ دے زہر ہی پلا ساقی!
چاہیئے کچھ تو زندگی کے لئے

دہر میں عزم کو یقیں کی قسم
کیا ہے دشوار آدمی کے لئے

غیر کا ہو کے اپنا اے عرفان
درد لازم ہے زندگی کے لئے

رفعت سلطان

نہ دلنواز ہو کیسے مری غزل خوانی
بہار پر ہے گلستانِ دل کی ویرانی

بجھے تو کیسے بجھے آنسوؤں سے آتشِ دل
یہ آگ وہ ہے بجھاتا نہیں جسے پانی

ترے جمال کی افسوں طرازیوں کے طفیل
زمانے میں کوئی بہزاد ہے، کوئی مانی

ہم اہلِ درد کے حالِ زبوں پہ ہنستے ہیں
یہی تو اہلِ جہاں کی ہے سخت نادانی

نہ ایک بار بھی دیکھا مری طرف اُس نے
نہ راس آئی مجھے میری چاک دامانی

ہم اہلِ شوق کی آشفتہ خاطری کے لئے
عطا ہوئی ہے تری زلف کو پریشانی

فقط یہ کہنے کی باتیں ہیں، ورنہ دنیا میں
وہ کون ہے جو نہیں حسرتوں کا زندانی

گیا تھا دل میں امیدیں ہزار لے کے، مگر
اُس انجمن سے ملی بھی مجھے تو حیرانی

مری نظر نے وہ دیکھی ہے شکل اے رفعت
نہیں ہے جس کا دو عالم میں کوئی بھی ثانی

خواب اور تعبیریں

اعجاز نسرین۔ بی، اے

مین دھوبی گھاٹ۔ لائل پور

یکم جولائی ۶۵ء

محترم چچا جان! سلام احترام

آپ کی عنایات پیہم جاری ہیں۔ افسانہ نمبر ملا۔ کچھ کہہ نہ سکی، افسانہ نمبر طرازنے نہ دے سکی، عید کارڈ ملا تو شکریہ ادا نہ کر سکی۔ ایک بار حمایت علی شاعر نے اپنے ڈرامے "برزخ" کے بارے میں سنایا تھا اور اُن کے لاکھ سمجھانے پر بھی "برزخ" کا مطلب سمجھ میں نہ آیا تھا اور آج ایسا سمجھ میں آیا ہے کہ ساری دنیا کو سمجھا سکتی ہوں۔

——— اور ہاں آپ نے فنکاروں کے چہروں سے نقاب اُتار کر بہت اچھا کیا ہے۔ ہمارے قارئین فنکاروں کو آسمانی مخلوق جان کر کیوں سمجھ لیتے ہیں کہ وہ بنے بنائے ہیرو ہیں۔ اُن کا کوئی گھر بار اور بیوی بچے نہیں ——— افسانے کے بارے میں کچھ نہ کہوں گی کیونکہ میں خود بھی نہیں جانتی کہ یہ میں نے کب کہاں اور کیسے لکھ دیا ہے . . .

آپ کی بھتیجی ——— اعجاز نسرین

"گُل!"

"جاؤ میں نہیں بولتی۔"

"کیوں؟"

"تم نے میرا گھروندا جو توڑ دیا ہے۔"

"ٹوٹنے والی چیز تھی ٹوٹ گئی۔ خدا کے لئے رونا نہ شروع کر دینا۔"

"میں کیوں رونے لگی۔"

"ارے یہ اب ریت میں کیا ڈھونڈ رہی ہو؟"

"میرا موتی جو کھو گیا ہے۔"

"امی کہتی تھیں ریت میں کھوئے موتی ذرا مشکل سے ملا کرتے ہیں۔"

اور میں پندرہ سال تک ریت میں کھوئے ہوئے موتی کو ڈھونڈتی رہی۔ اونچی اونچی لہریں بھی مجھے اپنے ساتھ نہ بہا سکیں۔ لہریں آتی رہیں لوٹتی رہیں اور میں ساحل کی ریت ٹٹولتی رہی۔

مانے ——— یہ پندرہ سال بعد کون مخصوص انداز میں گوا ڑ سجا رہا ہے۔

"نیمی تم رک جاؤ یہ دروازہ تم سے نہیں کھلے گا۔ اسے میں ہی کھول سکتی ہوں۔"

"گُل!"

"جی!"

"اتنے سال کیا کرتی رہیں کچھ تو بتاؤ؟"

"ریت میں کھوئے موتی کو ڈھونڈتی رہی اور آخر مل گیا۔"

"اچھا! بڑی خوش قسمت ہو!"

"اب پھر تو نہیں کھو جاؤ گے؟"

"نہیں۔"

"تم کیا جانو۔ میں نے یہ لمبی مدّت کس عالم میں گزاری ہے۔"

"مجھے احساس ہے۔"

"شادی!"

"کہو؟"
"تم اِتنے سگریٹ نہ پیا کرو۔"
"کیوں؟"
"جانے کیوں۔ میں تمھیں سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔
میں بتاؤں کیوں؟"
"کیوں؟"
"تم سگریٹ سے جلتی ہو۔"
"ہاں کبھی کبھی جی چاہتا ہے سگریٹ بن کر تمھارے لبوں سے لگ جاؤں۔"
"لگ جاؤنا۔"
"اونہوں۔ ابھی نہیں۔"

"پگلی!"
"جی۔"
"تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ پارے کی طرح تڑپتی پھرتی ہو کبھی یہاں کبھی وہاں۔"
"بادل ہو لتا ہے۔"

"ابھی نہیں۔"
"کیوں؟"
"ابھی انتظار کرنا پڑے گا۔"

"تو کیا پندرہ سال سے بھی زیادہ کوئی انتظار کر سکتا ہے۔ سیتا نے بارہ سال کا بن باس بھوگا تھا۔ لیکن —— نہیں انتظار کرنے والے تو عمر بھر انتظار کر سکتے ہیں۔ یہ کیا پاگل پن ہے۔ یہ کیسی دیوانگی ہے۔"

"شازی!"
"کہو؟"
"جی چاہتا ہے تم مجھے قید کر لو۔"
"کہاں؟"
"ایک ایسے گھر میں جس کا کوئی دروازہ کوئی کھڑکی کوئی روزن نہ ہو۔ اور تم صرف میرے ہو کر رہ جاؤ۔"
"نہیں پگلی!"

"کیوں؟"

"میرا گھر تو بہت پیارا ہوگا۔ جس کے آنگن میں سفید گلاب کے پاس آم کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھ کر ہم اپنے بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا کریں گے۔"

اُف! یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ جب وہ یہاں نہیں تھا جب بھی تو میں جی رہی تھی۔ اب کیوں اُسے جھپٹ کر دل میں چھپا لینے کو جی چاہتا ہے۔ اسی پاگل پن کی وجہ سے اُن سے چھپتی پھرتی ہوں۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔

"شگفتہ!"

"جی!"

"اپنا کچھ تو خیال رکھا کرو۔"

"کیا ہوا؟"

"میں جانتا ہوں تم گرمی اور سردی کو شدت سے محسوس کرتی ہو۔ انتہا پسند۔ جو ٹھہریں لیکن یہ ہیٹر اپنے اتنے قریب نہ رکھا کرو۔"

"کیوں؟"

"میرا نہیں تو اُنہی کا خیال کرو جو تمہارے اور میرے اشتراک سے دُنیا میں آنے والے ہیں۔"

"تمہارے اور میرے اشتراک سے پہلے تو..."

"شادی؟"

"کہو؟"

"شادی ـــــ لوگ باتیں بنانے لگے ہیں۔ مجھے اُن سے بچا لو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔"

"شگفتہ! میں بھی یہی سوچتا ہوں کہیں خزاں نہ آجائے۔ کہیں بہاروں کے خواب پریشان نہ ہو جائیں۔ مجھے بھی خزاں سے ڈر لگتا ہے۔"

"شادی! اگر اب بھی کسی خزاں کا ڈر ہے تو آؤ پہلے اُس لڑکی کا گلا دبا دو، جو سہاگ کے ایک عجیب سے دن کے خواب دیکھتی ہے۔"

لیکن تم نہ اُس پاگل لڑکی کا گلا دبا سکے اور نہ خزاں ہی کو روک سکے۔ میری پاگل چاہت تمہیں باندھ نہ سکی۔ اپنے لاابالی پن کی وجہ سے تم مجھے فیصلہ نہ کر سکے۔ نہ جانے تمہارے دل میں کیا تھا۔ خزاں آئی اور چاروں طرف پھیل گئی۔ تم جو سدا سے میرے گھروندے توڑتے آئے تھے، اب بھی توڑ کے آگے بڑھ گئے۔ میں قطرے کے گہر ہونے کا انتظار کر سکتی تھی۔ مگر دنیا ـــ الو کا خیال تھا جس موتی کو میں پندرہ سال تک ریت میں ڈھونڈتی رہی وہ پتھر نکلا۔ اُس پتھر کی چوٹ سہہ کر میں چپ چاپ لوٹ آئی۔

اور آج میں سفید گلاب کے پاس آم کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھی اپنے بچوں کو آنگن میں کھیلتے ہوئے دیکھتی ہوں لیکن اُن کا باپ ـــــ تم نہیں!!

غزل

فیروز نظر ـــــــ

کس لئے کہتی ہے دُنیا تجھے پتھر، جاناں؟
کھائی جب چوٹ تو ہم نے بھی یہ دلبر، جانا!
تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے ہر آنسو کو
ہم نے تارا کبھی سمجھا، کبھی گوہر جانا
منزلوں نے اُسی رہرو کے قدم چُومے ہیں
اپنے ہی عزم کو جس نے یہاں رہبر، جانا
سچ ہی کہتا تھا زمانہ تری بابت ہم سے
تُو ستمگر ہے، یہ اب ہم نے ستمگر، جانا
اُن کی محفل میں نظر صرف وہ شاعر ٹھہرا
جس نے ابرو کو کماں، آنکھ کو خنجر جانا

غزل

مدحت الاختر، بی، اے ـــــــ

اگر اِس میں نمودِ غم نہ ہوتی
محبت فارغ عالم نہ ہوتی
ہمیں تسلیم اُن کی بے نیازی
مگر اے کاش یہ پیہم نہ ہوتی
خلوصِ دل اگر ساقی میں ہوتا
ہمیں یوں فکرِ بیش و کم نہ ہوتی
کوئی دن اور جی لیتے جہاں میں
اگر تیری محبت کم نہ ہوتی
کسی کا غم اگر مل جاتا مدحت
جوانی آپ اپنا غم نہ ہوتی

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

افسانہ لکھ رہی ہوں	خوش باش ایم اے	دو روپے
اندھیرے	اختر عادل روپ	دو روپے
آگ اور دھواں	م م راجندر ایم اے	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
ایک پیار ایک دھوکا	رام سرن شرما	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
بیگم صاحبہ	شوکت تھانوی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
داماد	〃	دو روپے ۲۵ نئے پیسے
پگلی	〃	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
بے غیرت	مضطر ہاشمی	چار روپے ۷۵ 〃
باون پتے	کرشن چندر ایم اے	پانچ روپے ۹۵ 〃
پہلی لڑکی	رازداں ایم اے	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
انور	فیاض علی	آٹھ روپے ۵۰ 〃
برہمن	کرشن گوپال عابد	چار روپے ۵۰ 〃
ستم	〃	چار روپے ۵، 〃
گھائل	〃	تین روپے ۹۵ 〃
ظالم	سید نصرت	دو روپے ۵۰ 〃
جانے والے	اختر عادل روپ	تین روپے ۵۰ 〃
جاتی ہوئی بہار	وحشی محمود آبادی	چار روپے
چوٹ	دت بھارتی	تین روپے ۵، نئے پیسے
گناہ	〃	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
حالِ دل	بیگم نوازش ولایت حسین	تین روپے ۵۰ 〃
خاتون	انتصار حسین	تین روپے
حاجی مراد	قیسی رامپوری	چار روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
خمِ ابرو (نظم)	عبدالحمید عدم	دو روپے ۵۰ نئے پیسے

دو پھول	عادل رشید	تین روپے ۹۵ 〃
دو سال، پہلے دو سال بعد	زبیدہ خاتون	چھ روپے
فریب مسلسل	شفیق بانو	دو روپے
زہر	زکی انور	چھ روپے
برچھیں	قیسی رامپوری	چار روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	تین روپے
سناٹے	رضیہ سجاد ظہیر	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	تین روپے ۵۰ 〃
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	چار روپے ۵۰ 〃
ننگی جوانی	سعید امرت	دو روپے
رہ گذر	انیس مرزا	چار روپے ۵، نئے پیسے
خوفناک محبت	عبدالحلیم شرر	تین روپے
شاہدہ	انتصار حسین	تین روپے
کرنیں	شفیق الرحمٰن	تین روپے
ناظمہ کی آپ بیتی	ایم اسلم	تین روپے
ایک دل ہزار غم	عزیز بدایونی	دو روپے ۵ نئے پیسے
زرینہ	رئیس احمد جعفری	چھ روپے ۵۰ نئے پیسے
ننگا شہر	احمد تمجاع	پانچ روپے
دردانہ	نادرہ خاتون	پانچ روپے
چندر کلا	جمنا داس اختر	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
جیون	〃	دو روپے ۵۰ 〃
رادھا الزبتھ	〃	دو روپے ۵۰ 〃
پاپی	〃	چار روپے
سوناگاچھی	〃	چار روپے ۵۰
طوفانوں کی کہانی	〃	چار روپے ۵۰ 〃
جوار بھاٹا	〃	چار روپے ۵۰ 〃

قیامت	زکی انور	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
سازش	〃	دو روپے ۵۰ 〃
کانٹوں کی سیج	رشید اختر ندوی	پانچ روپے
گمراہ	قیسی رامپوری	چار روپے ۲۵ نئے پیسے
ناگ دیوتا	مخمور جالندھری	دو روپے ۵۰ 〃
خون کے چھینٹے	〃	دو روپے ۵۰ 〃
خوابگاہ میں	〃	تین روپے ۵۰ 〃
فراق	نگین بھارتی	تین روپے ۵۰ 〃
پیاسا	〃	تین روپے ۵۰ 〃
پراسرار رقاصہ	〃	دو روپے
پراسرار قاتل	〃	دو روپے
پیاس	کے۔ ایل نارنگ بی اے	تین روپے ۵۰ 〃
محبت روتی ہے	غلام عباس	دو روپے
مالوا	میکسم گورکی ترجمہ: رشی کمار شاد	ایک روپیہ ۵، 〃
کھیت میں لہو	تاجور سامری	ایک روپیہ ۵، 〃
جی ہاں بنتے ہیں	شوکت تھانوی	تین روپے ۷۵ 〃
پردے کے پیچھے	منٹو	دو روپے ۵۰ 〃
ملکۂ صحرا	اوم پرکاش نامی	دو روپے ۵۰ 〃
خاموش نغمہ	〃	چار روپے
آتش گل (مجموعہ کلام)	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
باقیات اقبال 〃	ڈاکٹر اقبال	تین روپے
تلخیاں (کلاں) 〃	ساحر	چھ روپے
تلخیاں (خورد) 〃	ساحر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
پرچھائیاں 〃	ساحر	ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر (مولانا آزاد)		تین روپے ۵۰ 〃
زہریلا حسن	اشفاق احمد	دو روپے

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

افسانہ

پھول اور سنگھار

م۔ صبوحی

نورنگ دروازہ۔ ۲/۱۲/۸۵۔ رائچور (میسور اسٹیٹ)

۱۵ر جون ۶۵ء محترم و مکرم! سلام و آداب

... یہ "پھول اور سنگھار" ہے۔ پسند آئے تو "بیسویں صدی" کی نذر کر دیجئے ـــــ عنواں ہی اگر بدل جائے تو پھر کسی چیز کی کیا وقعت! آپ تو یہ بات جانتے ہیں نا! احسان مانوں گی اگر آپ میری اِس کہانی کا عنوان نہ بدلیں...

ـــــ م۔ صبوحی

ابھی ابھی اُس کی دُور دراز کی رشتے کی بہن نے اُسے بتایا کہ تمہاری فردوس بھی عجیب پاگل ہے۔ اب بھی وہ رات کی تنہائیوں میں اپنی گیلی گیلی آنکھوں زرد زرد سے رخساروں سے اپنے ہونٹ دانتوں تلے چباتے چباتے جیسے سسکنے لگتی ہے۔ کیسے عجیب ہیں یہ سناٹے مسعود! جو میری زندگی میں تیر گئے ہیں۔ لوگ کچھ نہ کھو کر بھی سکون پا جاتے ہیں۔ میں نے اُسی سکون کو پانے کے لئے اپنا سب کچھ لُٹا دیا ہے۔ پھر بھی میرے سینے میں یہ کیسے آتش فشاں پھٹ رہے ہیں۔ تم لوٹ کیوں نہیں آتے مسعود! لوٹ کیوں نہیں آتے؟ کاش! میری تنہائیوں کا احساس تمھیں جینے نہ دیتا!! ـــــ وہ فردوس کی باتیں اُسے سُناتی چلی گئی۔ اُس نے سوچا بھی نہیں کہ اُس کی یہ باتیں اُس کے سسک سسک کر سوتے ہوئے جذبات و احساسات کو جگا کر پھر ایک نہ ختم ہونے والی اذیت کے ہاتھوں سونپ دیں گی۔ اُس نے ایک لمحہ کو بھی نہ سوچا کہ اُس کا زخم خوردہ دل پھر یہ تپش کیسے برداشت کر پائے گا۔ گھٹ گھٹ کر دم توڑ دینے والی تمناؤں کو پھر گلے سے لگا کر وہ کیسے زندہ رہ سکے گا؟ وہ تو کہتی کہتی اپنی راہ نکل گئی۔ وہ چلی گئی تو جیسے وہ تڑپ اُٹھا۔ دوڑ کر اُس کے پیچھے لپکا جیسے چاہتا ہو کہ اُسے پکڑ لے۔ اُس کی راہ روک کر پُوچھے۔ بتاؤ تو میری فردوس نے اور کچھ کہا ہے؟ کچھ پُوچھا، کچھ چاہا ہے؟ لیکن وہ پکڑ نہ سکا، روک نہ سکا۔ وہ تو اُس کے دل پر پڑے آبلوں کو روند کر نکل گئی۔ وہ دریچے کے در پر اپنا سر ٹیک کر رہ گیا۔ جیسے فردوس کی ساری یادوں کو جسم کا روپ دے کر کہنے لگا۔

کتنی عجیب ہے تمہاری زندگی فردوس! لوگ تمھیں سہاگن کہتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ تمہارے مسعود نے تمھیں چھوڑ دیا اور تم اپنے آپ کو بیوہ کہتے ہوئے ڈرتی ہو کہ تمہارا سہاگ زندہ ہے!

کاش وہ زندہ نہ ہوتا! لیکن موت بھی تو اُس کے لئے مشکل تھی ـــ وہ تو احساس کرنا چاہتا تھا کہ اُس کے بعد فردوس کی خزائیں کن بہاروں سے لپٹ جائیں گی۔ کتنی خوشیوں کے ہنگوروں میں وہ جھولتی رہے گی۔ کیسی مُسکراہٹیں اُس کے لبوں پر رقصاں رہیں گی۔ یہی کچھ سوچ کر اُس نے اپنے آپ کو زندگی کی سانسوں میں جکڑے رکھا تھا، اپنے قدموں میں اپنی محرومیوں کے احساس کی بیڑیاں ڈال دی تھیں تاکہ فردوس اپنی زندگی سنوار لے۔ وہ تو جی لے گا۔ جیسے بھی جی لے گا۔ فردوس کے خیال اور اُس کی یادوں کے ہر دیپ کو بُجھا کر، زندگی کی تاریک راہوں پر لڑکھڑاتا چلتا رہے گا۔ ایک دن کہیں نہ کہیں کوئی کھائی، کوئی خندق ضرور آئے گی جس میں گر کر وہ ختم ہو جائے گا۔ کتنا خوبصورت اسکیچ بنا لیا تھا اُس نے اپنی آئندہ زندگی کا! یہی تو ایک حسرت زندہ تھی۔ زندہ رکھے ہوئے تھی ـــ لیکن ـــ لیکن!

"کہاں ہیں فردوس تمہاری وہ بہاریں، جن کے لئے میں نے تمہاری راہ کے ہر کانٹے کو چُن لیا؟ کہاں ہیں وہ خوشیاں جن کے لئے میں نے ہر اندھیرے کو اپنے دل کا مہمان بنا لیا؟ کہاں ہیں وہ مُسکراہٹیں، جن کے رقص کی خاطر میں تمہارے لبوں کی شیرینی سے محروم ہو گیا! ـــ کہاں ہیں؟ ـــ کہاں ہیں؟"

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہے۔ بیاہ کے آٹھ دن بعد فردوس نے اُس سے پُوچھا تھا۔

"کیوں مسعود! مجھ سے بیاہ سے انکار کی کیا سُوجھی تھی؟"

جیسے اُس کے دل نے چیخ کر فردوس سے کہا تھا۔

"نہیں، نہیں میری زندگی! تم اِتنی سفاک اور ظالم نہ بنو۔ میرے دل کی گہرائیوں میں اُگی ہوئی درد کی بیل کو نوچ کر تمہیں کیا ملے گا؟ کیا پاؤ گی تم؟" ——— وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ پاکستان سے آٹھ برس بعد جب وہ لوٹ کر آیا تھا، دو ہی دن گزرے تھے۔ اُس کا بیاہ کر کے دم توڑتے باپ کی آرزو کے در پر اُسے قربان کر دیا گیا تھا۔ نہ کچھ پوچھا گیا نہ بتایا گیا۔ سب کچھ پہلے ہی سے طے تھا۔ زبان دی اور لے لی گئی تھی پھر بھی اُس نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن فردوس کیا جانے کہ اُس کی عزت کا جنازہ اُس کے کندھوں پر رکھ کر مجبور کیا گیا تھا کہ وہ اب فردوس کو کسی صورت اپنی زندگی میں دفن کر لے ورنہ فردوس کی رُسوائی ہو گی۔ رُسوائی کے پنجے اتنے خونخوار ہوتے ہیں کہ لڑکی کی عزت کے کفن کو تار تار کر دیتے ہیں۔ اُسی عزت کی خاطر اُس نے فردوس کو اپنے آپ میں دفن کر لیا تھا۔

●●●···●●●···●●●···●●●···●●●···●●●···●●●

- تم آسمانوں پر خدا کو تلاش کرتے رہتے ہو اور وہ نہیں ملتا۔ لیکن اگر تم آنکھیں کھول کر اپنے آس پاس دیکھو تو معلوم ہو کہ وہ تمہارے روبرو ہے۔
(رابندر ناتھ ٹیگور)
- جو اپنے سُکھ چین کے لئے دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے گویا وہ اِسی دُنیا میں اپنے لئے دوزخ تیار کرتا ہے۔ (ہری بھاؤ اپادھیائے)
- جب نیکی اور علم مل جاتے ہیں تو انسان دیوتا ہو جاتا ہے۔
(سوامی سار شبدا نند جی)
- پاک دامن، خوش اخلاق، نیک، اور فرماں بردار بیوی، مرد کے لئے نعمت ہے۔ اِسی طرح ایک بلند کردار اور وفادار مرد عورت کا زیور ہے۔ (مہاتما گاندھی)

●●●···●●●···●●●···●●●···●●●···●●●···●●●

اُس کے اور فردوس کے تعلق کا جو مزار بن گیا تھا، کس نے دیکھا تھا اُسے؟ باپ نے عدم کی راہ لی۔ سب نے اپنے اپنے راستے ناپے اور اُس جیسے پتھر پر ایک معصوم زندگی کی آرتی دے دی گئی۔

دن گزرتے گئے۔ وہ فردوس کے لئے ایک ایسی آواز بن گیا جو کسی بھٹکے ہوئے راہی کو کہیں دور سے سُنائی دیتی ہے۔ اُس کے فاصلے بڑھتے ہی گئے۔ قربت کی ہر گرہ کھُل کھُل کر پھیلتی گئی۔ پھیلتی ہی گئی۔ یہاں تک کہ ایک سرا دوسرے سرے سے بہت دُور نکل گیا۔

فردوس کی خاموش نگاہوں میں جب کبھی وہ دیکھتا، اُسے محسوس ہوتا جیسے یہ دو بھڑکتی شمعیں ہیں جو کسی کو اپنی آگ میں جلا دینا چاہتی ہیں۔ لیکن نہ جانے اُس کا دل کیسا دل تھا جو نہ پروانہ بن سکا نہ جل کر فنا ہو سکا۔ اُسے یقین تھا کہ جب کبھی فردوس اُس کی طرف دیکھتی ہو گی اُسے محسوس ہوتا ہو گا کہ وہ کسی میوزیم میں رکھے ہوئے کسی خوبصورت اسٹیچو کی خوبصورت آنکھوں میں اُتر گئی ہے۔ ایک دن فردوس نے اُسے بانہوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ جیسے شمع پروانے کو محبت میں جل کر فنا ہونے کا سبق دے رہی ہو لیکن وہ جھنجوڑتی ہی رہی۔ ایک دن اُس کے سینے پر سر ٹیک کر رو پڑی جیسے آنسوؤں کی ہر ضرب سے پتھر میں شرارے پیدا کرنا چاہتی ہو۔ اور پھر وہ روتی ہی رہی۔ اِسی طرح آخر وہ دن بھی آ گیا جب فردوس کے ہاتھ تھک گئے، اُس کی آنکھیں تھک گئیں۔ ہاتھ کے آنسو جم کر سنگ ریزے بنتے چلے گئے ——— اور جیسے وہ بھول گئی کہ وہ اور مسعود ایک ہی منزل کے دو راہی ہیں۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی ایسے قفس کے دو پنچھی ہیں جنھیں الگ الگ قید کر دیا گیا ہے۔ کاش کوئی اِس دیوار کو توڑ دیتا!!

فردوس نے اپنے گھر کی پچھلی طرف ایک خوبصورت باغ سجا لیا تھا۔ ہر شام جب وہ لوٹ کر گھر آتا، اُسے وہ یاسمین و صنوبر، کیا نا و لوگن ویلیا، نرگس و جوہی اور موگرے کے درمیان جھومتی ملتی۔ جیسے وہ خالق بن گئی ہو اور اپنی اِس تخلیق پر نازاں ہو۔

ایک ڈوبتی شام کو جب وہ باغ میں پہنچا، فردوس بہت سارے پھولوں سے اپنی گود بھرے بیٹھی تھی کچھ اِس طرح کہ اُسے محسوس ہوا تھا جیسے پھولوں نے فردوس کو گود میں لے لیا ہو۔

'اوہ! فردوس!! کتنے پھولوں میں بھری بیٹھی ہو! کہو تو کچھ اور توڑ کر تمھاری گود میں بھر دوں!!'

'میں کہہ تو دوں، لیکن تم میری گود بھر بھی سکو گے مسعود؟'

فردوس نے جیسے ہی اُس سے پوچھا، اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے پاؤں کے زخموں سے کوئی پوچھے کانٹوں بھری راہ طے بھی کر سکو گے؟ اُسے اپنے آپ سے نفرت سی ہو گئی۔ بے اختیار اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان ڈھانپ لئے۔

'ایسا تو نہ کہو فردوس! نہ کہو ——— نہ کہو ———' وہ چپکے سے پلٹ گیا۔

اُس روز پہلی بار اُسے بہت شدت سے احساس ہوا کہ جہاں قدرت نے اُسے مجسّم مجرم بنا کر بھیجا تھا، وہاں فردوس سے بیاہ کر کے اُس نے ایک اور گناہ بڑھا لیا ہے۔

ایک دن شام ڈھلے فردوس جب شاپنگ سے لوٹ کر آئی تو آتے ہی کہنے لگی۔

"جانتے ہو مسعود! بازار کی ایک گلی سے گزر رہی تھی کہ یہ ننھی ننھی جانیں، دھرتی کی گود میں پلنے والی یہ معصوم روحیں بلک رہی تھیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کسی کے لئے یہ دھرتی اِس حد تک سکڑ اور سمٹ جاتی ہے کہ کچھ نہ ملے، جیسے ماں نہ ہوئی کوئی ڈائن ہو گئی ——— جانے دو۔ دیکھو تو میں نے اِنھیں اپنی گود میں سمیٹ لیا ہے۔ آخر کسی نہ کسی کو میری آغوش میں پلنا ہی ہے۔ پھر ماں کی آغوش نہ ملے تو روح تمام عمر زخمی

ناگن کی طرح تڑپتی رہتی ہے۔"

فردوس بہک رہی تھی۔ بہک کر کہتی ہی جا رہی تھی ـــــ ان بچّوں سے لپٹی لپٹی اُس نے ایک نظر اُن بچّوں کی طرف دیکھا تھا۔ اُن کی آنکھیں ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے ویران کھنڈروں میں جلتے دیئے دیکھ رہا ہے۔ جھلملاتے دیئے۔

"ہاں ہاں فردوس! تم نے اچھا ہی کیا جو انھیں اپنے پیار کا آسرا دے دیا۔ ورنہ یہ بُجھ جاتے، یہ ختم ہو جاتے اور اگر انسان یوں ادنیٰ کیڑوں کی طرح بے کس و بے بس ختم ہونے لگے تو پھر قدرت اِس دُنیا کو حیوانوں کے ہاتھوں سونپ دے گی۔ شاید وہی اشرف بن سکیں۔ تم نے اچھا ہی کیا۔"

وہ فردوس کو باتوں میں اُلجھا رہا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ فردوس اِس حد تک بہک سکتی ہے؟ یوں بھی اپنی آسودگی تلاش کر سکتی ہے؟ اُس میں اِتنی ہمّت نہ تھی کہ ایک نظر فردوس کی طرف دیکھ لے۔

"مسعود!" فردوس نے پُکارا اور اُس نے اپنی آنکھوں پر سے سارا بوجھ ہٹا کر فردوس کی طرف دیکھا۔

"کتنے پیارے ہیں نا!" وہ کہہ رہی تھی۔ اُسے ناگاہ محسوس ہوا جیسے فردوس مجسّم ماں ہو۔ وہ گرد و غبار میں اَٹے ہوئے ایک بچّے کے بال سُلجھا رہی تھی اور دوسرے کے چہرے کی گندگی اپنی ساڑی کے آنچل سے صاف کر رہی تھی۔ فردوس کے بکھرے بکھرے بال، ڈھلکا ڈھلکا آنچل، بے ترتیب ساڑی! اپنے آپ سے اِس دُوری کو دیکھ کر اُسے محسوس ہوا جیسے فردوس کے ساتھ اُس نے انصاف نہ کیا ہو۔ اُسے یاد تھا، فردوس نے جب اُس کی دُنیا میں قدم رکھا تھا وہ چاند کی روپہلی کرن کی مانند تھی جیسے آسمان سے اُتری ہو اور زمین پر رقص کر رہی ہو۔

"فردوس!" اُس کے لب آہستہ سے ہلے جیسے وہ کہنا چاہتا تھا، تمھاری حالت بگاڑ کر میں خوش کہاں ہوں فردوس! تمھیں دیکھتے ہی میرے سارے جسم میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ میں تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہوں۔ کوئی دُکھ مجھے کچوکے لگا لگا کر نڈھال کر دیتا ہے لیکن ساری آوازیں اُس کے ہونٹوں تک پہنچیں اور کپکپا کر جم گئیں۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رات اندھیری اور سرد تھی۔ آتشدان میں چنگاریاں دہک دہک کر بُجھ رہی تھیں۔ کاش سب کچھ جل کر راکھ ہو جاتا۔ ورنہ پھر اے خدا! مجھے ہمت دے، قوّت دے کہ میں فردوس کی خوشیوں کی خاطر ہی فردوس کو چھوڑ سکوں۔ اُس کی مُسکراہٹوں کے لئے اُسے بُھلا سکوں۔ مجھے ہمّت دے میرے پروردگار!

اُس نے اپنا سر تکیے میں گاڑ دیا۔ اپنی آنکھیں سختی سے بھینچ لیں۔ اپنے آپ کو اپنی باہنوں میں جکڑ لیا۔ اپنے ہونٹ چبا کر زخمی کر لئے لیکن پھر بھی وہ سُلگتا ہی رہا۔ کاش اُسے کوئی برف کے مدفن میں دفن کر دیتا!!

وہ اُٹھ بیٹھا۔ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف گیا۔ اُس نے دیکھا فردوس دونوں بچّوں سے چمٹی ہوئی سو رہی تھی۔ کتنا تقدّس تھا چہرے پر! سچ مچ ماں خدا کی محبت و پاکیزگی کا ایک پرتو ہے۔ وہ فردوس کے قریب پہنچا۔ اُس پر جُھک سا گیا لیکن فردوس کے چہرے پر پڑتا ہوا اُس کا تاریک سایہ! ـــــ ناگاہ جیسے اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ تڑپ کر پلٹا: "نہیں۔ نہیں ـــــ میں مجسّم اندھیرا ہوں۔ تم روشنی ہو فردوس! تم روشن ہی رہو!!"

وہ دوڑ کر اپنے کمرے میں واپس آیا۔ میز کے قریب پہنچا، قلم پکڑا اور فردوس کے نام آخری پیغام چھوڑنا چاہ ہی رہا تھا کہ سامنے فردوس مُسکرا رہی تھی۔ عروسی لباس میں مُسکراتا پیکر! ـــــ "اُف! میرے ارادوں کو متزلزل نہ کرو فردوس! میں تمھارے لئے کچھ بھی نہیں۔" اُس نے فردوس کی مُسکراتی تصویر کو اپنے رومال سے ڈھانک دیا اور پھر فردوس کے نام ایک چٹھی چھوڑ دی۔

"میں تمھاری گود پھولوں سے بھر نہیں سکتا اور اس کے بغیر تمھارا وجود ادھورا ہے۔ تم نامکمل ہو میری زندگی! ـــــ میں اپنے جسم کا ڈھانچہ لے کہیں دُور جا رہا ہوں۔ تم سے میری ایک التجا ہے۔ میرے بعد مجھے بھول کر کسی اور کو اپنا لینا تاکہ تمھاری آغوش میں پھول کھلیں، کلیاں چٹکیں!!"

وہ بھاگ آیا ـــــ دُنیا کے سارے رہگزار چھان کر پانچ برس بعد جب فردوس کے شہر لوٹا اور دُور بہت دُور ایک ویران مقام پر بس گیا تو فردوس کی زندگی کے بربادیٔ ٹوٹتا ہر رگ اور رگ میں سمایا ہر آنسو جیسے ہوائیں دھیرے دھیرے اُسے

- اِس دُنیا میں ہونے والے مختلف واقعات و حادثات کی پُشت پر یقیناً کوئی طاقت کارفرما ہے، جس کے ہاتھ میں نظمِ عالم کی باگ ہے۔ وہی خدا ہے۔ (انگریز فلاسفر جوڈ)
- ہم سب کے دل و دماغ میں بہت سی طاقتیں سوئی ہوئی ہیں جنھیں ہمدردی اور حوصلہ افزائی کا ایک لفظ جگا سکتا ہے۔ (ولیم جیمس امریکی)
- جو دوسروں کا ادب نہیں کرتا اُس کا بھی ادب نہیں کیا جاتا۔ (ہربرٹ اسپنسر)
- ہر وہ چوٹ جو ہم جوشِ انتقام میں لگاتے ہیں، انجام کار اُس کا ہدف ہم ہی بنتے ہیں۔ (ولیم)

ے لگیں والے بتانے لگیں۔ اُسے معلوم ہوا کہ دُنیا نے فردوس کا جینا دُشوار کر دیا۔ اس
ر کہ اُس کے شوہر نے اُسے چھوڑ دیا۔ ہر ایک کی آنکھوں سے فردوس کے لئے جیسے
اریاں پھوٹتیں کہ اُس نے فردوس کو کیوں چھوڑا؟ کیوں چھوڑا؟ ہر ایک کی نگاہیں
دوس کے سراپا کو اپنے خیالات کے پیمانے میں سبر کر دیکھتیں کہ کوئی کھوٹ مل جائے۔
یک کی نگاہیں فردوس کے کردار کے شفاف شیشے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتیں کہ کوئی بال
آجائے۔ لیکن اُنھیں کچھ نہ ملا۔ اُنھوں نے کچھ نہ پایا۔

فردوس مجسم سوگوار بن گئی۔ اُس نے اپنے لبوں پر تالے ڈال لئے۔ شوہر کے
ہ رہتے ہوئے بیوہ بن گئی تاکہ دُنیا کسی طور ہی جینے تو دے۔ ہر آرائش و زیبائش،
رنگینی و خوبصورتی کو اُس نے اُس کے لئے تیاگ دیا تاکہ دُنیا کوئی الزام تو نہ دے!
ا گناہگار تھا وہ! ایک عذاب سے فردوس کو بچانے کے لئے پیچھے سے دوسرا عذاب
ڈال دیا۔

پانچ برس پہلے اُس نے اُسے اِس لئے چھوڑ دیا تھا کہ وہ پھولوں سے اپنی
دبھر لے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ وہ ایسا ظالم بن گیا ہے جو کچھ دے تو نہ سکا، اپنے ساتھ
دوس کا سہاگ اور سنگھار بھی لئے جا رہا ہے!

وہ دریچے سے ہٹ گیا۔ اپنے ساتھ لائی ہوئی فردوس کی تصویر پر سے رومال
ہٹا دیا، جیسے مُسکرائی فردوس اُس سے سِسک سِسک کر کہہ رہی تھی۔

"تم لوٹ کیوں نہیں آتے مسعود! کیوں نہیں آتے؟ کیوں نہیں آتے؟"

اُف! کیا کرے وہ؟ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا لیکن دوسرے
لمحے وہ بہت تیزی سے اپنا سامان سمیٹ رہا تھا۔

"ہاں فردوس! میں آج آرہا ہوں۔ پانچ برس تم نے میری راہ دیکھی ہے
اِس لئے کہ اچھا ہوں یا بُرا جیسا بھی ہوں، تمھاری پناہ ہوں، تمھاری زندگی کا امین،
تمھاری موت تک کا ساتھی ہوں۔ آنکھیں مُوند کر اپنا لو مجھے۔ بُھلا دو اِس احساس کو
کہ پھول ہی زندگی کا سنگھار نہیں ہوا کرتے!!!"

مشہور افسانہ نگار حضرت آسی رام نگری مناسب حق محنت پہ اصلاح کا کام بھی کرتے ہیں۔ ضرورت مند اصحاب خصوصاً نئے لکھنے والے اپنے مضامین، افسانوں اور کتابوں پر اصلاح لے کر ایک مستند ادیب کی خدمات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ یا ٹکٹ بھیجئے۔ پتہ: حضرت آسی رام نگری منظر سرائے۔ یو۔پی

مدیر بیسویں صدی کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی فوراً تعمیل ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد چاروں کھونٹ گھومتا ہے۔ افواہیں جمع کرتا ہے۔ اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ یہ جنون اِس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے ہوش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں۔

ریل کا سفر آسان

ہندوستان کی ریل گاڑیوں میں مسافروں کا رش روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور حالات یہاں تک صبر تناک ہو گئے ہیں کہ اگر آپ کو کہیں جانا ہو تو پندرہ پندرہ دن پہلے سیٹ بک کرانی پڑتی ہے اور سیٹ بک کرانے کے لئے جو کرپشن، سفارش اور رشوت وغیرہ کا قومی رواج چل پڑا ہے، وہ الگ۔

اِس صورتِ حالات سے محکمہ ریل بے حد پریشان تھا لیکن اب افواہ ہے کہ اس پریشانی کا حل تلاش کر لیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ ریل کے موجودہ کرائے کو دس گنا کر دیا جائے تاکہ کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا سفر کرنے کی جرأت نہ کر سکے ۔۔۔ دُوسری تجویز یہ ہے کہ ڈبل ڈیکر بسوں کی طرح تمام ریلیں ڈبل ڈیکر کر دی جائیں۔ نچلے ڈبوں اور اُوپر کے ڈبوں میں امتیازی شان پیدا کرنے کے لئے تجویز کیا گیا ہے کہ نیچے کے ڈبوں کا کرایہ موجودہ کرایہ سے دس گنا ہو اور اُوپر کے ڈبوں کا کرایہ نچلے ڈبوں سے دس گنا ہو۔

علاوہ ازیں تجویز یہ بھی ہے کہ ڈبل ڈیکر ریلوں کی چھتوں پر بھی مسافروں کو سفر کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ اِن چھتوں پر صرف تھرڈ کلاس مسافروں کو سفر کرنے کی اجازت ہوگی اور اگر اس پر بھی رش کم نہ ہوا تو ریلوں کو تین منزلہ کر دیا جائے گا۔ تیسری منزل کی چھتوں پہ ہر حال میں تھرڈ کلاس مسافروں کی مناہی ہو گی۔

بہرکیف اِن نئی تجاویز کے بعد مسافروں کو ہفتوں پہلے سیٹ بک کرانے کی زحمت سے نجات ملنے والی ہے۔ تاریخ کا بے صبری سے انتظار کیجئے۔

ایک غلطی ۔۔۔ ایک خمیازہ

گزشتہ دنوں خوراک کے بارے میں ریسرچ کرنے والی کمیٹی نے انکشاف کیا کہ گدھی اور اُونٹنی کا دودھ غذائیت کے اعتبار سے بہت مفید اور بہتر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس انکشاف پر ہندوستان کے پانچ بڑے بڑے سرمایہ داروں کی ایک ایمرجینسی میٹنگ بلائی گئی۔ جس میں یہ انقلابی فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان بھر کی گدھیوں اور اونٹنیوں کو ہول سیل پیمانہ پر خرید کر اُن کا اسٹاک کر لیا جائے۔

چونکہ کانسٹی ٹیوشن میں تجارت کرنے، مال کا اسٹاک کرنے اور اُسے مارکیٹ میں بھیجنے یا نہ بھیجنے کی آزادی ہے۔ اِس لئے سرکار اُن کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کر سکتی اور نہ گدھیوں اور اونٹنیوں کو مجبور کر سکتی ہے کہ وُہ سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت ہونے سے انکار کر دیں۔ سرکار کی دُوسری بے بسیوں کی طرح اِس بے بسی کا اثر کش ہوا بھی عوام پر پڑنے والا ہے۔

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ پانچ سرمایہ دار، ملک کی گدھیوں اور اونٹنیوں کے پانچ زون بنائے جا رہے ہیں۔ ہر زون کی گدھیاں اور اونٹنیاں ایک مرکزی اسٹاک میں جمع کر لی جائیں گی۔ ہر زون کے لئے خرید و فروخت کی ایجنسیاں کھولی جائیں گی اور اُن ایجنسیوں کے ذریعے ملک کی تمام دودھ والی گدھیاں اور اونٹنیاں خرید لی جائیں گی اور پھر ایک مصنوعی بحران پیدا کر کے انہیں دُگنے تگنے داموں پر مارکیٹ میں فروخت کیا جاتا رہیگا۔

اِس سلسلہ میں صرف ایک افواہ حوصلہ افزا ہے کہ سرکار اپنی غلطی تسلیم کرے گی کہ خوراک کی ریسرچ کمیٹی نے جو گدھی اور اونٹنی کے دودھ کے بارے میں نتیجہ نکالا تھا وہ ایک ٹیکنیکل غلطی کی وجہ سے نکالا گیا تھا سرکار اُس رپورٹ کو واپس لیتی ہے اور اعلان کرتی ہے کہ گدھی اور اونٹنی کا دودھ صرف گدھوں اور اونٹوں کے لئے بہتر اور مفید ہے، انسان کیلئے نہیں۔

امریکہ کی نقل میں

امریکی پارلیمنٹ نے ایک تجویز پاس کی ہے کہ آئندہ ہر سگرٹ ساز کمپنی اپنے ہر پیکٹ

پر یہ فقرہ لکھ دیا کرے۔ "سگریٹ آپ کی صحت کے لئے سخت مضر ہے۔ کیونکہ اس میں زہر ہوتا ہے"۔

دہلی کے پارلیمنٹری حلقوں میں یہ افواہ زور شور سے گشت لگا رہی ہے کہ ہند پارلیمنٹ کے چند ممبران امریکی پارلیمنٹ کی جمہوریت پرستی کی نقل میں ایک تجویز پیش کرنے والے ہیں کہ ہندوستان میں بناسپتی گھی تیار کرنے والی ہر کمپنی کے لئے یہ لازمی قرار دے دیا جائے کہ وہ بناسپتی گھی کے ہر ڈبے پر یہ فقرہ لکھ دیا کرے۔ "بھگوان کرشن کی دھرتی پر آپ بناسپتی گھی کھا کر مقدس گیتا کی توہین کر رہے ہیں"۔

سُنا گیا ہے یہ تجویز اگر پارلیمنٹ میں پیش کی گئی تو ہاؤس میں سخت ہنگامہ اور کرائسس پیدا ہونے کی توقع ہے۔ ممکن ہے، بناسپتی گھی تیار کرنے والی کمپنیاں (جن کی زریں پشت پر کئی معزز ممبران پارلیمنٹ ہیں) جمہوری نظام کے باعث اس کی براہ راست مخالفت نہ کر سکیں لیکن ایسے ہی ایک معزز "بناسپتی پرست" ممبر پارلیمنٹ سے غیر رسمی گفتگو کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ وہ سرمایہ داروں کے مفاد کے نام پر اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ بلکہ عوام کے مفاد کی آڑ میں اس پرستاؤ کو پاس ہونے سے روکیں گے اور یہ جمہوری دلیل دیں گے کہ بناسپتی گھی غریب عوام ہی زیادہ تر استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے جب تک ہندوستان میں غریب ختم نہیں کئے جاتے، اُس وقت تک بناسپتی گھی کو مضر صحت نہ کہا جائے۔ عوام دیسی گھی کھانے کی اہلیت سے محروم ہیں۔ اگر وہ بناسپتی گھی سے بھی محروم کر دئے گئے تو عوام میں بغاوت پھیل جائے گی اور جمہوری نظام کا تختہ اُلٹ جائیگا۔

امید واثق ہے کہ اس مدلل نکتہ کی بنا پر یہ پرستاؤ مسترد ہو جائیگا اور بناسپتی گھی بھگوان کرشن کی دھرتی پر بدستور راج کرتا رہیگا۔ لیکن اس سلسلہ میں جب میں نے بناسپتی گھی تیار کرنے والی کمپنی کے ایک سیٹھ سے بات کی تو وہ ہنس کر کہنے لگا۔ "اگر تجویز پاس بھی ہو جائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ہم ہر ڈبے پر یہ فقرہ لکھ دیں گے۔ غریب لوگ اِس فقرہ کے باوجود بھی مجبوراً بناسپتی گھی خریدتے رہیں گے۔ کیونکہ ضرورت گھی سے پوری ہوتی ہے، فقروں سے نہیں"۔

میاں بیوی ـــ بیوی میاں ــــــ •

پیرس سے ایک دوست نے ایک عجیب و غریب خط لکھا ہے کہ یہاں ایک شادی شدہ جوڑے میں بہت گہری محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے پل بھر کی جُدائی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ایک دن بیوی کو ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ تمہارے جسم میں مردانہ عناصر بڑھ رہے ہیں اور تمہارے مختلف اعضا میں جنسی تبدیلی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ اور عین ممکن ہے کہ کچھ عرصہ بعد تمہاری نسائیت بالکل معدوم ہو جائے۔ اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ تم آپریشن کروا کر مرد بن جاؤ۔

بیوی کو یہ سن کر بے حد صدمہ ہوا کیونکہ مرد بننے کا مطلب یہ تھا کہ اُسے خاوند سے جُدا ہونا پڑتا۔ لیکن ڈاکٹر کی اِس تنبیہ پر کہ آپریشن نہ کروایا گیا تو تمہاری زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی، اُس بچاری نے خاوند کو بتائے بغیر جنسی تبدیلی کے لئے دوائیوں کا استعمال شروع کر دیا۔

دوسری طرف اِس سے بھی دلچسپ واقعہ ہوا کہ خاوند صاحب جو جدید ترین انسان تھے، اُنہیں تفریحاً شوق چرایا کہ وہ جنسی تبدیلی کا تجربہ کریں اور مرد سے عورت بن جائیں۔ چنانچہ اُس نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے شرط لگائی کہ اگر تم مجھے مرد سے عورت بنا دو تو میں دس ہزار فرانک تمہیں دے دوں گا اور اگر تم مجھے عورت نہ بنا سکے تو بطور جرمانہ تم مجھے بیس ہزار فرانک ادا کرو گے۔

یہ سب کارروائی اُس نے اپنی بیوی سے پوشیدہ رکھی۔

شومئی قسمت سے یا خوش قسمتی سے خاوند کا آپریشن کامیاب ہو گیا اور وہ واقعی عورت بن گیا اور دس ہزار فرانک ہار گیا۔ جب وہ سر لٹکائے یہ الم ناک خبر سُنانے کے لئے گھر آیا بلکہ گھر آئی تو گھر میں بیوی کی بجائے ایک مرد کو بیٹھا پایا۔ کیونکہ یہ وہی دن تھا، جب بیوی کا آپریشن بھی کامیاب ہوا تھا اور وہ عورت کی بجائے مرد بن کر گھر میں داخل ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر کی کشش و پنج کے بعد جب دونوں نے ایک دوسرے پہ اپنی اپنی جنسی تبدیلی کا راز منکشف کیا تو دونوں اُداس اور غمگین ہونے کی بجائے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے اور آج کل دونوں پھر میاں بیوی کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خاوند بیوی بن گئی ہے اور بیوی خاوند بن گیا ہے۔ بنیادی رشتہ میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

نوٹ:۔ میں نہیں جانتا کہ یہ خبر صحیح ہے یا غلط۔ چونکہ افواہ کے بہت زیادہ نزدیک ہے۔ اِس لئے میں اِسے "افواہیں" میں شامل کر رہا ہوں۔

نہ گولی نہ لاٹھی ــــــ •

ہندوستان میں آئندہ مظاہرین پر نہ گولی چلائی جائیگی، نہ لاٹھی چارج ہوگا نہ آنسو گیس چھوڑی جائے گی۔

یہ تاریخی فیصلہ گذشتہ دِنوں ہوم منسٹری اور اپوزیشن پارٹیوں کے مشترکہ نمائندوں کی میٹنگ میں کیا گیا۔ حکومت اور اپوزیشن دونوں کو عرصے سے یہ تکلیف اور پریشانی تھی کہ جب بھی کوئی مظاہرہ ہوتا ہے تو ہجوم مشتعل ہو جاتا ہے اور مشتعل ہجوم کو ٹھنڈا کرنے کے لئے پولیس گولی چلاتی ہے۔ جو ایک غیر مہذبانہ فعل ہے۔ جوابی طور پر ہجوم سنگ باری کرتا ہے جو قریب قریب اتنا ہی غیر مہذب فعل ہے ــــ ان غیر مہذب طریقوں کو بند

کرنے کے لئے اپوزیشن اور حکومت دونوں بے قرار تھے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں اس سے اہنسا اور جمہوریت کی رُوح کو سخت اذیت پہنچتی تھی۔

چنانچہ مشترکہ میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ جب مظاہرہ ہو تو پولیس اپنے ساتھ نہ گولیاں لا سکے، نہ لاٹھیاں اور نہ آنسو گیس۔ اسی طرح ہجوم بھی پتھر اور لاٹھیاں نہیں اٹھائیگا بلکہ جب ہجوم مشتعل ہوگا اور پولیس کے حکم کے باوجود منتشر نہیں ہوگا تو پولیس اور مظاہرین کے درمیان کبڈی کا مقابلہ کیا جائیگا۔ دونوں طرف سے کبڈی کی ایک ایک ٹیم میدان میں اُترے گی۔ اگر مظاہرین کی کبڈی ٹیم ہار گئی تو مظاہرین رضاکارانہ طور پر منتشر ہو جائیں گے اور اگر پولیس کی کبڈی کی ٹیم ہار گئی تو پولیس خود بخود منتشر ہو جائے گی۔

چنانچہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پولیس اور مظاہرین کے درمیان دوستانہ مراسم کی داغ بیل پڑ جائے گی اور گولی اور لاٹھی چارج اور پتھراؤ کی وحشیانہ روایت کبھی نہیں دُہرائی جائے گی۔

بے زبانوں کا راشن ——— •

یہ اندوہناک خبر سُن کر کہ ہندوستان کے کئی شہروں میں راشننگ سسٹم شروع ہو جائیگا، اِن شہروں کے کئی پرندوں اور جانوروں میں ہلچل مچ گئی ہے۔

وجہ اِس ہلچل کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ سرکار نے فی کس چھ چھٹانک راشن دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن سرکار ایک اہم پوائنٹ فراموش کر گئی وہ یہ کہ کئی پرندے اور جانور ایسے ہیں جو انسان کے اِس مقررہ راشن میں سے حصہ لیتے ہیں۔ مثلاً چوہے، چڑیاں، کوے، طوطے، کبوتر، کتے، بلیاں وغیرہ ——— یہ سبھی حضرات اور خواتین انسان کے راشن میں ہی سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں اور اُنہیں خدشہ لاحق ہو گیا ہے؟ ممکن ہے، چھ چھٹانک راشن میں سے انسان اِن پرندوں اور جانوروں کو اُن کا حصہ دینے سے انکار کر دے، اور وہ بھوکوں مر جائیں۔ سنا گیا ہے کہ اِن پرندوں اور جانوروں نے کچھ انسانوں کو اِس قسم کی منتقمانہ گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے کہ جس سے اُن میں اضطراب پھیل گیا ہے۔

ایک باوثوق پرندے کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ آنے والے اِس غذائی کرائسس کی اطلاع ایسے تمام پرندوں اور جانوروں تک پہنچائی جا چکی ہے اور انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ چوہے، طوطے، چڑیاں، کبوتر، کتے اور بلیاں مل کر کم از کم پانچ ہزار کی تعداد میں جلوس نکالیں گے اور وزیر خوراک مسٹر سبرامنیم کی کوٹھی کے باہر مظاہرہ کریں گے، دھرنا لگائیں گے اور شاید مرن برت بھی رکھیں۔ وُہ وزیر خوراک سے مطالبہ کریں گے کہ اُن کے حصہ کا راشن بھی انسانوں کے راشن میں شامل کیا جائے ——— افواہ ہے کہ اگر مسٹر سبرامنیم کو اُن بے زبانوں کی زبان سمجھ میں آگئی اور اُنہوں نے اُسے بھاشائی "مظاہرہ" سمجھ کر استعفیٰ نہ دے دیا تو اُن کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائیگا اور شاید فی کس راشن چھ کی بجائے آٹھ چھٹانک کر دیا جائے۔

.....فردوسی پبلیکیشنز میں گوا ہوا افسانہ نمبر موصول ہوا۔ یہ کہنا نہ غلط ہوگا نہ مبالغہ کہ بیسویں صدی ہمارے ملک کا وہ معتبر رسالہ ہے جس کے افسانوی اور تغزلی ادب کو کوئی دوسرا رسالہ آئینہ نہیں دکھا سکتا۔ خدا کرے اُس کی عمر بہت ہی دراز ہو آپ کی نیک نیتی اور آپ کے حوصلوں کی طرح۔ آپ اُن تمام افسانہ نویس حضرات کو میری طرف سے مبارکباد پیش کر دیجئے جنکے ہر افسانہ پر سینکڑوں خطوط داد و ستائش کے آیا کرتے ہیں۔ کتنے مقبول و ممتاز شہرت کے مالک ہیں یہ حضرات!

اِس مرتبہ حضرت مولانا حسرت موہانی مرحوم کے نام سے جو غزل جناب عفت موہانی نے ارسال کی ہے اور جو آپ نے مع عفت صاحب کے خط کے شائع کی ہے اُسے دیکھ کر روح تڑپ اٹھی اِس لئے نہیں کہ غزل اتنی معیاری نہ تھی بلکہ اِس لئے کہ اس غزل میں تین مصرعے ایسے تھے جن کے آخر میں دو حرف بڑھے ہوئے تھے اور کسی قاعدے سے اب جائز نہیں ہے عام موزوں طبع مبتدی بھی اِس فرق کو آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں اور وہ اپنی بات میں یہ بتا دیتے ہیں کہ یہ تین مصرعے کسی الگ بحر کے ہیں باقی کسی ایک بحر کے۔ پھر یہ کیسے مان لیا جائے کہ حسرت موہانی جیسے علامہ شاعر اِس قسم کی بچکانہ غلطی کر سکتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ عفت صاحبہ کس لیاقت کی خاتون ہیں اور انہوں نے کس جذبہ کے تحت یہ شعر بھیجے جو اتنے بڑے معروف و مرحوم شاعر کی پوزیشن پہ حرف لائیں۔

سوال یہ ہے کہ بیسویں صدی کے حصہ نظم میں آپ نے کیا سمجھ کر اِسکا شائع کرنا روا رکھا؟ میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ یہ غزل مولانا مرحوم کی ہو سکتی ہے اور بفرضِ محال بحیثیت البشری اُن سے یہ غلطی ہو گئی تو اُسکو ذمہ داروں نے مشتہر کس جذبۂ نیک کے تحت کیا؟ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی عزت کی نگہبانی کریں اور کسی بھی نیک یا بد جذبے کے تحت اُن کی تعلیمات کو مجروح نہ کریں۔ میں پھر اپنا یہ شبہ ظاہر کرتا ہوں کہ یہ غزل مولانا حسرت موہانی کی نہیں ہو سکتی جسمیں ایسی لغزش ہو۔ آپ مہربانی کر کے یہ خط شائع کر کے ہزاروں ناظرینِ بیسویں صدی کو غلط فہمی کا شکار ہونے سے بچائیے۔

مخلص:۔ آبر احسنی

نوٹ:۔ غزل مذکورہ حضرت حسرت موہانی مرحوم کی ابتدائی غزلوں میں سے ہے۔ جب وہ اپنا کلام اُستاد کے پاس بغرضِ اصلاح بھیجا کرتے تھے۔ ہر مبتدی سے ایسی لغزشیں ممکن ہیں۔ یہ غزل اِس خیال سے شائع کی گئی ہے کہ قارئین ایسے شاعر کے ابتدائی کلام کا اندازہ کر سکیں جن کا شمار وقت کے ممتاز اساتذہ میں ہوا۔ (ادارہ)

تھکاوٹ

رام پال بی۔اے۔آنرز

۲۴،ایل۔ ماڈل ٹاؤن۔ ہوشیار پور (پنجاب)

۱۸ جولائی ۶۵ء خوشتر بھائی! تسلیم

اُردو کی بقا کے لئے آپ کی جد وجہد قابلِ داد و تحسین ہے۔ اگر آپ جناب جنادا س اختر اور دوسرے اصحاب اِس جد وجہد میں کامیاب نہ ہوتے (خدا نہ کرے) تو ہم جیسے بہتیرے اَن پڑھ اور جاہلِ مطلق ہو جائیں گے۔ خدا آپ سب کو کامیابی عطا فرمائے ــــــ "سلاخوں کے پیچھے" جُرم و مجرم کے سلسلے میں کافی مقبول ہوا ہے۔ اب کے ایک کہانی "تھکاوٹ" ارسال ہے۔ عام روش سے ہٹ کر اس میں ایک جلاد کا نفسیاتی تجزیہ ہے ــــــ جلاد، جس کا نام سُن کر آدمی کانپ اُٹھتا ہے، اُسے عزرائیل اور یم دُوت کے نام سے پکارتا ہے۔ اُس سے نفرت کرتا ہے، اُسے ننگِ انسانیت سمجھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ یہ سب ہوتے ہوئے بھی "انسان" ہے ــــــ کیا میں راستی پر ہوں؟ اِس کا جواب یہ کہانی پڑھنے والے ہی دے سکیں گے۔ کیونکہ اُن سے بہتر اور کوئی نقاد نہیں . . .

نیاز مند ــــــ رامپال

فتو آگیا ــــــ

اب شک پایۂ یقین کو پہنچ گیا کہ کل صبح نہالو ضرور پھانسی لگ جائے گا۔ یہ سرسراہٹ جو سرگوشی کے دائرہ سے نکل کر زبانِ عام پر آچکی تھی، فتو کے کانوں تک بھی پہنچی لیکن وہ اِن سب اشاروں کنایوں سے بے نیاز، پھانسی لگانے والا رسّہ دیکھ رہا تھا کہ کہیں اِس میں کوئی سقم نہ رہ جائے۔ گہرے نیلے کرتے پاجامہ اور کالی ٹوپی میں چھانٹ رہا تھا جیسے وہ دوسرے دن ایک انسان کا رشتۂ حیات قطع نہیں کرے گا بلکہ اُسے اُس کے افعال کی سزا جزا کا فلسفہ سمجھائے گا۔

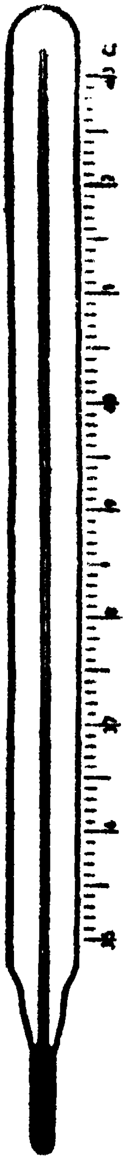
فتو کو اپنی نحوست کا علم تھا۔ اُس کے قدم کبھی نہیں گہرے سمجھے۔ اُس کی ذات سے بدشگونی وابستہ تھی۔ اُس کا وجود سایۂ موت تھا۔ حقارت بھری نظروں، کراہت آمیز فقروں، دبے چھپے نفرت انگیز اشاروں کو وہ خوب سمجھتا تھا۔ اور آج سے نہیں پچھلے چالیس برسوں سے۔ اُس نے سرکاری طور پر سیکڑوں قتل کئے تھے کیونکہ وہ سرکاری جلاد تھا۔

لیکن وہ اِس لئے بری الذمہ تھا کہ وہ تھا کال اکال۔ قاتل کا قاتل۔ ایک ساڑھے پانچ فٹ کا منحنی، دھان پان سا آدمی جس کا وزن ڈیڑھ من سے کم ہی تھا اُس نے نہ جانے کتنے جیالوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ چوڑی چھاتیوں اور تنی ہوئی مونچھوں کو مٹی میں ملا دیا تھا۔ نہ وہ عزرائیل کا مطلب سمجھتا تھا نہ یم دُوت کا۔ بس اپنے فرض کو خوب پہچانتا تھا۔

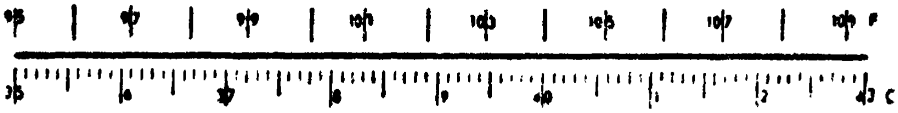
یہ اُس کی فرض شناسی کا آخری موقع تھا۔ سرکاری کاغذوں میں اِس ماہ کی پہلی تاریخ کو وہ اٹھاون برس کا ہو جائے گا اور پھر ــــــ فتو ٹمٹماتے ہوئے لیمپ کی روشنی میں سوچنے لگا۔ وہ دُنیا میں یکہ و تنہا تھا۔ نہ ماں، نہ باپ۔ نہ بیوی، نہ بچے۔ نہ بھائی، نہ بہن۔ وہ کون تھا؟ کس مذہب کا تھا، اُسے خود علم نہ تھا اور نہ اُسے علم اور مذہب کی ضرورت تھی۔ خدا کا نام اُس نے پھانسی چڑھنے والوں کے منہ سے سُنا تھا جو آخری منزل پر اللہ اکبر، ست سری اکال، ہر ہر مہادیو یا اُنگلی سے صلیب کا نشان بناتے تھے اور فتو کے ایک ہی جھٹکے کے ساتھ اُن کی ندا سے آخری وابستگی ہمیشہ کے لئے موت کے سایہ میں مدغم ہو جاتی تھی۔

فتو نے بیڑی کا ایک گہرا کش لگایا۔ زور سے کھانسا اور پوپلے مُنہ میں

آپ کے لئے



بخار دیکھنے کا نیا تھرمامیٹر



- ماہ اپریل ۱۹۶۶ء کے بعد، بخار دیکھنے کے تھرمامیٹر سینٹی گریڈوں میں ہوں گے۔
- ان تھرمامیٹروں پر ۳۵ ڈگری سینٹی گریڈ سے ۴۳ ڈگری سینٹی گریڈ تک کے نشان ہوں گے۔
- ان پر ہر ۰.۱ ڈگری سینٹی گریڈ کا نشان ہوگا۔
- انسانی جسم کی طبعی حرارت ۳۷ ڈگری سینٹی گریڈ ہوتی ہے۔

ڈائریکٹوریٹ آف میٹرک ویٹس اینڈ میژرز،
وزارت تجارت، بھارت سرکار

تھکاوٹ

رام پال بی۔ اے۔ آنرز

۲۴، ایل۔ ماڈل ٹاؤن۔ ہوشیار پور (پنجاب)

۱۸؍ جولائی ۶۵ء

خوشتر بھائی! تسلیم

اردو کی بقا کے لئے آپ کی جدوجہد قابلِ داد و تحسین ہے۔ اگر آپ جناب جمناداس اختر اور دوسرے اصحاب اِس جدوجہد میں کامیاب نہ ہوتے (خدا نہ کرے) تو مجھ جیسے بہتیرے اَن پڑھ اور جاہلِ مطلق ہو جائیں گے۔ خدا آپ سب کو کامیابی عطا فرمائے ——— "سلاخوں کے پیچھے" جرم و مجرم کے سلسلے میں کافی مقبول ہوا ہے۔ اب کے ایک کہانی "تھکاوٹ" ارسال ہے۔ عام روش سے ہٹ کر اِس میں ایک جلاد کا نفسیاتی تجزیہ ہے ——— جلاد، جس کا نام سن کر آدمی کانپ اُٹھتا ہے، اُسے عزرائیل اور یم دوت کے نام سے پکارتا ہے۔ اُس سے نفرت کرتا ہے، اُسے ننگِ انسانیت سمجھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ یہ سب ہوتے ہوئے بھی "انسان" ہے ——— کیا میں راستی پر ہوں؟ اِس کا جواب یہ کہانی پڑھنے والے ہی دے سکیں گے۔ کیونکہ اُن سے بہتر اور کوئی نقاد نہیں . . .

نیاز مند ——— رامپال

فتو آگیا ———

اب شک پایۂ یقین کو پہنچ گیا کہ کل صبح نہالو ضرور پھانسی لگ جائے گا۔ یہ سرسراہٹ جو سرگوشی کے دائرہ سے نکل کر زبانِ عام پر آچکی تھی، فتو کے کانوں تک بھی پہنچی لیکن وہ اِن سب اشاروں کنایوں سے بے نیاز، پھانسی لگانے والا رسہ دیکھ رہا تھا کہ کہیں اِس میں کوئی سقم نہ رہ جائے۔ گہرے نیلے کرتے پاتجامہ اور کالی ٹوپی میں چھانٹ رہا تھا جیسے وہ دوسرے دن ایک انسان کا رشتۂ حیات قطع نہیں کرے گا بلکہ اُسے اُس کے افعال کی سزا جزا کا فلسفہ سمجھائے گا۔

فتو کو اپنی نحوست کا علم تھا۔ اُس کے قدم ہلکے نہیں گہرے سبز تھے۔ اُس کی ذات سے بدشگونی وابستہ تھی۔ اُس کا وجود سایۂ موت تھا۔ حقارت بھری نظروں، کراہت آمیز فقروں، دبے چھپے نفرت انگیز اشاروں کو وہ خوب سمجھتا تھا۔ اور آج سے نہیں پچھلے چالیس برسوں سے۔ اُس نے سرکاری طور پر سیکڑوں قتل کئے تھے کیونکہ وہ سرکاری جلاد تھا۔

لیکن وہ اِس لئے بری الذمہ تھا کہ وہ تھا کال اکال۔ قاتل کا قاتل۔ ایک ساڑھے پانچ فٹ کا منحنی، دھان پان سا آدمی جس کا وزن ڈیڑھ من سے کم ہی تھا اُس نے نہ جانے کتنے جیالوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ چوڑی چھاتیوں اور تنی ہوئی مونچھوں کو مٹی میں ملا دیا تھا۔ نہ وہ عزرائیل کا مطلب سمجھتا تھا نہ یم دوت کا۔ بس اپنے فرض کو خوب پہچانتا تھا۔

یہ اُس کی فرض شناسی کا آخری موقع تھا۔ سرکاری کاغذوں میں اِس ماہ کی پہلی تاریخ کو وہ اٹھاون برس کا ہو جائے گا اور پھر ——— فتو ٹمٹماتے ہوئے لیمپ کی روشنی میں سوچنے لگا۔ وہ دُنیا میں یکہ و تنہا تھا۔ نہ ماں، نہ باپ۔ نہ بیوی نہ بچے۔ نہ بھائی، نہ بہن۔ وہ کون تھا؟ کس مذہب کا تھا، اُسے خود علم نہ تھا اور نہ اُسے علم اور مذہب کی ضرورت تھی۔ خدا کا نام اُس نے پھانسی چڑھنے والوں کے منہ سے سُنا تھا جو آخری منزل پر اللہ اکبر، ست سری اکال، ہر ہر مہادیو یا اُنگلی سے صلیب کا نشان بناتے تھے اور فتو کے ایک ہی جھٹکے کے ساتھ اُن کی خدا سے آخری وابستگی ہمیشہ کے لئے موت کے سایہ میں مدغم ہو جاتی تھی۔

فتو نے بیڑی کا ایک گہرا کش لگایا۔ زور سے کھانسا اور پوپلے مُنہ میں

بجھتے ہوئے بلغم کو چارپائی کے پاس تھوک دیا۔ ادھر بجھتے لیمپ کی روشنی ٹمٹمانے لگی۔ اُس نے سپاٹ دیوار پر اپنی نظریں گاڑ دیں اور سوچنے لگا ـــــ کاش یہ کبھی اٹھاون سال کا نہ ہوتا کیونکہ اُس کی زندگی میں کوئی مصروفیت تھی تو یہی تھی۔ اور اب . . .

اُسے یہ پیشہ وراثت میں ملا تھا۔ اُسے صرف اتنی کہانی یاد تھی کہ آج سے کوئی ساٹھ ستر سال پہلے اُس کا باپ جیل کے بڑے صاحب کے ہاں صفائی کا کام کرتا تھا۔ جیل خانے اُس وقت شاید نئے نئے بنے تھے اور بڑے صاحب نے اُس کے باپ کو لالچ دے کر، دھمکا کر، ڈرا کر اِس کام کے لئے آمادہ کیا تھا اور اس کے بعد اُس کی برادری نے اُس کا حقّہ پانی بند کر دیا تھا۔ جب اُس کے باپ نے پہلے آدمی کو پھانسی لگائی تھی تو اُس کی ماں نے اُسے چھوڑ کے دوسرا شوہر کر لیا تھا کیونکہ وہ بھی ایسے پاپی ہتیارے کے پاس رہنے کو تیار نہ تھی۔ وہ اپنے باپ کے پاس رہ گیا تھا کیونکہ ایسے گناہگار کے بیٹے کو بھی وہ اپنے پاس رکھنے کو گناہ سمجھتی تھی۔

فتّو خود بخود اپنی بے بسی پہ بلبلا اُٹھا۔ ہندوستانی ہونے کے ناطے اُسے اپنی قسمت پر یقین تھا۔ ماتھے کی لکیروں پر وشواس تھا۔ پچھلے جنم کے سنسکاروں کو مانتا تھا اور اِس جنم کے کرم ـــــ! فتّو خود بخود گھبرا گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اِس اندھیری کوٹھری میں سیکڑوں روحیں گھس آئی ہوں اور ہر روح فتّو سے پوچھتی ہو ـ "کیوں؟ مجھے پہچانتے ہو؟" لیمپ کی لَو جھلملانے لگی۔ لاشعوری طور پر اُس نے لیمپ کی بتّی اونچی کر دی۔ دھوئیں سے چمنی کالی ہوگئی اور بھک بھک کی آوازیں پیدا ہوئیں۔ فتّو سر سے پاؤں تک پسینہ میں نہا گیا۔ اُس نے گھبرا کر لیمپ کی بتّی نیچی کر دی۔ روشنی اپنی اصلی حالت پر آگئی اور فتّو نے اپنے آپ کو اِس واہمہ سے نکالنے کو زور زور سے بیڑی کے تین چار گہرے کش لے کر چھاتی سے سارا بلغم نکال کر فرش پر انڈیل دیا۔ "کیا اِس کا بھی کلیان ہوگا؟"

فتّو کو پچیس سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ اُس نے ایک برہمن کو پھانسی لگائی تھی جس نے اپنی بیوی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ وہ بھی مندر میں بھگوان کی مورتی کے سامنے! اُس نے پولیس، عدالت، جیل کہیں بھی جھوٹ نہیں بولا تھا اور پھانسی کے تختے پر بھی نہیں۔ اُس کی بیوی دیوی تھی اور اُس نے دیوی کی ہتیا کی تھی کیونکہ علاقہ کے ذیلدار نے دھوکے سے اُسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ امارت سے بدلہ نہ لے سکا لیکن جنون میں اُسے معصومیت میں کراہت نظر آئی اور وہ برداشت نہ کر سکا۔

تیس سال کا وہ پنڈت جو قاتل ہونے پر بھی پُر جلال تھا فتّو بھی ٹھٹھک کر رہ گیا تھا تو پنڈت نے ہنس کر کہا تھا۔

"فتّو! دیر نہ کر! کوئی کسی کو مارتا ہے، نہ جِلاتا ہے۔ تجھے اپنا کرم کرنا ہے۔ مجھے اپنے کرم کا پھل بھوگنا ہے۔"

پہلی بار فتّو نے محسوس کیا تھا کہ وہ پاپی نہیں ہے۔ وہ ایک کڑی ہے۔ وہ شاید کیڑے کو مارنے سے بھی گریز کرتا لیکن آدمی کو مارنا اُس کی قسمت میں لکھا تھا۔

لیمپ کی روشنی اونچی ہوگئی تھی۔ فتّو گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آخر اِس سارے ناٹک میں اُس کا کیا کردار ہے؟ آخری جھٹکا! وہ کسی کو گھر سے بلانے نہیں جاتا کہ بھئی پھانسی لگ جاؤ۔ لوگ لڑتے ہیں، جھگڑتے ہیں، مارتے ہیں، مرتے ہیں اور پھانسی لگ جاتے ہیں۔ پولیس پکڑتی ہے، عدالت سزا دیتی ہے، بڑے بڑے بھی اُسے قاتل سمجھتے ہیں اور جیل کے بڑے افسر آخری دن اُسے بُلا لیتے ہیں۔ لوگ باگ اُن کی عزت کرتے ہیں، سلام کرتے ہیں، دبتے ہیں، جھکتے ہیں اور صرف نفرت کرتے ہیں تو اِس سے جو ڈرامہ کے اختتام پر صرف آخری پردہ گرانے کے لئے نوکر ہے۔

فتّو انسانی فطرت پر غور کرنے لگا۔ وہ اَن پڑھ تھا، جاہل تھا۔ لوگوں کے خیال میں ہوّا تھا۔ مافوق الفطرت انسان تھا۔ جو دوسروں کو مار کے بھی خود موت کی دسترس سے محفوظ تھا! عزرائیل تھا، یم راج کا بیٹا تھا لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ انسان تھا اور بہتوں سے بہتر! فتّو خیالوں میں کھو گیا۔

ایک بار اُس کی برادری کے ایک آدمی کو پھانسی لگی۔ اُس نے بھی سُن لیا کہ وہ بدمعاش تھا، جواری تھا، لفنگا تھا اور پہلی بار اُس کے پاس اُس کی برادری کی ایک عورت آئی۔ بوڑھی سی۔ اُس کے ساتھ ایک اور عورت بھی تھی۔ بوڑھی نے دوسری کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ تیری ماں ہے فتّو! اِسے ساتھ لائی ہوں" اور پھر پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔ فتّو کی ماں فتّو کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ تیس سال پہلے وہ اُسے چھوڑ گئی تھی اور آج اُس پاپی کے پاس ایک بڑھیا کا سہارا بن کے آئی تھی۔ اُس بیٹے کے پاس جسے وہ اپنے پاس رکھنے کو تیار نہ تھی۔ فتّو ہمہ تن گوش سُنتا رہا۔

"نقّو میرا اکیلا لڑکا ہے" بڑھیا نے روتے ہوئے کہا "کیا تو پھانسی کا رسّہ ڈھیلا چھوڑ سکتا ہے کہ وہ بچ جائے؟"

عجیب درخواست تھی ایک ماں کی۔ جس کا لڑکا شرابی، آوارہ اور بدمعاش تھا۔ وہ ہر قیمت پر اُسے بچانے کو تیار تھی۔ وہ خود اُس کی جگہ پھانسی پر لٹک سکتی تھی۔ لیکن دوسری عورت گُم سُم کھڑی رہی۔ اُس نے اپنے جائے کو پیار نہیں کیا۔ بُلایا تک نہیں۔ وہ آوارہ نہ تھا، عیاش نہ تھا۔ بہتوں سے بہتر کما تا تھا سرکاری ملازم تھا۔ صحت بھی ان دنوں اچھی تھی لیکن وہ گناہ گار تھا۔ اپنے ناکردہ گناہوں کا سزاوار۔ اُس کے ہاتھ بے اختیار ماں کے پیروں کی طرف بڑھے لیکن اُس نے گھبرا کے پیچھے کھینچ لئے۔ فتّو گُم سُم ہو گیا۔ اُس نے آہستہ سے بڑھیا سے کہا۔

"ماں! میں تیرے لڑکے کو موت کے منہ سے تو نہیں چھین سکتا لیکن میں تیری سیوا کروں گا۔ میرا دُنیا میں اور کون ہے؟" اُس نے گہری نظر سے اپنی ماں کو دیکھا جو خلاء میں گھور رہی تھی۔

"چھی! تو میرا لڑکا ——— ایک جلّاد!!" اور دونوں عورتیں چل دیں کتنا قابلِ نفرت پیشہ ہے!! وہ دل ہی دل میں سوچتا رہا۔ آوارہ، بدمعاش، قاتل، ننگے بھی اس سے بہتر ہیں۔

فتّو کے دماغ کے پردے پر پُرانی تصویریں کھنچتی اور مٹتی رہیں اور وہ پھر حال کے اس لمحہ میں آگیا۔ یہ اُس کی نوکری کا آخری سین ہے۔ دُنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ روحانیت، نفرت، کراہیت، ذلالت سب پیسے سے چُھپ سکتی ہے۔ اِس کے ریٹائرڈ ہونے کے بعد اُس کی برادری کے کتنے لڑکے اِسی کام کو کرنے کو تیار تھے۔ تنخواہ کے علاوہ دس روپے فی آدمی کمیشن۔ اگر مہینے میں تین آدمی بھی پھانسی لگ گئے تو آپ ٹیرالین کی قمیص مُفت! وہ ایک نئے چھوکرے کے حساب پر دل ہی دل میں مُسکرایا اور اُس کا ہاتھ اپنے میلے کھدّر کے کُھردرے کپڑے سے مَس ہوا تو وہ سوچنے لگا ——— وقت وقت کی بات ہے۔ پیسہ کے پُجاریوں نے ہر گناہ میں ثواب کا پہلو نکال لیا ہے۔

پیسہ ——— کیا دُنیا میں یہی سب کچھ ہے؟ نہیں! فتّو نے اپنے آپ کو تسلّی دی۔ وہ پیسے والوں ہی کا تو لڑکا تھا جس نے وطن کے لئے جان دی تھی۔ پھانسی لگنے سے پہلے اُس نے "انقلاب زندہ باد۔ بھارت ماتا امر رہے!" کے نعرے لگائے تھے۔ اُس وقت وہ بیس اکیس برس کا ہوگا۔ آج وہ پچاس پچپن کا ہوتا۔ لیکن اُس کا نام اُس کی شکل ابھی تک اُسے یاد تھی۔ کیسے جھوم کے تختے پر چڑھا تھا۔ جیسے شیر کا بچہ ہو! اور پھانسی کا رسّہ گلے میں ڈالتے وقت اُس نے فتّو کی جھولی میں ایک مُسکراہٹ ڈالی تھی۔ یہ فتّو کا قیمتی اثاثہ تھا۔ کہتے ہیں اُس کے باپ کے پاس زمین تھی، جائداد تھی، خطاب تھا کیا نہ تھا۔ لیکن وہ ——— وہ دیوتا تھا!

اور جب فتّو اُس کی لاش کو ٹھیک کرنے لگا تھا تو زمین سے اُٹھے ہوئے اُس کے پیروں پر اُس نے سر رکھ دیا تھا اور اُس کے آنسوؤں سے ہلکے نیلے بے جان پیر دُھل گئے تھے۔ اُس نے پیر اُدھر نہیں کئے تھے۔ اُسے کسی سے نفرت نہ تھی۔

اُس روز شہر میں کتنا بڑا جلوس نکلا تھا۔ سُنا تھا بہت سے شہروں میں ہڑتال ہوئی تھی۔ فرنگیوں نے گولیاں چلائی تھیں۔ بہتیروں کو قید کیا تھا۔ ہنٹر پڑے تھے۔ لاٹھیاں برسی تھیں اور فتّو ڈر کے مارے کوٹھی سے نہیں نکلا تھا۔ شاید پہلی بار اُس نے اپنے آپ کو قاتل محسوس کیا تھا۔

فتّو نے نئی بیڑی سُلگائی۔

مُلک کو آزادی ملنے کے بعد وہ اُس کی سمادھی پر بھی گیا۔ لوگ آتے تھے، جاتے تھے اور اُس آزادی کے پروانے کو شردھانجلی بھینٹ کرتے تھے۔ وہ بھی ڈرتا ڈرتا سمادھی کے نزدیک پہنچا تو دیر تک کھڑا رہا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے پتھروں کو پرے ہٹا کے وہ اُس کے پاس آیا ہو اور پیار سے پُوچھتا ہو۔

"فتّو! کیسے ہو؟ میں تمھیں جانتا ہوں۔ میں مرا نہیں۔ میں مر نہیں سکتا۔ جب تک دھرتی ماں زندہ ہے، میرا اُس کا ناطہ قائم رہے گا!" اور پھر اُس نے ہنس کے کہا: "فتّو! مجھے امر بنانے میں تمھارا بھی حصّہ ہے۔ آخری سیڑھی تم نے پار کروائی تھی نا۔ یاد ہے؟"

فتّو اُسے یاد کرکے بلک بلک کے رو پڑا۔ اس بے رحم دُنیا میں وہ اُن چند لوگوں میں سے تھا جنھیں اُس سے نفرت نہ تھی۔ جو اُس کی مجبوریوں کو سمجھتے تھے۔ اُس کی لاچاریوں سے واقف تھے۔

فتّو پھر یادوں میں کھو گیا۔ اِس کے بعد اُسے اِس پیشے سے، اپنے آپ سے نفرت ہو گئی اور تب شاید اُس نے پہلی بار شراب پی جو بعد میں اُس کی عادت بن گئی۔ اُسے رہ رہ کے اپنے افعال کا غم ستانے لگا لیکن یہ عادت اس کے غم کی شدّت کو کم نہ کر سکی اور جب ایک پھانسی پانے والے نے کہا: "میری لاش پر ایک بوتل شراب کی انڈیل دینا" تو اُس نے اپنے کمیشن کے دس روپے کی شراب خرید کر مُردے کے منہ پر انڈیل دی اور شراب سے توبہ کر لی۔

جس شراب نے اُسے پھانسی کے تختے پر پہنچایا، مرنے کے بعد بھی اُسے اُس کی خواہش رہی۔ اُس کی اپنی خواہش کیا تھی۔ نہ زر، نہ زمین، نہ زن۔ نہ ماتم نہ فاقہ نہ غم!

ایک بار ایک پڑھے لکھے آدمی نے خاص طور پر اُس سے پُوچھا۔

"مرنے والے کی آخری خواہش کیا تھی؟"

"کیا آپ اُسے پُوری کر سکیں گے؟" فتّو نے جھنجلا کے کہا تھا۔ لوگ موت سے بھی مذاق کرتے ہیں۔ فتّو نے سوچا۔

"ضرور ضرور!" بہت سے آدمیوں میں خود کو نمایاں ظاہر کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

"اُس نے کہا تھا کہ اُس کے بعد آپ کو پھانسی پر لٹکا دینا۔"

"ہیں۔ ہیں۔ ہی ہی!" اُس کی ہنسی میں خوف نمایاں تھا۔ "تو بھئی! جلّاد بھی مذاق کرتے ہیں!"

"تو کیا میں آدمی نہیں؟" فتّو نے غصّے سے کہا۔ "اگر آپ موت سے چٹخارہ لینا چاہتے ہیں تو خود پھانسی کے تختے پر لٹک کر آخری خواہش ظاہر کر دیں۔" لیکن وہ

بجھا ہوا چہرہ پیلا ہوچکا تھا۔ "آخری خواہش؟" فتو منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ معلوم نہیں لوگوں میں یہ روایت کیوں ہے کہ پھانسی پر چڑھنے والے کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔ اس کی آخری خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ جتنی جلدی ہوسکے یہ قصہ ختم ہوجائے۔ پھانسی کی کوٹھری سے پھانسی کے تختے تک کے چند لمحے اُسے صدیاں معلوم ہوتے ہیں۔ کرب و درد، غم و الم اس کی سوچنے کی طاقت سلب کر لیتے ہیں۔ اُسے قرب و جوار، گرد و پیش کا ہوش نہیں رہتا۔ صرف کچھ سر پھرے جو اپنے آپ کو بے پروا اظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ایسی بے سر و پا اور اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں جن کا عقل و خرد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور انہیں اُن کی آخری منزل تک پہنچانے والے کردار اُن کی اس منطق سے پورے طور پر واقفیت رکھتے ہیں اور باہر کے لوگ تو بس ساحل سے طوفان کا نظارہ ہی دیکھتے ہیں۔

فتو ہنس سا گیا۔ وہ سوچنے لگا اب کوئی اس سے غلط سلط سوالات نہ پوچھے گا۔ اب کوئی بھی ریشمی رستے کے متعلق یا ریشم کی ڈوری کی نسبت نہ پوچھے گا۔ اُن لوگوں سے پوچھو کہ بھئی سلک اور اطلس کا پھانسی گھر میں کیا کام؟ ریشم کی ڈوری، ہنہہ! پھانسی نہ ہوئی بچے کا پالنا ہوگیا جسے ریشم کی ڈوری سے ہلایا جاتا ہے۔ لوگ مرنے میں بھی خوبصورتی ڈھونڈتے ہیں۔ جیسے بیوی بچوں کو پاس بٹھا کے چائے پیتے ہوئے بہت اطمینان سے کہیں۔ ارے فتو! تو آگیا۔ وہ نکالنا سوٹ کیس سے ریشم کی ڈوری۔ بڑی مہنگی منگوائی ہے۔" اور پھر "اچھا بچو! ٹاٹا۔ میں پھانسی لگنے جا رہا ہوں۔" عجیب دماغ ہے اُن لوگوں کا۔

اور پھر اُسے ادھیڑ عمر کا وہ بابو یاد آیا جس نے اُسے پتلون کوٹ پہن کے سلام کیا تھا اور سرگوشی کے لہجے میں کہا تھا۔

"مجھے پھانسی کے تختے کی ایک چھوٹی سی لکڑی چاہئے۔"

اور فتو نے حیرت سے پوچھا تھا "خیر تو ہے۔ کیوں کیا اُسی طرح کی لکڑی کا تختہ بنوانے کا خیال ہے؟" فتو کو اس وہم کا علم تھا کہ بانجھ عورتیں اس کا تعویذ بنا کر پہنتی ہیں۔

"میرے گھر اولاد نہیں جیتی۔ کسی نے کہا ہے۔" بابو نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

فتو نے فلسفیانہ انداز میں اُسے جواب دیا۔ "جو تختہ بچے پیدا کرنے والے نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے، وہ بھلا آپ کے بچوں کو زندگی کیسے دے گا؟"

بابو نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ "جو بھی ہو، فتو بھائی! میرا یہ کام کر دو۔ خدا تمہارا بھلا کرے گا۔"

نہ جانے کیوں فتو کو اس پر رحم آگیا۔ وہ اُسی وقت اندر جا کر ایک ٹکڑا کاٹ لایا اور بابو کو دیتے وقت ہنسا۔

دو سال بعد اتفاق سے اس نے بازار میں اس بابو کو پہچان لیا۔ اُس نے آواز دی۔ "بابو جی؟" اس نے پلٹ کر دیکھا اور رُندھے لہجے میں کہا۔ "کیا ہے؟"

"کیا بچے بچ گئے؟"

"نہیں۔" یہ اس نے ترش روئی سے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چلا گیا۔

رات آدھی سے زیادہ بھیگ چکی تھی اور صبح اُسے کام بھی کرنا تھا۔ جیل کی گھڑی نے دو بجا دیے تھے۔ اُسے چار بجے پھر کام میں جُت جانا تھا۔ اب تو یہ کام اُس کی ہڈیوں میں رچ گیا تھا۔ جیسے ایک ماہر موسیقار کے ساز پر انگلی رکھتے ہی تار مدھم، پنچم سُروں میں بول اُٹھیں۔ اُسے اِس کی پروا نہ تھی کہ اس بے خوابی کے بعد وہ اپنا کام ٹھیک طرح نہیں کر سکے گا۔ اُسے فکر تھی تو اس بات کی کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ یکدم اُس کے دماغ میں خیال آیا کہ وہ فلم میں کام شروع کر دے۔ ــــــــ اور وہ خود بخود ہنسنے لگا۔

فلم میں جب پھانسی لگاتے ہیں تو عجیب سا منظر ہوتا ہے۔ جیسے پھانسی نہیں کسی مجرے کی تیاری کر رہے ہیں اور فلم میں جسے جلاد کا کام دیا جاتا ہے وہ کتنا موٹا تازہ، لمبا چوڑا، کالا اور ڈراونا ہوتا ہے۔ اُف توبہ! اس کا ہاتھ لاشعوری طور پر اُس کے چپٹے گال اور لب پر پڑا اور اس نے اپنے مضمحل، دُبلے پتلے اعضاء پر دُھندلی آنکھوں سے نظر ڈالی تو وہ سوچنے لگا۔ ایسے موٹے آدمی کو تو ملزم کو تختے تک لے جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ اسے تو ویسے ہی کوٹھریوں کے سامنے سے گزار دیا جائے، پھانسی والے ملزم خود بخود ڈر اور خوف ہی سے مر جائیں! بلکہ وہ بھی پرلوک سدھار جائیں جنہیں اپیل پر بچ جانے کی اُمید ہے۔

اُسے کوئی پینتیس سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک لالہ قتل کر بیٹھا تھا اور پھانسی لگنے سے پہلے جیل کی کوٹھری میں ہارٹ فیل ہونے سے مر گیا تھا۔ لیکن وہ انگریز سپرنٹنڈنٹ بڑا اکھڑ، چڑچڑا اور بے ڈھب تھا۔ وہ نہیں مانا۔ کہتا تھا "قانون پورا کرو!" لاش کو چارپائی پر اٹھا کر لے گئے اور دو آدمیوں نے مُردے کو تختے پر کھڑا کیا اور اس کے گلے میں پھانسی کا رسہ ڈال دیا۔ بھلا ہو ڈاکٹر کا جس نے مجھے اس پاپ سے بچا لیا۔ اس نے بہت مشکل سے جیل کے صاحب کو سمجھایا کہ جو آدمی مر گیا، اس سے قانون کا مقصد پورا ہوگیا۔ اب اس مُردے کو پھانسی دینے سے کیا فائدہ؟ ڈاکٹر بھی انگریز تھا، اس لئے صاحب مان گیا۔ دیسی کی بات کہاں مانتا؟

فتو کے ذہن کے نہاں خانے میں لالہ کا چہرہ اُبھر آیا۔ کتنا کریہہ اور بدصورت تھا۔ اس کے مقابلے میں وہ پٹھان کتنا خوبصورت اور وجیہہ تھا! اور پھر فتو سوچنے لگا دونوں قاتل، دونوں گناہ گار! لیکن موت نہ خوبصورتی دیکھتی ہے، نہ بدصورتی۔ وہ مٹی کو مٹی میں ملا دیتی ہے۔ اس مٹی کو جسے آدمی ساری عمر سنوار کر رکھتا ہے اور شاید قتل بھی اِس مٹی کو اور سنوارنے کے لئے کرتا ہے ــــ اور فتو سوچنے لگا ــــ میری مٹی کس ٹھکانے لگے گی!

فتّو کو ایسا محسوس ہوا جیسے موت اور زندگی کا فلسفہ اُس کی سمجھ میں آ رہا ہو۔ اُس نے ادھ جلی بیڑی کان سے اُتاری اور ناک سے دھواں نکال کر زور سے کھانسا اور بلغم تھوک کر کہنے لگا "یہ بھی کمبخت مٹی ہی تو ہے۔ جب چھاتی اور مُنہ میں تھی تو جسم کا حصّہ تھی۔ اب اِسے ہاتھ لگاؤں تو ناپاک!"

اُسے اُس چھوٹے سے بچّے کا خیال آیا، جس کے وارث اُس کے باپ کی لاش کو پھانسی گھر سے واپس لے جا رہے تھے اور بچّہ ٹُھمک ٹُھمک کے ماں کی گود سے باہر نکلا جاتا تھا۔ وہ باپ کو خاموش دیکھ کر پریشان تھا کہ وہ نہ اُٹھتا ہے، نہ وہ اُس سے بات کرتا ہے۔ وہ ماں سے بار بار پُوچھ رہا تھا "ماں! ابا لو؟" اور جواب میں ماں کے پاس سسکیوں اور ہچکیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ آخر بچّہ ماں کی گود سے نکل گیا اور باپ کی چھاتی سے لپٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کی مونچھوں سے کھیلنے لگا۔ وہ کھیل جو اُسے باپ کو پسند تھا۔ تب اُس کی دادی نے روتے روتے جھپٹ کے اُس سے الگ کر دیا اور رُندھی ہوئی آواز میں کہنے لگی "بیٹا! یہ مٹی ہے!!" یہ فلسفہ بچّے کی سمجھ میں نہ آیا۔ اُسے دادی کی کم عقلی پر ترس آیا اور مونچھوں کی طرف اُنگلی کر کے کہنے لگا "بی بی۔ یہ مٹی نہیں بال ہیں!" لیکن ماتمی آواز میں اُس کی آواز ڈُوب کر رہ گئی۔

جیل کی گھڑی نے تین بجائے۔ لیمپ کی روشنی آہستہ آہستہ مدھم ہو رہی تھی۔ فتّو نے سوچا اب کیا سونا ہے۔ اِس کے بعد تو چار بجے جاگنا مشکل ہے۔ اُس نے چارپائی سے اُٹھنا چاہا تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بہت تھکا ہوا ہو۔ زندگی کے بوجھ سے! سالہا سال کی اِس نفرت انگیز زندگی سے ۔۔۔!! لیمپ کی مدھم سی روشنی میں کمرہ قریباً تاریک ہو چُکا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھی اِس تاریکی کا حصّہ ہو۔ اِس تیرہ و تار فضا میں ڈُوب رہا ہو۔ وہ اپنے واہمہ پر مُسکرایا لیکن مُسکراہٹ بہت پھیکی تھی۔

اُس نے ہمّت کر کے چارپائی چھوڑنا چاہی لیکن اُسے چکر سا آگیا۔ کمرے میں پرچھائیاں گہری ہو چکی تھیں۔ وہ پھر دھم سے چارپائی پر گر گیا۔ بہت مشکل سے حواس قائم کر کے اُس نے اپنی جیب سے بیڑی نکالی اور اندھیرے میں ماچس ٹٹولنے لگا۔ فتّو کو آنکھوں کی روشنی ختم ہوتی محسوس ہوئی۔ اُس نے آہستہ سے ماچس تھام کے بیڑی سُلگائی۔ جونہی شعلہ بُجھا، فتّو کے ناک سے دھواں نکلا۔ اُسے بہت زور سے کھانسی آئی اور بلغم تھوکنے کو سر نیچا کیا لیکن اُٹھا نہ سکا۔ لیمپ میں تیل ختم ہو چُکا تھا۔

"حضور ۔۔۔ اِفتّا مر گیا!" جیل کے وارڈر نے نیم بیدار جیلر کو اطلاع دی۔

"مر گیا؟ ۔۔۔ پھانسی لگنے سے پہلے؟" جیلر کے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

"موت پر کس کو اختیار ہے!" بوڑھے وارڈر نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا اور جیلر صاحب جنھیں خود اپنے فقرے کی اہمیت اور اپنی بوالعجبی کا آہستہ آہستہ احساس ہو رہا تھا، آہستہ سے بولے۔

"چلو۔ ہم کچھ اور بندوبست کر لیں گے۔" اور پھر کچھ سوچ کر بولے "پھانسی والے کے وارث تو آ گئے ہوں گے لیکن چھوٹے بابو جی کو بولو، ایک لاوارث لاش کو بھی ٹھکانے لگانا ہے۔ اِس کے لئے میونسپلٹی کو ٹیلیفون کر دیں۔"

غزل

صلاح الدین نیّر

کوششِ ضبط میں مُنہ پھیر کے روتے رہے وہ
حالِ دل میں نے جو پوچھا تو بُرا مان گئے

اپنی خاموش پرستش تو گوارا کر لی
نام لے کر جو پکارا تو بُرا مان گئے

خود تو دیکھا کیے دُزدیدہ نگاہوں سے مجھے
اور میں نے اُنہیں دیکھا تو بُرا مان گئے

روشنی آپ کو نیّر کی گوارا کب تھی
غیر کی بزم میں چمکا تو بُرا مان گئے

غزل

سلام کیفی بی۔ اے

رُخِ پُر نُور کا پروانہ دل ہے
ابھی انجام سے بیگانہ دل ہے

اسیرِ شیخ اور صیدِ برہمن
کبھی کعبہ، کبھی بُتخانہ دل ہے

کہیں یہ آئنہ خانہ نہ ٹُوٹے!
تمہارے حُسن کا کاشانہ دل ہے

تصوّر رات دن اُن کا ہے کیفی
فدائے جلوۂ جانانہ دل ہے

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

شکست کے بعد	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
طوفان کی کلیاں	"	چار روپے
گدھے کی واپسی	"	تین روپے
الٹا درخت	"	دو روپے پچھتر پیسے
دروازہ	"	دو روپے پچیس پیسے
سسرال	شوکت تھانوی	دو روپے
سترہ ۵۰	"	تین روپے پچاس پیسے
بقراط	"	دو روپیہ پچاس پیسے
جی ہاں پڑے ہیں	"	تین روپے پچیس پیسے
جوڑ توڑ	"	پانچ روپے
داماد	"	دو روپیہ پچیس پیسے
گوشۂ عافیت	پریم چند	پانچ روپے
چوگان ہستی مکمل	"	گیارہ روپے
دودھ کی قیمت	"	تین روپے
خاک پروانہ	"	تین روپے
صبح زندگی	راشد الخیری	دو روپے
شب زندگی	"	ایک روپیہ پچیس پیسے
شام زندگی	"	ایک روپیہ پچاس پیسے
سیدہ کی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
سمن پوش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
اقبال	"	چار روپے
گرد کارواں	کنھیا لال کپور	تین روپے
سنگ و خشت	"	دو روپیہ پچاس پیسے
سونا گاچھی	جگن ناتھ آختر	چار روپے پچاس پیسے
شعلۂ سنگ	کوثر چاند پوری	تین روپے پچاس پیسے
شمع	اے آر خاتون	پانچ روپے
چشمہ	"	دس روپے پچھتر پیسے
شکیلہ	مسعود ہمایوں	چار روپے پچیس پیسے

شکست ظلمت	مخمور جالندھری	ایک روپیہ پچھتر پیسے
آنسو کی کلیاں	"	ایک روپیہ پچھتر پیسے
پہلی محبت	"	ایک روپیہ پچیس پیسے
خواب گاہیں	"	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسداں	"	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	سعید امرت	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	"	تین روپے
اکبری دروازہ	"	چار روپے
دوشیزۂ روم	"	تین روپے
دیوانہ	"	تین روپے
دو دیوانے	"	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	"	تین روپے
گناہ	دت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	"	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	"	تین روپے پچانوے پیسے
مغرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
قیامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	"	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	"	چار روپے پچیس پیسے
ممتاز	ایم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات	"	پانچ روپے
ریحانہ	"	سات روپے

دعدہ	مہندر ناتھ	چار روپے پچھتر پیسے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
فردوس گوش	حضرت جوش ملیح آبادی	چار روپے
کفر و ایمان	ہری چند اختر	چار روپے
وسکی کی بوتل	موہن یادو	دو روپے
لنکن نے کہا	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر میکینک گائڈ	شیو ناتھ تسکین	چار روپے
موٹر ڈرائیونگ	کرشنا نند شرما	چار روپے پچاس پیسے
کیا خوب آدمی تھا		ایک روپیہ پچیس پیسے
عجیب لڑکی	اوم پرکاش نامی	تین روپے
ہمارا شیل (بچوں کیلئے)	خوشتر گرامی	پچاس پیسے
ہلدا سہاش	" ہندی "	پچاس پیسے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہر اثر	دو روپے
آندھی میں چراغ	غلام الثقلین	سات روپے پچاس پیسے
اقوال زریں	مصطفےٰ احسن زیدی	پچاس پیسے
انارکلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آشا دیپ بجھے نا	ست پرکاش سنگر	دو روپیہ
ابراہیم لنکن	چندر موہن لامبہ	ایک روپیہ پچھتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابوالکلام آزاد	تین روپیہ پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	جے سی داس ساجد	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
چھبیس سال بعد	امرتا پریتم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے چھالے	آزاد ملیح آبادی	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی

آؤ ڈوب جائیں

ایم کوٹھیاوی راہی

قاضی پور خورد۔ گورکھپور (یوپی)

۲۷ جولائی ۶۵ء   برادرِ محترم خوشتر صاحب! آداب

مہینوں بعد رات پھر اس حیاتِ ناآسودہ کے تشنہ جذبات "آؤ ڈوب جائیں" پکار اٹھے اور یہ کہانی۔۔ سیدھی سادی سی، مختصر کہانی دامن میں آگئی۔ اب اسے آپ کے دامن میں منتقل کر رہا ہوں۔ آپ اسے اُن آنچلوں کے حوالے کر دیجئے جن کے دل اندھیروں سے لَو لگائے روشنیوں کے خواب دیکھ رہے ہیں اور ڈوب رہے ہیں، ڈوبتے جا رہے ہیں۔ اسے دیکھ کر کسی ایک دل نے بھی "ساحل" پا لیا تو سمجھوں گا میرا تجربہ اکارت نہیں گیا۔ ویسے میرا یہ حال ہے ؎

تم اپنی شمع سے اس گھر میں روشنی کر لو
مرا چراغ سرِ رہگزار رکھا ہے

کہانی لکھنے سے پہلے یہ شعر کہا تھا۔ شاید اسی لئے کہانی میں دھندلکے ہی روشنی کا کام دے رہے ہیں۔ کیا اس پر اپنی رائے سے نوازیں گے؟۔۔۔

آپ کا بھائی ــــــ ایم کوٹھیاوی راہی

"ندی ہی زندگی ہے۔"

"اور کنارا؟"

"موت!"

"تو موت سے کیوں لپٹے ہوئے ہو؟"

"اس لئے کہ تم کنارے پر ہو۔"

"آؤ ڈوب جائیں۔"

"ابھی نہیں۔"

"کیوں؟"

"ابھی موت حسین ہے۔"

"اور زندگی؟"

"وہ بھی حسین ہے مگر موت سے کم۔"

"آؤ اسے موت سے زیادہ حسین بنا دیں۔"

"ہم ڈوب جائیں گے تو اسے دیکھے گا کون؟"

"ہماری روحیں۔"

"آج بہت مایوسی کی باتیں کر رہی ہو رکھیا۔"

"دل جو اُداس ہے۔"

"کیوں؟"

"ستاروں نے یاد کیا ہے شاید!"

"ستارے جھوٹے ہیں۔ ہم اگر بے چین مرے، ناآسودہ مرے تو ہماری روحیں سدا بھٹکیں گی۔ اسی دنیا، اسی ندی کے اسی ساحل پر۔"

"چین کیسے ملے؟"

"چلو بتاؤں۔"

"کہاں؟"

"اُس سامنے والے کیفے میں۔"

"کچھ پتھر کافی پی رہے ہیں۔"

"پینے دو۔"

"پتھر اِدھر دیکھنے لگے ہیں پربت۔"

"دیکھنے دو۔"

"یہاں بھی چین نہیں۔ یہاں بھی۔ ۔"

"آنسو نہ گرنے دو نہیں تو کیا یہ دیکھنے والے ہنس دیں گے۔ ۔"

"میں روؤں گی، روؤں گی۔ نہیں تو میرا دل خون ہو جائے گا۔"

"اِتنی مایوسی آخر کیوں؟"

"بس یوں ہی۔"

"کیا سچ مچ ندی کی گود چاہتی ہو؟"

"ہاں۔"

"کیا سچ مچ کنارا اب راس نہیں آتا؟"

"ہاں۔ ۔ ہاں۔ ۔"

"اچھی بات ہے۔ ۔ ۔ تو پہلے یہ کافی ختم کر لو اور پھر چلو پہلے مندر۔ ۔"

"مندر میں کیا ہوگا؟"

"نا آسودگی کا خاتمہ۔"

"سمجھی نہیں۔"

"شادی۔"

"اُف پربت! کتنے بھولے ہو۔ تم نے شاید میری مانگ کا سیندور ابھی تک نہیں دیکھا؟"

"ایں یہ کیا؟"

"کاش آج ملتے ہی میرے مہینوں گم رہنے کی وجہ پوچھ لیتے میں بتا دیتی کہ۔ ۔ ۔ کہ۔ ۔ ۔ میں اب تمھاری نہیں رہی۔ میری شادی ہو چکی، میری دُنیا میری آتما لُٹ چکی۔ میری محبت اب میری نہیں رہی پربت۔ ۔ ۔"

"آہستہ بولو لوگ کان لگائے ہوئے ہیں۔"

"اب کیا بولوں۔"

"وہ کیسا ہے؟"

"وہ کون؟"

"جیون ساتھی!"

"کیا یہ سُن کر صدمہ نہیں ہوا؟"

"نہیں۔"

"کیا مجھے پرائی پا کر دُکھ نہیں ہوا؟"

"نہیں۔"

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟"

"وہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ تم جب پہلے پہل ملی تھیں، پہلے پہل اِس دل میں آئی تھیں۔ ہاں تو کہو میری ساتھی، میری سہاگن! کیسا ہے وہ؟ بہت خوبصورت نہیں ہے کیا؟ کیا اُس کی آواز میں نغمہ نہیں سُنائی دیتا؟ کیا وہ کالا ہے بہت؟"

"یہاں سے چلو۔ یہاں تو سچ مچ پتھروں کے کان کھڑے ہو گئے ہیں۔ باہر بتاؤں گی!"

"تم کتنے فراخ دل ہو پربت! میں نے تو سوچا تھا مجھے پرائی پا کر مجھے لُٹی لُٹائی پا کر چیخ اٹھو گے لیکن تم مسکرا رہے ہو۔ کتنی اچھی ہے آج کی یہ تمھاری مسکراہٹ! میں نے تو سوچا تھا یہ سُن کر آنسوؤں سے تمھارے گال بھیگ جائیں گے پربت۔"

"اور اِسی لئے ندی کی گود چاہ رہی تھیں؟"

"ہاں اِسی لئے کہ تمھیں اپنی محبت کا یقین دلا سکوں۔"

"لیکن تم نے تو ابھی کہا تھا، تمھاری محبت تمھاری نہیں رہی۔"

"اب بھی کہتی ہوں۔"

"کیا؟"

"میری محبت میری نہیں رہی۔"

"خوب کہتی ہو۔"

"اب تم بھی شادی کر لو پربت!"

"کس سے؟"

"جس سے بھی جی چاہے۔"

"کیا تمھیں بہت خوشی ہوگی؟"

"ہاں بہت!"

"کیوں؟"

"تمھارا غم مٹ جائے گا۔"

"تمھارا غم مٹ گیا نا؟"

"کیسا غم؟"

"ٹھیک کہتی ہو۔ کیسا غم؟ خیر اب کہو وہ کیسا ہے؟"

"ہنس کے کیوں پوچھتے ہو؟"

"رو کے پوچھوں؟"

"نہیں۔ ۔ ۔ اچھا سُنو۔ اچھا ہے!"

"کون؟"

"جیسے پوچھ رہے ہو!"

"کالا ہے؟"

"نہیں سانولا!"

"بولتا ہے تو پایل کے نغمے سنائی دیتے ہیں نا؟"

"ہاں"

"جیسے موجوں کا گیت؟

"ہاں"

"اس سامنے لیٹی ندی کی موجوں کے گیت کی طرح؟"

"ہاں"

"اور اس کی آنکھیں کیسی ہیں ریکھا؟"

"بہت اچھی"

"میری آنکھوں سے بھی اچھی؟"

"طنز کرنے لگے... معلوم ہوتا ہے دل سے نہیں بول رہے ہو"

"دل سے کون بولتا ہے دھرتی پر جو میں بولوں... تم بھی تو من سے بولی رہی ہو نا!؟"

"ایسا معلوم ہوتا ہے اندر ہی اندر بہت دکھ پہنچا ہے"

"کیسے؟"

"آواز میں آنسو بول رہے ہیں"

"اچھا——!"

"ارے اتنی ہنسی... اتنی ہنسی... سچ کہو پربت! میری قسم کھا کر کہو، میری سگائی تمھیں کیسی لگی؟"

"جیسی لگتی ہے دنیا کو"

"تم دنیا والے تو نہیں ہو"

"تو کیا آسمان والا ہوں"

"وہ تو بھگوان ہے"

"اور مجھے بھی تو کہا تھا تم نے بھگوان ایک دن!"

"وہ تو اب بھی کہتی ہوں۔ سدا کہتی رہوں گی۔ میں چھن گئی، پھر بھی تمھیں کوئی دکھ نہیں درد نہیں چنتا نہیں"

"دل دیکھ رہی ہو؟"

"ہاں دیکھ رہی ہوں"

"میرا کہ اپنا؟"

"تمھارا"

"ٹھیک ہی کہتی ہو۔ اپنا کیسے دیکھ سکتی ہو۔ اب تو وہ اس کے پاس ہوگا۔ ہے نا؟"

"اچھا اب چلو۔ دھندلکے گہرے ہو رہے ہیں"

"ہاں گہرے ہو رہے ہیں"

"اب چلو نا"

"کہاں؟"

"اپنے اپنے ٹھکانے"

"میرا ٹھکانہ تو یہی ہے ریکھا!"

"کب سے؟"

"جب سے موت راس آگئی"

"موت!؟"

"ڈرو مت۔ کنارے کو موت کہتا ہوں نا!"

"اوہ!"

"تم جاؤ۔ تمھارا" وہ "تمھاری راہ تکتا ہوگا"

"اچھا تو اب کب ملوگے؟"

"جب چاہو"

"کہاں؟"

"اسی دھرتی آکاش کے بیچ۔ اسی موت اور زندگی کے درمیان!"

———— ٭ ————

"میرا بدن اجالے سے بنا ہے"

"چھو کے دیکھوں؟"

"تمھاری پرچھائیاں ڈوب جائیں گی۔ مجھے چھونا مت"

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"چاند میں"

"اور جب چاند نہیں ہوتا؟"

"تاروں میں"

"اور جب تارے نہیں ہوتے؟"

"آسمان میں"

"مجھے کیوں نہیں لے چلتے پربت!"

"تمھارا بدن اندھیرے سے بنا ہے"

"یہ اُجالے میں کب ڈھلے گا؟"

"جب چاہو گی۔"

"میں۔۔میں تو یہ بھی چاہنے لگی تھی جب تم ملے تھے۔ یہ ندی کا کنارا پہلے میرے لئے کچھ نہیں تھا۔ یہ ندی، یہ آکاش، یہ چاند تارے کچھ نہیں تھے لیکن جب سے تم ملے، سب میں آتما آگئی۔ بولو ایسا کیوں ہے پربت!؟ بولو۔ اپنے پاس اپنے بدن، اپنے ہونٹوں کے پاس مجھے کیوں نہیں آنے دیتے۔۔۔؟"

"تمہارا بدن اندھیرے سے بنا ہے۔"

"میں تمہاری یہ بات سُن کر گھبرا سی جاتی ہوں۔"

"یہ اندھیرے کی فطرت ہے۔"

"میں یہ بھی نہیں سمجھی۔"

"تم بہت بھولی ہو۔"

"میں۔۔۔میں۔۔۔اب کیا کہوں۔"

"رو رہی ہو؟"

"ہاں ہاں۔ دیکھو رو رہی ہوں، سسک رہی ہوں۔"

"میرے دل پر اس کا اثر نہیں۔"

"پتھر ہے تمہارے سینے میں۔"

"لیکن وہ بھی اُجالے سے بنا ہے۔"

"میں چاہتی ہوں۔ بہت چاہتی ہوں، اتنی رات گئے یہاں نہ آیا کروں۔ لیکن نہ جانے کیا ہے تم میں پربت! کہ آدھی رات کا گجر بجتے ہی کھنچی چلی آتی ہوں۔۔"

"جب تک اکیلی ہو کھنچی چلی آتی رہو گی۔ جب تک مہندی نہیں رچتی جب تک رنگ نہیں بدلتے، جب تک شہنائیاں نہیں بجتیں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بہت سے اندھیرے دیکھ چکا ہوں۔ دیکھتا آرہا ہوں۔ رات رات، مُدّتوں سے بھولی۔۔"

"میں بھولی نہیں ہوں۔"

"تو اور کیا ہو؟"

"دمینتی۔"

"اچھا نام ہے۔"

"میری کوٹھی پر چلو پربت!"

"وہاں کیا ہے؟"

"ممی، پاپا، پیار!"

"پیار کون؟"

"میں۔"

"تینوں اندھیرے!؟"

"معلوم ہوتا ہے آج بھی باتوں میں بھور کر دو گے۔"

"ہوں۔"

"اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے چلے جاؤ گے۔"

"ہوں۔"

"اور۔۔۔اور۔۔۔میں۔۔۔ پھر اپنی کوٹھی کے ہارسنگھار تلے آنسو بھری آنکھیں کھولوں گی اور ممی کہیں گی تُو نے سپنا دیکھا ہے؟ اور پاپا کہیں گے بیمار ہے لڑکی۔ پھر دونوں ہارسنگھار کے پیچھے جا کر میرے علاج کی باتیں کرنے لگیں گے۔ پاپا دُور کسی پہاڑی پر بھیجنے کو کہیں گے، ممی رو رو کر اُن کا ارادہ بدل دیں گی۔ اور میں۔۔۔اور میں۔۔۔ سارا دن پڑی سسکوں گی۔۔۔ گھبراؤں گی۔۔۔ اور سب سے آنکھیں بچا کر ممی کے پُرانے سنگار دان میں رکھے اُن خطوں کو نکال کر دُہراؤں گی جنھیں ایک رات پڑھ کر تمھیں دیکھنے، تم سے ملنے کی لگن جنم پائی تھی۔۔"

"اندھیرے سے جو بنی ہو۔"

"تو پھر بنا دو نا مجھے اُجالا۔ اُجالا پربت۔۔۔!"

"آں۔۔۔ نانانا۔۔۔ میرے قریب مت آؤ۔۔۔ مت آؤ۔ اُجالے اور اندھیرے کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں! میری بھولی! میری بھولی!! میری۔۔۔میری۔۔"

"رکھا۔۔۔رکھا۔۔۔؟"

"کیا ہے؟"

"جلد جاگو، رکھا ڈارلنگ ــــ جلد جاگو!"

"صبح ہو گئی؟"

"آنکھیں کھولو ــــ صبح ابھی نہیں ہوئی۔"

"آپ رو رہے ہیں؟"

"۔۔۔۔"

"کیا ہوا؟"

"۔۔۔۔"

"ارے یہ کیا دیکھ رہی ہوں۔ دمینتی۔۔۔ دمینتی بیٹی! میری بیٹی!! نہیں نہیں۔ اُف! آپ کیسے ڈاکٹر ہیں جی! یہ۔۔۔ یہ مری نہیں ہے۔ دیکھئے نا۔ اِس کے ہونٹ مُسکرا رہے ہیں۔ اِس کی آنکھیں کھُلی ہیں۔ ہارسنگھار کی اوٹ سے جھانکتے چاند کو دیکھ رہی ہیں۔ ارے آپ رو رہے ہیں۔ کیوں کیوں۔۔۔؟"

"پربت کون تمھارا رکھیا؟"

"پربت؟ — میں کیا جانوں؟"

"اور یہ دینتی کے سرہانے پڑی چٹھیاں؟"

"ائے یہ تو۔ یہ تو۔۔"

"آنسو پونچھ لو ڈارلنگ! اور مسکراؤ۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تمھارے کسی تشنہ ردمان کی یاد چٹھیوں کے رُوپ میں ابھی تک محفوظ ہے۔ اگر تم نے یہ کبھی بتا دیا ہوتا تو میں تم سے یہی کہتا، اِن یادوں کو پھونک دو، جلا دو، راکھ کر دو! ایسی یادیں ہمیشہ انتقام لیتی آئی ہیں۔ رکھیا! اپنے پیاروں کے پیاروں سے۔ مگر آہ! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ دینتی کو چادر اُڑھا دو۔ اِس معصوم نے آج تمھاری محبت کی قیمت ادا کر دی۔"

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر یہ ضرور تحریر فرمایئے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ "رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر۱" لکھنا کافی ہے۔ (مینیجر)

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے۔ بصورتِ دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے۔ ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

شعراء اور ادیب خواتین کے نام!

"بیسویں صدی" کے ذریعے ہندوستان و پاکستان کے مشہور ادیبوں اور شاعروں سے گزارش کی گئی تھی کہ وہ از راہِ کرم اپنے اپنے "محبوب مشغلوں" سے خاکسار کو مطلع فرمائیں لیکن مشہور شاعروں اور ادیبوں کی بجائے بے شمار موزوں ناکیوں اور قصہ نویسوں نے اپنے محبوب مشغلے بھیج دیے ہیں۔ میں ان حضرات کے محبوب مشغلے پھر کبھی لکھوں گا۔ فی الحال مشہور اہلِ قلم میرے حالِ زار پر توجہ فرماتے تو اچھا تھا — میرا خیال ہے، سب مشہور اہلِ قلم کالے پانی چلے گئے ہیں یا انھیں جیل ہو گئی ہے یا پھانسی پر لٹکا دیے گئے ہیں۔ اس لئے میں اب ان سطور کے ذریعے مشہور شعراء اور ادیب خواتین سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے اور اپنے محبوب شاعروں اور افسانہ نگاروں کے محبوب مشغلوں سے مجھے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں — کوئی صاحب یا صاحبہ اب اپنی تصویر نہ بھیجیں۔ تصویریں مشغلے چھپ جانے کی صورت میں خوشترگرامی صاحب کو بھیجی جا سکتی ہیں تاکہ کتاب میں شامل ہو سکیں — غیر ضروری اور فضول خط و کتابت کرنے والے حضرات جوابی خط لکھیں یا غیر ضروری خط و کتابت نہ کریں۔

راجہ مہدی علی خاں

۱۴۹۔ پالی روڈ۔ باندرہ۔ بمبئی ۵۰

دوستوں کی محفل سے

اختر بستوی۔ بی، اے

روشن محل۔ گاندھی نگر بستی (یو، پی)

۱۴ جون ۶۵ء   محترمی و معظمی! آداب و تسلیمات

"بیسویں صدی" کے جون کے شمارے میں میرے "ادبی لطائف" کی حالیہ قسط پڑھ کر حیدرآباد کے ایک صاحب نے مجھے ایک مراسلہ بھیجا ہے جس میں تحریر فرمایا ہے کہ "آپ نے جب یہ سلسلہ شروع کیا تھا اور "دوستوں کی محفل سے" کی پہلی قسط شائع ہوئی تھی تو اس میں یہ خوبی تھی کہ سارے لطیفے ایک مخصوص حلقۂ احباب سے متعلق معلوم ہوتے تھے اور ان میں ایک عجیب پُر لطف سی Intimacy نظر آتی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ بات ختم ہوتی گئی اور آپ بھی عام قسم کے لطائف لکھنے لگے۔ کیا آپ میری فرمائش پر پھر اُسی انداز کے ادبی لطیفے "بیسویں صدی" کے ذریعے ہم تک نہیں پہنچا سکتے؟" ——— مندرجہ بالا خط میں ایک ایسی بات کہی گئی ہے کہ میں اُس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہوں۔ اِس لئے آج آپ کو لطائف کی جو قسط بھیج رہا ہوں اِس میں وہ "خوبی" کافی حد تک موجود ہے جس کا احساس میرے حیدرآبادی دوست نے دلایا ہے ——— میں نے ایک ناولٹ "خوشبو کی پکار" حال ہی میں مکمل کیا ہے۔ دیکھئے وہ پڑھنے والوں تک کب پہنچ پاتا ہے . . .

احقر ——— اختر بستوی

ذوقِ عام ———●

ایک بار بستی میں جون کے مہینے میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اُس کی رونق بڑھانے کے لئے جو شعراء باہر سے تشریف لائے تھے اُن کے اعزاز میں دوسرے دن میں نے غریب خانے پر آموں کی دعوت کا بندوبست کیا جس میں لوگ "دسہری" اور "سفیدے" کی قاشوں کے ساتھ ساتھ پُر لطف باتوں سے بھی محظوظ ہوتے۔ ایک نوجوان غزل گو یکے بعد دیگرے تین چار قاشیں منہ میں رکھتے ہوئے بولے "بھئی میں تو اِس پھل کا عاشق ہوں! ——— اگر خدانخواستہ ہندوستان میں آم نہ رہ جائیں تو میں کسی اور ملک کو اپنا مسکن بنا لوں گا!"

اُن کے اِس جملے پر نازش پرتاب گڈھی نے منہ بنا کر کہا: "غالب نے آموں کی تعریف کیا کر دی کہ لوگ اِس پھل سے اپنی رغبت کا اظہار کرنا بھی ایک قسم کا "فیشن" سمجھنے لگے۔ جسے دیکھئے وہی صاحبِ ذوق بننے کے لئے خود کو آموں کا دلدادہ کہتا ہے۔ حالانکہ . . ."

شوق بہرائچی مرحوم انھیں بیچ ہی میں ٹوکتے ہوئے ہنس کر بولے "کیا کیجے نازش صاحب ؎

"آم" کا ذوق بھی اب "عام" ہوا جاتا ہے

سین اور انا سین ———●

الوخاص (اعظم گڈھ) میں ایک کل ہند مشاعرہ تھا۔ جس میں شریک ہونے والے شعراء کی آمد صبح ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ مشاعرے سے تین چار گھنٹے پہلے شام کی چائے کے لئے بہت سے شعراء ایک کمرے میں جمع ہوتے اور چائے پینے کے بعد وہیں بیٹھ کر مختلف موضوعات پر بات چیت کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد رفیق الوی کمرے میں داخل ہوئے اور سیدھے میرے پاس آکر بیٹھتے ہوئے بولے "اختر صاحب! آج کے مشاعرے کے لئے ابھی ابھی ایک غزل مکمل کی ہے، اُسے آپ کو سنانا چاہتا ہوں"

میں نے فنا نظامی کانپوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "اِنھیں

غزل سُنانے تو ایک بات بھی ہے۔ میں بھلا کس قابل ہوں؟"

رفیق صاحب نے فوراً ہی اپنا رُخ اُن کی طرف کر لیا اور غزل شروع کر دی۔ ثنا صاحب اخلاقاً ہر ہر شعر پر خوب دل کھول کر داد دیتے رہے، تعریف کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفیق صاحب نے غزل ختم کرنے کے بعد جیب سے کاغذات کا ایک پلندہ نکالتے ہوئے فرمایا: "حضور! اب ذرا میرے زیرِ تصنیف ڈرامے کا ایک سین بھی سُن لیجئے اور اندازہ لگائیے کہ میں نے آغا حشر کاشمیری کی شاگردی کا حق کس حد تک ادا کیا ہے۔"

ثنا صاحب گھبرا کر بولے: "نہیں قبلہ! میں اس سلسلے میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

رفیق صاحب نے حیران ہو کر پوچھا: "کیوں حضور؟ آخر آپ میرے ڈرامے کا سین کیوں نہیں سُننا چاہتے؟"

ثنا صاحب نے مسکرا کر جواب دیا: "کیونکہ ایک بار میں نے غلطی سے ایک صاحب کے ڈرامے کا ایک سین سُن لیا تھا جس کے نتیجے میں مجھے دو "انا سین" کھانی پڑی تھیں!"

ساری بُرائی اِک طرف ———●

نامور نقیبِ مشاعرہ، ملک زادہ منظور احمد میرے ساتھ ایک پرائیویٹ بس میں "ٹانڈہ" جا رہے تھے۔ اتفاق سے اُس بس میں میرے ایک پُرانے شناسا مل گئے۔ سلام دعا کے بعد میں نے اُن سے رسماً خیریت دریافت کی جس کے جواب میں اُنھوں نے فرمایا: "کیا بتاؤں جناب آج کل ایک عجیب مصیبت میں گرفتار ہوں۔ میرے بڑے سالے صاحب نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ شراب وہ پیتے ہیں، جوا وہ کھیلتے ہیں، آوارہ گردی وہ کرتے ہیں، گھر کی چیزیں وہ فروخت کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ دُنیا بھر کے عیوب اُن میں موجود ہیں۔ . ."

ملک زادہ صاحب ہم دونوں کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے بولے۔

"اب تک سُنا کرتا تھا ؏

ساری "خدائی" اِک طرف جورو کا بھائی اِک طرف

لیکن آج اِس مصرعے کو یوں پڑھنے کو جی چاہ رہا ہے ؏

ساری "بُرائی" اِک طرف جورو کا بھائی اِک طرف

اوپر، نیچے، درمیان ———●

ایک بار جناب منظور اللہ انصاری منظر گونڈوی میرے پاس سے منٹو کی تصنیف "اوپر، نیچے، درمیان" مانگ کر لے گئے۔ پانچ چھ ماہ گزر گئے، اور اُنھوں نے کتاب واپس نہیں کی۔ جب میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو میں نے تقاضے شروع کیے کیونکہ اُن کے گھر میں بچے بھی کتابوں کے ساتھ شغل فرمایا کرتے تھے، جس کی بنا پر مجھے اُس کی سلامتی کی فکر لاحق تھی۔ دو چار بار تو منظر صاحب میرے تقاضوں کو ٹال گئے لیکن ایک دن جب میں اُن کے سر ہو گیا تو اُنھوں نے جھینپے جھینپے سے تبسم کے ساتھ فرمایا: "کیا بتاؤں بھئی بات یہ ہے کہ اب اُس کتاب میں نہ "اوپر" رہ گیا ہے اور نہ "نیچے"۔ صرف "درمیان" باقی ہے۔ کہو تو وہی لوٹا دوں۔"

گُن یا گھُن ———●

ایک ادبی محفل میں جناب فضل الرحمٰن خلش اپنی غزل ترنم سے پڑھ رہے تھے۔ وہاں سخن سنجوں اور سخن فہموں کے ساتھ ایک نیتا جی بھی تشریف فرما تھے۔ خلش صاحب کے اشعار تو اُن کی سمجھ میں کم ہی آ رہے تھے لیکن اُن کے "فسونِ ترنم" سے وہ مسحور ہو کر رہ گئے تھے۔ جب غزل ختم ہوئی تو نیتا جی بولے: "جناب آپ کی آواز بہت اچھی ہے۔ بھگوان نے آپ کو یہ بہت بڑا "گُن" دے رکھا ہے۔"

خلش صاحب کی طبیعت اس "بیداد نما داد" سے کچھ مکدر سی ہو گئی اور اُنھوں نے فرمایا: "آپ میرے ترنم کو "گُن" کہتے ہیں اور میں اسے "گھُن" سمجھتا ہوں جو میری شاعری کو چاٹ جاتا ہے۔"

فی البدیہہ مقطع ———●

مزاح نگار شوہر بلیاوی (جو بھری جوانی میں فرشتۂ اجل کے محبوب بن گئے) کچھ دنوں تک بسلسلۂ ملازمت بستی میں بھی مقیم رہے۔ اُنھوں نے کچھ ایسی باغ و بہار طبیعت پائی تھی کہ ہر شخص سے اُن کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ لیکن بستی کے قیام میں اُن کا سب سے زیادہ اُٹھنا بیٹھنا محمود عالم بستوی کے دولت کدے پر ہوتا تھا۔ محمود صاحب اور شوہر صاحب کی دوستی ضرب المثل تھی لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں وہ ہمیشہ ایک دوسرے پر چوٹیں کیا کرتے تھے اور اُن میں ہر وقت زبانی نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔

ایک دن حسبِ معمول محمود صاحب کے گھر پر دوستوں کی محفل آراستہ تھی اور خوش گپیاں جاری تھیں۔ یکایک لوگوں نے شوہر صاحب سے فرمائش کر دی کہ وہ اپنا تازہ کلام سُنائیں۔ اُنھوں نے جواب دیا: "دوستو! میں نے ایک نئی غزل تو کہی ہے لیکن ابھی اس کا مقطع نہیں ہو پایا ہے۔ اگر آپ لوگ مجھے دو ایک دن کا موقع دیں تو میں اُسے مکمل کر کے سُناؤں۔" لیکن اُن کا یہ عذر ناقابلِ اعتنا سمجھا گیا اور سب نے یک زبان ہو کر کہا: "آپ نے جتنے شعر کہہ لئے ہوں اُتنے ہی سُنائیے۔"

اب شوہر صاحب کے لئے کوئی راہ فرار نہ رہی اس لئے اُنھوں نے غزل شروع کی جس کا مطلع تھا ؎

شیریں سخن بھی ہے اور تلخ نوائی بھی
گویا وہ کھلاتے ہیں مرچیں بھی مٹھائی بھی

شوہر صاحب جھوم جھوم کر پڑھتے رہے اور لوگ "واہ واہ" "سبحان اللہ" کا غلغلہ بلند کرتے رہے۔ لیکن محمود عالم صاحب شروع سے آخر تک بالکل چپ چاپ بیٹھے رہے۔ شوہر صاحب کے خاموش ہونے کے بعد انھوں نے کہا "میاں شوہر! میں نے تمھاری ہزل کے لئے فی البدیہہ ایک مقطع کہہ دیا ہے۔ حالانکہ یہ علامہ اقبال کے ایک مشہور شعر کی پیروڈی ہے لیکن پھر بھی تمھارا کام چل سکتا ہے کیونکہ پیروڈی بھی مزاح کا ایک جزو ہے۔ شعر سنو ؂

اے شوہر بلیاوی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق میں شامل ہو بیوی کی کمائی بھی

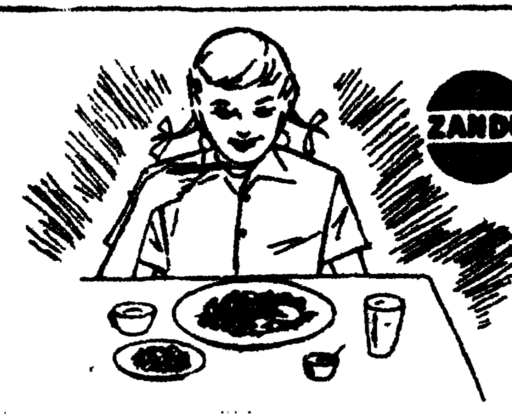
شیر اور شعر

دوستوں کی محفل میں شکار کی باتیں ہو رہی تھیں۔ لوگ اپنے اور دوسروں کے تجربات بیان کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے فرمایا "میرے ماموں بڑے زبردست شکاری تھے۔ انھوں نے اپنی جوانی کے زمانے میں مرزاپور کے جنگل میں ایک ببر شیر مارا تھا۔"

افتخار عزیز خاں ساز نے کہا "ضرور مارا ہوگا۔ لیکن یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے کہ اتنے فخر سے اس کا ذکر کیا جائے۔ میں نے خود ابھی کل رات ایسا ہی ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔"

ساز صاحب کے اس جملے پر سب لوگ چونک اٹھے اور حیرت و استعجاب کے عالم میں ان کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا "کیا اُلٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔ کل رات کو تو تم میرے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر بھلا ایسا کارنامہ کیونکر انجام دے لیا؟"

ساز نے ایک قہقہہ لگا کر جواب دیا "بھئی ان کے ماموں نے مرزاپور کے جنگل میں "ببر شیر" مارا تھا اور میں نے اپنی غزل میں ببر علی انیس کا "شعر" مار دیا تھا!!"





صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱ ــــ لیموں ــ زندگی کے لئے آبِ حیات

لیموں مشہور پھل ہے جو ہندو پاکستان میں ہر جگہ آسانی سے مل جاتا ہے۔ یہ صرف کم قیمت اور سستا ہے، فوائد کے لحاظ سے اتنا ہی گراں قدر۔ لیموں کئی قسم کا ہوتا ہے لیکن ان سب قسموں میں کاغذی لیموں ہی ہر اعتبار سے اعلیٰ ہے۔ اس کا چھلکا پتلا اور رس رقیق ہوتا ہے۔

لیموں کے رس میں وٹامن 'سی' خاص طور پر وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ وٹامن 'بی' کی بھی اس میں خاصی مقدار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کیلشیم اور پوٹاشیم جیسے مفید اجزاء بھی پائے جاتے ہیں۔

لیموں کے استعمال سے جسم کو کیروٹین کی شکل میں معدنی نمک حاصل ہوتا ہے جو بقائے صحت کے لئے نہایت ضروری ہے۔ چونکہ لیموں میں پوٹاشیم اور کیلشیم کی کافی مقدار پائی جاتی ہے۔ اس لئے اس کا استعمال جگر اور دل کی کمزوری میں بہت مفید ہے بعض اوقات تو لیموں کا استعمال سیب جیسے قیمتی پھل سے بھی زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ لیموں کا چھلکا، اس کے بیج اور رس تینوں چیزیں دواؤں میں کام آتی ہیں اور بہت سی بیماریوں کو دور کرتی ہیں۔

طبّی اعتبار سے لیموں کا مزاج سرد تر ہے۔ یہ دل و دماغ کو فرحت بخشتا ہے اور صفرا کی زیادتی سے پیدا ہونے والی گرمی اور حدت کو دُور کرتا ہے۔ لیموں کا رس ہاضم اور مقوی معدہ ہے اس کے استعمال سے موسمی بخار اور پیاس کی شدت جاتی رہتی ہے معدے اور آنتوں کی مختلف بیماریوں میں لیموں کا رس بہترین فوائد کا حامل ہے۔ ریاح کو خارج کرتا ہے، معدے اور آنتوں میں جو زہریلے مادے پیدا ہو جاتے ہیں، انھیں فضلہ کے ساتھ خارج کر دیتا ہے۔ جس طرح پانی سے جسم کی تمام غلاظتیں دُھل جاتی ہیں، اسی طرح لیموں کے رس سے جسم کے اندر پیدا ہونے والی کثافتیں دُور ہو جاتی ہیں۔ جسم کی بیرونی صفائی کے ساتھ ساتھ جسم کی اندرونی صفائی کا بھی پوری طرح دھیان رکھنا چاہئے۔ اگر علی الصبح ایک گلاس تازہ پانی میں لیموں کا رس اور تھوڑا سا نمک ملا کر پی لیا جائے تو یہ معدہ اور آنتوں کی صفائی کے لئے بہترین شے ہے۔ اس سے معدے اور آنتوں کی غلیظ اور لیس دار رطوبتیں گھل کر باہر نکل جاتی ہیں۔ انسان کی آنتوں میں عام طور پر مختلف قسم کے کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیموں کا رس اس شکایت کے لئے اکسیر ہے دراصل لیموں قاتل جراثیم ہے۔ جراثیم کو فوراً فنا کرنے کی زبردست تاثیر لیموں کے رس میں موجود ہے۔ ہمارے کھانے پینے کی چیزوں سے جسم میں ایک قسم کا زہر بنتا رہتا ہے جسے یورک ایسڈ کہتے ہیں۔ جسم سے اس زہر کا اخراج نہ ہو تو گٹھیا اور جوڑوں کا درد شروع ہو جاتا ہے۔ اس زہر کے اثر سے طبیعت گری گری سی رہتی ہے۔ ہر وقت سستی اور تکان سی محسوس ہوتی ہے۔ اس سے چھٹکارا پانے کے لئے علی الصبح لیموں کا رس گرم یا ٹھنڈے پانی میں پینا بہت مفید ہے۔ پیٹ میں پہنچتے ہی یہ گردوں اور معدے کی صفائی کرتا ہے۔ جسم کی تمام گندگی پاخانہ پیشاب اور جسم کے مساموں کی راہ سے زہریلے مواد کے اخراج میں لیموں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ جگر کے لئے تو لیموں کا رس امرت سے کم نہیں۔ کھانے کے ساتھ لیموں کا استعمال غذا کو جلد ہضم ہونے میں مدد دیتا ہے۔ لیموں کا رس ہاضم ہونے کے ساتھ ساتھ مصفّیٔ خون بھی ہے۔ یہ خون کو صاف کرتا ہے اور اگر خون میں زہریلے مادے شامل ہو گئے ہوں تو انھیں دُور کر دیتا ہے۔

گرمی اور برسات کے موسم میں اس کی شکنجبین کثرت سے استعمال کی جاتی ہے۔ اس سے پیاس کی شدت دُور ہو جاتی ہے۔ موسمی بخاروں میں اس کا استعمال خصوصیت سے مفید ہے۔ اس سے نہ صرف پیاس ہی دُور ہوتی ہے بلکہ صفرا کی وجہ سے جی متلانے کی شکایت بھی جاتی رہتی ہے۔ شکنجبین شربت کی طرح پکا کر بھی رکھی جاتی ہے اور اسے گھروں میں بوقتِ ضرورت تیار کر کے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ شربت بنانے کے لئے لیموں

کے رس میں حسبِ ضرورت شکر ملا کر اُس کا قوام تیار کرتے ہیں اور چھان کر بوتلوں میں بھر لیتے ہیں۔ یہ دیر تک رکھے رہنے پر بھی خراب نہیں ہوتی۔

خام شکنجبین، پانی میں لیموں کا رس اور شکر ملا کر تیار کی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کا استعمال پیاس، خون کی حدت، معدے اور جگر کی گرمی، صفرا کی زیادتی اور پیٹ کی مختلف شکایتوں میں سودمند ہے۔ لیموں کا رس خون کی حرارت کو کم کر کے خون کی تیزی کو تسکین دیتا ہے۔ فسادِ خون کو دُور کرتا ہے۔ صفرا کی حدّت اور تیزی کو بُجھاتا ہے۔

لیموں کا رس دافعِ زہر ہے۔ زہریلے جانوروں کے کاٹے پر لیموں کا رس لگانا اور مریض کو اس کا رس پلانا عام حالتوں میں نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔ کوئی زہریلی چیز معدے میں چلی جائے تو بار بار لیموں کا رس پلانے سے اُس کا دفعیہ ہو جاتا ہے۔ دراصل لیموں زہر کا تریاق ہے۔

کمزور بچّوں کے جسم پر لیموں کے رس میں نمک ملا کر مالش کرنے سے اُن میں طاقت اور توانائی آتی ہے۔

جن لوگوں کو دانتوں اور مسوڑھوں کے کمزور ہونے کی شکایت ہو انہیں چاہئے کہ وہ لیموں کے رس میں نمک ملا کر دانتوں اور مسوڑھوں پر اچھی طرح ملا کریں۔ اِس سے نہ صرف دانتوں کا میل ہی دُور ہوگا بلکہ مسوڑھے اور دانت بھی مضبوط ہو جائیں گے۔

لیموں کے رس میں گلیسرین اور گلاب کا عرق ملا کر چہرے پر ملنے سے داغ دھبّے اور مہاسے دُور ہو جاتے ہیں۔ چہرے کی خشکی دُور ہو کر جلد ملائم ہو جاتی ہے۔ نہانے کے پانی میں لیموں کا رس نچوڑ کر نہانے سے جسم اچھی طرح صاف ہو جاتا ہے اور بدن کے مسامات کھل جاتے ہیں۔

مچھلی کو اگر لیموں کا رس ملے ہوئے پانی سے دھویا جائے تو اُس کی بُو جاتی رہتی ہے۔

لیموں کے بیج طبی نقطۂ نظر سے فرحت بخش اور قابض ہیں۔ ان کا استعمال ہیضہ کی بیماری میں بہت مفید ہے۔ لیموں کے بیجوں کو پانی میں پیس کر ہیضہ کے بیمار کو تھوڑے تھوڑے وقفہ سے پلانا ہیضہ کا بہترین علاج ہے۔ اس سلسلہ میں ایک احتیاط بہت ضروری ہے کہ اگر لیموں کا بیج پیٹ میں چلا جائے اور آنتوں میں پھنس جائے تو اپنڈے سائیٹس جیسے موذی مرض کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

لیموں کا چھلکا سائے میں خشک کر لیں اور اُسے پیس کر باریک سفوف بنا لیں۔ یہ سفوف وبائی زمانہ میں صحت کی حفاظت کے لئے بہترین چیز ہے۔ اِس سفوف کی دو دو ماشہ کی خوراک وبا کے زہریلے اثرات سے محفوظ رکھتی ہے۔

سرد اور بلغمی مزاج والوں کے لئے لیموں کا استعمال مُضر ہے۔ وہ اِس سے پرہیز کریں۔ ایسے لوگ جن کے اعصاب کمزور ہیں، اُنھیں بھی لیموں کا زیادہ استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ لیموں اعصاب کی کمزوری میں ضرر رساں ہے۔ اِس کی مضرت دُور کرنے کے لئے اگر اِس میں خالص شہد ملا لیا جائے تو ضعفِ اعصاب کے مریض اور بلغمی مزاج والے بھی اِسے استعمال کر سکتے ہیں۔

آج کل خرابیٔ ہضم کی شکایت عام ہے۔ اِس کا بہترین علاج لیموں کا رس ہے۔ برسات اور ہیضے کے موسم میں تو شام کے کھانے کے ساتھ ادرک اور پیاز میں لیموں کا رس نچوڑ کر کھانا بہت ضروری اور مفید ہے۔ ذیابیطس، موسمی بخار اور ہیضہ کے موسم میں لیموں بہترین دوا کا کام کرتا ہے۔ زرد رو اور خون کی کمی کے مریضوں کو تو لیموں نئی زندگی بخشتا ہے۔ پُرانا قبض، بدہضمی، جگر کی خرابی، بھوک نہ لگنا، تھکن، بخار آنا، خون کا پتلا پڑ جانا، خون کی پُرانی خرابیوں اور سانس کے امراض میں لیموں اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ اِس سے بدن کی رنگت میں نکھار آتا ہے اور چُستی بڑھتی ہے۔

جرمن ڈاکٹر پروفیسر شمول نے لکھا ہے کہ "تازہ لیموں کا رس آبِ حیات کا سا اثر رکھتا ہے۔ جگر کے لئے تو یہ امرت ہے۔ اگر اِسے روزانہ صبح خالی پیٹ ایک گلاس باسی پانی میں پیا جائے تو عمر بڑھتی ہے۔"

خاکسار مُدیرِ "بیسویں صدی" برسوں سے اِس پر عامل ہے اور لیموں کے معجز نما اثرات کا قائل ———!

۲ ——— اپنی غلطی سے سبق حاصل کیجئے

بیشتر لوگ اپنی غلطی سے بد دل ہو جاتے ہیں۔ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن یہ بڑی بھول ہے۔ کوئی غلطی کر کے بد دل ہرگز نہ ہونا چاہئے۔ احساسِ کمتری میں ہرگز مبتلا نہ ہونا چاہئے۔ ہر غلطی ایک قیمتی تجربہ، ایک قیمتی سبق دیتی ہے۔

مشہور مفکّر ڈوگلس لرٹن نے لکھا ہے "اپنی ہر غلطی سے سبق حاصل کیجئے۔ دُنیا کے عقل مند لوگ یہی کرتے ہیں، کامیاب ترین ہستیاں اِسی طرح تجربات حاصل کر کے آگے بڑھتی ہیں۔"

ایک غلطی کو دوبارہ ہرگز نہ کیجئے اور کوشش کیجئے کہ آپ کم سے کم غلطی کریں۔ اگر آپ کا رجحان یہ ہو جائے کہ آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی تو ہوگی نہیں اِس لئے غلطیاں کرنے میں کیا حرج ہے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مستقل طور پر ناکام رہنے کی مشق کر رہے ہیں۔

کوئی غلطی سرزد ہو جانے سے اپنی جدوجہد میں نہ رُکئے۔ اگر آپ ایک بار مُنہ کے بل گر پڑے ہیں تو اُٹھ کھڑے ہوں۔ اپنی غلطی سے بد دل ہو کر بیٹھ نہ جائیں۔ اپنے خون کی گردش میں، اپنے خیالات میں کامیابی کی لگن پیدا کیجئے۔

اگر آپ شکست خوردہ اور ناکام رہے ہیں تو کوئی پروا نہ کیجئے، اُسے ہنسی میں اُڑا دیجئے۔ اگر ممکن ہے تو ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو پھر چُن لیجئے اور اُنہیں جوڑنے کی کوشش کیجئے۔

اگر ایسا ممکن نہیں تو اُس غلطی سے ایک تجربہ، ایک سبق حاصل کر کے اُٹھ کھڑے ہوں اور اپنے ذہن میں اس حقیقت کو رکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں کہ دوسرے لوگ بھی ناکام ہوتے ہیں۔ جن لوگوں میں کسی نقصان سے فائدہ حاصل کرنے کی لگن ہوتی ہے، وہ اپنی غلطی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

۳ــــ کیا آپ بوڑھے ہو رہے ہیں؟

کیا آپ بوڑھے ہو رہے ہیں اور دوسرے بہت سے بوڑھوں کی طرح اپنے بالوں کو سفید ہوتے دیکھ کر خوف زدہ ہو رہے ہیں؟ بڑھاپے سے ڈرنے والے موت سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے "تمہاری عمر کچھ بھی ہو، روح ہمیشہ جوان رہتی ہے۔ روح کو ہمیشہ جوان رکھو۔ روح کو ہمیشہ جوان سمجھو۔ اکثر عمر رسیدہ لوگوں میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے اور انتہائی غلطی سے یہ یقین ہو چکا ہے کہ اُن کی عمر اب کام کرنے کی نہیں رہی۔ پیری آگئی، ہمت کی آگ سرد ہو گئی۔ قویٰ جواب دے چکے ہیں اور روز بروز دُنیا کی سرگرمی میں حصہ لینے کے ناقابل ہو رہے ہیں۔ انہیں نوجوانوں کے لئے جگہ خالی کر دینی چاہئے محض اس لئے کہ وہ عمر کی ایک خاص منزل میں پہنچ گئے ہیں۔ وہ ترقی کے جہاز کا لنگر ڈال دیتے ہیں۔ اُن کی بالیدگی اور ترقی رُک جاتی ہے۔

اُن کی سستی اور کاہلی کی وجہ سے اُن کے اعضاء نکمے اور بیکار ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے بدن میں مرض کے مقابلے کی طاقت نہیں رہتی۔ اُن کے دماغ، اُن کے اعصاب اور اُن کے رگ و ریشے کے اکثر خلیات اپنے وقت سے سالوں پہلے بیکار ہو جاتے ہیں۔ اِس لئے وہ جلد بوڑھے ہو جاتے ہیں۔

ہماری ذہنی اور دماغی حالت پر، ہمارے طرزِ زندگی پر بھی پیش از وقت بڑھاپے کا بہت کچھ دارومدار ہے۔ اگر تم دل میں یہ خیال جما لوگے کہ بوڑھے ہو رہے ہو تو تمہارا یہ یقین تمہاری زندگی کا گلا گھونٹ دے گا۔

۴ــــ چولائی کا ساگ

یہ ایک برساتی ساگ ہے لیکن گرمیوں میں کنوئیں کے پانی سے زمین سیر کر کے بھی بویا جاتا ہے۔ شہروں میں اس کا استعمال کم ہے۔ دیہات میں زیادہ کھایا جاتا ہے۔ اس کا مزاج گرمی کی طرف مائل ہے مگر وَید معتدل بتاتے ہیں۔ تنہا بھی پکا کر کھایا جاتا ہے اور گوشت کے ساتھ بھی۔ یہ بہت جلد ہضم ہو جاتا ہے اور ملیّن تاثیر رکھتا ہے۔ اسے تندرست ہی نہیں کھاتے بلکہ ہر طرح کے مریضوں کو بھی دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دق کے مریضوں کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ یہ قبض کشا اور پیشاب آور ہے۔ جن لوگوں کے گُردے اور مثانے میں پتھری ہوتی ہے، وہ برابر چولائی کا ساگ کھائیں تو اُن کی پتھری ٹوٹ کر پیشاب کے راستے خارج ہو جاتی ہے۔ یہ ساگ صفرا، بلغم اور خون کے فساد کو مٹاتا ہے۔ بہت زود ہضم ہے اور بھوک پیدا کرتا ہے۔ چولائی ارزاں ترین ساگ ہے مگر بے شمار فوائد کا حامل ہے۔ اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ لال ساگ زیادہ مشہور ہے۔ اِس کی تاثیر نسبتاً گرم اور خشک ہے مگر ذیابیطس اور دائمی قبض میں بہت مفید ہے۔

چھٹانک بھر چولائی کے پتوں کو نصف سیر پانی میں جوش دیں، جب آدھ پاؤ پانی رہ جائے تو اسے چھان کر ایک ماشہ نمک ملا کر صبح، دوپہر اور شام کو پینے سے دردِ قولنج دور ہو جاتا ہے۔ اس کے مسلسل استعمال سے گُردہ اور معدہ کی پتھری بھی دُور ہوتی ہے۔ جسے سانپ نے کاٹ لیا ہو اسے چولائی کا پانی پلانے سے فائدہ پہنچتا ہے۔ سانپ کے کاٹے کو کئی دن برابر چولائی کا ساگ کھلایا جائے تو اُس کے جسم سے سانپ کے زہر کے سارے اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ چولائی کی جڑ پانی میں پیس چھان کر پلانے سے سوزاک کو آرام ہو جاتا ہے۔ چولائی کی جڑ تین ماشہ اور ایک ماشہ رسوت پیس چھان کر چاولوں کے ساتھ کھلانے سے استحاضہ (بچّہ کی پیدائش کے بعد کثرت سے خون آنا) کی شکایت دُور ہو جاتی ہے۔ چولائی کی تازہ جڑ کوٹ کر اُس کا پانی نکال لیں اور اُس میں رسوت پانچ ماشہ، ناگیسر ایک ماشہ ملا کر جنگلی بیر کے برابر گولیاں بنا لیں۔ روزانہ ایک گولی کھلائیں، اوپر سے چولائی کی جڑ کا جوش دیا ہوا پانی پلائیں۔ یہ خونی بواسیر کے لئے مفید دوا ہے۔

۵ــــ کامیابی کا راز

دُنیا میں ایسا کون انسان ہوگا جو کامیاب زندگی نہ گزارنا چاہتا ہو۔ اپنی زندگی کا دامن کامیابی و کامرانی کے پھولوں سے نہ بھر لینا چاہتا ہو۔ کیا چھوٹے، کیا بڑے سبھی کامیابی کا خواب دیکھتے ہیں لیکن بہت کم لوگ ہیں جو کامیابی کے راستے آشنا ہیں۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے "دُنیا میں وہی انسان کامیاب ہے جو کامیاب شخصیت کا مالک ہے۔ انسان کی شخصیت جتنی بلند اور جاذبِ نظر ہوتی جاتی ہے ویسا ہی وہ کامیاب اور کامراں ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپ کا مقصدِ حیات کچھ بھی ہو، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ اپنے مقصدِ حیات میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ بشرطیکہ آپ اپنے اندر ایک جاذبِ نظر شخصیت پیدا کر سکیں اور دوسرے لوگوں سے بغض و حسد کے بغیر تعاون اور محبت کی فضا میں رہ سکیں۔

انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اور ہماری زندگی کا سب سے اہم راز یہ ہے کہ ہم کسی طرح دوسروں سے بہتر اور خوش گوار تعلقات قائم کریں اور کسی طرح اُن سے تعاون حاصل کریں۔

آپ طاقت اور قوت کے بغیر زندگی میں نمایاں ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔

طاقت کا سرچشمہ لوگوں کا تعاون اور اشتراک ہے۔ جاذب نظر شخصیت کے لغیر ہم دوسروں کو اپنے مقصد کے لئے تعاون اور اشتراک پر آمادہ نہیں کر سکتے۔

۶ ـــــ کیا آپ احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں؟

دُنیا کے بہت سے ناکام لوگوں کی طرح کیا آپ بھی اپنی کسی کمی کے باعث احساسِ کمتری میں مُبتلا ہیں؟ اگر ایسا ہے تو مشہور مفکّر ڈوگلس لرٹن کی ان سطور کو بغور پڑھئے اور پھر دیکھئے کہ آپ کے سامنے پھیلا ہوا اندھیرا کیسے دُور ہو جاتا ہے، کافور ہو جاتا ہے۔ کیسے آپ کے سامنے ایک نہیں، کتنی ہی روشن راہیں اُبھر آتی ہیں۔

آپ دُنیا کے عظیم ترین اور کامیاب انسانوں میں ایک انسان بھی ایسا نہیں بتا سکتے جو کسی نہ کسی عضوی یا ذہنی نقص کا شکار نہ رہا ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگ شاہراہِ حیات پر تیزی اور پُراعتماد انداز میں بے دھڑک چل رہے ہیں۔ وہ اپنی کمی کو، اپنی راہ کی رُکاوٹوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ اگر ہم اعداد و شمار کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں سے کتنی کثیر تعداد ایسی جسمانی یا ذہنی کمی کی شکار ہے۔

امریکی میڈیکل ایسوسی ایشن کی اطلاع ہے کہ امریکہ میں چھ لاکھ افراد ایسے ہیں جو یا تو مکمل طور پر بہرے ہیں یا اونچا سُنتے ہیں۔ اس کے علاوہ لاکھوں ایسے ہیں جو ذہنی نقائص کے مارے ہوتے ہیں۔ لاکھوں ایسے ہیں جو احساسِ کمتری کے ہاتھوں تباہ ہیں اور لاکھوں ایسے ہیں جو اُن سے نسبتاً کم تکلیف دہ امراض کے شکار ہیں۔ اس کے باوجود انھیں میں سے پُریقین اور جری قسم کے لوگ عام سطح سے اُٹھ کر بُلند سطح پر آجاتے ہیں اور اپنا نام روشن کرتے ہیں اور اُنہی کے دوش بدوش منفی فکر کے لوگ ہوتے ہیں جو احساسِ کمتری میں مُبتلا رہتے ہیں۔ وہ اپنا مقام اُنہی لوگوں میں پیدا کر لیتے ہیں جن کی ساری عمر ناکامی کا رونا روتے گزر جاتی ہے۔

تاریخ ایسے جری، بہادر اور بلند حوصلہ لوگوں کے ذکر سے بھری پڑی ہے جو اپنے نقائص اور ایسی دُشواریوں کے باوجود عظیم شخصیتوں کے مالک بنے۔

۷ ـــــ ہیضہ سے محفوظ رہنے کی تدابیر

ہیضہ کے جراثیم کھانے پینے کی چیزوں کے ذریعہ مُنہ کے راستے معدے میں پہنچتے ہیں۔ اِس مرض سے محفوظ رہنے کے لئے سب سے مقدّم احتیاط یہ ہے کہ معدہ اور آنتیں تندرست ہوں اور معدہ خالی نہ رکھا جائے۔ خصوصاً جبکہ ایسے مقام پر جائیں جہاں ہیضہ کا زور ہو، جہاں ہیضہ کی چھوت لگنے کا اندیشہ ہو۔

ہیضہ کے جراثیم خراب پانی کے ذریعہ معدے میں پہنچتے ہیں۔ اِس لئے ہیضہ سے محفوظ رہنے کے لئے پینے اور ہاتھ دھونے اور کُلّیاں کرنے کے لئے جو پانی استعمال کیا جائے وہ اُبالا ہوا ہونا چاہئے۔

مکھیاں اور چیونٹیاں جیسے جانور ہیضہ کے کیڑوں کو پھیلاتے ہیں، اِس لئے کھانے کی چیزوں کو ڈھک کر رکھنا چاہئے۔

کھانے میں زیادہ سے زیادہ احتیاط برتنی چاہئے۔ باسی اور سڑی ہوئی غذا ہرگز نہ کھانی چاہئے۔ تازہ پکی ہوئی غذا کھانی چاہئے۔

کھانے پینے کی چیزوں کو چھُونے سے پہلے ہاتھوں کو صابن اور پانی سے اچھی طرح دھو لینا چاہئے۔ اِس طرف سے غفلت برتنا خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

بازار میں کھانے پینے کی چیزوں کو احتیاط سے نہیں رکھا جاتا۔ اُن پر گرد و غبار پڑا رہتا ہے، جن پر مکھیاں آزادی سے بیٹھتی ہیں۔ اِس لئے بازار کی چیزیں کھانے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ بازار سے جو دودھ لیا جائے اُسے جوش دیئے بغیر استعمال نہ کیا جائے۔

ہیضہ کے زمانہ میں خربوزہ، تربوز، کھیرا، ککڑی، پھُوٹ اور گلے سڑے پھل اور ترکاریاں کھانے سے پرہیز کرنا چاہئے۔

ہیضے کے زمانے میں کھانے پینے میں اعتدال سے کام لینا چاہئے۔ کوئی ایسی چیز نہ کھانی چاہئے جس سے بدہضمی کا اندیشہ ہو۔ اگر کسی وجہ سے بدہضمی ہو جائے تو فوراً اُس کا تدارک کرنا چاہئے۔ کھانے کے ساتھ سرکہ، لیموں، پودینہ، املی اور پیاز جیسی چیزیں ضرور استعمال کریں۔ یہ چیزیں بظاہر بہت معمولی ہیں لیکن ہیضہ کے تدارک میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ان سے ہیضہ کے جراثیم پیدا نہیں ہونے پاتے۔

خالی معدہ ایسی جگہ نہ جانا چاہئے جہاں ہیضہ پھیلا ہو۔ وہاں کی کوئی چیز نہ کھانی چاہئے، نہ پانی ہی پینا چاہئے۔

جوں ہی ہیضہ کے آثار نظر آئیں پینے کے پانی کی طرف فوراً توجہ دینی چاہئے۔ اگر کنوئیں کا پانی پیتے ہوں تو کنوئیں کے پانی کو صاف کرنے کے لئے اُن میں پوٹاس پرمیگنیٹ ڈالا جائے۔ چھوٹے کنوئیں کے لئے ایک چھٹانک اور بڑے کنوئیں کے لئے دو چھٹانک پوٹاس پرمگنیٹ کافی ہے۔ اِسے بالٹی یا ڈول میں حل کر کے کنوئیں میں ڈال دیں اور پھر کنوئیں کے پانی کو خوب ہلائیں۔ چوبیس گھنٹے کے بعد کنوئیں کا سارا پانی نکال دیں۔ اِس طرح کنوئیں کا پانی صاف ہو جائے گا۔ اگر تالابوں اور دریاؤں کا پانی پیا جاتا ہو تو اُسے اُبال کر پئیں۔ شہروں میں جہاں پانی کے نل لگے ہوتے ہیں، وہاں بھی ہیضہ کے زمانہ میں نلوں کا پانی جوش دے کر پیا جائے تو بہتر ہے۔

ہیضہ کے مریض کی استعمال شدہ کوئی چیز رومال، تولیہ، چادر، پیالے، چمچہ وغیرہ گرم پانی میں اُبالے بغیر استعمال نہ کرنا چاہئے۔

ہیضہ کے مریض کے فضلات کو لکڑی کے بُرادہ وغیرہ میں ملا کر جلا دیں یا گہرا گڑھا کھود کر دبا دیا کریں۔

سرگوشیاں

سوال و جواب

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ غیر اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کیے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھیے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لیے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

ماسٹر لطیف احساس۔ امراوتی

س۔ دلی میں اناج کی کیا حالت ہے؟

ج۔ ایں خانہ تمام آفتاب است۔ سرکار دولتمدار کی مہربانی و بیدار مغزی سے دلی ہو یا دلدار نگر سب جگہ ہی ایک حالت ہے

س۔ ظلم...؟

ج۔ ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ ظلم بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

محمد شفیق منظر۔ ڈیسر گڑھ

س۔ کیا دوست کبھی دشمن بن سکتا ہے؟

ج۔ دوست ہی کیا بھائی دشمن بن سکتا ہے۔ کیا آپ چین کو نہیں دیکھتے جس نے کبھی "ہندی چینی بھائی بھائی" کا نعرہ لگایا تھا۔

س۔ کیا دولت سے دنیا کی ہر شے خریدی جا سکتی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ لیکن دل نہیں

محمد جعفر بنگلور

س۔ بیچ منجدھار میں اگر پتوار ہاتھ سے چھوٹ جائے؟

ج۔ جب بھی ہمت نہ چھوڑنی چاہیے ؎
زور طوفاں دیکھ کر موجوں سے جو کترا گیا
اُس زبوں ہمت کی قسمت میں کنارا ہی نہیں

س۔ راجہ مہدی علی خاں کا کوئی غمگین شعر سنائیے۔

ج۔ راجہ صاحب غمگین شعر کیوں کہنے لگے، غمگین ہوں اُن کے دشمن! راجہ صاحب کا ایک دلچسپ شعر سنیے ؎
دو آنکھیں ہیں ہم سب کی مگر کانا ستم دین
ہم سب سے بھلا ہے معلوم نہیں کیوں؟

اے۔ ایل۔ حسرت۔ آرمور

س۔ "بیسویں صدی" کا ایک گزشتہ شمارہ زیر مطالعہ تھا۔ حنیف چودھری کے ادبی لطائف۔ دل و دماغ کو لالہ زار بنا رہے تھے کہ کاتب صاحب کا ایک اور لطیفہ نظر آیا۔ اختر شیرانی کے اس مصرعہ "یہ آنکھوں آنکھوں میں تو نے ساقی خبر نہیں کچھ پلا دیا کیا؟" کو یوں لکھ دیا "یہ آنکھوں آنکھوں میں تو نے ساقی، خبر نہیں کچھ پلا دیا کسے" کیا حنیف چودھری "بیسویں صدی" کے صفحات کو پھر لالہ زار بنائیں گے؟

ج۔ جناب حنیف چودھری توجہ فرمائیں

س۔ بھیا! کیا واقعی آج کل وفا مٹ چکی ہے؟ اگر نہیں تو دوست بے وفا کیوں ہیں؟

ج۔ وہ بے وفا نہیں۔ آج کل وفا کے معنی بدل گئے ہیں۔

س۔ سہت ہے ایک دل یہ تمنا کہیں جسے
دھوکا ہے ایک عقل کا دنیا کہیں جسے
کیا یہ سچ ہے؟

ج۔ اپنا اپنا خیال ہے ؎
ہے یہ دنیا ایک ہی افسانۂ ناکام شوق
جس نے جو چاہا الگ تجویز عنوان کر دیا

جمال الدین ساحل۔ کریم نگر

س۔ بیتی ہوئی یادیں تلخ کیوں ہوتی ہیں؟

ج۔ ساری یادیں تلخ نہیں ہوتیں۔ کچھ یادیں شیریں بھی ہوتی ہیں۔

س۔ آج دنیا کا خوش نصیب انسان کون ہے؟

ج۔ جو اپنے کو خوش نصیب سمجھتا ہے جسے خدا نے خود کو خوش نصیب سمجھنے کی توفیق دی ہے۔

ایس بیگ ایم اے کیر آف ۸۸ اے پی او

س۔ مجھے اردو ادب سے دلچسپی ہے اور افسانے لکھنا میرا شغل۔ ان افسانوں میں جان ڈالنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہاں اصلاح دینے والا کوئی نہیں ہے۔ بتائیے کیا کروں؟

ج۔ جناب آسی رام نگری سے رجوع کیجئے۔ ان کا پتہ یہ ہے:-

جناب آسی رام نگری منزل سرائے (بنارس)

س۔ میں اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی انتھک کوشش کرتا ہوں لیکن میرے ساتھی بری طرح میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا مجھے اپنی کوششوں سے منہ موڑ لینا چاہیے؟

ج۔ ہرگز نہیں۔ آج جو لوگ آپ کا مذاق اڑاتے ہیں کل آپ کے مداح ہوں گے۔

س۔ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ـــ پھر بھی لوگ دوسرے مذاہب والوں کو کھا جانے والی نظروں سے کیوں دیکھتے ہیں؟

ج۔ ایسے لوگ مذہب کی صحیح روح کو نہیں سمجھتے۔

زیڈ اے ظہور۔ مالیر کوٹلہ

س۔ "بیسویں صدی" کے لئے افسانہ بھیجنے کی کیا شرائط ہیں؟

ج۔ صرف ایک شرط ہے ـــ افسانہ "بیسویں صدی" کے معیار کا ہو۔

محمد نصرت اللہ امتیاز۔ بنگارا پیٹ

س۔ ڈاکٹر اقبال کا کوئی شعر سنائیے

ج۔ جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

س۔ کیا ہر انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہو سکتی؟

ج۔ ہر انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہو سکتی ہاں! جو انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرتے ہیں ان کی بیشتر خواہشیں پوری ہو جاتی ہیں۔

س۔ دل کا راز کسی کو بتا دیں تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

ج۔ راز راز نہ رہے گا افشا ہو جائے گا۔ ایک دانشور نے کہا ہے ـــ راز دل کہہ کر فاش نہ ہونے کی امید نہ رکھ۔

محمد منصور جمالی۔ رانچی۔ بہار

س۔ عورتیں مردوں سے کیا توقع رکھتی ہیں؟

ج۔ وہ حسین نہ ہوں جب بھی انہیں حسین نہیں حسین کہیں۔

س۔ زندگی کب اداس ہوتی ہے؟

ج۔ جب دل اداس ہوتا ہے۔

مجیب الرحمٰن۔ رانچی

س۔ کن خوبیوں کی حامل عورت اچھی شریک حیات بن سکتی ہے؟

ج۔ جو زندگی کی کانٹوں بھری راہ میں مسکراتی ہوئی اپنے رفیق حیات کے شانہ سے شانہ ملا کر اس کا ساتھ دے۔

س۔ بھائی جان! ذرا عورت کی تشریح کریں۔

ج۔ ع وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ!

محمد فاروق شکر نگر۔ نظام آباد دکن

س۔ زندگی کی تلخیاں کب عروج پر ہوتی ہیں؟

ج۔ جب انسان شیرینیوں کو تلخیاں کہنے لگتا ہے۔

مونذ عمر عزیز فاروقی علیگ۔ علیگڑھ

س۔ بھائی جان! کیا خوشگوار زندگی کے لئے بیوی کا پڑھی لکھی ہونا ضروری ہے؟

ج۔ پڑھی لکھی ہونے سے زیادہ ضروری ہے سلیقہ مند اور سمجھدار ہونا۔

س۔ طالب علمی کے زمانہ میں کسی سے محبت ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے؟

ج۔ اس محبت کو تعلیم کی طرف منتقل کر دینا چاہیے۔

قمر عالم انصاری کٹکاڈی نکتار۔ دربھنگہ

س۔ آپ کا محبوب مشغلہ؟

ج۔ اپنے خون جگر سے زبان و ادب کے چمن کی آبیاری حق و صداقت کی تائید و ترجمانی کر کے خطرات سے کھیلنا۔ حالات و حوادث پر طنز سے مسکراتے ہوئے یہ گنگنانا ـــ

راہ طلب کے دیوانے کب روکے رکتے ہیں
عزم محکم کے آگے کیا زنداں کیا زنجیر!

س۔ ساحر لدھیانوی کے کوئی دو شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ـــ

ہو کر خراب مے ترے غم تو بھلا دئے
لیکن غم حیات کا درماں نہ کر سکے
کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

ایس نعمت علی۔ دھلاوری

س۔ آج کے زمانے میں دولت انسان کے لئے خطرہ کیوں بن گئی؟

ج۔ دولت ہمیشہ انسان کے لئے خطرہ کا موجب رہی ہے۔

س۔ انسان گھریلو زندگی سے گھبرا جائے تو؟

ج۔ گھریلو زندگی کو پرکشش بنانے کی کوشش کرے۔

س۔ کیا دل برف سے بھی نرم ہے؟

ج۔ جی ہاں! دل برف سے بھی نرم اور پتھر سے بھی سخت ہے!

ایم، اے، ندیم۔ کلکتہ

س۔ ہندوستان اور پاکستان میں فرقہ وارانہ فساد کیوں ہوتے ہیں؟

ج۔ دونوں جگہ تنگ دل اور تنگ نظر لوگوں کے تعصب اور تنگ نظری کی وجہ سے فساد ہوتے ہیں۔

س۔ موجودہ دور میں ہندوستان میں مسلمان ہونا جرم ہے؟

ج۔ احساس کمتری میں مبتلا لوگوں کے لئے جرم ہے۔

س۔ ایک ایسا شعر سنایئے جس میں درد ہو۔

ج۔ مری حیات ہے محروم مدعا کے حیات
وہ رہگزر ہوں جسے کوئی نقش پا نہ ملا

شاکرہ کوثر۔ کاکوری

س۔ بھائی جان! میری سب سے بڑی آرزو تعلیم حاصل کرتے رہنا ہے لیکن لوگ میری خواہش پوری ہونے نہیں دیتے۔ بتایئے میں کیا کروں؟

ج۔ انسان کی ہر آرزو کہاں پوری ہوتی ہے۔ حالات اور ماحول سے بغاوت کرنا اور کامیاب ہونا آسان نہیں۔ اور وہ بھی ایک لڑکی کے لئے۔ اس لئے حالات سے سمجھوتہ ہی کر لیجئے۔

س۔ بھائی جان! ذرا یہ تو بتایئے، سماج کے بندھن لڑکیوں کے لئے اتنے سخت کیوں ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ یہ بندھن مردوں نے بنائے ہیں۔ یہ بندھن مردوں کے ہاتھ میں ہیں۔

س۔ بھائی جان! کیا محبت کرنا آج کا فیشن بن گیا ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ آپ دیکھتی نہیں۔ آج کل ہر نوجوان یہی کھیل کھیلتا ہے۔

ندیم۔ کویت

س۔ "سرگوشیاں" میں آپ کے پرعزم اور حوصلہ بخش جوابات پڑھ کر آزمائش کے طور پر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ کے مشوروں پر عمل کر کے دیکھا جائے۔ آپ کو یہ لکھتے ہوئے مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے کہ دو تین سال کے اندر آج میں ایک کامیاب انسان ہوں اور مجھے ہر چیز میسر ہے۔ بتایئے خورشید صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کیا نذر کروں؟ میری یہ کامیابی آپ کی مرہون منت ہے۔

ج۔ آپ کی کامیابی ہی ہمارا انعام ہے۔

س۔ میرے اس خیال سے آپ کہاں تک متفق ہیں۔ یقین محکم، ناقابل شکست عزم اور بلند حوصلہ انسان کی زندگی میں بہت کچھ دخل رکھتا ہے۔ اُسے یقیناً کامیاب بنا سکتا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اور پھر تقدیر کو کوسنا، دانائی نہیں۔ حالات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے رہو اور عزم و استقلال کے ساتھ قدم بڑھاتے جاؤ۔

ج۔ ہم آپ کے اس خیال سے سو فیصدی متفق ہیں

س۔ مجھے خط و کتابت سے عشق ہے۔ کوئی بھائی یا بہن ہمیں بھائی بنائیں تو ہم ممنون ہوں گے۔ کیا آپ میرا پتہ "سرگوشیاں" میں دے دیں گے؟

ج۔ آپ کا پتہ دیا جا رہا ہے:۔

ندیم۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۹۲، کویت

محمد لطیف عالم ناصح بھوپال

س۔ جب انسان مصیبتوں سے گھبرا جائے تو...؟

ج۔ حوصلہ کا دامن اور مضبوطی سے پکڑ لے۔

س۔ اردو کی ترقی کے لئے کوئی واحد راہ بتلایئے۔

ج۔ اردو کے حامی اردو کی بقا و ترقی کے لئے مجسم ایثار بن جائیں۔

سی، آر، موہنی۔ جھول توی

س۔ شاعرہ حقی حزیں کا پتہ بتائیں۔ نوازش ہو گی۔

ج۔ بھائی جان! حقی حزیں شاعرہ نہیں شاعر ہیں۔ کیا اب بھی آپ اُن کا پتہ جاننا چاہیں گے؟

رونق علی انصاری۔ کانپور

س۔ انڈونیشیا میں کتنے مسلمان ہیں؟

ج۔ نوے فیصدی۔

عبدالمجید خاں۔ بہرائچ

س۔ خوشتر بیبا! اس مہنگائی کے دور میں لیڈروں کی اتنی افزائش کیوں ہے؟

ج۔ خدا کا شکر اور حکومت کا شکریہ ادا کیجئے کہ اس گرانی کے دور میں کوئی تو چیز ارزاں تو ہے!

س۔ خوشتر بیبا! آج کل کے لیڈر تقریریں زیادہ کیوں کرتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ اُن کے پاس کام کم اور کام کی باتیں زیادہ ہیں۔

س۔ آنسو پر کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ دل کے اکثر فسانے جمیل
آنسوؤں میں سنائے جاتے ہیں

فتح فرید۔ کرک پورہ کشنگڑھ

س۔ پنڈت نہرو کو غربت کا احساس زیادہ تھا یا ابراہم لنکن کو؟

ج۔ پنڈت نہرو کو تھا نہ ابراہم لنکن کو۔ اُن سے زیادہ احساس اُن کے خوش پوش و خوش حال حواریوں اور جانشینوں کو ہے۔

س۔ آپ سوالوں کے جواب کتنے دنوں میں دیتے ہیں؟

ج۔ جب نمبر آتا ہے۔

عبدالرزاق۔ بمبئی

س۔ غریبی کا علاج؟

ج۔ غریبی کے خلاف جد و جہد!

س۔ زندگی میں اگر خوشیاں نہ ملیں تب کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ زندگی میں خوشیاں نہ ملیں جب بھی زندہ رہنا چاہئے، جب بھی جینا چاہئے۔ زندگی جب بھی موت سے پیاری ہے۔ کسی نے کہا ہے ؎

زہر کے گھونٹ پئے جاتا ہوں میں
دل کے زخموں کو سئے جاتا ہوں میں
غم کا بار گراں ہے کاندھوں پہ
پھر بھی خوش ہو کے جئے جاتا ہوں میں

اسداللہ اسد نیفا۔ آسام

س۔ میرے ہمنام اسداللہ خاں اسد (غالب) کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ زندگی اپنی جو اس طرح سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ایک مصرعہ اور سن لیجئے ؎
مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں

س۔ سونا پرکھنے کے لئے کسوٹی اور دوستی پرکھنے کے لئے؟

ج۔ دوست پر آن پڑنے والا کڑا وقت!

فیروز رضوی۔ رائچور

س۔ انسانیت کب روتی ہے؟

ج۔ جب جذبۂ بربریت انسان کو حیوان بنا کر اس پر طنز سے ہنستا ہے۔

س۔ اگر کوشش کے بعد بھی ناکامی ہو تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ کوشش جاری رکھنی چاہئے۔

س۔ اگر کسی بات کو بھول جانا چاہیں تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ یہ اربابِ حکومت بتا سکتے ہیں جو عوام سے بہت سے وعدے کر کے بھول جاتے ہیں۔

افتخار احمد۔ کانپور سینٹرل

س۔ بھیا! یہ غلام محی الدین خضر دہلوی کا کیا چکر ہے۔ میں نے اکثر اس کا نام "بیسویں صدی" میں دیکھا ہے۔ اس نے کس طرح "بیسویں صدی" کے ہزاروں روپے ہضم کر لئے؟

ج۔ کس طرح اس روسیاہ محسن کش نے "بیسویں صدی" کے ہزاروں روپے ہضم کر لئے؟ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔

س۔ سیاست داں بننے کے لئے کون کون سی شرائط لازمی ہیں؟

ج۔ صرف ایک شرط! خوبصورت فریب دینے کی مشق کر لینا۔

حارث الحوک۔ ردولی شریف

س۔ ہندوستان کے وزیرِ تعلیم کا نام محمد کریم چھاگلا ہے یا عبد الکریم چھاگلا؟

ج۔ محمد کریم چھاگلا۔

س۔ آج کل انسانوں میں انسانیت کیوں ختم ہوتی جا رہی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ انسان انسان نہ رہے۔

س۔ مجازؔ مرحوم کا ایک اچھا سا شعر سنایئے۔

ج۔ لب تک آ کے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

ذکیہ خانم۔ لاہور کینٹ

س۔ زندگی پر کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ ایک قطعہ سنئے ۔

زندگی شغلِ آہ و زاری ہے
زندگی ایک ضربِ کاری ہے
پھر بھی کیا دلکشی ہے ظالم میں
پھر بھی کمبخت کتنی پیاری ہے!

سراج الدین ایم ابراہیم بھیونڈی

س۔ "چیونٹی اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھودتا ہے" بتایئے یہ کس کا قول ہے؟

ج۔ ایک بڑے دانشور کا۔

س۔ بھیا! میں دہلی آنے کا ارادہ رکھتا ہوں، بتایئے وہاں آپ میری کیا خدمت کریں گے؟

ج۔ آپ کے لئے دیدہ و دل فرشِ راہ ہوں گے!

س۔ کوئی ایسا شعر سنایئے کہ ڈوبتے دل کو سکون ملے۔

ج۔ حریفِ جادۂ دشوار بن اور مسکراتا جا
کہ مشکل اصل میں بنتی ہے صرف احساسِ مشکل سے

بدر الدین انصاری مرزاپور

س۔ ساحرؔ لدھیانوی نے فلمی دنیا کیوں اختیار کر لی؟ ان کا پتہ تحریر فرمائیں تاکہ خط و کتابت کی جا سکے۔

ج۔ ہوسِ دولت کی کشش نے جیسے ہم سے بہت سے فنکاروں کو چھین لیا، ساحرؔ صاحب بھی ادبی دنیا سے دور چلے گئے۔ آپ مندرجہ ذیل پتہ پر خط لکھ سکتے ہیں:

ساحرؔ لدھیانوی

چانی نواز

مٹ بکس ۴۲ ۱۱ کلکتہ ۱

محمد یعقوب۔ فیض آباد

س۔ خوشتر صاحب! آپ کا پورا نام کیا ہے؟

ج۔ آپ کے تجاہلِ عارفانہ کے صدقے! آپ ہر ماہ "بیسویں صدی" میں ہمارا نام دیکھتے ہیں، پھر بھی سن لیجئے۔ ہمارا پورا نام خوشتر گرامی ہے۔

س۔ غلام محی الدین خضر کی جعلسازی کا تفصیلی واقعہ کیا ہے؟

ج۔ اس ننگِ انسانیت نمکِ حرام انسان کی شرمناک کہانی بہت طویل ہے۔ اس کہانی کا لبِ لباب یہ ہے کہ اس روسیاہ، محسن کش نے "بیسویں صدی" کا پچیس ہزار سے زائد رقوم دھوکے اور فریب سے نکال لیں اور بے شمار سالانہ خریداروں اور "بیسویں صدی" کے ایجنٹوں کی رقوم ہضم اور سبوتاژ کر لیں۔

اسلم جوش۔ بہاولپور

س۔ "بیسویں صدی" کے لئے تصویر کس سائز کی ہو؟

ج۔ جس سائز کی تصویریں آپ "بیسویں صدی" میں دیکھتے ہیں۔

س۔ خوشتر صاحب! قتیلؔ شفائی کا پورا نام کیا ہے؟

ج۔ نام سے کیا لینا ہے۔ کام دیکھئے۔ ان کا ایک حسین شعر سنئے ۔

لطف وہ نیند کے ماتے نیم باز آنکھوں پر
بھر رہا ہو جیسے کوئی آبگینوں میں

سید انوار حسین جعفری۔ علی گڑھ

س۔ بہت سے لوگ آپ سے آپ کا مذہب پوچھ چکے ہیں۔ آج میں بھی پوچھ رہا ہوں۔ کیا بتانے کی زحمت فرمائیں گے؟

ج۔ پہلے دوسروں سے جو بتلایا وہی حقیقت ہے۔
ہندو یا مسلماں ہے نظر میں میری یکساں
ہوں دردِ انساں میرا دین دردمندی

صلاح الدین بتلہ۔ دہلی

س۔ خدا کیا ہے؟

ج۔ انسان کی فہم و ذکاوت اور عقل و شعور سے بلند و بالاتر ہستی!

ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

فخر الزماں۔ کویت

س۔ میں "بیسویں صدی" کا مستقل خریدار بننا چاہتا ہوں۔ سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ دو خاص نمبر بھی چاہتا ہوں۔ فرمایئے میں آپ کو کتنے روپے کا بنک ڈرافٹ ارسال کروں جو مجھے ہر ماہ رجسٹری سے آپ پرچہ ارسال کر سکیں۔

ج۔ سالانہ قیمت کے طور پر آپ ایک پونڈ کا ڈرافٹ بھیجئے اور رسالہ بذریعہ رجسٹری منگوانے کے لئے مزید دس شلنگ بھیجئے۔ پرچہ بذریعہ رجسٹری ہر ماہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہے گا۔

تحمل حسین۔ اگت پوری

س۔ گزشتہ دس برسوں سے "بیسویں صدی" پڑھتا آرہا ہوں۔ آپ کی شبیہہ تو ذہن کے پردوں پر ابھا کرتی ہے لیکن آنکھیں اس شرف سے محروم ہیں۔ آخر کب تک؟

ج۔ آپ دس برسوں سے "بیسویں صدی" پڑھ رہے ہیں اور آپ نے ہمیں نہیں دیکھا؟ حیرت ہے!

س۔ ہر ماہ جب "بیسویں صدی" ملتا ہے عقیدت اور آرزو اور بڑھ جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ج۔ یہ تو اپنے دل سے پوچھنے کی بات ہے۔

عبدالمجید خاں۔ بھلائی نگر

س۔ زندگی کی خوشی کس میں ہے؟

ج۔ دوسروں کو خوشی دینے میں۔

س۔ آج کل جھوٹ بولنے سے فائدہ کیوں ہوتا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ آج کل سچ کی قدر کرنے والے بہت کم ہیں۔

الیاس صدیقی۔ بنارس

س۔ ہندوستان میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں؟

ج۔ ایک سو ستاون زبانیں۔

س۔ [illegible] آپ [illegible] ہے

ج۔ [illegible] کہتے ہیں۔

س۔ کیا محبت کرنا جرم ہے؟ اگر ہے تو کیوں [illegible] نہیں
کیوں [illegible] نے [illegible] رکھا ہے؟

ج۔ محبت کرنا جرم ہو یا نہ ہو، دنیا کی نظروں میں کسی [illegible]
[illegible]
کچھ ہی [illegible] سے [illegible]

س۔ کیا [illegible] کی تصویر [illegible] ہے

ج۔ [illegible]

ج۔ شعر [illegible] صاحب [illegible] آپ کے شعر [illegible]
سننا چاہتے ہیں [illegible]
[illegible] صاحب [illegible]
[illegible] آپ کے دوستوں [illegible]
[illegible] کرتے ہیں۔

س۔ [illegible] صاحب اپنا کوئی شعر [illegible] کریں
[illegible]

ج۔ [illegible]

[illegible]

ڈکشنریاں صنعت و حرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی

کشیدہ کاریاں و ڈکشنریاں

- [illegible] کشیدہ کاری ... چار روپے
- [illegible] کاری ... پانچ روپے ۵۰ پیسے
- چار روپے ۵۰ پیسے
- ... سیدہ خاتون ... تین روپے ۵۰ پیسے
- ... انور ... دو روپے ۵۰ پیسے
- دو روپے ۵۰ پیسے
- ... انور ... ایک روپیہ
- ایک روپیہ
- ... دو روپے
- اشرف بانو عفران ... دو روپے
- ... پانچ روپے

اپنی ادبی قابلیت بڑھائیے

اردو کی نایاب ترین ڈکشنریاں

- ... انگریزی سے اردو ... چار روپے
- ... قیمت مجلد ... روپے
- ... قیمت مجلد ... روپے
- ... عبدالحق ... تیس روپے
- ... بیس روپے
- ... بارہ روپے
- ... گیارہ روپے
- [illegible]
- [illegible]
- ... روپے
- [illegible]

صنعت و حرفت

- الیکٹریکل انجینئرنگ ... بارہ روپے
- الیکٹرک ... دو روپے
- الیکٹرک وائرنگ ... چار روپے ۵۰ پیسے
- موٹر کار ڈرائیونگ ... چار روپے
- الیکٹرک ... تین روپے ۵۰ پیسے
- الیکٹرک ... آٹھ روپے
- الیکٹرک ... امتحان کے پیپرز (جواب) ... [illegible]
- آئل و گیس انجن گائیڈ ... دس روپے
- آئل انجن گائیڈ ... چھ روپے
- کروڈ آئل انجن گائیڈ ... چار روپے ۵۰ پیسے
- وائرلیس ریڈیو گائیڈ ... چھ روپے
- ریڈیو سروسنگ ... آٹھ روپے ۲۵ پیسے
- ٹانکا لگانے کا ... دو روپے ۵۰ پیسے
- ... ایلومینیم ... تین روپے ۵۰ پیسے
- ... ستر روپے ۵۰ پیسے
- ... آٹھ روپے ۲۵ پیسے
- ... پندرہ روپے
- ... چار روپے ۵۰ پیسے
- ... آٹھ روپے
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

خانہ داری

- عصمتی دسترخوان ... آزاد ... تین روپے
- رضیہ کا دسترخوان ... سلطانہ ... دو روپے ۵۰ پیسے
- رنگ سازی ... دو روپے ۵۰ پیسے
- ملائی کا ... دو روپے ۵۰ پیسے
- ... دو روپے ۵۰ پیسے
- ... دو روپے ۵۰ پیسے
- کنفیکشنری ... دو روپے ۵۰ پیسے
- عطر ... (خوشبودار تیل) ... دو روپے ۵۰ پیسے
- ... بسکٹ ... دو روپے ۵۰ پیسے
- ... کا کام ... چار روپے ۵۰ پیسے
- فن مصوری ... چار روپے ۵۰ پیسے
- ... دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible]
- آئل ... کا کاروبار ... [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

RADIUM TONIC PILLS

نئی طاقت

نیا خون

کمزوری کا زبردست علاج

ریڈیم ٹانک پلز



نیا خون بکثرت پیدا کر کے نہ صرف کمزوری دور کرتی ہیں
بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں، وزن اور
خون کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے کھوئی ہوئی طاقت اور صحت
واپس لانے کیلئے ملک کے کونے کونے میں مشہور و مقبول
ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ کمزوری خواہ
کسی وجہ سے ہو کمزور سے کمزور انسان کو بھی نئی طاقت حاصل
ہوتی ہے تندرست نوجوان ریڈیم ٹانک پلز کے استعمال سے
اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں۔ قیمت مکمل علاج
چھ روپے محصولڈاک علاوہ۔

کلکتہ ایجنٹس
... این اینڈ کیمیکل پرائیویٹ لمیٹڈ
نمبر ۲۰ کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ

پتہ: ریڈیم کیمیکل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ پوسٹ بکس ...





جس نے پیدا کئے حسیں اُس نے
کیا دل آویز شاعری کی ہے ——— نریش کمار شاد

فوٹو: محفوظ شاہد۔ لاہور



یہ بات یاد رکھئے کہ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نہ زندگی میں جمود پیدا ہوسکتا ہے اور نہ ادب میں
اردو کو تقسیم ہند سے عظیم ترین نقصان پہنچا۔ خون کی ہولی کھیلی گئی اور سارے صالح اقدار جلا کر خاکستر کر دئے گئے اور
انسان مر گیا۔ ایسے میں کچھ دنوں ہم نفرت عداوت اور بغض و حسد کے ظلمات میں بھٹکتے رہے۔ الحمدللہ کہ وہ دور گزر گیا
انسانیت کی عظمت کا جذبہ پھر سے پیدا ہو رہا ہے۔ ادب میں پھر بہار آ رہی ہے۔ لیکن وہ پچھلی سی بات یقیناً نہیں
ہے۔ اس لئے کہ اب زمانہ ادب کی جگہ سائنس کا ہے۔ نمرزوں کے گیت گانے کی جگہ چاند پر کمند
ڈالنے کا۔ اس حیثیت سے سارے عالم کے ادب میں ایک طرح کا جمود ہے اور یہ اردو میں بھی ہے

——————علی عباس حسینی



اُردو کے مشہور و ممتاز افسانہ نگار جناب علی عبّاس حسینی کے اعزاز میں اَدبی مجلس نئی دہلی کے زیرِ اہتمام ایک خصوصی نشست منعقد کی گئی۔ اِس نشست میں دِلّی کی برگزیدہ علمی و اَدبی شخصیتوں نے شرکت کی —— تصویر میں علی عبّاس حسینی صاحب افسانہ نگاری کے فن پر اظہارِ خیال کر رہے ہیں۔ اِن کے قریب دِلّی کے امیرِ تعلقاتِ عامہ جناب گوپی ناتھ اَمن تشریف فرما ہیں جو اِس بزم کی صدارت فرما رہے ہیں۔ آمن صاحب کے بعد غالبیات کے ماہر جناب مالک رام ہیں اور اُن کے ساتھ جناب گربچن چندن، جن کے افسانے آپ "بیسویں صدی" میں پڑھتے رہتے ہیں ——



کلامِ شاعر بہ زبانِ شاعر کی محفلیں تو اکثر منعقد ہوتی ہیں لیکن افسانہ بہ زبانِ افسانہ نگار سُننے کا اہتمام مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ حسینی صاحب جتنے اچھے افسانہ نگار ہیں، اُتنے ہی اچھے "افسانہ خواں" بھی ہیں۔ اِس محفل میں اُنھوں نے اپنا افسانہ "میٹھا کڑوا جھوٹ" پڑھ کر سُنایا تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے افسانہ کے سارے کردار خود بول رہے ہیں——
اِس تصویر میں مدیر "بیسویں صدی" نظر آرہے ہیں جو حسینی صاحب کو افسانہ نہایت انہماک سے سُن رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ دہلی کے دو مشہور شاعر جناب برج لال جگی رعنا اور جناب کرشن موہن ہیں۔ رعنا صاحب سُننے سے زیادہ دیکھ رہے ہیں اور کرشن موہن تصویرِ حیرت بنے بیٹھے ہیں۔



جناب علی جواد زیدی نے کہا۔ ”اُردو کے اِس کہنہ مشق افسانہ نگار کو دنیا کے ممتاز افسانہ نگاروں کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے“ —— فراقؔ صاحب نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کہا۔ ”اگر پیدا کرنے سے پہلے خدا مجھ سے پوچھتا تو میں کہتا کہ حسینی صاحب کے ہاں پیدا ہونا چاہتا ہوں“ اؔمن صاحب نے فرمایا، ”حُسینی صاحب کو اپنے فن پر مکمل عبور حاصل ہے“ —— مالک رام صاحب نے رائے دی کہ ”حُسینی صاحب افسانہ نگار ہی نہیں، ایک صاحبِ طرز مؤرخ اور ادیب بھی ہیں“ لیکن حُسینی صاحب نے ایک سنجیدہ مُسکراہٹ کے ساتھ یہ کہہ کر مجلس برخاست کردی کہ ”اپنے قصیدے سُن سُن کر تو مجھے یہ شک ہونے لگا ہے کہ میرا کام ختم ہوگیا“

بیسویں صدی دہلی

نومبر ۱۹۶۵ء

ایڈیٹر:-

ٹیلیفون دفتر — ۲۷۱۹۳۴
ٹیلیفون رہائش — ۹۱۹۹۴۷

جلد — ۲۹
نمبر — ۱۱



تیر و نشتر

"ہندوستان کی عزت و ناموس کی ہر قیمت پر حفاظت کرنے کا عزم"۔ ایک اخباری عنوان —— میاں آپ بھی بڑے کاروباری ہیں۔ اپنا ملک ہے۔ اس میں قیمت کا کیا سوال ہے۔ کہو بلا قیمت حفاظت کرنے کا عزم۔

"ہندوستان پڑوسی ملکوں کو ڈرا دھمکا رہا ہے"۔ چین کا الزام —— اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔

"کشمیر کا جھگڑا انگریز کا چھوڑا ہوا ہے"۔ صدر ناصر —— انگریز ہی نے پھر اس کو ہوا دی اور وہی اب اس کے فیصلے کے راستے میں رکاوٹ ہے۔

"آئندہ لڑائی لمبی ہوگی"۔ جناب جمنا داس اختر مدیر "سویرا" —— بلکہ چوڑی بھی۔

"دشمن کے دانت توڑ دیے گئے ہیں اور وہ کاٹنے کے قابل نہیں رہا"۔ ایک خبر —— کیا محاذ پر دندان ساز بھی گئے ہوئے تھے؟

"دلی میں بلیک آؤٹ ختم" —— اور سفیدی آؤٹ ہو گئی۔

"سرحدی عوام کے حوصلے بلند ہیں"۔ ایک عنوان —— وہ ہمیشہ ہی بلند رہے ہیں۔ لیڈروں کے حوصلے بلند رکھنے کی ضرورت ہے۔

"الٹی میٹم کی میعاد ختم ہونے سے پہلے ہی چین نے ہتھیار ڈال دیے"۔ ایک عنوان —— کاغذی شیر ایسے ہی ہوتے ہیں۔

"بلیک آؤٹ کی سختی سے پابندی کی ضرورت"۔ ایک عنوان —— اور اس میں دو فائدے ہیں۔ ہوائی حملے سے بھی محفوظ رہیں گے اور بجلی کا بل بھی کم آئے گا۔



امریکہ کی جانب سے ہند اور پاکستان کے اختلافات ختم کرنے کی کوشش



روس کی طرف سے ہندوستان کی حمایت

"ایٹمی ہتھیار بنانے کی مانگ"۔ ایک عنوان ـــــ مگر ہم اِسے کبھی منظور نہ کریں گے۔ اِس لئے کہ ہم عدم تشدد کے علمبردار ہیں۔

"چینیوں نے اپنے علاقے میں چوکیوں کو خود ہی مسمار کر دیا"۔ ایک خبر ـــــ اور اپنی قوم کے سامنے ڈینگ مار دی کہ بھارت نے اُن کے حکم کی تعمیل کی ہے۔

"برطانیہ کی گومگو کی پالیسی"۔ ایک عنوان ـــــ جس پر آسمان سے بھی لعنت برستی ہے۔

"خطرہ ابھی ٹلا نہیں۔ گھریلو محاذ پر خاص توجہ دی جائے گی"۔ شری گلزاری لال نندہ ـــــ پورے ملک کی گھربار کی مالکنیں سُن لیں۔

"ایک لاکھ روپیہ رکشا فنڈ میں"۔ ایک خبر ـــــ تاکہ گلی گلی رکشا ہو جائے اور آنے جانے والوں کو سواری کی شکایت نہ رہے۔

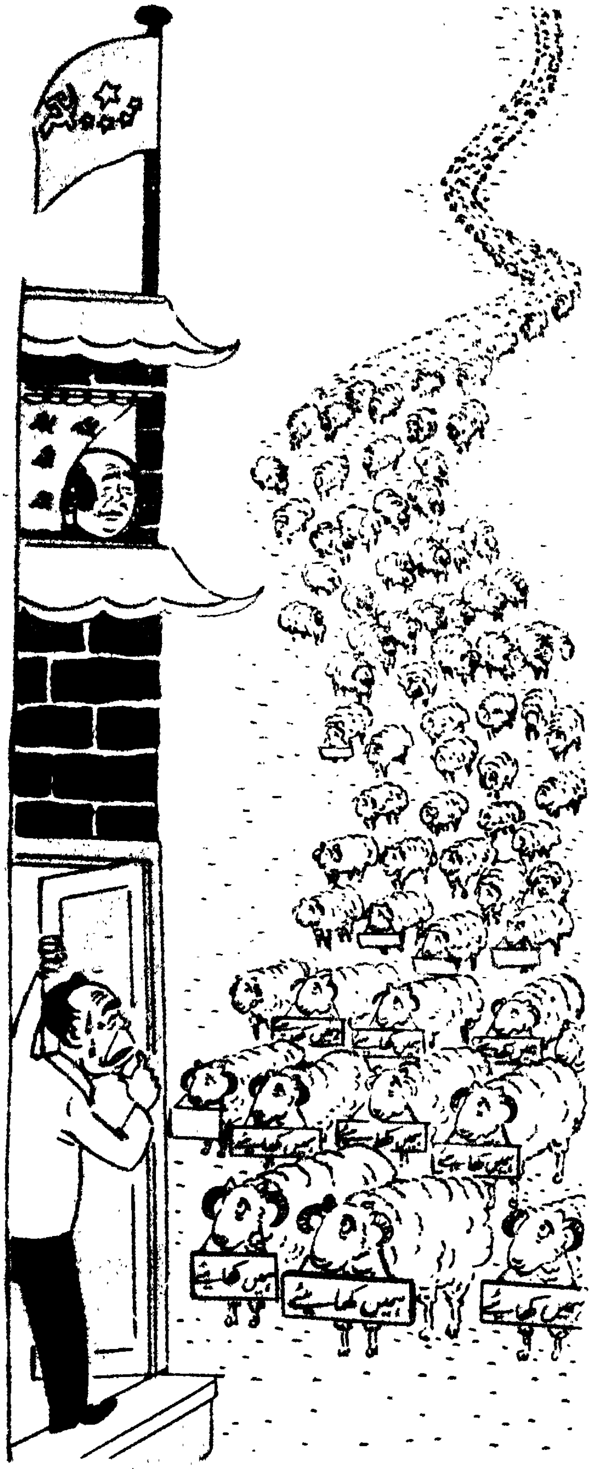
"دلی کے موٹر ورکرز میدان میں"۔ ایک خبر ـــــ اِس لئے سفر [illegible] موٹر ورکروں کے سر پر ہوگا۔

"بیٹے نے ماں کو قتل کر دیا"۔ ایک خبر ـــــ جنت کی تلاش میں جو ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

"یو۔ پی کے کانگرسی ممبروں کی سرکاری بل پر نکتہ چینی"۔ ایک عنوان ـــــ اِن کے ہونٹوں پر عہدوں۔ نوٹوں۔ پرمٹوں کی مہر لگائیے۔

"ملک بھر کے بیکاروں کی تعداد"۔ ایک عنوان ـــــ ملک بھر کا ہر بیکار لیڈر بن سکتا ہے۔

"امریکہ میں ہندوستان کو گندم مہیا کرنے پر غور و خوض"۔ ایک خبر ـــــ جلدی کیجئے آٹے کی لائنیں لمبی ہوتی جا رہی ہیں۔



ہمیں کھائیے اور انسانوں کو بچائیے۔

"چین کی اشتعال انگیز سرگرمیاں جاری ہیں" ایک خبر — اور وہ اپیلوں اور احتجاجوں سے باز آنے والا نہیں اسے ترکی بہ ترکی جواب دینے کی ضرورت ہے
جی — یہ لاتوں کے بھوت ہیں باتوں سے نہیں مانتے

"ہوسٹل میں کارتوس" ایک خبر — اور کلاس روم میں بندوق۔

"ہندوستان پاکستان پر قبضہ کرنے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا" شری لال بہادر شاستری — ایسا نہ کہئے جن سنگھیوں کو ناگوار ہوتا ہے۔

"آسام میں اخباری کاغذ تیار کرنے کے لئے تین فیکٹریاں قائم کی جائیں گی" ایک خبر — تاکہ کاغذی کارروائیاں کرنے کے لئے کاغذ کی قلت پیدا نہ ہو

"جھوٹی افواہیں پھیلانے کے الزام میں مراد آباد میں گرفتاریاں" ایک خبر — مگر دلی میں تو جھوٹی خبریں چھاپنے والے بدستور آزاد پھر رہے ہیں۔

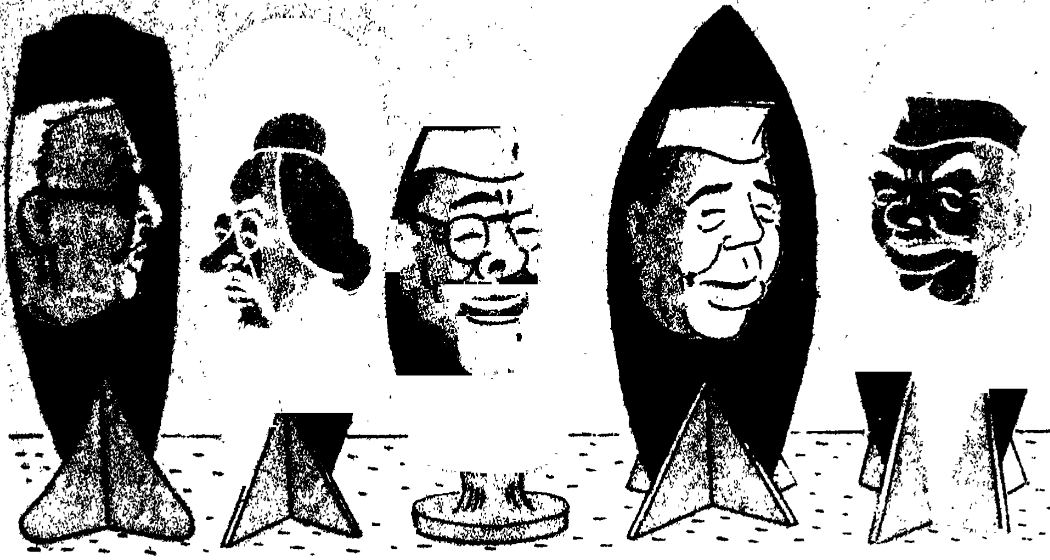
"ہم اپنی جانیں دے کر ہندوستان کی حفاظت کریں گے" ہندوستانی مسلمانوں کا عزم — مگر جن سنگھی اب بھی ان پر بھروسا نہیں کریں گے۔

"کامن ویلتھ چھوڑ دو" دلی پردیش کانگرس کے صدر کا مطالبہ — اور ہندوستان چھوڑ دو کی یاد ایک بار پھر تازہ کر دو۔

"گولڈ کنٹرول آرڈر واپس نہیں لیا جائے گا" ٹی ٹی کرشنما چاری کا اعلان — تو کم از کم کامراج پلان ہی واپس لے لیجئے کہ گولڈ کنٹرول کے بانی شری مرارجی ڈیسائی کو کابینہ میں لے لیا جائے۔

"جنگ بندی سے چین کے پیٹ میں درد" ایک عنوان — جلاب دیجئے ٹھیک ہو جائے گا۔

"اندھوں کی رہنمائی کا آلہ" ایک خبر — اور جو آنکھیں ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکیں ان کی آنکھیں کھولنے کے لئے بھی تو کوئی آلہ ایجاد کیجئے۔



"ہندوستان میں ایٹم بم بنانے کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے"
ایک عنوان ——— مگر اِن بموں کے بعد کسی اور بم کی ہمیں کیا ضرورت ہے۔

"بھارت میں رہنے والے برطانوی باشندوں کو کوئی خطرہ نہیں" ایک عنوان
——— اس لئے کہ ہندوستانی، برطانویوں کی طرح انسان دشمن نہیں پالیسی دشمن ہیں۔

"فرقہ پرستی کا چلن تباہ کن ہوگا" ایک عنوان ——— کاش یہ سیدھی سچی بات جن سنگھ، ہندو مہا سبھا، اکالی دل اور مسلم لیگ کسی طرح سمجھ لے۔

"ضروری چیزوں کی پیداوار ہمیں زیادہ کرنی ہوگی" شری کامراج کی تقریر ——— اور بچے سب سے زیادہ ضروری چیز ہیں۔

"چین جنگ میں کودا تو دنیا کی صورتِ حال بدل جائیگی" ڈاکٹر ذاکر حسین ——— یعنی وہ تنہا ایک طرف ہوگا اور ساری دنیا دوسری طرف ہوگی۔

"ایک نئی مجلس اقوام قائم ہوگی" چین کی دھمکی ——— یوں کہیے کہ چین ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے گا۔

"کھلاڑی بڑھ چڑھ کر جنگی کوششوں میں حصہ لیں" ایک عنوان ——— مگر خود آپس میں جنگ نہ شروع کردیں۔

"غفلت نقصان دہ ہوگی" سردار دربارہ سنگھ ——— صرف نقصان دہ ہی نہیں بلکہ ہلاکت آفریں بھی۔ سردار صاحب اہلِ وطن سے کہیے

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

"برطانیہ کی مفاد پرستی ضرب المثل ہے" ایک تبصرہ ——— ایسی جو محاورات اور ضرب الامثال کی کتابوں میں درج ہے۔

"چین گڑبڑ کرنے والے علاقوں میں اپنی ٹانگ اڑانے کا عادی ہو چکا ہے" برطانوی وزیرِ اعظم کا اظہارِ خیال ——— اُس کی یہ ٹانگ تو کبھی کی ٹوٹ گئی ہوتی اگر آپ نے امریکہ کا ساتھ دیا ہوتا۔

"[illegible] ایک خبر ـــــ آثار
[illegible] کریں۔

"چین کا الٹی میٹم خاصا سنگین تھا": ایک مقالہ ـــــ جی نہیں یوں کہیے
خاصا کاغذی تھا۔

"بھارت کی نادیاں بھی ہتھیار لے کر میدانِ جنگ میں آ نکلیں": ایک خبر
ـــــ مگر چست قمیصیں اور ٹیڈی شلواریں چھوڑنی ہوں گی۔

"ہزاروں تبتی چین کے خلاف جنگ میں خون کا آخری قطرہ تک بہانے کو
تیار ہیں": ایک خبر ـــــ اچھا تو اسی لئے تبت سے بھاگ کر ہندوستان آئے ہیں

"ہم چیلنج کا مقابلہ کریں گے": ایک عنوان ـــــ خدا کرے۔
ـــــ نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو

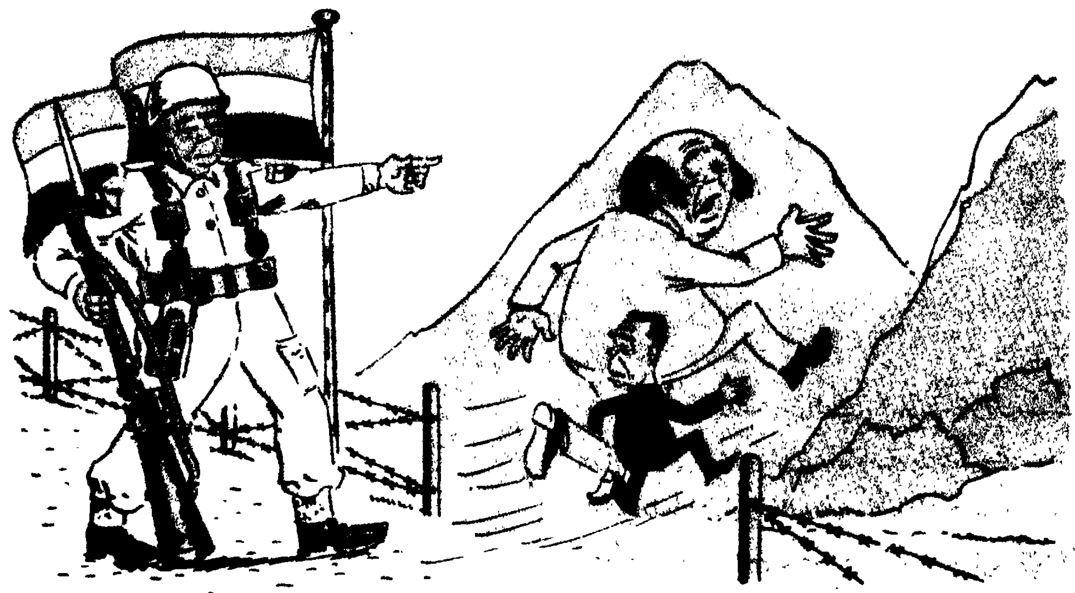
"ہندوستان کو ایٹم بم بنانا چاہیئے": پارلیمنٹ کے ممبران کا مطالبہ ـــــ
اس لئے کہ چین تبھی چپ ہو کر بیٹھے گا۔

"دہلی میں یکم نومبر سے راشننگ کا امکان نہیں": ایک خبر ـــــ
اس لئے کہ اب بلیک کرنے والوں نے توبہ کر لی ہے۔

"ہم مل جل کر ہی ملک کی حفاظت کر سکتے ہیں": ایک عنوان ـــــ کانگرسی
لیڈر کان کھول کر سن لیں۔

"نیفا کے بودھ جینی خطرے سے بے نیاز امن و آشتی کا پرچار کر رہے
ہیں": ایک خبر ـــــ امن کی فاختائیں اُڑا اُڑا کر۔

"ایشیا میں جمہوریت کا چراغ": ایک عنوان ـــــ بھارت میں
روشن ہے تو جلتا رہے گا۔



چین نے خود ہی الٹی میٹم دیا، خود ہی راہِ فرار اختیار کی

دُبلا پتلا چھریرا بدن۔ کھدر کی شیروانی اور پاجامے میں ملبوس جو ہر کارٹونسٹ کے لئے ایک شاندار اور منافع بخش ماڈل ثابت ہوا ہے ——— اُسی کا نام ہے ———



لمبا قد جس کی عظمت قطب مینار کی طرح مُسلّم۔ لمبی ناک جو ہمارے گھر بھر کی ناک بھی ہے، مونچھوں سے آراستہ۔ بڑی بڑی متجسس آنکھیں، دو نہیں، چشمے سمیت پوری چار۔ جسم جتنا ہلکا پھلکا، فیصلوں میں اُتنا ہی بھاری بھرکم۔ عقل قد و قامت سے دراز۔ ڈ ی۔ آئی۔ آر کے استعمال کے جملہ حقوق آپ کے ہاتھ میں محفوظ ہیں۔ کمیونسٹوں کی نظروں میں غازفرقہ پرستوں کے حق میں تلوار ——— معاملات کے حق میں حقیقت پسند۔ اپنے کام میں چاق و چوبند۔ اقدام میں مستعد۔ فیصلہ کرنے میں تیز اور اُس کے نباہنے میں اٹل۔ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ احمد آباد میں پروان چڑھے۔ دلّی میں حکومت کرتے ہیں اور ہماری سیکولر جمہوریت کے لال بہادر شاستری دل ہیں تو نندہ جی دماغ اور چاول دست و بازو۔ شکل و صورت اور حُلیے کے اعتبار سے سیدھے سچے انسان۔ عقیدے کے اعتبار سے انسان پرست۔ اِس کے لئے کبھی سادھو سماج بناتے ہیں تو کبھی سیوک سماج اور کبھی سداچار سمتی۔ نوجوانوں کے لئے ایک آدرش مورتی۔ محنت کشی سے محنت کشوں کے لیڈر اور پھر وزیرِ محنت بنے۔

مزدوروں کی رہنمائی میں عقل و خرد کے کمالات کا مظاہرہ کرنے کے بعد اب ڈنڈا سنبھالے پاسبانِ ملک و قوم بنے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں اندھیری راتوں میں ہارون رشید کی طرح دلّی کے گلی کوچوں کے چکر بھی لگاتے رہے ہیں۔

برف

کرشن چندر ایم اے

گرو نواس ففٹینتھ روڈ، کھار، بمبئی ۵۲

۱۱ر جولائی ۶۵ء

برادرم خوشتر صاحب! تسلیم

اِن دنوں غلّہ کی گرانی سے لوگوں کے پیٹ کی آگ نہیں بجھ رہی ہے۔ ضروریات زندگی کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ بازار میں آگ لگی ہے۔ ہر طرف آگ ہی آگ ہے — ! اس لئے "برف" بھیج رہا ہوں !! یہ افسانہ فٹ پاتھ کی زندگی سے متعلق ہے . . .

آپ کا ——— کرشن چندر

ایک سنیچر کی رات کو میں اپنے فٹ پاتھ کے دوستوں کے درمیان لیٹا لیٹا کہکشاں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں بڑے زور کی بریک لگا کر ایک ٹیکسی رکی۔ دو آدمیوں نے اُٹھا کر کسی کو ٹیکسی سے نکالا اور اُسے لا کر فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ پھر کسی نے ایک سوٹ کیس فٹ پاتھ کے فرش پر پھینک دیا۔ پھر جلدی سے وہ ٹیکسی اسٹارٹ ہو کے چلی گئی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے اور اتنے مختصر عرصہ میں ہوا کہ میں آنکھیں جھپکتا ہی رہ گیا۔

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں مل کر اپنی جگہ سے چند گز کے فاصلے پر اُس دُبلے پتلے انسان کو دیکھنے لگا جو اپنے سوٹ کیس کے قریب بیٹھا ہوا کراہ رہا تھا۔

میں اُٹھ کر اس کے پاس گیا۔

"تمھیں یہاں اِس طرح پھینکنے والے وہ کون تھے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"وہ میرا بھائی تھا۔ دوسرا اُس کا دوست تھا!" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"انھوں نے تمھیں یہاں اِس طرح کیوں پھینک دیا؟"

"کیونکہ مجھے چار سال سے کینسر ہے اور میں مرتا نہیں ہوں۔" وہ ادھیڑ عمر کا آدمی بڑی دلچسپی سے بولا۔ اس کے لہجے میں کوئی شکایت نہ تھی۔

"تمھارے بھائی کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔"

"وہ مجبور ہے۔ اُس کے چھ بچے ہیں۔ ایک بیوی ہے۔ ایک بوڑھی ماں ہے۔ دو بن بیاہی بہنیں ہیں اور تنخواہ ڈھائی سو روپئے ہے۔ تمھیں کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ کینسر کے علاج میں کتنا خرچ ہوتا ہے۔ میرا بھائی بہت ہی جذباتی آدمی ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ تمھیں معلوم ہی نہیں ہے۔ پچھلے چار برسوں میں اُس نے کس طرح اپنا اور اپنے خاندان والوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کے میرا علاج کیا ہے۔ تم سوچ ہی نہیں سکتے۔ وہ منفذ ماہ و سال کی چھوٹی چھوٹی خستیں جن سے روح کسی پرانے سکے کی طرح گھس جاتی ہے اُسی طرح میرے بھائی نے میرے علاج کی خاطر اپنے آپ کو گھسا ڈالا ہے اور اب اس کا کوئی چہرہ نہیں ہے۔ حوادث و آلام سے بھری ہوئی پوری گاڑی اُس کے چہرے پر سے گزر گئی ہے اور اب اس کا کوئی چہرہ نہیں ہے۔ اُس کے اندر کوئی جذبہ نہیں ہے۔ اس نے مجھے پھینک دیا ہے!"

وہ چپ ہو گیا۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود اور اتنا بیمار ہونے پر بھی اُس کے چہرے میں ایک عجیب سی دلکشی تھی۔ اُس کی بھنویں کمان کی طرح تنی ہوئی تھیں اور اُن بھنوؤں کے نیچے بڑے بڑے پپوٹوں کے اندر بڑی بڑی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ گہرے رنگ کی آنکھیں، جن میں ایک پیلاہٹ گدلی روشنی کی طرح چمکتی تھی۔ کبھی تو وہ پتلیاں راکھ کی طرح بجھی بجھی دکھائی دیتیں اور کبھی اُن میں کسی ذہنی روشنی کا انعکاس چھننے لگتا۔ ان آنکھوں کی روشنی واقعی کبھی بہت گہری اور سنہری ہوگی۔ لیکن اب تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں کی ناکام جد و جہد سے اس روشنی کو زنگ کھا گیا ہو۔ پھر بھی جب کبھی کسی ذہین خیال سے وہ آنکھیں روشن ہو جاتیں تو سارا چہرہ بدل جاتا۔ اُس کے لمبوترے چہرے پر اُس کی آنکھیں ہی سب سے زیادہ حیرت انگیز تھیں۔ اُن آنکھوں میں اُس وقت ایک گہرا کرب ابھر رہا تھا اور اس کا سارا چہرہ کسی شدید درد کے تشنج سے کھنچ رہا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ اُس نے مجھ سے کہا۔

"اِس سوٹ کیس کو کھولو۔ اِس میں نوالجین کی کوئی ٹکیہ ہوگی۔"

سوٹ کیس کو اِدھر اُدھر کھنگالنے سے چاندی کے سے پترے میں بند نوالجین کی ایک ٹکیہ مل گئی جو اُس نے اُسی وقت نگل لی۔

سوٹ کیس میں دو پرانی قمیصیں تھیں۔ ایک گرم پتلون تھی جس کا کپڑا کبھی بہت عمدہ رہا ہوگا۔ شیو کا سامان تھا۔ ایک کنگھا، ایک پرانی فائل، ڈورے سے بندھا ہوا تصویروں کا ایک بنڈل، ڈورا ڈھیلی ہو چکی تھی۔ چیزوں کو اچھی طرح رکھتے ہوئے تصویریں



[illegible] ہاتھ ڈالے
[illegible] سے لٹی ٹکی تھی۔

[illegible] سے ٹیک لگائے کھڑے ہوئے خوبرو نوجوان کو

"ارے یہ مشہور فلم اسٹار پریم ورما ہے۔ جس کی تصویریں ہم اپنے لڑکپن میں دیکھتے تھے !"

پریم ورما اور آرتی بالا کی جوڑی اُن دنوں اپنے عروج پر تھی۔

"ہاں میں ہی پریم ورما ہوں !" کرب کے درمیان اُس کے چہرے پر چند لمحوں کے لئے مسرت کی روشنی چمکی۔ چند لمحوں کے لئے اُن آنکھوں کا گدلا پن دُور ہو گیا اور اُن میں صاف سُتھری سُنہری روشنی کا انعکاس نظر آیا۔ پھر وہ آنکھیں بُجھ کر دُھندلی ہو گئیں۔

"تم پریم ورما ہو ؟" میں حیرت سے اپنے لڑکپن اور نوجوانی کے [illegible] دیکھتا رہا۔ ہاں وہی تو تھا۔ لااُبالی، برق آسا، سیماب صفت پریم ورما ! ... خوش لباس، خوش گفتار، خوش ادا پریم ورما ! پندرہ سال تک جس نے کالج کے لڑکوں کو اپنے ہیر اسٹائل اپنے لباس، بات چیت اور نت نئے فیشن کی نقل پر مجبور کیا۔ وہی بانکا چھیلا البیلا پریمی جو ریس کے گھوڑے پر آنکھ جھپکے بغیر دو دو لاکھ داؤ پر لگا کر اور ہار کر اس طرح بھول جاتا تھا جیسے وہ [illegible] کہیں رکھ کر بھول گیا ہو۔

"واقعی !" میں نے پُرانے فوٹو سے اُس کے موجودہ چہرے کا موازنہ کرتے ہوئے کہا "واقعی تم پریم ورما ہو۔ مگر تم ـــــ اِس فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے کیا کر رہے ہو ؟ تمہیں تو اس وقت اپنے لاکھا محل میں ہونا چاہیئے !"

"میرے سارے لاکھ ڈوب گئے۔ کچھ اچھے گھوڑوں پر، کچھ خوبصورت عورتوں پر، کچھ بیش قیمت کاروں پر، کچھ قیمتی شرابوں پر، میں نے وہ سب کھو دیئے، کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ وہ میرے ہاتھوں کی چھلنی سے کس وقت بہہ گئے۔ میں سُنہری دھوپ میں زندگی کے نواب کے نیچے مُنہ کھولے لیٹا تھا اور زندگی کا آبِ حیات آپ ہی آپ میرے منہ میں ٹپک رہا تھا۔ یکایک وہ فوارہ سُوکھ گیا اور میرا مُنہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا !

میں نے سنبھلنے کی کوشش کی، لیکن جوانی کی سُنہری دھوپ جا چکی تھی اور اس کے ساتھ وہ شہرت، وہ پرستش، وہ دولت، وہ عزت بھی جا چکی تھی جو ہمیشہ کے آنے سے آتی ہے، اور اُس کے جانے سے ہمیشہ کے لئے چلی جاتی ہے۔ میں نے ہاتھ پھیلا کر اُسے پکڑنا چاہا لیکن اُس نے مجھے زور کی ایک ٹھوکر ماری اور میں نیچے ہی گرتا گیا۔ جب سے میں نیچے ہی گرتا جا رہا ہوں۔ بڑے ہیرو سے چھوٹا ہیرو، چھوٹے ہیرو سے سائیڈ ہیرو، سائیڈ ہیرو سے کیریکٹر آرٹسٹ، کیریکٹر آرٹسٹ سے محض آرٹسٹ، آرٹسٹ سے ایکسٹرا، آخر میں وہ بھی نہیں۔ کینسر کا ایک مریض۔ اپنے بھائی کے یہاں پڑا ہوا۔ وہ بھی کیسا بھائی جسے میں نے آج تک اپنے کسی عیش و عشرت میں شریک نہیں کیا تھا۔ جسے میں نے آج تک اپنی لاکھوں کی دولت میں سے ایک چھدام تک نہیں دیا تھا۔ نوبجین کی ایک ٹکیہ کے لئے میں نے اپنے بھائی کی بیوی سے کیسے کیسے طعنے سُنے ہیں۔ میں جو ریس میں لاکھوں ہار جایا کرتا تھا، تم کیا جانو کہ لب جام سے دُرد تہ جام تک آتے آتے کیسی کیسی ذلتوں سے گزرا ہوں ... اور اب انھوں نے مجھے فٹ پاتھ پر پھینک دیا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میرے [illegible] اب صرف چار چھ مہینے رہ گئے ہیں۔ اور [illegible] درد جاتا نہیں۔ نوبجین کا ایک انجکشن لگ جائے تو رات آرام سے کٹے۔"

[illegible] وقت آدھی رات کو [illegible] یہاں سے آئے گا ؟

[illegible] وہ زمانہ تھا ایک ایک [illegible] پر [illegible] ڈاکٹر [illegible] تھا [illegible] سے [illegible] رکھنے [illegible] رات [illegible] تھا۔ دیکھو [illegible] میں [illegible]

[illegible] سوٹ کیس [illegible] جان [illegible] نہیں ہے"

[illegible] لا سکتے [illegible]

[illegible]

"میرے پاس ہی نہیں ہیں [illegible]

ہیں اور تم سوچ ہی نہیں سکتے کینسر کا درد کیا ہوتا ہے۔ [illegible] ہم [illegible] نس نس کو آگ دکھا رہا ہو !! کیا ایک سگریٹ بھی تمہارے پاس نہیں ہے"

میں نے سگریٹ نکال [illegible]

[illegible] اُس نے [illegible]

نے سگریٹ کا دُھواں [illegible]

چہرہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کیا

"سگریٹ کا ایک کش، روٹی کا ایک نوالہ، ہوا کا ایک جھونکا، ترشے ہوئے ہیرے سے زیادہ قیمتی معلوم ہوتا ہے! میں اس فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوں۔ سامنے سڑک پر روشنی کی ایک تکون لرز رہی ہے۔ یہ بجھتے ہوئے بس اسٹینڈ کا مستطیل نما سایہ ایرانی کی دکان کے محراب دار سائے میں گھل گیا ہے۔ جیسے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس سے باتیں کرتا ہے۔ غور سے دیکھو ان دونوں سایوں کو۔ کیا وہ دونوں سائے ایک مرد کی طرح مستطیل، دوسرا عورت کی طرح محراب دار، دو عاشقوں کی طرح ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے نہیں دکھائی دیتے ___؟ کیا ایسا نہیں معلوم ہوتا جیسے اُن کی ہستی بس کے اسٹینڈ اور ہوٹل کی محراب سے الگ ہے؟ کیا باتیں کر رہے ہیں یہ دونوں سائے ___؟ لیکن کون دیکھتا ہے ان سایوں کو۔ آج سے چار سال پہلے میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ زندگی میں اتنا گہرا اترنے کے لئے موت کی وادی میں جھانک لینا ضروری ہے۔ یا اُس کا ایک شدید ذہنی احساس بھی، زندگی کو اُس کی تمام اذیتوں کے باوجود کتنی قیمتی اور حسین بنا سکتا ہے۔ اس کا اندازہ صرف اُن لوگوں کو ہے جو موت اور اس کے کرب کو چھو کر زندہ ہوتے ہیں۔ وہ [illegible] لوگ تو محض جیتے ہیں۔"

[illegible] آہستہ سے سوٹ کیس کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گ[illegible] اب اُس کا [illegible] کے پیچھے [illegible] اندھیرے میں تھا [illegible] جیسے جما سوئی سوئی تھی [illegible] جو سو رہی ہیں [illegible] اپنے سونے [illegible] انھیں سے اس کو متعارف کرانے لگا۔ [illegible] اسلوب ہے [illegible] سے بیٹی کی سی [illegible] [illegible] ہے [illegible] جان کو [illegible] [illegible] بھی فٹ پاتھ ہمارا گھر ہے!" [illegible] کے لوگ مجھے یہاں رہنے دیں گے؟" اُس نے یکایک مجھ سے

[illegible] میرا خیال ہے تمہیں کوئی [illegible] [illegible] اس فٹ پاتھ پر [illegible] معقول ترین [illegible] [illegible] ہو سکتی ہے۔ ہم تو سوچ [illegible] نہیں سکتے [illegible] [illegible] کون [illegible] [illegible] ڈال [illegible] جذبات [illegible] زیادہ پریشان نہیں کر [illegible] چہرے پر [illegible] مسکراہٹ آگئی۔

[illegible] تم بار [illegible] جہاں چار سال [illegible] [illegible] کیا؟"

[illegible] وہ بولا "اب تو قصہ [illegible] اور اس کے بیوی بچوں کو روٹی ملے

[illegible] بھائی [illegible] کوئی ہسپتال [illegible] .....اس لئے [illegible] بھئی، مجبوری ہے!" "تو پھر کیا بدلا ہے [illegible]" "انسان بہت کچھ بدل کر [illegible]" وہ رک رک کر بولا "مجھے جیک لنڈن کی ایک اُس کی وہ کہانی مجھے بہت یاد آتی ہے جس میں اُس [illegible] ایک مشہور روایت کا ذکر کیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے۔ یہ روایت بہت پرانی ہے اور اس زمانے سے چلی آرہی ہے جب ریڈ انڈین قبیلے خوراک کی تلاش میں خانہ بدوش ہو کر جگہ جگہ گھومتے تھے۔ اُس زمانے میں فطرت انسان پر حاوی تھی۔ خوراک کم تھی اور بہت مشکل سے ملتی تھی۔ اس زمانے سے ریڈ انڈین قبیلوں میں یہ رسم چلی آرہی ہے کہ جب خاندان کا کوئی فرد بہت بوڑھا ہو جاتا ہے یا مسلسل بیماری سے اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ خود سے شکار نہیں کر سکتا، تو خود اُس کا بیٹا بوڑھے باپ کو کسی برفیلے ٹیلے پر مرنے کے لئے چھوڑ آتا ہے۔ بوڑھے باپ کو دو دن کا راشن دے جاتا ہے اور تین دن کے لئے تمباکو اور پھر بیٹا باپ کو اس برفیلے ٹیلے پر مرنے کے لئے چھوڑ [illegible] ہے۔ بہت دردناک کہانی ہے اور اُس وقت میں اسے سچ نہیں سمجھتا تھا کس طرح کوئی بیٹا خود سے اپنے باپ کو مرنے کے لئے برف میں اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن جب آج اُنھوں نے مجھے ٹیکسی سے اُتار کر اس فٹ پاتھ پر پھینک دیا، تو یکایک مجھے وہ کہانی یاد آگئی۔ یہاں بجلی ہے، لوہے اور کنکریٹ کی سڑک ہے۔ قدم قدم پر ہوٹل اور چائے خانے ہیں، شراب خانے اور کھانوں کی دکانیں ہیں، گرجا اور ڈرگ اسٹور ہیں۔ سائنس کی ترقی اور تہذیب کی [illegible] موجود ہے۔ جو آج سے چار ہزار [illegible] سال پہلے ریڈ انڈین کے کسی قبیلے میں موجود نہیں تھا۔ [illegible] سب کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں ہے۔ وہ جو مجھے اس فٹ پاتھ پر چھوڑ کر چلے گئے کسی طرح [illegible] ریڈ انڈین بیٹے سے کم مجبور نہ تھے!"

[illegible] خوفناک باتیں کرتے ہو [illegible]

"[illegible] دنیا کی حقیقت [illegible] بہت خوفناک [illegible] نوجوان!" [illegible]

آنکھیں کھولنا چاہتا ہوں" [illegible] اُس نے [illegible] کہا

"میری آنکھیں [illegible] کچھ دیکھ [illegible] کہ اب وہ آرام کرنا چاہتی ہیں کچھ [illegible] پپوٹوں میں [illegible] روشنی بہت تیز ہے اس کا مزہ بہت تلخ ہے۔ میری آنکھیں [illegible] ___ [illegible] سر جھکا کے [illegible] چپ ہو گیا۔

[illegible] باہر [illegible]
دیکھئے۔

ایک ... صورت پُروقار نوجوان ایک دمکتی ہوئی حسینہ کی کمر میں، ہاتھ ڈالے ایک کیڈیلاک کے سامنے کھڑا تھا۔ جوان کی شکل اس کینسر کے مریض سے ملتی جلتی تھی۔

"یہ تم ہو ——— ؟"

"ہاں !"

"اور یہ عورت کون ہے ؟ تمہاری بیوی ؟"

"نہیں، یہ مشہور فلم اسٹار آرتی بالا ہے !"

یکایک میں نے کیڈیلاک سے ٹیک لگائے کھڑے ہوئے خوبرو نوجوان کو پہچان لیا۔

"ارے یہ مشہور فلم اسٹار پریم درما ہے۔ جس کی تصویریں ہم اپنے لڑکپن میں دیکھتے تھے !"

پریم درما اور آرتی بالا کی جوڑی اُن دنوں بہت مشہور تھی۔

"ہاں میں ہی پریم درما ہوں !" کرب کے درمیان اُس کے چہرے پر چند لمحوں کے لئے مسرت کی روشنی چمکی۔ چند لمحوں کے لئے اُن آنکھوں کا گدلاپن دُور ہو گیا اور اُن میں صاف ستھری سنہری روشنی کا انعکاس نظر آیا۔ پھر وہ آنکھیں بُجھ کر دُھندلی ہو گئیں۔

"تم پریم درما ہو ؟" میں حیرت سے اپنے لڑکپن اور نوجوانی کے ہیرو کی طرف دیکھتا رہا۔ ہاں وہی تو تھا۔ لااُبالی، برق آسا، سیماب صفت پریم درما ! — خوش لباس، خوش گفتار، خوش ادا پریم درما ! پندرہ سال تک جس نے کالج کے لڑکوں کو اپنے ہیر اسٹائل، اپنے لباس، بات چیت اور نت نئے فیشن کی نقل پر مجبور کیا۔ وہی بانکا، چھیلا البیلا پریم درما جو ریس کے گھوڑے پر آنکھ جھپکے بغیر دو دو لاکھ داؤ پر لگا کر اور ہار کر اس طرح بھول جاتا تھا جیسے وہ اپنی ماچس کی ڈبیہ کہیں رکھ کر بھول گیا ہو !

"واقعی !" میں نے پُرانے فوٹو سے اُس کے موجودہ چہرے کا موازنہ کرتے ہوئے کہا "واقعی تم پریم درما ہو۔ مگر تم ——— اِس فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے کیا کر رہے ہو ؟ تمہیں تو اس وقت اپنے لاکھا محل میں ہونا چاہیئے !"

"میرے سارے لاکھ ڈوب گئے۔ کچھ اچھے گھوڑوں پر، کچھ خوبصورت عورتوں پر، کچھ بیش قیمت کاروں پر، کچھ قیمتی شرابوں پر، میں نے وہ سب کھو دیئے ! کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ وہ میرے ہاتھوں کی چھلنی سے کس وقت بہہ گئے۔ میں سُنہری دُھوپ میں زندگی کے فوارے کے نیچے مُنہ کھولے بیٹھا تھا اور زندگی کا آبِ حیات آپ ہی آپ میرے منہ میں ٹپک رہا تھا کہ یکایک وہ فوارہ سُوکھ گیا اور میرا مُنہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا !"

میں نے سنبھلنے کی کوشش کی، لیکن جوانی کی سُنہری دُھوپ جا چکی تھی اور اُس کے [illegible]

[illegible] اور اُس کے جانے سے ہمیشہ کے لئے چلی جاتی ہے۔ میں نے ... اُس نے مجھے زور کی ایک ٹھوکر ماری اور میں نیچے ہی گرتا گیا۔ جب سے میں نیچے ہی گر رہا ہوں۔ بڑے ہیرو سے چھوٹا ہیرو، چھوٹے ہیرو سے سائیڈ ہیرو، سائیڈ ہیرو سے کیریکٹر آرٹسٹ، کیریکٹر آرٹسٹ سے محض آرٹسٹ، آرٹسٹ سے ایکسٹرا، آخر میں وہ بھی نہیں کینسر کا ایک مریض۔ اپنے بھائی کے یہاں پڑا ہوا۔ وہ بھی کیسا بھائی جسے میں نے آج تک اپنی کسی عیش و عشرت میں شریک نہیں کیا تھا۔ جسے میں نے آج تک اپنی لاکھوں کی دولت میں سے ایک چھدام تک نہیں دیا تھا۔ نوبجین کی ایک ٹکیہ کے لئے میں نے اپنے بھائی، بیوی سے کیسے کیسے طعنے سُنے ہیں۔ میں جو ریس میں لاکھوں ہار جایا کرتا تھا، تم کیا جانو کہ جام سے دُرد تہ جام تک آتے آتے کیسی کیسی ذِلّتوں سے گزرا ہوں ——— اور اب انھوں نے مجھے فٹ پاتھ پر پھینک دیا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میرے مرنے میں اب صرف چار چھ مہینے رہ گئے ہیں۔ آہ ! یہ درد جاتا نہیں۔ نوبجین کا ایک انجکشن لگ جائے تو رات آرام سے کٹے۔

"اس وقت آدھی رات کو انجکشن کہاں سے آئے گا ؟"

"ہا ! کبھی وہ زمانہ تھا۔ ایک ٹیلی فون پر دس ڈاکٹر بلا لیتا تھا معمولی سے سر درد کے، ڈاکٹر رات بھر ڈیوٹی دیتا تھا۔ دیکھو سوٹ کیس میں نوبجین کی کوئی اور ٹکیہ ہے ؟"

"میں نے سوٹ کیس کو کھنگال کے اچھی طرح چھان پھٹک کے دیکھ لیا ہے۔ نہیں ہے۔"

"کیا تم میرے لئے ایک گولی کہیں سے نہیں لا سکتے ؟"

"نہیں ——— میرے پاس پیسے نہیں ہیں !"

"میرے پاس بھی نہیں ہیں۔" وہ ہنس کر بولا "اور ابھی مرنے میں کئی مہینے باقی ہیں اور تم سوچ ہی نہیں سکتے کینسر کا درد کیا ہوتا ہے۔ جیسے شیطان جسم کے اندر بیٹھا ہو اور نس نس کو آگ دکھا رہا ہو !! کیا ایک سگریٹ بھی تمہارے پاس نہیں ہے ——— ؟"

میں نے سگریٹ نکال کر اُس کا ایک سِرا اُس کے ہونٹوں میں رکھ دیا اور دوسرے سرے کو ماچس دکھائی۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے زور سے ایک کش لیا۔ بہت دیر تک اُس نے سگریٹ کا دُھواں اپنے سینے میں کسی قیمتی راز کی طرح روکے رکھا۔ پھر اچانک اُس کا کربناک چہرہ سگریٹ کے گہرے دُھوئیں میں کھو گیا۔ جیسے کسی بوڑھے پہاڑ کی چوٹی بادلوں میں کھو جائے .... پھر اُس کے چہرے پر پھیلا ہوا کُہرا چھٹ گیا۔ اب اُس کا چہرہ سگریٹ کی لذّت میں کھلا ہوا تھا۔

"جینے کی لذّت کیا ہے۔ یہ مجھے موت کے اِس قدر قریب آکر ہی معلوم ہوا ——— !"
اُس نے سرگوشی میں کہا۔

سگریٹ کا ایک کش، زندگی کا ایک لمحہ، ہوا کا ایک جھونکا ترشے ہوئے ہیرے سے زیادہ قیمتی معلوم ہوتا ہے! میں اس فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوں۔ سامنے سڑک پر روشنی کی ایک لکیر لرز رہی ہے۔ یہ چھتے ہوئے بس اسٹینڈ کا مستطیل نما سایہ ایرانی کی دوکان کے محراب دار سائے میں گھل گیا ہے۔ جیسے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُس سے باتیں کرتا ہے۔ غور سے دیکھو ان دونوں سایوں کو۔ کیا وہ دونوں سائے ایک مرد کی طرح مستطیل، دوسرا عورت کی طرح محراب دار، دو عاشقوں کی طرح ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے نہیں دکھائی دیتے ——؟ کیا ایسا نہیں معلوم ہوتا جیسے اُن کی ہستی بس کے اسٹینڈ اور ہوٹل کی محراب سے الگ ہے! کیا باتیں کر رہے ہیں یہ دونوں سائے ——؟ لیکن کون دیکھتا ہے ان سایوں کو۔ آج سے چار سال پہلے میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ زندگی میں اتنا گہرا اترنے کے لئے موت کی وادی میں جھانک لینا ضروری ہے۔ یا اُس کا ایک شدید ذہنی احساس بھی زندگی کو اُس کی تمام اذیتوں کے باوجود کتنی قیمتی اور حسین بنا سکتا ہے اس کا اندازہ صرف اُن لوگوں کو ہے جو موت اور اس کے کرب کو چھو کر زندہ ہوتے ہیں ورنہ اکثر لوگ تو محض جیتے ہیں!"

وہ چُپ ہو گیا۔ آہستہ سے سوٹ کیس کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ اب اُس کا چہرہ گلمہر کے پیڑ کے اندھیرے میں تھا۔ اُس کے قریب جمنا سوئی ہوئی تھی۔ جمنا جو سراہویں سڑک پر دھندا کرتی ہے۔ میں اپنے سوئے ہوئے ساتھیوں سے اُس کا تعارف کرانے لگا۔ - دیکھو وہ جس کا منہ کھلا ہوا ہے۔ وہ باسکو ہے —— وہ جس کی ناک سے سیٹی کی سی آواز نکلتی ہے وہ تاتیا ہے —— تاتیا جیب کترا ہے —— باسکو چور ہے۔ جان کوڑھی ہے۔ جمنا طوائف ہے —— میں ایک غریب ادیب ہوں۔ یہی فٹ پاتھ ہمارا گھر ہے!"

"کیا تمہاری ٹولی کے لوگ مجھے یہاں رہنے دیں گے؟" اُس نے یکایک مجھ سے سوال کیا۔

"صبح بات کروں گا" میں نے اُسے جواب دیا "میرا خیال ہے اُنھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا —— اتنا بڑا فلم اسٹار، اپنے وقت کا مقبول ترین ہیرو۔ اس فٹ پاتھ پر رہنے کے لئے آجائے، اس سے زیادہ ہماری خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ جمنا تو کل سنتے ہی شاید خوشی سے پاگل ہو جائے۔ پھر تم کون زیادہ عرصے یہاں رہو گے؟"

"زیادہ سے زیادہ تین ماہ یا چار ماہ کی زندگی باقی ہے یہی ڈاکٹر کہتے ہیں" وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولا "عارضی مہمان ہوں۔ زیادہ پریشان نہیں کروں گا!" اُس کے چہرے پر ایک عجیب دردناک سی مسکراہٹ آگئی۔

"لیکن پھر بھی تمہارے بھائی کو تمہیں رکھ لینا چاہیے تھا —— جہاں چار سال رکھا تھا وہاں چار ماہ اور نہیں رکھ سکتا تھا کیا؟"

"نہیں!" وہ بولا "اب تو قصہ یہ تھا کہ یا تو اُسے اور اُس کے بیوی بچوں کو روٹی ملے یا میری دوا آسکے۔ تم سوچ ہی نہیں سکتے درد سے میں کیسے کراہتا ہوں اور لوٹتا ہوں۔ میری بھابی شور سُن کر تقریباً نیم پاگل ہونے لگی تھی۔ اس لئے میں اُسے بھی قصور وار نہیں ٹھہراؤں گا۔ کوئی ہسپتال کسی مریض کو چار سال تک مفت جنرل وارڈ میں رکھنے کے لئے تیار نہیں تھا ... اس لئے انھوں نے مجھے فٹ پاتھ پر پھینک دیا ہے .... یہ سنگ دلی نہیں ہے بھئی، مجبوری ہے!"

"تو پھر کیا بدلا ہے اس دنیا میں؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"انسان بہت کچھ بدل کر بھی بہت کم بدلا ہے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے" وہ رُک رُک کر بولا "مجھے جیک لنڈن کی ایک کہانی یاد آتی ہے۔ جیک لنڈن تم نے پڑھا ہو؟ اُس کی وہ کہانی مجھے بہت یاد آتی ہے جس میں اُس نے شمالی امریکہ کے ریڈ انڈین قبائل کی ایک مشہور روایت کا ذکر کیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے۔ یہ روایت بہت پُرانی ہے اور اس زمانے سے چلی آرہی ہے جب ریڈ انڈین قبیلے خوراک کی تلاش میں خانہ بدوش ہو کر جگہ جگہ گھومتے تھے۔ اُس زمانے میں فطرت انسان پر حاوی تھی۔ خوراک کم تھی اور بہت مشکل سے ملتی تھی۔ اس زمانے سے ریڈ انڈین قبیلوں میں یہ رسم چلی آرہی ہے کہ جب خاندان کا کوئی فرد بہت بوڑھا ہو جاتا ہے۔ یا مسلسل بیماری سے اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ خود سے شکار نہیں کر سکتا، تو خود اُس کا بیٹا اپنے بوڑھے باپ کو کسی برفیلے ٹیلے پر مرنے کے لئے چھوڑ آتا ہے۔ بوڑھے باپ کو دو دن کا راشن دیا جاتا ہے اور تین دن کے لئے تمباکو اور پھر بیٹا باپ کو اس برفیلے ٹیلے پر مرنے کے لئے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ بہت دردناک کہانی ہے اور اُس وقت میں اسے سچ نہیں سمجھتا تھا، کس طرح کوئی بیٹا خود سے اپنے باپ کو مرنے کے لئے برف میں اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لیکن جب آج انھوں نے مجھے ٹیکسی سے اُتار کر اس فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔ تو یکایک مجھے وہ کہانی یاد آگئی۔ یہاں بجلی ہے، کولتار کی سڑک ہے، قدم قدم پر ہوٹل اور چائے خانے ہیں۔ شراب خانے اور پھلوں کی دُکانیں ہیں۔ گرجا اور ڈرگ اسٹور ہیں۔ سائنس کی ترقی اور تہذیب کی بقا کا ہر انتظام موجود ہے، جو آج سے چار ہزار سال پہلے ریڈ انڈین کے کسی قبیلے میں موجود نہ تھا —— لیکن سب کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں ہے۔ وہ جو مجھے اس فٹ پاتھ پر چھوڑ کر چلے گئے کسی طرح اس ریڈ انڈین بیٹے سے کم مجبور نہ تھے!"

"تم بہت خوفناک باتیں کرتے ہو ——!"

"ہماری دنیا کی حقیقت ہے ہی بہت خوفناک۔ اے نوجوان! میں تمہاری آنکھیں کھولنا چاہتا ہوں!" اُس نے نیم ڈرامائی انداز میں کہا۔

"میری آنکھیں اس قدر کھلی رہی ہیں۔ اتنا کچھ دیکھا ہے انہوں نے کہ اب وہ آرام کرنا چاہتی ہیں۔ کچھ دیر پپوٹوں میں بند رہنا چاہتی ہیں۔ حقیقت کی روشنی بہت تیز ہے اور اس کا مزہ بہت تلخ ہے۔ میری آنکھیں شہد کے قطرے کو ترستی ہیں ——" میں سر جھکا کے چُپ ہو گیا۔

پریم ورما کا سر سوٹ کیس کے نیچے لٹک گیا۔ اب اس کا نرخرہ طوطے کی چونچ کی طرح اُس کی سکڑی ہوئی گردن سے اُبھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ اس عجیب و غریب زاویئے میں لیٹا ہوا آسمان کو خاموشی سے تک رہا تھا۔

دُور سے ایک گاڑی نظر آئی۔ ایک کیڈیلاک پھر ایک امپالا۔ دونوں گاڑیاں فٹ پاتھ کے قریب آ کر رُک گئیں۔ امپالا کا پٹ کھلا۔ گاڑی اندر سے روشن ہوگئی۔ کیڈیلاک کا پٹ کھلا۔ گاڑی اندر سے روشن ہوگئی۔ جیسے الٰہ دین کا جن دو جگمگاتے ہوئے بیڈ روم میرے سامنے اُٹھا کے لے آیا ــــ اُن گاڑیوں کے آرام دہ گدّوں پر بال کندھوں تک بکھرائے ہوئے پھول پہنے ہوئے اپنے حُسن اور جوانی کی خوشبو میں سرشار عورتیں مردوں کے کندھوں سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ کوئی مسکرا رہی تھی۔ کوئی کٹیلی نگاہوں سے اپنے عاشق کو دیکھ رہی تھی ــــ کوئی بار بار یوں ہنستی تھی جیسے اس کے حلق کے اندر چاندی کا ایک چمچہ لٹک رہا ہو اور کھنک رہا ہو ــــ اُن میں سے میں کتنوں سے واقف تھا۔ میں نے اُن کی شکلیں دیکھی تھیں۔ پوسٹر پر اور فلم کے پردے پر ــــ اور آج میں اتنے قریب سے انھیں دیکھ رہا تھا۔

دونوں گاڑیوں سے فلم کے دو مشہور ہیرو نکلے۔ رجن کمار اور ہرجیت کمار دونوں میرے قریب آ کر کھڑے ہوگئے۔ دونوں کے چمکتے ہوئے جوتے میرے منہ کے بالکل قریب تھے۔ وہ بہت خوبصورت اور کھلائے پیئے جوتے تھے۔ بہت امیر اور مغرور جوتے! اُن کی کھال کسی سولہ برس کی حسینہ کی طرح شفاف تھی۔ کتنی اونچی ذات کے لکھ پتی جوتے تھے اور جوتوں کے اندر خوبصورت نائیلان کی رنگدار جرابیں اور جرابوں میں ٹخنے کسی خوبصورت عورت کے گالوں کی طرح اُبھرے ہوئے اور اُن کے اوپر چودہ انچ کی ٹیریلین پتلون کی مُہری۔ ایک خوبصورت ہیٹ کی طرح مُڑی ہوئی ــــ میں تو اس سے اوپر دیکھ ہی نہ سکا۔ نگاہ وہیں تک پھنس کے رہ گئی!

جوتے میرے منہ کے سامنے ذرا مُڑے، لرزے، اور اسے کانپے، لپکے پھر اوپر سے آواز آئی ــــ "عبدل کہاں ہے ــــ ؟"

یہ رجن کمار بول رہا تھا!

"جیل میں ہے" میں نے کہا۔

"ڈیم ....." ہرجیت کی آواز بیزاری سے کانپی۔ پھر اُس کے جوتے ایڑی سے اُٹھے۔ پنجوں پر زور پڑا۔ جوتے پر سوچ کی شکنیں پڑ گئیں۔ جوتے بہت برافروختہ تھے۔

"وِسکی ختم ہو چکی ہے!" ہرجیت نے مجھ سے کہا۔

"عبدل جیل میں ہے" میں نے اُسے جواب دیا۔ "وہ جو شراب سپلائی کرتا ہے"

مجھ سے مایوس ہو کر ہرجیت پریم ورما کی طرف مُڑا، جو اب اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور حیرت سے مُنہ کھولے ہوئے اُن دونوں موجودہ وقت کے فلمی ہیروؤں کو تکے جا رہا تھا!

"بڈھے ــــ!" رجن کمار نے بڑی نخوت سے پریم ورما سے کہا۔ "کیا تم ہماری مدد کر سکتے ہو؟ ہمیں شراب چاہئے۔ بہت شراب تم جو کہو گے ــــ ہم تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے!"

لیکن پریم ورما نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ منہ کھولے انھیں دیکھتا رہا!۔

ہرجیت نے تنک کر کہا "بڈھے کیا تو سنتا نہیں ہے ــــ ؟"

پریم ورما کچھ نہ بولا بس دیکھتا ہی رہا!

مایوس ہو کر رجن کمار نے ہرجیت کا ہاتھ پکڑ کر کہا "چلو چلیں یہاں سے۔ وہ لڑکا جیل میں ہے جو آڑے وقت ہمارے کام آتا تھا ــــ چلو کہیں اور ڈھونڈیں گے"

چمکتے ہوئے جوتے چلے گئے اور خوبصورت ٹخنے چلے گئے اور مُہریاں غائب ہوگئیں۔ پھر موٹر کے پٹ بند ہوگئے۔ روشنیاں گُل ہوگئیں۔ الٰہ دین اِن خوبصورت چلتی پھرتی خواب گاہوں کی شہزادیوں کو لے کر وہاں چلا گیا جہاں اُس چراغ کے مالک رہتے ہیں۔

"تم نے پہچانا؟" میں نے پریم ورما کی طرف گھوم کر سوال کیا۔

لیکن پریم ورما کا سر پھر سوٹ کیس سے نیچے لٹک گیا تھا۔ اُس نے اپنے چہرے پر ایک رومال ڈال لیا تھا۔ اس کا سارا جسم کسی خوفناک لرزش سے ہل رہا تھا اور وہ دانت کٹکٹاتے ہوئے، سسکتے، کراہتے، ٹھٹھرتے لہجے میں کانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اُف! برف ہے! میرے چاروں طرف برف ہے ــــ برف ہی برف!! برف کے ٹیلے۔ برف کے تودے۔ برف کے مہیب پہاڑ!! بچاؤ مجھے بچاؤ۔ میں برف میں گرا جا رہا ہوں ــــ"

غزل

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم اے

جس دم تری یاد آگئی ہے ؛ ہر دل پہ گھٹا سی چھا گئی ہے
سنتے ہی اُس آنکھ کی کہانی ؛ افلاک کو نیند آگئی ہے
اللہ رے نگاہِ نازِ تیری ؛ بجلی آنکھیں چُرا گئی ہے
پلکیں نم ہو کے رہ گئی ہیں ؛ کل جب تری یاد آگئی ہے
ہم ہیں وہ اہلِ راز جن کو ؛ وہ آنکھ قسم دلا گئی ہے
کچھ یوں بھی اُداس تھی طبیعت ؛ کچھ تیری بھی یاد آگئی ہے
اِک گوشۂ نقابِ زندگی کا ؛ میری آواز اُٹھا گئی ہے
معلوم نہیں مجھے بھی اے دوست ؛ کیا جی میں مرے سما گئی ہے
رُوتے ترے غم نصیب کب تک ؛ دنیا کی یاد آگئی ہے
اے دنیا! لبِ غم کی اِک بوند ؛ آئینہ تجھے دکھا گئی ہے
وہ میری غزل تھی جو سرِ بزم ؛ ہر آنکھ کو نم بنا گئی ہے
خاموشی درد کی کہانی ؛ کچھ رات گئے سنا گئی ہے
اے شورِ جہاں! نہ چھیڑ اِس کو ؛ دیوانے کو نیند آگئی ہے
کیا تھا مری شاعری کے لب میں ؛ اِک بات مگر بنا گئی ہے

وہ ذکرِ فراق تھا کہ جس پر
دنیا آنسو بہا گئی ہے

افسانہ

بے بی

اقبال صدیقی ایم۔ اے

آل انڈیا ریڈیو۔ الہ آباد

۱۹؍ اگست ۶۵ء   مکرم بندہ نواز! ہدیۂ تسلیم و نیاز

"بیسویں صدی" کے لئے ایک تازہ ترین افسانہ 'بے بی' حاضر خدمت ہے۔ اُمید کہ پسند آئے گا —— اور ہاں! میرے سابقہ افسانے 'مجھے تم سے کچھ کہنا ہے' کے متعلق آپ کی رائے کا انتظار ہے . . . .

آپ کا اپنا —— اقبال صدیقی

لان میں بے بی رندھیر کے ساتھ بیڈمنٹن کھیل رہی ہے اور میں کھڑکی کے سامنے بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی ہوں —— دیکھ رہی ہوں کہ رندھیر پسینے پسینے ہو رہا ہے —— وہ تھک کر چور چور ہو چکا ہے۔ اُس کا دم پھول رہا ہے۔ لیکن بے بی اب بھی چاق چوبند ہے۔ وہ اب بھی تازہ دم ہے۔ تکان کا نام و نشان تک نہیں۔ چہرے پر بشاشت لئے وہ نہایت چُستی سے سٹروک پر سٹروک لگا رہی ہے۔ رندھیر سے بے بی کے شاٹ اُٹھائے نہیں جاتے۔ وہ بالکل اناڑی کی طرح ہاتھ پھینکتا ہے۔ جیسے کسی انجانے کو پانی میں دھکیل دیا گیا ہو اور وہ ڈوبتا ڈوبتا سہارے کے لئے ہاتھ بڑھا رہا ہو۔

"شاباش!"

بے بی نے ٹھیک سروس لائن پر ڈراپ دیا۔ بے چارہ رندھیر بیک لائن سے بھاگا ہوا آ رہا ہے۔ "شہ، اتنی دیر!" بے بی اُس کی کس مپرسی پر تمسخر سے ہنستی ہے اور بے چارہ رندھیر کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ جاتا ہے۔

"آیا چائے یہیں لے آؤ"

بے بی کا یہ تیرھواں سال ہے۔ زندگی کی صرف تیرہ بہاریں دیکھی ہیں اُس نے۔ اگلے دسمبر میں اُس کی چودھویں سالگرہ ہوگی۔ اُس کے جسم کی اُٹھان شاہد ہے کہ وہ ایک بھرپور عورت ہوگی کیسا گٹھا ہوا صحتمند جسم ہے اُس کا! وہ ابھی سے سولہ سترہ کی معلوم ہوتی ہے۔ بالکل مجھ پر گئی ہے۔ میری ہی طرح بڑی بڑی آنکھیں ہیں اُس کی، جن پر گھنیری پلکوں کی چلمن پڑی رہتی ہے۔ ستواں ناک، کشادہ پیشانی، پتلی کمر، حُسن و رعنائی کا دلکش پیکر —— تیرہ چودہ کا سن کتنا قیامت خیز ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہوتا ہے جب جوانی بچپن سے آخری بار گلے ملتی ہے اور اُسے خدا حافظ کہتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب سینے میں کیوپڈ کا پہلا تیر آ کر لگتا ہے اور پھر سارا وجود اُتھل پتھل ہو جاتا ہے۔ پھر آنکھوں پر شرم و حجاب کی چلمن پڑ جاتی ہے اور دل میں ایک خاموش طوفان ایک مدوجزر اُٹھتا ہے جو کشتیِ حیات کو کہیں سے کہیں بہا کر لے جاتا ہے —— اس عہد کی یاد باقی پوری زندگی کا خواب بن کر رہ جاتی ہے۔ ایک حسین و دلکش خواب!۔

مجھے یاد ہے جب میں بے بی کے سن کی تھی تو میں بھی دیکھنے والوں کے ہوش اُڑا دیتی تھی۔ نوعمر تو نوعمر مجھے تو بڑے بوڑھے بھی مشکوک نظروں سے گھورتے تھے۔ لڑکوں کی نظریں تو اناڑی ہوتی ہیں، ناواقف۔ وہ صرف میری خمار آگیں آنکھیں دیکھتے، یا پھر گداز بانہیں لیکن بڑے بوڑھے تو مجھے اپنی تجربہ کار آنکھوں سے ٹٹول ٹٹول کر دیکھتے تھے۔ جیسے وہ میرے ایک ایک انگ سے واقف ہوں۔ اور جب وہ مجھے اس طرح دیکھ رہے ہوتے تو جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میرے جسم پر کپڑے ہی نہ ہوں —— چھی!۔

میں جب راستے سے گزرتی تو بڑی بڑی بچی مونچھوں والے بھوشن مہاراج تال دیتے تا تھئی، تت تھئی۔

جیسے میں راہ نہیں چل رہی ہوتی، بلکہ کتھک کی مشق کر رہی ہوتی اور پھر زور سے کھنکھار کر بھوشن مہاراج الاپ اُٹھتے ——

'اکیل مت جیئو نینوں میں کجرا ڈال کے'

اور جب میں ایک تیز نظر بالا خانے پر پھینکتی تو بھوشن مہاراج لہجہ بدل کر کہتے۔

"ہاں شروع کرو جی تا تھئی تت تھئی"

جیسے میں کچھ سمجھتی ہی نہ تھی!۔

"آیا چائے میں شکر نہیں ڈالی؟"

اس لونڈے رندھیر کو تو دیکھو۔ کیسا چپکا رہتا ہے بے بی سے۔ جب دیکھئے آدھمکتا ہے اور سیدھا بے بی کے کمرے میں چلا جاتا ہے اور پھر دیکھئے تو قہقہوں کے آبشار گر رہے ہیں

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بے بی ایک خوفناک بھنور میں پھنستی چلی جارہی ہے پھر دیکھئے بے بی کی تصویریں اُتاری جارہی ہیں۔

"ریڈی، ون، ٹو، تھری!"

جی چاہتا ہے ایک زنّاٹے کا طمانچہ دوں اُسے اور اُس کا کیمرہ چھین کر پھینک دوں، لیکن میرے ہاتھوں کی ساری طاقت سلب ہوجاتی ہے جب وہ مجھے بھی زبردستی کھینچ کر لا دیتا ہے اور میری خوشامدیں کرتا ہے۔

"آئیے نا آنٹی جی۔ آپ بہت فوٹوجینک ہیں۔ ایک پوز دیدیجئے تو مجھے فرسٹ پرائز مل جائے!"

"ہُنھ! فوٹوجینک!"

اور دیر تک یہ لفظ میرے کانوں میں گونجتا رہتا ہے ۔۔۔ فوٹوجینک! بے اختیار میری نظریں قدِ آدم شیشے کا تعاقب کرتی ہیں اور میں زیرِ لب بڑبڑا اُٹھتی ہوں۔

"فوٹوجینک!"

اور پھر میں کئی کئی برس پیچھے چلی جاتی ہوں ۔۔۔ رائے صاحب کے لڑکے مکیش کے ساتھ جس نے پہلی بار مجھے فوٹوجینک کہا تھا اور گرمیوں کی ایک دوپہر کو پورے چھ گھنٹے پوز کرنے کے بعد اُس نے میرا ایک پورٹریٹ اُتارا تھا۔ وہ ایک ماہر شبیہ کار تھا۔ تصویر کیا تھی، شکل میں تھی! بس سانس کی کمی تھی۔ میں تو دم بخود رہ گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کینوس سے اب باہر نکلی کہ تب باہر نکلی!

بے بی کو تصویریں کھنچوانے کا بہت شوق ہے۔ مجھے اعتراض نہ ہوتا اگر ندیم محض تصویریں ہی اُتارتا۔ لیکن وہ تو پوز درست کرنے کے بہانے بے بی کے جہاں چاہے ہاتھ لگا دیتا ہے اور میں کانپ اُٹھتی ہوں۔ کہیں اُسے ڈنک لگ جائے تو؟ مجھے اپنے سارے جسم پر مکیش کی اُنگلیاں چُبھتی محسوس ہوتی ہیں۔ میں نے کئی بار ہلکی ڈانٹ بتائی ہے۔ لیکن کم بخت پر ذرا جو اثر ہو۔ وہ تو جھٹ مجھے بازوؤں میں پکڑ لیتا ہے اور پھر وہی پُرانی باتیں!

"آئیے نا آنٹی جی، آپ بہت فوٹوجینک ہیں"

"ایڈیٹ!"

بے بی اب بچی نہیں رہی۔ ہندوستان جیسے گرم ملک میں جہاں لوگ لال مرچیں کثرت سے استعمال کرتے ہیں، اِس سِن کی لڑکیاں بچی نہیں کہلاتیں لیکن بے بی خود کو بچی تصور کئے جانے پر سخت مُصر ہوتی ہے۔ اُسی روز میں نے کہا۔

"بے بی، اب تمہیں سکرٹ نہیں پہننا چاہیئے"

"کیوں ممی؟"

"اب تم بڑی ہوگئی ہو بیٹی!"

"ہُنھ، بڑی ہوگئی ہوں۔ جتنی ہوں نہیں، اُتنا آپ مجھے احساس دلاتی ہیں"

"تو سُنو، میں احساس دلاتی ہوں۔ میں کہتی ہوں اب تمہیں ساڑی باندھنی چاہیئے بیٹی"

"میری سب سہیلیاں تو سکرٹ پہنتی ہیں۔ میں ساڑی باندھ کر اُن میں کیسی لگوں گی!"

بے بی ہے بہت ضدی۔ بالکل میری طرح۔ میرے گلے میں جھول کر کہنے لگی۔

"ممی، میری ٹانگیں بہت خوبصورت ہیں نا؟ مس ڈوری اکثر کہا کرتی ہیں"

"مس ڈوری تمہیں پڑھاتی ہیں یا تمہاری ٹانگیں دیکھتی ہیں؟"

"ہیں! اچھی ممی؟"

وہ مچلنے لگی۔

اری واہ ری چھوکری!

"ہشت!"

اِس لڑکی میں نرگسیت بہت کارفرما ہے۔ گھنٹوں آئینے کے سامنے بیٹھی خود فریفتگی میں مبتلا رہتی ہے۔

"یہ میرے بال ہیں یا ریشم کے لچھے؟"

"میری آنکھیں ہیں یا نرگس کے پھول؟"

"میری گردن ہے یا کسی پھول کی جھکی ہوئی ڈالی؟"

"میں لڑکی ہوں یا بلور کی مورتی؟"

"ممی میں ساڑی نہیں پہنوں گی!"

ضدی!

لیکن اُسے کیا پتہ اِس خود فریفتگی کا انجام کیا ہوتا ہے! ڈاکٹر زیدی ہر وقت میری تعریفیں کرتے تھے۔ میرے جسم کے ایک ایک عضو پر شعر پڑھتے تھے اور بس۔

میر اِن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے
نازکی اُس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے

اُردو شاعری میں عورت کا تصور کتنا حسین ہے! اور ڈاکٹر زیدی کیسے وجد آفریں انداز میں شعر پڑھتے تھے۔ رفتہ رفتہ میں سحر زدہ ہوجاتی اور پھر مجھے بالکل ہوش نہ رہتا۔

'نرگسیت کی شراب بہت تیز ہوتی ہے بے بی'

میں اُس سے کہنا چاہتی ہوں۔ میں اُسے ساری باتیں بتا دینا چاہتی ہوں۔ وہ میری بیٹی ہے اور میں اُس کی ماں ہوں۔ میں اُسے ساری باتوں سے واقف کرانا چاہتی ہوں لیکن جانے کیوں آواز میرے حلق ہی میں ڈوب کر رہ جاتی ہے۔ میرے مُنھ میں تالے پڑ جاتے ہیں۔ میری زبان گنگ ہوجاتی ہے۔ میں کہوں تو کیسے کہوں؟ وہ کونسی طاقت ہے جو میری ساری طاقت چھین لیتی ہے؟

مجھے اُس کے دوستوں سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ روز بہ روز اُن کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک عجیب سا خوف جس کی میں تشریح نہیں کر سکتی مجھے دبوچے رہتا ہے۔ ایک دن میں نے بے بی کے ڈیڈی سے اِس کا اظہار کیا لیکن کتنی آسانی سے ٹال گئے وہ۔ کہنے لگے۔

"تم کچھ بیمار تو نہیں رہنے لگی ہو؟"

واہ! یہ بھی خوب رہی۔ بھلا میں کیوں بیمار رہتی؟ اب یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے کہ جب کوئی خوبصورت عورت دوستوں میں گھر جاتی ہے تو اُس کے گرد مکڑی کا جال سا بُن جاتا ہے اور وہ اُس میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے —— اور ایک خوبصورت عورت کے گرد دوستوں کا حلقہ بہت جلد بن جاتا ہے۔ عورت ہی کے تصور نے تو انسان کے فنونِ لطیفہ کو جنم دیا ہے۔ زمانۂ قدیم سے آج تک عورت ہی تو چھائی رہی ہے انسان کے لطیف احساسات پر۔ میں جس کالج میں تھی تو لڑکوں سے لے کر پروفیسر تک میرے دوست تھے۔ سبھی مجھ سے باتیں کرنے کے مشتاق ہوتے۔ مجھے کیفے ٹیریا میں لے کر بیٹھنے میں لُطف محسوس کرتے اور مجھے پکچر کی دعوتیں دیتے۔ پروفیسر شرما تو میرے اتنے اچھے دوست تھے کہ میں اُن کے یہاں روز دیر تک پڑھا کرتی تھی۔ اُن کی بیوی ہمیں کھانا کھلا کر سو جاتیں (بے چاری بہت سمجھدار عورت تھیں) اور ہم دیر تک پڑھتے رہتے۔ پھر پروفیسر شرما مجھے اپنے سکوٹر میں گھر چھوڑ دیتے۔ بہت نیک انسان تھے وہ۔ اُنھیں کی عنایتوں سے مجھے ایم۔اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ ملی۔ اگر اُن کی شادی نہ ہو چکی ہوتی تو وہ مجھ سے یقیناً شادی کر لیتے —— لیکن بات فرسٹ کلاس فرسٹ تک ہی محدود رہی۔

جب میں پارٹیوں میں جاتی تو میری جان کو آفت آتی۔ اُف توبہ! ہر شخص میرے ہی ساتھ رقص کرنا چاہتا —— ذرا موقع ملا نہیں کہ کسی کی بانہوں کا حلقہ میری کمر کو جکڑ لیتا اور پھر میں آرکسٹرا کی تیز دُھنوں کے ساتھ اُس کے ساتھ فرش پر پھسل پڑتی۔ اور ساری عورتیں مجھ سے کتنا جلتی تھیں! پر اُن کے پاس نہ تو میری مہکی ہوئی سانسیں تھیں اور نہ میرا رس سے لبریز جسم!

بے بی کے ڈیڈی یہ سب کچھ نہیں سمجھتے۔ میں اُن سے کیا کہوں؟ وہ تو مجھے ہی بیمار بتاتے ہیں۔ مجھے بے بی کے دوستوں سے بہت خوف ہوتا ہے۔ مجھے اُس سانپ کے حلقے سے وحشت ہونے لگی ہے۔ اُس کا زہر بے بی کی جان لے کر رہے گا۔ میں سب برداشت کر سکتی ہوں لیکن اتنے سارے لڑکوں کے ساتھ بے بی کو نہیں دیکھ سکتی۔ دفتر میں بھی مجھے یہی فکر کھاتی رہتی ہے اور میں اکثر بھاگ کر گھر چلی آتی ہوں، لیکن ہر بار میں یہ دیکھ کر خفیف ہو جاتی ہوں کہ بے بی سکول گئی ہوتی ہے اور میرے شوہر کے دوست مسٹر پاٹھک میرا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔

"پاٹھک جی، آپ اِس وقت؟ میں تو یوں ہی چلی آئی دفتر سے" میں کہتی ہوں۔

"جی میں بھی ذرا یوں ہی چلا آیا۔ ادھر سے گزر رہا تھا سوچا آپ کی مزاج پرسی کرتا چلوں" پاٹھک جی مسکرا کر کہتے ہیں اور صوفے پر پھیل جاتے ہیں۔

"خیر بہت بہت شکریہ۔ ٹھہرئیے میں آپ کے لئے کافی بناتی ہوں"

بے بی گھر پر نہیں ہوتی۔ میرے شوہر دفتر اور بے بی اسکول گئی ہوتی ہے اور مسٹر پاٹھک کے لئے کافی بناتی ہوں۔ پاٹھک جی کچن میں آ جاتے ہیں۔ میرا ہاتھ بٹاتے ہیں اور آخر میں وہ مجھے البرٹو موراویا کی کتاب دے کر چلے جاتے ہیں "دی وومن آف روم"!

اندھیرا ہو چکا ہے لیکن بے بی اب تک کھیل رہی ہے۔

"بے بی!"

میں آواز دیتی ہوں لیکن میری آواز جیسے اُس کے کانوں تک پہنچتی ہی نہیں وہ مجھ سے بہت دُور کھڑی ہے اور میں اُسے آواز دے رہی ہوں۔ جیسے وہ کسی میلے میں کھو گئی ہے اور میں اُسے پُکار رہی ہوں۔

"بے بی!"

میں قریب قریب چیخ پڑتی ہوں —— میری آواز میں تلخی ہے، جھنجھلاہٹ ہے اعتراض ہے اور شاید بے بسی بھی۔ بے بی مجھ سے اتنی دُور کیوں چلی جا رہی ہے؟ یہ فاصلہ بڑھتا کیوں جا رہا ہے؟ وہ مجھ سے چھنتی کیوں جا رہی ہے؟ بے بی میرے سامنے ایک بڑا سوالیہ نشان بن کر کھڑی ہو گئی ہے۔ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان جس کا میرے پاس جواب نہیں کوئی حل نہیں اور میں گُھل گُھل کر مری جا رہی ہوں۔ مجھے شکست خوردگی کا گھن کی طرح کھا رہا ہے۔ میں اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہوں۔

"بے بی!"

"آئی ممی، بس آ گئی!"

کتنی آسانی سے ٹال جاتی ہے لڑکی! شام کا اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے۔ گویا اندھیرا بے بی کو اس اندھیرے میں گم کر دینا چاہتا ہے —— نہیں نہیں مجھے اِس تاریکی سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ میں اپنی بیٹی کو اس خوفناک تاریکی کے سمندر سے نکالنا چاہتی ہوں۔ یہ میرا فرض ہے —— میں اُس کی ماں ہوں۔

"بے بی!"

میں پُوری طاقت سے چیخ اُٹھتی ہوں —— آیا بھاگی بھاگی آتی ہے۔

"کیا ہوا میم صاحب؟"

"آ..... کچھ نہیں —— وہ بے بی اب تک کھیل رہی ہے!"

"جی ہاں، وہ تو روز ہی کھیلتی ہیں"

"ہاں ہاں روز کھیلتی ہیں"

میرا گلا رُندھ سا جاتا ہے —— آیا سہم جاتی ہے۔ وہ مجھے بگڑنے سے قاصر ہے

کم بخت وہ ملی نہیں۔ کبھی کوئی بھی نہیں سمجھتا۔ سب کے سب بھولے ہیں، نادان ہیں۔ آہستہ سے کیا بجلی کا بٹن دبا دیتی ہے اور کمرے میں تیز روشنی پھیل جاتی ہے۔ میری آنکھیں چُندھیا جاتی ہیں۔ میں آنکھیں پھاڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھتی ہوں۔ کچھ نظر نہیں آتا۔

"لاسٹ (LOST)"

میرے مُنہ سے نکلتا ہے۔ میں پھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی ہوں۔ دُھندلے دُھندلے سے سائے نظر آتے ہیں۔ پھر وہی ملے جُلے قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ قہقہے بہت دُور کسی غار سے بلند ہوئے ہوں اور پھر جیسے بہت نزدیک سے ایک نحیف سی آواز آتی ہے —— "ممی میں آ گئی!"

غزل

سید حجاب ترمذی

یہ اور مجھ پہ طرفہ ستم ڈھا رہے ہیں وہ — مل کر گلے بہ دیدۂ تر جا رہے ہیں وہ

عرضِ طلب کے بعد جو شرما رہے ہیں وہ — کچھ اور بھی حسین نظر آ رہے ہیں وہ

لحظہ بہ لحظہ کیوں مجھے یاد آ رہے ہیں وہ — کیا دل کی دھڑکنوں میں کمی پا رہے ہیں وہ

جتنا گریز مجھ سے کئے جا رہے ہیں وہ — اُتنا ہی اور میرے قریب آ رہے ہیں وہ

کچھ نا شگفتہ پھول سے برسا رہے ہیں وہ — خاموش اس طرح ہیں کہ فرما رہے ہیں وہ

اس دور میں خلوص کا ملنا محال ہے — پھر بھی مرے خلوص کو ٹھکرا رہے ہیں وہ

آئینے سے بھی اُن کو حجاب آ رہا ہے آج — رہ رہ کے اپنے آپ سے شرما رہے ہیں وہ

کیوں اعتبارِ وعدۂ فردا کے باوجود؟ — پھر آج میرے سر کی قسم کھا رہے ہیں وہ

در پردہ بڑھ رہی ہے جو پیہم کشیدگی — شاید مری وفا میں کمی پا رہے ہیں وہ

میں مطمئن نہ تھا تو وہ کتنے تھے شادکام — اب مطمئن ہوا ہوں تو گھبرا رہے ہیں وہ

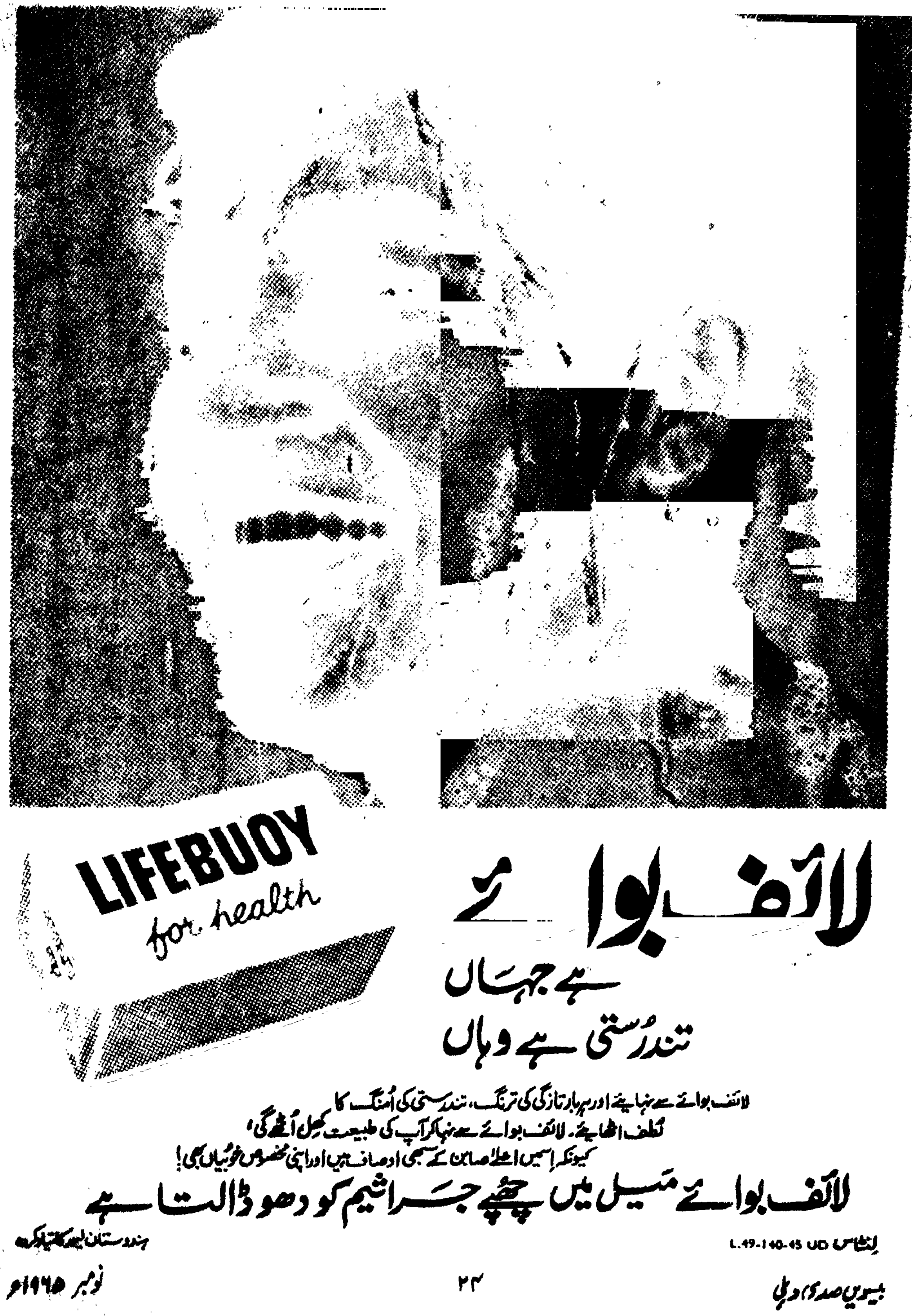
چہرہ فسردہ، زُلف پریشاں، نظر اُداس — اس حال میں نہ جانے کہاں جا رہے ہیں وہ

اچھا حجاب اُٹھا کہ بہ تمکینِ حُسنِ ناز — سر تا قدم حجاب بنے جا رہے ہیں وہ

اس التفاتِ خاص کے قربان جائیے! — پُرسش نگاہِ ناز سے فرما رہے ہیں وہ

لفظ و بیاں میں جو نہ ادا ہو سکی وہ بات — آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے سمجھا رہے ہیں وہ

میں اے حجاب ماہیِ بے آب کی طرح
خود ہی تڑپ رہا ہوں کہ تڑپا رہے ہیں وہ


LIFEBUOY
for health
لائف بوائے
ہے جہاں
تندرستی ہے وہاں
لائف بوائے سے نہائیے اور ہر بار تازگی کی ترنگ، تندرستی کی اُمنگ کا
لطف اٹھائیے۔ لائف بوائے سے نہا کر آپ کی طبیعت کھِل اُٹھے گی،
کیونکہ اِسمیں اعلےٰ صابن کے سبھی اوصاف ہیں اور اپنی مخصوص خوبیاں بھی!
لائف بوائے مَیل میں چھپے جراثیم کو دھو ڈالتا ہے
ہندوستان لیور کا تیار کردہ
لِنٹاس L.49-140-45 UD

اناپورنا

آکرم فاروقی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

۶۴۔ چلّہ۔ امروہہ۔ یوپی

۸ رمئی ۶۶۵ء

محترم خوشتر بھائی! آداب

اِس بار آپ کو "اناپورنا" میں مدعو کررہا ہوں۔ امید ہے آپ دعوت قبول فرمائیں گے لیکن یہ "اناپورنا" دِلّی کا نہیں، چنڈی گڑھ کا ہے۔ وہ چنڈی گڑھ جو تہذیب، حُسن، فیشن اور شرافت کا مسکن ہے —— میں اُن مخلص دوستوں کو فراموش نہیں کرسکتا، جنھوں نے مجھے چنڈی گڑھ کے چند روزہ قیام میں توقع سے زیادہ نوازا۔ پنجابی احباب کے خلوص کا میرے دل پر گہرا نقش ہے —— "دل کے رشتے" کے سلسلے میں دُور دراز مقامات سے آئے ہوئے "پیغامات" "بیسویں صدی" کی ہمہ گیری اور عالم گیری کا بیّن ثبوت ہیں۔ خدا کرے "بیسویں صدی" کئی صدیوں تک اپنی روایتی آن بان کے ساتھ افسانوی ادب کو بامِ عروج سے ہمکنار رکھے . . . .

مخلص —— اکرم فاروقی امروہوی

میں نے جلدی سے جیب میں اپنا پرس رکھا اور تیزی سے آگے بڑھ آیا۔ کچھ قدم آگے چل کر پیچھے کی جانب مُڑ کر دیکھا۔ وہ لڑکی اب بھی میرا تعاقب کررہی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُبھر آئیں۔ سارے بدن میں ایک ہلکی سی کپکپی دوڑ گئی۔ رُوح میں کانٹے سے چُبھ رہے تھے۔ میں جلدی سے سیکٹر بائیس کی طرف مُڑ گیا اور اطمینان کی سانس لیتا ہوا "اناپورنا" میں داخل ہوگیا۔ "عجیب لڑکی ہے" میں نے پسینے کی بوندیں رومال میں جذب کرتے ہوئے سوچا۔ "جہاں جاؤ مجھ سے پہلے موجود!"

میری زندگی کا یہ پہلا اتفاق تھا کہ کوئی لڑکی اِس طرح میرا پیچھا کرے۔ حالانکہ میں نے اُس سے کوئی بات نہیں کی، کوئی اشارہ نہیں کیا۔ صرف ایک ہلکی سی نگاہ اُس پر ضرور ڈالی تھی یا یوں کہیے کہ اُس کے سیمیں جسم کے متناسب خط و خال اور کتابی چہرے کی دلکشی نے مجھے مجبور کردیا تھا کہ اُسے ایک اچٹتی سی نظر سے دیکھ لوں اور بس . . . لیکن اُس نے میری نگاہوں کو ایک نظر میں تاڑ لیا اور ہلکے سے مُسکرادی —— اُس کی مُسکراہٹ میں بے پناہ کشش تھی، حُسن تھا اور ایک لطیف سی دل آویزی تھی۔

میں ایک قدم اور آگے بڑھا۔

میں نے چاہا کہ اُس سے کوئی بات کروں لیکن دل نے اِس ارادے سے باز رکھا۔ اِس لئے کہ ہوسکتا ہے اُس کے ساتھ اُس کا بھائی، یا کوئی اور عزیز ہو۔

اُس کے جسم پر مغربی لباس کے باوجود چہرے پر پاکیزہ نقوش تھے پنجاب کے تمدن نے اُن نقوش میں اور بھی نکھار پیدا کردیا تھا۔ ایسا نکھار جو شاید ہیر میں رہا ہوگا اور جسے رانجھے نے پوجا ہوگا۔

میرے ذہن میں یہ بھی خیال آیا، شاید وہ لڑکی کسی بدمعاش گروہ سے تعلق رکھتی ہو اور اپنی تیکھی ترچھی نگاہوں اور میٹھی مُسکراہٹ سے نئے انجانے پردیسیوں کو متاثر کرکے اُنھیں "بیوقوف" بنانا اُس کا پیشہ ہو۔

میرے ذہن میں ایک اور وسوسے نے سر اُبھارا کہ شاید وہ لڑکی نہ ہو کوئی چھلاوہ یا چڑیل ہو جس کے اُلٹے پیروں کو میں نہ دیکھ سکا۔ ورنہ یہ تو عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ جتنی بار "اناپورنا" گیا وہ وہاں ملی۔ جن راہوں سے گزرا، وہ کبھی میرے آگے اور کبھی پیچھے پیچھے چلی آتی تھی۔

میں نے سوچا شاید اُس لڑکی نے کسی میگزین میں میری تصویر دیکھی ہو اور پہچان گئی ہو۔ یہ بھی بہت ممکن ہے کہ میں کبھی اُس کا شناسا رہا ہوں لیکن اُسے کوئی بات تو کرنی چاہیے تھی . . . لیکن وہ پہل کیوں کرتی، آخر ایک لڑکی تھی نا . . .

مختلف خیالات میرے ذہن میں اُبھرتے رہے اور دل متواتر اُن کی تردید کرتا رہا۔ چائے لطیف تھی، میں ہلکے ہلکے سپ لے رہا تھا۔

"ارے وہ ظالم آگئی!" میرے ہاتھ میں پیالی کانپنے لگی۔

میں نے دیکھا وہ لڑکی کنکھیوں سے میری طرف دیکھ کر مُسکراتی ہوئی ہوٹل کے اندرونی کمرے میں داخل ہوگئی۔ اب میرا شک یقین میں تبدیل ہوگیا کہ لڑکی شعوری طور پر میرا تعاقب کررہی ہے، جس میں کوئی راز ضرور ہے۔ میں نے جلدی سے چائے ختم کی اور اُٹھ کر

نکل آیا۔

کچھ دور چلنے کے بعد میں ایک خوبصورت دُکان کے سامنے رُک گیا۔ یہ لیڈیز ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک معیاری دُکان تھی، جس میں مختلف ڈیزائن کے کپڑے آویزاں تھے۔ میں نے کچھ کپڑے خریدنے کا ارادہ کیا اور جیب سے پرس نکالا۔

لیکن میں نے پرس فوراً جیب میں رکھ لیا۔ میری اُنگلیاں لرزنے لگیں اور میں اپنے ہاتھ کو جیب سے نہیں نکال سکا۔ میرے سامنے وہ لڑکی اور اس بار اُس کے ساتھ ایک لحیم شحیم نوجوان، جس کے چہرے بُشرے پر بدمعاشی کے تمام عناصر موجود تھے، کھڑا تھا۔ اُس کی تیز نگاہیں مجھے کچھ اِس طرح گھور رہی تھیں، جیسے وہ مجھے ٹھکانے لگانے کی فکر میں ہو۔ لیکن میں نے سوچا وہ ایسا کیوں کرنے لگا اور میں کیوں غریب الدیار، وطن سے دور اتنی آسانی سے یہاں اپنا مزار بنوانے لگا۔ آخر میرے بھی مُنہ میں زبان اور بدن میں جان ہے۔ پھر بھی میں نے خیر اسی میں سمجھی، حسرتوں کا دامن سمیٹ کر کوچۂ جاناں سے عزت و عافیت کے ساتھ رخصت ہو جاؤں۔

تھا کچھ آگے بڑھ آیا لیکن یکایک گھبرا گیا۔

وہ نوجوان اتنی بے نیازی سے کندھا مارتا ہوا گزر گیا کہ میرے دل کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں۔ میں نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میرا پرس حُسنِ اتفاق ہی سے بچ گیا تھا۔ مجھے یقین آگیا کہ وہ دونوں جیب تراش ہیں اور میرے پرس کی تاک میں ہیں۔

میں نے فوراً راستہ کاٹا اور اپنی قیام گاہ پر آکر سو گیا۔ لیکن نیند میں بھی کئی بار میں چونک گیا۔

اگلے دن اتوار تھا۔ میں یونیورسٹی دیکھنے کی غرض سے سیکٹر پچیس کے بس اسٹینڈ پر پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد بس آئی اور میں سوار ہو گیا۔ بس کے چلنے میں دیر تھی۔ میں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ کچھ لمحے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا دماغ پیرس کی خوشبوؤں سے بس گیا ہے۔ میں نے رُخ پھیرا۔ خوشبوؤں کا مسکن میرے قریب تھا۔ میں نے احتیاطاً اپنے جسم کو سمیٹ لیا۔ یہی میری شرافت کا تقاضہ تھا۔

"کہاں جائیے گا ——— ؟" لڑکی نے سوال کیا۔

"پنجاب یونیورسٹی۔" میں نے اُس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن میری آواز گلے میں پھنس گئی اور حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔

'ارے یہ تو وہی لڑکی ہے!' میں نے گھبرا کر اُس کے پیروں کی طرف دیکھا۔

مجھے یقین آگیا کہ آج میری شامت قریب آگئی ہے۔ خدایا! اس لڑکی کو میرے پروگرام کی اطلاع کیسے مل گئی؟ وہ آخر کیوں میرا پیچھا کر رہی ہے؟ یہ کوئی جاسوس تو نہیں؟ میں اُس کے تعاقب کو اب اپنی خوش نصیبی نہیں، بدنصیبی تصور کر رہا تھا۔ اس لئے کہ کل اُس کے ساتھ ایک بدمعاش نوجوان کو دیکھا تھا۔ جس کے لانبے قد، کسرتی بدن، بڑی بڑی عقابی آنکھیں اور اُس کی نیم تراشیدہ مونچھوں نے میرے دل میں ایک عجیب سا خوف پیدا کر دیا تھا۔

میں اُس کے کو سوچ رہا تھا جب اِس لڑکی پر میں نے اپنی نگاہ ڈالی تھی۔ کتنا منحوس لمحہ تھا وہ! کونسی گھڑی تھی کہ چنڈی گڑھ میں قدم رکھا تھا اور کونسی ساعت تھی کہ گھر کو خدا حافظ کہا تھا۔

کنڈکٹر سے میں یونیورسٹی کا ٹکٹ لے چکا تھا لیکن پھر بھی یہی مناسب سمجھا کہ راستے میں اُتر جاؤں، تاکہ اِس بَلا سے نجات ملے۔

کسی اسٹاپیج پر بس رُکی اور میں اُتر گیا۔

لڑکی نے مجھے کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے شکایت کر رہی ہو کہ ہم تو تمہاری وجہ سے آئے تھے اور تم اتنی جلدی داغِ مفارقت دے کے چل دیئے؟ بڑے بھولے ہو، نادان ہو، لڑکی کی قربت سے بھاگتے ہو۔ ایسے ساتھ تو زندگی میں کبھی کبھی ملتے ہیں!

لیکن میں اس رُوح فرسا ساتھ کو لعنت ملامت کرتا ہوا دوسری جانب چل دیا۔

ابھی کچھ ہی قدم چلا تھا کہ وہ بدمعاش نوجوان جو کل اِس لڑکی کے ساتھ ملا تھا ٹکرا گیا۔ اُسے دیکھ کر میرا خون خشک ہونے لگا۔ اگر واقعی میرا بدن کاٹا جاتا تو شاید لہو کا ایک قطرہ نکلتا۔ اُس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ شاید ہلکے نشے میں تھا۔ سگریٹ کا دُھواں کچھ اِس انداز میں چھوڑ رہا تھا جیسے میری بساط اُس کے سامنے کچھ نہیں اور بس وہ اب مجھے مرغولوں میں پھانس لے گا۔ وہ میرے قریب آیا ہی چاہتا تھا لیکن میں اپنے قریب سے آہستہ گزرتی ہوئی بس میں سوار ہو گیا۔ وہ نوجوان تیزی سے بس کی طرف بڑھا لیکن سوار نہ ہو سکا۔

"ایک ٹکٹ ہائی کورٹ!" میں نے کنڈکٹر کے ہاتھ میں پیسے دیتے ہوئے کہا۔

میں کافی تھک چکا تھا اس لئے ہائی کورٹ کے کینٹین میں چائے پینے چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ہائی کورٹ دیکھنے کے لئے پاس بنوانے والی کیو میں آکر کھڑا ہو گیا۔

پاس بن جانے کے بعد میں لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچ گیا لیکن وہاں پہنچتے ہی مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے بلندی سے نیچے پھینک دیا ہو۔ میں بدحواس ہو گیا۔ وہ پُر اسرار لڑکی اور نوجوان میری طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ میں اُن کی نگاہوں سے بچ کر اگلی منزل کی طرف چلا گیا اور ہائی کورٹ کی بلندی سے چنڈی گڑھ کے حُسن کا جائزہ لینے لگا۔ فلک بوس عمارتوں کا حُسنِ ترتیب، کشادہ مرمریں سڑکوں پر بھاگتی ہوئی خوبصورت کاریں، رنگ برنگے لباس میں مُسکراتے ہوئے گلابی چہرے، جھیل کے شفاف پانی پر تیرتی ہوئی سُبک کشتیاں اور سورج مکھی کے اونچے اونچے زرد پھولوں والے پودے شہرِ نگاراں کے دلآویز حُسن کی غمازی کر رہے تھے۔ میں بہت دیر تک بالائی منزل پر ٹہلتا رہا اور سگریٹ کا دُھواں کھلی فضا میں بکھیرتا رہا، لیکن اچانک مجھے حلق میں دُھواں پھنستا ہوا محسوس ہوا۔ وہ لڑکی اور نوجوان آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اُن کے چہروں سے ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ وہ بے مدبشاش ہیں۔ دنیا کے سارے غموں سے محفوظ ہیں۔ زمانے کی کڑی دھوپ نے انھیں چھوا تک نہیں ہے۔ اُن کے چہروں پر آسودگی کی جھلکیاں تھیں لیکن ایسی آسودگی جو نیک نہیں، حرام کی کمائی سے پیدا ہوتی ہے۔ لڑکی کے ہاتھ میں چرمی بیگ تھا جسے میں کئی بار مشکوک نگاہوں سے دیکھ چکا تھا۔ میں نے سوچا شاید اس میں ریوالور ہوگا! لیکن میں اُس کی پروا کئے بغیر آگے بڑھ آیا۔

"سنئیے" میرے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی۔ شاید نوجوان نے مجھے پکارا تھا۔ آواز کے ساتھ ہی میرا دل بیٹھنے لگا۔ پھر بھی میں نے اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کیا اور چند لمحوں میں لفٹ کے ذریعے نیچے اُتر آیا لیکن ذہن اب بھی بلندی پر تھا۔ دراصل میں ان دونوں کے متعلق برابر سوچ رہا تھا کہ وہ کس قماش کے ہیں؟ کیسا پست کردار ہے کہ ایک پردیسی کو اس طرح پریشان کر رہے ہیں۔ جہاں جاتا ہوں کم بخت پیچھا نہیں چھوڑتے کیا پنجاب میں سب ایسے ہی لوگ ہیں ——؟

کچھ دیر بعد میں اپنی اُلجھی بکھری سوچوں کو لئے جھیل پر پہنچ گیا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں پانی کی سطح پر تڑپ رہی تھیں —ہوا میں خنکی تھی۔ شام کے دُھندلکے جھیل کنے تھے ماحول پر کیف و سرور طاری تھا۔ جھیل کے کنارے پر دو حسین جھلکے محو نظارہ تھے۔ ایک پل کے لئے مجھے اپنی تنہائی کا شدید احساس ہوا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور طویل کش لیتا ہوا ناؤ میں بیٹھ گیا۔ مانجھی ہلکے پُرکیف سُروں میں ہیر گنگنا رہا تھا۔ فضا رُومانی تھی۔ میں دھیمے ترنم سے غزل پڑھنے لگا۔ ابھی مطلع ہی کہا تھا کہ دیکھا وہ دونوں کنارے پر طلوع ہوگئے ہیں! اُنھیں دیکھتے ہی میری غزل آزاد نظم بن گئی! اور بس خودکشی کا مقطع سمجھنے لگا۔ میں نے سوچا وہ ظالم اِس پانی میں تو مجھے اب پانی بھی نہ لینے دیں گے —— لیکن میں نے سوچا کہ آخر میں نے کیا گناہ کیا ہے کہ وہ دونوں سائے کی طرح میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ صرف یہی کہ میں نے اُس لڑکی کو اُچٹتی سی نظر سے دیکھ لیا تھا یا یہ کہ پنجاب کی حسین راجدھانی دیکھنے کا مجھے کوئی حق نہیں یا پھر واقعی یہ دونوں بدمعاش ہیں یا جاسوس ہیں؟ میں نے تہیّہ کر لیا کہ اب میں اُن سے اپنے تعاقب کی وجہ دریافت کئے بغیر نہیں رہوں گا۔ میرا جسم غصے سے کانپنے لگا۔ میں نے آستینیں چڑھالیں۔ جسم کو سپاہیانہ جھٹکا دیا اور مانجھی سے فوراً واپس چلنے کو کہا۔ لیکن کشتی واپس آتے آتے وہ دونوں فرار ہوگئے تھے۔ شاید اُنھوں نے میرے "جلال" کا اندازہ کر لیا تھا۔

گھومنے کے بعد میں حسب معمول 'اناپورنا' میں داخل ہوگیا۔ کاؤنٹر سے کھانے کی سلپ لی۔ پیسے ادا کئے اور ٹرے لے کر ٹیبل پر آگیا۔ ابھی چند ہی لقمے کھانے پایا تھا کہ یکایک وہ دونوں پھر ہوٹل میں نازل ہوگئے۔

انھیں دیکھ کر نہ جانے میری بھوک کہاں چلی گئی، لیکن پھر بھی میں گھبرایا نہیں۔ اس لئے کہ مجھے پہلے سے یقین تھا کہ وہ 'اناپورنا' میں ضرور ملیں گے۔ میں نے جیسے تیسے کھانا زہر مار کیا اور مصلحتاً اُن لوگوں سے بات کئے بغیر سُرعت کے ساتھ نکل آیا۔

کچھ دُور آکر میں ایک پان کی دُکان پر ٹھہر گیا اور پان خریدنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن مجھے محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھ کو کسی نے ڈس لیا ہو! میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں اور پاؤں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی!

میری جیب سے پرس غائب تھا ——!!

میرے اللہ! میں کیا کروں ——؟ ہوٹل کا کرایہ کیسے ادا کروں گا؟ وطن کیسے جاؤں گا ——؟ کوئی بھوا انجان کو قرض بھی نہ دے گا —— میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور اس یقین کے ساتھ کہ اُن دونوں بدمعاشوں نے میرا پرس اُڑایا ہے اُلٹے پاؤں "اناپورنا" میں لوٹ آیا اور کاؤنٹر پر اُن بدمعاشوں کا حلیہ بتا کر پتہ پوچھا۔

"ارے وہ تو آپ کو دریافت کرکے چلے گئے!" کاؤنٹر کلرک نے کہا۔

مجھے یقین آگیا کہ اُنھوں نے ہی میرا پرس اُڑایا ہے۔ میں پولس کو رپورٹ کرنے کی غرض سے جانے ہی والا تھا کہ وہ ڈرامائی انداز میں مُسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا!" میں نے بے چین ہوکر کہا۔

"فرمائیے کیا خدمت کی جائے آپ کی؟" نوجوان نے فاتحانہ مُسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"نوازش تو جناب نے پہلے ہی کافی کر دی ہے!" میں نے بگڑ کر کہا "آپ براہِ کرم میرا پرس عنایت کر دیجئے ورنہ ....."

میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن نوجوان نے اُسی طرح مُسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ گھبرائیے نہیں —— پرس مل جائے گا" نوجوان کے جملے میں تسلّی کی مٹھاس تھی۔

"آپ کے پرس کی شناخت کیا ہے؟" نوجوان نے کارروائی شناخت شروع کر دی۔

"میرے پرس کی شناخت میری تصویر ہے جو اُس میں لگی ہوئی ہے" میں نے ثبوت پیش کیا۔

اُن دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر مجھے بغور دیکھا اور ایک پُرزور قہقہہ لگاتے ہوئے میرا پرس واپس کر دیا اور کہا "آپ غالباً پیدائشی بدحواس ہیں اور بدحواسی میں ٹیبل پر ہی پرس چھوڑ گئے۔ بوائے نے مجھے دے دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پرس آپ کا ہوگا۔ اس لئے کہ اُس ٹیبل پر آپ ہی بیٹھے تھے۔"

میں چند لمحوں تک تشکر آمیز نگاہوں سے اُنھیں دیکھتا رہا اور اپنے پچھلے خیالوں پر خود کو ملامت کرتا رہا کہ اُن کے بارے میں کیسے غلط خیال بن گئے تھے۔ لیکن یہ تو

شرارت کا حسین پہلو ہیں!

اب میں آپ [...] تعاقب کی وجہ دریافت کئے بغیر نہ رہ سکا۔ نوجوان نے بتایا ——

یہ میری بیوی ہیں اور میں اناپورنا کی مینجنگ کمپنی کا ڈائرکٹر ہوں۔ جب یہاں کے ماحول سے جی اوب جاتا ہے تو ہم گھومنے نکل جاتے ہیں۔ یہ ایک اتفاق تھا اور ایک عجیب حسین اتفاق کہ جہاں سے ہم گزرتے تھے وہاں سے آپ کا بھی گزرنا ہوتا تھا جسے ہم نے شدت سے مارک کیا لیکن اتفاق سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

مجھے اپنے خیالات پہ بڑی ندامت ہوئی اور اُسی لمحے مجھے محسوس ہوا پنجاب کی سرزمین پر انسان ہی نہیں فرشتے بھی نواس کرتے ہیں!

غزل

اختر واصف

شبِ مہ ہو، کنارِ آبجو ہو
نوا زن مطربِ شیریں گلو ہو

بدستِ ساقیِ گل رُو سبُو ہو
تو پہلو میں وہ جانِ رنگ و بُو ہو

اگر آمادۂ الطاف تو ہو
نہ کیوں ہر سانس شرحِ آرزو ہو

نمازِ عشق کی نیّت سے پہلے
سرشکِ خوں سے لازم ہے وضو ہو

خوشا قسمت جو ایسی موت آئے
تری شمشیر ہو میرا گلو ہو

سما جا میری آنکھوں میں یہاں تک
جدھر دیکھوں اُدھر تو رُوبرو ہو

ہے تجھ میں نہ مجھ میں کچھ تفاوت
فنا ایسی تمیزِ ما و تو ہو

اُسے ہو غیر کی کیونکر تمنا
جسے ہر دم تمہاری جستجو ہو

مجھے ڈر ہے نہ دامن گیر تیرا
سرِ محشر کہیں میرا لہو ہو

رہے دنیا میں رنگینی نہ کوئی
اگر ہر خوبرو ہی نیک خو ہو

مجھے پینے میں ہو کیوں عذر واعظ
جواز اس کا جو حکمِ واشربو ہو

مآلِ گل مرے پیشِ نظر ہے
مجھے پھر کیوں ہوائے رنگ و بو ہو

تلمذ ہے مجھے واصف سے اختر
مرا شہرہ نہ کیوں پھر چار سو ہو

غزل

صبا اکبرآبادی

پیروِ دل ہو کے پچھتاتا رہا
زندگی بھر ٹھوکریں کھاتا رہا

ہر قسم کا اعتبار آتا رہا
عشق دھوکے ہر نفس کھاتا رہا

عشق میں اندازۂ نقصاں نہیں
یہ سمجھتا ہوں کہ کچھ جاتا رہا

ہوں خفا کتنے جو دل کا نام لوں
پوچھنے آئے ہیں کیا جاتا رہا

دل کو الزامِ تمنا بھی ملا
حُسن دادِ ظلم بھی پاتا رہا

حشر میں ہم داستاں کہتے رہے
جس کو شرمانا تھا شرماتا رہا

تا حدِ مژگاں رہا سیلابِ غم
اپنے ہی ساحل سے ٹکراتا رہا

رفتہ رفتہ قید میں جی لگ گیا
دل بہت دن تک تو گھبراتا رہا

کچھ پریشانِ وفا ہم ہی نہ تھے
وہ دلِ نازک بھی گھبراتا رہا

تم نہ تھے تو کس پہ رُکتی چشمِ شوق
راہ میں کیا کچھ نظر آتا رہا

اہلِ کشتی! ناخدا سے التجا؟
کیا خدا کا آسرا جاتا رہا

وہ گنہگارِ محبت ہوں صبا
جو سزائیں پا کے اِتراتا رہا

محبوب مشغلے

راجہ مہدی علی خاں ——————

۱۴۹۔ پالی روڈ، باندرہ بمبئی ۵۰

۱۳ راگست ۶۶۵ محبوبِ کج ادا، معشوقِ دلربا، مکرمی و محترمی جناب خوشترگرامی صاحب!

آپ کا محبت نامہ ملا۔ آپ مجھے ہمیشہ از راہِ کرم محبت نامے ہی ارسال کرتے ہیں لیکن میرے خطوں کے جواب میں آپ اور آپ کا اسٹاف جو بے دردانہ بے مہری کا رویہ اختیار کئے رکھتا ہے، وہ ناقابلِ برداشت اور نہایت تکلیف دہ ہے۔ چنانچہ میں نے بادلِ ناخواستہ یہ فیصلہ کیا ہے کہ دو تین انتہائی ضروری خط لکھنے کے بعد آپ سے خط و کتابت بند کردوں۔ اِن ضروری خطوط کا تعلق "محبوب مشغلوں" کی قسطوں سے ہوگا۔ میں نے خواتین کے "محبوب مشغلوں" والا حصہ مکمل کرلیا ہے۔ اسے ایک خوشخط نقل نویس سے نقل بھی کرالیا ہے۔ کم و بیش ۲۱ یا ۲۳ خواتین کا ذکر ہے۔ خواتین کا حصہ بے حد دلچسپ ہوگیا ہے۔ ———— سرکار! جب آپ نے میرے بے شمار خطوں کے جواب میں بہت دیر کے بعد یہ اطلاع دی کہ آپ کو "محبوب مشغلوں" کی صرف دو قسطیں ملی ہیں تو مجھ پر بجلی گر گئی۔ میرے لئے یہ نقصان نقصانِ عظیم تھا۔ میں یہ سمجھا کہ روزنامہ "اُردو ٹائمز" کے ایڈیٹر، احمد رضوی صاحب نے اپنے جس دوست کو "محبوب مشغلوں" کا رجسٹرڈ لفافہ رجسٹری کے لئے دیا تھا، وہ اُس نے کہیں پھینک دیا یا وہ ٹرین یا ٹیکسی میں بھول گیا۔ تین چار بار ٹیلیفون کرایا تو رات کے دس بجے کے قریب احمد رضوی صاحب ٹیلیفون پر ملے۔ اُنھوں نے کہا، کل میں معلوم کروں گا کہ کیا قصہ ہے اور اپنے دوست کو آپ کے گھر بھیج دوں گا۔ رات کے گیارہ بجے تک رضوی صاحب کا دوست نہ آیا۔ دوسرے دن میں نے اُردو ٹائمز کے آفس میں اپنا ایک آدمی بھیجا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ رضوی صاحب بیمار ہیں اور آج دفتر نہیں آسکے۔ اِس دوست کو دوبارہ ٹیکسی میں بمبئی بھیجا گیا کہ وہ جاکر احمد رضوی صاحب کا پتہ معلوم کرے اور اُن سے اُس دوست کا پتہ معلوم کرکے اُس سے ملے۔ قصہ بہت لمبا ہے سرکار! اِس دوڑ دھوپ میں پانچ دن گزر گئے۔ ٹیکسیوں کا مجموعی خرچ پچھتر روپئے ہے۔ پچھتر روپئے کوئی بڑی رقم نہیں۔ ایسی ہزاروں رقمیں آپ پر سے نچھاور کی جاسکتی ہیں لیکن روپیہ فضول برباد ہوجائے، یہ بھی اچھا نہیں لگتا ———— مختصر یہ کہ رضوی صاحب رجسٹری کی رسید لے کر آگئے۔ رجسٹری کی مُہر سے ظاہر ہے کہ وہ ۲ راگست کو یہاں سے روانہ کی گئی ہے۔ دوسری رجسٹری پر ۸ راگست کی مُہر ہے۔ اِس طرح آپ کو اب تک "محبوب مشغلوں" کی تین قسطیں روانہ کی جاچکی ہیں۔ دو بذریعہ رجسٹری اور ایک پندرہ پیسے کے لفافے میں۔ سرکار! آپ چشمہ لگا کر اپنی دراز دیکھئے۔ دونوں رجسٹریاں اُس میں موجود ہوں گی۔ اگر ایک رجسٹری نہیں ملی تو مناسب کارروائی کرنے کے لئے دونوں رسیدیں بذریعہ رجسٹری روانہ کر رہا ہوں ———— آپ کا گرامی نامہ ۱۲ رتاریخ کا لکھا ہوا ہے۔ اگر ایک رجسٹری ۱۳ رتاریخ کو بھی ملی تو بھی آپ کے دفتر کو بذریعہ کارڈ یا بذریعہ تار اِس کی اطلاع فوراً دے دینی چاہئے تھی لیکن میری تکلیف کا آپ کو کہاں خیال ہے؟ آپ اور آپ کا اسٹاف تو بھنگ کے نشے میں مست رہتا ہے ———— میری قیمتی چیزیں اگر چوری ہوئی ہیں تو کیا ہے۔ دنیا میں میری سب سے زیادہ قیمتی چیز —— طاہرہ سے بھی زیادہ قیمتی، خوشتر گرامی ہے۔ اُسے میرے دل کے محل سے کوئی چور یا ڈاکو اُٹھا کر نہیں لے جاسکتا۔ وہ ہے تو سب کچھ ہے۔ بس ایک ہی تمنا ہے کہ وہ مسخرا نفس بمبئی آئے تو اُسے دو چار گھونسے جمادوں ....

خوشتر گرامی کے بوٹ کا پھٹا ہوا تسمہ ———— راجہ مہدی علی خاں

اشفاق احمد خاں مدیر "داستان گو" (لاہور)

ہر روز افسانہ کی ایک سطر لکھ کر سو جاتا، دوسرے دن دوسری سطر، تیسرے دن تیسری سطر۔ دس سال میں ایک افسانہ مکمل کر کے سستی کے گزشتہ تمام ریکارڈ توڑ دینا۔ LOTUS EATER کہلا کہلا کر خوش ہونا۔ غیر ملکی دوستوں کو خط لکھنا کہ "مجھے سستی میں نوبل پرائز دلواؤ۔" لاہور کے ادیبوں اور چرسیوں سے روز ملاقات کرنا اور کہنا "حرامزادو! اُلو کے پٹھو! میں ایم کی چُسکی لگائے بغیر، گانجا پئے بغیر تم سے زیادہ سست ہوں۔ تم دریائے راوی میں ڈوب کر مر جاؤ۔ نور جہاں کے مقبرے کے پاس دفن ہو جاؤ۔ میں ہر روز تمہاری کمینی قبروں پر فاتحہ پڑھنے آیا کروں گا۔"

اپنے دوست نسیم ممتاز سید سے ہر روز لڑنا کہ "تمہارا دوست راجہ مہدی علی خاں مجھے خط کیوں نہیں لکھتا، کیا سمجھتا ہے وہ اپنے آپ کو؟" نسیم کا جواب دینا "سرکار! راجہ صاحب کا خط پچھلے سال آیا تھا۔ مارے سستی کے آپ پڑھ نہیں پائے۔" یہ سن کر گردن جھکا لینا اور کھسیانا ہو کر کہنا "بکواس مت کرو، نقل بیجر کہیں کے۔"

اپنی بھانجی عزیزہ وسیم خالدہ سلمہا سے ہر روز جنگ کرنا کہ جب میرے دوست مجھے سست کہتے ہیں تو تم "گارڈن گارڈن" کیوں ہو جاتی ہو؟ یہ کہہ کر چھڑی اُٹھا کر اپنی بھانجی پر پھینکنا... مارے سستی کے چھڑی کا پطرس بخاری کی چھڑی کی طرح خلا میں ایک خاص زاویہ بنا کر ٹھہر جانا۔ چھڑی کو وہیں معلق کر کے اشفاق صاحب کا کھڑے کھڑے سو جانا۔ اپنی بیگم بانو قدسیہ بیگم کا ایک گھونسہ کھا کر بیدار ہونا اور چونک کر پوچھنا "اللہ میں کہاں ہوں؟"

لاہور ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلی ویژن پر شور مچانا۔ اپنے ڈرامے میں پارٹ کرنا۔ بیک وقت تین تین چار چار آوازیں بدل لینا۔ اپنے گلے سے عورتوں کی ایسی ایسی نخروں بھری آوازیں نکالنا کہ ریڈیو کے سامعین اُنھیں عورت سمجھ کر عاشق ہو جائیں۔

اپنی تمام کمائی ٹیپ ریکارڈروں پر ضائع کرنا۔ ہر روز صبح کو اُٹھ کر اپنے دو سو ٹیپ ریکارڈروں کو سلام کرنا اور پوچھنا "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے، کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

ہر روز اپنی زیرِ تصنیف کتاب "جھوٹ بولنے کے پانچ سو پچپن طریقے" میں ایک آدھ سطر کا اضافہ کر دینا۔ فنِ قہقہہ گری پر غیر ملکوں میں جا کر ریسرچ کرنا۔

ہر نوجوان کو تاکید کرنا کہ اگر تمہاری شادی نہیں ہوئی تو فوراً اپنی کسی کلاس فیلو لڑکی سے عشقیہ شادی کر لو۔ اگر نہیں کرو گے تو بخشے نہیں جاؤ گے۔ اگر رشتہ دار شادی کے مخالف ہوں تو انگلینڈ، امریکہ اور روس جا کر اپنے دوستوں سے مشورہ کرو اور واپس آ کے ہی رشتہ داروں کی مخالفت کے باوجود عشقیہ شادی کر لو۔

ڈشیں بہت رغبت سے کھاتا اور کھلاتا ... ڈشیں بہت لذیذ ہوتی ہیں۔ کاش اکرنی ... وہاں مجھے مینڈکوں کا قورمہ، چوہوں کا پلاؤ اور سانپوں کی دُموں کے کرتے دعوت دے کر کھلا دے۔"

اُجلی اُجلی، دُبلی دُبلی، موٹی موٹی، گندی گندی، فحش فحش گالیوں کا اسٹاک جمع کرنا۔ بعض خاص خاص آرٹسٹک گالیاں بٹوے میں چھپا کر رکھ لینا۔ بعض دوستوں کے پوچھنے پر کہ "یہ کس کے لئے ہیں؟" جواب دینا کہ "یہ دنیا کی ایک حسین ترین عورت کے لئے ہیں۔"

دوستوں کا ہنس کر تالی بجانا اور چلا چلا کر کہنا کہ "بھابی کے لئے ہیں، بھابی کے لئے ہیں۔"

لباس کے معاملے میں بالکل بے پروا ہونا، کھدر کے کپڑے پہننا، عالمِ مجذوبیت میں کبھی کبھی کپڑے پہنے بغیر ہی سڑک پر نکل جانا۔ ہر آنے جانے والے سے کہنا ؎

کپڑوں بغیر پھر نہ سکا کوہ کن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

پروفیسر ظفر احمد نظامی (شیوپوری۔ مدھیہ پردیش)

انگریزی ادب میں ایم۔ اے کر کے اُس سے یک بیک متنفر ہو جانا (غالباً کسی یوروپین خاتون سے ناکام محبت کے ردِ عمل میں)، چنانچہ ہر روز انگریزی ادب کی ایک کتاب دریا برد کرآنا۔

سیاسیات میں ایم۔ اے کر کے ریاست دتیا چلے جانا، شام کو بعد نماز تسبیح پر مندرجہ ذیل وظیفہ پڑھنا ؎

جھانسی گلے کی پھانسی دتیا گلے کا ہار
للت پور کبھی مت چھوڑیو جب تک ملے اُدھار

جھانسی کی گلیوں میں آوارہ گردی کرتے رہنا۔ اُدھار ملنے کے باوجود للت پور کبھی نہ جانا۔ بار بار پاگل ہو کر شیوپوری چلے آنا۔ ہیگل، نطشے، افلاطون، کیٹس، شیلے اور شیکسپیئر کے حوالے دے دے کر موچیوں پر رُعب ڈالنا۔ یکایک پاگل ہو کے سیاسیات کے طلبا کو انگریزی اور انگریزی کے طلبا کو سیاسیات پڑھا دینا۔

خود شادی کی قید سے آزاد رہ کر دوسروں کے لئے رشتے تلاش کرنا ...

اپنے ایک لاکھ دشمنوں کو شکر یئے یار سمجھنا۔ فضول خطوں کا فوراً اور ضروری خطوں کا کبھی جواب نہ دینا۔ قطعات، نظمیں، مضمون اور افسانے لکھ کر انھیں ...

بیسویں صدی دہلی

جانے میں چھپوانا۔

جہاں جانا، اپنی چکنی چپڑی باتوں کی وجہ سے بے حد مقبول ہو جانا۔ مشاعرے کروانا۔ گلے میں سے معمولی معمولی شعرا کرکے کر مشاعرے کروانا، ذلیل قسم کے مشاعروں کو کامیاب بنا دینا۔

اندر سے آتے ہوئے کسی کتّے کے گلے میں بانہیں ڈال کر مومن کا یہ شعر رُو رُو کر پڑھنا ؎

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ابراہیم شفیق (حیدرآباد)

۱۹۵۰ء سے مسلسل افسانے لکھنا۔ بیوی کے منع کرنے کے باوجود اب تک لکھے ہی جانا۔ یہ کہنے پر کہ دنیا میں کوئی ایک اچھا کام بھی کیجئے۔ مجھے گالیاں دینا اور کہنا "اللہ کرے تو مر جائے۔" (آمین)۔

اپنی کہانیاں ہندوستانیوں سے زیادہ روسیوں کو، اردو داں پبلک سے زیادہ ہندی داں پبلک کو پڑھوانا۔ محکمہ پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف کی سیوا کرنا۔ اس ڈیپارٹمنٹ سے اپنی سیوا کرانا۔ پوسٹ آفس میں پارسلوں اور منی آرڈروں وغیرہ پر اسٹامپ مارنا۔ پوسٹ آفس میں اسٹامپ کا چھاپہ لگاتے وقت یہ محسوس کرنا جیسے اُنھوں نے حال کے ایک لمحے پر سیاہی کی چھاپ لگا دی ہے اور ایک دن یہ تمام لمحے مل کر انھیں ماضی کی سیاہی میں غرق کر دیں گے۔

پوسٹ آفس کی ملازمت میں رہ کر بھی راجندر سنگھ بیدی کی طرح دوسروں کے محبت نامے چُرا کر نہ پڑھنا۔

حسیناؤں کی تصویریں بنانا۔ اُن کا مُنھ چڑانا اور کبھی کبھی غلطی سے اُن پر فقرے کسنا۔

ہر شخص کو ایماندار سمجھ کر اُس کی بات پر یقین کر لینا۔ اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کا کام کرنے میں مسرت محسوس کرنا۔ اگر راستے میں کوئی دوست پیدل جاتا ہوا مل جائے تو مروتاً خود سائیکل سے اُتر کر اُس کے ساتھ میلوں پیدل چلنا۔

گھر والوں اور دوستوں کو ہمیشہ اس بات کا یقین دلانا کہ میں ہی اس وقت اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہوں۔ ایڈیٹروں سے افسانے بھیجنے کے جھوٹے وعدے کر کے جھوٹ کا عالمی ریکارڈ توڑنا۔ مداحوں کے خطوط میں سے چُن چُن کر صرف خواتین کے خطوط کا جواب دینا۔ خوبصورت اور حسین خواب دیکھ کر مہینوں اُن کی تعبیریں سوچنا۔ شفق کو دیکھ کر کہنا ؎

شفق کی روشنی کتنی حسین معلوم ہوتی ہے
حسین میموں کی زُلفِ نازنیں معلوم ہوتی ہے

ظ۔ انصاری (بمبئی)

کھدّی بُننا، کہنا، میں مُفت لال کپڑا بنتا ہوں۔ انصاری کہلانا۔ پنساریوں سے دوستی کرنا۔ عُرس میں جانا۔ عُرس سے واپس آنا۔

ہفتہ وار "آئینہ" نکالنا۔ اس آئینہ میں ہر روز اپنی [illegible] دیکھ کر جھینپ جانا۔ لوگوں سے کہنا، "سُرخ صحافت کی آبرو میں ہی لُوٹوں گا، میں ہی بچاؤں گا، مجھ سے ڈرو!"

لامذہبیت کو فروغ دینے کے لئے مذہبی رہنماؤں کو اُلّو بنا کر اپنا کام نکالنا۔

اپنے نام کے عشق میں لفظ "ذلیل" کو "ظ" سے لکھنا۔ شہر میں آوارہ گھومتی ہوئی لاوارث "گائے بھینسوں" اور جوان اور بوڑھی "بکریوں" کو گھیر گھار کر گھر لے آنا۔ نعرے لگا لگا کر رات بھر اُن کی سیوا کرنا۔

ہر ہفتے "آئینہ" کے اسٹاف میں تبدیلیاں کر کے ایک اچھے بزنس مین اور بڑے کامریڈ ہونے کا ثبوت دینا۔ بڑے بڑے عقلمند آدمیوں کو بیوقوف بنا کر "آئینہ" کی مدد کے لئے تیار کرنا۔ اُن سے مدد حاصل کر کے کہنا، تم نے دنیا کی عظیم ترین ہستی کو ممنونِ احسان کر لیا ہے۔

نام و نمود کے لئے ادیب سے لیڈر اور لیڈر سے صحافی بن بیٹھنا۔ لوگوں پر رُعب ڈال کر مشاعروں کی صدارت حاصل کرنا اور ضمیر کی مدھم آواز سُن کر کہنا ؎

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

ظہیر کُنجاہی (راولپنڈی)

دوستوں سے قرض لے کر ایک آنہ ماہوار کے حساب سے واپس کرنا۔ ہر نئے بینک میں پانچ چھ روپے جمع کرنا۔ ہمیشہ اخبار والے کا مقروض رہنا۔

کنجاہی کہلوانا، پنڈی میں رہنا اور لکھنؤ سے محبت کرنا۔ سال میں صرف دو مرتبہ عید کے موقع پر نماز پڑھنا۔ دن میں تین مرتبہ شیو کرنا۔ نگاہ کمزور نہ ہونے کے باوجود چشمہ لگانا۔ ہر پندرہ منٹ کے بعد گرم گرم چائے کا ایک پیالہ پی کر جگر پھونکنا۔ رات کو سوتے میں چائے کے باغات میں ہل چلانا، لپٹن ٹی کمپنی کے مالکان سے ڈانٹیں کھا کھا کر بھی "ملازمت" نہ چھوڑنا۔

صبح لڑکوں کو پڑھانے کے لئے کالج جانا۔ شام کو مسجد میں جا کر مُلّا سے سبق پڑھنا۔ غلط سبق سُنانے کے جُرم میں صحنِ مسجد میں بڑی خوشی سے مُرغا بن جانا۔ مُرغا بن کر ایک آدھ بانگ بھی دے ڈالنا۔ نمازیوں کو ہنسا دینا۔ مسجد کے مُلّا سے کہنا ؎

[illegible] ہے

[illegible] ہی ہے

شانتی رنجن بھٹاچاریہ (کلکتہ)

[illegible] کے ساتھ ساتھ [illegible] میں [illegible] کے زمانے [illegible]

بنگالی کے [illegible] ہونے کے باوجود اردو میں [illegible] پر [illegible] بنگالی شاعروں اور ادیبوں کو اردو داں طبقے کے [illegible] کا بنگالی سے ترجمہ کرنا۔

بنگال حکومت کی اردو تعلیمات [illegible] کے سرپرست ہے [illegible] ہندو ہوکر پختونستان کا مطالبہ [illegible] کا لکھ کر [illegible] پٹھانوں کا ساتھ [illegible] کہہ کر [illegible] پٹھان ہے۔

[illegible] وقت [illegible] کہلانا اور خوش ہونا اپنی [illegible] سے [illegible] خان [illegible] مولانا [illegible] ہے [illegible]

بنگالی [illegible] اس طرح نظر آنا جیسے [illegible] کے [illegible] پر [illegible] ہی [illegible] رہا ہو۔

بنگال گورنمنٹ کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں اردو ترجمہ کا کام بطریق احسن انجام دینا۔ [illegible] فرقہ وارانہ ذہنیت کی وجہ سے کلکتہ کے اردو حلقوں میں بنگال کا [illegible] کہلانا۔ اپنا پسندیدہ جو ذیل الفاظ میں بتانا ؎

نام ہے میرا شانتی بابو ریجنٹ پارک میں رہتا ہوں
بن کے میں اردو کا دریا کلکتے میں بہتا ہوں

اطہر علی فاروقی (الہ آباد)

اردو ہندی کے جھگڑوں سے تنگ آکر الہ آباد کے ایک کالج میں دونوں زبانیں پڑھانے کی نوکری کر لینا۔ اس قسم کی کتابیں لکھ کر اپنا اور پڑھنے والوں کا دماغ خراب کرنا۔

(۱) اردو میں ویدک دھرم کے دیومالائی عناصر

(۲) عوامی مرثیے

(۳) [illegible]

(۴) [illegible]

(۵) [illegible]

(۶) تشیع اور [illegible]

(۷) [illegible]

[illegible] کے بجائے [illegible] ادیب ہونے کی وجہ سے [illegible] کی [illegible] میں پہنچے رہنا۔

اردو، فارسی، عربی، ہندی، بنگالی، انگریزی [illegible] حاصل کرنے کے بعد کہنا: "بندہ جاہل مطلق ہے۔ [illegible] نہیں آتی۔ مجھے چاہیے کہ میں خودکشی کر لوں۔"

"ماہر ہندوستانیات" کا خطاب حاصل کرکے بھی [illegible] وہ قدر و منزلت حاصل نہ کر سکنا جس کے وہ مستحق ہیں۔

ہندو ادیبوں سے زیادہ پیاری اردو [illegible] ہندی [illegible] میرا یہ شعر سن کر مسکرا دینا ؎

یہاں اطہر یہ بندہ ہے تمہارا عاشق و شیدا
ذرا یہ تو بتاؤ ہند میں تم کیوں ہوئے پیدا

شیون رضوی (بمبئی)

دوسرے گیت کاروں کی تعریف کرکے ان کے گیتوں کی مارکیٹ اپ کرنا اور اپنے گیتوں کی ڈاؤن کرنا۔ بہترین گیت لکھ کر دوسروں کی نظروں سے چھپے رہنا۔ [illegible] "گیت نگاری" کرنا۔ سال میں صرف ایک بار ہنسنا اور ۳۶۴ دن [illegible] شیون کا نام شیون اور [illegible] دن شیون بنانا۔ اپنی قسمت سے ہر روز نہار منہ [illegible] حصے کی دولت اور خوشیاں تو اپنے پاس رکھ لے۔

اپنا بہترین کلام ادبی رسالوں میں شائع کرانے کے بجائے صندوقوں میں بند کر دینا کہ کہیں مشہور نہ ہو جاؤں۔

غصے میں پاگل ہو جانا۔ جذبات کی شدت میں [illegible] ہونا اور [illegible] کوشش [illegible] ہندوستان میں [illegible] کی [illegible] کرنا۔ [illegible] نعرہ لگا کر [illegible] ہر روز [illegible] کے [illegible] کروا کر دوسرے [illegible] کر کہنا ؎

آپ کو تو یزید کہتے ہیں اور مجھ کو شہید کہتے ہیں

درندہ

سید شمیم اشرف

کسہری۔ پوسٹ رام سنیہی گھاٹ (بارہ بنکی)

۱۲ اگست ۶۵ء — محترم خوشتر صاحب اخلاص و نیاز

"کانچ کی پیرہن" کی اشاعت کے سلسلہ میں دور دراز سے تعریفی خطوط موصول ہوئے۔ "درندہ" کے متعلق اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ یہ کہانی محنت سے لکھی ہے۔ روایتی انداز سے الگ ہو کر۔ اور آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیے گا۔۔۔

خلوص کیش — سید شمیم اشرف

غزل رقص کرتی رہی۔

اور اُس کے دودھیا جسم کے دل آویز خطوط میں بجلی کی قوسِ قزحی روشنیاں تیرتی رہیں۔

کافور کی کلیوں کی طرح مہکتا ہوا شبنگ گورا گورا جسم!

گلنار پیالیوں کی طرح چھلکتی ہوئی نشیلی آنکھیں!!

اُسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس دنیا کی عورت نہ ہو اور طویل فاصلوں سے گزر کر آتی ہوئی تشنہ ذہنیتوں کے پُرفریب تصور سے آگے اُس کی گرم گرم معطر سانسیں ادراک کی بیکراں سرحدوں کو چھو رہی ہوں۔

یکایک گھنگھروؤں سے پھوٹتی ہوئی موسیقی ٹوٹ گئی۔ ساز خاموش ہو گئے اور غزل کسی شرابی کی طرح لڑکھڑاتی ہوئی اُس طرف چل پڑی جہاں شب خوابی کا لبادہ ایک ریک پر رکھا ہوا تھا۔

"ناچو" ایک بھاری آواز اُس کے ذہن کے منجمد دریچوں سے ٹکرا کر ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گئی۔ "ناچو ---- اور ناچو!"

"نہیں!" غزل چیخ اٹھی "میں تمہاری داشتہ نہیں ہوں!"

"ہونہہ" گل خاں کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ رقص کرنے لگی "تم اور کیا ہو سکتی ہو؟"

"عورت" غزل بھرائی ہوئی آواز میں بولی "تم جانتے ہو، ٹھیک سے، ورنہ تم خود اپنے وجود کے زہریلے ویرانوں میں بھٹکتی ہوئی ایک بھوکی پرچھائیں ہو۔"

"میں تمہیں فلسفے سے زیادہ عورت سمجھتا ہوں" گل خاں لمحہ گھورتا ہوا بولا۔ "جس کی آنکھوں سے درندگی جھانک رہی تھی۔

"عورت ہزار روپ اختیار کر سکتی ہے وہ اپنے وجود میں سمندر کی نغمہ ریز لہریں چھپائے رکھنے کے باوجود تشنہ رہتی ہے۔ اُس کے ہونٹوں کی نیم باز کلیاں پیاسی رہیں۔ اُس کی آنکھوں کی شرابی لہروں میں یہ اضطراب کیسا؟ اُس کے رخساروں کی جنتوں میں یہ خوابناک مہک کیوں؟ وقت کی ابتدا سے انتہا تک صنفِ نازک کی کہانی ایک پیاسے سمندر کی کہانی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ---- ؟"

"تم درندے ہو!" غزل زہریلے لہجے میں بولی "میں جا رہی ہوں!"

"نہیں!" گل خاں گرج کر بولا "تم رقص کرتی ہو تو ہوا کی زلفوں کی زنجیریں پگھل جاتی ہیں۔ تمہارے پیروں سے پہاڑی چشموں کی موسیقی پھوٹتی ہے۔ سیاہ گیسوؤں میں کشمیر کی وادیاں مہکتی ہیں۔ گلابی رخساروں میں چاند کی روشنی تیرتی ہے۔ ناچو ---- کل نہیں آئے گا، کبھی نہیں آئے گا! ---- ہا ہا ہا ---!!"

گل خاں کا چہرہ یکایک خوفناک ہو گیا تھا اور غزل کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں اُس کی روح کی گہرائیوں میں جوالا مکھی کے لاوے بکھیر رہی ہوں۔ گل خاں کی نگاہ میں وہ فلسفہ کم اور عورت زیادہ تھی اور اس وقت اُسے اپنے عورت ہونے پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ اُس کی روح احتجاج کر رہی تھی کہ قسّامِ ازل نے غزل کے ساتھ ایک گل خاں کیوں تخلیق کیا ہے؟ لیکن ---- نہیں۔ غزل اور گل خاں کا تصور اس گھناؤنے معاشرے کی اختلاط پذیری کی ایک بھیانک پرچھائیں ہے۔ میرے خدا! وہ کراہ اٹھی۔

"مجھے ــــــ میں تمہاری لاش پر بیٹھ کر مینڈولن بجانا بھی جانتا ہوں ــــــ؟
[illegible] تھا۔

"نہیں، نہیں، نہیں!!" غزل ہسٹریائی انداز میں چیخی۔
پھر اُسے یاد نہیں رہا کہ اُس کے نیم عریاں جسم پر کوڑوں کی خوں چکاں بارش کب تک جاری رہی۔ اُس کا شگفتہ سپید جسم خون کے دھبوں سے گلنار ہو گیا تھا اور گل خاں ــــــ؟
وہ ایک وفادار کتّے کی طرح غزل کے زخم چاٹ رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد اُس نے کوٹ کی جیب سے شیمپین کی بوتل نکالی اور اُسے اِس طرح گھورنے لگا جیسے اُس میں بوالہوسوں کی روح سارنگی بجا رہی ہو۔
وہ بوتل خالی کر کے تہہ خانہ سے باہر جا چکا تھا۔

پندرھویں دن غزل کے زخم اچھے ہو گئے۔ وہ اپنی مسہری پر لیٹی ہوئی سگریٹ کے ہلکے کش لے رہی تھی۔ دھوئیں کے ننھے ننھے دائروں سے پیچھے گل خاں اُس کے زخم چاٹ رہا تھا۔
"یہ اِس تہہ خانے کی آخری رات ہے۔" غزل کا قلم آہستہ آہستہ کاغذ پر پھیلنے لگا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں دُنیا کو ایک سوالیہ نشان سے زیادہ کچھ نہ دے سکی۔ یہ سوالیہ نشان ہر اُس 'غزل' کی ملکیت ہے جو اپنے جسم میں شہرت کی طمع، دولت کے مُنہ زور سکّوں کی حرص اور احساسِ خود نمائی کے خوفناک جراثیم لئے ہوئے اِس مائل بہ انحطاط معاشرے کی تاریک اور بدبُودار گلیوں میں آوارہ پھر رہی ہے۔ میں کوئی بات چھپا نہیں رہی ہوں۔ ورنہ میرا عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنے وجدان اور عرفان کا ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے ہیں اور اپنے کو مردِ کامل سمجھتے ہیں، وہ بھی آدھا سچ بولتے ہیں۔ میں اپنے ڈیڈی کی سخت گیر پالیسی کا شکار ہو کر ایک فلک نما انداز کی شاندار کوٹھی کی چہار دیواری میں نظر بند کر دی گئی۔ انہیں مجھ سے زیادہ اپنے خوفناک شکاری کتّوں سے محبت تھی۔ کوٹھی کے طویل و عریض لان پر کتّوں کے شو ہوتے تھے۔ اُن کی سالگرہ منائی جاتی تھی۔ میں اُس لاش سے مختلف نہیں تھی جسے اطلس و سنجاب میں لپیٹ کر ایک طلائی تابوت میں رکھ دیا گیا ہو۔ میں کھلی ہوا میں سانس لینا چاہتی تھی۔ زندگی میں جمود اور یکسانیت کا تصور میرے لئے بے حد اذیت ناک تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا ذہن کیڑوں مکوڑوں کی طرح منجمد اور غیر متحرک سطح پر ٹھہر کر رہ جائے۔ میری روح کے قوس قزحی جلوے روایات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے احتجاج کر رہے تھے۔ میرا شعور میری خوابگاہ کے روزنوں سے جھانکتی ہوئی چاند کی خنک دودھیا شعاعوں کا مفہوم نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میرے اپنے کچھ خواب تھے جن میں کشمیر کی صُبحیں مہکتی تھیں، رخساروں کے گلاب تھے، رسیلے ہونٹوں کا آبِ حیات تھا اور جلتے ہوئے ہونٹوں کی پیاس تھی۔ اپنے وجود کی خوبصورت دہلیز پر ایک اجنبی دستک کی خوشگوار بازگشت سُن کر مجھے ایسا محسوس ہوتا، جیسے زندگی مجھے دُنیا کے انجانے کناروں سے آواز دے رہی ہو۔
اور ــــــ ایک رات گل خاں کے ایجنٹوں نے مجھے اِس تہہ خانہ میں پہنچا دیا۔
گل خاں ظالم ہے، سنگ دل ہے، درندہ ہے! وہ بین الاقوامی پیمانہ پر بردہ فروشی کی گندی تجارت کرتا ہے اور میں جانتی ہوں کہ ایک دن وہ مجھے بھی جسم فروشی کے [illegible] پھینک دے گا جہاں میری بڑی بڑی نشیلی آنکھوں میں اسکاچ کی [illegible] جائیں گی۔ رخساروں سے پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں سے طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں مانگی جائیں گی۔ ہونٹوں میں شیلے اور کیٹس کی شاعری کے سرچشمے تلاش کئے جائیں گے۔
میرے خدا! ــــــ وہاں میرے گھر کی وہ عظیم چہار دیواری نہ ہوگی جس نے میری روح کو جکڑ رکھا تھا۔ ڈیڈی کی وہ انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں نہ ہوں گی جو اب تک میرے پیلے خوابوں کے زخموں سے بالیدگی حاصل کرتی رہیں۔ میں اپنے پیلے ڈیڈی کی راہ سے ہٹ گئی ہوں۔ اب وہ اپنی نئی اینگلو سیکسن بیوی کو حافظ و خیام کی شاعری سمجھا سکیں گے!!
غزل ایک طویل انگڑائی لے کر اُٹھی۔ کھڑکی سے باہر فضا چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔
دُور ــــــ سمندر کی لہروں کا شور اُس کے حواس کی نازک دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔
دروازہ پر اُنگلیوں کی کھٹ کھٹ سُن کر وہ آگے بڑھی اور بولٹ گرا دیا۔ گل خاں بلیک کھڑا اُسے عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں ویران تھیں۔ خزاں کے موسم کی طرح اُداس!

"چلو۔" وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔
"کہاں؟" غزل کا سارا جسم جھنجھنا اُٹھا۔
"سمندر تک۔ وہاں اسٹیمر موجود ہے۔ تم ہانگ کانگ جا رہی ہو۔" ــــــ گل خاں بے پروائی سے بولا۔
"میں ہانگ کانگ نہیں جاؤں گی۔" غزل چیخ اُٹھی۔
"تم ایک ہزار پونڈ میں بِک چکی ہو۔ ہنی، جلدی کرو!" وہ ایک طرف مُڑ گیا۔
چند لمحوں بعد وہ سمندر تک پہنچ گئے۔ غزل کا حسین چہرہ گہن کے چاند کی طرح اُداس تھا۔ اُس کے لاشعور میں ایک برہنہ جسم شمع کی لَو کی مانند تھرتھرا رہا تھا اور اُس کا وجود بوتلوں کے ارغوانی سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا۔

"غزل!" یکایک گل خاں کراہ کر بولا۔ "میرے قریب آؤ!"
"اوہ ــــــ" غزل چیخ اُٹھی۔ "فو ... خ ون!" اُس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

گل خاں کے پیٹ میں ایک بڑا سا چھرا پیوست تھا۔
"میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ تم ــــــ آزاد ہو!" گل خاں کے ہونٹوں پر ایک مضمحل مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔
غزل کی سسکیاں سمندر کی لہروں کے شور میں مدغم ہوتی جا رہی تھیں اور اُس کی گوری گوری مخروطی اُنگلیاں اُس کے بالوں میں ہولے ہولے رینگ رہی تھیں۔ گل خاں کا جسم سرد ہو چکا تھا ــــــ!!!

چند یادیں

ماہنامہ "خلوص" بلاک نمبر ۱۸۔ سرگودھا (پاکستان)

۱۰ر مئی ۱۹۹۵ء — پیارے بھائی جان! سلامت باشد

.....آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ تصویر چھوٹی سہی تو ہو، تب تو بات من کی دھون سے کسی طرح کم نہیں۔ لیجیے، بڑی تصویر پیش کرتا ہوں۔ آپ نے جس خلوص و محبت سے میرے مجموعے دہلی کے کتب خانوں سے تلاش کرکے بھجوائے، اُس کے لئے شکریہ تو نہیں کروں گا اور نیا سا سطر در شاداب لفظ تلاش کرکے پھر کبھی لکھوں گا۔ اپنی ہی کتابیں پڑھ کر حیران ہو رہا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیا واقعی یہ میری کتابیں ہیں اور میں کسی زمانے میں اچھے شعر بھی کہہ لیتا تھا۔۔ جانِ من! میرے خطوط کا سلسلہ خوب رہا۔ جب سے آپ نے میرے خطوط شائع کرنے شروع کئے ہیں، قارئین "بیسویں صدی" کے کوئی ڈیڑھ سو خط میرے نام آچکے ہیں۔ جن میں ہندوپاک کے نامور ادبا و شعرا بھی شامل ہیں۔ اکثر خطوط میں "بیسویں صدی" اور انسان دوست مدیر "بیسویں صدی" کا ذکر بڑے خلوص سے کیا گیا ہے اور لکھا ہے خوشتر گرامی نے ہمیں بچھڑے ہوئے الطاف سے ملا دیا۔ مرے ہوئے الطاف کو زندہ کر دیا۔ اِن خطوط میں میرے کلام کی تعریف کم ہے اور میرے خطوط کی زیادہ۔ آہ! کیا زمانہ تھا۔ جب آپ تھے، اختر شیرانی تھے، راجہ مہدی علیخاں تھے، حاجی لق لق تھے، چراغ حسن حسرت تھے، مولانا عبدالمجید سالک تھے اور لاہور تھا۔ اُسی زمانے کا ذکر ہے کہ اختر شیرانی میکلوڈ روڈ لاہور پر کشمیر بلڈنگ، حال لاہور ہوٹل کے پاس ایک چھوٹے سے کمرے میں مقیم تھے اور شمس العلما علامہ تاجور نجیب آبادی کے ماہنامہ "شاہکار" کی ادارت کرتے تھے۔ ایک رات اختر صاحب، دوسرے صاحب (کسی انگلش فلمی ہفت روزہ کے ایڈیٹر) راقم الحروف اور دودا پہلوان رات گئے تک پیتے پیتے سو گئے۔ نو بجے کے قریب میری آنکھ کھلی، دیکھا، دودا (داؤد) پہلوان برفیلی لسی کا ایک جگ لئے اختر صاحب کے سرہانے بیٹھا ہوا ہے اور اُنہیں جگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اختر صاحب آنکھ کھول کر دودا پہلوان سے کہتے ہیں۔ "تم چغد ہو، تم جیک الدین احمق ہو۔ مجھے سونے دو۔ ابھی کافی رات باقی ہے ——" مجھ سے دودا پہلوان کی مجبوری نہ دیکھی گئی۔ اُٹھا اور اختر صاحب کا سر اپنی گود میں رکھ کر خوب جھنجھوڑا۔ کچھ دیر تو مجھے بھی صلواتیں سناتے رہے۔ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ صبوحی کا مطالبہ کیا، مگر چیل کے گھر نیلے میں —— لسی پی گئی۔ زحمتِ غسل بھی فرمائی گئی اور پھر سب لوگ اپنے پسندیدہ دورے پر روانہ ہونے کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ اُن دنوں اختر صاحب کے مکان کے قریب ہی ہندوپاک کے نامور موسیقار ماسٹر غلام حیدر مرحوم و مغفور کی اہلیہ مشہور ریڈیو سنگر اُمراؤ ضیا بیگم رہتی تھیں۔ تانگہ اُمراؤ ضیا بیگم کے مکان کے سامنے رکا اور ہم سب ٹھپ ٹھپ کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ راقم الحروف سب سے آگے تھا۔ کواڑ کھٹکھٹانے تو بڑی رسیلی آواز میں جواب ملا "جاؤ ہم دروازہ نہیں کھولتے۔ آپ ہمیشہ دیر تک راہ دکھاتے ہیں ——" دراصل اُن دنوں ماسٹر غلام حیدر اور اُمراؤ ضیا بیگم کا معاشقہ پورے جوبن پر تھا اور وہ سمجھ رہی تھیں کہ ماسٹر جی آئے ہیں۔ میں نے جواب میں کہا: "آپ ہمیں بلاتی ہی نہیں، ہم آئیں کیسے؟" میری آواز پہچان کر اُمراؤ نے شرم سے آنکھیں جھکا لیں اور دروازہ کھول دیا۔ دیکھتی کیا ہیں! ایک میوزک تھیٹر

غزل

الطاف مشہدی

یہ درد ناک نظارے بھی شعر کہتے ہیں
کبھی کبھی تو ستارے بھی شعر کہتے ہیں

کسی کی مستِ خرامی اگر میسر ہو
تو ندیوں کے کنارے بھی شعر کہتے ہیں

حریم ناز کی مہکی ہوئی فضاؤں میں
گلاب رنگ نظارے بھی شعر کہتے ہیں

ہنسی کی لو میں نکھرتی ہے شامِ میخانہ
لبوں ... بھی شعر ...

دیارِ گل میں رہے پرتشنگی کے لئے
قفس میں درد کے مارے بھی شعر کہتے ہیں

بھرے گئے جو ... ساحل کی سمت لہرا کر
وہ تھرتھراتے ... بھی شعر ...

حسین لوگ ہیں الطاف ...
کبھی ہم ان ...

... کلام ... ہیں۔ امراؤ ضیاء بیگم، اختر شیرانی کی بڑی مداح تھیں اور
... پر سوز آواز میں ریڈیو پر گایا کرتی تھیں ع
میں ... ہوں، مجھ کو بھول جانا

... چائے پلائی گئی اور نذرانہ بھی پیش کیا گیا۔ ہم نذرانہ لے کر ... جگہ
کے ... چلے گئے اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ کوئی بارہ بجے کا وقت ہو گا ... نے
... چلیں کے گورنمنٹ میں ... نہیں رہا اور قافلہ دفتر روزنامہ ... سے
... کو ساتھ لیتا ہوا حکیم ... کی قیام گاہ پر جا پہنچا اور وہاں سے نذرانہ وصول
کر کے شاہی محلہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ شاہی محلہ میں ... پہلوان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی
تھی۔ ہم ایک آتش جمال حسینہ کے کمرے میں بیٹھ کر آتش پرستی کرنے لگے۔ تھوڑی دیر
کے بعد بازار میں شور و غل مچ گیا۔ اختر صاحب دوڑ کر باہر آئے تو سات آٹھ مسٹنڈے ... دو
پہلوان کو بری طرح پیٹ رہے تھے۔ اختر صاحب چھڑانے کی کوشش میں بری طرح
زخمی ہو گئے۔ سر میں بہت گہرا زخم آیا اور قمیص لہو سے تر ہو گئی۔ اختر صاحب کی یہ حالت
دیکھ کر غنڈے بھاگ گئے اور ... پہلوان اختر صاحب کو تانگے میں ڈال کر خدا جانے
کہاں لے گیا۔ اس عرصہ میں راقم الحروف نشہ کی شدت سے بے سدھ ہو چکا تھا اور اتنا
یاد نہیں کہ میں کس طرح بارود خانہ میں کامریڈ یعقوب الحسن، برادرِ خورد حکیم یوسف حسن
ایڈیٹر نیرنگ خیال" کے پاس پہنچ گیا۔ یعقوب صاحب نے کئی دنوں کے بعد بتایا
وہ رات گئے تک مجھے تانگے میں لئے پھرتے رہے۔ اخبارات و رسائل کے دفاتر
چھان مارے۔ مگر میری قیام گاہ کا پتہ نہ چلا۔ آخر دفتر "احرار" کے ایک لڑکے نے ان کی
مدد کی اور مجھے فیض باغ میں میری قیام گاہ پر پہنچا گیا۔

خوش شتر بھائی! اس خوش وقت کی صبح کو جب میری آنکھ کھلی تو معلوم ہوتا تھا کہ میں نے
... خواب دیکھا ہے۔ لیکن جب میری ٹوٹی ہوئی پسلی کی ... کر ...
... میں نے دیکھا کہ میری بیوی ...
... بیٹھ کر ... ہے ——— بھائی ...
... ملاقات ... ایک تازہ غزل بھی قبول کیجئے

آپ کا بھائی
الطاف مشہدی

پیاسی روحیں

ڈاکٹر کیول دھیر

دھیر ہسپتال، پھگواڑہ (پنجاب)

۱۰ اگست ۹۵ء

محترم مظفر حنفی صاحب! آداب

... کچھ دن پہلے اچانک ایک دوست سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک ایسے دوست سے جو کالج کے زمانے میں میرے بے حد نزدیک رہا تھا لیکن جب میں اپنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے پیشے میں چلا آیا تو ہم دونوں کی راہیں الگ الگ ہو گئیں۔ کئی سال گزر جانے کے بعد ہم اچانک ملے جب وہ بے حد مجبور ہو کے ایک راستے پر تھا اور ہم اپنی یادوں کے نقش ابھار کر رو اٹھے۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی داستان ایک دوسرے سے کہی۔ اپنے دوست کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اس کی زندگی کے اندھیروں میں بھٹکتی صحت میں نے جو افسانہ تحریر کیا ہے "بیسویں صدی" کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ——— اس کہانی کا مرکزی کردار شیکھر میرا ہی دوست ہے۔ جب وہ اپنی داستان بیان کر رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ انسانی زندگی قدرت کے ہاتھ کا ایک کھلونا ہے۔ بالکل ننھے بچے کے اس کھلونے کی مانند جسے کبھی تو وہ زمین پر پٹک دیتا ہے اور کبھی پیار سے سینے سے لگا لیتا ہے۔ قدرت بھی انسان کے ساتھ یہی کھیل کھیلتی ہے ——— اور میں سوچ رہا تھا کہ ایک انسان کی جدید تہذیب کی ان راہوں میں اس کیڑے کی طرح رینگتی نظر آتی ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہے اور میرا دوست اسی تلاش کے راستے میں محو ہے۔ اس کے بعد ہم نے ایک دوسرے کی طرح ایک عورت ہے لیکن اس کی عظمت کے آگے سرجھک جاتا ہے۔ قدرت کے اس کھیل کو ——— ایک طرف شکست کے بعد اردو میں یہ کہانی لکھی ہے بہت سے افسانوں کے علاوہ معروف ———

لکھنے والوں میں ہوں۔ ایک آدھ ناول بھی ہے دوسرے ہندی زبان میں چند کتابیں بھی مختلف موضوعات پر لکھ چکا ہوں۔ بلکہ کہانی پسند آئے گی اور چھپے گی ——— آپ کی رائے کا منتظر ہوں۔ اگر یہ کہانی بیسویں صدی میں جگہ پا سکی تو بیسویں صدی کے قارئین کی رائے بھی جاننا چاہوں گا ...

نیازمند ——— کیول دھیر

[illegible]

شیکھر کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

[illegible]

لوگ ایک گہری نگاہ ڈال ... بیتا اکثر پوچھ رہی تھی۔

[illegible]

... کے بس کی بات نہیں ہے۔"

حدیثِ دل

بات بھی آپ کے آگے نہ زباں سے نکلی
لیجیے آئے تھے ہم سوچ کے کیا کیا دل میں ——— وزیر علی صبا

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا ——— وزیر علی صبا

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم ——— مومن

اک لحظہ سینہ کوبی سے فرصت نہیں ہمیں
یعنی کہ دل کے جانے کا ماتم بہت ہے یاں ——— میر

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں، یاد سی آکے رہ گئیں ——— فراق گورکھپوری

مرسلہ: ایس۔ ایس۔ جھنکاری۔ ایم۔ اے۔ کلکتہ

"میں تم سے نریش کے بارے میں پوچھ رہی تھی" مالتی نے ریتا کی بات کو جیسے سُنا ہی نہیں۔

"نریش!" ریتا ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئی جیسے اچانک ہی برف پر ہاتھ رکھ دیا ہو اور اس کی ٹھنڈک سے اعصاب بے حس ہو گئے ہوں۔ "نریش سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی" ریتا کی دھیمی آواز میں درد پنہاں تھا۔

"تم نے اس کے بارے میں کچھ سوچا بھی نہیں؟"

"کئی بار ——— لیکن بہت دن پہلے۔ اب میں نے اپنے جذبات کو کچل ڈالا ہے۔ میں کبھی کچھ بھی نہیں سوچتی۔ سوچنا چاہتی ہی نہیں" ریتا کے چہرے کی اُداسی میں سلوٹیں اُبھر آئی تھیں جیسے جذبات کے اُمڈتے اُبھرتے طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ اپنی ساری طاقت لگا رہی ہو۔

"تو ایسی زندگی تمہیں بوجھ معلوم نہیں ہوتی ریتا؟" مالتی دیکھ رہی تھی کہ ریتا اب بھی طوفان میں اُلجھی ہوئی ہے۔ غیر شعوری طور پر اُس کا جسم تن گیا تھا اور سانسوں میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس کے ہاتھ ساڑی کے آنچل سے کھیل رہے تھے اور آنکھوں کی سُرخی نمایاں ہو گئی تھی۔ جیسے شعلے ناچ رہے ہوں اور چاروں طرف سے اُن میں گھری ریتا فرار ہونے کے لئے بے چین ہو۔

"بوجھ!" محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ایک لفظ کہنے کے لئے ریتا کو بہت جدوجہد کرنی پڑی ہو۔ "میں یہ بھی سوچنا نہیں چاہتی مالتی کہ زندگی مجھ پر بوجھ ہے یا میں زندگی پر بوجھ ہوں ——— میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی" جیسے یکایک ریتا کی آواز میں تلخی بھر گئی ہو۔ جیسے پوری شدت سے ساتھ اس نے اپنے دبے ہوئے جذبات پر ایک کاری ضرب لگانے کی کوشش کی ہو جیسے۔

ریتا نڈھال سی ہو کر صوفے کی پُشت پر گر گئی۔ اس کے اعصاب کا تناؤ ختم ہو گیا تھا تھکے ماندے سانسوں کا اُتار چڑھاؤ اس کی شکست کا احساس دلا رہا تھا۔ ریتا کی بھیگی آنکھیں بہنے لگی تھیں اور جذبات کا طوفان اس کے احساسات کو کُریدنے لگا تھا۔

چھ سال پہلے نریش اور ریتا کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔ کافی ہاؤس میں ریتا پانچ بجے سے اس کی منتظر تھی لیکن چھ بجے تک بھی وہ نہیں آیا تھا۔ ریتا بار بار گھڑی کی طرف دیکھتی اور اس کی جھنجلاہٹ بڑھتی جاتی۔ اُسے نریش پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ آج یہاں وہ اپنی زندگی کے بارے میں ایک اہم فیصلہ کرنے والے تھے اور پھر نریش ہی نے پانچ بجے شام کو کافی ہاؤس میں ملنے کی بات کہی تھی لیکن وہی ابھی تک نہیں آیا تھا۔

ریتا اور نریش کی دوستی زیادہ پُرانی نہیں تھی لیکن ایک سال کا عرصہ بھی تو کچھ کم نہیں ہوتا۔ ایم۔ اے فائنل اُنھوں نے ایک ساتھ کیا تھا۔ ریتا ابتدا ہی سے اس کالج میں تعلیم حاصل کرتی آرہی تھی لیکن نریش نے آخری سال یہاں داخلہ لیا تھا اور اسی دوران میں دونوں کے تعلقات کافی بڑھ گئے تھے۔

... نے دوسری بار کافی کا آرڈر دیا اور اس خیال سے کرسی کی پُشت پر جھک گئی کہ شاید اسی دوران میں نریش آجائے۔ وہ خاص طور سے آج کی اس ملاقات کے لئے تیاری کر کے آئی تھی۔ آج اُسے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کیا وہ دونوں زندگی کے ساتھی بن سکتے ہیں؟ یہ سوچتے ہوئے وہ اپنے ماضی کی یادوں میں کھو سی گئی۔ اُس کی ماں بہت سال پہلے مر گئی تھی۔ شاید وہ سات برس کی تھی۔ باپ نے دوسری شادی نہیں کی ——— کیوں؟ اس سوال پر آج تک اُس نے غور نہیں کیا تھا۔ اُس کی پرورش نوکروں کے ہاتھوں میں ہوئی تھی۔ ڈیڈی میں بھی اُسے کبھی کوئی خاص دلچسپی پیدا نہیں ہو سکی تھی کیونکہ وہ اپنے لاکھوں کے کاروبار میں بے حد مصروف رہتے تھے اور اکثر باہر ہی رہتے تھے۔ ریتا جب کالج میں داخل ہوئی تو یہ ماحول اُسے بے حد پسند آیا۔ یہاں ہر طرح کی آزادی تھی۔ ایک وسیع تالاب تھا جہاں بلا روک ٹوک ایک مچھلی کی طرح بہاؤ میں بہا جا سکتا تھا۔ اُس کے گھر کا ماحول بھی یہاں سے مختلف نہ تھا اور اس بہاؤ میں ریتا بہتی چلی گئی۔ حالات اور ماحول نے اُس کی شخصیت کو شوخی، چنچلتا اور ضد کے ملے جُلے دلکش رنگوں سے سنوارا۔ حسین تو وہ تھی ہی۔ آزادی اُسے میسر تھی۔ ہر خواہش کی تکمیل ہوتی تھی۔ جوان جذبات انگڑائیاں لیتے تھے۔ ہر لمحہ مستی و رعنائی میں سرشار تھا ——— معصوم خیالوں میں زندگی کے مسرور کُن اور حسین ارمان مچلتے نظر آتے تھے۔ ریتا کی حسین، شوخ اور جوان شخصیت نئی تہذیب کا شاہکار بن گئی تھی۔

کالج کے در و دیوار ریتا کے قہقہوں سے گونج گونج اُٹھتے تھے۔ یہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں اُس کی دلچسپیاں نمایاں تھیں۔ اُس کا ہر انداز جوان دلوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ کتنے قدم اُس کی طرف بڑھتے تھے۔ کتنی نگاہیں اُس کا پیچھا کرتی تھیں اور کتنی زبانیں اُس سے

پہلے کلام ہونے لگے سے بیقرار نظر آتی تھیں اور ریتا سب کا شیریں مسکراہٹ سے خیر مقدم کرتی تھی۔

جب وہ بی۔ اے میں داخل ہوئی تو زندگی میں پہلی بار اُس کا انداز بدلا۔ پہلی بار اُس کے جذبات میں چھپا ہوا طوفان نظر آیا اور پہلی بار اُس کی دھڑکنوں نے محبت کے ساز پر تھرکنا چاہا۔ یہ ویریندر تھا جو پہلی بار ریتا کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ جتنی تیزی سے ریتا میں یہ تغیر پیدا ہوا تھا اُس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اُس کے جذبات نے ویریندر سے محبت کی تھی۔ ویریندر کی باتوں میں ریتا نے جذبات کو تسکین عطا کرنے والی مٹھاس کا احساس کیا تھا۔ اُس کی محبت میں اُس نے آرزوؤں کی تکمیل کی جھلک دیکھی تھی اور اُس کی پُروقار شخصیت میں اُس نے عظمت کا احساس کیا تھا۔

ریتا نے ویریندر کے ساتھ نہایت شدت سے محبت کی۔ ہر لمحہ اُس کے قرب میں گزرا۔ لیکن جب جذبات کی گرمی کچھ ماند پڑی، دھڑکنیں معمول پر آئیں اور ہیجان ختم ہو کر شدت کا اثر کم ہو گیا تو ویریندر کے مقابلے میں ریتا نے راکیش میں کشش محسوس کی۔ اُس کے احساس نے راکیش کی آنکھوں میں محبت کی روشن شمعوں کی جھلک دیکھی اور اُس کے جذبات ایک بار پھر مچل اُٹھے۔ ایک بار پھر وہ نئے انداز میں ڈوبتی چلی گئی ——— اور جب چند ماہ بعد پہلے جذبات تھم گئے تو ریتا راکیش سے بھی الگ ہو گئی۔ اُسے ٹھہراؤ پسند نہ تھا، وہ دل کی دھڑکنوں کو محبت کی آنچ پر رقصاں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہر لمحہ محبت کی ایک حسین داستان بن جائے۔ ایسی محبت جس میں جذبات مچلتے رہیں، طوفان ہیجان بپا کرتے رہیں، دھڑکنیں تڑپتی رہیں اور جوش و شگفتگی جنم لیتی رہے۔

مالتی ریتا سے کافی نزدیک تھی۔ ہمراز بھی تھی۔ اُس نے بارہا ریتا کو جھنجوڑنے کی کوشش کی تھی۔ بارہا اُس نے کہا تھا کہ تم زندگی کے بھیانک راستوں پر چل رہی ہو لیکن ریتا مالتی کی اِن باتوں کو دقیانوسی کہہ کر اُس کا مذاق اُڑاتی تھی۔

مالتی کی باتوں کا خیال آتے ہی ریتا زیرِ لب مسکرائی اور کرسی کی پُشت سے اپنا سر اُٹھا کر میز پر جھک گئی۔ خیال آیا کہ بیرا شاید بہت دیر سے کافی سرو کر چکا ہے۔ پیالہ اُٹھا کر اُس نے کافی کی ایک چُسکی لی۔ کافی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو محسوس ہوا کہ بہت سے نئے لوگ ہال میں موجود ہیں۔ کچھ سوچ کر وہ مسکرا دی۔ شاید خیال پیدا ہوا تھا کہ لوگ اُسے اِس حالت میں دیکھ کر کیا سوچتے رہے ہوں گے؟ اُس نے سر کو ہلکا سا ایک جھٹکا دیا۔ شاید اپنے اِسی خیال کو جھٹک دینے کی کوشش تھی۔ نریش کا خیال آتے ہی چونک کر اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے چھ بج رہے تھے اور نریش کا پتہ نہ تھا۔ اُس کا دل چاہا اُٹھ کر چلی جائے لیکن پھر خیال ہوا وہ اِس وقت جائے گی کہاں؟ گھر؟ نہیں! شاید ہی کبھی وہ شام کے اوقات میں گھر پر رہی ہو! تو کیا مالتی کے یہاں؟ ——— نہیں! وہاں بھی نہیں۔ کیونکہ مالتی ہی کے یہاں سے تو وہ سیدھی کافی ہاؤس آئی تھی۔ مالتی کو معلوم تھا کہ آج وہ نریش سے شادی کے بارے میں فیصلہ کرنے والی ہے۔ اُس نے سوچا بہتر ہے کچھ وقت اور یہیں گزارا جائے۔ شاید نریش

فسانۂ ہجر

کیا سُناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے مہر پہ مرنے سے تو آساں ہوگا ——— مومن

وصل کی شب بھی تو کس درجہ سبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے ——— فیض احمد فیض

بعد مُدت کے تیرے ہجر میں کچھ
آج بیٹھا ہوں دل کو سمجھانے ——— فراق گورکھپوری

ہجر کی شب گزر گئی پھر بھی اثر یہ حال ہے
سامنے آفتاب ہے اور کہیں روشنی نہیں ——— اثر رامپوری

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گزری، وہ رات رات ہوئی ——— فراق گورکھپوری

مرسلہ: ایس۔ ایس۔ ہنکاری۔ ایم۔ اے۔ کلکتہ

آ ہی جائے۔ اِس فیصلے پر پہنچنے کے بعد ریتا نے ایک بار پھر ہال کا جائزہ لیا۔ دائیں طرف کارنر میں ایک میز خالی تھی۔ شور بھی وہاں کچھ کم تھا اور ریتا بیرے کو اشارہ کر کے کارنر کی میز کی طرف بڑھ گئی۔

وہ پھر ماضی میں گم ہو گئی تھی۔

نریش نے جب ایم۔ اے فائنل میں داخلہ لیا تو پہلے ہی دن لائبریری میں ریتا اُس سے ٹکرا گئی۔ نریش نے اپنے لئے ایک کتاب حاصل کی تھی۔ رجسٹر پر ابھی وہ دستخط کرنے ہی والا تھا کہ ریتا بھی وہاں آ پہنچی۔ شاید اُسے بھی اِسی کتاب کی ضرورت تھی۔

"یہ کتاب تو میں اِن کے نام اِشو کر رہا ہوں۔ اِس کی دوسری کوئی جلد یہاں موجود نہیں ہے" لائبریرین نے نہایت انکساری سے نریش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ریتا نے سر سے پاؤں تک نریش کا سرسری جائزہ لیا اور پھر لائبریرین سے مخاطب ہوئی۔

"یہ فلسفی اِس کتاب کو پڑھے گا؟" اور ساتھ ہی ماحول میں مختلف آوازوں کا مِلا جُلا قہقہہ بلند ہوا۔ "میرے نام پر یہ کتاب اِشو کرو" ریتا کے الفاظ میں طنز تھا اور انداز میں رعب! لائبریرین عجب تذبذب میں پڑ گیا۔ کبھی وہ نریش کی طرف دیکھتا اور کبھی ریتا کی طرف۔ لائبریری ہال میں موجود بہت سے طالب علم بھی یہ تماشہ دیکھنے کے لئے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ نریش نے لائبریرین کو اِس حالت میں دیکھا تو زیرِ لب مسکرا دیا اور کتاب ریتا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔



"یہ کتنا اچھا ہے۔ کسی کی آواز میں بےحد ملائمیت تھی۔ ہر لفظ میں ٹھہراؤ تھا۔ جیسے ریتا کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کا کوئی اثر اُس پر نہ ہوا ہو۔

"کتنا بور ہے یہ!" ریتا نے اسے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتی ہوئی پوچھتی۔ اُس نے نریش سے شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔

اُس دن ریتا نے مالتی سے باتیں کرتے ہوئے کہہ دیا "نریش یا تو واقعی فلسفی ہے یا ایک بہت پیاری شخصیت!"

"کیا فلسفی لوگ پیاری شخصیت کے مالک نہیں ہوتے؟" مالتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہوتے ہوں گے لیکن میرے لئے نہیں۔ میں کسی فلسفی سے چند منٹ بات تک نہیں کر سکتی۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے کوئی مُردہ سامنے کھڑا ہو۔"

مالتی مسکرا دی اور آہستہ سے بولی۔

"اگر نریش فلسفی نہ ہوا تو تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

ریتا نے گہری نظروں سے مالتی کی طرف دیکھا اور جواب میں اُس کا رخسار مسل دیا۔

نریش کی شخصیت پر سنجیدگی کی جھلک نمایاں تھی لیکن وہ فلسفی قطعی نہیں تھا۔ اُس کی آواز میں بےحد نرمی تھی، مٹھاس تھی اور کشش تھی۔ ہونٹوں پر ہمیشہ ایک سنجیدہ مسکراہٹ کھیلی رہتی۔ اُس کا ہر انداز نہایت مہذب و باسلیقہ تھا۔ اُس کی سنجیدہ شخصیت پُروقار تھی اور کالج کے ماحول میں نریش اپنے انداز کی منفرد اور پیاری شخصیت کا مالک تھا۔

ریتا کی دلچسپی نریش میں بڑھ رہی تھی اور ساتھ ہی وہ ایک عجیب سی تبدیلی اپنے آپ میں محسوس کر رہی تھی کہ اس حقیقت کا اظہار وہ نریش پر کیسے کرے۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُس کے جذبات محبت کے طوفان میں گھر گئے ہیں لیکن اس طوفان میں کسی طرح کا ہیجان نہیں روح کو تسکین عطا کرنے والا ٹھہراؤ ہے۔ نریش سے وہ باتیں کرتی تو اُس میں پہلی سی شوخی نہ ہوتی، وہ اُس سے مرعوب سی نظر آتی۔ یہ ساری باتیں ریتا کی ضد اور شوخ طبیعت کے بالکل برعکس تھیں۔ اُسے یہ احساس بھی تھا۔ پھر بھی اُس کے جذبات نریش سے محبت کے لئے پاگل ہوتے جا رہے تھے۔ مالتی نے ریتا کی یہ حالت دیکھ کر اُسے کہا تھا۔

"سچ مانو ریتا! زندگی میں پہلی بار تمہارے قدم صحیح راستے پر بڑھے ہیں۔ آج تک تم صرف محبت کا کھیل ہی کھیلتی رہی ہو۔ محبت ایسا جذبہ نہیں ہے جو جذبات کو بھڑکا کر ہیجانی کیفیت پیدا کر دے۔ محبت وہ عظیم جذبہ ہے جو جذبات میں ہلچل تو پیدا کرتا ہے لیکن اس میں ہیجان نہیں، ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ اس میں جھلسا دینے والی آگ کے بھڑکتے شعلے نہیں، میٹھی آنچ کی مسرور کُن تپش ہوتی ہے۔ اس راستے پر سنبھل کر چلنا ورنہ زندگی بھر محبت کے لئے ترستی رہو گی۔"

ریتا نے مالتی کو کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن اُس کی کھلی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ ضرور اپنی زندگی کی منزل تک پہنچ سکے گی۔

وقت نے آہستہ آہستہ الجھی گتھیاں سلجھا دیں اور ریتا کو اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل ہوئی۔ نریش نے ریتا کے جذبات کو محبت بخشی تھی اور ریتا محسوس کر رہی تھی کہ مالتی کے خیالات غلط نہیں تھے۔ اِن میں گہرائی ہے، حقیقت ہے۔ نریش کی محبت میں قلبی تسکین تھی اور ایک ایسا خمار تھا جو ہر لمحہ روح کو راحت بخشتا تھا۔ ریتا پر اس کا ایک اثر یہ بھی ہوا تھا کہ اب وہ شوخ تتلی نہیں رہ گئی تھی، کھِلی ہوئی اور سنجیدہ شخصیت بن گئی تھی۔ اِس ٹھہراؤ اور سنجیدگی نے اُس کے حُسن کو بھی دوبالا کر دیا تھا۔

ایم۔ اے فائنل کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد مالتی نے ریتا کو مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

"ریتا! تمہاری تعلیم اب مکمل ہو گئی ہے۔ ہر ہندوستانی عورت کی طرح تمہیں بھی بیاہ کرنا ہی ہے۔ جیون ساتھی ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اِس لئے اب جلدی ہی بیاہ کر لو۔"

"ہو جائے گا مالتی دیوی! لیکن تم کیا سوچ رہی ہو؟"

"جو رائے تمہیں دے رہی ہوں!" مالتی اپنی ہی بات پر شرما گئی "ڈیڈی میرے لئے آج کل لڑکے کی تلاش میں ہیں۔" ریتا نے اُس کے چٹکی کاٹ لی اور بولی۔

"اپنے ڈیڈی کو تو فکر ہے ہی نہیں۔ انھیں تو صرف بتا دینے کی ضرورت ہے کہ میں شادی کر رہی ہوں۔ نتیجہ نکل جائے اِس کے بعد پروگرام بنا کر ڈیڈی کو اطلاع کر دوں گی۔"

"لیکن ایک بات اور ہے ریتا! جب تمہارے ڈیڈی کو یہ معلوم ہوگا کہ تم ایک ایسے نوجوان سے بیاہ کر رہی ہو جس کا کوئی بنک بیلنس نہیں، کوئی روزگار نہیں اور جو صرف ایم۔ اے ہے اور کسی اخبار میں سب ایڈیٹر رہ کر اپنی تعلیم کے اخراجات پورے کرتا رہا ہے تو کیا وہ اعتراض نہیں کریں گے؟"

"ڈیڈی کو اعتراض تو نہ ہونا چاہئے لیکن اگر ہوا بھی تو اِس بات سے وہ مطمئن ہو جائیں گے کہ لڑکا ایم۔ اے ہے اور جلد ہی کسی کالج میں پروفیسر ہو جائے گا۔"

اور جب ایم۔ اے کا نتیجہ نکلا تو نریش، ریتا اور مالتی تینوں ہی کامیاب ہو گئے تھے۔ تینوں کی ملاقات ہوئی تھی اور باتوں ہی باتوں میں یہ طے پایا تھا کہ اب نریش اور ریتا کسی دن شادی کا فیصلہ کر لیں۔ نریش نے آج کافی ہاؤس میں ملنے کا وعدہ کیا تھا اور ریتا بےچینی سے اُس کی منتظر تھی۔

گھڑی پر نظر پڑتے ہی ریتا بُری طرح چونک اُٹھی۔ ساڑھے سات بج چکے تھے۔ ہال کے ایک کارنر میں جس میز پر وہ تھی، وہاں روشنی بہت کم ہو گئی تھی۔ شاید کوئی نقص ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے اس طرف اِردگرد کی کچھ میزیں بے رونق پڑی تھیں۔ کافی ہاؤس کے وسیع ہال کے دوسرے سبھی حصّوں میں کافی گہما گہمی تھی۔ ریتا کی نظریں بےدلی سے ہال کا

جائزہ لے رہی تھیں کیونکہ اب اُسے یقین سا ہو گیا تھا کہ نریش نہ آئے گا۔ اُس پر بُری طرح سے جھنجلاہٹ طاری تھی اور طرح طرح کی باتیں اُس کے ذہن پر نشتر زنی کر رہی تھیں۔ اُس کے دل میں یہ جذبہ بھی سر اُبھار رہا تھا کہ نریش شاید مجھ سے شادی نہ کرنا چاہے گا۔ جبھی تو خود ہی پروگرام طے کرنے کے بعد بھی وہ آیا نہیں۔ اِس جذبے کو وہ جتنا دبانے کی کوشش کرتی کہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا! کسی دوسری وجہ سے وہ نہ آ سکا ہوگا، اُتنی ہی شدّت سے یہ جذبہ سر اُبھارتا۔ اور ——————

اچانک ہی ریتا کی نگاہیں کونے کی ایک میز پر بیٹھے نریش پر پہنچ کر جم سی گئیں !! اُسے خوشی سے پاگل ہو جانا چاہیئے تھا لیکن اُس پر تو جیسے کسی نے وزنی پتھر دے مارا ہو۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ نریش کے ساتھ ایک جوان لڑکی تھی جس سے وہ مُسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔

ریتا تیز قدموں سے کافی ہاؤس سے باہر چلی گئی۔ نریش نے شاید اُسے دیکھا نہیں۔

———— ❖ ————

ریتا کی زندگی پر اِس حادثہ کا گہرا اثر ہوا۔ اُس کے جذبات مجروح ہو چکے تھے۔ نریش کے ساتھ کسی لڑکی کو دیکھ کر اُس کا شک یقین میں بدل گیا تھا کہ وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ اُس کے ذہن پر کاری ضرب لگی تھی اور اِس درد سے وہ تلملا اُٹھی تھی۔ کافی ہاؤس سے نکل کر غیر ارادی طور پر اُس کے قدم گھر کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ اُسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ پیدل ہی چل رہی ہے۔

وہ ساری رات جاگتی رہی۔ ایک پل کو آنکھوں میں نیند نہ آئی۔ اُس کی آنکھوں میں طیش اور غصّے کی آگ دہک رہی تھی۔ اُس کی ضدی فطرت بیدار ہو گئی تھی۔ کافی ہاؤس سے آنے کے بعد جو چوٹ، جو درد اُسے ملا تھا اب وہ باقی نہیں رہا تھا۔ اُس کی حالت زخمی شیرنی جیسی تھی جو مدِمقابل پر جھپٹنے کے لئے تلملا رہی ہو۔ اِسی جنونی کیفیت میں نہ جانے کیا سوچ کر ریتا نے یہاں سے کہیں دُور چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اور دُوسری صبح ریتا اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ کسی نامعلوم جگہ کو روانہ ہو چکی تھی۔

———— ❖ ————

چھ سال بعد آج اچانک ہی مالتی ریتا سے آملی تھی۔ مالتی اپنے شوہر کے ساتھ کسی عزیز کی شادی میں شریک ہونے کے لئے کل ہی کانپور آئی تھی اور یہاں شادی کی اِس تقریب میں ریتا کو دیکھ کر وہ خوشی سے جیسے پاگل ہو اُٹھی تھی۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ریتا اُس کے سامنے ہے! جب بمبئی سے وہ روانہ ہوئی تھی تو اُس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ کانپور میں ریتا سے ملاقات ہو جائے گی۔

ریتا بمبئی سے دہلی اور پھر الہ آباد پہنچی تھی جہاں گورنمنٹ کالج میں بطور پروفیسر اُسے جگہ مل گئی تھی۔ دو سال بعد اُس کا تبادلہ کانپور کو ہو گیا تھا اور تب سے وہ یہیں تھی۔ یہاں ریتا اپنی ایک اسٹوڈنٹ کی شادی کے سلسلے میں آئی تھی اور اُسے مالتی مل گئی تھی۔ ریتا اپنے ساتھ ہی مالتی کو گھر لے آئی اور دونوں ہی گھنٹوں ماضی کی یادوں میں کھوئی رہیں۔

جب ریتا نے بمبئی چھوڑنے کے بارے میں مالتی کو بتایا تو وہ رو سی دی۔

”ریتا! تمھاری اِس چھوٹی سی غلط فہمی نے صرف تمھاری ہی زندگی کو ویران نہیں بنا دیا، نریش کی زندگی بھی خزاں کی نذر ہو گئی“ مالتی نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ”تمھارے غائب ہو جانے کے چند ہی دن بعد نریش نے بھی بمبئی چھوڑ دی تھی اور آج تک معلوم نہیں وہ کہاں ہے؟“

”لیکن مالتی! کیا نریش نے مجھے دھوکا نہیں دیا؟ کیا کسی اور سے وہ محبت نہیں کرتا تھا؟“

”نہیں ریتا —— نہیں! وہ لڑکی بے سہارا تھی اور کسی طرح بھٹکتی ہوئی اخبار کے دفتر میں آپہنچی تھی جہاں نریش سے ملاقات ہو گئی۔ اُس بے سہارا لڑکی کی مدد کے لئے وہ اُسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ تمھارے بمبئی سے جانے کے چند ہی روز بعد نریش بھی نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ لیکن وہ معصوم لڑکی آج بھی بمبئی میں ہے اور ڈیڈی نے اُسے اپنے ہاں پناہ دے دی ہے۔“

ریتا رو دی —— روتی رہی۔ مالتی کی آنکھیں بھی چھلک آئیں۔ ماحول کی خاموشی خود ایک داستان بن گئی تھی۔ ناکام حسرتوں کی ایک غمناک داستان! دونوں کی پلکوں پر چمکتے آنسو بیتی زندگی کی یاد بن کر جھلملا رہے تھے۔

———— ❖ ————

مالتی چند دنوں کے بعد چلی گئی تھی لیکن ریتا کی زندگی میں ایک عجیب سی ہلچل مچا گئی تھی۔ وہ کہانیاں جنھیں ریتا دفن کر چکی تھی، اچانک ہی اُبھر آئی تھیں اور اِن کے اُبھرنے سے حقیقت کے نقش واضح ہو گئے تھے۔ ریتا کو اپنی غلطی کا احساس ستانے لگا تھا اور وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اُسی کی وجہ سے نریش کی زندگی کے روشن چراغ بجھ گئے ہیں اور نہ جانے وہ کہاں اور کن اندھیروں میں بھٹک رہا ہے؟

کانپور کے اِس ماحول سے بھی اُسے کوئی اُنسیت باقی نہیں رہی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کہیں اور چلی جائے۔ بمبئی جانے کے لئے تو وہ کسی حالت میں تیار نہیں تھی۔ مالتی کے بارہا مجبور کرنے پر بھی وہ رضامند نہ ہوئی تھی اور ہر بار اُس نے ایک ہی بات کہی تھی ”وہاں جا کر میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔“

اور ریتا نے تبادلہ کے لئے درخواست دے دی۔ سالانہ تبادلہ کا موقع تھا اور اُسے یقین تھا کہ اُس کی درخواست منظور کر لی جائے گی۔ پرنسپل کے علاوہ کوئی بھی [illegible]

واقف نہ ہوا تھا اور یہی ریتا کی خواہش تھی۔

لیکن یہ زمانہ راز نہ رہا۔ کالج ہی میں نہیں شہر کے مختلف حلقوں میں بھی ریتا سے تبادلہ کا چرچا تھا اور اس کی وجہ اس کی ہر دلعزیزی تھی۔ ریتا کا تبادلہ منسوخ ہوگیا تھا اور اس کی جگہ کوئی اور صاحب آنے والے تھے۔

آج صبح ہی ریتا جب کالج آئی تو اسے خبر ملی کہ ان کی جگہ کوئی پروفیسر آگئے ہیں اور پرنسپل کے کمرے میں ان سے بات چیت کر رہے ہیں۔ ریتا پرنسپل کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ نمسکار کے لئے ہاتھ اٹھے ——— اور . . .

اس کا جسم کانپ کر رہ گیا۔ پیر زمین پر لڑکھڑا گیا۔ اس کی جگہ جو نئے پروفیسر آئے تھے وہ کوئی اور نہیں، نریش تھا ——— نریش ———!!

غزل

پروفیسر عبدالرب عرفان ایم۔ اے

کوئی زہرہ جمال ہے، میں ہوں
میرا حسنِ خیال ہے، میں ہوں

مسئلہ ہے نباہ کا تم سے
زندگی کا سوال ہے، میں ہوں

"تو اور آرائشِ خمِ کاکل"
انتشارِ خیال ہے، میں ہوں

اُف یہ دورِ ثوابت و سیار!
گردشِ ماہ و سال ہے، میں ہوں

اُن سے عرضِ وفا خدا کی پناہ!
ایک نازک سوال ہے، میں ہوں

دل میں طوفاں، لبوں پہ مہرِ سکوت
حسرتِ عرضِ حال ہے، میں ہوں

عشق میں اپنی کائنات ہی کیا
اِک جہانِ ملال ہے، میں ہوں

اُن سے عرفان اور امیدِ وفا
اِک فریبِ خیال ہے، میں ہوں

غزل

راہی قریشی ایم۔ اے

تری نگاہِ کرم کی یہ روشنی اے دوست
مٹا گئی ہے مرے غم کی تیرگی اے دوست

مہک اٹھی تھی جو تیرے بدن کی خوشبو سے
مری حیات کا حاصل ہے وہ گھڑی اے دوست

ترا وجود مجسم بہار ہے، لیکن!
یہ چشمِ ناز ہے کس غم میں شبنمی اے دوست

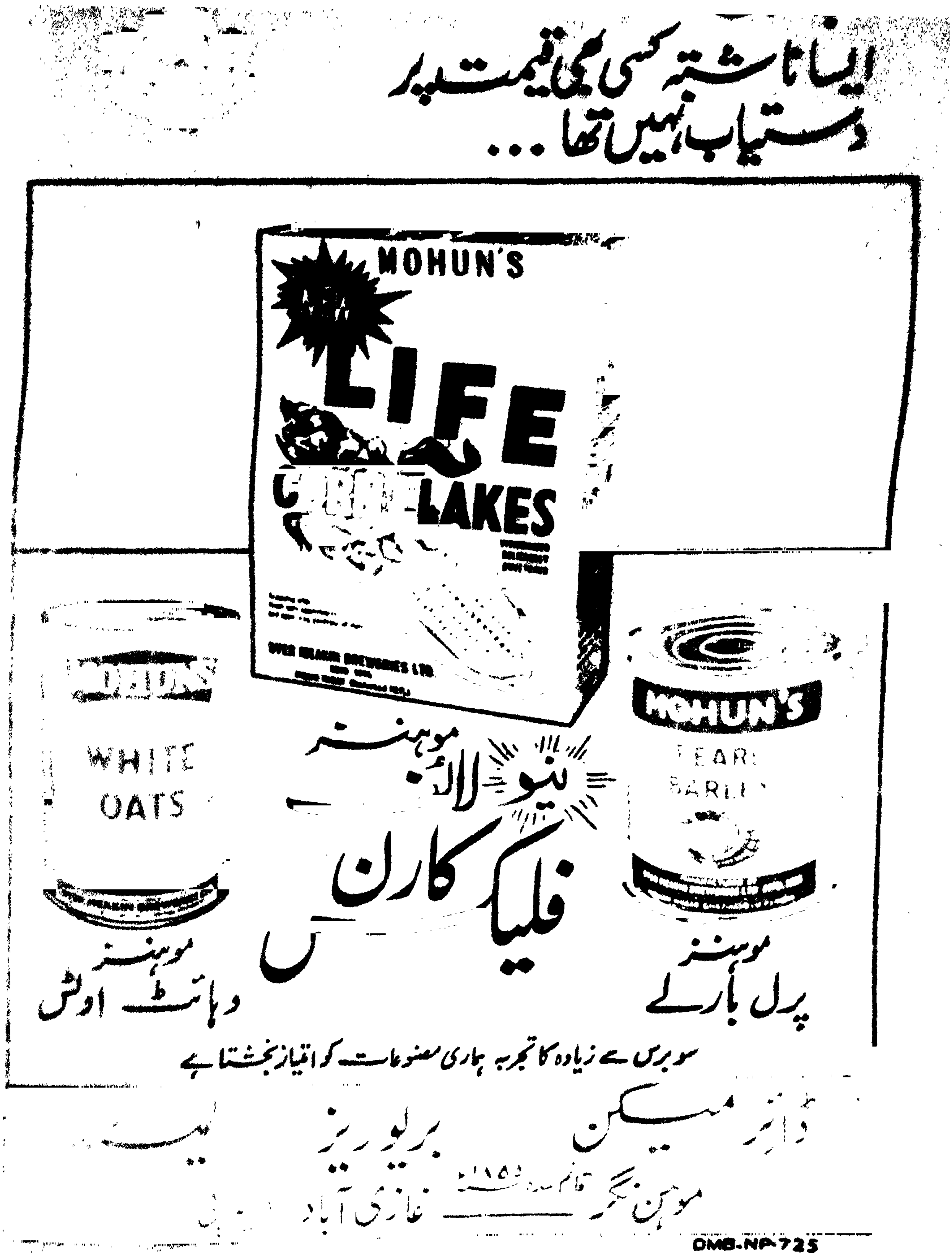
کوئی نہیں ہے زمانے میں قدرداں، ورنہ
عجیب شے ہے طبیعت کی سادگی اے دوست

ہزار شکر کہ دل کے سیاہ خانے میں
کھلی ہے تیرے تصور کی چاندنی اے دوست

یہ تیرے قرب کا عالم، عجیب عالم ہے
کہ میری سانس بھی اب ہے رُکی رُکی اے دوست

ابھی تو میرے فسانے کی ابتدا ہے، مگر
یہ تیری آنکھ میں کیوں آگئی نمی اے دوست

سنا ہے ہم نے، دیارِ وفا میں راہی کو
کہیں متاعِ تبسم نہ مل سکی اے دوست



ایسا ناشتہ کسی بھی قیمت پر
دستیاب نہیں تھا...
MOHUN'S
LIFE
LAKES
MOHUN'S
WHITE
OATS
MOHUN'S
موہنز
نیو لائف
فلیکس کارن
موہنز
وہائٹ اوٹس
موہنز
پرل بارلے
سو برس سے زیادہ کا تجربہ ہماری مصنوعات کو امتیاز بخشتا ہے
ڈائر میکن بریوریز لمیٹڈ
قائم شدہ ۱۸۵۵ء
موہن نگر ——— غازی آباد
DMB-NP-725

شعلۂ غم

شیب ردولوی۔ ایم، اے

لائبریرین، سینٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ رڑکی (یو۔پی)

۳ اگست ۶۵ء   پیارے بھائی اخلاص و محبت

. . . آپ نے پوسٹل ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے میں اُس سے بالکل متفق ہوں۔ اِس دور میں جب انسان چاند ستاروں تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہے، اخلاق روز بروز گرتی جارہی ہیں آخر ایسا کیوں ہے؟ ——

ایک کہانی "شعلۂ غم" حاضر ہے۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ اپنے رسالے میں جگہ دے کر نوازئیے گا —— افسانہ نمبر میں میری جو کہانی شائع ہوئی تھی اُس پر بہت سے تاثرات موصول ہوئے ہیں۔ آہستہ آہستہ سب کو جواب دے رہا ہوں۔ اِس کہانی پر بھی قارئین کی آراء کا منتظر رہوں گا . . .

نیازمند —— شیب ردولوی

"بات تو صرف جلنے کی ہے"

"لیکن نوعیت میں فرق ہے"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"جب شمع جلتی ہے تو پتنگا جل مرتا ہے اور جب دل جلتا ہے تو جان پر بن جاتی ہے"

"شمع کے جلنے پر پتنگا جل مرتا ہے لیکن دل جلنے پر انسان نہیں مرتا"

"یہ محض آپ کا خیال ہے۔ دل جلنے پر انسان بجھ جاتا ہے اور جب انسان بجھ جاتا ہے آرزوئیں مٹ جاتی ہیں، حوصلے ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ بس چلتی پھرتی لاش ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ حسرتوں اور ناکامیوں کا کفن اوڑھ لیتا ہے"

"تمھاری بات کچھ اُلجھی ہوئی ہے"

"آپ تو صرف بات کو کہہ رہے ہیں، یہاں تو زندگی ہی اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ بارہا اسے سلجھانے کی کوشش کی لیکن یہ اور اُلجھتی گئی —— ذہنی اُلجھنوں کے ہوتے ہوئے زندگی کا اُلجھ جانا کوئی نئی بات نہیں"

"یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں"

"یہ دل کے معاملے ہیں۔ آپ کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ مجبوریاں اور حسرتیں کتنی اذیت ناک ہوتی ہیں، آپ کیا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ آپ بڑے آدمی ہیں۔ آپ کے پاس بڑی بڑی کوٹھیاں اور چمکتی دمکتی کاریں ہیں۔ اُن میں حسرتوں اور مجبوریوں کا کہاں گزر؟ یہ تو ہم لوگوں کا حصہ ہیں، ہم سب کا مقدر!"

"مگر بات تو کچھ اور ہی تھی"

"وہ بات ہی کچھ ایسی ہے جس کے خیال ہی سے حسرتیں اور مجبوریاں مجسم بن کر سامنے آجاتی ہیں اور دل پھر جلنے لگتا ہے۔ کاش یہ ایک بار جل کر راکھ ہو جاتا لیکن یہ ہے کہ سُلگ سُلگ کر جلتا ہے۔ اُف یہ درد! یہ اذیتیں!!"

"سلسلہ وہیں پر رہ گیا"

"جانے کیا بات ہے۔ آج تو جی میں یہ آرہا ہے کہ دل کا ہر داغ نمایاں کردوں، ہر زخم کو زبان دے دوں لیکن سکون پھر بھی نہ ملے گا۔ آج میرے درد بول اُٹھے ہیں۔ میرا دل آپ بیتی سُنائے گا اور آپ کو صرف سُننا ہے۔

"وہ لڑکی نہیں ایک دیوی تھی جسے میں نے من کے سُنہرے مندر میں بٹھایا تھا۔ وہ مجھ پر بہت مہربان تھی۔ آپ جانتے ہیں جب دیوی مہربان ہو جائے تو دُکھ کیسا؟ جلن کیسی؟؟ اُس نے ظلم کرنا سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ جانتی ہی نہ تھی کہ ظلم و ستم کسے کہتے ہیں لیکن زمانہ نے ظلم و ستم کے لئے اسی کو تختۂ مشق بنا ڈالا۔ آپ کے سماج نے زیادتی کرنے کے لئے اُسے نشانہ بنایا جو اُس سے بے خبر تھی۔ آپ کی ماڈرن سوسائٹی نے اُس پر ایسی ایسی بجلیاں گرائیں کہ اُس کے مندر کے ساتھ ساتھ اُس کا وجود بھی جل کر خاک ہو گیا۔ وہ اتنا روئی کہ ظالم آسمان بھی رو پڑا، زمین کا سینہ بھی نم ہو گیا

لیکن آپ کے اِن اُبھرتے ہوئے سماج پر اِس کی کیسی کچھ اثر نہ ہوا ــــ یہ کیسا سماج ہے آپ کا؟"

"تم شاید میری ایک بات بھی نہ سمجھ سکا۔ تم مجھے اپنی کہانی اِس طرح سناؤ جیسے تم نے یہاں کی تصویروں کے بارے میں بتایا ہے۔"

"اِن تصویروں میں بھی اُس کا عکس نظر آئے گا۔ یہ تصویریں جنھیں آپ شاہکار کہتے ہیں، اُسی ظلم و ستم کا تبصرہ ہیں۔ آپ اِن تصویروں سے ڈرائنگ روم کو سجانا چاہتے ہیں لیکن آپ نے اِن کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا ہوتا، اِن کی گہرائی میں اُترنے کی کوشش کی ہوتی، اِن کے پیچھے جن کچلی آرزوؤں کی کراہ ہے انھیں سنا ہوتا۔ لیکن اِس کی کیا ضرورت؟ تلخ حقیقت سے آخر کب تک یہ سماج منہ موڑتا رہے گا؟ کیا ہو گیا ہے آپ کی سوسائٹی کو؟ کیسا ہے آج کا انسان؟؟"

- خدا، رب العالمین ہے۔ اُس کی عنایت بلاتفریقِ مذہب و ملت ہر شخص پر اُسی طرح ہوتی ہے جس طرح چاند کی روشنی غریب کی جھونپڑی اور بادشاہ کے محل دونوں کو یکساں طور پر منور کرتی ہے ــــ خدا ذات پات اور فرقوں سے ماورا ہے۔ وہ نہ ہندو ہے نہ مسلمان۔ وہ رب العالمین ہے۔ (خوشتر گرامی)
- جس طرح کنول گندے پانی میں رہ کر بھی پاک صاف رہتا ہے اور گندگی کا کوئی اثر نہیں لیتا اسی طرح انسان کو بھی زندگی کے دُکھ سُکھ اور اُن کی آلودگیوں سے بے نیاز رہنا چاہیے۔ (بھگوت گیتا)
- نیکی، بے شک اچھی چیز ہے لیکن نیک خیالات اُس سے بھی کہیں اچھے ہیں کیونکہ یہی خیالات ایک دن عمل کے سانچے میں ڈھل جائیں گے۔ (سوامی رام داس)

"ریشمی اُجالوں کے ساتھ وہ صبح کب آئے گی؟"

"سنہری کرنیں کب ختم کریں گی اِن اندھیروں کو؟"

"یہ بات اُس زمانے کی ہے۔" وہ دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "جب میں کاغذ پر آڑے ترچھے برش چلایا کرتا تھا۔ ایک دن میں ایک تصویر پر جُھکا ہوا اُس کے رنگ رُوپ کو سنوارنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ میرے بالکل نزدیک آ کر اُس تصویر پر جُھک گئی۔ میں اپنے کام میں اِتنا محو تھا کہ اُس کے قدموں کی آہٹ کا بھی احساس نہ ہوا۔ جب مجھے اپنی اُبھرتی ہوئی تصویر پر ایک سنہرا سایہ نظر آیا، میری نظریں اُوپر اُٹھیں اور ایک بہت ہی حسین پیکر سے اُلجھ پڑیں۔ میری بدحواسی پر وہ ایسے ہنسی جیسے دو پیمانے ٹکرا گئے ہوں۔"

"مجھے شرمندگی اور افسوس ہے کہ آپ کے کام میں مخل ہوئی۔" دُور وادیوں سے موسیقی اُبھرنے کی آواز آئی۔ "کیا آپ مجھے ڈبل زیرو کا برش کچھ دیر کے لئے دے سکتے ہیں؟"

"برش؟ لیکن آپ کیا کریں گی؟" میں نے بڑی دل چسپی سے پوچھتے ہوئے کہا۔

"میرا ڈبل زیرو کا برش کہیں گم ہو گیا ہے اور مجھے تصویر میں کچھ لکیریں دینا ہیں۔ اُس کے بغیر تصویر نامکمل معلوم ہوتی ہے۔" موسیقی ایک بار پھر اُبھر کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔

"کیا آپ پینٹنگ کرتی ہیں؟" میں نے برش رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں خاکہ بناتی نہیں خاکہ کھینچتی ہوں۔" کہیں دُور بہتے ہوئے آبشار کی آواز آ رہی تھی۔

"جی ــــ ؟" میں نے اُس کے چہرے پر نگاہیں ثبت کر دیں جہاں صبح کی سنہری کرنیں چمک رہی تھیں۔

"میں پینٹنگ نہیں کرتی، حلیہ بگاڑتی ہوں۔ اچھے خاصے ماحول کا ستیاناس کر دیتی ہوں۔" اُس کے رخساروں میں دو جھیلیں اُبھر آئیں۔ "میں ابھی پینٹنگ سیکھ رہی ہوں۔" وہ مسکرائی اور فضا میں قوسِ قزح لپک گئی۔

میری نگاہیں اُس کی خوبصورت آنکھوں سے پھسل کر اُن چھوٹی چھوٹی حسین جھیلوں میں تیرنے لگیں جہاں آرزوئیں پناہ لے رہی تھیں، خواب ڈول رہے تھے۔ میں اپنے احساس کو سمیٹتا اور اپنی سوچوں پر قابو پاتا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ اُسے تصویریں بنانے کی کیا ضرورت! وہ بذاتِ خود ایک بھرپور تصویر ہے۔ مجسم آرٹ۔ حُسن کا جیتا جاگتا شاہکار!!

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بھی برش چلانا سکھا دیجئے۔ مجھے پینٹنگ سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ ہے۔" ساری فضا میں ترنم اور سنگیت کی لرزش تھی۔

"میرا میوزیم سے نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپ اپنی تصویریں یہیں لے آیا کیجئے۔ میں دیکھ لیا کروں گا۔" میں نے اُس سے وعدہ کر لیا۔

وہ اپنی تصویریں میرے پاس لانے لگی۔ جب بھی میں اُن تصویروں میں کوئی تبدیلی کرتا تو وہ اُس کی وجہ دریافت کرتی اور کبھی تو گھنٹوں بحث کرتی۔ اُسے رنگوں کی آمیزش، تصویروں کا پس منظر اور دوسرے نکات پر کافی عبور تھا۔ اُس کی تصویروں میں اُس کے حُسن کی آمیزش ملتی ہی چلی گئی۔ اُن میں وہ چمک اور تابانی آتی گئی جو اُس کے چہرہ پر تھی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے اِتنے نزدیک آ گئے جیسے جنم جنم کے ساتھی ہوں۔ ہم لوگ بہت سادہ دل ہوتے ہیں۔ کوئی چھل کپٹ نہیں رکھتے۔ اِسی لئے ہم ایک دوسرے کے دلوں میں چُپ چاپ اُتر گئے۔ نہ بڑے بڑے دعوے کئے اور نہ لمبی لمبی قسمیں کھائیں۔ دل کے معاملات میں زبان کا کیا دخل۔ ایک جذبہ ہوتا ہے جو پروان چڑھتا رہتا ہے۔ میں نے اُس کے لئے نہ آسمان سے تارے توڑنے کی بات کی اور نہ اُس نے کبھی میری خاطر مر مٹنے کی خواہش ظاہر کی۔ پھر بھی ہم دونوں چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ وقت ایک ساتھ گزرے۔ وہ ہر روز آتی اور پھر ہم ایک دوسرے میں کھو جاتے۔ ہر شام جب بھی وہ آتی لہکتی اور مچلتی

اور جاتے وقت جانے کیوں اُس کے قدم بوجھل بوجھل سے ہوتے۔ اُس کے چلے جانے کے
بعد میری آنکھوں میں بھی کچھ دھندلاہٹ اُتر آتی اور میں اُداس ہو جاتا!

"میری تصویروں میں نکھار آتا گیا اور میری زندگی کی شاہراہ پر پھول بکھرتے
گئے۔ اچانک گرم ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ سارے پھول کُملا کر خاک میں مل گئے۔ بس راہ میں
کانٹے ہی کانٹے رہ گئے۔ اُنھوں نے پیروں سے دل تک زخمی کر ڈالا!" آرٹسٹ کے چہرے پر
اُداسی و انتشار کا سایہ پھیل گیا۔

"سورج نے ابھی رات کی سیاہی میں جھانکا ہی تھا کہ وہ نگارخانہ میں آکر
مجھ سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔ اُس کی آواز میں درد کی لرزش تھی۔ ہم سادہ دل
لوگ بس بہت روتے ہیں۔ غم پڑنے پر بھی اور خوشی ملنے پر بھی۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے ہم سب
کی زندگی کا مقصد ہی رونا ہے۔ جب اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں پر فالج کا حملہ ہو گیا ہے تو
میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا اور سنبھالا دیا لیکن اُس کی آنکھیں درد
کے آنسو گراتی رہیں اور میرا دل خون کے قطرے ٹپکاتا رہا۔ ڈاکٹروں نے اُس کی ماں کو
شہر لے جانے کا مشورہ دیا۔ ہم دونوں ہی اُس وقت مفلس تھے۔ غریبی سوالیہ نشان
بن کر ہمارے سامنے آگئی۔ میں اپنی تصویروں کو بازار میں اُٹھا لایا۔ میرے خونِ دل میں ڈوبی
ہوئی تصویروں کے کوئی بھی دام نہ لگ سکے۔ یہی تصویریں جنھیں آپ ڈرائنگ روم میں سجانا
چاہتے ہیں اور نمائش میں پیش کرنا چاہتے ہیں، اُس وقت بیکار تصور کی گئیں۔ جانتے ہیں
کیوں؟ اگر یہ تصویریں بک جاتیں تو ایک غریب لڑکی کی مفلس ماں کا علاج ہو جاتا۔ سماج کے
ٹھیکے داروں نے اُن کاغذی تصویروں کی بجائے اُس گوشت پوست کی تصویر، اُس معصوم
لڑکی کے دام لگا ڈالے۔ سبھی نے بڑھ بڑھ کر دام لگائے۔ لڑکی کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی۔
ایک طرف اُس کی اپاہج ماں اور دوسری طرف اُس کی یہ قدر! میرے خونِ جگر سے رنگی ہوئی
تصویریں جب اُس کے غم کا مداوا نہ کر سکیں تو مجبوریوں کے سامنے میں بھی سرنگوں ہو گیا۔
میں نے اُسے بہت سمجھایا کہ وہ قصبے کے سب سے بڑے رئیس سے شادی کر لے۔ اُس کی ماں کا
علاج ہو جائے گا اور اُس کے دن بھی پھر جائیں گے۔"

"اُس شرابی سے شادی کر لوں جو لڑکی کو شراب کی بوتل سے زیادہ نہیں سمجھتا!" وہ
مجھ پر زخمی ناگن کی طرح بپھر پڑی۔

"آخرکار میں نے سماج کی ہر تصویر کو اُس کے سامنے پیش کر دیا اور خود کو اس
انداز میں پیش کیا کہ اُسے یقین ہو جائے کہ میرے دل میں اُس کے لئے جذبۂ ہمدردی کے
سوا کچھ بھی نہیں۔ اُس کی دونوں خوبصورت جھیلوں میں سیلاب آگیا۔ میں نے اُس کی
آرزوؤں کو فرض اور قربانی کے درمیان رکھ دیا۔ وہ پاگل ہو اُٹھی اور میں بے چین ہو گیا۔
اُس کی شادی ہو گئی۔ میری خواہشات اور اُس کی تمنّائیں پُھلجھڑیوں کی آگ
میں جھونک دی گئیں۔ ارمانوں کی آگ کچھ تو اُس کی مانگ میں سیندور بن کر پہنچ گئی اور باقی میرے
سینہ میں اُتر آئی۔"

"اور اُس لڑکی کا کیا ہوا؟"
میں نے بہت دھیمے سے کہا۔

"جب تک بوتل میں شراب تھی زمیندار پیتا رہا، چھلکاتا رہا اور ایک دن خالی
ہو جانے پر اُسے ایک طرف پھینک دیا۔ ایک دن وہ خالی بوتل بھی پاش پاش ہو گئی اور
ٹوٹے ہوئے سنگریزے میرے دل میں چُبھ گئے۔ میں قصبہ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر اِس
وادی میں آگیا۔"

"اُس زمیندار کا نام کیا تھا؟"

"سر [illegible] آف سیدن پور۔"

"خدا کے لئے آپ اب کچھ مت کہئے۔ خاموش ہو جائیے اب! میں اپنی ماں کی

◆ ایک نورِ عمل، ایک سو تصویروں سے بہتر ہے ——— اپنے کسی عمل سے
دوسروں کا دل نہ دُکھائیں۔ کسی کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔ اپنے
پڑوسیوں سے چاہے وہ کسی مذہب و ملت کے ہوں، صلح و آشتی سے رہیں اور
اپنے عمل سے اُن کی خدمت کریں۔ (نوشتہ گرامی)

◆ عورتوں کو محکوم بنائے رکھنے کے لئے مردوں نے پوری سماجی طاقت اُن کے خلاف کھڑی
کر رکھی ہے اور مرد عورت کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔ اِس کے باوجود اُس کے برتاؤ
سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آج بھی عورت کے مقابلہ میں بزدل ہے۔ (رابندر ناتھ ٹیگور)

◆ کسی کو نصیحت کرنے کے لئے عقل و ادراک کی جتنی ضرورت ہے، اُس سے کہیں زیادہ
اُس پر عمل کرنے کے لئے ہے۔ ([illegible])

بے بسی اور اپنے باپ کے ظلم کی داستان نہیں سُن سکتا!" دل کی آواز ذہن میں گونج کر رہ گئی
نو وارد ایک لمحہ کے لئے بھی وہاں نہ ٹھہر سکا۔ اُس کی کار اپنے پیچھے گرد و غبار کا ایک کارواں
چھوڑ گئی۔

بوڑھا آرٹسٹ جانے کیا سوچ رہا تھا!!

شانِ نزول

——— نریش کمار شاد

۱۵ الیف۔ موتی باغ ۲، نئی دہلی

۲۷ جولائی ۶۵ء

قبلہ و کعبہ خوشتر گرامی صاحب

لیجیے، اس بار پھر حکمِ حاکم مرگِ مفاجات کے مصداق ڈاکٹر دیو کی بجائے "شانِ نزول" ہی بھیج رہا ہوں ——— راجہ صاحب کے لکھے ہوئے مشغلوں میں اب پہلی سی بات نہیں رہی۔ کاش وہ ویسے ہی دلچسپ شگفتے لکھنے لگیں جیسے انھوں نے شروع شروع میں لکھے تھے۔ اور راہیوں کے مسائل میں ان کی زندگی کے خیالی نہیں بلکہ حقیقی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کا خاکہ اڑائیں ——— آپ تو خود ہر ماہ "تیر و نشتر" لکھتے ہیں اور اس فن کے مشہور و معروف "جرّاح" ہیں۔ ظاہر ہے آپ اس نکتے سے خوب واقف ہیں کہ خاکہ اڑانے کا مدعا تو یہی ہے کہ جس کا خاکہ اڑایا جائے وہ بھی بظاہر پیچ و تاب کھانے کے باوجود دل ہی دل میں اس کی صداقت سے منحرف نہ ہو سکے بلکہ محظوظ ہو ——— راجہ صاحب اگر آپ کے دل کے قریب ہیں تو میں بھی تو دور نہیں ہوں، اس لئے یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ اس خط کو ضرور شائع کریں گے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی امید ہے کہ راجہ صاحب پر بھی میرا یہ خط گراں نہیں گزرے گا بلکہ ان کی تخلیقی رگ اور حسِ لطیف کو چھیڑنے کا باعث ہوگا ——— ان دنوں زندگی سے نبرد آزما ہوں۔ زندگی کا حکم یہ ہے کہ ع

شاد را ناشاد باید زیستن

اور میرا جواب ہے ع میری عادت ہے خزاں میں بھی گل افشاں ہونا

بہرحال ع آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

آپ کا اپنا ——— نریش کمار شاد

اگر سیاہ دِلم داغِ لالہ زار تو ام   اگر کشادہ جبینم گُلِ بہار تو ام

بہادر شاہ ظفر فجر کی نماز پڑھنے کے بعد چھپرکھٹ کی طرف سے گزرے تو وہاں اُن کی بیگم سر پر آبی دوپٹہ ڈالے آرام کر رہی تھیں۔ ظفر نے چلتے چلتے یہ مصرع کہہ دیا ع

دیکھنا آبی دوپٹہ مُنہ پہ اُس کے وقتِ خواب

جب دربار میں پہنچے تو وہاں ذوق دہلوی بھی موجود تھے۔ انھیں یہ مصرع سُنایا تو ذوق نے فی الفور مصرعِ ثانی کہہ کر شعر مکمل کر دیا ع

بُرجِ آبی میں ہے یا ماہِ روشن آب میں

ناسخ اور آتش دونوں کسی طوائف کے ہاں پہنچے طوائف جو خاصی دراز قامت تھی، اُس وقت گا رہی تھی۔ آتش نے اُسے دیکھتے ہی کہا ع

طُولِ شبِ فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے

طوائف نے یہ سُن کر ایک دم گانا بند کر دیا اور بہت متانت سے پُوچھنے لگی۔

"کیا فرمایا آپ نے؟"

ناسخ نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اُسی وقت شعر مکمل کر دیا ؎

یہ زلفِ مسلسل جو ترے رُخ پہ پڑی ہے
طولِ شبِ فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے

حکیم مومن خاں مومن لکھنوی، صاحب لکھنوی سے جو اُن کی محبوبہ بھی تھیں اور اُن سے مشورۂ سخن بھی کیا کرتی تھیں، ایک بار خفا ہو گئے۔ صاحب نے زبردستی مومن کے پاس بیٹھ کر اُن کی بدلی ہوئی نگاہوں کو دیکھتے ہوئے اپنا یہ مطلع پڑھا ؎

نظر ہے جانبِ اغیار دیکھیے کیا ہو
پھری ہے کچھ نظرِ یار دیکھیے کیا ہو

تو جوشِ مسرت سے مومن کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور اُسی وقت اُنھوں نے یہ شعر موزوں کر دیا ؎

دیں پاکیٔ دامن کی گواہی مرے آنسو
اس یوسفِ بے درد کا اعجاز تو دیکھو

داغ دہلوی مولوی عبدالحمید کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اُنھیں پیاس محسوس ہوئی۔ پانی طلب کیا تو ایک کمسن حسینہ پانی لے کر آئی جس کا دوپٹہ ہوا کے زور سے شانے پر سے سرک گیا اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لئے۔ داغ نے پانی پینے کے فوراً بعد مولوی صاحب سے کہا کہ ایک شعر ہو گیا ہے ؎

بادِ صبا نے بھی نہ کیا مجھ کو بے حجاب
سینے پہ ہاتھ رکھ لئے جب شانہ کھل گیا

اسرار الحق مجاز لکھنؤ کے کسی کالج کے ایک ادبی جلسے میں خصوصی مہمان کے طور پر مدعو تھے۔ حُسنِ اتفاق سے جلسے میں ایک خوبصورت خاتون مجاز کے برابر آ کر بیٹھ گئی اور جلسے کی کارروائی کے دوران ہی میں جب وہ کسی وجہ سے اُٹھ کر جانے لگی تو مجاز صدرِ مجلس سید احتشام حسین سے مخاطب ہو کر بولے۔

"احتشام صاحب! ایک شعر ابھی ابھی ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

کون اُٹھ کر چلا ہے محفل سے
جس طرف دیکھئے اندھیرا ہے

کسی نوجوان شاعر نے ایک حسن فروش فرخ کی نرگسی آنکھوں کو غور سے دیکھنے کے بعد کہا ؎

حیلۂ قتل کی تدبیر بے تقصیر ہوتی ہے

فرخ جو شعر و سخن کا خاصہ مذاق رکھتی تھی ذرا سے تامل کے بعد کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھ کر بولی ؎

نگاہِ ناز کی شاید یہی تاثیر ہوتی ہے

میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا میں شاعرانہ چشمکیں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ ایک بار سودا نے اپنی غزل کے مقطع میں کہا ؎

سودا تو اِس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرح

میر صاحب نے شعر سُنا تو اُن کی نازک مزاجی بلکہ بد مزاجی نے اس کے جواب میں اُن سے یہ شعر کہلوایا ؎

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اِس شعر کے فن میں
یونہی سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

مرزا غالب دہلوی نے جب مولوی فضل الحق وغیرہ کے کہنے اور زمانے کو سادہ مضامین کی طرف مائل دیکھ کر عام فہم اور آسان شعر کہنے شروع کئے تو اِس افسوس کے اظہار میں اُنھیں اپنی غزل میں یہ مقطع کہنا پڑا ؎

ہائے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھُلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

مولانا الطاف حسین حالی پر کسی دہلوی شاعر نے ایک بار جب یہ اعتراض کیا کہ "آپ پانی پت کے رہنے والے ہیں اس لئے آپ کو اہلِ زبان کی صف میں شامل نہیں کیا جا سکتا" تو مولانا نے معترض کے جواب میں یہ شعر کہا ؎

حالی کو تو بدنام کیا اُس کے وطن نے
اور آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو!

ریاض خیرآبادی لکھنؤ میں مولانا سید سبحان اللہ خاں کے مہمان تھے۔ شعر و ادب کی باتیں کرتے کرتے مولانا نے کسی استاد کا یہ مطلع پڑھا ؎

جس میں سے تُو نے دی تھی مجھے کل اُٹھا تو لا
ساقی سے الست کی بوتل اُٹھا تو لا

اسی زمین اور انھیں قافیوں میں ریاض سے مطلع کہنے کی فرمائش کی۔ ریاض نے کچھ تامل کے بعد کہا ؎

اتری ہے آسمان سے جو کل اٹھا تو لا
طاق حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا

مولوی محمد اسمٰعیل اللہ خاں عارف تلمیذ حضرت داغ دہلوی کو ایک بار راجہ صاحب نے تحفے کے طور پر اپنے باغ کی دسہریاں بھیجیں جن کی رسید میں عارف نے فی البدیہہ یہ شعر لکھ کر بھیج دیا۔

انھیں لطف وہ برسات میں سہری کے
جنھوں نے آم کھلائے ہیں دسہری کے

اکبر الہ آبادی دورانِ گفتگو میں خواجہ حسن نظامی سے کہنے لگے کہ پابہ رکاب ایک محاورہ ہے لیکن اب گھوڑوں پر سوار ہونے اور باگ کو اپنے ہاتھ میں لینے کا رواج کہاں۔ اب تو پابہ رکاب کہنے کی بجائے ٹکٹ بدست کہنا چاہئے۔
اور اتنا کہہ کر یہ شعر موزوں کر دیا۔

محاورات کو بدلیں زمانہ بدلا ہے
ٹکٹ بدست کہیں اب بجائے پابہ رکاب

فراق گورکھپوری کی نظر سے جب John Donne کا یہ جملہ گزرا ...

And make one little room and everywhere...

تو انھوں نے یہ شعر کہا۔

خلوتِ راز میں فقط ہم تم
ایک کمرے کو کائنات کریں

تلوک چند محروم کو جب پہلی بار لاہور آنے کا اتفاق ہوا اور سنیما کے بڑے بڑے پوسٹر دیواروں پر نظر آئے تو یہ قطعہ اُسی وقت موزوں ہو گیا۔

لبِ عشرت پہ تبسم نظر آتا ہے مگر
آنکھ اخلاق کی روتی ہے بڑے شہروں میں
خلوتِ خاص میں جس بات سے آتی ہے حیا
منظرِ عام پہ ہوتی ہے بڑے شہروں میں

آزادی سے پہلے سیونگ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں انگریزوں کی قصیدہ خوانی جن شاعروں کا شعار تھی اور جو اس کے صلے میں سیکڑوں ہزاروں روپے پاتے تھے، آزادی کے بعد گرگٹ کی طرح ایک دم رنگ بدل کر حب الوطنی کے گیت گانے لگے اور کانگریس نے بھی انھیں اپنے سرکاری دفاتر میں بڑے بڑے عہدے دے کر نوازا۔ حالانکہ ان سے بے نیاز کر دیا تو منور لکھنوی نے یہ شعر کہا۔

ان الوقتوں کا کیا کہنا ان کی ہمیشہ سے چاندی ہے
پہلے بھی تھا عیش میسر اب بھی مزے یہ لوٹ رہے ہیں

بسمل سعیدی ٹونکی ایک روز مشہور افسانہ نگار ... کا یہ شعر پڑھا کرتے

اک خط بات ہے جو رہتی ہے
کوئی تمام کوئی ... ہے

جب اس کی یہ معنویت ... کرنے لگے تو میں نے بسمل صاحب کو ٹوکتے ہوئے اختلاف کا اظہار کیا لیکن جب معنی مجھے چھیڑنے کی غرض سے بسمل صاحب نے اپنی ذہانت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس شعر کی شرح بیان کی تو یہ شرح مجھے بھی پسند آئی۔ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد میں نے کہا بسمل صاحب! آپ نے جو مطلب بیان کیا ہے وہ اگرچہ بہت عمدہ ہے لیکن یہ شعر پھر بھی مہمل ہے کیونکہ اس سے یہ معنی نہیں نکلتے۔ بہرکیف آپ کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے میں نے ایک شعر ابھی ابھی کہہ دیا ہے۔

ہر چند بے ثبات ہے انساں کی زندگی
انسانیت تو اپنی جگہ لازوال ہے

ضیاء فتح آبادی نے ۱۹۲۵ء میں اپنی شاعری کا آغاز کیا اور ۱۹۳۳ء میں ان کا اولین مجموعۂ کلام "طلوع" منظر عام پر آیا۔ اُس کا ایک نسخہ آپ نے "ادبی دنیا" لاہور کے ایڈیٹر منصور احمد کو بھی بھیجا اور ضیاء صاحب کی حیرت و مسرت کی انتہا نہ رہی جب دو ایک ماہ کے بعد "طلوع" پر تبصرہ کی بجائے اُنھوں نے اپنے متعلق منصور احمد کا لکھا ہوا تعارفی مضمون "ادبی دنیا" میں دیکھا۔ مضمون میں منصور صاحب نے اشعار میں اُن کی افتادِ طبیعت کو نمایاں طور پر دیکھا تھا۔ اس چیز نے ضیاء صاحب کو بہت متاثر کیا اور مضمون پڑھتے ہی یہ تاثر اُن کے اس مشہور شعر میں ڈھل گیا۔

ازل میں جب ہوئی تقسیمِ عالمِ فانی
بطورِ خاص ملا سوزِ جاوداں مجھ کو

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر یہ ضرور تحریر فرمائیے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ "رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶" لکھنا کافی ہے۔

(منیجر)



افسانہ

ٹھہرے درد کا گہرا غم

ظہیر کیفی امروہوی

محلہ کٹکوئی۔ امروہہ۔ ضلع مرادآباد۔ یو، پی

۲ اپریل ۶۵ء   محترمی خوشتر گرامی صاحب! تسلیم

نئی تخلیق "خوشبو میں آگ" آپ نے پسند فرمائی، یہ احساس ہی مسرتوں کا مخزن ہے۔ شکر گزار ہوں اُن لمحوں کا، جنھوں نے مجھے یہ سرفرازی بخشی، اور آپ کا بھی! اس جذبے نے مجھے تخلیقی طور پر ایک بار پھر تیز گام کر دیا ہے ——— "جہاں آرا" میری کہانی نہیں تھی۔ احساس کہانی نہیں ہے، تخلیق کا موجب ہوتے ہیں۔ لیکن کیا کروں اُن دُور دراز سے آئے "جہاں آرا" کے لئے استفسار ——— کہ یہ میری اپنی کہانی ہے! مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ "بیسویں صدی" کے قارئین ایک مخصوص انداز سے سوچتے ہیں، سمجھتے ہیں، اپنی چاہتوں سے نوازتے ہیں۔ میں اُن سب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے یہ عزتیں بخشی ہیں ——— اپنے ہی خیالوں اور خوابوں کی دین "ٹھہرے درد کا گہرا غم" بھیج رہا ہوں۔ اس جذبے کے ساتھ، کہ آپ کا نقطۂ نظر اسے کس انداز میں پرکھے گا۔ یہ وصف آپ کے پاس اس قدر فراواں ہے کہ آپ سے مستعار لینے کو جی چاہتا ہے مگر وہ ہمتیں اور خوبیاں کہاں سے لاؤں، جو یہ جرأتیں اپنا سکیں ——— افسانہ کی طوالت کے لئے معذرت طلب ہوں کہ "بیسویں صدی" کا ہر ورق قیمتی ہے۔ پھر بھی شاید کوئی جدت آپ سے اپنے لئے کچھ مانگ لے . . .

نیاز مند ——— ظہیر کیفی

جولائی سن اُنیس سو تریسٹھ عیسوی

انستان" جہالت پورہ۔ امروہہ (یو، پی)

تنہائی میری ساتھی ہے اور غم بھرے لمحے میرے ہمدرد . . . !!

میری اَن دیکھی فوزی! بہت سی چاہتیں قبول کرو!

تم اپنے پہلے خط سے لے کر چوبیسویں خط تک میں بھی میری زندگی کی اُداسی کی
ہ جاننے کے لئے جو اصرار کرتی چلی آرہی ہو، اس سے میں پریشان بھی ہوں اور خوش بھی
تم نے میری تحریر سے جانے کیسے اندازہ لگا لیا کہ کوئی کمی، کوئی دُکھ، گہرا درد میرے
ن میں چھپا ہوا ہے۔ اپنے پچھلے خط تک میں میں نے چاہا تھا کہ تم سے اپنے دل کی بات کیا
جانے تم میرے بارے میں یہ سب کچھ جان کر کیا سوچنے لگ جاؤ۔ اسی لئے اپنے
م اپنے آپ میں جگائے رہی ہوں۔ تم بُرا مان گئی ہو میرے اس انداز پر۔ میری فوزی!
ج میں تم سے اپنے بارے میں سب کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ تم میرے حالات جان کر مجھے اپنے مشورے سے نوازو گی!

فوزی! تم میری کتنی پیاری سہیلی ہو۔ اگر نیا سال مجھے دیکھنا نصیب نہ ہوتا تب میں کیسے تم سے اپنے دل کا حال کہہ پاتی۔ کیسے تم جیسی پیاری سہیلی کو پا سکتی۔ اسی لئے میں اس نئے سال کے لمحوں کو اپنے لئے خوش نصیب پا رہی ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ تمھارے دل میں میرے لئے درد ہے، ہمدردی ہے۔ میں اب اس ڈر سے تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتی کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ۔ للّٰہ میری بات کا یقین کرو، میری اُلجھنوں کا کوئی حل تلاش کرو۔ میں پیشگی شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اُف! مجھے معاف کر دینا فوزی! کہ میں تمھیں ابھی تک بور کر رہی ہوں۔ کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہی ہو کہ میں تمھیں اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا کر اپنے حالات سے تمھاری توجہ ہٹا رہی ہوں۔ نہیں فوزی! نہیں ——— ایسا نہیں ہے میری اچھی سہیلی!

سوچتی ہوں اپنی کہانی کہاں سے شروع کروں ——— کیا اُن لمحوں سے،

تھے۔ وہ ایک ادھیڑ مرد تھے [illegible]

معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی فطرت شوخی پسند [illegible]
اُن کی عادت نرم اور شگفتہ تھی لیکن وہ مجھ جیسی [illegible]
ناموزوں تھے۔ بہرحال وہ جو کچھ تھے، مجھے ناپسند نہ تھے [illegible]
میرے ماحول نے مجھے سونپا تھا۔ تنگ کرنا اُن کی عادت نہ تھی۔ میری [illegible]
تھی اور اسی لئے میرا دل اُن کی قربت میں لمحاتی طور پر شگفتہ تھا کہ اُنھیں رنگوں اور
خوشبوؤں سے بے حد اُنس تھا اور مجھے یہ پسند تھا۔ اُنھیں بھی یہ پسند تھا کہ میں ایک آزاد
اور ترقی پسند عورت کی طرح باہر کی دُنیا میں گھوموں، پھروں، قہقہے لگاؤں۔ میری فطرت
کے لئے اُن کا یہ مناسب رویّہ مجھے بھاتا تھا۔ اسی لئے وہ مجھے اچھے لگتے تھے۔ میری زندگی میں
جو کچھ تھا وہ بہت کچھ تھا لیکن کچھ نہیں تھا۔ جذباتی طور پر ایک کمی کھٹکتی تھی۔ [illegible]
چھنتی تھی۔ مجھے یہ سب کیا ملا ہے؟ یہ سوال میرے ذہن میں اُبھرتا تھا کہ وہ سب کہاں
ہے جس میں حسن کی ستائش کے [illegible] اور رعنائی کے لئے گرمی [illegible]
جذبے اور تعریف و توصیف کے لئے [illegible]
ہی رفتار ——— یہ سب کچھ اُن میں کہاں تھا؟ پھر بھی میں اُنھیں نبھانے میں خوشی محسوس
کرتی تھی کیونکہ اُنھوں نے مجھے آرام و آسائش کے لئے اتنا کچھ مہیا کر رکھا تھا کہ میری
فطرت یہ بھول گئی تھی کہ میری چاہتیں کہاں چھپی ہیں؟ وہ جب تھے، میرے پاس بیش
قیمت ملبوسات کے انبار تھے۔ رنگوں اور رعنائی کی تزئین کے لئے بہت کچھ تھا۔ وہ
ہر جدید فیشن کو اپنانے کے لئے مجھ سے پہلے تیار تھے، اسی لئے میرے پاس ہر رنگ، ہر
ڈیزائن کے برقعے تھے۔ کانوں میں آویزے میں نے کبھی دوسرے دن نہیں پہنے۔ میری
کلائیوں کی چوڑیاں ہر رات کے گزر جانے کے بعد ٹکڑوں میں بدل جاتی تھیں۔ اُن کا
ترنم ہر روز نئے سرے سے جنم لے کر بکھر جاتا تھا اور کانچ کے رنگین دائرے میری کلائیوں

کہانی [illegible]
وہ اُنس کا [illegible]
نہیں ہے، کیونکہ [illegible]
کہانی تھی [illegible]
[illegible]
[illegible]
آئندہ تفصیل سے لکھوں گی [illegible]
سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے [illegible]
رسالہ کا ایڈیٹر ہندو ہے یا مسلمان [illegible]
کرتا ہے اور انتہائی بیباکی سے چھاپ کر دوں کے تماشے دیکھتا [illegible]
برسوں سے اُس کا یہی محبوب مشغلہ ہے۔ کیا تم اُس ایڈیٹر کے بارے [illegible]
مجھے اطلاع دے سکتی ہو۔ میں اُس ایڈیٹر کو بھی اِس سلسلے میں جلد ہی خط لکھوں گی [illegible]
اُس افسانہ نگار کی زندگی کے پرخچے اُڑا کر سب کچھ لکھ دوں گی۔ جواب کا انتظار
سے کر رہی ہوں۔ تمھاری چاہتوں کی شیدائی ———

نظر [illegible]

آپ بھی یاد کر لیتے ہیں یا نہیں؟ آپ کی دلہن تو اچھی ہیں۔ آج ہی افتخار نے بتایا تھا کہ آپ نے "پلاننگ" کو اپنا لیا ہے۔ میں آپ کے اس جذبے کی قدر کرتی ہوں ساتھ ہی اپنے بارے میں بھی آپ سے ایک مشورہ مانگتی ہوں۔ خدانخواستہ اگر میں اس "ہوائی" کو جیسا کہ دشمنوں نے اڑائی ہے۔ [illegible] تو کیا آپ خود سے تعلق رکھیں گے؟ آپ کی رائے کا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دوں گی۔ میں تمہیں پھر بھی آگاہ کر دینا چاہتی ہوں کہ یہ سب کچھ درست ہے جیسا کہ تم نے سنا ہے۔ مجھے واقعی دوسری شادی کر لینی چاہئے۔ مگر کیوں؟ یہ سوال میرے لئے خود مصیبت بنا ہوا ہے۔ کاش! تم اس سلسلہ میں میری مدد کر سکتیں۔ میں شادی کرنے کا پروگرام بنا چکی ہوں لیکن ایک نئی آفت سر ابھار رہی ہے۔ میرا ایک افسانہ نگار مجھے پریشان کرنے پر تلا ہوا ہے۔ وہ جانے کیوں مجھ میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ جبکہ میں نے آج تک اس سے نہ کوئی بات کی ہے، نہ اُسے لفٹ دی ہے۔ وہ عجیب بے تکا انسان ہے۔ میرے ذہن و حواس پر ہر لمحہ اس کی شخصیت اپنا تسلط جمائے ہوئے ہے۔ خدا کے لئے عسمہ مجھے اس سے بچاؤ۔ وہ بے حد جذباتی نوجوان ہے۔ وہ مجھے تباہ کر دے گا، اپنی حرکتوں سے بدنام کرے گا۔ اگر تم میری مدد کر سکتی ہو تو اس سے

[illegible] میری
[illegible] امروہہ (یوپی)
[illegible] کا گہرا غم ——!!

چچی جان! تسلیم

[illegible] یہ لکھنا ہی بے کار ہے کہ یہ بہت طویل اور عجیب ہے کیونکہ زیادہ [illegible] کی عادت بہت پرانی ہے۔ یہ تو مجھے آپ کے پاس رہ کر ہی اندازہ ہو گیا [illegible] میں آپ کے خطوط کا جواب اتنا مختصر کیوں دینے لگی ہوں۔ [illegible] عرض کروں گی کہ میں ان دنوں بے حد پریشان ہوں۔ اپنی [illegible] پھر کبھی لکھوں گی۔ فی الحال اتنا ہی لکھوں گی کہ شفیع ان دنوں بے حد [illegible] گھر کا دروازہ اُن کے انتظار میں رات رات بھر کھلا رہتا ہے۔ [illegible] تشریف لاتے ہیں۔ میں نے اُن کے اس [illegible] خاموش ہو جاتے ہیں۔ [illegible] تبدیلی اُن میں کہاں سے آئی ہے [illegible] وہ بتانے کے [illegible] سوچتی ہوں اس طرح بھی میری زندگی [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] امروہہ (یوپی)
[illegible] بہتے لٹے ——!!

طاہر بھائی! تسلیمات

بھائی جان! آپ جب سے "دہرہ دون" گئے ہیں کوئی خیریت نہیں ملی۔ کیا [illegible] تفسیر نے آکر بتایا تھا کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں اور اس لئے کہ آپ کو کسی [illegible] نے یہ ہوائی بھیجی ہے کہ میں دوسری شادی کر رہی ہوں۔ میں اُس بدبخت کو [illegible] جس نے یہ افواہ تم تک پہنچائی ہے۔ میں تو بس یہی کہوں گی کہ اللہ کرے [illegible] کا برا حال ہو جو مجھے بدنامی کے داغ دے رہا ہے۔ آپ یقین کیجئے مجھے جب آپ [illegible] خوبصورت بھائیوں کا سہارا حاصل ہے تب بھلا میں کیوں اپنی حالت سے [illegible] زدہ ہوں۔ زیادہ نہ لکھوں گی۔ رات بہت بیت چکی ہے۔ آپ یاد آ رہے ہیں۔ کیا

جب میرے آسودگی بھرے گھر میں اپنے کنوارے پن کے البیلے، بھٹکتے خواب دیکھے تھے اور ایسی چاہتیں اپنائی تھیں، جنھیں پورا نہ ہونا تھا، نہیں ـــ یہ لکھنا اچھا نہیں کہ میں تمھیں اُس دَور میں لے جاؤں، جہاں میرے خوابوں اور خیالوں کے پھول تک مرجھا چکے ہیں۔ اُن مرجھائے پھولوں کو کون سونگھنا پسند کرے گا؟ آؤ پھر میری بات یہاں سے سُنو! یہ پچھلے پانچ سال پہلے کی بات ہے، جب وہ واردات ہوئی کہ میری زندگی میں ایک بھیانک طوفان آیا تھا۔ میں ایک بھرے پُرے گھر میں سب کچھ پاتے ہوئے بھی کچھ نہ ہونے کے احساس کو بھول کر زندگی کو خوشگوار بنا رہی تھی اور اپنے شوہر کی خامیوں اور خوبیوں کو جانتے ہوئے بھی اُس سے محبت کئے جا رہی تھی۔ وہ کیسے تھے؟ وہ کیا تھے؟ تم دو سوال کر سکتی ہو۔ میں یہ سوال کرنے سے پہلے ہی بتلائے دیتی ہوں۔ وہ جو کچھ تھے، میرے اپنے تھے لیکن میری زندگی اور دوشیزگی کے ساتھ مضحکہ خیز حد تک دلچسپ بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک ادھیڑ عمر تھے۔ یعنی ڈھلتی ہوئی جوانی کے زائل شدہ تارے۔ انتہائی پسند معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی فطرت خوشی پسند تھی۔ اُن کی چاہت شوخیوں کی دلدادہ تھی۔ اُن کی عادت نرم اور شگفتہ تھی لیکن وہ مجھ جیسی شوخ اور جذباتی لڑکی کے لئے قطعی ناموزوں تھے۔ بہرحال، وہ جو کچھ تھے، مجھے ناپسند ہوتے ہوئے بھی پسند تھے کہ انھیں میرے ماحول نے مجھے سونپا تھا۔ تنگ کرنا اُن کی عادت نہ تھی۔ میری دلجوئی اُن کی چاہت تھی اور اسی لئے میرا دل اُن کی قربت میں لمحاتی طور پر شگفتہ تھا کہ انھیں رنگوں اور خوشبوؤں سے بے حد اُنس تھا اور مجھے یہ پسند تھا۔ انھیں بھی یہ پسند تھا کہ میں ایک آزاد اور ترقی پسند عورت کی طرح باہر کی دُنیا میں گھوموں، پھروں، قہقہے لگاؤں۔ میری فطرت کے لئے اُن کا یہ مناسب رویّہ مجھے بھاتا تھا۔ اسی لئے وہ مجھے اچھے لگتے تھے۔ میری زندگی میں جو کچھ تھا وہ بہت کچھ تھا لیکن، کچھ نہیں تھا۔ جذباتی طور پر ایک کمی کھٹکتی تھی۔ میری روح چیخنی تھی "مجھے یہ سب کیا ملا ہے؟" یہ سوال میرے ذہن میں اُبھرتا تھا کہ وہ سب کہاں ہے، جس میں حُسن کی ستائش کے لئے گیت ہوتے ہیں اور رعنائی کے لئے گرمی بھرے جذبے اور تعریف و توصیف کے لئے خاموش مُسکراہٹیں یا پھر ہلچل آفریں لمحوں کی اپنی ہی رفتار ـــ یہ سب کچھ اُن میں کہاں تھا؟ پھر بھی میں انھیں نبھانے میں خوشی محسوس کرتی تھی، کیونکہ انھوں نے مجھے آرام و آسائش کے لئے اتنا کچھ مہیّا کر رکھا تھا کہ میری فطرت یہ بھول گئی تھی کہ میری چاہتیں کہاں چُھپی ہیں؟ وہ جب تھے، میرے پاس بیش قیمت ملبوسات کے انبار تھے۔ رنگوں اور رعنائی کی تزئین کے لئے بہت کچھ تھا۔ وہ ہر جدید فیشن کو اپنانے کے لئے مجھ سے پہلے تیار تھے، اسی لئے میرے پاس ہر رنگ، ہر ڈیزائن کے برقعے تھے۔ کانوں میں آویزے میں نے کبھی دوسرے دن نہیں پہنے۔ میری کلائیوں کی چوڑیاں ہر رات کے گزر جانے کے بعد ٹکڑوں میں بدل جاتی تھیں۔ اُن کا ترنّم ہر روز نئے سرے سے جنم لے کر بکھر جاتا تھا اور کانچ کے رنگین دائرے میری کلائیوں میں خاموش رقص کرتے تھے۔ پھولوں کا انھیں اتنا شوق تھا کہ وہ میرے بالوں میں مرجھا جاتے تھے۔ خوشبوؤں سے انھیں اتنی دلچسپی تھی کہ اُن کا تسلسل کبھی نہیں ٹوٹا۔ پھر کیا کمی تھی؟ اُن سے کیا شکایت تھی مجھے؟ اِن سوالوں کا جواب اپنے دل کی گہری تنہائیوں سے پوچھتی ہوں لیکن کچھ جواب نہیں پاتی۔ تڑپ کر رہ جاتی ہوں ـــ کہ اب وہ مجھ سے دُور شہرِ خموشاں کے سنّاٹے میں محوِ خواب ہیں۔ اُن کی یاد، اُن کا خلوص آج دل میں یہ سب کچھ دہرا کر اِس قدر شدید طور پر اُبھر آیا ہے کہ میں اِس کسک کو قابلِ برداشت جان کر اپنے ماضی کے دریچوں کو بند کر رہی ہوں۔

فوزی میری! میں اِن حالات سے قطعِ نظر تمھارے سامنے ایک مختصر سا سوال رکھ رہی ہوں۔ ہاں! جیسا کہ تم نے لکھا ہے، تم خوشگوار ازدواجی زندگی میں مُسکرا رہی ہو، اِس لحاظ سے تم بخوبی جانتی ہو گی کہ ایک جوان عورت کے لئے کسی کی چاہت کتنی ہنگامہ خیز ہو سکتی ہے۔ بس میری اچھی فوزی! میرے دل کے خاموش آنگن میں بھی چاہت کا ایک ایسا ہی نغمہ گونج رہا ہے لیکن میں اُسے سُنوں تو کیسے؟ کہ یہ عجیب بے سُرا سا پھر بھی دلکش و دل نواز ہے... فوزی... مجھے... نہیں... اُسے نہیں سمجھی۔ کیسے لکھوں؟ کہ مجھے ایک عجیب بے تکے سنجیدہ مگر جذباتی انسان کی حرکتوں نے متوجّہ کر لیا ہے!!

تم خود کہانی سمجھ دار ہو۔ شاید تم اُسے جانتی ہو گی۔ میرا مطلب ہے خود کہانی کار وہ تمھیں بھی پسند ہو گا ـــ کیونکہ "اکیسویں صدی" کی تم خریدار ہو اور وہ اُس کا کہانی کار۔ کیا تم اب بھی اُس کا نام جاننا چاہو گی؟ اِس کی ضرورت تو نہیں ہے، کیونکہ میں نے اپنے پچھلے خط میں یہ لکھ کر تمھاری توجّہ اِس طرف مبذول کرائی تھی کہ اُس نے جو کہانی میرے نام سے منسوب کی ہے، وہ میری نہیں ہے۔ وہ غلط ہے میری جان! میری کہانی اُسی جذباتی افسانہ نگار نے تخلیق کی تھی حقیقتوں کی رُوپ ریکھاؤں کے ساتھ ـــ جو خود تم نے بھی پڑھی ہے۔ اُس کے بارے آئندہ تفصیل سے لکھوں گی۔ تم لکھو کہ میں اُس کی اِس حرکت کا کیسے جواب دوں؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔ اور ہاں تم نے میرے پوچھنے پر بھی یہ نہیں لکھا کہ اُس رسالہ کا ایڈیٹر ہندو ہے یا مُسلمان! اور کیا وہ ایسے رومانی حادثے پسند کرتا ہے اور انتہائی بیباکی سے چھاپ کر دلوں کے تماشے دیکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے برسوں سے اُس کا یہی محبوب مشغلہ ہے۔ کیا تم اُس ایڈیٹر کے بارے میں بھی کھوج کر کے مجھے اطلاع دے سکتی ہو۔ میں اُس ایڈیٹر کو بھی اِس سلسلہ میں جلد ہی خط لکھوں گی اور اُس افسانہ نگار کی زندگی کے پرخچے اُڑا کر سب کچھ لکھ دوں گی۔ جواب کا انتظار ابھی سے کر رہی ہوں۔ تمھاری چاہتوں کی شیدائی ـــ

نظر نکہت

تیس اگست سن اُنیس سو تریسٹھ عیسوی

... خان ... روڈ۔ امروہہ (یو۔پی)

ٹھہرے ٹھہرے درد کا گہرا غم ——!!

ممی جان! تسلیم

آپ کا خط ملا۔ یہ لکھنا ہی بے کار ہے کہ بہت طویل اور عجیب ہے کیونکہ زیادہ لکھنے کی آپ کی عادت بہت پرانی ہے۔ یہ تو مجھے آپ کے پاس رہ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ آپ نے شکایت کی ہے کہ میں آپ کے خطوط کا جواب اتنا مختصر کیوں دیتی ہوں۔ اس بارے میں صرف یہی عرض کروں گی کہ میں ان دنوں بے حد پریشان ہوں۔ اپنی پریشانیوں کے بارے میں پھر کبھی لکھوں گی۔ فی الحال اتنا ہی لکھوں گی کہ عشیر اِن دنوں بے حد ... کی زندگی گزار رہے ہیں۔ گھر کا دروازہ اُن کے انتظار میں رات بھر کھلا رہتا ہے۔ ... شام کو غائب ہو کر صبح ہی کو تشریف لاتے ہیں۔ میں نے اُن کے اس اقدام اور رویّے کی اُن سے وجہ پوچھی تو وہ جواب میں خاموش ہو جاتے ہیں۔ اُن کا کھنچا کھنچا انداز دیکھ کر ہی میں کانپ جاتی ہوں۔ یہ تبدیلی اُن میں کہاں سے آئی ہے، کچھ نہیں کہہ سکتی۔ نہ جانے کون سا غم یا دکھ ایسا ہے جو ... ہوتے ہیں، وہ بتانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اُن کی اس عجیب حالت سے خوفزدہ ہوں۔ سوچتی ہوں اس طرح پھر میری زندگی کیسے گزرے گی؟ کیا میری ایک سالہ شادی شدہ زندگی اتنی جلدی اس ہنگامہ کی نذر ہو جائے گی۔ ممی جان! آپ خود ہی اُن سے کچھ پوچھئے۔ امید ہے حسب دستور آپ کے ہاں "نواں مہمان" آگیا ہوگا۔ اُس کے نام سے آگاہ کیجئے۔ بچوں کو پیار۔

آپ کی عصمت نسرین

... اکتوبر سن اُنیس سو تریسٹھ عیسوی

حیات میموریل" نزد گلو کا نیم۔ امروہہ (یو۔پی)

انجانی نیند کے گرتے، بہتے نشے ——!!

ظاہر بھائی! تسلیمات

بھائی جان! آپ جب سے "دہرہ دون" گئے ہیں کوئی خیریت نہیں ملی۔ کیا وجہ ہے؟ تفسیر نے آکر بتایا تھا کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں اور اِس لئے کہ آپ کو کسی شخص نے یہ ہوائی بھیجی ہے کہ میں دوسری شادی کر رہی ہوں۔ میں اُس بدبخت کو کچھ نہیں کہتی جس نے یہ افواہ تم تک پہنچائی ہے۔ میں تو بس یہی کہوں گی کہ اللہ کرے اُس کا بُرا حال ہو جو مجھے بدنامی کے داغ دے رہا ہے۔ آپ یقین کیجئے مجھے جب آپ جیسے خوبصورت بھائیوں کا سہارا حاصل ہے تب بھلا میں کیوں اپنی حالت سے خوفزدہ ہوں۔ زیادہ نہ لکھوں گی۔ رات بہت بیت چکی ہے۔ آپ یاد آرہے ہیں۔ کیا آپ بھی یاد کر لیتے ہیں ہمیں؟ آپ کی دلہن تو اچھی ہیں۔ آج ہی افتخار نے بتایا تھا کہ آپ نے "بلا منگ" کو اپنا لیا ہے۔ میں آپ کے اِس جذبے کی قدر کرتی ہوں ساتھ ہی ... بارے میں بھی آپ سے ایک مشورہ مانگتی ہوں۔ خدانخواستہ اگر میں اِس "ہوائی" کو جسے دشمنوں نے اُڑائی ہے، ... مان لوں تو کیا آپ مجھ سے ناراض رہیں گے؟ آپ کی رائے کا انتظار رہے گی۔

آپ کی اپنی نظمہ نکہت

آٹھ اکتوبر سن اُنیس سو تریسٹھ عیسوی

... دو منزلہ پرائیویٹ ... کی باشہ والی۔ دہلی

... پلکوں کے خواب، اُٹھتی آنکھ کا غم ——!!

... ڈارلنگ! بہت سے پیار

تمہیں آج عجیب خط لکھ رہی ہوں ... تمہیں یہ سب کچھ کیسے ... میں دہلی ملازمت کرنے کی غرض سے آئی ہوں اور ان دنوں شدید ذہنی اور جذباتی کرب میں مبتلا ہوں ... میری اس حالت کی وجوہات جاننا چاہتی ہیں۔ میں ... بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ خدا کے لئے مجھے تنہا رہنے دو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ تم سب لوگ میرے پیچھے کیوں پڑی ہو۔ میں کس طرح زندگی گزار رہی ہوں ... راتوں کی تنہائیوں میں کیسے کیسے خواب دیکھ رہی ہوں، اُنہیں میں تمہیں کیا بتاؤں؟ ... مذاق اُڑاؤ گی تم یقین بھی نہیں کرو گی کہ مجھ جیسی سمجھدار اور دور اندیش کیوں اس قدر خوفزدہ حالت میں سوچ رہی ہے ... ( ) ... ہاں

... عصمہ ... یہ صحیح ہے ... !

اِن دنوں میں ذہنی اور جذباتی طور پر بے حد اُلجھی ہوئی ہوں۔ میرے ذہن میں جو کچھ اُبھر رہا ہے، وہ تمہیں نہیں بتا سکتی۔ بتا بھی دوں تو تم قہقہے بکھیر دو گی۔ میں تمہیں پھر بھی آگاہ کر دینا چاہتی ہوں کہ یہ سب کچھ درست ہے جیسا کہ تم نے سُنا ہے۔ مجھے واقعی دوسری شادی کر لینی چاہئے۔ مگر کیوں؟ یہ سوال میرے لئے خود مصیبت بنا ہوا ہے۔ کاش! تم اِس سلسلہ میں میری مدد کر سکتیں۔ میں شادی کرنے کا پروگرام بنا چکی ہوں لیکن ایک نئی آفت سر اُبھار رہی ہے۔ میرا جانا پہچانا ایک افسانہ نگار مجھے پریشان کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ وہ جانے کیوں مجھ میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ جبکہ میں نے آج تک اُس سے نہ کوئی بات کی ہے، نہ اُسے لفٹ دی ہے۔ وہ عجیب بے تکا انسان ہے۔ میرے ذہن و حواس پر ہر لمحہ اُس کی شخصیت اپنا تسلط جماتے ہوتے ہے۔ خدا کے لئے عصمہ مجھے اُس سے بچاؤ۔ وہ بے حد جذباتی نوجوان ہے۔ وہ مجھے تباہ کر دے گا، اپنی حرکتوں سے بدنام کرے گا۔ اگر تم میری مدد کر سکتی ہو تو اُس سے

جب میں نے آسودگی بھرے گھر میں اپنے کنوارے پن کے ارتے بھٹکتے خواب دیکھے تھے اور ایسی چاہتیں اپنائی تھیں جنھیں پورا نہ ہونا تھا، نہیں ـــــ یہ کہنا چاہتی نہیں کہ میں تمھیں اُس دور میں لے جاؤں، جہاں میرے خوابوں اور خیالوں کے پھول تک مُرجھا چکے ہیں۔ اُن مرجھاتے پھولوں کو کون سونگھنا پسند کرے گا؟ تو پھر میری بات یہاں سے سنو! یہ پچھلے پانچ سال پہلے کی بات ہے ـ نہیں واردات ہے کہ میری زندگی میں ایک بھیانک طوفان آیا تھا۔ میں ایک بھرے پُرے گھر میں سب کچھ پاتے ہوئے بھی "کچھ نہ ہونے کے" احساس کو بھول کر زندگی کو خوشگوار بنائے ہوئے تھی اور اپنے شوہر کی خامیوں اور خوبیوں کو جانتے ہوئے بھی اُس سے سمجھوتہ کئے ہوئے تھی۔ وہ کیسے تھے؟ وہ کیا تھے؟ تم وہ سوال کرسکتی ہو۔ میں یہ سوال کرنے سے پہلے ہی بتائے دیتی ہوں۔ وہ جو کچھ تھے، میرے اپنے تھے لیکن میری زندگی اور دوشیزگی کے ساتھ مضحکہ خیز حد تک چپکے ہوئے تھے۔ وہ ایک ادھیڑ مرد تھے۔ ڈھلے، ماندے، جوانی کے زائل شدہ خمار کے ساتھ چلبلے پسند معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی فطرت شوخی پسند تھی۔ اُن کی چاہت شوخیوں کی دلدادہ تھی۔ اُن کی عادت نرم اور شگفتہ تھی لیکن وہ مجھ جیسی شوخ اور جذباتی لڑکی کے لئے قطعی ناموزوں تھے۔ بہرحال وہ جو کچھ تھے، مجھے ناپسند ہوتے ہوئے بھی پسند تھے کہ انھیں میرے ماحول نے مجھے سونپا تھا۔ شک کرنا اُن کی عادت نہ تھی۔ میری دلجوئی اُن کی چاہت تھی اور اسی لئے میرا دل اُن کی قربت میں لمحاتی طور پر شگفتہ تھا کہ انھیں رنگوں اور خوشبوؤں سے بے حد اُنس تھا اور مجھے یہ پسند تھا۔ انھیں بھی یہ پسند تھا کہ میں ایک آزاد اور ترقی پسند عورت کی طرح باہر کی دُنیا میں گھوموں، پھروں، قہقہے لگاؤں۔ میری فطرت کے لئے اُن کا یہ مناسب رویّہ مجھے بھاتا تھا۔ اِسی لئے وہ مجھے اچھے لگتے تھے۔ میری زندگی میں جو کچھ تھا وہ بہت کچھ تھا لیکن کچھ نہیں تھا۔ جذباتی طور پر ایک کمی کھٹکتی تھی۔ میری رُوح چیختی تھی، "مجھے یہ سب کیا ملا ہے؟" یہ سوال میرے ذہن میں اُبھرتا تھا کہ وہ سب کہاں ہے، جس میں حُسن کی ستائش کے لئے گیت ہوتے ہیں اور رعنائی کے لئے گرمی بھرے جذبے اور تعریف و توصیف کے لئے خاموش مسکراہٹیں یا پھر ہلچل آفریں لمحوں کی اپنی ہی رفتار ـــــ یہ سب کچھ اُن میں کہاں تھا؟ پھر بھی میں انھیں نبھانے میں خوشی محسوس کرتی تھی کیونکہ انھوں نے مجھے آرام و آسائش کے لئے اتنا کچھ مہیا کر رکھا تھا کہ میری فطرت یہ بھول گئی تھی کہ میری چاہتیں کہاں چھپی ہیں؟ وہ جب تھے، میرے پاس بیش قیمت ملبوسات کے انبار تھے۔ رنگوں اور رعنائی کی تزئین کے لئے بہت کچھ تھا۔ وہ ہر جدید فیشن کو اپنانے کے لئے مجھ سے پہلے تیار تھے، اِسی لئے میرے پاس ہر رنگ، ہر ڈیزائن کے برقعے تھے۔ کانوں میں آویزے میں نے کبھی دوسرے دن نہیں پہنے۔ میری کلائیوں کی چوڑیاں ہر رات کے گزر جانے کے بعد ٹکڑوں میں بدل جاتی تھیں۔ اُن کا ترنّم ہر روز نئے سرے سے جنم لے کر بکھر جاتا تھا اور کانچ کے رنگین دائرے میری کلائیوں میں خاموش رقص کرتے تھے۔ پھولوں کا انھیں اتنا شوق تھا کہ وہ میری آغوش ہی میں مُرجھا جاتے تھے۔ خوشبوؤں سے انھیں اتنی دلچسپی تھی کہ اُن کا تسلسل ابھی تک نہیں ٹوٹا۔ پھر کیا کمی تھی؟ اُن سے کیا شکایت تھی مجھے؟ اِن سوالوں کا جواب اپنے دل کی گہری تنہائیوں سے پوچھتی ہوں لیکن کچھ جواب نہیں پاتی۔ تڑپ کر رہ جاتی ہوں ـــــ کہ اب وہ مجھ سے دُور شہرِ خموشاں کے سنّاٹے میں محوِ خواب ہیں۔ اُن کی یاد، اُن کا غم آج بھی دل میں یہ سب کچھ دُہرا کر اِس قدر شدید طور پر اُبھر آیا ہے کہ میں اِس کسک کو قابلِ برداشت جان کر اپنے ماضی کے دریچوں کو بند کر رہی ہوں۔

فوزی، میری! میں اِن حالات سے قطع نظر تمھارے سامنے ایک مختصر سا مسئلہ رکھ رہی ہوں۔ ہاں! جیسا کہ تم نے لکھا ہے، تم خوشگوار ازدواجی زندگی میں مسکرا رہی ہو، اِس لحاظ سے تم بخوبی جانتی ہو گی کہ ایک جوان عورت کے لئے کسی کی چاہت کتنی ہنگامہ خیز ہو سکتی ہے۔ بس یہی اچھی فوزی! میرے دل کے خاموش آنگن میں بھی چاہت کا ایک ایسا ہی نغمہ بکھر رہا ہے لیکن میں اُسے سنوں تو کیسے؟ کہ یہ عجیب سا سُر پھر بھی دلکش و دل نواز ہے ... فوزی ... مجھے ... نہیں ... اُسے ... نہیں بھی ... کیسے لکھوں؟ کہ مجھے ایک عجیب سے سنجیدہ مگر جذباتی انسان کی حرکتوں نے متوجّہ کر لیا ہے!!

تم خود کافی سمجھ دار ہو۔ شاید تم اُسے جانتی ہو گی۔ میرا مطلب ہے اُس کہانی کار وہ تمھیں بھی پسند ہو گا ـــــ! کیونکہ "اکیسویں صدی" کی تم خریدار ہو۔ وہ اُس کا کہانی کار۔ کیا تم اب بھی اُس کا نام جاننا چاہو گی؟ اِس کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ میں نے اپنے پچھلے خط میں یہ لکھ کر تمھاری توجّہ اِس طرف مبذول کرائی تھی کہ اُس نے جو کہانی میرے نام سے منسوب کی ہے، وہ میری نہیں ہے۔ غلط ہے میری جان! میری کہانی اُسی جذباتی افسانہ نگار نے تخلیق کی تھی حقیقتوں رُوپ رکھیاؤں کے ساتھ ـــــ جو خود تم نے بھی پڑھی ہے۔ اُس کے بارے میں آئندہ تفصیل سے لکھوں گی۔ تم لکھو کہ میں اُس کی اِس حرکت کا کیسے جواب دوں؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے۔ اور ہاں تم نے میرے پوچھنے پر بھی یہ نہیں لکھا کہ اُس رسالہ کا ایڈیٹر ہندو ہے یا مُسلمان! اور کیا وہ ایسے رومانی حادثے پسند کرتا ہے اور انتہائی بیباکی سے چھاپ کر دلوں کے تماشے دیکھتا ہے معلوم ہوتا۔ برسوں سے اُس کا یہی محبوب مشغلہ ہے۔ کیا تم اُس ایڈیٹر کے بارے میں بھی کھوج کر مجھے اطلاع دے سکتی ہو۔ میں اُس ایڈیٹر کو بھی اِس سلسلہ میں جلد ہی خط لکھوں گی۔ اُس افسانہ نگار کی زندگی کے پرخچے اُڑا کر سب کچھ لکھ دوں گی۔ جواب کا انتظار سے کر رہی ہوں۔ تمھاری چاہتوں کی شیدائی ـــــ

نظمہ نکہت

اگست سن انیس سو پینسٹھ عیسوی

ان مشتمل روڈ۔ امروہہ (یو۔پی)

ٹھہرے درد کا گہرا غم ——!!

چچی جان! تسلیم

آپ کا خط ملا۔ یہ لکھنا ہی بے کار ہے کہ یہ بہت طویل اور عجیب ہے کیونکہ زیادہ لکھنے کی آپ کی عادت بہت پرانی ہے۔ یہ تو مجھے آپ کے پاس رہ کر بھی اندازہ ہو گیا ہے۔ نے شکایت کی ہے کہ میں آپ کے خطوط کا جواب اتنا مختصر کیوں دینے لگی ہوں۔ جواب میں صرف یہی عرض کروں گی کہ میں ان دنوں بے حد پریشان ہوں۔ ابھی ان کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گی۔ فی الحال اتنا ہی لکھوں گی کہ یہ ان دنوں بے حد زندگی گزار رہے ہیں۔ گھر کا دروازہ اُن کے انتظار میں رات رات بھر کھلا رہتا ہے۔ شام کو غائب ہو کر صبح ہی کو تشریف لاتے ہیں۔ میں نے اُن سے اس اقدام اور اس کی وجہ پوچھی تو وہ جواب میں خاموش ہو جاتے ہیں۔ اُن کا غمگین اور اداس چہرہ دیکھ کر میں کانپ جاتی ہوں۔ یہ تبدیلی اُن میں کہاں سے آئی ہے کہ سمجھ نہیں سکتی۔ کون سا غم یا دکھ ایسا بنائے ہوئے ہے، وہ بتانے کے لئے تیار نہیں۔ میں اُن کی عجیب حالت سے خوفزدہ ہوں۔ سوچتی ہوں اس طرح پھر میری زندگی کیسے گزرے گی۔ میری ایک سالہ شادی شدہ زندگی اتنی جلدی اس ہنگامہ کی نذر ہو جائے گی۔ چچی جان! آپ خود ہی اُن سے کچھ پوچھئے۔ امید ہے حسب دستور آپ کے "مہمان" نوازی "مہمان" آگیا ہوگا۔ اُس کے نام سے آگاہ کیجئے۔ بچوں کو پیار۔

آپ کی عصمت نسرین

اکتوبر سن انیس سو پینسٹھ عیسوی

حیات میموریل نزد گجلو کا نیم۔ امروہہ (یو۔پی)

انجانی نیند کے گرتے، بہتے نشے ——!!

ظاہر بھائی! تسلیمات

بھائی جان! آپ جب سے "دہرہ دون" گئے ہیں کوئی خیریت نہیں ملی۔ کیا وجہ ہے؟ تغیر نے آکر بتایا تھا کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں اور اِس لئے کہ آپ کو کسی شخص نے یہ ہوائی بھیجی ہے کہ میں دوسری شادی کر رہی ہوں۔ میں اُس بدبخت کو نہیں کہتی جس نے یہ افواہ تم تک پہنچائی ہے۔ میں تو بس یہی کہوں گی کہ اللہ کرے اس کا بُرا حال ہو جو مجھے بدنامی کے داغ دے رہا ہے۔ آپ یقین کیجئے مجھے جب آپ جیسے خوبصورت بھائیوں کا سہارا حاصل ہے تب بھلا میں کیوں اپنی حالت سے خوفزدہ ہوں۔ زیادہ نہ لکھوں گی۔ رات بہت بیت چکی ہے۔ آپ یاد آرہے ہیں۔ کیا آپ بھی یاد کر لیتے ہیں ہمیں؟ آپ کی دلہن تو اچھی ہیں۔ آج ہی افتخار نے بتایا تھا کہ آپ نے "پلاننگ" کو اپنا لیا ہے۔ میں آپ کے اِس جذبے کی قدر کرتی ہوں۔ ساتھ ہی اپنے بارے میں بھی آپ سے ایک مشورہ مانگتی ہوں۔ خدانخواستہ اگر میں اس "ہوائی" کو جیسا کہ دشمنوں نے اڑائی ہے، اپنا لوں تو کیا آپ مجھ سے تعلق رکھیں گے؟ آپ کی رائے کا انتظار کروں گی۔

آپ کی اپنی نغمہ نکہت

تیس اکتوبر سن انیس سو پینسٹھ عیسوی

دریا گنج دہلی

بند پلکوں کے خواب، کھلی آنکھ کا غم ——!!

نغمہ ڈارلنگ! بہت سے پیار

تم نے آج عجیب خط لکھا ہے۔ میں چونک سی گئی ہوں۔ تمھیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہو گیا؟ میں دو دن علاج کرانے کی غرض سے آئی ہوئی ہوں اور ان دنوں شدید ذہنی اور جذباتی کرب میں مبتلا ہوں۔ تم نے میری اس حالت کی وجوہات جاننا چاہی ہیں، لیکن اپنے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ خدا کے لئے مجھے تنہا رہنے دو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ تم سب لوگ میرے پیچھے کیوں پڑی ہو۔ میں کس طرح زندگی گزار رہی ہوں، یہ اور جانتا ہے میں رات دن کیسے کیسے خواب دیکھ رہی ہوں۔ انھیں میں تمھیں کیا بتاؤں کہ تم میرا مذاق اڑاؤ گی۔ تم یقین بھی نہیں کرو گی کہ مجھ جیسی سمجھدار اور دور اندیش کیوں اس قدر خوفزدہ حالت میں سوچ رہی ہے... ہاں... ہاں... عصمت... یہ صحیح ہے...!

ان دنوں میں ذہنی اور جذباتی طور پر بے حد الجھی ہوئی ہوں۔ میرے ذہن میں جو کچھ ابھر رہا ہے، وہ تمھیں نہیں بتا سکتی۔ بتا بھی دوں تو تم ہنسی میں بکھیر دو گی۔ میں تمھیں پھر بھی آگاہ کر دینا چاہتی ہوں کہ یہ سب کچھ درست ہے جیسا کہ تم نے سُنا ہے۔ مجھے واقعی دوسری شادی کر لینی چاہئے۔ مگر کیوں؟ یہ سوال میرے لئے خود مصیبت بنا ہوا ہے۔ کاش! تم اِس سلسلہ میں میری مدد کر سکتیں۔ میں شادی کرنے کا پروگرام بنا چکی ہوں لیکن ایک نئی آفت سر ابھار رہی ہے۔ میرا جانا پہچانا ایک افسانہ نگار مجھے پریشان کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ وہ جانے کیوں مجھ میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ جبکہ میں نے آج تک اُس سے نہ کوئی بات کی ہے، نہ اُسے لفٹ دی ہے۔ وہ عجیب بے تکا انسان ہے۔ میرے ذہن و حواس پر ہر لمحہ اُس کی شخصیت اپنا تسلط جمائے ہوئے ہے۔ خدا کے لئے عصمت مجھے اُس سے بچاؤ۔ وہ بے حد جذباتی نوجوان ہے۔ وہ مجھے تباہ کر دے گا، اپنی حرکتوں سے بدنام کر دے گا۔ اگر تم میری مدد کر سکتی ہو تو اُس سے

خط و کتابت شروع کر دو۔ اُسے رومانی اور جذباتی خطوط لکھ کر ذہنی طور پر اپنی طرف ملتفت کر لو۔ اس طرح وہ میرا پیچھا چھوڑ دے گا۔ اُس کا پتہ تم "اکیسویں صدی" سے حاصل کر سکتی ہو جس میں اُس کا تازہ افسانہ شائع ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے اپنی رائے دو گی مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا میں دوسری شادی کر کے لوگوں کی اُٹھتی نگاہوں سے بچ جاؤں۔ ان خیالوں کو چھوڑ کر نئی زندگی اپنا لوں جو مجھے پریشان کئے ہوئے ہیں اور اُن چاہتوں کو منہ توڑ جواب دوں جو جذباتیت کے جال میرے ارد گرد پھیلا رہی ہیں کہ میں کسی پرندے کی طرح اُس میں قید ہو جاؤں گی۔

بہرکیف! تم جو کچھ اُس افسانہ نگار کو لکھو، مجھے بھی لکھتی رہنا تاکہ میں اُس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھ سکوں۔ میں عنقریب وطن لوٹ رہی ہوں۔ خط کا جواب فی الحال یہیں کے پتے پر دینا۔ اپنی امی کو میرا سلام کہنا اور اُن بہنوں کو یاد کرنا جو مجھ سے ایک بار بمبئی میں ملی تھیں۔ کیا تم واپس بمبئی نہیں جاؤ گی؟ تمہارے اُن کو سلام جنھیں تم اپنا شوہر نہیں مانتیں۔

تمہاری اپنی نظمہ نکہت

۔۔۔ جنوری سن اُنیس سو چھہتر عیسوی

گھڑیال منزل۔ ۔۔۔ روڈ۔ امروہہ (یو۔ پی)

۔۔۔ آنسوؤں کی لرزشوں کا ترنم ۔۔۔!!

فوزی بہن! بہت سی محبتیں

تمہارا خط مل گیا تھا۔ جواب فوراً نہیں لکھا۔ دیر سے لکھ رہی ہوں۔ احساس ہے کہ بے حد پریشان تھی۔ حالانکہ تمہارا جواب اور مشورہ میرے لئے تسلیوں کا باعث بنا ہوا ہے۔ اب یہ لکھنا ہی فضول ہے کہ پریشان کیوں ہوں۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ میں ان دنوں اُس کہانی کی بدولت کافی حد تک لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی ہوں اور اردگرد کی عورتوں اور لڑکیوں کی گفتگو کا موضوع جانے کیوں میری ذات بن کر رہ گئی ہے۔ اپنے اندر اتنی ہلچل پا رہی ہوں کہ فیصلہ نہیں کر سکتی، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ وہ شخص مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہتا تھا، کبھی اُس نے بات تک نہیں کی۔ میں ہر روز دانستہ اُس کے سامنے سے نہیں گزرتی ہوں کہ وہ مجھے دیکھے، میرے اوپر کوئی جملہ کسے۔ یہ حقیقت ہے وہ بہت کم گو، سنجیدہ اور سیدھا سادہ انسان ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اتنا متین، گہری فطرت کا ہو کر بھی جذباتی انسان ہے اور میرے لئے انجانے اور عجیب خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ خواب جن کا علم مجھے اُس کی تازہ کہانی پڑھ کر ہوا، جو اُس نے میرے نام منسوب کی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میں اُس کی اس حرکت کا منہ توڑ جواب دوں۔ اس کے لئے میں نے اپنی ایک سہیلی کو لکھا بھی ہے۔ وہ یقیناً اب اُسے ایسی جذباتی اور ذہنی چوٹ دے گی جسے وہ یقیناً تا زیست نہ بھول پائے گا اور پھر بھولے سے بھی میرے بارے میں اپنے قلم اور ذہن کو رومان پرور رعنائیوں کی نوک پلک درست کرنے کے کام میں نہ لائے گا۔ لیکن آج اس نے ایک نئی اور عجیب بات کی ہے۔ میں اُس سے ایسی اُمید ہرگز نہ رکھتی تھی۔ بس اُس کی یہ بات ہی مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کئے ہوئے ہے۔ اُس کے اس انداز اور خلوص کو میں ابھی تک نہیں بھول پا رہی ہوں۔ آج کچھ ایسا ہوا کہ میں صبح ہی صبح ایک ضروری کام سے گوری باجی کے ہاں جا رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں اٹیچی تھی۔ اُس میں اُن کا کچھ سامان تھا، جو میں دہلی سے خرید کر لائی تھی۔ سوچا انھیں سونپ آؤں۔ جیسے ہی میں نے گلی کا موڑ طے کیا وہ مجھ سے ٹکرا گیا۔ اور اس بے تحاشہ طور پہ ٹکرایا کہ میں کانپ گئی۔ اٹیچی کا سامان بکھر گیا۔ وہ پہلے تو خاموش کھڑا دیکھتا رہا، پھر شاید پہلی بار بولا "آپ کو میری طرف سے غلط فہمی ہو گئی ہے۔" میں اُس سے اِس طرح کی بات کی توقع نہ رکھتی تھی۔ اسی لئے میں نے اُس کی بات کا جواب نہ دیا۔ بھلا اس جملہ کا کیا موقع تھا۔ جبھی تو کہتے ہیں افسانہ نگار کی عقل کاغذ کے صفحے میں ہوتی ہے۔ میرے دل میں بہت کچھ تھا لیکن کچھ نہ بولی۔ بکھرا ہوا سامان بھی نہ اٹھایا۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ وہ خود جھینپا جھینپا میرا سامان اکٹھا کرنے لگا۔ جانے کیوں میں نے اُس سے کہہ دیا "اللہ بھی! میرا پیچھا چھوڑ دو!!" وہ مجھے تکتا رہا، پھر بہت دیر بعد جو جواب دیا، وہ عجیب ہی نہیں سپاٹ بھی تھا "میں خاموش چاہتوں کا شیدائی ہوں!!" اور وہ چلا گیا۔ جیسے اِس ایک جملے میں اپنے دل کا سارا درد، غم اور کرب اُنڈیل دیا ہو۔ جیسے اُس کی ساری شخصیت، ساری جذباتیت اِس ایک جملے میں مدغم ہو کر رہ گئی ہو فوزی ڈارلنگ۔

تم ہی بتاؤ، میں اُسے کیسے بتاتی کہ میں بھی اُسے ایک خاص مرکز پہ چاہت کی نظر سے دیکھ رہی ہوں۔ خیالوں اور خوابوں میں، غموں اور خوشیوں میں اُسے شریک کئے ہوئے ہوں۔ میں کیسے اُسے سمجھاتی، بتاتی۔ وہ رُکا ہی نہیں چلا گیا تھا۔ اُس لمحے میں نے سوچا تھا کہ میں اُس سے چند ضروری باتیں کروں گی۔ اُس کا ذہن اور دل صاف کرنے کی کوشش کروں گی۔ اُس کی جذباتی حرکتوں کو سنبھالا دوں گی۔ لیکن وہ میرے دل کا حال جانے بغیر ہی چلا گیا تھا۔ جانے کیوں۔۔۔؟

وہ شاید جلدی اِس لئے چلا گیا تھا کہ کہیں میں اُسے اُس کی حرکتوں پہ جھنجوڑ نہ دوں، اُسے بُرا بھلا نہ کہوں، اُس کی بدتمیزیوں کا مزہ نہ چکھا دوں۔ وہ بزدل ہے، وہ نرا گاؤدی اور بدمزاج انسان ہے۔ وہ بے حد بے تکا اور لااُبالی ہے۔ دل میں آتا ہے اُسے ایسی ایسی سناتی کہ میرے قدموں میں شرمندہ ہو کر گر جاتا۔ لیکن وہ جا چکا تھا۔ کیسے سناتی، کیا گلی کی دیواروں، اینٹوں اور پتھروں کو یا اُن پتوں کو جو خزاں کے بعد بہار کے شگوفے بنے مسکرا رہے ہیں۔ گوری باجی سے گھر جا کر میں نے دیکھی میری وہ نئی تصویر لے اُڑا ہے، جو میں نے دہلی میں سفید چوڑی دار پاجامے اور ۔۔۔

ہم شادی چتلی پہن کر فراک میں کھنچوائی ہے۔ اُف میرے اللہ! اُس میں تو میرے سینے پر
پٹہ بھی نہیں ہے۔ میری کلائیوں میں چوڑیاں بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ میں نے اپنی ساری
ویڈیوں سے جدا اسٹائل میں کھنچوائی ہے۔ کیوں ایسی تصویر کھنچوائی تھی، میں اُس
لڑکو کوستی ہوں جب میں نے ایسا کیا تھا۔ اب بھلا وہ کیوں مجھے میری تصویر واپس
دے گا۔ اُسے تو ایک اور نیا شوشہ ہاتھ آگیا ہے۔ وہ یقیناً میری اس تصویر کی تشہیر کرے گا۔
نہیں ۔۔۔ میرے بارے میں اپنے دوستوں سے کہے گا کہ مجھے اُس سے محبت ہے۔ نہیں، مجھے
اُس سے محبت نہیں ہے لیکن اب میری بات کا کون یقین کرے گا۔ وہ یقیناً اب مجھے سے
بیانیے سے لوگوں میں پیش کرے گا۔ میری ساری اسکیم کا اُس نے میری تصویر پر آ کر
ستیاناس کر دیا ہے۔

فوزی! ایسی حالت میں میں کر بھی کیا سکتی ہوں؟ اب مجھے اُس کی طرف
جھکنا پڑے گا۔ اُس کی چاہت اور مضحکہ خیز جذباتیت کا جواب دینا پڑے گا۔ اُس سے
دوری بات کرنی پڑے گی۔ بہر حال! اب میں جو ... جذباتی طور پر اُسے اپنے قریب لاؤں گی۔
اور اپنی یہ تصویر حاصل کر کے سکون سے بیٹھوں گی ورنہ میری راتیں، میرے خواب پہلے سے
بھی زیادہ اُلجھ جائیں گے۔ میں اب اپنے پہلے پروگرام کو منسوخ کر رہی ہوں، میں دوسری
شادی نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں کروں گی۔ تمھاری ہمدردیوں، دلچسپیوں، محبتوں اور
چاہتوں کا شکریہ۔ رات کی گہری خاموشی میں میں اپنی ہی سانسوں کی نامحسوس بے ترتیبی پر
خود ہی چونکی۔ تمھیں خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ تم میری اس عجیب حالت پر مذاق
نہ اُڑاؤ گی میرا۔

تمھاری سہیلی نظمہ نکہت

سولہ فروری سن اُنیس سو چونسٹھ عیسوی
کہکشاں، مصطفی روڈ۔ امروہہ (یو پی)
خزاں کے شگوفے، بہاروں کے نغمے ۔۔۔!!
پھپھی جان! آداب

آپ کے خط نے ایک عجیب سا تاثر میرے دل پر جما دیا ہے۔ شبیر کی حالت رفتہ
رفتہ معمول پر آ رہی ہے۔ وہ اب گھر سے رات رات بھر غائب نہیں رہتے۔ اپنے کام میں
مصروف رہتے ہیں۔ کوئی خیال، کوئی خواب اُن کے دل میں جاگے بھی تو کیوں؟ وہ اب
مجھ سے بھی بات کرنے لگے ہیں۔ ننھے کی طرف بھی مسکراہٹ سے دیکھ لیتے ہیں۔ مجھے محسوس
ہوتا ہے یہ اُن کی فطرت کا کوئی خاص احساس ہے کہ وہ کبھی قنوطیت پرست ہو جاتے ہیں،
کبھی جذباتی، کبھی سنجیدہ اور کبھی شوخ۔ یا پھر یہ کہوں تو مناسب ہے کہ جاتی خزاں کی آتی
بہار نے اُنھیں ایک بار پھر میرے قریب کر دیا ہے۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے
میری طوفان زدہ حالت کو سنبھالا دیا۔ وہ اب واپس آتے ہوں گے۔ اُن کے آنے سے
پہلے ہی میں یہ خط پوسٹ کرنا چاہتی ہوں۔ اس لئے مختصر لکھ رہی ہوں۔ کوئی اور خیال
دل میں نہ لانا۔ مجھے آپ کی حالت کا احساس ہے۔ ننھا آگیا ہے۔ خوشی کی بات ہے۔
بچوں کو پیار۔

آپ کی ... نسرین

تین اپریل سن اُنیس سو چونسٹھ عیسوی
گھڑیال منزل، شہباز صدیقی روڈ۔ امروہہ (یو پی)
ادھ کھلے غنچے خیالوں کے، پھول بنے خوابوں کے ۔۔۔!!
فوزی میری! بہت سے پھول بہاروں کے

مجھے خوشی ہے کہ تم نے میرے حالات غور سے سنے، میرے ساتھ ہمدردیاں کیں
اور نیک مشورے دیئے۔ مجھے احساس ہے کہ تم میری سچی غم گسار سہیلی ہو، میں تمھاری شکر گزار
ہوں فوزی! اگر تم نے میرے غم اپنے دکھ سمجھ کر مجھے مشورے دیئے اور وہ پیام بھی جو میرے
بکھرتے خوابوں کی رعنائیاں بن گئے ہیں لیکن یہاں ایک عجیب بات نے جنم لے لیا ہے
مجھے یہ اُمید ہرگز ہرگز نہ تھی کہ ایسا اتنی تیزی سے سامنے آجائے گا۔ میں نے جس افسانہ نگار
کے بارے میں تمھیں لکھا تھا وہ بڑا ہی عجیب انسان ثابت ہوا۔ اُس نے مجھے اپنی طرف
ملتفت کرنے کے لئے ہر وہ طریقہ اختیار کیا جو کسی بھی شریف اور متین انسان کا شیوہ نہیں
ہو سکتا۔ اُس نے میری تصویر کے اتنے پوز بنوا ڈالے ہیں کہ اُس کے کمرے میں آویزاں رہنے
والی ساری تصویریں اب الماری میں بند ہیں اور صرف میری ہی تصویریں نمایاں
طور پر اُس نے لگا رکھی ہیں۔ دیکھو نا! کتنا بے تُکا انسان ہے۔ کوئی سمجھائے اس پاگل کو۔
ارے اللہ! میں اُسے یہ کبھی نہیں کہوں گی، لیکن کون سمجھائے؟ وہ مجھے تمھاری طرح ... جو
میں اُس سے بات کروں۔ وہ میرے دل کا حال نہیں جانتا۔ ایسا مجھے خیال ہے۔ وہ میرے
بارے میں لمحہ لمحہ کی خبریں اکٹھی کرتا رہتا ہے۔ آج ہی مجھے ... ۔۔۔
... کل ملا تھا۔ اُس نے مجھے تنہا پا کر روک لیا تھا اور ... جرأت سے میرے چہرے کو
تکتا رہا تھا اور پھر کہنے لگا تھا "میں تم سے ہمدردی کرتا ہوں، چاہت بھرے خواب ... ساتھ!"
میں نے اُس کی تمام گزشتہ حرکتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا "تھا ... اور فوزی
تمھیں دن رات کوستی رہتی ہوں، تمھارے قلم کو بددعائیں دیتی رہتی ہوں، اللہ کرے
کبھی اب نہ چلے میرے خلاف!" تمھیں نہیں معلوم اُس نے میری بات سن کر کیا جواب دیا۔
پہلے وہ مسکرا دیا پھر دھیرے سے بولا "میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔۔۔!" میں نے
اپنے بارے میں اُس کی جذباتیت اور چاہت ... کیا فیصلہ کیا ہے تم بتا سکتی ہو فوزی؟
نہیں ۔۔۔ تمھیں نہیں معلوم۔ میں جلدی ہی تمھیں اپنی شادی میں بلانے کا ٹیلیگرام دینے

والی ہوں۔ خوش ہونا؟ اچھا بھئی، باقی ملاقات پر۔

تمہاری باجی بہن نظمہ نکہت

پانچ سو تین انیس سو چودہ عیسوی

ریگستان منزل محلہ اردو۔ امروہہ (یو۔پی)

ٹھہرے خوابوں کے بہکے قدم ———!!

میرے ساتھی! سوغات محبت کی

چشتی بھائی! میں آپ کا، انجم بھارتی اور اپنے تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ آپ یقیناً یہی کہیں گے کہ اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے۔ زندگی میں لطف بڑھانے کے لئے ایسے سوانگ رچانے ہی پڑتے ہیں۔ ایسی شرمندگیاں اور حماقتیں کرنی ہی پڑتی ہیں۔ کسی کے لئے، کسی کے غموں کو نبھانے، سمجھنے اور سنبھالنے کے لئے ہم جیسے جذباتی انسانوں کو اپنا ذہن اور دل تباہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہاں! یہ ٹھیک ہے کہ میں نے آپ لوگوں کے ذریعے نظمہ نکہت نامی لڑکی سے محض خوش وقتی کے لئے خطوط لکھوائے اور اس کی تحریریں پانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا لیکن وہ مجھے سچ مچ اپنی زندگی سونپنے پر آمادہ ہو گئی ہے جبکہ میں شادی شدہ ہوں! اس کی معصومیت کی انتہا نے میری بیوی کو بھی متوجہ کر دیا ہے۔ یعنا میری سنجیدہ خاموشی کو وہ جانے کیا کچھ سمجھ گئی کہ اس نے بھی چچی کو میری اس تبدیلی کے بارے میں خط لکھ ڈالے۔ وہ تو کہئے کہ یہ خطوط وہ پوسٹ نہ کر سکی اور میرے علم میں اس کی تشویش اور گھبراہٹ آ گئی۔ اسی لئے میں نے یہ منزل بھی خود ہی طے کر لی یعنی خود ہی چچی جان کی طرف سے بھارتی سے خط لکھوائے۔ میں چچی جان کے خطوط سے اپنی اس کیفیت کی طرف پلٹا ہوں جو میں نے کسی وجہ سے گم کر دی تھی۔ کتنی بے وقوف ہے یہ عسمہ نسرین! اور کتنی معصوم ہے نظمہ نکہت کہ وہ آج تک یہ نہ سمجھی کہ وہ جو عسمہ نسرین اور فوزی کے خط پا رہی ہے، وہ میرے دوستوں کے ذہن کا نتیجہ ہیں۔ بہرحال میں اس ہنگامی اور وقتی رومان کو ختم کر رہا ہوں کہ اب میرے سر پہ بہت سی نئی ذمہ داریاں آ گئی ہیں۔ اُن لمحوں کو واپس لانا ہی کیا جو میرے خواب چھین چکے ہیں۔ کل میں نظمہ نکہت سے مل کر بھی یہ بات اسے سمجھا دوں گا کہ وہ میرے بجائے کسی اور سے شادی کر کے اپنی زندگی سنوارے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ والسلام!

آپ کا اپنا۔ عشیر الموڈدی

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ پاکستانی ٹکٹ ہندوستان میں کارآمد نہیں ہیں اس لئے پاکستانی احباب اس شرط سے مستثنیٰ ہیں۔ (منیجر جیوس صدی دہلی)

غزل

ماہر القادری

دل اُمیدوں سے پھر شادماں ہے
اے غمِ بے کسی! تو کہاں ہے
ہجر میں کوئی کیوں سرگراں ہے
یہ تو اِک منزلِ درمیاں ہے
اُس جبیں پر پسینہ کے قطرے
جیسے بھیگی ہوئی کہکشاں ہے
قُربِ منزل کا دھوکا نہ کھانا
زندگی منزلِ بے نشاں ہے
تم جفاؤں پہ نادم نہ ہونا
یہ حسابِ دلِ دوستاں ہے
چوٹ کھائے ہوئے دل کی لَے میں
نغمہ کم ہے زیادہ فُغاں ہے
آتشِ گُل کو اب کے ہوا کیا؟
گُلستاں میں دُھواں ہی دُھواں ہے
عاشقی اِک مصیبت ہے ماہر
دل نگاہوں سے بھی بدگماں ہے

کشمکش

رشمی پٹیالوی

اُٹھ گئی جب مری نظر سہواً
آنکھ سمجھی کہ اجنبی ہو تم
دل مگر یہ بہ بے پکار اُٹھا
جستجو جس کی تھی وہی ہو تم
حادثہ پھر کوئی قریب نہ ہو
پھر مرے دل پہ چھائے ہو تم
جس قدر چاہ بڑھتی جاتی ہے
اُتنے ہی دُور جا رہے ہو تم
بے خود ایسا بنا دیا تم نے
مُجھ کو اپنا کوئی خیال نہیں
تم سے ہو جاتے بے نیاز مگر
یہ مرے ہوش کی مجال نہیں
تم کو پلکوں کی اوٹ میں رکھ لوں
یا تُمھیں قلب میں اُتاروں میں
تم کو اپنا کہوں کہ بیگانہ
تم کو کس نام سے پکاروں میں؟

غزل

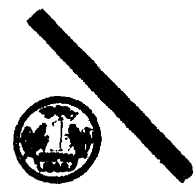
نسیم شاہجہاں پوری

مزاجِ حُسن ہے کس درجہ انقلاب پسند
کبھی حجاب سے نفرت، کبھی حجاب پسند
کوئی نباہ کی صورت نظر نہیں آتی
میں احتیاط کا قائل وہ اجتناب پسند
مآلِ کار کسے سوچنے کی فرصت ہے
کہ زندگی کی طرح وقت ہے شتاب پسند
میں اشکبار ہوں عصیاں پہ اس یقین کے ساتھ
کہ ہے خدا کو بہت دیدۂ پُر آب پسند
ازل سے واعظ و میکش میں ہے تضادِ خیال
اِسے شراب سے نفرت، اُسے شراب پسند
میں کیوں نہ حُسن کی عظمت کا اعتراف کروں
کہ جب خدا کو بھی ہے حُسنِ لاجواب پسند
ترا پیامِ عمل رائگاں ہے اے ناصح
کہ ہے زمانہ ابھی شاہد و شراب پسند
تغیراتِ زمانہ سے مطمئن ہوں نسیم
مری طرح ہے زمانہ بھی انقلاب پسند

اپنے بنکنگ کاروبار کے لئے

پنجاب نیشنل بنک ہی کیوں؟

چھ وجوہات ۔ آپ ایسے بنک سے کاروبار کرتے ہیں جو



محفوظ



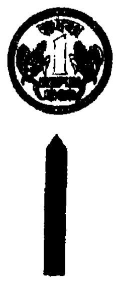
مستحکم



مضبوط

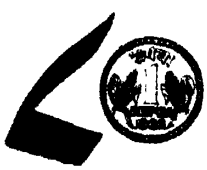


مددگار



ماہر

اور



سال پرانا ہے

افسانہ

روزی

راز یوسفی

۳۴/۱۔ دھرم پورہ۔ لاہور نمبر ۱۵

۲۶ جولائی ۶۵ء

صدیقِ محترم۔ ہدیہ سلام و عقیدت

افسانہ نمبر میں "خطرناک نغمہ" کی اشاعت کا شکریہ۔ اس ضمن میں اکثر قارئین کرام نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ یہ کہانی فرضی ہے یا سچی؟ ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ بنیادی طور پر یہ کہانی سچی ہے لیکن زیبِ داستان کی غرض سے جزئیات میں معمولی سا اضافہ کیا گیا ہے اور اس طرح اس کہانی کو "حقیقت و افسانہ" کا امتزاج کہنا زیادہ درست ہوگا ——— جبلّی طور پر صنفِ نازک وفا کی پتلا ہے لیکن بعض اوقات جب اس کا مردوں کے مظالم سے تنگ آکر اس کی انا جاگ اٹھتی ہے اور وہ انتقاماً بے وفائی پر اتر آتی ہے۔ وفا کا پاک جذبہ مکان و زمان کی قید سے آزاد ہے۔ یہ پاک جذبہ ہر رنگ، ہر نسل، ہر خطّے اور ہر ملک میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے اسی موضوع پر ایک تجرباتی کہانی کا تانا بانا بُنا ہے۔ خدا کرے آپ کو اور "بیسویں صدی" کے ان گنت قارئین کو پسند آجائے۔۔

سپاس گزار ——— راز یوسفی

میں کچھ دیر سے پہنچا تھا۔

ہال کی بتیاں گُل ہو چکی تھیں۔ "دُکھ سُکھ" کا افتتاحی شو تھا۔ مجھے وقت سے کچھ پہلے پہنچنا چاہئے تھا لیکن راستے میں کار کا انجن خراب ہو جانے کے باعث ایسا نہ ہو سکا۔ ہال کی دبیز تاریکی کے سائے لہرا رہے تھے لیکن مجھے اپنی نشست تلاش کرنے میں زیادہ دشواری کا سامنا نہ ہوا کیونکہ وہ پہلے سے محفوظ تھی اور اسٹیج سے قریب ہونے کے باعث وہاں ہلکی سی روشنی بھی تھی۔ دو رویہ گدّے دار کرسیوں کے درمیانی راستے سے دبے پاؤں گزرتا ہوا میں اپنی نشست پر جا بیٹھا اور کھیل کی دلچسپیوں میں کھو گیا۔

کچھ زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ پہلا ایکٹ ختم ہو گیا۔ پردہ گرا۔ تاریکی چھٹ گئی اور ہال کی بتیاں جگمگانے لگیں۔ ڈرامے کے منتظمین جو شاید دیر سے میری جستجو میں تھے، اسٹیج کے قریبی دروازہ سے اندر داخل ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اچانک اسٹیج ڈائرکٹر کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ ہونٹوں پر تبسّم کی گہری لکیر لئے ہوئے میری طرف لپکا اور مسخیانہ انداز میں بولا۔

"دُکھ سُکھ کا افتتاحی شو مبارک ہو! پہلا ایکٹ کامیابی کے ساتھ ختم ہوا ہے۔ ہال سے باہر آپ کے قلم سے نکلے ہوئے زوردار مکالموں کی تعریف ہو رہی ہے۔"

"شکریہ ——— لیکن ابھی یہ تعریف قبل از وقت ہے۔ پورا کھیل ختم ہونے پر صحیح نتیجہ سامنے آئے گا۔" میں نے دبی دبی آواز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"نتیجہ خوشگوار ہی نکلے گا۔ ڈرامہ کے شیدائی صرف آپ کا نام سُن کر ہی کھیل کے معیار سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔" اسٹیج ڈائرکٹر غیر ضروری تعریف پر اُتر آیا۔

"تعریف کا مستحق کام ہوتا ہے۔ نام میں کیا رکھا ہے؟" میں انکساری سے کام لینے لگا۔

اتنے میں بیرا کوکا کولا کی کئی بوتلیں طشتری میں سجائے ہوئے میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا

"کوک لیجئے" اسٹیج ڈائرکٹر بولا۔

"اس تکلّف کی کیا ضرورت تھی!"

"آپ شرمندہ کر رہے ہیں جمیل صاحب! یہ ساری ہنگامہ آرائی آپ ہی کی بدولت ہے۔

میں ابھی طشتری سے کوکا کولا کی بوتل اٹھا ہی رہا تھا کہ بائیں جانب ایک نسوانی آواز اُبھری۔

"بھائی جان! اکیلے اکیلے ہی پیجیے گا؟"

میں نے نظر گھما کر دیکھا تو صرف ایک گز کے درمیانی فاصلہ کی پہلی کرسی پر ایک مُرجھائی ہوئی سی خاتون پُر اشتیاق نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ پہلے تو میں کچھ چکرا سا گیا لیکن تھوڑی سی توجہ کے ساتھ دیکھنے پر میں نے اُسے بہت آسانی سے پہچان لیا۔

"اوہ! بھابی جان آپ؟" حیرت اور مسرت کے ملے جُلے جذبات سے میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ پھر فوراً ہی اپنے جذبات پر قابو پا کر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کوکا کولا کی بوتل پیش کرتے ہوئے بولا۔

"بہت عرصے کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔ کوک لیجئے۔"

"نہیں۔ آپ پئیں۔ میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔ ہاں! پان کا ایک ٹکڑا ہو تو کھلا دیجئے۔ منہ کا مزہ پھیکا ہو رہا ہے۔"

"وہ بھی پیش کروں گا۔ پہلے کوک تو پیجیے۔"

مزید تکلف سے کام لئے بغیر اُس نے کوک کی بوتل پی لی۔ پھر میں نے پانوں کی ڈبیہ کھولی اور پان پیش کیا۔

"آپ کے پاس زردہ تو ہوگا؟"

"زردہ ہی نہیں پلاؤ بھی ہے!" میں نے ازراہِ مذاق کہا۔ "کیا آپ زردہ بھی کھاتی ہیں؟"

"جی ـــــــ" اُس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے یہ سانس حلق کے راستے سے نہیں، براہِ راست دل چیر کر باہر آگئی ہو۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر وہ دھیرے سے بولی۔

راحت کو بھی تو زردہ بہت پسند تھا" اور پھر مجھے یُوں لگا جیسے اُس کا گلا رُندھ سا گیا ہو۔ چہرہ سُتّ گیا ہو۔ آنکھوں کی بیکراں ویرانیوں میں اضافہ ہوگیا ہو۔

پھر وہ کچھ نہ بولی۔ ہال کی بتیاں گُل ہوگئیں۔ ہر طرف اندھیرے کی چادر تن گئی۔ اسٹیج بقعۂ نور بن گیا۔ پردہ دھیرے دھیرے سرکنے لگا۔ اسٹیج ڈائرکٹر چلا گیا اور اسٹیج پر اداکاروں کی نقل و حرکت شروع ہوگئی۔ مکالمے گُونجنے لگے لیکن میرے جذبات میں ایک تلاطم بپا ہو چکا تھا۔ یادوں کے زخم ہرے ہوگئے تھے۔ اب سے بیس سال پہلے کا ایک ایک واقعہ میرے ذہن کی سطح پر یوں اُبھر آیا جیسے فلم کے پردے پر بے جان تصویریں!

راحت میرا منہ بولا بھائی تھا۔ ہم دونوں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ارادہ سے ساتھ ہی انگلستان گئے تھے اور ایک ہی کالج میں تعلیم پا رہے تھے۔ وہیں روزی کی ملاقات راحت سے ہوتی تھی اور کچھ ہی دنوں میں دونوں یک جان و دو قالب کی ساری منزلیں طے کر گئے تھے۔ روزی اُن دنوں اپنے نام کی مناسبت سے گلاب کا مہکتا ہوا پھول تھی۔ وہ نسلی طور پر انگریز لڑکی ضرور تھی لیکن عادات و اطوار اور چہرے مہرے سے مشرقی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

تقسیمِ ملک سے پہلے اُس کا بچپن ہندوستان میں گزرا تھا جہاں اُس کا باپ حکومتِ برطانیہ کی ملازمت کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ اِس لئے وہ ہندوستان کو نہیں بھولی تھی۔ اِس سے اُس کے بچپن کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ ہی وہ ہندوستانیوں کو بھی بہت پسند کرتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اُس نے اپنا جذباتی رشتہ حیات کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا

راحت نہ صرف ایک اچھا طالب علم تھا بلکہ سحر طراز شاعر بھی تھا۔ اُس کی رومانی نظمیں جذبات میں آگ سی لگا دیا کرتی تھیں۔ روزی کو اُردو ادب سے بہت لگاؤ تھا اور اس بنا پر بھی وہ بہت جلد راحت کی طرف مائل ہوگئی تھی۔

عام انگریز لڑکیوں سے روزی کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اُس میں بے حیائی اور بے راہروی نام کو نہ تھی۔ وہ بے حد متین و سنجیدہ اور باوقار تھی۔ کالج کے سرپھرے آوارہ طالب علم اُس سے آزادانہ بات چیت بھی کرتے تھے۔ وہ کسی کو لفٹ دینے کی قائل ہی نہ تھی۔ کالج کے اوقات میں وہ صرف راحت سے ہمکلام ہوتی تھی یا کبھی کبھار مجھ سے۔

کچھ دنوں بعد کالج کے ماحول پر یہ خبر بم بن کر گری کہ روزی اور راحت نے ایک دوسرے کو جنم جنم کا ساتھی بنا لیا ہے۔ ابتدا میں صرف مجھے اس بات کا علم تھا لیکن جب یہ سنسنی خیز خبر عام ہوئی تو ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں اور رنج و غصے کی ایک ہلکی ہلکی لہر چاروں طرف گردش کرنے لگی۔ انگریز لڑکے روزی کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے جس نے انگلستان کی عزت کو خاک میں ملا کر ایک ہندوستانی کے دامن میں پناہ لے لی تھی۔ جو اُن دنوں انگریزوں کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں پہنے ہوئے تھا لیکن روزی کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔ وہ اپنے فیصلے پر پُوری طرح مطمئن تھی اور راحت کو اپنی زندگی کا آخری سہارا سمجھ رہی تھی۔

کچھ دنوں بعد اچانک مجھے ہندوستان واپس آنا پڑا۔ کیونکہ یہاں میرے والد صاحبِ فراش تھے اور زندگی کی آخری سانس لینے سے پہلے مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھے اُن کی خواہش کا احترام کرنا پڑا اور اِس طرح میری اعلیٰ تعلیم ادھوری رہ گئی۔ اُن کے انتقال کے بعد تو میری ذمّہ داریوں میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

دو سال بعد راحت بھی روزی کے ساتھ ہندوستان واپس چلا آیا۔ اُن دنوں روزی کی گود میں ایک چھوٹی سی بچی تھی جو سچ مچ چینی کی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ میں اُن کے استقبال کے لئے بمبئی پہنچا تھا۔ روزی پُوری عورت بن چکی تھی۔ میں اُس کے حُسن و شباب کو دیکھ کر دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ سفید ہندوستانی لباس میں آسمان سے اُتری ہوئی حُور نظر آتی تھی۔ میں دل ہی دل میں راحت کی قسمت پر رشک کرنے لگا۔

ہم ساتھ ہی لاہور پہنچے۔ جہاں راحت کو ایک بہت بڑے کالج میں پروفیسری مل گئی اور زندگی کا نیا دور شروع ہو گیا۔ ان دنوں اُس کی شاعری اپنے پورے عروج پر تھی۔ اپنے علم و فضل کے ساتھ ساتھ اُس نے شاعری کو بھی وہ جدت اور نیا اسلوب بخشا تھا کہ سارے مُلک میں اُس کے نام کا طوطی بولنے لگا تھا۔

پھر ایک روز ـــــ ریڈیو نے اُس کے اچانک انتقال کی درد انگیز خبر سُنائی۔ پورے مُلک میں کہرام سا مچ گیا۔ میں راحت کی قیام گاہ پر پہنچا۔ جہاں پورا شہر اُمڈا ہوا تھا اور مرنے والے کو خراجِ تحسین ادا کر رہا تھا۔ اُس ہجوم میں ایک بیوہ اور دو یتیم بچوں کی کربناک حالت مجھ سے نہ دیکھی گئی۔ روزی غم والم کا پیکر بنی ہوئی راحت کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں پُر نم تھیں اور ہونٹ خشک۔ وہ سیاہ ماتمی لباس میں بھی کتنی حسین نظر آ رہی تھی جیسے وینس کا مجسمہ ہو یا کوہ قاف کی پری!

عمر کی لہر آئی اور گزر گئی۔

دوپہر کے کھانے میں ایک روز میں نے روزی سے کہا۔

" بھابی! تم بُرا نہ مانو تو میرے ہاں چلی آؤ۔ دل بہلا رہے گا۔"

اُس نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں جواب دیا۔

" نہیں بھائی! میں یہ کوٹھی نہیں چھوڑ سکتی۔ زندگی بھر نہیں چھوڑوں گی۔ اس کوٹھی میں وہ مجھے چلتے پھرتے، ہنستے بولتے نظر آتے ہیں۔ ابھی تک اس کوٹھی کے در و دیوار میں اُن کے قہقہے گونج رہے ہیں۔ میں جیتے جی اس کوٹھی کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں!"

پھر میں نے اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا اور روزی سینہ سپر ہو کر کارزارِ حیات میں سرگرمِ عمل ہو گئی۔

آج روزی کو ڈرامہ ہال میں دیکھ کر عقیدت و احترام سے میرا سر اُس کے سامنے جھک گیا۔ کتنی عظیم ہے یہ عورت! بیس سال پہلے کی حسین و جمیل روزی کے بالوں کی سیاہی سفیدی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ عارضوں کے گلاب مُرجھا چکے ہیں۔ آنکھوں کی چمک زائل ہو چکی ہے۔ چہرے کی جھریاں گہری ہوتی جا رہی ہیں۔ آواز کی کھنک ماند پڑ چکی ہے۔ دودھ جیسی سفید رنگت مٹی ہو چکی ہے۔ زمانہ قیامت کی چال چل چکا ہے۔ وقت نے دشمن کی طرح آنکھیں پھیر لی ہیں لیکن روزی کے عزم و ارادہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ آج بھی اپنی دو بچیوں کے ساتھ اُسی پُرانی کوٹھی میں رہتی ہے۔ وہ کوٹھی جس میں اُس کے بچھڑے ہوئے محبوب کی اَن گنت نشانیاں موجود ہیں۔ جہاں اُس کے سسکتے ہوئے ارمان دم توڑ رہے ہیں۔ جہاں اُس کا سہاگ اُجڑا ہے لیکن وہ ابھی تک اُس کھنڈر کی حفاظت کر رہی ہے ــــــ کون کہتا ہے کہ عورت بے وفا ہے۔ عورت "مغرب" سے تعلق رکھتی ہو یا "مشرق" سے، وفاداری کا جذبہ دونوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اُس کی سرشت ہے۔ اُس کی فطرت کا قیمتی جوہر ہے۔

میں سوچ کی انہی وادیوں میں بھٹکتا رہا اور اُس وقت چونکا، جب ڈرامہ ختم ہونے کے بعد تماشائی ہال سے باہر نکل رہے تھے۔ روزی بھی چپ چاپ ہال سے باہر نکل گئی۔ شاید اُس کے دل پر بھی ایسے کرب و اندوہ کا سایہ پڑ گیا تھا!!

غزل

سیف یزدانی جالندھری

تیرے بغیر یوں ہے یہ دل مضمحل اُداس
جس طرح میکدے میں پڑا ہو تہی گلاس

شکوہ ہے باغباں سے، نہ صیّاد سے گلہ
ہم کو ہوائے صحنِ چمن ہی نہ آئی راس

اُس چشمِ سحر کار کا افسوں نہ پوچھئے
ٹوٹی ہزار بار، بندھی لاکھ بار آس

بزمِ نیاز و ناز کے دستور ہیں وہی
اُن کو جفا پسند تو ہم کو وفا کا پاس

کیا مجھ میں اور غیر میں کچھ فرق ہی نہیں؟
کیا کہہ رہا ہے آپ کا اندازہ و قیاس

دیکھا گیا نہ اُن سے مری سمت پھر کبھی
کیسا یہ تو نے ظلم کیا اے نگاہِ یاس

بے رحم کس قدر ہے خزاں کی نگاہِ گرم
ہر پھول کو چمن میں بدلنا پڑا لباس

ہم کو سکوتِ اہلِ سخن سے گلہ ہو کیا
ہم لوگ ٹھہرے کشتۂ تحسینِ ناشناس

محشر کی فکر کس کو ہے یزدانیؔ حزیں
یزداں کی رحمتوں پہ گناہوں کی ہے اساس



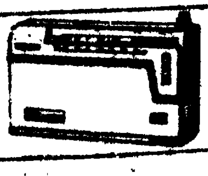
شارپ جھنکار آپ کی زندگی کو پُر مسرت بناتا ہے

گھر پہ یا گھر سے باہر، شارپ جھنکار ٹرانسسٹرز ہر عمر کے سننے والوں کے لئے مسرت بخش ہیں۔ چٹان کی طرح مضبوط اور قابلِ اعتماد ہونے کی وجہ سے یہ اُن تمام اعلےٰ ترین خوبیوں کے حامل ہیں جو بلند پایہ کارکردگی کو یقینی بناتی ہیں۔ مناسب داموں پر شاندار وضع قطع کے ساتھ یہ صرف اُن اصحاب کے لئے تیار کئے جاتے ہیں، جنہیں صرف بہترین ہی چاہئے۔ یادر کھیئے! شارپ جھنکار ریڈیو جاپان کی ہایاکاوا الیکٹرک کمپنی لمیٹڈ کی ٹیکنیکل تال میل کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

Sharp JHANKAR

جو صحیح آواز کو اصلی کمال تیار کرنے کیلئے دنیا بھر میں مشہور ہے

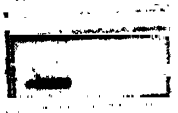
اِنڈین پلاسٹکس لمیٹڈ، ملوٹس ہاؤس، بمبئی-۱



ماڈل پی ایکس ایس۔ ۲۳۸ (پورٹیبل سیٹ)
۸۔ ٹرانسسٹر۔ بینڈ
ٹون کنٹرول ـــ ۲۲۵ ـــ روپیہ
ایکسائز ڈیوٹی ۲۰ روپیہ - علاوہ ٹیکس

ماڈل ـ ۵ لے ـ ۴۶
۶ ـ ٹیوب ـ ۴ ـ بینڈ
مختلف ٹون کنٹرول ـ ۲۵۰ ـ روپیہ
ایکسائز ڈیوٹی ۳۰ روپیہ علاوہ ٹیکس

ماڈل پی زیڈ ـــ ۲۹۰ (پورٹیبل سیٹ)
۹ ٹرانسسٹر ـــ ۳ بینڈ
فائن ٹیوننگ ـــ ۳۷۵ ـ روپیہ
ایکسائز ڈیوٹی ۴۰ روپیہ علاوہ ٹیکس



افسانہ

مُسکراہٹیں

ایم۔ یوسف ہستی

۲۹۰-۳-۱، مشیرآباد، حیدرآباد۔۲۰ (اے پی)

۶ راگست ۶۵ء

محترمی خوشتر صاحب تسلیم

"مُسکراہٹیں" لے کے پہلی بار آپ کی بزم میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اِس دُکھ بھری دُنیا میں مُسکرانا بہت بڑی بات ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر مُسکراہٹ کے پیچھے کوئی نہ کوئی غم ضرور ہوتا ہے۔ اور ایسا ہی ایک غم زیرِ نظر مُسکراہٹوں کے پیچھے چھپا ہوا ملے گا۔ . .

اخلاص کیش ——— ایم۔ یوسف ہستی

مجھے بحیثیت اسٹینوگرافر ولیکا اکشتان انسٹی ٹیوٹ میں آئے چند ہی دن گزرے تھے۔ کالج چھوڑنے کے بعد یہ میری پہلی ملازمت تھی۔ ماحول تو اجنبی تھا ہی۔ مجھے جو کام دیا گیا تھا وہ بھی میرے لئے نیا ہی تھا۔

"کہاں کالج کی زندگی اور کہاں یہ دفتری فائلوں اور نوٹس کی گھما گھمی! دونوں ہی زندگیاں ہیں —— پھر بھی کتنا فرق ہے دونوں میں!! ایک فضا میں سانس لیتے ہوئے مسرت ہوتی تھی اور وقت رنگینیوں اور دلچسپیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور یہ بھی ایک فضا ہے کہ سانس لیتے ہوئے کئی انجانی باتوں کا خیال آکر زندگی کو بوجھل بوجھل سا بنا دیتا ہے اور ایک گھٹن سی محسوس ہوتی ہے۔

آزادی اور غلامی کا فرق آج شدت سے محسوس ہو رہا تھا۔ کاش آزادی کے لمحے جاوداں ہوتے!!

گزشتہ چند دنوں سے ایک عجیب اتفاق سے دوچار ہونا پڑا۔ جب بھی میں "حاضری روم" میں دستخط کے لئے پہنچتی ہوں تو دیکھتی ہوں کہ انہیں پہلے سے کرہ میں موجود ہے۔ یا جب میں دستخط کرکے پلٹتی ہوں تو وہ داخل ہوتا ہے۔ ابتدا میں تو میں اِسے محض اتفاق ہی سمجھتی رہی لیکن جب یہ اتفاق پابندی سے کئی ہفتہ جاری رہا تو معاً اُس کے بارے میں میرے دل میں کُریدسی پیدا ہوئی۔

آخر یہ کیا بات ہے کہ وہ اُسی وقت کمرہ میں آتا ہے جب میں دستخط کرنے داخل ہوتی ہوں یا دستخط کرکے لوٹتی ہوں۔

کیا وہ مجھے دیکھنے تو نہیں آتا؟ کیا وہ مجھ سے واقف ہے؟ کیا وہ کچھ کہنا چاہتا ہو؟ یا وہ کہیں ——— !

لیکن میں نے اِن اندیشوں کو نہ تو کسی پر ظاہر کیا، نہ کوئی ایسی خواہش پیدا ہوئی کہ انہیں ہی سے کچھ پوچھ لیتی۔ لیکن کیا پوچھتی؟ جبکہ ——— !

اِس دَوران میں انہیں نے کوئی گفتگو کرنے کی سعی کی تھی اور نہ کوئی ایسی حرکت اُس سے سرزد ہوئی تھی جسے اُس کی طرف سے پیش قدمی کہہ سکوں۔ وہ بس ایک لمحہ میری طرف دیکھتا اور مُسکراتا ہوا گزر جاتا مُسکراہٹ، جب کسی سے تعارف نہ ہو تو کوئی معنی رکھتی ہے۔

"ہاں! اگر میں نے کوئی بات اِس عرصہ میں نوٹ کی تو اُس کی وہ روز روز کی نئی نئی وضع اور رنگت کی جامہ زیبی تھی جو اُس کے مذاقِ خوش پوشی کو ظاہر کرتی تھی۔

کبھی نیلے رنگ کی پتلون پر دُودھیا رنگ کی بُش شرٹ، کبھی سیاہ رنگ کی پتلون پر سفید شرٹ اور بادامی رنگ کی نکٹائی، کبھی فیروزی رنگ کا فُل سُوٹ، کتھائی رنگ کے موزے اور اُس پر سفید نوکدار ٹو والا شو۔ عموماً وہ سلک یا وولن کا پتلون اور ہلکے رنگ کی بُش شرٹ پہنتا اور آنکھوں پر ہلکے نیلے رنگ کی عینک لگاتا جو اُس کے چہرہ پر خوب جچتی اور ——— کبھی کبھی تو یہ خیال گزرتا کیوں نہ میں بھی عینک لگاؤں جبکہ وہ کسی کی شخصیت کو اُبھارنے میں اتنی معاون ثابت ہوتی ہے۔ جامہ زیبی میں عموماً عورت کو اونچا مقام حاصل ہے لیکن آنجناب کی خوش پوشی کو دیکھ کر عورتوں کو بھی رشک آجائے!

سچ تو یہ ہے کہ ہر رنگ کا لباس اُس کی کھُلی رنگت پر خوب زیب دیتا ہے اور اُس کی شخصیت کو خوب نکھارتا ہے۔

ایک دن میں صاحب (ڈی ڈی او) کے دیئے ہوئے ایک طویل ڈکٹیشن کو پوری توجہ اور مستعدی سے ٹائپ کر رہی تھی کہ دفعتاً انیس میرے قریب آیا اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"معاف کیجئے ـــــ اگر حرج نہ ہو تو اس مختصر سی درخواست کو ٹائپ کر دیجئے۔ یہ میرے چھوٹے بھائی کی درخواست ہے اور اس کی ابھی ضرورت ہے۔ دیکھئے نا، ایسے وقت لایا ہے جب میں بچوں کو پڑھانے میں بے حد مشغول ہوں اور باہر جا کر ٹائپ کروانے سے معذور۔ امید کہ آپ کچھ خیال نہ کریں گی۔ میں لئیق کو آپ کے پاس بھیج دیتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ تشکر آمیز مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد لئیق میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں انیس کی اس بات پر تھوڑی دیر کے لئے جھلا سی گئی۔

اتنا ارجنٹ کام کر رہی ہوں اور یہ بلائے ناگہانی ٹپک پڑی! لیکن میں نہ جانے کیوں لئیق کو ٹال نہ سکی۔

کتنا پیارا بچہ ہے ـــــ! معصوموں پر کون مہربان نہیں ہوتا! ـــــ میں ٹائپ رائٹر سے نوٹس کا کاغذ نکال کر درخواست ٹائپ کرنے لگی۔

یہ فیس کی معافی کی درخواست تھی۔

درخواست ٹائپ کر کے میں نے لئیق کے حوالے کر دی۔ وہ معصومانہ انداز میں مسکراتا ہوا سلام کر کے چلا گیا۔

یہ مسکراہٹ مجھے بہت ہی پیاری معلوم ہوئی ـــــ کتنی مماثلت ہے اِس مسکراہٹ میں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا یہ لئیق نہیں، انیس مسکرا رہے ہیں!! نہ جانے کیوں بعض بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو حیرت انگیز بھی ہوتی ہیں اور مسرت بخش بھی!

جب میں نے پھر اپنا دفتری نوٹ مشین پر چڑھایا تو یہ باتیں ذہن کی سطح پر ابھرنے لگیں۔

'کیا انیس اتنا گیا گزرا ہے کہ وہ اپنے بھائی کی تعلیمی فیس تک نہیں دے سکتا؟'

'ایک طرف اتنی غربت ـــــ اور دوسری طرف یہ خوش پوشی!'

'اُسے ایسا نہ کرنا چاہئے۔ اُسے اِس طرح نہ رہنا چاہئے!'

'چھوٹے بھائی بہنوں کو یوں اسکول میں رُسوا کر کے یہ شانِ خود نمائی!'

اِن خیالات کے آتے ہی میرے دل میں اُس کے لئے ایک عجیب نفرت اُبھری۔ میں تیزی سے مشین پر انگلیاں چلانے لگی۔ جیسے میں کاغذ پر نہیں، انیس کے سر پر ٹائپ کر رہی تھی۔ ایک لکچرار کا منہ نوچ رہی تھی!!

دو ڈھائی گھنٹے مسلسل کام کرنے کے بعد جب میں دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے اٹھی تو مجھے انیس سامنے والے برآمدے سے گزرتا ہوا نظر آیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے آگے سے برہنہ گزر رہا ہو۔ جیسے میں نے اُس کی زندگی کا گھناؤنا رُوپ دیکھ لیا ہو۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میں اُسے غریب ماننے کو تیار نہ تھی۔

بھلا ایک لکچرار بھی غریب ہو سکتا ہے!؟

اور میری بھوک نہ جانے کیوں مر سی گئی لیکن میں نے کچھ کھانا ضروری سمجھا۔

ایک لقمہ روٹی کا حلق سے اُترا ہی تھا کہ دماغ نے ایک کچوکا سا دیا۔

'تو اُس کی زندگی پر غور کرنے والی کون؟ وہ جو بھی کرتا ہوگا اپنے لئے بہتر سمجھ کر کرتا ہوگا!'

'کسی کے ظاہری حالات سے گھریلو حالات کا اندازہ لگانا کون سی عقلمندی ہے؟'

'زندگی ہرگز وہ نہیں ہوتی جو پیش کی جاتی ہے یا وہ نہیں ہوتی جو گزر رہی ہے؟'

'دراصل یہ وہ لمحے ہیں جن میں زندگی گزرتی ہے۔ یہ لمحے زندگی کو جس رُوپ میں چاہیں پیش کریں۔ زندگی ایک طویل سفر ہے جو کئی لمحوں سے مربوط ہے اور یہ لمحے کبھی بلندی پر لے جاتے ہیں، کبھی پستی میں دھکیل دیتے ہیں۔ عاقل وہ ہے جو بلندی کے قیام کا کوشاں رہتا ہے اور نادان وہ ہے جو پستی سے ابھرنا نہ چاہے۔ لیکن مجھے اُس کی زندگی سے کیا لینا؟ اُس کے بارے میں تو کون سوچنے والی ـــــ؟ تو اُس کی کچھ بھی تو نہیں!'

میرے دل کو یہ فقرے بُرے معلوم ہوتے اور میں جھلا سی گئی۔

'میں کون سوچنے والی؟ میں کون ـــــ؟ میں اُس کی کچھ بھی نہیں!'

'عورت ـــــ'

عورت ہی تو وہ ہستی ہے جو ہر لمحہ مرد کے کام آتی ہے۔ مرد کی زندگی کو زندگی بناتی ہے، اُسے حُسن و دلکشی بخشتی ہے۔ کبھی ماں بن کر، کبھی بہن بن کر اور کبھی ایسے اجنبی رشتے کے سائے جو بعد میں مستقل رُوپ دھار لیتا ہے۔

'پھر میں نہیں تو کون اُس کی طرف توجہ دے گا؟' میرے اندر کی عورت جاگ اٹھی۔ جیسے واقعی انیس کی زندگی کا عروج و زوال میرے ہی ہاتھ میں تھا!

میں نے ٹفن کیریر بند کیا اور ہاتھ دھونے کے لئے باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ جب منہ ہاتھ دھو کر واشنگ بیسن کے آئینہ کے سامنے کھڑی بالوں کو درست کر رہی تھی تو آئینہ نے میرے چہرے پر ایک عجیب اضمحلال کا کرب ظاہر کیا ـــــ اور میں اُسی لمحہ آئینہ سے دُور ہٹ گئی۔ کیونکہ ـــــ

غم و آزردگی کو کون اپنی آنکھوں سے دیکھنا گوارا کرتا ہے؟

اگر یہ کیفیت کسی اور پر ظاہر ہو گئی تو ـــــ!؟ میں کانپ سی گئی جیسے واقعی کوئی مجھے دیکھنے آ رہا ہو! اور میں مشین پر کاغذ چڑھا کر جلدی سے ایک لیٹر ٹائپ کرنے لگی تاکہ وہ اضمحلال یا افسردگی جو میرے چہرے پر نمایاں ہو گئی تھی کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔

نہ جانے کیوں مرد عموماً عورتوں کے مسکراتے ہوئے چہروں پر اتنی توجہ نہیں دیتے جتنی افسردہ و غمگین صورتوں کو بغور دیکھتے ہیں ـــــ جانے کیوں؟!

میں ٹائپ کرتی رہی ——— ٹائپ کرتی گئی ——— یہاں تک کہ سہ پہر کا وقت ختم ہو گیا۔ آج میں دانستہ ٹھیک ۵ بجے "حاضری روم" میں نہ جا کر انیس کی آزمائش کرنا چاہتی تھی کہ دیکھوں وہ اپنے وقت پر آکر دستخط کرتا ہے یا میری آمد کا منتظر رہتا ہے۔

لیکن ساڑھے پانچ بج گئے اور وہ نہ آیا۔ مجبوراً میں ہی اپنے کمرے سے نکل کر آہستہ آہستہ "حاضری روم" کی طرف بڑھنے لگی۔ آخر میں کب تک دفتر میں ٹھہرتی؟

ابھی میرے قلم نے دستخط بھی نہ کئے تھے کہ مجھے ایک ٹھوکر کی آواز نے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

"معاف کیجئے میں گرتے گرتے بچ گیا۔ چند سیڑھیوں نے آج گھیر رکھا تھا۔ دیر ہو گئی۔ لیکن حیرت ہے آپ بھی اب تک آفس سے نہیں گئیں۔ چلئے اچھا ہی ہوا ورنہ میں ٹھوکر تو کون دیکھتا!" انیس نے سنبھلتے سنبھلتے یہ سب ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا ——— اور پھر وہی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر پھیل گئی۔

دستخط کر کے ایک اُچٹتی نظر میں نے انیس پر ڈالی اور اس بار مسکراتے ہوئے کمرہ سے باہر نکل گئی اور دل ہی دل میں کہنے لگی۔

"یہ مرد بھی عجیب ہوتے ہیں کہ عورتوں کو دیکھ کر ہی ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اگر وہ مجھ پر گر پڑتا تو ———"

کمرہ سے باہر نکلی تو دُور تک کوئی نہ تھا۔ صرف چوکیدار دروازوں کو بند کر رہے تھے۔ دفعتہً ایک خیال آیا کہ کیوں نہ اُس درخواست کے بارے میں پوچھوں جس کا خیال ہی مجھے بے چین کئے ڈالتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی میری خودداری نے کہا۔

"میں کیوں پوچھوں اس بارے میں؟ کتنا بد اخلاق ہے وہ جو شکریہ کے چند بول بھی کہہ نہ سکا۔ لاکھ روایتی انداز سہی لیکن ہے تو تمیز سلیقہ کی بات۔ جیسے وہ میرا اپنا ہی کام تو تھا۔ دیکھنے میں کتنا سلجھا ہوا اور سلیقہ شعار نظر آتا ہے لیکن پرکھنے پر معلوم ہوا کہ بس یونہی گنوار سا اور ——— آؤٹ آف ڈیٹ ہے۔"

لیکن دل نے کہا۔

"ہو سکتا ہے تو اِس شکر گزاری کا غلط مطلب نکال لیتی کیونکہ احساسات بعض وقت لفظوں کا جامہ پہن کر بے کیف سے ہو جاتے ہیں۔ لیکن تو اس ادنیٰ سے کام کے لئے اظہارِ تشکر کیوں ضروری سمجھتی ہے؟ یہی نا کہ کم از کم اِس بہانے تو اُس سے بات چیت کرنے کا موقع پا سکتی؟ تو اب بھی ایسا کر سکتی ہے۔ ضرور کر سکتی ہے۔

"وہ کون سا جذبہ ہے جسے عمل کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ صرف جذبہ کی صداقت اور جرأتِ عمل چاہئے۔

میں کہتا ہوں رُک جا، ایک لمحہ کے لئے۔ دیکھ وہ تیرے پیچھے ہی چلا آرہا ہے اور بات کر لے ——— اِس میں حرج ہی کیا ہے؟ ڈرتی ہے ——— بزدل!! تجھے محبت شاید ہو نہ سکے۔

میرے قدم تھوڑی دیر کے لئے رُکے رہے اور میں نے غیر ارادی طور پر مُڑ کر دیکھا تو واقعی وہ مسکراتا ہوا، سائیکل ہاتھ میں تھامے ایسے چل رہا تھا جیسے اُسے میرا ہی انتظار ہے۔ اور میں جلدی جلدی بلڈنگ سے نکل کر رکشہ والے سے بات کرنے لگی۔

لوگ کہتے ہیں اور غالباً سچ کہتے ہیں کہ محبت ہو جاتی ہے۔ کی نہیں جاتی میں نہیں جانتی مجھے اُس سے محبت ہے یا نہیں ——— لیکن گزشتہ رات یہ ضرور ہوا کہ میں پوری طرح سو نہ سکی۔ نہ جانے کیوں وہ اجنبی میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ میں نے بہت سوچا نہ چاہا لیکن پھر بھی اُسی کی بات سوچتی رہی۔ میں اُس سے دُور رہ کر بھی اُس سے ہم کلام رہی۔ نہ جانے وہ کون سے تھے جو اُسی کے خیال کے تانے بانے میرے دماغ میں بُنتے جا رہے تھے۔ نہ جانے وہ کون سا کرب تھا جو اُسی کے نام پر اُبھرتا اور پھر ڈوب جاتا تھا۔ نہ جانے وہ کون سی کسک تھی جو اُس کے نام کے ساتھ ساتھ دل میں رہ رہ کر اُٹھ رہی تھی۔ شاید اُس جذبہ یا کرب کا نام محبت ہو!!

میں رات بھر سو نہ سکی اور صبح جو دفتر آئی تو ——— میرا خیال ہے دفتر میں ۹ بجے چلی آئی تھی اور آج انیس سے سامنا ہونے کی کوئی توقع نہ تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ میں انیس سے بچنے ہی کے لئے اتنی جلدی چلی آئی تھی۔ نہ جانے کیوں آج میری طبیعت اُس سے آنکھ ملانے سے گھبرا رہی تھی لیکن میری نظریں بار بار اُس برآمدے کی طرف اُٹھ رہی تھیں جہاں سے انیس گزرتا تھا۔ دل و دماغ پر ایک بار سا تھا اور میرا دل کام میں بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ میں اسے شب بیداری اور نیند کی کمی کا سبب سمجھ رہی تھی۔ پھر بھی وقت گزاری کے لئے، اپنی توجہ بانٹنے کے لئے چھوٹے لیٹر ٹائپ کرتی رہی۔

دوپہر کی گھنٹی بجی اور میں مشین چھوڑ کر باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر جب آئینہ پر نظر ڈالی تو میری صورت عجیب ہی نظر آنے لگی۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے نظریں ہٹالیں لیکن میں چہرے کی اُس کیفیت کو ذہن سے نکال نہ سکی۔ عجیب سی لکیریں۔ جو صورت پر نمایاں ہو گئی تھیں اور جو میرے اندرونی ہیجان کی مظہر بن گئی تھیں لیکن یہ اضطراب کیوں ———؟ کمزوری نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر خیال اُبھرا ——— انسان کے لئے نیند نہایت ضروری ہے ورنہ اُس کی اچھی خاصی صورت بگڑ جاتی ہے، تصویرِ غم بن جاتی ہے!!

"لیکن بھلا مجھے کیا غم ہے؟" میں آپ ہی آپ بڑبڑائی اور پھر ٹفن کھولنے میں مشغول ہو گئی۔

ارے ——— نہ جانے کیوں آج روٹی کو چیونٹیاں ہی چیونٹیاں لپٹ گئی تھیں۔ حالانکہ ڈبہ وہیں پر رکھا تھا جہاں روز رکھا ہوا ہوتا ہے۔

ٹھیک ہے، قدرت جس کا رزق ہے اُسے پہنچا دیتی ہے۔ مجھے نیند نہ آنے سے بھوک بھی نہ تھی۔

[illegible] بند کی اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر [illegible] کیا
[illegible] برآمدے کی طرف ایک نظر اُٹھائی تو خلاف توقع کئی لوگ ایک جگہ کھڑے محو گفتگو
[illegible] تھے۔

آج پہلی بار میری نظریں برآمدے کی طرف کئی بار اُٹھیں۔ آج سے پہلے جب کبھی [illegible] دیکھا تو کسی کو اس طرح آپس میں سر جوڑے نہ پایا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا۔

"شاید انیس کی غیر متوقع غیر حاضری پر یہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہوں"

انیس کی غیر حاضری آج مجھے بُری طرح کھل رہی تھی کیونکہ آج سہ پہر میں انیس سے کچھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔

عجیب آدمی ہے، ہم بے چین ہیں اور وہ غائب!!

کاش اُسے میری بے چینیوں کا اندازہ ہوتا!! یہ بے چینیاں اُسے کسی نہ کسی طرح ۵ بجے سے پہلے یہاں کھینچ دیں تو کتنا اچھا ہو!!

میں نے دل ہی دل میں سوچا اور ایک دلنوش کُن مُسکراہٹ میرے لبوں پر تیر گئی۔

انسان کو خیالوں میں مُسکرانے کی کتنی عجیب عادت ہوتی ہے!!

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو ابھی تین بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے میں چاہتی تھی آج پانچ نہ بجیں ــــــ اور جب انیس یہاں آجائے تو پانچ بجیں اور میں ــــــ میں بس اِتنا کہنے کا موقع پا سکوں۔

"کل رات مجھے نیند نہ آسکی۔ انسان کے لئے نیند بے حد ضروری ہوتی ہے۔ [illegible] اُس کا چہرہ بگڑ جاتا ہے اور یہ کہ آج دن بھر اُس نے میری آنکھوں [illegible]

اسی خیال میں کھوئی تھی کہ چپراسی نے آکر اطلاع دی کہ صاحب بلا رہے ہیں۔

مجھے یہ بلاوا پہلی بار ناگوار گزرا۔ لیکن میں کیا کر سکتی تھی؟ اپنا ڈکٹیشن پیڈ اور پنسل ہاتھ میں لے صاحب کے کمرہ میں داخل ہوئی اور اُن کے سامنے والی کرسی پر [illegible] اور اُن کی طرف ڈکٹیشن Dictation لینے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"دیکھو ساجدہ، جو بھی پیپرز ٹائپ کرنے کے ہوں وہ ٹائپ کر کے اپنے ہی پاس رکھ لینا۔ میں اب گھر جاتے ہوئے ٹھیک چار بجے دواخانہ پہنچ جاؤں گا۔ جہاں انیس کی اُس آنکھ کا جسے کل شام آپریٹ کیا گیا ہے، رزلٹ حاصل کروں گا۔

آج سے ایک سال پہلے ایسے ہی ایک آپریشن میں اُس کی ایک آنکھ کی روشنی جاتی رہی تھی اور اُسی آنکھ کی روشنی کی بحالی کے لئے کل پھر دوبارہ ڈاکٹر تاتر نے آپریشن کیا ہے جو حال ہی میں لندن سے آنکھوں کے اسپیشلسٹ ہو کر آئے ہیں۔ کچھ دن پہلے ڈاکٹر تاتر نے معائنہ کے بعد کہا تھا، دوسرا آپریشن کامیاب ہوگا۔ میری تو دعا ہے کہ خدا اُس کی چھینی ہوئی روشنی پھر لوٹا دے۔

کتنا ذہین اور بلند کردار لڑکا ہے۔ کیوں؟ آنکھ جیسی نعمت سے محروم ہو گیا ہے لیکن پھر بھی اُس کی مُسکراہٹ میں کبھی فرق نہ آیا ــــ یہ کہہ کر صاحب باہر چلے گئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میری دونوں آنکھوں میں تیزاب ڈال دیا ہو!!

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد چاروں کھونٹ گھومتا ہے افواہیں جمع کرتا ہے۔ اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ یہ جنون اس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے ہوش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں چھپی ہیں۔

جہاں گرد مصیبت میں

اس مرتبہ جہاں گرد عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ وہ افواہیں جمع کرنے نکلا تو اُسے یہ دیکھ کر بہت ذہنی کوفت ہوئی کہ اس بار افواہوں کا معیار بہت گر گیا ہے۔ پرائمری سکول کے سامنے گلے سڑے امرودوں کا خوانچہ لگانے والے بوڑھے سے کر یو، این، او کے سکریٹری جنرل اوتھانٹ تک سبھی افواہیں پھیلا رہے ہیں۔ کسی نے کوکا کولا کی ایک بوتل پی، ڈکار لی اور ڈکار کے ساتھ ایک افواہ نکال کر مارکیٹ میں پھینک دی۔ کسی خالص ان پڑھ عورت نے بینگن خریدے اور کنجڑے کو گالیاں دیتی ہوئی کہنے لگی۔ "سُور کہتا ہے، بینگن مہنگے ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ہر روز لاکھوں بینگن سوویت روس بھیجے جا رہے ہیں۔ ان بینگنوں کے بدلے میں وہ ہمیں ہتھیار سپلائی کرے گا۔"

یہ دیکھ دیکھ کر جہاں گرد کا جی متلانے لگا۔ افواہ جب بینگن اور امرود کی سطح پر آجائے تو وہ افواہ نہیں رہتی بلکہ تھالی کا بینگن بن جاتی ہے جو جدھر منہ آتا ہے، لڑھک جاتا ہے۔ اس لئے جہاں گرد مصیبت میں ہے کہ بینگن کو افواہ بنا کر کیسے پیش کرے؟ اپنی افواہوں کے معیار کو گرا کر رسوائی کیوں مول لے؟

جہاں گرد حوالات میں

اور پھر جہاں گرد نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ افواہوں کا معیار زوال پذیر کیوں ہوا؟ تو اُسے پتہ چلا کہ پاکستان اور ہندوستان نبرد آزما ہیں اور نبرد آزمائی کے عالم میں افواہیں پھیلانا جُرم قرار دے دیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افواہوں کا ناطقہ آرٹ سے ٹوٹ گیا ہے اور افواہیں اناڑیوں کے ہتھے چڑھ گئی ہیں۔ یعنی بقول غالب ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی ۔۔۔ اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

چنانچہ جہاں گرد حیران ہے۔ اب کیا کرے۔۔۔ وہ بھی اگر افواہیں پھیلاتے تو حوالات کی سیر کھاتے اور آرٹسٹ بن کر افواہ کی تخلیق کرے تو بھی اناڑیوں کی طرح جرنیوں کی صف میں چلا جائے۔ جبکہ جہاں گرد کا اصول یہ ہے کہ حوالات جانا انتہائی نامناسب بات ہے۔

آخر اناڑیوں اور حوالات کے درمیان "سینڈ وچ" ہو کر جہاں گرد نے سوچا کہ کوئی ایسی افواہ پیش کرنی چاہئے، جس میں ہتھکڑی بھی نہ پہننی پڑے اور اناڑی کہلانے سے بھی بچ جائے۔

لہٰذا ایک سینڈ وچ قسم کی افواہ ملاحظہ فرمائیے۔

کرفیو میں گدھا

ایک کافی ہاؤس میں یہ افواہ بڑی دلچسپی کے ساتھ گشت لگا رہی ہے کہ گزشتہ دنوں ایک گدھے کو کرفیو کے قواعد کی خلاف ورزی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ کیونکہ وہ کرفیو کے اوقات میں ایک سڑک پر آوارہ گردی کر رہا تھا۔ جب گدھے کو گرفتار کر کے پولیس اسٹیشن پر لے جایا گیا تو ایک ذہین پولیس انسپکٹر نے یہ سوال اٹھایا کہ کرفیو کے قواعد گدھوں پر لاگو کئے جا سکتے ہیں یا نہیں؟ گدھے کے بیان کے مطابق اُسے انسانی مسائل سے نہ کوئی دلچسپی ہے نہ تعلق۔ اس لئے انسان جب کبھی اور جیسے بھی قاعدے قانون بناتا ہے صرف انسانوں کے لئے بناتا ہے۔ گدھوں اور دوسرے جانوروں کے لئے نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ گدھے کو قانون کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع دے کر رہا کر دیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے وارننگ دی گئی کہ اُسے آئندہ کرفیو کے اوقات میں سڑک پر نکلنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس کی زندگی کا انحصار انسانوں کی زندگی پر ہے۔ اس لئے اُسے اپنے آقاؤں کے قاعدے قانون کا اخلاقی احترام کرنا چاہئے۔

رہا کرنے سے پہلے جب گدھے سے تفریحاً پوچھا گیا کہ وہ اس صورت میں سڑک پر کیا کرنے گیا تھا تو اس نے تھوڑا سا شرما کر کہا کہ وہ اپنی رفیقۂ حیات گدھی کو تلاش کر رہا تھا۔

جس کی زلفِ محبت میں وہ گرفتار ہو چکا تھا (یا ہو رہا تھا)

عاشق کی بھرتی

"جنگ اور عشق میں سب جائز ہے" — خیال کر رہنے جب یہ افواہ مجھے سنائی تو مجھے بھی ایک افواہ کا دھیان آگیا، جس پر عشق اور جنگ دونوں کا اثر تھا۔ یہ افواہ مجھے ایک دوست نے سنائی تھی کہ جنگ کے دن تھے۔ ہر وقت ہوائی حملے کا سائرن بجنے کا خطرہ رہتا تھا۔ گولے چھوٹنے کی آوازوں سے دل و دماغ لرزاں رہتے تھے۔ اس عالم میں ایک عاشق صاحب کو کسی نے ٹیلیفون کیا کہ آپ کی محبوبہ ہوائی حملہ کا شکار ہو کر دنیائے حُسن و عشق سے کوچ کر گئی ہے۔ اس پر عاشق صاحب بھاگم بھاگ محبوبہ کے گھر پہنچے اور لگے آہ و زاری کرنے۔ لوگوں نے پوچھا، کیوں حضرت! یہ ماتم گساری کس سلسلہ میں فرمائی جا رہی ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں محبت کا راز نہ کھل جائے، عاشق صاحب بولے۔ "میں ملک و قوم کی خدمت کے جذبے سے بھرتی کے دفتر گیا تھا لیکن انھوں نے مجھے بھرتی کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ تم "ان فٹ" (Unfit) ہو۔ اس لئے رو رہا ہوں کہ میں زندگی میں کسی کام نہ آسکا۔"

دراصل عاشق صاحب کا پروگرام یہ تھا کہ جب محبوبہ نہیں رہی تو میرا بھی جینا بیکار ہے۔ کیوں نہ میں بھی کسی بم کا شکار ہو جاؤں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ لوگ اُسے بھرتی کے دفتر میں لے گئے اور اُسے بھرتی کرا دیا گیا۔

بھرتی ہونے کے بعد انھیں دوسرے دن پتہ چلا کہ اُن کی محبوبہ صحیح سلامت اور زندہ و پائندہ ہے۔ کسی ظالم نے اُن کی موت کی غلط افواہ اُڑا دی تھی۔ اس پر موصوف بہت پریشان ہوئے اور جب تک فوجی ملازمت میں رہے پچھتاتے رہے کہ ایک افواہ کے ہاتھوں اُن کا عشق برباد ہو گیا۔

پٹرول کو مٹھائی بنا دیا

شاید اسی وجہ سے حکومتیں جب برسرِ جنگ ہوں تو افواہیں پھیلانے پر قانونی پابندی لگا دیتی ہیں۔ کیونکہ ان سے دشمن کو فائدہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر یہ افواہ پھیلا دی جائے کہ سرکار کے پاس پٹرول کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے تو دشمن خوشی سے پھُول کر کپّا ہو جائے گا کہ دہ مارا۔ اس افواہ کے فوری طور پر دو نتیجے ہوں گے:۔

۱۔ دشمن فوج کے کمانڈر انچیف اعلان کر دیں گے کہ فوج کے ہر سپاہی کو پانچ پانچ کلو مٹھائی بانٹی جائے۔ چنانچہ پچاس لاکھ روپے مٹھائی پر خرچ کر دئے جائیں گے۔

۲۔ کاریں اتنی سستی ہو جائیں گی کہ بائیسکل اور کار کی قیمت میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ جب پٹرول ہی نہ رہا تو کار رکھنے کا کیا فائدہ؟ کار کے مالک کار بیچ کر بائیسکل خرید لیں گے۔

اور جب پچاس لاکھ روپے مٹھائی پر برباد ہو چکے ہوں گے اور کاریں ایک ایک سو روپے میں فروخت ہو کر بائیسکلیں بن چکی ہوں گی تو اچانک خبر آئے گی کہ یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی تھی، ورنہ سرکار کے پاس تو پٹرول کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ کئی پشتیں اس سے جنگ لڑ سکتی ہیں۔ اس طرح بڑی دلچسپ صورت حالات پیدا ہو جائے گی۔ بازار میں پٹرول پمپوں کے ایجنٹ زور سے آوازیں لگا لگا کر پکارا کریں گے: "آئیے، آئیے! اپنی گاڑی میں پٹرول بھروا لیجئے۔ سستا لگا دیا ہے، کمپنی نے مال لُٹا دیا ہے۔"

اور دوسری طرف دشمن فوج کا کمانڈر انچیف ماتھے پر دو ہتڑ مار کر چیخ اٹھے گا۔ پچاس لاکھ روپے مفت میں ضائع ہو گئے۔ ان روپوں سے فوج کے لئے کتنا پٹرول خریدا جا سکتا تھا۔ اب یہ پٹرول مٹھائی بن کر پیٹ میں پہنچ گیا۔ کتنی بڑی حماقت ہو گئی۔ ضرور یہ افواہ دشمن نے ہمیں نقصان پہنچانے کے لئے اُڑائی تھی اور ہم دشمن کی یہ چال سمجھ نہیں سکے۔

ایک آوارہ وزیر اعظم

ہاں صاحب! افواہیں بڑی ستم ظریف ہوتی ہیں۔ یہ بڑی بڑی سلطنتوں کو اُلٹ کر رکھ دیتی ہیں۔ اگر کسی ملک کے وزیر اعظم کے متعلق یہ افواہ اُڑا دی جائے کہ وہ ایک مشتبہ عورت کے ساتھ ایک نامعقول مقام پر دیکھا گیا ہے تو پوری قوم وزیر اعظم کی جائے رہائش پر ڈنڈے اور جھنڈے لے کر پہنچ جاتی ہے — "عورت سے رشتہ توڑ دو۔ ورنہ گدی چھوڑ دو۔"

اور اس کے بعد وزیر اعظم چاہے لاکھ شہادتیں اور صفائیاں دیتے پھریں، اپنی پاک دامنی کے لئے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہونے پر تیار ہو جائیں لیکن وہ بچ نہیں سکیں گے۔ لوگوں کا اعتماد اُن پر سے اُٹھ جائے گا۔ کیونکہ افواہ ایک بھوت ہے جسے ایک بار چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنا پھُدکنا اور ناچنا بند نہیں کرتی۔ وہ انسانی جسم کے کونے کونے میں گھُس جاتی ہے۔ دل میں، دماغ میں، رگوں میں، ہڈیوں میں۔ حتیٰ کہ معدے تک میں گھُس جاتی ہے اور اُس وقت تک نہیں نکلتی جب تک وزیر اعظم صاحب نہیں نکل جاتے۔

چنانچہ ایک دن اعلان کر دیا جاتا ہے کہ وزیر اعظم صاحب پر جو الزام لگایا گیا ہے اگرچہ وہ سو فیصدی غلط ثابت ہو چکا ہے لیکن وزیر اعظم صاحب عوام کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنا استعفیٰ دے کر گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔

افواہ کی اس بے پناہ طاقت سے خدا بچائے۔ بڑے بڑے سپہ سالار تک کو اُکھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ہم اور تم تو کس شمار و قطار میں ہیں۔

ارجُن جیسا ایکسپرٹ

جب جنگ جاری ہو تو حریف ممالک ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے...

صرف جیٹ جہاز ہی نہیں چھوڑتے بلکہ افواہیں بھی چھوڑتے ہیں۔ کیونکہ افواہیں بھی جیٹ ہوائی جہاز سے کم نہیں ہوتیں۔ یہ بھی دشمن کے دل و دماغ کے اڈوں پر بمباری کرتی ہیں۔ اس لئے جنگ میں کتنا حکومتیں بڑے بڑے "افواہ سپیشلسٹوں" کو ملازم رکھتی ہیں جو گھر بیٹھ کر افواہیں ایجاد کرتے رہتے ہیں اور باہر آ کر چھوڑ دیتے ہیں۔

افواہیں دو دھاری تلوار ہوتی ہیں۔ دونوں طرف مار کرتی ہیں۔ یعنی دشمن کا سر کاٹنے کے لئے اڑتی ہیں لیکن اگر نشانہ باز اناڑی ہو اور تلوار دشمن کے سر پر نہ پڑے تو واپس پلٹ آتی ہیں اور خود نشانہ باز ہی کا سر کاٹ دیتی ہیں۔ کیونکہ تلوار کو تو کسی نہ کسی کا سر کاٹنا ہوتا ہے۔ کسی کا کٹ جائے، دشمن کا یا دوست کا۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہیں ذکر کیا ہے کہ پٹرول ختم ہونے کی افواہ کا اثر الٹا پڑے گا۔ یعنی پچاس لاکھ روپے کی مٹھائی کا نقصان اٹھانا پڑا۔ تلوار نے نشانہ باز ہی کا سر یعنی پچاس لاکھ روپیہ اڑا دیا۔

اس لئے افواہ اڑانے والا مہابھارت کے ارجن سے کم ایکسپرٹ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ افواہ کے گانڈیو دھنش سے چھوٹا ہوا تیر اگر کوروؤں کے صحیح نشانے پر نہ لگتا تو لوٹ کر ارجن کو اڑا دیتا اور مہابھارت کی تاریخ مختلف ڈھنگ سے لکھی جاتی۔

ہاتھی تھا یا آدمی ———●

مہابھارت کے ذکر پر مہابھارت ہی کا ایک واقعہ یاد آ گیا (افواہیں صرف آج کل ہی نہیں اڑائی جاتیں، مہابھارت کے مقدس زمانہ میں بھی اڑائی جاتی تھیں)

واقعہ آپ سب نے سنا ہوگا ——— کوروؤں کی فوج میں ایک بڑا زبردست ہاتھی تھا جس کا نام اشوتھامان تھا۔ یہ کوروؤں کے بہادر سپہ سالار مہارتھی کرن کا بڑا محبوب ساتھی تھا۔ کرن کو اشوتھامان ہاتھی سے مجنونانہ محبت تھی۔ جب پانڈوؤں کے جرنیلوں نے دیکھا کہ کرن تو ہارنے ہی میں نہیں آتا اور ہماری فوج کے پرخچے اڑائے جاتا ہے تو ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ افواہ کا ہتھیار چلا کر دیکھا جائے۔ ممکن ہے اس سے کرن چاروں شانے چت ہو جائے۔

پانڈوؤں کی فوج میں ایک سپاہی تھا جس کا نام اشوتھامان تھا۔ خوش قسمتی سے وہ کوروؤں کے ہاتھوں مارا گیا (کیونکہ سپاہی زیادہ ہوتے ہیں اس لئے مرتے بھی زیادہ ہیں) افواہ باز کو آئیڈیا سوجھا کہ فوج میں یہ افواہ اڑا دی جائے کہ اشوتھامان ہاتھی مارا گیا۔ یہ افواہ جونہی کرن کے کان میں پڑے گی، اس کا دل بیٹھ جائے گا اور وہ لڑنے کی سکت کھو بیٹھے گا۔

آئیڈیا بے حد اچھوتا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ کرن کو کیسے یقین آئے گا کہ یہ افواہ نہیں ہے بلکہ سچ ہے۔ ایک اور صاحب نے چٹکی بجا کر کہا۔ میں بتاتا ہوں۔ اگر یدھشٹر صاحب اونچی آواز میں کہہ دیں کہ اشوتھامان ہاتھی مارا گیا تو کرن کو اعتبار آ جائے گا کیونکہ یدھشٹر کے متعلق دشمنوں کو بھی یقین کامل تھا کہ وہ جھوٹ کبھی نہیں بولتے۔

چنانچہ یدھشٹر کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی۔ انھوں نے حسب دستور انکار میں ہلا دیا کہ صاحب! مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ کوئی اور سیوا بتایئے ——— ماہرین نے ایک اور سیوا بتاتے ہوئے عرض کی کہ آپ صرف اتنا کہہ دیجئے "اشوتھامان مارا گیا۔ آدمی تھا یا ہاتھی، یہ نہیں جانتا"

چنانچہ یدھشٹر صاحب نے باآواز بلند یہ فقرہ کہہ دیا۔ کرن نے صرف اتنا سنا کہ اشوتھامان مارا گیا۔ دوسرے فقرے پر پانڈوؤں نے ڈھول تاشے بجا دئے تاکہ کوئی دوسرا فقرہ نہ سن سکے۔

نتیجہ اس افواہ کا یہ ہوا کہ کرن صاحب شکست کھا گئے۔ کوروؤں کی سلطنت کا ایک چراغ گل ہو گیا۔ اگرچہ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ یدھشٹر مہاراج کے دامن سے آج تک یہ داغ نہیں دھل سکا کہ وہ سیاست دانوں کے چنگل میں پھنس کر اپنا ستیہ دھرم گنوا بیٹھے۔



نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

شکست کے بعد	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
طوفان کی کلیاں	″	چار روپے
گدھے کی واپسی	″	تین روپے
الٹا درخت	″	دو روپے پچھتر پیسے
دروازہ	″	دو روپے پچیس پیسے
سسرال	شوکت تھانوی	دو روپے
مسٹر ۵۰	″	تین روپے پچاس پیسے
بقراط	″	دو روپے پچاس پیسے
جی ہاں پیٹے ہیں	″	تین روپے پچیس پیسے
جوڑ توڑ	″	پانچ روپے
داماد	″	دو روپیہ پچیس پیسے
گوشۂ عافیت	پریم چند	پانچ روپے
چوگان ہستی مکمل	″	گیارہ روپے
دلہن کی قیمت	″	تین روپے
خاک پروانہ	″	تین روپے
صبح زندگی	راشد الخیری	دو روپے
شب زندگی	″	ایک روپیہ پچیس پیسے
شام زندگی	″	ایک روپیہ پچاس پیسے
سیتہ کی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
سمن پوش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
اقبال	″	چار روپے
گرد کارواں	کنھیا لال کپور	تین روپے
سنگ و خشت	″	دو روپیہ پچاس پیسے
سونا گاچھی	بملا داس اختر	چار روپے پچاس پیسے
شعلۂ سنگ	کوثر چاندپوری	تین روپے پچاس پیسے
شمع	اے آر خاتون	پانچ روپے
چشمہ	″	دس روپے پچھتر پیسے
شکیلہ	مسعود ہمایوں	چار روپے پچیس پیسے
شکست ظلمت	محمود جالندھری	ایک روپیہ پچھتر پیسے
آرزو کی کلیاں	″	ایک روپیہ پچھتر پیسے
پہلی محبت	″	ایک روپیہ پچیس پیسے
خوابگاہ میں	″	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسداں	″	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	سید امرت	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	″	تین روپے
اکبری دروازہ	″	چار روپے
دوشیزۂ روم	″	تین روپے
دیوانہ	″	تین روپے
دو دیوانے	″	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	″	تین روپے
گناہ	دت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	″	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	″	تین روپے پچانوے پیسے
مغرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
قیامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	″	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیاء عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	″	چار روپے پچیس پیسے
ممتاز	ایم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات	″	پانچ روپے
ریحانہ	″	سات روپے
وعدہ	مہندر ناتھ	چار روپے پچھتر پیسے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
فردوس گوش	حضرت جوش ملسیانی	چار روپے
کفر و ایمان	ہری چند اختر	چار روپے
وسکی کی بوتل	موہن یاور	دو روپے
لکھنؤ نے کہا	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر میکینک گائڈ	شیو ناتھ تسکین	چار روپے
موٹر ڈرائیونگ	کرشنا نند شرما	چار روپے پچاس پیسے
کیا خوب آدمی تھا		ایک روپیہ پچیس پیسے
عجیب لڑکی	اوم پرکاش نامی	تین روپے
ہمارا اٹیل (بچوں کیلئے)	خوشتر گرامی	پچاس پیسے
ہمارا بھارت	″ ہندی ″	پچاس پیسے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	الطاف اثر	دو روپے
آندھی میں چراغ	غلام الثقلین	سات روپے پچاس پیسے
اقوال زریں	مصطفےٰ احسن زیدی	پچاس پیسے
انارکلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آشا دیپ بجھے نا	ست پرکاش سنگر	دو روپے
ابراہیم لنکن	چندر موہن لامبہ	ایک روپیہ پچھتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابوالکلام آزاد	تین روپیہ پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	جے سی داس ساجد	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
چھبیس سال بعد	امرتا پریتم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے چھالے	ادیب آبادی	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دھلی

شیشہ

نکہت اقبال بی، اے

۷۲۔ لال کنواں لکھنؤ

۴ر اگست ۶۵ء

خوشتر بھائی جان کی خدمت میں ـــــ برائے منظوری!

گر قبول افتد زہے عز و شرف

آپ کی بہن ـــــ نکہت اقبال

وہ بڑی نخوت، والہانہ شان اور احساسِ برتری کو محسوس کرتے ہوئے جگمگاتی ہوئی جوہری کاؤنٹر کے پاس پہنچی، ایک خوش پوش نوجوان نے آگے بڑھتے ہوئے مسکرا کر لطیف انداز سے کہا۔

"یس، میڈم!"

"قیمت بتایئے؟" خوبصورت اور خوش پوش نوجوان عورت نے بڑی سرعت سے اپنا قیمتی بیگ کھولتے اور ایک بڑا خوبصورت کیس نکالتے ہوئے کہا۔ نوجوان نے بڑی بے چینی سے کیس کو کھولتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔

"میڈم فروخت کرنا پسند کریں گی؟"

"پار سال آویزے کی اس جوڑی کو!" اس نے غیر ضروری سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "میں نے ایک لاکھ پینتیس ہزار میں خریدا تھا۔۔" ٹھیک اس وقت خلاف اُمید کیس کے ٹپ سے بند ہونے کی آواز سن کر اس نے غور سے لیکن اندرونی اضطراب کے ساتھ نوجوان کی طرف دیکھا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا "آج ان کی قیمت زیادہ ہوگی۔۔۔؟"

"یس میڈم!" نوجوان نے قدرے تکلف سے اور آنکھیں نیچی کرتے ہوئے کہا۔

"جوہری ان کی قیمت ڈیڑھ لاکھ مانگ رہا تھا!" وہ پہلی بار زیرِ لب مسکرائی اور بالوں کی لٹ کو سمیٹتے ہوئے بولی "کسی طرح قیمت کم نہیں کرتا تھا لیکن بڑی مشکل سے اس نے پندرہ ہزار کم کئے۔"

"آپ کا بڑا خیال کیا میڈم؟" نوجوان نے پہلی بار عورت کو غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"کم سے کم پندرہ لاکھ کے زیورات بھی تو خرید چکی تھی" اس نے متکبرانہ مسکراہٹ سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"یہ بات ہے میڈم!" اس نے جلدی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یس!" نوجوان اور حسین عورت نے پہلی بار آنکھیں بند کرتے ہوئے اور نسوانیت سے جھومتے ہوئے کہا "مجھے یہی ایک شوق تھا، اصلی جواہرات کے زیورات کا اور۔۔ اگر میرے صاحب زندہ رہتے تو اس ایک سال میں دو اصلی پتھروں کے زیور میرے پاس اور ہو جاتے۔ پھر بھی ایک درجن ہیں جو کسی مہارانی کے پاس بھی نہ ہوں گے۔"

"میڈم آپ کے شوہر۔۔۔؟"

اس نے جلدی سے بات کاٹتے ہوئے کہا "انکم ٹیکس آفیسر تھے وہ! ـــ ایک سال پہلے کار کے حادثہ میں انتقال ہوگیا اُن کا۔۔"

"اوہ! ـــ میڈم!!" نوجوان کے لہجے میں غم تو تھا لیکن قدرے کھوکھلا۔

"اچھا!" نوجوان عورت نے کچھ یاد کرتے ہوئے اچانک پوچھا "آپ نے قیمت نہیں بتائی؟"

نوجوان نے جلدی سے جوان اور خوبصورت عورت کو دیکھا اور ٹالتے ہوئے عاجزی سے کہا "میڈم! یہ چیز ہمارے پاس نہیں ہوگی"

"یاقوت آپ کے پاس نہیں؟"

"جی نہیں" وہ جلدی سے ہنس دیا۔

"ارے!" وہ تمسخرانہ انداز سے مسکرائی اور کہا "اونچی دوکان اور پھیکا پکوان!"

"بات یہ ہے کہ خاندانی رئیس جو پتھروں کے قدردان تھے وہ تو اب رہے نہیں میڈم!

تم دولت مند پیسہ تو رکھتے ہیں لیکن ظرف سے محروم ہیں۔۔"

وہ مُسکرادی اور جب چلنے لگی تو نوجوان نے آہستہ سے کہا "اب گھر چلی جائیے گا، ان آویزوں کو اور کہیں نہ دکھائیے گا۔"

"لیکن میں بچّی نہیں رہی ہوں!" اُس نے بڑے غرور سے مُسکراتے ہوئے کہا "قیمت پُوچھ رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے میڈم!" اُس نے بہت انکسار سے مُسکرا کر کہا "لیکن سوال پرکھ کا ہے۔"

وہ مُسکرادی اور چلی گئی۔ باہر جاتے ہی اُس نے نوجوان کے مخلصانہ مشورہ کو ٹھکراتے ہوئے دوسرے جوہری کی دوکان کا رُخ کیا لیکن وہاں یاقوتی آویزوں کو دیکھتے ہی صاف آنی سے جواب ملا "یہ نقلی ہیں۔ یاقوت نہیں ہے۔۔"

"جی!" اُس نے قریب چیختے ہوئے کہا۔

جواب اور صفائی سے ملا "میرا مطلب ہے یہ پتھر نہیں بلکہ امی ٹیشن ہے ——— پیور امی ٹیشن ——— میڈم!"

خوبصورت جوان عورت تلملا گئی۔ اُس کا جی چاہا سفید بالوں والے خشک اور تنک مزاج جوہری کا ناخنوں سے منہ نوچ لے اور اُن بے نُور بُوڑھی آنکھوں کو نکال لے جو اصلی یاقوت پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ یہ یاقوتی آویزے اُس نے پچھلے سال بمبئی کی سب سے بڑی دوکان سے خریدے تھے۔ وہ رات اُسے اچھی طرح یاد تھی، جب وہ اپنے شوہر شہزاد کے ساتھ گئی تھی اُس نے یہ آویزے دیکھ لئے اور جب اُن کی طرف اشارہ کیا اور پُوچھا "یہ کیا ہیں" تو جوہری نے بڑی لجاجت سے کہا تھا "میڈم! یہ پسند کئے جا چکے ہیں۔ رانی چندن پور انہیں پسند کر چکی ہیں۔"

"اچھا!" اُس نے اضطراب پر قابو نہ پاتے ہوئے کہا تھا "دکھائیے تو؟"

"نہیں میڈم!" دوکاندار نے انکساری سے کہا تھا "آپ عورت ہیں اور عورت کی پسند ہمیشہ عورت سے ٹکراتی ہے ——— میری بدنامی ہو جائے گی اور دوکان کی ساکھ گر جائے گی میڈم!"

جب بہت اصرار کے بعد دوکاندار نے یاقوتی آویزے پیش کئے تو اُسے یاد آیا کہ انہیں دیکھتے ہی اُس کی نیت خراب ہو گئی اور اُس نے ہر جائز و ناجائز انداز سے اُن آویزوں کو خریدنے کی کوشش کی اور اُسے یاد آیا کہ وہ پہلا موقع تھا جب اُس نے اپنے شوہر کے علاوہ بُوڑھے جوہری کو بھی اپنے حُسن سے خوش کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے یاد تھا کہ سفید بال اپنے اصول کے آگے جوانی کے سیاہ بالوں کو برابر نظر انداز کرتے رہے اور اِس طرح ہندوستان کی روایات و نظریات کو برقرار رکھتے رہے۔ جب وہ ہر طرح سے تھک گئی تو اُس نے صاف اعلان کیا۔

"دیکھئے! اگر یہ یاقوتی آویزے میں یہاں سے پہن کر نہ گئی تو خودکشی کر لوں گی۔"

جوہری نے چونک کر پہلی بار اُسے دیکھا اور کہا "انسان کی زندگی پتھروں سے زیادہ قیمتی ہے شریمتی جی!"

"بغیر یاقوتی آویزوں کے نہیں ———!"

اور جب اُس کا اشتیاق و اصرار بہت بڑھ گیا تو اُسے یاد آیا کہ شہزاد جو اب تک غیر جانب دار حیثیت سے کھڑا مُسکرا رہا تھا اور سگار پی رہا تھا پہلی بار بولا اور جوہری سے انگلی یاقوتی آویزوں کو بیچ ڈالنے کے لئے نہ صرف کہا بلکہ اُس نے اپنے بے پناہ اشتیاق کا ثبوت بھی دیا اور کہا "جوہری! کیا تم چاہتے ہو کہ میری بیوی کے کان ننگے رہیں۔ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ میری بیوی رات بھر سِسکیاں لیتی رہے اور سو نہ سکے؟"

"نہیں جناب!" جوہری نے کچھ شرمندہ ہو کر کہا "میں چاہتا ہوں میری دوکان سے جو بھی جائے، مُسکراتا ہوا جائے۔"

"پھر آویزے کیوں نہیں دے دیتے؟"

"میں زبان دے چکا ہوں جناب!"

"ٹھیک ہے!" شہزاد نے کہا "کبھی کبھی معذرت بھی کر لی جاتی ہے۔"

اور بڑی ردوقدح کے بعد جوہری نے پہلی بار زندگی کا اصول توڑتے ہوئے رانی چندن پور کے پسندیدہ آویزے اُسے دے دئے تھے اور اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ اُس کے شوہر نے ایک لاکھ پینتیس ہزار کا چیک اُس کے سامنے لکھ کر جوہری کو دیا تھا ——— لیکن یہ نوجوان اور اناڑی جوہری یاقوت کے ٹکڑوں کو امی ٹیشن بتا رہا تھا۔ یہ سُن کر اُس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ اُسے یہ احساس ہوا کہ وہ اُسے اُس کے شوہر سے بدگمان کر رہا ہے جواب اِس دُنیا میں نہیں ہے۔ آخر اُس نے کہا "کیا آپ کی دوکان میں کوئی دوسرا تجربہ کار جوہری نہیں جو ان بُندوں کو دیکھ سکے؟"

"آپ شاید مجھے اناڑی سمجھ رہی ہیں؟"

"آپ یاقوت کو امی ٹیشن کہہ رہے ہیں؟"

"جہاں چاہیں دکھا لیجئے!" اُس نے بڑے اعتماد سے کہا "کھلا ہوا امی ٹیشن ہے اور زیادہ سے زیادہ پچاس روپے قیمت ہوگی۔۔"

اُس نے بمشکل سانس لی۔ نوجوان جوہری کو غصّہ اور حقارت سے دیکھا۔ یاقوتی آویزوں کو پرس میں رکھا اور بغیر کچھ کہے تیزی سے دوکان سے نکل آئی۔ اُس کے جاتے ہی نوجوان جوہری قدرے حسرت سے مُسکرایا اور زیرِ لب بولا "فیشن زدہ سوسائٹی میں آئے دن ایسا ہوتا رہتا ہے کہ امی ٹیشن یاقوت کہہ کر پیش کئے جاتے ہیں۔ دھوکا دیا جاتا ہے۔ خدا جانے اِس عورت کے دل پر کتنا شاک گزرے گا جب اِسے یقین ہو جائے گا کہ اُس کے شوہر نے اُسے دھوکا دیا تھا!؟"

وہ دوکان کے باہر کھُلی ہوا میں سانس لے رہی تھی اور یہ کہہ کر دل کو تسکین دے رہی تھی۔ نوجوان جوہری ابھی پتھر پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ وہ جوہری تو ضرور ہے لیکن پرکھ سے محروم ہے۔ لیکن اِس کے باوجود اُس کے دل میں آگ لگی تھی۔ اِس لئے نہیں کہ یاقوت

ہر ایمی ٹیشن سمجھا گیا تھا۔ بات اگر یہیں تک ہوتی تو کوئی بات نہ تھی لیکن وہ یہ سوچ کر کڑھنے لگی تھی کہ یاقوت اگر ایمی ٹیشن ثابت ہوئے تو اُس محبت کا کیا حشر ہوگا جو شہزاد کے مرنے کے بعد بھی اُس کے وجود کا احاطہ کئے ہوئے تھی اور ہزار سمجھانے کے باوجود وہ شہزاد کو بھلا دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ مرنے والے کے سوا کسی دوسرے کو اپنانے پر آمادہ ہی نہ تھی۔ اس لئے نہیں کہ شہزاد انکم ٹیکس آفیسر تھا اور یہ کہ اُس نے لاکھوں روپیہ کے قیمتی زیورات اُسے خرید دئے تھے اور اس طرح اُس نے اپنی محبت کا نہ مٹنے والا نقش اُس کے دل پر چھوڑا تھا۔ اُس کی فرمائش پوری کرنے کے لئے شہزاد نے اپنی ملازمت، شہرت، عزت، ساکھ اور وقار کو ہی خطرے میں نہ ڈالا تھا بلکہ اپنی ذات کو [illegible] دیا تھا۔ محض اس لئے کہ اُسے اپنی پیاری بیوی کے لئے [illegible] اُس کی خواہش پوری کرنی تھی۔ وہ دوکان کے باہر ایک طرف بڑھی [illegible] آندھی میں لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ گزرتی، ہنستی ہوئی خوش پوش عورتیں اُسے گھورتی جا رہی تھیں اور نہ جانے کیا سوچ رہے تھے۔

وہ اُس رات کے بارے میں سوچ رہی تھی، جب جوہری نے شہزاد کو ساتھ لڑی والے موتیوں کا ہار نہ خریدنے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ جوہری اُس کی قیمت تین لاکھ سے کم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اُس کا کہنا تھا، ہار کے موتی اپنا ثانی نہیں رکھتے اور شہزاد ہار خریدنے کے لئے ضد پر تھا۔ خود اُس نے ہار کے تصور کو نظر انداز کر دیا تھا لیکن شہزاد بار بار تکرار کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا "جب تک ہار خرید نہیں لوں گا، میری محبت ملول رہے گی!" ــــــ آج یہ ساری دُنیا دھُندلی نظر آ رہی تھی اور اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خود ہی نہیں بلکہ شہزاد، اُس کی محبت اور سارے جواہراتی زیور خلاء میں تنکوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ جیسے نوجوان جوہری نے یاقوتی آویزوں کو ایمی ٹیشن نہ کہا ہو بلکہ ایٹم بم مار کر اُسے، اُس کے انمول زیورات کو، اُس کے شوہر کو اور اُس کی ساری کائنات محبت کو پارہ پارہ کر دیا ہو۔ یاقوتی آویزے اگر نقلی ہو سکتے ہیں تو بینک لاکر میں محفوظ سارے جواہرات بھی شیشہ ہو سکتے ہیں۔ اور اگر حقیقت اسی روپ میں ہے تو محبت شیشے کے ایک ٹکڑے کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟

یہ سوچتے ہوئے اور زندگی کی قوتوں کو سمیٹتے ہوئے جونہی وہ تیزی سے آگے بڑھی، تو ایک خوش پوش نوجوان سے ٹکرا گئی۔ اُس نوجوان نے گھبرا کر اظہارِ معذرت کیا جبکہ قصور اُس کا نہیں تھا اور جب وہ آگے بڑھنے لگی اور اُچٹتی نگاہ نوجوان پر ڈالی تو وہ نوجوان مُسکرا رہا تھا اور دو تیز چمکدار آنکھیں اُس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ سر کو جھٹکا دے کر آگے بڑھ گئی اور آنکھوں کی چمک کو شیشے کی چمک سمجھ کر نظر انداز کر گئی۔ اس لئے کہ اس وقت شیشے کی کرچیں اُس کے دل اور دماغ میں چُبھ رہی تھیں اور دُنیا کی ہر حسین شئے اُسے شیشے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ خود کو بھی اس وقت چلتا پھرتا شیشہ ہی سمجھ رہی تھی!

وہ یاقوتی آویزے لے کر بہت سی دوکانوں میں گئی اور جب آخری دوکان میں یاقوتی آویزے دکھا رہی تھی تو آویزوں کو دیکھ کر ضعیف جوہری نے بڑے ہمدردانہ انداز سے اُسے دیکھا اور شاید چہرے کے آثار چڑھاؤ، گھبراہٹ اور اضطراب کے نفسیاتی پس منظر کو بھانپ کر بولا۔ "میں نہیں کہہ سکتا، آپ کو انجانے میں دھوکا دیا گیا یا جان بوجھ کر۔ لیکن آپ کو دھوکا ضرور دیا گیا۔"

"دھوکا ــــ" اُس نے لمبی سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آویزے یہی بتاتے ہیں!" جوہری نے آہستہ سے کہا "یہ رنگین شیشے ہیں، یاقوت نہیں۔"

اور جب وہ سُرخ شیشوں کے آویزوں کو گھر لے آئی تو بالکل خاموش تھی۔ یہ خاموشی طوفان کے بعد کا ٹھہراؤ نہیں بلکہ طوفان کی آنے والی سنگینی سے متعلق تھی یہی وجہ تھی کہ جونہی وہ ڈرائنگ روم میں آئی اور اُس کی نظر شہزاد کی قد آدم قیمتی تصویر پر پڑی تو اُس نے نفرت آمیز نگاہوں سے شہزاد کی تصویر کی طرف دیکھا اور پھٹ پڑی۔ "تمہاری مسکراہٹ شیشہ کی ہے۔ تم شیشہ کے ہو اور تمہاری یاد بھی شیشہ کے سوا اور کچھ نہیں۔۔"

یہ کہتے کہتے اُس نے لاشعوری طور پر گُلدان اُٹھایا اور شہزاد کی تصویر کی طرف کھینچ مارا۔ زور سے آواز ہوئی اور ڈرائنگ روم میں ہر طرف شیشے کی کرچیں بکھری ہوئی تھیں اور شہزاد کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ آواز سُن کر خادمہ آ گئی تھی اور دروازے پر سوالیہ نشان بنی کھڑی تھی۔ جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی اُس کے لئے ناقابلِ یقین تھا کیونکہ وہ مالکہ کی شدید محبت سے واقف تھی۔ وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ مالکہ بپھری ہوئی چیونٹیں چڑھائے غصہ اور نفرت سے اپنے مرحوم شوہر کی خراب شدہ تصویر کو گھور رہی تھی اور جب خادمہ پر اُس کی نظر پڑی تو اُس نے پرس سے سُرخ شیشے کے آویزے نکالے اور زور سے ٹوٹی ہوئی تصویر کی طرف کھینچ مارے اور دوسرے ہی لمحے تیز رفتاری سے چلی گئی۔ آویزے ٹوٹے ہوئے شیشے سے ٹکرا کر جب فرش پر گرے تو چکنا چُور ہو گئے۔ سفید کرچوں میں کہیں کہیں سُرخ کرچیں بھی مل گئیں اور فرش سُرخ و سپید ہو گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اُس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور خادمہ کی دستک ہی اُس نے نظر انداز نہیں کی بلکہ اُبھرتے ہوئے چاند کو جو ہمیشہ اُس کی محبت کی تابندگی کی علامت رہا تھا، نظر انداز کر دیا۔ وہ خنک رات کی تمام رعنائیوں کو بھول چکی تھی۔ بند اندھیرے کمرے میں اگر اُسے کچھ یاد آ رہا تھا تو صرف یہ کہ شہزاد نے نہ صرف اُسے بلکہ اُس کی محبت کو بھی دھوکا دیا تھا، اُس سے فریب کیا تھا۔ اُس کے خلوص اور وفا کی تذلیل کی تھی۔ یقیناً وہ رنگین شیشے کے زیورات بھی گلے لگا لیتی۔ ہزاروں باوفا عورتیں ایمی ٹیشن ہی پہنتی ہیں اور محبت کی دیوی بنی رہتی ہیں لیکن اُسے غم یہ تھا کہ شہزاد نے اُسے دھوکا کیوں دیا؟ اگر وہ کہہ دیتا کہ یاقوت، نیلم، زمرد، پکھراج اور ہیرے جواہرات وہ خرید نہیں سکتا تو کیا وہ شہزاد سے نفرت کرنے لگتی؟ یہ سچ ہے کہ زیورات سے اُسے عشق تھا لیکن شوہر کی محبت کا مداوا جواہرات نہیں ہو سکتے تھے۔

اس لئے کہ وہ عورت تھی اور عورت کی محبت دولت سے نہیں، محبت ہی سے خریدی جا سکتی ہے۔ بیشک تاج محل کا عکس حسن لئے ہوئے وہ فریب کی کٹیا میں دیا بن کر بھی جگمگاتی ہے! اس کی محبت اگر نہیں تھی، پھر شہزاد نے [illegible] دھوکا کیوں دیا۔

وہ مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ اندھیرے کائنات پر سیاہ چادر ڈالے ہوئے تھا۔ اس کا دل رہ رہ کر بھر آتا تھا۔ آنکھوں سے دریا پھوٹ پڑے تھے اور سسکیوں سے تاریکی کی سیاہ چادر تھرتھرا اٹھتی تھی۔ اچانک اُسے یاد آیا کہ شروع میں شہزاد نے جواہرات خریدنے پر ہلکا سا اعتراض کیا تھا۔ ایک بار قدرے نرمی لیکن سنجیدگی سے اس نے کہا تھا "ڈارلنگ! پتھر خرید کر کیا کرو گی۔ بے جان، بے حس پتھروں کو تمہارے حسن سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟" ــــــ اور اس نے شہزاد کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

"جواہرات میری کمزوری ہیں"

"اس کے لئے مجھے رشوت لینی پڑے گی!" شہزاد نے ہنستے ہوئے کہا تھا "حسن کی دیوی کو زیورات ناجائز کمائی سے لے کر چڑھاؤں، یہ توہین کس کی ہوگی؟"

"اچھا شاعری نہ کیجئے" اس نے ہنستے ہوئے اور ٹھنکتے ہوئے جواب دیا تھا اور شہزاد نے اس کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے بڑی گرمجوشی سے کہا تھا "اگر میں تاج محل نہیں بنوا سکتا تو کیا لعل و گہر بھی خرید کر نہیں دے سکتا؟" ــــــ اور اس کے بعد سے شہزاد نے بیوی کے اس شوق کو کبھی نہیں ٹوکا بلکہ ہنستے مسکراتے لعل و گہر خریدتا رہا اور ہنس ہنس کر کہتا رہا "اب میں لاکھوں سے کھیل رہا ہوں۔ صرف تمہاری خاطر، تاکہ تمہیں اصلی پتھر نذر کر سکوں۔ اپنی عزت، اپنی ساکھ، ملازمت اور یہاں تک کہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر..." اور وہ شہزاد کی محبت کی مہک سونگھ کر مسرور ہو گئی تھی۔ یہی وہ مہک تھی جس سے اس کا انگ انگ بسا ہوا تھا۔ شہزاد کی موت کو اگرچہ ایک سال ہو گیا تھا لیکن محبت کی مہک کم نہیں ہوئی تھی بلکہ بڑھ گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس نے امیر ترین اور خوبصورت ترین جوانوں کو ٹھکرا دیا تھا جو اس کی محبت کے متمنی تھے۔ کبھی کبھی وہ یہ سوچ کر مسکرا دیتی تھی کہ لوگ محبت کے نہیں بلکہ اس کی دولت کے متمنی تھے، جو جواہرات کے روپ میں اس کے پاس موجود تھی۔ کیونکہ سب ہی کو یہ بات معلوم تھی کہ شہزاد نے اُسے پندرہ بیس لاکھ کے جواہرات خرید دیے تھے اور اس کے لئے یہ کچھ مشکل نہ تھا کیونکہ وہ انکم ٹیکس آفیسر تھا اور وہ بھی بمبئی میں جہاں دس بیس لاکھ روپے سے کم پیش کش غرض مند کی طرف سے نہیں ہوتی تھی!

یہی وجہ تھی کہ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اُسے نہ دوسرا شہزاد مل سکتا تھا نہ وہ دوسری شادی کر سکتی تھی ــــــ اور اچانک اسے ارباب کا خیال آیا اور اس کا وہ طعنہ بھی کہ "شہزاد نے حسن و محبت کو لعل و گہر کی زنجیروں میں قید کر دیا ہے۔ کیا یہ اس کی خود غرضی نہیں؟"

ــــــ "کیسے؟" اس نے مسکرا کر ارباب سے پوچھا اور ارباب نے بہت بے چین ہو کر جواب دیا۔ "یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ تمہیں کسی ساتھی کی ضرورت نہیں، حسن و جمال کے پرستار ہوتے ہیں۔ تعجب ہے تمہیں پرستار کی نہیں، بے جان پتھروں کی ضرورت ہے۔ تعجب ہے تم ان شیشوں سے مطمئن ہو؟"

اس نے تڑپ کر پوچھا "شیشے! میرے کانوں کی زینت جو گوہر ہے کیا وہ شیشے کے ٹکڑے ہیں، یقیناً!" ارباب نے کہا "جس طرح شوخ شیشے چمکتے ہیں بالکل اسی طرح یہ تمام جواہرات بھی چمک رہے ہیں۔ دونوں کی چمک میں کیا فرق ہے؟ میں تو یہی کہوں گا کہ جوانی اور زندگی کا [illegible] سپید نیلے پیلے شیشے کے ٹکڑے تو نہیں ہو سکتے!... وہ مسکرائی اور یاقوتی آویزوں کو چھوتے ہوئے بولی "تم اگر شیشے کے ٹکڑے خریدتے تو وہ باقیمت ہوتے۔ چونکہ دوسرے مردوں نے [illegible] اس لئے تم ان کی تذلیل کر رہے ہو! ــــــ تم مرد بھی کتنے متعصب اور تنگ دل ہوتے ہو!؟..."

اُسے یاد آیا کہ وہ ارباب سے صرف اس لئے نفرت کرتی تھی کہ وہ شہزاد کے ایثار، اس کے خلوص اور اس کی محبت کا مذاق اڑاتا تھا اور اصل جواہرات کو نقل کہہ کر انہیں شہزاد کی محبت کا ثبوت نہیں بلکہ دھوکے، فریب اور بے وفائی کی نشانی بتاتا تھا۔ صرف اس لئے کہ ان جھوٹے پتھروں اور شیشے کے ٹکڑوں کو دکھا کر اس نے ایک زندگی برباد کی تھی۔ اسے خوشیوں سے دور کیا تھا، اُسے مسرتوں سے محروم رکھا تھا۔ کیا یہ ایک مرد کی خود غرضی نہیں تھی کہ خود تو مر جائے اور نوجوان، خوبصورت بیوی کو بھی اپنے ساتھ زندہ درگور کر دے؟ ــــــ نقلی جواہرات کو دیکھ کر ارباب کے ذہن میں ہمیشہ یہی رُخ ابھرا تھا اور اس نے ہمیشہ شہزاد کا مذاق اڑایا تھا ــــــ لیکن آج بند کمرے میں اندھیرے میں وہ کیا سوچ رہی تھی؟

آج اُسے ارباب سے اتفاق تھا۔ اس امر پر بھی کہ ایسے شوہر مطلق العنان ہوتے ہیں اور ان کی دلبستگی کبھی ایک سے نہیں ہوتی۔ یقیناً شہزاد کی کوئی دوسری محبوبہ بھی ہوگی جس پر وہ اپنی ساری کمائی لٹاتا ہوگا۔ اور یہ سوچ کر وہ پھر زار زار رونے لگی کہ مرنے والا اُسے شیشے کے ٹکڑے اور نقلی جواہرات دے کر دنیا سے رخصت ہوا! اس صورت میں جبکہ شہزاد کا بینک بیلنس بھی کچھ نہیں نکلا۔ حالانکہ اس کے دوسرے ساتھیوں نے نہ صرف کوٹھیاں بنوائی تھیں بلکہ انہیں نوٹوں سے بھر دیا تھا۔ شہزاد کے پاس تو رہنے کے لئے اپنا مکان تک نہیں تھا۔ یہ سب روپیہ ضائع کہاں ہوا؟ اگر اس کی کوئی دوسری محبوبہ نہیں تھی تو پھر اس کی آمدنی کہاں گئی؟

رات اسی طرح آنسوؤں کے ہار بنتے بنتے بیت گئی۔ سویرے جب وہ کمرے سے نکلی تو مرجھائے ہوئے پھول کی طرح تھی۔ نادرہ اُسے دیکھ کر لرز اٹھی۔ وہ بھی اپنی مالکہ کے غم اور جذباتی بے چینی پر رات دیر تک غور کرتی رہی تھی اور بہت کوشش کے باوجود سوائے اس کے وہ اور کچھ نہ سمجھ سکی تھی کہ نوجوان حسین مسافر تنہا زندگی کی ڈگر پر چلتے ہوئے ڈرتا ہے!

دس بجے وہ سیدھی بینک آئی اور لاکر سے موتیوں کے سلسلے زیورات جو آبنوس کے ایک بڑے صندوقچے میں بند تھے، لے آئی اور چلتے وقت اس کی چابی بینک منیجر کو دیتی آئی۔ بینک منیجر نے چابی لیتے ہوئے گھبرا کر پوچھا "کیا آپ لاکر واپس کر رہی ہیں؟" ــــــ "جی ہاں!" ــــــ منیجر نے ایک لمحہ رک کر کہا "آپ چوری کا خطرہ مول لے رہی ہیں؟" اس نے بالوں کی لٹ کو چھوتے ہوئے بڑی بے نیازی سے کہا "زندگی ہر ایک کو ایک بار لوٹتی ہے، دوبارہ نہیں..." اور اسی دن شام سے پہلے پہلے اس نے تمام زیورات شہر کے نامور جوہریوں کو دکھلائے۔ سب کا متفقہ فیصلہ

یہی بتاکہ زیورات اصلی نہیں نقلی ہیں اور یہ کہہ کر جوہری اُس کے مرجھاتے ہوئے گالوں کے پھول بڑی حیرت اور حسرت سے دیکھتے اور اُس وقت ششدر رہ جاتے جب اُس کی زبان سے یہ سُنتے کہ شہزاد نے اِنھیں اصلی اور انمول کہہ کر خریدا تھا اور اُسے محبت کا نذرانہ کہہ کر پیش کیا تھا۔

سب جوہریوں کی رائے یہی تھی کہ یا تو آپ کا شوہر آپ سے محبت نہیں کرتا تھا یا پھر کسی اور سے وابستہ تھا... اِس رائے میں اُسے صداقت نظر آتی تھی کیونکہ خود اِس کی بھی یہی رائے تھی۔ کل کی طرح جب وہ گھر پہنچی تو جذباتی انتشار کا شکار نہیں تھی۔ اُس نے جاتے ہی ارباب کو فون کیا اور کہا "دفتر سے فوراً یہاں آجائیے اور ایک ڈرامہ دیکھیے۔" ارباب کو فون کرکے وہ نہانے چلی گئی اور دیر تک ڈرائنگ روم میں رہی۔ جب وہاں سے نکلی تو اُس کے جسم پر دوہرے جواہرات کے زیور تھے اور وہ دُلہن معلوم ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ارباب بھی آگیا اور اُسے دیکھتے ہی بولا۔

"اچھا تو آج آپ دُلہن بننے جا رہی ہیں۔ یہی ڈرامہ دکھانا چاہتی تھیں؟" وہ ہنس دی اور اُس نے کہا: "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟" ارباب کو محسوس ہوا کہ وہ دُلہن کی طرح سجنے کے باوجود بھی دُلہن کے رُوپ اور نکھار سے محروم ہے۔ اُس کا چہرہ بُجھا ہوا ہے اور جذباتی طور پر وہ اُس مقام پر نہیں ہے جہاں اِس وقت اُسے ہونا چاہیے تھا۔ سکوت کو آخر اُس نے توڑا اور کہا: "یہ دوہرے زیورات شہزاد نے مجھے دیے تھے۔" ارباب خاموش رہا۔ وہ شاید یہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اُس کا شوہر ہوتا تو اُسے قیمتی زیورات کیسے نذر کرسکتا تھا؟ ـــ اچانک وہ اُٹھی اور تیزی کے ساتھ ایک ایک زیور کو نہایت عجلت سے اُتارنے لگی۔ پھر سب کو جمع کیا اور پتھر سے اُنھیں کوٹنے لگی۔ ارباب نے بے تاب ہو کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: "یہ کیا کر رہی ہو؟" اُس نے لمبی سانس لی، ارباب کو دیکھا اور کہا: "میں اِن زنجیروں کو توڑے دیتی ہوں جنھوں نے مجھے قید کر رکھا تھا ـــ" "تم انھیں ضائع کیے بغیر یہ قدم اُٹھا سکتی ہو" ـــ "اِن زنجیروں کو توڑے بغیر میں کچھ نہیں کرسکتی..." ارباب حیران تھا اور اُس کا ہاتھ برابر زنجیروں کو توڑ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ ہر لمحہ طوفان کا پیش خیمہ بنتا جاتا تھا۔

آخر طوفان گزر گیا ـــ نیلم، زمرد، پکھراج، یاقوت، لعل اور موتی سب کے سب چکنا چُور ہو چکے تھے اور اِن پتھروں سے ایک نئی عورت اُبھر آئی تھی۔ ارباب گہری خاموشی سے اِس نئی عورت کو دیکھ رہا تھا جو آئینے کے سامنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوار رہی تھی اور ہنس رہی تھی!

جب وہ بال بنا چکی تو اُس نے ہنستے ہوئے ارباب سے کہا: "اب میں عورت ہوں ـــ!"

ارباب خلافِ اُمید خاموش تھا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اچانک اُس نے کہا: "کل تک میں کسی ایک فیشن کی دوکان کا سجا ہوا شوکیس تھی۔ پابند اور مجبور، لیکن اب میں آزاد ہوں۔ میری محبت بھی آزاد ہے اور اب میں یہ دیکھوں گی کہ مفلس عورت سے محبت کرنے کا دعویدار کون ہے؟" اچانک ارباب اُٹھا۔ اُس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر یہ کہتے ہوئے چلا گیا: "جس بے پروائی اور بے دردی سے تم نے شہزاد کے تحفے پیس ڈالے ہیں اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اصلی نہیں تھے..."

"پھر کیا تھے؟" اُس نے چلا کر پوچھا۔ ارباب نے زور سے کہا: "شیشہ ـــ!" اُس نے بے تحاشہ قہقہہ لگایا اور دیر تک قہقہے لگاتی رہی۔

یہ خبر چھپ نہ سکی کہ اُس نے لاکھوں کے زیور پیس ڈالے۔ صرف اِس لیے کہ وہ آزاد

ہو جائے اور پھر اُس محبت کا شکار کرے جس کے بغیر نسوانیت پھول بننے سے محروم ہے ———! جگہ جگہ اِس کے بکھرے ہوئے تجربے ہوتے گئے۔ دفتروں سے کلبوں تک! کچھ اُسے بے وقوف عورت کہتے اور کچھ اُس کی خوبصورتی کے معترف ہوتے ——— اور آخر کار ایک دن کلب میں اُسے زندگی کا نیا ساتھی مل گیا جس نے نہایت صفائی سے بتا دیا کہ وہ شہزادو کی طرح جواہرات پیش نہیں کر سکے گا۔ وہ ایک چھوٹا عہدیدار ہے۔ شہزادو کی طرح ایک منٹ میں ایک لاکھ کمانے والا نہیں۔ لیکن اب اُس کا نظریہ ہی بدل چکا تھا۔ زندگی کے تجربے نے اُسے بتایا تھا کہ زیادہ دولت مند شوہر شیشے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور حد سے زیادہ غریب شوہر احساسِ کمتری کا شکار! ہیرے زیورات ——— تو وہ عورت کو حرم میں رکھنے کے لئے ہوتے ہیں۔ وہ تو ایک ایسا شوہر چاہتی تھی جو شہزادو کی محبت کی کمی پوری کر سکے اور بس ———!

جب وہ بدل گئی تو زمانہ بدل گیا ——— اُس نے یہی محسوس کیا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اِس حقیقت کی روشنی میں جب وہ ماضی کے دھندلکوں کو دیکھتی تو اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ کل تک سنہرے پنجرے میں قید تھی اور ہر بار یہ سوچ کر اُسے مسرت ہوتی کہ اُس نے سنہرے پنجرے سے آزادی حاصل کر لی ہے اور اب وہ اپنی موجودہ زندگی سے خوش ہے جہاں شہزادو کی دُنیا کی طرح لعل و گہر کی بارش تو نہیں ہوتی لیکن محبت، سکون اور وفا تو ہے۔ پھر عورت کو اور کیا چاہئے؟

ایک دن جب وہ سیر کو گئی تو یہ جان کر اُسے دکھ ہوا کہ شہزادو کا وکیل اُس سے ملنے آیا تھا ——— وہ شہزادو سے اِتنی خفا تھی کہ اُس کے نام کے ساتھ منسوب کسی چیز کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ جس شخص نے اُسے زندگی بھر دھوکا دیا اور اُس کی تذلیل کی وہ اُس کا نام بھی سُننا نہیں چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے وکیل سے ملنے سے انکار کر دیا اور کئی دن بعد جب اُس کے دل نے اُسے سمجھایا تو وہ کسی نہ کسی طرح وکیل سے ملنے پر راضی ہو گئی۔ وکیل نے دیکھتے ہی کہا: "میں ایک خوشخبری لے کر آیا ہوں میڈم!" ——— اُس نے طنزیہ انداز میں برجستہ کہا۔ "شیشے کے ٹکڑوں کی خوشخبری؟" وکیل ایک لمحہ کے لئے چپ ہوا، گھبرا کر اُسے دیکھا اور پھر اُس نے کہا: "آپ کی بیمہ پالیسی تیار ہے" اور جب اُس نے چونک کر وکیل کو دیکھا تو اُس نے کہا: "شہزادو صاحب! آپ سے واقعی محبت کرتے تھے اور اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے کہ آپ کے لئے کوئی ٹھوس قدم اُٹھائیں۔ میرے مشورہ پر مرحوم نے سات لاکھ کی بیمہ پالیسی لی تھی اور اپنے بعد آپ کو اِس کا مجاز کیا تھا۔ بیمہ کمپنی نے سات لاکھ کا چیک آپ کے نام بھیج دیا ہے اور میں اِسی سلسلہ میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔" اُس نے کرسی سے سر ٹیک دیا اور خاموش ہو گئی۔ بغیر مزید گفتگو کے ملاقات ختم ہو گئی۔ وکیل حیران تھا کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ ——— اِدھر وہ خلجان میں مبتلا تھی۔ وکیل کے الفاظ رہ رہ کر اُسے یاد آ رہے تھے ——— "شہزادو صاحب واقعی آپ سے محبت کرتے تھے۔ آپ کے لئے ٹھوس قدم اُٹھانے کے لئے فکر مند رہا کرتے تھے... مرحوم نے سات لاکھ کی بیمہ پالیسی لی تھی اور اپنے بعد آپ کو اِس کا مجاز کیا تھا..." وہ سوتے میں چونک پڑتی اور کوئی اُس کے کان میں کہتا۔ "سات لاکھ روپے" ——— کئی دن بعد جب جذباتی ہیجان میں کمی ہوتی تو وہ سوچنے لگی کہ جو محبت کرنے والا شیشوں کو یاقوت کہہ کر خرید سکے اُس کی محبت اصل اور ہیرے کیسے ہو سکتی ہے؟ شیشہ دینے والا سات لاکھ روپے کیسے دے سکتا ہے؟ کئی دن اسی خلجان میں گزر گئے۔ اُدھر وکیل روز آتا تھا اِس لئے کہ کمپنی کو مصدقہ دستخط بھیجنے تھے۔ جس دن اُس نے سات لاکھ کا ڈرافٹ لیا وکیل نے اُس کی پژمردگی دیکھ کر پوچھا: "آپ اُداس کیوں ہیں میڈم؟" جواب میں اُس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ وکیل اِس کیفیت کو شادیٔ مرگ سمجھا لیکن جب اُس نے سوال کیا تو اُسے اپنے خیال میں ترمیم کرنی پڑی: "ایسی ٹیشن کے زیورات خریدنے والا اُسے بیمہ پالیسی کیسے دے سکتا ہے؟..." وکیل مسکرا دیا جیسے وہ اِس راز سے واقف ہو: "میڈم! آپ غلط فہمی کا شکار ہو گئیں...؟"

"کیسے؟" وکیل نے کرسی آگے کھسکاتے ہوئے کہا: "شہزادو صاحب راشی نہیں تھے۔ آپ اُن کی بیوی تھیں لیکن اِس راز سے ناواقف تھیں۔ وہ اکثر آپ کی فرمائشوں سے پریشان رہا کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آپ اِس اصول اور معیار کو تسلیم نہیں کر سکتیں کہ بمبئی کا اِنکم ٹیکس آفیسر ناجائز آمدنی کا ایک پیسہ تک لینا نہیں چاہتا اور مجھے خوشی ہے کہ مرحوم آخر وقت تک اپنے اصول اور معیار پر قائم رہے۔ اِس صورت میں لاکھوں کے یاقوت، نیلم، پکھراج وہ کیسے خرید سکتے تھے؟ آپ ہی بتائیے ایسے بلند کردار کا شخص اپنی بیوی کے لئے جائز آمدنی سے لاکھوں کے زیورات کیسے خرید سکتا تھا؟ اور آپ کو سُن کر تعجب ہوگا کہ میں نے مرحوم کو مشورہ دیا تھا کہ جوہریوں سے مل لیں اور آپ کو ساتھ لے کر جواہرات خرید لیا کریں۔ مرحوم اِس ترکیب کو اِس لئے ناپسند کرتے تھے کہ اُن کے نزدیک یہ فراڈ تھا اور اُنھیں ڈر تھا کہ آپ کہیں بدگمان نہ ہو جائیں۔ لیکن اُن کی ایماندارانہ زندگی نے اُنھیں اِسی راہ پر چلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جب بھی آپ کے لئے کوئی زیور خریدتے تو بتاتے تھے کہ آپ بہت خوش ہیں لیکن وہ کتنا مغموم ہوتے تھے، یہ میں جانتا ہوں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یقیناً میں شیشہ نہیں ہوں لیکن پاک اور اصولی زندگی کے لئے شیشہ بن جانا پڑتا ہے ——— مجھے اُمید ہے میری وضاحت کے بعد آپ مرحوم سے بدگمان نہیں ہوں گی اور اُنھیں یا اُن کی محبت کو شیشہ تصور نہیں کریں گی...!؟" وکیل وضاحت کر رہا تھا اور اُسے پتہ نہیں تھا کہ وہ صوفہ پر بے ہوش ہو چکی ہے۔ سات لاکھ کا ڈرافٹ ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا ہے اور ——— اور ———!!

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دئے جاتے ہیں۔ مضامین کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نوآموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں اُنھیں واپس کر دئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (ایڈیٹر)

طنزیہ

چھاتہ بردار

——— پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی۔ ایم اے

۱۷۰۵، پہاڑی بھوجلہ۔ دلی

۱۰ ستمبر ۶۵ء — نشتر گرامی ادریا گنج مقامہ

کہیں اس مضمون کے عنوان سے اگاڑی پچھاڑی تڑا کر یہ نہ سمجھ بیٹھئے گا کہ آپ ڈی۔ آئی۔ آر میں دھر لئے جائیں گے۔ حالانکہ میری شکل کم از کم آپ کی زیادہ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ کوئی اپنی جوانی کے صدقے میں ہم دونوں کو بلا خطا و قصور دھر لے ——— یہ مزاحیہ مضمون سر پر موم بتی جلا کر لکھا ہے۔ اسے اصل مع سود کے بھیج رہا ہوں، گم نہ کر دینا ورنہ میرے اور آپ کے درمیان نہایت بین الاقوامی قسم کی پٹاڈگی ہو جائے گی اور میں کسی قیمت پر سیز فائر لائن کا احترام کرنے کو تیار نہ ہوں گا ——— جب سے یہ جھگڑا شروع ہوا ہے مختلف البعض عاشقوں نے اپنی اپنی فراق کی راتوں کو کہیں سے مذہب لے کر میرے مکان پر مسلط کر دیا ہے۔ رات میں درجنوں موم کی بتیاں جل بجھ ہوتی ہیں اور مفلسی کو ننانوے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بڑھاتی رہتی ہیں۔ ہاتھ کو ہاتھ اور بیوی کو میاں تک سجھائی نہیں دیتا۔ سچ تم ہی بتاؤ کہ اس تاریکی میں کوئی کہاں جائے۔ انسان کی زندہ دلی اور خوش طبعی کا اتنی زور سے شاید ہی کبھی گلا گھونٹا گیا ہوگا ——— اس مضمون کو اگر نہ چھاپنا ہو تو مجھے واپس کر دو۔ اس کی پالش نہ ڈالنا، ورنہ اپنا گلا گھونٹ کر تم پر ۳۰۲ کا مقدمہ قائم کر کے انتقال فرما لوں گا۔

وحشت ہم اپنی بعد فنا چھوڑ جائیں گے — اور تم پھرو گے چاک گریباں کئے ہوئے

مخلص ——— غلام احمد فرقت

(سر راہ دوسری منزل پر کمرہ تھا جس میں ایک طرف سلاخوں دار گیلری تھی۔ جس پر سکھانے کے لئے کپڑے ٹانگ دئے جاتے تھے۔ نیچے دوکانیں تھیں۔ دوکان داروں نے اپنی اپنی دوکانوں کو دھوپ سے بچانے کے لئے بانسوں پر پردے لگا رکھے تھے۔ گیلری سے اگر کوئی چیز گر جاتی تھی تو بجائے سڑک کے اُن پردوں پر رک جاتی تھی۔ اکثر جب کپڑے سوکھ کر اُن پر گر جاتے تو گھر والوں کو اٹھانے میں بانس یا کسی لمبی چھڑی کو استعمال کرنا پڑتا تھا۔ یہ تھا مکان مشاعر علی شاعر قنوجی کا۔ شاعر صاحب اس وقت بالکل تنہا تھے۔ بیوی اور بچے سینما دیکھنے گئے تھے۔ شاعر صاحب صحن میں تحت اللفظ نہا رہے تھے۔ پاجامہ جس کا ایک پائینچا خراب ہو گیا تھا، اُنھوں نے سوکھنے کے لئے گیلری میں ٹانگ دیا اور وہ ہوا سے اُڑ کر پردہ پر جا گرا)

آواز:۔ ہم آسکتے ہیں؟

شاعر:۔ (آواز پہچان کر) کون؟ آفاق؟

آفاق:۔ ہاں! اندر سے بند کیوں کئے ہوئے ہو؟

شاعر:۔ نہا رہا ہوں، رکو۔ ابھی آیا!

آفاق:۔ کیا اکیلے ہو؟

شاعر:۔ ہاں!

آفاق:۔ تو کیا ننگے نہا رہے ہو؟

شاعر:۔ بالکل!

آفاق:۔ اچھا تم نہاتے رہو۔ میں منہ پھیر کر کمرہ میں چلا جاؤں گا۔

شاعر:۔ دو منٹ چھتری کے نیچے دم کیوں نہیں لیتے؟

آفاق:- اگر پہچان لیں تو بھی کیا ہو سب دوست ہیں۔

شاعر:- اچھا (چٹخنی کھول کر اور دروازے کے پٹ کے پیچھے چھپ کر) لو کمرے میں آجاؤ۔ کواڑ بند کر لو۔

آفاق:- ہاں! ابھی تک نہیں نہائے ہو؟

شاعر:- ابھی دھوبی پاٹ کے دو ہاتھ مار کر واپس آیا ہوں۔

آفاق:- اچھا تو تم نہاؤ۔ جب تک میں اخبار پڑھ رہا ہوں۔

شاعر:- نہیں میں نہا چکا۔ تم اندر سے مجھے پاجامہ لے دو۔

آفاق:- (ادھر اُدھر دیکھ کر) پاجامہ کدھر رکھا ہے؟

شاعر:- پلنگ پر ہوگا۔ نہیں تو کسی کھونٹی دُونی پر ٹنگا ہوگا۔

آفاق:- (تلاش کرنے کے بعد) یار! یہاں تو کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

شاعر:- اچھا رہنے دو۔ اندر نہیں ہوگا۔ لاحول ولا قوۃ! وہ سکھانے کے لئے رکھا تھا۔ دیکھو نیچے تنور پر تو نہیں گر گیا۔ سُن رہے ہو؟ ذرا گیلری کی طرف نیچے پردوں پر دیکھ لو۔

آفاق:- ہاں یار! وہ تو خشک ہو کر نیچے پڑے پر لوٹیں مار رہا ہے۔ کیا بالکل ننگے ہو۔ کوئی اور کپڑا باندھ لو۔ تولیہ تو ہوگا۔

شاعر:- تولیہ بہت چھوٹا ہے۔

آفاق:- تو صحن میں کوئی کپڑا ہوگا۔ وہی باندھ لو۔

شاعر:- یہاں کوئی کپڑا نہیں۔ آج ہی سارے کپڑے بیگم نے دھوبی کو دے دئے ہیں۔

آفاق:- پھر؟

شاعر:- پھر کیا؟

آفاق:- ہاں! تو پھر یوں ہی چلے آؤ۔ کون سا مال ہے جو خطرے میں پڑ جائے گا۔

شاعر:- یار! اندر کمرے میں دیکھو، ایک پیٹی میں میرے کپڑے رکھے ہیں۔ اُس میں سے پاجامہ نکال لاؤ۔

آفاق:- یہاں سامنے کوئی پیٹی ویٹی نہیں ہے۔ دو گٹھڑیاں ضرور ہیں۔

شاعر:- تو انہی میں دیکھو۔ شاید ایک آدھ پاجامہ نکل آئے۔

آفاق:- ان گٹھڑیوں میں صرف زنانے کپڑے ہیں۔

شاعر:- دونوں گٹھڑیاں دیکھ لیں؟

آفاق:- ہاں! ایک گٹھڑی میں ساڑیاں اور جمپر وغیرہ ہیں اور دوسری میں پیٹی کوٹ اور ریشمی کپڑے ہیں۔

شاعر:- کوئی مردانہ کپڑا نہیں ہے؟

آفاق:- کہہ تو دیا۔ ہر چیز زنانی ہے۔

شاعر:- تو پھر یار! صندوق میں سے ایک سفید پیٹی کوٹ ہی نکال دو۔

آفاق:- پیٹی کوٹ کیا کروگے؟

شاعر:- تم دے تو دو۔

آفاق:- سفید پیٹی کوٹ تو ہے مگر اُس میں ازار بند نہیں ہے۔

شاعر:- اچھا تو کوئی دوسرا پیٹی کوٹ دے دو۔ کسی میں تو ازار بند ہوگا۔

آفاق:- ہاں ایک پیٹی کوٹ دھاری دار ہے جس کی زمین سرخ ہے مگر اس کے علاوہ کسی میں ازار بند نہیں ہے۔

شاعر:- اچھا سرخ دھاری والا ہی دے دو۔ لاحول ولا قوۃ! نہ جانے پاجامے کہاں سٹک گئے ہیں

آفاق:- تو کیا پیٹی کوٹ پہن لوگے؟

شاعر:- یہ بھی کبھی کبھی مفید ہوتا ہے۔

آفاق:- یہ لو!

(شاعر پیٹی کوٹ پہن کر کمرہ میں آکر پلنگ پر بیٹھ جاتا ہے)

آفاق:- (قہقہہ لگا کر) بھئی! کیا عجب لگ رہے ہو! نہ ہوئیں اس وقت بھابی۔ اس کی داد دیتیں۔

(کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز)

شاعر:- کون صاحب ہیں؟ اماں! آفاق ذرا گیلری سے جھانک کر دیکھو تو کون صاحب اس وقت نازل ہوئے ہیں۔

آفاق:- (گیلری سے باہر کی طرف دیکھ کر) یار! دو تین سوٹڈ بوٹڈ اور ایک شیروانی والے صاحب ہیں۔

شاعر:- (بدحواس ہو کر) بھئی آفاق! غضب ہو گیا۔ اب کیا کریں؟ کمبخت مردے بے وقت دفن ہونے چلے آتے ہیں۔ اب بتاؤ کیا کریں؟

آفاق:- پردہ پر سے کسی طرح پاجامہ اُٹھاؤ۔ اس کے سوا اور کیا صورت ہو سکتی ہے۔

باہر سے آواز:- اجی! کہہ دیجئے۔ میرٹھ سے سب جج صاحب ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں آئے ہیں۔

شاعر:- (بدحواس ہو کر) یار آفاق! غضب ہو گیا۔ اب کیا کریں ... ہے؟ خدارا، پکار کر کہہ دو آتے ہیں۔

آفاق:- جی ہاں۔ موجود ہیں۔ ابھی آتے ہیں۔ رکئے۔

شاعر:- مگر آفاق! خدا کے لئے بتاؤ کیا کروں۔ وہ لوگ ... طرح پاجامہ پردے پر سے اُٹھا دو۔

آفاق:- لیکن وہ لوگ تو بالکل سامنے گیلری کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

(باہر سے آواز) کیا تشریف نہیں رکھتے؟

شاعر:- یار آفاق! کہہ دو ... صاحب ...

اللہ میاں! کچھ تو تدبیر کرو۔ خدا جانتا ہے آبرو ریزی ہو جائے گی۔

آفاق ۔ بھئی میری عقل کام نہیں کرتی۔

شاعر ۔ یار تم اللہ کا نام لے کر گیلری سے بانس اُٹھا لاؤ اور پردہ پر سے پاجامہ کھینچ لو۔

آفاق ۔ لیکن وہ تو گیلری پہ پر سمر یزم کی مشق کر رہے ہیں (گیلری میں داہیں بائیں دیکھ کر) یار گیلری میں بانس تو بانس تنکا بھی دُور دُور تک نظر نہیں آرہا۔

شاعر ۔ یار ان لونڈوں نے تو ہمیں عاجز کر دیا۔ نہ جانے بانس اور لوہے کی چھڑ کہاں اٹھا کر پھینک گئے ہیں۔ اب بتاؤ۔ اس بے بسی میں کیا کروں۔ کس طرف دیوار پھاند کر جاؤں۔

آفاق ۔ اس حالت میں دیوار و دیوار تم معمولی قد مچہ نہیں پھاند سکتے۔

شاعر ۔ یار! یہ مذاق کا وقت نہیں۔ کوئی صورت بتاؤ۔ میں تو بہت اُلجھن میں ہوں۔ کدھر جاؤں۔ پھر نگاہ کر کہہ دو۔ حاضر ہو رہے ہیں۔

(باہر سے آواز) اے صاحب! شاعر صاحب سے کہہ دیجئے ہم لوگ جلدی میں ہیں۔

شاعر ۔ آفاق! کہہ دو کہ آتے ہیں۔ حاضر ہو رہے ہیں۔ اے خدا! اس وقت مجھ پر رحم کر۔

آفاق ۔ شاعر صاحب قبلہ آ رہے ہیں۔ کپڑے بدل کر غسل کر رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ کپڑے بدل رہے ہیں۔

شاعر ۔ اللہ یہ کہیں زینہ پر نہ چڑھ آئیں؟

آفاق ۔ تو بتاؤ میں کیا کروں۔ تم اپنی پینٹ کیوں نہیں پہن لیتے؟

شاعر ۔ ارے بھائی! وہ بھی تو نیچے واشنگ کمپنی میں استری کے لئے دے آیا ہوں۔

آفاق ۔ تو پھر مزے کرو۔

شاعر ۔ ان سالوں کو بھی اسی وقت مرنا تھا۔

آفاق ۔ قسم قرآن کی کیا تاک کر حملہ کیا ہے۔

شاعر ۔ حملہ نہیں واللہ! یہ تو زہر دے رہے ہیں۔

آواز ۔ تو کیا ہم لوگ چلے جائیں۔ شاعر صاحب آنا نہیں چاہتے؟

شاعر ۔ (گھگھیا کر آواز میں) بس! حاضر ہوا۔

آفاق ۔ (زیادہ زور کی آواز میں) آ رہے ہیں۔ کپڑے بدل چکے ہیں۔

آواز ۔ ان کو کہہ دیجئے جج صاحب انتظار کر رہے ہیں۔ ہم لوگ اوپر چلے آئیں۔

شاعر ۔ غضب ہو گیا۔ کہہ دو نہیں۔ اوپر آنے کی زحمت نہ کریں۔ زنانہ ہے۔ خدارا کہو۔ ارے بھائی کہہ دو۔ رُک گئے۔ اپنی جوانی کے صدقے میں رُکے رہتے۔

آفاق ۔ اتنی دیر سے کہہ تو رہا ہوں ــــــ (زور سے) آتے ہیں۔ آپ زحمت نہ فرمائیں۔

شاعر ۔ (پسینہ پسینہ ہو کر) بھائی آفاق! سر دست ایسا کرو کہ تم پیٹی کوٹ پہن لو اور یہیں بیٹھ جاؤ۔ میں تمھاری پینٹ پہن کر ان سے دو باتیں کر آؤں۔ لیکن جلدی کرو۔ میں ادھر سے اپنی پینٹ بھی لیتا آؤں گا۔ جلدی کرو۔ لو... میں منہ پھیرے لیتا ہوں۔ جلدی کرو... یار! پینٹ اُتارو (منہ پھیر کر) اُتاری...

آفاق ۔ تو پہلے تم مجھے پیٹی کوٹ تو دو۔

(نیچے سے آواز) اجی! قبلہ شاعر صاحب ہم لوگوں کے حال پر رحم فرمائیے۔

شاعر ۔ اچھا میں پیٹی کوٹ اُتارتا ہوں۔ تم منہ پھیر کر پینٹ اُتارنا شروع کرو۔

آفاق ۔ لاحول ولا قوۃ! اس وقت ننگے لُچے کو مت دیکھو۔ جلدی کرو۔ لو یہ پینٹ اور مجھے اپنا پیٹی کوٹ دو۔

شاعر ۔ (پیٹی کوٹ اُتار کر) لاؤ اپنی پینٹ۔

آفاق ۔ لے تو رہا ہوں۔ تم تو اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہے ہو۔ ارے لوٹا۔ ذرا کیوں سے بھرا!

شاعر ۔ ذرا رُک رہا ہوں (پینٹ لے کر اور جلدی جلدی پینٹ پہن کر) لو، پیٹی کوٹ۔

آفاق ۔ (جلدی سے پیٹی کوٹ پہن کر) اچھا! اب تم جاؤ۔

شاعر ۔ یار! کمر بالکل نہیں آرہی ہے۔ بہت چھوٹی ہے۔

آواز ۔ تو کیا ہم لوگ جائیں؟

شاعر ۔ حاضر ہوا ـــــ حاضر ہوا۔

(نیچے سے بڑبڑانے کی آواز) میاں چھوڑو۔ بڑے شاعر بے پھرتے ہیں۔ ایسے کاہل کو کہاں لے جاؤ گے۔

شاعر ۔ حاضر ہوا۔ معاف کیجئے گا۔ بس آیا حضور۔ ارے میاں آفاق! ذرا کمر کھینچ کر کس دو نا۔ دیکھو کیا رہے ہو؟

آفاق ۔ بھئی کمر کا آنا مشکل ہے۔ تمھارے پیٹ پر یہ نہیں آسکتی۔

شاعر ۔ میں سانس روکے لیتا ہوں (دانت کٹکٹا کر اور سانس روک کر) ہاں، اب، تو دو۔

آفاق ۔ سانس مشکل سے لے پاؤ گے۔

شاعر ۔ کچھ پروا نہ کرو۔ موت تو یوں بھی آنی ہے۔

آفاق ۔ (کھکھیا کر زور سے) لو سالا بٹن بھی ٹوٹ گیا۔

شاعر ۔ یہ کس اُلو کے پٹھے نے بٹن لگایا تھا؟

آفاق ۔ گھوڑے کی پیٹی ہاتھی کے باندھو گے تو وہ ٹوٹے گی نہیں تو اور کیا ہو گا۔ بس اب تم یوں ہی چلے جاؤ۔ کہہ دینا پینٹ بدلنے میں بٹن ٹوٹ گیا۔

شاعر ۔ چھوٹی مہری ہونے کی وجہ سے پینٹ بیچ میں کس بھی تو رہی ہے۔

آفاق ۔ تمھارا نچلا علاقہ چوڑا بھی تو ہے۔

(نیچے سے آواز) کہئے شاعر صاحب کپڑے بدل گئے؟

شاعر ۔ قبلہ حاضر ہوا! (زینہ سے نیچے اُتر کر) آپ سب حضرات مجھے معاف کریں۔ قسم آپ حضرات کے سرِ عزیز کی جس وقت آپ نے آواز دی ہے، نہانے ہی بیٹھا تھا۔

ب:۔ کیسے آپ نے مجھے پہچانا؟

ر:۔ کیوں نہیں؟

ب:۔ ارے بھئی شاعر صاحب! ہمارے سب جج صاحب سے ملئے۔

عر:۔ (بڑھ کر مصافحہ کرتے ہوئے) قبلہ! معاف کیجئے گا۔ آپ حضرات کو میں نے بڑی زحمت دی۔۔۔ آپ تو میرٹھ ہی میں ہیں نا؟

ب:۔ جی ہاں! مگر جتنی دیر میرٹھ سے یہاں آنے میں لگی تقریباً اتنی ہی دیر آپ کی زیارت میں ہو گئی۔

عر:۔ (تیسرے صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) آپ کو دیکھا تو ہے مگر آپ کا نام بھول رہا ہوں۔

احب:۔ میرٹھ کی مشہور و معروف ہستی جناب کیف قنوجی صاحب۔

اعر:۔ اتنی دیر سے میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہ قنوج کے عطر کی خوشبو کدھر سے آ رہی ہے؟ آپ سے تو غائبانہ تعارف ہے۔ رسائل میں آپ کا کلام برابر پڑھتا رہتا ہوں ۔۔۔ ماشاء اللہ غزل گو شعراء میں تو آپ کا ایک مقام ہے۔

صاحب:۔ مگر میں رسائل میں غزلیں بھیجنے کے خلاف ہوں۔

اعر:۔ یہ آپ اچھا کرتے ہیں جو ان حرام خوروں کو کلام نہیں بھیجتے۔ ایسے شاعر تو چہرے سے پہچان لیا جاتا ہے۔

صاحب:۔ آپ کو کہیں جانے کی جلدی تو نہیں ہے؟

اعر:۔ (ہنس کر) اب کیا عرض کروں۔ اگر آپ دس پندرہ منٹ بعد آتے تو شاید میں غسل کر کے نکل چکا ہوتا۔ بات یہ ہے کہ میرے یہاں گھر میں دو روز سے علیل ہیں اور مجھے اسی وقت ڈاکٹر کو اُن کا حال پہنچانا ہے۔ آیئے! کھڑے کھڑے ہی باتیں کر لیں ۔۔۔ اور بات ہی کیا کرنی ہے آپ کا حکم ہی کافی ہے۔

(سامنے سے ایک بچہ دوڑتا ہوا شاعر صاحب کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے)

چہ:۔ (جس کی عمر تقریباً آٹھ سال ہے، زور زور سے سانس لیتے ہوئے) ابا! ہم لوگ سینما ہو آئے۔ امی چوڑیاں خرید رہی ہیں۔ وہ بھی آ رہی ہیں۔ چلئے کوٹھے پر چلئے۔

ساعر:۔ (گھبرا کر) اچھا رکو۔ ہاں صاحب! تو قبلہ آپ جہاں فرمائیں گے میں حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ لوگ رکے کہاں ہیں؟

ند صاحب:۔ ارے صاحب! ہم لوگوں کی نہ پوچھئے۔ ہر جگہ رکے ہیں اور کہیں نہیں رکے۔ آپ ہی لوگوں کے چکر میں سویرے سے گھوم رہے ہیں۔

چہ:۔ ابا ۔۔۔ ابا! لیجئے امی بھی آگئیں۔ وہ دیکھئے سامنے آ رہی ہیں۔

ساعر:۔ (بیگم کو آتا دیکھ کر اور بے حد بدحواس ہو کر) تو آپ حضرات کہاں رکے ہیں؟ آپ چلئے میں ابھی حاضر ہوتا ہوں (بے تحاشہ زینے پر چڑھ کر) آفاق ۔۔۔ آفاق ۔۔۔

غضب ہو گیا۔ بیگم آ رہی ہیں۔ خدارا کہیں چھپ جا۔ میں ان لوگوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔

آفاق:۔ (گھبرا کر) میں کدھر چھپ جاؤں؟

شاعر:۔ (زینے سے اترتے ہوئے) گیلری میں ۔۔۔ ڈھابلی کے پیچھے ۔۔۔ ڈھابلی ۔۔۔ پلنگ ۔۔۔ گیلری ۔۔۔ ڈھابلی ۔۔۔ ڈھابلی۔ چھپ جا ۔۔۔ چھپ جا ۔۔۔ آفاق۔ ڈھابلی ۔۔۔ ڈھابلی آفاق ۔۔۔ چھپ جا ۔۔۔ آفاق ڈھابلی ۔۔۔

آفاق: ڈھابلی کدھر ہے؟ ۔۔۔ کدھر ہے؟ ۔۔۔ ڈھابلی ۔۔۔

شاعر:۔ (بدحواسی کے عالم میں زینے سے اتر کر) آیئے چلئے۔ آپ سے رستے میں باتیں ہو جائیں گی۔ چلئے (تیزی سے ایک گلی میں مڑ کر کہتا جاتا ہے) آیئے۔ آگے آ جایئے، آپ۔

زینے پر بچوں اور شاعر کی بیگم صاحبہ کے آنے کی چاپ سن کر آفاق کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ وہ دروازہ بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بیگم نے اپنے پیٹی کوٹ کی جھلک دیکھ لی۔ ایک بچے نے اندر جا کر جھانکا تو ڈر کے مارے اُس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ ماں ماں کہتا اپنی امی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور چلانے لگا۔ چور چور۔ بھوت بھوت۔ امی ۔۔۔ چور ۔۔۔ پیٹی کوٹ والا چور ۔۔۔

بیگم دوبارہ اندر جھانکتی ہے۔ آفاق گیلری کی طرف بھاگتا ہے، جہاں کوئی چیز چھپنے کی نہیں۔ بیگم بھی چلانا شروع کر دیتی ہے "دوڑو۔ چور چور۔ دوڑو ۔۔۔ لوگو! چور ۔۔۔ چور ۔۔۔" بچوں کے زور زور سے رونے کی چیخیں ۔۔۔

آفاق کوٹ کے نیچے پیٹی کوٹ پہنے زینے سے اندھا دھند چھلانگیں مارتا ایک طرف بھاگتا ہے۔ بہت سے لڑکے اور مرد پیچھا کرتے ہیں۔ ایک ہنگامہ۔ شور۔ غوغا۔ "پکڑو۔ پکڑو" مختلف آوازیں۔ "زنانہ ہے۔ چور ہے ۔۔۔ زنانہ ہے ۔۔۔ پاکستانی جاسوس ۔۔۔ چھاتہ بردار ۔۔۔ چھاتہ بردار ۔۔۔ پکڑو ۔۔۔ پکڑو ۔۔۔!!"


گھر میں دُھلی
سَرف
سے دُھلی
Surf
AMAZING BLUE POWDER

اپنا گھر

حسن اجمل مسرّت۔ ایم، اے

۳ بی۔ ۲۱/۱۲ امیدان۔ ناظم آباد۔ کراچی

۲۵ر جولائی ۶۵ء
محترمی! آداب

ترسیچین عقیدے کے مطابق جب تک پادری بچے کی رسم ادا نہ کرے وہ پُورا کرسچین نہیں کہلاتا، اور میں سمجھتا ہوں ادبی عقائد کے مطابق افسانہ نگاروں اور بیسویں صدی کے درمیان بھی کچھ ایسا ہی رشتہ ہے۔ بدقسمتی سے میں ابھی تک یہ رشتہ استوار کر سکنے سے محروم رہا ہوں۔ اس لئے ایک افسانہ لے کر حاضر خدمت ہو رہا ہوں ــــــ صبح کا بھُولا شام کو گھر لوٹ آئے تو اُسے بھُولا نہیں کہتے . . .

احقر ــــــــ حسن اجمل مسرّت

اُس دن بارش کے ساتھ ساتھ طوفان بھی آیا تھا۔

اور یہ پہلا اتفاق تھا کہ کمال نے اپنے گھر جاتے ہوئے ہلکا سا خوف محسوس کیا۔ نہ معلوم ں کا بوسیدہ مکان اِس طوفانی موسم کا مقابلہ کر سکے گا یا نہیں۔ بظاہر یہ اُمید نہیں تھی کیونکہ تناور رخت جڑ سے اُکھڑ گئے تھے اور شہر کے مختلف حصوں سے پُرانے مکانات گرنے کی خبریں برابر آ رہی یں لیکن وہ اپنے گھر سے دُور رہنے کو تیار نہیں تھا معلوم نہیں اِس ٹکونے کمرے سے اُسے کیا اُنسیت ی کہ اُسے دوسری چھت کے نیچے نیند ہی نہ آتی تھی چاہے وہ کیسی ہی جگہ ہو، کیسی ہی محفل ہو۔ اگر ے بیٹھے بیٹھے اپنے مکان کی یاد آجاتی تو وہ کہیں نہ رُک سکتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے یکایک اُٹھ کھڑا ہوتا۔ ب چلوں گا!"

اور اُس کا یہ جُملہ اب اِتنا زیادہ سمجھا جا چُکا تھا کہ جاننے والے اِس کے بعد اُس سے نے کے لئے بالکل اصرار نہ کرتے۔ اپنے مکان سے اُس کا یہ جذباتی تعلق مشہور تھا۔ ایک بار جب ی دوست نے اُس کے مکان پر کچھ نازیبا تبصرہ کر دیا تھا تو کئی دن تک کمال کی اُس سے بول چال رہی تھی۔ کہنے والے نے صرف اِتنا ہی کہا تھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا، تمھارا اُس گھر میں دل کیسے لگتا ہے؟ مجھے تو تمھارا مکان رنِ وسطیٰ کا کوئی قید خانہ معلوم ہوتا ہے یا جیسے تاریخ سے پہلے کا کوئی مُہیب الجثّہ جانور کمین گاہ کے باہر سر اُٹھائے کھڑا ہو!"

کہنے والے نے بہت صحیح بات کہی تھی۔ اُس کے مکان کی ہیئت واقعی خاصی ہیبتناک ں۔ تین منزلوں پر مشتمل وہ عمارت جس کی دوسری منزل کا ایک ٹکونا سا کمرہ اُس کا مکان تھا شاید اب سے سو سال پہلے تعمیر ہوئی تھی اور تعمیر کرنے والوں نے شاید کبھی اُس کی مرمّت کی طرف توجہ نہیں دی تھی اور اب عالم یہ تھا کہ دیواروں کا پلاستر اُدھڑ چُکا تھا، سُتون کھوکھلے ہو چُکے تھے اور چھجّے اپنے مکینوں کا بوجھ سہارتے سہارتے اِتنے زیادہ جُھک چُکے تھے جیسے کسی بھی لمحہ زمین پر آ رہیں گے۔ اُس عمارت کی آڑی ترچھی بے رنگ دیواریں ایک دوسرے کے سہارے یوں رُکی ہوئی تھیں جیسے ایک دوسری سے لپٹ کر اپنی کسمپرسی کا ماتم کر رہی ہوں ــــــ یہ سب درست تھا پھر بھی کمال نے اپنے دوست کی بات کا اِتنا بُرا مانا تھا جیسے اُس نے کمال کے مکان پر تبصرہ نہ کیا ہو اُس کی ماں بہن کو عیب لگایا ہو۔ اِس واقعہ کے بعد اُس کے دوست آہستہ آہستہ مکان سے اُس کے جذباتی لگاؤ کا احترام کرنے لگے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ آج جب بارش نے طوفانی رنگ اختیار کر لیا تھا اور پُرانے مکان دھڑا دھڑ گِر رہے تھے تو کسی دوست نے اُسے یہ مشورہ دینے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ یہ طوفانی رات اپنے مکان میں بسر کرنے کا خطرہ مول نہ لے۔

اور آج عجیب اتفاق تھا کہ اُسے خود ہی اپنے مکان میں جاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا! وہ اپنے مکان کے سامنے ایک دوکان کے سائے میں کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ اُسے اندر جانا چاہئے یا نہیں ــــــ بارش مُسلسل جاری تھی اور رہ رہ کر بجلی یوں کڑک رہی تھی جیسے قدرت اپنے طیش کا مظاہرہ کر رہی ہو اور اُس پر سے طوفانی ہوا! ــــ جیسے پُوری کائنات اپنی زندگی کے لئے ایک کربناک جدوجہد میں مُبتلا ہو! اور اُس طوفانی موسم میں اُس کا مکان یوں لرزتا ہوا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بے سہارا بچّہ کسی خوفناک منظر سے بار بار دہل اُٹھتا ہو اور جب کبھی طوفانی ہوا کا جھکّڑ آتا تو مکان کے چوبی زینے یُوں چرچرانے لگتے جیسے تاریخ سے

ہے کسی عجیب انجانے خوف سے بے بسی کے عالم میں اپنے جبڑے پھیلاتے ہوں اور اُس پر بجلی کی چمک ایسی معلوم ہوتی جیسے وہ اِس عفریت کی آخری کراہ ہو!

کمال کو اُس عفریت سے جنون کی حد تک محبت تھی۔ وہ دُنیا میں اکیلا تھا اور اِس بھری دُنیا میں ایک تنکوں سے بھی کم، وہ مکان ہی ایک ایسی چیز تھی جسے وہ اپنی کہہ سکتا تھا اور شاید اسی لئے اُس کی ساری محبت، ساری اپنایت کا مرکز وہ مکان تھا اور اِسی لئے اُس مکان کے بارے میں اُس کے جذبات بالکل وہی تھے جو سفید بالوں اور دُھندلی نگاہوں والی ماں کے لئے بچّے کے ہو سکتے ہیں اور اُس وقت وہ اپنی اُس بے زبان ماں کی آغوش میں سما جانے کو بے تاب تھا مگر یہ طوفانی بارش ـــــــــ

اور پھر اُس نے دیکھا نیچے والی منزل کے کئی خاندان ایک ایک کرکے اِس طوفانی بارش میں گھر چھوڑ کر کسی دوسری پناہ گاہ کی تلاش میں نکل گئے۔ دُور کہیں دھم سے ایک درخت گرا

◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆

- انتہاپسندی سراسر تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ (حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ)
- فاضل ترین اعمال یہ ہیں ـــــ اپنے دشمن کو دوست بناؤ، نادان کو اپنے حُسنِ تربیت سے دانا بناؤ۔ اہلِ فسق و فجور کو اپنے مخلصانہ پند و نصیحت سے راہِ راست پر لاؤ۔ (سقراط)
- اعمالِ زشت پر ندامت نہ ہونا، یہ دُوسری بُرائی ہے۔ (بقراط)
- غصّہ اگر برمحل ہے، تب بھی اُسے ایک حد کے اندر رہنا چاہئے۔ جیسے کھانے میں نمک کہ جب تک صحیح ہے، ہاضم ہے ورنہ مُضر۔ (افلاطون)
- نیکی کیا ہے؟ صفاتِ محمودہ کا انسان میں جمع ہو جانا۔ (حکیم جالینوس)
- دو بھائیوں میں دشمنی نہ ڈالو۔ وہ تو مِل جائیں گے اور تم ہمیشہ کے لئے بُرے بن جاؤ گے۔ (اقلیدس)

◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆✻◆

اور اُس کی شاخیں دیر تک چرچرا کر ٹوٹتی رہیں اور پھر اِتنی زور سے بجلی کڑکی جیسے اپنی اِس نئی فتح پر قہقہہ لگا رہی ہو اور اِس منظر نے اُس کی رہی سہی ہمت بھی چھین لی۔

اب اُس کے سامنے رات بسر کرنے کا مسئلہ تھا۔ وہ ایک رات کے لئے عابدہ کے گھر بھی رُک سکتا تھا۔ احمد بھی اپنے مکان میں تنہا رہتا تھا اور پھر سلیم تو بخوشی اُسے روک لے گا اور اِس طرح ناموں کا ایک سلسلہ اُس کے ذہن میں آگیا اور یہ نام اُن تمام متموّل عزیزوں اور دوستوں کے تھے جو اُس کی قدر کرتے تھے لیکن جن سے ملتے ہوئے کمال کو ہمیشہ ایک واضح بُعد محسوس ہوا کرتا تھا ـــــ ایک ایسا فاصلہ جسے دُودھ کی نہر بھی نہیں پاٹ سکی تھی! اور وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اُسے کس کے گھر کو آزمانا چاہئے۔ وہ دوکان کے سامنے سے کھُلی سڑک پر نکل آیا اور اُس کا لباس جو بوچھار کی وجہ سے پہلے ہی بھیگ چُکا تھا اب بارش سے پلک جھپکتے میں اُس کے جسم سے چپک گیا۔ بارش بڑی شدّت سے ہو رہی تھی۔ اِتنی شدّت سے کہ بُوندوں کے تواتر سے اُسے سانس لینے میں دقّت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سُنسان سڑک پر بارش میں بھیگتا ہوا ایک سمت میں چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک موڑ پر اُسے یہ احساس ہوا کہ وہ عابدہ کے گھر کے سامنے پہنچ چُکا ہے۔

عابدہ نے اُسے بہت حیرت سے دیکھا۔

"کمال بھائی آپ؟" اُس نے بھرپور حیرت سے کہا پھر فوراً ہی سنبھلتے ہوئے بولی۔ "شاید مجھے بارش کا احسان مند ہونا چاہئے کہ اِسی بہانے آپ آئے تو!"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔" اُس نے کہا۔ "اور لوگ کہاں ہیں؟"

"سب اندر ہیں۔" اُس نے کہا۔ "ٹھہرئے میں آپ کے لئے تولیہ لے آؤں۔ آپ کا لباس بالکل تر ہے۔"

اور پھر اُس نے موٹے موٹے روئیں والی تولیہ سے جسم خشک کرتے ہوئے عابدہ کی طرف چور نظروں سے دیکھا ـــــ اُسے احساس ہوا کہ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود اِس کے جسم کا کنوارا پن اور اِس کے لہجے کی کھنک برقرار ہے اور اِس کا وجود اب بھی اُس کنواری مہک میں بسا ہوا ہے جس کا ہلکا سا احساس اب تک اُس کے ذہن میں محفوظ تھا۔

پھر اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگایا اور ماچس کی تلاش میں جیبیں ٹٹولنے لگا۔ عابدہ نے ریک سے لائٹر اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

"ابھی تک ماچس بھول آنے کی عادت باقی ہے؟" اُس نے آہستہ سے پُوچھا۔

کمال نے جواب نہیں دیا۔ صرف خاموشی سے سگریٹ سُلگایا اور لائٹر عابدہ کی طرف بڑھا دیا اور جب عابدہ لائٹر لینے کے لئے اُس کی طرف بڑھی تو اُس نے پُوری شدّت سے پھر اُس مہک کے جھونکے کو محسوس کیا جس کے خلاف اُس کی تنہائیوں میں ابھی تک جنگ جاری تھی۔

عابدہ کے جسم میں ایک ایسی مہک تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ دُنیا کی کوئی خوشبو، کوئی عطر اِتنا لطیف، اِتنا دائمی نہیں ہو سکتا جتنی وہ مہک تھی جو قدرت نے اُس کے وجود میں بسا دی تھی۔ ایک مخصوص سی نسوانی مہک، جیسے پھولوں کا رس، مٹّی کا سوندھا پن، گلاب اور دودھ کا عطر ایک دوسرے میں گھُل مِل کر خوشبو میں بدل دیے گئے ہوں۔ ایک ایسی خوشبو جس میں ایک آسودگی گھُلی ہوتی ہے، ایک پیار رچا ہوا ہوتا ہے، ایک گھریلو پن بسا ہوا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ محض اُس کا خیال ہو لیکن وہ اُس مہک کا شدّت سے قائل تھا۔ اُس کے نزدیک ہر نسوانی جسم کی ایک مخصوص خوشبو تھی۔ بالکل منفرد اور ایک دوسری سے قطعی مختلف۔ اور وہ مختلف جسموں کو محض مہک سے اُسی طرح پہچان سکتا تھا جس طرح چہرے کی بناوٹ یا آواز کے فرق سے کسی کو پہچانا جاتا ہے۔ اور عابدہ کے وجود کی مہک ہر مہک سے الگ تھی ہر خوشبو سے جُدا تھی اور اُس نے اُس مہک کو اُس وقت اُسی شدّت سے محسوس کیا تھا جیسے کوئی بھولی ہوئی سہانی بات یکا یک یاد آتی ہے!

پھر گھر کے اور لوگ بھی باہر کمرے میں آگئے۔ خالہ امّی، اختر، عابدہ کے دو ننھے ننھے

...تے بچے اور پھر اِن سب کے بعد عابدہ چائے کی ٹرے لئے ہوئے اِس انداز سے
...یں آئی جیسے چائے اُس نے پہلے سے تیار کر رکھی ہو۔ خالہ امّی نے بہت اپنایت سے اُسے
...ہے رابطہ دوری پڑ گیا تھا۔ مدّتوں ملاقات نہ ہونے کا شکوہ کیا۔ عابدہ نے بچوں سے اُسے
...لام کروایا اور اختر نے بڑے کاروباری انداز میں اُس سے مصافحہ کیا اور یہ بات اُس نے فوراً
...وس کر لی کہ اختر اُس سے بے رُخی سے پیش آیا ہے۔
پھر چائے کا دور چلا تو اُس نے یونہی پوچھ لیا: "اور کیا حال ہیں آپ لوگوں کے۔
...بدہ تم تو اچھی ہو؟"
اور اِس جملہ پر عابدہ نے اُسے یوں تڑپ کر دیکھا جیسے یہ سوال کر کے اُس نے عابدہ
...ے دل کو ٹھیس پہنچائی ہو۔
ہاں وہ اچھی طرح تھی۔ اُس کا شوہر بہت وجیہہ تھا، متموّل تھا۔ اُن کے دو پھول
جیسے بچے تھے۔ اپنا گھر تھا۔ اپنی کار تھی۔ ایک چھوٹی سی دُنیا تھی جو اُس کے قدموں میں تھی لیکن
...س دُنیا میں ایک ادھورا پن تھا، ایک کمی تھی اور کمال کو معلوم تھا کہ اُس کی دُنیا میں یہ ادھورا پن
...س وجہ سے تھا ــــ احمق لڑکی! اُس نے سوچا۔ وہ اِتنا سب کچھ مل جانے کے بعد بھی ایک
خیالی ہیولے کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔
پھر مختلف موضوعات پر گفتگو چل نکلی اور کمال جو اِس ارادے سے آیا تھا کہ یہ طوفانی
رات عابدہ کے گھر گزارے گا، اِس بات کا انتظار کرتا رہا کہ کوئی اُس سے رُک جانے کے لئے اصرار
کرے۔ شاید خالہ امّی ہی کو احساس ہو جائے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ عابدہ نے اُسے
دو ایک بار ایسی نظروں سے ضرور دیکھا جیسے وہ اُس کے دل کی بات سمجھ گئی ہو لیکن اِس بات کی
منتظر ہو کہ اختر اِس سلسلہ میں پہل کرے ــــ آخر وہ اپنے دل کے چور کو کہاں لے جاتی؟
پھر تھوڑی دیر بعد اختر جماہی لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔
"میں معافی چاہوں گا!" اُس نے صرف اِتنا کہا اور اندر چلا گیا۔
کمال کو محسوس ہوا جیسے اُسے کسی نے بھرے بازار میں رُسوا کر دیا ہو۔ فوراً ہی وہ بھی
اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میں بھی چلوں گا۔"
عابدہ نے اُسے معذرت خواہ نظروں سے دیکھا۔ خالہ امّی نے دبی زبان سے روکا۔
"اِس طوفان میں کہاں جاؤ گے؟"
لیکن وہ نہ رُک سکا۔
اب وہ پھر سڑک پر تھا اور بارش کی بوندیں اُس کے جسم پر چوٹ لگاتی ہوئی محسوس
ہو رہی تھیں۔
اُسے عابدہ کے گھر آ کر بے حد ذہنی کوفت ہوئی تھی۔ نہ جانے اختر کو اُس سے اِتنی
نفرت کیوں تھی۔ اگر اُسے عابدہ سے ایسی محبت ہوتی جس کے آگے اختر کا کاروباری ذہن سوچ ہی
نہیں سکتا تھا تو اُسے عابدہ کو اپنا لینے سے کون روک سکتا تھا؟ یا اگر وہ عابدہ کو کسی وجہ سے
نہیں اپنا سکا تھا تو یہ اُس کا گناہ تو نہیں تھا۔ اگر وہ اِتنا ہی گنہگار ہوتا، جتنا اُسے اختر نے سمجھا تھا
تو شاید عابدہ کسی معصوم کلی کی طرح اُس کے گھر میں نہ مہک رہی ہوتی ــــ وجود کی خوشبو کے
پیار اور جسموں کے اتصال والی محبت میں کتنا بڑا فرق ہے، یہ اختر کا کاروباری ذہن کیسے سمجھ
سکتا تھا! اور کمال کو یہ سوچ کر خود بہت غصہ آیا کہ اُس نے عابدہ کے گھر رات گزارنے کا خیال
ہی کیوں کیا! اگر وہ کہیں ایسا کرتا تو دوسری صبح شاید عابدہ بھی اُس کی طرح سڑک پر نظر آتی۔
سوچنے کا یہ انداز اُس کی سمجھ میں کبھی نہ آ سکا تھا اور اِسی لئے وہ اپنے تمام عزیزوں
اور دوستوں سے الگ اپنی دُنیا بسائے ہوئے تھا۔ اُس کی ساری محبتوں کا مرکز صرف اُس کا
اپنا گھر تھا۔ وہ چھوٹا سا نیم تاریک کمرہ جس کی سیلی سیلی سی فضا اُس کے وجود کا ایک حصہ بن چکی تھی۔
مکان کا خیال آتے ہی اسے ایک بار پھر یہ سوچ کر رنجیدہ ہونا پڑا کہ وہ اپنے گھر
سے دُور رہنے پر مجبور تھا۔ بارش کا زور بڑھتا ہی جا رہا تھا اور رات کی تاریکی کے ساتھ ساتھ

- شادی کو دُنیا کی واحد جنت سمجھنا چاہئے۔ (برنارڈ شا)
- دیانت، وقت کی پابندی، سلامت روی اور نشہ آور چیزوں سے پرہیز بجائے خود حصولِ دولت کا ذریعہ ہیں۔ (بیکن)
- تمہارا اُدھار کی رقم سے بھرا ہوا پرس دراصل بالکل خالی ہے۔ (ریلے)
- سب سے بڑی مصیبت اور عذاب یہ ہے کہ بے وقوف لوگ پُر یقین ہیں اور عقل مند شک و شبہ میں گھرے ہوئے ہیں۔ (برٹرنڈ رسل)
- فیشن، آدمی سے زیادہ لباس بدلتا ہے۔ (شیکسپیر)
- سچا دوست وہ ہے جو آپ کی کمزوریوں کو جانتے ہوئے آپ سے محبت کرتا ہے۔ آخر آپ میں کچھ خوبیاں بھی ہوں گی۔ (والٹیئر)

طوفان بھی خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ رات گزارنے کا سوال اب اور بھی شدید ہو گیا تھا۔
احمد کے گھر کافی دیر تک کال بیل بجاتے رہنے کے بعد دروازہ کھلا تو احمد سلیپنگ
گاؤن پہنے ہوئے اِس انداز سے باہر نکلا جیسے اُسے زیادہ سے زیادہ یہ اُمید رہی ہو کہ اِس طوفان
میں آنے والا کوئی پاگل ہی ہو سکتا ہے یا پھر کوئی بے ضرر قسم کا انسان جیسے تار لانے والا۔ جب
اُس نے کمال کو بھیگا ہوا پایا تو بوکھلا گیا۔
"ارے کمال تم؟ ــــ خیریت تو ہے؟"
"سب خیریت ہے یار۔ اندر تو آنے دو۔" کمال نے کہا اور تیزی سے کھلے ہوئے
دروازے کے اندر چھلانگ لگا دی اور اُس ایک لمحہ میں کمال نے یہ بات محسوس کر لی جیسے احمد نے
بے اختیارانہ طور پر اُسے روکنے کی کوشش کی ہو لیکن وہ تو اچانک اندر چلا آیا تھا اور اندر آتے
ہی اُس نے دوسری بات جو محسوس کی کہ احمد کا کمرہ ایک نسوانی جسم کی خوشبو سے بسا ہوا تھا لیکن

یہ خوشبو کچھ ایسی اجنبی سی تھی جس سے کمال کو ہمیشہ نفرت رہی تھی اور ابھی وہ اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ کمرے کا پردہ اُٹھا اور ایک سانولی سی لڑکی اندر داخل ہوئی۔

”احمد ڈیئر ——“ وہ بے خیالی میں احمد سے کوئی بات کہنا چاہ رہی تھی لیکن کمال کو سامنے پاکر یکلخت گھبرا گئی اور اُلٹے پاؤں دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

”یہ میرے آفس میں ٹائپسٹ ہیں۔ مس ڈیسوزا۔“ احمد کہنے لگا ”بے چاری بارش میں پھنس گئی ہیں۔ ذرا بارش رُکے تو انہیں گھر چھوڑ آؤں۔“

اور کمال فوراً سمجھ گیا کہ آفس کی ٹائپسٹ لڑکیاں بلا وجہ احمد کے گھر نہیں آیا کرتیں۔

”اچھا بھائی میں چلتا ہوں“ یہ کمال جانے کے لئے مُڑ گیا۔

”آخر کیسے آئے تھے۔ خیریت تو ہے؟“ احمد نے پوچھا۔

”رات گزارنے کیا تھا تمہارے گھر۔“

”رات گزارنے —— اوہ!“

”فکر نہ کرو اب میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔“

”پھر کیا کرو گے؟“

”گھر واپس جاؤں گا۔“

”ایسے میں گھر نہ جاؤ۔ میری رائے یہ ہے کہ ——“ اُس نے سوچ کر کہا ”کیوں نہ یہ رات تم کسی ہوٹل میں گزار لو۔“

”ہوٹل میں! —— ہاں یہ خیال بھی اچھا تھا۔

پھر احمد نے جلدی جلدی اپنا ایک جوڑا نکال کر اُس کے حوالے کیا اور تکیے کے نیچے سے گاڑی کی چابی نکال کر بولا ”چلو میں تمہیں ہوٹل میں چھوڑ آؤں۔“

”کیا کرو گے۔ میں خود چلا جاؤں گا“ اُس نے کہا ”یہ وقت تم مس ڈیسوزا کے ساتھ بارش رُکنے کا انتظار کرنے میں صرف کر سکتے ہو۔“

”گدھے ہو تم!“ احمد نے اُس کی پیٹھ پر ٹھوکا دیا اور پھر لڑکی کو مخاطب کر کے اونچی آواز میں بولا ”وُڈ یو مائنڈ ڈیر ایٹ آئی ——!“

”یس شیور۔ آئی کین ویٹ!“ لڑکی نے دوسرے کمرے سے جواب دیا۔

اور احمد اُسے اتنی تیز رفتاری سے ہوٹل پہنچا کر بھاگا جیسے اُسے یہ ڈر ہو کہ اگر بارش رُک گئی تو مس ڈیسوزا کو روکنے کے لئے ایک اور طوفان اُسے اپنی جیب سے خریدنا پڑے گا!

کمال کے لئے ہوٹل میں قیام کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اُسے جو کمرہ ملا وہ دوسری منزل پر تھا۔ اُس نے جلدی جلدی بھیگا ہوا لباس تبدیل کیا اور بستر پہ بے سُدھ ہو کر گر پڑا۔ پلنگ گدیلا تھا لیکن اُس کے جسم کو اُن گدّوں پر عجیب بے کلی سی محسوس ہوئی۔ اُسے تمام ظاہری شان کے باوجود وہ بستر تکلیف دہ محسوس ہونے لگا۔ ماحول کی اجنبیت نے اُسے فوراً ہی اُس کمرہ سے متنفر کر دیا اور اُسے بہت شدّت سے اپنا گھر یاد آنے لگا۔

ہوٹل کا یہ کمرہ اُس کے اپنے کمرہ سے کئی گنا بڑا تھا۔ اُس کی مسہری گداز تھی اور اُس کی دیواریں بہت سلیقے سے پینٹ کی گئی تھیں لیکن اُسے تو وہ اجنبیت کاٹنے کو دوڑ رہی تھی جو اس پورے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ اُس کمرے میں اُس کے اپنے کمرے کا سکون کہاں تھا جب وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹتا تو اُسے اپنے جسم کو اُس غیر محسوس سے گڑھے میں جما کر بہت سکون ملتا جو اُس کے اپنے جسم کے بوجھ سے بستر میں پیدا ہو گیا تھا اور اُس کی پلاستر اُکھڑی ہوئی سیلن زدہ دیواریں اُسے اپنی محبت سے معمور محسوس ہوتی تھیں اور وہ چھوٹا کمرہ اُسے ایک ایسی آغوش کی طرح معلوم ہوتا جس میں اُس کے لئے محبت ہی محبت، اپنائیت ہی اپنائیت تھی —— اور ہوٹل کے اُس گداز بستر میں ہم آغوشی کا وہ انداز کہاں تھا۔ اُن گدّوں میں وہ گرمی بھی نہیں تھی جو اُس کے برسوں پرانے بستر میں اب تک محفوظ تھی۔ یہ اُس کے اپنے جسم، اُس کے اپنے خون کی حرارت تھی جو اُس کے بستر میں، اُس کے سارے کمرے میں رچی بسی ہوئی تھی۔ ہوٹل کے اُس سجے ہوئے کمرے اور اُس کے اپنے کمرے میں وجود کی مہک کا فرق تھا۔ اپنائیت اور اجنبیت کا فرق تھا۔ خون کے رشتے اور روپیہ سے خریدے ہوئے تعلق کا بنیادی فرق تھا اور پھر خون کی وہ گرمی جو اُس کے کمرے میں بسی رہ گئی تھی، اُسے آواز دینے لگی۔

اُس نے ہوٹل کا بل ادا کیا اور پھر بھیگتا ہوا سڑکوں پر چل پڑا اور اس بار اُس کا رُخ سیدھا اپنے گھر کی طرف تھا۔ بالکل جیل سے بھاگے ہوئے اُس قیدی کی طرح جو فرار کی ہر ممکن کوشش کے بعد ناکام ہو کر قید خانے واپس جا رہا ہو۔ اس بار جب وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچا تو موت کا معمولی سا احساس بھی اُس کے ذہن میں باقی نہیں رہا تھا۔ اُس نے چرچراتی ہوئی تاریک سیڑھیاں بے دھڑک طے کیں۔ اپنے کمرے کا تالا کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ صرف چند لمحوں کے لئے اُس کے کمرے میں روشنی نظر آئی اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ شاید وہ اپنے جسم سے بنے ہوئے گڑھے میں پہنچ کر بارش اور طوفان سے بے نیاز ہو کر بچوں کی طرح میٹھی نیند سو گیا تھا!

اگلی صبح طوفان تھمنے کے بعد احمد اُس سے رات کے رویّہ کی معافی مانگنے کے لئے ہوٹل پہنچا اور اُسے وہاں نہ پاکر اُس کے گھر آیا لیکن اُس وقت تک اُس کا گھر ملبہ کا ڈھیر ہو چکا تھا جس کے نیچے سے لاشیں برآمد کی جا رہی تھیں۔ کمال اپنے گھر میں سکون کی نیند سو رہا تھا!!

ناردرن ریلوے

نوٹس

مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء سے ٹائم ٹیبل میں عام ترمیم عمل میں آئے گی. چند مقررہ ٹرینوں کی رفتار تیز کر دی گئی ہے۔ اہم تبدیلیاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں :۔

۱۔ نئی ٹرینوں کا اجراء

(i) جالندھر سٹی اور لودھیاں خاص کے درمیان ہر ایک جانب ایک گاڑی (ڈیزل ریل کاریں نمبر ۲۔ جے ایل کے/ ۴ جے ایل کے) (ii) نواں شہر دوابہ اور جالندھر سٹی کے درمیان ہر ایک جانب ایک گاڑی (ڈیزل ریل کاریں ۲ این جے/ ۴ این جے) (iii) دہلی اور بیکانیر کے درمیان ہر ایک جانب ایک گاڑی (بیکانیر ایکسپریس ۸۹ اَپ/ ۹۰ ڈاؤن) (iv) ہنومان گڑھ اور سورت گڑھ کے درمیان ہر ایک جانب ایک گاڑی (پسنجر ۱۔ بی ایچ ایس ڈی/ ۲ بی ایچ ایس ڈی) (v) بیلارا اور پیپر روڈ کے درمیان ہر ایک جانب ایک گاڑی (پسنجر ۲ جے پی بی/ ۴ جے پی بی) (vi) پٹھانکوٹ اور بیج ناتھ پپرولہ کے درمیان ہر ایک جانب ایک گاڑی (پسنجر ۳ پی بی/ ۴ پی بی)

۲۔ (ا) ٹرینوں میں توسیع

۹۹۔ اپ/ ۱۰۰ ڈاؤن ہریانہ ایکسپریس گاڑیاں جو سردست دہلی اور حصار کے درمیان چلتی ہیں اُن میں سرسہ تک توسیع کر دی جائے گی۔

(ب) منقسم کی گئی ٹرینیں

۴۵۔ اپ/ ۴۶ ڈاؤن جنتا ایکسپریس گاڑیاں پٹھانکوٹ کی بجائے اب امرتسر سے شروع ہوں گی اور امرتسر

پر ہی ختم ہوں گی۔ اور ایک الگ گاڑی نمبر ۵۔ اے بی پی/ ۶۔ اے بی پی امرتسر اور پٹھان کوٹ کے درمیان چلے گی۔

۳۔ جن ٹرینوں کی رفتار تیز کی گئی

(i) ۲۰۸ ڈاؤن جودھپور۔ آگرہ ایکسپریس ۳۵ منٹ تک (ii) ۹۶ ڈاؤن ماروار میل ۱۰ منٹ تک (iii) ۹۵۔ اپ ماروار میل ۵ منٹ تک (iv) ۹۳۔ اپ جودھپور میل ۵ منٹ (v) ۹۱۔ اپ/ ۹۲ ڈاؤن بیکانیر میل ۵ منٹ ہر ایک (vi) ۱۰۰ ڈاؤن ہریانہ ایکسپریس ۵ منٹ (vii) ۵۷۔ اپ پٹھانکوٹ ایکسپریس ۵ منٹ (viii) ۲۵۔ اپ ایرکنڈیشنڈ ایکسپریس (بائی ویکلی) ۵ منٹ (ix) ۱۹۔ اپ دہرہ دون ایکسپریس ۵ منٹ (x) ۲ کے ایس میل کم پسنجر ریل موٹر ۱۰ منٹ اور (xi) ۴ کے ایس ۱۵ منٹ۔

۴۔ نئے اسٹیشن کھولے گئے

ریواڑی۔ سادل پور سیکشن پر اُولانٹ ہالٹ

۵۔ نئے ہالٹ مہیا کئے گئے

(i) ۳۔ اے ایف اور ۶۔ اے ایف دھیر گنج پر (ii) ۷۔ اپ ہرن گاؤں پر (iii) ۷ بی ایس بی اور ۶ بی ایس جی ایچ چک مہاراج کا ہالٹ پر (iv) ۱۔ بی آر آر، ۲۔ بی آر آر، ۳۔ بی آر آر، ۴۔ بی آر آر اُولانٹ ہالٹ پر (v) ۲۔ بی آر ایس سدھرانہ ہالٹ پر (vi) ۲ بی بی ایس رتن گڑھ کنک وال ہالٹ پر (vii) ۵۹۔ اپ راجپورہ پر (viii) ۱۔ ڈی آر اور ۳۳۔ اپ منڈکا ہالٹ پر (ix) ۴ ڈی ایس یو، ۲۷۴ ڈاؤن، ۲۔ اے ٹی ڈی، ۲۷۵۔ اپ اور ۲ ڈی ڈی صاحب آباد پر اور (x) ۳۹۔ اپ/ ۴۰ ڈاؤن اونچہریہ پر۔

۶۔ نئے کنکشن مہیا کئے گئے

(i) ۲ ڈاؤن کا ۵۶ ڈاؤن کے ساتھ دہلی پر (ii) ۱۹ ڈاؤن کا ۳۶۹۔ اپ، ۵۹ ڈاؤن اور

۲۱۹۔اَپ کے ساتھ دہلی پر (iii) ا۔ڈی یو کا ۶ ۴ ڈاؤن کے ساتھ انبالہ کینٹ پر (iv) ۸ کے ایس کا ۸۷ ڈاؤن کے ساتھ کالکا پر (v) ۲ بی ایس آر/۳ بی ایس آر، ا۔ جے آر ڈی/۲۔ جے آر ڈی کا ۸۹۔اپ/۹۰ ڈاؤن بیکانیر ایکسپریس گاڑیوں کے ساتھ رتن گڑھ پر (vi) ۲ بی آر ایس کا ۸۹۔ اپ کے ساتھ ریواڑی پر (vii) ا۔بی ایس بی کا ۲ بی ایچ ایس ڈی کے ساتھ سورت گڑھ پر۔ (viii) ۲ بی ایچ ایس ڈی کا ۴ بی بی بی، ۳ بی ایس بی اور ا۔بی ایس ایچ کے ساتھ ہنومان گڑھ پر۔ (ix) ا۔بی ایچ ایس ڈی کا ۳ بی بی بی، ۴ بی ایس بی، ۴ بی ایس ایچ کے ساتھ ہنومان گڑھ پر اور (x) ۵ ایس یو کا ۸۷۔اپ کے ساتھ انبالہ چھاؤنی پر۔

۷۔ جو ہالٹ منسوخ کیے گئے

(i) ا۔ٹی اے، ۳۵۶۔اپ، ۲۔اے سی اور ۳۵۵ ڈاؤن اعتماد پور پر (ii) ۲۔اے ٹی ایف کوبر پور پر (iii) ۲۔اے سی ڈاؤن چالیسر پر (iv) ۲۰۷۔اپ/۲۰۸ ڈاؤن تھانہ متھری ہالٹ، بسرولی اور بوراور پر (v) ۲۵۔اپ اور ۵۹۔اپ سبزی منڈی پر اور (vi) ا۔اے بی کیو وڈالا گرانتھین پر۔

۸۔ ٹرینوں کے اوقات میں اہم تبدیلیاں

(i) ۹۲ ڈاؤن طوفان ایکسپریس دہلی میں ۳۵۔۱۷ بجے کی بجائے ۲۵۔۱۷ بجے پہنچے گی (ii) ۱۹ ڈاؤن دہرہ دون ایکسپریس دہلی میں ۱۰۔۷ بجے کی بجائے ۲۵۔۶ بجے پہنچے گی اور ۲۰۔۹ بجے کی بجائے ۱۵۔۸ بجے چھوٹے گی۔یہ گاڑی دہرہ دون ۰۵۔۱۹ بجے کی بجائے ۵۵۔۱۷ بجے پہنچے گی (iii) ۲ ڈاؤن دہلی سے ۳۵۔۸ بجے کی بجائے ۲۰۔۸ بجے چھوٹے گی (iv) ۸۲ ڈاؤن نئی دہلی سے ۱۶ بجے کی بجائے ۲۰۔۱۶ بجے چھوٹے گی (v) ا۔اپ میل مغلسرائے سے ۴۲۔۷ بجے کی بجائے ۴۲۔۶ بجے چھوٹے گی اور دہلی میں ۳۵۔۲۰ بجے پہنچے گی (vi) ۸۳۔اپ لکھنؤ سے ۰۰۔۲۱ بجے کی بجائے ۵۰۔۲۰ بجے چھوٹے گی (vii) ۸۷۔اپ کالکا سے ۲۰۔۱۸ بجے کی بجائے ۱۰۔۱۹ بجے چھوٹے گی۔ (viii) ۵۵۔اپ مرادآباد سے ۳۰۔۱۶ بجے کی بجائے ۴۰۔۱۶ بجے چھوٹے گی اور دہلی میں ۳۵۔۲۰ بجے کی بجائے ۵۵۔۲۰ بجے پہنچے گی (ix) ۵۷۔اپ لدھیانہ میں ۳۵۔۱۵ بجے کی

بجائے ۱۵-۲۵ بجے پہنچے گی اور ۱۵-۴۹ بجے کی بجائے ۱۵-۳۸ بجے چھوٹے گی (x) ۲۵۷-اَپ الہ آباد سے ۲۱-۴۰ بجے کی بجائے ۲۲-۴۵ بجے چھوٹے گی اور لکھنؤ ۶-۰۵ بجے کی بجائے ۶-۵۵ بجے پہنچے گی (xi) ۱۳۱-اَپ مغل سرائے سے ۲۰-۴۵ بجے کی بجائے ۱۹-۴۵ بجے چھوٹے گی اور لکھنؤ سے ۷-۴۰ بجے کی بجائے ۶-۰۰ بجے چھوٹ کر دہلی ۱۵-۴۵ بجے کی بجائے ۱۴-۰۰ بجے پہنچے گی (xii) ۳ ایم ڈی مراد آباد سے ۱۱-۰۵ بجے کی بجائے ۱۱-۲۰ بجے چھوٹے گی اور دہلی ۱۶-۰۵ بجے کی بجائے ۱۶-۵۰ بجے پہنچے گی (xiii) ۱ اے ٹی ڈی دہلی میں ۱۶-۵۰ بجے کی بجائے ۱۸-۰۰ بجے پہنچے گی (xiv) ۹۴ ڈاؤن جودھپور سے ۱۴-۰۰ بجے کی بجائے ۱۴-۳۵ بجے چھوٹے گی اور دہلی میں ۵-۲۵ بجے کی بجائے ۶-۰۵ بجے پہنچے گی (xv) ۲۳۲ ڈاؤن ریواڑی سے ۳-۴۵ بجے کی بجائے ۳-۱۵ بجے چھوٹے گی اور دہلی ۶-۰۰ بجے کی بجائے ۵-۲۵ بجے پہنچے گی (xvi) ۲۰۴ ڈاؤن ریواڑی سے ۱۶-۲۵ بجے کی بجائے ۱۶-۲۰ بجے چھوٹے گی اور دہلی ۱۸-۵۰ بجے کی بجائے ۱۸-۳۰ بجے پہنچے گی (xvii) ۲۰۸ ڈاؤن جودھپور سے ۲۲-۳۰ بجے کی بجائے ۲۲-۰۰ بجے چھوٹے گی اور کوچامان روڈ ۵-۱۵ بجے کی بجائے ۴-۱۰ بجے پہنچے گی (xviii) ۹۶ ڈاؤن مارواڑ جنکشن سے ۱۸-۳۵ بجے کی بجائے ۱۸-۳۰ بجے چھوٹے گی اور جودھپور ۲۳-۳۰ بجے کی بجائے ۲۳-۰۰ بجے اور بیکانیر ۷-۵۵ بجے کی بجائے ۷-۴۰ بجے پہنچے گی (xix) ۹۵-اَپ بیکانیر سے ۲۰-۱۵ بجے کی بجائے ۲۰-۱۰ بجے چھوٹے گی اور مارواڑ جنکشن ۱۰-۵۰ بجے کی بجائے ۱۰-۴۰ بجے پہنچے گی (xx) ۱۰۰ ڈاؤن حصار سے ۵-۱۵ بجے کی بجائے ۵-۰۵ بجے چھوٹے گی اور ریواڑی ۸-۲۰ بجے کی بجائے ۸-۱۰ بجے پہنچے گی ۔ یہ ریواڑی سے ۸-۴۰ بجے کی بجائے ۸-۲۷ بجے چلے گی اور دہلی ۱۰-۵۰ بجے کی بجائے ۱۰-۳۵ بجے پہنچے گی (xxi) ۲ جے ایم بی میڑتا روڈ سے ۱۶-۴۰ بجے کی بجائے ۱۲-۱۵ بجے چھوٹے گی اور بیکانیر ۲۲-۰۰ بجے کی بجائے ۱۷-۱۰ بجے پہنچے گی (xxii) ۲ بی آر ایس ریواڑی سے ۶-۵۵ بجے کی بجائے ۶-۰۵ بجے چھوٹے گی اور سرسہ ۱۳-۰۵ بجے کی بجائے ۱۲-۲۰ بجے پہنچے گی (xxiii) ۲۱۰ ڈاؤن جودھپور سے ۹-۰۰ بجے کی بجائے ۸-۴۸ بجے چھوٹے گی اور کوچامان روڈ ۱۶-۱۵ بجے کی بجائے ۱۵-۵۵

بجے پہنچے گی (xxiv) ا۔ بی ایس آر رتن گڑھ سے ۳۰۔۶ بجے کی بجائے ۱۰۔۶ بجے چھوٹے گی اور سردار شہر ۴۸۔۸ بجے کی بجائے ۱۵۔۸ بجے پہنچے گی (xxv) ۲۔ بی ایس آر سردار گڑھ سے ۵۰۔۹ بجے کی بجائے ۱۵۔۹ بجے چھوٹے گی اور رتن گڑھ ۰۰۔۱۲ بجے کی بجائے ۲۵۔۱۱ بجے پہنچے گی (xxvi) ۳ کے ایس شملہ میں ۱۰۔۱۲ بجے کی بجائے ۵۵۔۱۱ بجے پہنچے گی۔

۹۔ جن ٹرینوں میں ایرکنڈیشنڈ ہٹالی گئی

(۱) ۴۱۔ اَپ اور ۴۲ ڈاؤن مصوری ایکسپریس دہلی اور دہرہ دون کے درمیان (مورخہ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۶۵ء سے) اور ۹۳۔ اَپ/۹۴ ڈاؤن جودھپور میل دہلی اور جودھپور کے درمیان۔

تھرو سیکشنل ڈبے جاری کئے گئے

(۱) دو تھرڈ کلاس ڈبے روزانہ ٹرین نمبر ۵۱ اور ۵۲ کے ہمراہ لکھنؤ اور پٹھانکوٹ کے درمیان چلیں گے (ii) ایک فرسٹ اور تھرڈ کلاس ڈبہ ہفتہ میں دو بار ٹرین نمبر سی آر ۷/۴/ آئی ایم ایل اور ۱۳۲/۳/ سی آر ۸ کے ہمراہ بمبئی وی ٹی اور وارانسی کے درمیان چلے گا (از بمبئی وی ٹی اور وارانسی بروز منگل اور شکروار بالترتیب) اور (iii) ایک فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ کلاس ڈبہ روزانہ ۸۹/۱ بجے آر ڈی کے ہمراہ دہلی ڈیگانہ کے درمیان اور ایک تھرڈ کلاس ڈبہ روزانہ ۲ بجے آر ڈی/۹۰ کے ہمراہ چلے گا۔

مفصل تفصیلات ماہ اکتوبر ۱۹۶۵ء سے جاری ہونے والے ٹائم ٹیبل میں ملاحظہ فرمائیں جو ریلوے بکنگ ریزرویشن اینڈ انکوائری دفاتر اور اہم اسٹیشنوں کے بکسٹالوں سے مل سکتا ہے۔

چیف اوپرٹینگ سپرنٹنڈنٹ

R.O.—48

قندِ پارسی

پروفیسر عبدالرب عرفان۔ ایم، اے

ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ آف پرشین۔ ودربھا مہاودیالیہ امراوتی

۳ اگست ۶۵ء

مکرمی جناب خوشتر صاحب! اخلاص تحیات

لطائف نمبر میری پسندیدہ لطائف کے دور میں بہترین رفیق ثابت ہوا۔ ابھی اس کے مطالعے سے حاصل ہونے والی طمانیت کا احساس ختم ہونے نہ پایا تھا کہ اگست کا شمارہ اپنی تمام تر دلفریبیوں اور دیدہ زیبیوں کے ساتھ آن پہنچا۔ سچ عرض کرتا ہوں، مداخلت کا لطف آگیا۔ صورت میں اضافے کے تعلق سے عرض کرنے دیجئے کہ اب "بیسویں صدی" کا ہر شمارہ "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" کے مصداق ہوتا ہے اور یہی اس کی ہمہ گیر مقبولیت کا راز ہے ——— چند روز پہلے کرم نامہ بھی باصرہ نواز ہوا۔ غزل کی اشاعت کے لئے شکریہ! ——— جناب بیتاب کا ارشاد کے "سُرخ حاشیے" دیکھ کر کئی ادیبوں نے خوانِ ادب پر "نمک پاروں" اور "شکر پاروں" کا نہایت پُر تکلف اہتمام کیا۔ آج میں بھی "قندِ پارسی" نذر کرنا چاہتا ہوں۔ اب تک "بیسویں صدی" کے صفحات پر اُردو کے مشاہیر شعراء اور ادباء کے لطائف و ظرائف شائع ہوتے رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ شعرائے فارسی کے ان لطائف کو بھی ضرور پسند فرمائیں گے۔ میں نے فارسی اشعار کا ترجمہ (منظوم) بھی لکھ دیا ہے . . .

نیاز آگیں ——— عبدالرب عرفان

شاہجہاں کے دورِ حکومت میں چندر بھان برہمن ایک ممتاز و معروف شاعر گزرا ہے۔ اُس کی فطری صلاحیتوں کی بنا پر شاہزادہ دارا شکوہ نے اُسے اپنے ندیموں میں شامل کر لیا تھا۔ ایک روز شاہزادے نے شاہجہاں کے حضور برہمن کے فنِ شعر گوئی اور اُس کی فطری صلاحیتوں کی کچھ اِس انداز سے تعریف کی کہ بادشاہ نے کمالِ اشتیاق کے ساتھ اُسے طلب کیا اور کچھ سُنانے کی فرمائش کی۔ برہمن نے ایک غزل شروع کی اور داد و تحسین حاصل کرتا ہوا مقطع پر پہنچا ؎

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار ⠀⠀ بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

(آشنا کفر سے دل میرا ہوا کچھ اِس طرح
کعبہ ہو کر بھی جب آیا تو برہمن ہی رہا)

بادشاہ نے اِس شعر کو کعبہ اور اسلام کی اہانت پر محمول کیا اور برہمن کو قید کر لینے کا حکم صادر کر دیا۔ حُسنِ اتفاق سے اُس محفل میں افضل خاں شیرازی بھی موجود تھا۔ اُس نے فوراً کہا: "عالیجاہ! ؎

خرِ عیسیٰ اگر بہ مکہ رود ⠀⠀ چوں بیاید ہنوز خر باشد

(خرِ عیسیٰ کا ہو جو مکہ گزر ⠀⠀ واپس آنے پہ بھی رہے گا وہ خر)

اگر برہمن بھی کعبہ سے برہمن ہی لوٹا تو اس میں تعجب کی کیا بات ؟"

خاقانی شروانی نے ایک روز اپنے ممدوح شیروان شاہ کی خدمت میں یہ شعر لکھ بھیجا ؎

وشتی دہ کہ در برم گیرد ⠀⠀ یا وثاقی کہ در برش گیرم

(عطا کر پوستیں اِک جو مجھے آغوش میں لے لے
یا اِک امرد غلام آغوش میں اپنی جسے لے لوں)

شعر پڑھ کر بادشاہ نے کہا کہ اُس نے دونوں چیزیں کیوں نہ چاہیں؟ جب خاقانی کو اِس کی خبر ہوئی تو اُس نے ایک لکڑی پکڑی اور اُس کے پر توڑ کر اُسے بادشاہ کے پاس اِس پیغام کے ساتھ بھجوایا کہ اُس نے دراصل "یا وثاقی" (یعنی ایک امرد غلام کے ساتھ) لکھا تھا۔ یہ شرارت اِس لکڑی کی ہے جس نے "با" میں ایک نقطے کا اضافہ کر کے اُسے "یا" بنا دیا۔

فتح علی شاہ قاچار کے عہدِ حکومت میں مہدی بیگ قزوینی ایک خوش طبع، بذلہ سنج

شاعر تھا۔ ایک روز فتح علی شاہ نے از روئے قدر دانی ایک قیمتی خلعت عطا فرمائی۔ مہدی نے وہ خلعت شراب کی قیمت میں رہن رکھ دی۔ اس خبر کو سن کر بادشاہ بہت برافروختہ ہوا۔ عتاب شاہی کے خوف سے مہدی نے فی البدیہہ یہ کہہ کر یہ شعر پیش کر دیا ؎

خلعت شاہ بہ بادۂ دیرینہ گرو   کہ بود بادۂ دیرینہ بہ از خلعت نو
(میں نے خلعت کو پرانی بادہ کہنہ کے لیے رہن رکھ دیا   کہ ہوتا ہے نئی خلعت سے بہتر بادۂ کہنہ)

یہ سن کر بادشاہ ہنس پڑا اور اُسے ایک دوسری خلعت عطا کر دی۔

خاندان مغلیہ کے دور حکومت میں ہند و ایران کے معاشرتی تعلقات نہایت گہرے تھے۔ سلاطین ہند و ایران میں مراسلات کے توسط سے علمی و ادبی مسائل پر تبادلۂ خیالات کا ایک سلسلہ قائم تھا۔ ایک مرتبہ فرمانروائے ایران شاہ عباس صفوی نے اکبر کی خدمت میں یہ فخریہ رباعی ارسال کی ؎

زنگی بہ سپاہ و خیل و لشکر نازد   رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد
اکبر بہ خزینۂ پر از زر نازد   عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد
(زنگی کو سپاہ و خیل و لشکر پہ ہے ناز   رومی کو سنان و تیغ و خنجر پہ ہے ناز
اکبر کو خزینۂ پر از زر پہ ہے ناز   عباس کو ذوالفقار حیدر پہ ہے ناز)

یہ فخریہ رباعی سن کر اکبر کو مناسب جواب کی فکر ہوئی۔ شعرائے دربار سے اس نے اس رباعی کا جواب چاہا۔ ملک الشعراء فیضی نے فی البدیہہ عرض کیا ؎

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد   دریا بہ گہر، فلک بہ اختر نازد
عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد   کونین بذات پاک اکبر نازد
(فردوس کو سلسبیل و کوثر پہ ہے ناز   دریا کو گہر، فلک کو اختر پہ ہے ناز
عباس کو ذوالفقار حیدر پہ ہے ناز   کونین کو ذات پاک اکبر پہ ہے ناز)

اس جواب سے اکبر بہت خوش ہوا اور فوراً یہ رباعی شاہ عباس کی خدمت میں بھیج دی۔

فارسی زبان کے شاعر تہیہ خانی کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی بے شمار داستانیں تذکروں میں ملتی ہیں۔ ایک ... احباب نے خانی سے ایک غزل سنانے کی فرمائش کی ... غزل ... کا مطلع تھا ؎

... بہ کہ پیدائی شود راز دو ... م توئی
... دو رست کوئی نظر آئے سمجھتا ہوں تو ...

... سے تحسین و آفرین بلند کیا۔ ... ایک شخص نے ...

لیجیے میں جامی سے پوچھا: "ورخرے پیدا شود؟" (یعنی اگر کوئی گدھا نظر آجاتا ہے؟) جامی نے برجستہ کہا: "باز پندارم توئی" (یعنی تب بھی میں یہ سمجھوں گا کہ تو ہے!)

اس برجستہ جواب کو سن کر حاضرین نے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کیا

مشہور شاعر شہاب الدین غزنوی کی خدمت میں کسی نے گلاب اور نرگس کا ایک گلدستہ پیش کیا۔ کچھ لوگ اس وقت موجود تھے۔ انھوں نے اس خصوص میں کچھ کہنے کی فرمائش کی۔ شہاب الدین نے فی البدیہہ کہا ؎

شاخے چند نرگس رعنا — گلے چند تازہ و چیدہ
آں ہمہ دیدہ ہا بستہ چہرہ — ایں ہمہ چہرہ ہا بستہ دیدہ
(نرگس خوشنما کی کچھ شاخیں — چند گلہائے تازہ و چیدہ
جب وہ آنکھیں ہیں چہرے کی — اور یہ چہرہ ہا بستہ دیدہ)

وقتی شیرازی مرض الموت میں مبتلا تھا۔ فیضی اس کی عیادت کے لیے گیا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وقتی کے ہوش و حواس قائم ہیں یا نہیں، فیضی نے اس سے پوچھا: "ما کیانیم؟" (ہم کون ہیں؟) ماکیان فارسی میں مرغی کو بھی کہتے ہیں۔ اس فقرے کا دوسرا مفہوم یہ تھا کہ (ہم مرغی ہیں) وقتی نے اسی وقت مسکرا کر کہا:

"طائر مرغ روحم شوق پرواز دارد، زود ماکیان می آرد"

(اب میری روح کا مرغ پرواز کا شوق رکھتا ہے، مرغی کی طرف رخ نہیں کرتا)

ملا شیدا عہد جہانگیر کے اواخر اور دور شاہجہاں کے ابتدائی ایام میں ایک مشہور شاعر گزرا ہے۔ اس کے معاصرین میں ناظری ایک نابینا شاعر بھی تھا۔ کسی جلسے میں ناظری نے اپنی غزل سنائی تھی جس کا مقطع ہے ؎

خواہ ناظری و خواہ بیگانہ نشیں — من نہیں ہم ترا با آشنا بیگانہ کردم
ناظری کے ساتھ مجھے آشنا و بیگانے کے ساتھ — جب سے تیری شرم کو تیرا نگہبان کر دیا

شیدا نے یہ سن کر برجستہ کہا: "یہ مثل ہندی مشہور است ——— زن نابینا را خدا نگہبان است!" (یعنی اندھے کی جورو کا اللہ بیلی)


جاذب نظر
حُسن
افغان کریم کیک
مکمل میک اپ ہے۔ کیونکہ آپ کی شباہت میں
فوراً دلکشی پیدا کرنے کے لئے کریم اور پاوڈر
کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ نہایت خوبصورت
ڈبیہ میں بند۔ یہ ایک جما ہوا پاوڈر
ہے جو ہر عورت کے لئے اشد
ضروری ہے۔ خصوصاً ملازمت
پیشہ خواتین کے لئے یہ آسانی
سے پرس میں رکھا جا سکتا
ہے اور آسانی سے
لگایا جا سکتا ہے۔
AFGHAN
Cream Cake
افغان سنو
بیوٹی ایڈز
ای۔ ایس پاٹن والا بمبئی



زندگی بخش معلومات، مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱۔ آملہ ۔۔۔ وٹامن سی کا خزانہ

آیوروید اور ہندوستانی طب کے پُرانے شاستروں میں آملہ کو دواؤں کا سرتاج کہا گیا ہے اور اس کے بے شمار مفید اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ویدک طریقۂ علاج میں آملہ کثرت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ طب یونانی بھی آملہ کی حیرت انگیز تاثیرات کی قائل ہے۔ آملہ ایک ایسا سستا اور آسانی سے دستیاب ہو جانے والا مفید پھل ہے جو ہندو پاک میں کثرت سے پیدا ہوتا ہے اور جو اپنے غذائی اور دوائی فائدوں کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔

تخمی آملہ کے مقابلہ میں قلمی آملہ جو وزن اور حجم کے اعتبار سے نسبتاً زیادہ بڑا اور ذائقہ میں کم ترش ہوتا ہے، عموماً استعمال کیا جاتا ہے۔ اچار، چٹنی، مربے اور مختلف دواؤں میں یہی کام میں لایا جاتا ہے۔ اس میں گودا زیادہ اور گٹھلی نسبتاً چھوٹی ہوتی ہے۔

طبی اعتبار سے آملہ کا مزاج سرد خشک ہے۔ آملہ جتنا مفید ہے اتنا ہی عام اور ارزاں بھی ہے۔ آیورویدک میں آملہ کو مقوی ادویہ میں بکثرت استعمال کیا جاتا ہے اور جدید تحقیقات کی رُو سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ تمام دوسری سبزیوں اور پھلوں کے مقابلہ میں آملہ ہی ایک ایسا پھل ہے جس میں وٹامن سی کی مقدار سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ جسم میں وٹامن سی کی کمی سے جو کمزوری اور دوسری خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں وہ تنہا آملہ کے استعمال سے دُور ہو جاتی ہیں۔ ویدک طریقۂ علاج شاید ہزاروں سال پہلے بھی اس راز سے واقف تھا۔ اسی لئے ہمارے گھروں میں عام طور پر آملہ کا استعمال اچار چٹنی اور مربّہ کی شکل میں کثرت سے ہوتا آیا ہے۔ لیکن آج جدید تہذیب نے ہمارے غذائی معیار کو جہاں اور کئی پہلوؤں سے نقصان پہنچایا ہے، وہاں آملہ کی افادیت اور اہمیت کو بھی بہت کچھ کم کر دیا ہے۔

آملہ بہت زود ہضم اور دل و دماغ کو فرحت بخشنے والا پھل ہے۔ یہ دل کی دھڑکن، اختلاج قلب اور دل کی بے چینی کو دُور کرتا ہے۔ قوتِ دماغی کی کمی، بینائی اور جگر کی کمزوری میں آملہ کا استعمال نہایت مفید ہے۔

چیون پراش نامی آیورویدک کی مشہور دوا ہے۔ اس کا جزو اعظم آملہ ہی ہے۔ اسے چیون رشی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ چیون پراش یعنی چیون رشی کی خوراک۔ کہتے ہیں اسے چیون رشی مہاراج طاقت اور جوانی برقرار رکھنے کے لئے استعمال کیا کرتے تھے۔ آملہ کا یہ مرکب آیورویدک طریقۂ علاج میں صحت و طاقت کے لئے سیکڑوں سال سے استعمال کیا جاتا ہے اور بہت مشہور ہے۔

تریپھلا بھی آیورویدک کا بہت مشہور مرکب ہے۔ یہ بہت سی بیماریوں میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ تریپھلا کا جزو اعظم بھی آملہ ہی ہے۔ اس میں ہیڑ، بہیڑہ اور آملہ شامل ہوتے ہیں۔ یہ ویدک کی نہایت مفید اور زود اثر دوا ہے۔

پیٹ کی مختلف خرابیوں میں اس کا استعمال حیرت انگیز فوائد کا حامل ہے۔ ضعف ہضم، ضعف جگر، ضعف معدہ، نفخ، احتباس ریاح اور بھوک نہ لگنے کی شکایتوں میں تریپھلہ رات کو پانی میں بھگو کر رکھ دیں اور صبح اس کا نتھارا ہوا پانی چار پانچ گھونٹ پئیں۔ اس کے مسلسل استعمال سے کچھ ہی دنوں میں یہ تمام شکایتیں جاتی رہیں گی۔ تریپھلہ کے پانی سے آنکھوں کو دھونا نہ صرف بینائی کو تیز کرتا ہے بلکہ آنکھوں کو بہت سی بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ خشک آملہ کو مٹی کے برتن میں رات بھر پانی میں بھگو کر صبح مل کر اس کے پانی سے آنکھوں اور بالوں کو دھونا بہت مفید ہے۔ بالوں کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ بال لمبے ہوتے ہیں اور دماغ کو تقویت ملتی ہے۔

سبز آملہ خون کی حدت اور یرقان کے مریضوں کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔ اس کی سبزی بنا کر یرقان اور حدتِ خون کے مریضوں کو کھلائی جائے تو بہت جلد فائدہ ہو جاتا ہے۔

آملہ پائیوریا، مسوڑھوں کے ورم اور ان کے سڑ جانے کی خاص دوا ہے۔ ڈاکٹر اس بات پر متفق ہیں کہ پائیوریا کا سب سے آسان اور موثر علاج آملہ ہے۔ سبز آملہ کو پانی میں اُبال کر اس کے غرارے کرنا اور چبا کر اس کا رس چوسنا منہ اور دانتوں کی بہت سی بیماریوں کے لئے اکسیر ہے۔ اس سے مسوڑھوں کے زخم بھر کر دانت مضبوط ہوتے ہیں اور منہ سے جو بدبو آنے لگتی ہے وہ رفع ہو جاتی ہے۔

آملہ دل و دماغ، معدہ اور اعضائے رئیسہ کو تقویت بخشنے والا ایک اعلیٰ درجہ کا پھل ہے۔ ماں بننے والی خواتین کے لئے آملہ کا مربّہ بہترین غذا ہے۔ اس سے دورانِ حمل میں نہ صرف خواتین کی صحت ہی اچھی رہتی ہے بلکہ بچّہ بھی تندرست، صحت مند اور خوبصورت پیدا ہوتا ہے۔

آملہ کا مربّہ تنہا یا چاندی کے ورق کے ساتھ علی الصبح نہار منہ کھانا تقویت قلب کے لئے بے نظیر ہے۔ اس سے دل و دماغ کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ گرمی، اختلاجِ قلب یا دل دھڑکنے کی شکایت ہو تو اس کے استعمال سے جلد ہی جاتی رہتی ہے۔ یہ معدے اور جگر کی کمزوری میں بہت مفید ہے۔ بینائی اور دماغی طاقت میں اضافہ کرتا ہے۔

کچے آملے کو نمک لگا کر صبح شام کھانے سے جسم میں وٹامن سی سے پیدا ہونے والی شکایتیں دُور ہو جاتی ہیں۔ جوارش آملہ پیچش اور اسہال کی موثر دوا ہے۔ اگر آنتیں اتنی کمزور ہو گئی ہوں کہ بار بار دست آنے کی شکایت لاحق ہو جاتی ہو تو صبح و شام جوارش آملہ ۶ ماشہ پانی کے ساتھ استعمال کریں۔ دست اور آنتوں کی کمزوری دور ہو جائے گی۔

یرقان کے مریض کو سبز آملہ کی ترکاری مسلسل کھلانی چاہئے۔ صحت کی حالت میں بھی پودینہ اور سبز دھنیا ملا کر بنائی ہوئی آملہ کی چٹنی استعمال کریں تو اس سے غذا کے ہضم ہونے میں مدد ملے گی۔ نفخ اور ریاح وغیرہ کی شکایات بھی پیدا نہ ہوں گی اور بھوک بھی خوب کھل کر لگے گی۔

اگر آپ کسی نہ کسی شکل میں آملہ استعمال کرتے رہیں تو یقین رکھئے یہ آپ کی صحت کا بہترین محافظ ہے۔

۲ـــــ نیند ـــــ صحت کی ضامن

انسان کی صحت کے لئے صحت بخش نیند بے حد ضروری ہے۔ گہری نیند سے بیدار ہونے پر احساس ہوتا ہے کہ جسم قوت سے لبریز ہو گیا ہے۔ جسمانی محنت ہو یا دماغی، اس کے بعد آرام و سکون ضروری ہے اور مکمل آرام و سکون نیند ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ نیند سے صرف اعضاء ہی کو سکون اور راحت نہیں ملتی، مکمل دماغی سکون بھی حاصل ہو جاتا ہے اور کام کرنے کے بعد جسم میں جو گرمی اور خشکی پیدا ہو جاتی ہے، نیند سے اس کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گہری نیند کے بعد جب آدمی بیدار ہوتا ہے تو اپنے جسم میں ایک ٹھنڈک کی محسوس کرتا ہے جس سے اسے کیف و سرور حاصل ہوتا ہے اور جسم ہلکا و چونچال ہو جاتا ہے۔

سونے کو دن میں بھی سویا جا سکتا ہے لیکن دراصل سونے کا وقت رات ہی ہے۔ رات ہی کی نیند سے صحت قائم رہتی ہے۔ اس لئے رات بلا وجہ جاگ کر ضائع نہ کرنی چاہئے۔ بعض لوگ رات کو بہت دیر تک جاگنے اور صبح دیر سے بیدار ہونے کی عادت بنا لیتے ہیں۔ یہ عادت بہت نقصان دہ ہے۔ صحت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ جن لوگوں کو رات میں بھی کام کرنا پڑتا ہے، انھیں تو مجبوری ہے کہ رات کو کم سوئیں یا بالکل نہ سوئیں اور اس کے بدلے دن میں اپنی نیند پوری کریں لیکن جو لوگ رات میں کام کرنے کے لئے مجبور نہیں ہیں انھیں نیند جیسی بے بہا نعمت سے اپنے آپ کو محروم نہ کرنا چاہئے۔

دس سال سے زیادہ عمر کے بچّوں کو جبکہ وہ محنت و مشقت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں، سنِ نمو تک یعنی تقریباً ۲۵ سال کی عمر تک سات گھنٹے سے زیادہ نہ سونا چاہئے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دیر تک سونے کے بعد بھی نیند پوری نہیں ہوتی، جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ گہری نیند نہیں آتی۔ ہلکی اور اُچٹتی ہوئی نیند ہوتی ہے۔ گہری نیند لانے کی تدبیر یہ ہے کہ رات کو سونے سے دو گھنٹے پہلے رات کا کھانا کھا لیا جائے تاکہ سونے کے وقت تک کھانا ہضم ہو کر معدہ ہلکا ہو جائے۔ رات کو ہلکی اور زود ہضم غذا کھانی چاہئے۔ زیادہ تیز اور گرم غذائیں نہ کھائیں۔ کھانا بھوک سے کم ہی کھائیں۔ دماغی یا جسمانی محنت سے سونے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی فارغ ہو جائیں۔ کچھ لوگوں کو سونے سے پہلے مطالعہ کی عادت ہوتی ہے لیکن سونے سے پہلے کسی ایسی کتاب کا مطالعہ نہ کرنا چاہئے جس کی وجہ سے دماغ پر زور پڑے۔ اس طرح نیند اُچاٹ ہو جاتی ہے۔ سونے سے پہلے سارے تفکرات کو ذہن سے نکال دینا چاہئے۔ سونے وقت سردیوں میں نیم گرم پانی سے اور گرمیوں میں ٹھنڈے پانی سے چہرہ اور ہاتھ پاؤں دھولیں۔ اس طرح جلد اور گہری نیند آئے گی۔

۳ـــــ خود اعتمادی ـــــ ایک عظیم طاقت

ایک مغربی مفکر نے لکھا ہے ـــــ "جو لوگ قدم قدم پر دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور خود پر اعتماد نہیں رکھتے، اُن کی اُمیدیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ ایسے لوگوں کے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے۔"

خود اعتمادی ہی انسان کو مشکلات اور نامساعد حالات کا کامیابی سے مقابلہ کا حوصلہ عطا کرتی ہے، اُسے کامیابی و کامرانی سے روشناس کراتی ہے۔ جب انسان خود اعتمادی کھو بیٹھتا ہے تو احساسِ کمتری اور دوسری نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو کر ناکامیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

ایک مفکر نے لکھا ہے ـــــ "وہ انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، جس کے ذہن پر مایوسی اور ناکامی کا جذبہ مسلط ہے، جو خود کو حقیر اور نااہل سمجھ کر کسی ذمہ داری کا

بوجھ اُٹھانے سے ڈرتا ہو۔

دُنیا کے کامیاب انسانوں نے خود اعتمادی ہی کی طاقت سے کامیابی کے پرچم لہرائے۔

جس طرح خود اعتمادی انسان کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے اسی طرح خود اعتمادی کا فقدان انسان کی ناکامی کا موجب ہوتا ہے۔ اپنی اہلیت پر شک، اپنے اوپر اعتماد نہ ہونا یہی چیزیں انسان کو ناکام بناتی ہیں۔ جب بھی آپ کو اپنی صلاحیت، قوت یا کارکردگی پر شک ہوگا، آپ کامیابی کی راہ سے بھٹک جائیں گے۔ ناکامی کا احساس خود اعتمادی کے لئے سم قاتل ہے اور کبھی کسی کام میں نمایاں کامیابی حاصل ہونے نہیں دیتا۔ جب تک پست ہمتی اور شکوک آپ کو گھیرے رہیں گے، آپ کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اپنا رُخ ایک دم بدل دیجئے۔ حوصلہ شکنی اور ناکامی کے خیالات کی لہروں کو کاٹ کر رکھ دیجئے۔ پختہ ارادے اور مضبوط دل کے ساتھ منزل مقصود کی طرف بڑھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ حالات آپ کے موافق ہونے لگے ہیں۔ اپنے اوپر بھروسہ کیجئے پھر دیکھئے حالات کس طرح بدل جاتے ہیں۔

خود پر اعتماد نہ ہونے سے کارکردگی کی اہلیت کم ہو جاتی ہے اور قابلیت و صلاحیت پر اوس پڑ جاتی ہے۔ اہلیت غارت ہو جاتی ہے۔

آپ کتنے ہی پریشان حال کیوں نہ ہوں، تنگدست کیوں نہ ہوں۔ کبھی مصیبت کو اپنے اوپر مسلط نہ ہونے دیں۔ ہمیشہ اپنے ماحول پر چھائے رہیں، اپنی ذات پر یقین رکھیں۔ آپ اپنے اندر یہ احساس پختہ کر لیں کہ آپ اپنے گرد و پیش پر غالب ہیں۔ مصمم ارادہ کر لیں کہ آپ حالات پر قابض رہیں گے۔ ان کے غلام نہیں بنیں گے ——— خیالات میں قوت ہوتی ہے۔ اگر آپ کو یقین واثق ہے کہ آپ کامیاب ہوں گے تو آپ کا یہ یقین ناسازگار حالات اور بے مہر ماحول کو آپ کے موافق بنا دے گا۔

۴ ——— پچاس سال کے بعد بھی

پچاس سال کی عمر کو پہنچتے ہی لوگوں کے شانے جھک جاتے ہیں۔ کمریں جھکتی ہیں تو سر بھی جھکا کر چلنے لگتے ہیں۔ جسم جھکنے کے ساتھ ہی خیالات اور حوصلے بھی پست ہو جاتے ہیں۔

لیکن آپ اپنے اوپر خود سے بڑھاپا طاری نہ کریں تو پچاس سال کی عمر کو پہنچ کر بھی آپ بوڑھے نہیں ہو سکتے۔ عمر کو طویل کرنے کا راز یہ ہے کہ اسے مختصر ہونے سے بچایا جائے۔ زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں بھول جانا ہی اچھا ہوتا ہے۔ ان باتوں میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنی زندگی کے گزرے ہوئے سالوں کو بھول جائیے۔ عمر کے گزرے ہوئے سالوں کو ہرگز نہ گنئے ——— ایسا کرنے سے آپ پچاس سال کی عمر کو پہنچ کر بھی اپنے کو پچاس سال سے کم ہی کا سمجھیں گے۔ اگر آپ کے بال کہیں کہیں سفید ہونے لگے ہوں تو کسی نوجوان کے سر میں کہیں کہیں سفید ہونے والے بالوں کو دیکھ لیجئے۔

اپنے دل کو یہ سوچ کر خوش رکھئے کہ آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ کی یہ خوشی آپ کے لئے تندرستی کا باعث ہوگی۔ خوشی اور سکون کا احساس پیدا کریں گے تو آپ کا ذہن بھی جواب میں خوشی ظاہر کرے گا۔ اگر آپ خوشی ظاہر کرنے کی کوشش کریں تو یہ آپ کو جوان بنائے رکھنے میں مدد دے گی۔

پچاس سال کی عمر میں جوان رہنے کے لئے اچھے خیالات رکھنے کے ساتھ ساتھ عمل بھی کیجئے۔ خون میں دوران پیدا کیجئے۔ طاقت کے مطابق ورزش کیجئے۔ یاد رکھئے اس عمر کا آرام جسم کو زنگ خوردہ بنا دیتا ہے۔

ایسے لوگوں سے تعلقات پیدا کیجئے جو خوش رہتے ہوں، جو آپ کو بھی خوش رکھیں۔ ایسے لوگوں کے سائے سے بھی دُور رہئے جو نہ خود خوش رہتے ہوں نہ آپ کو خوش رکھیں۔ جو نہ دلچسپ ہوں، نہ مہذب، نہ مسرور!

ان مشوروں پر عمل کر کے دیکھئے۔ بڑھاپا آپ کے قریب آتے آتے آپ سے بہت دُور چلا جائے گا۔

۵ ——— سفید شکر مضر ہے

شکر ہمارے جسمانی نظام کے لئے ایک ضروری چیز ہے۔ اس سے جسمانی نظام میں سکت اور قوتِ برداشت پیدا ہوتی ہے۔ شکر گوشت، خون اور طاقت بڑھاتی ہے۔ گھی کے ساتھ اس کا استعمال بدن کو مضبوط اور توانا کرتا ہے ——— لیکن اسے اعتدال کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے۔ اس کا زیادہ استعمال مفید ہونے کی بجائے مضر ہے۔ پھوڑا، پھنسی، ذیابیطس اور پیشاب کے ساتھ شکر خارج ہونے کے امراض لاحق ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

گنا، راب، شہد، دیسی گڑ اور شیریں پھلوں سے شکر کی ضرورت پوری کرنی چاہئے۔ ولایتی سفید شکر مضر ہے۔ ڈاکٹر اسے سفید زہر کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹروں کی اس رائے میں مبالغہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ سفید شکر مضر ہے۔ اس میں برائے نام فولاد اور تانبہ پایا جاتا ہے۔ فاسفورس ہوتا ہے نہ کیلشیم اور نہ وٹامنز۔ یہ سب اہم غذائی اجزاء اس کی صفائی کے دوران اس میں سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ دیکھنے میں یہ سفید اور دانہ دار بلوری شکر بن جاتی ہے اور کھانے میں خوش ذائقہ ہوتی ہے لیکن غذائی اعتبار سے یہ نہایت ناقص چیز ہے۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ اس کے ہضم کرنے کے لئے وٹامن بی کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ یا تو آپ اس شکر کے ساتھ وٹامن بی کا استعمال بھی کریں ورنہ آپ کے جسم میں جتنا وٹامن بی موجود ہے، یہ شکر اسے ضائع کرنے لگے گی۔ یہی سبب ہے کہ جو لوگ شکر اور اس سے بنی ہوئی مٹھائیاں زیادہ کھاتے ہیں، وٹامن بی کی کمی کا شکار رہتے ہیں ——— وٹامن بی نروس سسٹم اور دل و دماغ کے لئے بہت ضروری ہے۔ اگر یہ غذا میں نہ ہو تو پٹھوں کی پرورش اور نشو و نما میں نقص پڑ جاتا ہے۔ کھانڈ کو سفید کرنے کے دوران میں تیز حرارت سے وٹامن بی بالکل ضائع ہو جاتے ہیں۔

وٹامن بی بیجوں اور غلوں میں، گیہوں، مکئی اور دالوں کے چھلکوں میں بہت ہوتی ہے۔ انڈے کی زردی وٹامن بی کا خزانہ ہے۔ ساگ، سبزیوں، دودھ، دہی، چھاچھ اور پنیر میں بھی کافی مقدار میں ہوتی ہے۔

۶ ــــ زندگی زندہ دلی کا نام ہے

کسی نے کہا ہے ؎

مجھ پہ فرض ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگی تو عبارت ہے تیرے جینے سے

ڈاکٹر شام فورٹ نے لکھا ہے ــــ "آپ کی زندگی کے جتنے دن بیکار گزرے ہیں، ان میں سے زیادہ بری طرح برباد ہونے والا اُسے سمجھئے جس میں آپ پورے دن ایک بار بھی نہ ہنسے ہوں۔" مشہور فرانسیسی ادیب روکتے نے لکھا ہے ــــ "زمین کی سب سے زیادہ دل خوش کُن آوازوں میں سے ایک آواز لڑکیوں کے قہقہے کی ہوتی ہے۔"

ایک امریکی ڈاکٹر نے لکھا ہے ــــ "اگر تم اپنی زندگی کو طویل بنانا چاہتے ہو تو زیادہ سے زیادہ ہنسو۔"

ڈاکٹر جیمس جے والش کا بیان ہے ــــ "تھوڑا بہت بھی انسان ہنستے ہیں لیکن زیادہ ہنسنے والے کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور ساتھ ہی ہنسی خطرات، دہشت اور تشویش رفع کرتی ہے۔ خوب ہنس لینے کے بعد ذہنی الجھنوں میں بے حد کمی ہو جاتی ہے۔"

ڈاکٹر ریمی ہیٹس جو ایک ممتاز ادیب بھی تھے، وہ ہنسی کے ایک عظیم دوا ہونے پر کامل یقین رکھتے تھے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے ــــ "موجودہ نسل کا معدہ خراب ہے اس کی اصلاح اور ازالے کے لئے خوب ہنسنا چاہئے۔" وہ ضعفِ معدہ کے لئے یہی تجویز کیا کرتے تھے۔

کچھ عرصہ پہلے نیویارک یونیورسٹی میں ایک دلچسپ تجربہ کیا گیا تھا طلبا کے دو گروپ بناکر انھیں ایک ہی طرح کی غذا دی جاتی رہی۔ روزانہ کھانے کے بعد ایک گروپ کو ایک پروفیسر کی نگرانی میں سائنسی بحث و مباحثہ میں منہمک رکھا جاتا اور دوسرے گروپ کو مذاق و تفریح میں مصروف رکھا جاتا۔ دو ہفتوں کے بعد دیکھا گیا کہ مذاق و تفریح میں مصروف رہنے والے طلبا اپنے دوسرے ساتھیوں کے برعکس زیادہ صحت مند ہو گئے تھے۔

نطشے نے تو انسانیت کی ترقی کے لئے ہنسی اور خوش دلی کو شرطِ اوّل قرار دیا تھا۔

ایک بڑے ڈاکٹر کی رائے ہے ــــ "اگر اچھے طریقے سے ہنسنے کی عادت اور بہ کثرت قہقہے دُنیا میں موجود ہوتے تو جتنے ہسپتال اور ڈاکٹروں اور نرسوں کی فوجیں آج کل کام کر رہی ہیں ان میں سے اکثر کی ضرورت نہ رہتی اور سچ تو یہ ہے کہ یہ جنگ ــــ اور خونریزی بھی قدیم زمانے کی ایک کہانی بن جاتی۔"

۷ ــــ ہنسنے کی طرح رونا بھی مفید ہے

دل کھول کر ہنسنا اور قہقہے لگانا صحت کے لئے بے حد مفید ہے، یہ سبھی جانتے ہیں لیکن ہنسی کی طرح رونا بھی صحت کے لئے خاص اہمیت و افادیت رکھتا ہے یہ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔

ایک ماہرِ نفسیات ڈاکٹر ماڈسلے نے لکھا ہے ــــ "وہ غم جو آنسوؤں کے ذریعہ نکالا نہ کیا جائے، دوسرے اعضاء کو رُلا سکتا ہے۔"

ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں ــــ پیش آمدہ حالات سے مقابلہ کی طاقت کھو دینے پر جو اندرونی ہیجان پیدا ہوتا ہے، آنسو اُسے بخوبی سرد کر دیتے ہیں۔ رونا ایک ایسا غیر ارادی عمل ہے جس کے ذریعہ جذباتی دباؤ کی زیادتی خود بخود کم ہو جاتی ہے اور ہم عام قلبی حالت پر آجاتے ہیں۔ دبے ہوئے جذباتی ہیجان کو ختم کرنے کے لئے کھُل کر رو لینا بہت سُود مند ہے۔ بلا جھجک بے اختیار رونا جذباتی اعتبار سے انتہائی فرحت بخش اور مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس سے اندرونی کشمکش مٹ جاتی ہے اور جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ رونے سے اندرونی غُبار، آزردگی، مایوسی، دل شکنی اور کوفت مٹ جاتی ہے اور انسان ذہنی طور پر تازگی محسوس کرنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر ایرتی کا بیان ہے۔ جو لوگ شدید غم اور صدمے سے دوچار ہونے پر بھی نہیں روتے، اکثر متعدد عوارض کے شاکی رہتے ہیں۔

یورپ کے دوسرے ماہرینِ امراض النفس بھی یہی کہتے ہیں کہ آنسو بہانا اور رونا ایک تسکین بخش فعل ہے۔ جس سے وقتاً فوقتاً استفادہ کرنا چاہئے۔

سرگوشیاں

سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائیگا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

شوکت نظمی، بھونرا کوئیری

س۔ کسی نے عورت کو پھول، کسی نے شراب اور کسی نے پہیلی بتایا۔ لیکن صحیح معنوں میں عورت کیا ہے؟

ج۔ ماں، بہن، بیٹی، بیوی اور کی سب سے بڑی طاقت!!

س۔ تنہائی انسان کو کیا بنا دیتی ہے؟

ج۔ کسی کو سوگوار، کسی کو مسرت بکنار۔

ایم۔ نعیم نوشاد۔ کراچی

س۔ بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کیسے کی جا سکتی ہے؟

ج۔ خود اچھا بن کر۔ دوسروں کو اچھا بنا کر۔

س۔ انسان کا ضمیر مُردہ کیوں ہو جاتا ہے؟

ج۔ ضمیر کی آواز دبا کر انسان مسلسل گناہ کرتا رہتا ہے تو ضمیر مُردہ ہو جاتا ہے۔

عبدالسلام۔ بی، ای، ایل۔ بس پور

س۔ کیا ہر آدمی انسان کہلانے کا مستحق ہے؟

ج۔ جی نہیں۔ ہر انسان آدمی ہوتا ہے لیکن ہر آدمی انسان نہیں ہوتا۔

س۔ وہ کونسی خوبیاں ہیں جو انسانیت کو ہمیشہ زندہ رکھتی ہیں؟

ج۔ انسانیت پرستی، انسانیت نوازی!

عبدالرّحیم دامودی۔ بھٹکل

س۔ دولت مند لوگ کس فکر میں رہتے ہیں؟

ج۔ خانوسے کی فکر میں! دولت میں کیسے اضافہ ہو!!

س۔ عورت کیا ہے؟

ج۔ ہیلن نے کہا ہے ——— عورت زندگی کی کٹھن منزل کے لئے رہبر کامل ہے۔ ہوبنج نے کہا ہے ——— عورت عقل کی طرح گہری اور انصاف کی طرح عزیز ہے!

اے، رشید۔ شری پور۔ بردوان

س۔ کیا قابل شخص گناہ نہیں کرتا؟

ج۔ قابل لوگ تو اور بھی گناہ کرتے ہیں۔

س۔ محبت کا برعکس کیا ہوتا ہے؟

ج۔ نفرت، عداوت، بغض و شقاوت!

س۔ آزادی کا کیا مطلب ہے؟

ج۔ اخلاق اور قانون کے سارے ضابطوں سے آزاد ہو کر کھل کھیلنا!

مِس شاکرہ حسین، کلکتہ

س۔ زندگی کی اُلجھنوں سے چھٹکارا پانے کے لئے موت کی خواہش کرنا؟

ج۔ بزدلی ہے۔

س۔ بھائی جان! کیا ایسے لوگوں کو کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوتی ہے جو لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں؟

ج۔ جی نہیں، کامیابی انہیں کو ملتی ہے جو کامیابی کے لئے نئی نئی راہیں تلاش کرتے ہیں۔

ایم۔ کمال جاجوی۔ جاجا

س۔ دوستی کس چیز پر مبنی ہے؟

ج۔ کبھی محبت پر مبنی ہوتی تھی۔ اب دولت پر مبنی ہے۔۔

س۔ یہ دُنیا والے اتنے خود غرض کیوں ہوتے ہیں؟

ج۔ اِس دُنیا کی ریت یہی ہے۔

سید خورشید علی۔ امراوتی کیمپ

س۔ ارتقاء کا آخری زینہ؟

ج۔ آج کے انسان کے بلند عزائم کہہ رہے ہیں کہ۔
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں!

س۔ آپ کو صبح پسند ہے یا شام؟

ج۔ اپنے دامن میں اُبھرتا ہوا آفتاب لئے صبح!

س۔ آپ کی تعلیم؟

ج۔ قابلِ ترمیم ہے۔

فردوس جہاں۔ برہنی پور

س۔ بھیا! کیا لطف زندگی کا جب دل ہی بجھ گیا ہو؟

ج۔ بانو! سہ

ہے بڑی چیز انبساط مگر
غم نہ ہو تو حیات کچھ بھی نہیں

س۔ کمتری کے جان لیوا احساس سے کس طرح چھٹکارا پایا جا سکتا ہے بھیا!

ج۔ احساسِ کمتری کو دُور کرنے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنے ــــــ سوسے بُرا تو ایک سے بہتر بنا دیا!

س۔ خوشتر بھیا! میری زندگی اک بارِ گراں سے کم نہیں۔ آپ ہی بتائیے کیا کروں؟

ج۔ کیا غالب کے اس خیال سے آپ کو روشنی نہیں ملتی سہ

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

بانو! حالات سے شکست ہے توہینِ زندگی!

مظفر بیدلوی۔ لاتور

س۔ آرزو...؟

ج۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے ــــــ ترکِ آرزو ہی تونگری ہے۔

س۔ بھگوان، پرمیشور، رام، خدا... آپ ان سب میں کس کو مانتے ہیں؟

ج۔ ہم سب کو مانتے ہیں۔ ایک ہی عظیم و برتر ہستی کے یہ سارے نام ہیں۔

س۔ آپ سوالات کے جوابات مسلسل دار دیتے ہیں یا جس ماہ میں ہم بھیجیں اسی ماہ کے پرچے میں دیتے ہیں؟

ج۔ اتنے زیادہ سوالات آتے ہیں کہ مسلسل وار جواب دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

قمرالدین راٹوری۔ امین

س۔ کامیابی کا راز؟

ج۔ عزم، فکر، جہدِ پیہم۔

س۔ کوئی راٹوری کا کوئی مشہور شعر سنائیے۔

ج۔ ہوتے سندر نہ ہوتے کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر

جعفر شیخ فرید دامودی۔ بھٹکل

س۔ آج کل کے نوجوانوں کی بد خلاقی کے ذمّہ دار ان کے ماں باپ ہیں یا...؟

ج۔ آج کل کے نوجوانوں کی بداخلاقی کے ذمّہ دار بُرے دوست، بُری صحبت اور خود بے راہرو نوجوان ہیں۔

س۔ خوشتر بھائی! کیا آپ کی نظر سے کوئی ایسا انسان گزرا ہے جس نے سینما بینی سے اپنی زندگی کو کامیاب بنایا ہو؟

ج۔ کیوں نہیں۔ سینما دیکھ کر کتنے نوجوان طرح طرح کی بُرائیاں کرنے میں طاق ہو گئے!

احمد رضا خاں۔ رام پور

س۔ آج کی افسانہ نگاری کی دُنیا میں کرشن چندر کا کیا مقام ہے؟

ج۔ بہت بلند، سب سے بلند!

س۔ عورت مرد کو بیوقوف بناتی ہے یا مرد عورت کو؟

ج۔ مرد عورت کو فریب دیتا ہے۔

آنند تمناپوری۔ شولاپور

س۔ براہ کرم بتائیے کون سا شعر صحیح ہے؟

تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اُداس رہتا ہوں

یا

تجھ سے ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے بچھڑ کر اُداس رہتا ہوں

ج۔ پہلا شعر صحیح ہے۔

ایم۔ مسعود جوتی

س۔ اگر بیوی برے وقت میں ساتھ دینے سے انکار کرے تو؟

ج۔ بیوی تو برے برتاؤ پر بھی ساتھ دینے سے انکار نہیں کرتی۔

س۔ دوسری شادی؟

ج۔ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنا اپنی زندگی کو جہنم بنا لینا ہے۔

س۔ انسان حالات کا کہاں تک مقابلہ کرے؟

ج۔ اُس وقت تک حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے جب تک حالات سازگار نہ ہو جائیں۔

سکندر فیض آبادی

س۔ انسان کو قوم کی ترقی کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ صحیح نظریہ کو اپنا کر جد و جہد کرنی چاہئے۔

س۔ انسانیت کا دشمن کون ہے؟

ج۔ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن انسان ہے۔

س۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے؟

ج۔ خود غرضی!

محمد مظاہر علیدر۔ سورجگڑھا

س۔ کیا یہ سچ ہے

س۔ طوطی خانہ کب سے بہتر ہے خلیل

مشاعرہ کر دینا کسی کی غلطی یا شاد کا

ج۔ اگر یہ نہ ہو تو ایک اچھا خیال ہے

س۔ جوانی اگر فانی ہو جائے تو؟

ج۔ تب جوانی میں کشش نہ رہے گی۔

س۔ تقدیر بڑی ہے یا تدبیر؟

ج۔ کوشش تدبیر سے تقدیر سنور جاتی ہے۔

انوار حسین انصاری۔ بی اے۔ سہسرام

س۔ عورت کی مسکراہٹ زیادہ متاثر کرتی ہے یا آنسو۔

ج۔ آنسو۔

س۔ زندگی کب حسین ہوتی ہے؟

ج۔ دیکھنے والی آنکھ ہو تو زندگی میں حسن ہی حسن ہے زندگی کا ہر روپ حسین ہے۔

روشن امروہوی

س۔ شاعروں میں نمبر دیجئے۔

روشن، داغ، فیض، ساحر، شکیل، سلطان، قمر، رئیس امروہوی۔

ج۔ نظر اپنی اپنی، پسند اپنی اپنی ـــــ گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن!

س۔ آج کل شاعری کا معیار کیوں گرتا جا رہا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ آج کل کے مشاعروں میں شاعر کم، قوال زیادہ ہوتے ہیں۔

س۔ بیسویں صدی میں مضامین شائع کرنے کی کچھ شرائط ہیں؟

ج۔ جی ہاں۔ سب ایک شرط یہ ہے کہ بیسویں صدی کے معیار کے مطابق ہوں۔

ایس۔ ایم۔ سعید عالم پرولوی۔ مونگیری

س۔ محبت کرنا گناہ ہے؟

ج۔ آپ نے محبت کی وضاحت نہیں کی۔ پھر کیسے جواب دیا جائے۔

س۔ عشق اور محبت میں کیا فرق ہے؟

ج۔ جو خار اور کانٹے میں فرق ہے۔

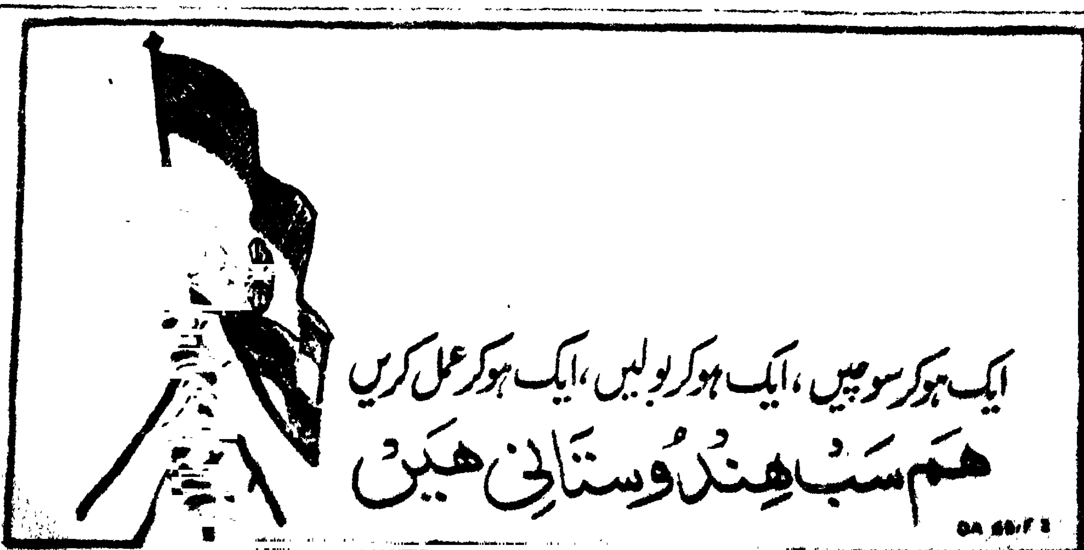
عاشق حسین انور جھریا

س۔ زندگی سے تنگ آ جائیں تو؟

ج۔ زندگی کو حسین و خوشگوار بنانے کے لئے جد و جہد کیجئے۔

س۔ انور صاحب کا کوئی اچھا شعر سنائیے۔

ج۔ نہ سمجھو کہ تاریکی شب اور گہری ہو گئی تو وہ کسی کی سوئی ہوئی روح کو جگاتا جا



محمد محب الحق۔ اکوٹ

س۔ آپ کی مادری زبان پنجابی ہے، پھر بھی آپ کو اُردو سے اتنی محبت کیوں ہے؟

ج۔ اچھی چیز سے سب کو محبت ہوتی ہے۔ اُردو زبان بہت پیاری زبان ہے۔

س۔ اُردو شاعری میں سب سے پہلے روایت سے بغاوت کس نے کی؟

ج۔ حالی اور آزاد نے۔

سید وحید اللہ۔ نلگنڈہ۔ آندھرا

س۔ "بیسویں صدی" میں صحت و زندگی" کے کالم میں کیا آپ ہماری فرمائش کے مطابق معلومات فراہم کر سکیں گے؟

ج۔ فرمائش کرنا جتنا آسان ہے، فرمائش پوری کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ پھر بھی کوشش کی جائے گی۔

س۔ دُنیا میں کُل کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اُن میں اُردو کا کون سا درجہ ہے؟

ج۔ ان کالموں میں کئی بار بتایا جا چکا ہے۔ آپ بھی سُن لیں ـــــ دُنیا میں ۲۳ ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اُن میں اُردو کا درجہ تیسرا ہے۔

س۔ غالب اور اقبال کا ایک ایک اچھا شعر سنا دیجئے؟

ج۔ بالترتیب سُنئے:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

کے۔ آر۔ کپور۔ میجر پال۔ علول آباد

س۔ زمانے کی گردش کسی کو غم واندوہ کے گرداب میں پھنسا دے تو وہ کیا کرے؟

ج۔ بزدل نہ ہو۔ حوصلہ کا دامن نہ چھوڑے۔ گرداب ساحل بن جائیں گے ؎

زورِ طوفاں دیکھ کر جو موج سے جو کترا گیا
اُس زبوں ہمت کی قسمت میں کنارا ہی نہیں

س۔ کسی کی تاریک زندگی میں اُمید اور خوشی کی کوئی شمع روشن نہ ہو تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ اُمید کی شمع روشن رکھنی چاہئے۔ کبھی خوشی کی شمع بھی روشن ہوگی۔

س۔ میں ایک شکستہ دل انسان ہوں۔ جب بھی "بیسویں صدی" میں سرگوشیاں پڑھتا ہوں، دل کو بے حد ڈھارس ملتی ہے۔ ایسا کیوں؟

ج۔ "بیسویں صدی" کی "سرگوشیاں" کی کرنوں نے ہزاروں تاریک زندگیوں کو روشنی بخشی ہے، آپ ہی نہیں، اِس حقیقت کے بہت سے لوگ معترف ہیں۔

[illegible]

س۔ جواہر لال کا خاص ... زبان خوشتر سے سُننے کی خواہش ہے۔

ج۔ جواہر لال جیسی عظیم شخصیتوں کے بارے میں نازش مشرق علامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لوگ سمجھتے ہیں جواہر لال مر گئے لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ ایسے لوگ کبھی نہیں مرتے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما!

ایم، ایس، پرویز۔ بانسی ہاٹ پورنیہ

س۔ کیا آپ مانتے ہیں کہ عورت کا آنسو پانی اور مرد کا آنسو خون ہے؟

ج۔ ہم تو عورت کے آنسو کو موتی سمجھتے ہیں۔

س۔ بھائی جان! انسانی زندگی کے لئے رات کی زیادہ اہمیت ہے یا دن کی؟

ج۔ دونوں کی۔

فرحت صابرہ۔ مسلم پورہ وانمباڑی

س۔ شیریں زبان، میٹھی آواز اور خوبصورتی۔ ان تینوں میں آپ کو کون سی چیز پسند ہے؟

ج۔ ہم ان تینوں کو پسند کرتے ہیں۔

س۔ بھائی جان! مذہب کا رشتہ افضل ہے یا انسانیت کا؟

ج۔ انسانیت کا۔

ایم، حق۔ چانوتی

س۔ یہ کہاں تک صحیح ہے کہ مسرت ناپائدار اور غم بہت پائدار ہے؟

ج۔ نیک کردار وعمل کے سوا کوئی چیز پائدار نہیں۔

محمد سیف الدین۔ گیا

س۔ کیا بربریت کو بربریت سے ختم کیا جاسکتا ہے؟

ج۔ کبھی ہمارا جواب ہوتا — ہرگز نہیں! لیکن ننگ انسانیت چین نے بتادیا کہ بربریت کو بربریت ہی سے ختم کیا جاسکتا ہے۔ اینٹ کا جواب پتھر ہے!

منصور عالم۔ خضر پور

س۔ عزمِ صمیم ... ؟

ج۔ انسان عزمِ صمیم کرلے تو بڑی سے بڑی مہم سر کرسکتا ہے۔

س۔ ایک باشعور جیون ساتھی ... ؟

ج۔ باشعور جیون ساتھی ہو تو زندگی کے ہر میدان میں کامیابی و کامرانی قدم چوم سکتی ہے۔

س۔ زندگی ... ؟

ج۔ زندگی بزمِ طرب بھی رسن و دار بھی ہے
زندگی پھول سے نازک بھی ہے تلوار بھی ہے

سراج الدین ایم ابراہیم بھیونڈی

س۔ بھیا! میں زندگی سے وفا چاہتا ہوں لیکن زندگی ہر بار منہ پھیر لیتی ہے۔ بتایئے کیا کروں؟

ج۔ آپ زندگی سے وفا کئے جایئے۔ زندگی کب تک بے وفائی کرتی رہے گی۔

س۔ اس نے "شمع" سے خاموش محبت کی۔ برسوں اس کی پُوجا کرتا رہا۔ اپنے دل کے نہاں خانوں میں اُسے چُھپائے رکھا لیکن جب اس نے "شمع کی روشنی" کو اپنے دامن میں سمیٹنا چاہا تو وہ گُل ہوگئی۔ بتایئے وہ اس تاریکی میں کہاں جائے؟

ج۔ وہ اپنے دل سے جہالت کی شمع جلا سکے۔ اندھیرا دُور ہو جائے گا۔

س۔ بلند حوصلہ رکھنے والا انسان؟

ج۔ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔

ایم، بیگم۔ جاجا

س۔ کیا غریبی میاں بیوی کو ایک دوسرے سے جدا کرسکتی ہے؟

ج۔ میاں بیوی میں خلوص ہو تو غریبی انھیں جدا نہیں کرسکتی۔

س۔ کیا بغیر شوہر کے زندگی ممکن ہے؟

ج۔ زندگی ممکن کیوں نہیں ہے لیکن ادھوری زندگی ہوگی۔ غیر مطمئن اور غیر محفوظ زندگی ہوگی۔

کلیم الدین اندوری۔ بمبئی

س۔ خوشتر بھیا! میرے عزیز ترین دوستوں میں دو دوست ہیں۔ ایک ہندو اور دوسرا مسلمان۔ جب میں ہندو کے ساتھ اس کے گروہ میں جاتا ہوں مسلمانوں کی بُرائی ان کی زبان سے سُنتا ہوں اور جب مسلمان کے ساتھ اس کے گروہ میں جاتا ہوں تو ہندوؤں کی بُرائی ان کی زبان سے سُنتا ہوں۔ حقیقت کیا ہے، کون بُرا ہے۔ ہندو یا مسلمان؟

ج۔ ہندو بُرے ہیں نہ مسلمان۔ وہ بُرے ہیں جو انھیں بُرا کہتے ہیں، دوسروں کو بُرا کہتے ہیں۔

ایڈیٹر و پرنٹر و پبلشر۔ خوشتر گرامی ——— مطبوعہ۔ دلی پرنٹنگ ورکس۔ چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائٹل و تصاویر۔ برائٹ پریس صدر بازار دہلی ——— پتہ۔ دفتر بیسویں صدی ... دہلی

ڈکشنریاں، صنعت و حرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

کشیدہ کاریاں، ڈکشنریاں

بیسویں صدی کی تیار کردہ کرشنا کاری	ایم اے	چار روپے
زینت کشیدہ کاری	زینت کوثر	پانچ روپے ۵۰ پیسے
[illegible]		چار روپے ۵۰ پیسے
سیدہ کی ״ ״	سیدہ خاتون	تین روپے ۵۰ پیسے
دلہن ״ ״	نجمہ بانو	دو روپے ۵۰ پیسے
مس ״ ״	״	دو روپے ۵۰ پیسے
شبنم ״ ״	قمر سیدہ نور	ایک روپیہ
قدسیہ ״ ״		ایک روپیہ
کامیاب درزی خانہ	زینب نور	دو روپے
تکیے کے اشعار	مشرف بانو عفت	دو روپے
زینت دستکاری ڈیزائن بک	زینت کوثر	پانچ روپے

انگریزی اردو میں اپنی قابلیت بڑھایئے

اردو انگریزی کی کامیاب ترین ڈکشنریاں

جیبی پاکٹ ڈکشنری انگریزی سے اردو ہندی		چار روپے
پایونیر انگریزی اردو ڈکشنری (کلاں) رسالہ سائز قیمت مجلد		دس روپے
پایونیر اردو انگریزی ڈکشنری (کلاں) رسالہ سائز قیمت مجلد		گیارہ روپے
اسٹوڈنٹ انگلش اردو ڈکشنری	عبدالحق	تیس روپے
اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری	״	بیس روپے
اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری	״	بارہ روپے
پایونیر اردو انگریزی ڈکشنری		گیارہ روپے
پایونیر انگریزی اردو ڈکشنری		دس روپے
جیبی آکسفورڈ ڈکشنری انگریزی سے اردو ہندی		تین روپے
اردو ادبی لغت		آٹھ روپے
فیروز اللغات جدید کلاں		بارہ روپے
فرہنگ عامرہ		سات روپے ۵۰ پیسے
فیروز اللغات عکسی خورد		چھ روپے ۵۰ پیسے

صنعت و حرفت

انجینئرنگ بک	[illegible]	بارہ روپے
الیکٹرک گائیڈ نیا ایڈیشن	״	آٹھ روپے
[illegible]		چار روپے ۵۰ پیسے
موٹر کار ڈرائیونگ		چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک [illegible]	״	تین روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک لائٹنگ		چھ روپے
الیکٹرک سپروائزر امتحان (پنجاب)		چھ روپے ۵۰ پیسے
آئل ڈیزل انجن گائیڈ	״	دس روپے
[illegible] انجن گائیڈ	״	چھ روپے
کروڈ آئل انجن گائیڈ	״	چار روپے ۵۰ پیسے
وائرلیس ریڈیو گائیڈ	״	چھ روپے
ریڈیو سروسنگ (ریڈیو مکینک)		آٹھ روپے ۲۵ پیسے
ٹانکا لگانے کا ہنر	״	دو روپے ۵۰ پیسے
چھوٹے ڈائنمو و الیکٹرک موٹر بنانا		تین روپے ۵۰ پیسے
پریکٹیکل آرمیچر وائنڈنگ (اے سی ڈی سی)	״	[illegible] روپے ۵۰ پیسے
ریفریجریٹر گائیڈ	[illegible]	آٹھ روپے ۲۵ پیسے
[illegible] ریڈیو گیان	״	پندرہ روپے
ٹرانسفارمر گائیڈ	״	چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک موٹرز	״	آٹھ روپے
خرد شکستا یعنی ٹرنر گائیڈ	״	تین روپے
ورکشاپ گائیڈ (فٹر ٹریننگ)	״	تین روپے
خراد اور ورکشاپ گیان	״	[illegible] روپے
پریکٹیکل گھڑی سازی	رام اوتار دید	چار روپے [illegible] پیسے
سائیکل ریپئرنگ	״	دو روپے ۵۰ پیسے

خانہ داری

عصمتی دسترخوان	آمنہ نازلی	تین روپے
رضیہ کا دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے ۵۰ پیسے
رنگ سازی	[illegible]	دو روپے ۵۰ پیسے
[illegible]		دو روپے ۵۰ پیسے
بوٹ پالش سازی	״	دو روپے ۵۰ پیسے
[illegible] / روشنائیاں بنانا		دو روپے ۵۰ پیسے
کنفیکشنری (انگریزی مٹھائیاں بنانا)		دو روپے ۵۰ پیسے
بازاری خوشبودار تیل	״	دو روپے ۵۰ پیسے
بیکری (بسکٹ ڈبل روٹی کیک)	״	دو روپے ۵۰ پیسے
پنساری کا کام	״	چار روپے ۵۰ پیسے
فن مصوری (پینٹر کاری)	״	چار روپے ۵۰ پیسے
پرفیومری ماسٹر	״	دو روپے ۵۰ پیسے
وارنش ماسٹر (وارنش سازی)		دو روپے ۵۰ پیسے
آتش بازی کا کاروبار		دو روپے ۵۰ پیسے
اچار مربہ چٹنی	[illegible]	دو روپے ۵۰ پیسے
حلوائی ماسٹر	[illegible]	دو روپے ۵۰ پیسے
تمباکو کا کاروبار (تمباکو کی دوکان)		دو روپے ۵۰ پیسے
پان کی دوکان		دو روپے ۵۰ پیسے
چھپائی پارچہ جات کیلیکو پرنٹنگ	״	تین روپے ۵۰ پیسے
انڈو یورپین ککری بک / دیسی انگریزی کھانے	کمال جبین	چار روپے
کاروبار بڑھانے کی ترکیبیں	״	دو روپے ۵۰ پیسے
موم بتی کا کاروبار	״	دو روپے ۵۰ پیسے
ڈیری فارمنگ	״	چار روپے

پتہ: رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

BISWIN SADI
[illegible]TH YEAR OF PUBLICATION
Telephones : Office 271637 Residence : 619927


دسمبر
BiswinSa



اِک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی

اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی ــــــــ داغ

فوٹو۔ کے، وارثی۔ بمبئی

NOV 1963

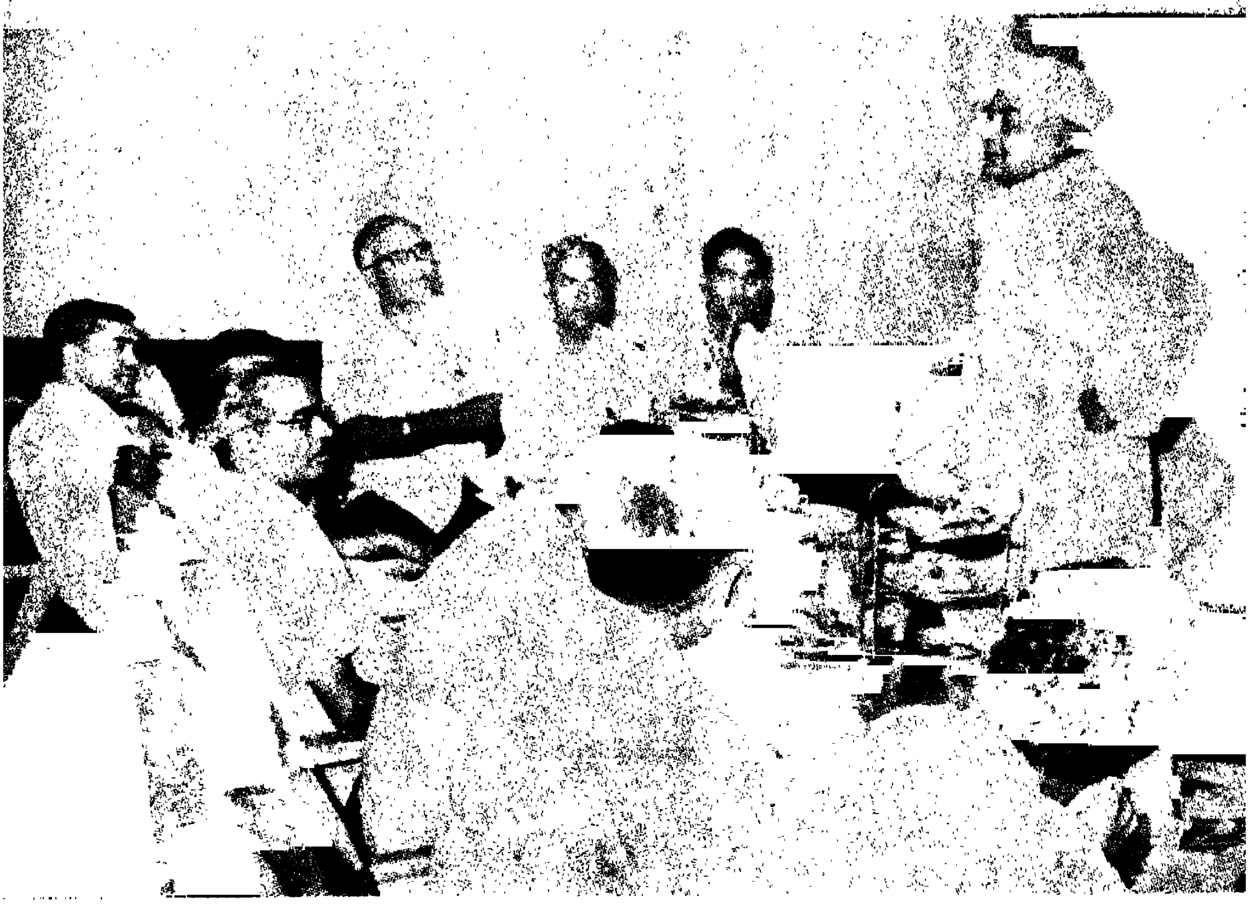


پچھلے دنوں کشمیر سے آئے ہوئے ممتاز جرنلسٹوں اور فنکاروں کے اعزاز میں جناب جمنا داس اختر مدیر "سویرا" دہلی نے کناٹ پلیس کے ایک شاندار ہوٹل میں پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ جناب اختر نے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح کشمیر کے اخبار نویسوں نے بھی اس نازک دور میں جس ہمت دلیری اور جرأت و دیانتداری سے اپنے فرائض کو پورا کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ تصویر میں جناب جمنا داس اختر تقریر کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ دائیں طرف سفید کھدر میں ملبوس جناب سید انیس الرحمان ایم - ایل - سی ایڈیٹر سہ ہفت روزہ "پرچم ہند" دہلی تشریف فرما ہیں۔ اُن کے بعد شری اوم پرکاش نامی روزنامہ "تیج" دہلی، جناب محسن جلیل آف کشمیر انفارمیشن آفس اور شری من موہن شرما آف ہندوستان سماچار نیوز ایجنسی گویا مقرر کی زبان سے اپنے دل کی آواز سُن رہے ہیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے



دِلی اور کشمیر کے جرنلسٹوں نے مختلف نشستوں میں آج کے اہم ، سیاسی ، سماجی
اور صحافتی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ اِس تصویر میں دائیں طرف جناب شمیم احمد صاحب
شمیم ایڈیٹر "آئینہ" سرینگر تقریر کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں —— وہ کہہ رہے ہیں
اخبارنویس کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ حق اور باطل کی جنگ میں اُسے اُس وقت بھی
حق کی آواز بلند کرنی چاہیئے جب وہ موت کے مُنہ میں ہو — تصویر میں بائیں طرف سے نامور شاعر و
ادیب جناب علی جواد زیدی پریس انفارمیشن آفیسر دہلی اور اُردو کے مشہور صحافی جناب بہار برنی گن
اِدارہ روزنامہ "الجمیعتہ" شمیم صاحب کی تقریر سُنتے ہوئے جیسے سوچ رہے ہیں ——
آملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک



کشمیری جرنلسٹوں کے ساتھ لی گئی ایک اور تصویر ——— جناب سید انیس الرحمان صاحب ایم۔ایل۔سی ایڈیٹر ہفت روزہ "پرچم ہند" دہلی تقریر فرما رہے ہیں۔ ایک ایک انداز اِس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ موصوف اپنے اُصولوں اور اِرادوں میں چٹانوں کی طرح مضبوط ہیں۔ محترم انیس صاحب نے فرمایا "کشمیر میں آج جو کچھ ہو رہا ہے، اُس کا تعلق مذہب اور عوام سے ہرگز نہیں۔ دراصل یہ دو مختلف عقیدوں اور اُصولوں کی لڑائی ہے ———"
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا



جو مخالف ہواؤں کے سامنے استقلال کے ساتھ سینہ سپر ہیں اور جہاد جاری رکھ رہے ہیں

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے

ٹیلیفون دفتر — ۲۷۱۶۳۷
ٹیلیفون رہائش — ۶۱۹۹۳۷



تیر و نشتر

"ہندوستان پانچ سال کے اندر خود کفیل ہو جائے گا" سبرامنیم کی تقریر
——— خدا کرے آپ کی یہ کوشش دیرپا درست نکلے۔

"پاکستان نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو برطانوی وزیر اعظم سو رہے تھے" شری لال بہادر شاستری ——— ہمارے جوان بارود کی گولیاں کھا رہے تھے اور برطانوی وزیر اعظم خواب آور گولیاں کھا رہے تھے۔

"مونگ پھلی کی ملاوٹ سے ۲۵ فیصدی گیہوں کی بچت ہو سکتی ہے" ایک اعلان ——— اور جمنا کے پانی کی ملاوٹ سے دودھ میں سو فیصدی اضافہ ہو سکتا ہے۔

"چین نئی چال چلنے والا ہے" ایک خبر ——— جس کا ہم سے جواب پائے گا۔

"گاندھی کا نام زندہ رہے گا" ایک عنوان ——— اور کانگرسی اُس کے نام کی تجارت کرتے رہیں گے۔

"ہند پاک لڑائی کے دوران تخریب کاری یا فرقہ وارانہ فساد کا ایک بھی واقعہ رونما نہیں ہوا" گلزاری لال نندہ ——— تخریب کار اور فسادیوں کا صبر و ضبط قابلِ داد ہے۔

"مغربی بنگال میں چاول نہ ملنے سے لوگ بھوکے مر رہے ہیں" پارلیمنٹ کے کمیونسٹ ممبروں کا الزام ——— اور کمیونسٹ ممبران صرف بیان بازی کر رہے ہیں۔

"ہندوستان کی حفاظت کے لئے ایٹم بم بناؤ" ایک زبردست مطالبہ
——— گاندھی اور نہرو کا دیش بناتے! رام رام - رام رام۔



"چینی بھینس کے آگے" ایک عنوان ——— امن کی بین بجانی فضول ہے۔



پنجابی صوبہ کے سوال پر پنجاب کیبنٹ میں اختلاف

"ہندوستان جنگ بندی پر قائم ہے" ایک عنوان ——— اس لئے کہ ہندوستان کا پردھان منتری امن پسند ہے۔

"یو۔پی کے سرکاری ہسپتال" ایک عنوان ——— جہاں انسان کیا حیوان بھی صحت نہیں پاتے۔

"مال غنیمت سمجھ کر ہندوستانی جہازوں کو ہضم کرنا آسان نہ ہوگا" ایک عنوان ——— وہ پیٹ میں سخت گڑبڑ پیدا کریں گے۔

"اُمید ہے حکومت آئندہ چوکنا رہیگی" ایک عنوان ——— یہی تو اُس کی عادت نہیں ہے۔

"بی بی سی اور بھٹو کی تقریر" ایک عنوان ——— دونوں ایک دوسرے کا ریکارڈ معلوم ہوتی ہیں۔

"آندولنوں کا راستہ چھوڑ کر دن رات کام کرو" سردار دربارا سنگھ۔ کام آپ کا حصہ ہے، اور آندولن اکالیوں کا۔ آپ انھیں اُن کے محبوب مشغلے سے کیوں روکتے ہیں؟

"ہم امن کے وارث ہیں" شری لال بہادر شاستری ——— [illegible] گاندھی اور بدھ کے نام لیوا ہیں۔

"روس کی مدد سے ہند میں کئی زرعی فارم قائم کئے جائیں گے" ایک [illegible] ——— اور اُن میں کمیونزم کی کاشت ہوگی۔

"چمن گنج میں چھرے ماری" ایک خبر ——— [illegible]

"اشتعال انگیزی کے باوجود [illegible] کام لیا" [illegible] ——— طاقتوروں کا یہی شیوہ [illegible]

"ہندوستان حق پر ہے: حکومت جرمنی کی رائے ـــــ اور حق کی جیت ہوتی ہے۔

"قومی دفاع کے لئے قالین کے تاجروں سے چندے" ایک خبر ـــــ "تاکہ چینی قالین کے شیروں کا منہ توڑا جاسکے۔

"برطانیہ کے سب سے بڑے جنگی جہاز کا مستقبل غیر یقینی" ایک عنوان ـــــ ہم بہار کو رو رہے ہیں۔ برطانیہ کا اپنا مستقبل غیر یقینی ہے۔

"چینیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا" ایک خبر ـــــ جہاں سے وہ بغیر ٹکٹ کے جہنم پہنچ گئے۔

"بھیک مانگنا خلاف قانون" ایک عنوان ـــــ ووٹوں کی بھیک اس سے مستثنیٰ ہے۔

"اناج کی پیداوار بڑھانے کی مہم" ایک عنوان ـــــ اناج کا لفظ بار بار دہرا دیجئے۔ کہیں بچے پیدا کرنے کی مہم نہ سمجھ بیٹھیں ہمارے بھارتی بھائی بند۔

"کرسٹین کیلر نے شادی کر لی: ایک خبر ـــــ شوہر بین الاقوامی شہرت یافتہ بیوی ہاتھ آنے پر فخر کر سکتا ہے۔

"پاکستان کے لئے چینی قرضہ" ایک خبر ـــــ کاش اُن سے کوئی کہے کہ قرض کی چینی کی بجائے گڑ سے کام چلا لیجئے۔

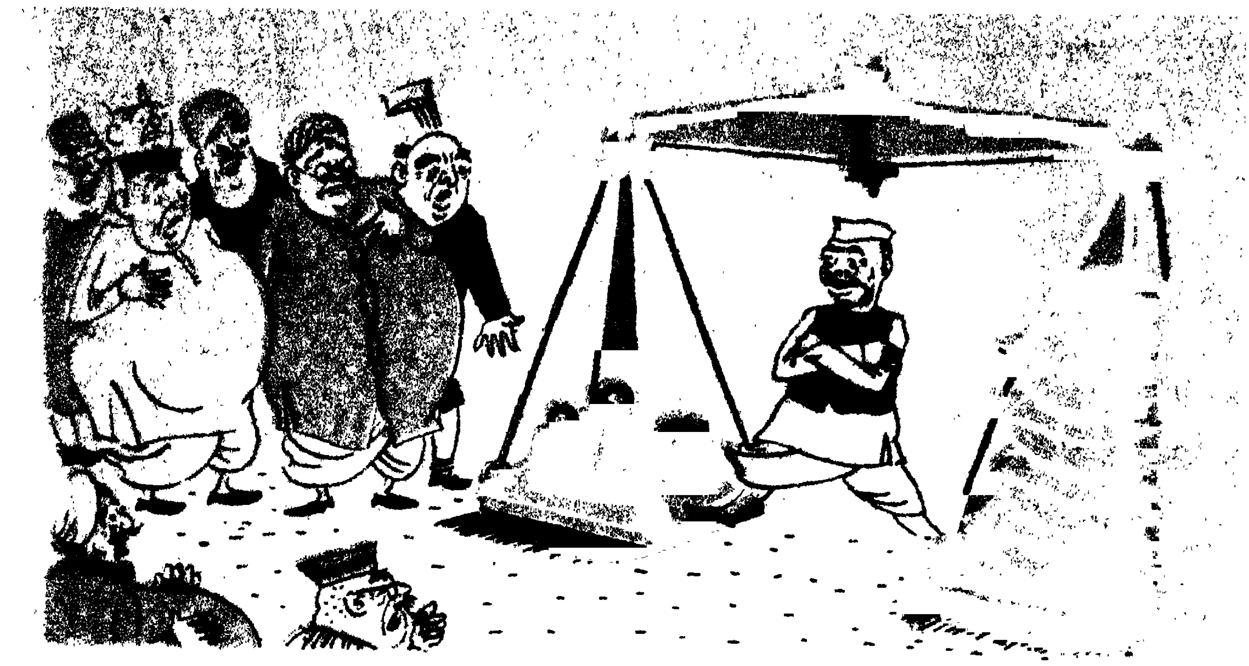
"سیلون کی ایک لڑکی کا شوہر سانپ" ایک خبر ـــــ جس کی پرورش وہ آستین میں کرتی ہے۔

"غازی آباد میں ایکتا دوس پر جلوس" ایک عنوان ـــــ جس میں ہزاروں غازیوں نے شرکت کی۔



ایشیا کے مطلع پر ہندوستان تنہا جمہوریت کا تابناک ستارہ ہے" ایک مقالہ ـــــ اور دشمنوں کی آنکھیں اُسی سے خیرہ ہوتی جاتی ہیں۔

یہ جعلساز اعظم "بیسویں صدی" کے ہزاروں روپے دھوکے اور فریب سے ہضم کر گیا



"قیمتوں کو ہرگز نہ چڑھنے دیا جائے گا": شری لال بہادر شاستری

"کسان مصنف کی کہانی": ایک عنوان ——— یعنی گیہوں چنے کی کھیتی۔

"صوبوں کے گرد وپیش": ایک عنوان ——— پھر کانگریسیوں کی رسہ کشی کے چرچے ہیں۔

"کانپور میں دفاعی نمائش": ایک خبر ——— دشمنوں کو دفع کرنے کے لئے۔

"پنجابی صوبے کے سوال پر پنجاب کیبنٹ میں انتشار پیدا ہوگیا": ایک خبر ——— یعنی صوبہ بٹے نہ بٹے کیبنٹ بٹ گئی۔

"انڈونیشیا میں رہنے والے چینیوں کی جائیدادیں ضبط کرلی جائیں گی": ایک خبر ——— اور انڈیا میں رہنے والے چینی محفوظ رہیں گے۔

"روس میں ہندوستانی کی[illegible]ٹ کا آپریشن کامیاب رہا": ایک خبر ——— یعنی چینی کیمونزم کے جراثیم نکال کر روسی ساخت کے کیمونسٹ جراثیم داخل کئے گئے۔

"ہم دو قومی نظریئے کو کھوکھلا کر دیں گے": شری چھاگلا ——— [illegible] تقریروں کے ہتھیار سے۔

"وکیل کی کار سے دو سو سل کھل گئے": ایک خبر ——— وکیلوں کے [illegible] اور عدالت کی پیشیوں سے نجات مل گئی۔

"گرفتاریوں کا سلسلہ جاری": ایک عنوان ——— آخر پولیس تنخواہ لیتی ہے بیکار کیوں رہے۔

"بھارت پوری طرح تیار ہے": شری کامراج ——— اس لئے دشمن کان کھول کر سن لے یہ للکار۔

"آزاد مارکٹ میں چاقو زنی": ایک خبر ——— یعنی آزاد مارکٹ میں چاقو کی آزادی۔

"ایک خیال": ایک عنوان ——— اور وہ خیال خام۔

"ہماری ساڑیوں کی صنعت شدید بحران کے دور میں" ایک خبر ——— ہندی شلواروں کی مقبولیت کا نتیجہ۔

"ناگالینڈ میں بزمِ اُردو کا قیام۔ خوشتر گرامی کو دعوت" جناب جمناداس خرم دیہ سوریا کی اطلاع ——— ہندی رکھشا سمتی احتجاج کرے۔ کم بخت اُردو وہاں بھی جا پہنچی۔

"ہندوستان جنگ بندی کا پورا احترام کرنا چاہتا ہے" شری لال بہادر شاستری ——— مگر اسے ہندوستان کی کمزوری نہ سمجھا جائے۔

"ہندوستانی مسلمان ملک کے وفادار رہیں تو اُن سے ہمیں کوئی عناد نہیں" گورو گولوالکر ——— بقول جناب جمناداس اختر کیا اب بھی گورو جی کو شک و شبہ ہے؟ ——— یہ شبہ دور ہو گیا تو دو قومی سیاست کا دیوالہ نکل جائے گا۔

"ہندوستان میں جنس لگان کے سسٹم کو ختم کر دینا چاہیے" زرعی اصلاحات کے ماہر کی سفارش ——— اس لئے کہ یہاں جنسی لگاؤ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

"برطانیہ کے لوگ دُنیا کی ایک تہائی چائے پی جاتے ہیں" ایک مقالہ ——— سروے کرنے والوں نے شاید بمبئی کے علاقہ راجہ مہدی علی خاں کے خاندان کا دورہ نہیں کیا جہاں بلیوں تک کو دن میں کئی کئی بار چائے پلائی جاتی ہے ورنہ اعداد و شمار کچھ اور ہی ہوتے۔

"پنجاب کو سیاسی طور پر ایک رکھنے کا پلان" ایک عنوان ——— جسے سردار دربارہ سنگھ ہی کامیاب بنا سکتے ہیں۔

"دلائی لامہ مسوری میں قیام کریں گے" ایک خبر ——— اور وہاں تبت کی پہاڑیوں کے مزے لیں گے۔



ہندوستانی سرحدوں پر زہریلے دشمن۔

شری وائی. بی. چوان



ہندوستان کے تحفظ کا دارومدار ہتھیاروں پر نہیں بلکہ متوازن دماغ۔ ٹھنڈے دل اور متناسب اعضا سے سجا ہوا وہ مہاراشٹری ڈھانچہ ہے جسے آج ہندوستان کا بچّہ بچّہ جانتا ہے اور وہ

کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ شری کرشنا مینن نے اپنی تقریروں سے شہرت حاصل کرنے کی کوشش کی اور چوان کی خاموشی نے اُن کے قدموں پر شہرت کا تاج نچھاور کر دیا —— مہاراشٹری خون رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ شیوا جی کی استقامت اور عزم ورثے میں ملا ہے اور مہاراشٹر کی گدی چھوڑ کر دلّی روانہ ہوتے وقت دیش رکھشا کا جو عہد کیا تھا اُس پر سولہ آنے پورے اُترے ہیں۔ اسٹیج کے پہلوان نہیں میدانِ جنگ کے بلوان ثابت ہوئے ہیں۔ جلسوں میں بھاشنوں کی بجائے بلیدان اُن کا ایمان ہے —— گاندھی ٹوپی، کھدر کی شیروانی، چوڑی دار پاجامہ لباس۔ بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، کتابی چہرہ، جس پر جلال و وقار نمایاں نظر آتا ہے۔ سڈول اور گٹھیلا جسم ہے۔ آواز میں لوچ بھی ہے اور وزن بھی اور کبھی کبھی تقریر میں لطیفہ گوئی کا انداز بھی ہوتا ہے —— شری شاستری کے دست و بازو اور ملک کی ڈھال ہیں۔ شاستری جی نے ملک کو "جے جوان جے کسان" کا نعرہ دیا ہے اور ہم اس میں

کا اضافہ کرتے ہیں

مرّیخ کا مُسافر

—— کرشن چندر ایم اے

گوردونواس، خفیشنٹو روڈ، کھار، بمبئی ۵۲

۳۰ ستمبر ۱۹۶۵ء

برادرم خوشتر گرامی! آداب

"مرّیخ کا مسافر" حاضر ہے۔ میرا یہ افسانہ اِس واقعہ سے متاثر ہے کہ انسان نے مرّیخ کے گرد اپنا راکٹ چکر لگانے کے لئے بھیج دیا ہے اور وہ مرّیخ کی تصویریں لے رہا ہے۔ وہ ضرور ایک دن خلائے بسیط کو مسخر کرلے گا، کیونکہ ہزار سماجی اور تہذیبی بُرائیوں کے باوجود وہ ایک ایسی شئے رکھتا ہے جسے دل کہتے ہیں —— دل —— جو عالمگیر اخوت کا سرچشمہ ہے ....

آپ کا —— کرشن چندر

مرّیخ کی مجلسِ مشاورتِ عظمیٰ کا خفیہ اجلاس شروع ہوا۔ آج ایک بھی رُکن غیر حاضر نہ تھا کیونکہ مرّیخ کا مسافر پہلی بار زمین پر گیارہ مہینے رہ کر لوٹا تھا۔ آج وہ اپنی رپورٹ پیش کرنے والا تھا۔

مجلسِ مشاورت کے صدر کے دماغ نے اپنے جسم کے اندر لگی ہوئی گھڑی سے وقت معلوم کیا (واضح رہے کہ مرّیخ میں گھڑی کلائی پر نہیں باندھی جاتی، مرّیخی انسانوں کے جسم میں دل کی جگہ ایک گھڑی ہوتی ہے۔ وہ ٹِک ٹِک کرکے وقت بتاتی رہتی ہے۔ اِس لئے کسی مرّیخی انسان کو، دوسرے انسان سے وقت معلوم نہیں کرنا پڑتا)

جب مجلسِ مشاورت کے صدر کو معلوم ہوگیا کہ رپورٹ پیش کرنے کا وقت آگیا ہے، تو اُس نے کہا۔

"کسرِ اعشاریہ صفر صفر تین دو حاضر ہو!"

(مرّیخ میں ہماری طرح نام نہیں رکھے جاتے۔ ہر مرّیخی انسان اپنے جسم سے ایک خاص طرح کی ویولینگتھ (WAVE LENGTH) خارج کرتا رہتا ہے۔ پیدا ہوتے ہی اُس مرّیخی بچے کی ویولینگتھ معلوم کرلی جاتی ہے۔ یہ ویولینگتھ ہمیشہ دوسرے انسان کی ویولینگتھ سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ اِس لئے مرّیخی انسانوں کے ناموں میں کوئی مغالطہ نہیں ہوسکتا)

کسرِ اعشاریہ صفر صفر تین دو نے اپنے سینے پر لگا ہوا ایک بٹن دبایا۔ بٹن دباتے ہی اُس کا سینہ کُھل گیا۔ سینے کے اندر ایک ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا۔ بہت ہی چھوٹا اور حساس۔ اِسی ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ ایک مائیکروفون بھی لگا ہوا تھا۔ کسرِ اعشاریہ صفر صفر تین دو نے سینے میں ہاتھ ڈال کے مائیکروفون نکال کر اپنے مُنھ میں فٹ کرلیا۔

(مرّیخی انسان، صرف مائیکروفون کے ذریعے بات کرتے ہیں اور اِس سلسلے میں وہ ہندوستانی نیتاؤں سے بہت مشابہت رکھتے ہیں)

جونہی کسرِ اعشاریہ صفر صفر تین دو نے بٹن دبا کر اپنا سینہ کھولا مجلسِ مشاورتِ عظمیٰ کے تمام ارکان نے اپنے اپنے سینے کھول لئے اور مائیکروفون اپنے کانوں میں فٹ کرلئے۔

(مرّیخ میں ہر انسان، ہر دوسرے انسان کی آواز اپنے ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کرتا رہتا ہے، اِس لئے مرّیخ میں کوئی جھوٹ نہیں بولتا)

کسرِ اعشاریہ صفر صفر تین دو، رپورٹ پیش کرنے کے کٹہرے میں کھڑا ہوگیا۔ مجلسِ مشاورتِ عظمیٰ کا سکریٹری بھی صدرِ محترم کی اجازت سے اُس پر بیچ بیچ میں جرح کرنے کے لئے کٹہرے کے باہر کھڑا ہوگیا۔

کسرِ اعشاریہ صفر صفر تین دو نے رپورٹ شروع کی۔

"صدرِ محترم اور اراکینِ مجلس!

کرۂ ارض کے انسان نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اب وہ ہمارے مقدس سیارے کے گرد چکر لگانے لگا ہے۔ اس لئے مجلسِ مشاورتِ عظمیٰ نے ضروری سمجھا کہ ارضی انسان کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ میں نے یہ سفر صدرِ محترم کی اجازتِ خاص سے طے کیا اور اِسے سب سے خفیہ بھی رکھا۔ میری معلومات ارضی انسانوں کے بارے میں، جو میں نے اپنے گیارہ

ماہ کے سفر کے دوران میں دریافت کیں، وہ بہت دلچسپ ہیں۔ اب میں انھیں آپ کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔"

"ارضی انسان کا قد ہم سے دُگنا ہوتا ہے یعنی کوئی چھ فٹ کے قریب اور وزن میں وہ ہم سے دس گنا بھاری ہے۔ چلتا بھی بہت آہستہ ہے کیونکہ زمین پر کشش ثقل کی گرفت مریخ سے کئی سو گنا زیادہ ہے۔ اس لئے مریخی انسان جتنا فاصلہ ایک دن میں طے کرتا ہے اُتنا فاصلہ ایک زمینی انسان کئی مہینے میں طے کرتا ہے۔ اس لئے بے چارہ لمبے سفر سے گھبراتا ہے اور فاصلہ ریل گاڑی، ہوائی جہاز اور موٹر وغیرہ سے طے کرتا ہے۔"

سکریٹری نے جرح کی۔

"یہ ریل گاڑی .... ہوائی جہاز .... اور موٹر وغیرہ کیا ہیں؟"

"سفر کرنے کے مکان ہیں۔" رپورٹ پیش کرنے والے نے بتایا: "بجلی، تیل یا بھاپ سے چلتے ہیں۔"

"کیا زمینی انسانوں کے جسم میں بجلی کا موٹر نہیں لگا ہوتا۔ جیسے ہم لوگوں کے اندر خود بخود لگا ہوتا ہے؟" سکریٹری نے حیرت سے پوچھا۔

"جی نہیں! زمین کے انسان کے جسم میں جو برقی رَو دوڑتی ہے، وہ بہت کمزور ہے۔ اتنی کمزور کہ ایک دن میں نے غلطی سے زمین کے انسان کو چھُو لیا۔ اُسے ایسا زبردست برقی جھٹکا لگا کہ وہ وہیں مرگیا۔ اُس کی موت کے بعد میں اس کی لاش کو اُٹھا کر ایک ویرانے میں لے گیا اور اُسے چیر پھاڑ کر دیکھا۔ انسانوں کا جسم مریخیوں سے بہت مختلف ہے۔ ہر انسان کے جسم کے اندر لال رنگ کا پانی بھرا رہتا ہے۔ اُس کے جسم میں گھڑی کے بجائے 'دل' ہوتا ہے اور پھیپھڑے ہوتے ہیں لیکن برقی رَو بہت کم ہوتی ہے۔ مجھے اُن سے ملنے جُلنے کے لئے اپنی برقی قوت کو بہت کم کرنا پڑا اور تقریباً زمینی انسانوں کی طرح رہنا پڑا۔"

"پھیپھڑے کیا ہوتے ہیں؟" نائب صدر نے دریافت کیا۔

"سانس لینے کا ایک آلہ ہے، جو ہم مریخیوں کے لئے بالکل بیکار ہے۔"

"ہمارے یہاں تو کوئی مریخی انسان سانس نہیں لیتا۔" صدرِ محترم بولے۔ "سمجھ میں نہیں آتا سانس لینے کی ضرورت کیا ہے؟"

"اس کے علاوہ انسان کے جسم میں ایک معدہ بھی ہوتا ہے۔" رپورٹ پیش کرنے والے نے بتایا۔

"معدہ کیا ہوتا ہے؟"

"اُس کے اندر روٹی جاتی ہے۔"

"روٹی کیا ہوتی ہے؟"

"جو وہ لوگ کھاتے ہیں۔"

"یہ 'کھاتے ہیں' کیا چیز ہے؟ تشریح کرو!"

"صدرِ محترم! اسا اہم مجلس! زمینی انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ... ہے کہ اُسے سمجھانے میں مجھے زیادہ وقت لگے گی لیکن انسانی تہذیب میں اس کی ترقی ... ممکن ہے اُس کے مستقبل میں یہ معدہ اتنا اہم ہے کہ میں اُس پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ ایک جسمانی آلہ ہوتا ہے جو ہر زمینی انسان کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ اُس سے گویا ایک نالی ہوتی ہے جو منھ میں کھلتی ہے۔ اس منھ کے ذریعے انسان ہر مقررہ وقت جب وہ چاہتا ہے یا جب اُسے نصیب ہوتا ہے، اپنی روزمرہ کی خوراک اُس کے اندر ڈالتا ہے یعنی وہ زمین پر اُگنے والی نباتات سے یا جانوروں کو شکار کرکے حاصل کرتا ہے۔ یہ خوراک اُس کے معدے میں جا کر جزو بدن بن جاتی ہے اور اس کے جسم میں طاقت پہنچاتی ہے۔ جس سے اُس کے جسم کا انجن چلتا ہے۔"

"اوہ!" صدرِ محترم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے بولے: "تو انسان ابھی جانوروں کی منزل میں ہے! گھاس پھونس چر کر یا جانوروں کو مار کر اپنی خوراک حاصل کرتا ہے۔ ابھی اُسے ہم مریخیوں کے برتر نظامِ حیات تک پہنچنے میں کئی ہزار سال لگیں گے۔ ہمیں ابھی ایسے جانور نما انسان سے کوئی خطرہ نہیں!"

(مریخ میں نہ کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ نہ جانوروں کا شکار ہوتا ہے۔ نہ کارخانوں میں وٹامنی اور مصنوعی خوراک تیار ہوتی ہے۔ مریخی انسانوں کے جسم میں گردن کے پیچھے دونوں کندھوں کے درمیان تین فٹ لمبی اور تقریباً دو فٹ چوڑی ایک شفاف جھلی ہے جو سورج کی کرنوں سے براہِ راست 'انرجی' حاصل کرتی ہے۔ جیسے زمین پر ہرے پتے حاصل کرتے ہیں۔ مریخی انسان کی یہی جھلی اُس 'انرجی' کو حاصل کرکے سارے جسم میں پہنچاتی ہے اس لئے کرۂ مریخ پر بھوک کا کوئی مسئلہ نہیں ہے)

"کرۂ ارض پر انسان کے لئے اپنی بقا کا مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ معدے کو بھرنے کے لئے وہ کھانا کہاں سے لائے؟ کس سے چھینے؟ فطرت سے کہ سماج سے؟ کس طریقے سے لائے؛ سچائی سے کہ جھوٹ سے؟ مکر و ریا سے؟ اور کن ذرائع سے حاصل کرے۔ کھیتی باڑی سے، تیر کمان سے، رائفل سے اور کن اصولوں کی بنا پر؟ یعنی اپنے کھیت میں ہل چلا کر... یا دوسرے کی کھیتی باڑی غصب کرکے۔ اپنے ملک میں رہ کر یا دوسروں کے ملک پر قبضہ کرکے۔ اپنی محنت سے حاصل کرکے یا لوٹ مار کرکے۔ انسانی تہذیب کے نشیب و فراز؛ اُس کی کاوشیں اور تگ و دو، اُس کے کلچر کے مد و جزر، سبھی اس ایک مسئلے سے پیدا ہوتے ہیں ——— بھوک!"

"شکر ہے کہ ہمارے یہاں معدہ نہیں ہے۔"

"لیکن میرا خیال ہے انسان کی ترقی میں معدے نے جتنا اہم رول ادا کیا ہے اُتنا کسی اور نے نہیں کیا۔ انسان کی بھوک اُسے کہاں سے کہاں لے گئی ہے۔" رپورٹ پیش کرنے والے نے مجلس کو خبردار کیا.... "ہو سکتا ہے یہی بھوک اُسے مریخ تک

پہنچادے۔ میرا خیال ہے، انسانی جسم میں معدہ اُس کے دل سے بھی اہم ہے۔"

"یہ دل کیا ہوتا ہے؟" ایک مریخی نے پوچھا۔

زمین سے آنے والے مریخی نے کہا: "یہی دل تو آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ زمین پر لوگ دل دیتے ہیں، دل لیتے ہیں۔ وہاں دل آجاتا ہے۔ دل روتا ہے۔ دل ٹوٹا جاتا ہے۔ دل لُوٹ جاتا ہے۔ دل میں بہار آتی ہے۔ دل ویران ہوتا ہے، دل شاد ہوتا ہے، دل برباد ہوتا ہے ——— ایک بار میرے میزبان کے ایک نوجوان لڑکے نے دو دن کھانا نہیں کھایا۔ وہ رات دن ٹھنڈی سانسیں بھرتا تھا اور روتا تھا ——— جب میں نے اُس سے پوچھا کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ تو وہ پڑوس کی ایک عورت کا نام لے کر بولا۔

"میں اُسے دل دے بیٹھا ہوں۔"

"میں نے فوراً اُس کے جسم کو ٹٹول کر دیکھا، وہاں دل موجود تھا اور بہت باقاعدگی سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے اُس لڑکے کے جھوٹ پر بہت حیرت ہوئی لیکن اپنے گیارہ مہینے کے سفر میں مجھے آج تک یہی پتہ نہ چل سکا کہ انسان کا دل ہے کہاں؟ یعنی وہ دل جس کی طرف وہ بار بار اپنی گفتگو میں اشارہ کرتے رہتے ہیں ——— وہ ہے کہاں؟"

مجلسِ مشاورتِ عظمیٰ کے سکریٹری نے رپورٹ کرنے والے سے پوچھا: "ابھی تم نے کسی عورت کا ذکر کیا، جسے وہ نوجوان اپنا دل دے بیٹھا تھا۔ یہ عورت کیا چیز ہے؟ اور اُس کا انسان کے دل سے کیا تعلق ہے؟"

رپورٹ کرنے والے مریخی کے سر اعشاریہ صفر صفر صفر تین دو کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ بولا۔

"جناب اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم نے زمین پر سب سے عجیب و غریب شئے کیا دیکھی؟ تو میں کہوں گا ——— عورت!"

"مگر عورت ہے کیا؟" ایک مریخی سائنسداں نے سوال کیا: "وہ عالمِ نباتات میں سے ہے یا عالمِ حیوانات سے، یا عالمِ جمادات سے؟"

"وہ اپنے عقائد کے اعتبار سے عالمِ جمادات میں سے ہے۔ اپنی عادات کے اعتبار سے عالمِ نباتات میں سے ہے اور قوتِ عمل کے اعتبار سے عالمِ حیوانات میں سے ہے ——— وہ ہر انسان کی شریکِ زندگی ہے۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔" مریخی سائنسداں نے انکار میں سر ہلا کے کہا: "کچھ اور بتاؤ!"

"اب کیسے بتاؤں؟" رپورٹ پیش کرنے والے نے پس و پیش کرتے ہوئے کہا۔ پہلی بار اُس کے چہرے پر سوچ کی شکنیں نمودار ہوئیں اور وہ چند لمحوں کے لئے اپنے خیالات مجتمع کرنے کے لئے چُپ ہوگیا۔

(بات یہ تھی کہ مریخ میں عورتیں نہیں ہوتیں۔ سبھی مریخی ایک سے ہوتے ہیں۔ وہاں انسانوں کے درمیان شادیاں نہیں ہوتیں۔ کیونکہ وہاں عورتیں ہی نہیں ہیں۔ اِس لئے شادی کس سے ہو؟ بچّے ایک عجیب عمل سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر چوتھے سال ایک مریخی کے مُنہ سے ایک عجیب و غریب رطوبت خارج ہوتی ہے۔ جب اُس رطوبت کے خارج ہونے کا وقت آتا ہے تو مریخی کے سر میں شدید درد ہونے لگتا ہے۔ یہ درد اُس رطوبت کے خارج ہونے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ جس وقت مریخی کے سر میں یہ درد اُٹھتا ہے اُسے فوراً کسی قریب کے ہسپتال میں پہنچا دیا جاتا ہے، جہاں اُس کے حلق سے خارج ہونے والے تھوک کو ایک مٹی کے گملے میں محفوظ کرلیا جاتا ہے۔ اُس مٹی کے گملے سے نیا مریخی پیدا ہوتا ہے اور اٹھارہ مہینے تک اُسی گملے میں بڑھتا رہتا ہے اور جب وہ مکمل ہوجاتا ہے تو اُس کی جڑیں آلوؤں کی طرح سُوکھ جاتی ہیں۔ وہ ایک دم چھلانگ مار کر گملے سے باہر نکل آتا ہے اور اس طرح اپنی زندگی کا نیا سفر شروع کرتا ہے)

"اب کیا بتاؤں صاحب!" بالآخر وہ مریخی جو رپورٹ پیش کر رہا تھا اپنے چاروں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ (مریخی انسان کے چار ہاتھ ہوتے ہیں)

"ایک بار ایک عورت مجھ پر فریفتہ ہوگئی تھی۔ وہ میرے ساتھ آنے کو بھی تیار تھی لیکن میرے فوٹون (PHOTONE) راکٹ میں اتنی جگہ نہ تھی کہ اپنے ساتھ لا سکتا ——— عورت بھی ایک طرح کا انسان ہوتی ہے۔ لیکن اُس سے زیادہ پیاری اور زیادہ دلکش اور زیادہ جھگڑالو لیکن صاحب بہت اچھی لگتی ہے۔ آنکھوں کو بھی اور کانوں کو بھی اور سونگھنے میں بھی، عجیب سی بھینی بھینی سی باس آتی ہے اُس کے پاس سے۔ میرا تو جی چاہتا تھا ہر وقت اُسے سونگھتا رہوں۔"

"کیا مریخی پھولوں سے بھی زیادہ خوشبو ہوتی ہے اُس میں؟"

"کسی پھولوں میں ایسی خوشبو نہیں ہوتی جناب! جو عورت کے بدن میں ہوتی ہے۔"

"کیا تم نے اُسے کھا کے دیکھا تھا؟" مریخی سائنسداں نے پوچھا۔

"عورت کو کھاتے نہیں جناب۔ اُس سے پیار کیا جاتا ہے۔"

"یہ پیار کیا ہوتا ہے؟"

"صاحب پیار بھی ایک عجیب و غریب شئے ہے۔ میں اُسے بیان بھی نہیں کرسکتا! کیونکہ ہمارے یہاں 'پیار' نہیں ہوتا۔ صرف فرائض ہوتے ہیں۔ فرائض تو آپ سمجھتے ہیں ——— اِس لئے کہ باپ اٹھارہ مہینے تک اپنے بیٹے کے گملے کی نگہبانی کرتا ہے لیکن یہ اُس کا فرض ہے۔ ہر مریخی .... مریخی نظامِ حیات کا وفادار ہے۔ یہ اُس کا فرض ہے لیکن وہ مریخ سے محبت نہیں کرتا۔ محبت کے جذبے کو آپ سمجھ نہیں سکتے۔"

"ایک گاؤں میں میں دو ہفتے رہا۔ جس کسان کے یہاں میں مہمان رہا اُس کی لڑکی گاؤں کے ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی۔ یہ کسان بہت غریب تھا۔ اُس کے یہاں صرف ایک وقت کھانا پکتا تھا تو بھی وہ لڑکی ایک نوجوان سے پیار کرتی تھی اور گھُٹ گھُٹ کر

پیار کرتی تھی اُس نوجوان سے اور اُس سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن قسمت نے کچھ اور ٹھان رکھی تھی۔ کیونکہ اُس نوجوان کے ماں باپ امیر تھے گاؤں کے مکھیا تھے اور اونچی ذات کے تھے اور لڑکی کے پاس اپنے پیار کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لئے لڑکے کے ماں باپ نے اُس شادی کی اجازت نہ دی اور اپنے بیٹے کی شادی کہیں اور طے کر دی ——— شادی کے دن اُس لڑکی نے گاؤں کے کنویں میں چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دی۔"

"جان دے دی؟" بہت سے مریخی ایک دم چلّا اُٹھے ... "کیوں؟"

"کیونکہ اُسے اُس لڑکے سے پیار تھا۔ پیار ایک بہت ہی گہرا جذبہ ہے اور اُس کا عمل فرض سے مختلف ہوتا ہے۔ فرض میں سختی ہوتی ہے ایک طرح کی، فرض میں ایک طرح کی میکانکی تربیت آجاتی ہے ——— لیکن پیار چیز ہی اور ہے ... وہاں مرد عورت سے، عورت مرد سے، اولاد والدین سے، ماں بیٹے سے، بیٹا اپنے ملک سے، ایک ملک دوسرے ملک سے محبت کرتا ہے۔"

"پیار وہاں صرف جانداروں ہی سے نہیں کیا جاتا۔ پیار کسی کو اپنے کام سے بھی ہو سکتا ہے، سائنس سے ہوتا ہے۔ پھول کی پتّی اور ہیرے کے جگر سے بھی ہوتا ہے ——— پیار کی ایک ہزار صورتیں ہیں۔ لیکن زمینی پیار کی لگن بہت گہری ہوتی ہے اور انسان کو بہت دُور اور بہت آگے پہنچا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا نرم گرم، گہرا اور پُرکشش رشتہ ہے جس میں ایک مرد دوسرے مرد کی جانب یوں کھنچتا ہے جیسے ایک ایٹمی ذرّہ دوسرے ایٹمی ذرّے کی طرف ..."

وہ کہتا کہتا چُپ ہو گیا ... پھر یکایک اُس کی سمجھ میں کچھ آگیا۔ اُس نے فوراً اپنی جیب سے ایک رُومال نکال کر پہلے تو اُسے خود سُونگھا، پھر اُسے صدرِ محترم کو پیش کرتے ہوئے بولا:-

"دیکھئے، یہ اُس عورت کا رومال ہے، جو اُس نے مجھے زمین سے چلتے وقت تحفے میں دیا تھا ——— وہ عورت مجھ سے پیار کرتی تھی۔ اُس عورت کے پیار کی خوشبو اِس رُومال میں ابھی تک بسی ہوئی ہے۔ اِسے ذرا سُونگھئے!"

صدر نے اُس رُومال کو ناک سے لگایا۔ کچھ دیر کے لئے اُس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ چند لمحوں کے بعد اُس نے آنکھیں کھول کر کہا۔

"اِس میں بادلوں کی خوشبو ہے۔"

صدر نے وہ رُومال نائب صدر کو دیا۔ اُس نے سُونگھ کر کہا۔

"نہیں اِس میں خوابوں کی خوشبو ہے۔"

اُس نے یہ رُومال اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک مریخی کو دیا۔ وہ اُسے سُونگھ کر بولا۔

"اِس میں تو کہکشاں کی خوشبو ہے۔"

چوتھے نے کہا۔

"اِس کی خوشبو مجھے اُس بھتنگے یا مچھلی [illegible] ہے جب سیارہ [illegible] ایک نقطہ تھا۔"

رپورٹ پیش کرنے والے نے کہا۔

"عورت سورج بھی ہے اور بادل بھی ——— کہکشاں بھی ہے اور خواب بھی ... وہ ایک عجیب و غریب پیکر ہے!"

ہال میں طویل خاموشی چھا گئی۔ کسرِ اعشاریہ صفر صفر تین دو کا چہرہ [illegible] یادوں میں کھویا ہوا تھا۔ بالآخر صدر نے اُس سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن وہاں کے نظامِ حیات کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا؟"

کسرِ اعشاریہ صفر صفر تین دو کا چہرہ یہ سوال سُن کر غرور سے تن گیا ———

"میں بہت فخر کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ارضی مخلوق کا نظامِ حیات، اتنا پختہ نہیں ہے۔ اتنا مکمل، جامع اور سائنسی نہیں ہے، جتنا ہمارا ہے۔ پھر اُن کے یہاں کوئی ایک نظامِ حیات، سارے کرۂ زمین پر لاگو نہیں ہے۔ بلکہ کئی نظامِ حیات ہیں۔ جن میں سے کئی ایک تو بے حد فرسودہ ہیں۔ بلکہ اُن کے جدید سے جدید نظامِ حیات میں بھی کئی خامیاں نظر آتی ہیں ——— وہاں ہماری طرح کا نظم و نسق نہیں ہے۔ ہمارے یہاں کسی فرد کے لئے غلطی کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن وہ لوگ۔ اپنے عقلی اور سائنسی نظام میں ابھی ہم سے بہت پیچھے ہیں اور اکثر غلطیاں کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں اُن سے کسی طرح کا خطرہ نہیں ہے اور یہی میری رپورٹ کا خلاصہ ہے۔"

کسرِ اعشاریہ صفر صفر تین دو نے بڑے فخر سے یہ اختتامیہ اعلان کیا۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔

لیکن مجلسِ مشاورتِ عظمٰی کے صدر کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اُس نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بہت گمبھیر لہجے میں کہا۔

"میں تم سے متفق نہیں ہوں۔ اگر انسان غلطی کر سکتا ہے اور پیار کر سکتا ہے اور دل رکھتا ہے، تو ہمیں سب سے بڑا خطرہ اِسی سے ہے ——— ایسا انسان ایک دن ضرور مریخ کو بھی فتح کر لے گا!"

غزل

چھیڑئے دل کسی شوخ کے رخساروں سے ۔ کھیلنا آہ دہکتے ہوئے انگاروں سے
ہم شبِ ہجر میں جب سوتی ہے ساری دنیا ۔ ذکر کرتے ہیں ترا چھٹکے ہوئے تاروں سے
اشک بھر لائے کسی نے جو لیا نام ترا ۔ اور کیا ہجر میں ہوتا ترے بیماروں سے
ہاں وہی پھول سے رخسار ہیں جن کے نہ وہی ۔ خار کھائے ہوئے بیٹھے ہیں گنہگاروں سے
چھیڑ نغمہ کوئی، گو دل کی رگیں اکھڑی ہیں ۔ ہم نکالیں گے صدا ٹوٹے ہوئے تاروں سے
آگئی یاد سیہ مست جوانی تیری ۔ کالی متوالی گھٹا اٹھی جو کہساروں سے
مسکراہٹ ہے لبوں پر کہ شفق پھولی ہے ۔ یا لوئیں پھوٹ رہی ہیں ترے رخساروں سے
ہم کو تیری ہے ضرورت نہ اسے بھول اے دوست ۔ تیرے اقراروں سے مطلب ہے نہ انکاروں سے
ہم ہیں وہ بیکس و بے یار کہ بیٹھے بیٹھے ۔ اپنا دکھ درد کہا کرتے ہیں دیواروں سے
مقتلِ بلبلِ کشتہ ہے بہارِ رنگیں ۔ آجکل بوئے کفن آتی ہے گلزاروں سے
جیسے دوکانوں سے نادار گزر جاتے ہیں ۔ خالی ہاتھ آتے ہیں ہم حسن کے بازاروں سے
جنبشِ ابروئے خمدار دمِ جوششِ عتاب ۔ جیسے چنگاریاں اڑ جاتی ہوں تلواروں سے
تجھکو اے جورِ فلک ہوکے رہیگا معلوم ۔ کبھی پالا جو پڑا ہم سے جگر داروں سے
اہلِ دنیا سے یہ کہتے ہیں مرے نالۂ دل ۔ ہم صدا دیں گے غمِ ہجر کے میناروں سے
اب وہ فرہاد نہ وہ تیشۂ فرہاد مگر ۔ ایک آواز سی آجاتی ہے کہساروں سے
نئے اسلوب کے خلاق حسینانِ جہاں ۔ طرحیں کیا کیا نکل آتی ہیں طرحداروں سے
سوزِ پنہاں سے ہے نسبت ترے رخساروں کو ۔ آنچ اپنی مجھے آئی ترے رخساروں سے
رو رعایت سے نہ لیں کام جو وقتِ بیداد ۔ لاگ رکھتے ہیں ہم ایسے ہی دل آزاروں سے
ہم کہ بازارِ محبت کے تماشائی ہیں ۔ نہ دکانداروں سے مطلب نہ خریداروں سے

عشق ہمدردئ عالم کا روادار نہیں
ہوگئی بھول فراقؔ آپ کے غمخواروں سے

افسانہ

پھول کا دل

عظیم واسطی

[illegible] بزاز محلہ، صدر بازار، لاہور چھاؤنی (مغربی پاکستان)
۱۷ر اگست ۱۹۶۵ء

مجتبیٰ خوشتر صاحب! خلوص بھرے سلام

میری خاموشی سے آپ کو گلہ ہی کیا ہوگا۔ میں ہوں ہی کونسی گنتی میں ـــــ بہر حال ایک کہانی "پھول کا دل" بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے ضرور پسند آئے گی اور آپ اِس پھول کے دل کو یقیناً سراہیں گے ـــــ یہ دل مشرقی عورت کا ہے اور مشرقی عورت بہت دلیر اور عظیم ہوتی ہے لیکن اگر کوئی اُس کی دلیری کو للکارے، اُس کی عظمت سے منکر ہو تو ـــــ
ـــــ تو میرے پھول کا دل چیر دیجئے!....

آپ کا ـــــ عظیم واسطی

لاہور ریلوے سٹیشن جن لوگوں نے پندرہ سال سے نہیں دیکھا، وہ اس کے متعلق صحیح اندازہ نہیں کر سکتے کہ اب اِس کی خوبصورتی میں کتنا اضافہ ہو گیا ہے۔ سامنے کی عمارتیں منہدم کر کے ایک خوبصورت پلاٹ بنا دیا گیا ہے۔ جس میں سبزہ زار سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی خوبصورت پہاڑی ہے۔ سڑکیں کشادہ اور خوبصورت ہیں۔ تانگہ اور ٹیکسی سٹینڈ ایک طرف کو سمٹ گئے ہیں اور اب اس کی خوبصورتی یوں نکھر آئی ہے جیسے کسی اُلجھے بالوں والی حسین دیہاتی دوشیزہ نے منہ دھو کر بالوں کو ایک جوڑے میں سمیٹ کر موتیے کے پھولوں کا گجرا اُس کے گرد لپیٹ لیا ہو اور اب جگمگاتی نیلی روشنیوں میں کھڑی شرما رہی ہو۔

یہ پُرشکوہ اور باوقار عمارت پانچ سال پہلے اسی طرح روشنیوں کے دُھندلکے نور میں نہائی کھڑی تھی اور اندر خیبر میل کی آمد آمد تھی۔ پلیٹ فارم نمبر چار پر بڑی گہما گہمی تھی۔ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس مرد اور حسین و جمیل عورتیں، دنیا جہان کی خوبصورتی اپنے جلو میں سمیٹے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس ہجوم میں کچھ لوگ اپنے پیاروں کی آمد کے منتظر تھے اور کچھ اپنے پیاروں کو الوداع کہنے آئے تھے۔ لوگوں کی نظریں بڑے کلاک کی طرف اُٹھتیں اور پھر بے چینی سے مشرق کی طرف لگ جاتیں۔

میاں محمد دین ٹمبر مرچنٹ اپنے سارے خاندان کے ساتھ سیڑھیوں کے پاس کھڑے تھے۔ آج اُن کا لڑکا اسد انگلینڈ سے ایروناٹیکل انجینئرنگ پاس کر کے آ رہا تھا۔ عزیز و اقارب اور دوست احباب کے چہرے مسرت سے کھلے پڑتے تھے۔ گیندے، گلاب [illegible] کے بڑے بڑے ہار اُن کے ہاتھوں میں جھول رہے تھے اور میاں صاحب [illegible] ہوئی تسبیح کے دانوں کو جلدی جلدی پھرا رہے تھے اور ہونٹوں [illegible] وہ دوسرے ہاتھ سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنی داڑھی کو بھی سمیٹ لیتے تھے۔ [illegible] بہنیں، پھوپھیاں، چاچیاں، خالائیں سب ایک گھیرے میں سمٹی کھڑی تھیں ـــــ [illegible] باپردہ لیکن نقاب اُلٹے ہوئے اپنے تازہ میک اپ کی بہاریں لٹا رہی [illegible] تھیں۔ سب بے چین تھیں، سب منتظر تھیں۔

آپ نے اُسے نہیں دیکھا۔ وہ اُس گھیرے سے ہٹ کر [illegible] وہ حوروں کو شرمانے والے حُسن کی مالک، جس کی آنکھوں میں تقدس [illegible] ملتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ جس کے لباس کی مخصوص تراش خراش [illegible] تھی جس کے پھول سے ہاتھوں کی نرمی سے تازہ گلابوں کا [illegible] میڈیکل کالج کے فائنل ایر کی طالبہ جس کے ملائم ہاتھوں کی [illegible] اُتارنے کو کافی تھی۔

نغمہ اپنے بھائی کے ساتھ اُس مجمع [illegible] بازو میں کھڑی تھی ـــــ اس آخری [illegible] تمنائیں اُس کے دل میں مچل رہی [illegible]

دلی جذبات کے ساتھ ساتھ کتنی تبدیلیاں ہو رہی تھیں یہ تو اُس وقت کے وہ لمحے ہی بتا سکتے ہیں جو بیت گئے۔

پلیٹ فارم کے اُس اُونگھتے ہوئے ماحول میں یکایک ہلچل مچ گئی۔ سنوتی کی طرف سے روشنی کی تیز کرنیں پلیٹ فارم کی طرف لپکیں اور پھر گڑگڑاہٹ کے ساتھ گاڑی پلیٹ فارم پر آن رُکی۔

اسد سیکنڈ کلاس کے دروازے میں کھڑا مُسکرا رہا تھا۔ سب اُدھر لپکے اور سب کے پیچھے نغمہ اپنے بھائی کے ساتھ شاہانہ وقار اور پُر تمکین انداز سے بڑھی۔

ایک لمحے کو افراتفری مچ گئی۔ اسد سے میاں محمد دین لپٹ گئے۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ ماں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ دوست احباب نے اُسے گھیر لیا اور پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا۔ دوسرے ہی لمحے اسد نے جھک کر اپنے پیچھے کھڑی ہوئی ایک میم کو آگے کر دیا۔

"اِن سے ملئے ابّی آپ کی بہو —— جینی!"

"اور جینی یہ ہیں میری ممی ——"

فلک کی وسعتوں سے آگ کا ایک گولہ دھما دھم کرتا نیچے آیا اور سیدھا نغمہ کے دل پر گِر کر دھک سے پھوٹ گیا۔ اُس نے اپنے بھائی کا بازو تھام لیا اور ایک قدم پیچھے سرک گئی۔

میاں محمد دین کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ان کی جیب میں تسبیح چلتے ہوئے تسبیح کے دانے رُک گئے۔

"اینڈ مائی ڈیڈی جینی —— !"

جینی آگے بڑھی اور ہاتھ بڑھا دیا۔

"پلیز ٹو میٹ یو ——"

ایک لمحے کو سب سکتے میں آ گئے!

میاں محمد دین کے ہاتھ کو تسبیح کے دانے آگ کے انگارے معلوم ہوئے۔ انھوں نے جلدی سے ہاتھ باہر نکال لیا۔ سب لوگ میاں محمد دین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میاں صاحب کے ردِ عمل کے منتظر تھے۔ وہ انتظار میں تھے کہ ابھی ایک بم پھٹا اور پھٹا۔

میاں صاحب نے چاروں طرف دیکھا اور سب کو اپنی طرف متوجہ پا کر تھوڑا گھوم کر نغمہ کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں کاجل پھیل رہا تھا۔ میاں صاحب کے چہرے پر ایک تغیر رُونما ہوا۔ اسد بولا ——

"ابا جی! جینی آپ کی شفقت کی منتظر ہے!"

اور میاں صاحب نے گردن جھکا کر جینی کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔ سب نے سکون کی سانس لی۔ سب کے تنے ہوئے چہرے مطمئن ہو گئے۔

اور نغمہ کی ایک ہلکی سی سسکی نکل گئی۔ اُس نے سر بھائی کے کاندھے پر ٹکا دیا اور بھائی اُسے سہارا دے کر فوراً باہر لے گیا۔

کسی عورت نے ہلکے سے سرگوشی کی۔

"اے۔ نغمہ بھی تو تھی پیچھے ——"

اُس کی آواز پر سب نے پیچھے مُڑ کر دیکھا

پیچھے ٹنگے ہوئے دو ہار پڑے تھے۔

اُس رات نغمہ ایک لمحہ نہ سو سکی۔ ساری رات روتی رہی —— لیکن صبح ایک نئی کرن لے کر بیدار ہوئی۔ عین ممکن تھا کہ برسوں پرانے اِن دونوں خاندانوں میں ٹھن جاتی۔ لیکن نغمہ کی تعلیم کام آئی۔ اُس نے گھر والوں کو سمجھایا کہ جب مجھے کوئی دُکھ نہیں تو آپ لوگوں کو کیا —— جو ہونا تھا سو ہو گیا۔

اور اُسی دن وہ ایک ساڑی کا بنڈل بنا کر اسد کے ہاں چلی گئی۔

وہاں جینی کو دیکھنے آنے والی عورتوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ جینی اور اسد خوش و خرم بیٹھے چہک رہے تھے کہ نغمہ ایک دم پہنچ گئی۔ شور یوں بند ہو گیا جیسے گرتا ہوا آبشار اچانک رُک جائے۔ عورتیں ہکا بکا ایک دوسری کو دیکھنے لگیں۔

"سلام اسد بھائی۔ شادی مبارک!"

اسد گُنگ ہو گیا۔ اُس سے کوئی جواب ہی نہ بن پڑا۔ نغمہ جینی سے مخاطب ہوئی جو حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"اینڈ بھابی مائی نیم اِز نغمہ، آئی ایم ہز کزن!"

"او —— !" جینی نے اس سے ہاتھ ملایا اور ہاتھ ملاتے ہی اس نے ساڑی کا بنڈل اُسے تھما دیا۔

جینی نے ساڑی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور مُسکرانے لگی۔

عورتیں طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگیں۔

"ڈوب نہ مری آتی۔ میں تو کبھی ایسے کا مُنھ بھی نہ دیکھتی!"

"ایسی عورتوں میں غیرت ہوتی کہاں ہے؟"

کوئی بولی۔

"اے بی کیا بُرا کیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اسے اور بہتیرے رشتے ایک سے ایک بڑھ کے!"

اب تک اُسے کسی نے بیٹھنے کو بھی نہ پوچھا تھا۔ اسد ہی بولا۔

"نغمہ بیٹھ جاؤ نا ——"

"تم نے جگہ ہی کہاں چھوڑی ہے!" وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

اور پھر جینی کو سالگرہ پہنائی گئی اُس کے فوٹو کھینچے گئے اور خوب تفریح رہی۔

پک نک پارٹیوں میں نغمہ ضرور ساتھ ہوتی اور خوب چہکتی۔ اسد کچھ دن تو شرمندہ شرمندہ سا رہا لیکن پھر نغمہ کی بے تکلفی دیکھ کر وہ بھی سب کچھ بھول گیا۔ وہ کبھی کبھی سوچتا کہ جینی کو لاکر اُس نے شادی غلطی کی ہے۔ نغمہ بہترین بیوی ثابت ہو سکتی تھی لیکن پھر خود ہی اِس کی تردید کر دیتا۔

دو سال ہنستے کھیلتے گذر گئے اور نغمہ ایم بی بی ایس کرکے گنگا رام ہسپتال میں ڈاکٹری کرتی رہی۔

اور پھر ایک دن اُس نے خوش خبری سنائی کہ اُسے سکالرشپ مل گیا ہے۔ سب خوش ہوئے اور ایک دن وہ ایف آر سی ایس کرنے انگلینڈ چلی گئی۔

اِس دوران میں بڑے بڑے انقلابات رُونما ہوئے۔ اسد کے دو بچے ہو گئے۔ جینی نے اُس سے طلاق لے کر ڈائرکٹر آف ایجوکیشن سے شادی کر لی۔ اسد کی ماں کا انتقال ہو گیا اور اسد ملک کا مایۂ ناز ایروناٹیکل انجنیئر بن گیا۔

اسد برابر نغمہ کو خط لکھتا رہا۔ جس میں وہ ایک ایک لمحے کی داستان لکھتا۔ وہ ہر خط میں نغمہ کو ایک لگا ہوا پان بھیجتا اور اُس کے خط پاکر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ اُس نے جینی کی طلاق اور شادی کی بات بھی اُسے لکھ دی تھی اور جینی سے شادی کرنے کی غلطی کا بھی اعتراف کر لیا تھا اور اُس سے معافی بھی مانگ لی تھی۔ اُسے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ وہ اُس کا بیچینی سے منتظر ہے!

اور پھر ایک دن نغمہ کا خط آیا کہ وہ آ رہی ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے باہر ایک لمبی سی کار رُکی اور اُس میں سے اسد نکل کر ریلوے سٹیشن کی بلڈنگ میں داخل ہو گیا۔

ریلوے سٹیشن اُسی طرح اپنی تمام رعنائیوں کو جلو میں سمیٹے جگمگا رہا تھا۔ اِس عرصے میں اُس کے حُسن میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ فلورنس لائٹس کی وجہ سے اسٹیشن کے ماحول میں ایک غنودگی سی رچ گئی تھی۔ ایک اپنائیت سی پھیل گئی تھی۔ ایک حُسن سا بکھر گیا تھا۔

آخری سیڑھی کے ساتھ ہی پلیٹ فارم نمبر چار اپنی کشادہ چھاتی بچھائے پڑا تھا۔ گہما گہمی کا وہی عالم تھا۔ لوگ باگ اپنے پیاروں کی آمد سے سرشار تھے۔ اپنے پیاروں کے بچھڑنے کے غم میں اُداس تھے۔ ایک پلیٹ فارم تھا۔ ایک دنیا تھی۔ خوشی اور غم شانہ بشانہ تھے۔ لوگوں کے چہروں پر محبت کی آنچ بھی تھی اور خلوص کی سرشاری بھی۔

اور میاں محمد دین اُسی سیڑھی کے پاس کھڑے تسبیح کے دانوں سے کھیل رہے تھے۔ اُس خاندان کے آج کے ہجوم میں کچھ نہ ہی عورتیں تھیں کچھ وہی لوگ تھے۔ کچھ نئی عورتیں نہیں پھرنے لگے تھے۔ سب مشرق کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اسد کوکا کولا کے اسٹال کی اوٹ میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا اور نغمہ کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تمنائیں اُس کے دل میں مچل رہی تھیں اور گلاب کے پھولوں کا ہار اُس کے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔

پلیٹ فارم پر ہلچل مچی۔ گڑگڑاہٹ سنائی دی اور گاڑی پلیٹ فارم پر آن رُکی۔ نغمہ شانِ بے نیازی سے اُتری۔ سب نے اُسے گھیر لیا۔ اسد بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور قریب تھا کہ وہ ہار نغمہ کے گلے میں ڈال دیتا کہ نغمہ پیچھے کو مُڑ گئی۔ ایک گورا گاڑی سے اُتر رہا تھا۔ اُس نے اُس کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"میٹ مائی ہسبنڈ مسٹر جان ٹامس!"

جان ٹامس مُسکرایا اور اسد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

اسد کے ہاتھ پر ہزاروں بچھو چمٹ گئے۔ اُس کی تمناؤں کے محل خاکستر ہو گئے۔ بدن لرز کر رہ گیا۔ ساری جان سمٹ کر اُس کی آنکھوں میں آ گئی۔ اُس نے لرزتی پلکوں سے نغمہ کو دیکھا۔

"بے غیرت!" دو لفظ اُس کی زبان سے نکلے اور پھر اُس نے ہار کو نوچ کر پھینک دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا ——— نغمہ آگے بڑھی اور اُس نے مُسکرا کر ٹوٹے ہوئے ہار کو اُٹھا لیا۔

عورتوں نے دانتوں تلے اُنگلیاں دبالیں۔ سب پیچھے کو سرک گئے۔ کوئی آگے نہ بڑھا ——— بڑھا تو میاں محمد دین ——— جس کے چہرے پر اطمینان تھا جس کے چہرے پر سکون تھا۔ اُس نے جان ٹامس سے ہاتھ ملایا۔ بے باپ کی بچی نغمہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اُن دونوں کو لے کر اسٹیشن سے باہر آ گیا۔

دوسرے دن اسد کو ایک لفافہ ملا۔ وہی نغمہ کی مانوس تحریر تھی ———

اسد!

میں جانتی تھی کہ تم اسٹیشن پر آؤ گے اور اپنی اُمیدوں کے پھولوں کا ہار لے کر آؤ گے اور اُسی طرح ٹوٹو گے جس طرح آج سے پانچ سال پہلے میں ٹوٹی تھی۔ میں نے بھی ہار نوچ کر یونہی پھینکا تھا جس طرح تم نے پھینکا ہے۔ میرا دل بھی یونہی ٹکڑے ٹکڑے ہوا تھا جس طرح تمہارا ہوا ہے لیکن اُس وقت یہ کسک صرف میں نے ہی محسوس کی تھی۔ یہ دُکھ، یہ کرب صرف میں نے ہی جھیلا تھا تم اِس سے واقف نہ تھے۔ تم اُس سے آگاہ نہ تھے۔

لیکن اب تو تمہیں اُس وقت کی اذیت کا احساس ہو گیا ہو گا۔ اُس وقت جو مجھ پر بیتی تھی۔ اس سے صرف میرا دل ہی

جتنا تھا مطلب اُس دُکھ، اُس اذیت، اُس کرب کا مزہ تم نے بھی چکھ لیا ہے —— میں جانتی ہوں اُس رات میری طرح تمہیں بھی نیند نہ آئی ہوگی۔

احمد! کیا غیر ممالک میں جا کر شادی کر چالینا صرف مردوں ہی کا حق سمجھا جاتا ہے، عورتوں کو نہیں؟ اگر مرد اُس اذیت کا صرف تھوڑا سا تصور بھی کر لیں جو مردوں کے غیر ممالک سے اپنے ساتھ بیویاں لانے پر زیادہ تر مشرقی عورتوں کو ہوتی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ کوئی مرد اپنے ساتھ غیر ممالک سے بیوی نہ لائے۔

—— تم نے مجھے "بے غیرت" کہا۔ میں خوش ہوں لیکن میں پوچھتی ہوں کیا غیرت صرف عورتوں ہی کے لئے رہ گئی ہے؟ مردوں کے لئے نہیں ——!

چلو چھوڑو، جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب میری طرح دل پہ پتھر کی سِل رکھ لو۔

لیکن اب جب کہ تم میری طرح اذیت کی آگ میں جل ہی چکے ہو تو کیا میں تمہیں بتا نہ دوں کہ عورت پھر عورت ہوتی ہے وہ "بے غیرت" نہیں ہوتی —— مسٹر جان ٹامس مشرقی علوم حاصل کرنے کے لئے یونیورسٹی میں داخل ہونے آئے ہیں، اُن سے صرف راہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میرے شریکِ حیات نہیں لیکن اِس مذاق میں وہ میرے شریک ضرور تھے اور وہ ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔

اب تم جلدی سے اپنا سا منہ لے کر آ جاؤ!۔

تمہاری

نغمہ

غزل

ابرؔ احسنی گنوری

دکھایا دوست نے جلوہ کچھ اس اندازِ کامل سے — نظر پر پڑ گئے پردے حجاب اُٹھنے لگے دل سے
جگر سے تیر نظروں سے تمنائیں الم دل سے — دُعائیں سب تمہیں دیتے ہیں اپنی اپنی منزل سے
غمِ دوراں غمِ جاناں غمِ پستی غمِ ہستی — ہزاروں سنگ ٹکرائے ہیں آ کر شیشۂ دل سے
کنارے پر بھنور سے بھی زیادہ حشر برپا تھا — پلٹ آیا پڑا طوفان کے دامن میں ساحل سے
کہاں اُٹھتے ہیں اب تھک کر سرِ رہ بیٹھنے والے — سکونِ مستقل دیتا رہے آوازِ مشکل سے
جنونِ عقل کے مارے ہوئے قدر اس کی کیا جانیں — کوئی دیوانہ صدیوں میں ہوا کرتا ہے مشکل سے
یہ اعجازِ محبت جب کبھی میں فرقت سے گھبرایا — تری آواز سے ملتی ہوئی آئی صدا دل سے
جلے جاتے ہیں اِس کی روشنی میں کتنے پروانے — نکلتے ہیں قیامت کے اندھیرے شمعِ محفل سے

حیات و موت اُن کے دور میں ہیں ایک مرکز پر
نظر آتے ہیں اب زندہ بشر بھی ابرؔ بسمل سے

غزل

علی احمد جلیلی ایم اے

غم و درد میں مسکرانا پڑے گا — تجھے زندگی، آزمانا پڑے گا
اُجالا تو ممکن ہے ظلمت کدے میں — مگر بجلیوں کو بُلانا پڑے گا
پسِ پردہ جلوؤں کا قائل نہیں ہیں — تجھے سامنے میرے آنا پڑے گا
بہاریں تو مانگی تھیں پر کیا خبر تھی — بہاروں کا ماتم منانا پڑے گا
ہر اِک سجدہ توہین ہے بندگی کی — یہ دھبہ جبیں سے مٹانا پڑے گا
جہاں دو قدم چل کے میں ٹھہر جاؤں — وہیں چل کے منزل کو آنا پڑے گا
رہِ عشق میں شمع کیا کام دے گی — ہر اک گام پر دل جلانا پڑے گا

ذرا پارسائی کا ماتم تو کر لوں
بہار آتے ہی جام اُٹھانا پڑے گا



آپ کی ساری دُھلائی جگمگاتی سفید! بیداغ صاف! اِس لئے کہ سَرف میں دُھلائی کی زائد قوت ہے۔ ڈھیروں جھاگ! آپ کے سبھی کپڑے کتنی آسانی سے دُھلتے ہیں۔ بچّوں کے لباس، قمیضیں، ساڑھیاں... ہر کپڑا زیادہ سے زیادہ سفید، زیادہ سے زیادہ صاف۔ گھر میں دھوئیے، سَرف سے دھوئیے۔

سَرف سے کپڑے سفید ترین دُھلتے ہیں!

ہندوستان لیور لمیٹڈ

لنٹاس SU. 49-140-45 UD

کیا نام کہ...

ظفر عالمگیر ایم اے

3/19/D/III ناظم آباد کراچی (۱۸) پاکستان

۹ اگست ۱۹۶۵ء

خورشتر بھائی! تسلیمات

جون میں مکان تبدیل کیا تھا لیکن اطلاع اس لئے نہ دے سکا کہ ایک نامکمل افسانہ مکمل کر کے بھیجنا چاہتا تھا۔ میں یہ افسانہ، افسانہ نمبر کے لئے لکھ رہا تھا لیکن اس کا آخری حصہ اب تک نہ لکھا جا سکا ــــــ سالنامہ کے لئے اسے مکمل کر کے بھیج دوں گا۔ آج ایک مزاحیہ افسانہ ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے پسند آئے گا ــــــ پتہ کی تبدیلی نوٹ فرمالیں۔

ثریا آپ کو سلام کہتی ہیں۔ اپنے شغلوں کے متعلق ایک مضمون آپ کو بھیجنا چاہتا ہوں بشرطیکہ راجہ مہدی علی خاں اجازت دیں۔ اُن سے ڈر اس لئے لگتا ہے کہ وہ کتوں کا کاروبار کرتے ہیں اُنھوں نے دو چار ولایتی نسل کے کتے بھیج دیئے تو مجھے خودکشی کرنے کی بھی مہلت نہ مل سکے گی۔

آپ کا ــــــ ظفر عالمگیر

مسعود نے آخر تنگ آکر ایک شام جہاد کی نیت باندھی اور پڑوس کے دروازے پر جا پہنچا۔ دروازہ بند تھا اور ایک چھوٹی سی تختی دروازے پر اس طرح لگی ہوئی تھی جیسے کوئی بدوضع ڈیل ڈول کا بھاری بھرکم آدمی پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اچھی سی نکٹائی لگالے۔ تختی پر لکھا ہوا تھا ــــــ ''محمد جلال ولد محمد جان عالم صاحب النقوی والتقوی جیت پوری حال مقیم لندن''۔ مسعود نے تختی پر ایک نظر ڈالی اور دروازے پر دستک دی۔

''کون؟'' بے حد کرخت آواز آئی۔ مسعود نے ایک بار پھر دستک دی۔

''ارے کون ہو، نام کیوں نہیں بتاتے ہو، خواہ مخواہ دروازہ ٹھونکے جاتے ہو۔ کیا نام کہ ایک منٹ کو دم تو لو'' جانِ عالم صاحب نے گرجتے ہوئے دروازہ کھولا۔

''السلام علیکم!'' مسعود نے غصیلی کر کہا۔

''فرمایئے آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''آپ ہی سے ملنا ہے مجھے''

''مجھ سے؟ کیا نام کہ مجھ سے آپ کو ملنا ہے!'' جانِ عالم صاحب حیرت سے چیخ پڑے۔

''جی ہاں!''

''کیا نام کہ میرا نام تو جانِ عالم ہے!''

''جی ہاں مجھے آپ ہی سے کام ہے۔ میں آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں''

''اوہو تو آپ ہمارے پڑوسی ہیں! کیا نام کہ اندر آجایئے نا، تشریف رکھئے ادھر، یہ صوفہ بہت آرام دہ ہے۔ کیا نام کہ پہلی بار جب میں اِس پر بیٹھا تو بیٹھتے ہی سو گیا''

''جی'' مسعود صوفے پر بیٹھ گیا اور جانِ عالم صاحب اندر لپکے۔

''کہاں ہو تم۔ ارے او جلال کی ماں!''

''کیوں بوکھلا رہے ہو، پھر تم نے جلال کہا اُسے۔ دس دفعہ جتا چکی ہوں کہ'' جانِ عالم صاحب کی بیگم نے باورچی خانے سے آواز لگائی۔

''اوہو! میں تو بھول ہی گیا، کیا نام کہ'' جانِ عالم صاحب ہکلانے لگے۔

''بالشت برابر کا لڑکا لندن جا پہنچا، اتنا بڑا ریڈیو بھجوایا تمھیں، صوفے کا روپیہ الگ سے بھجوایا اور تم اُسے جلال پکارو، واہ!''

''اوہو سنو تو، میں کہہ رہا ہوں، کیا نام کہ'' جانِ عالم صاحب کے حواس ابھی تک درست نہیں ہوئے تھے۔

''باہر کون ہے؟''

"یہی تو کہنے آیا تھا کہ جلال میاں نے ریڈیو کیا بھیجا محلے میں ہماری بھی عزت ہو گئی۔"

"کیوں؟"

"وہ اپنے پڑوسی ہیں نا! کیا نام کہ جو محلے میں کسی کو منہ نہیں لگاتے دہی۔"

"مقصود کے ابا کو کہہ رہے ہو؟"

"ہاں ہاں وہی اپنے برابر والے کیا نام کہ وہ آئے ہیں مجھ سے ملنے۔ میں تو حیران ہوں۔"

"کس طرح بٹھایا ہے انھیں یا باہر ہی کھڑا کر دیا ہے۔"

"صوفے پر بٹھایا ہے۔ اب تم کیا نام کہ جلدی سے چائے بنا دو۔ جلال میاں کو خدا سلامت رکھے۔ اب کچھ پیسے بھیج دیں تو میں ....."

"اب تم باہر جا کر بیٹھو۔"

"اچھا چائے ذرا جلدی سے ہاں!" جانِ عالم صاحب لہراتے ہوئے باہر نکلے اور مسعود کے برابر جا بیٹھے۔

"ہاں تو جناب کا نامِ نامی؟"

"مسعود!"

"ہاں تو مسعود صاحب خیریت تو ہے نا؟"

"جی ہاں ہر طرح سے خیریت ہے۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔ میں آج آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ"

"فرمایئے" جانِ عالم صاحب کھسک کر مسعود سے جا لگے اور اپنا منہ مسعود کے کان سے لگاتے ہوئے بولے "قرض ورض تو نہیں چاہیئے نا؟"

"توبہ کیجئے صاحب! اللہ کا دیا بہت کچھ ہے!" مسعود جھلا اٹھا۔

"اور میرے پاس بھی کیا نام کہ کچھ کمی نہیں ہے!" جانِ عالم صاحب نے گردن کو زوردار جھٹکا دے کر فرمایا۔

"ماشاء اللہ ماشاء اللہ! آپ اس سے پہلے کہاں تشریف رکھتے تھے؟" مسعود نے نفرت سے پوچھا۔

"یعنی آپ کے آنے سے پہلے کیا نام کہ صحن میں چارپائی پر لوٹ رہا تھا۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ یہاں تو سال بھر سے رہ رہے ہیں، اس سے پہلے جناب کہاں مقیم تھے؟"

"میں تو کراچی کے ہر محلے میں رہ چکا ہوں۔"

"اچھا!"

"جی ہاں کیا نام کہ لالو کھیت میں۔ لانڈھی میں، لیاقت بستی میں، قائدآباد میں۔"

"میں آپ سے یہ عرض کرنے حاضر ہوا تھا کہ ریڈیو آپ نے ..." مسعود کہہ رہا ہی تھا کہ جانِ عالم صاحب نے فوراً بات کاٹ دی۔

"یہ ریڈیو ـــــ کیا نام کہ میرا لڑکا ہے نا جلال ادھر جلال میاں ہے نا؟"

"جی!"

"آپ تو جانتے ہوں گے نا اُسے؟"

"میں واقف نہیں ہوں کیا وہ اسی مکان میں رہتے تھے؟"

"نہیں میرے یہاں آنے سے کچھ دن پہلے یعنی پارسال وہ لندن گیا ہے کیا نام کہ آپ اُسے نہیں جانتے؟ وہ لندن میں کسی جگہ ملازم ہے۔ کسی اچھے عہدے پر ہو گا اور پھر لندن، کیا نام کہ اچھے اچھے تو یہاں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں نوکری کے لئے، لندن کیا نام کہ لندن ہے وہاں تو کیا نام کہ"

"میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ ریڈیو....."

"جی کیا نام کہ میں کیا عرض کر رہا تھا ہمارے جناب کیا نام کہ ـــــ کیا نام بتایا تھا آپ نے اپنا؟"

"مسعود"

"مسعود صاحب میں کہہ رہا تھا جلال میاں نے یہ ریڈیو لندن سے بھجوایا ہے۔ کیا بڑھیا چیز ہے۔ جو دیکھتا ہے کیا نام کہ دیکھتا ہی رہ جاتا ہے!"

"جی ہاں بجا ہے۔ بڑے اعلیٰ درجے کی چیز ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ آپ کے صاحبزادے نے لندن سے بطور تحفہ بھیجا ہے۔"

"جی میرا دل تو کیا نام کہ بہت ہی خوش ہوا اسے پاکر۔"

"میں اسی سلسلے میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا آپ کو اس ریڈیو کا نام معلوم کرنا ہے؟ کیا نام کہ آپ بھی خریدنا چاہتے ہیں ایسا ہی ریڈیو؟"

"جی نہیں! میرے پاس ریڈیو موجود ہے" مسعود نے جھلا کر کہا۔

"مگر اس ریڈیو کی بات تو کیا نام کہ اسی کے ساتھ ہے۔ یہاں کے ریڈیو اس کا کیا مقابلہ کریں گے!"

"میرے پاس جرمنی کا بڑا اعلیٰ درجے کا ریڈیو ہے" مسعود ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔

"ہو گا ہو گا!" جانِ عالم صاحب نے بُرا سا منہ بنا کر کہا اور دوسری طرف منہ پھیرتے پھیرتے وہ اچانک اس طرح پلٹے جیسے کوئی بہت ہی نادر خیال اُن کے ذہن میں آ گیا ہو اور چیخ پڑے ـــــ

"لندن کے لوگ تو کیا نام کہ بڑے اعلیٰ ریڈیو بناتے ہیں اور پھر کیا آپ کو یاد نہیں ہے

"مجھے سب کچھ یاد ہے جانِ عالم صاحب! میں آپ کے ریڈیو کا شجرہ نسب پوچھنے حاضر نہیں ہوا ہوں" مسعود نے جھلا کر کہا۔

"کیا نام کہ" جانِ عالم صاحب سوالیہ نشان بن کر رہ گئے۔

"میں یہ کہنے حاضر ہوا تھا کہ آپ کے پڑوس میں کچھ شریف آدمی رہتے ہیں" مسعود نے اتنا ہی کہا تھا کہ جانِ عالم صاحب بھڑ اُٹھے۔

"جی ہاں، جی ہاں، ہم بھی کیا نام کہ شرافت کے پتلے ہیں۔ جلال میاں، کیا نام کہ ندن میں ملازم ہیں اور ہمارے والد اور ہمارے دادا ریاست جیسلپور کے مشیر رہ چکے ہیں۔ کیا نام کہ بچہ بچہ اُن کو جانتا ہے آپ کو تو معلوم ہی ہے۔"

"جی ہاں میری معلومات بے حد وسیع ہیں۔ میں کراچی کے ہر شخص کی اگلی پچھلی سات سات پشتوں سے واقف ہوں!"

"کیا محلے میں آپ کو کسی سے تکلیف ہے، یا ہم شریفوں کے بیچ کوئی رذیل آگرا ہے"

جانِ عالم صاحب نے بہت ہی رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"جی نہیں میں تو آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"

"فرمایئے فرمایئے! آپ کوئی کمیٹی ویٹی تو نہیں بنا رہے ہیں نا، بندہ ایسے بکھیڑوں سے دور بھاگتا ہے"

"آپ سُنیں تو سہی"

"فرمایئے!"

"آپ کا ریڈیو روزانہ رات کے دس بجے تک اس قدر اونچی آواز سے بجتا ہے کہ ہمیں اپنے گھر میں کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی، ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم کسی چھ پیسے والے ہوٹل میں بیٹھے ہوں"

مسعود نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا ——— جانِ عالم صاحب سر دبڑ گئے۔ دو تین لمحوں کے بعد انھوں نے کہا۔

"کیا نام کہ آپ چاہتے ہیں ہم اپنے گھر میں ریڈیو نہ سُنیں"

"یہ تو میں نے نہیں کہا ہے، لیکن . . . ." ابھی نوبت یہیں تک پہنچی تھی کہ بیگم نے آواز دی۔

"چائے لے جایئے!"

جانِ عالم صاحب صوفے پر اُچک کر اکڑوں بیٹھ گئے اور دروازے کی طرف مُنھ پھیر کر بولے۔

"رہنے دو چائے وائے یہ صاحب کیا نام کہ چاہتے ہیں کہ ہم ریڈیو نہ سُنا کریں۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ کیا نام کہ یہ چھ پیسے والے ہوٹل میں پڑے ہیں"

"یہ کون ہوتے ہیں ٹوکنے والے؟" بیگم نے پنجے جھاڑے اور دروازے میں اس انداز سے نکل آئیں جیسے مسعود کو صوفے سے اُٹھا کر باہر پھینک دیں گی۔

"میں آپ سے لڑنے نہیں آیا ہوں۔ جب آپ کو شرافت کا دعویٰ ہے تو شریفانہ انداز میں گفتگو کیجیے" مسعود نے بھی آستین چڑھائی۔

"جلال کی ماں تم اندر جاؤ" جانِ عالم صاحب نے بیوی کو پچکارا۔

"پھر تم نے جلال کہا؟" بیوی نے آنکھیں دکھائیں۔ جانِ عالم صاحب نے فوراً آنکھیں بند کرلیں۔

"اوہو کیا نام کہ جلال میاں کی ماں تم اندر جاؤ! ہاں تو کیا نام کہ آپ نے اپنا کیا نام بتایا تھا میرے ذہن سے اُتر گیا"

"میرے بھی ذہن سے اُتر گیا کہ میرا کیا نام ہے" مسعود نے چڑ کر کہا۔

"کیا نام کہ ——— کیا نام کہ ——— اوہو مسعود صاحب آپ کو تکلیف ہوتی ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ میرے ریڈیو کی آواز ہی ایسی ہے۔ اصلی ریڈیو ہے نا کوئی ایسا ویسا ریڈیو تو ہے نہیں کہ بیں بیں کرے۔ میں بھی اس کی آواز سے تنگ آکر کبھی کبھی اُسے بند کر دیتا ہوں"

"لیکن آپ اُس کی آواز کم بھی تو کرسکتے ہیں؟" مسعود نے حیرت سے کہا۔

"کم، کیا نام کہ کم؟" جانِ عالم صاحب اُچھل پڑے

"جی ہاں ریڈیو کی آواز کم، زیادہ ہوسکتی ہے"

"کیا نام کہ اس طرح تو ریڈیو خراب ہو جائے گا"

"نہیں حضور! یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آواز کو بڑھانے یا کم کرنے سے ریڈیو خراب ہو جاتا ہے، ہر ریڈیو میں والیوم کنٹرول ہوتا ہے۔ کیا آپ کے ریڈیو میں والیوم کنٹرول نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں ہے، کیوں نہیں ہے، اس میں تو ہر چیز ہے اتنے بڑھیا ریڈیو میں بھلا کیا نام کہ وہ کیا کہا تھا آپ نے، کیا نہیں ہے؟"

"والیوم کنٹرول"

"جی ہاں! ضرور ہوگا، لیکن کیا نام کہ ہمارا بھتیجا ہے نا ادریس کرکے، اُسی نے آکر ریڈیو لگا دیا تھا، تار بھی اُسی نے لگایا اور وہ ——— وہ ——— کیا نام کہ" جانِ عالم صاحب ہکلانے لگے۔

"جی ہاں میں سمجھ گیا آپ پلگ کو کہہ رہے ہیں"

"ہاں وہ بھی کیا نام کہ ادریس ہی نے لگایا ہے ورنہ ہم کون کیا نام کہ بجلی کا کام جانتے ہیں"

"لیکن اس کے لئے بجلی کا کام جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ لوگ جو ریڈیو رکھتے ہیں کیا سارے ہی بجلی کا کام جانتے ہیں؟"

"آپ بجے نہیں! آجکل کیا نام کہ ریڈیو پڑھے لکھے لوگوں کے پاس ہوتے ہیں۔ وہ ریڈیو کو بجتے ہیں۔ میری تعلیم کیا نام کہ ابھی ہی واجبی ہے۔"

"مگر آج کل جاہل اور کیا پڑھے لکھے، سب ہی ریڈیو اور ٹرانزسٹر لئے پھرتے ہیں؟"

"مگر جاہلوں کا ریڈیو [illegible] ہے۔"

"بلکہ ریڈیو کے لئے اعلیٰ تعلیم ہونا ضروری نہیں ہے۔ ادھر آپ نے سوئچ دبائی اور آپ کا ریڈیو آن ہو گیا۔"

"تو کیا نام کہ لکڑی کے تختے پر کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں پڑتی؟ کیا نام کہ شاٹ واٹ؟"

"کیا آپ تختے پر کھڑے ہوکر....."

"جی ہاں! میں تو بہت احتیاط سے ہر کام کرتا ہوں۔ کیا نام کہ اس عمر میں بجلی کا شاٹ میری جان ہی لے لے گا۔ کیا نام کہ وہ دیکھئے لکڑی کا تختہ ڈال رکھا ہے میں نے، اُس پر کھڑے ہوکر کیا نام کہ۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" مسعود اچھا خاصا سوالیہ نشان بن گیا۔

"جی ہاں، ادریس نے تار لگا دیا تھا۔ میں تو بس ایک وہ دیکھئے کیا نام کہ سفید سا ٹکڑا ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"میں تو بس اُسے دبا دیتا ہوں کہ کیا نام کہ بس ایک دو منٹ کے بعد آواز شروع ہو جاتی ہے۔"

"شاید آپ ایک ہی اسٹیشن سنتے ہیں۔"

"ادریس سے میں نے کہہ دیا تھا کیا نام کہ مجھے کون شوق ہے۔ بس اُس نے کراچی لگا دیا تھا۔"

"ذرا لگائیے تو آپ ریڈیو۔" مسعود نے کہا۔

"اچھا میں ذرا تختہ...." جانِ عالم صاحب اُٹھے اور تختے کی طرف لپکے جو ایک طرف رکھا ہوا تھا۔

"اُس تختے کو رہنے دیجئے۔" مسعود نے روکا۔

"نہیں جناب شاٹ واٹ...."

"ارے صاحب! آپ تو ریڈیو سے اس طرح ڈر رہے ہیں جیسے ریڈیو نہیں دیوانہ کتا ہے!"

"تو پھر آپ لگائیں۔" جانِ عالم صاحب نے جان کی خیر مناتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے۔

مسعود نے ریڈیو آن کیا اور ریڈیو پر ہاتھ رکھے آواز کا انتظار کرنے لگا۔

"کیا نام کہ آپ کو جھٹکا نہیں لگتا؟" جانِ عالم صاحب حیرت سے اچھل پڑے۔

"نہیں صاحب!"

"کیا نام کہ غضب ہو گیا!" ــــ جانِ عالم صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

جب مسعود نے انہیں بتایا کہ آواز کس طرح کم کی جا سکتی ہے اور سوئی کس طرح گھمائی جاتی ہے تو جانِ عالم صاحب خوشی سے پاگل ہوتے ہوتے رہ گئے۔

"واہ بھئی واہ کمال ہو گیا! کیا نام کہ میں جب کبھی ریڈیو کی آواز کم کرتا تھا تو [illegible] تھا کوئی خرابی ہوگی۔ مجھے تو کیا نام کہ معلوم ہی نہیں تھا کہ...."

"آپ کے بھتیجے نے آپ کو نہیں بتایا تھا؟"

"نہیں وہ تو کیا نام کہ بڑا ہی ڈھیلا ہے۔ جب سے جلال میاں لندن گئے اُس نے آنا ہی چھوڑ دیا۔ ریڈیو آیا تو دس بار اُس کے گھر گیا تب کہیں وہ آیا اور وہ بھی کیا نام کہ دو منٹ کے لئے!"

"اچھا اب تو آپ نے سمجھ لیا نا؟"

"جی ہاں جی ہاں! کیا نام کہ ارے جلال کی ماں، او ہو جلال میاں کی ماں دیکھا تم نے؟" جانِ عالم صاحب نے پکارا۔

"کیا ہوا ہے؟" اُن کی بیگم دروازے میں آ دھمکیں۔

"کیا نام کہ یہ ــــ یہ ــــ اپنے مسعود صاحب ہیں، کیا نام کہ انہوں نے مجھے بتا دیا ہے۔ تم کہتی تھیں نا اس کی آواز سے کان پھٹے جاتے ہیں۔"

"یعنی آپ دونوں بھی اس ریڈیو کی آواز سے بیزار تھے؟" مسعود حیران تھا۔

"جی ہاں جی ہاں! کیا نام کہ آپ کا بہت بہت شکریہ! ارے جلال کی ماں کیا نام کہ چائے وائے؟"

"پھر تم نے کہا جلال؟" بیگم نے آنکھیں نکالیں۔

"اوہ ہو جلال میاں کی ماں کیا نام کہ...." جانِ عالم صاحب کہتے کہتے صوفے میں دھنس گئے۔

غزل

سیّد حباب ترمذی

رُخ سے نقاب اُٹھا کے کوئی مُسکرا دیا — ہر سمت رنگ و نُور کا دریا بہا دیا

دُشواریوں نے راہِ طلب میں مزا دیا — ناکامیوں نے اور مرا دل بڑھا دیا

دل لے کے مجھ کو زہرہ جبینوں نے کیا دیا — ہر گام پر حسین فریبِ وفا دیا

صد شُکر روز روز کا جھگڑا مٹا دیا — اچھا کیا جو آپ نے مجھ کو بھلا دیا

صدقے تمہارے حاصلِ لُطف و عطا دیا — دونوں جہاں دیئے کہ غمِ لا دوا دیا

دل سے قریب ہو کے بھی تم نے بھلا دیا — میری محبتوں کا یہ اچھا صلا دیا

کیونکر کہوں کہ مجھ کو زمانے نے کیا دیا — ہر ہر قدم پہ ایک نیا تجربا دیا

آج اُن کی چشمِ مست مری سمت یُوں اُٹھی — جیسے کسی نے ساغرِ صہبا پلا دیا

ہر سمت تا بحدِ نظر پھول کھل گئے — تم مُسکرا دیئے کہ جہاں مُسکرا دیا

دل توڑ کر کسی نے مری آس توڑ دی — روشن تھا اک چراغ اُسے بھی بجھا دیا

بے رحم دوستوں کی نوازش رہے گی یاد — اک اور تازہ زخم بنامِ وفا دیا

عقل و خرد نے مہر و وفا کو بصد خُلوص — ترکِ تعلقات کا کیوں مشورا دیا

یہ بات مجھ کو یاد رہے گی تمام عُمر — اپنے نیاز مند کو تم نے بھلا دیا

رے کر یہ لُطفِ خاص غرورِ جمال اُنہیں — قدرت نے مجھ کو جذبۂ مہر و وفا دیا

ہارونہ کو نہ بھول سکوں گا کبھی حباب
جس کے خلوص نے مجھے شاعر بنا دیا

پلکیں جھکی جھکی سی

—— پروفیسر انور سیوانی۔ ایم، اے
شیخ محلہ، نئی گلی۔ سیوان ضلع سارن (بہار)

۱۸ اگست ۱۹۶۵ء

محترمی خوشتر صاحب! تسلیمات

جولائی اور اگست کے شمارے نظر نواز ہوئے۔ اشاعت کے لئے ممنون ہوں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ "بیسویں صدی" ترقی کرتا جا رہا ہے۔ اب تو عام شمارے بھی خاص نمبروں کی طرح دلکش ہوتے ہیں۔ —— اپنی نئی تخلیق "پلکیں جھکی جھکی سی" بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ کہانی پسند آئے گی۔ مجھے خود یہ کہانی پسند ہے۔ اور حلقۂ احباب میں بھی بہت پسند کی گئی ہے . . .

نیازمند —— انور

جھکی ہوئی پلکیں کچھ اور جھک گئیں

تمہارا حسین چہرہ جس پر وقت اور حالات کے نہ جانے کتنے کارواں گزرے ہوں گے۔ جانے کتنی کیفیات کا مرقع بن گیا۔

لمحہ بھر، صرف لمحہ بھر کے لئے میری آنکھیں تمہارے حسین چہرے کے خد و خال کا پیدا کر سکیں۔

کتنی مدت کے بعد ہم ملے تھے! جدائی میں تڑپتے لمحوں نے نہ جانے کتنے زمانوں، مہینوں اور سالوں کو حسرت بھری نگاہوں سے اپنے سے دور ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ تنگ دل حالات کا جبر! انھوں نے جذبات پر کیسے کیسے ستم توڑے! آرزوؤں اور تمناؤں کو پامال کر کے احساسات کو کیسا مفلوج بنا دیا۔

پھر بھی ہم جیتے ہیں۔ جیتے رہنے کے لئے مجبور بنا دیئے گئے ہیں۔

کیا یہ وہی زندگی ہے جسے ہم نے چاہا تھا، جسے ہم نے پیار کیا تھا اور جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر ہم نے مستقبل کے سندر سپنے دیکھے تھے۔

یہ تو اپنی زندگی نہیں رعنا! یہ تو ایک خول ہے جسے حالات نے ہمارے وجود کو ڈھکنے کے لئے تیار کیا ہے۔

بھلا بھلائے جا سکتے ہیں رعنا! وہ دن جو کبھی اپنے تھے۔

ہاں وہ دن جو کبھی اپنے تھے۔ تمہارے ساتھ گزرے ہوئے دن! جب زندگی چاندنی راتوں کی طرح حسین تھی۔ ہمارے دل آرزوؤں اور تمناؤں سے سرشار رہتے تھے ہم نے سمجھا تھا کہ زندگی حسن و لطافت کا نام ہے۔ زندگی بہاروں کی پُرمسرت صبح ہے۔

تمہارے پیار کی لطافت، تمہارا سحر زا حسن، تمہارے ناز و انداز اور محبت کی سرشاریوں میں، تمہارے عہد و پیمان، مجھے سب یاد ہیں۔ میرے دل پر ان کا نقش تاباں ہے۔ ہمیشہ تاباں رہے گا۔ جبر، مایوسیوں اور ناکامیوں کی گرد اس پر چھا جاتی ہے۔ اُسے دھندلا کر دیتی ہے۔ حالات کی تلخی اُسے مٹانے کی کوشش کرتی ہے لیکن کیا ایسا ممکن ہے۔ نہیں! جب تک خیالوں کو پرواز کی قوت نصیب ہے، وہ ان نقوش پر سایہ افگن رہیں گے، اُن کا پیغام دل کو سہلاتے رہیں گے۔

رعنا! ہم نے ایک دوسرے کو دل سے چاہا، ایک دوسرے کو پیار کیا۔ ہماری محبت معصوم تھی، بے غرض تھی۔ ہم نے اِس سے کچھ چاہا نہیں، کچھ مانگا نہیں۔ اِس کے لئے ہر طرح کا ایثار کرنا اپنا فرض جانا۔ ہم نے سمجھا زمانہ ہمارے ایثار کی قدر کرے گا، سماج ہمارے لئے آنکھیں بچھائے گا، زندگی ہمارے لئے حسین خوابوں کا شیش محل بنے گی۔

ہمیں کیا خبر تھی کہ روایت کی آہنی دیوار ہمارے درمیان آکھڑی ہوگی۔ دُنیا کے ظلم و ستم سہنے کے لئے ہم مجبور کر دئے جائیں گے۔ ننگ و ناموس کا ہوّا ہمارے ہونٹوں پر قفل لگا دے گا۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ ہماری وفاؤں کے جذبے کو مصلحتِ وقت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا جائے گا اور ہمارا حرماں نصیب وجود اِس زمین پر روتا بلکتا، موت کی تمنائیں کرتا لیکن جیتے رہنے کے لئے مجبور ہو جائے گا۔

تنگ دل روایات کی ستم گری جنھوں نے جبر سہنے کو بھی ایک رسم بنا لی ہے

جذبۂ وفا کی نادانی، اُس نے جبر سہنا جزوِ ایمان سمجھا اور مصلحتِ وقت کی دار پر مُہر بلب شہید ہوگئی!

جذبۂ وفا، کاش، اے کاش! تجھ سے بغاوت کی بُو پھوٹی ہوتی۔ تُو نے جبر کے خلاف آواز اُٹھائی ہوتی ——— !!

تب رعنا، تم دیکھتیں، اِن روایات کے کس طرح پرخچے اُڑ جاتے۔ اِن کی پہاڑ سی دیوار کس طرح گر کے کھنڈر بن گئی ہوتی۔ اِن کے ملبے کے نیچے سماج اپنی لاش سے چمٹا ہوتا۔

اے کاش ایسا ہوتا! اے کاش ہم ایسا کرسکتے! اے کاش ہم نے ایسا کیا ہوتا!!!

لیکن ایسا نہ ہوا۔

ہم ایسا نہ کرسکے، ہم نے ایسا نہ کیا۔

جذبۂ وفا، تُو نے ظلم سہے، آہ تیری کمزوری! ہم پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔

ہم ایک دوسرے سے دُور کردیئے گئے۔ ایک دوسرے کے لئے اجنبی بنا دیئے گئے۔

ایسے اجنبی جیسے ہمارا ایک دوسرے سے آشنا ہونا بھی ایک جُرم ہے۔

دن، مہینے، سال۔ جذبات سے عاری، زمین کی گردش سے لپٹے گزرتے رہے۔ آتے رہے اور جاتے رہے۔ وقت کی رفتار اپنے ساتھ نہ جانے کتنے نقوش سمیٹ لے جاتی ہے کتنی یادوں کے کارواں کو اپنی گرد میں گم کرتی چلی جاتی ہے۔ نہ جانے کتنے نقوش کو مٹاتی جاتی ہے۔ وقت کی دُوری فاصلے کی دُوری سے کہیں زیادہ طویل ہے۔ فاصلے کی دُوری کو انسانی عقل و دانش نے ختم کردیا ہے لیکن وقت کی دُوری انسان کی پہنچ سے باہر ہے۔ یہ دُوری پاٹی نہیں جاسکتی۔ یہ ہر آن طویل تر ہوتی جاتی ہے۔

وقت کی دُوری بڑھتی گئی، بڑھتی گئی۔ ہم ایک دوسرے سے دُور ہوتے گئے، اتنی دُور کہ کبھی قریب ہونے کا احساس تک مٹتا گیا! یہ میں نے کیا کہا۔ بھلا یہ کبھی مٹ بھی سکتا ہے! حالات کی چٹانوں کے نیچے دب کر یہ سسکیاں لیتا رہتا ہے، تڑپتا رہتا ہے۔ اِس کا دم گھُٹ جاتا ہے لیکن یہ مرتا نہیں۔ کاش یہ مرگیا ہوتا۔ پھر زندگی اتنی بیقرار، اتنی سوگوار نہ ہوتی۔

حالات کا جبر بڑھتا گیا۔ فکرِ معشیت نے اُسے اور سنگین بنادیا۔ حقائق کی تلخیاں کتنی کربناک ہوتی ہیں لیکن اُن سے بچ ہی کون سکتا ہے! اِن سے مفر نہیں، کوئی راہِ فرار نہیں۔

وقت کے تقاضے بھُول بھلیّوں سے نہیں بہلائے جاسکتے۔ اُن کا ساتھ دینا ہی پڑتا ہے، اُن کی مانگ پُوری کرنی ہی پڑتی ہے۔ حسرت و یاس کی وادیوں میں کوئی کب تک بھٹکتا رہ سکتا ہے! نامُرادی دل کے زخموں کا علاج تو نہیں، تمنّا کے زخم دل کا مدّعا تو نہیں بن سکتے! دنیا کی وُسعت محدود تو نہیں۔ اِس کی ظلمتیں ہی تو سب کچھ نہیں۔ اِس میں روشنیوں کا اُجالا بھی تو اپنا وجود رکھتا ہے۔

غم و اندوہ، رنج و الم زندگی کی حقیقتیں ہیں لیکن ساری حقیقت یہی تو نہیں۔

حقائق دو رُخی وجود رکھتے ہیں۔ اُن کی شخصیت دوہری ہے۔ غم و اندوہ کے ساتھ خوشی و شادمانی حقائق کا دوسرا رُخ ہیں۔ رنج و الم کے ساتھ مسرت و انبساط بھی تو ہیں۔ یاس و محرومی کے ساتھ اُمید و کامرانی بھی تو ہے۔ مجبوری کے ساتھ عشرت و شادکامی بھی تو ہے۔ حالات سے مُنہ چُرانا مفر کی صورت سہی اُن سے آنکھیں ملانا بھی تو جیتے رہنے کے لئے ضروری ہے۔ دل کے عذاب پر جو بھی بیتے، انسان کو اپنا وجود قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

ہم نے حالات کا ساتھ دیا۔ ساتھ دینا ہی پڑا۔ چارہ ہی کیا تھا! زندگی نے مصیبتیں سہیں، اذیّتیں برداشت کیں۔ اِسے عشرتیں بھی ملیں، کامرانیاں بھی نصیب ہوئیں۔ اِس نے بہاری لطافتیں بھی پائیں۔ اِس کی بیقراریوں کو قرار سا آگیا۔ بے چینوں کو سکون نصیب ہوا۔ آسودہ اور مطمئن سی زندگی ایک ڈگر پر چلنے لگی۔ وہ چلتی رہتی ہے۔

اتفاقات ——— زندگی میں اتفاقات آتے ہی رہتے ہیں۔ جن کا تصوّر تک بھی نہیں ہوجاتا! تصوّرات کی بلند پروازی بھی سمجھنے سے قاصر رہ جاتی ہے اور اتفاقات اچانک آکر کیسے کیسے کرشمے ہماری آنکھوں کو دکھاتے رہتے ہیں۔

یہ اتفاق کی بات تھی کہ اِس دیار میں میرا آنا ہوا۔ سالہا سال ——— بلکہ جیسے صدیوں کے بعد میرا یہاں آنا ہوا۔ اِس دیار میں جس سے میرے ماضی کی نہ جانے کتنی یادیں وابستہ ہیں۔

فاصلے کی دیوار پار کرکے جب ہمارا گزر کسی جانے پہچانے مقام پر ہوتا ہے تو نہ جانے کتنی بھُولی بسری یادیں ذہن کے دریچوں سے آکر جھانکنے لگتی ہیں۔ اُف! یہ زخم خوردہ یادیں، اِن کی ٹیس کتنی اذیّت ناک ہوتی ہے۔ وقت کا مرہم انہیں کیا بھرے گا۔ وہ تو انہیں اور ہرا کر دیتا ہے۔ حالات کا جبر تیرا احسان ہے۔ ہاں یہ تیرا احسان ہے کہ تو انہیں باہر نکلنے نہیں دیتا۔ انہیں دل کے تہہ خانے میں ہی مقید رہنے دیتا ہے۔

ماضی کی یادوں کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے میں نے تیرے دیار میں (جو کبھی میرا بھی تھا!) قدم رکھا تھا۔

رشتے، عزیز داریاں سماج کے بندھن ہیں۔ یہ انسانی رشتوں کی کڑیاں جوڑنے ہر انسان روزمرّہ کے کاموں میں اپنے کو کھوئے رکھتا ہے لیکن جب کوئی تقریب ہوتی ہے، غم و آلام کو بھُول کر اپنے عزیزوں اور احباب سے مل کر انسانی رشتے کی کڑیوں کو استوار کرتا ہے۔ مجھے ایک عزیز کی لڑکی کی شادی میں شرکت کرنی تھی۔ دن بھر عزیزوں، مہمانوں اور پُرانے ملاقاتیوں میں گھِرا رہا۔ رات کے کھانے کے بعد میں ایک کمرے میں تنہا لیٹا ہوا کچھ پُرانے سالوں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ ایک لڑکی نے میرے پاس آکر تمہارا پیغام سُنایا۔

"بھیا آپ کو رعنا باجی نے بُلایا ہے"

"رعنا نے بُلایا ہے!!" یہ آواز میرے کانوں میں گونجتی رہ گئی۔

رات ایک پہر بیت چکی تھی۔ گھروں کے کواڑ بند ہوچکے تھے بہت سے لوگ

رہے تھے ــــــ میں آیا۔ تمہارا مکان دو ہی مکانوں کے بعد تو تھا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صحن کو پار کر کے میں برآمدے میں آیا۔ برآمدہ خالی پڑا ہوا تھا۔ گھر کے لوگ اندر کے کمروں میں سو رہے ہوں گے۔ میں باہر کے کمرے میں ایک کونے میں رکھی ہوئی [illegible] بیٹھ گیا۔

تم آئیں اور کرسی کے قریب رکھی ہوئی چوکی پر بیٹھ گئیں۔ ایک سائے پر مجسمے الگ۔

خاموش، اُداس جیتی سی!

آنچل کو ہاتھ سے سنبھالے ہوئے۔

یہ حیا تھی یا حالات کی مجبوری!

میز پر رکھی لالٹین کی مدھم روشنی نے دھندلا سا اُجالا پھیلا رکھا تھا۔

ہم تنہا تھے، بالکل تنہا ــــــ سارے ماحول پر بالکل سکوت چھایا ہوا تھا۔

دل میں کیسے کیسے ارمان مچل رہے تھے۔ ترستی آنکھیں تمہارے دیدار کے لئے بیقرار ہو رہی تھیں۔ دل چاہتا تھا کہ تمہیں جی بھر کے دیکھ لوں۔ نہ جانے پھر کب تمہارا دیدار نصیب ہو۔

لیکن تم چوکی کے ایک کنارے سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ اتنا بڑا فاصلہ اور وقت کی دوری تو ظاہری طور پر پاٹ دی گئی تھی لیکن لالٹین کی دھندلی روشنی نے اتنی دوری پیدا کر دی تھی کہ تمہارا چہرہ صاف طور سے دکھائی نہ دیتا تھا اور ادھر میری ترستی آنکھیں بیقرار ہو رہی تھیں کہ انہیں تمہارے حسین چہرے کا دیدار نصیب ہو۔

"رعنا قریب آجاؤ!" ایک مختصر سا جملہ میرے لب پر آسکا۔

تم میرے قریب آکر بیٹھ گئیں ــــــ دلوں کی دھڑکن کو بیان کرنے کی الفاظ میں قدرت کہاں؟ ہمارے لبوں پر جیسے قفل پڑ گیا تھا۔ دل میں جذبات کی فراوانی ہوتی ہے تو قوت اظہار ان کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتی ہے۔

دل کی بیقراری پر کون قابو پا سکتا ہے؟ رعنا! تم میرے پاس ہو اور میری آنکھیں تمہارے دیدار سے محروم رہ جائیں، دل کیسے مان سکتا تھا؟ کس شوق سے میرے ہاتھ بڑھے۔ آنچل تمہارے رخ سے ہٹ گیا ــــــ!

جھکی ہوئی پلکیں کچھ اور جھک گئیں۔

تمہارا حسین چہرہ جس پر وقت اور حالات کے نہ جانے کتنے کارواں گزرے ہوں گے۔ جانے کتنی کیفیات کا مرقع بن گیا۔

لمحہ بھر، صرف لمحہ بھر کے لئے میری آنکھیں تمہارے حسین چہرے کے خد و خال کا دیدار کر سکیں۔ تمہارے حیا پرور ہاتھوں نے ایک ہی لمحے کے بعد ساڑی کے پلو سے تمہارا رخ چھپا دیا۔

آہ! اتنی دوری!! وقت کے فاصلے نے ہمارے درمیان حالات کی اتنی گہری خلیج حائل کر دی۔ یہ میرے ہاتھ جو کبھی تمہارے ہاتھوں میں ہوا کرتے تھے، آج اجنبی بن گئے! دل نے شاید اسے محسوس کیا ہو۔ شاید اس لئے کہ یہ احساسات کی خود داری سے کانپ رہے یہ [illegible] لمحات تھے!

انسان پر جب وقت کا سحر چل جاتا ہے تو اُس کے دم توڑتے خواب جوان ہو کر لوٹ آتے ہیں۔ لمحاتی سحر میں کھو کر انسان اپنے کو جذبات کے سپرد کر دیتا ہے۔ ایسے جذبات کی سرشاری کھو کر لمحات کا سحر۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیتے دن لوٹ آئے ہیں۔ میرے خیالوں پر ایسی مدہوشی چھا گئی تھی کہ وقت اور حالات کا فرق معدوم ہو گیا تھا۔ ان دلنشیں لمحات کی سرشاری نے میرے جذبات نے طوفان برپا کر دیا۔ میں اُٹھا اور تمہارے پہلو میں آ کھڑا ہوا۔ میں نے چاہا تمہیں سینے سے لگا لوں۔

لیکن وقت کا سحر ــــــ اس کی کیفیت تو کسی مداری جیسی ہے۔ دل کو نادان بچے کی طرح تماشائی سمجھ کر یہ ہمارے جذبات کے عجیب عجیب کرتب دکھاتا رہتا ہے۔ جیسے چاہتا ہے ہمیں نچاتا رہتا ہے۔

میں نے چاہا تمہارے ہاتھ چوم لوں۔

ایک آواز، ننھی سی آواز! میرے آگے بڑھتے ہوئے پاؤں رک گئے، ساکت ہو گئے۔

ایک بچے کی آواز، تمہارے کسی بچے کے رونے کی آواز! شاید وہ نیند میں چونک کر جاگا ہو۔

نہ جانے کون سے خیالوں میں مدہوش، تم چپ چاپ بت سی بنی بیٹھی رہیں۔

بچہ دو تین بار رویا اور چپ ہو گیا۔ شاید سو گیا ہو۔

خاموش، بے حس و حرکت تم بیٹھی رہیں۔

سر جھکائے پلکیں نیچی کئے، آنچل کو ہاتھ سے سنبھالے۔ تمہارا بچہ سو گیا۔ لیکن میرا مدہوش دل بیدار ہو گیا۔

ایک آواز، ایک ننھی سی پیاری آواز میرے کانوں اور خیالوں میں گونجنے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا ننھا نیند میں چونک کر اُٹھ بیٹھا ہو اور دن کو جن کھلونوں کو لانے کا وعدہ کیا تھا، اُن کے لئے ضد سے مچل کر مجھے "ابا! ابا!!" کہہ کر پکار رہا ہو۔

"ابا، ابا!" ننھی سی پیاری آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔

میرے اُٹھے ہوئے قدم اُٹھتے گئے اور میں کمرے سے باہر چلا آیا۔

کھڑکی سے جھانک کر رعنا! میں نے تمہیں دیکھا۔

تمہاری خاموش، اُداس کھوئی ہوئی نگاہیں اُس جگہ بھٹک رہی تھیں جہاں میں ایک لمحہ پہلے بیٹھا تھا۔

تمہاری آنکھیں ساڑی کے پلو سے باہر آکر مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ جب میں وہاں موجود نہ تھا۔ لمحات کا سحر شاید ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے دیکھا لڑکھڑاتے قدموں کو سہارا دیتے ہوئے تم اُس کمرے کی طرف گئیں جہاں تمہارے بچے سو رہے تھے۔

جب تم بستر پہ لیٹی ہوں گی رعنا! تو ماضی کے نہ جانے کتنے نقوش تمھارے خیالوں کی سطح پر ابھرے ہوں گے۔ ان بیتے دنوں کی یادوں نے تمھارے دل میں نہ جانے کتنے طوفان اٹھائے ہوں گے تمھارے آنسوؤں کے سمندر میں نہ جانے کتنے خوابوں کی چتاؤں کے شرارے بہہ رہے ہوں گے۔ لیکن رعنا! اب اس سے حاصل ہی کیا؟ حالات کی بے مہری زندگی کی بہاریں لوٹ لے گئی۔ اب اس کا ماتم ہی کیا! وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینا ہی جیتے رہنے کی سبیل ہے۔

رعنا! بھول جاؤ تم گذشتہ ماضی کو۔ ابھی تمھیں بہت کچھ [illegible] اپنے کو حال کے سپرد کر دو رعنا کہ یہی جیتے رہنے کی راہ دکھائے گا۔ تمھارا حال تمھارے معصوم بچے ہی تو تمھارا حال ہیں۔ کھو جاؤ ان میں۔ اپنے کو گم کر دو ان میں۔ یہی تمھارے غموں کا مداوا ہیں، یہی تمھاری تمناؤں کے زخم کے مرہم ہیں!!

غزل

اختر مشتاق رحیم آبادی

آداب اسیری بھی سرکار سکھا دینا
ہو جائے جو دیوانہ زنجیر ہلا دینا

راضی بہ رضا ہوں گے جو چاہو سزا دینا
مجرم کو مگر پہلے تم جرم بتا دینا

تردید مظالم بھی جب بن نہ پڑے ظالم
مظلوم ہی پر کوئی الزام لگا دینا

دیوانے کو سمجھانا اب اُن کو بھی مشکل ہے
جن کے لئے آساں تھا دیوانہ بنا دینا

اُمید کے ماروں کا کیا شغل شب ہجراں
گہ شمع جلا دینا، گہ شمع بجھا دینا

شاید کبھی مل جائے منزل اسی صورت سے
میں اپنی خبر دوں گا، تم اپنا پتا دینا

ناکام تمنا کا پیغام ہی کیا نارو!
تدبیر اگر پوچھیں، تقدیر بتا دینا

کیوں نامہ و قاصد کی تم فکر کرو اختر
اشعار کے پردے میں احوال سنا دینا

غزل

خورشید افسر بسوانی

غم وہ ہے جو کسی کے کام آئے
میرے آنسو سبھی کے کام آئے

غم جاناں ہو یا غم دوراں
کوئی تو زندگی کے کام آئے

اے صبا خاک دل اڑا لے جا
شاید اُن کی گلی کے کام آئے

روشنی جن پہ ناز کرتی تھی
وہ دیئے تیرگی کے کام آئے

حوصلے میری نامرادی کے
تیری زندہ دلی کے کام آئے

بارہا میری آنکھ کے آنسو
اُن کے ظرف تہی کے کام آئے

یہ بھی دستور کائنات ہے خوب
جس کا غم ہو اسی کے کام آئے

تم پہ افسردہ ملتفت کیوں ہو!
کیوں کسی اجنبی کے کام آئے

محبوب مشغلے

راجہ مہدی علی خاں

۱۴۹ پالی روڈ، باندرہ، بمبئی ۵۰

۱۰ ستمبر ۶۵ء

برادرِ محترم جناب خوشتر گرامی، تسلیم

میں اب "محبوب مشغلے" لکھ لکھ کر تباہ ہو چکا ہوں۔ آپ نے اب مجھ سے کوئی نیا قسط مانگی تو میں بوریا بستر باندھ کر روس چلا جاؤں گا۔ جہاں سنا ہے خواجہ احمد عباس صاحب کا گھر اب تک خالی ہے۔ آپ کو کرسیٔ ادارت پر جلوہ افروز ہو کر حکم چلانے کے سوا آتا ہی کیا ہے ؎

اُٹھی نگاہ تو حجت اشغلوں پہ جا ٹھہری ۔۔۔ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

خدا کے لئے مردوں کے مشغلوں کا سلسلہ بند کیجئے۔ آپ کے پاس جو مسودے جا چکے ہیں انھیں ننھی ننھی قسطوں میں منقسم نہ کیجئے۔ ان کی بڑی قسطیں بنائیے۔ سلسلہ ختم کیجئے۔ خواتین کا پارہ اب انتہائی درجے تک پہنچ چکا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لوگ تو "لیڈیز فرسٹ" سے معاملہ شروع کرتے ہیں خوشتر صاحب اور راجہ صاحب بڑے پرانے اور فرسودہ خیالات کے انسان ہیں جنھوں نے "لیڈیز لاسٹ" کہہ کر لیڈیز کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ بھلا عورت بھی کوئی پسِ پشت ڈالنے کی چیز ہے —— کل تقریباً ڈیڑھ ہزار خواتین کا ایک ہجوم "راجہ مہدی علی خاں مردہ باد۔ خوشتر گرامی بائیکاٹ۔ خود غرض مردوے مردہ باد" کے نعرے لگاتا ہوا میرے گھر کے سامنے آپہنچا۔ ہجوم نے پتھر مار مار کر میرے مکان کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے۔ پچیس ہزار بیہودہ صلواتیں سنائیں اور اور خدا جانے کیا کیا کہتی رہیں۔ میں نے تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔

جب میں نے باہر نکل کر خواتین سے پوچھا کہ "اے دنیا کی حسین ترین معزز ترین مخلوق، اے ماہ وشانِ انجمن آرا! آپ کے دشمنوں کو کیا تکلیف میں نے اور خوشتر صاحب نے پہنچائی ہے؟" تو وہ بولیں "ادیب خواتین کے مشغلے تم لوگ شائع کیوں نہیں کرتے؟ شرم نہیں آتی؟" —— میں نے جواب دیا "مجھے تو بہت شرم آتی ہے لیکن میں کیا کروں؟ آپ لوگ خوشتر صاحب کے سامنے جا کر مظاہرہ کیجئے۔" تو وہ بولیں "ہمارے پاس دلّی جانے کا کرایہ نہیں ہے۔ ہم خوشتر صاحب کا بدلہ آپ ہی سے لیں گی" —— یہ کہہ کر وہ میرے گھر پر پل پڑیں۔ میری بہت سی کتابیں، "بیسویں صدی" کے فائل، پانچ کتّے، چھ بلیاں اور آپ کی بہن طاہرہ سلطانہ کو پکڑ کر لے گئیں —— ان نادانوں کو یہ معلوم نہیں کہ بارہ ذی روح ہستیوں کا بار میری بجائے اپنے سر لے کر انھوں نے مجھ پر ظلم نہیں احسانِ عظیم کیا ہے۔ بھولی نادان خواتین یہ سمجھ رہی ہوں گی کہ میں سر پکڑ کر رو رہا ہوں گا لیکن میں قہقہے لگا رہا ہوں۔ ان بچاریوں کو کیا معلوم کہ انھوں نے مجھے کتنا مالی فائدہ پہنچایا ہے —— ان حالات میں آپ جو مناسب سمجھیں جلدی کریں ورنہ یہ سب خواتین اپنے پتے میرے یہاں چھوڑ گئی ہیں۔ میں سب کو دلّی کا کرایہ دے کر آپ کے پاس بھیج دوں گا۔

میرا مسرور اور شوناشونا گھر آپ کی خدمت میں سلام بھجوا رہا ہے۔ قبول کیجئے۔

مخلص —— راجہ مہدی علی خاں

پریم وار بٹنی (بمبئی)

کوکین کا بڑے پیمانے پر کاروبار کرنا۔ ہر وقت "عالم بالا" میں رہنا، بہت کم بات کرنا۔ ہیر کٹنگ سیلون والوں، چپل فروشوں اور ہر یجن دوستوں کو گالیاں دے دے کر زبردستی اپنا کلام سُنانا اور تاکید کرنا کہ زبانی یاد کر دو۔ ملک کے بڑے بڑے دانشور میرا کلام پڑھ پڑھ کر جھومتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو اور مولانا ابوالکلام آزاد کو میرا تمام کلام زبانی یاد تھا۔

میوزک ڈائریکٹروں کے پیر دبانا اور بڑے فخر سے کہنا مجھ میں ایک ہی عیب ہے کہ کسی کی خوشامد نہیں کر سکتا۔ ہر میوزک ڈائریکٹر کی دُھن سُن کر بدبڑانا اور کہنا سنگیت کی قسم، اتنی عمدہ دُھن آج تک نہیں سُنی۔ گھر جا کر وہی دُھن گنگنانا اور قہقہے لگانا۔

مسلمان دوستوں کی موجودگی میں ہندوؤں کو کوسنا اور ہندوؤں کے سامنے مسلمانوں کو گالیاں دینا۔ مسجد میں جا کر نماز پڑھنا اور مندر میں جا کر توبہ کرنا۔ اپنے پاپوں کا پرائشچت کرنا۔

وقتاً فوقتاً شاہراہوں پر خوبصورت لڑکیوں کے مہندی رچے ہاتھوں سے پٹ جانا۔ سال میں دو تین مرتبہ بدصورت لڑکیوں کے اغوا کے سلسلے میں دھر لئے جانا۔ رہا ہونے کے بعد دوستوں کو بیان دینا کہ تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے کشمیر گیا تھا۔ تنہائی میں رُو رُو کر کسی لڑکی کے قدموں پر گر جانا اور کہنا "خدا کے لئے مجھ سے عشقیہ شادی کر لو ورنہ میں مر جاؤں گا"

لڑکیوں اور عورتوں سے پٹ پٹ کر کہنا "آپ کی قسم بڑا مزا آیا۔ ہر روز پیٹا کیجئے"۔ سڑک پر سے گذرتی ہوئی لڑکیوں کو حسرت سے دیکھنا۔ لڑکیوں کے شرما جانے پر اُن سے کہنا "بڑی خوبصورت لگ رہی ہو"

چاندنی راتوں میں شعر کہنے کی بجائے اندھیری راتوں میں جگنوؤں کی شمعیں جلا کر اُلوؤں کے پاس بیٹھ کر شعر کہنا۔

بُرقعہ پہن کر راجہ مہدی علی خاں کے گھر جانا اور نسوانی آواز میں کہنا "میں طاہرہ سُلطانہ مخفی ہوں" اور طاہرہ سُلطانہ مخفی کو بتانا کہ راجہ مہدی علی خاں کے نام سے جو اشعار رسالوں میں چھپتے ہیں، وہ سب میں لکھتا ہوں۔

جوتشیوں کو ہاتھ دکھا دکھا کر کہنا ؎

مری تقدیر کے مالک! مرا کچھ فیصلہ کر دے
بُرا چاہے بُرا کر دے بھلا چاہے بھلا کر دے

ماہر القادری (کراچی)

ترنم سے شعر پڑھنے کے مرض میں مبتلا ہونا۔ گاتے گاتے شعر بھول جانا۔ معاف کیجئے کہہ کر شرمندہ ہو جانا۔ دوبارہ ٹرائی کرنا۔

اشعار کہہ کر بھول جانا۔ چنانچہ کسی کی زبانی اپنا کوئی شعر سُن کر بے اختیار داد دینے کے لئے اس طرح اُچھلنا کہ سُنانے والا ڈر کے ہٹ جائے یا چیخ مار کر بھاگ جائے۔

بیان دینا کہ میرے لئے مشاعروں میں شامل ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا نماز کے لئے باقاعدہ مسجد میں جانا۔

دعوتیں کرنا، دعوتیں ٹھکرانا۔ ہر دعوت کے موقع پر بھیڑیوں کی طرح کھانوں پر ٹوٹ پڑنا۔ دسترخوان سے روتے ہوئے یہ کہہ کر اُٹھنا کہ ہائے ہائے کیا کیا چیزیں رہ گئیں

اسلامی ادب کی علم برداری کرنا۔ ہر مذہبی رسالے کے ایڈیٹر کو "بھائی جان" "بھائی جان" کہہ کر پکارنا۔ مندرجہ ذیل شعر گنگنانا ؎

"مذہب" سکھا رہا ہے آپس میں بیر رکھنا
اس وقت ہم نوا ہے سارا جہاں ہمارا

پُشکر ناتھ (جموں)

دوستوں کی شراب پینا۔ دوستوں کے کباب کھانا۔ دوستوں کے سگرٹ پینا۔

دوستوں کا روپیہ اپنی جیب میں ڈال کر خرچ کرنا۔

دوستوں کی دعوتیں اُڑانا۔ دوستوں ہی سے چورن طلب کر کے انھیں ہضم کرنا۔ دوستوں کے بے حد اصرار پر سال میں ایک مرتبہ انھیں دعوت پر مدعو کر کے گھر سے بھاگ جانا۔ دوستوں کا اُن کے دولتکدے پر تشریف لا کر بھوکے واپس چلا جانا۔ خدا کا شکر ادا کرنا کہ کم بخت اپنے بال بچوں کو لے کر بھاگا، اگر ہمارے بال بچوں کو لے کر بھاگ جاتا تو؟

دفتر میں بیٹھ کر اپنے رفیقوں کے سگرٹ پھونک پھونک کر اپنا کلیجہ اور اُن کے دل جلانا۔

دفتر میں بیٹھے بیٹھے دخترِ رز کے عشق میں گریبان پھاڑ کر اس کی تلاش میں بھاگ جانا۔ دشمنوں اور دوستوں دونوں کے اکاؤنٹ میں شراب پی کر واپس آجانا۔

رات کو بارہ بجے کمرے کی کھڑکیاں، دروازے اور روشندان بند کر کے تنہائیوں سے ہم آغوش ہو جانا۔ بیوی کا چوری چوری روشندان سے جھانکنا کہ اندر کوئی اور تو نہیں ہے۔ شوہر کو محوِ افسانہ نگاری دیکھ کر جھینپ جانا اور آواز لگا کر پوچھنا "اے جی! رات کو دو بجے کمرے میں تنہا آپ کیا کر رہے ہیں؟" پُشکر ناتھ جی کا ہنس کر جواب دینا ؎

افسانہ لکھ رہا ہوں دلِ بے قرار کا
آنکھوں میں رنگ بھر کے ترے انتظار کا

دتّ بھارتی (دہلی)

انگلینڈ کی گلیوں میں کسی بھارتی لڑکی پر فریفتہ ہو جانا۔ اِس حادثے کے بعد اپنا اصلی نام بھوگی لال سے بدل کر دتّ بھارتی رکھ لینا۔ اُس لڑکی کا دتّ بھارتی صاحب کو اپنے کرائے سے بھارت لانا۔ ایک دن کسی بات پر ناراض ہو کر اُس لڑکی کا دتّ بھارتی صاحب

کو "پٹ بھارتی" کہہ کر کسی کنوئیں میں دھکا دے کر بھاگ جانا۔ بھارتی صاحب کا ایک دن میں بیٹھ کر کنوئیں سے بڑی مشکل سے باہر نکلنا۔ باہر آ کر رومینٹک ہو جانا اور اُس لڑکی کی یاد میں دلچسپ رومینٹک ناول لکھنا شروع کر دینا۔

بار بار پارلیمنٹ کی نشست کے لئے اُمیدوار ہونا۔ بار بار ہار کر بیٹھ جانا۔ بیوی سے پوچھنا "نیک بخت! دو ووٹ تو سمجھ میں آ گئے لیکن تیسرا ضرور کسی اُلو کے پٹھے نے مجھے دیا ہوگا۔ اُسے تلاش کر کے گلے سے لگا لینا چاہیئے"۔

شراب پینا۔ شراب میں گوشت فرائی کر کے شراب میں گُندھے ہوئے آٹے کی روٹی کے ساتھ بغیر مکھیاں اُڑائے کھا جانا۔

پنجابی لڑکوں کے ساتھ کورس گانا ؎

دتّ بھارتی ارے دتّ بھارتی	ادب دے تاگے نہیں لت بھارتی
بیٹھے بیٹھے ماری گئی مت بھارتی	آجا میں بتاواں تیری گت عاملی

نُوشاہ (سرینگر)

دن میں پچاس بار خودکشی کے پروگرام بنانا۔ شام کو یکایک کسی بار میں زندہ نظر آ جانا۔ بولنا کم، سوچنا زیادہ۔ اپنے ہر غم کو ایک مُسکراہٹ میں بہا دینا۔ ہر سال ایک کتاب شائع کرانا۔

کسی نہ کسی لڑکی کے عشق میں دن دن بھر یا رات رات بھر زار و قطار رونا۔ پوچھنے پر بتانا کہ خوشترگرامی کے عشق میں رُو رہا ہوں۔

زنانہ ناموں سے مرد ادیبوں کو چٹھیاں لکھنا اور محبت بھرے خطوط لکھ کر اُن سے تحائف وصول کرنا اور دوستوں میں فخریہ بیان کرنا۔

ہر خوبصورت چہرہ دیکھ کر بے ہوش ہو جانا۔ ہر بدصورت چہرہ دیکھ کر ہوش میں آ جانا۔ خوبصورت لڑکیوں کا مُنہ چڑا کر بھاگ جانا۔ کبھی کبھی خلوت میں اُن کے ہاتھوں بُری طرح پٹ جانا۔ مار کھا کر نور صاحب کا کہنا "معلوم ہوتا ہے چاہنے والوں کو پیٹنا آپ کا محبوب مشغلہ ہے"۔

حسینانِ شہر میں اختر شیرانی مرحوم کی طرح مقبول اور بدنام ہونے کی کوشش کرنا۔ مندرجہ ذیل شعر اکثر وردِ زبان رکھنا ؎

سُنا ہے میری بھا آتو رات کو آئے گی وادی میں
وہ سر پر اپنے میرا ہاتھ، پھروائے گی وادی میں

ادیب سہیل (کراچی)

ریلوے کی ملازمت کرنا۔ ریلوے انجن کے گلے میں باہیں ڈال کر چیخیں مار مار کر رونا۔ جواب میں اس کی "بھک بھک" سُن کر خاموش ہو جانا۔ یہ سمجھ کر کہ انجن مجھے تسلی دے رہا ہے۔ اُس کے بعد اُسی انجن کی گرم گرم پیٹھ پر سوار ہو جانا۔ کاغذ پنسل لے کر شعر کہنا۔ اُس انجن سے کوئلے نکال کر گھر لے جانا۔ کھانا پکانے کے لئے یہ کوئلے بیگم کے حوالے کر کے کہنا "کالے بھائی جان نے بطور امداد بھیجے ہیں"۔

ہر قسم کی کتابیں پڑھنا۔ مثلاً "کوک شاستر کا اصلی اور خفیہ باتصویر ایڈیشن"۔ "داستان خواجہ سرایان"۔ "گدھے کی سواری کا لامنہ کئے بغیر"۔ "رات کو بھونکنے کے پانچ سو پچیس طریقے"۔ "اُلوؤں کا شافی علاج" وغیرہ۔

میوزک سے دلچسپی لینا۔ صبح کو ڈھولک، دوپہر کو چمٹا، شام کو ٹوٹا ہوا ہارمونیم، رات کو طبلہ۔ آمین بجانا۔ پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے گانا سُننے کے لئے "بالاخانہ" کا رُخ کرنے کی بجائے کسی تالاب کے کنارے بیٹھ کر ٹرّاتے ہوئے مینڈکوں کے نغمے یا کوّوں کی کائیں کائیں سُن کر "الحمدللہ" کہہ کر واپس آ جانا۔

شام کو کُلہاڑا لے کر محلّے میں "لکڑیاں پھڑوا لو! لکڑیاں پھڑوا لو" کی آواز لگاتے ہوئے گلی گلی گھومنا۔ دو آنے فی من کے حساب سے محلّے والوں کی جلانے کی لکڑیاں پھاڑ کر رات کو ڈیڑھ روپیہ کما کر واپس آ جانا۔

بکریاں پالنا، اُن کا دودھ مینگنیوں سمیت پی جانا۔ بچی کُھچی مینگنیاں خُشک کر کے جیبوں میں بھر لینا۔ تمام دن انہیں سُونگھتے رہنا کہ جراثیم کش ہوتی ہیں۔

"خرام" "چٹگام" اور "ادبِ لطیف" لاہور کی ادارت سے دلچسپی لینا۔ راجہ مہدی علی خاں سے اُن پرچوں کے لئے نظمیں مانگتے رہنا جو نظمیں شائع ہی نہیں کرتے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

اس طرح پلکوں کے سگنل مت گرا	میں ہوں شاعر، ریلوے انجن نہیں
مت بگڑ مجھ سے میں انجن کی طرح	دو منٹ میں ترے کوچے سے گذر جاؤں گا

علی محمد لون (سرینگر)

اپنا پورا نام سُن کر ناراض ہو جانا۔ کہنا، مجھے نمک مرچ نون مت کہو۔

خدا کو صرف شراب پی کر یاد کرنا۔ نشہ اُترنے کے بعد کہنا "کون خدا؟ کہاں کا خدا؟ کسی نے دیکھا بھی ہے؟"

بہت کوششوں کے بعد اخباروں اور رسالوں میں اپنی تصویریں شائع کرانا۔ شائع ہو جانے کے بعد لوگوں سے کہنا "یہ کمینے نہ جانے کیوں ہر وقت میری تصویریں مانگتے رہتے ہیں"۔

تمام دن مشہور مشہور انگریزی کتابوں کے نام یاد کرنا۔ دوسرے دن ان کتابوں کے ناموں کا ذکر کر کے دوستوں پر رُعب ڈالنا۔

ریڈیو کی اچھی ملازمت چھوڑکر اکادمی میں چپراسی کا عہدہ قبول کرکے پندرہ روپے ماہوار میں گزارا کرنا۔

خود شراب پینا۔ کتوں کو شراب پلانا۔ بلیوں کو شراب پلانا۔ کتوں کو نشے میں "بھائی جان" کہنا۔

مندرجہ ذیل شعر گنگنانا ؎

میرا گھر ہے وہ گھر جہاں آکر — کتے بلے شراب پیتے ہیں
نشے میں کتے اور سب ہیں — ایسا لگتا ہے جیسے چیتے ہیں

فیض الرحمان فیض (حیدرآباد)

اینگلو انڈین مزاحیہ کلام لکھنا اور زیادہ تر روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں شائع کرانا۔

مشاعروں میں اپنا مزاحیہ کلام سُنا کر حاضرینِ مشاعرہ کو ہنسانا۔ خود رونا کبھی مشاعرے میں اور کبھی مشاعرے سے لوٹ کر اپنے گھر میں۔

گھر میں نمازیں کثرت سے پڑھنا۔ گھر سے باہر صرف نمازِ جنازہ پڑھانا۔ شہر میں "جنازوں کے امام" کے خطاب سے مشہور ہونا۔

اپنے کلام میں انگریزی الفاظ کی کمی محسوس کرکے بار بار انگلستان جاکر انگریزی الفاظ کی بوریاں بھر بھر کر لانا اور اُنھیں اپنی غزلوں میں خوبصورتی سے استعمال کرنا۔

علامہ خوشتر گرامی صاحب سے گلہ کرنا کہ وہ مزاح نگار شاعروں پر کیوں ملتفت نہیں ہوتے۔

محکمۂ تعمیرات میں نقشہ نویسی کے فرائض انجام دینا اور محکمے سے باہر دلوں کے اور گلی کوچوں کے نقشے بنانا۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

فیس "ستے ہینڈ" ہٹاتے تو بہت اچھا تھا — عشق کا بینڈ بجاتے تو بہت اچھا تھا
میری فوٹو کو جو دیکھا تو بگڑ کر بولے — فیض داڑھی نہ بڑھاتے تو بہت اچھا تھا

ٹھاکر پونچھی (دہلی)

اُردو میں افسانے مینوفیکچر کرنا۔ ہندی نہ جاننے کے باوجود ہندی افسانہ نگار ہونے کا دعویٰ کرنا۔ اپنے افسانوں کی تعریف کرواکے خوش ہونا۔ مندر، مسجد، ٹھاکر دوارے کبھی نہ جانا لیکن اپنے آپ کو ٹھاکر پونچھی کہلوا کر پھولے نہ سمانا۔ پروپیگنڈا کرکے لوگوں سے زبردستی خود کو کرشن چندر ثانی کہلوانا۔ افسانوں میں کرشن چندر کا چربہ اُتارنے کی کوشش کرنا — مہمل اصطلاحیں، بے معنی استعارے اور غلط زبان لکھنا۔ نثر میں شاعری کہنے کا دعویٰ کرنا

کشمیر سے بھاگ آنا اور کشمیر کی یاد میں آہیں بھرنا۔

دوستوں کے خلاف چپکے چپکے سازشیں کرنا۔ مُنہ دیکھے کی تعریف کرنا اور پیٹھ پیچھے گالیاں دینا۔

شراب میں نہانا اور پارسائی کا دم بھرنا۔

پبلشروں کی خوشامدیں کرکے اپنے ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع کروانا۔ کتابیں نہ بکنے پر پبلشروں کو گالیاں دینا کہ اُن سے کتابیں نہیں بکیں۔ پبلشروں کا ردی کے بھاؤ کتابوں کو بیچ ڈالنا اور توبہ کرنا کہ آئندہ کوئی کتاب نہ چھاپیں گے۔ ٹھاکر صاحب کا ردی والوں کو بدنام کرنا۔

ہم عمروں میں بزرگ بننے کی کوشش کرنا۔ چہرے پر بزرگی کی نقاب ڈالے دوستوں کو نصیحت کرنا، مشورے دینا۔ خیرخواہی کا دم بھرنا۔ خوشامد میں دوست کو "باپوجی"، "باپ" کہہ کر پُکارنا اور پیٹھ پیچھے اُس سے دشمنی کرنا۔

آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ دیکھ کر خوش ہونا اور بار بار یہ مصرعہ دوہرانا۔ ؏

بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی

عمران انصاری (بمبئی)

برٹش راج میں باغیانہ نظمیں لکھ لکھ کر قید ہونا۔ اپنے راج میں غیر باغیانہ نظمیں لکھ لکھ کر آزاد رہنے کی کوششیں کرنا۔ جیل میں قرآن شریف پڑھنا، مسلمان بن جانا۔ رہا ہونے کے بعد سب کچھ بھول جانا۔ قید کے دنوں میں لکھی ہوئی "من وا ہر من" گا گا کر سب کو ہارمونیم پر سُنانا۔

"انقلاب"، "کہکشاں"، "خیابان"، "جمہوریت" وغیرہ روزنامہ اخبارات میں ادارت کی مکھیاں مارنا۔ رو رو کر زندگی کے دن کاٹنا یعنی سرکاری جیل خانے سے رہا ہونے کے بعد دنیا کے قیدخانے میں قید ہو کر محنت مشقت کی چکی پیسنا۔ تعمیری ادب کے کاموں میں حصہ لے کر اپنی زندگی خراب کرنا۔ غنڈوں اور عقلمندوں کے سمجھانے پر کہ میاں یہ دھندے چھوڑو، پان بیڑی کی دُکان کھولو، بُرا مان جانا۔ غنڈوں کو گالیاں دینا۔ مرنے مارنے پر تیار ہو جانا۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

یہ چکی اور یار و ادب کی ہے چکّی — کبھی اِس میں گیہوں کبھی اِس میں مکّی
ادب کا یہ آٹا بھی ہے کیسا آٹا — کسی سے کبھی اِس کی روٹی نہ پکّی

گیان سنگھ شاطر (ہریانہ)

میکینیکل انجینئر ہوتے ہوئے شاعری سے عشق کرنا۔ بھاکڑا ڈیم جیسے عظیم منصوبہ کی تعمیر کچھ انوکھے انداز میں کرنا۔ ڈیوٹی پر جانا تو عمر اپنی کرسیا نگری (بھاکڑا ڈیم کے دامن میں ایک بستی کا نام ہے) میں پڑے رہنا۔ افسروں کا نوکری سے نکال دینے کی دھمکی دینا تو اُن کی ہجو میں کہنا۔ یاروں کے سمجھانے پر کہ شراب بُری شے ہے، اُن سے اُلجھ پڑنا اور کہنا کہ میں شراب نہیں "سوم رس" پیتا ہوں جس کو پی کر رشی مُنی اپنی عاقبت سنوارتے تھے۔

گورنمنٹ کے خرچ پر روس جانا اور وہاں بیگم سے مسلمان ہوجانا۔ ہندوستان واپس آنا
...والوں اور ایسے محترم کو پہچاننے سے صاف انکار کردینا۔ اُن کو اپنی غزلیں سُنا سُنا کر
...ن کو شاعر ہونے کا یقین دلانا۔

والد صاحب کا شاعر کی بجائے شعر خطاب عطا فرمانا اور مندرجہ ذیل اُردو کے
...ہور محاورے کی نوک پلک درست فرمانا: شعر رے شتر تیری کون سی کل سیدھی "

کبھی کبھی شاعری کا دورہ پڑنے پر بیگم شاعر کے سوجانے پر بیڈ روم سے ڈرائنگ
...میں لپک آنا۔ بیگم کا پردے کے پیچھے سے چھپ چھپ کر اُن کی حرکتوں کی نگرانی کرنا۔ کبھی
...یاس انگیز شعر نکل پڑنے پر ترنم سُروں میں گنگنانا۔ بیگم کا بگڑ کر ڈرائنگ روم میں چلے آنا
...: حضرت یہ کس کے فراق میں آنسو بہائے جا رہے ہیں؟ "اُن کا لاکھ سمجھانا کہ یہ شعر
... اور محض قوتِ پرواز کی دین ہے لیکن بیگم کو یقین نہ آنا اور گھر سے ڈنڈے مار مار کر نکال
...نا۔

قوم کے غم میں سونا، قوم کے غم میں پینا۔ قوم کے غم میں جینا، اُٹھنا، بیٹھنا اور مرنے
...واب دیکھنا۔ نمونۂ کلام:-

یہ وعدۂ فردا کے بہانے کب تک   یہ صبر و تحمل کے فسانے کب تک
جو بھوک سے دم توڑ رہے ہیں شاطر   وہ قوم کے گائیں گے ترانے کب تک

افسانہ

ایک تھی گڑیا

—————— نور شاہ

ہسپتال روڈ۔ درگہ جن۔ سرینگر

۲۹ اگست ۱۹۶۵ء

برادر محترم!

"ایک تھی گڑیا" پیشِ خدمت ہے۔ اس کہانی کے خد و خال پچھلے سرما میں میرے ذہن میں ابھرے تھے۔ شاید اسی لئے اس میں برف باری اور کہرے کے ملگجے اندھیروں کا ذکر ہے لیکن میں ان دنوں انھیں آخری شکل نہ دے سکا اس لئے کہ میں کہانی کے کرداروں سے اور زیادہ مانوس ہونا چاہتا تھا —— آپ کی رائے کا شدت سے انتظار رہے گا۔۔۔

آپ کا بھائی —————— نور شاہ

ایک حریری آنچل چہرے پر سرکایا جاتا ہے جو گالوں پر دھوپ چھاؤں بن کر تھرتھراتا ہے۔ ایک لطیف احساس کا سحر پھونکا جاتا ہے۔ جس کے پرتو سے عارض گلابی گلابی بن کر مہکنے لگتے ہیں۔ چوڑیوں کی ایک قطار نازک کلائی میں ڈالی جاتی ہے جس کی مدھر کھنک کانوں میں شہد بن کر قطرہ قطرہ ٹپکتی رہتی ہے —— اور پھر ایک گڑیا، ایک لڑکی کا روپ اپنا لیتی ہے۔ لڑکی نغمہ بن جاتی ہے۔ گیت بن جاتی ہے۔ نغمہ جو دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ گیت جو لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے۔

آندو بھی ایک ایسا ہی نغمہ ہے۔ ایک ایسا ہی گیت ہے!!

میں یہ کہانی آندو کے نام معنون کرتا ہوں۔

رات بھیگ چکی ہے اور میں ابھی ابھی لکھ رہا تھا۔ اپنی ہی ایک کہانی کو ناول کے کینواس پر ابھار رہا تھا۔ اس کہانی کو اپنے ہی ہاتھوں بنانا سنوارنا اور دفنانا ہے۔ کتنی بار اپنی زندگی کے ایک مختصر سے نامکمل سفر کو کہانیوں میں سمونے کی سعی کی، پھر بھی روح کو تسکین نہ ملی۔ اپنے من سے پوچھا۔

"اب کیا چاہتے ہو؟"

من خاموش رہا۔ کوئی آواز نہ آئی۔ میں نے داستان کی طرف دیکھا۔ داستان نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ایک بار، کئی بار —— اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا!

یہ داستان ہے ایک گڑیا کی، جس نے ایک سنہری ہرنی کا روپ اپنا لیا تھا۔ دوستو! تم بے شک میرا مضحکہ اڑاؤ لیکن یہ حقیقت ہے کہ صدیوں سے جنگل جنگل بیاباں بیاباں اس سنہری ہرنی کو پانے کے لئے گھومتا رہا ہوں۔

ہاں تو میں ابھی ابھی لکھ رہا تھا۔ لکھتے لکھتے قلم رک گیا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ باہر فضا میں جھانکا۔ برف گر رہی تھی۔ اس رات بھی برف گر رہی تھی، جب وہ مجھے منوہر کے زرد پیلے رنگ کے کمرے میں آخری بار ملی تھی —— سردی سے کپکپاتی رات کہر کی دبیز چادریں پھیلائے اتر آئی تھی۔ برف کے طوفان نے کہر کے ملگجے اندھیرے کو اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ باہر برف کے موٹے موٹے، سپید سپید اڑتے ہوئے گالے زمین پر گر کر منجمد تہہ میں بدل رہے تھے اور اندر زرد پیلے رنگ کے کمرے میں اس کی بادامی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے شبنمی قطرے تپتے ہوئے شفق آلود گالوں سے پگھل کر بہہ رہے تھے۔ وہ رو رہی تھی اس کی بڑی بڑی بادامی آنکھوں سے آنسوؤں کے بھرے بھرے سوتے ابل رہے تھے۔ ایسے ہی جیسے سرما کے دنوں میں ڈل جھیل کی منجمد سطح کو توڑ کر نیم گرم پانی کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

وہ رو رہی تھی لیکن میں اس وقت ان آنسوؤں کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس لئے میری نظروں کے سامنے صرف زلفوں کی خوشبوئیں تھیں اور چہرے کے دمکتے ہوئے خطوط تھے۔ ایک گڑیا تھی۔ ایک لڑکی تھی۔ سنہری ہرنی کے روپ میں اور اس کا سنہرا جسم تھا۔

"روؤ مت! تم نے مجھے محبت کی جو امانت دی ہے میں اسے اپنے پاس رکھوں گا۔"

وہ خاموش رہی!

شاید میری اس بات پر اس کے خیالوں میں تنہائیاں بابل کے گیت گاتی ہوئی سہیلیاں

حدیثِ دل

حادثے کیا ہم پہ گزرے ہم نے دیکھا تک نہیں
ہم اگر سُنتے تو آوازِ شکستِ دل بھی تھی ——— محمد علی تاج

کہاں وہ خلوتیں دن رات کی اور اب یہ عالم ہے
کہ جب ملتے ہیں دل کہتا ہے کوئی تیسرا بھی ہو ——— فراقؔ گورکھپوری

ہر تسلی سے سوا ہوتی گئی دل کی تڑپ
درد کچھ سے کچھ ہوا سامانِ درماں دیکھ کر ——— فانیؔ بدایونی

یہ بات کہ صورت کے بھلے، دل کے بُرے ہو
اللہ کرے جھوٹ ہو، بہتوں سے سُنی ہے ——— بشیر بدر

ان کے بہلائے بھی نہ بہلا دل
رائیگاں سعیِ التفات گئی ——— جگرؔ مرادآبادی

مرسلہ: ایس۔ ایس ہنکاری۔ ایم۔ اے (کلکتہ)

اُس کے ہاتھوں میں مہندی رچاتی رہیں، اُسے سُرخ جوڑے پہناتی رہیں ——— یہ تصوّرات اتنے حسین تھے کہ حقیقت ایک لمحے کے لئے بھی سامنے نہ آئی۔

رات اور بھیگ گئی۔

میں اُس لمحے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور وہ آنے والے کل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"یہ کیا ہوا؟" اندو نے کہا

"اب ہماری محبت کا رشتہ ابدی ہو گیا ہے۔"

"میرا انتظار کروگے نا؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ نظروں سے دُور سہی لیکن دل کے قریب رہوگی۔"

"شیشے کی طرح نازک دل ذرا سی بات سے ٹوٹ جاتے ہیں۔"

"لیکن میرا دل اتنا نازک نہیں۔"

شہر تے!

کہہ میں لپٹی اسی رات کے ایک لمحے میں میرے جنگلوں کی ہرنی نے اندو کا رُوپ اپنا لیا اور وہ بیابانوں اور جنگلوں کو چھوڑ کر اپنے غول سے بچھڑ کر شہروں کی طرف چلی گئی۔

جنگل ویران ہو گئے!

شہر آباد ہو گئے!!

داستان کھو گئی!!!

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے سینے سے آہوں کا دھواں اُٹھ رہا ہو۔ جیسے باہر برفانی تودوں کا سینہ چیر کر کسی نے لوہے کی تپتی ہوئی سلاخیں گھونپ دی ہوں اور سرسراتی ہوئی برف کے سینے سے گرم گرم دھواں بن کھا کے اُٹھ رہا ہو۔

برف گرتی رہی!

رات پگھلتی رہی!!

اور وہ چلی گئی۔ دُور، ان جنگلوں سے بہت دُور ———

آج بھی برف گر رہی ہے۔ ویسی ہی سپید برف۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برف سپید نہیں، سیاہ ہو گئی ہے اور اس سیاہی میں ایک سپید داغ نظر آ رہا ہے۔ یہ میری زندگی ہے۔ اُس کی داستان ہے اور یہ سپید داغ اندو کی یاد ہے۔ جب وہ رو رہی تھی میں اُس کے بالوں میں خوشبو تلاش کر رہا تھا اُس کے چہرے کے دمکتے ہوئے خطوط دیکھ رہا تھا۔ اب وہ یہاں نہیں اور میں سوچ رہا ہوں برف کے ان گالوں اور اُس کے شبنمی قطروں میں کیا فرق ہے۔ کتنا تضاد ہے۔ ایک کس قدر موت جیسی یخ بستہ ٹھنڈک لئے اور دوسری زندگی کی حرارت، ساری گرمی سے بھرپور۔ ایک کی نرمی مرگ گراں اور دوسرے کی نرمی حیات آفریں۔ لیکن اب وہ آنسو کہاں؟ وہ زرد پیلے رنگ کا کمرہ کہاں؟ یہ تو میرا اپنا کمرہ ہے اور میں اپنے کمرے میں اکیلا تنہا بھٹک رہا ہوں۔ سُنہری ہرنی کی تلاش میں ——— آدھے پائے کی فکر میں؟ سگریٹ بجھ چکا ہے۔ راکھ ہو چکا ہے۔ اس راکھ میں کوئی حرارت نہیں، کوئی گرمی نہیں۔ وہ ساری گرمی، ساری حرارت یخ بستہ جھیل میں بدل گئی ہے اور زندگی بے جان کفن اور داستان بن کر رہ گئی ہے۔ میری اپنی داستان۔ جسے میں ناول کے کینوس پر اُبھارنا چاہتا ہوں۔ اس داستان میں بہت سے چہرے ہیں۔ کچھ جانے پہچانے اور کچھ انجانے۔ ایک جانا پہچانا چہرہ منوہر کا بھی ہے۔ جس کے زرد پیلے رنگ کے کمرے میں پگھلتی رات کے ایک لمحے میں ایک گڑیا ایک لڑکی بن گئی اور اُس لڑکی نے سُنہری ہرنی کا رُوپ اپنا لیا۔ وہ ایک نغمہ بن گئی، ایک گیت بن گئی۔ جب ایک گڑیا ایک لڑکی کا رُوپ اپنا کر نغمہ بن جاتی ہے تو حریری رنگ کا آنچل اُس کے گالوں پر دھوپ چھاؤں بن کر تھرتھراتا ہے۔ چوڑیوں کی مدھر کھنک کانوں میں شہد بن کر بُوند بُوند ٹپکتی رہتی ہے۔ میں نے اس گڑیا کی کہانی منوہر ہی سے شروع کرنا چاہتا تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ منوہر کا کردار مجھ پر واضح نہ ہو سکا تھا۔ اُس کی سُونی آنکھوں میں کوئی اشارہ نظر نہ آیا تھا۔ شاید اس لئے اس نامکمل سفر میں جتنی بار کہانیوں میں سمونے کی سعی کی، میری روح کو تسکین نہ ملی۔ دل سے کوئی آواز نہ آئی۔

یوں تو میں نے منوہر سے اندو کی باتیں کی تھیں لیکن منوہر نے پہلی بار اُسے میرے دفتر میں دیکھا۔ اُس دن اندو مجھ سے ملنے دفتر آئی تھی۔

"یہ منوہر ہے میرا دوست۔"

"یہ اندو ہے"

بات ختم ہوئی۔ میں دیر تک اخبار کے کل کے ایشو کے لئے خبریں لکھتا رہا۔ اداریہ بھی لکھ ڈالا۔ ہم تینوں ایک ساتھ باہر نکلے۔ میں کسی بار میں گھس کر اولڈ مانک کے دو ایک پیگ پی کر اپنے جسم کو گرمی پہنچانا چاہتا تھا۔ منوہر میرے دل کی بات سمجھ گیا۔ اس نے اپنے گھر میں کافی پینے کی دعوت دی۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ کافی پیتے پیتے باتوں کا سلسلہ طویل ہو گیا۔ نہ جانے اندو کی کس بات پر منوہر بے حد جذباتی ہو گیا۔ بات شاید لڑکپن کے گھروندوں کی تھی۔ ہاں! کسی بات پر منوہر نے گیتا کا تذکرہ چھیڑا تھا۔ بچپن میں منوہر گیتا کے ساتھ گھروندے بنایا کرتا تھا۔ پھر گیتا چلی گئی کسی اور کو اپنا کر۔

منوہر نے کہا۔

"گھروندے تو بچپن کی یادیں ہیں لیکن گھر بنانا، گھر بسانا ایک الگ بات ہے۔ میرا دوست جس گھر کے بارے میں سوچتا ہے اس کا ان یادوں سے کوئی تعلق نہیں"

اندو نے کہا۔

"منوہر صاحب! مجھے افسوس ہے کہ میری کسی بات سے آپ کو تکلیف ہوئی۔ میں معافی چاہتی ہوں"

"نہیں تم ایسا مت سوچو۔ مجھے مسرت ہے کہ ایک خوبصورت گھر کی تعمیر کے لئے میرے دوست نے تمہارا انتخاب کیا ہے"

اندو نے شرما کر سر جھکا لیا۔

ایک حریری رنگ کا آنچل سرک گیا۔

ایک لطیف احساس کا سحر بکھر گیا۔

چوڑیوں نے کلائیوں میں ایک دوسری سے ٹکرا کر ایک گیت کو جنم دیا!

اندو کو گئے کتنے دن ہو گئے تھے۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ منوہر۔۔ منوہر اندو سے محبت کرتا ہے۔

یہ کتنا بڑا المیہ تھا۔

اس المیہ کا آغاز ٹورسٹ سینٹر سے ہوا۔ میں نے ایک کہانی لکھی تھی۔ شہروں سے آنے والی ایک لڑکی کی جو ایک شام بس سے ٹورسٹ سینٹر میں اترتی ہے۔ نیا ماحول، نئے لوگ اور نئی زندگی دیکھ کر اسے عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ ماحول اور یہ لوگ اسے اچھے لگنے لگتے ہیں یہ زندگی اچھی لگنے لگتی ہے۔ اس لئے کہ اس زندگی میں کوئی بناوٹ نہیں۔ ان لوگوں میں خلوص ہے۔ یہ لوگ زندگی سے پیار کرتے ہیں ـــــ وقت گزرتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تبدیلی آ جاتی ہے۔ یہ گل پوش وادی، یہ برفیلے پہاڑ، یہ سرسبز وادیاں اور ٹھنڈی جھیلیں اس کی زندگی کا رخ پھیر دیتی ہیں اور وہ شہروں کو چھوڑ کر کشمیر کو اپنا لیتی ہے۔ یہی ٹورسٹ سینٹر ہے جہاں سے کچھ دن پہلے کشمیر میں رہنے والی اندو ایک بس میں چڑھی اور شہروں میں کھو گئی۔

وہ کہانی کا آغاز تھا۔

یہ کہانی کا انجام ہے ـــــ!!

میں نے اندو سے کہا تھا کہ تمہارا انتظار کروں گا۔ وقت، وقت کی بات ہے۔ وقت نے کسی کا ساتھ دیا اور کسی کو فنا کر دیا۔ اس دن منوہر کے ہاں سالگرہ کی پارٹی تھی۔ میں تھا اور بھی کچھ دوست تھے۔ بشر نے اپنی تازہ نظم سنائی۔ میں نے منوہر کے اصرار پر اپنی کہانی پڑھی۔ شہروں سے آنے والی لڑکی جو کشمیر کو اپنا لیتی ہے۔ وہ لوگ چلے گئے تو کمرے میں ایک عجیب سی پراسرار خاموشی چھا گئی۔

میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"کیا سوچتے ہو؟"

"اندو کے بارے میں سوچتا ہوں اور تمہارے بارے میں بھی"

"کیا؟"

"آغاز اور انجام کی کشمکش میں مبتلا ہوں"

میں نے کہا۔

"کہانی اس وقت شروع ہوئی تھی جب وہ لڑکی شہروں سے آئی تھی۔ انجام یہ ہے کہ اندو شہروں کی جانب چلی گئی"

یاد

کچھ وقت کٹ گیا جو تری یاد کے بغیر
ہم پر تمام عمر وہ لمحے گراں رہے ـــــ سیماب اکبر آبادی

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے ـــــ فیض احمد فیض

اس کو بھولے ہوئے تو ہو فانی
کیا کرو گے اگر وہ یاد آیا ـــــ فانی بدایونی

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں ـــــ فیض احمد فیض

میں ترکِ رہ و رسمِ جنوں کر ہی چکا تھا
کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد ـــــ جگر مراد آبادی

مرسلہ: بی۔ ایس۔ ہنکاری ایم، اے (کلکتہ)

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کہانی تو اب شروع ہوتی ہے۔"

میں حیران رہ گیا۔

"حیران کیوں ہو رہے ہو؟" منوہر نے پوچھا۔

"نہیں تو ــــ!"

"تم اندو سے محبت کرتے ہو نا؟"

"ہاں۔"

"میں بھی کرتا ہوں۔"

"تم ۔۔۔!"

"کیا مجھے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں؟"

"ہے تو۔"

"تم یہ حق کیوں چھیننا چاہتے ہو؟"

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"محبت کے کئی روپ ہیں۔"

"تمہیں محبت کا کون سا روپ پسند ہے اور مجھے کون سا؟ اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا۔"

"اور گیتا ــــ!"

منوہر خاموش ہو گیا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اُن سُرمئی آنکھوں میں مجھے ایک اشارہ نظر آیا۔ اُس اشارے نے آہستہ آہستہ ایک لڑکی کی صورت اپنالی اور وہ صورت نغمہ میں ڈھل گئی۔

ہینہ سوتی بجول دِچھ مرستے

تنہ دل چھم للوان زیتیہ

اندو؟

پھر منوہر کے ہونٹ تھرتھرائے۔ ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جیسے وہ منوہر کی آواز نہ ہو، کوئی دُور خلا میں بول رہا ہو۔

"گیتا ــــ گیتا کے ساتھ میں نے مل کر گھروندے بنائے تھے۔ گڈے گڑیوں کے کھیل رچائے تھے۔ گیتا بھی ایک گڑیا ہی جیسی تو تھی۔ ایک معصوم سی گڑیا۔ پھر وہ جوان ہوئی اور اُس نے ایک نیا ساتھی تلاش کیا اور اُسی کے ساتھ چلی گئی ــــ پریتم میرا دوست تھا۔ اُس وقت میں نے سوچا تھا پریتم کا تعاقب کروں گا۔ اپنے بچپن کی یادوں کو پھر سے اپنی دنیا میں لاؤں گا لیکن وہ بہت دُور چلا گیا تھا۔ میں تنہا رہ گیا۔ تم ہی بتاؤ کب تک بچپن کی یادوں سے نباہ کرتا رہوں گا۔"

میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

"میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔ تم سے کتنی بار کہا بھی ہے کہ رستہ بدل کر کے ایک نیا گھر بساؤ۔"

"ہاں میں بھی چاہتا ہوں کہ ایک نیا گھر بساؤں۔ اس پرانے گھر کا ایک ایک کونہ، ہر کمرے میں گیتا کی سانسوں کی خوشبو آتی ہے۔ جس کی ہر دیوار پر گیتا کی یادیں تصویروں کی صورت میں لٹک رہی ہیں۔ جس کی ہر شئے میں گیتا کے ہاتھوں کے لمس کا احساس ہوتا ہے۔ اُس نئے گھر میں میں ہوں گا اور اندو ہو گی۔"

میں چیخ اُٹھا۔

"تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ تم تو جانتے ہو کہ میں اندو سے محبت کرتا ہوں۔"

"یہ جھوٹ ہے!"

"یہ سچ ہے!"

"وہ تم سے محبت نہیں کرتی۔ وہ مجبور تھی۔"

"مجبور ــــ"

"ہاں مجبور تھی۔ اس لئے کہ باپ کی بے وقت موت پر جب گھر کی ساری ذمہ داریاں اُسے سنبھالنا پڑیں تو تم نے اُسے سہارا دیا۔ اندو اُسی احسان کے زیرِ اثر وہ سب کچھ کرتی رہی جو تم نے چاہا ــــ میرے دوست تم اندو سے محبت نہیں کرتے۔ محبت تو اُس پھول کی مانند ہے جو دل کی گہری گھاٹیوں میں اُگتا ہے اور روز بروز نکھرتا ہے لیکن جسے کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ محبت کی بڑی وسعتیں ہیں اور زندگی نام کی شئے سے اُس کا گہرا تعلق ہے۔ تم تو اندو کے جسم سے محبت کرتے ہو۔"

"منوہر! تمہارے لئے ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔"

"گناہ کیلئے ــــ میں نہیں جانتا لیکن محبت کے بارے میں سوچنا گناہ نہیں ہے۔ ... کو چاہتا ہوں۔ اندو میرے لئے گیتا کا دوسرا روپ ہے۔ بچپن کی وہ گڑیا جس کے ساتھ میں نے گھروندے بنائے تھے۔"

"منوہر! تم اپنی روح میں جھانک کر دیکھو ــــ میں تمہارا دوست ہوں، تمہارا ساتھی ہوں۔"

منوہر نے اُسی جذباتی لہجے میں جواب دیا۔

"میں نے اپنی روح کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا ہے۔ اُس وقت [illegible] گیتا پریتم کے ساتھ گئی تھی۔ پریتم جو میرا دوست تھا۔ اسی لئے تو کہہ رہا ہوں میں [illegible] سے اندو سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارا خیال ہے کہ روح گناہ کرتی ہے۔ روح تو [illegible] روشنی کی طرح ہے۔ گناہ جسم کرتے ہیں۔ جسموں کا کیا ہے جسم فنا ہو جاتے ہیں۔"

میں ایک لمحے کے لئے گہری سوچوں میں ڈوب گیا۔ کیا میں واقعی اندو کے جسم کا متلاشی ہوں۔ سُنہری ہرنی کا سُنہرا جسم! اور کیا منوہر اُس کی روح کی پُوجا کرتا ہے؟

"اندو آئے گی تو ــــــ!؟"

"وہ ضرور آئے گی" منوہر نے کہا۔

ایک خواب تھا جو میں نے دیکھا۔ ایک سپنا تھا جو منوہر نے دیکھا لیکن خوابوں کی دُنیا کا کیا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ خواب دیکھتے دیکھتے ٹوٹ جاتے ہیں اور حقیقت سامنے آتی ہے۔

جو کچھ مجھے ملا وہ خواب تھا!

جو کچھ منوہر نے دیکھا وہ سپنا تھا!!

اور حقیقت اندو کے رُوپ میں سامنے آتی ہے۔ اُس لمحے کی بات کر رہا ہوں جب اندو شہروں کو چھوڑ کر پھر کشمیر لوٹ آتی ہے۔ پھر چلی جانے کے لئے۔ لوٹ جانے کے لئے اُن شہروں میں جہاں متحرک ہوتے جسم ہیں، نوٹوں کی ریل پیل ہے۔ آرٹ کے نام پر دولت کمانے کا بازار گرم ہے۔ چکنے سپید فرش پر پھینکے جانے والے نوٹوں اور نازک کلائیوں میں ڈالی جانے والی چوڑیوں میں کتنا فرق ہے۔ کس قدر تضاد ہے۔ ایک پستی کی طرف لے جاتا ہے، دوسرا بلندی کی طرف! لیکن جب بلندیوں اور پستیوں کا ملاپ ہوتا ہے تو ایک نئی عورت کا جنم ہوتا ہے جو اپنی مسکراہٹ سے پھول کھلا سکتی ہے اور ایک آنسو سے بہاریں لوٹ سکتی ہے۔ دل کی دھڑکنوں کو ایک نیا انداز دے سکتی ہے، ایک ادا سے زندگی چھین سکتی ہے، جیون کا رُخ بدل سکتی ہے ــــــ اُس عورت کے لئے محبت کچھ عمروں کا تقاضہ ہوتی ہے، کچھ مجبوری کا کھیل ہوتا ہے اور کچھ چند سکّوں کی قیمت ہوتی ہے۔

اندو لوٹ آئی ہے اور اب میری اس داستان کو ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن میری اس داستان میں اب کچھ اور بے جان چہروں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ایک بے جان سا چہرہ فلموں کا پروڈیوسر ہے جو اپنی پہلی رنگین فلم میرے جنگلوں اور بیابانوں میں فلمانا چاہتا ہے اور اس فلم کی ہیروئن ہے اندو ــــــ!! سنہرے جسم والی اندو اب اپنے پُرانے بوسیدہ مکان میں نہیں رہتی وہ ڈل جھیل میں ایک خوبصورت ہاؤس بوٹ میں ٹھہری ہوئی ہے۔ زرد پیلے رنگ کا وہ کمرہ دُور رہ گیا ہے۔

اندو مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ سُنا ہے اُس نے منوہر سے بھی ملنے سے انکار کیا ہے۔ منوہر جو اُسے اپنی روح کی گہرائی سے چاہتا تھا اور میں ــــــ جسے اندو نے انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔

کہتے ہیں اندو نے کہا ہے، جس منزل کو پا لینے کے لئے اُس نے پہلے میرا اور منوہر کا سہارا لیا تھا وہ منزل خود ہی اُس کے قدموں کو چُوم رہی ہے۔ اب پُرانی باتوں کو دہرانے سے کیا حاصل!!

یہ میری داستان ہے۔ مجھ سے زیادہ منوہر کی ہے اور اُس لڑکی کی ہے جو کبھی ایک گڑیا تھی ــــــ کاش وہ ہمیشہ گڑیا ہی رہتی ــــــ!!

غزلیں

پروفیسر منشاء الرحمٰن خان منشاء ایم اے

جب سے خرابِ غمزۂ محبوب ہو گئے
ہم اور بھی خدا کی قسم خوب ہو گئے

الزامِ شوق جتنے بھی ممکن تھے دہر میں
وہ سب ہماری ذات سے منسوب ہو گئے

شکوے گلے کی بات تو اس میں کوئی نہ تھی
کیوں میرا حال سُن کے وہ محجوب ہو گئے

جب سے ہمارے زخموں پہ ہنسنے لگے ہو تم
تب سے ہمیں یہ اور بھی محبوب ہو گئے

یہ سب ہمارے حُسنِ محبت کا فیض ہے
تم جو ستم شعارِ خوش اسلوب ہو گئے

نقد و نظر کے زاویے ایسے بدل گئے
ناخُوب تھے جو کام وہی خُوب ہو گئے

منشاؔ وہ کارہائے نمایاں نہ کر سکے
جو حادثاتِ زیست سے مرعُوب ہو گئے

پروفیسر ایم، اے حفیظ بنارسی ایم اے

ہوں فصلِ گُل نہیں اِس انجمن کے پھُول
آئی تمھاری یاد کھِلے میرے من کے پھُول

یہ سب مِلیں تو بادہ کشی کا مزا ملے
آنکھوں کے جام، زُلف کے بادل، دہن کے پھُول

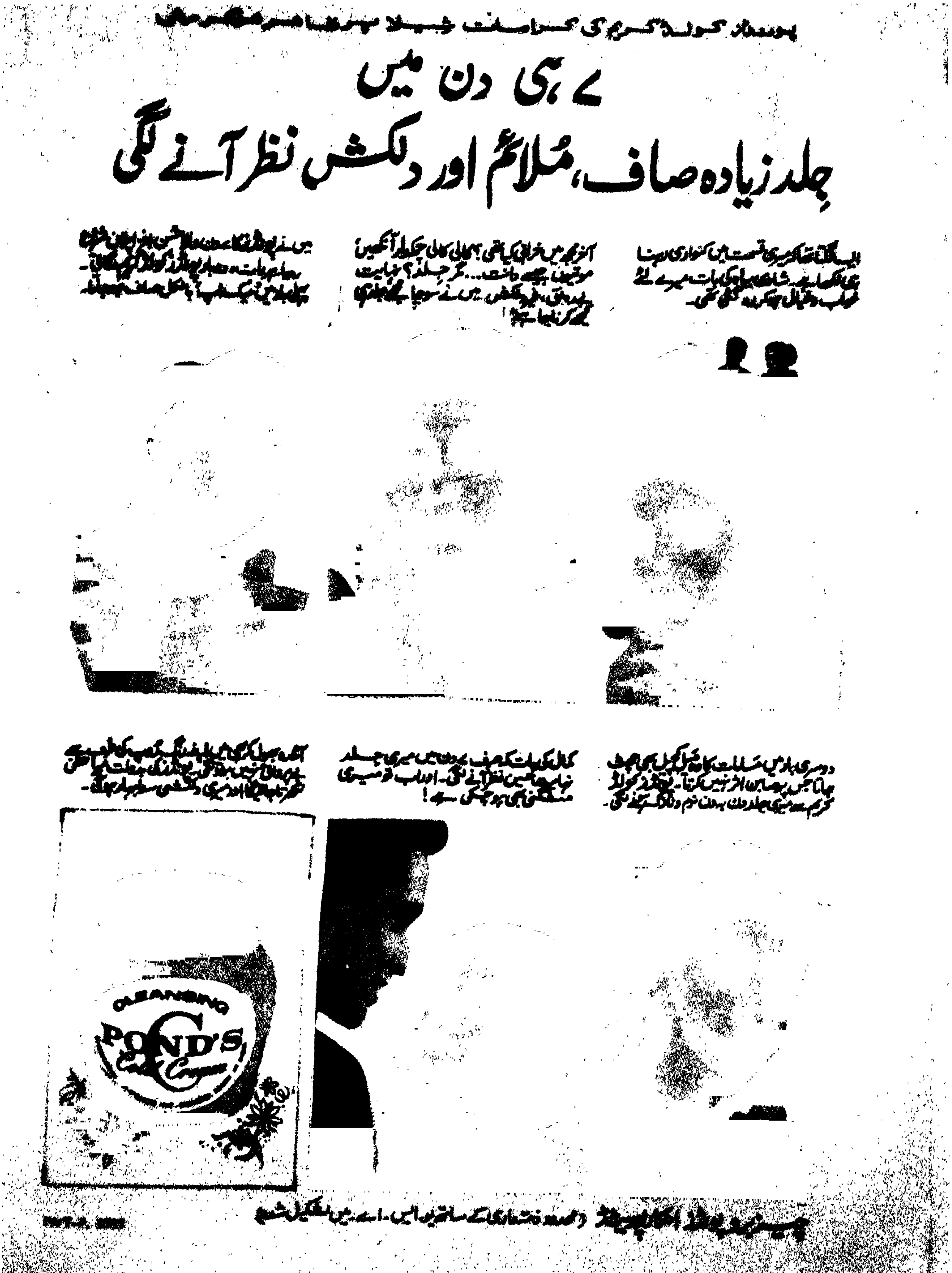
مہتاب جلوہ ریز ہے یا آسماں کا دِل
تارے ہیں ضوفشاں کہ کھِلے ہیں گگن کے پھُول

یُوں جلوہ گر ہے میری غزل کا ہر ایک شعر
جیسے ترے بدن پہ ترے پیرہن کے پھُول

سینہ ہے میرا صحنِ گلستاں بنا ہوا
یُوں زخمِ دل مہکتے ہیں جیسے چمن کے پھُول

کچھ اور تو نہیں کہ تجھے نذر کر سکوں
شاعر ہوں پیش کرتا ہوں شعر و سخن کے پھُول

تازہ رہے گا حشر تک ان کا چمن حفیظؔ
ہیں بے نیازِ بادِ خزاں فکر و فن کے پھُول


۷ ہی دن میں
جلد زیادہ صاف، مُلائم اور دلکش نظر آنے لگی
CLEANSING
POND'S

اے کاش!

اختر عابد نوگانوی

گیرمنات۔ امروہہ

۹ اگست ۶۵ء

محترم خوشتر صاحب! آداب

خلوص کے ساتھ ایک تازہ ترین افسانہ "اے کاش" حاضرِ خدمت ہے۔ قارئین تو اسے یقیناً پسند کریں گے لیکن آپ سے شرفِ قبولیت پانے کے بعد ہی یہ قارئین تک پہنچ سکے گا . . .

آپ کا نیازمند ——— عابد

ہمیں اس کمرے میں آئے ہوئے تقریباً چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ ہم دو افراد کی زندگی یوں معلوم ہوتی ہے جیسے ایک ہی محور پر گزر رہی ہو۔ ایک میں ہوں اور ایک امی جان ہیں جو اِدھر اُدھر کے کام میں مشغول رہتی ہیں اور میں اُوشا سلائی اسکول سے آنے کے بعد کسی کتاب کے مطالعہ میں محو ہو جاتی ہوں یا پھر یوں ہی تصورات کے محل تعمیر کرنے لگتی ہوں جو ہلکی سی آہٹ ہی سے چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ پھر میں اپنے تصورات، حالات اور دلی کیفیات کو ڈائری کے صفحات پر اُتار دیتی ہوں۔ اس کے سوا مجھے کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ امی بھی مجھ سے کسی کام کے لئے نہیں کہتیں۔ انھیں یہ احساس شدت سے ہے کہ تھک کر آرام کرنا میرے لئے ضروری ہے کیونکہ میں تمام دن اسکول میں لڑکیوں کو سینا پرونا اور کاڑھنا سکھاتی ہوں۔ یہی میرا ذریعۂ معاش ہے۔ زندگی ایک عرصے سے یوں ہی گزر رہی ہے جس میں کوئی رنگینی نہیں، کوئی حسین لمحہ نہیں، کوئی کشش نہیں جو اپنی جانب کھینچ لے اور میں ہر خیال کو ذہن سے نکال کر اسی کشش کا دامن تھام لوں اور ہمیشہ کے لئے خوابوں کی حسین وادی میں کھو جاؤں۔ محدود زندگی کی خلش کو بھول جاؤں ——— اے کاش کوئی لمحہ ایسا آئے . . .

آج ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ سارا عالم اندھیروں میں غرق ہو گیا ہے۔ بہت دیر سے لائٹ آف ہے۔ ایک عجیب پُراسرار ماحول ہے، ہر طرف سکوت چھایا ہوا ہے۔ میرے کمرے میں ایک شمع پگھل رہی ہے۔ جس کی لَو اندھیرے اور سناٹے کے خوف سے کانپ رہی ہے۔ ٹیبل پر رکھی ٹائم پیس کا دل دھڑک رہا ہے اور میری نگاہیں اُس پر جمی ہوئی ہیں۔ یہ کتنے لمحوں، کتنے گھنٹوں، کتنے دنوں اور کتنے سالوں کا ساتھ چھوڑ چکی ہے لیکن اس کی دھڑکنیں ابھی تک بند نہیں ہوئیں ——— یہی مجھے میرا ماضی یاد دلا دیتی ہے۔ میں چاہتی ہوں، اُن دنوں کو بھول جاؤں، اُن لمحوں کے خیالات کو ذہن سے کھرچ دوں لیکن میرا دل بیقرار ہو جاتا ہے، ایک خلش بیدار ہو جاتی ہے اور وہ دَور میرے سامنے آجاتا ہے جب میں خوشیوں کے گہوارے میں جھول رہی تھی، میرے احساسات جوان تھے۔ میری آنکھوں میں دمکتے چاند کا نور تھا اور کسی کی قربتوں نے میرے دامن میں کائنات کی خوشیوں کے خزانے اُلٹ دیئے تھے۔

ایسے میں مجھے پھر وہ دن یاد آگئے ہیں جو میری حیات تھے اور مجھے سدا بہاروں کا پیغام دیتے تھے۔

اے کاش! وہ لمحات پھر پلٹ آئیں۔

اس مہیب تاریکی میں کوئی روشنی بن کر میرے قریب چلا آیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے میرا ماضی پلٹ آیا ہے۔ مجھے مجھ سے بچھڑے وہ لمحات مل گئے ہیں میں جن کے لئے آج تک ترستی رہی ہوں۔ اُن بانہوں کا سہارا مل گیا ہے جن کے لئے بیقرار رہی ہوں۔ وہ مسکراہٹیں مل گئی ہیں جن کے چھن جانے کے بعد آج تک میرے لبوں پر مسکراہٹ نہ آسکی۔ وہ تصور مل گیا ہے جس کے لئے میری آنکھیں روتی رہی ہیں اور اس انقلاب نے کروٹ لی ہے جس نے مجھے تنہا چھوڑ دیا تھا۔

ذاکر! ——— میری حیات کا ساتھی۔

وہ دن، جب ذاکر میرے قریب، میرے ساتھ میری زندگی کی مہکتی راہوں میں اپنی مسکراہٹوں کے پھول بکھیر رہا تھا اور میں اُس کے ساتھ زندگی کا سفر طے کرتی جا رہی تھی۔

چاری راہوں میں کوئی کانٹا کوئی دشواری نہ تھی۔ ہم نے محبت کا دامن تھام کر زندگی کی آخری منزل تک پہنچ جانے کی قسم کھائی تھی ــــــ ایک بڑی فرم میں منیجر تھا معقول تنخواہ ملتی تھی۔ اگر کچھ کمی تھی تو صرف میری جیسی رفیق حیات کی۔

ایک دن جب ہم اس جستجو میں کامیاب ہو گیا تو اس نے مجھ سے کہا تھا۔

"فرزانہ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ تمہاری جیسی رفیق حیات مل گئی مجھے تمہاری جیسی لڑکی کی تلاش تھی۔"

"اور اگر میں نہ ملتی . . ." میں نے شوخی سے کہا تھا۔

"اگر تم نہ ملتیں تو میں شاید تاریکیوں میں ڈوب کر رہ جاتا ــــــ" ذاکر نے جواب دیا تھا۔

"خدا نہ کرے" میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"انھیں نازک ہاتھوں کے سہارے کی تو مجھے ضرورت تھی" اس نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا تھا اور میں شرم و حیا سے سمٹ گئی تھی میری سانسیں بہکنے لگی تھیں لیکن اس نے پھر کہا تھا۔

"فرزانہ! تمہاری ان مہکتی سانسوں ہی سے تو میری زندگی کو مہکار ملا ہے"

میں خاموش رہی۔

اس کے بعد اچانک ہی میری امیدوں کا چراغ گل ہو گیا۔

ذاکر خود دار انسان تھا۔ انسانیت کا دامن ہمیشہ تھامے ہوئے تھا محبت ہی کو ایمان سمجھتا تھا اور یہ ایمان ہی اس کی زندگی تھا لیکن اچانک ہی اس پر بے ایمانی کا الزام لگایا گیا کہ اس نے مل کے مالک کا ایک لاکھ روپیہ غبن کیا ہے۔ یہ بات اس کی خودداری پر بہت بڑی چوٹ تھی جسے وہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔ مجھ سے زیادہ ذاکر کو کسی نے نہ سمجھا تھا میں اس کی فطرت سے بخوبی واقف تھی لیکن میں بھی مجبور تھی کہ اس کی بے گناہی کا ثبوت نہ بن سکتی تھی۔ اس کی پیشانی سے اس داغ کو نہیں مٹا سکتی تھی جو اس کی عظمت و وقار پر بہت ہی بدنما داغ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجرم کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوتا اس نے اپنی زندگی کا چراغ اپنے ہی ہاتھوں سے گل کر دیا تھا۔

اس کے بعد میری زندگی میں مہیب اندھیرا تھا اور میں اس اندھیرے میں بھٹک کر دور نکل آئی جہاں ذاکر نہ تھا۔ صرف میرا دل تھا۔ اس میں تڑپتی ہوئی یادیں تھیں ان کے رستے ہوئے زخموں کو کسی نے نہ دیکھا تھا۔

اور اب بھی ان زخموں کو کسی نے نہیں دیکھا ہے۔

اے کاش! ـــــ ان لمحات کا تصور کوئی میری آنکھوں سے چھین لیتا۔

حسب معمول سنڈے کی چھٹی ہے۔ یہ دن عموماً بے کیف گزرتا ہے۔ آج اس بے کیفی کو دور کرنے کے لئے میں نے ایک کتاب کا سہارا لیا ہے لیکن کتاب پڑھتے پڑھتے میری نگاہیں خلاؤں میں بھٹک گئی ہیں۔ شام نے اپنا آنچل پھیلا دیا ہے اور میں بے مقصد خیالات سے الجھ رہی ہوں۔

اچانک کسی کی پرکشش آواز نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا ہے۔ یہ آواز سامنے والے کمرے سے آ رہی ہے۔ جب سے میں اس کمرے میں مقیم ہوں کبھی سامنے والے کمرے کے لئے بھی نہ سوچا تھا حالانکہ اس کمرے اور میرے کمرے میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے صرف ایک غلام حائل ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کمرے کی کھڑکیاں بند دیکھی تھیں اور نہ کبھی کوئی آواز سنائی دی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کمرے میں کوئی نہیں رہتا۔ لیکن آج جب یہ بات میرے ذہن میں سے کچھ دیر پہلے ایک مجموعہ میں پڑھی تھی اس کے بول میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور میں حیرت و استعجاب سے ان کھڑکیوں کو تک رہی ہوں جن سے یہ ترنم ریز آواز آ رہی ہے اور میرا دل میرے اختیار سے باہر ہوتا جا رہا ہے ـــــ یہ آواز کس کی ہو سکتی ہے؟

اے کاش! ـــــ یہ کھڑکیاں وا ہو جائیں!!

آج ہوا کے کسی آوارہ جھونکے نے اس کے کمرے کی کھڑکیوں کو وا کر دیا ہے۔ نہ جانے کتنے برسوں سے اس کمرے میں رہتا ہوگا لیکن میں نے آج پہلی بار دیکھا ہے۔ وہ عجیب سا معلوم ہو رہا ہے اور نہ جانے کن خیالات کی وادی میں بھٹک رہا ہے۔ میری نگاہیں اس کے وجود سے ہٹ کر اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگی ہیں جو ایک ویرانہ معلوم ہو رہا ہے ہر شے بے ترتیبی سے بکھری ہوئی معلوم ہو رہی ہے اور اس کی بے سر و سامانی کی غماز ہے۔

معاً وہ کسی درد کی شدت سے کمرے میں ٹہلنے لگا ہے۔ اس عالم میں اس کے لب کچھ گنگنا رہے ہیں اور میں اس کی اس کیفیت کے لئے سوچنے لگی ہوں کہ وہ کیسا عجیب انسان ہے۔ اس کے بڑے بڑے بکھرے بال چہرے پر مایوسی کی پرچھائیاں آنکھوں میں کسی کھوئی ہوئی شے کی تلاش، ایک عجیب سی کشش ہے جس میں وہ گرفتار معلوم ہوتا ہے اس کے لبوں سے ابھرتا ہوا ترنم کا سرور برابر ماحول میں رچتا جا رہا ہے۔

شام ڈھلی اور پھر رات آ گئی ہے۔ اس کے کمرے کی کھڑکیاں اب بھی کھلی ہوئی ہیں اور ان سے برقی روشنی باہر تک آ رہی ہے اور ایسا معلوم ہو رہا ہے آج کا سناٹا بھی نکل کر اجالوں میں ڈوب گئی ہے۔ دور آسمان کے سینے پر چمکتا ہوا چاند اور ستارے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ ایسے میں اس کے لب پھر ترنم ریز ہیں۔ بول اس کے ہونٹوں کو چوم رہے ہیں اور اس کا دل کسی احساس سے جیسے وہ گیت کا نام لے کر زبان تک لے آیا ہے۔

کچھ دیر بعد سکوت چھا گیا ہے اور میں ... سے آشنا ہوتا جا رہا ہے۔ نہ جانے کیوں میری ...

کون سا جذبہ ہے جو آنسوؤں میں ڈھل گیا ہو؟

اے کاش! ــــ میں اُس کے درد کی کسک کو قریب سے محسوس کر سکتی!!

میں نے تنہائی کے احساس سے گھبرا کر ٹیبل پر رکھے ہوئے ٹرانسسٹر کا سوئچ آن کر دیا ہے۔ چند لمحوں بعد اناؤنسر نے کہا ہے۔

"آج کے پروگرام میں ہم آپ کو پہلے ریاض جمالی صاحب کا لکھا ہوا ایک گیت اُنہیں کی آواز میں سُنوا رہے ہیں:"

تلخ تنہائی کے لمحات کسے پیش کروں

غم میں ڈوبی ہوئی یہ رات کسے پیش کروں

میں ٹھٹھک گئی ہوں ــــ یہ گیت، یہ ترنم، یہ آواز ــــ چند لمحوں تک میں کہیں کھوئی رہی۔ جب گیت ختم ہوا تو مجھے خیال آیا کہ یہ گیت تو میں سُن چکی ہوں ــــ تو کیا اِسی کا نام ریاض جمالی ہے ــــ ہاں! ــــ میرے دل نے جواب دیا اور میری نگاہیں فوراً ہی اُس کے کمرے میں پہنچ گئی ہیں۔

آج وہ کھڑکی کے بالکل قریب ہی بیٹھا ہے۔ اُس کے ہاتھوں میں کوئی کتاب ہے جس کے مطالعہ میں وہ محو ہے۔ میں چاہتی ہوں اُس کی محویت کو توڑ دوں، اُس کے … پاس ہو جاؤں لیکن میرے جذبات کے ارادوں میں اِتنی توانائی کہاں ہے جو اِس خلیج کو عبور کر جائیں۔ پھر وہ میرے لئے اجنبی نہ ہو اور میں اُس کی زندگی کے آئینے میں جھانک کر سب کچھ دیکھ لوں۔

لیکن میری فطرت کے تقاضے کتنے بزدل ہیں؟

اے کاش! ــــ میں اُن تقاضوں کو توانائی بخش سکتی!!

آج کئی دنوں بعد ایک عجیب سا حادثہ رونما ہوا ہے جس کے لئے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی لیکن یہ زمانے کے اتفاقات ہیں جو اکثر حادثے کر سامنے آجاتے ہیں۔ میرے لئے یہ بات حادثے سے کم نہیں ہے کہ کچھ دیر پہلے ہم دونوں ایک ہی راہ پر اجنبی مسافروں کی طرح قدم اُٹھا رہے تھے۔ میرے دل کی اُس وقت عجیب حالت تھی۔ قدم بار بار بہک رہے تھے۔ میں نے چور نگاہوں سے دیکھا تھی اور وہ بھی گاہے گاہے مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا جن میں … پیغام چھپے ہوتے ہیں۔

پھر اچانک ہی ہم ایک منزل پر ٹھٹک گئے۔ نجانے وہ کون سے جذبے تھے جنہوں نے … اُس کے قدموں کو ایک جگہ ٹھہر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر چند لمحوں تک وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ مجھے خیال آیا میرے قدم یہاں کیوں رُک گئے ہیں؟ یہ سوچتے ہی میں نے قدم اُٹھانے ہی تھے کہ اُس نے ٹوکا۔

"سُنیئے!"

میرے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ مجھے اُس کی جسارت پر تعجب تھا۔

"کیا اوپر والے کمرے میں آپ ہی رہتی ہیں؟" اُس نے پھر سوال کیا۔

"جی!" میں نے قدرے گھبراتے ہوئے جواب دیا لیکن اِس کے بعد میرے قدم نہ رُک سکے۔

کتنی مختصر سی بات تھی لیکن میرے لئے حادثہ بن گئی ہے جس کے لئے میں مختلف پہلوؤں سے سوچنے پر مجبور ہوں کہ میرے جذبوں کو نئی روح مل گئی ہے۔ ایک جرأت مل گئی ہے۔ اور میں سب کچھ بھول کر اِس جرأت کے ساتھ آگے بڑھ گئی ہوں، جہاں وہ مجھ سے قریب ہو گیا ہے۔ اور کھڑکی سے پھینکے ہوئے پرچے کو وہ استعجاب بھری نظروں سے پڑھ رہا ہے جس میں میں نے لکھا ہے۔

"اکثر آپ کی درد بھری آواز سُنی ہے۔ چند دن ہوئے جس گیت کو آپ نے ریڈیو اسٹیشن پر ریکارڈ کرایا تھا وہ بھی سُن چکی ہوں۔ آپ کے گیت کے یہ بول مجھے خاص طور سے پسند ہیں ــــ

اپنے اشکوں کی یہ سوغات کسے پیش کروں

دل کے بہکے ہوئے جذبات کسے پیش کروں

عنایت ہوگی اگر کسی وقت پھر یہ گیت سُنایئے تو ــــ آپ کے گیتوں کی شیدائی ــــ فرزانہ!"

میرے اِس پرچے کے جواب میں جو باتیں اُس نے لکھی ہیں، اُنھوں نے میرے دل میں ہلچل سی مچا دی ہے۔ اُس نے لکھا ہے۔

"آپ وہ پہلی شخصیت ہیں جس نے میرے گیت کو پسند کیا ہے۔ ریڈیو اسٹیشن سے یہ میرا گیت پہلی بار نشر کیا گیا ہے۔ آپ کی پسند کا احترام کرتے ہوئے یقیناً آپ کی خواہش پوری کروں گا۔ انتظار کیجئے ــــ ریاض جمالی ــــ"

اے کاش! ــــ یہ فاصلہ بھی نہ ہوتا!!

گزرتے دنوں کے ساتھ میں بہت آگے بڑھ چکی ہوں۔ میں نے فاصلے کے احساس کو بھی ختم کر دیا ہے۔ ایک دن میں نے امّی سے بہت زیادہ تعریف کی تو انہوں نے میرے جذبات کو دل کی گہرائی سے سراہا۔ نجانے انھیں کن لمحوں کی یاد آگئی تھی کہ اُن کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور وہ پہلا دن تھا جب وہ مجھ سے، میری نگاہوں سے، میرے دل سے قریب تھا اور امّی نے اُس کی اِتنی خاطر مدارات کی تھی کہ وہ بوجھ سا محسوس کرنے لگا تھا۔ پھر تکلفات کے تمام پردے اُٹھ گئے … وہ ہمارے گھر کا ایک فرد معلوم ہونے لگا۔ فاصلے قربتوں میں کیسے بدل جاتے ہیں یہ احساس مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ وہ میرے لئے ایک مخلص انسان ثابت ہو چکا تھا۔ اِس لئے میرے بے کیف لمحات اُس کے ساتھ گزرنے لگے تھے۔ میری تنہائی کا وہ ساتھی بن گیا تھا۔ اب میں نے اُسی کے ہاتھوں سے اپنے تصورات کے محل کی بنیاد رکھی تھی۔ ایک دن امّی نے پھر میرے جذبوں

کر لطیف بخش تو ہیں تصورات اور حسین ہو گئے۔

وہ ایک شاعر ہے۔ اُس کے سینے میں حساس دل ہے اور کسی گہرے غم سے آشنا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے مجھے اُس کی ہر بات، ہر انداز بے پناہ متاثر کرتا ہے لیکن سب سے زیادہ مجھے اُس کی موجودہ زندگی نے متاثر کیا ہے۔ اس لئے میں نے کبھی اُس کے ماضی کے آئینے میں جھانک کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے کہ اُس کی زندگی سے کون سا ایسا حادثہ وابستہ رہا ہے جس نے اُسے ایک انفرادی شخصیت کا مالک بنا دیا ہے۔ میں تو ایک خوش فہمی کے ساتھ تصورات کی اُن وادیوں میں بھٹکنے لگی ہوں جہاں وہ میرے ساتھ قہقہے لگاتا ہے۔

دو دن گزر چکے ہیں۔ وہ اتنی قربتوں کے بعد بھی مجھ سے دور رہا ہے۔ اُس کے کمرے کی کھڑکیاں بھی میں نے بند پائی ہیں۔ میں نے سوچا شاید کہیں چلا گیا ہو گا لیکن مجھ سے تو کہنا چاہئے تھا۔ ہو سکتا ہے کوئی ایسا ضروری کام آ پڑا ہو جس کی وجہ سے مجھے مطلع نہ کر سکا لیکن دوسرے دن شام کو جب میں اسکول سے واپس آئی تو میری آنکھوں کو پھر اُسی کی تلاش ہے لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ دو دن سے اُس کی طبیعت خراب ہے اور اپنے کمرے میں اسی دن سے تنہا پڑا ہے تو میں پریشان ہو گئی ہوں۔ میں نے امی سے ذکر کیا تو اُن کی پریشانی بھی معنی خیز بن گئی۔ اُنھوں نے فوراً ہی مجھ سے کہا، کہ میں جا کر اُس کی خبر لوں۔

ابھی تک وہ ہمارے ہی یہاں آتا رہا تھا لیکن یہ اتفاق نہ ہوا تھا کہ میں اُس کے کمرے میں قدم رکھتی، یہ موقع ہی نصیب نہ ہوا تھا۔ نہ اُس نے مجھ سے کبھی کہا تھا۔ شاید اُسے اپنی بے سروسامانی کا احساس شدت سے تھا۔ آج پہلا اتفاق ہے کہ میں نے اُس کے کمرے میں قدم رکھا ہے جیسا کہ میں نے سُنا تھا، وہ تنہا اپنے کمرے میں ایک چارپائی پر پڑا ہے۔ اُسے اپنی بھی خبر نہیں ہے۔ دو ہی دن میں اُس کی عجیب حالت ہو گئی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی رفیق قریب ہوتا ہے تو بیمار کے لئے درماں ثابت ہوتا ہے لیکن اُس کی رفیق صرف تنہائیاں ہیں۔ اُس سوگوار زندگی کے بارے میں سوچ کر میری آنکھیں نم ہو گئی ہیں۔ اُسے ایک ساتھی کی سخت ضرورت ہے۔ اُسے ہی نہیں، بلکہ اُس کی زندگی کے ہر ہر لمحے کو ضرورت ہے۔

میں اُس کے قریب بیٹھ گئی ہوں وہ ہلکے ہلکے کراہ رہا ہے۔ پھر میں نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا ہے جیسے میرا ہاتھ کسی بہت ہی گرم شئے سے چھو گیا ہے۔ اُس کا پورا جسم بخار سے جل رہا ہے جس کی شدت کو میں بہت قریب سے محسوس کر رہی ہوں۔

”کون ہے؟“ اچانک اُس کی گھٹی ہوئی آواز اُبھری۔

میں نے جواب میں مُسکرانے کی کوشش کی۔

”آپ نے کیسے تکلیف کی؟“ اُس نے مجھے پہچانتے ہوئے کہا۔

”آپ کے لئے؟“ میں نے فوراً ہی جواب دیا۔

”شکریہ اس نوازش کا ـــــ“ اُس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

”آپ کتنے بے پرواہ ہیں کہ اپنا ذرا بھی خیال نہیں رکھتے“ میرے دل کی بات زباں تک آ گئی۔

وہ جواب میں خاموش رہا جیسے اُسے بھی اپنی اس کوتاہی کا شدت سے احساس تھا۔ مجھے خیال آیا اس وقت اِسے صرف تیمارداری ہی کی ضرورت نہیں دوا کی ضرورت بھی ہے۔ اس لئے میں نے کہا۔

”آپ نے یقیناً دوا بھی نہیں پی ہو گی۔ میں ڈاکٹر کو بُلواتی ہوں“

”یہ تکلیف نہ کیجئے۔ معمولی سا بخار ہے صبح تک اُتر جائے گا“

اُس کا یہ عذر ایک تکلف تھا۔ اس لئے میں نے نظر انداز کر دیا۔

رات آئی تو وہ دوا پینے کے بعد آرام سے سو گیا اب اُس کے دل سے کوئی کراہ بھی نہیں نکل رہی ہے میں اُس کے قریب ہی بیٹھی ہوں اور اُس کی جانب سے مطمئن ہوں۔ اُس کے سرہانے ایک کتاب رکھی ہوئی ہے جسے میں نے اُٹھا لیا ہے لیکن جب میں نے اسے کھولا تو وہ کتاب نہیں ڈائری ہے جس میں بہت سی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ میں نے اُس کے کئی صفحات اُلٹ دئے ہیں۔ معاً ایک صفحے پر میری نظر ٹھہر گئی ہے۔ لکھا ہے ـــــ

”ماضی کی یادیں میری زندگی ہیں۔ یہ ہر ہر قدم پر میرے ساتھ رہتی ہیں۔ کئی منزلوں نے میرے قدموں کو روکا۔ مجھ سے اِن یادوں کو چھیننا چاہا لیکن میری یہ متاعِ دل کوئی نہ چھین سکا اور نہ کبھی کوئی چھین سکے گا۔ غم دنیا بھی اُس غم کو مجھ سے نہ چھین سکا ہے جو شہناز کی اچانک موت نے میری روح کو بخشا تھا۔ پانچ سال سے اُس غم کی یادیں میری روح کی گہرائی میں چھپی ہوئی ہیں۔

وہ وعدہ میں کبھی نہیں بھلا سکا ہوں جو میں نے ایک دن شہناز سے کیا تھا کہ ”شہناز تمھارے بغیر میری زندگی میں کبھی کوئی نہ آئے گا۔ اگر کسی نے آنے کی کوشش کی بھی تو میں اُن جذبوں کا گلا گھونٹ دوں گا“ ـــــ شہناز کی موت میری وجہ سے ہوئی تھی۔ کیونکہ میں اس قابل نہ تھا کہ اُسے ٹی بی جیسے مہلک مرض سے چھٹکارا دلا سکتا۔ اسی لئے میں اُن یادوں کی پوجا نہیں چھوڑ سکتا جن کا دامن تھام کر میں آج تک جیتا رہا ہوں“

میں نے اُس کی ڈائری کا ایک ہی صفحہ پڑھا ہے کہ میری نگاہیں کمرے کی محدود فضا میں بھٹک گئی ہیں۔ بھٹکتے بھٹکتے اُس تصویر پر جم گئی ہیں جو دیوار پر آویزاں ہے۔ وہ کسی خوبصورت عورت کی تصویر ہے جس کے گلے میں پھولوں کا ہار مُرجھانے لگا ہے۔ اِس کے بعد میں نے ایک گہری نظر اُس کے چہرے پر ڈالی ہے۔ وہ میری دلی کیفیت سے غافل ہے اور جیسے ہمیشہ ہی غافل رہا ہے۔

یہ خیال آتے ہی میرا دل غم کی گہرائی میں ڈوبنے لگا ہے، آنکھیں برس پڑی ہیں اور میں سوچ رہی ہوں۔

اے کاش! ـــــ میں اپنے ماضی کا دامن چھوڑ کر جذبات کے تقاضوں کے ساتھ نئی منزل کے لئے قدم نہ اُٹھاتی!!

شانِ نزول

—— نریش کمار شاد

۱۵ ایف۔ موتی باغ ۲۔ نئی دہلی

۲۳ ستمبر ۶۵ء

محبی خوشتر صاحب!

"بیسویں صدی" کے آئندہ شمارے کے لئے "شانِ نزول" کی نئی قسط حاضر ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کا دل باغ باغ ہو جائے تو "بیسویں صدی" میں شائع کرکے دوسروں کے دل بھی باغ باغ کیجئے۔۔۔

آپ کا —— نریش کمار شاد

کسی خوش ذوق نے مرزا محمد رفیع سودا کو یہ مصرعہ سنایا ؎

اک نظر دیکھنے سے ٹوٹ نہ جاتے ترے ہاتھ

اور مصرع کو شعر میں منتقل کرنے کی خواہش کی۔ سودا نے چند لمحوں کے تامل کے بعد یہ شعر موزوں کر دیا ؎

لیلیٰ اتنا تو نہ تھا پردۂ محمل بھاری
اک نظر دیکھنے سے ٹوٹ نہ جاتے ترے ہاتھ

ایک مشاعرے میں ہمعصر شعراء کی معاصرانہ چشمک کو دیکھ کر میرزا غالب ایسے بد دل ہوئے کہ کچھ مدت تک کوئی شعر نہ کہا اور دو ایک مشاعروں میں بھی اپنا کلام نہ سنایا۔

ذوق دہلوی نے آخر غالب سے خطاب کرتے ہوئے یہ شعر کہا ؎

رُکاو خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بُو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

ذوق کے اس شعر کے جواب میں غالب نے یہ شعر کہا ؎

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

کئی سال پہلے تلوک چند محروم لاہور میں حفیظ جالندھری سے ملنے انارکلی (لاہور) میں ان کی بیٹھک پر پہنچے تو حفیظ صاحب اس وقت وہاں موجود نہیں تھے محروم صاحب نے ان کی عدم موجودگی میں فی البدیہہ یہ قطعہ لکھ کر ان کی میز پر رکھ دیا ؎

دفتر جو بالاخانے میں دیکھا حفیظ کا
محروم سچ تو یہ ہے کہ دل شاد ہو گیا
رونق ہوئی انارکلی کی چہار چند
بازار سوز و ساز سے آباد ہو گیا
جن منزلوں میں حُسن کبھی نغمہ ریز تھا
اے عشق ان میں مائلِ فریاد ہو گیا

"سوز و ساز" حفیظ صاحب کے مجموعۂ کلام کا نام ہے اور انارکلی کے بالاخانے کسی زمانے میں طوائفوں سے آباد تھے۔

ایک خاص جلسے میں ایک حسین و جمیل مغنیہ مہمان تھی۔ وہ دورانِ گفتگو میں بار بار آئینہ اُٹھا کر دیکھتی اور پھر رکھ دیتی۔ شاید کسی دیکھنے والے نے نظر لگا دی کہ اس کے ہاتھ سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا۔ دل میں شرمسار ہونے کے باوجود تیوریوں پر بل ڈال کر کہنے لگی "ہم کیا کریں؟ اپنے آپ ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹ گیا۔"

یہ سن کر سراج لکھنوی نے برجستہ یہ شعر موزوں کر دیا ؎

شیشۂ دل توڑ کر بولا وہ شوخ
دیکھتے تھے چھُٹ پڑا ہم کیا کریں

لارڈ کچنر اور لارڈ کرزن میں چند سیاسی معاملات کی بنا پر اختلاف تھا جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ لارڈ کچنر جیت گئے اور کرزن کو مستعفی ہونا پڑا۔ کرزن کے استعفی کی بات جب
اکبر الٰہ آبادی کو معلوم ہوئی تو فی الفور دو شعر موزوں ہو گئے ؎

کرزن و کچنر کی حالت پر ہو گل
یہ صنم تشریح کا طالب ہوا
کہہ دیا میں نے کہ ہے یہ بات صاف
دیکھ لو تم زن پہ نر غالب ہوا

داغ دہلوی نے اپنی محبوبہ منی جان طوائف الٰہ آبادی کے نام ایک طویل محبت نامہ
لکھنے کے بعد نہایت خوبصورت بیل بوٹے والے لفافے میں رکھ کر اپنے شاگرد نوح ناروی کو
اس پر پتہ لکھنے کے لئے کہا۔

نوح صاحب نے جھجکتے ہوئے کہا ”استاد! گستاخی معاف۔ ڈاکخانے کی مہر
لفافے کی زیبائی کا خون کر دے گی۔ آپ فرمائیں تو اس لفافے کو کسی بڑے لفافے میں ڈال کر
اس پر پتہ لکھ دوں۔“ اور اتنا کہنے کے بعد تھوڑی دیر رک کر کہا ”— لیکن
اس دلکش لفافے پر آپ کا کوئی شعر ضرور ہونا چاہئے۔“

داغ یہ سن کر مسکرائے اور اسی وقت یہ مطلع موزوں کر دیا ؎

شوق کھلنے نہ دیا، عشق کا پردہ رکھا
اس لئے ہم نے لفافے میں لفافہ رکھا

اپنے شاگردوں کے ساتھ شاہ نصیر کسی میلے میں گئے تو وہاں انھوں نے ایک ایسی
عورت کو دیکھا جو وسمے کی چمک دار اودی رضائی سر پر اوڑھے ہوئے تھی۔ کسی شاگرد نے
شعر کہنے کی فرمائش کی تو شاہ نصیر نے اسی وقت کہا ؎

اودی وسمہ کی نہیں تیرے رضائی سر پر
مہ جبیں رات ہے تاروں بھری چھائی سر پر

ذوق دہلوی فکر سخن کر رہے تھے اور شعر اپنے شاگرد مولانا محمد حسین آزاد کو لکھوا
رہے تھے۔ غزل کا مطلع یہ تھا ؎

کون روتا ہے یہ لگ کر باغ کی دیوار سے
جب اور گرنے لگے جاتے ثمر اشجار سے

اسی دوران میں ایک سوداگر آ گیا اور انھیں اپنا سامان دکھانے لگا۔ ان میں ایک
اصفہانی تلوار بھی تھی جو ذوق کو بہت پسند آئی۔ اپنی پسند کا اظہار انھوں نے آزاد سے

مطلب پھر اس مصرع میں کیا ہے ؎

اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

آزاد نے اسی وقت اس مصرع میں ایک لفظ کی ترمیم کر کے پہلے دوسرا مصرع
لگا کر یہ شعر کہہ دیا ؎

سر لگا دیں ابروئے خمدار کی قیمت میں کیا
اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار کا

مالیر کوٹلہ کے نواب ذوالفقار علی نے ایک نہایت قیمتی موٹر خریدی تو اس میں
بیٹھ کر نواب صاحب، سر جوگندر سنگھ، میرزا جلال الدین اور علامہ اقبال لاہور میں شالا مار
باغ کی سیر کو نکلے۔ راستے میں جوگندر سنگھ نے حیرت کے ساتھ کہا کہ کمال ہے! نواب صاحب
کی موٹر انتہائی خاموش واقع ہوئی ہے۔

اتنی سی بات سن کر علامہ اقبال کچھ ایسے متاثر ہوئے کہ موٹر کے عنوان سے بعد
میں یہ شعر کہہ دئے ؎

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش
ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرام ناز
مانند برق تیز، مثال ہوا خموش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر
ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش
ہے پا شکستہ شکوۂ فریاد سے جرس
نکہت کا کارواں ہے مثال صبا خموش
مینا مدام شورش قلقل سے پا بگل
لیکن مزاج جام خرام آشنا خموش
شاعر کی فکر کو پر پرواز خامشی
سرمایہ دار گرمی آواز خامشی

علی بخش رنجور کپورتھلوی نے نہایت سنگلاخ ردیف ”کے ہاتھ“ میں جب
اپنی یہ غزل لکھی ؎

ہم تھے بے خود وہ اشارے کر رہا تھا ہاتھ سے
اس قدر ہم راہ بھولے تھک گئے رہبر کے ہاتھ

تو اس میں پتھر کا قافیہ یوں باندھا ؎

سنگدل تھا محبوب گرایا تھے پتھر کے ہاتھ

اسا تھی فنا شکر اس زمین میں پتھر کا قافیہ انھیں کا حصہ ہے۔ جوش ملسیانی

نے اسی زمین میں غزل کہتے ہوئے یہ شعر اُن کے اس شعر کے جواب میں کہا ؎

میرے تھے حُسن کے بُتخانے کی ہر مُورت سے مست

پھول برساتے ہیں مجھ پر سیکڑوں پتھر کے ہاتھ

میرے کسی دوست نے وقار انبالوی کی ایک غزل کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اُس کے کسی

شعر میں کوئی فعل نہیں۔ ہر شعر محض مفرد الفاظ کا مجموعہ ہے۔ میں نے جب وہ غزل سُننے کا اشتیاق

ظاہر کیا تو اُس نے کہا کہ کوئی شعر تو یاد نہیں البتہ مقطع کا مصرعِ ثانی یاد ہے ؎

رات، تنہائی، قلم، کاغذ، وقار

بعد میں اسی اسلوب کو اپناتے ہوئے میں نے بھی یہ قطعہ کہا ؎

ابتدا، عشق، لذتیں، وعدے

زندگی، کیف، رنگ، رعنائی

انتہا، ہجر، کاوشیں، صدمے

زندگی، درد، یاس، تنہائی

چیمسفورڈ کلب نئی دلی میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے زیرِ اہتمام ایک مشاعرہ

ہو رہا تھا جس میں رات گئے تک دورِ سخن کے ساتھ ساتھ دورِ جام بھی چلتا رہا۔ ایسے پُرکیف

ماحول کی مناسبت سے بسمل سعیدی نے اپنی غزل کا یہ مقطع فی البدیہہ کہہ کر پڑھ دیا ؎

ہزار بند درِ میکدہ سہی بسمل

پلانے والے ہیں تو پلائے جاتے ہیں

داغ دہلوی کا یہ شعر ؎

غش کھا کے داغ یار کے قدموں پہ گر پڑا

بے ہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

اُن کے تلمیذ التلامذہ جناب زار نکودری کو یہ شعر اس حد تک پسند آیا کہ اُنھوں نے

اپنی جذباتی کیفیت سے ہم آہنگ کرنے کے لئے یہ شعر کہا ؎

لڑکھڑا کر جب گرا میں پائے ساقی پر گرا

اس قدر بے ہوش ہونے پر بھی مجھ کو ہوش تھا

کوئی صاحب کہیں یہ مشہور شعر پڑھ رہے تھے ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے

عمر یونہی تمام ہوتی ہے

شعر سُن کر میلارام وفا کے مُنہ سے نکلا ؎

صبح ہوتا ہے، شام ہوتا ہے

وہ صاحب حیرت زدہ ہو کر کہنے لگے: "وفا صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

اور وفا صاحب نے اپنی اُستادی کے زور پر اُسی وقت یہ مصرع کہہ کر ؎

ذکر اُن کا مدام ہوتا ہے

اُن کی حیرت کو مسرت میں بدل دیا۔

مدیر بیسویں صدی کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کا ارشاد کی فوراً تعمیل ہو سکے۔ لمبے خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔



جن چیزوں پر وہ
ناز کرتی ہیں....
.... ان میں اُوشا سلائی مشین بھی ہے۔
اُوشا کی ہی بدولت ان کے بچّے نئے پوشاک میں خوش خوش دکھائی دیتے ہیں۔ اور ماں کو اس بات کا فخر ہے کہ اس نے خود انہیں سی ہے۔ اُوشا خریدنا عقلمندی کے ساتھ رقم لگانے کی علامت ہے۔ کیوں کہ اس سے کم خرچ پر زیادہ سے زیادہ کپڑے بنانا ممکن ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فرصت کا وقت گذارنے کے لئے اُوشا پر بے نقص سلائی سے فرحت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۵۰ سے زائد ملکوں میں عورتیں اُوشا رکھنے پر فخر کرتی ہیں۔ جدید طریقے سے سلائی کرنا سیکھئے۔ پورے ملک میں ۱۲ سو سے زائد اُوشا ایمبرائیڈری اور ٹیلرنگ اسکول اور ۴۰۰۰ سے زائد فروخت اور دیکھ بھال کے مراکز موجود ہیں۔
آرام سے سلائی کے لئے
اُوشا
سے سلائی کیجئے
JAY کا تیار کردہ
دی جے انجینئرنگ ورکس لمیٹڈ۔ کلکتہ ۳۱
IESMJG 655

آنکھیں

سحر اُمید بنگلوری

ڈی نمبر ۲۵۔ بابائین مبسور روڈ بنگلور

۵ ستمبر ۱۹۶۵ء

برادر عزیز و محترم خوشتر صاحب! سلام خلوص

"بیسویں صدی" کی دلکشی اور بلند ترین معیار نے جہاں میری حوصلہ افزائی کی ہے وہاں میرے افسانہ "تصویر" کی اشاعت کے بعد مجھے ست پر خلوص داد بہ ادا دوست بھی عطا کر دئے ہیں۔ اِسے کس کا احسان کہوں سمجھ میں نہیں آتا ۔۔۔ خوشتر گرامی کا یا "بیسویں صدی" کا ۔۔۔ ہمارے دوست ایک افسانہ کی اشاعت کے بعد اس قدر قریب آگئے ہیں کہ میں خود کو خوشتر گرامی کا احسان مند سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ بہرحال اب "آنکھیں" پیش خدمت ہے آپ کو یہ آنکھیں ضرور پسند آئیں گی ۔۔۔ کیا پتہ پڑھنے والوں میں کس کس کی آنکھیں ہوں ۔۔۔ ! "آنکھیں" کیسی ہیں اِن کے متعلق آپ کی بے لاگ رائے اور قارئین کرام کی بلند ذوقی ہی بہتر رہبر ہوگی ۔۔۔ کیونکہ خوشتر گرامی نے "بیسویں صدی" کے قارئین کو بلند نظر کے ساتھ بلند ذوق بھی عطا کر دیئے ہیں ۔۔۔

آپ کا اپنا ۔۔۔ سحر اُمید

نیلے آسمان پر چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا! اَن گنت تارے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ بادل کا ایک آدھ ٹکڑا کہیں کہیں نظر آجاتا تھا! ابھی ابھی شام ہوئی تھی اور ہوا کی ہلکی ہلکی لہروں سے پتے اس طرح ہل رہے تھے جیسے کسی دوشیزہ کا آنچل ہو۔ کبھی کبھی ہوا کا رُخ بدل جاتا تو درختوں کے پتے یوں ہلنے لگتے جیسے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی ہو۔ اُس وقت یوسف کا دل دھڑکنا بند کر دیتا! آج یوسف کے اندر بھی ایک ہوا سی چل رہی تھی۔ کبھی تیز کبھی آہستہ ۔۔۔ دل کی دھڑکن کے ساتھ! ابھی ابھی اُسے وہ دو آنکھیں نظر آئی تھیں ۔۔۔ دو آنکھیں ۔۔۔ ! پیچھے کی دیوار سے ملحق دائیں جانب کے گھر کے پیچھے کی دیوار جو سنگم تھی، اُسی دیوار میں، پندرہ فٹ بلند دیوار میں یہ پُرانا بوسیدہ دروازہ تھا جو کبھی دو گھروں کی آمد و رفت کا راستہ رہا ہوگا، نہ جانے کب بند کر دیا گیا تھا۔ اسی دروازے کے بالکل درمیان ایک پٹ میں دو سوراخ تھے چٹخنی کے سوراخ! چٹخنی جو ٹوٹ چکی تھی۔ یہ آنکھیں اِنھیں سوراخوں سے اُسے دیکھتی رہتی تھیں۔ گہری آنکھیں جیسے بھرا لبالب! سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، جن میں شباب سے بھرپور شراب کا نشہ سا چھلکتا رہتا تھا۔ وہ لانبی لانبی پلکیں جیسے کسی دلہن کا گھونگھٹ! مخمور آنکھیں جیسے کسی شاعر کی خمار انگیز غزل کا حسین ترین شعر ۔۔۔ یوسف تو اُن آنکھوں میں ڈوب ڈوب گیا تھا۔ لیکن اب بھی یہ آنکھیں نئی تھیں اُس کے لئے ۔۔۔ اپنی آنکھیں بند کر کے اُس نے تصور ہی تصور میں اُن آنکھوں کو دیکھا تھا۔ اُنھیں چاہا تھا۔

دو ماہ گزر چکے تھے ۔۔۔ !! دو ماہ !

اُس کے دل کی دھڑکن یک لخت تیز ہوگئی۔ جیسے کسی پہاڑی ڈھلوان سے کوئی تیز رفتار ٹرک دھڑ دھڑاتا گزر رہا ہو۔ اُس کے انگ انگ میں ایک برقی لہر سی دوڑ گئی۔ جیسے وہ آنکھیں اُس کے لبوں کے قریب آگئی ہوں۔ دو ماہ پہلے بھی تو اُس نے یوں ہی محسوس کیا تھا۔

سانولی شام تھی وہ ۔۔۔ مکان کے پیچھے گلاب کے چند پودے تھے اور انھیں کے درمیان وہ اپنی چھوٹی سی گول میز اور کرسی دھرے بیٹھا آنے والے کل کا لکچر تیار کر رہا تھا۔ جب وہ لکچر تیار کرنے یہاں آجاتا تو اُس کی بیوی شہناز وہ دروازہ بند کرا دیتی جو پیچھے کی طرف کھلتا تھا۔ اب وہ تنہا یہاں بیٹھ کر ایک آدھ گھنٹے میں لکچر تیار کر لیتا۔

اُس سانولی شام کو بھی وہ لکچر تیار کر رہا تھا اور لیکچر پوائنٹ ذہن میں نہیں آرہے تھے قلم ہاتھ میں لئے ہوئے ہی وہ سر اُٹھا کر سوچنے لگا۔ سوچوں کی آنکھیں دیوار پر

پھیلتی رہیں، پھیلتی رہیں اور یکایک دروازے سے پھسل کر اُن سوراخوں میں آئیں تو اٹک کے رہ گئیں۔ وہ سیاہ بڑی بڑی آنکھیں —— شباب کے نشے سے مخمور آنکھیں اُن سوراخوں سے مُسکراتی ہوئی اُسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اُچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو اور زور سے چیخ اُٹھا۔

"شہناز —— ! شہناز ——!!

دوسرے لمحے سوراخ صرف سوراخ رہ گئے اور اُس کی آنکھیں اُن آنکھوں کو ڈھونڈتی رہ گئیں! لیکن شہناز کو پکارنا تو ایک غیر اختیاری فعل تھا۔ شہناز تک اُس کی آواز پہنچی ہی نہ ہوگی۔ کیونکہ باورچی خانہ تو مکان کے اس جانب تھا جہاں تک پیچھے کی کی آواز پہنچ ہی نہ سکتی تھی اور اگر پہنچ بھی جاتی تو شہناز جواب کیوں دیتی؟ اُس نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ وہ کبھی یوسف سے لکچر تیار کرتے وقت بات نہ کرے گی۔ نہ مکان کے پیچھے چائے لے جائے گی۔ اسی لیے تو وہ چائے پی کر یہاں آجاتا تھا۔ چند لمحے وہ گھبرایا ہوا سا کھڑا اندرونی دروازے کو اور پھر سوراخوں کو دیکھتا رہا۔

پھر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ سارا جسم پسینہ میں شرابور ہو رہا تھا، کیوں آخر!! ؟ اُس نے سوچا صرف دو آنکھیں دیکھ کر وہ اس طرح کیوں گھبرا گیا ہے —— ؟ نہیں —— ! اُسے نہیں گھبرانا چاہیے۔ آخر کسی انسان ہی کی آنکھیں ہوں گی وہ —— ! یکایک اُسے محسوس ہوا کہ وہ کسی لڑکی کی آنکھیں ہیں ورنہ مرد کی آنکھیں گھبرا کیوں جاتیں مجھ سے —— ؟ اُس نے پیشانی پر بہہ آنے والے پسینے کی لہر کو پونچھا اور پھر اُن سوراخوں کی جانب دیکھنے لگا۔ آنکھیں نہیں تھیں —— ہاں! سیاہ زُلفیں نظر آنے لگی تھیں۔ پھر زلفیں کھسکنے لگیں، مانگ —— ! درمیانی حصہ، پھر سپید و سُرخ پیشانی کا ذرا سا حصہ —— پھر —— پھر —— آنکھیں! سیاہ بڑی بڑی آنکھیں —— ! اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اُن آنکھوں میں ڈوب رہا ہے۔ ڈوب رہا ہے —— آنکھیں ہی آنکھیں، چاروں طرف آنکھیں —— ! وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا لیکن پھر چند لمحوں بعد اُس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر خود بخود اُس جگہ چلی گئیں —— لیکن اب خلا کے سوا کچھ نہ تھا —— ! ایک خلا جو دو سوراخوں میں سما گیا تھا۔ جیسے کائنات میں اب صرف دو آنکھوں کے سوا اور کچھ بھی نہ رہ گیا ہو۔ یکایک اُسے شہناز کی یاد آئی اور وہ نفرت سے مُنھ بنا کر رہ گیا۔ اب تو وہ شہناز سے اتنا الگ ہونے لگا تھا کہ اُس سے بات بھی کرتا تو صرف ضرورت کے تحت —— ! آئے دن کے جھگڑوں سے وہ تنگ آچکا تھا۔ اُس کے خیال میں شہناز ذہنی اور شکّی عورت تھی اور کئی بار تو اُس نے صاف گوئی سے اُس سے کہہ بھی دیا تھا۔

"تم نے تو مجھ سے پڑھاتے ہوئے محبت کی تھی! اب شادی کر لی ہے۔ کون جانے کل کسی اور شاگرد سے محبت کر بیٹھو! میں کہتی ہوں یہ کالج میں لکچر جھاڑنے کا کام چھوڑ کر کوئی ڈھنگ کی نوکری دیکھ لو!"

وہ اُس کی بات اَن سُنی کر دیتا تھا۔ [illegible] وہ شہناز سے عشق کرنے لگا تھا۔ کالج میں بہت سی لڑکیاں تھیں حسین، خوبصورت لیکن اس جانب نظر، لیکن اپنے تلخ تجربے کی بنا پر وہ اُن لڑکیوں سے گریز کرتا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کوئی معصوم سی گڑیا جیسی خوبصورت، حسین اور چپ چاپ رہنے والی لڑکی جو گداز بدن والی ہو، دلکش، دلفریب اور پُرکشش حُسن کی مالک —— شوخ تتلی کی طرح اُڑنے والی ذہنی نہ ہو بس —— ! ورنہ شہناز کا حُسن بھی تو کالج کے لڑکوں کے لیے قیامت تھا لیکن اُس نے پروفیسر یوسف کو دل دے دیا —— اور کالج کے لڑکے بس مُنھ دیکھتے رہ گئے تھے!

لیکن محبت کی یہ شادی کامیاب نہ رہی اور رفتہ رفتہ شہناز اور یوسف ایک دوسرے سے دل ہی دل میں متنفر رہنے لگے۔ شہناز بھی اپنا شک دور نہ کر سکی۔ وہ بھی یوسف کے پاس مکان کے پیچھے چلی جاتی اور اُس کی کتابیں اُلٹنے پلٹنے لگتی۔ کون جانے کسی لڑکی کے نوٹس تیار کر رہے ہوں یا کسی کے محبت نامے ہی پڑھ یا لکھ رہے ہوں ؟ اور ایک دن یوسف نے اُسے بُری طرح ڈانٹ دیا تو اُس نے رو دھو کر صبر کر لیا اور پھر یوسف تنہا اپنے لکچر تیار کرنے لگا تھا۔

دوسری شام یوسف جب کالج سے لوٹا تو گھر کے دروازے ہی پر اُسے رُک جانا پڑا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت شہناز سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ اُس عورت کو نظر انداز کر گیا۔ پھر اُس عورت کے چلے جانے کے بعد شہناز سے پوچھنے لگا۔

"یہ کون تھیں —— ؟"

"سُلطانہ خانم —— ہمارے مکان سے ملحق مکان میں رہتی ہیں۔ شوہر جنگلات کے محکمے میں کام کرتے ہیں۔ بہت اچھی عورت ہیں۔ کبھی کبھی ادھر آجاتی ہیں ——" چائے میں شکر ملاتے ہوئے شہناز تعریف کرنے لگی۔

"ہوں —— !" یوسف نے تلخ لہجے میں کہا۔ "باہر کی عورتیں کبھی کبھی گھروں کو آگ لگا دیتی ہیں۔ ذرا ہوشیار رہنا۔"

"تم تو خواہ مخواہ شک کرنے لگتے ہو۔ نہ میں کسی سہیلی سے مل سکتی ہوں۔ نہ کوئی سہیلی یہاں آسکتی ہے۔ اب جو اس بے چاری شریف عورت سے دو باتیں کر لیں تو کون سا گھر جل گیا —— ؟" وہ بھڑک اُٹھی۔

"سہیلیوں کو تمہی نے روک رکھا ہے اور مجھے ملزم قرار دے رہی ہو!" یوسف نے کہا۔

"اور کیا کرتی؟ تمہاری آنکھوں کی پیاس جو بجھتی نہیں —— کون جانے کل کسی پر تمہاری نگاہِ اُلفت پڑ گئی تو ..... میری قسمت ہی پھوٹی ہے۔ تم تو مرد ہو، حاکم ہو" اور وہ رونے لگی۔

شہناز کے انتظار کی پرواہ کیے بغیر چائے پی کر وہ مکان کے پیچھے آگیا اور پھر وہی سوراخ ——! آدھا گھنٹہ گذر گیا لیکن وہ آنکھیں نظر نہ آئیں۔ وہ ایک کتاب کھول کر گنگناتے ہوئے انداز میں اوراق اُلٹتا رہا۔

"کٹ! کٹ! کٹ ——!!"

وہ چونک پڑا۔ اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

آنکھیں —— سیاہ بڑی بڑی آنکھیں سوراخ سے لگی ہوئی تھیں — پُرشباب پُرخمار آنکھیں جن میں ایک دعوت تھی محبت کی، بُلاوا تھا پیار کا —— ایک کائنات تھی! حسین و جمیل کائنات! وہ مسکرایا۔ پھر مسکراتا ہی رہا۔ آنکھیں اُسے دیکھتی ہی رہیں۔ پھر یوسف نے دُزدیدہ نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے آنے کا اشارہ کر دیا۔ جیسے یہ غیر ارادی تھا یا ارادتاً۔ وہ اشارہ کر دینے کے بعد چونک پڑا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اُسے ایک سوراخ میں کوئی سُرخ سُرخ شعلہ سا نظر آیا۔ وہ غور سے اُس شعلے سے نکلنے والی آتشیں لہروں کو دیکھنے لگا۔ پھر ہنس پڑا۔ آنکھوں والی نے زبان دکھائی تھی۔ شریر ——! پھر آنکھیں سوراخوں میں پھیل پھیل گئیں۔ وہ اُن آنکھوں کے جادو میں کھو کھو گیا۔ اُسے اتنا بھی احساس نہ رہا کہ شہناز دروازے سے نہیں تو دریچے ہی سے دیکھ سکتی ہے لیکن وہ تو پھر نوجوان ہو گیا تھا۔ دل کی دھڑکن بھی وہی تھی۔ احساسِ محبت بھی وہی تھا جو کبھی شہناز کی محبت کے آغاز میں محسوس ہوا تھا۔ وہ یوں محسوس کرتا تھا کہ شہناز اُس کی زندگی میں کبھی محبت کے پھول لائی ہی نہ تھی۔ محبت تو وہ اب کر رہا ہے۔ ایک اَن دیکھی لڑکی سے —— حسین جسم سے، خوبصورت حسین جسم، گداز جسم، وہ خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔

"کھٹ! کھٹ —— کھٹ!!!"

ایک بار پھر وہ چونک پڑا اور آنکھوں کو دیکھنے لگا لیکن اب وہ اُن آنکھوں میں کچھ بھی نہ دیکھ سکا کچھ بھی نہ پڑھ سکا۔ بس بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

"آجاؤ ...... !" اور پھر سر ہلا ہلا کر آنکھوں والی کو آنے کی دعوت دینے لگا —— آنکھیں سوراخ سے ہٹ گئیں! پھر اُسے انگوٹھا نظر آیا۔ وہ ہنس پڑا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے سوراخ میں گلاب کی چند پنکھڑیاں نظر آئیں۔ وہ اُٹھا اور تیزی سے بڑھ کر سوراخ سے پنکھڑیوں کو کھینچ لیا۔ اب اُس کی آنکھیں سوراخوں سے لگی دیوار کے اُس پار اِدھر اُدھر دوڑنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ اُس نے اُٹھ کر گلاب کی پنکھڑیوں کو آنکھوں سے لگایا اور چوم لیا۔

دوسرے دن دس بجے وہ کالج جانے لگا تو چونک کر رُک گیا۔ دو بڑی بڑی آنکھیں، سیاہ آنکھیں، برقعہ کی سیاہ جالی کے اندر سے اُس کی جانب حسرت سے دیکھ رہی تھیں —— لمحہ گذر گیا! آنکھیں گھوم گئیں اور پھر برقعہ پہنے ہوئے وہ لڑکی جو غالباً سلطانہ خانم کی دُختر ہوگی رکشا میں جا بیٹھی جو کسی اسکول کو جا رہا ہوگا۔ آنکھیں اُس سے دُور ہونے لگیں —— ہوتی گئیں ——!

اُس دن کالج میں وہ شیلی کی کوئی نظم پڑھا رہا تھا تو محبوبہ کی آنکھیں تذکرہ بن کر اُس کے سامنے آگئیں! اور آنکھوں کے حُسن کی اُس نے اِس انداز سے تشریح کی کہ سارا پیریڈ ختم ہو گیا لیکن —— آنکھیں —— پھر بھی تشریح طلب رہ گئیں۔ طلبا حیران تھے کہ آج پروفیسر صاحب صرف آنکھوں کا ذکر اتنی تفصیل اور جذباتیت سے کیوں کرنے لگے ہیں۔

شام کو وہ جلد ہی گھر لوٹ آیا۔ یکایک سر میں بُری طرح درد ہونے لگا تھا۔ گھر آکر اُس نے محسوس کیا کہ اُسے آرام کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن آنکھیں ——!؟ اُس نے ایک چھوٹا سا پُرزہ اُٹھایا پھر ادھورے لیکن جامع جملے یا الفاظ تحریر کرنے لگا۔

"سر میں درد ہے —— کل —— پیار!"

کسی طرح وہ چائے سے پہلے ہی مکان کے پیچھے چلا گیا۔ پُرزے کو سوراخ میں ڈال کر اطمینان کی سانس لی اور چلا آیا۔

دوسری صبح وہ معمول سے پہلے ہی مکان کے پیچھے چلا گیا اور بڑھ کر سوراخ سے وہ پُرزہ کھینچ لیا جو اُس میں نظر آ رہا تھا —— پُرزہ آنکھوں والی ہی کا تھا۔ وہی مختصر اور جامع جواب!

"دعا —— کاوش ——! پیار ——!"

دل یوں دھڑکنے لگا جیسے اب کوئی دم میں باہر آجائے گا۔ اُس نے تحریر سے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ لکھتے ہوئے آنکھوں والی کے ہاتھ کانپ رہے ہوں گے ورنہ یہ اُلجھے اُلجھے سے الفاظ —— ہائے! شدت کے ساتھ اُس نے محسوس کیا کہ اُن آنکھوں کو چوم لے۔ لیکن صرف پُرزے کو چوم کر اپنی ہی آنکھوں سے لگا لیا!

اُسی شام اُس نے دُور ہی سے منہ بنا کر اُن آنکھوں کو چوما۔ جواب میں سوراخ پر گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹ نظر آئے۔ کومل پنکھڑیاں۔ نازک ہونٹ ——! وہ بے قرار ہو کر دروازے کے قریب چلا گیا اور حسرت سے اُس پُرانے قفل کو دیکھنے لگا جو اُس کے اور اُن گلابی لبوں کے درمیان ایک آہنی دیوار بن گیا تھا۔ بے صبری سے وہ پکار اُٹھا۔

"سُنیئے ——! سُن رہی ہیں آپ ——!؟"

"آہستہ —— سرگوشی میں بولیئے ——" سرگوشی میں جواب ملا اور وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ پُرانا تالا ہمارے درمیان دیوار بنا ہوا ہے" اُس نے سرگوشی کی۔

"اور کوئی ہے وہاں ——؟" سرگوشی ہوئی اور جیسے گلابی ہونٹ یوسف کی آنکھوں کے آگے گھومنے لگے۔

"نہیں، کوئی نہیں!" یوسف نے بھی سرگوشی ہی میں جواب دیا۔
اب یہ سرگوشیاں دونوں کے لئے ایک نعمت بن گئیں۔
"بڑے بے صبر ہیں آپ!!" دوسری جانب سے کہا گیا۔
"آپ کی وہ نشیلی آنکھیں ـــــ ـــ وہ حسین و نازک لب جنہیں کہہ پانے کو جی چاہتا ہے ہیں" یوسف نے نیم وا آنکھوں سے کہا۔
"شریر کہیں کے ـــــ" جواب ملا اور یوسف کے دل و دماغ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ دل اچھل اچھل کر اُن آنکھوں میں ڈوب جانے کو بے قرار ہو رہا تھا۔
"اچھا ـــــ کل ـــــ!" یکایک گھبرائی ہوئی سرگوشی ہوئی اور اس سے پہلے کہ یوسف کوئی بات کرتا سوراخ صرف سوراخ رہ گئے اور یوسف یہ ہمت نہ کر سکا کہ آنکھ لگا کر اُس جانب کا منظر دیکھ لے۔ کون جانے کوئی اور آگیا ہو!
پھر یہ سرگوشیاں محبت کے ایک عظیم سمندر میں غرق ہوگئیں۔ یوسف کی زندگی میں ایک بار پھر سے بہار آگئی ـــــ تازہ بہار ـــــ زندگی کی حسین ترین منزل جہاں ایک خوبصورت گداز اور نرم و نازک جسم ہو ـــــ سکون ہو اور دل کی دھڑکن کے سوا کوئی آواز نہ ہو۔
دونوں سرگوشیاں ایک دوسرے کے جسموں پر رینگنے لگیں۔ کبھی کبھی چار آنکھیں سوراخوں کو بند کر دیتیں! لیکن یہ تو ایک بہلاوا تھا محض، اور اس بہلاوے کا مرکز اُن کی محبت تھی۔ ایک لڑکی اور نوجوان کی محبت ـــــ! محبت ـــــ جو کبھی عمر کا تقاضہ نہیں کرتی۔ نہ دولت اور دنیا کا احساس! محبت تو بس محبت ہوتی ہے۔
کبھی کبھی سوراخوں میں پُرزے ہوتے جو کبھی مختصر تحریر لئے ہوتے کبھی طویل لیکن وہ آنکھیں یوسف سے دور ہی رہیں اور یہی دوری اُسے دو ماہ تک کھینچ لائی تھی۔
اور کل ـــــ!!
دو ماہ کے بعد اُسے اُن سیاہ بڑی بڑی آنکھوں نے احساس دلایا تھا کہ اُس کی آنکھیں یوسف کی جانب لگے ہوئے تالے کو کھولنے سے قریب آسکتی ہیں تو یوسف نے زندگی میں پہلی بار چور بازار کی سیر کی تھی اور پورے دو دن کی جدوجہد کے بعد اُسے ایک چابی مل ہی گئی ـــــ! وہ چابی جو اُن آنکھوں کو اُس کے قریب کر سکتی تھی۔ سیاہ بڑی بڑی مدبھری اور پُرشباب و پُرخمار آنکھوں کو جو اُس کی حیاتِ رفتہ کو بُھلا سکتی تھیں۔ وہ اُس دن اتنا خوش تھا جیسے ساری کائنات کی دولت اس کے قدموں میں آگئی ہو۔ جیسے وہ ساری دنیا کا بادشاہ ہو!
جیب سے چابی نکال کر وہ چھوٹی سی میز پر بجانے لگا۔ سوراخ ابھی تک آنکھوں سے محروم ہی تھے اور یوسف کی نگاہیں انہیں پر مرکوز ہوگئی تھیں۔
نیلے آسمان پر چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اُس نے سر اٹھا کر آسمان پر اپنی نظریں پھیلا دیں۔ تاروں کی بے شمار آنکھوں میں وہی دو آنکھیں مسکراتی ہوئی اُسے نظر آنے لگیں۔ وہ سر جھٹک کر سوراخ کو دیکھنے لگا۔ آج غیر معمولی تاخیر ہوگئی تھی۔ جانے کیا بات تھی۔
یکایک وہ چونک پڑا۔ دیوار پر ـــــ دیوار کے سوراخ پر ـــــ صرف دو آنکھیں تھیں جو مسکراتی ہوئی اُسے نظر آرہی تھیں۔ وہی مسکراہٹ تو تھی جو اُسے اُن آنکھوں میں کھینچ لے گئی تھی۔
وہ بے قرار ہو کر پہلو بدلنے لگا اور پھر اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ساری کائنات میں زمین تا فلک سارے خلا میں وہ آنکھیں ہیں ـــــ اور ـــــ وہ نازک ہونٹ ـــــ وہ جھوم اُٹھا ـــــ! کتنی دیر ـــــ! ـــــ!! اُف ـــــ!! وہ بے چین ہو کر کھڑا ہوگیا اور ٹھنڈی سانس لے کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے یہی عالم رہا ـــــ آخر کب تک ـــــ!!
وہ ٹہلنے لگا۔ بار بار چابی ہاتھ سے کھینچ کر ہونٹوں پر آجاتی اور پھر پشت پر ہاتھ باندھے وہ ٹہلنے لگا۔ پھر کھٹ سے دروازے کی کھٹ کھٹ ـــــ آواز آرہی تھی۔ وہ جھپٹ کر دروازے کے قریب چلا گیا۔
"چابی ملی ـــ ـــ!؟" سرگوشی میں سوال کیا گیا۔
"ہاں! لیکن ـــــ کتنی دیر لگا دی تم نے ـــــ!؟" یوسف نے دھڑکتے ہوئے بے قرار دل کے ساتھ کہا۔
"صبر ـــــ صبر ـــــ!" ہلکی ہنسی کی آواز یوسف پر پھولوں کی بارش کر گئی۔
"سنئے ـــــ رات کو گیارہ بجے ـــــ ٹھیک ـــــ میں آؤں گی ـــــ" سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ "وہ ہاتھ مل رہا تھا۔" اس وقت خطرہ ہے۔ یاد رہے ـــــ رات کو ـــــ ٹھیک گیارہ بجے ـــــ ہاں ـــــ!؟"
"ہاں! ہاں ـــــ لیکن ـــــ!" وہ چُپ ہوگیا۔ مجبوری کے احساس سے اُداس ہوگیا۔
"آپ ہلکان رہتے ہیں! آپ کی بیوی شہناز جاگ رہی ہوں گی" سرگوشی ہوئی اور وہ ہلکی سی چڑ سے بول اُٹھا
"شہناز! شہناز ـــــ!! میں شہناز کو طلاق دے سکتا ہوں۔ اُس نے تو زندگی تباہ کر دی ہے میری ـــــ تم سمجھ کیوں نہیں رہیں!؟"
"ہاں! ہاں! میں سمجھتی ہوں ـــــ گیارہ بجے ـــــ اب رخصت ـــــ!"
سرگوشی ہوئی اور یوسف گھٹ کر رہ گیا۔ اتنی دیر کے جان لیوا انتظار کے بعد یہ تشنگی ـــــ!!
ہائے! محبت میں کتنے کٹھن لمحے آتے ہیں ـــــ!!
رات آئی ـــــ آج وہ نو ہی بجے بستر پر چلا گیا۔ جیسے جلد سو جانا چاہتا ہو۔ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ شہناز جلدی باورچی خانے سے نکل آئے اور جلد ہی سو جائے۔ اگر وہ گیارہ بجے تک جاگتی رہی تو ـــــ؟ لیکن وہاں تو سلطانہ خانم آگئی تھیں اور اپنی بکواس کر رہی تھیں لیکن اب وہ سلطانہ خانم سے پرخاش محسوس نہ کرتا تھا۔ بیرونی دالان میں بھی ایک دروازہ تھا جو سلطانہ خانم کے بیرونی دالان میں کھلتا تھا اور سلطانہ خانم جب چاہے چلی آتی تھیں۔

[illegible]

آنکھیں بند کر لیں اور خود کو سوتا ہوا ظاہر کرنے لگا۔ شہناز دالان اور کمرے کی لائٹ بجھا کر نوکرانی کے کمرے تک چلی گئی۔ پھر وہاں سے سامنے دریچے بند کرنے کے بعد دالان کے دروازے پر آ گئی۔ وہ سب محسوس کرتا رہا اور دل ہی دل میں دعا کرتا رہا کہ شہناز جلد ہی بستر پہ چلی جائے اور سو جائے اور گہری ہی جائے ———!! وہ بے چینی سے کروٹ بدل کر پھر خیالات کی لہروں پر بہنے لگا ——— سامنے دروازے اور دریچوں کو ٹھونک بجا کر دیکھنے کے بعد شہناز اُسی کے کمرے پر آ گئی تھی۔ پھر اُس نے یوسف کو آوازیں دیں لیکن وہ تو گہری نیند سو رہا تھا۔ شہناز بڑبڑانے لگی ———!

"جانے آج کل اتنی جلدی اور اتنی گہری نیند کیوں آنے لگی ہے۔ صحت کا خیال کوئی خود نہ رکھے تو بیوی بھی کیا خاک کر سکے گی۔ خدا بچائے اِن مردوں سے ———!"

پھر وہ جانے کیا کیا بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس کا کمرہ یوسف کے کمرے سے لگا ہوا تھا اور یوسف کے کمرے کے اندر بھی ایک دروازہ تھا جو شہناز کے کمرے میں کھلتا تھا۔ تکیے جھٹکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد شہناز کے کمرے کا بلب اندھیرے میں گم ہو گیا۔ سوئچ کی آواز سنائی دی ——— ٹک!

بلی کی طرح یوسف پلنگ سے اُتر پڑا۔ پھر پنجوں کے بل چلتا ہوا اندرونی دروازے پر جھک گیا۔ کنجی کے سوراخ سے جھانک کر ایک آنکھ سے دیکھنے لگا۔ کمبل کو گلے تک ڈھانپے شہناز سو رہی تھی۔ وہ انتظار کرنے لگا۔ ہر منٹ ایک پہاڑ کی طرح اُس کے سر سے گزر رہا تھا۔ اپنے بستر کی اَن گنت شکنوں سے بے نیاز وہ بے چینی سے کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ اُٹھا اور پھر ——— کنجی کے سوراخ سے آنکھ لگا کر دیکھنے لگا۔ شہناز اُسی طرح سو رہی تھی۔ خاموش ——— بالکل خاموش! وہ آہستہ سے اپنے پلنگ پر آ گیا۔ پھر زور زور سے کھانسنے لگا اور دوڑ کر پھر سوراخ سے دیکھنے لگا۔ کھانسی کی آواز بھی شہناز کو بیدار نہ کر سکی تھی۔ اُس نے اطمینان کی سانس لی اور ایک پُرسکون احساس کے ساتھ بستر پر آ بیٹھا۔ قمیص کی جیب سے کنجی نکال کر وہ اُسے پُرمسرت نظروں سے دیکھنے لگا اور سلیپنگ گاؤن پہنے ہوئے وہ دروازے تک آ گیا۔ نہایت احتیاط سے اُس نے دروازہ کھولا اور پھر تیزی سے بند کرنے کے بعد چٹخنی کے ہُک میں لکڑی کا ایک ٹکڑا ٹھونس دیا۔ تاکہ اُدھر سے کوئی دروازہ نہ کھول سکے اور پھر کھولتا ہی کون؟ ایک تو نوکرانی تھی۔ دوسری شہناز ——— اور دونوں سو رہی تھیں۔ پھر بھی اُس نے پوری احتیاط سے قدم بڑھائے اور پُرانے دروازے پر آ کر رُک گیا۔ آنکھیں ——— ابھی تک سوراخوں میں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اُس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ وہ دروازے میں یوں ٹہلنے لگا جیسے پہرہ دے رہا ہو! پانچ منٹ کس طرح گزرے اُسے احساس ہی نہ ہو سکا۔ وہ چونکا تو اُس وقت ———! جب دروازے پر اُنگلی ٹک ٹک کر رہی تھی۔

"میں آ گیا ہوں!" اُس نے سرگوشی میں [illegible]

"چابی ہے ———؟" سوال ہوا ——— "کہاں کی ہو ———؟!"

"ہاں ——— وہ سو رہی ہے۔ تم اِس قدر گھبرائی کیوں ہو؟ ٹھہرو ———!!! کھول لینے دو!"

"اتنی بے قراری ———؟!" ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی۔

"بے قراری ———! تم کیا جانو ——— میں کس قدر پیاسا ہوں! کس قدر ——— بدنصیب ——— کس قدر بے قرار!! اب تو کچھ نہ کہو ——— ٹھہرو ———!"

——— اُس نے جھک کر تالے میں کنجی ڈال کر گھمائی اور تالا الگ ہوتے ہی وہ چوکنا ہو گیا۔ اگر دروازہ چرمرا اُٹھا تو ———؟! اُس نے دونوں ہاتھوں سے ایک پٹ کو مضبوطی سے تھام لیا اور بڑی احتیاط کے ساتھ کھولنے لگا۔ پُرانا بوسیدہ دروازہ ——— کبھی کبھی ہلکی سی چیخ لگا اُٹھتا تھا ——— لیکن یہ چیخیں اتنی پُرخطر ہرگز نہ تھیں کہ شہناز یا کوئی اور جاگ اُٹھے۔ دروازہ کھلا ——— کھل گیا! برسوں پُرانا دروازہ کھل گیا۔ برسوں پُرانا احساسِ محبت جاگ اُٹھا۔ اور ——— یوسف کی آنکھیں بے اختیار آگے پھیل گئیں! اور پھر پھیل کر ہی رہ گئیں۔!

دو آنکھیں ——— سیاہ، بڑی بڑی آنکھیں ——— شباب کے خمار سے لبریز پیمانوں جیسی آنکھیں اُس کے سامنے کھلی ہوئی اُسے حسرت سے دیکھ رہی تھیں ——— بھرپور حسرت کے ساتھ ——— اور آنکھوں سے بہہ نکلنے والے دو آتشیں دھارے انگاروں جیسے پتلے اور نازک لبوں کے کناروں کو چھوتے ہوئے گزر رہے تھے۔ یوسف کو یوں محسوس ہوا جیسے برسوں پُرانا دروازہ ہی نہیں کھل گیا ہے بلکہ برسوں پُرانی بند آنکھیں بھی کھل گئی ہیں ———!!

"مجھے تم سے یہی اُمید تھی ———!" سامنے شہناز کھڑی کہہ رہی تھی اور یوسف آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھ رہا تھا ——— یا کون جانے! اُس کی آنکھوں میں خود کو دیکھ رہا ہو!

غزل

مظہر امام، ایم اے

پاؤں کی آہٹ نہ ہو، اے کوچہ گردانِ ہوس!
عشق کے ایوان میں آرام فرماتا ہے دل

دیکھیے پھر آپ کی پلکیں اُٹھیں اور جھک گئیں
پھر کوئی بھولی کہانی مجھ سے دُہراتا ہے دل

زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں جلنے کے بعد
تیری آغوشِ تصور میں سکوں پاتا ہے دل

اِک طرف محجوب آنکھیں اِک طرف دیوانہ پن
اپنی شوخی پر دُلہن کی طرح شرماتا ہے دل

بنتے جاتے ہیں سلاسل، بڑھتا جاتا ہے جُنوں
ہارتی جاتی ہے دنیا، جیتتا جاتا ہے دل

شب کے سناٹے میں جب سرگوشیاں کرتا ہے حُسن
ہونٹ میرے کانپنے لگتے ہیں، بھر آتا ہے دل

نارسا، ناکام ارمانوں کا مدفن ہے، امام!
اصطلاحِ عام میں جس کو کہا جاتا ہے دل

غزل

اختر آصفی

غنچہ و گُل کی حالت ہے جو پتّا پتّا جانے ہے
مالی ہی کو علم نہیں کچھ باغ تو سارا جانے ہے

رندِ پُختہ کار ہے ورنہ مے کی بُرائی کیا کرتا
شیخ کہ جانے کیونکر دنیا بھولا بھالا جانے ہے

غیر سمجھ کر اپنا اپنا تو سیدھا کرتے ہیں
اِس دُنیا میں کون کسی کو یارو، اپنا جانے ہے

مجھ کو اپنا جانو نہ جانو لیکن اِتنا جان لو تم
جو بھی تم کو جانے ہے وہ مجھ کو تمھارا جانے ہے

میرا غم نہ کرو ملاحو! اپنی خیر مناؤ تم
ہر گرداب کو میری کشتی اب تو کنارا جانے ہے

رندِ تر دامن ہی جانے اِس تلخی کی شیرینی
زاہدِ خشک بچارا اے دل! لذتِ مے کیا جانے ہے

اختر سب کا خادم ہے اور سب سے محبت کرتا ہے
تم ہی اُس کو بُرا کہتے ہو غیر تو اچھا جانے ہے

غزل

حق حزیں، ایم اے

عرضِ نیازِ عشق کے آئینہ دار ہو گئے
لوگ جو اُن کی راہ میں مِٹ کے غُبار ہو گئے

اُن کی نگاہِ ناز کے دل پہ جو وار ہو گئے
وجہِ سکون بن گئے، جانِ قرار ہو گئے

یا اِنہی بام و در پہ تھیں حُسن کی ضَوفشانیاں
یا یہی بام و در ہیں جو تیرہ و تار ہو گئے

آہ کچھ اِس طرح بھری، نالہ کچھ اس طرح کیا
درد کے جیسے اہلِ دل شکر گزار ہو گئے

یوں تو جہاں میں ہے کسے موت پہ اپنی بس مگر
آہ وہ خوش نصیب جو اُن پہ نثار ہو گئے

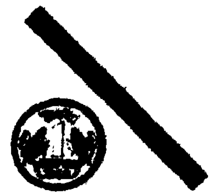
گریۂ غم سے بڑھ گئیں پردہ در کی زینتیں
اشک بھی اپنے شاملِ نقش و نگار ہو گئے

اُن کے نصیب میں کہاں لُطفِ بہارِ تازہ تر
وہ جو ہلاکِ آمدِ فصلِ بہار ہو گئے

اپنے بنکنگ کاروبار کے لئے

پنجاب نیشنل بنک ہی کیوں؟

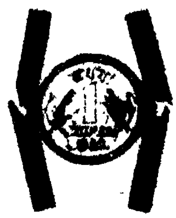
چھ وجوہات ۔ آپ ایسے بنک سے کاروبار کرتے ہیں جو



محفوظ



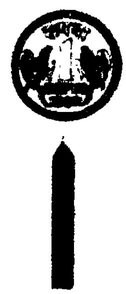
مستحکم



مضبوط



مددگار



ماہر

اور



سال پرانا ہے

PR. 6532/Urd/Ad/1

مزاحیہ

طویلے کی بلا بندر کے سر!

پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی۔ ایم۔ اے

۵۔۱۷، پہاڑی بھوجلہ۔ دلی

۳۱ اگست ۶۵ء

ڈیئر خوشتر گرامی!

یار! تمہارے ساغر کی رومانیت نے جب سے قافیہ کی شکل اختیار کی ہے اور جب سے ملک کے گوشے گوشے سے جنتا "گرانی" پر ہجویہ قصیدے لکھ لکھ کر سر دُھننے لگی ہے، اُس وقت سے ملک کی چوٹیں لُٹی جا رہی ہیں۔ پھر اُس کی داد و تحسین میں حکومت کی طرف سے جو لاٹھی چارج اور فائرنگ شروع ہوئی تو اُس نے ہم لوگوں کا ایسا قافیہ تنگ کر دیا ہے کہ اچھی طرح دو سطریں لکھنا بھی دُشوار ہو گیا ہے۔ اگر "گرامی" تمہارا تخلص ہے تو خدارا اپنا تخلص "گرانی" کر لو تاکہ جنتا کی زبان پر تمہارے سوا کسی دوسرے کا نام نہ آئے اور ملک کے لوگ تمہاری پرستش شروع کر دیں۔ وزیر تیس کی طرف سے تم گرانقدر انعام پاؤ اور پوری قوم میں شاد کام کہلاؤ ——— ایک خبر یہ بھی سُننے میں آئی ہے کہ تم نے دریا گنج میں امراضِ قلب کی کوئی دوکان کھول رکھی ہے اور اپنے دوست احباب میں اُس کی نمونے کی پڑیاں بانٹنی شروع کر دی ہیں۔ یوں دُنیا کو محبت کا مریض بناتے ہو اور قیس و فرہاد پر حرف لاتے ہو۔ کیا تم نے اِس قسم کی کوئی پڑیا ساغر نظامی کو بھی بھجوائی ہے جس کی وجہ سے انھیں ولنگڈن ہسپتال لے جا کر تشخیص کرائی جا رہی ہے کہ خدانخواستہ کوئی مرض محبت کے علاوہ تو نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ ڈاکٹر محبت کو کیا جانیں ع

نازِ والے نیاز کیا جانیں

یہ بھی سُنا ہے کہ کسی ڈاکٹر نے اُن کے قلب کی جانچ کر کے نیز نقطۂ نظر سے انھیں مریض بتا دیا ہے جس سے سارے ادیبوں، شاعروں اور ساغر کے گھر والوں میں ایک کھلبلی مچی ہے۔ یار! اِس سے باز آؤ اور ادیبوں اور شاعروں سے یہ مذاق نہ فرماؤ۔ اُردو شعر و ادب میں شہرت اور عظمت کے پیشِ نظر اگر میں یہ کہوں تو کیا غلط ہو گا کہ ع

دہی اِک شہر میں قاتل بچا ہے!

خدا کرے وہ ڈاکٹر جس نے اُن کے مرض کی تشخیص کی ہے، ساغر کے صحت یاب ہونے کے بعد ایک بین الاقوامی شہرت کا اناڑی ثابت ہو۔ میں شروع ہی سے ساغر سے کہتا تھا کہ پیارے! تم جب گھر سے نکلا کرو تو اپنے گلے اور ہاتھ میں سیاہ ناڑے باندھ لیا کرو ورنہ تمہارے گلے اور چہرے کو نظر لگ جائے گی۔ گلے میں ناڑا باندھنے کا مشورہ یوں دیا کہ اُس سے گلے سے لے کر چہرے تک کا علاقہ محفوظ رہے گا جو سارے جسم کی جان ہے اور ہاتھ میں ناڑا باندھنے کو یوں کہا کہ ریڈیو میں آنے کے بعد اُنھوں نے اِتنے ڈرامے، فیچر، نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں کہ اگر اُس ڈھیر پر کسی کی نظر پڑ جائے تو بلا سبب وہ نعرۂ تکبیر بلند کرنا شروع کر دے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر پورا اُردو داں طبقہ ساغر کی صحت یابی کے لئے ایک ساتھ، مدنی دل سے ہاتھ اُٹھاتے تو اِس جمہوری دور میں جہاں ہاتھوں کی اُٹھا بیٹھی پر بڑی بڑی سلطنتوں کا قیام اور زوال عمل میں آتا ہے اور جہاں محض ہاتھوں کے اُٹھنے سے بونوں کو قلب جیند کی عظمت حاصل ہو جاتی ہے، وہاں کیا مجال ہے کہ ساغر کے حق میں اِتنے ہاتھ اُٹھ جانے پر بڑے سے بڑے مرض میں اِتنی جرأت باقی رہے کہ

جس کے بعد ہی موصوف محبت کو چھوڑ کر اردو کے سلسلہ ادیبوں اور شاعروں کو تہنیت مل جائے گی جہاں تک اِس مُصیبت عظیم کی شکایت ہمیں تو پھر کہنا ہے کہ ہمارا شعبۂ ادب اعظم بڑے بڑے قد آدم وزیروں کا رہین ہے۔ اللہ اُن کی عمریں برکت دے اور ہم سب اُن کی قیادت میں ہر طرح ضرورت سے ہمکنار ہوں ——— ساغر کے بارے میں تو مجھے یقین ہے کہ جمشید کے وقت سے بڑے بڑے محتسب اور علماء لسّے نہیں مٹا سکے۔ اِس لئے یہ معمولی قلب کا مرض جو محض ایک خیال ہے ساغر کا کیا نقصان پہنچا سکے گا۔ وہ نہ صرف میخانۂ ادب میں زندہ رہے گا بلکہ ہماری محفلوں کو ساغر ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ ایک صاحب کہتے تھے کہ اگر سارے ہندوستان پر ہندی کا اسی طرح تسلّط ہو گیا جس طرح کہ یو۔پی میں ہے تو اردو کا کون شاعر ہے جو زندہ رہے گا۔ آئندہ نسلیں اِن کا نام تک نہ جانیں گی۔ میں نے کہا، چاہے میں فرقت سے مُحبت ہو جاؤں لیکن فراق اور ساغر کو کوئی مٹا نہ سکے گا۔ وہ ہندوستان پر انگریزی تسلّط کے بعد بھی زندہ اور با معنی رہیں گے۔ فراق زیادہ سے زیادہ فرنگ کی شکل اختیار کرلیں گے اور ساغر کو بھی اثر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بجائے ساغر کے گھٹ بن کر ہندی ادیبوں اور شاعروں کی محفلوں کو زینت دیتے رہیں گے ——— اب ایک کام کی بات سنو تمھیں کئی بار لکھ چکا ہوں کہ مضامین کی پال نہ ڈالا کرو۔ ایک صاحب میرا انٹرویو لے کر تمھیں دے گئے تھے۔ نہ تو تم نے ابھی تک اُسے چھاپا اور نہ ایک دوسرا مزاحیہ مضمون جو عرصے سے تمھارے پاس پڑا ہے اُسے تم نے دھوپ دکھانے کی کوشش کی۔

تم سلامت رہو ہزار برس !!

مخلص ——— غلام احمد فرقت

جب مہنگائی کم کرو جیسے نعروں نے وبائی شکل اختیار کرلی اور شورش کرنے والوں نے توڑ پھوڑ شروع کر دی تو حکومت کی "بلند اقبالی" اس منزل کو پہنچ گئی کہ ملک کا کوئی صوبہ ایسا نہ بچا جہاں کے دو ایک چھوٹے بڑے شہروں، قصبوں یا گاؤں سے یہ خبریں نہ آتی ہوں کہ فلاں شہر یا قصبے میں گرانی کا کمرتوڑ ہفتہ چلنے کے باعث پولیس کو جنتا پر گولیاں چلانا پڑیں یا مجبوراً لاٹھی چارج کرنا پڑا اور جنتا کے اتنے اتنے آدمی پامالِ سمِ اسپاں ہوگئے یا اتنے پولیس کے افسران یا سپاہی مجروح ہوئے۔ اِس لاٹھی چارج اور فائرنگ سے ملک کو اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ عوام انگریزوں کے زمانے میں جس چیز کے عادی نہ تھے اُس کے عادی ہوگئے اور لاٹھی چارج اور گولی کا جو خوف دورِ غلامی میں انھیں محسوس ہوتا تھا وہ خوف اب قطعاً اُن کے دلوں سے نکل گیا۔ جن علاقوں میں اس طرح کا کوئی "خوشگوار" واقعہ غلطی سے عمل میں نہ آیا تھا وہاں البتہ لوگ ویسے ہی بزدل کے بزدل رہے جیسے دورِ غلامی میں تھے۔ یہ دلچسپ واقعہ جو میں آپ سے بیان کرنے والا ہوں میرے ہی شہر کا ہے۔ اُس وقت تک گرانی کے سلسلے میں وہاں لاٹھی چارج نہیں ہوا تھا اور نہ گولی چلانے کی نوبت آئی تھی۔ اِس لئے وہاں کی مہذب جنتا "مارے خدا ملے" کے وظیفہ پر گزر بسر کر رہی تھی۔ بات یہ ہے کہ وہاں کے لوگ فطرتاً اتنے بہادر واقع ہوئے ہیں کہ اگر خدا نخواستہ کوئی شخص سڑک پر اُچھل کود کرنے لگتا ہے، تو بچوں کو کون کہے اچھے بھلے نوجوان مارے خوف کے اپنی اپنی ماؤں سے پٹ جاتے ہیں۔

ہاں تو وہاں گرانی کے خلاف مظاہرہ کے بجائے طلباء کا ایک ایجی ٹیشن اِس بنیاد پر شروع ہو گیا کہ یونیورسٹی کی ایک لڑکی کسی لڑکے کو اغوا کرلے گئی تھی۔ اِس زمانہ کی نیرنگی کے قربان جائیے ؎

زمانہ بھی کیا کیا بدلتا ہے رنگ
جو بیوی تھے اب وہ سالے ہوئے

محلہ فتح گنج میں طلباء کا ایک ایجی ٹیشن شروع ہو گیا اور اُس شورش میں شریک ہونے والے طالب علموں پر پولیس نے ہوائی فائر کر دئے جس سے لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔

ہمارے شہر میں ماشاء اللہ دو قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ ایک تو وہ جو اخلاقی طور پر یا اپنی ذاتی بزدلی کے تحت "ایکتا" پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور ہندو مسلمانوں میں محمود و ایاز کی تخصیص نہیں کرتے۔ دوسرے وہ لوگ جو مادر زاد عشاق ہیں اور اپنا زیادہ وقت روزی پیدا کرنے کی بجائے شعر و شاعری میں صرف کرتے ہیں۔ یہ حضرات مختلف ہوٹلوں میں بیٹھ کر مختلف کمپنیوں کی بنائی ہوئی بیڑیوں کے حسب نسب اور ذائقہ پر تبادلۂ خیال کرتے رہتے ہیں یا پھر کسی خیالی محبوبہ پر جان قربان کرنے کے بعد قبرستان سے آوازیں بلند کرتے ہیں ؎

لحد میں ہوں اور نالے جا رہے ہیں کوئے جاناں میں
مری منزل سے آگے بڑھ گیا ہے کارواں میرا

یا پھر ایک طبقہ سُود خور لالاؤں کا ہے جو سُود کھاتے کھاتے اتنے دبیز ہو گئے ہیں کہ جب کسی سڑک پر اپنے تمام اعضاء کو یکجا کر کے چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عقب میں

گوشت کی دو دو گلیاں بائدھے چل رہی ہیں اور اُن کی موٹی موٹی رانیں اِس طرح ایک دوسرے کو رگڑتی اور پیستی چلتی ہیں کہ اگر اُن دونوں کے درمیان آپ ایک گنے کا ٹکڑا رکھ دیں تو اُس کا عرق اِس طرح نکل آئے گا کہ آپ کو دوبارہ اُس کی گرتوڑ کر مزید رَس نکالنے کے لئے مشین میں رکھنے کی زحمت نہ ہوگی۔

جوانی فائر ہونے سے پہلے میں نے یکّے تانگے والوں میں ایک اُسی وضع قطع کے لالہ کو دیکھا، جن پر کچھ لوگ پھبتیاں کس رہے تھے۔ دوسری طرف فٹ پاتھ پر دو صاحب لالہ کو دیکھ دیکھ کر باتیں کر رہے تھے۔ اُن میں سے ایک صاحب بولے۔

"اماں میر صاحب! تم اُس روز کہہ رہے تھے کہ تم نے کبھی ہاتھی کو آج تک خودکشی کرتے نہیں دیکھا!؟"

بولے ـــــ "ہاں مرزا صاحب! ہمارے کان تو اِس طرح کے واقعہ سے بالکل آشنا نہیں۔ نہ تو ہم نے قصّے کہانیوں میں کہیں سُنا کہ کسی ہاتھی نے انسانوں کی طرح غصّے میں آکر خودکشی کرلی ہو اور نہ کسی گینڈے کو حرام موت مرتے دیکھا۔"

(لالہ کی طرف اشارہ کرکے) "لو چھوٹی رانی کے یہاں باہر ڈیوڑھی میں جو ہاتھی بندھا ہے اُسے لالہ کی جھلک دکھا کر خودکشی کروا لو۔"

ابھی یہ فقرہ ختم نہیں ہوا تھا کہ لالہ نے ایک یکّہ والے سے جو پان کی دکان سے بیڑی کا ٹکڑا نکال کر جلانے ہی والا تھا، امین آباد سے چوک تک کا کرایہ پوچھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ بتاتے ایک تانگے والے نے لالہ جی کو مخاطب کرکے کہا "لالہ جی! ذرا سامنے سے ہٹ جایئے گا۔" لالہ نے گرم ہوکر کہا "کہاں ہٹ جاؤں؟ کیا فٹ پاتھ پر گھوڑا چڑھا دینے کا ارادہ ہے؟" تانگہ والا بولا "حضور! گرم ہونے کی بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ اگر حضور نے حضور کی جھلک دیکھ لی تو بھڑک جائے گا اور گاڑی پچھاڑی تڑا کر کسی طرف نکل بھاگے گا۔"

اِتنے میں یکّہ والے نے اپنی بیڑی کا ایک کش لے کر لالہ جی سے کہا "پوری سواری کا ایک روپیہ پڑے گا!"

لالہ نے سراپا حیرت بن کر پوچھا "کیا چوک سے امین آباد کا کرایہ تین آنے سے ایک روپیہ ہوگیا ہے؟"

یکّہ والا بولا "حضور! کرایہ تو وہی ہے لیکن سواری دیکھ کر یہ دام بتائے گئے ہیں۔"

دوسرا تانگہ والا بولا "ہاں ہاں لالہ بات یہ ہے کہ حضور کو چوک تک گھوڑا پہنچا تو ضرور دے گا لیکن دو تین دن اسے طاقت کی دوائیں بھی تو دینی پڑیں گی۔"

لالہ نے برہم ہوکر کہا "سخت بدتمیز آدمی معلوم ہوتے ہو!"

ایک دُور کی آواز آئی "بھیّا! لالہ سے چنگی کا نمبر پوچھ لو!"

تیسرا تانگہ والا بولا "لالہ جی! گرم ہونے کی بات نہیں ہے۔ گھوڑے کو تین چکر بھی تو کرنے پڑیں گے۔ جان جوکھم کی بات تو علیٰحدہ رہی!"

ایک لونڈا جو قریب کھڑا تھا بولا "لالہ جی! یکّہ پر نہ بیٹھنا نہیں تو سالنے والا سپاہی حضور پہ بے رحمی کے الزام میں دھر لے گا۔"

اِتنی باتیں ہو پائی تھیں کہ منٹ گنج سے جو بندوق کے فائر کی آواز سُنائی دی اور لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے تو لالہ نے بھی لوگوں کو بھاگتے دیکھ کر ایک طرف زمین پر اپنے جسم کا رولر چلا دیا۔ وہ اِس تیزی سے چلنے کی کوشش کر رہے تھے جیسے کوئی کچھوا خشکی پر جلدی جلدی بیٹھکیں مار رہا ہو۔ لالہ ایک فٹ پاتھ پر اپنے حساب سے پورے ایک فرلانگ یومیہ کی رفتار سے بھاگ رہے تھے کہ ایک صاحب نے جو سامنے سے چلے آرہے تھے، لالہ کو بدحواس دیکھ کر پوچھا۔

"لالہ جی! کیا بات ہے۔ بھاگ کیوں رہے ہو؟" لالہ جی کا سارا گوشت پسینے میں تحلیل ہونے کی کوشش کر رہا تھا، کسی بارش پلوہ کی پھنکار مار کر بولے "سب بھاگ رہے ہیں!" اور یہ کہہ کر "جیتے رہے تو دیں گے" کہتے ہوئے صبا رفتاری سے چلنا شروع کردیا اور ابھی مشکل سے دس بیس گز کا طویل سفر طے کیا ہوگا کہ طلباء کے ایک گروہ کے پیچھے سے بھاگنے کی آواز سُن کر لالہ نے جو مڑ کر دیکھا تو وہ اُس فٹ پاتھ کو چھوڑ کر دوسرے فٹ پاتھ کی طرف جانے کے لئے سڑک کراس کرنے لگے اور ابھی سڑک کے وسط تک نہ پہنچنے پائے تھے کہ سامنے سے پولیس سوار طلباء کو حراست میں لینے کے لئے جو بڑھے تو ایک اناڑی نوجوان گھوڑا لالہ کو نہ جانے کیا چیز سمجھا کہ ایک دم سوار کو اپنی پیٹھ پر سے دھکیلتا ہوا سرپٹ ایک طرف بھاگنے لگا اور یہ دیکھ کر "بھاگو بھاگو" کا شور بلند ہوا اور گھوڑ سوار بیچارا سخت مجروح ہوکر سڑک پر کراہنے لگا۔

دوسرے دن اخبار میں جب ایک صاحب یہ خبر زور زور سے پڑھ رہے تھے کہ ایک سرکاری بیان میں بتایا گیا ہے کہ طلباء نے ایک سرکاری گھوڑ سوار کو بُری طرح زد و کوب کر کے زخمی کردیا تو ایک دوکاندار نے چِلّا کر کہا "چل جھوٹے ـــــ!!"

فرار

کہکشاں انجم

بھوجپور ہاؤس۔ ڈمراؤں (شاہ آباد)

۲۴ اگست ۹۵ء

قبلہ محترم! سلام عقیدت

"بیسویں صدی" کی بلندی اور عظمت کا احساس کرکے ہم اتنے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ اُن بلندیوں کو چھونے کی ہمت کیسے کریں؟ اپنی ایک دو کہانیوں پر چھوٹے موٹے مقابلوں میں انعام پاکر اور محترم رہبر چچا اور رکی انور سبحانی سے یہ جان کر کہ میں کوشش کروں تو اچھا لکھ سکتی ہوں، یہ افسانہ "بیسویں صدی" کے لئے بھیجنے کی جرأت کر رہی ہوں ——— جہاں یہ حقیقت ہے کہ "بیسویں صدی" ادب کا بلند معیار صحیفہ ہے وہاں یہ بھی سچ ہے کہ ادب کا یہ درخشاں اور بلند مینار، زندگی کے بھٹکتے قافلوں کی رہنمائی بھی کرتا ہے، ایک سمت منزل راہ بھی دکھاتا ہے۔ اسی خیال سے یہ افسانہ لکھنے کی تحریک ملی ہے . . .

——— کہکشاں انجم

آفتاب جیسے جیسے مغرب کی طرف جھکنے لگا ہے، میری خلش بڑھتی جا رہی ہے۔ سورج کے دھالے میرے دل کو کاٹے دے رہے ہیں۔ اس گھر میں یہ میری آخری شام ہے۔ یہ احساس کسی طرح سکون نہیں لینے دے رہا ہے۔ دماغ بار بار جھلا کر پوچھ رہا ہے کیا میرا یہ قدم درست راہ پر جائے گا . . . کیا میری کشتیٔ حیات کنارے لگ جائے گی؟

"باجی! میرے بال کب سنوارو گی؟" ریشماں پکار رہی ہے۔ میں خاموشی سے اس کے بالوں سے اُلجھ جاتی ہوں۔ میری اُلجھن بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔ اللہ! کیا یہ بال پھر کبھی میں اس طرح سنوار سکوں گی . . . ؟ کل یہ ریشماں کسے اپنے بال سنوارنے کے لئے پکارے گی۔ کل . . . کل تو . . . ؟ اُف ——— ! اب یہ شرجیل کیوں چیخ رہا ہے۔ اس سے تو خود کوئی کام ہوتا نہیں۔ ذرا ذرا سی بات کے لئے چیخنے لگتا ہے۔

مشین کی طرح میں ہر کام کرتی چلی جا رہی ہوں۔ کل کون یہ کام کرے گا؟ اس سوال سے کیوں میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، میری پلکیں بھیگتی چلی جا رہی ہیں۔ اللہ! یہ کیسے کیسے خیالات کے ناگ مجھے ڈس رہے ہیں . . . !!

آخر یہ دل کا فیصلہ دماغ مانتا کیوں نہیں ہے ——— اس گھر کی ایک ایک چیز، ایک ایک ذرّے کو میں حسرت سے کیوں دیکھ رہی ہوں، انھیں پیار سے چھو کیوں لینا چاہتی ہوں۔ آخر یہ گھر ایک نہ ایک دن تو چھوڑنا ہے ہی!

"لیکن کیا ایسے ہی؟" دماغ پوچھنے لگتا ہے، میں کانپ جاتی ہوں ——— واقعی اس طرح اگر میں اس گھر سے جدا نہ ہوتی تو یہاں کا ایک ایک ذرّہ میری جدائی پر سوگوار ہو جاتا۔ آنسوؤں کے موتیوں سے میرا دامن بھر جاتا۔ دشمنوں کے دل سے بھی دعائیں نکلتیں۔ اور آج ——— ؟ آج تو سب مجھے نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ اپنی خوشی کے لئے میں سب کی محبت ٹھکرا کر جاؤں گی۔ سب کو ٹھکرا رہی ہوں۔ گھر سے فرار ہو رہی ہوں . . اُف میرے خدا! مجھے حوصلہ دے۔ یہ آرشی بھی کتنا ظالم ہے۔ اس نے میری ان بیڑیوں کو بھی نہیں دیکھا میرے اِرد گرد بندھے بہت سے ان، ریشمی لیکن مضبوط دھاگوں کو نہیں دیکھا اور بس کٹھور حکمانہ لہجہ میں کہہ دیا کہ ہمارے ملن کا بس ایک یہی راستہ ہے! اگر میری ہونا چاہتی ہو تو چلو۔ سب سے دور چل کر ہم اپنی دنیا بسائیں، ورنہ اس دنیا میں ہمارے درمیان مجبوریوں کی اونچی دیواریں ہمیں کبھی ملنے نہ دیں گی ——— ظالم! تو نے کوشش تو کی ہوتی۔ کبھی پاپا سے کہہ کر تو دیکھا ہوتا۔ آخر میں بغیر پایل کے گیتوں کے، مہندی کی لالی اور آنسوؤں کی سوغات لئے کیسے تیرے ساتھ چل دوں ——— ؟

گھر والے مجھے رو رو کر دعاؤں کے ساتھ وداع کریں گے لیکن اگر آج یوں چلی گئی تو مجھے کوس کر رو دیا جائے گا . . . میں کیسے اس راہ پر بڑھوں؟ میں چلی گئی تو یہ ریشماں اور شرجیل کسے اپنے کام کے لئے پکاریں گے؟ یہ اتنی محبت کرنے والے میرے پاپا . . . اور یہ امّی . . . !!

رشتوں کی محبت کا بدلہ میں اِس طرح کیسے دے سکتی ہوں... نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے نہیں جانا چاہئے!

لیکن نظروں کے سامنے ارشد کیوں آیا جا رہا ہے۔ چند دن اُسے نہیں ملتی تو وہ وحشت زدہ، اُلجھے بال، زرد کملایا چہرہ لئے سگرٹ پر سگریٹ پھونکتا رہتا ہے۔ کہتا میری ہمیشہ کی عادت ہے آپ اُسے پاگل نہ بنا لے گی۔ وہ تو دیوانگی کی حد تک مجھے چاہتا ہے۔ مجھے وہ پاگل یاد ہے جو گلیوں اور بازاروں میں پھرتا تھا اور ایک دن ارشد نے بتایا تھا کہ یہ اپنی محبوبہ کی جدائی سے ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے اور پھر اُس نے بہت بھولے پن سے کہا تھا: "دیکھ لینا! اگر تم نے بھی مجھ سے بے وفائی کی تو اِسی طرح دیوانہ بن کر..."

میں نے کانپ کر اُس کے ہونٹوں پر ہتھیلی رکھ دی تھی۔ میری آنکھوں سے پھر سوالات پوچھتے ہیں۔ ماں باپ کب مستقبل کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ان سے تو جُدا ہونا ہی ہے اور ارشد کو ٹھکرا کر میں اپنے ساتھ اُس کی زندگی بھی برباد کر ڈالوں گی۔ نہیں... نہیں... مجھے

- اپنے تمام معاملات خدا کو سونپ دو، عیش و مسرت کی ساعتوں پر نازاں نہ ہو۔ مصائب و شدائد سے نہ گھبراؤ، زمانہ میں انقلاب آتے ہی رہتے ہیں۔ (عربی ادب)
- کم ظرفوں سے نہ دوستی اچھی نہ دشمنی، دونوں بُری۔ جیسے کُتّے کا کاٹنا اور اُس کا پیار سے چاٹنا دونوں مضر ہیں۔ (عبدالرحیم خانخاناں)
- بخل اور اسراف دونوں ہی مذموم ہیں لیکن اسراف، بخل سے کم مذموم ہے کہ اُس سے دوسروں کو تو فائدہ پہنچ جاتا ہے۔ (حکیم فیثا غورث)
- ہمیں لوگوں سے بھلائی کی اُمید نہیں، بس یہ کافی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ بُرائی نہ کریں۔ (حضرت شیخ سعدیؒ)
- دشمن کو کبھی حقیر و بے مایہ نہ سمجھو۔ (فارسی ادب)

جانا ہی چاہئے۔ میں جاؤں گی!!

سورج ڈوب گیا ـــــ چاند نکلا اور دل پر منوں بوجھ لئے میں ایک ایک کام کرتی رہی۔ رات اپنی منزلیں طے کرنے لگی۔ پاپا کے کمرہ کی لائٹ آف ہو چکی ہے۔ ریشماں اور شرجیل بھی سو چکے ہیں۔ امی بھی جا کر اپنے پلنگ پر لیٹ چکی ہیں۔ میں چپ چاپ اپنے کمرہ میں پڑی ہوں۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ اپنی خوشی، اپنی محبت کے لئے میں سارے رشتوں کو ٹھکرا کر جا رہی ہوں تاکہ ہم کبھی جُدا نہ ہو سکیں۔ میں ہیر اور سوہنی کی طرح تشنۂ آرزو نہ رہ جاؤں؟

گھڑیاں آگے کو سرکتی رہیں اور میں سسکتی رہی۔ گھڑی میں بارہ بج گئے ہیں اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی ہوں۔ صرف تین گھنٹے... تین گھنٹے اور اِس گھر میں رہنا ہے! اُس کے بعد میں باہر نکلوں گی جہاں ارشد میرا انتظار کر رہا ہوگا اور پھر ہم اپنی منزلوں کی طرف بڑھ جائیں گے... آنسوؤں کی روانی اور تیز ہو گئی ہے۔ میری امی... میرے ابّی... کتنی ظالم ہے میں تمھیں کتنی اذیت دے کر جا رہی ہوں! مجھے معاف کر دینا، معاف کر دینا اور پاپا... تم بھی معاف کر دینا۔ تم نے ہمیشہ مجھے خوشی دی ہے۔ تم لیانا بھی میری خوشی تھی۔ میں تمھیں کیسے بتاؤں کہ کون سی بات مجھے گنہگار بنا رہی ہے۔ ایک طرف میری محبت ہے اور دوسری جانب ساری کائنات!... الوداع! میرے گھر، میرے ساتھی...!

چپکے سے آکر میں امی کے پلنگ کے قریب کھڑی ہو گئی ہوں۔ دل ڈوبنے سا لگا ہے...... میں دیر تک یہاں کھڑی رہی تو پھر ماتا کی زنجیر مجھے باندھ لے گی۔ میں دل پر جبر کئے لوٹنے لگی ہوں۔ برآمدہ میں ایک بار پھر میرے قدم رکنے لگے ہیں۔ مدھم روشنی میں شہرا تن تو اسو رہی ہے۔ تم بھی میرے لئے روؤ گی نا برا؟... کتنی بار تم سے کہا تھا اللہ جلدی سے بیٹیا کے سہرے کی کلی کھلائے تو میں نیا جوڑا پہنوں... تمھیں کیا معلوم تھا کہ میرے سہرے کی کلی کھلے گی بھی تو تم اُس کی مہک نہ محسوس کرو گی... اور آگے بڑھتے بڑھتے میں پھر ٹھٹک گئی ہوں۔

صحن میں کھڑا مہندی کا پودا جیسے میرا آنچل تھام لیتا ہے۔ مجھ پیارے سینچنے والی اِس طرح نہ جا... میرے خونِ جگر کی لالی کے بغیر تیرا سہاگ کیا ادھورا نہ رہے گا...؟

اللہ ـــ! آخر یہ کیسی دشواری ہے۔ ایک محبت کے لئے کتنی محبتوں کو ٹھکرانا پڑے گا۔ میں کیا کروں۔ کیا کروں...؟ اِس گھر کا تو ایک ایک ذرہ میرے سامنے پہاڑ بن کر کھڑا ہے... ساری چیزیں زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک ساتھ مل کر مجھے جکڑے لے رہی ہیں، ایک دائرہ بن کر مجھے گھیر رہی ہیں...!! میں ہر زنجیر کو توڑ رہی ہوں لیکن وہ ہے کہ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتی۔ دل کی ہر دلیل کو دماغ ٹھکراتے جا رہا ہے... وہ مانتا ہی نہیں کہ اب فرار کے سوا کوئی راہ نہیں۔ اور کسی طرح میری تمنا کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

میں کمرہ میں بیٹھ جاتی ہوں... اُف! اِس دوراہے پر کھڑی میں کس اذیت میں مبتلا ہوں... کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ کس راہ کو اپناؤں ـــــ یہ موت اور حیات کی آخری راہیں!... ایک راہ پر اُجالے ہی اُجالے ہیں، بہار ہی بہار ہے لیکن دل کی دُنیا تاریک اور اُجڑی ہوئی ہے۔ اِس میں خوشی کی کسی کرن کا گزر نہیں ہے۔ یادوں کے چند پھول، ایک کبھی نہ مٹنے والی خلش اور جھوٹی مسکراہٹ کے سوا میرے پاس اپنا کچھ نہ رہے گا۔ دوسروں کی روشنی کے لئے میری خوشی کے چراغ بجھ ہی رہیں گے...! لیکن دوسری جانب دوسری راہ پر اپنوں بیگانوں کی نفرت کے اندھیرے ہوں گے۔ برداشت نہ کر سکنے والی بے رُخی ہوگی۔ راہ میں طنز کے ان گنت کانٹے بکھرے ہوں گے۔ میری مسکراہٹوں کے چراغ فروزاں ہوں گے۔ میں خوش ہوں گی کہ ہر دیوار کو توڑ کر میں نے اپنوں کی مرضی کے خلاف، اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدل دیا۔ اپنی تمنا کی تکمیل کے لئے میں نے ہر چیز قربان کر دی!

لیکن کیا سب کی خوشیاں چھینے بغیر میں خوش رہ سکتی ہوں؟ . . . یہ کیسی مجبوری ہے یہ کیسی دشواری ہے . . . ؟ میرے معبود! یہ کیسا تیرا قانون ہے کہ ایک سحر کے لئے لاکھوں تارے بجھیں . . . ! ان تاروں کی قربانی کے بغیر آخر سحر کیوں نہیں ہو سکتی؟

یہ میرے شفیق پاپا . . . اور یہ امی . . . یہ معصوم بہن بھائی . . . کیا ان سب کی خوشیاں اور محبتیں پامال کئے بغیر میں اپنی منزل نہیں پا سکتی . . . ؟ ان کے چہروں پر ہنسی کی سیاہی پوتے بغیر میں اپنی راہوں کو روشن نہیں بنا سکتی . . . لیکن . . . یہ سب میں کیسے کروں . . . کس دل سے کروں . . . ! ؟ اگر انہیں دیکھوں تو پھر ارشی کا کیا ہوگا . . ؟ میرے دل کے سرسبز چمن میں مسکراتی امیدوں کی کلیاں کیا دکھ کے نوکیلے اور زہریلے کانٹے نہیں بن جائیں گی۔ پھر . . . ! ؟ اللہ! آخر کس طرح میں ایک راہ چنوں ــــــ ؟ دل چاہ رہا ہے چیخ چیخ کر رونے لگوں ــــــ ! لیکن اب تو آنسو بھی خشک ہو گئے ہیں۔ اچھا ہی ہوا ورنہ کہیں ان آنسوؤں کے سیلاب میں میرا ارادہ ڈوب جاتا تو کیا کرتی . . . اُف! ڈھائی بج گئے! مجھے بالکل تیار ہو جانا چاہئے۔ لیکن اب کیا تیاری کرنی ہے؟ میں ساتھ لے جانے والا سب سامان تو اس اٹیچی میں رکھ ہی چکی ہوں . . . صرف اسے اٹھا کر چند منٹ کا راستہ طے کرکے باہر گلی میں پہنچ جاؤں گی . . . لیکن ابھی تو تین منٹ باقی ہیں . . . کاش جلدی بہت جلدی یہ وقت بھی بیت جاتا۔ اب میں زیادہ سوچنا نہیں چاہتی . . . یہ سوچیں میرے ارادوں کو متزلزل کر سکتی ہیں۔ میرا یقین ڈگمگانے لگتا ہے۔ خیالوں کے غاروں سے چھٹکارا پانے کے لئے میں میز پر سے کوئی کتاب اٹھانا چاہتی ہوں۔ اور اندھوں کی طرح ٹٹول کر جو رسالہ اٹھاتی ہوں وہ "بیسویں صدی" کا نیا شمارہ ہے۔ "چلو اچھا ہے" میں سوچتی ہوں ابھی اسے میں پڑھ بھی نہیں سکی ہوں۔ اور میں اس کے ورق الٹنے لگتی ہوں . . . جبھی ایک ورق پر میری نگاہیں جم جاتی ہیں ــــــ "آخر ایک انسان اپنا سب کچھ کھو کر بھی ایک آرزو ــــ صرف ایک تمنا کی تکمیل کیوں نہیں کر پاتا ــــــ ؟"

کیوں نہیں کر پاتا ــــــ ؟؟

کیوں نہیں کر پاتا ــــــ ؟؟؟

میرے دل میں شعلہ سا لپکا۔ میری نظریں آگے کی سطروں پر پھسلتی چلی جا رہی ہیں۔ "اور زندگی بھر کا سفر طے کرنے اور اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد جب اسے معلوم ہو کہ عمر بھر سائے کی تلاش میں وہ اپنے پاؤں لہولہان کرتا رہا ہے، وہ محض ایک سراب تھا تو وہ کہاں جائے . . . !!"

سوالوں کا ایک طوفان سا دل میں امڈ آیا ہے . . . اگر سب کچھ گنوا کر بھی ایک تمنا کی تکمیل نہ کر سکی تو . . . ؟ اگر ارشد نے دھوکا دیا . . . ؟؟ تو یہ آرزو پوری ہونے کی بجائے صرف دل کا داغ بن کر رہ جائے گی۔ پھر کیا ملے گا مجھے . . . ایک ازلی درد . . . ایک کرب . . . !! تو پھر درد کا یہ بوجھ ذلت کے ساتھ کیوں اٹھاؤں . . . جیتے جیتے عزت اور وقار سے کیوں نہ سہہ لوں . . . کون جانے پاپا ارشد کو میرے لئے پسند ہی کر لیں . . . انھوں نے انکار تو نہیں کیا ہے۔ یہ تو ارشی خود ہی فیصلہ کرکے ان کے پاس نہیں گیا . . . پھر جب ہم اتنے مجبور ہیں کہ حالات کے خار دار جنگلوں سے گزر کر بھی، یہ یقین نہیں کہ ہم اپنی تمنا کا پھول پا ہی لیں گے۔ تو پھر . . . پھر کیا یہ اچھا ہوگا کہ میں اتنی محبتوں کو ٹھکرا کر اتنی زنجیروں کو توڑ کر جاؤں . . . ؟

ٹن . . . ٹن . . . ٹن . . . اُف! تین بج گئے!! ارشد آ گیا ہوگا . . . وہ کیا سمجھے گا . . . میں اسے ساری باتیں کس طرح بتاؤں گی . . . کیا کروں . . . ؟ میری نظریں سامنے دیوار پر لگی گھڑی پر جمی ہیں اور ذہن میں ایک ہی سوال گھوم رہا ہے "اگر سب کچھ کھو کر بھی اسے نہ پا سکی؟"

- عورت مرد کی غلام نہیں ہے بلکہ اس کی بہترین رفیق، ہمدرد اور ساتھی ہے۔ عورت میں انسانی خدمت کا جذبہ مرد سے زیادہ ہوتا ہے۔ (مہاتما گاندھی)
- زندگی کی حفاظت کے لئے ہمت اور حوصلہ کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح کھیت کی حفاظت کے لئے کانٹوں بھری باڑھ کی۔ (آکشپاد)
- اگر آپ بیٹھے بٹھائے پریشانیاں سمیٹنے کے عادی ہیں تو انھیں مہربانی کرکے اپنے ہمسایوں میں نہ بانٹئے۔ (شنکر اچاریہ)
- دوسروں کی زندگی کے آئینہ میں اپنے لئے راہِ عمل تلاش کرو۔ (ایک مشرقی مفکر)
- علم ایک ایسا سرچشمہ ہے جس کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے۔ (بھرتری ہری)

اگر سب کھو کر . . . !

سب کچھ کھو کر بھی . . . کچھ نہ پا سکی تو پھر کیا فائدہ کہ سب کچھ کھو دوں؟ گھڑی کی سوئیاں سرک رہی ہیں آگے اور آگے . . . میں خاموش بیٹھی ہوں . . . ایک منٹ . . . دو منٹ . . . اور جیسے ہی چار بجتے ہیں، میں کٹے درخت کی طرح پلنگ پر گر پڑتی ہوں۔

"جاؤ میرے ارشی! سب کچھ کھو کر تمہیں پانا نہیں چاہتی۔ سب کی خوشی سے ملو تو قبول ہے ــــــ !!"

غزل آتی ہے یاد... غزل

زیب بریلوی

کھا کے دھوکے ترے پیام سے ہم
چھٹ گئے ہیں فریبِ عام سے ہم
پھر تو پہنچو وہاں سے ہم کو بھی
تم کو سمجھے ہیں جس مقام سے ہم
جنبشِ چشمِ التفات ٹھہر
مر مٹے ہیں ترے پیام سے ہم
جب سے ہاتھوں سے جام چھوٹ گیا
سہم جاتے ہیں ذکرِ جام سے ہم
دس لیتے رہے ہیں دنیا میں
زندگی بھر خیالِ خام سے ہم
بھول بیٹھے ہیں اپنی ہستی کو
آشنا ہو کے تیرے نام سے ہم
مجھ کو پہچانتے نہیں لیکن
پیار کرتے ہیں تیرے نام سے ہم
زیب دھوکا ہی کھا گئے ورنہ
خوب واقف تھے فیضِ عام سے ہم

مشتاق احمد خاں عادل ادیب

شمس و قمر بھی ماند ہیں جس کی ضیا کے سامنے
حور و ارم بھی منفعل جس کی حیا کے سامنے
لیلیٰ نجد، بے وفا جس کی وفا کے سامنے
اُف وہ حسینہ بہار، آتی ہے یاد بار بار
غنچے کی جس میں تھی مہک پھول کی تھی شگفتگی
ظلمتِ دہر کو چراغ، خانۂ دل کی روشنی
اہلِ چمن کے واسطے، جس کا وجود زندگی
نازشِ حُسنِ کردگار، آتی ہے یاد بار بار
ماہ جبین و دلربا، دردِ حیات کی دوا
عشق و وفا کی رہنما، مجلۂ شوق کا دیا
نغمۂ سازِ آرزو، سازِ الست کی صدا
جوشِ شباب نوبہار، آتی ہے یاد بابار
میری وفاؤں کے عوض جس نے ہزار غم دیئے
میری خوشی کو لوٹ کر، گوہرِ چشمِ نم دیئے
میرا سکون چھین کر، رنج دیئے الم دیئے
دل ہے ہنوز داغ دار، آتی ہے یاد بابار

اُدے سنگھ منصور

چاند تاروں کی بات رہنے دو
ماہ پاروں کی بات رہنے دو
غنچۂ دل نہ کھل سکے جن سے
اُن بہاروں کی بات رہنے دو
کر گئے ہیں ہمیں وہ خوگرِ غم
غم گساروں کی بات رہنے دو
اب تو منزل کی آرزو ہی نہیں
رہ گزاروں کی بات رہنے دو
دیکھ لو میری اشک بار آنکھیں
آبشاروں کی بات رہنے دو
جتنے رُسوا ہوئے ہم اِن سے ہوئے
رازداروں کی بات رہنے دو
کون پُرسانِ حال ہے اِن کا
بے سہاروں کی بات رہنے دو
اے منصور تم اِس زمانے میں
وضع داروں کی بات رہنے دو

طنزیہ

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد چاروں کھونٹ گھومتا ہے، افواہیں جمع کرتا ہے۔ اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ یہ جنون اس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے ہوش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں۔

چینی بھیڑیں مل گئیں

لندن میں یہ افواہ گشت لگا رہی ہے کہ چین کی جو آٹھ سو بھیڑیں گم ہو گئی تھیں ان کا پتہ چل گیا ہے۔

معلوم ہوا ہے یہ آٹھ سو بھیڑیں پیکنگ سے پانچ میل پر ایک باڑے میں قید ہیں۔ اس سربستہ راز کو ایک برطانوی نامہ نگار نے کھولا ہے جو حال ہی میں چین کے خفیہ دورہ سے لندن واپس آیا ہے اور اس کے پاس ان آٹھ سو بھیڑوں کا گروپ فوٹو موجود ہے۔ اس سے پہلے چین نے ہند سرکار پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ اس کی آٹھ سو بھیڑیں سرحدی علاقہ سے چرا کر لے گیا ہے۔ اس پر بھیڑوں کی یہ کہانی دنیا بھر میں مذاق کا موضوع بن گئی تھی لیکن ایک برطانوی نامہ نگار نے سوچا کہ معاملہ مذاق میں ٹال دینے والا نہیں بلکہ گمبھیر ہے کیونکہ اس کے خیال میں چینی کمیونسٹ دروغ بیان ضرور ہیں لیکن ان کے جھوٹ کے پیچھے کوئی نہ کوئی ڈرامائی سچائی ضرور ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ کسی نہ کسی خفیہ طریقے سے چین جا پہنچا اور بھیڑوں کی تلاش میں کامیاب ہو گیا۔

نامہ نگار مذکور کا کہنا ہے کہ یہ واقعی سرحدی بھیڑیں ہیں اور پوری آٹھ سو ہیں۔ انھیں ہند چین سرحد سے چینی افسر ہانک کر پیکنگ لے آئے اور ایک باڑے میں قید کر دیا اور اس کے باہر مسلح گارد بٹھا دی اور پھر دنیا میں مشہور کر دیا کہ یہ بھیڑیں ہندوستانی فوجی ہانک کر لے گئے ہیں تاکہ اس طرح ہندوستان کو چور ثابت کیا جائے۔

افواہ ہے کہ چین سرکار نے برطانیہ سرکار کو ایک سخت احتجاجی نوٹ بھیجا ہے کہ نامہ نگار مذکور سے کہا جائے کہ وہ بھیڑوں کا فوٹو گروپ کسی اخبار میں شائع نہ کرے اور نہ ہی بھیڑوں کے متعلق اس نے جو معلومات حاصل کی ہیں، انھیں پبلک کے سامنے لائے۔ چین سرکار نے برطانیہ کو دھمکی دی ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ چین میں تمام برطانوی جائداد پر قبضہ کر لے گی۔ لیکن نامہ نگار مذکور بضد ہے کہ وہ یہ فوٹو اور دوسری معلومات ضرور شائع کرے گا۔ بہرکیف آنے والے چند دنوں میں بھیڑوں کی کہانی ایک بار پھر دنیا کے سامنے آنے والی ہے۔

جنگ کے فوائد

اس افواہ پر سنجیدہ حلقوں میں اعتبار نہیں کیا جا رہا جس کی رو سے ہندوستان اور پاکستان کے ریڈیو ڈیلروں اور ریڈیو مکینکوں نے ہند و پاک کی حکومتوں سے مشترکہ اپیل کی ہے کہ دونوں ملک ایک دوسرے سے جنگ جاری رکھیں۔ کیونکہ جنگ سے ریڈیو کی انڈسٹری پر نہایت خوشگوار اثر پڑا ہے۔ جنگ کے دنوں میں ہر آدمی نے ریڈیو کی اہمیت سمجھ لی ہے اور زمانہ امن کی بہ نسبت دس گنا زیادہ ریڈیو سیٹ فروخت ہوئے ہیں نیز مرمت کے لئے ... جبکہ اس سے پہلے لوگ ریڈیو کو صرف ایک عیاشی سمجھتے تھے لیکن اب وہ روزمرہ کی ضرورت بن گئی ہے۔ لوگ کھانا دن میں دو بار کھاتے ہیں لیکن ریڈیو چوبیس گھنٹے سنتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک بات بے حد تعجب خیز ہے کہ اس اپیل پر کسی ریڈیو ڈیلر اور مکینک نے دستخط نہیں کئے۔ شاید اس لئے کہ کہیں وہ جنگ پسند نہ سمجھے جائیں۔ لیکن اپیل میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ دستخط نہ ہونے کے باوجود دونوں حکومتوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ دستخط نہ کرنے والوں کی سپرٹ اس اپیل میں موجود ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ دونوں حکومتوں نے اس اپیل کو صرف مذاق سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔

امریکہ کا انقلابی فیصلہ

امریکہ کی جانسن سرکار نے ایک حیرت انگیز فیصلہ کیا ہے۔

افواہ ہے کہ امریکہ سرکار آئندہ پچیس سال تک جنگی ہتھیار نہیں بنائے گی اور امریکہ کی تمام فیکٹریوں کو حکم دے دے گی کہ وہ اپنی فیکٹریوں میں صرف غیر فوجی سامان تیار کریں۔ مثلاً

خوراک، کپڑے، دوائیاں، فرنیچر اور آرائش و زیبائش کا سامان۔ اور آئندہ جو ملک امریکہ سے اسلحہ کی امداد طلب کرے، اُسے بسکٹ، جوتے، فرنیچر، دودھ اور لپ اسٹک وغیرہ اشیاء ارسال کی جائیں۔

سُنا گیا ہے کہ اس فیصلہ سے دُنیا بھر میں ہلچل مچ گئی ہے۔ امریکی صدر مسٹر جانسن کو مختلف ممالک سے تار بھیجے جا رہے ہیں کہ ہمیں اس پر اعتبار نہیں آتا کہ امریکہ ایسا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس لئے پوزیشن واضح کی جائے۔ اُدھر امریکہ کے اسلحہ فروش تاجروں نے جانسن سرکار کے خلاف ایک زوردار تحریک چلانے کی دھمکی دی ہے۔ کیونکہ ان تاجروں کی ساری اقتصادیات فوجی ساز و سامان کی بنیاد پر کھڑی ہے اور یہ بنیاد اگر اکھڑ گئی تو ان کی اقتصادی موت واقع ہو جائے گی۔ ان حالات میں وہ بغاوت پر آمادہ ہو رہے ہیں۔ نیٹو اور سیٹو معاہدہ کے ممالک بھی اس فیصلہ سے نالاں ہیں اور وہ شاید امریکہ کو یو۔ این۔ او سے نکال باہر پھینکنے کی کوشش کریں۔

سُنا گیا ہے کہ جانسن سرکار اپنے فیصلہ پر ڈٹی ہوئی ہے۔ اگرچہ جہاں گردنے جب مسٹر جانسن سے اس سلسلہ میں انٹرویو لیا تو مسٹر جانسن نے کہا: "مجھے اس طرح کے فیصلہ کا کوئی علم نہیں اور یقیناً

یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی"

جھوٹوں کا مقابلہ ●

دُنیا میں جلد ہی جھوٹ بولنے والوں کا ایک بین الاقوامی مقابلہ ہونے والا ہے۔

اس مقابلہ کا اہتمام اتحادی سبھا کی تہذیبی شاخ کی طرف سے کیا جائے گا۔ اس مقابلہ کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ تہذیب اور سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ جھوٹ کے فن نے کتنی ترقی کی ہے اور جھوٹ بولنے کے کون کون سے نئے اور سائنسی طریقے ایجاد کئے جا چکے ہیں۔

اس مقابلہ میں شمولیت کے لئے تمام حکومتوں کو اپنے اپنے جھوٹ کے ماہر نمائندے بھیجنے کی دعوت دی گئی ہے۔ کئی ممالک مثلاً ہندوستان، روس، افغانستان اور برما وغیرہ نے اپنے نمائندے بھیجنے میں ہچکچاہٹ ظاہر کی ہے۔ کیونکہ ان ممالک کو خطرہ ہے کہ وہ اس مقابلہ میں جیت نہیں سکیں گے۔ اس لئے شکست کی رُسوائی مول لینا دانشمندی کے خلاف ہے۔

بہت سے ممالک مثلاً چین، پاکستان، امریکہ، برطانیہ اور انڈونیشیا وغیرہ نے اس مقابلہ کا سواگت کیا ہے اور ان میں سے ہر ملک کو یقین ہے کہ وہ جھوٹ کے مقابلہ میں چیمپین شپ کا کپ جیت جائیں گے۔ چین نے تو یہ فیصلہ کیا ہے کہ اُس کے جھوٹوں کا ڈیلی گیشن سب سے بڑا اور زبردست ہوگا۔ اُسے یقین ہے کہ وہ فائنل مقابلہ میں اکیلا رہ جائے گا۔ لیکن چین کو شامل کرنے میں ایک قانونی رکاوٹ یہ ہے کہ وہ اتحادی سبھا کا ممبر نہیں ہے۔ اس لئے اگر اُسے شامل نہ کیا گیا تو ممکن ہے وہ اپنے حمایتی دیشوں کو بھی اس مقابلہ میں شامل ہونے سے روک دے اور ایک الگ بین الاقوامی مقابلہ کا اہتمام کرے۔

بہر حال یہ مقابلہ ثابت کر دے گا کہ تہذیب نے جھوٹ بولنے میں کتنی ترقی کی ہے اور اس میں سچ کا بیج قطعی طور پر نیست و نابود ہو گیا ہے یا ایک آدھ دانہ ابھی باقی ہے۔

دُنیا پانچ حصّوں میں بٹ جائیگی ●

افواہ ہے کہ اتحادی سبھا میں ایک ممبر ملک نے بڑی احمقانہ تجویز پیش کی ہے کہ اگر دُنیا میں مستقل امن قائم کرنا ہے تو ساری دُنیا کو چند مذہبی خطوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس وقت دُنیا میں چار بڑے مذہب ہیں۔ اسلام، ہندو دھرم، عیسائیت، بودھ ——— لہٰذا دُنیا میں چار بڑی بڑی مذہبی سلطنتیں قائم کر لی جائیں: اسلامی سلطنت، ہندو سلطنت، عیسائی سلطنت اور بودھ سلطنت۔ اس کے علاوہ دُنیا میں جو چھوٹے چھوٹے مذہبی فرقے ہیں انھیں ان کی مرضی سے اُن میں سے کسی نہ کسی بڑے مذہب میں مدغم کر دیا جائے۔

معلوم ہوا ہے کہ جب اس تجویز کا مسودہ مختلف ممبروں کی رائے کے لئے بھیجا گیا تو یہ عجیب انکشاف ہوا کہ مسلم ملکوں نے اسلامی سلطنت کے قیام کی مخالفت کی اور عیسائی ملکوں نے عیسائی سلطنت کی۔ یعنی ہر ملک جس مذہب سے تعلق رکھتا تھا اُس نے اپنے ہی مذہب کی متحدہ سلطنت کے قیام کو شک کی نگاہ سے دیکھا اور اعلان کر دیا کہ اگر ایسی سلطنتیں بنائی گئیں تو ہم ان کا بائیکاٹ کریں گے۔ کیونکہ کسی بھی ملک کا سربراہ اپنی حکومت کو مذہبی اتحاد کی خاطر چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

چنانچہ مذہب پرستوں کے ہاتھوں مذہب کی یہ دُرگت دیکھ کر تجویز کا محرک مایوس ہو گیا ہے اور اُس نے تجویز واپس لے لی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر بہت دلچسپ ہے کہ اس دوران میں کمیونسٹ ممالک خاموش تماشائی بنے رہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔

گدھوں کی بغاوت ●

دلّی میں افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ گزشتہ دنوں ہندوستان کے گدھوں کی ایک نمائندہ کنونشن منعقد ہوئی جس میں یہ انقلابی اور باغیانہ فیصلہ کیا گیا کہ انسان کے ساتھ تمام تعلقات توڑ لئے جائیں اور تمام گدھے شہری آبادی کو چھوڑ کر جنگلوں میں جا بسیں۔

اس فیصلہ کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب سے گدھا پیدا ہوا ہے، انسان اُسے احمق کہتا رہا ہے۔ نہ صرف کہتا رہا ہے بلکہ اُسے احمق بناتا بھی رہا ہے۔ حالانکہ گدھوں کی طرف سے انسان کو کئی بار برادرانہ وارننگ بھی دی گئی کہ وہ گدھوں کے متعلق اپنے متکبرانہ رویّہ میں مناسب تبدیلی کرے لیکن انسان کو عقل نہیں آئی۔ اس لئے اب جبکہ گدھوں کے سر سے پانی گزر چکا ہے، گدھوں کو چاہئے کہ انسان کو عملی سبق سکھائیں اور اُس کا بائیکاٹ کر کے

جنگلوں میں چلے جائیں۔

اس فیصلہ پر عمل درآمد کرانے کے لئے گدھوں کا ایک سرکاری پاور کمیشن مقرر کیا گیا ہے جو گدھوں کو شہر سے نکلنے میں مدد دے گا اور انھیں جنگلوں میں بحال کرنے کے انتظامات کی دیکھ بھال کرے گا۔ اس کے علاوہ اس کمیشن کو یہ بھی حق ہوگا کہ جو گدھا شہر کو چھوڑنے سے انکار کرے یا جنگل سے بھاگ کر دوبارہ شہر میں آجائے تو اُسے گدھوں کی سیکورٹی پولیس کان سے پکڑ کر لے جائے اور اُسے سنگین سزا دے۔

جب اس فیصلہ کی بھنک ایک شہری انسان کے کان میں پڑی تو اس نے مسکرا کر کہا۔ یہ فیصلہ بھی ایک طرح کا گدھا پن ہے۔ کیونکہ جنگل میں گدھوں کو کوئی جانور رہنے نہیں دے گا۔ اور اُسے انسانوں کا جاسوس سمجھا جائے گا۔ اس لئے جھک مار کر سارے گدھے دوبارہ شہروں میں لوٹ آئیں گے اور اپنے انسان بھائیوں میں آکر شامل ہو جائیں گے۔ واپس آنے والوں میں پاور کمیشن کے معزز گدھے بھی شامل ہوں گے۔

لیڈر کا اعتراف ————●

پنجاب کی راجدھانی چنڈی گڑھ میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ جی آج کل اپنی سوانح عمری لکھنے میں مصروف ہیں۔ جس میں وہ پہلی بار بڑی صاف بیانی سے کام لیتے ہوئے بتائیں گے کہ انھوں نے عمر بھر اپنی ایک سکھ سلطنت قائم کرنے کے لئے جو کوششیں کیں، اُن کوششوں میں کون سے بنیادی نقص تھے اور اُنھیں ہر کوشش میں جو ناکامی ہوتی وہ کیوں ہوتی؟ اس سلسلہ میں انھوں نے تمام پنجابی باشندوں سے اپیل کی ہے کہ وہ میری سوانح عمری مرتب کرانے میں مدد دیں۔ یعنی جس کسی کو میری کوئی تقریر، بیان، حرکت یا واقعہ یاد ہو، جس سے میری ناکامیوں کا ثبوت ملتا ہو، وہ مجھے ارسال کرے۔

سُنا گیا ہے کہ اس سوانح عمری کے آخر میں ماسٹر تارا سنگھ جی آنے والے فرقہ پرست سکھ لیڈروں کو چیتاونی دیں گے کہ وہ اپنی عمر عزیز سکھ سلطنت کے قیام کے خواب میں ضائع نہ کریں۔ کیونکہ جو کام مجھ سے نہ ہو سکا، وہ آنے والی کئی نسلوں تک کسی سے بھی نہیں ہو سکتا۔

یہ سوانح عمری ایک ہزار ایک صفحات پر مشتمل ہوگی اور اس کی کوئی قیمت نہیں لی جائے گی بلکہ مفت بانٹی جائے گی۔ کتاب کے سارے اخراجات ماسٹر جی اپنی گرہ سے ادا کریں گے۔

مالِ غنیمت کی واپسی ————●

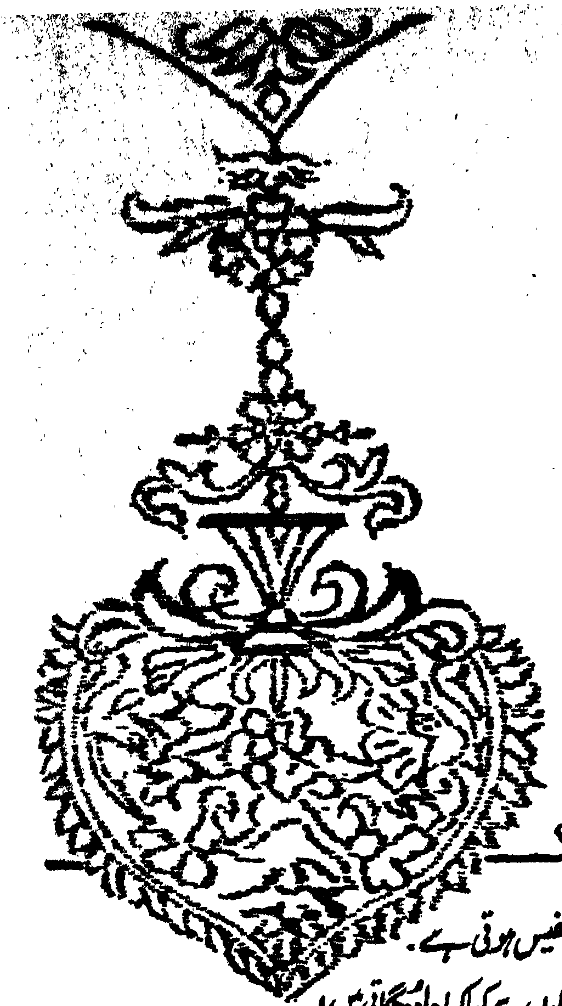
واشنگٹن کے بے خبر حلقوں میں یہ افواہ بڑے زور و شور سے گشت لگا رہی ہے کہ امریکہ کی سرکار نے ہند سرکار سے اُن پیٹن ٹینکوں اور ایک ہزار پونڈ کے بموں کی واپسی کا مطالبہ کیا ہے جو ہند و پاک جنگ میں بالکل صحیح و سالم حالت میں ہندوستانی فوج کے ہاتھ آئے۔ امریکی سرکار نے اس واپسی کے حق میں یہ دلیل دی ہے کہ یہ ٹینک اور بم امریکہ کی جائداد تھے۔ پاکستان کی جائداد نہیں تھے۔

سُنا گیا ہے کہ اس امریکی مطالبہ پر ہند سرکار بڑے تذبذب میں پڑ گئی ہے۔ کیونکہ ہند سرکار اس بات سے انکار نہیں کر سکتی کہ ٹینک اور بم امریکہ ہی کی ملکیت ہیں۔ لیکن بین الاقوامی جنگی قواعد کی رُو سے ان کا شمار مالِ غنیمت میں ہوتا ہے اور ان کی واپسی کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان کے کچھ غیر ذمہ دار ڈپلومیٹوں کا خیال ہے کہ ہند سرکار کو چاہئے کہ امریکہ کا مطالبہ چونکہ جذباتی ہے اور اس کے پسِ پُشت ندامت کی نفسیات کام کر رہی ہے۔ اس لئے یہ پیٹن ٹینک اور ایک ایک ہزار پونڈ کے بم واپس کر دینے چاہئیں اور ان ٹینکوں اور بموں کو جنگی قیدی سمجھ کر لوٹا دینا چاہئے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ دوبارہ ہندوستانی فوجوں کے مقابلہ پر نہیں بھیجے جائیں گے۔

اُمید کی جاتی ہے کہ امریکہ اس شرط کو قبول کرے گا اور اُنھیں جنوبی ویت نام سرکار کے ہاتھ بیچ دے گا!!





ہتھ کھڈی کے کپڑے خریدیئے

بھارت میں کپڑوں کی بُنائی نہایت نفیس ہوتی ہے۔
بھارتی بُنکر کی صناع اُنگلیاں قوسِ قزح کے رنگوں سے کیا کیا جادو جگاتی ہیں!
ایسا ہو بھی کیوں نا؟ اُن کی تحریک کا سرچشمہ تخلیق جو ٹھہرا۔ دُنیا میں کسی بھی دوسری جگہ اور بالخصوص اتنے بڑے پیمانے پر، ہتھ کھڈی کو یوں تخلیقی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔ جدید لباس اور سجاوٹ کا تقاضا ہے: نت نئے ڈیزائن، نئی نئی تکنیکیں۔ اور اِن کے نتیجے میں، بھارت کے ۳۰ لاکھ بُنکروں کا یہ عظیم ورثہ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ ماضی کی نسبت اب ہتھ کھڈی کپڑے زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں، اور بے شمار رنگوں، نمونوں اور ڈیزائنوں میں ملتے ہیں۔ اب یہ جگہ جگہ بکتے ہیں اور نت نئے طریقوں سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان کی مانگ دُنیا بھر میں ہے۔
پچھلے برس ہتھ کھڈی کپڑے کی برآمد سے ملک کو ۱۴ کروڑ روپے کا زرِ مبادلہ حاصل ہوا تھا۔

آل اِنڈیا ہینڈلوم بورڈ

DA 65/345

دسمبر ۶۵

افسانہ

تنہائی کا بوجھ

شکیل جاوید امروہوی

۱۲۷۔ گذری۔ امروہہ (یو۔پی)

۱۶ ستمبر ۶۵ء

مکرمی و معظمی خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

"بیسویں صدی" کی بزم سے طویل غیر حاضری کے بعد ——— بہت سے بوجھوں سے دامن چھڑاتے ہوئے "بیسویں صدی" کے لئے ایک افسانہ "تنہائی کا بوجھ" ارسال کر رہا ہوں ——— یہ افسانہ بھی میرے پہلے افسانوں کی طرح ڈائری پر مشتمل ہے۔ مجھے آپ کی رائے کا بے قراری سے انتظار رہے گا . . .

خاکسار ——— شکیل جاوید

۱۰ر اگست ۱۹۶۵ء

وہ کھڑکی آج بھی بند ہے!

میں کئی دن سے برابر دیکھ رہی ہوں وہ کھڑکی بند رہتی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے اُس کا بند ہونا اچھا نہیں لگتا۔ جب میں اُس کھڑکی کو کھلی پاتی ہوں تو میرے دل میں میٹھی میٹھی سی خلش پیدا ہو جاتی ہے اور میں خوابوں اور خیالوں کی دُنیا میں کھو جاتی ہوں۔ ہر رات مطالعہ کے بعد دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہوں۔ یونہی بے ربط سے خیالات . . . ایسے خواب . . . جن کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔ پھر بھی میں اِتنا ضرور محسوس کرتی ہوں کہ مجھے اِن خیالوں سے کچھ دلی تسکین ضرور ملتی ہے لیکن جو صرف عارضی ہوتی ہے۔ لیکن ——— لیکن میں کبھی کبھی اِن خیالوں کے بھیانک انجام سے کانپ کانپ جاتی ہوں۔ اُس وقت میرے دل کی کیفیت اور دھڑکنے کا انداز عجیب سا ہو جاتا ہے اور وہ منظر ——— جب کھڑکی سے دیکھنے والی دو سیاہ چمکدار آنکھیں میری طرف مُسلسل دیکھے جاتی ہیں جیسے وہ میرے جسم میں پیوست ہو جائیں گی۔ ہائے اللہ! ——— لیکن اُسی وقت میرے دل کے کسی گوشے سے یہ آواز آتی ہے کہ یہ آنکھیں اور اُن کا یہ دلکش عمل اِسی طرح جاری رہے اور اُس وقت تک جاری رہے جب تک کہ میں خود کو اپنے خیالوں کو اِس کائنات میں مدغم نہ کر دوں۔

جس دن وہ کھڑکی بند ہوتی ہے، میرے دل کی دھڑکن سہم جاتی ہے اور جیسے کائنات کا ذرّہ ذرّہ خاموش اور منجمد ہو جاتا ہے۔ زندگی کی ہر سانس مایوسی اور یاسیت کا پیغام سُناتی ہے۔ کون جانے یہ سلسلہ کب تک یونہی میری زندگی کے ساتھ جاری رہے گا ——— ؟ اور اب تو یہ سوال میرے لئے ایک معمّہ سا بن کر رہ گیا ہے جسے حل کرنا میرے اپنے بس کی بات نہیں، جیسے مجھے اپنے دل پہ اختیار نہیں۔

۱۷ر اگست ۱۹۶۵ء

ہر انسان کی زندگی سے وابستہ کچھ نہ کچھ آرزوئیں، کچھ نہ کچھ خواہشیں ضرور ہوا کرتی ہیں!

میری بھی کچھ آرزوئیں، کچھ خواہشیں ہیں۔ کاش! وہ پُوری ہو جائیں!!

نہ جانے مجھے تنہائی سے گھبراہٹ سی کیوں محسوس ہونے لگی ہے، میں لاکھ کوشش کے باوجود اپنے اِس خیال کو دُور نہیں کر سکی ہوں۔ جو تنہائی مجھے برسوں سے عزیز ہے، اب وہ میرے لئے ایک بوجھ سا کیوں بنی جا رہی ہے؟ یہ تنہائی کا بوجھ میری زندگی پر چھاتا جا رہا ہے؟؟ اب تو یہ تنہائی مجھے سانپ کی طرح ڈسنا چاہتی ہے۔ اِس سے پہلے میں ساری ساری رات اور سارا سارا دن پڑھنے لکھنے میں گزار دیتی تھی اور وقت کا احساس تک نہ ہوتا تھا لیکن اب ——— اب یہ کیا ہو گیا ہے مجھے ——— ؟ آخر وہ جذبے، وہ خیالات میرے اندر سے کہاں غائب ہو گئے؟؟

میری زندگی میں یہ غیر معمولی انقلاب لانے والی صرف وہی کھڑکی ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو اب ہرگز میں اُس کھڑکی کی طرف نہیں دیکھوں گی جس کی وجہ سے میرا اپنا سکون اور میری تنہائی میرے لئے ایک بوجھ سی بنی جا رہی ہے اور اب میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اُس کھڑکی کی طرف آنکھ اُٹھا کر کبھی نہ دیکھوں گی!!

۲۵ راگست ۱۹۶۵ء

لاکھ کوشش کے باوجود میں اپنے اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہوں کہ میں اُس کھڑکی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھوں گی جس نے میرا صبر و قرار، میرا سکون مجھ سے چھین لیا ہے۔ دل اس کے خیال سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں رہتا جہاں انجانی چاہتوں نے مجھے حسین خیالات کے گرداب میں پھانس لیا ہے۔ مجھے اپنے دل پہ اختیار نہیں رہا ہے اور میں خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں کھو جاتی ہوں اور دل کو ایک موہوم امید پر چھوڑ دیتی ہوں۔

---

۲۸ راگست ۱۹۶۵ء

آج وہ کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور وہ نوجوان ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھے جا رہا ہے۔ وہ میری طرف کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے جیسے میں نے اُس کا کچھ چُرا لیا ہو۔ اُس کی آنکھوں میں بلا کی کشش ہے جو مجھے اُس کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے۔ اُف خدایا! یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ میں یہ کیسی پاگل سی بن جاتی ہوں کہ بے سوچے سمجھے اُسے برابر دیکھے جاتی ہوں۔ انجام سے بے پروا اور خود سے بے خبر! اُس نوجوان کے ہاتھوں میں اُردو کا کوئی رسالہ ہے۔ شاید جسے وہ کھڑکی میں بیٹھا پڑھ رہا ہوگا۔ وہ جب بھی مجھے بالکونی پر دیکھ لیتا ہے فوراً کھڑکی میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور خاموش خاموش نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگتا ہے جیسے میں چور ہوں اور اُس کی کوئی شئے میں نے چُرائی ہے۔ میری سمجھ میں خاک نہیں آتا کہ وہ اس بیباکی سے میری طرف کیوں دیکھتا ہے۔ خدانخواستہ اگر کسی نے اُس کی یہ حرکت دیکھ لی تو میری ناحق بدنامی ہوگی۔ اُس کا کیا ہے وہ تو مرد ہے اور مرد بدنام نہیں ہوتے۔

یکم ستمبر ۱۹۶۵ء

آج میرا دل کچھ زیادہ گھبرا گیا تھا۔ اس لئے میں اپنی چھوٹی بہن شہناز کے ساتھ "بانسدیو پارک" میں پہنچ گئی۔ میرے پاس اُردو کے کئی رسالے تھے جنھیں میں پارک میں پڑھنے کے لئے لائی تھی لیکن وہاں کچھ اور ہی حادثہ رونما ہو گیا جس کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ ہوا یوں کہ میں پارک میں اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ شہناز بچوں کے ساتھ کھیلنے لگی۔ میں نے ایک رسالہ نکالا اور افسانہ "پیار کی پوجا" پڑھنے لگی۔ ابھی میں نے ایک ہی صفحہ پڑھا تھا کہ ایک اجنبی آواز مجھے حقیقت کی دنیا میں کھینچ لائی اور میری سانس رُکتی ہوئی محسوس ہونے لگی جو مکالمے میں افسانے میں پڑھ رہی تھی بالکل وہی مکالمے میری پشت کی طرف سے ادا کئے گئے۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

"جی! جی!! جی ہاں ——!" آواز میرے حلق میں پھنس گئی۔ میں نے دیکھا وہی کھڑکی والا نوجوان مجھ سے مخاطب تھا۔ اور میں تصویر حیرت بنی اُسے دیکھ رہی تھی اور مجھے اتنا ہوش بھی نہ رہا کہ میں اُس سے پردہ کر لوں۔ اُس وقت میری حالت کسی چور کی سی تھی جسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔ اتنے میں شہناز بھاگی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔

"دیکھو باجی! وہ سامنے جھاڑی میں سائیکل کے پاس کھڑی ہے، اُس نے میری تصویروں والی کتاب چھین لی ہے۔"

اور میں شہناز کے ساتھ جانے لگی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ پہلے کبھی دھڑکنے کا انداز بھی تو نہیں آیا!!

---

۷ رستمبر ۱۹۶۵ء

جیسے ہی میں بالکونی پر پہنچی اور میری نگاہیں اُس سامنے والی کھڑکی کی طرف اُٹھیں تو اُس نوجوان کو کھڑکی میں کھڑا پایا جیسے وہ میرا انتظار کر رہا ہو۔ میں نے دیکھا آج اُس کے چہرے سے یاسیت ٹپک رہی ہے۔ اُسے کیا تکلیف ہے، کیا پریشانی ہے؟ میں اُس سے کس طرح پوچھوں؟ لیکن کیوں پوچھوں؟ —— وہ میرا کون ہوتا ہے؟ اور وہ مجھے بالکونی پر کھڑی دیکھ کر کیوں کھِل اُٹھتا ہے؟ اُس کے چہرے پر خوشی کی لہریں چمک اُٹھی تھیں اور میرا دل دھڑکنے لگا ہے۔ پرسوں ہی نمی کہہ رہی تھی۔

"تعجب ہے سامنے میر صاحب والے مکان میں کنوارے کرایہ دار کو کس طرح کمرہ مل گیا۔"

میری سہیلی نمی کی بات بالکل سچ ہے کہ کرایہ دار اور کنوارا! لیکن ہو سکتا ہے وہ کرایہ دار میر صاحب کا کوئی رشتہ دار یا شناسا ہو ورنہ اس بستی میں کنوارے کرایہ دار کا سایہ بھی نہیں آسکتا۔ میں کتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ وہ نوجوان کرایہ دار بالکل تنہا ہے۔ اُس کے ساتھ کوئی بھی نہیں۔ پتہ نہیں وہ کھانا کہاں کھاتا ہوگا یا پھر اپنے ہی ہاتھ سے بناتا ہے۔ بہت سے مرد اپنے ہاتھ سے کھانا بناتے ہیں۔ یہ بس خدا نے عورت ہی کو طاقت دی ہے کہ وہ ہر طرح سے مرد کی خدمت کرے۔ عورت کے ہوتے ہوئے مرد اپنے ہاتھ سے کھانا بنائے، یہ بات عورت کے لئے شرم کی بات نہیں ہے؟ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ مرد اپنی خوشی سے کھانا بنانے میں عورت کا ہاتھ بٹائے۔ وہ سامنے کھڑکی والا نوجوان تو ابھی کنوارا ہے۔ بھلا وہ کس سے اپنا کھانا بنوائے؟ اور پھر اُس کی وضع قطع بھی ایسی نہیں جو وہ اپنے ہاتھ سے کھانا بنائے۔

لیکن میں یہ سب باتیں اُس نوجوان کے بارے میں کیوں سوچتی ہوں؟ وہ میرا قرب کیوں چاہتا ہے؟؟ وہ پارک میں میری بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔ اگر مجھے کوئی اُس کے ساتھ اس طرح بے پردہ دیکھ لیتا تو ——؟ اُف اللہ!!

---

۱۰ رستمبر ۱۹۶۵ء

ابھی ابھی شہناز نے مجھے بتایا کہ وہ ایک پرچہ دیا ہے اور مجھ سے کہا ہے کہ وہ سامنے والے بھائی شام سے دیکھ رہے ہیں اور کہا ہے کہ یہ پرچہ چپکے سے اپنی آپا کو دے دینا اور کسی سے اس کا

[illegible] ۔ میرا دل ہر وقت [illegible]
[illegible] میں نے شہناز سے پوچھا وہ وہاں کیوں گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ خود وہاں نہیں گئی۔ شاہد نے بازار میں دیکھ لیا تھا اور وہیں سے ناخنوں کا ڈبہ دلا دیا تھا۔ میں نے پیکٹ دیکھا اور شہناز کو اتنی جان سے آواز دی۔ میں فوراً بالکونی پر آگئی۔ میں نے دیکھا وہی کھڑکی والا نوجوان جس کا نام شہناز نے شاہد بتایا تھا، کھڑکی میں کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں چلی آئی اور میں نے اپنا کمرہ بولٹ کر لیا اور کانپتے ہاتھوں، دھڑکتے دل سے پیکٹ کھولا۔

پرچہ میں عجیب اُلٹی سیدھی باتیں لکھی ہوئی تھیں اور جگہ جگہ اشعار بھی تھے۔ آخر میں لکھا تھا ــــ "کیا آپ کہیں ملاقات کا شرف بخش سکتی ہیں؟"

لیکن میں شاہد سے کیوں ملوں؟ وہ میرا کون ہے؟؟ اگر کسی نے دیکھ لیا؟؟؟

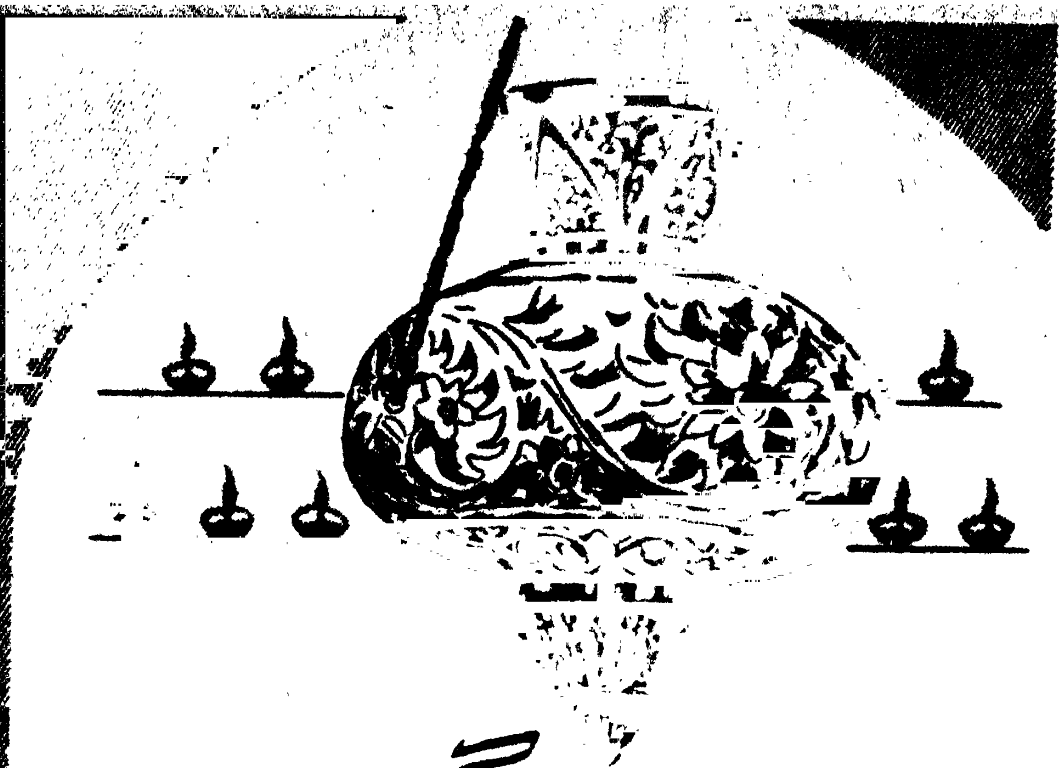
اور میں نے شاہد کا پرچہ آتشدان میں ڈال دیا لیکن وہاں آگ سرد تھی۔ میں نے ماچس اُٹھا کر تیلی جلائی اور پرچے کو جلا دیا۔ ایک شعلہ سا لپکا اور پرچہ جل کر راکھ ہو گیا۔ پرچہ جلنے لگا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے شاہد نے ایک کربناک چیخ ماری ہو اور مجھے اپنا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوا اور میرا دل پکار اُٹھا "شیا! تم نے بُرا کیا جو پرچہ جلا دیا!" لیکن اُسی وقت میرے دل نے کہا۔ "وہ میرا کون ہے؟"

کئی دن سے میں بالکونی پر نہیں گئی ہوں اور نہ میں نے گھر سے باہر قدم رکھا ہے۔ کل شہناز مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"باجی! وہ شاہد بھائی ہیں نا، اُن کے گھر کالے برقعے میں ایک عورت اور دو بچے آتے ہیں۔"

اور میں سوچنے لگی آخر کون عورت ہو سکتی ہے شاہد کے ہاں آنے والی! وہ تو ابھی کنوارا ہے، تنہا ہے۔ ننھی ننھی پھوار پڑ رہی ہے اور میں بالکونی پر آگئی ہوں۔ شاہد کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ اُف اللہ! شاہد کے ساتھ ایک عورت کھڑی ہے۔ شاہد کے ہاتھ میں اُس کا ہاتھ ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس عورت نے کھڑکی بند کر دی جس کے سہارے میں یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی بند ہوتے ہی مجھے اپنے دل پر ایک چھنت سی لگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے شاہد کے بارے میں سوچا، گر گئی، کیا میں نے اُن کے بارے میں کیوں سوچا؟ اور پھر تنہائی کے احساس کا بوجھ جاگ اُٹھا جسے میں کچھ دنوں کے لئے بھول گئی تھی!!





شاہی محل کے جھروکوں سے

پروفیسر عبدالرب عرفان۔ ایم، اے

ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ آف پرشین، ودربھا مہاودیالیہ، امراوتی (مہاراشٹر)

۵ دسمبر ۶۵ء

اے ادب پرور و ادیبِ شہیر   محترم "بیسویں صدی" کے مدیر!
اے سخن گستر و سخن پرداز   عرضِ خدمت ہے با خلوص و نیاز
آپ کا خط نظر نواز ہوا   باعثِ صد ہزار ناز ہوا
خوش ہوں یہ جان کر پسند آیا   تحفۂ "قندِ پارسی" میرا
ہوئی میری جو قدر افزائی   دولتِ ذوق و شوق ہاتھ آئی
پھل ملا مجھ کو اپنی کاوش کا   شکریہ لطف کا، نوازش کا
آپ کے التفات کے صدقے   حوصلے ہیں بڑھے ہوئے دل کے
ہے یہ ترتیب اک اور مجموعہ   شاہی محلوں کی داستانوں کا
محفلِ "بیسویں صدی" میں پھر   آج ناچیز ہو گیا حاضر
اے زہے بخت اگر پسند آئے   محنتوں کا صلہ مجھے مل جائے

نیاز آگیں ——— عبدالرب عرفان

مغل شہنشاہوں میں جہانگیر اپنی شراب نوشی اور عیش کوشی کے لئے مشہور ہے۔ اس کے دل میں ماہِ رمضان کا غیر معمولی احترام بھی اس کے دل میں تھا۔ رمضان کا چاند دیکھنے کے بعد وہ شغلِ شب و جام ترک کر دیا تھا اور عید کا چاند دیکھ کر "روزۂ صہبا" افطار کیا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ ماہِ رمضان کے آخری روز غروبِ آفتاب کے وقت وہ ملکۂ ہند نور جہاں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ رویتِ ہلال کے انتظار میں نگاہیں اُفقِ مغرب پر لگی ہوئی تھیں۔ حسنِ اتفاق سے چاند اُسی کو پہلے نظر آیا۔ وہ مارے خوشی کے کہہ اُٹھا ؎

ہلالِ عید بر اوجِ فلک ہویدا شد
(ہوا ہے جلوہ فگن چرخ پر ہلالِ عید)

نور جہاں نے فی البدیہہ کہا ؎

کلیدِ میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد
(ملی ہے آج وہ گم گشتہ میکدے کی کلید)

ہندوستان میں بہت کم عورتیں ایسی گزری ہیں جو اورنگ زیب کی بیٹی شہزادی زیب النساء مخفی کی طرح، طرح طرح کے علوم و فنون میں کمال و مہارت رکھتی تھیں۔ وہ صوفی مسلک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش گو شاعرہ بھی تھی اور شعر نہایت پاکیزہ کہتی تھی۔ ان خوبیوں کی بنا پر اورنگ زیب اُسے بے حد عزیز رکھتا تھا۔ وہ اکثر اُس کے ساتھ علمی و ادبی مباحثوں میں بھی حصہ لیتا تھا ——— ایک روز ایک قدِ آدم قیمتی آئینہ طاق سے گر کر چور چور ہو گیا۔ اورنگ زیب کی زبان سے بے ساختہ نکلا ؎

از قضا آئینہ چینی شکست
(قضا آئی تھی، ٹوٹا آج وہ آئینہ چینی)

زیب النساء نے برجستہ کہا ؎

خوب شد اسبابِ خود بینی شکست
(ہوا اچھا، رہا باقی نہ اِک سامانِ خود بینی)

اور شعر مکمل کر دیا۔

جس وقت شاہجہاں نے لقبِ شاہِ جہانی اختیار کیا تو شہنشاہِ ایران نے شاہجہاں کے نام اِس اعتراض کے ساتھ ایک مراسلہ تحریر کیا کہ اُس نے اپنے لئے اپنی حیثیت سے بڑھ کر لقب منتخب کیا ہے۔ مُلک ہندوستان تو کرۂ ارض کا ایک حقیر قطعہ ہے اور جیسا کہ لقب سے ظاہر ہے شاہجہاں نے "جہاں" فرض کر لیا ہے جو کسی طرح قرینِ قیاس نہیں اور یہ کہ اُس کی حکومت دُنیا کے سویں حصّہ پر بھی نہیں ہے۔

اِس اعتراض سے شہنشاہِ ہند سخت حیرت زدہ اور پریشان ہوا۔ اُس نے علمائے دربار سے اِس خصوص میں گفتگو کی اور اِس اعتراض کے مناسب جواب کے لئے مشورہ طلب کیا۔ ملک الشعراء ابوطالب کلیم نے دست بستہ عرض کی "جہاں پناہ کا اقبال بلند ہو! اِس اعتراض کا جواب دینے کی ذمّہ داری ناچیز اپنے سر لیتا ہے۔" اور فی البدیہہ کہا ؎

ہند و جہاں ز روئے عدد چوں برابر است
بر شہ خطابِ "شاہِ جہاں" زاں مُسلّم است
(عدد کی رُو سے برابر ہیں چونکہ ہند و جہاں
خطابِ "شاہِ جہاں" شاہ پر مُسلّم ہے)

(اعدادِ ابجد کی رُو سے ہند کے حروف میں علی الترتیب ۵ + ۵۰ + ۴ کے اعداد ہیں۔ جن کا میزان ۵۹ ہے اور جہاں کے حروف میں بالترتیب ۳ + ۵ + ۱ + ۵۰ کے اعداد ہیں جن کا میزان بھی ۵۹ ہے۔ اِس لئے اعدادِ ابجد کے اعتبار سے "ہند" اور "جہاں" برابر ہیں)

ایک موقع پر شہزادی زیب النساء نے کسی بزرگ کے روضۂ مقدّس کی زیارت کا ارادہ ظاہر کیا۔ مزار کے متولّی کو خبر دے دی گئی۔ متولّی نے شاہزادی کے شایانِ شان استقبال اور دوسرے ضروری امور کا بحُسن و خوبی انتظام کیا لیکن کسی وجہ سے شاہزادی کا یہ ارادہ معرضِ التوا میں آگیا۔ متولّی کچھ عرصہ انتظار کرتا رہا۔ ناچار یاد دہانی کے طور پر ایک شعر تحریر کر کے شاہزادی کی خدمت میں بھیج دیا ؎

اے کہ میگوئی کہ می آیم نمی آئی چرا
پائے شوقت را مگر رنگِ حنا زنجیر پاست؟
(اے کہ تُو آنے کا وعدہ کر کے کیوں آتا نہیں
پائے نازک کو مگر رنگِ حنا زنجیر ہے؟)

جواب میں شہزادی نے ایک شعر متولّی کو لکھ بھیجا ؎

گرچہ من لیلیٰ اساسم دل چو مجنوں بے نواست
سر بصحرا می زدم لیکن حیا زنجیر پاست
(لیلیٰ پوشش ہوں پہ دل ہے بے نوا مجنوں کی طرح
رُخ تو صحرا کا کیا لیکن حیا زنجیر ہے)

اِس شعر کو پڑھ کر متولّی کو نہ جانے کیا سُوجھی کہ اُس نے یہ شعر شاہزادی کی خدمت میں ارسال کرنے کی جرأت کر ڈالی ؎

عشق تا خام است باشد بستۂ ناموس و ننگ
پُختہ مغزانِ جنوں را کے حیا زنجیر پاست
(خام ہے وہ عشق جو ہے بستۂ ناموس و ننگ
پُختہ مغزانِ جنوں کو کب حیا زنجیر ہے)

شہزادی کے لئے یہ بات ناگوارِ خاطر تھی۔ اُس نے اِن الفاظ میں جواب دیا ؎

عاشقانِ ایزدی را سر بسر باشد حیا
چوں تُو مرغِ بے حیا را کے حیا زنجیر پاست
(عاشقانِ ایزدی ہوتے ہیں سر تا پا حیا
تجھ سے مرغِ بے حیا کو کب حیا زنجیر ہے)

جہانگیر ایک روز بغیر کسی اطلاع کے نور جہاں کی خوابگاہ میں اچانک داخل ہوا اُس وقت ملکۂ ہند ایک پُر تکلّف تخت پر آنکھیں بند کئے ہوئے دراز تھی۔ جہانگیر نے اُس کی بند آنکھوں کی طرف اشارہ کر کے کہا ؎

تُو مستِ بادۂ حسنی بفرما ایں دو نرگس را
کہ برخیزند از خواب و نگہ دارند مجلس را
(اے مستِ جامِ حُسن آواز دے اپنی دو نرگس کو
کہ ہوں بیدار خوابِ ناز سے اور دیکھیں مجلس کو)

نور جہاں نے اُسی عالم میں فوراً جواب دیا ؎

مکن بیدار اے ساقی ز خوابِ ناز نرگس را
کہ بدمستند در برہم ہمی زنند الحال مجلس را
(نہ کر بیدار خوابِ ناز سے اے ساقی نرگس کو
کہ ہیں بدمست وہ برہم ابھی کر دیں گی مجلس کو)

شاہانِ مغلیہ کی خاندانی رسم تھی کہ جب کوئی شاہزادی شادی کی خواہشمند ہوتی تو

(ہی خواہش کا اظہار اپنے بالوں میں نرگس کا پھول لگا کر کیا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ شہزادی زیب النساء اپنے محل سرا کے خوشنما باغ میں مصروفِ سیر و تماشہ اور محوِ گلگشت تھی۔ نرگس کے دلکش پھول اُسے بھا گئے اور بے خیالی میں چند عدد پھول اپنے جوڑے کی زینت کر لئے۔ اسی عالم میں اچانک باغ میں اورنگ زیب کا گزر ہوا۔ بادشاہ کی غیر متوقع آمد سے شاہزادی قدرے گھبرا سی گئی لیکن اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو اُس کے بالوں میں نرگس کے پھول دیکھ کر بادشاہ کوئی اور خیال کرے، اُس نے بغیر کسی تامّل کے بے ساختہ یہ شعر کہا ؂

نیست نرگس کہ بروں کردہ سر از افسرِ من
بہ تماشائے تو بیروں شدہ چشم از سرِ من
(سر نکالے نہیں نرگس نے مرے افسر سے
آپ کی دید کو آنکھیں نکل آئیں سر سے)

ایران کے ایک شاہزادے کے ساتھ شاہجہاں شطرنج کھیل رہا تھا۔ دونوں نے یہ شرط منظور کی تھی کہ اس بازی میں جسے شکست ہو وہ اپنی حسین کنیزوں میں سے ایک کنیز فاتح کو دے گا۔ چند ہی "چالوں" کے بعد شاہجہاں نے محسوس کیا کہ بساط کا نقشہ اُس کے حق میں نہیں ہے اور عنقریب اُسے "شکستِ فاحش" کا سامنا کرنا ہوگا۔ اُسی وقت وہ شاہزادے سے اجازت لے کر حرم سرا میں پہنچا تاکہ کنیزوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے اور شکست کھا کے شاہزادے کو پیش کر دے۔

اُس نے تمام کنیزوں کو جمع کر کے صورتِ حال اُن سے بیان کر دی اور اُن میں سے "جہاں خانم" نامی ایک کنیز کو چن لیا۔ کنیز یہ جان کر بہت متاثر ہوئی اور فوراً یہ شعر بادشاہ کی خدمت میں عرض کر دیا ؂

تو پادشاہِ جہانی جہاں ز دست مدہ
کہ "پادشاہِ جہاں" را جہاں بکار آید
(خدا جہاں کو نہ کر خود سے پادشاہِ جہاں
کہ بادشاہِ جہاں کو جہاں کی ہے طلب)

بادشاہ نے اُس کی عرض سن لی اور "حیات خانم" نامی دوسری کنیز معرضِ انتخاب میں آئی۔ حیات نے بھی برجستہ کہا ؂

جہاں خوش است ولیکن حیات می باید
اگر حیات نباشد جہاں چہ کار آید
(جہاں ہے خوب ولیکن ہے ناگزیر حیات
اگر حیات نہ ہو تو جہاں کا کیا مطلب؟)

بادشاہ نے اُس کی بات بھی مان لی اور ایک تیسری کنیز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"پس اے دل آرام! اب تو ہی مناسب رہے گی"۔ دل آرام کو حکمِ شاہ سے سرتابی کی مجال نہ ہوئی۔ خوش قسمتی سے وہ شطرنج میں مہارتِ تامّہ رکھتی تھی۔ اُس نے کہا: "جہاں پناہ کی ہر خواہش کی تکمیل لونڈی پر فرض ہے۔ لیکن میری تمنا ہے کہ بساط کا نقشہ صرف ایک نظر دیکھوں"۔

بادشاہ نے اُس کی یہ تمنا پوری کر دی۔ کنیز بساط کا نقشہ بغور دیکھ ہی رہی تھی کہ اُسے کچھ ایسی چالیں سوجھ گئیں جن سے بادشاہ کی بات بچ سکتی تھی۔ بطورِ اشارہ اُس نے عرض کیا ؂

شاہا دو رُخ بدہ و دل آرام را مدہ
پیل و پیادہ پیش کن و اسپ گشت مات
(اے شہ دو رُخ تو دے پہ دل آرام کو نہ دے
آگے بڑھا پیادہ و پیل اسپ سے ہے مات)

ایک موقع پر جہانگیر نے سفید حریر کی نہایت قیمتی اور عمدہ پوشاک زیبِ تن کی تھی۔ اُس میں لعل کے تراشے ہوئے تکمے (بٹن) لگے ہوئے تھے۔ جب اُس کا گزر ملکۂ ہند نور جہاں کے حضور ہوا تو ملکہ نے اُن درخشاں تکموں کو دیکھ کر گل افشانی کی ؂

ترا نہ تکمۂ لعل است در قبائے حریر
شُد است قطرۂ خون منت گریباں گیر
(نہ تکمے لعل کے ہیں زینتِ قبائے حریر
ہیں میرے خون کے قطرے ترے گریباں گیر)

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر "غیر مطبوعہ" لکھیں (بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں)۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دئے جاتے ہیں۔ مضامین کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نوآموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مُرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں انھیں واپس کر دئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (ایڈیٹر)

جوابِ طلب اُمور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ پاکستانی ٹکٹ ہندوستان میں کارآمد نہیں ہیں! اس لئے پاکستانی اصحاب اس شرط سے مستثنیٰ ہیں۔ (مینیجر بیسویں صدی)



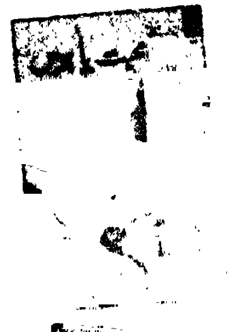














ہندوستان میں ہندی پاکٹ بکس کا سب سے پہلا اور ملک گیر شہرت کا حامل ادارہ

اب ہندی کے ساتھ ساتھ اُردو پاکٹ بکس کے میدان میں بھی پیش پیش ہے۔ ہمارا مقصد نہ صرف اُردو کے بلند پایہ مشاہیر کے شاہکار پیش کرنا ہے بلکہ ملکی و غیر ملکی زبانوں کے مفید و مقبول ترین مایہ ادب ـــــ ناول، افسانہ، ڈرامہ، شاعری، طنز و مزاح، سیاحت، علم و سائنس، اخلاقیات، جنسیات وغیرہ کو بھی اُردو کا لباس پہنا کر ارزاں قیمت پر اہلِ ذوق تک پہنچانا ہے۔

ہماری اُردو پاکٹ بکس کا مندرجہ ذیل دس کتابوں کا پہلا سیٹ منظرِ عام پر آ چکا ہے۔
آپ دیکھیں گے کہ یہ سیٹ مطالعہ کے ہر تقاضا کو پورا کرتا ہے۔

- کانچ کے ٹکڑے (طنزیہ افسانے) کرشن چندر
- لندن کی ایک رات (ناول) سجاد ظہیر
- جوگیا (رومانی افسانے) راجندر سنگھ بیدی
- عورت اور آبشار (ناول) بلونت سنگھ
- محبت یا ہوس (ناول) ٹالسٹائی
- میلی چاندنی (ناول) گلشن نندہ
- کامریڈ شیخ چلّی (طنزیہ خاکے) کنہیا لال کپور
- اُردو کی بہترین غزلیں مرتبہ پرکاش پنڈت
- عورت مرد (جنسیات) ڈاکٹر لکشمی نارائن
- کامیابی کے راز (اخلاقیات) سویٹ ماڈرن

قیمت فی جلد صرف ایک روپیہ

1/-

شرائط ایجنسی کے لئے لکھئے

ماحول

رامپال بی ایس (آزرم)

ایل-۳۳، ماڈل ٹاؤن، ہوشیار پور (پنجاب)

محترم [illegible] آداب

[illegible] تجزیہ کیا جائے جو غلط راہوں پر گامزن ہیں [illegible] ڈھونڈنا ایک مشکل کام ہے [illegible] کا نفسیاتی تجزیہ [illegible] لیکن وہ [illegible] اور بدچلن [illegible] ساتھ ساتھ وہ ذہنی طور پر [illegible] بچپن کے [illegible] ہمیشہ [illegible] رہتے ہیں ——— لیکن اس [illegible] کا گہرا اثر [illegible] بنا ہے جس کا دیہاتی ماحول میں کوئی [illegible] نہیں۔ شہر [illegible] آوارگی یا خودکشی کے وقت [illegible] چند جرم [illegible] ——— [illegible] ماحول [illegible] دیکھیے پڑھنے والے کیا کہتے ہیں۔۔

نیاز مند ——— ——— رامپال

یوگ راج نے نظر اُٹھائے بغیر جواب دیا۔ "ٹھیک ہے صاحب!"

"کیا ٹھیک ہے؟" میں نے جھنجلا کے پوچھا۔ "تم نے میری بات سنی بھی؟"

"ہاں! ٹھیک ہے صاحب!" اُس نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا اور پھر اپنے [illegible] نظارہ میں کھو گیا۔ میں سوچ رہا تھا، وہ کیا دیکھ رہا ہے۔ کوئی ایسی چیز تو تھی نہیں جس میں آدمی [illegible] ہو جاتے۔ پنجاب کے میدانوں میں کھیت اور کنوئیں، کہیں کہیں ٹیوب ویل، چراگاہوں میں [illegible] کھیتوں میں ہل، کسان اور فصلیں۔ یہ کچھ نئی چیزیں نہ تھیں۔

لیکن میری اور یوگ راج کی سوچ میں فرق تھا۔

"وہ دیکھو ——— وہ!" اُس نے اونچ نیچ کا فرق مٹا کر مجھے کندھوں سے پکڑ کے [illegible] ہوئے کہا۔ "وہ دیکھا صاحب!" اور بغیر پوچھے اُس نے یکے سے چھلانگ لگا دی۔ [illegible] اُس کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ میں نے یکہ رکوا کے اُسے آواز دی ——— "یوگی [illegible] راج!!"

[illegible] مڑ کے مجھے دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "آجاؤ!" وہ [illegible] رہا تھا اور [illegible] کے لئے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی پتلون اُٹھائے ہوئے تھا۔ وہ [illegible] اس طرح نکلا جاتا تھا جیسے چپہ چپہ اُس کا ناپا ہوا ہو۔ کچھ سڑک کے [illegible] سو گز پرے وہ ایک شکستہ سے چبوترے کے پاس رُک گیا اور [illegible] اختیاری میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دئے۔

میں جھاڑیوں اور ڈھیلوں سے بچتا ہوا جب اُس کے پاس پہنچا تو اُس نے دونوں بند ہاتھوں کو اپنے مُنہ پر اِس طرح پھیرا جیسے نمسکار کر رہا ہو اور مُنہ سے بولا۔ "سری واہگورو۔ تیرا آسرا!"

یوگی کی غیر ارادی حرکات و سکنات تین تمدنوں کی غمازی کرتی تھیں۔ نمسکار! خالص ہندوانہ۔ ہاتھ اُٹھا کے مُنہ پر پھیرنا جیسے نماز کے بعد دعا اور آخر میں خالصہ پنتھ کی دعا۔ میں حیران تھا کہ یہ اٹھارہ اُنیس سال کا نوجوان لڑکا جسے اِس سرزمین سے ناطہ توڑے کوئی

دس سال پہنچ چکے تھے اور جس کی رگ رگ میں جاپانی اور فورٹ کا کلچر گھر کئے ہوئے تھا۔ لے
اس سے مطلب؟

"صاحب! آپ بھی کچھ مانگ لیجئے۔ بابا جی کی سادھ ہے" اُس نے میرے اِس طرح کھڑے رہنے پر ناخوشگواری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"کس سے مانگوں؟" میں نے مصنوعی حیرانگی سے جواب دیا۔ "مجھے تو کوئی نظر نہیں آتا۔"

لیکن یوگ راج سنجیدہ تھا۔ وہ سادھ کے چاروں طرف کسی کو تلاش کر رہا تھا۔

"لے، لے!" اُس نے ایک راہ چلتی جاٹ عورت کو بلاتے ہوئے کہا۔ "سن۔ سن!"

"کیا؟" اُس نے سر پہ رکھی ہوئی تکی کے دانوں سے بھری ہوئی گٹھری کا توازن ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ "بولنے کی تمیز نہیں؟"

"ہم کیا بولا۔ ایسا بولا۔ ٹھیک بولا" یوگ راج نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "اور کیا بولے۔"

- بیکار آدمی زمین پر بار ہوتا ہے۔ (حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ)
- جب کام زیادہ ہوں تو اہم کام سے شروع کرو۔ (حضرت امام شافعیؒ)
- جب تک کسی بات کو عقل کے ترازو میں تول نہ لو، جواب ہرگز نہ دو۔ (حضرت شفیق بلخیؒ)
- غصہ کی آگ پہلے غصہ کرنے والے ہی پر پڑتی ہے۔ بعد میں دشمن پر پڑے یا نہ پڑے (حضرت شیخ سعدیؒ)
- راستی سے نیکی کی حفاظت ہوتی ہے اور سلامت روی سے حسن و جمال کی اور سادہ لباس عورت کی عفت و عصمت کا محافظ ہے۔ (یحییٰ برمکی)
- کاش لوگ اپنے حق پر راضی رہیں اور انصاف انھیں عزیز ہو جائے۔ (کے خسرو)

"کیوں صاحب؟" اُس نے گواہی کے لئے مجھے پیش کیا۔ میں نے ٹھیٹھ پنجابی میں عورت کو سمجھایا کہ یہ پنجابی نہیں جانتا

وہ عورت میری بات نہیں سن رہی تھی۔ وہ تو یوگی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اب عورت کے ہکلانے کی باری تھی: "ایسے تو۔ تُو یوگی ہے؟ دھنو پنڈت کا لڑکا!"

یوگی نے چند ثانیے عورت کو دیکھا اور اپنے قدم دس برس پیچھے ہٹا کے گاؤں میں اپنے گھر کے آنگن میں اپنی ماں کی پرانی سہیلی کو پہچان لیا: "ماسی جیتو! دھونی والے سادھ پہچان گئے ہو؟"

بمبئی کی تہذیب نے یوگی کو وقت کی قدر و قیمت بتا دی تھی۔ جہاں لوگ اقتصادی افادیت کے سوا وقت کسی دوسرے کے لیے ضائع نہیں کرتے۔ صاف، دو ٹوک بات ـــــ جس سے

مطلب حل ہو جائے اور مختصر! لیکن ماسی جیتو تو اُسی ماحول کی پیداوار تھی، جہاں سارا گھر ایک گاؤں میں سما جاتا ہے۔ اس نے جھٹ سے گٹھری سڑک سے چبوترے پہ رکھ دی اور یوگ راج کو اس انداز اور پیار سے چھاتی سے لگایا کہ یوں محسوس ہوا اُس گبرو جوان اُس کی چھاتی کے کھوئی محبت کے ساتھ دونوں پاؤں زمین سے اُٹھا کے اُس کے ماتھا بھرے بیٹے کے لگ کر ہوا میں معلق ہو گیا اور پھر ماسی نے ایکدم اُسے یوں آہستہ سے زمین پر کھڑا کیا جیسے کوئی بچہ احتیاط سے کھلونا میز پر رکھتا ہے اور ملے جلے پیار اور حقارت کے جذبے سے اُس کے سارے وجود کا جائزہ لے کر کہنے لگی "ارے! تُو تو پتلا سا ہی رہ گیا!" اور دونوں ہاتھ کی ہتھیلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جیسے "لاڈو کا گڈا!" لیکن یوگ راج ان تشبیہوں سے بے نیاز تھا۔ اُس نے اپنا پہلا سوال دُہرایا۔

"ماسی! وہ سادھ؟" ماسی نے سُنی اَن سُنی ایک کر کے کہا۔

"ایسے تیرے ساتھ کے نہالو، کرتارا، سرنو" اور پھر چھاتی نکال کے سر سے اونچا کر کے کہنے لگی "وہ تو سب مُسٹنڈے ہو گئے اور تُو!" ماسی نے ہتھیلی زمین سے کچھ اوپر کر کے کہا "تُو!" اور فقرہ پورا کرنے کی بجائے زور سے ہنس دی۔

"اور ماسی سادھ؟" یوگ راج کو ایک ہی رٹ تھی۔

"ایسے سادھو؟ وہ نمبردار کا لڑکا؟ وہ تو فوج میں ہے۔"

یوگ راج نے سر پیٹ لیا "دھونی والا سادھو۔ ماسی؟"

اب ماسی کی سمجھ میں بات آئی "اوہ! وہ؟ انھیں تو دیہہ تیاگے آج سات برس ہو گئے۔ جس سال باڑھ آئی تھی۔ بس اُسی سال"

یوگ راج کو باڑھ میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حالانکہ اُس باڑھ نے پنجاب کے دیہاتوں کا نقشہ بدل دیا تھا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی! ڈھور، ڈنگر، مویشی، فصل تباہ اور پھر بیماری! لوگ دھڑا دھڑ مرے لیکن یوگ راج اِس سے بے نیاز تھا۔ بمبئی کے کسی فٹ پاتھ پر باڑھ نہیں آئی تھی نہ کوئی ٹرام پانی میں بہی نہ ماہم ہی میں سیلاب آیا۔ کنگ سرکل کے پُل کے نیچے جون جولائی کی بارش کا اثر نہ تھا اور ماسی کہہ رہی تھی "بس سادھ نہیں گیا سادھو ہے۔ یہیں اُسے تاپ ہوا۔ بس مر گیا" اور پھر سوچ کے بولی "تیرا باپو بھی تو باڑھ کے بعد لوٹ آیا تھا اور اُسی نے تیری ماں جی سے پتہ لگا کہ تو گم ہو گیا ہے" ماسی نے اپنے جذبات ٹھنڈے ہوتے ہی پھر گٹھری سنبھالی اور یوگراج کے سر پر ہاتھ پھیر کے بولی: "اپنی ماں سے مت ملنا اکیلا کہیو۔ کل آؤں گی۔ آج دھیان رہے گی۔ ستو کے پاس" اور پھر ماسی کو ایکدم ہنسی آ گئی ــــ وہ گٹھری کو ایک ہاتھ میں لے کے پکڑ کے یوگ راج کو دوسرے ہاتھ میں لپیٹ کے کہنے لگی: "ارے تُو تو شادی سوت کرے گا جو تجھ سے چھ سال بڑی تھی اور اب اُس کا بڑا لڑکا گورنمنٹ جو نگے سال دس برس کا تجھ سے جوان لگتا ہے۔ دونوں بیٹوں کو قابو کر کے اکیلا جو رت بیٹا ہے۔" اور پھر ماسی تیز تیز قدم چل دی اور چند قدم پر رُک کے پھر یاد دہانی کراتے ہوئے بولی "پوری کو ہو امت ملیو اکیلا

سمجھو لیو!" اور پھر ہنس کے بولی "کل تجھے دو سیر گھی اپنی بھینس کا بھجواؤں گی۔"

لیکن یوگ راج کا دھیان اُدھر نہ تھا۔ وہ دھونی والے سادھو کی بات سوچ رہا تھا۔

"سادھو بڑا پہنچا ہوا تھا صاحب! بات بالکل سچی کرتا تھا۔ میرا باپ جب مار دھاڑ کے دنوں میں پورب سے گیا، تو مجھے بالکل نہ مانتا تھا لیکن جب کئی سال کوئی ٹھو کا رز کا کام نہ ملا تو یہاں آیا اور سادھو نے بتایا کہ پردیس میں جا۔ تب ناگپور گیا" اور نہ معلوم کیا سوچ کے کہنے لگا "صاحب! دھونی والا بمبئی میں ہوتا تو ریس، سٹہ، فلم والے بابا سادھو کو ڈھونڈتے اور یہ کہتے ہیں مر گئے۔" کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

یوگ راج کے اظہار عقیدت میں لاٹل پور کا اسلامی اثر، پنجاب کے دیہات کا پھلتا پھولتا دو گونہ بانی کا نقش اور برہمن خاندان میں پیدائش اور اس کے طور اطوار سوا اس کے باپ کو سر جھکاتے دیکھا اور بچپن کے لاشعوری طور پر جذب کئے ہوئے رسم و رواج جو اس کی سادگی تھی۔ انسانیت اور اپنا پن تھا اُنھیں بمبئی کی رنگ برنگی تہذیب مٹا نہ سکی۔

"سادھو کی آشیرواد لے کے باپو یہاں سے دلی اور دلی سے ناگپور گیا صاحب! کوئی مجھے بتانے لگا" لیکن باپو کے خط آنے پر ماں سیدھی ناگپور پہنچ گئی تھی۔ باپو کو روٹی کی بہت تکلیف ہے" یہ کہہ کے یوگ راج چپ ہو گیا۔ ہم آہستہ آہستہ تیکے کی طرف آ رہے تھے جو اونچی آواز میں ہمیں پکار رہا تھا اور شاید دبی زبان میں گالیاں بھی دے رہا ہو کیونکہ اُس کا گھوڑا اِدھر اُدھر کی فصلوں پر منہ مار کے تازہ دم ہو گیا تھا اور وہ اور وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یوگ راج چپ چاپ بے نیاز بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا جیسے کچھ کھو بیٹھا ہو اور پھر ایکدم چونک کے اُس نے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"صاحب! سادھو بابا مل جاتے تو بہت اچھا تھا۔ اب پھر لفڑا ہے۔"

"لفڑا کیا؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ یہ لفظ میری لغت میں نہ تھا۔

"صاحب! سب خراب۔ ایکدم خراب۔ کنڈم۔ گڑبڑ!" اور پھر میری طرف دیکھ کے بولا۔

"سمجھا صاحب! اگر ماں یہاں ماتھا ٹیک کے جاتی تو کاشت کو سب ناگپور میں مجھ کو کام ملتا۔ باپو کا کام وہاں ٹھیک نہیں تھا۔ ایک دن باپو نے ماں کو پیٹا کہ وہ سادھو بابا کی سیس کیوں لے کے نہیں آئی" یوگ راج نے پلٹ کے پھر سادھو کی طرف دیکھا۔ "ماں نے بہت بولا صاحب۔ تم نے لکھا تھا۔ روٹی کی تکلیف ہے۔ ہم آ گیا صاحب! لیکن باپو نے بھوک کا غصہ ماں پر نکالا اور صاحب! اب سب خراب ایکدم کنڈم ہو گیا۔ سادھو بابا مر گئے۔ اب ہم پھر کٹ میں اِدھر آیا۔"

یکے میں بیٹھ کے یوگی نے اپنا انٹرنیشنل والا بیگ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اب اُسے اِرد گرد کے منظر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اُسے گھریلو کشمکش، غربت، باپ کی لاچاری اور ماں کی مسکینی نے یہ باور کرا دیا تھا کہ اِس تنگ دستی کے پیچھے دھونی والے سادھو کی بد دعا ہے اگر وہ اُن کا آشیرواد لے سکے تو گھر کا نقشہ ہی بدل سکتا ہے۔ وہ ناگپور میں مشکل سے نو برس کا تھا جب وہ سادھو سے منت سماجت کرنے کو چل کھڑا ہوا۔

"لیکن صاحب! ریل سب ایک جیسی ہوتی ہے۔ انجن گاڑی، بابو، مسافر سب ایک جیسا!" اور اتنا کہہ کے یوگ راج بہت دیر کے بعد ہنسا۔ "جب ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو صاحب میں دلی نہیں، بمبئی میں تھا۔" اب یوگ راج کی زندگی کا دوسرا باب شروع ہوا۔

"میں اسٹیشن پہ بہت رویا صاحب! باپو، ماں سب کو پکارا لیکن بابو بولا "سالا! بھک منگا!" اپنے نخرے کرتا ہے جیسے سچ مچ ماں باپ گم ہو گیا ہو!" اور پھر کچھ دیر چپ رہ کے بولا۔ "اور صاحب! میں بھک منگا!!"

اب اُس کو گاؤں مشکل سے دو میل رہ گیا تھا۔ تیکے کے ہچکولے اور سست رفتاری سے فرار حاصل کرنے کا یوگ راج کو صرف ایک طریقہ معلوم تھا۔

"صاحب! آپ نے کبھی بمبئی دیکھا؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کہاں ٹھکانہ تھا صاحب؟" اُس نے مجھے حیرت سے دیکھا جیسے اُس کے سوا اور کسی کو

- غصہ عارضی دیوانگی ہے۔ (ایک مغربی مفکر)
- خوش سلیقگی کا تعلق طبیعت سے ہے آمدنی کی کمی بیشی سے نہیں۔ (جوش ملیگس)
- خوشی مردوں اور عورتوں پر دیوتاؤں کا عطیہ نہیں ہوتی۔ اُسے حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ ظاہری کوشش اور باطنی کوشش۔ (برٹرنڈرسل)
- کوئی دُنیا کی ساری دولت مجھے دے دے جب بھی میں اپنی بیوی سے تبادلہ نہ کروں، خواہ میں افلاس کے ہاتھوں کیسا ہی تنگ ہوں۔ (لوتھر)
- عورت کے نزدیک مرد ایک بھونرا ہے۔ ایک پھول کا رس چوستے ہوئے بھی وہ دوسرے پھولوں کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ (ایک مغربی مفکر)
- جتنے کھانے اُتنے مرض! (لاطینی کہاوت)

بمبئی جانے کی اجازت نہ تھی یا بمبئی کی بلی جا نکلی اور شیر سی ابھی تک اُس کی یاد میں گھلی ہوتی تھی اور وہ بہت بار اس کی صداقت کو پرکھنا چاہتا تھا "چیمبور" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ!" یوگ راج چیخ پڑا "صاحب! آپ نے راج کپور کا سٹوڈیو دیکھا؟"

"دیکھا" میں نے جواب دیا۔

"اور آپ نے سنت سٹوڈیو دیکھا، دنیا کا؟" وہ کہہ گیا اور پھر میرا جواب سُنے بغیر کہا "ہم نے فلم میں کام کیا۔ بہت لونڈا لوگ کام کرتا ہے۔ راج صاحب بہت اچھا آدمی ہے۔ اُس کا نرگس سے کٹا پٹی ہو گیا۔ یہ بات مجھے وناٹک بولا۔ وہ ستارہ کاتھا اور راجو بولا۔ وہ مدراسی تھا۔ کالا ۔۔۔ بوٹ پالش موافق۔ لیکن منہ سے بہت اچھا باجہ بجاتا تھا" وہ بے اختیاری میں منہ پر ہاتھ رکھ کے آواز نکالنے لگا۔ تیکے والے نے حیرانگی سے اُسے دیکھا اور ایک موٹی سی گالی گھوڑے کی طرف لڑھکا دی اور میں سمجھتا تھا کہ یوگ راج کا اِس میں ساجھا ہے۔

جی ہاں، آپ کی مسکراہٹ، منہ چومنے کے انداز اور ہلکی ہلکی تھپکیوں کو محسوس کرکے وہ آپ کی محبت کو پہچانتا ہے اور اپنے ننھے ننھے ہاتھ آپ کے مضبوط ہاتھوں میں دے دیتا ہے۔ یہ بھی قدرت کا ایک عجیب اصول ہے کہ بچہ محبت کی زبان کو فوری سمجھ لیتا ہے۔ آپ اسے انسانی جبلت کہہ سکتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے ماں باپ پر پورا پورا بھروسہ رکھتا ہے۔

بھروسے سے بھروسہ پیدا ہوتا ہے۔ آپ بھی اس کے اچھے مستقبل کی مضبوط بنیاد ڈال کر اس کے بھروسے کو بڑھائیے۔ اُسے اچھی تعلیم دلائیے تاکہ زندگی کے میدان میں وہ کامیاب ہو سکے۔ اور ہاں یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اس بنیاد کا انتظام صرف بیمہ زندگی کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔

ننھی منی جان
پیار کی
پہچان؟



مستقبل حوصلہ مند بنائیے بیمہ زندگی

"جو پاٹی پہ صاحب! ہم نے بہت دن رہتے ہیں (Main main) یہاں مس بابا میم صاحب، صاحب لوگ کو بھی پوری گھائی ہے آپ نے صاحب؟" اُس نے پھر میری طرف دیکھا۔ جیسے پھر تصدیق چاہتا ہو۔

"گھائی ہے" میں نے مُنہ بنا کے کہا "لیکن اچھی نہیں لگی۔"

"اچھی نہیں تھی" اُس کے چہرے پر استعجاب تھا "ہاں، پنجابی لوگ کم کھاتا ہے۔ سندھی اور پارسی بہت کھاتا ہے ۔۔۔ صاحب! جوہو دیکھا؟"

"دیکھا ہے" اب اُس کے چہرے پر مُسرّت اور منزہ تھی "صاحب بہت بُری جگہ ہے۔ مالابار گارڈن بھی بہت بُری ہے صاحب! ہمیں ایک پنجابی ٹیکسی والے نے بتایا کہ ایسا پنجاب میں ہو تو خون ہو جاتے!"

یوگ راج کا گاؤں اب نظر آ رہا تھا۔ اُس کے گردوپیش کا جھنڈا دکھائی دے رہا تھا۔

"گاؤں آ گیا صاحب! گیانی جی وہاں رہتے ہیں۔ وہ درخت گوردوارہ کے باغیچے کے ہیں اور بیچ موڑ پر نہال سنگھ نمبردار کی حویلی ہے اور پیچھے کی طرف لوہار کا احاطہ" وہ گاؤں کی طرف ایسی بھوکی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے جنم جنم کے بھوکے کو روٹی نصیب ہو گئی ہو "لیکن گاؤں کبھی بس بند دُور تھا۔ اور صاحب! میرے گاؤں میں سکول ہے۔ جب بابو گھر گیا تو میں میسری میں تھا۔ بابو تو کہتا تھا کہ یہیں پڑھ لیکن ماسٹر دھاوا سنگھ بہت مارتا تھا" یوگ راج مجھ سے ایسے ذکر کر رہا تھا جیسے وہ سب میرے پُرانے واقف ہوں اور میں اُس کا دل رکھنے کو سر ہلا رہا تھا۔

"ماسٹر دھاوا سنگھ تو پچھلے سال مر گیا" ٹیکے والے نے پہلی بار باتوں میں حصّہ لیا۔

"اوہ! ماسٹر جی؟" یوگ راج چونک پڑا "لیکن ماسٹر جی پڑھاتے بہت تھے اور سب کہتے تھے ماسٹر کا درجہ باپ کے برابر ہوتا ہے" یہ جملے مِلے جُلے خوف اور عزّت کا نتیجہ تھے۔ "ہمیں اُنھوں نے گانا سکھایا تھا"

سارے دیساں وچوں دیس پنجاب نی سیو
جیوں پھُلاں دا راجہ پھُل گلاب نی سیو
(سب دیسوں میں سُندر پنجاب ہے۔ جیسے پھولوں کا سرتاج گلاب ہے)

"ہاں صاحب! وہ سردار جی ٹیکسی ڈرائیور بھی پنجاب کا تھا جس نے وہ بات بولی تھی۔ جو خراب بات کو بُرا سمجھتا تھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ میں بھی پنجابی ہوں لیکن وہ نہ مانا وہ کہنے لگا نہ قد نہ کاٹھ، نہ بولی نہ چال۔ اور صاحب کیا کرتا۔ لیکن صاحب! مجھے گاؤں بہت یاد آتا تھا۔ ایک ذکی سوز صاحب ۔۔۔ فورٹ میں دفتر میں تھے۔ اُن کے فلیٹ پر روز بوٹ پالش کرتا تھا۔ ایک روز بالکونی میں اُنھوں نے ایک مس بابا کو چوم لیا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ ہم بولا اگر پنجاب میں ایسا ہوتا تو خون ہو جاتا! وہ بولا۔ پنجابی ایک دم جنگلی! ہم بولا۔ تم جنگلی! اُس نے ہاتھ اُٹھایا۔ ہم نے اُسے جُوتا دے مارا اور بھاگ گیا" اور اُس نے فخر سے اپنی ننھی منّی چھاتی کو پھُلایا جسے دیکھ کے میں اور ٹیکے والا دونوں ہنس دیے اور وہ کھسیانا سا ہو کے اپنا بیگ کھول کے دیکھنے لگا جس میں

اُس کی بمبئی کا دس سال کا کلچر بند تھا۔ ایک سُرخ قمیص، ایک نیلی پتلون، ایک کالا چشمہ اور ایک ہوائی چپل۔ گاؤں کے نزدیک اُس نے سب چیزیں باہر نکالیں۔ دے ہاتھوں سے اُسے جھاڑا اور پھر آہستہ سے بیگ میں رکھ دیا۔ صرف ایک ریشمی رومال نکال کے اپنی کلائی کے گرد باندھ لیا۔

"صاحب! پکڑا نہ جاتا تو باندرہ کا داوا ہوتا!" اُس نے اپنی چھاتی والی خفّت مٹانے کو کہا۔

"۔۔۔ تو تو ابھی پورا پنا بھی نہیں! دادا کہاں سے بنا!" ٹیکے والے نے اُس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ٹیکہ رُک گیا تھا کیونکہ یہاں سے گاؤں کا دو فرلانگ کا راستہ پیدل کا تھا اور اِس کا جواب یوگی نے ٹیکے والے کو ایسا لگتا رُکے، جس سے وہ گرتے گرتے بچا اور اُس کے مُنہ سے بے اختیار نکلا "او تیرے سور کے!" اور ہاتھ میں چابک اُٹھا لیا۔ بات بڑھ جاتی اگر میں اُن کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے کرایہ کے پیسے نہ رکھ دیتا۔ یوگ راج نے جواب میں اُسے ٹھیٹھ مرہٹی بولی میں گالی دی لیکن ٹکّے والا سمجھ نہ سکا۔ اُسے جلدی بھی تھی۔ چل دیا۔

"یہ یوگی کا گانا ہے" یوگ راج نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا "فارس روڈ پر تو ایسے کو رنڈی چوبارے پر بھی نہیں چڑھنے دیتی۔ بس خالی پیلی بوم مارتا ہے۔ سالا!"

اِس عمر میں اِس نے فورٹ سے فارس روڈ تک سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ اکیلا بچہ۔ اپنا راستہ آپ ڈھونڈنے کے لیے کیا نہیں کر گزرتا۔ بھیک منگا، گداگر، بھلّی والا، مزدور، ایکسٹرا، بوٹ پالش والا اور شاید جیب کترا بھی! میں نے پہلی بار اُس سے ایک سوال کیا۔

"کبھی جیب بھی کاٹی یوگ راج؟" وہ کچھ دیر چُپ رہ کے بولا۔

"آپ کو بتا دیتے صاحب! ابھی جھوٹ نہیں بولے گا۔ کاٹی ۔۔۔ لیکن دھندا اچھا نہیں۔ جوکھم بہت ہے۔ بات یہ تھی کہ تنکو سالا بہت تیز تھا۔ وہ ہمارے ساتھ چرچ گیٹ پر کیلے بیچتا لیکن کیلے بیچتا سب بہت کاٹتا۔ لکھنؤ کا تھا۔ بمبئی میں ایکٹر بننے کو آیا تھا صاحب! بہ نانی تھا سالے کو۔ دلا آنند یا یوت۔ مزے لے لے کے گانے گاتا اور رات فٹ پاتھ پر بائی لوگ کا رومال، بابو لوگ کا پیسہ کھاتا۔ ہم کو اُس نے چسکہ لگایا صاحب! وہ سب سٹوڈیو کو جانتا تھا۔ وارلی، اندھیری، چمبور ۔۔۔ کہتا تھا کمال امروہوی اُس کے باپ سے کٹنگ کرواتا تھا اور وہ سالا لوگوں کی جیب کی کٹنگ کرتا تھا! جب پکڑا گیا تو پولیس نے بہت پیٹا۔ ہم ایک روز تھانہ پہ ملنے گیا کہ افورڈ مارکیٹ کے سامنے جو نسا بڑا کوتوالی ہے صاحب! مجھ سے بولا فارس روڈ پہ بائی کو بولنا بس باہر آنے دے، اُس کے جھمکے لا دوں گا اور وہ بائی آخ تھو ۔۔۔"

یوگ راج نے بمبئی کے فارس روڈ کا غصّہ پنجاب کی لہلہاتی فصل پر نکالا "ہم تو ڈر گیا صاحب! ہم کو بائی وائی پسند نہیں اور تنکو کی بائی تو مجھے میچر کہتی تھی۔ ہم نے ایک بار اُس کے مُنہ پہ تھوک دیا اور پھر فارس روڈ کا مُنہ نہیں دیکھا" اُس کے لہجے میں خود اعتمادی کی جھلک تھی۔ اب اُس کا گاؤں بس سو گز رہ گیا تھا۔ اُس نے اپنا بیگ یوں اُٹھایا جیسے بوجھل ہو۔ حالانکہ سارا

وزن بس دو تین پونڈ ہوگا اور آہ بھر کے بولا: "صاحب! موقع نہیں ملا، نہیں تو بمبئی سے یہاں تک ٹیکسی میں آتا۔ چھتیس مرتبہ لاتا۔ گاؤں والے سمجھتے کہ یوگی واپس آیا ہے! لیکن اب ــــــ؟"

وہ رک گیا۔ اسے اپنی بے چارگی اور بے کسی پر خود رحم آ گیا۔ "اگر وہ نلکے والا پٹیل ٹھیک سے دھندا کرتا اور پیسہ ٹھیک ٹھیک دیتا تو صاحب! میں سمپورن سنگھ صوبیدار کے لڑکے گوربخش کو بتا دیتا کہ یوگی صرف دھنو پنڈت کا لڑکا بدھو نہیں کماؤ بھی ہے!" اور پھر اس نے مجھ سے سوال کیا: "صاحب! آپ دارو پیتا؟"

"نہیں" میں نے جواب میں گردن ہلا دی۔

"اوہ! بمبئی میں بہت بڑا بڑا آدمی دارو پیتا۔ ایکٹر، ایکٹریس، ہیرو، ہیروئن، ایکسٹرا، سیٹھ، پارسی، مارواڑی، بابو لوگ، میم صاحب، دادا، موالی سب پیتا صاحب! اس دھندے میں بہت پیسہ ہے۔ ہم نے بہت کمایا اور مہالکشمی پر بہت لگایا۔" اور پھر میری طرف دیکھ کے بولا: "مہالکشمی سمجھے صاحب؟ کئی نمبرا بلیو برڈ، بجلی، پرائڈ آف انڈیا، لیکن صاحب لک نہیں تھا۔"

"تو تم ریس میں بھی جاتے تھے؟" میں نے حیرت سے پوچھا: "تم تو بہت چھوٹے تھے۔"

"چھوٹے؟ صاحب کیا بولتا؟" وہ کھڑے کھڑے زمین کی طرف ہتھیلی کر کے بولا۔ "صاحب ایسا، اتنا چھوکرا وہاں جاتا ہے اور میں تو ٹپ لے کے جاتا تھا لیکن سالا جوکی لوگ مل جاتا ہے اور آپس میں حصہ کر لیتا ہے۔" اور پھر آہستہ سے مسکرا کے کہا: "صاحب! ایک دفعہ آ جاتے تو بس مزا آ جاتے۔ لک صاحب لک۔ قسمت برا تھا۔ ایک دم کنڈم!" اور پھر ہاتھ میں بیگ اٹھا کے کہنے لگا: "نہیں تو میں گاؤں میں ایسا نہ آتا۔ بابا کی سمادھ تاج محل ہوٹل موافق بنا دیتا۔" اس کی آنکھوں میں مایوسی اور حسرت تھی۔ گاؤں کے بالکل نزدیک اس نے چار مینار کی ڈبی اور ماچس میری حفاظت میں دے دی: "بابو کو مت کہنا صاحب! میں سگریٹ پیتا ہوں۔ گاؤں کے بڈھے بوڑھے کیا کہیں گے کہ بمبئی سے یہی سیکھ کے آیا ہے؟"

میری پتلون اور یوگی کے نیکر کو جاتے ہوئے دیکھ کر گاؤں کے بہت سے بچے اکٹھے ہو گئے۔ ان میں سے بہت سے وہ تھے جو اس کی گمشدگی کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ ایک تیرہ چودہ سال کی لڑکی شوروم کے دروازے پر آ گئی تو عورتیں دور سے ہی دیکھنے لگیں۔

"ماں! یہ تو پنڈتوں کا جوگی معلوم ہوتا ہے۔"

ماں نے اپنے ہاتھ پر لگا ہوا آٹا جھاڑتے ہوئے کہا: "ہاں ادھر سے دس سال ذرا نہیں بڑھا۔" اور پھر کچھ سوچ کے کہنے لگی: "تو تندور پہ روٹیاں لگا۔ میں پنڈتانی کو بدھائی دے آؤں۔" اسے یوگی سے زیادہ برادری کی فکر تھی ــــــ بچے شور کرنے لگے: "پنڈتوں کا یوگی! پنڈتوں کا یوگی!!"

شوروم کے ساتھ کی گلی سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت نمودار ہوئی اور یوگی کے گلے لگ کے زور زور سے رونے لگی۔ بہت سی عورتیں اکٹھی ہو چکی تھیں۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ عورتوں نے اس عورت کو الگ کرتے ہوئے کہا: "صبر کر پورنی۔ جیسے تیرے دن پھرے بھگوان سب کے ایسے ہی پھیرے!"

یہ جلوس ایک نیم پختہ مکان کے سامنے ٹھہرا۔ سولہ سترہ سال کی ایک لڑکی جو صدا دے رہی تھی، اس نے ایک بار غور سے دیکھا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر زور سے مار کے دوڑی:

"میرا ویرا!!"

یوگی آج اس استقبال کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کا گلا بھی رقت سے بھر گیا تھا لیکن بمبئی کے ٹھکرانے والے ماحول نے اسے اپنے جذبات پر قابو پانا سکھا دیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا: "کاہے روتی ماں بہن! ایسا کیسا کرتی ہے؟"

"ارے! یہ کون سی بولی بولتا ہے؟" مجمع سے شور اٹھا۔

"بمبئی سے آیا ہے" ماں نے یکدم آنسو پونچھ لئے: "ہمیں اس کے سکول سے خط آیا تھا کہ ہمارا یوگی وہاں پڑھتا ہے۔ کیوں یوگی؟"

"ہاں ماں!" یوگی نے آہستہ سے کہا۔ کسی کو کیا پتہ وہاں کون سے سکول میں تھا یا آوارہ بچوں کی درسگاہ کی زیرِ نگرانی تھا۔

"اور تمہیں ہمارے دس روپے مل گئے تھے؟" ماں سے اقتصادی برتری جتائی۔

"ہاں ماں!" یوگی دلہن نے آہستہ سے کہا اور کسی نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا:

"اتنی بمبئی کیوں آتے ہو؟" ... میرے پاس آیا اور پچاس سال کے ... پوچھ کے کہا: "بابو جی! آپ ..."



"میرا فرض تھا۔" جج اب میری طرف دیکھ رہا تھا۔ "اب آپ کو اس کا خیال رکھنا ہے۔ اس کی تربیت اور کام کاج کی چھٹی آپ مجھے دفتر ضرور بھجوا دیں۔"

"اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں سارے گاؤں پر ہے۔" باپ نے بڑے بوڑھوں کی طرف دیکھ کے کہا۔ بھلا وہ ممبئی کے یوگ راج کو کیسے ہضم کر سکتا تھا اور پھر وہ تو گاؤں میں عجوبہ تھا۔ عجیب لباس، عجیب ہیئت، عجیب جسم، عجیب عادتوں کا مالک۔ یا شاید وہ ساری ذمہ داری سے گھبرا رہا تھا۔

"ہاں ہاں! ہم ذمے دار ہیں!!" ایک بزرگ نے کہا اور ... نے تائید میں گردن ہلا دی۔

میں نے یوگ راج کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ ...

... نے آہستہ سے کہا "کیا آپ کے دفتر میں کوئی نوکری نہیں ہے؟" ... نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اچھا صاحب! میں آپ کا کھانا بناؤں گا۔ بستر لگاؤں گا۔"

"لیکن یوگ راج! میری ذمہ داری تھیں تمہارے ماں باپ تک پہنچانے کی تھی۔ تم اب ان کی امانت ہو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

مجمع اب ذرا دُوری پر تھا۔ وہ میرے پاس تقریباً اکیلا تھا۔ "صاحب! یہ اپنا گاؤں ہے؟" وہ رُک گیا۔ "ٹھیک صاحب! یہ سب چُپ چُپ سا ہے۔ اپن یہاں نہیں جینے سکتا صاحب!" اور پھر اُس نے ایک اچٹتی سی نظر مجمع پر ڈالی جہاں سب لمبے کُرتے، تہبند، رنگ برنگی پگڑیاں اور کھڑی جُوتی پہنے کھڑے تھے۔ دو ایک کے ہاتھ میں لاٹھیاں تھیں۔ چند کے پاس کدال اور پھاوڑے۔

"اچھا صاحب!" اُس نے بیگ اُٹھا کے میرے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔ "اسے اپنے ساتھ لے جاؤ صاحب! اپنے اردلی کو دے دینا۔"

"پاگل نہیں بنتے۔ تم اپنے ماں باپ کا ہاتھ بٹاؤ۔ تم اس گاؤں کے ہو، یہیں رہو اور کام کرو۔" میں نے اُس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

"نہیں صاحب! یہ گاؤں اپنا نہیں۔ اپن تو ممبئی جائے گا۔ وہاں کوئی دھندا کرے گا۔ کوئی بُرا کام نہیں کرے گا صاحب! اچھا دھندا کرے گا۔" اُس کی باتوں میں عزم تھا۔

"خیر کچھ دن یہاں رہو۔ پھر سوچیں گے۔" میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ سوچا چند دنوں میں دل لگ جائے گا۔ ماں باپ اور گاؤں کے ماحول میں گھل مل جائے گا تو ممبئی کا بھوت اُتر جائے گا۔

"ضرور صاحب! میرے لئے شہر میں نوکری ڈھونڈنا!" اُس نے پھر دُہرایا۔ "ہم جھگی کا کام کرے گا لیکن شہر میں رہے گا۔ ضرور صاحب بھول نہ جانا!"

"ضرور ..." میں نے اُسے تسلی دی اور سوچا اگر مل گیا تو اسے کام دلوا دوں گا اور گاؤں بہت پیچھے رہ گیا۔

کوئی پندرہ دن بعد اس سرپنچ کی چٹھی ملی۔

جناب عالی!

عزیزم یوگ راج پسر دمن راج پنڈت پرسوں سے گاؤں سے چلا گیا ہے۔ وہ آپ کو بہت یاد کرتا تھا۔ اگر آپ کے پاس پہنچا ہو تو اطلاع دیں۔

مجھے دُکھ تو ضرور ہوا لیکن مجھے بھی اُس کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ جواب کیا دیتا۔

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر یہ ضرور تحریر فرمائیے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیل ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ "رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶" لکھنا کافی ہے۔

رنیجر



غزل

کرشن موہن ایم اے

عمر کاٹی ہے سہارے عشق کے
گائے ہیں جی بھر کے نغمے عشق کے

بحر و دریا، شہر و قریہ، کوہ و دشت
ہر جگہ دیکھے تماشے عشق کے

کس قدر رنگیں ہے فرسودہ سماج
کس قدر رنگیں ہیں جذبے عشق کے

خود ہے افسردہ دل و کربِ آشنا
حُسن کیا ارماں نکالے عشق کے

حُسن تھا غمگین، تھک کر سو گیا
کب تلک سُنتا فسانے عشق کے

دُور کر دیں گے ترا بھی اضطراب
سُن ذرا اے حُسن شکوے عشق کے

طنز سے، طعنوں سے گھبراتا ہے کیوں
کرشن موہن یہ ہیں تحفے عشق کے

غزل

پروفیسر اختر نقوی

زندگی کی ہے یوں بسر تنہا
جیسے صحرا میں ہو شجر تنہا

اِک دوراہے پہ قافلے والے
بڑھ گئے مجھ کو چھوڑ کر تنہا

ایک موہوم سی تمنا میں
رات کاٹی ہے جاگ کر تنہا

انجمن انجمن نگاہ گئی
ہر جگہ دل رہا مگر تنہا

میرا سایہ بھی میرے ساتھ نہیں
ہو گیا ہوں میں کس قدر تنہا

بجھ گئے روشنی کے مینارے
رہ گئی ہے مری نظر تنہا

یوں گذرتے ہیں روز و شب نقوی
شام تنہا ہے اور سحر تنہا

غزل

ادیب مالکن پوری

سُنیں زمانے کا اب کیا پیام دیوانے
مٹا چکے خلشِ ننگ و نام دیوانے

سلامِ شوق تجھے اے مجالِ حق گوئی
بنے ہیں مصلحتوں کے غلام دیوانے

یہ انتظارِ بہاراں پئے جنوں کیسا
ہوا ہے کیوں تجھے سودائے خام دیوانے

جنوں کا ساتھ گرفتارِ ہوش کیا دیتے
چلے ہیں راہ پہ کب گام گام دیوانے

وہاں پہ گردشِ دوراں نہیں اثر انداز
گذارتے ہیں جہاں صبح و شام دیوانے

جہاں میں ہوتی شکستہ دلی کی قیمت کیا
نہ کرتے غم کا اگر احترام دیوانے

ادیب منزلِ وحشت میں کوچکے ہیں قدم
حواس و ہوش کو کر کے سلام دیوانے

افسانہ

اندھیرے ہار گئے

اسنیٰ رباب

۱۷۔ اوکھلا جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۲۷ جولائی ۶۵ء گرامی قدر اخترصاحب! عقیدتیں اور سلام

اپنی کہانی "اندھیرے ہار گئے" بیسویں صدی میں اشاعت کے لئے بھیجنے کی پہلی بار جرأت کر رہی ہوں — کہانی شامل اشاعت ہوگئی تو بے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔ بیسویں صدی کے معیار پر پورا اُترنا کوئی کھیل تو نہیں ہے پھر بھی ایک دیرینہ آرزو کے تقاضوں سے مجبور ہوکر آپ سے حوصلہ افزائی کی آرزو کر رہی ہے۔ دیکھئے کیا حشر ہوتا ہے! ——— آپ کی صحت کی طرف سے تشویش ہونے لگی ہے۔ خدا آپ کو اُردو زبان کی خدمت کے لئے صدیوں زندہ رکھے۔ آمین! . . .

آپ کی بہن ——— اسنیٰ رباب

آج بھی پیڈ بکس خالی پاکر اُس کی نظریں اُداس پنہائیوں میں کھو گئیں، اور وہ سوچنے لگا ———

"تم نے اچھا نہیں کیا زیب! اپنا سب کچھ ہی تو مٹا ڈالا۔ نفرت کی آگ نے تمہارے شعور کا خرمن جلاکر راکھ کر دیا۔ تمہارے فہم و ادراک کی آنکھیں بے نور ہوگئیں۔ زندگی کی ہیبت ناک تاریکیوں میں آج تم بےبس و مجبور کھڑی ہو۔ بالکل اکیلی! چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہو۔ سنسان اندھیروں میں دُور تک تمھیں کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ مایوسیاں تمھیں اپنی آغوش میں لینے کے لئے بیتاب، تمہاری طرف تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ بربادیاں دُور کھڑی ایک ادائے دلنواز سے مُسکرا رہی ہیں۔ آنسو سیلاب بلا بن کر تمھیں اپنی گود میں لینا چاہتے ہیں۔ تنہائیاں تمھیں اپنی طرف بُلا رہی ہیں۔ سوچو تو ——— ! وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ جب تم تھیں اور میں تھا اور سارے جہان کی خوشیاں تمہارے دامن میں سمٹ کر آگئی تھیں ——— ! ہمارے درمیان ایک محبت ہی تو تھی جو سدا ضیا پاشیاں کیا کرتی تھی۔ ارمانوں کی دل نواز مسکراہٹ سے ہمارے دن نور کی ٹھنڈک میں نہاتے ہوتے تھے اور راتیں ——— ؟ ایک چاندنی تھی جو زندگی کے گرد تبسم ریز تھی۔ ایک تازگی تھی جس نے ہماری آرزوؤں کی گود خوشیوں سے بھر دی تھی۔ ایک رعنائی تھی جس کی گرمی نے ہمارے دلوں کو نئے انداز سے ہنسنا سکھا دیا تھا۔ ایک سرخوشی تھی جس کی نرم لچک دار باہوں میں ہم نے اپنا سب کچھ سونپ دیا تھا۔ آج سوچتا ہوں تو وہ سب کچھ خواب سا نظر آتا ہے۔ زیب! تم کیا تھیں، کیا ہوگئیں؟ نہیں میں ہی بدل گیا۔ تمہارے لئے اب وہ نہیں رہا۔ لیکن زیب! مجھے تم سے پیار ہی کب تھا؟ ہمیشہ تمھیں دھوکے ہی تو دیتا رہا، جھوٹی قسموں نے تمہارے کان بوجھل کرتا رہا۔ تمہارے معصوم جذبے میری تمناؤں کی زندگی کو سدا گلے سے لگاتے رہے، تھپک تھپک کر سلاتے رہے۔ تمہاری دلنواز مسکراہٹیں میرے گناہوں کو اپنے دامنِ محبت میں چھپاتی رہیں اور میں فطرتاً کمینہ، طبعاً بے وفا تمھیں سچا پیار تک نہ دے سکا۔ اتنی حضور کی بے مثل عنایتوں و سلامِ عقیدت تک نہ پیش کر سکا ——— ایک خالی دامن بھلا کسی کو دے بھی کیا سکتا ہے!؟

اور وہ رات ——— !

تم تو شاید بھول گئی ہو۔ وہ رات تو میری زندگی کی آخری سانس تک میرے ہوش کے دامن سے لپٹی اٹکھیلیاں کرتی رہے گی۔ اُس کا خیال؟ الاماں! اِس وقت بھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زبردستی میرے کانوں میں لوہے کی تپتی ہوئی سُرخ سلاخیں ٹھونکی جا رہی ہوں۔ پگھلا ہوا سیسہ میری سماعت کے قلب و جگر میں پیوست کیا جا رہا ہو اور میں بےبس، مجبور، بے کس اپنی لٹتی ہوئی تمناؤں، اپنی دم توڑتی ہوئی آرزو کی دلدوز چیخیں سن رہا ہوں ——— وہ آرزو جو برسہا برس کی میری کاوشوں کا سرمایہ تھی، میری زندگی کی اساس تھی، آج رسوائیوں کے دوش پر گھر گھر ماری پھرتی ہے۔ کوئی منہ نہیں لگاتا، کوئی بات تک نہیں پوچھتا۔ نفرت سے اپنوں نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ پرائے تو پھر پرائے ہیں۔

آہ، وہ دلدوز لمحے ——— !

دسمبر ۱۹۶۵ء

[illegible] صورتِ عظمت کی ملکہ، رمزِ شکست کا اِک پیکر، سازِ راز ہائے سربستہ، خلق و کرم کی [illegible] تصویر [illegible] فرما رہی تھیں۔

"بڑھیا، تو میری دنیا کا گھر نہیں ہونے دے گی۔" فضا میں ایک بجلی سی کڑک اٹھی تھی۔

"چڑیل، جلا جلا کر تو نے میری بے زبان بھولی بھالی بچی کا ناس کر ڈالا۔ جا اُسے یہاں سے لا اور۔۔۔" ایک آتشیں شمشیر تھی جس کے شعلوں نے انصاف اور انسانیت کا خون کر ڈالا تھا۔

"مجھے اگر اس دن کی خبر ہوتی تو کتر کی گڑیا تک نہ دیتی" خوبصورت حقیقت کے شہ پر جھوٹ کے کالک پوت دی گئی تھی۔

امی حضور کے تاریکی جلال نے بے بس التجاؤں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

اور اس سے آگے مجھ میں سُننے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ نڈھال قدموں، لُٹی ہوئی آرزوؤں، بے کس تمناؤں کو کلیجے سے لگائے میں اپنے قادری کے گھر ننگی چارپائی پر جا گرا تھا، جس نے اپنے بزرگ باپ کی ضد کے مقابلے میں میرے کانپتے لرزتے ہاتھوں کو پیار سے تھام لیا تھا۔ جس نے اپنی صداقت پسندی اور اعلیٰ کردار سے میرے دل میں انسانیت کی ایسی شمع روشن کر دی تھی، جس کے ابدی نور میں انسانیت کے معصوم اور دلکش خدوخال مجھے تاحیات نظر آتے رہیں گے۔

اور پھر لب پرشکوت اور دل میں ماتمی نغمے لئے گھنٹوں بعد بوجھل قدموں سے میں اپنے گھر کی مایوسیوں میں لوٹ آیا تھا۔ رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے۔ ایک طرف بُوا جی بیٹھی تھیں، سکونِ صبح کی تصویر! اور صحن کے دوسرے گوشے میں ایک پلنگ پر تم تھیں، ہمیشہ کی طرح خاموش لیکن شرارتوں کا بے زبان شاہکار!

میرے لب آپ ہی آپ وا ہو گئے تھے۔

"بُوا جی! آپ اب تک سوئی نہیں ہیں" شاید اس طرح میں غموں کی دبی ہوئی آگ کو کرید کر پیار کے چھینٹوں سے سدا کے لئے بجھانے کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا۔

"تمہیں اتنی دیر کہاں ہو گئی؟ کھانا ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ زیب اب تک تمہارا انتظار کرتے کرتے سو گئی۔ جاؤ، اُسے اٹھا لو۔ کھانا کب کھاؤ گے؟" میں اُس پیار کے پیکر کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

"آپ نے بھی کچھ کھایا؟"

"ہاں! میں کھا چکی ہوں" بُوا جی آواز میں بھروسہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"آخر، آج آپ نے مجھ سے پہلے کھانا کیوں کھا لیا؟" میں اُن سے وہ سب کچھ کہلوا لینا چاہتا تھا جو ابھی چند گھنٹے پہلے میرے گھر کی اُداس خاموشیوں نے اپنے دل و جگر میں محفوظ کر رکھا تھا۔ اُن کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی میں اُن سے پوچھ بیٹھا تھا۔

"بُوا جی! ابھی چند گھنٹے پہلے گھر میں یہ شور کیسا ہو رہا تھا؟"

"نہیں تو۔۔۔!" اپنے جواب سے شاید وہ بھی مطمئن نہیں تھیں۔

"امی حضور نہیں آئی تھیں کیا؟"

"ہاں، ناطمہ آئی تھیں۔ تمہارا کافی دیر انتظار کرتی رہیں۔ تم جانتے ہو جب عورتیں مل بیٹھتی ہیں تو دُنیا جہان کے قصے چھڑ ہی جاتے ہیں۔ شور بھی ہونے ہی لگتا ہے اور ان دنوں تو نہ جانے کیوں تمہیں شور و غل کا احساس کچھ زیادہ ہونے لگا ہے۔ جاؤ کھانا لو۔ کافی رات ہو گئی ہے" بُوا جی اب بھی سب کچھ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

اور پھر میں نے اُن کے سامنے وہ سب کچھ دُہرا دیا تھا، جس کی ہیبت سے شرافت کے کان گُنگ ہو گئے تھے۔ جس کی حیات سوز تپش سے اخلاقی قدروں کے آنسو بہہ پڑے تھے۔

اُس کے بعد ــــــــ!

شاید تمہیں یاد ہو گا، میری نرمیِ گفتار سے تمہاری پیاری پیاری آنکھوں کے کنول شبنمی ہو گئے تھے۔

بادل برس کر کھُل گئے تو فضاؤں پر ایک مدہوش کُن سکون سا چھانے لگا تھا۔

محبت کے گنوائے ہوؤں پر پیار کے دہکتے ہونٹوں نے سایہ کر لیا تھا۔

اور میں تم سے کہہ رہا تھا ــــــــ

"زیب! ابھی تو زندگی میں ہمیں نہ جانے اور کتنے اُتار چڑھاؤ دیکھنے ہیں۔ تم غم نہ کرو۔ ہماری محبت غلط فہمیوں کو بے نقاب کر کے رکھ دے گی۔ پیار کا پرچم ہمارے تصورِ حیات پر سدا لہراتا رہے گا۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے کہیں دل شکستہ ہوتے ہیں۔ آؤ مل کر اُس زرّیں عہد کو ایک بار پھر دُہرا لیں، جس کے سہارے ہم اپنی منزل کی طرف چل رہے ہیں۔"

اور تم مجھ سے لپٹ کر نہ جانے کتنی دیر روتی رہی تھیں۔

اُنہیں دنوں باجی کی شادی ہونے لگی تھی۔ تم بے حد خوش تھیں، میں بھی مسرور تھا۔ گھر کے سبھی لوگ خوشیوں کی کشتی میں سوار قہقہے لگاتے، گیت گاتے، ایک دوسرے کو گُدگُداتے اُن لمحوں کو پا لینے کے لئے تیزی سے چل پڑے تھے، جن میں زندگی کی بھینی بھینی خوشبو ہوتی ہے۔ ایسی خوشبو جس کی سرمستی سے دلوں کے کنول کھل اٹھتے ہیں، مُرادوں کی راتیں سرشار ہو جاتی ہیں۔ نیندیں محبت کے گلے میں مرمریں بانہوں کے ہار پہنا دیتی ہیں ـــ اور ایسے ہی حسین لمحوں میں مجھ سے ایک بار پھر میری خوشیاں چھیننے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایک گھر بسایا جانے والا تھا۔ دوسرے کو اُجاڑنے کی تیاریاں شروع ہونے لگی تھیں [illegible]

تم نے مجھے پیار اور دلاسہ بنایا لیکن مجھے معلوم ہے زیب! امّی اعلان کر چکی تھیں ـــــــــ

"میں اسے ہرگز نہیں بلاؤں گی۔ آتا ہے آنے نہیں آتا ہے نہ آئے۔ بیٹی کو بھلا اُن کا پتہ کیوں تھا۔ ناز تو انھیں کے اُٹھائے جاتے ہیں جن سے پیار ہوتا ہے۔ جن سے دل کی دھڑکنیں وابستہ ہوتی ہیں، کوئی تعلق ہوتا ہے۔ مت اِترو انھیں۔ ہو جاتا ہے جن کا دل کی فہرست میں کہیں نام و نشان ہوتا ہے۔"

اور پھر میں خود ہی شادی کے ہنگاموں میں کھو گیا تھا۔ خود کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ تمھیں یاد تو ہوگا؟

زیب! کیا میرا وہ خط تمھارے پاس اب بھی محفوظ ہے جو باجی کی شادی سے دو دن پہلے میں نے تمھیں لکھا تھا؟

"... امّی حضور گہوارۂ نور ہیں، پیار کی روشنی ہیں، زندگی ... ہیں ... فروزاں ہیں، دشواریوں میں جادۂ منزل ہیں۔ جرأت کا دلہ با ساز ہیں اور عزم ... کا سوزِ جاوداں۔ میری روحِ عقیدت اُن کے حضور ... برسوں سے، اُس وقت سے جب تمھیں پانے کی آرزو میرے دل میں جنم لے چکی تھی ... تم پریشان نہ ہو۔ حوصلہ سے کام لو۔ مشکلیں سب کو پیش آتی ہیں، پریشانیوں سے ہر ایک کو سابقہ پڑتا ہے۔ ہماری راہوں کے کانٹے بھی جلد ہی ... ہو جائیں گے ... کی آندھی تھمے گی تو صدق و فریب کی شکلیں آپ ہی واضح نظر آنے لگیں گی۔ امّی حضور کے بوجھل دماغ کا دباؤ ذرا کم ہونے دو، تو امّی خود ہی بہت سے انھیں گلے لگا لیں گی۔"

ہاں، یہ خط باجی کو ضرور دکھا دینا۔ میری ساری عقیدتیں اُن سے وابستہ ہیں۔"

افسوس! آج تک وہ خط رازِ سربستہ رہا۔

یاد کرو ہماری خوشگوار زندگی میں ایک اور بھی زلزلہ آیا تھا۔

تم امّی حضور کے یہاں سے اپنے گھر آنے کسی طرح بھی آمادہ نہ ہوئی تھیں۔ میری ادنیٰ سی آرزو کو تم نے سرِعام پامال کر دیا تھا، پیروں تلے کچل کر رکھ دیا تھا۔ میری بار بار کی التجاؤں کو ٹھوکریں مار مار کر لہولہان کر دیا تھا۔ بتاؤ گی ـــــــ؟ میری التجا کیا اُسی طرح رُسوا ہونے کے قابل تھی؟ تمھیں اُس وقت بھی رحم نہ آیا جب تمھارے انکار اور عزیزوں کے تیکھے جملوں سے نڈھال ہارے ہوئے سپاہی کی طرح میں اپنے گھر لوٹنے لگا تھا۔ اُس گھر کی طرف جس میں کبھی ہم دونوں نے پیار بھرے ہاتھوں سے مل کر پیار کا ابدی بیج بویا تھا۔ تمھیں ذرا ترس نہ آیا۔ قہر آلود آوازیں میرا تعاقب کرتی رہیں۔ زہر میں بجھے ہوئے تیر میرے دل و جگر کا کلیجہ چھلنی کرتے رہے۔ میرا نہیں، تو باجی کی بزرگانہ شفقتوں ہی کا خیال کر لیا ہوتا۔ اُن کے پیار بھرے ہاتھوں کو نفرت سے یہ تو نہ موڑا ہوتا۔ لیکن تم بھی مجبور تھیں۔ امّی حضور حکم جو صادر فرما چکی تھیں۔

"زیب ہرگز نہیں جائے گی" تم میں اتنی جرأت بھلا کہاں سے آتی جو اپنے پیار کے محل کو آگ کی لپٹوں سے بچا لیتیں۔

اور آج پھر مجھے اُن منحوس لمحوں کی یاد ستانے لگی ہے۔

کالج کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ میری روانگی میں اب چند ہی گھنٹے تو باقی تھے۔ دل تمھاری عارضی جدائی کے تصور ہی سے بیٹھا جا رہا تھا لیکن تم بھی خاموش تھیں اور میرے لب بھی سِل سے گئے تھے۔ دو دن سے نہ جانے کیوں بے وجہ ہی تم مجھ سے ناراض ہو گئی تھیں۔ میں بھی لبوں پر بے زبانی کے طوفان لئے بے مطلب اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے یقین سا تھا کہ چلتے وقت تمھاری آنکھوں میں ایک فروزاں سوال ضرور شبنمی ہو اٹھیں گے۔ نازک لبوں پر ایسی سکوت ذرا سا تھرتھرا اٹھے گی جس کے معنی میرے سوا اور کوئی نہ سمجھ سکے گا۔ اور پھر میں تم سے لپٹ جاؤں گا۔ شکوے آنسو بن کر محبت کی آنکھوں سے بہہ نکلیں گے۔

لیکن افسوس! ایسا نہ ہو سکا۔ تمھاری آنکھوں میں محبت کی شمع جلوہ فروزاں نہ ہو سکی۔ تمھارے ہونٹوں پر تھا تو ... مسکرانے جانے پیار نہ بن سکے۔ پیار کے نغمے دل کی دھڑکنوں کو گلے نہ لگا سکے ـــــــ میں مایوس اپنے دل کی ویرانیوں میں چلا آیا۔

تمھارے دل نے آج پھر مجھے میری ویرانیوں کے ظلمت کدہ میں لوٹا دیا ہے۔ اب بربادیاں میری مونس ہیں۔ رُسوائیاں میری غمگسار ہیں، تنہائیاں میرا پیار ہیں اور مایوسیاں میری شام و سحر کا ساز!

زیب! اجازت دو، میں جا رہا ہوں۔ ایسی انجان منزل کی طرف جہاں نہ تمنّوں کے گلزار ہیں اور نہ مسرّتوں کے جاں فزا نغمے، نہ پیار کی خوشنما قندیلیں ہیں، نہ نفرت کے ... جہاں خوشی ہے نہ بیاں، رعنائی ہے نہ غم دل کی آگ۔ جہاں نور ہے اور نہ ظلمتیں، نہ روشنی ہے، اور نہ اندھیرے ـــــــ لاؤ میری وہ ہوتی ... بربادیاں، ساری رُسوائیاں ... میں انھیں ساتھ لے کر ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں گا۔ میرے پاس ایک ٹوٹا ہوا دل ہے ـــــ ایسا دل جس میں کبھی کسی کے لئے نفرت نہ پیدا ہو سکی۔ جس میں کدورت کا گزر نہ ہو سکا۔ جس میں اپنوں کے لئے پیار اور غیروں کے لئے سدا خلوص کی شمعیں روشن رہیں ـــــ چاہو تو اسے اپنے پاس رکھ لو"

دو آنسو اُس کی پلکوں پر تھرتھرائے اور شہابی گالوں سے پھسل کر زندگی کے دامن پر بکھر گئے ـــــ کون جانے یہ آنسو غم کے شعلے تھے یا نئی آرزوؤں کے فروزاں چراغ!!



زندگی بخش معلوماتی مقالات، اور مفید کارآمد اشارات

۱ • پپیتہ ——— وٹامنز کا خزانہ

یہ گرم تر پھل ہے بعض اطباء نے اسے گرم بھی لکھا ہے۔ یہ سبزی کی سبزی اور پھل کا پھل ہے۔ کچا اور پکا دونوں طرح کھایا جاتا ہے۔ کیمیاوی تجزیہ کرنے پر اس میں غذائی اجزاء، مفید نمکیات اور وٹامن اے، بی، سی اور ڈی پائے جاتے ہیں۔ وٹامن اے جو دودھ اور مکھن میں بکثرت ہوتا ہے اور جو انسانی نشو و نما کے لئے بہت ضروری ہے، اس کی بہت بڑی مقدار پپیتے میں ہوتی ہے۔ بدن کو غذائیت دیتا اور اس کی پرورش کرتا ہے۔ جگر اور آنتوں کو طاقت بخشتا ہے۔ اگر آنتوں میں کیڑے ہوں تو انھیں ہلاک کرتا ہے۔ گردہ و مثانہ میں پتھری ہو تو اسے بھی توڑ کر نکالتا ہے۔ پپیتے کو روزانہ استعمال کیا جائے تو یہ دائمی قبض، خونی بواسیر اور سوء ہضم میں بہت مفید ہے۔ اس کے دودھ میں ایک خاص جوہر (پے پین) ہوتا ہے، جس کا اثر معدے کی رطوبت ہاضم جیسا ہوتا ہے۔ اسی رطوبت کی وجہ سے کچا پپیتہ گوشت کو جلد گلانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

پکے ہوئے پپیتے میں، جو وٹامن اے ہوتے ہیں وہ بچوں کی نشو و نما کے لئے، نیز اُن کی ہڈیوں کو مضبوط کرنے اور عام جسمانی کمزوری کو دور کرنے کے لئے خاص طور پر مفید ہیں۔

پکے ہوئے پپیتے کو چھیل کر قاشیں کر کے کھانا کھانے کے بعد کھاتے ہیں۔ نیم پختہ پھل کو چھیل کر قاشیں تراش کر سرکہ میں ڈال کر بطور اچار استعمال کرتے ہیں۔

جو لوگ اس کے ذائقے کو پسند نہیں کرتے وہ نمک لگا کر کھاتے ہیں۔ اس کی چٹنی، اور مربہ بھی تیار کرتے ہیں۔

پیٹ کے کیڑوں کو ہلاک کرنے کے لئے کچے پپیتے کے سوا دو تولہ دودھ میں اتنا ہی شہد ملا کر پانچ تولہ گرم تیز پانی میں ملا کر ٹھنڈا ہونے پر پلائیں۔ دو گھنٹے کے بعد ارنڈی کا تیل... پیٹ کے سارے کیڑے ہلاک ہو کر خارج ہو جاتے ہیں۔

۲ • گانا ——— ایک صحت بخش عمل

جدید ماہرین نفسیات تحقیق و مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ گانا دوران خون پر نہایت مفید اثر ڈالتا ہے۔ خون کے بہاؤ کو تیز کرتا ہے، بافتوں کو تازہ قوت حیات بخشتا ہے، سمیات اور فضلات کو خارج کرتا ہے۔ بلا کی محنت طلب ورزش کے بعد اس سے ایک فرحت بخش صحت مندی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

سانس لینے پر بھی گانے کا نمایاں اثر ہوتا ہے۔ اس سے حلق اور پھیپھڑوں کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ گانے والوں کو پھیپھڑے اور سینے کی بیماریاں، نزلہ اور زکام کی شکایتیں بہت کم ہوتی ہیں۔

بعض ڈاکٹروں کا تو خیال ہے کہ گانا پھیپھڑوں کے امراض سے محفوظ ہی نہیں رکھتا بلکہ پھیپھڑوں کی بیماریوں کا اچھا خاصہ علاج بھی ہے۔

ڈاکٹر ڈاکشی کی رائے ہے کہ گانے سے غذا کے تقویت بخش عناصر کا خلاصہ حاصل ہو کر ہاضمہ میں مدد دیتا ہے۔ اس کی توجیہہ آسانی یوں کی جا سکتی ہے کہ گانے میں گہری سانسیں لینی پڑتی ہیں اور گہری سانسوں سے جسمانی بافتوں کی تکسید زیادہ ہو جاتی ہے، جس سے اشتہا بڑھ جاتی ہے۔ گانا سکھانے والوں کا مشاہدہ ہے کہ گانا گانے والے بچوں کا ہاضمہ اور بھوک نہ گانے والے بچوں کے مقابلہ میں ہمیشہ بہتر ہوتی ہے۔

مقوی غذاؤں، اشتہاری دواؤں، وٹامنوں میں تو روپے خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا صحت کو بازار میں خریدنا پڑتا ہے۔ یہ سب غیر فطری ذرائع ہیں لیکن حصول صحت کے لئے فطری اور قدرتی ذرائع ان سے بہتر ہوتے ہیں۔ گانا انہی ذریعوں میں سے ایک آسان، قدرتی ذریعہ ہے۔

ساتھ ہی یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ گانے سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ تان سین

[illegible] کہ آپ دوسروں [illegible]
دیں گے اس مقصد کے حصول [illegible] ہے۔

۳ • دوسروں کی قدر کیجیے!

ایک مشہور مفکر کا قول ہے ـــــــ "آپ دوسروں سے قدر کی توقع رکھتے ہیں تو دوسروں کی قدر کیجیے۔ قدر کے بھوکے دل کو قدر شناسی کی روٹی دینے سے آپ کو کیا حاصل ہوگا؟ یہ عمل آپ کو ایک مشعلِ زندگی کے حصول میں مدد پہنچائے گا۔ یہ آپ کے چہرے کو روشنی بخشے گا۔"

یہ قدر دانی ہی ہے جو زندگی کو صحیح معنی بخشتی ہے۔ آپ کو قدر دانی دوسروں ہی سے مل سکتی ہے اور اپنی زندگی کو تازہ دم رکھنے کے لئے آپ کو یہ حاصل کرنا ضروری ہے اور اسے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کے قدر دان بنیں۔ کیونکہ دوسرے لوگ بھی قدر دانی کے اتنے ہی بھوکے ہیں جتنے ہم اور آپ۔

مجھ میں، آپ میں اور ان تمام لوگوں میں جن سے ہمیں واسطہ پڑتا رہتا ہے، قدر دانی اور قدر شناسی کی بہت گہری خواہش ہوتی ہے۔ ہم صرف زبانی نہیں، عملی طور پر قدر دانی کا ثبوت چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ ہمارے متعلق اپنی عقیدت اور اپنے متشکرانہ جذبوں کا واضح طور پر اظہار کریں۔ محض دل ہی دل میں ہماری خوبیوں کو نہ سراہیں۔ ہم دوسروں سے قدر دانی کے متمنی

[illegible] کی تعریف و تحسین اور قدر شناسی ہماری عادت بن جائے۔

"دوسروں کا قول ہے ـــــــ "جو آدمی [illegible] ہے۔ جب میں اس شخص کی بہتری اور عظمت پر اظہار پسندیدگی کرتا ہوں تو [illegible] بن جاتا ہوں۔"

اگر [illegible] جیسے بلند مرتبہ انسان کے لئے [illegible] مفید ہو سکتا ہے۔

۴ • ناریل ـــــــ ایک مقوی پھل

ناریل بدن کو غذائیت دیتا ہے۔ قوت و حرارت پیدا کرتا ہے۔ جسم کو فربہ کرتا ہے۔ مقوی دماغ اور مقوی باہ بھی ہے۔ گردوں کو طاقت بخشتا ہے۔ جگر کو تقویت دیتا ہے۔ [illegible] قوی کرتا ہے لیکن کھانسی اور دمہ کے مریض کے لئے ناریل مضر ہے۔

کچا ناریل پکے ناریل سے زیادہ مفید ہے۔ یہ جلد ہضم ہو جاتا ہے اور بدن کو غذائیت دیتا ہے۔ پیٹ کے کیڑے نکالتا ہے۔ پکا ہوا ناریل قدرے قابض ہوتا ہے لیکن کچا زود ہضم ہوتا ہے۔

کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ کچے ناریل کو کوٹ کر اس کا رس نچوڑ کر [illegible]

[illegible] جائے تو نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس سے اس کے بدن کو غذائیت بھی ملتی ہے اور [illegible] میں مدد ملتی ہے۔

[illegible] سے جو تیل نکالا جاتا ہے، بدن میں قوت و حرارت پیدا کرتا ہے۔ سر میں لگانے سے بالوں کو بڑھاتا اور انھیں نرم اور چمکدار بناتا ہے۔ یہ تیل بچوں کی کالی کھانسی میں بھی مفید ہے۔ [illegible] لئے یہ تیل دن میں تین چار بار پلایا جائے۔

۵ • ایک قابلِ توجہ غفلت

ہم کھانا محض بھوک مٹانے کے لئے نہیں کھاتے۔ اس سے جسم کی تعمیر مقصود ہوتی ہے۔ لیکن کیا ہم کھانے کی تیاری میں اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں؟ ہم کھانے کی تیاری میں صرف ذائقہ کا خیال رکھتے ہیں۔ ذائقہ کے لئے غذائی افادیت کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

روٹی پکانے کے لئے آٹا گوندھتے ہوئے اس میں سوڈا یا بیکنگ پاؤڈر نہ ڈالنا چاہئے۔ سوڈے سے معدے میں سوزش پیدا ہوتی ہے اور اکثر اس سے [illegible] پھیلتی ہے۔

بیکریوں والے خمیر تیار کرنے کے لئے سوڈا اور بیکنگ پاؤڈر استعمال کرتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں مضر ہیں۔ سوڈا خاص طور پر مضر ہے۔ سوڈے کا مضر اثر بالعموم معدے کے علاوہ سارے جسمانی نظام پر پڑتا ہے۔ اس سے ڈبل روٹی کی غذائیت کم ہو جاتی ہے۔ اگر دوسرے بہتر طریقے استعمال کئے جائیں تو نہ صرف ڈبل روٹی کی غذائیت قائم رہتی ہے بلکہ اس کی لذت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

آٹے کے خمیر میں پانی کی جگہ دودھ استعمال نہ کرنا چاہئے۔ اس سے خرچ ہی نہیں بڑھتا، روٹی یا ڈبل روٹی ثقیل اور دیر ہضم ہو جاتی ہے۔ دودھ والی ڈبل روٹی پانی والی ڈبل روٹی کی نسبت کم خوش ذائقہ ہوتی ہے اور دیر ہضم بھی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دودھ والی روٹی معدے میں جا کر بہت جلد گل سڑ جاتی ہے۔

ڈبل روٹی وہی اچھی ہے جو ہلکی اور اسفنجی ہو۔ اس میں ترشی نہ ہونی چاہئے۔ اس طرح پکی ہونی چاہئے کہ خمیر کے جراثیم کا قلع قمع ہو گیا ہو۔ گرم ڈبل روٹی بھی اچھی نہیں۔ وہ دیر ہضم ہوتی ہے۔ البتہ بے خمیری روٹی گرم گرم اور تازہ ہی کھانی چاہئے۔

ڈبل روٹی کے سلسلے میں ایک اور بات یاد رکھنی چاہئے۔ کھانے سے پہلے اس کے پتلے پتلے ٹکڑے کر لینے چاہئیں۔ انھیں ہلکی آنچ پر رکھ کر سرخ کر لیا جائے اور اس کی نمی دور کر دی جائے۔ اس طرح وہ زود ہضم ہو جاتی ہے اور غذائیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

گیہوں کا آٹا چھاننا نہ چاہئے۔ بغیر چھنے ہوئے آٹے کی روٹی زیادہ قوت بخش ہوتی ہے۔ ماہر تو کہتے ہیں کسی چیز کے آٹے کو چھاننا نہ چاہئے۔ چھاننے سے اس کے قیمتی اجزاء ضائع ہو جاتے ہیں۔

سبزیاں پکاتے وقت یہ خیال رکھنا چاہئے کہ تیز آنچ سے ان کے وٹامن ضائع نہ ہو جائیں۔ غذائیت ختم نہ ہو جائے۔

وقتی یا بے پروائی کی وجہ سے کھانے کی تیاری میں حفظانِ صحت کے اصول پر عمل [illegible] گیا تو ایسا [illegible] سے جسمانی نظام میں خرابی پیدا ہوتی ہے، صحت برباد ہوتی ہے [illegible] سے ان گنت لوگ طرح طرح کے امراض میں مبتلا رہتے ہیں۔

۶ • کام ——— مسرت کی کنجی

کاموں میں مصروف و منہمک رہنے والے اُن لوگوں پر رشک کرتے ہیں جنھیں کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ ایسے لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں۔ بڑے بڑے مفکروں کا مشورہ ہے کہ اگر تم خوش رہنا چاہتے ہو، اگر ناکامیوں اور محرومیوں کے احساس سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو تو اپنے کو کاموں میں مصروف رکھو۔

انسانی فطرت کا مطالعہ کرنے والے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کام محرومی، ناکامی اور شکست کے جذبہ کو مغلوب کر دیتا ہے۔ لوگ فرائضِ منصبی سے سبکدوش ہو جانے اور پنشن پانے کے بعد روپے تو پاتے ہیں لیکن زیادہ خوش نہیں رہتے۔ تقریباً ہر پیشہ کے پانچ سو آدمیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ مردوں اور عورتوں کی اکثریت اُس وقت سب سے زیادہ خوش تھی جب وہ سب سے زیادہ محنت طلب اور مشکل کام میں مصروف تھے اور ذمہ داریوں کے بارے دبے ہوئے تھے۔

کچھ دن ہوئے امریکہ کے ایک اخبار "دِس ویک" میں مسٹر جان گبسن نے اس موضوع پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ معاشرتی سائنس کے ماہرین جنھوں نے اس موضوع کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے، کہتے ہیں۔ اگر آپ کو روزی کمانے کی فکر نہ رہے اور آپ سب کام چھوڑ دیں اور آرام طلبی کی زندگی بسر کرنے لگیں تو زندگی آپ کے لئے وبالِ جان ہو جائے گی۔

کچھ لوگ کہتے ہیں زیادہ کام کرنے اور سخت محنت کرنے سے خللِ اعصاب پیدا ہو جاتا ہے، یہ خیال غلط ہے۔ ماہرینِ نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ کام کی کثرت یا محنتِ شاقہ سے کبھی خللِ اعصاب نہیں پیدا ہوتا۔ خوف، پریشانی، فکر، ناکامی ایسی چیزیں ضرور ہیں جن سے اعصابی کمزوری پیدا ہوتی ہے لیکن کام کی زیادتی سے ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ زیادہ تر تو یہ ہوتا ہے محنتِ شاقہ خللِ اعصاب [illegible] ——— اس لئے [illegible] کے لئے وقت ہی نہیں دیتی [illegible] کام میں مصروف رکھئے۔

۷ • ایک [illegible]

[illegible] نے لکھا ہے ——— [illegible] آپ [illegible] کے [illegible] حل نہ کر سکے تو اُسے صحیح اور درست جواب پانے کی اُمید نہیں ہوتی لیکن اکثر آدمی آپ کو ایسے ملیں گے جو روزانہ صحت اور تندرستی کے اصولوں اور ضابطوں کے خلاف چلتے ہیں، قوانینِ قدرت کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور تندرستی کی اُمید بھی رکھتے ہیں۔ جو بو کر فصل پر گیہوں کاٹنے کی اُمید

رکھتے ہیں۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ اگر گھوڑے سے کام لینا ہو تو [illegible] تو یہ نہایت ضروری ہو کہ اسے خوب نہلائے دھلائے، مالش کرے، وقت پر کھلائے پلائے اور دانہ دے اور اُسے کافی آرام کا موقع دے لیکن اپنی ذات کے متعلق اپنے جسم کی مشین کے متعلق اُن کا یہ خیال ہے کہ یہ یوں ہی چلتی رہے گی۔ اسے مناسب تیل اور مالش [illegible] کوئی ضرورت نہیں۔ کھانے پینے اور سونے کی باقاعدہ عادات کے بغیر [illegible] رہے گی، اچھا کام کرتی رہے گی۔ مقررہ وقت پر صحت بخش غذا کھائے بغیر صحت مند [illegible] خیالات کے بغیر بھی جسم کا یہ گھوڑا کام دے سکتا ہے۔

کیا آپ نے کبھی یہ سوچا کہ یہ کتنی بڑی بھول ہے؟

۸ • ایک اچھی عادت

لوگوں کے ساتھ مل کر چلنے کی عادت ڈالئے۔ آپ کو معلوم ہوگا، آپ کتنی دولت عزت حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ مل کر چلنے کی عادت ہمارے لئے بے شمار مواقع پیدا کرتی ہے۔ صرف یہی نہیں، یہ عادت ہمیں انتہائی مسرت و شادمانی بخشتی ہے۔ کیونکہ جب آپ یہ خیال ہو کہ آپ دوسروں کو خوش کر رہے ہیں، دوسروں کو خوشی دے رہے ہیں تو یہی خیال آپ کے اندر خود بخود جوش اور ایک جذبہ پیدا ہو جائے گا کہ آپ انسانیت کے لئے مفید [illegible] کر رہے ہیں اور دنیا کی مسرتوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔

یہ جذبہ ایسے معجز نما اثرات دکھائے گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ یہ جذبہ احساس عمل کی شکل اختیار کرلے گا اور پھر آپ کی زندگی کا دامن مسرت و راحت [illegible] سے بھر جائے گا۔

۹ • ایک قیمتی نکتہ!

عام طور پر کہا جاتا ہے اور یہی سمجھا جاتا ہے کہ اپنی حالت کی طرف سے غافل [illegible] چاہئے۔ اپنی حالت پر نظر رکھنی چاہئے۔ لیکن مشہور مفکر ڈاکٹر [illegible] نے لکھا ہے ——— ذات کو زیادہ دیکھنا، اپنی ذات کی طرف زیادہ توجہ کرنا بھی صحت کو برباد کر [illegible] کے لوگوں کو ہمیشہ اپنی فکر رہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اعصاب میں [illegible] تعلق ہے کہ کمزور اعصاب رکھنے والے اور جلد گھبرا جانے والے [illegible] ہیں کہیں درد ہوا اور انھوں نے سمجھا یہ [illegible] ہر وقت [illegible] آپ کو الزام دیتے ہیں [illegible] لگ گیا۔ [illegible] کام ہو [illegible] زیادہ [illegible] آنکھیں ہمیشہ اپنی ذات کی طرف، ان کی توجہ زیادہ تر [illegible]

ہمیشہ اپنی ذات سے شکایت رہتی ہے۔ وہ زندگی کو کبھی کامل تندرستی اور صحت کی حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔ وہ فوراً گھبرا جاتے ہیں۔ انھیں ذرا سی بات سے کسی مرض کا شکار ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ تِل کا پہاڑ، رائی کا پربت بنا لیتے ہیں۔

تم جو کچھ بننا چاہتے ہو، اُس کی کامل و مکمل تصویر ہر وقت پیشِ نظر رکھو۔ اُس کی مکمل شکل، پورا پورا نقشہ دماغ میں کھینچ لو۔ اِس کے بعد اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

دوسری باتوں کے مقابلے میں مرض اور بیماری زیادہ تر الام و افکار اور رنج و پریشانی کے سبب سے ہے۔ لیکن کیا آپ یہ جانتے ہیں، یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ مرض کا اصل سبب کیا ہے۔ بیماری کا باعث کیا ہے۔ مرض کا سبب ہوتا ہے غلط خیال، غیر صحیح سوچنے اور غور کرنے کا طریقہ۔ بے قاعدہ رہن سہن۔ صحت کے اصولوں سے روگردانی اور حد سے زیادہ اپنی حالت کے بارے میں سوچتے رہنا۔ اپنی ذات کو دیکھنا۔

۱۰ • ایک غلط فہمی!

ادھیڑ عمر کے تصور سے جوانوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ بھی اُن لوگوں میں ہیں تو یقین کیجئے، ادھیڑ عمر کے تصور سے خوف کھانا بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ آپ ادھیڑ عمر کی برکتوں سے ابھی واقف نہیں ہیں۔ آپ اُس کے خیر مقدم کے لئے تیار ہو جائیں۔ اِس سے زیادہ نفع بخش سودا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

ادھیڑ عمر سے خوف کھانے والے بڑھاپا آنے سے پہلے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ جب یہ اٹل حقیقت ہے کہ ادھیڑ عمر آئے گی اور ضرور آئے گی تو اس سے خوف کھانے سے کیا فائدہ؟

یہ حقیقت ہے کہ ادھیڑ عمر کا زمانہ بہت محنت اور جفاکشی کا زمانہ ہوتا ہے۔ بڑی بڑی ذمہ داریوں کا بوجھ سر پر آ پڑتا ہے۔ خاندان کی ساری ذمہ داریاں پوری کرنی پڑتی ہیں۔ اپنے گھر کے علاوہ دوسرے لوگوں کی بھی کچھ نہ کچھ خدمتیں آپ کے سپرد ہو جاتی ہیں اور ستم ظریفی یہ کہ آپ کے احسان اور قربانیوں کے لئے نہ جوان آپ کے ممنون ہوتے ہیں، نہ بوڑھے!

اُن ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ حوصلہ اور تحمل سے یہ بوجھ اُٹھانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ ہاں بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن کے لئے آپ ابھی سے تیار ہو سکتے ہیں۔

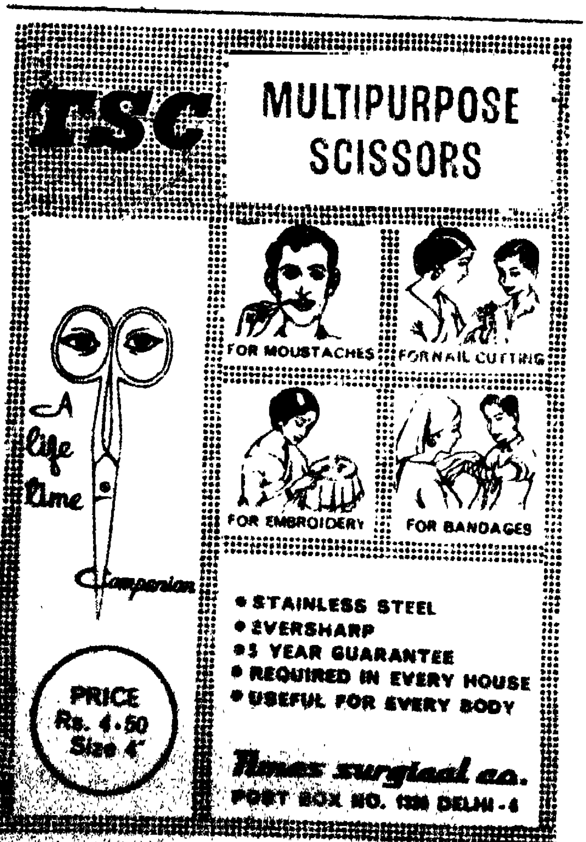
دراصل ادھیڑ عمر ہی ہر حیثیت سے انسان کی ترقی کا زمانہ ہوتا ہے لیکن صرف ادھیڑ عمر آپ کو ایک کامیاب قانون داں یا مشہور سرجن یا کسی ملک یا محکمہ کا پریسیڈنٹ یا وائس پریسیڈنٹ بنانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ عمر آپ کو صرف سن رسیدہ بنا دے گی۔ ترقی کے لئے اور سب کچھ آپ کو خود کرنا پڑے گا۔

بلندیوں کے قریب پہنچنے کے لئے آپ کو تجربہ حاصل کرنا ہوگا۔ آپ کو یہ دکھانا ہوگا کہ کارکردگی کا جو میدان آپ نے منتخب کیا ہے اُس کا وسیع علم آپ کو حاصل ہے۔

کہتے ہیں ادھیڑ عمر کے لوگوں کی زندگی روکھی پھیکی اور اُکتا دینے والی ہوتی ہے لیکن اگر وہ چاہیں تو اپنی زندگی کو بہت آسانی سے خوشگوار بنا سکتے ہیں۔ انھیں چاہئے کہ اپنی دلچسپیوں میں وسعت پیدا کریں۔ زندگی کو گوناگوں بنائیں۔ تفریحی مشغلوں میں وقت صرف کریں۔ دوسرے لوگوں میں، دوسرے خاندانوں میں، دوستوں میں، ہمسایوں میں دلچسپی لیں۔

ہم ادھیڑ عمر کو بہت شاندار اور درخشاں نہیں کہہ سکتے لیکن زندگی کے اِس حصے کو بہتر بنانے اور اِس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کے لئے اگر ہم جوانی ہی سے زمانے سے تیاریاں کرتے رہیں تو ہم بہت راحت اور مسرّت حاصل کر سکتے ہیں۔ اپنی زندگی کو پُر مسرّت زندگی بنا سکتے ہیں۔

مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات مرزا محمد ہادی رسوا عام طور پر امراؤ جان ادا کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن اِن کے تنقیدی مراسلات کی اشاعت سے اُن کی شخصیت کا نیا رُوپ سامنے آتا ہے۔ اِن مراسلات میں فن کے نفسیاتی اور جمالیاتی رُوپ اور فن اور انسانی فطرت کے تعلق پر نہایت فکر انگیز انداز میں بحث کی گئی ہے جسے ڈاکٹر محمد حسن ایم اے، پی ایچ ڈی نے مرتب کیا ہے۔ قیمت سوا تین روپے



دلیں یا بے پروائی کی وجہ سے کھانے کی تیاری میں حفظانِ صحت کے اصول پر عمل نہ کیا گیا تو ایسا کھانا کھانے سے جسمانی نظام میں خرابی پیدا ہوتی ہے، صحت برباد ہوتی ہے۔ ایسے کھانوں سے ان گنت لوگ طرح طرح کے امراض میں مبتلا رہتے ہیں۔

۶ • کام ـــــــ مسرت کی کنجی

کاموں میں مصروف و منہمک رہنے والے اُن لوگوں پر رشک کرتے ہیں جنھیں کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ ایسے لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں۔ بڑے بڑے مفکروں کا مشورہ ہے کہ اگر تم خوش رہنا چاہتے ہو، اگر ناکامیوں اور محرومیوں کے احساس سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو تو اپنے کو کاموں میں مصروف رکھو۔

انسانی فطرت کا مطالعہ کرنے والے اِس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کام محرومی، ناکامی اور شکست کے جذبہ کو مغلوب کر دیتا ہے۔ لوگ فرائضِ منصبی سے سبکدوش ہو جانے اور پنشن پانے کے بعد روپے تو پاتے ہیں لیکن زیادہ خوش نہیں رہتے۔ تقریباً ہر پیشہ کے پانچ سو آدمیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ مردوں اور عورتوں کی اکثریت اُس وقت سب سے زیادہ خوش تھی جب وہ سب سے زیادہ محنت طلب اور مشکل کام میں مصروف تھے اور ذمہ داریوں کے بارے دبے ہوئے تھے۔

کچھ دن ہوئے امریکہ کے ایک اخبار "دِس ویک" میں مسٹر جان گبسن نے اِس موضوع پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ معاشرتی سائنس کے ماہرین جنھوں نے اِس موضوع کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے، کہتے ہیں۔ اگر آپ کو روزی کمانے کی فکر نہ رہے اور آپ سب کام چھوڑ دیں اور آرام طلبی کی زندگی بسر کرنے لگیں تو زندگی آپ کے لئے وبالِ جان ہو جاتی ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں زیادہ کام کرنے اور سخت محنت کرنے سے خللِ اعصاب پیدا ہو جاتا ہے، یہ خیال غلط ہے۔ ماہرینِ نفسیات اِس بات پر متفق ہیں کہ کام کی کثرت یا محنتِ شاقہ سے کبھی خللِ اعصاب نہیں پیدا ہوتا۔ خوف، پریشانی، فکر، ناکامی ایسی چیزیں ضرور ہیں جن سے اعصابی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے لیکن کام کی زیادتی سے ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ زیادہ تر تو یہ ہوتا ہے محنتِ شاقہ خللِ اعصاب سے محفوظ رکھتی ہے۔ وہ آپ کو پریشان ہونے کے لئے وقت ہی نہیں دیتی ـــــــ اِس لئے اگر آپ خوش رہنا چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو کام میں مصروف رکھئے۔

۷ • ایک بڑی بھول

ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــــ طالب علم اگر حساب کے قاعدے کے مطابق سوال حل نہ کرے تو اُسے صحیح اور درست جواب پانے کی اُمید نہیں ہوتی لیکن اکثر آدمی آپ کو ایسے ملیں گے جو دن رات صحت اور تندرستی کے اصولوں اور ضابطوں کے خلاف چلتے ہیں، قوانینِ قدرت کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور تندرستی کی اُمید بھی رکھتے ہیں۔ جو بو کر فصل پر گیہوں کاٹنے کی اُمید رکھ سکتے ہیں۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ اگر گھوڑے سے کام لینا ہو تو اُسے وقت پر غذا دی جائے تو یہ نہایت ضروری ہو کہ اسے خوب نہلائے دھلائے، مالش کرے، وقت پر کھانا کھلائے اور دانہ دے اور اُسے کافی آرام کا موقع دے لیکن اپنی ذات کے متعلق، اپنے جسم کی مشین کے متعلق اُن کا یہ خیال ہو کہ یہ یوں ہی چلتی رہے گی۔ اِسے مناسب تیل اور مالش، تفریح اور کھیل کود کی کوئی ضرورت نہیں۔ کھانے پینے اور سونے کی باقاعدہ عادات کے بغیر بھی یہ ہمیشہ اچھی طرح چلتی رہے گی، اچھا کام کرتی رہے گی۔ مقررہ وقت پر صحت بخش غذا کھائے بغیر، صحت مند رکھنے والے خیالات کے بغیر بھی جسم کا یہ گھوڑا کام دے سکتا ہے۔

کیا آپ نے کبھی یہ سوچا کہ یہ کتنی بڑی بھول ہے؟

۸ • ایک اچھی عادت

لوگوں کے ساتھ مل کر چلنے کی عادت ڈالئے۔ آپ کو معلوم ہوگا، آپ کتنی دولت اور عزت حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ مل کر چلنے کی عادت ہمارے لئے بے شمار مواقع پیش کرتی ہے۔ صرف یہی نہیں، یہ عادت ہمیں انتہائی مسرت و شادمانی بخشتی ہے۔ کیونکہ جب آپ کو یہ خیال ہو کہ آپ دوسروں کو خوش کر رہے ہیں، دوسروں کو خوشی دے رہے ہیں تو اِس خیال سے آپ کے اندر خود بخود جوش اور ایک جذبہ پیدا ہو جائے گا کہ آپ انسانیت کے لئے مفید کام کر رہے ہیں اور دُنیا کی مسرتوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔

یہ جذبہ ایسے معجز نما اثرات دکھائے گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ یہ جذبہ یہ احساس عمل کی شکل اختیار کرلے گا اور پھر آپ کی زندگی کا دامن مسرت و راحت کے پھولوں سے بھر جائے گا۔

۹ • ایک قیمتی نکتہ!

عام طور پر کہا جاتا ہے اور یہی سمجھا جاتا ہے کہ اپنی حالت کی طرف سے غفلت نہ برتنی چاہئے۔ اپنی حالت پر نظر رکھنی چاہئے۔ لیکن مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــــ اپنی ذات کو زیادہ دیکھنا، اپنی ذات کی طرف زیادہ توجہ کرنا بھی صحت کو برباد کر دیتا ہے۔ سُست اور نکمے لوگوں کو ہمیشہ اپنی فکر رہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اعصاب میں اور قوتِ خیال میں بہت گہرا تعلق ہے۔ کمزور اعصاب رکھنے والی اور جلد گھبرا جانے والی طبیعتیں پل کے پل تِل کا پہاڑ بنا لیتی ہیں۔ کہیں درد ہوا اور اُنھوں نے سمجھا یہ تو کسی آنے والے بڑے مرض کی علامت ہے! یہ لوگ ہر وقت اپنے آپ کو الزام دیتے رہتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں ـــــــ آج کھانا زیادہ کھا لیا ہوا کا جھونکا لگ گیا۔ نیند نہ آئے گی۔ زکام ہو جائے گا۔ زیادہ کھانا نقصان دے گا۔ دوسرے لفظوں میں اُن کی آنکھیں ہمیشہ اپنی ذات کی طرف، اُن کی توجہ زیادہ تر اپنی طبیعت ہی کی طرف لگی رہتی ہے۔ انھیں

ہمیشہ اپنی ذات سے شکایت رہتی ہے۔ وہ زندگی کو کبھی کامل تندرستی اور صحت کی حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔ وہ فوراً گھبرا جاتے ہیں۔ انھیں ذرا سی بات سے کسی مرض کا شکار ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ تِل کا پہاڑ، رائی کا پربت بنا لیتے ہیں۔

تم جو کچھ بننا چاہتے ہو، اُس کی کامل و مکمل تصویر ہر وقت پیشِ نظر رکھو۔ اُس کی مکمل شکل، پورا نقشہ دماغ میں کھینچ لو۔ اِس کے بعد اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

دُوسری باتوں کے مقابلے میں مرض اور بیماری زیادہ آلام و افکار اور رنج و پریشانی کے سبب ہوتے ہیں۔ لیکن کیا آپ یہ جانتے ہیں، یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ مرض کا اصل سبب کیا ہے۔ بیماری کا باعث کیا ہے۔ مرض کا سبب ہوتا ہے غلط خیال، غیر صحیح سوچنے اور غور کرنے کا طریقہ۔ بے قاعدہ رہن سہن۔ صحت کے اصولوں سے روگردانی اور سب سے زیادہ اپنی حالت کے بارے میں سوچتے رہنا۔ اپنی ذات کو دیکھنا۔

۱۰ • ایک غلط فہمی!

ادھیڑ عمر کے تصور سے جوانوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ بھی ان لوگوں میں ہیں تو یقین کیجئے، ادھیڑ عمر کے تصور سے خوف کھانا بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ آپ ادھیڑ عمر کی برکتوں سے ابھی واقف نہیں ہیں۔ آپ اُس کے خیر مقدم کے لئے تیار ہو جائیں۔ اِس سے زیادہ نفع بخش سودا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

ادھیڑ عمر سے خوف کھانے والے بڑھاپا آنے سے پہلے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ جب یہ اٹل حقیقت ہے کہ ادھیڑ عمر آئے گی اور ضرور آئے گی تو اُس سے خوف کھانے سے کیا فائدہ؟

یہ حقیقت ہے کہ ادھیڑ عمر کا زمانہ بہت محنت اور جفاکشی کا زمانہ ہوتا ہے۔ بڑی بڑی ذمّہ داریوں کا بوجھ سر پر آ پڑتا ہے۔ خاندان کی ساری ذمّہ داریاں پُوری کرنی پڑتی ہیں۔ اپنے گھر کے علاوہ دوسرے لوگوں کی بھی کچھ نہ کچھ خدمتیں آپ کے سپرد ہو جاتی ہیں اور ستم ظریفی یہ کہ آپ کے احسان اور قربانیوں کے لئے نہ جوان آپ کے ممنون ہوتے ہیں، نہ بُوڑھے!

اُن ذمّہ داریوں سے بچنے کے لئے آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ حوصلہ اور تحمّل سے یہ بوجھ اُٹھانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ ہاں بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن کے لئے آپ ابھی سے تیار ہو سکتے ہیں۔

دراصل ادھیڑ عمر ہی ہر حیثیت سے انسان کی ترقی کا زمانہ ہوتا ہے لیکن صرف ادھیڑ عمر آپ کو ایک کامیاب قانون داں یا مشہور سرجن یا کسی مُلک یا محکمہ کا پریسیڈنٹ یا وائس پریسیڈنٹ بنانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ عمر آپ کو صرف سِن رسیدہ بنا دے گی۔ ترقی کے لئے اور سب کچھ آپ کو خود کرنا پڑے گا۔

بلندیوں کے قریب پہنچنے کے لئے آپ کو تجربہ حاصل کرنا ہوگا۔ آپ کو یہ دکھانا ہوگا کہ کارکردگی کا جو میدان آپ نے منتخب کیا ہے اُس کا وسیع علم آپ کو حاصل ہے۔

کہتے ہیں ادھیڑ عمر کے لوگوں کی زندگی روکھی پھیکی اور اُکتا دینے والی ہوتی ہے لیکن اگر وہ چاہیں تو اپنی زندگی کو بہت آسانی سے خوش گوار بنا سکتے ہیں۔ انھیں چاہئے کہ اپنی دلچسپیوں میں وُسعت پیدا کریں۔ زندگی کو گوناگوں بنائیں۔ تفریحی مشغلوں میں وقت صرف کریں۔ دوسرے لوگوں میں، دوسرے خاندانوں میں، دوستوں میں، ہمسایوں میں دلچسپی لیں۔

ہم ادھیڑ عمر کو بہت شاندار اور درخشاں نہیں کہہ سکتے لیکن زندگی کے اِس حصّے کو بہتر بنانے اور اِس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کے لئے اگر ہم جوانی ہی سے زمانے سے تیاریاں کرتے رہیں تو ہم بہت راحت اور مسرّت حاصل کر سکتے ہیں۔ اپنی زندگی کو پُرمسرّت زندگی بنا سکتے ہیں۔


دن اور رات خوبصورتی کی حفاظت . . .
افغان کولڈ کریم جلد کو زیادہ صاف اور اتنی صاف کرتی ہے کہ پہلے
کبھی اتنی صاف نہ ہوتی ہو۔ بہترین نتائج کے لئے ہمیشہ استعمال فرمائیں۔
افغان کولڈ کریم
چہرے، ہاتھ اور گردن پر تھوڑی تھوڑی
استعمال کریں اور رات بھر لگا رہنے دیں۔
AFGHAN COLD CREAM
دن کے دوران
افغان سنو
جلد کو دھول اور دھوپ سے محفوظ رکھنے کے لئے استعمال فرمائیں
اِس کے استعمال سے دن بھر جِلد نرم و ملائم رہتی ہے ۔
ای ۔ ایس ۔ پاٹن والا ۔ بمبئی ۔ ۷۷

سرگوشیاں

سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی معاشی تمدنی علمی ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

سید محمد۔ حیدرآباد (دکن)

س۔ چین کا باپو کہتا ہے ——— اگر دُنیا کی آبادی آدھی ہو جائے تو دُنیا کی باقی آبادی سُکھ سے رہ سکتی ہے ——— کیا چین کا یہ کہنا درست ہے؟

ج۔ خوئے بد را بہانۂ بسیار!

س۔ بھیا! چین کے تین حرفوں کو اُلٹ کر پڑھنے سے کیا بنتا ہے؟ ذرا جلد بتایئے۔

ج۔ چین کا حقیقی نام "نیچ" بن جاتا ہے۔

س۔ چین کا مستقبل؟

ج۔ ناؤ کاغذ کی کبھی چلتی نہیں
ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں

محمد حسین شاہ۔ سرینگر۔ کشمیر

س۔ بھائی صاحب! ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے کا گُر بتلایئے۔

ج۔ ازدواجی زندگی کے کسی موڑ پر اعتماد اور خلوص کا دامن نہ چھوڑا جائے۔

س۔ ایک قطرہ آنسو کی قیمت؟

ج۔ جیسا آنسو ہو۔ مگرمچھ کے آنسو کی بھلا کیا قیمت ہوگی!

طلعت جمال۔ بمبئی

س۔ بھیا! اگر آپ کو ایک دن کی بادشاہت مل جاتی تو آپ پہلا کام کیا کرتے؟

ج۔ اُردو پڑھنے لکھنے کو ممنوع قرار دے دیتے! "گدی" کا احترام تو بہرحال کرتے۔

س۔ آج کل لوگ فیشن کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہیں؟ کیا اُن کے پاس کوئی اور سوچ اور فکر نہیں؟

ج۔ ایسے لوگوں کے نزدیک فیشن پرستی ہی سب سے بڑا، سب سے اہم کام ہے۔

س۔ کچھ لوگ زندگی کو بارِ گراں کیوں سمجھتے ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ اُنھوں نے حوصلہ کا دامن چھوڑ کر اپنی زندگی کو بارِ گراں بنا لیا ہے۔

محمد اسمٰعیل خاں۔ احمد طاہر انصاری بمبئی

س۔ کیا آپ عروض کا جاننا شاعر کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں؟

ج۔ شاعر کو عروض جاننا چاہیے لیکن ہم عروض کو شاعری کے لئے ناگزیر نہیں سمجھتے۔ کتنے ایسے شاعر ہیں جو اچھے شاعر ہیں لیکن عروض سے واقف نہیں ہیں۔

س۔ آپ غزل میں اسلوب کو اہم سمجھتے ہیں یا خیال کو؟

ج۔ دونوں کو۔

س۔ آپ شاعری میں مقصدیت و افادیت کے کس حد تک قائل ہیں؟

ج۔ جس شاعری میں مقصدیت و افادیت نہ ہو۔ ہم ایسی شاعری کو صرف تفریح کا سامان سمجھتے ہیں۔

ایس۔ انصار۔ سورجاپور

س۔ زندگی کی انمول گھڑی کون سی ہے؟

ج۔ جس میں دل کو سچی مسرت کا احساس ہو۔

س۔ ایک دوست کو ہم نفس کیسے بنایا جائے؟

ج۔ انتہائی خلوص سے اُس کا سچا ہم نفس بن کر۔

س۔ بُرائی سے نفرت کرنی چاہئے یا بُرائی کرنے والے سے؟

ج۔ دونوں سے۔

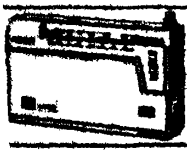
ایم۔ کے۔ کلیم۔ لکھنؤ

س۔ زندگی کی تاریک راہوں نے مجھے تقدیر کا قائل بنا دیا ہے۔ آپ تقدیر کے کہاں تک قائل ہیں؟

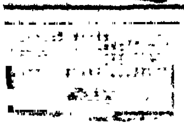
ج۔ محض تدبیر سے تقدیر سنور جاتی ہے۔



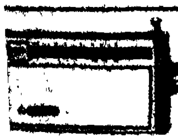
شارپ جھنکار آپ کی زندگی کو پُر مسرت بناتا ہے



ماڈل بی ایکس ایس - ۳۲۸ (پورٹیبل سٹ)
۸ - ٹرانسسٹر - بینڈ
ٹون کنٹرول — ۲۲۵ - روپیہ
ایکسائز ڈیوٹی ۲۰ روپیہ - علاوہ ٹیکس



ماڈل - ۵ اے - ۴۶
۶ - ٹیوب - ۴ - بینڈ
مختلف ٹون کنٹرول - ۳۵۰ - روپیہ
ایکسائز ڈیوٹی ۴۰ روپیہ - علاوہ ٹیکس



ماڈل بی زیڈ — ۳۹۰ (پورٹیبل سٹ)
۹ ٹرانسسٹر — ۴ بینڈ
فائن ٹیوننگ — ۳۷۵ - روپیہ
ایکسائز ڈیوٹی ۴۰ روپیہ - علاوہ ٹیکس

گھر پہ یا گھر سے باہر، شارپ جھنکار ٹرانسسٹرز ہر عمر کے سننے والوں کے لئے مسرت بخش ہیں - چٹان کی طرح مضبوط اور قابلِ اعتماد ہونے کی وجہ سے یہ اُن تمام اعلیٰ ترین خوبیوں کے حامل ہیں جو بلند پایہ کارکردگی کو یقینی بناتی ہیں - مناسب داموں پر شاندار وضع قطع کے ساتھ یہ صرف اُن اصحاب کے لئے تیار کئے جاتے ہیں، جنہیں صرف بہترین ہی چاہئے - یاد رکھیئے! شارپ جھنکار ریڈیو جاپان کی ہایاکاوا الیکٹرک کمپنی لمیٹڈ کی ٹیکنیکل تال میل کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔
جو بہترین کوالٹی کا مال تیار کرنے کیلئے دنیا بھر میں مشہور ہے

Sharp JHANKAR

اِنڈین پلاسٹکس لمیٹڈ، لوٹس ہاؤس بمبئی - ۱

RTM No. 16700

انور عالم آستانہ چوڑاسی (مدراس)

س۔ کچھ شعروں کے نیچے "نامعلوم" لکھا ہوتا ہے۔ نامعلوم کس شاعر کا نام ہے؟

ج۔ "نامعلوم" کسی شاعر کا نام نہیں ہے۔ نامعلوم کا مطلب ہوتا ہے جو معلوم نہیں۔

س۔ ظلم اور قلم میں کیا تعلق ہے؟

ج۔ ظلم اور ظلم میں دور کا بھی تعلق نہیں۔

س۔ دولت انسان کو اندھا کیوں بنا دیتی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ خود اندھی ہوتی ہے۔ اندھی نہ ہوتی تو بخیلوں کے پاس نہ جاتی۔

اے۔ قدوس۔ رشڑا۔ ہگلی

س۔ شمع سے پروانوں کا کیا تعلق ہے؟

ج۔ پرائی آگ میں جلتا ہے کون دنیا میں
پتنگے آگ میں اپنی بنامِ شمع جلے

س۔ "بیسویں صدی" کا افسانہ نمبر ۶۵ء بے حد پسند آیا۔ بتلایئے کیا انعام بھیجوں آپ کو؟

ج۔ آپ کی پسندیدگی ہی سب سے بڑا انعام ہے۔

ماسٹر شمیم۔ مدھوبنی۔ پورنیہ

س۔ ہندوستان کی حکومت اگر عورتوں کے ہاتھ میں آجاتی تو؟

ج۔ مرد رشک سے زہر کھا کر مر جائیں گے!

س۔ کیا یہ صحیح ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے عورتیں اپنا مقدس فرض بھول جاتی ہیں۔

ج۔ حالات اور ماحول مجبور نہ کرے تو عورت اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بھی اپنا مقدس فرض نہیں بھولتی۔

ڈاکٹر ایم۔ ایم۔ رحمن۔ امراؤتی

س۔ خوشتر صاحب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ "بیسویں صدی" کی مقبولیت اور کامیابی میں کس کا ہاتھ ہے۔ رام کا یا رحیم کا؟

ج۔ دونوں کا۔

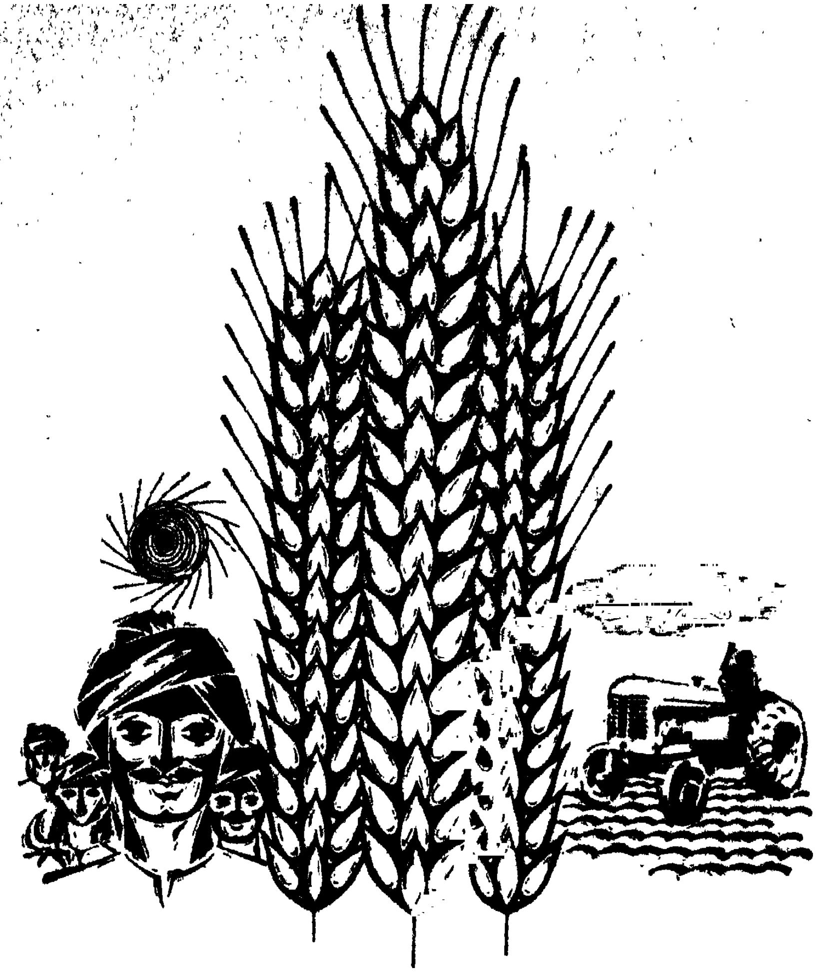
س۔ "بیسویں صدی" کے لئے ایک غزل بھیجوں، کیا آپ شائع کرنے کی زحمت فرمائیں گے؟

ج۔ "بیسویں صدی" کے معیار کی ہوگی تو ضرور شریکِ اشاعت کی جائے گی۔

سید صالح۔ دونگرہ

س۔ خوشتر بھیا! آپ "بیسویں صدی" کا نام بیسویں صدی کے بجائے "نوائے ادب" یا "امانتِ ادب" کیوں نہیں رکھ دیتے؟ "بیسویں صدی" جیسے ادبی صحیفہ کے شایانِ شان یہی نام ہیں۔

ج۔ "بیسویں صدی" بیسویں صدی کے پرستاروں کا ہے۔ وہ جو نام چاہیں رکھ لیں۔



ڈاکر بانٹ، کرنول

س۔ اکبر الٰہ آبادی کے اِس شعر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہو وہ سبھا کی پری نہ ہو

ج۔ حضرت اکبر نے بالکل بجا فرمایا ہے۔

س۔ دولت، عزت اور عورت میں کس کی قیمت زیادہ ہے؟

ج۔ عزت اور عورت کی۔

زبیدہ پروین۔ پنڈی۔ دلوریا

س۔ بھائی جان! میں بچپن سے شہر میں پلی پروان چڑھی۔ وہیں تعلیم پائی۔ کچھ بڑی ہوئی تو میری شادی ایسے دیہات میں ہو گئی ہے جہاں میرے اپنے ماحول سے اِس ماحول میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایسے میں زندگی گزارنا دوبھر ہو گیا ہے۔ بتائیے کیا کروں؟

ج۔ حالات سے سمجھوتہ کر لیجئے۔ پھر نئے ماحول میں بھی آپ خوش رہنے لگیں گی۔

س۔ زندگی کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے، جبکہ زندگی میں شکوہ چین نہ ہو۔

ج۔ اپنے سے زیادہ دکھی لوگوں کو دیکھئے۔ آپ کو اپنی زندگی شکھوں سے بھری معلوم ہونے لگے گی۔

س۔ بھائی جان! جب انسان کو اپنی زندگی سے نفرت اور بیزاری ہو جائے تو اُسے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ خدا سے دعا کرنی چاہئے کہ زندگی کا حُسن دیکھنے کے لئے بصیرت عطا فرمائے۔

سید وصی حیدر۔ گیا

س۔ چاک گریباں؟

ج۔ اے اہلِ جہاں گریہ نہیں ہے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

س۔ پھٹا دامن؟

ج۔ یہ دامن ہے یہ ہے گریباں آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

نسرین ماہرو۔ مظفرپور

س۔ آج کل لوگ انسان کی نہیں، دولت کی قدر کیوں کرتے ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ آج کی دُنیا میں دولت ہی سب کچھ ہے۔

س۔ عرصہ ہوا ہم نے آنکھیں پر چند اشعار بھیجے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ اب تک شائع نہیں ہوئے؟

ج۔ معیاری ہوتے تو یقیناً شریکِ اشاعت کئے جاتے۔

منیب فاروقی علیگ۔ علیگڑھ

س۔ بھائی صاحب! دُنیا میں پہلے عورت آئی یا مرد؟

ج۔ مرد! دُنیا کے سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام تھے۔

س۔ شاعر بننا آسان ہے یا ادیب؟

ج۔ سچی لگن ہو تو سب کچھ بننا آسان ہے۔ سچی لگن نہ ہو تو کچھ بھی بننا مشکل ہے۔

ایم۔ ایم حق۔ بوگرا (مشرقی پاکستان)

س۔ عورت کی زبان قینچی کی طرح کیوں چلتی ہے؟

ج۔ یہ تو اپنے اپنے ذوق کی بات ہے کسی کو عورت کی زبان قینچی کی طرح چلتی معلوم ہوتی ہے کسی کو پھول بکھیرتی ہوئی، گل افشانی کرتی ہوئی!!

[illegible]

س۔ [illegible] میں کیسی تبدیلی ہو گئی ہے؟

ج۔ [illegible] ہو گئی ہے [illegible] کیجے اس

رنگ!

س۔ خوشتر بھیا! غم کی تکمیل؟

ج۔ زندہ غم سہنے والوں کے لئے بعد مسرت بخش

ہوتی ہے کسی نے کہا ہے کہ

مسرت کی تمنا ہے تو غم کی انتہا کر لے

س۔ تھوڑی سی ہی سہی سچی راحت کہاں ملے گی؟

ج۔ سچی راحت کا تعلق جسم سے زیادہ روح سے ہے۔ دوسروں کو سکھ پہنچا کر، دوسروں کے لئے دکھ درد میں شریک ہو کر سچی راحت ملتی ہے۔

ذاکر باشاہ۔ کرنول (آندھرا)

س۔ "بیسویں صدی" کے ایک گزشتہ شمارہ میں محترمہ پیاری سلطانہ کے ایک سوال کے جواب میں آپ نے یہ شعر تحریر فرمایا ہے۔ براہ کرم زحمت نہ ہو تو بتلائیے یہ شعر کس کا ہے؟

دل برباد کو بھی بسنے والے دل ہی کہتے ہیں

خزاں دیدہ چمن کو بھی چمن کہنا ہی پڑتا ہے

ج۔ یہ شعر نجم ندوی کا ہے۔

س۔ شمع جلتی ہے لیکن پروانے جلانے کے لئے۔ سگریٹ جلتا ہے مگر سکون بخشتا ہے ۔۔۔ بتائیے دونوں میں کس کی اہمیت زیادہ ہے؟

ج۔ سگریٹ چند لمحوں کے لئے سکون بخشتا ہے۔ ورنہ ڈاکٹر کہتے ہیں سگریٹ کا دھواں موت کا دھواں ہے۔

س۔ خوشتر بھیا! جگر مرادآبادی کا کوئی اچھا سا شعر سنائیے۔

ج۔ لاکھوں میں انتخاب کے قابل بنا دیا

جس دل کو تم نے دیکھ لیا دل بنا دیا

[illegible]

س۔ چچا جان! [illegible] کی بات پر ہم سب چھوٹے بہن بھائیوں سے اکثر غصہ میں آجاتی ہیں۔ بتائیے ان کے غصہ اور ناراضگی کو ہم لوگ کیسے روکیں؟

ج۔ ان کے غصہ کو آپ لوگ غصہ نہ سمجھئے۔ اس طرح ان کا غصہ خود بخود ٹھنڈا ہو جائے گا۔

س۔ چچا جان! آج کل سرکاری غلہ کی دکان سے ہر ہفتہ کم از کم پاؤ شکر مل رہی ہے اس میں ہم گھر کے بارہ آدمی دو بار چائے پیتے ہیں اور کبھی کوئی میٹھی چیز بھی پکا لیتے ہیں۔ پھر بھی کچھ شکر بچ جاتی ہے۔ اگر آپ کو ضرورت ہو تو ہمارے پاس سے منگوا سکتے ہیں۔

ج۔ آہستہ بولئے کہیں جانے وزیر خوراک سمجھ نہیں جی نہ سن لیں ورنہ ہو سکتا ہے شکر کا کوٹہ مقرر کرنے والوں پر ان کا عتاب نازل ہوگا کہ اتنی زیادہ شکر کیوں دی جاتی ہے اور اتنی دریا دلی کیوں دکھائی جاتی ہے؟

سید عبدالمنان سالار [illegible]

س۔ زندگی کیا ہے؟ زندگی پر اپنی پسند کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ ایک شعر سنئے

نغمۂ موج سے لے راز صدا آتی ہے

زندگی نام ہے اٹھتے ہوئے طوفانوں کا

. . . ورگ

س۔ آپ اس بات سے کہاں تک متفق ہیں کہ اسلام ساری دنیا میں تلوار کے زور سے پھیلا۔

ج۔ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، یہ کہنا تاریخی

[illegible]

س۔ [illegible] آپ کے خیالات کیا ہیں۔ اس [illegible] میں کیا ہے؟

ج۔ اردو ترقی پسند نظم کی [illegible] پروان نہ چڑھ سکی۔ چند [illegible] بہا بہتر کہتے ہیں۔

ایم۔ قاسم انصاری میر پور ہاٹ، پورنیہ

س۔ "بیسویں صدی" کا معیار؟

ج۔ "بیسویں صدی" آپ کے سامنے ہے۔

س۔ الیکشن لڑنے کا بہترین نسخہ بتائیں؟

ج۔ ہزار بار ہار کر بھی بد دل نہ ہونا۔ الیکشن کے زمانہ میں پروپیگنڈہ تقریریں کرتے ہوئے اپنی تعریفوں کے پل باندھ دینا، جلسہ سننے والے [illegible] آپ کا منہ تکتے رہیں ۔۔۔ اپنی تقریروں میں بڑے بڑے دعوے اور سو فیصدی جھوٹے وعدے کرتے ہوئے ذرا بھی نہ جھجکنا!!

رفیق اکرم بھساولی بھساول

س۔ [illegible] دشمن کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہئے؟

ج۔ جسے دیکھ کر دوسروں کو عبرت ہو۔

س۔ سرد آہیں اور گرم آنسوؤں کے بعد ...؟

ج۔ شگفتہ مسکراہٹیں بھی آسکتی ہیں۔

صبیحہ بانو۔ راولپنڈی

س۔ دنیا میں کتنے مسلمان ہیں؟

ج۔ ۲۶ فیصدی۔

س۔ ہندوستان میں کتنے مسلمان ہیں؟

ج۔ ۱۴ کروڑ۔

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر۔ خوشتر گرامی ۔۔۔ مطبوعہ۔ دلّی پرنٹنگ ورکس۔ چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائٹل و تصاویر۔ بلاک پریس صدر بازار دہلی ۔۔۔ پتہ دفتر بیسویں صدی [illegible]


RADIUM TONIC PILLS
کمزوری کا زبردست علاج
ریڈیم ٹانک پلز